2ND EDITION

ہماری ویب ڈیجیٹل بک

عطا محمد تبسم

ATA MUHAMMED TABUSSUM

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

HAMARI WEB.com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Ata Muhammed Tabussum"
at Hamariweb.com

ایرانی انتخابات

ایرانی انتخابات میں ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کی کامیابی اور سرکاری ٹی وی پر سپریم لیڈر خامنہ ای کی جانب سے محمود احمدی نژاد کو مبارکباد اور ان کی مکمل حمایت کا اعلان کے ساتھ ہی امریکہ اور یورپی ملکوں کی اس امید کا خاتمہ ہوگیا کہ ایران میں کوئی تبدیلی آئے گی۔ سپریم لیڈر خامنہ ای نے محمود احمدی نژاد کی حمایت کرتے ہوئے دیگر صدارتی امیدواروں کو نومنتخب صدر کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے جبکہ میر حسین موسوی کے حامیوں کا احتجاج جاری ہے۔ اصلاح پسند گروپ کے 100 رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا ہے احتجاجی مظاہروں میں اب تک ایک ہلاکت کی اطلاع ملی ہے۔ موسوی کے حامیوں نے الزام لگایا ہے کہ انتخابی نتائج میں بڑے پیمانے پر بے قاعدگیاں ہوئی ہیں۔ جبکہ ایران کے نومنتخب صدر محمود احمدی نژاد نے مغربی میڈیا پر ایرانی انتخابات کی گمراہ کن کوریج کا الزام عائد کردیا۔ انہوں نے ایرانی انتخابات کو عظیم فتح قرار دیا ہے۔ امریکا جسے سب سے زیادہ ایران میں تبدیلی کی فکر تھی اس نے ایرانی صدارتی انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم انتخابات میں دھاندلی کے الزامات کا جائزہ لے رہے ہیں جبکہ یورپی یونین نے ایران کے صدارتی انتخابات کو متنازع قرار دیے جانے اور اس کے بعد ہونے والے پرتشدد واقعات

پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایران کے دسویں صدارتی انتخابات میں عوام کی شرکت کا جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس انتخابات میں خاص کر آزاد سوچ رکھنے والا شہروں میں متوسط طبقہ اور خوشحال لوگ، ایک بڑی تبدیلی کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ تاہم کم آمدن والے طبقے اور دیہاتی علاقوں میں موجودہ حکومت کے حامی احمدی نژاد کی حکومت برقرار رکھنے کے حامی تھے۔۔ ایرانی وزیر داخلہ صادق محصولی نے صدر احمدی نژاد کی فتح کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ انتخابات میں احمدی نژاد نے باسٹھ اعشاریہ چھ فیصد اور میر حسین موسوی نے تینتیس اعشاریہ سات فیصد ووٹ حاصل کئے۔ صادق محصولی کا کہنا ہے کہ کل تین کروڑ اکیانوے لاکھ ووٹ ڈالے گئے۔ صدر احمدی نژاد نے دو کروڑ پینتالیس لاکھ اور میر حسین موسوی نے ایک کروڑ بتیس لاکھ ووٹ حاصل کئے۔ محسن رضائی چھ لاکھ تینتیس ہزار ووٹوں کے ساتھ تیسرے اور مہدی کروبی تین لاکھ اکیس ہزار ووٹ لے کر چوتھے نمبر پر رہے۔ ووٹنگ کی شرح پچاسی فیصد رہی۔۔ امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے ایرانی صدارتی انتخابات میں صدر احمدی نژاد کی دوبارہ کامیابی کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکا ایرانی انتخابات میں دھاندلی کے الزامات اور اس کے بعد کی صورت حال کا جائزہ لے رہا ہے اور انتظار کر رہے ہیں کہ ایرانی عوام کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ ادھر برسلز میں یورپی یونین کے ہیڈ کوارٹر سے جاری ایک بیان میں بھی ایران میں صدارتی انتخابات کے بعد ہونے والے پر تشدد واقعات پر افسوس کا اظہار کیا گیا

۔ یورپیئن پریذیڈنسی نے توقع ظاہر کی ہے کہ نئی ایرانی حکومت عالمی برادری کے سامنے ذمہ داری کا مظاہرہ کرے گی اور ایٹمی تنازع پر مذاکرات کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے اپنی پوزیشن واضح کرے گی۔ ان حالات میں ایران کے لیے بڑا چیلینج انتخابات کے بعد حالات اور ماحول میں ٹھراؤ پیدا کرنا ہوگا جس کے لیے ابھی سے ایران کے مذہبی اور انقلاب کے حامیوں نے اعلیٰ اخلاقی اقدار اور جمہوریت میں عدم تشدد کی اہمیت کے بارے میں بیانات دینے شروع کردیے ہیں۔ چند اخبارات میں اور حکومت مخالف حلقوں میں دھاندلی کے بارے میں تشویش یا افواہیں کی خبریں بھی ہیں۔ لیکن انتخابات کے انعقاد کے ذمہ دار ادارے اور وزارت داخلہ دھاندلی کے ان خدشات یا شک کو دور کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اس وقت مختلف اندازوں رائے عامہ کے جائزوں سے جو بات واضح ہے وہ یہ کہ موجودہ صدر محمود احمدی نژاد کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے تاہم ان کے سب سے بڑے حریف، میر حسین موسوی، کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ تہران کے بازاروں اور گاڑیوں میں ان کی انتخابی علامت، سبز رنگ بہت واضح نظر آتا تھا۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ مغربی طاقتیں یہ امید کر رہی تھی کہ صدارتی انتخاب کے ناپسندیدہ نتائج نکلے گا تو ایران سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوجائے۔ انتخابی مہم کے دوران مغربی اخبارات میں تاثر یہ پیدا ہوا کہ اگر میر حسین موسوی انتخاب جیت گئے تو شاید یہ ایران کے قدامت پسندوں کی شکست ہوگی اور شاید اس طرح ایران بین الاقوامی معاملات، خاص کر جوہری

پروگرام کے بارے میں کوئی نرم رویہ اختیار کرلے گا۔ لیکن شاید انہیں اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوسکا کہ ایران اپنی پالیسیوں میں تسلسل رکھتا ہے اور، ایران کے جوہری پروگرام یا مشرق وسطیٰ کے بارے میں اس کی پالیسیوں میں تبدیلی کے بہت کم امکانات ہیں۔

میر حسین موسوی، کو ان کا حامی میڈیا ریفارمسٹ یعنی اصلاح پسند قرار دیتا رہا ہے۔ ان کے حامیوں نے گزشتہ برس کے پارلیمانی انتخابات میں اصلاح پسندوں کو بری طرح شکست دی تھی دراصل جن لوگوں کو اصلاح پسند کہا جا رہا تھا۔ وہ دراصل احمدی نژاد مخالف اتحاد تھا۔ میر حسین موسوی کے حامیوں میں سب سے بڑی شخصیت، سابق صدر محمد خاتمی ہیں جو اصلاح پسند ہیں، آیت اللہ ہاشمی رفسنجانی یا سابق سپیکر حجت الاسلام ناطق نوری بھی اصلاح پسندوں کے کیمپ میں تھے۔ اس کے علاوہ جمعیت مبارزان روحانیان (مجاہد علما کی جماعت)، اصول گرایان اسلامی (اصولیت پسند جماعت)، جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، حزب مشارکت اسلامیت وغیرہ بھی اصلاح پسندوں کے اتحاد میں شامل تھیں۔ ان میں اسلامی لیبر جماعت بھی تھی۔ جو اصلاح پسندوں میں سیکیولر یا جدید نظریات کی طرف جھکاؤ رکھنے والے دانشور اور شہری آزادیوں کے حامی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ انقلاب مخالف ایرانی جو مغربی ممالک میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں وہ اصلاح پسندوں کے ساتھ بے حد امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ انتخابات میں محمود

احمدی نژاد پر سب سے بڑا الزام ان کے مخالفین کی جانب سے یہ لگایا گیا کہ انہوں نے تیل کی برآمد سے حاصل ہونے والی دولت کو اپنی سیاسی مقبولیت کے لیے عوام میں لٹا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی مزدوروں کی کئی یونینیں، مزدور تنظیمیں، سکولوں کے اساتذہ کی یونینیں، نچلے طبقوں کی کئی تنظیمیں، کسانوں کی کئی تنظیمیں اسلامی انقلاب سے کمٹمنٹ رکھنے والے محمود احمدی نژاد کے حامی تھے۔ الیکشن میں سابق وزیر اعظم حسین موسوی صدر احمدی نژاد کے اصل حریف کے طور پر ابھرے۔ ایران کے دسویں صدارتی انتخابات میں سب سے بڑا موضوع عوام کی اقتصادی حالت تھی۔ تاہم جوہری پروگرام اور مغرب بالخصوص امریکہ، سے تعلقات پر بھی بحث ہوتی رہی۔ ایران کے صدارتی انتخابات میں جو اہم نعرے مختلف امیدواروں کی مہموں کا حصہ بنے۔ ان میں قانون کی حکمرانی'، 'عدل اور آزادی والا ترقی پسند ایران'، 'اقتصادی انقلاب' اور' سیاسی اصلاحات' شامل تھے۔ ایران کے دسویں صدارتی انتخابات ایرانی عوام اسلامی' انقلاب کی تیسویں سالگرہ کے دنوں میں ہوئے۔ اس انقلاب سے متعلق بنیادی سوالات بھی اٹھائے گئے۔ انقلاب کے مخالفین ایران کی ناکام اقتصادی پالیسیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی افادیت کو چیلنج کرتے رہے۔ جبکہ انقلاب کے حامی اقتصادی پالیسوں کی ناکامی کی ذمہ داری 'انقلاب کے بنیادی اصولوں سے انحراف' کو قرار دیتے رہے۔ ایرانی انتخابات کا اہم موضوع مہنگائی، بے روزگاری اور نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی مایوسی تھا۔ میر حسین موسوی نے جو ایران کے انقلاب

کے بعد 1981 سے لیکر 1989 ایران کے وزیراعظم رہے ہیں۔ ایرانی معیشت کی زبوں حالی کو اپنی انتخابی مہم کو بنیادی نقطہ بنا کر احمدی نژاد کی پالیسیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایرانی انتخابات کئی لحاظ سے ایران کی سیاسی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انتخابات میں پہلی مرتبہ امیدواروں کے درمیان ٹیلی ویژن پر مباحثے ہوئے۔ ایران میں اب تک امیدوار کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ اپنے مد مقابل کے خلاف الزام تراشی سے باز رہے جس کے نتیجے میں وہ مجبور ہوتا تھا کہ صرف اپنی کارگزاری یا اپنا پروگرام ہی پیش کرے۔ مگر اس مرتبہ انتخابات میں مغرب جمہوریتوں کی طرح ایران میں امیدوار ایک دوسرے کے خلاف سخت الزامات اور سخت زبان استعمال کرتے رہے ہیں۔ مثلاً احمدی نژاد نے میر حسین موسوی سے مباحثے کے دوران موسوی کے حامی سابق صدر محمد خاتمی اور سابق صدر ہاشمی رفسنجانی پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ان کے سولہ سالہ دور میں ایرانی عوام کی حالت تو نہ سدھری تاہم ان سابق صدور کی اولادیں ارب پتی بن گئیں۔ اس کے جواب میں احمدی نژاد پر یہ الزام لگتا رہا ہے کہ ان کی بدانتظامی کی وجہ سے ایران نے تیل کی بہت زیادہ قیمتوں سے جو منافع حاصل کیا تھا وہ سارے کا سارا ضائع ہوگیا۔ ایران کی آبادی کا ستر فیصد حصہ تیس برس کی عمر سے کم کا ہے اور چھبیس فیصد حصہ پندرہ برس کی عمر سے کم کا ہے۔ یہ انقلاب کے بعد پیدا ہونے والی نسل ہے اور انھوں نے ایران کو بھی کامیاب ریاست کے طور پر نہیں دیکھا ہے۔ حکومت کے اعداد و شمار کے

مطابق نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ منشیات کا شکار ہے اور اس مسئلے پر اپنی انتخابی مہم میں میر حسین موسوی حکومت پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ نئے دور حکومت میں ایٹمی پالیسی پرانی رہے گی، محمود احمدی نژاد ایرانی صدر محمود احمدی نژاد نے انتخابات میں اپنی فتح کو جائز قرار دیا ہے۔ ایک پریس کانفرنس کے دوران انتخابی نتائج پر کی گئی تنقید کو مسترد کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انتخابات کے بھاری ٹرن آؤٹ سے دنیا پر حکمرانی کرنے والے جابرانہ نظام کو دھچکا لگا ہے۔ احمدی نژاد نے کہا کہ ان کے نئے دورِ صدارت میں ایران کی جوہری پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ انہوں نے خبردار کیا کہ ایران پر حملہ کرنے والے کسی بھی ملک کو پچھتانا ہی پڑے گا۔ احمدی نژاد کے حریف اعتدال پسند رہنما محمد علی عبتاحی کا کہنا ہے کہ ہفتے کی رات پر تشدد مظاہروں کے دوران ان کے ایک سو سے زائد کارکنوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کیا گیا ہے۔ عبتاحی نے خدشہ ظاہر کیا کہ مزید گرفتاریاں عمل میں آ سکتی ہیں۔ گرفتار شدگان میں سابق صدر محمد خاتمی کے بھائی محمد رضا خاتمی بھی شامل ہیں۔ تاہم عدالتی ترجمان کے مطابق اعتدال پسند کارکنوں کو گرفتار نہیں کیا گیا بلکہ انہیں طلب کرکے کشیدگی پھیلانے سے باز رہنے کے لئے خبردار کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ان افراد کو بعد ازاں رہا کر دیا گیا۔ ایرانی حکومت نے انٹرنیٹ کی فلٹرنگ میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ تاہم موبائل فون سروس بحال کر دی گئی لیکن ایرانی شہری ابھی تک ایس ایم ایس ارسال نہیں

کر سکتے۔

اعتدال پسندوں رہنما میر حسین موسوی کی جانب سے صدارتی انتخابات میں دھاندلی اور بے ضابطگیوں کے الزام پر ایران میں 1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد ہفتے کو بدترین احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ مظاہرین نے دارالحکومت میں متعدد گاڑیاں نذرآتش کیں اور پولیس پر پتھراؤ کیا۔ دوسری جانب سیاسی تجزیہ کاروں نے احمدی نژاد کے دوبارہ انتخاب کو مغربی طاقتوں کے لئے مایوس کن قرار دیا ہے جو ایران کو اپنا جوہری پروگرام روکنے پر قائل کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ لندن میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ برائے اسٹریٹیجک اسٹڈیز کے مارک فٹزپیٹرک کہتے ہیں کہ احمدی نژاد کی انتخابی کامیابی ایران کے جوہری تنازعے کے جلد حل کے لئے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ ان انتخابات کے بعد ایران کے بارے میں بیرونی دنیا میں تو بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اندرون ملک بھی سیاسی دھڑوں میں اختلافات کھل کر سامنے آئے ہیں۔ احمدی نژاد نے اپنے حریفوں پر الزام عائد کیا کہ وہ مغرب کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے اصولوں کو اپناتے ہوئے قومی تشخص کو نقصان پہنچا رہے ہیں جبکہ احمدی نژاد کے حریف سابق وزیر اعظم میر حسین موسوی کا کہنا ہے کہ قدامت پسند صدر نے اپنی انتہاپسند خارجہ پالیسی کے ذریعے ایرانیوں کی تذلیل کی۔ 52 سالہ احمدی نژاد نے چار سال قبل 1979 کے اسلامی انقلاب کی بحالی کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے تیل برآمد کرنے والے

دنیا کے چوتھے بڑے ملک کی صدارت کا منصب سنبھالا تھا۔ انہوں نے ملک کے جوہری پروگرام کی توسیع کی، ان مغربی الزامات کو رد کیا کہ اس منصوبے کا مقصد جوہری ہتھیاروں کی تیاری ہے۔ ہولوکوسٹ کا انکار اور اسرائیل کے خلاف سخت بیانات کے ذریعے بھی انہوں نے عالمی طاقتوں کو ناراض کیا۔

سوات کے بے گھر افراد اور انسانی حقوق کی صورتحال

میر اای میل باکس سوات وادی اور بے گھر افراد کی امداد کی اپیلوں اور وہاں پیش آنے والے واقعات اور تصاویر سے بھرا پڑا ہے۔ پاکستان کی وادی سوات فوج اور طالبان کے درمیان جاری شدہ جنگ نے علاقے کے لاکھوں افراد کو نقل مکانی پر مجبور کر دیا ہے۔ ان بے گھر افراد کی حالت بہت ابتر ہے۔ کھانے پینے اور دواؤں کی قلت ہے۔ سوات کے مہاجرین کی افسوس ناک حالت کا سوچ کر دل دہل جاتا ہے۔ بعض اوقات آدھی رات کو میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ میں ان مصیبت زدہ انسانوں کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔ "خوراک ختم ہو چکی ہے۔ انہیں بیماریوں نے گھیر رکھا ہے، لوگ پریشان ہیں اور اب ان کی اس مصیبت پر سیاست ہو رہی ہے۔ متاثرہ علاقے کے لوگ چاہتے ہیں کہ کرفیو میں اتنی نرمی کی جائے کہ وہ وہاں سے نکل سکیں۔ مردان، کشمیر اور ہزارہ سے تعلق رکھنے والی طالبات بھی محصور ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کے اعداد و شمار کے مطابق دیر سے گیارہ روزہ آپریشن کے دوران ایک لاکھ تیس ہزار لوگ نقل مکانی کر چکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان تنظیموں کے ساتھ رجسٹرڈ ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے مردان، چارسدہ، درگئی، چکدرہ میں ریلیف کیمپ قائم کئے گئے ہیں جب کہ ہزاروں لوگ رشتہ داروں کے ہاں ٹھیرے ہیں۔ اسی طرح بونیر سے نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد بھی لاکھوں سے

سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان لوگوں کے لیے مردان اور صوابی میں کیمپ قائم کئے گئے ہیں تاہم کئی خاندان آسمان تلے رات گزارتے ہیں۔ پاکستان کے داخلی مہاجر پچھلے سال اگست سے، بعد تک ۱۰ لاکھ سے زائد افراد اپنا گھر بار چھوڑ چکے ہیں اور اب یہ تعداد ۳۳ لاکھ ہو چکی ہے۔ اس قدر بڑی تعداد کے بے گھر ہونے کا مشاہدہ ایک ہولناک تجربہ ہے۔ صرف دس فیصد بے گھر افراد کو خیمے دستیاب ہیں، جبکہ کھلے آسمان تلے، سورج کی تپش میں لاکھوں افراد پناہ لئے ہوئے ہیں۔ متاثرین کو کئی طرح کے مسائل کا سامنا ہے جن میں پینے کے صاف پانی کی کم دستیابی سرفہرست ہے۔ پاکستان میں ہونے والی لڑائی کا اثر براہ راست افغانستان پر پڑ رہا ہے۔ مشترکہ سرحد کے دونوں اطراف پشتون آباد ہیں اور انہی سے طالبان نے جنم لیا تھا۔ امریکہ خوش ہے کہ افغانستان کی لڑائی اب پاکستان کی سرحدوں کے اندر در آئی ہے۔ دوسری جانب مرکزی حکومت نے متاثرین کے لیے پچاس کروڑ اسی لاکھ روپے کی گرانٹ دینے کا اعلان کیا ہے۔ صوبہ سرحد میں قبائلی علاقوں سے بے گھر ہونے والے ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ متاثرین کے لیے گیارہ ریلیف کیمپ بنائے گئے ہیں۔ ادھر ریڈ کراس تنظیم کے مطابق مالاکنڈ میں شدید انسانی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ ریلیف کمشنر جاوید امجد کا کہنا ہے کہ ان کیمپوں میں مزید متاثرین رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بونیر اور دیر کے آپریشن کی وجہ مردان اور صوابی کیمپوں میں چار ہزار سے زیادہ خاندان رجسٹرڈ کیے گئے ہیں۔ مردان، صوابی میں کیمپوں سے باہر

بھی تین ہزار سے زیادہ خاندان آئے ہیں۔ پہلے گیارہ کیمپوں میں جگہ نہیں ہے صرف جلوزئی میں ایک ہزار خاندانوں کو رکھنے کی گنجائش ہے۔

امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے فروری میں ہونے والے حکومت اور طالبان کے درمیان امن معاہدے پر شدید تنقید کی تھی اور ان کا مؤقف ہے کہ اس سے طالبان کو منظم اور مضبوط ہونے کا موقع ملا ہے۔ واشنگٹن میں پاکستانی صدر آصف زرداری اور افغان صدر حامد کرزئی نے امریکی صدر باراک اوباما سے ملاقات میں القاعدہ اور طالبان کے مسئلے پر تبادلہ خیال کیا تھا۔ جس میں امریکی صدر نے کہا تھا کہ طالبان کو شکست دی جائے گی چاہے اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے۔ ادھر انٹرنیشنل ریڈ کراس نے مالاکنڈ آپریشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی حقوق کی صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور فریقین سے اپیل کی ہے کہ وہ جنگی قوانین کی پاسداری کریں۔ طالبان کے ظلم اور ان کی کاروائیوں کے ویڈیو کلپ جو ای میل کئے جا رہے ہیں وہ ہولناک ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ افسوس ناک اور شرمناک ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ طالبان اور فوج کے درمیان لڑائی کے نتیجے میں لاکھوں افراد مختلف علاقوں سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں ان بچوں اور عورتوں کا کیا قصور ہے جو اپنے ہی وطن میں بے گھر اور بے در ہو گئے ہیں۔ دیگر شہروں میں سیاسی لیڈروں کے ساتھ مخیّر حضرات نے مہاجرت کا شکار ہونے والے لاکھوں افراد کی مالی

امداد، اشیائے خوردو نوش اور اور دوسرے سامان کی فراہمی کے لئے کوششیں شروع کر رکھی ہیں مالاکنڈ آپریشن، پاکستانی ذرائع ابلاغ میں آپریشن کے بارے میں ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اخبارات کے اداریوں سے لے کر ٹی وی چینلوں کے اشتہارات تک جگہ جگہ ملٹری آپریشن کی حمایت جاری ہے۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے لڑی جانے والی "میڈیا وار" میں کامیاب کون ہوگا۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس کا نقصان اس ملک اور اسی قوم کو اٹھانا ہوگا۔

خواتین کے ساتھ بدسلوکی

کورنگی کے صنعتی علاقے میں واقع مہران ٹاؤن میں گزشتہ دنوں نامعلوم مسلح افراد نے چالیس سالہ محمد امین بلیدی اور ان کی اہلیہ زرینہ بلیدی کو گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ ان کا پانچ سالہ بیٹا اسد عباس محفوظ رہا۔ مقتولین کا تعلق بلوچستان کی سرحد کے قریب واقع ضلع جیکب آباد سے ہے۔ قتل کا یہ واقعہ چھ سال پہلے پسند کی شادی کرنے کا شاخسانہ تھا۔ مقتولین کے ورثا کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ کاروکاری کی رسم کا نتیجہ ہے۔ ہمارے یہاں غیرت کے نام پر قتل روزمرہ ہونے والے جرائم میں شامل ہے۔ کمیشن برائے انسانی حقوق پاکستان کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ملک میں پچھلے سال ایک ہزار دو سو دس خواتین کو قتل کیا گیا جن میں چھ سو بارہ خواتین کو غیرت کے نام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ کمیشن کے مطابق گزشتہ سال غیرت سمیت دوسری وجوہات کی بنا پر ایک سو چودہ بچے بھی قتل ہوئے۔ پاکستان میں غربت، مہنگائی کے بعد گھریلو تشدد کے واقعات میں خواتین کو مشکلات کا سامنا ہے۔ ایک عورت نے چار بچوں سمیت شوہر کے تشدد اور جان سے مار دینے کی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر ایدھی ہوم میں پناہ حاصل کی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے شوہر نے منشیات کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ بعد میں اکثر ان پر تشدد کیا جانے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ

شوہر کے مظالم اس قدر بڑھ چکے تھے کہ ایک بار سر پر زخم آنے کی وجہ سے آٹھ ٹانکے لگوانے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ منشیات خریدنے کے لیے گھر کا سارا سامان فروخت ہو گیا تھا۔ ’نوبت یہاں تک آ گئی تھی میرے شوہر نے بچوں کو بیچنے کی بات شروع کی دی تھی۔‘ ایدھی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ گزشتہ برسوں میں گھریلو تشدد سے تنگ آ کر پناہ لینے والی خواتین میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ پہلے ایسی خواتین کو ان کے والدین یا کوئی قریبی رشتہ دار اپنے ہاں پناہ دے دیتا تھا لیکن اب معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی ایک غیر سرکاری تنظیم عورت فاؤنڈیشن کا کہنا ہے کہ اس سال پاکستان میں خواتین پر تشدد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ عورت فاؤنڈیشن کے مطابق رواں سال کے پہلے نو ماہ میں ملک بھر سے خواتین کے خلاف تشدد کے پانچ ہزار چھ سو سے زائد واقعات کی رپورٹ موصول ہوئی ہیں۔ صوبہ سندھ میں حالیہ دنوں عورتوں کے خلاف مختلف نوعیت کے تشدد میں اضافہ کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔

گزشتہ دنوں میں عورتوں کے خلاف مختلف مقامات پر تشدد کے چار واقعات پیش آئے ہیں جن میں سے دو عورتیں کاروکاری رسم کے تحت قتل کر دی گئیں۔ ایک عورت کے شوہر نے چاقو سے بیوی کا ناک کاٹ دیا اور ایک عورت نے اپنے والدین کے گھر سے پولیس کی مدد سے پناہ حاصل کی ہے۔ اس طرح تیزاب کے حملے میں زخمی ہونے

کے بعد زخموں سے جانبر نہ ہو سکنے والی پچیس سالہ ماریہ شاہ کا معاملہ بھی خواتین کے ساتھ تشدد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر نے ماریہ شاہ پر تیزاب حملے کا از خود نوٹس لیا تھا۔ سندھ میں جنوری 2005 سے لے کر اپریل 2008 تک تین سال کے عرصہ میں خواتین کے ساتھ گھریلو بد سلوکی اور خوفزدہ کرنے کے ۵۷۷ واقعات پیش آئے۔ اس قسم کے سب سے زیادہ واقعات کراچی اور دادو میں رونما ہوئے جن کی تعداد فی شہر ۶۴۱ کے لگ بھگ ہے۔ سندھ اسمبلی میں گزشتہ دنوں حمیرہ علوانی کے ایک سوال کے جواب میں ایوان کو بتایا گیا کہ خواتین کے ساتھ بد سلوکی کے معاملہ میں ضلع میر پور خاص دوسرے نمبر پر ہے۔ جہاں گھریلو خواتین کے ساتھ بد سلوکی اور انہیں دہشت زدہ کرنے کے ۹ ۳ واقعات پیش آئے تھے۔ سنہ 2005 سے لے کر سنہ 2008 کے عرصہ میں صوبہ سندھ میں اجتماعی زیادتیوں اور قتل کے ۴۰۱ واقعات ہوئے، جن میں سے ۴۵ واقعات کراچی میں، حیدر آباد میں، اور سکھر میں ہوئے۔ خواتین پر تشدد کے ان واقعات کو دیکھتے ہوئے حکومت کو اس سلسلے ۱۴ میں کوئی لائحہ عمل تشکیل دینا چاہئے تاکہ ایسے واقعات میں کمی آ سکے۔ ساتھ ہی پولیس کو ان واقعات کی بھرپور طور پر تفتیش کرنی چاہئے اور عدالتوں میں زیر التوا مقدمات کا فیصلہ ہونا چاہئے تاکہ معاشرہ میں عدل کا نظام قائم ہو سکے۔

آنگ سان سوچی کی چونسٹھویں سالگرہ

آنگ سان سوچی اپنی چونسٹھویں سالگرہ 19 جون کو نظر بندی میں منائیں گی .برما کی جمہوریت نواز اور سالہا سال سے نظر بند سیاسی رہنما اور حزبِ مخالف کی لیڈر، نوبل انعام یافتہ آنگ سان سوچی ہیں۔ جو دنیا میں دی لیڈی' کہلائی جاتی ہیں۔ اس سال بھی وہ اپنی چونسٹھویں سالگرہ، 19 جون کو نظر بندی میں منائیں گی۔ ان کے ہمدرد امید کرتے ہیں کہ پابندیوں میں گزرنے والی یہ ان کی آخری سالگرہ ہو۔ جمہوریت نواز رہنما آنگ سان سوچی کو مئی دوہزار تین میں نظر بند کیا گیا تھا۔ انہوں نے پچھلے 19 سالوں میں تیرہ برس اپنے گھر میں نظربندی کی حالت میں گزارے ہیں۔ اتوار کو وہ اپنی سالگر تنہائی میں منائیں گی۔ ان کو ملنے والوں میں دو خدمت گار خواتین اور ایک ڈاکٹر ہیں جو ہفتے میں ایک بار ان کو دیکھنے آتے ہیں۔ آنگ سان سوچی گزشتہ تین سالوں سے نظر بند ہیں۔انہیں بجا طور پر دنیا کا سب سے جانا مانا سیاسی قیدی مانا جاتا ہے۔ آنگ سان سوچی نے اپنی زندگی کے گزشتہ سولہ میں سے نو سال قید تنہائی میں گزارے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر سنہرا دور قید و بند میں گزارا ہے۔ لیکن اب بھی ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی ہے۔

برما کی فوجی حکومت میں شامل جرنیل سوچی کی رہائی کے لیے ان تازہ ترین درخواستوں پر دھیان دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ جرنیل جنوب مشرقی ایشیا کے اس ملک میں جمہوری تبدیلی کے لیے بیرونی دباؤ کو بھی نظر انداز کرتے رہے ہیں۔۔برما کی جمہوریت نواز اور سالہا سال سے نظربند رہنما آنگ سان سوچی کی رہائی کے شروع ہونے والی نئی مہم میں۔برطانوی وزیرِ اعظم نے بھی اپنا نام شامل کروادیا ہے۔ مسٹر گورڈن۔براؤن نے کہا اس ناقابلِ۔برداشت ناانصافی پر دنیا خاموش ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ آنگ سان سوچی کی رہائی کے لئے اپیلوں میں اضافہ ہورہا ہے۔۔برما کی حزبِ مخالف، نوبل انعام یافتہ لیڈر پر ایک مقدمے کی کارروائی جاری ہے۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے نظربندی کے ضوابط کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان کے حامیوں نے ان کی حق میں انٹرنیٹ پر مہم شروع کی ہے۔ دنیا بھر سے انسانی حقوق کی تنظیمیں اور معروف ہستیاں وڈیو پیغامات ویب سائٹ پر ڈال رہی ہیں۔

گزشتہ دنوں کمبوڈیا کے دارالحکومت نوم پنہ میں سینکڑوں احتجاجیوں نے جنوبی ایشیا اور یورپ کی سر۔براہ کانفرنس کے باہر مظاہرہ بھی کیا تھا۔ اس ہفتے کے اوائل میں حقوقِ انسانی کے کارکنوں نے اعلان کیا تھا کہ انہوں نے۔برما کی حکومت سے آنگ سان سوچی اور دوسرے سیاسی مخالفین کو آزاد کرانے کے مطالبے پر چھ لاکھ دستخط حاصل کر لئے ہیں۔ امریکی صدر اوباما نے بھی۔برما کی حکومت سے

ان کی فوری اور غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ مقدمہ محض ڈرامہ ہے اور الزامات بے بنیاد ہیں۔ تین برس پہلے جب ان کی نظر بندی کی مدت اختتام کو پہنچ رہی تھی تو امید کی جارہی تھی کہ آنگ سان سوچی کو رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن برما میں حکام نے اپوزیشن رہنما آنگ سان سوچی کی گھر میں نظر بندی کی مدت بڑھا دی تھی۔ اس وقت اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان نے برما کی فوجی حکومت کے سربراہ سے اپیل کی تھی کہ آنگ سان سوچی کی نظر بندی ختم کردی جائے۔ کوفی عنان کا کہنا تھا کہ انہیں یقین ہے کہ جنرل تھان شوی درست قدم اٹھائیں گے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد برما کی حکومت کا یہ فیصلہ سامنے آگیا کہ آنگ سان سوچی مزید نظر بند رہیں گی۔ اس اعلان سے قبل رنگون میں واقع ان کے گھر کے اطراف سکیورٹی بڑھا دی گئی تھی۔ حکام کا کہنا ہے کہ انہیں معلوم نہیں کہ وہ کب تک نظر بند رہیں گی۔ آنگ سان سوچی کی سیاسی جماعت نیشنل لیگ فار ڈیمو کریسی انتخابات میں فتح کی سولھویں سالگرہ منانے کی تیاریاں کر رہی ہے تاہم جماعت کی اس کامیابی کو فوج نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ انیس سو باسٹھ میں فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور برما میں فوجی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ درمیان میں انہیں بہت تھوڑی مدت کے لئے رہا کیا گیا تھا۔ اپنی رہائی کے بعد ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ غیر مشروط طور پر رہا ہوئی ہیں اور انہیں ملک میں سفر کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ برما میں جمہوری تبدیلیاں لانے کے لئے پوری

طرح ثابت قدم ہیں۔ سوچی انیس ماہ سے رنگون میں اپنے گھر پر نظر بند تھیں اور انہیں کسی بھی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔

پچھلے ڈیڑھ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کی فوجی حکومت نے انہیں گھر سے باہر آنے کی اجازت دی۔ وہاں بھی سوچی نے اپنی مختصر تقریر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ انہیں غیر مشروط طور پر رہا کیا گیا ہے اور یہ کہ اب وہ سیاسی رہنما کی حیثیت میں کام کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ سوچی کی جماعت نے انیس سو نوے کے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن فوج نے انہیں اقتدار میں نہیں آنے دیا۔ انہیں ستمبر سن دو ہزار میں گرفتار کرکے ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ان کی گرفتاری کی فوری وجہ ان کی نقل حرکت پر عائد پابندیوں کے خلاف ان کی مزاحمت تھی۔ آنگ سان سوچی نے آخری بار گرفتار ہونے سے پہلے ملک کا دورہ کیا تھا جس کے دوران ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ سوچی کے والد آنگ سان کو برطانوی سامراج کے دوران برما کو متحد کرنے کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ سوچی کی انیس سو اٹھاسی میں برما واپسی پر امید ظاہر کی جا رہی تھی کہ وہ اپنے والد کا کارنامہ دہرائیں گی۔ سوچی کے پاس کبھی کوئی سیاسی عہدہ نہیں رہا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی شہرت کے بل پر وہ نسلی بنیادوں پر تقسیم ملک کو متحد کر سکیں گی۔ رنگون کے موجودہ حکمرانوں کی نسلی گروہوں سے بات چیت میں عدم دلچسپی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے

کہ سوچی کی ان گروہوں کو قریب لانے کی صلاحیت انہیں خطرناک بنا دیتی ہے۔ اس کا ایک ممکنہ نتیجہ یہ ہے کہ سوچی کی سالگرہ کے موقع پر ان کی رہائی کے لیے درخواستوں پر کان نہیں دھرا جائے گا اور امکان یہی کہ وہ زندگی کا یہ سال بھی زیادہ تر اپنے گھر کی چار دیواری میں قید تنہائی میں ہی گزاریں گی۔

کامیابی کا جشن، ہوائی فائرنگ

سرشام سے ہی ہر طرف ایک جوش خروش کی کیفیت تھی۔ جگہ جگہ نوجوانوں نے بڑی اسکرین لگائی ہوئی تھی۔ کرکٹ کے متوالے ورلڈ کپ دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہر تقریب میں یہی موضوع بحث تھا۔ پاکستان ورلڈ کپ جیت جائے، ہر دل میں یہ آرزو تھی اور ہر لب پہ یہ دعا تھی۔ فائنل میچ کو دیکھنے کا موقع کوئی بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا تھا۔ تقریبات تاخیر کا شکار ہو رہی تھیں کہ لوگ میچ دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ ایک دن پہلے مختار عاقل کے صاحبزادے فرحان عاقل کے ولیمے میں ضیا زبیری نے پاکستان کے جیتنے کی پیشن گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان کو جیتنا چاہئے کہ اس سے پوری قوم کو خوشی ملے گی۔ اتوار کو سڑکوں پر فائنل کے آغاز سے قبل سرشام ہی سناٹا چھاگیا اور ٹریفک کم ہوگیا تھا۔ شادی، سالگرہ اور ولیمہ وغیرہ کی تقریبات سے زیادہ لوگوں کی میچ میں دلچسپی تھی۔ مہمان کافی تاخیر سے پہنچ رہے تھے۔ رات کو جب یہ مرادیں پوری ہوئی تو پوری قوم کا جوش خروش یہ کہہ رہا تھا کہ ہم ایک قوم ہیں۔ ہمارا ایک ہی پرچم ہے، ایک ہی کلمہ ،ایک قرآن، ہے۔ گزشتہ رات جو جشن شروع ہوا تھا۔ اس میں خوشیوں کے اظہار کے جدا جدا انداز تھے۔ کہیں خوشی کے اظہار میں ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی تو کوئی سجدہ شکر بجا لا رہا تھا۔ کہیں مٹھائیاں تقسیم ہو رہی تھیں تو

کہیں بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد دی جارہی تھی۔ فائنل میچ میں شاہد آفریدی کے وننگ شارٹ کھیلتے ہی کراچی ہوائی فائرنگ آواز سے گونج اٹھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں مختلف علاقوں میں قومی پرچم اٹھائے سڑکوں پر نکل آئیں۔ جنھوں نے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے ڈالے، مختلف مقامات پر آتش بازی کا مظاہرہ بھی کیا گیا۔ نوجوانوں سڑکوں پر آکر موٹر سائیکلوں پر ون ویلنگ کا مظاہرے کرتے نظر آئے۔ جام ہوگیا۔ جبکہ بعض علاقوں میں مٹھایاں بھی تقسیم کی گئیں۔ جس کے باعث تقریبات رات گئے تک جاری رہیں۔ حیدرآباد میں بھی خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ہوائی فائرنگ کی گئی، آتش بازی کا مظاہرہ بھی کیا گیا اور مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، لوگوں نے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر مبارکباد دی، موٹر سائیکل سوار نوجوان ٹولیوں کی شکل میں سڑک پر نکل آئے اور خوشی کا اظہار کیا۔ میچ ختم ہوتے ہی ایک دوسرے کو ایس ایم ایس اور ٹیلی فون کے ذریعے مبارکباد دی جارہی تھی۔ مختلف مقامات پر آتش بازی اور ڈھول کی تھاپ پر فائرنگ بھی کی جاری تھی ۔لارڈز کے میدان پر ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈکپ فائنل میں پاکستان کی سری لنکا پر آٹھ وکٹوں سے شاندار فتح کے بعد کپتان یونس خان نے بین الاقوامی کرکٹ برادری پر زور دیا کہ پاکستان کو اس کے سیاسی حالات کی وجہ سے تنہا نہ چھوڑا جائے۔ "ہمارے تمام ہی مداحوں کی یہ خواہش تھی کہ ٹیم کو ایسی جیت نصیب ہو، ورلڈکپ میں فتح، ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈکپ میں یہ جیت ہماری پوری قوم کے لئے ایک بڑا شاندار تحفہ ہے۔"

یونس خان کے جذبات سے پر الفاظ میں دنیا میں کرکٹ کے متوالوں سے کہا کہ "اب ہم چیمپئنز ہیں۔ میں آپ سب سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ پاکستان کا دورہ کریں۔ ہمارے نوجوان کرکٹرز کے لئے ہمیں 'ہوم' سیریز کی اشد ضرورت ہے۔" لاہور میں مہمان کرکٹ ٹیم سری لنکا کے کھلاڑیوں کی بس پر حملے کے بعد بین الاقوامی کرکٹ ICC کونسل نے سیکیورٹی وجوہات کے باعث پاکستان سے 2011ء ورلڈکپ کرکٹ کی شریک میزبانی بھی چھین لی ہے۔ جو ایک بہت بڑی ناانصافی ہے اور اس طرح پاکستان کو دنیائے کرکٹ سے علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ لارڈز کے میدان پر ایک اہم ٹورنامنٹ کے فائنل میں جیت سے پاکستان نے دنیا پر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کردیا ہے کہ پاکستان اور کرکٹ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یونس خان کا یہ کہنا درست ہے کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں عام پاکستانیوں کو کوئی قصور نہیں ہے۔ "ملک میں جو حالات ہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ کھیل کو سیاست سے نہیں جوڑنا چاہیے۔ کھیل کو سیاست کی ضرورت نہیں۔ سری لنکا، بھارت اور بنگلہ دیش نے پاکستان کی ورلڈکپ کی میزبانی کی مخالفت کی ہے۔ وہ ایک افسوس ناک امر ہے۔ اس بار دفاعی چیمپئن بھارت سیمی فائنل تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ سری لنکا کو سوچنا چاہئے کہ ہم نے جان پر کھیل کر ان کے کھلاڑیوں کی جانیں بچائی ہیں۔ اور بنگلہ دیش کو نہیں بھولنا چاہیے

کہ وہ ہمارے وجود ہی سے تخلیق ہوا ہے۔ جشن خوشیوں کا ضرور منانا چاہیئے لیکن اس
میں فائرنگ اور اندھی گولیوں سے چار افراد جن میں معصوم بچے، شامل ہیں اور
افرد کے زخمی ہونے کے واقعات تکلیف دہ ہیں۔ ان پر ہمیں سوچنا چاہیئے۔ ۵۳، ۰۳
خوشیوں کا یہ اظہار کسی گھر میں تاریکی لے آئے یہ انتہائی افسوس ناک امر ہے۔

سازشی ٹولے کے مکروہ عزائم کو ناکام بنانا چاہیئے

کراچی میں ایک بار پھر کشید گی ہے۔ حکومت میں شریک دو جماعتیں اور اپوزیشن جماعتوں کے ٦ سیاسی کارکن ایک ہی دن میں موت کی وادی میں دھکیل دیے گئے ہیں۔ صوبہ سرحد اور سوات وادی کے ابتر حالات کے بعد کئی اخباری کالم نگاروں نے کراچی پر اظہار رائے کیا تھا۔ کراچی کا امن کئی حلقوں کے لئے باعث تشویش تھا۔ جمعرات کو اچانک شہر کے مختلف علاقوں میں نامعلوم دہشت گردوں کے ہاتھوں، متحدہ قومی موومنٹ، پیپلز پارٹی، جماعت اسلامی، مہاجر قومی موومنٹ کے کارکنوں کا قتل ایک بڑی کا پیش خیمہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ جمعہ کو صبح سویرے سبزی منڈی پر ایک تاجر کا قتل، اور. نیو کراچی سندھی ہوٹل کے قریب نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ایک سیاسی جماعت کے دو کارکنوں کو ہلاکت کا واقعہ بھی فکر انگیز ہے۔ جس میں سندھی ہوٹل کے قریب مسلح موٹر سائیکل سواروں نے گھر کے باہر بیٹھے دو افراد پر فائرنگ کر دی۔

اسی دن ڈیفنس میں رکن قومی اسمبلی یعقوب بزنجو کے گھر پر پارسل بم کا دھماکا ہوا، جس میں چار افراد زخمی ہوگئے۔ اطلاعات کے مطابق خیابان راحت میں ایم این اے یعقوب بزنجو کے گھر پر ایک پارسل موصول ہوا جسے کھولنے پر

زوردار دھماکا ہوگیا۔ خدانخواستہ سازشی عناصر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجاتے تو صورتحال مزید بگڑ جاتی۔ صوبائی قائمہ کمیٹی برائے داخلہ کے ایک حالیہ اجلاس میں، صوبائی وزیر داخلہ ڈاکٹر ذوالفقار علی مرزا نے اس صورتحال کا سخت نوٹس لیا ہے۔ اور پولیس کو جدید دور کے تقاضوں اور سیکورٹی حالات کے تناظر کو پیش نظر تیاریوں کے لئے کہا گیا ہے۔

اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ کمیونٹی پولیسنگ، کرائم سین کے طریقہ کار، ہنگامی حالات سے نمٹنے اور بروقت و مؤثر کارروائی کی حکمت عملی، فنگرپرنٹ میں مہارت، کمپیوٹر آپریٹنگ کورسز و بنیادی تربیت کے علاوہ دہشت گردوں، تخریب کاروں اور جرائم پیشہ عناصر سے نبرد آزما ہونے کی پولیس کو باقاعدہ تربیت دی جائے گی۔ ایمرجنسی حالات، سیکورٹی کی صورتحال، نگرانی کے نظام کی مزید بہتری اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کی روک تھام کے ضمن میں ایک ہزار اہلکاروں پر مشتمل اسپیشل پروٹیکشن گروپ تشکیل دیا گیا ہے جبکہ وہیکل ٹریکنگ نظام، ایف ایم ریڈیو نظام، مددگار 15 کال سینٹر اور دیگر شعبوں کو آن لائن کیا جارہا ہے۔ پولیس ریکارڈ اور آفس منیجمنٹ اینٹی ٹریٹڈ سسٹم کے تحت ملک کے تمام تھانوں پر مشتمل کمپیوٹرائزڈ مرکزی ڈیٹا بیس قائم کیا جارہا ہے۔ کمانڈ اینڈ کنٹرول نظام کے تحت کیمروں کے ذریعے کراچی کی نگرانی و مانیٹرنگ کا ایک نظام بھی قائم کیا گیا ہے۔ پولیس کو گاڑیاں بھی دی گئی

ہیں۔ اس قدر انتظامات کے باوجود کراچی میں ہونے والے واقعات کو نااہلی کہا جاسکتا ہے۔ کراچی ایک میگا سٹی ہے۔ موجودہ حالات میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری اپوزیشن اور حکمران جماعتوں پر عائد ہوتی ہے۔ کراچی کے امن وامان کو تہہ بالا کرنے کی سازش کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بیک وقت ساری جماعتوں کو مشتعل کرنے والوں کا مقصد ہی لوگوں کو باہمی طور پر لڑانا ہے۔ اور ہمیں اس سازشی ٹولے کے مکروہ عزائم کو ناکام بنانا چاہیئے

بجٹ کی آمد آمد

بجٹ کی آمد آمد ہے۔ ابھی سے جی دہل رہا ہے۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ ٹیکس نیٹ میں شکار کو لانے کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دوسری جانب عوام کا یہ حال ہے کہ ان کا بال بال ٹیکسوں میں جکڑا ہو ہے۔اشیاء خورد ونوش کی قیمتیں ہیں کہ آسمان پر پہنچی ہوئی ہیں۔ صرف دودھ کو لے لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی ان کی قیمت مقرر نہیں کرا سکا۔ دودھ والے دودھ اپنے من مانی قیمتوں پر فروخت کر رہے ہیں۔ گوشت کی قیمت میں بھی کوئی ٹھہراؤ نہیں ہے۔ بجلی کی قیمت میں سبسیڈی ختم ہو جانے کے بعد ۳ روپے فی یونٹ اضافہ ہو جائے گا۔ اب بھی یہی سوچا جا رہا ہے کہ مالیاتی کھاتوں میں بہتری لانے کا واحد طریقہ ٹیکس گزاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ اجناس کی عالمی قیمتوں میں دوبارہ اضافے کے رجحان کے باعث آئندہ مہینوں کے دوران گرانی میں کمی کی توقع نہ رکھی جائے۔ خاص طور پر تیل کی عالمی قیمتوں میں اضافے کے ملکی گرانی اور بیرونی حسابات کے توازن پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

اپنی سہ ماہی رپورٹ میں بنک نے کہا ہے کہ محاصل کی کمزور کارکردگی اور

اخراجات میں اضافے سے مالیاتی خسارے کا ہدف پورا نہ ہونے کا خطرہ ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ترقیاتی اخراجات کو گھٹانا درست نہیں کیونکہ اس سے ملک کے انسانی اور طبعی ڈھانچے پر مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ بنک کی تجویز ہے کہ مالیاتی کھاتوں میں پائیدار بہتری لانے کا واحد اور مناسب طریقہ ٹیکس گزاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے تاکہ ٹیکس اور جی ڈی پی کا تناسب بڑھ سکے۔ حکومتی اللے تللے پر کہا گیا ہے کہ جب تک حکومتی مشینری کے سائز میں خاصی کمی نہیں کی جاتی تب تک بے لچک سودی' ادائیگیوں اور دفاعی اور سول انتظامی اخراجات کے باعث جاری اخراجات میں قابل ذکر کمی ممکن نہیں۔' پاکستان کی عالمی مالی منڈی تک رسائی کی صلاحیت محدود ہے اور رقوم بیرون ملک جانے سے زری پالیسی پر مزید دباؤ پڑے گا۔ اسٹیٹ بینک نے سال کی تیسری سہ ماہی کے دوران مجموعی معاشی صورتحال مزید بہتر ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ اس سال کی اچھی خبر یہ تھی کہ گندم اور چاول کی ریکارڈ پیداوار کی وجہ سے حالات بہتر ہونے کی توقع ہے۔

رپورٹ میں گورننس کو بہتر بنانے، اداروں کو مضبوط بنانے اور قانون اور نگرانی کے نظام کی اصلاح کے لئے دوسرے دور کی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ گرانی کی اس لہر میں ۵۲ فیصد سے کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہم ابھی تک عوام کو ریلیف دینے میں ناکام رہیں ہیں۔ بجٹ میں عوام

کو سہولیات دینے کی ضرورت ہے۔ اس وقت عوام ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ منگائی نے ان کی کمر توڑ دی ہے۔ روٹی کی قیمت پورے ملک میں یکساں نہیں ہے۔ کراچی حیدرآباد میں روٹی ۵ روپے کی ہے تو پنجاب میں ۲ روپے کی اور سرحد اور بلوچستان والوں کو تو روٹی کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں یہ تو کوئی ان سے جا کر پوچھے۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ زراعت ٹیکس نہیں لگے گا۔ جبکہ سروسز سیکٹر پر ٹیکس لگے گا۔ بجٹ ہوں بھی عوام کو تقریر سے سمجھ میں نہیں آتا۔ جب اس کے اثرات گھر کے بجٹ پر پڑتے ہیں تو ہمیں سمجھ آتی ہے کہ بجٹ ہمارے ساتھ کیا ہاتھ کر گیا ہے۔

طالبان کے پاس امریکی اسلحہ کہاں سے آیا

جوں جوں آپریشن راہ راست تیز ہو رہا ہے۔ عوام کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سوات کے عوام کے قافلے اب ہر جگہ امن کی تلاش میں ہیں۔ پاکستانی عوام اپنے فوج سے بجا طور پر توقع کر رہے ہیں کہ وہ انہیں طالبان کے ظلم سے بچائیں گی اور بہت جلد وہ اپنے گھروں کو جا سکیں گے۔ ابھی تک طالبان کی قیادت یا ان کے کسی اہم رہنما کی گرفتاری یا ہلاکت کی خبر نہیں آئی ہے۔ حکومت نے تحریک طالبان سوات کے کمانڈر مولانا فضل اللہ اور ان کے ساتھیوں کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر انعام کی رقم میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مولانا فضل اللہ کے سر پہ مقرر کی گئ رقم 50 لاکھ سے بڑھا کر پانچ کروڑ روپے کر دی گئ ہے، جب کہ مسلم خان اور شام دوران سمیت ان کے نائب اور دیگر ساتھیوں کو گرفتار کرنے پر انعام کی رقم ایک ایک کروڑ مقرر کی گئ ہے۔ اس رقم میں اضافے کا باعث حالیہ دنوں میں پاکستان کے مختلف شہروں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیاں ہیں، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے پیچھے سوات کے طالبان کا ہاتھ ہے۔ تحریک طالبان پاکستان نے قبل لاہور میں ہونے والے خود کش

حملے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حملہ سوات میں ہونے والے فوجی آپریشن کے جواب میں کیا گیا تھا۔ لاہور کے حالیہ خودکش حملے کی ویڈیو کو دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حملہ آور بے حد تربیت یافتہ اور لاہور میں سری لنکا کی ٹیم اور پولیس لائن پر ہونے والے حملے سے بڑی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ دوسری جانب سوات میں جو طالبان سرگرم ہیں ان کی کاروائیوں کی ایسی ہولناک وڈیوز بھی انٹرنیٹ پر دیکھی جارہی ہیں۔ جن کو دیکھ کر یہ شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ کیا یہ لوگ واقعی طالبان ہیں یہ ان کے پردے میں کوئی اور کھیل رہا ہے۔ انسانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کرنا ایک درندگی ہے۔ طالبان کی قید سے فرار حاصل کرنے والے پاک فوج کے ایک میجر نے ان طالبان کو بے حد قریب سے دیکھا ہے۔ میجر بصیرت نے جرمن خبر رساں ادارے کو بتایا کہ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو 2007 میں آپریشن راہ حق شروع ہونے سے چند روز قبل اس وقت طالبان شدت پسندوں نے کبل بازار سے گھات لگا کر اغوا کرلیا تھا جب وہ علاقے میں سے وہاں سے گزر رہے تھے۔ طالبان جنگجوؤں نے انہیں فوری طور پر مٹہ منتقل کر دیا جہاں ان سب کو 24 دنوں تک قید میں رکھنے کے بعد شدت پسندوں کے ہیڈ کوارٹر پیوچار لے جایا گیا۔ میجر بصیرت نے بتایا کہ اس دوران عسکریت پسند حکومت سے ان کی رہائی کے بدلے دو کروڑ روپے نقد اور اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ بھی کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ حکام ان 46 مطالبات کو اس لیے نہیں مان سکتے تھے کیونکہ جن شدت پسندوں

کی رہائی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا انہیں بڑی کوششوں کے بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ میجر بصیرت نے بتایا کہ جب طالبان کو یہ یقین ہو گیا کہ حکومت ان کے مطالبات نہیں مانے گی تو ایک شام قید خانے میں آ کر انہیں اور ان کے ساتھیوں کے پیغام دیا گیا کہ شوریٰ نے سب قیدیوں کو گولی مار کر یا پھر ذبحہ کر کے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس پر آئیندہ دو سے تین روز میں عملدرآمد کیا جائے گا۔ لیکن جب ایک شام طالبان نے میجر بصیرت اور ان کے ساتھیوں کو بتایا کہ اگلی صبح انہیں ذبح کر دیا جائے گا تو ان سب نے طالبان کی قید سے ہر قیمت پر فرار ہونے کا فیصلہ کیا اور ہم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد یہ خبر پہنچ گئی اور انہوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔" میجر بصیرت نے بتایا کہ عسکریت پسندوں سے چھپتے چھپاتے پوری رات وہ اور ان کے ساتھی سخت سردی میں محض شلوار قمیض اور چپلوں میں جان بچانے کے لیے بھاگتے رہے۔" چوہے بلی کا یہ کھیل اگلی صبح تک جاری رہا اور بالآخر تقریبا 40 کلومیٹر تک مسلسل بھاگنے کے بعد صبح ساڑھے چھ بجے ہم سب ساتھی کبل میں قریب ترین فوجی کیمپ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جو اللہ کا ایک معجزہ تھا"۔ طالبان کی قید میں اپنے ایام کا ذکر کرتے ہوئے میجر بصیرت کہتے ہیں کہ "ہر روز لگتا تھا کہ آج ہماری زندگی کا آخری دن ہو گا کیونکہ ان کے ظالمانہ اور خوفناک رویوں کو دیکھتے ہوئے اور جس انداز میں وہ ہمارے سامنے دوسرے قیدیوں کو روزانہ گولیاں مارتے انہیں ذبح کرتے تھے وہ لمحات انتہائی پریشان کن اور

اعصابی تناؤ کا باعث تھے باوجود اس حقیقت کے کہ فوجیوں کے لیے یہ صورت حال نئی نہیں ہوتی۔" تین مرتبہ موت کے منہ سے بچ کر واپس آنے والے میجر بصیرت کا کہنا ہے کہ ان کے افسران نے سوات میں ایک بار پھر ان کی ڈیوٹی لگانے سے پہلے جب ان سے سوال کیا کہ کیا وہ اب بھی اس پیشے میں رہنا چاہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ پشتون قبیلے اورکزئی سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کے لیے ہار ماننا روایات کے منافی ہے۔"لیکن میرے ساتھ جب سے یہ واقعات پیش آئے ہیں اللہ تعالیٰ پر میرا ایمان اور بھی پختہ ہوگیا ہے کہ واقعی زندگی دینے اور لینے والا صرف اللہ ہے"۔ لیکن جو طالبان شدت پسندی ترک نہیں کرتے انہیں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ریاست ہمیشہ فتح یاب ہوگی کیونکہ اس کے پاس لامحدود وسائل ہوتے ہیں۔ طالبان کے ظلم اور تشدد آمیز کاروائیوں کو دیکھتے ہوئے یہ سوال اہم ہیں کہ عسکریت پسندوں کو اسلحے اور پیسے کی فراہمی کون کر رہا ہے۔

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اس ضمن میں میڈیا کو بتایا ہے کہ ڈرگ مافیا ان جنگجوؤں کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے اور حکومت وقت آنے پر حقائق قوم کے سامنے لائے گی۔ واضح رہے کہ پاکستان کے سیکورٹی ادارے اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ عسکریت پسندوں کے پاس سے جدید اور بیرونی ساخت کا اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ اس بارے میں پاکستان کے سابق سیکریٹری جنرل فارن افیئرز اور ممتاز تجزیہ کار

اکرم ذکی کا کہنا ہے کہ وزیراعظم کے زیرلب اشاروں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جنگ میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کو چاہیے کہ وہ پاکستان کے تحفظات کا ازالہ کرے اور مبینہ طور پر افغانستان سے اس اسلحے کی پاکستان سمگلنگ کو روکنے کے لیے اقدامات کرے۔ امریکی ذمے داروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ اسلحہ افغان فوجوں کے لیے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس اسلحے کا طالبان کے پاس آنا ایک سوالیہ نشان ہے۔ جس کا جواب ملنا ضروری ہے۔

تمیں مار خان

ہم نے اپنے بچپن میں تمیں مار خاں کی کہانی پڑھی تھی۔ جس میں لوگ تمیں مار خاں کے نام سے تھر تھراتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ تمیں مار خاں نے تمیں بندوں کو کھڑ کھڑا دیا ہے۔ یوں لوگ اس کی ہیبت سے کانپتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن تمیں مار خاں کو سیر کا سوا سیر مل گیا۔ انہوں نے تمیں مار خاں سے کہا کہ اب بتا تو کہاں کا تمیں مار خاں ہے۔ اور تو نے کتنے بندے پچھڑ کھائے ہیں۔ یہ سن کر تمیں مار خاں رونے لگا اور کہنے لگا کہ میں نے تو آج تک ایک بندہ نہیں مارا۔ تمیں آدمی کہاں اور ان کو مارنا کہاں۔ اصل کہانی یہ ہے کہ میں گھر بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا۔ جب تمیں مکھیاں مار لی تو میں نے اپنے آپ کو تمیں مار خاں کا خطاب دے لیا۔ اپنے اس خود ساختہ خطاب کے نتیجے میں لوگ مجھے تمیں مار خاں سمجھنے لگے۔ اب جہاں لوگوں کو ضرورت پڑتی وہ مجھے تمیں مار خاں کہہ کر لے جاتے۔ لوگوں کا کام نکل جاتا اور میری روزی روٹی چل نکلی۔ یہ ہے میری کہانی۔ مجھے تمیں مار خاں کی کہانی اس لئے یاد آئی کہ امریکی صدر کو بھی تمیں مار خاں بننے کا شوق چرایا ہے۔ بش نے تو عراق افغانستان پاکستان کو مقتل گاہ بنا کر چل دئے ہیں۔ اب بارک اوباما کی باری ہے۔ جو ایران پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایران میں جلاؤ گھیراؤ تو شروع کرا دیا ہے اور وہ ایران

کے اندرونی معاملات میں مسلسل بیان بازی کر رہے ہیں۔ اگر امریکی صدر یہ نہ کرے تو کیا مکھیاں مارے گا۔

اس کی ابتدا انھوں نے گزشتہ دنوں کر دی ہے۔ جب دنیا کا طاقتور ترین شخص قرار دیئے جانے والے صدر امریکہ نے ایک ٹی وی انٹرویو کے دوران ایک مکھی کو مار کر اپنی مہارت کو ثبوت دیا۔ صدر باراک اوباما کو ایک مکھی نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ وائٹ ہاؤس میں ایک انٹرویو دے رہے تھے۔ اس دوران جب صدر اوباما انتہائی سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اپنے میزبان کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے کہ نہ جانے کہاں سے ایک مکھی انکے درمیان مخل ہو گئی۔ صدر نے مکھی کو ہاتھ سے اڑانے کی بہت کوشش کی گویا خبردار کر رہے ہوں کہ بھاگ جا، ورنہ جان سے جائے گی۔ تاہم مکھی ان کے گرد چکر لگاتے ہوئے انکے اختیار کو مسلسل چیلنج کرتی رہی۔ صدر اوباما مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور جوں ہی مکھی نے انکے بائیں ہاتھ پر بیٹھنے کی کوشس کی انھس نے کسی کراٹے چمپئن کر طرح چاروں طرف منڈلاتی ہوئی مکھی کو ڈھیر کرکے اپنی طاقت اور پھرتی کا عملی ثبوت پیش کر ڈالا۔ دربار فرعون میں ایک مچھر نمرود کی تباہی کا باعث بن گیا تھا۔ کیا عجب کہ کوئی ایسی ہی معمولی مخلوق امریکہ کی تباہی کو باعث بن جائے۔ ایڈز، اور دوسری بیماریاں ننھے ننھے جراثیم ہی سے پھیلتی ہیں۔ اور یہی ان کی تباہی کا سبب بنے گی۔

بچے دو ہی اچھے

عجیب بات ہے جوں جوں میڈیا پر بہبود آبادی کے اشتہار بڑھ رہے ہیں۔ ملک کی آبادی بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ پہلے محکمے کا ن ام خاندانی منصوبہ بندی تھا۔ منصوبہ بندی ہماری کمزوری ہے۔ چاہے پانچ سالہ منصوبہ بندی ہو، یا دس سالہ منصوبہ بندی ہو۔ یا محبوب الحق کا منصوبہ بندی کمیشن یا کالاباغ ڈیم کا منصوبہ ہم نے کسی منصوبہ بندی کو قبول نہیں کیا۔ سو ہم نے محکمے کا نام بدل دیا۔ بہبود آبادی کا نام شوگر کوٹیڈ ہے۔ اس سے کام کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر ہم نے کم آبادی خوش حال گھرانہ کو سلوگن اپنایا۔ ۷۱ میں مشرقی پاکستان جدا ہوا تو ملک کی آبادی کا اندازہ ۶ کروڑ تھا۔ کم آبادی خوش حال گھرانے کی جستجو میں ہم نے اپنی آبادی میں دن دگنا ہی اضافہ کیا۔ اس وقت خیال تھا کہ شاید لوگوں کو کم آبادی کی تعریف میں دھوکہ ہوا ہے۔ پہلے گھروں پوری کرکٹ ٹیم ہوا کرتی تھی۔ میچ کھیلنے کے لئے لوگ گھروں میں خود کفیل تھے۔ جب چاہا میچ رکھ لیا۔ اماں ابا ریفری کے فرائض انجام دے لیا کرتے تھے۔ اب سوچا گیا کہ کیوں نا بچوں کی تعداد مقرر کردی جائے۔ اس لئے بچے دو ہی اچھے کا سلوگن وجود میں لایا گیا۔ دو اچھے بچوں کی جستجو اور محنت میں آبادی اتنی بڑھی کہ اب ہم اس پیداوار میں خود کفالت سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اب ہم بچے اسمگل بھی کرتے ہیں۔ بچے فروخت بھی کرتے

ہیں۔ بچوں سے مزدوری بھی کراتے ہیں۔ بچوں کو اونٹ کی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے اسے پاس پڑوس کے ملکوں کو بھی بھیج دیتے ہیں اور جو بچے فالتو بچ جاتے ہیں ان کو آبادی کم کرنے کے جدید طریقوں میں یعنی خود کش بمبار میں استعمال کرتے ہیں۔

امریکی تھنک ٹینک نے یہ جدید ٹیکنالوجی مسلمان ملکوں کے لئے ایجاد کی ہے۔ وہ خود تو شادی کے بندھن سے آزاد ہوگئے ہیں۔ ہم جنسیت کہاں سے آبادی پیدا کرے گی اور ویسے بچوں کی جو فوج تیار ہوئی ہے۔ وہ دنیا بھر میں جنگ و جدل میں مصروف ہے۔

اب امریکہ کو خیال آیا ہے کہ کیوں نہ پاکستان میں بچوں کی پیدائش پر ہی پابندی لگا دی جائے۔ اس لئے قومی اسمبلی میں زیادہ بچے پیدا کرنے پر ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی گئی ہے وفاقی وزیر بہبود آبادی فردوس عاشق اعوان بہت دور کی کوڑی لائی ہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا عنصر دہشت گردی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ للہذا پارلیمنٹ زیادہ بچے پیدا کرنے پر ٹیکس عائد کرنے کے حوالے سے پالیسی بنائے حکومت اسے نافذ کرنے کو تیار ہے۔ کل قومی اسمبلی کے اجلاس میں وقفہ سوالات کے دوران فردوس عاشق اعوان نے کہا ہے کہ غربت اور ناخواندگی کی وجہ سے لوگ ایسے عناصر کے ساتھ مل جاتے ہیں جو انہیں منفی سرگرمیوں میں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ زیادہ بچے پیدا کرنے پر ٹیکس عائد کرنا ہے تو اس کا آغاز ارکان پارلیمنٹ سے کیا جائے انہوں نے کہا کہ حکومت آبادی

پر کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور اس حوالے سے وہ اپنی کوتاہی کو قبول کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بحیثیت قوم ہم سب کو اپنی اپنی کوتاہی کو قبول کرنا چاہیے۔ یہ وہ کوہتایاں ہیں، جو آپ کے گھروں کی رونق، خوشیوں کا منبع، گلشن کے پھول، اور مستقبل کا عکس ہیں۔ ان پھولوں کو انگاروں میں تبدیل کیا ہے۔ تو اس میں قصور کس کا ہے۔ ان پھولوں کو کیا ہم نے مفت تعلیم، روٹی، سر چھپانے کی جگہ دی ہے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ تو اس دنیا میں آکر خوب مزے لوٹیں اور آنے والے بچوں پر پابندی لگا دیں کہ وہ اس دنیا میں نہ آئیں۔ یہ نظام قدرت ہے۔ اس میں فرعون نے بھی مداخلت کرنے کی کوسش کی تھی۔ لیکن وہ موسیٰ کی آمد کو نا روک سکا۔ پارلیمنٹ بھی یہ کوشش کرکے دیکھ لے۔

وزیر تعلیم کی کھری باتیں

سینئر صوبائی وزیر تعلیم پیر مظہر الحق ایک اچھے اسپورٹس مین ہیں۔ حیدرآباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول (پہلے اسکول کے پڑھے ہوئے وزیر تعلیم اس اسکول پر آج بھی فخر کرتے ہیں۔ وہ بے تکلفی سے حقیقتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کراچی میٹرک بورڈ کے امتحان میں اس بار ساری پوزیشن ماماپارسی اسکول کے طلبہ وطالبات نے حاصل کی ہیں۔ پرائیوٹ اسکول کے خالد شاہ اس کو پرائیوٹ اسکولوں کے لئے وجہ افتخار سمجھتے ہیں۔ لیکن پیر مظہر کا کہنا ہے کہ اب بھی سرکاری اسکولوں میں اچھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل امتحان ماں باپ کا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کتنی توجہ دیتے ہیں۔ پوزیشن ہولڈر طلبہ کے اعزاز میں تقریب کراچی پریس کلب والوں کی تھی۔ علاوالدین خانزادہ اور امتیاز فاران کی جوڑی نے کراچی پریس کلب کو کئی خوبصورت پروگرام دئے ہیں۔ یہ پروگرام بھی ان میں سے ایک تھا۔ پیر مظہر الحق ذرا لیٹ پہنچے تھے۔ لیکن اس کا بھی سبب تھا۔ وہ گورنر ہاوئس کے اجلاس سے آرہے تھے۔ جہاں سندھ اسمبلی کی پرانی عمارت کے عقب میں ایک نئی سندھ اسمبلی کی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ میٹرک میں اول آنے والی طالبہ نے بتایا کہ اس نے کبھی ٹیوشن نہیں پڑھی۔ اسکول میں اساتذہ نے اتنی اچھی طرح پڑھایا کہ رٹا لگانے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ پیر صاحب نے

بتایا کہ انہوں نے ورلڈ بنک والوں سے پوچھا کہ وہ سندھ میں اساتذہ کی بھرتی کے وقت ان کا ٹیسٹ لینے کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں۔ جس پر ان کو بتایا گیا کہ سندھ کا امتحانی نظام پر کسی کو اعتماد نہیں رہا اور یہ انتہائی ناقص ہو چکا ہے۔ عالمی بینک کو بھی سندھ کے امتحانی نظام پر اعتماد نہیں یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں اساتذہ بغیر ٹیسٹ کے بھرتی ہو رہے ہیں جبکہ سندھ کے اساتذہ کیلئے ٹیسٹ لازمی ہے۔ سندھ وزیر تعلیم نے ابھی چند دن پہلے فلور پر یہ بیان دیا تھا کہ سندھ میں ایک ہزار سے 1500 تک اسکول اوطاق بنے ہوئے ہیں اور انہیں خالی کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ پیپلز پارٹی جیسی حکومت اب تک ان اسکولوں کو خالی نہ کرا سکی تو آنے والے دور میں سندھ میں تعلیم کا کیا معیار کیا ہوگا۔ پریس کلب کے سینئر صحافی عبدالحمید چھاپرا نے پیر مظہر الحق سے کہا کہ بچوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کوئی انعام دیں۔

پیر صاحب گویا ہوئے کہ سب لوگ وزیر کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس بہت رقم ہوتی ہے۔ مجھے جب ڈاکو اغوا کر کے لے گئے تو انہوں نے کہا کہ ایک کروڑ روپیہ منگا کر دو۔ میں نے کہا کہاں سے ایک کروڑ دوں۔ میرے پاس کوئی سونے کی کان نہیں ہے۔ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم وزیر ہو۔ بے شک میں وزیر ہوں۔ لیکن بھائی ہم وزیر پیپلز پارٹی کے ہیں۔ پیر مظہر الحق نے اس موقع پر بچوں کی حوصلہ افزائی کے لئے، ۳۰ہزار، ۲۰ ہزار، ۱۰ہزار، بالترتیب

اول، دوئم، سوئم روپے کے انعام کا اعلان بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ صدر زرداری نے کہا تھا کہ پریس کلب والوں نے میری اسیری کے ایام میں میرا ساتھ دیا۔ اس لئے ان کے لئے کچھ کرنا ہے۔ انہوں نے حکم دیا کہ پریس کلب کی عمارت پریس کلب والوں کو دلوانا ہے۔ ہم نے اس پر کام کیا ہے۔ اب کلب والوں کو چاہئے کہ وہ خاموش نہ بیٹھ جائیں ۔ جب تک پٹواری سے اپنے نام نہ کرالیں۔ اس وقت تک خاموش نہ بیٹھیں۔ میں آپ کا وکیل بننے کو تیار ہوں۔ میٹرک بورڈ پر ریٹائرڈ لوگوں کی حکمرانی پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ تو ہماری بھی نہیں سنتا۔ ریٹائرڈ آدمی کو تبادلے کا خوف نہیں ہوتا وہ کنٹریکٹ پر آتا ہے جبکہ حاضر سروس افسر کو تبادلے کا ڈر ہوتا ہے۔ گورنر سندھ سے اس کی شکایات بھی کی ہے جس پر گورنر نے سندھ کے تعلیمی بورڈز میں حاضر سروس افسران لگانے کیلئے نام مانگے اور محکمہ تعلیم نے وہ نام بھیج بھی دیے۔

بغیر جیب کی پتلونیں

مغرب والوں کو جہاں اور بہت سے شوق ہیں۔ وہاں یہ بھی ہے کہ وہ ہر بات کی گریڈنگ کرتے ہیں۔ دنیا میں کون سب سے زیادہ امیر ہے۔ کون سب سے زیادہ غریب ہے۔ کون سب سے زیادہ خوش لباس ہے۔ کون سب سے زیادہ بے ہودہ لباس پہنتا ہے۔ کون سب سے زیادہ کرپٹ ہے، کون سب سے زیادہ بااثر ہے، یہ گریڈنگ افراد، ملکوں، کے بارے میں کی جاتی ہیں۔ خیر سے پاکستان اور پاکستان والوں کا کہیں نہ کہیں ذکر آہی جاتا ہے۔ ورلڈ کپ میں نمبر ون پوزیشن والے پاکستان کے خلاف امریکی میڈیا کے ذریعے زہر آلود مہم چلائی جارہی ہے۔ گزشتہ دنوں دنیا بھر کے ملکوں میں کرپشن پر نظر رکھنے والے ادارے ٹرانسپرنسی انٹر نیشنل نے ایک سروے جاری کیا جس میں بتایا گیا کہ پاکستان میں گزشتہ تین سالوں میں کرپشن میں سوا چار سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان دنیا کے ایک سو اسی ممالک میں پینتالیسواں کرپٹ ملک ہے۔ اس سروے میں بتایا گیا کہ مشرف دور میں 2006 میں کرائے گئے نیشنل کرپشن سروے میں پینتالیس ارب روپے رشوت کی نذر ہوئے تھے جو 2009 میں بڑھ کر ایک سو پچانوے ارب روپے تک جا پہنچے ہیں جو تین سالوں میں چار سو تیس فیصد زیادہ ہے۔ کرپشن میں پولیس اور توانائی کے اداروں نے سب سے زیادہ کرپٹ ہونے کی پہلی اور دوسری پوزیشن برقرار رکھی ہے۔

اب امریکی جریدے فارن پالیسی کی جانب سے دنیا کی ساٹھ ناکام ریاستوں کی فہرست جاری کی گئی ہے۔ فہرست کی تیاری میں معاشی بحران، انسانی حقوق، بیرونی مداخلت، نقل مکانی اور مہاجرین، حکومت کی کمزور عملداری، داخلی سلامتی، قدرتی آفات اور عوامی خدمات کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے۔ دنیا کی ناکام ریاستوں میں پاکستان کو دس نمبری بتایا گیا ہے۔ پہلی پوزیشن پر صومالیہ ہے جبکہ ساٹھ ممالک کی اس فہرست میں زیمبیا آخری پوزیشن پر ہے۔ رپوٹ میں کہا گیا ہے کہ معاشی بحران نے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا جو اس وقت بین الاقوامی مالیاتی فنڈ آئی ایم ایف کے سہارے زندہ ہے۔ ناکام ریاستوں کی فہرست میں افغانستان ساتویں نمبر پر، سری لنکا بائیسویں اور بنگلہ دیش انیسویں نمبر پر ہے۔ کرپشن اور رشوت ایک عالمی مسئلہ ہے۔ خود امریکہ امداد، فوجی معاہدوں میں جو کرپشن کرتا ہے۔ اس کا جائزہ کہاں لیا جاتا ہے۔ کرپشن کے مسئلے سے دوچار نیپالی حکومت نے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ جس کی ہمیں بھی تقلید کرنی چاہیے۔

نیپال کی سول ایوی ایشن کی وزارت نے رشوت روکنے کی کوشش کے سلسلے میں نیپال کے بڑے ائیرپورٹ پر فرائض ادا کرنے والے عملے کو ایسی پتلونیں فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن کی جیبیں نہیں ہوں گی۔ نیپال میں انسدادِ رشوت ستانی

کے محکمے کا کہنا ہے کہ کھٹمنڈو کے ہوائی اڈے پر رشوت کی شکایات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ یہ اقدام نیپال کے وزیرِ اعظم کے اس بیان کے بعد اٹھایا گیا ہے کہ کرپشن کی وجہ سے ہوائی اڈے کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب ایئرپورٹ پر عملے کو پہننے کے لیے ایسی پتلونیں دی جائیں جن کی جیبیں نہ ہوں۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ نیپال کے ایئرپورٹ کے عملے کی وردی میں ٹوپی، جوتے، اور انڈر گارمنٹ کا رواج ہے یا نہیں۔ ہمارے یہاں تو ان کا ایسے کاموں کے لئے استعمال زمانہ قدیم سے ہے۔ اگر پھر بھی انہیں مشکلات کا سامنا ہے تو انھیں اپنے فرنٹ مین سے مدد لینی چاہئے۔ ہم نے تو اس کاروبار کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ دس پرسنٹ سے سو پرسنٹ اور اس سے بھی اوپر ریٹ جا رہے ہیں۔ نیپال والوں کو ہم پر اعتماد کرنا چاہئے۔ آخر مصیبت میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔

برقعہ پوش خواتین

فرانسیسی صدر سرکوزی نے قومی اسمبلی میں یہ اعلان کرکے مسلم دنیا کے جذبات میں ایک بار پھر طلاطم پیدا کردیا ہے کہ.برقعہ فرانس میں قابل قبول نہیں ہے کیونکہ یہ خواتین کو قیدی بنا دیتا ہے۔ فرانسیسی صدر نکولا سرکوزی نے.برقعے کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ.برقعہ کوئی مذہبی علامت نہیں ہے بلکہ یہ خدمت گزاری کی ایک علامت ہے جو فرانس کی اقدار کے خلاف ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کی سب سے.بڑی تعداد فرانس میں آباد ہے۔ فرانس میں مسلمان خواتین کی بہت ہی معمولی تعداد.برقعہ اوڑھتی ہے۔ جس کے بعد فرانسیسی پارلیمنٹ نے ایک کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو.برقعہ اوڑھنے والی مسلمان خواتین کے بارے ایک مطالعاتی جائزے کا اہتمام کرے گا۔ مسٹر سرکوزی کی تقریر 136 سال میں کسی فرانسیسی صدر کی ورسائلس پیلس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے پہلا خطاب تھا۔ فرانسیسی قانون میں اس سے قبل اختیارات کی تقسیم کے تحفظ کے پیش نظر صدر پر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے خطاب پر پابندی تھی۔ صدر کا خطاب اس آئینی ترمیم کے باعث ممکن ہوا جسے مسٹر سرکوزی کے گزشتہ سال متعارف کرایا تھا۔

مغرب خصوصاً یورپی ممالک میں گزشتہ کئی برسوں سے حجاب، برقعہ، پردہ جو مسلمانوں کی مذہبی اقدار کا ایک حصہ تصور کئے جاتے ہیں۔ ایک منظم فکر کے ساتھ استہزا، پابندی، کا سامنا ہے۔ مغربی ممالک میں نقاب کا معاملہ بار بار اٹھایا جارہا ہے۔ گزشتہ عرصے میں کینیڈا کی ایک سو پچاس سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمان خواتین کے برقعہ یا نقاب پہن کر ووٹ ڈالنے کے مسئلہ پر بحث کی گئی۔ صوبہ انٹاریو میں صوبائی انتخابات سے قبل نقاب کے مسئلے کو چھیڑا گیا۔ کینیڈا میں مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ کثرت میں ہیں۔ کینڈا کے وزیر اعظم نے اس موقع پر کہا تھا کہ یہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ الیکشن کمیشن کو برقعہ پوش خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے جواب میں الیکشن کمیشن کے سربراہ مارک میرانڈ نے کہا کہ اس معاملے میں حکومت کوئی پابندی حائل نہیں کرسکتی کیونکہ جب پارلیمنٹ سے الیکشن کمیشن آف کینیڈا نے کچھ عرصہ قبل سفارشات طلب کی تھی تو اس وقت پارلیمنٹ نے کوئی واضح ہدایات جاری نہیں کی۔ کینیڈا سے مسلم کینیڈین کانگریس کی رہنما فرزانہ حسن نے کہا ہے کہ برقعہ اور نقاب کو اسلامی ملبوس کے طور پر پیش کرنا ایک 'بے ہودہ مذاق' ہے۔ اس دوران الیکشن کمیشن کمشنر مارک میرانڈ نے باپردہ مسلم خواتین کی شناخت کے مسئلے پر کسی قسم کے حکومتی دباؤ اور پارلیمنٹ کمیٹی کا مشورہ ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ کینیڈا کی مسلمان شہری خواتین پردے میں رہتے ہوئے ووٹ ڈال سکتی ہیں کیونکہ کینیڈا

میں انتخابی قوانین اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق ووٹر اپنی شناخت باتصویر سرکاری دستاویزات پیش کرکے کر سکتا ہے اور اگر اس کے پاس تصویری شناخت نہیں ہے تو پھر بھی وہ اپنے پتہ کی تصدیق کرتے ہوئے بیان حلفی اور ایک ضامن کے حلفی بیان دینے پر ووٹ ڈالنے کا مجاز ہے۔ الیکشن کمشنر کا کہنا تھا کہ قانون میں یہ گنجائش اس لئے رکھی گئی ہے کہ کوئی بھی شہری ووٹ کے حق سے محروم نہ رہے۔ اس کے علاوہ پریمئیر نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ اونٹاریو کے انتخابات میں انکے لئے نقاب یا پردہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور انہیں کوئی اعتراض نہیں اور نہ ہی وہ یہ شرط رکھیں گے کہ خواتین اپنے نقاب الٹ کر چہرہ دکھائیں۔ نقاب کا مسئلہ انتخابات ہی میں نہیں بلکہ بچوں کے کھلونوں میں بھی زیر بحث رہا۔

باپردہ گڑیا 'باربی' کے متعارف کرانے سے ایک اور بحث چل نکلی۔ بہت سے تاجروں کا کہنا تھا کہ باپردہ باربی گڑیا کو عرب ممالک میں بہترین رسپانس ملا۔ مصر کے کھلونوں کے بازار میں 'باربی' کے انداز سے ہٹ کر پردے والی گڑیا نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس کے خالق نے اس گڑیا کو 'اسلامی اقدار' کی حامل قرار دیا ہے۔ اس گڑیا کا نام فلا' رکھا گیا تھا۔ یہ گڑیا ایک روایتی اسلامی سکارف اور برقعے میں ملبوس ہے۔ اس کے' پاس اس کا اپنا گلابی رنگ کا جائے نماز بھی ہے۔ جو والدین اپنے بچوں کو باربی لے کر دینا نہیں

چاہتے انہوں نے بھی 'فلا' کو ترجیح دینا شروع کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تمام مسلم دنیا میں مقبول ہوگئی۔ اسے اسلامی اقدار کے مطابق بنایا گیا تھا۔ قاہرہ کے ایک بڑے سٹور کے چیف سیلزمین طارق محمود کا کہنا تھا کہ 'فلا کی مانگ زیادہ ہے کیونکہ یہ ہماری عرب ثقافت کے قریب ہے، یہ کبھی اپنا بازو یا ٹانگ ننگی نہیں کرتی'۔ مسلمان خواتین میں سکارف پہننے کے نئے جذبے کے ابھرنے کے ساتھ ہی مسلمان بچیوں کے لیے مخصوص کھلونے بنانے کا رواج کو بھی فروغ ملا۔ برطانیہ میں ایک مسلمان طالبہ کے نقاب کے مقدمے نے بھی بڑی شہرت پائی۔

بارہ سالہ طالبہ نے بکنگھم شائر سکول میں نقاب سے پورے چہرے کو ڈھانپنے پر عائد پابندی کو کورٹ میں چیلنج کیا تھا تاہم جج نے سماعت کے بعد مقدمے کو خارج کر دیا۔ لڑکی کے وکیل اور والد کا کہنا ہے کہ نقاب پر پابندی ہر اسلامی اور انسانی حق کی خلاف ورزی ہے۔ وکیل کا کہنا ہے کہ عدالتی فیصلے سے لڑکی اور ان کے خاندان والوں کو شدید مایوسی' ہوئی ہے۔ کینیڈا میں مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ کثرت میں ہیں' کینیڈا میں مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ کثرت میں ہیں اب لڑکی کو گھر پر ہی تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ کیونکہ اسکول کی یونیفارم پر اس تنازعے کے بعد اس کے لیے سکول میں تعلیم حاصل کرنا دشوار ہوگا۔ اسکول میں تیرہ سو طالبِ علموں میں ایک سو بیس مسلمان طالبات ہیں اور

ان میں سے آدھی حجاب لیتی ہیں۔ سابق برطانوی وزیر خارجہ اور دارالعوام کے قائد جیک سٹرا نے اپنے ایک مضمون میں مسلم خواتین کی طرف سے چہرے کو نقاب سے مکمل طور پر چھپانے کے عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مختلف 'برطانوی کیمیونٹیز' کے درمیان بہتر اور مثبت تعلقات میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ اخبار 'لنکا شائر ایوننگ ٹیلی گراف' میں جیک سٹرا لکھتے ہیں کہ چہرہ چھپانا 'خود کو علیحدہ اور مختلف دکھانے کا ایک نمایاں عمل ہے'۔ وہ کہتے ہیں کہ خواتین جب انہیں دفتر میں ملنے آتی ہیں تو وہ انہیں نقاب اتارنے کا کہتے ہیں تاکہ 'واقعی منہ در منہ بات ہو سکے۔ میرے خدشات بے جا بھی ہو سکتے ہیں لیکن بہر حال یہ ایک مسئلہ ہے'۔ جیک سٹرا بلیک برن کے علاقے سے منتخب ہوتے ہیں جہاں ایک چوتھائی آبادی مسلمان ہے۔ وہ لکھتے ہیں ' فون کال اور خط کے مقابلے میں ایک ملاقات کی اہمیت یہ ہے کہ آپ مخاطب کو صرف سن نہیں رہے ہوتے بلکہ اسے دیکھ بھی رہے ہوتے ہیں کہ حقیقت میں وہ کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ برطانیہ کے مسلمانوں میں ان بیانات کے بارے میں شدید رد عمل ہوا تھا۔

جیک سٹرا کے بیانات ان کے حلقے بلیک برن کے ایک دکاندار نسیم صدیقی کے لیے خوش خبری ثابت ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان بیانات کے وجہ سے ان کی دکان پر نقابوں کی فروخت میں اضافہ ہوا ہے اور انہوں نے اس سے پہلے اِتنی تعداد میں نقاب کبھی فروخت نہیں کیے۔ مسٹر صدیقی کی دکان علاقے میں سب سے زیادہ نقاب

فروخت کرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے 'پہلے میں ہفتے میں صرف دو یا تین نقاب بیچتا تھا لیکن اب میں ہفتے میں پانچ یا چھ فروخت کرتا ہوں۔ میری زیادہ تر خریدار نوجوان برطانوی مسلمان لڑکیاں ہیں۔ یہ لڑکیاں نقاب پہننے کا تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی مائیں پردہ نہیں کرتی ہیں لیکن وہ پردہ کرنا چاہتی ہیں۔' یقیناً جیک سٹرا اپنے بیان کے اس ردِ عمل کی توقع نہیں رکھتے۔ انہوں نے ایک مقامی اخبار میں مضمون لکھا تھا کہ ان کو مسلمان خواتین سے بات کرتے ہوئے دشواری ہوتی ہے جو میں نقاب پہن کر ان کے دفتر آتی ہیں۔ برطانیہ کی مسلم کمیونٹی نے جیک سٹرا کے بیانات کی مذمت کی تھی۔ زیادہ تر برطانوی مسلمان اس نظریے کو قبول نہیں کرتے ہیں کہ نقاب سے برطانیہ میں بسنے والی مختلف برادریوں کے تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں اور اِس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ بلکہ مسلمان یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں جان بوجھ کر خطرے کے نظر سے دیکھا جارہا ہے اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہیں۔ ایک برطانوی ناول نگار نائمابی رابرٹس نقاب کے بارے میں تجربات پر مبنی اپنی کتاب میری بہن کے ہونٹوں سے' میں کہتی ہیں کہ 'مجھے ڈر ہے کے نقاب کی بحث برطانیہ' کو تبدیل کر دے گی اور برطانیہ فرانس کے طرح بن جائے گا جس نے حجاب پر پابندی عائد کر دی ہے۔ وہ عورت جو پردہ کرتی ہے معاشرے کی سب سے بے ضرر فرد ہے۔ وہ شراب نہیں پیتی، سگریٹ نہیں پیتی اور معاشرے میں کسی دشواری کا باعث نہیں بنتی۔

ندیم صدیقی بتاتے ہیں کہ ان کی دکان پر کچھ دن پہلے ایک آٹھ سالہ لڑکی آئی تھی۔ وہ ایک نقاب خریدنا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے پندرہ منٹ تک بحث کرتی رہی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ آخر کار ہم نے اسے حجاب پر راضی کر لیا۔ لڑکی کی والدہ حجاب بھی نہیں پہنتیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ تین دن سے اپنی بیٹی کو سمجھا رہی تھیں کے اسے نقاب کی ضرورت نہیں ہے۔ جیک سٹرا کے بیانات کے بعد ایسا لگ رہا ہے کہ حوصلہ شکنی ہونے کی بجائے نقاب پہننے کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل میں نقاب پہننے والی عورتوں کی تعداد برطانیہ میں کم ہونے کی بجائے زیادہ ہو جائے گی۔ امریکہ میں ایک مسلم خاتون سلطانہ فری مین کا ڈرائیونگ لائیسنس اس بنا پر منسوخ کر دیا گیا کہ انہوں نے لائیسنس پر لگی تصویر میں نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ مسز فری مین نے امریکی حکام کے اسی نقطہِ نظر کو بنیاد بنا کر کہ ڈرائیونگ لائسنس پر لگی تصویر نقاب کے بغیر ہونی چاہیے، مقدمہ دائر کر دیا۔ انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ یہ کارروائی ان کے مذہبی حقوق کی آئینی آزادی کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ امریکی حکام نے عدالت سے سلطانہ فری مین کی جانب سے دائر کردہ مقدمے کو مسترد کرنے کی درخواست کی۔ ریاست فلوریڈا کے حکام کا مؤقف تھا کہ تصویر میں چہرے پر نقاب پہننے کے باعث عوامی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لیکن عدالت نے حکام کی اس اپیل کو خارج

کر دیا اور مسز فری مین کو عدالتی کارروائی جاری رکھنے کی اجازت دی۔ مسز فری مین امریکی شہری ہیں اور انہوں نے پانچ برس قبل اسلام قبول کیا تھا۔ان کے وکیل ہاورڈ مارکس نے بتایا کہ گزشتہ برس اِلی نائے سے فلوریڈا منتقل ہونے کے بعد جب مسز فری مین نے نقاب والی تصویر کے ساتھ لائسنس کی درخواست جمع کرائی تو انہیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ مسٹر ہاورڈ نے کہا کہ گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد فلوریڈا میں موٹر گاڑیوں کے ادارے نے لائسنس پر لگی تصویر تبدیل کرنے کو کہا تھا۔ وکیل کا کہنا ہے کہ مسز فری مین کے آزادیِ اظہار کے حق کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ گزشتہ دنوں لندن میں ایک مباحثہ ہوا جس میں یہی موضوع تھا۔ یعنی نقاب لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ اس بحث میں لندن میں مقیم ایک استانی عمرانہ نے کہا ہے کہ ان کے علم کے مطابق اسلام میں نقاب لینا لازمی نہیں لیکن پھر بھی وہ ایسا نقاب لیتی ہیں جس سے ان کی آنکھیں تک چھپ جاتی ہیں؟ ان کے محلے لیٹن میں ستّر سال سے مقیم جین کہتی ہیں کہ جب 'میں نے کافی سال قبل جب یہاں پہلی بار نقاب والی لڑکی دیکھی تو دنگ رہ گئ تھی۔ میں نے سوچا میرے ملک میں یہ کیسے لوگ آ گئے ہیں؟' انہوں نے سوال اٹھایا کہ لڑکیاں رنگ برنگے نقاب کیوں نہیں لیتی، کالا رنگ تو افسردگی کی علامت ہے؟ اسی علاقے کے ایک گرجا گھر میں تعینات ایک پادری کا کہنا ہے کہ 'میں نے نقاب پہنے کے جواز

سن کر بحیثیت مرد بے عزتی محسوس کی، کیا مجھے یہ بتایا جا رہا ہے کہ میں عورت کی شکل دیکھ کر اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا؟' عمرانہ نے اپنا مؤقف بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ چھ سال پہلے حج پر گئی تھیں جہاں انہوں نے نقاب پہننے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ نمازیں اور روزے فرض سے زیادہ رکھے جا سکتے ہیں تو میں نے پردے کا اہتمام جتنا کرنے کا حکم ہے اس سے بڑھ کر کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس سے مکمل تحفظ رہتا ہے اور کسی مرد کی طرف سے تعلقات بنانے کے لیے بات کرنے کا امکان کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہیں کہ ان کے کپڑے کا ایک ٹکڑا منہ پر لینے سے کیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کبھی کسی نے عریاں پھرنے والوں پر سوال کیوں نہیں اٹھایا؟ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نقاب میں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔

نقاب پہنے ہوئے ایک لڑکی فاطمہ نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ کسی واقف کار کو نقاب میں پہچانا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے محلے داروں سے گھر میں یا باہر بات کرتی ہیں۔ بچوں کے بارے میں انہوں نے کہا کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور ان کے تعصبات بھی نہیں ہوتے انہیں کسی کے نقاب پہننے یا نہ پہننے سے فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اکثر پارک جاتی ہیں جہاں بچوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔

انہوں نے کہ سائنسی طور پر ثابت ہو چکا ہے

کسی کو پہچاننے میں آواز کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی برقعہ اور حجاب کے مسئلہ پر اکثر بحث ہوتی ہے۔ اکثر ترقی پسند اور مغرب کی دلدادہ خواتین پردے نقاب اور حجاب کے بڑھتے ہوئے رجحان پر پریشان ہیں۔ گزشتہ دنوں پنجاب یونیورسٹی کی ایک خاتون پروفیسر نے اپنا رونا روتے ہوئے بتایا کہ یہ پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کی پچاس فیصد سے زیادہ طالبات خوفناک قسم کے برقعے اور حجاب پہن کر کلاسوں میں آرہی ہیں۔ خودکش حملوں کے خطرے کے پیش نظر حکومت ان برقعہ پوش خواتین سے خوفزدہ رہتی تھی۔ قومی اسمبلی میں خواتین کے لیے مخصوص نشستوں میں تینتیس فیصد اضافے کو پاکستان کے مردانہ برتری کے دعویدار معاشرے میں خوش آئندہ اقدام قرار دیا گیا تھا لیکن حجاب پہنے والی ارکان قومی اسمبلی کی وجہ سے پارلیمان کی حفاظت کے سلسلے میں مشکلات کا رونا رویا جاتا تھا۔ سیکورٹی والوں کو خطرہ تھا کہ کوئی اجنبی خاتون کسی بھی وقت کسی خاتون قومی اسمبلی کی جگہ ایوان میں داخل ہو سکتی ہے۔ قومی اسمبلی اور پارلیمان کی حفاظت سے متعلق حکام کا کہنا ہے کہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ اس خدشہ کے پیش نظر کہ حجاب پارلیمان کی حفاظت پر اثر انداز نہ ہو، ضروری اقدامات کر لئے گئے ہیں۔ حکام قومی اسمبلی میں برقعہ اوڑھنے والی خواتین کو آواز سے پہچاننے کے ماہرین موجود ہیں۔ جبکہ داخلے کے تمام دروازوں پر خواتین عملہ بھی متعین کیا گیا ہے۔ جو بوقت ضرورت کسی بھی خاتون کو روک کر شناخت کر سکتا ہے۔ ایم ایم اے سے تعلق رکھنے والی ایک رکن

قومی اسمبلی نے نام نہ ظاہر کرنے کی درخواست کرتے ہوئے بتایا کہ انتظامیہ سے بات چیت کے بعد خواتین اراکین نے نقاب کے بغیر تصاویر بنوا کر اسمبلی کے حکام کے حوالے کی ہیں تاکہ حفاظتی اقدامات سے متعلق مشکلات دور ہو سکیں۔ حجاب اور پردہ کا یہ معاملہ آج بھی پوری دنیا زیر بحث ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مغرب اور مشرق تہذیبوں کی یہ جنگ کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں۔

ڈالروں کی آس میں

نہ جانے ہمارے حکمرانوں کو کیا ہوگیا ہے۔ امریکہ ہم سے جتنا زیادہ مطالبہ کرتا ہے۔ ہم اس قدر اس سے ڈالروں کی فرمائش کرتے جاتے ہیں۔ ڈالروں کی اس جنگ میں ہم نے اس قدر لوگوں کو آگ اور خون کے سمندر میں دھکیل دیا ہے کہ اب روزانہ گنتی ہورہی ہے۔ جن لوگوں کو راہ نجات اور راہ راست پر لانے کے لئے یہ ہورہا ہے۔ ان میں سے ۴۰ لاکھ سے زیادہ گھروں سے بے گھر کیمپوں میں پڑے ہیں۔ اور جو راہ راست پر آنے کو تیار نہیں ہیں وہ پہاڑوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہماری اس کامیابی کی سند بھی ہمیں امریکہ ہی سے مل رہی ہے۔ وہ بھی امریکی انٹیلی جنس سے۔ گزشتہ دنوں امریکہ کے ڈائریکٹر آف نیشنل انٹیلی جنس ڈینس بلیئر اور پاکستان وافغانستان کیلئے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک نے یہ سند دیتے ہوئے ہماری پیٹھ تھپکی دی ہے اور کہا ہے کہ پاکستانی عوام میں سوات آپریشن کی حمایت مستحکم ہورہی ہے۔ ڈینس بلیئر نے واشنگٹن میں انٹیلی جنس ماہرین کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پہلی مرتبہ دنیا کے اس حصے (سوات) میں پاک فوج کے آپریشن کو حکومت اور عوام کی حمایت حاصل ہے۔ یہ ماضی کے مقابلے میں ایک مختلف صورتحال ہے جب فوجی آپریشنوں کو بہت کم حمایت حاصل ہوتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اپوزیشن لیڈر نواز شریف بھی حکومت کی حمایت کر رہے ہیں جو آگے کی طرف ایک اہم قدم

ہے۔ امریکہ نے ہمیں اس کام کے لئے 30 کروڑ ڈالر دینے کا اعلان کیا جبکہ باقی دنیا سے صرف 20 کروڑ ڈالر مل سکے ہیں۔ اقبال یہ کہ کر غیرت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے ، تیموری شہزادیوں کی غیرت اور حمیت کا ماتم کیا تھا۔ لیکن دنیا میں ایسی قومیں بھی ابھی زندہ ہیں جنھوں نے اس دور میں قومی غیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایران اب بھی ایک غیرت مند قوم کی طرح امریکہ کے مقابل ہے۔ ویت نام نے بھی امریکہ کی بالادستی کو قبول نہیں کیا۔ اور برسہا برس ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ویت نام میں ہوچی منہ کی جنگجویانہ کارروائیوں نے فرانس کو 1954ء وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ اس عرصہ میں جنوبی ویت نام امریکہ اور اتحادیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا ہوچی منہ کی زیر قیادت شمالی ویت نام سے جنوبی ویت نام پر حملے شروع ہوئے اس کے جواب میں 1964ء میں امریکی فضائیہ نے شمالی ویت نام پر بمباری شروع کردی اور جنوبی ویت نام میں پانچ لاکھ 43 ہزار فوجی داخل کردیئے۔ امریکی فضائیہ نے مسلسل 14 برس 1976ء تک شمالی ویت نام پر اتنی بمباری کی کہ ایک ویت نامی لیڈر کے بقول شمالی ویت نام کے کھیتوں میں اناج کی بجائے ہر طرف لوہے کی فصل آگ آئی تھی۔ خود امریکی ترجمانوں کے مطابق ویت نام کی پوری سرزمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں بچی تھی جس پر کارپٹ بمباری نہ کی گئی ہو۔ کارپٹ بمباری یعنی بموں کے قالین

بچھا دینے کی اصطلاح انہی دنوں ایجاد ہوئی تھی۔ بالآخر شمالی ویت نام نے کامیابی حاصل کی اور جنوبی ویت نام پر قبضہ کرلیا اور دو جولائی 1976ء کو دونوں حصے مل کر ویت نام پھر ایک ملک بن گیا مگر اس کامیابی کے پس منظر میں ہولناک خون فشانی کی تاریخ رقم ہوئی ہے۔ 1945ء سے 1976ء تک کے 32 طویل برسوں میں ویت نام کے مجموعی طور پر 12 لاکھ شہری ہلاک، 65 لاکھ گھر بدر ہوگئے جب کہ امریکہ کے 58 ہزار سے زائد اور اس کی اتحادی فوجوں کے پانچ ہزار 225 فوجی ہلاک ہوئے۔ لیکن یہ ایک آزاد اور خود مختار قوم کی جنگ تھی۔ جس نے لڑنے کا تہیہ کیا۔ ڈالر نہیں مانگے۔ ویت نام نے لاکھوں افراد کے ہلاک اور 65 لاکھ کے گھر بدر ہونے کے باوجود امریکہ اور فرانس جیسی سپر طاقتوں کی بالادستی قبول نہیں کی۔ اس قوم کی سرزمین کا چپہ چپہ لاکھوں امریکی بموں کے لوہے سے ڈھک گیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ امریکہ نے ویت نام میں فولاد کی صنعت کے لیے لاکھوں بموں کا اتنا لوہا دے دیا کہ آئندہ کئی برسوں تک فولاد سازی کے لیے باہر سے لوہا منگوانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس ہولناک تباہی کے باوجود ویت نام نے امریکہ کی غلامی قبول نہیں کی۔ لیکن ہم ہیں کہ ڈالروں کی آس میں بھیک مانگ رہے ہیں۔ اگر یہ ہماری جنگ ہے تو ڈالروں کی دھائی کس لئے۔

بجلی کے مارے عوام پر فتوے کی مار

بجلی کے مارے عوام کو کے ایس سی نے بھی مذہب اور اسلامی شریعت کی مار مارنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے پہلے مرحلے پر کے ای ایس سی نے ۲۱ علماء اکرام سے فتویٰ حاصل کیا ہے کہ بجلی کی چوری حرام ہے۔ پہلے مرحلے پر اس بارے میں خبر شائع کی گئی ہے جبکہ آئندہ چند دنوں میں اخبارات اور میڈیا پر اشتہارات بھی شائع ہوں گے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ کے ای ایس سی کی اس بجلی بچاؤ نفاد شریعت مہم سے کراچی والوں کی ایک بڑی تعداد بجلی چوری سے بعض آجائے گی۔ اور جہنم میں جانے سے بچنے کے لئے اپنی موجودہ زندگی کو جہنم بنانے پر شاکر رہے گی۔ فتویٰ لینے کا یہ نادر خیال نہ جانے کے ای ایس سی والوں کیوں آیا ہے۔ جب کہ لوڈ شیڈنگ کے سبب نہ تو کراچی میں نائٹ میچ ہو رہے ہیں۔ اور نہ ہی چراغاں۔ ہاں البتہ سڑکوں بجلی کے فراق لوگ ٹائر جلا کر دل جلانے جتنی روشنی کر لیتے ہیں۔ اس بار لوڈ شیڈنگ کے مارے لوگوں پر جو بجلی نہ آنے کا بل آیا ہے اس سے بھی لوگ بلبلائے ہوئے ہیں۔ اخبارات نے کے ای ایس سی کے فتوے کا توڑ کرنے کے لئے علماء کرام سے کے ای ایس سی کی زائد بلنگ کے بارے میں بھی فتویٰ لیا ہے۔ جس میں ایسی ناجائز بلنگ کو جو عوام سے زبردستی وصول کی جائے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے فتویٰ کا جواب فتویٰ ہی سے دیا جاسکتا ہے۔

ہمارے دوست جمیل علوی گو مفتی نہیں ہیں اور ان سے کسی نے فتویٰ بھی نہیں مانگا تھا لیکن انہوں نے زبردستی فتویٰ دیا ہے۔ اور اس بارے میں ان کی دلیل لاجواب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص ان کے گھر میں گھس جائے یا راہ میں پکڑ کر ان سے زبردستی رقم چھین لے۔ اور پھر اس رقم سے گلچھڑے اڑائے اور نشے میں بدمست کہیں راہ میں پڑا ہوا مل جائے۔ اس کے جیب میں اس رقم کو کچھ بچا کھچا حصہ بھی ہو تو کیا مجھے اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ میں وہ رقم اس کی جیب سے نکال لوں۔ سب نے اس بات سے اتفاق کیا اور علوی صاحب نے اسے ہی جواز بنایا۔ ان کا کہنا ہے کہ کے ای ایس سی والوں نے ۴۰ فیصد لائین لاسسز، بجلی کی چوری، کنڈا مافیا، کے ای ایس سی کی نااہلی اور ناجائز ٹیکسوں کی مد میں، غلط بلنگ کی صورت میں اہل کراچی کو نچوڑ لیا ہے۔ عوام بجلی کے ناجائز بل بھرتے بھرتے تنگ آ چکے ہیں۔ لوڈ شیڈنگ کے باوجود بجلی نہ استعمال کرنے کا بھی بل ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسی صورت میں عوام کیا کریں۔ ہمیں کے ای ایس سی کے حکام سے یہ گلہ ہے کہ انہوں نے اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے کراچی میں طالبان کی آمد سے پہلے شریعت اور فتوے کا سہارا نہیں لینا چاہئے تھا۔ اب انہوں نے مقطع میں سخن گستران بات ڈال دی ہے تو ان فتووں پر عمل درآمد کے لئے انہیں طالبان کی آمد کا انتظار کرنا چاہئے۔

مجرموں کو پھانسی دی جائے

کراچی میں اغوا، قتل، اور تاوان کی وصولی کے واقعات اس تیزی سے ہو رہے ہیں کہ اخبارات میں ابھی ایک واقعہ کی بازگشت ختم نہیں ہوتی ہے کہ شہ سرخیوں میں ایک نیا واقعہ سامنے آ جاتا ہے۔ زمان ٹاؤن کے علاقے میں تین سالہ بچی کو اغوا اور زیادتی کے بعد قتل کرکے لاش گٹر میں پھینکنے کا واقعہ شقی القلبی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس بارے میں شک اور شبہے کی گنجائش اس لئے باقی نہیں رہ جاتی کہ مجرموں نے خود اس گٹر کی نشاندہی کی جس سے اس بچی کی لاش ملی ہے۔ یہ اتنا بڑا ثبوت ہے کہ اس کے بعد کسی مقدمے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میرے نزدیک ان ظالم اور سفاک مجرموں کو فوری پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔ چند ہفتوں قبل بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ جس میں طارق روڈ سے ایک تاجر طارق عادل کے جواں سال بچے کو تاوان کے لئے اغوا کیا گیا تھا۔ پھر تاوان لے کر بھی ظالموں نہ صرف اس کو قتل کرکے گندے نالے میں اس کی لاش ڈال دی تھی۔ بلکہ مزید رقم کے لالچ میں مجرم بعد میں بھی والدین سے اس کی بازیابی کے لئے سودے بازی میں مصروف رہے اور بالآخر پکڑے گئے۔ پولیس اور سی پی ایل سی نے ان مجرموں کو گرفتار کراکے قانون کے حوالے کر دیا ہے اور اب مقدمہ چل رہا ہے۔ جانے یہ مقدمہ کب تک چلے گا۔ اور مجرموں کو سزا بھی ہوسکے گی یا نہیں۔ کراچی میں ۱۹۹۰

سے ۹۰۰۲ تک اغوا اور اغوا برائے تاوان کے ۱۱۶ کیسسز رپورٹ ہوئے ہیں۔ جن میں سے صرف ۳۵۳ یعنی ۳۵ فیصد کے لگ بھگ کیسسز حل ہو سکے۔ اور ۸۵۲ کیسسز کا پتہ نہ چل سکا۔ کراچی میں ۶۰۰۲ سے اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ۶۰۰۲ میں ایسی وارداتوں کی تعداد ۲۹۶ تھی جو ۷۰۰۲ میں ۸۲۱ فیصد بڑھ گئی اور ایسے واقعات کی تعداد ۰۲۸ ہو گئی۔ ۸۰۰۲ یں یہ تعداد ۱۰۴ ہو گئی ہے۔ لیکن اس تعداد میں کمی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اپنے عزیز واقارب کی جان کے خطرے کے پیش نظر اب ایسے کیسسز کے بارے میں پولیس کو رپورٹ ہی نہیں کی جاتی ہے۔ زمان ٹاؤن والے کیس میں گرفتار ٹریفک پولیس اہلکاروں ہیڈ کانسٹیبل بشیر احمد اور پولیس کانسٹیبل نور محمد جسمانی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہیں۔ سماعت کے دوران مقتولہ کے عزیز واقارب کی بڑی تعداد نے احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے ملزمان کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ معاشرہ کو جرائم سے پاک کرنے کے لئے مظاہرین کا یہ مطالبہ برحق ہے۔

کی دہائی میں فیڈرل بی ایریا میں ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔ جس میں بے بی ترنم ناز کو ۰۸ قتل کر دیا گیا تھا۔ جنرل ضیاالحق نے مجرموں کو پھانسی دے دی اور کراچی کیا پورا ملک ایک عرصے تک جرئم سے پاک ہوگیا، گزشتہ عرصے میں عدالتوں سے بہت سے ملزماں جو اغوا اور تاوان کے مقدمات میں ملوث تھے۔ عدم ثبوت کی بنا پر رہا کر دیے گئے ہیں۔ جس سے ان مجرموں کی حوصلہ افزائی ہوئی

ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت بھی شہر میں ۱۸۸ سے زائد گینگ اغوا کے دھندے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ہماری پولیس اور قانون کے رکھوالوں کی ساری توجہ کا مرکز موٹر سائیکل پر ڈبل سواری پر پابندی ہے۔اور ہم نے اسی کو جرائم کے سدباب کی قلید سمجھا ہوا ہے۔ سندھ ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس مشیر عالم اور مسٹر جسٹس کے کے آغا پر مشتمل ڈویژن بنچ نے حکومت سندھ کو جوہدایت کی ہے کہ وہ موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی سے قبل اور بعد میں ہونے والے جرائم کا تقابلی ریکارڈ پیش کرے وہ بالکل صحیح اقدام ہے۔۔ ڈبل سواری پر پابندی کے خلاف ہیومن رائٹس کے انتخاب عالم سوری نے درخواست دی ہے۔ شہر میں امن وامان کی صورتحال مخدوش ہے، جرائم پیشہ افراد متحرک اور فعال ہیں، اس لئے وزیر داخلہ کو بھی بیوکریسی کے چنگل سے نکلنا چاہئے۔اور اغوا کی وارداتوں کا سختی سے نوٹس لینا چاہئے۔ چیف جسٹس آف پاکستان کو بھی ایسے مقدمات کا ملک بھر سے ریکارڈ طلب کرکے تحقیقات کرنا چاہیے کہ کیا عدالتیں ان مقدمات میں واقعی انصاف کررہی ہیں یا یہ اغوا کی وارداتیں بااثر افراد کی کمائی کا ذریعہ بن گئی ہیں

برطانوی پولیس کی پاکستانی طلبہ پر چڑھائی

گزشتہ دنوں.برطانوی پولیس نے انسداد دہشت گردی کی ایک نام نہاد کاروائی میں دس پاکستانی طلبہ کو گرفتار کرکے ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ انہوں نے.بڑے دہشت گرد پکڑے ہیں۔ طویل تفتیش کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ لیکن اب.برطانوی پولیس اپنی خفت مٹانے کے لئے ان طلبہ کو رہا کرنے پر تیار نہیں ہے۔ ان طلبہ کے والدین نے پاکستان آکر اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ ان طلبہ کو رہا کیا جائے۔ اوراس سلسلے میں حکومت پاکستان سخت اقدام کرے۔ ان طلبہ کا اس کے علاوہ کوئی جرم نہیں تھا کہ وہ با جماعت مسجد میں نماز کے لئے جاتے تھے۔ اور ہوٹلوں میں تفریح کے لئے جاتے تھے۔.برطانوی پولیس نے انسداد دہشت گردی کی اس کارروائی کی.بڑے پیمانے پر تہشیر کی اور پاکستانیوں کو بدنام کیا۔ شمال مغربی انگلینڈ سے گرفتار کئے جانے والے دس پاکستانی طالب علم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سٹوڈنٹ ویزا پر.برطانیہ میں رہ رہے تھے۔ پولیس نے لیورپول اور مانچیسٹر میں مختلف چھاپوں کے دوران یہ گرفتاریاں کی تھیں۔.برطانوی ہوم سیکرٹری Jacqui Smith نے پولیس کو اس "کامیاب" آپریشن کے لئے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ تھا کہ.برطانیہ کو شدت پسندوں سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ یہ گرفتاریاں ایک ایسے وقت میں عمل میں آئی ہیں جب.برطانوی پولیس

کے انسدادِ دہشت گردی کے شعبے کے سربراہ کو سکیورٹی کے معاملے میں غفلت برتنے پر تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ایک اعلیٰ برطانوی پولیس افسر کی غلطی آپریشن کی وجہ بن گئی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اسسٹنٹ کمشنر بوب کوئیکسکاٹ لینڈ یارڈ کے اسسٹنٹ کمشنر بوب کوئیک کی غلطی کے باعث حساس دستاویزکے منظر عام پر آنے کے بعد پولیس نے کئی افراد کو گرفتار کیا جب کہ کوئیک نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ان کا استعفیٰ منظور بھی کر لیا گیا۔ برطانوی میڈیا کے مطابق انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت چھاپوں کا منصوبہ بہت پہلے بنایا گیا تھا مگر اعلیٰ برطانوی پولیس افسر Bob Quick کی غلطی کی وجہ سے آپریشن سے متعلق حساس دستاویزات کی تصویر منظر عام پر آنے کے بعد گریٹر مانچسٹر اور لنکا شائر پولیس کو فوری کارروائی کرنا پڑی۔

برطانیہ میں لگاتار چھاپوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ان کی تصاویر انسداد دہشت گردی کے حوالے سے ایک حساس دستاویزکے ساتھ شائع ہو گئیں۔ اس تصویر میں واضح طور پر درج تھا" آپریشن پاتھ وے" جس کے نیچے لکھا تھا" برطانیہ میں القاعدہ کے ممکنہ حملوں کی منصوبہ بندی کے خلاف سیکیورٹی سروس کی قیادت میں آپریشن "اس دستاویزپر یہ بھی درج تھا" خفیہ "۔ باب کوئیک کی یہ تصویر وزیر اعظم گورڈن براؤن کے دفترکے قریب لی گئی تھی۔ تصویر چھپنے کے فوراً بعد پولیس نے چھاپوں کا سلسلہ شروع کر دیا دریں اثناء اسکاٹ لینڈ

یارڈ کی جانب سے جاری ہونے والے ایک بیان اس غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اسسٹنٹ کمشنر کوئیک اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہیں نے ایک خفیہ اور حساس دستاویز کو اس طرح ہاتھ میں اٹھا کر باہر نکلنا نہیں چاہئے تھا کہ اس پر درج کوائف پڑھے جا سکتے۔ برطانوی وزیر داخلہ جیکی اسمتھ نے حساس دستاویزات کے حوالے سے پولیس افسر کی غلطی پر کوئی بیان دینے سے گریز کیا۔ شمال مغربی برطانیہ میں انسداد دہشت گردی یونٹ کے سربراہ ٹونی پورٹر نے بتایا کہ پولیس نے خفیہ اداروں کی جانب سے دے گئی معلومات پر چھاپے مارے۔ ان کا کہنا تھا مانچسٹر، لیور پول اور لنکا شائر میں آٹھ جگہوں پر چھاپے مار کر بارہ افراد گرفتار کئے گئے تھے۔ بعد میں یہ سب جھوٹ ثابت ہوا۔ اب اس جھوٹ کو چھپانے کے لئے ٹال مٹول سے کام لیا جارہا ہے۔ برطانیہ میں پاکستانوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ جو اس جھوٹ کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سال ہزاروں طلبہ برطاینہ پڑھنے کے لئے جاتے ہیں۔ اگر برطانیہ میں پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کا امتیازی سلوک کیا گیا تو یہ برطانیہ کے مستقبل پر بھی اثر انداز ہوگا اور پاکستانی طلبہ کو تعلیم کے لئے دوسرے ملکوں کی جانب دیکھنا ہوگا۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ یہ کس نے لکھا ہے۔ اور اس کا حقیقی رائٹر کون ہے۔ ہمیں اس خط کے مندرجات پر غور کرنا چاہیے۔ اس نفسا نفسی کی دنیا میں جہاں انسان کی قدر ہر آنے والے دن میں گرتی جا رہی ہے۔ جہاں ہر روز دولت کے حصول میں انصاف کا خون ہو رہا ہے۔ لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ قانون کا مذاق اڑایا جا رہا ہے اور حکومتیں انسانوں کو پھاڑ کھانے پر تلی ہوئی ہیں۔ عوام کو کسی طرح کا ریلیف نہیں دیا جا رہا۔ ایک حکم پر عوام کے چہروں پر مسکراہٹ کھلنے بھی نہیں پاتی کہ راتوں رات ایک اور حکم کے ذریعہ عوام کے منہ سے نوالہ پھر چھین لیا جاتا ہے۔ جموریت کے بطن سے پھر آمریت طلوع ہو رہی ہو۔ فرعونیت کا لہجہ اختیار کیا جا رہا ہو۔ وہی حیلے پرویزی اور رزداروں کا وہی چلن ہو تو معاشرہ میں کس تبدیلی کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔ دور پرویز اگر اس قدر برا تھا اور اس آمریت کے بطن سے یہ ہی جمہوریت طلوع ہونی تھی تو اس تو اچھا تھا کہ کچھ دن اور آمریت کے ستم سہہ لئے جاتے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ تاریخ میں جب ہمارے بارے میں لکھا جائے گا تو وہ کچھ یوں ہوگا۔

ہمارے پاس بلند بالا عمارتیں ہیں لیکن برداشت بالکل نہیں ہے۔ وسیع شاہراہیں

ہیں لیکن تنگ خیالات ہیں۔ ہمارے دور میں بہت خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن ماحاصل کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم بہت کچھ خریدتے ہیں لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہمارے زمانے کے لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ لوگوں کے پاس بڑے بڑے مکانات ہیں لیکن ان میں مکین نہیں ہیں۔ ہمارے پاس آسائش بے حساب اور وقت ناپید ہے۔ ہمارے عہد کے لوگوں کے پاس ڈگریاں بڑی بڑی ہیں لیکن دانش نہیں ہے۔ معلومات بہت ہیں لیکن فیصلے کی طاقت نہیں ہے۔ ماہرین کی فوج ہے لیکن مسائل پھر بھی کم نہیں ہوتے۔ دواؤں کی افراط ہے لیکن صحت پھر بھی نہیں ہے۔ کھاتے پیتے بہت ہیں۔ خرچ بہت کرتے ہیں لیکن ہنستے بہت کم ہیں۔ گاڑیاں تیز بھگاتے ہیں، لیکن فاصلے پھر بھی کم نہیں ہوتے۔ جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ رات تک جاگتے ہیں لیکن صبح بیدار ہوتے ہیں تو تھکاوٹ سے چور ہوتے ہیں۔ پڑھتے بہت کم ہیں۔ ٹی وی بہت دیکھتے ہیں، لیکن عبادت میں دل نہیں لگاتے ہم نے اپنے مسائل کو بڑھا لیا ہے لیکن اپنی قدر کھو بیٹھے ہیں ہم باتیں بہت کرتے ہیں لیکن محبت نہیں کرتے اور نفرتوں میں زندہ رہتے ہیں ہم نے زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے لیکن زندگی بسر کرنا نہیں ہم نے چاند پر آنا جانا شروع کر دیا ہے لیکن سڑک پار کر کے پڑوسی سے ملنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے ہم خلاء میں جا رہے ہیں لیکن اپنے اندر جھانکنے کی فرصت نہیں ہم عظیم الشان چیزیں بناتے ہیں۔ لیکن ان میں پائیداری نہیں ہوتی ہم نے فضاء کو صاف کر دیا ہے لیکن روحوں کو آلودہ کر دیا ہے ہم نے ایٹم کو توڑ دیا ہے لیکن اپنے تعصبات کو نہیں توڑ

سکے۔ ہم بہت لکھتے ہیں۔ لیکن بہت ہی کم سیکھتے ہیں ہم بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرپاتے ہم سیکھنے کے لئے بھاگتے پھرتے ہیں لیکن انتظار نہیں کرتے ہم نے معلومات کو بڑھانے کے لئے زیادہ کمپیوٹر تو بنالیے ہیں۔ لیکن ہمارا ابلاغ کم سے کم ہو رہا ہے یہ فاسٹ فوڈ کا زمانہ ہے لیکن ہم بہت کم ہضم کرپاتے ہیں، ہمارے دور کے بڑے آدمی ہیں لیکن ان کے کردار بہت چھوٹے ہیں، منافع کے لئے سرگرداں رہتے ہیں لیکن رشتوں کا قتل کرتے ہیں، یہ بڑی آمدنیوں کا دور ہے، لیکن پھر بھی طلاق کی شرح زیادہ ہے، محلات اور بنگلے ہیں لیکن گھر نہیں ہے، تیز رفتار سفر ہے ڈسپوزبل ڈائیپرز ہیں، اخلاقیات کی تباہی ہیں راتوں کو جاگتے ہیں، اوور ویٹ جسم ہیں، اور ہر طرح کی دوائیاں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں شوروم کی کھڑکیوں میں بہت کچھ ہیں لیکن اسٹاک خالی ہیں، یہ ٹیکنالوجی کا وہ دور ہے جس میں ایک لمحہ میں آپ کچھ پڑھنا چاہو تو پڑھ لو ورنہ ایک کلک کے ذریعے اسے مٹادو۔

لیکن یہ یاد رکھیں کہ کچھ وقت ان کو بھی دیں جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ نہیں رہیں گے، ان سے محبت کے چند جملے کہیں جو آپ کی طرف امید کی نظروں سے دیکھتے ہیں، کیونکہ کل یہ ننھے منے بچے جوان ہونگے انہیں خوشی سے گلے لگائیں، یہی آپ کا مستقبل ہیں۔ کیونکہ یہ واحد خزانہ ہے جو آپ کے پاس ہے اور جس میں آپ کا کچھ خرچ بھی نہیں ہو رہا، یاد

رکھیں ان لوگوں کا سہارا بنیے جو بوڑھے ہیں، ان سے محبت کیجئے ان سے بات کیجئے انہیں
وقت دیجئے۔ کیونکہ یہ سدا آپ کے ساتھ نہیں رہیں گے۔

دو ارب ڈالر کا حساب؟

امریکہ کی ڈیموکریٹ پارٹی کے سینئر سینیٹر اور امریکی سینیٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے چیئرمین جوزف بائڈن نے گزشتہ دنوں یہ تجویز پیش کی ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے پاکستان کو دی جانے والی اقتصادی امداد میں تین گنا اضافہ کر دیا جائے جبکہ فوجی امداد کڑی شرائط کے تحت دی جائے۔ ڈیموکریٹ سینیٹر کا یہ بیان ایک ایسے وقت سامنے آیا ہے جب امریکی مالی محتسب ادارے نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کی جانب سے پاکستان کو دی جانے والی امداد میں کئی طرح کی مالی بے ضابطگیاں پائی گئی ہیں اور جنوری سنہ دو ہزار چار سے جون دو ہزار سات کے دوران پاکستان کو دی جانے والی امداد میں سے دو ارب ڈالر کی رقم ایسی ہے جس کے خرچ کا مکمل حساب موجود نہیں ہے۔ پاکستانی عوام اب اس امداد کے ثمرات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ڈالر کی بڑھتی ہوئی مانگ اور پاکستانی روپے کی قدر میں تیزی سے آنے والی کمی نے پوری قوم کو تباہی سے دوچار کر دیا ہے۔ قومی خزانے میں موجود زرمبادلہ کے ذخائر جن کا ذکر کرتے ہوئے شوکت عزیز کی زبان سوکھتی تھی۔ اب بخارات بن کر اڑ گئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس امداد کے بدلے میں ہمارے حکمرانوں نے اپنا قومی وقار، عزت، آزادی اور ضمیر رہن رکھ دیا

ہے۔ اسی امداد کے کارن ہم نے مدد کرنے والوں کی بہت ساری ناجائز اور ناپسند خواہشات پوری کر رہے ہیں۔ چونکہ حکمران اس امداد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی انا، عزت، وقار اور ضمیر داؤ پر لگاتے ہیں اس لئے لامحالہ اس کے تصرف کا سب سے پہلا حق ان کی ذات کا ہے۔ اس لئے پاکستان سے سرمایہ راتوں رات غائب ہو رہا ہے۔ امریکہ نے جو ڈالر دیئے ۔ وہ سوئس بنکوں کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکے۔ لیکن پاکستان نے اس کے لئے کیا قیمت ادا کی ۔ امریکی مداخلت کی وجہ سے پاکستان بھر میں جو خود کش دھماکے ہوئے، ملک کا امن وامان برباد ہوا، معیشت تباہ ہوئی۔ اس کا ازالہ اور حساب کتاب کون کرے گا۔ پاکستان کی بد قسمتی ہے کہ وہ ہمیشہ امریکہ کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا ہے۔ اور یہ اس غلطی کا تسلسل ہے جو پہلے وزیر اعظم پاکستان کے پہلے دورہ امریکہ کی صورت میں تھی۔ پاکستان کے حکمران ہمیشہ سے امریکہ کا دم بھرتے آئے ہیں۔ آنے والے اور جانے والے ہمیشہ ہاتھوں میں کشکول لئے رکھتے ہیں۔ ہماری انکل سام سے درخواست ہے کہ ۔ دوستوں سے حساب کتاب کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ یوں بھی حساب دوستان در دل ہوتا ہے۔

اس وقت کوئی بچانے والا نہ ہوگا

یوم آزادی کا یہ جلسہ ایک روائیی جلسہ تو نہ تھا۔ لیکن اس میں پورے ملک کی

نمائندگی ضرور تھی۔ خط غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے سارے کردار میرے سامنے تھے۔ اس جلسے کے مقررین باقاعدہ مقرر بھی نہ تھے۔ فرش پر بیٹھے ہوئے سارے لوگ باری باری اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے۔ جب وزیر کی باری آئی تو محسوس ہوا جیسے گرم گرم لاوا بہہ رہا ہے۔ اس کا سوال تھا کہ کیا آج پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ کیا اسی لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ کیا یہ وہی صبح ہے جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا۔ کیا اس ملک کے غریب عوام اسی طرح آٹے اور روٹی کے لیے ترستے ہوئے اپنی جانیں خودکشیوں کے ذریعے ختم کرتے رہیں گے۔ سندھ کی یہ آواز ابھی خاموش ہوئی تھی کہ بلوچستان کے اس بزرگ کی باری آگئی جس نے بچپن میں تحریک پاکستان کے نعرے لگائے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بلوچستان کے لوگوں کا کیا قصور ہے۔ کہ پورے پاکستان کو گیس مہیا کرنے والے اپنے گھروں میں گیس سے محروم ہیں۔ نوکریوں سے محروم ہیں بلکہ اپنے صوبے میں تعلیم کے بھی موقع سے بھی محروم ہیں۔ سرحد ساتھی کہہ رہا تھا کہ کل جنھوں نے آزادی کی جنگ لڑی اور کشمیر کا وہ حصہ لے کر دیا جو آج آزاد کشمیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج ہم ان پر گولے برسا رہے ہیں۔ ان سرسبز وادیوں میں آگ برسا رہے ہیں۔ میرے پنجاب کے ساتھی بھی بے روزگاری، افلاس، اور بڑھتی ہوئی غربت سے شاکی تھے۔ شہروں میں رہنے والے بھی آج کل بے روزگاری، ٹرانسپورٹ کے کرایوں، مہنگائی، لاقانونیت کے ہاتھوں زندگی عذاب ہونے کی داستاں سنا رہے تھے۔ لیکن یہ سارے لوگ اپنے اس دشمن سے ضرور آگاہ

تھے۔ اور شکوؤں کے ساتھ ساتھ پر امید تھے۔ کہ آج کا یوم آزادی ان کی حقیقی آزادی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ یہ ساری باتیں سنتے ہوئے۔ میں سوچتا ہوں۔ قدرت نے تو ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ شائد ہم ہی نہ اہل نکلے جو اس نعمت کو نااہل افراد کے سپرد کر دیا۔ اگر آج پاکستان سے جائز اور ناجائز منافع کمانے والے اس دولت کو اس ملک میں رکھتے تو شائد ہمیں یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ناجائز منافع کمایا وہ ملک سے باہر چلا گیا اگر اس منافع سے ملک کے اندر کارخانے لگتے تو لوگوں کو روزگار ملتا اور خاندانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا۔ مشرف کے دور میں نمبر دو معیشت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ زر مبادلہ کے ذخائر مصنوعی تھے معیشت حقیقی معنوں میں مستحکم نہ تھی۔

سب کچھ دھوکہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شوکت عزیز اقتدار سے علیحدہ ہوئے تو معیشت زوال پذیر ہونے لگی۔ آٹھ سالوں کے دوران معیشت مستحکم ہوتی اور ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتی تو چار ماہ میں معیشت زوال کا شکار نہ ہوتی۔ مہنگائی اور بے روزگاری کی ذمے داری بھی ان ہی عناصر پر ہے۔ اب یہ منتخب مخلوط حکومت کا فرض ہے کہ وہ مہنگائی کے جن کو بوتل میں بند کرے۔ مہنگائی سے نجات کا مستقل حل یہ ہے کہ پاکستان کے عوام منظم ہو کر ایک نئے سماجی اور معاشی معاہدے کا مطالبہ کریں جو انصاف، عدل اور مساوات کے اصولوں پر ترتیب دیا جائے۔ ذخیرہ اندوزوں اور اسمگلروں کے خلاف ریاستی طاقت استعمال

کی جائے۔ سرمایہ داروں، تاجروں اور صنعت کاروں کو ملی بھگت کرکے ناجائز منافع خوری اور عوام کو لوٹنے کی ہرگز اجازت نہ دی جائے کرپشن پر قابو پانے کے لئے احتساب کا منصفانہ نظام وضع کیا جائے کرپٹ عناصر کو کڑی سزائیں دی جائیں کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں بلیک اکانومی کا سائز سو بلین ڈالر ہے جسے وائٹ کرنے سے دس بلین ڈالر ٹیکس وصول کیا جا رہا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ امیروں پر ٹیکس لگائے اور غریبوں کو ریلیف دے،۔بڑے سٹاک بروکر راتوں رات کروڑ پتی بن جاتے ہیں ان پر ٹیکس نہ لگانا ظلم اور ناانصافی ہے اسی طرح دولت ٹیکس اور کیپیٹل گین ٹیکس بھی عائد کیا جانا چاہیے۔ حکومت غیر ترقیاتی اخراجات کم کرے اور زرعی انقلاب کی پالیسی وضع کرے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو اور اشیائے ضروریہ کی قیمتیں کم ہو سکیں۔ موجودہ حکومت نے تھوڑے عرصے کے لئے مواخذے کے مطالبہ کے ذریعے مہلت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اس کی بقا کا دارومدار مہنگائی کے خاتمے پر ہے لہٰذا یہ مسئلہ حکومت کی نمبر ون ترجیح ہونا چاہیے مہنگائی کو کنٹرول کرنے کے لیے خصوصی ٹاسک فورس تشکیل دی جائے جو مستقل بنیادوں پر کام کرے۔ اگر مہنگائی کے طوفان کو روکنے کے لیے سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو اس طوفان کی لہریں پورے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی بھوکے ننگے مفلس عوام کوئی اور راستہ منتخب کر سکتے ہیں۔ اور عوام کا رخ ان کی جانب ہو گا جو عوام کو اب تک لوٹتے رہے ہیں۔ پھر انہیں بچانے والا بھی کوئی نہ ہو گا۔

کام نکل جانے کے بعد

امریکہ ہمیشہ اپنے محسنوں کو کام نکل جانے کے بعد ڈس لیتا ہے۔ کسی بھی مسئلہ پر امریکی تھنک ٹینک پہلے رائے عامہ ہموار کرتے ہیں اور اس کے بعد بے رحمی سے فیصلہ کرتے ہیں۔ ضیاالحق کو امریکہ نے جس بے رحمی سے منظر سے ہٹایا اس کے مقابلے میں پرویز مشرف پر امریکہ نے بے حد نرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھیں نہ صرف مواخزے اور محاسبے سے بچا لیا گیا ہے۔ بلکہ انھیں محفوظ راستے بھی دیا جا رہا ہے۔ وہ ملک میں رہیں گے یا نہیں اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ عرصے قبل جنوبی ایشیا امور کے ماہر ڈاکٹر مارون وائن بام نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ امریکہ پاکستان کے حالات میں براہِ راست دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پاکستانی فوج کو مشورہ دے گا کہ وہ جمہوری حکومت کے ساتھ کھڑی ہو اور آئینی عمل کا ساتھ دے۔ ان کا کہنا کہ اگر جمہوری حکومت کو فوج نے مشرف کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے ختم کر دیا تو یہ بڑا دھچکا ہوگا۔

'واشنگٹن میں ہی امریکی فارن پالیسی انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو ڈاکٹر جیف اسمتھ نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ کی حکمتِ عملی کا اِس صورتِ حال سے گہرا تعلق ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ کا کہنا تھا کہ امریکہ کو چاہیے کہ جمہوری قوتیں جو بھی فیصلہ کریں وہ اِس کا ساتھ دے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پاکستان

پیپلز پارٹی کے شریک چیرمین آصف علی زرداری اور مسلم لیگ ن کے رہنما میاں نواز شریف نے بڑے اعتماد سے کہا ہے کہ ملک کے موجودہ حالات میں صدر مشرف ملک کا اختیار استعمال کرنے کی غلطی نہیں کر 2-B کے موجودہ حالات میں صدر مشرف 58 سکتے۔ مذاکرات کے بعد حکمراں اتحاد میں شامل دو بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف نے ایک مشترکہ اخباری کانفرنس میں صدر پرویز مشرف کو ہٹانے اور ججوں کو بحال کرنے کے فیصلوں کا اعلان کیا تھا۔ آصف علی زرداری نے اس پریس کانفرنس میں اس بات کا بھی اظہار کیا تھا کہ صدر کے مواخذے کے فوراً بعد ان تمام ججوں کو فوری طور پر مری معاہدے کے تحت بحال کر دیا جائے گا، جنہیں صدر مشرف نے غیر آئینی طور پر اپنے عہدوں سے برطرف کر دیا تھا۔ اِس کے علاوہ حکمراں اتحاد نے آئین میں کی گئی سترہویں ترمیم کو ختم کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے جس کے تحت 1999ء کی صدر مشرف کی فوجی بغاوت اور اس کے بعد کیے گئے ان کے اقدامات کو آئینی تحفظ حاصل ہے۔

کے ذریعے دیا جا چکا ہے۔ مشرف B انہیں حکومت برطرف کرنے کا اختیار بھی 58-2 کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد حکمران اتحاد کی بڑی جماعت کے سربراہ آصف زرداری نے جس طرح اپنی حکمت عملی تبدیل کی ہے اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی ججوں کی بحالی کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے میں خاصا وقت

لگے گا۔ دوسری جانب مشرف کے جانے کے تین دن کے اندر ہونے والے تین خودکش حملوں نے بھی اسٹیبلشمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔اب نئی سیاسی محاذ آرائی کے لئے نئی صف بندیاں ہورہی ہیں۔ عوام کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہوچکا ہے۔ مہنگائی، افراط زر پیٹرول کی قیمت میں اضافے نے پوری معیشت کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ پیپلز پارٹی کو عوامی جماعت ہونے کے ناطے عوام کی حمایت حاصل ہے۔ لیکن اگر اس نے بہت جلد عوام کو ریلیف نہ دیا تو یہ عوامی قوت ہی اس کے زوال کا سبب بن جائے گی۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں احمد فراز کا یہ مصرعہ اردو شاعری میں امر ہو چکا ہے۔ احمد فراز کے بچھڑنے کی خبر کے بعد ان کا یہ مصرعہ زبان زد عام ہے۔ اردو شاعری یوں بھی آہستہ آہستہ تہی دامن ہو رہی ہے۔ تابش دہلوی، جون ایلیا، ضمیر نیازی، حبیب جالب، حفیظ جالندھری، اقبال عظیم، صوفی تبسم، دیکھتے ہی دیکھتے اس بزم فانی سے اٹھ کر رخصت ہو گئے۔ احمد فراز نوجوانوں کے شاعر ہیں۔ اور گزشتہ دنوں امریکہ کے ایک مقامی ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے یا آئی سی یو میں داخل تھے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم ان کا علاج کر رہی تھی۔ ان کے معالج ڈاکٹر مرتضٰی کے مطابق احمد فراز کو گردوں کے عارضے سمیت کئی امراض تھے۔ لیکن ان کا فشار خون، اور دل کی حرکت کام کر رہی تھی ۔ ان کی صحت یابی کی امید ہو چلی تھی۔ کہ ان کے رخصت ہونے کی خبر آ گئی۔ گزشتہ دنوں ان کی حالت تشویشناک رہی ۔ پاکستان سے ان کے صاحبزادے شبلی فراز بھی ان کی دیکھ بھال کیلیے شکاگو پہنچے۔ پی ٹی وی سے احمد فراز کے انتقال کی خبر نشر کی گئی تھی جسے بعد میں کچھ پاکستانی نجی چینلوں نے بھی چلایا تھا جو غلط ثابت ہوئی۔ احمد فراز امریکہ میں پاکستانی نژاد ڈاکٹروں کی تنظیم ’اپنا‘ کے سالانہ کنونشن میں مشاعرے میں شرکت کے لیے واشنگٹن ڈی سی آئے تھے جہاں وہ گر پڑے تھے اور

ان کے گھٹنوں پر چوٹیں آئی تھیں۔ ان چوٹوں سے انہیں ابتدائی طور انفیکشن ہوگیا تھا اور پھر انہیں شکاگو کے ایک ہسپتال میں ان کو گردوں کے عارضے کیوجہ ڈائیلیسس مشین پر رکھا گیا۔ فراز صاحب کی رحلت کی خبر نے مجھے ان سے ہونے والی ایک ملاقات یاد دلا دی۔ آواری ٹاورز ہوٹل کی سوئمنگ پول کی سائڈ پر ہونے والی ایک تقریب کے بعد چند دوستوں کے ساتھ بزم آرائی میں اس دن احمد فراز خوب موڈ میں تھے۔

انہوں نے خوبصورت اشعار سنائے۔ اور حال دل کہا۔ ملکی حالات پر میں نے انہیں دل گرفتہ پایا۔ ان کا کہنا تھا کہ وزیرستان اور بلوچستان میں ظلم ہو رہا ہے۔ خود احمد فراز کا تعلق وزیرستان سے ہے، ان کا کہنا تھا کہ وزیریوں نے کشمیر کا وہ حصہ پاکستان کو لے کر دیا ہے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم ہر بار یہ سمجھے کہ بہار آئی ہے۔ ضیا دور کے بارے میں کہا اس وقت حالات ایسے تھے کہ ملک سے باہر جانا پڑا۔ میری نظمیں اور شاعری ٹی وی، ریڈیو، اور اخبارات پر پابندی کی وجہ عوام سے دور تھی۔ میری شاعری عوام کی لیے ہے۔ یہ گڑھے میں ڈالنے کے لئے تو نہ تھی۔

اس دوران انہوں نے تازہ اشعار سنائے۔

قتل عشاق میں اب دیر ہے کیا بسم اللہ۔ سب گناہگار ہیں راضی یہ رضا بسم اللہ

میکدے کے ادب آداب سب ہی جانتے ہیں۔ جام ٹکرائے تو واعظ نے کہا بسم اللہ

ہم نے کی رنجش بے جا کی شکایت تم سے۔ اب تمہیں بھی ہے گلہ تو بسم اللہ
چلا تھا ذکر زمانے کی بے وفائی کا۔ تو آ گیا ہے تمہارا خیال ویسے ہی
ہم آ گئے ہیں تہہ دام تو نصیب اپنا۔ وگرنہ اس نے پھینکا تھا جال ویسے ہی
جب ہر اک شہر بلاؤں کا ٹھکانہ بن جائے۔ کیا خبر کب کون کس کا نشانہ بن جائے
ہم نے ایک دوست کی چاہت ہیں جو لکھی ہے غزل۔ کیا خبر اہل محبت کا ترانہ بن جائے

احمد فراز نے بین الاقوامی شہرت اپنی شاعری سے حاصل کی۔ ان کی شاعری پاکستان میں احتجاج کی شاعری کا استعارہ ہے۔ لیکن اب ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں احتجاجی شاعری اور تحریکیں دم توڑ چکی ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں مضبوط جمہوری نظام ہونے کے سبب وہاں احتجاجی شاعری کے علاوہ مضبوط تحریکیں ہر دور میں جاری رہی ہیں۔

پاکستان میں احتجاجی شاعری جنرل ایوب کے زمانے تک خوب ہوتی رہی۔ ایک لحاظ سے جنرل ضیاالحق کے دور میں بھی شاعروں کے پروٹسٹ کا جذبہ ان کی تخلیقوں میں نمایاں تھا لیکن اب یہاں کے شاعر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کچھ تو اسی نظام میں گھل مل گئے اور جو باقی بچے وہ جیلوں میں یا تو گل سڑ گئے یا وطن بدری کے شکار ہوئے۔ پروٹسٹ کی شاعری کے لیے ہی فیض نے جیل کاٹی۔ ہمیں بھی فوجی ظلم کا شکار بنایا جاتا رہا۔

احمد فراز کو نئی نسل سے محبت ہے۔ اس لئے نئی نسل کے شاعروں کے نام ان کا پیغام ہے کہ نوجوانوں مطالعہ کرو۔ دنیا کو باریکی سے سمجھو۔ ایک دور تھا کہ سماج و سیاست کے کم شعور رکھنے والے ہی شاعری کرتے تھے لیکن اب تو نئی نسل کو دنیا کے حالات کے متعلق گہرائی سے جانکاری رکھنے کی ضرورت ہے لیکن مجھے دکھ ہے کہ اب ایسا کوئی سکول نہیں ہے۔ ہم پہلے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اور سیکھتے تھے۔ اب ایسا ماحول بننے ہی نہیں دیا جاتا۔ مجھے دکھ ہے ہمارے یہ بچے کہاں جائیں۔ احمد فراز نے ساری عمر لیکچرار شپ، ریڈیو، لوک ورثہ، اکیڈمی ادبیات، اور دیگر اداروں میں ملازمت کی۔ حکومت نے احمد فراز کو پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے سے ہٹا دیا تھا اور ان کی جگہ افتخار عارف کو پاکستان نشنل بک فاؤنڈیشن کا ایم ڈی مقرر کیا تھا۔ تہتر سال احمد فراز کو انیس سو چورانوے میں ا±س وقت کی وزیر اعظم بینظر بھٹو نے احمد فراز کی تقرری نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ایم ڈی کے طور پر کی تھی لیکن جب ان کی معیاد ختم ہوئی تو اس وقت کے نگران وزیر اعظم معراج خالد ان کی 'تاحکم ثانی' تقرری کر دی۔ وزات تعلیم کے ترجمان مبشر حسن نے احمد فراز کو ہٹائے جانے کے بارے میں کہا کہ احمد فراز کی عمر کافی ہو چکی تھی اور وہ بیمار رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کو ہٹایا گیا تھا۔

احمد فراز گیارہ سال تک اپنے اس عہدے پر برقرار رہے۔ احمد فراز نے اپنے اس

عہدے سے ہٹائے جانے کی وجوہات بتاتے ہوئے کہا تھا کہ 'میں نے کچھ دن پہلے نجی ٹیلی وژن چینلز کو بعض انٹرویو دیے جس میں نے کہا کہ فوج کا ایک حد تک کردار ہے کیونکہ میں اس بات کی حمایت نہیں کرتا کہ فوج ایک خاص رول سے باہر بھی کام کرے اور شاید یہی وجہ بنی مجھ ہٹانے کی'۔ ان کی ملازمت کے دوران نیشنل بک فاؤنڈیشن نے دو سو ملین روپے کمائے جو ایک ریکارڈ ہے۔ احمد فراز کو پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا سول اعزاز ہلال امتیاز بھی دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ان کو ستارہ امتیاز بھی مل چکا تھا۔ گزشتہ دور حکومت میں احمد فراز کی سرکاری رہائش گاہ سے ان کا سامان نکال کر سڑک پر پھینک دیا اور زبردستی مکان خالی کرالیا گیا تھا۔ یہ مکان ان کی بیگم ریحانہ گل کے نام تھا جو دو برس قبل ایڈیشنل سیکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوچکی ہیں اور نوٹس ملنے کے باوجود بھی مقررہ مدت تک مکان خالی نہیں کیا تھا۔ قانون کے مطابق ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی بھی ملازم چھ ماہ تک مکان رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔ احمد فراز ان دنوں برطانیہ میں تھے۔ جب بی بی سی نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ خود سرکاری ملازم ہیں اور ایک ادارے 'نیشنل بک فاؤنڈیشن' کے سربراہ ہیں اور ان کا حق بنتا ہے کہ اگر بیوی ریٹائر ہوں تو مکان انہیں الاٹ کیا جائے۔ لیکن شائد یہ اس ابتلاء کا نکتہ آغاز تھا۔ انہوں نے کہا کہ تین ہفتے پہلے انہیں وزیراعظم شوکت عزیز نے رات کو گیارہ بجے فون کیا اور کہا کہ 'مجھے پتہ چلا ہے کہ کچھ لوگ آپ سے زبردستی مکان خالی کرانا چاہتے ہیں'

لیکن میں نے انہیں روک دیا ہے'۔ احمد فراز کے مطابق جب وزیراعظم نے انہیں تسلی دی تو وہ برطانیہ آ گئے اور جب وزیراعظم ملک سے باہر دورے پر گئے تو وزیر کے حکم پر اچانک ان کا سامان گھر سے نکال کر سڑک پر پھینک دیا گیا اور زبردستی اہل خانہ کو گھر سے بے دخل کر کے قبضہ کر لیا گیا۔ اس کارروائی کے بعد احمد فراز کے اہل خانہ نے ایک 'گیسٹ ہاؤس' میں رات گزاری جبکہ گھر کا پورا سامان نیشنل بک فاؤنڈیشن کے دفتر منتقل کر دیا گیا۔ احمد فراز نے کہا کہ حکومت کے ایسے عمل سے انہیں صدمہ پہنچا ہے اور بالخصوص جب وہ ملک سے باہر ہیں اور سخت بیمار بھی۔ اس اقدام کے بعد احمد فراز نے حکومت پر آئین کا تقدس پامال کرنے اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا الزام عائد کرتے ہوئے احتجاجاً اعلیٰ شہری اعزاز 'ہلال امتیاز' واپس کر دیا ہے۔ ادب کے شعبے میں ملنے والا یہ ایوارڈ واپس کرتے ہوئے کابینہ ڈویژن کو لکھے گئے ایک خط میں انہوں نے کہا ہے کہ سن دو ہزار چار میں یہ اعزاز انہوں نے اس لیے قبول کیا تھا کہ انہیں امید تھی کہ انسانی حقوق کی صورتحال بہتر ہو گی۔ اس بارے میں انہوں نے ایک خط تحریر کیا جس میں انہوں نے لکھا کہ وہ اس امید پر تھے کہ حالات سن انیس اکہتر جیسے نہیں ہوں گے جب ملک ٹوٹ گیا تھا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ احمد فراز نے بلوچستان اور وزیرستان کی صورتحال کا اپنے خط میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'بدقسمتی سے آئینی اور جمہوری اقدار کو بوٹوں تلے روندا جا رہا ہے۔ حکومت افواج پاکستان کو اپنے ہی لوگوں سے لڑا رہی ہے اور

ان کا خون بہا رہی ہے۔ لگتا ہے کہ حکمرانوں نے ماضی کی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھا'۔

انہوں نے کہا کہ ہلال امتیاز ایک بڑا اعزاز ضرور ہے لیکن ان کے بقول جب وہ اپنی فکری آنکھ سے دیکھتے ہیں تو انہیں یہ اعزاز ایک کلنک کا ٹیکہ لگتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عوام نے جو انہیں محبت اور پیار اور عزت دی ہے وہ موجودہ غیر جمہوری، غیر نمائندہ اور ظالم حکمرانوں کے دیئے گئے اعزاز سے کہیں زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ صدر جنرل پرویز مشرف کے قوم سے کیے گئے خطاب پر افسوس اور مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ احمد فراز نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی واحد آواز سے شاید کچھ زیادہ فرق نہ پڑے لیکن وہ امید کرتے ہیں کہ ان جیسی اور آوازیں بھی بلند ہوں گی۔ لیکن ان کے بقول ایسے میں وہ اپنے اندر سے آنے والی آواز کو دبا بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ ملک بھر سے ان جیسی لاکھوں آوازیں اٹھیں گی اور ملک میں آئین اور قانون کی حکمرانی قائم ہوگی اور مطلق العنانیت کا خاتمہ ہوگا۔ صدر مشرف کے استعفی کی خبر انہوں نے بستر علالت پر سنی۔ مرتے دم انہیں جموریت کی بحالی کی خوشی ہوئی ہوگی۔ ح ساس شاعر ہم سے جدا ہوگیا ہے۔ اور اب اس کی شاعری ہمیشہ اس کی یاد دلاتی رہے گی۔

کوئی انقلاب نہیں آئے گا

فیصل آباد کے رہائشی علاقہ پرتاب نگر میں 4 بچوں کے بیروزگار باپ صفدر نے بجلی کا بل زیادہ آنے پر اہل خانہ سے جھگڑ کر خود کو آگ لگا لی۔ اس کے جسم کا 80 فیصد حصہ جل گیا ہے۔ اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے۔ میہڑ کی حسنہ جونیجو نے گاؤں گھاڑی میں غربت کی وجہ سے زہریلی دوا پی کر خودکشی کرلی۔ اس کے آٹھ بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ غربت کی وجہ سے گھر میں ایک روٹی کا آٹا بھی نہیں تھا۔ ماں بچوں کو روٹی پکانے کا دلاسا دیتی رہی۔ بھوک کی وجہ سے بچے روتے رہے۔ بچوں کو روتے ہوئے دیکھ کر ماں مسماۃ حسنہ جونیجو نے خودکشی کرلی۔ عوامی دور میں عوام کا کیا حال ہے۔ راتوں کو بھیس بدل کر عوام کے دکھ درد کا راز جاننے کا نہ یہ زمانہ ہے اور نہ کسی کو اس کی فکر ہے۔ فکر ہے تو بس یہ ہے کہ آج کا بینک بیلنس کیا ہے۔ اور کتنی رقم آج اکاؤنٹ میں آچکی ہے۔ 2001 سے سنہ 2009 کے مارچ کے مہینے تک پیٹرولیم مصنوعات پر عائد کیے جانے والے ٹیکسوں کی مد میں غریب عوام سے حکومت نے 10 کھرب، 23 ارب 64 کروڑ روپے کمائے تھے۔ اس رقم کے بریک اپ میں سیلز ٹیکس کی مد میں 548954 ملین، فیڈرل ایکسائز ڈیوٹی کی مد میں 33381 ملین روپے، کسٹم ڈیوٹی کی مد میں 79771 ملین روپے، پیٹرولیم ڈویلپمنٹ لیوی کی مد میں 281364 اور انکم ٹیکس کی مد میں 80171 ملین کمائے

ہیں۔ اس کے بعد تیل کی چار بڑی کمپنیوں کا منافع اہے۔ اٹک آئل کمپنی نے 6918 ملین ۶ ارب ۱۹ کروڑ ۰۸ لاکھ روپے، پاکستان سٹیٹ آئل نے ۵۴ ارب ۵۳ کروڑ ۰۵ لاکھ روپے، شیل پاکستان نے ۱۵ ارب ۸۲ کروڑ ۰۶ لاکھ روپے، لین اور شیوران کالٹیکس) نے ۷ ارب ۷ ۳ کروڑ ۰۸ لاکھ روپے کا منافع کمایا ہے۔ آئل مارکیٹنگ) کمپنیوں اور حکومتی اداروں کی اس لوٹ مار سے ہی غریب صفحہ ہستی سے مٹتے جارہے ہیں۔ اوگرا کے وکیل نے عدالت کو بتایا تھا کہ پیٹرولیم کی مصنوعات کی قیمتوں کے بریک اپ میں سب سے زیادہ اضافہ ایکس ریفائنری پر کیا گیا تھا جو چار روپے سے لیکر چھ روپے ہے۔

نئے مالی سال کو شروع ہوئے ابھی ہفتہ ہی گزرا ہے کہ پٹرول اور ایل پی جی کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ کرکے عوام پر مہنگائی کے بم گرا دیئے ہیں۔ حکمران تجوریاں بھرنے میں مصروف ہیں، اب ہر ماہ مٹی کے تیل، پٹرول اور گیس کی قیمت میں اضافہ کیا جائیگا۔ پاکستان کی 62 سالہ تاریخ میں یکم جولائی سے ڈیزل کی قیمت پیٹرول سے بھی بڑھا دی گئی ہے جبکہ ماضی میں یہ 5 سے 10 فیصد کم ہوا کرتی تھی۔ حکومت کی جانب سے پیٹرول کی قیمت میں اضافے کے باوجود پٹرول ڈیلرز نے اپنے طور پر بھی پٹرول کی قیمت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔ پیٹرول کی فی لیٹر قیمت پر ڈیلرز کمیشن 2 روپے ہونے کے باوجود صارفین سے 18 پیسے فی لیٹر اضافی وصول کیے جارہے ہیں۔ گو مدت ہوئی اب پیشوں کا کوئی لین

دیں نہیں رہا۔ لیکن باٹا کمپنی کی طرح وزارت پیٹرولیم نے فی لیٹر پیٹرول 62 روپے پیسے جبکہ ہائی اسپیڈ ڈیزل کیلئے 62 روپے 65 پیسے فی لیٹر قیمت مقرر کی ہے، پمپ 13 مالکان کی جانب سے پیٹرول پر فی لیٹر 18 پیسے جبکہ ڈیزل پر 19 پیسے زائد وصول کیے جارہے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عوام کو عدالت عظمی سے کوئی ریلیف ملا تھا ۲۴ گھنٹوں میں صدراتی آرڈیننس نے یہ کہانی ختم کردی۔ کہا جارہا ہے کہ حکومت نے آئی ایم ایف سے 5 ارب ڈالر کی امداد حاصل کرنے کے لیے یہ آرڈیننس جاری کیا ہے حکومت قرضہ دینے والے اداروں کو یقین دلانا چاہتی ہے کہ حکومت عوام سے پیٹرولیم پر ٹیکسز کی مد میں سالانہ 122 ارب روپے کا ہدف حاصل کرے گی۔ 17 کروڑ عوام اب صرف پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے سے ہی نہیں بلکہ ہر چیز کی قیمتوں میں اضافے سے متاثر ہوں گیا۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ اور دیگر طریقوں سے معاشی قتل کرنے کے بعد عوام زندہ درگور ہو گئی ہے۔ سابق حکومت نے یوٹیلٹی اسٹور کے ذریعہ غریبوں کو سستا آٹا، دال فراہم کرنے کا نسخہ تجویز کیا تھا۔ اب سب سے پہلے یوٹیلٹی سٹورز پر فروخت کئے جانے والی دالوں کی قیمتوں میں ایک روپے سے دس روپے فی کلو تک اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ حال ہی میں یوٹیلٹی سٹورز پر فروخت کئے جانے والے تمام اشیاء کی قیمتوں میں تین روپے اضافہ کیا گیا تھا۔ نئ قیمتوں کا اطلاق فوری طور پر کر دیا گیا ہے۔ جبکہ پرانا سٹاک بھی نئ قیمتوں پر فروخت کیا جائے گا۔
یوٹیلٹی سٹور کارپوریشن کی جانب سے دالوں کی

قیمت میں ایک روپے سے دس روپے تک اضافہ کے اعلامیہ کے بعد مونگ کی قیمت روپے سے بڑھ کر 47 روپے فی کلو گرام ، دال ماش 78 روپے سے بڑھ کر 83 46 روپے فی کلو گرام، سفید چنا 78 روپے سے بڑھ کر 88 روپے فی کلو گرام تک ہو گیا ہے۔ گوشت دودھ کی قیمتوں میں جو ہوشربا اضافہ جاری ہے اس کو لگام دینے والا کوئی نہیں ہے۔ پاکستان اور آئی ایم ایف کے درمیان مذاکرات جاری ہیں۔ پاکستان نے بجلی پر سبسڈی ختم کرنے کی شرط پوری کرنے کیلیے مزید چھ ماہ کی مہلت مانگنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اب خونی انقلاب آئے گا، میں کہتا ہوں۔ یہاں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ انقلاب غیر تمند قوم، اور جرات مند لیڈر لاتے ہیں۔ یہاں ایسا کوئی نہیں ہے۔ عوام یوں سسکتے، بلکتے، جلتے، مرتے رہیں گے۔

روشنیوں کے شہر میں اندھیرے اور سائے

روشنیوں کے شہر میں روز بروز اندھیرے اور سائے بڑھ رہے ہیں، قانون اور ضابطہ شاید ہی کہیں نظر نہیں آتا ہو اور ہمدردی اور رواداری کا قحط سنگین ہو چلا ہے۔ لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ کراچی میں مختلف گروہوں کے مفادات بڑھ گئے ہیں، ان مفادات کے آپس میں ٹکراؤ اور گروہوں کے آپس میں نت نئے روابط اور صف بندیوں نے صورتحال کو کشیدگی کی طرف دھکیل دیا ہے۔
انیس سو نوے کی دہائی میں اور ۲۰۰۹ میں فرق اتنا ہے کہ پہلے جب سیاسی طور پر غیر یقینی کی فضا تھی اس وقت اس قسم کے واقعات میں جن لوگوں کی اموات ہوتی تھیں ان کی بوری بند لاشیں ملا کرتی تھیں اور آج دن دھاڑے کسی بھی مقام پر قاتل اپنا وار کرجاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر واقعات کے پیچھے سیاسی ہاتھ اور سازش تلاش کی جاتی ہے لیکن قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ پہلے کورنگی، لانڈھی، ملیر، اور لیاری علاقوں میں یہ وارداتیں ہوتی تھیں۔اب لیاقت آباد، ملیر، لانڈھی، شاہ فیصل، سعید آباد، رامسوامی، جیسے علاقوں میں یہ وارداتیں ہوتی ہیں۔
وزیر داخلہ کے کراچی میں آنے اور ان کی جانب سے ان واقعات پر سخت ایکشن کا سن کر میں تو کانپ اٹھا تھا۔ کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ اب کوئی قتل ہوا تو

دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ کچھ دن پہلے کراچی والے صدر آصف علی زرداری کی آمد پر بہت خوش ہوئے تھے۔ کیوں کہ ان کی کراچی آمد کے بعد لوڈ شیڈنگ بند ہو گئی تھی۔ رحمان ملک صاحب کی آمد پر بھی کراچی والے خوش تھے کہ اب یہ قتل و غارت گری کا سلسلہ اب بند ہو جائے گا۔ کیوں کہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اب جب تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ سارے خواب سچے ہوں۔ اٹھارہ اکتوبر کو پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بینظیر بھٹو کے استقبالی جلوس پر حملے اور ایک سو چالیس افراد کی ہلاکت کے واقعے، نشترپارک بم دھماکے اور بارہ مئی جیسے بڑے واقعات پرانے تو ہوگئے ہیں لیکن ان واقعات سے دہشت زدہ ہو کر عام شہری کر سہم کر رہ گیا ہے۔

پاکستان کا سب سے بڑا اور صنعتی شہر کراچی ہے۔ ایک کروڑ سے زائد آبادی کے اس شہر میں روزانہ ہونے والی، ہلاکتوں، دہشتگردی اور خوں ریزی کے تمام واقعات کے لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ جو لوگ اخبار نہیں پڑھتے وہ ٹی وی پر بریکنگ نیوز سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ علاقے میں لوگوں سے یہ خبر سنتے ہیں۔ ان میں غصے، خوف، دہشت کی کیفیت پیدا ہوتی ہیں۔ شہریوں میں ڈپریشن اور بے خوابی کی شکایت بڑھ رہی ہیں۔ رویہ میں بھی چڑچڑا پن آگیا ہے۔ بظاہر ان واقعات کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا ہے۔ مگر ایسے کئی لوگ ہیں۔ جن کے ذہنوں پر ہلاکتوں، دہشتگردی اور خوں ریزی کے ان واقعات نے منفی اور

مضر اثرات ڈالے ہیں۔ فوری طور پر ان کی شدت ظاہر نہیں ہوتی لیکن یہ زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ کراچی میں گزشتہ ایک دہائی سے بم دھماکوں اور خون ریزی کے واقعات اور عدم تحفظ کے احساس سے نوجوان سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔
نوجوانوں کا حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ڈر اور خوف ہے اسے ہم نے اپنے اندر دبا دیا ہے، بظاہر بہادری کے ساتھ آ جا رہے ہیں مگر یہ ڈر اور خوف یادداشت پر اثرانداز ہوتی ہے۔
جب بہت ساری پریشانیاں لاشعور میں چل رہے ہوں تو وہ صحیح طور پر ریکارڈ نہیں ہوتیں، اور جب اسے پلے کرتے ہیں تو صحیح پلے نہیں ہوتی اور بھول جاتے ہیں۔' بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کچھ نہیں ہوا مگر ہر تخریب کاری اور خونریزی کے واقعات کے بعد عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ ہر کوئی پریشان رہتا ہے کہ میرا بچہ، میرا خاوند، میری بیوی، بچی گھر سے باہر گئے ہیں، پتہ نہیں وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟ کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟ کراچی میں موبائل ٹیلیفون کی اتنی خریداری ہوئی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رہ سکیں۔ پہلے کراچی کے لوگوں کے مسائل میں بیروزگاری اور رہائش کا تھا۔ سکیورٹی کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کرتا تھا، مگر اب آپ کوئی بھی سروے کریں اس میں سکیورٹی سب سے اہم ایشو کے طور پر سامنے آتا ہے۔

رواں سال کے پہلے چھ ماہ کے دوران کراچی میں تقریباً ایک سو سیاسی کارکن قتل ہوئے ۔ جون میں ۴۷ ہلاکتیں ہوئیں۔ جبکہ جولائی میں اب تک ۲۳ سیاسی کارکن قتل ہو چکے ہیں۔ جبکہ 2008ء میں 74 سیاسی کارکن قتل ہوئے تھے۔ یہ بات ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان سندھ چیئرمین کی مرتب کردہ ایک رپورٹ میں بتائی گئی ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے گزشتہ سال کے 74 سیاسی کارکنوں کے قتل کے مقابلے میں رواں سال میں 100 سیاسی کارکن قتل ہوئے جن میں سے مہاجر قومی موومنٹ کے متحدہ قومی موومنٹ کے 28، پیپلز پارٹی کے 11، عوامی نیشنل پارٹی (اے این، 38 پی) کے 10، سندھ ترقی پسند پارٹی کے 4، تحریک طالبان کے 2، پاکستان مسلم لیگ ن) کے 2، جماعت اسلامی کے 2 اور پاکستان مسلم لیگ (فنکشنل)، جئے سندھ قومی) محاذ اور پنجابی پختون اتحاد کے ایک ایک کارکن شامل تھے۔ سیاسی کارکنوں کا قتل یوں بھی کراچی کے لئے تباہی کا باعث ہو رہا ہے کہ اب لوگ سیاست سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ جو شعبہ کبھی خدمت، ایثار، سے عبارت تھا وہ اب لہو رنگ ہے۔ اور کراچی جو کبھی ملک کی سیاست کو لیڈ کرتا تھا۔ اب یہاں دور دور تک کوئی ملک گیر بڑا سیاسی لیڈر نظر نہیں آتا۔ کراچی ایسا تہی دامن تو کبھی نہیں رہا تھا۔

سوات کا نوحہ

گھر جانے کی بیقراری کیسی ہے۔ یہ کوئی ان سے پوچھے جن کو ان کی جنت سے تن کے کپڑوں میں گھروں سے نکال دیا گیا ہو آج ان کی واپسی کا دن ہے ان کی آنکھوں میں گھروں پر جانے کے خواب ہیں لیکن وہاں گھر ہی نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ بے گھر ہونے والے افراد میں بعض ایسے بھی ہیں جنہیں سوات میں حالات کی درست ہوجانے کا اعتبار اور کسی کے دعووں پر اعتماد نہیں ہے۔ سوات اور ملاکنڈ ڈویژن میں مئی کے پہلے ہفتے میں طالبان کے خلاف شروع کی گئی فوجی کاروائی کے بعد حکومتی اعداد و شمار کے مطابق تین ملین سے زیادہ افراد نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ لیکن ان بے گھر افراد کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں ہے۔ حکومت زیادہ سے زیادہ عالمی امداد کی حصول کی خاطر بے گھر ہونے والے افراد کی تعداد زیادہ بتانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان کے بقول ایک محتاط اندازے کے مطابق ملاکنڈ ڈویژن سے دو ملین کے قریب لوگ بے گھر ہوئے ہوں گے۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ملاکنڈ ڈویژن کے بے گھر افراد کی باقاعدہ واپسی پیر سے شروع ہوگی مگر کیمپوں میں کام کرنے والے غیر سرکاری امدادی اداروں کا کہنا ہے کہ گزشتہ چند دنوں کے دوران تیس ہزار سے زائد افراد پہلے ہی سوات پہنچ چکے ہیں۔

صوبہ سرحد کی حکومت کی جانب سے لوگوں کی واپسی کے حوالے سے جاری ہونے والے نظام اوقات کے مطابق کیمپوں اور باہر رہنے والے تمام افراد کی واپسی کا عمل تین مرحلوں میں پینتیس دنوں کے دوران مکمل ہوگا۔ اس سلسلے کا پہلا مرحلہ پیر تیرہ جولائی سے شروع ہوگا تاہم کیمپوں میں کام کرنے والے سوات کے چار غیر سرکاری امدادی اداروں کے اتحاد 'ڈیزاسٹر ریسپانس ٹیم' کا کہنا ہے کہ حکومتی شیڈول کے اعلان سے پہلے ہی لوگوں نے واپسی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔' ایک ادارے کے مطابق تیس ہزار سے زائد افراد پیدل چلتے ہوئے مختلف پہاڑی اور دیگر دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے سوات پہنچ چکے ہیں۔ مینگورہ اور مضافات میں امن و امان کی صورتحال سکیورٹی فورسز کی گرفت میں ہے تاہم شہر میں کرفیو بدستور برقرار ہے۔ کہا گیا تھا کہ ان بے خانماں لوگوں کو امداد دی جائے گی۔ اس امداد کے چیکوں وہی حال ہے جو اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ یعنی اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ جنہیں نقد رقم کی ضرورت ہو وہ تو جو انہیں مل جائے وہ لے لیتے ہیں۔ ایسے امدادی چیکوں کیش کرانے والے کمیشن ایجنٹوں کے وارے نیارے ہو رہے ہیں۔

ان افراد کی بے گھری پر ہم نے ایک بار پھر کشکول اٹھایا تھا، ساری دنیا کے سامنے دہائی دی، اقوام متحدہ کو کھڑا کیا۔ لیکن رقم ملی تو بھی کتنی صرف 230 ملین ڈالر۔ اقوام متحدہ نے بین الاقوامی امدادی اداروں اور ممالک سے

مالاکنڈ آپریشن کے متاثرین کے لیے پانچ سو چالیس ملین ڈالر کی امداد کا مطالبہ کیا تھا جس میں اب تک صرف دو سو تیس ملین ڈالر وصول ہوئے ہیں جن میں سے بیشتر آئی ڈی پیز پر خرچ ہو چکے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ زلزلہ زدگان کے لیے جو امداد عالمی برادری نے دی تھی ۔ اس مرتبہ بین الاقوامی امدادی اداروں اور ممالک نے پہلے کی طرح امداد نہیں دی ہے۔ اقوام متحدہ کے حکام کے مطابق اس وقت کوئی تین ہزار سکولوں کی عمارتوں میں آئی ڈی پیز رہائش پذیر ہیں اور ستمبر میں سکول کھلنے سے قبل ان آئی ڈی پیز کے حوالے سے کچھ کرنا ہوگا۔ کئی علاقوں میں موسم خوشگوار ہے جبکہ نچلے علاقوں میں گرمی بہت ہے۔ شدت پسندوں کی واپسی کا خوف بھی ہے لیکن گھروں سے دور مسائل اتنے زیادہ ہیں کہ لوگ واپسی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ہمارے دوست احمد فواد نے سوات پر ایک نظم لکھی ہے۔

دھواں بن کر اڑ رہا ہے سب وہ پھولوں کا دیار
گھاٹیاں فردوس صورت وادیاں جنت مثال
سوات زخموں سے نڈھال
،ہنتی گاتی بستیاں، سب چپ ہیں مرگھٹ کی طرح
ایک گھنا جنگل ہے جس میں رات دن محبوس ہیں
آشنا مانوس چہرے سارے نامانوس ہیں
زندہ بچنے والے اک اک سانس سے مایوس ہیں

سر کٹی لاشوں نے ان چوکوں کا ماضی کھا لیا
گولیوں کی تڑتڑاہٹ آسمانوں تک گئی
کوچہ کوچہ گھوم کر موت کے قدموں نے
سارے شہر کو اپنا کیا
دوستوں کا دشمنوں کا جاننا ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ احمد فواد کی یہ طویل نظم رلا دینے والی ہے۔ یہ وادی سوات کا نوحہ ہے۔ اب اس نوحہ پر مزید کیا لکھا جائے۔

ایک مظلوم مسلمان عورت کی پکار

حقوق انسانی کی دہائی دینے والے، اور آزادی صحافت کی آواز بلند کرنے والے معاشرے میں عدالتی کاروائی ایسی ہوتی ہیں۔ اور انصاف کا خون اس طرح کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں سوچ کر شرم آتی ہے۔ ایک حافظ قرآن، اعلیٰ تعلیم یافتہ باپردہ خاتون کی ایسی بے حرمتی۔ یہ سب ایک پاکستانی بیٹی کے، ایک ماں کے، ایک محب وطن خاتون کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ عقوبت خانے میں قرآن کی بے حرمتی کی جارہی ہے اور ہم خاموش ہیں۔ انوسٹیگیشن کے نام پر اسے برہنہ کرکے اس کی وڈیوز بنائی جاتی ہیں۔ امریکہ میں قید پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی یہ ستم ڈھائے جارہے ہیں اور ہم خاموش ہیں۔ ڈاکٹر عافیہ پر امریکوں نے جو مقدمہ بنایا ہے اس کو دیکھ کر ظہور الہی مرحوم پر بھینس چوری اور ارباب غلام رحیم کی جانب سے آصف زرداری کے خلاف بکری چوری کا مقدمہ بنانے کی دھمکی یاد آجاتی ہے۔ عافیہ پر الزام ہے کہ انہوں نے افغانستان میں چھ امریکی فوجیوں کی موجودگی میں ایک امریکی فوجی سے ایم فور رائفل چھین لی اور اس کا سیفٹی گیج کھینچ کر امریکی فوجی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جس کے بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ گویا امریکی فوجی چوڑیاں پہن کر بیٹھے تھے ۔ کس کے بعد ایک امریکی فوجی نے اس پر نزدیک سے گولی چلائی ۔ جس میں سے ایک گولی نے اس کا گردہ ناکارہ کردیا اور دوسری

گولی اس کے دل سے ایک سینٹی میٹر نیچے سے گزر گئی۔ عافیہ نے نیویارک میں سماعت کے موقع پر عدالت کو بتایا کہ انہوں نے امریکی فوجیوں پر نہ تو گولی نہیں چلائی اور نہ ہی وہ امریکہ کے خلاف ہیں بلکہ وہ امن کی حامی اور جنگ کے خلاف ہیں۔ نیویارک کی وفاقی عدالت یو ایس کورٹ صدرن ڈسٹرکٹ میں جج رچرڈ ایم برمین کے سامنے جب خاتون پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو جیل سے مبینہ طور زبردستی پیش کیا گیا۔ سات گھنٹوں کی عدالتی کارروائی کے دوران ڈاکٹر عافیہ مختلف مواقع پر اٹھ کر جج کو مخاطب کرتی رہی۔ انہوں نے خود پر جیل میں تشدد ہونے اور جیل کے محافظوں کی طرف سے مبینہ طور پر قرآن کو ان کے پاؤں میں رکھنے کے بھی الزامات لگائے۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو تقریباً دس ماہ کے بعد عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔

جج رچرڈ برمین کے سامنے عدالت کی کارروائی جیسے ہی شروع ہوئی تو ڈاکٹر عافیہ صدیقی اٹھ کر کھڑی ہوئی اور جج سے مخاطب ہو کر کہا: 'میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی گولی نہیں چلائی۔ نہ میرے پاس بندوق ہے۔ میں امریکہ کے خلاف نہیں ہوں'۔ جج نے اس موقع پر ڈاکٹر عافیہ کو عدالتی کارروائی میں مخل نہ ہونے اور بیٹھ جانے کو کہا۔ استغاثہ کی جانب سے غیر جانبدار نفسیاتی ماہر ڈاکٹر تھامس کو چارکی اور گریگوری بی سیتھاف نے وکلاء اور عدالت کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات کے جواب میں کہا کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی نفسیاتی طور

پر مقدمہ چلائے جانے کی اہل ہیں۔ دوسری جانب وکیل استغاثہ کا موقف تھا کہ ڈاکٹر صدیقی نفسیاتی طور پر بالکل ٹھیک ہیں اور وہ مقدمے سے بچنے کے لیے بہانے کر رہی ہیں۔ جبکہ ان کی وکیل صفائی ڈان کارڈی نے استغاثہ کی طرف سے مقرر کردہ ماہر نفسیات کی رائے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مؤکلہ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں۔ سماعت کے دوران ڈاکٹر عافیہ نے ایک موقع پر اپنا رخ کمرا عدالت میں موجود عام لوگوں اور صحافیوں کی طرف کرتے ہوئے کہا کہ وہ جاکر دنیا کو بتائیں کہ 'میں بے قصور ہوں اور مجھ پر ظلم ڈھائے گئے ہیں اور سازش کی گئی ہے'۔ جب جج نے انہیں خاموش رہنے اور بیٹھ جانے کو کہا تو انہوں نے براہ راست جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جیل میں ان پر تشدد کیا جارہا ہے اور جسم برہنہ کرکے تلاشی لی جاتی ہے اور اس کی وڈیو بنائی جاتی ہے اور یہ سب کچھ ان کے حکم پر کیا جارہا ہے۔ اس پر جج نے کہا کہ وہ جیل حکام کو صرف قواعد کے مطابق تلاشی کی مزاحمت کرنے والوں پر سختی کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس پر ڈاکٹر عافیہ نے کہا کہ 'اگر کسی کی برہنہ کرکے تلاشی لی جائے تو کیا وہ مزاحمت بھی نہ کرے!'۔ انہوں نے عدالت سے استدعا کی کہ انہیں اپنے بچوں سے ملوایا جائے اور ان کے ساتھ پانچ سال سے ہونے والے ظلم و تشدد کا حساب بھی لیا جائے۔ عافیہ پر اب تک کوئی جرم ثابت نہیں ہوسکا۔ گزشتہ چھ سال سے

پورا مغربی میڈیا اس پر الزامات لگا رہا ہے۔ لیکن اب تک کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ اقوام متحدہ کا چارٹر بھی یہ کہتا ہے کہ غیر قانونی حراست میں رکھے جانے والے کسی شخص پر کسی قسم کا الزام ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کنونشن یہ بھی کہتا ہے کہ خاتون کا تقدس ہر حال میں مقدم رکھا جائے خواہ اس پر کوئی الزام ہو۔ لیکن آج قانون بنانے والے ہی اسے پامال کر رہے ہیں۔ اور ہمارے سفیر اور وزراء امریکہ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں، عافیہ کی پکار ایک مظلوم مسلمان عورت کی پکار ہے۔ لیکن اب کوئی محمد بن قاسم نہیں ہے۔ جو اس پکار پر لبیک کہے۔

نوجوان نسل کو بچاؤ

میرے ایک دوست کے بیٹے حال ہی میں پاکستان سے باہر تعلیم حاصل کرنے گئے ہیں۔ ہر چند کہ وہ ان کا لاڈلہ بیٹا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ہمت کرکے اسے دو تین سال کے لئے ملک سے باہر بھیج دیا ہے۔ میرے آفس کے دو ساتھیوں کے بیٹے بھی چند سال قبل لندن تعلیم کے حصول کے لئے گئے تھے۔ دونوں نے وہاں شادی کر لی اب ماں باپ روتے ہیں کہ ہم نے کیوں بھیجا تھا۔ پاکستان میں گزشتہ چند برسوں سے یہ تبدیلی آئی ہے کہ اب بڑی تعداد میں پاکستانی طالبعلم امریکہ اور دیگر ملکوں میں تعلیم کے لئے جارہے ہیں۔ ان میں غیر ملکوں میں تعلیم کے لئے کونسلنگ کرنے والوں اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کی تشہیر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اخبارات، رسائل، انٹرنیٹ، اور اب فیس بک نوجوانوں کو ورغلانے میں سب سے آگے ہیں۔ والدین بچوں کو باہر بھیجتے ہوئے اس بات کا مطلق خیال نہیں کرتے کہ ان تعلیمی اداروں میں تشدد کا کیا رجحان ہے۔ جس کے پاس دولت ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ یہی خواب دیکھتا ہے کہ وہ باہر جا کر تعلیم حاصل کرے۔ حال میں وومین سیلف ڈسٹریکشن آن لائن اعداد شمار کے مطابق امریکہ میں ہر سال دس لاکھ لڑکیاں بن بیاہی ماں بن جاتی ہیں۔

یورپین کمیشن کی ایک تحقیق کے مطابق امریکہ میں ساری دنیا سے زیادہ کرائم کی شرح ہے۔ جس سے اسے کرائم کیپیٹل آف دی ورلڈ کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ گزشتہ دنوں آئرلینڈ کی حکومت کی جانب سے قائم کردہ ایک کمیشن نے انکشاف کیا ہے کہ آئرلینڈ کے چرچوں میں پادریوں کی جانب سے بچوں پر جنسی تشدد کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ملک میں موجود مذہبی اسکولوں اور اداروں میں کیتھولک پادریوں اور ننوں نے ہزاروں بچوں کو جنسی اور جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ دوہزار چھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ تقریباً تین سوایسے افراد ہیں جو اب آئرلینڈ سے باہر رہائش پذیر ہیں اور وہ اپنے اوپر اسکولوں اور دیگر جگہوں پر کئے گئے جنسی تشدد کے مقدمے کی پیروی کیلئے ایک سو چھیاسٹھ مرتبہ آئرلینڈ واپس آئے ہیں۔ آئرلینڈ کی طرح امریکا بھی ایک ایسا ہی ملک ہے جہاں اس طرح کے واقعات عام ہیں۔ دوہزار چار میں امریکی کانفرنس آف کیتھولک بشپ کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق انیس سو پچاس سے کام کرنے والے پانچ ہزار سے زائد پادریوں یعنی چار فیصد نے جنسی تشدد جیسے جرائم کئے ہیں گو کہ ان کی سطح کم تھی۔

رپورٹ کے مطابق بارہ ہزار سے زیادہ افراد پادریوں کے جنسی تشدد کا شکار ہوچکے ہیں۔
میں ورجینیا کی یونی ورسٹی ورجینیا ٹیک میں پیش آیا جس میں ۲۰۰۷

قاتل نے یونی ورسٹی کے اندر دو مختلف جگہوں پر دو گھنٹوں کے وقفے سے فائرنگ کر کے کم از کم 32 افراد کو ہلاک کر دیا۔ پہلی فائرنگ ایک ہاسٹل کے اندر جب کہ دوسری کلاس روم کی عمارت میں کی گئی۔ اس قتلِ عام سے امریکہ کے تعلیمی اداروں میں ہونے والے دوسرے سانحوں کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ امریکہ میں تعلیمی اداروں میں تشدد کا پہلا واقعہ 1966ء میں پیش آیا تھا جب ٹیکساس کی یونی ورسٹی میں ایک شخص نے 13 افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد 1998ء میں ریاست کولوراڈو میں کولمبائن ہائی سکول میں 12 طلبا اور ایک استاد کو سکول میں اندھا دھند فائرنگ کر کے ہلاک کر ڈالا تھا۔ اکتوبر 2006ء میں پینسلوینیا کے دیہی علاقے میں ایک شخص نے آمش فرقے سے تعلق رکھنے والی چھ بچیوں کو ایک سکول کے کمرے میں گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ اس صورتحال میں ہمیں اپنے بچوں کو مغربی اداروں میں بھیجنے سے پہلے ان کی کارکردگی اور وہاں ہونے والے جرائم پر ضرور نظر ڈال لینی چاہیئے۔ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں ابھی تک ایسے تشدد کے واقعات نہیں ملتے۔ امریکہ مدارس کو جس قدر بدنام کر رہا ہے۔ اور ان کو طالبان سے مربوط کر رہا ہے یہ ایک سازش کا حصہ ہے۔ جمہوری معاشروں میں شائستگی، رواداری اور تحمل و برداشت کے اوصاف لازمی ہوتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں توازن قائم رکھنے اور اجتماعی معاملات کی عمدہ انجام دہی میں مدد ملتی ہے۔ جمہوری ذہن کی تشکیل کے لیے ہمیں اپنے تعلیمی اداروں میں اس امر کا بطورِ خاص اہتمام کرنا ہو گا کہ طلبہ اور طالبات میں

اختلاف رائے کا احترام پیدا ہو اور انہیں مشورے کے ساتھ اجتماعی امور طے کرنے کی عملی تربیت ملتی رہے۔ وہ ممالک جنھوں نے امریکی طرز معیشت کو آگے بڑھ کر گلے لگا لیا بلکہ اس کے حوالے سے آئی ہوئی ہر چیز کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ اور ہمارا ملک بھی ان ممالک میں سے ہے جنھوں نے اندھا دھند امریکی طرز حیات کے لئے دیدہ ودل فرش راہ کر دئے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے نام پر آنے والی ہر چیز کے لئے اپنے تمام دروازے کھول دئے۔ برتھ کنٹرول کے نام پر جنسی بے راہ روی کی نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور اس کے فروغ کے لئے عالمی ادارہ صحت کے فنڈ سے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں میں ایسے ایسے اشتہارات واعلانات دینے شروع کر دیئے کہ شریف شہریوں کا دم گھٹنے لگا۔ اسقاط حمل اب کوئی جرم نہیں رہا۔ بلکہ اس کے لئے ہر سہولت دستیاب ہے خواہ حمل کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ تعلیمی اداروں میں جنسی تعلیم کا فتنہ اسی گلوبلائزیشن اور امریکی طرز زندگی کی دین ہے۔ ایسی متعدد نقالیاں ہیں جنہیں ترقی کے نام پر اختیار کیا جارہا ہے۔ بڑے شہروں کا کلچر نہایت تیزی کے ساتھ امریکی کلچر میں تبدیل ہو رہا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک میں تو مغربی اقدار سے اِس والہانہ عشق ہے کہ دہلی ہائی کورٹ نے ہم جنس پرستی کی سرپرستی میں فیصلہ دیا ہے۔ یہ مقدمہ لڑنے والی ناز فاؤنڈیشن کی خاتون صدر نے کہا ہے کہ "بھارت اب صحیح معنی میں 21 ویں صدی میں داخل ہوگیا ہے۔" مغربی اقدار سے یہ محبت کیا کسی غیرت مند ملک کو زیب دیتی ہے۔ ہمیں اپنی نئی نسل

پر رحم کرتے ہوئے اسے مغرب کے اس تباہ کن ہتھیاروں سے بچانا چاہیے۔

بارش کے بعد

کراچی میں موسلا دھار بارش کے اڑتالیس گھنٹے بعد بھی شہر کی جو صورتحال ہے۔ اسے جنگ کے بعد کی صورتحال سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ ٹوٹی ہوئی سڑکیں، بہتا ہوا اور جمع شدہ پانی، کچرے کے ڈھیر، اور اس پر مستزاد یہ کہ شہر کے وسیع حصے میں بجلی غائب ہے جس کی وجہ سے شہر کے بیشتر علاقوں میں پینے کے پانی کی شدید قلت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ کراچی میں دو سو پینتیس ملی میٹر بارش ریکارڈ کی گئی۔ اس سے قبل کراچی میں سب سے زیادہ بارش انیس سو ستتر میں دو سو سات ملی میٹر ریکارڈ کی گئی تھی۔ کراچی میں اس طوفانِ باد باراں کے دوران مختلف حادثات میں ۵۰ سے زائد افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ محمود آباد، گارڈن ایسٹ، منظور کالونی، گلشن حدید سمیت شہر کے کئی علاقوں میں اڑتالیس گھنٹوں سے بجلی بند ہے جس کی وجہ سے پینے کے پانی کی فراہمی بھی معطل ہے اور ان علاقوں کے مکینوں میں سخت اشتعال پایا جاتا ہے۔ شہر کے بعض مقامات پر بجلی اور پانی کی بندش اور بارش کے پانی کی نکاسی نہ ہونے کے خلاف مشتعل لوگوں کی جانب سے سڑکوں پر احتجاج جاری ہے۔ کے ای ایس سی کے حکام مسلسل دعوی کر رہے ہیں کہ شہر کے زیادہ تر علاقوں میں بجلی کی فراہمی بحال کر دی گئی ہے۔ لیکن عوامی احتجاج اب سڑکوں کو بلاک کر رہا ہے۔ ٹرینوں کو روک رہا ہے، وزراء عوامی نمائندوں سے ناراض ہے۔

سیاست دانوں اور سڑک پر چلنے والی گاڑیوں پر پتھراؤ کر رہا ہے۔ عوامی جذبات کی وہ شدت ہے کہ اب خطرہ ہے کہ کراچی میں نئے سرے سے حالات بدترین نہ ہو جائیں۔ ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ نے اپنے مرکزی دفاتر کے مقامات سے بارش کے پانی کی نکاسی نہ ہونے اور بجلی نہ ہونے کے باعث مریضوں کو فراہم کی جانے والی ایمبولنس سروس عارضی طور پر معطل کر دی ہے۔ کے ای ایس سی کے معاملے میں حکام بے بس نظر آتے ہیں۔ تو دوسری طرف کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی کے عہدیداروں بے فکر۔ بارش باراں رحمت ہے اس کے آنے کا گلا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے بعد کے حالات افسوسناک کہے جا سکتے ہیں۔ شہری مسائل کے حل کے لئے اخبارات تشہیر کے لاکھوں روپے کے اشتہارات میں کئے جانے والے سارے دعوے مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئے ہیں۔ تین دن گزرنے کے باوجود اب تک شہر کے بیس سے پچیس فیصد علاقوں میں بجلی بحال نہیں ہو سکی ہے جس کی وجہ بارش کے نتیجے میں بجلی کی تنصیبات میں پیدا ہونے والے نقائص ہیں۔ بعض علاقوں میں بجلی سے محروم مشتعل لوگ کے ای ایس سی کے عملے پر حملے کر رہے ہیں جس کی وجہ سے مرمت کے کام میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ اور عملہ ان علاقوں میں جانے سے کترا رہا ہے۔ پیر اور منگل تک ایم اے جناح روڈ اور بولٹن مارکیٹ کے علاقوں کی دکانوں میں دو سے تین فٹ پانی جمع ہوا تھا۔ جو حالیہ سڑکوں کی استرکاری کا بدترین شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ ان مارکیٹوں سے پانی نکال کر سڑک پر ڈال

دیا گیا ہے لیکن جب کوئی گاڑی گزرتی ہے تو پانی پھر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ شہر کے بعض علاقے تاحال بارش کے پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ پورا شہر نمک کا بنا ہوا تھا۔ جو بارش ہوتے ہی گھل کر رہ گیا۔ کراچی میں بارش اور طوفانی ہواوؤں اور مرکزی شاہراہوں پر گرنے والے ہورڈنگز اور سائن بورڈ کے نیچے دب کر کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ طوفانی بارش میں ہونے والی ہلاکتوں اور زخمیوں کی تعداد 200 سے زائد بتائی جا رہی ہے۔

زیادہ تر نقصان، درخت، بجلی کے پول اور ہورڈنگز گرنے سے ہوئی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ وہ ادارے ہیں جو اس کا نظم نسبق چلاتے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر تھوڑی سی آمدنی کے لئے لوگوں کی جانوں کو خطرہ میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ بلاشبہ سٹی ناظم مصطفیٰ کمال ایک متحرک شخصیت ہیں۔ انھوں نے مہینوں قبل سٹی گورنمنٹ کی زنگ آلودہ مشنری کو ہلایا تھا۔ لیکن بارش کے بعد کی صورتحال کو یہ مشنری پھر بھی بہتر نہ کر سکی۔ مرکزی شاہراہوں سے پانی صاف کرنے کی کاوش قابل تعریف لیکن مزار قائد، گورنر ہاؤ س کی سڑک کے پاس پانی کا پھیلاؤ ایک بد نظمی کا شاہکار ہے۔ پیر کو ٹریفک میں لوگوں کو جو دشواریاں ہوئی۔ اس کی ذمہ داری ٹریفک پولیس کے سر ہے جو ایسے موقع پر عوام کو بے یارومددگار چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہے۔ میٹھادر، کھارادر، لیاری، گلشن حدید، گلستان جوہر، بلدیہ ٹاؤن، لانڈھی، کورنگی سمیت شہر کے کئی نشیبی علاقوں میں بارش کا پانی

بدستور گلیوں میں جمع ہے جس سے لوگوں کو آمدورفت میں سخت پریشانی پیش آرہی ہے۔ کراچی بلدیاتی انتظام کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ شہر کا تینتیس فیصد علاقہ سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ اور ٹاؤنز انتظامیہ کے ماتحت ہے جبکہ باقی ماندہ علاقے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، چھ کنٹونمینٹ بورڈز، سائٹ، کراچی پورٹ ٹرسٹ اورپورٹ قاسم کے زیر انتظام ہے۔ وفاقی حکومت نے متاثرین کی فوری بحالی کے لیے بیس کروڑ روپے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن اس سے کہیں بڑھ کر کراچی کے کسی ایک والی وارث کا تعین ضروری ہے۔ ون کمانڈ کے بغیر آپ کس پر اس شہر کی زمہ داری ڈال سکتے ہیں۔ بجلی، پانی، سڑکیں، بلڈنگ کنٹرول، نکاسی آب، پولیس امن وامان سب کا ذمہ کوئی ایک تو ہونا چاہئے تاکہ اس کا احتساب کیا جاسکے۔ اور وہ پوری طرح اس شہر کو ایک میٹرو پولس بناسکے۔

کراچی کیوں آتش فشاں ہے

بجلی کی قیمت میں غیر معمولی اضافے، مسلسل لوڈ شیڈنگ، پانی کی قلت نے، عوام میں شدید بے چینی اور ایسے احتجاجی رویہ کو جنم دیا ہے۔ جو ملک کو انارکی اور بدترین تشدد کی جانب لے جارہا ہے۔ بدترین اقتصادی بحران میں بجلی کی قیمتوں میں اضافے سے کاروباری سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ عوام بے روزگاری کا شکار ہیں۔ بجلی کے بلوں نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ اس پر کوئی وزیر یہ کہے بجلی کے بحران کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں میں کوئی بھی بجلی کا بل ادا نہیں کرتا۔ تو یہ ایک ایسا پیٹرول بم ہے۔ جو آئندہ ایسے دھماکے کرے گا کہ لوگ خود کش حملوں کو بھول جائیں گے۔ وزیر موصوف نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ملک کو سردیوں میں گیس کی کمی کا بھی سامنا ہوگا اور گیس کی بھی لوڈ شیڈنگ کی جائے گی، انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ سندھ میں 42 فیصد بجلی چوری ہوتی ہے۔ عوام کے غیض وغضب کا ایک ہلکا سا مظاہرہ تو گزشتہ روز نظر آگیا۔ جب پنجاب کے دارالحکومت لاہور سمیت صوبے کے قصبوں، شہروں اور دیہاتوں میں بدترین لوڈ شیڈنگ کے خلاف تاجر تنظیموں کی کال پر شٹر ڈاؤن ہڑتال، پر تشدد مظاہرے، واپڈا، لیسکو، فیسکو کے دفاتر سمیت کئی سرکاری دفاتر اور پولیس موبائلوں پر حملے، اور مشتعل افراد کی جانب سے ساندل ایکسپریس کی 4 بوگیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ پنجاب کے

متعدد شہروں میں پرتشدد واقعات رونما ہوئے۔

جھنگ شہر میں روزانہ 18 گھنٹے سے 20 گھنٹوں کی لوڈشیڈنگ سے پریشان عوام سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے سرگودھا سے ملتان جانے والی ٹرینوں کو روک کر مسافروں کو اتار لیا اور ساندل ایکسپریس کی 3 بوگیوں کو نذر آتش کر دیا۔ شہری ٹرین کی چھتوں پر چڑھ گئے اور حکومت کے خلاف شدید نعرے بازی کی گئی۔ اس سے قبل صبح سویرے واپڈا ہاؤس کو بھی آگ لگا دی گئی مظاہرین نے پولیس کی بھی 2 گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا۔ لاہور روڈ پر واپڈا فیسکو آفس پر دھاوا بول دیا۔ وہاں موجود اہلکاروں کو تشدد کا نشانہ بنایا اور ریکارڈ پھاڑ کر اسے آگ لگا دی۔ یہ حالات ملک کے سب سے بڑے صوبے کے ہیں۔ جہاں روٹی دو روپے کی ملتی ہے، آٹا کراچی کے مقابلے میں آدھی قیمت پر دستیاب ہے۔ پانی اور ٹرانسپورٹ کے مسائل کراچی کی نسبتاً کم ہیں۔ صوبائی حکومت عوام کی امنگوں کی ترجمان کہی جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں حیدرآباد پریس کلب میں دعوت چائے کے موقع پر چیف ایگزیکٹیو آفیسر حیسکو حبیب اللہ خلجی نے عوام کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ بجلی پر سبسڈی ختم کی گئی تو نرخ فی یونٹ 12 روپے تک پہنچ جائیں گے۔ اس وقت مجموعی طور پر بجلی کی قیمت 5 روپے 71 پیسے فی یونٹ ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت دیہی علاقوں میں 8 اور شہری علاقوں میں 6 گھنٹے لوڈشیڈنگ کی جا رہی ہے۔ جبکہ دیہاتوں میں میٹر ریڈنگ بھی نہیں ہو رہی

ہے انہوں نے کہا کہ اس وقت حیسکو کے مختلف اداروں پر 15 ارب روپے کے بقایا جات ہیں۔

بجلی بحران کے پیش نظر اور بقایا جات کی وصولی کے لیے پاکستان الیکٹرک سپلائی کمپنی نے حال ہی میں ملک بھر میں ایک ہی جگہ پر بجلی کے دو یا اس سے زائد کنکشن لگانے پر فوری طور پر پابندی عائد کردی ہے۔ واپڈا کے ذرائع نے بتایا ہے کہ بجلی کے 2 کنکشنز کے موجودگی کے سبب بجلی چوری میں نہ صرف اضافہ ہوا ہے بلکہ ایسے کنکشن کے حامل صارفین سے واجب الادا رقم کے حصول میں بھی دشواریوں کا سامنا ہے۔ پچھلے دنوں کے سخت موسم میں پانی و بجلی کے وفاقی وزیر راجا پرویز اشرف نے کراچی میں کئی خوبصورت باتیں کی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ (۱) کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی نے معاملات درست نہ کیے تو حکومت کو انتہائی اقدام اٹھاتے ہوئے انتظامی امور واپس لینے پڑیں گے۔ (۲) آئی ایم ایف کی شرائط کے مطابق جولائی سے بجلی پر ایک روپے کی بھی سبسڈی نہیں دی جا سکتی جس کے باعث بجلی کے نرخوں میں 35 فیصد تک اضافہ کرنا ہوگا جس میں سے فوری طور پر 15 فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے۔۔ (۳) بجلی کی کمی کو پورا کرنے کیلئے 4 ارب ڈالر کی ضرورت ہے (۴) پیپکو کے واجبات میں اضافے کی بڑی وجہ بجلی کی چوری ہے، (۵) قائمہ کمیٹی اور سیاسی قیادت کنڈا سسٹم کے خاتمے کیلئے ہماری مدد کریں (۶) کراچی کے دوستوں کو بجلی کی قیمت میں اضافے

کی خبر دی تو انہوں نے کہا کہ آپ قیمت بڑھا دیں ہم کنڈوں کی تعداد بڑھا دیں گے۔
اس موقع پر ایم ڈی پیپکو طاہر بشارت چیمہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ کچے کے علاقے میں ایک ہزار غیر قانونی ٹیوب ویلز چل رہے تھے جن کے خلاف آپریشن کرتے ہوئے 30 ٹرانسفارمرز اتار کر ملوث افراد کے خلاف ایف آئی آرز درج کرادی گئی ہیں۔
ایم ڈی پیپکو نے مزید بتایا تھا کہ 31 مارچ 2009ء تک پیپکو کی کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی سے قابل وصول رقم 80.1 ارب، فاٹا 81.8 ارب، حکومت سندھ 14.7 ارب، آزاد کشمیر 1.8 ارب، بلوچستان میں ٹیوب ویلز کیلئے مرکزی حکومت اور بلوچستان حکومت سے 4.7 ارب جبکہ نجی شعبہ سے 73.4 ارب روپے ہے۔ دوسری جانب پیپکو کے ذمہ آئی پی پیز کی 70.5 ارب روپے، گیس سپلائرز 14.1 ارب، آئل کمپنیوں کے 7.3 ارب، واپڈا 39.2ارب اور دیگر کی 5.8 ارب روپے کی رقم واجب الادا ہے۔ بجلی کی کی صورتحال کو بہتر کرنے کے لئے حکومت نے بنکوں سے 5.8 ارب روپے کے قرضے حاصل کیے اور 2009-10ء کیلئے 92.2 ارب روپے کے ٹرم فنانس سرٹیفکیٹس کا اجراء کیا گیا۔ بجلی چوری میں غریب لوگوں کے مقابلے میں امیر اور بااثر لوگوں کا کتنا حصہ ہے۔ اس کا اندازہ معاصر اخبار کی اس خبر سے ہوجاتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقوں میں بااثر لوگوں کے گھروں میں کیسے دھڑلے سے بجلی چوری ہورہی ہے۔ اور کوئی مائی کا

لال ان کے کنکشن کاٹنے کی جرات نہیں کرتا۔ ان علاقوں میں کے ای ایس سی کو صرف بجلی کی فراہمی کی مد میں 72 کروڑ روپے ماہانہ نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ کے ای ایس سی ذرائع کے مطابق ان علاقوں میں بجلی چوری میں کے ای ایس سی کے 16 سینٹرز کے منیجرز اور دیگر افسران براہ راست ملوث ہیں جو اپنے سینٹرز کی حدود میں ماہانہ 20 سے 25 لاکھ روپے رشوت وصول کر رہے ہیں۔ کے ای ایس سی کے اعداد و شمار کے مطابق ڈیفنس اور کلفٹن میں ایک ہزار مربع گز کے بنگلہ میں 3 ہزار سے 10 ہزار کلو واٹ بجلی فراہم کی جاتی ہے جبکہ ماہانہ اوسط بل 4 ہزار ہونا چاہیے تاہم کے ای ایس سی کو ماہانہ اوسط 4 ہزار روپے فی گھر کے حساب سے 80 کروڑ روپے وصول ہونے کے بجائے 4 سو روپے فی گھر کے حساب سے صرف 8 کروڑ روپے مل رہے ہیں۔ ان دونوں علاقوں میں بجلی چوری ہونے کی وجہ سے کے ای ایس سی کو سالانہ 8 ارب 64 کروڑ روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ رپورٹر نے ان صارفین کے میٹر نمبر بھی دئے ہیں جو ان سہولیات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور دیگر لاکھوں صارفین کا بھی یہی معاملہ ہے۔ کے ای ایس سی کی سابق اور موجودہ انتظامیہ ڈیفنس، کلفٹن اور شہر کے دیگر علاقوں میں ماہانہ کروڑوں روپے کی بجلی چوری کے بارے میں آگاہی کے باوجود ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر رہی ہے اور اس اہم مسئلے پر پر اسرار خاموشی اختیار کر لی۔ کے ای ایس سی کی شیئرز ہولڈرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری چوہدری مظہر نے بتایا کہ انتظامیہ بجلی چوری کی روک تھام میں سنجیدہ نہیں ہے اور اس اہم معاملے پر

خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ یہ ہے بجلی کی چوری کی صورتحال، اس معاملے میں نہ حکومت سنجیدہ ہے نہ کے ای ایس سی، نواز شریف کے زمانے میں جن لوگوں کو لا کر واجبات وصول کرنے کے لئے بٹھایا گیا تھا۔ اس وقت لائن لاسسز ۴۲ فیصد تھے۔ ان کے جانے کے وقت یہ لائن لاسسز ۴۰ فیصد ہوگئے۔ انہوں نے واجبات کی وصولی پر کمیشن بھی حاصل کئے۔ کے ای ایس سی کس کی ملکیت ہے یہ بھی ایک سوال ہے۔ کون ہے جو پردے میں چھپا بیٹھا ہے۔ کون ہے جو صرف ریکوری پر نظر گاڑھے بیٹھا ہے۔ کے ای ایس سی کی زمینوں، عمارتوں، پر دانت گاڑھے ہوئے۔ ۸۱ ماہ سے کوئی نیا منصوبہ شروع نہیں کیا گیا۔ بجلی کی صورتحال بہتر کیسے ہوگی۔ اب بھی وقت ہے کراچی کے عوام کو سہولت دی جائے۔ نئے منصوبے جنگی بنیادوں پر شروع کیئے جائیں۔ سستی بجلی دی جائے۔ آئی ایم ایف کے چنگل سے نکلا جائے۔ ورنہ کراچی یونہی آتش فشاں بنا رہے گا

کراچی میں بجلی کا بحران 2015ء کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا

جب صوبے کا وزیراعلیٰ اس بے بسی کا اظہار کرے کہ کے ایس سی حکام ہمارے فون تک نہیں اٹھاتے تو عام آدمی کیا کرے گا۔ اب تک تو بجلی کی وجہ سے پانی کا مسئلہ تھا۔ اب آٹے کا بھی بحران آنے والا ہے۔ فلور ملیں بھی آج کل بجلی سے چلتی ہیں۔ اگر انہیں بجلی پوری نہ ملی تو وہ پروڈکشن کہاں سے کریں گے۔ اب تو متحدہ قومی موومنٹ کے اراکین اسمبلی، سینٹرز ناظمین نے جو اسمبلیوں یا سینٹ میں اس بارے میں احتجاج کر سکتے تھے انہوں نے بھی عوام کے ساتھ سڑکوں پر احتجاج کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس بار بجلی کی ستائی ہوئی عوام اس قدر غضبناک ہے کہ بہت سے لیڈروں اور جماعتوں کی لیڈری خطرے میں ہے۔۸۱ جون کو جب کراچی اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ تو وزیر اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ نے اسمبلی کے فلور پر کہا تھا کہ اگر کے ای ایس سی انتظامیہ نے صدر آصف علی زرداری سے کئے ہوئے وعدے کو پورا نہ کیا تو کے ای ایس سی کو حکومت کی تحویل میں لے لیا جائے گا، بجلی کا بحران سابقہ حکومت کا پیدا کردہ ہے لیکن ہم اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے عوام کو ریلیف پہنچائیں گے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بجلی کے بحران کو دور کرنے کیلئے سنجیدہ ہے اسی لئے وفاقی وزیر پانی و بجلی سمیت صدر آصف علی زرداری نے اس مسئلے کے حل کیلئے خصوصی طور پر کراچی کا دورہ کیا اور کے ای ایس سی

انتظامیہ کو ایک ماہ میں بحران ختم کرنے کیلئے اقدامات کرنے کی مہلت دی ہے، ابھی صرف دو ہفتے ہی گزرے ہیں، اگر کے ای ایس سی انتظامیہ نے وعدہ خلافی کی تو حکومت فیصلہ کرچکی ہے کہ کے ای ایس سی کو اپنی تحویل میں لے لے پھر چاہے حکومت کو نفع ہو یا نقصان۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ 10 برسوں میں بجلی پیدا کرنے کا ایک بھی پلانٹ نہیں لگایا گیا جس کا خمیازہ آج پوری عوام بجلی کے بحران کی صورت میں بھگت رہی ہے، بے نظیر بھٹو شہید نے اپنے دور حکومت میں 8000 میگاواٹ بجلی کا کے ٹی بندر پروجیکٹ شروع کیا جس کو بعد میں آنے والی نواز شریف حکومت کے وفاقی وزیر پانی و بجلی چوہدری نثار علی نے بجلی کی ضرورت نہ ہونے کا دعویٰ کرکے بند کرادیا تھا اگر آج کے ٹی بندر پروجیکٹ مکمل ہوجاتا تو ملک میں بجلی کا بحران پیدا نہیں ہوتا۔ بجلی کا یہ بحران ایک کوئی ایک دن پیدا نہیں ہوا ہے۔ کے ای ایس سی ایک ہاتھی ہے۔ جو مر کر بھی سوا لاکھ کا ہے۔ ۲۰۰۵ میں کے ای ایس سی کو جن وعدوں پر نجی شعبے کے حوالے کیا تھا۔ کیا وہ پورے ہوئے۔ جو حلقے کل تک اس ادارے کو نجی شعبے میں دینے کے حامی تھے۔ وہ آج کیوں فیس سیونگ کے لئے سڑکوں پر احتجاج کر رہے ہیں۔ کراچی میں بدترین لوڈ شیڈنگ ۲۰۰۶ سے شروع ہوئی تھی۔ اس دوران لوگوں کے احتجاج کا رخ مشرف ہٹاؤ تحریک کی طرف موڑ دیا گیا۔ ۲۰۰۷ میں زلزلے کے جھٹکے بجلی نہ ہونے کی بنا پر ریکارڈ نہ ہوسکے۔ شہر کی مصروف آئی آئی چندریگر روڈ پر مبینہ طور پر زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے اور جب محکمہ موسمیات سے

رجوع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دفتر میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے جھٹکوں کو ریکارڈ نہیں کیا گیا۔

محکمے کے عہدے دار نے کہا کہ، انہیں نہیں معلوم کہ زلزلہ آیا بھی تھا کہ نہیں؟۔ ۲۰۰۷ میں بھی شہر میں اوسطاً چھ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی تھی۔ جب کہ نظام میں خرابی کے باعث یہ دورانیہ اکثر زیادہ ہوتا ہے۔

سخت گرمی اور لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے شہری راتیں جاگ کر گزارتے تھے۔ اور اکثر مختلف علاقوں میں ہنگامے ہوتے تھے۔ صورت حال کی سنگینی کا نوٹس لیتے ہوئے سپریم کورٹ کی کراچی رجسٹری نے 'کے اِی ایس سِی' کے عملے کو طلب کرکے حالات 20 دِن میں بہتر بنانے کی ہدایت کی تھی۔ روشنیوں کا شہر کہلانے والے کراچی کی سڑکیں اور آبادیاں اندھیروں میں ڈوبی رہتی ہیں۔ اکثر ہسپتالوں میں آپریشنوں کا ملتوی کر دینا معمول بن گیا تھا۔ جون ۲۰۰۹ کراچی میں بجلی کا بدترین بحران جاری رہا، شام سات بجے کراچی کو بجلی سپلائی کرنے والی جامشورو، حبکو اور دادو ٹرانسمیشن لائن ٹرپ ہونے کی وجہ سے بن قاسم پاور پلانٹ، کورنگی تھرمل پاور پلانٹ، کورنگی اور سائٹ گیس ٹربائن بند ہوگئے جبکہ کے ای ایس سی کا نظام درہم برہم ہونے سے کراچی اٹیمی بجلی گھر اور ٹپال، گل احمد سمیت تمام نجی پاور پلانٹس بھی اپنی سپلائی جاری نہ رکھ سکے اس

طرح سارا شہر بجلی سے محروم ہوگیا۔ بن قاسم پاور پلانٹ کے دو یونٹ بند ہونے سے بجلی کا شارٹ فال چھ سو پندرہ میگا واٹ تک پہنچ گیا۔ اس وقت شہر میں بجلی کی طلب چھ سو پچاسی میگا واٹ اور پیداوار سترہ سو اٹھہتر میگا واٹ تھی۔ دوسری طرف 'کے ای ایس سی' اس بات کا شور مچاتی رہی ہے کہ تقسیم کے نظام پر برداشت سے زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے بریک ڈاؤن ہونا معمول بن گئے ہیں۔ ابھی کراچی میں مزید حالات خراب ہوں گے۔ کیوں کہ ماہرین کا کہنا ہے کہ کراچی میں بجلی کا بحران 2015ء کے بعد بھی ختم نہیں ہوگا۔ ماہرین کے مطابق کے ای ایس سی کی نجی انتظامیہ 2012ء تک کراچی میں بجلی کا بحران ختم کرنے کا دعویٰ کر رہی ہے یہ سراسر غلط ہے۔ اس وقت تک بجلی کی طلب میں 20 فیصد سالانہ اضافہ کی شرح سے 60 فیصد اضافہ ہو جائے گا۔ پیداوار میں مشکل سے 15 فیصد اضافہ ہوگا۔ ماہرین کے مطابق 2012 تک پیداوار میں 500 میگا واٹ سے کم اضافہ ہوگا۔ اس وقت طلب 2400 میگا واٹ ہے جس میں ایک ہزار میگا واٹ کی کمی ہے جو پوری ہونے کی توقع نہیں ہے۔ کے ای ایس سی کے سینئر انجینئرز کی رائے میں بجلی کے بحران سے کراچی کو آئندہ چھ سال تک نجات نہیں ملے گی۔ اس صورتحال میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ طفل تسلیاں ہیں۔ موسم بہتر ہوگا۔ لوگ بجلی اور کے ایس سی کو بھول جائیں گے، اگلے برس پھر یہی ہوگا۔

حسینی لائبریری اور ابن صفی کی یاد میں

مکتی گلی حیدرآباد میں چلتے ہوئے جانے کیوں مجھے حسینی لائبریری کی یاد آ گئی۔ پھر اس جانب میرے قدم اٹھ گئے۔ لیکن اب وہاں حسینی لائبریری کی جگہ کھلونوں کی دکان ہے۔ جو حسینی بھائی کی اولاد چلا رہی ہے۔ حسینی لائبریری حیدرآباد کی مشہور لائبریری تھی۔ لائبریری جس کے کھلنے سے پہلے لوگ آ کر بیٹھ جاتے تھے اور رات گئے تک یہ کھلی رہتی تھی۔ یہاں ہر طرح کی کتابیں تھیں۔ جاسوسی، ادبی، رومانی، ڈائجسٹ، رسالے اور اس زمانے میں پڑھنے والے بھی بہت تھے۔ حیدرآباد کی رونق ان لائبریریوں سے قائم تھی۔ جو گلی گلی میں کھلی ہوئی تھیں، لیکن حسینی بھائی اور ان کی اس لائبریری کی بات ہی اور تھی۔ ہم لائبریری کو کوئی کونہ پکڑ کر کھڑے ہی پوری کتاب پڑھ ڈالتے۔ پھر ایک ساتھ ۵، ۵، کتابیں لے جاتے۔ ہماری صبح ان کتابوں سے ہوتی، جو ہم آنکھیں ملتے ہوئے بلامنہ دھوئے، بستر سے اٹھے پڑھنا شروع کردیتے اور والدہ محترمہ کی جانب سے مدح سرائی کے بعد بادل ناخوستہ طوہا کرہا بستر سے اٹھتے۔ حسینی بھائی کی لائبریری سے حیدرآباد کی کئی نسلوں علم وادب حاصل کیا۔

جاسوسی ناولوں کے شوق ہی نے آگے تعلیم کے شوق کو پروان چڑھایا۔ ان جاسوسی ناولوں میں سب سے بڑا کمال ابن صفی کے ناولوں کا تھا۔ جس کے بارے میں دنیاکے ،معروف ناول نگار اگاتھا کرسٹی نے کہا تھا کہ

اگرچہ میں اردو نہیں جانتی لیکن مجھے برِ صغیر کے جاسوسی ناولوں کے بارے میں معلومات ہیں۔ وہاں صرف ایک ہی اصل ناول نگار تھا، ابنِ صفی: اردو کے جغادری نقادوں کی نظر میں جاسوسی ادب کی جو بھی اہمیت ہو، اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ آج تک اردو کے کم ہی کسی دوسرے ادیب کو پڑھا گیا ہوگا۔ جس قدر ابن صفی کو پڑھا گیا۔ ان کی کتاب آنے سے پہلے پڑھنے والے ایڈوانس کاپی بک کرایا کرتے تھے۔ ہمارے دوست افتخار جمیل جعفری کو یہ سرف حاصل ہے کہ انہوں نے ابن صفی سے نہ صرف ملاقات کی بلکہ انہیں نواب شاہ میں شکار بھی کھیلایا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ابن صفی نے الاعظم اسکوئر میں ایک فلیٹ لے رکھا تھا جہاں وہ خاموشی سے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ ابن صفی کی پیدائش 26 جولائی سنہ 1928ء کو الہ آباد ضلع یو پی کے چھوٹے سے شہر نارا میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ نارا سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر نوح ناروی ان کی والدہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس لیے ابن صفی کا خاندان بھی ادبی تھا۔ انہوں نے آٹھ سال کی عمر میں "طلسمِ ہوش ربا" کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس داستان نے جہاں ان کے ذہن میں تخلیقی اور تخیلاتی عناصر کی بنیاد ڈالی، وہیں اس کتاب کے محاورات اور تراکیب سے بھرپور زبان نے بھی ان کے ذہن کی تشکیل میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اپنے گھر میں انہوں نے اردو کی دیگر کلاسیکی کتابوں کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ایک روز انہیں عذرا اور عذرا کی واپسی جیسی دو کتابیں مل گئیں۔ یہ

رائڈر ہیگرڈ کے ناول "شی" کا ترجمہ تھی۔ ابن صفی نے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ اس طرح کی چیزیں تو وہ بھی لکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد انہوں نے اسرار ناروی کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ جب وہ ساتویں جماعت میں تھے تو انہوں نے ایک افسانہ "ناکام آرزو" کے نام سے لکھا، جو ممبئی کے ہفت روزہ رسالہ "شاہد" میں شائع ہوا، جس کے مدیر عادل رشید تھے۔ ابن صفی نے شاعری بھی کی وہ جگر مراد آبادی کے طرزِ کلام سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنا شعری مجموعہ "بازگشت" کے عنوان سے ترتیب دیا تھا جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

آگرہ یونیورسٹی سے بی اے پاس کرنے کے بعد ابنِ صفی ایک اسکول میں استاد مقرر ہو گئے اور اپنا ذاتی ماہنامہ "نکہت" الہ آباد سے جاری کیا۔ اس کی اشاعت میں انہیں اپنے دوست عباس حسینی کا تعاون حاصل ہوا۔ نکہت کی شکل میں ابن صفی کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور فطری حس مزاح کے اظہار کا موقع ملا۔

انہوں نے نکہت میں ڈیڑھ سو سے زائد طنزیہ مضامین لکھے جن میں کچھ پیروڈیاں بھی تھیں۔ ان میں سے مضامین کا انتخاب کتابی شکل میں شائع ہوا جس کا عنوان ہے ڈپلومٹ مرغا" اسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن صفی میں طنز و مزاح کی بے پناہ" صلاحیتیں تھیں۔ لیکن آگے چل کر ابن صفی کو جاسوسی ناول نگار کی

حیثیت سے شہرتِ جاوداں حاصل ہونے والی تھی اس لیے انہوں نے چند انگریزی جاسوسی ناولوں کا ترجمہ کرنے کے بعد خود ناول لکھنے شروع کیے اور مارچ سنہ 1952ء میں جب ابن صفی کا پہلا ناول " فریدی اور حمید " کے بنیادی کرداروں پر مشتمل " دلیر مجرم " کے نام سے الہ آباد سے شائع ہوا تو پھر انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ فریدی اور حمید " کے کردار پر مشتمل تقریباً 45 ناولوں کی زبردست کامیابی کے بعد سنہ " 1955ء میں انہوں نے عمران کا اچھوتا کردار تخلیق کیا۔ عمران، حمید، کرنل فریدی اور قاسم جیسے کرداروں کو انہوں نے زندہ جاوید بنا دیا۔ جاسوسی ناولوں کی تشکیل کا خیال ان کے ذہن میں یوں آیا کہ اس زمانے میں گھٹیا قسم کے رومانی اور جنسی ناولوں کا بازار میں سیلاب سا آگیا تھا اور اس زمانے کی نوجوان نسل تباہ ہو رہی تھی۔ اس وقت ابن صفی نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے جاسوسی ناول لکھنے شروع کیے کہ وہ نوجوان نسل کو فحش ادب کی طرف جانے سے روک دیں گے۔ انہوں نے جاسوسی دنیا میں ناول لکھنے شروع کیے تو اس نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ سنہ 1952ء میں ابن صفی پاکستان چلے گئے۔ یہاں انہوں نے "عمران سیریز" اور جاسوسی دنیا کے علاوہ ہر ماہ ایک ناول شائع کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ وقت آگیا کہ وہ اردو کے چند سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیبوں میں شامل ہو گئے لوگ ان کے ناولوں کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ 1960ء میں ابن صفی شدید طور پر علیل ہو گئے اور تین برسوں تک وہ کچھ

نہ لکھ سکے۔ صحت یابی کے بعد ان کا پہلا ناول "ڈیڑھ متوالے" شائع ہوا اور اس کی اتنی زبردست پذیرائی ہوئی کہ پندرہ ہی دنوں کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ ابن صفی کے ناول جب ہندی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے تو اس زبان میں بھی انہیں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی پھر ان کے ناول بنگلہ، گجراتی، تامل اور تیلگو میں بھی چھپے اور اس زبان کے بھی قارئین نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اشاعتی دنیا میں شاید سرقہ کی اتنی بدترین مثال دوسری نہیں ملے گی جتنی ابن صفی کے ناولوں کے سلسلہ میں ملتی ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کی مقبولیت دیکھتے ہوئے کچھ اور اصحاب نے اسی طرح کے ملتے جلتے ناموں سے ناول شائع کرنے شروع کر دیئے۔ کسی نے این صفی نام رکھا تو کسی نے اببن صفی اور ان اصحاب کے بھی سینکڑوں ناول شائع ہو گئے یہاں تک کہ کانپور کے ایک دیدہ دلیر پبلشر نے تو ابن صفی کے نام سے ہی ناول شائع کرنا شروع کر دیئے۔ ابن صفی لاکھ تردید کرتے رہے کہ یہ ناول ان کے لکھے ہوئے نہیں ہیں لیکن کون سنتا تھا۔ ابن صفی نے ڈھائی سو سے بھی زائد جاسوسی ناول لکھے اور صرف 52 سال کی عمر میں 26 جولائی 1980ء کو ان کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ اب بھی میں جب کبھی ابن صفی کا ناول ہاتھ میں لیتا ہوں تو پھر میں اپنی لڑکپن کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ جہاں حسینی بھائی پان کھاتے ہوئے اپنی لائیبریری میں بیٹھے ہوئے نظر آتے

یہ المناک حادثے کب تک ہوں گے

میں جب بھی کسی کنٹینرز کے حادثے کی خبر سنتا ہوں تو دہل جاتا ہوں۔ میرے سامنے جواں سال عامر پاریکھ کی تصویر آ جاتی ہے۔ جو سابق ٹاؤن ناظم احمد پاریکھ کا بیٹا تھا۔ اور ایک ایسے ہی حادثے میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وہ اپنے بچوں سے سیل فون پر بات کر رہا تھا۔ جب ایک کنٹینز اس کی گاڑی پر آ گرا۔اور وہ اسی دوران جاں بحق ہوگیا۔ گو اس حادثے کو دو تین برس گزر گئے لیکن احمد پاریکھ جب بھی کسی ایسے حادثے کا سنتے ہیں۔ وہ پھر اسی المناک کیفیت میں ڈوب جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں میں یہ المناک سانحے جسم اور ذہن میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو مہینوں اور سالوں جاری رہتی ہیں۔ احمد پاریکھ ان ہی میں سے ایک ہیں۔ وہ ایسے حادثات کی تفصیل میں جاتے ہیں۔ اور ان قوانین کی پابندی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو ان کنٹینرز کو لانے لیجانے کے لئے ضروری ہیں۔ شہری علاقوں میں ان کی آمد و رفت کے اوقات بھی متعین ہیں۔ جن کی پابندی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ پولیس اہلکار مٹھی گرم ہونے کے ساتھ ہی ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اکثر ایسے ہی حادثے جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ کل آئی سی آئی کے پل پر ہوا۔ ماری پور روڈ پر خاتون ڈاکٹر اور اس کے خاندان کی ہلاکت میں ٹریفک پولیس کے وہ اہلکار برابر کے شریک ہیں جو صرف ذاتی مفاد کے لئے ممنوعہ اوقات میں بھاری ٹریفک جن میں

ٹرالر اور کنٹینر شامل ہیں کو سڑکوں پر چلنے کی اجازت دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عاصمہ آدم خان، ان کے شوہر آدم خان لغاری اور بچے 13 سالہ فراز اور 11 سالہ محمد احمد سمیت یہ سار خاندان چند ہی لمحوں میں کنٹینر گاڑی پر گرنے کے باعث خالق حقیقی سے جاملا۔ ڈاکٹر عاصمہ محکمہ صحت سے منسلک ڈاکٹر تھیں اور ماری پور ڈسپنسری میں نہایت احسن طریقے سے اپنی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ ہمارے شہروں میں بے ہنگم ٹریفک کی وجہ سے حادثات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جہاں ڈرائیونگ کی غلطی سے روزانہ المناک حادثات رونما ہو رہے ہیں۔ کراچی کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف بسوں اور ویگنوں کی تعداد اور روش وہی پرانی ہے۔ کھچ بھری ہوئی بسوں اور ویگنوں میں اگر پاؤں رکھنے کی جگہ بھی مل جائے تو غنیمت جانیے۔ بھری ہوئی اس ٹرانسپورٹ کے باعث مسافروں کو گاڑیوں کی چھت پر بٹھانے کا رواج بھی عام ہے۔ بارش کے موسم میں خصوصاً بجلی کے تار ایسے مسافروں کے لیے انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔ چھت پر چڑھے ہوئے مسافر نجانے کیوں ٹریفک پولیس والوں کو دکھائی نہیں دیتے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر مختلف روٹس کی بسیں اور ویگنیں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے یہ بھی ٹرانسپورٹ مافیا سے مل کر پولیس کی آمدنی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ کراچی سٹی پولیس چیف کے مطابق ہر ماہ تین سو سے زائد افراد سڑکوں پر حادثات میں ہلاک ہوجاتے ہیں جن میں اکثریت بچوں اور بوڑھوں

کی ہوتی ہے اور جو سڑک عبور کرتے ہوئے گاڑیوں کی زد میں آ جاتے ہیں۔ اٹھارہ فیصد حادثات منی بسوں کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق سڑکوں پر راہ گیروں کو پیش آنے والے 56 فیصد حادثات میں 26 فیصد حادثات اسکولوں کے طلبہ وطالبات کو پیش آتے ہیں جبکہ شہر کی سڑکوں پر سالانہ 580 تا600 ٹریفک حادثات ہوتے ہیں۔ لاکھوں لوگ اس شہر میں بلا لائسنس گاڑیاں چلا رہے ہیں۔ اس وقت شہر میں ۲۰ لاکھ موٹر سائیکلیں اور پندرہ ہزار سے زیادہ منی بسیں کوچیں ہیں۔ ناخواندہ ڈرائیور تیز رفتاری سے کوچ چلاتے ہیں بدتمیزی سے پیش آتے ہیں اور آئے دن حادثات کرتے ہیں۔ لیکن کوئی انہیں لگام دینے والا نہیں ہے۔ پچاس اور سو روپے میں ٹریفک قانون بکتا ہے۔ کسی کو سزا نہیں ہوتی۔ کیونکہ زیادہ تر ٹرانسپورٹ مافیا میں پولیس اور اعلیٰ حکام شامل ہیں،۔ منی بس کے ڈرائیور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ چکر لگانے کی کوشش میں حادثات کرتے ہیں۔ کراچی ٹرانسپورٹ اتحاد کے رہنما ارشاد بخاری کا کہنا ہے کہ جس ملک میں قانون کی حکمرانی نہ ہو وہاں لوگ بے پرواہ ہوتے ہیں۔ ڈرائیور کو جب سزا کے خوف ہوگا تو وہ محتاط طریقے سے گاڑی چلائے گا، یہاں سزا کی بجائے جرمانہ کیا جاتا ہے اور یہ جرمانہ بھی مالک ادا کرتا ہے۔ کراچی کے شہریوں کو ان بڑھتے ہوئے حادثات پر سوچنا چاہیے۔ حکام بھی اس بارے میں غور وفکر کریں۔ قانون کو عملداری کو یقینی بنائیں۔

ورنہ یہ حادثہ تو کسی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔

کیا مستقبل میں سابق صدر مشرف کا کوئی سیاسی کردار ہوگا؟

سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کا طرہ امتیاز یہی ہے کہ وہ جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں۔ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ پاکستانی سیاست میں ان کی آمد کے بارے میں ایک عرصے سے چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے ۹ سالہ اقتدار میں دوست اور دشمن خوب پیدا کئے۔ گو ان کے سیاست میں حصہ لینے پر سرکاری ملازمین پر عائد دو سالہ مدت کی آئینی بندش میں ابھی کئی مہینے باقی ہیں، (یہ پابندی اس سال کے اواخر تک ختم ہو رہی ہے)، پرویز مشرف پاکستان کی سیاست کے خدوخال سدھارنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے سیاست میں آنے، دوبارہ سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کا عندیہ بھی دیا۔ اور وہ دوبارہ صدارت کے منصب پر فائز ہونے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بھرپور طور پر زندگی انجوائے کر رہے تھے۔ کہ پاکستانی سیاست کے کانٹوں نے ایک بار پھر انہیں گھسیٹ لیا ہے۔ بات پہلے ان گھر کی بجلی سے شروع ہوئی، بجلی کی عدم فراہمی نے ہر پاکستانی کو اس بارے میں حساس بنا دیا ہے۔ ان کے فارم ہاؤس کو جنہوں نے قوائد کو بالائے طاق رکھ کر بجلی فراہم کی تھی۔ انہوں نے ہی یہ فائیلیں نکال کر میڈیا والوں کو پیش کر دی۔ اقتدار جانے کے بعد پاکستانی سیاست میں یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ کونسی فائل کس وقت کھولنی ہے۔ یہ ان اہلکاروں کو خوب پتہ ہے۔

پرویز مشرف کے گولف کھیلنے، برج کھیلنے، لیکچر دینے کی خبروں کے ساتھ ہی ق لیگ میں ان کی آمد کی خبریں بھی تھیں۔ آنے والے دنوں کی تیاریوں کے لئے یوں بھی نئی صف بندیاں ضروری ہیں۔ لندن کے ذاتی فلیٹ میں اپنے دوستوں سے ملاقات، برج کا کھیل، انٹرویو، کانفرنسوں میں لیکچر ان کے مشاغل اور ایک محب الوطن پاکستانی کے طرح ملکی خدمت کیلئے خود کو وقف کرنے کیلئے تیار پرویز مشرف ابھی ہوم ورک میں مصروف تھے کہ ان کا راستہ روکنے کے اقدام ہونے لگے۔ ابتدائی طور پرپرویز مشرف عملی سیاست سے کنارہ کشی کے بعد ان دنوں اپنے کاروبار پر توجہ دے رہے تھے۔

اس امر کا انکشاف مصری روزنامے "البدیل نے کیا تھا۔ اخبار کے مطابق پرویز مشرف نے برطانیہ کے دورے سے واپسی پر خفیہ طور پر مصر گئے۔ پرویز مشرف نے یہ دورہ مشہور مصری بزنس مین اور ٹیلی کام گروپ "اورسکام" کے مالک نجیب ساویرس کی دعوت پر کیا تھا۔ اس دورے کے دوران سابق پاکستانی صدر نے سخت سیکیورٹی میں قاہرہ کے "فورسیزن" ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ مسلم لیگ ق صدارت کے مسئلے پر مزید تقسیم ہو گئی ہے۔ اور اب کنگز پارٹی میں مشرف کے قدم رکھنے کی جگہ نہیں رہی ہے۔ لیکن سابق صدر مشرف کو اب بھی پیر صاحب پگارا کی آشیر باد حاصل ہے۔ جو ملکی سیاست کی ایک کرشماتی شخصیت ہیں۔ بعید نہیں کہ اس بار

بھی سیاست میں نیا گل کھل جائے۔

سپریم کورٹ نے ۳ نومبر ۲۰۰۷ کی ایمرجنسی اور پی سی او ججوں کی برطرفی کے کیس میں سابق صدر جنرل مشرف کو عدالت میں طلب کرکے اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا ہے اس بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے مشرف کو طلب کرلیا ہے۔ اور مشرف عدالت میں نہیں آئیں گے۔ لیکن سابق صدر نے اپنے انٹرویو میں واشگاف لہجے میں کہا ہے کہ میں واپس ضرور جاؤ ں گا۔ عدالتوں کا سامنا کرنے کو تیار ہوں اور یہ کہ ق لیگ کی قیادت کی پیش کش ہوئی تو قبول کرلوں گا۔

یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ جوں جوں یہ کیس آگے .ڑھے گا سپریم کورٹ دوسرے فریقین کو بھی عدالت میں طلب کرے گی۔ وہ فریق سپریم کورٹ کے فیصلہ کرنے والے جج بھی ہو سکتے ہیں اور جنرل مشرف کے وکیل بھی۔ وہ جنرل مشرف کی حکومت کے وزراء بھی ہو سکتے ہیں اور سابق وزیراعظم شوکت عزیز بھی۔ ایک طبقہ یہ امید بھی کر رہاہے کہ جنرل مشرف سپریم کورٹ میں پیش نہیں ہوں گے بلکہ وہ ملک واپس بھی نہیں آئیں گے۔ بعض حلقے پرویز کو مقام عبرت بنا دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پرویز مشرف کی گردن پتلی ہے۔ اس لئے ان پر مقدمہ چلے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں عبرت ناک سزا دی جائے ۔ ان کی پاکستان میں ساری

جائیداد ضبط کر لی جائے۔ نصاب کی کتابوں میں ان کے غیر قانونی اقدامات کو مخصوص جگہ دی جائے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں ایسے اقدامات اٹھانے والوں اور ان کی حمایت کرنے والوں کے کالے کرتوتوں پر لعنت بھیجتے رہیں۔

لیکن یہ ایک پنڈورا بکس ہے۔ سوال یہ ہے کہ مشرف کے اقدامات میں شریک سیاستدانوں کو ان جرائم سے کیسے مبرا قرار دیا جاسکتا ہے۔ سپریم کورٹ ایوب خان، یحییٰ خان، اور ضیاء الحق ان کی حمایت کرنے والی سیاسی جماعتوں، ان کو راستہ دینے والے عدلیہ کے ارکان کے خلاف بھی کاروائی کرے۔ دنیا میں آمر کی لاشوں کو نکال کر ان پر مقدمے چلائے جارہے ہیں۔ ہمارے یہاں پک اینڈ چوز کی پالیسی کیوں ہے۔ ہماری قومی اسمبلی اور سینٹ کو بھی ایسے قوانین پاس کرنے چاہئیں جن کی رو سے ڈکیٹٹر کی حمایت کرنے والے سیاستدانوں کو نہ صرف ہمیشہ کیلیے نااہل قراد دے دیا جائے بلکہ ان کیلیے اس سے بھی کڑی سزا تجویز کی جائے۔ کیونکہ ایسے ڈکیٹٹروں کو اگر کسی نے سہارا دیا ہے تو وہ ایسے مفاد پرست سیاستدان ہی ہوتے ہیں جو قومی مفاد پر خود غرضی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر چوہدری برادران، مشاہد حسین، وصی ظفر، شیخ رشید، درانی، ظفراللہ جمالی، ڈاکٹر شیر افگن وغیرہ جنرل مشرف کی جھولی میں نہ بیٹھتے تو یہ کھیل آگے نہیں بڑھتا۔ ایک معاصر اخبار نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اس کیس کو آگے بڑھانے سے پہلے سپریم کورٹ کو اپنے چودہ رکنی بنچ پر نظرثانی کرنی چاہیے اور ان

ججوں کو بنچ میں نہیں رکھنا چاہیے جو ایمر جنسی اور ججوں کی برطرفی کے اقدامات سے متاثر ہوئے۔

۲۰۰۷ء کے اختتام تک مشرف پاکستان کی مقبول شخصیت تھے۔ امریکہ ان کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ پاکستان کے سیاست دانوں کا بڑا حلقہ ان کے گرد حلقہ ڈالے ہوئے تھا۔ چیف جسٹس آف پاکستان کی برطرفی کے بعد مختلف واقعات اور فیصلوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس سے جنرل (ر) مشرف کی ساکھ بری طرح گری اور ایوان صدر سے ان کے رخصتی کے دن قریب تر آتے چلے گئے۔ اور اگلے ہی سال اسی ملک کی انتہائی نا پسندیدہ شخصیت بن گئے۔ جولائی میں چیف جسٹس آف پاکستان کی بحالی، سپریم کورٹ کے فیصلے سے خود کو بچانے کے بحیثیت آرمی چیف 3 نومبر کی ایمر جنسی آرمی چیف کے عہدے کا چھوڑنا، بدنام زمانہ این آر او، سیاسی حمایت کیلئے بینظیر کے ساتھ مشکوک ڈیل، سعودی عرب کے دباؤ پر نواز شریف کی وطن واپسی، بینظیر کا قتل، فروری 2008ء کے انتخابات اور کنگز پارٹی ق لیگ کی شکست، آصف زرداری کا مضبوط رہنماء کے طور پر سامنے آنا، سابق آمر کا سیاسی طور پر تنہا ہو جانا، امریکہ کی جانب سے نظریں پھیر لینا، اپنی اتحادی جماعت اور سابق ادارے سے دوری، اور سب سے بڑھ کر لال مسجد میں لاتعداد معصوم بچیوں، نوجوانوں، کا قتل عام، چند ایسے واقعات ہیں جنہوں نے جنرل مشرف کے زوال پر مہر ثبت کی ہے۔ ان میں سیاست دان ہمیشہ ان کے ساتھ

کھڑے نظر آئے ہیں۔ جنرل (ر) مشرف کے 8 سالہ دور اقتدار میں جو نشیب و فراز
اور موڑ آئے ہیں۔ انہوں نے کبھی توقع بھی نہ کی کہ ان کی کیریئر میں ایسا موڑ آئے گا
کہ ان کی کمانڈو حکمت عملی، ٹیکنیک اور سٹریٹجی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

نظام بدلنے کی روایت

ضلعی حکومتوں کے نئے نظام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ تنویر نقوی جو اس نظام کے خالق تھے۔ سوالات کے جواب دے رہے تھے کہ ایک سوال ہوا یہ نظام کب تک قائم رہے گا۔ جنرل صاحب نے فرمایا کہ اب یہ نظام مستقل رہے گا۔ کیوں کہ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بہت بڑی دعوت ہو۔ اور اس کا تمام گند صاف کیا جائے۔ اور پھر سیاست دانوں کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ آ کر پھر سے وہی کچھ کریں۔ ۸ برس بعد پھر وہی ہو رہا ہے۔

حکومت نے بلدیاتی اداروں کے حوالے سے ایک اجلاس میں یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ چاروں صوبوں میں مقامی حکومتوں کے موجودہ نظام کو صوبوں کے ماتحت لایا جائے گا۔ اختیارات کی کشمکش اور موجودہ نظام کو لپیٹنے سے قبل ہی ان معاملات میں تیزی آ گئی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ ناظم کراچی سید مصطفیٰ کمال اور پانچ ٹاؤن ناظمین نے سٹی ناظم کے اختیارات پر قدغن سے متعلق صوبائی حکومت کے دو خطوط کو سندھ ہائیکورٹ میں چیلنج کر دیا۔ صوبائی محکمہ بلدیات، بورڈ آف ریوینیو اور چیف منسٹر کے پرنسپل سیکرٹری کی طرف جاری کئے گئے خطوط میں کہا گیا تھا کہ وزیر اعلیٰ سندھ نے ضلعی ناظمین پر سرکاری املاک فروخت کرنے،

ٹرانسفر یا نیلام کرنے پر پابندی لگا دی ہے۔ درخواست گزاروں کے وکیل نے پٹیشن میں مؤقف اختیار کیا ہے کہ آئین کے آرٹیکل 140 اے کے تحت صوبائی حکومتیں ضلعی حکومتیں قائم کرنے اور ان کو اختیارات کی منتقلی کی پابند ہیں اور وزیراعلیٰ سندھ کے احکامات پر مبنی یہ دو خطوط قانونی تقاضوں کو پورے کئے بغیر اور آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جاری کئے گئے ہیں اس لئے انہیں منسوخ کیا جائے۔

چند دن قبل اسلام آباد میں چاروں صوبوں کے وزراء اور اعلیٰ حکام کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ بلدیاتی نظام کو صوبوں کے ماتحت کیا جائے گا۔ اس بارے بلدیاتی اداروں کے قانون میں ترامیم کی سمری جلد ہی صدر آصف زرداری کو بھجوا دی جائے گی۔ اس سے قبل ناظمین نے صدر کو ایک خط لکھا تھا جس میں بلدیاتی اداروں کو تحلیل نہ کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ جبکہ سپریم کورٹ میں بھی اس بارے میں ایک درخواست جمع کرائی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگست میں بلدیاتی اداروں میں ناظمین کی جگہ ایڈمنسٹریٹرز تعینات کر دیئے جائیں گے۔ حکومت کی دلیل ہے کہ امن وامان کی صورتحال کی وجہ سے فی الحال بلدیاتی انتخابات کروانا ممکن نہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حکمراں جماعتوں کی مقبولیت کا گراف منفی میں جا چکا ہے اور ان کے بقول حکمرانوں کو خدشہ ہے کہ جماعتی بنیادوں پر ہونے والے

انتخابات ان کی مقبولیت کا پول کھول دیں گے۔ بعض اسے افسر شاہی یعنی بیورو کریسی کی سازش کہتے ہیں جن کو بلدیاتی نمائندوں کے اختیارات ہضم نہیں ہو رہے ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی و بلدیاتی سالہ تاریخ میں اب تک سات بلدیاتی الیکشن فوجی حکمرانوں کے دور میں ہوئے سیاسی حکومتوں نے اس حوالے سے ہمیشہ لیت و لعل سے کام لیتی رہی ہیں۔ تمام ایسے آمر حکمرانوں نے سیاستدانوں کے احتساب کا نعرہ لگایا اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے بلدیاتی نظام کا سہارا لیا۔ ایوب خان نے اس مقصد کیلئے بنیادی جمہوری کے تحت بی ڈی الیکشن کرائے۔ ضیاء الحق نے اقتدار میں عوام کی حقیقی شرکت کے لئے مجلس شوریٰ اور میئر سسٹم ایجاد کیا اور پرویز مشرف نے اقتدار کی نچلی سطح تک منتقلی کیلئے ضلعی حکومتوں کی داغ بیل ڈالی۔ پھر ان آمر کے انجام کے ساتھ ہی ان کے بنائے ہوئے نظام بھی اسی انجام سے دوچار ہوئے۔ آمروں نے اپنے لئے تالیاں بجوانے، نعرے لگوانے اور اپنے جلسوں میں زیادہ سے زیادہ لوگ اکٹھا کرنے کے لئے ان اداروں کا سہارا لئے رکھا۔ ایسے ایک جلسے میں اسلام آباد میں پرویز مشرف نے عوام کو مکے دکھا کر عوام کی قوت کا اظہار کیا تھا۔ اب نہ وہ مکے ہیں اور نہ ہی وہ عوام کی طاقت۔ کراچی میں میئر عبدالستار افغانی نے جب عوامی حقوق مانگے، تو ان کی بساط لپیٹ دی گئی۔ فاروق ستار

عرصے تک عدالتوں میں پیش ہوتے رہے۔ نعمت اللہ خان کو شاندار خدمات کے باوجود دوسری مدت نہیں دی گئی۔ اور اب مصطفیٰ کمال ہیں آگے جانے کیا ہو۔ کراچی پر پہلے عوامی دور میں بھی ایڈمنسٹریٹرز بیٹھے رہے۔ اب بھی اسی کی تیاریاں ہیں۔ موجودہ ضلعی نظام میں ممکن ہے کچھ خامیاں ہوں مگر درحقیقت یہ خامیاں عوام کیلئے سود مند، حکمران طبقہ اور منتخب نمائندوں کیلئے نقصان دہ ہیں۔ کراچی، حیدرآباد میں جو ترقیاتی کام اس نظام کے تحت ہوئے وہ ایک مثال ہیں۔ اس وقت بھی یہی مسئلہ درپیش ہے کہ صوبائی حکومت کس طرح اپنے صوبے کے ضلع میں ایک نئی حکومت کا وجود تسلیم کرے، منتخب ارکان کیوں اتنی بھاری مالیت کے ترقیاتی منصوبوں سے دور رہیں۔ یہ بات طے ہے کہ کوئی نظام اپنی حیثیت میں برا نہیں ہوتا۔ اصل خرابی نظام چلانے والوں میں ہوتی ہے نظام چلانے والے دیانت دار مخلص نیک نیت ہوں تو بدترین استحصالی نظام میں رہتے ہوئے بھی ملک و قوم کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ انصاف اور جمہوریت کا تقاضا ہے موجودہ نظام کو برقرار رکھا جائے۔ صرف حکمرانوں کی خواہش اور ارکان اسمبلی کے مطالبہ پر اس نظام کا خاتمہ قوم سے سنگین نوعیت کا مذاق ہوگا، نظام بدلنے کی یہ روایت جاری رہی تو ہم صرف تجربات کرتے رہ جائیں

کشمیر سیکس سکینڈل کشمیریوں کی بے کسی کا رونا ہے

اپوزیشن بڑی ظالم ہوتی ہے۔ وہ اپنے مخالفین کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ اور انہیں اچانک دبوچ لیتی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ایک کٹ پتلی حکومت ہے۔ جس کے وزیراعلیٰ عمر عبداللہ ہیں۔ شیخ عبداللہ کے پوتے۔ شیخ عبداللہ کا خاندان کانگریس کے ساتھ ہے۔ اور کشمیر میں وہ ہندو نواز کہلاتے ہیں۔ منگل کے روز جموں کشمیر کی صوبائی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے دوران حزب اختلاف نے وزیراعلیٰ عمر عبداللہ پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ دو ہزار چھ کے بدنام زمانہ سیکس سکینڈل میں ملوث ہیں۔ اس الزام کے بعد عمر عبداللہ اس قدر غصے میں آئے کہ اپنے کارکنوں کے روکنے کے باوجود وہ اپنے والد کے ہمراہ گورنر کے پاس پہنچے اور اپنا استعفیٰ سونپ دیا۔ جموں کشمیر قانون ساز اسمبلی میں حزب اختلاف پی ڈی پی کے رکن مظفر حسین بیگ نے اسپیکر کو ملک کے سب سے بڑے تفتیشی ادارہ سی بی آئی کی مرتب کردہ ایک فہرست تھما دی تھی۔ اس فہرست میں جموں کشمیر کے اس بدنام زمانہ سیکس سکینڈل میں ملوث ان ایک سو انتیس ملزموں کے نام شامل تھے۔ جن کی سی بی آئی تفتیش کر رہی ہے۔ مسٹر بیگ، مفتی محمد سعید کی وزارت میں قانون کے وزیر تھے۔ انہوں نے اسپیکر سے کہا کہ، 'اس فہرست میں ملزم نمبر 102 کو دیکھ لیجیے، وہ عمر عبداللہ ولد فاروق عبداللہ ہیں۔' اس کے بعد ایوان میں شور و غل مچ گیا۔ عبداللہ نے نہایت

جذباتی انداز میں اعلان کیا کہ وہ صوبائی گورنر کو اپنا استعفیٰ سونپ دینگے۔ انہوں نے کہا: ' مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ملزم بے گناہ ثابت نہیں ہوتا وہ گناہ گار ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ میرے اوپر ایک کلنک ہے، ایک دھبہ ہے۔' اور عمر عبداللہ استعفی دینے پہنچ گئے۔

عمر عبداللہ پر یہ کلنگ کا ٹیکہ ہو نہ ہو لیکن بھارتی حکومت کے لئے یہ شرمناک باب ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ظلم اور کشمیریوں پر جس طرح عرصہ حیات تنگ کر رہا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ کشمیر میں آئے دن فوجیوں کی جانب سے خواتین کی آبرو ریزی کے واقعات ہوتے ہیں۔ کشمیر سیکس اسکینڈل بھارت کے اس نقاب کو اتار دیتا ہے جو وہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ۲۰۰۶ میں انڈین ایکپریس میں نوجوان کشمیری لڑکیوں کو نوکریوں کا جھانسہ دے کر ان کی برہنہ فلمیں بنانے ور ان کا جنسی استحصال کرنے سے متعلق یہ سنسنی خیز سکینڈل منظر عام پر آیا تھا۔

مئی میں انڈین ایکسپریس نے جموں کشمیر پولیس کے حوالے سے سیکس اسکینڈل کا ۲۰۰۶ انکشاف کیا تھا۔ جس میں بڑے بڑے سیاستدان، پولیس حکام، بااثر افراد، انٹیلیجنس کے حکام شامل تھے۔ پولیس نے ۲ سی ڈی بھی پکڑی تھی۔ جس میں ان سرگرمیوں کا ریکارڈ تھا۔ اس سی ڈی میں ایک ۱۵ سالہ بچی کی ویڈیو بھی تھی۔

جس سے زبردستی زیادتی کی جارہی تھی۔ بعد ازاں اس بچی کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ یہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی۔ جس نے شناختی پریڈ میں کئی ملزمان کو شناخت کرلیا تھا۔ ان میں ٹرانسپورٹ منسٹر حکیم یاسین، ایم ایل اے غلام حسین، یوجیش سہنائے، ڈی جی پی رینک افسر راجندر ٹیکو، سنئیر آئی پی ایس آفیسر اشکور وانی، نیاز محمود، شیخ محمود، جموں کشمیر بنک کے چیئرمین یوسف خان،، براڈوے ہوٹل کے مالک انیل امید شامل تھے۔ اس بچی نے عدالت میں ایک گورے چٹا صاحب کا بھی ذکر کیا تھا۔ جنھوں نے ایک سرکاری ہٹ میں چشمہ شاہی پر ایک بچی کے ساتھ بدکاری کی تھی۔ یہ گورے چٹے صاحب بعد میں پرنسپل سیکریٹری پلاننگ اقبال کنڈے نکلے۔ اس مقدمے کی جموں کشمیر ہائی کورٹ میں سماعت کے دوران ایک اہم گواہ کو ایک عمارت کی تیسری منزل سے گرا کر ہلاک کردیا گیا۔

اس واقعے کی ایک بار پھر یاددہانی نے بھارت کے اصل روپ کو دنیاکے سامنے کردیا ہے کہ وہ نہ صرف ان واقعات کی پشت پناہی کررہا ہے۔ بلکہ انسانی حقوق کو بری طرح پامال کررہا ہے۔ بھارت میں دہشت گردی کے سب سے زیادہ گروپ سرگرم ہیں۔ اقلیتوں پر سکھوں، عیسائی، مسلمانوں، اور دلتوں پر اس کے ظلم پناہ ہیں۔ لوگ گجرات میں ہونے والے فسادات کو ابھی نہیں بھولے ہیں۔ بابری مسجد کا سانحہ بھی پوری دنیا کے سامنے ہے۔ پاکستان پر بھارت مسلسل الزام تراشی کررہاہے۔ پاکستان کی دوستی کی خواہش کو اس کی کمزوری سمجھا جارہا

ہے۔ بلوچستان اور سرحد کے واقعات میں جو غیر پختون طالبان کے لاشے ملے ہیں۔ وہ پاکستان کے معاملات میں بھارتی در اندازی کا ثبوت ہیں۔ ان حالات میں بھارت کو اپنے رویئے پر غور کرنا چاہیئے اور کشمیر میں انسانی خون کی ہولی کھیلنے اور انسانی حقوق کی پامالی سے باز آ جانا چاہیئے۔

عشق کے کھیل میں جاں کا زیاں ہوتا ہے

لاہور میں کالے کوٹ والے چند وکلاء کی جانب سے تشدد کے جو واقعات سامنے آئے ہیں۔ اس نے حکومتی رٹ کا سوال پھر اٹھا دیا ہے۔ کیا اس ملک میں کوئی قانون ہے، کیا اس قانون پر عملداری ہو رہی ہے۔ کیا ظلم، زیادتی، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، گراں فروشی، اغوا، قتل، اور تشدد کے واقعات کی روک تھام کی جا رہی ہے۔ کیا ملک کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والوں کو انصاف کے کٹھرے میں لایا جا رہا ہے۔ کیا کوئی ظالم کا ہاتھ پکڑنے والا ہے۔ کیا کوئی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب یہاں سزا پاتا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں عوام رات دن، اسکرین پر ان واقعات کی فوٹیج دیکھتے ہیں۔ اخبارات میں تصویر اور خبریں دیکھتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے بلاگ پر دستاویزی ثبوت دیکھتے ہیں اور یو ٹیوب پر وہ فحش مکالمات سنتے ہیں۔ جن میں کہا جاتا ہے۔ تم نے لائیو پروگرام کے دوران سوال پوچھا تھا نا۔ اب میں تم کو اس کا جواب دیتا ہوں۔ اور طبقہ اشرافیہ کے یہی لوگ اقتدار کے ایوانوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ کیا مقدمات دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے چلائے جا رہے ہیں۔ چونکہ اس وقت آمر کرسی اقتدار پر فائز تھا۔ اس لئے اس کا کچھ نہ بگاڑا جاسکا۔ اور آج وہ اقتدار میں نہ ہوتے ہوئے بھی اتنا بااثر ہے۔ کہ عدالت کے کٹھرے میں کھڑا ہونا تو دور کی بات۔۔۔۔اس کے چیلوں کو بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ جسٹس خواجہ محمد شریف نے صحافیوں اور پولیس پر وکلاء کی جانب سے تشدد کا از خود نوٹس لے لیا ہے۔ انھوں نے ایک ڈویژن بنچ بھی بنا دیا ہے۔ جو پیر کو از خود نوٹس کی سماعت کرے گا۔ اس سلسلے میں ایس پی آپریشن اور لاہور بار کے صدر کو پیر کو طلب کر لیا گیا ہے۔ پولیس نے سیشن کورٹ کے باہر ایک مقامی نجی چینل کے کیمرہ مین پر تشدد کرنے والے وکلا کے خلاف تھانہ اسلام پورہ میں ایف آئی آر بھی درج کر لی گئی ہے۔ لیکن کیا واقعی انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے اور ملزمان کو جلد از جلد گرفتار کر کے قانون کے کٹھرے میں لا کر کھڑا کیا جائے گا۔ یہ خوش فہمیاں ہیں۔ اگر اس ملک میں قانون کی حکمرانی ہوتی تو کسی کو چیف جسٹس آف پاکستان کو بالوں سے پکڑنے کی جرات نہ ہوتی، آئین اور قانون کے ساتھ یوں مذاق نہ کیا جاتا، صحافیوں، وکلاء سول سوسائٹی پر کیمروں کے سامنے وحشیانہ انداز میں سادہ لباس والے ڈنڈے نہ برساتے، ۱۲ مئی کو کراچی میں خون کی ہولی نہ کھیلی جاتی، وکلاء کو زندہ نہ جلایا جاتا۔ چینلوں پر حملے نہ ہوتے، عوام کی محبوب رہنما شاہراہ عام پر یوں قتل نہ کر دی جاتی، جو راہ میں رکاوٹ ہوا سے اسے آگ اور بارود سے نہ اڑایا جاتا۔
پاکستان میں گزشتہ برسوں میں کئی صحافی اور اخبار نویس قتل، گرفتار، تشدد

سے شدید زخمی اور ہراساں کئے گئے ہیں۔ ان واقعات کا تسلسل جاری ہے۔ صحافت اب آسان پروفیشن نہیں ہے۔ یہ خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر کیمرے والے صحافی، اور فوٹو گرافران کی جانیں تو عذاب میں ہوتی ہیں۔ صحافیوں کے قتل، گرفتاریوں، تشدد اور ہراساں کرنے، آزادی اظہار پر پابندیوں کے خلاف سپریم کورٹ میں تشکیل ترابی کی پٹیشن موجود ہے۔ صرف مئی 2006ء سے مئی 2007 کے دوران ایک سال میں پانچ صحافی قتل ہوئے 17 گرفتار، 61 زخمی اور 27 کو ہراساں کیا گیا واقعات میں میڈیا کی جائیداد کو نقصان پہنچایا گیا۔ میڈیا کوریج پر پابندیوں کے 11 واقعات سامنے آئے۔ ۸۰۰۲ اور ۹۰۰۲ میں بھی ان واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ 16 یہ صحافیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی بات مانتے ہوئے دیانت داری سے اپنا پیشہ وارانہ فرائض نبھائیں۔ انہیں ہر حال میں سچ کی رپورٹنگ کرنی چاہیے۔ مختلف ذرائع ابلاغ اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کے مشترکہ بنیادی اصولوں پر مبنی کتاب صحافت کے عناصر" میں مصنفین بِل کو واچ اور ٹام روسینسٹیل لکھتے ہیں کہ حقائق " کے بارے میں معلومات اکٹھی اور ان کی تصدیق کرنے کے بعد " صحافی کو ان کے " مطالب کی ایماندارانہ اور قابلِ اعتماد تصویر پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

صحافیوں کو کسی تنازعہ میں شامل تمام فریقین کی صحیح عکاسی کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ رپورٹنگ کے دوران تمام متعلقہ ماخذات کا احاطہ کرنا ہی وہ طرزِ فکر ہے جو صحافی کی ساکھ کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ بااعتماد رپورٹنگ کرکے صحافی ایمانداری کے ساتھ کسی واقعہ کے بارے میں قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور عمداً واقعے کا ہو بہو نقشہ کھینچتا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کہ کسی واقعے کی رپورٹنگ کرتے ہوئے اس سے لاتعلق رہا اور اس کا اثر نہ لیا جائے۔ صحافی اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ تاہم اپنے کام سے مکمل انصاف کرنے کے لئے انہیں خود پر قابو رکھنا پڑتا ہے۔

اس کام میں جاں کازیاں ہونے کا ہر آن کھٹکا لگا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی پاکستان کے میڈیا نے جس بہادری اور جی داری کے ساتھ آزادی صحافی کی جنگ لڑی ہے۔ سول سوسائٹی میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ وہ قابل تعریف ہے۔ وکلاء کو بھی ان کالی بھیڑوں کی سرکوبی کرنا چاہیے۔ جو ان کی بدنامی کا باعث ہو رہی ہیں۔ یہ سازش بھی ہو سکتی ہے۔ شیر افگن کو نمونہ عبرت بنانے والے بھی تو نادیدہ ہاتھ تھے۔ جو کالے کوٹوں میں ملبوس تھے۔ جب کسی صحافی پر تشدد اور ظلم ہوتا ہے۔ تو معاشرے میں مایوسی پھیلتی ہے۔ صحافیوں پر تشدد اور مظالم کے باعث عام آدمی کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد عام آدمی کے حقوق کے

لئے کوئی نہیں کھڑا ہوتا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ صحافیوں کے خلاف ہونے والے مظالم کا از خود نوٹس لے اور صحافیوں کو تحفظ اور عمدہ ماحول فراہم کیا جائے تاکہ وہ اپنے فرائض آزادانہ ماحول میں ادا کر سکیں۔ مستقبل کا صحافتی کردار اسی وقت متعین ہوگا۔ جب قانون کی حکمرانی ہو اور صحافیوں کو اپنے فرائض ادا کرنے کی آزادی ہو۔

نواز۔۔۔۔۔۔ساڈاشیر ہے

نواز۔۔۔۔۔۔ ساڈا شیر ہے۔ باقی ہیر پھیر ہے۔ الیکشن کے دنوں میں جب یہ نعرہ لگتا تھا۔ تو میاں برادران کے سینے خوشی سے پھول جاتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ نواز گروپ نے شیر کا انتخابی نشان پسند کیا تھا۔ شیر کے نشان نے کام دکھا دیا اور میاں نواز شریف کی پارٹی کامیاب ہو گئی۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس لئے بادشاہت کا خواب شیر والی پارٹی بھی دیکھنے لگے۔ تو یہ اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ لیکن جب ایٹمی دھماکوں کے بعد جب پارٹی رہنما خود کو واقعی شیر سمجھنے لگے تھے تو اچانک شیر کو مشکل پڑ گئی۔ تخت و تاج تو گیا سو گیا جان کے لالے پڑ گئے۔ ایسے وقت میں بکری تو کیا چوہا بننا پڑے تو وہ بھی قابل قبول ہوتا ہے۔ سو جان ہے تو جہاں ہے کے مصداق پہلے جان بچانا ضروری ٹھہرا۔ لیکن خوئے سلطانی آسانی سے نہیں جاتی ہے۔ شہزادوں کے شوق بھی شاہانہ ہوتے ہیں۔ شیر سے الفت ہی تھی ۔ جو وزیر اعلیٰ پنجاب کے صاحبزادے نے سائبیریا کے برفزاروں میں پایا جانے والا شیر منگوایا۔

برفزار ماحول میں پرورش پانے والے شیر کو تو وہی ماحول چاہئے۔ لاہور کی گرمی اس شیر کی برداشت سے باہر ہے۔ اس لئے اس شیر کو شریف خاندان کے رائے

وٹڈ فارم پر بجلی سے ٹھنڈا رکھے جانے والے ایک خصوصی احاطے میں رکھا گیا۔ جب پورے ملک میں بجلی کی ہاہاکار مچی ہو تو ایک شیر بچے کے لئے برف والا ماحول پیدا کرنے پر کتنی بجلی خرچ ہوگی۔ یوں بھی شوق دا کوئی مول نہیں ہوتا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ شیر کی درآمد کی خبر میڈیا والوں کے ہاتھ لگ گئی۔ ذرائع ابلاغ میں ایک شور مچ گیا۔ کیونکہ اس نایاب شیر کو ایئر کنڈیشن پنجرے میں رکھا جاتا تھا۔ پاکستان میں اس وقت زبردست گرمی پڑ رہی ہے اور اس گرمی میں ملک بجلی کے بدترین بحران سے گزر رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے میٹر اور ایئر کنڈیشن پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ جب یہ خبر شائع ہوئی کہ اس احاطے کو مقامی طور پر بجلی سے ٹھنڈا رکھا جاتا ہے تو ملکی اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں شدید تنقید شروع ہو گئی۔ بجلی کے اس شدید بحران میں جب شہروں میں دس سے بارہ گھنٹے کی روزانہ لوڈشیڈنگ کی جاتی ہے۔ تو ایک شیر بچے کے لئے یہ عیاشی کیوں۔ اس تنقید کے پیش نظر یہ حکم دیا گیا کہ اس شیر کو فوری طور پر حکام کے حوالے کر دیا جائے۔

جنگلی حیات کے عالمی ادارے ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ کا کہنا ہے کہ شریف خاندان اب اس شیر کو رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ والے کہتے ہیں اس شیر کو صوبے سرحد کی حکومت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں کہ کیوں صوبے سرحد کی حکومت کا انتخاب کیا گیا تاہم ایک وجہ یہ

ہو سکتی ہے کہ سرحد میں موسم پنجاب کی نسبت ٹھنڈا رہتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مادہ شیر ہے۔ اور شریف خاندان اس کے بچے کھلانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے سرحد والوں سے کہا کہ وہ ایک شیر دے دیں۔ تاکہ وہ اس شیرنی کے بچے دیکھ سکیں۔ سرحد والوں کا کہنا ہے کہ بھائی شیرنی ادھر بھیج دو۔ اس لئے یہ شیر وہاں بھیجا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ وزارت ماحولیات نے ایسے جانوروں کی برآمد پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ لیکن یہ پابندیاں تو ہما سا کے لئے ہوتی ہیں۔ ہمارے حکمران بھی عجیب ہیں۔ کسی کو گھوڑے پالنے کا شوق ہے تو کسی کو کتے پالنے کا اور کسی کو شیر پالنے کا۔۔۔۔۔۔ عوام کو پالنے کا کسی کو خیال نہیں۔

کراچی کے لوگوں کی بے بسی اور بے حسی

کراچی کے لوگوں کی بے بسی اور بے حسی کی داد دینی چاہیے۔ بے بسی یہ کہ اس شہر میں کیسے کیسے حادثات ہو رہے ہیں، لیکن شہری بے بسی سے یہ واقعات دیکھتے ہیں۔ غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ٹائر جلاتے ہیں۔ حکمرانوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ یہ جلوس نکالتے ہیں۔ پھر بے بسی سے آنسو بہاتے ہیں اور خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ بے حسی ایسی کے شہر میں حادثہ ہو، فائرنگ ہو، بم پھٹے، عمارت گر جائے، مرنے والے مر جائیں۔ لیکن کراچی اسی طرح شہر نگاراں، مست خراماں، اپنے جلو میں نئے ہنگامے لئے، اپنی چہل پہل میں مگن رہے گا۔ جمعہ کو کراچی کے علاقے میٹھادر میں ایک اور عمارت زمیں بوس ہو گئی۔ اس سانحے میں جان بحق ہونے والے ۴۲ افراد کی لاشیں نکال لی گئی ہیں، جبکہ زخمی ہونے والے 6 افراد اسپتال میں زیر علاج ہیں جس کے بعد امدادی کام ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ شہر کے قدیمی علاقے میٹھادر کی کامل گلی میں گرنے والی عمارت تقریباً 100 مربع فٹ کے پلاٹ پر بنائی گئی تھی جس کی پہلی منزل پر ایک گودام تھا جبکہ باقی 4 منزلوں پر لوگ رہتے تھے۔

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ اس عمارت میں 30 سے زائد افراد رہتے تھے جن میں

سے اکثر میمن برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ گنجان آبادی کے اس علاقے میں اس حادثے کی اطلاع پاتے ہی مقامی لوگ بھی ایمرجنسی لائٹس اور ہتھوڑے لے کر جائے حادثہ پر پہنچ گئے اور ہاتھوں سے ملبہ ہٹانے کی کوشش کی۔ حادثے کے بعد لائٹ چلی گئی تھی۔ سٹی حکومت کی جانب سے ملبہ ہٹانے کے لیے بھاری مشینری بھی بھیجی گئی مگر تنگ گلی ہونے کی وجہ سے یہ جائے حادثہ پر پہنچ نہیں سکی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ریسکیو آپریشن انتہائی سست رفتاری سے کیا گیا ہے اور رضاکار اور شہری حکومت کے اہلکار تاخیر سے جائے حادثہ پر پہنچے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کراچی میں کیا کوئی ایسا ادارہ اور ایسا مرکز ہے۔ جو کسی بھی حادثے کی اطلاع پاتے ہی حرکت میں آجائے اور تمام کام سلیقے سے انجام پائیں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ہم کراچی میں ایک بھی ایسا ہنگامی مرکز نہ بنا پائے جہاں بیک وقت زخمیوں کی بڑی تعداد کو طبّی امداد دی جاسکے۔ نہ ہی ایسے رضا کاروں کی کوئی فورس تیار کی گئی جو ایسے ہنگامی حالات میں تیزی سے حرکت میں آئیں۔ سب سے زیادہ تو یہ کہ وہ ایسی امدادی سرگرمیوں کا تجربہ اور تربیت رکھتے ہوں۔ ہم نے سب کچھ ایدھی اور چھیپا پر چھوڑ رکھا ہے۔ یہ ہی زخمیوں کو لیجائیں گے۔ یہ ہی امدادی کام کریں گے۔ یہ ہی کھانے کا اہتمام کریں گے۔ تو پھر حکومت اور شہری ادارے کہاں ہیں۔ اور ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

کراچی میں مخدوش عمارتیں ایک عرصے سے ہیں۔ لیکن کیا ان عمارتوں کو صرف خالی

کرانے کے نوٹس کا اجراء ہی ہماری ذمہ داری ہے۔ ایسے خاندانوں کی آبادکاری کون کرے گا۔ کیا یہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے رہیں گے۔ جیسے حادثے کے بعد کے بی سی اے کی جانب سے قریب کی 5 عمارتوں کو مخدوش قرار دے کر خالی کرالیا۔ اور اب یہ فٹ پاتھ پر بسیرا کر رہے ہیں۔ کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کی ٹیکنکل کمیٹی برائے خطرناک عمارات نے سال 2008 ء کی سروے رپورٹ میں شہر کی 163 مختلف قدیم اور مخدوش عمارتوں کو خطرناک قرار دیا ہے۔ جبکہ مزید عمارتوں کے معائنے کا سلسلہ جاری ہے۔ رپورٹ کے مطابق فہرست میں سب سے زیادہ خطرناک عمارتیں صدر ٹاؤن میں واقع ہیں جبکہ اس فہرست میں جمشید، لیاری، کیماڑی، ملیر اور شاہ فیصل ٹاؤن کی بھی کئی مخدوش حالت عمارتیں شامل ہیں ان عمارتوں کو فوری خالی کرنے کے لئے اگست میں کہا گیا تھا۔ متبادل انتظامات نہ ہونے کے باعث یہ نہ ہوسکا۔ اور یہ حادثات ہوئے۔ جن کو ذرا سی تدبیر سے روکا جاسکتا تھا۔

کراچی میں 182 پرائمری 69 سیکنڈری اور 30 ایلیمنٹری اسکولوں کی عمارتیں اپنی خستگی کے باعث حادثات کے خطرے سے دوچار ہوسکتی ہیں۔ ان اسکولوں میں ہمارے آپ کے بچے پڑھتے ہیں۔ ایک ایک اسکول میں سینکڑوں بچے ہیں۔ یہ سرکاری اسکول ہیں۔ سرکاری اسکولوں کی زبوں حالی، بنیادی سہولتوں کا فقدان، سفارش کی بنیاد پر نااہل اساتذہ کے تقرری جیسی شکایات عام ہیں۔ بظاہر میٹرک تک

تعلیم مفت کردی گئی ہے مگر عملاً سرکاری اسکولوں کی یہ حالت بنادی گئی کہ وہاں تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں رہا۔ جن سرکاری اسکولوں کا رقبہ بڑا، عمارتیں اچھی اور معیار تعلیم قدرے بہتر ہے انہیں لوگوں کے احتجاج کے باوجود یکے بعد دیگرے نجی ملکیت میں دیا جارہا ہے۔ تو کیا ہم کسی اور بڑے حادثے کا انتظار کر رہے ہیں۔ بارشوں میں ۵۰ سے زائد اموات ہوئیں۔ ان کا ذمہ دار کون ہے۔ کسی کو تو ان ہلاکتوں کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ جولائی میں کراچی میں عمارت گرنے سے ہلاکتوں کا دوسرا واقعہ ہوا ہے۔ لیاقت آباد میں اکیس جولائی کو ایک چار منزلہ زیرِ تعمیر عمارت کے گرنے سے کم از کم گیارہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ یہاں بھی تین دن تک امدادی کام جاری رہا تھا۔ اور ہم صرف لاشیں ہی نکال سکے۔ کراچی میں چند برسوں میں شہری حکومت نے کروڑوں روپے مالیت کی بھاری مشینری خریدی تو کیا یہ صرف نمائشی تھی۔ کراچی کی ۷۰ فیصد آبادی گنجان علاقوں میں رہتی ہے۔ تو کیا ان ۷۰ فیصد عوام پر مصیبت پڑنے پر کام آنے والی مشینری ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس بے بسی کا مظاہرہ ہم کھارادر اور لیاقت آباد کی گلیوں میں دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں سڑکیں دھونے والی ان مشینوں کی ضرورت تو نہ تھی۔ جو ایک دو تصویری سیشن کے بعد ناپید ہو گئی ہیں۔ ہمیں ان مسائل پر سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ یہ ہماری بے بسی اور بے کسی کا مداوا کر سکتا ہے۔ گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد اور وزیراعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ ایسے حادثات پر فوری حرکت کرتے ہیں۔ انہوں نے عمارت گرنے کا

نوٹس لیتے ہوئے تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔ لیکن عوام چاہتے ہیں کہ اب نوٹس لینے اور تحقیقات سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام کیا جائے۔ ورنہ یہ حادثے یوں ہی ہمارا مقدر بنے رہیں گے۔

رمضان المبارک سے قبل بڑھتی ہوئی مہنگائی، اور غربت

سپریم کورٹ آف پاکستان نے سابق پرویز مشرف کی جانب سے تین نومبر 2007 ء کو لگائی جانیوالی ایمرجنسی کو غیر آئینی اور غیر قانونی اقدام قرار اور پی سی او ججوں کو کام سے روک دینے کے بعد سے پاکستانی عوام کی امیدیں عدالت عالیہ کی جانب ایک بار پھر اٹھ رہی ہیں۔ گو عدالت نے واضح کر دیا ہے کہ موجودہ فیصلے سے ملک کے انتظامی اور مالیاتی فیصلے اور صدر کا حلف متاثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود عوام بڑھتی ہوئی مہنگائی، اور غربت کے خاتمے کے لئے بھی عدالت ہی کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں۔ رمضان المبارک کے آنے میں ابھی دو ہفتے باقی ہیں ۔ لیکن بازاروں میں مہنگائی، قیمتوں میں تیزی سے اضافے، اشیاء صرف کی مصنوعی قلّت کی جو صورتحال ہے۔ وہ ناقابل برداشت ہے۔ چینی کی قیمت میں روزانہ اضافہ ہورہا ہے۔ گھی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوچکا اور مزید قیمت بڑھائی جارہی ہے۔ دودھ اور گوشت، سبزیاں اور پھل عوام کی قوت خرید سے باہر ہیں۔ اوگرا نے پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں جس کمی کا اعلان کیا ہے وہ عوام کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ اوگرا کے نوٹیفیکیشن کے مطابق پٹرول کی قیمت 1 روپے 67 پیسے کمی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ قیمتوں میں کمی کا اعلان عالمی مارکیٹ میں پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں گراوٹ کے باعث کیا گیا ہے۔

دوسری جانب اوگرا نے سندھ اور پنجاب میں سی این جی کی قیمت میں 60 پیسے اضافے کے ساتھ قیمت 48 روپے 60 پیسے کر دی ہے جبکہ ملک کے دیگر علاقوں میں سی این جی کی قیمت 27 پیسے کمی کے ساتھ 48.73 فی کلو ہو گئی ہے۔ شائد اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ گاڑی والے حضرات کی اکثریت سی این جی استعمال کرتی ہے اور اس سے بھی متوسط طبقہ متاثر ہوا ہے۔ پیٹرول کی قیمت میں یہ کمی عدالت کی جانب سے کاربن ٹیکس کے خلاف فیصلے کے بعد کی گئی ہے۔ اس سے قبل پیٹرولیم کی قیمتوں کے تعین کے بارے میں جسٹس ریٹائرڈ رانا بھگوان داس کی سربراہی میں بننے والے کمیشن نے اپنی رپوٹ میں کہا تھا کہ عالمی مارکیٹ میں تیل کی قیمت کو غیر ملکی کرنسی کی بجائے پاکستانی روپے کے ساتھ منسلک کیا جائے تاکہ پیٹرولیم کی مصنوعات میں کمی کا فائدہ عوام کو پہنچ سکے۔ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں کا طریقہ کار وضح کرنے کے لیے توانائی اور پیٹرولیم کی فیلڈ کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ کمیشن نے پیٹرولیم مصنوعات پر عائد کیا گیا کاربن ٹیکس کی بھی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ٹیکس عوام پر اضافی بوجھ ہے جس کو نہیں لگنا چاہیے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ کمیٹی مختصر، درمیانی اور طویل مدت کے منصوبے بھی بنائے اس کے علاوہ آئل اینڈ گیس ریگولیٹری اتھارٹی (اوگرا) اور وزارت پیٹرولیم کی استعداد کار میں بھی اضافہ کیا جائے۔

کمیشن نے سنہ 2001 سے سنہ 2009 کے مارچ کے مہینے تک پیٹرولیم مصنوعات پر عائد کیے جانے والے ٹیکسوں کی مد میں عوام سے حاصل کی گئی رقم کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق اس عرصے کے دوران حکومت نے 10 کھرب، 23 ارب 64 کروڑ روپے کمائے تھے۔ اس لوٹ مار کے بعد تو عوام کو ریلیف ملنا چاہیے تھا۔ لیکن اب جو قیمتیں مقرر کی گئی ہیں وہ ایک مذاق کی حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان میں ہر دور حکومت میں کم و بیش مہنگائی کا رونا رہا ہے۔ کبھی پٹرول، کبھی ڈیزل، کبھی آٹا اور کبھی دوسری اجناس کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے غرض عوام مشکلات کا شکار ہی رہتے ہیں۔ روٹی، کپڑا، مکان کے بعد تعلیم اور روزگار وغیرہ یہ تمام مسائل ایسے ہیں کہ جن میں پاکستان کا ہر شہری گرفتار نظر آتا ہے۔ مگر یہ افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ حکومت نے مہنگائی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں کہ تن ڈھانپنے کو کپڑا اور پڑھنے کو کتاب تو دور کی بات ہے اب دو وقت کی روٹی کے لئے بھی پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔ سابق دور میں شوکت عزیز نے عوام کو مہنگائی سے بچانے کے لئے یوٹیلٹی اسٹور کے تن مردہ میں جان ڈالی تھی لیکن اب ان اسٹورز پر بھی لوٹ مار ہے۔ حال ہی میں یوٹیلٹی سٹورز پر فروخت کئے جانے والی دالوں کی قیمتوں میں ایک روپے سے دس روپے فی کلو تک اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ کچھ عرصے پہلے ہی یوٹیلٹی

سٹورز پر فروخت کئے جانے والے تمام اشیاء کی قیمتوں میں تین روپے اضافہ کیا گیا تھا۔ اس طرح یوٹیلٹی سٹورز اور بازاروں میں فروخت کئے جانے والی اشیاء کی قیمتیں یکساں ہو گئیں ہیں۔ جبکہ پرانا سٹاک بھی نئی قیمتوں پر فروخت کیا جارہا ہے۔ مہنگائی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب سڑکوں، فٹ پاتھوں، محلوں، گلیوں میں بھیک مانگنے والوں میں اضافہ کر رہا ہے۔ سرکاری اداروں کو اس وقت حرکت میں آنا چاہئے۔ کراچی میں رمضان سے قبل ایسے سستے بازار لگنے چاہیئے جہاں عوام سکون سے خریداری کر سکیں۔ شہری حکومت، این جی اوز، معاشرتی و سیاسی جماعتوں کو عوام کی خدمت کے اس عمل میں اپنا حصہ بٹانا چاہئے۔ تاکہ حکومت کی مدد ہو۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ رمضان کی آمد سے قبل ایسی کمیٹیاں تشکیل دے جو مارکیٹ کی مانیٹرنگ کریں۔ ان میں سرکاری اہلکاروں کے ہمراہ عوامی نمائندے بھی لئے جائیں، اگر یہ کیا گیا تو اس بات کا امکان ہے کہ عوام کو تھوڑا بہت ریلیف مل جائے۔

امن کے نام پر انسانوں کا قتل عام

امریکن سنٹر میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسانے کی فلم دکھائی جارہی تھی۔ ہیروشیما کا ہنستا بستا شہر دیکھتے ہی دیکھتے آگ اور لامتناہی آگ میں بدل گیا۔ یہ خونی داستان بھی اسی امریکہ نے رقم کی ہے۔ جو آج عراق، افغانستان، پاکستان، فلیسطین اور دنیاکے دیگر خطوں میں امن، جمہوریت، دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر انسانوں کا خون بہا رہاہے۔ یہ داستان خونچکاں امریکہ کے کرنل پال ٹبٹس نے چھ اگست 1945 کو لٹل بوائے نامی ایٹم بم گرا کر لکھی تھی۔ اس کے نتیجے میں ہیروشما میں دو لاکھ انسان لقمہ اجل ہوئے۔ یہ دنیا میں اس لحاظ سے تباہی کا سب سے بڑا سنگین واقعہ تھاکہ اتنی کم مدت میں اتنے زیادہ انسان صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ امریکہ کواس پر اب بھی کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ نہ کبھی بم گرانے پر اس نے کوئی معذرت کی۔ دریائے آئی اوئی کے کنارے ایٹم بم کی یادگار وہ کھنڈر نما گنبد ہے جس کو ڈوم کہتے ہیں اور اسی کے پڑوس میں وہ عجائب گھر ہے جس میں ایک بچی کی وہ تڑی مڑی بائیسکل بھی ہے جس پر وہ ایٹم بم گرنے کے وقت سوار تھی۔ گنبد کی سیڑھیوں پر وہ پرچھائیں ہمیشہ کے لئے معلق ہو گئی ہے جو عمارت کے ایک ایسے باسی کی ہے جو بم گرتے وقت سیڑھیوں سے اتر رہا تھا لیکن ایٹمی حرارت سے ایک پرچھائیں میں تبدیل ہو کر وہیں معلق

ہو گیا۔ یہ المیہ اس عہد کی نشانی ہے جب دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے لیے امریکہ کے صدر ہیری ٹرومین نے جاپان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ غیر مشروط طور پر ہتھیار پھینک دے لیکن جاپان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ امریکہ روس کے جاپان میں داخل ہونے سے پہلے ہی جاپان کو سرنگوں کرکے اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا۔ اس لیے ان مقاصد کے حصول کے لیے اس نے انسانی تاریخ کا مہلک ترین ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہیروشیما پر گرایا جانے والا پہلا ایٹم بم انولاگے نامی بی-29 ہوائی جہاز پر لاد کر لایا گیا تھا جس کے پائلٹ کرنل پال ٹبٹس تھے۔ یہ ساٹھ کلو گرام یورینیم 235 کا بنا ہوا بم تھا۔ لٹل بوائے نامی اس بم کو آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر ہیروشا کے مرکز پر گرایا گیا تھا۔ بم زمین سے اوپر فضا میں پھٹا۔ بہت سے لوگوں نے ایٹمی تپش سے بچنے کے لیے دریائے آئی اوئی میں چھلانگیں لگا دیں لیکن دریا کا پانی ایٹمی توانائی سے ابل رہا تھا۔ اس بم نے دو لاکھ انسانوں کی جان لی۔ جاپان نے ہیروشا پر گرنے والے ایٹم بم کے نتیجے میں بھی ہتھیار نہیں پھینکے تو نو اگست کو میجر چارلس سوینی نے فیٹ مین نامی ایٹمی بم ناگاساکی کے شہر پر گرایا۔ یہ آٹھ کلو گرام پلوٹینم 239 کا بنا ہوا بم تھا۔ اس بم کی وجہ سے ایک لاکھ بیس ہزار لوگ جان بحق ہوئے۔

امریکہ نے آج پوری دنیا میں ایک ایسی دہشت گردی کی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ جس کا

کوئی انت نہیں ہے۔ امریکہ آج بھی دنیا میں امن کا ٹھیکے دار بنا ہوا ہے۔ جنگی اخراجات سے اس کی معاشی بدحالی بڑھتی جارہی ہے۔ اربن انسٹیٹیوٹ کی تازہ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں عورتوں اور بچوں سمیت 35 لاکھ شہری سڑکوں پر سوتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں 35 لاکھ شہری بے گھر ہیں۔ ان میں ساڑھے تیرہ لاکھ بچے بھی شامل ہیں۔ صرف نیویارک میں 37 ہزار افراد جن میں 16 ہزار بچے بھی شامل ہیں، روزانہ مارکیٹوں کے چھجوں کے نیچے سونے پر مجبور ہیں۔ امریکہ کے بڑے بڑے بینک دیوالیہ ہوچکے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ بے روزگار ہوچکے ہیں۔ امریکہ میں ایسے درجنوں گروپ اور جماعتیں قائم ہوچکی ہیں جو امریکہ سے اپنی ریاستوں کی مکمل آزادی کی جدوجہد کررہی ہیں۔ اس سلسلے میں کئی جماعتوں نے امریکی وفاقی حکومت کے غیر معمولی اختیارات کے خاتمے اور امریکی ریاستوں کی مکمل آزادی اور علیحدگی کا حق دینے کیلئے قانون سازی کا مطالبہ کیا ہے۔ ان تنظیموں کا مؤقف یہ ہے کہ امریکہ کی وفاقی حکومت انکی ریاست سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے اس کا بہت ہی کم حصہ ریاست کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتی ہے جبکہ امریکی حکومت امریکی عوام کے ٹیکسوں کی آمدنی سے دنیا کے مختلف حصوں میں جو بھی فوجی کاروائیاں کررہی ہے اس کا بوجھ ٹیکسوں کی شکل میں امریکی عوام پر ہے اور انہیں شدید معاشی و اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

آج ۶ اگست ۹۰۰۲ ہے۔ اس اندوہناک واقعے کو گزرے ۴۶.برس گزر گئے۔ ہیروشیما میں مرنے والوں کی یاد میں آج شہر کے امن پارک میں تقریبات ہوں گی۔ مرنے والوں کی یاد میں شہر کی بڑی گھنٹی بجائی جائے گی اور شہر کے امن پارک میں گلدستے رکھے جائیں گے۔ مرنے والوں کی یاد میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جائے گی۔

لیکن دنیا کے باسی جو امن چین سے رہنا چاہتے ہیں، امریکی عوام سے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کے ٹیکس پر چلنے والی امریکی حکومت کب تک دنیا میں امن کے نام پر انسانوں کا قتل عام کرتی رہے گی

قائد تحریک کی درخواست کا نمبر کب آئے گا

گزشتہ سال کراچی میں بینک اہلکاروں کی طرف سے طفیل شاہ شخص کے گھر پر اس کی خواتین سے بد تمیزی کے واقعہ کے بعد طفیل شاہ نے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ طفیل شاہ نے بنک سے کاروبار کے لئے قرضہ لیا تھا۔ جس کی عدم ادائیگی پر بنک والے اسے ہراساں کر رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف اسی ملک میں گزشتہ چار سال میں ۹۱۱ ارب روپے کے قرضے معاف کرائے گئے ہیں۔ 17 اکتوبر 1999 کو بینکاری کے شعبے میں جنرل پرویز مشرف نے اپنے ایجنڈے کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ بینکوں کے قرض نادہندگان سمیت ایسے افراد جنہوں نے اپنے قرضے معاف کرائے ہیں وہ 4 ہفتوں میں تمام واجبات ادا کریں ورگرنہ ان کے خلاف قانون کا آہنی ہاتھ حرکت میں آ جائے گا۔ لیکن یہ آہنی ہاتھ ان طاقتور سیاستدانوں، صنعت کاروں، جرنیلوں، جاگیرداروں کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا جو اربوں روپے لوٹ کر کھا گئے، بلکہ عوام کو مکے دکھا کر عوام کی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ مشرف دور میں ماضی میں معاف کرائے گئے قرضوں کی مد میں تو ایک پیسے کی بھی وصولی نہیں ہوئی۔ لیکن اس دور میں جس تیزی سے قرضے معاف کئے گئے اس کی پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ قرضے معاف کرنے والوں میں نہ صرف وہ ممتاز سیاستدان شامل ہیں جو قومی مفاہمتی آرڈیننس 2007ء سے مستفید

ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ بڑے تاجر، صنعت کار اور وڈیرے بھی شامل ہیں جن کے پاس ملک کے اندر خطیر رقوم کے اثاثے موجود ہیں جن کو فروخت کرکے بینکوں کے قرضے وصول کئے جا سکتے تھے۔ مشرف نے عوام سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ 12 نومبر 1999 کے بعد بینکوں کے نادہندگان اور قرضے معاف کرانے والوں کے نام شائع کر دیئے جائیں گے لیکن ان کے عرصے اقتدار میں کبھی یہ فہرست شائع نہیں کی گئی۔ حالانکہ نواز شریف اور بینظیر کے دور میں یہ فہرست شائع ہوتی رہی تھی۔

اپریل ۲۰۰۸ میں اس وقت کے وفاقی وزیر خزانہ سینیٹر اسحاق ڈار نے سینٹ میں انکشاف کیا ہے کہ گزشتہ تین سالوں کے دوران سرکاری بنکوں اور مالیاتی اداروں سے 14 ارب 91 کروڑ 93 لاکھ 51 ہزار روپے مالیت کے قرضے معاف کروائے گئے ہیں جبکہ گزشتہ 8 سالوں کے دوران غیر ملکی قرضوں کا حجم 27 ارب سے بڑھ کر 53 ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔ ایک سوال کے تحریری جواب میں سینیٹر اسحاق ڈار نے ایوان کو بتایا کہ گزشتہ تین سالوں 2005-07 کے دوران صنعتی شعبے سے وابستہ 89 قرض دھندگان نے مجموعی طور پر 8 ارب 57 کروڑ 61 لاکھ 29 ہزار روپے کے قرضے معاف کروائے اس دوران تجارتی شعبے سے وابستہ 12 ہزار چار سو چار قرض دھندگان نے تین ارب 30 کروڑ 82 لاکھ 20 ہزار روپے کے قرضے معاف کروائے جبکہ زرعی شعبے سے وابستہ 82442 قرض دھندگان نے تین ارب تین کروڑ

پچاس لاکھ دو ہزار روپے کے قرضے معاف کروائے وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے ایوان بالا کو یقین دہانی کرائی ہے کہ 30 دن کے اندر ملک کے بینکوں سے قرضے معاف کرانے والوں کی تفصیلات جاری کردی جائیں گی۔ لیکن حکومت میں وزارتوں سے علیحدگی کے بعد انہیں اپنا یہ وعدہ یاد ہی نہ رہا۔

سال ۲۰۰۶ میں مسلم کمرشل بنک نے خاموشی سے اپنی سالانہ رپورٹ میں سال 2005ء میں مختلف کاروباری و صنعتی اداروں کے 1 ارب 3 کروڑ روپے سے زائد کے قرضے معاف کردیئے۔ بینک کی طرف سے جاری کی گئیں تفصیلات کے مطابق سال 2005ء کے دوران 82 کاروباری و صنعتی یونٹوں کے 5 لاکھ یا اس سے زائد کے قرضے معاف کئے گئے ہیں۔ یہ وہ قرضے ہیں جو گزشتہ سال 2005ء کے دوران 31 دسمبر تک مختلف کاروباری و صنعتی اداروں کو فراہم کئے گئے تھے۔ مجموعی طور پر 82 کاروباری و صنعتی اداروں کو ایک ارب 3 کروڑ 51 لاکھ روپے کے قرضے معاف کئے گئے ہیں۔ بینک نے ایڈ کو ٹیکسٹائلز لمیٹڈ اسلام آباد کو 47 لاکھ روپے ثاقب فیبرکس فیصل آباد کو 70 لاکھ روپے، ہائی ٹیک انٹرنیشنل فیصل آباد کو 94 لاکھ روپے، ایس ڈی اے کولڈ سٹوریج پشاور کو 2 کروڑ، 41 لاکھ روپے سے زیادہ کا قرضہ معاف کیا گیا ہے۔ رحمٰن انڈسٹریز سوپ مینوفیکچررز لاہور کو 73 لاکھ روپے نظام الدین علی اسبسٹو انڈسٹریز کراچی کو 80 لاکھ روپے، علی پور چینوٹ ملز لمیٹڈ لاہور کو 1 کروڑ 44 لاکھ روپے، سٹار سلیکا انڈسٹریز لمیٹڈ کو 1 کروڑ روپے ایس اینڈ کی

انٹرپرائزز اسلام آباد کو 4 کروڑ 41 لاکھ روپے، جمال ٹیوب ملز لاہور کو 20 کروڑ، سن شائن جیوٹ ملز لاہور کو 1 کروڑ 63 لاکھ روپے سے زیادہ کا قرضہ مسلم کمرشل بینک نے معاف کر دیا ہے۔ یہ وہ قرضے ہیں جو مختلف صنعتی اداروں نے گزشتہ سال مسلم کمرشل بینک سے حاصل کئے تھے۔

قرضوں کی معافی کی دوڑ میں بی بی کے پہلے دور میں 7.23 بلین اور دوسرے میں 6.64 بلین روپے کی قومی رقم بنکوں کو کبھی نہ مل سکی۔۔1985 اور 1999 کے دوران نواز شریف نے اپنے ادوار میں سیاسی حمایت کے لئے ارکان اسمبلیوں پر سرکاری خزانے کے تمام دوازے کھول دیئے۔ نواز شریف نے سب سے زیادہ قرضے معاف کرنے کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ نواز شریف کے پہلے دور میں 2.39 بلین روپے کے قرضے بیک جنبش قلم معاف ہوگئے۔ شوکت عزیز کے زریں دور میں 31.63 بلین کا قرض معاف کیا گیا۔ نادہندگان کی فہرست میں چوہدری شجاعت، چوہدری پرویز الہی، جام یوسف اور کالاباغ خاندان کے چشم وچراغ ملک اللہ یار جیسے نام نمایاں ہیں۔ اسی خانے میں جنرل امجد سمیت آٹھ جرنیل شامل ہی۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے 2002 میں اپنے شیڈول کی وہ تمام شقیں ہی ختم کر دیں جو مگرمچھوں کے قرضے معاف کرنے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتیں تھیں۔

سینٹر پروفیسر خورشید احمد نے سینٹ میں سوال اٹھایا تھا جس پر مشیر خزانہ

شوکت ترین نے جواب میں کہا تھا کہ گزشتہ حکومت کے دوران 42 ارب روپے کے قرضے معاف کیے گئے اور یہ تمام قرضے اسٹیٹ بینک کے قواعد کے مطابق معاف کیے گئے ہیں۔ یہ تمام قرضے بینکوں نے اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سفارش پر تمام دستیاب قوائد کو سامنے رکھ کر معاف کیے ہیں۔ شوکت ترین نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قرضوں کو معاف کرنے کا فیصلہ میرٹ پر کیا گیا ہے۔ سینئر پروفیسر خورشید احمد نے سوالات کے دوران نکتہ اٹھایا کہ ایوان کو بتایا جائے کہ 42 ارب کے علاوہ بھی قرض معاف کیے گئے ہیں یا نہیں اور خیبر بینک کو تو قرضے معاف کرنے کے لیے دباؤ میں لایا گیا تھا، مشیر خزانہ شوکت ترین نے سوال کے جواب میں کہا کہ ان کے پاس پوری معلومات نہیں ہیں فی الحال جو معاملہ ایوان میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ اسٹیٹ بینک کے سرکلر 290 کے تحت معاف کیے جانے والے قرضوں کی تفصیل سے متعلق ہے۔ اسی طرح سے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کو وزارت خزانہ کی طرف سے جو اعداد و شمار مہیا کیے گئے کے مطابق اِس عرصہ میں عوامی سیکٹر کے بنکوں نے 30.18 بلین روپے کا ریکارڈ توڑ دیا ہے جو 1985 تا 1999 کے دوران قرضوں کی شکل میں معاف کی گئی تھی۔ یہ رقم بلین روپے اس رقم سے زائد تھی۔ جو تین سابقہ حکومتوں کے چودہ سالہ عہد 59.95 اقتدار میں معاف کی گئی تھی۔ یہ قرضہ شوکت عزیز کے دور میں کھایا پیا گیا۔ یہ نقطہ بھی اپنی جگہ پر سچائی کا امین ہے کہ شوکت عزیز و مشرف کے دور میں پاکستانی خزانے کو بڑی بیدردی و بے رحمی سے لوٹا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی صورتحال

یہی ہے۔ قرض کی وصولی تو دور کی بات ہے قرض لینے والوں کے ناموں کی فہرست بھی منظر عام پر نہیں لائی جارہی ہے۔ حنا ربانی کھرنے بھی وعدہ کیا ہے کہ یہ فہرست طویل ہے اس لئے اس کو لانے میں تاخیر ہورہی ہے۔

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے گزشتہ دنوں چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چوہدری کے نام کھلا خط لکھا تھا۔ جس میں چیف جسٹس کی توجہ ملکی حالات کی طرف دلاتے ہوئے ان سے کھربوں کے قرضے معاف کرانے والوں کے خلاف ازخود نوٹس لینے کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے اس خط میں کہا ہے کہ سرکاری بینکوں سے اربوں کھربوں روپے کے قرضے لے کر معاف کرانے والوں کے خلاف آئین و قانون کے مطابق کارروائی کرتے ہوئے تمام پیسہ واپس سرکاری خزانے میں لایا جائے۔ آپ اس سلسلے میں ازخود نوٹس لے کر ملک کی دولت ہڑپ کرنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی کریں۔ خط میں کہا گیا ہے کہ محترم چیف جسٹس آپ سے میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ میرے اس کھلے خط کو پٹیشن کی حیثیت سے قانونی شکل دے کر کارروائی کا آغاز کریں تاکہ ملک معاشی بحران سے نجات پائے اور ہم سب ملکر پاکستان کو ایک مستحکم اور باوقار ملک بنانے میں کامیاب ہوسکیں۔ دیکھئے الطاف حسین کی اس درخواست پر کب سنوائی ہوتی ہے

کالے کوٹ میں کالی بھیڑیں

کالے کوٹ والوں نے دو سال کے عرصے میں جو عزت، شہرت اور نیک نامی کمائی تھی۔ وہ دو دن میں ہوا ہو گئی۔ میڈیا نے اظہار آزادی کے لئے گزشتہ عرصے میں بے حد قربانی دی ہے۔ یہ کیمرے کی سرخ آنکھ ہی تھی۔ جس نے ایک آمر کے اقدامات کو پوری قوم کے سامنے بے نقاب کیا۔ پھر کیمرہ مینوں کے کیمرے ٹوٹے، اخبار والوں کے سر پھٹے، خون بہا لیکن یہ قافلہ رکا نہیں۔ چینلوں پر حملے، ترغیب، لالچ، توڑ پھوڑ، پابندیاں صحافیوں سے یہ حق نہ چھین سکی۔ جس کا مطالبہ کل لاہور میں وکلاء کے ایک گروپ نے کیا۔ میں اسے وکیلوں کا نمائندہ نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ اعتزاز احسن نے بھی ان چند خود سر لوگوں کی حرکتوں پر لاہور بار کی رکنیت سے استعفی دے دیا ہے۔ ایک پولیس اہلکار کو مارتے ہوئے وکلاء کی ویڈیو ٹی وی چینلز پر دکھانے کے بعد اور پھر وکلاء کی جانب سے ایک نجی ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین کا سر پھاڑنے اور کیمرہ توڑنے کے واقعات کا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خواجہ شریف نے از خود نوٹس لیا تھا جس کی گزشتہ سماعت جاری تھی۔ اس سماعت کے دوران کمرہ عدالت میں کافی بڑی تعداد میں وکلاء موجود تھے۔ جونہی سماعت کے بعد صحافی اور وکلاء باہر نکلے تو وکلاء نے صحافیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی براہ راست نشریات کا نظام بند کریں جسے صحافیوں نے تسلیم نہیں کیا جس پر

وکلاء نے صحافیوں کے خلاف نعرے لگائے، ان سے بد سلوکی اور گالیاں دیں۔

یہ میں بہت مہذب پیرائے میں لکھ رہا ہوں۔ ورنہ اخبارات میں جو تفصیلات ہیں۔ وہ ہمیں عدالتوں پر اس حملے کی یاد دلاتی ہیں، جس نے اس ملک عدالتوں کے قدر و منزلت کو مجروح کیا تھا۔ اس وقت بھی یہ میڈیا تھا جس نے عدالتی وقار کی بحالی کی جنگ لڑی۔ پھر چیف جسٹس کی یہ لائیو کوریج تھی۔ جس نے اس ملک کے لوگوں کا جگایا اور سول سوسائٹی نے ایک طویل اور کامیاب جنگ لڑی۔ صحافیوں نے مال روڈ پر جو احتجاجی مظاہرہ کیا ہے۔ اب اس کی لہر پورے ملک میں پھیلے گی اور کالے کوٹ والوں کے لئے شرمندگی کا باعث بنے گی۔ اب صحافی تنظیموں کا مطالبہ ہے کہ جب تک اس واقعے اور اس سے پہلے ہونے والے واقعات میں ملوث وکلاء کے خلاف قانونی کارروائی کر کے انہیں سزا نہیں دی جاتی تب تک صحافی برادری اپنا احتجاج جاری رکھے گی۔

یہ کیسی خود سری، اور غنڈہ گردی ہے۔ پنجاب بار کونسل کی ڈسپلنری کمیٹی جس نے صحافی کو مارنے والے چار وکلاء کے لائسنس معطل کیے تھے اس نے جمعرات کو ان کے لائسنس بحال کر دیے۔ تو کیا کالے کوٹ قانون سے بالاتر ہیں۔ چند لوگوں کے مسئلے کی وجہ سے پوری وکلاء برادری کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ میڈیا اس واقعے کو غیر ضروری طول دے رہا ہے اور کسی حد تک ان

کی رپورٹنگ بھی درست نہیں۔ صحافیوں پر کوئی تشدد نہیں کیا اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ایسی فوٹیج تھی جس میں وکلاء صحافیوں کو مار رہے تھے ۔ایک طرف وکلاء کہتے ہیں کہ صحافیوں کو ڈسٹرکٹ کورٹس اور سیشن کورٹس میں آنے نہیں دیں گے۔ لیکن کیا وکلاء اس بات میں حق بجانب ہیں۔ کیا عدالتیں ان کی من مانی کاروائیوں کے لئے ہیں۔ ایک نجی ٹیلی ویژن چینل کے کیمرہ مین پر وکلاء کا تشدد بلا جواز تھا۔ کیا اس تشدد کا یہ جواز کافی تھا کہ ٹیلی ویژن چینل کے کیمرہ مین نے ایک ایسی فوٹیج بنالی تھی جس میں چند وکلا ایک پولیس اہلکار کو مارتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور یہ فوٹیج بعد ازاں تمام ٹی وی چینلز پر دکھائی گئی۔ کیمرہ وہی دکھاتا ہے جو اس کے سامنے ہو۔ یہ تو آئینے کے مانند ہے۔ جو ہو رہا تھا۔ وہی دکھا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے اس واقعہ کی فلم بنائی۔ تو کیا کسی فلم کی شوٹنگ تھی۔ یا کوئی پرائیوٹ جگہ تھی۔ یہ عدالت تھی۔ جہاں پولیس اور وکلاء دنگے فساد کے لئے نہیں۔ انصاف، اور قانون کی بالا دستی کے لئے جاتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پولیس اسٹیشن ہو یا عدالت یا کوئی پبلک مقام قانون کی خلاف ورزی، مارنے پیٹنے، اور تشدد کے ایسے واقعات عام ہیں۔ یہ وکلاء کی بدقسمتی ہے کہ عدالت میں پیش آنے والا یہ واقعہ میڈیا پر آگیا۔ ضلعی عدالتوں میں وکلا کی جانب سے ایسے واقعات کا ہونا افسوس ناک ہے۔ وکلاء برادری کو اسے وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے۔ وکلا کی نمائندہ تنظیموں کو آگے بڑھ کر ان وکلاء کے خلاف کاروائی کرنی

چاہیے۔ صحافیوں کے خلاف غم و غصے کے اظہار سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

ایک گلوگارہ کے اشارہ ابرو پر

میں اپنی کہانی بعد میں سناؤں گا۔ پہلے یہ خبر پڑھ لیجئے۔ انگریزی معاصر اخبار کے مطابق ۱۴ اگست کو پی آئی اے کی ایک پرواز کو جو لاہور جارہی تھی، ایک گلوگارہ شبنم مجید کے پرس کو ڈھونڈنے کے لئے راستے سے واپس اسلام آباد آنا پڑا۔ ائیرپورٹ پر آکر اس جگہ پرس تلاش کیا گیا۔ پرس میں ۸۱ ہزار روپے کیش اور سونے کے زیورات تھے۔ جو ظاہر ہے نہیں ملے۔ گلوگارہ ایوان صدر میں جشن آزادی کی تقریب میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد اسلام آباد سے پی کے ۳۵۶ میں واپس لاہور جارہی تھیں۔
میری کہانی یہ ہے کہ ۱۳ اگست کی شام پانچ بج کر ۲۰ منٹ والی پی کے ۱۳۹ کی پی آئی اے کی پرواز سے سکھر سے کراچی آنے کے لئے جب میں سکھر ائیرپورٹ پہنچا تو وہاں ائیرپورٹ لاؤنج پر تالے پڑے تھے۔ سول ایوی ایشن کا عملہ غائب تھا۔ پرواز کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ ساڑھے پانچ گھنٹے لیٹ ہے۔ مسافروں کے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ لاؤنج بند تھا اور متبادل جنریٹر چلانے سے سول ایوی ایشن کے عملے نے انکار کردیا۔ اس بدتمیزی اور نالائقی، بدانتطامی کے لئے پی آئی اے کا ہر مسافر اپنے ٹکٹ میں سے ۱۴۰ روپے سول ایوی ایشن کو ادا کرتا ہے۔ اس تاخیر پر پی آئی اے کو نہ کوئی حرف ندامت تھا، نہ

مسافروں کی دلجوئی، اور نہ سکھر کی تڑپاتی گرمی میں ٹھنڈے میں بٹھانے، مشروب تو درکنار پانی تک پلانے کو کوئی موجود نہ تھا۔ یہ یوم آزادی کی شب تھی۔ پورا پاکستان یوم آزادی کی خوشیاں منا رہا تھا۔ لیکن سکھر ائیرپورٹ پر مسافر ۴ گھنٹے شدید گرمی میں بلبلاتے رہے۔ مسافروں میں، عورتیں، بچے، بوڑھے سب شامل تھے۔ لیکن یوم آزادی پر پانچ گھنٹے سے محبوس مسافروں کو پرواز میں کھانا، معمول کیا، اسنیک، مشروبات سے بھی محروم رکھا گیا۔ چھوٹے بچوں کو ٹافیاں یا سوئٹ جس کا جشن آزادی کی مناسبت سے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وہ ناپید تھے۔

قومی جھنڈے والی ائیر لائین میں مسافروں کی یہ بے توقیری ہے جس کے سبب چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ نے پی آئی اے کی پروازوں میں تاخیر پر ازخود نوٹس لیتے ہوئے حکام کو طلب کیا۔ چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ خواجہ محمد شریف کی جانب سے لئے جانے والے ازخود نوٹس میں کہا گیا کہ انہوں نے خود کئی مرتبہ پی آئی اے میں سفر کیا اور پرواز تاخیر کا شکار ہوئی۔ اس کے علاوہ سندھ، پشاور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس صاحبان بھی متاثر ہوئے اور جوڈیشل کونسل کی میٹنگ میں تاخیر سے پہنچے جس کی وجہ سے اجلاس بھی تاخیر سے شروع کیا گیا۔ عدالت نے اس سلسلے میں ایم ڈی پی آئی اے، ڈی جی سول ایوی ایشن اور لاہور کے ائیرپورٹ منیجر کو طلب کیا تھا۔

یہ بھی پی آئی اے کی بد انتظامی کا تسلسل ہے کہ جس کے سبب صد مملکت کو ایوان صدر میں پی آئی اے کے معاملات کا جائزہ لینے کیلیئے اعلیٰ سطح کا اجلاس بلانا پڑا۔ صدر آصف علی زرداری نے پی آئی اے کے انتظامی امور بہتر بنا کر مسافروں کو آرام دہ سفری سہولیات فراہم کرنے کی تلقین کی ہے۔ صدر نے اس اجلاس میں ہدایت کی کہ پی آئی اے کے انتظامی امور کو بہتر بنا کر معاملات ٹھیک کیے جائیں اور مسافروں کی شکایات دور کرکے انہیں جدید سفری سہولیات فراہم کی جائیں۔

پی آئی اے ملک کی پہچان ہے۔ لیکن بدانتظامی، لوٹ مار، بدعنوانی، اقرباپروری، ناجائز بھرتی، اور الیلے تللوں نے اس ادارے کو ایک ایسا مرد بیمار بنا دیا ہے۔ جو بستر مرگ پر سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے اور ہم اب بھی اس سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ حال ہی میں پی آئی اے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا 315 واں اجلاس میں بتایا گیا تھا کہ جنوری سے جون 2008ء کے دوران ادارے کو 18 ارب روپے کے خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔ جبکہ بورڈ آف ڈائریکٹر کے ایک اجلاس کے بعد وزیر دفاع احمد مختار نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ روپے کی قدر میں کمی اور تیل کی زیادہ قیمتوں کی وجہ سے پی آئی اے کو سال 2008ء کے دوران 39 ارب روپے کا خسارہ ہوا، انہوں نے مستقبل میں بہتری کی امید دلاتے

ہوئے بتایا کہ پی آئی اے ملازمین کی اولاد کیلئے ملازمتوں میں پانچ فیصد کوٹا مختص کیا گیا ہے، گریڈ 4 تک کے تمام کنٹریکٹ ملازمین کو بھی مستقل کیا جا چکا ہے، ادھر: قومی ایئر لائن کے پائلٹوں کی نمائندہ تنظیم پاکستان ایئر لائن پائلٹ ایسوسی ایشن اور انتظامیہ کے درمیان بھی رسہ کشی جاری ہے۔ پالپا کے عہدیداروں کا کہنا ہے کہ وہ ایم ڈی پی آئی اے سے مذاکرات نہیں کرینگے بلکہ چیئرمین پی آئی اے سے مذاکرات کرینگے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ۸۰ (اسی) سے زائد کنٹریکٹ پائلٹوں کو مستقل کیا جائے۔

پی آئی اے میں کیا ہو رہا ہے اس پر پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر اس مرد بیمار کا علاج بھی تجویز کیا ہے۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے پی آئی اے میں ایک سال کے دوران 13 ارب روپے سے زائد کی مالی بے ضابطگیوں پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے انتظامیہ کو مالی انتظامات بہتر بنانے کی ہدایت کی ہے۔ کمیٹی نے ایک کھرب 34 ارب 7 کروڑ روپے مالیت کے 8 بوئنگ 777 کی خریداری میں ضابطے پورے نہ کرنے پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور پی آئی اے سول ایوی ایشن کے درمیان مقدمہ بازی کے حوالے سے چیئرمین کمیٹی کا کہنا تھا کہ حکومتی ادارے باہمی تنازعات ثالثی کے ذریعے حل کریں، چیئرمین کمیٹی نے سول ایوی ایشن اتھارٹی کے کراچی میں واقع ہوٹل مڈوے کی لیز میں ڈائریکٹر جنرل کی جانب سے اضافہ کرنے پر برہمی کا اظہار کیا۔

کسی دور میں پی آئی اے منافع بخش ادارہ تھا۔ جب عہدوں پر تعیناتی سیاست پر نہیں میرٹ پر ہوتی تھی۔ سیاسی تقرری کے بعد عہدیدار تو پھلنے پھولنے لگے ان کی کاروں کے بیڑے میں تو اضافہ ہونے لگا لیکن ادارے کا بیڑا غرق ہو گیا۔ مشرف دور میں اس ادارے کے ایم ڈی نے جہاز پر شلوگن اور تھیم بدلنے کا ٹھیکہ اپنی بیٹی کو دلوایا۔ یوں ۷۹ جہازوں کی فی کس ۵ لاکھ روپے سے تزئین نو کی گئی۔ ایک سال میں 3 ارب روپے کی بے ضابطگیاں ایک طرف سالانہ خسارہ بھی اس کے برابر ہے۔ دنیا بھر میں نجی ائیر لائنز منافع میں جا رہی ہیں۔ لیکن پی آئی اے تباہی سے دوچار ہے۔ انتظامیہ کا اداروں کے ساتھ وفادار ہونا ہی اس کی کامیابی ہوتی ہے۔ جس کا پی آئی اے میں فقدان ہے۔ اس کا اظہار کمیٹی کی کارروائی اور ہدایات سے بھی ہوتا ہے۔ حکومت تیل کی قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔ پی آئی اے اس قیمت پر تیل خریدنے سے قبل ہی کرایوں میں اضافہ کر دیتی ہے۔ تیل کی قیمت کم ہونے پر اضافہ واپس نہیں لیا جاتا۔ یہ مسافروں کے ساتھ ظلم ہے۔

افسروں کی من مانی کا اندازہ مڈوے کی لیز میں اضافے اور پی آئی اے اور سول ایوی ایشن کی آپس میں مقدمہ بازی سے لگایا جا سکتا ہے۔ پی آئی اے کی انتظامیہ کو اخراجات کے معاملے میں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ مالی

بدعنوانیاں تو ناقابل برداشت ہیں۔ سابق افسران کو کٹہرا عدالت میں کھڑا کرکے پوچھنا چاہئے کہ ان کہ غلط فیصلوں نے اداروں کا کیا حشر کیا۔ یہ ادارے پارٹیوں کی جاگیر نہیں ہیں۔ جو جب چاہے یہاں اپنے من پسندیدہ افراد کو بھر دے۔ ان افسران سے پوچھا جائے کہ ان کے غلط فیصلے کیسے ادارے کو تباہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ اخراجات ذمہ دار افسروں کے ذمے ڈال دیئے جائیں تو چند منٹ میں مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ ایک طرف کرائے بے تحاشا ہیں، دوسری طرف مسافر پی آئی اے کی سروس سے مطمئین بھی نہیں۔ جب ادارے موم کی ناک بن جائیں۔ ایک گلوکارہ کے اشارے پر جہاز کا رخ موڑ دیا جائے۔ مسافروں کو بے توقیر اور حقیر جانا جائے۔ تو مسافروں کے دم سے چلنے والی ایئر لائین کیسے کامیاب ہوگی۔

لوٹ سیل جاری ہے

دو ماہ قبل کراچی کی مقامی تھوک مارکیٹ میں 100 کلو چینی کی بوری کی قیمت 4350 روپے سے کم ہو کر 4340 روپے اور، درجہ اول گھی کے کنستر کی قیمت 1790 روپے سے کم ہو کر 1780 روپے ہو گئی تھی۔ لیکن دو ماہ کے دوران ہی ایسی لوٹ مار مچی کہ یہ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ کراچی سٹے بازوں اور منافع خوروں کی جنت ہے۔ یہاں آپ کو سٹے باز بندر روڈ پر کھڑے دور سے آنے والی گاڑیوں کے نمبر پر سٹہ کھیلتے نظر آئیں گے۔ اسٹاک مارکیٹ میں سٹہ کھیلنے والے ذرا اونچے قسم کے کھلاڑی ہیں۔ سٹے نے آج ایشاء کی اس بڑی مارکیٹ کو تباہ کر دیا۔ اربوں روپے کی سٹے بازی ہوئی۔ لیکن کمانے والے کما کر عیش کر رہے ہیں، اور تباہ ہونے والے اپنی قسمتوں کو کوس رہے ہیں۔ پاکستان میں افواہ سازی کی فیکٹریاں لگی ہیں۔ آپ کوئی بھی جھوٹی سچی خبر ایس ایم ایس پر بھیج دیں۔ شام تک یہ خبر چینلوں سے نشر ہونے لگے گی۔۔ بریکنگ نیوز میں نمبر ون ہونے کی دوڑ میں سب کچھ جائز ہے۔ بعد میں وضاحت، تردید، ہوتی رہے گی۔ رمضان سے تین ہفتے قبل جب قیمتوں میں اضافہ ہونا شروع ہوا تھا۔ تو ہم نے اپنے کالم میں اس کا ذکر کیا تھا۔ لیکن یہاں ایسا کون سا ادارہ یا اتھارٹی ہے جو قیمتوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ نتیجہ سامنے ہے۔ مارکیٹ میں مختلف افواہیں پھیلا کر چینی کی قیمتیں بڑھانے والے

کامیاب ہیں۔ اور بڑے پیمانے پر منافع کما رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ آئندہ دنوں میں چینی کی قیمت میں مزید اضافہ ہوگا۔ اب تو ۵۰ روپے کلو کی سرکاری قیمت کا نوٹیفیکیشن بھی جاری کردیا گیا ہے۔ چینی کی قیمتوں میں زبردست اضافہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن ان قیمتوں پر حکومت کی جانب سے مہر تصدیق ثبت کرنا۔ اس حیرت کا دوچند کردیتا ہے۔
تین ماہ قبل ریٹیل میں چینی کی قیمت 28 روپے کلو تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر جا پہنچی ہے۔
نومبر سے مارچ کا عرصہ چینی کی پیداوار کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصے میں چینی کی قیمت میں مسلسل اضافہ ہوا۔ اس وقت سارے ادارے سو رہے تھے۔ اور متعلقہ وزارتیں اور حکام انتظار کررہے تھے۔ کہ عوام چیخیں چلائیں۔ تو بڑھی ہوئی قیمتوں میں کچھ کمی کرکے اشک سوئی کردیں گے۔ جیسے بجلی کی قیمتوں، یا ٹرانسپورٹ کرائے، یا تیل کی قیمتوں میں کیا گیا، تو کیا مطمئین ہیں کہ اب ایسی کوئی چیٹینگ نہیں ہوگی۔ جی نہیں یہ مافیا پھر کسی اور سیکٹر میں سر اٹھائے گی۔ اور آپ کو حیران کردے گی۔ خدشہ ہے کہ آئندہ دنوں میں نہ جانے کن کن چیزوں کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ حکومتیں کس لئے ہوتی ہیں۔ کیا انہیں مارکیٹ کے ایسے منافع خوروں اور سٹے بازوں کے خلاف فوری ایکشن لینا نہیں چاہئے تھا۔ اگر اسکے ذمہ دار شوگر مل تھے۔ تو چینی بڑھتی ہوئی قیمت کو روکنے کیلئے فوری اقدامات کرتے ہوئے ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کے پاس

موجود چینی کے اسٹاک کو کیوں ریلیز نہیں کیا گیا۔ چینی کی قیمت میں اضافے کے باعث شوگر ملوں نے تقریباً ۵۰ارب روپے کا منافع کمایا ہے۔ چینی کے عوض بینکوں کے قرضوں کی فوری واپسی سے قیمتوں میں فوری کمی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس آپشن کو بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ بینکاری ذرائع کہنا ہے کہ کہ شوگر ملوں نے گنے کی کریشنگ کے وقت بینکوں سے 52 ارب روپے قرض لیا تھا اور جولائی کے اختتام تک انہوں نے 23 ارب روپے کی رقم واپس کردی تھی۔ دوسری جانب شوگر ملوں کے پاس تقریباً 12 لاکھ ٹن چینی موجود تھی۔ جس کی کرشنگ سیزن میں قیمت 33 ارب 40 کروڑ روپے تھی مگر قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے اب اس چینی کی قیمت 60 ارب روپے سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس طرح ملوں کو بغیر کسی محنت کے 26 ارب 40 کروڑ روپے کا فائدہ ہوا ہے۔ دوسری جانب پاکستان شوگر ملرز کا کہنا ہے کہ ملوں کے پاس 7 لاکھ ٹن چینی موجود ہے، اگر ان اعداد وشمار کو درست مان لیا جائے تو بھی 19 ارب 60 کروڑ روپے مالیت کی چینی کی قیمت 35 ارب روپے سے زائد ہو گئی ہے اور اس طرح شوگر ملوں کو ان کے اسٹاک پر 15 ارب 40 کروڑ روپے کا منافع ہوا ہے۔ بینکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ مرکزی بینک نے شوگر ملوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ چینی کے اسٹاکس کے عوض لئے گئے قرضوں کو واپس کردیں مگر بعد میں اس فیصلے کو تبدیل کردیا گیا اور شوگر ملوں کو آئندہ تین ماہ تک قرضے واپس کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مقامی مارکیٹ میں قیمتوں کو کم کرنے کے لئے شوگر ملوں کے چینی کے عوض لئے گئے قرضوں کی فوری واپسی

ضروری تھی۔ شوگر ملیں پنجاب کی ہوں یا سندھ۔ ان کے مالکان بہت طاقت ور ہیں۔ وہ بنکوں سے قرضہ لے کر، ٹی سی پی سے ایڈوانس لے کر بھی مارکیٹ میں سپلائی نہ دیں تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے۔ کہا گیا کہ سندھ شوگر ملز کی جانب سے طلب کے مقابلے میں مقررہ سپلائی میں کمی کے باعث چینی کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ شوگر ملوں کے پاس چینی وافر مقدار میں موجود ہے لیکن ڈلیوری آرڈرز جاری ہونے کے باوجود شوگر ملوں کی جانب سے چینی فراہم نہیں کی جارہی ہے۔ یہ ایک مافیا ہے۔ جس میں سب شریک ہیں۔ اور عوام بے حس ہیں۔ جو اپنے حق کے لئے لڑنے سے محروم ہے۔

محسن قوم

اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حوالے سے پاکستان کا کوئی قانون نہیں توڑا تھا۔ وہ اس قوم کے محسن اور ہمارے قومی ہیرو ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر جو الزامات لگائے گئے تھے وہ غلط تھے پاکستان نے این پی ٹی معاہدہ پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کوئی ملکی قانون نہیں توڑا تھا۔ یہ صرف ایک آمر کی کاروائی تھی جو اپنے اقتدار کو بچانے اور امریکی حمایت کے حصول کے لئے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ٹی وی پر لے کر آئے اور ان سے زبرستی بیان دلوایا۔ مشرف نے امریکہ کو یقین دلایا کہ میں آپ کا بہترین خادم ہوں۔ دنیاکے نقشہ پر پاکستان پہلا مسلمان ملک ہے۔ جس نے ایٹمی صلاحیت حاصل کی۔ بھارت، اسرائیل، ساؤتھ افریقہ، ایران، شمالی کوریا جیسے ملکوں نے ایٹمی صلاحیت کے حصول کے لئے دنیاکے کسی نہ کسی ملک سے تو تعاون حاصل کیا ہی ہوگا۔ یہ قانونی طور پر ہوا یا غیر قانونی طور پر یہ ایک جدا بحث ہے۔ اسرائیل کو ایٹمی ہتھیار بنانے کے سلسلے میں برطانیہ نے مدد کی امریکہ آج بھی اس کی پشت پناہی پر کھڑا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی ملک نہیں ہے۔ جس نے اپنے سائنسدانوں کے ساتھ یہ حشر کیا ہو۔ پرویز مشرف نے جو جرائم کئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر قدیر کی توہین کا سنگین جرم بھی شامل ہے۔ جو پوری قوم کی

توہین کے مترادف ہے۔ انہیں انصاف کے کٹھرے میں لانا ضروری ہے۔ جوہری ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کئی ممالک کو غیر قانونی طور پر فراہم کرنے کے الزام میں چار برس سے زیادہ کا عرصہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنے گھر پر نظر بندی میں گزارا۔ سنہ دو ہزار چار میں ڈاکٹر قدیر سے سرکاری ٹیلی وژن پر زبردستی نشر کروائے جانے والے بیان میں کہلوایا گیا تھا کہ ایٹمی راز منتقل کرنا ان کا ذاتی فعل تھا اور اس میں حکومت یا اس کا کوئی ادارہ ملوث نہیں تھا۔ جس کے بعد سے اسیر ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی آزادانہ نقل وحمل اور میل جول پر پابندیاں عائد کردی گئی۔ جو بعد میں نئی حکومت کے آنے اور عدالت سے ملنے والے ریلیف کے نتیجے میں ان کی رہائی پر ختم ہوئی۔

یورپی اور امریکی دنیا میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر ایک عرصے سے سازش کے انداز میں پروپیگنڈہ کیا جارہاہے۔ اور اکثر یہ خبریں گردش میں رہتی ہیں کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام اور جوہری ہتھیار غیر محفوظ ہیں، اور یہ کسی بھی وقت شدت پسندوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں، جسے ایک خام خیالی، یا چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ پاکستان کا پروگرام محفوظ اور ذمہ دار ہاتھوں میں ہے۔ اور اب تک ہمارے سائنسدانوں نے اس بارے میں انتہائی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

امریکی سفارت خانے نے حال ہی میں اسلام آباد میں سفارت خانے کے لئے حکومت سے ۱۸ ایکڑ زمین اور ۱۵ سو سے زیادہ میرین رکھنے کی درخواست کی ہے۔ جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہونی چاہیئے۔ کیوں کہ اس طرح پاکستان کا ایٹمی منصوبہ براہ راست خطرے کا شکار ہو جائے گا۔ پاکستان میں توانائی کے حالیہ بحران میں بھی یہ بات پوشیدہ ہے کہ پاکستان کو کبھی بھی پر امن مقاصد اور توانائی کے حصول کے لئے ایٹمی بجلی گھر بنانے اور چلانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور کراچی میں قائم ایٹمی بجلی گھر پر ہمیشہ شک و شبے کا اظہار کیا گیا۔

اس کے برعکس سابق سوویت یونین کے ایک شہر چرنوبل کے ایٹمی مرکز میں فنی خرابی پیدا ہونے سے ۱۹۸۶ء میں دھماکہ ہوا تھا جس کے بعد وہاں سے ایٹمی تابکاری پھیلنے کا عمل شروع ہوا۔ اس کے تباہ کن اثرات اب تک رونما ہو رہے ہیں۔ چرنوبل کے ایٹمی ری ایکٹر کے چاروں طرف ایک وسیع علاقہ (جو انگلینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کے مشترکہ رقبے کے برابر ہے) ایسی تباہی سے دوچار ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق چرنوبل کا نام اس سزا کی علامت بن چکا ہے جو ترقی (پروگریس) کی بے قید خواہش کا لازمی نتیجہ ہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۸۶ء کے اس حادثہ سے اب تک ۹۰ لاکھ انسان متاثر ہو چکے ہیں۔ تابکاری سے متاثرہ علاقوں میں رہنے والے لاکھوں لوگوں پر ابھی تک

تباہ کن اثرات کا عمل جاری ہے۔ چرنوبل کے قریب کے علاقے سے چار لاکھ افراد کو ان کے گھروں سے نکالا گیا اور اگلے ۳۰ برس تک یہ لوگ واپس اپنے گھروں کو نہیں گئے۔ اس امر کی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ بیلورشیا اور یوکرائن کے لوگوں کو ایٹمی بابکاری کے نتیجہ میں خطرناک بیماریاں لاحق ہو گئی جن یں مختلف اقسام کے کینسر بھی شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سائنس کی دنیا میں اس صورت حال کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی (جاپان کے وہ شہر جن پر امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم پھینکے تھے) کے سلسلہ میں جو تجربات حاصل ہوئے تھے وہ اس تابکاری کے معاملہ میں کسی کام کے نہیں ہے۔ ناگاساکی اور ہیروشیما میں ہونے والے دھماکوں کے دوران ایک مختصر گھڑی میں تابکاری کی بہت بڑی مقدار خارج ہوئی تھی، جبکہ چرنوبل کے حادثہ میں خارج ہونے والی تابکاری کی کل مقدار ان دو ایٹم بموں کی تابکاری کی مقدار سے بہت زیادہ ہے۔ اور اس کا اخراج آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوا بچوں پر اس تابکاری کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہوئے ہیں۔ ان میں Thyroid کینسر کی بیماری میں ڈرامائی اضافہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ان میں سے بہت سے لوگوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بہر حال جو اعداد و شمار معلوم ہوسکے ہیں۔ ان کے مطابق صرف رشیا (سوویت یونین کی ایک ریاست میں جن لوگوں کی موجودگی کا پتہ چل سکا ہے۔ ان میں سے حادثہ کے بعد ۷۰۰۰ مر چکے ہیں اور ۸۳ فی صد ایسے لوگ ہیں جو کسی نہ کسی خطرناک مرض میں

مبتلا ہو گئے ہیں۔ سوویت یونین کے سابق اکائیاں، بیلو رشیا، رشیا اور یوکرائین اس حادثہ کے سبب پیدا ہونے والے مسائل اپنے محدود وسائل کی وجہ سے حل نہیں کر سکتے۔ بیلو رشیا میں چرنوبل کے اس حادثہ کے سبب جو اقتصادی اور صحت کے مسائل پیدا ہوئے ہیں ان پر اس ریاست کے سالانہ بجٹ کا پانچواں حصہ خرچ ہو رہا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین کا بہت بڑا رقبہ کسی کام کا نہیں رہا۔ وہاں کھیتی باڑی ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی مکانات تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کی روائتی اسلام دشمنی کے پس منظر میں پاکستان کے بارے میں اسرائیل کے عزائم بالکل واضح رہے ہیں۔ اسرائیل کے بانی وزیراعظم ڈیوڈ بن گوریاں نے 1967ء میں سوربون یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ اسرائیل کے نزدیک پاکستان عربوں سے بھی خطرناک ہے اور ہم اسے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہمیں پاکستان کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ یہ تقریر 9 اگست 1967ء کے جیوش کرانیکل، لندن میں شائع ہونے والے یہود کے باقاعدہ ترجمان میں شائع ہوئی تھی۔ بن گوریان نے مزید کہا کہ اسرائیل نے دفاعی حیثیت سے ایک بڑی طاقت عمل تشکیل دی ہے۔ (جس کا باقاعدہ مظاہرہ سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر مغربی ذرائع ابلاغ اور بنگلا دیش کے قیام کے لیے انکی تنظیموں وغیرہ کی کارکردگی سے ہو چکا ہے)۔ یہاں تک جیوش کرانیکل نے مشرقی

پاکستان پر حملہ کرنے والے جنرل جیکب کے یہودی ہونے کی اطلاع اپنے پرچے کے ذریعے دنیا کو دی اور اس کے اسرائیل سے تعلقات کے بارے میں آگاہ کیا۔ 73ء میں پاکستان نے عرب اسرائیل جنگ میں جس طرح عربوں کی اور خصوصیت سے شام کی فضائیہ کی انتہائی نازک موقع پر عملی طور پر مدد کی تھی ۔ اسکی یاد شام کے ایئر پورٹوں پر لگی ہمارے شہید پائلٹوں کی تصاویر سے اب تک تازہ کی جا سکتی ہے۔ اسرائیل کو اپنے خدشے کی مزید تائید اس صورت میں حاصل ہو گئی تھی۔ پھر شام کے علاوہ اردن اور سعودی عرب میں ہمارے فوجی مشن کی موجودگی فلسطینوں کی حمایت سے ہمارا تعلق بہت واضح ہوگیا تھا۔۔۔ یہ بھی یقیناً اسرائیل بہت اچھی طرح جانتا ہے چنانچہ اس نے بعض جملوں کے ذریعے پاکستان کے بارے میں محض اظہار پر اکتفا نہیں کی بلکہ عملًا اپنی حکمت عملی کا ہدف ہمیں بنایا۔ اس نے ہمارے دشمن انڈیا سے خصوصی تعلقات قائم کیے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ان تعلقات اور معاہدوں کو حال ہی میں بہت وسعت دی گئی ہے۔ یہود وہنود کی مشترکہ حکمت عملی کے لیے بے حد کام کیا گیا ہے۔۔ ان تعلقات پر جواہر لال نرویونیورسٹی (دہلی) میں ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا گیا ہے۔

عالم اسلام) THE UNHOLY ALLIANCE پاکستان نقطہ نظر سے ایک کتاب کیخلاف ہند اسرائیلی تعاون پر) محمد حامد صاحب کی لکھی ہوئی جون 1978ء میں شائع ہوئی۔ اسلامی ریسرچ اکیڈمی کراچی کے ریسرچ مصباح الاسلام فاروقی مرحوم نے صہونیت

کے عالم اسلام کے خلاف اس کے عزائم کو واضح کرنے کیلئے عالم اسلام میں پہلی مرتبہ اس کا اردو میں jewish conspiracy کام کیا اور اسے ایک کتاب کی شکل دی۔ ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ایوب خان کے دور میں اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ بعد میں شدید دباؤ کے تحت ہی یہ پابندی ختم کردی گئی تھی۔ فری میسن لاج پر جو عالمی جمہوریت کا ایک حصہ ہے پر پاکستان میں پابندی لگادی گئی۔ 1974ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران جب قادیانی خلیفہ مرزا ناصر قومی اسمبلی کی کمیٹی میں پیش ہوا تو اس الزام سے انکار کیا کہ قادیانیوں کا کوئی مشن اسرائیل میں ہے۔ لیکن 1971ء میں اسرائیلی مذاہب کے بارے میں ایک کتاب اسرائیل سے شائع ہوئی۔ جس میں بتایا گیا کہ اسرائیل میں اسوقت 600 پاکستانی قادیانی موجود ہیں۔ اور انہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ بھی واضح طور پر تحریر تھا کہ قادیانی اسرائیلی افواج میں شامل ہو سکتے ہیں۔ (جبکہ اسرائیل میں موجود عرب مسلمانوں کو اسرائیلی فوج میں داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔)ڈان کراچی (17اگست 1970ء) میں تحریر کیا گیا۔ پچھلے چند برسوں سے امریکہ، یورپ اور بین الاقوامی ادارے پاکستان کے ایٹمی تحقیق کے پروگرام کو شک اور تشویش کی نظر سے دیکھ رہی ہے اسرائیلی لابی کے لوگوں نے مغربی ڈپلومیٹس کو یہ باور کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ کہ مسلم ممالک میں پاکستان ہی ایٹمی ہتھیار بنا سکتا ہے۔ اس امر کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ امریکی حکومت نے پاکستان کے ایٹمی ترقی کے پروگرام کو تباہ کرنے کے لیے ایک

ٹاسک فورس قائم رکھی ہے۔

امریکی ذرائع ابلاغ میں اسرائیل نواز حلقوں نے پاکستان کے خلاف تیزی سے مہم شروع کر رکھی ہے۔ امریکہ نے ۱۹۷۶ ہی میں فرانس پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس معاملے میں پاکستان کی مدد نہ کرے۔ کارٹر انتظامیہ نے کسنجر کی لائن پر چلتے ہوئے پاکستان کی اقتصادی امداد بند کردی صرف اس بات کی سزا دینے کیلئے کہ پاکستان کیوں فرانس سے ری پرسسنگ پلانٹ لے رہا ہے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف جاری مہم کو جو کئی برسوں سے جاری ہے۔ اب ختم ہونا چاہئے۔ پاکستان نے توانائی کے شعبے میں پیش رفت کے لئے کراچی کا ایٹمی بجلی گھر شروع کیا تھا۔ لیکن پاکستان کے دشمنوں نے اسے اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔ جس کے نتیجے میں یہ ملک توانائی کے بحران کا شکار ہے۔ پاکستان واحد ملک ہے جو درمیانے درجے کی ایٹمی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اس کا یہ سلسلہ کامیابی سے جاری ہے۔ اس نے اب ذمہ دار جوہری سائنسدانوں کی باقاعدہ ٹیم تیار ہے۔ جو اپنے ایٹمی پروگرام کو چلانے اور محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پاک افواج بھی اپنے اس صلاحیت اور ذمہ داری سے واقف ہے۔ امریکہ اور مغربی دنیا کو اس مرحلے پر یہ سوچنا چاہئے کہ اگر پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کو پرامن اور توانائی کی سہولتوں کے لئے مواقع فراہم کئے گئے

تو یہ ملک نہ صرف امن عالم کی بقا۔ کے لئے مفید کردار ادا کر سکتا ہے۔ بلکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھی فرنٹ لائن پر اپنا بھرپور کردار ادا کر سکتا ہے۔

جناح پور سے آزاد بلوچستان تک

پاک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ میجر جنرل اطہر عباس کا تعلق ایک علمی ادبی اور صحافتی گھرانے سے ہے۔ آئی ایس پی آر کی ویب سائٹ پر انہوں نے سول ملٹری تعلقات کے حوالے سے اپنے خصوصی مضمون میں کہا ہے کہ سول ملٹری تعلقات میں بہتری کیلئے قومی سلامتی کونسل جیسے اداروں کا قیام اہمیت کا حامل ہے۔ انٹیلی جنس اداروں کو سیاسی مقاصد یا ڈیلنگ کیلئے استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ حکومت اور اپوزیشن پارلیمنٹ کی دفاعی کمیٹیوں کے ارکان کا انتخاب احتیاط سے کریں۔ کسی بھی ادارے یا فرد کو آئین کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ جنگیں کبھی عوامی حمایت کے بغیر نہیں جیتی جاسکتیں۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں ملک میں نہ صرف بدترین سیاسی بحران پیدا ہوا بلکہ پاک فوج کا تشخص بھی بری طرح متاثر ہوا۔ انہوں نے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ ' فوج یہ چاہتی ہے کہ اس کی دفاعی ضروریات ترجیحی بنیادوں پر پوری ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ سول محکموں میں حاضر سروس یا ریٹائرڈ فوجی افسروں کی تقرری کی بھی سول انتظامیہ اور بیوروکریٹس کے درمیان تشویش کا باعث بنتی ہے حالانکہ حکومتی پالیسی کے تحت منتخب اداروں میں حاضر سروس یا ریٹائرڈ فوجی افسروں کیلئے دس فیصد کوٹہ مقرر ہے تاہم سول اداروں میں فوجی افسروں کی طویل تقرری بھی پاک فوج کی ساکھ کیلئے درست نہیں'

چنانچہ یہ تقرریاں انتہائی محدود ہونی چاہئیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات واضح کی کہ انٹیلی جنس اداروں کو سیاسی مقاصد یا ڈیلنگ کیلئے استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ آج میڈیا میں اچھالا جانے والا لاپتہ افراد کا معاملہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے۔ آئی ایس پی آر کے ماضی قریب کے ذمہ داروں کے برعکس میجر جنرل اطہر عباس کا رویہ میڈیا کے بارے میں بڑی حد تک حقیقت پسندانہ ہے۔ پاکستان کی سیاست میں خرابیوں کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سے ہمارے انٹیلی جنس کے اداروں کا اثر نفوذ سیاست میں زیادہ دخیل ہوا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ لیکن اس کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں سندھو دیش، پختونستان، آزاد بلوچستان، اور جناح پور جیسے منصوبے تخلیق کئے جاتے رہے۔ اور ان منصوبوں کی آڑ میں سیاسی کارکنوں کا قتل عام کیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۲ میں سندھ میں جئے سندھ کی تحریک کا ہوا کھڑا کیا گیا۔ اور سندھ میں بڑے پیمانے پر سندھی مہاجر فسادات ہوئے۔ جس کے اثرات اب بھی سندھ کی سیاست میں پائے جاتے ہیں۔ پھر بھٹو دور میں اے این پی کو نشانہ بنایا گیا، ولی خان سمیت اے این پی کی ساری قیادت کو غدار قرار دیا گیا۔ اور حیدرآباد جیل میں ان کے خلاف مقدمے بنائے گئے۔ بعد میں یہی رہنما قومی اتحاد کے صف اول کے رہنما قرار پائے۔ اس دور میں بلوچستان پر فوج کشی کی گئی۔ اور وہاں کے جمہوری رہنما، سردار عطاللہ مینگل، سردار غوث

بخش بزنجو، سمیت ہزاروں افراد کو ملکی سیاست سے متنفر کر دیا گیا۔ ضیاء الحق کے پورے دور میں سندھ کے گاؤں گھوٹوں کو تختہ مشق بنایا گیا۔ جس کے بطن سے ایم آر ڈی کی تحریک نے جنم لیا۔ سندھ میں شہری سیاست میں ایم کیو ایم کی آمد سے سندھ میں بسنے والے لاکھوں مہاجر نوجوانوں کے دلوں میں اس بات کی امید پیدا ہوئی تھی کہ کوٹہ سسٹم کا خاتمہ ہوگا۔ شہری یونیورسٹی (جو حیدرآباد کے شہریوں کا جائز مطالبہ ہے) قائم ہوگی، اور مہاجر کے حقوق کو تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن ۱۹۸۸ کے بلدیاتی انتخاب میں کامیابی کے بعد ایم کیو ایم کا ایسا پیچھا کیا گیا کہ ۱۹۹۲ میں اس تنظیم کو مٹانے کے لئے آپریشن کا سہارا لیا گیا۔ اسٹیبلشمنٹ کو ایم کیو ایم کا سیاست میں آنا اس قدر ناگوار گزرا کہ 19 جون 1992ء کو ایم کیو ایم کے خلاف بدترین ریاستی آپریشن کا آغاز کر دیا گیا۔

اس دوران ایم کیو ایم کے ہزاروں ذمہ داران وکارکنان، سینیٹ وارکان اسمبلی ہمدردوں ایم کیو ایم کے چیئرمین عظیم احمد طارق، الطاف حسین کے بڑے بھائی ناصر حسین اور جواں سال بھتیجے عارف حسین کو بھی نہایت بے رحمی سے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد ماورائے عدالت قتل کر دیا گیا۔ اس بدترین آپریشن کے دوران سرکاری اہلکاروں نے الطاف حسین کے دیگر عزیز واقارب کو بھی گرفتار کرکے بے رحمانہ تشدد کیا اور انہیں ذہنی ٹارچر کیا۔ ہزاروں مہاجر نوجواں ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ آخر مہاجر قومی موومنٹ کو 27 جولائی 1997 کو متحدہ قومی موومنٹ بن جانا پڑا۔

گزشتہ روز ایک ٹی وی مذاکرے میں کہا گیا ہے کہ 1992ء میں متحدہ کے خلاف آپریشن کے دوران جناح پور کے نقشے کی برآمدگی ایک ڈرامہ تھی۔ ایم کیو ایم کے دفتر سے ایسا کوئی نقشہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ ایک نجی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے انٹیلی جنس بیورو کے سابق ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیئر (ر) امتیاز کا کہنا تھا کہ جناح پور کا نقشہ قوم میں نفاق ڈالنے کی سازش تھی جبکہ اس بارے میں کراچی کے اس وقت کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر کا کہنا ہے کہ انہیں ایسے نقشے کا کوئی علم نہیں تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہ کون لوگ تھے جو ملک اور قوم کے مستقبل سے کھیل رہے تھے، اور اب بھی یہ کون لوگ ہیں جو بلوچستان، سرحد اور سندھ میں یہ کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی تو ان کو نکیل ڈالنے والا ہونا چاہیئے۔ اس ملک میں سیاست کرنے والی جماعتیں سب محب وطن ہیں۔ سب کا اس دھرتی سے رشتہ ہے، سب اس کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس ملک کے وسائل میں سے ان کو بھی حصہ دیا جائے، وہ بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں، ہندوستان، افغانستان میں دودھ اور شہد کی نہریں نہیں بہہ رہی کہ لوگ ان کے ایجنٹ بن کر اس پاک دھرتی کو نقصان پہنچائیں۔ یہ ہماری نالائقی ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو ناراض کردیا ہے، ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے، سوچنا چاہیے، اور

اس کا مداوا کرنا چاہیے۔

سی آئی اے کے بھیانک جرائم

محمد جواد کو بھی ان ہزاروں افراد کی طرح پانچ سال بعد گوانتا ناموبے جیل سے رہا کردیا گیا جن پر امریکیوں نے جھوٹے الزام لگائے تھے۔ جواد پر دو امریکی فوجیوں پر حملہ کرکے زخمی کرنے کا الزام عائد تھا۔ اس وقت جواد کی عمر ۲۱ سال تھی۔ انسانی حقوق کی تنظیموں اور اداروں کے لئے یہ ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ محمد جواد کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ اسے گوانتانا موبے کی خوفناک جیل میں کیا کیا اذیتیں دی گئی ہوں گی۔ اس کا بچپن اس سے چھین لیا گیا۔ عالمی عدالت انصاف کب تک سوتی رہے گی۔ امریکیوں کے بھیانک جرائم پر کب تک پردہ پڑا رہے گا۔ سی آئی اے کی جانب سے دورانِ تفتیش مشتبہ دہشتگردوں پر جو تشدد کیا جاتا رہا اس کی تفصیلات آہستہ آہستہ منظر عام پر آ رہی ہیں۔

بدنام زمانہ گوانتانا موبے میں قیدیوں کو خوفزدہ کرنے کیلئے ان کے سیل سے ملحقہ کمروں میں دیگر قیدیوں کے قتل کا ڈرامہ رچا کر تفتیش کیے جانے اور شدید نفسیاتی دباؤ ڈالے جانے کا انکشاف ہوا ہے۔ امریکی میڈیا کے مطابق عنقریب جاری کی جانے والی سی آئی اے کی رپورٹ میں گوانتانا موبے جیل کے قیدیوں سے وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک کیے جانے کا واضح تذکرہ موجود ہے۔

رپورٹ کے مطابق قیدیوں میں جان سے مارے جانے کا خوف پیدا کرنے کیلئے ان کے سیل سے ملحقہ کمروں میں باقاعدہ فائرنگ اور ہنگامہ آرائی کر کے قیدی کو عدم تعاون پر قتل کرنے کا بھرپور ڈرامہ رچایا جاتا تھا۔ قیدیوں کو نشانے پر لے کر فائر کرنے کا ڈرامہ کیا جاتا اور ڈرل مشین کو جسم کے حساس اعضاء کے قریب چلا کر انہیں دہشت زدہ کیا جاتا رہا۔ میڈیا کے مطابق یہ رپورٹ سی آئی اے کے ایک انسپکٹر جنرل نے 2004 میں تیار کی تھی جو اب جلد منظر عام پر لائی جانے والی ہے.

سی آئی اے کی ان دستاویزات سے پتہ چلا ہے کہ دوران تفتیش نائن الیون کے مبینہ ماسٹر مائنڈ خالد شیخ محمد کو بچوں کے قتل تک کی دھمکی دی گئی تھی۔ تاکہ اس سے اعتراف کرایا جاسکے۔ حال ہی میں محکمہ انصاف کی اخلاقیات کی کمیٹی نے اٹارنی جنرل ایرک ہولڈر سے سفارش کی تھی کہ درجن بھر ملزمان سے کی جانے والی تفتیش کے دوران تشدد کے واقعات کی ازسر نو تحقیق کرائی جائے۔ ان واقعات کی ازسر نو تحقیقات کی صورت میں سی آئی اے کے اہلکاروں کے خلاف قانونی کارروائی کے راستے کھل جانے کے امکانات ہیں۔ اس سلسلے میں ایک خصوصی وکیل کی نامزدگی بھی عمل میں آئی ہے۔ یہ نامزدگی ایسے وقت کی گئی ہے جب سی آئی اے کے متنازع تفتیشی طریقوں پر چند برس قبل جاری کی جانی والی رپورٹ کے وہ سنسر شدہ حصے ظاہر کیے جا رہے ہیں جن کے مطابق درجنوں مواقع پر سی آئی

اے اہلکاروں نے مشتبہ شدت پسندوں کو ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا۔ پچھلے دنوں ایک عدالت نے حکم دیا تھا کہ سی آئی اے کے تشدد پر رپورٹ کے ان خفیہ حصوں کو منظر عام پر لایا جائے جنھیں بش انتظامیہ نے کلاسیفائیڈ کر دیا تھا۔ ان جرائم کی شدت کو دیکھتے ہوئے صدر باراک اوباما نے دہشت گردی کے اہم ملزمان سے تفتیش کرنے کے لیے ایک نیا یونٹ تشکیل دینے کی منظوری دی ہے جس میں سکیورٹی کے مختلف اداروں کے انتہائی پیشہ ور تفتیش کار شامل ہوں گے اور تشدد جیسے غیر قانونی طریقوں پر پابندی ہوگی۔

امریکی صدر باراک اوباما انتظامیہ نے سی آئی اے کے حراستی مراکز میں قیدیوں پر دوران تفتیش غیر قانونی تشدد کے نئے انکشافات کے بعد اس معاملہ کی تحقیقات کرنے پر غور شروع کر دیا۔ امریکی ذرائع ابلاغ کے مطابق امریکی اٹارنی جنرل ایرک ہولڈر قیدیوں سے تفتیش کے سی آئی اے کے طریقہ کار کی تحقیقات کیلئے خصوصی پراسیکیوٹر مقرر کرنے پر غور کر رہے ہیں۔ حکام کے مطابق قیدیوں سے تفتیش کے دوران انہیں جان سے مار دینے کی دھمکیوں جیسے غیر قانونی طریقوں کے استعمال پر سی آئی اے کے کل 6 اہلکاروں کے کیس محکمہ انصاف کو بھجوائے گئے جن میں سے صرف ایک کو سزا ہوئی بلکہ باقی کے بارے میں سی آئی اے کے تحقیقاتی بورڈ کے ذریعہ پوچھ گچھ کی ہدایت کی گئی۔ تاہم ان میں سے دو نے سی آئی اے بورڈ کے سامنے پیش ہونے کی بجائے ملازمت سے استعفیٰ دے

دیا۔ سی آئی اے کے حوالہ سے امریکی اٹارنی جنرل کی رپورٹ پر سی آئی اے کو انسانی حقوق کے اداروں کی طرف سے سخت تنقید کا سامنا ہے۔ خود سی آئی اے حکام پریشان ہیں کہ وہ اپنے ان غیر قانونی اقدامات کا دفاع کس طرح کریں۔

امریکی صدر باراک اوباما نے خطرناک قرار دیئے گئے دہشت گردوں سے تفتیش کیلئے اعلیٰ اختیاراتی گروپ تشکیل دینے کی بھی منظوری دیدی ہے۔ امریکی عہدیدار کے حوالے سے رپورٹ میں کہا ہے کہ صدر باراک اوباما کا یہ اقدام حراست اور تفتیش میں تبدیلی کے طریقوں سے متعلق پالیسی کا حصہ ہے۔ اعلیٰ اختیاراتی گروپ کا نام ہائی ویلیو ڈیٹینی انٹروگیشن گروپ رکھا گیا ہے۔ یہ گروپ انٹیلی جنس ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ماہرین پر مشتمل ہوگا۔ اخبار کے مطابق اس اقدام کا مقصد قیدیوں کی حراست اور ان سے تفتیش کے اختیارات کو سی آئی اے کے بجائے وائٹ ہاوس کے کنٹرول میں لانا ہے۔

نئی پابندیوں کے پیش نظر سی آئی اے نے بھی اپنی حکمت عملی میں تبدیل کرلی ہے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پینیٹا نے اپنے ساتھیوں کو ایک ای میل بھیجی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کا تحفظ کریں گے جنھوں نے اپنے ملک کے لئے خدمات انجام دی ہیں۔ اور انہیں قانونی امداد دی جائے گی۔ سی آئی اے کے اہلکاروں کو ممکنہ جرائم کے مقدمات کا سامنا کرنے کی

صورتحال پیش آسکتی ہے۔ جرمنی کے ایک ہفت روزہ نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ امریکی سی آئی اے نے گوانتا ناموبے کے قیدی منتقل کرنے کے لئے بلیک واٹر کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ جرمن ہفت روزے کے مطابق سی آئی اے نے گوانتا ناموبے کے قیدیوں کو اشیاء منتقل کرنے کے لئے بدنام زمانہ بلیک واٹر کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ ہفت روزے نے بلیک واٹر کے دو سابق اہلکاروں کے حوالے سے بتایا ہے کہ بلیک واٹر قیدیوں کو مختلف ممالک منتقل کرے گی جہاں قیدیوں پر تشدد میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ ان ممالک میں ممکنہ طور پار پاکستان، افغانستان یا ازبکستان ہو سکتے ہیں۔ جہاں کے عقوبت خانوں میں قیدی لائے جائیں گے اور ان سے مزید پوچھ گچھ کی جائے گی۔ پاکستان کو یقیناً امریکی سی آئی اے کے جرائم میں حصہ دار نہیں بننا چاہئے۔ یوں بھی ابھی ان چار ہزار گمشدہ افراد کے تلاش جاری ہے۔ جو دہشت گردی کے شبہے میں غائب کر دیے گئے ہیں۔ عالمی انسانی حقوق کے اداروں کے بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مظالم پر آواز اٹھائیں۔

مفت کھانا گھر

ان دونوں میاں بیوی سے میری یونیورسٹی کے زمانے سے واقفیت ہے۔ دونوں یونیورسٹی میں پڑھے۔ دوستی رفاقت اور شادی کے بندھن میں بندھ جانے کے بعد بھی دونوں میں کچھ کرنے کی جستجو تھی۔ ایک بنگالی اخبار سے وابستگی کی وجہ سے کبھی کبھار، خالد سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک عرصے بعد خالد سعید اور ان کی اہلیہ پروین سعید نے سرجانی میں مفت کھانا گھر پروجیکٹ شروع کیا۔ اب اس کی کئی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ بلکہ اب تو میڈیکل سینٹر اور تعلیم گھر بھی قائم ہوگیا ہے۔ پروین سعید کا کہنا ہے کہ اس بستی میں ہونے والے ایک واقعے نے ان کی زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔ ایک عورت نے فاقہ کشی سے تنگ آکر اپنے دو بچوں کو ہلاک کرکے خودکشی کرلی۔ اس واقعے کے بعد پروین سعید نے ایک مفت کھانا قائم کیا۔ جہاں دو رپے میں ایک وقت کا کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ کھانا گھر علاقے میں مقبول ہوگیا۔ اس کار خیر میں اب بہت سے لوگ مدد کر رہے ہیں۔ سول اسپتال کے پیچھے سے گزرتے ہوئے مین فٹ پاتھ پر سیلانی ٹرسٹ کے کارکنوں کو دیکھتا ہوں۔ جو صبح سویرے سے اپنا کام شروع کردیتے ہیں۔ سیلانی ٹرسٹ روزانہ سٹی کورٹ، اور دیگر جگہوں پر غریب اور نادار افراد کو مفت کھانا کھلاتا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ جو بغیر کسی شہرت،

اور خود نمائی کے لاکھوں روپے روزانہ خیراتی کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ نیو چالی پر دوپہر کے وقت ایک جگہ پر میں نے لوگوں کی قطار لگی دیکھی۔ یہ علاقے میں محنت مزدوری کرنے والے، اور نچلے درجے کے سفید پوش ملازمین تھے، جو مفت کھانے کے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ اس علاقے کے رحمدل تاجروں کی جانب سے دوپہر کے وقت کے کھانے کا یہ سلسلہ کئی برس سے جاری ہے۔ جس میں لوگ تعاون کرتے ہیں۔

رمضان المبارک یوں بھی نیکیوں اور رحمتوں کا مہینہ ہے۔ صدقات، خیرات، زکواۃ، اس مہینے میں ادا کرنے کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن، شوکت میموریل ٹرسٹ، خدمت خلق فاؤ نڈیشن، ایدھی ٹرسٹ، ایس آئی یو ٹی، سمت ہزاروں ادارے ہیں جو انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان اداروں کے پیچھے وہ مخیّر حضرات ہیں۔ جو ان اداروں کی مدد کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کو ان ہی اداروں اور افراد نے سہارا دیا ہوا ہے۔ معاشی بحران ہمارے یہاں ہی نہیں ہے بلکہ اس نے امریکہ میں بھی دستک دی ہوئی ہے۔ وہاں بھی جاری معاشی بحران نے کئی امریکی خاندانوں کے لئے پیٹ بھر کھانے کا حصول مشکل بنا دیا ہے۔ واشنگٹن کے فیڈنگ امریکہ نامی ادارے کے ایک سروے کے مطابق گزشتہ سال کے دوران ضرورت مند افراد کے لئے قائم امریکی فوڈ بینکس میں فراہم کئے جانے والے کھانے کی طلب میں 30 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ خصوصاً ان متوسط گھرانوں میں جو معاشی بحران میں

اپنی ملازمتوں سے محروم ہوئے۔ ان کے لئے بچوں کی پرورش ایک امتحان بنی ہوئی ہے۔ جائیداد کی خرید وفروخت کرنے والی ایک کمپنی سے نوکری ختم ہونے کے بعد اب یہ بے روزگاری کے دن کاٹنے والی ایک ماں کا کہنا ہے کہ اپنے بچوں کے کھانے کی ضرورت کے لئے فلوریڈا کے نواح میں واقع ایک فلاحی تنظیم کے تحت کام کرنے والے مفت باورچی خانے کا رخ کرنا پڑا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ یہ امریکہ کی اس تیزی سے بڑھتی پھیلتی مڈل کلاس کا حصہ ہیں جو امریکہ کی معاشی ست روی کے اثرات جھیل رہی ہے۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے مالی حالات چند سال پہلے تک انتہائی خوشگوار تھے۔ صرف پچھلے سال تک یہ لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں پھرتے تھے، انہیں کبھی مدد مانگنی نہیں پڑی تھی۔ امریکہ میں معاشی مندی جہاں متوسط طبقے کی اکثریت کی ملازمتیں ہڑپ کر چکی ہے، وہاں عوام کے عطیات سے چلنے والے ادارے بھی مالی مسائل کا شکار ہیں۔۔ گزشتہ سال امریکہ کے دو تہائی خیراتی اداروں کو ملنے والی رقوم میں دو فیصد کمی ہوئی۔ لیکن ہمارے یہاں کار خیر کے کاموں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔۔۔۔ جو شخص میرے نام پر ایک درہم دیتا ہے۔ میں اسے دس عطا کرتا ہوں۔ جو ایک بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے۔ اسے دس کا کھانا ملتا ہے۔ اپنے رزق کو بڑھاؤ گھٹاؤ نہیں۔۔۔ (کیمیائے سعادت

آٹے چینی پر عوام کی ذلت

سٹی ناظم سید مصطفیٰ کمال کے کارناموں میں سب سے بڑھ کر پریڈی اسٹریٹ کی تعمیر ہے۔ جس کے ذریعہ کراچی کے عوام کو بندر روڈ کے متبادل ایک نیا راستہ ملا ہے۔ ابھی اس سڑک پر کئی مسائل ہیں۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اس سڑک کی تعمیر سے لائینز ایریا کی آبادی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ دونوں طرف کی آبادی کو ایک دوسری طرف جانے کے لئے سڑک پر نہ تو درمیان میں کوئی کٹ دیئے گئے ہیں، اور نہ ہی بچوں، خواتین کو آنے جانے کے لئے کوئی محفوظ راستہ جس کی وجہ سے آئے دن حادثات کا دھڑکہ لگا رہتا ہے۔ صدر میں ایمپریس میں ٹریفک آ کر پھنس سا جاتا ہے۔ بس والے بسوں کا آڑھا تیڑھا کرکے راستہ بند کردیتے ہیں۔ جس کے لئے ٹریفک پولیس بھی بے بس نظر آتی ہے۔ نو تعمیر شدہ پریڈی اسٹریٹ صدر میں قائم پتھارے، ٹھیلے اور دیگر تجاوزات قائم ہیں۔ جن سے سٹی حکومت کے اہلکار گزشتہ چار دن سے نبرد آزما ہیں۔ اور اب یہ جگہ میدان جنگ بنی ہوئی ہے۔ دو دن پہلے تجاوزات کرنے والوں نے فائرنگ کرکے ٹریفک مینجمنٹ پر مامور سٹی وارڈنز کے 6 اہلکاروں کو شدید زخمی کردیا تھا۔ جس کے باعث پریڈی اسٹریٹ صدر میں ٹریفک معطل ہوگیا۔ اب بھی یہاں پولیس مامور ہے۔ اور کسی بھی ناخوشگوار حادثہ کا امکان ہے۔ سٹی حکومت، اور ڈی سی او شہر سے گرانی، ذخیرہ اندوزی، ناجائز

منافع خوری کے خاتمے کے لئے سرگرداں ہیں۔ لیکن پھل فروش، سبزی فروش، دودھ چینی، گوشت بیچنے والے اب کسی کی نہیں سنتے، قانون ان کے لئے موم کی ناک ہے،، جسے جب چاہے رشوت اور بھتہ دے کر جیسے چاہے موڑا جا سکتا ہے۔ رمضان المبارک میں افطار اور سحر کے موقع پر بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے عوام کی زندگی عذاب کر دی ہے۔
اس مستزاد یہ کہ حکومت نے رواں سال اکتوبر سے بجلی کے نرخ میں بتدریج مزید 24 فیصد اضافے کا فیصلہ کرلیا ہے جس سے مجموعی طور پر بجلی کا ہر یونٹ 24 فیصد مہنگا ہو جائے گا۔ بجلی کے نرخوں میں اضافہ ان چند شرائط کا حصہ ہے جو عالمی مالیاتی فنڈ نے حکومت پاکستان کو اضافی قرض فراہم کرنے کے لیے مقرر کی تھیں۔ اس طرح حکومت کی جانب سے بجلی پر دی جانے والی سبسڈی ختم کر دی جائے گی۔
آٹے کے لئے پریشان اور غریب لوگوں کو ایک وزیر کی جانب سے تھپڑ مارنا باعث افسوس ہے۔ چینل پر عوام کی بے توقیری کے مناظر عام ہیں۔ عوام کو آٹا بھیک کی صورت میں دیا جا رہا ہے۔ حکومت گراں فروشی اور ذخیرہ اندوزی کے خاتمے میں ناکامی کا غصہ عوام پر نکالا جا رہا ہے۔ حکومت عوام کو ریلیف دینے کے مؤثر اقدامات کرنے چاہیے تھے۔ شہریوں کو رعایتی قیمت 10 روپے فی کلو کے حساب سے آٹے کی فروخت ایسے بے ہنگم طریقے پر کی جارہی ہے، جس سے حکومت کا امیج متاثر ہو رہا ہے۔ اس پر عوام کے غم وغصے کا اندازہ اس سے کیا جاستا ہے کہ اب

تک سستے آٹے کے پانچ ٹرک عوام کی جانب سے لوٹے جاچکے ہیں۔ پھر اس آٹے کی چور بازاری بھی ہو رہی ہے۔

مہنگائی کے خلاف سٹی حکومت کے مجسٹریٹس نے گرانفروشوں کے خلاف کریک ڈاؤن جاری کر رکھا ہے۔ علاقوں میں اچانک چھاپے مار کر دکانداروں کو گرفتار کرکے جیل کی سزا سنائی جارہی ہے۔ گرانفروشوں کے چالان کرکے لاکھوں روپے جرمانہ کیا جارہا ہے۔ لیکن شہریوں کو مقررہ قیمتوں پر آٹا، چینی، فروٹ، سبزی اور کریانہ آئٹمز کی دستیابی نہیں ہو رہی ہے۔ وزیراعلیٰ سندھ کی ہدایت پر کراچی سے تعلق رکھنے والے صوبائی وزرعا مشیروں اور اراکین سندھ اسمبلی پر مشتمل 4 ٹیمیں تشکیل دی گئی ہیں جو رمضان ، المبارک کے دوران قیمتوں کی نگرانی کریں گی اور مختلف مارکیٹوں میں چھاپے ماریں گی۔ لیکن حکومت نے اس کوڑے کو بہت تاخیر سے حرکت دی ہے۔ اب جبکہ پورا نظام خراب ہوچکا ہے۔ اور ہر گروہ من مانی کر رہا ہے تو معاشرہ میں تبدیلی کیسے آئے گی۔ اس پر حکومت کو سوچنا چاہیئے اور طویل المدت منصوبہ بنانا چاہیے۔ رمضان یکایک تو نہیں آئے نہ ہی چینی اور آٹا اچانک مہنگا ہوا ہے۔ اس میں ہمارے پالیسی سازوں کا عمل دخل ہے۔

امریکی سفیر کی تردید یا تصدیق

یہ پہلی بار ہوا ہے کہ امریکی سفیر کو پاکستان میں امریکی عزائم کے بارے میں وضاحت کرنی پڑی ہو۔ امریکہ نے اس سرزمین کو اپنی جاگیر سمجھا ہے، اور شائد اسی لئے امریکی سفیر یہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ ہم پاکستان کو بھاری امداد دے رہے ہیں۔ اس لئے سفارتخانے کی توسیع کی جارہی ہے، امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن نے سابق صدر پرویز مشرف کے ساتھ کسی خفیہ ڈیل کی تردید تو کی لیکن انہوں یہ اعتراف بھی کیا کہ امریکی سفارت خانے نے اسلام آباد میں ۱۸ ایکڑ اراضی خریدی ہے، یوں پاکستان میں امریکی سفارت خانہ وہ پہلا سفارت خانہ ہے جس کے پاس پاکستان میں سب سے زیادہ اراضی ہے۔ امریکی سفیر نے اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے پاس دو سو مکانات ہیں۔ ظاہر ہے یہ ۱۲۰ گز والے مکانات نہیں ہیں۔ ۱۰۰۰ گز کے مکانات بھی ہوں گے تو اس کا مطلب ۲۰۰ ہزار گز زمین ہوا۔ امریکی سفیر کا ارشاد ہے کہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کیلئے امداد میں اضافہ کے باعث سفارتخانہ کے انفراسٹرکچر میں توسیع کی ضرورت ہے اور توسیع کا عمل مکمل ہونے کے بعد بھی امریکی میرینز کی تعداد 20 سے کم رہے گی۔ انہوں نے سفارتخانہ میں امریکی میرینز کی تعداد میں خطرناک اضافہ کی رپورٹوں کی تردید کی اور کہا کہ اس وقت 9 میرینز سفارتخانہ میں

کام کر رہے ہیں جن کی ذمہ داری سفارتخانہ کے اندر سیکورٹی کو یقینی بنانا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دنیا بھر میں امریکہ کے 150 سفارتخانوں کی اندرونی سیکورٹی کیلئے ایک ہزار میرینز تعینات ہیں۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ صرف پاکستان میں ہزاروں میرینز تعینات کر دیئے جائیں اور ان میرینز کی ذمہ داری صرف سفارتخانہ کے اندر کی سیکورٹی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت سفارتخانہ میں 250 مستقل امریکی عملہ ہے جبکہ ایک ہزار سے زائد پاکستانی عملہ مختلف سیکشنز میں کام کر رہا ہے اور 200 عارضی عملہ ہے۔ ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ امریکہ کو پاکستان میں جاسوسی کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی اس مقصد کیلئے سفارتخانہ میں توسیع کی ضرورت ہے۔ امریکی سفیر نے سابق صدر پرویز مشرف کے ساتھ کسی خفیہ ڈیل کی تردید کی۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ۸۱ ایکڑ اراضی کی خریداری کا یہ معاہدہ کس دور میں اور کن شرائط و ضوابط کے تحت ہوا۔ اور کیا کل بھارت بھی پاکستان سے ایسی ہی سہولیات مانگے۔ تو پاکستان کی حکومت بھارت کو یہ سہولتیں دے گی۔

امریکی سفیر نے بلیک واٹر کی خدمات حاصل کرنے کی اطلاعات کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ سفارتخانہ اور بلیک واٹر کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں، نہ ہی بلیک واٹر امریکی محکمہ خارجہ کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ لیکن اس بارے میں اب بھی اطلاعات ہیں کہ بلیک واٹر پاکستان میں کام کر رہی ہے۔ اور ہوٹل میرٹ

اسلام آباد میں جو حملہ ہو تھا وہ انھی میرین کے شبے میں کیا گیا تھا۔ اس بات کی بھی اطلاعات ہیں کہ امریکہ پاکستان اور افغانستان کے معروضی حالات کو مد نظر رکھ کر اپنے فوجی افسران کی خصوصی تربیت کیلئے انٹیلی جنس کا دائرہ بڑھا رہا ہے۔ امریکی ذرائع ابلاغ کے مطابق امریکی فوج کے سنٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پٹر اس ہفتے میں انٹیلی جنس ٹریننگ سنٹر کا افتتاح کرنے والے ہیں۔ اس سنٹر کو "سنٹر فار افغانستان پاکستان ایکسی لینس" کا نام دیا گیا۔ ذرائع کے مطابق امریکی دفاعی انٹلی جنس ایجنسی کے ریٹائرڈ کرنل دیرک ہاروے اس سنٹر کے سربراہ ہوں گے۔ انٹیلی جنس سنٹر میں مستقبل کے تجزیہ نگاروں اور افسران کو تربیت دینے کے علاوہ انہیں پشتو اور دیگر علاقائی زبانیں سکھائی جائیں گی۔ یہ تمام تر تیاریاں خطے میں امریکہ کی طویل المدتی موجودگی کا اظہار ہیں۔ جس پر اس ملک کے عوام اور سیاسی قائدین کی تشویش کا بے وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

حال ہی میں امریکی فوج کے سربراہ ایڈمرل مائیکل مولن نے پھر کہا ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ کرنیوالے منصوبہ ساز تاحال زندہ ہیں اور وہ امریکا پر مزید حملوں کی سازش کر رہے ہیں۔ امریکن لیجن کے اکانوے سالانہ کنونشن کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے ایڈمرل مائیک مولن نے کہا کہ گیارہ ستمبر کو امریکا پر حملے کرنے والے نہ صرف زندہ ہیں بلکہ وہ حملوں کی سازش پاک افغان

سرحدی علاقے سے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ پاکستان اور افغانستان میں سے کوئی ایک یا دونوں ممالک انتہا پسند نظریے کے شکنجے میں آ جائیں۔ مولن کا کہنا تھا کہ امریکی صدر براک اوباما کی جانب سے ان کو یہی مشن سونپا گیا ہے کہ وہ اس سازش کو ناکام بنا دیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان بھی انتہا پسندوں سے جنگ جاری رکھے ہوئے ہے جبکہ ایساف کے زیر اہتمام افغانستان میں القاعدہ اور اسکے اتحادیوں کیخلاف جنگ جاری ہے، اسلئے انہوں نے پاکستان افغانستان کورڈی نیشن سیل کو احکامات جاری کیے ہیں کہ وہ خطے کے مسائل پر خصوصی طور پر کام کرے کیونکہ ہمیں ان ممالک کی اس حوالے سے مدد کرنے کی ہے۔

پاکستان ایک آزاد اور جمہوری ملک ہے۔ نائین الیون کے قضیے میں اس کی کوئی براہ راست ملوث ہونے کی بات نہ تھی۔ یہ مشرف ہی کی مہربانی ہے کہ انھوں نے نیند سے اٹھ کر بش کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، جس کے نتیجے میں انہیں ڈالرز تو مل گئے۔ لیکن پاکستان میں امریکی عمل دخل اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب امریکہ نے اسے اپنی زرخرید لونڈی سمجھ لیا ہے۔ مشرف دور کا خاتمہ ہوچکا۔ ان کے دور کے سیاہ کاریوں کا اب حساب ہورہا ہے۔ اور امریکہ سے ہونے والے خفیہ معاہدے بھی ابھی بے نقاب ہونے ہیں۔ ایسے میں حکومت پاکستان کو سفارتی آداب اور قوانین کے مطابق امریکہ کو ملک میں وہی سہولیات دینی چاہیئے جو امریکہ

میں پاکستان کو حاصل ہیں۔ اور جو سفارتی درجہ رکھتی ہیں۔

بھارت میں ایٹمی دھماکوں کا جنون

بھارت میں دفاعی تحقیق وترقی کے ادارے ڈی آر ڈی او کے سینیئر سائنسدان کے سنتھانم نے اا برس بعد دنیا کو یہ کہہ کر حیران کردیا ہے کہ بھارت نے مئی انیس سو اٹھانوے میں پوکھران میں جو جوہری آزمائشی دھماکے کیے گئے تھے، وہ حکومتی دعوؤں کے برعکس پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے دفاعی جوہری پروگرام کو بہتر بنانے کے لیے بھارت کو مزید آزمائشی دھماکے کرنے کی ضرورت ہے۔ سنتھانم آزمائشی جوہری دھماکوں کے وقت پوکھران میں موجود تھے۔ اور اس ٹیم کا حصہ تھے جس نے جوہری دھماکے کئے تھے۔ اب ان کا دعویٰ ہے کہ ’ تھرمونیوکلیر ‘ یا ہائیڈروجن بم کے دھماکوں کی شدت سائنسدانوں کی توقعات سے کہیں کم تھی۔ ۱۹۹۸ میں ہندوستان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی اور انہیں دھماکوں کے بعد پاکستان میں اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف نے بھی زبردست بین الاقوامی دباؤ کے باوجود جوابی آزمائشی دھماکے کیے تھے۔ جوہری دھماکوں کی آزمائش کے وقت پوکھرن میں سابق صدر اے پی جے عبدالکلام اور اس وقت کے قومی سلامتی کے صلاح کار برجیش مشرا بھی موجود تھے۔ لیکن برجیش مشرا نے کے سنتھانم کے دعوؤں کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ٹیسٹ پوری طرح کامیاب رہا تھا اور ایٹمی سائنسدان عبدالکلام نے اس کی تصدیق بھی کی تھی۔ اسی نوعیت کے

دعوے اس وقت غیر ملکی اداروں نے بھی کیے تھے جو اپنے انتہائی حساس آلات سے زیر زمین دھماکوں کی شدت کافی باریکی سے ناپنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ آلات زلزلوں کی شدت ناپنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

کے سنتھانم نے یہ دعویٰ ایسے وقت کیا ہے جب بھارت اپنے جوہری پروگرام کو وسعت دینے میں مصروف ہے اور اس نے حال ہی میں امریکہ، فرانس، اور روس سے اس سلسلے میں نئے معاہدات میں کامیابی حاصل کی ہے۔ بھارت نے ابھی تک سی ٹی بی ٹی کے معاہدے پر دستخط نہیں کئے ہیں۔ بھارتی سائنسدان کے اس دعوے نے دنیا کو جہاں حیران کیا ہے وہاں بھارت میں بھی ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ سینئر جوہری سائنسدان آر آر سبرامنیم نے کے سنتھانم کے دعوی کو قابل یقین کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سنتھانم کو حقیقت کا علم ہوگا کیونکہ وہ اس پورے عمل میں شامل تھے اور ٹیسٹ کے وقت وہاں موجود تھے۔ 'انہی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے جوہری سائنسدان گوپال کرشنا نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا کہ اس وقت بھی ماہرین کو یہ ماننے میں کافی دشواری ہوئی تھی کہ پہلا ہی آزمائشی دھماکہ چالیس کلوٹن کا تھا۔' اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ ٹیسٹ اگر اتنا کامیاب رہا ہے تو یہ ایک غیر معمولی کامیابی ہے۔ بھارتی بحریہ کے سربراہ ایڈمیرل سریش مہتا نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ بھارت کے پاس بھرپور دفاعی جوہری صلاحیت موجود ہے اور یہ کہ پوکھران دھماکے پوری طرح کامیاب تھے۔

پاکستان میں ماہرین کا کہنا ہے کہ بھارت نئے سرے سے ایٹمی دھماکے کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے راہ ہموار کر رہا ہے۔ پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا کہنا ہے کہ بھارت اگر ایٹمی دھماکے کرنا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ بھارت کی حکومت ملکی مفاد میں فیصلے کرتی ہے۔ ایک امریکی ماہر کا کہنا ہے کہ جب آپ اپنی سابقہ غلطیوں کی بنیاد پر نیا منصوبہ بناتے ہیں تو آپ نئے سرے سے تجربہ کرنے کے لئے پاگل ہو جاتے ہیں۔ اور بھارت یہی کر رہا ہے۔ سنتھانم کے بیان سے آزمائشی دھماکوں کی کامیابی پر بحث دوبارہ شروع ہو گئی ہے کیونکہ حکومت یہ دعوے کرتی رہی ہے کہ اب اسے مزید جوہری آزمائشی دھماکے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
اور اس کا براہ راست تعلق اس بات سے بھی ہے کہ آیا حکومت کو آزمائشی دھماکوں پر پابندی کے معاہدے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے چاہئیں یا نہیں۔
حکومتی سائنسدانوں کا دعوی تھا کہ آزمائشی دھماکے کی شدت پینتالیس کلوٹن تھی لیکن سنتھانم اور دیگر ماہرین کہتے ہیں کہ یہ دھماکہ بیس کلوٹن سے زیادہ نہیں تھا۔ ہندوستان نے پوکھرن میں گیارہ اور تیرہ مئی انیس سو اٹھانوے کو پانچ جوہری آزمائشی دھماکے کیے تھے اور اس پورے عمل کی ذمہ داری ڈی آر ڈی او نے سنبھالی تھی۔ ان دھماکوں کے بعد بھارت اور پاکستان کے خلاف عالمی

برادری نے تعزیری پابندیاں عائد کر دی تھیں جو کئی برسوں تک جاری رہیں۔

بھارت خطے میں سیاسی بالادستی کے لئے جوہری تجربات کرتا رہا ہے۔ حال ہی میں ہندوستان نے اپنی ٹیکنالوجی سے بنی ہوئی پہلی جوہری آبدوز سمندر میں اتاری ہے۔ یہ آبدوز جوہری میزائلوں سے لیس ہے اور سمندر کی گہرائیوں سے اپنے ہدف پر نشانہ لینے کی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہے۔ 'اریہنت' نامی یہ آبدوز ایٹمی ری ایکٹر سے چلتی ہے اور اس کی سمندر کی سطح سے زیر آب جانے کی رفتار بہت تیز ہے۔

اریہنت آبدوز تقریباً دو برس تک مختلف تجرباتی مراحل سے گزرے گی اور اسے باضابطہ طور پر 2011 میں ہندوستانی بحریہ میں شامل کیا جائے گا۔ اسی طرح کی دو مزید جوہری آبدوزیں 2015 تک تیار کیے جانے کا منصوبہ ہے۔ یہ آبدوز روس کی چارلی-1' آبدوز کی ساخت پر بنائی گئی ہے اور یہ جوہری میزائل سے حملے کرنے اور' جوابی حملے کر سکتی ہے۔ اس کی لمبائی 104 میٹر ہے اور اس کی رفتار پچپن کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ اس آبدوز سے سو میٹر کی گہرائی سے میزائل فائر کیے جا سکتے ہیں۔ اریہنت پانی کے نیچے سو سے زیادہ دنوں تک رہ سکتی ہے۔ اسے پیغام رسانی کے لیے بھی پانی کی اوپری سطح نہیں آنا پڑے گا۔ اس پر 80 میگا واٹ کا جوہری ری ایکٹر لگا ہوا ہے۔

دفاعی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ جوہری آبدوزوں کی شمولیت سے خطے میں ہندوستانی بحریہ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔ ہندوستان بحر ہند میں اپنی بحری طاقت کو مستحکم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ بحریہ کی جدید کاری کے عمل میں اس کی نظر روایتی حریف پاکستان پر نہیں بلکہ چین پر ہے۔

بھارت اور روس میں جوہری معاہدہ ہو چکا ہے۔ جس کے تحت روس بھارت کے لیے چار جوہری ری ایکٹرز بنانے میں ہندوستان کی مدد کرے گا۔ روس جنوبی بھارت کے کوڈن کولم میں پہلے ہی سے ایک ہزار میگاواٹ کی وسعت والے ایک ری ایکٹر کو بنانے میں مصروف ہے۔ اس معاہدے پر بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ اور روسی صدر دیمتری مدیدیونے دستخط کیے ہیں۔ امریکہ کے ساتھ جوہری معاہدے کے بعد بھارت نے پہلے فرانس کے ساتھ اور اب روس کے ساتھ جوہری توانائی کے شعبے میں تعاون کے لیے معاہدہ کیا ہے۔ اس سمجھوتے سے جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی دوڑ کے خدشات پیدا ہوگئے ہیں۔ تقریباً تین دہائیوں تک پابندیوں کا سامنا کرنے کے بعد بھارت کو امریکہ نے سویلین جوہری ٹیکنالوجی تک رسائی مہیا کر دی ہے۔ اس معاہدے سے امریکہ کو بھارت کے سویلین جوہری تنصیبات کے معائنے کی اجازت کے بدلے امریکی ٹیکنالوجی تک رسائی اور توانائی کے مسئلے پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔ امریکی صدر بش اور بھارتی

وزیر اعظم من موہن سنگھ نے معاہدے پر دستخط جولائی دو ہزار پانچ میں کیے تھے جس کے بعد کئی برسوں کے مذاکرات کے بعد واشنگٹن میں دونوں ممالک کے وزرا خارجہ نے گزشتہ ہفتے اس معاہدے کو حتمی شکل دے دی۔ اس معاہدے کے تحت بھارت نے جوہری تجربات کا حق محفوظ رکھا ہے تاہم امریکہ کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں وہ معاہدہ ختم تصور کرے گا۔ لیکن کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ اس سمجھوتے سے جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ اور جنوبی ایشیا میں ہتھیاروں کی دوڑ کے خدشات پیدا ہو گئے ہیں۔

اس معاہدے کے تحت بھارت کو جوہری ایندھن فراہم کیا جاسکے گا جو وہ اپنی دفاعی پیداوار کی جانب لگا سکے گا۔ اس معاہدے کے تحت بھارت یورینیم کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرسکے گا۔ اگرچہ بھارت میں چند ایسے ریکٹرز ہیں جو سویلین یعنی بجلی کی پیداوار کے لیے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ یورینیم صرف انہیں ریکٹرز میں استعمال ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بھارت اپنی پیداوار تین، چار اور دس گنا تک بڑھا سکے گا۔ بھارت تین سے تیس جوہری ہتھیار سالانہ تیار کرسکے گا۔
پاکستانی وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی نے بھی گزشتہ دنوں امریکہ سے اسی قسم کے معاہدے کا مطالبہ کرتے ہوئے امریکہ سے کہا کہ وہ دو جوہری طاقتوں کے

درمیان امتیازی سلوک نہ کرے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت کے ساتھ معاہدے کے بعد اب پاکستان کا بھی حق ہے کہ اس طرح کے معاہدے کا مطالبہ کرے۔

موید یوسف امریکہ میں بوسٹن یونیورسٹی میں پڑھانے کے علاوہ کالم نگار بھی ہیں۔ اس معاہدے کو وہ کئی حوالوں سے ایک غیر معمولی معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس سے قبل ان رعایات کے ساتھ یہ معاہدہ نہیں کیا گیا۔ اس سے قبل چین اور روس کو بھی ری پروسیسنگ کی سہولت مہیا نہیں تھی۔' صرف اسرائیل، پاکستان اور بھارت اس کیٹگری میں آتے ہیں۔ اسرائیل نے چونکہ جوہری ہتھیاروں کا اعتراف نہیں کیا ہے تو پھر صرف پاکستان اور بھارت ہی دو ایسے ملک رہ جاتے ہیں۔ جب بھارت کو یہ سہولت دی تو پاکستان کو بھی دینی چاہیے۔ بعض مبصرین کے خیال میں بھارت سے اس ڈیل کے ذریعے امریکہ علاقے میں چین کے اثر و رسوخ کو کم کرنا چاہتا ہے۔ لہذا چین اور پاکستان کے درمیان کسی ایسے معاہدے کی وہ شدید مخالفت کرے گا۔ ایسے میں کیا پاکستان کو چین کی جانب دیکھنا چاہیے؟

ہندوستان اور امریکہ کے درمیان ہونے والے جوہری معاہدے نے جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے سلسلے میں کئی اہم سوالات پیدا کر دیے ہیں۔تاہم یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ اس معاہدے کے بعد ہندوستان اور امریکہ کے نئے دفاعی تعلقات

کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ آئی اے ای اے ادارے کے ڈائرکٹر جنرل محمد البرداعی کا کہنا ہے مجھے لگتا ہے کہ یہ معاہدہ ہندوستان کے لیے، دنیا کے لیے، جوہری عدم پھیلاؤ کے لیے' اور دنیا کو جوہری ہتھیاروں سے آزادی دلانے کی ہماری کوششوں کے لیے بہت اچھا ہے۔'

بعض ماہرین کے خیال میں اس معاہدے کے بعد جوہری عدم پھیلاؤ کی مہم کو دھچکہ لگا ہے کیونکہ ہندوستان کے پاس جوہری ہتھیار ہیں لیکن اس نے جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط نہیں کیے ہیں اور اس پر سے پابندی بھی ہٹ گئی ہے۔ لندن میں انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار سٹریٹجک سٹڈیز میں جوہری معاملات کے ماہر مارک فٹز پیٹرک اس معاہدہ کو جوہری عدم پھیلاؤ کی مہم کے لیے ایک بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا 'اس معاہدے سے دوسرے ملکوں کو یہ پیغام جائے گا کہ انڈیا کی ضرورت سے زیادہ حمایت کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد پاکستان، ایران اور شمالی کوریا اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اس معاہدے کا سہارا لیں گے۔ اس کے علاوہ مصر جیسے ممالک مستقبل میں اپنے لیے اس معاہدے کو ایک نمونے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔' یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ پینتالیس ملکوں کے جوہری گروپ نے ہند امریکہ معاہدے کو اتفاق رائے سے منظوری دی جب کہ ملک کے اندر سیاسی جماعتوں کے اندر اس معاہدے پر شدید اختلافات ہیں۔ حزب اختلاف کی جماعت بی جے پی نے اسے ملک کے اقتدار اعلیٰ'

سے سمجھوتہ' قرار دیا تو وہیں بائیں بازو کی جماعتیں بھی اسے 'امریکی سامراجیت کے آگے گھٹنے ٹیکنے' کے مترادف بتا رہی ہیں۔

اس معاہدے کے نفاذ سے آئندہ دس برس میں جوہری ری ایکٹروں سے تیس ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کی جاسکے گی۔ جوہری توانائی کے محکمے مطابق سنہ 2050 تک ایٹمی ری ایکٹروں سے دو لاکھ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ ہے۔ طویل مدتی منصوبے کے تحت اس صدی کے وسط تک ہندوستان کی بجلی کی ضروریات کا 26 فیصد جوہری ٹیکنالوجی سے پورا کیا جائے گا۔ ماہرین کے مطابق یہ ہندوستان میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کی طرف پہلا اہم قدم ہے۔ بھارت میں اس وقت پندرہ ایٹمی ری ایکٹر موجود ہیں لیکن یورینیم کی کمی کے سبب ان سے دو ہزار میگا واٹ سے بھی کم بجلی پیدا ہو پا رہی ہے۔ اس معاہدے کے نفاذ سے آئندہ دس برس میں جوہری ری ایکٹروں سے تیس ہزار میگاواٹ بجلی پیدہ کی جاسکے گی ہندوستان تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اس کی مجموعی داخلی پیداوار صرف پانچ برس میں دوگنی ہو گئی ہے لیکن سڑکوں، جدید بندرگاہوں، سٹوریج اور سب سے اہم بجلی کی کمی کے سبب اس ترقی کو جاری رکھنا ممکن نہیں ہے۔ چین اگر آج ہندوستان سے برسوں آگے چل رہا ہے تو صرف اس لیے کہ اس نے ترقی کی منصوبہ بندی اور ان پر عمل آج سے تیس برس پہلے شروع کر دیا تھا۔ اور وہاں جو منصوبے بنائے گئے وہ حال کی ضروریات کے مطابق نہیں بلکہ مستقبل کے تقاضوں کو ذہن میں رکھ کر

بنائے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں جو جدید ڈھانچے تیار ہو رہے ہیں وہ امریکہ اور یورپ سے برسوں آگے ہیں۔ ہندوستان میں بجلی کی کتنی قلت ہے اس کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مہاراشٹر جیسی ترقی یافتہ صنعتی ریاست میں بھی صنعتوں کے لیے روزانہ کئی گھنٹے بجلی کی سپلائی بند کرنی پڑتی ہے۔ کانپور جیسے صنعتی شہر بجلی اور دوسری سہولیات کی کمی کے سبب 'تباہ' ہوگئے اور نوئیڈا اور غازی آباد جیسے علاقوں میں صنعتی یونٹ چلائے رکھنے کے لیے ہر برس ہزاروں کروڑ روپے جنریٹر ڈیزل پر صرف ہوتے ہیں۔

پاکستان کی جوہری ٹیکنالوجی پر بھارت ہی نہیں امریکہ، اسرائیل اور اسلام دشمن قوتوں کی ایک عرصے سے نظر ہے۔ بھارت کے ایٹمی قوت کے جنون میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس سے خطے میں طاقت کا توازن برقرار رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ بھارت کو اپنے تمام منصوبوں میں امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے گوشتہ دنوں اس بارے میں ایک تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ فرانس نے پاکستان کو جو غیر مشروط جوہری ٹیکنالوجی کی پیشکش کی ہے اس پر ہم اس کے مشکور ہیں لیکن امریکہ کو چاہیے کہ وہ ہمیں بھی وہی ٹیکنالوجی دے جس کا اس نے بھارت سے معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پر امن جوہری ٹیکنالوجی رکھنا ہر ملک کا حق ہے اور اس ضمن میں وہ ایران کی

حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یورپی یونین کے ساتھ ایران کے جاری مذاکرات کی حمایت کرتے ہیں تاہم ریفرل پالیسی کی حمایت نہیں کرتے۔

پاکستان کے جوہری اثاثوں پر امریکی تشویش اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ پاکستان کے جوہری اثاثوں کی حفاظت کے بارے میں امریکہ کے سرکاری حلقے مسلسل تشویش کا شکار رہے ہیں۔ گو امریکی فوج کے چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف ایڈمرل مائیک مولن نے کہا ہے کہ وہ جوہری اثاثوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کی پاکستان کی صلاحیت سے مطمئین ہیں۔ لیکن اس کے برعکس امریکہ کی قومی سلامتی کے مشیر جنرل جیمز جونز نے کہا ہے کہ واشنگٹن کو اسلام آباد سے اس بات کی ضمانت درکار ہے کہ پاکستان کے نیوکلیر ہتھیار شدت پسندوں سے محفوظ ہیں۔ یہ بیانات ایک ایسے وقت پر سامنے آئے تھے جب پاکستان کے صدر آصف زرداری اور انٹیلی جینس ایجنسی آئی ایس آئی کے سربراہ شجاع پاشا امریکی صدر باراک اوباما اور دیگر اعلیٰ حکام سے پہلی ملاقات کرنے امریکہ پہنچے تھے۔ دوسری جانب بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ بھارت اور فرانس کے درمیان ایٹمی تعاون کے معاہدے کے لئے فرانس کا دورہ کرچکے ہیں۔ دونوں ملکوں نے بعض خاص شعبوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھا تعاون کی کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ بھارت کے برعکس امریکہ اور اقوام متحدہ خطے میں ایران اور شام جیسے ملکوں

کا پیچھا کر رہا ہے۔ عراق میں ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کا ڈرامہ رچا کر اس ملک پر امریکی قبضے کو بھی ساری دنیا جانتی ہے۔اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ ایران نے ایک ہزار تین سو کلو گرام یورینیم جمع کر لیا ہے جبکہ شام کے پاس بھی یورینیم کی موجودگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ یہ پرپیگنڈہ بھی کیا جا رہا ہے کہ ایران کے پاس جتنی مقدار میں یورینیم ہے وہ ایک جوہری بم بنانے کے لیے کافی ہے۔

اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کونسل امریکہ کے ان دعووٗں کی بھی تحقیقات کر رہی ہے کہ ستمبر 2007 میں اسرائیل نے شام کے جس مقام پر حملہ کرکے اسے تباہ کیا تھا، وہ ایک جوہری ری ایکٹر تھا جس نے ابھی کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ گزشتہ سال اقوام متحدہ کے جوہری ادارے آئی اے ای اے کو شام کے الکبیر جوہری مرکز سے یورینیم کے آثار ملے تھے۔ اسرائیل نے شام کے اس جوہری مرکز کو 2007 میں ایک میزائل حملے میں تباہ کر دیا تھا۔ ایران پر یہ الزام بھی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی ہدایات کے برعکس یورینیم کی افزودگی جاری رکھے ہوئے ہے۔ سیکورٹی کونسل نے ایران سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ یورینیم کی افزودگی کی تمام سرگرمیاں اس وقت تک بند کر دے جب تک جوہری توانائی کے عالمی ادارے ’آئی اے ای اے‘ کے نگران اس کے یورینیم افزودگی کے پروگرام کا معائنہ نہیں کر لیتے۔ ایران کا کہنا ہے کہ اس کا جوہری پروگرام پرامن مقاصد کے لیے ہے

اور اس کا جوہری ہتھیار بنانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مغربی ممالک اور امریکہ ایران کے جوہری پروگرام کو ہمیشہ تشویش کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ اسرائیل ایران کی جوہری تنصیبات کو تباہ کرنے کی دھمکیاں بھی دے چکا ہے۔ اسرائیل ماضی میں عراق اور شام کی جوہری تنصیبات کو حملے کرکے تباہ کر چکا ہے۔ پاکستان کے جوہری اثاثوں کے بارے میں بھی تشویش کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ پاکستانی دفتر خارجہ کا کہنا ہے کہ پاکستان کے جوہری اثاثے مکمل حفاظت میں ہیں اور ان اثاثوں کی حفاظت کے لیے پاکستان کو کسی ملک کے تعاون کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو ممالک بھارت کے ساتھ جوہری معاہدے کر رہے ہیں انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ اس سے خطے میں عدم استحکام پیدا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کو بھارت کے ساتھ ایٹمی معاہدے کرتے ہوئے اپنا دوہرا معیار ترک کرنا چاہیے۔

پاکستان کے ایٹمی اثاثے ہمیشہ محفوظ ہاتھوں میں رہے ہیں، لیکن ایک مسلمان ملک ہونے کے ناطے پاکستان پر امریکی دباؤ جاری ہے۔ امریکہ کے اتحادی ملک دنیا میں کسی مسلمان ملک کے پاس ایٹمی قوت نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان دنیا کا واحد مسلمان ملک ہے جس نے یہ طاقت نہ صرف حاصل کرلی ہے بلکہ اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے،
بھارت کو امریکہ نے ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ میں آزادی دے کر خطے میں عدم توازن پیدا کردیا ہے، پاکستان بھی ایٹمی

صلاحیت کو پرامن مقاصد کے لئے استمال کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان اس وقت شدید توانائی کے بحران میں مبتلا ہے۔ اگر پاکستان کو بھی ایٹمی بجلی گھر کی سہولت حاصل ہو تو اس کی معاشی مشکلات کم ہو سکتی ہیں، عالمی برادری کو اپنے دوہرے معیارات پر نظر ثانی کرتے ہوئے پاکستان کو بھی وہی سہولتیں دینی چاہیئے، جو بھارت کو دی گئی ہیں

صدی کا سب سے بڑا فراڈ نائین الیون

نائین الیون تاریخ انسانی کا سیاہ باب

امریکا میں رونما ہونے والا نائین الیون کا واقعہ انسانی تاریخ میں ایک ایسا سیاہ باب ہے جس کے رد عمل نے دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دہشت گردی کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کا آغاز کر دیا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے جہاں افغانستان اور عراق کو جنگ کے کھلے میدان میں تبدیل کیا وہاں پاکستان کو بھی شدید جانی مالی نقصان اور اس کی سالمیت کو خطرات سے دو چار کر دیا ہے۔ امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف اپنے اتحادیوں کے ساتھ ان ملکوں میں بھی دہشت گردی شروع کر دی ہے جو اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ آج پاکستان اور ایران جیسے ملک اس آگ کی لپیٹ میں ہیں۔ اس واقعہ کو گزرے ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں لیکن اس کے رد عمل کی بازگشت آج بھی دنیا بھر میں گونج رہی ہے۔

نائن الیون

گیارہ ستمبر دو ہزار ایک کو واشنگٹن میں امریکی محکمہ دفاع پینٹاگون کی

عمارت اور نیویارک میں تجارتی مرکز ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ہائی جیک کئے جانے والے تین طیارے ٹکرا دیئے گئے اور محکمہ خارجہ (اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ) کے باہر کار بم دھماکا ہوا۔ امریکا میں ہونے والے ان خود کش حملوں کے باعث 2974 افراد لاپتہ ہو گئے۔ مرنے والوں میں دنیا کے 90 ملکوں کے تمام شہری شامل تھے۔ ہزاروں افراد ہلاک اور اتنی ہی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے جب کہ اربوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ ملک کے تمام ہوائی اڈے بند کر دیئے گئے اور وائٹ ہاؤس سمیت اہم سرکاری عمارتیں خالی کرا لی گئیں۔ گیارہ ستمبر بروز 2001 منگل کی صبح نیویارک میں جس وقت ہزاروں لوگ دفاتر جانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے کہ ایک بوئنگ 767 طیارہ ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی 110 منزلہ عمارت کے پہلے ٹاور سے ٹکرایا۔ اس حادثے کے ٹھیک اٹھارہ منٹ بعد بوئنگ 757 طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے 110 منزلہ دوسرے ٹاور سے ٹکرایا۔ ان دونوں حادثات کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد یونائیٹڈ ایئر لائنز کا ایک اور بوئنگ 757 طیارہ واشنگٹن میں امریکی محکمہ دفاع پینٹاگون کی عمارت پر گر گیا جس سے پینٹاگون کا صدر دفتر جزوی طور پر تباہ ہو گیا جب کہ عمارت کے دوسرے حصے میں آگ لگ گئی۔ ان حملوں کے بعد واشنگٹن میں ہی کانگریس کی عمارت کیپٹل ہل کے نزدیک طاقتور بم دھماکا ہوا اور فوراً ہی واشنگٹن میں امریکی محکمہ خارجہ کے قریب ہی ایک اور طاقتور بم دھماکا ہوا۔ ان حملوں کے بعد ریاست پنسلوانیا میں ہی ایک بوئنگ 757 طیارہ بھی گر کر تباہ ہو گیا جس سے اس میں سوار 145 افراد ہلاک ہو

گئے۔ نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرانے والے دونوں طیارے ہائی جیک کئے گئے تھے۔ بوئنگ 767 طیارے کو بوسٹن سے لاس اینجلس جاتے ہوئے جب کہ دوسرے طیارے کو ڈلاس سے لاس اینجلس جاتے ہوئے اغوا کیا گیا۔ ان دونوں طیاروں میں کل 156 افراد سوار تھے جو اس حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ان دونوں طیاروں کا تعلق امریکی ایئر لائنز نامی ایجنسی سے تھا جب کہ پینٹاگون پر گرنے والے طیارے میں 47 افراد سوار تھے جو تمام ہلاک ہو گئے۔ اس طیارے کا تعلق بھی یونائیٹڈ ایئر لائن نامی کمپنی سے تھا۔ یہ دونوں طیارے بھی راستے سے ہی ہائی جیک کر لئے گئے تھے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاورز ان حملوں کے بعد زمیں بوس ہو گئے۔

"حملے کے بعد"

ان حملوں کے بعد امریکا میں زبردست خوف وہراس پھیل گیا۔ نیویارک اور واشنگٹن سے لوگ پناہ کی تلاش میں فرار ہونے لگے اور امریکا میں آنے والی تمام پروازوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ کینیڈا میں اتریں۔ امریکا میں ٹرین سروس بھی معطل کر دی گئی۔
امریکا میں تمام پلوں اور سرنگوں کی بھی ناکہ بندی کر دی گئی اور ایف بی آئی نے معاملے کی تحقیقات شروع کر دیں۔ امریکی حکام نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر دہشت گردی کے واقعہ میں چھ حملہ آوروں کے ہلاک ہونے کا دعوی کیا تاہم ان کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں نہ ہی ان کی

شناخت بتائی گئی۔

حملہ کس نے کیا؟

امریکی ٹی وی سی این این نے حملوں کے بعد اس پروپیگنڈہ کا آغاز کیا کہ ان حملوں میں مسلمان انتہا پسند ملوث ہیں۔ امریکی صدر بش نے اسے کروسیڈ وار سے تعبیر کیا۔ سی این این نے باوثوق ذرائع کے حوالے بتایا کہ ان حملوں میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جن کا تعلق اسامہ بن لادن کی تنظیم سے ہے۔ دنیا میں ایسی دہشت گرد تنظیمیں بہت کم ہیں جن کے پاس اتنے مالی وسائل اور جدید نیٹ ورک ہے جو اس طرح کے بڑے اور مربوط حملے کر سکتی ہیں۔ ایک مبصر کا کہنا تھا کہ اس دہشت گردی کے اگرچہ مٹھی بھر لوگ ذمہ دار ہیں جنھوں نے طیارے اغوا کیے یا چلا کر عمارتوں سے ٹکرا دیئے مگر ان کے پیچھے ایک ماسٹر مائنڈ بھی موجود ہے۔ اب تک تو صرف دنیا بھر میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہی زیر بحث رہے مگر یہ بلند عمارتیں بھی بڑے پیمانے پر تباہی کا سبب بن گئیں جن سے صرف طیارے ہی ٹکرائے اب لوگوں کی توجہ ضرور اس جانب بھی جائے گی۔ وائس آف امریکا کے مطابق حملوں کے باعث امریکا کو عشروں میں بدترین بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کس نے کیا ہے۔ بعض حلقے اس کا الزام اسامہ بن لادن پر عائد کرتے رہے۔ اس کی کڑیاں چند ماہ بعد ملنے والے اس ویڈیو بیان سے ملاتے ہیں جو حادثاتی طور پر

ظاہر ہوئے تھے جن میں امریکی تنصیبات پر حملوں کے لئے کہا گیا تھا۔ ایشیا سے ایک مبصر نے کہا کہ حملے کے لئے جس پیمانے پر منصوبہ بندی کی گئی ہے یہ اسامہ بن لادن کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسامہ ان دنوں افغانستان میں مقیم تھے اور ان کی تمام تر سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی اور بیرونی دنیا سے ان کا کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ جتنے بڑے پیمانے پر یہ کام ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ اسامہ بن لادن کا کام نہیں ہے۔ مشرق وسطی کے ایک مبصر کا کہنا تھا کہ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ حملے میں کون ملوث ہے۔ اوکلوہوما بم دھماکے میں پہلے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا مگر بعد میں امریکی ہی اس کے ذمہ دار پائے گئے تھے۔ ایک فلسطینی مبصر نے کہا کہ حملے اور دھماکے کی ذمہ داری عرب دنیا پر عائد ہوگی۔ ایک امریکی مبصر کا کہنا تھا اس سلسلے میں اسامہ پر شک کیا جا سکتا ہے۔

شکوک و شبہات

نوگیارہ کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا تیسرا مینار کیسے گرا تھا تیسرا مینار باقی دو میناروں کے سات گھنٹے کے بعد گرا تھا۔ سینتالیس منزلہ مینار جسے 'ٹاور سیون' بھی کہا جاتا ہے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے جڑواں میناروں 'ٹوِن ٹاورز' کے تباہ ہونے کے سات گھنٹے بعد گرا تھا۔ تیسرے مینار کے بارے میں کچھ حلقوں کی طرف سے شک کا اظہار کیا گیا تھا کہ اسے خود دھماکہ کر کے گرایا گیا تھا۔

واشنگٹن ڈی سی کے قریب ہی ماہرین کے ایک گروپ کی طرف سے عنقریب مکمل کی جانے والی رپورٹ میں اس شک کو رد کر دیا گیا۔ اور تیسرے مینار کے گرنے کی وجہ اس کی مختلف منزلوں پر لگنے والی آگ بتائی گئی۔ یاد رہے کہ 'ٹوِن ٹاورز' کے برعکس تیسرے مینار سے کوئی جہاز نہیں ٹکرایا تھا۔ ماہرین کی تفتیش کے بعد یہ دنیا میں فولاد سے بنی پہلی بلند و بالا عمارت ہو گی جس کے زمین بوس ہونے کی وجہ آتشزدگی ہو گی۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ فار سٹینڈرڈ اینڈ ٹیکنالوجی کے تفتیش کار ڈاکٹر شیام سندر نے بی بی سی کو بتایا کہ ان کے اندازے کے مطابق امکان یہی ہے کہ تیسرے مینار کی مختلف منزلوں پر آگ پھیل رہی تھی جو بالآخر عمارت کے تباہ ہونے کی وجہ بنی ہو گی۔ تاہم آرکیٹکٹس اینڈ انجینیئرز فار نائین الیون ٹروتھ نامی تنظیم سے وابستہ ماہرین کا کہنا ہے کہ تیسرے مینار کی تباہی کے بارے میں سرکاری طور پر بتائی جانے والی وجہ ناممکن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یقیناً اس مینار کو خود گرایا گیا ہوگا۔ تنظیم کے بانی رچرڈ گیگ نے کہا کہ چھٹی جماعت کا بچہ بھی اس عمارت کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس کی رفتار اور توازن کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے کہ یہ مینار خود زمین بوس نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا کہ جو عمارتیں خود گرتی ہیں وہ سیدھی نہیں گرتی بلکہ اس سمت جھکتی جہاں سب سے کم مزاحمت ہو۔ 'وہ سیدھی نیچے نہیں جاتیں'۔

اسامہ بن لادن

اسامہ بن لادن جس پر الزامات عائد کیے گئے۔ 1979ء میں امریکہ کی مدد کے لیے افغانستان پہنچے تھے۔ اور افغان وار میں روس کے خلاف جہاد میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت وہ امریکیوں کے شانہ بشانہ روس سے نبرد آزما تھے۔ تاہم ۱۹۸۰ کے عشرے میں روس کی شکست کے بعد ان کے امریکیوں سے اختلاف ہو گئے۔ 1996 میں انہوں نے پہلا فتویٰ جاری کیا تھا کہ امریکی فوج سعودی عرب سے نکل جائیں۔ جس میں اسامہ بن لادن نے امریکہ کی اسرائیل کے بارے میں خارجہ پالیسی پر اعتراضات کیے تھے۔ (۵)
ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگون میں دہشت گردی کے گیارہ ستمبر کے واقعات پر امریکا کے سرکاری اداروں میں بڑی لے دے ہوئی۔ دنیا کی منظم ترین اور ترقی یافتہ انٹیلی جنس کی ناکامی ہر جگہ موضوع بحث بنی رہی۔ ان حملوں کے دو دن بعد ایف بی آئی نے 19 مشتبہ افراد کی فہرست جاری کی جن کا تعلق اسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم القاعدہ سے جوڑا گیا۔ (۶) ان مشتبہ افراد کی فہرست اور تصویروں کی اشاعت کے بعد یہ حقائق بھی منظر عام پر آ گئے کہ ان میں سے بیشتر افراد حادثے کے وقت امریکا سے ہزاروں میل دور تھے۔ جس سے ایف بی آئی کے لئے مزید جگ ہنسائی کا اہتمام ہوا۔ اسامہ بن لادن نے 16 ستمبر 2001ء کو امریکہ میں رونما ہونے والے واقعات سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کیا تھا۔ اس کا بیان الجزیرہ سے نشر ہوا۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ یہ انفرادی کاروائی ہے اور ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ (۷) تاہم بعد میں ڈرامائی طور پر اسامہ بن لادن کے ٹیپ منظر عام لائے گئے۔ امریکی صدراتی

انتخاب 2004ء کے موقع پر اسامہ بن لادن کا ایک ایسا ٹیپ منظر عام پر لایا گیا۔ جس میں اس نے امریکہ پر القاعدہ کے حملوں کا اعتراف کیا۔ اسامہ بن لادن کا انسانوی کردار کے بارے میں اب عوامی حلقوں کی یہ رائے ہے کہ یہ ایک خیالی پیکر ہے۔ اب اسامہ بن لادن زندہ نہیں ہے۔ اور اس خیالی پیکر میں امریکہ سی آئی اے اپنے پسندیدہ رنگ بھرتی رہتی ہے۔ امریکہ نے خالد شیخ کو ان حملوں کا ماسٹر مائنڈ بتایا ہے۔ جسے پاکستان سے گرفتار کرکے امریکہ کے حوالے کر دیا ہے۔ خالد شیخ نے پہلے اعتراف اور پھر ان الزامات سے انکار کردیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اسے ایک ہی بار موت سے ہمکنار کردیا جائے۔ کیونکہ وہ تشدد کے برتاؤ سے تنگ آچکا ہے۔ (۷) نائین الیون کے واقعات کے پس پردہ مقاصد کے بارے میں دنیا بھر میں یہ تاثر عام ہے کہ یہ صدر بش کی ہوس ملک گیر اور مسلم دنیا کے خلاف کاروائی تھی۔ جس کے نتیجے میں دنیا کے دو آزاد مسلمان ملک عراق اور افغانستان پر امریکہ نے قبضہ کر لیا ہے۔ انسداد دہشت گردی کے ایک ماہر رچرڈ اے کلاوک نے اپنی کتاب Against all enimiesمیں لکھا ہے کہ امریکہ کی روس کے خلاف کاروائی اور افغانستان میں آمد اور جنوب میں اسرائیل کو مضبوط کرنے کی پالیسی نے ہی القاعدہ کو جنم دیا ہے۔ ایک اور نامہ نگار پیٹر برجین نے لکھا کہ یہ حملے اس منصوبے کا حصے تھے جس کے تحت امریکہ کو مشرقی وسطی میں اپنی فوجی اور" ثقافتی موجودگی میں اضافے کا موقع ملا۔ امریکہ نے نائین الیون کے بعد ناٹو کونسل کے ذریعہ یہ اعلان کرادیا کہ

امریکہ پر ہونیوالے یہ حملے ناٹو اقوام پر حملے تصور کیے جائیں گے۔ اور امریکی حکومت نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا یہ آغاز کیا اور کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کو عدالت کے کٹہرے میں لائیں گے۔ (۸) گو اقوام متحدہ دہشت گردی کے کسی متفقہ تعریف پر متفق نہیں ہو سکی لیکن اس کے باوجود امریکہ نے دہشت گرد کو ٹھکانہ دینے والے ملکوں کے خلاف معاشی اور فوجی پابندیوں حفاظتی اور اطلاعاتی انٹیلجنس میں شرکت کی ذمہ داری ڈال دی۔ اور اس کا پہلا نشانہ افغانستان اور پھر عراق کو بنایا گیا۔ یہ دونوں آزاد جمہوی ملک تھے۔ جن پر آج بھی امریکی فوجیں اور ناٹو فوجیں موجود ہیں۔ ۸۱ ستمبر ۱۰۰۲ کو پاکستان کے سابق سیکریٹری خارجہ نیاز نایک نے بی بی سی کے ایک انٹرویو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ جولائی ۱۰۰۲ میں ۱۱۔۹ کے نیویارک کے حملوں سے دو ماہ قبل اعلیٰ امریکی حکام نے ان سے کہا تھا کہ افغانستان کے خلاف فوجی کاروائی اکتوبر کے وسط میں شروع کی جائے گی۔ بلاشبہ افغانستان پر حملے کی منصوبہ بندی ۱۱۔۹ حملوں سے بہت پہلے کر لی گئی تھی اور مقصد اس کا امریکا کی عظیم تر فوجی حکمت عملی پر عمل درآمد کرنا تھا۔ عراق پر امریکہ کے غاضبانہ قبضے پر آج ساری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ یہ حملے عراق کے تیل کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

محمد عطا

تینتنس سالہ محمد عطا کا تعلق مصر سے ہے۔ 1985 میں اس نے قائرہ یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ 90 میں ایک سول انجینئرنگ کمپنی کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ امریکی ذرائع کا کہنا ہے کہ 97ء کے وسط میں وہ انسٹی ٹیوٹ سے پندرہ ماہ کیلئے غائب ہوگیا۔ اکتوبر 98 میں واپس آیا تو گھنی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ میں اس نے ایک جماعت بنائی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتا تھا۔ امریکا میں وہ نیویارک میں رہنے لگا اور ایک سال کے اندر اندر اس نے ہوا بازی کی ٹرننگ حاصل کر لی۔ گیارہ ستمبر سے دو دن پہلے وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ "ان میں سے ایک مروان الشیحی، جو ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دوسری عمارت سے ٹکرانے والے جہاز پر سوار تھا۔" ایک فٹنس کلب میں دیکھا گیا جہاں انہوں نے تین گھنٹے گزارے اور وڈیو گیم سے لطف اندوز ہوئے۔ سی آئی اے کا گمان ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے شمالی ٹاور سے ٹکرانے والے جہاز کے پائلٹ کو سیٹ سے ہٹا کر محمد عطا نے پائلٹ کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ بعد میں عربی اخبار الشرق الاوسط کے نمائندے نے محمد عطا کے والد سے ملاقات کی تو اس کا دعویٰ تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دھماکے کے بعد محمد عطا نے اسے فون کیا اور اس سے مختصر گفتگو کی۔ والد کا کہنا ہے کہ گفتگو کے دوران محمد عطا کی آواز نارمل نہیں تھی اور اسے اندیشہ ہے کہ اس کے بیٹے کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ والد کا کہنا ہے کہ محمد عطا ہوا بازی کی الف ب سے بھی نابلد ہے۔ اسے ہوائی سفر سے چکر آتے ہیں۔ اسرائیل کی

انٹیلی جنس "موساد" نے محمد عطا کو اغوا کر کے اسے قتل کیا ہو گا اور اس کے پاسپورٹ کو اس غرض کے لئے استعمال کیا ہو گا۔

مروان الشیحی

امریکی خفیہ ادارے ایف بی آئی نے جو مبینہ ہائی جیکرز کی فہرست جاری کی تھی اس میں دوسرے ہائی جیکر کا نام مروان الشیحی بتایا گیا ہے۔ تئیس سالہ مروان یوسف الشیحی کا تعلق متحدہ عرب امارات سے ہے۔ تفتیشی اداروں کا خیال ہے کہ ٹریڈ سینٹر پر دوسرے طیارے کو ٹکرانے کے لئے مروان الشیحی اسے کنٹرول کر رہا تھا۔ گمان کیا جاتا ہے کہ مروان کی محمد عطا سے گہری دوستی تھی۔ گیارہ ستمبر سے قبل وہ اور اس کے دوساتھی ہائی اسکول کے بعد 1998ء میں مروان متحدہ عرب امارات کی مسلح افواج میں شامل ہو گیا۔ 1999ء میں مسلح افواج نے اسے تعلیم کے لئے جرمنی بھیجا جہاں مختصر قیام کے بعد وہ امارات واپس آ گیا اور شادی کی۔ امارات میں 25 دن گزارنے کے بعد واپس جرمن چلا گیا جہاں اس نے اپنے پاسپورٹ کی گمشدگی ظاہر کی اور نیا پاسپورٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تفتیشی اداروں کے مطابق پرانے پاسپورٹ میں افغانستان کا ویزہ تھا جہاں وہ جہاد میں شرکت کرنے گیا تھا۔ نیا پاسپورٹ حاصل کرنے کے بعد وہ امریکا روانہ ہو گیا۔ امریکا جانے کے بعد اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ ہیمبرگ میں وہ اپنی مصری والدہ کے رشتہ دار محمد عطا کے ساتھ رہتا تھا۔ مروان کے اچانک

لاپتہ ہونے پر اس کے گھر والے پریشان ہو گئے تھے۔ اس کے بڑے بھائی نے امارات میں سرکاری اداروں سے رجوع کیا جنھوں نے جرمنی میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کا بھائی خود جرمنی گیا جہاں اسے معلوم ہوا کہ وہ امریکا گیا ہوا ہے۔ بعد میں مروان نے امارات میں اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ کرکے اپنی خیریت کی اطلاع دی لیکن اس نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے۔

زیاد سمیر الضراح

زیاد سمیر الضراح کا تعلق بیروت سے 75 کلومیٹر دور ایک گاؤں المرج سے ہے۔ امریکا کے تفتیشی اداروں کا کہنا ہے کہ وہ پنسلوانیا کے قریب گرنے والے جہاز کے ہائی جیکروں میں شامل تھا۔ یہ بھی خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ مذکورہ جہاز کے پائلٹ کی سیٹ زیاد نے ہی سنبھالی تھی۔ شہری ہوابازی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ پانچ سال پہلے ہیمبرگ گیا تھا۔ اس دوران وہ ہر سال اپنے گھر والوں سے ملنے بیروت آتا رہا۔ آٹھ ماہ قبل اس کے والد کا بائی پاس آپریشن ہوا تو وہ اسے دیکھنے آیا تھا۔ زیاد کا والد اپنے بیٹے کو 1500 ڈالر ماہانہ روانہ کرتا تھا جس سے وہ اپنی تعلیم اور ضروریات کا خرچہ چلاتا۔ زیاد کے والد کا کہنا ہے کہ مذکورہ حملوں سے چار گھنٹے پہلے اسے زیاد کا فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اسے یونیورسٹی کی طرف سے بوئنگ 767 کی

تربیت کی لئے اسکالرشپ مل گیا ہے اور وہ فلوریڈا جا رہا ہے۔ زیاد کے چچا جمال الجراح نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ زیاد خوش مزاج نوجوان تھا اور وہ انتہا پسند تھا اور نہ اسلامی تعلیمات کا پابند۔ جرمنی میں وہ اپنی ترک گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا تھا۔ واضح رہے کہ زیاد کی فیملی نے اس کی وہ تصویر بھی اخبارات کو جاری کی ہے جس میں زیاد کسی تقریب میں لڑکی کے ساتھ ڈانس کر رہا ہے۔ ترک گرل فرینڈ نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ زیاد کا مذکورہ دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرانے والے محمد عطا نامی مشتبہ شخص سے اس کا کوئی تعلق رہا ہے۔

عبدالعزیز العمری

ایف بی آئی کی فہرست میں مبینہ ایک اور ہائی جیکر کا نام عبدالعزیز العمری بتایا گیا ہے۔ وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے شمالی ٹاور سے ٹکرائے جانے والے طیارے میں سوار تھا۔ گمان ہے کہ وہ خود بھی پائلٹ تھا۔ وہ ریاض میں 24 دسمبر 1972 کو پیدا ہوا۔ ایف بی آئی کے مطابق عبدالعزیز العمری فلوریڈا میں مقیم تھا۔ مشتبہ افراد کی فہرست میں عبدالعزیز العمری کا نام بھی شامل ہے لیکن اس نے دھماکے کے تیسرے دن ریاض میں اخباری نمائندوں سے ملاقات میں کہا کہ دھماکے کے دوران وہ ریاض میں ڈیوٹی پر تھا۔ وہ 1993ء میں وہ انجینئرنگ کی تعلیم کے حصول کے لئے امریکا کے شہر کولوراڈو گیا جہاں قیام کے دوران (1995ء) میں

اس کے فلیٹ میں چوری ہو گئی جس میں اس کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات بھی غائب ہو گئے۔ چوری کے واقعے کی اس نے پولیس کے اطلاع دے دی۔ 31 دسمبر ئمیں اس نے نیا پاسپورٹ بنوایا۔ 11 جنوری 1996ء کو وہ نئے پاسپورٹ پر 1995 دوبارہ امریکا گیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپریل 2000ء کو وطن واپس آگیا۔ عبد العزیز نے کہا کہ وہ شہری ہوا بازی سے قطعی واقف نہیں اور نہ ہی کسی انتہا پسند تنظیم سے اس کی وابستگی ہے۔ پنسلوانیا کے قریب گر کر تباہ ہونے والے طیارے میں مشتبہ احمد النعمی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فلوریڈا میں مقیم تھا اور وہیں ہوا بازی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ احمد النعمی نامی یہ 23 سالہ نوجوان سعودی عرب کے شہر عسیر میں مقیم تھا جہاں سے پندرہ ماہ پہلے وہ عمرہ کی ادائیگی کے لئے روانہ ہوا اور واپس نہیں آیا۔

احمد النعمی

امریکا کے تفتیشی اداروں کو ریاض میں مقیم احمد النعمی ایک پائلٹ کا بھی پتہ چلا ہے۔ مذکورہ جہاز میں سوار احمد النعمی فلوریڈا میں مقیم تھا۔ ایف بی آئی نے احمد النعمی کی تصویر بھی میڈیا کو جاری کی جسے دیکھنے کے بعد احمد حیدر النعمی نامی سعودی ایئر لائن کا کارکن مقامی اخبار کے دفتر گیا اور مذکورہ حملوں سے اپنی لا تعلّقی کا اظہار کیا۔ 33 سالہ احمد النعمی نے

بتایا کہ وہ ایئر لائن میں ہوائی جہاز کے عملے کا نگران ہے۔ وہ سعودی عرب کے شہر جیزان میں پیدا ہوا۔ 1998ء میں وہ پہلی بار امریکا گیا۔ گزشتہ اکتوبر میں دوسری بار اور جولائی میں وہ آخری بار امریکا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ تینوں بار اس نے اپنا کوئی سرکاری کاغذ نہیں کھویا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم بھی جدہ میں حاصل کی۔ احمد النعیمی گزشتہ 14 سال سے سعودی ایئر لائن سے وابستہ ہے۔ امریکا میں مختصر قیام کے دوران اس نے ہوٹل کے سوائے کہیں اور اپنا پاسپورٹ نہیں دکھایا نہ ہی امریکا میں اس نے کرائے پر گاڑی لی۔ احمد النعمی نے کہا کہ ایف بی آئی کی جاری کردہ فہرست میں مشتبہ افراد کی کثیر تعداد سعودی ایئر لائنز سے وابستہ ہے جن کی اکثریت 11 ستمبر کے حملوں کے دوران امریکا میں نہیں تھی۔ ان کا نام مشتبہ افراد میں شامل کرکے ہمیں صدمہ پہنچایا۔ تاہم حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکہ نے حملوں میں ملوث افراد کے ملکوں مصر، لبنان، متحدہ امارات، سعودی عرب کے بجائے دہشت گردی کے خلاف کاروائی کے لیے افغانستان کو منتخب کیا جس کا اس واقعے سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

عراق کی جنگ میں امریکیوں کی ہلاکت اور نقصانات

عراق کی جنگ میں 3 ہزار سے زیادہ امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں، اس سے 10 گنا زیادہ زخمی ہوئے ہیں اور ڈیڑھ لاکھ کے قریب فوجی عراق کی جنگ میں کچھ کردار

ادا کرنے کے باعث ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہیں جس سے پوری امریکی فوج کا ذہنی اور اخلاقی توازن درہم برہم ہے۔ مالی اعتبار سے 450 ارب ڈالر کے بلاواسطہ مصارف کے علاوہ جو بوجھ امریکی معیشت پر پڑا ہے، اس کا اندازہ چوٹی کے امریکی معاشی ماہرین کے خیال میں 2 ٹریلین (2 ہزار ارب) ڈالر سے زیادہ ہے اور باقی دنیا کی معیشت پر اس کے علاوہ کم از کم ایک ٹریلین (ایک ہزار ارب) ڈالر کا بوجھ پڑا ہے۔

پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نقصانات

پاکستان نے امریکہ کو دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں روز اول سے معاونت فراہم کی۔ امریکہ حملوں کی وجہ سے پاکستان میں ایک بار پھر افغانستان مہاجرین کی آزادی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حکومت پاکستان امریکیوں کو فوجی اڈوں کی سہولیات ایندھن اور دیگر اشیاء کی فراہمی میں مدد دی اور القاعدہ کے شبے میں 600 افراد کو گرفتار کرکے امریکہ کے حوالے کیا۔ جنہیں بدنام زمانہ گوانتا بے (کیوبا) میں لے جا کر بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ امریکہ نے جہاں بانی اور اسرائیل کو محفوظ کرنے کے لیے ہزاروں بلین ڈالر جنگ کی آگ میں جھونک دیے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ دو سال میں ۲۵ امریکی فوجی کاروائیوں کے ذریعے ہماری سرزمین کو ہماری آزادی اور حاکمیت کا مذاق اڑاتے ہوئے نشانہ بنایا گیا ہے۔ جن میں سیکڑوں افراد بشمول معصوم

بچے، بوڑھے اور خواتین شہید ہوئے ہیں۔

کونڈو لیزا رائس نے کمال شفقت سے فوج کو سیاسی قیادت کے تحت کارفرما دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ (Undr civilian control The need for Pakistan's military to be placed) اور امریکی سینیٹرز اور سفارت کاروں نے معاشی اور فنی امداد میں تین گنا اضافے کی بات کی۔ کانگرس نے اگلے پانچ سال کے لیے 7 ارب ڈالر کی امداد کے پیکج کا دلاسہ دیا ہے۔ لیکن گاجر مولی والی اس سیاست کے ساتھ ڈنڈے اور لاٹھی والی بات کا بھی بھرپور اظہار کیا گیا۔ امریکہ کے جوائنٹ چیف اسٹاف ایڈمرل مائک ملین نے کہا کہ اگر مجھے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا پڑے جہاں سے اگلا حملہ ہونے والا ہے تو یہ وہ جگہ ہے جسے میں یقیناً منتخب کروں گا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں القاعدہ ہے، جہاں ان کی قیادت ہے اور ہمیں اس چیلنج کو ختم کرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ اسی طرح سی آئی اے کے ڈائریکٹر مائیکل ہے ڈن (Michael Hayden) کا ارشاد ہے: القاعدہ قبائلی علاقے میں دوبارہ مجتمع ہو گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ امریکا پر کسی دوسرے حملے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ ایک اور جاسوسی ایجنسی ایف بی آئی اے کے ڈائریکٹر روبرٹ موئیلر (Robert Mueller) کا ارشاد گرامی ہے کہ القاعدہ کے کارندے قبائلی علاقوں میں روپوش ہیں اور "وہ راتوں رات خاموشی سے غائب نہیں ہو جائیں گے۔" اس کورس میں جس بات کا سب سے زیادہ

تذکرہ ہے، وہ یہ ہے کہ نائن الیون کے حملے کی منصوبہ بندی عراق میں نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ افغانستان میں ہوئی تھی۔ پانچ سال تک عراق کو تاراج کرنے کے بعد اب یہ راگ الاپا جارہا ہے کہ اصل خطرہ تو افغانستان اور پاکستان سے ہے اور ہم ناحق عراق میں پھنسے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن سے ایک اہم رپورٹ کے مطابق: گذشتہ 10 دنوں میں خطرے کے نئے احساس یعنی فاٹا میں القاعدہ قائدین کا دوسرے نائن الیون کا منصوبہ بنانے پر واشنگٹن میں درجنوں اجتماعات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ (ڈان، 21 اپریل 2008) 90 ہزار فوجی قبائلی علاقوں میں برسرپیکار ہیں اور گذشتہ تین سال میں 1200 سے زائد فوجی ہلاک اور ہزاروں زخمی ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جنھیں دہشت گرد کہا جاتا ہے ان کا جانی نقصان بھی اس سے کسی طرح کم نہیں۔ نیز 3 ہزار سے زیادہ عام شہری جن میں بچے، بوڑھے اور خواتین بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ لقمہ اجل بن گئے ہیں۔ پورے علاقے میں انتشار، افراتفری اور خون خرابہ ہے۔ آبادی کے نقل مکانی کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کو نائن الیون کے بعد امریکا کے حواری بننے کی بڑی بھاری معاشی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ امریکا تو یہی طعنہ دیتا ہے کہ ہم نے 11 ارب ڈالر کی امدادی ہے مگر حقیقت یہ کہ اس میں سے 2 ارب ڈالر فوجی خدمات کے معاوضے میں دی گئی ہیں۔ اور اصل معاشی امداد جس کا ایک حصہ قرض کی شکل میں ہے صرف 5 ارب ہے، جب کہ پاکستان کو ملک اور بیرونی محاذ پر جو معاشی نقصان اس جنگ میں شرکت کی وجہ سے ہوا ہے، اس کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ 2002ء میں صرف پانچ سال

کی بنیاد پر خود امریکا کی نارتھ کمانڈ کی ویب سائٹ پر یہ نقصان 10 سے 12 ارب ڈالر قرار دیا گیا تھا۔ آزاد ذرائع کے مطابق گذشتہ سات سال میں یہ نقصان 12 سے 15 ارب ڈالر کا ہے جس کی کوئی تلافی نہیں کی گئی اور نہ اس کا کوئی مطالبہ پاکستانی حکومت نے کیا، بلکہ اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔

مسلمانوں اور عربوں کے خلاف نفرت انگیز مہم

دانشوروں کا کہنا ہے کہ ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایسے ادوار آتے ہیں جب انہیں امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاید مسلم برادری بھی ایسے ہی مرحلے سے گزر رہی ہے۔ گیارہ ستمبر اور سات جولائی کے واقعات کے بعد دنیا بھر میں نسلی، مذہبی اور سیاسی مباحثوں نے خاصی شدت پکڑ لی ہے۔ نائین الیون کے واقعات کے بعد امریکہ برطانیہ مسلمانوں اور عربوں کے خلاف نفرت انگیز مہم چلائی گئی اور مسلمانوں سے مشابہت کی بنا پر سکھوں کو بھی بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ہیل اسٹیٹ یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق ان حملوں کا سب سے زیادہ شکار مسلمان، عرب اور مشرقی وسطیٰ کے باشندوں کو بنایا گیا ہے۔ 80 ہزار عرب اور مسلمان باشندوں کے فنگر پرنٹ لیے گئے۔ انٹرویو اور تفتیش کی گئی۔ 5 ہزار غیر ملکیوں کو گرفتار کیا گیا۔ جبکہ پوری دنیا میں دہشت گردی کے نام پر ہزاروں افراد کی ایئر پورٹ پر تلاشی اور گرفتاری اور بے دخلی کی گئی۔

مسلمانوں کی دل آزاریاں

نائن الیون کے بعد دنیا میں مسلمانوں کی دل آزاری کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل آزار خاکہ شائع کیے گئے۔ جس پر ساری دنیا میں مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ نائین الیون کی ساتویں برسی پوری دنیا میں منائی گئی۔ دنیا بھر کے رسائل وجرائد میں اس حوالے سے تحریریں شائع ہوئیں۔ لیکن اس موقع پر امریکہ میں مسلمانوں کی دل آزاری کی ایک اور حرکت ہوئی۔ امریکہ کی ایک کمپنی نے انٹرنیٹ نام کے اس Muslim Massacre'' پر ایک گیم جاری کیا ہے ''مسلمانوں کا قتل عام کمپیوٹر گیم کو فری ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ کئی مرحلوں میں مکمل ہونے والے اس گیم کا مسلح ہیرو دنیا کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرنے کے مشن پر ہے۔ مشین گن، راکٹ لانچر اور دیگر جدید ترین ہتھیاروں سے لیس یہ ہیرو ایک طیارے سے پیرا شوٹ کے ذریعہ خلیج میں اترتا ہے اور مسلمانوں کا صفایا شروع کرتا ہے۔ اس کے مدمقابل اسلامی لباس میں ملبوس مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں مسلم کلچر کے مطابق عمارتیں اور مذہبی مقامات مساجد کو دکھاتے ہوئے یہ ہیرو وہ مسلمانوں کو قتل عام کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ تمام مزاحمتوں کو دور کرتے ہوئے قتل کرتا رہتا ہے۔ اور گیم کے مراحل پار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب اس کا مقابلہ اسامہ بن

لادن سے ہوتا اور یہ ہیرو اسامہ کو قتل کر دیتا ہے اور اگلے مرحلے کے لئے روانہ ہو جاتا ہے۔ اگلے مرحلے میں نعوذ باللہ اسکا مقابلہ اللہ اور رسول اللہ سے دکھایا گیا ہے۔ اس طرح گیم مکمل ہوتا ہے۔ یہ گیم بائیس سالہ امریکی سبوتر واگٹ نے بنایا ہے۔ واگٹ آسٹریلیا میں مقیم ہے۔ واگٹ کا کہنا ہے کہ اس گیم مقصد یہ پیغام دینا ہے کہ زمین کے کسی چپے پر مسلمان مرد یا عورت زندہ نہ رہنے پائے۔ اس گیم کے ریلیز ہوتے ہی عالم اسلام سے شدید رد عمل دیکھنے میں آنے لگا ہے۔ پاکستان اور ایران نے اس گیم کے خلاف سخت رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے گیم کو فوراً انٹرنیٹ سے ہٹانے کا مطالبہ کیا ہے۔ ایران کی ایک تنظیم لشکر علی کے سربراہ مہدی سروشانی نے کہا ہے کہ امریکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منافرت پھیلانے کی ملٹی ملین ڈالر مہم جاری رکھے ہوئے ہے۔ عالم اسلام کو امریکہ کی سازش سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اور امریکی سازشوں کا منہ توڑ جواب دینا ناگزیر ہوتا جارہا ہے۔برطانیہ کی اسلامی تنظیم رمضان فاؤنڈیشن نے اس گیم پر شدید غصے کا اظہار کیا ہے۔ ایک پاکستانی کمپیوٹر گیم ایکسپرٹ نے اس حرکت کو مجرمانہ ذہنیت اور بیمار ذہنی کا مظہر قرار دیا ہے

ہندوستان کے مسلمانوں کی تذلیل

نائن الیون کے بعد لوگوں کی مذہبی بنیادوں پر تذلیل ایک معمول بن چکا ہے۔

ہندوستان دنیا کے ان چند ملکوں میں ہے جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے۔ یہاں

تقریباً پندرہ کروڑ مسلمان ہیں اور وہ بھی دنیا کے دوسرے خطوں کی طرح گیارہ ستمبر کے منفی اثرات کی زد میں آئے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد ہندوستان میں کشمیر اسمبلی اور ملک کی پارلیمنٹ پر حملے کیے گئے۔ سازش کے تحت بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں جن میں حملے کا نشانہ واضح طور پر ہندوؤں کو بنایا گیا اور رد عمل میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا ہے۔ ان میں ٹرینوں کے مخصوص ڈبوں میں دھماکے، احمد آباد کے اکشر دھام مندر اور بنارس کے سنکٹ موچن مندر پر بم حملے شامل ہیں۔ گزشتہ برس ہندوؤں کے بڑے تہوار دیوالی سے ایک روز قبل دلی کے مصروف بازاروں میں خونریزی بھی اسی سلسلے کی کڑی نظر آتی ہے۔ دہشت گردی کے پے در پے واقعات اور گیارہ ستمبر کے نیویارک کے حملے نے مسلمانوں کی شبیہ بری طرح مجروح کی ہے۔ ہندوستان میں آج مسلمان شک کے محاصرے میں ہے۔ ممبئی اور دلی جیسے بڑے شہروں میں ہندو آبادی والے علاقوں میں لوگ اب مسلمانوں کے ہاتھوں مکان فروخت کرنے یا کرائے پر دینے میں ہچکچاتے ہیں۔ انڈین مسلمانوں کو دہشت گردی کے واقعے کے بعد ہراساں کیا جاتا ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک طرف دہشت گردی کی قیمت مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ادا کرنی پڑی ہے تو دوسری جانب ممبئی اور گجرات کے فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کی ہلاکت کے لیئے ایک شخص کو بھی سزا نہ دیئے جانے سے مسلم برادری مزید پستی اور شکستگی کے احساس سے گزر رہی ہے۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد امریکہ نے سلامتی کے نام پر جس طرح کے اقدامات کیے ہیں ان کی پیروی کرتے

ہوئے ہندوستان میں مسلمانوں سے امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔ حقوق انسانی کی تنظیمیں اور مسلمان شکایت کرتے رہے ہیں کہ دہشت گردی کے کسی واقعہ کی صورت میں مسلمانوں کو ہراساں کیا جاتا ہے، انہیں بڑی تعداد میں غیر قانونی طور پر حراست میں رکھا جاتا ہے، لوگوں کی مذہبی بنیادوں پر تذلیل کی جاتی ہے اور اکثر اذیتیں دی جاتی ہیں۔ اقلیتی امور کے تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ میڈیا عموماً مسلمانوں کی منفی خبریں ہی پیش کرتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد سلامتی کے بعض ماہرین اور ہندو دانشوروں کی طرف سے یہ تجاویز کھل کر سامنے آئیں کہ اسرائیل کے طرز پر ہندوستان کی سکیورٹی افواج کو بھی ان افراد کے مکانوں کو تباہ کر دینا چاہیئے جو دہشت گرد کارروائیوں میں شامل ہوں یا جن پر تخریبی سرگرمیوں میں شامل ہونے کا شک ہو۔ گزشتہ سات برس ہندوستان کے مسلمانوں پر کافی بھاری گزرے ہیں۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کے تمام مکتبہ فکر کے علماء دلی میں جمع ہوئے۔ انہوں نے دہشت گردی کی ہر شکل میں خواہ وہ کسی بھی مقصد کے لیئے ہو مذمت کی اور اسے اسلام کی روح کے منافی قرار دیا۔ علماء نے حکومت پر یہ واضح کر دیا کہ اسلام کو دہشت گردی سے منسوب نہ کیا جائے کیونکہ اسلام، بقول ان کے، بے قصوروں کی ہلاکت کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔

جابر سلطان اور کلمہ حق

نوائے وقت ایک اخبار ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ بھی ہے۔ قیام پاکستان کی تخلیق جس قرار داد کی منظوری سے ہوئی، اس دن یہ اخبار بھی طلوع ہوا۔ یہ اخبار ایک ایسے اخبار نویس کا خواب تھا۔ جو وطن سے بے پناہ محبت رکھتا تھا۔ وہ اس سرزمین پاک پر کلمہ حق کا غلبہ چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے اس اخبار کی پیشانی پر جابر حکمران کے خلاف کلمہ حق کے اظہار کو سب سے افضل جہاد کی عبارت سے روشن کیا۔ عارف نظامی کے والد حمید نظامی نے تئیس مارچ سنہ انیس سو چالیس کو عین اس دن لاہور سے نوائے وقت کا پہلا پرچہ شائع کیا تھا جب لاہور کے منٹو پارک میں قرارداد پاکستان پیش کی گئی۔ نوائے وقت کراچی کی اشاعت کے موقع پر میں اس کی تاسیسی ٹیم کا رکن تھا۔ اس ٹیم میں کئی نابغہ روزگار جوہر تھے۔ جو بد قسمتی سے ایک ساہوکار کی جھولی میں آ گرے تھے۔ محمد سرور اس ٹیم کا سرخیل تھا۔ آج لندن میں دی نیشن لندن کا مالک ایڈیٹر ہے۔ انور سن رائے بی بی سی لندن سے وابستہ ہے۔ اخلاق احمد نے اخبار جہاں کی ادارت کی اور اسے بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یوسف خان (چیف رپوٹر) الیاس شاکر (چیف ایڈیٹر قومی اخبار، چیف اگزیکٹیو دھوم ٹی وی)، صالح محمد ظافر، حاجی احمد مجاہد، گل محمد فیضی، خالد اظہر، علی نواز خاصخیلی (اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کراچی ایف ایم) عبدالجبار خان، یہ

سارے نوجواں تھے، اور کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اخبار کے مالک ایڈیٹر کا خیال تھا کہ آٹھ سو روپے کی تنخواہ پر سالہا سال تک ان سے کام لیتا رہے گا۔ اسی زمانے میں ہمارے ایک دوست نے ایک معاصر اخبار میں ایک کالم لکھا، صحافت کے خرکار کیمپ جس میں اس صورتحال کا ذکر تھا۔ جس پر اخبار کے ایڈیٹر نے تمام ملازمین کی انکوائری کرادی کہ یہ مضمون کس نے لکھا ہے۔ بعد میں ہمارے یہ دوست ایک دن اچانک نوائے وقت کے دفتر میں مجید نظامی کے کمرے میں داخل ہوئے اور کہا کہ یہ مضمون میں نے لکھا ہے، میرا نام یہ ہے، آپ کو کوئی اعتراض ہے۔ نظامی صاحب ہکا بکا رہ گئے۔

گورے چٹے عارف نظامی ان دنوں باہر سے تعلیم پا کر جو اکثر کراچی کے دفتر آتے تھے۔ یہ بھی ان دنوں صحافت میں اپرینٹنش تھے۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے روزنامہ نوائے وقت کے اگزیکٹو ایڈیٹر اور دی نیشن کے ایڈیٹر بنے۔ عارف نظامی نے دی نیشن کو بنایا، جمایا اور چلایا لیکن آج جب اس اخبار کے لئے عارف نظامی کی کاوش رنگ لائی ہیں تو ایک بار پھر بڑے نظامی صاحب نے اپنے خون کو اس ادارے سے جدا کر دیا جسے ان کے باپ نے قائم کیا تھا۔ حکمرانوں کی آمرانہ سوچ شور مچانے والے اپنی آمرانہ سوچ پر قابو نہیں پا سکتے۔ کتنے لوگ نوائے وقت کی سیڑھیاں اتر گئے۔ لیکن کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن ادارہ نوائے وقت کے بانی حمید نظامی کے صاحبزادے، دی نیشن کے ایڈیٹر،

عارف نظامی بھی ایک روز اسی طرح سیڑھیاں اتر جائیں گے۔ انگریزی اخبار 'دی نیشن' کے ایڈیٹر عارف نظامی کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا ہے اور ان کی برطرفی میں بھی اسی رعونت، اور آمرانہ طرز کا اظہار ہے۔ جو اس سے پیشتر ملازمین سے روا رکھا جاتا رہا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ کل ہیڈ آفس کی پالیسی تھی کہ کہ دفتر میں کوئی خاتون ملازم نہیں رکھی جائے گی، جس زمانے میں ضیا شاہد کراچی نوائے وقت کے ریزیڈینٹ ایڈیٹر تھے۔ اس وقت ایک حکم نامے کے تحت کراچی کے دفتر سے تمام خواتین اسٹاف کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ لیکن آج اپنے خون کو چھوڑ کر لے پالک خواتین کے سپرد سارا اخبار کر دیا گیا ہے۔ شاید اسی لئے زمانے میں خون سفید ہونے کی باتیں کی جاتی ہیں۔ اخبارات میں ایڈیٹر آتے جاتے رہتے ہیں، برطرفیاں تقرریاں اور استعفے بھی پاکستان کی صحافت میں معمول کی بات ہے لیکن عارف نظامی کی اس انداز سے برطرفی ہے جس کے بارے میں اس سے پہلے یہ تاثر تھا کہ وہ اخبار کے مالکوں میں سے ایک ہیں۔ ایک صدمہ والی بات ہے۔ خاص طور پر جب ان کے والد حمید نظامی کے صحافتی کیریئر کو اس اخبار کی بنا کر جب آزادی صحافت کی بات کی جاتی ہو۔

عارف نظامی اس وقت بچے تھے جب ان کے والد صرف پینتالیس برس کی عمر میں

انتقال کر گئے تھے۔ عارف نظامی کی والدہ نے نوائے وقت کی ادارت سنبھالی اور اپنے کم سن بچوں کے ساتھ اخبار چلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں۔اس وقت صحافیوں کی ملک گیر ہڑتال چل رہی تھی۔ اور کمسن یتیم بھتیجے کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے کے بجائے، جائیداد کا بٹوارہ کیا جا رہا تھا۔ دیور بھابھی میں صلح کے بعد مجید نظامی روزنامہ نوائے وقت کے انتظامی اور ادارتی سربراہ ہوئے۔ نوائے وقت کا پریس تباہ ہوگیا۔ اور نیا پریس لگایا گیا۔ بھتیجے عارف نظامی نے ایک عام رپورٹر کی حثیت سے اخبار میں کام کرنا شروع کیا اور سنہ انیس سو چھیاسی میں اس دور کے پنجاب کے واحد نجی انگریزی اخبار 'دی نیشن' کی بنیاد رکھ دی۔ پرنٹ لائن پر عارف نظامی کا نام شائع ہونے لگا تھا۔ عارف نظامی سے اظہار یک جہتی میں بہت سے صحافیوں نے اس ادارے سے استعفا دے دیا ہے۔ جو ایک پیشہ ور ایڈیٹر کی برطرفی کے طریقہ کار کے خلاف احتجاج ہے۔ سی پی این ای کے صدر کی حیثیت سے بھی ان کا ایک مقام ہے۔ عارف نظامی کی یوں برطرفی نے جنرل ضیاء کی جانب سے محمد خان جونیجو کی وزیر اعظم کے عہدے سے برطرفی کے واقعہ کی یاد دلا دی۔ ہماری صحافتی اور سیاست کی تاریخ انہی واقعات سے عبارت ہے۔

سب قصور عوام کا ہے

سب کچھ کے ذمہ دار عوام ہیں

گوجر خان میں چار گھنٹے سے لائیں میں خجل خواری اور 10 روپے کلو آٹا حاصل کرنے کی جستجو میں ایک اور شخص جان کی بازی ہار گیا۔ کراچی سمیت پورے ملک میں ستا آٹا اسکیم کے حصول کے لئے عوام کو جس ذلت کا سامنا ہے وہ اب دیکھی نہیں جاتی۔ غریبوں کی ایسی رسوائی پہلے کبھی نہیں ہوئی کہا جاتا ہے کہ شہریوں کو بد نظمی کے باعث شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ کئی مقررہ مقامات پر سستے آٹے کے اسٹالز کا نام ونشان تک نہیں۔ سندھ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ صوبے بھر میں عوام کو ریلیف پہنچانے کیلئے رمضان المبارک میں کراچی کے مقررہ 200 سے زائد مقامات پر آٹا 10 روپے کلو فروخت کیا جائے گا۔ شہریوں کی بڑی تعداد شہر میں پوچھتی پھرتی ہے یہ اسٹال کہاں ہیں۔ پولیس اہلکاروں کی زور زبردستی سے کئی تھیلے خریدنے کی تصاویر شائع ہوئی ہیں۔ لیکن کوئی بتائے کہ کیا ہماری پولیس غریبوں میں شمار نہیں ہوتی، اس کے بچے بھی تو اسی آٹے کی روٹیاں کھاتے ہیں۔ شوکت عزیز نے یوٹیلٹی اسٹور کے ذریعہ قوم کی غریبی کا علاج ڈھونڈا تھا۔ لیکن اب یہاں بھی ایک کلو چینی کے لئے لمبی لمبی لائن لگی ہوتی ہیں۔

ابھی عوام آٹے، چینی، بجلی کے صدمے سے بے حال ہیں کہ ایک اور خوشخبری ان کے لئے آ گئی ہے۔ وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی نے کہا ہے کہ قوم کو گیس، بجلی اور پانی کے بحران کے لیے تیار رہنا ہوگا تاہم حکومت اس کے خاتمے کے لیے شارٹ، مڈ ٹرم اور لانگ ٹرم پالیسیاں بنا رہی ہے۔ عوام کے نصیب میں چین کہاں ہے، مشکلات کے پہاڑ سر کرنا اب ان کا مقدر ہوچلا ہے۔ دودھ، گوشت، سبزیاں، پھل رمضان میں جس من مانی قیمت پر فروخت ہوئے اس پر عوام کس سے شکایت کریں۔ شہر میں امن وامان کے ڈنکے بج رہے ہیں لیکن عوام کرب کا شکار ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کامیابی پر شادیانے بجائے جارہے ہیں لیکن شہروں میں امن امان کی جو حالت ہے اس کا ذمہ دار کون ہے۔ یہاں حکومتی رٹ کہا ہے۔ ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی میں لوٹ مار کے واقعات بڑھ گئے ہیں۔ اس کا اندازہ سی پی ایل سی کی اس رپورٹ سے ہوجاتا ہے جس کے مطابق رمضان المبارک کے گزشتہ 2 عشروں میں شہر بھر میں اسٹریٹ کرائم کی 2728 وارداتیں ریکارڈ کی گئی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق 20 دنوں میں مسلح ملزمان 86 گاڑیاں چھین اور 207 چوری کرکے فرار ہوگئے۔ 168 موٹر سائیکلیں اسلحے کے زور پر چھینی اور مختلف مقامات سے 706 موٹر سائیکلیں چوری کرکے لے گئے۔ 519 موبائل فون چھینے اور 1042 چوری کیے گئے۔ حکومت خوش ہے کہ کراچی میں ڈبل سواری پر پابندی لگانے سے سارے مسائل حل ہوگئے ہیں۔ ایک سال کی حکومت کا جشن منانے کے لئے اخبارات کے

صفحات کو گواہ بنایا جا رہا ہے۔ عوام کو مشورے دیئے جا رہے ہیں کہ ایک چمچہ چینی استعمال کر کے بیماریوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ عوام بے چارے سڑکوں پر دھکے کھا رہے ہیں، ابھی تک ملازمتوں سے پابندی کے خاتمے کا فیصلہ نہیں ہوا، یہ فیصلہ ملازمتوں کی بندر بانٹ سے پہلے ممکن نہیں ہے۔ یہ ساری مہنگائی، بدامنی، فساد، ہنگامہ، لوٹ مار، دھوکے کا کاروبار.... سب کچھ کے ذمہ دار عوام ہیں۔ حکومت یا اس کا کوئی ادارہ یا وزارت نہیں ہے۔ اس لئے اب عوام کو راہ راست پر آ جانا چاہئے۔ رمضان کا مہینہ یوں بھی توبہ کا مہینہ ہے۔ ساری عوام کو اپنے قادر مطلق سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ کیوں کہ حکمران عوام کا عکس ہوتے ہیں۔

ایک اور سانحہ

ہماری تاریخ میں سانحے اس تواتر سے ہو رہے ہیں کہ اب کسی بھی مقام کا نام بغیر کسی سانحے کے یاد نہیں کیا جاتا، سانحہ کارساز، سانحہ راولپنڈی، سانحہ مری، سانحہ نشتر پارک ۔۔۔ اور نہ جانے کتنے سانحے ہیں جو یاد آتے چلے جاتے ہیں، ن سانحوں میں ایک اضافہ سانحہ کھوڑی گارڈن ہے۔ قدیم شہر میں گنجان کاروباری علاقہ میں کھوڑی گارڈن سے میرا تعارف پرانی کتابوں اور رسائل کے سبب ہوا تھا۔ یہاں پرانے رسالے، کتابیں، اور ہر طرح کا سامان ملتا تھا۔ اب کتابوں اور رسالوں کی دکانوں میں کاسمیٹکس کا سامان، الیکٹرونک کے آئیٹم،اور کھانے پینے کا سامان فروخت ہوتا ہے۔

پیر کے روز یہاں راشن کی تقسیم کے دوران پیش آنے والا واقعہ ہماری اجتماعی بے حسی، عوامی بد نظمی، ،بڑھتی ہوئی غربت، اور انسانی مجبوری کی المناک داستان ہے۔ کھوڑی گارڈن میں مفت راشن کی تقسیم کے دوران بھگڈڑ مچنے سے ۸۱ خواتین جاں بحق ہو گئی جبکہ متعدد خواتین زخمی ہیں۔ مفت راشن تقسیم یا زکواۃ یا خیرات، یا غریبوں کو کپڑوں کی تقسیم کا اس شہر کے ہر علاقے میں ہوتا ہے۔ لیکن پہلے یہ کام لوگوں کی تعداد کے لحاظ سے نہایت خوش اسلوبی سے

جاری تھا۔ لیکن اب ہر روز لاکھوں افراد کے خط غربت سے نزدیک ہونے سے اس تعداد میں اس قدر اضافہ ہوگیا ہے کہ جہاں بھی کہیں زکواۃ یا کسی نوعیت کی مفت تقسیم کا شور ہوتا ہے، سینکڑوں لوگ پہنچ جاتے ہیں، نظم وضبط کی ہماری قوم میں کوئی عادت ہی نہیں ہے۔ اچانک بھگدڑ مچنے کا یہ نیا واقعہ نہیں ہے، کئی سال پہلے راولپنڈی میں ایک مزار میں بہشتی دروازے میں کئی ہلاکتیں ہوچکی ہیں۔ کراچی میں فیضان مدینہ میں بھی ایسی ہی بھگدڑ میں بہت سے خواتین جاں بحق ہوئی تھیں۔ خواتین یوں بھی کمزور ہوتی ہیں، جلد صدمے کا شکار ہوتی ہیں اور بے ہوش ہوجاتی ہیں۔ یہاں بھی اکثر خواتین کی ہلاکت دم گھٹنے سے ہوئی ہے۔ اس میں مفت راشن تقسیم کرنیوالے چودھری افتخار کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جسے پولیس نے محض اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے گرفتار کرلیا ہے۔ ہمارے حکام واقعے پر نوٹس لینے اور رپورٹ طلب کرنے اور تحقیقات کا حکم دینے کی حدتک ہیں۔ وہ اس طوفان کا ادراک ہی نہیں رکھتے جو ہمارے معاشرے کو بہا کرلے جارہا ہے۔ ہم متاثرین کو معاوضے کی ادائیگی کو اہم سمجھتے ہیں۔ لیکن کیا ایک دو لاکھ روپے ایک انسانی جان کی قیمت ہوسکتے ہیں۔ بعض لوگ سانحہ کھوڑی گارڈن کی ذمہ داری حکومت پر عائد کرتے ہیں کہ مہنگائی کے سبب سفید پوش طبقے کو حکومت نے بھکاری بنادیا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ہمارا معاشرہ تباہ ہورہا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے جلسے۔۔۔ بم دھماکے۔۔۔ تحریک آزادی عدلیہ۔۔۔ فائرنگ۔۔۔ خود کش حملے۔۔۔ دہشت گردی کا شکار۔۔۔ ریاستی بدمعاشی۔۔۔ معاشی

بدحالی۔۔۔ حکومت اور حزب اختلاف میں تصادم۔۔۔ تحاریک بحالی جمہوریت۔۔۔ اناج کا بحران۔۔ چینی کا بحران، بجلی، گیس، پانی کے بحران۔ اور اس پر ستم یہ کہ ہر ظلم کا شکار۔۔۔ نہتی اور مظلوم پاکستانی غریب عوام۔۔۔ جن کو ہر بااثر طبقے نے استعمال کیا چاہے وہ سیاستدان ہوں ملا ہوں یا آمر۔۔۔ اس واقعے کے اصل ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے چینی اور آٹے کی ذخیرہ اندوزی کی ہے اور وہ مال بنانے اور لوٹ مار کا کوئی موقع نہیں ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ہم نے آئی ایم ایف کے حکم پر سبسڈی ختم کی ہیں تو دوسری طرف اربوں روپے کی اسکیموں میں غریب عوام کو مختلف اسکیموں کے ذریعے ریلف دینے کا ڈھونگ رچایا جارہا ہے۔ اس کا آسان حل تو یہ تھا کہ حکومت راشن کارڈ اسکیم کا اجراء کردیتی۔ لوگ عام مارکیٹ سے نہ سہی راشن کی دکانوں سے ہی آٹا، چینی، گھی، چائے حاصل کر لیتے۔ اگر ہمارے حکام عوام کے ذرا بھی ہمدرد ہوتے تو مہنگائی پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی۔ لوگوں کو روزگار مہیا کیا جاتا۔ تو اتنی بڑی تعداد میں زکوۃ لینے والے افراد نہیں ہوتے اور رش کی وجہ سے بھگدڑ نہیں مچتی۔

روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے کہاں گئے، طاقت کا سرچشمہ عوام کیا ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے وعدوں اور دعوؤں میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں اتنے برے حالات پچھلے کسی دور حکومت میں نہیں رہے۔ آمروں کے

دور میں لوگوں کو روٹی کی فکر تو تھی مگر اب تو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور حکومت خالی نعروں اور کھوکھلے دعووں سے عوام کو طفل تسلی دینے میں مصروف ہے۔ ارباب اختیار کی یہ بے حسی طوفان سے پہلے کا سکوت بھی بن چکی ہے۔ سچ یہ ہے کہ خونی انقلاب پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

زندہ قومیں اپنے ہیروز کا ایسے ہی استقبال کرتی ہیں

زندہ قومیں اپنے ہیروز کا ایسے ہی استقبال کرتی ہیں جیسے عراقی عوام نے بش پر جوتا پھینکنے والے عراقی صحافی منتظر زیدی کی رہائی کے بعد ان کا استقبال کیا۔ زیدی نے صدر بش پر جوتا پھینکتے ہوئے انہیں 'کتا' کہا تھا ان کے اس جرم کے لیے انہیں تین سال کی سزا سنائی گئی تھی اور مارچ میں جیل بھیج دیا گیا تھا لیکن ان کے صاف ستھرے ماضی کے سبب ان کی تین سال کی سزا کم کرکے ایک سال کردی گئی تھی اور اب جیل میں ان کے اچھے برتاؤ کی وجہ سے انہیں گزشتہ روز رہا کردیا گیا۔

منتظر زیدی کو صدر بش پر جوتا پھینکنے کے بعد عرب دنیا میں ایک ہیرو کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اور وہ اس کے مستحق بھی ہیں، انہوں نے بش کو اس وقت کتا کہا تھا۔ جب امریکہ کا جھوٹ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور بہت سے غدار ان کے آگے اور پیچھے دم ہلاتے پھر رہے تھے۔ صدر بش پر جوتا پھینکنے سے قبل منتظر الزیدی کو بہت کم لوگ جانتے تھے لیکن ان کی جرات اور قومی حمیت نے انھیں ساری دنیا میں مشہور کردیا۔ وہ قاہرہ کے ایک نجی ٹی وی چینل 'البغدادیہ' کے لیے کام کرتے تھے۔ ایک پریس بریفنگ میں انہوں نے جب سابق امریکی صدر پر جوتا پھینکتے ہوئے کہا کہ ' کتے یہ عراقی بیواؤں، یتیم بچوں

اور ان عراقیوں کی جانب سے الوداعی تحفہ ہے جو عراق میں مارے گئے ہیں'۔ ان کا یہ انوکھا احتجاج ساری دنیا میں ٹی وی پر دیکھا گیا اور زیدی عرب دنیا کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں بھی ایک ہیرو کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ جو لوگ بش پر جوتے پھینکنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک بش کو اس سے بہتر ڈھنگ سے الوداع نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک خون آشام بھیڑیئے کے لئے یہ عبرتناک، ذلت آمیز اختتام تھا۔ زیدی کو اس کی پاداش میں جیل میں تشدد برداشت کرنا پڑا۔ ان کی اس جی داری پر عراق ہی نہیں دنیا بھر میں لوگوں نے جشن منایا، انٹرنیٹ پر گیمز بنائے گئے، ٹی شرٹ بنائی گئیں۔ اور ان کی رہائی کا جشن جاری ہے، ایسے ہی مناظر لیبیا میں اس وقت دکھائی دیئے تھے۔ جب گزشتہ دنوں لیبیا کے ہیرو لاکربی بمبار عبدالباسط علی المگراہی سکاٹ لینڈ کی جیل سے رہائی کے بعد لیبیا واپس پہنچے۔ جہاں سینکڑوں لوگ ان کے استقبال کے لیے جمع تھے۔
عبدالباسط علی محمد المگراہی کو انیس سو اٹھاسی میں پین ایم کے مسافر جہاز کو سکاٹ لینڈ کے قصبے لاکربی کے اوپر دھماکہ خیز مواد سے اڑانے کے جرم میں ستائیس برس کی قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس واقعے میں دو سو ستر افراد ہلاک ہوئے تھے۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی کے بیٹے نے المگراہی کی لیبیا واپسی میں اہم کردار ادا کیا۔ انھیں اسکاٹ لینڈ کی حکومت نے لاکربی طیارے

کی تباہی کے الزام سے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر رہا کر دیا تھا۔ المگراہی مثانے کے کینسر میں مبتلا ہیں اور ڈاکٹروں کے مطابق ان کے زندہ بچنے کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ امریکی اس رہائی پر سیخ پا ہیں اور امریکہ کے صدر براک اوباما نے المگراہی کی رہائی کو غلطی قرار دیا ہے۔ امریکیوں کا مطالبہ ہے کہ لیبیا کی حکومت کو المگراہی کا ہیرو کے طور استقبال نہیں کیا جانا چاہیے تھا اور اب انہیں نظر بندی میں رکھا جائے۔ امریکہ نے عبد الباسط المگراہی کی ممکنہ رہائی یا لیبیا منتقلی کو رکوانے کی کوششیں کی تھیں۔ امریکہ کے سات سینٹروں نے سکاٹ لینڈ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عبد الباسط المگراہی کو رہا نہ کرے۔ امریکی سینیٹروں نے جن میں ایڈورڈ کینیڈی اور جان کیری بھی شامل ہیں لاکربی کے ملزم المگراہی کی جلد رہائی کے فیصلے پر تشویش ظاہر کی تھی۔ 'لاکربی کا واقعہ بھی امریکی سی آئی اے کی سازش تھی۔ جیسی سازش گیارہ ستمبر دو ہزار کا واقعہ تھا۔ یہ مسلمانوں کو بنام کرنے اور ان کے ملکوں پر قبضہ کرنے کی سازش ہے جو آہستہ آہستہ بے نقاب ہو رہی ہے۔

گو امریکیوں نے اس کے بدلے میں لیبیا سے بھاری تاوان حاصل کیا ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ مطمئین نہیں ہیں۔ عراق اور لیبیا کے عوام اور حکومتیں اپنے ہیروز کا ایسے ہی استقبال کرتی رہیں گی۔ لیکن ہماری قوم کو کیا ہوگیا ہے، اور ہمارے حکمرانوں کی غیرت کہاں سو گئی ہے، کہ اس قوم کی ایک مظلوم بیٹی

امریکہ کی قید میں ہے، اس پر کوئی جرم بھی ثابت نہیں ہوا، اس پر تشدد کر کے ذہنی معذور بنا دیا گیا ہے، ہماری عدالتیں، عوام، اس کی رہائی کے منتظر ہیں۔ لیکن امریکی حکومت ایک نہتی لڑکی سے لرزہ بااندام ہے۔ ڈاکٹر عافیہ اس قوم کی بیٹی ہے جسے زر فروشوں نے ڈالروں کے عوض بیچ دیا ہے، اس کے دو بچے اب بھی لاپتہ ہیں، اس کا ایک بیٹا آج بھی اپنی ماں کی راہ دیکھ رہا ہے۔ کہ شائد عید پر اسے ماں کی رہائی کا تحفہ مل جائے۔

نان ایشوز کی سیاست

اب اس بات میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ ایک منظم مہم کے ذریعہ عوام کو ان کے اصل مسائل سے دور کیا جارہا ہے۔ اخبارات اور الیکٹرونک میڈیا پر چاند کے مسئلے پر ہونے والی لایعنی بحث اور میرا کی شادی کے ٹوٹے چلا کر عوام کو ان کے اصل مسئلے سے دور کیا جارہا ہے۔ کیا ہم نے اس بحث میں اخبارات کے صفحے کے صفحے ضائع نہیں کردیئے کہ مشرف پر مقدمہ چلایا جائے، انھیں عدالت کے کٹھرے میں کھڑا کیا جائے، روزانہ اخبارات میں بیان دینے والے، پریس کانفرنس کرنے والے، میڈیا پر منہ سے جھاگ اگلنے والے اب کیوں اچانک خاموش ہوگئے۔ کیا عوام کی حمایت کے دعوے کرنے والے، لال مسجد کے معصوم بچوں اور بچیوں کے قاتلوں کو سزا دلانے کے دعوے کرنے والے حج عمرے اور شاہی ملاقاتوں میں سب کچھ بھول گئے۔ چار دن تک دو عیدوں پر دن رات بیانات دینے والوں نے مشرف کی باقیات، یا اسلام کی باقیات پر فخر کرنے والوں نے اپنے بیانات سے عوام کی کوئی خدمت کی ہے یا عوام میں مزید تفرقہ پھیلایا ہے۔ اگر سرحد والوں نے اس بار بھی ایک دن پہلے عید کرلی تو کونسی قیامت آگئی۔ کتنے برسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اب کسی کی اتھارٹی کوئی ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ ورنہ برصغیر پاک وہند میں دہلی کے جامع مسجد سے چاند کا اعلان ہوتا اور

توپوں کے داغنے، اور نقاروں کے ذریعے رات تک پورے برصغیر کے مسلمانوں کو یہ پیغام مل جاتا کہ کل عید ہے۔ نہ اس میں سرکار کا دخل تھا، نہ کوئی رویت ہلال کمیٹی تھی، نہ چیئرمین کا استحقاق تھا کہ وہ ٹی وی پر آکر اعلان کریں گے۔ اجلاس میں آنے والوں کو ٹی اے ڈے اے ملے گا۔ بس شہادتیں مل جاتی تھیں اور اس کے بعد اعلان ہوجاتا تھا۔ اس زمانے میں تو ۲۰، ۲۲ منزلہ عمارتیں اور ایسی دوربین بھی نہ تھی۔ پھر بھی مسلمان دہلی کی جامع مسجد کے اعلان پر کان لگائے رہتے۔ کبھی دو عیدوں کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ کتنے دن تک ہم طالبان کی سوات میں شکست کا جشن منائیں، ہم کامیابیوں پر فخر سے پھولے نہیں سماتے اور جب کوئی دھماکہ ہوجاتا ہے تو پھر خاموش ہوجاتے ہیں، کیا فائدہ ایسی بڑھکوں کا، ٹی وی چینلوں پر ایک دوسرے پر گندے الزامات میں ہم نے عوام کا کتنا وقت ضائع کیا۔ مشرف پر آئین توڑ مقدمہ چلانے کی بحث سے کیا حاصل ہوا، ذکر نہ ہوا تو بلوچستان کے سلگتے ہوئے مسائل کا نہ ہوا، رمضان کے دوران عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی آٹے اور چینی کی لمبی لمبی لائنوں میں عورتیں ہلاک ہوئیں تو بھی کوئی طوفان نہیں آیا۔ ایک دن سے زیادہ اس پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ اس سے زیادہ وقت تو اداکارہ میرا کی شادی یا ناشادی کی خبر پر بحث ہوتی رہی۔

بلیک واٹر کی موجودگی کے ثبوت مانگے جارہے ہیں۔ لیکن کوئی پوچھے کہ جب

امریکی شہری پاکستان میں غیر محفوظ ہیں تو بلیک واٹر کی طرف سے اردو اور پنجابی زبان پر عبور رکھنے والوں کو بطور ایجنٹ بھرتی کیوں کیا جارہا ہے۔ پشاور اور اسلام آباد میں منظم ہونے کے بعد اب کراچی میں بھی اپنا نیٹ ورک قائم کرنے کا کیا جواز ہے، ڈیفنس اور گلشن اقبال میں بنگلے کرائے پر کیوں حاصل کئے جارہے ہیں۔ ڈیفنس کے علاقے خیابان شمشیر میں ریجنل ہیڈ کوارٹر کس تنظیم کا بن رہا ہے۔ اب تو اسلام آباد پولیس نے وفاقی دارالحکومت میں غیر ملکیوں کے زیر استعمال پرائیوٹ رہائش گاہوں اور گاڑیوں کا سروے مکمل کر لیا ہے۔ جس کے مطابق غیر ملکیوں کے پاس تقریباً 13 سو رہائش گاہیں ہیں جو کہ ڈپلومیٹک انکلیوژرر سے باہر سیکٹر ایف، جی، ای اور آئی سیکٹرز میں ہیں۔ امریکی سفارتخانہ کو سیکورٹی فراہم کرنے والی نجی سیکورٹی کمپنی سے غیر قانونی اسلحے کی برآمدگی کے بعد اب کونسے ثبوت کا انتظار ہے۔ عوام کا حقیقی مسئلہ تو چینی کا تھا۔ چینی کی قیمتوں میں جو لوٹ مچی ہے۔ کوئی پوچھے ٹریڈنگ کارپوریشن سے کہ اس نے بروقت چینی درآمد کرنے کے اقدامات کیوں نہیں کیئے جس کی وجہ سے چینی کا بحران پیدا ہوا۔ اگست میں شوگر ڈیلرز نے مل مالکان کے ساتھ ایڈوانس معاہدے کیسے کیے، اگست 2009 میں ایک لاکھ میٹرک ٹن چینی خریدی گئی تاہم ڈیلرز نے یہ چینی کیوں نہیں 2009 اٹھائی، سول سوسائٹی، وکلا اور عوام کی ہمدرد چند سیاسی جماعتوں کو ایک ایسی تحریک چلانی چاہیئے جو حقیقت میں عوام کی نمائندہ ہو۔ اگر سوسائٹی کا پڑھا لکھا طبقہ آج بھی کوئی

تبدیلی لانے کا ارادہ کرلے تو پھر یہ تبدیلی لا کر رہتا ہے۔

بولو جی تم کیا کیا خریدو گے

خلیجی ممالک کو سات لاکھ ایکڑ پاکستانی اراضی لیز پر زرعی فارمز قائم کرنے کے لئے دینے کی اطلاعات نے پوری قوم کو تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پاکستان کے وفاقی وزیرِ سرمایہ کاری وقار احمد خان نے اے پی پی کو بتایا کہ 'ہم پاکستان بھر سے دس لاکھ ایکڑ زمین ایسے سرمایہ کاروں کے سامنے پیش کر رہے ہیں جو اسے خریدنا چاہیں یا پھر طویل مدت کے لیے پٹے پر لینے کے خواہشمند ہیں'۔ انہوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں حکومتِ پاکستان اور سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دیگر عرب ریاستوں کے درمیان بات چیت جاری ہے۔ ادھر امریکہ ہے کہ پاکستان میں سفارت کاری کے نام پر یا دوسرے پروجیکٹ کی آڑ میں دھڑ دھڑ زمین خریدنے میں مصروف ہے۔ چاہے زمین اسلام آباد کی ہو یا پشاور یا کراچی ڈیفنس کی امریکہ کو یہ ہر قیمت پر چاہیئے۔ گیری لوگر بل کی شرائط میں کیا کیا پنہاں ہے۔ اسے آپ ایک نظر میں نہیں سمجھ سکتے۔ اس معاہدے میں اگر مگر کی شرائط اتنی پیچیدہ ہیں۔ کہ آپ ان کی گرہیں نہیں کھول سکتے۔ لاہور کی عدالت میں اس سلسلے میں جو درخواست دائر ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ملکی اراضی لیز پر دینے کا اقدام ایک نئی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنے کے مترادف ہے اور اراضی لیز پر دینے کا معاہدہ دراصل عام کاشت کاروں کے لیے موت کا پروانہ ہوگا کیونکہ اس اقدام سے

کسانوں کو زرخیز اراضی سے محروم کر دیا جائے گا۔ کسان بورڈ نے یہ مقدمہ قائم کیا ہے اور اس کے وکیل کا کہنا ہے کہ حکومت یہ اراضی غیر ملکیوں کو دینے کے بجائے چھوٹے کسان کو دے جس سے نہ صرف کسان خوشحال ہوگا بلکہ ملک کو بھی فائدہ ہوگا۔ سعودی حکومت اور پاکستان کے سرمایہ کاری بورڈ کے درمیان پاکستان میں زرعی زمین پٹے پر دینے کے لیے جو روابط ہوئے ہیں ان کی بنیاد سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں بننے والا ایک قانون ہے جس کے تحت حکومت کسی بھی ملک، غیر ملکی فرد یا کمپنی کو ملک کے چاروں صوبوں میں لامحدود زرعی زمین آسان شرائط اور پرکشش مراعات پر زرعی استعمال کے لیے فروخت کرنے یا پٹے پر دینے کی مجاز ہے۔ حکومت پاکستان کو یہ اختیار سنہ دو ہزار دو میں بننے والے کارپوریٹ فارمنگ ایکٹ کے ذریعے حاصل ہے جس کے تحت غیر ملکی سرمایہ کاروں کو راغب کرنے کے لیے ایک پالیسی بھی تیار کی گئی تھی۔

سابق صدر پرویز مشرف کے جاری کردہ اس قانون کے تحت وزارت خوراک وزراعت نے سرمایہ کاری بورڈ کے ذریعے ملک کے چاروں صوبوں میں اکانوے لاکھ ہیکٹر قابل کاشت زمین کی نشاندہی کی گئی تھی۔ جو تاحال زیر کاشت نہیں لائی جا سکی ہے۔ اس میں سے اڑتالیس لاکھ ہیکٹرز بلوچستان کے قلات، کوئٹہ، نصیر آباد اور مکران ڈویژن میں واقع ہے۔ پنجاب میں یہ زمین ڈیرہ غازی خان، بہاولپور، راولپنڈی اور لاہور میں، صوبہ سندھ میں حیدرآباد، میرپورخاص، سکھر اور لاڑکانہ میں ہے جبکہ صوبہ سرحد کے جن اضلاع میں اس نوعیت کی سرکاری زمین کی

نشاندہی کی گئی ہے ان میں ڈیرہ اسماعیل خان، ہزارہ اور کوہاٹ شامل ہیں۔ قابل کاشت اراضی فروخت کرنے سے ملک میں خوراک کا بحران مستقبل میں مزید بڑھنے کے خدشات پیدا ہو سکتے ہیں۔

ان علاقوں میں موجود زمین کو زرعی مقاصد کے لیے ملکی و غیر ملکی کارپوریٹ اداروں اور ممالک کو فروخت کرنے یا ناوے برس کے پٹے پر دینے کے لیے مراعاتی پیکج بھی موجود ہے۔ اس پیکج کی خاص بات یہ ہے کہ اس پالیسی کے تحت فروخت کردہ زمین پر کاشتکاری یا فارمنگ کو صنعت کا درجہ حاصل ہو گا جس کے باعث نہ صرف اس سلسلے میں درآمد ہونے والی مشینری ڈیوٹی فری ہو گی بلکہ مختلف مدوں میں یہاں سرمایہ کاری کرنے والوں کو ٹیکس کی چھوٹ بھی دی جائے گی۔ زرعی فارمنگ میں سرمایہ کاری کرنے والوں کو مقامی پارٹنر ساتھ ملانے کی پابندی بھی نہیں ہو گی اور اس زمین کی پیداوار اور یہاں بننے والے مویشیوں کے فارمز کی مصنوعات وہ براہِ راست ملک سے باہر بھیجنے کے مجاز ہوں گے۔ اس زمین سے حاصل ہونے والے منافع کو بھی ملک سے باہر لیجانے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ مشرف تو چلے گئے۔ ان کی ڈیل اور ڈھیل اس ملک کے عوام کے لئے گلے کا پھندا بنی ہوئی ہے۔ امریکہ ہو یا دوسرے غیر ملکی سرمایہ دار سب لالچی نظروں سے پاکستان کو دیکھ رہے ہیں۔ ان معاہدوں کے نتیجے میں کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ اس عبرتناک حقیقی واقعے سے کر لیجیے۔ کل یہ دن ہمیں بھی دیکھنا

ہوں گے۔ جاپان کے ایک زمیندار سوئیچی چیبانا جو ان زمینداروں میں سے ایک ہیں ان کی آبائی زمین ۵۰ برس سے امریکی فوجی اڈوں کے تصرف یا قبضے میں رہی۔ اتنے عرصے یہ اپنی زمین پر قدم رکھنے سے بھی محروم رہے۔ ۱۹۹۶ میں جب جاپان امریکی فوجی معاہدے کی تجدید سے قبل چند دن کے لئے عبوری طور پر یہ معاہدہ اس وقت کے صدر کلنٹن کی آمد اور اس پر دستخط ہونے تک معلق رہا۔ جاپانی عدالت نے ایک دشوار گزار مقدمے کے دوران سوچی چیبانا کو یہ حق دیا کہ وہ ایک دن کے لئے اپنی زمین پر قدم رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ شکستہ دل کسان نے اس دن اپنے احباب، دوستوں، رشتہ داروں کو اکٹھا کیا اور جاپان کا ایک روایتی ساز شامی سین بجا کر اپنی زمین سے عقیدت اور محبت کا اظہار کیا۔

یہ ساری باتیں جھوٹ ہیں افسانہ ہیں

پاکستان میں بدعنوانی، رشوت، لوٹ مار، اقرباپروری، قرضے معاف کرانا، پلاٹ حاصل کرنا، سرکاری دورے، سرکاری خرچ پر علاج کرانا، اور سرکاری خرچ پر حج اور عمرے کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس لئے چیئرمین سینٹ کے غیر ملکی دوروں پر واویلا کرنا بھی انتہائی غیر ضروری ہے، یہ دورے ہمارے نمائندوں کا استحقاق ہیں۔ جس کے لئے اس ملک کے کروڑوں لوگ پیٹ کاٹ کر اپنے منتخب نمائندوں کو ہر طرح کا عیش و آرام بہم پہنچاتے ہیں۔ ہمارے وزیر اعظم اپنے نمائندوں کے مستقبل کے لئے بھی کوشاں ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ یہ ارکان اسمبلی جو دن رات اس قوم کی بہتری اور خوشحال مستقبل کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کے لئے رہنے کو کوئی گھر نہ ہو۔ اس لئے بہت جلد ان ارکان اسمبلی کو اسلام آباد میں ایک ہزار گز کے پلاٹ دیئے جائیں گے۔ کراچی کی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے ارکان نے بھی کونسل کے اجلاس میں مطالبہ کیا ہے کہ تیسر ٹاؤن کی نئی بستی میں ان کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں ایک ایک پلاٹ دیا جائے، حال ہی میں دنیا بھر میں بدعنوانی کے حقائق کا جائزہ لینے والے عالمی ادارے ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے پاکستان کے بارے میں جو رپورٹ شائع کی ہے وہ انتہائی نامناسب ہے اور یہ ہمارے ہر دلعزیز صدر کی حکومت کو ایک زبردست دھچکا دینے کی انتہائی بھونڈی کوشش ہے۔

جو اس ملک کی بہتری کے لئے ہر ماہ ۲۰ دن غیر ملکی دوروں پر گھر بار سے دور رہ کر اس ملک کے غریب عوام کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کے کوشش میں مصروف ہیں۔ اس رپورٹ میں پاکستان میں بدعنوانی کے خاتمے کے لیے حکومتی اقدامات پر جو عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی اس ملک کے عوام کے مستقبل سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ یہ رپورٹ ایک ایسے نا مناسب وقت میں شائع ہوئی ہے جب صدر مملکت امریکا بہادر کے لیے بے مثال خدمات کے عوض فرینڈز آف پاکستان کے اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک میں موجود تھے۔ ان حرکتوں کی وجہ سے پاکستان میں سیاسی تبدیلی کے بعد دو گہرے دوستوں یعنی چین اور سعودی عرب کا اعتماد بھی پاکستان پر مجروح ہوگیا ہے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل تھوڑے تھوڑے وقفے سے پاکستان میں بدعنوانی کے بارے میں رپورٹیں شائع کرتی رہتی ہے لیکن اب یہ رپورٹ جلدی جلدی شائع کی جارہی ہیں۔

جون 2009ء میں ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق تین برسوں میں سوا چار سو فیصد بدعنوانی میں اضافہ ہوا ہے۔ دنیا بھر میں بدعنوانی، رشوت عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ ہے۔ ان اداروں کو بدعنوانی سے کوئی نفرت نہیں ہے۔ بلکہ یہ رپورٹیں صرف اس لیے مرتب کی جاتی ہیں کہ رشوت کے نام پر مقامی حکمرانوں کو بلیک میل کرکے ناپسندیدہ احکامات منظور کرائے جائیں۔ ہمارے نمائندے بہت غریب ہیں۔ قومی اسمبلی میں عوام کے منتخب نمائندوں کے جمع

کروائے گئے اثاثوں کے مطابق کئی سابق وزراء اور ممبران اسمبلی کی ملکیت میں کوئی گھر یا گاڑی بھی نہیں ہے۔ الیکشن کمیشن میں داخل کرائے گئے اثاثوں کے مطابق اسی سے زیادہ سابق ممبران قومی اسمبلی، سابق وفاقی وزراء فیصل صالح حیات، اویس لغاری، وصی ظفر اور نصیر خان جبکہ وزرائے مملکت مخدوم خسرو بختیار، حنا ربانی کھر اور حامد یار ہراج بھی شامل ہیں، کے پاس اپنا گھر نہیں تھا۔ سابق قانون وصی ظفر نے الیکشن کمیشن کو بتایا تھا کہ وہ اپنا گھر اپنے بیٹوں کو تحفہ میں دے چکے ہیں۔ ان اثاثوں کے مطابق چوہدری شجاعت حسین کے پاس اپنی گاڑی بھی نہیں تھی ۔ جبکہ ان کی اسلام آباد اور لاہور میں دو گھروں میں فقط شراکت داری ہے۔ خورشید شاہ کے پاس بھی کوئی گھر نہیں ہے۔ دو سابق وزرائے اعظم چوہدری شجاعت حسین اور ظفر اللہ جمالی کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ وفاقی وزیر دفاع راؤ سکندر اقبال، وفاقی وزیر تجارت ہمایوں اختر خان جن کی ملوں اور پیپسی کے کارخانوں کی دھوم تو سب نے سنی ہے مگر ان کے پاس بھی کوئی گاڑی نہیں ہے۔ وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ، مخدوم فیصل صالح حیات، وفاقی وزیر صحت نصیر خان، وفاقی وزیر مذہبی امور اعجاز الحق اور رضا حیات ہراج نے بھی حلفاً کہا ہے کہ ان کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ اتنے غریب ارکان اسمبلی کی مدد کے لئے اگر وزیر اعظم پلاٹ دیں، یا کوئی کمیشن دے تو کوئی بری بات نہیں ہے، دنیا والے تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں، ٹرانسپیرینسی انٹرنیشنل والے بھی جھوٹ بولتے ہیں، یہ سب ہمارے ہر

دلعزیز صدر اور عوام کی محبوب جیالی قیادت کو نا مقبول بنانے کی کوشش ہے۔ جس پر کسی کو یقین نہیں کرنا چاہیے۔

کیری لوگر بل نئے جال لائے پرانے شکاری

کیری لوگر بل پرانے شکاریوں کا نیا ہتھیار
پاکستانی حکمرانوں کو مبارک ہو کہ امریکی کانگریس کے ایوان نمائندگان نے پاکستان کو آئندہ پانچ برس میں ساڑھے سات ارب ڈالر کی غیر فوجی امداد کی فراہمی کے لیے کیری لوگر بل متفقہ طور پر منظور کرلیا ہے۔ کیری لوگر بل پر صدر اوباما کی جانب سے حتمی دستخط ہونے کے بعد پاکستان کو ہر برس سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے ڈیڑھ ارب ڈالر کی امریکی امداد ملے گی۔ اس بل کی منظوری پر امریکیوں کی باچھیں مسرت سے کھلی ہوئی ہیں اور ہمارے حکمران اس کامیابی پر جشن منا رہے ہیں۔ لالچ انسانی فطرت کا حصہ ہے اور ہمارے حکمران اس میں بہت آگے ہیں۔ اس بل کے تحت امریکی کانگریس نے انتظامیہ کو پابند کیا ہے کہ وہ پاکستانی حکومت پر کڑی نظر رکھے اور امریکی وزیر خارجہ ہر چھ ماہ بعد اس بات کی تصدیق کریں کہ پاکستان القاعدہ اور شدت پسندوں کے خلاف بھرپور کارروائی کر رہا ہے، شدت پسندوں کو اپنی سرزمین پڑوسی ممالک کے خلاف حملوں کے لیے استعمال ہونے نہیں دے رہا، حکومتی عناصر، فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو شدت پسندی کی پشت پناہی سے روک رہا ہے اور عدلیہ کے آزاد کردار

میں کوئی مداخلت نہیں کر رہا۔ بل کے تحت وزیر خارجہ کو اس بات کی تصدیق بھی کرنا ہوگی کہ پاکستان شدت پسند گروپوں لشکر طیبہ اور جیش محمد وغیرہ کے مبینہ تربیتی کیمپوں کو ختم کرنے کے لیے مستقل اقدامات جاری رکھ رہا ہے۔ کیری لوگر بل میں کہا گیا ہے کہ غیر فوجی امداد کی یہ رقم ترقی، تعلیم اور توانائی کے شعبوں میں ہی خرچ ہونی چاہیے اور اس کا اہم مقصد پاکستان میں جمہوری اقدار اور اداروں کا فروغ ہوگا۔ بل کے تحت اس بات کو بھی یقینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر فوج سیاسی معاملات میں مداخلت کرے یا حکومت پر قبضہ کرے تو یہ امداد معطل کی جاسکے۔ اس کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پاکستان ایٹمی عدم پھیلاؤ کو یقینی بنائے گا اور ایٹمی سائنسدان اے کیو خان کے مبینہ نیٹ ورک کو سرگرمیوں سے باز رکھے گا۔ اس سلسلے میں پہلے بل میں تجویز کیا گیا تھا کہ پاکستان امریکہ کو مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ کی اجازت دیگا لیکن پاکستان کی جانب سے متعدد شرائط پر اعتراضات کے بعد اب یہ کہا گیا ہے کہ ایسے افراد کی تفتیش میں پاکستان معاونت کرے گا اور خفیہ معلومات میں امریکہ کو شریک کرے گا۔ ترقی، تعلیم اور توانائی کے شعبوں میں ملنے والی اس امداد کی تقسیم کے حوالے سے بھی پاکستان اور امریکہ کی حکومتوں کے درمیان اختلاف ہے امریکہ چاہتا ہے کہ تمام امداد پاکستانی حکومت کے حوالے کرنے کے بجائے کچھ رقم غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے جبکہ کچھ رقم ترقیاتی منصوبوں کے لیے براہ راست مختص کی جائے جبکہ پاکستان کا اصرار ہے کہ امداد پاکستانی

حکومت کے ذریعے ہی استعمال ہو۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان اس وقت ایک نازک دور سے گزر رہا ہے۔ شمالی علاقہ جات کے بعد اس بل کی منظوری سے کوئٹہ بلوچستان پر کاروائی کے لئے دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ وزیر داخلہ رحمان ملک کا کہنا ہے کہ پاکستان میں کسی غیر ملکی ایجنسی کی سرگرمیاں نہیں ہیں اس حوالے سے تمام خبریں بے بنیاد ہیں، کوئٹہ کسی کی ہٹ لسٹ پر نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دہشت گردوں کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی اور زخمی دہشت گرد خشکی پر مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ لیکن دوسری جانب پاکستان میں امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن نے کہا ہے کہ دہشت گردوں کے اڈوں سے متعلق امریکا کی فہرست میں کوئٹہ سب سے اوپر ہے۔ امریکی سفیر نے یہ بات واشنگٹن پوسٹ کو ایک انٹرویو میں کہی۔ اخبار کی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستانی حکام نے طالبان تحریک کو کوئٹہ میں دوبارہ منظم ہونے کی اجازت دی کیونکہ وہ طالبان کو داخلی خطرہ سمجھنے کے بجائے اسٹریٹجک اثاثہ سمجھتے ہیں۔ امریکی سفیر کا کہنا ہے کہ ماضی میں طالبان کی کوئٹہ شوریٰ پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی کیونکہ اس علاقے میں امریکی فوج نہیں ہے اور فاٹا کی نسبت کوئٹہ کے بارے میں امریکا کو زیادہ معلومات بھی نہیں ہیں۔ لیکن اب سرحد کے دوسری طرف امریکی فوجی موجود ہیں اور کوئٹہ شوریٰ امریکی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ امریکی ایوان نمائندگان

کی سپیکر نینسی پلوسی نے امریکی ایوان نمائندگان میں کیری لوگر بل کی منظوری کے بعد کہا کہ پاکستان نے دہشت گردوں کے نیٹ ورک کو تباہ کرنے اور دنیا کے مختلف حصوں میں دہشت گردوں کو محفوظ ٹھکانے بنانے سے روکنے کی جنگ میں فرنٹ لائن ملک کا کردار ادا کیا ہے۔ نینسی پلوسی نے کہا کہ کیری لوگر بل کی منظوری سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی استعداد کار کو مزید مؤثر بنانے میں مدد ملے گی۔ امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے چیئرمین سینیٹر جان کیری لوگر بل کی منظوری پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس بل سے اس بات کا بھی ثبوت ملا ہے کہ امریکہ پاکستان کے ساتھ طویل المیعاد سٹریٹجک تعلقات چاہتا ہے۔ امریکی صدر کی جانب سے اس بل پر دستخط ہونے کے بعد پاکستان اور امریکہ کے عوام اور حکومتوں کے درمیان پارٹنرشپ کے فروغ کیلئے یہ ایک بہت بڑا تحفہ ہو گا۔ امریکی اس بل کو پاکستان میں سرمایہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں، ایک امریکی سینٹر نے تو عوامی طور پر اس بل کو ایک طویل المدت سرمایہ کاری قرار دیا جس واحد مسلم ایٹمی طاقت میں دہشت گردی کا خاتمہ ہوگا۔ کیری لوگر بل پرانے شکاریوں کا نیا ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعہ پاکستان کو گاجر اور چھڑی کے فارمولے کے ذریعہ قابو کیا گیا ہے۔ اس کی چھپی ہوئی شرائط جب ہم پر آشکارا ہو گی تو ہمیں اندازہ ہوگا کی یہ جدید دور کا ایسٹ انڈیا کمپنی کا معاہدہ ہے۔ ہم نے اپنی آزادی اور قومی سلامتی کا بہت سستا سودا کیا ہے جس کا اندازہ ہمیں بہت جلد ہو جائے گا۔

یہ قصہ بھی تمام ہوا

سانحہ کھوڑی گارڈن کی تحقیقات اب اختتام پذیر ہو گئی ہیں۔ جس کے مطابق اکثر خواتین دم گھٹنے اور ایک ذہنی خوف کا شکار ہو کر ہلاک ہوئیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں کسی بھی خاتون کی ہلاکت کسی زخم یا چوٹ کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ ۴۱ ستمبر کو ۰۲ خواتین بھگدڑ یا دم گھٹنے سے ہلاک ہوئیں، تو پورے ملک میں کوئی کہرام نہیں مچا، کوئی شور بپا نہیں ہوا، ہر ایک نے اپنی اپنی بولی بولی، اظہار ہمدردی کیا، اخبارات میں تصویر چھپوائیں، حکومت نے انکوائری کے لئے ایک جج کو مقرر کیا، انکوائری میں ہر پہلو کا جائزہ لیا گیا۔ بہت سے افراد کے بیانات ریکارڈ کئے گئے، جس نے جو کچھ دیکھا تھا، اس کا اظہار کر دیا۔ پاکستان میں ہونے والے اکثر حادثوں، سانحوں اور واقعات کی طرح یہ سانحہ بھی گزر گیا۔ اب ایک رپورٹ کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ رپورٹ میں کہا جائے گا کہ ان خواتین کی موت ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹروں کے پوسٹ مارٹم نے بھی ان خواتین کے جسموں پر آنے والے زخموں کو دیکھا۔ لیکن کسی نے بھی ان عورتوں کی روحوں کے زخموں کو نہ دیکھا۔ نہ ہی کسی رپورٹ میں ان کے پیٹ میں چھپی ہوئی اس بھوک کا سراغ لگایا جا سکا، جو ان کی موت کا سبب بن گئی۔ کسی رپورٹ نے اس غربت کے بارے میں بھی نہیں کہا جس کے سبب شہر کی پسماندہ بستیوں سے نکل کر

آنے والی یہ خواتین یہاں آئی تھیں۔ اس رپورٹ میں اس بات کا بھی ذکر نہیں ہوگا کہ ان کے بچے جن کی بھوک مٹانے کے لئے یہ خواتین یہاں آئی تھیں۔ اب کس حال میں ہیں۔ اب ان کو روٹی کے لئے کون دلاسا دے رہا ہوگا۔ یہ بچے راتوں کو ڈر کر روتے ہوں گے تو ان کو چپ کرانے والا کون ہوگا۔ یہ پوری قوم کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ سانحہ کھوڑی گارڈن نے معاشرے میں موجود غربت کا پردہ چاک کر دیا ہے۔

عورت جو ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے وہ یہاں کتنی محفوظ ہے، ۳ سال، ۵ سال کی بچیاں بھی جنسی جنونیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ آئے دن ایسے ہولناک واقعات رپورٹ ہو رہے ہیں، جن کو پڑھتے ہیں، تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جن گھروں پر یہ قیامت گزرتی ہے۔ ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ اسپتالوں میں سے بچے اغوا کئے جا رہے ہیں۔ یہ معاشرہ کہاں جا رہا ہے، اس مملکت خداداد میں علاج کی سہولت نہ ہونے سے ہر دو گھنٹے میں ایک عورت زچگی کے دوران ہلاک ہو جاتی ہے۔ جہاں ہر ۲۱ گھنٹے میں ایک عورت خودکشی کرتی ہے۔ جہاں ہر روز دو عورتیں جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ کیا ہم ایسے ہی تھے۔ کیا اس میں کوئی تبدیلی آئے گی۔ کیا ہم اس صورتحال کو بدلنے کے کچھ کر رہے ہیں۔ کرپشن اور بدعنوانی کی وجہ سے پاکستان کا نام ساری دنیا میں سرفہرست ہے۔ جمہوریت کے شور میں خودکشیاں اور بچوں کی فروخت ہو رہی ہے۔ یہ کونسا نظام ہے جس میں مہنگائی کا طوفان

دیکھ کر لوگوں کو آمریت یاد آ رہی ہے جس میں آٹے، چینی کی یہ لوٹ مار تو نہ تھی۔ صدارتی، پارلیمانی، آمرانہ نظام حکومت کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی ناکامی کی بھی اصل وجہ کرپشن اور بدعنوانی ہے۔ پاکستان میں ہر شعبے کے طاقتور افراد اس ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ اب ایک ایسا میکنزم بنایا جاچکا ہے کہ غریب عوام کا استحصال اشرافیہ کی مجبوری اور ضرورت بن چکا ہے۔ مہنگائی کی وجہ سے اشیاء ضرورت بھی اب غریب آدمی کی دسترس سے باہر ہوچکی ہیں جس کی وجہ سے پاکستان میں غریب لوگ بدترین نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ مہنگائی اور غربت کی وجہ سے پاکستان میں خودکشی کرنیوالے افراد کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد جیسے شہروں میں غریب افراد ہر روز خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ سرمایہ دار پاکستان میں مکروہ بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔ سرمائے کی طاقت کو استعمال کرکے غریب طبقے کا استحصال کیا جارہا ہے۔ سیاسی جماعتوں، حکومت، بیوروکریسی، اسٹیبلشمنٹ میں سرمایہ دار، جاگیردار اور جرنیل بیٹھے ہوئے ہیں جو صرف اپنے طبقے کی بہتری کیلئے پالیسی بنا رہے ہیں۔ سیاست دان، سرمایہ کار، مذہبی قیادت سب کاروبار میں مصروف ہیں۔ غریب طبقے کے مفادات کو تحفظ دینے پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ غربت اور امارت میں اتنے بڑے فرق کی وجہ سے سماجی معاشرہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اب چاہے لوگ خودکشی کرکے مریں یا راشن کی بھگدڑ میں کسی کو اس سے کیا غرض۔

لیاری پیپلز پارٹی کا دل جو خون آلودہ ہے

بے نظیر بھٹو کی شادی کی تقریب ایک ایسی عوامی تقریب تھی۔ جو ہمیشہ یاد آتی ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اس کے لئے لیاری کا انتخاب کیا تھا اور لیاری والوں نے اس تقریب کی میزبانی کا حق ادا کردیا تھا، اس رات ککری گراؤنڈ میں جشن کا سماں تھا۔ آتش بازی، لوک رقص، لیاری والوں کی خوشیاں قابل دید تھیں۔ لیاری پیپلز پارٹی کا دل ہے۔ جو بھٹو خاندان سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ لیاری والوں کی پیپلز پارٹی کے لئے قربانیاں بے مثال ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی ضیا دور میں یہ لیاری کی خواتین ہی تھیں جو ہمیشہ اپنی شہزادی کے گرد پروانوں کی طرح حلقہ بنائے رکھتی تھیں، بے نظیر اس حلقے میں ہمیشہ اپنی سیکورٹی سے بے فکر رہتی تھیں۔

اسی لیاری میں جرائم پیشہ عناصر اور پولیس کے درمیان مقابلے میں گزشتہ روز سات افراد ہلاک ہوگئے۔ اس سے ایک دن قبل یونیورسٹی روڈ اور گلستان جوہر کا علاقہ میدان جنگ بنا ہو تھا۔ جہاں سندھی قوم پرست جماعت سندھ ترقی پسند پارٹی کے ایک کارکن کی ہلاکت کے خلاف احتجاج میں ۹ گاڑیاں جلادی گئ تھیں۔ ترقی پسند پارٹی نے کارکن کی ہلاکت کا الزام سندھ حکومت کی اتحادی جماعت عوامی نیشنل پارٹی یعنی اے این پی کے کارکنان پر لگایا ہے۔ جبکہ اے این پی

کے ترجمان کا کہنا ہے کہ وہ جمن گنگو کی ہلاکت میں ملوث نہیں ہیں اور ان کے کارکنان پر فائرنگ کی گئی ہے۔

لیاری گزشتہ کئی برسوں سے پولیس مقابلوں اور گینگ وار سے متاثر علاقہ رہا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۲۰۰۵ سے اب تک تقریبا ۴۰۰ افراد اس گینگ وار میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ لیاری میں مبینہ پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے رحمان بلوچ عرف رحمان ڈکیت اور ان کے تین ساتھیوں کی ہلاکت کے واقعے کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ رحمان بلوچ کی ہلاکت کے خلاف لیاری، گولیمار اور آس پاس کے علاقے مکمل طور پر بند ہوگئے تھے۔ پولیس کے مطابق رحمان بلوچ کراچی کے علاقے لیاری میں گزشتہ کئی برسوں سے جاری گینگ وار اور دیگر جرائم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ وہ کئی مرتبہ پولیس کی تحویل سے فرار ہو چکے تھے۔ رحمان بلوچ پر الزام تھا کہ وہ ڈکیتی سمیت ایک سو سے زیادہ جرائم میں ملوث تھے۔ حکومتِ سندھ نے ان کے سر پر پچاس لاکھ روپے کا انعام مقرر کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ حالیہ حکومت کے قیام کے بعد رحمان بلوچ نے لیاری میں جاری گینگ وار کے خاتمے اور قیام امن کے لیے کوششیں شروع کر رکھی تھیں۔ دو ماہ قبل لیاری میں جشن امن منعقد کیا گیا تھا، جس میں رحمان بلوچ کو سردار رحمان خان بلوچ کے لقب سے نوازہ گیا تھا۔ انہوں نے امن امان برقرار رکھنے

کے لیے امن کمیٹیاں قائم کردی تھیں۔ حالیہ حکومت کے قیام کے بعد گزشتہ ایک سال سے رحمان بلوچ غیر سرگرم ہوگئے تھے۔ انہوں نے لیاری میں جاری گینگ وار کے خاتمے اور قیام امن کے لیے کوششیں شروع کر رکھی تھیں اور آج کل ان کا ایک سیاسی کردار سامنے آ رہا تھا۔ لیاری سمیت شہر کی دیواروں پر ایسی چاکنگ کی گئی تھی جن میں ان کے اقدامات سراہا گیا تھا لیاری کے کچھ علاقوں میں پینے کے پانی اور دیگر سہولیات کی فراہمی پر لوگ ان کے شکر گزار تھے۔ رحمان بلوچ اس عرصے میں ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے مقبول ہوچکے تھے، اور اس بات کے لئے بھی کوشش کی جارہی تھی کہ انھیں سینٹر کا انتخاب لڑایا جائے۔ لیاری کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہاں کی پاپولر لیڈر شپ کر ابھرنے سے پہلے ہی منظر عام سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس سے قبل بلوچ اتحاد کے سابق صدر سہراب بلوچ کو لیاری کے علاقے بغدادی میں فائرنگ کرکے ہلاک کردیا گیا تھا۔ جنوری دو ہزار پانچ میں بلوچ اتحاد کے چیئرمین انور بھائی جان کو بھی قتل کیا جاچکا ہے۔ یہ تنظیم بھی لیاری میں جاری گینگ وار کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ انور بھائی جان لیاری میں ایک توانا آواز تھی جو خاموش کردی گئی۔

لیاری کی بہتری کے لئے کچھ عرصے پہلے لیاری ٹاسک فورس بھی بنائی گئی تھی، جو اچانک ختم کردی گئی تھی۔ پولیس کا دعوی ہے کہ بہتر پولیسنگ کے ذریعے حالات پر قابو پا لیا جائے گا پولیس افسر کا کہنا ہے کہ لیاری میں بھتہ

مافیا سرگرم ہے اور جرائم پیشہ افراد کے چار گروہ پولیس پر حملوں میں ملوث ہیں۔ لیاری ٹاؤن پولیس نے اعلیٰ حکام سے لیاری میں تعینات نفری کی تعداد ایک ہزار تک کرنے کی تجویز کر رکھی ہے جس کی موجودہ تعداد چار سو ہے۔ لیاری کے مکینوں کو پولیس پر اعتماد نہیں ہے وہ موجودہ حالات کو پولیس کی دہشت گردوں اور بدمعاشوں کے ساتھ ملی بھگت قرار دیتے ہیں۔ ہے۔ لیاری کے بڑے مسائل لاقانونیت، بے روزگاری اور بجلی کی عدم فراہمی ہیں۔ لیاری میں پولیس یا عوام کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ راتوں کو خاص طور پر گھر سے باہر نکلنا ناممکن ہے کیونکہ مختلف گروہ رات کو لڑتے ہیں فائرنگ کرتے ہیں اور عام لوگ بیچ میں آ کر مارے جاتے ہیں، خوف کی وجہ سے کئی لوگوں نے اپنے بچوں کو سکولوں سے اٹھا لیا ہے جبکہ کاروبار اور دکانداری الگ زبوں حالی کی شکار ہے۔ ڈکیت گروہ کے لوگ بھتہ گن پوائنٹ پر لے جاتے ہیں جس کی وجہ سے کئی کارخانے اور دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ علاقے میں مسلسل بدامنی کی فضاء کی وجہ سے پانچ ہزار خاندان نقل مکانی کر چکے ہیں۔ اس وقت لیاری میں گیارہ یونین کونسل ہیں جن میں چھ یونین کونسل ان گینگ کے قبضے میں ہیں جس کی بنیاد پر یہاں سیاسی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

کراچی ایک عرصے سے ایک محصور شہر کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ جس کے داخلی اور خارجی راستوں جرائم پیشہ افراد اور ایسے بااثر لسانی گروہ منظم ہیں جو جب

چاہے شہر کا امن وامان تہہ و بالا کر سکتے ہیں۔ کراچی میں سہراب گوٹھ پر ہونے والے آپریشن میں بھی ایسی ہی صورتحال تھی۔ انیس سو بانوے میں کراچی میں جرائم پیشہ افراد کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا گیا تھا جو کسی نہ کسی طور انیس سو ننانوے تک جاری رہا۔ لیکن بعد میں اس کا رخ جرائم پیشہ افراد کے بجائے ایک سیاسی جماعت کے خلاف کردیا گیا اور سینکڑوں افرد کو مبینہ طور پر ماورائے عدالت قتل کیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی میں شعبے کرمنالوجی کی سربراہ ڈاکٹر رعنا صبا سلطان کا کہنا ہے کہ آپریشن جرائم پر قابو پانے کا پائیدار حل نہیں بلکہ معاشرے سے محرومیوں کے خاتمے کو ممکن بنانے کی ضرورت ہے۔ سندھ حکومت اور صدر آصف زرداری نے لیاری کی بہتری کے لیے اربوں روپے کا لیاری پیکج منظور کیا ہے جس پر عمل درآمد شروع ہوچکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے جلد از جلد لیاری کے عوام کو وہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں جن کی انھیں ضرورت ہے۔

امریکیوں کے خدشات

اسلام آباد کے قلب میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک کے دفتر میں خود کش حملے کے بعد ملک بھر میں اقوام متحدہ کے تمام دفاتر کو عارضی طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کے مرکزی ترجمان اعظم طارق نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ادارے عوامی فلاح کے لیے نہیں بلکہ امریکی مفادات کے تحفظ کا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے حکومت کو تنبیہ کی ہے کہ وزیرستان میں تازہ کارروائی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے جو کہ بقول ان کے 'خالہ جی کا گھر نہیں ہوگا'۔ اعظم طارق کا کہنا تھا 'امریکی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف ناعاقبت اندیش حکمران کئی برسوں سے قبائلی علاقوں پر ہیلی کاپٹروں اور ٹینکوں سے گولہ باری کر رہے ہیں۔ مسجدیں اڑائی جا رہی ہیں، مدرسے تباہ کر رہے ہیں اور ہنستے بستے گھر تباہ کر رہے ہیں۔ لیکن حصول ڈالر میں بدمست حکمران اسے کامیابی تصور کر رہے ہیں۔ ان کا الزام تھا کہ اقوام متحدہ نہ کسی کی داد رسی کر سکتا ہے نہ اس کا سلیقہ اور صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ملک کو متنازعہ امریکی کمپنی بلیک واٹر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ 'ہم پاکستانی قوم، فوج اور سرزمین کے دشمن نہیں ہیں۔

وزیر داخلہ رحمان ملک نے کہا ہے کہ پاکستان میں ایسے مزید حملے ہوں گے، کیونکہ جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کی تیاریاں مکمل ہیں۔ سوات آپریشن کی کامیابی کو شور اور غلغلہ ابھی تھما بھی نہیں تھا کہ ایک نئے معرکے کی تیاریاں ہوچکی ہیں۔ بے سہارا اور پریشان حال عوام ایک بار پھر نقل مکانی کر رہے ہیں۔ گو امریکی حکام بظاہر صدر زرداری، پاکستانی فوج اور سول حکومت کی شدت پسندی کے خلاف لڑائی کی وجہ سے تعریف کر رہے ہیں لیکن امریکی ذرائع ابلاغ وہ باتیں منظر عام پر لا رہے ہیں جو سیاستدان مصلحتاً نہیں کر سکتے۔ واشنگٹن پوسٹ نے پاکستان پر اپنے ایک اداریے میں لکھا ہے کہ صدر اوباما پاکستان میں جو کم سے کم سیاسی اور فوجی مقاصد ہیں وہ بھی حاصل نہیں کر سکے۔ اخبار کے مطابق گو پاکستانی فوج نے طالبان کو وادی سوات سے مار بھگایا ہے کیونکہ ان کی سوات میں موجودگی پاکستان کی اپنی بقا کے لیے خطرناک تھی۔ لیکن وہ ابھی وزیرستان میں طالبان کے خلاف لڑائی نہیں لڑنا چاہتی جو کہ اصل علاقہ ہے جہاں طالبان کا گڑھ ہے اور وہ وہیں سے افغانستان کے خلاف حملے منظم کر رہے ہیں۔
واشنگٹن پوسٹ کے مطابق ایسے لسانی پنجابی اسلامی شدت پسند گروپ بھی متحرک ہیں جنھوں نے ہندوستان کے خلاف، ممکنہ طور پر خفیہ اداروں کی مدد سے، حملے منظم کیے تھے، جبکہ صدر آصف زرداری کی حکومت اہلیت کی کمی کا شکار ہے اور غیر مقبول ہے اور حکومت کے مخالفین کے دعوے ہیں کہ اس نے انیس سو نوے کے طور طریقے اپنائے ہوئے ہیں جب مسٹر زرداری کو مسٹر ٹین

پرسنٹ کا لقب ملا تھا۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق ایسے لسانی پنجابی اسلامی شدت پسند گروپ پاکستان میں متحرک ہیں جنھوں نے ہندوستان کے خلاف، ممکنہ طور پر خفیہ اداروں کی مدد سے، حملے منظم کیے تھے، جبکہ صدر آصف زرداری کی حکومت اہلیت کی کمی کا شکار ہے اور غیر مقبول ہے اور حکومت کے مخالفین کے دعوے ہیں کہ اس نے انیس سو نوے کے طور طریقے اپنائے ہوئے ہیں جب انھیں مسٹر ٹین پرسنٹ کا لقب ملا تھا۔

اخبار نے تجویز کیا ہے کہ اوباما انتظامیہ نے پاکستان کی ترقی، تعلیم اور توانائی کے لیے جو ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کی امداد کا کیری لوگر پروگرام بنایا ہے اس کو جلد کانگریس سے منظور کرایا جائے اور کوشش کی جائے کہ یہ رقم براہ راست صرف حکومت کو تھما دینے کے بجائے مخصوص پراجیکٹس کو دی جائے۔ امریکہ کے ایک اور بڑے اخبار نیو یارک ٹائمز کو یہ فکر لاحق ہے کہ امریکہ پاکستان کو امداد تو دے رہا ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رہ رقم ترقی، تعلیم اور توانائی پر خرچ ہوگی اور رشوت اور بدعنوانی کی نظر نہیں ہوجائے گی؟ اخبار کے مطابق امریکی اقتصادی ماہرین کی ٹیموں نے حال میں اسلام آباد کے دورے کیے ہیں اور اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ رقم کن منصوبوں پر خرچ ہو اور کیا اقدامات کیے جائیں کہ یہ پیسہ اسی مقصد پر خرچ ہو جس کے لیے مختص کیا جارہا ہے۔

امریکہ چاہتا ہے کہ وہ جو رقم پاکستان کو دے رہا ہے اس کا استعمال اس طرح

ہو پاکستانی عوام کو امریکہ اپنا دوست لگے اور امریکہ مخالف احساسات کچھ کم ہوں۔ لیکن ایک امریکی اہلکار کے مطابق ضروری نہیں کہ پاکستانی حکومت کو دی جانے والی رقم سے ملک میں ترقی، تعلیم یا توانائی کچھ بھی حاصل ہو سکے۔ امریکہ کا ایجنڈا اب کسی سے مخفی نہیں رہا وہ اسلام مسلمانوں اور پاکستان کے دشمنوں بھارت اور اسرائیل کا آزمودہ دوست اور خیر خواہ ہے۔ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات تک رسائی، چین اور ایران کا گھیراؤ کرنے کیلئے پاکستان میں سفارت خانے کی توسیع کی آڑ میں فوجیوں اور جاسوسوں کی چھاؤنیاں بنائی جا رہی ہیں اور دنیا میں یہ تاثر پختہ ہو رہا ہے کہ پاکستان امریکہ کی کالونی ہے جس کا وائسرائے ہالبروک اسلام آباد میں بیٹھ کر سیاسی اور اقتصادی معاملات پر احکامات جاری کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب امداد مانگنے کے بجائے اس پرائی جنگ" سے نکلنے کی حکمت عملی وضع کی جائے جس پر اپنے پاس سے 36 ارب" ڈالر خرچ کر کے ہم نے رسوائی و عدم استحکام کی جو خریداری کی ہے سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے ممکنہ ایٹمی تجربات کا بھرپور جواب دینے کی تدبیر اور امریکی مداخلت کو روکنے کیلئے فوری اقدامات کئے جانے چاہئیں تاکہ ملک کا دفاع اور سلامتی کسی قسم کے خطرے سے دوچار نہ ہو۔

دہشت گردی کیخلاف نام نہاد جنگ میں شمولیت کے بعد سے پاکستان 36ارب ڈالر کا

نقصان اٹھا چکا ہے جبکہ امریکہ سے اب تک پاکستان کو بمشکل 10 ارب ڈالر ملے ہیں۔
اگلے 5 سال کے دوران مزید ساڑھے 7 ارب ڈالر ملنے کی امید ہے لیکن اس امداد کا جھانسہ دے کر فنڈز خرچ کرنے کے نظام کی نگرانی کے نام پر امریکہ نے اسلام آباد میں اپنی خفیہ ایجنسیوں، فوج اور دیگر اداروں کا وسیع و عریض نیٹ ورک قائم کر لیا ہے۔
امریکی سفیر این پیٹرسن نے اعتراف کیا کہ امریکہ اسلام آباد میں 200 مکان کرائے پر لے چکا ہے سفارت خانے میں توسیع کرکے میرینز کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔
اگرچہ امریکی سفیر نے انکی تعداد کم بتائی مگر دفتر خارجہ کے ترجمان عبدالباسط انکی تعداد ایک ہزار ظاہر کر چکے ہیں۔ بدنام زمانہ تنظیم "بلیک واٹر" کے اہلکاروں کی اسلام آباد اور پشاور میں موجودگی اور ان کے لئے 3 سو بلٹ پروف گاڑیوں کی پورٹ قاسم پر پہنچنے کی اطلاعات منظر عام پر آچکی ہیں یہ پراجیکٹ سی آئی اے کا ہے جس کا مقصد القاعدہ اور طالبان کے اہم لیڈروں تک رسائی حاصل کرنے اور ہمارے ایٹمی اثاثوں پر نظر بد رکھنا ہے۔ اس سے نہ صرف پاکستان کی خودمختاری ختم ہو کر رہ گئی ہے بلکہ سلامتی کو درپیش خطرات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں ڈرون حملوں اور دیگر اقدامات کی وجہ سے امریکہ کیخلاف نفرت کا اعتراف امریکی سفیر کے علاوہ رچرڈ ہالبروک اور مائیک مولن بھی کر چکے ہیں اس لئے اتنی بڑی تعداد میں امریکیوں کی وفاقی دارالحکومت میں موجودگی بذات خود سیکورٹی مسائل کا باعث بنی رہے گی اور عام شہریوں کی زندگی کو بھی

خطرات لاحق رہیں گے۔ تازہ ترین یہ کہ امریکی صدر بارک اوبامہ نے کہا ہے کہ پاکستان سمیت جہاں بھی القاعدہ کے ٹھکانے ہیں انھیں نشانہ بنایا جائے گا۔ اس صورتحال میں امریکی امداد اور کیری لوگر بل کے پاس ہونے پر اظہار مسرت کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ ملک کیسی خطرناک صورتحال سے دوچار ہے۔

یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

فیصل صالح حیات نے ڈاکٹر عذرا فضل پیچیو ہو کے خلاف جو کلمات کہے ہوں گے، وہ یقیناً پاکستان کی پارلیمانی روایات کے منافی ہوں گے۔ شاید یہ وجہ ہے کہ قومی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر فیصل کریم کنڈی نے اس معاملے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے۔ قومی اسمبلی میں منگل کو گالم گلوچ اور نازیبا الفاظ استعمال کرنے کی پاداش میں مسلم لیگ (ق) کے پارلیمانی لیڈر فیصل صالح حیات کو سزا کے طور پر ایک جب کہ پیپلز پارٹی کے رکن اسمبلی جمشید دستی کو تین روز تک اجلاس میں شرکت سے روک دیا گیا۔

ہماری پارلیمنٹ میں ڈھول دھپہ اور عوامی انداز کا استعمال کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کا آغاز عوامی دور ہی سے ہوا تھا۔ جب اپوزیشن رہنما مفتی محمود، نوبزادہ نصراللہ، پروفیسر غفور احمد کو اسمبلی سے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا تھا۔ بھٹو دور میں عوامی طاقت کا پہلا وار اپوزیشن پر ہی ہوا تھا۔ لیکن اس دور کے اپوزیشن ارکان زبانی طور پر اس قدر بد زبان نہیں ہوئے تھے۔ اقتدار والے بھی ٹانگیں توڑنے کی دھمکیاں تو دیتے تھے، لیکن اسمبلی میں مہذب انداز ہی میں بات کرتے تھے۔ پارلیمنٹ میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی

غلام اسحاق خان کے خلاف گو بابا گو، گو بابا گو کے نعرے لگوائے، تہمینہ دولتانہ نے بھی اسمبلی میں کبھی چوڑیاں اور کبھی دوپٹہ پھینک کر احتجاج کیا۔ شاید یہ وجہ تھی کہ مشرف دور میں صدر کا حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ اسمبلی سے خطاب کر سکیں، کیونکہ پڑھی لکھی اسمبلی کے ارکان کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ منگل کو قومی اسمبلی میں اس وقت بدمزگی پیدا ہو گئی تھی جب مسلم لیگ (ق) کے پارلیمانی لیڈر مخدوم فیصل صالح حیات اور صدر آصف علی زرداری کی ہمشیرہ ڈاکٹر عذرا فضل پیچوہو کے درمیاں گرما گرمی ہوئی۔

موجودہ اسمبلی کی تقریباً ڈیڑھ سالہ مدت میں یہ دوسرا موقع تھا کہ حکومت اور حزب مخالف کے اراکین میں غیر پارلیمانی جملہ بازی ہوئی، لوٹے لوٹے اور شیم شیم کے نعرے سننے کو ملے اور اراکین ایک دوسرے کی طرف لڑنے کے لیے لپکتے رہے۔ یہ بدمزگی اس وقت پیدا ہوئی جب فیصل صالح حیات نے ڈاکٹر عذرا فضل پیچیو ہو کے خلاف مبینہ طور پر نازیبا الفاظ کہے۔ یہ الفاظ کاروئی سے سے حذف کر دیے گئے ہیں۔ فیصل صالح حیات جیالے ہیں جو سنہ دو ہزار دو کے انتخاب میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر رکن منتخب ہونے کے بعد فوجی صدر پرویز مشرف کے متوالے بن گئے تھے۔ ان کے مبینہ نازیبا الفاظ پر ان کے اور مظفر گڑھ سے پیپلز پارٹی کے منتخب نوجوان رکن اسمبلی جمشید دستی کے درمیاں گالم گلوچ ہوئی تھی۔ جمشید دستی اپنی نشست چھوڑ کر اگلی نشستوں تک آ گئے تھے اور فیصل

صالح حیات سے لڑنے کے لیے لپکے تھے تو انہیں سید خورشید شاہ اور رحمٰن ملک نے پکڑ کر بٹھا دیا تھا۔ اس دوران ایوان میں سخت ہنگامہ ہو گیا تھا اور پیپلز پارٹی کے بیشتر اراکین اپنی نشستوں پر کھڑے ہو کر لوٹا لوٹا اور شیم شیم کے نعرے لگاتے رہے تھے۔ فیصل صالح حیات نے نکتہ اعتراض پر کہا تھا کہ ان کی دس تحاریک التوا سپیکر نے مسترد کر دیں اور مسلم لیگ (ق) جو کہ ایوان میں عددی اعتبار سے تیسری بڑی جماعت ہے، اسے نظر انداز کیا گیا۔ جس پر حکومتی چیف وہپ سید خورشید نے وضاحت کی کہ تمام جماعتوں نے کیری لوگر بل پر تفصیلی بحث کا فیصلہ کیا اور ایسے میں کسی دوسری تحریک پر کیسے بحث ممکن ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر حزب مخالف چاہے تو حکومت فیصل صالح حیات کی تحریک پر بحث کے لیے تیار ہے۔ لیکن فیصل صالح حیات نے کہا کہ ایوان کی کارروائی صبح شام چلائی جائے تو ان کی تحاریک پر بحث ہو سکتی ہے۔ اس پر ڈاکٹر عذرا فضل پیچوہو نے کہا کہ وہ روزانہ مقررہ وقت پر ایوان میں پہنچتی ہیں اور اکثر فیصل صالح حیات اور بعض دیگر اراکین نصف گھنٹہ بھی ایوان میں نہیں بیٹھتے اور ایسے میں وہ کیسے آٹھ گھنٹے کی کارروائی چلانے کی بات کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں فیصل صالح حیات نے متعلقہ خاتون کو 'دھمکی آمیز انداز میں' جو کچھ کہا وہ کارروائی سے حذف کر دیا گیا اور ایوان میں ہنگامہ ہو گیا۔ ڈپٹی اسپیکر کا کہنا ہے کہ دونوں ارکان نے ایوان کے وقار کے منافی رویہ اختیار کیا۔ پارلیمانی لیڈر کشمالہ طارق اور اور مرکزی وزیر فردوس عاشق

اعوان کی ایک میڈیا ٹاک شو میں ہونے والی گفتگو بھی ہماری تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ مخالفت میں اس قدر دور ہو جانا کہ ایک دوسرے کے خلاف غیر مہذب زبان کا استعمال اور لڑائی جھگڑا کرنا کسی صورت ایک مہذب معاشرے کا عکاس نہیں ہو سکتے۔ ہمارے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ برداشت اور عدم برداشت ہی کا نتیجہ ہے۔ گلیوں اور سڑکوں پر ہونے والی بازاری بات چیت اگر اسمبلی میں ہونے لگے تو اس کے اثرات عوام پر بھی مرتب ہوں گے۔ کاش ہمارے رہنما یہ گفتگو کرتے ہوئے یہ سوچ لیا کریں کہ ان کی یہ گفتگو ان کے بچے، گھر والے، اور دیگر لوگ بھی دیکھیں گے۔

جامعہ کراچی میں جوتے بازی کا آغاز

رات کے گیارہ بجے تھے جب کراچی پریس کلب کے باہر ٹی وی چینلز کی کئی او بی وین کھڑی تھیں۔ ٹی وی چینلز کے رپورٹرز اور نوجوانوں کا ایک ہجوم تھا۔ کیمروں کی روشنی میں ایک نوجوان جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا کہ امریکی اسکالر کے رویے نے اس کو ایسا کرنے پر مجبور کردیا۔ محمد حسین کا کہنا تھا کہ فلسطین میں اسرائیلی مظالم کی حمایت اور تضحیک آمیز رویئے نے اسے امریکی اسکالر کو جوتا مارنے پر مجبور کیا۔ جامعہ کراچی شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے طالبعلم محمد حسین پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا کہ امریکی تھنک ٹینک فاؤنڈیشن فار ڈیفنس آف ڈیموکریسیز کے سربراہ کلفورڈ مے نے مسلمانوں کو انتہا پسند اور ایران کے اسلامی انقلاب کو بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کی جڑ قرار دیا تھا اور اس کے سوالوں پر کلفورڈ نے تضحیک آمیز رویہ اختیار کیا جس کے جواب میں اس نے کلفورڈ کو جوتا دے مارا۔ محمد حسین نے جامعہ کراچی کی انتظامیہ سے اپیل کی ہے کہ اس کے اقدام کو محب وطن پاکستانی کے امریکیوں کےخلاف جذبات سمجھیں اور اسے مزید تعلیم حاصل کرنے دیں۔ محمد حسین نے کہا ہے کہ اسے اپنی جان کا خطرہ ہے کیونکہ اس واقعہ کے بعد کچھ عناصر اسے نشانہ بنا سکتے ہیں۔

دنیا بھر میں اب جوتے خطرناک ہتھیار کا روپ دھار گئے ہیں۔ عراقی صحافی المنتظر الزیدی نے بش پر کیا جوتے پھینکے، دنیا بھر میں لوگوں کو اپنے غم وغصے اور جذبات کے اظہار کا موقع مل گیا ہے۔ چند دن پہلے ایک ترک صحافی نے آئی ایم ایف کے ایک ڈائریکٹر پر جوتے دے مارے تھے۔ استنبول کے دورہ پر آئے ہوئے آئی ایم ایف کے ڈائریکٹر کے ساتھ جو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں طلباء سے خطاب کر رہے تھے۔ اس دوران ایک طالبعلم صحافی نے اپنا سفید جوتا آئی ایم ایف کے ڈائریکٹر کو دے مارا۔ بالکل اسی طرح جس طرح فلسطین کے بچے اور نوجواں اپنی غلیل سے اسرئیلی ٹینکوں پر پتھر مارتے ہیں۔ کشمیر کے نوجواں بھارتیوں کے خلاف پتھر مار کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا بھر میں امریکیوں سے نفرت کے اظہار کے لئے جوتوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اب امریکیوں کو ہر جگہ جوتے پڑنا شروع ہوگئے ہیں تبھی تو انہوں نے افغانستان سے امریکی جنگ پاکستان کی طرف منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے عوام جارح، ظالم اور دہشت گرد امریکا کے چہرے کو دیکھ چکے ہیں اور ان کو ہرگز امریکا سے کوئی محبت نہیں۔ وہ امریکہ سے ملنے والی کسی امداد کو بھی دھوکہ کا جال سمجھتے ہیں، غریب ملکوں کو غلام بنانے اور وسائل پر قبضے کی امریکی جنگ کے خلاف جس نفرت کا آغاز بغداد سے ہوا تھا آج اس کا اظہار ہر جگہ ہو رہا ہے۔ اس جوتا مار مہم میں اعزاز پانے والے بڑے لوگ ہیں۔ بھارتی وزیر اعظم منموہن سنگھ، اپوزیشن لیڈر ایل کے ایڈوانی اور وزیر

داخلہ چدم برم بھی جوتے کھانے والوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ امریکی دانشوروں نے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف ایک نام نہاد پروپیگنڈہ کیا ہے اور جامعہ کراچی میں جوتے کھانے والے کلیفورڈ ڈی بھی امریکی دانشور ہیں۔ کلیفورڈ ڈی امریکی تھنک ٹینک فاؤنڈیشن فار ڈیفنس آف ڈیموکریسی کے صدر ہیں۔ ڈیلی ٹیلی گراف نے موصوف کو امریکا کے سو بااثر کنزرویٹیو میں شمار کیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ امریکا کی موجودہ پالیسیوں کی تشکیل میں اس کا بھی حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کو ۲۰۰۶ میں عراق اسٹڈی گروپ جس کو کانگریس فنڈ کرتا ہے کا ایڈوائزر تعینات ہوا تھا۔ پاکستان کے نوجواں آج کل شعلہ جوالہ بنے ہوئے ہیں۔ امریکہ کے خلاف نفرت کا لاوا ابل رہا ہے۔

جامعہ کراچی میں ایک طالب علم کا جوتا جارحیت کے منہ پر مزاحمت اور آزادی پسندی کا جوتا ہے۔ یہ دہشت گردی کے منہ پر امن پسندی کی جوتا بازی کا آغاز ہے۔

اوباما کو امن کا نوبل انعام کس لئے

دنیا میں دھماکے کرنے کا سہرا اگر کسی کے سر ہے تو وہ الفریڈ نوبل ہیں۔ جو نوبل انعام کے بانی کہلاتے ہیں۔ الفریڈ سویڈن میں پیدا ہوئے۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ روس میں گزارا۔ ڈائنامائٹ الفریڈ نوبل ہی نے ایجاد کیا تھا۔ جس کے طفیل ساری دنیا میں دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ رواں سال 5 خواتین نے نوبل انعام جیت کر نیا ریکارڈ قائم کر دیا جبکہ امریکا کی ایلینر اوسٹروم اقتصادیات کا نوبل انعام جیت کر یہ اعزاز حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ اب تک ایک سال میں تین خواتین کی جانب سے نوبل انعام جیتنے کا ریکارڈ 2004ء میں قائم ہوا تھا جو رواں سال 5 خواتین کی جانب سے نوبل انعام جیتنے سے ٹوٹ گیا۔ گزشتہ ہفتے نوبل انعام کمیٹی نے جرمن مصنف ہوٹا مویلر کو ادب، اسرائیل کی ادایوناتھ کو کیمسٹری، آسٹریلوی امریکن ایلزبتھ بلیک.برن اور امریکا کی کیرول گریڈر کو مشترکہ طور پر طب کا نوبل انعام دیا۔ اس بار نوبل انعام کی خاص بات یہ ہے کہ امریکی صدر.براک اوباما کو امن کا نوبل انعام دیا گیا ہے جس پر دنیا بھر میں ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے، عالمی رہنماؤں نے امید ظاہر کی ہے کہ اوباما دنیا میں امن کیلئے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ ایران نے اس فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نوبل انعام دینے کا فیصلہ وقت سے پہلے

اور جلد بازی میں کیا گیا۔ انعام دینے کا بہترین وقت وہ ہوتا جب عراق اور افغانستان سے غیر ملکی فوجیں نکل جاتیں اور امریکا فلسطینیوں کے حقوق کی حمایت کرتا۔ کیوبا کا کہنا ہے کہ اوباما کو صرف وعدوں کی بنیاد پر انعام سے نوازا گیا۔ دنیا کو درپیش مسائل وعدوں سے نہیں سنجیدہ عملی اقدامات سے حل ہوں گے۔ حماس کے رہنما اسماعیل ہانیہ نے کہا ہے کہ جب تک امریکا کی پالیساں تبدیل نہ ہوں، یہ انعام فلسطینیوں کو آگے یا پیچھے نہیں لے جاسکتا۔ امریکی صدر جن کے نامہ اعمال میں ابھی تک کوئی کریڈٹ نہیں ہیں۔ شاید خود بھی حیران ہیں کہ انھیں یہ انعام کس بات پر دیا گیا ہے۔ ساری دنیا اس فیصلے پر دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ روس، ایران، پاکستان، عراق، فلسطین اور لبنان میں عوام نے فیصلے پر تنقید جبکہ اسرائیل، برطانیہ، جرمنی، فرانس، بھارت اور دیگر ممالک میں فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ الفریڈ نوبل نے ڈائنامایٹ کے علاوہ متعدد دوسری ایجادات بھی کی تھیں۔ اپنی زمینوں اور ڈائنامائٹ سے کمائی گئی دولت کے باعث 1896ء میں اپنے انتقال کے وقت نوبل کے اکاؤنٹ میں 90 لاکھ ڈالر کی رقم تھی۔

الفریڈ نوبل نے موت سے قبل اس نے اپنی وصیت میں لکھ دیا تھا کہ اس کی یہ دولت ہر سال ایسے افراد یا اداروں کو انعام کے طور پر دی جائے جنھوں نے گزشتہ سال کے دوران میں طبیعات، کیمیا، طب، ادب اور امن کے میدانوں میں

کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ پس اس وصیت کے تحت فوراً ایک فنڈ قائم کر دیا گیا جس سے حاصل ہونے والا منافع نوبل انعام کے حق داروں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ 1968ء سے نوبل انعام کے شعبوں میں معاشیات کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ نوبل فنڈ کے بورڈ کے 6 ڈائریکٹر ہیں جو دو سال کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں اور ان کا تعلق سویڈن یا ناروے کے علاوہ کسی اور ملک سے نہیں ہو سکتا۔ نوبل فنڈ میں ہر سال منافع میں اضافے کے ساتھ ساتھ انعام کی رقم بھی بڑھ رہی ہے۔ 1948ء میں انعام یافتگان کو فی کس 32 ہزار ڈالر ملے تھے، جب کہ 1997 میں یہی رقم بڑھ کر 10 لاکھ ڈالر تک پہنچ گئی۔ نوبل انعام کی پہلی تقریب الفریڈ کی پانچویں برسی کے دن یعنی 10 دسمبر 1901ء کو منعقد ہوئی تھی۔ تب سے یہ تقریب ہر سال اسی تاریخ کو ہوتی ہے۔
طبیعات کا نوبل انعام "رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز" کی جانب سے اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے طبیعات کے شعبے میں اہم ترین دریافت یا ایجاد کی ہو۔ کیمیا کا نوبل انعام "رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز" کی جانب سے اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے طبیعات کے شعبے میں اہم ترین دریافت یا بہتری کی ہو۔ نوبل انعام برائے طب "کیرولنسکا انسٹیٹیوٹ" کی جانب سے اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے طب کے شعبے میں اہم ترین دریافت کی ہو۔ ادب کا نوبل انعام "سویڈش اکیڈمی" کی جانب سے اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے ادب کے شعبے میں نمایاں

کام کیا ہو۔ امن کا نوبل انعام "نارویجیئن نوبل کمیٹی" کی جانب سے اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے اقوام کے درمیان دوستی، افواج کے خاتمے یا کمی اور امن عمل تشکیل دینے یا اس میں اضافہ کرنے کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہوں۔

The Sveriges اقتصادیات کا نوبل انعام اسے باضابطہ طور پر الفریڈ نوبل یادگاری کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی سفارش نوبل نے نہیں کی تھی۔ یہ انعام Riksbank Prize رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز" دیتی ہے"

اس بار امریکا کی ایلینور اوسٹروم اور اولیور ولیم سن نے معیشت کا نوبل انعام مشترکہ طور پر حاصل کیا ہے۔ اس طرح ایلینور معیشت کے شعبہ میں نوبل انعام جیتنے والی پہلی جبکہ رواں سال نوبل انعام حاصل کرنے والی پانچویں خاتون ہیں۔ چھہتر سالہ ایلی نور اور ستتر سالہ ولیم سن کو معاشی بحران کے خاتمے کیلئے خدمات پر نوبل انعام سے نوازا گیا ہے۔ انعام کی چودہ ملین ڈالرز کی رقم دونوں ماہرین معیشت میں مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی۔ ایلینور انڈیانا یونیورسٹی کی پولیٹیکل سائنٹسٹ ہیں جبکہ وہ ایریزونا یونیورسٹی کی بانی ڈائریکٹر بھی ہیں۔ ولیم سن کا تعلق کیلی فورنیا یونیورسٹی سے ہے اقتصادیات کا نوبل پرائز دو امریکی ماہرین ایلینور اوسٹرم اور اولیور ولیمسن کو دیا گیا ہے۔ انیس سو اسی کے بعد سے اس انعام کو امریکی چوبیس مرتبہ جیت چکے ہیں اور انیس سو اڑسٹھ میں اقتصادیات کے لیے

نوبل انعام شروع ہونے کے بعد سے محترمہ اوسٹرم یہ اعزاز حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ محترمہ اوسٹرم نے کہا کہ "ہم اب نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں اور ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خواتین عظیم سائنسی کارنامے کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اقتصادیات کا نوبل انعام جیتنے والی پہلی خاتون ہونا یقیناً اعزاز ہے لیکن یہ اعزاز حاصل کرنے والی آخری عورت نہیں ہونگی"۔ رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز نے انہیں یہ ایوارڈ اس تحقیق کے لیے دیا ہے کہ کس طرح جنگلات، دریاؤں اور گھاس کے میدانوں جیسے قدرتی وسائل کا استعمال کرنے والے ان کی دیکھ بھال حکومت اور اور نجی کمپنیوں سے بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ مسٹر ولیئمسن نے یہ تفتیش کی ہے کہ خام مال کی سپلائی اور تیاری جیسی مارکٹ سرگرمیاں کیوں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں اگر وہ ایک واحد فرم کے تحت کی جائیں۔

ادب کے شعبے میں جرمن مصنفہ ہرٹا ملر نے سنہ 2009 کے لیے ادب کا نوبل انعام حاصل کیا ہے۔ جرمن مصنفہ کو متاثر کن شاعری اور ناولز لکھنے پر نوبل انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ ہرٹا مولر رومانیہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے مختصر کہانیوں کا مجموعہ۔ لو لینڈ۔ لکھا جس پر رومانیہ میں پابندی لگا دی گئی تاہم اسے جرمنی میں بے انتہا پسند کیا گیا۔ 1953 میں رومانیہ میں پیدا ہونے والی ہرٹا ملر رومانیہ

کے ڈکٹیٹر نکولائی چاؤشسکو کے دورِ اقتدار کے مشکل حالات کو پیش کرنے کے لیے جانی جاتی ہیں۔ سویڈش اکیڈمی نے ملر کے لیے نوبل انعام کا اعلان کرتے ہوئے ان کی نثر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی بھی تعریف کی ہے۔ ملر رومانیہ کی جرمن اقلیت سے تعلق رکھنے والے ایک گھرانے میں پیدا ہوئیں اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان کی والدہ کو سویت یونین میں ایک مزدور کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ہرٹا ملر کو ستّر کی دہائی میں رومانیہ کی خفیہ پولیس سے تعاون نہ کرنے کے الزام میں نوکری سے برخاست کر دیا گیا اور اس کے بعد سنہ 1987 میں جرمنی منتقل ہو گئیں۔ جرمنی منتقل ہونے سے قبل سنہ 1982 میں جرمن زبان میں لکھے گئے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جسے رومانیہ میں سنسر شپ کا سامنا کرنا پڑا۔ ملر کی ابتدائی تحریریں تو ان کے ملک سے چوری چھپے باہر لے جائی گئیں تاہم بعد میں آنے والے سالوں میں انہیں متعدد ادبی انعام ملے جن میں سنہ 1998 میں ڈبلن میں دیا جانے والا امپیک ایوارڈ بھی شامل ہے۔

اس برس کیمسٹری میں نوبل اعزاز بھارتی نژاد امریکی سائنسداں وینکٹ رامن رامکرشنن اور دیگر دو سائنسدانوں کو ملا ہے۔ ڈاکٹر راماکرشنن کی سربراہی میں کام کرانے والی سائنسدانوں کی اس ٹیم کو رائبوسومز کے مطالعے پر یہ انعام دیا گیا۔ رائبوسومز انسان کے جسم میں پروٹین بناتا ہے۔ امریکی شہری ڈاکٹر راماکرشنن کو اسرائیلی خاتون سائنسدان ادا یونوتھ، اور امریکہ کے

تھومس سٹیز کے ساتھ اس اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ بھارت میں پیدا ہوئے راماکرشنن اس وقت برطانیہ کی کیمبریج یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔ ستاون سالہ راما کرشنن کیمبریج یونیورسٹی کے ایم آر سی لیباریٹریز آف مالیکولر بائیولوجی کے سٹرکچرل سٹیڈیز سیکشن کے چیف سائنسدان ہیں۔ تینوں سائنسدانوں نے تھری ڈائمینشنل تصاویر کے ذریعے پوری دنیا کو سمجھایا کہ کس طرح رائبوسومز الگ کیمیکل کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ نوبل اعزاز کمیٹی کا کہنا ہے کہ ’ان سائنسدانوں نے سائنس کی دنیا میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور ان کے اس کام کی وجہ سے بہت ساری بیماریوں کا علاج اینٹی بائیٹنک دوائیوں کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ ادا یونوتھ اسرائیل کے وزمین انسٹیٹیوٹ میں سٹرکچرل بائیولوجی کی پروفیسر ہیں اور کیمیائی سائنس کے شعبے میں نوبل پانے والی چوتھی خاتون ہیں۔ تیسری سائنسدان تھومس سٹیز کا تعلق امریکہ کی ییل یونیورسٹی سے ہے

امریکی صدر براک اوباما نے اس سال جنوری میں اقتدار سنبھالا تو پوری دنیا کو ان سے بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ سابق امریکی صدر جارج بش نے دنیا کو تباہی سے دوچار کیا تھا۔ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا بحران ہو جس کا حل تلاش کرنے کا عزم براک اوباما نے نہ کیا ہو۔ لیکن اب تک اوباما کے کارناموں میں سے کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر

انھیں دنیا میں امن کا سب سے بڑا اعزاز دیا جاتا۔ اب اگر انھیں یہ اعزاز دے ہی دیا گیا ہے تو اب ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی لاج رکھیں اور اپنے آپ کو بجا طور پر اس اعزاز کا مستحق ثابت کردیں۔ امن کا یہ انعام شائد انھیں اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ دنیا کے امن کو تہہ و بالا کرنے سے باز رہیں۔

ہم اپنے سائنس دانوں سے اور کیا چاہتے ہیں؟

تعلیم اور ریسرچ کے میدان پاکستان کا نمبر دنیا میں ۲۹ نمبر پر آتا ہے۔ دنیا میں سب اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم اور تحقیق کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو منوانا چاہیۓ۔ لیکن ہماری ایسی ترجیحات نہیں ہیں کہ جس کے ذریعے ہم دنیا میں اپنا یہ مقام حاصل کر سکیں، پاکستانی قوم ذہانت کے اعتبار سے دنیا کی ذہین قوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی سائنسی ادارے ناسا میں پاکستانی ماہرین کے تعداد زیادہ ہے بلکہ وہ اہم عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں سائنسی اداروں کی نا قدری کا کیا حال ہے اس کا اندازہ آپ اس واقعے سے کر سکتے ہیں۔ ہمارے موجودہ وفاقی وزیر سائنس و ٹیکنالوجی محمد اعظم خان سواتی ہیں۔ جو جمعیت علماء اسلام کے سینٹر ہیں۔ گزشتہ دنوں وہ کراچی تشریف لائے تو انھوں نے سرکاری سائنسی تحقیقاتی اداروں کا دورہ کیا۔ اس موقع پر انہوں نے سائنس کی تحقیق کرنے والوں سے پوچھا کہ ان کے اس کام کا کیا فائدہ ہے، انھوں نے اس موقع پر نہایت حقارت سے کہا کہ ان اداروں کی جانب سے لمبے چوڑے اخراجات کرنے، حکومتی وسائل کو ضائع کرنے کے علاوہ کیا کام ہے۔ اور یہ ملک و قوم کی کیا خدمت کر رہے ہیں۔ انگریزی معاصر روزنامے نے اس بارے میں جو تفصیل بتائی ہے۔ اس کے مطابق وفاقی وزیر نے پی سی ایس آئی آر، نیشنل

انسٹیٹوٹ آف اوسنو گرافی، پاکستان اسٹینڈرڈ اینڈ کوالیٹی کنٹرول اتھارٹی، اور کونسل آف ورک اینڈ ہاؤ سنگ جیسے اداروں کا دورہ کیا۔

اس موقع پر وزیر موصوف نے ایک کام کا گر یہ بتایا کہ ان اداروں کے پاس جو زمین موجود ہے اس کو کمرشل طور پر استعمال میں لائیں۔ اور اس سے آمدنی میں اضافہ کریں۔ پی سی ایس آئی آر ملک کا قدیم تحقیقاتی ادارہ ہے۔ جو ۱۹۵۳ سے قائم ہے۔ اس ادارے نے ملک میں سائنس کے فروغ اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت کے لئے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ آج جوس، اور بہت سی اشیاء اور خشک خوراک کو محفوظ کرنے کی جو ٹیکنالوجی ہے۔ وہ اسی ادارہ کی تحقیق کی مرہون منت ہے۔ اس وقت جو برآمدات ہوتی ہیں۔ یہ ادارہ ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اب تک اس ادارہ نے ۷۸۱۱ ٹیکنالوجی، اور پروسیس تیار کئے ہیں، جو نہ صرف ملک میں کمرشل طور پر استعمال میں ہیں بلکہ ۱۱۵ تو رجسٹرڈ ہیں۔ ۱۰۸ بیرونی ملک میں پیٹینٹ ہیں۔ اس ادارے کی آمدنی گزشتہ سال چار کروڑ تھی جو اب بڑھ کر چھ کروڑ ہو گئی ہے۔ حکومت ان تحقیقاتی اداروں کے سائنس دانوں کو تنخواہ کے علاوہ کیا دیتی ہے۔ پاکستان کے ان سائنس دانوں ہی کا کارنامہ ہے کہ آج پاکستان دنیا کی واحد ایٹمی صلاحیت رکھنے والی مملکت ہے۔ جس کی وجہ سے مغرب اور امریکہ ہمارا دشمن بنا ہو ہے۔ اس کے باوجود یہ ملک دنیا کے بہترین سائنسدان پیدا کرنے والا آٹھواں ملک شمار کیا جاتا ہے۔ پاکستان سائنس کی تحقیق پر اپنی کل

مجموعی آمدنی کا صرف اعشاریہ چھ فیصد خرچ کرتا ہے۔ اس بجٹ میں ہم اپنے سائنس دانوں سے اور کیا چاہتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے جو اس ملک کے سارے وسائل پر دسترس رکھتے ہیں۔ کہ انھوں نے اس ملک کو کیا دیا۔

اغوا برائے تاوان کی وارداتیں

لیاقت آباد پولیس نے 11 سال کی عمر میں اغوا کی جانے والی بچی کو 17 سال بعد بازیاب کرالیا ہے، گیارہ سال پہلے ہونے والے اس واقعے کا پولیس کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی۔اس بچی کو ان کے پڑوسیوں نے اغوا کیا تھا۔ عزیز آباد پولیس نے اغوا برائے تاوان میں ملوث ایک ملزم کو گرفتار کرکے زنجیروں سے بندھے مغوی صنعت کار کو بازیاب کرا لیا۔ سائٹ کے اس مغوی صنعتکار عصمت کا کھوج لگا کر یاسین آباد میں ایک مکان پر چھاپہ مارا اور کمرے میں بند زنجیروں سے جکڑے اور آنکھوں پر پٹی بندھے مغوی صنعتکار عصمت کو بازیاب کرکے ملزم شاہد کو گرفتار کر لیا۔ ملزم سے ایک ٹی ٹی پستول اور وصول کی گئی تاوان کی رقم 2 لاکھ روپے برآمد کر لی گئی۔ اغوا برائے تاوان کی ایک اور واردات میں ڈیفنس فیز 8 میں واقع این ایل سی کی کینٹین کے مالک محمد حسین مغل کو چند مسلح افراد اغواء کرنے کے بعد اسے یونیورسٹی روڈ گلشن اقبال کی طرف لے جارہے تھے کہ نیپا چورنگی سگنل پر گاڑی رکی تو محمد حسین ملزمان کی قید سے فرار ہوگیا اس کے شور کرنے پر قریب موجود لوگ جمع اور ملزمان فرار ہوگئے۔ بعد میں ملزمان پکڑے گئے۔ کراچی اغوا کاروں کے لئے جنت ہے۔

کراچی میں روزانہ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ جن میں چند ایک ہی کی پولیس میں رپورٹ درج ہو پاتی ہے۔ کچھ لوگ ڈر کر اور کچھ ملزماں کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہو کر ایسی وارداتوں کے بعد پولیس کے پاس نہیں جاتے۔ اغوا برائے تاوان میں وصول ہونے والی رقوم دہشت گردی کی وارداتوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ اغواکاروں کے کراچی میں کئی گروپ کام کر رہے ہیں۔ جن کے رابطے بلوچستان، اندرون سندھ، اور قبائلی علاقوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سندھ پولیس کا وہ شعبہ اینٹی وائیلنٹ کرائم سیل اغواء برائے تاوان کے مقدمات کی تحقیقات کرتا ہے۔ پچھلے 7 سال کے دوران اس کی کارکردگی ناقص دکھائی دیتی ہے۔ 2003ء میں سندھ پولیس نے باقاعدہ اینٹی وائیلنٹ کرائم سیل کا باقاعدہ قیام کیا گیا تھا۔ اور اس میں آنے والے مقدمات انسداد دہشت گردی کی عدالت میں سنے جاتے ہیں۔ پولیس نے سینکڑوں انتہائی خطرناک ملزمان کی گرفتاری توظاہر کی گئ' تاہم ابھی تک کوئی ایسا مقدمہ سامنے نہیں آیا جس میں کسی بھی ملزم کو ان مقدمات کی روشنی میں سزا دی گئ ہو۔ مقدمات اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ کسی کو سزا ہی نہ ہو۔ 2005ء سے اغواء برائے تاوان کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ پولیس کی عدم دلچپی کی وجہ سے مقدمات کے فیصلے نہ صرف تاخیر سے ہوتے ہیں بلکہ اس میں بہت معمولی نوعیت کی سزائیں سنائی جاتی ہیں۔ اکثر ملزمان عدم ثبوت اور شہادتوں کی آڑ لے کر بری ہو جاتے ہیں۔

پولیس نے کئی اغواکاروں کو مقابلے میں مارنے کا اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔ ان میں لیاری کا رحمان بلوچ، امان اللہ بروہی اور قادر نوہانی جیسے ملزمان شامل ہیں۔ جن پر حکومت سندھ کی طرف سے لاکھوں روپے کا انعام مقرر تھا۔ گزشتہ 6 سال کے دوران شہر کے پوش علاقوں سے اغواء ہونے والے افراد کے ملزمان کو گرفتار کرنے کی تعداد غریب علاقوں سے اغواء ہونے والے ملزمان سے کہیں زیادہ ہے۔ بہت سے واقعات میں اغوا کرنے والے تاوان کی رقم وصول کرنے کے بعد مغوی افراد کو قتل بھی کردیتے ہیں۔ نئی جوڈیشل پالیسی کے مطابق اب ان مقدمات کی سماعت ہر دوسرے روز ہونی ہے۔ صوبائی وزیر داخلہ سندھ ڈاکٹر ذوالفقار علی مرزا نے پولیس کو صوبے بھر اور بالخصوص کراچی میں جرائم کے انسداد کے لئے مزید مستعدی اور کڑی نگرانی سے منظم کارروائیوں کے احکامات جاری کئے تھے۔ انہوں نے پولیس کو ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ صوبے اور بالخصوص کراچی میں اغواء برائے تاوان کی وارداتوں کی روک تھام، ایسی وارداتوں میں مغویان کی صحیح سلامت بازیابی، مغویان کو رکھے جانے والے مقامات کے خاتموں اور ایسے سنگین جرائم میں ملوث گروہوں، ان کے سرپرستوں اور کارندوں کی گرفتاریوں کے لئے ٹھوس حکمت عملی پر مشتمل منصوبہ بندی ترتیب دینے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ انہوں نے سندھ کے کچے کے علاقوں میں موجود ڈاکوؤں کی کمین گاہوں کے خاتموں اور انہیں پناہ دینے والے

پتھاریداروں کے خلاف نتیجہ خیز پلان ترتیب دینے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ دوسری جانب پولیس کی جانب سے اسٹریٹ کرائم، قتل، اقدام قتل، اغواء برائے تاوان اور دیگر سنگین مقدمات میں ملوث ملزمان کے مقدموں میں عدالتوں کی جانب سے سمن جاری کرنے کے باوجود پولیس افسران واہلکاروں کا گواہی کے لئے حاضر نہ ہونا عدالتی عمل پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ احکامات کے جو پولیس افسران اہلکار مقدمات میں گواہی کے لئے حاضر نہیں ہوتے ان کے خلاف سخت محکمہ کارروائی عمل میں لائی جائے۔ چیف جسٹس کو ان بڑھتے ہوئے واقعات کا نوٹس لینا چاہیے۔ اغوا برائے تاوان کے مقدمات کی خصوصی مانیٹرنگ کی جائے۔ تاکہ کراچی میں پھیلا ہو خوف وہراس کم ہو۔

انجام گلستان کیا ہوگا

دوسری جنگ عظیم میں یورپ سے شکست کھانے کے بعد جرمن قوم کو سب سے ذلت آمیز شرائط کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس قوم نے اپنی حب الوطنی، محنت، جانفشانی، سے ایک بار پھر نہ صرف اقوام عالم میں اپنا مقام حاصل کیا، بلکہ بہت سے معاملات میں یورپ سے بازی لے گیا۔ علامہ اقبال نے شائد ان ہی خصوصیات کے بنا پر اپنی تعلیم کے لئے جرمنی کو پسند کیا تھا۔ اسی جرمن قوم نے وطن سے محبت کی ایک انوکھی مثال قائم کی ہے۔ دنیا بھر میں لوگ ٹیکس سے بچنے کے لئے قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن جرمنی کے ۴۴ افراد نے اپنے ملک کو ٹیکس دینے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ان افراد نے اپنے ملک کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے زیادہ ٹیکس دینے پر نہ صرف آمادگی ظاہر کی ہے بلکہ حکومت کو زیادہ ٹیکس وصول کرنے کے لیے عدالت سے بھی رجوع کیا ہے۔ جرمنی کے ایک امیر ترین گروپ نے اپنی رٹ پٹیشن میں کہا ہے کہ ان کے پاس بہت دولت ہے۔ جو ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا حکومت ہم سے زیادہ ٹیکس وصول کرے تاکہ ملک کو اقتصادی بحران سے نکالا جاسکے۔ درخواست پر 44 امیر ترین افراد کے دستخط ہیں۔ جرمنی کے ایک ریٹائرڈ 66 سالہ ڈاکٹر کے مطابق اگر جرمن کے 22 لاکھ امیر افراد 5 فیصد زائد دولت ٹیکس دیں تو دو سال میں ملک کو 100 ارب یورو کی اضافی آمدنی

ہو گی۔ جس سے اقتصادی بحران کا خاتمہ ہو جائیگا۔
جرمنوں کے برعکس پاکستان میں دولت مند افراد کی بڑی تعداد اپنی دولت چھپاتی ہے۔ اور ٹیکس چوری کرتی ہے۔ ایک اندازے کے پاکستان میں 800 ارب روپے کی سالانہ ٹیکس چوری ہوتی ۔ ملک میں ٹیکس کا سارا بوجھ غریب عوام پر یا سرکاری شعبے کے ملازمین پر ہے۔ ٹیکس چوری کرنے والے اور عوام کو لوٹنے والے 80 فیصد شوگر ملز کے مالکان سیاسی رہنما ہیں جن میں سے 68 فیصد مالکان حکومت میں شامل ہیں۔ خود کو غریب عوام کے نمائندہ قرار دینے والے ان رہنماؤں کی حالت یہ ہے کہ کروڑوں ڈالرز کے اخراجات سے ان کی جماعتوں کے انٹرنیشنل سیکرٹریٹ لندن میں قائم ہیں۔ پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں غریب لوگ امراء کو سبسڈی دیتے ہیں کیونکہ پاکستان میں 90 فیصد ٹیکس بالواسطہ ہیں اور غریبوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور امراء چند ہزار ہیں۔ اس ملک میں غریبوں کی اکثریت بجلی، گیس، پٹرول، ٹیلیفون کے استعمال پر جو بالواسطہ ٹیکس ادا کرتی ہے وہ ان براہ راست ٹیکسوں سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں جو امراء بادل نخواستہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جب کوئی غریب کسان گاؤں سے اپنی سبزی یا پھل شہر لاتا ہے تو وہ نہ صرف کارپوریشن کے اہلکاروں کو اپنی پیداوار کا کچھ حصہ دینے پر مجبور ہوتا ہے بلکہ ٹول ٹیکس بھی ادا کرتا ہے جبکہ امیر آدمی جو سیاستدان یا بیوروکریٹ ہوتا ہے اور لینڈ کروزر پر

ہونے کے باعث مستثنٰی خیال کیا جاتا ہے۔ VIP سوار ہوتا ہے وہ ٹول ٹیکس سے ہمارے ہاں صاحب حیثیت سیاستدانوں، بیوروکریٹس اور بالادست طبقے کے افراد کی اکثریت نان کسٹم پیڈ انتہائی قیمتی گاڑیوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ مگر قانون نافذ کرنیوالے اداروں کی کیا مجال کہ ان کو پکڑ سکیں۔ پاکستان میں اہل ثروت افراد انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس دینا گوارہ نہیں کرتے ہیں جسکی وجہ سے ہماری قومی آمدنی میں ٹیکسوں کی شرح جی ڈی پی کا محض 9.5 فیصد ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ میں موجود ارب پتی ممبران کے گوشواروں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں اکثریت کے پاس نہ تو کوئی گھر، گاڑی اور بینک بیلنس ہے۔ اسی لئے وہ زکوۃ فنڈ اور بیت المال کی امانتوں پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد کے پاس اسلام آباد، لاہور، کراچی میں کروڑوں روپوں کی مالیت کے بنگلے ہیں مگر پراپرٹی ٹیکسوں سے بچنے کیلئے رجسٹریوں میں ان کی مالیت چند لاکھ روپے ہوتی ہے۔ الیکشن کمیشن نے سینٹ کے ارکان اثاثوں کی جو تفصیل دی ہے اس کے مطابق سب سے زیادہ اثاثوں کے مالک وفاقی وزیر سیاحت محمد اعظم خان سواتی ہیں، جن کے اثاثوں میں متحدہ عرب امارات میں دو کروڑ درہم کی جائیداد جبکہ اندرون ملک 25 کروڑ روپے کی غیر منقولہ جائیداد شامل ہے جبکہ سب سے کم اثاثوں کے مالک جمعیت علماء اسلام کے

پارلیمانی لیڈر مولانا گل نصیب خان ہیں جن کے پاس 30 ہزار روپے کی نقدی اور 3 ہزار روپے بینک بیلنس شامل ہیں۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے شائع کئے گئے گوشواروں کے مطابق پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سیکرٹری جنرل مشاہد حسین سید کے پاس ذاتی گاڑی نہیں ہے۔ مسلم لیگ (ق) کے سیکرٹری اطلاعات طارق عظیم کے بیرون ملک ساتھ لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ کے اثاثہ جات ہیں۔۔ وفاقی وزیر پارلیمانی امور ڈاکٹر بابر اعوان کے اثاثہ جات ۶۲ کروڑ سے زائد ہیں۔۔ مسلم لیگ (ق) کے سینئر لیفٹیننٹ جنرل ر) جاوید اشرف کے اثاثہ جات میں ایک کروڑ 16 لاکھ روپے کے مختلف شہروں میں) پلاٹ شامل ہیں۔ سابق وزیر اطلاعات محمد علی درانی کے زیادہ تر اثاثے ان کی اہلیہ کے نام پر ہیں۔ جبکہ ان کے ذمہ 20 لاکھ روپے کے قرضے واجب الادا ہیں۔ سینٹ میں قائد حزب اختلاف کامل علی آغا کے اثاثہ کی مجموعی مالیت دو کروڑ پانچ لاکھ روپے ہے۔ سابق اٹارنی جنرل پاکستان سردار لطیف کھوسہ کے اثاثہ جات میں پچاس لاکھ روپے کے زیورات شامل ہیں جن کی مالیت شادیوں کے وقت اور موجودہ 50 لاکھ روپے درج کی گئی ہے۔ یہ زیورات ان کی بیگمات کے نام ہیں۔ یہ تو چند نام ہیں، فہرست بہت طویل ہے۔ طبقہ اشرافیہ کے لائف سٹائل کی وجہ سے غربت ایک سنگین معاشی مسئلہ بن چکا ہے۔ عوام بجلی پانی گیس پیٹرول کے ٹیکس اپنا پیٹ کاٹ کر ادا کر رہے ہیں۔ لیکن امرا نہ تو اس ملک کی لوٹی ہوئی دولت واپس لانے پر تیار ہیں، اور نہ ٹیکس ادا کرنے پر رضامند ہیں۔ پاکستان کا مالیاتی خسارہ جو 722 بلین روپے

ہے۔ اگر زرعی ٹیکس لیا جائے۔ امراء سے ٹیکس لیا جائے تو یہ خسارہ ختم ہو جائیگا۔
موجودہ حالات نے عوام کو مایوسی میں دھکیل دیا ہے۔ غریب اور متوسط طبقے کے نوجوانوں میں سماجی بے چینی، احساس کمتری اور شدید تلخی کا احساس جنم لے رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ شدید ناراض نسل بن چکے ہیں۔ کچھ جرائم کی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں چند ایک دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں، اکثریت منشیات کی دنیا میں پناہ گزیں ہو چکی ہے اور چند خوش قسمت جائز یا ناجائز ذریعوں سے غیر ممالک میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں ایسے میں وطن عزیز کی ترقی اور کامرانی کیلئے کون علم بلند کریگا جبکہ ہر طرف چوروں اور راہزنوں کا راج ہے۔ اہل اقتدار کے ایوانوں میں جدھر نظر اٹھاؤ تو لگتا ہے کہ۔ ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے۔ انجام گلستاں کیا ہوگا

نواز زرداری ملاقات۔۔۔ امیدیں، توقعات، اندیشے

ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت پنپے، آگے بڑھے اور جمہوریت ترقی کرے۔ اسی کے ذریعے پاکستان کے عوام کو خوشحالی ہو سکتی ہے۔ آپ نے آٹھ سالہ ڈکٹیٹر شپ دیکھ لی ہے جس کے دوران سوائے ذلت اور رسوائی کے اس قوم کو کچھ نہیں ملا۔ نواز شریف نے لندن سے واپسی پر اسلام آباد میں ایک نیوز کانفرنس میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس سے پہلے پاکستان مسلم لیگ نون کے قائد نواز شریف نے کہا تھا کہ مثیاق جمہوریت کاغذ کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے اور پارلیمنٹ کی ذمہ داریاں دوسرے ادارے پوری کر رہے ہیں جبکہ پارلیمنٹ صرف دیکھ رہی ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں نواز شریف اور صدر آصف زرداری کی ملاقات سے بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں۔ ایوان صدر میں ہونے والی ملاقات، گفت، نشست، برخواست کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ اس ملاقات کا بہت انتظار تھا۔ لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا، جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا۔ اگر میاں صاحب کو یہی نصیحت کرنی تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت شفاف طرز حکمرانی کو اپنائے تاکہ موجودہ سیاسی نظام کو ناکام ہونے سے بچایا جائے۔ تو یہ سب کچھ تو میاں صاحب پہلے بھی کہہ رہے تھے۔

اس ملاقات میں کیا زیر بحث آیا اس سے زیادہ وہ اہم ہیں جو زیر بحث نہیں آئے۔ راجہ ظفر الحق کہتے ہیں کہ دونوں رہنماؤں کی بات چیت میں متنازع قومی مصالحتی آرڈیننس اور پاکستان کے لیے امریکی امداد سے متعلق کیری لوگر بل زیر بحث نہیں آیا۔ این آر او اور کیری لوگر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لئے اس کا نام تک نہیں لیا گیا۔

جس طرح اس ملاقات میں جن اہم مسائل پر بات نہیں کی گئی وہ قابل ذکر ہیں اسی طرح اس ملاقات میں شرکت کرنے والوں سے زیادہ وہ اہم ہیں جنھوں نے شرکت نہیں کی۔ اس ملاقات کے حوالے سے دونوں اطراف کی ٹیم میں ایک ایک تبدیلی کی گئی۔ مسلم لیگ (ن) کے وفد میں چودھری نثار علی خان کی جگہ مخدوم جاوید ہاشمی اور پیپلز پارٹی کی جانب سے رحمٰن ملک کی جگہ مخدوم امین فہیم کو شامل کیا گیا۔ مبصرین

صدر زرداری اور نواز شریف کے درمیان ملاقات کے وقت وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی، مسلم لیگ کے سینئیر رہنما اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف چودھری نثار علی خان اور شہباز شریف کی غیر حاضری پر بھی تعجب کا اظہار کر رہے ہیں۔ دونوں رہنماؤں نے دارالحکومت میں آرمی چیف سے ملاقات کی تھی۔ جس پر مسلم لیگ نون کے قائد میاں محمد نواز شریف نے کہا تھا کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ شہباز شریف اور چوہدری نثار کو آرمی چیف سے چھپ کر ملنے نہیں جانا چاہیے تھا بلکہ اگر سیکیورٹی امور پر ہی بات کرنا مقصود تھی تو سب کے سامنے جایا جاسکتا تھا۔ چودھری نثار علی خان حالیہ دنوں میں صدر زرداری پر پارلیمان کے اندر اور

میڈیا میں شدید تنقید کرتے رہے ہیں۔ جب کہ وزیر اعظم گیلانی خصوصاً کیری لوگر بل کی بعض شقوں پر بظاہر ویسے ہی تحفظات کا اظہار کرتے آئے ہیں جن کا اظہار فوجی قیادت کر چکی ہے ایوان صدر اور امریکی عہدے دار اس بات پر ہم زبان و ہم خیال ہیں کہ ساڑھے سات ارب ڈالر کے امریکی امداد کے بل پر خدشات بلاجواز ہیں اور یہ دونوں ملکوں کے درمیان مضبوط اور طویل المدتی تعلقات کی بنیاد بنے گا۔ ملاقات سے چند گھنٹے پہلے اسلام آباد میں صحافیوں سے باتیں کرتے ہوئے نواز شریف نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ اگر متنازع قومی مصالحتی آرڈینس یعنی این آر او، سترھویں ترمیم اور کیری لوگر بل پر مسلم لیگ (ن) کے تحفظات دور کیے جانے کی یقین دہانی کرائی گئی تو وہ اسے یقیناً ایک بڑی پیش رفت سمجھیں گے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ طے پا گیا ہے۔ مبصرین کے مطابق فریقین کے بیانات میں تو کوئی بڑی بات سامنے نہیں آئی لیکن ملاقات کے بعد مسلم لیگ (ن) کے رہنما بظاہر جس طرح مطمئین نظر آئے اس سے ایسا لگتا ہے کہ دونوں کے درمیاں کوئی درپردہ معاملہ طے پا گیا ہے جس کی تفصیل دونوں فی الحال ذرائع ابلاغ کو بتانا نہیں چاہتے۔ دونوں رہنماؤں میں ججوں کی بحالی پر اختلافات کے بعد پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت ختم کرکے گورنر راج نافذ کرنے کے بعد پیدا ہونے والے سخت اختلافات کے بعد سترہ جولائی کو رائیونڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔ جس کے بعد تین ماہ سے زیادہ عرصے کے بعد اب دوبارہ ملاقات ہوئی ہے۔

اس ملاقات میں آئین میں تمام غیر جمہوری شقیں میثاق جمہوریت کے مطابق ختم کرنے اور مذاکرات جاری رکھنے پر اتفاق کیا گیا۔ دونوں رہنماؤں میں یہ 11ویں ملاقات تھی، دونوں رہنماؤں میں 101 روز بعد یہ ملاقات ہوئی ہے۔۔ دونوں رہنماؤں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ آئین میں ترامیم میثاق جمہوریت میں طے شدہ اصولوں کے مطابق کی جائیں گی۔ ترامیم سیاسی پارٹیوں کو اعتماد میں لے کر کی جائیں گی، دونوں رہنماؤں نے عسکریت پسندی کو قومی سلامتی کے لئے بڑا چیلنج قرار دیا ہے اور اس سے فوری اور مؤثر طور پر نمٹنے کی ضرورت پر زور دیا۔ صدر زرداری اور میاں محمد نواز شریف نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک فوج، دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں اور عوام کی قربانیوں کو سراہا ہے، ملاقات کے دوران آئینی اصلاحات، میثاق جمہوریت، بلوچستان کی صورتحال، دہشت گردی کے خلاف جنگ، معاشی خودمختاری کے حصول اور احتساب کے نظام کو مؤثر بنانے پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا دونوں رہنماؤں نے تمام معاملات میثاق جمہوریت کے مطابق حل کرنے پر اتفاق کیا۔ ملاقات میں پیپلز پارٹی کے ایک رہنما نے کہا کہ "میاں صاحب" آپ کے ساتھی اندھیروں میں عسکری قیادت سے ملاقاتیں کر رہے ہیں مگر دن کی روشنی میں جمہوریت کو مضبوط بنانے کے لئے ہونے والی ملاقات میں شرکت نہیں کرتے۔' ایک اور سوال کے جواب میں نواز شریف نے جواب میں کہا کہ وہ حکومت گرانے کی کسی کوشش کا حصہ نہیں بنیں گے' البتہ

پیپلز پارٹی کے طرز حکمرانی کی وجہ سے حکومت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چھری خربوزے پر گرتی ہے یا خربوزہ چھری پر گرتا ہے۔

تیسرا راستہ خودکشی ہے

امریکی افغانستان کی حالیہ جنگ سے بے زار ہوتے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک سینئر امریکی سفارتکار نے افغانستان میں لڑی جانے والی لاحاصل جنگ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ۶۳ سالہ میتھیو ہوہ نے گزشتہ دنوں نینسی پاؤل کو چار صفحات کا ایک خط تحریر کیا ہے۔ جس میں افغانستان میں جاری جنگ پر اپنے خدشات اور تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ امریکی محکمہ خارجہ کو بھیجے گئے استعفے میں انہوں نے کہا کہ افغانستان میں جاری جنگ عسکریت پسندی کو ہوا دے رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ امریکا کو افغانستان میں موجودگی سے کیا فائدہ ہو رہا ہے۔ میتھیو ہوہ نے چھ سال عراق میں امریکی فوج کے میرین کیپٹن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اور ریٹائر ہو کر اسی سال محکمہ خارجہ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ ان دنوں زابل میں سینئر سویلین سفارتکار کی حیثیت سے تعینات تھے۔ میتھیو ہوہ افغان جنگ کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دینے والے پہلے سفارتکار ہیں۔ کابل میں امریکی سفیر نے انہیں راضی کرنے کی کوشش کی اور ایک اچھی نوکری کی پیشکش کی۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا اور فوراً واشنگٹن چلے گئے اور رچرڈ ہالبروک سے روبرو ملاقات کی۔ صدر اوباما کے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک نے میتھیو کے بعض خیالات سے اتفاق کیا ہے لیکن ان کا

کہنا ہے کہ افغان جنگ بے معنی نہیں۔ ہالبروک نے ان سے اپیل کی ہے کہ وہ افغان پالیسی تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو محکمہ خارجہ میں ہی رہیں

انہیں واشنگٹن میں تعینات کیا جائے گا۔ استعفیٰ دینے سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ جب کہ میتھیو ہوہ نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا ہے کہ وہ اب امریکی عوام کو ان کے شہروں میں جا کر بتانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کے کانگریس کے نمائندوں کو بلا کر بتائیں کہ یہ سب صحیح نہیں ہو رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عراق میں جب ہمارا گروپ عراقی نوجوانوں پر تشدد کرتا تھا تو مجھے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ امریکی افغانستان میں مر رہے ہیں۔ اور وہاں طالبان کا اثر بڑھ رہا ہے۔ امریکی سفارت کار کے استعفیٰ سے اوباما ایڈ منسٹریشن میں بھونچال آیا ہوا ہے۔ بارش کے پہلے قطرے کی طرح اب مزید ایسے احتجاج ہوتے رہیں گے۔ افغانستان میں گزشتہ روز صبح سویرے اقوام متحدہ کے گیسٹ ہاؤس پر طالبان نے دھاوا بول دیا تھا۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلیری کلنٹن کے لئے یہ ایک بد شگونی تھی۔ طالبان نے افغانستان میں تیزی سے اپنا دباؤ بڑھایا ہے۔ لیکن دوپہر میں پشاور کے ایک بازار میں ایک بارود بھری گاڑی کے دھماکے میں ایک سو سے زیادہ افراد جن میں، معصوم بچے، عورتیں، اور ایک مدرسے کے طالب علم بھی تھے۔ منظر نامہ ایک بار پھر تبدیل کر دیا، اور میڈیا کی ساری توپوں کا رخ طالبان کی جانب مڑ گیا۔ گو طالبان نے اس دھماکے

میں ملوث ہونے کی تردید کی ہے۔ لیکن امریکی اشارے یہی ہیں کہ پاکستان میں ایسی کاروائیاں جاری رہیں، جن سے طالبان اور مذہبی رجحان رکھنے والی قوتوں کے خلاف عوامی نفرت میں اضافہ ہو۔ اب تک اس حکمت عملی میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ لیکن یہ سال اپنی جگہ اہم ہے کہ طالبان ایسی کاروائیوں میں کیوں حصہ لیں گے۔ جس سے ان کے خلاف نفرت میں اضافہ ہو۔ اور ایسی کاروائیوں کے خلاف بھارت اور امریکہ اور ان کے اتحادی کیوں سب پہلے مذمت کرتے ہیں۔

رواں سال میں افغانستان میں نیٹو کے 445 فوجی ہلاک ہوئے ہیں جن میں دو سو ستتر امریکی فوجی تھے۔ افغانستان میں گزشتہ آٹھ سال سے جاری جنگ کے دوران اکتوبر کا مہینہ امریکی فوجیوں کے سال خونی ثابت ہوا جس میں اب تک ساٹھ امریکی 2009 فوجی ہلاک ہو چکے ہیں۔ تین ہیلی کاپٹر کی تباہی میں گیارہ امریکی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے اگست دوہزار نو امریکی فوجیوں کے لیے سب سے خونی مہینہ تصور کیا جاتا تھا جس کے دوران اکاون فوجی ہلاک ہو گئے تھے۔امریکی محکمہ دفاع کے ایک اہلکار کے مطابق ماہ اکتوبر ابھی تک امریکی فوجیوں کے لیے سب سے.برا مہینہ ثابت ہوا ہے۔

افغانستان میں امریکی فوجیوں کی ہلاکت میں اضافہ ایسے وقت دیکھنے میں آیا ہے جب امریکی صدر براک اوباما افغانستان کے بارے امریکی پالیسی کا از سر نو جائزہ لے رہے ہیں اور افغانستان میں امریکی کمانڈر جنرل میکرسٹل چالیس ہزار مزید فوجیوں کا تقاضہ

کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے گیسٹ ہاؤس پر حملہ کے بعد افغان طالبان کے ایک ترجمان نے ایک ٹیکسٹ پیغام کے ذریعے یہ کہہ کر حملے کی ذمہ داری قبول کی کہ یہ حملہ سات نومبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات کو درہم برہم کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم ہے۔ یہ تازہ ترین حملہ ایک ایسے وقت ہوا ہے جب صدارتی انتخاب کے دوسرے مرحلے سے پہلے ملک میں سخت کشیدگی کا ماحول ہے اور امریکی صدر براک اوباما ایک ایسے بِل پر دستخط کرنے والے ہیں جس کے تحت حکومت کے خلاف تشدد کو ترک کرنے والے طالبان جنگجوؤں کو رقوم ادا کی جائیں گی۔ اس دفاعی بِل کے تحت قائم ہونے والے فنڈ کے لیے ایک اعشاریہ تین ارب ڈالر کی خطیر رقم رکھی گئی ہے۔ امریکی کمانڈر عراق میں حکومت سے مل جانے والے شدت پسندوں کو ایسی ادائیگیاں کرتے رہے ہیں لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ افغانستان میں بھی یہ سلسلہ پہلی بار باقاعدگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔

واشنگٹن میں بی بی سی کے نامہ نگار رچرڈ لیسٹر کا کہنا ہے کہ عراق میں اس سکیم کے تحت نوے ہزار بندوق برداروں نے حکومت مخالف کارروائیاں چھوڑ کر مقامی لشکر بنائے اور اپنے شہروں کو شدت پسندوں سے بچایا۔ امریکی حکام نے ہر جگہ اپنی جنگ لڑنے کے لئے کرائے کے لوگ بھرتی کئے ہیں۔ افغانستان کی جنگ امریکیوں کے لئے ایک روگ بن گئی ہے۔ جس سے وہ نکلنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اس علاقے سے دستبردار بھی نہیں ہونا چاہتے ہیں، ہیلری کلنٹن کا بہ حیثیت وزیر

خارجہ یہ پہلا دورہ پاکستان کے لئے ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ اس دورے میں میڈیا، عوام اور حزب اختلاف نے کھل کر امریکہ کے خلاف جذبات کا اظہار کیا ہے۔ دنیا بھر میں بھی امریکہ کے خلاف رد عمل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ کے اتحادی اور اقوام متحدہ بھی محسوس کرتی ہے کہ سب کچھ صحیح نہیں ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اقوام متحدہ کے اداروں اور ان سے وابستہ افراد پر حملے ہو رہے ہیں۔ اسی لئے اقوام متحدہ نے پاکستان اور افغانستان میں امریکی ڈرون حملوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ واشنگٹن بغیر پائلٹ طیاروں کے استعمال کا قانونی جواز پیش کرے۔ جبکہ امریکا کا کہنا ہے کہ اسے جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نیویارک میں میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کے نمائندے فلپ ایلسٹن کا کہنا تھا کہ پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں امریکی ڈرون حملوں میں بے گناہ لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں۔ جو عالمی قوانین کی خلاف ورزی اور اقوام متحدہ کے کنوینشن کے منافی ہے۔ امریکا واضح کرے کہ ان حملوں میں بے گناہ شہری ہلاک نہیں ہو رہے۔ موجودہ حالات میں افغانستان میں ہونے والی جنگ ایک فیصلہ کن مرحلے پر داخل ہو گئی ہے۔ اس جنگ سے نکلنے کے لئے امریکہ کو ایک جانب پاکستان پر اعتماد کرنا ہوگا۔ تو دوسری جانب افغانستان کے طالبان سے مذاکرات کرنے ہوں گے۔ اس کے علاوہ تیسرا راستہ خودکشی ہے۔

محنت کش بچے

بچے برائے فروخت کا پلے کارڈ لے پریس کلب کے باہر یا کسی مصروف بازار میں کسی ماں باپ کو دیکھ کر ہمارا میڈیا فورا بریکنگ نیوز کی خبر لے دوڑتا ہے۔ اور پل بھر میں سارے چینل یہ خبر دیتے ہوئے سیاستدانوں، سوشل ورکرز سے ان کے تاثرات لے رہے ہوتے ہیں۔ تو کیا مثل یوسف بازار میں بکنے کے لئے بچے ہی ایسی ارزاں جنس رہ گئی ہے۔ جسے جب چاہے ماں باپ بازار میں بیچنے نکل کھڑے ہوں۔ کیا ہمارا معاشرہ مادیت پسند ہوگیا ہے؟ کیا ہمارا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے؟۔ اور کیا ہماری حکومتوں اور ارباب اختیار نے واقعی اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیا ہے؟۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا اس دور میں ماں باپ کی محبت اس قدر کم ہو گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بازاروں میں فروخت کرنا شروع کردیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جس پر ہمارے معاشرے میں سنجیدہ بحث ہونی چاہیئے۔ ایک جانب معاشرہ اور حکومت اپنی اس ذمہ داری سے رخ موڑے کھڑے ہیں۔ تو دوسری جانب ہم نے ان بچوں سے محنت مزدوری کرکے اپنے خاندان کو ہاتھ بٹانے کو حق بھی چھین لیا ہے۔

گزشتہ دنوں سندھ اسمبلی میں وقفہ سوالات کے دوران اپوزیشن رکن عارف مصطفی

جتوئی کے ایک سوال کے جواب میں سندھ کے وزیر محنت امیر نواب نے ایوان کو بتایا کہ سندھ کے اضلاع تھرپارکر، عمرکوٹ، جامشورو اور دادو سے یکم مئی 2008ء سے اپریل 2009ء تک 4367/ محنت کش بچوں کو بازیاب کرایا گیا جن سے مختلف 30/ فیکٹریوں اور قالین بافی نے کارخانوں میں جبری مشقت لی جاتی تھی ان میں 2180/ کم عمر بچیاں بھی شامل ہیں۔ بازیابی کے بعد ان بچوں کو ایک این جی او "تھر دیپ" کے حوالے کیا گیا جس نے ان بچوں کو اسکولوں میں داخل کیا اور ان کی بحالی کے لئے اقدامات کئے۔ اس رپورٹ پر سندھ اسمبلی میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اس موقع پر متعدد ارکان نے سوالات اٹھائے اور کہا کہ کم عمر بچیوں کو کہاں رکھا جارہا ہے ؟ کیا ان بچوں کو ان کے والدین سے ملنے دیا جارہا ہے یا نہیں؟ اور کیا بچوں کو فروخت تو نہیں کردیا گیا؟۔ ارکان کی اس تشویش پر اور ایوان کے مشورے سے اسپیکر نے یہ معاملہ اسٹینڈنگ کمیٹی برائے محنت کے حوالے کردیا اور اسے رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی۔ وزیر محنت نے کہا کہ میں کمیٹی کے ارکان کے ساتھ خود جاؤں گا اور ان بچوں سے ملوں گا۔ اسپیکر سندھ اسمبلی نثار احمد کھوڑو نے ایوان کی اسٹینڈنگ کمیٹی برائے محنت کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ سندھ کے مختلف اضلاع سے بازیاب کرائے گئے محنت کش بچوں کے حالات کا جائزہ لے اور اپنی رپورٹ اسمبلی میں پیش کرے۔ تا حال یہ رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قومی معاملات میں ہمارے سیاستدانوں کا رویہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

والدین اس قدر خود غرض ہو چکے ہیں کہ انہیں یہ معصوم آمدنی میں اضافے کا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن دوسری جانب ہمارے حکمران اتنے سخت دل ہو چکے ہیں کہ وہ ان نونہالوں کی فلاح و بہبود اور روشن مستقبل کے لئے کسی قسم کی حکمت عملی تیار نہیں کرتے بلکہ مہنگائی، بے روزگاری میں روز بروز اضافہ کرنے کو ترقی سمجھتے ہیں۔

ان ملازم پیشہ بچوں کی اکثریت مہنگائی کے سبب ہی عملی زندگی کی جانب آتی ہے۔ لیکن ہم مغرب کے پروپیگنڈے سے اس قدر متاثر ہیں کہ ہم اپنے خصوصی حالات کا تجزیہ نہیں کرتے۔ ہمارے سیاست دانوں نے اس مسئلے پر سوچا ہی نہیں۔ یادش بخیر پاکستان میں مشقت کرنے والے بچوں یا چائلڈ لیبررز کی تعداد کے بارے میں درویش صفت عبدالستار افغانی نے ایک سوال پوچھا تھا۔ جس پر ایوان کو بتایا گیا کہ اس ضمن میں تازہ اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ تاہم محنت و افرادی قوت کے وزیر کے بقول انیس سو چھیانوے میں کیے گئے سروے کے مطابق ملک میں محنت کش بچوں کی تعداد تینتیس لاکھ تیرہ ہزار تھی۔ آج ۳۱ سال بعد بھی کسی کو یہ اعداد شمار نہیں معلوم اور نہ اس مسئلے پر کوئی توجہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچا جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں سے ان کا بچپن نہ چھینا جائے بلکہ فطری انداز میں انہیں پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ بچے ہی قوم کا مستقبل ہیں ان محنت کش بچوں کی طرف

بھرپور توجہ دی جائے اور اپنی قوت و استطاعت کے مطابق ان کے بچپن و مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے عملی جدوجہد کی جائے۔

ایک نئے کھیل کا آغاز

نا رو۔ نا رو۔۔ میرے بچے نا رو۔۔ شیخ صاحب اپنے شاگرد کو سمجھا رہے تھے۔ لیکن شاگرد تھا کہ روئے جا رہا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی جس پر شاگرد کو آخر کار رونا ہی تھا۔ شیخ نے اپنے شاگرد کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شادی کر لے۔ شادی میں مسئلے مسائل ہوتے ہی ہیں۔ اس لئے اب شیخ صاحب نے مشورہ دیا کہ طلاق دے دو۔ شاگرد کو لڑائی جھگڑے کے باوجود بیوی پسند ہے اس لئے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔ اس لئے وہ رو رہا ہے۔ الطاف حسین اپنے دوستوں کو بہت کم مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے مشورے تجربے کا نچوڑ ہوتے ہیں اس لئے بڑی افادیت رکھتے ہیں۔ جب الطاف بھائی نے آصف علی زرداری کو صدر بننے کا مشورہ دیا تھا تو ان کی صائب رائے کے احترام میں زرداری صاحب نے مسند صدارت پسند کی تھی۔ اب متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے صدر آصف علی زرداری کو ایک اور مشورہ دیا ہے کچھ کہتے ہیں کہ یہ استعفیٰ کا مشورہ ہے اور کچھ اسے جمہوریت بچانے کو مشورہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ مشورہ ایک بم شیل تھا جس نے زور دار دھماکہ کر دیا تھا۔ ایک ٹی وی چینل نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ایم کیو ایم کے قائد نے صدر کو یہ مشورہ وفاقی وزیر برائے پارلیمانی امور ڈاکٹر بابر اعوان کے ذریعے دیا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ بطور دوست میں آپ کو یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ جمہوریت بچانے

کیلئے آپ اپنے ساتھیوں سمیت بڑی قربانی دیں اور عدلیہ کا سامنا کریں۔ رابطہ کمیٹی کے رکن مصطفٰی عزیز آبادی نے اپنے ایک وضاحتی بیان میں کہا ہے کہ قائد تحریک الطاف حسین نے نجی ٹی وی چینل کو انٹرویو میں آصف علی زرداری کو استعفٰی دینے کے مشورے کی کوئی بات نہیں کی۔ ٹی وی کے اینکر پرسن نے اس حوالے سے جو خبر بھی دی ہے وہ اسلام آباد میں اپنے ذرائع کے حوالے سے دی ہے۔ اب تک صدر آصف علی زرداری نے بڑی مہارت، سیاسی سوجھ بوجھ اور دانشمندی سے حکومت کی ہے۔ انہوں نے غیر ممالک کے ۲۲ دورے بھی کئے ہیں۔ قومی اسمبلی میں صرف 120 ارکان کی اکثریت کے ساتھ خود صدر منتخب ہوئے۔ چیئرمین سینٹ اور سپیکر قومی اسمبلی اپنی مرضی سے منتخب کرائے۔ اب صدر زرداری تھوڑی سی آزادی چاہتے ہیں۔ جس کے لئے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تھا۔ میاں نواز شریف نے صدر زرداری کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ایسی غلطی نہ دہرائیں جس کے سبب انھیں طویل عرصہ اقتدار کی راہداریوں سے دور رہنا پڑا تھا۔ انھوں نے اپنے بھائی شہباز شریف اور چوہدری نثار کی بہت ہلکے انداز میں سرزنش کی تھی کہ انھیں رات کے اندھیرے میں آرمی چیف سے جا کر نہیں ملنا چاہئے تھا۔ اسلام آباد میں سیاسی ذرائع اس بات کی پیشن گوئی کر رہے ہیں کہ ایوان صدر کا گھیراؤ کر لیا گیا ہے۔

جنرل کیانی کی مدت ملازمت 11 نومبر 2010ء میں ختم ہو گی ابھی ان کے پاس

پورا ایک سال ہے اس لئے ان کی ملازمت میں توسیع کے حوالے سے اختلافات کی باتیں محض ہوائی کہی جاسکتی ہیں۔ بعض ذرائع کہتے ہیں کہ صدر زرداری 17 ویں ترمیم کے اختیارات سے سبکدوش ہونے پر کسی طرح تیار نہیں ہیں جن کا تحت صدر زرداری کو تینوں مسلح افواج کے سربراہان چیف جسٹس سپریم کورٹ وہائی کورٹس کی تقرری کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی ایوان صدرارت سے وضاحت کی جاچکی ہے۔ مسلم لیگ ن کی طرف سے بار بار یہ اعلان ہوتا رہاہے کہ غیر آئینی طریقے سے حکومت گرانے کی کسی کوشش کا ساتھ نہیں دیا جائیگا۔ میاں نوز شریف خود اسی میدان کے شہسوار ہیں۔ کل انھیں بھی ان ہی حالات سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں صدر آصف زرداری نے ملک کے ہر طبقہ کو بڑی کامیابی سے استعمال کیا۔ تاہم ان کا اصل امتحان اب شروع ہوا ہے۔ موجودہ حکومت پر کرپشن کے الزامات کا انبار ہے اور حکومت کسی بھی معاملہ میں اپنی پوزیشن کلیئر نہیں کر سکی، حالیہ چینی کے بحران، سرکاری اراضی کی لوٹ سیل اور کرائے کے بجلی گھروں کے علاوہ بیرونی سودوں میں بھی کمیشن اور کک بیکس کا الزام ہے۔ ایسے میں این آر او پر حکومتی پسپائی ایک حکمت عملی بھی کہی جاسکتی ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ کھیل شروع ہوچکا ہے۔ اب یہ کھلاڑیوں پر منحصر ہے کہ وہ کیا حکمت عملی ترتیب دیتے ہیں۔

بیٹا یا بیٹی مہذب معاشرے میں انسانیت کا قتل

آج کی اس مہذب دنیا میں انسانیت کا قتل ہو رہا ہے۔ لیکن انسان اس پر خاموش ہیں، کہیں نسل پرستی کے نام پر، کہیں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام، اور کہیں معاشرتی رسم و رواج کے نام پر، تو کہیں صنفی امتیاز کے نام پر یونیسیف کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑے جمہوری اور سیکولر ملک ہونے کے دعویدار بھارت میں صنفی امتیاز کے منظم منصوبے کے تحت 5 کروڑ لڑکیاں پیدائش سے پہلے یا بعد میں قتل کر دی جاتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیف کی اس رپورٹ میں ان خوفناک اعداد و شمار کا انکشاف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بھارت میں بچیوں کو پیدائش سے قبل یا بعد میں قتل کرنے کا معاملہ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔
بھارت میں رائج جہیز کا نظام ہے جو غریب خاندان کے بس کی بات نہیں، اور لڑکی کی پیدائش مصیبتوں اور پریشانیوں کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ عورت مخالف یہ صورتحال صرف کسی ایک جگہ محدود نہیں بلکہ ثقافتی عقائد اور معاشرتی روایات کی بنیاد پر ہر طبقہ میں یہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی اسکی جنس معلوم کر لی جاتی ہے اور لڑکی ہونے کی صورت میں اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ بھارت میں ذات برادری کی تقسیم اور لڑکیوں کے لیے جہیز اس کی خاص وجہ ہے۔ یونیسیف نے اسے

سنگین صورتحال قرار دیا ہے۔ بھارت میں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد ۹۳۷ رہ گئی ہے۔ اس صورتحال پر بھارت میں خاصا واویلا تو مچایا جاتا ہے۔ لیکن اب تک کوئی ٹھوس اقدام نہیں ہوسکے۔ کچھ عرصہ پہلے بچوں کے لئے کام کرنے والی ایک خیراتی تنظیم کی جانب سے دائر کردہ ایک مقدمہ میں عدالت میں سوال اٹھایا گیا تھا کہ ایسے اسپتالوں اور شفا خانوں کو سزا دی جائے۔ جس پر بھارتی سپریم کورٹ نے حکم دیا تھا کہ پیدائش سے قبل جنس کا تعین کرنے کے لئے رحم مادر کا سکین کرنے والے شفا خانوں کو سزائیں دی جائیں اور ان قوانین پر سختی سے عملدرآمد کروایا جائے جو لڑکیوں کے اسقاط کو روکنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

مذکورہ تنظیم کا کہنا تھا کہ کئی والدین کو جب الٹرا ساؤنڈ کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں بچی پیدا ہوگی تو وہ حمل ضائع کروا دیتے ہیں۔ بھارت کے دہی علاقوں میں لڑکیوں پر لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ لڑکے کما کر لاتے ہیں۔ بھارتی حکومت جہیز کے رواج کو بھی ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس رواج کو پہلے ہی خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ پیدائش سے پہلے یہ جاننے کے لئے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی اکثر جوڑے الٹرا ساؤنڈ کرواتے ہیں۔ تاہم بھارتی حکومت نے دس سال قبل اس پر پابندی عائد کر دی تھی۔ لیکن حالیہ جائزوں سے پتہ چلا ہے کہ اس قانون پر کم ہی عمل ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے اس حکم

میں وفاقی اور ریاستی حکومتوں پر زور دیا ہے کہ وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دلائیں۔ اس سے قبل عدالت نے حکم دیا تھا کہ مختلف شفا خانوں میں استعمال ہونے والی الٹرا ساؤنڈ مشینوں کی نگرانی کی جائے اور ان مشینوں کو ضبط کر لیا جائے جن کے ذریعے پیدائش سے قبل بچے کی جنس کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ عدالت کے حکم سے لگتا ہے کہ وہ بچیوں کے اسقاط حمل کا تدارک کرنا چاہتی ہے۔ تاہم ان کے خیال میں زیادہ ضروری امر اس رویہ اور سلوک میں تبدیلی لانا ہے جو لڑکیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ بھارت میں جہیز کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ بہت بڑی تعداد میں لڑکیاں جہیز نہ ہونے کے سبب شادی نہیں کر پاتی، اور جو گھرانے شادی کے لئے جہیز دیتے بھی ہیں۔ ان کی لڑکیوں پر تشدد بھی کیا جاتا ہے۔ جہیز نہ لانے والی لڑکیوں کو جلانے کے واقعات بھی بھارت میں عام ہیں۔ پاکستان میں بھی اکثر شادی شدہ گھرانوں میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے یہاں جو اولاد ہو وہ لڑکا ہو، حال ہی میں پاکستان میں ہونے والے ایک سروے میں بتایا گیا ہے کہ پاکستانی شہریوں کی ایک بڑی اکثریت چاہتی ہے کہ ہر شادی شدہ جوڑے کے ہاں صرف ایک بچے کی صورت میں بچی کے مقابلہ میں بچہ پیدا کرنے کو ترجیح دیں گے۔ گیلانی ریسرچ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام بین الاقوامی ادارے گیلپ کی طرف سے کرائے گئے سروے کی رپورٹ

کے مطابق سروے میں پاکستانی شہریوں سے پوچھا گیا کہ اگر خدا انہیں صرف ایک بچے سے نوازے تو وہ بچی کی پیدائش کو ترجیح دیں گے یا بچے کی پیدائش کو۔ اس کے جواب میں شادی شدہ شہریوں میں سے 82 نے جواب میں کہا کہ وہ بچے کی پیدائش چاہیں گے جبکہ 16 فیصد نے بچی کی پیدائش کی خواہش کا اظہار کیا اور دو فیصد نے کوئی رائے دینے سے انکار کیا۔

سروے رپورٹ کے مطابق غیر شادی شدہ شہریوں کی 70 فیصد نے بچے اور 26 فیصد نے بچی کی پیدائش کی خواہش کا اظہار کیا۔ رپورٹ کے مطابق شہری علاقوں میں مقیم 79 فیصد جبکہ دیہی علاقوں میں مقیم 89 فیصد شہریوں نے صرف ایک بچے کی صورت میں بچی کی بجائے بچہ کی پیدائش چاہیں گے۔ بچہ اور بچی نعمت خداوندی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بچوں کی یہ تفریق بھی عورتوں کی پیدا کردہ ہے۔ جو خاندان میں بچی کی پیدائش پر منفی رویہ کا اظہار کرتی ہیں۔ آج کی بچی کل بہن، بیٹی، بیوی، ماں کے رشتے میں ڈھل جائے گی۔ اور یہی خاندان کے نظام کو چلائے گی۔ معاشرے میں ان رویوں پر قدغن لگانی چاہیے۔ آج کل ایسے کلینک اور اداروں کی بھی بھرمار ہے، جو اشتہار دے کر پوچھتے ہیں کہ آپ کو بیٹی چاہیے یا بیٹا۔ حکومت کو ان کاروباری اداروں کا نوٹس لینا چاہیے۔ اور ان پر پابندی لگانا چاہیے۔ یہ معاشرے میں افراط و تفریط پیدا کر رہے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف ایک بار پھر نفرت کے بادل

امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف ایک بار پھر نفرت کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ٹیکساس میں واقع ایک اہم فوجی چھاؤنی، فورٹ ہڈ، میں تعینات ایک فوجی افسر نے جمعرات پانچ نومبر کو فائرنگ کرکے 12 افراد کو ہلاک اور 30 سے زائد کو زخمی کردیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد فوجی حکام نے مبینہ حملہ آور کا نام میجر ندال ملک حسن بتایا۔ جو امریکی قومیت رکھتے ہیں اور چھاؤنی کے ہسپتال سے منسلک ایک ماہر نفسیات ہیں۔ اس واقعے کے فوراً بعد دنیا بھر کے میڈیا پر ایک بار پھر مسلمانوں کا میڈیا ٹرائیل شروع کردیا گیا اور اسلام کو شدت پسند مذہب قرار دے کر اس کے پیروکاروں پر رکیک حملے کئے جانے لگے۔ امریکہ میں مسلمان اس واقعے کے بعد نائین الیون جیسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ امریکی صدر بارک اباما نے اس واقعے سے فوری نتائج نکالنے سے گریز کی پالیسی اپناتے ہوئے عوام سے صبر کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ اس واقعے کی تحقیق کی جارہی ہے اور واقعہ کے محرکات کے بارے میں پیش رفت جاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود انٹرنیٹ پر اسلام، پیغمبر اسلام، اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ جاری ہے۔

اس خبر کی تفصیل جاننے کے لئے جب میں نے نیٹ پر خبروں کا جائزہ لیا تو کئی

ایسے تبصرے دیکھے جو مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان لئے ہوئے تھے۔ اس واقعے کی آڑ میں بارک اوباما کی عراق اور افغانستان کی پالیسوں پر شدید تنقید کی جارہی ہے۔ ابتدائی اطلاعات میں فوجی اڈے کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل رابرٹ کون نے بتایا کہ فائرنگ کا یہ واقعہ چھاؤنی کی اس عمارت میں پیش آیا جہاں فوجی افغانستان اور عراق میں تعیناتی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تفتیش کاروں نے اس بات کی یقین دہانی کر لی ہے کہ میجر حسن نے یہ کارروائی اکیلے ہی کی تاہم انھوں نے اس واقعہ کے محرکات کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا۔پینٹاگون کے ترجمان جیف مورل نے کہا ہے کہ محرکات کے بارے میں کی جانے والی قیاس آرائیاں قبل از وقت ہیں کیونکہ ان کے بقول ہم خود ابھی تک اس واقعہ کے بہت کم حقائق سے آگاہ ہیں۔ اب تک جو تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ میجر حسن کی عمر 39 سال ہے۔ ان کے والدین فلسطین کے ایک گاؤں سے ہجرت کرنے کے بعد امریکہ میں آکر آباد ہوئے تھے۔ میجر حسن ریاست ورجینیا میں پیدا ہوئے۔ اور امریکی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ریاست کے میڈیکل بورڈ کے ریکارڈ کے مطابق اس نے 2003ء میں واشنگٹن ڈی سی میں فوج کے ایک میڈیکل سکول سے ڈگری حاصل کی تھی۔ فورٹ ہڈ امریکہ کی بڑی فوجی چھاؤنیوں میں سے ایک ہے جہاں تقریباً تین لاکھ فوجی اور سویلین کام کرتے ہیں جن کے ہزاروں رشتہ دار بھی یہیں رہائش پذیر ہیں۔

اس چھاؤنی کے 15 ہزار فوجی ان دنوں امریکہ سے باہر فرائض انجام دے رہے ہیں اور یہاں سے باقاعدگی کے ساتھ فوجیوں کو افغانستان اور عراق بھی بھیجا جاتا ہے۔ میجر حسن ایک ماہر نفسیات ہیں۔ جن کی ذمہ داریوں میں ان امریکی فوجیوں کی بحالی شامل تھی۔ جو عراق اور افغانستان میں فوجی کاروائیوں کے بعد ذہنی صدمات سے دوچار تھے۔ ایک ماہر نفسیات علاج سے قبل اپنے مریضوں سے ان واقعات کی مکمل تفصیل لیتا ہے۔ جن سے اس مریض کا تعلق رہا ہے۔ امریکی جنگجوں نے عراق اور افغانستان میں جو مظالم ڈھائے ہیں۔ وہ اس قدر ہولناک ہیں کہ ان امریکیوں کو اب نارمل زندگی گزرنا مشکل ہوگیا ہے۔ میجر حسن بھی آئے دن ایسی داستان سنتے تھے۔ جو ان پر اثر انداز ہوئی۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی تھے۔ امریکہ نے مسلمانوں پر جو ظلم کئے ہیں، وہ عراق اور افغانستان میں نفرت کا ایسا بیج ہے۔ جس کا زہریلا پھل امریکہ کو کھانا پڑے گا۔ میجر حسن امریکی مظالم کے نتیجے میں پکنے والی فصل کا ایک دانہ ہے۔ ان پر یہ بھی دباؤ تھا کہ انھیں بہت جلد افغانستان بھیجا جائے گا۔ امریکہ میں بہت سے فوجیوں نے عراق اور افغانستان میں خدمات ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی نوکریوں سے استعفیٰ دے دیئے ہیں۔ میجر حسن بھی اس بارے میں سوچ رہے تھے۔ افغانستان جانے کے بارے میں وہ اپنی ناپسندیگی کا اظہار کرچکے تھے۔ امریکہ، برطانیہ، اور یورپی ممالک میں عوام کی بہت بڑی تعداد اپنے حکمرانوں سے پوچھ رہی ہے کہ افغانستان اور عراق میں لڑی جانے والی جنگ کس کی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب

ان حکمرانوں کو اپنی عوام کے سوالوں کے جواب دینا مشکل ہو جائیں گے۔ پاکستان کے حکمرانوں کو بھی ایک بار پھر سوچ لینا چاہئے کہ وہ اس ملک میں کس کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

سی مور ہرش کی بے بنیاد اور شر انگیز رپورٹ

افوج پاکستان کے جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے سربراہ جنرل طارق مجید نے پاکستان کے جوہری اثاثوں کے بارے میں امریکی جریدے نیویارکر میں شائع ہونے والی مشہور صحافی سی مور ہرش کی خبر کو بے بنیاد اور شر انگیز قرار دیا ہے۔ جنرل طارق مجید نے ایک بیان میں کہا ہے کہ جوہری اثاثوں کی حفاظت کے لیے پاکستان نے ایک بہت ہی مؤثر اور فعال نظام وضع کر لیا ہے جس میں ان اثاثوں کی تحویل اور رسائی کے معاملات کے بارے میں سخت ترین ضوابط بنائے گئے ہیں۔ انھوں نے نیویارک اخبار کے اس دعویٰ کو رد کیا کہ پاکستان ان اثاثوں کی حفاظت کے لیے امریکہ سے خفیہ مذاکرات کر رہا ہے۔ جنرل طارق مجید نے کہا کہ پاکستان کو جوہری اثاثوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے کسی ملک کے تعاون کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے جوہری پروگرام کی حفاظت اور ترقی کے ذمہ دار ہونے کے ناطے وہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ کسی غیر ملک یا فرد یا کسی ادارے کو پاکستان کے جوہری اثاثوں تک رسائی یا ان اثاثوں کے بارے میں خفیہ اور اہم معلومات فراہم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جنرل طارق مجید نے واشگاف لفظوں میں کہا کہ ملک کا سکیورٹی نظام ان اثاثوں کی حفاظت اور ان کو ہر ممکنہ خطرے سے بچانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور وہ اس کے لیے پوری طرح

تیار ہے۔ انہوں نے کہا وہ سمجھتے ہیں کہ جوہری اثاثوں کی حفاظت کے لیے پاکستان سکیورٹی فورسز کسی بھی دوسرے ملک کی سکیورٹی فورسز سے زیادہ اہل ہیں اور ان کو بہتر کرنے کے لیے کسی بھی دوسرے ملک سے مذاکرات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کم وبیش انہی الفاظ میں وزارت خارجہ اور اسلام آباد میں امریکی سفیر پہلے ہی امریکی میگزین نیو یارکر میں سی مور ہرش کے پاکستانی جوہری اثاثوں سے متعلق رپورٹ کو مسترد کرچکے ہیں۔ سی مور ہرش کی اس متنازعہ رپورٹ میں سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ انہوں نے جوہری اسلحہ کی حفاظت سے متعلق بتایا کہ وہ سب محفوظ ہیں جو کہ ایک طویل اور گہری سرنگ میں رکھے گیے ہیں تاکہ ترسیل میں آسانی ہو اور گہرائی کی وجہ سے کسی بھی حملے کی صورت میں محفوظ رہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکا پاک فوج کے ساتھ حساس نوعیت کے مذاکرات کر رہا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ دنوں پاکستان کے دفاعی شعبے کو دی جانے والی چار سو ملین ڈالر امداد بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے تاکہ فوج اپنی ضروریات پوری کرسکے۔ پاکستان نے اس رپورٹ کے مندرجات کو بے بنیاد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ پاکستانی فوج اور امریکہ کے مابین جوہری ہتھیاروں کی حفاظت کے لیے مذاکرات کے الزامات بالکل بے بنیاد ہیں۔ امریکہ پاکستانی جوہری ہتھیاروں کی حفاظت کے لیے پاکستان فوج کی مدد فراہم نہیں کر رہا اور

نہ ہی جوہری اثاثوں یا مواد پر قبضے کی خواہش رکھتا ہے۔ پاکستان وزارت خارجہ کا کہنا ہے کہ اسٹریٹجک و ایٹمی اثاثے تہہ در تہہ محفوظ ہیں اور ان کا کمانڈ اینڈ کنٹرول انتہائی فول پروف ہے۔ 'حفاظت کا تمام تر نظام مقامی ہے۔ تحفظ کے لیے کسی امداد کی ضرورت ہے نہ ان اثاثوں تک کسی کو رسائی کی اجازت دیں گے۔' ان کے مطابق پاکستانی افواج حفاظت کی ہر ممکن صلاحیت رکھتی ہیں۔ 'سکیورٹی کے بارے میں امریکی حکام سے گفت و شنید کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی بھی تجویز انتہائی مضحکہ خیز ہوگی جبکہ چند عناصر پاکستان مخالف گھناؤنے اور گمراہ کن پروپیگنڈے پر عمل پیرا ہیں جو کسی صورت کامیاب نہیں ہو سکتے۔'

ترجمان دفتر خارجہ عبدالباسط نے رپورٹ کو سازش اور پاکستان مخالف گمراہ کن پروپیگنڈے کا حصہ قرار دیا اور کہا کہ مصنف کی جانب سے غلط اور لغو معلومات شائع کر کے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا گیا ہے جس کا بنیادی مقصد چند عناصر کی پشت پناہی سے پاکستان کے تشخص کو داغدار کرنا ہے۔ ترجمان کا کہنا تھا کہ مضمون کے مصنف سیمور ہرش پروپیگنڈا پر کام کرتے ہوئے اپنی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے حال ہی میں دیے گئے بیان کو بھول گئے جس میں انہوں نے جوہری اثاثوں کے تحفظ پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ لہٰذا کالم نگار کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں اور سنسنی خیزی سے پرہیز کرتے ہوئے حقائق کو اجاگر

کرنا چاہیے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ۲۷ سالہ تحقیقات کار اور رپورٹر سیمور ہرش نے ’دی نیو یارکر‘ میگزین میں پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کے بارے میں رپورٹ شائع کی ہے۔ وہ طویل عرصے سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا پیچھا کئے ہوئے ہیں۔ لھتونیہ کے یہودی خاندان سے تعلق رہنے والے سی مور ہرش یونیورسٹی آف شکاگو اور نیو یارکر میگزین سے وابستہ ہیں۔ انھیں ویٹ نام جنگ میں سائی لی قتل عام کے بارے میں رپورٹ شائع کرنے پر عالمی شہرت ملی تھی۔ اس رپورٹ پر انھیں ۰۷۹۱ میں پلٹزر ایوارڈ دیا گیا تھا۔

انھوں نے اپنے کیریر کا آغاز پولیس رپورٹنگ سے کیا تھا۔ ابو غریب جیل عراق کے بارے میں بھی ان ہی کی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ جس سے دنیا کو امریکیوں کے مظالم کی خبر ہوئی۔ ان کی کئی رپوٹوں نے دنیا میں تھر تھری مچائی ہے۔ جنوری ۶۰۰۲ میں سیمور ہرش نے ’دی نیو یارکر‘ میگزین میں سی آئی اے کی ایک خفیہ رپورٹ کا حوالہ دیا تھا جو سیٹلائیٹ سے لی گئی تصاویر اور دیگر معلومات کی بنیاد پر تیار کی گئی تھی۔ ایران کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں اس رپورٹ نے امریکہ کے جھوٹے پروپیگنڈے کو بے نقاب کیا تھا۔ جو وہ ایران کے خلاف کرتا رہا ہے۔

جریدے کے مطابق سی آئی اے کی رپورٹ میں کچھ اہلکاروں نے اپنے نام نہ ظاہر کرتے ہوئے یورپ اور امریکہ کے ان دعوؤں پر شک کا اظہار کیا ہے کہ ایران درحقیقت جوہری ہتھیار تیار کرنے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 'سی آئی اے کو اب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا ہے کہ ایران کسی خفیہ جوہری پروگرام پر کار بند ہے جو کہ اس کے پرامن جوہری پروگرام کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو'۔ وائٹ ہاؤس کی ترجمان ڈانا پرینو نے اس آرٹیکل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ بش انتظامیہ کے بارے میں غلط اندازوں پر مبنی ہے۔ 'وائٹ ہاؤس ایسے شخص کے کام اور تجزیے کو تسلیم نہیں کرے گا جو ہمارے فوجیوں کی ہتک کرتا رہا ہو اور اس کی تحقیق جھوٹ پر مبنی ہو اور جس کا مقصد اس کے اپنے بنیاد پرست خیالات کا جواز پیش کرنا ہو'۔ انھوں نے یہ رپورٹ بھی شائع کی تھی کہ امریکہ اور اسرائیل حزب اللہ کے خلاف جنگ کے بارے میں بہت پہلے سے رابطے میں تھے۔ تحقیقی صحافی سیمور ہرش نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اسرائیل نے حزب اللہ کے خلاف کارروائی کا منصوبہ بنانے کے بعد بش انتظامیہ کے اہلکاروں کو آگاہ کیا تھا۔ اس طرح ان کی ایک اور رپورٹ میں اس انکشاف نے دنیا کو حیران کر دیا تھا کہ امریکی کمانڈوز ایران کے اندر گھس کر ممکنہ امریکی حملوں کے لئے فوجی ٹھکانوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

اس خبر میں سیمور ہرش نے لکھا تھا کہ انہیں خفیہ اہلکاروں نے بتایا کہ بش انتظامیہ کا اگلا نشانہ ایران ہے۔ سیمور ہرش کے مطابق ایران کی ایٹمی تنصیبات اور میزائیل تنصیبات کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ سیمور ہرش نے اپنی یہ رپورٹ پینٹاگون سے منسلک سابق انٹیلی جنس اہلکاروں اور ان ذرائع کے حوالے سے تیار کی تھی ۔ جنھوں نے اپنی شناخت ظاہر نہیں کی ہے۔ ان کی ایک رپورٹ میں امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ پر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ذاتی طور پر ایسا خفیہ پروگرام شروع کیا ہے جو عراقی قیدیوں سے بدسلوکی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ مذکورہ پروگرام کے تحت عراق میں امریکی فوج کے خلاف بڑھتی ہوئی مزاحمت کے بارے میں معلومات کے حصول کے لئے قیدیوں کو جسمانی تکلیف اور جنسی ذلت پہنچانے کے حربے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ سی مور ہرش کی تحقیقاتی رپورٹوں میں گمنام ذرائع کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کی رپورٹیں ایک خاص وقت اور خاص معاملے پر ہوتی ہیں۔ جن کے دور رس نتائج نکلتے ہیں۔ اور جن کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والے فیصلہ کرتے ہیں۔ کئی سچ کے ساتھ ان کی رپورٹوں میں برتے جانے والے امتیازی سلوک کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ان کے سی آئی اے سے گہرے روابط ہیں۔ جن کی بنیاد پر وہ کسی بھی اسٹوری کے ٹائم فریم کا تعین کرتے ہیں۔ پاکستان کے بارے میں مذکورہ صحافی کا رویہ ہمیشہ معاندارانہ رہا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی اس رپورٹ میں پاکستان کے دو صدور کے متعلق بیان کیا ہے۔ صدر زرداری کے متعلق پرویز

مشرف کی زبانی کلمات سے انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں یہ گمراہ کن رپورٹ اس ملک کے عوام کو افواج پاکستان سے بدظن کرنے کی سازش ہے۔ ہرش یہودی اور ہندو لابی کے پروردہ ہیں اور پاکستان کے بارے میں ان کی یہ رپورٹ ملک کی اساس پر حملہ ہے۔

چینی کی خوشہ چینی

کراچی کی ایمپریس مارکیٹ کے ساتھ سابق وزیر خواجہ شہاب الدین کے نام پر قائم شہاب الدین مارکیٹ اب لائینز ایریا کی نئی شاہراہ پر چھوٹی چھوٹی دکانوں میں قائم ہے۔ جہانگیر پارک کے سامنے اس وسیع و عریض پلاٹ کو خالی کراتے وقت وعدہ کیا گیا تھا کہ ان دکانداروں کو واپس وہاں بسایا جائے گا۔ جو تا حال پورا نہیں ہو سکا ہے۔ وعدوں کے مقابلے پر کراچی میں زمین کے پلاٹ زیادہ قیمتی ہیں۔ اس لئے وعدوں کی اس قدر پروا نہیں کی جاتی۔ یوں بھی اردو شاعری میں محبوب کے وعدے ایفاء کے لئے نہیں۔ بلکہ محبوب کو ستانے کے لئے ہوتے ہیں۔ چینی کی خوشہ چینی کے لئے میں نے گزشتہ کئی دنوں کئی کوشش کیں۔ جو کامیابی سے دوچار نہ ہو سکی۔ میرے دفتر کے نزدیک ایک یوٹیلٹی اسٹور ہے۔ جس پر چینی آنے سے پہلے ہی، چونٹیوں کی طرح لوگوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ چینی سے چونٹیوں کی رغبت نے ان کے حواس میں چینی کی بو رچا دی ہے۔ جبکہ ملک میں چینی کی کمیابی نے انسانوں میں چونٹیوں کی جبلت کو جنم دے دیا ہے۔ یوٹیلٹی اسٹور پر روز لائن لگتی ہے۔ روز جھگڑے ہوتے ہیں۔ سیکورٹی والے دھکے دیتے ہیں۔ لیکن چینی کی کشش کی طویل قطار اسی طرح قائم رہتی ہے۔
شہاب مارکیٹ میں جب دکاندار نے ایک چھوٹے کو بلا کر کہا کہ جلدی سے پانچ کلو دانہ لے آ۔ تو میں یہ سمجھا کہ

قربانی کی آمد ہے۔ جانور کے لئے دانہ منگوایا جارہا ہے۔ لیکن جب ایک خاکی تھیلے میں خاموشی سے چینی لائی گئی۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ اب چینی کے لئے بھی مارکیٹ میں منشیات کی طرح کوڈ ورڈ استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ ایک دن پہلے ملک میں کاروباری مسابقت کے فروغ کے ادارے نے شوگر ملز ایسوسی ایشن کی جانب سے چینی کے بحران پیدا کرنے میں اپنی 'غلطی' تسلیم کر لینے کے بعد نرم برتاؤ کی درخواست غور کرنے کے لیے منظور کی تھی۔

کمپٹیشن کمیشن آف پاکستان کے ترجمان کے مطابق شوگر ملز مالکان کی جانب سے قاعدہ نمبر اکتالیس کے تحت دائر کردہ نرم برتاؤ کرنے کی درخواست میں شوگر ملز نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ ملک میں چینی کی فراہمی میں ان سے کوتاہی ہوئی ہے جس پر وہ معافی کے طلبگار ہیں۔ آل پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن کے چیئرمین سکندر خان نے اپنی غلطی' تسلیم کرنے کا بیان جاری کرنے سے انکار کیا ہے تاہم ان کا کہنا ہے کہ انہوں' نے کمیشن کے چیئرمین کے سامنے اپنا مؤقف رکھا ہے۔ ملک میں عدالتی حکم پر عملدرآمد میں صوبائی حکومتوں کو اسقدر دلچسپی نہیں ہے۔ جتنی حکومت بچانے کے لئے لی جارہی ہے۔ شہر کے سب سے بڑے سپر اسٹور میں جو سفاری پارک کے نزدیک وسیع و عریض رقبے پر قائم ہے۔ چینی سرے سے نایاب ہے۔ اس اسٹور کا دعویٰ ہے کہ یہاں آپ سوئی سے لے کر ہاتھی تک خرید سکتے ہیں۔ لیکن چینی یہاں بھی غائب ہے۔ پریس کلب سے نکل کر

سندھ سیکریٹریٹ کے عقب میں ایک یوٹیلٹی اسٹور پر بھی ہر وقت لائن لگی ہوتی ہے۔ لیکن چینی یہاں بھی چند خوش نصیبوں ہی کو مل پاتی ہے۔ باقی چینی حکومت سندھ کے اہلکاروں کو خفیہ طریقے پر سپلائی کی جاتی ہے۔ چند دن پہلے صحافیوں کو منہ بند رکھنے کے لئے پریس کلب میں بھی چینی کی ایک کھیپ پہنچی تھی۔ لیکن اخباروں کے دفتر میں اطلاع پہنچنے سے پہلے ہی چینی کا اسٹاک ختم ہوگیا۔ پورے مہینے کا سودا خریدنے والے گاہکوں کہیں کہیں پانچ ہزار روپے کی خریداری پر دو کلو چینی کا 'تحفہ' دیتے ہیں۔

عام شہریوں کو چینی کی تاریخی قلت کا سامنا ہے جس کا آغاز حکومت شوگر ملزم مالکان کے ایک تازہ ترین معاہدے سے ہوا ہے۔ عدالت عالیہ سے منظوری کے بعد نافذ ہونے والے اس معاہدے کے تحت ظاہری اور باطنی طور پر یکساں خواص والی چینی عام اور کمرشل کے ناموں سے ایک ہی مارکیٹ میں دو الگ الگ قیمتوں پر فروخت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس معاہدے میں طے کیا گیا ہے کہ عام صارف کو چینی چالیس روپے فی کلو کے حساب فراہم کی جائے گی جو مجموعی کھپت کا صرف تیس فی صد بیان کیا گیا ہے۔ باقی ستر فی صد پر مشتمل چینی کی قیمت کے تعین کو آزاد مارکیٹ کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا اور اسے کمرشل چینی کا نام دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر قیمت پچاس فی صد کے اضافے کے ساتھ ساٹھ روپے فی کلو تک جا پہنچی ہے۔ کمرشل چینی کا استعمال بیکریوں میں بسکٹ، مٹھائی، ٹافی

گولی، بسکٹ، مشروبات والی فیکٹریوں اور دیگر کاروباری و صنعتی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے اور عام چینی عام صارف کے لیے ہے۔ اب عام آدمی مہنگے داموں بھی چینی خرید نہیں سکتا کیونکہ پولیس چھاپے کے خوف سے کوئی پرچون فروش کمرشل چینی خرید کر کلو دو کلو کے پیکٹ میں فروخت نہیں کر سکتا جبکہ تھوک میں سو یا پچاس کلو کی بوری خریدنا ایک عام گھریلو صارف کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب ایک دو کلو چینی کے لئے شہریوں کی شناختی پریڈ کا سلسلہ شروع ہے۔ بغیر شناختی کارڈ اور دستخط یا انگوٹھا لگائے بغیر کوئی دکانداروں آپ کو چینی نہیں دے گا۔ چینی عام صارف کے لیے اس ایک انار کی مانند ہو گئی ہے جس کے طلب گار سو بیمار ہیں۔ یہ جنس نایاب بن چکی ہے۔ بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز نے اپنی سیل بڑھانے کے لیے انعامی سکیموں کی طرح زیادہ سیل پر چینی سرکاری نرخوں پر دینے کی سکیموں کا اعلان کر دیا ہے۔ ہمارے کچھ دوستوں نے چینی کے بائیکاٹ کی مہم چلائی ہوئی ہے۔ لیکن ایسے بائیکاٹ سے کیا ہوتا ہے۔ ہم مافیاؤں کے چنگل میں ہیں۔ سیمنٹ، آٹا، چینی، ٹماٹر، چاول، اسٹاک ایکسچینج، سونا، پرائز بونڈ، رئیل اسٹیٹ، دالیں اور دودھ، گوشت سب کے کارٹیل موجود ہیں۔ کون ہے جو ان مافیاؤں پر ہاتھ ڈالے۔ یہ سب حکومت میں بھی ہیں۔ اور اپوزیشن میں بھی۔ محض یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ شوگر مافیا کہلانے والے بالادست طبقے نے ایک بار پھر عوام کو پچھاڑ دیا ہے۔

پھر کیا ہوگا؟

جب سے میرے بیٹے کا موبائل فون غائب ہوا ہے میری بیوی عجیب وہم کا شکار ہو گئی ہے۔ وہ بیٹے کو باہر جانے نہیں دیتی اور اگر ضرورت کے تحت اسے جانا پڑے تو اس وقت تک بے چین رہتی ہے۔ جب تک وہ آ نہیں جاتا۔ یہ موبائل گلشن سے نیپا والے روٹ کی ایک ذرد شیطان (منی بس جی ہاں ابتدا میں اس کا یہی نام تھا) میں ایک نوسر باز گروہ نے نکال لیا تھا۔ اس روٹ پر روزانہ ایسی وارداتیں ہوتی ہیں۔ پولیس کو بھی سب معلوم ہے۔ کوئی کاروائی نہیں ہوتی۔ کچھ میں بھی وہمی سا ہوگیا ہوں، کسی اے ٹی ایم مشین کے بوتھ کے پاس سے گزرتا ہوں۔ تو آس پاس کھڑے لوگوں کا جائزہ لینے لگ جاتا ہوں۔ مجھے ہر شخص ہی مشکوک نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس سیکورٹی گارڈ پر بھی شک ہونے لگتا ہے جو بوتھ کے باہر کھڑا ہے۔ چار پانچ ہزار کی تنخواہ پانے والا جب لوگوں کو نوٹوں سے جیبیں بھر کر جاتا دیکھتا ہے تو اس کا بھی ایمان خراب ہوتا ہوگا۔ بار بار میں اس کا موازنہ ان ڈاکوؤں کی تصویروں سے کرنے لگتا ہوں جو میڈیا کی مہربانی سے ٹی وی میں دکھا دی جاتی ہیں۔ میں نے جب سے ایک چینل پر اے ٹی ایم بوتھ میں لوٹنے اور قتل کی وارداتیں دیکھی ہیں۔ میری آنکھوں سے نیند غائب ہے۔ میں نے اس قاتل مشین (اے ٹی ایم) سے دور رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنے تمام جاننے والوں کو بھی

مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ان قاتل مشینوں سے لین دین کرتے وقت ہوشیار رہا کریں۔
ہمارے مسائل اور معاملات کے بارے میں ہم سے زیادہ باہر والے فکر مند رہتے ہیں۔ وہ ہماری تعلیم، دینی مدرسے، بڑھتی ہوئی آبادی، گاؤں میں پینے کے پانی نہ ہونے، صحت کی سہولیات، شدت پسندی، داڑھی بڑھانے، برقعہ اور چادر اوڑھنے کی عادات اور ہمارے ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت کے مسئلے پر بھی پریشان ہیں۔ اس کے لئے وہ رات دن منصوبے بناتے ہیں تاکہ برے وقت میں ہماری مدد کر سکیں، ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت پر انہوں نے ریہرسل بھی کی ہے۔ اب یہ حفاظتی ٹیم دبئی اور ہمارے ملک میں موجود ہے۔ کوئی تین سال پہلے کسی غیر ملکی ادارے کو خیال آیا کہ موجودہ حالات میں ہماری ذہنی کیفیت کیا ہے اور آگے چل کر کیا ہوجائے گی۔ اس کے لئے انہوں نے کراچی کا انتخاب کیا۔ اس سروے کے بعد انہوں نے کراچی کے شہریوں کے حوالے سے ایک رپورٹ جاری کی تھی کہ پانچ سال کے اندر اندر کراچی کی 85 فیصد آبادی ذہنی مریض ہوجائے گی۔ اس کی وجوہات کراچی میں بے ہنگم ٹریفک، اسٹریٹ کرائمز، اغوا برائے تاوان، ہڑتالیں، بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کو بتایا گیا تھا۔ اس وقت تک نہ روز خود کش حملے ہوتے تھے اور نہ ہی بدترین لوڈشیڈنگ کا سامنا تھا۔ نہ چینی اور آٹے کے لئے لوگ مارے مارے پھرتے تھے۔ نہ اسکولوں اور کالجوں میں دہشت گردی کی واردات ہوتی

تھی۔ یہ اسٹریٹ کرائمز کے نام سے کوئی آشنا تھا۔ نہ اغوا اور لوٹ مار کے ایسے دل ہلا دینے والے واقعات تھے۔ دو تین برسوں سے اسٹریٹ کرائمز بالخصوص کراچی میں تو عوام کا جینا محال کیا ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی اس سے بچا ہوا ہو۔

کوئی بھی کہیں بھی کسی سے بھی (ماسوائے حکمرانوں اور اعلیٰ افسروں کے جو محافظوں کے سائے تلے گھروں سے نکلتے ہیں اور ان کے گھروں پر بھی سرکاری پہرہ دار ہوتے ہیں یا سرمایہ دار جن کے پاس ذاتی سیکیورٹی گارڈز ہیں) کوئی ٹی ٹی دکھا کر موبائل فون بٹوا اور زیور چھین لیتا ہے اور مزاحمت پر جان سے بھی مار دیتا ہے۔ کوئی بھی راہگیر ان کی پہنچ سے باہر نہیں۔ اب شام کو چہل قدمی اور ورزش کے لیے پارک میں سنسان حصے سے گزرنا محال ہے۔ راہگیر ہی کیا کراچی میں تو بھری سڑکوں پر دوڑتی گاڑیوں کو روک کر لوٹا جاتا ہے۔ دن دہاڑے چار پانچ ہزار کی رقم کے لئے گولی مار دی جاتی ہے۔ کسی بھی چلتی بسوں میں دو بدمعاش چڑھ کر سب مسافروں کو فون اور پرس سے محروم کر دیتے ہیں۔ اب تک ہزاروں لوگوں کو اے ٹی ایم مشینوں سے کیش نکالتے ہوئے ٹی ٹی دکھا کر رقم سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو گولی بھی مار دی جاتی ہے۔ کسی جیتے جاگتے انسان کو فلمی منظر میں نہیں بلکہ حقیقت میں مرتے ہوئے دیکھنا ایک عذاب سے کم نہیں۔ اب پولیس کے پاس خفیہ کیمرے سے حاصل وڈیو کلپس ،

واردات کرنے والوں کے خاکے ہیں، خودکش دھماکے کرنے والوں کے سر ہیں، وارداتوں میں استعمال ہونے والی گاڑیاں ہیں، قبل از وارداتوں کی دھمکیاں ہیں، اور سب سے بڑھ کر ان حملوں میں زندہ پکڑے جانے والے ملزمان ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں بھی اگر کچھ نہیں ہوتا تو اس قوم کا پاگل ہونا، اور ذہنی مریض ہونا ضروری ہے۔ سب سے زیادہ خطرناک امر یہ ہے کہ کل یہ پاگل قوم سڑکوں پر آگئی اور اگر یہ حکمران یہ سیاستدان یہ افسر شاہی اور قانون کے ٹھیکیدار ان پاگلوں کے ہاتھ لگ گئے تو پھر کیا ہوگا؟

سیاست اور کبڈی

پاکستانی سیاست میں چوہدری صاحبان کا کردار بہت دلچسپ ہے۔ چوہدری محمد علی سے لیکر چوہدری شجاعت حسین تک پاکستان کی سیاست میں دونوں چوہدری وزیر اعظم کے منصب تک پہنچے اور ملکی تاریخ میں اپنا نام رقم کرالیا۔ کہتے ہیں کہ پنجاب میں گجرات سے زیادہ برادری ازم کا تعصب کہیں اور نہیں ہے۔ گجرات کے چوہدریوں نے قسمت کی یاوری سے ۲۶۹۱ میں نوابزادہ اصغر علی کو شکست دے دی۔ ملک کی سیاست میں چوہدری ظہور الٰہی اس شان سے داخل ہوئے کہ وہ ایوب خان کا دست راست بن گئے۔ اس زمانے میں بھٹو اور ظہور الٰہی دوست تھے۔ ذاتی راہ و رسم دوستی میں بدل گئی تھی۔ نواب آف کالا باغ سے ان بن ہوئی تو چوہدری ظہور الٰہی کونسل مسلم لیگ میں چلے گئے، شومئی قسمت دیکھئے ۱۹۷۰ کے الیکشن میں مسلم لیگ کونسل کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے ایک ایک کرکے پیپلز پارٹی کو پیارے ہوگئے۔ اور اپوزیشن کے لئے چوہدری ظہور الٰہی اکیلے مسلم لیگی رہ گئے۔ ظہور الٰہی بھٹو دور میں عتاب کا شکار ہوئے تو ان پر بھینس چوری کا شہرہ آفاق مقدمہ قائم ہوا۔ جیل میں تفہیم القران پڑھ کر وہ دائیں بازو کے قومی اتحاد کے صف اول کے لیڈر شمار ہونے لگے ۔۱۹۷۷ میں مارشل لاء کے بعد قومی اتحاد کی جانب سے وزیر بنے، اور لاہور میں الذوالفقار کی دہشت گردی کا شکار ہو کر رتبہ شہادت حاصل کیا،

چوہدریوں کی دوسری نسل میں چوہدری منظور الٰہی کے صاحب زادے پرویز الٰہی نے ۳۸۹۱ میں ضلع کونسل گجرات کے چیرمین ہو کر اپنی سیاست کا آغاز کیا۔۵۸۹۱ کے غیر جماعتی انتخاب میں بڑے چوہدری شجاعت بھی کامیاب ہو گئے۔۳۹۹۱ کے انتخابات میں چوہدری شجاعت کو شکست ہو گئی۔ ان کے خاندان کے سب لوگ ہار گئے۔ صرف چوہدری پرویز الٰہی ایک صوبائی نشست پر کامیاب ہوئے۔ پنجاب پر حکمرانی چوہدریوں کا خواب تھا، اس کی تکمیل عہد مشرف میں ہوئی، چھوٹے چوہدری پرویز الٰہی طویل عرصے پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ پڑھا لکھا پنجاب کے لئے انہوں نے خوب پبلسٹی کی کہتے ہیں کہ پبلسٹی کی اس رقم سے پنجاب میں ایک ہزار سے زیادہ پرائمری اسکول کھولے جا سکتے تھے۔
مشرف کو سو بار وردی میں منتخب کرانے آرزو کا بار بار اظہار کرتے ہوئے وہ پنجاب کی سیاست سے بے دخل ہوئے۔ لال مسجد کی لالی نے گجرات کے چوہدریوں کے منہ پر ایسی سیاہی ملی کہ وہ کہیں کے نہ رہے۔ پاکستانی سیاست میں سیاست دانوں کے کپڑے اتر جاتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے لنگوٹ کس کر باندھتے ہیں۔ سیاست میں پہلوانی کے داؤ پیچ اور کبڈی کا اسٹیمنا درکار ہوتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ بڑے چوہدری آج کل کبڈی کبڈی والوں سے داؤ پیچ سیکھ رہے ہیں۔
چند دن پہلے انہوں نے پاکستان کبڈی فیڈریشن کے چیرمین کی حیثیت سے پاکستان کبڈی فیڈریشن کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس سے صدارتی خطاب کیا۔ چوہدری شجاعت

حسین نے اپنے اس خطاب میں کہا ہے کہ ملک میں کبڈی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے گا اور کھلاڑیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ہر ممکن اقدامات کئے جائیں گے انھوں نے اس موقع پر کبڈی کے کھلاڑیوں کے معاشی مسائل کو حل کرنے اور متوازن خوراک کی فراہمی کیلئے ایک کمیٹی بھی تشکیل دے دی ہے۔ انہوں نے کامل علی آغا کو چیئرمین کبڈی فیڈریشن کا ایڈوائزر بھی نامزد کیا۔ چوہدری صاحب نے یہ خطاب ایسے نازک موقع پر کیا ہے۔ جب ملک میں سیاست کے کھلاڑی ناکام ہوتے نظر آرہے ہیں، ان کی یہ غیر نصابی سرگرمیاں قابل تعریف ہیں۔ پہلوانی ورزش اور اکھاڑے کی مٹی سے چوہدریوں کا وقار بلند ہوگا۔ یہ نیک فال ملک کے لئے بھی بہتر ہوگا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی

سندھ کی سیاست میں رواداری، اور شرافت کے ایک دور کا خاتمہ

غلام مصطفیٰ جتوئی کو اپنی اس سیاسی غلطی کا ہمیشہ افسوس رہا کہ بھٹو خواتین سے مشورے کی بجائے وہ جنرل ضیا کی وزیر اعظم کے عہدے کی پیشکش کو قبول کر لیتے تو کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ لیکن اس فیصلے میں بھی ان کی سیاسی بصیرت، رواداری، ذاتی شرافت، اور بردباری کا دخل تھا۔ ضیا دور میں جلاوطنی کے خاتمے کے بعد بے نظیر بھٹو کی یہ مجبوری تھی کہ وہ اپنے انکلز سے جان چھڑا لیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر، اور ممتاز بھٹو، پھر کبھی پارٹی میں داخل نہ ہو پائے۔ جتوئی جو بھٹو کو زلفی کہا کرتے تھے۔ ضیاء الحق کے مارشلاء کے وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ بھٹو صاحب کی طرح سندھ سے بلا مقابلہ منتخب ہوئے تھے۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کے اختلافات نے اس وقت جنم لیا جب بے نظیر بھٹو اپنی والدہ کے ساتھ پیپلز پارٹی کی شریک چیئرمین نامزد ہوئیں اور انھوں نے 'انکلز' سے فراغت حاصل کر کے اپنے ہم عمر لوگوں کو پارٹی میں اہم ذمہ داریاں سونپی۔ 'ہیرو ہیرو، زیرو زیرو' کا نعرہ پیپلز پارٹی میں جتوئی کی رخصتی کے وقت ہی لگایا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی سے اپنی

رخصتی کے بعد انہیں اس بات کا بھی غم رہا۔ ان کی وزیر اعظم بننے کی خواہش مکمل طور پر تو پوری نہیں ہو سکی لیکن اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان نے جب نواز شریف کو رخصت کیا تو جتوئی تین ماہ کے لیے نگراں وزیر اعظم مقرر ہو گئے۔ پیپلز پارٹی سے رخصتی کے بعد انھوں نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ نیشنل پیپلز پارٹی کی بنیا رکھی تھی۔ جتوئی انیس سو انسٹھ میں پیپلز پارٹی سے وابستہ ہوئے اور انیس سو ستر کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا رکن بنے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں غلام مصطفیٰ سیاسی امور، بندرگاہ اور جہاز رانی، مواصلات، قدرتی وسائل، ریلوے اور ٹیلی کمیونیکیشن کے وفاقی وزیر رہے۔ انیس سو تہتر میں غلام مصطفیٰ جتوئی کو سندھ کے وزیراعلیٰ منتخب ہوئے۔ انہیں قیام پاکستان کے بعد سندھ کا طویل عرصے تک وزیراعلیٰ رہنے کا اعزاز حاصل رہا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے سن تراسی میں سندھ میں چلنے والی ایم آر ڈی موومنٹ میں انھوں نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ان کے اشارے پر ہی سندھ کے ایک سابق وزیر اعلیٰ میر غلام علی تالپور کے بڑے بیٹے اور سابق وزیر میر اعجاز علی تالپور اور پاکستان کونسل مسلم لیگ کے ایک وقت میں صدر حاجی نجم الدین سریوال جیسے کئی سیاستدانوں نے گرفتاریاں پیش کرکے تحریک کو جلا بخشی تھی۔ تحریک بحالی جمہوریت کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ رہائی کے بعد غلام مصطفیٰ جتوئی نے نیشنل پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔

انیس سو اٹھاسی میں ملک کی نو جماعتوں پر مشتمل اسلامی جموری اتحاد قائم ہوا تو غلام مصطفٰی جتوئی آئی جے آئی کے بانی صدر مقرر ہوئے۔ لیکن وہ انتخاب میں اپنی آبائی سیٹ سے ہار گئے۔ جس کا انھیں ساری زندگی غم رہا۔ انیس سو اناسی کو کوٹ ادو سے ہونے والا ضمنی الیکشن جیت کر ایم این اے منتخب ہوئے۔ یہ نشست ان کے لئے غلام مصطفٰی کھر نے خالی کی تھی۔ اور تمام اپوزیشن جماعتوں نے انہیں مشترکہ قائد حزب اختلاف نامزد کیا۔ کوٹ ادو سے کامیابی کے بعد جتوئی کو اپنی سیاسی زندگی میں پہلی بار حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھنے کا تجربہ ہوا جتوئی اپنے دل میں خواہش پال بیٹھے تھے کہ انہیں وزیر اعظم ہونا ہے لیکن نواز شریف ان کے لیے کھر ثابت نہ ہوسکے اور آئی جے آئی کے قیام کے وقت انہیں یقین دہانی کے باوجود وزیر اعظم نہیں بنایا گیا اور نواز شریف خود وزیر اعظم بن گئے۔ پاکستان کے بیشتر سیاست دانوں کی طرح انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو سیاست میں متعارف کرا دیا تھا۔ ان کے بیٹے وفاقی وزیر، صوبائی وزیر ہوئے، ان کے بیٹے مسرور جتوئی ضلع نوشہرو فیروز کے ضلع ناظم ہوئے اور بھتیجے عاقب جتوئی ابھی ضلع ناظم ہیں۔

ممتاز بزرگ سیاست داں، نیشنل پیپلز پارٹی کے سربراہ اور سابق نگراں

وزیراعظم غلام مصطفیٰ خان جتوئی ۸۱ نومبر ۹۰۰۲ جمعہ کے روز سینٹرل لندن کے سینٹ میری اسپتال میں 78 .برس کی عمر میں انتقال کرگئے۔ ان پر 4 نومبر 2009ء کو فالج کا حملہ ہوا تھا جس کے باعث انہیں اسپتال میں داخل کردیا گیا تھا۔ انتقال کے وقت ان کے بھائی، بیٹے اور خاندان کے دیگر لوگ لندن میں موجود تھے۔ وہ اپنے چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے سوگواران میں چار بیٹے غلام مرتضیٰ خان جتوئی، مسرور خان جتوئی، عارف مصطفیٰ جتوئی اور آصف مصطفیٰ جتوئی اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے ایک بیٹے طارق مصطفیٰ جتوئی کا 6 سال قبل انتقال ہوگیا تھا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے انتقال سے سندھ میں روایت، رواداری، شرافت، بردباری کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔

لال بتی

رات کے کسی لمحے درد کی شدت سے کراہتی ہوئی میری ماں مجھے کہتی مجھے لال بتی لے چلو، اور ہم انھیں لال بتی لے جاتے، ڈیوٹی پر موجود اسٹاف انھیں اسٹریچر پر ڈالتا، اور تیزی سے ڈیوٹی ڈاکٹر ان کے درد کی شدت کو کم ہونے کی دوائیں اور انجیکشن دیتا، صبح تک والدہ کی طبعیت بحال ہوجاتی اور اگلے دن ہم انھیں گھر لے آتے، والدہ آپریشن سے گھبراتی تھیں، اور ان کے درد کا مداوا سرجری میں تھا۔ ان دنوں حیدرآباد کا سول اسپتال لال بتی کے نام سے پہچانا جاتا تھا، اسپتال میں صفائی کی صورتحال قابل رشک تھی، اسٹاف اور ڈاکٹر مستعد، قابل، اور بے لوث تھے۔ اسپتال میں مریضوں کو تین وقت خوراک دی جاتی تھی، ناشتے میں ابلے ہوئے انڈے، مکھن لگے توس، دودھ، دوپہر میں سالن روٹی اور سوئٹ ڈش کھانے کا معیار بہت اچھا اور صفائی ستھرائی بہت زیادہ تھی۔

۷۰ اور ۸۰ کی دہائی تک سول اسپتال حیدرآباد اپنے معیار اور علاج کی سہولیات کے سبب بہت نامور تھا، اندرون سندھ سے آنے والے مریضوں کی بڑی تعداد یہاں شفایاب ہوتی تھی۔ دوائیں اسپتال سے فراہم کی جاتی تھیں، آج کی طرح ہر بات کے لئے مریضوں پرچی نہیں تھما دی جاتی تھی کہ یہ دوا اسٹور سے منگا لیں،

اسپتال میں آپریشن با قاعدگی سے ہوتے تھے، حیدرآباد کی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی، سرکاری اسکولوں میں بچوں کو دودھ اور فروٹ بن دیئے جاتے تھے۔ ان پہلے اسکولوں کی تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول حیدرآباد میں داخلے کے لئے ٹیسٹ ہوتے تھے اور میرٹ پر داخلے دیئے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں تارا چند اسپتال بھی مشہور تھا۔ یہاں او پی ڈی کی سہولت تھی۔ اور ایک آنہ پرچی پر دوائیں اور علاج کیا جاتا تھا۔ آج یہ اسپتال حافظ مبارک علی شاہ اسپتال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو بے ہنگم کمرشل دکانوں میں گھر کر اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ پرائیوٹ اور چیر ٹیبل اسپتال کے نام سے میمن انجمن ہسپتال موجود تھا، جو آج بھی گران قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

سول اسپتال حیدرآباد ۱۸۸۱ میں بمبئ فیکلٹی آف میڈیسن کے اشتراک سے حیدرآباد اور اندرون سندھ کے لوگوں کو میڈیکل سہولیات کی فراہمی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ میں اس کا نام بدل کر سول اسپتال کردیا گیا تھا۔ بعد میں لیاقت میڈیکل کالج جامشورہ کے قیام کے بعد اس کا نام بھی لیاقت میڈیکل کالج کردیا گیا۔ اور اسے کالج سے منسلک کرکے ٹیچنگ اسکول کی حیثیت دے دی گئی،۱۹۷۰ کی دہائی تک سول اسپتال کی صورتحال بہت اچھی تھی، اس کا نظم نسبق بہتر تھا، یہاں کراچی کے بعد سب سے اچھی آپریشن، سرجری کی سہولیات موجود تھیں، ایمرجنسی میں بھی یہاں اندرون سندھ

سے آنے والوں کے لئے اچھے انتظامات تھے۔ حال ہی میں لیاقت میڈیکل کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لیاقت میڈیکل کا نام بڑھنے کے ساتھ اس کے معیار اور اس کے کام کی بھی شہرت ہوتی لیکن اب یہاں کی صورتحال اس قدر خراب ہے کہ لوگ یہاں آنے سے کتراتے ہیں اور پرائیویٹ علاج کو بہتر پاتے ہیں، اسپتال کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور پروفیسروں کے ماشاللہ سب کے پرائیویٹ کلینک چل رہے ہیں۔ وہ اسپتال میں ایک دو گھنٹے کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ اور یہاں آنے والوں کو اپنے کلینک میں آنے کا مشورہ دے کر چلے جاتے ہیں۔ جنرل وارڈ میں مریضوں کو دیکھنے کی فرصت بھی نہیں ہوتی۔ ایک تو حکومت کی جانب سے دواؤں کی فراہمی کے لئے مناسب فنڈ موجود نہیں ہیں تو دوسرے جانب موجود فنڈز میں بھی گھپلے، کرپشن، چور بازاری ہو رہی ہے۔ اسپتال کی چوری شدہ دوائیں آس پاس کے میڈیکل اسٹور پر فروخت ہو رہی ہیں، غربت کے بڑھتے ہوئے سائے اور حیدرآباد کی غریب آبادی اور مہنگے علاج کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سول اسپتال کے معیار کو بہتر کیا جائے عوام کو سستا علاج فراہم کیا جائے، بڑے ڈاکٹر کو پرائیوٹ پریکٹس سے نہیں روک سکتے تو کم از کم انھیں سرکاری وقت کی تو پابندی کرائی جا سکتی ہے۔ جس کی وہ تنخواہ لیتے ہیں۔ بھٹائی اسپتال پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ صوبائی وزیر صحت کو چاہئے کہ

وہ اس صورتحال پر توجہ دیں، کراچی کے مینڈیٹ والوں کے لئے حیدرآباد والوں کی بڑی قربانیاں ہیں

مر جائیں جب ہم تو انصاف کرو گے

جو لوگ زندگی بھر سرکاری اداروں میں کام کرتے ہیں۔ وہ آخری وقت میں اس امید پر خوش رہتے ہیں کہ انھیں آخر میں پینشن کا سہارا ہوگا۔ میرے ایک دوست جو ایک بڑے مالیاتی ادارے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اکثر فون کرکے یاد دہانی کراتے ہیں، کہ ان کی پینشن ابھی تک ان کے اکاؤنٹ میں نہیں گئی ہے۔ ایک اور دوست اکثر اس وقت آتے ہیں، جب انہیں اپنے زندہ ہونے کا سرٹیفیکیٹ درکار ہوتا ہے۔ اس سرٹیفیکیٹ کی عدم موجودگی میں آپ کی پینشن رک جاتی ہے۔ میں مہینے کے شروع میں کئی بینکوں کے سامنے بوڑھوں کی قطار دیکھ کر سمجھ جاتا ہوں کہ یہ سب اپنی پینشن کے لئے آئے بیٹھے ہیں، کسی بھی سرکاری ادارے میں اپنی جوانی خرچ کردینے والے یہ پینشنر آخری دنوں میں اپنے واجبات کے لئے کیسے عذاب سے گزرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ننھے خاں کے اس دلخراش واقعے سے ہوتا ہے۔ ننھے خان ریلوے میں اسپیشل ٹکٹ چیکر تھے۔ زندگی ریل میں گزاری۔ حیدرآباد کے باسی ننھے خان کو امید تھی کہ ریٹائرمنٹ پر ان کو اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔ جس سے وہ اپنی زندگی آرام سے بسر کرسکیں گے۔ لیکن اربوں روپے کی زمین اور اثاثے رکھنے والے اس ادارے کو ہمارے حکمرانوں نے اس حال میں پہنچا دیا ہے کہ اب اس کے پاس اپنے ملازمین کی تنخواہوں، پینشن، کی معمول کی ادائیگی بھی

مشکل ہو گئی ہے۔ ننھے خان اپنے واجبات کی ادائیگی کے لئے ہر جگہ مارے مارے پھرے اور آخر ننھے خان بھی انصاف کی راہداریوں میں اپنے حق کے لئے ہائی کورٹ پہنچ گئے۔ جہاں سے ان کے واجبات کی ادائیگی کے لئے ریلوے حکام کو حکم دیا گیا۔ لیکن ریلوے حکام نے اسی روایتی تساہل سے کام لیا۔ اسی دوران ننھے خان کی غربت اور بیچارگی پر فالج کا حملہ ہوا اور ننھے خان بستر کے ہو کر رہ گئے۔ ان کا آٹھ لاکھ اسی ہزار کا چیک ریلوے کی فائلوں میں رہا، جب ریلوے یونین نے اسلام آباد میں فنانس کنٹرولر سے اس معاملے میں بات چیت کی تو ۳۱ اکتوبر کو ننھے خان کے واجبات کا چیک تیار ہو گیا۔ لیکن بستر پر پڑے ننھے خان یہ چیک وصول کرنے دفتر نہ جا سکتے تھے۔ ریلوے والوں نے یہ چیک ڈاک سے روانہ کر دیا۔ یہ چیک اس ان ننھے خان کے گھر پہنچا، جب وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ اس سفر کے لئے انھیں اس رقم کی ضرورت نہیں تھی، ریلوے ورکرز یونین کے صدر منظور رضی اور ان کے تمام ساتھی غمزدہ ہیں، ان کا ساتھی اپنی بیماری اور غربت کے ساتھ اس دنیا سے چلا گیا۔ وہ اس کی زندگی میں اس کے واجبات نہیں دلا سکے۔ مجھے ملیر کے اس استاد اور اس کی بیوی کا خیال آ رہا ہے۔ جو اپنی زندگی میں اپنے واجبات کے لئے محکمہ تعلیم میں خوار ہوتے رہے۔ اور ایک دن بھوک اور غربت اور سفید پوشی کے مارے دونوں میاں بیوی اپنے گھر میں خاموشی سے مر گئے۔ شائد اس دن کے لئے کسی نے کہا ہے کہ مر جائیں جب ہم تو انصاف کرو گے۔

قرض معاف کرانے والوں کی فہرست بھی شائع کی جائے

این آر او کے بعد قرض معاف کرانے والوں کی فہرست بھی شائع کی جائے
وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی نے ایک ہفتے قبل جب یہ کہا تھا کہ ہم این آر او کے مقدمات کیلئے عدالتوں کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہیں ہم جیلوں سے پہلے گھبرائے تھے نہ آئندہ گھبرائیں گے، آزاد عدلیہ کا ہر فیصلہ قبول ہوگا، تو پیپلز پارٹی اور اس کے اتحادیوں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ڈی ڈے اتنی جلدی آجائے گا۔ عید قربان کے ساتھ ہی ایک اور قربانی کی تیاریاں قابل فہم تو ہیں، لیکن ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا، کیری لوگر بل، بلیک واٹر، این آر او پر اسمبلی میں ہزیمت اٹھانے کے بعد این آر او سے فائدہ اٹھانے والوں کی فہرست نے بہت سے چہروں کا رنگ سرخ کردیا ہے۔
بہت سے مراعات یافتہ افراد تو اس بات پر شدید ناراض ہیں، ان کے نام اس فہرست میں شامل ہی کیوں کئے گئے، امریکہ میں مقیم سفارت کار کی آواز میں سوز محسوس ہورہا تھا۔ اور ان کے غم وغصے کا اظہار ایک ٹی وی چینل پر کامران خان سے چیختی چلاتی آوازوں میں بات چیت سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ پارٹی کے کئی وزراء اس بات کا جواب دینے سے قاصر تھے کہ ان کے وزیراعظم نے ان کے ناموں کی اشاعت کی اجازت دیتے ہوئے کیسی بے

مہری کا ثبوت دیا۔ این آر او پر عوامی حلقوں کی جانب سے بھی شدید رد عمل کا اظہار ہوا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس بدنام زمانہ آرڈیننس سے فائدہ اٹھانے والوں میں سیاست دان کی تعداد آدھے فیصد سے بھی کم ہے۔ جبکہ فائدہ اٹھانے والے بیوروکریٹس صرف تین فیصد ہیں۔ ۹۷ فیصد لوگوں کا نام و پتہ بے نام ہے نہ تو قوم کو ان کے کرتوتوں کا علم ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں واویلا ہے۔ یہ امر بھی استعجاب کا باعث ہے کہ ۸۰۴۱ میں سے ۹۷ فیصد یعنی ۷۷۹۳ کا تعلق سندھ کے صوبے سے ہے۔ گویا ملک کے دیگر حصوں سے تعلق رکھنے والے کرپشن سے پاک ہیں، اس فہرست سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ایم کیوایم متحدہ ایسی جماعت ہے جس کے مقدمات کی تفصیل دی گئی ہے۔ جبکہ دیگر کرپشن کرنے والوں کی تفصیل نہ دے کر ان کے جرائم کو ہلکا ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ بات قوم کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان ناموں کے ساتھ کرپشن کی مالیت بھی بتائی جائے تاکہ قوم کو پتہ چلے کہ کس نے کس قدر لوٹا ماری کی ہے۔ وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی یہ بات بھی کہہ چکے ہیں کہ 'ہم احتساب کا صاف و شفاف اور سب کیلئے قابل قبول قانون بنانا چاہتے ہیں اسے اتفاق رائے سے پارلیمنٹ میں لاکر منظور کرائیں گے۔

وزیراعظم نے کہا کہ این آر او سے فائدہ اٹھانے والوں میں سیاستدانوں سے زیادہ دوسرے لوگ ہیں۔ این آر او سے فائدہ اٹھانے والے نمایاں سیاستدانوں

میں صدر آصف زرداری، ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین، گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد خان، سابق وزیر اعلیٰ سرحد آفتاب شیر پاؤ اور نصرت بھٹو سمیت ۳۴ سیاستدان، تین سفارتکاروں اور دو سو اڑتالیس بیوروکریٹس سمیت آٹھ ہزار اکتالیس افراد شامل ہیں۔ سیاستدانوں میں صدر آصف زرداری، متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین، ڈاکٹر فاروق ستار، کنور خالد یونس، شعیب بخاری، ڈاکٹر عشرت العباد، وسیم اختر، صفدر باقری، بابر غوری، سلیم شہزاد، آغا سراج درانی، نصرت بھٹو، کبیر خان، جہانگیر بدر، مشتاق اعوان، رانا نذیر، انور سیف اللہ، آفتاب شیر پاؤ، میر باز کھیتران، یوسف تالپور، احمد صادق اور جاوید قریشی، پیر مکرم الحق، بریگیڈیئر امتیاز ریٹائرڈ، سلمان فاروقی، رحمان ملک، عثمان فاروقی۔ سفارتکاروں میں حسین حقانی، واجد شمس الحسن اور اے آر صدیقی کے ناموں کا توڈھنڈورا تو رات دن میڈیا سے پیٹا جارہا ہے۔ لیکن ان ہزاروں افراد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جارہا کہ انہوں نے کیا گل کھلائے ہیں۔ کئی حلقوں کی جانب سے یہ بھی مطالبہ کیا جارہا ہے کہ حکومت میں شامل ایسے وزراء سے استعفیٰ لے لئے جائیں گے۔ جن کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ اس بات کو بھی مشتہر کیا جارہا ہے کہ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے کابینہ میں ردوبدل کا فیصلہ کر لیا ہے اور عید کے بعد کابینہ میں بڑے پیمانے پر ردوبدل ہوگا اور کئی وزراء فارغ کردیئے جائیں گے۔ کابینہ میں تبدیلی کے عمل کو تیز ہوتے ہوئے دیکھ کر پارٹی کے اندر وزیر اعظم کے خلاف

ایک لابی بھی متحرک ہو گئی ہے اور اس نے وزیر اعظم کی اہلیہ کا نام بھی این آر او سے مستفید ہونے والوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا جسے بعد ازاں اس فہرست میں 12 گھنٹے کے تبدیلی کرکے نکال دیا گیا ہے۔ آئندہ ہفتوں میں ملکی سیاست میں مزید بھونچال آنے کی پیشن گوئیاں کی جارہی ہیں۔ اسمبلی میں اس بات کا بھی مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ گزشتہ دس برسوں کے دوران معاف کرائے گئے قرضوں کی تفصیلات بھی منظر عام پر لائی جائیں۔ اور ان کی فہرست بھی میڈیا پر لائی جائے۔ اگر یہ فہرست جس کو شائع کرنے کا اسمبلی میں وعدہ کیا گیا ہے منظر عام پر آ گئی تو مزید بہت سے چہروں سے نقاب اتر جائے گا۔

حکومتوں کے چل چلاؤ کا وقت

میاں نواز شریف نے اپنی وزارت عظمیٰ کی آخری تقریر جلال پور جٹاں میں کی تھی۔ اپنی معزولی سے چند گھنٹے قبل میاں نواز شریف نے کہا تھا حکومت مضبوط ہے اور اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ قومی اتحاد کے مذاکرات کے دوران بھٹو صاحب نے بھی یہی کہا کہ یہ کرسی (وزارت عظمیٰ) بہت مضبوط ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، اور نواز شریف کے جن دو ادوار میں حکومتیں ختم کی گئی۔ ان میں کسی بھی حکمران کو آخری وقت تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ان کی حکومتوں کے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔ بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ماسوائے جنرل یحیٰی خان تمام ہی فوجی انقلاب کے بانیوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ بھی ہمارے لئے شرمناک بات ہے کہ فوجی حکمرانوں کے عرصہ اقتدار میں طویل عرصے تک لب کشائی نہ کرنے والے سیاست دان، جمہوری حکومتوں کے برسر اقتدار آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد کرپشن، بد عنوانی، لوٹ مار، اقرباء پروری، غیر شفاف حکمرانی، اور عوام کو ریلیف نہ دینے کے معاملے میں اسقدر بدنام ہو جاتے ہیں، کہ سنتا جا شرماتا جا۔ کے مصداق یہ داستانیں ہر جگہ ان کا منہ چڑا رہی ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی بد نصیبی کی بات ہے کہ یہ سیاست دان، عدم اتفاق، انتشار، غیر ذمہ داری، اور ہوس اقتدار میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ عوام ان سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ پھر سیاستدانوں میں

کشمکش ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر الزام لگتے ہیں سیاست دان رسوا ہوتے ہیں۔ اور جب وہ اقتدار سے محروم ہوتے ہیں تو کوئی چشم پر نم نہیں ہوتی، کوئی آواز بلند نہیں ہوتی، اور ان کو طویل عرصے کے لئے اقتدار کی راہداریوں سے دور کر دیا جاتا ہے۔ سیاست دانوں کی کرپشن پاکستان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہی سے سیاست دانوں کو بدنام کرنے کی درپردہ سازش ہوتی رہی ہیں۔اسکندر مرزا، ایوب خان نے جو گڑھا دوسرے سیاست دانوں کے لئے کھودا، خود اسی گھڑے میں گرے۔ ایوب خان کی بدنامی میں ان کے بیٹے کیپٹن گوہر ایوب اور گندھارا انڈسٹریز کی داستانیں تھیں۔ بھٹو کی آمرانہ روش انھیں لے ڈوبی۔ جبکہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار میں کرپشن کی ہوشربا داستانیں منظر عام پر آئی۔ ان سیاست دانوں کے احتساب کا نعرہ لگانے والے سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں سب سے زیادہ قرضے معاف کرکے ایک ایسی بدعنوانی کا ارتکاب کیا گیا جس سے پورے معاشرے کا نظام تلپھٹ ہوگیا ہے۔ ان اندازے کے مطابق ان کے دور میں جو قرضے معاف کئے گئے ان کی کل مالیت تقریباً 108 ارب روپے تھی۔ 1982ء میں معاف کرائے گئے قرضوں کی مالیت صرف 8 ارب روپے تھی جو 1999ء میں بڑھ کر 164 ارب روپے ہو گئی تھی۔ نواز شریف کے دونوں ادوار میں 22.35 ارب روپے کے قرضے معاف کرائے گئے۔ ان کے پہلے دور میں تقریباً 2.5 ارب روپے اور دوسرے دور میں تقریباً ارب روپے کے قرضے معاف کرائے گئے۔ شہید بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار 20 میں کل ساڑھے سات ارب

روپے کے قرضے معاف ہوئے جن میں سے 45 کروڑ روپے پہلے دور میں اور پونے ساتارب روپے دوسرے دور میں معاف ہوئے۔ یہ قرض معاف کرانے والے کون تھے۔ اور قومی خزانے پر یہ بوجھ کیوں ڈالا گیا۔ سیاست دانوں کے یہی شب و روز ہیں جن کے سبب پاکستان کرپشن میں دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔

عالمی ادارے ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے دنیا کے بدعنوان ممالک کی 2009 ء کی جو رپورٹ جاری کی ہے اس میں 180 ممالک کی فہرست میں پاکستان کا 42 واں نمبر ہے جبکہ سال 2008 ء کی رپورٹ میں پاکستان کا نمبر 43 واں تھا۔ عالمی ادارے کی اس رپورٹ کے مطابق بنگلہ دیش کی پوزیشن گزشتہ سالوں کے مقابلے میں بہتر ہوئی ہے اور اب یہ اس فہرست میں تیسرے نمبر پر آ گیا ہے۔ اس سے پہلے سال 2001 ، 2002 اور 2003 میں یہاں کرپشن بہت زیادہ تھی۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے مطابق دہشت گردی کے نتیجہ میں نہ صرف غربت بلکہ کرپشن بھی بڑھتی ہے ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں سال 1991 سے 2007 کے دوران قانونی اور غیر قانونی طریقے سے فوجی حکومتیں اور پاور کا غلط استعمال بھی کرپشن کی وجہ بنا ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کرپشن، بد انتظامی، کے باعث پاکستان کی ساکھ دنیا میں تقریباً ختم ہو گئی پاکستان کرپشن کے باعث شدید مالی مشکلات کا شکار ہے غربت، مہنگائی، خوراک اور بجلی کی کمی میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومت کو اچھی حکومت شفاف انتظامیہ اور کرپشن کے خاتمے کے لیے فوری اقدامات

کرنا ہوں گے ورنہ پاکستان انحطاط کا شکار رہے گا۔ عوام کی حالت پتلی ہو۔ اور بے چینی
.بڑھ رہی ہو تو حکومتوں کو سمجھ جانا چاہئے کہ ان کے اقتدار کو عرصہ تیزی سے ختم
ہو رہا ہے

بابری مسجد پر جسٹس لبراہن کمیشن رپورٹ

بھارت کا مکروہ چہرہ

بھارت میں بابری مسجد اور تین ہزار مسلمانوں کی شہادت کے واقعہ نے ساری دنیا کے لئے سیکولر بھارت کا وہ چہرہ بے نقاب کردیا تھا جس میں وہ اقلیتوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ تین سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرنے والے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا رویہ ہمیشہ معاندارانہ رہا ہے۔ ہندو کی تعصب اور مسلمانوں سے امتیازی برتاؤ ہی کے سبب قائدا عظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ قائدا عظم کو ہندو ذہنیت اور سازشوں اور ان کی مکاری کا بخوبی اندازہ تھا۔ تقسیم کے بعد بھارت میں مسلمانوں کو ہندوؤں نے کسی میدان میں پنپنے نہ دیا۔ بابری مسجد کو انتہا پسند ہندوؤں نے جس طرح شہید کیا اور نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیا وہ بھارت کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ہے۔ مسلمانوں پر انتہا پسندی کا الزام دھرنے والے بھارت میں اس کے سیاسی رہنما بھی مسلمانوں کے قتل اور مسجد کا شہید کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ایودھیا میں واقع بابری مسجد کو چھ دسمبر انیس سو بانوے کو ہندو انتہا پسندوں نے مسمار کر دیا تھا جن کا دعوٰی تھا کہ مسجد ان کے بھگوان رام کی جائے پیدائش پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس واقعے کے دس دن بعد کہ جسٹس

منموہن سنگھ لیبرہان کی سربراہی میں جسٹس لبراہن کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ تاکہ اس تاریخی مسجد کی شہادت میں ملوث عناصر کو منظر عام پر لاکر انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے۔ کمیشن نے ۱۷ برس کے بعد اپنی رپورٹ جون ۲۰۰۹ کو پیش کردی تھی۔ جسٹس لیبرہان نے تیس جون کو یہ رپورٹ حکومت کو پیش کی تھی اور حکومت کو اسے ایک ایکشن ٹیکن رپورٹ (اے ٹی آر) کے ساتھ چھ مہینے کے اندر ایوان میں پیش کرنا تھا۔ لیکن بھارت کی موجودہ حکومت نے سیاسی مقاصد کے تحت اس رپورٹ کو چار ماہ تک دبائے رکھا۔ چند دن پہلے اس رپورٹ کے کچھ حصے انڈین ایکسپریس اخبار نے شائع کردیئے۔ جس سے بھارت کی سیاست میں ایک بھونچال آگیا ہے۔ اخبار نے انکشاف کیا ہے کہ جسٹس لیبرہان نے مبینہ طور پر یہ بھی کہا ہے کہ مسجد کی مسماری کا منصوبہ کافی سوچ سمجھ کر تیار کیا گیا تھا اور بی جے پی کی اعلیٰ قیادت کو اس کا علم تھا۔ انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس نے وزارت داخلہ میں ایسے ذرائع کے حوالے سے خبر دی تھی کہ جسٹس منموہن سنگھ لیبرہان نے بی جے پی کی اعلیٰ قیادت کو 'سیوڈو ماڈریٹ' یا دکھاوے کے اعتدال پسند بتایا ہے۔ اس رپورٹ میں جہاں مسلمانوں پر یہ کہہ کر تنقید کی گئی ہے کہ وہ ایک منطقی اور واضح نقطہ نظر پیش کرنے میں ناکام رہے۔ وہاں سنگھ پریوار (آر ایس ایس، شوسینا اور وی ایچ پی) کی اعلیٰ قیادت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے ملک کو فرقہ وارانہ منافرت کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔ اخبار کے مطابق بابری مسجد کی مسماری ایک سوچا سمجھا قدم

تھا۔ اس میں ہندو نظریاتی تنظیم آر ایس ایس کا ہاتھ تھا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر اٹل بہاری واجپائی اس سازش میں شامل تھے۔ رپورٹ مییں اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راو کو یہ کہہ کر بری کر دیا ہے کہ مرکز میں اس وقت کانگریس کی حکومت کیا کر سکتی تھی۔ اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ بی جے پی نے واویلا مچانا شروع کر دیا کہ اس کے خلاف سازش کی جا رہی ہے اور اسے ایک خاص وقت میں منظر عام پر لایا گیا ہے۔ انکوائری کمیشن کی رپورٹ ذرائع ابلاغ میں منظر عام پر آنے کے بعد حزب اختلاف نے مطالبہ کیا تھا کہ اسے بلا تاخیر پارلیمان میں پیش کیا جائے۔ پارلیمان میں رپورٹ پیش کیے جانے کے بعد راجیہ سبھا میں حزب اختلاف کے اراکین نے نعرے بازی کی اور کچھ ارکان کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوئی۔

اس رپورٹ میں پولیس پر الزام ہے کہ وہ بابری مسجد کا انہدام چپ چاپ دیکھتی رہی اور اسے روکنے کی کوشش نہیں کی جن لوگوں نے جمہوریت کے ساتھ غداری کی مخالفت کرنی چاہی انہیں فوراً خاموش اور بے اثر کر دیا گیا۔ وفاقی حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ انٹیلیجنس ایجنسیوں نے اسے صورتحال کا صحیح تجزیہ فراہم نہیں کیا تھا۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ نے پہلے ہی یہ احکامات دے دیے تھے کہ کار سیوکوں کے خلاف طاقت کا استعمال نہ کیا جائے اور موقع پر موجود پولیس افسران نے مسجد کی مسماری کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سنگھ

پریوار کے رہنما یہ چاہتے تھے کہ چھ دسمبر کے واقعات کو کوئی واضح ریکارڈ باقی نہ رہے اس لیے صحافیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔ بابری مسجد کی مسماری کے لیے تین طرح کے لوگ ذمہ دار تھے۔ ایک وہ جنھوں نے سازگار حالات پیدا کیے، یہ وہ لوگ تھے جو اس حملے کو روک سکتے تھے۔ یہ ریڈیکل عناصر تھے۔ دوسرا گروپ ان لوگوں کا ہے جن پر نظریاتی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں دکھاوے کا اعتدال پسند کہا جا سکتا ہے۔ ریڈکل کسی بھی قیمت پر مسجد گرانا چاہتے تھے، نام نہاد اعتدال پسند مندر بنانا چاہتے تھے لیکن لازمی طور پر مسجد کی مسماری کی قیمت پر نہیں۔ تیسرا گروپ وہ ہے جس پر ثانوی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ رپورٹ میں ان 'سیوڈو ماڈریٹ' یا صرف دکھاوے کے اعتدال پسندوں کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ ایک طرف تو اڈوانی، واجپائی اور جوشی جیسے رہنما یہ کہتے رہے کہ اس پورے سانحہ میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن دوسری طرف یہ بات بالکل واضح ہے کہ چھ دسمبر کے واقعات نہ جذبات کی رو میں بہہ کر پیش آئے اور نہ یہ کسی غیر ملکی سازش کا نتیجہ تھے۔ ان کی منصوبہ بندی بہت سوچ سمجھ کر اور بہت تفصیل سے کی گئی تھی۔ لہٰذا ایسے میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان دکھاوے کے اعتدال پسندوں کو کیا سازش کا علم تھا، کیا سنگھ پریوار ان کے کنٹرول میں تھا اور کیا وہ مسجد کی مسماری کو روکنے کے لیے کچھ کر سکتے تھے؟ کافی گہرے مطالعے کے بعد کمیشن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان دکھاوے کے اعتدال پسندوں کو بری الذمہ قرار نہیں دیا

جاسکتا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں مانا جاسکتا کہ ایڈانی، واجپائی اور جوشی کو سنگھ پریوار کے عزائم کا علم نہیں تھا۔ یہ لوگ فیصلہ سازی کے عمل میں شامل تھے۔ یہ رہنما آر ایس ایس کے احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کی سیاسی زندگی ختم ہو جاتی۔ آر ایس ایس ان کے کنٹرول میں نہیں تھا اور جو راہ انہیں اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی تھی اس کے تعین میں بھی ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ کمیشن کو اس بات کے شواہد نہیں ملے ہیں کہ حالات ان رہنماں کے کنٹرول میں تھے یا وہ ان کی سمت بدل سکتے تھے۔ لیکن جرم کی ذمہ داری کے تعین میں انہیں شبہہ کا فائدہ نہیں دیا جاسکتا۔ 'اوپر سے ملنے والے احکامات' کی بنیاد پر کسی کو ذمہ داری سے بری نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت میں اس صفائی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان رہنماؤں نے جو کیا ہے اس سے بڑا جرم یا غداری جمہوری نظام حکومت میں ممکن نہیں ہے۔ للہذا کمیشن کو ان دکھاوے کے اعتدال پسندوں کی مذمت کرنے میں کوئی جھجھک نہیں ہے۔ بابری مسجد کی مسماری کی انکوائری کرنے والے لیبرہان کمیشن نے سترہ سال کی تفتیش کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے بی جے پی کی اعلیٰ قیادت اور سنگھ پریوار کے رشتوں کی ایک حیرت انگیز لیکن جیتی جاگتی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کمیشن کی رپورٹ نو سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے جس میں تحریک کے آغاز سے لیکر مسجد کے انہدام تک کے

واقعات پر کافی دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رپورٹ کے کچھ اہم اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

سنگھ پریوار نے رام مندر کی تحریک کے دوران اپنی اشتعال انگیزی سے عام آدمی کی آواز کو خاموش کیا تاکہ کوئی مندر کے مطالبے کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات نہ کرسکے۔ رام مندر کی تحریک کو آدمی اور ایک عام ہندو کی رضاکارانہ حمایت حاصل نہیں تھی لہٰذا اصل معنوں میں یہ عوامی تحریک نہیں تھی۔ تحریک چلانے کے لیے فنڈنگ سنگھ پریوار کے مختلف بینک کھاتوں سے فراہم کی گئی۔ یہ رقم دسیوں کروڑ روپے سے زیادہ تھی اور اسے چھ دسمبر انیس سو بانوے کے واقعات کو عملی شکل دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ مسجد کی مسماری سے قبل ایودھیا میں بڑی تعداد میں کارسیوکوں کی موجودگی محض اتفاق نہیں تھی۔ آر ایس ایس جیسی جماعتوں میں فوج جیسا ڈسپلن ہوتا ہے۔ لہٰذا اس بات میں دم نہیں کہ کارسیوک (مذہبی رضاکار) جذباتی ہوگئے تھے۔ بابری مسجد کی مسماری کے لیے بہت تفصیلی منصوبہ بندی کی گئی تھی اور یہ بات قابل یقین نہیں کہ وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ یا آر ایس ایس کے سربراہ کے سدرشن یا سنگھ کے مقامی رہنماؤں کو اس کا علم نہیں تھا۔ آر ایس ایس اور وی ایچ پی کے مٹھی بھر رہنماؤں نے جس طرح عوام کے جذبات بھڑکائے، اس کی حالیہ وقتوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بی جے پی، آر ایس ایس، بجرنگ دل اور وی ایچ پی وغیرہ میں قیادت

کا ایک ایسا طبقہ ابھرا جس نے کسی بھی نظریہ اور اخلاقی اقدار کی پرواہ کیے بغیر ایودھیا ایشو کو بھڑوادیا اور اس دوران کسی بھی جانی نقصان کی پرواہ نہیں کی۔ یہ قاتل تھے جن کے ہاتھوں میں تلوار ان کے نظریاتی رہنماؤں نے تھمائی تھیں۔ اس دوران اتر پردیش میں آر ایس ایس کی متوازی حکومت کام کر رہی تھی۔ کلیان سنگھ اور ان کی ٹیم نے ایسے حالات پیدا کیے کہ بابری مسجد کی مسماری یقینی ہو گئی تھی۔ اور انہیں لال کرشن ایڈوانی، اٹل بہاری واجپائی اور مرلی منوہر جوشی کی حمایت حاصل تھی۔ یہ ہے بھارت کا اصل چہرہ۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں جس مذہبی رواداری سے کام لیا۔ یہ مسجد بھی اسی کی ایک داستان ہے۔ تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں ہے کہ یہ مسجد بابر نے تعمیر کروائی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر اس زمانے میں ہوئی جب اورنگ زیب عالمگیر یہاں کا صوبہ دار تھا ایک روائت کے مطابق یہاں ایک ہندو جاگیردار رہا کرتا تھا جس کی بیٹی حسن و شباب میں یکتا تھی۔ صوبہ کے ایک مسلمان حاکم نے (جو وہاں کافی اثر ورسوخ کا مالک تھا) اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جاگیردار کی بیٹی پر دست درازی کی۔ مقامی طور پر جاگیردار کا کوئی داد رسی کرنے والا نہ تھا آخر کار وہ اپنی شکایت لے کر صوبہ دار اورنگ زیب عالمگیر کے پاس پہنچا۔ عالمگیر نے جاگیردار کا مؤقف سنا حاکم کو طلب کیا۔ تحقیقات کے نتیجے میں حاکم کا جرم ثابت ہو جانے پر اس کو سزائے موت دی گئی۔ کہا جاگیردار اس انصاف پر اپنے خاندان سمیت مسلمان ہو گیا اور اپنی جاگیر کا وہ

بہترین حصہ پیش کیا جس پر یہ شاندار مسجد تعمیر کی گئی۔ اس مسجد کو مغل حکمرانوں کے جدامجد ظہیرالدین محمد بابر کے نام سے منسوب کیا گیا۔ یہ مسجد رام کوٹ پہاڑی پر 16 ویں صدی میں ریاست اترپردیش کے شہر ایودھیا میں تعمیر کی گئی۔ 1528ء کے لگ بھگ انتہا پسند ہندوؤں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ مسجد رام کی جنم بھومی یعنی جائے پیدائش کو گرا کر تعمیر کی گئی ہے۔ 1949 میں مسجد کو بند کرا دیا گیا۔ اس طرح 40 سال سے زائد عرصے تک یہ مسجد متنازع رہی۔ 6 دسمبر 1992ء کو انتہا پسند ہندوؤں نے مسجد کو شہید کر دیا۔ جس کے بعد بھارت میں اپنی تاریخ کے بدترین ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ جن میں تین ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ اس مسجد پر پہلے بھی فسادات ہوتے رہے ہیں سب سے پہلے 1853: ایودھیا کے پہلے مذہبی فسادات ہوئے۔ 1859: برطانوی نوآبادیاتی حکومت کی جانب سے عبادت کی جگہ کی تقسیم کر دی گئی۔ 1949: مسجد کے اندر سے 'رام' کی مورتی کی دریافت کا شوشہ چھوڑا گیا۔ حکومت نے متنازعہ مقام قرار دے کر مسجد بند کروادی۔ 1984: وشوا ہندو پریشد کی جانب سے 'رام' کی جائے پیدائش کو آزاد کروانے کے لیے تحریک کا اعلان کیا گیا اور بی جے پی کے رہنما لعل کرشن ایڈوانی نے اپنی سیاست چمکانے کے کئے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی۔ 1986: ضلعی عدالت کی جانب سے ہندوؤں کو متنازعہ مقام پر پوجا کی اجازت دے دی گئی۔ جس پر مسلمانوں کا جانب سے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ 1989: وشوا ہندو پریشد نے مسجد سے ملحقہ زمین پر رام مندر کی بنیاد رکھ

دی۔1990: وشوا ہندو پریشد کے حامیوں نے مسجد کو جزوی طور پر نقصان پہنچایا۔
بھارتی وزیرِاعظم کی جانب سے مسئلے کے حل کی کوشش کی گئی۔ جو ناکام رہی۔1991:
ریاست اترپردیش میں بی جے پی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ بی جے پی کی حکومت میں
وشوا ہندو پریشد کے حامیوں کی جانب سے بابری مسجد کی شہادت ایک سوچے 1992:
سمجھے منصوبے سے کی گئی اور ہندو مسلم فسادات کرائے گئے جس میں تین ہزار افراد
ہلاک ہوئے جن کی اکثریت مسلمان تھی۔ گجرات کے بدنام زمانہ فسادات میں بھی
گجرات کے اس وقت کے وزیراعلیٰ نریندر سنگھ مودی ملوث تھے۔ کشمیر میں مسلمانوں کو
جس طرح قتل کیا جارہا ہے۔ یہ سب بھارت کا مکروہ چہرہ ہے۔

افسوس اس قوم پر جس کی رہبر لومڑی ہو

افسوس اس قوم پر جس کی رہبر لومڑی ہو

جس کا فلسفی مداری ہو

جس کا فن پیوندکاری اور نقالی ہو

افسوس اس قوم پر جو ہر نئے حکمران کا استقبال ڈھول تاشے سے کرے

اور رخصت گالم گلوچ سے

اور وہی ڈھول تاشے ایک نئے حاکم کے لیے بجانا شروع کر دے (خلیل جبران)

سکندر اعظم نے کہا تھا کہ مجھے ان شیروں کی فوج سے کوئی ڈر اور خوف نہیں جس کی قیادت بھیڑیا کر رہا ہو۔ لیکن مجھے ان بھیڑیوں کی فوج سے ڈر اور خوف محسوس ہوتا ہے۔ جس کی قیادت ایک شیر کر رہا ہو۔ قائد اگر شیر ہو تو وہ اپنے قافلے کی نگہبانی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر بھیڑیا قائد ہو تو قافلے کا خدا حافظ۔۔۔ بھیڑیوں کی خصلت کیا ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ برفانی علاقوں میں اس وقت ہوتا ہے۔ جب ہر طرف برف ہی برف ہوتی ہے۔ کوئی خوراک نہیں ہوتی۔ ایسے میں سب بھیڑیئے ایک دائرہ بنا لیتے ہیں۔ پھر سب ایک دوسرے پر نظریں جما کر بیٹھتے ہیں۔ پھر جب کسی بھیڑیے کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ تو سب بھیڑیے اس پر ٹوٹ پڑتے

ہیں۔ پل بھر میں اس کی تکہ بوٹی کرکے کھا جاتے ہیں اور پھر نئے سرے سے اس کھیل کا آغاز کرتے ہیں۔ پھر سے دائرہ بناتے ہیں۔ پھر کسی کی آنکھ لگنے کا انتظار کرتے ہیں۔ یوں یہ کھیل آخری بھیڑئے تک جاری رہتا ہے۔ ملک میں آج جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ اس نظم میں تصویر کیا ہوا ہے۔ خلیل جبران لبنان کا رہنے والا تھا۔ اس نے یہ نظم جس کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس نے 1934ء میں لکھی تھی۔ یہ نظم اس کے اپنے وطن کے حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ مسلمان ملکوں کی حالت پہلے بھی ایسی ہی تھی اور اب بھی۔ سال گزرنے کے بعد بھی یہ نظم تازہ ہے۔ اس کے چند اشعار آپ کے لئے پیش ےے ہیں۔

میرے دوستو اور ہم سفرو
افسوس اس قوم پر جو یقین سے بھری لیکن مذہب سے خالی ہو
افسوس اس قوم پر جو ایسا کپڑا پہنے جسے اس نے خود بنا نہ ہو
جو ایسی روٹی کھائے جسے اس نے اگایا نہ ہو
افسوس اس قوم پر جو داداگیر کو ہیرو سمجھے
اور جو چمکیلے فاتح کو سخی گردانے
افسوس اس قوم پر جو خواب میں کسی جذبے سے نفرت کرے
لیکن جاگتے میں اسی کی پرستش کرے
افسوس اس قوم پر جو اپنی آواز بلند کرے

صرف اس وقت جب وہ جنازے کے ہم قدم ہو
ڈینگ صرف اپنے کھنڈروں میں مارے
اور اس وقت تک بغاوت نہ کرے
جب تک اس کی گردن مقتل کے تختے پر نہ ہو

ذکر آل پاکستان ٹلا ایسوسی ایشن اور گل محمد ایسوسی ایشن کا

آل پاکستان ٹلا ایسوسی ایشن اور گل محمد ایسوسی ایشن جامعہ کراچی کی ایسی غیر سیاسی تنظیمیں تھیں جو جامعہ کے سیاسی جھگڑوں کے بیچ اپنے منفرد نعروں اور سرگرمیوں سے نہ صرف جامعہ کے سیاسی تناؤ کو کم کرتی تھیں بلکہ چہروں پر مسکراہٹ اور شگفتگی لاتی تھیں۔ ان سرگرمیوں سے ہر ایک لطف اندوز ہوتا تھا۔ جب جامعہ کراچی میں ایشیا سرخ ہے اور ایشیا سبز ہے کے پرجوش نعروں کا مقابلہ ہوتا تھا تو اس دوران آل پاکستان ٹلا ایسوسی ایشن والے سرخ ہے نہ سبز ہے ایشیا کو قبض ہے کا نعرہ لگا کر ماحول کو ٹھنڈا کر دیتے تھے۔ گل محمد ایسوسی ایشن والوں کا نعرہ تھا زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔۔۔ جامعہ میں الیکشن کے دوران ایک بین الاقوامی نمائش کا اہتمام بھی ہوا جس میں ملکہ پیٹرا کے سینڈل اور ٹوتھ برش سے لیکر کپڑے عاشق کی اشیاء استعمال کی بھی نمائش کی گئی تھی۔ دنیا بھر میں جہاں ایک نمبر کا چرچا ہوتا ہے۔ وہاں دو نمبر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے جب سے امن کا نوبل انعام امریکی صدر اوباما کو ملا ہے۔ لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ اب نیویارک والوں نے نوبل انعام کے مقابلے پر اگنوبل انعام کا مقابلہ کرایا ہے۔ جس میں ادب کا نوبیل انعام آئرلینڈ کے محکمہ پولیس کو ملا جس نے ایک خاص شخص کا پچاس بار چالان کا ٹکٹ درج کیا تھا۔ نوبیل

کا نوبیل انعامات کی (Ig Nobel Prizes) 'انعامات کے متوازی 'اگنوبیل انعامات طرح دنیا بھر کے میڈیا میں ڈھنڈورا نہیں پیٹا گیا. اگنوبیل انعامات کے اعزاز سے نوازنے کے لیے ایک امریکی ریاست میساچوسٹس کے شہر کیمبرج میں ایک خصوصی تقریب بپا کی جاتی ہے اور ان کا اعلان کم و بیش نوبیل انعامات کے اعلان کے دنوں ہی میں کیا جاتا ہے، نوبیل اور اگنوبیل انعامات میں فرق یہ ہے کہ اگنوبیل انعامات میں تحقیق کے انتخاب کا معیار یہ ہے کہ پہلے تو لوگ انعام کا سن کر خوب ہنسیں اور پھر غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگنوبیل انعامات کے مستحق علما و فضلا اپنے متعلقہ شعبوں میں جتنے دور کی کوڑی لے کر آتے ہیں، اسے دیکھ کر انشا اللہ خان انشا کا مصرعہ ذہن میں آتا ہے، اندھے کو اندھیرے میں بڑے دور کی سوجھی۔ مثال کے طور پر اس سال امن کا اگنوبیل انعام سوئٹزلینڈ کے اس سائنس دان کو دیا گیا جس نے اس بات پر دادِ تحقیق دی تھی کہ کسی کو بے ہوش کرنے کے لیے اس کے سر پر بیئر کی خالی بوتل مارنا زیادہ کارگر رہے گا یا بھری ہوئی بوتل! تحقیق سے معلوم ہوا کہ خالی بوتل زیادہ مؤثر ہتھیار کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح طب کا نوبیل انعام کیلی فورنیا کے اس ڈاکٹر کو ملا جس نے 60 سال تک اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں چٹخا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی آیا انگلیاں چٹخانے سے جوڑوں کی بیماری آرتھرائٹس لاحق ہوتی ہے یا نہیں۔ کیلی فورنیا کے ڈاکٹر ڈونلڈ انگر اس 60 سالہ تحقیق کے دوران روزانہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں چٹخاتے رہے لیکن

انھوں نے دوسرے ہاتھ کو اس مشق سے محفوظ رکھا۔ ساٹھ سال بعد جب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ہاتھوں کی جسمانی صحت میں ذرا برابر فرق نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انگلیاں چٹخانے سے آپ کے قریب بیٹھنے والے کتنا ہی الجھتے ہوں، کم از کم اس عمل کے باعث آپ کو آرتھرائٹس کا مرض لاحق نہیں ہوگا۔ ریاضی کا انعام زمبابوے کے ریزرو بنک کو ملا۔ کمیٹی نے انعام کی توجیہ یہ بیان کی کہ بنک نے لوگوں کو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے ہندسوں سے نبرد آزما ہونے کا آسان طریقہ فراہم کر دیا ہے۔ اور وہ یوں کہ بنک نے ایک سینٹ سے لے کر ایک ہزار کھرب ڈالر کے نوٹ چھاپے ہیں، جس کی مدد سے اب لوگ ان بڑی رقموں کا حساب لگا سکتے ہیں، جو کسی اور صورت میں ممکن نہیں تھا۔ ایک سینٹ سے لے کر ایک ہزار کھرب ڈالر کے نوٹ چھاپنے پر زمبابوے کے سرکاری بنک کو اگنوبیل انعام سے نوازا گیا۔ اسی طرح صحتِ عامہ کا انعام ڈاکٹر الینا بوڈنار کو ایک نادر ایجاد پر ملا۔ انھوں نے ایک ایسی برا ایجاد کی ہے جسے ہنگامی حالات میں گیس ماسک کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ برا + گیس ماسک 99.9 فی صد موذی گیسوں کو فلٹر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ فزکس کا اگنوبیل انعام یونیورسٹی آف ٹیکسس کی الزبتھ شپیر کو دیا۔ الزبتھ یہ دور کی کوڑی لائی تھیں کہ آخر حاملہ خواتین بچے کے بوجھ تلے آگے کی طرف لڑھکتی کیوں نہیں ہیں۔ ان کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاملہ خواتین لڑھکنے سے بچنے کے لیے چلتے وقت تھوڑا سا پیچھے کی طرف جھک جاتی ہیں۔ نوبل انعام کے

برعکس اگنوبیل انعامات کی خامی یہ ہے یہ سائنس دان چاہے کتنی عرق ریزی سے تحقیق کیوں نہ کریں، انھیں انعام کے ساتھ کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ یہی نہیں بلکہ تقریب میں شرکت کرنے کے لیے بھی اپنے خرچ پر آنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو ہمارے سیاست دان، بیوروکریٹ، سرمایہ دار، شوگر مل مالکان میں سے ہر ایک اس قابل ہے کہ اسے اگنوبل ایوارڈ سے نوازا جائے۔ خاص طور پر شوگر مل مالکان کہ جنھوں نے تین ماہ کے قلیل عرصے میں چینی انیس روپے سے بہتر روپے پر پہنچا دی ہے۔ اس انھیں ضرور انعام دیا جانا چاہئے۔

قائد تحریک کی درخواست کا نمبر آگیا

پاکستان میں قرضوں کی معافی کے لئے اس قوم کے ساتھ ایسا بڑا دھوکہ کیا گیا ہے کہ اس کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ قرضے وہاں واپس ہوتے ہیں جہاں ان کی واپسی کے لئے قرض وصول کرنے والے کھڑے ہوں۔ جہاں قرض وصول کرنے والے ہی اپنے دعویٰ میں کمزور ہوں وہاں قرض کیسے وصول کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہر وہ شخص جس نے قرضہ لیا تھا اور ٹیکنکل طور پر اداروں نے ہی قرضہ، معاف کردیا تو ان کی نادہندگی کو کون چیلنج کرے گا۔ اگست ۲۰۰۹ میں ایم کیو ایم کے قائد نے چیف جسٹس آف پاکستان کو ایک کھلا خط لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے چیف جسٹس کی توجہ ملکی معاملات پر دلاتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کے بنکوں سے لئے جانے والا کھربوں روپے کے قرضے معاف کرانے والوں کے خلاف آئین اور قانون کے تحت کاروائی کی جائے اور تمام پیسہ قومی خزانے میں واپس لایا جائے اور اس خط پر از خود نوٹس لے کر کاروائی کی جائے۔ قومی اخبار کے ان ہی کالموں میں ہم نے لکھا تھا کہ قائد تحریک کی اس درخواست کا نمبر کب آئے گا۔ گزشتہ روز جناب چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے خط پر سوموٹو نوٹس لیتے ہوئے متعلقہ حکام سے 1971 سے لیکر اب تک معاف کرائے گئے قرضوں کا تفصیلی ریکارڈ طلب کرلیا ہے۔ چیف جسٹس نے سوموٹو لیتے ہوئے درخواست گزار کے خط کو

کے سوموٹو کیس کے ساتھ یکجا کردیا جس میں عدالت نے 54 ارب روپے 2007 کے قرضے معاف کرانے کے خلاف سوموٹو لیا تھا۔ عدالت نے الطاف حسین کے خط پر گورنر سٹیٹ بینک اور سیکرٹری فنانس کو نوٹس جاری کرتے ہوئے ان لوگوں کے ناموں کا ریکارڈ طلب کرلیا جنھوں نے 1971 سے لیکر آج تک قرضے معاف کرائے۔ عدالت نے حکم دیا کہ درخواست گزار الطاف حسین کو بھی اس بات سے آگاہ کردیا جائے کہ ان کے خط پر سوموٹو نوٹس لے لیا گیا ہے۔ یوں قائد تحریک کی اس درخواست کا نمبر آگیا ہے۔

جناب الطاف حسین قدم بہ قدم قومی سیاست میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ قومی سیاست میں ان کی موجودگی اس ملک کے بہت سے مسائل حل کرسکتی ہے۔ بشرطیہ وہ قوم کے حقیقی مسائل پر توجہ مرکوز رکھیں۔ ان قرضوں کی فہرست جو اخبار میں آرہی ہے تو اس پر ردعمل بھی آرہا ہے۔ اب تک سندھ اسمبلی میں قائد حزب اختلاف جام مدد علی نے کہا ہے کہ میں نے کوئی قرضہ معاف نہیں کرایا ہے۔ نیشنل بینک آف پاکستان نے قرضوں کی معافی کے حوالے سے میڈیا خبروں کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ بینک نے سب سے کم قرضے معاف کئے ہیں۔ جبکہ مسلم لیگ کے ترجمان کا کہنا ہے کہ چوہدری فیملی نے کوئی قرض معاف نہیں کرایا، وفاقی وزیر منظور وٹو نے کہا ہے کہ 29 لاکھ روپے قرض معاف نہیں کرایا، ہمایوں اختر کی جانب سے کہا گیا ہے کہ ان کے خاندان کے کسی فرد نے آج تک ایک ٹیڈی پائی کا قرض

معاف نہیں کروایا، جبکہ حلیم عادل شیخ کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاتھ صاف ہیں کوئی قرضہ معاف نہیں کرایا۔ عذرگناہ از بدتراش گناہ کے مصداق نیشنل بینک کی تردید نما تصدیق ہے۔ جس میں انہوں نے قرضوں کی معافی کے بارے میں میڈیا میں شائع ہونے والی خبروں کے اس تاثر کی تردید کی ہے جس میں سب سے زیادہ معاف کردہ قرضے نیشنل بینک کے بتائے گئے ہیں۔ ترجمان نے اس حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ نیشنل بینک آف پاکستان نے سب سے کم یعنی اثاثہ جات کے 0.83 فیصد قرضے معاف کئے۔ 2000-2008ء کے دوران بینک کے مجموعی معاف کردہ قرضے 6.723 ارب روپے رہے۔ 68 فیصد لازمی ایڈجسٹمنٹ ہیں (اس میں 38 فیصد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سرکلر 29 کے تحت ایڈجسٹ کئے گئے ہیں۔ سب سےبڑا فراڈ یہی ہوا ہے کہ جن قوانین کے تحت یہ قرض واپس لیا جانا تھا اس ہی کو بدل دیا گیا۔ سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر سلمان شاہ اب اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں کہ قرض معاف کرانے والوں کی ساری تفصیلات عوام کے علم میں لائی جارہی ہیں اور یقیناً آزاد میڈیا کا اس میں بہت اہم کردار ہے کل جب یہ قرض معاف ہو رہے تھے اور وہ مشرف کے ساتھ تھے تو اس وقت وہ کیوں مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد شہباز شریف کا کہنا ہے کہ ان کی پارٹی کے قائد نواز شریف اور پارٹی کی مشاورت سے سیاسی بنیادوں پر معاف کرائے گئے قرضوں کی واپسی کے لئے عدالت میں درخواست دائر کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ میاں صاحب اور بی بی کے دور میں معاف کئے گئے قرضوں کا کیا ہوگا، اور

کئے ہوئے قرضے واپس مل سکتے ہیں؟اس کا عمومی جواب نہیں written off کیا ہے۔ کیونکہ سب نے فائیلوں کا پیٹ بھرا ہے، ان قرضوں کی معافی کے لئے بھی بڑے بڑے فائل کھلے ہوں گے۔ کروڑوں روپے کی رشوت دی گئی ہوگی۔ مگر بہت سے حقائق ریکارڈ پر ہیں۔ عدالت میں بہت سے حقائق سے پردہ اٹھے گا۔ اگر اب بھی کوئی بنک کوئی مالیاتی ادارہ کسی واپس شدہ قرضے کی وصولی کے پیچھے پڑ گیا تو بالآخر کامیاب ہو سکتا ہے۔

یہ بھی خبر آئی ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر قرضوں کی معافی کے بعد بھی تمام بینکوں کے کل شرح منافع میں 408 فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ بنک اپنے کھاتے داروں کو اپنے منافع میں شریک نہیں کرتے ہیں، گویا یہ پیشہ عوام کا ہے جسے بنکوں نے ہتھیا لیا ہے۔۔ قابل توجہ بات یہ ہے مالی سال 2006ء کے دوران تمام پاکستانی بینک مل کر ٹیکس کٹوتی کے بعد 82.54 ارب روپے کل شرح منافع کمانے میں کامیاب ہوئے تمام پاکستانی بینکوں کے حاصل کردہ کل شرح منافع کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء میں یہ مالیاتی ادارے صرف ان لوگوں سے کمائی کر رہے تھے جو اپنے ذمے شرح سود مقررہ وقت پر اور شیڈول کے مطابق ادا کر رہے تھے جبکہ دیگر کسٹمرز بڑے قرضے لے کر حکومتی سرپرستی اور بینکرز کی ملی بھگت سے انہیں معاف کروا رہے تھے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ پاکستانی بینک اس وقت بھی اچھا منافع کما رہے ہیں جبکہ عالمی معیشت

بحران میں جکڑی ہے اور بنکنگ سیکٹر کو شدید مندی کا سامنا ہے۔بڑے پیانے پر قرضہ جات کی معافی اور غیر منافع بخش قرضہ جات کے بڑے اعداد و شمار سے پاکستانی بنکوں کی بیلنس شیٹ کمزور ہونی چاہئے تھی لیکن یہ اعداد و شمار معجزے کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ جنرل (ر) پرویز مشرف کے دور کے صرف 7 سال میں 125ارب روپے سے زائد کے قرضے معاف کئے گئے جبکہ محمد خان جونیجو، بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے منتخب ادوار 1986-1999ء کے دوران صرف 30 ارب کے قرضے معاف کئے گئے۔ میاں نواز شریف کے دو ادوار حکومت میں 22.35 ارب روپے کے قرضے معاف کئے گئے جو 1986 سے 1999ء کے دوران معاف کئے گئے کل قرضہ جات کا 74.5 فیصد ہیں بینظیر بھٹو شہید کے دو ادوار میں 7.23 ارب روپے کے قرضہ جات معاف کئے گئے جو ان 13 سالوں میں معاف کئے گئے قرضہ جات کا 24.2 فیصد بنتے ہیں۔ اب جو 9/11 کے بعد سے اب کے قرضوں کا قصہ شروع ہوگا۔ تو مزید انکشافات ہوں گے۔ قوم کے سامنے یہ حقائق آنا اور مجرموں کو کیفر دار پہنچانا ضروری ہے۔

یہ ہمارے بچوں کا معاملہ ہے

گزشتہ دنوں ایک بنک میں ایک دوست کے پاس جانا ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ بنک سے قرض لینے والی کمپنیوں کے اسٹاک کا سالانہ آڈٹ کیا جاتا ہے۔ میرے آڈیٹر نے بتایا کہ ڈبوں میں دودھ فروخت والی ایک کمپنی کے آڈٹ کے دوران اس کمپنی کے اسٹاک میں پاؤڈر دودھ، ویجیٹیبل آئل اور ڈیری کریم ,کے علاوہ یوریا کھاد اور کاسٹک سوڈا بھی خاصی مقدار میں شامل تھا۔ میرے دوست کا کہنا تھا کہ ڈبوں میں پیک دودھ کو گاڑھا کرنے اور تادیر محفوظ رکھنے کے لئے یہ کمپنیاں عوام کی جانوں سے کھیل رہی ہیں۔ اور ملاوٹ شدہ دودھ بڑے پیانے پر مہنگے داموں پر خرچ کیا جارہا ہے۔ جس سے عوام طرح طرح کی بیماریوں میں بتىلا ہورہے ہیں۔ اس کے براہ راست اثرات گردوں میں پتھری اور دیگر جسمانی عوارض کی صورت میں رونما ہورہے۔ اس مضر صحت دودھ کے بارے میں دوسری بات انہوں نے یہ بتائی کہ اس کو کسی بھی لیبارٹری میں ٹیسٹ کرالو۔ یہ نقلی دودھ ثابت نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک مقدمہ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ مقدمے میں ایک وکیل نے ۱۰ ہزار روپے خرچ کرکے دودھ کے نمونے جمع کئے ہیں، اب یہ نمونے لندن کی لیبارٹریز میں جانچ کے لئے بھیجے جائیں گے۔ ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس میاں ثاقب نثار نے پیکٹوں میں بند ملاوٹ شدہ مضر صحت دودھ کی خرید وفروخت کے

خلاف کیس پر مزید کارروائی 22 دسمبر تک ملتوی کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ عدالت کسی کو بھی انسانوں اور خصوصاً بچوں کی زندگیوں سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے گی اگر کوئی اس جرم میں ملوث پایا گیا خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اسے جیل جانا پڑے گا۔

عدالت نے قرار دیا کہ پاکستان میں دودھ میں ملاوٹ کا تجزیہ کرنے والی لیبارٹریاں غیر معیاری ہیں، اس لیے دودھ کے نمونے لیبارٹری ٹیسٹ کیلئے بیرون ملک بھجوائے جائیں گے۔ دوران سماعت عدالتی معاون بیرسٹر سدرہ نے عدالت کو بتایا کہ کئی ممالک میں چائنا کی تیار کردہ بہت سی کھانے پینے کی اشیاء پر پابندی عائد کی گئی ہے کہ ان میں میلامائن کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ عدالت کے روبرو ظفراللہ ایڈووکیٹ نے درخواست دائر کر رکھی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں ڈبوں اور پیکٹوں میں بند فروخت ہونے والا دودھ مضر صحت اجزاء کی ملاوٹ کا حامل ہے جس سے انسانی صحت اور خصوصاً بچوں کی صحت پر انتہائی مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس دودھ میں میلا مائن اور دوسرے مضر صحت اجزاء شامل ہوتے ہیں للذا اس دودھ کی خرید وفروخت پر پابندی لگائی جائے۔ اب تک ہم دودھ میں پانی ملانے پر روتے تھے، لیکن اب پتہ چلا کہ دودھ میں محض پانی ملانے کے عمل سے انسانی صحت پر اتنے مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے تھے۔ جس قدر پاؤڈر، ویجیٹیبل آئل اور ڈیری کریم سے دودھ تیار کردہ دودھ سے ہوتے ہیں۔ یہ

تو سراسر انسانی جانوں سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح دودھ کو زیادہ گاڑھا کرنے، زیادہ دنوں تک محفوظ رکھنے اور خراب ہونے سے بچانے کے لیے یوریا کھاد، کاسٹک سوڈا اور دیگر مضر صحت کیمیکلز کا استعمال ایک گھناؤنا جرم ہے۔ ایسے دودھ سے پاکستانی نسل طرح طرح کے امراض کا شکار ہو رہی ہے۔ اس معاملہ میں حکومت کے ذمہ داران کی چشم پوشی کسی صورت بھی قابل معافی نہیں ہے۔ نہ جانے ہمارے فوڈ انسپکٹر کیا کر رہے ہیں۔ حکومتی محکمے دودھ میں ملاوٹ کے خلاف فوری مؤثر کارروائی عمل میں لانے سے گریزاں ہیں۔ ہر طرف رشوت کا بازار گرم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مضر صحت ملاوٹ کرنے والے عناصر کے خلاف مقدمات درج کروائے جائیں انہیں جرمانے کیے جائیں۔ انکے سٹاک اور جائیدادیں ضبط کی جائیں۔ ملاوٹ کی وجہ سے بالخصوص بچوں اور نوجوانوں کی صحت پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ نئی نسل کی جسمانی نشو و نما متاثر ہو رہی ہے۔ ہماری قوم کے نوجوان نسل کے قد پست اور جسم نحیف ہوتے جا رہے ہیں جبکہ دنیا کے دیگر ممالک کی نوجوان نسل دراز قد اور مضبوط جسم کی مالک ہے۔ حکومت دودھ میں ملاوٹ کے خلاف مؤثر قانون سازی کرے اور دودھ میں ملاوٹ کے خلاف مہم چلائے اور محکمہ لائیو سٹاک، محکمہ صحت، ڈسٹرکٹ گورنمنٹس لیبارٹری خصوصی افسران برائے انسداد ملاوٹ اور محکمہ ماحولیات کو PCSIR،
ہدایات جاری کرے کہ وہ دودھ میں ملاوٹ کے خلاف مہم چلائیں، بازار سے دودھ کے نمونہ جات حاصل کرکے لیبارٹری میں ٹیسٹ کروائے جائیں کہ اس میں کون سے کیمیکل

شامل ہیں۔ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ بھی دودھ میں ملاوٹ کے خلاف مہم چلائیں۔ اور قوم کو ملاوٹ کے عذاب سے بچائیں۔ یہ کوئی سیاسی ایشو نہیں ہمارا اور ہماری نسلوں کی صحت کا معاملہ ہے۔ دیگر جماعتوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں سے بھی میری درخواست ہے کہ دودھ میں مضر صحت ملاوٹ کو رکوانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ یہ ہم سب کے بچوں کا معاملہ ہے۔

این آر او کا مردہ پھر زندہ ہوگیا

این آر او کے بارے میں وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے کہا تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔ لیکن یہ مردہ جسے دفن کردیا گیا تھا اب ایسا زندہ ہوا ہے کہ اس سے بہت سے لوگ موت سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔ عدلیہ کا اتنا بڑا بنچ جب بھی بنتا ہے، کہا جاتا ہے کہ کوئی بڑا فیصلہ آنے والا ہوتا ہے۔ یوں بھی اس وقت ملک میں جمہوریت ہے لیکن بد قسمتی سے منتخب نمائندوں نے سارا بوجھ عدلیہ پر ڈال دیا ہے۔ عدلیہ کے پیچھے اس وقت عوام کی طاقت ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ عوام نے عدلیہ سے بے حد امیدیں لگا رکھی ہیں۔ قومی دولت کی جو لوٹ مار اس ملک میں کی گئی ہے۔ اس کی کوئی حد ہے نہ حساب، اب یہ معاملہ کھربوں روپے کا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے اربوں روپے کی لوٹ مار کی ہے۔ تو دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دن رات غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ مہنگائی نے انسانوں کی زندگی عذاب میں کی ہوئی ہے۔ بینظیر بھٹو اور جنرل پرویز مشرف میں ہونے والی ڈیل میں دبئ کے حکمران خاندان کا رول اہم تھا۔ لیکن اس وقت جنرل مشرف کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اگر وہ ایک جلا وطن رہنما کی واپسی پر دبئ کے شیخ کی بات مان لیں تو دوسرے کی واپسی سے متعلق سعودی عرب کے شیخ کو انکار ان کے لیے نا ممکن ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میاں نواز شریف این آر او پر ہونے والے مذاکرات کا براہ راست حصہ تو نہ تھے لیکن ان کی واپسی اس قانون سے اتنی ہی جڑی ہوئی تھی جتنی بینظیر بھٹو کی۔ بینظیر بھٹو ملک کے عوام کی محبوب تھیں۔ عوام انھیں اپنی صفوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت پاکستان مسلم لیگ قاف نے بہت شور مچایا کہ بی بی جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرکے واپس آ رہی ہے لیکن اس کے باوجود لاکھوں لوگوں نے انہیں کراچی میں خوش آمدید کہا۔ وطن واپسی کے بعد بینظیر بھٹو نے ایک دانستہ حکمت عملی کے تحت میاں نواز شریف سے مسلسل رابطہ رکھا۔ ان کے قریبی ساتھیوں کا کہنا ہے کہ قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے میاں نواز شریف سے ٹیلیفون پر بات کی تھی۔ بینظیر بھٹو کی ہر بات اور ہر حرکت سے واضح تھا کہ وہ اپنے مفاہمتی فلسفے کو محض ایک قانون تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی یہ واضح خواہش تھی کہ وہ اپنے ناقدین پر ثابت کریں کہ این آر او ان کی ذاتی سیاست کی بقا نہیں بلکہ پاکستان میں مفاہمت کے مستقبل کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بینظیر بھٹو کا اصرار تھا کہ جب سیاسی دشمنی کی دیواروں کو قانونی سہارا دے کر کھڑا کیا ہو تو انہیں گرا کر ان کی جگہ سیاسی مفاہمت کی بنیادیں ڈالنا بھی قانونی سہارے کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کی نظر میں این آر او کے بغیر چارٹر آف ڈیموکریسی پر عمل درآمد ناممکن تھا اور اس معاملے میں پاکستان مسلم لیگ

نواز کے سربراہ میاں نواز شریف نے کبھی ان سے اختلاف نہیں کیا۔

بے نظیر بھٹو تو اس فلسفے کو اور بھی آگے لے جانے کی خواہشمند تھیں۔ وہ کئی سال تک جنوبی افریقہ کی طرز پر حقائق اور مفاہمت کمیشن بنانے پر زور دیتی رہیں جس کے سامنے سب سیاستدان، جرنیل، کاروباری حضرات اور بیوروکریٹس اپنے جرائم کا اعتراف کرتے، آئندہ قانون کی پاسداری کا عہد کرتے، سیاستدان ایک دوسرے کی ٹانگ نہ کھینچنے کا عزم کرتے اور فوجی قیادت سیاسی حکومتوں کے خلاف سازش کرنے سے توبہ کرتی۔ ستائیس دسمبر دو ہزار سات کو بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی موت کے ساتھ ہی پاکستان میں تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی سیاسی مفاہمت نے بھی دم توڑ دیا۔ سیاسی مفاہمت کے اس کھیل میں میاں نواز شریف اس وقت تک بینظیر بھٹو کے جونیئر پارٹنر بنے رہنے پر آمادہ تھے۔ لیکن بینظیر بھٹو کی موت سے پیدا ہونے والے سیاسی خلا نے انہیں نئی راہیں دکھائیں۔ دوسری جانب بینظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری کی سیاست نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ بینظیر بھٹو یہ طے کرکے وطن لوٹیں تھیں کہ آصف زرداری دبئی میں رہتے ہوئے بچوں کا خیال رکھیں گے۔ لیکن ان کی موت نے پارٹی کی ذمہ داریاں لوگوں پر ڈال دی جو نہ تو بینظیر بھٹو کے سیاسی مفاہمت کے فلسفے سے پوری طرح واقف تھے اور نہ ہی اسے عملی جامہ پہنانے کا سیاسی قد کاٹھ رکھتے تھے۔ سیاسی بدمزگی نے ایک بار پھر این آر او کے مردے میں جان ڈال دی کیونکہ

پے در پے ہونے والی سیاسی حماقتوں نے وہ سیاسی مفاہمت جو این آر او کی روح تھی اسے ختم کر دیا تھا۔ اب وہی این آر او جس نے پاکستانی سیاست کو مفاہمت کے ایک نئے دور میں لے جانا تھا چند گنے چنے لوگوں کی ذاتی سیاست کا پہرے دار نظر آنے لگا۔ ایسے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ وہ ان لوگوں سے دامن چھڑا لے جنہوں نے این آر او سے فائدہ اٹھایا ہے اور جب تک وہ لوگ کلین ہو کر نہیں آ جاتے اس وقت تک انہیں امور مملکت سے علیحدہ رکھنا چاہیے۔ عوام، اور پاکستانی میڈیا کی خبروں، اطلاعات، تجزیوں اور تبصروں نے ایک نئی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ این آر او اچھا ہے یا برا، اس سے قطع نظر لگتا یہی ہے کہ اٹھائیس نومبر کے بعد این آر او کی قبر میں اس قانون کے ساتھ ساتھ قومی مفاہمت کا مردہ بھی لیٹے گا۔

ہم اب بھی خاموش ہیں

ہمارے حکمران اب تک امریکہ کی کاسہ لیسی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں اس بات کی ہمت اور طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے امریکی آقاؤں کے خلاف کچھ کہہ سکیں۔ پاکستان میں بلیک واٹر کی موجودگی اب کوئی راز نہیں ہے۔ مساجد، مدرسے، بازار، دفاتر سب پر حملے کئے جارہے ہیں، یہ حملے باقاعدہ تربیت یافتہ لوگ کر رہے ہیں۔ جو کرائے کے قاتل نہیں ہیں، بلکہ باقاعدہ لڑائی کرکے ہمیں تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ عوام کو کیوں اعتماد میں لے کر نہیں بتایا جارہا ہے۔ اب تک پکڑے جانے والے لوگوں کو عدالتوں کے سامنے کیوں نہیں لایا جاتا۔ پاکستان میں صرف مذہبی لوگوں کو کیوں نشانہ بنایا جارہا ہے۔

حال ہی میں معروف امریکی جریدے 'وینٹی فیئر' نے امریکی نجی فوجی ایجنسی بلیک واٹر کے سربراہ کے اعترافات سمیت ایجنسی سے متعلق انکشافات پر مبنی ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بلیک واٹر کو امریکی سی آئی اے کی طرف سے پاکستان کے نیوکلیئر سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قتل کرنے کا کام دیا گیا تھا لیکن بعد میں امریکی حکومت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ فیشن، فن اور سیاست پر نکلنے والے مشہور امریکی جریدے 'وینٹی فیئر'

کے تازہ ترین شمارے میں شائع ہونے والی اس رپورٹ میں بلیک واٹر کے سربراہ ایرک پرنس کی شخصیت پر خاکے اور ان کے انٹرویو میں بلیک واٹر سے متعلق کی گئی کئی کارروائیوں اور سرگرمیوں کی تردید اور تصدیق کے علاوہ بلیک واٹر تنظیم کے امریکہ کے اندر اور عراق اور افغانستان میں کارروائیوں کے متعلق اہم انکشافات بھی کیے گئے ہیں۔
برطانوی ریڈیو کے مطابق اس رپورٹ میں واشنگٹن پوسٹ کی اس خبر کا ذکر بھی ہے جس کے مطابق سی آئی اے نے بلیک واٹر کو القاعدہ اور طالبان رہنماؤں کو قتل کرنے کے پروگرام چلانے کا ٹھیکہ دیا تھا۔ اس پروگرام سے واقف ایک ذریعے کے حوالے سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ سی آئی اے کے ایسے پروگرام میں مبینہ طور پر گیارہ ستمبر کے دہشتگرد حملوں میں ہائی جیکروں کی مالی معاونت کرنے والے شخص مامون درکنزالی کو جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں نشانہ بنا کر قتل کرنے کے منصوبے کے علاوہ پاکستان کے نیوکلیئر سائنسدان ڈاکٹر اے کیو خان کا قتل بھی شامل تھا۔
ونیٹی فیئر، کی اسی رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ دبئی میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو مبینہ طور متوقع طور سی آئی اے ٹیم نے دبئی میں ڈھونڈ نکالا تھا لیکن امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی سے اس کارروائی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ جریدہ بتاتا ہے کہ سی آئی اے کے قاتل جتھوں کے 'ڈھونڈو، نشانے کا تعین کرو اور ختم کرو' نامی پروگرام کی منظوری دو ہزار

دو میں سابق صدر جارج بش نے دی تھی۔ اس سے قبل سی آئی اے کے ایسے پروگرام پر ریگن دور میں پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے افراد کو نشانے پر رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایجنسی کے پروگرام کا دائرہ اس سے کہیں بڑا تھا جتنا تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم امریکی جریدے نے اپنے سی آئی اے میں ذرائع کے حوالے سے کہا ہے کہ عبدالقدیر خان یا درکنزالی جیسے مشنز کو ختم کر دینے کی وجہ ایسے مشنوں پر مامور افراد کی نااہلی یا اس کے لیے مطلوب اہلیت کا فقدان نہیں بلکہ سیاسی نیت (پولیٹیکل ول) کا نہ ہونا تھا۔

اس رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں وینٹی فیئر کی ٹیم نے بلیک واٹر سے سربراہ اور سابق امریکی کمانڈو ایرک پرنس کے ہمراہ بلیک واٹر کی امریکی ریاست شمالی کیرولآئنا میں واقع تربیت گاہ، ورجینیا ریاست میں اس کے ہیڈ کوارٹر کے علاوہ افغانستان پاکستان سرحد پر افغان پولیس کو تربیت دینے والے مرکز کا بھی تفصیلی دورہ کیا۔ جریدے کی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایرک پرنس نے انکشاف کیا کہ ستمبر دو ہزار آٹھ میں اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں جس شام خودکش حملہ ہوا اسی شام ہوٹل میں انہیں چیک ان ہونا تھا لیکن انہوں نے اپنے اسلام آباد کے سفر کا پروگرام منسوخ کر دیا تھا۔ ایرک پرنس نے وینٹی فیئر کو بتایا کہ انہیں امریکہ سے اطلاع ملی تھی کہ ان کا ایک سالہ بیٹا

سوئمنگ پول میں گر گیا ہے جسے بعد میں اس کے بارہ سالہ بھائی نے بچا لیا تھا اور اس کی خیریت کی اطلاع ملنے پر انہوں نے افغانستان سے براستہ اسلام آباد ایک رات میریٹ ہوٹل میں قیام کے بعد امریکہ جانے کے لیے اس سفر کا ارادہ ختم کر دیا تھا۔ یہ سارے انکشافات کس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ہم امریکہ کی جنگ میں گھٹنے گوڈے دھنس چکے ہیں۔ امریکی استعمار کے چاہنے والے اس ملک کی تباہی پر لگے ہوئے ہیں اور ہم اب بھی خاموش ہیں۔

غریب کی غربت

غریب کی غربت پر رونا آتا ہے لیکن جب یہ غریب اقتدار سے قربت حاصل کرتا ہے
اور دولت اس کے قدم چھونے لگتی ہے تو وہ کس قدر حریص ہوجاتا ہے۔ اس کا اندازہ
ان سیاست دانوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جنھوں نے غربت میں آنکھ کھولی اور غریبوں کی
تقدیر بدلنے کا عزم کیا اور پھر وہ خود بھی اسی دولت اور عیش اور آرام میں پڑ گئے۔
دور کیوں جائیں پاکستان کی سیاست میں ایسی ہزاروں مثالیں ہیں۔ آج جو سیاست میں
اربوں روپے کے اثاثے لئے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے کسی سرکاری ملازم سے بھی کم انکم
ٹیکس دیا ہے۔ بلکہ بعض سیاست دانوں کے اثاثوں کے گوشواروں کو دیکھ کر تو ان پر رحم
آتا ہے کہ کیوں نہ ان کی مدد زکواۃ اور خیرات سے کی جائے۔
کراچی میں جن لوگوں نے ملیر، ایف بی ایریا، لالوکھیت، کھارادر جیسی متوسط طبقے سے
سیاست میں کامیابی حاصل کی وہ بہت جلد ڈیفینس پہنچ گئے۔ جو کل سائیکل اور موٹر
سائیکل پر سواری کرتے تھے وہ آج بڑی بڑی گاڑیوں کے مالک ہیں۔ لندن ان کی نانی
کا گھر ہے۔ امریکہ، برطانیہ وہ سیر سپاٹے کرنے جاتے ہیں۔ آج پاکستان میں این آر او،
قرضے معافی، فراڈ، رشوت، منشیات اسمگلنگ اور جانے کیا کیا دھندے جاری ہیں،
اربوں اور کھربوں کی جائیداد ہیں۔ لیکن

ایک پہلو ایسا ہے جس پر بار بار سوچنا پڑتا ہے۔ اس پر بات کرنے سے پہلے ذرا بھارت کے ایک غریب وزیر اعلیٰ کا قصہ سن لیں۔ غربت کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑنے والا قبائلی اپنی مدھو کوڑا کو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے ایک کان میں مزدوری کرنا پڑی تھی۔ 90 کے عشرے تک وہ ایک کان میں مزدور تھا۔ مزدور نیتا بن جانے سے عوام اس پر اعتماد کرنے لگے۔ لیکن پھر اچانک اس میں تبدیلی آئی اور وہ سیاست میں حصہ لینے لگا۔ 1991 جھاڑ کھنڈ میں نرسیما راؤ حکومت کو عدم اعتماد کا سامنا تھا۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ جھاڑ کھنڈ کے دو قبائل رہنماؤں نے اپنے بنک اکاؤنٹ میں 50،50 لاکھ روپے جمع کروائے ہیں۔ انہی دنوں خبر آئی کہ کانگرس نے ارکان کی حمایت خریدنے کے لیے انہیں 50،50 لاکھ روپے رشوت کی پیشکش کی ہے۔ مدھو کوڑا کا نام بھی رشوت لینے والوں میں شامل تھا۔ اور پھر وہ جھاڑ کھنڈ کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ اس کان مزدور کو آج کل 4 کھرب روپے غیر قانونی طور پر حاصل کرنے کا الزام ہے۔ جس پر ان کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ اس انکوائری کے دوران خبر آئی کہ مدھو کوڑا کے ایک قریبی ساتھی نے چند روز کے اندر 6 کھرب 4 ارب روپے ممبئی کے ایک بنک میں جمع کرائے ہیں۔

تیسری دنیا میں پائے جانے والے رجحانات کی روشنی میں مدھو کوڑا شائد الزامات سے بری ہو جائیں۔ ان پر مقدمات چلیں گے۔ شائد سزا بھی ہو جائے۔ لیکن

دولت تو ان کے پاس ہے نا۔ عزت تو آنی جانی ہے۔ لیکن اب ان کے بچوں کو مفلسی کے باعث تعلیم ادھوری نہیں چھوڑنا پڑے گی۔ پاکستان والوں کا نام میں اس لئے نہیں لیتا کہ آپ سب انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، اب میں اس منافقت کا ذکر کروں گا۔ جو ہماری رگ وپے میں جاری ہے، کیونکہ جب یہ قوم اور ملک کو لوٹنے والے مقدمات میں پھنس جاتے ہیں۔ تو ان کو بچانے کے لئے بھی غریب سڑکوں پر نکل آتے ہیں مظاہرے کرتے ہیں، اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ ان کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی۔ کیونکہ چند ہڈیاں ان کے دستر خوان سے ان کے لئے بھی پھینک دی جاتی ہیں۔

نجیب بھیجی تو ہمیں یاد بہت آئے گا

بدھ کی شام کراچی پریس کلب میں بہت گہما گہمی تھی۔ ڈاکٹر عافیہ کی رہائی کے سلسلے میں ہیومن نیٹ ورک کا سیمینار تھا۔ پریس کلب کے سابق صدر نجیب احمد کی تقریر بہت جذباتی تھی۔ ظلم اور زیادتی کے واقعات اسے ہمیشہ جذباتی کر دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ مظلوموں کی حمایت کرتا تھا۔ چاہے اس حمایت کے نتیجے میں اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ کسی کا کوئی کام ہو وہ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کسی کا ساتھ دینا ہو۔ کوئی وعدہ نبھانا ہو، کسی کے ساتھ جانا ہو۔ وہ ہمیشہ وقت پر پہنچ جاتا تھا۔ شاید یہی اس کی مقبولیت کا سبب تھا۔ اس نے دل کا روگ پال رکھا تھا۔ لیکن وہ بہت سے صحتمند افراد سے زیادہ کام کرتا تھا، سیاست میں بہت سے نازک مقام آتے ہیں۔ لیکن اس کی مسکراہٹ جو اب خواب اور خیال ہو گئی ہے۔ بہت سے شکوؤں کا بہت پیارا سا جواب ہوتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلی ملاقات کب کہاں ہوئی تھی۔ لیکن اس پہلی ملاقات کے بعد وہ دل میں رہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی یاد دل کو کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہے کہ کسی پل چین نہیں پڑتا۔ بار بار اس کی صورت سامنے آتی ہے۔ اور ایک تیر سا دل میں لگتا ہے۔ طارق اسلم نے جمعرات کو فون پر یہ اطلاع دی تو ذہن پر سناٹا چھا گیا۔ بھیجی اب اس دنیا سے چلا گیا۔ کتنے سارے لوگوں کو سوگوار کر کے۔ صحافت

میں اس نے اپنا مقام خود بنایا تھا۔ وہ ان تھک کام کرنے والا کارکن تھا۔ کام کو منظم کرنے کی اس کی صلاحیتیں بے پناہ تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دوست دلدار تھا۔ دوستوں کی دلداری کرتا تھا۔ دائیں بائیں بازو کے سب لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ کراچی پریس کلب کے انتخابات اس کی مقبولت کا پیانہ تھے۔ کئی سال سے وہ مختلف عہدوں پر کامیاب ہوتا رہا۔ ۸۰۰۲ کے سالانہ انتخابات میں نجیب نے 440 ووٹ لیکر سب سے زیادہ ووٹ لینے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے مدمقابل صدر کے عہدے کے امیدوار صبیح الدین غوثی نے 264 لے سکے تھے۔ گزشتہ سال وہ پہلی بار الیکشن ہار گیا۔ لیکن اس نے اس ہار کو اپنی جیت بنالیا تھا۔ کیونکہ اس کی ہار میں اس کے دوستوں کا ہاتھ تھا۔ اور وہ دوستوں کی کامیابی پر نازاں تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کے دیئے ہوئے اس تمغہ شکست کو اپنے سینے پا سجائے رکھا۔ اور اسی میدان میں اس شان سے کھڑا رہا کہ دھوکہ دینے والا رو دے۔ ایسی شان سے دھوکہ کھاؤ۔ کرائم رپورٹر، بااثر صحافی، جنگ اور جیو کے سینئر رپورٹر اور کراچی پریس کلب کے سابق صدر کی حیثت سے وہ بہت اختیار رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے اثر رسوخ سے ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کے کام کئے۔ صحافتی حلقوں اور اپنے دوست احباب میں اسے پیار سے "بھیجی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ نام اس کی شخصیت سے مناسبت رکھتا تھا۔ وہ اپنے گلی محلے علاقے میں بھی اسی طرح

مقبول تھا۔ جامعہ ملیہ میں اسلامی جمعیت طلبہ وابستگی کے بعد اس نے اپنے اس تعلق کو ہمیشہ نبھایا۔ وہ جمعیت کا رکن بنا۔ اور اس نے رضائے الٰہی کے حصول کو اولیت دی۔ اکتوبر1961ء کو پیدا ہونے والے نجیب احمد کی یہ عمر جانے کی نہ تھی۔ لیکن اسے جلدی تھی اس لئے اس بہت سے بڑے بڑے کام بہت تھوڑے عرصے میں کر لئے۔ جمعیت کے ہفتہ کتب کے موقع پر اس نے کہا تھا، کہ لوگ مختصر سی زندگی میں ڈاکے ڈالتے ہیں اور لوگوں کی جانیں لیتے ہیں مگر جمعیت کے کارکنان نوجوانی کی عمر میں طلبہ کی امداد اور انکا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ہفتہ کتب منعقد کرکے فنڈز جمع کر رہے تاکہ کوئی طالبعلم تعلیم سے محروم نہ رہ جائے اس کام کو جتنا سراہا جائے کم ہے۔ نجیب احمد نے کہا تھا کہ آپ جو کام کر رہے ہیں اسے بھرپور طریقے سے جاری رکھیں اس راہ میں رکاوٹیں بھی آئیں گی اور مخالفین آپ پر تنقید بھی کرینگے مگر طلبہ کی بھلائی اور انکی خدمت کا کام جاری رکھیں۔ یہی اس کا مشن تھا۔ اس نے مخالفین اور تنقید کی کبھی پروانہیں کی۔ وہ آزادی صحافت کا جرنیل تھا۔ پرویز مشرف کے پورے دور میں اس نے جرات کے ساتھ آمریت سے لڑائی لڑی۔ کراچی میں صحافیوں اور آزادی صحافت کی حامی دوسری تنظیموں نے مزارِ قائد پر دھرنا دیا تو پریس کلب سے ریلی نکالی گئی جس کی قیادت پاکستان میں صحافیوں کی تنظیم کے رہنما مظہر عباس۔ کراچی پریس کلب کی صدر صبیح الدین غوثی اور نجیب احمد نے کی۔

کراچی میں صحافی رشید چنا عبدالطیف ابو شامل، محمد طاہر، علی الطاف اور زاہد خٹک کی گرفتاری اور پولیس چھاپوں کے خلاف یہ ریلی نکالی گئی تھی۔ شہر میں ایک بڑے عرصے کے بعد صحافیوں نے بھرپور طاقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس موقع پر جلوس کے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کراچی پریس کلب کے صدر کی حیثیت سے نجیب احمد نے کہا تھا کہ اس ملک میں ڈکٹیٹروں نے حکومت زیادہ عرصے کی ہے اور اس دور میں بھی صحافیوں نے اپنے فرائض کوڑے کھا کر اور جیلوں میں جا کر بھی ادا کیے ہیں۔ کراچی پریس کلب نے پہلے ضیاالحق کو للکارہ تھا۔ جس کے بعد سیاسی جماعتوں کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اب صدر مشرف کے خلاف جدوجہد کی جائیگی۔ چینلز کی بندش اور پیمرا ترمیمی آرڈیننس کے خلاف احتجاج کے دوران ایک سو ایک سو ایک سی صحافیوں کی پریس کلب سے گرفتاری کے موقع پر اس کی جرات اور بہادری یاد رہے گی۔ کئی مواقع پر نجیب کی گرفتاری کے لئے پریس کلب کا گھیراؤ کیا گیا۔ لیکن اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہ آئی اور اس نے کبھی راہ فرار اختیار نہیں کی۔ روزنامہ ''اسلام'' کراچی کی بندش کے خلاف احتجاج میں سوائے چند چینلز کے تمام نشریاتی اداروں کی جانب سے شدید مایوسی کا سامنا رہا تھا۔ تاہم اس موقع پر صحافی حلقوں کی جن چند شخصیات ''پی ایف یو جے'' کے سیکریٹری مظہر عباس، راولپنڈی اسلام آباد پریس کلب کے صدر مشتاق منہاس، بزرگ صحافی عبدالحمید چھاپرا، کراچی یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری خورشید

عباسی، یوسف خان، مقصود یوسفی کے ساتھ کراچی پریس کلب کے صدر نجیب احمد، سیکریٹری امتیاز خان فاران کی آواز سب سے توانا تھی۔ نجیب کی موت نے کراچی پریس کلب کو سوگواری کی چادر اوڑھا دی ہے۔ اگلے ہفتے کراچی پریس کلب کے الیکشن ہیں، لیکن اس بار ایک مہربان چہرہ نظر نہیں آئے گا۔ نجیب بھیجی تو ہمیں بہت یاد آئے گا۔

دنیا کی اہم ترین اور طاقتور شخصیات

مجھے طاقت اور اقتدار سے محبت ہے لیکن یہ محبت ایک آرٹسٹ جیسی محبت ہے۔ جیسی ایک فنکار اپنے وائیلن سے کرتا ہے۔ نیپولین بونا پارٹ کا یہ قول آج کی دنیا میں پوری طرح صادق نہیں آتا۔ دنیا میں ہر شخص کو اپنے اقتدار سے محبت ہے۔ چاہے یہ اقتدار اور طاقت کسی عورت کو اپنے گھر پر ہو چاہے کسی دفتر میں کسی باس کو حاصل ہو۔ لیکن اصل مزا تو طاقت کے نشے میں ہے۔ جو بادشاہوں کو بادشاہ بناتا ہے۔ ایک سربراہ مملکت کی طاقت کا نشہ کچھ دیگر چیز ہے۔ یہ قوت اور اقتدار ایک مذہبی پیشوا کے اقتدار سے مختلف ہوتا ہے۔ قوت اور حکمرانی کے دائرے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی صحافی کے قلم کی طاقت کا کسی دہشت گرد کی طاقت سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن جب تک قوت اور طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ کسی کی طاقت کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کوئی شخص دنیا کے بہت سے لوگوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ پوپ بینڈیٹ ایک ارب سے زیادہ افراد کے مذہبی پیشوا ہیں۔ یعنی دنیا کے چھٹے حصے پر ان کا اثر نفوز ہے۔

دنیا کو چلانے والی اہم ترین اور انتہائی طاقتور شخصیات کی ایک فہرست امریکی بزنس میگزین "فوربز" نے شائع کی ہے اس فہرست میں سربراہان مملکت،بڑے سرمایہ دار سوشل ورکرز، مذہبی پیشوا حتیٰ کہ مجرموں کو بھی شامل کیا گیا ہے مذکورہ جریدے کے مطابق یہ وہ

شخصیات ہیں جو اپنے اپنے شعبوں میں انتہائی اثرو رسوخ اور اختیارات کی حامل ہیں۔
ء کی طاقتور شخصیات کی فہرست مرتب کرنے والے صحافیوں نے کہا کہ فہرست 2009
مرتب کرنے سے قبل ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ "اختیار یا طاقت کی حقیقت کیا
ہے؟" اور کسی شخص کے با اثر ہونے کی کسوٹی کیا ہونی چاہیے؟ اس کے نتیجے میں اثرو
اختیار کی چار اقسام سامنے آئیں" مائیکل نور اور نکول پرل روتھ نے کہا کہ "کسی ایک
کسوٹی یا رویہ پر پورا اترنے والا شخص با اثر اور با اختیار نہیں، ضروری ہے کہ ایسی
شخصیت چاروں جہات کی کسوٹی پر پورا اترتی ہو۔ پہلی کسوٹی: کیا ایسا شخص دیگر بہت سے
لوگوں پر اثر اور اختیار رکھتا ہے؟ دوسری کسوٹی: کیا یہ شخص اپنے معاصرین کے مقابلے
میں زیادہ مالی وسائل رکھتا ہے؟ تیسری کسوٹی: کیا یہ شخص دیگر بہت سے حلقوں اور
شعبوں میں اثرو نفوذ رکھتا ہے؟ چوتھی کسوٹی: کیا یہ شخص اپنے اثرو رسوخ اور اختیار کا
باقاعدہ استعمال کرتا ہے؟

اس طے کردہ اصول کے مطابق امریکی صدر باراک اوباما کو اس وقت دنیا کی انتہائی با
اختیار اور طاقتور شخصیت قرار دیا گیا ہے۔ چین کے صدر ہو جن تا دوسری اہم، طاقتور
اور اثرو رسوخ رکھنے والی شخصیت ہیں جبکہ روس کے صدر ولادی میر پوٹن کو اس فہرست
میں تیسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ ۵۸ سالہ سعودی فرماں روا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز
طاقتور شخصیات کی فہرست میں نویں نمبر

پر ہیں۔ اس فہرست میں وہ سب سے زیادہ معمر فرد ہیں۔ جب کہ فہرست کے سب سے کم عمر بااثر افرد میں ۳۶ سالہ گوگل کے بانی سرگے برین اور لیری پیج بھی شامل ہیں جن کا نمبر پانچواں ہے۔، پاپائے روم بنی ڈکٹ 11 ویں پوزیشن پر، اٹلی کے وزیر اعظم برلسکونی 12 ویں، جرمن چانسلر انجیلا مرکل 15 ویں، بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ 36 ویں، القاعدہ رہنما اسامہ بن لادن، 37 ویں، ایران کے رہبر اعلیٰ آیت اللہ خامنہ ای 40 ویں اسرائیلی وزیر اعظم بینجمن نا تین یاہو ۵۴ ویں نمبر پر ہیں۔ اس فہرست میں منشیات کے بے تاج بادشاہ جوکین گزمین کو ۴۱ واں نمبر دیا گیا۔ اس فہرست میں بی بی سی کے ڈائریکٹر جنرل مارک جان تھامپسن بھی شامل ہیں جن کا نمبر ۵۶ واں ہے۔ جبکہ وینز ویلا کے صدر ہوگوشاوینز کو آخری پوزیشن 67 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ فوربز کی اس فہرست میں پاکستانی وزیر اعظم اور بھارتی وزیر اعظم کے درمیان اسامہ بن لادن نام ڈال کر خطے کی سیاسی صورتحال پر خاموش تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں ایک نام ایسا بھی ہے جو کسی بھی طرح بااثر اور بااختیار نہیں کہے جا سکتے ہیں اور اس حوالے سے طے کردہ اصول و ضوابط کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتا ہے یہ شخصیت وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی ہے جریدے کے مطابق گیلانی ان افراد میں شامل ہیں جو مجموعی طور پر 10 کروڑ انسانوں میں اپنا اثر و نفوذ رکھتے ہیں یوسف رضا گیلانی کو اس فہرست میں 38 ویں پوزیشن دی گئی ہیں۔ وزیر اعظم 17 ویں ترمیم کے تحت حاصل اختیارات کے بغیر بے اثر

تصور کئے جاتے ہیں، ان کے مقابلے میں صدر آصف زرداری کے پاس مالی وسائل بھی بہت زیادہ ہیں اور ایک اندازے کے مطابق انکی مالیت 40 ارب ڈالر سے زائد ہے اور گیلانی نے اپنے انتخابی گوشوارے میں اپنے اثاثوں کی مالیت صرف دو لاکھ بتائی ہے۔

اس فہرست میں مائیک ڈیوک کا نمبر ۸ واں ہے۔ جو امریکہ میں پرائیوٹ سیکٹر میں سب سے زیادہ ملازمین رکھتے ہیں، وہ وال مارٹ کے چیف ایگزیکٹیو ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر بل کیلر بھی اس دوڑ میں ۷۵ واں نمبر پر ہیں۔ جن کے اثر رسوخ اور وسائل انڈسٹری کے دیگر افراد کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کسی شخص کے عہدے سے اس کی قوت اور اثر کا اندازہ لگانا مناسب نہیں ہے۔ اس کے لئے کسی فرد کی سوچ، دانش مندی، مثبت انداز فکر، کردار، اخلاقیات اور اس کے کام کو بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کیا اس نے قوت اثر رسوخ کا صحیح سمت میں استعمال کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کامیاب لوگوں کے پیچھے کچھ اور شخصیات ہوتی ہیں۔ وہی قوت کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں روتھ چائلڈ اور راک فیلر کے نام لئے جاتے ہیں، جن کے سامنے اوباما اور ہیلری کیلنٹن کٹھ پتلی شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ دنیا میں غربت، مسائل، مشکلات تباہی کا سبب یہی لوگ ہیں، جو دنیا کو جمہوریت کے نام پر بے وقوف بنا رہے ہیں۔ دنیا انھیں سچائی، انصاف کا علمبردار سمجھتی ہے۔ لیکن یہ اخلاقیات کے ادنی معیار پر بھی پورے نہیں اترتے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

جب پوری قوم این آر او کے عدالتی فیصلے کی منتظر تھی۔ اس وقت وقفے وقفے سے وفاقی کابینہ کے ان فیصلوں کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ جن میں سادگی اور کفایت شعاری کے اقدامات کئے گئے تھے۔ دو تین وزارتیں تو اسی دن ایک دوسرے میں ضم کر دی گئی۔ مجھے یہ اعلانات سن کر ۱۹۷۷ کا وہ زمانہ یاد آ گیا۔ جب قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کی حکومت کے مذاکرت ہو رہے تھے۔ ان مذاکرات کے جلو میں بھٹو صاحب کی جانب سے شراب پر پابندی، جمعہ کی چھٹی سے اعلانات ہوئے۔ لیکن مذاکرات بدستور ایک تنی ہوئی رسی پر چلتے رہے جس کا نتیجہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کی صورت میں قوم کو بھگتنا پڑا۔ این آر او جسے اب گندہ قانون کہا جا رہا ہے۔ اور جس کے بارے میں سپریم کورٹ کے ۱۷ رکنی بینچ نے متفقہ پر کالعدم قرار دیا ہے۔ اور اس کے بارے میں کہا ہے کہ ایسا کوئی قانون تھا ہی نہیں۔ ۷ اکتوبر ۲۰۰۷ کو ایک آمر نے صرف آٹھ ہزار اکتالیس افراد کو پہنچانے کے لئے ایک ٹریلن ۵۶ بلین روپے کے قرضے معاف کر دیے۔ یہ ۱۷ کروڑ عوام کا پیسہ تھا۔ کسی کے باپ کی جاگیر نہ تھی کہ اس بے دردی سے لٹا دیا جاتا۔ شاہ خرچی اور فیاضی ایسی کہ صرف ایک شخص کو ایک اعشاریہ پانچ بلین ڈالر کا قرض معاف کیا گیا۔ ایک سیاست دان کی بیوی کو ۱۳۰ ملین معاف کر دئے گئے۔ جس قدر رقم این آر او کے تحت معاف کی گئی

ہے۔ اس میں چھ کیری لوگر بل آ سکتے ہیں۔ قوم چاہتی ہے کہ یہ پیسہ واپس لایا جائے، یہ نظام مملکت تو چلنا چاہئے لیکن ان لوگوں کا احتساب ضروری ہے جنھوں نے قوم کو لوٹا ہے۔

وفاقی کابینہ نے اب جس کفایت شعاری کی سفارشات کی منظوری دی ہے۔ اس میں وزراء کی تعداد 60 سے کم کرکے 30، وزارتوں کی 49 سے 30 اور ڈویژنوں کی تعداد سے 37 کرنے کا فیصلہ، اضافی وزراء فارغ کر دیئے جائینگے، صدر، وزیراعظم کے 52 غیر ملکی دوروں میں 40 فیصد اور وزراء کے 30 فیصد کمی، حکومتی خرچ پر حج ختم، صدر ، وزیراعظم کے قافلے میں سات، سات گاڑیاں، گورنر وزیر اعلیٰ چھ، چھ اور وزراء صرف دو گاڑیوں کا سکواڈ رکھ سکیں گے، 1800 سی سی سے اوپر کی گاڑیوں پر پابندی، غیر ملکی دروں پر وفود کی تعداد کم سے کم، وی آئی پی افراد کے نجی جہاز کمرشل استعمال پر دینے کا فیصلہ، بیوروکریسی اور وزراء کو یوٹیلٹی سہولتوں کی بجائے ماہانہ رقم دی جائے گی، فرنیچر تبدیل کرنے پر پابندی، چائے پانی کا خرچ صرف 30 فیصد اور سرکاری تقریبات میں صرف ون ڈش ہوگی، ضمنی گرانٹیں ہر تین ماہ بعد پارلیمنٹ سے منظور کرائی جائینگی صدر کے موٹر کیڈ میں 25 سے 30 گاڑیاں ہوتی تھیں اب صرف 7 گاڑیاں ہوں گی۔ یہ سارے اقدامات اب کیوں کئے جارہے ہیں، اس کے کرنے کا صحیح وقت تو وہ تھا۔ جب یہ حکومت بنی تھی۔ گزشتہ دو سال میں عوام پر مہنگائی کو جو طوفان آیا ہے یا

لایا گیا ہے۔ اس سادگی پر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

ایک اور لانگ مارچ کی تیاری

قائد اعظم ایک عظیم قائد ہی نہیں ایک بہترین انسان اور عوام کا ہمدرد تھے۔ انہوں نے ہمیشہ انسانوں اور مسلمانوں کی بھلائی کے لئے کام کیے۔ انہوں نے پاکستان کو ایک مستحکم ملک کی حیثیت دینے کے لئے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا۔ بیماری اور صحت کی خرابی نے انہیں اتنی زیادہ مہلت نہ دی کہ وہ اس ملک کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر جاتے لیکن انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ اصولوں کی پیروی کی۔ آج بانی پاکستان کی وہ تقریر یاد آجاتی ہے جو انہوں نے 11 اگست 1947ء میں ارکان آئین ساز اسمبلی کو مخاطب کر کے فرمائی تھی۔ قائداعظم نے فرمایا تھا: "مجھے دوسرے ممالک کا زیادہ علم نہیں مگر آج ہمارے خطے کا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن اور رشوت ہے کرپشن زہر کے مانند ہے۔ مجھے یقین ہے ارکان اسمبلی یہ زہر ختم کرنے کیلئے دل وجان سے کوششیں کریں گے۔" قائد کو پاکستان کے قائم اور دائم رہنے پر بے انتہا یقین تھا۔ جب ہندو اس ملک کے جلد دیوالیہ ہوجانے کی باتیں کرتے تھے۔ تو انہوں نے ۵ نومبر ۱۹۴۴ کو مسلم لیگ کے پلاننگ کمیٹی کے اجلاس میں کہا تھا۔ ہمارے پاس پاکستان میں پیٹرولیم، کوئلے، خام لوہے اور دوسری معدنیات کے ذخائر موجود ہیں۔ میں ان بیانات میں کسی مبالغہ آرائی کو قبول نہیں کرتا میں بحیثیت ایک عام آدمی کے کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں پاکستان کبھی

دیوالیہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک مستحکم ریاست ہوگی۔ اگرچہ یہ اتنا دولت مند نہیں ہوگا جیسے کہ ہندوستان۔ اسی تقریر میں قائد نے فرمایا تھا کہ آپ سے میری درخواست ہے کہ یہ نکتہ لازمی طور پر اپنے ذہن میں رکھیں کہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ امیر، امیر تر ہو جائیں اور چند افراد کے ہاتھوں میں دولت کو جمع کرنے کا عمل تیز کر دیا جائے۔ ہمارا مقصد عوام کے عمومی معیار زندگی کو یکساں طور پر بلند کرنا ہوگا۔ ہمارا نصب العین سرمایہ دارانہ نہیں بلکہ اسلامی ہونا چاہیئے۔

یہ تھے ہمارے قائد اور ان کے رہنما اصول آج ہمارے سیاست دانوں، تاجروں، بیورو کریٹ، اور بااثر طبقے نے اس ملک کو لوٹ مار کرکے کیا بنا دیا ہے۔ افسوس بانی پاکستان کے بعد سیاستدانوں سے لے کر بیورو کریسی تک میں کرپشن کی سبھی اقسام نے پرورش پائی۔ دنیا میں کرپٹ حکمران کبھی پھل پھول نہ سکے۔ انڈونیشیا کا "مرد آھن" جنرل سوہارتو قومی خزانہ لوٹنے، مخالفین پر ظلم وستم ڈھانے اور غیروں امریکیوں کی چاکری کرنے میں سرفہرست ہے تاہم اس کا دور حکمرانی نیک و بد کا عجیب امتزاج ہے۔ جنرل سوہارتو دور حکمرانی سے پہلے دس برس تو ملک کی تعمیر وترقی میں محو رہا لیکن پھر ذاتی خواہشات، اولاد و عزیز اوقارب کی 'ضروریات" اور دیگر انسانی کمزوریاں اس پر غالب آگئیں۔ اس نے قومی خزانے سے رقم لوٹنے کے نت نئے طریقے ایجاد کیے۔ اس کی دیکھا دیکھی

دوسرے سیاست دان بھی جب اقتدار میں پہنچے تو مختلف طریقے اپنا کر کرپشن کرنے لگے۔ یوں انھوں نے بھی اپنے ملکی و غیر ملکی اکاؤنٹ لوٹ مار کی رقم سے بھر لیے۔ یہ ساری کرپشن بڑی صفائی سے ہوئی تاکہ ان کے خلاف کم سے کم ثبوت سامنے آسکیں۔ فلپائن کا حکمران فرڈینڈ مارکوس نے 1965ء میں اقتدار سنبھالا اور 1986ء میں رخصت ہو گیا اس دوران مارکوس نے کرپشن کے کئی ریکارڈ توڑ کر تاریخ میں اپنا نام "محفوظ" کرالیا اور دوسروں کیلئے عبرت ناک مثال بن گیا۔ مارکوس نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور اقتدار بحال رکھنے کیلئے پہلا کام یہ کیا کہ عدلیہ بیوروکریسی اور فوج میں اپنے "آدمی" مقرر کر دیئے اس ضمن میں رشوت دھونس اور دھمکی سے خوب کام لیا گیا۔ بعد ازاں اس نے ارکان اسمبلی کی تجوریاں بھر کر آئین میں من مانی تبدیلیاں کرالیں۔ یوں یہ شق ختم ہو گئی کہ کوئی آٹھ سال بعد دوبارہ صدر نہیں بن سکتا۔ اقتدار کو دوام بخشنے کے بعد مارکوس اور اس کے عزیز و دوست کھل کر کھیلے۔ انھوں نے سرکاری اداروں کا چارج سنبھال لیا۔ سودوں میں گھپلے ہونے لگے۔ بینکوں سے قرضے لیے گئے کئی سرکاری اداروں کی جائیدادیں ہڑپ کر لی گئیں۔ جب وہ ادارے کمزور ہو گئے تو انہیں اونے پونے داموں بیچ دیا گیا ان سودوں میں بھی کمیشن کھایا گیا غرض مارکوسی قبیلے نے ہر وہ کرپٹ راہ اپنائی جس نے انہیں دولت مل سکے۔ کرپشن کے اسیر دیگر حکمران کرپٹ ترین حکمرانوں کی فہرست میں تیسرا نمبر زائرے (یاکانگو) کے جنرل موبوتو سیکو کا ہے۔ موصوف ساڑھے اکتیس سال (1965ء تا 1997ء) تک

اپنے ملک میں حکمرانی کرتا رہا۔ اس دوران موبوتو نے کرپشن کو ملکی کرنسی بنا دیا۔ اس کے دور حکومت میں رشوت لینا اور دینا ایک فن اور باقاعدہ نظام بن گیا۔ دنیا کے دس کرپٹ ترین لیڈروں میں سربیا کا حکمران، میلوشویچ 1 ارب ڈالر، صدر ہیتی، جین کلاڈو لئیر 300 تا 800 ملین، صدر پیرو، البرٹو فیوجی موری 600 ملین، وزیر اعظم یوکرائن پالو لازارینکو 114 تا 200 ملین، صدر نکاراگوا، آرنولڈو الیمان 100 ملین اور صدر فلپائن، جوزف ایسٹرڈ 70 تا 80 ملین بھی شامل ہیں۔ یہ تمام لیڈر لوٹ مار اور کرپشن کرنے کے بعد اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش ہو چکے ہیں۔ لیکن پاکستان میں جو کرپشن ہوئی ہے وہ ان ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ جب تک اس ملک میں قانون کا راج اور بدعنوانوں سے لوٹی ہوئی رقم واپس نہیں لی جائے گی اس ملک کا نظام درست نہیں ہوگا۔ اور اس کے لئے عوام کو ایک اور لانگ مارچ کی تیاری کرنا ہوگی۔

یہی نوشتہ دیوار ہے

برطانوی وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل نے کہا تھا کہ جمہوریت بدترین نظام حکومت ہے، لیکن ان نظاموں سے بہتر ہے جو اب تک آزمائے جا چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کہے گئے اس قول میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی اور جمہوریت کی اچھائیوں برائیوں کو پرکھنے کے بعد بھی دنیا میں سب سے مقبول نظام حکومت جمہوریت ہی ہے۔
پاکستان میں بھی ہر سیاسی جماعت جمہوریت کے گن گاتی ہے، خود کو جمہوری نظام کا علمبردار کہتی ہے اور اس مقصد کے لیے دی جانے والی قربانیوں کا ذکر فخر سے کرتی ہے۔ لیکن اس جمہوریت میں بھی ایک آمریت چھپی ہوئی ہے۔ سیاسی جماعتوں میں جبر اور آمریت کی فضا ان پارٹیوں کو جمہوریت کا وہ مضبوط ستون نہیں بننے دیتی جو ان کا اصل مقام ہے۔ آج بھی ملکی تاریخ کے کئی اہم فیصلے پاکستانی عوام سے مخفی ہیں جن پر ماضی میں مذاکرات دبئی، ریاض، لندن اور واشنگٹن میں ہوتے رہے ہیں۔
جمہوریت ایک ایسا عمل ہے جس کے تحت ہمیں ویسے ہی حکمراں ملتے ہیں جس کے ہم لائق ہوتے ہیں۔ دوسرا خطرہ سیاسی جماعتوں میں اندرونی جمہوریت کا فقدان ہے۔
ملک کی تمام بڑی سیاسی پارٹیاں شخصیات کے گرد گھومتی ہیں اور طاقت کا مرکز

بھی پارٹی یا اس کا کوئی عضو نہیں بلکہ ایک شخصیت ہی ہوتی ہے جس کی قیادت کو پارٹی کے اندر کوئی چیلنج کر سکتا ہے نہ ہی اس کے فیصلے سے کوئی اختلاف کر سکتا ہے۔ اب یہ ہماری قسمت ہے کہ یہ حکمران کیسے ہیں۔ بد دیانت، لٹیرے، قرض کی رقم پی جانے والے، اختیارات سے تجاوز کرنے والے۔ پاکستان میں کتنے ایسے سربستہ راز ہیں۔ جن سے آج تک پردہ نہیں اٹھا ۱۶ دسمبر آ کر گئی۔ لیکن آج تک حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی۔ پنجاب بنک کی رقم تو واپس مل جائے گی۔ لیکن 990ء میں انڈس بنک میں جو لوٹ مار ہوئی اس کا کیا ہوگا۔ کراچی کے ایک بزنس مین نے 14 کروڑ روپے کس کو دیئے۔ اس رقم میں سے کس کس کو بندر بانٹ ہوئی۔ اصغر خان کی رٹ پٹیشن ابھی سپریم کورٹ میں ہے۔ اس پر بھی بات ہونے والی ہے۔ لیکن اصل مسئلہ سیاسی جماعتوں کا ہے۔ جو اپنی صفوں سے کالی بھیڑوں کو نکالنا نہیں چاہتی۔ پیپلز پارٹی اور ن لیگ پھر باہم شیر وشکر ہو جائیں گے۔ جمہوری حکومت اب تک کے عرصہ میں عوام کو ڈیلیور نہیں کر سکی، بجلی، پیٹرول، گیس، چینی، آٹا کے بحرانوں پر قابو پانے میں اب تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اب این آر او پر فیصلہ آنے کے بعد عوامی قوت سے بحال ہونے والی عدلیہ کی کارکردگی پر بھی انگلیاں اٹھ رہی ہیں، دوسری طرف ملک میں آئے روز ایک نیا بحران جنم لیتا ہے اور اس شدت کے ساتھ کہ لوگ دیگر بحرانوں کو بھول جاتے ہیں۔ کرپشن کے الزامات کا انبار ہے اور حکومت کسی بھی معاملہ میں اپنی پوزیشن کلیئر نہیں کر سکی، حالیہ چینی کے

بحران، سرکاری اراضی کی لوٹ سیل اور کرائے کے بجلی گھروں کے علاوہ بیرونی سودوں میں بھی کمیشن اور کک بیکس کا الزام ہے۔ لوٹ کھسوٹ کے جس نظام کی وجہ سے امریکہ عام پاکستان شہریوں میں بدنام ہے اس صورتحال کا مداوا کرنے کیلئے پاکستان میں ایک ایسا نظام حکومت ضروری ہے جو کرپشن سے مکمل طور پر پاک ہو جس کا سربراہ نیک نام، دیانتدار اور ملک و قوم کا ہمدرد ہو، کوئی نہیں چاہتا کہ یہ سسٹم ڈی ریل ہو۔ پاکستان خونیں انقلاب کی طرف بڑھے قوم اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ لوگ اب محاسبہ چاہتے ہیں۔ پاکستان کی دولت لوٹنے والوں کا۔ یہی نوشتہ دیوار ہے

یہ کام خواجہ سرا ہی کر سکتے ہیں

عدالت عظمٰی نے جو ہیجڑوں کے ذریعے قرض دہندگان سے قرض وصول کرنے کی تجویز دی ہے تو اس میں بھی ایک رمز پوشیدہ ہے۔ بر صغیر میں خواجہ سراؤں کو ہمیشہ شہنشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ وہ محل سرا کے محافظ، زنان خانے کے رابطے، بیگمات کے راز دان، شہزادوں کے اتالیق، ملکہ اور شہزادیوں کے منہ چڑھے تھے۔ سب سے زیادہ شاہ کے وفادار تھے۔ اب ان کا شمار نہ ہی اور نہ شی میں ہوتا ہے۔ شاید یہ کارخانہ قدرت کا وہ خام مال ہے جو غلطی سے تیار ہوگیا اور بازار میں آگیا۔ اب نہ ان کی کوئی کھپت ہے نہ کوئی قدر۔ مغل دربار تھا تو انھیں بھی اقتدار تھا۔ وہ بھی کہیں مشیر سفیر تھے۔ اب نہ کوئی دربار ہے نہ کوئی وقار۔ بازار میں ہیں تو استہزاء کا سبب ہیں، محلے میں ہیں تو سب کے لئے عجوبہ روزگار، لوگ تفریح کے لئے ان سے دل بہلاتے ہیں، کوئی انسان سمجھتا ہی نہیں، گھر ان کے لئے نہیں، روزگار ان کے لئے نہیں، تعلیم ان کے لئے نہیں، ایک بازار ہے ٹھکانہ جس کے لئے شہر شہر مارے مارے پھرتے ہیں۔ بھلے وقتوں میں کوئی ناچ گانا دیکھ کر مدد کر دیتا تھا، اب کوئی تھوکتا بھی نہیں۔ ۷۷ کی تحریک میں ان خواجہ سراؤں کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے جلوسوں کا یہ مقبول نعرہ تھا۔ ایوب آیا، میں نہ بولی، یحیٰی آیا میں نہ بولی، بھٹو آیا تو میں بولی چلاؤ گولی، چلاؤ گولی

عدالت عظمٰی کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے خواجہ سراؤں کے طرف سے دائر ایک درخواست کی سماعت کے دوران حکومت کو جو صائب مشورہ دیا ہے کہ وہ امتیازی سلوک کا شکار معاشرے کے اس طبقے کو باعزت ملازمتیں دینے کے لیے حکمت عملی وضع کرے۔ اور یہ تجویز بھی دی ہے کہ قرض نادہندگان سے وصولی کے لیے حکومت پاکستان خصوصاً انکم ٹیکس کا محکمہ خواجہ سراؤں کی خدمات حاصل کرنے پر غور کرے جیسا کے ہمسایہ ملک بھارت کی بعض ریاستوں میں کیا گیا ہے۔ یہ دراصل معاشرے اور حکمرانوں کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔ جس معاشرے میں قوت والے اور مرد جو کام نہ کرسکیں بلا شبہ وہ کام زنخوں کو سونپ دینا چاہئے۔ قوم کے اربوں روپے شیر مادر سمجھ کر پی جانے والوں سے یہ رقم یہ لوگ ہی نکلوا سکیں گے۔ انھیں اپنی نہ عزت کی فکر ہو گی نہ وقار کی۔ گلے میں ڈھول ڈال کر اپنی پارٹی کے ساتھ جب یہ لوگ بڑے لوگوں کے محلوں کا محاصرہ کرکے گا بجا کر ان قرضوں کی تفصیل بتا کر عوام کو جمع کر لیں گے تو بہت سوں کو اپنی عزت بچانی مشکل ہو جائے گی۔ ملک بھر میں خواجہ سراؤں کی تنظیموں نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس سے نہ صرف ان کی برادری کے لیے روزگار کا مسئلہ حل ہو گا بلکہ ملک سے لوٹی ہوئی دولت کی واپسی میں بھی آسانی ہو گی۔ کراچی میں بندیا رعنا خواجہ سراؤں کی تنظیم " جیا" کی سربراہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ بھاری قرضے لے کر خاموش بیٹھے ہیں ہم جب ان

کے دروازوں پر جا کر بیٹھیں گے تو شاید وہ یہ نوبت ہی نہ آنے دیں اور خود ہی قرضہ واپس دیں اور اپنے واجبات ادا کر دیں۔ خواجہ سراوں کو معاشرے کا متحرک رکن بنانے کے لیے یہ سپریم کورٹ کی جانب سے ایک اچھا قدم ہے جو قرض نا دہندگان کے لیے یقیناً برا ثابت ہوگا کیونکہ وہ اس وقت تک ڈیرا ڈالے رکھیں گے جب تک رقم واپس نہیں مل جاتی۔ کیوں کہ نہ تو ہمارے کوئی بچے ہیں اور نہ ہمیں گھر واپس جانے کی جلدی ہو گی۔ پاکستان میں چھوٹا قرضہ لینے والے افراد تو خود کشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن بڑا قرضہ لینے والوں کے لیے کھلے عام معافی ہے۔ اور اس کے لئے گندے قانون این آر او کا سہارا لیا گیا ہے۔ اب خواجہ سرا اس پر ایسے ایسے مکھڑے گائیں گے کہ گلی گلی اس کی شہرت ہو گی۔

کراچی والے کب تک گیدڑ کی موت مرتے رہیں گے

وزیر اعظم نے کراچی میں یوم عاشور کے جلوس میں بم دھماکے کے بعد ہونے والے مالی نقصان کے ازالے کے لئے ایک ارب روپے کے پیکیج کا اعلان کیا ہے اس امداد کو کیا نام دیا جائے۔ ۴۸ گھنٹے سوچ بیچار کرکے جس امدادی پیکیج کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسے پی نٹ کہا جاسکتا ہے۔ مونگ پھلی کا دانہ۔ کیا ایک سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے یہی سلوک مناسب ہے۔ کراچی جو سب سے زیادہ ٹیکس دیتا ہے۔ جو اس ملک کی معیشت کی شہ رگ ہے۔ جو ملک پر آنے والے ہر مشکل وقت میں فرنٹ لائن پر کھڑا رہتا ہے۔ جس کے عوام، تاجر، وکلا، صحافی، مزدور، اساتذہ، سول سوسائٹی کے لوگ اس ملک کی سلامتی کے لئے جانوں کا نذرانہ دیتے رہے ہیں۔ اور دے رہے ہیں ان کی قربانیوں کا یہی صلہ ہے۔ کیا کراچی کے عوام لوٹ کا مال ہیں۔ کیا یہ لوگ بھیڑ بکریاں ہیں۔ کیا یہاں کے شہری اور تاجر اور عوام کی جانیں اور مال اور املاک اس لئے ہے کہ کوئی بھی شر پسند گروہ جب چاہے اسے تباہ کردے، جب چاہے لوٹ لے، جب چاہے اس شہر میں قتل و غارت گری کردے۔ کیا اس شہر کے لوگوں کو تحفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا یہاں کے کاروبار کرنے والوں کی سلامتی حکومتی اداروں کا فرض نہیں ہے۔ کیا یہاں کی عوام کے جان اور مال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو پھر اس شہر میں بار بار ایسے واقعات کیوں

رونما ہو رہے ہیں۔ رٹ آف دی گورنمنٹ کہاں ہے۔ جب اس شہر پر قیامت ٹوٹتی ہے۔ تو سارے امن وامان قائم رکھنے والے ادارے کہاں سو جاتے ہیں۔ شرپسندوں کو لوٹ مار سے روکنے کے لئے گولی کیوں نہیں چلتی، پولیس، رینجرز، اور دیگر ادارے کہاں سو جاتے ہیں۔ فائر بریگیڈ کہاں رہ جاتے ہیں۔ میں نے کراچی کو جلتے ہوئے ۲۷ دسمبر کو دیکھا تھا، ۲۱ مئی کو دیکھا تھا، ۹ اپریل کو دیکھا تھا، کراچی کے ضمنی انتخاب کے ۲۰۰۷ موقع پر دیکھا تھا۔ ان تمام مواقع پر حکومت کہاں تھی۔ کراچی کے شہریوں کی یہی بے بسی ان کا مقدر ہے۔ تو کیا ہم اپنی آستینوں میں سانپ پال رہے ہیں۔ کیا ہم زہریلے ناگوں کو دودھ پلا رہے ہیں، اور کیا ہم لیٹروں کو محافظ سمجھ بیٹھے ہیں، مگرمچھ کے آنسو شاید یہ محاورہ ایسے ہی کسی وقت کے لئے کہا گیا ہے۔ کراچی ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ کو چار دن تک جلتا رہا۔ نئی نئی گاڑیاں لوگوں سے چھین کر ان کی آنکھوں کے سامنے ان سے ڈیکٹ نکالے گئے۔ سی این جی کھولی گئی، ٹائر اتارے گئے۔ پھر ان کو آگ لگائی گئی۔ یہ لوگ آسمان سے اتر کر نہیں آئے تھے۔ ان کے چہروں پر نقاب نہیں تھے۔ لیکن ان کی اس شرپسندی پر کوئی انھیں روکنے والا نہیں تھا۔ سب مہر بلب تھے۔ دکانیں جلتی رہی فائرنگ ہوتی رہی لوٹ مار جاری رہی مسلسل چار دن تک کراچی میں یہ کھیل جاری رہا۔ لیکن دو سال بعد بھی آج تک کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔

جب ۲۱ مئی کو نقابوں سے بے نیاز بے خوف چہرے ہاتھوں میں ہتھیار لئے لوگوں کو قتل کر رہے تو بھی پورے ملک میں ایک مجرمانہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور جب ۹ اپریل کو وکلاء کی لائین سے کھڑی گاڑیوں پر، ان کے دفاتر پر، زندہ انسانوں پر ایسا ہی کیمیکل ڈال کر آگ لگائی جارہی تھی، تو بھی کوئی راکا ایجنٹ نہیں تھا، نہ کوئی موساد تھی، نہ کوئی طالبان تھے۔ کون لوگ تھے یہ کہاں سے آئے تھے۔ سب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ لیکن سب نے ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کئے رکھی۔ کوئی آواز نہیں اٹھی، جو میرے قاتل میرے دلدار سے فریاد کرسکے۔ کوئی محافظ میدان میں نہیں آیا جو ان شرپسندوں کا ہاتھ پکڑ سکے۔ تو کیا یہ سب لاشیں اٹھانے والے، بین کرنے سینہ کوبی کرنے، ماتم کرنے والے اور تماشا دیکھنے والے ہیں۔ لاشوں کی گنتی کرنے والے، مجروح افراد کے ساتھ تصویریں کھنچوانے والے، بیانات دینے والے، پریس کانفرنس کرنے والے۔ آج کراچی کے باسیوں کو ایک بار پھر سوچنا چاہیئے کہ وہ کب تک گیدڑ کی موت مرتے رہیں گے۔ کب تک آہ فغاں کرتے رہیں گے۔ کب تک امداد کی بھیک مانگتے رہیں گے، کب تک ٹیکسوں کی معافی کی درخواست کرتے رہیں گے۔ کب تک اپنے بچوں کے حلق کے نوالے چھین کر ان مگرمچھوں کے پیٹ بھرتے رہیں گے۔ قاسم تیلی نے صدر مملکت کو صحیح آگاہ کیا کہ اس نوعیت کا واقعہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا اور اس سے قبل بینظیر کی شہادت کے وقت بھی یہ ہوا تھا اس وقت بھی ہم نے کہا تھا کہ ملزمان کو گرفتار کیا جائے کیونکہ ٹی وی پر یہ سارے نظر آرہے ہیں اگر نہیں کروگے

تو یہ دوبارہ ہوگا اور یہ بات ہم نے صدر زرداری کو بھی بتائی ہے۔ ان کے مطابق صدر زرداری، گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد اور وفاقی وزیر رحمان ملک نے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ ان کے پاس فوٹیج موجود ہیں جس میں لوگ نظر آ رہے ہیں اور انہیں گرفتار کیا جائے گا۔ دھماکے کے ۲۱ منٹ بعد منظم مشتعل افراد کون تھے۔ جو آگ لگانے کے سارے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ یہ کون سے فول پروف حفاظتی انتظامات تھے، جس میں شہر بھر میں بھی جلاؤ گھیراؤ کے واقعات ہوئے، مجموعی طور پر چار سو دکانیں اور پچاس سے زائد گاڑیاں نذر آتش کر دی گئیں لائٹ ہاؤ س پر واقع لنڈا بازار، تاریخی بولٹن مارکیٹ کی ڈھائی سو دکانیں تباہ کی گئی، بولٹن مارکیٹ کے قریب واقع فیروز مارکیٹ اور کلاسک مارکیٹ کو جلایا گیا، جس کے نتیجے میں درجنوں دکانیں اور کروڑوں روپے کا سامان جل گیا۔ پولیس اور سیکورٹی فورسز کی کئی گاڑیوں سمیت درجنوں کاریں اور بسیں نزر آتش کر دیں۔ خود کش حملے پر کیوں اصرار کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ جان چھڑانے کا آسان نسخہ ہے۔ اب ۸۴ گھنٹے بعد یہ مراد بھی بر آئی کہ کالعدم تحریک طالبان پاکستان نے کراچی خود کش دھماکے کی ذمہ داری قبول کر لی، کراچی میں بم دھماکے کے بعد ہونے والی ہنگامہ آرائی اور آتشزدگی کے واقعات میں تقریباً 30 ارب روپے کے نقصانات کا تخمینہ لگایا گیا ہے جبکہ 80 فی صد دکانیں فائر بریگیڈ کے عملے کی عدم دستیابی اور حکومت کی غفلت کے باعث جلیں۔ اسمال ٹریڈرز کے محمود حامد اور الائینس مارکیٹ کے چیئرمین عتیق میر کا کہنا

ہے کہ تقریباً 2 ہزار سے زائد دکانوں کو نذرآتش کیا گیا۔ آل پاکستان میمن فیڈریشن ایسوسی ایشن کے صدر احمد چنائے کا یہ مطالبہ برحق ہے کہ حکومت کراچی میں ہونے والے نقصانات کا ازالہ کرے۔ کراچی کے شہریوں کو اپنے حقوق کی یہ جنگ خود لڑنی ہوگی۔

آپا

آپا سب کی آپا تھیں۔ وہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ یہ نام انہیں ان کے بھائیوں نے دیا تھا۔ اور ہم سب بھی انہیں آپا کہتے تھے۔ ماں یا امی کبھی ہم بہن بھائیوں نے انہیں اس نام سے نہیں پکارا۔ آپا بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن انہیں تعلیم کا شعور تھا۔ میرے نانا نے انہیں نصیحت کی تھی کہ اس نئے دیس میں بچوں کو پڑھانا ورنہ یہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ آپا نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ حالات ایسے سازگار نہ تھے۔ تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت اور محنت کو اپنا شعار بنایا، کیسی کیسی مزدوری کی بیڑیوں اور مٹھائی کے ریپر باندھنے کے کام سے اتنی یافت ہوجاتی تھی کہ دال روٹی کا خرچ ہوجاتا، وہ بلا کی کفایت شعار تھیں۔ گھر کی کوئی چیز ضائع نہ ہونے دیتیں۔ وہ زمانہ گھروں میں چکی کا زمانہ تھا۔ صبح سویرے چکی لے کر آٹا پیسنے بیٹھ جاتیں۔ راجھستانی گیت انہیں بہت یاد تھے۔ چکی پیستے ہوئے وہ گیت گاتی جاتی تھیں۔ سادہ زمانہ تھا۔ گھروں میں بجلی نہ تھی۔ لالٹین اور چراغ کی روشنی میں کام ہوتا تھا، گھر کے کام کاج مغرب سے پہلے نمٹ جاتے تھے۔ گھروں میں دوپہر کے کھانے کا باقاعدہ رواج نہ تھا۔ مغرب کے بعد کھانا کھا لیا جاتا تھا۔ گیس نہ تھی۔ مٹی کے چولہے تھے۔ جن میں لکڑی جلائی جاتی۔ گیلی لکڑیاں آجاتی تو گھر دھوئیں سے

بھر جاتا۔ ان کی آنکھیں دھوئیں سے جلنے لگتیں۔ لیکن وہ پھونکنی سے پھونکیں مارتی جاتیں اور چولہے پر روٹیاں پکاتی جاتیں۔ شکر کا قحط پڑا تو گڑ کی چائے بننا شروع ہوئی۔ اس زمانے میں ان چیزوں میں لذت بہت تھی۔ گوشت ہفتے میں ایک بار ہی بنتا تھا، جس میں شوربہ زیادہ ہوتا تھا۔ آپا سردیوں میں باجرہ کی کھچڑی بناتیں، کڑھی ان کو مرغوب تھی۔ سردیوں کی آمد ہوتی تو وہ اس کی تیاریاں شروع کر دیتیں۔ لحاف سیتیں روئی بھرانے کے بعد خود ہی ان میں ڈورے ڈالتیں۔ ان کے پاس فرصت کے لمحات نہ ہوتے ایک کے بعد ایک کام قطار بنائے ان کے سامنے کھڑے رہتے۔ اور وہ ایک کے بعد ایک کام خوش اسلوبی سے نمٹاتی رہتیں۔ انہوں اپنی عسرت اور تنگ دستی میں کسی سے کوئی قرض بھی نہیں لیا۔ کسی سے کبھی ادھار لیا بھی تو اسے ادا کرنے کی انہیں بے چینی رہتی۔ اسی عسرت اور تنگ دستی میں انہوں نے اپنے پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں کو تعلیم دلائی اور ان کی شادی کی۔ اور پھر بھی دنیا بھر کے کام کرتی رہتیں۔ ان کی ملنسار طبعیت کی وجہ سے ان کے بہناپے بھی بہت تھے۔ وہ اپنے بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ لیکن ان کی دوپٹہ بدل بہنوں کی تعداد بہت سی تھی۔ وہ من موجی تھیں۔ دل چاہتا تو باتیں کرتی، اور خوب کرتی دنیا جہاں کے قصے سناتیں۔ پھر انہیں اس سے غرض نہ ہوتی کہ کون سن رہا ہے اور کون نہیں سن رہا۔ وہ اپنے قصے سناتی رہتیں۔ تقسیم کے قصے کیسے گاؤں والوں نے مسلمانوں کو قتل کرنے کی سازش کی عید کی نماز پڑھنے کے لئے جب سارے مسلمان چلے جاتے تو ہندو

گاؤں پر حملہ کرتے۔ مسلمانوں کو اس سازش کی خبر ہو گئی تو راتوں رات گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ ہوا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، تایا فوج میں صوبیدار تھے۔ رات کو فوجی ٹرک لے آئے۔ اور خاموشی سے بھرے پرے گھر مال مویشی، ساز و سامان چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ کھوکھراپار کی سرحد پار کرکے حیدرآباد اسٹیشن کے سامنے مکھی کے باغ میں مہاجرین کے کیمپ لگے تھے۔ لیکن انہیں کیمپ میں رہنا پسند نہ تھا۔ جلد ہی ایک مکان میں منتقل ہوئیں۔ جس میں بہت سی کوٹھریاں تھیں۔ بہت جلد یہ کوٹھریاں ان کے دور پرے کے جاننے والوں سے بھر گئیں۔ خود کے رہنے کے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھری ان کے حصے میں آئی اور اسی میں انہوں نے زندگی گزاری۔ آپا آپریشن سے بہت ڈرتی تھیں۔ ان کے پیٹ میں رسولی تھی۔ جس کا درد انہیں اکثر بے چین کر دیتا۔ اور انہیں رات کو لال بتی سول اسپتال لے جانا پڑتا۔ ایک دو دن میں وہ ٹھیک ہو جاتی۔ ڈاکٹر انہیں آپریشن کا مشورہ دیتے۔ لیکن خوف کے سبب وہ آپریشن پر تیار نہ ہوتیں۔ بیٹیوں کی شادی اور بچوں کے بڑے ہو جانے پر انہوں نے آپریشن کرالیا۔ لیکن ان کی بیماریوں میں شوگر اور بلڈ پریشر شامل ہو گئے، شوگر کی موذی بیماری سے وہ بہت تنگ تھیں۔ اس کی دواؤں کے بارے میں وہ کہا کرتی تھیں کہ نہ جانے ان سے کب پیچھا چھوٹے گا۔ انہیں محتاجی اور معذوری کی زندگی پسند نہ تھی۔ آنکھوں کی بینائی کے بارے میں وہ بے حد فکر مند رہتی تھیں، اس کے لئے جس کسی ڈاکٹر کا سنتی اس کے پاس چل دیتیں۔ اپنی بیماریوں کا مقابلہ انہوں نے بڑی پامردی

سے کیا۔ لیکن پرہیز سے ان کا سدا کا بیر تھا۔ جو چاہتی وہ کھاتیں۔ جس سے ڈاکٹر اور حکیم منع کرتے۔ اس کی بہت زیادہ پابندی نہ کرتیں۔ رمضان کے پورے روزے بیماری میں بھی رکھتیں۔ ذکر وہ کرتی رہتیں، تسبیح پڑھتی رہتیں۔ اپنی تکلیف کو اس وقت تک ضبط کئے رہتیں جب تک برداشت ہوتی۔ کئی بار شدید بیمار ہوئیں۔ شوگر لیول گر جاتا، یا بہت بڑھ جاتا ایسے لمحوں میں انہیں اسپتال لے جاتے اور وہ ٹھیک ہو کر گھر آ جاتیں۔ الیکشن میں ووٹ ڈالنے جاتیں۔ قلعہ آپریشن کے موقع پر خود عورتوں کے جلوس میں چلی گئیں۔ اور پولیس آپریشن پر کئی دن تک پولیس والوں کو برا بھلا کہتی رہیں۔ زمانہ طالب علمی میں تحریک نظام مصطفٰے میں، جلسے جلوسوں میں میری شرکت پر کبھی نہ روکا، ان دنوں جلوسوں پر گولیاں چلتی تھیں۔ لیکن وہ ہماری سلامتی کے لئے دعائیں کرتی رہتیں۔ طالب علمی کا وہ دور تحریکوں، جلسے جلوسوں سے بھرپور تھا۔ تحریک نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں میری گرفتاری پر بھی ثابت قدم رہیں۔ ان دنوں میں سیڑھیوں کے نیچے بیٹھک میں سویا کرتا تھا۔ رات بھر وہ میری آمد کے انتظار میں چکر لگاتی رہتیں۔ رات کے کسی حصے میں جب میں آکر سوجاتا تو انہیں چین آتا، سردیوں میں کئی بار میرا لحاف ٹھیک کرتیں۔ صبح پوچھتی کب آیا تھا۔ میں کہتا فلاں وقت آیا تھا۔ وہ مجھے بتا دیتیں کہ کب آیا تھا۔ آپا نے حج ان دنوں کیا جب میرا چھوٹا بھائی سعودی عرب میں تھا۔ سفر حج کے واقعات اب ان کی بات چیت کا حصہ تھے۔ وہ وہاں کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ ایک

ہفتہ قبل ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ میں کراچی پریس کلب کی الیکشن کمیٹی کی میٹنگ میں بیٹھا تھا۔ دیوان مشتاق میں ان کی دل کی بیماری بڑھ گئی تھی۔ کہنے لگیں۔ کیوں بار بار چکر لگاتا ہے۔ اب میں ٹھیک ہونے کی نہیں۔ لیکن چند دن میں ٹھیک ہو گئی۔ ان کی طبیعت ایسی ہی تھی ۔پل میں تولہ پل میں ماشا۔ لیکن وہ اس پر بھی شاکر تھیں۔ انہیں معذوری کا خوف تھا۔ وہ اس بات سے بہت ڈرتی تھیں کہ کہیں چلنے پھرنے سے محتاج نہ ہو جائیں۔۔ میں نے ایک بار وہیل چیر لانے کا کہا۔ تو منع کر دیا۔ لو اب میں کرسی پر بیٹھ کر چلوں گی۔

آپا کو دس تک گنتی آتی تھی۔ باقی کام وہ دس، دس کو جوڑ کر چلاتی تھیں۔ انہیں نوٹ کی بھی زیادہ پہچان نہ تھی۔ پہلے رنگوں سے پہچان جاتی تھیں۔ اب نئے نوٹ ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ پیسے انہوں نے کبھی جمع نہیں کیے ۔ جو آتے خرچ کر دیتیں۔ وہ معصوم اور بھولی تھیں۔ اسپتال میں ڈاکٹر نے راؤنڈ پر آنے پر معمول کے مطابق پوچھا۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ شام کو کہنے لگیں لو میں دو دن کے لئے اسپتال آئی ہوں۔ میں کسی کی شکایت کیوں کروں۔ ہم نے کہا ڈاکٹر آپ سے بیماری کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ آپ کو کیا شکایت ہے۔ اچھا میں سمجھی وہ ماسیوں اور صفائی کرنے والوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل والد صاحب کے انتقال کے بعد وہ اکثر ان کے قصے سنانے بیٹھ جاتیں۔ ان دنوں ہر وقت وہ کوئی ہدایات دیتی رہتی تھیں۔ مختلف ٹیسٹ کرانے کے لئے

گھر سے نہا دھو کر تیاری کر کے آئیں۔ اس بار اسپتال میں وہ بار بار یہ کہتی رہیں کہ اب میں گھر نہ جاؤ ں گی۔ اپنی میت کو غسل دینے کے بارے میں تمام ہدایات دیں۔ بچوں کے خیال رکھنے کا کہا۔ ایک ایک بات کی تفصیل بتائی۔ لیکن ہم اس وقت یہی خیال کرتے رہے کہ آپا کو کوئی ایسی سیریس تکلیف نہیں ہے۔ یہ ایسی باتیں یونہی کہہ رہی ہیں، نویں محرم ہوچکی تھی۔ ساتویں محرم کو ملیدہ پر نیاز ہوتی ہے۔ ملیدہ کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شوگر کے ڈر سے تھوڑا سا چکھا۔ چھوٹے بھائی ایاز سے مچھلی کی فرمائش کی۔ مغرب کے وقت ان کی طبعیت اچانک بگڑ گئی۔ کلمہ شریف کا ورد کرنے لگیں۔ میں نے کہا آپا جلد ٹھیک ہوجاؤ گی۔ پھر گھر چلیں گے۔ کہنے لگیں۔ تجھے کیا پتہ مجھے کیا نظر آرہا ہے۔ پھر زور زور سے کلمہ شریف کو ورد اور توبہ کرنے لگیں۔ اللہ سے معافی کی درخواست کرنے لگیں۔ اور خواب غفلت میں زور زور سے السلام وعلیکم، السلام علیکم کہتی رہیں۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی دلشاد ان کے پاس موجود تھے۔ درد کی شدت میں اضافہ ہوگیا تو ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ انہوں نے دوا دی۔ انجیکشن لگایا۔ تو پرسکون ہوگئیں۔ رات کو ایک بج گیا تھا۔ میرا دوسرا بھائی شمشاد اپنے بچوں کو لے کر آگیا۔ پھر وہ بچوں کو چھوڑنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اپنی بیگم کے ساتھ آگیا۔ انہوں نے کہا کہ رات ہم یہاں رک جاتے ہیں۔ گھر جانے کی طبعیت

نہیں تھی۔ بھائی کے ضد کرنے پر میں اٹھا۔ جانے سے پہلے میں ایک لمحے کے لئے اٹھ کر ان کے چہرے کی طرف بڑھا۔ میں نے نرمی سے اپنا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھا۔ مجھے ان کا چہرہ ٹھنڈا لگا۔ میں نے اپنے بھائی کو آواز دی۔ ہم نے انہیں ہلایا آواز دی۔ لیکن ان کی روح پرواز کرچکی تھی۔ ڈاکٹر نے آکر ان کا معائنہ کیا۔ اور ان کے رخصت ہونے کی تصدیق کر دی۔ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آگیا۔ بے شک سب کو آخر ایک دن اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور ان کے روح بھی اپنے پروردگار کے حضور پرواز کر گئ تھی۔ آپا میری ماں تھیں۔ جو ۹ محرم ۲۷ دسمبر ۲۰۰۹ کی شب سوا ایک بجے اس جہان فانی سے روانہ ہو گئیں۔

نیا سال نئی امیدیں

کراچی میں محرم کی دس تاریخ کو بپا ہونے والی قیامت اور تباہی کے بعد میں ۳۱ دسمبر کی رات یہ سوچ رہا تھا کہ اس بار کراچی میں نئے سال پر زیادہ شور و ہنگامہ نہیں ہوگا، لیکن جب نئے سال کا آغاز ہوا تو میں سوچ رہا تھا کہ بم دھماکوں، پیٹرول، چینی، بجلی، اور مہنگائی کی ماری یہ قوم اب 2010 میں کچھ سکون کا سانس لے گی۔ لیکن اس بے حس قوم کے پاس اب کچھ رہا نہیں ہے۔ عوام بے حس ہو چکی ہے کراچی کے ہولناک سانحے کے بعد نئے سال کے جشن کی فائرنگ جس قدر ہولناک تھی۔ یہ بتانے کے لئے کافی تھی کہ اس شہر میں اگر کوئی سازش اپنا کام کر گئی تو کسی کے دشمن کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی، باقی کام ہم خود کرلیں گے۔ امریکی ہمارے سروں بیٹھے ہیں اور ان کی سی آئی اے ہماری سرحدوں سے لگی بیٹھی ہے۔ سال کے آخری دن افغانستان میں ایک خودکش حملے اور بم دھماکے میں امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے آٹھ امریکی ایجنٹوں سمیت تیرہ غیر ملکی ہلاک ہوئے۔ اس حملے میں خودکش حملہ کرنے والا امریکوں کا ایجنٹ تھا۔ جو ایک عرصے سے ان کے رابطے میں تھا۔ اب اس حملے کی ذمہ داری طالبان نے قبول کرتے ہوئے کہا ہے کہ افغان فوج میں شامل ان کے ایک ساتھی نے یہ خودکش حملہ کیا ہے۔ خودکش حملہ آور نے فوجی یونیفام پہن رکھا تھا جسے امریکوں نے چیک کئے بغیر اندر آنے

دیا اور اس نے فوجی اڈے کی سکیورٹی کو دھوکہ دیتے ہوئے اڈے کی ورزش گاہ میں دھماکہ کر دیا۔

امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کے مطابق سنہ انیس سو سینتالیس میں خفیہ ادارے کے قیام کے بعد سے لے کر اب تک نوے اہلکار ڈیوٹی کے دوران ہلاک ہوئے ہیں۔ابتداء میں ہلاک ہونے والے افراد کو عام امریکی شہری بتایا گیا تھا تاہم بعد ازاں انہیں سی آئی اے کے ایجنٹ قرار دیا گیا تاہم ان افراد کی شناخت تاحال ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ادھر جنوبی افغان صوبے قندھار میں سڑک کے کنارے نصب ایک بم پھٹنے سے کینیڈا کے چار فوجی اور ایک کینیڈین خاتون صحافی مارے گئے۔ یہ دو برس میں کسی ایک واقعے میں ہلاک ہونے کینیڈینز کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ ہلاک ہونے والی چونتیس سالہ صحافی کا نام مشیل لینگ بتایا گیا ہے اور وہ پہلی مرتبہ افغانستان گئی تھیں۔ سنہ 2009 افغانستان میں تعینات غیر ملکی افواج کے لیے ہلاکتوں کے حوالے سے سب سے برا سال رہا ہے۔افغانستان میں آٹھ امریکی ایجنٹوں کی ایک ساتھ ہلاکت آٹھ سالوں میں سب سے بڑا نقصان ہے۔ جس پر امریکوں کا تلملانا اور غصہ کرنا فطری امر ہے، لیکن اس غصے کا انتقام لکی مروت میں کھیل میں مگن معصوم اور سادہ لوح عوام سے لینا ایک قابل نفرت عمل ہے۔ جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔اس خطے میں سی آئی اے اپنے کھیل میں مصروف ہے۔ اس کے ایجنٹ جابجا پھیلے ہوئے ہیں اور اس

کا جال پورے ملک میں ہے۔ لوگوں میں ایک دوسرے سے منافرت کے بیج بوئے جارہے ہیں۔ یہ طالبان ہیں، ظالمان ہیں، کرائے کے قاتل ہیں یا بلیک واٹر والے یا کوئی اور منظم گروہ انھیں اپنا ہدف اچھی طرح یاد ہے۔ اور یہ ہدف پاکستان ہے۔ اس کی سلامتی اور اس کا استحکام ہے۔ جانے ہم پاکستانیوں کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ ہم ایک دوسرے پر انگلیاں اٹھارہے ہیں، جب کہ دشمن ہم پر نشانہ لگائے بیٹھے ہیں۔ حکومت میں قوم کو کوئی خوشخبری نہ سنا سکی ہے اور نہ کوئی وعدہ ایفا ہوا صدر آصف علی 2009 زرداری اور نواز شریف کے درمیان بھی خلیج حائل ہونے کی وجہ سے دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان فاصلے اور اداروں کے درمیان تصادم کے خدشات بھی بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیک ہولڈر اور نان اسٹیک ہولڈر ایک دوسرے کے درپے ہیں۔ نئے سال سے قوم کو نئی امیدیں اور توقعات ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ ان کے دکھوں کا مداوا کیا جائے۔ حکمران طبقہ کو 2010 میں ضرور ان کی مشکلات کا ازالہ کرنا چاہیے۔ صحیح معنوں میں پارلیمنٹ آئین کی بالادستی کو یقینی بنانا چاہیے۔ تاکہ نئے سال میں قوم کو کسی نئے بحران کا تحفہ نہیں ملے۔

اب احتساب ہونا چاہئے۔

سپریم کورٹ میں لاپتہ افراد سے متعلق درخواستوں کی سماعت کے دوران حکومت اور حکومتی اہلکاروں کی ناکامی کے بارے میں ججوں نے جو ریمارکس دیے ہیں۔ وہ اس بات کا اظہار ہیں کہ ملک میں لاپتہ افراد کا معاملہ سنگین ہوگیا ہے۔ لاپتہ افراد کے بارے میں جو صورتحال ۲۰۰۷ میں تھی۔ وہی اب بھی ہے۔ اس معاملے کی سنگینی ہی تھی جس نے پرویز مشرف اور عدالت عالیہ کے درمیان خلیج حائل کردی تھی۔ جس کا نتیجہ میں ملک کے دوستون کے درمیان محاذ آرائی ہوئی۔ اور بالاآخر عدلیہ کامیاب ہوئی۔ ۲۰۰۷ میں سینٹ کی فنگشنل کمیٹی کے چیئرمین سینٹر ایس ایم ظفر تھے۔ اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ قانون کے رکھوالے قانونی طریقہ اختیار کریں۔ اور غائب کیے جانے والے افراد کو عدالتوں میں پیش کیا جائے تاکہ وہ اپنا قانونی دفاع کرسکیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ہم بھارت کے بارے میں بہت واویلا کرتے ہیں کہ کشمیر میں بھارت کی فوج اور پولیس نے ہزاروں کشمیریوں کو غائب کردیا ہے۔ لیکن خود ہمارے ملک میں نائین الیون کے بعد جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہوئی ہیں اور مسلسل ہورہی ہیں ان کو ہم عالمی اداروں کو کیا جواب دیں گے۔ کراچی میں ایم کیوایم کے خلاف جو آپریشن ہوا تھا۔ اس وقت بھی کراچی اور حیدرآباد سے نوجوانوں کو ان کے گھروں سے اٹھا کر غائب کردیا جاتا تھا۔ اور

پھر کوئی کہیں پولیس مقابلے میں اور کوئی اور انداز میں ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ یہ کھیل کئی برسوں سے جاری ہے۔ اور ملک بھر میں یہ تعداد اب بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ فروری ۲۰۰۷ میں چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں تین رکنی فل بنچ اس کیس کی سنوائی کر رہا تھا۔ اس وقت آمنہ مسعود جنجوعہ اپنے شوہر سمیت کئی افراد کی گمشدگی کی پیروی کر رہی تھیں، اس وقت بھی چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے کہا تھا کہ گمشدہ افراد کی بازیابی کے لئے جو ہم سے ہو سکا وہ کریں گے۔ ہمارے ہاتھ میں بندوق نہیں ہے۔ یہی طریقے ہے کہ لاپتہ افراد کی تلاش کے لئے کچھ کر سکیں۔ اب دو سال کے بعد بھی وہی صورتحال ہے۔ جس میں جسٹس جاوید اقبال کو یہ کہنا پڑا ہے کہ ملک میں 'یہ کیسی جمہوریت ہے جس میں بنیادی انسانی حقوق کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔' جسٹس جاوید اقبال نے کہا ہے کہ ملکی نظام تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے اور کسی نہ کسی کو اس نظام کو درست کرنے کے لیے مداخلت کرنا ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ اگر سپریم کورٹ مداخلت کرے گی تو پھر واویلا مچ جائے گا کہ عدالت اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہی ہے۔ صوبہ سرحد، بلوچستان، کو مسئلہ بھی اس سے جڑا ہوا ہے۔ مشرف دور میں نہ صرف لوگوں کو غائب کیا گیا۔ بلکہ انھیں پکڑ پکڑ کو امریکی ایجنسیوں کے حوالے بھی کیا گیا۔ اس میں لاکھوں ڈالر کمائے گئے۔

یہ رقم کن کے کھاتوں میں گئی۔ اور کون ان سے فائدہ مند ہوا۔ یہ ایک راز ہے۔ ملکی سلامتی اہم ہے۔ لیکن ملک کے شہری بھی اہم ہیں۔ ان کے بھی حقوق ہیں۔ جو لوگ اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ یا حکومتوں کی پالیسیوں سے اختلاف وہ سب غدار نہیں ہوتے۔ اختلاف رائے ان کا جمہوری حق ہے۔ لاپتہ افراد پر اب حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ اٹارنی جنرل نے عدلیہ کو بتایا ہے کہ لاپتہ افراد کا پتہ لگانے میں آٹھ سو دس ادارے سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ اور یہ ادارے اس قدر حساس ہیں کہ وہ بیک وقت یک جا ہو کر ان معلومات کا تبادلہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کس قدر بد قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے یہاں سیکورٹی کے ادارے اتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ اور اس کے باوجود ملک میں دہشت گردی اور تخریب کاری کا یہ عالم ہے کہ پولیس اور دیگر ایجنسیوں نے کراچی میں جلوس کے راستے کی کلیرینس سرٹیفیکیٹ دے دیئے۔ اور اس کے بعد جو سانحہ پیش آیا۔ اس میں پینتالیس قیمتی جانیں ضائع ہوئیں، اور اربوں کا مالی نقصان ہوا۔ ان اداروں کی کارکردگی کا اب احتساب ہونا چاہیے۔ اور یہ کام کہیں نہ کہیں سے شروع کرنا ہی پڑے گا۔

پھرتیاں اور پھرتیاں

جمعہ کی شام بھی اداس تھی، مارکیٹیں وقت سے پہلے بند ہو چکی تھیں سڑکوں پر سناٹا تھا، شہر کے مختلف حصوں میں فائرنگ کے واقعات میں متعدد ہلاکتیں ہو چکی تھیں۔ کئی دن سے کراچی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ عجیب سنگدل شہر ہے اب اس میں کتنی لاشیں گریں کتنے جنازے اٹھیں، کیسے ہی بم پھٹیں، لوگ مریں، آگ لگ جائے، بینک لٹ جائیں، لیکن شہر کراچی کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ جب جسم حادثوں اور سانحوں کا عادی ہوجائے تو بے حسی رگ رگ میں اتر جاتی ہے۔ کراچی کے جسم پر اتنے چرکے، اتنے گھاؤ، اتنے آپریشن، اور اتنی وارداتیں ہوچکی ہیں کہ اس میں سوچنے، ری ایکٹ کرنے، احتجاج کرنے، شور مچانے، اور فریاد کرنے کی بھی سکت نہیں رہی ہے۔ مغرب کے بعد پریڈی کے علاقہ خوفناک فائرنگ سے گونج اٹھا۔ دکانیں بند ہونے لگیں اور لوگ افراتفری میں بھاگنے لگے۔ عین اسی وقت چند سو گز کے فاصلے پر وزیر داخلہ کراچی پریس کلب آئے ہوئے تھے۔ آس پاس کا پورا علاقہ سیل تھا، رینجرز کے جوان تھے، جدید ترین اسلحہ تھا، اور برق رفتار گاڑیاں۔۔۔۔وزیر داخلہ آج کل کراچی پر بڑے مہربان ہیں، اب ان کی کراچی کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں، یوم عاشور کے بعد واقعات کے علاوہ انھیں کراچی کی عدالتوں کی سیڑھیاں بھی چڑھنا پڑتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ اور

سیاسی جنگ بھی شدت اختیار کر گئی ہے۔ جس میں اب تک محتاط اندازے کے مطابق ۴۴ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ گزشتہ جولائی سے اب تک اس ٹارگٹ کلنگ، گینگ وار، مافیا لڑائی،اور سیاسی کھینچ تان میں ۶۵۲ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی مخدوش حالات میں گزشتہ جولائی میں وفاقی وزیر داخلہ مسٹر عبدالرحمان ملک اچانک لندن سے کراچی پہنچے تو... اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ '' میں لندن میں الطاف حسین سے مل کر آ رہا ہوں... اب کراچی میں ٹارگٹ کلنگ ہوئی تو سب دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے عوام اور صحافیوں کو ترغیب دیتے ہوئے اعلان کیا کہ عوام ٹارگٹ کلنگ کی مووی بنا کر وزارت داخلہ کو بھیجیں ٹارگٹ کلنگ کے دوران تصویر لینے والے صحافی کو پانچ لاکھ روپے انعام دیا جائے گا'' لیکن حیرت کی بات ہے کہ سوا کروڑ سے زائد انسانوں کے شہر کراچی جس میں موبائیل فون کی تعداد بھی دو کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ اب تک کسی نے پانچ لاکھ کا انعام نہیں لیا۔ کراچی آجکل خاموش ' نامعلوم اور ان دیکھے دہشت گردوں کی زد میں ہے' ویسے تو کراچی کا وجود اپنے ہی سپوتوں کے دیئے ہوئے زخموں سے پہلے ہی بھرا ہوا ہے۔ کبھی گراؤنڈ میں بوری بند لاشوں سے لیکر، نشتر پارک میں بم دھماکے، کارساز میں بے نظیر کے قافلے پر خود کش حملے،12 مئی کو میڈیا کے کیمروں کی دیکھتی آنکھوں کے سامنے 50 سے زائد انسانوں کے شکار سے لیکر جیتے جاگتے حرماں نصیب وکیلوں کو ان کے چیمبرز میں زندہ جلانے، یوم عاشور کے جلوس میں بم دھماکے، اور دکانوں کی

لوٹ مار اور آگ لگانے تک۔ شہر کراچی کا وجود زخموں سے اٹا پڑا ہے۔ وزیر داخلہ رحمان ملک نے تازہ ارشاد فرمایا ہے کہ کراچی کے حالات اتنے خراب نہیں ہوئے ہیں کہ شہر میں فوج کو طلب کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ کراچی میں سرجیکل آپریشن کے لیے رینجرز کو اختیارات دیے گئے ہیں اور ٹارگیٹ کلنگ .برداشت نہیں کی جائے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ فوج کو تب طلب کیا جاتا ہے جب پولیس اور رینجرز مکمل طور پر حالات کا سامنا کرنے میں ناکام ہو گئے ہوں مگر ان کے مطابق کراچی میں ایسے حالات نہیں ہے کہ کراچی ٹارگٹ کلنگ میں کوئی بھی ملوث ہو چاہے ایم کیو ایم ہو یا بلوچی مگر کسی کو .برداشت نہیں کیا جائیگا اور ٹارگٹ کلنگ کا خاتمہ کیا جائے گا۔ چھ ماہ پہلے بھی کراچی میں ٹارگٹ کلنگز کی روک تھام کے لئے وزیرِ اعلیٰ ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس ہوئی تھی۔ جس میں کہا ہے۔ حکمران جماعت پیپلزپارٹی کی اتحادی جماعت متحدہ قومی موومنٹ کی رابطہ کمیٹی نے جمعہ کو ایک پریس کانفرنس میں فوج اور رینجرز سے کراچی میں قیام امن کے لیے مدد کی اپیل کی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کس قدر حالات خراب ہونے کا انتظار کیا جائے، اب سیٹلائٹ کے ذریعے نگرانی کی سہولت کے حصول کے لیے کوشش کی جا رہی ہے تاکہ جو لوگ رات کو ٹارگٹ کلنگ کا منصوبہ تیار کرتے ہیں ان کی اطلاع .بروقت مل سکے۔ کیا کراچی کے مسائل کا یہ حل ہے۔ یا کراچی والوں سے مذاق کیا جارہا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سارے کام عوام نے ہی کرنے ہیں تو کراچی میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کیا ذمہ داری رہ جاتی ہے؟ کیا قانون نافذ کرنے والوں کی ذمہ داری صرف امریکہ مخالف عناصر کو ڈھونڈ کر گرفتار کرنا اور مارنا ہی رہ گئی ہے۔۔۔؟۔ متحدہ کے رہنماء ڈاکٹر فاروق ستار کا کہنا ہے کہ ان کی جماعت کے کارکنان کو جرائم پیشہ افراد 'ٹارگٹ کلنگ' میں ہلاک کر رہے ہیں مگر حکومت ان کے خلاف کارروائی نہیں کر رہی ہے۔ رحمان ملک کا کہنا ہے کہ ٹارگٹ کلنگ میں پیپلزپارٹی اور متحدہ کے کارکن ہلاک ہو رہے ہیں اور فائدہ تیسرے فریق کو ہو رہا ہے۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات گزشتہ دو ماہ سے جاری ہیں۔ اب تک کراچی میں سرجیکل آپریشن کے لیے رینجرز کو اختیارات کیوں نہ دئے گئے۔ اب تک ہونے والی ٹارگٹ کلنگز کی عدالتی تحقیقات کیوں نہ ہو سکی۔ کرائسس مینجمنٹ سیل قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، اس کا کیا ہوا۔ ٹارگٹ کلنگس سے متعلق انٹیلی جینس نظام کو مربوط کرکے ذمہ داروں کو اب تک کیوں نہیں پکڑا جاسکا۔ کراچی کی صورتحال پر جنگل کا وہ لطیفہ یاد آتا ہے۔ جس میں ایک بندر جمہوریت کے تحت جنگل کا بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ ایک دن شیر ہرن کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ ہرن نے بندر سے فریاد کی۔ بندر نے کہا ابھی بندوبست کرتا ہوں، پھر بندر نے ایک درخت سے دوسرے درخت کود پھاند کرکے خوب پھرتیاں دکھائیں۔ اتنے میں شیر ہرن کا بچہ ہڑپ کر گیا۔ ہرن نے فریاد کی۔ بندر نے کہا میں نے تو خوب پھرتیاں دکھائیں۔ لیکن ۔۔۔۔۔ کچھ کام نہ بن

سکا

پاکستان کا خون بہہ رہا ہے

لاڑکانہ سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان ۲۴ سالہ عدیل اور ۲۳ سالہ رضوان کی لاشیں کراچی سے ان کے آبائی گاؤں پہنچ گئی ہیں۔ یہ دونوں نوجوان کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ دونوں دوست کراچی مزدوری کرنے آئے تھے۔ وہ ناصر کالونی کورنگی میں مزدوری کرتے تھے۔ دونوں دوستوں کو گزشتہ دنوں کراچی میں اس وقت گولی ماردی گئی جب وہ ایک دکان سے ناشتہ خرید رہے تھے۔ عدیل اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ اس کا باپ اس ذہنی صدمے سے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔ رضوان یتیم تھا۔ اس کا صرف ایک چھوٹا بھائی ہے۔ یہ دو بدقسمت نوجوان کراچی میں قسمت آزمانے آئے تھے۔ لیکن شہر میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ میں مارے گئے۔

کراچی میں گزشتہ ایک سال کے دوران ٹارگٹ کلنگ کے دو سو سے زائد واقعات میں 221 افراد مارے گئے ہیں سیاسی جماعتوں کی طرف سے کئے گئے دعوؤں کے مطابق ان واقعات میں ایم کیو ایم کے 69 ایم کیو ایم حقیقی کے 60 پیپلز پارٹی کے 28، اے این پی کے 23 اور دیگر جماعتوں و تنظیموں کے 41 کارکن ہلاک کئے گئے، ٹارگٹ کلنگ کے سبب سے زیادہ واقعات تھانہ شاہ فیصل کی حدود میں ہوئے جن کی تعداد 27 بتائی جاتی ہے بہت سے پولیس سٹیشنوں کے علاقہ میں ہونیوالی

ہلاکتوں کی صحیح تعداد واضح نہیں ہے بلکہ اس قسم کی درجنوں وارداتوں کو میڈیا سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس ٹارگٹ کلنگ میں بہت سے لوگ تو ایسے مارے جاتے ہیں۔ جیسے وہ چڑیا کے بچے ہوں جنہیں شکاریوں نے محض تعداد بڑھانے کے لئے مار دیا ہو۔ یہ بے وسیلہ لوگ یوں بھی سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔

ان کے قتل کا نہ کوئی مقدمہ ہوتا ہے، نہ شہادت، یہ تو خون خاک نشیاں ہوتا ہے جو زمین پر گر کر خاک ہو جاتا ہے۔ اس کا نہ کوئی مدعی ہوتا ہے۔ نہ کوئی گواہ، یوں بھی جن کے گواہ ہیں۔ شہادتیں ہیں، مقدمات ہیں ان کا کیا فیصلہ ہوا ہے۔ جو ان بیچاروں کا ہوگا۔ دو تین ماہ قبل جو ٹارگٹ کلنگ کی لہر آئی تھی۔ اس میں ہوٹل والے، تندور والے، موچی، بھیک مانگنے والے ۵۰ سے زائد افراد تین چار دن میں ہلاک کر دئے گئے تھے۔ ان کے بھی نہ مقدمے ہیں نہ کوئی گواہ، اور نہ ہی کوئی انصاف مانگنے والا۔ کراچی کی زمین پر بے گناہوں کا اتنا خون گرا ہے کہ یہ خون بار بار انصاف کی دہائی دیتا ہے۔ دو ہفتہ گزرنے کے باوجود کراچی کے حالات قابو میں نہیں آرہے۔ جو اس پر قابو پا سکتے تھے وہ بدامنی پر سنجیدگی سے قابو پانے کے بجائے جلتی پر تیل چھڑک رہے ہیں۔ اور الزامات کی تجارت ہو رہی ہے۔ شہر میں روزانہ لاشیں گر رہی ہیں۔ بار بار کہا جاتا ہے کہ ٹارگٹ کلنگ کی ہرگز اجازت نہ دی جائے گی لیکن یہ سب کرنے والے کس سے اجازت مانگتے ہیں۔ اس کے جواب میں روزانہ ٹارگٹ کلنگ ہو رہی ہے۔

رینجرز کی تعداد میں تین گنا اضافہ کردیا گیا ہے مگر بے سود۔ گزشتہ اتوار کو بھی مزید افراد قاتلوں کا ہدف بن گئے اور کوئی ایک بھی پکڑا نہ جاسکا۔ غارت گری لیاری سے 10 نکل کر شہر کے کئی علاقوں میں پھیل چکی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ اردو بولنے والوں کا قتل ہے۔ کوئی اسے بلوچوں کا قتل قرار دیتا ہے۔ سب نے اپنے ہاتھوں اور زبانوں پر مصلحتوں کے قفل چڑھا رکھے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی مصلحتیں ہیں۔ اور اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ کراچی کے واقعات وفاقی اور صوبائی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی سازش ہے۔ کسی کو یہ لینڈ مافیا، ڈرگ مافیا اور اسلحہ مافیا کی کاروائی لگتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کراچی کے عوام کا خون بہہ رہا ہے۔ یہ پاکستان کا خون بہہ رہا ہے۔ یہ بے گناہوں کا خون بہہ رہا ہے۔ جس کا وبال ہم سب پر ہے۔

کاش اب بھی کسی کو عوام کی خدمت کا خیال آجائے

بچے کسی بھی ملک اور قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ قوم کا مستقبل کہے جاتے ہیں۔ ساری خوشیوں کے رنگ بچوں ہی سے جگمگاتے ہیں۔ لیکن میاں چنوں میں جو ریلوے حادثہ ہوا ہے۔ اس نے ہماری خوشیوں کو گہنا دیا ہے۔ یہ ایسا داغ ہے جو کسی طرح نہ دھویا جاسکے گا۔ ہونہار اور معصوم بچے جو اپنے اسکول جانے کے لئے نکلے تھے۔ انھیں محکمہ ریلوے کی غفلت نے مار دیا۔ اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والے اور بڑی بڑی تنخواہ لینے والے پاکستان ریلوے کے حکام کو تو اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ اس ملک کے ۲ ہزار سے زائد ایسی ریلوے کراسنگ ہیں جہاں نہ کوئی پھاٹک ہے اور نہ ہی کوئی چوکیدار۔ ہندوستان میں ریل کے محکمے نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ جبکہ ہمارے ریلوے اتنی ہی پستی میں جاگری ہے۔ ریلوے کے وزیر یوں تو چاند دیکھنے سے لے کر کراچی کی ترقی پر کوئی تبصرے کا موقع ضائع نہیں کرتے لیکن اس محکمے کے سدھار کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ کراچی ریلوے کی زمینیں سب سے قیمتی ہیں۔ لیکن اس کی بدعنوانیاں ایسی ہیں کہ یہ محکمہ دیوالیہ ہوچکا ہے۔ اس کا نظام تلپٹ ہوچکا ہے۔ اور آئے دن ہونے والے حادثات نے دنیا بھر میں پاکستان کو بدنام کردیا ہے۔ وفاقی وزیر نے اس بارے میں تبصرہ کیا ہے کہ ریل اپنے ٹریک پر تھی۔ وہ حادثہ کرنے سڑک پر نہیں گئی تھی۔

اس میں ڈرائیور کی غلطی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کیا ریلوے کراسنگ پر گیٹ نصب کرنا، پل بنانا، چوکیدار متعین کرنا کیا ریلوے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیا حادثے کے متاثرہ خاندانوں کو لاکھ، دو لاکھ کا معاوضہ دینے سے معاملہ حل ہو جائے گا۔ افسوس کہ ہم نے انسانی جانوں کو روپے کے مول تول میں بدل دیا ہے۔ ہر حادثے کے بعد چیک دینے، امداد کرنے کے اعلانات ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان حادثوں کے ہونے سے پہلے احتیاط اور پلاننگ نہیں کرتے۔ ریلوے میں کیسے کیسے حادثے ہوئے ہیں۔ ہر بار اس بارے میں چھان بین شروع ہوتی ہے۔ اعلیٰ حکام بچ جاتے ہیں۔ اور غفلت کے الزام میں بعض ادنی اہلکاروں کو سزا دے دی جاتی ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ پاکستان ریلوے کے ساتھ محیر العقول حادثات، واقعات ہوئے ہیں۔

ایک بار کراچی کینٹ ریلوے سٹیشن سے فیصل آباد جانے والی سپر ایکسپریس بغیر انجن کے کیسے چل پڑی تھی۔ کئی برس پہلے ایک فاتر العقل شخص کراچی کے ایک ذیلی سٹیشن پر کھڑی ٹرین کے انجن پر چڑھ گیا اور ٹرین کو تقریباً پچاس کلو میٹر تک دوڑاتا لے گیا، راولپنڈی کے قریب ایک انجن بے قابو ہو کر مسجد میں جا گھسا اور سن ستر کی دھائی میں ایک سالم ریلوے انجن غائب ہوگیا اور آج تک پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں گیا۔ آپ نے یہ تو سنا ہوگا کہ دو ٹرینیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی یہ سنا کہ تین ٹرینیں ایک دوسرے سے ٹکرا

گئی ہوں۔ یہ حیرتناک واقعہ جولائی دو ہزار پانچ میں سندھ کے شہر گھوٹکی کے قریب ہو چکا ہے جس کے سبب ایک سو بیس سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ اسی جگہ سے کچھ دور سانگی ریلوے سٹیشن پر انیس سو نواسی میں دو ٹرینوں کے ٹکراؤ سے چار سو سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔اس تصادم کو جنوبی ایشیا کے ریل حادثوں میں سب سے خوفناک قرار دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں ریلوے حادثات کی سالانہ اوسط سو کے لگ بھگ ہے۔ صرف دو ہزار چھ میں ایک سو پچیس چھوٹے۔بڑے حادثات ہوئے جن میں سے زیادہ تر کے اسباب میں سگنلنگ کا فرسودہ نظام، ریلوے ٹریک کی کہنہ سالی اور انسانی غفلت شامل ہے۔ جب پاکستان بنا تو پاکستان ریلوے جو اس زمانے میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کہلاتی تھی، اس کی ریلوے لائنوں کی لمبائی آٹھ ہزار ایک سو بائیس کلومیٹر تھی جبکہ آج ریلوے لائن کی طوالت آٹھ ہزار ایک سو باسٹھ کلومیٹر ہے۔ گویا ساٹھ برس کے دوران ریلوے لائن میں چالیس کلومیٹر کا اضافہ ہوا حالانکہ پاکستان بننے کے بعد مردان چارسدہ اور کوٹ ادو کشمور ریلوے لائن بچھائی گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ سندھ اور پنجاب میں کئی ریلوے روٹ خسارے کے نتیجے میں بند کرنے پڑے اور اس کے نتیجے میں بہت سے مقامات پر چور لائن ہی اکھاڑ کر لے گئے۔ اس وقت ستر فیصد ریلوے ٹریک، نوے فیصد ریلوے پل اور پینتالیس فیصد ریلوے انجن اپنی تکنیکی معیاد پوری کر چکے ہیں لیکن ان کا استعمال اس لیے جاری ہے کیونکہ تعمیر و مرمت کا بجٹ نہیں ہے اور اس مد میں ریلوے کو کم از کم تیس ارب روپے درکار ہیں جبکہ ریلوے کا

سالانہ اوسط خسارہ تین ارب روپے کے لگ بھگ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ حکومت ٹرانسپورٹ کی مد میں جتنا بجٹ بناتی تھی اس کا ستر فیصد ریلوے کو ملتا تھا لیکن جب مختلف حکومتوں نے ریلوے کے بجائے شاہراہوں پر توجہ دینی شروع کی تو حال یہ ہوا کہ اب ریلوے کو ٹرانسپورٹ بجٹ کا محض پانچ فیصد مل پاتا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں ریلوے کی زمین جس کی مالیت کھربوں روپے بنتی ہے لینڈ مافیا کے قبضے میں ہے۔ فوج سمیت متعدد سرکاری ادارے ٹرانسپورٹیشن کی مد میں ریلوے کے کروڑوں روپے کے مقروض ہیں۔ اگر ان مدوں میں سے نصف رقم ہی ریلوے کو مل جائے تو اس کے درد دور ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر ایک کا مفاد دوسرے سے وابستہ ہے اس لیے ایسا ہونا مستقبلِ قریب میں ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نتیجہ سڑکوں اور ریلوے کے حادثات کی صورت میں نکل رہا ہے۔ ستر فیصد ٹرانسپورٹیشن ریلوے ٹریک کی بجائے سڑک کے راستے ہو رہی ہے۔ ٹرینوں کی کمی، ناقص سروس اور انتظامی کنفیوژن کے سبب مسافروں کی بڑی تعداد بھی ٹرین کے بجائے روڈ ٹرانسپورٹ کو ترجیح دینے لگی ہے۔ کئی حلقے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ٹرین سروس اور نظام الاوقات میں روڈ مافیا کا عمل دخل حیرتناک طور پر بڑھ گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ پاکستان ریلوے کا ہمیشہ سے یہ حال تھا۔ سن ستر کی دھائی تک ریلوے کا انتظام بڑی حد تک ان اہلکاروں کے ہاتھ میں تھا جو برٹش دور میں بھرتی ہوئے تھے اور ان میں پیشہ ورانہ جذبہ اور ڈسپلن ختم نہیں ہوا تھا۔ اور ریلوے کا محکمہ پیسے بنانے کے لئے نہیں بلکہ عوام کی خدمت کے لئے

تھا۔کاش اب بھی کسی کو عوام کی خدمت کا خیال آ جائے۔

عوام کی چیخیں

صدر مملکت آصف زرداری نے فیصل آباد میں ایک عوامی جلسے میں عوام کو خوشخبری سنائی ہے کہ وہ بجلی، گیس، پیٹرول سستا کرکے دکھائیں گے۔ جبکہ دوسری جانب زمینی حقائق یہ ہیں کہ بجلی گیس اور پیٹرول کی قیمتوں میں مسلسل اضافے سے افراط زر کی شرح اٹھارہ فیصد ہو گئی ہے۔ مہنگائی کا گراف راکٹ کی رفتار سے اوپر جارہا ہے۔ انڈے کی قیمتوں میں ایک دن میں چودہ روپے فی درجن کا اضافہ ہوا۔ تین دن بعد آٹھ روپے کا اضافہ اوراب یہ قیمت بلندترین سطح یعنی سو روپے فی درجن پر پہنچی ہوئی ہے۔ ہمارے محترم وفاقی وزیر.برائے امور خزانہ شوکت ترین کا ارشاد ہے کہ اپریل میں بجلی کی قیمت میں 6 فیصد تک اضافہ کیا جاسکتا ہے، وزیر پیداوار و صنعت میر ہزار خان بجرانی نے قومی اسمبلی کو آگاہ کیا ہے کہ آنے والے دنوں میں چینی کا بحران مزید سنگین ہوجائے گا کیونکہ منافع خوروں، اور چور بازاری کرنے والوں نے ذخیرہ اندوزی کر رکھی ہے۔

بین الاقوامی مارکیٹ میں قیمتوں میں اضافے کے انتظار اور گنے کی پیداوار میں کمی کے سبب منافع خور بھی مزید لوٹ مار کے انتظار میں ہیں۔ حکومت نے چینی کی سرکاری قیمت میں یکمشت سات روپے فی کلو کا اضافہ کرکے یوٹلیٹی

اسٹور پر چینی باون روپے کلو کردی ہے۔ جو بھی عوام کو آسانی سے نہیں مل رہی۔ کھلی مارکیٹ میں چینی ستر روپے کلو فروخت ہو رہی ہے۔ اس سال گیہوں کی بوائی بھی کم ہوئی ہے۔ بارشوں کے نہ ہونے سے اور دریاؤں میں پانی کم آنے سے یہ فصلیں شدید خطرات میں ہیں۔ ایسے میں صدر زرداری کا یہ اعلان ایک معجزہ یا کرشمہ دکھانے والی بات ہے۔ پاکستان ایک جانب تو دہشتگردی کی اس جنگ کا شکار ہے جو امریکہ نے اس کے سر پر تھوپ دی ہے۔ تو دوسری جانب پاکستان کے پالیسی سازوں نے اسے آئی ایم ایف کے اس جال میں پھنسا دیا ہے جو مکڑی کے جالے کی مشابہت رکھتا ہے۔ اور اس جال میں پھنسنے والا ہمیشہ مارا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اکتوبر 2008ء میں ملک دیوالیہ ہونے کے قریب تھا، آئی ایم ایف کے پاس جانے کا فیصلہ انتہائی مجبوری میں کیا تھا لیکن اب ہمیں اس ایجنڈے پر عمل کرنا پڑ رہا ہے۔ جس نے عوام کی چیخیں نکال دی ہیں، اور آئی ایم ایف کے مطالبات ہیں کہ پورے ہو کر نہیں دے رہے۔ آئی ایم ایف نے پاکستان سے طے پانے والے قرضے کے معاہدے کی جو تفصیلات جاری کی ہیں۔ ان کے مطابق ترقیاتی اخراجات میں ایک 1.7 ارب ڈالر کمی اور ایک ارب ڈالر ٹیکسوں میں اضافہ کرنا ہوگا۔ حکومت نے آئی ایم ایف کو بجلی مزید مہنگی کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی ہے۔ پیٹرولیم مصنوعات پر سبسڈی ختم کردی گئی ہے اور اب بجلی پر بھی سبسڈی ختم کردی جائے گی۔ ٹیکسٹائل پر آر اینڈ ڈی سہولت ختم

کردی گئی ہے۔ آئی ایم ایف سے طے پانے والے معاہدے کے تحت رواں مالی سال افراط زر کی شرح 20 فیصد تک لانے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ انکم ٹیکس اور جنرل سیلز ٹیکس میں چھوٹ کی کمی کے لئے جون تک پارلیمنٹ میں قانون سازی کی جائے گی۔ آئندہ بجٹ میں تمباکو پر ایکسائز ڈیوٹی میں اضافہ ہوگا۔ ٹیکس ریونیو کی شرح میں اضافے کے لئے جنرل سیلز ٹیکس کا دائرہ وسیع کیا جائے گا۔ اسٹیٹ بینک کے اختیارات میں اضافے کے لیے بینکنگ کمپنیز آرڈیننس جون تک پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ اس قانون کے ذریعے اسٹیٹ بینک کو کسی بھی بینک انتظامیہ کی تبدیلی بینکوں کی ملکیت لینے بینکوں میں ایڈمنسٹریٹر کے تقرر اور بینکوں کی تشکیل نو کا اختیار حاصل ہوگا۔ آئی ایم ایف پروگرام کی ایک شق کے مطابق حکومت اس پروگرام پر عمل درآمد کے بارے میں آئی ایم ایف کو باقاعدگی کے ساتھ اعتماد میں لینے کی پابند ہے۔ اور مقررہ اہداف کے حصول میں ناکامی کی صورت میں قرض کا اجرا روک لیا جائیگا۔ اقبال نے کہا تھا جب جھکا تو غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من۔ ہم نے اپنی قومی غیرت کا سودا امریکہ اور آئی ایم ایف جیسے اداروں سے کیا ہے۔ جنہوں نے دنیا کے غریب ملکوں کو تباہ و برباد کیا ہے۔ ہم اب بھی ان ہی سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے ناامیدی۔ مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

ٹرانسپورٹ پر توجہ دی جائے

کراچی کے سڑکوں پر روزانہ ایسے حادثات کے تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جن میں مرنیوالوں کے بارے میں معلومات نہیں ہوپاتی۔ اور ایسے مرنیوالوں کو سرکاری اسپتالوں سے ایدھی کے مردہ گھر منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں چند دن ان لاشوں کو رکھنے کے بعد پولیس ضروری کاغذی کاروائی مکمل کرکے ایسے لاشوں کو نامعلوم قرار دے کر قبرستان میں دفن کردیتی ہے۔ کراچی میں سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ نے سگنل فری کوریڈور بنائے ہیں۔ شہر میں پلوں، انڈر پاس راستے اور شاہراہوں کی وسعت نے کراچی میں موجود ٹریفک کو ایک بے لگام گھوڑے کی صورت دے دی ہے۔ جو ان شاہراہوں اور سڑکوں پر تیز رفتاری سے دوڑتا ہے۔ اور جہاں راستے مسدود ہوتے ہیں۔ وہاں ٹریفک جام ہوجاتا ہے۔ ٹریفک کی بھتہ خوری نے ٹریفک نظام کو تباہی کے دھانے پر لاکھڑا کیا ہے۔ بس ڈرائیور اور رکشہ والوں کی من مانیاں عروج پر ہیں۔ اور وہ سڑکوں پر اس طرح قانون کا مذاق اڑاتے ہیں کہ عام آدمی شدید مشکل پریشانی اور بے چارگی سے دوچار ہوتا ہے۔ صدر اور بندر روڈ پر آپ اس صورتحال کو بخوبی مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ عوام کی بڑی تعداد منی بسوں، کوچز، اور دوسری گاڑیوں کی چھتوں پر سفر کرنے پر مجبور ہیں یا لوگوں کی اکثریت پائیدانوں پر لٹک کر سفر کرتی ہے۔

بدنام زمانہ ٹوکن سسٹم دوبارہ رائج ہے۔ جس میں ڈرائیور گاڑیاں بھگانے، اور اسٹاپ پر زیادہ دیر تک گاڑیاں کھڑی رکھتے ہیں۔ جس سے مسافروں کو مشکلات اور پریشانی ہوتی ہے۔ اور سڑکوں پر رش کے دوران ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ خواتین مسافروں کی حالت سب سے خراب ہے۔ زنانہ حصوں میں اکثر مرد حضرات کا قبضہ ہوتا ہے۔ کنڈیکٹر اور ڈرائیور مسافروں سے ناروا سلوک کرتے ہیں۔ کرایوں میں مسلسل اضافے اور مطلوبہ سفری سہولتیں نہ ہونے سے عوام میں برداشت ختم ہوتی جارہی ہے۔ بس اسٹاپ پر بسیں کھڑی کرنے کا رواج ختم ہو چلا ہے۔ اب یہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے مرضی ہے کہ وہ کہاں گاڑی کھڑی کرکے آپ کو اتارتا ہے۔ بعض حالات میں تو گاڑیوں کو بیچ سڑک میں کھڑا کرکے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مریضوں کو دانستہ موت کے منہ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ سٹی گورنمنٹ نے صدر میں کئی منزلہ پارکنگ لاٹ تعمیر کیا ہے۔ لیکن صدر کے علاقے میں گاڑیاں بدستور دکانوں کے سامنے پارک کی جاتی ہیں۔ ٹریفک پولیس کے لفٹر شاہراہوں سے صبح سے شام تک گاڑیاں اٹھاتے ہیں۔ کار اٹھانے پر پانچ سو روپے جرمانہ اور موٹر سائیکل پر دو سو روپے جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ ہر ماہ اس مد میں کراچی کے عوام سے کروڑوں روپیہ سمیٹا جارہا ہے۔ جس کا نہ کوئی حساب ہے نہ کوئی اکاؤنٹ۔ یہ سب پولیس کے حکام کے جیب میں جاتا ہے۔ کراچی کے عوام کو ایک عرصے سے پانچ ہزار سی این جی بسوں کے سڑکوں پر لانے کا مژدہ جانفزا

سنایا جارہا ہے۔ لیکن اب تک اس پر کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ کراچی کے عوام کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ بڑی بسیں چلائی جائیں۔ بھتہ خوری کو ختم کیا جائے، ٹریفک قوانین پر سختی سے عمل کیا جائے۔ از سر نو بسوں اور کوچز کے نئے روٹ ترتیب دیے جائیں۔ کراچی میں بڑھتے ہوئے حادثات میں کمی بھی ان اقدامات سے ممکن ہے۔ سندھ حکومت کو ٹرانسپورٹ کے اس اہم مسئلے پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

امن کی آشا

امن کی آشا کا بھاشن دینے والوں کو سوچنا چاہئے کہ ہمیں کیسے پڑوسی سے واسطہ پڑا ہے۔ جو ہمیں نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اگر ہندو مسلمانوں سے یہ دغا بازی نہ کرتا تو برصغیر کی یوں تقسیم نہ ہوتی۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر کئی سو سال حکومت کی تو ہندوؤں سے رواداری کا سلوک کیا۔ لیکن ہندو نے ہمیشہ موقع پا کر مسلمانوں کی پیٹ میں چھرا گھونپا۔ کھیل کا میدان ہو یا ثقافت یا تجارت کا میدان بھارت ہمیشہ پاکستان کو مات دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کھیل میں سیاست نہیں ہونی چاہئے۔ پاکستان ٹوئنٹی ٹوئنٹی کا عالمی چیمپئن ہے اس کے کھلاڑی ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ لیکن بھارت میں آئی پی ایل کی نیلامی کے دوران پاکستان کے کھلاڑیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ اس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ نیلامی سے قبل یہ کہا جا رہا تھا کہ اس سیزن میں آفریدی سب سے مہنگے کھلاڑی ثابت ہوں گے لیکن جب بولی شروع ہوئی تو سب کو پتہ چل گیا کہ یہ سب ایک ڈرامہ تھا۔ پاکستانی کھلاڑیوں کو بلا کر ذلیل کرنے کا۔ آخر میں یہ ثابت ہو گیا کہ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔

سپورٹس کو سیاست اور کسی بھی طرح کے امتیاز سے پرے سمجھنے والے ہندوستانی

کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اجیت واڈیکر کہتے ہیں کہ جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ 'اگر آپ کو شکایت تھی کہ پاکستانی کھلاڑی آئی پی ایل میں کھیل نہیں سکیں گے جس طرح وہ دوسرے سیزن میں کھیلنے میں ناکام رہے تھے تو پھر آپ کو انہیں پہلے ہی نیلامی کی فہرست میں شامل نہیں کرنا چاہیے لیکن فہرست میں شامل کرنے کے بعد ان کے لیے بولی نہ لگانا جبکہ ان میں اس وقت ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ کے چیمپئن موجود ہیں، کسی اور بات کی طرف اشارہ کرتا ہے، ایسے وقت میں جبکہ پاکستان میں باکسنگ چیمپئن شپ میں ہندوستانی باکسر حصہ لے رہے ہیں۔ پاکستان سے تجارتی اور ثقافتی روابط بڑھانے کی بات ہوتی ہے۔ پاکستان کی مارکیٹ میں بھارتی فلموں کی نمائش سینما ہال میں کی جارہی ہے۔ پاکستانی کھلاڑیوں کے ساتھ کیوں یہ برتاؤ کیا گیا۔ آئی پی ایل بورڈ کو اس کا جواب دینا چاہئے۔ پاکستانی کھلاڑی سہیل تنویر جو آئی پی ایل فرینچائز راجستھان رائلز کے لیے پہلے سیزن میں انتہائی کامیاب کھلاڑی ثابت ہوئے تھے، ان کے لیے جب راجستھان رائلز نے دوبارہ بولی نہیں لگائی تو فرینچائز کی حصہ دار اداکارہ شلپا شیٹی نے میڈیا کے سوال کے جواب میں کہا کہ 'ہمیں نوجوان اور تجربہ کار کھلاڑیوں کو اپنی ٹیم میں شامل کرنا تھا اور کسے لینا ہے کسے نہیں اس کے لیے ہم اپنے کپتان کے مشورے کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اگر کوئی کھیلنے کے لیے وقت پر نہیں مل سکتا تو پھر اس کے لیے بولی کیوں لگائی جائے'۔ فرینچائزرز اور مودی نے پاکستانی کھلاڑیوں کو نہ لیے جانے کے لیے جو جواز

پیش کیا ہے وہ انتہائی بودا ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو پہلے ہی ان کھلاڑیوں کے نام فہرست میں شامل ہی نہ کئے کرکٹ ایسا ذریعہ ہے جو دونوں ممالک کے درمیان ایک بار پھر دوستی اور بھائی چارگی پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا تھا لیکن اب اس کے ذریعہ ہی ایک مرتبہ پھر شک و شبہ کا بیج بو دیا گیا۔ کرن مورے مانتے ہیں کہ سپورٹس کو سیاست سے بالاتر ہونا چاہیے۔ ان کے مطابق ایک ایسے وقت میں جبکہ دونوں ممالک کے حالات کشیدہ ہیں، پاکستانی کھلاڑیوں کو ہندوستان میں کھیلنے کا موقع مل رہا تھا اور انہیں جان بوجھ کر کھیلنے کا چانس نہیں دیا گیا۔ مورے کہتے ہیں کہ یہ دو ممالک کے کھلاڑیوں کا معاملہ ہے اس لیے اس بات کو کھل کر سامنے آنا چاہیے کہ اصل وجہ کیا ہے اور مودی کو پاکستانی کرکٹ بورڈ کو جواب دینا چاہئے۔ قومی اسمبلی میں اس معاملے پر لے دے شروع ہو چکی ہے۔ پاکستان کے پارلیمانی وفد نے بھارت کا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ ن لیگ نے بھارتی فلموں کی سینماؤں میں نمائش بند کرنے کا مطالبہ کیا ہے، یہ پاکستان کے کھیل کے شیدائیوں کی آواز ہے۔ امن کی آشا کی مالا جپنے والوں کی ابھی آنکھیں کھل جانی چاہئے کہ بھارت کا اصل روپ کیا ہے۔

قائد اعظم کا خواب

نوید آصف الحمرا ہال لاہور کے اس جلسے میں کوئی سیٹ نہ ملنے پر سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ جس میں اسے گولڈ میڈل ملنا تھا۔ اس نے لاہور بورڈ کے امتحان میں پورے نو سو انیس نمبر حاصل کرکے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ دوسری پوزیشن حاصل کرنے والا طالب علم اوکاڑہ کے گاؤں ناریوال سے تھا۔ اس کا اسکول اس کے گھر سے سات کلو میٹر دور تھا۔ جہاں وہ روزانہ پیدل جاتا تھا۔ اس جلسے میں آنے سے پہلے وہ شام کو اپنی ماں کے پاس بیٹھا تھا کہ لاہور میٹرک بورڈ کے اہلکاروں کی ایک ٹیم اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کے گاؤں پہنچی۔ نوید اقبال اور اس کی ماں ان کی آمد کی خبر پا کر ڈر سے گئے۔ چند دن پہلے ان کی بھینس چوری ہو گئی تھی۔ چوری کے اس واقعے سے وہ دلبرداشتہ تھے۔ پھر انھیں خوشخبری سنائی گئی کہ نوید اقبال لاہور میٹرک بورڈ کے امتحان میں دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ اور کل وزیر اعلیٰ پنجاب اسے ایک تقریب میں گولڈ میڈل دیں گے۔ نوید اقبال لاہور الحمرا پہنچ گیا۔ لیکن اس جلسہ گاہ میں جہاں اس کی اعلیٰ کارکردگی کو سراہا جانا تھا، اس کے لئے کوئی نشست خالی نہ تھی۔ وہ جلسہ گاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ پھر جب اس کا نام پکارا گیا تو پتہ چلا کہ یہ تو وہ طالب علم ہے جس نے گولڈ میڈل حاصل کیا ہے

اسپنج کی چپل پہن کر اس نے گولڈ میڈل حاصل کیا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جب وزیر اعلیٰ پنجاب کی اس پر نظر پڑی تو انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے اپنی سیٹ آفر کی۔ نوید آصف کے لئے قائد اعظم ایک رول ماڈل ہیں۔ وہ ان کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے۔ یہ ملک پاکستان کو بناتے ہوئے اس کے خالق کو خیال تھا کہ یہ ملک ایسا رول ماڈل ہوگا جہاں حق داروں کو ان کا حق ملے گا۔ میرٹ اور قابلیت پر لوگوں کی قدر کی جائے گی۔ لیکن یہاں محنت اور قابلیت والوں کی کیسی ناقدری ہے۔ ڈگریاں والے کیسی ذلت سے دوچار ہیں۔ نوکریاں آج بھی پارٹی والوں کو سفارش والوں کے لئے ہیں۔ باقی کے لئے خجل خواری کے سوا کچھ نہیں ہے۔" جناح آف پاکستان "کے مصنف پروفیسر اسٹینلے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا امریکہ اپنے کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔" بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کا دھارا بدل دیتے ہیں اور ایسے لوگ تو اور بھی کم ہوتے ہیں جو دنیا کا نقشہ بدل دیتے ہیں اور ایسا تو کوئی کوئی ہوتا ہے جو ایک نئی مملکت قائم کر دے۔ محمد علی جناح ایک ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے بیک وقت تینوں کارنامے کر دکھائے۔ شیکسپئر کہتا ہے کہ کچھ لوگ پیدا ہی عظیم ہوتے ہیں اور کچھ اپنی جدوجہد اور کارناموں کی بدولت عظمت حاصل کر لیتے ہیں گو کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح میں عظمت و قابلیت اور نیک نامی کی ساری خوبیاں پیدائشی تھیں اقبال نے کہا تھا کہ دو سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند۔ لیکن جناح آئے تو برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کا

وہ دیرینہ خواب پورا ہوا جو مسلمانان ہند گزشتہ دو صدیوں سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔
آج بھی پاکستان میں نوجوان نسل ہی سے اس ملک کی تعمیر اور ترقی کی امیدیں ہیں،
لیکن یہ امیدیں اس وقت پوری ہوں گی جب ہم نوید اقبال جیسے ہونہار بچوں کو ان کا حق
دیں گے۔ ان کو عزت اور احترام سے وہ سیٹ دیں گے۔ جس کے وہ حقدار ہیں۔

بلیک واٹر ایک حقیقت ہے

گورنر پنجاب کے بیٹے کی شادی کے موقع پر وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے لیاقت بلوچ سے گلہ کیا ہے کہ ان سے بغیر کسی تحقیق کے وزارت داخلہ سے استعفیٰ طلب کیا جارہا ہے۔ لیاقت بلوچ نے ان سے کہا کہ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے پاکستان میں بلیک واٹر کی موجودگی کی خود تصدیق کر دی ہے تو مزید کس تحقیق کی ضرورت ہے جبکہ وزیر اطلاعات قمر الزمان کائرہ نے بھی بیان دیا ہے کہ حکومت کا یہ مؤقف کبھی نہیں رہا کہ بلیک واٹر پاکستان میں موجود نہیں ہے تو حقیقت بالکل عیاں ہو گئی ہے۔ اس موقع پر وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے وہاں موجود سینئر ایڈیٹرز اور سیاستدانوں کی موجودگی میں کہا کہ میں اپنے مؤقف پر قائم ہوں پاکستان میں بلیک واٹر تنظیم کا کوئی آپریشن یا سرگرمی نہیں ہے۔ میڈیا کے ایک خاص حصہ نے امریکہ کے وزیر دفاع سے مہارت اور چالاکی سے سوال کیا اور اپنے مطلب کا جواب نشر کر دیا۔ وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے اصرار کرکے کہا کہ میرا واضح اور دو ٹوک مؤقف ہے کہ پاکستان میں بلیک واٹر تنظیم کی کوئی سرگرمی نہیں ہے اگر یہ ثابت ہو جائے تو وہ اپنے اعلان کے مطابق وزارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔

امریکی وزیر دفاع اور ہمارے وزیر داخلہ دونوں بڑے بھولے ہیں۔ جو اخبار والوں کے جھانسے میں آ جاتے ہیں۔ حالانکہ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز تو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ امریکہ کے سابق فوجیوں پر مشتمل نجی کمپنی کو، جس کا پہلا نام 'بلیک واٹر' تھا سی آئی اے دہشت گردی کے خلاف مہم میں القاعدہ کے خلاف ڈرون حملوں میں استعمال کرتی رہی ہے۔ نیویارک ٹائمز نے سرکاری حکام اور سکیورٹی کمپنی کے موجودہ اور سابق ملازموں کے حوالے سے کہا ہے کہ اس کمپنی کے اہلکار پاکستان اور افغانستان میں موجودہ خفیہ اڈوں پر ڈرون طیاروں پر 'ہیل فائر' میزائل اور پانچ سو پونڈ وزنی لیز گائیڈڈ میزائل لگانے کا کام کرتے رہے ہیں۔ یہ کام ماضی میں سی آئی اے کے اپنے ماہر انجام دیتے تھے۔ اخبار کے مطابق کمپنی سے تعلق رکھنے والے اہلکاروں کو ان خفیہ اڈوں کی نگرانی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ برطانوی اخبار گارڈین نے بھی نیویارک ٹائمز کی اس خبر کو شائع کیا ہے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا کہ بلیک واٹر کی خفیہ کارروائیوں میں شمولیت کی خبروں نے صدر بش کے دور میں سی آئی اے کی کارروائیوں پر نئے قانونی سوالات کو جنم دیا ہے۔ اخبار مزید کہتا ہے کہ ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ القاعدہ کے سرکردہ اہلکاروں کو ہلاک کرنے کا پروگرام کیا دانستہ طور پر کانگریس سے مخفی رکھا گیا۔ کانگریس نے انیس سو چھہتر میں ویتنام اور لاطینی امریکہ میں سی آئی اے کی 'ٹارگٹ کلنگ' کی کارروائیوں پر سماعت کے بعد اس طرح کی کارروائیوں پر

پابندی لگا دی تھی۔ لاطینی امریکہ میں مخالفین کو ہلاک کرنے کی کاروائیوں میں فیدل کاسترو پر چھبیس ناکام قاتلانہ حملے بھی شامل تھے۔ بلیک واٹر کمپنی جس کا نیا 'ایکس ای' ہے اور جسے 'زی' پکارا جاتا ہے کس قدر مہارت اور استعداد کی حامل ہے۔ کمپنی کی کاروائیوں اور خاص طور پر عراق میں اس کے اہلکاروں کے رویئے کی بنا پر اس کو شدید تنقید کا سامنا رہا ہے لیکن اس کے باوجود اسے مستقل طور پر سی آئی اے کی طرف سے کروڑوں ڈالر کے ٹھیکے دیئے جاتے رہے اور یہ پھلتی پھولتی رہی۔ اخبار کے مطابق بلیک واٹر کے موجودہ اور سابق اہلکاروں سے کیئے جانے والے انٹرویوز سے سی آئی اے کے القاعدہ کے کارکنوں کو ہلاک کرنے کی کاروائیوں میں بلیک واٹر کی شمولیت کے بارے میں مزید تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ بلیک واٹر کو ان کاروائیوں میں سن دو ہزار چار میں پورٹر جے گاس کے سی آئی اے کے سربراہ بننے کے بعد شامل کیا گیا۔ حکام کا کہنا ہے کہ سی آئی اے نے بلیک واٹر کے ایگزیکٹیوز کو 'لائسنس ٹو کل' یا قتل کرنے کی کھلی چھٹی نہیں دی تھی۔ تاہم ان کرائے کے فوجیوں کو القاعدہ کے سرکردہ ارکان اور سرگرم کارکنوں کو پتا لگانے اور ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔

سی آئی اے کے اس پروگرام سے آگاہی رکھنے والے سرکاری حکام کا کہنا ہے کہ لبلبی دبا کر کسی کو ہلاک کرنا سب سے آسان کام ہوتا ہے اور اس میں زیادہ

مہارت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا اصل میں لبلبی دبانے تک کا جو کام ہوتا ہے وہ اصل اہمیت رکھتا ہے۔ سرکاری حکام کا کہنا ہے کہ کسی دہشت گردی کو پکڑنے اور پھر اس کو ہلاک کرنے کی سی آئی اے کے ڈائریکٹر سے پیشگی اجازت ضروری ہوتی ہے اور اسے وائٹ ہاؤس کے سامنے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ بلیک واٹر کے سی آئی اے کے ساتھ بزنس معاملات زیادہ تر خفیہ رہے لیکن اس کے امریکی وزارت خارجہ کے ساتھ معالات منظر عام پر آ گئے۔ امریکہ وزارت خارجہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ عراق میں اپنے سفارت کاروں کی سکیورٹی کے لیے بلیک واٹر کی خدمات حاصل کرتا رہا ہے جس سے کئی تنازعات بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ عراق میں سترہ شہریوں کی ہلاکتوں پر بلیک واٹرز کے پانچ ارکان پر امریکہ میں فرد جرم عائد ہو چکی ہے۔ کمپنی کے خفیہ آپریشن کے لیے امریکی ریاست نارتھ کیرولائنہ میں 'بلیک واٹر سلیکٹ' سے ایک بہت بڑا دفتر موجود ہے۔ اس کمپنی کا سی آئی اے کی طرف سے پہلا ٹھیکہ سن دوہزار دو میں کابل میں نئے اڈے کے لیے سکیورٹی فراہم کرنے کا تھا۔ نیویارک ٹائمز کمپنی کے موجودہ اور سابق ملازمین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ کمپنی کے ملازمین کو ڈرون طیاروں پر ہیلر فائر اور لیزر گائڈڈ میزائل نصب کرنے کی تربیت نویڈا میں قائم نیلس ایئر بیس پر دی جاتی ہے۔ اخبار نے کئی اور سرکاری اور کمپنی کے ملازمین کے حوالے سے لکھا ہے کہ سی آئی اے ایک عرصے تک پاکستان کے صوبے بلوچستان میں قائم فضائی اڈے شمسی سے ڈرون طیاروں کی پروازیں کرتی رہی ہے لیکن حال ہی میں جلال آباد میں

ایک نیا اڈہ بنا لیا گیا ہے۔ سرکاری حکام کا کہنا ہے کہ اب جلال آباد سے زیادہ تر ڈرون طیاروں کی پروازیں ہوتی ہیں جہاں ہر گھنٹے میں ڈرون طیارہ اڑتے یا اترتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں شمسی بیس اب بھی استعمال ہو رہا ہے۔ حکام کا کہنا ہے کہ امریکہ نے جلال آباد میں اڈہ قائم کرنے کا فیصلہ اس بنا پر کیا کہ کہیں پاکستانی حکومت عوام میں پائے جانے والے امریکہ مخالف دباؤ کا شکار ہو کر ملک میں موجود اڈے بند کرنے کا مطالبہ نہ کر دیں۔ بلیک واٹر کے ملازمین ڈرون حملوں کے اہداف کی نشاندھی میں شامل نہیں ہوتے اور ان پر نصب میزائیلوں کو چلانے کا بٹن لینگلے ورجینیا میں بیٹھے سی آئی اے کے اہلکاروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ ایجنسی کے بہت کم ملازمین افغانستان اور پاکستان میں موجود ہوتے ہیں۔ بلیک واٹر کے کرائے کے لوگوں کا ڈرون حملوں میں شامل ہونا بعض اوقات تنازعات کا بھی باعث بنتا ہے۔ جب کبھی بھی ڈرون سے داغے میزائل اپنے ہدف سے چوک جاتے ہیں سی آئی اے والے بلیک واٹر کے ملازمین کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ بلیک واٹر ایک حقیقت ہے۔ ہم نے شتر مرغ کی طرح اپنی گردن ریت میں چھپا لی ہے، ڈالرز کی چمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ ہم امریکیوں کے جدید غلام ہیں جو ان کی سچائی پر بھی پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ کاش ہم میں تھوڑی سی بھی قومی غیرت ہوتی۔

شجاعت اور بہادری کی ایک داستان

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے ملک اور قوم کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی نفع نقصان سے بالاتر ہو کر ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں، جن سے ان کا نام ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے ملک اور قوم کے بارے میں ایسے فیصلے کرتے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ قائد اعظم، لیاقت علی خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، سر سید احمد خان، علامہ اقبال، ایسے بے لوث رہنما تھے۔ جنہوں نے اس قوم لئے سوچا اور طویل جدو جہد کی۔ ایک آزاد وطن کے حصول کے لئے ہزاروں ایسے گمنام مجاہد بھی ہیں جنہوں نے اس ملک پر اپنا تن من دھن وار دیا۔ آج بھی ایسے لوگ ہیں۔ جو اس ملک کی بقا، سالمیت پر دل وجان سے قربانی دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہی لوگ کسی ملک اور قوم کا اصل سرمایہ ہیں۔ دنیا میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ آج سے تیس سال قبل پورے اٹلی میں مافیا کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ منشیات فروشی، سیاسی کرپشن پے آف، کک بیکس بھتہ، منی لانڈرنگ غرض ہر جرم میں ملوث تھی۔ چونکہ سیاستدانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی اس سے منسلک تھا لہٰذا مافیا پھلتی پھولتی رہی۔ خاص طور پر سسلی اور روم کے علاقے اس کا گڑھ بن گئے۔ اس وقت اٹلی میں ایک قانوں داں اٹھا اور اس نے اپنی قوم کو اس ناسور سے نجات دلانے کا تہیہ کیا۔ وہاں عدلیہ تھی جس نے

اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا۔ 1980ء کے بعد عدلیہ کے تفتیشی جج مافیا کے کرتوتوں اور سرگرمیوں سے پردہ اٹھانے لگے۔ ان میں دلیر اور ذہین فالکون پیش پیش تھے۔ وہ ایک تفتیشی جج تھے۔ انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھ مافیا کے خلاف چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھیس بدل کر عام لوگوں سے ملے اور مافیا کے ارکان و آقاؤں سے متعلق مفید معلومات حاصل کیں۔ اس دوران مافیا نے شک کی بنیاد پر کئی سپاہی مار ڈالے۔ جج بھی ان کا نشانہ بنے۔ یوں اب مافیا کے خلاف جنگ عدالتی ہی نہیں معاشرتی جنگ کا بھی آغاز ہوا۔

فالکون کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے تفتیش سے ثابت کر دیا، مافیا کوئی چھوٹی تنظیم نہیں اس کے سرے بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس وقت اٹلی میں سب مافیا کی دہشت کا شکار تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ قانون کے ہاتھ کتنے ہی لمبے ہوں، وہ مافیا کرتا دھرتاؤں تک نہیں پہنچ سکتے مگر فالکون نے پر نظریہ باطل کر ڈالا۔ انہوں نے اٹلی میں اینٹی مافیا پول" بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس سرکاری گروہ میں مافیا کے خلاف" سرگرم عمل اٹلی بھر کے جج شامل تھے۔ یہ گروپ بنانے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی ایک جج اگر مافیا کا نشانہ بن جائے۔ تو دوسرے جج ان کا مشن لے چلیں۔ تمام جج اپنی حاصل کردہ معلومات ایک دوسرے کو بتاتے تھے تاکہ تفتیش میں آسانی ہو سکے۔ اطالوی ججوں کی شبانہ روز محنت و چھان بین کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1986ء میں مافیا کے چار ہزار تہتر ارکان ایک

وسیع مہم کے دوران گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں سے 360 پر مقدمہ چلا جو "میکسی مقدمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مقدمہ 10 فروری 1986ء سے 16 دسمبر 1987ء تک جاری رہا۔ بیشتر ملزموں کو کڑی سزائیں دی گئیں۔ ان میں مافیا کے سرکردہ باس میخائیل گریکو اور سلاد اتوار رینا شامل تھے۔ اس مقدمے کو بین الاقوامی شہرت ملی۔ اس مقدمہ کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار مافیا کے ایک سرگرم رکن، ٹوما سوبوسکیٹا نے سرکاری گواہ بنتے ہوئے یہ بتایا کہ مافیا کی تنظیم کیونکر کام کرتی ہے۔

ٹوماسو نے اپنی پراسرار تنظیم کے خفیہ راز فالکون کے سامنے ہی افشا کیے۔ اس کا کہنا تھا بقیہ جج میرے ساتھ بہت مناسب سلوک کرتے ہیں لیکن فالکون نے میرا احترام کیا اور مجھے بھی انسان سمجھا۔" ٹوماسو سے حاصل کردہ معلومات اٹلی ہی نہیں امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں بھی جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری کا سبب بن گئی۔ مافیا کے ٹکر لینے کے باعث ظاہر ہے، فالکون زندگی خطرات میں گھر گئی۔ حفاظت کیلئے حکومت نے انہیں سپاہی فراہم کر دیئے۔ میکسی مقدمے کے بعد وہ مافیا کا نشانہ نمبر ایک بن گئے۔ آئے دن انہیں قتل کی دھمکیاں ملنے لگیں مگر فالکون پوری جرات سے مافیا کے خلاف سرگرم عمل رہے۔

آخری برسوں میں سرکاری افسر اور سیاست دان فالکون کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے لگے جن کے مافیا سے روابط تھے۔ مگر انہیں اطالوی عوام کی بھرپور حمایت

حاصل تھی ۔ فالکون اب خصوصاً سسلی میں عوام کے ہیرو بن چکے تھے۔ آخر مافیا کی سازشیں رنگ لائیں اور وہ گیووانی فالکون کو راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ 23 مئی 1992ء کو فالکون بیوی اور تین محافظوں کے ساتھ روم جانے کیلئے پالیمر مو ہوائی اڈے سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک تنگ جگہ مافیا کے کارندوں نے 350 کلو دھماکہ خیز مواد سرنگیں کھود کر بچھا دیا۔ جیسے ہی فالکون کا قافلہ وہاں پہنچا دھماکہ کر دیا گیا۔ کاروں میں بیٹھے سبھی مسافر ہلاک ہو گئے اور سڑک میں کئی فٹ چوڑا اور گہرا گڑھا بن گیا۔ یوں ملک کو جرائم سے پاک کرنے کی مہم میں ایک جج نے اپنی اور اپنے خاندان کی جان قربان کر دی۔ فالکون کے بعد یہ مشن ان کے دوستوں نے جاری رکھا۔ ان کے قریبی دوست پاؤلو بورسلینو تھے۔ وہ فالکون کے آبائی محلے سے تعلق رکھنے کے علاوہ تفتیشی جج بھی تھے۔ ان دونوں دوستوں نے مافیا کے کرتوت طشت از بام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صرف دو ماہ بعد 14 جولائی کو بورسلینو کی کار بھی بم دھماکے سے اڑا دی گئی۔ اس حملے میں پانچ سپاہی بھی ہلاک ہوئے۔ فالکون اور بورسلینو کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آج اٹلی کا پالیمر مو ہوائی اڈا ان کے ناموں سے منسوب ہے۔ اٹلی میں انہیں قومی ہیرو سمجھا جاتا ہے۔

فیس بک بھی جاسوسی کے لئے

فیس بک بھی جاسوسی کا ہتھیار ہے

گزشتہ سال میں نے اپنے دوست کو جب فیس بک پر آنے کی دعوت دی تو مجھے اس کی ای میل موصول ہوئی کہ مجھے اپنے بارے میں امریکن سی آئی اے اور اسرائیل کی موساد کو ساری تفصیل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس ویب سائٹ کی تمام معلومات سے امریکہ اور اسرائیل فائدہ اٹھائے گا۔ اس وقت میں نے اس خیال کو رد کر دیا تھا۔ لیکن اب یہ بات حقیقت کو روپ دھار چکی ہے کہ اسرائیل یہ ویب سائٹ مخالفین کے بارے میں مفید معلومات کے حصول اور لوگوں کے ذہنوں تک رسائی کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران سماجی روابط کے فروغ کے لئے انٹرنیٹ ویب سائٹ فیس بک کے صارفین کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے.

اس سائٹ کے استعمال کنندگان اپنے مخصوص دوستوں کے لئے خاندان کے افراد کی تصاویر پوسٹ کرتے یا اپنے بارے میں نئی معلومات فراہم کرتے ہیں اور ایسا وہ یہ سمجھ کر کر رہے ہوتے ہیں کہ یہ ان کے نجی استعمال میں ہے لیکن حال ہی میں فرانس سے شائع ہونے والے ''اسرائیل میگزین'' نامی جریدے نے انکشاف کیا ہے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس زیادہ تر عرب اور مسلمان صارفین پر

اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے اور وہ ان کے فیس بک کے صفحات کو ان کی سرگرمیوں اور سوچ وفکر کے تجزیے کے لئے استعمال کر رہی ہے.

میگزین کی اس رپورٹ پر اسرائیلی حکومت اور سفارتی حلقوں نے اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے اور پیرس میں متعین اسرائیلی سفیر نے میگزین پر دشمن کو کلاسفائیڈ معلومات فراہم کرنے کا الزام عائد کیا ہے. فرانس کی ایک یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیرارڈ نیروکس نے بتایا ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے اسرائیل کی خفیہ سرگرمیوں کا انکشاف مئی 2001ء میں ہوا تھا. نیروکس ''انٹرنیٹ کے خطرات'' نامی کتاب کے مصنف ہیں. ان کا کہنا ہے کہ ''یہ اسرائیلی نفسیات دانوں پر مشتمل ایک انٹیلی جنس نیٹ ورک ہے جو عرب دنیا اور خاص طور پر فلسطینی اسرائیلی تنازعے سے متعلق ممالک اور لاطینی امریکا کے ممالک پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں''. پروفیسر نیروکس نے میگزین کو بتایا کہ ''مردوں کی ایک بہت بڑی تعداد خواتین سے ملنے کے لئے اس ویب سائٹ کو استعمال کرتی ہے لیکن یہ غیر محفوظ ہے کیونکہ یہ مردوں کو دھوکا دینے کا ایک بہترین ذریعہ ہے جس سے ان کی خامیوں کا بھی پتا چلایا جا سکتا ہے''. ان کا کہنا تھا کہ کسی مرد کی جاسوسی کے لئے کسی خاتون کو استعمال کرنا تو بہت ہی آسان کام ہے. یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ اسرائیل پر عام لوگوں کی جاسوسی کے لئے فیس بک کو استعمال کرنے کا الزام عاید کیا گیا ہے. اپریل 2008ء میں اردن کے ایک

روزنامے الحقیقہ الدولیہ میں ''پوشیدہ دشمن'' کے عنوان سے شائع شدہ ایک مضمون میں بھی اس سے ملتے جلتے دعوے کئے گئے تھے.

اخبار نے لکھا تھا کہ یہ بہت ہی خطرناک رجحان ہے کہ لوگ خاص طور پر نوجوان کسی دوسرے کی باتوں پر اعتماد کرتے ہوئے فیس بک یا اسی طرح کی سماجی روابط کی ویب سائٹس پر اپنی جملہ ذاتی تفصیلات کا اظہار کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان عناصر کا بآسانی ہدف بن جاتے ہیں جو اس طرح کے لوگوں کی تلاش میں ہوتے ہیں''. فیس بک کا نام عالمی سیاست میں بھی کوئی اجنبی نہیں ہے اور اسے مختلف ممالک کے اپوزیشن گروپ اپنی مہم کو آگے بڑھانے کے لئے استعمال کرتے ہیں. ایران میں صدارتی انتخابات کے بعد بدامنی کے دوران بھی اپوزیشن گروپوں نے اس سائٹ کو مظاہروں کو منظم کرنے کے لئے استعمال کیا تھا. ''اسرائیل میگزین'' کی رپورٹ کے مطابق فیس بک سے صہیونی ریاست کے دشمن ممالک میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کے بارے میں صہیونی انٹیلی جنس کو مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں جنھیں وہ اپنی مستقبل کی منصوبہ بندی کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کی روشنی ہی میں صہیونی دوسروں کے بارے میں اپنے فیصلے کرتے ہیں. موجودہ دور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اس سائنسی دور میں دشمن دور بیٹھ کر ڈرون حملے کرتا ہے۔ وہ موبائیل فون کی چپس کے ذریعے اپنے ہدف کو نشانہ بناتا ہے۔ آج کل جو خودکش حملے کئے جا رہے ہیں ۔ ان میں بھی

موبائیل چپس کا استمال بعید از قیاس نہیں ہے۔ ہمیں دشمن کے ان ہتھکنڈوں کا مقابلہ بھی
انہی ہتھیاروں سے کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے ابھی سے تیاری کرنا ہوگی۔

ہمارے عنایت علی خاں

حیدرآباد محبتوں کا شہر ہے۔ اس شہر میں رہنے والے کہیں بھی ہوں ایک دوسرے سے جب بھی ملتے ہیں ۔ ٹوٹ کر ملتے ہیں۔ اکثر اس محبت اور ملنساری کو دیکھ کر لوگ ہمیں حیدرآباد مافیا کا خطاب دیتے ہیں۔ عنایت علی خاں ہمارے اسی شہر کے بزرگ ہیں۔
ان کی ایک حمد و نعت کے دو شعر ہیں۔

مجھے تو نے جو بھی ہنر دیا، بکمال حسن عطا دیا
میرے دل کو حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دی، میرے لب کو ذوق نوا دیا

اس حمد نعت کا شعر آخری شعر ہے

کبھی اے عنایت کم نظر تیرے دل میں یہ بھی کسک ہوئی
جو تبسم رخ زیست تھا اسے تیرے غم نے بھلا دیا

اب اس حمد میں جو عنایت علی خاں نے پہلے شعر میں ہمارا نام اور دوسرے شعر میں ہمارا تخلص استعمال کیا ہے تو آپ اسے حیدرآباد نوازی نہ سمجھیے اور نہ

ہی ہمارے اس مضموں کو حیدرآباد مافیا کی کاروائیوں میں شامل کیا جائے۔
سید ضمیر جعفری نے عنایت علی خاں کی مزاحیہ شاعری کو اسلامی دنیا کے بم سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے اصناف شاعری میں حمد و نعت، نظم و غزل، اور ظریفانہ شاعری جسے میدانوں میں شہسواری کی ہے۔ اور ہر سطح پر اپنا معیار اور آہنگ بلند رکھا ہے۔ خاں صاحب، صاحب علم و دانش ہیں۔ وہ معلم بھی ہیں، مدرس قراں بھی ہیں، سیاست دان بھی ہیں، شکاری بھی ہیں، عنایت صاحب کی شخصیت کے اتنے رخ ہیں کہ سب کا تعارف کرانا مشکل ہے۔ لیکن یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پیار کی طرح ان کی کوئی بھی پھرت اترے، عنایت علی خاں ، سراپا عنایت ہی نظر آتے ہیں۔ان کا حلیہ اور ان کے فقرے ان کا آپ ہی تعارف کرادیتے ہیں۔ ان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ بادہ و ساغر والے ہمراقابوں میں بھی انھوں نے کبھی اپنی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔
عنایت صاحب کی شخصیت بڑی طرح دار ہے۔ یوں بھی آپ ٹانک کے پٹھان ہیں۔ آپ کا ہر رنگ جاذب نظر اور دل کو لبھانے والا ہے۔ قوم کا درد رکھتے ہیں۔ بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ اس صاف گوئی کے سبب ٹی وی چینل والے انہیں لائیو کاسٹ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ وہ اپنے تعلق فکر پر فخر کرتے ہیں، شہید عبدالمالک پر ان کی نظم ۔۔۔۔۔ایسے ہی تعلق کی شہادت دیتی ہے۔

بار یابی جو تمہاری ہو حضور مالک
کہنا ساتھی میرے کچھ سوختہ جاں اور بھی ہیں
اپنے رستے ہوئے زخموں کو دکھا کر کہنا
ایسے تمغوں کے طلبگار وہاں اور بھی ہیں

عنایت علی خاں ہر عمر کے لوگوں میں مقبول ہیں، ان کی شاعری کی مقبولیت نے انہیں انٹرنیشل بنا دیا ہے۔ اب وہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ادب سے تعلق رکھنے والے اور بے ادب سب شامل ہیں۔ سرکار والے اور اختلاف والے سب ان کی شاعری کے اسیر ہیں، ان سب میں کوئی قدر مشترک ہے تو وہ ہے ہنسنے ہنسانے کی لگن اور مسکرانے کا حوصلہ ہے۔ مذاق ہی مذاق میں وہ کیسی گہری باتیں کرتے ہیں۔

ہم ان کو لائے راہ پر مذاق ہی مذاق میں
بنے پھر ان کے ہمسفر مذاق ہی مذاق میں
پڑے رہے پھر ان کے گھر مذاق ہی مذاق میں
مزے سے ہو گئی بسر مذاق ہی مذاق میں
ہوا ہے جدے میں جو اک مزاحیہ مشاعرہ
ہم آ گئے خدا کے گھر مذاق ہی مذاق میں
لطیفہ گوئی کا جو رات چل پڑا تھا سلسلہ

ابل پڑے کئی گٹر مذاق ہی مذاق میں

اٹھو کہ اَب نمازِ فجر کے لئے وضو کریں
کہ رات تو گئی گزر مذاق ہی مذاق میں

یہاں عنایت آپ کو مشاعروں کی داد نے
چڑھا دیا ہے بانس پر مذاق ہی مذاق میں

عنایت علی خاں نے لوگوں میں خوشیاں بانٹی ہیں۔ آج کے دور میں جب ہر ایک پریشاں ہے۔ انہوں نے مسکرانے اور ہنسنے کا حوصلہ دیا ہے۔ اور غلطیوں، خامیوں، کوتاہیوں کو ایسے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ پہلے ہم ان پر ہنستے ہیں اور پھر ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

وہ سورج تھا ستارہ ہوگیا ناں
جدائی کا اشارہ ہوگیا ناں

سکھایا تھا جسے دنیا میں جینا
وہی دنیا کو پیارا ہوگیا ناں

کہا بھی تھا محبت تم نہ کرنا
خسارہ ہی خسارہ ہوگیا ناں

بہت ہی دور اپنی دسترس سے
رفاقت کا کنارہ ہوگیا ناں

وہ اپنے گھر کا ہوگیا ناں

کلیجہ سب کا ٹھنڈا ہوگیا ناں

ہمارا حال پتلا ہے تو کیا غم

تیرا الو تو سیدھا ہوگیا ناں

لفافہ بھی ملا ہے داد کے ساتھ

چلو کچھ دال دلیا ہوگیا ناں

عنایت علی خاں کی شاعری پھلجڑی کی طرح چلتی ہے۔ اور پھر سارا ماحول اس کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ ہنستے ہوئے چہرے مسکراتے ہوئے لوگ، مستقبل کے اندیشوں اور پریشانیوں سے بھنچے ہوئے ہونٹ، اور پتھر جیسے چہروں کے سامنے عنایت علی خان کا کلام اور نام آتا ہے تو پہلے چہروں کے عضلات نرم ہوتے ہیں، لب وا ہوتے ہیں، مسکراہٹ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر لوگ ماحول سے بے پروا ہوجاتے ہیں۔ بے ساختہ قہقہے مارتے ہوئے لوگ اپنے منصب اور حیثیت سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ بلکہ ان پریشانیوں اور دکھوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ جن کے جبر نے ان سے مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔ امریکہ اور یورپ والوں سے ان کی چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی ہے۔ عنایت علی خان کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔ کشش ہے کس بلا کی دیکھنا، اس ملک میں یارو

جسے دیکھو، وہ کہتا ہے میں امریکہ جاتا ہوں

ادھر اک دلبرانہ شان سے امریکہ کہتا ہے

کہ صاحب آپ کیوں زحمت کریں، میں خود ہی آتا ہوں۔

سخاوت میں بھلا امریکیوں کا کون ثانی ہے

جو بوٹی مانگیے تو مرغ سالم بھیج دیتے ہیں

پھر اپنے ملک پر تو ان کی اس درجہ عنایت ہے

کہ صاحب ایڈ کے پیکج میں حاکم بھیج دیتے ہیں

ان کا وہ معرکتہ الآرا شعر تو اب بھی زباں زد عام ہے کہ

قوم مشکل میں ہے اور مشکل کشا لندن میں ہے

تشویش و اضطراب میں کہتا تھا اک کسان

امریکی سنڈیاں میرے کھیتوں میں آ گئیں

میں نے کہا میاں تجھے فکر کھیتوں کی ہے

امریکی سنڈیاں تو تیرا ملک کھا گئیں

کبھی دیکھتے تھے جو تفسیر قرآن

وہ اب دورِ نو کی پھبن دیکھتے ہیں

لگائی ہے لو جب سے امریکیوں سے
سنن کی جگہ سی این این دیکھتے ہیں
ان کا یہ شعر بھی اب حسب حال ہے کہ
حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر
کراچی میں ہونے والے مہاجر پٹھان فسادات کی یاد آج بھی اس شعر سے ہو جاتی ہے
کہ
خود ہی خنجر بدست ہوں ہر دم
اور خود ہی لہو لہان بھی ہوں
میری مشکل عجیب مشکل ہے
میں مہاجر بھی ہوں پٹھان بھی ہوں
ایک سکہ بند شاعر کے مجموعے پر ان کی یہ پھبتی خوب جچتی ہے
پانچویں شعر پر جاناں نے یہ جھلا کے کہا
یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے جاناں جاناں

یہ کیسا مقدمہ ہے

یہ ایک ایسی مظلوم عورت ہے۔ جس کی پکار پر کوئی ابن قاسم مدد کو نہ آیا۔ اس پر ظلم کرنے والے خود اس کی اپنی قوم کے افراد ہیں۔ جو کبھی غیر مسلموں پر ظلم کے خلاف کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج ڈالروں کی جھنکار نے انہیں اپنی قوم کی اس بیٹی کی چیخوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور ایک مظلوم نہتی عورت، جس کے بچوں کو اس سے چھین کر مار ڈالا کے خلاف مقدمہ چلا رہی ہے۔ اس مقدمے پر ساری دنیا کی نظریں ہیں، یہ امریکی عدالت میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا مقدمہ ہے۔ اس مقدمہ کو دیکھنے کے لئے عدالت کی عمارت کی اندر اور باہر فٹ پاتھ پر پاکستانی اور مقامی امریکی مرد و عورتوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ یہ لوگ علی الصبح عدالت کی عمارت کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں برقعہ پوش اور حجاب پہنے عورتیں بھی تھیں، باریش نوجوان بھی، بچے بھی تو لبرل قطع وضع اور خیالات رکھنے والے مرد اور عورتیں بھی۔ 'کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف ایک مسلمان اور انسان ہونے کے ناطے ڈاکٹر عافیہ کے پیشی پر آئے ہیں۔ یہ حجاب پہنے خاتون اپنی دو جواں سال بیٹیوں اور چھوٹے بچے لے کر آئی ہیں۔ عدالت کو بتایا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر عافیہ کے پیٹ میں زخم ہے اور آنتوں سے خون جاری ہے اور اب تک انہیں حکومت کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھا رہی'۔ جج ۔۔۔ لیکن

اب تک انہیں کسی ڈاکٹر یا لائسنس یافتہ فزیشن کو کیوں نہیں دکھایا گیا؟' امریکی وکیل استغاثہ ۔۔۔ مدعا علیہ اپنا طبّی معائنہ کسی خاتون ڈاکٹر سے کروانا چاہتی ہے اور خاتون ڈاکٹر دستیاب نہیں ہو سکیں'۔ یہ ہے امریکہ کا انصاف ۔ ایک اور جھلک ملاحظہ ہو ۔۔۔۔ استغاثہ کی طرف سے پیش کئے گئے گواہ احمد گل نے، جو افغانستان میں امریکی افواج کے لیے مترجم تھے، عدالت کو اٹھارہ جولائی سن 2008 کے واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی کمر اس پردے کی طرف تھی جس کے پیچھے ڈاکٹر صدیقی موجود تھیں۔ جب امریکی فوجی کیپٹن سنائیڈر نے چیخ کر کہا کہ "اس کے پاس رائفل ہے" تو انہوں نے مڑ کر دیکھا کہ ڈاکٹر صدیقی بندوق اٹھائے پلنگ کے پاس کھڑی تھیں۔ مسٹر گل کا کہنا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر صدیقی کو رائفل سمیت دھکا دیا

اور جب امریکی چیف وارنٹ افسر نے ان کے پیٹ میں گولی ماری تب وہ بمشکل ان سے رائفل چھین پائے۔ اس دوران ان کے مطابق رائفل سے دو گولیاں چلیں۔ گزشتہ روز کیپٹین سنائیڈر نے بیان دیا تھا کہ ڈاکٹر صدیقی رائفل تانے پلنگ پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھیں۔ وکیل صفائی لنڈا موریونے کے پوچھنے پر مسٹر گل نے واضح طور پر کہا کہ انہوں نے ڈاکٹر صدیقی کو پلنگ پر گھٹنوں کے بل بیٹھے نہیں دیکھا۔ وکلاء صفائی کی جرح پر مسٹر گل نے بتایا کہ اس واقعے کے بعد وہ امریکی حکومت کے تعاون سے امریکہ منتقل ہو چکے ہیں اور امریکی شہریت حاصل

کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ ہیں خریدے ہوئے گواہ۔ لیجئے ایک اور گواہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ گیری وڈ ور تھ ہیں، جو کہ رہی ہیں کہ میں نے بیں برس پہلے اس لڑکی کو بارہ گھنٹے کے نیشنل رائفل کے بنیادی کورس میں پسٹل شوٹنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا،جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ ہزاروں طلبہ میں سے اس طالبہ کو بیں برس بعد کیسے شناخت کر سکتی ہیں تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔اس لڑکی نے چار سو سے بارہ سو راؤنڈ چلائے تھے۔ لیکن یہ پسٹل سے چلائے تھے۔ کسی رائفل سے نہیں چلائے تھے۔ اس جواب سے ساری عدالت کو ششدر کر دیا ´ ایک اور گواہ ایف بی آئی کے ایجنٹ بروس کیمر مین کا کہنا تھا کہ جولائی ۸۰۰۲ میں عافیہ نے انھیں بتایا تھا کہ میں نے یہ رائفل ڈرانے کے لئے اٹھائی تھی۔تاکہ میں فرار ہو سکوں ۔ میں نے اس بیان کے بارے میں اپنے اعلیٰ حکام کو آگاہ کر دیا تھا، لیکن جب دفاع کے وکیل ایلن شارپ نے اس ایف بی آئی کے ایجنٹ کو اس کے تحریر کردہ نوٹس دکھائے جس میں ایسی کسی رائفل کا کوئی ذکر نہ تھا تو اس کی زبان گنگ رہ گئی۔ یہ ہیں عافیہ کے مقدمے کے گواہ۔۔۔۔۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی جن کا تعلق دہشت گردی سے جوڑا جاتا رہا۔ لیکن ان کے خلاف مقدمے میں دہشت گردی کا کوئی الزام نہیں۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر الزام ہے کہ انہوں نے افغانستان کے صوبے غزنی کے ایک پولیس ہیڈ کوارٹر میں ان سے تفتیش کے لیے آنے والی امریکی ٹیم پر ایم فور رائفل سے حملہ کیا۔ استغاثہ کے پیش

کردہ ایف بی آئی کے ماہرین نے عدالت کو بتایا کہ ڈاکٹر صدیقی کی انگلیوں کے نشان ان کاغذات پر سے تو ملے ہیں جو مبینہ طور پر حراست کے وقت ان کے پاس سے دستیاب ہوئے تھے لیکن اس رائفل پر نہیں ملے جس سے انہوں نے مبینہ طور پر گولیاں چلائی تھیں۔ مقدمے کی ابتدائی سماعت نے اس وقت ڈرامائی شکل اختیار کر لی جب عدالت کو بتایا گیا کہ ملزمہ نے مبینہ طور پر جس گن سے امریکی فوجیوں پر گولیاں چلائی تھیں اس بندوق پر عافیہ صدیقی کی انگلیوں کے نشان یا کوئی اور ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس بندوق سے فائر کی گئی گولیوں کے خول موجود ہیں جبکہ دوران سماعت عافیہ صدیقی نے ایک بار پھر امریکہ کے عدالتی نظام پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انہیں امریکہ کی عدالت سے انہیں انصاف کی توقع نہیں اور مجھ پر لگائے تمام الزامات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں یہ ہیں اس مقدمے کے ثبوت جن کا کوئی سر ہے نہ پیر۔ پراسیکیوٹر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ عافیہ صدیقی کا القاعدہ یا طالبان سے تعلق کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور نہ ہی اس تعلق کے شبہ میں ان کے خلاف کوئی الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں اس مظلوم عورت کا مقدمہ ہے۔ مستقبل میں سپر پاور کے خلاف ایسی ایف آئی آر ہو گی۔ جس سے مشرف اور بش کبھی نہ بچ سکیں گے

پیٹھ میں چھرا کون گھونپ رہا ہے

زندگی کی قدریں اور روایات کس طرح تبدیل ہو رہی ہیں۔ ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہے۔ ٹیلی وژن کے رنگین اسکرین پر زندہ انسان کو پھٹتے ہوئے دیکھنا، انسانوں کے بکھرتے ہوئے اجسام اور بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلے ہماری نوجوان نسل پر کیا اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ کراچی پر پے در پے قیامتیں گزر رہی ہیں۔ اور ہم اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔ دھماکوں کے بعد پہلا اعلان تو یہ ہوتا ہے کہ مرنے والوں کے لواحقین کو ۲ لاکھ اور زخمیوں کو ۵۰ ہزار معاوضہ دیا جائے گا۔ ہم نے انسانی جانوں کو روپوں اور پیسوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس آگے ہماری نظر ہی نہیں جاتی۔ ٹیلی وژن کا اسکرین چند لمحے ماحول کو اداس رکھتا ہے اور پھر آپ کو گانے، ناچ، اور دوسری رنگ رلیوں میں مصروف کر دیتا ہے۔ طرح طرح کی معرکہ آراء باتیں قصے کہانیوں میں ڈھل کر آپ کو کوئی فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔

سنتے آئے ہیں، مگر یہ ہوشربا مناظر اب آپ کو دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ یہ اکیسویں صدی کا ایک طلسم کدہ ہے۔ ایک طرف اگر دنیا جہاں کی معلومات گھر بیٹھے ملتی ہیں تو دوسری طرف اس کے تفریحی پروگرام کسی طرح بھی طلسم ہوش

ربا سے کم نہیں۔ خاص طور پر مختلف چینلز کے کبھی نہ ختم ہونے والے طلسمی جال نے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو جکڑ رکھا ہے۔ گھریلو خواتین کیلئے ان کی اہمیت ایک وقت کا کھانا تیار کرنے کے مترادف ہے۔ ان ڈراموں کے موضوعات زیادہ تر گھریلو مسائل، رشتوں کے اقدار، محبت و نفرت کی جنگ اور خواہشوں کے نت نئے انداز کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ ان کہانیوں میں روایتی ہیرو، ہیروئن کے انجام سے ہٹ کر ایک نئی روش اختیار کر گئی ہے کہ ڈرامہ کی کہانی تمام کرداروں کا باری باری طواف کرتی ہیں اور اس طرح سے ایک لامتناہی سلسلہ سالہا سال سے چلتا آ رہا ہے۔ روز مرہ کے عام موضوعات سے لے کر کٹھن مراحل زندگی کو سلجھانے کی کوشش اور نت نئے موضوعات کی دلفریبی نے ناظرین کو الجھا کر رکھ دیا ہے اور اس طرح اس طلسم ہوش ربا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

پروگرام بچوں کے ہوں یا بڑوں کے زمانے کی رنگینی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آزادی و لذت کے وہ سارے سامان میسر ہیں جو ہر آج کو رنگین بنا رہے ہیں اور ہر کل سے بے خوف کر رہے ہیں۔ اگر اس سراب نظر سے توجہ ہٹائی جائے تو کچھ اہم باتیں توجہ طلب ہیں جہاں یہ ڈرامے اعلیٰ تفریح اور سبق آموز کہانیوں کا مسکن سمجھے جاتے ہیں وہیں نئی تہذیب اور کلچر کو بھی جنم دے رہے ہیں۔ ہم جس بھی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں اس کا تو اب احساس بھی ختم ہوتا جا

رہا ہے روزمرہ معاملات اب اس تربیت کے باعث ہمیں مختلف دکھائی دیتے ہیں ہمارے رسم و رواج کے اندر جو کچھ ملاوٹ ہو چکی ہے شاید اس کا خمیازہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس نئے دور کی نئی تہذیب کے جو ثمرات ہمیں مل رہے ہیں اس کا کریڈٹ اس ذہن کو دینا چاہیے جس نے کامیابی کے ساتھ اپنا رنگ ہمارے اوپر رنگ دیا ہے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ امید یہ ہے کہ ہم، جو کہ اس دلدل میں بری طرح پھنس چکے ہیں اور بچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، اگلے مرحلے پہ اپنا وجود کھو چکے ہوں گے۔ جہاں ہمارے پاس دوسروں کی برائیاں کرنے کیلئے بہت وقت ہے وہاں ہم اپنے گریبان میں جھانکنے کی جرات نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو احساس دلانے کا وقت بھی نہیں یہ سلسلہ اگر یونہی چلتا رہا تو نا معلوم کتنی نسلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا آج اگر ہم کم از کم اتنی ہمت کر لیں کہ اپنی آنکھوں کی پٹی اتار کر غیر جانبدار ہو کر اپنے ارد گرد بدلتے ہوئے زندگی کے رنگوں کو اپنی "ذاتی" آنکھوں سے دیکھ کر فیصلہ کریں کہ آیا ہم سب کچھ صحیح کر رہے ہیں یا کچھ غلط بھی ہو رہا ہے؟ آیا ہم اتنے لاپرواہ ہیں اور کیا ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں؟ ہم کب تک معاملات سے پہلو تہی کرتے رہیں گے۔ آج ہماری قوم کے نوجوان بچے جس رنگ کو اپنا رہے ہیں کیا وہ ہمارا اپنا رنگ ہے؟ کیا ہمارا یہی ورثہ ہے کہ اگر ایک طرف ہم امپورٹڈ اشیائے صرف پسند کرتے ہیں تو کیا دوسری طرف امپورٹڈ لائف اسٹائل کو بھی اپنا لیں جو چاہے ہماری تہذیب کی کمر میں چھرا ہی گھونپ رہا

ہو؟

یہ فصل آپ نے بوئی ہے

شیخ رشید پر فائرنگ کے واقعے نے دار لحکومت اسلام آباد میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی ہے، اور پاکستانی سیاست دانوں کو ایک بار پھر احساس دلا دیا ہے کہ سیاست کھیل نہیں ہے زنانیاں دا۔۔۔ البتہ بے نظیر بھٹو اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مردوں سے بڑھ کر جی داری کا ثبوت دیا۔اور جان آفریں اس سیاست پر نچھاور کردی۔ شیخ رشید پر اس حملے میں نامعلوم مسلح افراد کی فائرنگ سے دو افراد ہلاک اور تین زخمی ہوئے ہیں۔ ہم ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے میڈیکل سپرنٹینڈنٹ کا کہنا ہے کہ شیخ رشید گولی لگنے سے نہیں بلکہ گرنے سے زخمی ہوئے ہیں۔ تہمینہ دولتانہ کا کہنا ہے کہ شیخ رشید کے پیر میں موچ آئی ہے۔ شیخ رشید بڑے بڑ بولے ہیں۔ شیخ رشید نے جم کر جنرل مشرف کی ڈکٹیٹر شپ کا ساتھ دیا اور پانچ سال خوب اقتدار کے مزے لوٹے۔ اس دوران لال حویلی والے شیخ رشید کے سامنے لال مسجد لال کردی گئی اور وہ چپ رہے۔ اس لئے شیخ رشید احمد اِس حلقے سے جہاں سے وہ ۵۸۹۱ ء کے بعد سے اب تک مسلسل چھ بار انتخاب جیت چکے تھے۔ ۸۱ فروری سنہ دو ہزار آٹھ میں ہونے والے عام انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ نون کے سنئیر رہنما مخدوم جاوید ہاشمی سے بری طرح شکست سے دوچار ہوئے، نے شیخ رشید کو شکست دی تھی۔ عوامی مسلم لیگ کے سربراہ اور

سابق وفاقی وزیر شیخ رشید احمد کو پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ سیاست کا کیا حال ہوگیا ہے۔ پانچ برس میں ایک ڈکٹیٹر نے اس ملک کا کیا حال کر دیا۔ شیخ صاحب اس وقت بھی اس کے حمایتی تھے۔ جب معصوم بچیوں پر فاسفورس بم استعمال کئے گئے۔ سیاست میں قاتلانہ حملے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایوب خان کے دور میں نواب کالا باغ ان کاموں میں خوب شہرت رکھتے تھے۔ مولانا مودودی کے جلسے میں ان پر گولی چلائی گئی۔ جس میں جماعت کا ایک کارکن اللہ بخش شہید ہوا۔ اس جلسہ میں کسی نے مولانا سے کہا کہ گولیاں چل رہی ہیں آپ بیٹھ جائیں۔ جس پر مولانا مودودی نے وہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ اگر آج میں بیٹھ گیا تو کون کھڑا رہے گا۔ مولانا کی سنت پر ڈاکٹر نذیر شہید ڈٹے رہے۔ اور رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ سانگھڑ میں بھٹو پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ تو ان کا ملازم نورا ان کی ڈھال بن گیا۔ لاہور میں خواجہ رفیق مال روڈ پر شہید ہوگئے۔ نواب احمد خان قتل ہوئے۔ جن کے قتل کے الزام میں بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ شیر پاؤ پر حملہ ہوا۔ اور وہ شہید ہوگئے۔ ملک کی سیاست میں بعد میں تو گولی اور گالی کی سیاست ایسی چلی کہ اب بم دھماکے، میزائیل، ڈرون حملے، خودکش حملے ہو رہے ہیں۔ ایک ایک واقعے میں سینکڑوں ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔ شوکت عزیز تو ایک قاتلانہ حملہ سہار نہ پائے اور بھاگ لئے۔ مشرف کئی حملوں میں بھی بچے رہے۔ اور بے نظیر ایک حملے سے بچی تو دوسرے میں اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ شیخ رشید پر جو قاتلانہ حملہ ہوا اس کے کیا محرکات ہو سکتے ہیں۔ یہ شیخ رشید پر

منحصر ہے کہ وہ اس قاتلانہ حملے میں کس کو نامزد کرتے ہیں۔ لیکن ہم ان کی رہنمائی کیلیے اس قاتلانہ حملے پر روشنی ڈال سکتے ہیں تاکہ شیخ رشید کو مقدمے میں حملہ آوروں کو نامزد کرنے میں آسانی رہے۔ شیخ رشید نے دو چار علما کے نرغے میں لال مسجد کے واقعے پر معافی مانگی ہے مگر ہو سکتا ہے لال مسجد کے متاثرین نے انہیں معاف نہ کیا ہو اور انہیں سے بدلہ لینے کی کوشش کی ہو۔ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لال مسجد کے متاثرین نے ان پر پہلے حملہ کیوں نہیں کیا اور انتخابی مہم کے دوران ہی کیوں حملہ کیا۔ یہ شیخ رشید ہی ہیں جنھوں نے اپنے حلقے کے انتخابات کروانے کیلیے سپریم کورٹ تک دوڑ لگائی اور یہ بات حکومت کو پسند نہیں آئی ہوگی۔ یہ وفاقی حکومت بھی ہو سکتی ہے اور صوبائی حکومت بھی۔ ان پر حملہ کرنے والا ان کے مقابلے میں کھڑا کوئی امیدوار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ہماری یہ روایت رہی ہے کہ جس کے جیتنے کی امید ہو اسے ایسے ہی راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بھی امکان ہے کہ شیخ رشید نے خود یہ ڈرامہ رچایا ہو۔ کیونکہ سیاستدان کیلیے انتخاب جیتنے کیلیے دو چار ساتھیوں کی قربانی کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اگر شیخ رشید کی کسی کیساتھ ذاتی دشمنی ہے تو وہ خود اس بارے میں بتا سکتے ہیں۔

شیخ رشید احمد کو اب ملک کے عوام کا درد بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ملک میں غریب لوگ خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ خودکشیوں کی وجہ حکمرانوں کے ترقیاتی منصوبوں پر اربوں روپے ضائع کرنا ہے۔ ماضی میں خود شیخ صاحب یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے انہوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ملک میں بجلی کا کوئی بحران نہیں لوڈ شیڈنگ مصنوعی ہے مجھے ایک ہفتے کے لیے اختیار دیا جائے لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ نہ کردوں تو لال حویلی کے باہر پھانسی لگا دیں۔۔

ویل ڈن نسیم حمید

ہمارے ملک میں کتنا ٹیلنٹ ہے۔ جو سخت کوشش، محنت، اور لگن کے ساتھ نا مساعد حالات، ناانصافی، اقربا پروری، میرٹ کے قتل عام کے باوجود آگے بڑھنے کی جہد وجہد میں مصروف ہے۔ اس ملک کے اصل رکھوالے، اور اس کے ساتھ محبت رکھنے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ جو اپنے کچے مکانوں، بغیر کسی کوچنگ، ٹریننگ کے کھیلوں کی دنیا میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں۔ ہم اپنی نوجوان نسل کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں ناکام رہے ہیں، کراچی کی کچی اور غریب بستیوں میں نسیم حمید جیسی کتنی بچیاں ہیں۔ جو پڑھائی، کھیل، مصوری، آرٹ، فنون کی دنیا میں اپنا اور ملک اور قوم کا نام روشن کر سکتی ہیں۔ لیکن ان بچوں پر نہ حکومت اور نہ کھیلوں کے فروغ کے نام پر کروڑوں روپے کا ہر سال بجٹ رکھنے والے ادارے کوئی توجہ دیتے ہیں۔ نہ ان کی تعلیم اور صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ لیاری جو فٹبال کے لئے زرخیز علاقہ تھا۔ اسے ہم نے باکسنگ، فٹبال کے بجائے منشیات سے شہرت دی۔ ساؤتھ ایشین گیمز میں خطے کی "اسپرنٹ کوئن" کا اعزاز حاصل کرنے والی پاکستانی نسیم حمید کا گھر پوری دنیا نے میڈیا پر دیکھا۔

اس گھر کے باہر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہے۔ نسیم حمید کے میڈلز اور

ٹرافیاں صندوق میں رکھی ہوئی ہیں۔ جن کو سجانے کے لئے کوئی شوکیس نہیں ہے۔ وہ مزدور کی بیٹی ہے۔ جس نے ملک کا نام روشن کردیا ہے۔ کورنگی کی نسیم حمید نے 100 میٹر کی دوڑ میں طلائی تمغہ حاصل کرکے جنوبی ایشیا کی تیز ترین خاتون کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ جس کے بعد نسیم حمید کو خطے کے میڈیا میں زبردست پذیرائی ملی۔ ایک عرصے کے بعد پاکستان کی اس کامیابی نے دلوں میں جوش اور ولولہ بھر دیا ہے۔ نسیم حمید کی کامیابی کو بھارت اور بنگلہ دیش کے میڈیا میں نمایاں جگہ دی گئی۔ بنگلہ دیش کے مختلف چینلز نے ان کے قدموں کے نشان دکھائے۔ سری لنکن اخبار نے انہیں "وومن آف دی ریجن" کا خطاب دیا۔ یہ کراچی کی بیٹی ہے۔ جس نے ملت اسکول کورنگی اور کورنگی کالج سے میٹرک اور انٹر کی تعلیم حاصل کی ہے۔ نسیم حمید 40 گز کے گھر میں رہتی ہے۔ اس کی غربت کا یہ عالم تھا کہ اس کے گھر والے اس سے بھی چھوٹے گھر کی تلاش میں تھے۔ تاکہ اس گھر سے فروخت ہونے والی رقم سے گھر کے لیے کچھ ضروری اشیاء خرید لی جائیں ۔ اور جسم اور جاں کا رشتہ قائم رکھا جائے۔ اللہ نے اس بچی کو کامیابی دلائی اور اب طلائی تمغہ جیتنے پر پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن اور پاکستان ایتھلیٹکس فیڈریشن نے ایک، ایک لاکھ روپے انعام کا اعلان کیا ہے۔ ناظم کراچی سید مصطفیٰ کمال نے 2 لاکھ روپے انعام کا اعلان کیا ہے۔۔ ایک بہن، ایک بھائی اور ماں باپ کے ساتھ رہنے والی نسیم حمید کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے والے خاندان کی کفیل ہیں۔ مہنگائی کے دور میں اعلان کردہ رقم

زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن 40 گز کے مکان میں رہنے والے ایک غریب خاندان کے لیے یہ رقم ملنا کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ ایک کمرے کا یہ مکان جس میں وہ مقیم ہیں اس خاندان کی بے بسی کی تصویر ہے۔ نسیم کے والد راج مستری کا کام کرتے ہیں اگر مزدوری مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ کھانے کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔

نسیم حمید آرمی کی ایتھلیٹکس ٹیم کا حصہ ہیں۔ ان کو ملنے والے 9 ہزار روپے ماہانہ ہی اس خاندان کے گزر بسر کا سبب بنتے ہیں۔ کسمپرسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نسیم حمید کو ملنے والے میڈلز اور ٹرافیاں ایک اٹیچی کیس میں رکھے ہوئے ہیں۔ نسیم حمید کی چھوٹی بہن قرۃ العین بھی کھلاڑی ہے اور سندھ کی فٹ بال ٹیم کی رکن ہیں۔

نسیم کے والد حمید اور والدہ نسرین کو ہی نہیں آج ہر پاکستانی کو اپنی بیٹی پر فخر ہے۔

پاکستان نے ایتھلیٹکس میں چار گولڈ، دو سلور اور چار برانز میڈلز حاصل کئے۔

بھارت نے ڈھاکا گیمز میں مجموعی طور پر 87 گولڈ میڈل اور پاکستان نے انیس گولڈ میڈل جیتے ہیں۔ بنگلہ دیش نے فٹبال اور کرکٹ میں باکسنگ میں گولڈ میڈل جیتا ہے۔

کراچی کی گلیوں اور سڑکوں پر آج کل بچے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ اس شہر میں قائد اعظم نے کرکٹ کھیلی ہے۔ لیکن اس وقت کھیلنے کے میدان تھے۔ اب ہم نے پلازے بنا دئے ہیں۔ قائد تحریک کہتے ہیں کہ کچے گھروں میں موجود ٹیلینٹ ملک کو وکٹری

اسٹینڈ پر لا سکتا ہے۔ لیکن کراچی والو یہ بھی تو سوچو کہ یہ ٹیلنٹ جھگیوں، میں کیوں ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت، بنیادی سہولتیں فراہم کرنا کس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ایک نسیم حمید کا مسئلہ نہیں بلکہ اس ملک کے 90 فیصد عوام کا مسئلہ ہے۔

ویلنٹائن ڈے پر آگ کے تحفے

ویلنٹائن ڈے پر محبت کے اظہار کے لیے گلاب کے پھول سے بہتر تحفہ کوئی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اس بار اس دن محبت اور پھول پھلوار کے بجائے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نواز نے ایک دوسرے کو گرما گرم تحفے ارسال کئے ہیں۔ اس نے ماحول میں آگ سی بھر دی ہے۔ میاں نواز شریف نے اسلام آباد میں انتہائی دل گرفتہ انداز میں بیتے ہوئے ماہ و سال کی کہانی سناتے ہوئے کہا کہ جمہوریت صدر زرداری کے ہاتھوں میں غیر محفوظ ہے اور یہ کہ انہیں صدر زرداری کے اقدامات سے بہت مایوسی ہوئی ہے۔ میاں نواز شریف دو سال سے جس مخمصے میں گرفتار تھے۔ باالآخر وہ اس سے باہر آ گئے اور انہوں نے واضح انداز میں کہہ دیا کہ زرداری کی جمہوریت اور آمریت میں کوئی فرق نہیں اور صدر زرداری جمہوریت کے لیے بڑا خطرہ ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ شہباز شریف میری اجازت سے آرمی چیف سے ملے تھے۔ میاں نواز شریف نے حالیہ عدالتی بحران میں ایک بار پھر عدلیہ کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ججوں کی تقرری کے معاملے پر آئین کے مطابق عمل نہ کیا گیا تو مسلم لیگ ن اعلیٰ عدلیہ کا اسی طرح ساتھ دے گی جیسے عدلیہ بحالی تحریک میں دیا تھا۔ میاں

نواز شریف کی اسلام آباد کی اس پریس کانفرنس کا جواب جیالوں نے لاہور کی ریلی میں میاں نواز شریف کے پتلے جلا کر دیا۔ سپریم کورٹ کی جانب سے اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کے تبادلے کا صدارتی حکم غیر آئینی قرار دیے جانے کے بعد مختلف شہروں میں وکلا تنظیموں، سول سوسائٹی اور سیاسی جماعتوں جماعت اسلامی، تحریک انصاف کی جانب سے حکومت کیخلاف اور ججوں کی حمایت میں مظاہروں اور پورے ملک میں پیپلز پارٹی کی جانب سے صدر زرداری کے ساتھ یکجہتی کے مظاہروں نے ملک میں ایک ہلچل کی کیفیت پیدا کردی ہے۔

سیاست میں اپنے فیصلوں کی حمایت میں سیاسی جماعتوں کا اپنے کارکنوں کو سڑکوں پر لے آنا، اور سیاسی جماعتوں کے قائدین کا سخت لب ولہجہ ملک میں عوامی سطح پر تصادم کی فضا ہموار کر رہا ہے۔ جس کا فائدہ سیاسی جماعتوں اور جمہوریت کو نہیں پہنچے گا۔ ایسے میں جناب وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے جو مصالحتی انداز اختیار کیا ہے اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ حالات پر قابو پالیا جائے گا۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ جمہوریت، ملک اور اداروں کو کوئی خطرہ نہیں۔ ججوں کے معاملے سمیت تمام معاملات کو حل کر لیں گے۔ عدلیہ کا معاملہ مسئلہ کشمیر نہیں جو حل نہ ہوسکے۔ ایک ایسے دن جب اظہار محبت کی نئی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ جلسوں میں آگ لگانا، پتلے جلانا، جمہوریت کے لئے نقصان دہ ہے۔ ملک میں تمام ادارے اپنا کام کر رہے ہیں، اور انہیں اپنے اپنے

دائرہ اختیار میں کام کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہی جمہوریت کا حسن ہے۔ جسے قائم رکھنا چاہیئے۔ سیاسی قائدین کو اس آگ کی آنچ کو مدہم رکھنا چاہیئے ورنہ یہ آگ سب کر جلا کر راکھ کردے گی۔ اور جمہوریت کا قافلہ صحرا میں بھٹکتا پھرے گا۔

بھارت میں انصاف کا قتل

بھارت نے ممبئ حملوں کو جواز بنا کر نہ صرف ان مذاکرات کی میز پر بیٹھنے سے انکار کیا۔ جو طویل عرصے کی جھد و جھد کے بعد دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لارہے تھے۔ ایک ممبئ حملے کو بنیاد بنا کر پاکستان کے خلاف مسلسل بہتان تراشی کی جاتی رہی۔ ممبئ حملے کو اب تقریباً سوا سال کا عرصہ ہوچکا ہے۔ لیکن بھارت میں اس مقدمے میں بہت زیادہ پیش رفت نہیں ہو سکی ہے۔ گزشتہ دنوں اس واقعے کے واحد زندہ ملزم اجمل قصاب نے یہ بیان دے کر واقعے کی پول کھول دی تھی کہ ان سے جو اعترافات کرائے گئے ہیں۔ وہ تشدد کا نتیجہ تھے۔ انھوں نے تمام الزامات سے انکار کردیا تھا۔ اس کیس میں ایک مزید پیش رفت یہ ہوئی تھی کہ ہندوستان کے وزیر داخلہ پی چدامبرم نے کہا تھا کہ 26 نومبر 2008 کو ممبئ پر دہشت گردانہ حملہ کرنے والوں کو جو لوگ ہدایتیں دے رہے تھے ان میں سے ایک ہینڈلر ہندوستانی ہو سکتا ہے۔ تاہم انھوں نے کہا تھا کہ اس مشتبہ شخص کی ابھی تک شناخت نہیں ہو سکی ہے۔ جوں جوں یہ مقدمہ عدلیہ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس سے اس بات کے شواہد مل رہے تھے کہ یہ بھارت کا اندرونی معاملہ تھا۔ جس کو پاکستان پر تھوپ کر بھارت امریکہ اور دنیا کی ہمدردیاں سمیٹ رہا تھا۔ اس حملے کے دوران بھارتی پولیس افسر ہیمنت کرکرے کو جس انداز سے قتل کیا گیا

تھا۔ وہ بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ ۱۱ فروری کو اس مقدمے کے وکیل شاہد اعظمی کو ان کے دفتر میں قتل کر کے اس مقدمے کو مزید پر اسرار بنا دیا ہے۔ اور اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ یہ سب کھیل بھارتی خفیہ ایجنسی را کا ہے۔ جو اس کے تمام ثبوت مٹا رہی ہے۔ اس بات کا خدشہ بھی موجود ہے کہ مبینہ ملزم اجمل قصاب کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس خطرے کا کئی بار ملزم بھی اظہار کر چکا ہے۔

ممتاز شاعر کیفی اعظمی اور اداکارہ شبانہ اعظمی کے رشتہ دار شاہد اعظمی ایک جواں ہمت وکیل تھے۔ جو بھارت میں ان مقدمات کو لینے کی شہرت رکھتے تھے۔ جو کوئی اور وکیل نہیں لیا کرتا تھا۔ وکیل شاہد اعظمی کو ان کے دفتر میں فائرنگ کر کے قتل کیا گیا۔ اعظمی کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ انہیں اس سے پہلے کئی مرتبہ دھمکیاں بھی مل چکی تھیں۔ قتل کے عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ چار افراد ممبئی کے کرلا ٹیکسی مینس کالونی علاقے میں واقع شاہد اعظمی کے دفتر میں آئے۔ انہوں نے آفس سٹاف کو بتایا کہ وہ اپنے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں اعظمی سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ اعظمی جب دفتر میں داخل ہوئے تب حملہ آوروں نے ان سے کچھ دیر بات کی اور پھر اچانک ریوالور نکال کر انتہائی قریب سے ان پر چار فائر کیے۔ فائرنگ کے بعد وہ چاروں فرار ہو گئے۔ اعظمی کو راجہ واڑی ہسپتال لے جایا گیا لیکن ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا۔ کرلا

پولیس سٹیشن کے سینئر پولیس انسپکٹر باگوے تو ابھی تفتیش میں مصروف ہیں۔ لیکن پولیس کرائم برانچ کے ذرائع نے شاہد اعظمی کے قتل کے پیچھے مافیا سرغنہ چھوٹا راجن کا ہاتھ ہونے کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ چھوٹا راجن پر اس سے قبل ممبئی بم دھماکوں کے کئی ملزمین کو ہلاک کرنے کا الزام عائد ہو چکا ہے اور کئی مرتبہ قتل کرنے کے بعد انہوں نے قتل کا اعتراف بھی کیا تھا۔ شاہد اعظمی کو اس سے قبل چھوٹا راجن گینگ سے علیحدہ ہوئے گینگسٹر روی پجاری کی جانب سے جان سے مارنے کی دھمکی ملی تھی جس کی انہوں نے مقامی پولیس سٹیشن میں شکایت درج بھی کرائی تھی۔

ایڈوکیٹ اعظمی اس وقت ممبئی حملوں کے انڈین ملزم فہیم انصاری کے کیس کی پیروی کر رہے تھے۔ فہیم پر الزام ہے کہ انہوں نے ممبئی کی ریکی کرکے اور اس کا نقشہ بنا کر نیپال میں لشکر طیبہ کے اراکین کو دیا تھا۔ اعظمی اس کے علاوہ گیارہ جولائی سن دو ہزار چھ میں ہونے والے سلسلہ وار ٹرین دھماکوں کے ملزمین کے کیس کی بھی پیروی کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ممبئی سے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار دو کشمیریوں کا کیس بھی لڑ رہے تھے۔ اکتیس سالہ ایڈوکیٹ شاہد اعظمی کو بابری مسجد انہدام کے بعد ممبئی میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ملزم قرار دے کر پولیس نے ٹاڈا قانون کے تحت گرفتار کرکے جیل بھیج دیا تھا۔ سات برس انہیں ایک جھوٹے الزام میں جیل میں رکھا

گیا۔ سن بانوے سے سن ناوے تک اعظمی جیل میں رہے لیکن پھر انہیں سپریم کورٹ نے بری کر دیا۔ جس کے بعد اعظمی نے قانون کی پڑھائی مکمل کی اور انہوں نے بحیثیت کریمنل وکیل کے ایسے مسلمان ملزمین کا کیس لینا شروع کیا جو خود کو بے قصور اور پولیس کی مبینہ زیادتی کا شکار بتاتے تھے۔

اعظمی ایسے انتہائی حساس کیس میں مسلم ملزمان کے کیس کی پیروی کے لیے مشہور تھے جن کے کیس کو اکثر وکلاء ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ سن ترانوے بم دھماکے کی پیروی کرنے والی دفاعی وکیل فرحانہ شاہ نے شاہد اعظمی کی موت کو انصاف اور قانون کی موت قرار دیا۔ ممبئی حملہ کیس میں بھارتی وزیر داخلہ مسٹر چدامبرم نے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ممبئی حملوں میں بھارتی شہری کے ملوث ہونے کے بیان نے صورتحال کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ انہوں نے اس مشتبہ شخص کے بارے میں کہا: '' وہ کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جس نے پاکستان سے یہاں آ کر ایک لمبے عرصے تک رہ کر یہاں کا لب و لہجہ اور زبان کی خصوصیات حاصل کر لی ہوں۔ یا یہ کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو ہندوستان سے پاکستان گیا ہو اور وہاں کسی شدت پسند تنظیم میں شامل ہو گیا ہو۔''۔ مسٹر چدامبرم نے کہا کہ 26 نومبر کے حملے میں ایک ہینڈلر کے بارے میں ایک عرصے سے شبہ ہے کہ وہ ہندوستانی ہو سکتا ہے۔ وہ ابو جندل کے نام سے بات کر رہا تھا جو اس کا اصل نام نہیں ہے۔ تاہم مسٹر

چدامبرم نے کہا کہ وہ اس کے بارے میں کوئی قیاس آرائی نہیں کر سکتے۔ '' ہم واضح طور پر اس شخص کی شناخت تب تک نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اس کی آواز کا نمونہ نہیں مل جاتا۔ ''ابو جندل کا لب و لہجہ ہندوستانیوں سے ملتا تھا اور اس نے اپنی بات چیت کے دوران انتظامیہ کے لیے '' پرشاسن '' اور مشال کے لیے '' اودہرن '' جیسے خالص ہندی کے متعدد الفاظ استعمال کیے تھے۔ ہندوستان میں بی جے پی اور شیو سینا جیسی جماعتیں کئی بار یہ سوال اٹھا چکی ہیں کہ ممبئی حملے جیسا واقعہ مقامی شدت پسندوں کی مدد کے بغیر انجام نہیں دیا سکتا۔ پاکستانی حکام بھی کئی بار یہ کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان کو اس حملے میں مقامی شدت پسندوں کے ملوث ہونے کی گہرائی سے تفتیش کرنی چاہیے۔

بھارت میں شاہد اعظمی کا قتل انصاف کی موت ہے۔ بھارت کو مان لینا چاہئے کہ اب اس ٹوپی ڈرامے میں کوئی جان نہیں رہی ہے۔

پولیس کے ہاتھوں موٹر سائیکل سواروں کی تذلیل

کراچی کے شہریوں کو ان دنوں ٹریفک پولیس کے ہاتھوں جو تذلیل برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان میں موٹر سائیکل سوار سرفہرست ہیں۔ آپ کسی سڑک سے گزر جائیں، پولیس والوں نے کئی موٹر سائیکل والوں کو روک رکھا ہوگا۔ کاغذات کی چیکنگ اور اس کے ساتھ ہی جوڑ توڑ کا کاروبار آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہوگا۔ اس چیکنگ کے دوران یہ واقعہ بھی اسی شہر میں پیش آیا کہ باپ بیٹے کو روک لیا گیا۔ بیٹے نے لاکھ کہا کہ میرا باپ بیمار ہے۔ اسے ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ لیکن بیٹے پر تشدد کیا گیا۔ اور باپ کو موبائیل میں ٹھونس دیا گیا۔ جہاں اس پر دل کا دورہ پڑا۔ اور وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔ اکثر تھانوں کی حدود میں پولیس والے نوجوانوں کو اپنے ساتھ تھانے لے جاتے ہیں اور تھانے سے فون کیا جاتا ہے کہ آپ کا بچہ تھانے میں ہے۔ اب آپ بھاگتے دوڑتے جائیں گے۔ کاغذات دکھانے کے باوجود پولیس والوں کی دال روٹی کا جرمانہ بھی آپ کو ادا کرنا ہوگا۔ ڈبل سواری انگریزی زبان کے الفاظ ہیں جن کا استعمال عام طور پر کراچی میں موٹر سائیکل پر دو افراد کی بیک وقت سواری کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

موٹر سائیکل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ غریب اور متوسط طبقے کی سواری

ہے لیکن آئے دن ڈبل سواری پر پابندی عائد کرکے عروس البلاد کراچی کے شہریوں کے لئے اس کی افادیت کو شجر ممنوعہ بنادیا جاتا ہے۔ انتظامیہ کی نااہلی کی سزا کراچی کے مظلوم غریب و متوسط طبقے کو دی جاتی ہے۔ حکومتی حلقوں کی طرف سے اس پر پابندی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ڈبل سواری سے دہشت گردوں اور شرپسندوں کو اپنی مذموم کاروائیوں میں مدد ملتی ہے اس لئے اس پر پابندی عائد رہنی چاہیے۔ عوام الناس کے نزدیک حکومت کا یہ مؤقف " عذرگناہ بدتر ازگناہ" کے مترادف ہے امن وامان کی صورتحال کو بہتر بنانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے کے بجائے ڈبل سواری پر پابندی لگا دینا حکومت کی ذہنی دیوالیہ پن کی عکاسی کرتا ہے۔ حکومتی اہلکاروں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ ڈبل سواری پر پابندی صرف کراچی اور حیدرآباد میں کیوں ہے۔ اندرون سندھ اور ملک کے دیگر حصوں میں حالات زیادہ خراب ہیں وہاں بھی تو پابندی لگائی جائے۔

پاسبان کے رہنما الطاف شکور اور ان کے ساتھی اس سلسلے میں ایک عرصے سے احتجاج کررہے ہیں۔ سندھ ہائی کورٹ میں بھی اس سلسلے میں ایک درخوست زیر سماعت ہے۔ سندھ ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس مشیر عالم اور مسٹر جسٹس عقیل احمد عباسی پر مشتمل ڈویژن بنچ نے ڈبل سواری پر پابندی کے خلاف دیدار علی چانڈیو کی درخواست پر سیکرٹری داخلہ سے 10 دن میں رپورٹ طلب کی ہے درخواست گزار کی جانب سے جاوید چھتاری ایڈووکیٹ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ وکیلوں، ڈاکٹروں

اور لیکچرروں کو بھی ڈبل سواری پر پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ عصر حاضر میں سب سے سستا اور مطلوبہ مقام تک فوری رسائی کا واحد ذریعہ موٹر سائیکل ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے میں جبکہ پٹرولیم مصنوعات کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں یہ سواری کم آمدنی اور متوسط گھرانے کے دو افراد کے لئے انتہائی موزوں اور باکفایت ذریعہ آمد ورفت ثابت ہوا ہے۔

تاہم گزشتہ کئی ماہ سے ڈبل سواری پر پابندی نے ایسے قلیل آمدنی والے متعدد گھرانوں کو اس سہولت سے محروم کردیا ہے۔ ڈبل سواری پر اس قدر طویل اور سخت پابندی کے باوجود ٹارگٹ کلنگ اور اسٹریٹ کرائمز کی شرح میں گزشتہ چند ماہ کے دوران بجائے کمی واقع ہونے کے افسوس ناک حد تک اضافہ ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ موجودہ صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر ایک یہ کہنے پر مجبور ہے کہ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری کی پابندی پر حقیقتاً معصوم شہری ہی پوری طرح عمل پیرا ہیں جو کہ اس لامتناہی پابندی کے باعث ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں جبکہ موٹر سائیکل پر ڈبل سواری کی پابندی سے ٹرانسپورٹ حضرات تو یقیناً ایک کثیر رقم کی اضافی آمدنی یومیہ وصول کررہے ہیں، جبکہ کم آمدنی والے، ملازم پیشہ افراد اور چھوٹے کاروباری حضرات اس پابندی کی وجہ سے نہ صرف مالی مشکلات کا سامنا کررہے ہیں بلکہ کوئی ایمرجنسی پیش آنے کی صورت میں انہیں انتہائی دشواری اٹھانا پڑتی ہے۔ مندرجہ بالا دشواریوں اور پریشانیوں

کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کو اپنے اس فیصلے پر نظرثانی کرنا چاہیے۔ ضرورت اس
امر کی ہے کہ ڈبل سواری پر عائد پابندی کو فی الفور ختم کیا جائے اور ٹارگٹ کلنگ و
اسٹریٹ کرائمز کی لعنت پر قابو پانے اور اس کے مستقل حل کے لئے ایسے ذرائع بروئے
کار لائے جائیں جو عام شہری کے روزمرہ معمولات میں دشواری کا باعث نہ ہو۔

سو جوتے سو پیاز

آپ نے سو پیاز اور سو جوتے والا لطیفہ سنا ہے۔ اگر یاد نہیں آ رہا تو ایک بار پھر سن لیں۔ ایک جاٹ کسی مقدمے میں پھنس گیا۔ عدالت نے سزا سنا دی۔ سزا سو پیاز کھانے یا سو جوتے کھانے کی تھی۔ سزا کے انتخاب کا حق ملزم کو دیا گیا۔ جاٹ نے سزا سن کر ہنس کر کہا یہ تو کوئی سزا نہیں ہے۔ لو جی میں سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ میں سو پیاز کھاؤں گا۔ سو اس کے آگے پیاز کا ٹوکرا رکھ دیا گیا۔ اب جناب جاٹ نے پیاز کھانا شروع کیا۔ ایک دو تین۔۔۔۔ دس بارہ پیاز کھائی ہوں گی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اب پیاز نہیں کھائی جا رہی تھی۔ کہنے لگا کہ میں سو جوتے کھانے کو تیار ہوں۔ پھر جاٹ کو جوتے لگنا شروع ہوئے۔ ابھی گنتی بیس تک پہنچی تھی کہ جاٹ چلانے لگا ہائے مر گیا۔ ہائے مر گیا۔ روکو روکو۔۔۔ میں پیاز کھانے کو تیار ہوں۔ دوبارہ سے پیاز کا ٹوکرا اس کے سامنے لایا گیا۔ اس نے پیاز کھانا شروع کی اور۔۔۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا بس جی بس ۔۔ میں جوتے کھانے کو تیار ہوں۔ سارا گاؤں یہ تماشا دیکھتا رہا۔ جاٹ کبھی پیاز اور کبھی جوتے کھاتا رہا۔ اور یوں اس نے سزا بھگتی کہ سو پیاز بھی کھائی اور سو جوتے بھی کھائے۔ آپ نے کیلے کے چھلکے پر پھسل کر دیکھا ہے۔ آسان لگتا ہے نا۔۔۔ بس کیلے کے چھلکے پر پاؤں رکھ دو۔ باقی آپ کو کیا کرنا ہے۔ جو کرنا ہے وہ

چھلکے نے کرنا ہے۔ آپ کو تو اس وقت ہی پتہ چلے گا۔ جب آپ چاروں شانے چت سڑک پر پڑے ہوں گے۔

نہ جانے وہ کیسے مشیر اور دوست ہیں جنھوں نے چار دن پہلے صدر مملکت کو عدلیہ کے ججوں کو لگانے کا نوٹیفیکیشن نکالنے کا مشورہ دیا تھا۔ راتوں رات ایک بحران نے جنم لیا۔ پورے ملک میں لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ سڑکوں پر جلسے جلوس، عدالتوں میں بائیکاٹ، جلسے، ہنگامہ، کسی کے پتلے جلے، کسی کی تصویر پر جوتوں کی برسات ہوئی، کہیں زندہ باد کہیں مردہ باد کے نعرے لگے۔ اسٹاک مارکیٹ کی حالت پتلی ہو گئی۔ عوام بیچارے حیران۔ یا اللہ آٹا، چینی، بجلی، گیس، اور پیٹرول کی یہ مہنگائی۔ اور حکمرانوں کا یہ شوق پنجہ آزمائی۔ کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ لیکن بھگتنا تو عوام کو ہوگا۔ چیف کی بحالی پر کیسی کیسی نکتہ آفرینی کی گئی۔ مشرف کے غیر قانونی اقدام کو ختم کرنے کے لئے سبحان اللہ کیسی کیسی قانونی موشگافیاں کی گئی۔ کیسے مشیر اور دوست ہیں جنھوں نے کہا کہ معطل ججوں کی بحالی ایگزیکٹو آرڈر سے نہیں ہو سکتی۔ انہیں از سر نو حلف اٹھانا پڑے گا۔ انکی بحالی آئینی پیکیج کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر کیا ہوا ان ججوں کو ایک اوورسیز اور ایک لوکل ٹیلی فون کال پر بحال کرنا پڑا اور بدنامی بھی کمائی۔ پھر این آر او کیس میں بھی ان مشیروں اور دوست نما دشمنوں نے ایک سو بیس دن کی وہ مہلت گنوا دی۔ جس میں پارلیمنٹ

کو اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ عدالت میں این آر او کا دفاع کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اور جب عدالت نے اسے کالعدم قرار دے دیا تو آپ اس فیصلے پر عمل درآمد کروانے کے بجائے پورے معاملے کو سیاست قرار دے دیا۔ جمہوریت کے خلاف سازش کا شور مچ گیا۔ آئی ایس آئی کو ماتحت کرنے کا مشورہ بھی ان دوستوں کا ہوگا۔ جو نوٹیفیکیشن سات گھنٹے بعد ہی واپس لینا پڑا۔ اپنے ہی ملک کے اداروں کو فتح کرنے کا مشورہ دینے والے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کے مقاصد کیا ہیں۔ جمہوریت کو ان آستین کے سانپوں سے خطرہ ہو سکتا ہے۔ باہر والے تو ایوان صدر میں آ نہیں سکتے۔ عوام کو روٹی کپڑا اور مکان بلکہ اب تو امن امان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ سیاست کے کھیل میں اور کوئلوں کی دلالی میں منھ کالا ہوتا ہی ہے۔ لیکن منہ کالا کرانے والے، راستے میں کیلے کے چھلکے بچھانے والے، اور سو پیاز اور سو جوتے کھلوانے والوں کے نام عوام کو پتہ چلنا چاہئے۔

آخری الفاظ

زندگی فانی ہے۔ ایک دن سب کو دنیا سے جانا ہے۔ انسان اس دنیا میں کیا کیا جمع کرتا ہے۔ لیکن ایک دن اسے خالی ہاتھ لوٹ جانا ہے۔ آخری ہچکی سے ذرا پہلے، سانس کی ڈور ٹوٹنے سے کچھ دیر قبل، جب آس کی ڈوری ٹوٹ جاتی ہے۔ اس وقت انسان کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہے۔ سکندر اعظم کے کفن سے باہر نکلے خالی ہاتھ ایک معروف استعارہ بن چکے ہیں۔ دنیا سے سکندر گیا تو کفن سے باہر اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ بستر مرگ پر جب سکندر سے پوچھا گیا کہ اس کے بعد کس کو بادشاہ بنایا جائے تو اس نے کہا "سب سے طاقت ور کو" اور یہ ہی اس کے آخری کلمات تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم قائد ملت لیاقت علی خان کے لبوں پر دم آخرت یہ الفاظ تھے، "اللہ پاکستان کی حفاظت کرے۔" بابائے ترک مصطفیٰ کمال اتاترک نے کومے میں جانے سے قبل پوچھا "کیا وقت ہوا ہے؟" برطانیہ کے سابق وزیراعظم اور معروف سیاستدان سر ونسٹن چرچل نو دن کومے کی حالت میں رہنے کے بعد آں جہانی ہوئے اور اس طویل کومے میں جانے سے پہلے انہوں نے کہا تھا میں اس سب سے بہت اکتا گیا ہوں۔ گوتم بدھ کے آخری کلمات تھے، "بھکشو یاد رکھنا تمام مرکب مادی اشیا فنا ہو جائینگی، مستعدی اور محنت سے جدوجہد کرنا۔" جیک ڈینیل امریکا کے معروف شراب ساز کارخانے جیک ڈینیلز ٹینیسی وہسکی

ڈسٹیلیری کا بانی تھا اور اس کے آخری الفاظ تھے "ایک اور جام.... پلیز!" چارلز ڈکنز ممتاز برطانوی ادیب تھے۔ فطرت سے محبت اور اس کی منظر کشی ان کے کلام بنیادی موضوع رہا۔

یہ بات مشہور ہے کہ جب برطانیہ میں ریل کی پٹری بچھانے کے کام کا آغاز ہوا تو ڈکنز نے زمین پر آہنی پٹریاں بچھانے کو پسند نہ کیا، جو ان کی زمین سے محبت کی ایک مثال بن گئی۔ اتفاق دیکھیے۔ جب چارلس ڈکنز اپنے گھر کے قریب چہل قدمی کر رہے تھے اور انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہوں نے سہارا دینے والے افراد سے کہا، "زمین پر زمین پر" یعنی زمین پر لٹا دو اور یہ کہتے کہتے ہی وہ عظیم شاعر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ تھامس ایڈیسن کا شمار سائنس دانوں میں ہوتا ہے جن کی ایجادات نے اکیسویں صدی میں انسانی زندگی پر بے پناہ اثرات مرتب کیے۔ یہ معروف موجد جب بستر مرگ پر تھا تو اس کے سامنے کھڑکی کھلی ہوئی تھی وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوا وہاں کتنی خوب صورتی ہے ان کلمات کے مفہوم پہ یہ بحث کی جاتی ہے کہ آیا ایڈیسن کھڑکی سے نظر آنے والے منظر کی خوب صورتی کی طرف اشارہ کر رہا تھا یا موت کے بعد آنے والی زندگی کی طرف۔ فرانس کے فرماں رواں نپولین بونا پارٹ کے آخری کلمات تھے "فرانس، فوج جوزفین۔" شاعر مشرق علامہ اقبال کا انتقال طویل علالت کے بعد ہوا۔ ان کے آخری وقت کے متعلق تذکرہ نگاروں نے اقبال کے دیرینہ خادم علی بخش کے بیان

کو نقل کیا ہے جس کے مطابق علی الصبح اقبال کے سینے میں درد اٹھا علی بخش نے اقبال کو سہارا دیا، "اللہ! میرے یہاں درد ہو رہا۔۔۔۔" کہتے ہوئے اقبال کا سر پیچھے کو ڈھلک گیا اور مشرق بلند ستارہ وقت سحر غروب ہو گیا۔ نظریہ ارتقا سے شہرت پانے والے چارلس ڈارون آخری دم کہہ رہے تھے "میں موت سے ڈرنے والا دنیا کا آخری شخص نہیں۔" جب رومیوں نے یونانی سلطنت کے شہر سائرس پر قبضہ کر لیا تو فوج کو خاص طور پر حکم دیا گیا کہ معروف یونانی ماہر ریاضیات، طبیعات داں اور موجد ارشمیدس کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ جو فوجی ارشمیدس تک پہنچنے میں کامیاب ہوگے، انہوں نے دیکھا کہ ارشمیدس زمین پر کچھ دائرے بنا رہا ہے۔ فوجیوں نے ارشمیدس کو اپنے ساتھ جانے پر مجبور کیا اور زبردستی شروع کر دی جس کے جواب میں ارشمیدس نے کہنا شروع کر دیا میرا دائرہ خراب مت کرو! اس پر ایک رومی فوجی نے طیش میں آکے اسے قتل کر دیا۔ بنجمن فرینکلن کا شمار ریاست ہائے متحدہ کے بانیوں میں ہوتا ہے ایک موجد، ماہر طبیعات، سیاستدان، سفارت کار اور صحافی سمیت کئی حوالوں سے فرینکلن کا نام جانا جاتا ہے۔ اپنے آخری وقت میں اس نے ایک دردناک حقیقت بیان کی۔ جب اس کی بیٹی نے اسے کروٹ بدلنے کو کہا تاکہ اسے سانس لینے میں جو دشواری پیش آرہی ہے وہ دور ہو جائے تو فرینکلن نے یہ کلمات ادا کیے مرتا ہوا انسان کوئی بھی کام آسانی سے نہیں کر سکتا۔" معروف روسی ناول نگار لیون ٹالسٹائی کے آخری کلمات تھے لیکن کسانو! ایک "کسان کیسے مرتا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ پرنسز آف ویلز لیڈی ڈیانا گاڑی کے حادثے کے بعد زخمی حالت میں یہ کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلی گئی، "میرے خدا! یہ کیا ہو گیا؟" مغربی فلسفے کے بادا آرم قدیم یونانی فلسفی سقراط نے زہر کا پیالہ پینے سے قبل اپنے شاگردوں سے یہ آخری کلمات کہے، "کریٹو! ہمیں ایسکلی پئیس کی نذر ایک مرغا کرنا چاہیے، دیکھو! یہ بھول نہ جانا" ایسکلی پئیس علاج اور نجات کے یونانی دیوتا کا نام تھا۔ ان کلمات سے لگتا ہے کہ سقراط روح کے جسم میں قید ہونے کو زندگی سمجھتا تھا اور موت کو روح کی نجات اور آزادی سے تعبیر کرتا تھا جب ہی اس نے اپنی موت پر شکر بجالانے کیلئے نجات کے دیوتا کو نذر چڑھانے کی وصیت کی۔ ارسطو کے آخری کلمات اس کے مشاہدے اور طرز فکر کو عیاں کرتے ہیں اس نے دم آخر کہا "قدرت نے کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔" نابغہ روزگار سائنس داں آئزک نیوٹن نے اس کائنات پر غور و خوض ذریعے جو کارنامے انجام دیے وہ ناقابل فراموش ہیں، لیکن وہ آخری لمحات میں اپنی ساری جدوجہد کو ان لفظوں میں بیان کرتا ہے مجھے نہیں معلوم کہ دنیا کے بارے میں مجھ پر کیا کچھ ظاہر ہوا لیکن میں نے تو سمندر کے کنارے کھیلنے والے اس لڑکے کی طرح اس دنیا کو دیکھا جس کے سامنے حقیقت اور سچائی کا سمندر تھا اور وہ ساحل پر سیپیاں اور خوش نما پتھر تلاش کرتا رہا۔ اس دنیا سے جانے والوں مشہور لوگوں کے کہے ہوئے یا تحریر کردہ آخری کلمات اپنے اندر کئی معنی خیز

پیغامات سموئے ہوئے ہیں۔ ان آخری کلمات میں کہیں حکمت اور دانائی پنہاں ہے تو کسی کے حرف حرف سے بے بسی عیاں ہے۔ یا خواہش کا اظہار موت کا خوف اپنی زندگی کا کام یابی کا احساس اور کہیں خالق سے ملاقات کا شوق، استقلال، ندامت، رشک اور سفاکی کے الگ الگ لہجوں میں ادا کیے گئے یہ آخری الفاظ زندگی کے مختلف روپ دکھاتے ہیں۔

دنیا سے جانے سے پہلے ہر انسان کو سوچنا چاہیے کہ اس کی موت کے وقت اس کے آخری الفاظ کیا ہوں گے۔

ذرا سی بات کا بتنگڑ

پاکستان میں سیاست دان جس غربت، بدحالی، بے گھر اور بے دری میں اس ملک کے عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ وہ نہ صرف کار ثواب ہے۔ بلکہ اس کا اجر انہیں آخرت میں ملے گا۔ اس قدر محنت مشقت، دردسری کے باوجود ان بے چارے سیاست دانوں پر، بدعنوانی، رشوت، لوٹ مار، اقربا پروری، قرضے معاف کرانا، پلاٹ حاصل کرنا، سرکاری دورے، سرکاری خرچ پر علاج کرانا، اور سرکاری خرچ پر حج اور عمرے کرنے، اور مال بنانے کے الزامات لگتے رہتے ہیں۔ اور تو اور بے چارے ان سیاست دانوں کے انکم ٹیکس کی ادائیگی، ان کے اثاثہ جات، اور ان کے مہنگے علاج، بیرون ملک دوروں، اور سرکاری خرچ پر حج اور عمرے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے صدر مملکت اور چیئرمین سینٹ کے غیر ملکی دوروں پر خوب واویلا کیا گیا۔ حالانکہ، یہ دورے ہمارے نمائندوں کا استحقاق ہیں۔ جس کے لئے اس ملک کے کروڑوں لوگ انہیں منتخب کرتے ہیں۔ یہ عوام اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے منتخب نمائندوں کو ہر طرح کا عیش و آرام بہم پہنچانا چاہتے ہیں۔ ہمارے سٹی ناظم کے پاس تو سر چھپانے کے لئے گھر بھی نہیں تھا۔ اللہ الطاف بھائی کو سلامت رکھے۔ انہوں نے ہمارے مصطفٰی کمال بھائی کے لئے ایک گھر تحفے میں دے دیا ہے۔

ہمارے وزیر اعظم اپنے نمائندوں کے مستقبل کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ ارکان اسمبلی جو دن رات اس قوم کی بہتری اور خوشحال مستقبل کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کے لئے رہنے کو کوئی گھر نہ ہو۔ اس لئے ارکان اسمبلی کو اسلام آباد میں ایک ہزار گز کے پلاٹ دیئے جانے کے لئے کوئی راستہ نکال رہے ہیں۔۔برا ہو اس عالمی ادارے ٹرانسپیرنسی انٹر نیشنل کا جو پاکستان کے بارے میں الٹی سیدھی اڑاتا رہتا ہے۔ اس نے ہمارے صدر کے بارے میں یہ ہوائی چھوڑی تھی کہ صدر محترم ہر ماہ ۰۲ دن غیر ملکی دوروں پر رہتے ہیں۔ جس کے بعد سے ان کا ملک سے باہر جانا بھی چھوٹ گیا ہے۔ قومی اسمبلی میں عوام کے منتخب نمائندوں کے جمع کروائے گئے اثاثوں کو بھی بھائی لوگ نکال کر اخبار کی زینت بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ معلومات تو الیکشن کمیشن کی فائیلوں کا پیٹ بھرنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ اب اگر فہرست میں وزیر داخلہ رحمان ملک کے گھر کی قیمت پونے سات لاکھ روپے لکھ دی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ یہ مکان اتنے میں بیچ رہے ہیں۔ یا یہ کہ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے ملتان میں 63 لاکھ روپے کا گھر خریدا ہے۔ کراچی میں تو اس رقم میں ۰۲۱ گز کا گھر نہیں ملتا۔ گیلانی صاحب کے کسی مرید نے اس رقم میں گھر تحفے کے طور پر دیا ہوگا۔

حکمراں جماعت کے سیکرٹری جنرل جہانگیر بدر کے بینک اکاؤنٹ میں صرف 2 لاکھ 21

ہزار روپے ہیں۔ تو اس میں برائی کیا ہے ان کی پارٹی کے اکاؤنٹ میں تو کثیر رقم ہے۔ چیئرمین سینیٹ فاروق نائیک 13 کروڑ 16 لاکھ روپے کی جائیداد کے مالک ہیں جبکہ ان کی تجارتی سرمایہ کاری 7 لاکھ 76 ہزار روپے سے زائد ہے۔ وفاقی وزیر خزانہ شوکت ترین 54 کروڑ 55 لاکھ روپے کی اندروں اور بیرون ملک جائیداد کے مالک ہیں، ان کے پاس 2 کروڑ 18 لاکھ روپے مالیت سے زائد کی چار گاڑیاں بھی ہیں۔ مسلم لیگ ق کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین اسلام آباد اور لاہور میں گھروں کے آدھے حصے دار ہیں، جن کی مالیت 87 لاکھ روپے ہے۔ سینئر جہانگیر بدر کے لاہور میں گھر کی قیمت 26 لاکھ روپے ظاہر کی گئی ہے۔ شوکت ترین کا بینک بیلنس ایک کروڑ 76 لاکھ روپے ہے اور انھوں نے مختلف اداروں میں 3 ارب 6 کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ جے یو آئی کے مولانا گل نصیب کا شمار غریب ترین ارکان میں ہوتا ہے جن کے پاس آٹھ مرلے کا گھر اور صرف 60 گرام سونے کے زیورات ہیں۔ یہ فہرست نئی تو نہیں ہے۔ پچھلی حکومت میں جانے والے وزراء اور ممبران اسمبلی بھی بیچارے اتنے ہی غریب تھے۔ سابق ممبران قومی اسمبلی، سابق وفاقی وزراء فیصل صالح حیات، اویس لغاری، وصی ظفر اور نصیر خان جبکہ وزرائے مملکت مخدوم خسرو بختیار، حنا ربانی کھر اور حامد یار ہراج کے پاس اپنا گھر نہیں تھا۔ سابق قانون وصی ظفر نے الیکشن کمشن کو بتایا تھا کہ وہ اپنا گھر اپنے بیٹوں کو تحفہ میں دے چکے ہیں۔ ان اثاثوں کے مطابق چوہدری شجاعت حسین کے پاس اپنی گاڑی بھی نہیں تھی۔ دو سابق وزرائے اعظم چوہدری شجاعت حسین اور

ظفراللہ جمالی کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ وفاقی وزیر دفاع راؤ سکندر اقبال، وفاقی وزیر تجارت ہمایوں اختر خان جن کی ملوں اور پیپسی کے کارخانوں کی دھوم تو سب نے سنی ہے مگر ان کے پاس بھی کوئی گاڑی نہیں ہے۔ وزیر داخلہ آفتاب شیرپاؤ، مخدوم فیصل صالح حیات، وفاقی وزیر صحت نصیر خان، وفاقی وزیر مذہبی امور اعجاز الحق اور رضا حیات ہراج نے بھی حلفاً کہا ہے کہ ان کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ اتنے غریب ارکان اسمبلی کی مدد کے لئے اگر وزیر اعظم پلاٹ دیں، یا کوئی کمیشن دے تو کوئی بری بات نہیں ہے، دنیا والے تو یونہی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں

سوئس بنکوں کے خفیہ اکاؤنٹس

سوئس بینک دنیا بھر کی عوام کی محنت کی کمائی اپنے خفیہ اکاؤنٹس میں لئے بیٹھے ہیں۔ پاکستان بھی ان ملکوں میں سے ایک ہے۔ جس کے عوام کی خون پسینے کی کمائی، کرپشن، لوٹ مار، دھوکہ دہی، ٹیکس چوری کے ذریعے ان بینکوں کے خفیہ اکاؤنٹس میں پڑی ہے۔ جس کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ اگرچہ عدالت عالیہ نے ان خفیہ اکاؤنٹس کے بارے میں نیب کو نئے سرے سے کاروائی کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس سے اس بات کے امکانات پیدا ہوئے ہیں کہ ان خفیہ اکاؤنٹس سے رقم حکومت پاکستان کو منتقل کردی جائے گی۔ لیکن یہ بڑا پر پیچ راستہ ہے۔ جس کے لئے ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ معاملہ غریب ملکوں سے نکل کرامیر ملکوں کے لئے بھی اہم ہوگیا ہے۔ گزشتہ سال فرانس کے وزیر خزانہ ایرک ورتھ نے انکشاف کیا تھا کہ سوئس بینکوں میں تین ہزار فرانسیسی شہریوں کے اکاؤنٹس کا سراغ لگایا گیا ہے جن میں ٹیکس سے بچنے کیلئے چار ارب یورو کی رقم جمع کرائی گئی یہ تفصیل صرف تین بنکوں سے ملنے والی معلومات پر مشتمل ہے وزیر خزانہ نے بتایا کہ دو بینکوں نے بغیر فنانشل ایڈمنسٹریشن کو آگاہ کئے بناء کسی پریشانی کے ہمیں درست اور مکمل معلومات فراہم کر دی ہیں جبکہ تیسرے بنک سے خفیہ انفارمر کے ذریعے معلومات حاصل کی گئی۔

سال ۹۰۰۲ میں 20 ممالک نے لندن میں ایک کانفرنس میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا تھا۔ اجلاس میں فرانس اور جرمنی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک دنیا میں مالیاتی کرپٹ عناصر اور ٹیکس چوروں کی جنتیں ختم نہیں کی جاتیں۔ کرپشن، لوٹ مار، دھوکہ دہی، ٹیکس چوری اور اقتصادی بحران جیسے مسائل پر قابو نہیں پایا جا سکتا، کیونکہ دنیا بھر کے بدعنوان حکمران سیاستدان، جرنیل، بیوروکریٹس، ڈرگ مافیا اور مراعات یافتہ طبقہ اپنے ملک سے سرکاری خزانہ لوٹ کر اور غریبوں کا لہو چوس کر جمع کیا جانے والا دھن ان جنتوں کی شریانوں میں اتار دیا جاتا ہے جہاں بینک سیکریسی کے نام پر اس کالے دھن کو تحفظ دیا جاتا ہے اور کسی ملک کو ان اکاؤنٹس تک رسائی نہیں ہوئی۔ کوئی ملک اگر اس حوالے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اسے ٹرخا دیا جاتا ہے جو دراصل مجرموں کو تحفظ اور جرائم کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ اس مطالبہ پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ عالمی بینکنگ سیکریسی ایکٹس کا خاتمہ کیا جائیگا اور بینکوں کو پابند کیا جائیگا کہ جو ملک اپنے کی شہری کے بارے میں معلومات طلب کرے اسے فراہم کی جائیں تاکہ کالا دھن اور کالے چہرے سامنے آ سکیں۔ واضح رہے کہ فنانشل اینڈ ٹیکس ہیونز کی اصطلاح دراصل سوئٹزرلینڈ، لکسمبرگ، مناکو، ہالینڈ، سنگاپور، فلپائن، .برونائی، چلی، بلجیم، آسٹریا، گوئٹے مالا، یوراگوئے اور ملائیشیا وغیرہ کیلئے استعمال ہوتی ہے ان ممالک کے بینک دولت

جمع کرانے والوں سے ذرائع آمدنی کی کوئی تفصیل نہیں پوچھتے۔ فرانس میں گزشتہ چند برسوں سے ٹیکس چوری کے لئے اپنی رقوم ان ہیونز میں جمع کرانے کے عمل کو فروغ

ملا۔ بڑے بڑے اداکار گلوکار، پروڈیوسرز، سرمایہ دار، تاجر اور افسر و سیاستدان اپنا سرمایہ ایسی جنتوں میں منتقل کر رہے ہیں اکثر نے تو ٹیکس سے بچنے کیلئے فرانس کی شہریت چھوڑ کر سوئٹزر لینڈ اور ہالینڈ کی شہریت حاصل کر لی ہے اس عمل کو شدید تنقید کانشانہ بنایا گیا جس کے بعد فرانسیسی حکومت نے یہ سرمایہ واپس لانے کیلئے کوششیں شروع کر دی ہیں۔

سوئٹزرلینڈ حکام کا کہنا ہے کہ فرانس کے ساتھ چند روز پہلے ایک معاہدہ طے پایا ہے جس کی روشنی میں جنوری 2010ء سے ہم کھاتہ داروں بارے بینک سیکریسی ایکٹ کی روشنی میں معلومات کے تبادلے کے پابند ہوں گے جن تین ہزار کھاتہ داروں کا ذکر کیا جارہاہے ان کے بارے میں فرانس کی طرف سے سوئس حکومت کو سرکاری طور پر کوئی درخواست نہیں ملی اس لئے یہ معلومات سرکاری سطح پر فراہم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرانس نے ان 3 ہزار کھاتہ داروں کو اپنی رقوم 30 دسمبر تک وطن واپس لانے کی مہلت دی تھی۔ اس مہلت کا مطلب دیگر افراد کو خوفزدہ کرکے اپنی رقوم واپس لانے کیلئے مجبور کرنا ہے۔ پاکستان کے غریب عوام جو آج کل غربت اور منگائی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ان کا بھی ان امیر ملکوں سے یہی مطالبہ ہے کہ ان خفیہ اکاؤنٹس کی تفصیلات

کو عام کیا جائے۔ حکومت پاکستان کو مطلوبہ اطلاعات فراہم کی جائیں۔ اور اس دولت کو
پاکستان لایا جائے۔

موٹر سائیکل کے بڑھتے ہوئے حادثات

حیدرآباد میں گزشتہ تین دن میں میرے عزیزوں کے تین سے زائد ایسے حادثات ہوئے ہیں جن کا سبب موٹر سائیکل کے تیز رفتاری اور لاقانونیت ہے۔ ان حاشات کے نتیجے میں میرے ایک کزن دوست محمد کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ جبکہ بقیہ حضرات بھی اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ حیدرآباد شہر میں ان دنوں موٹر سائیکلوں کا سیلاب ہے، اور اس کے سوار زیادہ تر بچے ہیں، جو تیز رفتاری سے گلی کوچوں میں موٹر سائیکل دوڑاتے ہیں۔ حیدرآباد میں تعمیر ہونے والے پل بھی ان موٹر سائیکل کے حادثات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں، جہاں رات میں موٹر سائیکل سوار غلط سمت سے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے حادثے کا شکار ہوتے ہیں۔ یا پل پر موٹر سائیکلیں کھڑی کرکے ہوا خوری کے مزے لے رہے ہوتے ہیں، اور ٹریفک کے قوانین سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ دو ماہ قبل ٹنڈوالہیار میں بھی موٹر سوار دو کمسن بچوں کی ہلاکت کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے ایک پورا خاندان اجڑ کر رہ گیا تھا۔ آج کل حیدرآباد کے اسپتال موٹر سائیکل کے حادثوں کے زخمیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسے حادثات کی روزانہ اوسط ۲۰ سے ۲۵ ہے۔ جن میں آرتھوپیڈک کے کیس زیادہ ہیں۔ حیدرآباد جیسے شہر کے لئے یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب شہر میں ٹریفک قوانین کی پابندی ختم کردی گئی ہے۔ اور عوام کو ان تیز رفتار قاتلوں کے حوالے کردیا

گیا ہے۔ پہلے کبھی حیدرآباد میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ موٹر سائیکلوں کی آپس میں ٹکر کے نتیجے میں کوئی ہلاک ہوسکتا ہے۔ اب یہ آئے دن کا معمول ہے۔ کراچی میں بھی ایسے حادثات کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ اب ہر ماہ تقریباً پچاس سے زائد افراد موٹر سائیکل کے حادثے میں ہر ماہ ہلاک ہوتے ہیں۔ جبکہ زخمی اور معذورین کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

حادثات کا شکار ہونے والے زیادہ تر افراد راہگیر ہوتے ہیں۔ جبکہ باقی جاں بحق ہونے والے افراد میں سائیکل و موٹرسائیکل سوار، ڈرائیور اور مسافر شامل تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ موٹر سائیکل سواروں کے حادثات میں متاثر ہونے کی ایک بڑی وجہ تیز رفتاری اور ہیلمٹ نہ پہننا ہے۔ کراچی میں ایک خطرناک رجحان یہ ہوگیا ہے کہ اکثر جگہوں پر غلط سمت سے ٹریفک چل رہا ہوتا ہے۔ زیادہ تر حادثات مختلف سگنل فری کوریڈورز پر پیش آتے ہیں۔ کراچی میں اکثر حادثات زیادہ تر بسوں، منی بسوں، ٹرک اور ٹریلرز، ڈمپرز اور واٹر آئیل ٹینکروں کی تیز رفتاری یا اوورٹیکنگ کے سبب بھی پیش آتے ہیں۔ کراچی میں یونیورسٹی روڈ پر کچھ دن پہلے ایک منی بس والے نے فٹ پاتھ پر کھڑی ایک بچی کو ٹکر ماردی۔ پھر اس کے کمسن بھائی اور خالہ کو ہسپتال لے جانے کے بہانے انھیں کہیں ویران علاقے میں چھوٹ کر بھاگ گیا۔ بچی خون زیادہ بہہ جانے پر انتقال کر گئی۔ ایسے حاثات اس شہر میں ہو رہے ہیں، جو کھلی لاقانونیت کے زمرے میں آتے ہیں۔

یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ شہر کی اکثر سڑکیں فٹ پاتھ کے بغیر ہیں اور جہاں فٹ پاتھ ہیں وہاں تجاوزات کے قبضے ہیں جس کی وجہ سے راگیروں کو مجبوراً فٹ پاتھ کے بجائے سڑک پر چلنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ناگہانی حادثات جنم لیتے ہیں۔
ٹریفک ماہرین کا کہنا ہے کہ شہر میں ٹریفک پولیس کی تعداد ضرورت سے بہت کم ہے جس میں اضافہ کیے بغیر عوام کو ٹریفک قوانین کا پابند بنانا ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ شہر میں ڈرائیوروں کی اکثریت کے پاس لائسنس بھی نہیں ہے۔
اس لیے جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ گاڑی جائے وقوعہ پر چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور یہ گاڑیاں بعد میں ان کے مالکان باآسانی کورٹ سے بازیاب کرالیتے ہیں۔
ماہرین کے مطابق اس طرح غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد کو تحفظ ملتا ہے اور وہ احتساب سے بچ جاتے ہیں۔ ایسے میں حادثات کی روک تھام کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ایک افسوسناک امر یہ بھی ہے کہ محکمہ ٹریفک کے پاس بڑی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کے مکمل اعداد و شمار نہیں ہیں۔ ٹریفک حکام نے پبلک ٹرانسپورٹ کے مالکان سے ڈرائیوروں کے مکمل کوائف طلب کئے تھے۔ جس پر بھی کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ ماہرین کے نزدیک ان حادثات کی ایک اہم وجہ ٹریفک قوانین کی عملداری میں ناکامی اور لوگوں کی ان قوانین سے ناواقفیت ہے۔ ٹریفک کے ضابطہ اخلاق سے متعلق رہنمائی بھی اب فراہم نہیں کی جاتی، اس شہر

میں کراچی ٹرانسپورٹ ٹیکنکل اسکول ہوا کرتا تھا جہاں شہری ٹریفک قوانین سیکھتے تھے اور پھر انہیں ادارے کی جانب سے سرٹیفیکیٹ دیا جاتا تھا جس کی بنیاد پر انہیں ڈرائیونگ لائسنس ملتا تھا۔ بعد میں حکومت نے اس ادارہ کو بغیر کسی ٹھوس وجہ کے بند کر دیا اور اب بہت سے ڈرائیور بسوں، منی بسوں، ڈمپرز اور ٹرکوں کے لیے جعلی لائسنس کراچی اور حیدر آباد سے رشوت دے کر حاصل کرتے ہیں۔

ٹریفک ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر حکومت اور ٹریفک پولیس کے اعلیٰ حکام ٹریفک حادثات کی شرح کو کم کرنا یا ختم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ٹریفک قوانین پر سختی سے عملدرآمد کو یقینی بنانا ہوگا ساتھ ہی ہر سطح پر عوام میں ان قوانین سے آگاہی میں اضافہ کرنا ہوگا تاکہ تیز رفتار اور غیر محتاط ڈرائیونگ بے شمار زندگیاں ختم کرنے کا سبب نہ بنے۔

قانون کی حکمرانی

قانون کی حکمرانی ختم ہو جائے تو معاشرے میں انارکی جنم لیتی ہے۔ جس میں کوئی قاعدہ اور قانون نہیں رہتا۔ بڑے بڑے گروہ اپنے مطالبات کے حق میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیئے کہ یہ گروہ اپنے طور پر یہ فیصلہ بھی کر چکے ہوتے ہیں کہ وہی حق بجانب ہیں۔ ملک بھر میں اب ایسے گروہ منظم ہیں جو غلط مطالبات پر احتجاج اور شور کرتے ہیں۔ یہ گروہ نہ صرف مجرموں کی حمایت کرتے ہیں بلکہ ان کے مطالبات کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ گزشتہ دنوں کوئٹہ میں پولیس اہلکاروں نے اپنے مطالبات کے حق میں جلوس نکالا اور قانون کے رکھوالوں نے قانون کے منافی اقدامات کیے۔ ایسا ہی جرائم پیشہ افراد کا اجتماع اس وقت دیکھنے میں آیا جب ہاکس بے پر منشیات اور شراب نذر آتش کرنے کے موقع پر لوٹ مار کا واقعہ پیش آیا۔ جس میں قانون کے رکھوالوں کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ لوٹ مار کرنے والے گروہ کے لوگ لاٹھیاں، مال غنیمت جمع کرنے کے لئے تھیلے اور دیگر سامان ساتھ لے کر آئے تھے۔ یوم عاشور کے موقع پر کراچی میں بولٹن مارکیٹ اور اس کے نواح میں جلاؤ گھیراؤ، لوٹ مار کے جو واقعات پیش آئے وہ بھی منظم کاروائی تھی۔ لیاری آپریشن میں جو لوگ پکڑے گئے، ان کے خلاف بھی کوئی کاروائی کرنے کے بجائے انھیں احتجاج کے نتیجے میں رہا کر دیا گیا۔ یوم عاشور کے موقع پر جو

گرفتاریاں ہوئیں ان میں سے بھی بہت سے افراد کو ایسے ہی احتجاج پر رہا کر دیا گیا ہے۔
پاکستان میں لاقانونیت اور کرپشن کا ناسور پھیلتا جارہا ہے۔ بدعنوانی کی شکایات پر وزیراعظم نے کچھ عرصہ پہلے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ جس کی سربراہی وزیر خزانہ شوکت ترین کررہے تھے۔ اس کمیٹی کو نہ صرف ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی اس رپوٹ کا جائزہ لینا تھا جو بدعنوانی سے متعلق تھی بلکہ اس کا اصل کام بدعنوانی کے اسباب کا تعین اور تدارک کے طریقے طے کرنا بھی تھا۔ لیکن اب تک اس سلسلے میں پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس وقت ملک میں بدعنوانی کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ خاص طور پر سرکاری محکموں میں۔ کسی بھی ادارے کو دیکھ لیجیے بدعنوانی کے دفتر کے دفتر نکل آئیں گے۔ اخبارات میں آئے دن انکشافات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسی خبر کم ہی آتی ہے کہ بدعنوانوں کو سخت سزا دی گئی ہو۔ پاکستان اسٹیل اور پنجاب بنک اس کی واضح مثالیں ہیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ بدعنوانی کے خلاف کاروائی کرنے والوں کے اپنے ہاتھ صاف نہیں ہوتے۔ رشوت لینے میں کوئی پکڑا بھی جاتا ہے تو رشوت دے کر چھوٹ جاتا ہے۔ چینی، بجلی، پیٹرول، اور اب نیا اسکینڈل رینٹل پاور کا سامنے آیا ہے۔ جس میں بجلی کا مسئلہ تو بدستور قائم ہے۔ کوئی کام نہ ہونے، اور بجلی فراہم نہ ہونے کے باوجود سوا پانچ ارب روپے کرائے کے بجلی گھروں کو دئے گئے ہیں۔ یہ فیصلہ کس کا تھا اور اس کا فائدہ کس کو پہنچا ہے اس پر کوئی تحقیق ہونی چاہئے۔

پیٹرول کی قیمتوں میں جو لوٹ مار ہے۔ اور عوام کو جس طرح لوٹا جارہا ہے۔ وہ بد دیانتی کی انتہاء ہے۔ اب یہ خبر آئی ہے کہ ٹی وی کی لائسنس فیس جو بجلی کے بلوں کے ساتھ لی جارہی تھی۔ اس میں خاموشی سے دس روپے کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں نہ صارفین کو بتایا گیا۔ نہ کوئی اعلان ہوا۔ بس خاموشی سے کٹوتی کرلی گئی۔ وہ بھی مالی سال کے درمیان۔ چینی کے بحران کی بنیاد بدعنوانی ہے جس میں شوگر مل مالکان' ذخیرہ اندوز اور انتظامیہ ملوث ہیں۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ چینی کے کارخانوں کے بیشتر مالکان سیاستدان اور بااثرافراد ہیں۔ جب دوسرے یہ دیکھتے ہیں کہ بدعنوانی کرنے والے عیش کررہے ہیں' اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑا تو ان کو بھی حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ بھی یہ سب کچھ کریں اور آئندہ پھر کسی این آر او جیسے قانون سے فائدہ اٹھالیں۔ بات یہ ہے کہ جب قانون شکن اور بدعنوان افراد ہی کی حکومت ہو تو ملک میں ہر طرف بدعنوانی اور انارکی پھیلے گی۔ ماضی میں ہماری عدالتوں کا جو کردار رہا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ لیکن اب عدالتیں قانون کی حکمرانی کے لئے کام کررہی ہیں۔ اگر حکومت ہر شعبہ میں صرف اہلیت کو مدنظر رکھے اور قانون کا احترام کرے تو بدعنوانی اور لاقانونیت پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ یہی کام نہیں ہورہا اور حکمران اپنا اقتدار بچانے کے لیے اہلیت یا میرٹ کو قربان کرنے پر مجبور ہیں۔

کرپشن سے نجات ۔۔۔ مگر کیسے

گزشتہ دنوں عالمی افق پر دو مشہور شخصیات بدعنوانی کے مقدمات میں گرفتار ہوئیں۔ پہلا واقعہ اٹلی کا ہے جہاں فاسٹ ویب کے بانی ارب پتی سیلویواسگالیا کو پولیس نے گرفتار کرلیا۔ ملک واپسی پر انہیں ان کے ذاتی جیٹ طیارے سے سیدھا جیل لیجایا گیا۔ ان پر غیر قانونی طور پر بھاری رقوم ملک سے باہر لیجانے کا الزام ہے۔ دوسرا واقعہ تھائی لینڈ کا ہے جہاں سپریم کورٹ نے سابق وزیر اعظم تاکسن سیناواترا کے ایک اعشاریہ چار بیلین کے اثاثے منجمد کر دیئے ہیں۔ ان پر ایک خاندانی کمپنی کی ملکیت کو غیر قانونی طور پر چھپانے اور اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کے الزامات ہیں۔ ایسی میڈیا رپورٹ بھی سامنے آئی ہیں۔ جن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ بین الاقوامی برادری میں اعلیٰ سطح پر ہونے والی بدعنوانی کے واقعات پر تشویش پائی جاتی ہے۔ بی بی سی سے باتیں کرتے ہوئے کرشیاء کے صدر آئیو جوزفک کا کہنا ہے کہ کروشیا میں کرپشن ایک طرز زندگی بنتا جارہاہے۔ یہ ہمارے ملک کے لئے انتہائی خطرناک ہے، نہ صرف یہ کہ ان لوگوں نے ملک کی کچھ دولت اور جائیداد ہتھیا لی ہے۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے کہ یہ لوگ سیاسی طور پر بااثر ہوگئے ہیں۔ کروشیا میں گزشتہ عرصے میں بہت سے سینیئر افراد کو گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ گرفتاریاں ملک کو کرپشن سے پاک کرنے اور اس

کے امیج کو بہتر بنانے کے لئے کیا جارہا ہے۔ روس کے صدر بھی ان دنوں کرپشن سے نبرد آزما ہیں۔ تاکہ ملک کی تیز رفتار اقتصادی ترقی میں حائل رکاوٹیں دور کی جاسکیں۔ ۸۰۰۲ میں صرف چھ ماہ کے عرصے میں ساڑھے چار ہزار کرپشن کے مقدمات کا جائزہ لیا گیا۔ تقریباً ۵۳۲ وفاقی اور مقامی افسران اور سات سو قانون پر عملدرآمد کرنے والے افسران کو سزائیں دی گئیں۔ ان اعداد شمار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روس میں کرپشن کس طرح سرائیت کر گئی تھی۔ اس کرپشن کو روکنے کے لئے ہر سطح پر کوشش کی گئی۔ قوانین بنائے گئے۔ عدالتی نظام میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ چین میں پارٹی کے طاقتور سیکریٹری اور پولٹ بیوروکے رکن چنگ لیان یو کو ۶۰۰۲ میں کرپشن کے الزامات پر برطرف کردیا گیا، اس سال بھی سولہ اعلیٰ افسران کو سزائیں دی گئی ہیں۔ اور تطہیر کا یہ عمل جاری ہے۔ بھارت میں بھی کرپشن کے واقعات پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ اور کرپشن میں ملوث افراد کو کہیں پناہ نہیں مل رہی ہے۔ کرپشن میں ملوث سیاستدانوں اور بیوروکریٹ کو آج کل ساری دنیا میں جس نفرت اور حقارت کا سامنا ہے۔

اس کا کچھ عکس ہمارے یہاں بھی ملتا ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں مغرب نے اپنے پسندیدہ جرنیلوں کے کرتوں سے اغماض برتا ہے۔ جنرل سوہارتو انڈونیشیا اور

پنوشے چلی اس کی واضح مثالیں ہیں۔ لیکن آج ان پر بھی مقدمات چلانے کی بات ہو رہی ہے۔ جبکہ یہ بیماری اور بڑھاپے کو سہارا بنا کر اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد فوجی سامان کی خریداری میں جو کمی آئی ہے۔ اس نے اسلحے کا کاروبار کرنے والوں کو تیسری دنیا کی جانب راغب کر دیا ہے۔ جو اسلحے کی خریداری میں بھاری کمیشن اور کک بیک دیتے ہیں۔ یوں انہیں زیادہ قیمت پر ناقص اسلحہ ٹھکانے لگانے کو موقع میسر آتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اسلحے کی بین الاقوامی تجارت میں ہر سال دو اعشاریہ پانچ ارب ڈالر کی رشوت دی جاتی ہے۔ رشوت اور بددیانتی کے ان واقعات نے معاشروں کو تباہ کر دیا ہے۔ امیر اور بااثر افراد کی دولت کے ڈھیر روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ جبکہ غریب اور پسماندہ طبقے دن بدن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان بھی ان بدقسمت ملکوں میں سے ایک ہے جہاں کرپشن نے ڈھیرے ڈال رکھے ہیں۔ ہر سال سالانہ بجٹ کا بڑا حصہ کرپشن کی نظر ہو جاتا ہے۔ کرپشن اس ملک میں سائنس اور کاروبار بن گئی ہے۔ اب ان جرائم کو بے نقاب کرنا اس قدر آسان نہیں رہا۔ لیکن جرم کے سیاہ داغ کہیں نہ کہیں نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ پاکستانی عوام میں بیداری کی لہر انگڑائی لے رہی ہے۔ اور ان واقعات پر آوازیں اٹھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عوامی شعور کا امتحان آنے والے بلدیاتی انتخابات ہیں۔ جن میں عوام کو کرپشن کے خاتمے کے لئے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

کراچی دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہ

کیا کراچی دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔ یہ سوال شدت سے سر اٹھائے ہوئے ہے۔ کراچی میں ایک عرصے کے تعطل کے بعد اچانک شروع ہونے والے دہشت گردی کے واقعات نے اس سوال کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ۷۰۰۲ تا ۹۰۰۲ تک جب پورے ملک میں دہشت گردی کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ کراچی کے دامن میں کوئی ایسی چنگاری نہ تھی۔ لیکن ۹۰۰۲ کے جاتے جاتے، ۷۲ دسمبر کو یوم عاشور کے موقع پر ہونے والے دھماکے نے کراچی کو بھی ملک کے دوسرے غیر محفوظ کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ رہی سہی کسر چہلم کے موقع پر ہونے والے دھماکوں نے پوری کر دی۔ فروری ۰۱۰۲ میں چہلم کے موقع پر ہونے والے دھماکے نے ان حلقوں کے شبہات کو یقین میں بدل دیا کہ کراچی میں دہشت گرد پناہ لئے ہوئے ہیں۔ اس کی تصدیق حال ہی میں ملا برادر اور ملا عمر کے داماد کی گرفتاری سے بھی ہوتی ہے۔ کراچی میں ہزاروں مدرسے ہیں۔ جن کے بارے میں ماضی میں یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ جہاد کے لئے یہاں سے طالب باہر بھیجے جاتے ہیں۔ کراچی بہت سے لسانی، مذہبی، سماجی، معاشی گروہوں، اور جرائم پیشہ افراد کے منظم گروہوں کا بھی مرکز ہے۔ جو مشتعل، پڑھے لکھے، بے روزگار نوجوانوں کو ان گروہوں سے وابستگی کو جنم دیتا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ کراچی میں دہشت گردی کے وقعات میں اضافہ فاٹا میں

آپریشن شروع ہونے کے بعد ہوا ہے۔ بعض افراد کا کہنا ہے کہ کراچی میں ان وقعات کی ذمہ داری کراچی کے شہریوں پر عائد ہوتی ہے۔ جو اپنے پڑوسیوں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ افراد اس کا حل محلّہ کمیٹیوں کے فعال کردار میں تلاش کرتے ہیں۔ جو سیاسی اثر سے پاک ہوں۔ کراچی میں فاٹا کے آپریشن کے بعد نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جس کو چیک کرنے کی ذمہ داری قانون نافذ کرنے والے اداروں پر عائد ہوتی ہے۔ کراچی میں جائیداد کی خریداری کو مانیٹر ہونا چاہیئے۔ یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ کراچی میں گزشتہ دو برسوں میں دہشت گردی کے واقعات نے کیوں جنم نہیں لیا۔ اس کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ پہلے کراچی کا امن امان دہشت گردوں کی ضرورت تھا۔ جو کاروائی کے بعد یہاں پناہ لیتے، یا زخمی ہونے پر علاج کرانے کراچی آجاتے تھے۔

بہت سے افراد کراچی کے واقعات کو عالمی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ علاقائی سیاسی زمینی حقائق جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، تیس سال پہلے اس کھیل کا آغاز ہوا تھا۔ دنیا کے معاملات میں اب وسط ایشیا، مشرق وسط کے بعض ممالک اور جنوبی ایشیاء کا تکون انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا کے اہم ترین معاملات، ایرانی ایٹمی پاور کی خواہشات، چین میں مسلمانوں کو کچلنے کی مہم، بھارت کی علاقائی بالادستی کی خواہش اور پاکستان کی داخلی سلامتی، وسط

ایشیا میں تیل اور گیس کے ذخائر اور امریکہ کی علاقے میں دلچسپی ایسے معاملات ہیں۔ جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ القاعدہ اپنے وجود سے محروم ہے۔ لیکن کسی نہ کسی سطح پر اس کی ذہانت دخل انداز ہے۔ امریکہ کی پاک افغان پالیسی میں بھارت بھی داخل ہوگیا ہے۔ افغانستان میں بھارت کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے۔ یہاں تک کہ افغانستان کی وزارت تعلیم کو بھارت چلا رہا ہے۔ راکے چھ ایجنٹ افغانستان میں حالیہ خود کش حملوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔ جو بھارت کی مداخلت کا کھلا ثبوت ہیں۔ روس، چین، افغانستان، بھارت، سعودی عرب سب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ کابل کا راستہ کشمیر سے براہ راست ہونا چاہئے۔ اسرائیل ایران کی ایٹمی تنصیبات پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ اور آئیندہ برسوں میں اسرائیل کے ایران کی ایٹمی تنصیبات پر حملوں کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے افراد اس خیال کے بھی حامی نظر آتے ہیں کہ موجودہ دہشت گردی بغیر سرمائے کے ناممکن ہے۔ اور اب دہشت گردی ایک کاروبار ہے۔ کراچی میں ہونے والی لوٹ مار، اغوا، ڈکیتی کی وارداتوں کے پیچھے بھی دہشت گردوں کی کاروائی نظر آتی ہیں۔ جو آج کا فنڈز جمع کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ اس وسیع تر صورتحال میں کراچی میں دہشت گردی کی وارداتوں پر گہری نظر رکھنے، اور کراچی کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لئے ایک مربوط لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔

کرائے کے قاتل

گزشتہ دنوں دبئی کے ایک ہوٹل میں انتہائی سیکورٹی کے باوجود حماس کے رہنما محمود ال بہوکے قتل نے پوری دنیا کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ سیکورٹی کیمروں میں قاتلوں کی تصاویر موجود تھیں۔ جو آسٹریلوی پاسپورٹ پر دبئی آئے اور حماس کے رہنما کو قتل کر کے آرام سے واپس چلے گئے۔ دبئی پولیس کے مطابق قتل کی تحقیقات کے دوران 25 مشکوک افراد کو گرفتار کیا گیا دبئی پولیس کے مطابق قتل میں موساد کا ہاتھ ہے قتل کی اس واردات میں تین آسٹریلوی شہریوں کے جعلی پاسپورٹ استعمال کئے گئے۔ یہ تینوں آسٹریلوی شہری اسرائیل میں رہتے ہیں۔ آسٹریلوی اہلکاروں اور میڈیا سے رابطوں پر ان کے رشتے داروں اور والدین نے بتایا کہ وہ اس واقعہ پر حیران ہیں۔ کیونکہ اس واردات کے بعد تینوں آسٹریلویوں کی زندگی کو اسرائیل میں خدشہ لاحق ہے۔ مذکورہ تین آسٹریلوی باشندوں میں سے ایک جو شواڈینیل بروس کی ماں نے میڈیا کو بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کی سلامتی بارے بہت پریشان ہے جو شوا اسرائیل میں ہے مگر ہم نہیں جانتے وہ کس حال میں ہے اور کیا جو شوا بھی اپنے پاسپورٹ کے غیر قانونی استعمال میں ملوث ہے؟ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ صوبہ وکٹوریہ کے یہ تینوں یہودی نژاد اسرائیلی بھی موساد کیلئے کام کرتے ہیں؟ جن آسٹریلویوں کے قتل کی اس واردات میں پاسپورٹ استعمال ہوئے ان

میں سے ایک 27 سال خاتون نکول مکابے بھی ہے۔ جو اس وقت تل ایب میں مقیم ہے۔ نکول نے میڈیا کو بتایا کہ وہ اس حوالے سے بہت خوفزدہ اور اس بات سے لاعلم ہے کہ اس کا پاسپورٹ کس طرح سے جعلی پاسپورٹ بنانے کیلئے استعمال کیا گیا۔
آسٹریلوی وزیر خارجہ کا کہنا ہے کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی اس حوالے سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ قتل کی اس واردات میں جو پاسپورٹ استعمال کئے گئے وہ 2003ء میں جاری کئے گئے اور اس کے بعد سے نئے پاسپورٹ جاری کرنے کیلئے 2005ء سے پاسپورٹس مائیکرو ٹیکنالوجی استعمال کی جا رہی ہے۔ جس کی نقل کرنا ناممکن ہے قابل ذکر بات یہ ہے کہ آسٹریلیا میں یہودی لابی کافی مضبوط ہے۔ دونوں ممالک میں کافی مضبوط روابطہ ہیں۔ آسٹریلوی وزیراعظم رڈ کیون آسٹریلوی پاسپورٹس کے غلط استعمال پر سخت برہمی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ آسٹریلیا نے ہمیشہ اسرائیلی مؤقف کی حمایت کی ہے اور اسرائیلی سلامتی کی اصولی طور پر تائید کی مگر ہمیں یہ برداشت نہیں ہے کہ اسرائیل یا کوئی بھی ملک ہمارا نام خراب کرے اور ہمیں غیر قانونی کاموں کیلئے استعمال کرے۔ انہوں نے کہا کہ آسٹریلوی ادارے حماس لیڈر کے قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسرائیل کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی موساد کے ایک سابق ایجنٹ وکٹر آسٹروسکی نے انکشاف کیا ہے کہ موساد عرصہ دراز سے دنیا کے مختلف ممالک میں خفیہ کارروائیوں کیلئے جعلی آسٹریلوی پاسپورٹ استعمال کر رہی ہے۔ وکٹر 1980ء تک موساد کے ایک اہم ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس کا کہنا

ہے کہ موساد کے ہیڈ کوارٹر میں مختلف ممالک کے جعلی پاسپورٹ تیار کرنے کیلئے باقاعدہ ایک سیل قائم ہے۔

جو پاسپورٹ فیکٹری کی طرح کام کرتا ہے اور کسی بھی ملک کا اصل جیسا نقلی پاسپورٹ تیار کرنے میں مہارت رکھتا ہے اس فیکٹری میں پاسپورٹ بنانے کیلئے خصوصی پیپرز، لوگو اور تحریریں تیار کی جاتی ہیں۔ وکٹر نے بتایا کہ موساد اپنے ایجنٹوں کو مختلف ممالک میں کارروائی کیلئے جعلی پاسپورٹ فراہم کرتی ہے۔ جعلی پاسپورٹ جاری کرتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ جن پر کسی ملک میں داخلہ پر پاسپورٹ ہولڈر پر کوئی شک نہ کیا جاسکے، وکٹر کے مطابق زیادہ تر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فرانس، برطانیہ اور کینیڈا کے جعلی پاسپورٹ تیار کئے جاتے ہیں۔ اسرائیل میں تعینات آسٹریلیا میں 1997ء سے 1999ء تک تعینات سابق سفیر آئین وکھاک نے انکشاف کیا ہے کہ اپنی تعیناتی کے دوران انہوں نے اسرائیل کے محکمہ خارجہ کے سنئر افسروں کو خبردار کیا تھا کہ اسرائیل کو اپنے مقاصد کیلئے آسٹریلوی پاسپورٹ کی غیر قانونی تیاری اور ان کے غیر اخلاقی استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ اس بیان کے بعد اسرائیل کی طرف سے جعلی آسٹریلوی پاسپورٹ تیار کرنے کا معاملہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ سابق آسٹریلوی حکومتیں اسرائیل کی طرف سے جعلی پاسپورٹ تیار کرنے کے عمل سے آگاہ تھیں۔ اور اگر ایسا تھا تو یہ بات

اب تک منظر عام پر کیوں نہ کر سکی؟ سابق وزیر اعظم ہاورڈ کے وزیر خارجہ الیگزینڈر نے انکشاف کیا ہے کہ انکے دور میں اس اطلاع پر کہ اسرائیل میں آسٹریلوی پاسپورٹس کو جعلی پاسپورٹوں کی تیاری میں استعمال کیا جارہا ہے پر اسرائیل کو خبردار کیا گیا تھا۔ دنیا میں موساد کی اس دیدہ دلیری پر لے دے ہورہی ہے۔ لیکن کوئی اس پہلو پر نہیں بات کررہا کہ پاکستان اور افغانستان میں ہونیوالی دہشت گردی کرنے والے طالبان کیا حقیقی طالبان ہیں یا اس بھیس میں غیر ملکی انٹیلیجنس ایجنسیوں کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔ حال ہی میں طالبان کی جانب سے رہا کئے جانے والے مغوی سکھوں نے انکشاف کیا ہے کہ جن طالبان کی قید میں وہ تھے ان میں سے کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، لاہور، پنجاب اور بلوچستان میں را کے ملوث ہونے کے شواہد بھی موجود ہیں۔ ایسے حالات میں ان کرائے کے قاتلوں کا نیٹ ورک پورے پاکستان میں موجود ہے۔ جن کا دین ومذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جو علماء دین کو قتل کر رہے ہیں، مساجد مدرسوں، عبادت گاہوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ اور نوٹوں اور ڈالرز کے بل بوتے پر مقامی نیٹ ورک سے کام لے رہے ہیں۔ کاش کوئی اس بین الاقوامی سازش کا نوٹس لے۔

ارکان اسمبلی کی جعلی ڈگریاں اور تعلیمی بورڈ کی حالت زار

آج سے کراچی میں ہزاروں طلبہ وطالبات میٹرک کے امتحانات میں شرکت کر رہے ہیں۔ دو دن پہلے ان میں سے بیشتر طلبہ اس بات سے پریشان تھے کہ انھیں ان کے ایڈمٹ کارڈ نہیں ملے تھے۔ پھر یہ طلبہ پریشان ہو کر بورڈ آفس پہنچ گئے۔ جوں جوں طلبہ کا ہجوم بڑھا، معاملات بھی الجھ گئے۔ ایڈمٹ کارڈ اور امتحانی فارم کے معاملے پر ثانوی تعلیمی بورڈ کراچی کے باہر احتجاجی مظاہروں کی بازگشت گورنر ہاؤس کا سلسلہ بدھ کو دوسرے روز بھی جاری رہا۔ سینکڑوں پرائیویٹ امیدوار سخت گرمی اور دھوپ میں اپنے امتحانی فارم جمع کرانے کیلئے احتجاج کرتے رہے لیکن بورڈ نے ان کے امتحانی فارم وصول نہیں کئے۔ البتہ بورڈ نے نجی اور سرکاری اسکولوں کے امتحانی فارم 12 سو روپے لیٹ فیس کے ساتھ وصول کئے۔ 24 اسکولوں کے ایک ہزار سے زائد فارم بدھ کو جمع کئے گئے جن میں 3 سرکاری ہائر سیکنڈری اسکول بھی شامل تھے۔ جن کے ایڈمٹ کارڈ جمعرات کو جاری ہوئے۔ میٹرک کے طلبہ کو ہزاروں روپے فیس کی ادائیگی کے بعد جو ایڈمٹ کارڈ مظاہروں کے بعد ملے وہ انھیں گھروں پر ملنا چاہئے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارا سارا تعلیمی نظام تباہ ہوتا جارہا ہے۔ تعلیمی بورڈ کی کارکردگی ہمار معیار تعلیم کا اظہار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے امتحانات شروع ہونے سے 10 روز قبل مارچ سے ایڈمٹ کارڈ جاری کرنے کا شیڈول جاری کیا گیا جبکہ بورڈ کی جانب سے 13 اسکولوں سے امتحانی فارم لینے کا سلسلہ گزشتہ اکتوبر سے جاری تھا۔ 6 مارچ تک بورڈ نے 12 سو روپے لیٹ فیس کے ساتھ امتحانی فارم وصول کئے۔ بورڈ کی سیکریٹری کے مطابق آخری تین دن میں شدید دباؤ کے باعث امتحانی فارم جمع کرانے کی میں اضافہ کیا گیا جس میں ساڑھے 4 ہزار سے زائد امتحانی فارم جمع ہوئے دو روز تک ان کی اسکروٹنی ہوئی اور 21 مارچ سے ایڈمٹ کارڈ جاری ہونا شروع ہو گئے۔ اسی دوران سینکڑوں پرائیویٹ امیدوار اور کئی نجی اسکول نے امتحانی فارم جمع کرانا چاہا لیکن بورڈ نے امتحانی فارم نہیں جمع کئے جس کی وجہ سے مظاہرے اور احتجاج شروع ہوا۔ اور دو پرچے ملتوی کرنا پڑے۔ بہت سے حلقے میٹرک کے پرچے ملتوی ہونے کے ذمہ دار افسران کیخلاف سخت کاروائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس وقت سیکنڈری بورڈ سے یونیورسٹی تک مبینہ رشوت، سفارش، نقل اور بدعنوانی کا راج ہے۔ جبکہ اس صورتحال کا نوٹس لینے کیلئے کوئی ذمہ دار شخص تیار نہیں۔

گزشتہ سال جب بوٹی مافیا کے ارکان کو نقل کراتے ہوئے پکڑا گیا۔ تو انہی افراد کو نکال دیا گیا۔ جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ امتحانی ہالوں میں جو صورتحال ہوتی ہے وہ تو ایک الگ کہانی ہے لیکن طلباء اندھیرے

میں اپنے مستقبل کا چراغ کیسے جلائیں گے یہ کسی نے نہیں سوچا۔ امتحانی ہالوں میں بجلی کی بندش کے دوران متبادل انتظامات کا کوئی بندوبست نہیں۔ ائر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر تعلیمی ترقی کے لئے سیمینارز اور مباحثوں پر کروڑوں خرچ کرنے والوں کو اس اہم اور بنیادی مسئلہ کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے لیکن شاید یہ ہمارے حکمرانوں کے لئے مفت کے کھیل کا درجہ رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوڈشیڈنگ کی صورتحال کا اندازہ ہونے کے باوجود کسی بھی امتحانی ہال میں متعلقہ حکام کی طرف سے کوئی متبادل بندوبست نہیں کیا گیا ہے۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ ان بچوں پر جو امتحان دے رہے ہیں۔ یہ بھی پہلی بار ہو رہا ہے کہ سائنس کے طلبہ کو امتحان دوپہر میں ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنے اداروں کو مثالی بنانا تھا۔ لیکن کیا کریں قوم کے رہنما جعلی ڈگریاں لے کر اسمبلیوں میں بیٹھے ہیں۔ تو قوم کے بچوں کا کیا حال ہوگا۔

بجلی کا تازہ بحران

گزشتہ ہفتے تک کراچی کے حالات ٹھیک چل رہے تھے۔ شہریوں نے بجلی کے بارے میں کے ای ایس سی کی پالیسیوں سے کسی حد تک سمجھوتہ کرلیا تھا۔ ہر علاقے میں شیڈول کے مطابق لوڈ شیڈنگ ہو رہی تھی۔ جسے شہریوں نے قبول کرلیا تھا۔ لیکن وفاقی وزیر پانی و بجلی جو کرائے کے بجلی گھروں کے معاملے پر سخت ہزیمت کو شکار ہوئے تھے۔
انھیں کراچی کے شہریوں کا یوں پرامن رہنا شاید گوارا نہیں رہا۔ انھوں نے نہ جانے کیا فسوں پھونکا ہے کہ کراچی والے ایک بار پھر بلبلائے ہوئے ہیں۔ فی الحال کراچی میں شروع ہونے والا موجودہ بجلی کا بحران اب اس وقت تک حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا جب تک یا تو وفاقی حکومت مداخلت نہ کرے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کراچی میں پیدا کردہ بجلی کا بحران مصنوعی ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو مشتعل کرکے انھیں سڑکوں پر نکالنا ہے۔ تاکہ پھر مفاد پرست افراد کو اپنے منصوبوں پر کام کا موقع ملے گا۔ اور مہنگی بجلی کے لئے کرائے کے بجلی گھر خریدے جائیں۔ کچھ اسے پی ایس او اور کے ای ایس سی کی اندرون خانہ لڑائی قرار دیتے ہیں۔ جو کچھ یوں ہے کہ حکومت نے دسمبر میں کے ای ایس سی کو بجلی پیدا کرنے کے لیے ایندھن فراہم کرنے کی ذمہ داری پی ایس او کو دیتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ وہ کے ای ایس سی کو فرنس آئل، گیس کے نرخ پر فراہم کرے اور قیمت میں جو فرق

آئے گا، وفاقی وزارت خزانہ اخراجات برداشت کرتے ہوئے اسے پورا کرے گی۔اس دوران کے ای ایس سی کو قریباً ڈھائی ارب روپے مالیت کا لگ بھگ نواسی ہزار ٹن فرنس آئل فراہم کیا گیا، مگر اب جبکہ اس ایندھن کی قیمت یا رقم ادا نہیں کی جارہی، تو پی ایس او نے ایندھن کی فراہمی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔کے ای ایس سی حکام ادارے کو ہونے والے نقصان کا معاملہ ادائیگی سے مشروط کر رہے ہیں۔ جس سے معاملات خراب ہو رہے ہیں۔ اب کراچی میں ۸ سے ۱۰ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔ عوام سراپا احتجاج ہیں۔

کراچی میں بجلی کے بدترین بحران کے باعث شہری بلبلا اٹھے کے ای ایس سی کی جانب سے ہر ایک گھنٹے بعد ڈیڑھ گھنٹے کی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ سے معمولات زندگی تباہ ہو کر رہ گئے۔ بجلی کی آنکھ مچولی کی وجہ سے شہر میں پانی کا بحران بھی سنگین ہوگیا۔اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ بجلی کے بحران پر جلد قابو نہ پایا گیا تو ملکی معیشت بیٹھ جائے گی اور ہزاروں صنعتیں بند اور لاکھوں شہری بے روزگار ہو جائیں گے۔ کراچی میں طویل لوڈشیڈنگ کی شکایات پر جمعرات کو گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد نے کے ای ایس سی، سوئی گیس اور پی ایس او حکام کا اجلاس طلب کیا۔اجلاس میں گورنر سندھ نے تینوں اداروں کے مسائل کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کیلئے حکام کو ہدایات جاری کیں۔کے ای ایس سی کو ایک ارب روپے کے مختصر مدت کے قرض کی فراہمی کیلئے ڈاکٹر عشرت

العباد نے نیشنل بینک کے صدر علی رضا سے بات چیت کی۔ نیشنل بینک کی جانب سے کے ای ایس سی حکام کو تمام ضوابط کی تکمیل کے بعد قرضہ فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ قرض فراہمی کی یقین دہانی پر سوئی سدرن سے گیس اور پی ایس او سے تیل کی فراہمی بحال کردی گئی ہے ملک میں بجلی کا شارٹ فال 4242 میگاواٹ تک پہنچ گیا ہے' وزارت پانی و بجلی کے ذرائع کے مطابق بجلی کی پیداوار 9598 میگاواٹ جبکہ مانگ 13852 میگاواٹ ہے۔ بجلی کے بحران پر قابو پانے کے لئے کراچی کی مارکیٹوں کو رات آٹھ بجے بند کرنے کی تجویز پر بھی عمل نہیں ہو سکا۔ واپڈا ملک بھر میں جاری بجلی بحران پر موسم گرم کیلئے حکمت عملی طے کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے فی گھر بجلی کے یونٹ مقرر کرنے کی تجویز پر غور کررہی ہے۔ جس میں ہر گھر کے لئے 175 یونٹ سے 1175 یونٹ تک مقرر ہونگے اور یونٹ ریٹ یونٹ اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتے جائیں گے ہر گھر اپنے حاصل شدہ یونٹ ایک ماہ میں استعمال کرے گا وہ ایک دن میں استعمال کرے یا 30 دن میں اس بارے میں وہ اپنی ضرورت کے مطابق یونٹ استعمال کرکے بجلی پوری کرے گا۔ کچھ حلقے یہ تجویز بھی دیتے ہیں کہ بجلی کے بحران کے حل تک ائیر کنڈیشن اور بل بورڈ، اشتہاری بورڈ، پر پابندی لگائی جائے۔ اسٹریٹ لائٹ بھی بند کی جائیں۔ اور بجلی کی چوری پر قابو پایا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کیا کرتی ہے۔

بھٹو کی میراث کون سنبھالے گا

سندھ میں پلنے والی مہاجروں کی ایک نسل بھٹو دشمنی میں جوان ہوئی۔ ۷۰ کی دہائی کی سندھ میں شہروں میں بسنے والی نسل نے ۱۹۷۲ کے لسانی فسادات دیکھے، کوٹہ سسٹم کا جبر سہا، ملازمتوں میں امتیاز، داخلوں میں ڈومیسائل کی تلوار کے زخم سہے۔ اس نسل کو سیاست دانوں نے خوب بھڑکایا، پیپلز پارٹی کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی سندھی اور مہاجروں میں تفریق کی ایک لکیر کھینچ دی گئی۔ بد قسمتی سے پیپلز پارٹی نے بھی سندھ کے شہری علاقوں سے امتیاز کا رویہ اپنایا۔ جس کے سبب سندھ کے شہری علاقوں کی وہ مخلص قیادت بھی پیپلز پارٹی میں پنپ نہ سکی جو بھٹو کی شیدائی تھی۔ ان دنوں جو مہاجر بھٹو کا دم بھرتے تھے وہ اپنی بستیوں میں اجنبی ہوتے تھے۔ ان کا معاشی بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جو بھٹو کا شیدائی تھا۔ وہ اس پر فدا تھا۔ حیدرآباد میں پیپلز پارٹی کی تشکیل ہوئی۔ میر برادران میر رسول بخش تالپور، میر علی احمد تالپور، چوہدری اشرف، الہی بخش قائم خانی، بدیع الحسن زیدی، جیسے سیاست دانوں نے بھٹو کی ہمنوائی کی۔ بھٹو حیدرآباد کئی بار آئے، قاضی اکبر کا ہوٹل اورینٹ اس زمانے میں نیا نیا بنا تھا۔ بھٹو یہاں پر قیام کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد، حیدرآباد پولیس لائین میں بھٹو نے جلسہ، وہ ایک شعلہ بیاں مقرر تھے۔ عوام

کے دل ان کی مٹھی میں ہوتے تھے۔ وہ جلسوں میں ایسی آتش فشانی کرتے کہ پل میں آگ لگ جاتی۔ حیدرآباد میں انھوں نے کولیوں کے لئے شاندار کواٹر تعمیر کرائے۔ یہ سندھ کے قدیم باشندے جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ خود بھٹو نے آکر انھیں ان کواٹروں کی چابیاں دیں۔ انھوں نے سرکٹ ہاؤ س میں آکر سندھی اور مہاجر طلبہ سے ملاقاتیں کیں۔ وہ طالب علموں کے رہنماؤ ں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیا کرتے تھے۔ سندھ پیپلز اسٹوڈنس فیڈریشن، اور نوپس کو خوب بڑھایا۔ لیکن بد قسمتی سے سندھ کے شہری علاقے بھٹو کے حامی نہ بن سکے۔ مذہبی جماعتوں کے سحر میں مبتلا لوگ بھٹو سے دور ہی رہے۔ ہمارے معاشرے میں افراد سے سیاسی اختلاف اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس میں کسی بھی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بھٹو، جی ایم سید، مولانا مودودی، اسی سانحے کا شکار ہوئے۔ بھٹو خاندان نے سیاست میں جو قربانیاں دی ہیں۔ آج سب اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ سندھ میں رہنے والے اب پیپلز پارٹی کو مہاجر دشمن نہیں گردانتے۔ اس خلیج کو پاٹنے میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

بینظیر بھٹو کی زندگی حادثات، سانحات اور المیوں سے مزین دکھائی دیتی ہے۔ عین عالم عنفوان میں اس خاتون آہن نے اپنے نوجوان باپ کو ایوان اقتدار سے طوق و سلاسل کے سپرد ہوتے دیکھا۔ ااور پھر آسمان نیلی فام نے دیکھا کہ تیسری دنیا میں امید کی کرن دکھانے والے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو ایک

مقدمہ میں پھانسی کی سزا دے گئی اور عالم یہ تھا کہ بیوی شوہر اور بیٹی باپ کا آخری دیدار نہ کر سکی بیٹے پہلے ہی ملک سے باہر زبردستی کی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بھٹو خاندان پر وطن کی زمین تنگ کر دی اور آخر بینظیر کو بھی وطن کو خیر باد کہنا پڑا ابھی باپ کی موت کے زخم تازہ تھے کہ نوجوان بھائی شاہنواز کے پراسرار قتل کی جڑ نے اس آہنی عزم کی مالک نازک اندام لڑکی کو چلا کر رکھ دیا مکافات عمل نے کام دکھایا 1986 میں بینظیر کا وطن واپسی تاریخی استقبال دیکھ کر آمروں کی رات کی نیند اڑ گئی۔ یہ تاریخ کا جبر تھا کہ ذلت کے ساتھ وطن سے نکالی جانیوالی بینظیر بھٹو آمر کے صرف دو سال بعد ملک کے وزیراعظم منتخب ہو گئیں۔ مگر آمر کی باقیات نے بینظیر حکومت کو 18 ماہ تک بھی نہ چلنے دیا۔ مگر فقط تین سال بعد ایک مرتبہ پھر اقتدار کا ہما بینظیر کے کندھے پر آ بیٹھا لیکن اس دور میں بینظیر کو تیسرا صدمہ سہنا پڑا جب ان کے دور اقتدار میں ان کے دوسرے بھائی مرتضٰی پولیس فائرنگ سے ہلاک ہو گئے اور الزام بینظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری پر عائد کیا گیا۔ بینظیر کے دوسرے دور میں بھی محلاتی سازشیں عروج پر رہیں اور 96 میں انہی کے منتخب کردہ صدر فاروق لغاری نے انکی حکومت کا خاتمہ کر دیا پھر مقدمات کی ایک لمبی فہرست کھولی گئی مقدمات، عدالتیں اور پیشیاں، آخر مقدمات بنانے اور سزائیں دلوانے والوں نے ہی بینظیر کو محفوظ راستہ دیا اور عین ہائیکورٹ سے سزا سنانے سے ایک روز قبل بینظیر کو بیرون ملک فرار کرا

دیا گیا اور ان کی یہ خود ساختہ جلا وطنی 18 اکتوبر 2009ء کو امریکی دباؤ پر پرویز مشرف سے معاہدہ کے بعد ختم ہو گئی۔ 1986ء میں اہل لاہور نے دختر مشرق کا فقید المثال استقبال کر کے تاریخ رقم کی تو 2007ء میں اہل کراچی نے اپنی لیڈر کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ شہر قائد نے ایسا استقبال ایسا ہجوم شائد کبھی دیکھا نہ سنا ہو گا۔ مگر عوام اور جمہوریت دشمن قوتوں کو یہ استقبال ایک آنکھ نہ بھایا اور وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ عین اس ٹرک کے سامنے جس میں بینظیر سوار تھیں۔ دھماکہ ہوا اور 200 سے زائد کارکن اپنی لیڈر پر پلک جھپکتے میں فدا ہو گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے بینظیر بھٹو بچ گئیں لیکن دشمنوں نے محض دو ماہ نو دن بعد اس خاتون کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں قتل کر ڈالا۔ بے نظیر اور بھٹو کی قربانیوں نے پیپلز پارٹی کو اقتدار بخشا ہے۔ عوام بھٹو کے شیدائی ہیں۔ وہ اب بھی اپنے لیڈر کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ بھٹو خاندان کی نئی نسل جوان ہو رہی ہے۔ بھٹو جونیئر، فاطمہ بھٹو، یا بلاول بھٹو زرداری کون ہے جو اپنے دادا، نانا یا پھوپی یا ماں کی اس میراث کو سنبھالے گا۔

سسٹم کو چلنا چاہئے

پاکستان میں پہلی بار کوئی صدر اپنے اختیارات کم کرنے کے بل پر دستخط کرے گا۔ اٹھارویں ترمیم کی منظوری سے 1973 ء کا آئین اصل شکل میں بحال ہو جائے گا جس سے ملک کے جمہوری ادارے مضبوط ہوں گے۔73 کا آئین ذوالفقار علی بھٹو نے دو لخت پاکستان کے اس حصے کو دیا تھا۔ جسے مغربی پاکستان کہا جاتا تھا۔ بھٹو نے 73 کا متفقہ آئین بنایا۔ لیکن وہ اس آئین کی روح پر پوری طرح عمل نہ کرسکے۔ اپوزیشن ارکان کو اسمبلی سے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔ بلوچستان کی جمہوری حکومت ختم کرکے صوبے میں پہلی بار فوج کا آپریشن کیا گیا۔ صوبہ سرحد کی اے این پی کو خلاف قانون قرار دیا۔ ولی خان اور ان کی جماعت پر حیدرآباد جیل میں غداری کا مقدمہ چلایا گیا۔ بھٹو صاحب کی پارہ صفت طبعیت میں ٹہراؤ نہ تھا۔ وہ ہر آن کوئی نہ کوئی جنگ جاری رکھتے۔ اپوزیشن سے ان کی جنگ نے انہیں اقتدار اور زندگی سے محروم کیا۔ اور ملک کو مارشل لاء اور فوجی حکمرانوں کے سپرد کردیا۔ بھٹو 73 کے آئین کی روح پر عمل کرتے تو پاکستان کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ یہ بھی تاریخ کا جبر ہے کہ بھٹو نے جو آئین بنایا تھا۔ آج ان کے داماد اور ان کی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی ہی اس کا چہرہ سنوار رہی ہے۔ کئی دہائیوں کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ملک کی سیاسی و فوجی قیادت، پارلیمان اور عوام، تمام

سیاسی جماعتوں میں آئین میں اٹھارویں ترمیم کے مسودہ پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے توقع کے مطابق رواں ہفتے کے آخر میں پارلیمان کے دونوں ایوان اس بل کو منظور کرلیں گے۔ اس ترمیم کی منظوری کے بعد صدر آصف علی زرداری کو حاصل کئی اہم اختیارات پارلیمان اور وزیر اعظم کو واپس مل جائیں گے اور صدر محض ایک علامتی سربراہ مملکت ہوں گے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ صدر کو اپنے طور پر حکومت اور پارلیمان کو تحلیل کرنے یا پھر ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ 58 ٹو بی کی شق سابق فوجی حکمران ضیاالحق کے دور میں آئین میں متعارف کرائی گئی اسی شق کو استعمال کرتے ہوئے ماضی کے پاکستانی صدور نے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی منتخب حکومتوں کو برطرف کیا تھا۔ نئی ترمیم کے بعد مستقبل میں فوجی بغاوتوں کی حوصلہ شکنی کے لیے اٹھارویں ترمیم کے ذریعے آئین کی شق چھ میں تبدیلی کرکے اب دستور کو معطل کرنے کا اقدام بھی سنگین غداری کے زمرے میں آئے گا۔ اس کے علاوہ ججوں کی تعیناتی کے لیے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں ایک سات رکنی کمیشن تشکیل دیا جائے گا تاہم اس کی سفارشات کی حتمی منظوری کا اختیار پارلیمان کے ایک آٹھ رکنی کمیشن کو دیا گیا۔ بعض آئینی ماہرین کی رائے ہے کہ اس شق سے عدلیہ کی آزادی متاثر ہوگی۔ اس ترمیم میں صوبہ سرحد کا نیا نام خیبر پختون خواہ تجویز بھی شامل ہے۔ جس پر اے این پی خوشیاں منا

رہی ہے۔ اور خوشیوں کے اس جشن میں دو دن پہلے اس نے ۴۳ افراد کی شہادت دی ہے۔ آئین میں اٹھارویں ترمیم کا بل پارلیمان میں منظوری کے لیے ایک ایسے وقت پیش کیا گیا ہے جب سپریم کورٹ کی طرف سے حکومت پر اس دباؤ میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے کہ وہ صدر زرداری کے خلاف سوئس مقدمات دوبارہ کھولنے کے لیے فوری اقدامات کرے۔ صدر آصف علی زرداری 58 ٹو بی کی تلوار اپنی نیام سے نکال کر وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو پیش کر رہے ہیں۔ جو واقعی بڑے دل گردے کی بات ہے۔ 58 ٹو بی پاکستان کی دہکتی آگ نے ملک کی تین جمہوری حکومتوں کو جلا ڈالا۔ 58 ٹو بی اور وزیراعظم صدر اختلاف کی تاریخ خاصی ہولناک ہے۔ آج تک جتنی حکومتیں ختم ہوئی ہیں، آمریت آئی یا جمہوری حکومت رخصت ہوئی اس میں صدر اور وزیراعظم کا کہیں نہ کہیں اختلاف ضرور حکومت اور اسمبلی کے خاتمے کا سبب بنا۔ اس کی کاٹ کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک ہی پارٹی کے صدر فاروق لغاری نے اپنی پارٹی کی وزیراعظم کو اس چھری سے ذبح کردیا تھا۔ لیکن اب حالیہ ترمیم میں یہ شق ختم کی جارہی ہے۔ اور یہ صدر آصف علی زرداری کے ہاتھوں سے ہو رہا ہے۔ جو اس وقت کسی نہ کسی شکل میں ملک کی وحدت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ انھیں اس کا کریڈٹ ضرور دیا جانا چاہیئے۔ پھر اس سسٹم کو چلنے بھی دیا جائے۔ تاکہ ملک میں جمہوریت کی روایات پنپ سکیں۔ پاکستان کھپے کا نعرہ ہی نہیں اس کے لئے اب کام بھی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے آصف زرداری بہت موزوں شخصیت ہیں۔

عوام پر نئے ٹیکسوں کا بوجھ

آئی ایم ایف نے پاکستان سے ٹیکس وصولی کا 13 کھرب 80 ارب روپے کا ہدف حاصل کرنے کیلئے سپیشل ڈیوٹی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔ جبکہ حکومت ان دنوں ویلیو ایڈڈ ٹیکس لگانے میں سنجیدہ ہو رہی ہے۔ جس سے حکومت کو آٹھ سو ارب روپے کی ٹیکس آمدنی کی توقع ہے۔ ویلیو ایڈڈ ٹیکس کھپت کے بجائے پیداوار پر لگایا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس مصنوعات کی حتمی قیمتوں پر لگانے کے بجائے پیداواری سلسلے میں ہر مرحلے، خام مال کی ڈسٹری بیوشن سے لے کر حتمی سیل کی قیمت پر لگایا جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر پروڈیوسرز اور ڈسٹری بیوٹرز پر یہ ٹیکس نہیں لاگو کیا جاتا بلکہ اس کا اصل بوجھ اشیاء صارفین پر پڑے گا۔ یہ ٹیکس اشیائے خوردنی، گھریلو کھپت کی اشیاء اور ایسی ادویات پر بھی لاگو ہوگا جو اس وقت پاکستان میں جنرل سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں جبکہ صرف آٹا، گندم اور زندگی بچانے والی دوائیاں اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گی۔

پاکستان دنیا کے ان مملکت میں سے ہے جس کے غریب عوام براہ راست ٹیکسوں کی زد میں ہیں۔ گذشتہ حکومتوں نے ٹیکسوں کی وصولیابی کے لئے ایک نیا حربہ یہ استعمال کیا ہے کہ بہت سے ٹیکس یوٹیلیٹی کے بلوں میں شامل کر دیئے ہیں۔ جو

عوام پر ایک بوجھ بن گئے ہیں۔ ٹیکسوں میں خصوصاً پیٹرول کی فروخت میں ایک بدعنوانی یہ ہے کہ قیمتوں کا تعین کرتے وقت فی لیٹر قیمت راؤنڈ فیگر کے بجائے ہمیشہ پیسوں میں رکھی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر ہر لیٹر پر پورا روپیہ عوام سے وصول کیا جاتا ہے۔ یہی صورت حال بجلی کے بلوں کی ہے۔ یوں ہر روز لاکھوں روپے عوام سے زائد وصول کئے جاتے ہیں۔ پاکستان کے 2008-09ء میں اخراجات جی ڈی پی کے 18 سے 20% سالانہ تھے جبکہ ایف بی آر کی محصولات جی ڈی پی کا 9.5% ہیں۔ پاکستان میں اس وقت ٹیکس کی وصولی کی جی ڈی پی میں شرح 9.5% ہے جبکہ انڈیا میں یہ شرح 11 سے 12% ہے۔ پاکستان میں وصول ہونے والا ٹیکس کے ہر روپے میں سے ۴۰ پیسے کرپشن ، اور سرکاری اللے تھللوں میں خرچ کردئے جاتے ہیں۔ ملک کا مقتدر طبقہ ٹیکس کی چوری میں سب سے آگے ہے۔ یہ صرف عوام ہیں یا تنخواہ دار طبقہ جس کی تنخواہوں سے ایٹ سورس ٹیکس وصول کرلیا جاتا ہے۔بڑھتے ہوئے ٹیکس کا بوجھ بھی اسی طبقے پر ہے۔ ملک کے مخصوص حالات میں اس قدر زیادہ شرح کے ٹیکس سے جو عوام پر لگائے جارہے ہیں۔ اس سے پہلے سے ہی کمزور ملکی معیشت مزید تباہ ہوکر رہ جائے گی اور اس سے افراط زر، مہنگائی اور غربت میں مزید اضافہ ہوگا۔ ملک میں 60% سے 70% تک غیر دستاویزی (انفارمل سیکٹر) ہے۔ جو ٹیکس کی چوری کرتا ہے۔ صرف 30% سے 40% دستاویزی معیشت سے حکومت کو ریونیو مل رہا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس ملک میں لوگ ٹیکس ادا نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس ملک کے عوام اربوں روپے ایدھی، شوکت خانم

الخدمت، خدمت خلق، انصار برنی ٹرسٹ، سیلانی ویلفیر، چھیپا، اور دیگر فلاحی تنظیموں کو دیتے ہیں۔ لیکن حکومت کو ٹیکس نہ دینے کی وجہ عدم اعتماد ہے۔ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ جس حکومت میں کابینہ میں ۳۹ وزیر، مشیر ہوں، جن پر ہر ایک پر ایک لاکھ روپے روزانہ خرچ ہوتے ہوں۔ تو وہ عوام کی خدمت کیا کرے گی۔ بجلی، پانی، پیٹرول، اشیاء صرف کی قیمتوں میں جو ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ ملک میں عوام کے صبر کو دعوت دے رہا ہے۔ اب بھی ہم نے عقل کے ناخن نہ لئے تو پھر ملک میں بپھرے ہوئے عوام کو کوئی بند نہ روک سکے گا۔

اطلاعات تک رسائی کا قانون

پاکستانی میڈیا ان دنوں شعیب اور ثانیہ مرزا کی شادی میں اس طرح مگن ہے جیسے بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ اس شادی کے مختلف پہلوؤں پر جب ملک کے اچھے بھلے سنجیدہ ادیب اور دانشور بھی اپنی دانشوری کے پھول ٹی وی پروگرام میں بیٹھ کر کھلانے لگیں تو اس بات کا گمان ہوتا ہے کہ اس ملک میں اس سے بڑھ کر کوئی عوامی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ میڈیا نے پروپیگنڈے کا ایسا جال بن رکھا ہے کہ اس سے ہٹ کر مزید سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ سوات میں لڑکی کو کوڑے مارنے کی جعلی فلم نے ہزاروں خاندانوں کو بے گھر کیا، ہزاروں لوگ اس فلم کے نشر ہونے کے بعد مارے گئے۔ پاکستان کی معیشت تباہ ہوئی۔ اب اس فلم کے ہدایت کار، ڈرامہ ساز، اداکار پیسہ دینے والے، پیسہ لینے والے این جی او سب سامنے ہیں۔ لیکن اس سازش کرنے والوں پر کوئی مقدمہ نہیں ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ انہوں نے اس ملک کی تباہی کے لئے اس ڈرامے میں کیوں حصہ لیا۔ آج کے دور میں میڈیا کے ہتھیار سے معصوم انسانوں کو ذبح کیا جارہا ہے۔ عراق پر حملے سے پہلے سی این این پر ایک جعلی فلم میں ایک کتے کو گیس کے کیمیائی ہتھیار سے ہلاک ہوتے دکھایا گیا۔ پھر پروپیگنڈہ نے وہ رخ اختیار کیا کہ لاکھوں مسلمانوں کو عراق میں قتل کردیا گیا۔ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان میں انتھروکس کے

جراثیمی ہتھیاروں کے حملے کا ڈرامہ رچایا گیا۔ اخبارات کے دفاتر پر اس سلسلے میں کیسی کیسی کاروائیاں ہوئیں۔ لیکن کسی نے بھی بعد میں نہ پوچھا کہ یہ سب ڈرامہ کس لئے تھا۔ تیسری دنیا کے عوام خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ لیکن عالمی سازشی کھلاڑیوں نے برڈ فلو کا ڈرامہ رچا کر لاکھوں مرغیوں کو تلف کرا دیا۔ جو گوشت 120 روپے کلو مل رہا تھا اب ڈھائی سو روپے کلو مل رہا ہے۔ کیا صحافت یہی ہے؟ حکومتی "کارکردگی" کی تعریفوں اور ان کے سرکاری بیانات چھاپ دیئے جائیں۔ کیا میڈیا کی یہی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ اسے فراہم کیا جائے اسے بلا سوچے سمجھے نشر کر دیا جائے۔ صحافت وہ ہے جس کے قلم کی قرآن نے قسم کھائی اور اس سے تعلیم دینے کی بات کی ہے۔ صحافت نہ کسی کے اشارے پر کسی کے خلاف مہم چلانے کا نام ہے نہ کسی کے تعلقات کی بناء پر کسی کی تعریفیں کرنے کا۔ آج میڈیا کو سنجیدگی سے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیئے۔ نئی آئینی ترامیم کی رو سے آئین میں آرٹیکل 19اے کی شمولیت سے عام شہریوں کو سرکاری دستاویزات تک رسائی حاصل ہو گئی ہے جو کہ ایک بنیادی حق ہے اور اب اگر کسی شہری کو یہ حق نہیں دیا جائے گا تو وہ ایسی صورت میں عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔ 37برسوں کے بعد اس آرٹیکل کی شمولیت سے آزادی رائے کا اظہار شہریوں کا بنیادی حق بن گیا ہے۔ 18ویں ترمیم میں نیا آرٹیکل 19 شامل کیا گیا ہے۔ 19اے میں تحریر کیا گیا ہے "معلومات تک رسائی کا حق ہر شہری کو عوامی اہمیت کے معاملات میں رسائی کا حق حاصل ہو گا۔ بشرطیکہ کسی

معقول ریگولیشن یا قانون کے ذریعے اس پر پابندی نہ ہو۔

مذکورہ شق کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور صحافیوں سمیت شہریوں کو معاملات تک رسائی حاصل ہو جائے گی جس سے شفافیت آئے گی۔ اب شہریوں اور صحافیوں کو اپنے اس حق کو استعمال کرنا چاہئے۔ عدالتوں میں اس سلسلے میں مقدمات ہونے چاہیے۔

ہماری صحافتی تاریخ ہمارے اکابرین کے کارناموں سے روشن ہے۔

قیام پاکستان کی تحریک میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کی خدمات کو کون بھول سکتا ہے کہ ان سب لوگوں نے ذات کی قربانی دے کر حریتِ فکر اور حرمتِ قلم کا پرچم بلند رکھا۔ کیا ہم ان لوگوں کی صحافت سے اپنی صحافت کا کوئی موازنہ کر سکتے ہیں؟ ہمیں اس مرحلے پر ضرور سوچنا چاہئے کہ ہم کب تک.بڑی خبر کے چکر میں ملک اور قوم کا سودا کرتے رہیں گے۔

پولینڈ کے صدر کے طیارہ کا حادثہ کیا واقعی حادثہ تھا؟

پولینڈ میں آج کا دن ایسا ہی پرآشوب ،اور غم واندوہ سے بھرا ہوا ہے۔ جیسے پاکستان میں 17 اگست 1988 کا دن تھا۔ جب پاک فوج کے جرنیلوں کی بڑی تعداد اس وقت کے صدر جنرل ضیاالحق کے ہمراہ طیارے کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ صدر ضیا کے ہمراہ امریکی سفیر بھی تھے۔ دو دن پہلے پولینڈ کے صدر لیخ کازیسکی کا طیارہ بھی اسی طرح روس کے شہر اسمولنسک میں ایئرپورٹ کے قریب گر کر تباہ ہوگیا جس کے نتیجے میں صدر، ان کی بیوی، آرمی چیف سمیت متعدد اہلکار ہلاک ہوئے۔ اس وقت پولینڈ کی سرزمین سوگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پولینڈ کے صدر کے اس حادثے اور صدر ضیاء کے حادثے میں جہاز کی مماثلت کے علاوہ اہم بات یہ ہے کہ دونوں امریکہ نواز تھے۔ پولینڈ کے ٠٦ سالہ صدر لیخ کازیسکی اور ان کے جڑواں بھائی جرولاء کازیسکی 2005 میں برسر اقتدار آئے تھے۔ جب انھوں نے لاء اینڈ جسٹس پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے بھائی 2009 میں وزیراعظم بن گئے تھے ۔ صدر لیخ کازیسکی ٨١ جون ٩٤٩١ کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے جڑواں بھائی جرولاء کے ساتھ ان کی شہرت کی ابتدا ٢٦٩١ میں ایک فلم میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اور انھیں عموماً وہ دونوں جنھوں نے چاند کو چرانا چاہا کے طور پر شناخت کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس فلم میں دونوں بھائی چاند کو چرا کر فروخت

کرکے امیر بن جانا چاہتے تھے۔ پولینڈ کے صدر امریکہ کے حامی تھے اور وہ ملک سے کرپشن اور بدعنوانی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں امریکی دفاعی میزائل سسٹم بھی لگانے کے حامی تھے۔ وہ ایسے کیمونسٹ افسران سے بھی چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ جو سیاست اور کاروبار میں گھسے ہوئے ہیں۔

بعض مبصرین اس حادثے کو امریکہ کی سازش قرار دیتے ہیں جو اپنے دوستوں کو صلہ دوستی دینے میں بہت آگے ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ امریکی مفادات کی نئی جنگ ہے۔ جو روس کی ریاستوں پر قبضہ کرنے کے لئے جاری ہے۔ 2 دن قبل ہی کرغیزستان کے صدر کو اپوزیشن کی مداخلت کے ذریعے اقتدار سے فارغ کیا گیا ہے اور اب پاکستانی سابق صدر جنرل ضیاالحق کے طرز پر طیارے کی تباہی اور پولش صدر اور ان کے دوستوں، فوجی جرنیلوں، بینک گورنر، معیشت دان اور دانشوروں کی ہلاکت کوئی حادثہ نہیں ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ماسکو ابھی افغانستان میں اپنی شکست کو نہیں بھولا اور وہ اپنی سابقہ ریاستوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا اور امریکا کے مقابلے میں زیادہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ امریکی اخبار نیو یارک ٹائمز کے مطابق پولش صدر جنگ عظیم دوم میں روس کی ریڈ آرمی کی پولینڈ میں مداخلت کے بعد سوویت یونین کی خفیہ پولیس کے ذریعے 20 ہزار سے زائد پولش آفیسرز کے قتل کے حوالے سے ایک اجلاس میں شرکت کیلئے روسی شہر اسمولنسک میں آرہے تھے۔ کسی دوسرے ملک میں کسی سربراہ مملکت

کے طیارے کے حادثے صدر اور ان کی اہلیہ سمیت کم از کم اٹھاسی افراد ہلاک ہونے کا یہ منفرد واقعہ ہے۔ روس میں تاشقند میں مزاکرات کے دوران بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاشتری بھی پراسرار حالات میں ہلاک ہوئے تھے۔ حکام کا کہنا ہے کہ یہ حادثہ شدید دھند میں لینڈ کرتے ہوئے صدارتی طیارہ درختوں سے ٹکرانے سے ہوا ہے۔ اس حادثے میں ضیاءالحق کے حادثے کی طرح کوئی نہیں بچا۔ حکام نے بتایا کہ 'جہاز زمین پر گر کر بکھر گیا'۔ ضیاء کے حادثے کے بعد غلام اسحاق خان نے اپنی نشری تقریر میں کہا تھا۔ کہ طیارہ فضا میں پھٹ گیا۔ اس جہاز پر عملے کے آٹھ ارکان سمیت ستانوے افراد سوار تھے جبکہ پولش حکام کے مطابق اس پرواز پر نواسی افراد نے سفر کرنا تھا لیکن ایک شخص اس پرواز پر سوار نہیں ہوا۔ ضیاء کے حادثے میں بھی ایک فرد ایسا تھا جو آخری وقت طیارہ میں سوار نہیں ہوا تھا۔ ماضی میں بھی کئی اہم بین الاقوامی سیاسی شخصیات اس قسم کے حادثات کا شکار ہو چکی ہیں۔ اس فہرست میں ایسے سیاستدانوں کے نام ہیں جو فضائی حادثوں کا نشانہ بنے۔

اروِد لنڈمین، انیس سو چھتیس

سویڈن کے وزیرِاعظم اروِد لنڈمین نو دسمبر سنہ انیس سو چھتیس میں اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا طیارہ لندن سے اڑان بھر رہا تھا کہ اِسی دوران کرائڈن میں مکانات پر جا گرا۔

ولیڈ سلو سکورسکی، انیس سو تینتالیس

پولینڈ کے وزیرِ اعظم سکورسکی چار جولائی سنہ انیس سو تینتالیس کو جلا وطنی کے دوران اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا طیارہ جبرالٹر سے اڑنے کے کچھ دیر بعد بحیرہ روم میں جا گرا۔

بار تھیلمی بوگانڈہ، انیس سو انسٹھ

افریقہ کی سینٹرل ریپلک کے صدر انتیس مارچ سنہ انیس سو انسٹھ کو اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا جہاز دورانِ پرواز پیشنگوئی سے گزرتے ہوئے پھٹ گیا۔

داگ، انیس سو اکسٹھ

اقوامِ متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل داگ ہیمر شولڈ سترہ ستمبر سنہ انیس سو اکسٹھ کو اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا جہاز زیمبیا میں گر کر تباہ ہوا۔

عبدالسلام عارف، انیس سو چھیاسٹھ

عراق کے سابق صدر عبدالسلام عارف تیرہ اپریل سنہ انیس سو چھیاسٹھ میں اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا ہیلی کاپٹر خراب موسم کے باعث حادثے کا شکار ہوا۔

بیجیڈک، انیس سو ستتر

یوگوسلاویہ کے وزیراعظم اٹھارہ جنوری سنہ انیس سو ستتر میں اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا طیارہ برفانی طوفان کے باعث ایک پہاڑی سے ٹکرا گیا۔

جیمی رولڈوس، انیس سو اکیاسی

ایکواڈور کے صدر جیمی رولڈوس چوبیس مئی سنہ انیس سو اکیاسی میں اس وقت مارے گئے جب ان کا طیارہ خراب موسم کے باعث حادثے کا شکار ہوا۔

جنرل عمر، انیس سو اکیاسی

پاناما کے رہنما جنرل عمر اکتیس جولائی سنہ انیس سو اکیاسی میں اس وقت ہلاک ہوئے جب پاناما ائر فورس کا جہاز پراسرار حالات میں تباہ ہوگیا۔

سامورا مچل، انیس سو چھیاسی

موزمبیق کے صدر انیس اکتوبر انیس سو چھیاسی میں اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا طیارہ خراب موسم کے باعث ماپوٹو میں لینڈنگ کے دوران تباہ ہوا۔

جنرل محمد ضیاالحق، انیس سو اٹھاسی

پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ضیا الحق سترہ اگست انیس سو اٹھاسی کو اس وقت ہلاک ہوئے جب پاکستانی فضائیہ کا ایک سی ون تھرٹی طیارہ بہاولپور سے اڑنے سے کچھ دیر بعد ہی گر کر تباہ ہو گیا۔ اس حادثے میں پاکستانی فوج کے کئی اعلیٰ افسران اور پاکستان میں امریکہ کے سفیر بھی مارے گئے۔

جووینل اور سیپریئن، انیس سو چورانوے

روانڈا کے صدر جووینل اور برونڈی کے صدر سیپریئن چھ اپریل سنہ انیس سو چورانوے میں اس وقت ہلاک ہوئے جب کیگالی ہوائی اڈے کے نزدیک ان کا طیارہ ایک میزائل لگنے سے تباہ ہوا۔

بورس، دو ہزار چار

مقدونیہ کے صدر بورس چھبیس فروری سنہ دو ہزار چار میں اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا طیارہ لینڈنگ کے دوران خراب موسم کے باعث حادثے کا شکار ہوا۔

جان گرنگ، دو ہزار پانچ

سوڈان کے نائب صدر جان، تیس جولائی دو ہزار پانچ کو اس وقت ہلاک ہوئے جب ان کا طیارہ سوڈان کے جنوب میں خراب موسم کے باعث ایک پہاڑ سے ٹکرا گیا۔

پولینڈ کے صدر لیخ کزنسکی کے حادثے پر پوری دنیا میں افسوس ہو رہا ہے۔ لیکن یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ اب دنیا سیاست میں عداوت اس ڈگر پر پہنچ چکی ہے کہ ایک فرد کو ختم کرنے کے لئے سینکڑوں، ہزاروں، نہیں لاکھوں افراد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی زندہ مثالیں صدام حسین، اسامہ بن لادن، ملا عمر موجود ہیں۔

میڈیا کی آزادی

فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی کی طرح ان کی اہلیہ کارلا.برونی بھی میڈیا میں رہنے کا فن جانتی ہیں۔ شادی سے پہلے وہ ایک کامیاب پاپ اسٹار رہیں۔.برونی نے فروری 2008ء میں صدر سرکوزی سے شادی کی تھی۔ اس شادی سے پہلے سرکوزی نے عہدہ صدارت سنبھالنے کے پانچ ماہ بعد ہی اپنی دوسری بیوی سسیلیا کو اکتوبر 2007ء میں طلاق دی تھی۔ اس کے بعد.برونی کے ساتھ ان کے رومانس کے چرچے بھی رہے، صدارتی محل میں ایک مختصر سی تقریب میں وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے تھے۔ صدر کوزی کو کئی اعزاز حاصل ہیں، مثلاً سرکوزی پہلے فرانسیسی صدر ہیں، جنھوں نے اپنے عہد صدارت میں طلاق دی، ان کا یہ بھی امتیاز ہے کہ گزشتہ سات دہائیوں میں وہ پہلے صدر ہیں جنھوں نے دورِ صدارت کے دوران شادی کی۔ اپنے شوہر کی طرح کارلا کے قصے کہانیاں بھی دنیا بھر کے اخبارات و جرائد اور میڈیا میں مقبول ہیں۔ چند دن پہلے خبر آئی کہ فرانسیسی صدر نکولس سرکوزی کی اہلیہ کارلا.برونی کی دوستی ایک بے گھر فرد کے ساتھ ہو گئی ہے اور وہ ان کو رقم دیتی ہیں اور ان سے موسیقی پر بات کرتی ہیں۔ بے گھر فرد ڈینس نے بھی اس راز کو نہیں چھپایا اور ایک 'کلوزر' نامی میگزین میں اپنے انٹرویو میں بتایا کہ صدر کی اہلیہ.برونی نے ان کو ایک ہوٹل میں رہنے کی پیشکش کی ہے جس کا خرچہ وہ خود اٹھائیں گی۔ ڈینس نے

مزید بتایا کہ ان دونوں کی بات چیت اس وقت شروع ہوئی جب اکتالیس سالہ اطالوی نژاد ماڈل اور گلوکارہ اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہیں تھیں۔ برطانوی اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کو ڈینس نے بتایا کہ 'انہوں نے میرا حال پوچھا اور مجھے ایک یا دو پچاس یا سو یورو کے نوٹ دیے۔' ان کا مزید کہنا ہے کہ دونوں نے کتابوں یا موسیقی پر بات چیت کی اور برونی نے ان کو اپنی نئی البم بھی دی۔ تاہم ڈینس نے برونی کی ایک ماہ تک ہوٹل میں رہنے کی پیشکش مسترد کر دی۔ اس کہنا تھا کہ برونی نے مجھے فوجی قسم کا ایک کمبل بھی دیا ہے جس سے میں گرم رہتا ہوں۔' برونی نے بے گھر افراد کے رسالے کو ایک انٹرویو میں ان کی اور ڈینس کے درمیان ہونے والی بات چیت کا ذکر کیا تھا جس کے بعد رسالے کلوزر نے ڈینس کا انٹرویو کیا۔ تھوڑے عرصے پہلے فرانسیسی صدر کی اہلیہ نے اس کمپنی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ جو ان کی برہنہ تصویر والے تھیلے بیچ رہی تھی۔ کارلا برونی کے وکیلوں نے پارڈن نامی اس کمپنی سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر کے ہرجانے کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کے وکلا کا کہنا تھا کہ یہ فوٹو انیس سو ترانوے میں ایڈز کے خلاف ایک مہم کے لیے کھینچی گئی تھی اور نہ کارلا برونی نے اور نہ ہی تصویر لینے والے فوٹو گرافر نے کمپنی کو اس کے استعمال کی اجازت دی تھی۔ اس مقدمے کے بعد کمپنی نے دکانوں سے یہ تھیلے واپس منگوا لیے اور انہیں ضائع کر دیا۔ ری یونین میں یہ تھیلے تقریباً تین سو پاکستانی روپے میں فروخت ہو رہے تھے۔ ان سفید تھیلوں پر سابق ماڈل کارلا

.برونی کی بلیک اینڈ وہائٹ.برہنہ تصویر چھپی ہوئی تھی۔.برونی کے وکلا نے عدالت میں کہا کہ وہ یہ نہیں چاہتیں کہ اس تصویر کو ایڈز کی بیداری کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے استعمال کیا جائے اور یہ کہ وہ اس کے کمرشل استعمال کے خلاف ہیں۔ یہ تصویر ایڈز مخالف مہم کے لیے لی گئی تھی ،اس تصویر کا ایک اصل پرنٹ نیو یارک میں نیلام کیا گیا تھا جو اکیانوے ہزار ڈالر میں بکا تھا۔

فرانس کی خاتون اوّل کارلا.برونی سرکوزی نے ایک ویب سائٹ بھی کھولی تھی۔ جس میں ان کی فلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ صدارتی محل میں ان کی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس ویب سائٹ کے کھلتے ہی پہلے ہی روز اس پر اتنے کلک پڑے کہ وہ بند ہو گئی۔ وہ پسماندہ طبقے کی مدد کے لئے ایک فاؤنڈیشن، ایڈز، تپ دق اور ملیریا کے خلاف کوششوں کے لئے قائم عالمی فنڈ کے لئے بحثیت سفیر ان اور فرانس کی خاتون اوّل کے طور پر شہرت رکھتی ہیں، تازہ ترین یہ ہے کہ فرانس کی عدالت نے ملک کے 24 نیوز چینلز کو فرانس کی خاتون اول کی نجی زندگی میں مداخلت اوران کے خلاف افواہیں پھیلانے پر 4 ہزار ڈالر جرمانے کی ادائیگی کا حکم دیا ہے جو کہ گلوکارہ بنجمن بیولے کو جائے گا جس کے وکیل کا کہنا تھا کہ ان افواہوں سے بنجمن کی ذات اور کیریئر کو نقصان پہنچا۔ بنجمن نے عدالت 20 ہزار یورو ہرجانے کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ عدالت

نے کارلا برونی کے بارے افواہیں پھیلانے کو ان کی نجی زندگی میں صریح مداخلت قرار دیا۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ نکولا سرکوزی نے اپنے اہل خانہ کے حقوق کے تحفظ کے لیے کسی بھی دوسرے فرانسیسی صدر سے زیادہ عدالتوں کا سہارا لیا۔ لیکن فرانس اور یورپ کی عدالتیں میڈیا کو لگام دینے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ناک کے آگے سے دوسرے فرد کی آزادی شروع ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے چینل جس طرح آزادی کا استعمال کر رہے ہیں۔ وہ بہت سے طبقوں کے لئے باعث آزار ہے۔ گزشتہ دو دنوں میں ٹی وی چینل سے وابستہ دو صحافی بم دھماکوں میں جان بحق ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹروں اور وکلاء سے ان کی دست بدست جنگ ہو چکی ہے۔ حکومتی حلقے بھی میڈیا ٹرائیل کے الزامات لگاتے ہیں۔ اس پر ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ میڈیا کی اس آزادی سے کیا ہم غریب اور حقوق سے محروم افراد کی کوئی خدمت کر رہے ہیں، یا قصے کہانیوں سے دل بہلا رہے ہیں۔

ناظمہ ۔۔ نئی صبح ضرور طلوع ہوگی۔

میں بہت اداس ہوں۔ ناظمہ طالب کے بہیمانہ قتل کا رد عمل اتنا ناقص ہے۔ مجھے اس پر شرم آتی ہے۔ کراچی پریس کلب میں پروفیسر ذکریا ساجد کے یہ الفاظ سن کر ہر شخص اپنی اپنی جگہ شرمسار تھا۔ میں اس شام ریڈیو پاکستان کے نیوز روم میں تھا۔ جب کوئٹہ میں ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والی جامعہ بلوچستان کے شعبہ ابلاغ عامہ کی پروفیسر ناظمہ طالب کے بارے میں خبر آئی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ ناظمہ نے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ ماس کیمونیکشن سے ایم اے کیا تھا۔ مجھے آرٹس لابی کی وہ خوبصورت صبحیں، اور شام یاد آئی۔ جب گوشہ صحافت میں سارے دوست جمع رہتے تھے۔ کلاس کے بعد لابی کا یہ گوشہ سب کی پناہ گاہ تھا۔ جماعتی، سرخے، کامریڈ، یہاں سب ایک تھے۔ ایک ہی رشتہ تھا، دوستی اور محبت کا، سب جدا ہوگئے۔ تیس برس گزر گئے ہیں۔ لیکن جو بھی ان لمحوں کا شریک تھا۔ اب کہیں بھی ملتا ہے تو اسی اپنائیت اور محبت سے۔ اس میں طلبہ سے زیادہ اساتذہ کا کمال تھا۔ جو اپنے طلبہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ آج ناظمہ کو یاد کرنے سارے پرانے دوست اور ساتھی موجود تھے۔ قیصر محمود، یوسف خان، مہناز فاطمہ، انعام باری، ڈاکٹر نثار زبیری، پروفیسر توصیف احمد خان، پروفیسر مطاہر حسین، ڈاکٹر سیمیں نغمانہ، صحافت کے ہر شعبے میں کراچی یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے سابق

طلبہ موجود ہیں۔ لیکن ناظمہ طالب کی شہادت پر کوئی بڑا ردعمل نہیں آیا۔ بلوچستان کے حقوق کی جنگ لڑنے والے بہادر بلوچوں نے ایک نہتی خاتون کو گولی کا نشانہ بنایا۔ جو ۳۰ برس سے ان کی کئی نسلوں کو تعلیم کے زیور سے آرستہ کررہی تھی۔ اس کے شاگرد کیسے بے حس ہیں۔ جو اپنی پروفیسر کے قتل پر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک بیٹے سے اس کی ماں چھین لی گئی۔ صحافتی برادری کی خاموشی، اور اس سے زیادہ، سندھ اور بلوچستان کی حکومتوں کی بے حسی ایک سوالیہ نشان ہے۔ ناظمہ کا قتل ایک سفاکانہ وار ہے۔ جو پاکستان کے جسم پر کیا گیا ہے۔ قبائلی روایات کے امین بلوچوں نے ایک عورت کو مار ڈالا۔ یقین نہیں آتا۔ امتیاز فاران پریس کلب کے صدر ہیں۔ ان کی تقریر جذبات سے پر تھی۔ ناظمہ کے بیٹے کے مستقبل کے لئے ایک سوالیہ نشان ہے۔ کوئی اس کی مالی امداد، کوئی نوکری، کوئی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں۔ کیا ان چیزوں سے اس کی ماں مل جائے گی۔ وہ بچہ عمر بھر اپنی ماں کو یاد کرتا رہے گا۔ ناظمہ کرچی آنا چاہتی تھی۔ کراچی یونیورسٹی کا شعبہ بھی سیاست کا شکار ہے۔ عملی زندگی میں ساتھ چلنے والے موقع پا کر پیٹھ میں چھرا گھونپنے سے نہیں چوکتے۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ دوستی کی دولت سب سے ارفع اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ جس سے وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ چند سکوں کے لئے دوستی فروخت کردیتے ہیں۔ شائد یہی دستور زمانہ ہے۔ ناظمہ کراچی نہ آسکی۔ اور اب بہت دور چلی گئی۔ اس کا نام ہمیشہ کے لئے امر ہوگیا۔ اس نے جاتے جاتے بلوچستان میں جو

علم کی شمعیں روشن کی ہیں۔ ان سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جہالت کے اندھیرے میں نئی صبح ضرور طلوع ہو گی۔

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آج سارے لوگ ماں سے محبت کا عالمی دن منا رہے ہیں۔ ماں سے محبت کرنے والے ماں کے پیار، اسکی محبت، اس کی قربانی، اس کے جذبے، اس کی رحمدلی، اس کی ممتا کو یاد کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو اس سایہ رحمت سے محروم ہیں۔ ان کے اشکوں کا سیل رواں نہ خشک ہوتا ہے اور نہ تھمتا ہے کہ اس دنیا میں ماں جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ وہ جو رات میرا انتظار کرتی تھی۔ میرے بستر پر آتے جاتے چادر ٹھیک کرتی تھی۔ میرے لئے دعاؤں کو ایسا پہاڑ بناتی تھی کہ جس سے دنیا کی ساری آفت ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی تھیں۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ میری ماں سے مجھے محبت ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس کی پسند سے بھی محبت کروں۔ میری ماں کی زبان اردو تھی۔ دیہاتی اردو جو شہر میں کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ اس اردو پر آج کڑا وقت ہے۔ آج صبح سویرے جو برقی ڈاک (ای میل) موصول ہوئی اس میں ایک ایسے گروپ کی جانب سے رکنیت کی درخواست کی گئی تھی۔ جو اردو سے محبت کرتا ہے اور اردو کی ترویج واشاعت کا خواہاں ہے۔ میں نے اس درخواست کی تائید کی۔ جس کے جواب میں مجھے اپنے تاثرات رقم کرنے کے لئے کہا گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے وہاں موجود افراد کے تاثرات انگریزی میں تحریر دیکھے۔ اسی طرح کا تجربہ ریڈیو پاکستان کے خبروں کے شعبے میں ہوا۔ جہاں اردو خبریں پڑھنے والی ایک

نئی خاتون کو اردو گنتی یا اعداد شمار پڑھنے کے لئے انگریزی کا سہارا لینا پڑا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی اکثر اردو تقاریر رومن میں تحریر کر لیا کرتی تھیں۔ آج کل گشتی فون موبائل فون کے لئے یہ ترجمہ ہمارے دوست ابو نثر نے کیا ہے) پر جو پیغامات آتے) ہیں۔ وہ بھی رومن میں تحریر کئے جاتے ہیں۔ ہماری نئی نسل تیزی سے اردو رسم الخط سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جس میں جدید برق رفتار ٹیکنالوجی کا کمال بھی ہے۔ غالب انے اپنے آپ کو غریب شہر کہا تھا۔ لیکن اب غریب اردو ہے۔ جس کے چاہنے والے انگریزی کے والی وشیدا ہیں۔ یہ اپنے ہی وطن میں غریب الدیار ہے۔ اور حکمرانوں سے اپنے حق کے لئے بھیک مانگتی نظر آتی ہے۔ یہ ہر جگہ اپنا حق مانگتی ہے۔ مجھے دفتروں میں لگاؤ، مجھے سرکار کے کاموں میں لگاؤ، مجھے عدالتوں میں لگاؤ۔ مجھے اپنی بول چال میں لگاؤ۔ اردو کے اصل دشمن تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اردو اگر سرکار کی زبان ہوگی تو اس ملک کے ۸۹ فیصد عوام کو زبان مل جائے گی۔ اور وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ انہیں اپنے دفاتر میں اپنے کلرکوں فوقیت ہی اسی لئے ہے کہ وہ انگریزی میں فائلوں پر حاشیے تحریر کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے ہم اردو کو نہیں آنے دیں گے۔ غالب کے شعر میں کسی نے تحریف کرکے کیا خوب کہا ہے۔ ہم کو ان سے زبان کی امید۔ جو نہیں جانتے زبان کیا ہے۔ اخبارات و رسائل نے تو اردو کی کچھ دلجوئی کی ہے کہ ان کی بقا کا دارومدار ہی اردو کی اشاعت پر ہے۔ لیکن برقی میڈیا نے جو اردو پر ستم ڈھایا

ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں، انگریزی الفاظ خبروں میں یوں سمائے ہوئے ہیں گویا انگریزی میں اردو کا تڑکا لگایا گیا ہے۔ اردو میں جب تک ہم ذریعہ تعلیم نہیں اپنائیں گے۔ ہمارا معیار تعلیم بہتر نہیں ہوگا۔ نقل سے بھی اسی وقت چھٹکارا ملے گا۔ جب ہم اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں پڑھائیں گے۔ ہم اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ تقلید ایک ذہنی فعل ہے۔ اور جب تک ہم اپنی زبان نہیں اپنائیں گے۔ ہم دوسروں کی تقلید کرتے رہیں گے۔ اور ہم تخلیق میں پیچھے رہیں گے۔ اردو محبت کی زبان ہے۔ آج پختون خواہ کا کوئی شہری ہو، یا بلوچستان کا، یا سندھ کا کوئی باسی، جب وہ اپنا دکھڑا سب کو سناتا ہے تو اردو ہی میں بات کرتا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے آج یورپ، امریکہ، برطانیہ، اور دیگر ملکوں میں پاکستانیوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہے تو اسی اردو کے سبب ہے۔ سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے۔

بارہ مئی کی وہ شام

12 مئی کی وہ شام میرے حافظہ پر ایک سرخ لکیر کی طرح جم گئی ہے، جب شہر میں جگہ جگہ لاشیں تھیں، جلی ہوئی گاڑیاں تھیں، یا اسپتالوں میں بہتے خون کے ساتھ زخمیوں کی بڑی تعداد، پھر اسی شام اسلام آباد میں ایک کرائے کے جلسے میں مکہ لہراتے ہوئے ایک آمر نے کہا کہ کراچی میں اس کے مخالفین نے مشرف کی طاقت دیکھ لی ہے۔ 12 مئی کے اس دن شہر میں ۴۰ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ 50 سے زیادہ زخمی بے شمار گاڑیاں جلی پڑی تھیں۔ اور سارے دن بے گناہ اور معصوم شہریوں پر آگ اور گولیوں کی بارش ہوتی رہی تھی۔ دل جل رہا ہے اور آنکھ میں بے بسی کے آنسو تھے۔ ہلاک ہونے والے کسی بھی قوم اور فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن یہ کراچی کے باشندے تھے۔ حریت فکر ان کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ ٹی وی پر ایسے ایسے ہولناک مناظر تھے کہ آج تک نہیں بھولتے۔ بیٹے کی میت پر بین کرتی ماں، اور بہن کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس افتخار چودھری کو معطل کرنے کے بعد صدر پرویز مشرف کے خلاف وکلاء کا احتجاج زور پکڑ رہا تھا۔ جس میں وکلا کے ساتھ ساتھ حزبِ اختلاف کی جماعتیں بھی شامل ہوتی گئیں۔ 12 مئی کو چیف جسٹس نے کراچی میں وکلاء سے خطاب کرنا تھا۔ پرویز مشرف کے پاس ایک راستہ یہ تھا کہ ملک میں ہنگامی حالت

لگا کر مظاہروں پر پابندی لگا دیں۔ یا اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے حزبِ اختلاف کو سبق " سکھا دیا جائے۔ 11 مئی کو ہی حالات کشیدہ ہوگئے۔ اور اس رات مسلم لیگ " نواز کا ایک کارکن شہید کر دیا گیا۔ انتظامیہ نے راتوں رات شہر کی تمام بڑی شاہراہوں پر ٹرک کھڑے کرکے انہیں بند کر دیا۔ صبح تک سارا شہر مفلوج ہو چکا تھا۔ 12 مئی کو دوسری سیاسی جماعتوں کے ان جلوسوں اور قافلوں پر حملہ آور ہوتے رہے، جو چیف جسٹس کے استقبال کے لیے نکالے جا رہے تھے۔ ان حملوں میں 38 کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔ چیف جسٹس افتخار چودھری کراچی ایئرپورٹ پر محصور ہو کر رہ گئے۔ آخر کار شام کو وہ اپنے خطاب کا ارادہ ترک کرکے واپس اسلام آباد لوٹ گئے۔ شام کو اسلام آباد میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے پرویز مشرف نے کراچی میں " عوامی طاقت " کے مظاہرے پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں جو سرکاری خرچ پر لوگوں کو زبردستی جمع کرکے رچایا گیا تھا، اسی دن جب کراچی خون میں نہا گیا تھا، ڈھول پر رقص کیا گیا۔ چیف جسٹس سندھ ہائیکورٹ نے از خود نوٹس لیتے ہوئے پولیس کے آئی جی، سندھ، او دوسرے ذمہ داروں کو عدالت میں طلب کیا۔ لیکن کسی نے آنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی سندھ کی عدالت عالیہ کی فائلوں میں یہ مقدمہ بھی ان ہزاروں مقدموں کی طرح لاوارث پڑا ہے۔ جس کا خون کراچی کی گردن پر ہے۔ انسانی خون اس وقت تک پکارتا رہتا ہے۔ جب تک اس پر انصاف نہ ہوجائے 12 مئی گزر جائے گی، مئی پھر آئے گی۔ رزق خاک ہونے والا لہو اس وقت تک پکارتا رہے گا۔ جب تک 12 اسے

انصاف نہیں مل جاتا۔

اس ہار میں بھی جیت ہے

پریس کلب میں چار دن پہلے میں نے جب قمر بھائی سے پوچھا کہ کیا معجزہ ہو سکتا ہے۔ کیوں نہیں مسلمانوں کی تاریخ معجزوں سے بھری پڑی ہے۔ اس دن صبح سویرے جب میں ریڈیو سن رہا تھا تو ایک اینکر پرسن کہہ رہی تھی کہ ٹونٹی ٹونٹی میچز میں بھارت ہار گیا ہے۔ اور ٹورنامنٹ سے باہر ہوگیا ہے۔ لیکن پاکستان اگر کوئی معجزہ ہوجائے تو سیمی فائنل میں پہنچ جائے گا۔ اس جیسی دعائیں پاکستانیوں نے خوب کیں۔ اور اللہ نے ان کی دعائیں سن لی۔ مسلمان جو ایمان والا ہے اگر صدق دل سے اللہ سے رجوع ہو کر دعا مانگے تو اس کی دعا میں اثر ہوتا ہے اللہ کی رحمت جوش میں آجاتی ہے اور اللہ اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتا۔ بارہا اللہ کی یہ نشانیاں منظر عام آتی ہیں مگر مسلمان اس سے سبق نہیں لیتا اور اپنے ایمان کا محاسبہ نہیں کرتا۔ دعا ہی مومن کا اصل ہتھیار ہے دعا کے ذریعہ ہی ایک مسلمان اپنے خدا کو راضی کرکے اپنے اوپر نازل مصیبتوں کو راحت میں تبدیل کر سکتا ہے مگر افسوس کہ آج مسلمان اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے کم اور لوگوں کی رضا و خوشنودی کے لئے زیادہ محنت کرتا ہے۔ مسلمان ہر دور میں ظلم وزیادتی کا شکار ہوا ہے وحشت و بربریت کے ہولناک مناظر سے دوچار ہوا ہے مگر جب جب بھی اس نے بے بسی کے عالم میں اپنے رب کو پکارا ہے اللہ نے اس کی

فریاد سن کر اس کی مدد کی ہے۔ پاکستانیوں کی دعاؤں سے پاکستان کو ایک بار پھر یہ موقع ملا کہ اس نے دنیا میں کھیل کے میدان میں اس نے دنیا سے خراج تحسین حاصل کیا۔ کامیابی اور ناکامی اللہ کی جانب سے ہوتی ہے ہمارا کام اپنی بہترین صلاحتیوں سے کسی کام کو کرنا ہوتا ہے۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم نے بلاشبہ ایک ایسے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔ جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہماری اس ہار میں بھی فتح ہے۔ اس میچ سے پاکستانیوں نے پھر اسی زندہ دلی کا مظاہرہ کیا جو اس کا مزاج ہے۔ ہم اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کو اس شاندار کھیل پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ٹیم کو خوش ہونا چاہیئے کہ اب انہیں قومی اسمبلی کی مجلس قائمہ کے سامنے حاضری نہیں دینا پڑے گی۔ اس سے مسلمانوں کو سبق یکھنا چاہئے اور ہر مصیبت و پریشانی کی گھڑی میں صدق دل سے اللہ کی آزمائش سمجھ کر اس سے رجوع ہو کر انصاف طلب کرنا چاہئے۔ اللہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ ہمیں کھیل کو کھیل ہی سمجھنا چاہئے، فنکار اور کھلاڑیوں کو قاعدوں اور قوانین میں جکڑ کر کوئی بھی ان سے بہتر کارکردگی نہیں کراسکتا۔ یہ دل کے معاملے ہیں۔ اگر آپ نے کھلاڑیوں کے دل جیت لئے تو وہ اس ملک کے لئے آج نہیں تو کل ہر صورت میں کامیابی حاصل کریں گے۔

ڈرون حملوں سے زیادہ خطرناک

کراچی میں گزشتہ تین روز سے انسانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ شہر بھر میں انسانی لہو کی ارزانی ہے۔ معصوم اور بے گناہ لوگ ایسے مارے جارہے ہیں۔ جیسے شکاری پرندوں کو شکار کرتے ہیں۔ نہ مارنے والوں کا پتہ ہے۔ نہ مرنے والوں کو معلوم ہے کہ انہیں کس جرم کی سزا دی گئی۔ اب تک مرنے والوں کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ صحیح اعداد و شمار کسی کے پاس نہیں ہیں۔ اب تک کوئی ادارہ کراچی میں ہونے والی ہلاکتوں کے مستند اعداد و شمار فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ این جی او بھی اس مسئلے پر خاموش ہیں۔ اور حکومت کے پاس بھی کوئی ایسی سمری نہیں جس سے اندازہ ہوسکے کہ کراچی میں کس قدر بے گناہ لوگوں کا خون بہا ہے۔ انسانی خون کی حرمت تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلاف کعبہ پکڑ کر اس کی حرمت اور تقدس کی قسم کھائی اور کہا کہ اے کعبہ تیری حرمت سے زیادہ انسانی جان محترم ہے۔ کسی انسان کی ہلاکت صرف اس فرد کی موت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پورے خاندان کو تباہی سے دوچار کردیتی ہے۔ کراچی میں چالیس خاندان سے ان کی روٹی کمانے والا چھین لیا گیا ہے۔ اب کتنے بچے اسکول اور تعلیم سے محروم ہوں گے۔ کتنے خاندان مزید غربت اور افلاس کے اندھیروں میں ڈوب جائیں گے۔ اور کتنے سڑکوں پر مانگنے کھڑے ہوں گے۔

ٹارگٹ کلنگ کا نام بھی خوب ہے۔ کون

ٹارگیٹ ہے۔ اور کون ٹارگیٹ بنا رہا ہے۔ یہ سب کے سامنے بھی ہے اور اس سے سب ناواقف بھی ہیں۔ کراچی کبھی غریبوں اور بے وسیلہ لوگوں کی سرپرستی کے لئے مشہور تھا۔ کتنے لوگ اس شہر میں خالی ہاتھ، آنکھوں میں خوب سجائے داخل ہوئے۔ اور پھر اس شہر نے ان کے دامن کو دولت سے بھر دیا۔ لیکن بیس برس میں اس شہر میں کیسا جادو ہوگیا ہے۔ لوگوں کی نہ جان محفوظ ہے نہ مال، نہ عزت نہ آبرو۔ شہر میں معمولات زندگی اسی طرح جاری ہیں۔ عجب بے حسی کا دور ہے۔ رینجرز اور پولیس کے سرچ آپریشن میں 370 سے زائد افراد گرفتار کر لئے گئے۔ جن میں سے صرف چار ٹارگیٹ کلنگ میں ملوث ہیں۔ تین چار سو گرفتار شدگان کا جرم یہ ہے کہ وہ ڈبل سواری موٹر سائیکل پر جارہے تھے۔ ہر تھانے نے اپنی گنتی پوری کرنے کے لئے سڑک پر چلتے، پارکوں میں سوتے، آوارہ گھومتے، نشئی، ہیرونچی، گرفتار کر لئے ہیں۔ بھلا ان کا ٹارگیٹ کلنگ کرنے والوں سے کیا تعلق یہ تو ٹارگیٹ ہیں۔ ٹارگیٹ، کبھی پولیس کا ٹارگیٹ، کبھی منشیات فروشوں کا، کبھی کسی گولی کا۔۔۔۔ اربوں روپے سے سیکورٹی فراہم کرنے والے جو اپنی سیکورٹی کے لئے کراچی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہیلی کاپٹر میں سفر کرتے ہیں۔ انہوں نے کمال مہارت اور مستعدی سے ٹارگیٹ کلنگ کے تمام مقدمات نامعلوم ملزمان کے خلاف درج کئے ہیں۔ کراچی کے شہری عدم تحفظ کا شکار ہیں اور غیر آئینی انداز میں ان کے شہری حقوق اور آزادیاں ختم کی جارہی ہیں۔ کئی بستیوں میں شہری آزادانہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے حتیٰ کہ انہیں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی دستیاب نہیں۔

شہریوں کی آزادانہ نقل و حرکت میں مشکلات ،آئین کے آرٹیکل 15 کی خلاف ورزی ہے۔ آئین کا آرٹیکل 9 زندگی اور آزادی کا تحفظ دیتا ہے۔ کراچی میں مرنے والے سب انسان تھے، صوبائی حکومت اتنی بے بس ہے کہ وہ انسانوں کے قتل کو روک نہیں سکی۔ حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے لیکن وہ اس مقصد میں بری طرح ناکام رہی ہے، کوئی قاتل گرفتار نہیں کیا جاسکا ہے۔ کراچی میں جنوری سے اب تک ٹارگٹ کلنگ میں 578/افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ اتنی ہلاکتیں تو چار ماہ میں ہونے والے ڈرون حملوں میں نہیں ہوئی۔ جہاں چودہ حملوں میں صرف دو سو چودہ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ پھر تو یہ ٹارگٹ کلنگ ڈرون حملوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ قوم کو اس پر سوچنا چاہیے۔

یوم تکبیر کا پیغام

سال 1999 میں کوئٹہ اس قدر غیر محفوظ نہ تھا۔ نہ وہاں آئے دن ٹارگٹ کلنگ کے واقعات تھے۔ ہم نے کوئٹہ اور اطراف کے علاقوں کی خوب سیر کی۔ کوئٹہ کے باغات پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ اور عوام میں کوئی بے چینی نہ تھی۔ ایک شام ہم نے کنٹونمنٹ پارک کی سیر کی جہاں چاغی (بلوچستان) کی پہاڑیوں کو ماڈل روشنی کے قمقموں سے منور تھا۔ 28 مئی 1998 کو پاکستان نے بھارت کے ایٹمی دھماکوں کا جواب دیا تھا۔ اور دنیا میں اپنے آپ کو ایٹمی قوت رکھنے والے ملکوں میں شامل کیا تھا۔ یہ دن ہماری تاریخ میں یوم تکبیر کے طور پر ریکارڈ کیا گیا۔ اس دن دھماکے کرنے سے پہلے اس وقت کے امریکی صدر بل کلنٹن نے اس وقت کے وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کو پانچ ٹیلیفون کئے اور اربوں روپے امداد کی پیشکش کی ۔ لیکن نواز شریف نے اس وقت صدر امریکہ کو، نو سر، کہا اور تاریخ میں اپنا نام لکھوا لیا۔ بھارت پاکستان کے مقابلے میں دگنی سی زیادہ فوج رکھتا ہے۔ بھارت کے دفاعی اخراجات بھی، پاکستان کے کل بجٹ سے زیادہ ہیں۔ بھارت ایک ارب سے زیادہ آبادی کا ملک ہے۔ وہاں ہم سے زیادہ شدت پسندی اور علیحدگی کی تحریکیں ہیں۔ لیکن بدنام پاکستان کو کیا جاتا ہے۔ بھارت میں اجمل قصاب ڈرامہ اور امریکہ میں فیصل شہزاد ڈرامہ ایک ہی اسکرپٹ اور ایک ہی

ہدایتکار کے شاہکار ہیں۔ جن کا مقصد پاکستان کو کمزور کرنا ہے۔ بھارت میں بی جے پی کے غنڈوں کو کوئی لگام نہیں ڈالتا۔ جو آئے دن مسلمانوں کا معاشی اور جانی نقصان کرتے ہیں۔ امریکہ نے ہمیں ایٹمی قوت بن جانے کی جو سزا دی ہے۔ موجودہ حالات اسی کا شاخسانہ ہیں۔ بھارت ایک بدمست ہاتھی ہے۔ جو پاکستان کو ایک چڑیا کی طرح پاؤں تلے مسل دینا چاہتا ہے۔ لیکن جو طاقت اسے باز رکھتی ہے وہ ہماری یہی ایٹمی قوت ہے۔ جس پر طرح طرح کے الزامات اٹھائے جاتے ہیں۔ کبھی اسلامی بم کے تذکرے ہوتے ہیں۔ تو کبھی ایٹمی ڈیٹرجنٹ غیر محفوظ ہونے اور ان کے شدت پسندوں کے ہاتھ میں جانے کا شور مچایا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ بھٹو نے گھاس کھا کر ایٹم بم بنانے کو جو عزم کیا تھا۔ جسے ضیاء الحق نے اپنی کرکٹ ڈپلومسی سے تقویت دی اور میاں نواز شریف نے اسے ایک حقیقت کے قالب میں ڈھال دیا۔ ایسے دن قوموں کی تاریخ میں ہمشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے سابق حکمرانوں نے جو امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کاسہ لیسی کی پالیسی اپنائی تھی۔ آج بھی اس کا تسلسل جاری ہے۔ جس کی وجہ سے امریکہ اور عالمی مالیاتی اداروں کو پاکستان سے ڈو مور کا مطالبہ بڑھتا جارہا ہے۔

آج پھر وہی یوم تکبیر ہے۔ 12 سال پہلے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں سے سرزمین پاک اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی تھی۔ آج پھر اسی جذبے اور قومی جوش و خروش کی ضرورت ہے۔ آج یوم تکبیر پر ہمیں اس عزم کو دھرانا چاہئے کہ ہم اغیار کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال کر پھینک دیں گے۔ ہم اپنی

خارجہ پالیسی درست کریں گے۔ ہم اپنے وطن کے تمام باشندوں کو پیپلز پارٹی کے منشور کے مطابق روٹی کپڑا مکان بھی دیں گے۔ اور انھیں سر اٹھا کر جینے کی امنگ بھی دیں گے۔ آج کے یوم تکبیر کا یہی پیغام ہے۔

قدرت کے کھیل بھی نرالے

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فاطمہ بھٹو نے ’لہو اور تلوار کے گیت لکھ کر بھٹو خاندان سے انتقام لیا ہے۔ ’سانگز آف بلڈ اینڈ سورڈ یا ’لہو اور تلوار کے گیت‘ فاطمہ بھٹو کی نئی کتاب ہے جو انکی یاداشتوں پر مبنی ہے۔ بھٹو خاندان اپنی تحریر اور تقریر کے باعث ہمیشہ عوام میں مقبول رہا ہے۔ بھٹو کی تقاریر عوام کی دلوں کی آواز تھی۔ اپنے ایام اسیری میں انہوں نے کتاب لکھی تھی۔ اگر مجھے قتل کیا گیا۔۔۔ ضیاء کے دور میں یہ کتاب پاکستان میں نہ چھپ سکی۔ اسی دور میں بے نظیر بھٹو کے ان خفیہ خطوط کا خوب چرچا رہا۔ جو انہوں نے بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے بیرون ملک لکھے۔ پنکی کے خطوط اسمگل ہو کر باہر جاتے تھے۔ جو بعد میں ایک خبر رساں ایجنسی کے ہاتھ لگ گئے۔ اور اخبارات تک پہنچ گئے۔ بے نظیر بھٹو کی کتاب ڈاٹر آف ایسٹ، جس کا اردو ترجمہ دختر مشرق کے نام سے شائع ہوا۔ ایک بیسٹ سیلر کتاب تھی۔ اچھی انگریزی اس خاندان کی خاصیت رہی ہے۔ اور اب یہ ورثہ فاطمہ بھٹو کو منتقل ہوا ہے۔ جس کا وہ خوب استعمال کر رہی ہیں۔ فاطمہ بھٹو کی کتاب لندن کے ایک اشاعتی ادارے جو ناتھن کیپ نے شائع کی ہے۔ بھٹو خاندان کی اکثر کتابیں بیرون ملک کے اشاعتی اداروں ہی سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ فاطمہ بھٹو نے اپنی تازہ کتاب اپنی علیل دادی بیگم نصرت بھٹو اور والدہ غنویٰ

بھٹوکے نام کی ہے۔ بیگم نصرت بھٹو زندہ ہوتے ہوئے بھی برسوں سے عوام کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی بے نظیر کی شہادت پر بھی وہ کہیں دکھائی نہ دیں۔ فاطمہ بھٹوکے والد میر مرتضٰی بھٹو کو انیس سو چھیانوے میں ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کیا گیا تھا۔ اگلی صبح میرا گزر اس سڑک سے ہوا۔ صبح سویرے ہی سے سڑک کو سرف پوڈر کے ذریعے رگڑ رگڑ کر دھویا جا رہا تھا۔ فیض نے کہا تھا خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد۔ لیکن خون کے یہ دھبے تو کسی برسات کے بغیر ہی مٹا دیئے گئے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو انیس سو اناسی میں فوجی دور حکومت میں پھانسی دے دی گئی، ان کے دوسرے بیٹے شاہنواز بھٹو جو انیس سو پچاسی میں قتل ہوئے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ شاہنواز کے قتل کے ٹھیک گیارہ برس بعد فاطمہ بھٹوکے والد میر مرتضٰی بھٹو جو انیس سو چھیانوے میں ہلاک کیے گئے مرتضی بھٹوکے قتل کے گیارہ برس بعد بینظیر بھٹو دو ہزار سات میں ہلاک ہوئیں۔ اور ان کی شہادت کے مقام کو بھی راتوں رات سرف اور پانی سے رگڑ رگڑ کا صاف کر دیا گیا۔ فاطمہ بھٹو اس وقت چودہ برس کی تھیں جب بینظیر بھٹوکے دور حکومت میں ان کے والد کو کراچی میں ان کے گھر کے باہر پولیس نے ہلاک کر دیا۔ بہن کی حکومت میں پولیس کے ہاتھوں بھائی کا قتل ہونا، تاریخ کا المیہ ہے۔ فاطمہ بھٹو کا الزام ہے کہ ان کے والد کے قتل کا مقصد دراصل بھٹو خاندان کے اصلی جانیشن کو راہ سے ہٹانا تھا۔ فاطمہ لکھتی ہیں کہ ان کی پھوپھی بینظیر بھٹو جسے

’وہ ’وڈی بوا

کہتی ہیں، بچپن سے ہی ان کے والد میر مرتضٰی پر غلبہ پانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں اور بھٹو خاندان کی سیاسی وارث بننے کی کوشش کرتی رہیں۔ فاطمہ بھٹو نے اپنی 'وڈی بوا' کی مخالفت میں اس کتاب میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جس پر اس خاندان سے محبت کرنے والے حیران ہیں۔ تاریخ میں حقائق نہ ہوں تو وہ قصہ کہانی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن تاریخ نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب میں ایک بیٹی نے اپنے باپ پر لگے دہشت گردی اور مسلح جدوجہد کے الزامات کو دھونے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس میں وہ کتنی کامیاب ہوئیں۔ یہ وقت بتائے گا۔ کتاب میں اپنی وڈی بوا سے اظہار نفرت کرنے والی فاطمہ بھٹو کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ قدرت نے اسے بے نظیر بھٹو کی کاپی بنایا ہے۔ اس لئے وہ عجیب کشمکش میں رہتی ہیں۔ وہ اپنی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں، لوگ جب مجھے کہتے ہیں کہ میری شکل بینظیر بھٹو سے ملتی ہے تو میرے پاس کچھ کہنے کو نہیں ہوتا۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔

یا اللہ، یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پیپلز پارٹی بے قصور

پیپلز پارٹی والوں کو آج کل اللہ رسول ﷺ بہت یاد آ رہے ہیں۔ مشکل اور مصیبت کے دنوں میں اللہ اور رسول ﷺ کے سوا مسلمان اور کس سے دستگیری کا سوال کر سکتے ہیں۔ بی بی محترمہ پر جب مصیبت اور مشکل گھڑی آئی تو ان کے ہاتھوں میں تسبیح بھی نظر آئی اور پاکستان آتے ہوئے وہ قرآن کے سائے میں سرزمیں پاک پر اتری تھیں۔ ان دنوں اکثر یہ نعرہ لگایا جاتا تھا۔ یا اللہ یا رسول ﷺ ۔ بے نظیر بے قصور لوگ الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی۔۔۔ سیکولر پسند، لادینیت، دہریت اور غیر اسلامی افکار والی پارٹی ہے۔ حالانکہ اس پارٹی میں مولانا احترام الحق تھانوی بھی موجود ہیں۔ اور اسے مولانا فضل الرحمان کی حمایت واعانت بھی حاصل ہے۔ پیپلز پارٹی پر کڑا وقت اس لئے بھی آیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات فوزیہ وہاب نے ایک چینل پر فرمایا کہ آصف زرداری کو عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا جب اس سے پوچھا گیا کہ اسلام میں تو خلیفہ وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب قاضی نے طلب کیا تھا تو وہ بھی قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے تھے اور اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کیا تھا تو اس بات کے جواب میں فوزیہ وہاب نے کہا کہ " اس وقت آئین نہیں تھا اور صرف قرآن تھا اس لیے ایسا ہوا تھا" ۔ فوزیہ وہاب کے بیان نے ہر مسلمان کی دل شکنی کی۔

کاش وہ یہ بات نہ کہتی ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ تمام عدالتی و تعزیری فیصلے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین رضوان اللہ اجمعین کے دور میں ہوئے تھے اس "آئین" کے نہ ہوتے ہوئے معاذاللہ کالعدم ہیں۔۔۔۔۔ کیا۔

ہم نے یہ ملک (لادین) آئین کے لیے حاصل کیا تھا یا نفاذ قرآن و سنت۔۔؟۔ اس بیان پر صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔آج کل میڈیا میں "فوزیہ وہاب" کے بیان پر کافی گرما گرم بحث چھڑ چکی ہے۔۔ فوزیہ وہاب نے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اپنے بیان پر معافی مانگ لی ہے، ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی قرآن اور آئین کا تقابل نہیں کیا اور نہ ہی آئین کو قرآن پر فوقیت دی۔ اسلام آباد سے جاری ہونے والے ایک وضاحتی بیان میں فوزیہ وہاب نے کہا کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہترین ریفارمر سمجھتی ہیں، ان کے دور کی اصلاحات آج بھی رائج ہیں۔

فوزیہ وہاب نے کہا کہ ان کے بیان کو سیاق و سباق سے ہٹ کر پیش کیا گیا۔ فوزیہ وہاب نے کہا کہ اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہے تو وہ معافی مانگتی ہیں، ہر مسلمان کی طرح وہ بھی قرآن اور سنت ہی کو سپریم لاء تصور کرتی ہیں جبکہ قرآن مجید رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور ام القوانین ہے۔ فوزیہ وہاب کا

متنازعہ بیان اور اس پر بحث ابھی جاری ہے۔ اب پارٹی کے سیکرٹری جنرل جہانگیر بدر نے کہا ہے کہ جن لوگوں نے کبھی اسکول اور کالج کا منہ نہیں دیکھا وہ ہاتھ میں ڈگریاں لئے پھر رہے ہیں، انہیں چاہیے کہ اپنی آخرت سنوارنے کے لیے جعلی ڈگریاں پھاڑ دیں۔ وہ لاہور کی احتساب عدالت میں اپنے خلاف غیر قانونی بھرتیوں اور ناجائز اثاثوں کے ریفرنس کیسز کی سماعت کے بعد میڈیا سے گفتگو کر رہے تھے۔ جہانگیر بدر کا کہنا تھا کہ وہ 2002 سے جعلی ڈگری ہولڈرز کے خلاف بول رہے ہیں۔ انہوں نے، جمشید دستی کی حمایت کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جمشید دستی کے ساتھ ہزاروں لوگ ہیں انہیں کیسے ٹکٹ نہ دیا جاتا۔ جہانگیر بدر نے کہا کہ جعلی ڈگری والے آخرت سنوارنے کیلیے جعلی ڈگریاں پھاڑ دیں۔ پیپلز پارٹی والوں کو اپنے سیکریٹری جنرل کے بیان پر توجہ دینی چاہئے اور ابھی سے اپنی آخرت سنوارنے کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ نہ جانے آئندہ کوئی مہلت ملے گی بھی یا نہیں۔

ٹوپی پہنی نہیں جاتی بلکہ ٹوپی پہنائی جاتی ہے

کپھے کھپے اور نا کھپے نا کھپے کے نعروں کے بیچ میں پھر ٹوپی آ گئی ہے۔ یہ ٹوپی پہنے اور پہنانے والی نہیں ہے۔ نوجوان نسل سے ٹوپی کی بات کہیں تو وہ کہتے ہیں، انکل ٹوپی پہننے کی بات چھوڑیئے ! یہ بتائیں کس کو ٹوپی پہنانی ہے۔ گزرے زمانے میں ٹوپی ہماری تہذیب و تمدن کا حصہ تھی۔ ترکی ٹوپی، رام پوری ٹوپی، دوپلّی ٹوپی سندھی ٹوپی، بلوچی ٹوپی، گاندھی کیپ، جواہر کیپ، جناح کیپ، پھر ماؤ کیپ، بھٹو کیپ، چی گویرا کیپ اور جانے کون کون سی کیپ آئی، اور ہم ٹوپی کو بھول گئے۔ ہمیں ٹوپی ہی آج کیوں یاد آئی؟ گزشتہ دنوں سندھ میں بڑے جوش و خروش سے سندھی ٹوپی کا دن منایا گیا۔ اور ہم خوش ہوئے کہ سندھ کے گاؤں دیہاتوں کی مقبول سندھی ٹوپی سندھ کے شہری نوجوانوں میں بھی مقبول ہوئی۔ ٹی وی چینل والے اینکر اگر ذرا توجہ شیروانی اور شلوار کرتے پر فرما دیں تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اور کسی کا ہو نہ ہو شلوار کرتے بنانے والے کاریگر تو اپنے کاروبار کو دوبارہ زندہ کرنے پر ان اینکر پرسن کے بے حد مشکور ہوں گے۔ بچپن میں ہمیں ترکی ٹوپی بہت پسند تھی۔ اس وقت ہمیں اس کا نام نہیں پتہ تھا۔ لیکن اس میں لگے پھندنے سے ہمیں بہت دلچسپی تھی۔ اور ہم اس گھومتے ہوئے پھندنے کی گردش ہی کو دیکھا کرتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی کی یہ

پھندنے والی ٹوپی انکل عرفی میں حسنات بھائی نے ایسی مقبول کی کہ ہر بچہ ہمیں کہتا نظر آیا چکو ہے میرے پاس ۔۔ ہاں ۔ ٹوپیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں راجستھانی صافے اور پگڑیاں بھی بھی لگتی تھیں۔ راجستھانی پگڑی اس قدر بڑی ہوتی تھیں کہ ضرورت پڑنے پر ان پگڑیوں کو رسے کے طور پر کنویں سے پانی نکالنے کے لئے ڈول میں بھی باندھ کر کوم لیا جاتا تھا، ہمارے تایا پھول خاں تو اپنی آخری عمر میں بھی یہ رنگ.برنگی پگڑی باندھا کرتے تھے۔ پہلے بچے اپنے جاننے والوں کو انکل نہیں کہتے تھے ۔ کسی کو چچا اور کسی کو ماموں کے رشتہ سے پکارتے تھے۔ پچاس.برس میں کایا پلٹ گئی ہے۔ اب ہمارے ہاں اس لفظ یعنی' ماموں۔ چچا' کی جگہ انکل سام کے ' انکل ' نے لے لی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی کب اور کیسے ہوئی کسی کو اس کا پتہ ہے اور نہ اس کا احساس۔ کرتا پاجامے کے آگے، ٹوپی کی بات پرانی لگتی ہے۔ اب جو ہمارے سندھی بھائیوں نے سندھی ٹوپی سے محبت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تو امید ہے نوجواں نسل ایک بار پھر سے اپنے سر کی عزت کو دوبارہ وقار بخشے گی۔ نصف صدی میں ہماری تہذیبی اقدار تیزی سے بدلی ہیں۔ ہمارے معاشرے سے ایک دوسرے سے محبت رواداری، احترام سمیت نہ جانے کیا کیا غائب ہو گیا ہے۔ ہماری نئی نسل کو تو رومال بھی یاد نہیں کہ گھر سے نکلتے ہوئے رومال لازمی ہاتھ یا جیب میں ہوتا تھا۔ اب تو ہاتھوں میں موبائل ہے۔ اور کانوں میں ائیر فون یا پھر لیپ ٹاپ۔ ہم یہ باتیں اپنے دوست سے کر رہے تھے کہ موبائل ہاتھ میں لئے ایک نوجوان ہم سے

مخاطب ہوا انکل آپ کہاں رہتے ہیں؟ کراچی میں ہم نے جواب دِیا: اس نے نہایت تمسخرانہ لہجے میں کہا کہ میرا مطلب ہے کس علاقے میں؟ ہم نے جھلا کر کہا اسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں آپ رہتے ہیں۔" انکل! یہی تو مسئلہ ہے آپ کا آپ کہتے تو یہ ہیں کہ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اپنے حال سے بے نیاز ہو کر اپنے ماضی میں رہ رہے ہیں۔" انکل! یا تو دنیا جس طرح اور جس سمت چل رہی ہے اس کے ساتھ چلئے یا پھر دنیا کو اپنے ساتھ چلانے کے صلاحیت پیدا کیجئے۔ ورنہ ابھی تو آپ کی ٹوپی وغیرہ گئی ہے آئندہ کیا کیا جائے گا اس کی لمبی فہرست بن جائے گی اور سچ یہ ہے کہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کے معاشرے سے ٹوپی چلی گئی ہے۔ ٹوپی گئی نہیں ہے بلکہ ٹوپی تو موجود ہے بس آپ کو دکھائی نہیں دے رہی ہے۔" ہم نے کہا وہ کیسے؟ "ارے انکل ٹوپی اب پہنی نہیں جاتی بلکہ ٹوپی پہنائی جاتی ہے۔ آپ بھی ٹوپی پہنانا سیکھ لیجئے زمانے سے۔

ایک سپر اسٹار کی بیماری

بالی وڈ کے سپر اسٹار امیتابھ بچن ان دنوں بیمار ہیں۔ کسی انسان کی بیماری اسے اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ اس کے پاس سے ایک ایسی دولت چھن گئی ہے۔ جو دنیاوی دولت سے نہیں خریدی جاسکتی۔ صحت ایک ایسی نعمت خداوندی ہے جس کے چھن جانے پر ہی اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امیتابھ اپنی بیماری کے تعلق سے اپنے بلاگ پر لکھتے ہیں " یہ ایسی کہانی ہے جو ختم ہی نہیں ہوتی۔ مجھے نہیں پتا میری قسمت میں کیا لکھا ہے"۔ امیتابھ کے پرستاروں کے لئے اس کی بیماری کی خبر ایک بری خبر ہے۔ ان کی آخری فلم تین پتتی ہے جو انھوں نے برطانوی اداکار بین کنگسلے کے ساتھ کی تھی۔ بالی وڈ سپر اسٹار امیتابھ بچن کو جگر کا مرض لیور سیروسس ہے، یہ سنسنی خیز انکشاف خود امیتابھ نے کیا ہے۔ جس سے اس کے لاکھوں شیدائی بے چین ہیں۔ امیتابھ فلمی دنیا کے ان چند بڑے فنکاروں میں سے ہیں، جو شراب نہیں پیتے۔ جب کہ یہ بیماری بیشتر شراب پینے والوں کو ہوتی ہے۔ یہ بیماری امیتابھ کے حصے میں کیسے آئی جب وہ شراب کو چھوتے ہی نہیں؟ امیتابھ کے مطابق وہ شراب تو نہیں پیتے۔ خیال یہ ہے کہ 1982ء میں قلی فلم کی عکس بندی کے دوران ہوئے حادثے میں زخمی ہونے کے بعد انہیں دیے گئے خون کے عطیے میں کسی شخص کے خون میں اِس بیماری کے جراثیم موجود تھے۔ جس کے

اثرات اب نمایاں ہو چلے ہیں۔ لیور سیر وسس مرض کی وجہ سے امیتابھ کے جگر کا 25 فی صد حصہ بے کار ہو چکا ہے۔ سرجیکل گیسٹرو کے ماہر ڈاکٹر سنجے پانڈیا سے یہ سوال کیا گیا کہ جگر کا 25 فی صد ناکام ہونا انسانی صحت کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے تو پانڈیا نے کہا اوپر والے نے ہمیں جو اعضاء دیے ہیں وہ ہمارے جسم کی ضروریات سے سات فی صد زیادہ کام کرتے ہیں۔ ایک کھلاڑی کے لیے یہ تشویش ناک بات ہو سکتی ہے پر ایک فن کار صحیح طبّی جانچ کے ساتھ بیماری کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ 67 سالہ امیتابھ کچھ سالوں میں کئی بار پیٹ کی بیماری کے باعث اسپتال میں زیر علاج رہے ہیں۔ بھارت اور بین الاقوامی سطح پر اپنی منجھی ہوئی اداکاری کے لیے مشہور 150 سے زائد فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے والا یہ سپر اسٹار جب کون بنے کا کروڑ پتی میں آیا تو اس نے اپنی اداکاری سے ایک کوئز پروگرام کو بھی عالمی شہرت بخش دی۔ اور چھوٹے اسکرین کو بھی اپنی جداگانہ کمپیئرنگ سے عروج بخشا۔ ایشوریا رائے جیسی بہو اور ابھیشک جسے بیٹے کے باپ اور جیہ جیسی اداکارہ کے شوہر امیتابھ اب بھی پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوتے ہیں تو اپنی اداکاری سے لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنی بیماری کی خبر کو عام آدمی کے ساتھ بانٹنا چاہا۔ ڈاکٹر پانڈیا کے مطابق لیور سیر وسس مرض میں انسانی جگر کے ٹشو کو کچھ نقصان پہنچتا ہے اور زخم کے نشان کی وجہ سے جگر کی ساخت بدل جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے مزید کہا کہ شراب پینے والوں کے علاوہ ہیپاٹائٹس بی اور سی وائرس

بھی لیور سیروسس مرض کی وجہ بنتے ہیں۔ امیتابھ کے طبّی کیس میں بھی ہیپاٹائٹس کے وائرس نے ہی ویلن کا کردار کیا ہے اور اِس مرض کا پتا امیتابھ کو آٹھ سال قبل چلا۔

امیتابھ کے پرستار اس کی صحت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ وہ صحت یاب ہونے کے بعد اپنے شیدائیوں کو اپنی لاجواب اداکاری سے محظوظ کرتے رہیں گے۔

پاکستانی صحافیوں کی بے مثال بہادری

میری طلعت حسین سے ملاقات کلفٹن کے ساحل پر واقع ایک ہوٹل میں اس وقت ہوئی تھی۔ جب وہ ایک صحافتی ورکشاپ میں شریک تھے۔ اس ورکشاپ میں بھارت سے آنے والے کئی صحافی موجود تھے۔ خوبصورت، وجیہہ اور انگریزی اردو میں یکساں مہارت رکھنے والے طلعت حسین ان دنوں اسلام آباد میں دی نیوز کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ ٹیلی ویژن پر ان کا مقبول پروگرام سویرے سویرے جاری تھا۔ بعد میں پی ٹی وی ورلڈ پر ان کا پروگرام نیوز نائٹ بھی مقبول ہوا۔ بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ طلعت حسین نے ہیڈ اینڈ شولڈر کے ایک اشتہار میں ماڈلنگ بھی کی ہے۔ وہ پاکستان کے مانے ہوئے ان چند صحافیوں میں سے ہیں۔ جو نیشنل ڈیفینس کالج، ایر وار کالج، نیول وار کالج، پاکستان فارن سروس ٹریننگ اکیڈمی اور قائد اعظم یونیورسٹی میں لیکچر کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ وہ سی این این، لاس اینجلس ٹائمز، گارجین، نیویارک ٹائمز جیسے اخبارات میں لکھتے ہیں۔ یوں انہیں عالمی شہرت حاصل ہے۔ پاکستانی میڈیا میں ان کی شہرت کے کئی حوالے ہیں۔ جن میں لائیو وتھ طلعت ان کا مقبول ترین پروگرام تھا۔
پیر کے دن جب اسرائیل نے غزہ کے محصور اور مظلوم باشندوں کو امدادی سامان لے جانے والے قافلے پر حملہ کیا اور دنیا کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے این جی او سے تعلق رکھنے والے 20 سے زائد افراد ہلاک

ہونے کی خبر آئی۔ تو پاکستان اور دنیا کی صحافتی برادری کو اس بات نے مضطرب کر دیا کہ اس امدادی قافلے میں طلعت حسین بھی شامل ہیں۔ جنہیں دیگر افراد کے ساتھ اسرائیلی فوجیوں نے گرفتار کرلیا ہے۔ یہ غزہ کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لیے جانے والا تاریخ کا سب سے بڑا قافلہ تھا۔ جس میں دنیا بھر سے سینکڑوں افراد شامل ہیں۔ قافلے میں ندیم احمد خان ان کی اہلیہ، آج نیوز کے نیوز اور کرنٹ افیئر کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر طلعت حسین، پروڈیوسر رضا محمود آغا پاکستانی مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ترکی کی غیر سرکاری تنظیم آئی ایچ ایچ کے سربراہ محترم بلند یلدرم اس قافلے کی قیادت کر رہے ہیں۔ تیرہ بحری جہازوں پر مشتمل امدادی سامان بھی قافلے کے ہمراہ ہے۔ اس سامان میں ادویات، اشیائے خورد و نوش، کپڑے اور دیگر امدادی سامان شامل ہے۔ قافلہ اس سامان کو غزہ کے مظلوم مسلمانوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ادھر اسرائیل کے تیور اور ارادے جو پہلے ہی سے کچھ خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اس نہتے قافلے پر گولیوں کی بارش کر دی اور قافلے میں شامل افراد کو گرفتار کرلیا۔ یہ اسرائیل کی دہشت گردی اور غنڈہ گردی کا ایسا ثبوت ہے۔ جس کی عالمی طور پر مذمت کی جا رہی ہے۔ ترکی میں اس قافلے کو تقریباً دس لاکھ افراد نے استنبول میں جمع ہو کر الوداع کہا تھا۔ اور ان کے نعروں سے صرف استنبول ہی نہیں بلکہ اسرائیلی ایوانوں کے در و بام بھی گونج اٹھے اور اسرائیلی حکومت حواس باختہ ہو گئی۔ اسرائیل کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے

کہ اس مہم کے پیچھے ترک حکومت ہے اور یہ امدادی سامان حماس کے لیے بھجوایا جا رہا ہے، چنانچہ اسرائیل نے اشدد نامی بندرگاہ پر اپنے جنگی جہاز جمع کئے اور بیچ سمندر میں قافلے پر حملہ کیا۔ اس سے قبل بلند یلدرم نے کہا تھا کہ ہمارا مقصد خطے میں موجود تمام قیدیوں اور مظلوموں کی آزادی ہے اور یہ ہمارا اجتماعی مسئلہ ہی، ہمارا یہ قافلہ اس تحریک کا نقطہ آغاز ہے اور ہمارا دوسرا بڑا مقصد پناہ گزین فلسطینیوں کو مکانات بنا کر دینا اور انہیں اپنے گھروں میں دوبارہ بسانا ہے۔" اسرائیلی فوج نے اس قافلے پر کمانڈو فوجیوں کے ذریعے حملے کیا۔ جس میں کم از کم بیس افراد کے ہلاک ہوئے اور بہت سے زخمی ہیں۔ حملے کے بعد ترکی کے وزیر خارجہ نے سلامتی کونسل کے ہنگامی اجلاس کے دوران مطالبہ کیا کہ اسرائیلی حملے کی بین الاقوامی تحقیقات کرائی جائیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اسرائیل کو فوری طور پر معافی مانگنی چاہیے اور پکڑی گئی چھ کشتیوں کو چھوڑ کر حراست میں لیے گئے فلسطینی نواز امدادی کارکنوں کو رہا کر دینا چاہیے اور انہیں زرِ تلافی ادا کرنا چاہیے۔' اسرائیل کے سب سے بڑے اتحادی امریکہ نے ابھی تک اس حملے پر محتاط ردِ عمل ظاہر کیا ہے اور اپنے بیان میں انسانی جانوں کے ضیاع پر افسوس کا اظہار کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ حملے کی مزید اطلاعات کے مطابق حملہ ساحل سے ساٹھ کلومیٹر دور بین الاقوامی پانیوں میں ہوا۔ ترک ٹیلی وژن پر دکھائی جانے والے تصاویر میں اسرائیلی فوجی کشتیوں پر انسانی حقوق کے کارکنوں سے لڑتے ہوئے

دکھائے گئے۔ ٹیلی ویژن چینل الجزیرہ نے اسی کشتی سے حملے کی خبر نشر کرتے ہوئے بتایا کہ اسرائیلی بحریہ نے فائرنگ کی اور کشتی پر سوار ہو گئی جبکہ کشتی کے کپتان زخمی ہو گئے ہیں۔ الجزیرہ کی خبر اس آواز پر ختم ہوئی جس میں ایک شخص عبرانی میں کہتا ہوا سنائی دیا ہے کہ 'سب بکواس بند کر دیں'۔ ان کشتیوں پر ہزاروں ٹن امدادی سامان موجود ہے جس میں سیمنٹ اور تعمیر میں کام آنے والا دوسرا سامان بھی موجود ہے جو اسرائیل غزہ لے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسرائیل نے غزہ میں حماس کے اقتدار میں آنے کے بعد سے علاقے کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی تھی۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ وہ ہر ہفتے پندرہ ہزار ٹن امداد غزہ میں لے جانے کی اجازت دیتا ہے۔ اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ یہ وہاں کی ضرورت کا چوتھا حصہ بھی نہیں۔ غزہ کے عوام کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امدادی سامان لے کر جانے والے بحری جہازوں کے قافلے فوٹیلا پر اسرائیلی فوجیوں کے حملے کے بعد لاپتہ ہونے والے تمام پاکستانی شہریوں کے بارے میں پاکستانی حکام کا کہنا ہے کہ وہ اس حملے میں محفوظ ہیں اور وہ اسرائیل کی تحویل میں ہیں۔ ان میں پاکستان کے نجی ٹیلی ویژن آج نیوز کے نیوز اور کرنٹ افئیرز کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر طلعت حسین اور پروڈیوسر رضا محمود آغا کے علاوہ ایک غیر سرکاری تنظیم کے چیئرمین ندیم احمد خان ہیں۔ یہ افراد اس قافلے میں شامل ایک جہاز پر سوار ہیں۔ ترکی کی معروف رفاہی و فلاحی تنظیم آئی ایچ ایچ اس مہم میں پیش پیش ہے۔ غزہ کے محاصرے کا آغاز 27

دسمبر، 2008ء کو اسرائیلی فضائی حملوں سے ہوا، جس کو اسرائیل نے آپریشن کاسٹ لیڈ (Operation Cast Lead) کا نام دیا، اس تنازع کا آغاز نومبر، 2008ء میں غزہ میں اسرائیلی فوج کے چھاپے میں 6 فلسطینی مسلمانوں کی شہادت سے ہوا۔ اس تنازع میں اب تک 550 سے زائد فلسطینی مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ اب تک ہلاک ہونے والے 550 فلسطینیوں میں سے 25 فیصد عورتیں اور بچے ہیں جبکہ زخمیوں میں ان کا تناسب 45 فیصد ہے۔ حملوں کے نتیجے میں غزہ میں صورتحال مزید بگڑ چکی ہے اور اشیائے خورد و نوش اور طبّی امدادی سامان کی سخت قلت ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں پینے کا صاف پانی اور ایندھن بھی نایاب ہے۔ شہر کے تمام ہسپتال زخمیوں سے بھرے پڑے ہیں اور طبّی امداد نہ ملنے کے سبب زخمی دم توڑ رہے ہیں۔ علاقے کی بجلی پہلے ہی سے معطل ہے اور لاکھوں لوگ ایک بدترین انسانی المیہ سے دوچار ہیں۔ غزہ سے ملنے والی اطلاعات بھی انتہائی محدود ہیں کیونکہ اسرائیل نے غزہ میں صحافیوں کا داخلہ بند کر رکھا ہے اس لیے حقیقی صورتحال کا درست اندازہ نہیں ہو پا رہا۔ چار صدیوں تک فلیسطین پر عثمانیوں کی حکمرانی رہی ہے۔ 1917ء میں برطانیہ نے اس خطے کو اپنی تحویل میں لے کر اعلان بالفور کے ذریعہ یہودیوں کے لئے ایک قومی ریاست کے قائم کی۔ جس کے بعد سے ارض فلسطین پر مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ اسرئیل کی دہشت گردی کو امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ فوٹیلا کے امدادی قافلے پر حملے نے یہودیوں کی دہشت گردی کو بے نقاب کردیا ہے۔ پاکستان کے صحافیوں نے اس قافلے میں

شامل ہو کر جرات اور بہادری کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ پاکستانی عوام اپنے ہیروز کا استقبال کرنے کو چشم براہ ہے۔

مصلحتوں اور مجرمانہ غفلتوں کا شکار کراچی

ہم ابھی ایک خونی مہینے سے گزر کر آئے تھے۔ مئی کو اگر ماضی میں دیکھا جائے تو یہ کراچی کے شہریوں کے لیے کئی برس سے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ مئی کے مہینے میں یہاں کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے جو ماضی کو بھلا دیتا ہے۔ مئی 2010ء کو ہی لے لیں تو کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ میں 42 سے زائد بے گناہ افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کے بعد پیپلز پارٹی کے دو کارکنوں کا قتل ہوا۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے، پارٹی کے ایم این اے عبدالقادر نے اپنے استعفٰی کا اعلان کر دیا۔ جون کو شروع ہوئے ابھی ایک ہی دن خیریت سے گزرا ہے کہ لیاری میں ایک خونی لڑائی چھڑ گئی ہے۔ کراچی میں گروہی ، نسلی، سیاسی، بھتہ مافیا، منشیات فروش، زمینوں پر قبضہ کرنے والوں کی اجارہ داری ہے۔ جس میں عام شہری کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ شہر کے کسی بھی حصے میں کسی بھی وقت کوئی معمولی سا واقعہ، یا جھگڑا ایک تصادم کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ جس کے سنگین نتائج سامنے آتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شہر میں حالات خراب ہوجاتے ہیں۔ مسلح افراد کراچی کی گلیوں اور محلوں میں دندناتے پھرتے ہیں۔ اور جب تک حالات پر قابو پایا جاتا ہے۔ کئی قیمتی انسانی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں۔ آج ہی کے قومی اخبار میں ان جرائم پر قابو پانے والی اور امن امان بحال رکھنے

والی پولیس کی ایک احتجاجی ریلی کے کارکنوں پر تشدد کی نمایاں تصویر شائع ہوئی ہے۔ پولیس افسر انتہائی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک نوجوان کو بھاری بوٹ سے لات مار رہا ہے۔ یہ ہماری پولیس کی بہادری کی لازوال نشانی ہے۔ وہ نہتے سیاسی کارکنوں پر لاٹھیوں، بھاری بوٹوں،اور بندوقوں سے ٹوٹ پڑتی ہے۔ لیکن جہاں گولیاں چل رہی ہوں، عوام مر رہی ہو، اور مسلح جتھے حملہ آور ہوں وہاں یہ پولیس دور دور تک نظر نہیں آتی۔ کراچی میں اسلحہ مافیا کی پشت پناہی کرنے والی طاقتوں کی مہربانی سے ہر قسم کا ملکی اور غیر ملکی اسلحہ اور گولہ بارود کراچی میں عام دستیاب ہے۔ قریب دو کروڑ آبادی کے اس شہر میں اب تک محکمہ داخلہ اسلحہ لائسنسوں کے ریکارڈ کو کمپیوٹرائز نہیں کرسکا۔ تین اطراف سے کھلے کراچی میں ہر جانب سے اسلحہ آرہا ہے۔

کراچی میں بڑے پیانے پر اسلحے کے کاروبار کو لسانی فسادات اور جرائم کی پرورش کا اہم ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اسلحہ زیادہ تر ٹرکوں اور بڑی گاڑیوں میں چھپا کر کراچی لایا جاتا ہے، کراچی کے تھانوں میں غیر قانونی ہتھیار برآمد کرنے کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ سیاسی اور لسانی جھگڑوں میں اور دیگر مجرمانہ کاروائیوں میں غیر قانونی اسلحہ استعمال کیا جاتا ہے، توکیا ہم نے ان کاروائیوں پر قابو پانے کے لیے غیر قانونی اسلحے کی ترسیل کو روکنے کے خاطر خواہ انتظامات کئے ہیں۔ دو دن پہلے مجھے

سپر ہائی وے پر واقع ایک ہوٹل پر جانے کا موقع ملا۔ یہ ہمارے فاران کلب کے دوستوں کی محفل تھی۔ جسکی میزبانی سلیم قریشی نے کی تھی اور اس کے روح رواں ندیم اقبال تھے۔ واپسی میں رینجرز کے اہلکاروں نے ناکے لگائے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے ہماری گاڑیوں کی خوب اچھی طرح تلاشی لی۔ لیکن پورے کراچی میں یہ ناممکن ہے۔ گزشتہ مہینوں میں وفاقی وزیر داخلہ رحمان ملک نے کراچی کے دورہ کے موقع پر کہا تھا کہ ٹارگٹ کلنگ کے واقعات روکنے کے لیے ایجنسیوں کے کردار میں اضافہ، رینجرز کو تلاشی کے اختیارات اور کراچی میں محکمہ داخلہ کے کرائسس مینجمنٹ سیل کا قیام شامل ہے۔ انھوں نے کراچی میں تشدد کے واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک عدالتی کمیشن قائم کرنے اور تشدد کے ذمہ داروں کے خلاف بلاتخصیص کاروائی کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے ریکارڈ کے مطابق مجموعی ملکی محاصل میں کراچی کا حصہ 53.38 فیصد کے قریب ہے اس میں سے 53.33 فیصد کسٹم ڈیوٹی اور مختلف اشیا پر درآمدی ڈیوٹی کی مد میں حاصل ہوتا ہے۔ پاکستان کی جی ڈی پی (مجموعی ملکی پیداوار) میں اکیلے کراچی کا حصہ 20 فیصد سے زیادہ ہے۔ دو سال پہلے کراچی دنیا کے امیر ترین شہروں کی فہرست میں 81ویں نمبر پر تھا۔ اب بھی سالانہ 5.9 فیصد کی متوقع شرح نمو کے ساتھ 2020ء تک کراچی کی جی ڈی پی 127 ارب ڈالر متوقع ہے، اس طرح کراچی دنیا کا 66واں امیر ترین شہر بن سکتا ہے۔ تاہم ملک میں سرمایہ کاری کا سب سے بڑا مرکز ہونے کے باوجود کراچی کا امن وامان ہمیشہ مصلحتوں اور

مجرمانہ غفلتوں کا شکار رہا ہے۔ جو اس کی تباہی کا سبب بن رہا ہے۔

میں ان غنڈوں کی فوری گرفتاری چاہتا ہوں

میں ان غنڈوں کی فوری گرفتاری چاہتا ہوں، کل صبح تک 1500 لوگ اندر کردیئے جائیں، کمرے میں ایک آواز گونجی اور اس کے ساتھ ہی سرخ گاؤن والی شخصیت پردے کے پیچھے غائب ہوگئی۔ انوارالحق نے فوری طور پر 1500 کے ہندسے کو ۱۷ پر تقسیم کرنا شروع کردیا، کیونکہ صوبے (مشرقی پاکستان) میں ضعلوں کی تعداد سترہ تھی۔ وہ پریشان تھے کہ تقسیم میں باقی بچنے والے چار کے ہندسے کا کیا کریں۔ این ایم خان عقدے وا کرنے کے ماہر تھے۔ بولے میمن سنگھ بڑا ضلع ہے، وہاں سے چار لوگ اور پکڑ لو۔ اگلی صبح تک 1500 سو لوگ گرفتار کئے جاچکے تھے۔ ان قسمت کے ماروں میں رکشا کھینچنے والے، محنت کش، بے گناہ مسافر، غریب خوانچے والے اور بے یارومددگار راہ گیر سب شامل تھے۔ تین ماہ سے کم عرصے میں مشرقی بنگال کو تسخیر کرنے کے بعد اسکندر مرزا کراچی واپس چلے گئے۔ مئی ۱۹۵۴ کا یہ واقعہ الطاف گوہر نے، ایوب خان فوجی راج کے پہلے دس سال، نامی کتاب میں اسکندر مرزا کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ سرخ گاؤن والے اسکندر مرزا تھے۔ جنہوں ۶۵ سال پہلے کسی بھی واقعے کے نتیجے میں پولیس کی کاروائی کے لئے جو رہنمائی کا اصول طے کیا تھا۔ اس پر آج بھی اسی طرح عمل ہورہا ہے۔ پاکستان میں کیسے کیسے خونی واقعات ہوئے ہیں۔ خود کش دھماکے، دہشت گردی کے واقعات، کئی کئی گھنٹوں تک پولیس سے

دہشت گردوں کی آنکھ مچولی، ٹیلیوژن چینلوں پر براہ راست ان مقابلوں کو دنیا بھر میں دیکھا گیا۔اس پر ہمارے وزیر داخلہ کی براہ راست کمنٹری، اور پولیس اہلکاروں کے دعویٰ، اور پھر پولیس والوں یا قانون نافذ کرنے والوں کے ہاتھوں میں دبوچے ہوئے دہشت گرد جن کی شناخت چھپانے کے لئے ان کے منہ پر فوراً کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ پولیس والے اپنی زبان میں ایسے مجرموں کو دلہن کہتے ہیں۔ حکومت کی جانب سے اعلان کہ ہم نے دہشت گردوں کو گرفتار کرلیا ہے۔ ہوم منسٹر کے دعویٰ کہ ہم دہشت گردوں کے نیٹ ورک نزدیک جا پہنچے ہیں۔ لیکن بعد میں نہ جانے یہ دہشت گرد کہاں چلے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں اخبارات میں تفصیل کیوں نہیں آتی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آئے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پکڑے جانے والے بہت سے افراد کا ان دہشت گردی کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کئی دہشت گرد تو بیچارے کچرا چننے والے نکلے۔ کئی کا قصور یہ تھا کہ ان کے چہرے پر داڑھی تھی، جو آج کے دور میں دہشت گردوں کا ٹریڈ مارکہ بنادیا گیا ہے۔ کئی ایسے بھی تھے جن کی شکل صورت ہی ایسی تھی کہ وہ دہشت گرد نظر آتے تھے۔ مشرف دور میں بھی بہت سے ایسے افراد کو خطرناک اور منظم گروہ کے طور پر میڈیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ جو بعد میں عدالتوں سے بری ہو گئے۔ ایسے مجرموں کو پکڑ کر سب سے پہلے ہم انہیں ہائی پروفائل کیس بناتے رہے۔ تاکہ امریکہ سے آشیر باد اور ڈالر مل سکیں۔ ملک میں ہونے والے ان خونی واقعات پر ایک جوڈیشل کمیشن قائم ہونا چاہیے۔ ان تمام کیسوں کی

چھان بین ہونی چاہیے کہ اس کے نتیجے میں کس کس نے تمغے، ترقیاں، انعامی رقوم وصول کیں۔ جن بے گناہ اور معصوم لوگوں کو پکڑا گیا۔ اور بے گناہ ثابت ہوئے، ان کو دی جانے والی رسوائی، اذیت اور ان کے چھینے گئے ماہ سال کا مالی مداوا ہونا چاہیے۔ ان افسران اور اہلکاروں کو سزائیں ملنی چاہیے۔ جنہوں نے جھوٹے مقدمات بنائے۔ ایسے تمام کیسوں کے بارے میں ایک قرطاس ابیض کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے منہ پر ملی ہوئی سیاہی کو دھو سکے۔

ٹرانسپورٹ کے کرائے میں اضافہ کیوں

جب ساری دنیا میں پیٹرول سستا ہو رہا ہے۔ اور بجٹ کے آنے میں دو دن باقی ہیں تو حکومت نے کمال سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیٹرول کی قیمتوں میں کمی کا اعلان کردیا۔ عوام کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوگی۔ کیونکہ بجٹ کے بعد جو مہنگائی کا طوفان آنے والا ہے۔ وہ سب کو حواس باختہ کردے گا۔ سندھ حکومت ایک طویل عرصے سے ٹرانسپورٹ مافیاکے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے ایک جانب پیٹرول کی قیمتیں کم ہوئیں تو دوسرے ہی دن سندھ میں ٹرانسپورٹ کے کرایوں میں ایک روپے کا اضافہ کردیا گیا، کراچی میں ٹرانسپورٹ کی ابتر صورت حال ہے۔ سٹی گورنمنٹ عوام کو سی این جی بسوں کے آنے کی نوید سناتے سناتے خود چلی گئی۔ لیکن کراچی میں عوام کے لئے ٹرانسپورٹ میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ بے ہنگم ٹریفک کی وجہ سے حادثات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کراچی ٹریفک کے حادثات کے سبب خطرناک ترین شہروں میں شمار ہونے لگا ہے۔ جہاں ڈرائیونگ کی غلطی سے ہر روز حادثات رونما ہوتے ہیں وہاں مسافروں کی بے احتیاطی بھی اس خطرناک صورت حال کا باعث ہے۔ ایک طرف تو کراچی کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف بسوں اور ویگنوں کی تعداد اور روش وہی کہ پرانی ہیں۔ دفتری اوقات میں مسافرٹرانسپورٹ میں سوار ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کھچا

کھچ بھری ہوئی بسوں اور ویگنوں میں اگر پاؤں رکھنے کی جگہ بھی مل جائے تو غنیمت ہوتی ہے۔ بھری ہوئی اس ٹرانسپورٹ کے باعث مسافروں کو گاڑیوں کی چھت پر بٹھانے کا رواج بھی عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی تو چھت پر سوار ہونا مجبوری ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس پر شوقیہ بھی سوار ہوا جاتا ہے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو وین کے اندر بیٹھنے پر چھت پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ چلتی ہوئی گاڑی کی چھت پر سوار ہونے اور اس سے اترنے میں کوئی حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔ بارش کے موسم میں خصوصاً بجلی کے تار ایسے مسافروں کے لیے انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔ چھت پر چڑھے ہوئے مسافر نجانے کیوں ٹریفک پولیس والوں کو دکھائی نہیں دیتے یا پھر وہ جان بوجھ کر ان سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حکومت سندھ کچھ نہ کرے تو یہ تو کر سکتی ہے کہ ایسی بسوں اور ویگنوں کے خلاف کاروائی کرے۔ اور ٹرانسپورٹرز کی مونوپلی توڑتے ہوئے، بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر مختلف روٹس کی بسیں اور ویگنیں چلانے کے لئے نئے روٹس کا اعلان کرے۔ کرایوں میں اضافے کے ساتھ ٹرانسپورٹرز کو مسافروں کو سہولیات فراہم کرنے کے لئے پابند کیا جائے۔ ورنہ کراچی کے سڑکوں پر حادثوں میں عوام کا خون یونہی بہتا رہے گا۔

آئی ایم ایف کا بجٹ قوم کو مبارک ہو

عالمی مالیاتی ادارے یا آئی ایم ایف کے ساتھ پچھلے سال جو معاہدہ طے ہوا۔ اس معاہدے کے مطابق حکومت بجلی، تیل، گندم، گنے اور بعض دیگر اشیا پر دی جانے والی مالی امداد ختم کرنے کی پابند ہے۔ جبکہ سٹاک مارکیٹ پر کیپیٹل گینز ٹیکس سمیت جائیداد کی خرید وفروخت اور مختلف سروسز پر نئے ٹیکس بھی لاگو کرنے ضروری ہیں۔ اس صورت حال میں بجٹ پیش کرنا حکومت کے لئے اور بھی مشکل تھا کہ کسی کو پاکستان پر اعتماد نہیں ہے۔ ہمارے اعداد شمار بھی اپنی وقعت کھو چکے ہیں۔ حکومتی افراد پر بھی کسی کو کوئی اعتماد سرے سے نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قومی بجٹ اور حفیظ شیخ دونوں اسمبلی میں ایک ساتھ آئے۔ ٹیکسوں کے نفاذ پر ابھی تک چاروں صوبوں کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے اس لئے ویٹ کا مسئلہ فی الحال اکتوبر تک لٹکا دیا گیا ہے۔ اس نئے ٹیکس کے لگنے کے بعد یہ توقع کرنا کہ اس سے عام آدمی کو فرق نہیں پڑے گا محض طفل تسلی ہے۔ اس ٹیکس کا اثر کم و بیش ہر چیز پر پڑے گا اور اسی نسبت سے مہنگائی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کھانے پینے کی اشیا سے لے کر الیکٹرانکس اور عام گھریلو استعمال کی چیزوں کی قیمتوں میں کم از کم بیس سے پچیس فیصد اضافہ لازمی ہو جائے گا۔ پارلیمنٹ اور حکومت میں شامل وڈیرے اور چوہدری اور بڑے زمینداروں نے ایک بار پھر

زرعی آمدنی کو ٹیکس سے بچانے میں کامیاب اور سارا بوجھ غربت میں پسے ہوئے عوام پر ڈالنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ لابی اس قدر طاقتور ہے کہ انھوں نے شوکت ترین کو اس لئے رخصت کردیا کہ وہ کہتے تھے کہ نئے مالی سال میں زرعی ٹیکس ضرور لاگو کیا جائے گا۔ ماہرین معیشت کا کہنا ہے کہ ان نئے ٹیکسوں کے نفاد اور سبسڈیز کے خاتمے سے عام آدمی کے لیے مہنگائی میں اضافہ تو یقینی ہوگا پاکستان کی موجودہ حکومت بھی ماضی حکومتوں کی طرح پاکستان کے عوامی اثاثوں کو فروخت کرنے کے درپے ہے تاکہ انکو بیچ کر جتنا پیسہ اکٹھا ہوسکے کیا جائے اور خوب لوٹ مچائی جائے اس کے علاوہ ان کی سیل میں بداعنوانیوں سے بھی خوب کمایا جائے اور پھر ان قومی ملکیتی ادروں کو اپنے رشتہ داروں یا پیاروں کو اونے پونے داموں دے کر انہیں خوش کیا جائے۔ جیسے پاکستان ان کی ذاتی جاگیر یا ملکیت ہے۔ ضیا الحق آمریت ہو یا پھر اس کے سپولے نواز لیگ ہو یا پھر انہی کی ترقی یافتہ شکل مشرف لیگ آمریت ہو اور اس کا وزیر اعظم جو آئی ایم ایف کا سرکاری گماشتہ تھا اسی روش پر قائم رہے لیکن اب بد قسمتی سے پیپلز پارٹی جو عوام اور مزدورں کی نارملی پارٹی ہے جس کی قیادت پر عوام اور مزدور دشمن جاگیردار ساہوکار، سرمایہ دار، اور ریاستی ایجنٹ، قابض ہو چکے ہیں انکی موجودہ حکومت بھی، انہی عوام دشمن پالیسیوں پر گامزن ہے۔ اور اکیس نیشنلائز اداروں کو ڈی نیشنلائز کر رہی ہے جس کے خلاف مزدور سراپا احتجاج ہیں اور پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمپین نے اس کے خلاف پورے پاکستان

میں ایک منظم تحریک کا آغاز بھی کر رکھا ہے۔ اور اب جب پاکستان کے قومی تحویل میں ادارے ختم ہونے والے ہیں یا فروخت کے لیے مزید نہیں رہے۔ تو اب حکومت پاکستان کی زمین کو بھی عالمی منڈی میں فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ کیا تنخواہ میں اضافے سے مہنگائی اور افراط زر میں کمی ہوگی۔ جی نہیں بائیس گریڈ والوں کی تنخواہ میں پچاس فیصد اضافہ مہنگائی میں مزید اضافے کا سبب بنے گا۔ اس بجٹ کا آٹھواں حصہ دفاعی اخراجات میں چلا جائے گا۔ جبکہ فوج کے پینشن اور دوسرے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے، نچلی سطح کے ملازمین کی تنخواہوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا بڑا حصہ گیس بجلی پیٹرول اور آٹے دال گوشت اور دودھ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی نظر ہو جائے گا، جماعتِ اسلامی کے رہنماء پروفیسر خورشید احمد کے اس سوال کا جواب بھی اس بجٹ دستاویز میں نہیں ہے کہ وہ وفاق کے ان پچیس محکموں کا مستقبل کیا ہوگا۔ جنہیں ختم کرنے کا فیصلہ اٹھارہویں آئینی ترمیم میں کیا گیا ہے۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے نتیجے میں تقریباً ڈھائی لاکھ سرکاری ملازمین بے روزگار ہوں گے۔ لیکن بجٹ ان کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔

بوجھل دل اس بارے میں قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دیا اور سوچتا رہا کہ پچھلے سال 4 کھرب 84 ارب روپے کے بجٹ میں غریبوں کو دی جانے والی 189 ارب روپے کی مراعات واپس لی گئی تھیں، اس سال چھ سو پچاسی ارب روپے کا خسارے کا

بجٹ ہے۔ جس میں سے گندم کپاس، بجلی کھانے پینے کی اشیاء سمیت ایک سو چار ارب کی مراعات جو غریبوں کے لئے تھیں ان کو ختم کر دیا گیا ہے، ہیں۔ یہ سب بوجھ غریب اور متوسط طبقہ پر پڑے گا۔ دوسری طرف بجٹ کا خسارہ چھ سو پچاسی ارب روپے سے زائد ہونے کی وجہ سے غیر ملکی قرضوں کا بھاری بوجھ مزید بھاری ہو جائے گا۔ جس سے 17 کروڑ کی آبادی میں سے ہر شخص پر قرضہ کا بوجھ بڑھ جائے گا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت ہماری قوم کا بچہ بچہ اور ہر مرد اور خاتون ساٹھ ہزار روپے فی کس مقروض ہے۔ بجٹ میں کوئی ایسا اقدام نظر نہیں آیا جس سے عوام کو براہ راست کوئی ریلیف ملتا ہے۔ زر مبادلہ کے ذخائر 9 کا انحصار غیر ملکی امداد اور قرضوں پر ہے۔ ملک میں 30 سے 35 فیصد افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اور ان کی مجبوری میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی بھوک انسان کی حب الوطنی کو ہی نہیں اس کا ایمان بھی کھا جاتی ہے۔ ایسے میں عوام کو کیا اور کس لئے قربانی کا درس دیا جائے۔ بجٹ پر کوئی مطمئن نہیں۔ کار' فریج اور ائیر کنڈیشنر کے بغیر تو زندگی گزاری جا سکتی ہے مگر آٹا' گھی اور چینی پیٹرول کے بغیر تو زندگی نہیں گزر سکتی۔' پتا نہیں وطن کی کتنی مائیں غربت کے لبادے میں اپنی عصمت چھپائے اپنے دست دعا کو کشکول بنائے پھرتی ہیں۔ صحت، تعلیم، امن و امان، بجلی، روزگار کی فراہمی پر بجٹ خاموش ہے اور پارلیمنٹ میں بیٹھا طبقہ اشرافیہ تالیاں پیٹ رہا ہے۔ یہ ہے عوامی جمہوریت۔ کیا اس

جمہوریت سے عوام کا پیٹ بھرے گا۔ کیسے کیسے لطیفے ہیں تین کروڑ انرجی سیور بلب مفت تقسیم کئے جائیں گے۔ جنکو جلانے کے لئے ہمارے پاس بجلی نہیں ہے۔ وفاقی وزیر مالیات عبدالحفیظ شیخ کا کہنا ہے کہ بہت ساری خرابیوں کی وجہ مالی بدانتظامی ہے۔ ان کے مطابق پورے ملک کی حکومت کا سالانہ خرچ ایک سو پینسٹھ ارب روپے ہے لیکن صرف بجلی پیدا کرنے والی کمپنی پیپکو کو سالانہ ایک سو اسی ارب روپے کی سبسڈی دی جاتی ہے۔ قوم کو لوٹنے والے یہ معاہدے کس نے کیے اور کون اب تک انہیں چلا رہا ہے۔ اس کا جواب شائد وزیر خزانہ کے پاس بھی نہیں ہے، کیونکہ کل ملک دیوالیہ ہوجانے پر یہ سارے پنچھی تو دوسرے ملکوں میں اڑ جائیں گے، عوام یونہی پستی رہے گی۔

آٹے دال کا بھاؤ

بجٹ اجلاس میں شرکت کرنے والے عوامی نمائندوں سے ایک ٹی وی اینکر پرسن نے یہ سوال کیا کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ آٹے کی فی کلو قیمت کیا ہے۔ یا دال کی قیمت فی کلو کیا ہے، یا گوشت کس بھاؤ بک رہا ہے تو کسی عوام نمائندے کو آٹے، دال، گوشت کو بھاؤ نہیں معلوم تھا۔ یہ ہمارے منتخب نمائندے ہیں۔ جو پاکستان کے عوام کے ووٹوں سے اسمبلیوں میں پہنچے ہیں، جو ہمارے لئے بجٹ کی منظوری دیتے ہیں۔ جو عوام کا غم کھاتے ہیں۔ ایر کنڈیشن گاڑیوں، دفاتر، گھروں میں رہتے ہیں۔ عوام کے ٹیکس سے اپنی مراعات اور الاؤنس لیتے ہیں۔ جہازوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں وقت گزارتے ہیں۔ اس دو سالہ عوامی جمہوری دور میں عوام پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ کسی کو اس کا احساس نہیں ہے۔ حکومت کے دو سال میں مارچ 2008 تا مارچ 2010، آٹا 13 روپے سے بڑھ کر 34 روپے اور چینی 21 روپے سے بڑھ کر 67 روپے، پیٹرول 46 روپے 71 روپے، موٹر سائیکل 32000 روپے سے بڑھ کر 62000 روپے، یو ایس ڈالر 60 سے بڑھ کر 83 روپے، کال اور ایس ایم ایس ٹیکس 15% سے بڑھ کر 21% اور لوڈ شیڈنگ 30% سے بڑھ کر 150% ہو گئی ہے۔ چائے کی پتی (250 گرام کا پیکٹ) 65 روپے سے بڑھ کر 124 روپے کا ہو گیا ہے، مرغی کا گوشت 71 روپے سے بڑھ کر 116 روپے ہو گیا ہے۔ (یاد رہے کہ یہ اعداد شمار مارچ تک کے ہیں۔ تین ماہ میں ان

میں مزید اضافہ ہوا ہے۔) روز مرہ کی استعمال کی ہر چیز، سبزیاں اور پھل، بجلی اور قدرتی گیس کے نرخ، پٹرولیم مصنوعات ہر چیز عوام کی پہنچ سے دور ہو گئی ہے۔ کراچی کے عوام پر کے ایس سی کی صورت میں جو قہر نازل ہو رہا ہے۔ اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ تازہ ترین یہ ہے کہ کے ای ایس سی کو کراچی کے عوام سے چار ارب چونتیس کروڑ پچاسی لاکھ روپے فیول ایڈ جسٹمنٹ کی مد میں وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور سات ماہ میں کے ای ایس سی کراچی کے عوام سے پانچ روپے بائیس پیسے فی یونٹ کے حساب سے اضافی بل وصول کرے گی۔ نیپرا جس نے کے ای ایس سی کے اعداد شمار کو ماننے سے انکار کیا تھا، اب صارفین کے حقوق سے زیادہ کے ای ایس سی کے مفادات کی پاسبانی کررہی ہے۔ کراچی کی سیاسی، سماجی، عوامی تنظیموں کو اس ناانصافی پر اپنی آواز بلند کرنی چاہئے۔ کے ای ایس سی نے اپنا یہ ہرجانے کا دعویٰ مقررہ مدت میں پیش نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی اسے دو ارب روپے کا فائدہ اس ایک فیصلے سے پہنچایا جارہا ہے۔ اس کے پیچھے کون سی قوتیں ہیں۔ جو ڈوریاں ہلا رہی ہیں۔ ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ کے ای ایس سی کی ملکیت میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ دوسری جانب کے ای ایس سی کے ذریعے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جارہا ہے۔ بجلی کے موجودہ نرخ 3.91 روپے ہیں جو ۵۰ یونٹ والے صارفین سے وصول کئے جاتے ہیں۔ 100 یونٹ سے زیادہ بجلی استعمال کرنے والے صارفین اور کمرشل اور صنعتی صارفین کیلئے نرخوں میں عام صارف کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ

گھریلو صارفین جو 101 سے 300 یونٹس کے درمیان بجلی استعمال کرتے ہیں ان کیلئے نرخ 4.96 روپے فی یونٹ (علاوہ ٹیکس) ہے، جو 301 سے 700 یونٹ استعمال کرتے ہیں ان کیلئے نرخ 8.03 روپے فی یونٹ ہے جبکہ 700 یونٹس سے زائد استعمال کرنے والوں کیلئے نرخ 10 روپے فی یونٹ (ٹیکس کے بغیر) ہے۔ کمرشل صارفین کیلئے بجلی کے نرخ فروری 2008ء میں 9.53 روپے فی یونٹ (بشمول ٹیکس) ہوا کرتے تھے جبکہ اب یہ قیمت 14.93 روپے فی یونٹ (بشمول ٹیکس) تک جا پہنچی ہے۔ یہی صورتحال گیس کی ہے۔ گیس کی قیمتوں میں 15 فیصد اضافہ ہوا جبکہ ایل پی جی کی قیمتیں روپے فی سلنڈر سے بڑھ کر 1092 فی سلنڈر ہو گئیں یعنی 270 روپے فی 817 سلنڈر۔ ڈیزل 37.86 سے 69.27 فی لٹر اور مٹی کا تیل 42 سے 72 روپے فی لیٹر تک پہنچ چکا ہے۔ وہ غریب جو ایل پی جی نہیں خرید سکتے، جن کے پاس قدرتی گیس نہیں ہے اور لکڑی استعمال کرتے ہیں ان کیلئے لکڑی کی قیمتیں 230 روپے فی 40 کلوگرام سے بڑھ کر 302 روپے ہو گئی ہے گزشتہ 2 برس کے دوران ہوشربا مہنگائی کے نتیجے میں تقریباً ہر شہری کی زندگی اس سطح سے 50 فیصد زیادہ مہنگی ہو گئی ہے جتنی یہ فروری- مارچ 2008ء میں ہوا کرتی تھی۔ جب موجودہ حکومت نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ ایک طرف ملک کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے تو دوسری طرف کرپشن میں بھی ریکارڈ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جبکہ گڈ گورننس دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ عام شہری کی زندگی بد سے بدتر ہو چکی ہے ملک کے تاجر طبقے تباہ حال ہے۔

بے روزگاری میں اضافہ

ہورہا ہے۔ صنعتی یونٹ بند ہورہے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کی صورتحال یہ ہے کہ ایک سال میں تین چار کمپنیاں لسٹیڈ ہوئی ہیں۔ حکومت کا سینسیٹو پرائس انڈیکس (ایس پی آئی) یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ فروری 2008ء میں 173 تھا جو جنوری 2010ء میں بڑھ کر 254 تک پہنچ چکا ہے روز مرہ کے استعمال کی کئی اشیاء کی قیمتوں میں 250 سے 300 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ عوامی اجتماعات میں روٹی، کپڑا اور مکان کے وعدے کرنے والے حکمرانوں نے فروری 2008ء سے حقیقتاً انہیں بے مثال مہنگائی دی ہے۔ ہم ایک بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ اور مستقبل میں بھی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ جب تک عوام اور حکومت کے درمیان اعتماد کے فضا قائم نہیں ہوگی، یہ صورتحال مزید بگڑتی جائے گی۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ سنگین حالات کو محسوس کرے۔ اور عالمی اداروں کے عوام دشمن معاہدوں سے الگ ہوکر عوام کی سہولت کے اقدامات کرے۔

ڈاکٹرز کی ٹارگٹ کلنگ کی ایک تازہ لہر

کراچی میں ڈاکٹرز کی ٹارگٹ کلنگ کی ایک تازہ لہر آئی ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے میں شہر میں چار ڈاکٹر ہلاک کردیے گئے ہیں۔ اس ایک ماہ میں تقریباً آٹھ ڈاکٹر ہلاک کئے جاچکے ہیں۔ حیدرآباد میں گزشتہ ہفتے پروفیسر ڈاکٹر اسلم میمن کو دن دھاڑے اغوا کیا گیا۔ جو تا حال لاپتہ ہیں۔ انہیں تاوان کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔ پشاور میں ڈاکٹرز کا اغوا اب باقاعدہ کاروبار ہے۔ اور بڑی تعداد ایسے ڈاکٹروں کی ہے جو اس ہولناک تجربے سے گزر چکے ہیں۔ پاکستان میں آبادی کے تناسب سے دو ہزار تین سو افراد پر ایک ڈاکٹر کی سہولت ہے۔ ایک ڈاکٹر کی تعلیم پر حکومت کے لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ حالات میں جب بھی ایسی بے یقینی کی فضا ہوتی ہے۔ ملک سے برین ڈرین (ذہین افراد کا ملک سے چلے جانے) کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس ایک ماہ میں سندھ سے تین سو ڈاکٹر اور پنجاب سے بارہ سو ڈاکٹر ملک چھوڑ کر جاچکے ہیں۔ کوئٹہ کے حالات بھی خراب ہیں۔ جہاں ایک ماہ میں سات ڈاکٹر قتل کردیے گئے۔ اندرون سندھ کی صورت حال بھی کوئی اچھی نہیں ہے۔ جمعہ کو پاکستان میڈیکل ایسو سی ایشن (پی ایم اے) نے کراچی میں ڈاکٹروں کے قتل کی مذمت کرتے ہوئے اسے انسانیت سوز قرار دیا۔ اورنگی ٹاؤن میں ایک ڈاکٹر کو پیر کی شام دو نامعلوم مسلح افراد نے گولیاں مار کر ہلاک کردیا تھا۔ چالیس

سالہ ڈاکٹر بابر عبدالمنان کو زخمی حالت میں عباسی شہید ہسپتال پہنچایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہوسکے۔ بدھ دو جون کو ایک پچاس سالہ ڈاکٹر جنید شاکر کو نیو کراچی کے سیکٹر ای میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شاکر اپنی نجی کلینک سے موٹر سائیکل پر گھر جا رہے تھے کہ بارش اور لوڈشیڈنگ کے دوران نامعلوم افراد نے انہیں ہلاک کر دیا اور جمعرات کے روز صبح ڈاکٹر حسن رضا کو جب وہ نیشنل میڈیکل سینٹر سے اپنی ڈیوٹی ختم کرکے نکلے تھے قتل کیا گیا۔ جمعہ چار جون کو کراچی میں کالاپل کے قریب پینتیس سالہ ڈاکٹر حسن حیدر بخاری کو گولیاں مارک ہلاک کیا گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ وہ نیشنل میڈیکل سینٹر سے اپنی رات کی ڈیوٹی ختم کرکے گھر واپس پہنچے تھے کہ انہیں نامعلوم کار سواروں نے ہلاک کر دیا۔ ان کو تین گولیاں سر میں ماری گئی تھیں۔ کراچی سے ملحقہ بلوچستان کے صنعتی شہر حب میں ہفتے کی شب نامعلوم ملزمان نے ساکران روڈ پر واقع ماروی کلینک کے مالک ڈاکٹر مدن لعل ولد رام چند کو موبائل فون چھیننے کے دوران مزاحمت کرنے پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ مقتول کافی عرصے سے حب کے ساکران روڈ پر ماروی کلینک چلاتا تھا۔ ادھر جیکب آباد کے ڈاکٹر ڈاکٹر امر کھتری کے قاتلوں کی عدم گرفتاری کے خلاف احتجاجی مظاہرے کر رہے ہیں۔ ڈاکٹروں اور پیرامیڈیکل اور شہریوں کی ایک بڑی تعداد نے سول اسپتال سے شہر کے مختلف راستوں سے مارچ کرتے ہوئے وفاقی وزیر اعجاز جکھرانی کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچ کر دھرنا دے کر روڈ بلاک کی۔ دوسری

جانب پی ایم اے جیکب آباد کے ایک وفد نے ڈاکٹر اے جی انصاری اور ڈاکٹر گل محمد برڑو کی قیادت میں وفاقی وزیر جسٹس ریٹائرڈ عبدالرزاق تھہیم سے ملاقات کی اور انہیں ڈاکٹر کے قتل سے متعلق معلومات سے آگاہ کیا۔ ان ہی دنوں میں سانگھڑ میں ایک ڈاکٹر کو بھی قتل کیا گیا۔ اس حوالے سے میں نے پی ایم اے کے مرکزی صدر ڈاکٹر حبیب الرحمٰن سومرو سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے تو ان کا کہنا تھا کہ ان وارداتوں نے ڈاکٹر کمیونٹی میں بے چینی پیدا کر دی ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ڈاکٹروں کے خلاف پھر وہی مہم چلائی جا رہی ہے جو 2000ء کی دہائی کے آغاز میں شروع کی گئی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹروں کے خلاف حالیہ مہم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان واقعات کو نہ روکا گیا تو خدشہ ہے کہ ایک بار پھر ڈاکٹر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ سی سی پی او وسیم صاحب اور ان کے ساتھ دیگر پولیس اہلکار آئے تھے۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ پولیس کو الرٹ کریں گے۔ جب کہ پولیس نے تمام ڈاکٹروں کے قتل کے مقدمات نامعلوم افراد کے خلاف درج کیے ہیں اور تاحال کسی ملزم کو گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ ایک ڈاکٹر اپنے مریض کا علاج، کسی مذہبی، گروہی، لسانی، علاقائی، تعصب سے بالاتر ہو کر کرتا ہے۔ اس کے کام کے اوقات ایسے ہیں کہ وہ آسانی سے ٹارگٹ بن جاتا ہے۔ یہ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی ایک سازش ہے۔ جس کا پورے معاشرے کو مل کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اگر کل ڈاکٹر نہ ہوگا تو آپ کس سے علاج کرائیں گے۔ ذرا اس پر ٹھنڈے دل سے سوچیں۔

موزے، برساتی کوٹ، سیل فون کی حفاظت کرنی چاہیے

دو دن پہلے پریس کلب میں میرے ایک دوست کے پاس امریکہ سے فہد ہاشمی کے والد کا فون آیا۔ طویل گفتگو کے بعد میرے دوست نے بتایا کہ ہاشمی صاحب کراچی میں رہتے تھے۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ جنہیں ۱۹۸۰ میں دو ڈھائی سال کی عمر میں پاکستان سے امریکہ لے گئے تھے۔ ان بچوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی، ان کی اردو بھی واجبی سے ہے۔ ان میں چھوٹا بیٹا فہد ہاشمی ہے۔ فہد ہاشمی نیویارک کے علاقے کوئینز میں پلے بڑھے۔ انہوں نے بروکلین کالج سے ۲۰۰۳ میں پولیٹیکل سائنس کی ڈگری لی۔ اور پھر انٹرنیشنل ریلیشنز میں لندن کی میٹروپولیٹن یونیورسٹی سے ۲۰۰۶ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ نائین ایلیون کے بعد امریکہ نے مسلمانوں کے خلاف جو ظالمانہ پالیسی اختیار کی۔ اس پر امریکیوں نے بھی احتجاج کیا۔ فہد ہاشمی بھی امریکی پالیسوں اور مسلمانوں کے خلاف امریکی امتیازی رویہ پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتا تھا۔ امریکی معاشرہ ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے۔ لیکن فہد کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ فہد ہاشمی ایک ذہین اور پڑھنے لکھنے والا طالب علم تھا۔ دوران طالب عالمی اس کا تعارف 'المہاجرون' نامی تنظیم سے ہوا۔ اس کی لمبی ڈارھی اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے اس کی ہمدردی اور امریکہ کے مسلمانوں کے خلاف اقدامات نے اسے امریکی پالیسوں سے اختلاف کا

راستہ دکھایا۔ لیکن وہ امریکی شہری تھا۔ قانون کی پاسداری کو مقدم رکھتا تھا۔ اس لئے وہ کسی خلاف قانون کام میں ملوث نہیں ہوا، لیکن امریکی انٹیلیجنس اور ایف بی آئی اس کے پیچھے لگی رہی۔ چھ جون کو اسے ہیتھرو ایئر پورٹ سے گرفتار کرلیا گیا۔ اس پر القاعدہ سے رابطے، فوجی ساز وسامان اور رقم کی فراہمی کا الزام لگایا گیا۔ جب وکیل نے فوجی امداد کی تفصیلات پوچھی تو یہ موزے اور برساتی کوٹ نکلا۔ امریکیوں کی پوری کوشش تھی کہ فہد کو برطانیہ سے امریکہ لے جایا جائے۔ وہ برطانیہ سے امریکہ کے حوالے کئے جانے والے پہلے فرد ہیں۔ ۲۰۰۷ میں امریکی فہد ہاشمی کو امریکہ لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ جہاں اسے اے کیٹیگری سیکورٹی میں تین سال تک ۲۳ گھنٹے قید تنہائی میں رکھا جاتا رہا۔ جب ایک گھنٹے اس کی اہل خانہ سے ملاقات کرائی جاتی تو اس دوران چاروں طرف کیمرے لگے ہوتے۔ اس رویہ نے فہد کو نفسیاتی مریض بنا دیا۔
اس کی داستان اس قدر ہولناک تھی کہ اس کی ایک امریکی پروفیسر نے اس پر احتجاج کی مہم شروع کردی۔ امریکہ اور برطانیہ میں پاکستانی کیمونٹی میں یہ کیس بہت اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ جو مقدمے سے قبل ہاشمی کی قید کے حالات پر اعتراض کر رہے ہیں۔ ہاشمی کو مین ہیٹن کی جیل کی کوٹھری میں لگ بھگ تین سال تک دن کے 23 گھنٹوں کے لیے تنہا رکھا جاتا تھا۔
بروک لین کالج کی سیاسیات کی پروفیسر ژاں تھیوہارس نے ہاشمی کو پڑھایا تھا

اور انھوں نے اس کے مقدمے کی تشہیر کے لیے ایک مہم منظم کرنے میں بھی مدد کی تھی جس میں مین ہیٹن میں چندہ اکٹھا کرنے کی ایک حالیہ مہم بھی شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہاشمی کی قید کے حالات اذیت رسانی کے زمرے میں آتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اِس قسم کے حالات غیر انسانی ہیں۔ یہ بین الاقوامی معیار کے منافی ہیں۔ یہ لوگوں کی اہلیت پر اور مسٹر ہاشمی کی جانب سے خود اپنا دفاع کرنے کی اہلیت پر ایک غیر مناسب سودے بازی کے مترادف ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ غیر امریکی رویہ ہے۔ جیل کے باہر فہد ہاشمی کے حمایتیوں کا طویل عرصے تک باقاعدگی سے احتجاج بھی جاری رہا۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے بھی اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ ہاشمی کو قانونی کاروائی سے پہلے ہی اذیتناک حراست میں رکھا گیا ہے۔ لیکن امریکی اپنے اس خلاف قانوں رویہ پر شرمندہ نہیں ہیں۔ وہ اسے معمول کی کاروائی قرار دیتے ہیں۔ پاکستانی نژاد امریکی شہری سید فہد ہاشمی کو دہشت گردوں کی مدد کرنے کے جرم میں بدھ کو نیویارک کی ایک عدالت نے پندرہ سال قید، اور رہا ہو کر مزید تین سال نگرانی میں گزارنے کی سزا سنائی۔ ڈاکٹر عافیہ کی طرح یہ کیس بھی مسلمان نوجوانوں کو یہ باور کرانے کے لئے ہے کہ وہ اپنے دل سے جذبہ جہاد کو نکال پھینکیں۔ ورنہ انہیں دنیا میں عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ امریکیوں نے مسلمانوں پر تشدد کے جو نئے انداز پنائے ہیں۔ ان پر امریکی اور انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی شرمندہ ہیں۔ اور مسلسل احتجاج کر رہے ہیں۔ قیدیوں کو طویل

عرصے قید تنہائی میں رکھ کر انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا جاتا ہے۔ پھر ایسے ٹاؤٹ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ جو قیدیوں کی ہمدری حاصل کرتے ہیں۔ اور انہیں عدالت میں اعتراف جرم اور ہلکی سزا سنانے کے لئے ہموار کرتے ہیں۔ فہد ہاشمی پر بھی یہی نسخہ آزمایا گیا۔ جج نے جب ان سے پوچھا کہ کیا تم اعتراف کرتے ہو۔ تو اس نے کہا الحمدللہ۔ جی ہاں ۔ پھر اس کا جرم بھی کیا ہے، ایسے مقدمات تو پاکستانی پولیس بھی بناتی رہی ہے، چوہدری ظہور الٰہی پر بھینس کی چوری سے مشابہ اس مقدمے میں موزے، برساتی کوٹ، سیل فون کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ پاکستانی نوجوانوں کو اپنے موزے، برساتی کوٹ، سیل فون کی حفاظت کرنی چاہیے۔

پاکستان کرونیکل نوجوان نسل کے لئے ایک تحفہ

عقیل عباس جعفری چپکے چپکے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اور پھر جب اس کی کوئی نئی کاوش سامنے آتی ہے تو سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ عقیل عباس جعفری کس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ عقیل عباس کی نئی تحقیقی کتاب 'پاکستان کرونیکل' ایک ایسی تحقیقی کاوش ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے محدود وسائل میں ایک بڑا تحقیقی کام کیا ہے۔ وہ مستقل مزاجی اور لگن سے کام کرتے ہیں۔ اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔ تحقیق و تحریر میں بتلا رہنے والوں کو بھی یہ بات ایک مرتبہ چونکا دے گی کہ کسی نے تن تنہا پاکستان کی 70 برسوں کی سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشی تاریخ کو ایک دستاویزی صورت دی ہے۔ تقریباً گیارہ سو صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی اس کتاب کو اس قدر دقتِ نظری کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کہ گمان گزرتا ہے کہ شاید کسی بڑے حکومتی ادارے نے، بڑی ٹیم کے ساتھ، ایک معرکہ سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں پیرس کی مشہور شاہراہ شانزے لیزے کا 1901ء کا ایک منظر ہے۔ بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گرافی کی اس شاہکار تصویر میں پورے یورپی معاشرے کو اپنی تمام تر تفاصیل کے ساتھ محفوظ کیا گیا تھا۔ کتاب کے اختتام پر 1990ء کے شانزے لیزے کی تصویر ہے۔ ان دو تصویروں کے درمیان ایک ہمہ گیر انقلاب کی داستان رقم ہے جو خصوصاً ادارت کا ایک

کارنامہ ہے۔ چند طویل مضامین کے علاوہ، جو عموماً سگمنڈ فرائیڈ، آئن سٹائن جیسے لوگوں پر لکھے گئے، بیشتر مواد بہت مہارت سے کم از کم الفاظ میں لکھا گیا اور اسے نادر و نایاب تصاویر سے مزین کیا گیا۔ مہاتما گاندھی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح پر بھی مضامین تحریر کیے گئے۔ ہندوستان کی آزادی، فسادات جیسے واقعات بھی اس میں شامل ہوئے اور سوویت روس کے خلاف جہاد افغانستان میں پاکستان کے فرنٹ لائن سٹیٹ کے کردار پر بھی بات ہوئی۔ انتہائی دیدہ زیب کاغذ پر چھاپی گئی اس کتاب کے تمام صفحات رنگین ہیں۔ رنگوں نے اور رنگوں کے امتزاج نے مدیروں اور ناشروں کی بہت مدد بھی کی۔ عقیل عباس جعفری کا کہنا ہے کہ علم دشمن معاشرے میں علم دوستی کا مہنگا اور خطرناک شوق پالنے والوں کو اپنے ذاتی تجربوں کی روشنی میں فوراً سمجھ آ جاتی ہے کہ جن مراحل کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے، جن رویوں کا اشارتاً ذکر کیا گیا ہے، وہ کس قدر جان لیوا ہوں گے۔ پاکستان میں ایک محقق کی لگن، عزت نفس اور قوت ارادی کو بہت کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عقیل عباس جعفری نے 1990ء میں پاکستان ٹیلی وژن کی معلوماتی سیریز "سات دن" سے اپنے تحقیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔ موجودہ کتاب کی ایک اہم خصوصیت نادر تصاویر ہیں۔ عطیہ فیضی کی تصویر اور ان کی والدہ امیر النساء کے چہرے سے کم ہی لوگ آشنا تھے ۔ اس کتاب میں پاکستان کی اردو، پنجابی، گجراتی اور سرائیکی فلموں

کے نادر اشتہارات شائع کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں جو ہماری اجتماعی سیاسی یادداشت کا حصہ ہیں۔

اس قدر ضخیم کتاب پڑھتے ہوئے اگر بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے کسی نوعیت کی ذاتی رائے زنی اور تعصب سے الگ رکھا گیا ہے۔ چونکہ جعفری صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں لہٰذا یہ غالب طور پر پاکستان کی ثقافتی، علمی، ادبی تاریخ بن گئی ہے۔ سیاسی زندگی کے تمام تر اہم اور کم اہم واقعات بیان کرنے کے باوجود اس کا ثقافتی پہلو غالب رکھنا ادارت کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ تمام تر اہم اخبارات و جرائد کے اجرا، بندش یا خاتمہ کی تفصیل موجود ہے۔ اہم ادبی، علمی شخصیات کے مختصر لیکن مربوط پروفائل دیے گئے ہیں، تمام تر سرکاری اور غیر سرکاری ایوارڈ (آدم جی، نگار ایوارڈ وغیرہ) کی تفاصیل موجود ہیں اور بیشتر اہم کتابوں کے سرورق دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں آپ کو پاکستان کی فلم انڈسٹری، شاعری، ڈرامہ، ٹیلی وژن، ریڈیو پاکستان وغیرہ کا پورا سفر نظر آئے گا۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے پہلا تعجب یہی ہوتا ہے کہ ایک شخص نے تن تنہا یہ کام کیسے سرانجام دے دیا، لیکن کچھ دیر کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اردو علم و ادب کی تاریخ میں عقیل عباس جعفری ایک تازہ اضافہ ہے، ورنہ اس نوعیت کے اہلِ جنوں ہمارے ہاں ہمیشہ سے رہے ہیں۔ بہت سے نام ذہن میں آتے ہیں۔ سبط حسن اور علی عباس جلالپوری جیسے محقق جنھوں نے تن

تنہا اپنے زمانے کے فکری مزاج کو ڈھالنے میں ایک لازوال کردار ادا کیا۔ انصاری جیسا مترجم جو ناقابل یقین کام کر گیا۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی، عین الحق فرید کوٹی، حسن عسکری، آصف خان، محمد طفیل اور سید قاسم محمود جیسے ان تھک لکھاری جو اپنی لگن میں بڑا علمی سرمایہ چھوڑ گئے۔ کے کے عزیز کے بارے میں کیا کہیے؟ زاہد چوہدری، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر اقبال احمد، اختر احسن اور عزیز صدیقی اور ستار طاہر کو کن الفاظ میں یاد کیا جائے؟ شفقت تنویر مرزا، احمد سلیم اور ڈاکٹر مبارک علی ایسی ہی لگن کے ساتھ علمی اور تحقیقی کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔

عقیل عباس جعفری کی یہ کاوش اپنے وطن کے لیے، وطن سے محبت کرنے والی اور اس کے روشن اور تابناک مستقبل کا خواب دیکھنے والی نسل کے ایک تحفہ ہے۔

افغانستان میں ایک کھرب ڈالر کی معدنیات کا انکشاف

امریکہ اب افغانستان سے نہیں جائے گا۔ کیونکہ اب تک اس نے افغانستان میں جو سرمایہ کاری کی تھی اس کے نتائج آنا شروع ہو گئے ہیں۔ افغانستان میں ایسے معدنی ذخائر کا سراغ لگایا گیا ہے۔ جو امریکہ کے اب تک ہونے والے سارے نقصانات کا ازالہ کر دے گا۔ یہ ذخائر اب سے پہلے معلوم نہیں ہوئے تھے۔ خیال یہ ہے کہ ان ذخائر سے افغان معیشت کو تبدیل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ ان ذخائر کی مالیت کا اندازہ 1 ٹریلین امریکی ڈالر کا ہے۔ افغانستان میں معدنی ذخیرے کی تلاش کا کام خاصے عرصے سے جاری تھا۔ امریکی حکام کے مطابق اس ذخیرے میں لوہا، تانبا، کوبالٹ، سونے اور لیتھیم جیسے اہم صنعتی دھاتیں بہت بڑی مقدار میں ہیں اور بہت سی ایسی معدنیات بھی ہیں جو جدید صنعت کے لئے ضروری ہیں۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ بالآخر افغانستان کان کنی میں سب سے زیادہ اہم ملکوں میں سے ایک میں ہو سکتا ہے۔پینٹا گون کی ایک خفیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ افغانستان میں پتہ چلنے والے ذخائر میں لیتھیم جیسی قیمتی دھات ہے جو، " لیپ ٹاپ اور BlackBerrys کے لئے بیٹری کی تعمیر میں اہم خام مال. کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ افغانستان کے معدنی دولت کے وسیع پیمانے پر ملنے کی رپورٹ پر پینٹا گون اور امریکی حکام اور امریکی ارضیات کے ماہر خوشی سے جھوم اٹھے ہیں۔

اس بارے میں افغان حکومت اور صدر حامد کرزئی کو بھی اعتماد میں لیا گیا ہے۔
افغانستان میں حکام کا کہنا ہے کہ امریکی اداروں کے مطابق ملک میں معدنیات کے ذخائر کی مالیت ایک کھرب ڈالر تک ہو سکتی ہے۔ افغانستان میں ایک چینی کمپنی کی مدد سے تانبہ نکالنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔پینٹاگون، امریکی ارضیاتی سروس اور امریکی امدادی تنظیم یو ایس ایڈ کے اندازے کے مطابق افغانستان میں معدنیات کے ذخائر کی مالیت کم از کم نو سو ارب ڈالر کے قریب ہے۔ امریکہ کے جیولوجیکل سروے کے مطابق ان معدنیات میں بڑی مقدار میں لوہے اور تانبے کے ساتھ ساتھ قیمتی لیتھیم کے ذخائر شامل ہیں۔ افغانستان کی وزارتِ معدنیات کے ترجمان جواد عمر کا کہنا ہے کہ وہ ملک میں معدنیات کی اصل مالیت کے بارے میں تو نہیں بتا سکتے ہیں لیکن اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ملک کی ترقی میں یہ اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اگر معدنیات کو نکالا جاتا ہے تو افغانستان خود کفیل ہو سکتا ہے، اور اسے کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سروے سے حاصل ہونے والے نتائج کے مطابق ملک میں موجود معدنیات کی مالیت ایک کھرب ڈالر ہے۔ ملک میں موجود تمام معدنیات کا سروے نہیں کیا گیا لیکن جو بھی دریافت ہوئیں ان کی مالیت ایک کھرب ڈالر ہے۔ صدر حامد کرزئی کے ترجمان وحید عمر کا کہنا ہے کہ سروے سے حاصل ہونے والے نتائج کے مطابق ملک میں موجود معدنیات کی مالیت ایک کھرب ڈالر ہے۔ ملک میں موجود تمام معدنیات کا سروے نہیں کیا گیا لیکن جو بھی دریافت ہوئیں ان کی مالیت

ایک کھرب ڈالر ہے۔ تاہم یہ سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ اس وقت یہ معلومات منظر عام پر کیوں لائی گئی ہیں۔ امریکہ کے جیولوجیکل سروس نے افغانستان میں موجود معدنیات کے ذخائر کے متعلق سال دو ہزار سات میں رپوٹ جاری کی تھی۔ امریکہ نے گزشتہ سال دسمبر میں ان معدنیات کی مالیت کا اندازہ لگایا تھا۔ اس کے بعد جون چودہ کو ایک کھرب مالیت کی معدنیات کی رپورٹ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئی تھی۔ بی بی سی کے جل میگکڈ رنگ کا کہنا ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب افغانستان اور وہاں قائم حکومت کی تنہائی میں اضافہ ہو رہا ہے، یہ ظاہر کرنا کہ افغانستان میں بڑی تعداد میں سونے کے ذخائر موجود ہیں، افغانستان کے مسئلے کے بین الاقوامی حل اور جنگ سے متاثر ملک کو قیمتی انعام دینا ہو سکتا ہے۔' دریافت ہونے والے ذخائر میں لیتھیم بھی شامل ہے جو موبائل فون سے لیکر لیپ ٹاپ کی بیٹری میں استعمال ہوتا ہے اور اس کی مستقبل میں گاڑیوں کی بیٹریوں میں استعمال ہوگا۔ لوہا: چار سو اکیس ارب ڈالر، تانبہ: ستائیس ارب ڈالر، کوبالٹ: اکیاون ارب ڈالر، گولڈ: پچیس ارب ڈالر، اس وقت بولیویا کے پاس لیتھیم کے سب سے زیادہ ذخائر ہیں۔ اس کے علاوہ افغانستان میں نیوبئیم کے ذخائر بھی موجود ہیں جو سٹیل کو مزید مضبوط کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔ معدنیات کی دریافت امریکی ارضیاتی سروس نے افغان حکومت کے ساتھ مل کر کی ہے۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز نے پینٹاگون کے حوالے سے بتایا ہے کہ ' افغانستان لیتھیم کا سعودی عرب' بن سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہی

افغان صوبے لوغر میں ایک چینی کمپنی کی مدد تانبے کے ذخائر نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ معدنیات کو زمین سے نکالنے کے لیے ایک بڑے پیانے پر معدنیات کی صعنت لگانے کے لیے کئی سال درکار ہونگے اور ایسا کرنے کے لیے امن کا موجود ہونا لازمی ہے، سرمایہ داروں کو سکیورٹی ضمانت دینا مشکل ہو گا۔ بی بی سی کے نامہ نگار کا کہنا ہے کہ افغانستان نے معدنیات کی دریافت کا خیر مقدم کیا ہے کیونکہ اسے شدت سے ترقی کی ضرورت ہے، لیکن معدنیات کی دریافت مسئلے کا راتوں رات حل نہیں
ہے۔ 'معدنیات کو زمین سے نکالنے کے لیے ایک بڑے پیانے پر معدنیات کی صعنت لگانے کے لیے کئی سال درکار ہونگے اور ایسا کرنے کے لیے امن کا موجود ہونا لازمی ہے، سرمایہ داروں کو سکیورٹی ضمانت دینا مشکل ہو گا۔ نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اگر افغانستان کی سٹریٹجک اہمیت بڑھتی ہے تو افغانستان میں امریکہ سمیت خطے کے ممالک چین اور بھارت اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ سینٹر فار سٹریٹیجک اینڈ انٹرنیشنل سٹڈی میں سینئر ریسرچ فیلو سٹفیفن سانوک کا کہنا ہے کہ افغانستان میں معدنیات نکالنا آسان کام نہیں ہے۔' ان کے خیال میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ افغانستان جیسے ملک میں جہاں فوجی کارروائی چل رہی ہے وہاں سے ایسی معدنیات کو نکالا جا سکے۔' انھوں نے کہا کہ 'افغانستان میں نہ صرف مواصلات کا بنیادی ڈھانچہ موجود نہیں بلکہ ان کے پاس قوانین بھی نہیں جو سرمایہ داروں کو راغب کر سکیں،
روزگار کے لیے یہ ایک بڑا موقع ہے جس کی

مدد سے ایک لمبے عرصے تک شدت پسندی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

دوست اور دشمن کی پہچان

پاکستان میں ایک غریب آدمی کے پاس فریاد کرنے کے لئے مزارات اور آستانے ہی رہ گئے ہیں۔ جہاں دنیا سے ٹھکرائے ہوئے، مشکلات، پریشانیوں سے چور، الم رسیدہ افراد ڈیرہ ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لوگ آزادی سے اپنے دکھ اور غم کی بپتا سناتے ہیں، فریاد کرتے ہیں۔ مرادیں مانگتے ہیں۔خ وشیاں ہوں یا غم ان مزارت اور بزرگوں کے خانقاہیں ہمشہ پر رونق رہتی ہیں۔ یہاں پڑاؤ کرنے والوں کو کبھی کھانے کی فکر نہیں ہوتی۔ نہ ہی کسی آستانے پر کوئی بھوکا سوتا ہے۔ حضرت سید ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی الھجویری ثم لاہوری معروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا مزار بھی ان مراکز میں سے ایک ہے جہاں لوگ سکون کی تلاش میں جاتے ہیں۔ لیکن اب مزارات پر سیکورٹی کے نام پر ان غریبوں اور بے مکان لوگوں کو تنگ کیا جاتا ہے۔ داتا گنج بخش کا زمانہ (400ھ تا 465ھ / 1009ء تا 1079ئ) کا ہے۔ ہجویر اور جلاب غزنین کے دوگاؤ ں ہیں شروع میں آپ کا قیام یہیں رہا اس لیے ہجویری اور جلابی کہلائے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔
روحانی تعلیم جنیدیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ سے پائی۔ مرشد کے حکم سے 1039ء میں لاہور پہنچے۔ اور یہیں کے ہو رہے، کشف المحجوب آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ لاہور میں بھاٹی دروازہ کے

باہر آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ لاہور جانے والے داتا دربار پر حاضری ضرور دیتے ہیں۔ عوام آپ کو گنج بخش (خزانے بخشنے والا) اور داتا صاحب کہتے ہیں ایک ہزار سال سے داتا دربار لاہور، عوام کے لئے کھلا ہوا ہے۔ لیکن داتا دربار پر جو دہشتگردی کا واقعہ پیش آیا ہے۔ اس پر ہر آنکھ نم اور ہر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ پہلے مساجد پر دہشت گردی کے حملے ہوئے اور مساجد کو تالے لگا دیئے گئے۔ اب مساجد نماز کے اوقات پر کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ اب کوئی مسافر مسجد میں شب نہیں گزار سکتا۔ کیا اب مزارات اور آستانے بھی اس کڑے وقت سے گزرنے والے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو لاکھوں غریب بے موت مر جائیں گے۔ یہ مزار اور خانقاہیں غریبوں کی لائف لائن ہیں۔ سیاست دانوں نے اس انسانی المیئے کو بھی اپنی سیاست کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ سیاست ہی کہ شعبدہ بازیاں ہیں۔ جنھوں نے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے۔ ہمیں ایک بار پھر سوچنا چاہئے کہ ہم یہ جنگ کس کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ بھوک سے بلکتے، اور خودکشیوں کے سیلاب میں کیا ہم اپنے عوام کو وہ کچھ دے رہے ہیں جس کے وہ متمنی ہیں۔ ہم نے سارے وسائل دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جھونک دیئے ہیں۔ پورا ملک میدان جنگ بنا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے ہاتھ میں اس دہشت گردی کا سرا نہیں آ رہا۔ ہماری انٹیلیجنس، ہمارے دعویٰ اور ہماری تحقیقات ایک ڈھونگ، اور پبلیسٹی انسٹنٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حکومتِ نے ایک بار پھر دہشتگردی سے نمٹنے کی کوششوں پر بات چیت کے لیے آئندہ ہفتے قومی کانفرنس بلانے کا اعلان

کیا ہے۔ کانفرنس کی تجویز مسلم لیگ (ن) کے قائد میاں نواز شریف نے دی ہے۔

انہوں نے پھر اس بات کو دہرایا ہے کہ حکومت طالبان سے بات چیت کرے وہ کہتے ہیں کہ پنجاب حکومت ریت میں سر ڈال کر خطرہ نہیں ٹال سکتی' مسلم لیگ نون کے قائد کا کہنا ہے کہ اس قومی کانفرنس میں فوج اور سکیورٹی اداروں کی رائے بھی لی جائے۔

گزشتہ برس سوات اور قبائلی علاقہ جات میں آپریشن سے قبل بھی ایک کل جماعتی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں سیاسی جماعتوں کی قیادت کو اس کاروائی کے حوالے سے اعتماد میں لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ کیا ہم نے اس بات چیت کو آگے بڑھایا۔ ملک کے موجودہ حالات ایک سیاسی عزم چاہتے ہیں۔ جس پر ہمیں تمام سیاسی حلقوں کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ اس کے بغیر دہشت گردی کے خلاف کوئی حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چھ سال سے ملک دہشت گردی کی زد میں ہے لیکن اتنا عرصے گزرنے کے باوجود حکومت انتہا پسندی کی روک تھام اور اس کے انسداد میں ناکام رہی ہے۔ اس کے بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک طے نہیں کرسکے کہ ہمارا دوست کون ہے اور ہمارا دشمن کون ہے۔

ریلوے کی کہانی سنتا جا شرماتا جا

کراچی سٹی ریلوے اسٹیشن کی پٹریاں ٹرینوں کے انتظار میں خاموشی سے راستہ تکتی ہیں۔ لیکن ویران اور اجاڑ پلیٹ فارم پر ماضی کی کوئی رونق نظر نہیں آتی۔.برصغیر میں ٹرین لانے کے لئے انگریز نے بڑی جدوجہد کی، سرمایہ لگایا، اور اس سستے وسیلہ سفر کو عام کیا۔ پاکستان کی تباہی میں ریلوے کا ہاتھ زیادہ ہے یا واپڈا کا۔ کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ان دو اداروں میں جو لوٹ مار کی گئی ہے اور اداروں کو تباہ وبرباد کردیا گیا ہے اس کے اثرات اور مضمرات پوری قوم کو.برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ ریلوے کی وزارت ان چار وزارت میں سے ایک ہے جسے اربوں روپے کے فنڈز دیئے گئے۔ لیکن اس پیالے کے پیندے میں سوراخ ہے جو اسے کبھی بھرنے نہیں دیتا۔ عوام ریلوے حکام کو اپنی شکایات سنائیں تو ہمارے وزیر مملکت.برائے ریلوے فقیر جادم منگریو انہیں ٹرین میں سفر کے دوران درود شریف پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس ملک کے عوام کا اللہ سے ایک رشتہ خاص ہے۔ یہ اپنے حکمرانوں کی بداعمالیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اور اس پر جس شکر اور صبر کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اسی کے طفیل یہ گاڑی چل رہی ہے۔ ریلوے کا خستہ حال ٹریک بہت پرانا ہوچکا ہے، ٹرینوں اور پٹریوں کی حالت نہایت خراب ہے۔ آئے دن حادثات اور انکوائریاں ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ اس غریب

محکمے پر دو دو وزیروں کا بوجھ ہے۔ ریلوے کی کراچی سے میر پور خاص تک کی سینکڑوں ایکڑ اراضی کو غیر قانونی طور پر فروخت کر دیا گیا یا پھر اس پر قبضہ کر کے کرپٹ افسران نے اپنے لوگ بٹھا دیئے ہیں۔ یہ اتنی مالیت کی ہے کہ اس سے ریلوے کو نیا وجود دیا جاسکتا ہے۔ پاکستان ریلوے ایک ایسا ادارہ ہے جو تمام تر مساعد اور زبوں حالی کے باوجود عوام کو ایک آرام دہ اور سستا سفر اور مال.برداری کے انتہائی کم قیمت پر فرائض سرانجام دے سکتا ہے۔ لیکن حکمرانوں اور بیورو کریسی کی لوٹ مار کی وجہ سے یہ ادارے تباہ حال ہیں۔ حکمرانوں کی نااہلیوں اور بیورو کریسی کی بے ایمانیوں نے اس ادارے کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ مزدور کہتے ہیں کہ اگر ریلوے کو مزدوروں کے جمہوری کنٹرول میں دے دیا جائے تو چھ ماہ سے ایک سال کے مختصر ترین عرصے میں اس کو منافع بخش ادارہ بنایا جاسکتا ہے۔ پاکستان ریلوے میں انیس سو اٹھتر کے بعد یکے بعد دیگر اقتصادی جھٹکے دیئے گئے۔ انیس سو چھہتر کے آخر میں پاکستان ریلوے کیرج فیکٹری اسلام آباد کا ایک معاہدہ بنگلہ دیش ریلوے کے ساتھ کیا گیا۔ جس میں کیرج فیکٹری کو ایک سو پچاس کوچز بنا کر بنگلہ دیش کو دینی تھیں۔ جس پر عمل درآمد انیس سو ستتر میں ہوا۔ اور بیس کوچز بنگلہ دیش کو دی گئیں اور جب ضیاء الحق آمریت ملک پر مسلط ہوئی تو ریلوے کی بد عنوان اور نااہل بیورو کریسی نے گھپلے کرنا شروع کر دیئے جس کی وجہ سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ پھر مشرف آمریت میں تمام مزدور دشمن اقدامات کئے گئے۔ فوجی حکومت اور کمیشن

مافیہ نے مل کر ریلوے کیرج فیکٹری کو دیوالیہ کرنے کے اقدامات کئے۔ بجائے فیکٹری کو خام مال مہیا کرنے کے جس کی وجہ سے فیکٹری اپنی پیداواری صلاحیت کو بڑھائے اور اس فیکٹری میں کام کرنے والے تقریباً تین ہزار پانچ سو محنت کشوں کو فائدہ پہنچتا اور ادارے کو بھی فائدہ ہوتا۔ اس کے برعکس چین سے ایک معاہدہ کوچز خریدنے کا کیا گیا جس کی وجہ سے اربوں کا نقصان ہوا اور کروڑوں روپے کا کمیشن کھایا گیا۔ ریل کا محنت کش انتہائی کسمپرسی کی حالت میں مبتلا ہے۔ تنخواہ کم اور ڈیوٹی 12 گھنٹے کرنی پڑتی ہے۔ ادارے میں مسلسل ڈاؤن سائزنگ کی جارہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لگ بھگ ڈیڑھ ارب روپے ماہانہ خسارے پر چلنے والا سرکاری ادارہ پاکستان ریلوے پینسٹھ ارب روپے کا مقروض ہونے کے بعد دیوالیہ ہو چکا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ قومی خزانے پر بوجھ اس ادارے نے بھاری شرح سود پر مزید 21 ارب روپے کا قرض لے لیا ہے اس رقم سے پاکستان ریلوے چین سے نئے انجن اور بوگیاں خریدے گا۔ ریلوے کی کہانی کرپشن' غیر ذمہ داری' اقربا پروری اور سیاسی نوازشات کی ایسی عجیب کہانی ہے جس کا ہر لفظ حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ تین عشرے قبل پاکستان ریلوے منافع بخش ادارہ تو نہ تھا لیکن ملک بھر کے عوام بسوں اور ویگنوں میں سفر کرنے کی بجائے ٹرین میں سفر کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور پلیٹ فارمز پر ہر وقت عوام کا رش رہتا تھا۔ لیکن اب اس کی سروس کئی علاقوں میں بند کر دی گئی ہے۔۔ وہ علاقے جن میں ریلوے نے اپنی سروس بند کر دی تھی' ریلوے حکام نے ان علاقوں

سے ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ کر بیچنی شروع کر دیں۔ ملک میں جب بھی کوئی حکومت تبدیل ہوئی تو نئی آنے والی حکومت نے اپنے لاڈلوں اور چہیتوں کو ریلوے میں بھرتی کرانا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے نالائق اور کام چور افراد ریلوے میں بھرتی کئے جاتے رہے اور محکمانہ خسارے کا باعث بنتے رہے۔ اس وقت بھی ریلوے پر بھرتیوں کے لئے زبردست دباؤ ہے۔ ہر روز ہزاروں افراد بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ کرپشن عام ہے۔ مشرف دور میں ریلوے کے خسارے سے تنگ آکر اس کی نجکاری کی بات بھی چلتی رہی لیکن پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر یہ ادارہ نجی تحویل میں نہ دیا جاسکا اور ایک نئی گیم شروع کر دی گئی کہ اگر چین سے نئے انجن اور نئی بوگیاں خرید لی جائیں تو معاملات کو درست کیا جاسکتا ہے اس حوالے سے مشرف دور میں ایک عجیب لطیفہ بھی ہوا چین سے انجن اور بوگیاں منگوالی گئیں اور پاکستان پہنچنے پر پتہ چلا کہ یہ پاکستانی ریلوے لائن کے حساب سے زیادہ چوڑی ہیں۔ کیا پاکستان انہی لطائف کے لیئے بنا تھا۔

موج خوں سر سے گزر جانے سے پہلے

کیا یوم آزادی عافیہ کی رہائی کا پیغام لائے گا

وہ امریکہ کے باطل نظام کے لئے خطرہ ہے۔ وہ مظلومیت کی تصویر، وہ جبر، ظلم،اور ناانصافی کے خلاف جدو جہد کی ایک علامت ہے۔ اس کا نام ڈاکٹر عافیہ ہے۔ جسے اس ملک کے بردہ فروش حکمرانوں نے ڈالرز کے عوض بیچ دیا۔ ایک ڈاکٹر عافیہ پر کیا موقوف ہے، دہشت گردی کے نام پر کتنے نوجوان، کتنے بچے، عورتیں، بہن بیٹیاں اور مائیں غائب کردی گئی ہیں،انسانی حقوق کی حفاظت کا نعرہ بلند کرنے والی امریکی حکومت نے اس دور میں جس طرح انسانی حقوق کو پائمال کیا، انھیں پیروں تلے روندا، اور عالمی انسانی حقوق کے چارٹر کی جس طرح دھجیاں بکھیری ہیں، وہ ساری دنیا مہربلب دیکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ امریکی نظام کے خلاف تھی، ہر چند کہ اس نے کبھی اس نظام کے خلاف مسلح جدو جہد کا راستہ نہیں اختیار کیا۔ لیکن وہ اسلام کی حقانیت کی پرزور مبلغ رہی، وہ حافظہ قرآن ہے، قرآن اس کے سینے میں دفن ہے۔ ڈاکٹر عافیہ جسے قیدی نمبر 650کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کومسلسل تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ بگرام جیل میں ان کے چیخنے کی آوازیں دور دور تک آتی تھیں جہاں ان پر جسمانی تشدد کے ساتھ ساتھ جنسی تشدد

بھی کیا جاتا تھا۔ یہ برطانوی صحافی ایوان ریڈلی تھی۔ جس نے ڈاکٹر عافیہ کے کیس کو ساری دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے دنیا کو بتایا کہ عافیہ صدیقی کو کس طرح مردوں کے بیت الخلاء استعمال کرنے پر مجبور کیا جاتا جہاں پردے کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ آج بھی ہیومن رائٹس اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی شہادتیں موجود ہیں کہ عافیہ پر انتہا درجہ کا تشدد کیا جاتا رہا ہے۔ آج عافیہ کی ناک ٹوٹی ہوئی ہے، دانت ٹوٹ چکے ہیں، دل سے ایک انچ نیچے اسے گولی ماری گئی۔ لیکن وہ آج بھی زندہ ہے۔ یوآن ریڈلی کہتی ہے کہ، ڈاکٹر عافیہ پر لگائے گئے امریکی الزامات دنیا کی کسی بھی عدالت میں ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور یہ سب جھوٹ سے گھڑے ہوئے ہیں، ۔ گوانتانا موبے سے رہا ہونے والے معظم بیگ نے اپنی کتاب میں جو سنسنی خیز انکشاف کیے ہیں۔ وہ رونگھٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے مطابق عافیہ صدیقی شاید جسمانی و جنسی تشدد برداشت کرتے کرتے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہیں۔ لیکن امریکہ اب بھی عافیہ کو قید کئے ہوئے ہے۔ وہ دراصل مسلمان نوجوانوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ عافیہ کی طرح امریکہ کسی بھی مسلمان نوجوان کو عبرت کی تصویر بنا سکتا ہے۔ عافیہ صدیقی فروری 2003ء کو پاکستان آئیں تھیں۔ وہ پاکستانی شہری ہیں۔ انھوں نے کبھی امریکی شہریت کے لئے درخواست نہیں دی۔ انھوں نے امریکہ میں میاچوسٹس یونی ورسٹی ہوسٹن سے نیورلوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ 30 مارچ 2003ء کو وہ اپنے تین بچوں جن کی عمریں اس وقت 6 ماہ 4 سال اور 9 سال کے درمیان ہوگی

کراچی سے اسلام آباد جانے کے لیے یلو کیب میں روانہ ہوئیں مگر اس کے بعد ان کا کہیں پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں اور ان کے معصوم معصوم بچے کس کی تحویل میں ہیں۔ ان کی والدہ اور گھر والوں کو دھمکی دی گئی کہ وہ اس کا تذکرہ نہ کریں۔ یہاں تک کہ میں برطانوی صحافی نے یہ خبر بریک کی۔ یہ ایک آمر کے زوال کے دن تھے۔ ۲۰۰۷ اور پھر بردہ فروش ٹولے کے رخصت ہونے کے بعد امریکی عدالت نے ایک ڈھونگ رچا۔ امریکہ میں ڈاکٹر عافیہ پر مقدمے کا کوئی قانونی جواز نہ امریکہ کے قانون میں ہے نہ بین الاقوامی قانون میں ہے۔ وہ ظلم نا انصافی اور حکمرانوں کی بے حسی کا شکار ہیں، ہیومین نیٹ ورک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ڈاکٹر عافیہ کی رہائی کے لئے ہر سطح پر کوشش کی عدالتوں، مظاہروں، پریس کانفرنس، ریلی، مزاکرے، یاداشتیں، اور اس سب کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا میں ڈاکٹر عافیہ کو ایک مظلوم عورت کے طور پر جانا جاتا ہے، اب اس مقدمے کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے، ہیومین رائٹ نیٹ ورک نے عافیہ رہائی کمیٹی تشکیل دی ہے۔ جس کی جانب سے یکم اگست اتوار کو سفاری پارک سے نیپا تک ایک فیملی واک کا اہتمام کیا گیا ہے۔ گلشن اقبال میں اس ریلی کا مقصد بھی اس خاندان سے اظہار یکجہتی کرنا ہے۔ جو گلشن میں رہائش پذیر ہے۔ ڈاکٹر عافیہ کی رہائی کے لئے کوشش کرنا ہماری ملی اور قومی ذمہ داری ہے، مفتی رفیع عثمانی مفتی اعظم پاکستان کا کہنا ہے کہ عافیہ ہماری معصوم بیٹی ہے۔ جو بے ضمیر پاکستانی حکمرانوں کی بے حسی کی وجہ سے امریکہ

کے ظلم کا شکار ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عافیہ کو فوری واپس لائے۔ عوامی جمہوری حکومت کے دور میں عافیہ کے دو بچے واپس آ چکے ہیں۔ اگر اس وقت عافیہ کی رہائی کے لئے حکومت سنجیدہ کوشش کرے تو یہ اس کی نیک نامی میں اضافہ کر سکتی ہے۔ نعیم الدین نعیم نے عافیہ کے بارے میں اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کیا ہے اور ہیومین رائٹ نیٹ ورک نے اے غیرت مسلم جاگ کے نام سے مظلوم عافیہ کے لئے ترانے کی سی ڈی شائع کی ہے۔ جسے خالد جمال نے بڑی محنت سے پروڈیوس کیا ہے۔ نعیم احمد نعیم کے اشعار ہیں

مسندوں پر غلام بیٹھے ہیں۔ راستوں پر عوام بیٹھے ہیں
ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے مظلوم۔ منبروں پر امام بیٹھے ہیں
ظلم کی انتہا ہے، لب بستہ۔ سر جھکائے تمام بیٹھے ہیں

ساری امیدیں ختم ہوئیں------

زندگی کے راستے کتنے کٹھن اور جاں لیوا ہیں۔ دشت کی آبلہ پائی میں زخم روح کے ناسور بن جاتے ہیں۔ ایک امید کا سہارا تھا کہ کچھ جانیں بچ جائیں گی۔ لیکن رات گئے کائرہ صاحب کی پریس کانفرنس نے یہ امید بھی ختم کردی۔ جائے حادثہ کے مناظر ہولناک تھے۔ حادثے کے بعد سوائے آگ کی راکھ، جسموں کے ٹکڑے،کے کچھ بھی نہ بچا۔ انسان فانی ہے۔ موت کے سو بہانے ہوتے ہیں۔ مرنے والے مر جاتے ہیں۔ اور جانے والوں کی صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ اسلام آباد میں طیارے کے حادثے میں جاں بحق ہونے والے مسافروں میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ کراچی سے اسلام آباد تک کا سفر ان کی زندگی کا آخری سفر ہوگا۔ آج جانے کیوں مجھے چھ جولائی ۱۹۷۴ یاد آرہی ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی اجتماعی سانحہ تھا۔ سٹی کالج حیدرآباد کے طلبہ سالانہ ٹور پر مری گئے تھے۔ جہاں ان کی بس نتھیاگلی سے ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر گئی تھی۔ ۴۵ نوجواں طالب علم اس حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ تین دن تک ہم حیدرآباد کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے رہے، رات کو نیند نہیں آتی تھی، سارے دوست یاد آتے تھے۔ حیدرآباد ائیرپورٹ پر ۴۵ جنازے قطار سے رکھے ہوئے تھے۔ میرے ہوش میں یہ پہلا اجتماعی حادثہ تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دور بھی پاکستان پیپلز پارٹی کا تھا۔ بھٹو صاحب کی

حکومت تھی، یہ بھی جولائی کا مہینہ ہے، بہت سا وقت گزر گیا ہے۔ لیکن اب بھی پیپلز پارٹی کی حکومت ہے۔ نجانے یہ اتفاق ہے کہ قدرت کی جانب سے کوئی انتباہ۔ بعض اوقات قوموں کو اجتماعی غلطیوں پر ایسی ہی سزا دی جاتی ہیں۔ قدرت کی مصلحتوں کے اشارے ہوتے ہیں، سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاز کے ملبے سے ایک سے ایک اندوہناک کہانی نکل رہی ہے اور طرح طرح کے سوالات اٹھ رہے ہیں۔ اپنی نوعیت کا یہ انوکھا سانحہ اس وقت پیش آیا جب ملک کے گوشے گوشے میں لوگ شبِ برات کی مقدس شب میں عبادت کرکے دعاؤں سے فارغ ہوئے تھے۔ ایک ایک مسافر اپنے پیچھے کئی کئی کہانیاں چھوڑ گیا۔ مارگلہ کی پہاڑیاں، جہاں لوگ خوشیاں حاصل کرنے جاتے ہیں،ان مسافروں کی ابدی آرام گاہ بن گئی ہے۔ غلام عباس کی بیٹی مائیوں بیٹھی تھی۔ دلہن کی سہیلیاں اور خاندان والے مہندی سجانے میں مصروف تھے۔ غلام عباس صاحب شادی کی مصروفیات میں سے چند گھنٹوں کا وقت نکال کر کچھ دفتری امور کو نمٹانے کے لیے اسلام آباد گئے تھے۔ ان کی بیٹی رخصتی کے لئے باپ کا انتظار کر رہی ہے۔ گلشن اقبال کا وہ نو بیاہتا جوڑا جس کی صرف چار روز قبل 23 جولائی کو شادی ہوئی تھی اور جو ہنی مون منانے کے لئے اسلام آباد گیا تھا۔اس کے والدین اور دیگر رشتہ داروں اب بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنی پلکوں پر خواب سجائے رخصت ہونے والے یوتھ پارلیمنٹ کے چھ دوستوں کا ان کے دوست اور احباب ہمیشہ انتظار کرتے رہیں گے۔ آنکھوں سے سے مسلسل آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔

برسات تو تھم گئی لیکن آنسوؤں کی یہ برسات یونہی جاری رہے گی۔ فضائی حادثے میں پائلٹ سمیت عملے کے تمام ارکان جاں بحق ہوگئے ہیں۔ کیپٹن پرویز اقبال چوہدری فرسٹ آفیسر مجتبیٰ دین، ایئر ہوسٹس حنا عثمان، ام حبیبہ اور جویریہ فراز کو ان کے اہل خانہ اور ساتھی ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔ یہ رقت آمیز مناظر، غم سے نڈھال والدین اور عزیز واقارب و لواحقین، جانے ان سب کو کب صبر آئے گا۔ حادثے کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جارہا ہے۔ تخریب کاری، حادثہ یا انسانی غلطی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ "بلیک باکس" کی تلاش سے کیا ہوگا۔ اندازے اندازے اور امکانات۔ کیا کوئی ایسی رپورٹ منظر عام پر آئے گی۔ جس میں ذمہ داروں کا تعین ہو۔ آئندہ ایسی غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ آج قومی سوگ ہے۔ تمام سرکاری عمارتوں پر قومی پرچم سرنگوں ہے۔ اس حادثے سے انسانی محبت اور خلوص کے بہت سے پہلو بھی ہیں۔ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے فضائی حادثے کی تحقیقات کے لیے پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی ہے۔ جس نے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ کمیٹی کو کام کرتے ہوئے ٹی وی چینلز کے مختلف پروگراموں کی ویڈیو بھی دیکھنی چاہیے جس میں مختلف ماہرین نے جو کچھ کہا ہے اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ شاید اس سے کوئی مدد مل سکے۔

قائد اعظم تیرا احسان ہے احسان

قوت ارادی

قائد اعظم بے پناہ قوت ارادی کے مالک تھے۔ وہ مجمع کو دیکھ کر بھی اپنے اصولی مؤقف سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ کانپور کے اجلاس میں مسلم لیگ اور کانگریس کے راستے جدا جدا ہو گئے۔ اس اجلاس میں جس میں کانگریس کے حامیوں کو خاص طور پر جمع کیا گیا تھا۔ اجلاس میں گاندھی جی کی ایک قرارداد منظور کی گئی۔ محمد علی جناح نے اس قرارداد پر زبردست نکتہ چینی کی۔ پچاس ہزار کے مجمع میں قائد اعظم نے اپنی تقریر اس الفاظ سے شروع کی، میں اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں، ان کی آواز شور وغل اور ہنگامے میں ڈوب گئی۔ انہیں یقین تھا کہ حاضرین ان کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن انہوں نے لوگوں کے شور غل پر اسٹیج نہیں چھوڑا۔ ڈائس پر خاموش کھڑے رہے۔ جب شور کم ہوا تو انہوں نے پھر سے کہا، میں اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں۔ مجمع نے پھر شور کرنا شروع کیا۔ لیکن انہوں نے اپنی تقریر گھن گرج کے ساتھ جاری رکھی۔ آہستہ آہستہ ان کے جوش، حوصلے، تحمل کے سامنے مجمع خاموش ہوگیا۔ انہوں نے مجمع کو اپنے ساتھ کرلیا، لیکن مطلوبہ ووٹ حاصل نہ کرسکے۔ لیکن انھوں نے ثابت کردیا کہ ان پر حکم نہیں چلایا جاسکتا۔ وہ گاندھی کو مسٹر گاندھی کہہ کر مخاطب کرتے۔ لوگ چیختے چلاتے کہ مہاتما گاندھی کہو، لیکن وہ شور غل سے بے نیاز مسٹر

گاندھی ہی کہتے رہے۔ اپنی تقریر کے دوران ایک بار انہوں نے مولانا محمد علی کو مسٹر محمد علی کہا، لوگ مشتعل ہو گئے نہیں نہیں۔۔ مولانا محمد علی کہو۔ ہنگامہ ہوتا رہا۔ جب سکون ہوا تو قائد نے پھر اسی طرح تقریر شروع کی۔ میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ مجھے یہ حق ہے کہ میں کسی شخص کو جس لقب سے چاہوں مخاطب کروں بشرطیکہ وہ ناشائستہ نہ ہو۔ میں مسٹر محمد علی کو مولانا تسلیم نہیں کرتا۔ یہ قائداعظم ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ ہزاروں کے مجمع سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی بات کا برملا اظہار کرتے تھے۔

(میٹ مسٹر جناح ۔ اے ۔ اے ۔ رؤف صفحہ ۵۳۲)

آج کتنے ہیں جو مصلحت اور منافقت چھوڑ کر قائد کی طرح جو بات حق سمجھتے ہوں اس کا برملا اظہار کریں۔

کراچی کا خدا حافظ

کراچی ایک بار پھر جل اٹھا ہے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں پچاس سے زائد ہلاکتیں ہوچکی ہیں۔ سینکڑوں زخمی ہیں۔ اسپتال زخمیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جگہ جگہ تشدد کے واقعات جنم لے رہے ہیں۔ تیس کے لگ بھگ گاڑیاں، جن میں رکشہ، موٹر سائیکل، منی بسیں، ٹرک ٹینکر شامل ہیں، جل کر خاکستر ہوچکی ہیں۔ اور یہ گراف لمحہ بہ لمحہ اوپر ہی جارہا ہے۔ کاروبار زندگی معطل ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں دکانیں، ٹھیلے، پتھارے نذر آتش کیے جاچکے ہیں۔ بہت سی نواحی بستیوں میں شدید کشیدگی ہے۔ بنارس، اورنگی ٹاؤن، قصبہ کالونی، سہراب گوٹھ، سائٹ اور ایف بی ایریا، لانڈھی، ملیر، گلشن اقبال، گلستان جوہر، سمیت شہر کے مختلف حصوں میں توڑ پھوڑ، مار دھاڑ کے واقعات ہورہے ہیں۔ سرکاری اور نجی املاک جلائی جارہی ہے۔ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے پر الزامات لگا رہی ہیں۔ صدر بیرون ملک دورے پر ہیں، وزیر داخلہ اس لڑائی کے سرے وانا، طالبان، لشکر جھنگوی، جنداللہ اور دیگر کالعدم مذہبی جماعتوں سے ملا رہے ہیں۔ کراچی میں یہ واقعات اچانک وقوع پذیر نہیں ہوئے، ایم کیو ایم کے صوبائی رکن اسمبلی رضا حیدر کے بہیمانہ قتل نے اس سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ بدن کر دیا ہے۔ جو کراچی میں ایک مدت سے لگی ہوئی ہے۔ اور اسے بجھانے یا ختم کرنے کے لئے کوئی

کاروائی اور ٹھوس اقدام نہیں اٹھایا گیا۔ گزشتہ سال کراچی میں ہدف بنا کر قتل کئے جانے والوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی۔ رواں سال میں یہ تعداد اب تک دو سو تیس شمار کی جاتی ہے۔ وزیر داخلہ اسے لسانی، گروہی، مذہبی، فرقہ وارانہ فسادات کی سازش گردانتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کراچی میں ہونے والے قتل کے جرم کی بنیاد کھلی سیاسی دشمنیوں پر ہے۔ حالیہ دنوں میں پولیس نے مختلف جماعتوں کے کم از کم 10 سیاسی کارکنوں کے خلاف، تشدد کے واقعات میں ملوث ہونے کے شبہ میں کیس درج کئے ہیں۔ اسی طرح، 40 افراد جنہیں جولائی میں ہدف بنا کر قتل کیا گیا ان میں، بھاری اکثریت مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ منسلک تھی۔ شہر کے، نسلی اور فرقہ وارانہ ہلاکتوں کے علاوہ جرائم پیشہ گروہوں کی جنگ بھی جاری ہے۔ جس میں لیاری اور اب ڈالمیا سرفہرست ہیں۔ اسی طرح زمین چھیننے اور پلاٹوں پر قبضے کے لئے بھی مسلح گروپ برسرپیکار ہیں۔ جو ملیر اور سرجانی ٹاؤن کے علاقوں میں توسیع علاقے کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ کہیں اسٹیٹ تنازعہ ہے، کہیں پر قتل ووٹ بینک کے قیام کے لیئے کیا جارہا ہے۔ کراچی میں تشدد کئی پرتوں ہے. اس میں مزید اضافہ پولیس کی ناکامی اور ناقص کارکردگی ہے۔ صوبائی حکومت بھی اس صورت حال کو قابو کرنے میں ناکام رہی ہے۔ کراچی میں تشدد کی اہم وجوہات اہم سیاسی جماعتوں کی قیادت کی ناکامی بھی ہے۔ جو اقتدار میں شامل ہونے کے باوجود اپنے اختلافات حل کرنے اور، ہلاکتوں پر روک لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ بہت سی جماعتیں ہیں

جن کے کارکنوں پر تشدد میں ملوث ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن سیاسی جماعتوں نے ان سنگین الزامات کی جانچ پڑتال اور شہر کی فلاح و بہبود، اور امن کو ترجیح نہیں دی۔ قانون اور انصاف کی ہر طرف سے دھائی دی جاتی ہے، لیکن قانون کے تقاضوں کو پورا کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ پچھلے دنوں جب ٹارگٹ کلنگ پر بہت شور مچا تو کراچی میں ہونے والی ہلاکتوں پر حکومت نے نیم دلی کے ساتھ ایک انکوائری ٹریبونل تشکیل دیا تھا۔ لیکن اس ٹریبونل کو کوئی سہولت، جگہ کی فراہمی، سیکورٹی، اور رقم فراہم نہیں کی گئی۔ یوں اس کی جانب سے بھی اب تک کوئی پیش رفت نہیں دکھائی دی۔ اس بات کی اطلاعات ہیں کہ، ٹریبونل نے کاروائی شروع کرنے سے پہلے مناسب سیکورٹی، جگہ اور عملے کے لئے بات کی ہے۔۔ اس سلسلے میں انکوائری ٹریبونل کے سربراہ جسٹس (ر) علی سائیں ڈنو متیلو نے محکمہ داخلہ کو ایک خط بھیجا تھا۔ حکومت سندھ نے یہ ٹریبونل گزشتہ دنوں شہر میں متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کے کارکنوں سمیت 80 سے زیادہ لوگوں کی ہلاکتوں کے بعد قائم کیا تھا۔ ٹریبونل کے دائرہ کار میں، ھدف بنا کر قتل کے واقعات میں ملوث گروہوں کی نشاندہی کرنا اور ایسے واقعات کو روکنے کے لئے مؤثر اقدامات تجویز کرنا تھا۔ یہ دوسرا ٹریبونل ہے جو گزشتہ دو سالوں کے دوران پی پی پی کی قیادت میں صوبائی حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا ہے۔ اس سے قبل جسٹس علی محمد بلوچ کی سربراہی میں ایک ٹریبونل دسمبر 2008ء میں قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد

نومبر دسمبر 2008

میں ہونے والے نسلی تشدد کے اسباب کا پتہ لگانا تھا، یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ کراچی میں پہلے بھی انکوائری ٹربیونل بنائے گئے تھے۔ پیپلز پارٹی کی ریلی کے دوران 2007-08 میں، سانحہ نشترپارک 2006 اور 18 اکتوبر دھماکے پر تشکیل دیئے جانے والے کمیشن کی رپوٹیں بھی منظر عام پر نہیں لائی گئی۔ اور نہ ہی ان اسباب اور افراد کی نشاندہی کی گئی جس کے سبب یہ سانحات پیش آئے۔ کراچی کی سڑکوں اور گلیوں میں سینکڑوں لوگوں کا خون بہا ہے۔ لیکن ان کی تحقیقات کبھی نہ ہو سکی۔ ستمبر 2006 میں ارباب غلام رحیم نے سانحہ نشترپارک کے لئے سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس رحمت حسین جعفری کی سربراہی میں انکوائری کمیشن بنایا تھا۔ اپریل 2008 میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے جسٹس (ر) ڈاکٹر غوث محمد کی سربراہی میں 18 اکتوبر کارساز ریلی دھماکوں کی تحقیقات سونپی تھی۔ سندھ حکومت ایک انکوئری کمیشن اپریل میں سٹی کورٹس میں الطاف عباسی ایڈووکیٹ اور دوسرے وکلاء کو طاہر پلازہ میں ان کے دفتر میں جلا دینے کے واقعات کی چھان بین کے لئے بھی قائم کیا تھا۔ لیکن اب تک ان میں سے کسی کی نہ رپورٹ آئی اور نہ ہی کسی کو ذمہ دار قرار دے کر قانون کے کٹھہرے میں لایا گیا۔ کراچی میں دو دن میں ہلاک و زخمی ہونے والے غریب، مزدور، چائے والے، تندور والے، چوکیدار، محنت کش ہیں، جن کے چہروں، سینوں، اور جسم پر ایم ایم نائین، کلاشنکوف، جیسے ہتھیاروں سے گولیاں چلائی گئی ہیں۔ رضا حیدر کا قتل ایک دلخراش اور افسوسناک سانحہ ہے۔ لیکن اس شہر میں بے کس بے

وسیلہ محنت کشوں کا قتل عام اس سے بھی بڑا سانحہ ہے۔ اب بھی معاشرہ میں توازن کو قائم رکھنے کی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو کراچی کا خدا حافظ ہے۔

عمران فاروق شہید انقلاب

عید کے بعد کراچی میں کیا ہوگا۔ یہ ایک عمومی سا سوال تھا۔ جو عید پر ملنے جلنے والے ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے۔ اس سوال کی وجہ پاکستان کی تیسری بڑی سیاسی جماعت اور مخلوط حکومت میں نمایاں کردار ادا کرنے والی متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کے وہ بیانات اور خطاب تھے۔ جن میں انقلاب اور جاگیرداروں اور وڈیروں کے خلاف اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے۔ قائد تحریک کی سالگرہ ١٧ ستمبر کو منائی جاتی ہے اور ایم کیو ایم کے کارکن اس دن کا خصوصیت سے انتظار کرتے ہیں کہ اس دن انھیں اپنے رہنما کے جنم دن پر خوشیاں منانے کا موقع ملتا ہے تو دوسری جانب نائین زیرو کے نزدیکی میدان میں موسیقی اور گانوں کا منفرد شو ہوتا ہے جس میں ملک کے بڑے فنکار شرکت کرتے ہیں۔ ٹھیک بارہ بجے الطاف حسین اپنے ساتھیوں سے یک جہتی کے لئے خطاب کرتے ہیں۔ ملک میں سیلاب کی صورت حال کے سبب اس بار سالگرہ کی تقریبات سادگی سے منائی جانے والی تھی کہ اچانک ایک ناگہانی افسوس ناک خبر نے ماحول کو سوگوار کردیا۔ لندن میں ایم کیو ایم کے مرکز کے قریب ایم کیو ایم کے کنوینر عمران فاروق کو نامعلوم قاتل نے چھریوں کے وار کرکے قتل کردیا۔ عمران فاروق لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ 1992 میں حکومت کی طرف سے ایم کیو ایم کے خلاف شروع

کئے گئے آپریشن کے بعد روپوش تھے۔ اس دوران ان کے خلاف کئی مقدمات درج کئے گئے تھے۔ ان مقدمات کو سیاسی انتقام کا نام دے کر انھوں نے اپنی جان کو درپیش خطرے کے پیش نظر لندن میں سیاسی پناہ لے رکھی تھی۔

کراچی میں نسلی اور سیاسی فسادات کی تاریخ بیس برس پرانی ہے۔ جہاں کسی بھی ہلاکت پر ہنگامے پھوٹ پڑتے ہیں۔ گزشتہ ماہ متحدہ قومی موومنٹ کے رکن اسمبلی رضا حیدر کے قتل کے بعد شہر میں ہونے والے ہنگامے اور فسادات میں 85 افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عمران فاروق کے قتل کی خبر ملتے ہی شہر میں سوگ کی فضا پھیل گئی اور خوف کا ماحول محسوس کیا جانے لگا تھا۔ جس پر ایم کیو ایم کی قیادت نے انتہائی منظم انداز سے حالات کو قابو میں کیا۔ اور یہ پہلا موقع ہے کہ ایم کیو ایم کی صف اول کی قیادت کے ایک فرد کی موت پر کراچی میں کوئی ہلاکت نہیں ہوئی۔ لندن میں ہونے والے اس قتل نے سیاسی حلقوں میں ایک خوف پیدا کر دیا ہے۔ لندن پاکستانی سیاست دانوں کی جنت ہے۔ جہاں وہ ملکی سیاست سے گھبرا کر پناہ لیتے رہے ہیں۔۔برطانوی اخبار ٹیلی گراف نے ڈاکٹر عمران فاروق کی موت پر اپنے تبصرے میں کہا ہے کہ اگر عمران فاروق کی موت سیاسی قتل ثابت ہوئی تو اس سے نا صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے سیاست دانوں کو تشویش ہو سکتی ہے۔ اخبار گارڈین کے مطابق عمران فاروق کے ساتھی ان کی موت کو سیاسی قرار دے رہے ہیں۔۔برطانیہ کو سیاسی بنیاد پر پناہ گاہ کے

حوالے سے دنیا میں محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ عمران فاروق کا قتل ابھی تک ایک معمہ ہے۔ پولیس کے مطابق 50 سالہ ڈاکٹر عمران فاروق کو لندن کے شمالی علاقے میں اپنے گھر کے سامنے زخمی حالت میں پایا گیا۔ ان پر چاقو کے متعدد وار کیے گئے تھے جبکہ ان کے سر پر بھی چوٹ کے نشان تھے۔ لندن پولیس کا کہنا ہے کہ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے ایم کیو ایم کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر عمران فاروق کی شہادت پر جس دل گرفتگی اور اظہار غم کیا ہے۔ اس نے ایم کیو ایم کے کارکنوں کو بھی غم زدہ کر دیا ہے۔ بھائی کے آنسو کارکنوں سے نہیں دیکھے جاتے۔ زندگی کا سب سے بڑا صدمہ قرار دیتے ہوئے الطاف حسین نے عمران فاروق کو شہید انقلاب قرار دیا ہے۔ عمران فاروق کی شہادت کے بعد کراچی کے علاقے شریف آباد میں واقع ان کی رہائش گاہ پر تعزیت کے لیے لوگوں کی بڑی تعداد آ جا رہی ہے۔ غم سے نڈھال ڈاکٹر عمران فاروق کے والد محمد فاروق اپنی رہائش گاہ پر پرسہ دینے والوں ملتے سے ہیں۔ تو ایک بوڑھے باپ کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کراچی میں بہت سے ایسے خاندان ہیں جنھوں نے اپنے بڑھاپے کا سہارا کھو دیا ہے۔ پاکستان بنانے والوں کی نئی نسل کو سیاست راس نہیں آئی، مڈل کلاس سیاست دانوں کی فصل کو بام پر آنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالا گیا۔ عمران فاروق بھی اسی مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے باپ کے یہ الفاظ اس مڈل کلاس سیاست کا نوحہ ہیں۔ عمران فاروق کی زندگی ایک درویش کی زندگی تھی، وہ بہت سادہ زندگی گزارتے

تھے اور کم پیسوں میں گزارا کرتے تھے۔ مہاجر سیاست کا دو بار رکن اسمبلی منتخب ہونے والا پارٹی کا کنویزیوں دنیا سے چلا گیا۔ اس اسمبلی کا تو غریب سے غریب رکن بھی تین کروڑ کا مالک ہے۔ الطاف حسین نے سچ کہا کہ یہ غم ان کی دل پر نقش رہے گا جو کبھی ڈھل نہیں سکے گا۔

عافیہ کی رہائی حکومت پوائنٹ اسکور کر سکتی ہے

اس دن بھی سارے دوست ڈاکٹر عافیہ کے گھر جمع ہوئے تھے۔ جو عافیہ کی رہائی کے لئے طویل جدو جہد کے بعد اس مرحلے پر پہنچے ہیں۔ برطانیہ سے ایون رڈلی مریم اور گوانتابے کے قیدی معظم بیگ آئے تھے۔ کراچی کے دوستوں میں سلیم مغل، انتخاب سوری، شہزاد مظہر، پاسبان کے الطاف شکور، صحافتی برادری، این جی اوز اور دانشور سب یہ سوچ رہے تھے کہ اب عافیہ کی رہائی کیسے ہو۔ عصمت آپا، عافیہ کی والدہ کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ احمد جو اپنی ماں سے بچھڑ کو ادھورا سا سہا ہوا بچہ ہے۔ مریم تو اب تک شاک کی کیفیت میں ہے۔ فوزیہ کہہ رہی تھی کہ عافیہ تو اسی دن مر گئی تھی۔ جب اس کے بچے اس سے چھین لئے گئے تھے۔ امریکی عدالت ایک ایسے قیدی پر مقدمہ چلا رہی ہیں جو ظلم وستم سے ذہنی طور پر معذور ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے مقدمے کے دوران اس کی بیٹی مریم کو بار بار اس کے سامنے لا کر دھمکی دی جاتی رہی کہ اگر اس نے لب کشائی کی تو اس کی بیٹی عمر بھر اسے نہ مل سکے گی۔ ڈاکٹر عافیہ پاکستان کی بیٹی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بردہ فروش حکمرانوں نے اسے اپنے اقتدار پر قربان کر دیا ہے۔ چند روز جاتے ہیں کہ امریکی عدالت اسے سزا سنا دیں۔ اس سزا پر پاکستان ہی میں نہیں دنیا اسلام میں شدید رد عمل ہو سکتا ہے۔ وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے امریکہ کے

اٹارنی جنرل کو ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی رہائی اور وطن واپسی کیلئے ایک خط لکھا ہے۔ ایک طویل خاموشی کے بعد، کیا ایسی اپیل پہلے نہیں کی جا سکتی تھی۔ آخر پاکستان امریکہ کا کیسا اتحادی ہے جو اپنے شہریوں کو نہ انصاف دلا سکتا ہے۔ نہ انھیں امریکہ سے واپس مانگ سکتا ہے۔ وزیر داخلہ نے امریکی اٹارنی جنرل کو باور کرایا ہے کہ یہ پاکستانی عوام کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور ڈاکٹر عافیہ کی رہائی سے پاکستان میں امریکہ کیلئے اچھے جذبات پیدا ہونگے۔ انہوں نے کہا ہے کہ امریکی حکومت اس معاملہ کے انسانی پہلو کو بھی مد نظر رکھے کیونکہ ڈاکٹر عافیہ کے دو بچے غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہیں جس سے ان کی صحت بھی متاثر ہو رہی ہے جبکہ ڈاکٹر عافیہ کی ضعیف والدہ بھی انتہائی پریشان کن صورت حال سے دوچار ہیں۔ انہوں نے اٹارنی جنرل سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر عافیہ کی وطن واپسی کے لئے ذاتی اثر ورسوخ استعمال کریں۔ رحمان ملک نے یاد دلایا ہے کہ امریکہ کی قانونی تاریخ میں ایسی 90 مثالیں موجود ہیں کہ جن میں مقدمات انسانی بنیادوں پر واپس لیئے گئے۔ ایک افغان جیل میں قیدی اور تشدد کا سامنا کرنے اور اپنے بچوں سے علیحدگی کا درد ہی عافیہ کے لئے کافی ہے، امریکہ پاکستان کی عوام سے یکجہتی پیدا کرنا چاہتا ہے تو اسے عوامی امنگوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ صدر امریکہ چاہیں تو وہ رہائی کے اقدام کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی وطن واپسی پاکستان میں امریکہ کے لئے خیر سگالی پیدا ہوں گے۔ حکومت اپنی ماضی کی غلطیوں سے کچھ

سبق یکھ سکتی ہے۔ حکومت جس کی ناکامی کے چرچے اور چل چلاؤ کی باتیں کی جارہی ہیں۔ وہ عافیہ کے مقدمے میں مداخلت کرکے اپنی پوائنٹ اسکور کرسکتی ہے۔ اسے گیلانی اور زرداری حکومت کو کارنامہ ہی سمجھا جائے گا۔ اگر ڈاکٹر عافیہ کے بارے میں امریکی حکومت نے کوئی عاجلانہ فیصلہ کیا تو دہشت گردی کی جنگ میں اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی ناٹو افواج کی سپلائی لائن بھی متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ اور ششدت پسندوں کو بھی اس کے خلاف نفرت ابھارنے کا موقع مل جائے گا۔ پورے ملک میں عافیہ کو سزا ہونے کی صورت میں احتجاج کی جو لہر ابھرے گی۔ اس پر پل باندھنا حکومت کے لئے مشکل ہوگا۔

چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی

مولانا فضل الرحمان، مولانا مفتی محمود کے صاحبزادے ہیں۔ حکومت ان کو ایسی راس آئی ہے کہ چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی۔ بے نظیر ہوں، یا نواز شریف، مشرف ہوں یا زرداری ان کی پانچوں انگلیاں ہی کیا، سب کچھ گھی میں ہے۔ ملک میں آگ لگے یا سیلاب آئے ان کی قدم پاکستان کی سرزمین پر ٹکتے ہی نہیں۔ ملک میں سیلاب آیا تو مولانا عمرے پر چلے گئے، لال مسجد کا سانحہ ہوا تو مولانا لندن جا بیٹھے۔ ان کے بھائی مولانا عطا الرحمٰن بھی وزارت، گاڑیوں، اور بیرونی دوروں کے شوقین ہیں۔ حکومت میں رہنے سے سارے شوق پورے ہو جاتے ہیں۔ ابھی مولانا دوبئ سے آئے ہیں۔ قصد امریکہ جانے کا تھا۔ پر امید بر نہ آئی۔ امریکیوں نے انھیں اپنے ملک آنے سے روک دیا گیا ہے۔ ادھر وفاقی وزیر سائنس و ٹیکنالوجی اعظم خان سواتی کو امریکا جانے کی مشروط اجازت دی گئی ہے۔ امریکی محکمہ خارجہ کے حکام نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر تصدیق کی ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن نیویارک میں ہونے والی او آئی سی کی سالانہ رابطہ کانفرنس میں شرکت کیلئے دوحہ سے روانہ ہو رہے تھے۔ تاہم انہیں دوحہ ایئرپورٹ پر امریکی حکام کے کہنے پر بورڈنگ پاس جاری نہیں کیا گیا اور امریکا جانے سے روک دیا گیا۔ محکمہ خارجہ کے حکام کے مطابق ان کے کیس کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں جلد فیصلہ کر لیا

جائے گا۔ کشمیر کمیٹی کی سربراہی کے نام پر مولانا کو فل پرٹوکول حاصل ہے۔ وزیر داخلہ رحمان ملک نے پاکستانی سفیر اور امریکی حکام سے رابطہ کرکے اپنی تشویش سے آگاہ کیا ہے اور انہیں امریکا آنے کی اجازت دینے پر زور دیا ہے۔ ان کی پارٹی کے ایک اور وفاقی وزیر سائنس و ٹیکنالوجی اعظم خان سواتی کو امریکا میں داخلے کی مشروط اجازت دے دی گئی ہے۔ ذرائع کے مطابق اعظم سواتی کو امریکا داخل ہونے پر وفاقی وزیر کا پروٹوکول نہیں دیا جائے گا اور ان کی اسکریننگ کی جائے گی۔ دوسری جانب مولانا فضل الرحمان کے ترجمان نے کہا کہ مولانا کو دوحہ ایئرپورٹ پر امریکا جانے سے روکے جانے کی خبریں بے بنیاد ہیں وہ اسلام آباد میں اپنی رہائش پر موجود ہیں۔ ایسے مولانا کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے تو کشمیریوں کا اس سے بدتر حال کیوں نہ ہوگا۔

کیسا مقدمہ ـــــــ کیسی سزا

بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی اندھیر نگری چوپٹ راجہ ڈاکٹر عافیہ کو سزا سنانے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی کہ ترقی کے اس دور میں بھی وہی اندھیر نگری ہے۔ عافیہ کو امریکہ کی عدالت سے دی جانے والی 86 سال قید کی سزا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امریکہ میں پانچ سال میں پہلی بار کسی عورت کو انتہائی سزا دی گئی ہے۔ یہ سزا مسلمان نوجوانوں کو امریکہ کی جانب سے ایک تنبیہ ہے کہ وہ اگر حریت فکر، آزادی اظہار اور امریکہ کے دہرے معیار کے خلاف کوئی بات کریں گے تو انہیں درس عبرت بنا دیا جائے گا۔ عافیہ ایک ایسی مظلوم عورت ہے۔ جس کی پکار پر کوئی ابن قاسم مدد کو نہ آیا۔ اس پر ظلم کرنے والے خود اس کی اپنی قوم کے حکمران افراد ہیں۔ جو کبھی غیر مسلموں پر ظلم کے خلاف کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج ڈالروں کی جھنکار نے انھیں اپنی قوم کی اس بیٹی کی چیخوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور ایک مظلوم نہتی عورت سے خوفزدہ ہے۔ اس مظلوم عورت کے شیر خوار بچے کو اس سے چھین کر مار ڈالا گیا۔ اس کے دو بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا گیا۔ یہ مقدمہ ایک ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ جس میں انصاف کا قتل کیا گیا ہے۔ اس مقدمے پر ساری دنیا کی نظریں تھیں۔ دنیا یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ امریکہ جو حریت فکر، اظہار آزادی، معاشرتی انصاف کا درس دیتا ہے۔ کیا انہی اصولوں پر

وہ انصاف بھی مہیا کرتا ہے۔ بد قسمتی سے نائن الیون کے بعد امریکہ نے انصاف کے دہرے معیارات قائم کئے ہیں۔ امریکی عدالت میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا مقدمہ جنھوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ امریکہ نے اس مقدمے میں انصاف کا خون کیا ہے۔ اس کا مقدمہ دیکھنے کے لئے عدالت میں جو لوگ آتے تھے۔ ان میں برقعہ پوش اور حجاب پہنے عورتیں بھی تھیں، بارلیش نوجوان بھی، بچے بھی تو لبرل وضع قطع اور خیالات رکھنے والے مرد اور عورتیں بھی۔ عدالت میں جب پہلی بار عافیہ کو پیش کیا تو وہ شدید زخمی تھیں۔ اس وقت جج کو بتایا گیا کہ، ڈاکٹر عافیہ کے پیٹ میں زخم ہے اور آنتوں سے خون جاری ہے اور اب تک انہیں حکومت کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھا رہی'۔ جج نے پوچھا کہ اب تک انہیں کسی ڈاکٹر یا لائسنس یافتہ فزیشن کو کیوں نہیں دکھایا گیا؟' امریکی وکیل استغاثہ نے جواب دیا مدعا علیہ اپنا طبّی معائنہ کسی خاتون ڈاکٹر سے کروانا چاہتی ہے اور خاتون ڈاکٹر دستیاب نہیں ہو سکیں'۔ یہ ہے امریکہ کا انصاف۔ ایک اور جھلک ملاحظہ ہو۔۔۔۔ استغاثہ کی طرف سے پیش کئے گئے گواہ احمد گل نے، جو افغنستان میں امریکی افواج کے لیے مترجم تھے، عدالت کو اٹھارہ جولائی سن 2008 کے واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی کمر اس پردے کی طرف تھی جس کے پیچھے ڈاکٹر صدیقی موجود تھیں۔ جب امریکی فوجی کیپٹن سنائیڈر نے چیخ کر کہا کہ "اس کے پاس رائفل ہے" تو انہوں نے مڑ کر دیکھا کہ ڈاکٹر صدیقی بندوق اٹھائے پلنگ کے پاس کھڑی تھیں۔ مسٹر گل کا کہنا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر

صدیقی کو رائفل سمیت دھکا دیا۔ اور جب امریکی چیف وارنٹ افسر نے ان کے پیٹ میں گولی ماری تب وہ بمشکل ان سے رائفل چھین پائے۔ اس دوران ان کے مطابق رائفل سے دو گولیاں چلیں۔ گزشتہ روز کیپٹین سنائیڈر نے بیان دیا تھا کہ ڈاکٹر صدیقی رائفل تانے پلنگ پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھیں۔ وکیل صفائی لنڈا مورینو کے پوچھنے پر مسٹر گل نے واضح طور پر کہا کہ انہوں نے ڈاکٹر صدیقی کو پلنگ پر گھٹنوں کے بل بیٹھے نہیں دیکھا۔ وکلاء صفائی کی جرح پر مسٹر گل نے بتایا کہ اس واقعے کے بعد وہ امریکی حکومت کے تعاون سے امریکہ منتقل ہو چکے ہیں اور امریکی شہریت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ ہیں وہ خریدے ہوئے گواہ جن پر اس مقدمے کی بنیاد رکھی گئی۔

ایک اور گواہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ گیری وڈ ورتھ ہیں، جو کہہ رہی ہیں کہ میں نے بیس برس پہلے اس لڑکی کو بارہ گھنٹے کے نیشنل رائفل کے بنیادی کورس میں پسٹل شوٹنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا، جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ ہزاروں طلبہ میں سے اس طالبہ کو بیس برس بعد کیسے شناخت کر سکتی ہیں تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لڑکی نے چار سو سے بارہ سو راؤنڈ چلائے تھے۔ لیکن یہ پسٹل سے چلائے تھے۔ کسی رائفل سے نہیں چلائے تھے۔ اس جواب نے ساری عدالت کو ششدر کر دیا ایک اور گواہ ایف بی آئی کے ایجنٹ بروس کیمر مین کا کہنا تھا کہ جولائی ۲۰۰۸ میں عافیہ نے انہیں بتایا تھا کہ میں نے یہ رائفل ڈرانے کے لئے اٹھائی تھی۔ تاکہ میں فرار ہو سکوں۔ میں نے اس بیان کے بارے میں اپنے اعلیٰ حکام کو آگاہ کر دیا

تھا، لیکن جب دفاع کے وکیل ایلن شارپ نے اس ایف بی آئی کے ایجنٹ کو اس کے تحریر کردہ نوٹس دکھائے جس میں ایسی کسی رائفل کا کوئی ذکر نہ تھا تو اس کی زبان گنگ رہ گئی۔ یہ ہیں عافیہ کے مقدمے کے گواہ جن کی بنیاد پر یہ انتہائی سزا سنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا تعلق دہشت گردی سے جوڑا جاتا رہا۔ لیکن ان کے خلاف مقدمے میں دہشت گردی کا کوئی الزام نہیں۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر الزام ہے کہ انہوں نے افغانستان کے صوبے غزنی کے ایک پولیس ہیڈ کوارٹر میں ان سے تفتیش کے لیے آنے والی امریکی ٹیم پر ایم فور رائفل سے حملہ کیا۔ استغاثہ کے پیش کردہ ایف بی آئی کے ماہرین نے عدالت کو بتایا کہ ڈاکٹر صدیقی کی انگلیوں کے نشان ان کاغذات پر سے تو ملے ہیں جو مبینہ طور پر حراست کے وقت ان کے پاس سے دستیاب ہوئے تھے لیکن اس رائفل پر نہیں ملے جس سے انہوں نے مبینہ طور پر گولیاں چلائی تھیں۔ مقدمے کی ابتدائی سماعت نے اس وقت ڈرامائی شکل اختیار کر لی تھی۔ جب عدالت کو بتایا گیا کہ ملزمہ نے مبینہ طور پر جس گن سے امریکی فوجیوں پر گولیاں چلائی تھیں اس بندوق پر عافیہ صدیقی کی انگلیوں کے نشان یا کوئی اور ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس بندوق سے فائر کی گئی گولیوں کے خول موجود ہیں۔ دوران سماعت عافیہ صدیقی کی بیٹی مریم جو ایک یہودی کے پاس تھی۔ اسے لا کر عافیہ کو دکھایا جاتا تھا۔ اور دھمکی دی جاتی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کی بیٹی کا کبھی پتہ نہیں چلے گا۔ عافیہ کو شروع ہی سے امریکہ کے عدالتی نظام پر اعتماد نہیں

تھا۔ جس کا اس نے برملا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں امریکہ کی عدالت سے انصاف کی توقع نہیں اور مجھ پر لگائے تمام الزامات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں یہ ہیں اس مقدمے کے ثبوت کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا۔ پراسیکیوٹر نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ عافیہ صدیقی کا القاعدہ یا طالبان سے تعلق کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور نہ ہی اس تعلق کے شبہ میں ان کے خلاف کوئی الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ شدت پسندوں کو اس فیصلے سے اپنے اقدامات کو جواز مل جائے گا۔ امریکہ اور پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کی ناٹو افواج کی سپلائی لائین بھی متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ اور تشدد پسندوں کو بھی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف نفرت ابھارنے کا موقع مل جائے گا۔ پورے ملک میں عافیہ کو سزا ہونے پر جو احتجاج کی جو لہر ابھری ہے۔ اس پر پل باندھنا حکومت کے لئے مشکل ہوگا۔ امریکہ نے اس مظلوم عورت کو سزا سنا کر اپنے خلاف ایک ایسی ایف آئی آر کٹا دی ہے۔ جس سے مشرف اور بش جیسے حکمران کبھی نہ بچ سکیں گے۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

محبت تمھیں بلائے اس کے پیچھے پیچھے چلے جاؤ۔ گو اس کی راہیں سخت اور دشوار ہوں اور جب اس کے بازو تمھیں سمیٹیں تب ایسا ہونے دو گو اس کے پنکھوں میں پوشیدہ تلوار تمہیں زخمی کردے۔ اور جب وہ تم سے کچھ کہے تو اس کا یقین کرلو۔ گو اس کی آواز تمہارے خوابوں کو منتشر کردے، جس طرح باد شمال باغ کو برباد کردیتی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح محبت تمہارے سر پر تاج رکھتی ہے۔ اسی طرح وہ تمھیں مصلوب بھی کرتی ہے۔ محبت اگر تمہارے بڑھنے میں مددگار ہوتی ہے تو وہ تمہاری کانٹ چھانٹ بھی کرتی ہے۔ جس طرح وہ تمہاری بلندیوں پر چڑھ کر تماری سب سے نازک شاخوں کو پیار کرتی ہے۔ جو دھوپ میں تھر تھراتی ہیں۔ اس طرح وہ تمہاری جڑوں تک بھی اتر جاتی ہیں، اور اس سے لگی ہوئی جڑوں کو ہلا دیتی ہیں۔ کنک کی بالیوں کی طرح وہ تمھیں اپنے میں اکھٹا کرلیتی ہیں۔ محبت قبضہ نہیں کرتی نہ اس پر قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے محبت کے لئے محبت ہی کافی ہوتی ہے۔،، خلیل جبران کا فلسفہ محبت ایک بہتے دریا کی طرح ہے۔ مدھر جھرنے کی طرح جس کے بہاؤ میں ایک کاٹ بھی ہے اور تیزی بھی۔ اس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔ درد کی دوا پائی۔ درد لا دوا پایا۔ دل کے بارے میں کہا گیا کہ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔ لیکن اب انسان کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ انسانی لہو جس کی حرمت ہر چیز سے بڑھ

کر ہے۔ کیسے بہہ رہا ہے۔ کون بہا رہا ہے۔ کراچی تو محبت کا دریا تھا۔ جس سے ہر ایک فیضیاب ہوا۔ جس کے چشمے تو خشک نہ ہوتے تھے۔ لیکن یہ آگ اور خون کیوں اس شہر میں اتر آیا ہے۔ نہ مساجد، نہ خانقاہیں، نہ بازار نہ گلیاں، نہ محلے، نہ مکان کچھ بھی تو محفوظ نہیں۔ محبت کہاں گئی، ایسی نفرت ایسا زہر، ایسی آگ کے ایک ہی شب میں بیسیوں افراد ہلاک کردیئے جائیں۔ کیا یہی جمہوریت ہے، کیا جمہور کا خون اتنا ہی ارزاں ہے۔

سائنس دان بھی کیا کیا تحقیق کرتے ہیں۔ اب انہوں نے تحقیق کی ہے کہ درد کم کرنے کی سب سے زیادہ طاقتور دوا محبت ہے۔ تحقیق دانوں کا کہنا ہے کہ محبوبہ کی تصویر ہی اس کے عاشق کے دماغ کے اس مخصوص حصے کو متحرک کرسکتی ہے جو دوا کے طور پر عمل کرتا ہے، محبت کسی بھی ممکنہ اثرات کے بغیر درد کو کم کرنے میں فوری کام کرتی ہے۔ امریکی اخبار لاس اینجلس ٹائمز کے مطابق جلد یا بدیر محبت کا انجام ہمیشہ دکھ اور درد پر ہی ہوتا ہے لیکن اس محبت میں کچھ راحت کا پہلو بھی ہے اور خاص کر جسمانی نکتہ نظر سے اس کا فائدہ بھی ہے۔ ایک امریکی جریدے میں شائع محبت پر ایک تحقیقی اور نفسیاتی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ذہنی انتشار کے شکار فرد کے سامنے محبوب کی تصویر اس کے درد کو کم کردیتی ہے۔ تصویر نظروں کے سامنے آنے سے اس کے دماغ کے ایک خاص حصے کے فنکشن کرنے سے 36 سے 45 فی صد درد میں کمی ہوجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران سائنس دانوں نے دماغ کا مطالعہ کیا تو اس میں ایسا عمل ہوتا دیکھا گیا جو اس درد کو ختم کرنے میں معاون ثابت

ہوا۔ محبت تو ایک جادو ہے، جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہم اس محبت سے کیوں محروم ہوتے جا رہے ہیں، معاشرے میں محبت نہ رہی تو یہ جہنم سے.برا معاشرہ ہوگا، نفرتوں کے شعلوں میں محبت ہی تریاق ہو سکتی ہے، کیا ہم محبت کا یہ پیغام لوگوں میں عام نہیں کر سکتے، محبت فاتح عالم ہے۔ ہمیں دلوں کو محبت سے مسخر کرنا ہوگا، ورنہ یہ آگ کے شعلے سب کچھ جلا کر راکھ کر دیں گے۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

یہ ذلت کے مارے لوگ

لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے اہلکار ریمنڈ ڈیوس کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے فہیم شمشاد کی پچیس سالہ بیوہ نے خود کشی کرلی۔اس کی خود کشی سے قبل کی جانے والی گفتگو میڈیا کے چینل پر نشر ہوئی۔ لیکن اس بے حس قوم میں کوئی زلزلہ بپا نہیں ہوا۔ پچیس سالہ بیوہ شمائلہ کی خود کشی کا ذمہ دار کون ہے۔ ریمنڈ ڈیوس، امریکہ، صدر زرداری، الطاف حسین، جماعت اسلامی، یا میڈیا ؟ اس کا تعین کون کرے گا۔ ریمنڈ ڈیوس کے ہاتھوں قتل ہونے والے مقتولین کے ورثا اور اہل خانہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اگر ریمنڈ ڈیوس کو سزا نہ دی گئی تو تمام اہل خانہ خود کشی کرلیں گے۔ تو کیا ہم خودکشیاں کرنے کے لئے ہی رہ گئے ہیں۔ فہیم کی بیوہ کے قتل کی ذمہ داری میڈیا کو قبول کرنی چاہیے۔ یہ قاتل میڈیا ہے۔ جو بلا سوچ سمجھے ہر بات کو اسقدر اچھالتا ہے کہ ذہن پراگندہ ہوجاتے ہیں۔ کیا پاکستان میں انصاف ایسا ہی ہے کہ فوری فیصلے ہوجاتے ہیں۔ اگر ہم ملکی سطح پر ہونے والے قتل و غارت کے واقعات کے فیصلے نہیں کرتے تو اس مقدمے کا فیصلہ کیسے اتنی جلد کرلیں گے۔ کراچی میں برسوں سے موت کا کھیل جاری ہے۔ ہزاروں لوگ قتل ہوچکے ہیں۔ ان کا مقدمہ اور فیصلہ کون کرے گا۔ امریکی اہلکار کے بارے میں یہ بھی اطلاعات ہیں کہ وہ "فرضی نام" سے بلیک واٹر تنظیم کیلئے کام کر رہا تھا۔ اس کا نام

ریمنڈ ڈیوس" نہیں ہے۔ اس کے پاس مذکورہ تنظیم کے بارے میں بھی کافی تحریری" تفصیلات موجود ہیں۔ اس سے بلیک واٹر کیلئے کام کرنے کے عوض بھاری معاوضے کے ثبوت بھی ملے ہیں۔ اس کا ایک دن کا معاوضہ 870 ڈالر جبکہ چھ ماہ کا معاوضہ دو لاکھ ڈالر تک لکھا ہوا ہے۔ اس کی گاڑی سے برآمد ہونے والی قیمتی اشیاء، جدید ترین اسلحہ، سینکڑوں ڈالر اور دیگر جدید آلات سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ڈپلومیٹ نہیں بلکہ امریکی جاسوس تنظیم کا سرگرم رکن ہو سکتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہ کسی سے مذکورہ تنظیم کیلئے کام کرنے کے سلسلہ میں معاوضہ طے کرنے جا رہا تھا۔ اس کی گاڑی سے جدید ساختہ جو پستول برآمد ہوا ہے وہ سپیریئر ترین میٹل کا ہے اور بلاک نامی کمپنی کا ہے جس کی رینج کے علاوہ نشانہ بھی ایکوریٹ ہے اور اس پستول میں گولی کی رفتار اور Velosity بڑھنے کی بھی صلاحیت ہے اور نشانے کے خطا ہونے کے بھی امکانات کم ہیں۔ 70 گولیاں اور بھری ہوئی چار میگزین کے علاوہ ٹیلی فونک کیمرہ کے اندر اہم تنصیبات کی معلومات اور دیگر نقشہ جات کی تصاویر سے بھی یہ بات واضح نظر آ رہی ہے کہ وہ سفارتکار نہیں بلکہ فرنٹ محاذ پر لڑنے والا کسی بین الاقوامی تنظیم کا متحرک اور سرگرم رکن ہے۔ اور یہ ایک امریکی نہیں ہے۔ ایسے قاتل پاکستان میں چہار جانب گھوم رہے ہیں۔ ان قاتلوں کو ویزہ دینے والے بھی بڑے مجرم ہیں۔ ان کے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کو یہاں آنے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کس نے اٹھا رکھی ہے۔ تیونس میں ایک بے روزگار فرد کی خودکشی سے

انقلاب آگیا۔ مصر والے اب بھی تحریر چوک میں بستر بوریا لئے بیٹھے ہیں۔ پاکستان میں انقلاب کا نعرہ لگانے والے بزدل اور غیرت سے بہت دور ہیں۔ ان میں جان دینے اور جان لینے کا حوصلہ نہیں ہے۔ اس جذبے کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ اس سے اچھے اور سچے تو وہ طالبان ہیں۔ جو اپنے جھوٹے سچے نظریات کے لئے موت کو گلے لگاتے ہیں۔ ان کی فکر راستہ اور طریقہ کار غلط ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے انقلابی ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ مذہب کے نام دہشت گردی کا انہوں نے جو انداز اختیار کیا وہ قابل مذمت کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے حوصلے جرات اور جہد مسلسل کی داد دینی چاہیئے۔ اب پاکستان میں انقلاب لانے کا نعرہ لگانے والوں کو بھی طالبان سے انقلابیت کا درس لینا چاہیئے۔۔ یہاں کے ترقی پسند دانشور عوام کو شوگر کوٹیڈ گولی دے رہے ہیں کہ ،،پاکستان میں ایک سنجیدہ اور اہم تبدیلی آرہی ہے ، انقلاب آتا ہوا نظر نہیں آرہا، کوشش کی جارہی ہے کہ یہ ایک موومنٹ بنے اور اس میں الطاف بھائی کا بہت اہم رول ہوگا،، نجم سیٹھی جیو نیوز کے پروگرام "آپس کی بات" میں کس کو خوش کر رہے ہیں۔ کراچی کے مجبور اور بے بس عوام کو دیکھنا ہے تو بسوں کی چھتوں، پائیدان سے لٹکے ہوئے، اور منی بسوں میں مرغے بنے ہوئے ذلت میں لپٹے ہوئے دیکھئے۔ یہ روزانہ بھتہ دیتے ہیں، پرس اور موبائیل ، موٹرسائیکل، سے محروم ہوتے ہیں۔ اور اف بھی نہیں کرتے۔ کیا انقلاب لانے والے ایسے ذلت کے مارے ہوتے ہیں۔

نہر سوئز

مصر میں جاری سیاسی بحران کے عالمی بحران میں تبدیل ہونے کے خدشات میں اس امریکی دھمکی کے بعد اضافہ ہوگیا ہے۔ جس میں امریکہ نے کہا ہے کہ نہر سوئز کی بندش پر سفارتی ' اقتصادی حتیٰ کہ فوجی طاقت سے جواب دے سکتے ہیں، امریکا نے اپنے اس عزم کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ خطے میں اپنی عسکری سرگرمیوں میں ردوبدل کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا جس کی بڑی وجہ شمالی افریقہ میں پایا جانے والا عدم استحکام ہے۔ امریکی فوج کی سینٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل جیمز مائس نے واضح کیا ہے کہ نہر سوئز تیل سپلائی کا اہم ذریعہ ہے اور مصر میں جس نے بھی اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسے بند کرنے کی کوشش کی وہ یقیناً ایک بہت بڑی غلطی کرے گا۔ اس کے علاوہ اس عمل کے شدید اقتصادی نقصانات برداشت کرنے ہونگے۔ جنرل جیمز مائس مصر سے پاکستان تک وسیع خطے میں امریکی فوجی آپریشنز کے نگران ہیں۔ ان کا یہ پالیسی بیان اس بات کا اظہار ہے کہ اس خطہ میں امریکہ اسرائیل کے مفادات کا پاسبان ہے۔ دوسری جانب مصر میں غیر یقینی سیاسی صورت حال کے سبب عالمی منڈی میں خام تیل کی قیمتیں مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ تجزیہ کاروں کے مطابق مصر میں پرتشدد واقعات اور غیر یقینی سیاسی صورت حال کی وجہ سے نہر سوئز کے راستے تیل بردار بحری جہازوں کی آمد و رفت متاثر

ہونے کا خدشہ ہے۔ اس کے نتیجے میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لندن میں مارچ کے سودوں کے لئے برینٹ نارتھ سی کروڈ آئل کی قیمت ایک سو دو ڈالرز فی بیرل سے تجاوز کر گئی۔ یہ ستمبر دو ہزار آٹھ کے بعد فی بیرل تیل کی سب سے زیادہ قیمت ہے۔ نیویارک کی مارکیٹ میں بھی مارچ کے سودوں کے لئے فی بیرل تیل کی قیمت نو سینٹس اضافے کے ساتھ نوے ڈالرز چھیاسی سینٹس پر بند ہوئی اسی بحران کے تناظر میں امریکی جنرل کا کہنا ہے کہ مصر میں جو کوئی بھی اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے نہر سوئز کو بند کرنے کا فیصلہ کرتا ہے وہ ایک بہت بڑی غلطی کرے گا کیونکہ اس کے اقتصادی اثرات خوفناک ہوں گے۔ ایسے اقدام میرے تصور سے بھی باہر ہے'۔ جنرل جیمز ماٹس سے، جب یہ سوال کیا گیا کہ حسنی مبارک کے 30 سالہ دورِ اقتدار کے خلاف مظاہروں اور ہنگاموں کے سبب اگر بحری جہازوں کے سب سے اہم چینل، نہر سوئز کے روٹ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو کیا امریکہ جوابی کاروائیاں کرنے کے لئے تیار ہے؟ جنرل جیمز ماٹس کا کہنا تھا ' اگر ایسا ہوتا ہے تو امریکہ، سفارتی، اقتصادی اور فوجی ہر طرح کی کاروائی کر سکتا ہے، تاہم میرے لئے یہ سب مفروضاتی ہے اور میں سیاسی لیڈروں کا اس سلسلے میں احترام کروں گا'۔ مصر کے بحران میں شدت آنے کے ساتھ ہی رواں ہفتے کے اوائل ہی سے اسٹاک مارکیٹ میں مندی کا رجحان رہا۔ خطرہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ کسی بھی وقت مصر میں جاری پر تشدد مظاہرے دوسرے عرب ملکوں تک بھی پھیل سکتے ہیں اور تیل کی قیمتیں بڑھ

سکتی ہیں۔ یہ خدشہ بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے کہ مصر میں حکومت کی تبدیلی سے نہر سوئز کو بند کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف مصری عوام غربت، کرپشن اور پسماندگی سے تنگ آ چکے ہیں تو دوسری جانب نہر سوئز تیل کی سپلائی کا ایک اہم روٹ ہے اور اس کے ذریعے یومیہ ایک ملین بیرل تیل کی ترسیل ہوتی ہے۔ اس ترسیل کا اہم ذریعہ نہر سوئز ہے۔ جس سے امریکہ یورپ اور اسرائیل کے مفادات بندھے ہوئے ہیں۔ امریکی سینیٹ نے جنرل جیمز ماٹس کو گزشتہ اگست میں امریکی سینٹرل کمانڈ کا سربراہ مقرر کیا تھا اور انہوں نے جنرل پیٹریاس کی جگہ یہ اہم عہدہ سنبھالا تھا، جو افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کی فورسز کی سربراہی کر رہے تھے۔

تیل کی عالمی تنظیم اوپیک کے سیکرٹری جنرل عبداللہ البدری نے بھی اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ تیل کی سپلائی میں خلل آنے کی صورت میں تیل کی مجموعی پیداوار بڑھا دی جائے گی۔

قاہرہ میں اقتدار کی جنگ جاری ہے اور تحریر اسکوائر میں پرامن مظاہرین پر حسنی مبارک کے حامیوں کے روپ میں حملہ کرنے والے پولیس والوں کے وحشیانہ تشدد کے باوجود مظاہرین کے حوصلے بلند ہیں۔ پرامن ملین مارچ کے بعد 82 سالہ مصری صدر حسنی مبارک نے کہا ہے کہ وہ چند ماہ بعد اقتدار سے دست بردار ہو

جائیں گے۔ لیکن عوام نے اس بات کو مسترد کردیا ہے اور فوری اقتدار چھوڑنے کا مطالبہ کیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مصر کو برطانوی قبضے سے آزاد کرانے کے لیے فوج میں ہم خیال افراد کا ایک گروہ تشکیل دیا تھا۔ اسی گروہ نے 23 جولائی 1952ء کو بغاوت کرتے ہوئے حکومتی دفاتر، ریڈیو اسٹیشنوں، تھانوں اور قاہرہ میں فوج کے صدر دفتر پر قبضہ کرلیا۔ اس بغاوت کے نتیجے میں 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ کے ہیرو جنرل محمد نجیب مصر کے صدر بن گئے۔

ناصر 1958ء میں ٹائم میگزین کے سرورق پر جمال عبدالناصر کی تصویر شائع ہوئی تھی، 23 جون 1956ء کو مصر کے صدر بنے۔ ان کے دور صدارت کے کارناموں میں نہر سوئز سے برطانوی افواج کا انخلا اور اسوان ڈیم کی تعمیر ہیں۔ صدر ناصر شروع شروع میں ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھے جو مغربی ملکوں کے خلاف نہیں تھی لیکن 1954ء کے بعد وہ روس اور اشتراکی ممالک کی طرف زیادہ جھکنے لگے اور اس طرح مصر اور مغربی ممالک کے درمیان براہ راست کشمکش شروع ہو گئی جس کا پہلا بڑا اظہار اسوان بند کی تعمیر کے سلسلے میں ہوا۔ مصر کی خوشحالی کا تمام تر انحصار دریائے نیل پر ہے، جس کی وجہ سے مصر کو تحفئ نیل کہا جاتا ہے۔ نیل کے پانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مصری حکومت نے اسوان کے مقام پر پرانے بند کی جگہ ایک نیا اور زیادہ بڑا بند تعمیر کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا تاکہ مصر میں مزید زمین زیر کاشت آسکے اور بن بجلی بڑی مقدار

میں حاصل ہوسکے۔ امریکہ، برطانیہ اور عالمی بینک نے اس منصوبے کے لیے قرضہ فراہم کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن ان ملکوں نے جب دیکھا کہ مصر روس اور اشتراکی ممالک کی طرف مائل ہو رہا ہے اور ایک ایسی پالیسی پر چل رہا ہے جو ان کے مفاد کے خلاف ہے تو انھوں نے جولائی 1956ء میں قرضہ دینے کا فیصلہ واپس لے لیا۔ سوئز بحران اسوان بند کی تعمیر مصری معیشت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی تھی اس لیے مصر میں امریکہ اور برطانیہ کے فیصلے کے خلاف شدید رد عمل ہوا صدر ناصر نے فرانس اور برطانیہ کی زیر ملکیت نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لے لیا اور اعلان کیا کہ اسوان بند نہر سوئز کی آمدنی سے تعمیر کیا جائے گا۔ برطانیہ اور فرانس نے مصر کے اس فیصلے کے خلاف اسرائیل کے ساتھ مل کر سازش کے تحت 29 اکتوبر 1956ء کو اسرائیل کے ذریعے مصر پر حملہ کرادیا جس کے دوران اسرائیل نے جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا۔ اگلے ہفتے برطانیہ اور فرانس نے بھی نہر سوئز کے علاقے میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ برطانیہ اور فرانس کی اس جارحانہ کاروائی کا دنیا بھر میں شدید رد عمل ہوا، امریکہ نے بھی پرزور مذمت کی اور روس نے مصر کو کھل کر امداد دینے کا اعلان کیا۔ رائے عامہ کے اس دباؤ کے تحت برطانیہ اور فرانس کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں اور اسرائیل نے بھی جزیرہ نمائے سینا خالی کر دیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے دستے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر متعین کر دیئے گئے تا کہ طرفین ایک دوسرے کے خلاف جنگی کاروائی نہ کر سکیں۔ یہ واقعہ سوئز بحران " کہلاتا ہے۔ غیر ملکی "

افواج کے کامیاب انخلا سے ناصر عرب دنیا میں ہیرو اور فاتح کی حیثیت سے ابھرے۔ روس کی مدد سے اسوان بند کی تعمیر یکم جنوری 1960ء کو شروع اور 1970ء میں مکمل ہوئی۔ بند کی تعمیر کے نتیجے میں جو جھیل وجود میں آئی اسے جھیل ناصر کا نام دیا گیا۔

روسی اثر کا بڑھنا

ناصر اور خروشیف 9 سے 26 مئی 1964ء تک مصر کے دورے کے دوران سوویت وزیر اعظم نکیتا خروشیف نے ناصر کو "ہیرو آف سوویت یونین"، آرڈر آف لینن" اور "سوویت گولڈن اسٹار" کے اعزازات سے نوازا۔

اسوان بند کی تعمیر کی ذمہ داری بھی روس نے قبول کرلی اور وسیع پیانے پر اسلحہ بھی مصر کو فراہم کرنا شروع کردیا۔ مصر نے یہ پالیسی اگرچہ مغربی اثرات سے آزاد رہ کر قومی مقاصد کو اپنی مرضی کے مطابق پورے کرنے کے لیے اختیار کی تھی لیکن مغرب سے پوری طرح کٹ جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر کی غیر جانبدارانہ پالیسی ختم ہوگئی اور مصر نہ صرف اپنی ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل بلکہ اپنی بقا کے لیے بھی روس کا محتاج ہوگیا۔ مصر کی حالت تقریباً

اس قسم کی ہو گئی تھی جو سوئیکارنو کے آخری دور میں انڈونیشیا کی تھی۔ ناصر نے اگرچہ انقلاب کے آغاز میں ہی کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا لیکن اس کے باوجود اشتراکی نظریات پہلے سے زیادہ شدت سے مصر میں عام ہونا شروع ہو گئے اور صدر ناصر کے دور میں مصر میں جن سماجی اور اقتصادی نظریات کا غلبہ ہوا وہ روس کے اشتراکی نظریات سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لے کر برطانیہ اور فرانس کے حملوں کا جرات کے ساتھ مقابلہ کرکے ناصر نے جس ہمت کا ثبوت دیا اس کی وجہ سے وہ عربوں میں بالخصوص اور دنیا میں بالعموم مصر کا وقار بڑھ گیا لیکن مصر کے وقار میں اس اضافے کے ساتھ ساتھ مصر پر روس کے اثرات میں اضافہ ہوگیا۔ اب تک مصر کے بیشتر ترقیاتی منصوبے امریکہ اور مغربی ممالک کی امداد سے مکمل کیے جاتے تھے لیکن ہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد مغربی ممالک سے مصر کے تعلقات ختم ہو گئے۔ اس طرح بیرونی امداد کے معاملے میں جو خلا پیدا ہوا اسے روس اور دیگر اشتراکی ممالک نے پر کرنے کی کوشش کی۔ صدر ناصر چونکہ عرب دنیا کی مقبول ترین شخصیت بن چکے تھے اس لیے انہوں نے اپنی اس حیثیت سے فائدہ اٹھا کر عرب اتحاد کے لیے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اس مقصد کی تکمیل میں عرب ملکوں کے بادشاہی نظام اور غیر اشتراکی نظام سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ناصر نے ان کو ختم کرنے کے لیے جمہوری طریقوں کے بجائے سازشوں کا طریقہ اختیار کیا

اور عرب ملکوں میں براہ راست مداخلت شروع کردی۔ اس طریقہ کار نے عرب ممالک کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ ناصر عرب اتحاد نہیں بلکہ اپنا اقتدار چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عرب ممالک کے اختلافات پہلے سے زیادہ بڑھ گئے۔

عرب اتحاد کا نعرہ عرب اتحاد کے نقطہ نظر سے 1958ء سے 1960ء تک کا زمانہ سب سے کامیاب زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ فروری 1958ء میں شام میں اشتراکیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لیے شام نے مصر سے الحاق کرلیا اور اس طرح دونوں ملکوں پر مشتمل متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئی۔ بعد میں یمن اس جمہوریہ کا تیسرا رکن بن گیا لیکن صدر ناصر کی آمرانہ پالیسی کی وجہ سے متحدہ عرب جمہوریہ کی گاڑی زیادہ دن نہ چل سکی۔ سب سے پہلے شام نے بغاوت کی اور وہ 30 ستمبر 1961ء کو مصر سے علیحدہ ہوگیا۔ اس کے بعد یمن کو خود مصر نے متحدہ عرب جمہوریہ سے خارج کردیا۔ اس کے باوجود مصر اپنے لیے 10 سال یعنی ستمبر 1971ء تک متحدہ عرب جمہوریہ کی اصطلاح استعمال کرتا رہا۔

عرب ممالک میں مداخلت صدر ناصر اگرچہ اپنے حامیوں کی مدد سے عراق، شام اور اردن میں مداخلت کررہے تھے اور سعودی عرب کے خلاف انہوں نے مسلسل مہم چلائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تمام ممالک میں مغربی کٹھ پتلی حکومتیں بادشاہت کی صورت میں قائم تھیں اور ہر فیصلے کے لیے مغرب کی محتاج تھیں۔

دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی سب سے نمایاں مثال یمن کی ہے۔ یہاں انہوں نے پہلے تو یمنی حریت پسندوں کے ایک گروہ سے سازش کرکے ستمبر 1965ء میں امام یمن کا تختہ الٹ دیا اور جب اس کے نتیجے میں شاہ پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو صدر ناصر نے اپنے حامیوں کی مدد کے لیے وسیع پیمانے پر فوج اور اسلحہ یمن بھیجنا شرع کردیا اور چند ماہ کے اندر یمن میں مصری فوجوں کی تعداد 70 ہزار تک پہنچ گئی۔ بلاشبہ صدر ناصر کے اس جرات مندانہ اقدام کی وجہ سے عرب کے ایک انتہائی پسماندہ ملک یمن میں بادشاہت کا قدیم اور فرسودہ نظام ختم ہوگیا اور جمہوریت کی داغ بیل ڈال دی گئی لیکن یہ اقدام خود مصر کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

صدر ناصر یمن کی فوجی امداد کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے تھے کہ اب مصر دنیائے عرب کا سب سے طاقتور ملک بن گیا ہے وہ اسرائیل کے مقابلے میں روس پر مکمل بھروسہ کرسکتا ہے چنانچہ ایک طرف تو انہوں نے طاقت کے مظاہرے کے لیے ہزاروں فوجی یمن بھیج دیئے اور دوسری طرف اسرائیل کو دھمکایا۔ اقوام متحدہ کی جو فوج 1956ء سے اسرائیل اور مصر کی سرحد پر تعینات تھی صدر ناصر نے اس کی واپسی کا مطالبہ کردیا اور آبنائے عقبہ کو جہاز رانی کے لیے بند کرکے اسرائیل کی ناکہ بندی کردی۔ اسرائیل اس جنگ کے لیے پوری طرح تیار تھا

اورامریکہ اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ انھوں نے مصر کی کمزوری کا اندازہ کرکے جون 1967ء کے پہلے ہفتے میں بغیر کسی اعلان جنگ کے اچانک مصر پر حملہ کردیا اور مصر کا بیشتر فضائی بیڑہ ایک ہی حملے میں تباہ کردیا۔ مصر کی فوج کا بڑا حصہ یمن میں تھا جسے بروقت بلانا ممکن نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ 6 دن کی مختصر مدت میں اسرائیل نے نہ صرف باقی فلسطین سے مصر اور اردن کو نکال باہر کیا بلکہ شام میں جولان کے پہاڑی علاقے اور مصر کے پورے جزیرہ نمائے سینا پر بھی قبضہ کرلیا۔ ہزاروں مصری فوجی قیدی بنالئے گئے اور روسی اسلحہ اور ٹینک یا تو جنگ میں برباد ہوگئے یا اسرائیلیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ عربوں نے اپنی تاریخ میں کبھی اتنی ذلت آمیز شکست نہیں کھائی ہوگی اور اس کے اثرات سے ابھی تک عربوں کو نجات نہیں ملی۔ اسرائیل کے مقابلے میں اس ذلت آمیز شکست کے بعد صدر ناصر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سعودی عرب اور اردن سے مفاہمت پیدا کی اور شاہ فیصل سے تصفیہ کے بعد جس کے تحت مصر نے یمن میں مداخلت نہ کرنے کا عہد کیا، مصری فوجیں یمن سے واپس بلالی گئیں۔ مصر کی شکست کی سب سے بڑی وجہ مصری فوج کی نااہلی اور مصری فوجی نظام کے نقائص تھے لیکن مصری فوج اور اسلحہ کی بڑی تعداد کو یمن بھیجنا بھی شکست کی ایک بڑی وجہ تھی۔

جون 1967ء کی جنگ کے نتیجے میں غزہ (فلسطین)، اور جزیرہ نمائے سینا کا 24

ہزار مربع میل (ایک لاکھ 8 ہزار مربع کلومیٹر) کا علاقہ اسرائیل کے قبضے میں آگیا، نہر سوئز بند ہو گئی اور مصر جزیرہ نمائے سینا کے تیل کے چشموں سے محروم ہوگیا۔ صدر ناصر نے شکست کی ذمہ داری تسلیم کرتے ہوئے فوراً استعفی دے دیا لیکن ایک آمرانہ نظام میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ آمر کی جگہ لینے والا آسانی سے نہیں ملتا۔ مصر میں بھی یہی ہوا چونکہ کوئی متبادل رہنما سامنے نہیں آیا اس لئے 9 جون کو استعفی واپس لینے کے لیے قاہرہ میں مظاہرے کئے گئے اور صدر ناصر نے استعفی واپس لے لیا۔ اس طرح صدر ناصر کا اقتدار تو قائم رہا لیکن 1967ء کی شکست کی وجہ سے مصری فوج کی عزت خاک میں مل گئی۔ لوگ فوجیوں کو دیکھ کر فقرے چست کرنے لگے جس کی وجہ سے فوجیوں کو عام اوقات میں وردی پہن کر سڑکوں پر نکلنے سے روک دیا گیا۔

1967ء کی جنگ نے مصر کی معیشت کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ مصر کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ نہر سوئز تھی جس کی وجہ سے مصر کو ہر سال ساڑھے 9 کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ نہر کے مشرقی کنارے پر اسرائیل کا قبضہ ہوجانے کے بعد نہر سوئز میں جہاز رانی بند ہو گئی۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ مصر کو اسرائیل کی جارحانہ کاروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اپنی معیشت کو مضبوط بنانے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی نہر سوئز کی آمدنی کا بند ہونا بڑا تباہ کن ثابت ہوتا لیکن سعودی عرب، کویت اور لیبیا آڑے آئے اور تینوں نے مل

کر ساڑھے 9 کروڑ ڈالر سالانہ کی امداد فراہم کرکے نہر سوئز کی بندش سے ہونے والے نقصان کی تلافی کردی۔

جولائی 1968ء میں صدر ناصر نے روس کا دورہ کیا جس کے بعد روس نے مصر کو از سر نو مسلح کرنا شروع کیا۔ روس نے پہلی مرتبہ زمین سے ہوا میں چلائے جانے والے کم فاصلے کے میزائل مصر کو دیئے۔ آواز کی رفتار سے ڈیڑھ گنا تیز چلنے والے جیٹ طیارے اور 500 ٹینک دینے کا وعدہ کیا۔ تین ہزار فوجی مشیر اور فنی ماہر بھی فراہم کئے۔ عرب ملکوں میں سعودی عرب، کویت اور لیبیا نے وسیع پیانے پر مالی امداد فراہم کی۔ روس اور عرب ملکوں کی اس امداد سے مصر کے فوجی نقصانات کی ایک حد تک تلافی بھی ہوگئی اور اقتصادی حالت بھی سنبھل گئی۔ 1968ء کے آخر میں اسوان بند نے بھی کام شروع کردیا۔

صدر نے اگرچہ 1968ء میں ایک استصواب رائے کے ذریعے عوام کا اعتماد بھی حاصل کرلیا تھا لیکن ان کی پالیسی کے خلاف اندرونی بے چینی میں برابر اضافہ ہورہا تھا لیکن اس کا اظہار استبدادی نظام کی وجہ سے کھل کر نہیں ہوسکتا تھا لیکن جنوری 1968ء میں طلبہ نے پولیس راج کے خلاف جو مظاہرہ کیا اس سے اس بے چینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ روس کی پالیسی سے عوام غیر مطمئن تھے لیکن اب صدر ناصر کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ روس صرف دفاع کی حد

تک اسلحہ دینا چاہتا تھا اور وہ مصر کو اتنا مضبوط نہیں بنانا چاہتا تھا کہ اسرائیل کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ اس کے برخلاف امریکہ نے اسرائیل کو اتنا مسلح کردیا تھا کہ وہ اپنے پڑوس کے تمام عرب ملکوں کے خلاف بیک وقت جارحانہ کارروائی کر سکتا تھا۔

صدر ناصر کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ روس فوجی اور اقتصادی امداد کے ذریعے مصر میں کمیونزم کا فروغ چاہتا ہے اور فلسطین سے متعلق عربوں کی پالیسی کو اپنے مفاد کے تحت تشکیل دینا چاہتا ہے۔ آخرکار صدر ناصر نے طے کیا کہ اسلحہ اور اقتصادیات کے معاملے میں صرف ایک ملک پر انحصار مصر کے لیے مفید نہیں ہوسکتا اور 1969ء میں انہوں نے اس مقصد کے لیے مغرب خصوصاً فرانس کی طرف رخ کیا لیکن صدر ناصر کی یہ پالیسی ابھی واضح شکل بھی اختیار نہ کرپائی کہ 28 ستمبر 1970ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔

اخوان المسلمون پر مظالم

ناصر اور اخوان ناصر نے اپنے دور اقتدار میں 13 جنوری 1954ء کو اخوان المسلمون پر پابندی عائد کرکے اسے خلاف قانون قرار دے دیا اور حسن الھضیبی سمیت بہت سے اخوانی گرفتار کرلئے گئے۔ اخوان کی سرگرمیاں پابندی کے بعد بھی ختم نہیں ہوئیں۔ 7 جولائی 1954ء کو مصری حکومت نے جب انگریزوں سے معاہدہ کیا تو اخوان نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اس معاہدے کو مصر کو برطانیہ

کے ہاتھوں فروخت کر دینے کے مترادف قرار دیا۔ اس معاہدے کی مخالفت کی وجہ سے حکومت نے روزنامہ اخوان المسلمون پر 10 ستمبر 1954ء کو پابندی لگادی۔ 26 اکتوبر کو ناصر پر قاتلانہ حملہ ہوا جس نے ناصر کو اخوان کے خلاف کاروائی کرنے کا موقع فراہم کردیا اور اخوان کی تردید کے باوجود کارکنوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ مصر کے مشہور اخبار "المصری" کے ایڈیٹر احمد ابو الفتح کے مطابق چند ہفتوں کے اندر گرفتار ہونے والوں کی تعداد 50 ہزار تک پہنچ گئی جن میں سید قطب اور عبدالقادر عودہ جیسے مفکر اور ادیب بھی شامل تھے۔ 7 نومبر 1954ء کو فوجی عدالت نے 6 ممتاز اخوان رہنماؤں کو صفائی کی سہولتیں فراہم کئے بغیر سزائے موت سنادی۔ حسن ہضیبی کی سزائے موت بڑھاپے کی وجہ سے عمر قید میں تبدیل کردی گئی۔

مارچ 1964ء میں جب مصر میں ہنگامی حالت کا خاتمہ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کردیے گئے جن میں اخوان بھی تھے لیکن ایک سال بعد ہی اخوان پر ابتلا اور آزمائش میں مبتلا ہوگئے۔ جولائی 1965ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں پکڑ دھکڑ کی نئی مہم شروع ہو گئی جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 6 ہزار اخوان گرفتار کر لئے گئے جبکہ غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق یہ تعداد 20 سے 50 ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ جن میں تقریبا 800 خواتین بھی شامل تھیں۔ حسن ہضیبی بھی دوبارہ گرفتار کر لئے گئے اور ان کو تین سال قید

بامشقت کی سزا سنائی گئی جس کی تاب نہ لاکر وہ 8 نومبر 1965ء کو شہید ہوگئے۔
اس مرتبہ کو جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں سب سے ممتاز شخصیت استاد سید قطب (1906ء تا1966ء) کی تھی جو نہ صرف اخوان کے حلقے بلکہ اپنے زمانے میں مصر کے سب سے بڑے مفکر اور ادیب تھے۔ انہیں 13 جولائی 1955ء کو عوامی عدالت کی طرف سے 15 سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ تاہم ان کی علمی عظمت سے واقفیت کے بعد ناصر نے انہیں ایک سال بعد معافی کی شرط پر رہا کرنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن سید قطب نے معافی مانگنے سے انکار کردیا۔ انہیں وزارت تعلیم کی بھی پیشکش کی گئی جو انہوں نے ٹھکرادی۔ حکومتی پیشکشیں قبول نہ کرنے پر سید قطب کی رہائی عمل میں نہ آسکی۔ مارچ 1964ء میں ہنگامی حالت کے خاتمے کے بعد رہا ہونے والے سیاسی قیدیوں میں وہ بھی شامل تھے لیکن ایک سال بعد اخوان کے تیسرے دور ابتلاء و آزمائش میں وہ پھر گرفتار کرلئے گئے۔ اس مرتبہ ان کے بھائی محمد قطب اور دو بہنیں حمیدہ قطب اور امینہ قطب بھی گرفتار ہوئیں۔ 25 اگست 1966ء کو حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں سید قطب اور ان کے ساتھیوں پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا۔ ملزمان کی طرف سے پیروی کرنے والا کوئی وکیل نہ تھا، باہر کے لوگوں نے پیروی کرنا چاہی لیکن انہیں اس کی اجازت نہ دی گئی۔ بالآخر 25 اگست 1966ء کو سید قطب کو پھانسی

دے دی گئی۔ اس طرح وہ حق کی خاطر جان لٹانے والے شہداء کے قافلے کے ہم سفر بن گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینا، زرعی و صنعتی اصلاحات اور مغرب کی سامراجی قوتوں کے مقابلے میں جرات مندانہ اقدامات صدر ناصر کے ایسے کارنامے ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کے روشن کارناموں کو ان کے استبدادی مزاج اور مخالف عناصر پر ہولناک مظالم نے داغدار کردیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ تاریخ میں صدر ناصر کا نام اسلامی تحریک کو کچلنے، اسلامی اقدار اور پیغام کو دبانے اور غیر اسلامی اقدار کو فروغ دینے والوں میں سرفہرست ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایسے شخص کے دور میں ہوا جس نے مصر سے باہر افریقہ میں اسلام کی تبلیغ کے لیے قابل قدر کوششیں کیں۔ ناصر کی طبیعت کا یہ تضاد ظاہر کرتا ہے کہ اسلام سے زیادہ ان کو اپنا اقتدار عزیز تھا۔

نہر سوئز

نہر سوئز مصر کی ایک سمندری گذرگاہ ہے جو بحیرہ روم کو بحیرہ قلزم سے ملاتی ہے۔ اس کے بحیرہ روم کے کنارے پر پورٹ سعید اور بحیرہ قلزم کے کنارے پر سوئز شہر موجود ہے۔ یہ نہر 163 کلومیٹر (101 میل) طویل اور کم از کم 300

میٹر چوڑی ہے۔اس نہر کی بدولت بحری جہاز افریقہ کے گرد چکر لگائے بغیر یورپ اور ایشیاکے درمیان آمدورفت کر سکتے ہیں۔ 1869ء میں نہر کی تعمیر سے قبل اس علاقے سے بحری جہاز ایک جانب سامان اتارتے تھے اور بحیرہ قلزم تک اسے بذریعہ سڑک لے جایا جاتا تھا۔

بحیرہ احمر یا بحیرہ قلزم بحر ہند کی ایک خلیج ہے۔ یہ آبنائے باب المندب اور خلیج عدن کے ذریعے بحر ہند سے منسلک ہے۔ اس کے شمال میں جزیرہ نمائے سینا، خلیج عقبہ اور خلیج سوئز واقع ہیں جو نہر سوئز سے ملی ہوئی ہے۔ 19 ویں صدی تک یورپی اسے خلیج عرب بھی کہتے تھے۔تاریخ میں پہلی بار بحیرہ احمر میں سفر کی کوشش مصریوں نے کی۔ بائبل میں موسیٰ کی کہانی میں ایک کنیز کے بیٹے کی جانب سے اسرائیلیوں کو آزادی دلانے کے لئے بحیرہ احمر کو عبور کرنے کی کوششوں کا ذکر ہے۔ یورپیوں نے 15 ویں صدی میں بحیرہ احمر میں پہلی بار دلچسپی کا اظہار کیا۔ 1798ء میں فرانسیسی جنرل نپولین بوناپارٹ نے مصر پر حملہ کرکے بحیرہ احمر پر قبضہ کرلیا۔ انجینئر جے پی لیپیر نے بحیرہ احمر اور بحیرہ روم کو ملانے کے لئے نہر کی تعمیر کی, جس کا منصوبہ عثمانیوں نے بنایا تھا مگر اسے بنا نہ سکے تھے۔ نہر سوئز کو نومبر 1869ء میں کھولا گیا۔ اس وقت برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے مشترکہ طور پر نہر میں تجارتی مقامات سنبھالے۔ جنگ عظیم اول کے بعد یہ مقامات بتدریج ختم ہوگئے۔ دوسری جنگ عظیم

کے بعد امریکہ اور سوویت یونین نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کی۔ عربوں اور اسرائیل کے درمیان 6 روزہ جنگ کے باعث نہر سوئز 1967ء سے 1975ء تک بند رہی۔

سوئز کی اہمیت کے پیش نظر اسرائیل اب سوئز پر گرفت رکھتا ہے۔ اس کی میرین بھی یہاں آتی جاتی ہیں اور یہاں ایک سرنگ بھی بنانے کی اطلاعات ہیں۔ گذشتہ سال اسرائیل کی ایک سب میرین نے نہر سوئز سے بحر اسود کے درمیان بحریہ کی ایک فوجی مشق میں حصہ لیا تھا. اس بات کا انکشاف دفاعی ذرائع نے کیا تھا۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ اسرائیلی بحریہ نے ایلات کے ساحلی علاقے میں فوجی مشق کی تھی اور اس دوران '' اسرائیل کی ایک ڈالفن کلاس کی سب میرین نے بحر اسود سے نہر سوئیز تک چکر لگایا تھا اور یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ ایک اسرائیلی کے مطابق '' اس فوجی مشق کی کئی ماہ قبل منصوبہ بندی کی گئی تھی. بحری تجربہ رکھنے والے ایک اور اسرائیلی ذریعے نے دعویٰ کیا ہے کہ اس بحری مشق سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم پہلے کی نسبت زیادہ سرعت اور آسانی کے ساتھ بحر ہند اور خلیج فارس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں'' مصری ذرائع اس بات سے آگاہ ہیں کہ اسرائیل نے سوئز میں خفیہ گزرگاہ بنالی ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ اسرائیلیوں نے نہر میں اگر کوئی ایسا راستہ بنالیا ہے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ مصر اور اسرائیل حالت جنگ میں نہیں ہیں۔

اسرائیلی روزنامہ یدیعوت احرنوت نے بھی اس کی تصدیق کی کہ ایک اسرائیلی سب میرین نے پہلی مرتبہ میں نہر سوئز کو بحیرہ احمر میں فوجی مشق میں حصہ لینے کے لئے استعمال کیا تھا.اس سے پہلے اسرائیلی بحری جہاز بحیرہ احمر میں پہنچنے کے لئے افریقہ کا ایک ہفتے کا لمبا سمندری چکر کاٹتے تھے.

اس اخبار کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ڈالفن سب میرین کے ساتھ مصر کے بحری جہاز بھی سفر کررہے تھے اور یہ اسرائیل کے دشمن ملک ایران کے لئے ایک واضح پیغام تھا اور اسرائیل اور مصر کی جانب سے ایران کے جوہری پروگرام کے خطرے کے پیش نظر آپس کے باہمی رابطے کا اظہار تھا.اسرائیل کو شبہ ہے کہ ایران اپنے سویلین نیوکلئیر پروگرام کے پردے میں جوہری بم تیار کررہا ہے اور اسے اس بم سے خطرہ ہے. لیکن ایران اس الزام کی مسلسل تردید کرتا چلا آرہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس کا جوہری پروگرام پرامن مقاصد کے لئے ہے. واضح رہے کہ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کی واحد جوہری طاقت سمجھا جاتا ہے۔ نہر سوئز شمال مشرقی افریقہ میں واقع ہے اور یہ دنیا کے تین براعظموں کے مختلف ممالک کو ملانے کا نزدیک ترین بحری راستہ ہے۔ مصر کی ترقی کا استحکام اور اس کے خرچ کا دار ومدار زیادہ تر بیرونی ممالک کے سرمایہ کاروں کے اعتماد پر منحصر ہے جو.بڑی تعداد میں سیاح کے روپ میں آتے ہیں یا پھر وہ کمپنیاں جو حکمت عملی کے اعتبار بہت ہی اہم سوئز کینال کے ذریعے اپنے مال.بردار بحری جہاز بھیجتی

ہیں۔ موجودہ حکومت مخالف مظاہروں کے پیش نظر بحران سے بچنے کے لیے بیشتر بیرونی کمپنیوں نے بچاؤ کی تدابیر اپنائی ہیں۔ ادھر اس خدشے کے پیش نظر کہ اس بحران سے تیل کی آمد و رفت متاثر ہوگی، تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ائر لائنز اور سیاحتی کمپنیوں میں شیئرز گرنے لگے ہیں اور سیاحوں کو یا تو ملک چھوڑ کر جانے کے لیے کہا جا رہا ہے یا پھر اہم شہروں میں جانے سے باز رہنے کو کہا جا رہا ہے۔ مصر کو دو ہزار نو میں شعبہ سیاحت سے ساڑھے گیارہ کروڑ ارب ڈالر سے بھی زیادہ کی کمائی ہوئی تھی۔ اگرچہ دو ہزار دس کے حتمی نتائج نہیں آئے ہیں لیکن سال کے پہلے نصف میں مصر جانے والوں میں تقریباً اکیس فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ مصر میں تقریباً بارہ فیصد محنت کش لوگ شعبہ سیاحت سے جڑے ہیں اور اکتوبر سے مئی تک کے درمیان سیاحت کے لیے سب سے اہم وقت ہوتا ہے۔ مصر کے سرکاری ذرائع ابلاغ کی طرف سے مستقل یہ بات دہرانے کے باوجود کہ سوئز کنال میں آمد و رفت متاثر نہیں ہوگی۔ سنہ انیس سو ستانوے میں لگزر میں اٹھاون سیاحوں کے قتل کے بعد سے آنے والوں میں کمی دیکھی گئی تھی۔ گیارہ ستمبر کو امریکہ کے ٹوئن ٹاورز پر حملے اور دو ہزار چار اور چھ میں سینائی میں حملے کے بعد سے بھی سیاحوں کی تعداد کم ہوئی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجموعی سطح پر اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ سنہ دو ہزار میں تقریباً پچپن لاکھ لوگ مصر گئے تھے جس سے سوا چار ارب ڈالر سے بھی زیادہ کی آمدنی ہوئی تھی۔ مصر کے موجودہ بحران سے ایک بات تو صاف ہے کہ عالمی معیشت

باہم مربوط ہے لیکن یہاں اس کا واضح ثبوت سوئز کنال کے روپ میں ہی دکھتا ہے۔ سرمایہ کاروں اور بیرونی کمپنیوں میں سب سے زیادہ تشویش اس بات پر ہے کہ کہیں اس سے سوئز کنال کو تو خطرہ لاحق نہیں ہے کیونکہ ان مظاہروں کا ایک اہم مرکز سوئز شہر بھی رہا ہے۔ مصر کے سرکاری ذرائع ابلاغ کی طرف سے مستقل یہ بات دہرانے کے باوجود کہ سوئز کنال میں آمد و رفت متاثر نہیں ہوگی، تیل کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ عالمی سطح پر تیل کی پیداوار کا تقریبا ایک فیصد تیل ٹینکرز یا پائپ لائن سے نہر سوئز سے ہی گزرتا ہے۔ اس نہر سے ہر برس تقریباً پینتیس ہزار بحری جہاز گزرتے ہیں اور دنیا میں مال بردار جہازوں کی آمد و رفت کے لیے یہ سب سے اہم راستوں میں ایک ہے۔

بی این پی کے ثام پینٹنز کہتے ہیں کہ '' سپلائی کے حوالے سے پر اب کچھ پریشانی ہے۔ ان کے مطابق نہر سوئز میں کسی بھی طرح کی رخنہ اندازی سے امریکہ سے زیادہ یوروپ کو پریشانی ہوگی۔

تیل اور سیاحت کے بعد سوئز کینال مصر کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس ماہ حکام نے سوئز کنال سے دو ہزار دس میں حاصل ہونے والے محصولات پونے پانچ ارب امریکی ڈالر بتایا ہے۔

اگرچہ مصری حکام اس بات پر مصر رہے ہیں کہ وہ سوئز کینال میں کسی بھی طرح کی رخنہ اندازی کی کوششوں سے سختی سے نمٹیں گے۔

ایک حالیہ رپورٹ میں عالمی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف، جس نے دو ہزار آٹھ میں مصر میں تقریباً تئیس لاکھ لوگوں کو بے روزگار بتایا تھا، کا کہنا ہے کہ دو ہزار بیس تک یہ تعداد ستّر لاکھ سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ ڈنمارک کی شپنگ اور تیل کمپنی اے پی مولیر میئرزک کا کہنا ہے کہ اس صورت حال سے ان کی تجارتی اور آپریشنل سروسز متاثر ہوئی ہیں۔

اس کمپنی کے کینال میں پچپن فیصد کنٹینرز ہیں لیکن کپمنی کے ایک ترجمان نے موجودہ صورت حال سے ہونے والے نقصانات کے متعلق قیاس آرائی کرنے سے انکار کر دیا۔

اس موجودہ صورت حال کے اثرات سے پنپنے والے ایک اس امکان پر بھی غور ہورہا ہے کہ کہیں اس سے عالمی سطح پر ایسی تبدیلیاں تو رونما نہیں ہوں گی جس سے مزید بحران جنم لیں۔

ایک حالیہ رپورٹ میں عالمی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف، جس نے دو ہزار آٹھ

میں مصر میں تقریباً تئیس لاکھ لوگوں کو بے روزگار بتایا تھا، کا کہنا ہے کہ دو ہزار بیس تک یہ تعداد ستّر لاکھ سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔کچھ عرصے پہلے غزہ میں محصور افراد کو امدادی سامان پہنچانے پر نہر سوئز سے گزرنے پر بھی ایک تنازعہ کھڑا ہوگیا تھا۔

اور مصر میں نہر سوئز انتظامیہ کے ایک سرکاری عہدیدار نے کہا تھا کہ انتظامیہ کو ایران سمیت کسی ملک کی جانب سے نہر سوئز سے گزرنے کی اجازت کے لیے درخواست موصول نہیں ہوئی ہے تاہم ہماری جانب سے امدادی سامان لیکر غزہ آنے والے کسی بھی ایرانی جہاز کا راستہ روکا نہیں جائے گا۔

معروف مصری اخبار "اہرام" نے نہر سوئز کے امور کے ذمہ دار کے حوالے سے کہا ہے کہ " نہر سوئز انتظامیہ ایرانی جہازوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ معاہدہ قسطنطنیہ کے مطابق کسی بھی ملک کے بحری جہاز کو نہر سوئز سے گزرنے کی اجازت ہے۔ ایران میں موجود ہلال احمر تنظیم نے غزہ کی پٹی کا چار سال سے جاری اسرائیلی محاصرہ توڑنے کے لیے امدادی سامان پر مشتمل بحری جہاز غزہ کی پٹی بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ 3 فروری سنہ 1915 عیسوی کو پہلی جنگ عظیم کے دوران نہر سوئز پر پہلی بار حملہ کیا گیا۔ نہر سوئز وہ آبی راستہ ہے جو بحیرہ روم کو بحیرہ احمر سے ملاتا ہے۔اس دن جرمنی اور عثمانی سلطنت کی فوجوں نے مشترکہ طور پر نہر سوئز پر حملہ کیا جو

انگریزوں کے قبضے میں تھی۔ لیکن انہیں شکست ہوئی اور وہ پیچھے ہٹ گئیں۔ نہر سوئز پر انگریزوں کا قبضہ باقی رہا۔ 1956 میں مصری رہنما جمال عبدالناصر کے ذریعے نہر سوئز کو قومیانے کے اعلان تک اس پر انگریزوں کا ہی قبضہ تھا۔ نہر سوئز سے گزرنے کے لئے جہازوں کو کتنا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اس کا انحصار جہاز پر لدے سامان پر ہوتا ہے۔ اہم وجہ صومالی قزاقوں کا خطرہ ہے۔ اگرچہ افریقہ کا چکر کاٹ کر منزل تک پہنچنے میں 10 دن زیادہ لگتے ہیں لیکن اس روٹ پر بحری قزاقی کا خطرہ کم ہے۔ سوئز میں داخل ہونے کا منظر ایک سیاح نے یوں بیان کیا ہے۔

آہستہ آہستہ Containership رنگین خانوں میں بٹی دیوار کی طرح ایک عظیم اسماعیلیہ کے ساحلی علاقے سے گزر کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ یہ جہاز ساحل سے صرف پچاس میٹر دور ہے لیکن اس کے انجنوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مغرب کی جانب کھجور اور آم کے پیڑ دکھائی دیتے ہیں جبکہ مشرق کی جانب صحرائے سینائی پھیلا ہے۔ درمیان میں نہر سوئز ہے جس کا پانی گہرا نیلا ہے۔ نہر کے کنارے ایک اونچی عمارت کھڑی ہے جہاں سے بحری جہازوں کی آمد و رفت کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ جہاز نے نیوی گیشن سنٹر میں Mohammad Abdelkader رانی شعبے کے انچارج نصب ایک بڑی سکرین دکھاتے ہوئے کہا۔: " اس سکرین پر ہم راڈار تصویروں کی مدد سے نہر کے کسی بھی حصے کو چیک کر سکتے ہیں۔ شمال کی طرف سے آنے والے

میں اس وقت تک رکنا پڑتا ہے جب تک کہ جنوب Bitter Lake بحری جہازوں کو سے آنے والا جہازوں کا قافلہ گزر نہیں جاتا۔" جنوب کی پورٹ سعید سے شمال کی سوئز بندرگاہ تک پہنچنے میں جہازوں کو اوسطاً 14 گھنٹے لگتے ہیں۔ اس کے الٹ سفر میں اس قدر وقت نہیں لگتا۔ کیونکہ جہازوں کو انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ ہر روز تین قافلے نہر سے گزرتے ہیں۔ تقریباً 60 جہاز روزانہ نہر سوئز سے گزر کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ سوئز کینال انتظامیہ کے ڈائریکٹر Ahmad Ali Fadel نے بتایا: "ایک جہاز جو نہر سوئز سے گزرتا ہے،اسے منزل تک پہنچنے میں کم وقت لگتا ہے، اس کا ایندھن بھی کم خرچ ہوتا ہے اور اب اسے کرایہ بھی پہلے کے مقابلے میں کم ادا کرنا پڑتا ہے۔ پٹرول کی قیمتیں سستی ہونے کی وجہ سے بہت سے جہاز اب کیپ ٹاؤن کے متبادل روٹ سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں ایک طرح سے کاروباری مقابلے کا سامنا ہے جو پہلے نہیں تھا۔" اس کی سب سے بڑی وجہ بحری قزاقی کے واقعات ہیں Ahmad Ali Fadel نے کہا کہ بحری قزاق دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے وہ صومالیہ کے ساحلی علاقوں تک ہی کاروائیاں کرتے تھے، اب ساحل سے 50 سمندری میل دور تک مار کرنا ان کے لئے ایک عام سی بات ہے۔ نہر سوئز کو گہرا اور چوڑا کرنے کا کام جاری ہے۔ جس کے بعد یہاں سے 22 میٹر گہرائی تک پانی میں ڈوبے Containership بھی گزر سکیں گے۔ مصر میں غیر یقینی سیاسی صورت حال اور پر تشدد واقعات کی وجہ سے نہر سوئز کے راستے تیل بردار بحری جہازوں کی آمد و رفت متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔

اس کے نتیجے میں عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لندن میں مارچ کے سودوں کے لئے .برینٹ نارتھ سی کروڈ آئل کی قیمت ایک سو دو ڈالرز فی بیرل سے تجاوز کر گئی۔ یہ ستمبر دو ہزار آٹھ کے بعد فی بیرل تیل کی سب سے زیادہ قیمت ہے۔ نیویارک کی مارکیٹ میں بھی مارچ کے سودوں کے لئے فی بیرل تیل کی قیمت 9 سینٹس اضافے کے ساتھ 90 ڈالرز 86 سینٹس پر بند ہوئی ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہودیوں کا تیسرا ہدف کراچی اور گوادر کی بندرگاہیں ہیں جو خطے میں نہر سوئز سے زیادہ معاشی اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں۔ مسلم امہ کی تاریخ قوم پرستی اور غداری سے داغدار ہے۔ دیکھئے تاریخ میں سوئز نہر کیا گل کھلاتی ہے۔

خزینہ نبوت

خزینہ نبوت حضور اکرم ﷺ کی احادیث کا مختصر مجموعہ ہے۔ جس میں احادیث کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے۔ ربیع الاول کے ماہ مبارک کی مناسبت سے یہ بہت متبرک تحفہ ہے۔ جو اسلامک ریسرچ اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔احادیث کی منظوم ترجمانی پروفیسر سید ارشد جمیل نے کی ہے۔پروفیسر سید ارشد جمیل تدریس و تعلیم کے شعبہ سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ،، محسن انسانیت کے اقوال و افکار کو سخن وری کا موضوع بنانا مجھ جیسے سائنس کے استاد کے لئے خاصا مشکل کام تھا جو بہرحال اللہ کے کرم سے ہوگیا۔ ارشد جمیل صاحب نے جو مختصر احادیث منتخب کی ہیں۔ وہ حافظ فضل الرحمنشاہ صاحب نقشبندی مجددی کی کتاب،، جواہر نبوت،، سے لی گئی ہیں۔ پروفیسر عنایت علی خان نے اس منظوم ترجمانی پر نظر ثانی کی ہے۔ کتاب عمدہ گیٹ اپ اور خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ (بخاری) اس کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ اعمال کا مدار ہے نیت کا التزام۔ نیت میں ہو فتور تو اعمال سب حرام یا پھر یہ حدیث تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہے۔ اس کو شعر میں یوں بیاں کیا گیا ہے۔ تم میں سے بہترین ہے جو انسان خلیق ہو۔ جو اپنے اہل خانہ پر نرم و شفیق ہو، میانہ روی سب سے بہتر ہے (بہیقی) کو انھوں نے یوں

شعر میں بیان کیا ہے فرمان مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بڑا دلنشین ہے۔اوسط
عمل طریق عمل بہترین ہے۔کتاب کی قیمت سو روپے ہے۔ یہ کتاب نوجوانوں اور
شعری ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بہترین تحفہ ہے۔کتاب ڈی ۔35 بلاک 5
فیڈرل بی ایریا سے منگوائی جا سکتی ہے۔

کیا امن کی آشا کا خواب پورا ہو گا

بھارت میں پاکستانی فنکاروں کی تذلیل کب تک

امن کی آشا کا خواب ، دوستی اور ہم ایک ہیں کا نعرہ کھوکھلا اور زمینی حقائق سے بہت دور ہے۔ اس کا اندازہ ان عناصر کو ہو جانا چاہیئے جو کشمیر میں بہنے والے لہو کو موسیقی رقص اور فلموں کے حوالے سے بھلانا چاہتے ہیں۔ بھارت کا اصل چہرہ وہی ہے، جو ممتاز گلوکار راحت فتح علی خان کے گرفتاری کے بعد سامنے آیا ہے۔

پاکستانی گلوکار راحت فتح علی خان کو ایک لاکھ 24 ہزار ڈالر برآمد ہونے پر نئی دہلی ایئرپورٹ پر گرفتاری کے بعد اب چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن ان کا پاسپورٹ ان سے لے لیا گیا ہے اور انھیں بھارت چھوڑنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ ریونیو انٹیلی جنس حکام راحت فتح علی خان سے برآمد ہونیوالی رقم کے حوالے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔

راحت فتح علی خان کا کہنا ہے کہ انہیں دہلی ایئرپورٹ پر ایک بھارتی نجی کمپنی کے عہدیدار کی جانب سے رقم فراہم کی گئی لیکن انہیں قانون کا علم نہیں تھا کہ رقم کے بارے میں پہلے سے کسٹمز حکام

کو بتانا ضروری ہوتا ہے۔ دہلی ایئرپورٹ پر بھارتی کسٹمز نے پوچھ گچھ کے لئے ریونیو حکام کو طلب کرلیا جنہوں نے گلوکار سے تفتیش کے بعد انہیں گرفتار کرلیا۔ بھارتی میڈیا کے مطابق ان کے طائفے میں شامل دیگر16 افراد کو بھی حراست میں لے لیا گیا ہے۔ادھر پاکستان کے وزیرداخلہ رحمٰن ملک نے راحت فتح علی کو نئی دہلی ایئرپورٹ سے حراست میں لئے جانے کی اطلاع پر نئی دہلی میں موجود پاکستان کے ہائی کمشنر شاہد ملک سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور شاہد ملک سے راحت فتح علی کے متعلق تفصیلات طلب کیں، رحمٰن ملک نے ہائی کمشنر کو خود صورتحال کی نگرانی کرنے اور راحت فتح علی کو ہر ممکن تعاون فراہم کرنے کی ہدایت کی۔ بھارت میں پاکستانی فنکارون کی اہانت کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ راحت فتح علی خان کے خلاف گزشتہ سال جولائی میں بھارتی شہر گڑ گاؤں میں ایک تھانے میں ایف آئی آر درج کی گئی تھی جو ایک پروگرام کے منتظمین نے درج کرائی تھی۔ اس رپورٹ میں الزام لگایا گیا تھا کہ راحت فتح علی خان نے ایک شو میں پرفارم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ شو میں نہیں آئے جبکہ انہیں معاوضہ پیشگی ادا کیا گیا تھا۔ نئی دہلی کے ایک صحافی کے مطابق عین ممکن ہے کہ راحت فتح علی خان کو مذکورہ کیس کے حوالے سے بھی گرفتار کرلیا جائے گا۔ راحت فتح علی خان کو بھارت میں زبردستی روک لیا گیا ہے۔ یہ پاکستان اور فن کی توہین ہے۔

راحت نصرت فتح علی خان یا صرف راحت فتح علی خان (فیصل آباد میں 1974ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ایک پاکستانی موسیقار اور گلوکار ہیں۔ وہ بنیادی طور پر پنجابی قوالی کے ایک گلوکار ہیں۔ وہ استاد نصرت فتح علی خان کے بھتیجے ہیں۔ قوالی کے علاوہ بھی وہ غزل اور ہلکی پھلکی موسیقی گاتے ہیں۔ وہ بڑے پیمانے پر پاکستان، بھارت کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کا دورہ کرکے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر چکے ہیں راحت فیصل آباد میں 1974ء میں روایتی موسیقاروں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام فرخ فتح علی خان تھا۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی اور قوالی کے فن میں اپنے چچا نصرت فتح علی خان سے تربیت حاصل کی تھی۔۔ راحت کا پہلا عوامی فنی مظاہرہ دس یا گیارہ برس کی عمر میں ہوا جب انہوں نے اپنے چچا کے ساتھ 1985 میں برطانیہ کا دورہ کیا، اور قوالی پارٹی کے ساتھ گانے کے علاوہ سولو گانے بھی گائے۔ 27 جولائی، 1985ء کو برمنگھم میں ایک کنسرٹ میں انہوں نے سولو غزل،، مکھ تیرا سوہنیا شراب نالوں چنگا اے،،گائی۔ میں ہائرو تفریحی مرکز کے ایک کنسرٹ میں انہوں نے ایک سولو گانا،، گن 1985 گن تارے لنگھ گئیاں راتاں،،گایا۔انھوں نے پاپ (2004) کے ہٹ گانے من کی لگن سے بالی وڈ میں پس پردہ گلوکار کے طور پر اپنا نام درج کروایا۔ بالی وڈ فلموں کے گانوں کی وجہ سے وہ ہندوستان میں بھی بہت مقبول ہیں۔2010ء میں انہوں نے برطانیہ کے ایشیائی موسیقی اعزازات میں "بہترین بین الاقوامی ایکٹ" کا اعزاز جیتا برطانیہ)۔ AMAs)

اپنی منفرد آواز اور انداز کی بدولت بالی ووڈ میں چھا جانے والے پاکستانی گلوکار راحت فتح علی خان اب آسکر ایوارڈ یافتہ موسیقار اے آر رحمان کے ساتھ کام کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ راحت فتح علی خان مشہور بالی ووڈ ہدایت کار امتیاز علی کی آنے والی فلم راک اسٹار میں اے آر رحمان کی تخلیق کردہ موسیقی پر اپنی آواز کا جادو جگا ئیں گے۔ اس فلم میں ہیروئن کا کردار بھی ایک پاکستانی نژاد ماڈل نرگس فخری ادا کر رہی ہیں جبکہ رنبیر کپور ان کے مقابل ہیرو کا کردار نبھائیں گے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل نصرت فتح علی خان اور شیراز اوپل بھی اے آر رحمان کے ساتھ کام کر چکے ہیں 2010 میں موسیقی کے شعبہ میں راحت فتح علی خان کی کامیابی اور ان کی شہرت یقیناً دیر تک قائم رہے گی۔ اس سال راحت فتح علی خان کو ابھرنے اور خود کو دوسروں سے ممتاز ثابت کرنے کا موقع ملا۔ ان کے کئی گانے شہرت کی فہرست میں ٹاپ پر

رہے۔

فلم 'عشقیہ' کا گانا 'دل تو بچہ ہے جی' سال کے ابتدائی مہینوں میں ریلیز ہوا۔ یہ رومینٹک گانا تھا سو اس کی موسیقی ہٹ تو ہونا ہی تھی۔ عموماً رومینٹک گانے ہٹ ہو جاتے ہیں مگر ہر بار یہ فارمولا بھی کامیاب نہیں رہتا۔ وشال بھردواج نے اس گانے کو کمپوز کیا تھا۔ آواز کا جادو جگایا تھا راحت فتح علی

خان نے جس نے سننے والوں کے دل جیت لئے۔ گانے میں سنگر کا کمال بھی نمایاں رہا اور میوزک کا بھی جیسا کہ اکثر راج کپور کے گانوں میں ہوا کرتا تھا۔ ایک اور گانا سجدہ بھی بے حد مشہور ہوا۔ شنکر ،احسان ،لوئے کی خوب صورت کمپوزنگ سے سجا یہ گانا سننے والوں کو دم بخود کر دیتا ہے۔ فلم 'مائی نیم از خان 'کی شہرت میں قدم بہ قدم چلتا ہوا یہ گانا شنکر مہادیون، ریچا شرما اور راحت فتح علی کی دلوں کو چھو لینے والی آوازوں میں گندھا ہے۔ یہ گانا اپنی خوبصورت موسیقی، طبلہ و ڈھولک کی تھاپ اور بہترین گلوکاروں کی وجہ سے اگلے کئی سال تک سننے والوں کے دلوں پر راج کرتا رہے گا۔

'تیرے مست مست دو نین'

راحت فتح علی کی مترنم آواز اس گانے کو فلم 'دبنگ 'میں "منی بدنام ہوئی" جیسے سپر ہٹ آئٹم سانگ کی موجودگی کے باوجود سامعین کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ سراسر کمال ہے۔ گانے کی موسیقی واجد اور ساجد نے ترتیب دی جو آپس میں بھائی ہیں۔ بھارتی فلمی حلقوں میں پاکستانی فنکاروں کے خلاف ایک محاذ اکثر بنایا جاتا ہے۔ بھارت میں ایک لابی پاکستانی فنکاروں کی ہندوستانی فلموں میں کام کرنے کی مخالف ہے۔ ان کے مطابق پاکستانی گلوکاروں کو ہندوستان میں گانے کے مواقع نہیں دینے چاہئیے؟ کچھ عرصے پہلے اس تنازع کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ابھیجیت بھٹاچاریہ نے زی ٹی

وی کے پروگرام 'ایک سے بڑھ کر ایک' میں پاکستانی گلوکار مسرت شیخ کی شرکت پر اعتراض کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایسے کسی پروگرام کے جج بننا نہیں چاہیں گے جس میں پاکستانی گلوکاروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ ابھیجیت شروع سے ہی ہندوستان میں پاکستانی گلوکاروں کی آمد سے ناخوش رہے ہیں۔اور اسی سبب انہوں نے سنہ 2003 میں پاکستانی گلوکاروں کو ہندوستان میں گانے پر پابندی کے لیے عدالت کے دروازے پر بھی دستک دی تھی۔ اس بارے میں زی ٹی وی کے بزنس چیف ترون مہرہ نے اس بات کی تصدیق کی کہ ابھیجیت نے مسرت کی شمولیت پر اعتر‌ض کیا تھا۔ابھیجیت بھٹاچاریہ نے زی ٹی وی کے پروگرام 'ایک سے بڑھ کر ایک' میں پاکستانی گلوکار مسرت شیخ کی شرکت پر اعتراض کیا۔ ابھیجیت کی دلیل تھی کہ ہندوستانی گلوکار بھوکے مر رہے ہیں اور ایسی صورت میں پاکستانی گلوکاروں کو یہاں مواقع فراہم کیا جا رہا ہے۔ بقول ابھیجیت 'یہ ہمارے لیے شرم کی بات ہے کہ ہم پاکستانی گلوکاروں سے گوانے کے لیے خود پاکستان جاتے ہیں جبکہ ہمارے گلوکاروں کو پاکستان میں پروگرام کرنے کی اجازت تک نہیں ملتی۔' پروگرام کے میزبان اور بھوجپوری فلموں کے مشہور اداکار روی کشن کا کہنا ہے کہ ابھیجیت نے یہ بہت سطحی بات کی ہے اور انہیں اس کا بہت افسوس ہے۔ روی کشن کے مطابق فن اور فنکار کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ پاکستانی فنکار اگر اچھے ہیں تو انہیں دنیا کے کسی بھی کونے میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کشن کے مطابق ہندوستان کا دل بہت بڑا ہے اور یہاں صرف

پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے فنکاروں کو مواقع دیے جاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کا مطالبہ تھا کہ پاکستان کو بھی اپنا دامن اور دل کو وسیع کرنا چاہئے۔ فلم انڈسٹری میں ایسے بھی کئی فنکار تھے جو اس تنازعہ سے بچنا چاہتے ہیں۔گلوکارہ شریا گھوشال نے اس مسئلہ پر کچھ بھی کہنے سے انکار کر دیا ان کا کہنا تھا کہ یہ بہت ہی حساس معاملہ ہے اور وہ کیرئیر کے اس سٹیج پر کسی طرح کے تنازعہ میں پڑنا نہیں چاہتیں۔ دوسری جانب گلوکار شان کا کہنا تھا کہ ابھیجیت دا کے خیال سے وہ کچھ حد تک متفق ہیں۔شان کے مطابق ابھیجیت دا نے اپنے کیرئیر میں بہت کچھ حاصل کر لیا اس لیے یہ بات انہوں نے اپنے لیے تو بالکل نہیں کہی ہے وہ ہندوستان کے اچھے اور نوجوان ٹیلینٹ کو ابھرنے کا موقع دینا چاہتے ہیں جو پاکستانی بے سرے سنگرز ان سے چھین رہے ہیں۔ فن کی قدر ہونی چاہیے۔ فنکار پر کسی بھی ملک یا سرحد کا لیبل نہیں ہوتا، ابھیجت کی یہ بات کہ ان کے یہاں گلوکار بھوکے مر رہے ہیں وہ بہت غلط ہے۔ فنکار کے فن کی قدر ہوتی ہے اگر اچھا فنکار ہے تو پھر اسے ترقی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اسے کسی ملک کی سرحد پابند کر سکتی ہے۔شان کا کہنا تھا کہ وہ غزل کے شہنشاہ مہدی حسن، غلام علی یا نصرت فتح علی خان کی بے حد عزت کرتے ہیں اور انہیں واقعی فنکار مانتے ہیں۔شان کو اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ ہندوستان کے فنکاروں کو پاکستان اپنے یہاں آ کر پرفارم کرنے کے لیے ویزا تک نہیں دیتا ہے۔ میوزک ڈائرکٹر ساجد واجد فیم ابھیجیت کے اس ریمارکس

کو ان کی کم ظرفی مانتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ فنکار پر کسی بھی ملک یا سرحد کا لیبل نہیں ہوتا۔ابھیجیت کی یہ بات کہ ان کے یہاں گلوکار بھوکے مر رہے ہیں وہ بہت غلط ہے۔فنکار کے فن کی قدر ہوتی ہے اگر اچھا فنکار ہے تو پھر اسے ترقی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اسے کسی ملک کی سرحد پابند کر سکتی ہے۔ ہندوستان کے کئی ٹی وی ریالٹی شوز میں پاکستانی گلوکار اور فنکار حصہ لیتے رہے ہیں اور مسرت نے اس سے قبل زی ٹی وی کے شو'سارے گاماپا' سنہ دو ہزار سات میں حصہ لیا تھا۔ بھارت میں پاکستانی گانے ان کی دھنیں اور شاعری چرانے کا بھی رواج عام ہے۔۔ بھارت کے فلمی حلقوں میں بھارتی فلم دبنگ کا ایک مقبول گیت " منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیئے" بھی پاکستان ہی سے چوری کیا گیا ہے۔ پاکستان کے گلی کوچوں میں گونجنے والے اس مقبول گیت کو جب اٹھارہ سال پہلے پاکستانی کے معروف اسٹیج پر فورمر اور فنکار عمر شریف نے ایک پاکستانی فلم مسٹر چارلی میں قوالی کے طور پر گایا تھا۔ اب بھارتی فلم دبنگ میں اس گانے کی دھن پر جس گیت کو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ ایک تنازعہ بن گیا ہے۔ منی بدنام ہوئی" گانے پر ملائکہ اروڑا نے رقص کیا ہے عمر شریف کہتے ہیں کے انہوں" نے یہ گیت " لڑکا بدنام ہوا حسینہ تیرے لیئے" خود لکھا تھا اور خود ہی گایا تھا مسٹر چارلی نامی فلم کے فلمساز پروڈیوسر کیفی کا کہنا تھا کہ ان کی فلم کے اس گانے کی دھن بلا اجازت بھارتی فلم کے گانے میں معمولی ردوبدل کے ساتھ استعمال کر لی گئی ہے جو کہ درست

نہیں ہے۔ پاکستانی موسیقار وزیر افضل کہتے ہیں کہ بھارتی فنکاروں کی طرف سے پاکستانی گیتوں کی نقل کا یہ واقعہ پہلا نہیں ہے ان کے مطابق خود انکے پانچ گانے بھارتی فلموں میں کاپی کئے جا چکے ہیں۔ نصرت فتح علی خان اور میڈم نورجہاں کے کئی گانے بھی بھارت میں کاپی کئے جا چکے ہیں۔کچھ عرصہ پہلے ایک پاکستانی ہدایت کار شعیب منصور نے "دھن ہماری آپ کے نام ہوئی" کے عنوان سے ایک ڈاکومنٹری تیار کی تھی اس ڈاکومنٹری میں سو سے زائد ایسے پاکستانی گانوں کی نشاندہی کی گئ تھی جنھیں بھارت میں کاپی کیا گیا تھا۔ پاکستانی موسیقار وزیر افضل کہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے فنکاروں کی طرف سے گیتوں کی چوری سے اصل فنکاروں کی حق تلفی ہوتی ہے اس لئے حکومتی سطح پر اس کے تدارک کے لئے کام ہونا چاہیئے مگر ایک پاکستانی نغمہ نگار خواجہ پرویز کہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت دونوں ہمسائے ہیں دونوں کی طرف سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اس پر زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیۓ۔ ان کے مطابق یہ واقعات پروفشنل بداخلاقی اور فنی زوال کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مبصرین کے مطابق اس گانے کے بولوں کے مطابق اگرچہ منی اور لڑکا بدنام ہوا ہے لیکن اس گیت کو چرانے والوں کی نیک نامی میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ راحت فتح علی خان بھارت میں تیزی سے مقبول ہونے والے گلوگار ہیں۔ ان کے پاکستانی قومی گیت دھرتی اور ہم پاکستان زبان زد عام ہیں؛ ہندوستان کی ہٹ فلموں میں ان کے گانے مقبول ہوئے ہیں۔ کئی ہندوستانی فلموں کی کامیابی کا سہرہ ان

کے گائے ہوئے گیت ہیں۔ ان کے ہٹ گانوں میں

میں نے اسے دیکھا ہے

کسی روز ملو

(پاپ لال (الاپ 2004

من کی لگن

کلیگٹ جیا دھڑک دھڑک 2005

اومکارا نینا 2006

جھوم برابر جھوم بول نا ہلکے ہلکے 2007

اوم شانتی اوم جگ سونا سونا لاگے 2007

نمستے لندن میں جہاں رہوں 2007

آ جا نچ لے او رے پیا 2007

سنگھ از کنگ تیری اور 2008

حال دل حال دل 2008

کوئی چلا جا رہا ہے en:Woodstock Villa " وڈ سٹاک ولا 2008

(دل کبڈی زندگی یہ (فلم میں خصوصی آمد 2008

آسماں - دی سکائی از دی لمٹ من بانورا 2009

میں اور مسز کھنہ ربا 2009

بلو باربر جاؤ کہاں 2009

لو آج کل اک دن چڑھیا (سٹار سکرین ایوارڈز میں بہترین گانے کا اعزاز حاصل 2009
کیا)

دیکھ بھئی دیکھ آنکھوں میں کیوں سپنے بھائے ہیں 2009

جگ جیوندیاں دے میلے جگ جیوندیاں دے میلے 2009

لندن ڈریمز خواب جو 2009

دے دنا دن رشتے ناطے 2009

(ویر سریلی اکھیوں والے اور سریلی اکھیوں والے (دوگانا 2009

مائی نیم از خان سجدہ 2010

عشقیا دل تو بچہ ہے جی 2010

تو بات پکی پھر سے 2010

اٹر ونڈر فل آفٹر لائف گم سم 2010

لاہور او رے بندے 2010

بدمعاش کمپنی فقیرا 2010

ورثہ میں تینوں سمجھاواں کی 2010

آئی ہیٹ لو سٹوریز بہاراں 2010

ملیں گے ملیں گے عشق کی گلی 2010

ونس اپان آ ٹائم ان ممبئی تم جو آئے 2010

وئی آر فیملی آنکھوں میں نیندیں 2010

دبنگ تیرے مست مست دو نین 2010

(انجانا انجانی آس پاس ہے خدا اور آس پاس ہے خدا۔ (دوگانا 2010

آکروش من کی مت 2010

ناک آؤٹ خوشنما سا یہ روشن ہو 2010

جیسے گانے شامل ہیں۔

پاکستانی گلوکار راحت فتح علی خان کو نئی دہلی ائرپورٹ پر 6 گھنٹوں کی پوچھ گچھ کے بعد جس طرح گرفتار کیا گیا، وہ پاکستانیوں کے لئے اہانت آمیز ہے۔ اس واقعے کے بعد وزیر داخلہ رحمان ملک نے بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر شاہد ملک کو فون کر کے راحت فتح علی خان کے معاملہ پر معلومات حاصل کی۔ ان معلومات میں بتایا گیا کہ راحت فتح علی خان کو نئی دہلی ائرپورٹ پر فارن کرنسی ایکٹ کی خلاف ورزی پر گرفتار کیا گیا۔ ان سے ایک لاکھ 24 ہزار امریکی ڈالر برآمد ہوئے۔ بھارتی قانون کے مطابق پانچ ہزار ڈالر سے زیادہ کرنسی ملک سے باہر نہیں لے جائی جا سکتی۔ راحت فتح علی کے منیجر کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہائی کمشنر شاہد ملک کا کہنا ہے راحت فتح علی کے معاملہ پر بھارتی حکام سے رابطے میں ہیں۔ ان کو قانونی مدد فراہم کی جائے گی۔ رحمٰن ملک نے کہا کہ راحت فتح علی کے معاملہ کا جائزہ لے رہے ہیں اور پاکستان کے ہائی کمشنر خود نگرانی کر رہے ہیں۔ کسٹمز حکام راحت علی خان سے پوچھ گچھ کر رہے

ہیں کہ یہ کرنسی ان کے پاس کہاں سے آئی اور وہ یہ کہاں لے جانا چاہتے تھے؟۔ کسٹمز حکام اس بات کی بھی تحقیقات کر رہے ہیں کہ آیا اس حوالے سے ٹیکس بھی جمع کرایا گیا ہے یا نہیں؟۔ بھارتی ٹی وی کے مطابق راحت فتح علی کا کہنا ہے انہیں دلی ائرپورٹ پر ایک بھارتی نجی کمپنی کے عہدیدار کی جانب سے رقم فراہم کی گئی لیکن انہیں اس قانون کا علم نہیں تھا کہ کسٹمز حکام کو بتانا ضروری ہوتا ہے، چترلیش واستو نے نجی کمپنی کی طرف سے راحت کو ائرپورٹ پر پیسے دیئے تھے اور وہ نئی دہلی سے واپس ممبئی جا رہا تھا۔ ریڈیو مانیٹرنگ کے مطابق بھارت کے ماہر قانون مسٹر تلسی نے کہا ہے راحت فتح علی خان کو اب واپس پاکستان بھیج دیا جائے گا انہیں بھارت میں روکے رکھنے یا مقدمہ چلائے جانے کا امکان نہیں ہے۔ راحت فتح علی خان کی اہلیہ ندا راحت نے کہا انکی اپنے شوہر سے بات ہو گئی ہے اور انھوں نے بتایا ہے کہ اب انہیں ہوٹل لے جایا جا رہا ہے وہ بالکل خیریت سے ہیں، معاملات جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ترجمان دفتر خارجہ نے کہا ہے راحت فتح علی کے معاملے پر پاکستانی ہائی کمشنر شاہد ملک کے ساتھ رابطے میں ہیں اور اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے سٹار کے ساتھ کوئی بدتمیزی یا غلط سلوک نہ ہونے پائے۔

کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ بھارت میں پاکستانیوں کے خلاف کھیلا جانے والا ایک کھیل ہے۔ جس میں سب کچھ منصوبہ بندی سے کیا گیا ہے۔ راحت فتح علی خان

ہندوستان میں بہت مقبول ہیں اور اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے بھارتی گلوکار سونو نگم کے ساتھ ٹی وی پر موسیقی کے ایک پروگرام میں جج کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ چھوٹے استاد نامی اس شو میں بھارت اور پاکستان کے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ بھارت میں پاکستانی فنکاروں کے ساتھ یہ کچھ ہوتا آیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک اور پاکستانی فنکار عدنان سمیع کے خلاف بھی غیر ملکی کرنسی سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی کے الزام میں کاروائی کی گئی تھی۔ ممبئی میں ان کے کئی فلیٹ سیل کر دیے گئے تھے اور ان پر بیس لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کیا گیا تھا جس کے خلاف انہوں نے اپیل کر رکھی ہے۔ دوسری جانب ہم ہیں کہ بھارتی فنکاروں کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے بیٹھے ہیں۔ جب ایک طرف بھارت میں راحت فتح علی خان کو گرفتار کیا جارہا تھا تو اس وقت فیض تقریبات میں بھارتی اداکاروں کی بڑی تعداد ہماری میزبانی کے مزے لوٹ رہی تھی۔ فیض امن میلے میں شرکت کرنے والے بھارتی فنکاروں کا کہنا ہے کہ عوام اور انقلاب کی بات کرنے والے شاعر فیض احمد فیض کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کرنا ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ بھارت سے آنے والے فنکاروں میں شبانہ اعظمی اور ان کے شوہر جاوید اختر، بھارتی اداکارہ راجند گپتا، شریش چھاپڑیا ان ، ایلا ارون شامل ہیں۔ فلمی صنعت سے وابستہ سریش چھاپڑیا نے اس موقع پر کہا کہ فیض احمد فیض کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات نے دو ملکوں کے لوگوں کو اکٹھا ہونے کا موقع فراہم کیا ہے اور انہیں ان

تقریبات میں شرکت کرنے کی بہت خوشی ہے۔ بھارتی اداکارہ شبانہ اعظمی اور ایلا ارون نے فیض امن میلے میں پاکستانی فنکاروں کے ساتھ ملکر لوک گیتوں پر رقص کیا اور فیض احمد فیض کو خراج عقیدت پیش کیا۔

بھارت نے ایک اور بھارت نواز گلوکار راحت فتح علی خان کا جس طرح سواگت کیا ہے اس سے بھارت یاترا کے شوقین گلوکاروں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ موصوف کچھ عرصہ قبل بھارت میں کمسن گلوکاروں کا ایک طائفہ بھی لے کر گئے تھے یہ پروگرام دراصل پاکستان اور بھارت کو موسیقی کے ذریعے ایک کرنے کی کوشش تھی۔ بھارت کئی پاکستانی دانشوروں' گلوکاروں اور بھارت کے گن گانے والے پاکستانیوں کو شرمندہ کر چکا ہے لیکن وہ بھارت پر پھر بھی فریفتہ ہیں۔ 2004ء میں پاکستان ہیومن رائٹس ایکٹویٹس کے ایک گروپ پر بھی نئی دہلی کے ہوٹل میں چھاپہ مار کر گرفتار کر لیا گیا تھا ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر بھارت میں قیام پذیر ہیں۔ پاکستانی گلوکار عدنان سمیع کے ساتھ بھی بھارت "حسن سلوک" کا مظاہرہ کر چکا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے کئی دانشور' صحافی' گلوکار اور اداکار بھارت کے ساتھ مل کر "امن کی آشا" کی تلاش میں سرگرداں ہیں ابھی تک انہیں یہ احساس نہیں ہو سکا کہ بھارت انہیں اچھوت خیال کرتا ہے۔ بھارت کے گن گانے والے پاکستانی فنکاروں کو متعدد بار ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے باوجود وہ بھارت یاترا سے باز نہیں آتے۔

راحت فتح علی خان سے قبل عدنان سمیع خان کی ممبئی میں اڑھائی کروڑ روپے مالیت کی جائیداد کو غیر قانونی خریداری قرار دیکر ضبط کر لیا گیا تھا۔ گزشتہ سال انفورسمنٹ ڈائریکٹوریٹ نے فارن ایکسچینج ایکٹ کے تحت عدنان سمیع کی ممبئی میں اڑھائی کروڑ روپے مالیت کی جائیداد ضبط کر لی تھی۔ بھارتی قانون کے مطابق کوئی غیر ملکی بھارت میں جائیداد نہیں بنا سکتا۔ عدنان سمیع کی پاکستانی شہریت ہونے کے باعث انہیں بھارت میں جائیداد بنانے کی اجازت نہیں جس کے عوض ان پر بیس لاکھ روپے کا بھاری جرمانہ بھی عائد کیا گیا، بھارت میں عدنان سمیع کی املاک میں آٹھ فلیٹس اور پانچ پارکنگ مقامات شامل ہیں، ایک طرف یہ کاروائی ہوری تھی تو دوسری جانب بھارت کے معروف غزل گائیک جگجیت سنگھ پاکستانی گلوکار عدنان سمیع پر تنقید کر رہے تھے۔ ان کا کہنا رھا کہ عدنان سمیع گا نہیں سکتا،اسے پاکستان واپس چلے جانا چاہئے۔ایک ویب سائٹ کو انٹرویو میں جگجیت سنگھ نے بتایا کہ عدنان سمیع غلطی سے گلوکار بن گیا ہے، وہ یہاں اداکار بننے آیا تھا،اسے گانا آتا ہی نہیں،اس جیسے لوگوں کو واپس پاکستان چلے جانا چاہئے کیوں کہ یہ یہاں پیسے کمانے آتے ہیں۔ جگجیت سنگھ کے اس ریمارکس پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے عدنان سمیع کا کہنا ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ وہ (جگجیت) میرے متعلق ایسا کہہ سکتے ہیں۔ عدنان سمیع نے کہا وہ ہمیشہ میرے ساتھ شفقت سے پیش آئے اور میں ان کا بہت بڑا مداح ہوں۔ بھارت میں گلوکار عدنان سمیع خان کی جائیداد ضبط کئے جانے پر پاکستانی

فنکاروں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا تھا۔ یونائیٹڈ فلم ایسوسی ایشن آف پاکستان کے سینئر وائس چیئرمین اور پیپلز کلچرل ونگ پنجاب کے صدر مصطفیٰ قریشی اور شاہدہ منی نے کہا ہے کہ ہم تو پہلے سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ بھارت نے پاکستان کو دل سے تسلیم ہی نہیں کیا جب بھی ہمارے فنکار بھارت گئے۔ بھارت والوں نے ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ عدنان سمیع کے ساتھ برتاؤ قابل مذمت ہے۔ یہ واقعہ بھی ابھی تازہ ہے جس میں بھارت کی ایک انتہا پسند تنظیم نے پاکستانی فنکار شکیل صدیقی کو لافٹر شو کرنے سے روک دیا ہے۔ ہندو انتہاء پسند ایم این ایس راج ٹھاکرے، مہاراشٹر نگ وردن سینا نے نجی ٹی وی کو دھمکی آمیز خط بھیجا تھا جس میں دھمکی دی گئی ہے کہ ٹی وی کے مزاحیہ پروگرام سے پاکستانی فنکار شکیل صدیقی کو نہ نکالا گیا تو مہاراشٹر میں چینل کے تمام پروگرام نشر نہیں کرنے دیں گے۔ ان واقعات سے پاک بھارت امن کی آشا کا بھانڈا ایک بار پھر بھارت میں ہی پھوٹ گیا ہے۔ ہم ایک ہیں کے جعلی نعروں اور گانوں اور ترانوں کی کھوکھلی حقیقت ایک بار پھر اس وقت بے نقاب ہو گئی جب بھارتی حکومت نے ممتاز گلو کار عدنان سمیع کی 2003 ء میں خریدی گئی جائیداد کو نہ صرف ضبط کیا بلکہ اسے 20 لاکھ روپے جرمانہ بھی کر دیا۔ تھوڑی سی تو لفٹ کرادے والے عدنان سمیع نے 2003 ء میں اوسرائے سکائی گارڈن، لوکھنڈوالا اور اندھیری مغرب میں 8 فلیٹ اور پانچ پارکنگ پلاٹ خریدے جس میں سے پانچ فلیٹ اس نے اپنی بیوی صباء کو تحفے میں دیئے اور یہ فلیٹ خفیہ طور

پر تحفے میں نہیں دیئے گئے تھے بلکہ یہ سارے معاملات میڈیا میں آتے رہے تھے۔
2010ء کے اختتامی ایام میں بھارت کے انفورسمنٹ ڈائریکٹریٹ کو اچانک انکشاف ہوا کہ یہ سب غیر قانونی ہے۔ اور انھوں نے عدنان سمیع کی جائیداد کی خریداری کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے ضبط کرنے کی کاروائی کر ڈالی۔ جس سے بھارت کی پاکستان سے دوستی اور پاکستان کے شہریوں کو "ہم ایک ہیں" کا چکمہ دینے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ عدنان سمیع تو خیر پاکستانی ہیں ہندو دہشت گردی کا شکار بھارتی مصور اور فلمی دنیا کے نامی گرامی نام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ سیکولر بھارت کا اصلی روپ بھارتی فوج اور معاشرے میں طاقت پکڑنے والے آر ایس ایس کے ہندو جنونیوں کی تخریب کاری اور دہشت گردی سے اکثر بے نقاب ہوتا رہتا ہے۔ آر ایس ایس کی غنڈہ گردی اور دہشت گردی سے جمہوریت کا دعویدار بھارت 90 سالہ نامی گرامی ممتاز مسلمان مصور ایف ایم حسین کو نہیں بچا سکا جنھوں نے اظہار رائے کی تخلیقی آزادی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے مصوری کے کئی تاریخی اور نادر نمونے تخلیق کئے ہیں لیکن آر ایس ایس سمیت ہندو دہشت گردوں نے بھارت کے عالمی شہرت یافتہ مصور ایف ایم حسین پر "جرم مسلمانی" میں زندگی اتنی تنگ کردی کہ وہ قتل کی دھمکیوں کے باعث 2006ء میں بھارت سے ہجرت کرکے قطر میں مقیم ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بھارتی ہندو دہشت گردوں نے ان کے بے شمار تخلیق پارے اور فن مصوری کے نادر نمونے تباہ کر دیئے حتیٰ کہ بھارت میں فن مصوری کے حوالے سے کئی اعزازات اور انعامات کا حقدار

ٹھہرائے جانے والے مصور ایف ایم حسین پر 900 مقدمات درج کر دیئے گئے۔ ہندوتوا" کے تحت انہیں دہشت گرد ہندوؤں نے بھارت چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب" انہیں قطر کی حکومت کی طرف سے شہریت کی پیشکش کی گئی ہے۔ قطر کی شہریت اختیار کرنے کے بعد ممتاز مصور ایف ایم حسین کو بھارتی قوانین کے مطابق بھارتی شہریت سے دستبردار ہونا پڑے گا کیونکہ بھارتی قوانین کے مطابق دوہری شہریت کی اجازت نہیں ہے۔ "جرم مسلمانی" میں بھارتی مصوروں کے ساتھ ساتھ بھارتی فلمی دنیا کی نامی گرامی شخصیات بھی ہندو دہشت گردی اور نفرت کا نشانہ بنتی رہتی ہےں۔ بالی ووڈ کے ممتاز ہیرو اور کولکتہ نائٹ رائیڈرز کے مالک شاہ رخ خان نے حق سچ بات کرتے ہوئے کرکٹ کے ورلڈ چیمپئن پاکستانی کھلاڑیوں کو آئی پی ایل میچوں میں شرکت کے حق میں بات کی تھی تو بھارت کی دہشت گرد تنظیم شیوسینا جسے "را" کی سرپرستی حاصل ہے نے آسمان سر پر اٹھالیا اور فلمی دنیا کے لبرل مسلمان شاہ رخ خان کو مسلمان ہونے کے ناطے متعصب قرار دیکر پاکستان کرکٹرز کا حامی ہونے کا "مجرم" بھی بنا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس جرم کی پاداش میں یہ سزا بھی سنا دی کہ شاہ رخ خان بھارت چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں اور اسلام آباد جا کر بیٹھیں۔ بھارت میں اس کے لئے نہ کوئی جگہ اور نہ ہی گنجائش باقی ہے۔ بھارت سے دوستی کے خواستگار نہ جانے کیوں تمام قانونی تقاضے پورے کرکے بھارت جانے والوں پر تشدد اور تشدد سے مرنے والوں کو بھول جاتے ہیں۔ جن کو ہماری اکثریت کھیل اور شوبز کے میدان

میں ہیرو سمجھتی ہے ان کی بھارت میں تذلیل ہوتی ہے۔ تازہ ترین واقعہ راحت فتح علی خان کے ساتھ پیش آیا ہے۔ لیکن اس سے قبل عدنان سمیع کو بھی کروڑوں کی جائیداد چھین کر دھتکار دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے فنکار اور کھلاڑی بڑی بے شرمی سے نوٹ بنانے اور پیسہ کمانے کیلئے بھارت کا رخ کرتے ہیں۔ بھارت میں ایک بھی پاکستانی ٹی وی چینل دکھانے کی اجازت نہیں۔ سپریم کورٹ کی طرف سے پابندی کے باوجود ہمارے ہاں پاکستانی چینلز سے زیادہ انڈین فحش چینل دکھائے جاتے ہیں۔ سینماؤں میں بھارتی فلمیں چل رہی ہیں۔ ہمارے پڑوسی سینما میں بھی سکھ فلمی بورڈ پر دندنا رہے ہیں۔ پاکستانی چینلز بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ بھارت کے اشتراک سے بنے پروگرام دکھا رہے ہیں۔ ان کی سکرینوں پر انکی فلمیں چل رہی ہیں۔ پرنٹ میڈیا میں پاکستانی فنکاروں سے زیادہ دشمن ملک کے فنکاروں کو کوریج دی جاتی ہے۔ کیا یہ سب قومی وقار کے منافی نہیں؟ ہمارے حکمران کسی بھی جدت پسند اور آزاد خیال حلقے سے پیچھے نہیں۔ ان تمام لوگوں کو جو پاک بھارت امن دوستی کا پرچار کرتے ہیں۔ امن کی آشا کا ہر وقت دم بھرتے ہیں۔ ہندوستان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ اب ہوش آجا چاہیئے۔

کتاب۔ مزدور تحریک، مزدور مسائل، اور سید مودودی

مصنف پروفیسر شفیع ملک

مزدور تحریک، مزدور مسائل، اور سید مودودی پروفیسر شفیع ملک کی نئی کتاب ہے۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ مزدور تحریک کے حوالے سے یہ نہایت اہم تصنیف ہے۔ جسے پروفیسر شفیع ملک نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا ہے۔ کتاب میں مزدور تحریک کے نہایت اہم حوالہ جات ہیں۔ اس کتاب میں پہلی بار بیسویں صدی کے عظیم اسلامی مفکر سید مودودی کے نظریات اور عملی راہنمائی اور مزدور تحریک سے ان کی دلچسپی اور مزدور تحریک میں کام سے متعلق ان کی ہدایات کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ پروفیسر شفیع ملک نے اپنی زندگی مزدور تحریک کے لئے وقف کی اور اس تحریک کے ہر اول دستے کے کارکن کی حیثیت سے انھوں نے ناقابل فراموش کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سید مودودی نے جو فکر اور رہنمائی دی اس کے نتیجہ میں پاکستان میں مزدور تحریک میں ایک عظیم الشان انقلاب آیا۔ اور پورے ملک میں نیشنل لیبر فیڈریشن کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مزدوروں کی فلاح و بہبود کے ناقابل فراموش کارنامے ظہور پذیر ہوئے۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جماعت اسلامی نے ایوب خان کی بدترین آمریت میں حریت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے 21 فروری 1957 کو لیبر ویلفئیر کمیٹی کی تنظیم نو کا

فیصلہ کیا تھا۔ اس کمیٹی کے حوالے سے لیبر ویلفیئر کمیٹی کا لاہور میں 12 مئی کو ہونیوالا کنونشن بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں پہلی بار سید مودودی نے محنت کشوں سے خطاب کیا تھا۔ یہ وہ پرآشوب دور تھا جب مزدور تحریک سرخ پرچم میں لپٹی ہوئی اس ملک میں سرخ سویرا کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ جولائی میں مولانا مودودی کی زیر صدارت دو روزہ لیبر کانفرنس منعقد ہوئی۔ مولانا مودودی کی دور بین نگاہوں نے اس بات کا اندازہ کرلیا تھا کہ اس ملک میں آئندہ حکمرانی کرنے والے مزدور کے کندھوں کو استعمال کریں گے۔ اور اسی لئے انھوں نے مزدوروں کو تحریک اسلامی کا اہم جز بنانے کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ بھی جماعت اسلامی ہی تھی جس نے مزدور کے استحصال کو روکنے کے لئے اوقات کار، کم از کم اجرت، اور چائلڈ لیبر کی مخالفت اور عورتوں کو کام کے دوران علیحدہ جگہوں کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ تحریک اسلامی ہی کے یہ مطالبات ہیں، جو آج روشن خیال اور ترقی پسند این جی اوز لئے پھرتی ہیں۔ پروفیسر شفیع ملک نے پاکستان کے مزدوروں کے لئے عالمی ادارے آئی ایل او میں بھی حق نمائندگی ادا کیا اور بین الاقوامی چارٹر میں مزدور مفاد میں متعدد ترامیم کرائیں۔ مولانا مودودی مزدور تحریک کے ان رہنماؤں سے بھی رابطے میں رہتے تھے۔ جن کا تحریک اسلامی سے تعلق نہ تھا۔ ان سے خط وکتابت بھی رہتی تھی۔ اس سلسلے کا ایک اہم خط مولانا نے مزدور رہنما نبی احمد کو بھی تحریر کیا تھا۔ جو اس وقت پاکستان کیبلز ایمپلائیز یونین کے جنرل سیکریٹری تھے۔ اس کتاب کا مقدمہ

سید منور حسن امیر جماعت اسلامی نے تحریر کیا ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں، 60 کی دہائی کے آخر میں سوشلزم اور اسلام کی بحث بڑی شدومد سے شروع ہو گئی۔ بھٹو کی شکل میں کیمونسٹ اور شوشلسٹ عناصر کو امید کی کرن نظر آئی اور ان کی امیدیں جوان ہو گئی۔ انہوں نے بھٹو کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کرلی۔ ان کا انداز جارحانہ ہوگیا تھا۔ اس کا جواب مولانا سید ابواعلی مودودی نے بڑی جرات کے ساتھ دیا۔ اس زمانے میں مزدوروں میں کام کی اہمیت اور ضرورت اس کشمکش کے تناظر میں بہت بڑھ گئی تو نیشنل لیبر فیڈریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ میدان عمل میں اس فیڈریشن نے بڑے معرکے سرانجام دیئے۔ پی آئی اے اور ریلوے جیسے اداروں میں ریفرینڈم جیتے۔ اس کے علاوہ اور بھی بڑی یونینوں کے سی بی اے بنے۔ سوشلزم اور کیمونزم جو ایک سیلاب کی شکل میں آتا دکھائی دیتا تھا، اس کے آگے بندھ باندھنے میں این ایل ایف نے موثر کردار ادا کیا۔ یہ کہانی اس کتاب میں شفیع ملک صاحب نے بیان کردی ہے۔ اس طرح جہاں انھوں نے تاریخ کا قرض ادا کیا وہیں کارکنان کو یہ پیغام دیا کہ جوش جذبے اور ہر قیمت پر فتح حاصل کرنے کے لئے پر عزم لوگ جب میدان میں اترتے ہیں تو فتح و کامرانی آگے بڑھ کر ان کے قدم چوم لیتی ہے۔۔ پروفیسر شفیع ملک نے مزدور کے حوالے سے اہم لٹریچر فراہم کر رہے ہیں۔ ان کی یہ کتاب لیبر فیلڈ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کو پاکستان ورکرز ٹریننگ اینڈ ایجوکیشن ٹرسٹ نے شائع کیا ہے۔ کتاب کی

قیمت 200 روپے ہے۔ یہ کتاب پاکستان ورکرز ٹریننگ اینڈ ایجوکیشن ٹرسٹ سے ST-
بلاک 5 گلشن اقبال کراچی سے منگوائی جاسکتی۔ 2/3

بل گیٹس کے امدادی منصوبے

انسان دولت کے لئے جیتا ہے۔ دولت کماتا ہے اور صحت گنواتا ہے۔ ایک دن جب وہ بیمار ہوتا ہے تو پھر یہ دولت صحت حاصل کرنے لئے دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے۔
دنیا کے امیر ترین افراد میں شامل اور کمپیوٹر سافٹ وئر کمپنی مائیکرو سافٹ کے سربراہ بل گیٹس ابھی اس منزل پر تو نہیں آئے ہیں۔ لیکن انھوں اپنی جمع شدہ دولت کو خیراتی کاموں میں خرچ کرنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے ریٹائر ہونے کا اعلان کیا ہے۔ بل گیٹس اب اپنا زیادہ تر وقت خیراتی کاموں میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔
تاہم وہ مائیکروسافٹ کے چئرمین رہیں گے لیکن صرف خاص پروجیکٹ پر کام کریں گے۔ جوانی میں گیٹس کا خواب تھا کہ ہر گھر میں ایک کمپیوٹر ہو اور انھوں نے اس خواب کی تعبیر کے لیے کام کیا۔ ایک مشہور وکیل کے بیٹے گیٹس نے خود اپنا کمپیوٹر پروگرام تیرہ سال کی عمر میں بنایا۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں انھوں نے کمپیوٹر پروگرامنگ کی صلاحیت کو اور نکھارا۔ انھوں نے یونیورسٹی چھوڑ کر اپنے بچپن کے دوست پال ایلن کے ساتھ نیو میکسکو میں مائیکروسافٹ کمپنی

بنائی۔ ان کو پہلی کامیابی انیس سو اسی میں ہوئی جب انہوں نے آئی بی ایم کے ساتھ ایم ایس ڈوس کا معاہدہ کیا۔ باون سال کی عمر میں گیٹس دنیا کے امیر ترین شخص ہیں۔ بل گیٹس کے پاس 82 ارب ڈالر ہیں اور اپنی دولت کو اپنے ایک فلاحی ادارے کے ذریعے انسانوں کی فلاح کے لئے خرچ کر رہے ہیں۔ یوں بل گیٹس دنیا کے سب سے امیر آدمی ہی نہیں بلکہ سب سے بڑے خیرات کرنے والے بھی ہیں انہوں نے "بل اینڈ ملینڈا فاؤنڈیشن - Bill and Melinda Gates Foundation " بنائی ہے جس کا بجٹ 60 ارب ڈالر ہے جو کہ جنوبی بھارت کی دو مکمل ریاستوں کرناٹک اور آندھراپردیش کی سالانہ آمدنی کے برابر ہے۔ گزشتہ سال بل گیٹس نے آئندہ 10 سالوں کو ویکسینز کی دہائی کے نام سے موسوم کیا تھا، آج سے دس سال بعد کی ایک ایسی دنیا کا تصور پیش کیا تھا۔ جہاں عالمی صحت کمیونٹی ہر ضرورت مند بچے کو زندگی۔ بچانے والی ویکسین فراہم کرنے کے لیے یکجا ہو جائے اور ان ویکسینز کی فراہمی اور تیاری میں سرمایہ فراہم کرے۔ جس کی اشد ضرورت ہے۔ گیٹس نے تحریر کیا کہ ”ہر کوئی میدان میں نہیں اتر سکتا یا عطیہ تک نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک ان لوگوں کا وکیل ہو سکتا ہے جن کی آوازیں اکثر نہیں سنی جاتیں۔ میں لوگوں کو درپیش مشکلات کے حل کے لیے کام کرنے میں شمولیت پر ہر ایک کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ یہ زندگی کے لیے اپنی طرف متوجہ کرے گا۔“۔ بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن کے شریک چیئر بل گیٹس نے کچھ عرصے پہلے جاری کردہ اپنے تیسرے سالانہ خط میں پولیو کے خاتمے اور بچوں میں وسیع

پیمانے پر حفاظتی ٹیکوں کے معاملے پر اظہار خیال کیا تھا۔ان کی ذاتی ترجیحات پر مبنی خط میں ایک کٹھن اقتصادی ماحول کا سامنا کرنے کرتے ہوئے حکومت سے غیر ملکی امداد میں سرمایہ کاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس خط میں بل گیٹس نے تحریر کیا کہ "اگر معاشرے افراد کو بنیادی صحت فراہم نہیں کر سکتے، اگر یہ افراد کو خوراک اور تعلیم نہیں دے سکتے تو ان کی آبادی اور مسائل بڑھیں گے اور دنیا ایک غیر مستحکم جگہ بن جائے گی۔ خواہ آپ اخلاقی ضرورت پر یقین رکھتے ہوں یا امیر دنیا کے ذاتی مفاد روشن رکھنے میں، حالات کی حفاظت جو ہر ایک کے لیے ایک صحت مند، کامیاب مستقبل کی طرف لے جائے میرے خیال میں ایک ایسا مقصد ہے جس پر ہم سب اتفاق رکھتے ہیں۔" بل گیٹس نے امریکا کے اسکولوں کی مسلسل بہتری کی ضرورت پر بھی زور دیا اور ماں اور بچے کی صحت، ملیریا، ایچ آئی وی / ایڈز اور زراعت کے لیے مزید رہنمائی، جدت اور سرمایہ کاری کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس خط میں بلگیٹس نے ویکسین کیا ہمیت اور پولیو کے خاتمے کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ بچپن کے حفاظتی ٹیکوں کی عالمی جدوجہد کے نتیجے میں پولیو 99 فیصد تک ختم ہوا اور اب یہ مرض صفحہ ہستی سے مٹنے والا ہے۔ گیٹس کا کہنا ہے کہ "پولیو سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مطلب ہے کہ کوئی بچہ اس مرض سے مفلوج یا معذور نہیں ہوگا۔ انسانی حالات میں کوئی اہم پیش قدمی کے لیے حل اور دلیر قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم بہت قریب ہیں، لیکن ہمیں اس سفر کے آخری مرحلے کو ختم کرنا ہوگا۔"

بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن نے سائنسی دنیا کے مختلف 78 پراجیکٹس کے لئے اربوں ڈالر مختص کرنے کا اعلان کیا ہے۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے چونتیس ارب ڈالر جن سائنسی منصوبوں پر خرچ کئے جائیں گے ان میں مختلف بیماریوں کے لئے مدافعتی ویکسین کی تیاری نمایاں ہے۔ ان منصوبوں میں خاص طور پر عالمی سطح پر حیاتیاتی منصوبوں کو فوقیت دی گئی ہے۔ فاؤنڈیشن کی جانب سے یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ جن اٹھہتر منصوبوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کی ریسرچ کی حیثیت کو جانچتے ہوئے بعد میں اضافی ایک لاکھ ڈالر بھی دیے جا سکتے ہیں۔ جن مختلف تحقیقی منصوبوں کے لئے مالی عطیے کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں ملیریا بخار کی تصدیق کا کم لاگتی طریقہ کار، کیڑوں سے نشانوں کو ختم کرنے کا عمل، لیزر ویکسین کے ذریعے پیراسائٹس کی تباہی وغیرہ شامل ہیں۔ فاؤنڈیشن نے بعض ریسرچ پراجیکٹس کو انتہائی اختراعی قرار دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ یہ مستقبل میں قابل عمل ہو کر انسانی جان بچانے میں معاونت کریں گے۔ ان ریسرچ پراجیکٹس کا انتخاب ایک مقابلے کے ذریعے کیا گیا تھا۔ ان میں دنیا بھر سے مختلف ملکوں سے ریسرچ منصوبے فاؤنڈیشن کو جمع کروائے گئے تھے۔ کامیاب اداروں کا تعلق اٹھارہ ملکوں سے ہے۔ ان ممالک کی یونیورسٹیوں کے علاوہ ریسرچ انسٹیٹیوٹس اور چند غیر سرکاری تنظیموں کی جانب سے اپنے اپنے ریسرچ پراجیکٹس کو کامیاب منصوبوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ان ممالک میں جرمنی بھی

شامل تھا۔

بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن کیا ہے۔

ہر زندگی یکساں اہمیت کی حامل ہے، اس یقین کے ذریعے اپنی راہیں متعین کرنے والی بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن دنیا بھر کے افراد کو صحت مند و سیر حاصل زندگی فراہم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں، اس کی نگاہیں لوگوں کی صحت کو بہتر بنانے اور انہیں خود کو بھوک اور انتہائی غربت سے باہر نکلنے میں مدد دینے کا موقع فراہم کرنے پر مرکوز ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں، اس کی خواہش اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ تمام افراد — بالخصوص وہ جن کے پاس وسائل کم ہیں — کو اسکول اور زندگی میں کامیابی کے لیے ضروری مواقع تک رسائی حاصل ہو۔ سیاٹل، واشنگٹن میں واقع فاؤنڈیشن کی قیادت سی ای او جیف ریکس اور شریک چیئر ولیم ایچ گیٹس سینئر کر رہے ہیں، اور بل اور میلنڈا گیٹس اور ویرن بوفیٹ کی زیر ہدایت کام کر رہے ہیں۔ جہاں بل گیٹس اپنی دولت خیرات میں اور فلاحی منصوبوں میں خرچ کر رہے ہیں۔ وہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بل گیٹسکی آمدنی منصفانہ نہیں ہے۔ ان حلقوں کا الزام ہے کہ بل گیٹس امداد اس لئے دیتے ہیں کہ حکومتیں مفت سافٹ ویئر کا استعمال نہ کریں۔ وہ لوگوں کو اسی طرح اپنے سافٹ ویئر پر منحصر بناتے ہیں جس طرح افیم بیچنے والے نوجوانوں کو مفت سیمپل دے کر پھنساتے ہیں۔ ونڈوز پر اپنی اجارہ داری

کا استعمال کر کے وہ اپنے حریفوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔اس غیر منصفانہ کمائی سے وہ دنیا کے امیر ترین شخص بن گئے ہیں۔ بل گیٹس کی امداد کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے والے اس کا تجزیہ کچھ یوں کرتے ہیں۔،، گیٹس اصل میں دو شعبوں میں مدد دے رہے ہیں، صحت اور تعلیم۔ صحت کے شعبہ میں وہ ملیریا اور ایڈس کے علاج کے لئے ٹیکوں کے فروغ پر زور دے رہے ہیں۔ وہ بیماری کو دوا سے روکنا چاہتے ہیں۔

لیکن غریب ممالک کے لوگوں کا اصل مسئلہ بھوک ہے نہ کہ دوا۔امیر ممالک کے ذریعہ ونڈوز سافٹ ویر، موبائل فون، کمپیوٹر چپ وغیرہ مہنگا بیچے جانے کے سبب یہ ممالک غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔ گیٹس کی حالت اس ڈاکٹر جیسی ہے جو مریض سے اتنی فیس وصول کر لیتا ہے کہ وہ آٹا چاول نہ خرید پائے۔

کھانے کی قلت میں مریض کی حالت بگڑتی ہے۔ تب ڈاکٹر اسے گھر کے زیور بیچ کر مہنگی دوا خریدنے پر مجبور کرتا ہے۔اس طرح گیٹس پہلے مہنگا ونڈوز سافٹ ویر بیچ کر غریب ممالک کے عوام کو بیمار بناتے ہیں پھر ان کے علاج کے لئے جدید دواؤں کے استعمال کو فروغ دیتے ہیں۔ گیٹس کے اس عمل پر شک اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ دوا بنانے والی کمپنیوں کے شیئر بھی خرید رہے ہیں۔بزل ڈاٹ کام (Buzzle.com) ویب سائٹ پر بتایا گیا ہے کہ گیٹس نے اہم دوا کمپنی مارک (Merck) کے 76.9 ملین ڈالر کے شئیر خریدے ہیں، فائزر (Pfizer)

کے (Johnson & Johnson) کے 37.3 ملین ڈالر کے اور جانسن اینڈ جانسن
ملین ڈالر کے۔ وہ بڑی کمپنیوں کی دواؤں پر اجارہ داری کو فروغ دے رہے ہیں 29.7
کے فروغ کی ہے۔ واضح ہو کہ (generic drugs) جب کہ ضرورت عام دواؤں
کے دوحہ مذاکرات میں ترقی پذیر ممالک کا ایک اہم مطالبہ بڑی (WTO) ڈبلیو ٹی او
کمپنیوں کے ذریعہ دواؤں کی اجارہ داری کو ختم کرنے کا تھا۔ بل گیٹس اسی اجارہ داری کو
بڑھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دیکھا جاتا ہے کہ صحت کے شعبہ میں دی گئی مدد کو گیٹس
کمپیوٹر سے جوڑ دیتے ہیں۔ جیسے ہندوستان میں 100 ملین ڈالرس ایڈس کے لئے اور
ملین ڈالر کمپیوٹر تعلیم کے لئے دئے گئے ہیں (بشمول ونڈوز کے ہندی ورژن کی 400
فروخت)۔

(Andrew ویب سائٹ پر اینڈریو لینارڈ (Salon.com) اسی طرح سیلان ڈاٹ کام
بتاتے ہیں کہ لاتبریریوں میں کمپیوٹر لگانے کے لئے گیٹس نے 200 ملین (Leonard
ڈالر کی مدد دی ہے۔

لیلا راجیوا بتاتی ہے کہ گیٹس کے ذریعہ آندھرپردیش پر مدد دینے کے اعلان کے بعد اس
وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر این چندرا بابو نائیڈو نے کہا کہ ریاستی حکومت مائیکرو سافٹ
کے پراڈکٹس کا استعمال کرے گی۔ ظاہر ہے کہ گیٹس جس رقم کو مدد کے طور پر دے رہے
ہیں اس سے مائیکرو سافٹ کمپنی کے سافٹ ویر کی مانگ

بڑھتی ہے اور گیٹس کو خود فائدہ پہنچتا ہے۔
پاکستان میں بھی پولیو کے خاتمہ کے لئے بل اینڈ ملنڈا گیٹس فاؤنڈیشن نے 17 ملین ڈالرز کی امداد دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس امداد کا اعلان دنیا کے امیر ترین امریکی بزنس مین اور دنیا کی سب سے بڑی سوفٹ ویئر کمپنی مائیکروسوفٹ کے چیئرمین بل گیٹس نے پاکستان کے سرکاری وفد سے ابوظبی میں ہونے والی خصوصی ملاقات میں کی۔ بل گیٹس نے پاکستان کے دورے کرنے میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ پولیو ایکشن پلان پر عملدرآمد کے حوالے سے پاکستان آئینگے۔ پاکستان کے ایک اعلیٰ سطحی وفد وزیراعظم کی معاون خصوصی بیگم شہناز وزیر علی کی قیادت میں دبئ پہنچا تھا۔ جہاں بل گیٹس سے ملاقات کے دوران شہناز وزیر علی نے انہیں صدر مملکت آصف علی زرداری کا خصوصی خط دیا۔ بل گیٹس نے پاکستان کی کوششوں کو سراہتے ہوئے پولیو کے خاتمہ کے لئے مکمل تعاون کا یقین دلایا تازہ ترین غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بل گیٹس کی ذاتی دولت کا اندازہ چون بلین امریکی ڈالرز سے زیادہ لگایا گیا ہے۔ وہ دنیا کے امیر ترین شخص ہیں۔ انہوں نے اپنی دولت کا چھتیس بلین ڈالرز کا سرمایہ مختلف فاونڈیشنز کو عطیہ کر رکھا ہے جو دنیا بھر میں انسانی فلاح و بہبود کا کام انجام دے رہی ہیں۔ یہ دنیا میں بطور خیرات دیا جانے والا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے اپنے ادارے مائیکرو سوفٹ کے ذریعے ہماری دنیا کو

بدل کے رکھ دیا ہے۔ ایک طویل عرصے تک وہ دنیا کے انتہائی معتبر کنواروں میں شمار کیے جاتے رہے ہیں تاہم شادی اور بچوں نے اب ان کی زندگی کے رخ کو مکمل طور سے تبدیل کردیا ہے۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ پہلے کون آتا ہے دی بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاونڈیشن یا پھر ان کا باپ بننا... لیکن ایک بات یقینی ہے کہ وہ شخص جس نے کبھی اس دنیا کو بدل کے رکھ دیا تھا اور اس کے عوض بلین ڈالرز اکٹھے کیے تھے اب وہی شخص بڑی خاموشی سے ایک مرتبہ پھر اس دنیا کو تبدیل کرنے کے لئے وہی سرمایہ اور دولت واپس کر رہا ہے۔اس کی قائم کردہ تنظیم "دی بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاونڈیشن" نے ایک عالمی کردار ادا کرتے ہوئے دنیا بھر کے عوام کے لئے ویکسین کی تیاری اور تقسیم کا کام شروع کر رکھا ہے جس کا بنیادی مقصد انسانیت کو چھوت چھات کے امراض سے محفوظ رکھنا ہے جس میں پولیو جیسا خطرناک مرض بھی شامل ہے۔ اپنی سیٹل کی رہائش گاہ سے ایک انٹرویو میں پاکستان کے حوالے سے، بل گیٹس نے اپنے خدشات اور رجائیت کا اظہار کرتے ہوئے پولیو جیسے مہلک مرض کے خلاف پاکستان کی جنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے پاکستان کی انفارمیشن ٹیکنالوجی صنعت کی پسماندگی کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی فاونڈیشن پہلے ہی ستانوے ملین ڈالر پاکستان کو دینے کا عہد کر چکی ہے جو براہ راست پولیو کے انسداد کی غرض سے دیئے جائیں گے۔ تاہم انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ ان کا ادارہ ویکسین کی تیاری پر ملین، ملین ڈالرز خرچ کر رہا ہے لہذا پاکستان کو مختلف طریقوں سے امداد

دینے کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔ بچوں کے لئے بنائی جانے والی ویکسین پاکستان کے بچوں کے کام آئے گی۔ ہم نے عالمی سطح پر پولیو کے انسداد کے لیے بڑی بھاری رقم مختص کی ہے جس کا ایک بڑا حصہ پاکستان کو بھی دیا جائے گا۔ بل گیٹس کو اس بات پر گہری تشویش ہے کہ "فاٹا کے علاقوں میں چار لاکھ کے قریب بچوں کو پولیو کے ٹیکے لگوانے سے گریز کیا جاتا ہے"۔ ان کا کہنا تھا کہ عام طور سے صوبائی حکومتوں اور مسلح افواج کی مدد سے اس اہم کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن ہو سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فی الوقت پاکستان کو سب سے بڑا چیلنج یہی درپیش ہے کہ اپنی بہت بڑی اور نقل و حرکت میں مصروف آبادی کو مختلف امراض اور بیماریوں سے محفوظ کیسے رکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسے تمام بچوں کو تلاش کرکے پولیو کے ٹیکے لگانے ہوں گے جن کے والدین انہیں یہ ٹیکے لگوانے سے گریز کرتے ہیں۔ اگر ان بچوں کو یہ ٹیکے نہ لگائے گئے تو وہ پولیو جیسے سنگین مرض کو پھیلانے کا سبب بن جائیں گے۔ بہرحال انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ اس حوالے سے پاکستان کی مسلح افواج نہایت کامیاب کردار ادا کرسکتی ہیں بالخصوص فاٹا کے قبائلی علاقہ جات میں مسلح افواج کی جانب سے اس پیغام کو پھیلائے جانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ پولیو سے محفوظ رہنے کے نظریئے کو فروغ حاصل ہوسکے۔ فاٹا کے مسئلے پر بل گیٹس، حالیہ امریکی دورے کے موقع پر پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کے ساتھ بھی تفصیلی تبادلہ خیال کرچکے ہیں۔ صدر زرداری نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اپنے

وزیر اعظم، وزرائے اعلیٰ، مسلح افواج کی مدد سے ٹیکوں کے نظام کو بہتر بنانے کی غرض سے مل جل کر کام کریں گے اور ہر چھ ماہ بعد اپنی کارکردگی پر نظرثانی بھی کریں گے۔بل گیٹس نے چھوت چھات کے امراض پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ اور اس امید کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان میں وزارت صحت کی تشکیل نو اس راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت پاکستان کے بعض عظیم اشخاص اس مقصد پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کی مدد کرنے کے لیے ہر طرح سے تیار ہوں۔ بہر صورت ان کا یہ ماننا تھا کہ پاکستان میں وزارت صحت کی تنظیم نو پولیو کی مہم کے راستے میں نہ صرف رکاوٹیں پیدا کرنے کا سبب ہو گی بلکہ دوسرے امراض اور بیماریوں کے لیے تیار کیے جانے والے ٹیکوں کے لیے بھی یہ پراگندگی کا سبب بنے گی کیونکہ اگر ہم بدستور ویکسین سے استفادہ کرتے رہے تو اس طرح ہم پاکستان میں سینکڑوں ہزاروں انسانوں کی جانیں بچا سکیں گے۔بل گیٹس نے اس پروپیگنڈے کو یکسر مسترد کیا کہ پولیو کے ٹیکے اور دیگر امراض کی ویکسین ایسی ادویات پر مشتمل ہیں جو بالخصوص مسلمان آبادیوں میں نامردگی اور بانجھ پن کا باعث بن سکتی ہیں۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ پولیو ویکسین، امریکا میں سرے سے تیار ہی نہیں کی جاتی اس کے برعکس دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک انڈونیشیا اس ویکسین کا سب سے بڑا تیار کنندہ ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہر روز اربوں کی تعداد میں پولیو کے قطرے پوری دنیا کے بچوں کو پلائے جاتے

ہیں۔انہوں نے کہاکہ فاٹاکے قبائلی علاقوں میں پولیو اور دیگر چھوت چھات کے امراض کا تناسب بہت زیادہ ہے۔جب ان سے پوچھاگیاکہ وہ ایسے طریقے تجویز کریں جن پر عملدرآمدکے ذریعے پاکستان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی خدمات کا نظام بہتر ہوسکے تو انہوں نے کہاکہ پہلے اپنے تعلیمی نظام کو ٹھیک کیجئے اور ملک کو استحکام سے آشنا کیجئے بہرحال ان کا ماننا تھاکہ پاکستان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صورتحال بہت بہتر ہے۔ کامیابی کی کلید یہی ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے گریجویٹس کامعیاراور تعداد بڑھے اور پاکستان خود کو عالمی مارکیٹ سے وابستہ کرسکے۔انٹرنیٹ نے ہماری دنیا کوایک عالمی سیارے میں تبدیل کردیا ہے۔بل گیٹس نے کہاکہ میرے پاس پاکستان کے بارے میں کوئی خصوصی اعداد و شمار تو نہیں ہیں لیکن اس کا تعلق بہرحال کالج کے تعلیمی نظام اور ملکی استحکام سے بہت گہرا ہے۔ایک اور سوال میں بل گیٹس سے پوچھاگیاکہ دنیاکے امیر ترین شخص کی حیثیت سے جب وہ سونے کے لیے جاتے ہیں توان کے دماغ میں کیا چل رہاہوتا ہے ؟؟؟ ... بل گیٹس نے کہاکہ "پہلے میں سوفٹ ویئرکے بارے میں سوچا کرتا تھا جو میرااصل کام تھا۔اب میرے بال بچے ہیں اور میں خیراتی فاونڈیشن بھی چلارہاہوں لہٰذا میں اسی فاونڈیشن کے منصوبوں اور پولیو جیسے سنگین امراض سے نجات حاصل کرنے کے طریقوں پرہی غور کرتا رہتا ہوں۔اگرٹی بی اور ملیریاکے انسداد کے لیے کوئی نئی ویکسین تیار کی جائے تو کیسا رہے ؟؟؟جب میں اپنے بچوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہوں تو

میں ان خبروں پر غور کر رہا ہوتا ہوں جو تمام دنیا کے بچوں کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لا سکیں"۔ بل گیٹس پاکستان آنے اور "پولیو فری پاکستان" کا جشن منانا چاہتے ہیں۔

پولیو نے دنیا بھر کے بچوں کو ایک بار خوف میں مبتلا کیا تھا لیکن اب صرف چار ملک – افغانستان، بھارت، نائیجیرا اور پاکستان – ایسے ہیں جہاں پولیو کا سلسلہ رکا نہیں۔ گزشتہ سال نائیجیریا اور بھارت میں غیر معمولی پیش قدمی نظر آئی جہاں 2009ء کے مقابلہ میں پولیو کے کیسز تقریباً 95 فیصد تک کم ہو گئے۔ لیکن پھر بھی کچھ الگ کیسز حدود سے تجاوز کر سکتے ہیں اور یہ چنگاری دوبارہ بھڑک سکتی ہے۔ کچھ لوگ بل گیٹس کی آمدنی کو بھی غریبوں کے استحصال سے ہونے والی آمدنی قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لیکن امور خیر کی دو شکلیں ہوتی ہیں ایک تاجر غریب کو گھٹیا مال بیچ کر ہونے والی غیر شرعی آمدنی سے لنگر چلا سکتا ہے ایسی خیرات کو لا حاصل کہا جائے گا۔ سچی خیرات سچی کمائی سے کی جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بل گیٹس کی آمدنی کا کردار کیا ہے؟ بل گیٹس کی امیری کا اصل ذریعہ ان کی کمپنی "مائیکرو سافٹ" کے ذریعہ بنایا گیا "ونڈوز" کے تحت ہوئے ٹرپس معاہدے سے بل گیٹس کو (WTO) سافٹ ویئر ہے۔ بلیو ٹی او اس سافٹ ویر کو دنیا میں بیچنے کی اجارہ داری حاصل ہو گئی ہے۔ مارکسس ڈاٹ کام (marxist.com) ویب سائٹ پر مارٹن وان ہوورسوین (Maarten

بتاتے ہیں کہ : دنیا میں 94 فیصد کمپیوٹروں میں ونڈوز سافٹ (Vanheuverswyn
سافٹ ویئر ہے جو کہ (LINUX) ویئر چل رہا ہے۔ ونڈوز کا خاص حریف لائینکس
ویب سائٹ پر لیلا راجیوا (CounterPunch) مفت میں دستیاب ہے.کاونٹر پنچ
بتاتی ہیں کہ : (سابق) صدر جمہوریہ ہند اے پی جے عبدالکلام نے (Lila Rajiva)
بھی مفت سافٹ ویئر کو فروغ دینے کی بات کہی ہے۔ لیکن بل گیٹس مفت لائنکس کی
جگہ ونڈوز کا استعمال کرا رہے ہیں یوں سمجھیں کہ صاف پانی کا جھرنا بغل میں بہہ رہا ہے
لیکن بل گیٹس بوتل میں پانی کو اچھا بتا کر.بڑی رقم کما رہے ہیں۔آسٹریلیا کے زیڈ ڈی
بتاتے ہیں کہ بل (Andrew Colley) کے اینڈریو کالی (ZDNet) نیٹ ورک
گیٹس مسلسل کوشاں ہیں کہ مفت میں دستیاب لائیکس سافٹ ویئر کا لوگ استعمال نہ
کریں۔آسٹریلیا کی این ایس ڈبلیو (NSW) ریاست کے وزیر کامرس (John Della
نے اعلان کیا تھا کہ حکومت لائنکس کا استعمال کرنے جا رہی ہے۔ (Bosca
بل گیٹس فوراآسٹریلیا پہنچے اور 40 ملین آسٹریلین ڈالر کی مدد کا اعلان کیا جس سے
کمزور طبقات کو کمپیوٹر کی تعلیم دی جاسکے۔ گیٹس کا اصل مقصد حکومت کے ذریعہ لائنکس
کے استعمال کو روکنا ہے۔ اسی سلسلہ میں 2002ء میں ہندوستان کی بے جے پی حکومت
نے ارادہ کیا تھا کہ ونڈوز کی جگہ لائنکس کے استعمال کو فروغ دیا جائے۔ فورا بل گیٹس
ہندوستان آئے اور 500 ملین ڈالر کی

مدد کا اعلان کیا جس میں تقریبا 100 ملین ڈالر کا انسداد ایڈس اور 400 ملین ڈالر کمپیوٹر کی تعلیم کے لئے دئے گئے اس کے بعد ہندوستان کی حکومت نے لائنکس کے استعمال پر خاموشی اختیار کر لی۔

اینڈریو کالی کے مطابق بل گیٹس چاہتے ہیں کہ کسی بھی طرح دنیا بھر کے عوام ونڈوز سافٹ ویئر پر منحصر ہو جائیں۔ اس وقت چین میں ونڈوز سافٹ ویر بڑے پیمانے پر ڈپلیکیٹ کیا جا رہا تھا۔ اس پر بل گیٹس نے کہا: "اگر نہیں چوری کرنی ہے تو میں چاہوں گا کہ وہ ہمارے مال کی چوری کریں۔ وہ اس منحصر ہو جائیں گے تب ہم آئندہ دہائی تک پیسہ وصول کی کوئی ترکیب تلاش کر لیں گے۔"

جس طرح کمپنیاں شروع میں کسی خریداری کے ساتھ دوسرا مال مفت دیتی ہیں پھر اسے بیچنے لگتی ہیں ایسا ہی بل گیٹس کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں مارٹن وان ہورسوین بتاتے ہیں کہ: مائیکروسافٹ نے انٹرنیٹ ایکسپلورر سافٹ ویر کو ونڈوز کے ساتھ مفت دینا شروع کر دیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ صارفین میں دوسرے براؤزر نیٹ اسکیپ (Netscape) کا استعمال ختم ہو گیا نتیجتاً حریف نیٹ اسکیپ کمپنی کا دھندا بند ہو گیا۔

جس طرح چینی کی ملیں زرعی ترقی کے لئے گنے کا اچھا بیج کسانوں کو تقسیم

کرتی ہیں تاکہ انہیں بہتر معیار کا گنا مل جائے اسی طرح گیٹس تعلیم کے فروغ کے لئے کمپیوٹر بانٹتے ہیں جس سے مائیکرو سافٹ کی مانگ بڑھے گیٹس اب اپنا زیادہ تر وقت خیراتی کاموں میں سرف کرنا چاہتے ہیں ۔ جرمنی کے جن منصوبوں کی بل اینڈ ملینڈا گیٹس فاؤنڈیشن نے پذیرائی کی ہے وہ نینو ذرات کے ذریعے انسانی جسم میں ویکسین کو داخل کرنا ہے۔ اس تحقیق کا مقصد ویکسین کو بدن میں داخل کرنے کے بعد اس کا پسینے کے ذریعے اخراج ہے۔ اس سے بدن کے مدافعتی نظام کو نئی قوت ملے گی۔ گیٹس فاؤنڈیشن نے ملیریا بخار کے بارے میں نئے تحقیقی منصوبوں کو خاص طور پر پسند کیا ہے۔ اس ریسرچ میں کئی علاقوں سے منصوبے شامل ہیں۔ تھائی لینڈ کمبوڈیا کی سرحد پر ملیریا کے حوالے سے منصوبہ منظور کیا گیا ہے۔ افریقی ملک یوگنڈا میں جو منفرد تحقیقی عمل جاری ہے، اس کو بھی پسندیدگی سے دیکھا گیا ہے۔ دوا یا مدافعتی ویکسین سے مزید افزائش پانے والے ملیریا کے مچھروں پر خصوصی توجہ کے پراجیکٹس کو بھی مالی عطیے کے لئے منظور کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یوگنڈا میں ایک پودے کی افزائش پر کام کیا جا رہا ہے جو ملیریا پھیلانے والے مچھروں کو کھاتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے منصوبوں کو بل اینڈ گیٹس فاونڈیشن کی جانب سے ریسرچ جاری رکھنے کے لئے مالی معاونت کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اب تک یہ فاونڈیشن سائنسی ریسرچ کے لئے کئی ارب ڈالر دے چکی ہے! ترقی پذیر ممالک کے کسانوں کے لیے امریکہ میں ایک نیا عالمی فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ فنڈ کے افتتاح کے موقع پر بل گیٹس بھی

موجود تھے۔ دو سال قبل تیل کی قیمتوں میں اضافہ اور عالمی معاشی بحران کا آغاز، دنیا بھر میں اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافے کا سبب بنے۔ مہنگائی کے زیادہ تر متاثرین غریب ممالک، خصوصاً افریقی خطے کے وہ لوگ تھے جو پہلے ہی تنگدستی کے شکار تھے۔ تقریباً نوے کروڑ ڈالر کے گلوبل ٹرسٹ فنڈ کا افتتاح کرتے ہوئے مائیکرو سافٹ کے بانی بِل گیٹس نے کہا کہ غربت میں کمی کا بہترین طریقہ، ترقی پذیر ممالک کے چھوٹے کسانوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ زیادہ خوراک پیدا کر سکیں۔ فنڈ کی رقم کو زیرِ کاشت زمین اور آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے، دیہی علاقوں میں سڑکوں کا جال بچھانے اور پیداوار بڑھانے کے لیے کسانوں کو بہتر بیج اور کھاد فراہم کرنے پر خرچ کیا جائے گا بِل گیٹس کا کہنا تھا کہ 'دنیا کے سب سے زیادہ غریب لوگ وہ کسان ہیں جن کے پاس انتہائی محدود زمینیں ہیں۔ جب تک وہ اپنی پیداوار نہیں بڑھائیں گے، تب تک وہ غربت کے چکر میں پھنسے رہیں گے۔ اس لیے ان کی مدد کرنا غربت کے خاتمے کی کنجی ہے۔' گلوبل ٹرسٹ فنڈ کو چلانے کی ذمہ داری عالمی بینک کو سونپی گئی ہے۔

فنڈ کی رقم کو زیرِ کاشت زمین اور آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے، دیہی علاقوں میں سڑکوں کا جال بچھانے اور پیداوار بڑھانے کے لیے کسانوں کو بہتر بیج اور کھاد فراہم کرنے پر خرچ کیا جائے گا۔ گزشتہ سال دنیا کے آٹھ امیر

ترین ممالک جی ایٹ نے اپنے اجلاس میں اعتراف کیا تھا کہ تیس سالوں سے زرعی شعبے میں سرمایہ کاری کے فقدان نے انتہائی غربت کو جنم دیا۔ جی ایٹ ممالک نے غریب ممالک میں خوراک کے تحفظ کے لیے بائیس ارب ڈالر کا وعدہ کیا تھا۔ گلوبل ٹرسٹ فنڈ کا قیام اس وعدے کی پہلی قسط ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے جی ایٹ ممالک کی طرف سے اربوں ڈالر کے مزید امدادی کام ہونا باقی ہیں۔

مسخروں کی حکومت

ہم نے بھی کیسے کیسے مسخروں کو حکومت دے دی ہے، جو ایک جوکر کی طرح رنگ.برنگی ٹائیاں پہن کر میڈیا کے سامنے بڑھکیں مارتے ہیں،اور ایسی تقریر کرتے ہیں، جو اگر کوئی سرکاری پروٹوکول سے باہر کرے تو عوام اسے لتر رسید کریں۔لیکن اب ہمارے میڈیا کی مجبوری ہے یا منافقت کے وہ ان لایعنی فضول باتوں کو بھی شہ سرخیوں میں جگہ دیتا ہے۔ اگر اس ملک میں صحافت میں قابل جوہر ہوتے تو یہ بیانات اور باتیں مراسلوں میں بھی شائع نہ کرتے۔ کل حافظ آباد میں ہمارے وزیر داخلہ نے جو جھک ماری ہے وہ اخبار والوں نے چھاپ کر پھر اپنے دیوالیہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں،،۔

وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے کہا ہے کہ توہین قرآن کا مرتکب امریکی پادری ٹیری جونز القاعدہ اور طالبان کا ایجنٹ ہے،ڈرون حملے پاکستان نہیں بلکہ امریکا کروا رہا ہے،ان حملوں کو روکنا ہمارے بس میں ہے نہ ہی 66 ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنے والے ڈرون مار گرانے کی ٹیکنالوجی ہے داخلہ نے کہاکہ قرآن پاک کی توہین کرنے والا امریکی پادری دہشت گرد ہے، اس ناپاک جسارت پر عالم اسلام میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے، رحمٰن ملک نے منور حسن، عمران خان، فل الرحمٰن، مولانا تقی عثمانی، مفتی منیب الرحمٰن اور دیگر مذہبی و سیاسی قائدین سے کہا

کہ وہ ہڑتالوں کی بجائے اسلام آباد آئیں میں خود ان کے ساتھ مل کر پادری کے خلاف جلوس کی قیادت کروں گا۔ یو این او اور اٹلی میں پوپ کے سامنے مظاہرہ کروں گا۔ یہ ہر چیز اس طرح پاکستان سے ڈالرز کی طرح باہر لے جاتے ہیں۔ بے نظیر کا قتل بھی اقوام متحد میں لے گئے اور سو جوتے اور پیاز کے مصداق لاکھوں ڈالر بھی گنوائے اور پھر فیصلے اب ملکی عدالتوں ہی کے تحت ہو رہے ہیں۔ ان کی لئے ہر چیز کو ذمہ دار طالبان اور القاعدہ ہیں۔ اب جب امریکہ بھی طالبان اور القاعدہ سے پلٹ رہا ہے اور طالبان سے مذاکرات کر رہا ہے تو انھیں توہین قران کرنے والے معلون پادری بھی القاعدہ اور طالبان نظر آ رہے ہیں۔ پاکستان عوام کب تک ان مسخروں کے ان لطائف کو برداشت کرتے رہیں گے۔ اٹھو پاکستان ۔۔۔۔۔۔ مسخروں سے نجات حاصل کرو۔

غریب عوام کے ارب پتی نمائندے

پاکستان کے سیاست دان اب بدنامی سے نہیں ڈرتے ، کرپشن، لوٹ مار، دھونس دھاندلی،اختیارات کا ناجائز استعمال، ذاتی مقاصد کے لئے پوری قوم کو داؤں پر لگا دینا، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔گذشتہ برسوں میں لوٹ مار کرپشن، دھوکہ دہی کا جس بڑے پیمانے پر چلن ہوا ہے اس نے عوام کا بھوکوں مار دیا ہے، بے روزگاری، منگائی اور دہشت گردی، اور آئے دن کے ہونے والے حادثات نے عوام کی کمر توڑ دی ہے۔ غربت کی لکیر سے نیچے جانے والے روز بڑھ رہے ہیں تو دوسری جانب سیاست دانوں کا کاروبار دن دگنی رات چوگنی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ ہمارے سیاست دان ارب پتی ہیں، رات دن قوم کے غم میں لنچ ڈنر کھاتے ہیں۔ تقریر کرتے ہوئے مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔ اربوں کی کرپشن کرتے ہیں ، جیل میں جاکر عیش کرتے ہیں۔ لیکن لوٹی ہوئی دولت واپس نہیں کرتے۔ صدر آصف زرداری کے اثاثے اور دولت کا کوئی شمار نہیں ہے۔ اب وہ پاکستان ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے بڑے دولت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پاکستان اکانومی واچ کے صدر کے مطابق ن لیگ کے سربراہ اور موجودہ حکمرانوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں سیاست کو ایک منافع بخش کاروبار سمجھتے ہیں۔ طریقہ واردات الگ مگر مقصد ایک ہے۔ پاکستان کو لوٹ مار کے لئے زرخیز خطہ سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ میاں نواز شریف کے اربوں روپے مالیت کے کاروبار

عرصہ دراز سے مسلسل خسارے میں ہیں مگر اس کے باوجود انکے اثاثے بڑھ رہے ہیں اور وہ پاکستان کے چوتھے امیر ترین شخص بن چکے ہیں۔ حسین نواز کے تریسٹھ کروڑ کے اثاثے صرف برطانیہ میں موجود ہیں جبکہ دیگر مغربی ممالک اور سوئس بینکوں کے اکاونٹ اسکے علاوہ بتائے جاتے ہیں۔

نیا بجٹ آنے والا ہے۔ جس کی منظوری کے لئے چوہدری برادران سے صلح ہوئی ہے۔ قاتل لیگ کو صدر پاکستان نے معافی دے دی ہے۔ اور اب وہ شیروانیاں پہن کر حلف اٹھانے والے ہیں۔ دوسری جانب آئی ایم ایف سے مہنگی شرائط پر قرضوں کے حصول کی سودے بازی ہوری ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستان سے محبت اور عنایت کرنے والے آئی ایم ایف اور امریکہ، پاکستانی سیاستدانوں کی دولت کی ملک یں واپسی کی شرط عائد نہیں کرتے۔ پاکستانی پارلیمنٹ کے ارکین کی انہتیس فیصد ٹیکس سرے سے ادا نہیں کرتی، سینٹ اور قومی اسمبلی کے کل گیارہ سو ستر ارکان میں سے صرف سات سو سات اراکین ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے بھی صرف نو فیصد یعنی ایک سو نو ایسے ارکین ہیں جو ایک لاکھ سالانہ سے زائد ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

دوسری جانب پورے ملک کے لئے قاعدے قوانین بنانے والی قومی اسمبلی کے 342 ارکان میں سے ترپن فیصد یعنی 181 ارکان ٹیکس دیتے ہیں، ان میں سے صرف 43

ایسے ہیں جو ایک لاکھ سے زائد ٹیکس دیتے ہیں۔ سینٹ کے 100 ارکان میں سے آدھے سے بھی کم صرف 48 افراد ٹیکس ادا کرتے ہیں اور انیس ایسے اراکین ہیں جو ایک لاکھ سالانہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ پنجاب اسمبلی کے 371 میں سے صرف 34 ایسے ہیں جو ایک لاکھ سے زائد ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ سندھ اسمبلی کے 168 میں سے ایک لاکھ ٹیکس دینے والے نو اراکین پارلیمنٹ ہیں۔ خیبر پختون خواہ کے 124 میں سے ایک لاکھ ٹیکس دینے والے صرف تین اراکین ہیں۔ جبکہ بلوچستان کی اسمبلی کا ایک رکن ہے جو ایک لاکھ سے زائد ٹیکس ادا کرتا ہے۔ ٹیکس کی ادائیگی کا یک جانب یہ حال ہے تو دوسرے جانب ان کی بڑھتی ہوئی دولت کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

کچھ عرصے قبل پارلیمانی جمہوریت کی کارکردگی کا جائزہ لینے والی ایک غیر سرکاری تنظیم پیلڈیٹ نے اراکینِ اسمبلی کی جانب سے انتخابی کمیشن کے پاس جمع کرائے گئے اثاثوں کی تفصیل سے حاصل کردہ اعداد شمار سے ایک رپورٹ مرتب کی تھی۔ جس میں ان امارت کو اندازہ کیا گیا تھا۔ پلڈاٹ کے مطابق اراکینِ اسمبلی میں سب سے زیادہ امیر اور دولت بھی میں پہلے نمبر پر محبوب اللہ جان، دوسرے نمبر پر شاہد خاقان عباسی جبکہ تیسرے پر جہانگیر خان ترین ہیں۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کاروبار سیاست سب سے اچھی تجارت ہے۔ جس میں کچھ نہ کرنے پر بھی اثاثوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق قومی اسمبلی کے اراکین کے اثاثوں میں گزشتہ چھ سال کے دوران تین گنا

اضافہ ہوا ہے۔ سال دو ہزار دو اور تین کے درمیان ایک رکنِ اسمبلی کے اثاثوں کی اوسط مالیت اگر دو کروڑ ستائیس لاکھ تھی تو وہ سال دو ہزار آٹھ نو میں بڑھ کر آٹھ کروڑ روپے تک جا پہنچی ہے۔ پلڈاٹ کے مطابق موجودہ اسمبلی کے اراکین پرانے ایوان سے دوگنا امیر ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں تو امیر بنے اور لوٹ مار کے تمام اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں، ۲۰۰۲ میں مشرف دور میں قائم ہونے والی پڑھی لکھی اسمبلی میں امیر ترین رکنِ پیپلز پارٹی کے محبوب اللہ جان تھے۔ جو کوہستان سے ہیں جن کے اثاثوں کی مجموعی مالیت تین ارب روپے سے زیادہ ہے۔ دوسرے نمبر پر شاہد خاقان عباسی جبکہ تیسرے پر جہانگیر خان ترین ہیں۔ اس کے مقابلے میں غریب ترین رکن فیصل آباد سے حکمراں پیپلز پارٹی کے سعید اقبل چوہدری ہیں جن کے ذمے تقریبا تین کروڑ روپے واجب ادا ہیں۔ ان کے بعد سانگھڑ سندھ سے روشن دین جونیجو اور لاہور سے شیخ روحیل اصغر ہیں۔ خواتین میں مسلم لیگ نون کی پنجاب سے رکن نزحت صدیق امیر ترین ہیں جن کے اثاثوں کی مالیت اکانوے کروڑ سے زائد کے ہیں۔ ان کے بعد پشاور سے پیپلز پارٹی کی عاصمہ ارباب جہانگیر دوسرے نمبر پر پانچ سو پندرہ کروڑ روپے کے ساتھ ہیں۔ عورتوں میں مسلم لیگ نون کی پنجاب سے رکن نزحت صدیق امیر ترین ہیں جن کے اثاثوں کی مالیت اکانوے کروڑ سے زائد کے ہیں۔ ان کے بعد پشاور سے پیپلم پارٹی کی عاصمہ ارباب جہانگیر دوسرے نمبر پر پانچ سو پندرہ کروڑ روپے کے ساتھ ہیں قبائلی علاقوں سے رکن اسمبلی محمد کامران خان کے اثاثوں میں ایک

سال میں بیالیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس جائزے میں امیر ترین سیاسی جماعت کے طور پر جس کے اراکین دولتمند ہیں مسلم لیگ فنکشنل ثابت ہوئی تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے اسلام آباد سے منتخب اراکین کے بعد ترتیب وار خیبر پختونخواہ، پنجاب، قبائلی علاقوں، سندھ اور بلوچستان کے اراکین امیر ترین ہیں۔ مشرف دور میں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا اور منتخب نمائندوں نے نوٹوں کی بوریاں بھر بھر کر تجوریاں بھری۔ معاملہ جعلی ڈگریوں کا ہو، یا کرپشن الزامات، یا کسی بھی نوعیت کے احتساب کا پاکستان کی طبقہ اشرافیہ کے یہ نمائندے جو اپنے آپ کو عوامی لیڈر کہتے ہیں اپنے آپ کو ہر طرح کے احتساب اور بازپرس سے مبرا سمجھتے ہیں۔ سال 2009 میں پاکستان کے الیکشن کمیشن نے سینیٹ، قومی اور ملک کی چاروں صوبائی اسمبلیوں کے تین سو انچاس ایسے ارکان کی فہرست جاری کی تھی جنھوں نے الیکشن کمیشن کی طرف سے دی جانے والی تاریخ پر اپنے اثاثوں کے گوشوارے جمع نہیں کروائے۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے جاری ہونے والی فہرست کے مطابق سینیٹ کے گیارہ، قومی اسمبلی کے ایک سو پانچ، پنجاب اسمبلی کے ایک سو سینتالیس ، سندھ اسمبلی کے تینتیس، سرحد سے پینتیس اور بلوچستان کے بیس، ارکان اسمبلی شامل ہیں۔ قومی اسمبلی کے تین سو بیالیس ارکان میں سے صرف دو سو چونتیس ارکان نے اپنے گوشوارے جمع کروائے ۔ گو الیکشن کمیشن نے اس بات کا انتباہ بھی کیا کہ جن ارکان پارلیمنٹ اور اراکین صوبائی اسمبلی نے مقررہ تاریخ تک اپنے اثاثوں کے گوشوارے جمع نہیں کروائے تو ان کی رکنیت معطل کر

دی جائے گی۔ ان افراد میں وفاقی کابینہ کے ارکان بھی شامل تھے ۔ جن میں وزیر خزانہ شوکت ترین، وزیر تجارت مخدوم امین فہیم، وزیر پیداوار منظور احمد وٹو، وزیر پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف، بہبود آبادی کی وزیر ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان، سرحدی امور کے وزیر نجم الدین خان، وزیر مزہبی امور حامد سعید کاظمی، انسانی حقوق کے متعلق وفاقی وزیر ممتاز عالم گیلانی، پیٹرولیم اور نجکاری کے وفاقی وزیر سید نوید قمر اور مواصلات کے وزیر عالمگیر خان، وزیر ماحولیات حمید اللہ جان آفریدی، مواصلات کے وزیر مملکت امتیاز صفدر وڑائچ، اطلاعات کے وزیر مملکت صمصام بخاری کے علاوہ حکمراں جماعت پاکستان پیپلز کی سیکرٹری اطلاعات فوزیہ وہاب جیسی شخصیات شامل تھیں ۔ اسی فہرست میں سابق صدر فاروق لغاری بھی اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی کی اہلیہ اور رکن قومی اسمبلی فرح ناز اصفہانی بھی شامل تھیں۔ گوشوارے جمع نہ کرنے والوں میں زیادہ تعداد کا تعلق حکمراں جماعت پاکستان پیپلز پارٹی جبکہ دوسرے نمبر پر حزب اختلاف کی جماعت پاکستان مسلم لیگ نواز سے تھا۔

دوسری جانب جمع کرائے گئے گوشواروں کی حیثیت بھی ایک مزاق کی سی ہے۔ آپ ایک کروڑ کے اثاثے کو چند لاکھ کا لکھ سکتے ہیں۔ آپ سے بازپرس کرنے اور تحقیقات کو حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ یہ کتنا بڑا مزاق ہے کہ پاکستان کے الیکشن کمیشن کو جمع کرائے ارکان پارلیمنٹ کے اثاثہ جات کے مطابق وزیر اعظم

یوسف رضا گیلانی اور جمیعت علمائے اسلام (ف) کے رہنما مولانا فضل الرحمان کے پاس ذاتی گاڑی نہیں ہے۔ وزیر اعظم کے کل اثاثے کی مالیت ایک کروڑ 94 لاکھ روپے ہے۔ ان کے پاس 63 لاکھ روپے کا پنجاب کے شہر ملتان میں مکان ہے، (آجکل ایک سو بیس گز کے گھر کی پوش علاقے میں یہی قیمت ہے ۔گیلانی صاحب یقینا ایک سو بیس گز کے گھر میں نہیں رہتے) ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کا بینک بیلنس ہے۔ اس کے علاوہ وہ دو سو تولے سونے کے مالک بھی ہیں۔ تاہم ان کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ قائد حزب اختلاف جو اسمبلی کے فلور پر قوم کی ہمدردی میں طویل تقاریر کرتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے اثاثوں کی مالیت کا تعین کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ قومی اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف چوہدری نثار علی خان کے اثاثوں میں ملک کے مختلف شہروں میں چھ زمینیں ہیں، ایک مکان اور فیض آباد میں 98 کنال زمین اور پنجاب کے شہر چکری میں 430 کنال اراضی ہے۔ ان کے پاس ایک مرسڈیز گاڑی اور ایک پجیرو بھی ہے۔کامریڈ، عوامی خدمت گار عوامی نیشنل پارٹی کے قائد اسفندیار ولی کے کل اثاثے تین کروڑ چار لاکھ روپے کے ہیں۔ سنا ہے کہ اندرون ملک اور بیرون ملک ان کا کاروبار خوب چمک اٹھا ہے۔ اب وہ سیاست میں تو کبھی کبھی ضرورت کے وقت رونمائی کراتے ہیں۔ ڈیزل اور مولانا ایک زمانے میں ہم قافیہ شمار ہوتے تھے۔ بعض لوگوں کے ہر طرف پھیلے کاروبار پر نظریں گاڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن گوشوارے سے ان کی مسکینی ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا فضل الرحمان کا اپنے اثاثوں میں ایک مکان ڈیرہ غازی خان میں ہے جس

میں ان کا پانچواں حصہ ہے۔ ان کا ایک اور مکان شور کوٹ میں ہے جس کی مالیت پچیس لاکھ ہے۔ ان کے پاس چار لاکھ تین ہزار روپے نقدی بھی ہے۔ پنجاب کے چوہدری بھی ان اثاثوں سے تو غریب ہی لگتے ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ قاف کے رہنما اور پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی کے اثاثوں میں دو مکانات ہیں جن کی مالیت ایک کروڑ بتیس لاکھ روپے ہے اور اس کے علاوہ نوے ایکڑ زمین بھی ہے۔ ان کے پاس ایک گاڑی بھی ہے جس کی مالیت دو کروڑ چھ لاکھ روپے ہے۔ نقدی میں ان کے پاس چار کروڑ چھ لاکھ روپے ہیں۔ سونے میں ان کے پاس پچاس اونس سونا ہے۔

پاکستان کی سینیٹ اور اسمبلی میں عوامی نمائندے کتنے امیر ہیں، ان کی چند جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔

غریب سنیٹر

الیکشن کمیشن میں ظاہر کیے گئے اثاثوں کے مطابق سینیٹر مولانا گل نصیب کے اثاثے سب سے کم ہیں۔ الیکشن کمیشن کے اہلکار کے مطابق اس فہرست میں سب سے غریب مولانا گل نصیب ہیں جن کے پاس آٹھ مرلے کے گھر کے علاوہ ساٹھ گرام سونا بھی شامل ہے۔

شوکت ترین سابق وزیر خزانہ

الیکشن کمیشن کے اہلکار کے مطابق اس فہرست کے مطابق حکمراں جماعت پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے سینیٹرز اثاثے رکھنے کے حوالے سے سب سے اوپر ہیں۔ الیکشن کمیشن کی جانب سے تیار کی جانے والی فہرست کے مطابق سب سے زیادہ اثاثے پاکستان کے وزیر خزانہ شوکت ترین کے ہیں اور ان کے اثاثوں کی مالیت اربوں روپے ہے۔ شوکت ترین کے پاس چوّن کروڑ پچپن لاکھ کی جائیداد، دو کروڑ اٹھارہ لاکھ روپے کی گاڑیاں اور مختلف مالیاتی اداروں اور بینکوں میں تین ارب روپے کی سرمایہ کاری بھی ہے۔ یہ تفصیلات پہلی بار ریکارڈ پر آئی ہیں۔

رحمان ملک وفاقی وزیر داخلہ

ظاہر اثاثوں کے اعتبار سے وزیر داخلہ رحمان ملک دوسرے نمبر پر ہیں اور ان کے اثاثوں کی مالیت کروڑوں روپے میں ہے

حکمراں جماعت سے تعلق رکھنے والے سینیٹر اور وزیر داخلہ رحمان ملک کے پاکستان میں دو گھر ہیں۔ ایک گھر کراچی میں ہے جس کی مالیت چھ لاکھ روپے ہے (کراچی میں چھ لاکھ روپے کا ڈھنگ کا دو کمروں کا فلیٹ نہیں ملتا) جب کہ دوسرا گھر صوبہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں ہے جس کی مالیت ایک کروڑ روپے

ہے۔اس کے علاوہ ان کے پاس بی ایم ڈبلیو گاڑی ہے جس کی مالیت اکتیس لاکھ پچاس ہزار روپے ہے۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ چوراسی ہزار روپے کا بینک بیلنس ہے۔وزیر داخلہ کی لندن میں جائیداد کی مالیت انتیس کروڑ پچاس لاکھ روپے ہے جب کہ بیرون ملک تین لاکھ ڈالر کا کاروبار ہے جو ان کی اہلیہ کے نام ہے علاوہ ازیں پچاس تولے زیورات بھی ان کی اہلیہ کے نام ہیں۔ وفاقی وزیر کے اثاثوں کی تفصیلات پہلی مرتبہ سامنے آئی ہیں۔

فاروق نائیک

سینیٹ کے چئرمین فاروق ایچ نائیک کا تعلق بھی حکمراں جماعت پاکستان پیپلز پارٹی سے ہے اور ان کی جائیداد اور دیگر اثاثوں کی مالیت تیرہ کروڑ سے زائد ہے۔

چوہدری برادران

سابق وزیر اعظم اور پاکستان مسلم لیگ قاف کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کے لاہور اور اسلام آباد میں واقع دو گھروں میں آدھا حصہ ہے جن کی مالیت 72 لاکھ روپے ہے جبکہ تین کروڑ اڑسٹھ لاکھ روپے بینک بیلنس ہے۔سابق وزیر اعلی پنجاب چوہدری پرویز الہی کے اثاثوں کی مالیت اکتیس کروڑ روپے ہے۔(یہ خاندان اربوں روپے کے این آئی سی ایل، اور پنجاب بنک فراڈ میں مبینہ طور پر

(ملوث ہے

سلیم سیف اللہ

مسلم لیگ قاف کے ایک دھڑے ہم خیال گروپ کے سربراہ سیلم سیف اللہ خان کے اثاثوں کی مالیت آٹھارہ کروڑ اکیس لاکھ ہے اس کے علاوہ بارہ لاکھ روپے کی گاڑیاں اور بارہ لاکھ کے طلائی زیورات بھی ہیں۔

راجہ ظفرالحق

سینیٹ میں پاکستان مسلم لیگ نار کے چیئرمین راجہ ظفرالحق کی بیس لاکھ روپے کی جائیداد کے علاوہ تین لاکھ پچھتّر ہزار روپے بینک بیلنس ہے۔

رضا ربانی

قومی سلامتی کے بارے میں پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کے چیئرمین رضا ربانی کا کراچی میں ایک گھر ہے جس کی مالیت پچپن لاکھ روپے ہے۔ لاہور میں بھی ان کا ایک گھر ہے جس کی مالیت پچاس لاکھ روپے ہے اس کے علاوہ بیس لاکھ روپے کا بینک بیلنس بھی ہے۔

سنیٹر احمد علی

حکمراں اتحاد میں شامل متحدہ قومی موومنٹ کے سینیٹر احمد علی کی ایک کروڑ پینتالیس لاکھ روپے کی جائیداد ہے اس کے علاوہ پچاس لاکھ روپے کی دو گاڑیاں بھی ان کی ملکیت ہیں۔ احمد علی خزانے سے متعلق سینیٹ کی قائمہ کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد

جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے سینیٹر پروفیسر خورشید احمد کے پاس چالیس لاکھ روپے کے گھر کے علاوہ چالیس لاکھ روپے کی اراضی بھی ہے۔

زاہد احمد خان

حکمراں اتحاد میں شامل عوامی نیشنل پارٹی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات زاہد خان کے پاس پچاس لاکھ روپے کی جائیداد کے علاوہ چار لاکھ روپے کا بینک بیلنس بھی ہے

طلحہ محمود

حکمراں اتحاد میں شامل ایک اور جماعت جمعت علمائے اسلام (ف) سے تعلق رکھنے والے سینیٹر طلحہ محمود کی جائیداد کی مالیت ساڑھے چار کروڑ روپے ہے جبکہ

بتیس لاکھ روپے کا کاروبار اور اناسی لاکھ روپے بینک اکاونٹ میں ہیں۔ طلحہ محمود داخلہ کے بارے میں سینیٹ کی قائمہ کمیٹی کے چئرمین بھی ہیں۔

فیصل رضا عابدی

پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے سینیٹر فیصل رضا عابدی کے پاس اٹھانونے لاکھ کی جائیداد کے علاوہ اتنالیس لاکھ روپے کی گاڑیاں اور ستر ہزار روپے کا بینک بیلنس بھی ہے۔

الیکشن کمیشن نے چند دن قبل قومی اسمبلی کے اراکین کی طرف سے مالی سال 2010ء کیلئے جمع کرائے گئے اثاثہ جات کے سالانہ گوشوارے جاری کئے ہیں۔ جس کے چند دلچسپ حقائق ملاحظہ ہوں

ایم این اے نور عالم خان

خیبر پختونخوا سے پیپلز پارٹی کے ایم این اے نور عالم خان امیر ترین ارکان میں شامل ہیں جنہوں نے ساڑھے تین ارب روپے کے اثاثے ظاہر کئے ہیں جبکہ ان کے پاس 4 ہزار کنال زرعی اراضی بھی ہے۔

انجینئر امیر مقام

انجینئر امیر مقام کی جائیداد کی مالیت 16 کروڑ 36 لاکھ، ایک کروڑ 60 لاکھ کا بزنس، دو کروڑ 60 لاکھ روپے کی گاڑی، پانچ لاکھ کی جیولری 11 کروڑ 97 لاکھ روپے کی نقدی ہے۔ ان کے اسلام آباد میں دو پلاٹ، 17 گاڑیاں ہیں جن میں 3 ٹرک شامل ہیں۔

غلام احمد بلور

عوامی نیشنل پارٹی کے رکن قومی اسمبلی اور وفاقی وزیر ریلوے حاجی غلام احمد بلور کے کل اثاثہ جات کی مالیت 4 کروڑ 64 لاکھ 62 ہزار ہے جن میں 3 کروڑ 35 لاکھ روپے کے کیش اور پرائز بانڈ ہیں۔ ان کی بیگم کے اثاثہ جات ایک کروڑ 51 لاکھ 50 ہزار ہیں۔ وفاقی وزیر مواصلات ارباب عالمگیر خان کی پاکستان میں جائیداد کی مالیت ایک ارب 45 کروڑ روپے جبکہ دبئی میں 3 کروڑ روپے مالیت کا اپارٹمنٹ، 7 کروڑ کے سیونگ سرٹیفکیٹس، 95 لاکھ روپے مالیت کی تین گاڑیاں، 36 لاکھ روپے مالیت کے زیورات، 2 کروڑ روپے کا بینک بیلنس ہے۔

مسعود عباسی

مسعود عباس کی اراضی اور دیگر اثاثہ جات کی مالیت 14 کروڑ 2 لاکھ روپے جبکہ بینک میں جمع شدہ رقم 14 کروڑ روپے ہے۔

اسفند یار ولی

عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ اسفندیار ولی کی زرعی اراضی کی مالیت 3 کروڑ روپے جبکہ گھر کی مالیت 40 لاکھ روپے مالیت ہے۔ ان کے پاس پانچ لاکھ روپے کی گاڑی، تولے سونا اور بینک بیلنس 6 لاکھ روپے ہے۔ 50

آفتاب شیرپاؤ

پیپلز پارٹی شیرپاؤ کے سربراہ آفتاب احمد خان شیرپاؤ کی چارسدہ میں دکانیں اور ہاؤس کی مالیت ایک کروڑ 35 لاکھ روپے، 35 لاکھ روپے کی گاڑی جبکہ 3 لاکھ 33 ہزار روپے بینک بیلنس ہے۔ ان کی اراضی اور اثاثہ جات کی مالیت ایک کروڑ 57 لاکھ 72 ہزار روپے ہے۔

انجینئر عثمان خان

انجینئر عثمان خان ترکئی کی پاکستان میں اراضی اور گھر کی مالیت 80 لاکھ روپے جبکہ دوہا قطر میں گھر کی مالیت ڈیڑھ کروڑ روپے ہے۔

سردار مہتاب

مسلم لیگ (ن) کے پارلیمانی لیڈر سردار مہتاب احمد خان کی 60 لاکھ روپے مالیت کے گھر اور فارسٹ اراضی ہے، ان کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے۔

فیصل کریم کنڈی

ڈپٹی اسپیکر فیصل کریم کنڈی کے پاس 23 کنال زرعی اراضی ہے جس کی مالیت 5 لاکھ روپے، 8 لاکھ روپے بینک بیلنس جبکہ ان کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے۔

ہمایوں سیف اللہ خان

ہمایوں سیف اللہ خان کی پاکستان میں جائیداد کی مالیت 16 کروڑ 59 لاکھ روپے جبکہ ان کی سرمایہ کاری ایک کروڑ 38 لاکھ، 100 تولے سونا، 54 لاکھ روپے بینک بیلنس، دو گاڑیاں ہیں۔

منیر خان اورکزئی

فاٹا اراکین کے پارلیمانی لیڈر منیر خان اورکزئی کے کرم ایجنسی میں گھر کی مالیت ایک کروڑ 70 لاکھ، پشاور ورسک روڈ پر 2 کروڑ 20 لاکھ روپے ہے۔ ان کا دوہا قطر میں ٹرانسپورٹیشن کا کاروبار ہے جس میں دو لاکھ 65 ہزار ڈالر کی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔

عبدالمالک وزیر

فاٹا سے رکن عبدالمالک وزیر کے پاس پاکستان میں اپنا گھر نہیں ہے جبکہ ان

کے پاس 8 لاکھ 25 ہزار روپے کی گاڑی اور 20 ہزار روپے بینک بیلنس ہے۔ ظفر بیگ بھٹی کے 3 کروڑ روپے کے گھر، ایک کروڑ 40 لاکھ روپے کی اراضی ہے۔

انجم عقیل خان

مسلم لیگ (ن) کے اسلام آباد سے رکن انجم عقیل خان کے راولپنڈی اسلام آباد میں مختلف مقامات پر کروڑوں روپے کی اراضی ہے، 65 لاکھ روپے کی گاڑی ہے۔ 17

شاہد خاقان عباسی

شاہد خاقان عباسی کے 30 لاکھ روپے مالیت کی دو گاڑیاں، 30 لاکھ روپے کی جیولری، کروڑ 80 لاکھ روپے کے گھر، ایک ارب 60 کروڑ روپے کا کاروبار ہے۔ 20

راجہ پرویز اشرف

پیپلز پارٹی کے رکن قومی اسمبلی راجہ پرویز اشرف کی اسلام آباد میں 2 کوٹھی کی مالیت ساڑھے 5 کروڑ روپے، ایک کروڑ 70 لاکھ روپے کی زرعی اراضی، 18 لاکھ روپے کی گاڑی، 10 تولے سونا ہے۔

کیپٹن محمد صفدر

نواز شریف کے داماد کیپٹن محمد صفدر کا اسلام آباد میں 500 گز کے پلاٹ کی

مالیت اڑھائی لاکھ روپے، مانسہرہ میں ایک کنال پلاٹ کی مالیت 7 کروڑ 86 لاکھ روپے، بی ایم ڈبلیو گاڑی کی مالیت 60 لاکھ روپے، 550 گرام جیولری، 40 لاکھ روپے بینک اکاؤنٹ ہے۔

چوہدری نثار علی خان

اپوزیشن لیڈر چوہدری نثار علی خان کے مختلف جگہوں پر 8 پلاٹس، چکری میں 430 کنال زرعی اراضی جبکہ 198 کنال شاملات، مرسیڈیز کار 2010 پجارو، فیض آباد میں رہائشی گھر، 5 لاکھ 86 ہزار روپے الائیڈ بینک میں جمع ہیں۔ ان کی بیگم کے نام پیر سوہاوہ اسلام آباد میں ایک کنال کا پلاٹ، چکری میں 328 کنال کی زرعی اراضی، رائیونڈ لاہور میں 8 کنال کا زرعی پلاٹ جبکہ فیروز سنز لیبارٹریز میں دو لاکھ 81 ہزار کے حصص ہیں۔

رکن قومی اسمبلی حنیف عباسی کے مختلف مقامات پر 6 پلاٹ یا گھر ہیں جن کی مالیت ایک کروڑ 24 لاکھ روپے ہے۔

شیخ آفتاب احمد کے پاس پاکستان میں اثاثہ جات کی مالیت ایک کروڑ 39 لاکھ 20 ہزار روپے جبکہ 24 لاکھ روپے سے زائد بینک کا قرضہ لیا ہوا ہے۔

چوہدری پرویز الٰہی

سابق وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی کے گلبرگ لاہور میں گھر کا نصف حصہ ہے جس کی مالیت 32 لاکھ 90 ہزار جبکہ اسلام آباد میں گھر میں شیئر 50 فیصد ہے جس کی مالیت 52 لاکھ 50 ہزار روپے ظاہر کی گئی ہے، قصور میں ساڑھے بارہ ایکڑ زرعی اراضی کی مالیت 45 لاکھ روپے ظاہر کی گئی ہے۔ ان کے پاس 2 کروڑ 60 لاکھ روپے مالیت کی گاڑی ہے، 4 کروڑ 61 لاکھ روپے کا بینک بیلنس ہے۔

سمیرا ملک کا بینک بیلنس ایک کروڑ 76 لاکھ روپے جبکہ ان کے پاس 28 لاکھ روپے کی دو گاڑیاں ہیں۔ ان کے پاس 3 کروڑ 90 لاکھ روپے کی زرعی اراضی، 85 لاکھ روپے کا بنی گالہ میں پلاٹ اور 3 کروڑ 60 لاکھ روپے کا اسلام آباد میں گھر ہے۔

عابد شیر علی کے اسلام آباد میں پلاٹ اور گھر کی مالیت 93 لاکھ روپے، ایک کروڑ 18 لاکھ روپے کی ٹیکسٹائل کے شعبہ میں سرمایہ کاری کی ہے جبکہ ان کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے۔

،غلام بی بی پروانہ کی 4 کروڑ روپے کی زرعی اراضی، 8 لاکھ روپے کا گھر

ساڑھے تین کروڑ روپے کا زیر تعمیر لاہور میں گھر ہے۔
مخدوم سید فیصل صالح حیات کی 194 ایکڑ اراضی ہے جس کی مالیت 4 کروڑ 45 لاکھ روپے، شاہ جیوانہ ٹیکسٹائل مل کی مالیت 17 لاکھ 42 ہزار روپے ہے، 22 لاکھ روپے کی گاڑی 60 تولے سونا، 57 لاکھ روپے بینک بیلنس ہے۔
شیخ وقاص اکرم کے پاس 40 لاکھ روپے کی گاڑی، رائس مل، فواد گھی انڈسٹری اور جھنگ میں فلنگ اسٹیشن ہے۔
مسلم لیگ (ق) کے رکن چوہدری وجاہت حسین کے مختلف علاقوں میں گھر، فارم ہاؤس اور زرعی اراضی کی مالیت ایک کروڑ 79 لاکھ روپے، 5 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری، 55 لاکھ روپے کی دو گاڑیاں، پچاس تولے سونا، دو کروڑ روپے بینک بیلنس ہے۔
وزیر دفاع چوہدری احمد مختار کی گھروں اور اراضی کی مالیت 50 لاکھ روپے، ایک کروڑ 50 لاکھ روپے کا بینک بیلنس ہے۔
سابق وزیر اطلاعات قمر زمان کائرہ کے گجرات میں زرعی اراضی کی مالیت ساڑھے

کروڑ، گھر کی مالیت 25 لاکھ جبکہ پٹرول پمپ کی مالیت ڈیڑھ کروڑ روپے ہے۔ ان 3 کے پاس 50 تولے سونا ہے۔

مسلم لیگ (ن) کے رکن خواجہ محمد آصف کے دو رہائشی گھروں کی مالیت 84 لاکھ روپے، ڈی ایچ اے لاہور میں چار کنال کے پلاٹ کی مالیت 60 لاکھ روپے ہے، ان کے پاس 6 گاڑیاں ہیں۔ متحدہ عرب امارات کے بینک میں ان کے 74 ہزار 186 درہم جبکہ سٹی بینک نیویارک میں 20 ہزار ڈالر جمع ہیں۔

وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان کی زرعی اراضی اور گھر کی مالیت 2 کروڑ 85 لاکھ روپے، 13 لاکھ روپے کی گاڑی اور 2 کروڑ 86 لاکھ روپے کی جیولری ہے۔ ایک کروڑ 13 لاکھ 11 ہزار روپے ان کے اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔

احسن اقبال کی زرعی اراضی اور رہائشی پلاٹ کی مالیت 2 کروڑ 10 لاکھ روپے، 14 لاکھ روپے کی گاڑی اور 15 تولے سونا ہے۔

محمد حمزہ شہباز شریف

وزیر اعلیٰ پنجاب کے بیٹے محمد حمزہ شہباز شریف کے کل اثاثہ جات کی مالیت 21 کروڑ 10 لاکھ روپے ہے۔ ان کی چوہدری شوگر مل، رمضان شوگر مل، حمزہ سپننگ

ملز، محمد بخش ٹیکسٹائل ملز، کلثوم ٹیکسٹائل ملز، حدیبیہ پیپر ملز سمیت دیگر میں انوسٹمنٹ ہے۔

رضا حیات ہراج

رضا حیات ہراج کے پاس 54 لاکھ روپے کی دو گاڑیاں، 100 تولے سونا، فلور مل میں 50 فیصد حصص، آئل مل میں شراکت، لاہور میں ساڑھے تین کنال کے گھر میں ایک چوتھائی حصہ جس کی مالیت 40 لاکھ روپے، دو کنال کا لاہور میں گھر بیگم کو تحفتاً دیا ہے جس کی مالیت 40 لاکھ روپے بتائی گئی ہے۔

حنا ربانی کھر

وزیر مملکت برائے خارجہ امور حنا ربانی کھر کی کھر غربی میں 387 کنال اراضی، کوٹ اردو میں 800 کنال، اسلام آباد میں پلاٹ اور کوٹ ادو میں 78 ایکڑ اراضی ہے۔ ان کے پاس 30 لاکھ روپے کی جیولری ہے۔

حامد سعید کاظمی

کروڑوں روپے کے حج اسکنڈل میں ملوث سابق وزیر مذہبی امور حامد سعید کاظمی کی پاکستان میں جائیداد کی مالیت ایک کروڑ 70 لاکھ، 18 لاکھ 32 ہزار کے شیئرز، 3 گاڑیاں، 50 تولے سونا ہے۔

فریال تالپور

صدر آصف علی زرداری کی بہن رکن قومی اسمبلی فریال تالپور کی ٹنڈو اللہ یار میں 52 ایکڑ اراضی، ڈسٹرکٹ حیدر آباد میں 153 ایکڑ، ڈسٹرکٹ سانگھڑ میں 43 ایکڑ، ڈی ایچ اے کے کراچی میں 90 لاکھ روپے کا گھر، گوادر میں پلاٹ، کلفٹن کراچی میں ایک کروڑ 20 لاکھ روپے کا گھر، 22 لاکھ روپے کا کاروبار، 62 لاکھ کی سرمایہ کاری، 3 گاڑیاں، 3 کروڑ 73 لاکھ روپے کا بینک بیلنس ہیں۔

ڈاکٹر عذرا فضل

ڈاکٹر عذرا فضل کے اثاثہ جات میں ڈی ایچ اے میں دو کروڑ روپے کا گھر، گوادر میں 5 لاکھ روپے کا پلاٹ، سانگھڑ میں 24 لاکھ روپے کی زرعی اراضی، اسلام آباد میں پلاٹ کیلئے 7 لاکھ روپے جمع کرائے ہیں، ڈی ایچ اے ویلی اسلام آباد اور ڈی ایچ اے ہومز اسلام آباد میں پلاٹوں کیلئے ایڈوانس جمع کرایا ہے۔ ڈی ایچ اے سٹی کراچی میں کمرشل اور رہائشی پلاٹ کیلئے 35 لاکھ روپے جمع کرائے ہیں۔

مخدوم امین فہیم

مخدوم امین فہیم کی ہالہ میں 184 ایکڑ زرعی اراضی، بیٹیوں، بیگم اور بیٹوں

کے نام پر بھی زرعی اراضی ہے۔ ڈی ایچ اے کراچی میں 2 ہزار مربع گز کا ساڑھے تین کروڑ روپے مالیت کا گھر، ڈی ایچ اے کراچی میں ہزار مربع فٹ کا ایک کروڑ 32 لاکھ روپے کا گھر، فیز ٹو ڈی ایچ اے کراچی میں 1 کروڑ 44 لاکھ روپے کا گھر، فیز فائیو میں 7 لاکھ روپے کا گھر، پونے چار ایکڑ کا اسلام آباد، راول ڈیم کے پاس فارم ہاؤس، دبئی میں 22 لاکھ درہم کا اپارٹمنٹ ان کے اثاثہ جات میں شامل ہے ان کے پاس چار گاڑیاں ہیں جبکہ 28 لاکھ کی جیولری ہے۔

سید نوید قمر

سید نوید قمر کے پاس 54 لاکھ 80 ہزار روپے کی بدین میں زرعی اراضی، ٹنڈو محمد خان میں 115 ایکڑ جبکہ مٹھی میں 40 ایکڑ اراضی ہے۔ ان کے پاس 48 لاکھ روپے کی گاڑی اور 50 تولے سونا ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ مرزا

اسپیکر قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کی پاکستان میں ڈی ایچ اے کراچی میں ہاؤس کی مالیت ڈیڑھ کروڑ روپے، اسلام آباد میں پلاٹ و اپارٹمنٹ، 250 ایکڑ زرعی اراضی، 466 ایکڑ اپنے اور بچوں کے نام زرعی اراضی، بدین میں 32 ایکڑ اور زرعی فارم ہاؤس جبکہ اوورسیز اپارٹمنٹ کیلئے ایک کروڑ 12 لاکھ روپے ایڈوانس جمع کرائے ہیں۔ ان کے مرزا شوگر ملز میں شراکت داری، دو گاڑیاں اور

144 تولے سونا ہے۔

ڈاکٹر محمد فاروق ستار

ایم کیو ایم کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر ڈاکٹر محمد فاروق ستار کا کراچی میں گھر میں حصہ 6 لاکھ ہزار روپے، دوگاڑیاں، 400 گرام سونا، 5 ہزار 557 روپے نقدی، 16 لاکھ 30 ہزار بینک بیلنس ہے۔ 48

خوش بخت شجاعت

خوش بخت شجاعت کے ذمہ 88 لاکھ 96 ہزار روپے بینک قرضہ ہے۔ سید حیدر عباس رضوی کے پاس 5 لاکھ روپے کی گاڑی 95 تولے سونا، 4 لاکھ نقدی، 81 لاکھ روپے بینک بیلنس ہے جبکہ ان کے پاس اپنا ذاتی گھر نہیں۔

پاکستان کی سیاست میں حساب کتاب، احتساب، بازپرش لایعنی باتیں ہیں۔ یہاں کے سیاست دان جب عوام کی طاقت سے ایک بار اقتدار میں آجائیں تو پھر وہ نوٹ کماو مہم میں لگ جاتے ہیں۔ ان میں جہاں قانونی گرفت نہیں ہے وہاں عوامی سطح پر بھی لوگ ان نمائندون سے کوئی سوال جواب نہیں کرتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جانب ان اثاثوں کی چھان بین ہو تو دوسری جانب اس سلسلے میں موثر قانون سازی کی جائے۔ بعض حلقوں کی رائے ہے کہ سپریم کورٹ سیاستدانوں کے

اثاثوں کا جائزہ لے اور ٹیکس ادا نہ کرنے والے ارب پتی رہنماوں کو الیکشن کے لئے نا
اہل قرار دے۔

کیا یہ بجٹ ہمارا بجٹ ہے یا آئی ایم ایف کا بجٹ ہے

بجٹ نے غریب کو زندہ درگور کر دیا۔ اس سال بھی ہم نوٹ چھاپ کر گزارہ کریں گے
اس وقت ہماری قوم کا بچہ بچہ اور ہر مرد اور خاتون ساٹھ ہزار روپے فی کس مقروض
ہے

حال ہی میں ایک ٹی وی چینل پر ہونے والے سروے میں ۹۰ فیصد عوام کی رائے یہ
تھی کہ یہ بجٹ ہمارا بجٹ نہیں ہے بلکہ یہ آئی ایم ایف کا بنایا ہوا بجٹ ہے۔

امریکی جریدے وال سٹریٹ جرنل کا کہنا ہے کہ حکومت پاکستان بجٹ خسارہ پورا کرنے
کے لیے امیروں پر ٹیکس لگا کر آمدنی میں اضافہ کرنے کے بجائے نوٹ چھاپنے پر تکیہ
کرے گی۔ جس کی وجہ سے افراطِ زر میں اضافہ ہو رہا ہے اور معیشت روزگار کے کافی
مواقع پیدا نہیں کر رہی ہے۔ اخبار کہتا ہے کہ عالمی بینک نے پچھلے سال سے پاکستان کو
ساڑھے تین ارب ڈالر کی ادائیگی روک رکھی ہے، جو پاکستان کے لیے 11.3 ارب
ڈالر کی آخری قسط ہے۔ وجہ اِس کی یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے بجٹ خسارے کو کم
کرنے کیلیے سخت قدم نہیں اٹھائے۔ عالمی

بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک نے بھی بجٹ کی امداد کی مد میں ایک ارب ڈالر کی رقم روک رکھی ہے۔ اخبار کہتا ہے کہ پاکستان نے نہایت امیر لوگوں پر ٹیکس نہ لگا کر قرضوں پر تکیہ کر رکھا ہے۔ اِس کی بجٹ کا ایک چوتھائی پرانے قرضوں پر سود ادا کرنے پر خرچ ہو جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ صحتِ عامہ اور تعلیم کیلیے تھوڑی رقم دستیاب ہے۔ حکومت نے بجٹ خسارہ پورا کرنے کے لیے نوٹ چھاپنے پر تکیہ کر رکھا ہے۔ رواں مالی سال کیلیے اس کا تخمینہ مجوعی قومی پیداوار کا چھ فی صد ہے۔ ایسا کرنے سے حکومت نے افراطِ زر کو 13 فی صد تک بڑھنے دیا ہے۔ اِس سے پیدا شدہ صورتِ حال کی وجہ سے نجی کاروباری طبقے کو بینک قرضے حاصل کرنے میں مشکل آتی ہے۔ بیرونی سرمایہ کار پہلے ہی پاکستان کی سیکورٹی کی صورتِ حال کی وجہ سے ہچکچاہٹ میں مبتلا ہیں اور کم و بیش ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ نتیجتاً، ملک کی شرح نمو سکڑ رہی ہے۔ پاکستان کی معیشت کی تباہی کی بنیادی وجہ عالمی اداروں کے قرضے ہیں۔ جن کے سبب ہم آئے دن ان کی شرائط کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں۔ آئی ایم ایف کی کڑی شرائط نے ہمیں بری طرح جکڑ رکھا ہے۔

آئی ایم ایف کا کہنا ہے کہ پاکستان قرضہ وصولی کے اقدامات کو بہتر بنائے اور اپنے ٹیکس نیٹ کو وسیع کرے۔ آئی ایم ایف نے یہ بھی کہا ہے وہ پاکستان کے ساتھ مذاکرات جاری رکھنے کے لئے پر عزم ہے اور یہ مذاکرات چند ہفتوں تک

جاری رہیں گے ،اور جولائی 2011 کو مشن بھیجا جائیگا۔ اعلا میے میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں سیلاب اور تیل کی قیمتوں میں اضافے سے معاشی ترقی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ افراط زر کی بلند شرح برقرار ہے اور بجٹ کے مسائل کی وجہ سے میکرواکنامک استحکام ممکن نہیں ہو رہا تاہم مارچ میں نئے ٹیکس اقدامات ایک اہم سنگ میل ہے۔ آئی ایم ایف کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ بجٹ خسارے کو کم کرنے کے لئے ٹیکس نیٹ کو بڑھا کر ٹیکس ریونیو میں اضافہ کیا جائے اور خصوصاً جنرل سیلز ٹیکس میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ آئی ایم ایف نے صحت، تعلیم، انفراسٹرکچر کے شعبوں میں حکومتی اخراجات میں اضافہ اور مالیاتی شعبے کی کڑی نگرانی کرکے استحکام کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ سال گزشتہ کے جائزے میں کہا گیا ہے کہ سال 2010 یں حکومتی اخراجات کو منجمد کرنے کے فیصلہ پر عمل نہ ہو سکا۔ رواں مالی سال کے دوران 400 ارب روپے سے زائد کے اضافی اخراجات کر دیئے گئے۔ مالی سال کے اختتام تک بجٹ خسارہ 915 ارب روپے کے ساتھ ساڑھے 5 فیصد رہنے کا امکان ہے۔ رواں مالی سال کے لئے بجٹ خسارہ 4.7 فیصد مقرر کیا گیا تھا۔ دہشت گرد کے خلاف جنگ اور بجلی پر سبسڈی کے نتیجے میں پہلے 9 ماہ میں بجٹ خسارہ 783 ارب روپے کے ساتھ 5.3 فیصد تک پہنچ گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق 9 ماہ میں 1495 ارب روپے کی محاصل جمع ہوئے تھے۔ حکومتی اخراجات کو منجمد کرنے کے حوالے سے بلند و بانگ دعوے کئے گئے تھے۔ ان دعوؤں کے برعکس اخراجات 2278 ارب روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ جن میں 1909ارب

روپے کے غیر ترقیاتی اخراجات شامل ہیں۔ اقتصادی ماہرین کے مطابق معاشی استحکام اور بجٹ خسارے میں کمی کے لئے محصولات میں اضافہ اور شاہ خرچیوں میں کمی ناگزیر ہے۔ ماہرین نے کہا ہے کہ اگر اس قسم کے اقدامات نہ کئے گئے تو ملک پر قرضوں کے بوجھ میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ حکومت نے یکم جولائی سے شروع ہونے والے نئے مالی سال سنہ دو ہزار گیارہ اور بارہ کے لیے 27 کھرب 67 ارب روپے کا بجٹ قومی اسمبلی میں پیش کر دیا ہے جو کہ رواں سال کے بجٹ سے چودہ اعشاریہ دو فیصد زیادہ ہے۔ وفاقی وزیرِ خزانہ عبدالحفیظ شیخ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ورلڈ بنک کے ایما پر حکومت میں شامل کئے گئے ہیں۔ قومی اسمبلی میں بجٹ پیش کیا تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی انھیں روٹی پیش کر رہا تھا تو کہیں سے ان کو چوڑیاں پیش کی جارہی تھیں، بطور وزیرِ خزانہ وہ دوسری بار بجٹ پیش کر رہے تھے۔ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والی حکمران جماعت پیپلز پارٹی کا یہ چوتھا بجٹ ہے جس نے غریبوں کو کنگال اور امیروں کو مالا مال کر دیا ہے۔۔ اس بجٹ میں دفاعی اخراجات کے لیے 4 کھرب ارب اکیس کروڑ پچاس لاکھ روپے مختص کیے گئے ہیں جو کہ رواں سال کے بجٹ سے 95 ارب ستاون کروڑ پچاس لاکھ روپے یا قریبا دس اعشاریہ دو فیصد زیادہ ہیں۔ وفاقی 50 وزیر عبدالحفیظ شیخ نے اس بجٹ میں مجموعی وفاقی خسارے کا تخمینہ آٹھ کھرب انچاس ارب روپے بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تخمینہ شدہ صوبائی سرپلس کی مد میں ایک سو پچیس ارب روپے جانے کی وجہ سے

مجموعی مالی خسارہ سات کھرب چوبیس ارب روپے ہوگا۔ اس خسارے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ خسارے کو بیرونی امداد اور بینکوں سے قرضہ حاصل کرکے پورا کیا جائے گا۔ بجٹ میں ٹیکس کی وصولی کا تخمینہ بیس کھرب چوہتر ارب اٹھارہ کروڑ بیس لاکھ روپے لگایا گیا ہے جو کہ رواں مالی سال کے مقابلے میں تیئیس فیصد زائد ہے۔ بجٹ دستاویزات کے مطابق جاری اخراجات کا تخمینہ قریباً تئیس کھرب پندرہ ارب روپے لگایا گیا ہے جو کہ رواں مالی سال سے ایک فیصد زیادہ ہیں۔ دفاع کے لیے بجٹ کے مد میں چار کھرب پچانوے ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جبکہ ریٹائرڈ فوجیوں کو دی جانے والی پنشن کی رقم اس میں شامل نہیں ہے۔ گزشتہ برس کی طرح نئے مالی سال کے لیے بجٹ میں ایک نئی مد صوبوں کے علاوہ امداد ہے جس میں تین سو چالیس ارب روپے مختص ہیں۔ وزارت خزانہ کے حکام کا کہنا ہے کہ اس رقم کا زیادہ تر حصہ بھی دفاعی مقاصد کے لیے ہے جو فوجی آپریشنز، خصوصی ٹاسک یا سیلاب وغیرہ جیسی قدرتی آفات میں کام کرتے ہیں انہیں ادا کی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اصل معنوں میں دفاعی بجٹ کا مجموعی حجم آٹھ سو ارب روپے سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ رواں سال میں دفاع کے لیے مختص رقم سے 35 ارب بائیس کروڑ روپے زیادہ خرچ کیے گئے۔آئندہ مالی سال 2011-12 ءکے لئے قومی ترقیاتی پروگرام کا حجم 7 کھرب 30 ارب روپے مقرر کیا گیا ہے' قومی ترقیاتی پروگرام کیلئے 2 کھرب 90 ارب صوبائی ترقیاتی پروگراموں کیلئے 4 کھرب 30 ارب جبکہ ایرا کے تحت منصوبوں کے لئے دس ارب روپے رکھے گئے ہیں

بجٹ

دستاویزکے مطابق وفاقی بجٹ سال 2011-12 ء میں قومی ترقیاتی پروگرام کا مجموعی حجم 7 کھرب 90 ارب روپے ہے صوبائی ترقیاتی پروگراموں کیلئے چار کھرب 30 ارب روپے رکھے گئے ہیں جبکہ ایرا کے تحت منصوبوں کیلئے دس ارب روپے مختص کئے گئے ہیں علاوہ ازیں خصوصی پروگراموں کے تحت 32 ارب روپے کے منصوبے مکمل کئے جائیں گے اور نیشنل ہائی وے اتھارٹی کیلئے چالیس ارب روپے کا ترقیاتی پروگرام رکھا گیا ہے۔ وفاقی بجٹ 2011-12 ئ میں پانی و بجلی کیلئے 36 ارب 60 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں پانی و بجلی کے منصوبوں میں منگلا ڈیم کی توسیع کے لئے چھ ارب نیلم جہلم ہائیڈرو پاور پراجیکٹ کیلئے 11 ارب دیا میر بھاشا ڈیم کے لئے 18 ارب روپے سدپارہ گومل زام ڈیم کیلئے 1 ارب اور بلوچستان میں 100 چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کیلئے پچاس کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد صوبوں کو منتقل کی گئی وزارتوں کیلئے وفاقی بجٹ میں کوئی رقم مختص نہیں کی گئی، اٹامک انرجی کمیشن کیلئے 15 ارب اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کو 14 ارب روپے دیئے جائیں گے بجٹ 22 دستاویزکے مطابق وفاقی بجٹ 2011-12 ء میں وزارت ریلوے کے لئے 15 ارب روپے مختص کئے گئے ہیں منصوبہ بندی اور ترقیاتی ڈویژن مختلف منصوبوں پر 32 ارب روپے خرچ کرے گا' وفاقی بجٹ میں وزارت صنعت و پیداوار کے لئے 2 ارب 10 کروڑ' وزارت داخلہ کیلئے 5 ارب 80 کروڑ' وزارت دفاع کیلئے 3 ارب 85 کروڑ وزارت دفاعی پیداوار کیلئے 1 ارب 50 کروڑ وزارت سائنس اور ٹیکنالوجی کیلئے 1 ارب 20 کروڑ ریاستوں اور

سرحدی علاقہ جات کے لئے 10 ارب روپے رکھے گئے ہیں جبکہ صوبوں کو منتقل کی گئی وزارتوں کیلئے کوئی رقم مختص نہیں کی گئی ' بجٹ دستاویز کے مطابق پاکستان اٹامک 15 انرجی کمیشن کو 22 ارب 20 کروڑ روپے مہیا کئے جائیں گے جبکہ ہائیر ایجو کیشن کمیشن کیلئے 14 ارب روپے مختص کئے گئے ہیں۔ وفاقی حکومت نے دہشتگردی کیخلاف جنگ اور دفاعی اداروں کی استعداد کار میں اضافے کیلئے آئندہ مالی سال 2011-12ئ کیلئے ارب روپے اضافے کے ساتھ 495ارب 21 کروڑ 50 لاکھ روپے کا دفاعی امور 53 کے بجٹ کی منظوری دی ہے۔ پیش ہونے والی بجٹ دستاویز کے مطابق آئندہ مالی سال کے دفاعی بجٹ میں ملازمین سے متعلقہ اخراجات کیلئے 206ارب 48 کروڑ 80لاکھ روپے رکھے گئے ہیں جو گزشتہ سال 176ارب 72 کروڑ 60لاکھ روپے تھے ، عملی اخراجات کیلئے 128ارب 28 کروڑ 30 لاکھ روپے ، مادی اثاثہ جات کیلئے 117ارب کروڑ 10 لاکھ روپے ، تعمیرات عامہ کیلئے 42ارب 63 کروڑ 80 لاکھ روپے اور 59 منفی وصولیات کیلئے 1ارب 25 کروڑ 50 لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ دوسری جانب آئندہ مالی سال 2011-12ئ کیلئے پی ایس ڈی پی میں ڈیفنس ڈویژن کیلئے 3ارب، کروڑ 57 لاکھ روپے روپے مختص کئے گئے ہیں جن کے ذریعے 35 جاری اور نئی 84 سکیموں کی تکمیل کو یقینی بنایا جائے گا۔ پی ایس ڈی پی میں دفاعی شعبے میں مختص کئے گئے فنڈز میں گوادر میں نئے انٹر نیشنل ایئرپورٹ کی تعمیر کیلئے 1ارب 10 کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ سیٹلائٹ سسٹم کیلئے 1ارب 59 کروڑ 37 لاکھ روپے شامل ہیں۔ وفاقی حکومت نے ممبران پارلیمنٹ

کیلئے مختص خصوصی فنڈز کیلئے آئندہ مالی سال 2011-12ء کیلئے 33 ارب روپے مختص کئے ہیں۔ پی ایس ڈی پی کے مطابق پیپلز ورکس پروگرام ون کیلئے آئندہ مالی سال کیلئے 5ارب جبکہ پیپلز ورکس پروگرام 2 کیلئے 28ارب روپے مختص کئے گئے ہیں۔ گزشتہ سال وفاقی حکومت نے سپیشل پروگرام کیلئے 30ارب روپے مختص کئے تھے لیکن خراب معاشی صورتحال کے باعث 22ارب 77 کروڑ 50لاکھ روپے جاری کئے گئے ۔پاکستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا بجٹ پر کوئی ہوم ورک نہیں ہوتا اس لئے وہ بجٹ پر تنقید برائے تنقید تک ہی رہتے ہیں۔ اس بار بھی سیاسی جماعتوں نے روایئتی تبصرہ کرتے ہوئے آئندہ مالی سال کے بجٹ میں وفاقی ملازمین کے ایڈہاک الاونس اورپینشن میں اضافوں کا خیر مقدم اور افراطِ زر کے تناظر میں بجٹ کو عوام کے لیے مجموعی طور پر غیر تسلی بخش قرار دیا ہے۔ حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی جماعت پاکستان مسلم لیگ نون کے رہنماء پرویز رشید کا کہنا ہے کہ حکومت نے بجٹ کی تیاری میں دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔انہوں نے ملک میں توانائی کے بحران سے نمٹنے کے لیے بجٹ میں سامنے آنے والے اقدامات کو بھی ناکافی قرار دیا۔ لیکن مسلم لیگ ن اس سلسلے میں کوئی متبادل پروگرام پیش کرنے سے بھی قاصر رہی۔ جماعتِ اسلامی کے رہنماء پروفیسر خورشید احمد نے اس بارے میں تشویش کا اظہار کیا کہ وفاق کے ان پچیس محکموں کا مستقبل کیا ہوگا جنہیں ختم کرنے کا فیصلہ اٹھارہویں آئینی ترمیم میں کیا گیا ہے۔ ان کی تشویش اس اعتبار سے بجا ہے کہ جو محکمے صوبوں کو دیئے جائیں گے، ان کے

تقریباً ڈھائی لاکھ سرکاری ملازمین متاثر ہوں گے لیکن بجٹ ان کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔پروفیسر خورشید نے وی اے ٹی کا ذکر نہ ہونے پر بھی تشویش ظاہر کی۔ان کے بقول سیلز ٹیکس میں ایک فیصد اضافے سے مہنگائی بڑھے گی۔ان کی رائے میں افراطِ زر، قرضوں اور توانائی کے بحران کے بارے میں بجٹ میں خاطر خواہ اقدامات کا اعلان نہیں کیا گیا۔آفتاب احمد خان شیرپاؤ اس بجٹ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکومت اپنا بجٹ خسارہ پورا کرنے کے لیے مزید قرضے لے گی جس سے مہنگائی میں اضافہ ہوگا اور غریب آدمی متاثر ہوگا۔ فاٹا کے منیر اورکزئی اس بارے میں کہتے ہیں کہ تمام دنیا سے یہ (حکومت) پیسے فاٹا کے نام پر بٹورتے ہیں۔ یہاں حالت یہ ہے کہ "ہمارے موجودہ بجٹ سے پچاس فیصد حصہ کاٹ لیا اور نئے بجٹ کو اڑتیں فیصد کم کر دیا"۔اس بجٹ سے چھوٹے صوبے خوش نہیں ہیں۔صوبہ بلوچستان سے بلوچستان نیشنل پارٹی عوامی کے رہنما یعقوب بزنجو آٹا، گھی اور دالوں پر ختم کی جانے والی سبسڈی کو عوام دوستی کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ وہ بلوچستان کے لیے ٹیوب ویل کی سبسڈی ختم کرنے کے فیصلے کو بھی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

2011-12 کے بجٹ کو منظور کرانے کے لئے حکومت نے بڑے جتن کئے ہیں۔ مسلم لیگ ق کو وزارتوں پر اپنے ساتھ ملایا گیا ہے۔ جبکہ جے یو آئی کے غفور حیدری کو سینٹ میں حزب اختلاف منتخب کراکے رام کیا گیا ہے۔ بجٹ اجلاس میں اپوزیشن

اراکین نے اسپیکر کے سامنے جمع ہو کر 'لوڈ شیڈنگ نا منظور'، 'امریکی غلامی نا منظور'، جھوٹ بولنا بند کرو 'شیم' 'شیم'، 'ڈاکو' 'ڈاکو' اور 'آزادی، آزادی' کے نعرے لگائے۔ ٹی وی پر عوام کو صرف ڈاکو ڈاکو کا شور سنائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کون کس کو ڈاکو کہہ رہا ہے۔ لٹے پٹے عوام کے لئے تو سارے ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے کہے جا سکتے ہیں۔ اس وقت پاکستان کی معیشت کا سب سے بڑا مسئلہ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ورلڈ فوڈ آرگنائزیشن اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی شرائط ہیں جن میں پاکستانی معیشت اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ اس کی اندرونی قوت نمو ان شرائط کی وجہ سے تقریباً نیم مردہ حالت میں پہنچ چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی ملک کی معیشت کا پہلا راہنما اصول اس کے اپنے عوام کی خوشحالی ہونا چاہئے۔ کوئی ایسی معیشت جو اپنے ملک کے عوام کی خوشحالی کو پس پشت ڈال کر ترقی کرنے کا دعویٰ کرے وہ یقیناً غلط ترجیحات کے راستے پر گامزن ہے جسے ٹھیک راستے پر لانا حکومت وقت کی پہلی ترجیح ہونا چاہئے۔ اگر کسی ملک کے عوام کو دو وقت کی روٹی نہ ملتی ہو اور وہ اپنے ملک میں پیدا ہونے والی گندم زر مبادلہ کمانے کے لئے ایکسپورٹ کرنا شروع کر دے تو اسے معاشی حماقت کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ بد قسمتی سے آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ورلڈ فود آرگنائزیشن اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے بین الاقوامی ادارے جس طرح کی پالیسیاں پاکستان جیسے ممالک پر مسلط کرتے ہیں اس کا نتیجہ ایسی ہی بھوک ننگ کی شکل میں نکلتا ہے

جس سے آج کل پاکستان کے عوام دوچار ہیں۔ اگر پاکستان اپنی معیشت ٹھیک خطوط پر استوار کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے پاکستان کو چند بظاہر مشکل لیکن حقیقتاً معاشی طور پر انتہائی مفید فیصلے کرنا ہوں گے۔

اس ضمن میں سب سے بڑی مشکل آء ایم ایف، ورلڈ بینک، ورلڈ فوڈ آرگنائزیشن اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن سے معاشی پالیسی سازی کے عمل کو آزاد کرانا ہے۔ یہ بجا ہے کہ پاکستان نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے لے رکھے ہیں اور ورلڈ فود آرگنائزیشن اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے چارٹروں پر دستخط کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے لئے گئے قرضے اور ورلڈ فوڈ آرگنائزیشن اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے چارٹر کے تحت کئے گئے معاہدے پاکستان کے عوام کو بھوک اور افلاس کی وجہ سے خودکشیوں پر مجبور کردیں تو ایسے قرضوں اور ایسے معاہدوں کا کیا فائدہ؟

پاکستان کی معیشت کی تعمیرِ نو کے لئے پاکستان کو ان سب اداروں کو معاشی پالیسی سازی کے عمل سے خارج کرکے اپنی معاشی ترجیحات کو از سر نو مرتب کرنا ہوگا۔ ایسے اقدامات کرنا ہوں گے جس سے عوام کو بھوک اور ننگ سے بچایا جاسکے۔ ایسا کرنے کے لئے پاکستان کو کھانے پینے کی اشیا کی ایکسپورٹ فوری طور پر بند کرنا ہوگا۔ گندم، چاول، دالیں اور فروٹ ایکسپورٹ کرکے کمائے

گئے زر مبادلہ کا کیا فائدہ؟ اگر پاکستانی روٹی کے نوالے کو ترس رہے ہو۔ اور ان کے بچے بھوک سے بلک رہے ہوں اور حکومت گندم، چاول، دالیں اور فروٹ ایکسپورٹ کرکے زر مبادلہ کما رہی ہو تو ایسا زر مبالہ پاکستانی معیشت کو طاقت ور بنانے کی بجائے کمزور کرے گا۔ لیکن موجودہ حکومت نے یوٹلیٹی اسٹور کی بہت سی اشیاء پر سبسیڈری ختم کردی ہے۔ جو آئی ایم ایف کا مطالبہ رہا ہے۔ دوسری جانب ٹیکسٹائل اور جوتوں اور کنسٹرکشن سے متعلقہ مصنوعات کی ایکسپورٹ کے بارے میں پالیسی تبدیل ہونی چاہئے۔ پاکستان کے صنعتی اور زرعی سیکٹر کو دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا کے لئے سستی اور قابل بھروسہ انرجی سپلائی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لیکن موجودہ بجٹ اس سے خالی نظر آتا ہے۔

پرائیوٹائزیشن نے پاکستان کے انرجی سپلائی سیکٹر کو تباہ کردیا ہے۔ پاکستان کو فوری طور پر انرجی سپلائی سیکٹر کو سرکاری شعبے میا لانا چاہیئے۔ پاکستان کو طویل مدت اور مختصر مدت کے اقدامات بھی کرنے ضروری ہیں ۔ جن میں سرفہرست بجٹ میں توازن قائم کرنا، شہروں اور دیہاتوں کی تنظیم نو کرنا، نیا سماجی ڈھانچہ تشکیل دینا، تعلیم، صحت اور ٹرانسپورٹیشن اور نقل وحرکت کے شعبے کی تنظیم نو اور تعمیر نو کرنا۔ صنعت اور زراعت کی جدید اصولوں کے مطابق تنظیم نو کرنا۔ ان اقدامات سے پاکستان کی معیشت تعمیر نو کی راستے پر گامزن ہو سکتی ہے۔

معاشی استحصال کے شکار پاکستان کے 17 کروڑ عوام حکمران طبقے سے اب کسی بھی طرح کی اچھائی کی توقع نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی یہ امید کر سکتے ہیں کہ موجودہ بجٹ عوام کو کوئی اچھی خبر دے گا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بجٹ بھی معاشی ظلم جبر کے شکار عوام کیلئے موت کا پروانہ ثابت ہوگا۔ اس عوامی حکومت کے دور میں عوام نے آئے روز نئے بجٹ کا سامنا کیا ہے۔ آئی ایم ایف کے مطالبے پر سیلز ٹیکس اور ویلیوایڈیڈ ٹیکس دونوں ملا کر مجموعی طور پر تقریباً 32 فیصد ڈائریکٹ ٹیکس پاکستان کے غریب عوام پر لادنے کی تیاریاں ہیں۔ پاکستان کے 48 فیصد عوام جو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں وہ اس نئے ٹیکس کے نتیجے میں روٹی سے بھی محروم ہو جائینگے۔ اسلام آباد کے محلوں میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کو شاید یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ ایک عام آدمی کس قدر مشکل ترین حالات سے گزر رہا ہے۔ پچھلے سال آئی ایم ایف سے جو معاہدہ طے ہوا۔ اس معاہدے کے مطابق حکومت بجلی، تیل، گندم، گنے اور بعض دیگر اشیا پر دی جانے والی مالی امداد ختم کرنے کی پابند ہے۔ ویٹ ٹیکس کا مسئلہ فی الحال اکتوبر تک لٹکا دیا گیا ہے۔ اس نئے ٹیکس کے لگنے کے بعد یہ توقع کرنا کہ اس سے عام آدمی کو فرق نہیں پڑے گا محض طفل تسلی ہے۔ اس ٹیکس کا اثر کم و بیش ہر چیز پر پڑے گا اور اسی نسبت سے مہنگائی میں اضافہ ہو جائے گا۔ کھانے پینے کی اشیا سے لے کر الیکٹرانکس اور عام گھریلو استعمال کی چیزوں

کی قیمتوں میں کم از کم بیس سے پچیس فیصد اضافہ لازمی ہو جائے گا۔ اس بار بھی
پارلیمنٹ اور حکومت میں شامل وڈیرے اور چوہدری اور بڑے زمینداروں نے ایک بار
پھر زرعی آمدنی کو ٹیکس سے بچانے میں کامیاب اور سارا بوجھ غربت میں پسے ہوئے
عوام پر ڈالنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت ہماری
قوم کا بچہ بچہ اور ہر مرد اور خاتون ساٹھ ہزار روپے فی کس مقروض ہے۔ بجٹ میں
کوئی ایسا اقدام نظر نہیں آتا جس سے عوام کو براہ راست کوئی ریلیف ملتا ہو۔ غریب
آدمی آٹا، گھی اور چینی پیٹرول کے بغیر تو زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ صحت، تعلیم، امن و
امان، بجلی، روزگار کی فراہمی پر بجٹ خاموش ہے۔

غیر قانونی ہتھیاروں کے انبار

ملک میں جاری دہشت گردی اور ہلاکتوں کے بڑھتے ہوئے واقعات پر قابو پانے میں ناکامی پر عرصہ دراز سے انسانی حقوق کی تنظیمیں، سیاسی و دینی جماعتیں اور عام شہری حکومت سے شہر کو غیر قانونی اسلحہ سے پاک کرنے کے لیے آپریشن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں ساڑھے ستاسی کروڑ چھوٹے ہتھیار ہیں جن میں چوہتر فیصد ہتھیار شہریوں اور مسلح گروہوں کے پاس ہیں جبکہ پاکستان میں بھی چھوٹے ہتھیار لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کے پاس ہیں جن میں زیادہ تر غیر قانونی ہیں۔ پاکستان میں جو 1998ء میں جو مردم شماری ہوئی تھی اس میں تقریباً دو کروڑ ہتھیار پائے گئے، جس میں سے صرف بیس لاکھ ہتھیار لائسنس یافتہ تھے باقی ایک کروڑ اسی لاکھ ہتھیار بغیر لائسنس کے تھے لیکن یہ بھی دس گیارہ سال پرانے اعداد و شمار ہیں جن میں یقیناً اب اضافہ ہوچکا ہے۔ ہمارے معاشرے میں چھوٹے ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے نتیجے میں خاندانی جھگڑوں میں ان کا استعمال بڑھا ہے اور اس کا زیادہ تر نشانہ خواتین اور بچے بنتے ہیں۔ ان ہتھیاروں کی موجودگی میں قبائلی جھگڑے ایک جنگ کا روپ دھار لیتے ہیں اور ان میں کئی اموات ہوجاتی ہیں۔ لیکن پولیس ان جھگڑوں کو نمٹانے میں ناکام رہتی ہے۔ اس وقت بھی پاکستان میں چھوٹے ہتھیار لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کے پاس

ہیں پاکستان جیسے ممالک میں جہاں چھوٹے اسلحے کی روک تھام میں ریاست ناکام رہی ہے وہاں اس طرح کے اسلحے کو فروغ میں خود اس کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست خود کسی ایک گروپ کے خلاف دوسرے گروپ کی حمایت کرکے اپنے آپ کو ملوث کرتی ہے۔ اور حکومتی رٹ ختم ہوجاتی ہے۔ 80 اور پھر 90 کی دہائیوں میں اس کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں اسلحے کی بھرمار ہوئی ہے۔ ملک میں ریاستی پالیسی کے تحت غیر ریاستی عناصر کو اسلحہ دیا گیا اور اب تک یہ پالیسی تبدیل نہیں ہوئی ہے۔ حکومت عسکریت پشندی کا الزام عائد کرکے جن علاقوں میں آپریشن کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں ان علاقوں میں عسکریت پسند زیادہ پیدا ہورہے ہیں وہاں پر حکومت کو ہنگامی بنیادوں پر ترقیاتی کام کرانے چاہئیں تاکہ اس چیز کو روکا جاسکے'۔

سول سوسائیٹی کے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ملک میں چھوٹے ہتھیاروں پر قابو پانے کے لیے سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر پالیسی وضع کرے اور پہلے قدم کے طور پر ان ہتھیاروں کی پیداوار کو ریگولرائز کرے یا سرے سے بند کردے۔ غیر سرکاری تنظیمیں جو ملک میں غیر قانونی ہتھیاروں کے خلاف آواز اٹھا رہی ہیں ان کا کہنا ہے کہ ملک میں ایسے ہتھیاروں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور اس وقت ملک میں لوگوں کے پاس لگ بھگ ڈھائی کروڑ چھوٹے ہتھیار موجود ہیں جن میں سے ڈیڑھ کروڑ سے زائد بغیر لائسنس ہتھیار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غیر قانونی

ہتھیاروں کی بہتات کی وجہ سے ملک کی اندرونی سلامتی خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے اور یہ ملک میں بدامنی کا ایک بڑا سبب ہے۔

ہر سال ماہ اکتوبر کے آخری ہفتے کو ہتھیاروں کے خلاف عالمی ہفتہ کے طور پر منایا جاتا ہے جس کا مقصد دنیا بھر میں لوگوں میں یہ شعور پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سڑکوں پر ہتھیاروں کی موجودگی کے بغیر دنیا کتنی پر امن ہوتی ہے۔ 1978ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اسلحہ کی تخفیف کے حوالے سے بلائے گئے خصوصی سیشن کی قرارداد میں دو اقسام کے ہتھیاروں کی تخفیف کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان میں انسانی تباہی والے ہتھیار جیسے نیوکلیائی، کیمیکل یا بائیولوجیکل ہتھیار اور ایسے چھوٹے ہتھیار جیسے رائفل، پستول اور بندوق وغیرہ۔ جس سے معاشرے میں انارکی پھیلتی ہے۔ اسلحے کے زور پر تشدد کے خلاف کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیم "انٹرنیشنل ایکشن نیٹ ورک آن سمال آرمز" کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے پاکستان میں اس بارے میں سرکاری اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں ۔تاہم تخمینوں کے مطابق پاکستان میں لائسنس اور بلا لائسنس ہتھیاروں کی کل تعداد کروڑ سے زائد ہے۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں سب سے زیادہ ہتھیار عام شہریوں 2 کے پاس ہیں اور ان کے ہتھیاروں کی تعداد فوج، پولیس اور عسکریت پسندوں کے پاس موجود اسلحے سے بھی زیادہ ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کو دیکھتے ہوئے حکومت کی جانب سے باقاعدہ طور پر قومی سطح پر "آرمز

کنٹرول پروگرام" شروع کیا گیا جس کا مقصد شہریوں سے غیر قانونی اسلحہ کی ضبطی کے ذریعے ایک مہم شروع کرنا تھا۔ اس حوالے سے جون 2001ء میں حکومت کی جانب سے غیر قانونی اسلحہ رکھنے والے افراد کو رضاکارانہ طور پر اسلحہ جمع کرا کر عام معافی کا اعلان کر کے دو ہفتے کی مہلت دی گئی مگر یہ مہم بھی بری طرح ناکام ہو گئی۔

جبکہ "ہٹ اینڈ رن شوٹنگ" کے 95 فیصد واقعات میں نائن ایم ایم اور 32 بور کے ممنوعہ ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں۔ رپورٹوں کے مطابق اگرچہ اس حوالے سے شہر میں اسلحہ کے حوالے سے سرکاری طور پر کوئی اعداد و شمار موجود نہیں مگر ایک اندازے کے مطابق صرف 2009ء میں ایک لاکھ پچیس ہزار کے لگ بھگ نائن ایم ایم کے پستول فروخت کیے گئے۔ ایک سینئر وکیل کا کہنا ہے کہ عدالتوں میں دیگر جرائم کی نسبت سب سے زیادہ غیر قانونی ہتھیاروں کے مقدمات کراچی کی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ غیر قانونی ہتھیاروں کے مقدمات لوئر کورٹس میں چلتے ہیں جہاں سے ان مقدمات میں گرفتار ملزمان آسانی سے ضمانت پر رہا ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ملک بھر میں غیر قانونی اسلحہ ہونے کے ثبوت اور شواہد کے باوجود جب بھی غیر قانونی اسلحے کے بارے میں کاروائی اور آپریشن کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے کراچی کا نام لیا جاتا ہے۔ ماضی میں

بھی مختلف حکومتوں کی جانب سے کراچی میں غیر قانونی اسلحہ کے خلاف آپریشن کیے گئے جو نامناسب حکمت عملی کے سبب ناکامی سے دوچار ہوئے۔ کراچی میں غیر قانونی اسلحہ کے خلاف پہلا آپریشن 80ء کی دہائی کے وسط میں سہراب گوٹھ کے علاقے میں کیا گیا تھا جسے شہر بھر میں اسلحہ کی فراہمی کا مرکز سمجھا جاتا تھا مگر یہ آپریشن بری طرح ناکام ہوا۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق پولیس کے محکمہ ہیں موجود افسران کی وجہ سے پہلے ہی سے غیر قانونی اسلحہ کے بیوپاریوں کو اطلاع دینے پر وہ سہراب گوٹھ سے نکل گئے تھے جس کی وجہ سے پولیس کی جانب سے چھاپہ مارنے پر صرف چند پرانے ہتھیار اور کم مقدار میں بارود برآمد ہوا۔ اسلحہ کے خلاف دوسرا آپریشن بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت میں 90ء کی دہائی کے وسط میں شروع کیا گیا۔ اس آپریشن میں شہر کے مختلف علاقوں میں اسلحہ کی برآمدگی کے ساتھ ساتھ سیاسی کارکنوں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اس آپریشن کے بعد پولیس ایک منظم حکمت عملی کے تحت قبائلی علاقوں سے شہر میں فراہم کیے جانے والے غیر قانونی اسلحہ کی سپلائی لائین کو کافی حد تک توڑنے میں کامیاب ہوئی تھی ۔شہر کو غیر قانونی اسلحہ سے صاف کرنے کے لیے تیسرا آپریشن میاں نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں شروع ہوا مگر سیاسی دباؤ کا شکار ہو کر اس آپریشن کو روکنا پڑا۔ جنرل (ر) پرویز مشرف کے دور ہیں بھی کراچی میں اسلحہ کے خلاف ایک مہم شروع کی گئی تھی جس کے نتیجے میں محض چند ہزار غیر قانونی ہتھیاروں کو ضبط کیا گیا تھا۔ موجودہ حکومت پر کراچی میں امن وامان کی بدترین

صورت حال اور ہلاکتوں کی شرح میں اضافے کے سبب شہر کی تمام سیاسی و دینی جماعتوں غیر سرکاری تنظیموں اور شہریوں کی جانب سے شہر کو اسلحہ سے پاک کرنے کی مہم، شروع کرنے کا مطالبہ بار بار کیا جا رہا ہے۔

غیر سرکاری تنظیمیں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان، شہری اور نیشنل سوشل فورم اسلحہ کی تخفیف کے حوالے سے کام کر رہی ہے۔شہریوں کی جانب سے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان اور سٹیزن پولیس لائزن کمیٹی (سی پی ایل سی) کے باہمی اشتراک سے شہر میں "گن فری سوسائٹی" کے نام سے ہتھیاروں کے خلاف مہم شروع کی گئی تھی جس کے تحت عوام میں شعور اور آگہی پھیلانے کے حوالے سے پروگرام منعقد کیے جاتے رہتے ہیں۔ایک جانب چھوٹے ہتھیاروں کے بارے میں حکومت کے پاس کوئی اعداد و شمار موجود نہیں ہیں لیکن غیر قانونی اسلحہ سے پاک کرنے کی مہم میں سرگرم غیر سرکاری تنظیموں کا کہنا ہے کہ ملک میں چھوٹے ہتھیاروں کی تعداد لگ بھگ ڈھائی کروڑ ہے جن میں سے بغیر لائسنس کے ہتھیاروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے جبکہ تقریباً ستر لاکھ لائسنس یافتہ ہتھیار ہیں۔

واقف حلقے الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان میں غیر قانونی اسلحہ کا سب بڑا ذریعہ افغانستان ہے، ملک میں کلاشنکوف کلچر کی وجہ افغان لڑائی ہے۔ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ درہ آدم خیل، بلوچستان اور پنجاب کے زیر انتظام

قبائلی علاقوں میں بھی غیر قانونی طور پر ہتھیار تیار کیے جاتے ہیں، اس کے علاوہ کشمیر کے 'جہاد کے نتیجے میں بھی پاکستان میں غیر قانونی اسلحہ پھیلا۔

بعض حلقے یہ بات بھی کہتے ہیں کہ انیس سو سینتالیس میں برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے وقت پاکستان ہندوستان کے مقابلے میں روایتی ہتھیاروں میں کمزور تھے۔ اس وقت یہاں ایسی پالیساں بنائی گئی کہ جس میں ملک کو سکیورٹی سٹیٹ بنا دیا جس میں ہتھیار اور جنگجو کلچر کو فروغ دیا۔ افغانستان سے اسلحہ اسمگل ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جرمنی نے تقریبا تین سال قبل افغان پولیس اور فوج کو مسلح کرنے کے لئے 10 ہزار پستول کابل حکومت کے حوالے کئے تھے۔ جرمن ریڈیو نے اپنی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ 2006ء میں افغان وزارت داخلہ کے حوالے کئے گئے پستول افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں غیر قانونی طور پر فروخت کئے جا رہے ہیں۔ پستول پاکستان اور افغانستان کی بلیک مارکیٹ میں فروخت ہو رہے P1 جرمن والتھیر ہیں۔بنیادی طور پر یہ پستول افغان پولیس کے لئے تھے۔ان ہتھیاروں کے استعمال کی نگرانی کی ذمہ داری امریکی سربراہی میں ایک ٹیم کو سونپی گئی تھی۔ جس نے اس کا خیال نہ رکھا جرمن حکومت کا کہنا ہے کہ اس کی کوشش تھی کہ افغانستان کے سیکیورٹی اہلکار اپنے ملک میں سلامتی کی ذمہ داری سنبھالے، اس مقصد کے لئے انہیں

تکنیکی مدد فراہم کی جا رہی ہے۔ اس مدد کو کس طرح استعمال کیا گیا، یہ جان کر مایوسی
پستول تقریبا 50 سال پرانے ہیں۔ تاہم زیادہ استعمال شدہ نہیں P1 ہوئی۔ والتھیر
ہیں۔ اسلحے کے تاجروں کے حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ سینکڑوں ہتھیار فروخت کے لئے
دستیباب ہیں۔ یہ پستول علاقے میں انتہائی مقبول ہیں اور خریداروں سے اس کے لئے
اضافی قیمت وصول کی جا رہی ہے۔ یہ پستول 680 یورو یعنی ایک ہزار امریکی ڈالر میں
فروخت ہوتا ہے۔ افغانستان کے دارالحکومت کابل میں تو اس گن کی مانگ بھی زیادہ
ہے اور قیمت بھی۔ وہاں اسے سولہ سو امریکی ڈالر میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ ان
ہتھیاروں کی غیر قانونی فروخت میں افغانستان کے سابق اور موجودہ فوجی ملوث ہیں،
جنہیں پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں بھی اسمگل کیا جا رہا ہے۔

ملک میں اسلحہ کے خلاف مہم چلانے والے اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہاں غیر
قانونی اسلحہ کی ترسیل کو روکے بغیر امن کا قیام ناممکن ہے۔ پاکستان کے ہر شہر میں خودکار
رائفلوں اور پستولوں سمیت چھوٹے غیر قانونی ہتھیار آسانی سے بازار میں دستیاب ہیں
اور مختلف سیاسی ومذہبی گروہوں کے کارکنوں کے پاس ایسا غیر قانونی اسلحہ وافر مقدار
میں موجود ہے۔ پاکستان میں سیاسی جماعتیں اس بات کا مطالبہ تو کرتی ہیں کہ غیر قانونی
اسلحہ کی روک تھام کی جائے لیکن ہتھیاروں کی نمائش میں یہی سیاسی رہنما اور ان کے
کارکن نمایاں ہوتے

ہیں۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو ہر جماعت کے کارکنوں کے پاس بڑی تعداد میں ہتھیار پائے جاتے ہیں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ حکومت غیر قانونی اسلحے کے خلاف ایک منظم مہم شروع کرنے کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے قانون سازی بھی کرے جس میں غیر قانونی ہتھیار رکھنے والے ملزمان کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے کیونکہ اس جرم میں گرفتار ملزمان آسانی سے 13-D کے مقدمے سے ضمانت پر بری ہو جاتے ہیں۔ جس میں زیادہ سے زیادہ تین ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔ کراچی میں غیر قانونی اسلحہ اور گولہ بارود اسمگل کرنے کے کئی راستے ہیں۔ وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق شہر میں پھل اور سبزیاں لانے والے ٹرکوں اور ٹرالرز، ریتی بجری کے ٹرکوں، آئل ٹینکرز اور دیگر شہروں سے سامان لانے والے ٹرکوں کے ڈرائیور اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہسپتالوں کی ایمبولینس گاڑیاں اور پانی لانے والے ٹینکرز کے ساتھ ساتھ شہروں کے درمیان چلنے والی انٹر سٹی بسیں بھی اسلحے کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ رپورٹ میں صوبہء بلوچستان اور صوبہء سندھ سے اسلحہ اسمگل کرنے کی طریقوں، ملوث افراد، گروپوں اور راستوں کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صوبہء بلوچستان، جس کی سرحد افغانستان اور ایران سے ملتی ہے، سوویت افغان جنگ کے بعد اب ملک میں غیر قانونی ہتھیاروں کی آمد کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس صوبے کی 600 کلومیٹر طویل سرحد کراچی سے جیکب آباد تک سندھ سے ملتی ہے۔ یہی راستہ شہر میں غیر قانونی ہتھیاروں

کی آمد کا بڑا ذریعہ ہے۔ان ہتھیاروں کے بڑے خریدار متحارب سیاسی گروپ اورانتہا پسند تنظیمیں ہیں، جنھوں نے ان دنوں بدامنی اور دہشت گردی کے لئے پاکستان کو ہدف بنا رکھا ہے۔ وزارت داخلہ کی رپورٹ کے مطابق کراچی کے علاقے منگھو پیر سے آگے بلوچستان کی سرحد پر شاہ نورانی کا علاقہ بھی غیر قانونی اسلحہ اسمگلروں کا ایک محفوظ مرکز ہے۔ وہاں اسلحہ ذخیرہ کرنے کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ گروہ تاوان کے لئے اغوا کئے گئے افراد کو بھی رکھتے ہیں۔ اس علاقے سے اونٹوں پر لکڑیاں لاد کر لائی جاتی ہیں اور اِس آڑ میں اسلحہ کراچی منتقل کیا جاتا ہے۔ اسمگلر اس راستے پر پولیس اور نیم فوجی رینجرز کی چیکنگ نہ ہونے کی وجہ سے اسے محفوظ تصور کرتے ہیں۔ رپورٹ میں ان چار راستوں کی نشاندہی نمایاں طور پر کی گئی ہے، جو مہلک ہتھیاروں کی شہر میں آمد کا بڑا ذریعہ ہیں۔

پہلا راستہ چمن، جنگل پیر علی زئی (افغان مہاجر کیمپ) قلعہ عبداللہ کچلاک، کوئٹہ، سریاب، بولان، سبی، جیکب آباد، شکارپور اور حیدرآباد سے کراچی آتا ہے۔ شہر میں اسلحے کی آمد کا دوسرا راستہ کوئٹہ، بولان، سبی، ڈیرہ بگٹی، کشمور، کندھ کوٹ، شکارپور، لاڑکانہ، دادو اور حیدرآباد سے ہوتا ہوا کراچی آتا ہے۔ تیسرا راستہ کوئٹہ، خضدار، تھل اور حب سے ہوتا ہوا کراچی پہنچتا ہے۔ شہر میں غیر قانونی ہتھیاروں کی ترسیل کا چوتھا راستہ قلعہ سیف اللہ سے

شروع ہو کر ژوب، ڈیرہ اسماعیل خان، فورٹ منڈو، ڈیرہ غازی خان سے سندھ کے شہر سکھر، حیدرآباد سے کراچی تک ہے۔ اسلحہ اسمگلنگ کے حوالے سے وزارت داخلہ کی رپورٹ میں سر کریک سمیت ان بحری راستوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، جو انڈیا اور پاکستان کے درمیان متنازعہ علاقے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق سر کریک اور شاہ بندر پاکستانی علاقہ) کے درمیانی جگہ، جو لائٹ ہاؤس کے نام سے مشہور ہے، اسلحہ اسمگلنگ) اور سرحد پار سے آنے والے ہتھیاروں کی کھیپ کی پہلی منزل ہے۔ کراچی کی دوسری بندرگاہ پورٹ قاسم کے قریب ابراہیم حیدری کے علاقے میں بنی کچی کھاڑیاں اور اطراف کے چھوٹے غیر آباد جزیروں پر بھی یہ ہتھیار جمع کئے جاتے ہیں اور پھر کوسٹ گارڈز کی نظروں سے بچا کر مچھیروں کی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے شہر میں منتقل کئے جاتے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق اکثر اوقات غیر قانونی ہتھیاروں کی فروخت کے لئے سپر ہائی وے پر افغان خیمہ بستی اور الآصف اسکوائر خریداروں اور اسمگلروں کی میٹنگ کے مقامات ہیں۔ لیکن ان مقامات کی آگاہی کے باوجود اس جگہ چیکنگ کا کوئی موثر نظام قائم نہیں ہے۔

حکمرانوں کا رویہ بھی اس بارے میں میں منفی رہا ہے۔ وہ وردی والوں کے ساتھ ساتھ سادہ لباس میں مسلح نجی گارڈ رکھتے ہیں۔ اسی سبب ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو فروغ ملتا ہے۔ حکومت اس مسئلے کے حل کے لئے ملک میں چھوٹے اسلحہ کے

پھیلاؤ کو روکنے کے لیے پالیسی وضع کرے جس کے تحت چھوٹے اسلحے کی پیداوار کو ریگولرائز کیا جائے یا اسے یکسر بند کردیا جائے۔ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ پاکستان چھوٹے اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے عالمی سطح پر ہونے والی کوششوں کا حصہ بنے اور دنیامیں چھوٹے ہتھیاروں کی پیداوار اور تجارت کو کنٹرول کرنے کے لیے مجوزہ عالمی قانون آرمزٹریڈ ٹریٹی کی حمایت کرے۔ سابق سویت یونین کے خلاف جنگ میں پاکستان کا کردار بھی ملک میں غیر قانونی اسلحے کے پھیلاؤ کا باعث بنا۔ ہمیں اپنی پالیسی پر نظرثانی کی ضرورت ہے اور پاکستان کو سکیورٹی سٹیٹ سے فلاحی ریاست بنانا پڑے گا۔ یہ امر واقعہ بھی ہے کہ غیر قانونی اسلحہ کے روک تھام کے لیے ملک میں قوانین اوران پر عمل کا طریقہ کار موجود ہے لیکن اس پر موثر طریقے سے عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔

حکومت کو چاہیئے کہ وہ ان قوانین پر عمل کرے، حکومت اسلحہ کے لیے لائسنس جاری نہ کرے، ممنوعہ اسلحہ پر پابندی ہونی چاہیے، اسلحہ کی نمائش، تقاریب اور شادیوں میں ہوائی فائرنگ پر پابندی عائد کی جانی چاہیے، کھلونا ہتھیاروں پر بھی پابندی عائد ہونی چاہیے تاکہ بچوں میں یہ رجحان نہ بڑھ پائے۔

صوبہ سندھ گزشتہ کئی عشروں سے بدامنی، لاقانونیت اوراسلحے کی غیر قانونی

اسمگلنگ کے مسئلے سے دوچار ہے۔ بڑھتی ہوئی لاقانونیت کے سبب کراچی شہر کا تشخص بین الاقوامی سطح پر سخت مجروح ہو رہا ہے۔

کراچی شہر میں غیر قانونی ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا درست اندازہ متحارب دھڑوں کے درمیان تصادم یا نئے سال کے آغاز پر ہوائی فائرنگ سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالیہ دنوں میں قیمتی سرکاری اور پرائیوٹ زمینوں پر ناجائز قبضے کے لئے کئی قبضہ گروپ برسرپیکار ہیں۔ ان تمام گروپوں کے کارندے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں اور زمینوں پر قبضے کی جنگ اکثر مسلح تصادم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس دوران ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے لیکن پولیس سیاسی دباؤ اور مالی فوائد کے باعث ان گروپوں کے خلاف کاروائی سے گریزاں ہے۔ افغان جنگ کے بعد سے پاکستان میں غیر قانونی ہتھیاروں کی فراوانی شروع ہوئی۔ مختلف حکومتوں نے اس سلسلے میں صرف سیاسی بیانات دئے تاہم حقیقی اقدامات سے گریز کیا گیا۔ ملک میں بڑے پیمانے پر ممنوعہ بور کے لائسنسوں کے اجراء کے ایک اسکینڈل کے سامنے آنے کے بعد صورتحال اور مخدوش ہوجاتی ہے۔ وزیر داخلہ کا کہنا ہے کہ ایسے تمام لائسنس منسوخ کردئے گئے ہیں، جن کے کوائف نامکمل اور مشتبہ تھے جبکہ وزارت داخلہ کے دو اہلکاروں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ موجودہ صورتحال میں غیر قانونی ہتھیاروں کی موجودگی کسی بڑے سانحے کا سبب بن سکتی ہے۔ جس کی ایک جھلک بے نظیر بھٹو کے قتل کے

بعد سندھ میں دیکھنے میں آئی تھی۔ پولیس کو اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ بصورت دیگر انارکی کو روکنا دشوار ہوگا۔ ایسی اطلاع بھی ہیں کہ بااثر سیاسی شخصیات ممنوعہ بور کے ایک اسلحہ لائسنس کے نمبر کئی ہتھیاروں پر کندہ کروا کر استعمال کر رہے ہیں، جو سنگین جرم ہے۔ اس بارے میں ذرائع کا کہنا ہے کہ کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ کی طرح نادرا سے اسلحہ لائسنس کا بھی کمپیوٹرائزڈ اندراج کرانا انتہائی ضروری ہے۔

بے گھر افراد جو پناہ گزیں ہو کر عذاب کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں

انسان اپنے گھربار اور وطن کی مٹی سے جدا ہو جائے تو در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ ایسے انسان دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں لیکن کوئی انھیں پناہ نہیں دیتا۔ جو پناہ گزیں ہوتے ہیں وہ ہر آن اپنے گھروں میں واپس جانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن جنگ، نسلی فسادات، تشدد اور سیاسی لڑائیوں لوگوں کو گھروں سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ افغانستان، عراق، کشمیر، بوسنیا، میں لاکھوں لوگ جنگ کے نتیجے میں بے گھر ہوئے۔ اقوام متحدہ کا ادارہ جسے انسانوں کے تحفظ کے لیا تشکیل دیا گیا تھا، آج چند دولت مند اور بااثر ملکوں نے یرغمال بنایا ہوا ہے۔ جو ملکوں پر جنگ مسلط کرنے میں معاونت کر رہا ہے۔ دنیا بھر میں اس وقت ایک کروڑ پچپن لاکھ افراد اپنا گھربار چھوڑ کر دیگر ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہیں اور ان پناہ گزینوں میں سے اسّی فیصد کے میزبان پاکستان جیسے غریب ممالک ہیں۔ جن کی معشیت پر اس بوجھ نے تباہی پھیر دی ہے۔ عالمی یومِ پناہ گزیناں کے حوالے سے جاری اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان دنیا میں سب سے زیادہ پناہ گزینوں کی میزبانی کر رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق دنیا میں تین ممالک پاکستان، ایران اور شام میں ان پندرہ اعشاریہ چار ملین پناہ گزینوں کی ایک چوتھائی سے زیادہ تعداد قیام پذیر ہے جبکہ پاکستان میں

دنیاکے کسی بھی ملک سے زیادہ پناہ گزین رہ رہے ہیں۔اس رپورٹ کی تیاری میں رواں سال شمالی افریقہ میں سیاسی بے چینی کی وجہ سے نقل مکانی کرنے والی افراد کی تعداد شامل نہیں ہے۔اقوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزیناں انتونیو گتترز اس بارے میں بتاتے ہیں کہ اگرچہ مغربی ترقی یافتہ ممالک پناہ گزینوں کی ممکنہ آمد کے حوالے سے خدشات کا اظہار کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے یہ خدشات درست نہیں کیونکہ دنیا میں پناہ گزینوں کا بوجھ تو غریب ممالک ہی اٹھا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ بڑے پیمانے پر نقل مکانی سے مسائل کھڑے ہوتے ہیں لیکن مغربی ممالک ’حالات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں‘۔ہائی کمیشن برائے پناہ گزیناں کا کہنا ہے کہ سنہ انیس سو پچاس میں ایجنسی کے قیام سے اب تک حالات بہت بدل چکے ہیں اور جہاں اس وقت توجہ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے نقل مکانی کرنے والے اکیس لاکھ افراد پر تھی وہاں اب قریباً ساڑھے پندرہ ملین پناہ گزین موجود ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد موجودہ صدی انسانیت کے لئے تباہی لے کر آئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں تو صرف اکیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے تھے لیکن اب اپنا ملک چھوڑنے والے ڈیڑھ کروڑ افراد کے علاوہ صرف گزشتہ برس دنیا بھر میں دو کروڑ پچھتر لاکھ افراد اندرونِ ملک نقل مکانی پر مجبور ہوئے جبکہ ساڑھے آٹھ لاکھ افراد نے سیاسی پناہ طلب کی اور یوں گزشتہ برس دنیا بھر میں کسی بھی وجہ سے نقل مکانی کرنے والے افراد کی کل تعداد چار کروڑ سینتیس

لاکھ رہی۔ دنیا بھر کے پناہ گزینوں میں سے ایک تہائی فلسطینی ہیں اور ان کی تعداد پچاس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن اسرائیل ایک ناسور کی صورت میں اس خطے کے عوام پر مسلط ہے۔ اور اس کی چیرہ دستیوں سے بے گھر ہونے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ جیسے دولت مند ممالک اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بیس فیصد پناہ گزینوں کا تعلق افغانستان سے ہے جن میں سے بیشتر پاکستان اور ایران میں قیام پذیر ہیں۔ پاکستان میں دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ پناہ گزین ہیں۔ جن کی وجہ سے ملک میں خوراک، رہائش، نقل حمل اور زندگی گزارنے کے وسائل روز بروز انسانی پہنچ سے دور ہو رہے ہیں۔ بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور عوام کی بڑی تعداد خط غربت سے نیچے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ عراق سے سترہ لاکھ، صومالیہ سے سات لاکھ ستر ہزار اور کانگو سے چار لاکھ ستتر ہزار افراد نے نقل مکانی کی۔ یو این ایچ سی آر کا کہنا ہے کہ ان پناہ گزینوں کو اگر ان کے میزبان ممالک اپنے معاشرے میں ضم نہ کریں تو انہیں شدید مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ ادارے کے ترجمان ایڈریئن ایڈورڈز کے مطابق 'یہ اکثر ہوتا ہے کہ ہمسایہ ممالک ان پناہ گزینوں کو سیاسی وجوہات پر شہریت نہیں دیتے'۔ تاہم یو این ایچ سی آر کا یہ بھی کہنا ہے ان افراد کو پناہ دینے والے ممالک کی سخاوت قابلِ تعریف ہے کیونکہ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کی اپنی آبادی کو مکمل وسائل میسر نہیں۔ ادارے نے رپورٹ میں اس حوالے سے پاکستان کی مثال دی ہے جہاں

پاکستان کی فی کس قومی پیداوار کے لحاظ سے سات سو دس پناہ گزینوں کے لیے ایک ڈالر کی رقم موجود ہے جبکہ اس کے برعکس جرمنی میں یہ شرح سترہ افراد فی ڈالر کی ہے۔ بے گھری کے اس عذاب میں عورتیں اور بچے بھی مبتلا ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن کے ماں باپ نہیں ہیں۔ حال ہی میں یورپ میں پناہ کے لیے درخواست دینے والے ایسے افغان بچوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ جن کے ہمراہ کوئی بالغ شخص موجود نہیں ہوتا۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق اٹھارہ سال سے کم عمر کے چھ ہزار سے زائد بچے یورپ میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ گزشتہ سال کے مقابلے میں ساٹھ فیصد زیادہ ہے۔ دو ہزار آٹھ میں اعداد و شمار کے مطابق اٹھارہ سال سے کم عمر کے تین ہزار آٹھ سو بچوں نے یورپ میں پناہ کے لیے درخواست دی تھی۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کا کہنا ہے کہ ایسے تارکین وطن بچوں کو تحفظ فراہم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یونیسف کا کہنا ہے کہ نئے اعداد و شمار اصل تعداد سے کم ہو سکتے ہیں کیوں کہ کئی بچے گرفتاری یا ملک بدر کیے جانے کے خوف سے پناہ کے لیے درخواست ہی نہیں دیتے۔ یونیسف کی ایک نئی تحقیق کے مطابق یورپی ممالک تارکین وطن بچوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں کیوں کہ وہاں ان کے لیے کوئی مفید پالیسی موجود نہیں ہے۔ امدادی کارکنوں نے حال ہی میں پیش آنے والے ایک واقعہ کی مثال دی جس میں یونان سے اٹلی جانے والی لاریوں میں چھپنے کی کوشش میں

دو افغان بچوں میں سے ایک تیرہ سالہ بچہ ہلاک ہو گیا تھا۔برطانیہ میں ایک مطالعاتی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یونیسف کے مطابق تنہا سفر کرنے والے ان بچوں کو اکثر نسلی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب یہ اپنی کہانی کسی بڑے کو سناتے ہیں تو ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا اور برطانیہ تک سفر کے دوران انہیں جس ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے وہ اس کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔اقوام متحدہ تارکین وطن بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مسئلے میں مزید تحقیق کی ضرورت تو محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس کے تدارک کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتا۔ ان بے وسیلہ بچوں کو تحفظ پہنچانے کی فوری ضرورت ہے۔ دوسری جانب امریکہ کے اتحادی مملکت جنہوں نے عراق پر حملے کئے اور لاکھوں لوگوں کو بے گھر کیا۔ وہ پناہ گزینوں کو اپنے ملک میں پناہ بھی نہیں دیتے۔ بلکہ انھیں گرفتار کرکے جیلوں میں ڈال دیتے ہیں۔برطانیہ نے بھی عراق کے پناہ گزینوں سے ایسا ہی سلوک کیا اور عراق سے آنے والے پناہ گزینوں کو آمد کے بعد سے حراست میں لے لیا اور پھر انھیں واپس عراق بھیج دیا۔ واپس پہنچنے والے ان پناہ گزینوں کو عراق میں بھی ایئرپورٹ پر پوچھ گچھ کے لیے حراست میں رکھا گیا۔ پناہ گزینوں کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے ادارے یو این ایچ سی آر نے عراق کے بعض حصوں میں پر تشدد واقعات اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے پیش نظر ان عراقیوں کی وطن واپسی پر تشویش کا اظہار تو کیا ہے لیکن وہ انسانی ہمدردی کے ناطے انھیں کوئی ریلیف فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یو این ایچ سی آر

کا کہنا ہے کہ یہ صورتِ حال اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ان پناہ گزینوں کو بین الاقوامی تحفظ حاصل رہے۔ یو این ایچ سی آر نے برطانیہ کی بارڈر ایجنسی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو، اس کے مطابق، عراقی پناہ گزینوں کو ڈی پورٹ کرنے کے سارے عمل کو شفاف رکھنے میں ناکام رہی ہے۔ پناہ گزینوں کی واپسی کا یہ عمل رضاکارانہ نہیں بلکہ انہیں زبردستی برطانیہ بدر کیا جا رہا ہے۔ عراق واپسی کے لیے شارٹ لسٹ کیے گئے پناہ گزینوں نے بتایا کہ انہیں ان کی مرضی کے خلاف وطن واپس کرنے کے لیے مختصر مدت کے لیے حراستی مراکز میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک عراقی پناہ گزین کو جس نے سترہ سال کی عمر میں ملک چھوڑا تھا ایک تین سالہ بیٹا برطانیہ میں چھوڑ کر واپس جانا پڑ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ غیر معینہ مدت کے لیے حراست میں رہنے کو عراق واپسی پر ترجیح دیں گے۔ عراقی پناہ گزین جن کو برطانیہ نے ملک بدر کیا ہے کا کہنا ہے کہ ان کو جہاز سے اتارنے کے لیے برطانوی بارڈر ایجنسی (یو کے بی اے) نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان افراد میں شیروان عبداللہ بھی تھے جنہوں نے بتایا کہ برطانوی اہلکاروں نے ان کو اور دیگر افراد کو جہاز سے اتارنے کے لیے تشدد کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے بتایا 'وہ ہم کو کھینچ رہے تھے اور انہوں نے ہمیں کہا کہ وہ ہمیں بری طرح ماریں گے اگر ہم جہاز سے نہ اترے۔' ان سے جب پوچھا گیا کہ آیا یہ واقعہ جہاز پر پیش آیا تو ان کا کہنا تھا 'جی جہاز پر۔ اگر کوئی جہاز سے اترنے کے لیے تیار نہیں تھا تو وہ اس کو دھکیلتے، گردن سے

پکڑتے اور تقریباً مار ہی ڈالتے اور وہ لوگ سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔' عبد اللہ کا کہنا تھا کہ ان کی ساری رقم عراقی پولیس نے ہوائی اڈے پر لے لی۔تاہم عراقی حکام نے اس الزام کی سختی سے تردید کی۔دوسری جانب ملک بدر کیے گئے چودہ افراد نے یو این ایچ سی آر کو بتایا کہ یو کے بی اے کے اہلکار نے ان کو جہاز پر چڑھانے اور اتارنے کے لیے تشدد کا نشانہ بنایا۔تشدد کے یہ واقعات اکثر پناہ گزینوں کو بھگتنے ہی پڑتے ہیں۔ پناہ گزینوں کی آمد سے پاکستان بے پناہ مسائل کا شکار ہے۔پاکستان میں افغان مہاجرین دو دہائی سے زیادہ عرصے سے مقیم ہیں اور واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ قوم پرست جماعتیں ان کی آباد کاری کے خلاف ہیں اور ان کی واپسی کا مطالبہ کرتی ہیں۔ حال ہی میں پاکستان میں مقیم رجسٹرڈ افغان پناہ گزینوں کی دوبارہ رجسٹریشن کا کام شروع کیا گیا ہے اور اب پہلی مرتبہ پناہ گزینوں کے اٹھارہ سال سے کم بچوں کو پیدائش کا سرٹیفیکیٹ بھی جاری کیا جائے گا۔ یہ رجسٹریشن کارڈ ان پناہ گزینوں کو جاری کیے جا رہے ہیں جو پہلے سے رجسٹرڈ ہیں لیکن ان نئے کارڈ کی مدت دو ہزار بارہ تک ہو گی اور اس دوران افغان پناہ گزین قانونی طور پر پاکستان میں رہ سکیں گے جس کے بعد ان کی وطن واپسی کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ کہا جا رہا ہے کہ برتھ سرٹیفیکیٹ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پناہ گزینوں کے بچوں کو شہریت دے دی گئی ہے بلکہ اس سرٹیفیکیٹ سے ان بچوں کو بنیادی تمام سہولیات دستیاب ہوں گی۔ یہ فیصلہ حکومت پاکستان اور افغانستان

کے حکام کے مابین اس سال مارچ میں ہونے والے اجلاس میں کیا گیا تھا جس پر عملدرآمد اب کیا جا رہا ہے۔ اس اقدام کو بچوں کے مستقبل کے لیے بہتر قرار دیا جا رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اب یہ بچے اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم بھی حاصل کر سکیں گے۔ دو ہزار نو کے سروے کے مطابق پاکستان میں کوئی سترہ لاکھ رجسٹرڈ افغان پناہ گزین موجود ہیں ۔ جنہیں اب دو ہزار بارہ تک رہنے کی آزادی دی گئی ہے۔ دوسری جانب افغان پناہ گزینوں کی واپسی کا سلسلہ بھی جاری ہے اور اس سال مارچ سے اب تک کوئی نوے ہزار پناہ گزین واپس اپنے وطن چلے گئے ہیں جنھیں تمام سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔ پاکستان میں اندرونی شورش اور دہشت گردوں کے خلاف کاروائی کی بنیاد پر بھی نقل مکانی ہوئی ہے۔ سوات آپریشن میں تیرہ لاکھ افراد بے گھری کے عذاب سے گزرے اور انھیں اپنے ہی ملک میں نقل مکانی میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔
سیلاب نے بھی لاکھوں افراد کو بے گھر کیا اور انھیں گھر بار چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ پاکستان فوج اور طالبان کے درمیان لڑائی سے متاثر ہونے والوں پر اربوں روپے کے اخراجات آئے لیکن امیر ملکوں نے جنھوں نے اپنی جنگ ہم پر مسلط کر دی لیکن کوئی قابل ذکر امداد نہ دی ۔ امریکی محکمہ دفاع جہازوں کے ذریعے پاکستان امداد پہنچانے پر غور کرتا رہا اور لوگ مصیبت میں مبتلا رہے۔ پینٹاگون کے ایک اہلکار کا کہنا تھا کہ وہ حکومتِ پاکستان سے باقاعدہ درخواست کا انتظار کر رہے ہیں اور اس کے بعد حلال خوراک، پانی کے ٹرک اور

ٹنیٹ بھیجے جائیں گے۔ یو این ایچ سی آر کے مطابق سوات آپریشن میں 1994 میں روانڈا میں ہونے والی لڑائی کے بعد ہجرت کرنے والے لوگوں سے زیادہ افراد نے ہجرت کی ہے۔ یو این ایچ سی آر کے ترجمان کا کہنا تھا کہ 'ہمیں معلوم ہے کہ یہ اقتصادی طور پر مشکل دور ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس عالمی برادری کی، جس نے مالی نظام کو بچانے کے لیے اربوں حاصل کیے ہیں، ذمہ داری ہے کہ ضرورت مند لوگوں کی مدد کرے۔' لیکن اس مصیبت میں بھی اسی فیصد پناہ گزینوں کا بوجھ عوام نے اٹھایا۔ پاکستان لیں مقیم افغان پناہ گزین اپنے ملک کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں اور اس کے سیاسی عمل سے بھی دور نہیں رہتے ۔ حالیہ افغانستان کے انتخابات میں بہت سے لوگوں نے ووٹ ڈالنے میں حصہ لیا، صدارتی انتخاب میں ان کی دلچسپی دور ہتے ہوئے بھی برقرار رہی ۔ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے پناہ گزین کے مطابق نوے ہزار افغان پناہ گزین رجسٹرڈ ہیں جبکہ افغان پناہ گزین سندھ کے جرگہ کے چیئرمین حاجی عبداللہ شاہ بخاری کا کہنا ہے کہ سندھ میں چار لاکھ سے زائد پناہ گزین موجود ہیں جن کی اکثریت کراچی میں آباد ہے۔ حاجی عبداللہ نے صدارتی انتخابات میں عبداللہ عبداللہ کی حمایت کی تھی اور انہیں یقین تھا کہ وہ جیت جائیں گے۔ وہ حامد کرزئی کے ناقد ہیں اور کہتے ہیں کہ 'حامد کرزئی نے آٹھ سال میں کیا کیا ہے۔ انہوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا کہ یہاں جو فارین ایکٹ میں افغانی گرفتار ہوتے ہیں انہیں رہا کرائیں۔ تو وہ ملک کے لیے کیا کریں گے؟'

۔' کراچی میں افغان شہریوں کی اکثریت سپر ہائی وے پر قائم کیمپ میں رہتی ہے۔ یہ کیمپ انیس سو چھیاسی میں قائم کیا گیا تھا۔شام میں حالات خراب ہونے پر بھی ایک ہزار شامی باشندوں نے ترکی میں پناہ لی ہے۔ عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ بینڈکٹ اور اقوامِ متحدہ نے شام سے درخواست کی کہ وہ اپنے شہریوں پر حملے نہ کریں۔ یہ مطالبہ اس وقت سامنے آیا جب فرانس اور برطانیہ نے اقوامِ متحدہ کی ایک قرارداد کے ذریعے شام میں مظاہرین کے خلاف حکومتی کاروائیوں کی مذمت کرنے کی تجویز پیش کی۔ شام کے شمالی شہر جسر الشغور میں ایک سو بیس سکیورٹی اہلکاروں کی ہلاکت کی اطلاعات کے بعد شہریوں میں سخت فوجی کاروائی کے خدشات پائے جاتے ہیں۔ حکام کے مطابق جسر الشغور کے شہریوں نے حکومت سے وہاں امن قائم کرنے کے لیے فوج کو مداخلت کرنے کی درخواست کی ہے۔ شامی حکام کا کہنا ہے کہ 'مسلح گروہوں' نے ان سکیورٹی اہلکاروں کو ہلاک کیا اور حکومت شہر میں حکومتی کنٹرول کی بحالی کے لیے 'طاقت کا استعمال' کرے گی۔ ترک وزیر اعظم رجب طیب اردگان کا کہنا ہے کہ وہ شام سے آنے والے پناہ گزینوں کی وجہ سے اپنے ملک کی سرحدیں بند نہیں کریں گے۔ پناہ گزینوں کا یہ مسئلہ ساری دنیا کے لئے ایک المیہ کہ حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ترقی یافتہ دور میں انسان اپنے گھروں سے بے گھر کر دئے گئے ہیں۔

پاکستان میں تعلیم سب سے نیچے

پاکستان میں تعلیم کا شعبہ ایک 'خاموش بحران' کا شکار ہے۔ تعلیم کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی مذہب، معاشرہ یا ملک ہو ہر کوئی تعلیم کی طرف زور دیتا ہے۔ اسلام نے بہت زیادہ تعلیم پر زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی طرف پہلی وحی بھیجی تو وحی کا پہلا لفظ ہی "پڑھ" تھا۔ ہم اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسی کام کی شروعات صرف اور صرف تعلیم سے ہی ہو سکتی ہے اور کوئی کام تعلیم کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ پاکستان کے چالیس فیصد بچے سکول کا منہ نہیں دیکھتے۔ اسکولوں کی بڑی تعداد گھوسٹ اسکول کی ہے۔ جو صرف کاغذ پر ہیں مگر اسکے اساتذہ کو تنخواہ برابر مل رہی ہو۔ روزنامہ ڈان میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق ملک کے لگ بھگ دو لاکھ بیس ہزار سکولوں میں سے میں ایسے کراماتی سکولوں کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہے جنہوں نے سلیمانی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔ بیس ہزار درختوں کے نیچے قائم ہیں۔ چالیس فیصد میں پانی نہیں اور ساٹھ فیصد میں بجلی نہیں۔ قیام پاکستان سے آج تک اس ملک میں چودہ سے زائد تعلیمی پالیساں نافذ ہو چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ جنوبی ایشیا کا سب سے ناخواندہ ملک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ھمارا نظام تعلیم فرسودہ اور انگریز کا بنایا ہوا ہے۔ اس کا بانی

لارڈ میکالے تھے جس نے کہا تھا کے میرا نظام تعلیم پڑھ کر مسلمان۔ مسلمان نہیں رہ سکتا۔

انسانی معاشروں کا حسن تعلیم، شعور، احساس ذمہ داری،کا ہی مرہون منت ہوتا ہے۔ قوموں کی ترقی میں تعلیم کی اسی اہمیت کے پیش نظر معیشت کا اہم ترین حصہ تعلیم پر صرف ہونا چاہیے۔ بد قسمتی سے پاکستان میں تعلیمی شعبہ کی زبوں حالی اور اس شعبہ کو تجارت کا درجہ دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ملک میں شرح تعلیم انتہائی کم ہے محض 57 فیصد افراد پڑھنا اور لکھنا جانتے ہیں۔ تعلیمی شرح میں اس حد تک کمی کے باوجود افسوس اس بات کا ہے کہ ہر سال بجٹ میں تعلیم کا حصہ بڑھنے کے بجائے مزید کم کردیا جاتا ہے۔ جیسا کہ 2006-2007ء میں بجٹ میں تعلیم کے لیے 2.5 فیصد حصہ مختص کیا گیا تھا جو کہ گھٹ کر 2010ء میں 2 فیصد رہ گیا ہے۔ اس کے ساتھ اگر ہم خطے کے دیگر ممالک میں تعلیم کے لیے بجٹ کے حصہ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم تعلیمی بجٹ میں سب سے نیچے ہیں۔ اس وقت تعلیم پر بنگلہ دیش 2.6 فیصد، نیپال 3.2 فیصد، بھارت 3.3 فیصد، ایران 5.2 فیصد، مالدیپ 8.3 فیصد خرچ کرتا ہے۔ ان تمام ممالک میں سے پاکستان تعلیم پر بجٹ کا سب سے کم حصہ مختص کرنے والے ممالک میں سر فہرست ہے۔ عالمی سطح پر تعلیم کے شعبے میں سرگرم تنظیم 'گلوبل کیمپین فار ایجوکیشن' نے اپنی ایک تازہ رپورٹ میں ایشیائی ممالک کے حوالے سے جو اعداد

و شمار پیش کیے ہیں ۔ ان کے مطابق پاکستان میں 41 فیصد لڑکیاں بنیادی تعلیم مکمل نہیں کر پاتی ہیں جب کہ ہمسایہ ملک بھارت میں یہ شرح 30 فیصد ہے۔ گلوبل کیمپین فار ایجوکیشن کی معاون برطانوی تنظیم 'اوکسفیم' کے پاکستان میں عہدے دار سعید الحسن کا کہنا ہے کہ ملک میں خصوصاً لڑکیوں کی بنیادی تعلیم کے حوالے سے حالات کبھی بھی تسلی بخش نہیں رہے۔ پاکستان میں لڑکوں کی شرح خواندگی 69 فیصد اور لڑکیوں کی 45 فیصد ہے، جب کہ ملک میں قائم تقریباً ڈیڑھ لاکھ پرائمری اسکولوں میں سے 45 فیصد لڑکوں اور 31 فیصد لڑکیوں کے لیے ہیں۔ حکومت سمیت تمام سیاسی جماعتوں کو اپنی زیادہ توجہ اس صنفی فرق کو ختم کرنے اور تعلیم کے فروغ پر مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ موجودہ حالات میں پاکستان میں لڑکیوں کے لیے اپنی بنیادی تعلیم مکمل کرنے کا امکان ہی 50 فیصد ہے۔ اٹھارویں آئینی ترمیم کے تحت شعبۂ تعلیم کی صوبوں کو منتقلی کے بعد کیا صورتحال ہوگی یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ صوبوں میں تعلیم سمیت دیگر اقدام پر توجہ دینے کا کوئی خاص نظریہ یا پالیسی نہیں ہے۔ تعلیم سے متعلق اکثر تجزیہ کاروں کی رائے یہ ہے کہ اس فیصلے پر عمل درآمد سے قبل صوبوں کی استعداد بڑھانا ناگزیر تھا۔" یہ فوری فیصلہ تو کیا گیا ہے، لیکن اس کے لئے باقاعدہ جس ہوم ورک کی ضرورت تھی۔ اس حوالے سے خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا اور نہ یہ دیکھا گیا کہ صوبوں میں یہ ذمہ داری نبھانے کی استعداد ہے یا نہیں۔ وزارت تعلیم بھی ایک دباؤ کا شکار ہے کیوں کہ صوبوں کو اس نئی صورت

حال سے واضح آگاہی نہیں ہے۔" بیشتر سیاسی جماعتوں کا کہنا ہے کہ اختیارات کی مرکز سے صوبوں کو منتقلی کے عمل میں ابتدائی طور پر مشکلات کا سامنا ہو گا لیکن مستقبل میں اس فیصلے کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے کیوں کہ اختیارات اور وسائل کی منتقلی کے بعد صوبے اپنی کارکردگی کے خود ذمہ دار ہوں گے اور ناکامی کا الزام وفاق پر نہیں ڈالا جا سکے گا۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ صوبوں کو چار سو ارب روپے کی اس رقم سے زیادہ دلچسپی ہے۔ جو صوبوں کو تعلیم کے لئے منتقل کی جائے گی تاکہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق فنڈز اور وسائل کا استعمال کر سکیں۔ تعلیم کے ساتھ ہی معیار تعلیم کا بھی ذکر آتا ہے اس بارے میں بھی شکوک وشبہات ہیں۔ حکومتی اہلکار کا کہنا ہے کہ تعلیم کے شعبے کی ترقی کے لیے حکومت ترجیحی بنیاد پر کام کر رہی ہے اور قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ کے تحت صوبوں کو چار سو ارب روپے کی رقم منتقل کی جا رہی ہے تاکہ وہ تعلیم کے فروغ کے منصوبوں پر مالی وسائل کا استعمال کر سکیں۔ این ایف سی کے تحت وسائل کی منتقلی کے بعد پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں وفاق کا کردار محدود ہو جائے گا اور اب یہ صوبوں پر منحصر ہو گا کہ وہ کس طریقے سے اپنے ہاں اس شعبے میں بہتری لاتے ہیں۔ پاکستان خصوصا دیہی علاقوں میں تعیلم کے گرتے ہوئے معیار پر ناقدین مرکزی حکومتوں کو تنقید کا نشانہ بناتے آئے ہیں۔ اب اس شعبے پر اگر توجہ نہیں دی جاتی تو اس کا حساب صوبوں کو دینا ہو گا۔ پاکستان کے دیہی علاقوں میں معیارِ تعلیم پر مرتب کیے

گئے اپنی نوعیت کے ایک جائزے میں درس وتدریس کی عمومی صورت حال کو' نہایت مایوس' کن قرار دیا گیا ہے۔ساؤتھ ایشین فورم فار ایجوکیشن (سفید) نامی ایک غیر سرکاری علاقائی تنظیم کی سالانہ رپورٹ کے مطابق اسکول جانے والے تین سے سولہ سال تک کی عمر کے بچوں میں 50 فیصد سے زیادہ اردو یا پھر اپنی مادری زبان میں تحریر کیا ہوا ایک جملہ بھی نہیں پڑ سکتے۔اس رپورٹ میں اسلام آباد کے علاوہ سندھ، بلوچستان، خیبر پختون خواہ، پنجاب پاکستان کے زیر انتظام کشمیر اور گلگت بلتستان کے 32 اضلاع کے دیہی علاقوں میں 445 نجی اور 1,296 سرکاری اسکولوں میں تعلیم کے معیار کا جائزہ لیا گیا ہے۔رپورٹ کے مطابق ریاضی کا مضمون پڑھنے والوں میں صرف 44 فیصد بچے دو ہندسوں پر مشتمل تفریق کے سوالات حل کر کے لیکن یہ امر بھی باعث حیرت ہے کہ دیہی علاقوں کے ان اسکولوں میں زیر تعلیم بچوں میں سے انگریزی کا متن پڑھنے والوں کی شرح 32 فیصد ہے۔اس جائزہ رپورٹ میں 960 دیہاتوں میں 54 ہزار سے زائد بچوں کی تعلیمی اہلیت کا جائزہ لیا گیا جن میں لڑکے اور لڑکیاں شامل ہیں۔زیر جائزہ اسکولوں میں تیسری جماعت کے صرف 44 فیصد طالب علم پہلی جماعت کی کتاب کا متن پڑھ سکتے ہیں جب کہ 80 فیصد بچے دوسری جماعت کی نصابی کتاب کا متن پڑھنے سے قاصر ہیں۔اسکولوں کی عمومی حالت زار پر بھی اس جائزہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سرکاری پرائمری اسکولوں میں صرف 57 فیصد میں پینے کے صاف پانی اور 45 فیصد میں قابل استعمال بیت الخلاء کی سہولتیں موجود ہیں جبکہ نجی اداروں

میں صورت حال نسبتاً بہتر ہے۔۔ اس جائزے میں بچوں میں معیار خواندگی کے بارے میں جو پریشان کن انکشافات سامنے آئے ہیں وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے سر توڑ کوششیں کی جائیں اور آئندہ نسلوں کی تعلیم و فلاح میں نمایاں سرمایہ کاری کی جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے معیار کو بہتر کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں اسکولوں کے اساتذہ کی بہتر تربیت کی جائے۔ ہمارے نظام تعلیم ہیں طالب علم رٹے رٹائے الفاظ یا جملوں کو یاد تو کر لیتا ہے لیکن مفہوم سے ناآشنا رہتا ہے۔ تعلیمی امور کا جائزہ لینے والے ملک میں نظام تعلیم کو یکساں کرنے پر زور دیتے ہیں اور ہنگامی بنیادوں پر بجٹ کو دوگنا کرنے اور پرائمری، سکینڈری اور یونیورسٹی کے معیار تعلیم کو دنیا کے تعلیمی اداروں کے ہم پلہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔ اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ مذہبی تعلیمی اداروں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ملایا جائے تاکہ مذہبی طلبہ دنیاوی تعلیم اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ مذہبی تعلیم سے مستفید ہو سکیں۔ اس طرح سوچ اور علمی میدان میں یکسانیت کو پروان چڑھایا جا سکے۔ ادھر برطانوی حکومت کے تعاون سے پاکستان میں تعلیم کے نظام کو بہتر بنانے والی پاکستان ایجوکیشن ٹاسک فورس نے بھی سال دو ہزار گیارہ کو تعلیمی ایمرجنسی کا سال قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ملک کا تعلیمی نظام ہنگامی صورتحال کا شکار ہے جس سے کروڑوں بچوں کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔

ایجوکیشن ٹاسک فورس کی طرف سے 'پاکستان کی تعلیمی ایمرجنسی' کے عنوان سے جاری کی گئی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی اس تباہ کن ایمرجنسی کے اثرات انسانی، سماجی اور معاشی سطح پر موجود ہیں اور اس بحران سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہے۔اس رپورٹ کے مطابق پاکستان تعلیم کے حوالے سے اپنی بین الاقوامی ذمہ داریاں نبھانے میں اب تک ناکام رہا ہے اور تقریباً ستر لاکھ بچے پرائمری تعلیم سے محروم ہیں اور یہ تعداد لاہور شہر کی پوری آبادی کے برابر ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنے بچے اس وقت پرائمری تعلیم سے محروم ہیں ان کی تقریباً دس فیصد تعداد پاکستان میں ہے اس طرح تعلیم سے محروم بچوں کی تعداد کے حوالے سے پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ہائی سکولوں میں داخلے کی شرح محض تیئیس فیصد ہونے کی وجہ سے پاکستان بین الاقوامی اور اپنی آئینی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں اور بھی پیچھے ہے۔ اور آج بھی ایسے بچوں کی تعداد ڈھائی کروڑ ہے جو تعلیم حاصل نہیں کر پا رہے ہیں۔دنیا میں چند غریب ترین ممالک میں پرائمری تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ پاکستان میں تعلیمی مواقع کم نہیں ہیں بلکہ اس کی ناہموار تقسیم ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ملک کے بیس فیصد امیر ترین شہری غریب ترین شہریوں کے مقابلے میں سات سال زیادہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دوسری طرف تیس فیصد پاکستانی انتہائی تعلیمی غربت میں

زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ بمشکل دو سال تک سکول جا پاتے ہیں۔ دنیا میں چند غریب ترین ممالک میں پرائمری تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا اپنے اپنے تعلیمی اہداف مقررہ مدت میں حاصل کرنے کی جانب گامزن ہیں۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان اپنی قومی پیداوار کا کم از کم چار فیصد تعلیم پر خرچ کرنے کا پابند ہے۔ لیکن حالیہ برسوں کے بجٹ میں یہ شرح بڑھنے کے بجائے کم ہو رہی ہے یعنی گزشتہ برس صرف دو فیصد تعلیم پر خرچ کیا گیا۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پاکستان کو اپنے تعلیمی اہداف کو پورا کرنے کے لیے سالانہ سو ارب روپے درکار ہوں گے۔ ٹاسک فورس کا کہنا ہے کہ حکومت سرکاری سکولوں پر قومی پیداوار کا محض ڈیڑھ فیصد خرچ کر رہی ہے اور یہ خرچ اس سبسڈی سے بھی کہیں کم ہے جو پی آئی اے، پاکستان سٹیل ملز اور پیپکو کو دی جاتی ہے۔ اس وقت ملک میں تیس ہزار سے زیادہ سکول مخدوش حالت میں یا اس کی عمارتوں کو مرمت کی اشد ضرورت ہے جبکہ اکیس ہزار سے زیادہ سکول کھلے آسمان تلے چل رہے ہیں اور بہت سے سکولوں میں بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ صرف پینسٹھ فیصد سکولوں میں پینے کا پانی میسر ہے، باسٹھ فیصد میں بیت الخلاء کی سہولت موجود ہے، اکسٹھ فیصد کی چاردیواری ہے اور صرف انتالیس فیصد میں بجلی کا نظام موجود ہے۔ اس رپورٹ میں تجاویز دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پاکستان کو اپنے تعلیمی اہداف حاصل کرنے کے لیے کچھ اضافی اخراجات کرنا ہوں گے۔ معاشی

دباؤ کی موجودہ صورتحال میں اولین ترجیح یہ ہونی چاہیئے کہ سال کے بجٹ میں تعلیمی اخراجات موجودہ سطح پر بحال رکھنے کو یقینی بنایا جائے۔

پاکستان کے نظامِ تعلیم کی زبوں حالی پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج تک پاکستان میں کوئی ایک معیاری تعلیمی نظام رائج ہی نہیں ہو سکا۔ ہر حکومت تعلیم کے فروغ کے لئے نئے سے نئے تجربے کرتی ہے جو کہ پہلے نظام سے بھی برے نتائج لاتا ہے۔ پاکستان کے نظامِ تعلیم کی خرابیوں پر توجہ کی جائے تو اس کی چند بڑی وجوہات درج ذیل ہیں۔ اپنی زبان سے دوری، طبقاتی تفریق، ریسرچ اور معیارِ تعلیم کا فقدان تعلیم کا ترجیحی پالیسی میں شامل نہ ہونا، ہمارے نظامِ تعلیم میں سب سے بڑا مسئلہ اپنی قومی زبان اردو سے دوری ہے۔ ہم انگریزی کی اندھی تقلید اور اردو کے دشمن ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں دو فیصد طبقہ انگریزی کا سہارا لے کر اٹھانوے فیصد عوام پر حکمرانی کر رہا ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں اپنی قومی زبان میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ باور کریا جاتا ہے کہ انگریزی تعلیم کے بغیر جدید ٹیکنالوجی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اگر ترقی کے لئے انگریزی ہی ضروری ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی ترقی یافتہ ممالک جنھوں نے اپنی قومی زبانوں میں ترقی کی ہے وہ انگریزی کے بغیر ترقی کیسے کر گئے ہیں۔ دنیا کے زیادہ ترقی یافتہ ممالک نے اپنی ہی زبان میں ترقی کی ہے نہ کہ کسی دوسری زبان میں۔

انسان ہمیشہ اپنی

زبان میں ہی سوچتا ہے۔ اگر آج پاکستان میں نظامِ تعلیم کی زبان اردو کر دی جائے تو ایسے ایسے شاہکار ہوں جن کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا۔ایک محدود سروے کے مطابق دیہاتی بچے جو پڑھ نہیں پاتے اور پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں ان میں سے تقریباً 95 فیصد صرف انگریزی کی وجہ سے چھوڑتے ہیں۔ اگر آپ میٹرک میں فیل ہونے والے طلباء کا جائزہ لیا جائے تو ان میں سے تقریباً 80 فیصد انگریزی کے مضمون میں فیل ہوتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کی صورتحال مزید ابتر ہے۔ ایک طالب علم ساری زندگی اردو میں پڑھتا ہے پھر اچانک کالج پہنچ کر سب کچھ اردو کی بجائے انگریزی میں ہو جاتا ہے تو اسے سمجھ تو سب آ جاتی ہے لیکن انگریزی کی وجہ سے وہ لکھ نہیں پاتا۔ پنجاب یونیورسٹی کے آرٹس کے طالب علم جو فیل ہوتے ہیں ان میں 97 فیصد صرف انگریزی میں فیل ہوتے ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم اردو میں ہو تاکہ ایک عام طالب علم بھی آسانی سے علم حاصل کر کے اس کے علاوہ انگریزی یا کوئی بھی دوسری زبان سیکھنا چاہے ضرور سیکھے بلکہ علم میں اضافے کے لئے جتنی چاہے زبانیں سیکھے۔ہمارے تعلیمی نظام میں بگاڑ کا دوسرا بڑا سبب طبقاتی تفریق ہے جو قومی زبان اردو اور انگریزی کو بنیاد بنا کر ہی ڈالا گیا ہے۔ پرائیویٹ ادارے کاروباری ذہن کے پیشِ نظر انگریزی میں تعلیم دینے کو ترجیح دیتے ہیں اور امراء کے بچے انہیں پرائیویٹ اداروں میں پڑھتے ہیں اور غریب گورنمنٹ کے پیلے اسکولوں میں ۔ اب تعلیم اور ڈگریاں فروخت کی جا رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج

یا یونیورسٹی میں غریب طالب علم سر توڑ محنت کے بعد میرٹ پر آ کر داخل ہوتا ہے اور امیر کا بچہ سلف فنانس پر سیٹ خریدتا ہے، اور یہ ثابت کر دیا جاتا ہے کہ غریب طالب علم محکوم ہے اور امیر حکمران جو پیسے سے کہیں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ گورنمنٹ اداروں کا معیار، پرائیویٹ کے مقابلے میں پشت ہے۔ چونکہ پرائیویٹ میں فیس بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے غریب کی پہنچ سے دور اور امیر وہاں تعلیم حاصل کرتا ہے یوں امیر کا معیار غریب سے بلند سمجھ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر غریب کا بچہ ماسٹر کرکے کلرک بنتا ہے اور امیر کا ماسٹر کرکے افسر۔۔۔ اسی طبقاتی تفریق کی وجہ سے سفارش اور رشوت کے ذریعے امیروں کو نوکریاں ملتی ہیں لیکن غریب اس سے محروم رہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے غریب بچوں اور جوانوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں ایک بیماری یہ بھی ہے کہ یہاں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی طالب علم نے کتنی کتاب اپنے ذہن میں نقش کی ہے اور یہ کتنا لکھ سکتا ہے۔ عام طور پر چھٹی جماعت سے لے کر گریجویشن تک امتحانات میں یہ ہی دیکھا جاتا ہے کہ کوئی طالب علم ایک خاص وقت میں کتنا لکھ سکتا ہے۔ جو جتنا زیادہ لکھتا ہے اسے اتنے ہی نمبر ملتے ہیں۔ ہمارا معیار علم کی بجائے لکھنے کی رفتار بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ دیکھا جائے کہ ایک طالب علم کتنا علم رکھتا ہے۔ لیکن یہاں زیادہ سے زیادہ لکھنے اور خوبصورتی کے نمبر ہوتے ہیں۔ اب ایک طالب علم بہت ذہین ہے وہ ایک اچھا سکالر بن سکتا ہے لیکن اس کی لکھنے کی

رفتار یا لکھائی خوبصورت نہیں تو بس اسے اسی بات کی سزا دی جاتی ہے کہ تم تیز اور خوبصورت لکھ نہیں سکتے اس لئے تم کسی کام کے نہیں۔۔۔ مزید ہماری اعلیٰ تعلیم میں سب سے بڑا مسئلہ ریسرچ سے دوری ہے۔ کتابیں یاد کرنا اور پھر انہیں امتحانات میں لکھ دینا ہی معیار سمجھ لیا ہے اور ریسرچ کا شوق اور فائدہ بتایا ہی نہیں جاتا۔ ان سب باتوں کے علاوہ پاکستان کے حکمرانوں کے لئے تعلیم کا شعبہ ترجیح نہیں ہے۔ جس کے سبب نظامِ تعلیم میں بھی بے شمار کمزوریاں ہیں۔ جن میں اساتذہ کی تربیت، آئے دن نصاب کی تبدیلی، جدید سہولیات کی کمی، عملی تربیت، تجربہ گاہ کی کمی، تجربہ گاہ میں معیاری سامان کی کمی، امتحانات کا نظام، تعلیمی اداروں کی عمارتوں کا غلط استعمال، رشوت، سفارش اور ان جیسی بے شمار کمزوریاں ہمیں ترقی سے دور کر رہی ہیں۔ اسلامی جمعیت طالبات پاکستان نے جو تعلیمی سفارشات و مطالبات پیش کئے ہیں ان میں سر فہرست :۔ ا) بجٹ 2011-2012ئ میں GDP کا 5 فیصد حصہ تعلیم کے لیے مختص کیا جائے۔ ۲) تعلیم کو تجارت بنانے اور نجی شعبہ کے ہاتھوں میں دینے سے گریز کرتے ہوئے حکومت اس کو اپنی پہلی ترجیح میں رکھے۔ ۳) 18ویں ترمیم کے مطابق نصاب کی تیاری کا اختیار صوبوں کو منتقل کرنے کے فیصلہ کو فی الفور واپس لیا جائے۔ اس فیصلے سے ملک کی ملی وحدت اور قومی یکجہتی کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ۴) طبقاتی نظام تعلیم کے خاتمے کے لیے فوری کوششیں کی جائیں اور یکساں نظام تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ جس کے ذریعے معاشرہ سے طبقاتی کشمکش کا خاتمہ

ممکن ہو سکے۔ ۵) باقاعدہ اور موثر منصوبہ بندی کے ذریعے ملک سے جہالت کا خاتمہ ممکن بنا کر تعلیم کی شرح کو بڑھایا جائے۔ ٦) پرائمری اور سکینڈری سطح کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ ۷) اساتذہ کی خصوصی تربیت اور اہل افراد کو شعبہ تعلیم میں بھرتی کرکے معیار تعلیم کو بلند کیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان ترقی کرے تو ہمیں سب سے پہلے نظامِ تعلیم کو اپنی ترجیح کی پالیسی اپنانی ہوگی۔ یہ کام حکومت اور عوام دونوں کا ہے۔ اس کے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ انفرادی طور پر تعلیم عام کرنے اور نظامِ تعلیم کو بہتر کرنے کے لئے کوشش کرنی ہو گی۔ مختلف سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیمی مقابلے کرائیں۔ غریب طالب علموں کے اخراجات جو اٹھا سکتے ہیں۔ انھیں اٹھانا چاہیئے۔ اسکول، کالج تعلیمی ادارے بنانے چاہیئے۔ معیاری اور سستی تعلیم کو عام کیا جائے۔ تاکہ غریب بھی آسانی سے پڑھ سکے۔ تعلیمی ماحول کو عام کیا جائے۔ بچوں اور نئے طالب علموں کی بہتر سمت میں رہنمائی کرنے، ریسرچ کا جذبہ پیدا کرنے میں خاص طور پر توجہ دینی ہو گی۔ انٹرنیٹ جیسے میڈیا پر کھیل کود کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ تعلیمی مواد اردو میں مہیا کیا جائے۔ اسی سے معاشرہ بہتر ہوگا۔ اور ایسے افراد پیدا ہوں گے۔ جو ملک و قوم کا نام روشن کریں گے۔۔۔

کرچی والے خوش ہیں۔

پاکستان میں صحافت بے حد آسان بھی ہے اور مشکل ترین بھی۔ آپ کوچہ صحافت میں قدم رکھ کر اسلام آباد میں شاندار قیمتی پلاٹ بھی حاصل کر سکتے ہیں اور سلیم شہزاد اور کئی دوسرے صحافیوں کی طرح کسی قبرستان میں دو گز زمیں بھی۔ آپ جہازوں میں غیر ملکی دورے بھی کر سکتے ہیں اور سنئیر صحافی محمد علی خالد کی طرح سڑکوں پر پیدل مارچ بھی۔ آپ لاکھوں کی تنخواہ بھی لے سکتے ہیں اور ٹرانسلیٹر عبد الرحیم کی طرح چند سو روپے پر رات دن قلم کی محنت اور مشقت کی راہ بھی اپنا سکتے ہیں. سید سلیم شہزاد اسلام آباد میں ایشیا ٹائمز آن لائن کے بیورو چیف تھے۔ اس پہلے وہ کراچی میں اسٹار میں رپورٹر تھے۔ انھیں خبروں سے عشق تھا۔ اور اسی عشق نے انھیں امتحان میں ڈال دیا۔ کرچی میں ان سے پریس کلب یا کسی اور جگہ ملاقات ہوتی تو ان کی مسکراہٹ اور زندہ دلی اور صحافت میں بے باکی سے سابقہ پڑتا۔ 29 مئی کو سلیم شہزاد اسلام آباد میں اپنے گھر سے ایک ٹیلی وژن چینل کو انٹرویو دیتے کے لیے نکلتے ہیں اور پھر لاپتہ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہیومن رائٹس واچ کے علی دایان حسن کو بتا دیا تھا کہ اگر وہ قتل ہو جائیں یا اگر وہ لاپتہ یا قتل ہو جائیں تو ذمہ داری کس پر ہوگی۔ سلیم شہزاد لاپتہ اور پھر قتل ہو گئے۔

جون میں صحافی برادری نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی اپیل پر اسلام آباد میں پارلیمان کے سامنے دھرنا دیا اور ان کا مطالبہ منظور ہوگیا کہ حکومت سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں سلیم شہزاد کے قتل پر تحقیقاتی کمیشن قائم کرے۔ 17 جون کو آئی ایس پی آر کے ترجمان کہتے ہیں کہ حقائق کو جاننے کے لیے سلیم شہزاد کے قتل کی مکمل اور گہری تحقیقات ہونی چاہیے۔ کل سے کمیشن نے باقاعدہ سماعت کا آغاز کردیا ہے حمزہ اور ایک اور صحافی فیضان اپنا بیان ریکارڈ کروا تو دیا ہے لیکن وہ شکایت کرتے ہیں کہ ان کو دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ اب تک نئے سال کے آغاز سے پانچ صحافی قتل ہو چکے ہیں ۔ اس سے پہلے جو قتل ہوئے ان کا حساب کتاب ہی نہیں ہے۔ صحافت بری ہے یا بھلی لیکن عوام کو خوب ریجھائے ہوئے ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کی رنگا رنگی اور چٹکلے سن کر لوگ خوش ہوجاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں فرق پڑے یا نہ پڑے ، لوڈ شیڈنگ ختم ہو یا نہ ہو۔ ڈاکے چوری، اور سینہ زوری سے موبائیل چھیننے کی واردات ہو یہ بھتہ خوری ، ہم سب اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں۔ صدقہ دینے کے لیے۔ کسی کے کہنے اور مانگنے سے پہلے موبائیل اور پرس نکال کر دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں یا شکر ہوا۔ آج تو بال بال بچ گئے۔ کٹی پہاڑی پر برستی گولیوں میں (جن میں اب تک 186 افرد قتل ہو چکے ہیں) پھنسے ہوئے ایک کیمرہ می نے پریس کلب میں اپنی بپتی سناتے ہوئے کہا کہ سناٹے اور اندھیرے میں گاڑی کھڑے کر

کے سر نیچے کرکے بیٹھا رہا۔ کئی گھنٹے بعد نجات ملی۔ بس جان بچ گئی۔ کراچی میں نیا نظام بھی آگیا بھائی لوگ رضامند ہوگئے ہیں۔ امریکہ سے اسماعیل کامریڈ نے پوچھا ہے اب تو کراچی میں خیریت ہے نا۔۔ سب امن ہوگیا ہے۔ گورنر صاحب آگئے ہیں۔" میں نے کہا ہے ہاں خیریت ہے، دس بارہ گھنٹے لوڈشیڈنگ ، کئی کئی گھنٹے ٹریفک جام، پانی کے لئے ترستے نلکے، بھتہ خوری، چوری، لوٹ مار، اغوا ٹارگٹ کلنگ اور ٹریفک ایکسیڈنٹ سے روز بچ جانے والے کراچی کے شہری مزے میں ہیں۔ جو مر جاتے ہیں کی قسمت کی خرابی اور جو بدقسمت ان کے خاندان والے رہ جاتے ہیں وہ اللہ کے سہارے پر زندہ ہیں۔

کراچی والے بہت خوش ہیں۔ اللہ ایسی خوشیاں سارے ایم این اے ، ایم اپی اے، صدر، وزیراعظم، وزیر مشیر اور پارٹی کارکنوں کو دے۔ آمین

شہر خموشاں

شہر کی سڑکوں پر تاریکی اور سناٹا تھا، کبھی کبھی کہیں سے فائرنگ کی آواز آتی، گھر سے فون آیا تھا، علاقے میں کشیدگی ہے، دکانیں بند ہوگئی ہیں اور فائرنگ ہورہی ہے۔ گاڑی چلاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، کس راہ کو اختیار کروں، شاہراہ فیصل لیکن جوہر موڑ سے بچ کر کیسے نکلا جائے۔ وہ علاقہ تو خطرناک ہے، پچھلی بار وہاں سے گزرا تھا۔ سڑک پر پتھروں کے ڈھیر تھے، جلتے ٹائروں سے دھواں پھیل رہا تھا۔ صدر میں لائنز ایریا کی سڑک پر ہو کا عالم تھا، کبھی کبھی کوئی گاڑی تیزی سے نکل جاتی، ہر ایک دوسرے سے سہا ہوا' جانے کب کہاں سے گولی آجائے۔ رینجرز اور پولیس تو دن کی روشنی میں بھی نہیں ہوتی، اب رات کی اس تاریکی میں کہاں نظر آئے گی۔ قیصر خان نے پوچھا کیا سبزی منڈی سے نکلا جاسکتا ہے؟ اور کہاں سے جائیں گے، یونیورسٹی روڈ پر جانے کا یہی ایک راستہ ہے۔ باقی ساتھی انتظار میں تھے کہ ایک ساتھ نکلا جائے۔ گلشن میں جانے کا ایک ہی راستہ بچا ہے،پل کے نیچے سے عزیز بھٹی پارک کا راستہ۔ جب سے یہاں دن دھاڑے میرے دونوں موبائل اور پرس چھنا ہے، یہاں سے گزرتے ہو ڈر لگتا ہے۔ رات کی تاریکی میں سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ گلیوں کے باہر لڑکے کھڑے ہیں۔ گلی کے لڑکے سارے اپنے ہیں۔ لیکن انہی اپنوں سے ڈر لگتا ہے۔ جانے پارٹی نے کیا

لائین دی ہو۔ شہر میں ایک دو قتل ہوں تو کوئی بات ہے، اب تو اعداد شمار کی جنگ ہے کل اتنے مرے تھے، آج اتنے مرے ہیں، کوئی شمار بھی نہیں ہے۔ پہلے محلے میں کتا، بھی مرجاتا تھا تو، اس پر افسوس ہوتا تھا، گلی کے کتوں تک کو سب پہچانتے تھے۔ اب کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتا، پڑوس میں رہنے والا یا محلے میں رہنے والا سب اجنبی ہیں۔ اجنبی اجنبی.... ان اجنبی جانے پہچانے افراد سے گزر کر میں گھر پہنچ گیا۔ ٹی وی کھولا تو مرنیوالوں کی تعداد ایک چینل پر 13، دوسرے پر 15، اور تیسرے پر 19 بتائی جارہی تھی۔ شہر کے سارے علاقے متاثر تھے، اب راکٹ بھی چلنے لگے ہیں۔ کراچی میں محکمہ داخلہ سندھ نے ڈبل سواری پر تا حکم ثانی پابندی عائد کر دی ہے۔ قاتلوں کو پکڑنے یا روکنے کے بجائے پولیس اور رینجرز کو ہدایت کی گئی ہے کہ پابندی پر عملدرآمد کو یقینی بنایا جائے۔ کراچی میں امن و امان کی خراب صورتحال میں ایک وجہ جگہ جگہ موٹر سائیکل سواروں کی فائرنگ بتائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ڈبل سواری پر بار بار پابندی لگتی ہے۔ موٹر سائیکل بندوق، پستول، راکٹ سے زیادہ خطرناک ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر گھر میں موجود ہے۔ جانے کیوں اس کی بناوٹ، خریداری، رکھنے پر پابندی کیوں نہیں لگائی جاتی۔ میرا دوست کہتا ہے یہ ٹرانسپورٹ مافیا ہے۔ روزانہ کروڑوں روپے کا بھتہ پولیس کو ملتا ہے۔ ڈبل سواری پر پابندی سے بسوں منی بس والوں کی چاندی ہوجاتی ہے۔ دروازوں، کھڑکیوں اور چھت پر بیٹھ کر سفر کرنے والے منہ مانگا کرایہ ادا کرتے ہیں۔

سب کو گھر جانے کی جلدی ہوتی ہے اور گھر سے نکلنے کی بھی.... صبح مرنیوالوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ میرے محلے کے دو نوجوان اور ان کا ملازم بھی اس گنتی کا حصہ ہے۔ دونوں بھائیوں کو ان کی مٹھائی کی دکان پر گولی ماردی گئی۔ جنازے کے لیے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ شہر میں ایسے بہت سے محلے اور گھر ہیں جہاں جنازوں کی تیاریاں ہیں۔ عجیب شہر اور عجیب لوگ ہیں، بھتہ بھی دیتے ہیں، گولیاں بھی کھاتے ہیں، اور ووٹ بھی دیتے ہیں۔ یہ تو اس بادشاہ کی رعایا بن گئے ہیں جسے کوڑے کھانے، ٹیکس دینے پر اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ بادشاہ کے حضور التجا کرتے ہیں کہ حضور کوڑے کھانے کے لیے لائین بہت بڑی ہے۔ ذرا کوڑا مارنے والے عمال کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ میری بھی یہی عرض ہے، جب مقدر تیرگی، بوری بند اور بے نام لاشیں ہی ہیں تو حضور مارنے والوں کی تعداد بڑھا دیجیے تاکہ دو کروڑ آبادی کا یہ شہر جلد شہر خموشاں میں بدل جائے۔

مندر سے اربوں روپے کی مالیت کے ہیرے اور جواہرات دریافت

بھارت کی جنوبی ریاست کیرلا میں سولہویں صدی کے ایک مندر کے تہ خانے سے اربوں روپے کی مالیت کے ہیرے اور جواہرات دریافت نے بھارت میں اس نئی بحث کو چھیڑ دیا ہے کہ دنیا بھر کی دولت ہوتے ہوئے بھی کسی ملک کے عوام کو بھوکا ننگا اور تعلیم اور دیگر سہولتوں سے دور رکھا جاسکتا ہے۔ اور کیا بھگوان کو دولت کی ضرورت ہے۔ جبکہ عوام اپنی ضرورتوں کے لئے محتاجگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پدمنا بھاسوامی نامی یہ مندر ریاست کے دارالحکومت تروانت پورم میں واقع ہے۔اور مندر کے چار تہ خانوں میں سے دو تقریباً ایک سو تیں.برس سے نہیں کھولے گئے تھے۔ مندر میں موجود نوادرات کی قیمت کے متعلق ابھی کچھ اندازہ نہیں ہے۔ اس مندر کو ٹریونکور کے راجاؤں نے سولہویں صدی میں تعمیر کروایا تھا اور مقامی کہانیوں میں اس طرح کی باتوں کا ذکر ہے کہ ان راجاؤں نے اپنی دولت مندر میں چھپانے کے لیے اس کی دیواروں میں قیمتی ہیرے جڑوائے تھے۔ راجاؤں نے بہت سی قیمتی اشیا تہ خانے میں رکھوائی تھیں اور شاید یہ نوادرات اس وقت سے وہاں موجود ہیں۔ مندر سے اب تک جتنا خزانہ ملا ہے اس کی مالیت ایک لاکھ کروڑ روپے کے قریب بتائی جارہی ہے لیکن فی الحال یہ تخمینے ہی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ خزانے کی اصل مالیت کا اندازہ لگانے میں مہینوں لگ جائیں گے

کیونکہ بڑی مقدار میں جو سونے کے سکے، زیورات اور مورتیاں ملی ہیں ان کی صحیح مالیت تاریخی اہمیت کے تناظر میں طے ہوگی۔ لیکن صرف وزن کے حساب سے بھی جو مالیت بتائی جارہی ہے، وہ اتنی زیادہ ہے کہ اس کی وسعت کو سمجھانے کے لیے طرح طرح کے موازنے کیے جارہے ہیں۔ یعنی اگر آپ ایک کے آگے بارہ مرتبہ صفر لکھیں تو ایک لاکھ کروڑ کی رقم بنتی ہے۔ یہ رقم اتنی ہے کہ کیرالہ کا پورا قرض ادا کرنے کے بعد بھی تقریباً پچیس ہزار کروڑ روپے بچ جائیں گے، یا اس سے پورے ملک میں فوڈ سیکیورٹی ایکٹ (تقریباً ستر ہزار کروڑ روپے) اور روزگار کی گارنٹی کی سکیم (چالیس ہزار کروڑ روپے) کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، یا ڈھائی سال کا تعلیم کا بجٹ فراہم کیا جاسکتا ہے، یا پھر سات مہینے کے دفاعی اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں۔۔۔ اور پھر بھی بات سمجھ میں نہ آئے تو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی کمپنی وپرو کے تمام حصص خریدے جاسکتے ہیں۔ بھارت جہاں عوام غربت اور مہنگائی، بے روزگاری کے عزاب تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہاں سوال کیا جارہا ہے کہ یہ دولت کس کام کی ہے۔ جنوبی بھارت کے جس مندر کے تہہ خانوں سے اربوں ڈالر کے ہیرے جواہرات برآمد ہو رہے ہیں، اس کا انتظام ٹریونکور ریاست کے سابق شاہی خاندان کے ہاتھوں میں ہے لیکن بتایا جاتا ہے کہ وہ مندر کی بے پناہ دولت سے کبھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ سپریم کورٹ کی ہدایت پر جیسے جیسے ماہرین مندر کے تہہ خانوں کے دروازے کھول رہے ہیں، بیش قیمت خزانے کے ساتھ ساتھ کچھ حیرت انگیز اور ناقابل یقین کہانیاں بھی

سامنے آ رہی ہیں۔ ممبئی کی یونیورسٹی میں قدیم ہندوستانی تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر کشور گیکوار کا کہنا ہے کہ "پرانے زمانے میں بادشاہ اکثر اپنی طاقت کے اظہار کے لئے مندروں میں وسیع دولت عطیہ دیتے تھے۔ تاکہ ان کی مذہبی طاقت کے ساتھ سیاسی طاقت میں اضافہ ہو اور بادشاہ کے طور پر دنیا میں دوسری جگہوں پر انھیں عوامی حمایت حاصل ہو۔ ماہرین کے مطابق اس مندر کا پہلا ذکر نویں صدی کی دستاویزات میں ملتا ہے لیکن باقاعدہ ریکارڈ چودھویں صدی سے ہی دستیاب ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں ٹریونکور کے راجا مارتھنڈ ورمانے پورا شاہی خزانہ مندر کے سپرد کردیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے بھگوان وشنو کے 'سیوک' (خادم) کے طور پر حکمرانی کی۔ تب سے ہی انہوں نے شاہی خاندان کے اس خزانے کی حفاظت کی ہے۔ یہ مندر کیرالہ کے دارالحکومت تھیرووانت پورم کے وسط میں قائم ہے۔ بھارت کی آزادی کے بعد ٹریونکور ریاست بھی وفاق ہند میں ضم ہو گئی تھی لیکن مندر کا انتظام شاہی خاندان کے ہاتھوں میں ہی رہا۔ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ مندر کے تہہ خانوں میں اتنا بڑا خزانہ پڑا ہوا ہے، کبھی بھی شاہی خاندان اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ دولت بھگوان وشنو کی امانت ہے۔

سابق شاہی خاندان آج بھی پدم نابھا سوامی یا بھگوان وشنو کا 'بھکت' ہے اور اخباری اطلاعات کے مطابق یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ مندر کے تہہ خانوں میں

اتنا بڑا خزانہ پڑا ہوا ہے، کبھی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ دولت بھگوان وشنو کی امانت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ پوجا کے بعد مندر سے نکلتے ہیں تو اپنے پیر جھاڑتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق یہ ایک علامتی روایت ہے جس سے ریاست کے سابق حکمراں یہ پیغام دیتے ہیں کہ ہیرے جواہرات تو دور وہ مندر کی دھول بھی اپنے ساتھ لیکر نہیں جائیں گے۔ ایک رپورٹ کے مطابق خاندان کے موجودہ سربراہ اتھرادوم تھیرونل مارتھنڈ ورما آج بھی اگر کسی دن مندر نہیں جا پاتے تو مندر میں ایک سو اکیاون روپے پچپن پیسے چڑھاتے ہیں۔ دوسرے شاہی خاندانوں کے برعکس مارتھنڈ خاندان نے شان و شوکت کے بجائے سادگی کو ترجیح دی ہے اور ان کا رجحان فنون لطیفہ اور ثقافت کی طرف زیادہ ہے۔ اسی خاندان کے راجاؤں نے بیسویں صدی میں سزائے موت پر پابندی لگا کر اور نام نہاد ’اچھوت‘ لوگوں کے مندر میں داخلے پر پابندی ختم کرکے انقلابی نظیریں قائم کی تھیں۔ بھارت کے قدیم مندروں میں بے پناہ دولت کے قصے نئے نہیں ہیں۔ سومنات کا مندر برصغیر کی تاریخ میں اپنی دولت اور شان و شوکت کے سبب مشہور رہا۔ جس پر محمود غزنوی نے سترہ حملے کئے تھے۔ اس سے پہلے تیروپتی کا مندر سب سے مالدار مانا جاتا تھا جس کے اثاثوں کی مالیت تقریباً چالیس ہزار کروڑ روپے بتائی جاتی ہے۔ ان مندروں میں نذرانے پیش کرنے والوں کے لیے آج بھی الگ الگ برتن رکھے جاتے ہیں، سونے کے لیے الگ، چاندی اور نقد کے لیے الگ۔ اس مندر کے چھٹے اور آخری تہہ خانے کے باہر

لوہے کا گیٹ ہے اور کسی کو نہیں معلوم کے اس کے اندر کیا ہے۔ اسے کھولنے کے لیے ماہرین کی مدد لی جائے گی۔ غیر تصدیق شدہ اطلاعات کے مطابق یہ بھی ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ اب اس خزانے کا کیا ہوگا؟ حتمی فیصلہ تو سپریم کورٹ کے ہاتھ میں ہے لیکن ریاست کے وزیر اعلیٰ اوومن چنڈی نے عندیہ دیا ہے کہ خزانہ کو چھیڑا نہیں جائے گا کیونکہ ان کے بقول یہ مندر کی ملکیت ہے اور حکومت کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کئی دیگر سیاسی پارٹیاں بھی یہی کہہ رہی ہیں لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خزانے کو فلاحی کاموں کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ جن تہہ خانوں میں سے یہ خزانہ مل رہا ہے، ان میں کئی تقریباً ڈیڑھ صدی سے کھولے نہیں گئے تھے۔ غیر تصدیق شدہ اطلاعات کے مطابق یہ بھی ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ خزانے کی تفصیلات سپریم کورٹ کے حکم پر یکجا کی جارہی ہیں اور کمیٹی آئندہ چند دنوں میں اپنی ابتدائی رپورٹ عدالت میں پیش کرے گی۔ عدالت نے مندر کے اثاثوں کی فہرست تیار کرنے کا حکم ایک مقامی وکیل کے اس پٹیشن پر دیا تھا کہ مندر میں سکیورٹی کا مناسب انتظام نہیں ہے اور یہ کہ اس کا انتظام حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہیے۔ ادھر کیرالہ ہائی کورٹ پہلے ہی یہ فیصلہ سنا چکا ہے کہ ریاستی حکومت کو مندر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہیے لیکن شاہی خاندان نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا تھا.

کیرل کے ایک مندر شری پدمنابسوامی مندر میں آج کل سپریم کورٹ کی جانب سے مقرر کمیٹی کے سات افراد مندر کے خزانے کی فہرست بنانے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلے اس مندر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری شراون کوٹ کے شاہی خاندان کی تھی۔ مندر کے 6 خفیہ کمروں پر ایک طرح کی نشانی لگائی گئی ہے۔۔ حال ہی میں ٹی پی سندر راجن نام کے ایک وکیل نے مندر کی بدانتظامی کو لیکر سپریم کورٹ میں ایک عرضی داخل کی تھی۔ اسی کے بعد عدالت نے ان سبھی کمروں کو کھولنے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے اے اور بی 1874 سے بند پڑے تھے۔ گذشتہ ہفتے سی ڈی اور ایک کمرے کو کھولا گیا تھا جس میں سے 1 ہزار کروڑ کی دولت ملی تھی۔ کیرل کا یہ مندر بھارت دیش کا سب سے امیر مندر کہا جاسکتا ہے۔ غیر سرکاری تجزیے کے مطابق اس مندر کے کمروں میں رکھے گئے سونے، ہیرے جواہرات وغیرہ کی تقریباً قیمت 1 لاکھ کروڑ روپے تک تجویز کی گئی ہے۔

A سپریم کورٹ کی ایک ٹیم نے شری پدمنابسوامی مندر کے تہہ خانے میں بنی تجوری سے Aتک اس طرح کی کل 6 تجوریاں ہیں۔ تجوری F سے A کھولی۔ مندر میں ہزاروں سال پرانے سکے، 2.5 کلو وزنی 9 فٹ لمبے نیکلس اور کان کی بالیوں کے سائز میں ایک ٹن سونا اور سونے کی چھڑیں اور ہیرے جواہرات سے بھرے بورے اور سونے کی زنجیریں، ہیرے جڑے زیور، تاج اور دوسری چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ اس خزانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے 17 کلو سونے کے سکے بھی ملے ہیں۔ اس کے

علاوہ نیپولین عہد کے 18 سکے، ریشم میں لپٹے قیمتی جواہرات سکوں اور زیوروں کی شکل میں 1 ہزار کلو سونے کا ایک چھوٹا ہاتھی ملا ہے۔ کچھ چیزوں پر 1722 سن لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ راجہ کارتک تروئل رائے ورما کے عہد کے ہیں۔ ان 6 کو 1882 کے بعد سے نہیں کھولا گیا۔ فی الحال صرف B اور A تجوریوں میں سے کی ہی اتنی موجودہ دولت کی قیمت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ابھی ان کی پختہ ویلیو A تجوری نہیں لگائی گئی ہے پھر بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مندر تروپتی بالاجی مندر کو پیچھے چھوڑ کر بھارت دیش کا امیر ترین مندر بن گیا ہے۔ انتظامیہ نے مندر کی سکیورٹی بڑھادی ہے۔ چاروں طرف سکیورٹی کیمرے اور الارم سیٹ لگا دئے گئے ہیں۔ کیرل کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کا کہنا ہے کہ مندر کی سکیورٹی کے لئے ایک کمانڈو فورس بنائی جائے گی۔ سپریم کورٹ کی طرف سے مبصر مقرر کئے گئے ہیں۔ کیرل ہائی کورٹ کے سابق جسٹس سی ایس راجن اور جسٹس ایس این کرشنا کا کہنا ہے کہ ہر سامان کی فہرست تیار کی جا رہی کا کھلنا ابھی باقی ہے۔ اسپریم Eاور B ہے۔ قیمت کا صحیح اندازہ لگانا کافی مشکل ہے۔ کمرہ کورٹ نے سات رکنی کمیٹی کو تروانت پورم میں واقع شری پدمنابھ سوامی مندر کے تہہ خانوں کو کھولنے پر پابندی لگادی ہے۔ جسٹس آر وی رونددرن اور جسٹس اے کے پٹنائک کی ڈویژن بنچ نے عرضی گذار شراون کوٹ کے راجہ رہے، راجہ مارتنڈ ورما اور کیرل حکومت سے کہا ہے کہ وہ قدیم مندر کے تقدس اور سکیورٹی کو یقینی بنانے کے مناسب تجاویز کے ساتھ عدالت آئیں۔ اور راجہ

مارتنڈ ورما کے وکیل نے جرح کے دوران کہا کہ مندر پبلک پراپرٹی ہے اور راج پریوار کے کسی بھی فرد نے بیشمار دولت یا پراپرٹی پر کسی کے حق کا دعوی نہیں کیا ہے اور اس کا کوئی بھی حصہ خاندان کے کسی فرد سے وابستہ نہیں ہے۔ پراپرٹی بھگوان پدمنابھ سوامی کی ہے۔ مندر کی پراپرٹی کے بارے میں مورخوں کا کہنا ہے کہ اس خزانے کی تاریخی اہمیت کو دیکھتے ہوئے تو اس کی قیمت لگانا مشکل ہوگا پھر بھی کہا جا رہا ہے کہ اس کی بازار مالیت 1 لاکھ کروڑ سے 10 گنا زیادہ ہوگی۔ پدمنابھ سوامی مندر شراون کوٹ شاہی فیملی نے بنوایا تھا۔ بھگوان وشنو کا یہ مندر کیرل کے قلعے کے اندر ہی بنا ہوا ہے۔ اس مندر کو 108 دویہ دشمے میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ دویہ دیشم یعنی وشنو جی کا گھر۔ یہاں بھگوان وشنو کی سوتی ہوئی مورتی ہے۔ شراون کوٹ کے راجہ اپنے آپ کو وشنو کا بھگت کو سیوک مانتے ہیں۔ مندر کے بننے کی کئی کہانیاں ہیں۔ اس میں سے ایک جو سب سے زیادہ مشہور ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دیواکر منی نے بھگوان کرشن کی تپسیا کی تھی اور انہیں درشن دینے کو کہا۔ بھگوان ایک شرارتی بچے کی شکل میں انہیں درشن دینے آئے اور پوجا کے لئے رکھے شیو لنک کو نگل گئے۔ منی نے غصے میں اس بچے کا پیچھا کیا لیکن وہ جاکر ایک بڑے پیڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ اچانک وہ پیڑ گر گیا اور بھگوان وشنو کی مورتی میں بدل گیا۔ منی سمجھ گئے کہ وہ بھگوان وشنو کا ہی اوتار تھا۔ منی نے بھگوان سے کہا یہ مورتی بہت لمبی ہے اسے تھوڑا چھوٹا کریں تاکہ میں اور دوسرے بھگت

ایک بار میں اس کے درشن کر سکیں۔ اتنا کہتے ہی وہ مورتی چھوٹی ہو گئی لیکن پھر بھی اس کا قد کافی بڑا رہا۔ آج بھی اس مورتی کو تین گیٹ والے مندر میں رکھا گیا ہے۔ اس کے دروازے سے وشنو جی کا سر دکھائی دیتا ہے۔ اسے شیو جی کی طرح پوجا جاتا ہے ،
دوسرے دروازے سے پیٹھ دکھائی دیتے ، جس کی نابھ میں کمل کا پھول نکل رہا ہے اسے برہما کا سوروپ کہتے ہیں اور تیسرے دروازے سے بھگوان وشنو کے پیر دکھائی دیتے ہیں ، جسے موکش کا دوار مانا جاتا ہے۔ کیرل کا یہ مندر کھجوراہوں کے مندروں جیسی فنکاریوں اور مورتی سے بھرا ہے۔ اسی وجہ سے تروانتت پورم کا نام ملا۔ تروانتت پورم یعنی بھگوان کا پوتر گھر۔ کیرل کے شری پدمنابھ سوامی مندر سے سونے کی اب تک کی سب سے بڑی برآمدگی ہوئی ہے۔ ایک لاکھ کروڑ سے زیادہ خزانے کی اس برآمدگی نے ایک بحث چھیڑ دی ہے کہ پوجا استھلوں پر ایشور کو کیا حقیقت میں گولڈ کی ضرورت ہے؟ لوگ پیلی چمکدار دھات کی پوجا کر رہے ہیں یا پھر اپنے بھگوان کی۔ اب یہ مندر ویٹیکن کے بعد دنیا کا سب سے امیر ترین مندر بن گیا ہے۔ پچھلے ہفتے سے اس بحث نے بھی زور پکڑا ہے کہ آخر یہ سونا کس کا ہے؟ بھگوان کا ہے یا پھر کیرل کے عوام کا۔
مندر ہندو مت کے پیروکاروں کے لئے عبادت کی جگہ ہے. زیادہ تر مندروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مندر وقف ہیں۔ اور کسی نہ کسی ہندو دیوتا کی

موجودگی بتوں یا مورتیوں یا، تصاویر سے آراستہ ہیں۔ مندر عام طور پر ایک بنیادی دیوتا، صدارت دیوتا، اور دیگر اہم دیوتا کے ساتھ منسلک ماتحت دیوتاوں کے نام سے موسوم ہیں۔ کچھ مندروں کئی دیوتاوں کے لئے اور کچھ کسی ایک کی عبادت کے لئے وقف ہیں. بہت سے مندروں اہم جغرافیائی پوائنٹس، جیسے ایک پہاڑی کے سب سے اوپر، یا کسی جھرنے کے قریب، گھپاؤ ں اور ندیوں میں واقع ہیں، کیونکہ کچھ پرانے لوگوں کا خیال ہے کہ دیوتاوں کی جنم استھانی پیڑوں کے قریب دریاؤں، جنگلوں اور گھپاؤ ں میں ہوئی ہے اس لئے انھیں کھیلنے کے پہاڑوں، اور اسپرنگس اور جنگل جیسی جگہ بھاتی ہیں۔ بھارت اور ایشیا میں یہ مندر دور دراز جگہوں اور مقامات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں شمالی بھارتی مندروں، جنوبی بھارتی مندروں،اڑیسہ اور پاکستان کے مختلیف حصوں میں، جنوبی ایشیا، مغربی بنگال اور بنگلہ دیش،انڈونیشیا میں اہم مندر موجود ہیں۔ مختلیف ریاستوں میں مندر کے کنٹرول، مندر کے انتظام اور خود مختاری کے لئے غیر سرکاری انتظام ہے۔

یہ مندر دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں، زبان کی بنیاد پر جانے جاتے ہیں۔ لفظ ہندی سمیت کئی زبانوں میں استعمال کیا جاتا ہے، اور 'گھر' کے mandiram مندر یا لئے ایک سنسکرت لفظ، مندرا، (نہتارت کی طرف سے ایک دیوتا کی) سے ماخوذ ہے.

، Punyakshetram ، Kshetralayam، مندروں مندر، دیوستانم

کے طور پر جانا جاتا ہے، اڑیسہ میں مندرا، کناڈا میں Punyakshetralayam یا
کے طور پر مالالم میں کشتری یا Mondrian اور بنگالی میں Devastanam
کے طور پر جانا جاتا ہے. عام طور پر ایک دیوتا کے گھر کا مطلب مندر ہی Jambalaya
لیا جاتا ہے لیکن اس اصطلاح کو ایک بادشاہ کے گھر کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔
ہندو مندروں کو عام طور پر تین اہم تعمیراتی شیلیوں میں تقسیم کیا گیا ہے. جن میں
جنوبی بھارت کی ڈراوڈ انداز، شمالی بھارت کے ناگرا اسٹائل، اور مخلوط ورثہ اسٹائل
شامل ہیں۔ دنیا میں سب سے قدیم مندروں کی تعمیر میں اینٹوں اور لکڑی کا استعمال کیا
گیا لیکن بعد میں پتھر ترجیحی مواد بن گیا. مندر کی تعمیر اور ان کی عبادت کا طریقہ قدیم
سنسکرت صحیفوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مندروں کے فن تعمیر، رسومات، طریق عبادت
میں کافی اختلافات ہیں۔ اور مندروں میں روایات بھی مختلیف ہیں. ہندومت میں
مندروں کی ایک طویل تاریخ ہے جو برہما کی مخلوق میں احترام اور پوجا کے ساتھ جڑا ہوا
ہے.اہم مندروں میں عبادت یا 'پوجا' کے لئے علامتی پرساد میں پھل، پھول، مٹھائی
اردو) نامی) dukan' لائی جاتی ہے۔ بھارت میں مندروں میں عام طور پر چھوٹے
اسٹورز بھی ہوتے جس میں عام طور پر کیلے کی پتیوں میں پرشاد دیا جاتا ہے۔ ہندو عام
طور پر جب مندر کے اندر داخل ہوتے ہیں تو دونوں ہاتھوں کو احترام کی علامت کے طور
پر ایک ساتھ جوڑ کر داخل ہوتے ہیں۔ مندر کو ہندومت میں کائنات کی جائے پیدائش،
یا دیوتاؤں اور لوگوں کے ملنے کی

جگہ، اور غیر معمولی دنیاؤں کے درمیان کی حد کی علامت مانا جاتا ہے مندر کے پروہت یا پجاری دیوتا کے پاؤں پر ان کے پرساد رکھتے ہیں۔ جو بعد میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ کئی جنوبی بھارتی مندروں میں، صرف پجاریوں کو داخل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ مندر کے انتظام کا عملہ عام طور پر پوجا کے لئے وقت کا اعلان منسر میں گھنٹے اور گھنٹیاں بجا کر کرتے ہیں۔. یہ ہندومت کی قدیم رسم ہے مختلیف مندروں میں پوجا کا وقت مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، کچھ مندروں میں آرتی ایک بار یا دن میں دو بار اتاری جاتی ہے۔ یہ پوجا کا مخصوص انداز ہے۔ جسے پروہت یا پجاری انجام دیتے ہیں۔ بعض مندروں میں، آرتی دن میں پانچ مرتبہ بھی انجام دی جاتی ہے۔ ہندو کلچر میں گانا، بھجن بکتی گانے یا موسیقی کو کہا جاتا ہے۔ بھجن، ڈھولک یا طبلا اور ہارمونیم کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ جبکہ داسیاں ناچ گانے کے ذریعہ دیوتاؤ ں کو خوش کرتی ہیں۔ فنکاروں کی طرف سے اپنے فن کا مظاہرہ رقص کے طور کیا جاتا ہے۔

زائرین ہندو مندروں میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اتار کر داخل ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مندروں کے باہر ایک جوتے کی دکان اس کام کے لئے مختص ہوتی ہے۔ یہ رواج خاص طور پر جنوبی بھارتی مندروں میں عام ہے۔ ہندو مذہب سکھاتا ہے کہ زندگی کے تمام فارم برہما کی طرف سے بنایا ہے اور بنی نوع انسان کو جانوروں سے اشتراک کی ضرورت ہے. اس لئے ہندو دھرم میں آوارہ کتوں، گایوں کو، بندر

اور مندروں میں پرندوں کی مختلف نسل دیکھنے کو ملنا عام بات ہے. شمالی بھارت کے ، مندروں کی رسومات کے برعکس پاکستان کے عام مندروں میں یہ رسومات بہت آسان ہیں. اس کے علاوہ شمالی بھارتی مندروں کو اکثر کم قدامت پسند اور بہت سے معاملات میں سب کو دیوتا کی سب سے اندرونی کمرہ میں داخل کرنے کے لئے اور دیوتا کو ذاتی طور پر عبادت کی اجازت ہوتی ہے. اس طرح کے معاملات میں ، دیوتا کو بہت قیمتی گہنی زیورات سے آراستہ کیا جاتاہے. مندر کا اندرونی دل کمرہ جہاں دیوتا (عام طور پر بت کی شکل میں) موجود ہے ، ہندو معاشرہ میں رسومات ، روایات تہوار ، ایک علاقے سے علاقے میں اکثر کافی مختلف ہوتی ہیں۔بھارتی ریاست مہاراشٹر میں نوبیاہتے جوڑے اپنی ازداجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے مندر پر حاضری دیتے ہیں مگر اس حاضری کے لیے شوہر اپنی بیوی کو گود میں اٹھا کر مندر کی 200 سڑھیاں چڑھتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ خوشیاں حاصل کرنے کے لیے یہ رسم ادا کرتے ہیں اور علاقے کے تقریباً تمام جوڑے یہ رسم خوشی خوشی ادا کرتے ہیں۔ اڑیسہ اور مغربی بھارت کی مشرقی ریاست میں مندروں کو بھی اس تفریق کا سامنا ہے. جنوب میں ، کیرل کے مندروں کی رسمیں دیگر تین ریاستوں کے مندروں سے بہت مختلف ہیں. دنیا بھر میں مشہور مندروں یعنی Lingaraj ،زگنناتھ پوری ، کوتارک میں پائے جاتے ہیں. Odisha بوونے شور ان مندروں کی قدیم عمارتیں 1200 سال پرانی ہیں. بوونے شور میں دس ہزار مندروں موجود ہے جو اڑیسہ میں مضبوط ہندوازم کی

نمائندگی کرتے ہیں۔ گوا کے مندروں کا فن تعمیر بہت منفرد ہے. گوا کے درماد کرن کے ایک حصے کے طور پر، پرتگالی گوا جزائر پر 1000 سے زائد مندروں کو منہدم. کیا گیا اور نئے امندروں کی تعمیر کی گئی۔ یہ مندر ہندو شاہی ریاستوں کی ریاست کے تحت علاقوں میں تعمیر کیے گئے تھے. اس طرح ان مندروں کی عمر 500 سال سے زیادہ نہیں ہیں، اور بعض اسلامی اور پرتگالی کی ارکیٹیکچرل اثرات کے ساتھ اصل مندر گوا .مندر شیلیوں کا منفرد امتزاج ہیں Hemadpanti کے فن تعمیر، ڈراوڈ، نگر اور تاہم آزادی کے بعد سے، انفرادی طور پر ہندو مندروں میں احترام کے ساتھ ان کے اپنے معاملات کے انتظام فرقوں کی خود مختاری میں شدید کمی آئی ہے. بھارت (اور جنوبی بھارت میں خاص طور پر تمام ریاستوں) میں کئی ریاستوں کے ریاستی حکومتوں کے آہستہ آہستہ تمام ہندو مندروں پر ان کے کنٹرول میں اضافہ ہوا ہے. گزشتہ دہائیوں کے دوران، خاص طور پر جنوبی ریاستوں میں مختلف قوانین کے خلاف بھارت اور پاکستان کی سپریم کورٹ میں کئی مقدمات لڑے گئے، اور حکمران جماعتوں کے سیاستدانوں کو مندر کے انتظام اور کام کاج کے ہر پہلو کو کنٹرول کرنے کی مزاحمت کی گئی۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

دہشتگردی کے خلاف جنگ میں امریکہ نے لاکھوں بےگناہ اور معصوم انسانوں کو قتل کیا۔ نائیں الیون کے بعد اب ساری دنیا کے سامنے یہ حقیقت آ چکی ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی ڈرامہ تھا۔ جس کا واحد مقصد امریکہ کی جانب سے افغانستان، عراق، ایران، پاکستان جیسے ممالک پر قبضہ کرنا اور مصر، لیبیا، مراکش، سوڈان، سعودی عرب، اردن، جیسے اسلامی ممالک میں اپنے پٹھو حکمران کو برسر اقتدار لانا تھا۔ امریکہ اپنی اس جارحیت میں اپنا کردار اب بھی ادا کر رہا ہے۔ اور بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔ امریکی فوجیوں نے درندگی اور وحشیانہ پن کی انتہاء کرتے ہوئے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر لاکھوں عورتوں، بچوں، بوڑھے اور نوجوانوں کا قتل عام کیا ہے۔ جس پر امریکہ کو انسانیت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ایک دن یوم حساب ہوگا۔ اور اس میں شامل ہر کردار کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ معصوم انسانوں کی ہلاکت کے بہت سے واقعات میں امریکیوں کے ملوث ہونے کے ثبوت مل چکے ہیں۔ جس کے بعد وہ ان واقعات کو انسانی غلطی، فرینڈلی فائر، غلط فہمی، جیسے الفاظ کا سہارا لے کر بنی نوع انسانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اس جنگ میں افغانستان اور عراق اور پاکستان میں بہت سے صحافی بھی ہلاک کیے گئے۔ جن کی تشدد زدہ لاشیں پھینک دی گئی۔ جن کے بارے میں آج تک نہ پتہ چل سکا کہ وہ کن حالات میں مارے

گئے۔ حال ہی میں افغانستان میں ہلاک ہونے والے پچیس سالہ بی بی سی کے نمائندے بھی امریکی دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ جس کے بارے میں افغانستان میں نیٹو کی کمان میں تعینات کثیر الملکی فوج ایساف نے اعتراف کیا ہے کہ اس سال جولائی میں بی بی سی کا نامہ نگار احمد امید خپل واک اس کی غلطی سے ہلاک ہو گئے تھے۔ایساف کے مطابق ایک امریکی فوجی نے پشتو بولنے والے اس صحافی کو صوبہ ارزگان کے قصبے ترین کوٹ میں خود کش حملہ آور سمجھ کر ہلاک کر دیا تھا۔امریکی فوج کی اس کاروائی میں انیس افراد ہلاک ہوئے تھے جن میں احمد امید خپل واک بھی شامل تھے۔ نیٹو نے ان کی ہلاکت کے بعد بی بی سی کے مطالبے پر ایک انکوائری شروع کی تھی۔ جس میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ خپل واک ایساف فوج کے حملے کے وقت غسل خانے میں چھپ گئے تھے۔انکوائری رپورٹ کے مطابق خپل واک کو جس وقت ہلاک کیا گیا اس وقت ان کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے امریکی فوجی خود کش دھماکے کرنے کا بٹن یا ٹریگر سمجھا۔بی بی سی گلوبل نیوز کے ڈائریکٹر پیٹر ہورکس نے ایک بیان میں احمد امید واک کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ صحافیوں کا ہر ممکن طریقے سے تحفظ ہونا چاہیے تاکہ دنیا ان کی خبریں سن سکیں۔ احمد امید خپل واک اس سال جولائی کے مہینے میں طالبان کے ایک حملے کے دوران ہلاک ہوگئے تھے۔ اس وقت یہ پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ وہ شدت پسندوں کی گولی سے ہلاک ہوئے۔خپل واک کی ہلاکت کے بعد متضاد اطلاعات سامنے آئی تھیں جس وجہ سے بی بی سی نے مطالبہ

کیا تھا کہ اس بات کی تحقیقات کی جائیں کہ احمد امید کن حالات میں مارے گئے۔ بی بی سی نے ایک بیان میں افغانستان میں نیٹو کی کمان کے تحت تعینات بین الاقوامی افواج سے کہا تھا کہ وہ احمد کی ہلاکت کی تحقیقات کرے اور اس کے نتائج بی بی سی اور احمد کے لواحقین کو بتائے۔ پچیس سالہ احمد امید اس وقت ہلاک ہوئے جب ارزگان صوبے کے قصبے ترین کوٹ میں ایک ٹی وی اور ریڈیو سٹیشن پر شدت پسندوں نے حملہ کیا۔ اس حملہ میں کئی دیگر افراد بھی ہلاک ہوئے۔ طالبان نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کی تھی تاہم ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے احمد امید کو ہلاک نہیں کیا۔ انہوں نے احمد کی ہلاکت کا الزام حکومتی افواج پر عائد کیا تھا جبکہ ایک مقامی خبر رساں ایجنسی کا کہنا تھا کہ احمد امید کو امریکی فوجیوں نے ہلاک کر دیا۔ احمد کے بھائی کا کہنا ہے کہ احمد نے انہیں دو ٹیکسٹ میسج بھیجے تھے۔ ایک میں لکھا تھا کہ 'میں چھپا ہوا ہوں، موت آچکی ہے' اور دوسرے میں لکھا تھا کہ 'اگر میں مر جاؤں تو میرے لیے دعا کرنا'۔ احمد سنہ دو ہزار آٹھ سے بی بی سی کے ساتھ وابستہ تھے۔

کیا موسیقی اور صوفی ازم سے پاکستانی معاشرے میں انقلاب آجائے گا؟

پاکستان میں شدت پسندوں کے حملوں، لوڈ شیڈنگ کے عذاب، ڈینگی کے خوں آشام حملے، پے در پے ہونیوالے حادثات نے جہاں آہوں اور سسکیوں کو جنم دیا ہے۔ وہاں لوگوں نے غم و مصائب سے صوفی ازم اور موسیقی کی چادر میں پناہ لی ہے۔ ملک کی اشرافیہ اب جگہ جگہ ایسی نجی محفلیں منعود کرتی ہے۔ جس میں موسیقی میں راہ نجات ڈھونڈی جاتی ہے۔ امراء جاتی کے آس پاس پھیلے ہوئے فارم ہاؤس میں یہ محفلیں تواتر سے ہوتی ہیں۔ موسیقی سے شغف کی یہ ایک غیر معمولی رسم ہے، جس کا محرک موسیقی ہے۔ یہ رسم نوجوان لیکن دولت مند پاکستانیوں نے چلائی ہے، جو دہشت گردی، انتہاپسندی اور سیاسی بحران کے نرغے میں لپٹے اپنے ملک پاکستان کو مثبت راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں پاکستانی موسیقاروں کی ترتیب دی ہوئی ایک میوزک البم نے بھی میوزک پسند کرنے والوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اپنی مقبولیت کے لحاظ سے یہ امریکہ اور برطانیہ میں پہلے نمبر پر جبکہ یورپ میں دس مقبول ترین البموں میں شامل ہے۔
اس البم میں جاز موسیقی کا مشہور ٹریک "ٹیک فائیو" بھی شامل ہے جسے اگرچہ اب تک انتیس مرتبہ ریکارڈ کیا جا چکا ہے لیکن پاکستانی موسیقاروں نے پہلی مرتبہ اس ٹریک کو مشرقی آلات موسیقی سے تیار کرکے بالکل ایک نئی چیز تخلیق کی ہے۔

پاکستانی لوک فنکار ریشماں، الن فقیر، پٹھانے خان، الغوزہ نواز مصری خان جمالی ایسے فنکار ہیں جنھوں نے لوک موسیقی کے ذریعہ لوگوں کو غم واندو سے نجات دلائی، ان کی آوازیں ہماری لوک موسیقی کا خزانہ ہیں۔ نصرت فتح علی اور راحت فتح علی خان نے اس میں نیا رچاؤ پیدا کیا ہے۔ سچل فوک البم کو بنانے میں موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھنے والی ایک متمول کاروباری شخصیت عزت مجید نے اساسی کردار ادا کیا ہے۔ یہ البم ساٹھ پاکستانی فنکاروں کی مدد سے تیار ہوا ہے۔ لاہور میں سچل اسٹوڈیو بھی صوفی شاعر سچل سرمست کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے ڈائریکٹر آپریشن مشتاق صوفی ہیں ان کا کہنا ہے کہ ملکی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ نصرت فتح علی خان کے بعد موسیقی کے کسی پاکستانی گروپ کو عالمی سطح پر اتنی پذیرائی ملی ہے اور یہ سب کچھ کسی سرکاری مدد کے بغیر ہوا ہے۔ ان کے مطابق انفرادی کوششیں اپنی جگہ لیکن موسیقی کی سرپرستی کیے بغیر اسے فروغ نہیں دیا جا سکتا۔ ان کے بقول جن حکومتوں کو صحت اور تعلیم پر بھی مناسب رقوم خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی ان سے آرٹ اور موسیقی کے فروغ کے لیے اقدامات کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

دیکھا جائے تو پاکستان میں فلمی صنعت اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، ایک زمانے میں پاکستان میں سالانہ سو سے زیادہ فلمیں بنا کرتی تھیں

لیکن پاکستانی فلم انڈسٹری کے زوال کی وجہ سے فلمی موسیقی بھی تقریبا ختم ہو کر رہ گئی۔ موسیقاروں نے اس راہ پر چلنا ہی چھوڑ دیا۔ کچل اسٹوڈیو نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان موسیقاروں کو اکٹھا کیا تھا۔ اب کچل جاز کی کامیابی سے ان فنکاروں کو پاکستانی موسیقی کے پرانے دور کی بحالی کی امید پیدا ہونے لگی ہے۔ پاکستان کو ایک جانب دہشت گردی کی کارروائیوں کا سامنا ہے۔ تو دوسری جانب ملک کا ثقافتی دارالحکومت لاہور موسیقی اور ثقافتی سرگرمی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ رائے ونڈ روڈ پر سابق وزیراعظم نواز شریف کی اسٹیٹ کے قریب فارم ہاؤسز میں متعدد لوگ ہر ہفتے کی رات رقص و موسیقی کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ اور ان کا کہنا ہے: "یہ ہے پاکستان، میرا پاکستان، بدلتا ہوا پاکستان، اب اور دھماکے نہیں، دہشت گردی کی اور کارروائیاں نہیں، ہمارا معاشرہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی موسیقی اور فن کے حوالے سے لوگ سوال کرتے ہیں۔ غزل گائیکی کے مستقبل کے بارے میں مشہور گلوکار جگجیت سنگھ فکر مند ہیں، "ان دنوں بہت کم غزل گلوکار بچے ہیں کیونکہ انہیں کوئی پلیٹ فارم نہیں مل رہا ہے۔ نئی نسل سیکھنا چاہتی ہے، لیکن اب یہ مقبول نہیں رہی، تو نوجوان اس کی تربیت بھی حاصل نہیں کر رہے، ایسی صورت حال میں آپ نئی نسل کو غزل گاتے اور سنتے ہوئے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔ غزل گائیکی کے بادشاہ جگجیت سنگھ کا کہنا ہے کہ بھارت میں غزل گانے والے ختم ہو رہے ہیں اور نئی نسل چاہتے ہوئے بھی غزل گانے سے قاصر ہے۔ ان

کے مطابق ری مکس کے زمانے میں کلاسیکی گائیکی دم توڑ رہی ہے۔ غزل گائیک جگجیت سنگھ ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکس میں مبتلا ہیں۔ انھیں لائف سپورٹ سسٹم پر رکھا گیا ہے۔ڈاکٹر ان کی نگہداشت کر رہے ہیں۔ گذشتہ جمعہ کو ان کے دماغ کی نس پھٹ جانے کی وجہ سے انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں دوبار ان کے دماغ کی سرجری کی گئی ہے۔ اس روز وہ پاکستانی غزل سنگر غلام علی کے ساتھ ایک پروگرام پیش کرنے والے تھے، لیکن اچانک ان کا بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا کہ دماغ کی نس پھٹ گئی اور انھیں فوراً اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اب تک ان کی غزلوں کے 40 سے زائد البم منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ انھیں بھارت سرکار کی جانب سے سال 2003ء میں 'پدم بھوشن' کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ انھیں 'شہنشاہِ غزل' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ بالی وڈ کی بیشمار فلموں میں انھوں نے اپنی آواز کا جادو جگایا ہے۔

پاکستان میں ضیاالحق کا دور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں پر بھاری پڑا تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے عزت مجید بھی پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمنسٹریٹو سائنسز کے استاد رہے ہیں۔ ضیاالحق دور میں انہیں ملک چھوڑنا پڑا، کچھ عرصہ سعودی عرب میں رہے پھر لندن جا بسے، مالیاتی امور میں مہارت رکھنے والے عزت مجید آج کل لندن میں اپنا کاروبار بھی کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے ماضی کے معروف فلم ساز اور ہدایت کار میاں مجید کے صاحبزادے

ہیں۔ عزت مجید نے عمدہ موسیقی کی تخلیق کے لیے غیر تجارتی بنیادوں پر لاہور میں موسیقی کا ایک "پرپز بلڈ" اسٹوڈیو بھی بنا رکھا ہے۔ سچل اسٹوڈیو کی تیاری میں انہیں ایک جرمن شہری اور برطانیہ کے معروف ساؤنڈ انجینئر کرسٹوف براخر کی رہنمائی بھی میسر رہی ہے۔ عزت مجید کا کہنا ہے کہ وہ مالی اور تکنیکی وسائل استعمال کرتے ہوئے جنوبی ایشیا کی موسیقی کو عالمی میعار کے مطابق تیار کر رہے ہیں۔ وہ کلاسیکی، نیم کلاسیکی، فوک اور جاز سمیت موسیقی کے کئی شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں وہ جاز کا ایک مزید اور برصغیر کی جدید نظموں کے حوالے سے ایک خصوصی البم پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عزت مجید کہتے ہیں کہ انہیں خوشی ہے کہ سچل جاز کی مقبولیت سے نہ صرف پاکستانی موسیقی کو عالمی سطح پر پذیرائی ملی ہے بلکہ اس سے پاکستانی موسیقاروں کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ بغیر کسی حکومتی تعاون سے موسیقی کی خدمت کرنے والے عزت مجید کو دکھ ہے کہ ان کے موسیقی کے، جس البم کی دنیا بھر میں دھوم مچی ہوئی ہے، ان کے اپنے وطن پاکستان میں لوگ اس بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ ان کے بقول، "پاکستان کا سافٹ امیج اجاگر کرنے والی ان کی اس شاندار کامیابی پر ابھی تک کسی حکمران شخصیت نے انھیں نہیں سراہا۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے سیلاب کی امدادی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے عزت مجید کو دعوت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابھی مجھ سے کسی نے اس سلسلے میں بھی رابطہ نہیں کیا۔" عزت کہتے ہیں کہ ان کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی

ذاتی کوششوں سے اجڑے ہوئے پاکستانی فنکاروں کو دنیا میں عزت اور شہرت مل رہی ہے۔دوسری جانب لندن کی منسٹری آف ساؤنڈ پاکستان میں موسیقی کے پروگراموں کا اہتمام کر رہی ہے۔ اس منسٹری کی جانب سے ایونٹوں کے بھٹے پر حال ہی میں منعقدہ ایک پروگرام کے ڈی جے فیصل بِگ کا کہنا ہے کہ یہاں ایسا لگتا ہے کہ جیسے پاکستان میں نہیں، بلکہ کہیں اور ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کم از کم یہ وہ پاکستان تو نہیں لگتا، جسے آپ ذرائع ابلاغ کے ذریعے جانتے ہیں۔اس کے منتظمین نے لندن کے معروف نائٹ کلب کو ایک رات کے پروگرام کے لیے ایک ڈی جے بھیجنے پر قائل کیا ہے۔ یہ پروگرام پاکستان میں سیاسی موضوعات پر اظہارِ خیال اور ذہنی دباؤ سے چھٹکارے کی وجہ بن رہا ہے۔ اپنے کزن عمیر کے ساتھ اس پروگرام میں شریک زوبیہ کہتی ہیں: "آپ دیکھیں گے، ایک دِن آئے گا، جب پورا پاکستان بدلے گا، ہم اپنے معاشرے کو بدلیں گے، ہم انقلاب لائیں گے اور ہم انتہاپسندی سے چھٹکارا پائیں گے۔

پاکستانی گلوکار راحت فتح علی خان موسیقی کے حوالے سے بھات پاکستان بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ راحت اور شریا گوشال کے نئے گانے " تیری میری ، میری تیری پریم کہانی۔۔۔" نے بھارت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی دھوم مچائی ہوئی ہے۔ سلمان خان کی سپرہٹ فلم "باڈی گارڈ" نے جہاں ڈیڑھ ارب روپے کا ریکارڈ بزنس کرکے تاریخ میں اپنا نام امر کر لیا ہے وہیں فلم کی کامیابی میں

اس گانے کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔کچھ لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔۔راحت فتح علی خان بھی انہی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہیں۔ راحت نے 2003ء میں بھارتی فلموں سے گیتوں کا سفر طے کرنا شروع کیا تو ایک کے بعد ایک ہٹ گانا گاتے چلے گئے اور آج یہ عالم ہے کہ ایک عام سا گانا بھی راحت کے سروں اور لے میں ڈھل کر خاص ہو جاتا ہے۔

راحت فتح علی خان کی کامیابی کی فہرست بہت لمبی ہے۔ گزشتہ سال انہوں نے فلم " دبنگ " کے لئے ایک گیت گایا تھا جس کے بول تھے " تیرے مست مست دو نین "۔ یہ گیت اس قدر مشہور ہوا کہ اس پر انہیں چار ایوارڈ ملے جن میں آئیفا ایوارڈ سرفہرست ہے۔اسی سال ان کا ایک اور گانا موسیقی کی دنیا میں ہلچل مچا گیا اور وہ تھا فلم ویر کا گانا " سریلی انکھیوں والے "ان دونوں گانوں نے راحت فتح علی کی شہرت کو گھر گھر پہنچا دیا۔ آج بھی یہی گانے ان کی پہلی پہچان بنے ہوئے ہیں۔ دو ہزار دس میں ہی شاہ رخ خان کی فلم " مائی نیم از خان " کے لئے راحت نے جو گانا گایا اس کا ٹائیٹل تھا " سجدہ "۔ یہ بات بتانا اضافی ہوگی کہ سجدہ نے بھی راحت کو اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں وہ مقام بخشا جس کی حسرت تو بے شمار لوگ کرتے ہیں مگر پاتا کوئی کوئی ہی ہے۔ سن 2010ء میں ہی فلم " عشقیہ "کا گانا "دل تو بچہ ہے جی "گا کر راحت نے ایک اور دھماکا کیا۔ یہ گیت سال کا سب سے زیادہ سنا جانے والا اور کامیاب ترین گیت ٹھہرایا گیا۔

اس گانے پر بھی انہیں بیسٹ پے بیک سنگر کا ایوارڈ ملا۔ "میں تینو سمجھاواں کی۔۔" بھی سن دوہزار دس کا کامیاب گانا تھا۔یہی نہیں بلکہ اسی سال انہوں نے جن فلموں میں کامیاب گیت گائے ان میں "تو بات پکی، لاہور، بدمعاش کمپنی، ورثہ، آئی ہیٹ لو اسٹوری، ملیں گے ملیں گے، ونس سپون آ ٹائم، تم جو آئے، انجانہ انجانی، آکروش، ناک آؤٹ "اور" وی آر فیملی" شامل ہیں۔علاوہ ازیں سن دوہزار دس اور گیارہ سے پہلے راحت کے جو گانے نہایت مشہور ہوئے ان میں " لگن لاگی، جیادھڑک دھڑک، جگ سونا سونا لاگے، او رے پیا، تیری اور، آس پاس خدا" شامل ہیں۔ مجموعی طور پر راحت فتح علی کے کامیاب اور مشہور گانوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان کامیابیوں کے علاوہ راحت فتح علی خان بیرون ممالک ایک پروگرام کا معاوضہ ایک لاکھ امریکی ڈالر لینے والے پہلے پاکستانی گلوکار بھی بن گئے ہیں۔ مقامی اخبار کی ایک رپورٹ کے مطابق بالی ووڈ میں ریلیز ہونے والی فلموں میں راحت فتح علی خان کے گیتوں کی زبردست کامیابی کے بعد انہوں نے اپنا معاوضہ بڑھادیا ہے جس کے بعد وہ پہلے پاکستانی گلوکار بن چکے ہیں جنہیں امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ سمیت دیگر ممالک میں پرفارم کرنے کے فی شو ایک لاکھ امریکی ڈالر ادا کئے جارہے ہیں جبکہ وہ پاکستان میں ایک شو میں پرفارم کرنے کا معاوضہ بیس سے پچیس لاکھ روپے وصول کرتے رہے ہیں۔

موسیقی سے محبت رکھنے والے کہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت میں باصلاحیت

گلوکاروں کی کمی نہیں ہے لیکن چمک دھمک کے اس دور میں اصل گلوکار کا آگے آنا مشکل ہے۔اگرچینل والے فطری صلاحیتوں کی واقعی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں شرکاء کو شو ختم ہونے کے بعد بھی تربیت دینا چاہیے۔ موسیقی ایک وسیع موضوع ہے۔ اس کی اپنی ریاضی اور گرائمر ہے۔ جب تک کسی کو یہ سب پتہ نہیں ہوتا، وہ ایک اچھا گلوکار نہیں بن سکتا۔ اس باب میں 15 بیس سال تک موسیقی سیکھنے کے بعد ہی کسی کو غزل گائیکی کا فن حاصل ہو سکتا ہے۔" جگجیت سنگھ اور پاکستانی غزل گلوکار غلام علی گہرے دوست ہیں۔ دونوں اکثر مل کر پروگرام کرتے ہیں۔ غلام علی کو بھارت میں مقبولیت حاصل ہے۔ دونوں پرانے دن یاد کرتے ہیں۔پاکستان کے ثقافتی دارالحکومت لاہور میں دہشت گردی سے الگ کر ایک تین روزہ بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی۔ جس میں ادب، موسیقی، ڈرامے اور مصوری سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی بڑی تعداد شریک ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد بھی پاکستان کے سافٹ امیج کو بلند کرنا تھا۔ اس کانفرنس کی مختلف نشستوں میں اردو شاعری کے کلاسیکی دریچے، پاکستانی مصوری میں نئی جہتیں، پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کی تاریخ، اردو ناول کے سو سال، پاکستان میں غزل گائیکی کا مستقبل، ڈرامہ نگاری کا عروج و زوال، اردو افسانے کے سو برس، پاکستان میں لوک موسیقی کی روایت اور آرٹ کی ترقی میں ریاست کا کردار جیسے اہم اور متنوع موضوعات پر مقالات پیش ہوئے۔ فنون لطیفہ کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دینے

والے ماہرین کو 'الحمرا حاصل عمرایوارڈ' بھی دیے گئے۔ موسیقی کے شعبے میں یہ ایوارڈ استاد غلام حسن شگن، مصوری میں پرفیسر خالد اقبال، ادب میں معروف ناول اداس نسلیں کے مصنف عبداللہ حسین اور ڈرامے کے میدان میں اداکار قوی خان کو دیا گیا تھا۔ پاکستان میں فن کی قدر افزائی بہت نمایاں نہیں ہے،اسی لئے فنکار حکومت سے التجا کرتے ہیں کہ وہ جس کسی فنکار کو بھی ایوارڈ دینا چاہتی ہے، اسے اس فنکار کی زندگی میں ہی دے دیا جائے۔ ان کے بقول بعد از مرگ ستائش کا کسی فنکار کو کیا فائدہ؟

معروف صحافی محمود شام اس بارے میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ادب موسیقی انسانی زندگی کو خوبصورت بناتا ہے اور شاعری انسانی دماغ کو تر وتازہ کرتی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ معروف ملٹی نیشنل کمپنی مارکس اینڈ سپنسر نے ایک شاعر کی ریزیڈنٹ پوئیٹ کے طور پر تقرری کی ہے۔ یہ شاعر ہر ہفتے کمپنی کے ملازمین کو اپنا کلام سنا کر ان کی ذہنی اور فکری تازگی کا سبب بنتا ہے، جس سے ملازمین کی ذہنی صلاحیتیں جلا پاتی ہیں اور ان کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ دیکھنا ہی ہے کہ موسیقی اور صوفی ازم کی اس دوڑ میں پاکستان کے اس کردار کو مغرب میں سراہا جاتا ہے یا نہیں۔ اور آئیندہ اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

کراچی میں سی این جی اسٹیشن کی بندش سے شہر میں سناٹا

کیا یہ کراچی کی تباہی کی نئی سازش ہے

کراچی میں سی این جی اسٹیشن کی بندش سے شہر میں سناٹا ہے۔ سڑکوں سے ٹرانسپورٹ غائب ہے اور شہری پریشان ہیں۔ کراچی میں 60 فیصد سے زائد پبلک ٹرانسپورٹ سی این جی پر منتقل ہونے اور سی این جی اسٹیشن بند ہونے سے شہر قائد کی سڑکیں ہڑتال کا منظر پیش کرنے لگی ہیں، سوئی سدرن گیس کمپنی کی جانب سے سی این جی گیس کی دو دن کی بندش اور رات گیارہ بجے سے سندھ بھر میں سی این جی اسٹیشن بند کرنے کی ہدایت کے بعد گیس نہ ملنے کی وجہ سے منگل کی شام ہی سے سی این جی اسٹیشن بند ہونا شروع ہوگئے تھے۔ سی این جی اسٹیشن پر لمبی لمبی قطاریں لگی تھیں۔

پاکستان میں ایک کے بعد ایک بحران نے عوام کو جان بلب کر رکھا ہے۔ آٹا، چاول چینی، دالیں، گھی، تیل، ٹماٹر، پیاز، پانی، بجلی، سیمنٹ، ریلوے، کا بحران یہ قوم دیکھ چکی ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مصیبت ان کی راہ دیکھ رہی ہے۔ حکومت کے پاس کوئی روڈ میپ ہے نہ مستقبل کا کوئی لائحہ عمل نتیجہ

ایک بے یقینی کی کیفیت ہے جو ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ توانائی کے بحران نے پاکستان میں سی این جی کی راہ دکھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے گیس کی قیمتوں میں کئی سو گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ دنیا میں ٹرانسپورٹ میں پاکستان قدرتی گیس استعمال کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کی سی این جی کی گاڑیوں کی تعداد ستائیس لاکھ ہے۔ دوسرے نمبر پر ایران ہے جہاں سی این جی گاڑیوں کی تعداد انیس لاکھ پچاس ہزار، بھارت میں یہ تعداد گیارہ لاکھ ہے۔اس وقت پاکستان سی این جی انڈسٹری میں پہلے نمبر پر ہے 90 بلین روپے کی پرائیویٹ سیکٹر نے سرمایہ کاری کی ہے اور دنیا بھر میں سی این جی کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے۔ اس وقت 27 لاکھ گاڑیاں سی این جی پر ہیں اور سی این جی انڈسٹری 28 فیصد ٹیکس ادا کررہی ہیں۔ اس انڈسٹری میں حکومت کی طرف سے کوئی سرمایہ کاری نہیں کی گئی، سی این جی مڈل کلاس کا ایندھن ہے جو کہ کسی بھی ملک کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اس کے علاوہ سی این جی ماحول پر نہایت مثبت اثرات مرتب کررہا ہے کیونکہ یہ 85 فیصد کم زہریلی گیس اخراج کرتی ہے زیرو لیڈ اور زیرو ذراتی مادہ اخراج کرتا ہے اس وقت سی این جی پر چلنے والی 27 ملین گاڑیاں جن میں سوزوکی اور ٹیوٹا وین شامل ہیں اگر پیٹرول اور ڈیزل پر چل رہی ہوتیں تو بڑے شہروں کی ہوا سانس لینے کے قابل نہ رہتی۔ سی این جی انڈسٹری اب تک 90 بلین کی انویسٹمنٹ کرچکی ہے۔ سی این جی 6.12 بلین لیٹر پیٹرول کا متبادل بن چکی ہے اوراس سے اربوں ڈالر کی بچت ہورہی ہے سی این جی کے کاروباری حلقوں

نے حکومت کے دیئے گئے اہداف کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا ہے۔ شہریوں کا کہنا ہے کہ پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں مسلسل اضافے کے بعد پبلک ٹرانسپورٹروں نے اپنی گاڑیوں کو سی این جی پر منتقل کر لیا ہے اور سی این جی کی بندش ان کے سفری معاملات کو بری طرح متاثر کر دیتی ہے پبلک ٹرانسپورٹ سڑکوں سے غائب ہو جاتی ہے اور بہت کم گاڑیاں سڑکوں پر ہونے کی وجہ سے مسائل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ شہریوں کا کہنا تھا کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں سی این جی اسٹیشن کو بندش سے مستثنیٰ قرار دیا جائے ورنہ سی این جی اسٹیشن کی بندش کراچی کو تباہ کر سکتی ہے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ کے حکومتی فیصلے کے بعد کراچی سمیت سندھ بھر میں سی این جی اسٹیشن کی بندش کی وجہ سے تمام فلاحی اداروں کی ایمبولینس سروس بھی متاثر ہوئی ہیں۔ صرف کراچی میں ایدھی اور چھیپا ویلفیئر کی 60 سے زائد ایمبولینسیں سی این جی نہ ہونے کے باعث کھڑی ہو گئیں سول ہسپتال، جناح ہسپتال اور عباسی شہید ہسپتال میں مریضوں کو شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ چھیپا ویلفیئر کے ترجمان کے مطابق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متعدد ایمبولینسوں میں سی این جی ختم ہو رہی ہے جس کے بعد مختلف ہسپتال میں مریضوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کراچی میں گذشتہ سال مئی میں پہلی بار بجلی کی پیداوار میں اضافے کے لیے حکومتی فیصلے کے تحت سندھ اور بلوچستان کے سی این جی اسٹیشنز 24 گھنٹے کیلئے بند کئے گئے تھے۔ اس سے قبل حکومت کی توانائی بچت پالیسی کے تحت صوبہ پنجاب اور خیبر

پختون خواہ اور بلوچستان میں سی این جی بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ حکومت کا کہنا ہے کہ سی این جی اسٹیشنز کو ایک روز بند رکھنے سے بچائی گئی گیس بجلی کے منصوبوں کو فراہم کی جارہی ہے جس سے بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ لیکن عوام کو ان وعدوں پر کوئی اعتبار نہیں ہے۔

کراچی میں گیس اسٹیشنز کی بندش سے سب سے زیادہ متاثر سی این جی رکشہ ڈرائیورز ہوئے ہیں جن کا کہنا ہے کہ گیس سلنڈر چھوٹا ہونے کے باعث ان کو اپنے رکشے بند کرنا پڑتے ہیں جس سے ان کا روزگار متاثر ہو رہا ہے۔ کراچی میں منگل کی سہ پہر سے ہی سی این جی اسٹیشنوں پر گاڑیوں کی طویل قطاریں لگنا شروع ہو گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے شہر کے بیشتر سی این جی اسٹیشن گیس کا پریشر کم یا ختم ہونے کی وجہ سے گیارہ بجے سے پہلے ہی بند ہو گئے۔ کراچی میں محکمہ داخلہ سندھ نے پہلے ہی موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی عائد کر رکھی ہے ایسے میں سی این جی کی بندش نے شہریوں کو بری طرح متاثر کیا ہے ، بسیں نہ ملنے کے باعث دفاتر پہنچنے میں دشواری کا سامنا ہے وہاں بچوں کے اسکول وین ڈرائیوروں نے بھی چھٹی کر لی ہے۔ بچے ٹرانسپورٹ کے نہ ہونے سے گھروں کو دیر سے پہنچے۔

اس مسئلے پر کنزیومر ایسوسی ایشن آف پاکستان کے چیئرمین کوکب اقبال

کا کہنا ہے کہ سی این جی کی ہفتہ وار بندش سے توانائی کے بحران پہ قابو پانے میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ بجلی کے بحران کی وجہ سے لوگ معاشی بد حالی کا شکار ہو گئے ہیں، آٹے کی قیمت میں کمی کے باوجود نان بائی 7 سے 8 روپے کی روٹی فروخت کر رہے ہیں۔ بجلی کے بحران کی وجہ سے پورے ملک میں معاشی بحران شروع ہو چکا ہے سفید پوش طبقہ اپنی جمع پونجی کھا رہا ہے۔ ہر کاروباری ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہو ں سے دیکھ رہا ہے کہ آئندہ آنے والا وقت کیسے گزرے گا، مارکیٹوں سے گاہک غائب ہیں۔

گذشتہ سال جون میں وفاقی وزیر برائے ماحولیات حمید اللہ جان آفریدی نے کراچی والوں کو نوید سنائی تھی کہ اگلے چند ماہ تک آٹھ ہزار سی این جی بسیں پاکستان آ رہی ہیں جن میں سے چار ہزار کراچی میں چلائی جائیں گی۔ انہوں نے آج کراچی میں کوریا اور پاکستان کے اشتراک سے متبادل توانائی کے حوالے سے کی جانے والی سرمایہ کاری سے متعلق سیمینار سے خطاب میں کہی تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ دنیا بھر میں گلوبل وارمنگ کے پھیلاؤ کے خلاف اقدامات کئے جا رہے ہیں اور وفاقی محکمہ ماحولیات بھی پاکستان میں صاف شفاف ماحول اور اس حوالے سے متبادل ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے متحرک ہے۔ ابھی سال بھی پورا نہی ہوا ہے کہ حکومت نے اس بارے میں یوٹرن لے لیا ہے۔ ملک یں سی این جی اسٹیشنز کی ہفتہ وار تعطیل کا فیصلہ وفاقی حکومت نے بجلی کی پیداوار میں

اضافے کیلئے کیا تھا تاہم اس فیصلے سے بجلی کی صورتحال زیادہ بہتر نہ ہو سکی تاہم عوام اور
سی ای جی اسٹیشنز کے مالکان کو ضرور پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔
کراچی ٹرانسپورٹ اتحاد کے صدر ارشاد بخاری کا کہنا ہے کہ سڑک پر ڈیزل سے چلنے
والی گاڑیوں کے علاوہ صرف وہی گاڑیاں چل رہی ہیں جو منگل کی رات سی این جی بھر
واچکی ہیں لیکن دوپہر کے بعد سے لے کر جمع کی صبح تک یہ گاڑیاں بھی غائب ہو جائیں
گی۔" کاروبار تو متاثر ہو ہی رہا ہے لیکن معیشت اور عوام کو اس بندش سے کیا نقصان
ہوگا شاید حکومت کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔ نیشنل فورم فار انوائرمنٹ نے بھی گیس لوڈ
مینجمنٹ پلان کے تحت سی این جی اسٹیشنز بند کرنے پر انتہائی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اور
کہا ہے کہ اس فیصلے سے فضائی آلودگی میں اضافہ ہوگا اور ماحول کیلئے کی جانے والی
کوششوں پر فرق پڑے گا فورم کے صدر محمد نعیم قریشی کا کہنا ہے کہ ملک میں چلنے والی
لاکھ گاڑیوں میں سے 25 لاکھ گاڑیاں سی این جی پر منتقل ہوئی ہیں اور اس سے گذشتہ 50
دس سال میں فضائی آلودگی میں 30 فیصد کمی واقع ہوئی ہے جو نہ صرف ملک و معیشت
بلکہ انسانی زندگی کیلئے بہتر ہے اور ملک میں سالانہ 30 ہزار افراد فضائی آلودگی سے
ہلاک ہو جاتے ہیں، نعیم قریشی کا کہنا ہے کہ پاکستان نے فضائی آلودگی میں خاتمے کیلئے
میں کیوٹو پروٹوکول پر دستخط کیئے 1995

ہیں جس کے تحت وہ فضائی آلودگی میں کمی کیلئے اقدامات کرے گا انہوں نے کہا کہ اس فیصلے سے سی این جی کی صنعت اور سرمایہ کاری پر منفی اثر پڑے گا اور دوسری طرف پٹرول کی درآمد پر لاکھوں ڈالر کا زرمبادلہ بھی خرچ ہوگا۔ انھوں نے تجویز دی کہ شمسی توانائی سے چلنے والے گیزرز کی حوصلہ افزائی کی جائے، ایل پی جی آٹو گیس اسٹیشنز جلد از جلد شروع کیئے جائیں اور پبلک ٹرانسپورٹ کو سی این جی پر منتقل کرنے کے عمل کو تیز کیا جائے نیشنل فورم نے عوام سے بھی اپیل کی کہ وہ گیزر، ہیٹر اور چولہوں کو مناسب وقفے سے استعمال کریں اور گیس کو بچانے کیلئے ہر ممکن قدم اٹھائیں۔ کراچی ٹرانسپورٹ اتحاد کے مطابق شہر میں چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ کی تعداد کل 18 ہزار ہے جن میں سے تقریباً 16 ہزار سی این جی میں تبدیل کی جاچکی ہیں۔ ارشاد بخاری کا کہنا ہے کہ پاکستان میں پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں مسلسل اضافے سے بیشتر گاڑیوں کی سی این جی میں تبدیلی کے رجحان کو دیکھتے ہوئے پبلک ٹرانسپورٹ مالکان نے بھی اپنی گاڑیاں ڈیزل سے سی این جی میں تبدیل کرلیں لیکن شاید انھیں اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقتوں میں انھیں اس کا کیا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ سی این جی ڈیلرز ایسو سی ایشن سندھ کے صدر عبدالسمیع خان کا کہنا ہے کہ سندھ میں 450 سی این جی اسٹیشنز ہیں جب کہ ستر فیصد گاڑیاں سی این جی پر چل رہی ہیں جو منگل کو گیس کی بندش سے متاثر ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک میں گیس کی قلت ہے لیکن حکومت کو گھریلو

صارفین کے بعد ہمیں ترجیح دینی چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی ترقی کے لیے کراچی کی اقتصادی سرگرمیوں کا جاری رہنا بہت اہم ہے۔ "ہم سے مشاورت کیے بغیر یہ فیصلے کردیئے جاتے ہیں۔ اگر حکومت تین چار سال پہلے سی این جی سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان کردیتی کہ کتنی گاڑیاں سی این جی پر ہونی چاہئیں تو آج یہ حال نہ ہوتا۔"

پاکستان میں سردی کی شدت میں اضافے کے ساتھ گیس کی قلت بھی بڑھ جاتی ہے۔ حکومتِ پاکستان نے موسمِ سرما میں قدرتی گیس کی طلب و رسد میں عدم توازن کی وجہ سے اس بحران پر قابو پانے کے لیے گیس لوڈ مینجمنٹ منصوبے کا اعلان کیا تھا تاہم گھریلو صارفین کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔

گھریلو صارفین گیس کی بندش سے پریشان وزارت پیٹرولیم نے موسم سرما میں گیس کی لوڈ مینجمنٹ کا جو منصوبہ ترتیب دیا تھا اس کے تحت گھریلو صارفین ترجیحی بنیادوں پر گیس فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔

امیر جماعت اسلامی کراچی محمد حسین محنتی نے ہفتے میں دو دن سی این جی اسٹیشنز کی بندش کے فیصلے کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان وسائل سے مالا مال ملک ہے مگر حکمرانوں کی کرپشن، نااہلی اور بدانتظامی کے باعث عوام کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سی این جی بندش سے

ٹرانسپورٹ بری طرح متاثر ہوگی جس سے ہزاروں محنت کش اور عوام بری طرح متاثر ہوں گے۔ حکومت اپنی نااہلی کا سارا بوجھ عوام پر منتقل کر رہی ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سی این جی بندش کا عوام دشمن فیصلہ فی الفور واپس لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ میں گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں جو صوبے کی ضروریات کے لئے کافی ہیں، آئین کے تحت صوبے کے وسائل پر پہلا حق صوبے کا ہے، گیس کی لوڈشیڈنگ کا کوئی تک نہیں بنتا مگر حکمران اپنی نااہلی چھپانے کے لئے سندھ کے عوام کو اس حق سے محروم کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سی این جی بندش سے ہزاروں منی
بسیں، کوچز، رکشہ، ٹیکسی اور دیگر گاڑیاں بند ہوجائیں گی جس سے شہر پبلک ٹرانسپورٹ کی ہڑتال کا منظر پیش کرے گا اور اس کا سارا اثر پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر کرنے والے متوسط اور غریب عوام پر پڑے گا۔ ڈیزل کی قیمتوں میں آئے روز ہوشربا اضافے کی وجہ سے گاڑی مالکان نے مجبوراً ہزاروں روپے خرچ کرکے گاڑیوں کو سی این جی پر منتقل کرایا مگر سی این جی بندش کے ظالمانہ فیصلے سے ان کی معاشی صورتحال مزید ابتر ہوگی، رکشہ، ٹیکسی اور لوڈنگ سوزوکی چلانے والے ہزاروں محنت کش اس سے براہ راست متاثر ہوں گے اور ان کے گھروں کے چولہے بجھ جائیں گے۔
سی این جی مارکیٹ کے حلقوں کا کہنا ہے کہ اس صورتحال سے خاص طور پر وہ لوگ سب سے زیادہ متاثر ہوں گے جو حال ہی میں اس کاروبار سے وابستہ ہوئے ہیں اور

ان میں وہ جن کے پاس صرف سی این جی اسٹیشن ہیں۔ انہوں نے کروڑوں روپے کے قرضے لے کر سرمایہ کاری کی ہے جبکہ سی این جی اسٹیشنوں کی بندش سے ہزاروں کی تعداد میں لوگٹ بھی بے روزگار ہوں گے۔

سردیوں میں گیس کا بحران گزشتہ کئی سالوں سے چل رہا ہے لیکن اس مرتبہ سی این جی کو دانستہ طور پر نشانہ بنایا جارہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سی این جی ایسوسی ایشن نے حکومت سے رابطہ کیا لیکن حکومت نے مذاکرات کرنے سے انکار کردیا ہے' عوام کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے اور ہم حکومت کے ساتھ اس سلسلے میں مذاکرات کے ذریعے اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ دوسری جانب زرعی معیشت کے طفیل پاکستان آج تک "دوستوں" اور دشمنوں دونوں کی ریشہ دوانیوں کا کامیابی سے مقابلہ کرتا چلاآ رہا ہے اور امریکہ و بھارت کی دیرینہ خواہش کے علاوہ ہمارے عوام دوست حکمرانوں کی کدو کاوش کے باوجود معاشی دیوالیہ پن سے بچتا چلاآ رہا ہے لیکن بجلی مہنگی اور نایاب، ڈیزل سونے کے بھاؤ اور پانی کی فراہمی میں مسلسل کمی کے باوجود کسانوں اور کاشتکاروں نے مختلف اجناس گندم، چنا، چاول، گنا وغیرہ کی پیداوار میں ریکارڈ اضافے کا کارنامہ انجام دیا اور عام آدمی خود انحصاری پر زور دینے لگا جو ہمارے پالیسی سازوں اور حکمرانوں کو پسند نہیں آیا اور اس نے گیس کی کمی کا بہانہ بنا کر سی این جی سٹیشنوں کو ہفتے میں دو تین روز بندش کا اہتمام کیا تاکہ جو ٹرانسپورٹ

سی این جی استعمال کر رہی ہے وہ سڑکوں کارخ نہ کرے۔حالانکہ جب لوگوں کو گیس کے استعمال کی ترغیب دی جارہی تھی تواس وقت سوچنا ضروری تھا کہ قیمتی گیس کے ذخائر کتنا عرصہ چلیں گے؟ بجلی کی لوڈشیڈنگ کا فیصلہ کرتے وقت بھی یہ اہتمام نہیں کیاگیا کہ اس قومی بحران میں ہر طبقے کے لوگ اپنا حصہ ڈالیں اور جنریٹرز کے گھریلو و کمرشل استعمال کو کسی قاعدے قانون کا پابند کیا جائے تاکہ قیمتی زرمبادلہ تیل کی درآمد پر ضائع نہ ہو اورگیس سے چلنے والے جنریٹر کی روک تھام ضروری ہے تاکہ قیمتی گیس سے گھریلو صارفین کے علاوہ انڈسٹری کی ضروریات پوری کی جائیں۔ایل این جی گیس کی درآمد کا فیصلہ ہوا تو لائسنس شفاف انداز میں جاری کرنے کی بجائے من پسند افراد کو الاٹ ہوئے اور اتنابڑا قومی سکینڈل وجود میں آیا جس کی وجہ سے ایل این جی کی درآمد کا معاملہ معرض التوا میں پڑاہے۔تازہ شاہکار یہ ہے کہ گیس کی لوڈشیڈنگ کا دائرہ فرٹیلائزر انڈسٹری تک بڑھادیا گیا ہے جس کی وجہ سے کھادوں کی قلت اور مہنگائی نے کسانوں کی نیندیں حرام کردی ہیں۔فرٹیلائزر انڈسٹری صرف گیس پر چلتی ہے اور وہ ڈیزل، یافرنس آئل سے نہیں چلائی جاسکتی اسی بناپر فرٹیلائزرز کو ترجیحی بنیادوں پر گیس فراہم کی جاتی رہی ہے۔گیس کی سپلائی میں تعطل ڈال کر مقامی انڈسٹری کو بند اور مخصوص مافیا کو کھادیں درآمد کرنے کی اجازت دی جارہی ہے تاکہ وہ اپنی جیبیں بھریں۔انڈسٹری کی بندش سے نہ صرف بیروزگاری میں اضافہ ہوگا بلکہ مہنگی درآمدی کھاد کسانوں اور کاشتکاروں کی

مشکلات میں اضافہ کرے گی اور زرعی معیشت کو نقصان پہنچے گا لیکن حکمرانوں کو اس سے کیا؟

سی این جی سٹیشنز کی بندش سے آمد و رفت میں خلل پڑتا ہے۔ فرٹیلائزر انڈسٹری کی بندش سے لوگ بیروزگار بھی ہوں گے اور زرعی پیداوار پر بھی اس کے مہلک اثرات مرتب ہوں گے البتہ حکومت کے بعض چہیتوں کو درآمدی کھادوں سے بھرپور فائدہ ہوگا اور وہ اپنے سرپرستوں کی خدمت و تواضع پورے اہتمام سے کر سکیں گے۔ یہ فیصلہ کس نے اور کیوں کیا؟ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ زرعی معیشت کی حوصلہ افزائی کا یہ حکومتی انداز قوم کو مبارک! اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حکمران ان کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ پنجاب میں طویل عرصے سے سی این جی اسٹیشنوں کی ہفتہ وار بندش سے پریشان مالکان کا حوصلہ جواب دے گیا اور انہوں نے بندش کا حکم ماننے سے انکار کر دیا حکومت کی جانب سے مسلسل ڈیزل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے شہر میں چلنے والی 8000 منی بسوں اور کوچز سمیت 1500 بسیں جو ڈیزل سے سی این جی پر منتقل کرائی گئی ہیں، سی این جی کی 2 دن کی بندش کی وجہ سے روٹ پر نہیں آ سکیں گی اور جہاں نجی گاڑی مالکان پریشانی کا شکار ہوں گے، وہیں ڈیزل سے سی این جی میں منتقل کرائی گئی پبلک ٹرانسپورٹ پر براہ راست اثر پڑے گا وہ بند ہو جائے گی، جس کی وجہ سے ہزاروں یومیہ اجرت کے محنت کشوں کو پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے معمول کے مطابق دفاتر

جانے میں شدید اذیت اور پریشانی کا سامنا ہو گا۔ اس سلسلے میں کراچی ٹرانسپورٹ اتحاد کے صدر ارشاد بخاری کا کہنا ہے کہ سی این جی کی 2 دن کی بندش سے ٹرانسپورٹ کم چلے گی، جس کا تمام اثر متوسط اور غریب عوام پر پڑے گا، ڈیزل کی روز بروز ہوشربا قیمتوں کی وجہ سے ٹرانسپورٹ مالکان نے مجبوراً ہزاروں روپے کے عیوض گاڑیوں کو سی این جی پر منتقل کرایا۔ انہوں نے صدر، وزیراعظم اور وزیر پیٹرولیم سے مطالبہ کیا ہے شہر کی موجودہ امن و امان کی صورتحال میں اس طرح کے فیصلے عوام کو مزید پریشانی میں مبتلا کردیں گے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ امن ظالمانہ اقدام کو فوری واپس لیا جائے بصورت دیگر ہم ٹرانسپورٹرز کا اجلاس بلا کر گاڑیاں بند کرنے کا فیصلہ کریں گے۔

شہریوں نے مطالبہ کیا ہے کہ سی این جی کا بحران ختم کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں تاکہ ان کی مشکلات کم ہو سکیں ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ کاروں والوں کیلئے سی این جی بند کرکے پبلک ٹرانسپورٹ کو گیس فراہم کی جائے تاکہ عوام کو سفری سہولیات میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اگر متحدہ ٹرانسپورٹ یونین کی جانب سے پہیہ جام کی کال دی گئی تو اس میں بھرپور شرکت کی جائیگی۔ سندھ ہائی کورٹ کی طرح اسلام آباد ہائی کورٹ بھی سی این جی بندش کے خلاف حکم امتناع جاری کرچکی ہے۔ جس پر عمل نہیں کیا جارہا۔ پورے ملک میں عوام کا حکومت کے خلاف غم وغصہ بڑھ رہا ہے اور لوگ حکومتی فیصلے کی خلاف

ورزی کر رہے ہیں۔ اس پہلے پوٹھوہار ریجن کے بیشتر سی این جی اسٹیشن مالکان نے تین روزہ بندش کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور کئی اسٹیشن کھلے رہے اور گاڑیوں کو سی این جی فراہم کی جاتی رہی۔ حکومت نے سی این جی کی قیمتوں میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ ذرائع کے مطابق یہ اضافہ عالمی مالیاتی اداروں کی ہدایت پر کیا گیا ہے اور اس کی وجہ حکومتی قرضے ہیں۔ اسی پلان کے تحت گھریلو صارفین اور فرٹیلائزر سیکٹر کے لئے گیس میں سبسڈی ختم کرکے قیمتوں میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ اوگرا اتھارٹی ایک عضو معطل بن گیا ہے۔ جو پٹرولیم مصنوعات میں بلاجواز اضافہ کر رہا ہے۔ اور عوام کی مشکلات کو نہیں دیکھا جارہا ہے۔

دنیا میں بلند قامت مجسمے

دنیا میں بلند قامت مجسمے علیحدہ شناخت اور حیثیت ہی نہیں بلکہ انسانی تخلیق کے بے مثال ہنر کا بھی اعتراف ہیں

مجسمے انسانی سازی کا آغاز کیسے ہوا ہوگا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ انسان کو جو تخلیق کی صلاحیت قدرت نے عطا کی ہے۔ یہ اسی خداداد صلاحیت کا اظہار ہے۔ ہاتھوں سے تشکیل دی جانیوالی تعمیرات میں انسانی خدوخال پر مشتمل مجسمے سب سے پیچیدہ اور فنی مہارت کے حامل ہوتے ہیں، دنیا میں اس حوالے سے بلند قامت مجسمے علیحدہ شناخت اور حیثیت ہی نہیں بلکہ انسانی تخلیق کے بے مثال ہنر کا بھی اعتراف ہیں۔ دنیا میں اونچائی کے لحاظ سے صف اول کے مشہور بلند قامت مجسموں میں سے نو کا تعلق بدھ مت سے ہے۔

عوامی جمہوریہ چین کے کثیر آبادی والے صوبے ہنان کے دور دراز قصبے لوشان میں اپرنگ ٹیمپل بدھا 128 میٹر بلند مجسمہ سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہمیشہ سے رہا ہے۔ اس طویل القامت مجسمہ کو دنیا بھر کے سیاحوں اور بدھ مت دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ بلند و بالا مجسمہ افغانستان کے قصبے "بامیان" میں

طالبان کے ہاتھوں 2001 میں بدھا کے دو مجسمے گرانے کے بعد 2002ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ چین نے انتہا پسندی کے خلاف بہ طور احتجاج یہ بلند و بالا مجسمہ انتہائی تیزی سے تعمیر کیا تھا، جو بدھ مت کے فلسفے "ھرم کایا" کے مطابق ملکوتی دنیا کی اولین غیر مرئی ہستی کا مجسمہ ہے۔ بدھ عقائد کے مطابق، اس ہستی کی تجسم بعد میں گوتم بدھ اور دیگر بدھوں کی شکل میں ہوئی۔ مجسمے کی مجموعی اونچائی میں اگر بیس میٹر بلند کنول کا پھول، عمارتی ستون اور تراشی ہوئی پہاڑی کی اونچائی بھی شامل کر لی جائے۔ جس کے درمیان بدھا کا مجسمہ ایستادہ ہے تو مجموعی اونچائی 128 میٹر سے بڑھ کر 202 میٹر تک جا پہنچتی ہے۔ انڈیا کے صوبے بہار سے تعلق رکھنے والی بین الاقوامی تنظیم کے زیر اہتمام تعمیر کئے جانیوالے اس مجسمے میں گیارہ سو تانبے کے دھاتی ٹکڑے استعمال کیے گئے ہیں، جن کا مجموعی وزن ایک ہزار ٹن ہے۔ اس مجسمے پر مجموعی لاگت 55 ملین امریکی ڈالر آئی ہے۔ اس کے سامنے کے رخ پر دریائے Foquan بہہ رہا ہے، جب کہ پشت پر Foud پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ وادی میں واقع گرم پانی کے قدرتی چشمے کی نسبت سے اسے Spring Temple Buddha کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ بدھا کے بنائے گئے مجسموں میں ہتھیلیوں اور ہاتھوں کے انداز مختلف پیغامات کو ظاہر کرتے ہیں، جنہیں سنسکرت زبان میں Mudre کہا جاتا ہے، جس کے معنی "علامت" یا "مہر" کے ہیں۔ اسپرنگ ٹیمپل بدھا کا انداز تعمیر "ویتار کا مدرا" ہے، جو مہاتما بدھ کو معلم ظاہر کر رہا ہے۔

"لیٹا ہوا بدھا"

Monywa کے قصبے Sagaing لے کیان سیٹکیار میانمار،.برما کے انتظامی علاقے میں تعمیر کردہ گوتم بدھ کا یہ مجسمہ 116 میٹر بلند ہے، جس میں 13.5 میٹر کا چبوترہ بھی شامل ہے۔ مجسمے کے نچلے حصے میں بدھ مت سے متعلق کام 21 فروری 2008 ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس مجسمے کے قدموں میں ایک اور 90 میٹر طویل بدھا کا مجسمہ بھی موجود ہے، جو دائیں ہاتھ کی کروٹ پر لیٹا ہوا ہے۔ اس مجسمے کو مقامی زبان میں لے کیان سیٹکیار یعنی "لیٹا ہوا بدھا" کہا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ اندر سے کھوکھلا ہے اور اس میں گوتم بدھ کی شخصیت اور تعلیمات کے بارے میں معلومات تحریر ہیں۔ چنانچہ زائرین اور سیاح اس مجسمے میں سر سے لے کر پیر تک گھوم پھر کر گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات سے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ کروٹ کے بل لیٹے ہوئے اس بدھ کے عقب میں گہرے پیلے رنگ پر مشتمل 116 میٹر بلند گوتم بدھ کا مجسمہ میانمار کا اہم سیاحتی مقام بھی بن چکا ہے۔

اشیکوڈاہیبیٹسو

میں واقع بدھ مت کے فرقہ مہایان سے تعلق رکھنے والے Ushiku جاپان کے شہر ملکوتی دنیا کے مقدس بدھا "امیتابھا" کا یہ مجسمہ مجموعی طور پر 120 میٹر

بلند ہے، جس میں دس میٹر کا چبوترہ اور اس ہی میٹر بلند کنول کا پھول بھی شامل ہیں۔ واضح رہے کہ بدھا امیتابھا مہایان بدمت کے کلیدی آسمانی کرداروں (بودھی استوا) میں سے ایک ہے۔ 1993ء میں مکمل ہونیوالے اس مجسمے میں 85 میٹر بلندی تک برقی دینے کی سہولت بھی فراہم کی گئی ہے۔ مجسمے کا مجموعی وزن 4003 ٹن ہے اور اس کے چہرے کا سائز بیس میٹر پر مشتمل ہے، جب کہ انگشت شہادت سات میٹر لمبی ہے۔ مجسمے کو اندر سے چار منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے پہلی منزل نیم تاریک ہے، جہاں پر ایک خاص مقام سے روشنی ستون کی شکل میں نیچے آتی دکھائی دیتی ہے۔ ستون کی شکل میں دکھائی دینے والی یہ روشنی اوپر جانے والے زینے کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ اس پر اسرار اور روحانی ماحول کے ساتھ سفر کرتے ہوئے زائرین دوسری منزل پر جا پہنچتے ہیں، جو دس تحریری مواد پڑھا جا سکتا ہے۔ تیسری منزل، جو بیس میٹر سے شروع ہو کر تیس میٹر پر ختم ہوتی ہے، پر بدھا کے لگ بھگ تین ہزار سونے سے بنے ہوئے بت موجود ہیں۔ اس منزل کے بعد 80 میٹر تک خلا ہے جس کے بعد چوتھی منزل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دراصل پانچ میٹر ایک چھوٹا سا کمرہ، جس میں ایک مستطیل شکل کی کھڑکی ہے، جو بدھا امیتابھا کے سینے میں کھلتی ہے، جہاں سے باہر کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک اس مجسمے کے نام کا تعلق ہے تو جاپانی زبان میں Duibutsu کے معنی بڑے یا جسم بدھا کے ہیں۔

نا شان ہی شانگ کوان

جنوبی بحر چین میں واقع کم و بیش دو سو جزائر پر مشتمل چین کے سب سے چھوٹے صوبے میں ایستادہ یہ بت 108 میٹر بلند ہے جو بدھ مت عقائد Sanya ہینین کے جزیرے کا مجسمہ ہے، جسے بھارت میں تارادیوی کہا Guanyin کے مطابق ہم دردی کی دیوی جاتا ہے۔ یہ مجسمہ 24 اپریل 2005ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ چھ برس میں مکمل ہونیوالے اس مجسمے کی تعمیر بدھ مت کے 108 انتہائی اہم بھکشوؤں نے انجام دی تھی۔ یہ کانسی سے بنے تین مجسمے ہیں۔ جن کی پشت آپس میں ملی ہوئی ہے۔ ان تینوں میں سے ایک کا رخ خشکی، یعنی چین کی سمت اور دو کا رخ جنوبی بحر چین کی جانب ہے۔ وہ مجسمہ جس کا رخ خشکی کی طرف ہے اس کے ہاتھوں میں بدھ مت کی متبرک اشیاء ہیں۔ دوسرے مجسمے نے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں، جن میں مالا ہے، جب کہ دیوی کے تیسرے مجسمے کے ہاتھوں میں کنول کا پھول ہے۔ تینوں مجسموں کے سروں کے اوپر پیپل کا پتا بنایا گیا ہے، جس میں تبتی زبان میں بدھ مت کے مقدس منتر درج ہیں۔ چاروں جانب پانی سے گھرے اس مجسمے کے اطراف میں بدھ مت کی تعلیمات کے حوالے سے شان دار عبادت گاہ اور تحقیقی مراکز بھی قائم ہیں۔ خشکی اور سمندر کے درمیان عبادت گاہ تک جانیوالے راستے میں 99,999 مجسمے رکھے گئے ہیں۔ اس مجسمہ کا نام اس کے جنوب میں واقع بدھ دیومالائی عقائد کے مطابق مقدس پہاڑی Nanshan کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔

شہنشاہ ین دی اور ہیونگ دی کے مجسمے چین کے صوبے ہینان کے صدر مقام Zhengzhou میں واقع مجسمے قدیم چین کے شہنشاہوں یان تی اور ہوانگ کے چہروں پر مشتمل ہیں، جن کی بلندی 106 میٹر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ چین، تائیوان، ہانگ کانگ، مکاو وغیرہ میں بسنے والے چینی نسل کے تمام افراد کے جدامجد یہی دونوں شہنشاہ تھے۔ 2007ء میں پایہ تکمیل کو پہنچنے والے یہ دونوں مجسمے بیں برس کی مدت کی لگ بھگ چار ہزار برس Yan میں چٹانی پہاڑیوں کو تراش کر مکمل کیے گئے۔ بادشاہ جسے زرد بادشاہ بھی کہا جاتا ہے، Huang، قبل اسی علاقے میں حکم رانی تھی، جب کہ کو چین کے پانچ قدیم مقبول بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہیونگ وی کو چین کے روایتی طریقہ علاج کا بانی اور مارشل آرٹ کے ابتدائی ماہروں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ جب کہ چین کے قدیم مذاہب تاوازم اور کنفیوسش ازم کی تعلیمات میں بھی اس کا خاصہ عمل دخل ہے۔ اگرچہ مجسمہ سازوں نے ان دونوں شہنشاہوں کے چہروں کے شبیہ ایک دوسرے کے قریب قریب بنائی ہے، لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے اور ان کے درمیان کئی خوں ریز جنگیں بھی لڑی گئیں۔

کے پہاڑی قصبے Miyagi سیندائی وائی کے نون 100 میٹر بلند یہ مجسمہ جاپان کے شہر Sendai میں ایستادہ ہے، جو مہمایان بدھ مت کے مطابق ہم دردی کے دیوتا یا بدھا کی Kannon کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یادگاہ اور عبادت گاہ ہے۔

دیوی کا Guanyin دیوتا Avalokitesvara اور ین میں رائج بدھ عقائد کے مطابق مردانہ روپ ہے، چنانچہ اسے "دائی کینون" کا مجسمہ کہا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ بارہ منزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں بدھ مت کے حوالے سے 108 تصاویر اور متبرک اشیاء محفوظ ہیں۔ مجسمے کے بالائی حصے تک پہنچنے کیلئے برقی سیڑھی بھی نصب ہے۔ مجسمے کے اندر داخل ہونے کا راستہ ڈریگون کی شکل کا ہے۔ زائرین اور سیاح ڈریگون کے منہ میں سے ہوتے ہوئے مجسمے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ مجسمہ کمال مہارت سے ڈریگون کی پشت پر نصب کیا گیا ہے جس کے سر پر بدھ تعلیمات کی کامیابی کی علامت Dhvaja بھی بنی ہوئی ہے۔ تاہم مجسمے کی تعمیر کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے اسے 1980ء کی دہائی میں ایک ایسی کمپنی نے تعمیر کیا تھا جو اس کی لاگت کی آڑ میں اپنی دوسری تعمیرات کا ٹیکس بچانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی افراد مجسمے کو عبادت کے حوالے سے مناسب نہیں سمجھتے اور اسے صرف سیاحوں کی دلچسپی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

پیٹر دی گریٹ پندھویں صدی کے آخر میں روس پر بادشاہت کرنے والے شہنشاہ پیٹر اول کا یہ مجسمہ 96 میٹر بلند ہے جس کی نقاب کشائی روس کی بحریہ کے تین سو سال مکمل ہونے پر 1997ء میں کی گئی تھی۔ روس کی بحریہ کی داغ بیل پیٹر اول نے ڈالی تھی۔ ماسکو میں واقع اس مجسمے کا ڈیزائن جارجیا سے تعلق رکھنے والے

نے بنایا تھا۔ اس مجسمے کے حوالے سے ایک دلچسپ Zurab Tsereteli مجسمہ ساز
نے پہلے یہ مجسمہ کرسٹوفر کولمبس کے امریکاZurab Tsereteli امر یہ ہے کہ
دریافت کرنے کے سفر کے پانچ سو سال مکمل ہونے پر تیار کیا تھا، جسے انھوں نے
امریکی حکومت کو 1992ء میں فروخت کرنا چاہا۔ لیکن امریکی حکومت نے یہ پیش کش
نے کولمبس کے چہرے کی Zurab Tsereteli قبول نہیں کی۔ چنانچہ 1996ء میں
جگہ پیٹر اول کا چہرہ بنا کر یہ مجسمہ منفرد مقام رکھتا ہے، مگر نومبر 2008ء میں سیاحوں
کے ایک گروپ نے اسے دنیا کا دسواں بدہیبت ترین مجسمہ قرار دیا۔ سیاہ رنگ پر مبنی فولاد
سے بنا یہ فن پارہ بادشاہ کے بجائے کسی بحری قزاق کا مجسمہ دکھائی دیتا ہے، جو اوپر تلے
ایک دوسرے میں پیوست پانچ بحری جہازوں پر کھڑا سمندر کی جانب دیکھ رہا ہے اس کا
بایاں ہاتھ جہاز کی ہینڈل پر ہے، جب کہ دایاں ہاتھ بلند ہے جس میں اس نے دنیا کا
نقشہ تھاما ہوا ہے۔

تھائی لینڈ کا عظیم بدھا تھائی لینڈ کے وسطی صوبے آنگ تھونگ میں اپنے ہم نام قصبے میں
تعمیر کیا گیا، مجسمہ 16 سال کی مدت میں 2008ء میں مکمل ہوا۔ اس مجسمے کی اونچائی
میٹر ہے۔ تاہم، اسے تعمیر کرنیوالوں نے مجسمے کے گرد پر اسراریت کی چادر تان 92
رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حوالے سے معلومات نہایت کم ہیں۔ تاہم، یہ ایسے
طویل القامت مجسموں کی فہرست میں سب سے بلند ہے جن میں گوتم بدھ آلتی پالتی
مارے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مجسمے کا

طرز تعمیر مدرا کا ہے جو بدھا کے حق میں زمین کی گواہی کو ظاہر کرتا ہے۔ بدھا کے سر پر انتہائی مہارت سے اسٹوپا کی علامت بھی بنائی گئی ہے۔ بدھ عقائد میں اسٹوپا سے مراد ایسا مقام ہے جہاں پر نیک بھکشوؤں کی باقیات اور راکھ محفوظ کی جاتی ہے۔ اس مجسمے کی چوڑائی 63 میٹر ہے۔ کنکریٹ سے بنے اس مجسمے پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے۔ اس انتہائی خوب صورت مجسمے میں تعمیر پر ساڑھے تین ملین ڈالر کی لاگت آئی۔

بدھ مت کے Jiangsu عظیم بدھا لنگ شان چین کے مشرقی ساحل واقع صوبے پیروکاروں کیلئے ایک اہم مقام ہے۔ چین کے اس کثیر آبادی والے اس صوبے کے کی پہاڑی پر واقع گوتم بدھ کا یہ مجسمہ Ling Shan 88 میں Wuxi تاریخی علاقے میٹر بلند ہے۔ کانسی کا تعمیر کیا گیا۔ یہ مجسمہ 1996ء میں مکمل ہوا۔ اس کے قدموں میں بنے ہوئے کنول کے پھول تک پہنچنے کیلئے 99 قدمچے بنائے گئے ہیں۔ کنول کے پھول کے درمیان کھڑے ہوئے اس مجسمہ کا وزن لگ بھگ 700 ٹن ہے۔ یہ مجسمہ بدھ مت کی ٹیمپل کا حصہ ہے۔ Xiangfu لگ بھگ ایک ہزار سال پرانی وسیع و عریض عبادت گاہ اس مجسمے کا طرز تعمیر "دیتار کار مدار" ہے، مہا تما بدھ کو بہ طور معلم پیش کرتا ہے۔

Hokkaido دائی کنون کیتا نو، میاکو پارک جاپان کے دوسرے سب سے بڑی جزیرے کے

کیتا نومیاکو پارک" میں ایستادہ یہ مجسمہ 88 میٹر بلند ہے۔ جس کی تعمیر 1989"
ء میں مکمل ہوئی۔ یہ مجسمہ بھی بدھ مت کے عقائد کے مطابق ہم دردی کے آسمانی دیوتا
بدھا کی یادگاہ اور عبادت گاہ ہے۔ اس مجسمے کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ اس کا بالکل
اوپری مقام پر ایک پلیٹ فارم ہے، جہاں سے ارد گرد کے وسیع اور خوب صورت مناظر
کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی چھٹی اور بیسویں منزل کے درمیان بدھ مت
بھی کہتے Byakue Kannon کی آٹھ عبادت گاہیں واقع ہیں۔ مقامی افراد اس مجسمے کو
ہیں اس کا پلیٹ فارم کنول کے پھول کی شکل کا ہے، جس کے درمیان میں مجسمہ ابھرتا
چین میں پوجی جانیوالی دیوی Avalokitesvara دکھائی دیتا ہے۔ واضح رہے کہ
کہ جاتا ہے، اس مجسمے کا Kannon کا مردانہ روپ ہے، جسے جاپان میں Guanine
طرز تعمیر "جانا مدرا" ہے، جو تعلیم کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔
اکتوبر 1967ء میں پایہ تکمیل کو پہنچنے والا 85 میٹر بلند یہ مجسمہ اپنی تعمیر کے 15
وقت دنیا کا کنکریٹ سے بناسب سے بلند و بالا مجسمہ تھا، جسے حکومت روس نے دوسری
جنگ عظیم کے دوران لڑی جانیوالی "جنگ اسٹالن گراڈ" کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔ روس
Yevgeny جس کا سابقہ نام اسٹالن کے مشہور مجسمہ ساز Volgograd کے شہر
Nikolai Nikitin تھے، جنہوں نے 7900 ٹن کنکریٹ کا یہ مجسمہ Vuchetich
کے ساتھ مل کر ڈیزائن کیا تھا۔ اس مجسمے کے لیے یہ بطور

نے خدمات پیش کی تھیں۔ مجسمے کے ہاتھ میں Valentina Izotova ماڈل خاتون
لہرانے والی تلوار کی اونچائی 33 میٹر ہے، جب کہ اس کے قدموں تک پہنچنے کیلئے،
روزتک جاری رہنے والی جنگ اسٹالن گراڈ کی مناسبت سے، 200 قدمچے تعمیر 200
کیے گئے۔ زیر زمین پانی کی سطح میں تبدیلی کے باعث مجسمہ جھکاو اور گرنے کے خطرے
سے دوچار ہے۔

میں نصب اس مجسمے کی اونچائی 80 میٹر Awaji آواجی کننوں جاپان کے جزیرے
ہے۔ یہ مجسمہ بھی ہم دردی کے آسمانی دیوتا یا بدھا کی یادگار اور عبادت گاہ ہے۔ اگر یہ
ایولکوتیسوارا" بدھا کی جاپان میں بڑے پیمانے پر عبادت کی جاتی ہے، مگر سیاحوں کے"
مطابق یہ مجسمہ دیگر بلند قامت مجسموں کی نسبت خاصا بھدا اور تعمیری حسن سے عادی
ہے، چنانچہ اس مجسمے کو سیاحتی نقطہ نظر سے اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہ مجسمہ بیس میٹر
بلند چبوترے پر بنایا گیا ہے، جسے مجسمے کی اونچائی میں شامل نہیں کیا جاتا۔

امریکہ کرپشن کا بانی اور مائی باپ ہے

اسّی اور نوے کی دہائی میں ہمارے اردو اخبارات نے مالی بدعنوانی کی جگہ امریکی اصطلاح "کرپشن" کو شہ سرخیوں میں جگہ دینا شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے دو جمہوری حکومتیں میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی حکومتوں کو کرپشن کے الزامات لگا کر ختم کیا گیا۔ اب "کرپشن" اور "کرپٹ" کے الفاظ اردو ڈکشنری کا حصہ بن گئے ہیں۔

اب ملکوں کی کرپشن جانچنے کے لئے قرضہ دینے والے ممالک نے ٹرانسپیرنسی جیسے ادارے بنا دیے ہیں۔ لیکن ان اداروں کی مالی معاونت کے ذرائع چھپائے جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مالی کرپشن امریکہ اور یورپ میں ہوتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان ممالک نے اپنی کرپشن کو "کک بیک" "کمیشن"۔ "سروس چارجز"۔ جیسے نام دئے ہیں۔ "کک بیک" کا تصور ہی مغرب سے آیا ہے۔ مسلمان کے نزدیک رشوت لینے والا ہی نہیں رشوت دینے والا بلکہ رشوت کی طرف راغب کرنے والا بھی اتنا ہی برابر کا مجرم ہے۔ دنیا کا سب سے انتہائی کرپٹ ملک سوئٹزرلینڈ ہے۔ سوئس بینکوں میں دنیا بھر میں کرپشن کے ذریعے کمایا جانے

والا پیسہ پڑا ہے۔ آج تک تمام تر مطالبات اور اپیلوں کے باوجود غریب ملکوں کا لوٹا ہوا پیسہ سوئٹزرلینڈ نے واپس نہیں لوٹایا۔ پاکستان سے لوٹی ہوئی ساٹھ ملین ڈالرز بھی یہیں محفوظ ہیں۔

امریکہ کا حال یہ ہے کہ وہاں موجود لابنگ فرمیں اپنے "کلائنٹ" سے بھاری معاوضے وصول کرکے کانگریس ممبران کو خریدتے ہیں اور اس طرح مختلف ممالک کے خلاف یا ان کے حق میں فیصلے صادر کروائے جاتے ہیں۔ پاکستان ان غریب ممالک میں شامل ہے جسے مسئلہ کشمیر، ایٹمی معاملے اور کئی ناقابل تحریر معاملات پر امریکی لابنگ فرموں کو بھاری رقوم دینا پڑتی ہیں۔ بی بی سی نے حال ہی میں ایک سروے کرایا۔ اس جائزے میں شامل چار کے علاوہ سب ممالک میں کرپشن کو بہت سنجیدہ مسئلہ کہا گیا ہے۔ برازیل میں چھیانوے فیصد لوگوں نے کرپشن کو بہت سنجیدہ مسئلہ قرار دیا، مصر میں اکیانوے فیصد، کولمبیا میں اٹھاسی فیصد، فلپائن میں ستاسی فیصد اور کینیا میں چھیاسی فیصد لوگوں کی یہی رائے تھی۔ ان کے علاوہ چین میں بھی تہتر فیصد اور امریکہ میں سڑسٹھ فیصد، روس میں اڑسٹھ فیصد اور انڈیا میں چھیاسٹھ فیصد نے کرپشن کو اہم مسئلہ قرار دیا ہے۔ امریکہ میں کرپشن تیزی سے بڑھ رہی ہے اور امریکی غریب ملکوں کو امداد دے کر اس میں کرپشن کی سرپرستی کرتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکسیشن و اکانومی پالیسی

کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ درجنوں امریکی کمپنیاں حکومت کی جانب سے سبسڈیز حاصل کرنے اور سالانہ اربوں ڈالر منافع کمانے کے باوجود ٹیکس چوری میں ملوث ہیں۔ رپورٹ کے مطابق امریکہ کی 30 منافع بخش کمپنیاں مجموعی طور پر 160 ارب ڈالر منافع کمانے کے باوجود گزشتہ 3 سال سے نیگٹیو انکم ٹیکس ریٹ سے لطف اندوز ہو رہی ہیں بلکہ بعض مذکورہ کمپنیاں ٹیکس ریبیٹ بھی لے رہی ہیں۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ 280 کارپوریشنوں نے مجموعی طور پر تقریباً 223 ارب ڈالر کی ٹیکس سبسڈیز حاصل کی ہیں۔ دوسری جانب امریکہ ٹیکس چوری سکینڈل کے معاملے پر سوئٹزرلینڈ سے سودے بازی بھی کرتا رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی وزیر خزانہ ایولین وڈمر نے اس کی تصدیق کی اور صحافیوں کو بتایا کہ امریکہ کو اس معاملے پر بات چیت کی تجویز دی گئی ہے اور مزید کسی پریشانی سے بچنے کے لئے ہم اس مسئلے کو جلد حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس پہلے امریکہ نے ایک سوئس بینک " کریڈٹ سوئس" پر الزام عائد کیا تھا کہ بینک نے ٹیکس چوری کرنے میں ہزاروں امریکی کھاتے داروں کی مدد کی ہے،امریکہ کا سوئٹزرلینڈ پر دباو تھا کہ وہ کریڈٹ سوئس کے ہزاروں امریکی کھاتے داروں کی تفصیلات اسے فراہم کرے ،امریکہ ماضی میں بھی سوئس بینک یو بی ایس کے ساڑھے چار ہزار کھاتیداروں کی تفصیلات حاصل کر چکا ہے۔ بعد میں امریکہ اور سوئٹزر لینڈ، امریکی ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے کے خلاف سوئٹزر لینڈ کے ایک بہت بڑے بینک، یو بی ایس کے خلاف ایک مقدمے کو ختم کرنے پر اصولی طور پر رضامند

ہو گئے۔

مقدمے کی بنیاد امریکہ کا یہ مطالبہ تھا کہ یو بی ایس ایسے لگ بھگ 52 ہزار امریکی کھاتے داروں کے ریکارڈ اس کے حوالے کرے، جن کے بارے میں امریکہ کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ سوئٹزر لینڈ میں خفیہ اکاؤنٹ کے ذریعے امریکہ میں ٹیکس ادا کرنے بچ رہے ہوں۔ یو بی ایس کا استدلال یہ تھا کہ اگر وہ امریکی قانون کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے کھاتے داروں کے ریکارڈ حوالے کرتا ہے تو یہ سوئٹزر لینڈ کے قانون کی خلاف ورزی ہوگی اور اسے اپنے ملک میں تعزیری کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔اس مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے پہلے ہی روز ریاست فلوریڈا میں ایک وفاقی جج نے یہ اطلاع ملنے پر سماعت منسوخ کر دی کہ اہم نکات پر اصولی طور پر سمجھوتا ہو گیا ہے۔ اب تک اس سمجھوتے کی تفصیلات بدستور صیغہ راز میں ہیں۔

امریکہ میں صنعتی اداروں کی پالیسیوں ، مالی نظام اور بڑھتے کرپشن کے خلاف ہونے والے مظاہروں نے اب کم و بیش پورے شمالی امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

گذشتہ دنوں نیو یارک میں شروع ہوئی یہ تحریک اتنی تیزی سے پھیلنی شروع ہوئی کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے امریکہ کے کئی شہروں واشنگٹن، لاس اینجلس، بوسٹن، پورویڈنس ہوتے ہوئے کناڈا کے شہر ٹورنٹو اور وینکوور تک

پہنچ گئی۔وال اسٹریٹ پر قبضہ کرلو کے نعروں کے ساتھ وال اسٹریٹ کے قریب ہونے والے ان مظاہروں سے ترغیب پا کر کناڈا میں مظاہرہ کر رہے افراد بھی ٹورنٹو کی بے اسٹریٹ پر قبضہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔پولس کارروائی اور کئی سو افراد کی گرفتاری کے باوجود یہ مظاہرے تھمنے کے بجائے اور بھی شدت اختیار کرتے جارہے ہیں۔اور کچھ کا یہ خیال ہے کہ وال اسٹریٹ پر مظاہرے اور قبضہ سردیوں میں بھی جاری رہے گا۔ امریکہ میں کرپشن کے خلاف اس تحریک نے اب آن لائن شکل اختیار کر لی ہے اور آن لائن اسپیشل نیٹ ورک پر اسے بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔فیس بک پر دی وال اسٹریٹ نام سے بنی برادری کو 66 ہزار سے زیادہ افراد پسند کر رہے ہیں۔مظاہرین کا کہنا ہے کہ عرب ملکوں میں آئے انقلاب سے متاثر ہو کر یہاں بھی یہ تحریک چلائی گئی ہے۔ان مشتعل مظاہرین کا کہنا ہے کہ امریکہ کا موجودہ مالیاتی نظام ملک کے متوسط اور غریب طبقات کے مفادات کو داؤ پر لگا کر امیروں اور ذی اثر لوگوں کو ہی فائدہ پہنچا رہا ہے۔

امریکوں نے تیسری دنیا میں کرپشن کا جو جال بچھایا ہے۔ وہ افغانستان، عراق، پاکستان میں بھی پھیلا ہوا ہے۔کیری لوگر بل سے لے دیگر امدادی معاہدے اس ڈیل میں آتے ہیں۔حال ہی میں ایک امریکی اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق امریکی وفاقی پراسیکیوٹرز افغان صدر حامد کرزئی کے بڑے بھائی کے

خلاف بدعنوانی کے سلسلے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔وال سٹریٹ جرنل کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ شمال مشرقی امریکی ریاست نیویارک کے پراسیکیوٹرز صدر حامد کرزئی کے بھائی محمود کرزئی کے خلاف، جو ایک امریکی شہری ہیں، ٹیکس چھپانے، ناجائز کاروبار اور دولت بٹورنے کے الزامات کے تحت تحقیقات کر رہے ہیں۔اخبار کا کہنا ہے کہ امریکی پراسیکیوٹرز اس مقدمے کے سلسلے میں افغان بینک کے اعلیٰ عہدے داروں اور افیون کے غیر قانونی کاروبار میں ملوث افراد کے خلاف بھی تحقیقات کر رہے ہیں۔اخبار کے ساتھ اپنے ایک انٹرویو میں افغان صدر کے بھائی نے کسی بھی غلط کام کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک کاروباری شخص ہیں اور انہوں نے قانونی طریقوں سے دولت حاصل کی ہے۔ انہوں نے اخبار کو اپنی مالیاتی دستاویزات دیں جن کے مطابق انہوں نے ایک کروڑ 20 لاکھ ڈالر جمع کیے ہیں۔ محمود کرزئی نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو پچھلے ہفتے بتایا تھا کہ وہ مزید آمدنی دکھانے کے لیے امریکہ میں اپنے ٹیکس کے گوشوارے میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ریاست میری لینڈ میں واقع اپنے گھر کے کرائے اور دبئی میں اپنی ایک جائیداد کی فروخت کی آمدنی گوشوارے میں ظاہر کریں گے۔ محمود کرزئی نے کہا کہ انہیں دبئی میں ایک پرآسائش بنگلہ خرید کر اسے جلد فروخت کرنے سے کم از کم آٹھ لاکھ ڈالر کا منافع ہوا تھا۔ بنگلے کی خرید کے لیے انہوں نے افغانستان کے کابل بینک سے قرضہ لیا تھا۔امریکی ریاست میساچوسٹس میں ان کا ایک ریستوران ہے اور جنوبی افغانستان کے قندھار صوبے

میں ایک بڑے رہائش پراجیکٹ میں ان کا حصہ ہے۔ تھوڑے عرصے قبل افغان صدر حامد کرزئی نے افغانستان کے مرکزی بینک میں مالیاتی شعبے کی ترقی کے لیے کام کرنے والے امریکی مشیر پر پابندی لگا دی تھی۔ وہ کئی برسوں سے اس بینک کے لیے کام کر رہے تھے کے روز ایک امریکی واچ ڈاگ نے لکھا ہے کہ افغان بینک ریگولیٹرز کی تربیت کرنے والے مشیر ہربرٹ رچرڈسن کے خلاف بینک میں روز بروز نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ قبل ازیں رچرڈسن نے ایک بیان میں کہا تھا کہ امریکی امداد کے اربوں ڈالر افغانستان میں کرپشن اور منشیات کی فروخت کی نذر ہو چکے ہیں۔ ان کے مطابق امریکی امداد عسکریت پسندوں کے ہاتھ بھی لگی ہے۔ افغانستان کے لیے اس خصوصی امریکی انسپکٹر جنرل کا کام منی لانڈرنگ اور دیگر مالیاتی جرائم کی نشاندہی کرنا بتایا گیا تھا۔ اس خصوصی انسپکٹر جنرل کی تعیناتی کانگریس کی طرف سے کی گئی تھی تاکہ افغانستان کے لیے امریکی امداد کے خرچ کی جانچ پڑتال کی جا سکے۔ اس انسپکٹر جنرل کی رپورٹ کے مطابق کانگریس 2002ء کے بعد سے 70 بلین ڈالر افغانستان میں ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کر چکی ہے۔ افغان سینٹرل بینک بہت عرصے سے تنازعے کا شکار ہے۔ امریکی شہریت رکھنے والے افغان بینک کے چیئرمین عبدالقدیر فطرت نے اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ افغان دارالحکومت میں قائم ایک نجی 'کابل بینک' میں 467 ملین ڈالر کی بدعنوانیوں اور غبن کی وجہ سے دیوالیہ ہونے کی تحقیقات کرنا چاہتے تھے جبکہ حکومتی شخصیات کی طرف سے

مسلسل مداخلت کی جا رہی تھی اور ان کی جان کو خطرہ ہے۔

کچھ عرصہ قبل 'شکاگو ٹریبون' نے ایک اداریے میں ایک سابق گورنر پر چلنے والے مقدمے کے بارے میں لکھا تھا کہ جج جیمز زیگل سابق گورنر کو سزا دیتے وقت شکاگو کے ایک اور ڈسٹرکٹ جج روبن کسٹیلو کے اِس فیصلے کو ملحوظ نظر رکھیں گے جو انھوں نے رشوت ستانی کے ایک اور مقدمے میں دیا تھا۔ ریاست ایلی نوای کے سابق گورنر راڈ بلاگووِچ پر بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کے جو 21 الزامات تھے ان میں سے انھیں کا قصوروار پایا گیا ہے، جِن میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے امریکی سینیٹ کی وہ 18 نشست فروخت کرنے کی کوشش کی تھی جو صدر براک اوباما کے صدر بننے کے بعد خالی ہو گئی تھی۔ جو الزامات بلاگووِچ پر عدالت میں ثابت ہو چکے ہیں ان کی پاداش میں ملنے والی سزا کا دورانیہ تین سو سال تک ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں کرپشن اور امیر و غریب کے درمیان خلیج بڑھ جانے سے معاشرتی تناؤ بڑھ رہا ہے اور یہ بحث چل رہی ہے کہ اصلاحات اور سرکاری کنٹرول اور سرمایہ داری کے جس ملے جلے مرکّب سے امریکہ غربت کی پستی سے ایک عالمی طاقت کی بلندی تک پہنچ گیا وہ اب اپنی افادیت کھو چکا ہے اور اِس کے نتیجے میں ایک نیا طاقت ور طبقہ ابھر آیا ہے، جب کہ باقی لوگ پیچھے رہ گئے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق لوگوں کے خیال میں یورپ اور شمالی امریکہ میں گزشتہ تین برسوں میں ترتیب وار تہتر اور سڑسٹھ فیصد کرپشن بڑھی ہے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ہر دس افراد میں سے سات بدعنوانی کے واقعات کو رپورٹ کرنے کے خواہاں

ہیں۔ٹرانسپرینسی نے دنیاکے دیگر ملکوں کی فہرست میں امریکہ کو 24 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ پاکستان میں بھی امریکی امداد میں کرپشن اور بدعنوانی کا شہرہ ہے۔ اور اس کی سرپرستی بھی امریکہ ہی کرتا ہے اور اس کے شہری اس میں ملوث ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل پاکستان میں سرگرم ایک امریکی این جی اوز کو بدعنوانی میں ملوث پائے جانے کے بعد امریکی حکومت نے فنڈنگ پر پابندی عائد کردی تھی۔ یوایس ایڈ نے اس بارے میں کہا تھاکہ اکیڈمی فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ نامی این جی او نے پاکستان میں پندرہ کروڑ ڈالر کے پراجیکٹ پر کام کیا تھا۔ جس کے تحت پاکستانی قبائلی علاقوں میں سکول اور سڑکوں کی صورت حال بہتر بنائی گئی تھی۔ تاہم آڈٹ اور تفتیش سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پراجیکٹ کی انجام دہی میں اکیڈمی فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ بدعنوانی اور جعل سازی میں ملوث رہی۔ یوایس ایڈ نے این جی او کے لیے فنڈنگ روک دی اور پراجیکٹ سے منسلک پاکستانی کینیڈین شہری کو برطرف کردیا۔ یادرہے کہ امریکہ اور کئی ممالک نے زلزلہ اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد این جی اوز کے زریعے فنڈنگ شروع کی ہوئی تھی ، لیکن وہی این جی اوز آڈٹ کے بعد خردبرد میں ملوث پائی

گئی۔ جس کے بعد ان کی فنڈنگ روک دی گئی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب امریکہ کی ملی بگھت ہے۔ وہ جب چاہے کرپشن کی آزادی دے اور جب چاہے رسی کھینچ لے۔

بجلی اور گیس مہنگی اور مہنگی ہوتی جارہی ہے

پاکستان میں بجلی و گیس کا بحران شدید سے شدید ہوتا جارہا ہے۔ بجلی اور گیس مہنگی اور مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ گھروں کے چولھے ٹھنڈے،کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند، سڑکوں پر سی این جی گاڑیاں خاموش، بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور عوام سوچ میں گم ہیں کہ وہ ایسی جمہوریت کا کیا کریں جو ان کے مسائل پر ان کا منہ چڑا رہی ہے۔کابینہ کے ایک اجلاس میں وزیر خزانہ نے بتایا تھا کہ گزشتہ تین سالوں میں موجودہ حکومت ملک میں توانائی کے منصوبوں پر ایک ٹریلین روپے خرچ کر چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نتیجہ صفر ہے۔ جون جولائی میں گرمی کی شدت بڑھنے کے ساتھ ہی ملک بھر میں بجلی کی لوڈشیڈنگ میں بھی بے حد اضافہ ہوا تھااور بجلی کا شاٹ فال چھ ہزار میگا واٹ کی ریکارڈ سطح تک پہنچ گیا تھا جبکہ شہروں میں کئی کئی گھنٹے کی لوڈشیڈنگ جاری ہے۔ اب یکم نومبر سے بجلی کے نرخ میں دو فیصد کا اضافہ کردیا گیاہے۔ بجلی کے نرخوں میں اضافے کا نوٹیفکیشن جاری کردیاگیا ہے۔ ابھی اور ستم یہ باقی ہے کہ آئی ایم ایف سے معاہدے کے تحت بجلی کی مد میں دی جانیوالی سبسڈی ختم کرنے کیلئے بجلی کی قیمت ماہانہ دو فی صد بڑھانا ہوگی۔ گزشتہ دو سال کے دوران بجلی کی قیمت میں تقریبا60 فیصد تک اضافہ کیا گیا ہے مگر بجلی کے شعبے میں خسارہ کم نہیں ہورہا ہے۔ چیلنز

پارٹی کے سید نوید قمر کا کہنا ہے کہ تیل کی قیمتوں میں اضافے اور ڈالر کی نسبت روپے کی قدر میں کمی سمیت مختلف عوامل کی وجہ سے تقریباً گزشتہ دس برس کے اندر بجلی کے نرخوں میں سو فیصد اضافہ ہوچکا ہے۔ مالی سال سنہ دو ہزار دو اور چار میں بجلی کی اوسط فی یونٹ قیمت تین روپے پچانوے پیسے تھی جو اگست دو ہزار گیارہ میں سات روپے چھیاسٹھ پیسے ہوچکی ہے۔ قومی اسمبلی میں تحریری طور پر پیش کردہ حکومت کی معلومات کے مطابق جب موجودہ حکومت اقتدار میں آئی اس وقت بجلی کی اوسط قیمت پانچ روپے چوالیس پیسے فی یونٹ تھی جو اب دو روپے بائیس پیسے فی یونٹ بڑھی ہے۔ لیکن بد دیانتی یہ ہے کہ بجلی کی قیمت میں فی یونٹ تقریبا تین روپے جو حالیہ اضافہ کیا گیا ہے وہ شامل نہیں کیا گیا۔ سبسیڈی ختم ہونے کے بعد بجلی کے فی یونٹ کی قیمت گیارہ روپے سے زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر بجلی کے فی یونٹ نرخ میں تریسٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مختلف کمپنیوں پر تین سو ارب کے قرضے ہیں۔ جس کی ادائیگی کے لئے حکومت مختلف اوقات میں چار سو ارب روپے کے ٹرم فنانس سرٹیفیکیٹ جاری کرتی ہے۔ بجلی کمپنیاں، کمپنی کی حکومت کی طرح سرمایہ سمیٹ رہی ہیں۔ بجلی اپنی صلاحیت سے پچاس فیصد کم پیدا کی جارہی ہے۔ مہنگا فرنس آئل بچایا جارہا ہے اور گیس سے بجلی پیدا کی جارہی ہے جس سے گیس بھی ناپید ہورہی ہے۔ بجلی کے لائین لاسسز تین سال میں اکانوے ارب ہوگئے ہیں۔ بجلی کے بلوں کی عدم وصولیابی سے قومی خزانے کو چونسٹھ ارب روپے کا نقصان ہورہا ہے۔ بجلی کمپنیاں من مانا

منافع کما کر ملک سے باہر بھیج رہی ہیں۔ ان پر حکومت کا کوئی قابو نہیں ہے۔ دوسری جانب گیس کا بھی برا حال ہے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ گیس پیدا کرنے والے علاقوں میں بھی ہے۔ اس سال گیس کی قیمت میں چودہ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ سے آئندہ دنوں میں موسم میں فرٹیلائیزر فیکٹریاں پینتالیس دن بند رہیں گی۔ جس سے ملکی زراعت متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ سرکار کی جانب سے نوید سنائی جاتی ہے کہ موجودہ حکومت تاحال تین ہزار تین سو ستتر میگا واٹ اضافی بجلی سسٹم میں شامل کرچکی ہے جبکہ آئندہ دو سے تین سال میں چوبیس سو میگا واٹ مزید بجلی سسٹم میں آ جائے گی۔ تاحال بجلی سسٹم میں لائی گئی ہے اس میں چار کرائے کے بجلی گھروں کی تین سو ناوے میگاواٹ بجلی بھی شامل ہے جبکہ باقی بجلی جوہری، ہائیڈل، گیس اور تیل پر چلنے والے بجلی گھروں سے حاصل کی گئی ہے۔ قومی اسمبلی میں توانائی کے بحران پر بحث کے دوران اپوزیشن کے بعض اراکین نے کہا تھا کہ نندی پور اور چیچوں کی ملیاں میں قائم ہونے والے بجلی گھروں کی مشینری ایک سال سے کراچی کی بندرگاہ پر پڑی رہی اور مختلف وزارتوں میں خط وکتابت کی وجہ سے وہ قابل استعمال نہ ہو سکی۔ جبکہ بعض نے الزام لگایا کہ اس التوا کا سبب رشوت تھی۔ مارچ سنہ دو ہزار آٹھ (جب موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا) اس وقت فرنس آئل کی قیمت پینتیس ہزار ایک سو چھپن روپے فی میٹرک ٹن تھی جو ستبر سن دو ہزار گیارہ میں چونسٹھ ہزار سات سو بیالیس روپے ہو چکی ہے۔ گیس کی قیمت دو سو باون روپے

ایم ایم بی ٹی یو سے بڑھ کر تین سو چورانوے روپے جبکہ فی ڈالر کی قیمت باسٹھ روپے پچاسی پیسے سے بڑھ کر ساڑھے اٹھاسی روپے ہو چکی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ بجلی گھروں نے فرنس آئل کے بجائے گیس سے بجلی پیدا کرنا شروع کی ہے جس سے ملک میں گیس کے بحران میں بھی شدت آ گئی ہے۔ وفاقی وزیر کے بقول اگر گزشتہ پانچ برس میں دیکھا جائے تو فرنس آئل کی قیمت میں دو سو ستائیس فیصد جبکہ گیس کی قیمت میں چھیاسٹھ فیصد اضافہ ہوا اور اس کی وجہ سے بجلی کی قیمت بڑھائی گئی۔

دو ماہ قبل جب بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے خلاف پورے ملک میں ہنگاموں کی لہر اٹھی تو حکومت حرکت میں آئی ۔ لیکن پھر سو گئی۔

بجلی فراہم کرنے والے ادارے پاکستان الیکٹرک پاور کمپنی یعنی پیپکو کے مطابق ملک میں بجلی کی پیداوار کم ہو کر دس ہزار میگا واٹ رہ گئی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں بجلی کی طلب سولہ ہزار میگا واٹ تک جا پہنچی ہے۔ پیپکو حکام کا کہنا ہے کہ ملک کو اس وقت چھ ہزار میگا واٹ کے قریب بجلی کی کمی کا سامنا ہے۔ بجلی کی پیداوار میں کمی سے لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بھی بڑھ گیا ہے اور شہروں میں دس سے بارہ گھنٹوں جبکہ دیہی علاقوں میں سولہ سولہ گھنٹوں تک لوڈ شیڈنگ کی جا رہی ہے۔ لوڈ شیڈنگ سے جہاں صنعتوں کو نقصان پہنچ رہا ہے وہیں

عام تاجر بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں اور ان کا روزگار بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔

موسم سرما میں قدرتی گیس کی کھپت میں اضافے کی وجہ سے پنجاب کے صنعتی شہروں میں لوڈ مینجمنٹ کے تحت گیس کی فراہمی معطل ہونے سے تین سے چار روز کے لیے ملیں اور کارخانے بند رہتے ہیں اور اسی وجہ سے روزانہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں بے روزگار ہیں۔ جبکہ صوبے کے سی این جی سٹیشن بھی ہفتے میں دو روز کے لئے بند ہوتے تھے۔ اب اس کا دورانیہ تین سے چار دن کا ہوگیا ہے۔

گیس کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے مرکز اور پنجاب کے مابین تعلقات میں کشیدگی آ گئی ہے اور وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف صوبے میں ہونے والی قدرتی گیس کی عدم فراہمی پر کئی بار تشویش کا اظہار کر چکے ہیں اور آخری ملاقات میں شہباز شریف نے وزیر اعظم سے یہ شکایت بھی کہ کہ وفاقی حکومت کی یقین دہانیوں کے باوجود پنجاب کو گیس کی فراہمی کے اعلان پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ قدرتی گیس کی کھپت زیادہ ہونے کی وجہ سے کارخانوں کو گیس کی فراہمی تاحکم ثانی معطل رہنے پر تاجر اور مزدور مشتعل ہیں اور صنعت کاروں آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے رہے ہیں۔ صرف فیصل آباد میں لوڈ مینجمنٹ کے تحت گیس کی فراہمی معطل ہونے سے پانچ سو کے قریب ملیں اور کارخانے بند پڑے ہیں۔ جس سے سب سے زیادہ متاثر وہ مزدور ہوئے جو کارخانوں میں یومیہ اجرت پر کام کرتے ہیں۔

گزشتہ چھ ماہ کے دوران پچاس ہزار مزدور بے روزگار ہو گئے ہیں۔دسمبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی تین دنوں کی بندش کی جا رہی ہے۔ جس کے بعد جنوری اور فروری کے بارے میں لوگ سوال کر رہے ہیں۔ کہ آئیندہ کیا ہوگا جو صورت حال پیدا ہوئی اس کے بعد سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے صوبہ پنجاب کے صنعتی شہروں میں پانچ دنوں سے قدرتی گیس کی فراہمی معطل ہونے کی وجہ سے ٹیکسائل ملز بحران سے دوچار ہیں اور لوڈ مینجمنٹ کے تحت گیس کی فراہمی معطل ہونے سے ملیں اور کارخانے بند پڑے ہیں۔

اس سلسلے میں آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن یعنی اپٹما کا ایک ہنگامی اجلاس میں پنجاب بھر سے ٹیکسٹائل ملز مالکان نے شرکت کی ہے اور احتجاجی تحریک چلانے کی دھمکی دی ہے۔ ٹیکسٹائل ملز مالکان کا کہنا ہے کہ پنجاب میں صنعتوں کو گیس کی مکمل سپلائی بند کرنے کا فیصلہ وفاقی کابینہ کے اس اجلاس کے بعد کیا گیا ہے جس میں واضح طور پر صرف دو روز کی لوڈ شیڈنگ کا اعلان کیا گیا تھا۔

لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔

دوسری جانب کرائے کے بجلی گھروں سے قوم کو بجلی تو نہ ملی لیکن لوٹ مار کی ایک شرمناک کہانی سامنے آئی ہے۔ اس کا مقدمہ آج کل سپریم کورٹ میں چل

رہا ہے۔ چار ارب روپے سے زیادہ کی رقم عدالت کے حکم پر واپس مل گئی ہے۔ کئی ماہ پہلے سید نوید قمر نے ایک اور سوال کے جواب میں قومی اسمبلی کو بتایا تھا کہ ترکی سے جہاز پر منگوائے گئے بجلی گھر سے ماہانہ اکیاون میگا واٹ بجلی مل رہی ہے اور حکومت اٹھہتر کروڑ روپے انہیں ادا کر رہی ہے۔ واضح رہے کہ اس بجلی گھر کو معاہدے کے مطابق دو سو اکتیس میگا واٹ بجلی پیدا کرنی ہے اور انہیں تیل کی فراہمی حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ لیکن حکومت مختلف وجوہات کی بناء پر انہیں تیل کی فراہمی نہیں کر پا رہی ہے اور محض اکیاون میگاواٹ کی خاطر اٹھہتر کروڑ ماہانہ (نو ملین ڈالر) 'کیپیسٹی چارجز' کی مد میں ادا کر رہی ہے۔ وزیر کے مطابق حکومت نیلم جہلم بجلی گھر بنانے کے لیے صارفین سے دس پیسے فی کلو واٹ فی گھنٹہ سرچارج لیتی ہے اور اب تک ساڑھے سترہ ارب روپے سے زیادہ رقم اکٹھی ہوئی ہے۔ لیکن اس جھوٹ کا پول سپریم کورٹ میں اسوقت کھل گیا۔ سماعت کے دوران حقائق سامنے آئے۔ کرائے کے بجلی گھروں کے معاہدوں میں مبینہ بدعنوانی سے متعلق از خود نوٹس کی سماعت کے دوران چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے ریمارکس دیے ہیں کہ ان بجلی گھروں سے جتنی مہنگی حاصل کی جارہی ہے اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ عدالت کا کہنا تھا کہ ایک طرف حکومت عالمی مالیاتی ادارے اور ورلڈ بینک سے قرضوں کے حصول کے لیے معاہدے کر رہی ہے اور دوسری طرف ان بجلی گھروں کو پیٹرول فراہم کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ دو رکنی بینچ نے از خود نوٹس کی سماعت کی تو رشا

پاور کمپنی کے عبدالحفیظ پیرزادہ نے دلائل دیتے ہوئے بتایا کہ موجودہ حکومت نے بغیر سوچ سمجھے ان منصوبوں کی منظوری دی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے انیس کرائے کے بجلی گھروں کی منظوری دی تھی جسے بعد میں پانچ کر دیا گیا۔
عبدالحفیظ پیرزادہ کا کہنا تھا کہ ملک میں بدعنوانی کا راج ہے اور کرپشن کی یہ حالت ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کو دورہ پاکستان کے دوران یہ کہنا پڑا کہ حکومت بدعنوانی کو روکے۔ ان کا کہنا تھا کہ موجودہ حکومت کا یہ حال ہے کہ ایک وفاقی وزیر ان منصوبوں میں دوسرے سابق وفاقی وزیر پر کروڑوں روپے رشوت لینے کا الزام عائد کر رہا ہے۔ چیف جسٹس نے جب وزارت پانی و بجلی کے وکیل خواجہ طارق رحیم سے استفسار کیا کہ وہ ان کرائے کے بجلی گھروں سے اتنی مہنگی بجلی خرید رہے ہیں تو کوئی طریقہ کار وضع کیا ہے کہ عوام تک کس طرح اور کتنے داموں پر بجلی فراہم کی جائے گی۔ جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔
چیف جسٹس نے استفسار کیا کہ وہ کرائے کے ان بجلی گھروں کو تیل فراہم کیوں نہیں کر رہے تو وزارت پانی و بجلی کے وزیر کا کہنا تھا کہ حکومت کے پاس فنڈز نہیں ہیں۔ چیف جسٹس کا کہنا تھا کہ اگر عاقبت اندیشی سے کام لیا جاتا تو ملکی قرضے سڑسٹھ ارب ڈالر تک نہ پہنچتے۔ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے کہا ہے کہ کرائے کے بجلی گھروں کے مالکان کو اربوں روپے پیشگی ادا کر دیے گیے لیکن

کسی نے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ ان بجلی گھروں سے کتنی میگاواٹ بجلی سسٹم میں آئے گی۔ کسی نے ان نجی پاور کمپنیوں سے یہ تک پوچھنے کی جسارت نہیں کی کہ اس منصوبے میں کونسی سی مشینری استعمال ہوگی اور نہ ہی کمپنیوں سے اس ضمن میں کوئی گارنٹی لی گئی۔ ریشما پاور کمپنی کے وکیل عبدالحفیظ پیرزادہ نے کہاکہ ان کی کمپنی نے چھبیس فیصد سود پر ایڈوانس میں لیا تھا۔ دو سو ایک میگاواٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نجی پاور کمپنی کو چار ارب اور ساٹھ کروڑ سے زائد کی رقم ادا کی گئی جبکہ گزشتہ دو ماہ کے دوران ریشما پاور کمپنی سے بجلی کی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی۔ عدالت کے حکم پر اس کمپنی سے چار ارب سے زائد کی رقم چھبیس فیصد مارک اپ سمیت واپس لی گئی۔ یہی حال ایک اور کمپنی گلف گوجرانوالہ پاور کمپنی کا تھا۔ ایک اور ٹیکنو پاور کمپنی نے بھی سات فیصد مارک اپ پر ایڈوانس میں لی گئی رقم واپس کی۔ ان مختلف نجی پاور کمپنیوں کو حکومت نے ایڈونس کی مد میں پچیس ارب روپے دیے تھے تاہم سپریم کورٹ کی مداخلت پر ابھی تک صرف چار ارب روپے سے زائد کی رقم قومی خزانے میں واپس آسکی ہے۔ عدالتوں کے حکم کے بعد حکومت کو ہوش آیا ہے اور اب وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کی سربراہی میں منعقدہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ بجلی پیدا کرنے والے نجی اداروں کو ایندھن کی فوری فراہمی یقینی بنائی جائے گی تاکہ بجلی کی پیداوار میں جلد از جلد اضافہ کیا جاسکے۔ پاکستان میں بجلی کی کمی خاصی سنگین صورتحال اختیار کرتی جا رہی ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں بجلی کی پیدوار اور استعمال میں فرق ساڑھے چھ ہزار میگا واٹ تک پہنچ گیا ہے۔ یعنی ملک کا پہیہ چلانے کے لیے جتنی بجلی درکار ہے اس کا ایک تہائی پیدا کیا جا رہا ہے۔ بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کا دعویٰ ہے کہ اگر ہم گیس خریدنے میں آزاد ہوں تو ہم اپنی صلاحیت کے مطابق آٹھ ہزار میگا واٹ بجلی فوری پیدا کر سکتے ہیں۔ تیل سے بجلی بنانے والی نجی کمپنیوں یا آئی پی پیز کا کہنا ہے کہ حکومت نے ان کی ادائیگیاں روک رکھی ہیں جس کی وجہ سے وہ تیل نہیں خرید پا رہے اور یوں بجلی اپنی صلاحیت کے مطابق پیدا نہیں کر پاتے۔ یوں یہ سارا بحران مصنوعی اور حکومت کا پیدا کردہ نظر آتا ہے۔ دوسری جانب پانی اور بجلی کے ادارے 'واپڈا' کے بجٹ میں نوے ارب روپے کی مالی بے ضابطگیوں کی اطلاعات ہیں۔ آڈیٹر جنرل آف پاکستان نے 'واٹر اینڈ پاور ڈیویلپمینٹ اتھارٹی' یا 'واپڈا' کے مالی سال سنہ دو ہزار نو اور دس کے بجٹ میں نوے ارب روپے سے زیادہ مالی بے ضابطگیوں اور بے قاعدگیوں کی نشاندہی کی ہے۔ آڈیٹر جنرل کی یہ رپورٹ گزشتہ دنوں حکومت نے قومی اسمبلی میں پیش کی ہے لیکن اس پر بحث یا کارروائی کے لئے پارلیمنٹ کے پاس وقت نہیں ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ نیلم جہلم ہائیڈرو پاور پروجیکٹ کے ٹھیکے میں اصل رقم سے پانچ ارب سترہ کروڑ روپے سے زیادہ رقم ادا کی گئی اور اس کے دستاویزات بھی آڈٹ حکام کو پیش نہیں کیے گئے۔ اس پروجیکٹ میں پونے انتیس کروڑ روپوں سے زیادہ رقم لگژری

گاڑیوں کی خریداری پر خرچ کی گئی ہے اور ان گاڑیوں کی خریداری پر مارکیٹ کی قیمت سے آٹھ کروڑ سترہ لاکھ روپے زیادہ ادا کیے گئے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ واپڈا کی مالی بے ضابطگیوں میں ساٹھ کروڑ ڈالر سے زیادہ زر مبادلہ کی رقم بھی شامل ہے جو قواعد کی خلاف ورزی کرتے خرچ کی گئی ہے جبکہ قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ساڑھے بتیس ارب روپے کی مزید رقم بھی خرچ کی گئی ہے۔

آڈیٹر جنرل کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ واپڈا میں فراڈ اور چوری مالی گھپلوں کے مد میں تقریبا ساڑھے تینتالیس کروڑ روپے ضائع کیے گئے ہیں۔ جبکہ واپڈا حکام کی غفلت کی وجہ سے تقریبا بیالیس کروڑ کا نقصان ہوا۔ رپورٹ کے مطابق مختلف کمپنیوں کو مطلوبہ رقم سے زیادہ ادائیگی کے مد میں تقریبا ساڑھے نو کروڑ کا نقصان پہنچایا گیا ہے۔ جبکہ پانچ ارب سترہ کروڑ روپے کے اخراجات کا واپڈا نے آڈٹ حکام کو ریکارڈ ہی فراہم نہیں کیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پانی ذخیرہ کرنے کی تین سہولیات جس میں تربیلا، منگلا اور چشمہ شامل ہے اس میں سنہ دو ہزار دس تک ریت بھر جانے کی وجہ سے پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش چھ ملین ایکڑ فٹ کم ہو گئی ہے جو کہ تینتیس فیصد بنتی ہے۔ جبکہ سنہ دو ہزار پندرہ تک یہ گنجائش مزید کم ہو کر چھتیس فیصد اور سنہ دو ہزار بیس میں چالیس فیصد ہو سکتی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے نیلم جہلم منصوبے کے ٹھیکیدار کو قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انشورنس کے مد میں پونے تئیس

کروڑ روپے سے زیادہ رقم ادا کی گئی ہے۔ ستم یہ ہے کہ اس منصوبے کے لیے رقم پاکستان میں تمام صارفین کے بلوں پر سرچارج عائد کرکے لی جاتی ہے اور اس رقم میں گھپلوں کے ذمہ داران کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں ہوئی۔ پرویز مشرف کی سابقہ حکومت اور موجودہ حکومت نے کرائے کے بجلی گھروں کے پندرہ منصوبے منظور کیے جس سے ستائیس سو میگا واٹ بجلی سسٹم میں آنی تھی لیکن سنہ دو ہزار دس تک صرف باسٹھ میگا واٹ پیپکو حاصل کرسکا۔ پندرہ معاہدوں میں سے نو موثر ہوسکے اور حکومت نے پیشگی ادائیگی کرتے ہوئے سولہ ارب ساٹھ کروڑ روپے ادا کیے۔ قوم کو کوئی بتانے کو تیار نہیں کہ سولہ ارب ساٹھ کروڑ روپے میں کس کس کا حصہ رہا ہے۔ موجودہ حکومت نے 'نوڈیرو 11 رینٹل پاور پروجیکٹ' کو زیادہ ریٹ دینے کی وجہ سے قومی خزانے کو ڈیڑھ ارب روپے کا نقصان ہوا۔ جبکہ نگران حکومت کے دور میں فیصل آباد میں کرائے کا بجلی گھر لگانے کے ایک منصوبے میں ٹیکنو انجینیئرنگ سروس کو فائدہ پہنچاتے ہوئے قومی خزانے کو اسی کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ ظاہر لگتا ہے کہ یہ کرپشن کے کیسز ہیں۔ لیکن جب ان کیسسز پر کوئی عدالتی کاروائی ہوتی ہے تو جمہوریت کے بچانے کی دھائی دی جاتی ہے۔ عوام حیران ہیں کہ وہ کس سے فریاد کریں۔

صدر زرداری میڈیا کی زد میں

صدر زرداری میڈیا میں رہنے کا فن جانتے ہیں۔ وہ سیاست دان نہیں ہیں لیکن ان کی سیاست نے سب کی سیاست کو مات دے دی ہیں۔ سیلاب ہو یا میمو اسکنڈل، پارلیمنٹ سے خطاب ہو۔ یا ایم کیو ایم سے سمجھوتا، کرپشن الزامات ہو یا عارضہ قلب اور دبئی کا دورہ آصف زرداری عالمی ذرائع ابلاغ کی سرخیوں اور الیکٹرونک میڈیا کی سرخ آنکھ کی زد میں رہتے ہیں۔ صدر کے دل کے دورے کی خبر اور انتہائی عجلت میں ائر ایمبولینس میں ان کی دبئی روانگی نے میڈیا کو خوب قیاس آرائیوں کا موقع دیا۔ صدر زرداری کی صحت کے بارے میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے لندن سے اپنے پارٹی کارکنوں کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا اور عوام سے دعائے صحت کی اپیل کی۔ مسلم لیگ (ن) کی طرف سے محتاط تبصرے میں احسن اقبال نے کہا کہ صدر کی صحتیابی کے لئے دعا گو ہیں تاہم ایسی حکومت کا ہارٹ فیل ضرور ہونا چاہیے۔ غیر ملکی اخبارات نے اس صورتحال پر معنی خیز تبصرے کئے۔ امریکی جریدے فارن پالیسی نے اپنی ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ صدر زرداری کی اچانک دبئی روانگی سے ظاہر ہوتا ہے وہ استعفےٰ دے رہے ہیں جریدے نے امریکی حکومت کے ایک سابقہ عہدیدار کے حوالے سے کہا ہے کہ امریکہ کے ذمے داروں کو دل کا معمولی دورہ پڑنے کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا ہے انہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صدر

زرداری خرابی صحت کے باعث استعفٰے بھی دے سکتے ہیں جریدے کے مطابق صدر مملکت نے میموگیٹ سکینڈل کے بارے میں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنا تھا اس خطاب کو اب غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دیا گیا ہے جریدے نے امریکی حکومت کے ایک سابقہ عہدیدار کے حوالے سے لکھا ہے کہ گزشتہ ہفتے کے اختتام پر جب صدر اوبامہ نے صدر زرداری سے فون پر گفتگو کی تھی تو صدر زرداری لا تعلق اور پریشان تھے پاکستان کے صدر میموگیٹ سکینڈل پر بڑھتا ہوا دباؤ محسوس کر رہے ہیں گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے اب صرف وقت کی بات ہے سابقہ عہدیدار کے مطابق امریکی حکومت میں توقع کی جا رہی ہے کہ صدر زرداری مستعفی ہو سکتے ہیں یہ ان ہاؤس تبدیلی کا آپشن ہے جس کے بارے میں بات ہوتی رہی ہے ساؤتھ ایشیا سنٹر کے ڈائریکٹر شجاع نواز کے مطابق صدر زرداری استعفٰے دے دیں گے اس طرح سویلین حکمرانی کو محفوظ کر لیا جائے گا۔امریکی اخبار نیو یارک پوسٹ نے کہا ہے کہ صدر زرداری کی دبئی روانگی میمو سکینڈل کے دوران سامنے آئی ہے اس اسکینڈل کے باعث زرداری انتظامیہ پر دباؤ میں اضافہ ہوا ہے۔

برطانوی اخبار گارڈین کے مطابق کہا جا رہا ہے کہ صدر زرداری خرابی صحت کی آڑ میں استعفٰے دے دیں گے کیونکہ فوج کی جانب سے دباؤ بڑھ رہا ہے صدر ملٹری اسٹیبلشمنٹ میں بہت زیادہ مقبول ہیں غیر ملکی میڈیا کی ان تمام اطلاعات کو

یکسر غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس بارے میں صدر کے ترجمان کے بیانات تضادات کا مجموعہ تھے۔ پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے پہلے کہا کہ صدرِ پاکستان طبّی معائنے کے لیے دبئ گئے ہیں اور انہوں نے صدر کی سرگرمیوں کے بارے میں بعض ذرائع ابلاغ کی جانب سے پھیلائی جانے والی افواہوں کو غلط قرار دیا ہے۔

بدھ کی صبح جاری کردہ ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ صدرِ پاکستان پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے بچوں سے ملنے اور طبّی معائنے کے لیے دبئ گئے ہیں۔

صدر زرداری کے ذاتی معالج کرنل سلمان کے مطابق تجویز کردہ طبّی ٹیسٹ معمول کے مطابق ہیں اور یہ قلب اور شریانوں سے تعلق رکھنے والی کیفیت کے بارے میں ہیں جن کی تشخیص اس سے قبل ہوئی تھی۔

صدارتی ترجمان فرحت اللہ بابر نے بتایا کہ میڈیا پر آنے والی اطلاعات کے برعکس صدر زرداری علاج یا طبّی معائنے کے لیے کسی ہسپتال نہیں گئے بلکہ انھوں نے منگل کی شام پہلے چیئرمین سینٹ فاروق نائک، اور وزیرِاعظم سید یوسف رضا گیلانی اور وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک کے ساتھ الگ الگ ملاقاتیں

بھی کی تھیں۔

بی بی سی اردو سروس نے اپنے تبصرہ نما خبر میں بتایا کہ فرحت اللہ بابر نے صدر کی دبئی روانگی کے بارے میں جو خبر جاری کی تھی اس کا متن معمول سے ہٹ کر محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہی مقامی ذرائع ابلاغ میں قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔

ان قیاس آرائیوں کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ صدر کی دبئی روانگی سے قبل چیئرمین سینیٹ جو صدر کی غیر موجودگی میں قائم مقام صدر ہوتے ہیں، ان سے اور وزیراعظم اور وزیر داخلہ سے ملاقات کی خبریں بھی صدارتی ترجمان نے جاری کی ہیں۔

حالانکہ ماضی میں صدر کی بیرون ملک روانگی سے قبل ان کی اس طرح کی مصروفیات کے بارے میں خبریں یا تو مخفی رکھی جاتی ہیں یا پھر اس بارے میں بہت ہی کم بتایا جاتا ہے۔

صدر آصف علی زرداری کے خلاف مختلف ذرائع سے میڈیا کے ایک حصے میں مسلسل خبریں نشر یا شائع ہو رہی ہیں کہ صدر آصف علی زرداری مستعفی ہونے والے ہیں

اور شاید واپس وطن نہیں آئیں گے۔

لیکن صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے ان خبروں کی سختی سے تردید کرتے ہوئے اسے ’قیاس آرائی، خیالی اور غیر درست‘ قرار دیا ہے۔

حالانکہ ماضی میں فرحت اللہ بابر، صدر سے منسوب کسی خبر کی تردید کے متن میں من گھڑت، بے بنیاد اور جھوٹی‘ خبروں جیسے الفاظ استعمال کرتے رہے ہیں۔ دوسری ’

جانب

وزیراعظم ہاؤس سے جاری ہونے والے بیان میں کہا جارہا تھا کہ صدر زرادری اپنے بچوں کے اصرار پر دبئی گئے ہیں۔ جبکہ پاکستان کی حکمران جماعت پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو زرداری نے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی سے ملاقات کی ہے۔

وزیراعظم ہاؤس سے جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا ہے کہ صدر زرداری پہلے سے موجود عارضہ قلب سے متعلق علامات کے بعد دبئی گئے ہیں۔

بیان کے مطابق دبئی میں ابتدائی میڈیکل ٹیسٹ کیے جانے پر ڈاکٹروں نے ان کی

حالت کو تسلی بخش قرار دیا ہے۔ ڈاکٹروں نے ابھی تشخیص کرنی ہے کہ آیا صدر کی طبیعت پہلے سے زیر استعمال ادویات کے ناموافق رد عمل کے نتیجے میں خراب ہوئی ہے یا ان کو پہلے سے لاحق عارضہ قلب کی وجہ سے ہوئی ہے۔

بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ صدر ابھی ڈاکٹروں کی زیر نگرانی رہیں گے اور ڈاکٹروں کی ہدایت پر ہی واپس وطن آ کر اپنی معمول کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے۔ وزیر اعظم ہاؤس سے جاری ایک دوسرے بیان میں کہا گیا ہے کہ ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین اور جمعیت علماء اسلام (ف) کے سربراہ مولانا فضل الرحمان نے وزیر اعظم گیلانی کو فون کر کے صدر کی صحت کے متعلق دریافت کیا۔ امریکی سرکاری ریڈیو وائس آف امریکہ ترجمان کے حوالے سے اس خبر میں بتایا ہے کہ دبئی کے اسپتال میں زیر علاج صدر آصف علی زرداری کو جمعرات کے روز انتہائی نگہداشت کے یونٹ سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں وہ اس وقت آرام کر رہے ہیں۔

ترجمان کے بقول اب تک کیے گئے تمام طبّی معائنوں اور لیبارٹری کے تجزیوں کے نتائج ڈاکٹروں نے نارمل قرار دیے ہیں اور صدر پاکستان کی صحت کے بارے میں کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔

پاکستانی صدر عارضہ قلب کی علامات کے بعد منگل کی شب ہنگامی طور پر علاج کے لیے دبئی چلے گئے تھے اور بیرون ملک ان کی اس اچانک روانگی کی وجہ سے مقامی اور بین الاقوامی میڈیا میں صدر زرداری کے مستعفی ہونے کی قیاس آرائیوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تاہم صدارتی ترجمان نے امید ظاہر کی ہے کہ صدر کی صحت یابی کی خبر کے بعد یہ قیاس آرائیاں دم توڑ دیں گی۔

جمعرات کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں بھی صدر زرداری کی علالت کا معاملہ اٹھایا گیا اور وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اراکین کو بتایا کہ صدر مملکت تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ اجلاس کے بعد نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان نے کہا کہ ذرائع ابلاغ میں کی جانے والی قیاس آرائیوں کی وجہ غیر متعلقہ حکومتی نمائندوں سے رابطہ کرکے تخیلاتی خبروں کی تشہیر تھی۔

پاکستانی صدر کی دبئی روانگی سے محض دو روز قبل ان کے ترجمان نے اعلان کیا تھا کہ وہ عاشورہ کے بعد پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کریں گے جس میں وہ نیٹو حملے اور میمو گیٹ اسکینڈل پر حکومت کا موقف پیش کریں گے۔ بی بی سی نے ایک اور خبر میں لکھا کہ پاکستان کے اقتدار کے ایوانوں میں پس پردہ کچھ ایسی سرگرمیاں محسوس ہوتی ہیں جس سے پاکستانی سیاست میں ایک بھونچال پیدا

ہوسکتا ہے۔ بظاہر نظر نہ آنے والی اِن درپردہ سرگرمیوں کو جھانکنے والے بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا اقتدار کی سازشوں کا کھیل لگتا ہے جس سے جمہوری نظام کو سخت خطرات محسوس ہوتے ہیں۔ درپردہ اقتدار کے ایوانوں کے اہم کھلاڑیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں جب صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر سے بات ہوئی تو وہ واضح طور پر کچھ بتانے سے تو گریزاں نظر آئے۔

لیکن ان کی باتوں سے صاف صاف محسوس ہوا کہ 'حالات اچھے نہیں ہیں۔' تاہم انہوں نے اس تاثر سے اتفاق کیا کہ ایوان صدر پر کئی اطراف سے دباؤ بڑھ رہا ہے اور اب کی بار ماضی کی نسبت صورتحال نہایت پیچیدہ ہے۔

جس میں متنازعہ میمو کے معاملے کی میاں نواز شریف کی درخواست پر سپریم کورٹ میں سماعت، پارلیمان کو متنازعہ میمو کی تحقیقات کرنے میں مشکلات، ذوالفقار مرزا کا متحدہ کے خلاف کارروائی پر پارٹی قیادت سے اختلافات اور شاہ محمود قریشی کی جانب سے جوہری پروگرام کے صدر کی وجہ سے غیر محفوظ ہونے کے الزامات بھی شامل ہیں۔

پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کی خرابیِ صحت کی بنا پر اچانک دبئی روانگی کے بعد بدھ کو صدر کے صاحبزادے اور حکمران پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول

بھٹو زرداری نے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی سے تفصیلی ملاقات بھی کی ہے۔ بلاول بھٹو زرداری نے اس ملاقات میں سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی اور عام طور پر وہ سندھی ٹوپی پہننے سے گریز کرتے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ جب ان کے والد خرابی صحت کی وجہ سے دبئی میں طبّی معائنہ کرا رہے ہیں ایسے میں بلاول بھٹو پاکستان میں سیاسی امور نمٹا رہے ہیں۔

وزیراعظم کہتے ہیں کہ صدر آصف علی زرداری ابھی مکمل صحتیابی تک دبئی میں ڈاکٹروں کی زیر نگرانی رہیں گے۔

ایک اہم بات یہ بھی وزیراعظم ہاؤس سے جاری ہونے والے بیان میں بتائی گئی ہے کہ ابھی اس بات کا تعین ہونا باقی ہے کہ صدر کی طبیعت دوائی کھانے سے بگڑی یا پہلے سے جو انہیں عارضہ قلب لاحق ہے اس کی وجہ سے خراب ہوئی۔

صدر آصف علی زرداری کی طبّی معائنے کے لیے اچانک دبئی روانگی کے بعد بعض مقامی ذرائع ابلاغ میں قیاس آرائیوں کا ایک 'فلڈ گیٹ' کھل گیا ہے۔

کچھ مقامی ٹی وی چینل تو صدر کے مستعفی ہونے اور ان کے واپس وطن نہ لوٹنے کے بارے میں بھی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔

لیکن صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے ایسی تمام قیاس آرائیوں کو مسترد کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ

صدر استعفٰی دیں گے اور نہ ہی بیرون ملک زیادہ قیام کریں گے۔

ان کے بقول صدر مملکت جلد صحتیابی کے بعد واپس وطن آئیں گے اور ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔

ادھر صدر آصف علی زرداری کے قریبی دوست اور پیٹرولیم کے وفاقی وزیر ڈاکٹر عاصم نے مقامی ذرائع ابلاغ سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ صدر کو دبئی کے ہسپتال کے 'آئی سی یو' وارڈ میں رکھا گیا ہے۔

البتہ ان کا کہنا ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ تاکہ وہ عیادت کرنے والوں سے دور رہیں اور آئندہ چار پانچ روز میں صدر آصف علی زرداری واپس پاکستان پہنچ جائیں گے اور میڈیا سے بات چیت کریں گے۔ ایک عربی ویب سائٹ العربیہ ڈاٹ نیٹ نے اس بارے میں تفصیلات کچھ یوں بیان کی۔،،پاکستان کے صدر

آصف علی زرداری عارضہ قلب میں مبتلا ہونے کے بعد علاج کے لیے اچانک دبئی چلے گئے ہیں جس کے بعد ملک میں ان کے حوالے سے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں اور افواہیں گردش کر رہی ہیں۔اسلام آباد میں وزیر اعظم ہاوس کی جانب سے جاری کردہ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ ''صدر آصف زرداری ابھی دبئی میں زیرعلاج رہیں گے اور ڈاکٹروں نے اجازت دی تو اس وقت ہی وہ واپس آکر اپنے فرائض انجام دیں گے۔معالج ان کی تشخیص کر رہے ہیں کہ کہیں ان کی حالت ان ادویہ کے ری ایکشن سے تو نہیں بگڑی، جو وہ لے رہے تھے''۔بیان کے مطابق حکمران جماعت پاکستان پیپلزپارٹی کے چیئرمین اور صدر کے بیٹے بلاول بھٹوزرداری نے وزیراعظم یوسف رضاگیلانی سے ملاقات کی جس میں صدر زرداری کے عارضہ قلب کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا گیا۔بیان میں کہا گیا ہے کہ صدر کے بچوں نے ان کے دبئی جانے پر اصرار کیا تھا۔دبئی میں ابتدائی تشخیص سے معلوم ہوا ہے کہ صدر کی حالت بہتر ہے اوران کا میڈیکل چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹروں نے ان کی حالت کو تسلی بخش قرار دیا ہے۔امریکی میگزین ''فارن پالیسی'' نے صدر آصف زرداری کے حوالے سے ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ طبّی وجوہات کی بناء پر صدارت سے استعفٰی دے سکتے ہیں اور صدر زرداری امریکی صدر براک اوباما سے گفتگو کے دوران بھی میمو کے معاملے پر دباو کا شکار تھے۔ لیکن حکومتی حلقوں کی جانب سے اس خبر کی سختی سے تردید کی گئی ہے اور واضح کیا گیا کہ صدر آصف زرداری پہلے سے عارضہ قلب میں مبتلا ہیں اور وہ طے شدہ

شیڈول کے مطابق معمول کا طبی معائنہ کرانے دبئی گئے ہیں۔ امریکا کے ایک سابق عہدے دار نے میگزین ''دی کیبل'' کو بتایا کہ ''واشنگٹن کو مطلع کیا گیا ہے کہ صدر آصف زرداری کو سوموار کی رات دل کا ایک معمولی دورہ پڑا تھا اور اس کے بعد انھیں ایک ائیر ایمبولینس کے ذریعے دبئی لے جایا گیا''۔

فارن پالیسی میگزین کی ویب سائٹ پر پوسٹ کی گئی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس سے ایک روز صدر اوباما کے ساتھ نیٹو حملے کے حوالے سے ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران آصف علی زرداری دباؤ میں لگ رہے تھے اور ان کی گفتگو میں تسلسل نہیں تھا۔ اس سابق امریکی عہدے دار کے بہ قول ''اب گرفت مضبوط کی جارہی ہے اور دنوں ہی کا معاملہ رہ گیا ہے''۔ ان کا اشارہ غالباً پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی جانب تھا.

سماجی روابط کی ویب سائٹ ٹویٹر پر بھی صدر زرداری کے ملک سے چلے جانے کے حوالے سے طرح طرح کی افواہیں گردش کررہی ہیں اور منگل کی رات یہ افواہ بھی پھیلائی گئی تھی کہ فوج نے اقتدار سنبھال لیا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس خبر کو پوسٹ کرنے والے نے اس کو واپس لے لیا۔

واضح رہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت کو اس وقت میمو اسکینڈل کی

وجہ سے آرمی، عدلیہ اور حزب اختلاف کی جانب سے سخت دباو کا سامنا ہے. صدر آصف زرداری پر یہ الزام عاید کیا جارہا ہے انھوں نے واشنگٹن میں سابق پاکستانی سفیر حسین حقانی کو مئی میں پاک آرمی کے خلاف امریکا کے سابق چیرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف ایڈمرل مائیک مولن کو ایک خط لکھا تھا جس میں ان سے سول حکومت کی مدد کے لیے کہا گیا تھا۔ گذشتہ قریباً چار سال کے دوران حکومت کی اپنی کارکردگی بھی کوئی اتنی قابل فخر نہیں رہی ہے۔اس وقت تمام حکومتی اداروں میں بدعنوانیوں کے قصے عام ہیں، مہنگائی روزافزوں ہے جس کی وجہ سے عوام بھی اس سے نالاں ہیں۔ حزب اختلاف کی بڑی جماعت مسلم لیگ نواز اور سابق کرکٹ لیجنڈ عمران خان کی قیادت میں تحریک انصاف حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔

پی پی پی کی حکومت کی کارکردگی سے اس کے مخالفین کے علاوہ اس کی اتحادی سمجھے جانے والی جماعتیں بھی ناخوش ہیں۔اس کی ایک اتحادی جماعت جمعیت علماء اسلام کے سینیٹر سابق وفاقی وزیر، اعظم سواتی نے بدھ کو پارٹی اور سینیٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک میں کرپشن، بے روزگاری، لاقانونیت اور مہنگائی کی وجہ سے وہ مستعفی ہو رہے ہیں کیونکہ ملک کو درپیش بحرانوں سے نمٹنے میں سینیٹ کا ادارہ اپنا کردار ادا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام اراکین پارلیمنٹ کو استعفیٰ دے دینا چاہیے

جرمنی ریڈیو ڈوچے ویلے کی ایک اور خبر میں صورتحال کا جائزہ کچھ یوں لیا گیا۔
زرداری کے مستعفی ہونے کی قیاس آرائیاں

میمو گیٹ' اسکینڈل سامنے آنے کے بعد 56 سالہ صدر زرداری اور ان کی حکومت' سیاسی مخالفین کی طرف سے مسلسل دباؤ میں ہے جو مبینہ مکتوب لکھنے کا جرم ثابت ہونے پر صدر اور امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی پر غداری کا مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اپوزیشن رہنما نواز شریف کی طرف سے عدالت عظمٰی میں دائر ایک آئینی درخواست بھی زیر سماعت ہے۔

منگل کو سینٹ کے چیئرمین فاروق نائیک نے صدر زرداری سے اسلام آباد میں ملاقات کی

پاکستان کے صدر آصف علی زرداری کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ دل کا معمولی دورہ پڑنے کے بعد وہ علاج کے لیے دبئی گئے ہیں جہاں اس وقت ایک اسپتال میں ڈاکٹر ان کی نگہداشت کر رہے ہیں۔ لیکن مقبولیت کھوتے پاکستانی صدر کی اچانک بیرون ملک روانگی کے بعد بدھ کو مقامی ذرائع ابلاغ میں تمام دن صدر کے مستعفی ہونے کی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔

صدر کو اتوار کے روز سینے میں اچانک درد محسوس ہوا اور ڈاکٹروں نے اسے ایک سنجیدہ معاملہ قرار دے کر انھیں علاج کے لیے فوری طور پر لندن یا دبئ جانے کا مشورہ دیا۔

تاہم ذرائع کے مطابق مختلف طبّی مسائل کا شکار آصف علی زرداری نے حسب معمول اس مرتبہ بھی اپنی بیماری کو معمولی مسئلہ قرار دے کر ڈاکٹروں کے مشورے کو نظر انداز کر دیا۔

لیکن جب انھوں نے اپنے تمام قریبی رفقا کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو بیرون ملک مقیم ان کے بچوں کو وطن واپس بلایا گیا تاکہ وہ اپنے والد کو علاج کے لیے بیرون جانے پر آمادہ کر سکیں جس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی۔

ایوان صدر کے ذرائع نے وائس آف امریکہ کو بتایا ہے کہ صدر زرداری کو دبئ روانہ کرنے کے بعد ان کے اکلوتے بیٹے اور حکمران پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو وطن میں رک گئے۔

وزیراعظم ہاؤس سے جاری ہونے والے ایک بیان میں بلاول کی پاکستان میں

موجودگی اور بدھ کو وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی سے ان کی ملاقات کی تصدیق کی گئی ہے اور اس بات کی بھی تصدیق کی گئی ہے کہ اپنے بچوں کے اصرار پر صدر زرداری علاج کے لیے دبئی جانے پر آمادہ ہوئے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ صدر کو لاحق عارضہ قلب کی وجہ سے ہونے والی تکلیف کے باعث وہ دبئی علاج کے لیے گئے ہیں اور اس وقت ان کی حالت مستحکم ہے۔ بیان کے مطابق ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ وطن واپس آ کر اپنے معمول کے فرائض انجام دیں گے۔

صدر زرداری کو چھ سال قبل بھی دل کا دورہ پڑا تھا جس کے بعد سے وہ باقاعدگی سے علاج کے لیے ادویات لے رہے ہیں۔

لیکن اس سے قبل ایوان صدر سے منگل کی شب جاری کیے گئے بیان میں کہا گیا تھا کہ پاکستانی صدر معمول کے طبّی معائنے کے لیے دبئی گئے ہیں۔

ان متضاد بیانات کے بعد ملک میں یہ قیاس آرائیاں زور پکڑنا شروع ہو گئیں کہ صدر زرداری مستعفی ہو رہے ہیں جس کی وجہ امریکی قیادت کو لکھا گیا ان سے منسوب میمو یا خط ہے جس کی تحقیقات کے لیے سپریم کورٹ نے ایک تفتیشی کمیشن قائم کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ ذرائع نے ان اطلاعات کو بھی مسترد کیا ہے کہ دبئی راونگی کے لیے صدر کو ایمبولینس میں جہاز تک لے جایا گیا بلکہ اس کے

برعکس مسٹر زرداری ائرپورٹ جانے کے لیے خود چل کر گاڑی میں بیٹھے۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ پاکستانی صدر کی حالت تشویش سے باہر ہے اور وہ چند روز تک دبئی اسپتال میں زیر علاج رہیں گے۔

میمو گیٹ' اسکینڈل سامنے آنے کے بعد 56 سالہ صدر زرداری اور ان کی حکومت' سیاسی مخالفین کی طرف سے مسلسل دباؤ میں ہے جو مبینہ مکتوب لکھنے کا جرم ثابت ہونے پر صدر اور امریکہ میں پاکستان کے سابق سفیر حسین حقانی پر غداری کا مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں اپوزیشن رہنما نواز شریف کی طرف سے عدالت عظمی میں دائر ایک آئینی درخواست بھی زیر سماعت ہے۔

گزشتہ ہفتے ایوان صدر کے ترجمان نے اعلان کیا تھا کہ عاشورہ کے بعد صدر زرداری پارلیمان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کریں گے جس میں وہ میمو گیٹ اسکینڈل اور پاکستانی فوجی چوکیوں پر نیٹو کے مہلک حملے پر اپنا موقف پیش کریں گے۔ ان کا یہ خطاب اب ملتوی کر دیا گیا ہے۔ان کی حکمران پیپلز پارٹی پر اس وقت بدعنوانی، ناقص انداز حکمرانی اور اقربا پروری کے الزمات روز مرہ کا معمول بن چکے ہیں جبکہ عدالت عظمی کے احکامات پر عملدرآمد میں حیل وحجت پر بھی ناقدین کی طرف سے کڑی تنقید کی جا رہی ہے۔

پیپلز پارٹی کی مقبولیت کے بارے میں کیے گئے گیلپ پاکستان کے حالیہ سروے میں 71 فیصد افراد نے موجودہ حکومت کے خاتمے کو ترجیح دی تھی۔پی پی پی کی مخلوط حکومت کے فوج کے ساتھ تعلقات میں تناؤ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں جبکہ اس وقت پاکستان اور امریکہ کے تعلقات بھی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ صدر زرداری اور ان کی جماعت پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت کو نومبر کے اوائل سے شدید سیاسی دباؤ کا سامنا ہے جس کی وجہ صدر سے منسوب امریکی قیادت کو بھیجا گیا مبینہ خط ہے جس میں پاکستان کی فوجی قیادت کی برطرفی کے لیے امریکہ سے مدد مانگی گئی تھی۔واشنگٹن میں سابق پاکستانی سیفر حسین حقانی پر الزام ہے کہ وہ اس خط کے مصنف تھے اور امریکی حکام تک اسے پہنچانے کا کام انھوں نے پاکستانی نژاد امریکی شہری منصور اعجاز کو سونپا تھا۔ لیکن حسین حقانی اور وزیراعظم گیلانی کی حکومت ان الزامات کر رد کر چکے ہیں اور پارلیمان کی کمیٹی برائے قومی سلامتی کو اس پورے معاملے کی تفتیش کا کام سونپا گیا ہے۔

لیکن اسی اثنا میں اپوزیشن رہنما نواز شریف نے میمو گیٹ اسکینڈل کی تحقیقات کروانے کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کر رکھا ہے جس پر اپنے ابتدائی حکم میں عدالت عظمیٰ نے تمام فریقین کو تحریری بیانات داخل کرنے کے لیے 15 دن کی

مہلت دے رکھی ہے جو 16 دسمبر کو پوری ہو گی۔اس درخواست میں نواز شریف نے صدر زرداری، حسین حقانی، وفاق، آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل احمد شجاع پاشا کو فریق بنا رکھا ہے۔

ادھر برسلز میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی وزیر خارجہ ہلری کلنٹن نے توقع ظاہر کی ہے کہ صدرزرداری صحت یاب اور جلد وطن واپس جاکر اپنی ذمہ داریاں دوبارہ سنبھال لیں گے صدر زرداری دبئی کے ایک اسپتال میں زیرعلاج ہیں، وہ کئی دیگر بیماریوں میں بھی مبتلا رہے ہیں جس میں ریڑھ کی ہڈی کی سنگین تکلیف، ذیابیطس، بلند فشار خون، جذباتی عدم استحکام، یادداشت اور ارتکاز کا مسئلہ، انشقاق ذہنی، انتشار و ذہنی افسردگی شامل ہیں، صدر مملکت منگل کو دل کی تکلیف میں مبتلا ہوئے جب انہیں چند روز بعد اپنے اعلان شدہ شیڈول کے مطابق پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنا تھا اور میمو اسکینڈل پر سپریم کورٹ کو جواب بھیجنا تھا۔ صدر زرداری کی بیماریوں کے حوالے سے قومی و بین الاقوامی میڈیا میں کئی برسوں سے مختلف خبریں آتی رہی ہیں، ان رپورٹس کے علاوہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے خود اپنی کتاب میں اپنے شوہر کی خراب صحت کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ تقریباً مرچکے تھے، آصف زرداری کے صدارتی الیکشن کے موقع پر روزنامہ فنانشل ٹائمز نے پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین کے ہیلتھ سرٹیفکیٹ کی دستاویزی تفصیلات شائع کی تھیں جو

مختلف عدالتوں میں جمع کرائے گئے تھے، سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی آخری کتاب میں انکشاف کیا تھا کہ آصف زرداری شدید بیمار شخص ہیں ان کی زندگی خطرے میں تھی جب 2005 میں نیویارک کے اسپتال میں ان کا علاج شروع ہوا تھا، بے نظیر بھٹو نے اپنی کتاب "ری کنشلشن۔ اسلام۔ ڈیموکریسی اینڈ ویسٹ" میں رقم کیا تھا کہ ان کے شوہر کی صحت ٹھیک نہیں، صفحہ 224 پر شہید وزیراعظم لکھتی ہیں کہ جب 2005 میں میرے شوہر دبئی میرے اور میرے بچوں کے پاس آئے تو وہ ایک" ڈاکٹر کے بقول دل کے جان لیوا حملے کے قریب تھے۔"آصف علاج کے لئے نیویارک چلے گئے، میں ہر تیسرے ہفتے انہیں دیکھنے امریکا جاتی تھی، سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے تکلیف ہو گئی اور میرے گھٹنے کا آپریشن ہوا، جب میں اس وقت کے دوران اپنی والدہ کی بیماری کو دیکھتی ہوں تو وہ 2003 میں تقریباً مرنے کے قریب تھیں اور 2005 میں شوہر کی بیماری کو دیکھتی ہوں تو وہ بھی مرنے کے قریب تھے۔ 25اگست 2008 کو فنانشل ٹائمز نے ڈاکٹروں کی جمع کردہ دستاویزات کے حوالے سے خبر دی تھی کہ پاکستان میں صدارت کے اہم ترین امیدوار آصف علی زرداری سال گزشتہ سے سنگین نفسیاتی مسائل میں مبتلا رہے ہیں، ان کی دو سال کی طبی رپورٹس میں بتایا گیا ہے کہ ذہنی انتشار اور دماغی عدم توازن کے امراض کی تشخیص کی گئی تھی۔ اخبار نے عدالتی دستاویز کے حوالے سے بتایا تھا کہ نیویارک شہر کے ایک ماہر نفسیات فلپ سالٹیل نے مارچ 2007 میں تشخیص کی تھی، آصف زرداری کی اسیری نے انہیں جذباتی عدم استحکام

اور یادداشت وار تکار کی بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نے عدالت کو لکھا تھا کہ وہ کم از کم ایک سال تک زرداری کی ذہنی صحت میں بہتری کی پیشگوئی نہیں کر سکتا۔

نیویارک کے ایک اور ماہر نفسیات اسٹیفن ریچ کے حوالے سے اخبار نے بتایا تھا کہ آصف زرداری کو اپنی اہلیہ اور بچوں کی تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں، وہ مسلسل خوفزدہ" ہیں اور خودکشی سے متعلق سوچتے ہیں۔" "آصف زرداری نے اپنی طبّی دستاویزات کو انگلش ہائی کورٹ (اب کالعدم) میں کیس کی سماعت ملتوی کرانے کے لئے کامیابی سے استعمال کیا جہاں حکومت پاکستان نے ان پر مبینہ بدعنوانی پر مقدمہ دائر کیا تھا، یہ کیس سرے محل کے حوالے سے تھا۔

متحدہ عرب امارات کے ایک اخبار نے صدر زرداری کے ساتھی کے حوالے سے دعویٰ کیا ہے کہ صدر ابھی چند ہفتے وطن واپس نہیں آئیں گے۔ اخبار کا کہنا ہے کہ صدر کو اگرچہ آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے تاہم وہ ابھی چند ہفتے ڈاکٹروں کی زیر نگرانی رہیں گے۔ واضح رہے کہ صدر کی بیماری کے حوالے سے ملک میں کئی طرح کی چہ مگوئیاں کی جارہی ہیں۔

اس بارے میں صدر کی ہمشیرہ فریال تالپور کا کہنا ہے کہ صدر کی طبیعت بہتر ہے اور چند دن میں واپس آجائیں گے جبکہ ایوان وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ صدر

ڈاکٹروں کی اجازت کے بعد ہی وطن واپس آئیں گے۔ ڈاکٹر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ کسی اِنسان پر لگائے جانے والے الزامات کا بھی اِنسانی دل و دماغ پر نہایت شدید اثر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِنسان جلد یا بدیر امراضِ قلب یا اعصابی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص بڑا اور طاقتور ترین کیوں نہ ہو وہ بھی اندورنی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا ضرور شکار ہو جاتا ہے۔ صدر زرداری بھی گوشت پوشت کے آدمی ہیں۔ جو سینے میں ایک حساس دل رکھتے ہیں۔ ان خبروں نے ان کے دل اور اعصاب پر ایسا اثر ڈالا کہ صدر یکایک عارضے قلب میں مبتلا ہو کر اپنا دل تھام کر راتوں رات اپنے معالجین کے ہمراہ دبئی روانہ ہو گئے۔ صدر کی حالت طبّی لحاظ سے تو بہتر ہے مگر سیاسی اعتبار سے خراب کے اشارے ہیں۔ امریکی انتظامیہ بھی صدر کی اِس اچانک بیماری سے پریشان ہے اور اِس نے بھی وائٹ ہاوس میں امریکی تھنک ٹینک کے ہمراہ صدر زرداری کی بیماری کے بعد کی پیدا ہونے والی صورتحال پر غور وخوص کرنا شروع کر دیا ہے۔

دوسری جانب ایک امریکی جریدے فارن پالیسی میں مضمون نگار جوش راگن نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ صدر آصف علی زرداری میموگیٹ اسکینڈل پر شدید دباو میں ہیں اور طبّی بنیادوں پر صدارت کے عہدے سے مستعفی ہو سکتے ہیں اور ساتھ ہی اِس جریدے نے یہ بھی لکھا ہے کہ امریکی حکومت میں یہ سوچ بڑی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے کہ کیا صدر زرداری اپنے سنگین ہوتے معاملات میں سے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکل جانے کا کوئی بہانہ یا راستہ تلاش کر رہے ہیں جریدہ لکھتا ہے کہ امریکی

انتظامیہ کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ صدر کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور اب یہ صرف کچھ وقت کی بات ہے اور اِس کے ساتھ ہی امریکی جریدے نے بلا حیل وحجت یہ بھی دعوی کیا ہے کہ امریکی انتظامیہ کی پاکستانی حکام سے اِن ہاوس تبدیلی کے آپشن پر بھی بات چیت جاری ہے۔

ایسے میں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے صدر آصف علی زرداری کا بھی سخت ترین امتحان شروع ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بیماری اور اپنی عہدے صدارت کے حوالے سے اپنی صفائی میں واپس پاکستان آکر کیا کچھ کہنا چاہیں گے۔

امریکہ نے پاکستان میں فوج کے اقتدار میں آنے کی افواہوں کو رد کر دیا ہے۔ واشنگٹن حکام کا یہ مؤقف پاکستانی صدر آصف علی زرداری کی بیماری کی خبروں پر ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا ہے۔ وائٹ ہاؤس کے ترجمان جے کارنی نے بدھ کو کہا: "ہم نے رپورٹیں دیکھی ہیں۔ ہم ان کی صحت کی جلد بحالی کی امید کرتے ہیں۔"

امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان مارک ٹونر سے جب پوچھا گیا کہ کیا پاکستانی صدر کے خلاف خاموش بغاوت کے عمل پر امریکہ کو پریشانی ہے تو انہوں نے کہا کہ ایسی قیاس آرائیوں پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی ایسی

کوئی تشویش ہے۔ خبر رساں ادارے اے ایف پی کے مطابق ان کے قریبی ساتھیوں نے اس باتوں کو خارج از امکان قرار دیا ہے کہ صدر استعفی دے دیں گے۔

اثاثوں کی سیاست

پاکستان سیاست دانوں اور مقتدر شخصیات کے لیئے لوٹ سیل ہے۔ جہاں وہ دونوں ہاتھوں سے اس ملک کے وسائل اور قومی دولت لوٹ رہے ہیں۔ اس لوٹ مار میں سب شریک ہیں، پاکستان میں سیاست دانوں کے اثاثے دن دگنی رات چوگنی رفتار سے بڑھ رہے ہیں ۔ ایسے میں کوئی اگر ان اثاثوں اور اس دولت کے بارے میں سوال کرلے جو اس ملک سے لوٹ کر بیرون ملک لے جائی جارہی ہے تو اخبارات میں ایک شور مچ جاتا ہے۔ سیاست دانوں کی کرپشن اور بدعنوانیوں پر پہلا وار ایوب خان نے مارشل لاء کے دور میں کیا اور ایبڈو کا قانون بنا کر سیاست دانوں کو سیاست سے باہر کیا۔ ضیاء الحق کے دور میں بھی سیاست دانوں کی کرپشن کو اچھالا گیا۔ لیکن اس دور مین جو کرپشن اور اثاثے بنائے گئے، اس پر کوئی بات نہ کرسکا۔ آج بہت سے جرنیلوں کے بیٹے سیاست دان بنے بیٹھے ہیں۔ بہت سے تاجر اور صنعت کار اس کاروبار سیاست میں آگئے کہ بازار میں یہی کاروبار سب سے اچھا ہے۔

ایک دور وہ تھا جب ہمارے سیاستدان اپنے اثاثے فروخت کرکے عوام کی خدمت اور سیاست کیا کرتے تھے کیونکہ ان کے پاس کاروبار کیلیئے وقت نہیں ہوتا تھا اور ایک دور یہ آیا ہے جہاں سیاستدان سیاست کی آڑ میں دھڑا دھڑ اثاثے بنانے

میں مصروف ہیں۔ سرمایہ داروں نے تجارت کی طرح سیاست کو بھی یرغمال بنالیا ہے اب کوئی عام آدمی قومی یا صوبائی اسمبلی میں جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا کیونکہ اب سیاست کو ایک منفعت بخش کاروبار بنادیا گیا ہے۔ ماضی میں سیاستدان اپنے ووٹرز کے کام کیلئے خود ساتھ چلتے اور اپنے ذاتی وسائل استعمال کیا کرتے تھے جبکہ اب اگر کسی کا کوئی جائز یا ناجائز کام کرنا ہو تو اس سے پہلے معاملہ طے کیا جاتا ہے۔ اندرون ملک سمیت اوورسیز سے پارٹی فنڈ کے نام پر کروڑوں اور اربوں روپے اکٹھے ہوتے ہیں جو پارٹی سربراہان کے نجی اکاؤنٹ میں چلے جاتے ہیں اور سیاسی پارٹیوں کی مختلف تقاریب کیلئے ارکان اسمبلی اور عہدیداران سے الگ چندہ لیا جاتا ہے۔ قومی و صوبائی اسمبلی کیلئے پارٹی ٹکٹ کے امیدواروں سے درخواست کے ساتھ فی کس ہزاروں اور پارٹی فنڈ کے نام پر کروڑوں روپے ناقابل واپسی وصول کئے جاتے ہیں۔ ٹکٹ اور پارٹی عہدے کے خواہشمند افراد پارٹی لیڈر کی خدمت میں قیمتی گاڑیوں، گھڑیوں اور آئی فون سمیت مختلف تحائف پیش کرتے ہیں مگر ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ سیاستدانوں کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی ان سے ان کی آمدنی یا اثاثوں کے بارے میں سوال کرے یا ان پر انگلی اٹھائے۔ پاکستان کی اربوں کھربوں ڈالر کی دولت بیرونی بنکوں میں پڑی ہے۔ اس وقت کا حقیقی چیلنج بیرون ملک اثاثوں کی ہمارے ملک میں منتقلی ہے۔ ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں، ججوں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس کے بیرون ملک بڑے پیمانے پر کاروبار ہیں اور ان کا سرمایہ بھی بیرونی بنکوں میں پڑا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو

پاکستان کی قومی معیشت کی رگ رگ سے لہوکاایک ایک قطرہ نچوڑ کر جمع کی گئی ہے۔
ان سیاست دانوں اور حکمرانوں کی حکومت اور سیاست پاکستان میں مگر تجارت پاکستان سے باہر ہے۔ یہ تجارت ان ملکوں میں کرتے ہیں جو دوستی کی آڑ میں ہمارے ساتھ دشمنی نبھاتے ہیں۔

پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کے اثاثوں اور گوشواروں سے متعلق تفصیلات کا اعلان کرکے ایک نئی روش کو اپنایا ہے۔ عمران خان نے سال 2011ء کے دوران محض سوا3 لاکھ روپے کا ٹیکس جمع کرایا جو پچھلے سال کے مقابلے میں 15 لاکھ روپے کم ہے جبکہ قابل ٹیکس آمدنی صرف 5 لاکھ 46 ہزار620 روپے ظاہر کی گئی ہی، عمران خان نے گھریلو اور ذاتی اخراجات 66 لاکھ 7 ہزار170 روپے بتائی، اسلام آباد میں 2 مکان ظاہر کیے ہیں جس میں سے ایک کی مالیت ظاہر نہیں کی گئی، غیر ملکی اکاونٹس میں ایک لاکھ 83 ہزار201 ڈالر، ایک ہزار 230 پاونڈزاور 92 ہزار 62 یوروشامل ہیں، 50 لاکھ کی پراڈو، 825 کنال کی زرعی زمین کے بھی مالک ہیں،
عمران خان کی طرف سے اپنے بچوں کے نام کوئی جائیداد اور اثاثے ظاہر نہیں کیے گئے۔ انکم ٹیکس گوشوارے میں عمران خان کی طرف سے بچوں کی تعلیم پر اخراجات کی مد میں کوئی رقم ظاہر نہیں کی گئی اور نہ ہی کلب ممبر شپ فیس کی مد میں کوئی اخراجات ظاہر کیے گئے ہیں۔تاہم ویلتھ اسٹیٹمنٹ میں عمران خان کی طرف سے اپنے بچوں کے نام کوئی جائداد اور

اثاثے ظاہر نہیں کیے گئے۔ عمران خان کی طرف سے ویلتھ اسٹیٹمنٹ میں اپنے اثاثہ جات کی مجموعی مالیت 3 کروڑ 94 لاکھ 12 ہزار 312 روپے ظاہر کی گئی۔ پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے اپنے تمام اثاثے ظاہر کرتے ہوئے ملک کے دیگر سیاست دانوں سے بھی ایسا کرنے کا مطالبہ کیا۔ عمران خان نے اپنے اثاثہ جات ڈکلیئر کرکے بہت سے سیاست دانوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ عمران خان نے اپنے اثاثوں کی ڈکلیئریشن کے وقت صدر آصف زرداری اور میاں نواز شریف کو چیلنج کیا تھا

۔ صدر زرداری تو ابھی تک اس بارے میں خاموش ہیں۔ دوسری جانب مسلم لیگ نون کے رہنما احسن اقبال نے کہا ہے کہ عمران خان اثاثوں کا شور مچا کر قومی ایشوز سے قوم کی توجہ ہٹانا چاہتے ہیں۔ احسن اقبال کا کہنا تھا پاکستان کا ایشو اس وقت اثاثے نہیں، پاکستان کو اس وقت دیگر کئی اہم مسائل کا سامنا ہے۔ اگر عمران خان اثاثوں کے معاملے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو عدالت میں جائیں ہم بھی آئیں گے۔ احسن اقبال کا کہنا تھا کہ نواز شریف اور شہباز شریف نے 2007 کے الیکشن میں اپنے اثاثے ظاہر کردیے تھے۔ عمران خان اس معاملے میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں، قائد حزب اختلاف چوہدری نثار علی خان نے تو اس بارے میں اسلام آباد میں ایک جوابی پریس کانفرنس کر دی اور عمران خان کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے الزام لگایا کہ انھوں نے آدھی زندگی ٹیکس ادا نہیں کیا ہے اور ان کی الیکشن کمیشن میں جمع کرائی گئی اثاثوں کی تفصیلات بھی متنازعہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عمران خان

نے جو اثاثے ظاہر کیے ہیں وہ اتنے نہیں ہیں کہ اس سے سیاسی جماعت چلائی جاسکے۔

چوہدری نثار نے کہا کہ ان کی جماعت کا مطالبہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتوں کے اراکین کے اثاثوں کی غیر جانبدارانہ چھان بین کرائی جائیں۔ انھوں نے اس بارے میں ،،نہ نو من تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی کے مصداق یہ عجیب شرط رکھی کہ " جو جو جماعتیں ہیں اس وقت جو حقیقی شفافیت سے نظام کو چلانا چاہتی ہیں سپریم کورٹ سے درخواست کریں کہ وہ ایک خصوصی بینچ یا ٹریبونل بنائے جو تمام پارٹی لیڈر کے اثاثہ جات کی چھان بین کرے "۔

دوسری جانب میاں نواز شریف کے بھائی اور وزیراعلیٰ پینجاب میاں شہباز شریف نے اپنے اور اہل خانہ کے اثاثے ڈکلیئر کرکے ایک سوال کھڑا کردیا ہے، اگر وہ اثاثے کا اعلان کرسکتے ہیں تو مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں نواز شریف کو اس میں کیا مشکل ہے۔

میاں شہباز شریف نے اپنے اور اپنے بیٹوں حمزہ شہباز اور سلمان شہباز کے اثاثے بھی ظاہر کئے ہیں۔ وہ اپنی نئی نسل کو اس میدان میں اتارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے میں نواز شریف کو اپنی بیٹی مریم کو سیاست میں لانا پڑا ہے۔ یہ سیاست دان کیا یہاں تو ہر شخص جو دولت رکھتا ہے۔ احتیاط اور حفاظتی تدابیر کے تحت اپنے بیوی بچوں یا عزیز و اقارب کا نام استعمال کرکے اثاثے چھپاتا ہے۔ سیاست دان اتنے سادہ نہیں ہے جو وہ اپنا سب کچھ اپنے نام پر رکھیں گے۔جہاں حکمرانوں اور منتخب عوامی نمائندوں کو یہ فن

آتا ہو کہ اپنے اثاثوں کو کس طرح چھپانا یا کم ظاہر کرنا ہے وہاں اثاثے ظاہر کرنے کی پابندی ایک سیاسی شعبدہ بازی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے عوام کو تو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے مگر منجھے ہوئے سیاستدانوں کو ہراساں یا بلیک میل نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کو ٹیکس سمیت مختلف قانونی پیچیدگیوں سے بچاؤ کیلئے اکاؤنٹس میں ہیر پھیر کرنے میں مہارت رکھنے والے افراد کی خدمات دستیاب ہیں۔ ہمارے سیاست دان تو مقروض اور غریب ہیں جو انکم ٹیکس بھی ادا کرنے کے قابل نہیں۔ ان کی تو ایدھی والوں کو زکواۃ سے مدد کرنی چاہیے انتخابات میں ہونیوالے بھاری اخراجات تو ان کے دوست احباب یا مریدوں کی طرف سے پورے کیئے جاتے ہیں۔

برطانوی اخبار لندن پوسٹ نے اپنی ایک رپورٹ میں پاکستان کی ان سیاسی و غیر سیاسی شخصیات کی نشاندہی کی تھی جنہوں نے 8 کھرب ڈالر کے اثاثے بیرون ملک منتقل کر رکھے ہیں اخبار نے ان افراد حوالے سے جن میں آصف زرداری، نواز شریف، اسفند یار ولی، رحمان ملک، چند جرنیل، بیوروکریٹس اور تاجر شامل ہیں سنسنی خیز انکشافات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نام نہاد اشرافیہ کی اس مختصر سی اقلیت نے پاکستان کو غیر ملکیوں کے آگے یرغمال بنا رکھا ہے تاکہ ان کے اثاثوں، جائیدادوں، غیر ملکی شہریت اور گرین کارڈز کو تحفظ حاصل رہے۔ اخبار نے گارڈین میں میں شائع ہونے والی ایک پرانی رپورٹ کے حوالے سے

لکھا ہے کہ پاک فوج کے بعض جرنیلوں کی ذاتی دولت 35 ملین پاؤنڈ کے لگ بھگ ہے جو پاک کرنسی میں ساڑھے تین ارب سے زائد ہے چند سال پہلے تک زرداری اور بینظیر بھٹو کے اثاثوں کی مالیت 2ارب ڈالر کے قریب تھی جو اب زرداری کو منتقل ہو چکے ہیں رپورٹ کے مطابق بینظیر کے 26 غیر ملکی بینک اکاؤنٹس تھے 14 جائیدادیں تھیں جن میں سرے محل اور کچھ فارمز اور لگژری اپارٹمنٹ شامل تھے ان کی مالیت ایک کھرب پاؤنڈ سے زائد بنتی ہے۔اسپین میں بھی بینظیر بھٹو کی دو آف شور کمپنیوں اور ایک ولا کا سراغ لگایا گیا تھا ان میں شارجہ سے تعلق رکھنے والی دو کمپنیوں پیٹرو لائین اور ٹمپو گلوبل اور چھ بینک اکاؤنٹس منجمند کردیئے گئے تھے یہ کارروائی وفاقی احتساب بیورو کی درخواست پر کی گئی تھی 5لاکھ یورو کی مالیت کا ولا جو بینظیر اور ان کے تین بچوں بلاول ، بختاور آصفہ کے نام پر تھا اسپین کے صوبے ویلشیا کے ہائیکورٹ کے حکم پر منجمند کر دیا گیا تھا پیٹرو لائن کمپنی مبینہ طور پر بینظیر بھٹو ، ایف آئی اے کے سابق ڈائریکٹر جنرل رحمان ملک اور حسن علی جعفری کی ملکیت تھی جو 2000ء میں کثیر سرمائے سے قائم کی گئی تھی لندن پوسٹ کے مطابق نواز شریف کا جاگیردار طبقے سے کوئی تعلق نہیں ان کا خاندان امرتسر کے قریب قصبے جاتی عمرہ سے ہجرت کرکے لاہور آیا اور یہاں وہ 1960تک درمیانے درجے کی تین فیکٹریوں آئرن فاؤنڈری ، برف خانہ اور واٹر پمپ فیکٹری کے مالک بنے جس میں بلاشبہ پورے خاندان کے محنت شامل تھی مگر جنرل ضیاء الحق کے دور میں ان

کے والد میاں شریف مرحوم نے سابق گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی تک رسائی حاصل کر لی اسطرح وہ چکن فارم میں داخل ہوگئے اور ان کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں نے سونے کے انڈے دینے شروع کر دیئے 1983 میں نواز شریف کو پنجاب کا وزیر خزانہ بھی مقرر کر دیا گیا 1981 میں ان کے اتفاق گروپ کی آمدنی 337 ملین روپے تھی جو میں کم از کم 2500 ملین تک جا پہنچی صرف 6 سال کے عرصے میں اتفاق نجی 1987 شعبے میں پاکستان کا امیر ترین انڈسٹریل گروپ بن گیا۔ دولت کی اتنی فراوانی کوئی معجزہ نہیں تھی کہ جسکے تحت یہ اربوں کے اثاثے بنا لئے، اخبار نے لکھا ہے کہ پاکستان میں سیاست بھی کوئی برابزنس نہیں ہے اس میں سرمایہ کاری کرنے والے کی دولت میں اندازوں سے کہیں زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے موجودہ وزیر داخلہ رحمان ملک نے زرداری کے تحفظ کیلئے میاں نواز شریف اور ان کے خاندان کی کرپشن کے بارے میں صفحات کی جو رپورٹ تیار کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ شریف فیملی نے 200 کاروباری مقاصد کیلئے پاکستانی بینکوں سے 6 کروڑ 60 لاکھ ڈالر کے قرض لئے اور انہیں غیر قانونی طور پر فارن ایکسچینج میں تبدیل کرالیا، رپورٹ کے مطابق نواز شریف نے لندن میں دو کمپنیوں نسکول اور نیلسن انٹرپرائزز کے توسط سے جائیدادیں خریدیں جن کی ادائیگی لاہور کے ایک فرضی بینک اکاؤنٹ سے کی گئی۔ انہوں پارک لین کے علاقے میں ایون ڈیل ہاؤس میں 4 فلیٹ خریدے جن کی مالیت ساڑھے سات کروڑ سے زائد بتائی جاتی ہے اس وقت ان فلیٹوں کی مالیت 4 گنا بڑھ گئی ہے۔

صدر مملکت آصف علی زرداری کے اثاثوں کی مالیت کے حوالے سے نیب کے دعووں اور ان اعداد و شمار میں زمین آسمان کا فرق ہے جو پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین نے خود 7-1996ء میں ظاہر کئے تھے۔ نیب نے سپریم کورٹ میں جو رپورٹ پیش کی ہے اس کے مطابق مسٹر زرداری کے اثاثوں کی مجموعی مالیت 1.7 ارب ڈالرز (140 ارب روپے) ہے لیکن مسٹر زرداری نے 1996-97ء میں اپنے اثاثوں کی مالیت صرف ایک لاکھ 51 ہزار 190 امریکی ڈالرز (12.7 ملین روپے) بتائی تھی۔ اسی سال مسٹر زرداری نے صرف 9 ہزار 191 روپے انکم ٹیکس ادا کیا اور انہوں نے اپنی آمدنی 4 لاکھ 95 ہزار 44 روپے بتائی تھی۔ ذرائع کے مطابق 1996-97ء میں مسٹر زرداری اور شہید بینظیر بھٹو کے مشترکہ اثاثوں کی مالیت انہوں نے خود تقریباً 31 ملین روپے بتائی تھی۔ قصر صدارت کے ترجمان فرحت اللہ بابر اس موقف کو دہراتے ہیں کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں اور کھوکھلی معلومات پر مبنی ہیں۔۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا وہ میڈیا کو اس بات سے آگاہ کریں گے کہ آج اور اس وقت صدر زرداری کی دولت اور اثاثوں کی مالیت کیا ہے، تو انہوں نے کہا کہ اگر قانونی طور پر اس کی ضرورت پیش آئی تو وہ ایسا کریں گے بصورت دیگر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت کے دو وفاقی وزراء، قمر زمان کائرہ اور بابر اعوان نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے صدر زرداری کے ان اثاثوں کے حوالے سے نیب کے دعووں کی تردید کی تھی جن کی فہرست عدالت

عظمیٰ میں اسی روز پیش کی گئی تھی۔ دونوں وزراء اور پیپلز پارٹی کے ترجمان نے بڑی ہی آسانی سے آصف علی زرداری کے 60 ملین ڈالرز (500 ملین روپے) مالیت کے ان مصدقہ اثاثوں پر تبصرے سے گریز کیا جو 1996ء میں جنیوا میں سٹی بینک نے منی لانڈرنگ کے الزامات کے تحت منجمد کردیئے تھے جنہیں این آر او کی وجہ سے بحال کردیا گیا۔ اس اکاؤنٹ کی موجودگی سے کسی نے انکار نہیں کیا لیکن کسی نے بھی اس بات کی وضاحت پیش نہیں کی کہ یہ اثاثہ کہاں سے آیا، کس طرح جمع یا منتقل کرایا گیا اور اس رقم پر کوئی ٹیکس دیا گیا تھا یا نہیں۔ نیب ذرائع کا کہنا ہے کہ صدر زرداری اور شہید بینظیر بھٹو کی جانب سے 1992 سے 1997ء تک جمع کرائے گئے ٹیکس کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کے پاس معمولی اثاثے اور درمیانی آمدنی تھی۔ آصف علی زرداری کی جانب سے 1992-93 سے 1996-97ء تک ظاہر کی گئی دولت اور ادا کئے گئے انکم ٹیکس کے حوالے سے ذرائع کا کہنا ہے کہ مسٹر زرداری نے 1992-93، 1993-94، 1994-95، 1995-96 اور 1996-97ء میں اپنی آمدنی ترتیب وار ایک لاکھ 20 ہزار 318 روپے، ایک لاکھ 42 ہزار 947 روپے، تین لاکھ تین ہزار 163 روپے، چار لاکھ 17 ہزار 212 روپے اور چار لاکھ ہزار 44 روپے بتائی تھی۔ انہی ذرائع کا کہنا تھا کہ شہید بینظیر بھٹو نے 1996- 95 97ء میں جب 8 ہزار 152 روپے کا انکم ٹیکس جمع کرایا تھا تو اس وقت انہوں نے اپنی آمدنی 4 لاکھ 39 ہزار 62 روپے ظاہر کی تھی۔ قانون کے مطابق ویلتھ ٹیکس ریٹرن جمع کراتے وقت پاکستان اور پاکستان سے

باہر اثاثوں کی مکمل تفصیلات ظاہر کرنا ہوتی ہیں۔ صدر زرداری نے 1993-94ء میں اپنے اثاثوں کی مجموعی مالیت 3.8 ملین روپے ظاہر کی تھی۔ 1994-95ء میں انہوں نے بتایا کہ ان کے اثاثے بڑھ کر 12 ملین روپے ہوگئے جبکہ 1995-96ء اور 1996-97ء میں مجموعی طور پر جو رقم ظاہر کی گئی وہ ترتیب وار 10.8 ملین اور 12.76 ملین روپے تھی۔ نیب ذرائع نے کہا کہ سابق وزیر اعظم بینظیر بھٹو کی جانب سے 1993-94ء میں بتایا گیا تھا کہ ان کے پاس 4.5 ملین روپے، 1994-95ء میں 14.2 ملین روپے، 1995-96ء میں 16.5 ملین روپے جبکہ 1996-97ء میں 18.7 ملین روپے کے اثاثے ہیں۔ ملکی قانون کے مطابق ارکان پارلیمنٹ کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر سال الیکشن کمیشن کو اپنے اثاثوں کی مالیت بتائیں، جو عوامی معلومات ہوتی ہے اور میڈیا اس کا جائزہ لے سکتا ہے۔ پاکستان میں اثاثوں کی سیاست کو سیاسی مخالفین کم علمی قرار دے کر مسترد کرتے آئے ہیں۔ یہاں بنکوں اور مالیاتی اداروں سے نہاد اشرافیہ کو قرض جاری کیا جاتا ہے اور بعد میں معاف کردیا جاتا ہے۔ اس وقت پاکستان کا خزانہ تقریباً خالی ہے جبکہ ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں اور کاروباری شخصیات کی تجوریاں لبالب بھری ہوئی ہیں۔ کیونکہ انہیں پاکستان کی قومی معیشت نہیں اپنے نجی کاروبار کی مضبوطی اور ترقی عزیز ہے۔ پنجاب کے وزیر قانون پنجاب رانا ثناء اللہ تو یہاں تک کہہ گئے کہ عمران خان نے جعلی اثاثے دکھا کر عوام کو گمراہ کیا ہے۔ اور یہ کہ،، یہودی لابی کیلئے کام کرنیوالا نام نہاد لیڈر ملکی ایشوز سے عوام

وحکمران کی نظر ہٹانا چاہتا ہے،، ہمارے سیاست دان کہتے ہیں کہ یہ سوال نہیں کرنا چاہیئے کہ کتنی دولت ہے؟کتنا خرچ کیا؟کتنا ٹیکس جمع کرایا؟ لیکن عوام یہ سوال اگر زبان پر نہیں لاتے تو دل میں وہ یہ ضرور سوال کرتے ہیں کہ یہ سیاست دان اپنے اثاثوں کی ڈکلیئریشن کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت ضرور کریں کہ انہوں نے یہ اثاثہ جات کس طرح بنائے اوروہ بیرون ملک کی بجائے پاکستان میں کاروبار کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں مقتدر طبقات کو اختیارات سے تجاوزاوران کاناجائزاستعمال کرنے کی بری عادت ہے۔ بجٹ بنانے والے اپنی معلومات کو نہ صرف اپنے کاروبارکیلئے استعمال کرتے ہیں بلکہ اپنے عزیز واقارب کو بھی مستفید کرتے ہیں۔ حکمران اور سیاستدان اپنے عہدے اور اثرورسوخ کے بل پراپنا کاروبار خوب چمکاتے ہیں اور کروڑوں کی جائیداد کوڑیوں کی قیمت پر خرید لی جاتی ہے۔ پھر وہاں شاہراؤں سمیت ترقیاتی منصوبوں کاجال بچھانے کیلئے قومی وسائل کارخ اپنے محلات اور فارم ہاؤسز اورانڈسٹریز کی طرف موڑدیاجاتا ہے۔ ایسے حالات میں چند درویش صفت سیاست دان ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان کی ملکیت صرف ایک سو گز کا ایک مکان ، اللہ، رسول اور قرآن سے محبت ہے۔ یہ جماعت اسلامی کے امیر سید منور حسن ہیں جنھوں نے راولپنڈی میں جلسہ عام میں یہ اعلان کرکے قوم کو یہ بتادیا ہے کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

پاکستان پر سب کی نظر

میموگیٹ، دہشت گردی، ایبٹ آباد حملہ، پاک امریکہ تعلقات پر بیرونی ذرائع ابلاغ کی رپورٹیں۔ پاکستان پر سب کی نظر

یہ گزشتہ اکتوبر کی بات ہے کہ پاکستان کے دفتر خارجہ نے ایک مختصر وضاحت جاری کی۔ جو کچھ اس طرح تھی۔،، دفتر خارجہ نے ایک پرائیویٹ شخص کے ذریعے ایک مبینہ پیغام واشنگٹن بھجوانے کے متعلق اخبارات میں شائع ہونے والی بعض خبروں کے حوالے سے کہا ہے کہ برطانوی اخبار فنانشل ٹائمز میں مبینہ پیغام کے متعلق شائع ہونے والی خبر قطعی بے بنیاد ہے اور اس پر تبصرے بلاجواز' غیر ضروری اور قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ دفتر خارجہ کے ترجمان نے جمعہ کو اپنے بیان میں کہا کہ کسی غیر ملکی حکومت کو پیغام پہنچانے کیلئے ایک پرائیویٹ شخص کی خدمات حاصل کرنا پیغام رسانی کے مروجہ سرکاری ذرائع کی نفی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس فرضی کہانی میں بیان کئے گئے دعووں کی کوئی ساکھ نہیں ہے اور انہیں سختی سے مسترد کیا جاتا ہے۔،، کسی کو نہیں پتا تھا کہ یہ چھوٹی سی خبر پاکستانی سیاست میں ایک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اس خبر سے نہ صرف امریکہ یں پاکستانی سفیر حسین حقانی کو اپنے منصب سے ہاتھ دھونے

پڑیں گے بلکہ پاکستان کی جموری حکومت کے چل چلاؤ کا کڑا وقت آ جائے گا۔ اور ایک دن ایسا آئے گا کہ پاکستانی سفیر عدالت عالیہ کے سامنے کھڑے کہہ رہے ہوں گے۔ مائی لارڈ،، میمو کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، ملکی مفاد کیخلاف کوئی کام نہیں کیا، میمو لکھا نہ لکھوایا، دیکھا نہ بھجوایا، مجھے میمو کے معاملے میں غلط طور پر ملوث کیا گیا، اللہ کا نام لے کر جو کہوں گا سچ کہوں گا، پیشے کے اعتبار سے سکالر ہوں، اپنا بیان سابق سفیر کی حیثیت سے دے رہا ہوں، اس وقت میرا عارضی پتہ وزیر اعظم ہاؤس ہے۔ میں قومی اور عالمی اخبارات میں مضامین بھی لکھتا رہا ہوں۔ مئی دو ہزار آٹھ میں وزیر اعظم گیلانی نے مجھے امریکہ میں پاکستان کیلیئے سفیر عمومی مقرر کیا۔ میں نے پاکستان کا کیس موثر انداز میں پیش کیا اور ان خدمات پر ہلال پاکستان ایوارڈ بھی دیا گیا۔ دس اکتوبر دو ہزار گیارہ کو فنانشل ٹائمز میں منصور اعجاز نے مضمون لکھا جس کے بعد سولہ نومبر دو ہزار گیارہ کو میں نے صدر کو ایک خط میں مستعفی ہونے کی پیشکش کی۔ اس موقع پر کمیشن کے کہنے پر حسین حقانی کے وکیل زاہد بخاری نے میمو سے متعلق مضمون پیش کیے۔ مضمون کے مطابق منصور اعجاز نے لکھا کہ سویلین حکومت نے مائیک مولن سے مدد مانگی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میمو کی تشکیل، ڈرافٹنگ اور اسے مائیک مولن تک پہنچانے میں میرا کوئی کردار نہیں سوائے میڈیا کہ میمو کی حیثیت کے بارے میں بھی مجھے کوئی علم نہیں۔ حسین حقانی نے کہا کہ استعفیٰ منظور ہونے کے بعد نوٹیفکیشن بطور ثبوت کمیشن کو

پیش کرتا ہوں۔ وزیراعظم نے بائیس نومبر دوہزار گیارہ کو میرا استعفیٰ منظور کرلیا تھا۔ حسین حقانی کا یہ مقدمہ عدلیہ میں زیر سماعت ہے۔،،

یہ پہلا اور آخری موقع نہیں ہے کہ امریکی اور عالمی اخبارات و جرائد سمیت تجزیہ نگاروں اور ماہرین نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے حالات اور واقعات کو نہ صرف بگاڑا ہے بلکہ پاکستان کو ایک ایسے گرداب میں لا پھنسایا ہے کہ اب اس سے نہ نکلا جاتا ہے۔ نہ اس سے پیچھا چھڑایا جاسکتا ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک حقانی نیٹ ورک کا تذکرہ تھا۔ طالبان کی پشت پناہی کا الزام تھا۔ تجزیہ میں کہا جارہا تھا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات ایسے مرحلے مےں داخل ہو چکے ہیں جہاں دونوں کے مفادات کا ٹکراؤ شروع ہوگیا ہے، ایک جانب اگر امریکہ، افغانستان میں اتحادی افواج پر کیے جانے والے طالبان کے حملوں کا براہ راست الزام حقانی نیٹ ورک پر عائد کرتے ہوئے اس پر مزید دباؤ ڈالنا اور شمالی وزیرستان میں آپریشن کا آغاز کروانا چاہتا ہے، تو دوسری طرف پاکستانی حکام اور افواج نے امریکہ پر واضح کردیا ہے کہ اب وہ امریکی مطالبات مےں توسیع اور ڈومور کی گردان نہیں سننا چاہتے اور امریکی حکام اور افواج کو اس ضمن میں خود کو بھی کچھ کرنا چاہئے۔ ایک جانب جنگجو نیٹ ورک کی جوابی کارروائی کا قضیہ وجہ نزاع بنا ہوا ہے تو دوسری طرف پاکستان اور ایران کے درمیان گیس پائپ لائن کا معاملہ بھی امریکہ

کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث ہے۔ عالمی میڈیا کے پاکستان کے بارے میں کوئی نہ کوئی بریکنگ نیوز دیتا ہے اور پاکستان کے ذرائع ابلاغ اسے من و عن شائع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔۔برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز نے اپنی ایک اشاعت میں ایک رپورٹ شائع کی۔ جس میں انکشاف کیا گیا کہ پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کی حال ہی میں پاکستان میں امریکی سفیر کیمرون منٹر سے آئی ایس آئی چیف جنرل شجاع پاشا کی موجودگی میں ملاقات کرائی گئی ہے۔۔برطانوی اخبار کے مطابق پاکستان کی طاقتور اسٹیبلشمنٹ 2 روایتی سیاسی گروپوں ن لیگ اور پیپلز پارٹی کی بدعنوانی سے تنگ آکر عمران خان کی حمایت کر رہی ہے۔۔برطانوی اخبار کی رپورٹ میں کہا گیا کہ ،، یہ ایک کھلا راز ہے کہ فوجی قیادت اور طاقتور آئی ایس آئی عمران خان کی سیاسی مہم میں تعاون کر رہی ہے۔ ایک سینئر اہلکار نے تصدیق کی کہ اسے فوج کی حمایت حاصل ہے لیکن انھوں نے کہا کہ اس سے حکمران جماعت پی پی سے زیادہ نقصان نواز شریف کو ہوگا۔ دوسری جانب آئی ایس پی آر نے ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل احمد شجاع پاشا کی موجودگی میں پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان اور پاکستان میں امریکی سفیر کیمرون منٹر کی ملاقات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز کے دعوے کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔ پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے سنڈے ٹائمز کی اس خبر پر اس کے خلاف قانونی کارروائی کا آغاز کیا۔ لندن میں عمران خان کے سالیسٹر ایس ٹی لاء سالیسیٹرز

کے مہتاب عزیز نے روپرٹ مرڈوک کو لکھا کہ سنڈے ٹائمز میں شائع ہونے والے آرٹیکل "عمران ناگزیر" (Imran the inevitable) سے خان کے سیاسی موقف اور پاکستانی عوام میں اس تاثر سے ان کی شہرت کو نقصان پہنچا ہے کہ پاک فوج ان کی پشت پر ہے۔ حالانکہ یہ عمران خان کے ان اصولوں اور سیاسی آئیڈیالوجی سے براہ راست متصادم ہے جس کی خاطر انہوں نے بہت سی قربانیاں دیں۔ لاء سوٹ میں کہا گیا ہے کہ عمران خان پاکستان کی طاقتور فوج اور اسٹیبلشمنٹ کے کسی بھی اثر سے پاک ایک آزاد سیاسی رہنما ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جسٹس پارٹی کے (دعویدار) عمران خان نے آرٹیکل کی مین تھیم سے ایک بڑا ایشو اٹھایا ہے جس میں اخبار نے ہمارے کلائنٹ پر اپنے سیاسی وژن کے خلاف جانے کا الزام لگایا۔

برطانوی اخبار" فنانشل ٹائمز" نے کراچی میں ٹارگٹ کلنگ پر اپنی ایک رپورٹ میں یہ بھی کہا کہ پاکستان کے غیر مقبول صدر آصف علی زرداری ملک کے سب سے بڑے شہر میں تشدد کے خاتمے ناکام اور امن قائم کرنے میں کمزور ثابت ہوئے، پاکستانی عوام فوجی حکومت سے دکھاوے کی جمہوریت کی طرف سفر پر تذبذب کا شکار ہیں کہ یہ سفر ملک کو زیادہ استحکام دے گا یا اس کے ٹکڑے کر دے گا، کراچی میں تشدد ملک کے طویل مدتی استحکام اور مغربی ممالک کی سلامتی کے لیے وارننگ ہے، کراچی کے علاوہ پاکستان کا کوئی دوسرا ایسا شہر نہیں ،جہاں بندوق کی سیاست ، لسانی اور نسلی کشیدگی ، فرقہ وارانہ تناو ، ریاستی کمزوری ،

عسکریت پسندی اور منظم جرائم ہوں، کراچی آج پریشر ککر بن چکا ہے، سفاکانہ طرز عمل نے ایک طاقت پکڑ لی ہے، ناقص اسلحے سے لیس اور کم نفری پر مشتمل پولیس طاقتور سیاستدانوں کے خوف سے قاتلوں کو پکڑنے سے ڈرتی ہے، سیکورٹی اداروں کو حکومت کی طرف سے ٹارگٹ کلرز کو گرفتار کرنے کی نہیں بلکہ ان پر نظر رکھنے کی ہدایت ہے۔ .برطانوی اخبار نے کراچی پر اپنی تفصیلی رپورٹ میں لکھا کہ جنوبی ایشیا کے عظیم اقتصادی انجن کراچی پر کنٹرول کرنے کے لئے سست مگر تسلسل کے ساتھ جنگ جاری ہے۔ کراچی نے ماضی میں بھی ایسے سنگین حالات دیکھے ہیں، اس وقت پاکستانی فوج نے کراچی کی گلیوں میں مسلح جھڑپوں کے خاتمے کے لیے آپریشن کیا تھا۔ کراچی میں قتل کے واقعات میں تسلسل دو حریف سیاسی جماعتوں کے درمیان طویل عرصے سے جاری اختلافات کی وجہ سے ہے جن کی بنیادیں پشتون اور مہاجروں سے ملتی ہیں۔ رواں موسم گرما میں تشدد نئی بلندیوں تک جا پہنچا۔ پیچیدہ بستیوں اور کٹی پہاڑی پر مشتمل شہر میں فائرنگ اور دستی بم کے حملوں میں جولائی میں 300 سے زائد زندگیوں کے چراغ گل ہو گئے۔ اس لحاظ سے جولائی سب سے بدترین ماہ ثابت ہوا۔ پاکستان کی ایک غیر سرکاری تنظیم انسانی حقوق کمیشن کے مطابق رواں برس 800 سے زائد افراد کو کراچی میں ہلاک کیا گیا۔ ہر روز قتل کے واقعات ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے غیر مقبول صدر آصف علی زرداری ارب ڈالر کے معاشی حب، اسٹاک ایکس چینج اور اہم ترین بندرگاہ کے حامل ملک 160 کے سب سے بڑے شہر میں تشدد کے خاتمے اور اسے امن

قائم کرنے میں کمزور ثابت ہوئے۔ درحقیقت کراچی میں تشدد ملک کے طویل مدتی استحکام کے لیے ایک ہلکا سا انتباہ ہے جس کے نتائج مغرب کی سلامتی پر سنگین اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔

اس تجزیئے میں مزید کہا گیا کہ پاکستان کے افغانستان میں کردار پر امریکا اور یورپ کے خدشات اپنی جگہ پر ہیں۔ پاکستانی فوج میں اسلامی عسکریت پسندوں سے تعلقات اور جوہری ہتھیاروں کی سیکورٹی کے بارے بھی دو رائے پائی جاتی ہیں۔ ان درپیش خطرات میں مئی میں امریکی نیوی سیلز کی جانب سے اسامہ کی ہلاکت نے مزید اضافہ کردیا ہے۔ کراچی میں قتل عام کی نسبتاً بظاہر وجوہ سیاسی یا مقامی ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہاں گہرے ہوتے تنازعات پاکستان کی ترقی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ کراچی کے علاوہ پاکستان کا کوئی دوسرا ایسا شہر نہیں، جہاں بندوق کی سیاست ، لسانی اور نسلی کشیدگی، فرقہ وارانہ تناو، ریاستی کمزوری ، عسکریت پسندی اور منظم جرائم ہوں یہ تمام عوامل ملک کو کمزور بنا تے ہیں۔ یہ ان رجحانات کا تعین ہے کہ فوجی حکومت سے دکھاوے کی جمہوریت کی طرف سفر پر پاکستانی ہچکچا رہے ہیں، یہ سفر ملک کو زیادہ استحکام دے گا یا اس کے حصے بکھیر دے گا۔

کراچی ملک کے سب سے زیادہ لبرل ، سیکولر شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ کراچی کو

نیول بیس پر عسکریت پسندوں کے حملے جیسی دہشت گردی کی کارروائیوں کا بھی سامنا رہا ہے۔ کراچی میں 2000 سے 2006 تک سالانہ اوسطاً قتل کے واقعات دو سو سے کم رہے، 2008 تک قتل کے واقعات کی تعداد سالانہ 8 سو تک جا پہنچی، 2009 سے اب تک قتل کے واقعات کی تعداد سالانہ 8 سو سے 14 سو کے درمیان ہو گئی۔ 2009-10 میں کراچی سے سالانہ ملک کا 79 فیصد کسٹم ڈیوٹیز، 44 فیصد ڈائریکٹ ٹیکسز اور 58 فیصد سیلز ٹیکسز حاصل ہوئے۔ کراچی میں تشدد کی کارروائیاں ووٹوں پر کنٹرول کے لیے ہیں۔ تنازعات سے بھری سیاست کا یہ کھیل کسی اور جگہ نہیں دیکھا جیسا کراچی میں ہے۔اخبار کہتا ہے کہ جتنا زیادہ لوگ خوفزدہ ہوں گے، اتنا ہی وہ اپنے تحفظ کیلئے ان جماعتوں کی طرف رخ کریں گے اور اس سے ان کے رہنما زیادہ طاقت ور بن جائیں گے۔ کراچی میں قتل صرف سیاسی پارٹیوں کے سرگرم رکن ہی نہیں ہوتے بلکہ عام لوگوں، مسافروں، ٹیکسی ڈرائیوروں اور دکانداروں کو بھی اس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اپنے تحفظ کی خاطر درجنوں تاجروں نے بندوق کے لائسنس کے لئے درخواستیں دی ہوئی ہیں۔ریاست بجلی فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ انصاف سے وابستہ توقعات کم ہیں۔ناقص اسلحے سے لیس اور کم نفری پر مشتمل پولیس طاقتور سیاستدانوں کے خوف سے قاتلوں کو پکڑنے سے ڈرتی ہے۔ فنانشل ٹائم کی ایک اور رپورٹ میں یہ الزام لگایا گیا کہ پاکستان نے چین کو اسامہ بن لادن کیخلاف آپریشن میں تباہ ہونے والے امریکی اسٹیلتھ ہیلی کاپٹر کے ملبے کا معائنہ کرایا تھا۔ فنانشل ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق ایبٹ آباد میں اسامہ بن

لادن کیخلاف آپریشن میں گر کر تباہ ہونے والے بلیک ہاک ہیلی کاپٹر کی چین کے انٹیلی جنس اہلکاروں نے تصاویر لیں اور اس کے ڈھانچے کے نمونے میں بھی حاصل کئے۔ میمو گیٹ کے بارے میں امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے جو رپورٹ دی اس میں کہا ہے کہ پاک فوج سپریم کورٹ کے حکم کے تحت اب صدر آصف علی زرداری کی روانگی اور انتخابات کے انعقاد میں خوشی محسوس کرے گی، جنرل کیانی نے انتہائی سخت اور جذباتی انداز میں میمو کی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔ اخبار نے اپنی ایک رپورٹ میں میمو سکینڈل سے بننے والی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کی جانب سے انتہائی سخت اور جذباتی انداز سے سپریم کورٹ سے تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔اخبار کے مطابق پاکستانی فوج مبینہ طور پر صدر آصف علی زرداری کے غیر دستخط شدہ پیغام کو دو مئی کے بعد اس وقت کے پاکستانی سفیر حسین حقانی کے ذریعے پاکستانی نژاد امریکی بزنس مین منصور اعجاز کے ہاتھوں امریکی حکام تک پہنچانے کے اقدام پر غصے میں نظر آتی ہے۔

اخبار کے مطابق طاقتور فوج اور کمزور سویلین حکومت کے درمیان صدر آصف علی زرداری کے بیرون ملک روانگی سے ٹکراؤ روکنے کی کوششیں سپریم کورٹ میں میمو گیٹ کیس پر متضاد بیانات پیش کرنے سے دم توڑ گئی ہیں۔اخبار کے مطابق کہ فوجی حکام میمو کو درست اور عدالت کے ذریعے حقائق سامنے لانا چاہتے ہیں مگر

حکومت اپنی تشکیل کردہ پارلیمانی کمیٹی کے ذریعے تحقیقات چاہتی ہے۔اخبار نے صدر زرداری کے بارے میں سوال اٹھاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کیا اب ان کے مخالف کامیاب ہوجائیں گے، تاہم اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ فوج چاہے زرداری کو نکال باہر کرنا چاہتی ہو یا کمزور، مگر وہ خارجہ پالیسی اور قومی سلامتی کے معاملات کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔پاکستان کے میمو اسکینڈل میں بلیک بیری کے ریکارڈ کی خبروں پر ردِ عمل میں یہ اسمارٹ فون بنانے والی کمپنی ریسرچ اِن موشن نے کہا ہے کہ وہ اپنے صارفین کی پرائیویسی کے قانونی حقوق کا دفاع کرے گی۔

امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے ، حسین حقانی کی حمایت میں ایک رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا کہ سابق سفیر حسین حقانی اپنی زندگی کو خطرہ محسوس کر رہے ہیں ، وہ بطور سفیر، سابق صحافی اور بوسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر انتھک شخص معلوم ہوئے مگر پاکستان میں انہیں مشکوک تصور کیا جاتا ہے ، پاکستانی فوج نے انہیں پاکستان کی نسبت زرداری کا سفیر تصور کیا، میمو کا معاملہ اب سپریم کورٹ میں ہے جو پاکستان کی تاریخ میں زیادہ آزاد عدالت تصور کی جارہی ہے مگر پاکستان کی حکمران جماعت اسے آرمی اور اپوزیشن کا آلہ کار قرار دے رہی ہے، جوڈیشل کمیشن کی انکوائری جنوری کے آخر میں مکمل ہونے پر عدالت معاملہ پارلیمنٹ کے سپرد کرکے صدر زرداری کے مواخذہ کی سفارش یا تفتیش کاروں کو

حسین حقانی کیخلاف غداری کی فرد جرم عائد کرنیکا حکم دے سکتی ہے۔امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ جنرل (ر) پرویز مشرف اپنے دور میں ہونیوالے ہر ڈرون حملے کی خود منظوری دیتے تھے۔ان کے دور میں چوالیس ڈرون حملے ہوئے ، جتنے حملوں کی اجازت دی اتنی ہی تعداد میں حملوں کی تجویز مسترد بھی کی ، موجودہ حکومت کے آنے کے بعد امریکی انتظامیہ نے ڈرون حملوں سے قبل پاکستان سے اجازت لینا ترک کردیا،آصف زرداری عوامی سطح پر ڈرون حملوں کے مخالف نظر آئے ،ذاتی طور پر حامی رہے، حملوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا،پاکستان میں ڈرون حملوں کا مکمل اختیار سی آئی اے کو حاصل ہے ،رپورٹ کے مطابق پچھلے تین سال میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ہونے والے متعدد ڈرون حملوں میں تیرہ سو پچاس سے لے کر دوہزار دو سو پچاس افراد ہلاک ہوئے جن میں سے بیشتر عام شہری ہیں۔ اکتوبر میں برطانوی اخبار گارجین نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ جنرل پرویز اشفاق کیانی نے صدر زرداری کو نااہل اور بدعنوان وزراء کو ہٹانے کے لئے ایک فہرست دی ہے۔تاہم اخبار نے ان وزراء کے نام بتانے سے گریز کیا۔برطانوی امریکی اخبارات کے علاوہ بھارتی اخبارات بھی اس مہم میں شریک رہتے ہیں ۔ ہمارے اخبارت اور میڈیا کی بدقسمتی کہیے یا تساہل کہ ان خبروں کی کسی ذریعے سے تصدیق کیئے بغیر ہی یہ خبریں ہمارے اخبارت اور چینل کی ہیڈ لائینز اور بریکنگ نیوز بن جاتی ہیں۔ اور پھر ہماری سیاست میں ایک بھونچال سا آجاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اخبارت پاکستان کی

داخلی سیاست سے متعلق بیرونی ذرائع ابلاغ کو اسقدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے ذرائع سے ان خبروں کو کیوں نہیں شائع کرتے۔ اس میں حکومت کا بھی قصور نظر آتا ہے۔ جو ملکی اخبارات اور صحافیوں کو اعتماد میں لے کر معاملات کے بارے میں شفاف طور پر موقف نہیں اپناتے۔ جس کے نتیجے میں ہمیں اکثر اہم واقعات کی خبریں غیر ملکی اخبارات اور جرائد سے لیتے ہیں۔

چل چل میرے خامہ چل

بہت دنوں سے لکھنے کو طبعیت نہیں چاہ رہی۔ اس لیئے لکھا بھی نہیں۔ جس دور میں الفاظ بے توقیر ہو جائیں۔ لکھے ہوئے لفظوں کی حرمت کا کوئی احساس ہی نہ ہو اس میں لکھنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو جو صلاحیت بخشی گئی اس کے مطابق حق ادا کیا یا نہیں تو پھر جو بھی صلاحیت ہے۔اس کے مطابق عمل کرنا مقدر ٹھیرا۔ جب تک جی میں جان ہے۔ اور اس دنیا میں زندہ ہیں کچھ نہ کچھ تو کرتے رہنا ہے۔ آپ کو جو کچھ آتا ہے وہی کریں گے۔ ہماری قسمت میں قلم سے رشتہ ناتہ جڑا ہے۔ اس لئے لکھنا ہی مقدر ٹھیرا۔ آج کل برقی پیغامات کا دور ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں گشتی فون (موبائیل فون کا یہ اردو ترجمہ شائد آپ کو پسند نہ آئے)کا پیغامات کا صندوق بھر جاتا ہے۔ لوگ بھی خوب ہیں ان کے پاس وقت بھی ہے اور پیسہ بھی۔ دونوں کا ضیاع کرتے ہیں۔ آج کل رمضان ہے تو احادیث اور قران کی آیات کے پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ رمضان میں عبادت کرنے والے رات دن قران پڑھ رہے ہیں۔ سن رہے ہیں۔ عمل کی توفیق اللہ نے دی ہے تو عمل بھی کر رہے ہیں۔ اب ان پیغامات سے کیا مقصد پھر ان کو مٹانا بھی پڑتا ہے۔ دل میں اللہ کی آیات مٹاتے ہوئے خوف آتا ہے۔ یہی حال حدیث کے پیغامات کا ہے۔ حدیث عمل کرنے کے لئے ہیں۔ پیروی سنت نبوی صرف پڑھنے کے لئے تو نہیں ہیں۔ لیکن کیا

کیا جائے پیغامات ہیں کہ آئے جاتے ہیں۔ پھر ان کو بغیر سوچ سمجھے آگے بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی ایک بات بھی بغیر تصدیق آگے چلی گئی تو اس کا وبال سب کی گردن پر ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔ لطیفہ بھی بھیجے جاتے ہیں۔ بچپن میں ملا دو پیازہ کے لطیفے سنے اور سنائے جاتے تھے۔ اب جا کر پتہ چلا ملا دو پیازہ تو اچھے بھلے عالم فاضل تھے۔ اصل نام ابوالحسن تھا۔ عرب کے شہر طائف میں پیدا ہوئے۔ ملا دوپیازہ کیسے بنے اس بارے میں کہتے ہیں کہ ایک دن ایک امیر نے انھیں دعوت پر بلایا۔ وہاں دستر خوان پر دو پیازہ پلاؤ بھی تھا۔ جو ملا کو بہت پسند آیا۔ ملا ابوالحسن دو پیازہ پلاؤ پر ایسے لہلوٹ ہوئے کہ پھر جہاں دعوت ہوتی پوچھتے کیا دو پیازہ پلاؤ بھی دستر خوان پر ہوگا۔ بس وہ دن ہے کہ لوگ انھیں ملا دو پیازہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ملا تو چلے گئے لطیفے رہ گئے۔ چلتے چلتے یہ بھی سن لیں کہ کراچی والوں کے لئے یہ بھی ایک خبر ہے کہ گذشتہ چوبیس گھنٹے میں کوئی ایک بھی قتل نہ ہوا۔ یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے۔ اس پر سجدہ شکر بجا لانا چاہیئے۔ اللہ کراچی کو امن کا گھوارہ بنائے۔ آمین

ساری دنیا میں جاری انسانوں کی موت کا کھیل

اجرتی قاتلوں کے ہاتھ قتل کرنا کتنا آسان ہے؟

ٹارگٹ کلنگ ، سپاری، کرائے کے قاتل، جیسے جرائم کسی بھی نام سے پکارے جائیں ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ کسی انسان کی موت

کراچی میں ہر سال ہزاروں افراد ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہورہے ہیں۔

ٹارگٹ کلنگ ، سپاری، کرائے کے قاتل، جیسے جرائم کسی بھی نام سے پکارے جائیں ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ کسی انسان کی موت، انسانوں کی موت کا یہ کھیل ساری دنیا میں جاری ہے۔ کراچی ہو یا ممبئی، دہلی ہو یا لاہور، نیویارک ہو یا لندن ہر جگہ آپ کو کرائے کے قاتل مل جائیں گے۔ سوال اس رقم کا ہے جو آپ اس کام کے لئے خرچ کریں گے۔ یا ان افراد کا انتخاب جو اس کام کو انجام دیں۔اپنے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی جستجو اور دوسروں کو راستے سے ہٹانا، ایک کھیل ہے۔ جو حکومتیں، مافیا، جرائم پیشہ گروپ، ڈان، انٹیلیجنس ایجنسیاں، منشیات فروش تنظیمیں، جاسوس ادارے کراتے رہتے ہیں۔ کرائے کے قاتل سربراہ مملکت سے لے کر ایک عام آدمی تک کو قتل کرسکتے ہیں۔ یہ خدمت ایک آدمی، گروپ یا چینل کی صورت میں انجام دی جاسکتی ہے۔ قتل کی منصوبہ

بندی کرنے والے ایک ایک بات اور ذرا ذرا سی جزئیات کا خیال رکھتے ہیں۔ بعض ان کو ایسے حادثے کا روپ دیتے ہیں کہ کسی کو قتل کو گمان ہی نہ ہو۔ اور کچھ ایسے دیدہ دلیری سے کرتے ہیں کہ سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔ دنیا میں ایسے مشہور قتل ہزاروں میں ہیں۔ پہلے بادشاہوں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ پھر زمانہ بدلا تو لیاقت علی خان جیسے وزیر اعظم کو راولپنڈی میں بھرے جلسے میں قاتل نے نشانہ بنایا۔ بے نظیر بھٹو کو بھی قاتلوں نے جلسہ عام نہ سہی لیکن عوام کے سامنے قتل کر دیا۔ صدر ضیا الحق کو اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ جہاز سے باہر آتے۔ پاکستان میں سیاسی قتل کی ایک پوری سیریز ہے جو اب بھی چل رہی ہے۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی کے قتل پر تو ہالی وڈ نے فلم بنائی ہے جس میں قاتل کی پوری منصوبہ بندی سامنے ہے۔ بھارت میں اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا قتل بھی کرائے کے قاتلوں ہی نے کیا تھا۔

بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کا قتل بھی ایسی ہی سازش کا تانہ بانہ تھی۔ اب ایسے گروہ اور جرائم پیشہ افراد کے گروہ موجود ہیں جو انٹرنیشنل طور پر اپنا نیٹ ورک رکھتے ہیں۔ اس بارے میں بھی اطلاعات ہیں کہ قتل کی منصوبہ بندی.برطانیہ میں کی جاتی ہے لیکن عمل درآمد پنجاب کے دیہاتوں میں کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل نشریاتی ادارے بی بی سی نے اس سلسلے میں تحقیقات کیں اور ایک

رپورٹ شائع کی جس کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بھارتی نژاد برطانوی شہری ہندوستان میں اپنے خاندان والوں یا بزنس میں شراکت داروں کو کرائے کے قاتلوں کے ہاتھوں قتل کراتے ہیں۔

بھارتی نژاد برطانوی شہری خاندان والے یا بزنس میں شراکت دار سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہندوستان کا انتخاب اس لیے کرتے ہیں کہ اجرتی قاتل کام کرنے کے کم پیسے لیتے ہیں اور پکڑے جانے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔

اس مسئلے کو منظر عام پر لانے کے لیے برطانیہ اور بھارت میں کام کرنے والوں کا خیال ہے کہ سینکڑوں افراد اس طریقے سے اجرتی قاتلوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے قتل کی منصوبہ بندی تو برطانیہ میں کی جاتی ہے لیکن اس پر عمل درآمد بھارتی پنجاب کے دیہاتوں میں کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بی بی سی کی ایک رپورٹر اس طریقے سے قتل کیے جانے کے بارے میں مزید جاننے کے لیے بھارت روانہ ہوئی اور ریاست پنجاب کے ایک دیہات پہنچی۔

اس گاؤں میں ایک برطانوی خاتون اپنے شوہر کے ہمراہ چھٹیاں منانے آئی تھیں اور ان کی موت ایک مبینہ ٹریفک حادثے میں ہوئی جس میں مارنے والی گاڑی کا ڈرائیور بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن ان خاتون کے رشتہ داروں کو شک ہے

کہ یہ ایک قتل کی واردات ہے۔ ان خاتون کی والدہ کا کہنا ہے کہ ان (خاتون) کا شوہر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا لیکن ان کی بیٹی نے شوہر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ان کی والدہ کے بقول ان کی بیٹی نے اپنے شوہر سے کہا 'میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہوں گی'۔

ان کی والدہ جائے وقوعہ پر سب سے پہلے پہنچی تھیں۔ 'انہوں نے میری بیٹی کو مارا اور اس کی لاش گڑھے میں پھینک دی اور تاثر یہ دینے کی کوشش کی کہ اس کی موت حادثے میں ہوئی ہے۔ وہاں پر نہ تو خون کے نشانات تھے اور نہ ہی گاڑی اور نہ ہی ٹائروں کے نشانات۔ پنجاب میں پولیس، سیاستدان اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات ان افراد کو مزید تحفظ فراہم کرتے ہیں جو برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں۔ تحفظ اس طرح کہ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ انہوں ہی کے کہنے پر قتل ہوا ہے تب بھی ان کے خلاف مقدمہ درج نہیں ہوتا۔ جسی کھنگڑا پولیس کی طویل تفتیش کے باوجود ابھی تک اس قتل میں مبینہ طور پر ملوث افراد کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں کیا گیا۔

ان خاتون کی ہلاکت سے ملتی جلتی ہی ایک اور ہلاکت 1998 میں برطانوی شہری سرجیت اتھوال کی بھی ہوئی۔ دو سال قبل برطانوی عدالت نے فیصلہ دیا کہ چھبیس سالہ سرجیت کے قتل کا منصوبہ ان کے شوہر اور ساس نے بنایا تھا۔ انہوں نے

بھارت میں اجرتی قاتل کے ذریعے سرجیت کو قتل کرایا۔ سرجیت کو گلا دبا کر ہلاک کیا گیا اور ان کی لاش دریا میں بہا دی۔

سرجیت کے بھائی جگدیش سنگھ کا کہنا ہے 'میرے خیال میں سرجیت کے قتل نے پہلی بار اس راز سے پردہ فاش کیا ہے کہ کس طرح برطانیہ میں رہائش پذیر پنجابی افراد عورتوں کو واپس پنجاب بھیجتے ہیں تاکہ وہ یہاں پر آسانی سے قتل کی جا سکیں۔' جگدیش آج کل ایسی خواتین کے اہل خانہ کے ساتھ مل کر اس ایشو کے بارے میں آواز اٹھاتے ہیں۔ لیکن اجرتی قاتلوں کے ہاتھ قتل ہونے والوں میں صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مرد بھی ہیں۔ بھارت کے صوبہ پنجاب میں ہلاک کیے گئے ایک مرد کے بھائی راجو نے کہا 'ان کے بھائی کے سر پر گولی ماری گئی تھی اور ان کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ ہمارے پاس شواہد موجود ہیں جو اشارہ دیتے ہیں کہ میرے بھائی کا قتل میرے بھائی کی بیوی اور اس کے عاشق نے کرایا ہے۔ اور ہمیں شک ہے کہ یہ قتل انشورنس کے پیسے کی لالچ میں کیا گیا ہے۔

اجرتی قاتلوں کے ہاتھ قتل کرنا کتنا آسان ہے؟ اس بارے میں حقائق جاننے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان اور بھارت میں پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان ایک غیر تحریری معاہدہ ہے۔ جس میں دونوں ساجھے دار ہیں۔ کراچی جیسے شہر میں دن دھاڑے سینکڑوں قتل ہوئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان میں اعلی حکام

پولیس اہلکار، سیاست دان، مذہبی رہنما، تاجر سب شامل ہیں۔ بم دھماکے، اسنیپ فائرنگ، نامعلوم افراد کے حملے سب کچھ یہاں جاری ہے۔ لیکن تفتیش نام کی کوئی چیز اب باقی نہیں رہی۔ پاکستانی صحافی بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ سلیم شہزاد کا قتل تو ایک ٹیسٹ کیس تھا۔ جس کی رپورٹ بھی سامنے ہے۔ اس بارے میں پاکستانی اخبارات اور صحافی اب بہت کم تردد کرتے ہیں ۔ اخبارات کے مالکان اور صحافیوں نے اب ایسے قتلک کیس کی تفتیش اور فالواپ اسٹوری دینے سے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ لیکن بھارت اور دیگر ممالک میں اخبارات اور صحافی ایسی خبروں کا پیچھا کرتے ہیں۔

بھارتی صحافی نیلم راج کے مطابق اجرتی قاتل ڈھونڈنا بہت آسان ہے۔ جس شخص کو قتل کرنے کے پیشے دیے جاتے ہیں وہ ایک معمولی چوراچکا ہوگا۔ 'عام طور پر وہ ایسا شخص ہوتا ہے جو گاوٴں کا بدمعاش ہو۔

بھارت میں اجرتی قاتل کے ذریعے ہلاک کروانا سستا ہے۔ اجرتی قاتل پانچ سو پونڈ کے عوض قتل کرتے ہیں۔ماضی میں قتل کرنے کا طریقہ کار گزرتی گاڑی سے گولیاں مارنا لیکن اب اس قتل کا طریقہ کار یہ ہے کہ موت ایک ٹریفک حادثہ لگے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں پکڑے جانے کا خطرہ کم ہے۔پنجاب کے شہر لدھیانہ میں جسی کھنگرا ایک کامیاب کاروباری اور سیاسی شخصیت ہیں۔ وہ

لندن میں کاروبار کیا کرتے تھے لیکن اب وہ کانگریس جماعت کے پنجاب اسمبلی میں رکن ہیں۔ ’بھارت کی کئی ریاستوں بشمول پنجاب میں پولیس، سیاستدان اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات ان افراد کو مزید تحفظ فراہم کرتے ہیں جو برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں۔ تحفظ اس طرح کہ اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ انہی ہی کے کہنے پر قتل ہوا ہے تب بھی ان کے خلاف مقدمہ درج نہیں ہوتا۔‘ انہوں نے اس مسئلے کا ذمہ دار پولیس کو ٹھہرایا اور کہا کہ پولیس کے ملوث ہونے کے باعث ہر سال ایک سو کے لگ بھگ بیرون ملک رہائش پذیر ہندوستانیوں کا قتل ہوتا ہے۔ لیکن جالندھر کے پولیس سربراہ سنجیو کلڑا پولیس کے ملوث ہونے کے الزامات کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی ہلاکتوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہیں۔ ’میرا تجربہ کہتا ہے کہ عام طور پر ایسے واقعات کے بارے میں بات زیادہ کی جاتی ہے جبکہ حقیقت برعکس ہوتی ہے۔‘ لیکن بھارت میں اس طریقے سے ہلاک ہونے والے اہل خانہ کو انصاف نہیں مل رہا ہے۔ وہ انصاف کے لیے برطانوی حکومت سے رجوع کرتے ہیں اور اب برطانوی سراغ رساں ایسے معاملات کی تفتیش کے لیے بھارت بھیجے جاتے ہیں۔ میٹروپالیٹن پولیس کے کمانڈر سٹیو ایلن ایسے فعل کے مرتکب افراد کو کچھ ان الفاظ میں متنبہ کرتے ہیں ’برطانوی شہریوں کی بیرون ملک قتل کے حوالے سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا ہے اور ہم ایسے افراد کا پیچھا کریں گے اور ان کو ڈھونڈ نکالیں گے اور انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کریں گے۔

لیکن کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کو روکنے کے بارے میں حکومت کا ایسا کوئی عزم سامنے نہیں آتا۔ زبانی کھوکھلے دعووں سے کراچی کی قسمت نہیں بدلے گی۔ اس سلسلے میں ہیومین رائٹس کمیشن آف پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق سال 2011 کے پہلے چھ ماہ کے دوران کراچی میں ٹارگٹ کلنگ اور قتل و غارت گری عروج پر رہی۔ اس عرصے میں 1138 افراد کو قتل کیا گیا۔ ایچ آر سی پی کی چیئرپرسن زہرہ یوسف نے ایک پریس کانفرنس کے دوران بتایا کہ جنوری سے جون 2011 تک کراچی میں مجموعی طور پر 1138 افراد کو قتل کیا گیا، ان میں 490 افراد ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنے۔ ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والوں میں 250 افراد ایسے تھے جن کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں تھا، جبکہ 150 افراد کا تعلق سیاسی جماعتوں، 19 کا مذہبی جماعتوں، 3 کا تعلق قوم پرست جماعتوں اور 4 افراد کا تعلق کالعدم تنظیموں سے تھا، لسانی بنیادوں پر افراد جبکہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر 8 افراد کو قتل کیا گیا، ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننے 56 والوں میں 9 خواتین اور 4 بچے بھی شامل ہیں جنہیں لسانی بنیادوں پر قتل کیا گیا۔ چھ ماہ کے دوران لیاری گینگ وار میں 37 مردوں اور 2 خواتین کو قتل کیا گیا۔ دیگر افراد مختلف جرائم میں قتل ہوئے جن میں پولیس مقابلوں کے دوران مارے 648 جانے والے

افراد کی تعداد چونتیس ہے۔ مختلف واقعات میں 41 پولیس اہل کار، ملٹری اور پیراملٹری اہلکار جاں بحق ہوئے۔ ذاتی دشمنی کی بنیاد پر 123 افراد جبکہ 137 افراد کو اغواکے 11 بعد قتل کیاگیا۔ 29 افراد کی لاشیں مختلف مقامات سے ملیں، ایچ آر سی پی کیمطابق سے 2010 تک 8913 افراد کو قتل کیا گیا، سب سے زیادہ 798 افراد کو 2005 اغواکے بعد قتل کیاگیا،ادارے کا کہنا ہے کہ حکومت کی سیاسی مصلحت کے باعث کراچی میں پولیس اوررینجرز کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر ہے اور کراچی میں اتنی بڑی تعداد میں شہریوں کی ہلاکت قانون نافذ کرنیوالے اداروں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے۔

کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کے بارے میں صحیح اعداد شمار بھی کسی نے مرتب نہیں کیئے۔ یہاں تک کے سیاسی جماعتیں بھی اپنے ہلاک شدگان کا کوئی معتبر ریکارڈ نہیں مرتب کر سکی۔ اعداد و شمار کے مطابق سالِ رواں کے پہلے آٹھ میں کراچی یں چودہ سو سے زائد افراد ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنے ہیں جبکہ مجموعی طور پر شہر یں گزشتہ چند برسوں میں ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔۔ سال گزشتہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی۔

انسانی حقوق کمیشن نے اس سال کی پہلی ششماہی رپورٹ جاری کرتے ہوئے دعوی

کیا کہ کراچی میں سیاسی کارکنوں کی شرح ہلاکت میں گزشتہ برس کی نسبت چھبیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ برس کے دوران نشانہ بنا کر ہلاک کیے جانے والے سیاسی کارکنوں کی تعداد چوہتّر تھی۔ رپورٹ کے اعداد و شمار کے مطابق مہاجر قومی موومنٹ کے اڑتیس، متحدہ قومی موومنٹ کے اٹھائیس، حکمراں جماعت پاکستان پیپلزپارٹی کے گیارہ، عوامی نیشنل پارٹی کے دس، سندھ ترقی پسند پارٹی کے چار، پاکستان مسلم لیگ (ن) اور جماعت اسلامی کے دو دو، پاکستان مسلم لیگ (ف)، جسقم اور پنجابی پختون اتحاد کا ایک ایک کارکن ٹارگٹ کلنگ کا شکار بنے۔ رپورٹ کے مطابق کراچی میں حادثاتی اموات کی شرح میں اکیس فیصد اضافہ ہوا ہے جس میں خواتین کی شرح میں تراسی اور بچوں کی شرح میں ایک سو باسٹھ فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا جبکہ اس سال پہلے چھ ماہ کے دوران قتل کیے جانے والے افراد کی تعداد نو سو اڑتیس ہے جن میں ایک سو انیس خواتین اور چوراسی بچے بھی شامل ہیں۔ مہاجر قومی موومنٹ کے اڑتیس، متحدہ قومی موومنٹ کے اٹھائیس، حکمراں جماعت پاکستان پیپلزپارٹی کے گیارہ، عوامی نیشنل پارٹی کے دس، سندھ ترقی پسند پارٹی کے چار، پاکستان مسلم لیگ (ن) اور جماعت اسلامی کے دو دو، پاکستان مسلم لیگ ف)، جسقم اور پنجابی پختون اتحاد کا ایک ایک کارکن ٹارگٹ کلنگ کا شکار بنے۔)

رپورٹ کے مطابق اس سال پہلے چھ ماہ کے دوران سب سے زیادہ قتل کے واقعات جون کے مہینے میں ہوئے۔ اعداد و شمار کے مطابق رواں سال پہلے چھ ماہ کے دوران اٹھانوے افراد کو ذاتی دشمنی کی بنائی پر قتل

کیا گیا، ستّر افراد مزاحمت کرتے ہوئے ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بنے، اکیاون افراد کو اغوائ کرنے کے بعد تشدد کرکے ہلاک کیا گیا، انچاس افراد کی مختلف علاقوں سے نامعلوم لاشیں برآمد ہوئیں، مزید انچاس افراد کو لسانی یا نسلی فسادات کے نتیجے میں قتل کیا گیا اورپینتالیس افراد مبینہ پولیس مقابلوں کے دوران مارے گئے۔

اسی طرح رپورٹ کے مطابق پچیس پولیس اہلکار مختلف واقعات میں ہلاک کیے گئے جبکہ اٹھارہ افراد لیاری گینگ وار کا نشانہ بنے۔

کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے حوالے سے ایک عدالتی کمیشن بھی بنایا گیا تھا جس کی تحقیقاتی رپورٹ سامنے آ گئی۔ یہ کمیشن گزشتہ سال چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری کی ہدایت پر ٹارگٹ کلنگ کی تحقیقات کیلئے جسٹس قربان علوی کی زیر صدارت بنایا گیا تھا، کمیشن نے انکشاف کیا کہ انہیں ناقص اور غلط اطلاعات دی گئیں جس کی وجہ سے ٹارگٹ کلنگ کی حتمی فہرست مرتب کرنے میں دشواری کا سامنا رہا۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق شہر میں سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی ٹارگٹ کلنگ میں 476 افراد 2011ئ میں قتل ہوئے جس میں متحدہ قومی موومنٹ کے 121، پیپلز پارٹی کے 113، عوامی نیشنل پارٹی کے 98، مہاجر قومی موومنٹ کے 26، سنی تحریک کے 37، جعفریہ الائنس کے 27، کچھی رابطہ کمیٹی کے

جماعت اسلامی کے 19 کارکنان شامل ہیں۔ رپورٹ کے مطابق دو واقعات میں ،22 ہلاک ہونے والے افراد کی دعویدار تین تین جماعتیں تھیں جن میں ایم کیو ایم، اے این پی اور جماعت اسلامی شامل تھیں۔ تحقیقات کے مطابق وہ متحدہ قومی موومنٹ کا کارکن تھا کمیشن میں متحدہ قومی موومنٹ، عوامی نیشنل پارٹی، جعفریہ الائنس سمیت تمام جماعتوں کے رہنما خود اپنی اپنی فہرستیں لیکر پیش ہوئے، کمیشن نے متعدد پولیس افسران کا علیحدہ علیحدہ بیان بھی قلمبند کیا۔ کمیشن نے اپنی سفارشات بھی وزیراعلیٰ کو دیدیں جس میں کہا گیا ہے کہ جاں بحق ہونے والے افراد کے لواحقین کیلئے مالی معاوضے کا اعلان کیا جائے اور 60 گز کا پلاٹ دیا جائے اور متاثرہ بچوں کو مفت تعلیم فراہم کی جائے۔ یہ ایک اعلی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ ہے۔ جس سے اعلی اداروں کی بے بسی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کراچی میں پچھلی 4 جمہوری حکومتوں کے دور یہ ٹارگٹ کلنگ مسلسل جاری رہی ۔ مشرف دور کے اس عرصے میں جس میں کراچی میں نعمت اللہ خان سٹی میئر رہے اس عرصے میں کوئی ٹارگٹ کلنگ نہیں ہوتی۔اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ پرویز مشرف کے آتے ہی ٹارگٹ کلنگ ختم ہو گئی تھی، اور پھر کیوں پرویز مشرف کے جاتے ہی کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کا یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ عدالتیں دہشتگردوں کو ثبوت نہ ہونے پر جیلوں سے رہا کر دیتی ہیں۔ کچھ

کہتے ہیں کہ ان میں قصور خراب حالات کے تحت نقل مکانی کرنے والوں کا ہے کہ ان کی آڑھ میں بہت سے دہشتگرد کراچی کا رخ کر رہے ہیں۔ کراچی میں منشیات ، غیر قانونی اسلحہ کا کاروبار ، زمینوں جائیدادوں پر غیر قانونی قبضے، ڈاکو گیری، اغوا برائے تاوان جیسے جرائم بھی عروج پر ہس۔ شہر کے مختلف علاقوں میں قانون سے بالاتر نو گو ایریاز قائم ہیں۔ جس کے باعث پر امن شہری یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ یہاں جرائم مافیا نے اپنا جال پھیلایا ہوا ہے۔اہل کراچی بہت برے طریقے سے اس شیطانی شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں لینڈ مافیا، بھتا مافیا، سر گرم ہے اور کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں ہے۔ کراچی میں جرائم ٹارگٹ کلنگ کو پولیس میں جرائم پیشہ افراد کی بھرتیوں سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کراچی میں پولیس کے افراد کی بہت بری تعداد ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوئی ہے۔ سب سے زیادہ المناک صورتحال یہ ہے کہ کراچی والوں نے ان جرائم کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا ہے۔ اور تبدیلی کوئی خواہش اور کوشش نظر نہیں آتی۔ جس سے اس مسئلہ کوئی حل بھی نکلنا ممکن نہیں ۔ کیونکہ اللہ بھی ان ہی لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔

امریکہ میں گن کلچر

امریکہ ایک ایسا ملک ہے جس کی زبان اور محاورے قتل تشدد سے جڑے ہوئے ہیں۔ کسی قوم کی زبان، ہلاکت آفرینی کو رائج کرتی ہے اور اسے تقویت پہنچاتی ہے۔ تو اس کے اثرات عوام پر بھی ہوتے ہیں۔ امریکی روزمرہ کی زبان میں بولتے ہیں "اسٹاک مارکیٹ میں قتل عام کرنا"، وال اسٹریٹ کی ایک کہاوت ہے "گلیوں میں جب خون بہہ رہا ہو تو آپ خریداری کرتے ہیں"، اور تجارتی ادارے "قیمتوں کی جنگ" میں مقابلہ کرتے ہیں۔ امریکی صدارتی انتخابی مہمات زوروں پر ہیں۔ انتخابی مہم چلانے والے کارکنوں کو "فوجی دستہ" یا "پیدل سپاہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مجالس قانون ساز میں بل "قتل" کر دیے جاتے ہیں۔ غربت، جرائم، منشیات اور دیگر مسائل پر قوم "جنگ جاری رکھتی ہے"۔۔ اسی لغت کی حامل وقم کے بچے اب درسگاہوں میں قتل کر رہے ہیں۔ بیس سالہ نوجوان کے ہاتھوں بیس بچوں اور چھ جوان افراد کے قتل نے پوری امریکی قوم کو رلا دیا ہے۔ وہ قوم جو دوسری اقوم کے لاکھوں بچوں کے قتل پر نہیں روتی اپنے بچوں کے لئے کیسے رو رہی ہے۔

امریکی پولیس تفتیش کر رہی ہے کنکیٹی کٹ کے سکول میں 26 افراد کے قاتل ایڈم لینزا آیا کسی ذہنی بیماری کا شکار تو نہیں تھے۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا

کہ امریکہ میں ایسا ہولناک واقعہ ہوا ہو۔ سال رواں میں اجتماعی قتل کا یہ تیسرا بڑا واقعہ ہے۔ جسے دبانے کے لئے امریکی حکومت اور میڈیا یک زبان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 26 افراد کا قاتل ایڈم لینزا ذہین لیکن شرمیلے تھے۔امریکی میڈیا نے بیس سالہ ایڈم لینزا کو اس حملہ آور کی حیثیت سے شناخت کیا ہے۔ اس کے سابق ہم جماعتوں کو ان کی زیادہ تفصیلات یاد نہیں ہیں۔ وہ ایک ایسے لڑکے کی بات کرتے ہیں جو اچھے کپڑے پہنتا تھا اور محنت کرتا تھا، لیکن اس نے شاید ہی سکول میں کوئی لفظ بولا ہو۔ امریکی میڈیا کے مطابق 2010 کی ایر بک میں ایدم لیزا کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ اس کی بجائے ان کے نام کے خانے کے آگے 'کیمرا شائی' یا 'کیمرے کے سامنے شرمیلا' لکھا ہوا ہے۔ اس کا فیس بک پر کوئی صفحہ نہیں بنا ہوا تھا، اور انٹرنیٹ پر ان کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایڈم لینزا ریاست کنیٹی کٹ کے قصبے نیوٹن کے ایک متمول مضافات میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ نیوٹن ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ لیکن ان کے دوست بہت کم تھے۔ایڈم کی خالہ مارشا لینزا نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ انھیں مشفق اور محبت کرنے والے والدین نے پالا تھا، اور اگر ان کے بیٹے کو نفسیاتی علاج کی ضرورت ہوتی تو وہ یقیناً اسے حاصل کرنے سے نہ ہچکچاتے۔اسکے والدین نے 2009 میں طلاق لے لی تھی، اور وہ اس طلاق سے کم از کم تین سال پہلے علیحدہ ہو

گئے تھے۔ ان کے والد پیٹر لینزا کنیٹی کٹ ہی کے ایک اور قصبے سٹیم فورڈ منتقل ہو گئے تھے جہاں انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔

ان کی والدہ نینسی اپنے گھر ہی میں رہیں۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ ایڈم نے انھیں اسی گھر میں قتل کر دیا تھا۔ وہ سکول میں استانی تھیں۔ دونوں بھائیوں پر اپنے والدین کی علیحدگی کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ اس حملے میں سکول کی لائبریری کلرک میری این جیک اٹھارہ بچوں کو ساتھ لے کر لائبریری کے ایک سٹور روم میں چھپ گئی تھیں اور بچوں کو خاموش رہنے کے لیے بچوں کو بتایا کہ وہ کہ یہ ایک حفاظتی مشق کا حصہ ہے۔ ایڈم لینزا اپنی ماں کو گھر پر ہلاک کرنے کے خود گاڑی چلا کر سکول پہنچا اور زبردستی سکول میں گھس کر بیس بچوں سمیت چھبیس افراد کو ہلاک کر دیا۔ ہلاک ہونے والوں میں سکول کے پرنسپل بھی شامل ہیں۔ سینڈی ہک سکول کے بچوں کی عمریں پانچ اور دس برس کے درمیان تھیں۔ پولیس کی لیفٹیننٹ پال وینس کا کہنا ہے کہ 18 بچے سکول ہی میں ہلاک ہو گئے تھے جب کہ دو ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ اس حملے میں چھ بالغ بھی مارے گئے، جن میں سکول کے پرنسپل ڈان ہوچسپرنگ بھی شامل ہیں۔ حملہ آور بھی ہلاک ہونے والوں میں شامل ہے، جس کے بارے میں خیال ہے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو گولی مار لی تھی۔ صدر اوباما ٹیلی وژن پر تقریر کرتے ہوئے بار بار اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا، ’ہمارا ملک اس قسم کے واقعات سے بہت زیادہ دفعہ گزر چکا ہے۔" ہمارا ملک اس قسم کے واقعات سے بہت زیادہ

دفعہ گزر چکا ہے۔ ہمیں اکٹھا ہونا ہے اور سیاست سے قطع نظر اس قسم کے سانحوں کو روکنے کے لیے بامعنی اقدام کرنے ہوں گے۔" ہمارے دل آج ٹوٹے ہوئے ہیں، ان بچوں کے والدین، دادا دادی، اور بھائیوں بہنوں سے اور ان بالغ افراد کے خاندانوں کے لیے جنھیں ہم نے آج کھو دیا ہے۔ یہ بھی اطلاعات ہیں کہ حملے میں استعمال ہونے والا تمام اسلحہ مشتبہ حملہ آور ایڈم لینزا کی ماں کے نام پر رجسٹرڈ تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ فائرنگ کرنے والے شخص ایڈم لینزا نے سیاہ کپڑے پہن رکھے تھے اور بلٹ پروف جیکٹ بھی پہنی ہوئی تھی اور وہ بہت سارے ہتھیاروں سے لیس تھا۔ جمعے کو ہونے والی فائرنگ کا یہ واقعہ دو ہزار بارہ میں ہونے والا تیسرا بڑا فائرنگ کا واقعہ ہے۔ امریکی ریاست کولوریڈو میں جولائی کے مہینے میں ایک مسلح شخص نے سینما میں گھس کر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں بارہ افراد ہلاک ہوئے۔ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب سینما گھر میں فلم بیٹ مین کی نمائش ہو رہی تھی۔ اسی طرح اگست میں امریکی ریاست وسکانسن میں ایک سکھ مندر پر حملے کے نتیجے میں چھ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اسی ماہ دو افراد امریکی ریاست اوریگان کے ایک شاپنگ سنٹر پر فائرنگ سے ہلاک ہو گئے تھے۔ نیویارک کے ایک اخبار نے کولاراڈو کے شہر آرورا کے سنیما میں پیش آنے والے واقعے پر لکھا تھا کہ اگر ہالی وڈ کی تصوراتی دنیا اور حقیقی دنیا کی خوفناکی آپس میں گڈمڈ ہو جائیں تو پھر کولوراڈو جیسے المیے جنم لیتے ہیں۔ حالیہ قتل کے واقعے کے بعد امریکہ میں بندوق کلچر پر ایک دفعہ

پھر میڈیا سمیت ہر جگہ بحث چھڑ چکی ہے۔امریکہ میں گن لابی اور گن کنٹرول لابی یا اینٹی گن لابی امریکی سیاست اور اقتدار میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہی ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ بہت سے ڈیموکریٹ گن کنٹرول کے حامی ہیں جبکہ ریپبلکنز کی بہت بڑی تعداد گن لابی کے حق میں ہوتی ہے۔

یہاں امریکی سیاست پر بااثر نیشنل رائفل ایسوسی ایشن بھی ہے اور شہروں میں قومی گن شو بھی منعقد ہوتے ہیں جنہیں دیکھنے کے لیے مرد ہوں کہ خواتین جوق در جوق آتے ہیں۔لیکن ڈیموکریٹس ہوں کہ ریپبلیکنز، تقریباً ڈھائی سو سال قبل آئین میں کی گئی دوسری ترمیم کے تحت امریکی شہریوں کو ملنے والا ایسا حق مانتے ہیں جس کے تحت ہر بالغ امریکی کو اپنے دفاع میں بندوق رکھنے کا حق حاصل ہے۔

امریکہ شاید دنیا کا واحد ملک ہے جہاں آئینی طور پر ہر بالغ شہری کو ہتھیار یا بندوق رکھنے کا حق حاصل ہے۔

اگر آپ کی عمر اٹھارہ سال یا اس سے زائد ہے، آپ امریکی شہری ہیں اور آپ کا کوئی پہلے سے مجرمانہ ریکارڈ نہیں ہے تو آپ محض اپنا ڈرائیؤنگ لائسنس یا ریاستی شناختی دستاویز کسی بھی اسلحے کی دکان پر دکھا کر بندوق خرید سکتے ہیں۔

امریکہ میں کئی ریاستیں ایسی ہیں جہاں آپ اپنے دفاع میں گولی چلا سکتے ہیں، یا آپ کی ملکیت میں گھس آنے والے کو آپ بلا جھجک گولی مار سکتے ہیں۔امریکہ میں کئی ریاستیں ایسی ہیں جہاں آپ اپنے دفاع میں گولی چلا سکتے ہیں۔

بہت سے امریکیوں نے اپنے گھروں پر ایسی تختیاں لگا رکھی ہیں جن پر تحریر ہے کہ بغیر اجازت اندر آنے والے کو گولی ماری جا سکتی ہے۔ یا 'وی شوٹ دی ٹریس پاسر' یعنی ہم اندر گھس آنے والے کو گولی مار دیتے ہیں۔ ایک اینتھروپولوجسٹ دوست کے مطابق امریکی ہتھیاروں سے عشق کرتے ہیں' اور یہی بات آپ کو کئی امریکی فخر سے بتائیں' گے۔امریکن رائفل مین کا ایک ہیرو والا 'ماچ ±و مین' تصور امریکی زندگی اور لوک گیتوں میں بھی موجود ہے۔ مشہور امریکی افسانہ نگار ارنسٹ ہیمنگوے کی بندوقیں بھی خود ان جتنی ہی مشہور ہیں اور ان پر ایک کتاب 'ہیمنگویز گنز" بھی شایع ہوئی ہے۔۔حال ہی میں برطانوی اخبار گارڈین نے دنیا میں آتشیں اسلحہ رکھنے والے ملکوں کا ایک نقشہ شائع کیا ہے جس میں امریکہ کو اول نمبر پر بتایا گیا ہے۔ اس نقشے میں میں بندوقیں رکھنے والے ملکوں میں سب سے زیادہ بندوقیں امریکیوں کی بتائی گئی ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اٹھاسی اعشاریہ آٹھ فی صد افراد بندوق سے مارے جانے کے خطرے کی زد میں ہیں۔

سفید فام آباد کاروں کے ہاتھوں 7 کروڑ ریڈ انڈینوں کی نسل کشی کے بعد،، ریاستہائے متحدہ امریکہ عرف یونائیٹڈ سٹیٹس آف امیریکہ وجود میں آیا تھا۔ پندرہویں صدی کے اواخر یں یوروپی مہم جوئی کا آغاز ہوا تو یکے بعد دیگرے مختلف ممالک اور خطے دریافت ہوتے چلے گئے حتی کہ 12 اکتوبر 1492 کو کولمبس امریکہ کے مشرقی ساحل کے قریب بہامار پہنچا۔ یوں پہنچنے کو تو کولمبس سے قبل مسلم جہاز رانوں کا ایک قافلہ بحر ظلمات کو عبور کرکے امریکی سرزمین تک پہنچا تھا۔ لیکن امریکہ کے جنوب مشرقی ساحل پر فلوریڈا کے قریب واقع امریکہ کی سرزمین پر کولمبس کی شکل میں کسی یوروپی کا یہ پہلا قدم تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے مختلف مقامات کی دریافت کا سلسلہ چل پڑا۔

امریکہ کیونکہ فی زمانہ دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی و عسکری قوت ہے جس کا دنیا بھر کے معاملات پر اس اثر و رسوخ ہے اور اس کی اہمیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن اگر آپ امریکہ کے دورے پر جائے اور وہاں کے شہریوں سے گفتگو کریں تو آپ پر تھوڑی دیر میں ایک انکشاف ہوجایگا کہ امریکی شہری اپنے گھروں سے باہر چہل قدمی یہاں تک کے اپنے گھر کے باہر بھی اکیلے گھومنے سے خوفزدہ ہیں۔ اسی گن کلچر کے ہاتھوں گلیوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا طوفان گرم ہے جس سے کوئی بھی محفوظ نہیں۔ امریکی محکمہ انصاف کے مطابق امریکہ کے شہروں یں اسی گن کلچر کے ہاتھوں اوسطاً ہر بائیس منٹ میں کسی فرد

کا قتل ہو جاتا ہے، ہر پانچ منٹ میں ایک آبروریزی کی واردات ہوتی ہے تو ایک ڈکیتی 49 سیکنڈ بعد رپورٹ ہوتی ہیں جبکہ چوریوں کی شرح تو ہر دس سیکنڈ کی ہے۔ محکمہ انصاف کے ہی مطابق ہر برس جرائم کے باعث امریکہ کو 675 ارب ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے جس میں جانی نقصان یا ذہنی صدمے کا کوئی حساب شامل نہیں۔ اسی طرح امریکہ کی جیلوں میں دنیا بھر کے مقابلے میں سب سے زیادہ قیدی موجود ہیں جنکی تعداد بائیس لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں پچاس ہزار غیر امریکی ہیں جو دہشتگردی کے شبہ میں بنا کسی عدالتی احکامات کے جیلوں میں مقید ہیں اور انھیں کسی قسم کے حقوق بھی حاصل نہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق امریکی جیلوں میں قید ایک لاکھ افراد بے گناہ ہیں جبکہ ایسے بے گناہ افراد کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہیں جنھیں حالیہ برسوں کے دوران سزائے موت دی جا چکی ہیں۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ گونتاموبے یا عراق کی ابوغریب جیل کی طرح امریکہ کی اپنی جیلوں میں بھی نہ صرف تشدد عام ہے بلکہ وکلاء کے علاوہ یہاں کے جج بھی عوام کو غیر قانونی طور پر جیل بھیجنے کی دھمکی دیتے رہتے ہیں تاہم اس رپورٹ کو امریکہ میں Ban کر دیا گیا ہے۔ یہ عجیب صورت حال ہے کہ آئے دن امریکہ میں عام شہریوں کے ہاتھوں تشدد کے واقعات رونما ہو رہے ہیں، لیکن گرفتاریوں، بیان بازیوں اور بحث و مباحثہ سے آگے بات بڑھتی ہی نہیں ہے اور سارا معاملہ ایک مخبوط الحواس کی جنونی کاروائی کے خانہ میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔ اب امریکہ ایک ایسا ملک ہے۔ جہاں تشدد نام کی ایک تہذیب کا راج

قائم ہو چکا ہے۔ جہاں ماں اپنی پانچ سال کی بچی کو حقیقی رائفل کو نہارتے دیکھ کہتی ہے کہ بٹیا یہ رائفل تمہاری عمر کے لحاظ سے بڑی ہے۔ابھی تم چھوٹی بندوق پر گزارا کر لو۔ جہاں گھروں کے دروازوں پر کتے سے ہوشیار کی جگہ ، مالک سے ہوشیار رہنے کی دھمکی کچھ انداز میں لکھی ہوتی ہے کہ "خبردار، بلا اجازت داخل ہوئے تو گولی مار دی جائے گی"۔ 1997 سے 2008 تک امریکی درسگاہوں میں فائرنگ اور تشدد کے بیسوں واقعات میں سو سے زائد افراد کو اپنی جانیں گنوانی پڑتی ہیں۔ ورجینا یونیورسٹی میں اسی قسم کی اندھا دھند فائرنگ کے نتیجہ میں بتیس لوگوں کی دردناک موت کو یاد کرکے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تعلیمی اداروں کی فیگرس ہیں ورنہ تو ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں 2000 سے 2009 تک 298,000 اموات یعنی سالانہ تقریباً 30,000 اموات گن فائرنگ سے ہوئی ہیں۔ فروری 2009 میں محض بارہ دن کے وقفہ میں فائرنگ سے شکاگو کے شاپنگ مال میں پانچ خواتین کی ہلاکت اور الینوائے یونیورسٹی میں پانچ طلباء اور ایک استاد کی اموات نے امریکی معاشرہ کی چکا چوند کے پیچھے کے سچ کو دنیا کے سامنے پوری طرح بے نقاب کر دیا تھا۔

امریکی معاشرہ کا سچ بندوق رکھنے اور اس کے استعمال میں نہیں، بلکہ اس تہذیبی انتشار اور سماجی اقدار کے بکھراؤ میں پوشیدہ ہے دوسری جنگ عظیم اور سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد نیو ولڈ آرڈر کا نعرہ دینے والا امریکہ

دوسری طرف خود اس کے عوام کے لئے مواقع تو دور، اتنے مسائل کھڑے کر دئے ہیں کہ وہ "وال اسٹریٹ پر قبضہ کرو" جیسی مہم چلانے پر مجبور ہیں۔ امیر و غریب کے درمیان وسیع ہوتی خلیج کے چلتے عوام امیروں سے نفرت تک کرنے لگے ہیں۔ بے روزگاری کی شرح 9 فیصد سے زائد ہے جو نوجوانوں میں پچیس فیصد سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ تعلیم اور علاج عام آدمی کی پہونچ سے دور ہوتا جارہا ہے۔ 'بہترین مواقع کی سرزمین' غریب لوگوں کے رہنے کے لئے تلخ تر ہو گئی۔" پے در پے تکالیف، نت نئی پریشانیاں۔ کہیں نوکری چھن جانے کا غم تو کہیں بے گھری اور دربدری کا خوف۔ کہیں زندگی کی معمولی معمولی سہولیات سے محرومی کا احساس تو کہیں وعدوں کا ایفانہ کرپانے والی حکومتوں کے خلاف غصہ۔ جب ذہن اس حد تک پریشاں ہوں اور دلوں پر اس قدر بوجھ۔ اوپر تلے امید کی کوئی کرن بھی دکھائی نہ دے تو مخبوط الحواس ہو جانا، فرسٹریشن کا شکار ہو جانا عین ممکن ہے۔ اس وقت بندوقوں کے علاج کی نہیں، انسانوں کے علاج کی ضرورت ہے۔ یوں بھی کسی نے سچ کہا ہے کہ بندوقیں خود بخود نہیں چلتیں انہیں انسان چلاتا ہے۔ کسی قوم کے اذہان پر دہشت گردی، تشدد اور بہیمیت کا ایسا غلبہ نظر نہیں آتا جیسا کہ امریکیوں کے ہاں ہے۔ گزشتہ صرف نصف صدی میں امریکا میں ہونے والے جرائم کی خبروں کا جائزہ لیں، آپ کو نظر آئے گا کہ ایک بیٹی اپنی ماں کا سر تن سے جدا کر دیتی ہے، کٹی ہوئی گردن بالوں سے پکڑ کر بڑے اسٹائل سے وہ پولیس اسٹیشن جاتی ہے اور فٹ پاتھ پر کٹا ہوا سر پھینک دیتی ہے۔ دو بیٹے

اپنے والدین کو قتل کر دیتے ہیں۔ ایک سیریل کلر دو طوائفوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ ایک ہم جنس پرست بدکاری کی ترغیب دیتا ہے، اپنے نوجوان شکار کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فریزر میں محفوظ کرلیتا ہے اور پھر یہ گوشت کھاتا رہتا ہے۔ ایک خاموش پراسرار قاتل یونیورسٹی میں 15 افراد کو قتل کر دیتا ہے۔ کولمبین ہائی اسکول کولوراڈو میں بھاری ہتھیاروں سے مسلح لڑکے 13 ہم جماعتوں کو قتل اور 28 کو زخمی کر کے خودکشی کرلیتے ہیں۔ ایک شخص اسکول کے بچوں کا ان کے کھیل کے میدان میں خودکار اسلحے سے قتلِ عام کر دیتا ہے۔ ویت نام جنگ میں حصہ لینے والا ایک فوجی فاسٹ فوڈ فیملی ریسٹورنٹ میں موجود گاہکوں کو مشین گن سے بھون ڈالتا ہے، 20 ہلاک 13 زخمی۔ دوبدو فوجی لڑائی کا ماہر چرچ میں گھس کر عبادت میں مصروف لوگوں کا قتلِ عام کرتا ہے، ساتھ ہی بلند آواز میں کہتا جاتا ہے "میں نے اِس سے قبل ایک ہزار قتل کیے ہیں، ایک ہزار قتل اور کروں گا" وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب آخر کیا ہے؟ یہ کیسا معاشرہ ہے؟ یہ کیسی ترقی ہے؟ یہ ذہنیت کس چیز کی غماز ہے؟ انسانی تاریخ نے ایسی ہلاکت خیز ذہنیت کے حامل افراد کبھی نہیں دیکھے۔ 1961 میں امریکا میں فی ایک لاکھ افراد پر تشدد جرائم کی شرح 158.1

تھی جو 2010 میں 403.6 ہو گئی۔ امریکی حکومت کے یہ اعداد و شمار غماز ہیں کہ معاشرہ کس سمت میں ترقی کر رہا ہے۔

امریکہ کی دہشت گردی اور اسلام دشمنی

ایک امریکی نوجوان کی زبانی

آج سے چار سال قبل یہی اپریل کا مہینہ تھا جب میں ایک مقامی ہسپتال میں اپنا کام ختم کرکے گاڑی کی طرف جارہا تھا کہ میرے پاس امریکی حکومت کے دو ایجنٹ آئے۔

انہوں نے کہا کہ مجھے دو راہوں میں ایک کا انتخاب کرنا ہوگا، ایک راستہ آسان تھا اور دوسرا مشکل۔ 'آسان' راستہ ان کے مطابق یہ تھا کہ امریکی حکومت کا مخبر بن جاؤں اور یوں کبھی عدالت یا قید خانے کی صورت نہ دیکھنی پڑے گی اور دشوار راستہ، سو وہ آپ کے سامنے ہے۔تب سے اب تک ان چار سالوں کا اکثر حصہ میں نے قید تنہائی میں ایک ایسے کمرے میں گزارا ہے جس کا حجم ایک چھوٹی سی الماری جتنا ہے اور مجھے دن کے تئیس گھنٹے اسی میں بند رکھا جاتا ہے۔ایف بی آئے اور ان وکلاء نے بہت محنت کی، حکومت نے مجھے اس کوٹھری میں ڈالنے، اس میں رکھنے، مقدمہ چلانے اور بالآخر یہاں آپ کے سامنے پیش ہونے اور اس کوٹھری میں مزید وقت گزارنے کی سزا سننے کے لئے لوگوں کے ادا کردہ ٹیکسوں کے سینکڑوں ڈالر خرچ کئے۔

اس دن سے ماقبل ہفتوں میں لوگوں نے مجھے بہت سے مشورے دیئے کہ مجھے آپ کے

سامنے کیا کہنا چاہیئے۔ کچھ نے کہا کہ مجھے رحم کی اپیل کرنی چاہیئے کہ شاید کچھ سزا میں تخفیف ہو جائے، جبکہ دوسروں کی رائے تھی کہ کچھ بھی کر لوں میرے ساتھ سختی ہی کا معاملہ کیا جائے گا۔ تاہم میں بس یہ چاہتا ہوں کہ چند منٹ اپنے بارے میں گفتگو کروں۔

جب میں نے مخبر بننے سے انکار کر دیا تو حکومت نے ردعمل کے طور پر مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے دنیا بھر میں مسلم ممالک پر قبضے کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کی حمایت کا 'جرم' کیا ہے۔ یا 'دہشتگردوں' کی جیسا کہ وہ انہیں کہنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ میں کسی مسلمان ملک میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں یہیں امریکہ میں پلا بڑھا ہوں اور یہی بات بہت سے لوگوں کو غضبناک کرتی ہے۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ میں امریکی ہونے کے باوجود ان باتوں پر یقین رکھوں جن پر میں رکھتا ہوں اور وہ موقف اختیار کروں جو میں نے کر رکھا ہے؟ آدمی اپنے ماحول میں جو کچھ دیکھتا ہے وہ ایک جز بن جاتا ہے جو اس کا نقطہ نظر تشکیل کرتا ہے، اور یہی حال میرا بھی ہے۔ لہٰذا، ایک نہیں بلکہ بہت سی وجوہات کے سبب میں جو کچھ ہوں امریکہ ہی کی وجہ سے ہوں۔

کا ذخیرہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ بیٹ مینcomic books چھ سال کی عمر میں میں نے میرے ذہن میں ایک تصور بویا، میرے سامنے ایک نمونہ رکھا کہ کس طرح دنیا

کا نظام چل رہا ہے، بعض ظالم ہوتے ہیں، بعض مظلوم ہوتے ہیں اور بعض وہ جو مظلومین کی حمایت کے لئے آگے آتے ہیں۔ یہ چیز میرے ذہن میں اس طرح پیوست رہی کہ اپنے بچپن کے پورے دور کے اندر میں ہر اس کتاب کی طرف کھنچا چلا جاتا جس میں یہ نمونہ پیش کیا جارہا ہو Uncle Tom's Cabin, TheAutobiography of Malcolm X اور مجھے تو The Catcher in the Rye میں بھی ایک اخلاقی پہلو نظر آتا تھا۔

پھر میں ہائی اسکول پہنچ گیا اور تاریخ کے اسباق پڑھے ،اور مجھ پر یہ واضح تر ہوگیا کہ دنیا کا یہ اصول کتنا حقیقی ہے۔ میں نے امریکہ کے اصل باشندوں اور یورپی آبادکاروں کے ہاتھوں ان پر ہونے والے ظلم کے بارے میں پڑھا۔ میں نے پڑھا کہ پھر ان یورپی آبادکاروں کی نسلوں کو کس طرح کنگ جارج سوم کی جابرانہ حکومت کے دوران ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ میں نے پال ریور اور ٹام پین کے بارے میں پڑھا اور یہ کہ کس طرح امریکیوں نے برطانوی فوج کے خلاف مسلح بغاوت کی، وہ بغاوت جس کا اب ہم امریکہ کی انقلابی جنگ کی حیثیت سے جشن مناتے ہیں۔ آج جہاں ہم بیٹھے ہیں بچپن میں اس سے کچھ دور ہی اسکول کی فیلڈ ٹرپ پر جایا کرتے تھے۔ میں نے ہیریٹ ٹب مین، نیٹ ٹرنر، جان براون اور اس ملک میں غلامی کے خلاف جنگ کے بارے میں پڑھا۔ میں نے ایما گولڈ مین، یوجین ڈیبز، مزدوروں کی انجمنوں، ورکنگ کلاس اور غرباء کی جدوجہدوں کے بارے میں

پڑھا۔ میں نے این فرینک اور نازیوں کے بارے میں پڑھا کہ وہ کس طرح اقلیتوں کو اذیتیں دیتے تھے اور مخالفین کو قید کر دیتے تھے۔ میں نے روزا پارکس، میلکم ایکس، مارٹن لیوتھر کنگ اور شہری حقوق کی جدوجہد کے بارے میں پڑھا۔ میں نے ہو چی منھ کے بارے میں پڑھا کہ کس طرح ویت نام کے باشندگان نے کئی دہائیاں یکے بعد دیگرے آنے والے غاصبین کے خلاف لڑنے میں گزار دیں۔ میں نے نیلسن منڈیلا اور جنوبی افریقہ میں نسلی عصبیت کے خلاف جنگ کے بارے میں پڑھا۔ میں نے ان سالوں میں جو کچھ پڑھا وہ چھ سال کی عمر میں سیکھی گئی بات کی مزید تصدیق کر رہا تھا، کہ پوری تاریخ میں ظالم اور مظلوم کے درمیان ایک مستقل جنگ جاری رہی ہے۔ میں نے جس بھی جدوجہد کے بارے میں پڑھا، میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مظلوم کا طرفدار پایا، اور ان کی حمایت میں کھڑے ہونے والوں کو میں نے ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھا، خواہ وہ کسی بھی ملک سے ہوں، کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ میں نے کبھی بھی اپنی کلاسوں کے نوٹس نہیں پھینکے۔ آج بھی جبکہ میں یہاں کھڑا ہوں وہ میرے کمرے کی الماری میں سلیقے سے رکھے ہیں۔

جتنی بھی تاریخی شخصیات کے بارے میں میں نے پڑھا ان میں سے ایک سب میں ممتاز تھی۔ میلکم ایکس کے بارے میں بہت سی چیزوں نے مجھے متاثر کیا لیکن جس چیز نے سب سے زیادہ دلچسپی بڑھائی وہ کایا پلٹ تھی، ان کی کایا پلٹ۔ مجھے

دیکھی ہے یا نہیں، یہ تقریبا ساڑھے تین 'X' معلوم نہیں کہ آپ نے سپائیک لی کی فلم گھنٹے کی ہے، اور ابتدا میں نظر آنے والا میلکم آخر میں نظر آنے والے میلکم سے بہت مختلف ہے۔ وہ ایک ان پڑھ مجرم ہوتا ہے جو بعدازاں ایک شوہر، ایک باپ، اپنے لوگوں کا محافظ اور فصیح البیاں لیڈر بن جاتا ہے، ایک اصولی مسلمان جو مکہ میں حج کا فریضہ ادا کرتا ہے اور بالآخر شہید ہوجاتا ہے۔ میلکم کی زندگی نے مجھے یہ سبق دیا کہ اسلام کوئی وراثتی دین نہیں ہے؛ یہ کسی نسل یا تہذیب کا نام نہیں ہے۔ یہ تو طریقہ زندگی ہے، ایک فکری حالت ہے جو کوئی بھی اپنا سکتا ہے چاہے وہ کہیں سے بھی تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی ماحول میں پلا بڑھا ہو۔ اس چیز نے مجھے اسلام کو بنظر غائر دیکھنے کی ترغیب دی اور بس پھر میں اس کا دلدادہ ہوگیا۔ میں تو صرف ایک نوجوان تھا اوراسلام اس سوال کا جواب پیش کرتا تھا جو بڑے بڑے سائنسی ذہن دینے سے قاصر ہیں۔ اور جس کا جواب نہ پا کر امرائ اور مشہور و معروف لوگ ڈیپریشن اور خودکشیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کائنات میں ہمارا وجود کیوں ہے؟ اسلام نے جواباً بتایا کہ کس طرح ہمیں زندگی گزارنی ہے۔ کیونکہ اسلام ہمیں کسی پیشوا یا راہب کا محتاج نہیں کرتا لہٰذا میں نے براہ راست قرآن اور سنت کی گہرائیوں میں جانا شروع کردیا، تاکہ اس فہم کے سفر کا آغاز کرسکوں کہ اسلام کیا ہے، بحیثیت انسان اسلام میرے لئے کیا پیش کرتا ہے، ایک فرد کی حیثیت سے، میرے اردگرد کے لوگوں کے لئے، ساری دنیا کے لئے، اور جتنا جتنا

میں یکھتا گیا، مجھے اسلام کی قدر و قیمت کا اتنا ہی احساس ہونے لگا گویا وہ کوئی ہیرا ہے۔ یہ میرے عنفوان شباب کی بات ہے، لیکن آج بھی پچھلے چند سالوں کے دباؤ کے باوجود، میں یہاں آپ کے اور اس کمرہ عدالت میں موجود تمام لوگوں کے سامنے ایک مسلمان کی حیثیت سے کھڑا ہوں، الحمدللہ۔

اس کے ساتھ ہی میری توجہ دنیا بھر میں مسلمانوں کے حالات کی طرف گئی۔ اور جدھر بھی میں نے نگاہ ڈالی میں نے دیکھا کہ نام نہاد طاقتیں میری محبوب شے کے درپے ہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ سویت نے افغانستان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ سربوں نے بوسنیا کے مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی۔ مجھے روسیوں کے ہاتھوں چیچن مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے متعلق پتہ چلا۔ مجھے پتہ چلا کہ اسرائیل نے لبنان میں کیا کیا تھا، اور اب امریکہ کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ فلسطین میں کیا کچھ کر رہا ہے۔ اور مجھے پتہ چلا کہ خود امریکہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ مجھے جنگ خلیج کے متعلق اور ان یورینیم بموں کے متعلق علم ہوا جن سے ہزاروں لوگ مر گئے اور عراق میں کینسر کی شرح آسمان کو پہنچ گئی۔ میں نے امریکہ کے صادر کردہ ان احکامات و قوانین کے بارے میں جانا جن کے باعث عراق میں کھانا، دوائیں اور طبّی سامان جانے سے روک دیا گیا اور کس طرح ،اقوام متحدہ کے مطابق، نتیجتاً پانچ لاکھ سے زائد بچے ہلاک ہوئے۔ مجھے میڈیلائن ایلبرائٹ کے '۶۰ منٹ' کے انٹرویو کا ایک حصہ یاد ہے جس میں

اس نے اپنا یہ اظہار خیال کیا تھا کہ یہ بچے اسی قابل تھے۔ میں نے گیارہ ستمبر کو دیکھا کہ کس طرح کچھ افراد نے ان بچوں کی ہلاکتوں پر ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے اور انہیں عمارتوں میں اڑا دینے کی صورت میں اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ امریکہ نے براہ راست عراق پر حملہ کر دیا ہے۔ میں نے حملے کے پہلے روز آپریشن 'Shock and Awe' کے نتیجے میں ہونے والی تباہی دیکھی، ہسپتال کے وارڈوں میں وہ بچے تھے جن کے سروں میں امریکی میزائلوں کے ٹکڑے کھبے ہوئے تھے (ظاہر ہے یہ سب کچھ سی این این پر نہیں دکھایا گیا)۔ مجھے حدیثہ کے قصبے کے بارے میں علم ہوا جہاں چوبیں مسلمانوں کو جن میں ایک چھیتر سالہ ویل چیئر پر بیٹھا بوڑھا، عورتیں اور ننھے بچے شامل ہیں، ان کے بستروں میں ہی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ مجھے عبیر الجنبی کے بارے میں پتہ چلا، ایک چودہ سالہ عراقی بچی جسے پانچ امریکی فوجیوں نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا، جنہوں نے پھر اس کے اور اس کے گھر والوں کے سروں میں گولیاں ماریں اور ان کی لاشوں کو جلا دیا۔ میں بس اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، آپ دیکھتے ہی ہیں کہ مسلم خواتین نامحرم مردوں کو اپنے بال تک نہیں دکھاتیں۔ ذرا تصور کریں ایک گاوں سے تعلق رکھنے والی بچی کو بے لباس کیا جائے اور پھر ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں یکے بعد دیگرے پانچ فوجی اسے بے عزت کریں۔ آج بھی جبکہ میں اپنے سیل میں بیٹھا ہوتا ہوں، ان ڈرون حملوں کے بارے میں پڑھتا ہوں جو پاکستان، صومالیہ اور یمن

جیسے ممالک میں روزانہ مستقل بنیاد پر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ پچھلے ماہ ہی ان سترہ افغان مسلمانوں کے بارے میں سنا جن میں اکثریت ماؤں اور ان کے بچوں کی تھی، جو ایک امریکی فوجی کی گولیوں کا نشانہ بنے اور اس نے ان کی لاشوں کو بھی جلا دیا۔ یہ تو صرف چند کہانیاں ہیں جو شہ سرخیوں تک پہنچ پاتی ہیں، تاہم اسلام کے جو تصورات میں نے سب سے پہلے سیکھے ان میں بھائی چارہ اور وفاداری بھی شامل ہے، کہ ہر مسلمان خاتون میری بہن ہے اور ہر مرد میرا بھائی اور مل جل کر ہم سب ایک جسم کی مانند ہے اور ہمیں ایک دوسرے کی حفاظت کرنی ہے۔ بالفاظ دیگر، میں یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میرے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہے، امریکہ بھی ظالموں میں شامل ہو اور میں غیر جانبدار رہوں۔ مظلوموں کے لئے میری حمایت جاری رہی تاہم اس بار اس میں اپنائیت بھی تھی، اور یہی احساسات ان لوگوں کے لئے بھی تھے جو ان مظلومین کے دفاع میں اٹھے۔

میں نے پال ریور کا تذکرہ کیا تھا، وہ آدھی رات کو لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے نکلا کہ برطانوی سام ایڈمز اور جان ہینکاک کو گرفتار کرنے کے لئے لیگزنگٹن کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں اور اس کے بعد کانکورڈ جائیں گے تاکہ وہاں آزادی کے لئے لڑنے والی ملیشیا کے ذخیرہ کردہ اسلحہ کو ضبط کریں۔ جس وقت تک برطانوی کانکورڈ پہنچے آزادی کے لئے لڑنے والے لوگ اپنے ہاتھوں میں

اسلحہ لئے ان کے سامنے مقابلے کے لئے کھڑے تھے۔انہوں نے برطانویوں پر گولیاں چلائیں، ان سے لڑائی کی اور انہیں ہرادیا۔ اسی جنگ سے امریکی انقلاب کا آغاز ہوا۔ جو کام ان لوگوں نے کیا اس کے لئے ایک عربی لفظ ہے ،اور وہ لفظ 'جہاد' ہے، اور میرا مقدمہ بھی اسی سے متعلق تھا۔ وہ ساری ویڈیوز اور تراجم اور بچگانہ بحثیں کہ' اوہ ! اس نے اس جملے کا ترجمہ کیا تھا' اور' اوہ ! اس نے اس جملے پر نظرثانی کی تھی !'،اور وہ تمام پیش کردہ باتیں ایک ہی معاملے کے گرد گھومتی تھیں: وہ مسلمان جو امریکہ کے خلاف اپنا دفاع کررہے تھے جو ان کے ساتھ وہی سلوک کررہا ہے جو برطانیہ نے امریکہ کے ساتھ کیا تھا۔پیشیوں کے اندر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ میں کبھی بھی بازاروں میں امریکیوں کے 'قتل' کے کسی منصوبے میں شامل نہیں رہا، یا جو بھی کہانی بنائی گئی تھی' اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔حکومتی گواہوں نے خود بھی اس دعوے کا رد کیا، اور ایک کے بعد دوسرا ماہر اس جگہ آکر کھڑا ہوتا رہا، جنہوں نے میرے تحریر کردہ ہر ہر لفظ کے حصے بخرے کرنے میں کئی گھنٹے گزارے کہ میرے عقائد کو بیان کر سکیں۔ اس کے بعد جب میں آزاد ہوا تو حکومت نے اپنا ایک خفیہ ایجنٹ بھیجا کہ وہ مجھے اپنے کسی چھوٹے سے 'دہشتگردانہ منصوبے' میں ملوث ہونے کی ترغیب دے سکے، لیکن میں نے شمولیت سے انکار کردیا۔تاہم حیرت کی بات ہے کہ جیوری کو اس بارے میں کوئی خبر نہیں۔

لہذا، میرا یہ مقدمہ امریکی شہریوں کے قتل پر میرے موقف کے لحاظ سے نہیں تھا، بلکہ یہ امریکیوں کے ہاتھوں مسلمان شہریوں کے قتل کے لحاظ سے میرے موقف پر تھا، اور وہ یہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اراضی پر غاصب قوتوں کے خلاف دفاع کرنا چاہئے چاہے وہ امریکی ہوں، روسی ہوں یا مریخی ہوں۔ میں اسی بات پر یقین رکھتا ہوں، ہمیشہ سے میرا یہی یقین رہا ہے اور ہمیشہ یہی یقین رہے گا۔ یہ نہ دہشت گردی ہے، نہ انتہا پسندی ہے۔ یہ تو بس دفاع نفس کی سادہ سی منطق ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی نمائندگی آپ کے اوپر موجود علامت کے تیر کر رہے ہیں، وطن کا دفاع۔ چنانچہ میں اپنے وکلاء کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ آپ کو میرے عقائد ماننے کی ضرورت

نہیں۔ نہیں، بلکہ جس کے اندر بھی تھوڑی سی عقل اور انسانیت ہوگی لامحالہ اسے یہ بات ماننی ہی پڑے گی۔ اگر کوئی آپ کے گھر میں گھس کر چوری کرنا چاہے اور آپ کے اہل و عیال کو نقصان پہنچانا چاہے تو عقل یہی کہے گی کہ اس جارح کو باہر نکالنے کے لئے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کیا جائے۔ لیکن جب وہ گھر کوئی مسلم سرزمین ہو، اور وہ جارح امریکی فوج ہو، تو کسی وجہ سے یہ اصول بدل جاتے ہیں۔ عقل کا نام 'دہشت گردی' رکھ دیا جاتا ہے، اور جو لوگ سمندر پار سے آئے قاتلوں کے خلاف اپنا دفاع کرتے ہیں وہ 'دہشت گرد' بن جاتے ہیں جو 'امریکیوں کو قتل' کر رہے ہیں۔ ڈھائی صدی پہلے امریکہ جس ذہنیت کا شکار تھا جب برطانوی ان سڑکوں پر چل رہے تھے وہی ہے جس کا شکار آج مسلمان ہیں جن کی سڑکوں پر امریکی فوجی مٹر گشت کر رہے ہیں۔ یہ

استعماریت کی ذہنیت ہے۔جب سرجنٹ بیلز نے پچھلے مہینے ان افغانوں کو قتل کیا تو ذرائع ابلاغ کا سارا زور اس کی ذات پر تھا، اس کی زندگی، اس کی پریشانی، اس کے گھر کا گروی ہونا، گویا وہی ظلم کا نشانہ بنا ہے۔اور جن لوگوں کو اس نے مارا تھا ان کے لئے کم ہی ہمدردی دکھائی گئی، گویا وہ حقیقی لوگ نہیں تھے، انسان نہیں تھے۔بدقسمتی سے یہی ذہنیت معاشرے کے ہر فرد میں راسخ ہو چکی ہے، چاہے اسے اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو۔حتی کہ میرے وکلاء بھی، دو سال گفتگو کرنے، سمجھانے اور وضاحتیں پیش کرنے میں لگے اور پھر کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے خول سے باہر جھانک سکیں اور کم از کم میری بات میں موجود منطق و عقل کو بناوٹی طور پر ہی قبول کر سکیں۔دو سال! اگر اتنے ذہین لوگوں کو اتنا وقت لگا، جن کا کام میرا دفاع کرنا تھا، اپنی ذہنیت تبدیل کرنا تھا اور پھر مجھے یونہی کسی جیوری کے سامنے پیش کر دیا گیا اس بات کے تحت کہ وہ ،

میرے 'غیر جانبدار موکل' ہیں ، مطلب یہ کہ مجھے اپنے ساتھیوں کی جیوری کے سامنے نہیں پیش کیا گیا کیونکہ جو ذہنیت امریکہ پر چھائی ہوئی ہے اس کی وجہ سے میرے کوئی ساتھی ہی نہیں۔اسی حقیقت کو بنیاد بناتے ہوئے حکومت نے مجھ پر مقدمہ چلایا، اس لئے نہیں کہ انہیں کوئی حاجت تھی، بس صرف اس لئے کیونکہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔

میں نے تاریخ کی کلاسوں میں ایک اور بات بھی سیکھی تھی۔امریکہ نے تاریخ

میں ہمیشہ اپنی اقلیتوں کے خلاف غیر منصفانہ ترین حکمت عملیاں اپنائی ہیں، ایسے افعال جنہیں قانون کا تحفظ بھی حاصل تھا، اور پھر بعد میں پیچھے دیکھ کر یہی کہا گیا'آخر ہم کیا سوچ رہے تھے؟'غلامی، جم کرو، جنگ عظیم دوئم میں جاپانیوں کی نظر بندی، یہ سب امریکی معاشرے میں بالکل قابل قبول تھا، اور سپریم کورٹ کی پشت پناہی کے ساتھ تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور امریکہ بدل گیا، عوام اور عدلیہ دونوں نے پیچھے دیکھ کر یہی کہا کہ 'آخر ہم کیا سوچ رہے تھے؟' جنوبی افریقہ کی حکومت نیلسن منڈیلا کو دہشت گرد سمجھتی تھی، اور اسے قید حیات کی سزا سنائی گئی تھی۔ لیکن وقت گزر گیا اور دنیا بدل گئی، انہیں احساس ہوا کہ ان کی پالیسی کتنی ظالمانہ تھی، کہ دراصل وہ دہشت گرد نہیں تھا، اور اسے قید سے آزاد کر دیا گیا۔ وہ صدر بھی بن گیا۔ لٰہذا ہر چیز ذہنیت سے تعلق رکھتی ہے، یہ 'دہشت گردی' کا سارا معاملہ بھی اور یہ کہ کون دہشت گرد' ہے۔ یہ سب تو وقت اور مقام پر منحصر ہے اور یہ کہ کون اس وقت 'عالمی قوت' ہے۔

آپ کی نظروں میں میں دہشت گرد ہوں، صرف ایک میں ہی یہاں پر ایک زرد لباس میں کھڑا ہوں اور میرا یہاں زرد لباس میں کھڑا ہونا بالکل معقول ہے۔ لیکن ایک دن امریکہ بدل جائے گا اور لوگوں کو اس دن کی حقیقت کا احساس ہوگا۔ وہ دیکھیں گے کہ کس طرح ہزاروں لاکھوں مسلمان غیر ممالک میں امریکی فوج کے

ہاتھوں قتل ہوئے اور اپاہج ہوئے۔ تاہم کسی طریقے سے آج میں ہوں جسے ان ممالک میں 'قتل اور اپاہج کرنے کی سازش' کی وجہ سے قید میں بھیجا جارہا ہے، کیونکہ میں ان لوگوں کا دفاع کرنے والے مجاہدین کی حمایت کرتا ہوں۔ لوگ پیچھے مڑ کر دیکھیں گے کہ کس طرح حکومت نے مجھے 'دہشتگرد' کی حیثیت سے قید کرنے کے لئے لاکھوں ڈالر خرچ کئے، لیکن اگر ہم کسی طرح امیر الجنبی کو اس موقع پر زندہ کرکے لا کھڑا کریں جب وہ آپ کے فوجیوں کے ہاتھوں ذلیل ہورہی تھی، اسے اس گواہی کے کٹہرے میں کھڑا کریں اور اس سے پوچھیں کہ دہشت گرد کون ہیں، تو یقیناً اس کا اشارہ میری طرف نہیں ہوگا۔

حکومت کا کہنا ہے کہ مجھ پر شدت کا بھوت سوار ہے، 'امریکیوں کے قتل کا بھوت سوار ہے۔ لیکن اس دور میں رہنے والے مسلمان کی حیثیت سے، میں اس سے زیادہ طعن آمیز جھوٹ سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔،،

یہ ایک ایسے امریکی نوجوان کا عدالتی بیان ہے۔ جو امریکہ ہی میں پلا بڑھا۔ امریکی کی ظالمانہ کاروائی کا شکار طارق مھنا ایک پاکستانی مصری امریکن ہیں۔ ان کے والدین پاکستان اور مصر سے امریکہ ہجرت کر گئے تھے اور طارق وہیں پیدا ہوئے اور پیدائش سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ انہیں امریکی حکومت نے انٹرنیٹ پر جہادیوں کی حمایت کرنے کے الزام میں کئی سال کے لئے

جیل بھیج دیا ہے۔ جس وقت جج انہیں سزا سنا رہا تھا انھوں نے بھری عدالت میں یہ بیان دیا تھا۔ اس جذباتی بیان نے عدالت میں موجود بہت سے لوگوں کو مبہوت کر دیا تھا اور کئی لوگ اپنی آنکھیں پونچھتے دیکھے گئے۔ اس تقریر کے بعد جج نے کہا کہ امریکی عدالت صرف قانون کے دائرے میں رہ کر فیصلہ دیتی ہے قانون بناتی نہیں اور امریکی قانون یہی کہتا ہے کہ آپ مجرم ہیں۔ امریکی جج کے سامنے طارق مہنا کی تقریر نے امریکہ کی دہشت گردی اور اسلام دشمنی کو بے نقاب کر دیا۔ آج امریکی جیلوں میں ڈاکٹر عافیہ، طارق مہنا اور ان جیسے ہی ہزاروں مسلمان بند ہیں جو اپنی حق گوئی کی بابت امریکی عقوبت خانوں میں قید ہیں اور امریکہ کی اسلام دشمنی کا ہدف بن رہے ہیں۔

بال ٹھاکرے نفرتوں کا سوداگر

مسلمان دشمنی اور پاکستان دشمنی ان کی وجہ شہرت تھی۔

قدرت کا عجب نظام ہے کہ ساری زندگی مسلم دشمن کا پرچار کرنے والے بال ٹھاکرے کو آخری وقت میں موت کے منہ میں جانے سے روکنے والے تین معالجوں میں سے دو مسلمان ڈاکٹر تھے اور ان کی موت کا اعلان کرنے والے بھی مسلمان ڈاکٹر تھے۔

ممبئی میں دو دن سے سارا شہر بند ہے، سڑکیں سنسان ہیں، ہر دکان، اور کاروبار بند ہے،ٹی وی پر خبروں کے علاوہ کوئی اور پروگرام نہیں چل رہا، اخبارات کے صفحوں پر ایک ہی خبر ہے، بال ٹھاکرے کی موت کی خبر، سامنا (مراٹھی اخبار) اور دوپہر کا سامنا (ہندی میں) دونوں اخبارات کے صفحات مسلسل دوسرے دن بھی سوگ کی علامت کے طور پر سیاہ صفحات میں شائع ہوئے ہیں۔ بال ٹھاکرے،دونوں اخبارات کے بانی مدیر تھے ۔اپنی شروعات 23 جنوری، 1988 کے بعد سے تاریخ میں پہلی بار ہے، کہ اس کے دو اہم صفحات بلیک پرنٹ ہوئے ہیں۔ اخبار میں ایک تصویر نمایاں ہے وہ ہے بال ٹھاکرے کی جس پر سرخی ہے۔ "دنیا شیوسینا سربراہ

کی طاقت اور 'شیو سنکو عقیدت" کی گواہ رہے گی۔ بال ٹھاکرے کی ارتھی ہندوستانی پرچم میں لپیٹ کر، توپوں کی سلامی کے ساتھ آخری رسومات کے لئے چلی تو لاکھوں افراد اس جلوس میں تھے۔پولیس کمشنر نے اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب ملتوی کردی تھی۔ مہاراشٹر کے دارالحکومت میں صنعتی و شہری سرگرمیاں معطل رہیں جبکہ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کیلیے 48ہزار پولیس اور سیکیورٹی اہلکاروں کی تعیناتی کی گئی تھی۔ نو کلومیٹر کا فاصلہ دس گھنٹوں میں طے ہوا۔ ممبئ کی فلموں سے وابستہ بڑی بڑی شخصیات گھنٹوں اس تقریب میں کھڑی رہی ۔بابری مسجد کی شہادت ،اور بھارت میں ہزاروں مسلمانوں کے قتل اور ان کے سیکڑوں گھرجلانے کے الزامات اور مقدمات میں ملوث سخت گیر ہندو قوم پرست جماعت شیو سینا کے سربراہ بال ٹھاکرے تقریباً چھیالیس سال تک عوامی زندگی میں رہے اور متنازع بیانات کے ساتھ ان کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔

بال ٹھاکرے کیخلاف 1993 میں ممبئ میں مسلمانوں کے خلاف مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد بھڑکانے کے الزامات تھے اور سرکاری انکوائری میں اسے ذمے دار بھی قرار دیاگیا تھاتاہم حکومت اس کے خلاف مقدمہ درج کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔انہوں نے نہ تو کبھی کوئی انتخاب لڑا، نہ ہی کوئی سیاسی عہدہ ہی قبول کیا، پھر بھی بھارت کی مغربی ریاست مہاراشٹر کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ ان کے متنازعہ بیانات اور سیاست میں تشدد سے ہر شخص

اور حکومت خوفزدہ رہتی تھی۔ وہ اعلانیہ ہٹلر کے پرستار تھے۔ اور اسی کے نقش قدم پر چل کر دہشت کی مقبولیت کو اپنا موٹو بنایا تھا۔ تاریخی بابری مسجد کے انہدام کے بعد 'انھوں نے کہا تھا 'ہمارے لوگوں نے اسے گرایا ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔

وہ تشدد کے استعمال کے حق میں بھی تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ 'میں سیاست میں تشدد اور طاقت کا استعمال کروں گا کیونکہ کمیونسٹوں کو یہی زبان سمجھ آتی ہے اور کچھ لوگوں 'کو تشدد کا ڈر دکھانا چاہیے تب ہی وہ سبق سیکھیں گے۔

نومبر دوہزار نو میں بھارتی کرکٹر سچن ٹنڈولکر نے کرکٹ کے میدان میں جب یہ کہا کہ ممبئی تمام ہندوستانیوں کا ہے۔ تو اس بیان پر بال ٹھاکرے نے سچن کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ بال ٹھاکرے نے کہا تھا کہ جب آپ چوکا یا چھکا لگاتے ہیں تو لوگ آپ کی تعریف کرتے ہیں، لیکن اگر آپ مراٹھیوں کے حقوق کی خلاف ورزی کریں گے یا ان پر تبصرہ کریں گے تو اس سے مراٹھی مانس کو ٹھیس پہنچے گی اور وہ اسے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اس وقت بال ٹھاکرے نے سچن ٹنڈولکر کو کرکٹ کے بہانے سیاست نہ کرنے کی نصیحت بھی دی تھی۔ بہرحال تندولکر اب بھارت کے ایوان بالا کے نامزد رکن ہیں۔

اپریل دوہزار دس کو بال ٹھاکرے نے بھارت کی سٹار ٹینس کھلاڑی ثانیہ مرزا کو اس وقت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ جب انھوں

نے پاکستانی کرکٹ کھلاڑی شعیب ملک کے ساتھ شادی کا اعلان کیا تھا۔ بال ٹھاکرے نے ایک بار پھر اپنے جانے پہچانے انداز میں کہا تھا کہ ثانیہ اگر بھارت کے لیے کھیلنا چاہتی ہیں تو انہیں کسی بھارتی کو ہی اپنا رفیق حیات منتخب کرنا ہوگا اور اگر ثانیہ مرزا نے شعیب سے شادی کی تو وہ بھارتی نہیں رہ جائیں گی، ان کا دل اگر ہندوستانی ہوتا تو کسی پاکستانی کے لیے نہیں دھڑکتا۔ بال ٹھاکرے نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ثانیہ اپنے کھیل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے تنگ کپڑوں، فیشن اور محبت کے قصوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔

بھارت کی دوسری ریاستوں سے ممبئ آ کر بسنے والوں کے خلاف بال ٹھاکرے نے اپنی سیاست چمکائی تھی۔ وہ ان کے خلاف آخر تک انتہائی سخت الفاظ کا استعمال کرتے رہے۔

مارچ دو ہزار دس میں مہاراشٹر کے گورنر کے شنیر نارائن نے کہا تھا کہ ممبئ میں کوئی بھی رہ سکتا ہے۔

اس پر بال ٹھاکرے نے شیو سینا کے ترجمان اخبار 'سامنا' میں لکھا تھا کہ ممبئ دھرم شالہ بن گئی ہے، بیرونی لوگوں کو آنے سے روکنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ پرمٹ سسٹم نافذ کر دیا جائے۔ پاکستانی کرکٹ کھلاڑیوں کو انڈین پریمیئر لیگ یعنی آئی پی ایل میں شامل کرنے کی بات چلی تو اداکار اور کولکتہ نائٹ رائڈرز کے مشترک مالک شاہ رخ خان نے اس بات کی حمایت کی۔

اس سے مشتعل ہو کر بال ٹھاکرے نے شاہ رخ خان کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ بال ٹھاکرے نے اس وقت کہا تھا کہ پاکستانی کھلاڑیوں کی وکالت کے لیے شاہ رخ خان کو 'نشان پاکستان' سے نوازا جانا چاہیے۔ بال ٹھاکرے نے ہمیشہ پاکستان کے ساتھ بھارت کے میچ کی مخالفت کی انھوں نے آئندہ ماہ ہونے والے بھارت پاکستان سیریز کی بھی مخالفت کی تھی۔ شیو سینا کے سربراہ بالا صاحب ٹھاکرے نے کبھی نہ تو کوئی انتخاب لڑا اور نہ ہی کوئی سیاسی عہدہ قبول کیا۔ یہاں تک کہ انہیں باقاعدہ طور پر کبھی شیو سینا کا صدر بھی نہیں بنایا گیا تھا، لیکن ان سب کے باوجود مہاراشٹر کی سیاست اور خاص طور پر اس کے دارالحکومت ممبئی میں ان کا حکم چلتا تھا۔ اور کوئی اس سے چوں چرا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کاروبار، ملازمت، سیاست، کھیل، فلم، اخبار، میڈیا، پولیس حکومت، سیاست، ممبئی کی زیر زمین دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے۔ فلم کے ہیرو اور ہیروین کا انتخاب وہ کرتے تھے۔ اور کونسی فلم چلے گی اور کون سی نہیں یہ بھی ان کا فیصلہ ہوتا تھا۔ ان کا سیاسی سفر بھی بڑا منفرد تھا۔ وہ ایک پیشہ ور کارٹونسٹ تھے اور شہر کے ایک اخبار فری پریس جرنل میں کام کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے نوکری چھوڑ دی اور مراٹھی بولنے والے مقامی لوگوں کو ملازمتوں میں ترجیح دیے جانے کی مانگ کو لے کر تحریک شروع کر دی۔ ممبئی (اس وقت ممبئی کو بمبئی کہا جاتا تھا) میں واقع کمپنیوں کو انہوں نے نشانہ بنایا)

لیکن دراصل ان کی یہ مہم ممبئی میں رہنے والے جنوبی ہندوستانیوں کے خلاف تھی کیونکہ شیوسینا کے مطابق جو ملازمتیں مراٹھیوں کے حصے میں آنی چاہیے تھیں ان پر جنوبی ہندوستانیوں کا قبضہ تھا۔ جنوبی ہندوستان کے کاروبار، املاک کو نشانہ بنایا گیا اور آہستہ آہستہ مراٹھی نوجوان شیوسینا میں شامل ہونے لگے۔

انھوں نے اپنی پارٹی کا نام شیوسینا سترھویں صدی کے ایک جانے مانے مراٹھا راجہ شیواجی کے نام پر رکھا تھا۔ شیواجی مغلوں کے خلاف لڑے تھے۔ انھوں نے مسلح جتھے تیار کیئے جو جب چاہئے کسی کو بھی ان کے حکم پر تشدد کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ سیاسی حریفوں، تارکین وطن اور یہاں تک کہ میڈیا پر شیو سینکوں کے حملے عام بات تھی۔ دیکھتے دیکھتے ممبئی کے ہر علاقے میں مقامی دبنگ نوجوان شیوسینا میں شامل ہونے لگے۔ ایک گاڈ فادر کی طرح بال ٹھاکرے ہر تنازعے کو حل کرنے لگے۔ لوگوں کو نوکریاں دلانے لگے اور انھوں نے حکم دے دیا کہ ہر معاملے میں ان کی رائے لی جائے۔ یہاں تک کی فلموں کی نمائش میں بھی ان کی من مانی چلنے لگی۔ بال ٹھاکرے کی زندگی سے جڑی کئی خیالی کہانیاں عام ہونے لگیں۔ کہا گیا کہ وہ جرمنی کے سابق ڈکٹیٹر ہٹلر کے مداح ہیں۔ ایک میگزین میں ان کے حوالے سے یہ خبر دی گئی تھی لیکن انھوں نے نہ تو اس کی تصدیق کی اور نہ ہی تردید۔ ممبئی مونسپل کارپوریشن کے انتخابات میں ان کی

پارٹی کی کارکردگی اچھی نہیں رہی۔ شیو سینا کا اثر ممبئ اور اس کے آس پاس کے علاقوں تک ہی محدود رہا اور ابتدا میں ریاست کے دوسرے علاقوں میں پارٹی کا کچھ خاص اثر نہیں تھا۔ بال ٹھاکرے کو ممبئ میں ہی مقبولیت حاصل تھی۔ سیاسی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ ابتدائی دور میں حکمراں کانگریس نے شیو سینا کو یا تو نظر انداز کیا یا پھر کئی معاملات میں کمیونسٹوں یا اپنے سیاسی مخالفین کو ختم کرنے کے لیے شیو سینا کو حوصلہ افزائی کی۔

لیکن اسّی کی دہائی کے دوران شیو سینا ایک بڑی سیاسی قوت بن گئ جو ریاست میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے اپنی دعویداری پیش کر رہی تھی۔ انیس سو بانوے میں اتر پردیش کے ایودھیا شہر میں تاریخی بابری مسجد کے منہدم کیے جانے کے بعد ممبئ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جو کئ ہفتوں تک چلے۔ ان فسادات میں شیوسینک بھی شامل رہے، فسادات میں کل نو سو افراد ہلاک ہوئے۔ سینکڑوں لوگوں نے فسادات کے بعد ممبئ چھوڑ دیا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔

صرف تین سال کے بعد شیو سینا اور بی جے پی اتحاد ریاست میں اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ بال ٹھاکرے نے اپنے ایک بہت ہی قریبی رہنما کو وزیر اعلی بنایا اور اقتدار کی چابی خود اپنے پاس رکھی۔ گزشتہ ایک دہائی میں

شیوسینا کی مہم کا رخ بھارت کی دوسری ریاستوں سے ممبئی آنے والے تارکین وطن اور مذہبی اقلیتوں کے خلاف ہو گیا۔

ٹھکرے ایک اچھے مقرر تھے اور لوگوں کو اپنی پرجوش باتوں سے خوب متوجہ کرتے تھے۔ ممبئی کے شیواجی پارک میں ہر سال ہندوؤں کے تہوار دسہرہ کے موقع پر ان کے حامیوں کو ان کے بیان کا خوب انتظار رہتا تھا۔ اس سال وہ خراب صحت کی وجہ سے شیواجی پارک تو نہیں جا سکے لیکن اپنے حامیوں کے لیے انھوں نے ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعے پیغام بھیجا جس میں انھوں نے اپنے چاہنے والوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ان کے بیٹے اور شیوسینا کے ایگزیکٹو صدر اودھو ٹھاکرے کو اتنا ہی پیار اور عزت دیں جتنا انھوں نے بال ٹھاکرے کو دیا تھا۔ایک کارٹونسٹ کے طور پر بال ٹھاکرے برطانوی کارٹونسٹ ڈیوڈ لو کو بہت پسند کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم پر ڈیوڈ لو کے کارٹون بہت مقبول ہوئے تھے۔حالیہ دنوں تک ٹھاکرے اپنے مراٹھی ہفتہ وار 'مارمی' کے لیے خود کارٹون بناتے تھے۔

ایک طاقتور لیڈر ہونے کے باوجود بال ٹھاکرے اپنے ساتھیوں کو جوڑ کر نہیں رکھ سکے۔ ان کے بہت سے قریبی ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔خود بال ٹھاکرے کے بھتیجے راج ٹھاکرے نے ان کی پارٹی چھوڑ دی کیونکہ بال ٹھاکرے نے اپنے بیٹے اودھو ٹھاکرے کو اپنا وارث مقرر کر دیا تھا۔حالیہ دنوں میں دونوں

ٹھاکرے.برادران کے کچھ قریب آنے کی خبریں آتی رہی ہیں اور یہ اندازہ بھی لگایا جانے لگا کہ راج ٹھاکرے اور اودھو ٹھاکرے میں انتخابی اتحاد بھی ہو سکتا ہے لیکن راج ٹھاکرے اپنی پارٹی کو تحلیل نہیں کریں

۔

23 جنوری 1926ء کو پیدا ہونے والے بال ٹھاکرے نے شیو سینا کی بنیاد 1996ء میں ڈالی تھی۔ تب ان کا بنیادی محرک یہ تھا کہ ملازمتوں کے معاملے میں باہر سے آکر ممبئی میں آباد ہونے والوں کی بجائے یہاں کے ان مقامی باشندوں کو ترجیح دی جائے، جن کی مادری زبان مراٹھی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'ممبئی پر پہلا حق صرف مراٹھیوں کا ہے'۔ تقریباً 20 ملین کی آبادی والا ممبئی بھارت کا خوشحال ترین شہر اور ریاست مہاراشٹر کا دارالحکومت ہے اور اس شہر کی سیاست گزشتہ دو عشروں سے مکمل طور پر کٹر مذہبی نظریات کے حامل بال ٹھاکرے کے کنٹرول میں تھی۔ ٹھاکرے بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو اکثر 'قوم دشمن' کہا کرتے تھے۔ وہ پاکستان پر بھی سخت تنقید کیا کرتے تھے اور پاکستان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کی بھارتی کوششوں کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اس سال جولائی میں شیو سینا کے اخبار 'سامنا' میں بال ٹھاکرے نے لکھا کہ 'بھارت میں دھماکوں میں ملوث پاکستان کے ساتھ امن مذاکرات کرنا ایک ڈھونگ ہے جبکہ ا±ن کے ساتھ کرکٹ کھیلنا غداری ہے۔ کارٹونسٹ کی حیثیت سے اسے ابتداء میں کامیابی ملی لیکن جلد ہی تنخواہ پر جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے انھوں نے نوکری

چھوڑ دی اور بمبئی سے غیر مراٹھی لوگوں کو باہر نکالنے کی تحریک شروع کی۔ بال ٹھاکرے نے لسانی اور مذہبی بنیادوں پر بے روزگار نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرنا شروع کیا۔ بال ٹھاکرے کے مطابق یہ تنظیم صرف مراٹھی نوجوانوں کو انصاف دلوانے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ غیر مراٹھیوں کے خلاف اس تحریک نے متعدد دفعہ تشدد کا رنگ اختیار کیا۔ شیو سینا میں بال ٹھاکرے کے علاوہ کوئی دوسرا لیڈر نہیں تھا۔ حتی کہ جماعت میں تنظیمی انتخابات کی بات کرنے کی بھی حماقت کسی نے نہیں کی۔ جن لوگوں نے آواز اٹھانے کی کوشش کی انہیں جماعت سے نکال دیا گیا۔ ان میں چھگن بھجبل بھی شامل تھے جو مہاراشٹر کے نائب وزیر اعلیٰ بھی رہے۔۔جب 1995ء میں مہاراشٹر میں شیو سینا اور بی جے پی کی مخلوط حکومت بنی، تو حکومت سے باہر رہنے کے باوجود تمام فیصلے بال ٹھاکرے ہی کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی اس بات سے انکار نہیں کیا کہ وہ ریموٹ کنٹرول سے حکومت چلاتے ہیں۔ ان کی جماعت مرکزی حکومت میں بھی شامل رہی اور اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی پر ہمیشہ دباؤ قائم رکھا۔ شیو سینا کے ایک رکن پارلیمان کی جانب سے وزیر اعظم کے قریبی معاونین پر بدعنوانی کے الزامات پر واجپئی اتنا ناراض ہوئے کہ انہوں نے استعفے کی پیش کش کر دی تھی۔ بعد میں 2005ء اور 2006ء میں شیو سینا میں شدید اختلافات سامنے آئے۔ اور اس کے کئی کارکنان بال ٹھاکرے کی آمرانہ حکمت عملی کی وجہ سے جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ حتی کہ بال ٹھاکرے کے بھتیجے نے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنائی۔

بال ٹھاکرے نے کھلم کھلا ہٹلر کو اپنا سیاسی پیشوا تسلیم کیا، اس کا کہنا تھا کہ جرمنی کے فسطائی رہنما کے بارے میں لوگ جو بھی کہیں، ہٹلر نے جو بھی کیا جرمنی کے حق میں ہی کیا۔ بال ٹھاکرے کی پوری سیاست اسی نظریہ کے ارد گرد گھومتی رہی اور اپنے مسلمان مخالف نظریہ کو وہ اسی تناظر میں پیش کرتا رہا۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ اس کی مقبولیت میں اس کے اقلیت مخالف متنازعہ بیانات کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ قوم پرست طبقہ اس طرح کی باتیں سننا چاہتا ہے۔ موت سے دو دن قبل بال ٹھاکرے کی عیادت کو جانے والے بالی وڈ اسٹار امیتابھ بچن اور ان کے بیٹے ابھیشک بچن پر شیو سینا کے کارکنوں نے حملہ کرکے زخمی کر دیا تھا۔ بلکہ ان کے کپڑے بھی پھاڑ دیئے تھے۔ تاہم امیتابھ بچن نے گھر واپسی پر ٹوئٹر پر حملے کی تصدیق کی اور مزید لکھا کہ جب وہ فلم " قلی" کی شوٹنگ کے دوران زخمی ہوئے تھے تو بال ٹھاکرے ان کی عیادت کو اسپتال بھی آئے تھے۔

بال ٹھاکرے کی ہندو انتہا پسند تنظیم شیو سینا نے بھی نازی اور فاشسٹ پارٹی کے بہت سے اصول اپنائے۔ ہفتہ کو ڈاکٹروں نے میڈیا کے سامنے بال ٹھاکرے کے چل بسنے کا احوال بیان کیا تو ممبئی سمیت آس پاس کے شہروں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کاروباری زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔ ممبئی پولیس بھی خوفزدہ تھی اور آخری رسومات ادا کرنے کے موقع پر ہدایت نامہ (ایڈوائز) جاری کی تھی کہ

شہری اپنے گھروں سے بلاوجہ باہر نہ نکلیں حکام نے گزشتہ ہفتے سے ہی پولیس کی تمام چھٹیاں منسوخ کرکے انہیں الرٹ کر دیا تھا۔ انھوں نے 1966ء میں شیوسینا پارٹی کی بنیاد رکھی لیکن بہت عرصہ تک اسے ممبئی کے انڈر ورلڈ اور سیاست میں کوئی نمایاں مقام نہیں ملا۔ تب اسے کسی نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ شیوسینا کا ایک نکاتی منشور غیر اعلانیہ طور پر پاکستان دشمنی قرار دے دیا جائے چنانچہ تب سے بال ٹھاکرے نے پاکستان دشمنی کو اپنا کاروبار بنا لیا اور واقعی اس کی وجہ سے اس کی پارٹی میں ایک طرف انتہا پسند ہندو اور دوسری طرف جرائم پیشہ افراد اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے دھونس، دھاندلی اور دھمکیوں سے بھتہ لینے والی ممبئی کی انڈر ورلڈ میں اپنا ایک مقام بنا لیا لیکن دوسرے بھتہ لینے والے گروہوں سے چپقلش چلتی رہی، خصوصاً فلم انڈسٹری اور بلڈر مافیا سے بھتہ لینے والے گروپ بہت طاقتور تھے، جب اس کے بیٹے نے جبراً ایک انڈین فلم کے پروڈیوسر ہونے کے حقوق حاصل کئے تو فلم انڈسٹری میں سرمایہ لگانے والوں نے اسے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں پار کر دیا۔ بال ٹھاکرے کی اپنے بھائی کے ساتھ بہت دوستی تھی لیکن جب اس کے بیٹے نے مفادات کے چکر میں اصل روپ دکھایا تو علیحدگی ہو گئی اور اس نے الگ سیاسی پارٹی (اور بھتہ گروپ) قائم کر لیا۔ اس وقت اس کے تمام امور اودھے ٹھاکرے چلا رہا تھا اور اب اودھے ٹھاکرے اب شیوسینا کا نیا سربراہ ہوگا جس کی بال ٹھاکرے نے وصیت کی ہے۔ لیکن اب شائد وہ پاکستان دشمنی کو اپنانے کا کاروبار نہ بنائے کہ

پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور آج چتا میں جلنے والی ارتھی کی راکھ کے گنگاب ±رد کرنے سے ایک باب ختم ہو گیا۔ راجکپور نے صحیح کہا تھا۔ رام تیری گنگا میلی ہو گئی پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے۔ نفرتوں کے سوداگر بال ٹھاکرے دنیا کے ان بدقسمت لوگوں میں سے ایک تھے جن کے مرنے پر اس کے چاہنے والوں کے اتنے آنسو نہیں بہے جتنا اس کے مخالفین نے سکھ کا سانس لیا۔ تشدد، نفرت، خون، دشمنی، بھتہ خوری اور ہر سنگین جرم سے مزین بال ٹھاکرے کی زندگی مسلسل تنازعات کی زد میں رہی۔ ذاتی زندگی کی محرومیاں اور مشکلات اپنی بدترین بربریت اور وحشیانہ پن کے ساتھ باہر آئیں اور پھر وہ ممبئی کا سب سے طاقتور ترین شخص بن گیا۔بڑے بڑے بدمعاش اور گینگ ماسٹرز اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، کئی انڈین فلموں کے خاموش "ولن" کے کردار بال ٹھاکرے کی شخصیت کو سامنے رکھ کر ہی تخلیق کیے گئے۔۔ بال ٹھاکرے کی پارٹی کا بنیادی سیاسی ایجنڈا ممبئی میں باہر کے رہائشیوں، گجراتیوں اور جنوبی بھارتی شہریوں پر حملہ کرنا تھا جن پر وہ مقامی میراٹھی زبان بولنے والے لوگوں کے حقوق چرانے کا الزام عائد کرتے تھے۔ 1999ء میں ان پر چھ سال کے لیے انتخابات میں حصہ لینے حتیٰ کہ ووٹ ڈالنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جو دسمبر 2005ء میں ختم ہوئی ان کی جماعت 2009ء میں ریاستی انتخابات ہار گئی اور اس کے بعد ہی ٹھاکرے کی صحت بھی گرنا شروع ہوئی۔ بال ٹھاکرے سفید رنگ کے کپڑے، نارنجی رنگ کی چادر اور سیاہ چشمہ پہنے رکھتے تھے۔ بال ٹھاکرے

اپنی پارٹی کے اخبار "سامنا" کا بے دریغ استعمال کرتے تھے جس میں 6دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی شہادت کے وقت انہوں نے ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر کے حق میں ایک مضمون لکھا تھا۔ سی بی آئی کی طرف سے ان پر بابری مسجد کی شہادت کی سازش رچانے کا الزام عائد کیا گیا اپنی نفرت آمیز تقاریر کی وجہ سے ان پر متعدد مقدمات دائر کیے گئے۔ یہاں تک کی فلموں کی نمائش میں بھی ان کی من مانی چلنے لگی۔اور تمام ہالی وڈ سٹارز ہاتھ باندھے ان کے آگے موجود رہتے اور پھر ممبئ میں فلم ریلز کرنے کے لیے بھی ان سے منظوری لینا ضروری سمجھا جانے لگا۔یہ قدرت کا عجب نظام ہے کہ ساری زندگی مسلم دشمن کا پرچار کرنے والے بال ٹھاکرے کو آخری وقت میں موت کے منہ میں جانے سے روکنے والے تین معالجوں میں سے دو مسلمان ڈاکٹر تھے اور ان کی موت کا اعلان کرنے والے بھی مسلمان ڈاکٹر تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دہشت اور وحشت بھی انسانی خواہشات کے آگے ہار جاتی ہے۔آج بھارتی مسلمان دعا کر رہے ہیں کہ ظلم و تشدد کے پیروکار بال ٹھاکرے کی موت کے ساتھ ہی اس کی زہریلی سوچ اور خون آشام پالیسی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے تاکہ کروڑوں بھارتی مسلمانوں کو سکون کا سانس نصیب ہو سکے۔

میرے شہر میں سردی آئی ہے

سردی کے آتے ہی لنڈا بازار سج گئے
طویل انتظار کے بعد کراچی والوں نے گرم کپڑے نکالے ہیں
سستے داموں گرم کپڑوں کی خریداری ایک زمانے میں غریب اور متوسط گھرانے کے افراد ہی کیا کرتے تھے مگر اب امیر اور ایلیٹ کلاس طبقہ بھی لنڈا بازار کا رخ کرتا ہے، جس کا سبب مہنگائی میں اضافہ ہے۔ نوجوانوں میں اس کا رجحان زیادہ ہے جسکی وجہ نوجوان طبقہ میں ویسٹرن ڈیزائنز کے کپڑوں کی مقبولیت ہے۔
سردی کا موسم چھوٹے بچوں، نحیف الجسم افراد اور عمر رسیدہ آدمیوں کیلیئے بطور خاص خطرناک ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنی قوت برداشت اور موسمی شدائد کو برداشت کرنے کی صلاحیت پر انحصار کرتے ہیں۔ انھیں اسپتال اور ڈاکٹروں کے چکر لگانا پڑتے ہیں۔ سو آپ بھی ذرا احتیاط کرلیں، کہیں سردی آپ کے مزاج نہ پوچھ لے۔
میرے شہر میں سردی آئی ہے۔ طویل انتظار کے بعد کراچی والوں نے گرم کپڑے نکالے ہیں۔ سردی کی آمد نے موسم کو بدل دیا ہے، کراچی ہی نہیں ، ملک بھر کے

بیشتر علاقے اس وقت شدید سردی کی لپیٹ میں ہیں اور اب شہر کراچی کا موسم بھی تبدیل ہوا ہے اور یہاں بھی سردی کی آمد ہو ہی گئی۔ کراچی میں درجہ حرارت تو گر رہا ہے۔ لیکن سیاست کی گرمی بڑھ رہی ہے۔ مار دھاڑ قتل و غارت گری ویسے ہی ہے۔ سپریم کورٹ نے ووٹر لسٹوں کی فوج اور ایف ایس سی کے جوانوں کے ذریعے تصدیق کا حکم دیا ہے، اس بھی درجہ حرارت بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ ملک کے شمالی اور بالائی علاقے بھی شدید سردی کی لپیٹ میں ہیں۔ سردی کا موسم شروع ہوتے ہی شہریوں کو گرم کپڑوں کی فکر ستانے لگتی ہے۔ مہنگائی میں اضافے کے باعث بہت سے شہری گرم کپڑوں کی خریداری کیلئے نئے کپڑوں کے بجائے پرانے کپڑوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ مہنگائی میں اضافے کے باعث جہاں نئے گرم کپڑے خریدنا عام آدمی کی دسترس سے باہر ہوگیا ہے، وہیں پرانے کپڑوں کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ کراچی میں صدر کے ٹھیلوں پر گرم کپڑوں کے ڈھیر ہیں اور جوں جوں سردی لہر چلتی ہے، ان ٹھیلوں پر ہجوم کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ یوں تو کراچی شہر میں پرانے کپڑے فروخت کرنے کا سب سے بڑا بازار شہر کے وسط ایم اے جناح روڈ پر قائم ہے۔ جو "لائٹ ہاوس لنڈا بازار" کے نام سے مشہور ہے، کبھی یہاں لائٹ ہاوس سینما ہوا کرتا تھا۔ یہاں پر فلم کی تقسیم کاروں کے دفاتر تھے۔ اب یہاں پرانے کپڑے بکتے ہیں۔ پرانے استعمال شدہ کپڑے فروخت کرنے والا یہ "لنڈا بازار" کراچی شہر کا سب سے قدیم اور وسیع بازار ہے جہاں ہر قسم کے چھوٹے بڑے استعمال شدہ پرانے گرم کپڑے، سویٹرز، گرم شالیں، جوتے، کمبل

لحاف، پردے، مفلرز، لیدر جیکٹس، گرم کوٹ دستیاب ہوتے ہیں۔

پورے کراچی سے شہریوں کی بڑی تعداد اس بازار سے سردیوں کی خریداری کرنے آتی ہے۔استعمال شدہ کپڑوں کی قیمت نئے کپڑوں کی نسبت کافی کم ہوتی ہے اس لئے شہری اس بازار کا رخ کرتے ہیں۔نئے گرم کپڑوں کی قیمت تو ہزاروں میں ہوتی ہے مگر پرانے گرم کپڑے چند سو روپوں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔

سستے داموں گرم کپڑوں کی خریداری ایک زمانے میں غریب اور متوسط گھرانے کے افراد ہی کیا کرتے تھے مگر اب امیر اور ایلیٹ کلاس طبقہ بھی لنڈا بازار کا رخ کرتا ہے، جس کا سبب مہنگائی میں اضافہ ہے۔نوجوانوں میں اس کا رجحان زیادہ ہے جسکی وجہ نوجوان طبقہ میں ویسٹرن ڈیزائنز کے کپڑوں کی مقبولیت ہے، اکثر نوجوان لڑکیوں سمیت لڑکے بھی فیشن کی مناسبت سے لنڈا بازاروں سے خریداری کرتے ہیں، کیوں کہ یہ پرانے کپڑے سستے ہوتے ہیں اور کوالٹی کے حساب سے بھی معیاری ہوتے ہیں۔

مگر جیسے جیسے مہنگائی میں اضافہ ہو رہا ہے، مہنگائی کے اثرات لنڈا بازار کے پرانے کپڑوں کی قیمتوں پر بھی پڑے ہیں۔

مزار قائد سے ٹاور کی جانب آتے ہوئے۔کا ایم سی بلڈنگ سے پہلے ہی آپ کو ٹھیلے نظر آئیں گے، جن پر سوئیٹر، موزے، جیکٹ، کوٹ، پرانے جوتے، نظر آتے

ہیں۔ لائٹ ہاؤس سینما کی پرانی عمارت کے ساتھ کی گلیوں میں لنڈا بازار ہے۔ یہاں لوگوں کا رش نظر آئے گا۔ بہت سی خواتین قیمت میں کمی کرنے کے لیے بحث و تکرار کرتی دکھائی دیں گی۔اور کہیں دکانداروں اور گاہکوں کے درمیان قیمت پر ہی بحث و مباحثہ ہوتا دکھائی دے گا۔ بہت سی خواتین یہاں کی مستقل گاہک ہیں، جو پردے، قالین، گھریلو آرائش کا سامان یہاں سے خریدتی ہیں۔ ایک خاتون جو یہاں اکثر آتی ہیں۔ انکا شکوہ تھا کہ " مہنگائی میں اضافہ کے سبب ہی تو ہم جیسا متوسط طبقہ یہاں سے خریداری کرنے آتا ہے مگر اس سال تو حد ہی ہو گئی قیمت بہت بڑھ گئی ہے، پرانے کپڑے خریدنا بھی مشکل ہوگیا ہے"۔ایک اور خاتون نے بڑے کام کی بات بتائی اور کہا " گرم کپڑے خریدنا بھی ضروری ہے سردی بڑھ جائے گی تو ان کی قیمتیں اور بھی بڑھ جائینگی اس لئے شروع میں ہی گرم کپڑے خریدلیں تو اچھا ہے" میں نے کمبل فروخت کرنے والے ایک دکاندار سے پوچھا کہ اب اس قدر مہنگا مال کیوں فروخت کیا جا رہا ہے۔ تو اس نے کہا کہ " ہم جو مال مارکیٹ فروخت کیلئے لاتے ہیں وہ تین گنا مہنگا ہوگیا ہے، اس لیے ہم مہنگا فروخت کرنے پر مجبور ہیں"۔ گرم جیکٹس فروخت کرنے والے ایک دکاندار کا کہنا تھا کہ ' یہ مال دوسرے ملکوں سے آتا ہے تو ہمیں اس کی کسٹم اور ٹیکس ڈیوٹی بھی دینی ہوتی ہے، حکومت کی جانب سے ڈیوٹی ٹیکس میں بھی اضافہ ہوگیا ہے تو مال بھی اسی حساب سے مہنگا بک رہا ہے"۔خریداری کے دوران ایک صاحب کا کہنا تھا کہ اس سال کم کپڑے خریدے ہیں کیوں کہ جیب اجازت نہیں دے رہی ہے کہ

پرانے کپڑے ہی کھل کر خرید سکیں، پچھلے سال کی نسبت دگنی مہنگائی ہو گئی ہے۔" بازار میں رش ہونے کے باوجود مہنگائی میں اضافے کے سبب خریداروں کی جانب سے گرم کپڑوں کی خریداری میں کمی دیکھنے میں آئی، بچوں کے گرم کپڑوں پر ذرا زیادہ رش ہوتا ہے۔ لیکن وہاں بھی قیمت پر بحث چلتی ہے۔کچھ خریدار تو قیمت پوچھ کر ہی آگے بڑھ جاتے اور کچھ خریدار قیمت میں کمی کروانے پر اصرار کرتے اور مجبوراً مہنگے کپڑے اور جوتے خریدتے ہیں۔ سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی گرم ملبوسات کی مانگ میں اضافہ ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے لنڈا بازاروں میں لوگوں کا رش بڑھ جاتا ہے۔ عوام جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں مہنگائی میں اضافہ کی وجہ سے خاصے پریشان نظر آتے ہیں وہیں سرد موسم کے آغاز کے ساتھ گرم ملبوسات کی ضرورت ان کی پریشانی بھی بڑھ جاتی ہے۔لیکن شہر میں قائم لنڈا بازار غریب اور متوسط طبقے کے لئے اس مہنگائی کے دور میں کسی نعمت سے کم نہیں، سردی کی آمد کے ساتھ ہی لائٹ ہاوس، ایمپریس مارکیٹ اور لیاقت آباد میں واقع مراکز پرانے گرم ملبوسات اور جوتوں سے سج جاتے
ہیں، عوام کا کہنا ہے مہنگائی کے اس دور میں ان بازاروں سے ہمیں مناسب قیمت پر معیاری جوتے اور کپڑے مل جاتے ہیں اسی لئے وہ ان بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔ شہر قائد میں سردی کی آمد آمد ہے،اسی لئے یہاں کے لنڈا بازار آباد ہونا شروع ہو گئے ہیں کیونکہ یہاں لوگوں کو کم قیمت پر گرم کپڑے جو مل جاتے ہیں۔کپڑوں کا تو گذارا ہو جاتا ہے۔ لیکن سردی میں لوگوں کو لحاف اور کمبل کی بھی ضرورت ہوتی

ہے، شدید سردی نے غریب اور مزدور پیشہ طبقہ کے لیے مشکلات کھڑی کردی ہے، اور ان کے پاس ٹھٹھرتی راتیں پر سکون انداز میں گزارنے کے لیے گرم لحاف اور بستر موجود نہیں ہیں۔ اب روئی پچاس روپے کلو ہے، اور ایک عام لحاف میں پانچ چھ کلو روئی بھری جاتی ہے۔ لحاف کی بھرائی، سلائی، اور دھاگے ڈلوائی بھی دو سو روپے کا خرچ ہے۔ یوں اب لحاف کی قیمت آٹھ سو سے ہزار روپے ہو گئی ہے۔ شہر میں بہت سے مخیّر افراد اور ادارے غریبوں کو سردی سے بچنے کے لئے لحاف مہیا کرتے ہیں۔ چند دن پہلے الخدمت نے سردی کے ستائے شہر کے سفید پوش افراد میں 3 ہزار لحاف اور گدے تقسیم کیئے ہیں۔ الخدمت کے ونٹر منصوبے کے تحت ہر سال مستحق اور سفید پوش افراد میں لحاف اور گدے تقسیم کیے جاتے ہیں ، اس سال بھی الخدمت شہر کے پانچوں اضلاع میں مستحق افراد کو سردیوں سے بچانے کے لیے اب تک 3 ہزار لحاف اور گدے تقسیم کرچکی ہے، جبکہ مزید لحاف اور گدوں کی تیاری جاری ہے۔ الخدمت کراچی کے سیکرٹری
انجینئر عبدالعزیز نے مخیّر حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ شدید سردی سے پریشان سفید پوش لوگوں کی مدد کے لیے الخدمت سے تعاون کریں۔ غربت اور مجبوری نے بہت سے سفید پوش افراد کو بھی لحافوں کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ شہر میں سفید پوش افراد کی بڑی تعداد شدید سردی سے متاثر ہے، الخدمت تو اپنے مجبور اور بے سہار ابھائیوں کی مدد کے لیے کوشاں ہے ہی۔ اس سلسلے میں افراد کو اپنے آس پاس دیکھ کر لوگوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ دوسری جانب سرد موسم اپنے دامن میں بہت سی رنگینیاں بھی لایا ہے۔

مہنگے ہونے کے باوجود لوگ میوہ کھانے کا شوق مونگ پھلی سے پورا کرتے ہیں۔ دسمبر کا دامان ایک نہایت ہی خوشگوار مگر سرد ماحولی رنگینیوں اور رعنائیوں سے معمور ہونے لگا ہے۔ معاشرتی سرگرمیوں میں شدت وبرق رفتاری آ رہی ہے۔ ماحول میں ایک عجیب سی خنک تاب تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے۔ دفتر اور کاروباری اوقات تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اس موسم میں وقت کی رفتار کے انداز بدلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ہوٹلوں' ماڈرن ریسٹورنٹوں' طعام گاہوں اور تفریحی مقامات کا ماحول گویا ایک نیا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ قہوہ خانوں کی رونقیں دوبالا ہوجاتی ہیں۔ ٹھنڈی فضاؤں کے جھونکے اور ہلکورے انسان کو یہ احساس ہی نہیں ہونے دیتے کہ دن کب طلوع ہوا اور کب ختم ہوا۔

دسمبر کے بعد کا حصہ موسم سرما کے عنفوان شباب کا زمانہ ہوگا۔ گرم مشروبات اور گرم غذاوں کا زور بڑھ جائے گا۔ نحیف سے نحیف معدہ بھی شدت اشتہا کا اشتہار بن جاتا ہے اور جسمانی نظام قوت پذیری کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔

اس مہینے میں جہاں ایک اوسط درجہ کی صحت رکھنے والا آدمی زندگی کے تمام تر مادی تقاضوں میں ایک غیر معمولی انقلاب محسوس کرتا ہے وہاں اس کی صحت کا معیار بھی روبہ تغیر ہونے لگتاہے۔ یخ بستگی اور ٹھٹھراؤ کا دہانہ کسی وقت بھی کھل سکتا ہے اور موسمی تقاضوں کے مطابق نہ چلنے والے افراد اچانک اور

غیر متوقع طور پر سردی کی لپیٹ میں آ کر زکام' سر درد' اعصابی ٹھٹھراؤ پسلیوں کے سکیڑپن' سرسام دماغی' نخاع دماغی کے جمود' نمونیہ ایسے عوارض میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔

امراء وصاحب حیثیت افراد تو موسم سرما کے اس شدید زمانے میں حسب ضرورت گرم ملبوسات' حفاظتی تدابیر اور انڈہ' مچھلی' مرغ اور میوہ جات پر مشتمل اعلیٰ غذاؤں سے اپنے نظام صحت کے گرد مناسب حفاظتی حصار استوار کئے رہتے ہیں لیکن غریب اور مزدور پیشہ افراد اپنی اقتصادی و معاشی ناہمواریوں کے تحت شدید سردی کے ان ایام میں موسم کے برفیلے تھپیڑے سہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ناکافی لباس اور مطلوبہ لوازم میسر نہ آ سکنے کی وجہ سے ایسے افراد موسمیامراض میں گھرے رہتے ہیں اور سوائے جسمانی قوت مدافعت' محنت و مشقت کے کام اور گلابی دھوپ سینکنے اور رات کو کمبل یا لحاف میں منہ لپیٹ کر سو رہنے کے ان کو اور کوئی اطمینان بخش لازمہ حیات اور ذریعہ سکون نہیں ہوتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس مہینے میں موسمی اثرات کا باعث بیمار ہونے والوں میں باحیثیت اور متمول افراد کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ سردی کا موسم چھوٹے بچوں' نحیف الجسم افراد اور عمر رسیدہ آدمیوں کیلئے بطور خاص خطرناک ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنی قوت برداشت اور موسمی شدائد کو برداشت کرنے کی صلاحیت پر انحصار کرتے ہیں۔ انھیں اسپتال اور ڈاکٹروں کے چکر لگانا پڑتے ہیں۔ سو آپ

بھی ذرا احتیاط کر لیں، کہیں سردی آپ کے مزاج نہ پوچھ لے۔

کھلونا ہتھیار

مستقبل کے معمار مغرب کے بھیانک منصوبے کا شکار

بچوں کے ذہنوں میں تخریب کاری پیدا کرنے والے کھلونا نما جدید ہتھیار

بچے کھیلنے کے لئے اب چاند نہیں پستول اور بندوق مانگتے ہیں۔

اسلحے سے اپنے حریفوں کو زیر کرنے کا یہ کھیل بچوں کی شخصیت کا حصہ بننے کی صورت میں معاشرے سے.برداشت اور تحمل ختم کردے گا جس کی روک تھام کے لیے والدین کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا

مستقبل کے معمار معصوم بچّوں کے ہاتھوں میں کھلونا نما ایئر گن، کلاشنکوف اور پستول نظر آنا ایک خطرناک رجحان

کھلونے دنیا بھر میں بچوں کو بہلانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ بچوں اور کھلونوں کا رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے بچوں کے لئے کہا جاتا تھا کہ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند، لیکن اب بچے کھیلنے کے لئے چاند نہیں مانگتے ہیں۔ اب انہیں پستول اور بندوقوں سے کھیلنے کا شوق ہو گیا ہے یہی وجہ ہے اب کھلونوں کی دکان اسلحے کے کھلونوں سے بھری پڑی ہیں۔ کھلونوں کی دکانوں پر مختلف چھوٹی.بڑی بندوقوں کو واضح طور پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ بہت دن پہلے

کلفٹن کی ایک دکان پر سجے ہوئی ایک گن میرے بچے کو بھا گئی، میں نے اسے ایک دوسرا کھلونا لے دے دیا۔ لیکن گھر آنے تک اس کی ضد اسی گن کے بارے میں تھی، اور تین دن کی مسلسل ضد کے آگے مجھے اسوقت ہتھیار ڈالتے بنی۔ جب میں دوبارہ اس دکاندار کے سامنے تھا۔ بچے تو انگارے سے بھی کھیلنے کی ضد کرتے ہیں مگر نقصان کے پیش نظر والدین انہیں متبادل کھلونوں سے بہلاتے ہیں۔ مستقبل کے معماروں کے ہاتھوں میں موجود یہ کھلونے معاشرے کے تربیتی اداروں کی زوال پذیری کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور فلموں اور ویڈیو گیمز نے بچوں کی نفسیات کو اتنا متاثر کیا ہے کہ وہ اب صرف ہتھیار نما کھلونوں سے کھیلنے کی ضد کرتے ہیں اور اپنے پسندیدہ فلمی ہیرو کی طرح کسی کو مارنے اور مرنے کے انداز اپناتے ہیں۔ اخبارات اور ٹی وی چینلز میں ہتھیاروں سے لیس افراد کی تصاویر بچوں میں اسلحے سے رغبت کا ایک اور سبب ہیں۔ امجد اسلام امجد نے ایک نظم میں کہا ہے۔

یہ دنیا ایسی منڈی ہے
بلا قیمت جہاں انسان بیچے جا تو سکتے ہیں
کھلونوں کا مگر سودا خسارے میں نہیں ہوتا
زمانے بھر کے بچوں کا یہ مشترکہ وتیرہ ہے
کھلونے جب ملیں انکو تو وہ خوش ہو کے ہنستے ہیں
مگر جب ان کھلونوں سے بھری اونچی دکانوں سے

پلٹتے پھول سے بچے، تہی دامان آتے ہیں
نم آنکھوں میں، بھرے آنسو، بہ صد مشکل چھپاتے ہیں
تو لگتا ہے
کہ بچے اب نہیں ہنستے

کھلونے ان پہ ہنستے ہیں۔ کھلونے مہنگے اور سستے کا زمانہ اب گذر گیا، چین کی کھلونا ساز فیکٹریوں نے اب ہر قیمت کے کھلونے بنا کر ڈھیر کر دیئے ہیں۔ دوسری جانب بھارتی فلمیں ہیں۔ جس سے متاثر ہو کر شہر کے بچوں نے بھی کھلونا ہتھیار اٹھا لیے ہیں، آتشیں اسلحے کی ہو بہو نقل پسٹل، شاٹ گن، پمپ گن اور جدید رائفلوں کی بڑی کھیپ اب ہر تہوار پر فروخت کے لیے کراچی پہنچ جاتی ہے۔

شہر کے گنجان آبادی اور کم آمدن والے علاقوں میں کھلونا ہتھیاروں کی فروخت عروج پر پہنچ چکی ہے، تاجروں نے چین سے کھلونا بندوقوں کے درجنوں کنٹینرز درآمد کیے گئے ہیں جو شہر میں کھلونے کے دکانوں کے علاوہ عارضی اسٹالز اور پتھاروں پر فروخت کی جارہی ہیں، شہر کے گنجان آبادی والے علاقوں اورنگی، لانڈھی، ملیر، کورنگی، لیاقت آباد، لائنز ایریا، اولڈ سٹی ایریا، بلدیہ ٹاؤن سمیت مختلف علاقوں میں کھلونا بندوقوں کی بھرمار ہے۔ بچے پلاسٹک کے چھروں کو ان کھلونا بندوقوں کے میگزین میں بھر کر اصلی اسلحے کی طرح لوڈ کر کے

دوسرے بچوں پر فائر کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ شرارتی کھیل سنگین نقصان کا سبب بھی بنتا ہے اور آنکھ یا جسم کے کسی دوسرے نازک حصے میں لگنے والے چھرے گہرے زخم ساری عمر کا روگ بن جاتے ہیں۔ کھلونوں کی زیادہ تر فروخت تہواروں پر ہوتی ہے اور بچے اپنی جیب خرچی سے یہ کھلونے خریدتے ہیں۔ گذشتہ چند سال سے شہر میں کھلونا بندوقوں کی فروخت کا رجحان بڑھ رہا ہے، ساتھ ہی ہر سال نت نئے ڈیزائن اور نمونوں کی کھلونا بندوقیں مارکیٹ میں لائی جارہی ہیں، زیادہ تر کھلونا بندوقیں چین سے درآمد کی جاتی ہیں جن کی قیمت 50روپے سے 1200روپے تک ہے، چھوٹے سائز کے پسٹل 70 سے 200روپے، شاٹ گن اور پمپ گن کی نقل250سے500روپے جبکہ خودکار رائفلوں کی نقل 600 سے 1200روپے میں فروخت کی جارہی ہیں، بچوں میں کھلونا بندوقوں کے بڑھتے ہوئے شوق پر سنجیدہ حلقوں میں تنقید کی جاتی ہے لیکن اس کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاتا ہے۔ نفسیاتی ماہرین کہتے ہیں کہ بھارت سے دوستی اور ہر طرح کی بھارتی فلموں کی ملک میں آزادانہ نمائش اور انڈرورلڈ اور غنڈہ گردی کے موضوعات پر بنائی جانے والی بھارتی فلموں میں آتشیں اسلحے کی بے دریغ نمائش سے پاکستانی معاشرے پر شدید منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں، بے روزگار نوجوان راتوں رات امیر بننے اور طاقت کے ذریعے غلبہ حاصل کرنے کے لیے بھارتی فلموں جیسے ہی انداز اختیار کررہے ہیں جس سے معاشرے میں محنت کرکے اپنا مقام بنانے کے بجائے جرائم کی راہ اختیار کرکے پیسہ کمانے کا منفی رجحان فروغ پارہا ہے۔

اس رجحان کی ایک جھلک کراچی شہر کی گلیوں میں کھیلنے والے بچوں کے مشاغل سے بھی ملتی ہے، اسلحے سے اپنے حریفوں کو زیر کرنے کا یہ کھیل بچوں کی شخصیت کا حصہ بننے کی صورت میں معاشرے سے برداشت اور تحمل ختم کردے گا جس کی روک تھام کے لیے والدین کو اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہے۔

چائنا کے پلاسٹک کے کھلونا نما جدید ہتھیار بچوں کے ذہنوں میں تخریب کاری کے عناصر پیدا کر رہے ہیں۔ بہت سے والدین نے حکومتسے مطالبہ کیا ہے کہ حکومت ایک طرف تو دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے دوسری طرف ایسے کھلونوں سے ننھے معصوم پھولوں کے ذہنوں کو تخریب کاری کی جانب مائل کیا جارہا ہے۔ اسپر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندہ قومیں ہمیشہ اپنی حیات کی بقاکے لیے پیش بندی کرتی ہیں تاکہ ان کا مستقبل تابناک ہو اور ترقی وکامرانی کی راہیں ان کا استقبال کرسکیں۔ لیکن ہم اس شعور سے محروم ہیں۔ کراچی میں اسلحے کی پابندی سے پہلے ہم افریقی ملک پیرو کی تقلید تو کر سکتے ہیں، جہاں بچّوں اور ان کے کھلونا نما ہتھیاروں کی روک تھام کے لئے باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ اسکولوں میں بچوں کو ان کھلونوں سے دور رہنے کی تلقین کی گئی۔ کھلونا اسلحے کے خلاف مہم کے دوران اسکول کے بچوں کو اپنی نقلی بندوقیں ڈبے میں ڈال پر بدلے میں انھیں دیگر کھلونے دیئے گئے۔ لیکن

امریکہ اس کو رجحان کو فروغ دے رہا ہے۔ امریکی ریاست ایری زونا میں تو ہزاروں افراد (بچّوں) نے ایک دوسرے پر پانی کی پستولیں تان کر ایک ریکارڈ بنایا ہے۔ ایری زونا کے شہر ماریکوپا میں 3 ہزار 804 افراد (بچّوں) نے کھیل ہی کھیل میں کھلونا واٹر پستولوں سے ایک دوسرے پر فائر کرکے دنیا کی سب سے بڑی واٹر پسٹل فائٹ کا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

کچھ لوگ اسے اقدار کی تیز رفتار تبدیلی بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ سب معاشرے میں انواع واقسام کے اسلحے کی بے جا نمود و نمایش، معاشرے میں تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پانے میں حکومتی ناکامی ہے جس کے باعث بچّے نہ صرف اے کے 47، کلاشنکوف، ریپٹر، ٹی ٹی کے ناموں سے بخوبی واقف ہیں بلکہ کھیل کے لیے والدین سے ان ہی ہتھیاروں" کی فرمایش کرتے ہیں، مستقبل کے معمار معصوم بچّوں کے ہاتھوں میں" کھلونا نما ایئر گن، کلاشنکوف اور پستول نظر آنا بالکل نیا رجحان ہے۔ اگرچہ پہلے بھی یہ کھلونے بازاروں میں بکتے تھے اور محدود پیمانے پر چند بچّوں کے ہاتھوں میں دیکھے جاتے تھے لیکن شدّت کے ساتھ یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ جیسے بڑے پیمانے پر بیوپاری حضرات بازاروں میں جان لیوا نہ سہی لیکن نقصان دہ کردار پر مبنی کھلونوں کا انبار لگایا جارہا ہے اور ان کی قیمت انتہائی کم رکھی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے بھی ان تک رسائی آسان ہے۔

سماج میں تشدد کے فروغ میں اسلحہ نے جو منفی اور ہولناک کردار ادا کیا ہے اس پر مغرب نے کتابوں اور تحقیقی مقالوں کے انبار لگا دیے ہیں مگر ایشیائی ممالک اور خاص طور پر انڈو پاک کلچر اور فلم انڈسٹری میں تشدد اور اسلحہ کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو تشویش ناک ہی کہا جاسکتا ہے۔ نوجوان نسل ہتھیاروں کے استعمال میں ایک قسم کی رومانویت میں مبتلا ہے،اسلحہ کے گلیمر نے اس کی معصومیت اور رحم دلی کے سر چشمے خشک کردیے ہیں، معاشرے میں ضد،ہٹ دھرمی، اضطراب، اشتعال، غصہ اور غضبناکی نے قتل وغارت گری اور ٹارگٹ کلنگ کا ایسا جنون پیدا کیا ہے کہ شہر کراچی میں انسانی جان لینا اب معمول بن چکا ہے۔ہر غربت زدہ نوجوان اس سوچ میں گم ہے کہ اس بے سمت معاشرے میں اس کے ہاتھ میں ایک گن اور کچھ مسلح ساتھی ہوں تو وہ ریمبو اور ٹرمینیٹر بن کر ہنگامہ برپا کر سکتا ہے۔

یہ سوچ معاشرے میں گینگ وار اور بھتہ خوری کے ناسور کی صورت پھیل چکی ہے اور درجنوں دہشت گرد اور تشدد پسند گروپ اور مافیائیں منی پاکستان کو تاراج کر رہی ہیں۔اس لیے یہ امر باعثِ فکر ہے کہ ایسے کھلونے نہ صرف سماجی طور پر بچّوں کے معصوم ذہنوں پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں بلکہ بچّوں کو زخمی کرنے کا بھی باعث بنتے ہیں۔ شہر کراچی کے اکثر اسپتالوں میں ایسے کیسز سامنے آئے

کہ جن میں کھلونا ایئر گن اور پستول کے چھروں سے بچّوں کی آنکھیں ضایع ہو گئیں یا جسم کے دیگر حصّوں میں چوٹ لگ گئی تھی۔ یہ ایک ایسا سماجی مسئلہ ہے جسے مشترکہ طور پر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں عوامی نمایندے، سماجی ادارے، حکومتی حلقے اور سب سے بڑھ کر والدین اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ رائے عامہ کے نمایندے اس منفی رجحان کو آگے بڑھنے سے روکیں، شعور و آگہی کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ حکومتی حلقے ایسے خطرناک کھلونے کی خرید و فروخت پر پابندی عاید کریں۔ والدین بچّوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں کہ بنیادی طور پر یہ مسئلہ والدین کی لاپروائی سے شروع ہوتا ہے جو آگے چل کر علاقائی و قومی مسئلہ بن جاتا ہے۔ خیال رہے کہ بچپن زندگی کا سب سے خوبصورت حصّہ ہوتا ہے، اسی میں بچّے سیکھنے کے عمل سے گزرتے ہیں اور اس میں کردار سازی ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے شرح خواندگی میں کمی ہونے کے باعث ہم اپنے مستقبل کے معماروں کے ذہن میں کچھ ایسی تلخ یادیں چھوڑ دیتے ہیں جو تمام عمر آسیب کی طرح انسان کا پیچھا کرتی ہیں اور اسے ایک کامیاب انسان بننے سے روکتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ والدین بچّوں کو ایک قابل اعتماد اور سلجھا ہوا بچپن دیں اور انھیں نقصانات سے بچاؤ کے اقدامات کریں تاکہ یہی بچّے بڑے ہو کر کہہ سکیں

کہ: میرے بچپن کے دن۔ کتنے اچھے تھے دن معاشرے میں عدم برداشت کے باعث جنم لینے والے پر تشدد واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ میڈیا بھی اس میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ماہرین نفسیات نے بچوں میں بڑھتے ہوئے اس رجحان کو انتہائی خطرناک قرار دیا ہے۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق مختلف ٹی وی چینلز پر دکھائے جانے والے ڈراموں میں پر تشدد واقعات کی بدولت بچوں میں کھلونا ہتھیاروں میں دلچسپی بڑھنے کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے' جبکہ کھلونا ہتھیاروں کی مانگ میں بڑھتے ہوئے اضافے کے پیش نظر کھلونا تیار کرنے والی فیکٹریوں نے بھی اپنی پیداوار میں اضافہ کر دیا ہے۔ ماہرین نفسیات بچوں کی پر تشدد واقعات پر مبنی ڈراموں میں بڑھتی ہوئی دلچسپی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بڑھتے ہوئے رجحان کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ بچے ماحول سے جلد اثر قبول کرتے ہیں اور والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اس قسم کی ٹی وی ڈراموں سے دور رکھیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پانے کیلئے موثر اقدام کرے تاکہ بچوں پر پڑنے والے منفی اثرات کو زائل کیا جاسکے۔ باشعور والدین اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ملک کی سیاسی فضاء خون سے رنگین ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے شہر کا کوئی گلی محلہ ایسا نہیں جہاں قتل کا انسانیت سوز واقعہ اخبار کی شہ سرخی نہ بنا ہو۔ دوسری طرف لائسنس اور غیر لائسنس یافتہ اسلحہ ساتھ رکھنے کا کلچر بھی روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ استعمار جہاں معاشرے میں سازشوں کو پنپنے کے موقعے

تلاش کرتا ہے وہیں اس کی نظریں مستقبل پر بھی مرکوز ہوتی ہے۔استعمار ہماری نسل کو بے راہ روکرنے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ بچوں میں اسلحہ کے مشابہہ کھلونوں کی طلب میں اضافہ ،ان کے اندر غیر مرئی خونی جذبہ کو تحرک دینے کا باعث ہے۔ جسے ان اسلحہ کھلونوں کے استعمال کے وقت بچوں میں مقابلے کے دوران مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔برتری کے حصول کے لئے ان اسلحہ کھلونوں سے چھرے چھوڑے جاتے ہیں۔ جو کہ بچوں میں اس عادت کے رسوخ کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں کہ ہمارے مستقبل کے معمار ہمارے ہاتھ سے نکل کر مغرب کے بھیانک منصوبے کا شکار ہونے جارہے ہیں، بلکہ اس سے قبل کارٹونز چینلز، فیملی پروگراموں، ویڈیو گیمز اور بعض دلچسپ مگر انتہائی خطرناک مغربی طرز فکر کے حامل منصوبے ہماری نسلوں کی ذہنی اور فکری تباہی ثابت ہوئے۔ بین ٹین ، بے بلیبیٹ نامی کارٹونز اوران کے نام پر ملنے والی اشیاء بچوں کے زبان زد عام ہیں۔ جو ناپختہ اذہان پر مغربی بالادستی کا بین ثبوت ہے۔ والدین کا فریضہ ہے کہ وہ اس طرح کے استعماری منصوبوں پر گہری نظر رکھیں اور ایسے کھلونوں کا بائیکاٹ کریں جو بچوں کی سرشت کا حصہ بن سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ حکومت اس سلسلے میں بے بس ہیں۔ حال ہی میں امریکہ میں چین کے بنائے ہوئے لگ بھگ ایک ملین کھلونے دکانوں سے واپس منگوائے گئے ہیں۔ ان کھلونوں کے لئے اس بات کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ان کے پینٹ میں ضرورت سے زیادہ لیڈ شامل ہے۔ لیڈ بچوں کی صحت کے لیے خطرناک بتایا جاتا ہے۔ ٹوائے میکر فیشر پرائیس کا کہنا

ہے کہ اس کی ایک تفتیش سے پتہ چلا ہے کہ کھلونے بنانے والی چینی کمپنی نے رنگ کے کچھ ایسے عناصر ان کھلونوں میں شامل کیے ہیں جن کی اجازت نہیں ہے۔ گزشتہ جون میں آر سی ٹو نامی کمپنی نے چین میں بنائی گئی ڈیڑھ ملین 'ٹوائے ٹرینز' امریکی دکانوں سے ہٹالی تھیں کیونکہ ان کے پینٹ میں بھی لیڈ پایا گیا تھا۔اب ہماری حکومت کو اس بارے میں ہوش آیا ہے۔ لیکن اس میں بھی وفاقی حکومت کی طرف سے نئی تجارتی پالیسی میں بچوں کیلیے خطرناک کھلونوں کی درآمد پر پابندی عائد کرنے اور کھلونوں کی درآمد کیلیے کھلونے برآمد کرنے والے ممالک سے خطرے سے پاک کھلونوں کے سرٹیفکیٹ کو لازمی قرار دینے کا اصولی فیصلہ کیا گیا ہے۔اس ضمن میں فیڈرل بورڈ آف ریونیو (ایف بی آر) کو ہدایات کی گئی ہیں کہ کھلونوں کی درآمد کو سختی سے مانیٹر کیا جائے اور ایسے کھلونے جو خطرناک ہیں ان کی درآمد کو روکا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ شیر خوار بچوں کیلیے صرف وہی کھلونے ملک میں درآمد ہو سکیں جو خطرناک نہ ہوں اور اس سے بچوں کو نقصان نہ پہنچتا ہو جبکہ وزارت تجارت کے حکام کے مطابق وفاقی حکومت کو تجویز دی گئی ہے کہ امپورٹ پالیسی آرڈر میں ترمیم کی جائے اور نئی تجارتی پالیسی میں ترمیمی امپورٹ پالیسی آرڈر کے تحت پاکستان میں بین الاقوامی معیار کے حامل کھلونے درآمد کرنے کی اجازت دی جائے اور جن ممالک کی طرف سے پاکستان کو کھلونے برآمد کیے جاتے ہیں ان ممالک کیلیے کھلونوں کے خطرے سے پاک ہونے کے سرٹیفکیٹس کو لازمی قرار دیا

جائے۔ لیکن اس سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آیا حکومت نے کھلونا نما ہتھیاروں پر بھی کوئی پابندی لگائی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ہمارے حکمرانوں کو ضرور سوچنا ہوگا۔

دنیا کا نمبر ایک جاسوس خاتون صحافی کے جال میں پھنس گیا

امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کو خاتون صحافی سے آپ بیتی لکھوانا مہنگی پڑ گئی۔ دنیا زمانے کے لئے اسکینڈل بنانے والے، حکومتوں کا تختہ الٹنے والے، اور دنیا کے سیاست دانوں اور سربراہوں کے راز حاصل کرنے والے سی آئی اے کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس نے کبھی یہ خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ایک دن ان کا ایک ایسا اسکینڈل سامنے آئے گا، جو نہ صرف ان کے منہ پر کالک مل دے گا، بلکہ امریکہ کو بھی دنیا بھر میں رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکا کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے ڈائریکٹر ڈیوڈ پیٹریاس کو اپنی 60 ویں سالگرہ کے صرف دو دن بعد اس وقت مستعفی ہونا پڑا جب ایف بی آئی نے ان کے پاولا بروڈویل نامی خاتون کے ساتھ ناجائز تعلقات کا راز افشاء کیا۔ پیٹریاس کو 9 نومبر 2012ء کو اپنے عہدے سے الگ ہونا پڑا، یہ حسن اتفاق ہے کہ 9 نومبر کو پاولا کی 40ویں سالگرہ تھی۔ امریکی تاریخ کا یہ اسکینڈل ابھی اپنے اختتام کو نہیں پہنچا ہے۔ بلکہ یہ ایک آغاز ہے۔ جس کے پیچھے بہت سی کہانیاں اور انکشافات ہونے ہیں۔ اس بارے میں بھی تحقیقات ہو رہی ہیں کہ آیا صدر اوباما کو الیکشن سے پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا، اور انھوں نے اس معاملے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے

تاخیر کی تاکہ وہ الیکشن میں کامیاب ہو جائیں، تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اگر یہ اسکینڈل پہلے بے نقاب ہوتا تو اوباما صدر منتخب نہ ہو پاتے۔ کانگریس اس بارے میں تحقیقات کا کہہ چکی ہے صدر کی انتظامیہ پہلے ہی کانگریس سے درخواست کر چکی ہے کہ اس معاملے میں دی جانے والی وضاحت کی 13 نومبر کو شنوائی کی جائے۔ اس بارے میں پہلے ہی بہت سے شکوک پائے جاتے ہیں۔ کانگریس یہ بھی جاننا چاہے گی کہ کہیں اس معاملے کو 6 نومبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات کی تکمیل تک دبایا تو نہیں گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اگر یہ بکھیڑا انتخاب سے پہلے کھڑا ہوا ہوتا تو اوبامہ دوبارہ "وہائٹ ہاؤس" کے مکین نہ بن سکتے۔ صدارتی انتظامیہ کی جانب سے اس معاملے کو عارضی طور پر دبائے بنا چارہ نہیں تھا، ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی کے شعبہ عالمی سیاست کے تجزیہ نگار آندرے سدورووو کو یقین ہے،" بلاشبہ اگر یہ معاملہ الیکشن سے پہلے عیاں ہو جاتا تو اوبامہ کی انتخابی مہم پر اس کا بہت برا اثر ہوتا۔ کسی نہ کسی شکل میں جس کا نتائج میں بھی اظہار ہوتا۔ امریکی خاندانی مسائل کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے اس اطلاع کا عام ہو جانا ملک کی مجموعی سیاسی صورت حال پہ بری طرح اثر انداز ہوتا۔"

دوسری جانب امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے سابق سربراہ ڈیوڈ پیٹریاس کے مستعفی ہونے کے بعد امریکا کی دفاعی کمپنی لاک ہیڈ مارٹن کے صدر اور متوقع

چیف ایگزیکٹو کرسٹوفر کو باسک کو بھی "غیر مناسب" تعلقات پر ان کے عہدے سے برطرف کردیا گیا۔ امریکی میڈیا کے مطابق کمپنی کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ تحقیقات کے بعد کمپنی کی ایک ملازم سے غیر مناسب تعلقات برقرار رکھنے پر ادارے کے صدر اور متوقع چیف ایگزیکٹو کرسٹوفر کو باسک کو ان کے عہدے سے برطرف کردیا گیا ہے۔ جنرل پیٹریاس سے لیبیا میں امریکی سفیر کی ہلاکت کے حوالے سے بھی پوچھ گچھ ہونی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس اسکینڈل میں بھی دو خواتین کی باہمی رقابت نے یہ دن دکھائے۔ اور دو خواتین کی لڑائی سی آئی اے چیف ڈیوڈ پیٹریاس کی نوکری اور عہدہ لے ڈوبی۔ امریکی حکام کے مطابق وائٹ ہاوٴس اور اعلیٰ حکومت کو رواں ہفتے ہی پیٹریاس اور پاوٴلا براڈول کے افیئر کا علم ہوا ہے۔ امریکی حکام کا کہنا ہے کہ ڈیوڈ پیٹریاس کی محبوبہ کو شک تھا کہ ان کے محبوب کسی دوسری خاتون کے چکر میں پڑگئے ہیں اور پاوٴلا نے ایک خاتون کو دھمکی آمیز ای میل کرڈالی۔ خاتون نے ایف بی آئی کو شکایت کی اور مدد مانگتے ہوئے معاملے کی تحقیقات کی درخواست کی۔ سابق سی آئی اے چیف پیٹریاس کے پاولا براڈویل سے تعلقات کا علم ایف بی آئی کو اس وقت ہوا جب انہوں نے جل کیلی کو موصول ہونے والی دھمکی آمیز ای میلز کی تحقیقات کیں۔ یہ ای میلز پاولا نے بھیجی تھیں۔ جاسوسوں نے جب پاولا کی ای میلز چیک کیں تو پیٹریاس کے محبت نامے سامنے آگئے۔ سی آئی اے کے سابق چیف ڈیوڈ پیٹریاس اور پاولا براڈویل کا معاشقہ منظر عام پر لانے والی خاتون

پیٹریاس اور ان کی اہلیہ کی مشترکہ دوست نکلیں۔ فلاڈیلفیا کے شہر ٹیمپا میں مقیم جل کیلی کو پاولا براڈویل کی جانب سے دھمکی آمیز ای میلز موصول ہو رہی تھیں جو انھوں نے ایف آئی اے کو دکھا دیں اور ایف آئی نے پیٹریاس پر نظر رکھنا شروع کردی۔

اس معاملے میں امریکا میں ایف بی آئی کے ایجنٹس نے ڈیوڈ پیٹریاس کے استعفے کی وجہ بننے والی پاولا براڈویل کے گھر کی تلاشی بھی لی ہے۔امریکی میڈیا کی رپورٹس کے مطابق ایف بی آئی کے درجن بھر کے قریب ایجنٹوں نے نارتھ کیرولینا کے علاقے شارلٹ میں پاولا براڈویل کے گھر کی تلاشی لی، بکس اٹھا کر لئے اور گھر کے اندر کی تصاویر بنائیں۔ ایک جانب ڈیوڈ پیٹریاس کے خلاف تفتیش شروع کرنے والے ایف بی آئی ایجنٹ کو خود تفتیش کا سامنا کرنا پڑگیا۔ غیر ملکی خبر ایجنسی کے مطابق ڈیوڈ پیٹریاس کیخلاف تفتیش کی شروعات کرنے والے ایف بی آئی ایجنٹ سے جل کیلی کے ساتھ نامناسب رویئے کی تحقیقات کی جارہی ہیں۔ پیٹریاس کے معاشقے کی تفتیش کرنے والے اِس اہلکار پر الزام سامنے آیا ہے کہ اس نے اپنی قابل اعتراض تصاویر جل کیلی کو بھیجی تھیں۔

کتابی چہرے اور تیکھے نین نقش والی چالیس سالہ پاؤلا براڈویل جس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں ڈوب کر دنیا کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کے سربراہ کو

اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا۔ ویسٹ پوائنٹ کی ملٹری اکیڈمی کی گریجویٹ پاؤلا۔براڈویل ہارورڈ سینٹر فار پبلک لیڈرشپ میں ریسرچ فیلو بھی ہیں۔ جب کہ لندن کے کنگ کالج کے وار اسٹڈیز سے پی ایچ ڈی کررہی ہیں۔ صحافت کا پیشہ اختیار کرنے والی پاؤلا کی ڈیوڈ پیٹریاس سے پہلی ملاقات دو ہزار چھ میں ہارورڈ کینیڈی اسکول میں ہوئی جہاں وہ لیکچر دے رہی تھیں۔ اس ملاقات میں پاؤلا نے خود کو اکیڈمک ریسرچر کے طور پر متعارف کرایا جس کے بعد نین سے نین ٹکرائے اور یوں سلسلے کا آغاز ہوا۔ پاؤلا دو ہزار دس میں افغانستان بھی گئیں جہاں انہوں نے ڈیوڈ پیٹریاس کی چار سو صفحات پر مشتمل سوانح عمری "آل ان : دی ایجوکیشن آف جنرل ڈیویڈ پیٹریاس" کے نام سے تحریر کی جسے بائیو گرافی سے زیادہ لو لیٹر سے تعبیر کیا گیا۔ ایف بی آئی کو دونوں کے درمیان سلسلے کا علم ہوا تو پیٹریاس کو مستعفی ہو کر قیمت ادا کرنا پڑی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاؤلا خود بھی شادی شدہ ہیں اور اپنے دو بچوں کے ساتھ شمالی کیرولائنا میں مقیم ہیں۔ وہ خصوصی آپریشن کمانڈ اور دہشت گردی پر ایف بی آئی کی مشترکہ ٹاسک فورس کے ساتھ بھی کام کرچکی ہیں۔ پیٹریاس پر ایک سنگین الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے لیبیا میں بر وقت کاروائی نہیں کی۔ اس بارے میں ہارنے والے صدارتی امیدوار مٹ رومنی نے اوباما پر الزام لگائے تھے۔ اور ظاہر ہے سی آئی اے کا چیف اس صورتحال سے پوری طرح آگاہ تھا۔

امریکی محکمہ دفاع نے جمعے کو 'ٹائم لائین' سے متعلق ایک دستاویز جاری کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ 11 ستمبر کو بن غازی میں امریکی قونصل خانے پر حملے سے ایک گھنٹہ قبل پینٹاگان کے اعلیٰ حکام حملے کے بارے میں آگاہ تھے۔ تاہم، چار امریکیوں کو، جن میں امریکی سفیر بھی شامل تھے، ہلاکت سے بچانے کے لیے یورپ سے بروقت کمک پہنچانا ممکن نہ تھا۔ وزیر دفاع لیون پنیٹا اور ان کے اعلیٰ فوجی مشیر کو حملے سے 50 منٹ قبل اس کی اطلاع دی گئی تھی۔ پنیٹا اور جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیرمین جنرل مارٹن ڈیمپسی نے 30 منٹ بعد صدر براک اوباما سے وائٹ ہاؤس میں ملاقات کی، جس میں بن غازی کی ممکنہ صورت حال سے نبرد آزما ہونے سے متعلق غور ہوا۔ بن غازی میں شدت پسندوں نے قونصل خانے کا گھیراؤ کرکے اسے آگ لگا دی تھی۔ حملے میں امریکی سفیر کرسٹوفر اسٹیونز ہلاک ہوئے۔ پینٹاگان نے یہ ٹائم لائین اِس لیے جاری کی ہے تاکہ جنم لینے والے سوالات کا جواب دیا جاسکے جو قونصل خانے پر حملے سے متعلق باتوں نے پیدا کیے ہیں جن میں سفیر کی موت واقع ہوئی۔ حالیہ امریکی صدارتی انتخابی مہم کے دوران، ریپبلیکن چیلنجر مِٹ رومنی نے صدر اوباما پر الزام لگایا تھا کہ وہ حملے کی صورت حال سے مناسب طور پر نبرد آزما نہیں ہو پائے۔ وزیر دفاع پنیٹا بارہا کہہ چکے ہیں کہ بن غازی کے قریب کوئی فوجی طیارہ یا فوجی دستے موجود نہیں تھے جو فوری طور پر وہاں پہنچ پاتے۔ اس روز پنیٹا اور ڈیمپسی وائٹ ہاؤس سے پینٹاگان گئے جہاں حملے کا جواب دینے سے متعلق تجاویز پر غور کیے

لیے کئی اجلاس منعقد ہوئے۔وہ جیسے ہی پینٹاگان پہنچے، ایک قریبی اڈے سے سی آئی اے کی ایک ٹیم بن غازی کے قونصل خانے پہنچ چکی تھی، تاکہ زندہ بچ جانے والے باقی اہل کاروں کو وہاں سے منتقل کیا جاسکے۔پنیٹا اور ان کے سینئر مشیروں کے اجلاس جاری رہے اور اسی دوران پنیٹا نے یورپ میں موجود انسداد دہشت گردی کے دستوں کو لیبیا میں تعیناتی کے زبانی احکامات جاری کیے۔دوسرے ہی روز تمام امریکیوں کو، جن میں ہلاک شدگان بھی شامل تھے، طیارے کے ذریعے بن غازی سے باہر لے جایا جاچکا تھا۔ اس سے قبل اوباماجب پہلی بار منتخب ہوئے تھے تو بھی انہیں ایسی ہی گھمبیر صورت حال کا اس وقت سامنا کرنا پڑا تھا۔جب جنرل میک کرسٹل نے ایک انٹرویو میں امریکی انتظامیہ، صدر اوباما اور نائب صدر جو بائیڈن کے خلاف تنقیدی تبصرے کئے تھے، جن کی انہیں بھاری قیمت چکانی پڑی۔ یہ تنقیدی تبصرے ’رولنگ سٹون‘ نامی میگزین میں شائع ہونے ہیں۔تاہم اس مضمون کے متعدد حصے منظر عام پر آنے کے فوراً بعد ہی میک کرسٹل کو کابل سے واشنگٹن طلب کیا گیا۔ رولنگ سٹون کے ایک مضمون میں اس فوجی کمانڈر سے منسوب بیانات میں صدر اوباما، نائب صدر جو بائیڈن، وزیر دفاع رابرٹ گیٹس اور وائٹ ہاوس کے بعض دیگر اعلیٰ حکام پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔امریکی فوجی کمانڈر نے افغانستان میں نامور صحافی مائیکل ہیسٹنگس کو ایک انٹرویو دیا تھا، جس میں انہوں نے افغان جنگ،

اوباما انتظامیہ اور وائٹ ہاوس حکام پر کھل کر تبصرے کئے تھے۔ ان تبصروں کے منظر عام پر آنے کے بعد یہ صاف ہوگیا تھا کہ جنرل میک کرسٹل کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ صدر اوباما نے اس فیصلے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایک کمزور صدر نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہی جنرل پیٹریاس کو افغانستان میں فوجوں کا کمانڈر بنایا گیا تھا۔ جنرل ڈیوڈ پیٹریس کو عراق میں شیعہ سنی فسادات اور تشدد کے واقعات پر قابو پانے کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔

امریکا کے 60 سالہ سابق فوراسٹار جنرل 40 سالہ پاولا کی زلفوں کے اسیر ہوگئے جو دو بچوں کی ماں ہے امریکا کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے سابق سربراہ ڈیوڈ پیٹریاس کے کیریئر کے خاتمے کا باعث بننے والی پاولا براڈویل نامی خاتون ہارورڈ یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ ہیں اور لندن میں کنگز کالج میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ براڈویل نے 10 برس تک فوج میں بھی خدمات انجام دی ہیں جبکہ وہ ایک صحافی بھی ہیں جن کے جال میں دنیا کا نمبر ایک جاسوس پھنس گیا، پیٹریاس اپنی اہلیہ کا 37 برس کا ساتھ بھی بھلا بیٹھے ان کے معاشقے کا بھانڈا اس پھوٹا جب ایف بی آئی نے ان کے ای میل اکاونٹس کی نگرانی شروع کی، امریکی حکام کے مطابق اگر ڈیوڈ پیٹریاس دوران سروس اس غلطی کا ارتکاب کرتے تو ان کا کورٹ مارشل ہو سکتا تھا، امریکی حکام کے مطابق اس معاشقے کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب ایف بی آئی نے پیٹریاس کے ای میل اکاونٹس کی نگرانی شروع کی کیوں کہ انہیں

شک تھا کہ.براڈویل کو پیٹریاس کے ذاتی ای میل اکاونٹ تک رسائی حاصل ہے،تاہم ایف بی آئی کو ان کے ای میل اکاونٹ سے دونوں کے معاشقے سے متعلق پیغامات ملے،براڈویل نے "آل ان ، دی ایجوکیشن آف جنرل ڈیوڈ پیٹریاس"کے نام سے ان کی سوانح عمری بھی تحریر کی ہے۔، پیٹریاس کی سوانح عمری کے دیباچے میں براڈویل نے تحریر کیا ہے کہ ان کی پیٹریاس سے پہلی ملاقات 2006ء میں ہوئی تھی جب وہ ہارورڈ کے کینیڈی اسکول سے گریجویٹ کررہی تھیں، پیٹریاس وہاں آکر عراق جنگ اوردیگر جنگی محاذوں کے تجربات بیان کیا کرتے تھے،ہارورڈ یونیورسٹی نے چند طلباء کو پیٹریاس سے ملاقات کی دعوت دی تھی جن میں براڈویل بھی شامل تھیں جہاں انہوں نے پہلی بار اپنا تعارف پیٹریاس سے کروایا،پاولاامریکی ریاست شمالی کیرولینا میں اپنے شوہر اوردو بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں ، پیٹریاس کے ایک قریبی ساتھی کے مطابق پاولا نجی تقریبات میں اکثر پیٹریاس کا پیچھاکیاکرتی تھیں اوران سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں،2011ء میں سی آئی اے چیف کا عہدہ ملنے کے بعد دونوں کے تعلقات میں دراڑآ گئی تھی تاہم پاولانے پیٹریاس کا پیچھاجاری رکھااور گزشتہ چند ماہ کے دوران پاولانے انہیں سیکڑوں ایک میلز بھیجیں،ذرائع کے مطابق پاولاکی افغانستان میں بھی پیٹریاس تک رسائی تھی۔،پاولاکے خاوندکا نام اسکاٹ براڈویل ہے جوایک ریڈیالوجسٹ ہیں ،اس جوڑے کے دو بچے ہیں۔پاولابراڈویل امریکی ریاست شمالی ڈکوٹامیں پلی بڑھی ہیں،انہوں نے ماسٹر ڈگری ڈینور یونیورسٹی کے جوزف کوربل اسکول سے انٹرنیشنل

اسٹڈیز میں حاصل کی جبکہ جان ایف کینیڈی اسکول سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں بھی ماسٹر کیا، پاولا نے امریکی فوج میں بھی خدمات انجام دیں، انہیں 2012ء میں امریکی ریزرو فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی، پاولا اپنے 15 سالہ فوجی کیریئر کے دوران 60 ممالک کا سفر کر چکی ہیں۔

پیٹریاس اسی ہفتے 60 برس کے ہو چکے ہیں، ان کی شادی کو 38 سال کا عرصہ بیت چکا ہے، ان کی اپنی بیوی ہولی پیٹریاس سے ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ امریکی فوج میں ایک کیڈٹ تھے، حکام کے مطابق اگر پیٹریاس دوران سروس اس غلطی کا ارتکاب کرتے تو ان کا کورٹ مارشل ہو سکتا تھا۔ مستعفی ہونے کے بعد ڈیوڈ پیٹریاس نے سی آئی اے اسٹاف کے نام ایک پیغام میں کہا کہ ان کے استعفیٰ کی وجہ شادی سے ہٹ کر کسی اور کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں، شادی کے 37 برس بعد کسی سے ناجائز تعلقات رکھ کر میں نے انتہائی غلط فیصلہ کیا، بحیثیت شوہر یا کسی ادارے کا سربراہ یہ برتاو کسی صورت قابل قبول نہیں، ان کا کہنا تھا کہ گزشتہ روز انہوں نے وائٹ ہاوس میں صدر اوباما سے درخواست کی ہے اب وہ یہ عہدہ چھوڑنا چاہتے ہیں، پیٹریاس کا کہنا تھا کہ صدر اوباما نے جمعہ کو ان کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے۔ اس موقع پر امریکا کی نیشنل انٹیلی جنس کے سربراہ جیمز کلیپر کی جانب سے بھی ایک بیان جاری ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ ڈیوڈ پیٹریاس کے مستعفی ہونے کے باعث ہمیں ایک انتہائی قابل احترام افسر سے محروم

ہونا پڑا ہے امریکی صدر بارک اوباما نے بھی ڈیوڈ پیٹریاس کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ڈیوڈ پیٹریاس نے کئی دہائیوں تک امریکا کی غیر معمولی خدمت کی ہے، وہ ایک بہترین جنرل تھے، پیٹریاس کے دور میں اسامہ کے قتل کی کاروائی کی گئی تھی۔ جس نے اوباما کے مقبولیت کے گراف کو آگے بڑھایا تھا۔ امریکی حکام نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ اسامہ بن لادن کی جانب سے صدر اوباما اور جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کو قتل کرنے کی منصوبے کا انکشاف ان کے کمپاونڈ سے ملنے والی دستاویزات سے ہوا ہے۔ اسامہ نے اس سلسلے میں الیاس کاشمیری کو ذمہ داریاں سونپی تھی۔ اوباما انتظامیہ کے ایک اعلیٰ

عہدیدار کے مطابق اس نے ان دستاویزات کا بغور جائزہ لیا ہے جو اصل ہیں اور جلد اصل عربی زبان اور ترجمے ساتھ منظر عام پر لائی جائیں گی۔ واضح رہے کہ اسامہ کی موت کے ایک ماہ بعد الیاس کشمیری مبینہ طور پر امریکی ڈرون حملے میں مارا گیا تھا۔ ڈیوڈ پیٹریئس ستمبر دو ہزار ایک کے واقعات کے بعد سے امریکہ کے اہم ترین فوجی افسروں میں سے ایک ہیں۔ عراق میں امریکی فوجیوں کی سربراہی اور افغانستان میں انسدادِ دہشت گردی کی مہم چلا کر ماہرین سے انھوں نے بہت داد سمیٹی تھی۔ دو ہزار گیارہ کے وسط میں جب لیون پنیٹا وزیرِ دفاع بنے تو جنرل پیٹریئس نے افغانستان میں فوجوں کی سربراہی چھوڑ کر سی آئی اے کی قیادت سنبھل لی۔ جنرل پیٹریئس کے بعد سی آئی اے ممکنہ طور پر مشکلات کا شکار ہو سکتی ہے۔ اس وقت ادارے کو بجٹ کٹوتی اور بن غازی میں امریکی قونصل خانے پر حملے میں اپنے

کردار پر سوالات کے سلسلے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ ڈیوڈ پیٹریاس نے امریکی فوج میں سینتیس برس ملازمت کی۔2007 میں عراق میں امریکی آپریشن کی سربراہی اور پھر جون2010 سے افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے
کمانڈر رہے۔افغانستان میں انہوں نے جنرل اسٹینلے میکرسٹل سے کمانڈ لی جن کو رولنگ اسٹون رسالے کو متنازع بیان دینے کے باعث فوج سے نکال دیا گیا تھا۔ پیٹریاس اگست کو امریکی فوج سے سبکدوش ہوئے تو ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں خفیہ 2011 ایجنسی سی آئی اے کا سربراہ بنایا گیا۔
میں پیدا ہونیوالے ڈیوڈ پیٹریاس نے انفنٹری رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا.1952 اورانھوں نے پہلی بار2003 میں عراق میں ایکشن میں حصہ لیا۔ سنہ1991 میں پیٹریاس کے سینے پر غلطی سے گولی اس وقت لگی جب مشقوں کے دوران ایک فوجی لڑکھڑا کر گر گیااوراس سے گولیاں چل گئیں۔ لیکن پانچ گھنٹے کی سرجری کے بعد وہ بچ گئے۔۔۔ ڈیوڈ پیٹریاس موت کے منہ سے ایک اور بار اس وقت بچے جب1999 میں مشقوں ہی کے دوران ان کا پیراشوٹ ساٹھ فٹ کی بلندی پر پھٹ گیا۔ سنہ2005 میں وہ فورٹ لیونفرتھ میں فوجی کالج کے سربراہ بنے اورانھوں نے انسداد دہشت گردی کا ہدایت نامہ دوبارہ تشکیل دیا۔ امریکی صدر جارج بش کی حکمت عملی تھی کہ عراق میں شدت پسندوں کو شکست دیکر ملک کو مستحکم کیا جائے اور فوج کا انخلاء کیا جائے۔ لیکن ستمبر میں کانگریس کے سامنے جنرل پیٹریئس نے ڈیموکریٹس 2007

کو متنبہ کیا کہ انخلاء میں جلدی نہ کریں کیونکہ اس سے تباہ کن نتائج مرتب ہونگے۔ اس بریفنگ کے بعد امریکا نے عراق میں تیس ہزار فوجی مزید بھجوائے۔ عراق میں بیس ماہ کمانڈ کرنے کے بعد ان کو سینٹرل کمانڈ کا سربراہ بنا دیا گیا۔۔۔ ان کی ذمہ داریوں میں مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا بشمول افغانستان اور پاکستان میں امریکی فوجی کارروائیاں اور منصوبہ بندی شامل تھیں۔ پیٹریاس کی سربراہی میں سی آئی اے کے خفیہ آپریشنز میں اضافہ ہوا جس میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے بھی شامل ہیں۔ امریکی میڈیا نے جنرل پیٹریاس کے استعفے کی ایک اور وجہ سیاست میں دلچسپی بتائی ہے، اس سال کے شروع میں خبریں آئی تھیں کہ جنرل پیٹریاس، ری پبلکن پارٹی کی طرف سے صدارتی الیکشن لڑنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے صدارتی امیدواروں کے بحث مباحثہ کیلئے مشہور سینٹ انسالم کالج آف نیو ہمپاشائر کا دورہ بھی کیا تھا، جنرل پیٹریاس، اگرچہ سیاست میں دلچسپی کی تردید کرتے رہے ہیں۔

تاہم میڈیا کا اصرار ہے کہ وہ آئندہ الیکشن میں ری پبلکن کے بہترین صدارتی امیدوار ہو سکتے ہیں، ایک امریکی اخبار کا کہنا ہے کہ پیٹریاس کو لیبیا میں امریکی قونصلیٹ پر حملے میں امریکی سفیر کی ہلاکت پر تنقید کا سامنا بھی تھا۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کے مطابق اوباما کو جمعرات کی صبح شائبہ تک نہ تھا کہ سی آئی اے چیف استعفیٰ دینے والے ہیں۔

صدر اوباما نے پیٹریاس

کا استعفیٰ فوری منظور کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ رات کو اس کے بارے میں سوچیں گے تاہم اوباما اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ پیٹریاس پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔

یاد رہے کہ صدر براک اوباما نے گذشتہ سال جون میں افغانستان میں امریکی اور نیٹو فوج کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کو سی آئی اے کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ امریکی اخبارات نے دعویٰ کیا تھا کہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس سی آئی اے کے سربراہ بن گئے تو نائن الیون کے بعد دو جنگیں لڑنے والا یہ جنرل اپنی تیسری جنگ پاکستان میں لڑے گا، خطے میں انٹیلی جنس ایجنسی کو زیادہ سے زیادہ مسلح کرنا ڈیوڈ پیٹریاس کی اولین ترجیح ہوگی، ڈیوڈ پیٹریاس کی بطور سی آئی اے سربراہ نامزدگی سے آئی ایس آئی بھی خوش نہیں تھی۔ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس نے ایسے وقت میں سی آئی اے کی کمانڈ سنبھالی تھی۔ جب ایجنسی کو امریکا کی سب سے زیادہ خطرناک فوجی طاقت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ سی آئی اے افغانستان سے لے کر یمن تک متنازعہ علاقوں میں کام کر رہی ہے۔ اسی دور میں سی آئی اے نے پاکستان میں لگاتار ڈرون حملے کیئے، حملوں میں تیزی کی بڑی وجہ بھی جنرل ڈیوڈ پیٹریاس تھے۔ جو ڈرون حملوں کے مضبوط حامی تھے۔

امریکا کے نیشنل انٹیلی جنس ڈائریکٹر جیمز آر کلیپر نے ایک بیان میں ڈیوڈ پیٹریاس کے عہدہ چھوڑنے کے فیصلے کو ملک کے لیے نقصان قرار دیا ہے۔ واضح

رہے کہ امریکا جیسے ممالک میں کسی بھی خفیہ یا حساس ادارے کے سربراہ کے اس طرح کے تعلقات کو معیوب سمجھتا جاتا ہے کیونکہ اس طرح حساس خفیہ معلومات کے افشاء کا احتمال موجود رہتا ہے۔ پیٹریاس نے ستمبر 2007 میں کانگریس کے سامنے ڈیموکریٹس کو متنبہ کیا تھا کہ عراق سے انخلاء میں جلدی نہ کریں کیونکہ اس سے تباہ کن نتائج مرتب ہوں گے۔ اس بریفنگ کے بعد امریکہ نے عراق میں تیس ہزار فوجی مزید بھجوائے اور پیٹریئس نے اپنا بنایا ہوا ہدایت نامہ نافذ کرایا۔ عراق میں بیس ماہ کمانڈ کرنے کے بعد ان کو سینٹرل کمانڈ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ ان کی ذمہ داریوں میں مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا بشمول افغانستان اور پاکستان میں امریکی فوجی کارروائیاں اور منصوبہ بندی شامل تھیں۔ سنہ 2010 میں انہوں نے افغانستان کی کمانڈ سنبھالی اور اگست 2011 میں فوج سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ پر ان کو سی آئی اے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس سارے فسانے میں جو ایک اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ اہل مغرب اور امریکہ جن کو سیکولر معاشرہ کہا جاتا ہے۔ وہاں کسی سلامتی ادارے اور صدر مملکت کے لئے سخت اخلاقی شرائط اور معیار کیا ہیں اس بات کو ڈیوڈ پیٹریاس کے حالیہ استعفٰی سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ بل کلنٹن کتنے طاقتور ڈیموکریٹ صدر تھے مگر جب ان کے تعلقات غیر مناسب انداز میں ایوان صدر میں کام کرنے والی ایک خاتون سے استوار ہو کر طشت ازبام ہو گئے تو انہیں نہ صرف پارلیمانی مواخذے کا سامنا کرنا پڑا بلکہ قوم کے سامنے آ کر اخلاقی جرم کو تسلیم اور

اس کی معافی مانگنا پڑی، صدر نکسن کتنے طاقت ور صدر تھے مگر جب مخالفین کی سیاسی حکمت عملی سمجھنے اور اس کا توڑ ایجاد کرنے کے لئے اس بات کی خفیہ ریکارڈنگ کروائی تو بعد ازاں یہ معاملہ واٹر گیٹ سکینڈل کے نام سے سامنے آیا اور پوری قوم نے اپنے فیصلہ سے صدر کو اخلاقی مطلوبہ معیار سے ساقط قرار دے دیا تو نکسن کو مستعفی ہونا پڑا اور قوم سے معافی مانگنا پڑی تھی۔ لیکن پاکستان میں کیسے کیسے اسکینڈل، سازش، گھناونے واقعات، ارباب اقتدار سے وابستہ کہانیاں ہونے دن رات شراب نوشی اور غلط کاریوں میں اکثر غرق رہنے کے باوجود خود کو عقل کل اور پارسا ثابت کرتے ہوئے ملک کی تقدیر بنانے کے نام پر تباہی و بربادی بھی لاتے رہتے ہیں۔ کیا ہم میں ذرا سی بھی شرم اور حیاء موجود ہے؟۔ ہمارے سلامتی اداروں میں خمار آلود آنکھیں عذاب کا راستہ بن گئی ہیں۔ اعلیٰ قیادت اگر اخلاقی کرپشن میں ملوث ہو تو پوری قوم کو نحوست زدہ کر دیتی ہے۔ سیاسی فیصلہ ساز اگر مالی کرپشن اور اخلاقی کرپشن میں دھنسے ہوئے ہوں تو ہم سب برباد ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم ڈیوڈ پیٹریاس کے از خود مستعفی ہونے سے سبق اور راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں؟؟؟

امریکہ کے انتخاب پیشے کا کھیل

ان امریکی انتخابات پر تقریباً چھ ارب ڈالر کی لاگت آئی ہے اور ہر امریکی کو یہ انتخاب بیس ڈالر میں پڑا ہے۔ اگر ان انتخابات کو سوشل میڈیا کے انتخابات کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی

انتخابات میں بارک اوباما ایک بار پھر صدر بن گئے، کسی نے کہا،،امریکہ کو اوباما اور پاکستان کو ڈرون مبارک ہوں،،۔ اور کسی نے کہا کہ ،، امریکی صدر سیاہ فام ہو یا سفید فام پاکستان کو کیا فرق پڑے گا،،۔ امریکی صدارتی انتخابات جہاں شروع سے آخر تک جہاں دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنے رہے وہیں یہ موضوع 'سوشل میڈیا' پر بھی چھایا رہا۔ دنیا بھر کے کروڑوں افراد نے سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر امریکہ کے صدارتی انتخابات سے متعلق اپنی آرا اور انتخابات کے نتائج پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

امریکہ میں انتخابات ہو گئے۔ ساری دنیا ان انتخابات کے پیچھے تھی۔ ہر شخص ٹوئٹر یا فیس بک پر موجود تھا۔ انتخابات میں بارک اوباما ایک بار پھر صدر بن گئے، کسی نے کہا،،امریکہ کو اوباما اور پاکستان کو ڈرون مبارک ہوں،،۔ اور

کسی نے کہا کہ ،، امریکی صدر سیاہ فام ہو یا سفید فام پاکستان کو کیا فرق پڑے گا،،۔

امریکی صدارتی انتخابات جہاں شروع سے آخر تک جہاں دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنے رہے وہیں یہ موضوع 'سوشل میڈیا' پر بھی چھایا رہا۔ دنیا بھر کے کروڑوں افراد نے سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر امریکہ کے صدارتی انتخابات سے متعلق اپنی آرا اور انتخابات کے نتائج پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ان امریکی انتخابات پر تقریباً چھ ارب ڈالر کی لاگت آئی ہے اور ہر امریکی کو یہ انتخاب بیس ڈالر میں پڑا ہے۔ اگر ان انتخابات کو سوشل میڈیا کے انتخابات کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔ امریکہ انتخابی مہم کے دوران صدارتی امیدواروں کے جانب سے کئے گئے مجموعی اخراجات 2008 کے الیکشن کے مقابلے بیس کروڑ ڈالر کم رہے تاہم سینٹ اور کانگریس کے امیدواروں کے خرچوں کو ملا کر یہ تاریخ کے مہنگے ترین انتخابات ہیں۔ امریکہ کے فیڈرل الیکشن کمیشن کے مطابق صدر براک اوباما نے انتخابی مہم پر مجموعی طور پر ترانوے کروڑ بارہ لاکھ ڈالر خرچ کئے ہیں جبکہ ان کے مخالف مٹ رومنی نے ایک ارب ایک کروڑ ڈالر سے زائد کی رقم خرچ کی ہے۔ دونوں امیدواروں نے مجموعی طور پر دو اعشاریہ چھ ارب ڈالر خرچ کئے ہیں جبکہ گزشتہ امریکی انتخابات میں دو اعشاریہ آٹھ ارب ڈالر استعمال ہوئے تھے۔ رومنی اخراجات کے حوالے سے تو آگے رہے مگر اوباما کو انفرادی عطیات زیادہ ملے۔ انتخابات کے قواعد کے مطابق حتمی صدارتی امیدوار سرکاری خزانے سے نو

کروڑ دس لاکھ ڈالر لینے کے حقدار تھے تاہم اس صورت میں انھیں اپنے اخراجات محدود رکھنے پڑتے۔ اسی وجہ سے دونوں صدارتی امیدواروں نے یہ رقم لینے سے گریز کیا۔

دوسری طرف صدارتی امیدواروں کے ساتھ سینٹ اور کانگریس کے امیدواروں کو شامل کر لیا جائے تو یہ خرچہ آٹھ ارب ڈالر سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ یوں یہ انتخابات امریکی تاریخ کے مہنگے ترین انتخابات ہیں۔

الیکشن کا دن آنے سے پہلے ہی انتخابی مہم سے انتخابی دوروں تک کے اخراجات چھ ارب ڈالر کی حدود پار کر گئے تھے ۔دی ویسلیئن میڈیا پراجیکٹ کے مطابق صدارتی انتخابات کی مہم کے آغاز سے نولاکھ پندرہ ہزار بار اشتہارات آن ایئر ہوئے ۔ گزشتہ انتخابی مہم کے اخراجات کے مقابلے میں چوالیس اعشاریہ پانچ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس بار انتخابی مہم کے اخراجات چھ ارب سے زائد تھے ۔ جو چالیس ملکوں کے مجموعی جی ڈی پی سے زیادہ ہے۔ امریکہ میں اربوں روپے کے اخراجات کارپوریشنز کی جانب سے کیئے جاتے ہیں تاکہ اوول آفس میں بیٹھنے والا صدر اقتدار ملنے کے بعد معاون ثابت ہو سکے۔

ان انتخابات کا خاص پہلو یہ تھا کہ اس میں نہ کوئی دنگا فساد ہوا، نہ کوئی گولی چلی، نہ کو جھگڑا ہوا ,

امریکہ کے حالیہ صدارتی انتخاب پاکستان جیسے بہت سے جمہوری ملکوں کے لئے

بہت سے قابل تقلید پہلو لئے ہوئے ہیں۔ امریکی سیاست، معیشت اور میڈیا پر دو فیصد یہودیوں کی واضح چھاپ ہے اور اسکے اسلام مخالف اقدامات بھی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں مگر ایک آزاد جمہوری معاشرے کے نمائندہ ملک کے طور پر وہاں بہت سی اچھی چیزیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں اور یہ خوبیاں انہوں نے طویل جمہوری تجربے کے بعد حاصل کی ہیں۔ ایک پختہ جمہوری معاشرے کی سب سے بڑی خوبی تحمل اور بردباری ہے۔ جس میں دوسروں کے وجود اور انکے خیالات و نظریات کو بھی برداشت اور ان کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں اس کا فقدان ہے، اس کا مشاہدہ آپ روزانہ الیکٹرونک میڈیا پر ہونے والے بحث و مباحثے میں کرتے ہوں گے۔ باہم میل ملاپ اور گفت و شنید کے دوران احترام کو ملحوظ رکھنا تو ویسے بھی بنیادی انسانی تقاضا ہے مگر جن لوگوں نے عوام کو لیڈ کرنا ہوتا ہے انکے درمیان برداشت اور تحمل زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے ہاں اس بنیادی انسانی خوبی کی خاصی حد تک کمی نظر آتی ہے حالانکہ ہمارا مذہب ہمیں دوسروں سے کہیں زیادہ تحمل اور درگزر کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ نے حسب سابق امریکہ کے موجودہ صدارتی امیدواروں کو بحث مباحثوں کے درمیان میڈیا پر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے دیکھا ہوگا۔ دونوں میں سے کسی نے کسی بھی جگہ جذباتی ہو کر ایک دوسرے پر کوئی کیچڑ نہیں اچھالا، کسی نے دوسرے کو غدار، سیکورٹی رسک، بددیانت اور کرپٹ قرار نہیں دیا۔ اصولی باتوں پر بحث مباحثے ہوتے رہے۔ اپنی اپنی حکمت عملیوں کی وضاحت اور پیش آمدہ چیلنجز کو حل کرنے

کے لئے مختلف تجاویز سنجیدگی کے ساتھ عوام کے سامنے رکھی گئیں۔ الیکشن کے بعد صدر اوباما نے فریق مخالف مٹ رومنی کو مبارکباد پیش کی کہ اس نے بھرپور الیکشن مہم کا اہتمام کیا۔ ہارنے والوں نے دھاندلی کا کوئی الزام نہیں لگایا۔ جیتنے والے نے کسی چھوٹے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ آپس میں دست و گریبان ہوئے۔ ہارنے والے یا جیتنے والے نے حصول اقتدار کی دوڑ میں کسی بھی مرحلے پر جذباتی ہو کر کوئی ایسی بات نہیں کی کہ بعد ییں شرمندگی کا باعث بنتی۔ اوباما کی جیت کو رومنی نے کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے اوباما کو بھی مبارکباد دی ہے۔

انتخابی صدارتی مہم کا یہ پہلو بھی قابل تقلید ہے کہ وہ لوگ عوامی اجتماعات یا جلسے عام پبلک مقامات کی بجائے یونیورسٹیوں اور میڈیا کے مراکز میں منعقد کرتے ہیں تاکہ سامعین اور شرکاء سنجیدگی سے قومی مسائل پر غوروفکر کریں اور اپنا فیڈ بیک دیں۔ اسکے برعکس ہمارے ہاں لاہور کا موچی گیٹ ہو یا مینار پاکستان، راولپنڈی کا لیاقت باغ ہو یا مری روڈ، کراچی کا نشتر پارک ہو یا مزار قائد، ملتان کا قلعہ ہو یا فیصل آباد کا دھوبی گھاٹ یہ مقامات ایسے موقعوں پر ہلے گلے اور دھینگا مشتی کے مراکز نظر آتے ہیں۔

عوامی اجتماعات میں ایک دوسرے پر الزامات کی بارش ایسے کی جاتی ہے جیسے پوری دنیا کی برائیاں سمٹ کر فریق مخالف میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس خطیبانہ جنگ میں یہ

بھی نہیں دیکھا جاتا کہ کل یہی دشمن ہمارا سیاسی حلیف بھی بن سکتا ہے جبکہ اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ نواز شریف نے بے نظیر بھٹو کو ہمیشہ سیکیورٹی رسک قرار دیا مگر جب دونوں کو مشرف کی ڈکٹیٹر شپ کا سامنا کرنا پڑا تو مجبوراً دونوں کو اکٹھے ہو کر میثاق جمہوریت جاری کرنا پڑا۔ اسی طرح زرداری نے جس جماعت کو قاتل لیگ قرار دیا آج وہی نہ صرف اقتدار کے دستر خوان پر انکے ساتھ شریک ہے بلکہ آئندہ الیکشن متحد ہو کر لڑنے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔

امریکی الیکشن مہم کی تیسری اور اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ انکے لیڈر اپنے ذاتی اور جماعتی مفادات سے اوپر اٹھ کر قومی اور عوامی مفادات کے تحفظ کی بات کرتے ہیں۔ انکے تمام تر دلائل اس ایک نقطے کے گرد گھوم رہے ہوتے ہیں کہ وہ کس طرح امریکی قوم کو تحفظ اور خوشی دے سکتا ہے۔ اسکے برعکس یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہمارے تمام سیاسی و مذہبی قائدین پہلے تو ذاتی مفادات کے چنگل سے آزاد نہیں ہوتے، ان کی سیاست و قیادت کی ساری قابلیت اسلئے ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اپنی ذاتی اور اپنے دوست احباب کی تجوریاں بھرتے ہیں۔ قومی مفادات محض زبانی دعوے ہوتے ہیں چنانچہ ملک کی خارجہ پالیسی، تعلیمی پالیسی، اقتصادی پالیسی اور اسی طرح کی بنیادی ضروری چیزیں ہمارے سیاسی قائدین کے دائرہ فکر و شعور سے باہر رہتی ہیں۔ اسکے برعکس یورپ اور امریکہ

میں قیادت کو اپنا مکمل پروگرام اور اس پر عمل درآمد کے اسباب کو قوم کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس پر اوپن بحث مباحثے اور اعتراضات ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو بھی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ مہنگائی، کرپشن، ناانصافی، جہالت اور توانائی کے بحران جیسے اہم مسائل پر بھی ہمارے قائدین کوئی واضح لائحہ عمل نہیں رکھتے۔ پھر بھی عوام دھڑے بازیوں میں ملوث خود غرض اور جاہل "سیاستدانوں" کو ووٹ دے کر اسمبلیوں میں لے آتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے کیا قانون سازی کرنی ہے اور قوم کی تقدیر بدلنے کے لئے کیا اقدامات کرنے ہیں؟

امریکہ کے الیکشن چند بنیادی مسائل پر ہوئے اور دونوں صدارتی امیدواروں نے معیشت، ٹیکس، ایران، افغانستان، اسقاط حمل، قومی سلامتی، صحت عامہ اور تارکین وطن پر اپنا موقف قوم کے سامنے مباحثوں کے ذریعے پیش کیا۔

اوباما نے امریکن ریکوری اور ری انویسٹمنٹ یعنی معیشت کی بحالی اور دوبارہ سرمایہ کاری کے بل پر دستخط کیے جسے سٹمولس بھی کہا جاتا ہے۔ اس منصوبے کے تحت سات سو اڑسٹھ ارب ڈالر کی ٹیکسوں میں چھوٹ اور تعلیم، بنیادی ڈھانچے، توانائی، صحت اور دوسرے منصوبوں میں سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اوباما نے امریکی آٹو انڈسٹری یعنی گاڑیاں بنانے والی کمپنیوں کی مالی مدد کے منصوبے کی منظوری دی۔ کولمبیا پانامہ اور جنوبی کوریا کے ساتھ تجارتی معاہدوں پر

دستخط کیے۔۔مٹ رومنی کا منصوبہ ٹیکس کی کٹوتیوں پر منحصر ہے، یہ اوباما کے دو ہزار دس کے قوانین کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں انہوں نے وال سٹریٹ اور بنکوں کے قوانین میں ترامیم کیں تھیں۔ ایران پر دونوں رہنماوٴں کا موقف بھی مختلف تھا،اوباما نے تہیہ کیا تھا کہ وہ ایران کو جوہری ہتھیار تیار کرنے سے ہر صورت روکیں گے۔ اسی طرح اوباما اسرائیل یا امریکہ کی جانب سے ایران کی جوہری تنصیبات پر مستقبل قریب میں حملے کے مخالف ہیں۔ اوباما اس معاملے کے سفارتی حل پر زور دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کا یہ کہنا ہے کہ 'اس حل کے لیے وقت تیزی سے گزر رہا ہے' اور کچھ بھی خارج از امکان نہیں ہے۔ انہوں نے ایران کے خلاف نئ پابندیوں پر دستخط کیے ہیں جن میں ایران کے مرکزی بنک، تیل کی آمد اور مالیاتی نظام کے خلاف پابندیاں شامل ہیں۔

رومنی کا کہنا ہے کہ ایران کا جوہری ہتھیار حاصل کرنا بالکل قابل قبول نہیں ہے۔ ان کا بھی فوجی اقدام کے بارے میں کہنا ہے کہ 'یہ راستہ موجود رہے گا'۔

قومی سلامتی اور جنگ کے حوالے سے اوباما کا دعوی تھا کہ انہوں نے اسامہ بن لادن سمیت القاعدہ کے تقریباً تمام رہنماؤں کو قتل کرنے کروایا، عراق سے امریکی افواج کے انخلا کو مکمل کیا اور کانگرس میں موجود ریپبلکنز کے ساتھ دفاعی شعبے کے اخراجات میں اگلے دس سال کے دوران اڑتالیس کروڑ ستر لاکھ

ڈالر کی کمی پر اتفاق کیا۔ جبکہ مٹ رومنی قومی سلامتی اور جنگ کے بارے میں نظریہ رکھتے تھے کہ

فوجی سازوسامان اور مزائل دفاعی نظام پر بہت زیادہ خرچ کریں گے اور پینٹاگان یا امریکی وزارت دفاع کے بجٹ میں ایک کھرب ڈالر کا اضافہ کریں گے جبکہ دفاعی شعبے کے سویلین حکام پر اخراجات کم کریں گے۔ افغانستان کے بارے میں اوباما نے اقدار میں آنے کے بعد افغانستان میں امریکی افواج کی تعداد میں اضافہ کیا لیکن اب بتدریج کمی کے ساتھ انہوں نے دو ہزار چودہ میں مکمل انخلا کا اعلان کر رکھا ہے۔
رومنی کا یہ کہنا ہے کہ ان کا ہدف دو ہزار چودہ تک افغان حکام کو سکیورٹی کی منتقلی ہے لیکن وہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ دو ہزار چودہ میں انخلا کے منصوبوں کا جائزہ لیں گے اور ان کی بنیاد فوجی سربراہوں کے تخمینوں پر رکھیں گے۔ صحت عامہ کے بارے میں دو ہزار دس میں صحت عامہ کے قانون میں نمایاں تبدیلیوں پر مبنی ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے فرد واحد کو بیمہ کروانے کا کہا گیا اگر اس کے پاس پہلے ہی سے صحت کا بیمہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قانون میں بیمہ کمپنیوں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ کسی شخص کو پہلے سے موجود بیماری کی وجہ سے بیمہ دینے سے انکار نہیں کر سکتیں۔ یہ قانون ریاستوں کو پہلے سے موجود میڈی کیڈ نامی عوامی بیمہ پروگرام میں

امداد دینے کی بھی بات کرتا ہے۔

رومنی اوباما کہ صحت عامہ کے قانون کو ختم کر دیں گے اگرچہ یہ قانون انہی کے میساچوسٹس میں منظور ردہ ایک ایک قانون پر مبنی ہے اور ریاستوں کو بہت ساری صحت کی پالیسیاں واپس کر دیں گے۔ ڈاکٹروں کی غلط کاریوں پر کیے جانے والے مقدمات پر حد لگائیں گے اور فرد واحد کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ وہ بیمہ غیر سرکاری منڈی میں یا دوسری ریاستوں میں خرید سکیں جہاں اس کے دائرہ اثر میں کمی ہو اس پر اٹھنے والے اخراجات بھی کم ہوں۔ غیر قانونی تارکین وطن پر اوباما نے آئین کے تحت مفوضہ اعلیٰ انتظامی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اور کانگریس میں موجود ریپبلکنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بعض نوجوان تارکین وطن کو قانونی حیثیت دینے کی اجازت دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے غیر قانونی تارکینِ وطن کو امریکہ بدر کرنے میں بہت تیزی آئی ہے۔ رومنی نے اوباما کے نوجوان تارکین وطن کو قانونی حقوق دینے کے مخالفت کی لیکن یہ نہیں کہا کہ اسے واپس لیں گے یا نہیں۔ اوباما اسقاط حمل کے حقوق کی حمایت کرتے ہیں اور انہوں نے سپریم کورٹ میں دو ایسے ججوں کو تعینات کیا ہے جو اسقاط حمل کے حامی ہیں۔

ان کا کہنا ہے 'میری صدارت زندگی کے حق میں ہو گی' اوباما نئی قسم کی توانائی کے منصوبوں کے حق میں ہیں جیسا کہ ہوائی چکیاں اور کاروں کے لیے

جدید بیٹریاں، اسی طرح انہوں نے کاروں کے ایندھن کے استعمال میں بہتری اور آلودگی کے اخراج پر قوانیں سخت کیے ہیں۔ انہوں نے کی سٹون تیل کی پائپ لائن بنانے کی مخالفت کی جس کے تحت خام تیل کینیڈا سے خلیج میکسیکو میں منتقل کیا جانا تھا۔ اس بارے میں ان کا یہ کہنا تھا کہ امریکہ کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اس پائپ لائن کے ماحول پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ رومنی کا کہنا تھا کہ وہ ایسے قوانین میں آسانی پیدا کریں گے جن سے کوئلہ پر چلنے والے بجلی گھروں، تیل کی تلاش اور جوہری بجلی گھروں کے قیام میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس بار الیکشن کا مرکز محور سوشل میڈیا پر ریکارڈ توڑ امریکی انتخابی مہم چلی۔ امریکا میں صدارت کے دونوں امیدواروں کے درمیان ٹیلی وژن پر پہلے مباحثے کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ویب سائٹ ٹوئٹر پر دس ملین سے زیادہ پیغامات بھیجے گئے تھے۔ بلاشبہ سوشل میڈیا کے اعتبار سے یہ انتخابی مہم ریکارڈ توڑ رہی۔

چار سال پہلے باراک اوباما کوا±ن کی سوشل میڈیا مہم کی وجہ سے پہلے ’انٹرنیٹ صدر‘ کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس بارا±ن کے ری پبلکن حریف مِٹ رومنی بھی اپنی مہم کے دوران سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کیونکہ چار سال پہلے کے مقابلے میں فیس بک یوزرز کی تعداد میں دس گنا اور ٹوئٹر کے صارفین کی تعداد میں پانچ گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ نصف امریکی آبادی فیس بک کی رکن ہے۔ اس بار ہونے والے الیکشن میں انٹرنیٹ کا

کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا، جسے اوباما اور ان کے حریف رومنی کی جانب سے اپنی اپنی تشہیر کے لیے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ میڈیا منیجروں نے ٹوئیٹر اور فیس بک کو خوب استعمال کیا۔ سوشل بیکرز نامی فرم کے مائیک جسونڈی کہتے ہیں کہ ’ٹیلی وژن پر لوگ آرام سے چینل بدل دیتے ہیں، اس لیے سوشل میڈیا مارکیٹنگ ٹی وی پر تشہیر کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر ہے۔ ایک ٹی وی اشتہار نہ صرف بہت زیادہ مہنگا ہوتا ہے بلکہ جاتا بھی صرف ایک ہی سمت میں ہے۔ اس کے مقابلے میں فیس بک یا ٹوئٹر پر پوسٹ کیے جانے والے پیغامات بحث کی تحریک دیتے ہیں اور ان کا بعد میں تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے‘۔ برلن میں جان ایف کینیڈی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ امریکی امور کے ماہر کروڈ کنیپفر کہتے ہیں کہ ان پیغامات کے اتنی بڑی تعداد میں ایک سے دوسری جگہ بھیجے جانے میں امیدواروں کی انتخابی مہم کے رضاکاروں کا اپنا بھی بہت زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ سوال لیکن یہ ہے کہ کیا یہ پیغامات انتخابی نتائج پر درحقیقت اثر انداز بھی ہوتے ہیں؟ SAP نامی فرم کے ایک سافٹ ویئر پروگرام کی مدد سے پتہ چلایا گیا ہے کہ دونوں صدارتی امیدواروں کے درمیان آخری مباحثے کے دوران انٹرنیٹ پر فضا اوباما کے لیے زیادہ سازگار رہی جبکہ رومنی کے بیانات پر زیادہ ترغصے

کا اظہار کیا گیا۔ مطلب یہ کہ اگر انتخابات صرف اور صرف سوشل میڈیا پر منعقد ہوتے تو موجودہ صدر باراک اوباما کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتیں۔ انتخابی مہم کے دوران مِٹ رومنی کے بیانات کو بھی سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس پر بھرپور طریقے سے فالو' کیا جاتا رہا تمام تر تجزیوں اور رپورٹوں کے باوجود یہ کہنا مشکل تھا کہ آج کے ' صدارتی انتخابات کے نتائج کیا رہیں گے اور انتخابی مہم کے دوران کس امیدوار کی حکمت عملی بالآخر کامیاب ٹھہرے گی۔ رومنی کے مقابلے میں فیس بک پر اوباما کے پرستاروں کی تعداد تین گنا اور ٹوئٹر پر دَس گنا زیادہ تھی تاہم رائے عامہ کے جائزوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو دونوں امیدواروں کے درمیان کانٹے دار مقابلہ تھا۔

سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس پر پیغامات کے تبادلے کے نتیجے میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے والے امریکی شہریوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا، ابتدا میں اس تعداد کے بڑھنے کا امکان ظاہر کیا جا رہا تھا۔ شوشل نیٹ ورک کو ووٹروں کو متحرک کرنے سے انتخابی نتائج پر کس قدر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے، اس کا اندازہ سن 2000ء کے انتخابات سے لگایا جا سکتا ہے۔ تب ریاست فلوریڈا میں ڈالے جانے والے 0.01 فیصد سے بھی کم ووٹوں نے پورے ملک کے انتخابات کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔

امریکی صدارتی انتخابات میں باراک اوباما کی جیت کے حوالے سے پاکستانی ذرائع ابلاغ نے بھی خوب تبصرے اور جائزے پیش کئے پاکستان کے تقریبا تمام ٹی وی چینلوں نے امریکی الیکشن کو مرکزی حیثیت دی۔ پاکستان کے ایک سینئر صحافی اور روزنامہ نئی بات کے ایڈیٹر عبداللہ طارق سہیل کا کہنا ہے کہ "پاکستان کی قوم صدر اوباما کی امن کی خواہش کو ایسی امید سمجھتی ہے، جو اگر مکمل طور پر پوری نہ بھی ہو سکے تو پھر بھی اس حوالے سے خوش آئند ہے کہ امریکہ بڑی حد تک اس خطے سے نکل جائیں گے۔ اس طرح شاید حالات میں کچھ بہتری آسکے گی۔ افغانستان کے بعد یہ پاکستان ہی ہے، جو دہشت گردی کے خلاف جاری امریکی جنگ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے"۔ حامد میر نے اوباما کی جیت پر اپنے کالم میں کہا کہ باراک اوباما کی جیت کی خبر ایک ایسے موقع پر موصول ہوئی، جب پاکستانیوں کے دل ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی اپیل کے مسترد ہونے پر دکھی تھے۔ انگریزی روزنامہ ڈیلی نیشن نے توقع ظاہر کی ہے کہ امریکا کی نئی ڈیموکریٹک حکومت پاکستان میں جمہوری عمل کی حمایت کرے گی تاہم اخبار کے بقول اوباما انتظامیہ کا بھارت کی طرف داری کا رجحان، جاری رہنے کا امکان ہے۔ روزنامہ نوائے وقت کی رائے میں اوباما کی پالیسیاں امریکی مفادات کے تابع رہیں گی اور اس انتخابی نتائج پر کسی پاکستانی کو خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اخبار نے حکومت پاکستان کو ملکی مفادات سامنے رکھ کے پاک امریکا تعلقات سے متعلق نئی پالیسی بنانے کا مشورہ دیا ہے۔ انگریزی اخبار

ڈان نے اوباما اور پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے اپنے اداریے میں کہا ہے کہ دیکھنا یہ ہے کہ اوباما کی نئی ٹیم اپنی خارجہ پالیسی کے متنازعہ پہلوؤں پر نظرثانی کرتی ہے یا نہیں۔ اخبار کے مطابق تاریخ میں پہلی پر نچلی ترین سطح پر پہنچے ہوئے پاک امریکا تعلقات کو بہتر بنانا، پاکستان اور امریکا کی حکومتوں کے لیے ایک بڑا چیلنج ہوگا۔ مسلم ممالک سے امریکا کے تعلقات کے حوالے سے اخبار ڈان کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں باراک اوباما کو اپنی قاہرہ میں کی جانے والی تقریر دوبارہ پڑھنی چاہیے۔ اردو اخبار روزنامہ ایکسپریس نے اپنے اداریے "صدر اوباما کی جیت، ٹارزن کی واپسی" میں امریکی سیاست دانوں کی تعریف کرتے ہوئے پاکستانی سیاست دانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بھی ملکی انتخابات میں اپنے منشور پر ووٹ مانگنے کی روایت کو فروغ دیں۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ پر لیکن کیا ہم پاکستانی امریکہ سے کچھ سیکھ سکتے ہیں، کچھ نہیں تو اس ملک کے عوام کو ایک پرامن الیکشن کا تحفہ ہی دے دیا جائے۔ جس میں کسی کی زندگی کا چراغ گل نہ ہو۔

ٹوئٹر' کی ترجمان رشیل ہاروٹر کے مطابق صدارتی انتخاب کی رات ان کی ویب' '
سائٹ پر امریکہ کی سیاسی تاریخ کا سب سے زیادہ ذکر کیا جانے والا واقعہ بن گئی ہے۔
ان کے مطابق منگل کی شب ٹوئٹر پر امریکی انتخاب سے متعلق تین کروڑ 10 لاکھ
پیغامات 'ٹویٹ' کیے گئے۔ ترجمان کا کہنا ہے کہ صدر اوباما کی فتح کے

اعلان کے فوری بعد ٹوئٹر پر ایک منٹ میں تین لاکھ 27 ہزار پیغامات درج کیے گئے جو ایک ریکارڈ ہے۔ جب کہ انتخاب کے حوالے سے سارا دن فی منٹ اوسطاً 11 ہزار ٹوئٹ کیے جاتے رہے۔ انتخاب میں فتح کے اعلان کے بعد صدر براک اوباما کے ٹوئٹر اکاؤنٹ سے "مزید چار سال۔۔" کے پیغام کے ساتھ ان کی ایک تصویر بھی جاری کی گئی جس میں وہ اپنی اہلیہ مشیل اوباما کو گلے لگا رہے ہیں۔ ڈیجیٹل نیوز ویب سائٹ 'بز فیڈ' کے مطابق یہ تصویر اور پیغام ویب سائٹ کی تاریخ میں سب سے زیادہ بار 'ری ٹوئٹ' کیا جانے والا پیغام بن گیا ہے۔ صدر اوباما کی یہی تصویر سماجی رابطوں کی ایک اور مقبول ویب سائٹ 'فیس بک' پر بھی جاری کی گئی ہے جو 'فیس بک' انتظامیہ کے مطابق ویب سائٹ کی تاریخ کی سب سے زیادہ 'لائک' کی جانے والی تصویر بن گئی ہے جسے اب تک 32 لاکھ سے زائد افراد پسند کرچکے ہیں۔ صدارتی انتخاب کے تناظر میں فیس بک' پر صدر اوباما کے بارے میں گفتگو کرنے والوں کی تعداد 20 لاکھ رہی جب' کہ مٹ رومنی کے بارے میں ساڑھے نو لاکھ افراد نے پوسٹس کیں۔ لگ بھگ 83 لاکھ افراد نے 'فیس بک' پر اپنے ووٹ ڈالنے کا اعلان کیا۔ 'فیس بک' کے مطابق لگ بھگ لاکھ افراد نے ویب سائٹ پر اپنے ووٹ ڈالنے کا اعلان کیا یا اس سے متعلق 83 تجربات شیئر کیے۔ صدارتی انتخاب کے دن 'فیس بک' کی ملکیتی تصاویر کے تبادلے کی ویب سائٹ 'انسٹا گرام' پر امریکی شہریوں نے 'ووٹ' کے عنوان کے تحت پونے آٹھ لاکھ سے زائد تصاویر شیئر کیں جب کہ ویب سائٹ پر 'الیکشن' اور اس سے ملتے جلتے عنوانات کے تحت مزید

ڈھائی لاکھ سے زائد تصاویر پوسٹ کی گئیں۔ پاکستان میں بھی امریکہ کا صدارتی انتخاب سماجی رابطوں کی ویب سائٹس کے صارفین کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ تاہم پاکستانیوں کی اکثریت کی جانب سے صدر اوباما کی فتح پر کوئی خاص پرجوش ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ صدر اوباما کی فتح پر 'فیس بک' اور 'ٹوئٹر' پر پاکستانیوں کی جانب سے شیئر کیے جانے والے پیغامات میں سے بیشتر میں ڈرون حملوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

کئی افراد نے یہ سوال اٹھایا کہ آیا صدر اوباما دوبارہ انتخاب کے بعد بھی پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے جاری رکھیں گے یا اپنی ماضی کی پالیسی پر نظرِ ثانی کریں گے جب کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ان خدشات کا اظہار کیا کہ صدر اوباما کے دوبارہ انتخاب کے بعد پاکستان کے بارے میں ان کی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جب کہ ڈرون حملوں میں بھی اضافہ ہوگا۔

جنسی زیادتی کے واقعات بھارتی خواتین کیلئے ایک بھیانک خواب

دست درازی اورہراساں کرنے اور جنسی زیادتی کے واقعات بھارتی خواتین کیلئے ایک بھیانک خواب بن گئے

عوامی مقامات پر نامناسب فقرے بازی ، دست درازی اورہراساں کرنے کے واقعات بھارتی خواتین کیلئے ایک بھیانک خواب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ بھارت میں ایک لڑکی کے ساتھ اجتماعی ریپ کے واقعے اوراس لڑکی کی ہلاکت نے نے پورے بھارت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بھارتی شہروں میں مظاہرے ہورہے ہیں اور حکومت اس سلسلے میں بے بس نظر آتی ہے۔ساعت اعشاریہ چھ ارب انسانوں کی اس دنیا میں تین ارب سے زائد انسانی آبادی ہیں کل انسانی آبادی کا انچاس فیصد عورتیں ہیں۔ آدھی دنیا کے خلاف دنیا بھر ہی میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے کے لئے کلنگ کا ٹیکہ ہیں۔ سی این این کی ایک رپورٹ کے مطابق بھارت میں 2011 کے دوران عورتوں سے جنسی زیادتی کے 24,206 واقعات پیش آئے۔۔ صرف دلی شہر میں سال 2012 کے دوران جنسی زیادتی کے 600 واقعات رپورٹ ہوئے۔ دلی ،جہاں لڑکیاں ہیلمٹ پہن کر موٹر سائیکل چلاتی ہیں۔ جہاں 21 سے 34 سال کی عمر کی 34 فی صد عورتیں شہر کی ورک فورس ، افرادی قوت کا حصہ ہیں۔ جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور تیزی سے ابھرتی ہوئی عالمی معیشت کی

راجدھانی ہے۔۔دلی۔۔۔جسے ریپ کیپیٹل آف دا ورلڈ کہا جاتا ہے۔

ہر سال دنیا بھر میں عورتوں سے جنسی زیادتی کے ڈھائی لاکھ واقعات ہوتے ہیں۔ امریکہ میں ایک تنظیم کرائسس کنیکشن انک ڈاٹ آرگ کے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ہر پینتالیس سیکنڈ میں ایک واقعہ جنسی زیادتی کا ہوتا ہے۔ کالجز میں پڑھنے والی ہر 7 میں سے ایک لڑکی جنسی تشدد کا سامنا کرتی ہے۔ امریکہ میں بھی ایسے 61 فیصد واقعات رپورٹ نہیں کئے جاتے۔ پاکستان میں سی کی ڈاکٹر شازیہ، ملتان کی مختار مائی کیس مشہور ہوئے۔ اور آئے دن ایسے واقعات جنم لیتے ہیں۔ معصوم بچوں اور بچیوں سے زیادتی کے واقعاتر عام ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے کوئی اقدام نہیں کیئے جا رہے ہیں۔ نہ ہیء ان مقدمات کے جلد فیصلے ہوتے ہیں۔ بھارت کی ارون دھتی رائے ان واقعات پر کہتی ہیں کہ (ریاست مہاراشٹر کا ایک گاؤں) میں دلت خاتون اور اس کی بیٹی کا ریپ کر کے انہیں جلا دیا گیا تھا۔ وہ چھتیس گڑھ میں قبا کلی خاتون سونی سوری کے ساتھ ہونے والے واقعے کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ جس میں ریپ کرنے والے پولیس افسر کو بہادری کا ایوارڈ ملا۔' وہ کشمیر کے معاملے پر بات کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ کشمیر میں جب سیکورٹی فورسز غریب کشمیریوں کا ریپ کرتے ہیں، اس وقت سیکورٹی فورسز کے خلاف کوئی پھانسی کا مطالبہ نہیں کرتا۔' یا 'جب کوئی اونچی ذات کا آدمی دلت (سماجی اعتبار سے نچلے طبقے کے ہندو) کا ریپ کرتا ہے تب تو کوئی ایسی

مطالبہ نہیں کرتا۔ ہندوستان میں جس لڑکی کا ریپ ہوتا ہے اسے کوئی قبول کیوں نہیں کرتا؟ کئی معاملات میں جس کا ریپ ہوتا ہے اسی کو خاندان کے لوگ گھر سے نکال دیتے ہیں۔' ابھی کچھ برس پہلے تک بھارت کی ہندی فلموں میں بھی جنسی زیادتی کا شکار ہونے والی خواتین کا انجام اکثر خودکشی کی شکل میں دکھایا جاتا تھا جیسے کہ وہ خود اپنے اوپر کیے گئے ظلم کی مجرم ہو۔ بھارتی معاشرے کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو عورت کی شکل میں دیویوں کی پوجا کی جاتی ہے اور دوسری جانب اسے ہر قسم کے تشدد اور تفریق کا سامنا ہے۔

ریپ یا جنسی زیادتی کا سوال بھارت میں ایک عرصے سے عوام کے شعور میں کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے جنسی زیادتی کے مجرموں کو قانون کا کوئی خوف ہی نہ ہو۔ معاشرے کا رویہ بھی فرسودہ اور اکثر قابل مذمت رہا ہے۔ جنسی زیادتی کے کسی واقعے کے بعد اگر کوئی بحث چھڑتی تو کبھی اس طرح کے مشورے آتے کہ لڑکیوں کو جینز نہیں پہننی چاہیے تو کبھی کوئی رہنما یہ بتاتا کہ لڑکیوں کو رات میں گھر سے نہیں نکلنا چاہیئے۔

دلی میں جنسی زیادتی کے خلاف مظاہرہ، ہزاروں کی تعداد میں لوگ سڑکوں پر

ہر برس جنسی زیادتی کے ہزاروں واقعات کے باوجود بھارتی معاشرے میں انسانیت

کے خلاف اس بھیانک جرم کی جڑ تک جانے اور ان پر قابو پانے کے طریقوں پر کبھی کوئی منظم اور موثر بحث نہ ہو سکی۔ ملک کے پالیسی سازوں قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اس مجرمانہ ذہنیت کو شکست دینے کی کوشش نہیں کی جس نے آج پورے بھارتی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

جنسی زیادتی کے واقعات بھارتی معاشرے کا غیر پسندیدہ حصہ بن چکے ہیں۔ مجرموں کو سزا دینے کے لیے سو برس پرانے جو قوانین نافذ ہیں وہ اتنے پیچیدہ، مبہم اور تکلیف دہ ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے قانون کی مدد نہیں لینا چاہے گا۔ اسی لیے خواہ وہ قتل کا معاملہ ہو یا جنسی زیادتی کا، بیشتر مجرم سزاؤں سے بچ جاتے ہیں۔ عام لوگوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قانون بااثر طاقتور اور مجرموں کے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ریپ کے بڑھتے ہوئے واقعات صرف قانون میں خامی کے ہی نہیں بھارتی معاشرے کی بے حسی کے بھی عکاس ہیں۔

لیکن گزشتہ اتوار کو ایک نوجوان طالبہ کے ساتھ جو واقعہ ہوا ہے اس نے لوگوں کے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایک موثر قانون اور قانون کی حکمرانی کے لیے پورے ملک میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لوگ اب ان واقعات کے لیے حکومت اور پولیس سے جواب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اگر یہ جرائم

نہیں تھم رہے ہیں تو اس کے لیے کون ذمے دار ہے۔' اس شرمناک واقع نے پورے ملک کے اجتماعی شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس مسئلے پر شوشل میڈیا پر بھی بحث جاری ہے۔ بالی ووڈ اسٹار ایمتابھ بچن، نے اس بارے میں اپنے بلاگ میں لکھا کہ امانت' کہیں یا 'دامنی'۔ اب یہ صرف ایک نام ہے۔ اس کے جسم کی موت ہو گئی'، ہے لیکن اس کی روح ہمارے دلوں کو جھنجھوڑتی رہے گی۔ وزیر اعظم منموہن سنگھ کا کہنا ہے کہ میں پوری عوام کے ساتھ مل کر اس لڑکی کے گھر والوں اور دوستوں سے اظہارِ افسوس کرتا ہوں۔ میں دعا گو ہوں کہ اس کے خاندان کو صبر عطا ہو۔

سہیل سیٹھ، مصنف اور مارکیٹنگ کی شخصیت سہیل سیٹھ، نے ٹوئیٹر پر لکھا کہ اگر اپنی موت سے وہ مردوں کے لیے یہ سبق چھوڑ گئی ہے کہ انہیں خواتین سے کس طرح برتاو کرنا ہے اور کس طرح ان کا احترام کرنا ہے تو یہ ایک اصل جیت ہوگی۔ بنگلہ دیشی مصنفہ تسلیمہ نسرین نے لکھا ہے کہ کیا اسے دوسرے ملک میں مرنے کے لیے سنگاپور بھیجا گیا تھا؟ لیکن لوگوں کو اس کی شویاترا نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس لڑکی کی کہانی جانتے ہیں۔

کوہلی، فلم ڈائریکٹر لکھتے ہیں کہ نئی دہلی میں اجتماعی عصمت دری کی شکار بنی لڑکی کی موت ہو گئی ہے، اس کے ڈاکٹروں نے اسے مردہ قرار دے دیا ہے۔ نیہا

دھوپیا، اداکارہ اور ماڈل لکھتی ہیں کہ سال کا اختتام اتنی دردناک خبر کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اداکارہ دیا مرزا، مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے جسم کے ایک حصے کی موت ہوئی ہے۔ شبانہ اعظمی، اداکارہ نے لکھا کہ اور اس کی موت سنگاپور میں ہوئی۔ ہماری بے حسی ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ امید ہے کہ وہ ملک کا سویا ضمیر جگا کے گی۔ وجے مالیا، ممبر پارلیمنٹ اور صنعتکار افسوس ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کی موت اس پر تشدد اور غیر انسانی عمل سے ہوئی۔ بھارت میں جنسی زیادتی کے واقعات غیر ملکی سیاح خواتین کے ساتھ بھی ہوتے ہیں۔ عصمت دری کا یہ واقعہ اکیس مارچ سنہ دو ہزار چھ میں پیش آیا
تھا۔ جرمنی کی متاثرہ طالبہ نے اپنے بھارتی ساتھی بی ٹی موہنتی کے خلاف جنسی زیادتی کی شکایت کی تھی۔

اس معاملے کے فاسٹ ٹریک عدالت میں درج کیے جانے کے نو دن بعد ہی فیصلہ سناتے ہوئے موہنتی کو سات سال کی سزا سنا دی گئی تھی۔ حالانکہ اس کے بعد موہنتی پرول پر رہائی کے بعد فرار ہو گئے تھے اور آج تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے ہیں۔ اس سے قبل سنہ دو ہزار پانچ میں جودھ پور میں فاسٹ ٹریک عدالت نے جرمنی کی ایک خاتون سیاح کے ساتھ دو لوگوں کے ذریعے کیے گئے ریپ کے معاملے میں ایسا ہی فیصلہ سنایا تھا اور دو ہفتے میں کارروائی مکمل کر لی گئی تھی۔ اسی طرح سنہ دو ہزار چھ میں ایک جاپانی خاتون نے پشکر میں ایک گیسٹ ہاؤس کے مالک ببلو پر جنسی زیادتی کا الزام لگایا تھا۔ اسی طرح دسمبر دو ہزار

آٹھ میں اودے پور میں ایک برطانوی سیاح کے ساتھ ہوٹل مالک کی جانب سے ریپ کرنے کے معاملے کی بھی سماعت چار ماہ میں مکمل کر لی گئ تھی اور عمر قید کی سزا دی گئ تھی۔ بھارت میں انصاف میں تاخیر بہت ہوتی ہے۔

پانچ ستمبر انیس سو ستانوے کو راجستھان یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جس میں تقریبا بارہ افراد نے مبینہ طور پر ایک خاتون کے ساتھ ریپ کیا تھا، لیکن اس میں ملزموں کو سزا دینے میں پندرہ سال لگ گئے۔ خواتین شکایت کرتی ہیں کہ ان کے گھر سے نکلتے ہی مردوں کی جانب سے ہراساں کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، امریکی خبر رساں ادارے نے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ بھارتی معاشرے میں عوامی مقامات پر خواتین کی حالت زار کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔52 سالہ بینکار خاتون گیتا گنیشان نے بتایا کہ نئی دہلی میں انکی بیٹی زیر تعلیم تھی،ایک دن مقامی پارک میں واک کے دوران 4 افراد نے اسکا محاصرہ کر کے اسکے ساتھ دست درازی کی، انہوں نے کہا کہ بیٹی بھاگ کر گھر پہنچ گئی لیکن کئی مہینوں تک واک کیلیے باہر نہیں نکلی۔آگرہ سے تعلق رکھنے والی26 سالہ وکیل سندیا جادون نے بتایا کہ جب وہ گھر سے کورٹ کیلیے نکلتی ہیں تو ہراساں کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، انہوں نے بتایا کہ گذشتہ ہفتے بس میں 4 افراد نے میرے ساتھ دست درازی کی، میرے چلانے پر ایک مرد نے مسکرا کر کہا کہ تم مجھے کس طرح روک سکتی ہو جبکہ کوئی مسافر

میری مدد کو نہیں آیا اور میں بس سے نیچے اتر گئی اور اگلے کئی دنوں تک پبلک ٹرانسپورٹ پر سفر نہیں کیا۔ 21 سالہ طالبہ پریانکا کھتری نے بتایا کہ سماج میں خواتین کے خلاف تشدد اور رویوں کو دیکھتے ہوئے ہماری دنیا بہت ہی محدود ہو گئی ہے، شام کے بعد والدین کے بغیر گھر سے نکلنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ تھامسن رائٹرز فاؤنڈیشن کی جانب سے کی گئے سروے میں خواتین کی تعلیم، صحت، روزگار اور انکے خلاف تشدد کا جائزہ لیا گیا۔ اس سروے کے مطابق بھارت میں خواتین سے زیادتی اور قتل کے وارداتوں میں ریکارڈ اضافے کے بعد خواتین عدم تحفظ کا شکار، نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے مطابق زیادتی کے یومیہ ساٹھ واقعات ہو رہے ہیں

بھارتی میڈیا کے مطابق نیشنل کرائم ریکارڈز بیورو کے اعداد و شمار کے مطابق انیس سو نوے میں خواتین سے زیاتی اور قتل کے دس ہزار اڑسٹھ واقعات ہوئے جبکہ دس.برس میں یہ تعداد.بڑھ کر سولہ ہزار چار سو چھیانوے ہو گئی۔ اب خواتین اور لڑکیاں بھارتی معاشرے میں خود کو غیر محفوظ تصور کرتی ہیں۔ اور گھر سے باہر نکلنے سے بھی اجتناب کرتی ہیں۔

این سی آر بی رپورٹ کے مطابق صرف دارالحکومت دہلی میں خواتین سے زیادتی کے واقعات میں پچیس فیصد اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ کے مطابق چند سماجی تنظیموں کے

علاوہ کسی سیاسی و سماجی پارٹی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ اور نہ ہی حکومت نے کوئی اقدامات کیے۔ بھارت میں انتخابات اور امیدواروں پر نظر رکھنے والی غیر سرکاری تنظیم نیشنل الیکشن واچ کا کہنا ہے کہ کئی ممبران پارلیمان اور ممبران اسمبلی کے حلف ناموں میں دی گئی رپورٹ کے مطابق ان پر خواتین کے خلاف جرائم کے کیسز ہیں۔ تنظیم کا یہ بھی کہنا ہے کہ گزشتہ پانچ سالوں میں سیاسی جماعتوں کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں کو ٹکٹ دیے گئے۔ اراکین پارلیمان اور ممبران اسمبلی کی جانب سے الیکشن کمیشن میں داخل کرائے گئے گزشتہ حلف ناموں کی پڑتال سے معلوم ہوا کہ چھ اراکین اسمبلی نے الیکشن کے وقت بھارتی الیکشن کمیشن میں دیے گئے اپنے حلف نامہ میں اعتراف کیا ہے کہ ان کے خلاف جنسی زیادتی کا الزام ہے۔اس کے علاوہ 36 دیگر اراکین اسمبلی کے حلف ناموں کے مطابق ان پر خواتین کے خلاف دیگر جرائم کے الزامات ہیں۔ ان میں سے چھ انڈین نیشنل کانگریس، پانچ بی ایس پی اور تین ایس پی سے ہیں۔ نیشنل الیکشن واچ کے جائزے میں یہ بھی سامنے آیا ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں سیاسی جماعتوں نے اسمبلی انتخابات کے لیے 27 ایسے لوگوں کو ٹکٹ دیا جن کے حلف ناموں کے مطابق ان کے خلاف جنسی زیادتی کے الزام ہیں۔ بھارت میں خواتین کی حالت کتنی اچھی ہے اس کا سیدھا تعلق ان کے اقتصادی حالات سے ہے۔انیس ممالک کی فہرست میں

بھارت سب سے آخر نمبر پر ہے۔ اس کی وجہ بھارت میں لڑکیوں کی کم عمر میں شادی، جہیز کا رواج، گھریلو تشدد اور رحم مادر میں لڑکیوں کو مار دینا بتایا گیا ہے۔ بھارت میں خواتین کو ایسے واقعات سے بچانے کے لئے ایک کمپنی نے ایک پروگرام بھی بنایا ہے۔
اس پروگرام میں جب کسی لڑکی کو کمپنی کی گاڑی جیسے ہی اتارتی ہے، سکّا اپنے موبائل فون میں ایک پروگرام آن کر لیتی ہیں جسے "فائٹ بیک" کہا جاتا ہے۔ یہ پروگرام جی پی ایس کے ذریعے یہ بتانا شروع کر دیتا ہے کہ وہ اس وقت ٹھیک کس مقام پر ہیں۔
جگدیش مترا اس ٹیک کمپنی کے سی ای او ہیں جس نے فائٹ بیک پروگرام تیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "آپ کو جیسے ہی کوئی پریشانی محسوس ہو، آپ کو اور کچھ نہیں کرنا ہے، بس "ایک بٹن دبانا ہے۔
جیسے ہی کوئی خاتون خطرے کا بٹن دباتی ہیں، اس کے بعد ان کے پاس چند سیکنڈ ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے فیصلے کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتیں، تو ٹیکسٹ میسیج، ای میل اور فیس بک کے ذریعے ، فوراً ان کے محل وقوع کے بارے میں ایک پیغام ان کے دوستوں یا گھرانے کے نام چلا جاتا ہے جن کے نام انھوں نے فہرست میں شامل کیے ہوتے ہیں۔
اس پروگرام کو استعمال کرنے والوں کا ڈیٹا ایک انٹریکٹو نقشے پر اکٹھا کر

لیا جاتا ہے۔ مترا کہتے ہیں کہ ان کی کمپنی نقشے پر نظر رکھتی ہے لیکن کسی پبلک مانیٹرنگ سینٹر کی طرح کام نہیں کرتی۔ "قانونی سہولتیں فراہم کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ صرف وہی لوگ قانونی فرائض انجام دے سکتے ہیں جنھیں اس کا اختیار حاصل ہے، یعنی پولیس اور ایسے ہی دوسرے سرکاری ادارے۔"

2010 کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق، نئی دہلی میں جنسی حملوں کے 400 سے زیادہ واقعات ہوئے۔ میڈیا کی بہت سی تنظیموں نے اس شہر کو بھارت میں آبرو ریزی کے صدر مقام کا لیبل لگا دیا ہے۔ کلپنا وسواناتھ، عورتوں کے حقوق کے لیے جد وجہد کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں" اگرچہ یہ پروگرام بہت اہم ہے، اور اسے ایک اہم رول ادا کرنا ہے، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں محتاط رہنا چاہیئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری ایک بار پھر عورتوں کے سر ڈال دی جائے۔"

بھارت میں عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات بڑی حد تک عام ہیں۔ بھارت کے تازہ ترین نیشنل فیملی ہیلتھ سروے کے مطابق 40 فیصد سے زائد عورتوں نے یہ بات تسلیم کی کہ انہیں زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے شوہروں کے ہاتھوں مار کھانی پڑی ہے۔ یہ سروے ملک کے 28 ریاستوں میں کیا گیا جس میں 1.25 لاکھ سے زائد خواتین سے سوالات پوچھے گئے تھے۔ سروے کے مطابق جن 75000 ہزار مردوں سے

سوالات پوچھے گئے ان میں سے 51 فیصد سے زائد نے کہا کہ انہیں اپنی بیویوں کو مارنے پیٹنے میں کوئی خرابی یا قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ عورتوں پر گھریلو تشدد کی روک تھام کے لئے حکومت نے 2005 میں ایک قانون بھی بنایا تھا لیکن اس سے عورتوں کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آسکی ہے۔ سدھا سندر رمن کہتی ہیں کہ خواتین تنظیموں کی جدوجہد اور دباؤ کے بعد حکومت نے قانون تو بنادیا لیکن اس کا نفاذ ابھی تک کاغذات تک ہی محدود ہے۔ سدھاسندر رمن کا کہنا ہے کہ اگر حکومت واقعی عورتوں کو گھریلو تشدد سے بچانا چاہتی ہے تو اسے تمام قوانین کو خلوص اور سختی سے نافذ کرنے ہوں گے۔ اس میں سماجی، اقتصادی اور قانونی اصلاحات کرنی ہوں گی اور مساوات اور جمہوری سماج کے قیام کی طرف قدم بڑھانے ہوں گے ۔ہر برس جنسی زیادتی کے ہزاروں واقعات کے باوجود بھارتی معاشرے میں انسانیت کے خلاف اس بھیانک جرم کی جڑ تک جانے اور ان پر قابو پانے کے طریقوں پر کبھی کوئی منظم اور موثر بحث نہ ہوسکی۔ ملک کے پالیسی سازوں قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اس مجرمانہ ذہنیت کو شکست دینے کی کوشش نہیں کی جس نے آج پورے بھارتی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ریپ کے بڑھتے ہوئے واقعات صرف قانون میں خامی کے ہی نہیں بھارتی معاشرے کی بے حسی کے بھی عکاس ہیں۔

لیکن گزشتہ اتوار کو ایک نوجوان طالبہ کے ساتھ جو واقعہ ہوا ہے اس نے لوگوں

کے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایک موثر قانون اور قانون کی حکمرانی کے لیے پورے ملک میں مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لوگ اب ان واقعات کے لیے حکومت اور پولیس سے جواب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اگر یہ جرائم نہیں تھم رہے ہیں تو اس کے لیے کون ذمے دار ہے۔

پاکستانی گوشت کے پہاڑ کھا رہے ہیں

ضرورت سے زیادہ کھانے والے، لمبا عرصہ جی نہیں پاتے
باون فیصد پاکستانی کا کہنا تھا کہ وہ گوشت کھانے کو ترجیح دیں گے جبکہ سینتیس فیصد نے سبزیاں اور صرف دس فیصد نے کہا کہ وہ دال کھانا پسند کریں گے
جوں جوں عید قرباں قریب آ رہی ہے۔ پورے ملک میں منڈیاں مویشیاں لگ رہی ہیں۔ اور قربانی کے جانور دور دارز سے شہروں میں لائے جا رہے ہیں۔ جب عید پر لاکھوں جانوروں کی قربانی ہوگی تو پھر گوشت کھانے کا اہتمام بھی کیا جائے گا، گوشت کی نئ نئ ڈشیں تیار ہوں گی۔ نئ نئ تراکیب استمال ہوں گی، فریج میں گوشت رکھنے کی گنجائش بڑھائی جائے گی۔
کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ کھانے کے لیے جیتے ہیں اور کچھ جینے کے لیے کھاتے ہیں۔
ماہرین کا کہنا ہے کہ کھانے کے لئے جینے والے، یعنی جسمانی ضرورت سے زیادہ کھانے والے، لمبا عرصہ جی نہیں پاتے ،تاہم جو جینے کے لیے کھاتے ہیں، وہ طویل عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔

کھانے پینے کی عادات کے بارے میں ملک میں ایک سروے کیا گیا۔ اس سروے کے مطابق پاکستان کے زیادہ تر لوگ کھانے میں گوشت کھانا چاہتے ہیں اور سب سے کم تعداد ان لوگوں کی ہے جنہیں دالیں کھانے کا شوق ہے۔ جائزوں کے دوران پاکستان کے دیہی اور شہری علاقوں کے اڑھائی ہزار سے زائد لوگوں سے ان کی رائے معلوم کی گئی۔ گوشت خوری سے متعلق سروے کے دوران لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھا گیا کہ اگر مالی مشکلات ختم ہوجائیں اور اشیائے صرف کی قیمتیں مستحکم ہوجائیں تو وہ کس غذا کو ترجیح دیں گے، گوشت، سبزی یا دالیں۔ رپورٹ کے مطابق باون فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ گوشت کھانے کو ترجیح دیں گے جبکہ سینتیس فیصد نے سبزیاں اور صرف دس فیصد نے کہا کہ وہ دال کھانا پسند کریں گے۔ رپورٹ میں پچھلے تئیس سالوں میں ملک کے اندر گوشت خوری کے رجحان کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق ملک میں مرغی کا گوشت سب سے زیادہ کھایا جاتا ہے۔ جائزے میں بتایا گیا ہے کہ انیس سو اٹھاسی سے دو ہزار آٹھ تک گوشت کی مختلف اقسام میں مرغی کے گوشت کا استعمال سب سے زیادہ بڑھا ہے جبکہ بکرے کے گوشت کے استعمال میں سب سے زیادہ کمی ہوئی ہے۔ سروے کے مطابق اس عرصے کے دوران مرغی کے گوشت کا استعمال چودہ سے بڑھ کر پینتالیس فیصد اور بڑے گوشت کا استعمال چونتیس سے بڑھ کر سینتیس فیصد تک پہنچ گیا ہے جبکہ بکرے کے گوشت کا استعمال اکاون فیصد سے کم ہو کر پندرہ فیصد رہ گیا ہے۔

پاکستان کا شمار اب ان ملکوں میں ہونے لگا ہے۔ جہاں گوشت خوری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مہنگائی کا رونا تو ضرور رویا جاتا ہے۔ لیکن گوشت کھانے کے شوقین کم ہوتے نظر نہیں آتے۔ گوشت خوری ایک عالمی مسئلہ ہے۔ اس کے دلائل بھی خوب ہیں۔ مثلاً دنیا میں کئی علاقے ایسے ہیں جہاں گھاس کا تنکا بھی پیدا نہیں ہوتا، یہاں کے لوگوں کی زندگی کا دارومدار مچھلی اور ان جانوروں کے گوشت پر ہوتا ہے جو وہاں پائے جاتے ہیں۔ کیا گوشت کھانے پر پابندی لگانا ان کو بھوکا مارنا نہیں ہوگا جس کے نتیجے میں وہ زندگی سے محروم ہو جائیں گے؟۔ پھر یہ کہ پالتو جانور جب تک دودھ اور بچے دینے کے قابل ہوں اپنے مالکوں کے لیے فائدہ مند ہوں گے لیکن جب اس قابل نہ رہیں تو ان کے اخراجات کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ جب جانور بوجھ بننے لگیں گے تو ان کو پالنے کی ذمہ داری کون لے گا؟

سب سے بڑھ کر یہ کہ گوشت میں پروٹین ہی پروٹین ہوتی ہے، گوشت کے پروٹین انسانی جسم کا جزو بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ متوازن غذا میں گوشت کا ہونا ضروری ہے۔

اسلام، یہودیت، اور عیسائی مذہب گوشت خوری کی اجازت دیتے ہیں بدھ مت کے

بانی گوتم بدھ کے زمانے میں گوشت خوری عام تھی اور انہوں نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ وہ خود بھی گوشت کھاتے تھے۔ بدھ مت کے ماننے والوں میں جانور ذبح نہ کرنے کا رجحان ڈھائی سو سال قبل مسیح کے ایک بدھ حکمراں اشوک کے زمانے سے پیدا ہوا ہے۔ اس عہد میں دیوتاوں کے نام پر اور ان کے آستانوں پر جانوروں کی قربانی کرنے اور ان کا گوشت کھانے کا عام رواج تھا، اشوک نے اس پر پابندی لگادی اور اس قانون کو سختی سے نافذ کیا۔ رام چندر جی کو ہندو مت میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ انہوں نے جب چودہ سو سال کا طویل عرصہ اپنی بیوی سیتا اور بھائی لچھمن کے ساتھ بن باس میں گزارا تو اس دوران جنگلی پھلوں کے علاوہ ہرن اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا اور ان کا گوشت کھایا۔ گوشت کھانے کے لئے ڈاکٹر منع نہ کرتے لیکن احتیاط کا ضرور کہتے ہیں۔ سائنسدانوں بھی اس بارے میں رائے دیتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک نئی تحقیق میں کہا ہے کہ زیادہ گوشت کھانا اور محفوظ کرنے کے عمل سے گزارے گئے گوشت کا کھانا مضرِ صحت ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں گوشت کی پیداوار ہیں گزشتہ مالی سال کے دوران 5.76 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ سال گوشت کا پیداواری ہدف 3 ملین ٹن تھا جبکہ پیداوار 3.2 ملین ٹن ہوئی۔ وزارت نیشنل فوڈ سیکیورٹی اینڈ ریسرچ نے رواں مالی سال 2012-13 کیلیے گوشت کا پیداواری ہدف 3.3 ملین ٹن مقرر کیا ہے۔ تاکہ گوشت کی ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ گوشت اور اس سے تیار کردہ مصنوعات کی برآمدات میں اضافہ کیا جا

سکے۔حکام کے مطابق گزشتہ مالی سال کے دوران 1.76 ملین ٹن بڑے گوشت اور 0.629 ملین ٹن بکرے کے گوشت کی پیداوار حاصل ہوئی اور اس طرح مالی سال 2011-12 کے دوران بڑے گوشت کی پیداوار میں 4.7 فیصد جبکہ بکرے کے گوشت کی پیداوار میں 3.4 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔افغانستان میں اتحادی فوج کی موجودگی کے سبب بھی ملک میں گوشت کی کھپت زیادہ ہوئی ہے۔افغانستان چوری چھپے اور قانونی طریقہ پر گوشت پاکستان ہی سے سپلائی کیا جاتا ہے۔اس بارے میں پشاور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے۔جس نے عبوری حکم کے ذریعہ افغانستان کو گوشت سپلائی معطل کرنے کا حکم جاری کیا ہے۔پشاور کی تاجر برداری نے پشاور ہائی کورٹ کی طرف سے افغانستان کو پرمٹ کے ذریعے سے گوشت اور پولٹری کی برآمد تاحکم ثانی معطل کرنے کے حکم کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ اس سے صوبہ میں مہنگائی میں کمی واقع ہوگی اور غریب عوام کو فائدہ ہوگا۔سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے سینئیر نائب صدر ضیاء الحق سرحدی کہتے ہیں کہ 'کئی سال سے افغانستان کو پرمٹ کے ذریعے سے گوشت اور مال مویشی سمگل کیے جا رہے تھے'۔اس اسمگلنگ کی وجہ سے خیبر پختونخوا کے مختلف شہروں میں گوشت اور مرغی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ضیاء الحق سرحدی کا کہنا ہے کہ گوشت کی برآمد کے پرمٹ سیاسی بنیادوں پر یا بھاری رقوم کے عوض جاری کیے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر وفاقی محکموں کی طرف سے ہی جاری ہوتے ہیں۔پشاور میں عدالت نے گوشت اور مرغیوں کی قلت اور ان کی

قیمتوں میں خاطر خواہ اضافے پر از خود نوٹس لیا تھا۔

انٹرنل میڈیسن میں شائع کی گئی ایک تحقیق میں یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائنا کے ڈاکٹر بیری ہاپکنز نے کہا ہے کہ 'گوشت کھانے میں کمی کرنا ضروری ہے'۔ محققین کے مطابق 'کوئی یہ نہیں کہہ رہا کہ برگر اور گوشت کھانا بند کر دیا جائے بلکہ صرف اس میں کمی لائے جائے'۔اس تحقیق میں پتہ چلا کہ وہ افراد جو زیادہ گوشت کھاتے ہیں ان کی جلدی موت کے امکانات زیادہ ہیں اور خاص طور پر ان کو امراض قلب یا سرطان ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔ تحقیق کے مطابق زیادہ گوشت کھانے والے افراد ایک سو ساٹھ گرام جبکہ کم گوشت کھانے والے افراد اوسطاً صرف پچیس گرام گوشت کھاتے ہیں۔ تحقیق کے مطابق اگر گوشت کھانے میں کمی کی جائے تو گیارہ فیصد مرد اور سولہ فیصد عورتیں جلد موت سے بچ سکتی ہیں۔امریکا میں کی جانے والی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر آپ کو اپنی عمر سے دس سال زیادہ جینے کی خواہش ہے تو گوشت چھوڑ کر پھلوں اور سبزیوں پر انحصار کریں۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ مناسب مقدار میں متوازن خوراک آپ کو طویل عرصے تک جینے میں مدد دیتی ہے۔یونیورسٹی آف میری لینڈ میں کی جانے والی تحقیق کے مطابق مرنے والوں میں سب سے کم شرح پھل سبزیاں اور مچھلی کھانے والوں کی

ہے۔ ایک جانب تو ملک میں مہنگائی نے عوام کا جینا محال کر دیا ہے۔ دوسری جانب اشیاء خورد نوش کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ دنیا بھر میں اشیائے خور و نوش کی قیمتیں ہمیشہ کم و بیش ایک ہی سطح پر رہتی ہیں، لیکن ہمارے یہاں آئے روز اشیاء خور دونوش کی قیمتوں میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آتا ہے۔ موجودہ وقت میں، کہ جب دنیا ایک گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کر چکی ہے، ڈبلیو ٹی او پر دستخط کرنے کے بعد ہر ملک دوسرے ممالک کے ذرائع پر اتنا اختیار رکھنے کے قابل ہو گیا ہے جتنا کہ وہاں کے مقامی لوگوں کو اختیار حاصل ہے۔ دیگر دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو چیز جہاں پیدا ہو رہی ہے، اب وہ باآسانی اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں اس کی صحیح قیمت مل سکے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کسی پاکستانی کی اشیاء زیادہ قیمتیں ملنے کی وجہ سے دیگر ممالک میں پہنچ جاتی ہیں تو پاکستانی میں ان کی شدید قلت پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ اس مشکل سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہر ملک اپنے عوام کی قوت خرید میں اضافہ کرے۔ یعنی دنیا بھر میں کم از کم اجرت اتنی ہونی چاہیئے کہ ہر شخص کم از کم اپنی خوراک خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

انسان کے لئے خوراک ہمیشہ بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ پاکستان میں حکومت نے بنیادی ضروریات کی اشیاء کے کنٹرول سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ملک میں خوراک کو حصول روز بروز مشکل ہو رہا ہے۔ دودھ جیسی بنیادی ضرورت کی قیمت

میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، اسی طرح گوشت کی قیمتیں بھی آسمان پر پہنچ رہی ہیں۔ بکرے کا گوشت تو اب صرف ایک خاص طبقہ تک محدود ہوگیا ہے۔ اس لئے حکومت کو اس سلسلے میں ایسی پالیسی بنانی چاہیئے جس سے ایک امیر اور غریب کی خوراک کی ضورت یکساں طور پر پوری ہو سکیں، عوام کو بھی اپنی بے جا خواہشات پر قابو پانا چاہیئے، اور گوشت خوری سے نکل کر سبزی اور دیگر اشیاء خورد و نوش کا اپنانا چاہیئے۔

ٹیررزم انشورنس کے ذریعہ دہشت گردی کے واقعات

ٹیررزم انشورنس کے ذریعہ دہشت گردی کے واقعات کے دوران قومی اور نجی املاک کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ ہونا چاہیئے۔

پاکستان کو اس وقت سب سے پیچیدہ مسئلہ جو درپیش ہے، وہ دہشت گردی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں شروع ہونے والا یہ مسئلہ اب ہماری زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ روزانہ ہلاکتیں، کہیں بم دھماکہ ہے تو کہیں ٹارگٹ کلنگ، لوگ ٹارگٹ کلنگ میں مارے جائیں یا' فرقہ واریت میں، بم دھماکے سے ہلاک ہوں یا خود کش حملے میں، رزق خاک بنے والے یہ افراد اس قوم کا حصہ ہیں۔ یہ افسوس ناک خبریں ہماری زندگی کو آہستہ آہستہ تبدیل کر رہی ہیں۔ یہ خبریں ہم روزانہ پڑھتے ہیں۔ سن اور دیکھ رہے ہیں' ان خبروں نے ہماری اجتماعی نفسیات تبدیل کر دی ہے' ہمارے اندر سے زندگی کی محبت اور موت کا افسوس نکل گیا ہے' ہم اب بم دھماکوں' خود کش حملوں' روڈ ایکسیڈنٹس' فرقہ وارانہ اور خاندانی دشمنیوں کی ہلاکتوں کو ڈرامے کی طرح دیکھتے ہیں' ہم نعشوں کے قریب سے گزرتے ہیں۔ اور لمحہ بھر کو نہیں رکتے۔ دوسری جانب اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم نے جدید دور کے تقاضے بھی نہیں اپنائے، معاشی تحفظ یا کسی خاندان کو

اپنے پیروں پر کھڑا رکھنے کے لئے نہ تو اجتماعی انداز میں اور نہ ہی انفرادی طور پر ہم نے کوئی منصوبہ بندی کی ہے۔ انشورنس یہ بیمہ ایک ایسا ہی منصوبہ ہے۔ لیکن اس جانب سے ہماری عدم توجہی نے اس مفید منصوبے سے ہمیں دور کر دیا ہے۔ دوسری جانب بیمہ زندگی کی پالیسی میں ایک ایسی شق بھی موجود ہے جو ایک بیمہ دار کو دہشت گردی، بم دھماکے، جنگ یا ہنگامے میں ہلاک ہونے پر بیمے کے تحفظ سے محروم کر دیتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس شق کو تبدیل کیا جائے، حال ہی میں دہشت گردی کے واقعات میں ہونے والے مالی نقصان سے کاروباری طبقے کو محفوظ رکھنے کے لیے ایشیائی ترقیاتی بینک نے ایک پیش رفت کی ہے۔ اب ایشیائی بنک پاکستان میں انشورنس ٹیررزم پول بنانے میں حکومت کی مدد کے لیے تیار ہو گیا اس سلسلے میں سیکورٹی ایکسچینج کمیشن کو قوانین کی تیاری کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ابھی تک اس کی پیش رفت سست ہے۔ اگر یہ قوانین جلد تیار ہو جائیں اور عمل درآمد کے لئے نافذ کر دیئے جائیں تو روزانہ ہلاک ہونے والے افراد کے خاندانوں کی اشک شوئی ہو سکتی ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے ذرائع کے مطابق حکومت پاکستان اور بینک کے درمیان یہ نظام ترتیب دینے کے لیے بات چیت جاری ہے۔ ٹیررزم انشورنس کا مقصد دہشت گردی کے واقعات کے دوران قومی اور نجی املاک کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ اور ان واقعات میں تلف ہونے والی انسانی جانوں کے نقصان کا مداوا کرنا ہے۔ لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ابھی تک ملک میں کوئی بھی انشورنس کمپنی دہشت گردی

اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کا ازالہ کرنے کے منصوبے پیش نہیں کرتی ہے۔ ہمارے یہاں روایتی بیمہ پالیسیاں ہیں۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ خیال ہے کہ اس پول کے قیام کے ذریعے حکومت اور ایشیائی ترقیاتی بینک مل کر بیمہ کمپنیوں کے ذریعے ایک ایسا نظام ترتیب دیں گے جس میں دہشت گردی اور سیاسی افراتفری کے باعث ہونے والے نقصان کو بھی بیمہ کمپنیاں قبول کر سکیں گی۔امریکہ میں گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد دنیا کے بہت سے ممالک میں ٹیررزم انشورنس پول قائم کیے گئے ہیں جن کے ذریعے دہشت گردی سے ہونے والے نقصان کا بیمہ کیا جاتا ہے۔پاکستان میں کئی برس سے اس نظام کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ لیکن سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے باعث بیمہ کمپنیاں دہشت گردی کے خلاف بیمہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔ دہشت گردی، لاقانونیت اور بدامنی کے باوجود پاکستان میں ایک فیصد سے بھی کم شہریوں کو بیمے کا تحفظ حاصل ہے۔ ہماری 99 فیصد آبادی کم علمی اور وسائل کی کمی کے باعث بیمے کی سہولت حاصل کرنے کے لیے بچت اور سرمایہ کاری کے منصوبوں سے مدد نہیں لیتی۔ اب چند برسوں سے پاکستان میں لائف انشورنس اور املاک کی انشورنس کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور لاقانونیت کے سبب انشورنس کمپنیوں کو بھی مشکلات کا سامنا ہے، محترمہ بے نظیر شہید کی شہادت کے بعد پورے ملک میں ہونے والی بدامنی اور نقصانات کے واقعے سے انشورنس کمپنیاں خوفزدہ ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ انشورنس کمپنیاں حساس اور غیر محفوظ

علاقوں میں تجارتی و کمرشل املاک کو انشورنس کا تحفظ فراہم کرنے سے اجتناب کر رہی ہیں یا پھر ان سے زائد پریمیم طلب کیا جا رہا ہے۔

امن وامان کی سنگین صورتحال، دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ عروج پر پہنچنے کے باوجود پاکستانی عوام اپنی زندگی کو تحفظ دینے کے لیے سرمایہ کاری سے گریزاں ہیں، بدامنی، ٹارگٹ کلنگ اور دہشت گردی کے واقعات میں انسانی جانوں کے ضیاع کے باعث گزشتہ 4 سال کے دوران اگرچہ انفرادی بیمہ زندگی کا تحفظ حاصل کرنے والوں کی شرح 69.56 فیصد جبکہ گروپ انشورنس کا تحفظ حاصل کرنے والوں کی شرح 138.23 فیصد بڑھی ہے لیکن اسکے باوجود پاکستان کی مجموعی آبادی کا 99.4 فیصد حصہ انشورنس کے تحفظ سے محروم ہے اور صرف آبادی کے 0.6 فیصد حصے نے انشورنس کا تحفظ حاصل کیا ہوا ہے۔ عام آدمی پہلے ہی ہوشربا مہنگائی، بے روزکاری، بجلی اور گیس کے اخراجات اور گھریلو بجٹ سمیت دیگر معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ بڑھتی ہوئی بدامنی سے خوفزدہ ہوکر وہ بیمہ زندگی اور املاک وکاروبار کا بیمہ کرانے پر مجبور ہوگیا ہے تاکہ کسی بھی ممکنہ حادثے کی صورت میں اسکے خاندان کو معاشی سپورٹ حاصل ہوسکے۔ لیکن اس کے لئے انشورنس کمپنیوں اور حکومت کو بھی آگے بڑھنا ہوگا۔ تاکہ ملک میں دہشت گردی کے واقعات میں ہونے والے مالی نقصان سے کاروباری طبقے کو کچھ ریلیف مل سکے۔

درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

.برطانیہ میں ہر سات میں سے ایک شخص دائمی درد کا شکار ہے جس میں جوڑوں اور سر کے درد شامل ہیں۔

درد کم کرنے والی دواؤں یعنی 'پین کلرز' کے باعث ہونے والی اموات گزشتہ دس .برس میں تین گنا زیادہ ہو گئی ہیں

درد کا حل ایک گولی۔۔ ایک زمانے میں سر درد کے علاج کے لئے ڈسپرین کے اشتہار کا یہ جنگل عام تھا۔ درد ایک ایسی علامت ہے۔ جو خود بیماری تو نہیں لیکن اس کی علامت کہی جا سکتی ہے۔ درد کہیں بھی، کسی بھی وقت، کسی کو بھی ہو سکتا ہے۔ شاعر خود درد میں مبتلا رہے، کسی نے کہا درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا، تو کسی نے کہا،، یہ درد کی دنیا ہے اِدھر دیکھ تو لے،، دل ویراں ہے، تیری یاد ہے، تنہائی ہے۔زندگی درد کی بانہوں میں سمٹ آئی ہے۔ اقبال نے کہا دل درد سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے ساغر صدیقی نے کہا کہ،،مدعا کچھ نہیں فقیروں کا۔ درد ہے لا دوا فقیروں کا۔ لیکن یہ شاعروں والا درد نہیں ہے سچ مچ کا درد ہے۔

اب خواتین میں کمر درد کی بیماری عام ہوتی جا رہی ہے.۔ سر درد بھی ہمارے یہاں

نے (WHO) عام ہے۔ یہ نوعمر اور بالغ بچوں کی عام شکایت ہے، عالمی ادارہ صحت درد سے نجات ایک انسانی حق تسلیم کیا ہے۔ کینسر اور آرتھرائٹس میں یا آپریشن اور زچگی کے بعد درد بیماری کا حصہ بن جاتا ہے۔ بڑھاپے میں درد کی شکایت عام ہے، ضعیف افراد بڑے پیمانے پر ایسی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں جو گھٹنے اور پشت کے درد کا باعث ہوتی ہیں اور ان افراد میں کینسر اور فریکچر کے باعث سرجری کی شرح بھی زیادہ ہے۔ چوٹ یا بیماری کے خاتمے تک محض درد کی علامتوں میں عارضی آرام درکار ہوتا ہے تاہم بعض صورتوں میں درد برقرار رہتا ہے اور مسائل پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کے مریض رفتہ رفتہ اپنے جسمانی معمولات کو ترک کرنا شروع کردیتے ہیں اور بالآخر بستر تک محدود ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپے کے عوامل کی پیچیدگیوں اور دیگر طبّی مسائل کی موجودگی کے پیش نظر پٹھوں اور ہڈیوں میں ہونے والے معمولی سے درمیانے درجے کے مستقل درد کے لیے سادہ دافع درد دوائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کے خطرناک اثرات پر توجہ نہیں دی جاتی۔ امریکہ کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہیروئن اور کوکین کی نسبت اموات کی بڑی وجہ درد کم کرنے کی دواؤں کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہے۔ سینٹرز فار ڈیزیز کنٹرول اینڈ پروینشن (سی ڈی سی) کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ڈاکٹروں کی تجویز کردہ خوراک سے زیادہ دوا کھانے کے رجحان نے ایک وبا کی شکل اختیار کر لی ہے اور درد کم کرنے والی دواؤں یعنی 'پین کلرز' کے باعث ہونے والی اموات گزشتہ دس برس میں تین گنا زیادہ ہو گئی ہیں۔ تاہم

رپورٹ میں درج ہے کہ یہ دوائیں درد تو کم کرتی ہیں لیکن اس قدر نشہ آور ہیں کہ پچھلے سال امریکہ میں کیے گئے ایک سروے میں معلوم ہوا کہ بارہ سال سے زیادہ عمر کے ہر بیس افراد میں سے ایک فرد ان دواؤں کا غیر ضروری استعمال کرتا ہے۔ 'سبسٹنس ابیوز اینڈ مینٹل ہیلتھ سروسز ایڈمنسٹریشن' نامی امریکی حکومتی ادارے کی پامیلہ ہائڈ کا کہنا ہے 'ہر روز تقریباً پانچ ہزار پانچ سو افراد درد کم کرنے والی دواؤں کا غلط استعمال شروع کرتے ہیں۔' دوسری جانب ایک اور امریکی ادارے ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کے اعداد و شمار کے مطابق سنہ انیس سو ننانوے سے لے کر اب تک دواخانوں کو ان دواؤں کی فروخت میں تین سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔" رپورٹ میں درج ہے کہ یہ دوائیں درد تو کم کرتی ہیں لیکن اس قدر لت آور ہیں کہ پچھلے سال امریکہ میں کیے گئے ایک سروے میں معلوم ہوا کہ بارہ سال سے زیادہ عمر کے ہر بیس افراد میں سے ایک فرد ان دواؤں کا غیر ضروری استعمال کرتا ہے۔ "لیکن سرکاری رپورٹ کے مطابق مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ دوائیں زیادہ خریدی جا رہی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ان دواؤں کے نسخے بھی پہلے سے زیادہ دے رہے ہیں۔ سی ڈی سی کے تھامس فریڈن نے خبر رساں ادارے اے ایف پی کو بتایا 'اس رپورٹ سے یہ واضح ہوا ہے کہ ریاستوں کو ان دواؤں کے متعلق پالیسیاں درست و تبدیل کرنی ہوں گی تاکہ ان کا غلط استعمال کم کیا جا سکے۔' واضح رہے کہ سنہ دو ہزار آٹھ میں تقریباً پندرہ ہزار اموات صرف درد کم کرنے والی دواؤں کی وجہ سے ہوئی تھیں۔ اور ہر برس یہ

تعداد بڑھ رہی ہے۔ کتنے لوگ اس سے متاثر ہیں؟ اس کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہے۔ اس مسئلے کی وسعت کے بارے میں بہت کم تحقیق کی گئی ہے۔ ایک جرمن رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ چار فیصد کے قریب لوگ اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ این آئی سی ای کی ہدایات جاری کرنے والے ماہرین کے مطابق ان کی تعداد دو فیصد کے قریب ہے۔ میگرین سر درد کا عارضہ لاحق میں درد کش ادوایات کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کسی بھی دوا کی ضرورت سے زیادہ مقدار نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ لیکن دماغی امراض کے ماہروں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ درد کش ادویات کے زیادہ استعمال سے سر درد الٹا بڑھ کیوں جاتا ہے۔ شاید ان سے جسم کے درد کا مقابلہ کرنے کا نظام کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے۔ مائیگرین کا علاج خاصا سخت ہے۔ اس کی شدت کم کرے کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم ایک مہینے تک تمام درد کش ادویات مکمل طور پر بند کر دی جائیں۔ مریضہ فران سوین کو اس علاج سے گزرنا پڑا۔ انھیں کئی برسوں سے میگرین سر درد کا عارضہ لاحق تھا۔ انھیں احساس نہیں تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ درد کش ادویات لے رہی ہیں جو بیماری کو بدتر بنا رہی ہیں۔ لیکن اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ کتنی ادویات ضرورت سے زیادہ ہیں؟ ڈاکٹروں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان مریضوں پر نظر رکھیں جن کی علامات دوا کے تین ماہ استعمال کے بعد بدتر ہو گئی ہوں دماغی امراض کے ماہرین (نیورولوجسٹ) کئی برس سے ادویات کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہونے والے سر درد کے بارے میں جانتے ہیں۔ لیکن صحت پر نظر

رکھنے والی تنظیم این آئی سی ای کے مطابق بہت کم مریض اور ڈاکٹر اس کے بارے میں جانتے ہیں۔این آئی سی ای نے برطانیہ اور ویلز کے صحت کے اہل کاروں کو نئی ہدایات جاری کی ہیں، جو تمام دنیا کے ڈاکٹروں پر لاگو ہو سکتی ہیں۔ ڈیسری فلپز کی موت ایک ایسے ہی کیس میں ہوئی۔اسے گزشتہ سال اگست میں جگر کے کام نہ کرنے کی تکلیف کی وجہ سے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ تحقیقات کے دوران ڈیسری کے دادا ڈیسمینڈ فلپز کا کہنا تھا کہ ڈیسری کی چھاتی میں گلٹیاں اکثر بن جایا کرتی تھیں جنہیں سرجری کے ذریعے نکالنا پڑتا تھا لیکن ان گلٹیوں میں کینسر نہیں تھا۔ ان سرجریوں کے بعد انہیں بہت درد ہوتا۔ تاہم ایسے میں وہ درد کو کم کرنے کے لیے بہت زیادہ پیراسیٹامول لے رہی تھیں لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ نتیجہ یہ نکلے گا۔ 'ڈیسری درد کو کم کرنے کے لیے پیراسیٹامول کا استعمال کر رہی تھیں اور شاید ضرورت سے زیادہ کر رہی تھیں۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ ان کی موت بہت ساری پیراسیٹامول ایک ساتھ لینے سے ہوئی ہے یا پھر یہ کافی عرصے سے بہت زیادہ لینے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ موت کا سبب دریافت کرنے والے اہلکار مارک لیٹن کا کہنا ہے کہ ڈیسری کی موت ضرورت سے زیادہ پیراسیٹامول کے استعمال سے ہوئی ہے۔ رپورٹ میں درج ہے کہ یہ دوائیں درد تو کم کرتی ہیں لیکن اس قدر نشہ آور ہیں کہ موت کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔

گزشتہ دنوں امریکہ میں کیے گئے ایک سروے میں معلوم ہوا کہ بارہ سال سے زیادہ عمر کے ہر بیس افراد میں سے ایک فرد درد کش دواؤں کا غیر ضروری استعمال کرتا ہے۔ 'سبسٹنس ابیوز اینڈ مینٹل ہیلتھ سروسز ایڈمنسٹریشن' نامی امریکی حکومتی ادارے کی پامیلہ ہائڈ کا کہنا ہے 'ہر روز تقریباً پانچ ہزار پانچ سو افراد درد کم کرنے والی دواؤں کا غلط استعمال شروع کرتے ہیں۔' دوسری جانب ایک اور امریکی ادارے ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن کے اعداد و شمار کے مطابق سنہ انیس سو ننانوے سے لے کر اب تک دواخانوں کو ان دواؤں کی فروخت میں تین سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ دوائیں زیادہ خریدی جا رہی ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ان دواؤں کے نسخے بھی پہلے سے زیادہ دے رہے ہیں۔ سنہ دو ہزار آٹھ میں تقریباً پندرہ ہزار اموات صرف درد کم کرنے والی دواؤں کی وجہ سے ہوئی تھی ۔ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہیروئن اور کوکین کی نسبت اموات کی بڑی وجہ درد کم کرنے کی دواؤں کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہے۔

سینٹرز فار ڈیزیز کنٹرول اینڈ پریونشن (سی ڈی سی) کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹروں کی تجویز کردہ خوراک سے زیادہ دوا کھانے کے رجحان نے ایک وبا کی شکل اختیار کر لی ہے اور درد کم کرنے والی دواؤں یعنی 'پین کلرز' کے باعث ہونے والی اموات گزشتہ دس برس میں تین گنا زیادہ ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر

درد کے خاتمے پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دائمی درد کو ختم کرنے والی ادویات کا تجربہ کیا گیا۔ایک جریدے جرنل سائنس میں شائع کی گئی ریسرچ میں یونیورسٹی آف کیمبرج کے تحقیق کاروں تجربہ کے دوران ایچ سی این ٹو جین کو چوہوں کی درد کی نسوں سے نکال لیا۔ اس عمل کے بعد دائمی درد ختم ہوگیا تاہم فوری درد میں آرام نہیں آیا۔ تحقیق کاروں کا کہنا ہے کہ ان کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایسی دوا تیار کرنے کے امکانات ہیں جن کے ذریعہ ان پروٹین کی پیداوار کو روکا جاسکتا ہے جو ایچ سی این ٹو جین پیدا کرتے ہیں اور جو دائمی درد کا موجب بنتے ہیں۔ نسوں کے آخری حصوں میں اس جین کی شناخت تو کئی برس پہلے ہوچکی تھی تاہم یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ یہ ہی دائمی درد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دائمی درد دو اقسام کے ہوتے ہیں جن میں ایک انفلیمیٹری پین ہوتا ہے جس میں جلن کا احساس ہوتا ہے اور یہ کسی بھی قسم کے زخم لگنے یا جلنے سے ہوتا ہے۔ دوسری قسم نیوروپیتھک پین ہے جو نسوں کے دبنے یا نقصان پہنچنے پر ہوتا ہے اور یہ مستقل بلکہ عمر بھر رہتا ہے۔اس تحقیق کے کلیدی تحقیق کار پروفیسر پیٹر مک ناٹن کہتے ہیں 'اس جین پر کام کرنے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے طبّی عمل کے ذریعے ہٹانے یا بند کرنے سے نیوروپیتھک پین ختم ہوجاتا ہے لیکن یہ اچانک ہونے والے درد کو ختم نہیں کرتا۔' دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحقیق کے لیے فنڈ بائیو ٹیکنالوجی اینڈ بائیو سائنس ریسرچ کونسل اور یورپی یونین نے فراہم کیے تھے۔ کھلاڑی بھی درد کش

ادویات استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر نئے فٹبالرز سینیئر کھلاڑیوں کی پیروی کرتے ہوئے درد کش ادویات کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے فٹبال ٹورنامنٹس کے لیے ہونے والے گزشتہ سروے میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ متعدد کھلاڑی درد کش ادویات استعمال کرتے رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں سنہ دو ہزار دس کے فٹبال کے عالمی کپ کے نتائج.برطانوی جرنل آف سپورٹس میڈیسن نامی جریدے میں شائع ہوئے ہیں جن کے مطابق اس دوران کھلاڑیوں نے سب سے زیادہ درد کش ادویات استعمال کیں۔ماہرین کا کہنا ہے کہ درد کش ادویات استعمال کرنے سے بلخصوص پیشہ ور کھیل کو خطرات ہو سکتے ہیں۔ماہرین کے مطابق کھیل کے دوران ان کھلاڑیوں کے گردے حساس ہو چکے ہوتے ہیں اور ایسے میں دوائیں انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔فٹبال کی عالمی تنظیم فیفا کے ایک طبّی اہلکار نے بین الاقوامی فٹ بالرز کو خبردار کیا ہے کہ وہ ٹورنامنٹ کے دوران کسی بھی قسم کے درد کش ادویات لینے سے اپنی صحت کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ تین سال قبل جنوبی افریقہ میں ہونے والے فٹ بال کے عالمی مقابلوں کے دوران تقریباً چالیس فیصد کھلاڑی ہر میچ سے قبل دوائیں استعمال کرتے ہوئے پائے گئے تھے۔ بہت سی خواتین چھاتی کے سرطان کے علاج کے لئے بھی درد کش ادویات استعمال کرتی ہیں۔ تاہم ماہرین کے مطابق ابھی تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ درد کش ادویات کے استعمال سے چھاتی کے سرطان کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔ صحت عامہ کیلئے بوسٹن یونیورسٹی سکول کی ماہر سرجن لن روزن برگ

کا کہنا ہے: "میرا نہیں خیال کہ خواتین کو چھاتی کے سرطان سے بچنے کیلئے اسپرین استعمال کرنی چاہئے۔ اگر خواتین چھاتی کے سرطان سے فی الواقع بچنا چاہتی ہیں تو انہیں سخت ورزش کرنی چاہئے اور پھلوں اور سبزیوں کا زیادہ استعمال کرنا چاہئے۔ پاکستان میں ذیابیطس گردے خراب یا ناکارہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے بھی درد کش ادویات یا حکیموں کے کشتوں کا استعمال ہے۔ پاکستان میں ہر دس لاکھ افراد میں سے سالانہ 100 سے 150 افراد کے گردے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ درد کش ادویات اور حکیموں کے کشتوں کا بے دریغ استعمال گردوں کے ناکارہ ہونے کا سبب بن رہا ہے۔ ڈاکٹر ظفر اقبال کا کہنا ہے کہ حکیموں کے "کشتوں" سے ہر ممکن پرہیز کریں، درد کش ادویات، دھاتوں کی آمیزش والے کشتے، گردوں کی پتھری اور موروثی بیماریاں گردے کے امراض کی وجوہات ہیں۔ پاکستان میں درد کے علاج کے کلینکس اور باقاعدہ اعلیٰ تربیت یافتہ معالجوں کی کمی کے باعث ابھی تک اس طریقہ کار کا استعمال محدود ہے۔ ہمارے علم میں ہے کہ دنیا کی آبادی بڑھاپے میں مبتلا ہو رہی ہے اور بالغوں اور ضعیف العمر افراد میں درد کے علاج کی نمایاں ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں ہمیں درد کے اعلیٰ تربیت یافتہ معالجوں اور درد کے علاج اور دیکھ بھال کے کلینکس کی کمی کے باعث ضعیف العمر افراد کو درد میں آرام پہنچانے کے حوالے سے مخصوص چیلنج کا سامنا ہے۔ ہمیں ہر صورت میں ضعیف العمر افراد میں شدید یا مستقل درد کے بڑھتے ہوئے خطرے سے واقف ہونا اور ان کمزور مریضوں کو درد میں

مناسب آرام پہنچانے کے لیے سنجیدہ کوششیں کرنا ہوں گی۔

دھرنا ہوگا، لڑنا ہوگا

دھرنا سیاست۔ کیا ملک کی تقدیر بدل دے گی؟

دنیا کی تاریخ میں انسان اپنے عمل سے ہر تبدیلی لا سکتا ہے۔ اور تبدیلی کے لئے عوام اپنے گھروں سے نکل پڑیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انھیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔ مصر کے دارالحکومت قاہرہ کے التحریر سکوائر پر اٹھارہ دن تک دھرنا دینے والے خمیہ زن احتجاجی مظاہرین کا جذبہ ساری دنیا نے دیکھا۔ اپنے مطالبات میں جس نظم و ضبط سے یہ اٹھارہ دن گزرے وہ دیدنی تھے۔ مصری عوام دیوانہ وار جھوم جھوم کر مصر کے پرچم کو ہوا میں لہراتے تھے۔ التحریر سکوائر، مزاحمتی تحریک میں تاریخ کا حصہ بن گیا۔ آج ساری دنیا میں عوام احتجاج کے لئے پرامن انداز میں اپنے مطالبات کے حق کے لئے دھرنے دیتے ہیں۔ عرب دنیا میں عوام اپنے آمر حکمرانوں سے نبرد آزما ہے۔ پاکستان کے عوام نے بھی ایک آمر کو رخصت کرنے کے لئے وکلاء اور سول سوسائٹی کے ساتھ جو بے مثال تحریک چلائی وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔

دنیا میں دھرنا سیاست یا احتجاج شمالی امریکہ سے شروع ہوا۔ جہاں گوروں کے

مقابلے میں کالوں سے امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ انکے اسکول کالج کیفے ریستورانت، بسیں سب الگ تھیں۔ فروری 1961 میں نارتھ کیرولینا یونیورسٹی کے چا کالے طالب علم ایک مشہور زمانہ اسٹور میں داخل ہوئے اور سامان خریدنے کے بعد ایک لنچ کاونٹر پر جاکر بیٹھ گئے جو صرف گوروں کے لئے مخصوص تھا۔ انھوں نے کافی کا آڈر دیا۔ انتظامیہ نے انھیں سرو کرنے سے انکار کردیا۔ یہ طلبہ یہاں بیٹھے رہے۔ یہاں تک کے اسٹور کے بند ہونے کا وقت ہوگیا۔

دوسرے دن اسٹور کھلنے پر یہ طلبہ پھر آگئے اس بار ان کی تعداد دو درجن سے زائد تھی۔ انھوں نے کاونٹر پر کھانے کا آرڈر دیا۔ انتظامیہ نے انھیں اس دن بھی سرو کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ طلبہ وہاں بیٹھے رہے۔ یہ خبریں مقامی اخبارات میں شائع ہوئی تو اگلے دن اس دھرنے میں مزید اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ اسٹور والوں کے لئے کاروبار کرنا ممکن نہ رہا۔ 6 فروری کے دن جب اسٹور کے اندر اور باہر بہت بڑا مجمع تھا تو ایک فون کال آئی جس میں کہا گیا تھا کہ اسٹور میں بم رکھا ہے جس کے بعد تما ہجوم منتشر ہوگیا۔ دو ماہ تک اسٹور بند رہے لیکن جب اسٹور کھلا تو احتجاج اور دھرنا دوبارہ شروع ہوگیا۔ اور گورے بھی کالوں کی حمایت میں آگئے۔ اس دھرنے کے نتیجے میں پورے امریکہ میں کالوں کے خلاف امتیازی سلوک کے خلاف ایک ملک گیر تحریک برپا ہوئی۔ اور یہ قوانین تبدیل ہوئے۔

دھرنا سیاست پاکستان میں اب اتنی مقبول ہو گئی ہے کہ گھروں میں بچے بھی اپنی فرمایش پوری نہ ہونے پر دھرنے کی دھمکی دینے لگے ہیں۔ دھرنا پاکستان کی جدید تاریخ میں جماعت اسلامی بلکہ صحیح لفظوں میں قاضی حسین احمد صاحب نے متعارف کرا یا۔ قاضی کے دھرنے نہ صرف مشہور ہوئے بلکہ انھوں نے ملک کی سیاست کا رخ بھی موڑا۔ قاضی حسین احمد صاحب کی قیادت میں سب سے مشہور دھرنا اسلام آباد میں بے نظیر حکومت میں دیا تھا۔ جس میں جماعت اسلامی کے چار کارکنوں کی شہادت ہوئی ۔ خود قاضی صاحب بھی حکومتی تشدد کا شکار ہوئے۔ اس کے نتیجے میں بے نظیر صاحبہ کی حکومت تو ختم ہو گئی لیکن پھر نواز شریف کے ہاتھ آئی اور نواز شریف صاحب وزیر اعظم بن گئے۔ قاضی حسین احمد اپنے دونوں ادوار میں اس احتجاجی سیاست کا حصہ بنے رہے۔ اور انھوں نے ایم ایم اے کا اتحاد بنا کر سیاسی طور پر کامیابی بھی حاصل کی ۔

جماعت اسلامی کے موجودہ امیر سید منور حسن کا مزاج قاضی صاحب جیسا تو نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے موقف کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے آنے کے بعد جماعت کے ریلی ، لانگ مارچ ، ملین مارچ، اور دھرنوں میں کمی آئی ہے۔ 5 دسمبر 2010 کو جماعت اسلامی نے پارلیمنٹ ہاوس اسلام آباد کے سامنے چھ گھنٹے تک دھرنا دیا تھا، اس موقع پر کارکنوں میں خشک چنے کے پیکٹ تقسیم کئے گئے۔ اسلام آباد پولیس نے ریڈ زون کو مکمل طور پر سیل کر دیا تھا۔ دھرنا کے پنڈال کے چاروں طرف خاردار تاریں

لگادیں۔ شرکاء کو واک تھرو گیٹ سے گزارا گیا تھا اور پولیس کی بھاری نفری دھرنا کے پنڈال کے ارد گرد حفاظتی فرائض انجام دیتی رہی جماعت کا یہ ایک پرامن دھرنا تھا۔ سید منور حسن نے ریمنڈ ڈیوس کی رہائی سے قبل حکومت کے خلاف 25 فروری کو مزنگ چوک میں احتجاجی دھرنا دیا تھا۔ ان کی تمام جدوجہد کا مرکز پاک امریکا تعلقات کے خاتمے اور امریکہ اور آئی ایم ایف کی غلامی سے بھی نجات کے لئے ہے۔

اب ہمارے یہاں دھرنا سیاست مقبولیت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔اس لئے ہر طرف دھرنا دھرنا نظر آتا ہے۔ اس دھرنے میں بھی عوام ہی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاہراہیں بند ہوجانے سے مسافر پریشان ہوتے ہیں۔ اور بھوک پیاس اور دیگر مسائل جنم لینے لگتے ہیں۔ کراچی اور سندھ ان دھرنوں کا خصوصی مرکز ہیں۔ گذشتہ دنوں لیڈی ہیلتھ ورکرز کی طرف سے دوبار قومی شاہراہ پر دھرنا دیا گیا۔ جس میں ق لیگ کی ممبر قومی اسمبلی ماروی میمن، مختلف سیاسی و سماجی رہنماوں ،لیڈی ہیلتھ ورکرز سمیت 700 افراد کے خلاف دہشت گردی ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کرلیا گیا ہے۔ میہڑ میں بیج، کھاد، راشن اور خیمے نہ ملنے کے خلاف 20 سے زائد دیہات کے سیکڑوں سیلاب متاثرین نے قومی شاہراہ کے مختلف مقامات پر 3 گھنٹے دھرنا دیا، شاہ لطیف یونیورسٹی خیرپور اور زرعی یونیورسٹی ٹنڈوجام کے ملازمین نے ریٹائرڈ افسران کو ہٹانے اور دیگر مطالبات

کے حق میں ہڑتال کی اور وائس چانسلر آفس کے سامنے دھرنا دیا۔ جیو نیوز کے رپورٹر ولی خان بابر کے بہیمانہ قتل پر کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی کوئٹہ اور اندرون سندھ سمیت ملک بھر میں صحافیوں نے یوم سیاہ مناتے ہوئے دھرنے دیئے۔ جئے سندھ محاذ کی جانب سے سیلاب سے متاثرہ علاقوں کی تعمیر نو کے لیے حیدرآباد میں گل سینٹر سے پریس کلب تک احتجاجی ریلی اور دھرنا دیا گیا۔ ' مرکزی جمعیت علماء پاکستان حیدرآباد کی جانب سے مہنگائی کے خلاف پریس کلب حیدرآباد پر احتجاجی دھرنا دیا گیا تھا۔ دھرنا سیاسی جماعتوں ہی میں نہیں بلکہ معاشرے کے تمام طبقات میں مقبول ہے۔ کچھ عرصہ قبل فنڈز کے اجراء کے حوالے سے سرکاری جامعات کے وائس چانسلرز اور وفاقی وزیر خزانہ ڈاکٹر حفیظ شیخ کے درمیان ہونے والے مذاکرات ناکام ہوگئے تو وزیر خزانہ نے نئی اسکالرشپس بند کرنے اور سرکاری جامعات کو فنڈز دینے سے انکار کردیا اس موقع پر وائس چانسلرز کی کمیٹی نے حکومت کو دھمکی دی کہ اگر فنڈز کا اجراء بند ہوا تو تمام سرکاری جامعات کو تالے لگا کر شاہراہ دستور پر دھرنا دیا جائے گا۔ صحافی اور میڈیا والے بھی اب اپنے مطالبات کے لئے دھرنا دیتے ہیں۔ ان کے خلاف معاشرے کے بااثر طبقات اور سیاسی جماعتیں بھی دھرنا سیاست کرتی ہیں۔ جیو اور جنگ کے خلاف بھی ایک ایسا دھرنا دیا گیا جس میں سیاسی جماعتوں کی پشت پناہی تھی۔ ٹیلیوژن چینلز کے مالکان کی تنظیم پاکستان براڈ کاسٹرز ایسوسی ایشن نے جیو نیٹ ورک کے دفتر اور صحافیوں کو ہراساں کرنے پر سخت

مذمت کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ جیو کے دفتر کے سامنے دھرنے میں شامل سیاسی جماعت کے عہدیداروں کی بازپرس کی جائے اور ایسے واقعات کی روک تھام کیلئے اقدامات کئے جائیں۔پاکستان کے شورش زدہ علاقے مالاکنڈ میں فوجی آپریشن کی وجہ سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں کی سندھ آمد کے خلاف سندھی قوم پرست جماعتوں نے پنجاب سندھ سرحد کے قریب دھرنا دیا تھا۔ دھرنے کی قیادت سندھ ترقی پسند پارٹی کے رہنمائی ڈاکٹر قادر مگسی نے کی تھی۔

کراچی کے عوام ان دنوں ایک طرف تو بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے گزر رہے ہیں تو دوسری جانب بجلی اور پانی کے لئے بلبلاتے عوام کے دھرنے ہیں جو شہر کی کسی بھی شاہراہ پر کسی وقت بھی ہو سکتے ہیں۔ کراچی کے عوام نے جمہوریت کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ وہ قومی، علاقائی، لسانی، مذہبی جماعتوں اور تنظیموں کے ان دھرنوں میں حصہ لیتے ہیں اور انھیں کامیابی سے ہمکنار کرتے ہیں۔پرویز مشرف کے جانے کے بعد پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی اور ججوں کی بحالی کا وعدہ پورا نہ ہوا تو سب سے پہلے 28 اگست 2008 کو کراچی کے ایم اے جناح روڈ پر وکلاء کی جانب سے دو گھنٹے کا دھرنا دیا گیا۔ صدر آصف زرداری کے خلاف ملک میں ہونے والا یہ پہلا دھرنا تھا۔ جس کے بعد تحریک چلی اور ججوں کی بحالی ہوئی۔ کراچی میں یوم عاشور پر بم دھماکے میں ہلاکتوں کے بعد بھی یہاں دھرنا دیا گیا۔ ضیا الحق کے دور میں عشر کے مسئلے پر بھی شعیہ

برادری کی جانب سے ایم اے جناح روڈ پر کئی گھنٹوں کا دھرنا دیا گیا تھا۔

اب کراچی پر ایک بار پھر ساری دنیا کی نظریں ہیں۔ ناٹو فورسز کی سپلائی لائین کو روکنے کے لئے تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے 21 اور 22 مئی 2011ء کو کراچی میں ڈرون حملے روکنے کے لئے جس دھرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس دھرنے کے اعلان نے حکمرانوں اور عوام کو اضطراب سے دوچار کردیا ہے۔ ڈرون حملے سرحد اور وزیرستان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔ احتجاج بھی وہیں ہوتا ہے۔ لیکن کراچی جیسے شہر میں یہ پہلا موقع ہے کہ ان حملوں پر اتنا بڑا قدم اٹھایا جارہا ہے۔ عوام عمران خان کو پسند کرتے ہیں۔ اور پشاور کے بعد کراچی کے اس دھرنے کو کامیاب بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کو آزاد ملک کے طور پر قائم رکھنے کی خواہش رکھنے والا ہر فرد اس دھرنے پر نظریں گاڑھے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان پیپلزپارٹی اور اس کے اتحادیوں بشمول اپوزیشن اور دینی سیاسی جماعتوں کو یہ احساس بھی ہونا چاہئے کہ عمران خان صحیح رخ پر کام کررہے ہیں اور وہ غیرت مندی کا مظاہرہ کررہے ہیں کہ پاکستان کی خودمختاری کی نفی کرنے والے ملک کے خلاف عوامی آواز اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ ن عمران خان سے خوش نہیں ہے۔ اس کا اظہار قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف چوہدری نثار خان کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں انھوں

نے خفیہ ایجنسیوں پر سیاست میں ملوث ہونے کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا تھا کہ سیاسی جماعتوں کے اتحاد اور دھرنے میں خفیہ ایجنسیاں ملوث ہیں اور وہ اس حوالے سے پارلیمنٹ کو تمام ثبوت فراہم کرنے کیلئے تیار ہیں، عمران خان نے پشاور میں ڈرون حملوں کے خلاف دھرنے کے بعد کم و بیش اپنی دس سالہ سیاسی جدوجہد میں انہیں پہلی مرتبہ عوامی سطح پر جس انداز سے پذیرائی ملی ہے اس پر وہ نازاں اور مسرور ہی نہیں بلکہ ملک میں بہت جلد تبدیلی لانے کے بارے میں بھی انتہائی پر عزم ہیں۔

دھرنا دینا اور اس میں شرکت کرنے کے حوالے سے مغربی دنیا میں تیاریوں کا سلسلہ کئی مہینوں پر محیط ہوتا ہے۔ وہ دھرنے کی جگہ، عوام کی ضروریات، ہنگامی حالات اور لوگوں کے تحفظ کے لئے مناسب اقدامات اور تیاریاں کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں عوام کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور عوام بھی ان دھرنوں اور ریلیوں میں فیسٹیول اور میلے ہی کی طرح شرکت کرتے ہیں۔ ایسے دھرنوں میں شرکت سے پہلے لوگوں کو ہدایات دینی چاہیئے کہ وہ اکیلے پولیس کی طرف بڑھنے کی کوشش مت کریں، ٹولیوں کی صورت میں آگے بڑھیں، اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں پوری معلومات رکھیں، ایسے لوگوں کے ساتھ جائیں جو آپکے دوست ہوں یا آپکو اچھی طرح جانتے ہوں اور آپکو کچھ ہونے کی صورت میں آپکی مدد یا خبر رکھنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ایسے جوتے پہنیں کہ آپ کو پہنے

اور دوڑنے میں آرام دہ ہوں، ایسے کپڑے پہنیں جو آپ کے جسم کو زیادہ سے زیادہ ڈھکے رکھیں اور گیس کو کھال پر لگنے سے بچائیں، اپنے ساتھ پانی اور نمک ضرور رکھیں، پینے کے لئے اور گیس کا شکار ہونے کی صورت میں منہ دھونے کے لئے پانی ضرور ساتھ رکھیں، کوشش کریں کہ دو قمیضیں پہنیں تاکہ بوقت ضرورت اوپر والی شرٹ کو اتار کر اور بھگو کر آنسو گیس کے خلاف استعمال کر سکیں، اپنے ساتھ اپنی شناختی علامات ضرور رکھیں تاکہ ایمرجنسی کی صورت میں آپ کی شناخت ہو سکے، اتنے پیسے ضرور ساتھ رکھیں کہ اپنے ساتھ دو تین لوگوں کے کھانے پینے اور فون کا خرچہ پورا کر سکیں، گھڑی، کیمرہ، کاغذ پینسل ہمراہ رکھیں تاکہ اہم معلومات کو ریکارڈ کر سکیں، اگر آپ سانس، شوگر یا کسی اور مرض میں مبتلا ہیں تو انہیلر، انسولین اور مطلوبہ ادویات ساتھ رکھیں، کوئی ایسی چیز نا پہنیں جسکی وجہ سے آپ یا وہ چیز آسانی سے گرفت میں آ سکے، مثلاً زیورات، کھلے بال، ٹائی، کانوں کے لٹکتے ہوئے بندے وغیرہ، کھانے پینے کا پورا خیال رکھیں تاکہ لمبے وقت تک احتجاج کا حصہ بن سکیں، اگر لمبے وقت کا احتجاج ہے تو نیند ضرور حاصل کریں۔ ہمارے یہاں ہجوم میں دہشت گردی کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ جس کا بھی انتظام ضروری ہے۔ اس دھرنے کی ضرورت کے بارے میں عمران خان کا کہنا ہے کہ دہشت گردی کیخلاف جنگ سے پاکستان کو 70 ارب ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے جبکہ ان سے کئی ہزار انسانی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ ان کے نزدیک دہشت گردی کے خلاف جنگ پاکستان کی اپنی جنگ نہیں

ہے۔ان کا کہنا ہے کہ تحریک انصاف ہی عوام کو انصاف دلائے گی کیونکہ اسٹیبلشمنٹ کی پیدا کردہ جماعتیں یہ کام نہیں کر سکتی۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں بڑی سیاسی جماعتیں دور کھڑی تماشا دیکھ رہی ہیں اگر یہ جماعتیں دھرنا دیں تو 72 گھنٹوں میں ڈرون حملے ختم ہو سکتے ہیں۔

انتخابی دنگل سج گیا

ملک میں الیکشن کا دنگل سج گیا ہے۔ بڑے بڑے ہیوی ویٹ سیاسی پہلوان اکھاڑے میں اتر گئے ہیں، اور ہر طرف بلے بلے، آوے ہی آوے کی للکار سنائی دے رہی ہے۔ جلسے ،جلوسوں، ریلیوں کی بہار ہے۔ ایک دنگل ہر شام کو ٹی وی چینلز پر بھی سجتا ہے، جس میں بڑھکیں، للکار، چیلنج، جوش ولولے، کا اظہار زبانی ہوتا ہے۔ جلسوں میں بھی اوے جاگیر دارا کی للکار سنائی دے رہی ہے۔ ٹی وی چینیل اپنی مہارت کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیمرہ ٹرک، کرینیں، اسٹار کل، جلسوں کی کوریج کے لئے استعمال کی جارہی ہے۔ گلی محلوں، میں انتخابی مہیم کے نعرے نہ سنائی دیں، لیکن شوشل میڈیا پر ہر طرح کا نعرہ اور تبصرہ موجود ہے۔ کارٹون میں ہر ایک پر پھبتی کسی جارہی ہے۔ ماہرین ہر روز اخبارات میں نئے تجزیئے پیش کر رہے ہیں۔ پھر جمہوریت کے ایسے دشمن بھی ہیں جو ہر روز امیدواروں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ جاری ہے، بم دھماکے ہو رہے ہیں، انتخابی دفاتر کو نشانہ بنایا جارہا ہے، لیکن ہم پاکستانی ہیں ہم تو جیتیں گے۔کا نعرہ لگا کر نوجوان ہلے گلے میں بھی مصروف ہیں۔ موزانہ ہورہا ہے کہ کس کی ریلی کامیاب ہے مقابلہ ہے کہ کون سب سے زیادہ بلند و بانگ دعوے سے عوام کا دل جیت پایا ہے اور بے چارے عوام سوچ رہے ہیں کہ کس طرف جائیں اور کس طرف نہ جا ئیں۔پر کشش دعوے، دل پر اثر کرنے والے نعرے، نئ نئ آفرز کا لالچ عوام کو لبھا نے میں مصروف ہے۔ منشور

کے نام پر پھر دلفریب وعدے ہیں۔ کوئی دعوہ کر رہا ہے کہ ہمارا ساتھ دیں فائدے میں رہیں گے ۔ کسی پارٹی کا بیان ہے لوڈ شیڈنگ کے خاتمے کے ساتھ روزگار فری کسی کا پیکج ہے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا روٹی کپڑا مکان ہم ہی دیں گے۔ کوئی تعلیم ، صحت ، مکان اور مہنگائی سے بے فکر ہو جانے کی دھائی دے رہا ہے۔ پیشہ ور سیاست دان چیخ، چیخ کر جلسوں میں عوام کو اپنی صفائی و دیانت کے قصے سنا رہے ہیں۔ کئی لیڈروں کو اپنی سیاسی صلاحیتوں پر بہت اعتماد اور غرور ہے قوم کا غم ابھیں مارے ڈال رہا ہے جو حکو مت میں ہیں وہ تو عوام کو کوئی ریلیف نہ دے سکیں اور جو اپوزیشن ہیں میں وہ بھی لو ڈ شیڈنگ ، کرپشن ، دہشت گردی ، مہنگائی کے خلاف ریلیاں نکال کر عوام کے سامنے مظلومیت کا ناٹک کر رہی ہیں ایک کے بعد ایک سیاسی جلوس جلسے نکل رہے ہیں الیکشن سے پہلے ایک نئے سیاسی دنگل کا اہتمام ہے۔ دوسری جانب عوام منگائی سے بلبلہ رہے ہیں۔ فیصلہ نہیں کر پا رہے کہ کون دوست اور کون دشمن ہے۔ انقلاب سرخ اور سبز کے بجائے ، ایک نعرہ ہے۔ جو سب لگا رہے ہیں لیکن کسی کو نہ اس کے معنی پتہ ہیں نہ اس کی روح سے واقف ہیں۔ نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فارغ ہو کر جب یہ نوجوان نوکریوں کی تلاش میں نکلتے ہیں تو نو ویکنسی کا بورڈ ان کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے قوم کے ان ہونہاروں کی بے بسی افسوس ناک ہے۔ پرچی سفارش نے ان کی امیدوں کے چراغ گل کر دیئے ہیں۔ نوجوان گلوکار پاکستان کی منفی سیاست اور معاشرے میں دن بدن پھیلتی برائیوں ، محرومیوں اور مجبوریوں سے بے زار عوام کے لیے گانوں میں دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ سیاست اور سیاست دان

سے عوامی بے زاری اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن پھر بات وہیں پر اٹک جاتی ہے کہ جائیں کہاں کس کا ساتھ دیں حکومت سے نالاں ہیں تو دوسری جانب بھی تو وہی لوگ ہیں ایک چہرے پر کئی چہرے لگائے ہوئے لوگ اب یہ مومن کیا کرے کہ ایک بار ڈسنے کے بعد بھی ڈسوانے کو دوسرا سوراخ نظر نہیں آتا کہاں سے لائیں ایسا لیڈر جو قوم کو قائداعظم، مہاتیر یا طیب اردگان بن کر ان مشکلوں سے خلاصی دلا سکیں ایسا لیڈر جو خوش نما لباسوں اور شاندار محلوں میں رہنے کے بجائے عوام کی فکر کرے جو حرام مال کھا کر اپنی قوم کو بھی حرام مال کھانے کی عادت نہ ڈالے جو اپنی علم وذہانت مکر وفریب اور سازشوں کیلئے، عقل و فکر کو شرارت کیلئے، دولت کو ایمان خریدنے کیلئے اور حکومت کو ظلم و جبر کے لیے کیلئے استعمال نہ کرے۔ جو عوام کیلئے ترقی کرنے کے تمام راستوں پر رشوت، جھوٹ، خوشامد اور سازش کے کانٹے نہ بچھا دے۔

سڑکوں اور شاراہوں پر بڑے بڑے ہورڈنگ، بینرز، وال چاکنگ، فیلکسز کی صورت میں چہرہ شناسی اور اعتماد سازی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ کئی سیاسی و مذہبی جماعتیں میدان میں باقاعدہ ا±تر چکی ہیں اور جلسوں کے ذریعے عوامی رابطہ مہم بھی شروع کر چکے ہیں، لیکن اب بھی عوام شکوک و شبہات کا شکار ہیں،۔بڑھتی ہوئی دہشت گردی نے سوال اٹھا دیا ہے کہ الیکشن ہوں گے یا نہیں ایکشن کے التوااور موجودہ سیٹ اپ جاری رکھنے کی باتیں بھی کئی زبانوں سے جاری ہیں۔ اس حوالے سے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ مارچ میں حکومت کی مدت تمام ہونے کے بعد نگران سیٹ اپ لمبی مدت کیلئے ہو سکتا ہے۔

سیاست دان اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ الیکشن ہو جے چاہیئے اور شیڈول کے مطابق ہوں۔ اسی لئے الیکشن کی تیاریاں عروج پر ہیں، ملکی مخدوش امن و امان کی صورتحال، جنوبی پنجاب صوبہ کی مہم اور دیگر نئے نئے چیلنجز کو دیکھ کر کئی ایسی پیشن گوئی بھی کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ منظم طریقہ سے کیا جا رہا ہے اور اس کا واحد مقصد الیکشن کا التوا کروانا ہے۔ موجودہ حالات میں عوامی مہم کسی بھی جماعت کے لئے چلانا کو جلسے کرنا مشکل ہے تو ان کے پاس شہید بھٹو خاندان کے PPP ممکن نہیں رہا۔ تقریروں کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کے ناقدین موجودہ حکومت کی پالیسیوں پر سخت نالاں ہیں۔ لیکن وہ بھی کوئی ایسی بھرپور مہم چلانے سے قاصر ہیں کہ عوام کو وہ آئینہ نہ دکھا سکیں جو دکھانا چاہتے ہیں۔ پنجاب میں نگراں سیٹ اپ کے بعد باقاعدہ طور پر انتخابی مہم شروع ہو چکی ہے۔ اب کارنر میٹنگز سجیں گی۔ ووٹرز کی آؤ بھگت ہوگی۔ ناراض ووٹرز کی منتیں ترلے کیے جائیں گے اور جوں جوں پولنگ ڈے قریب آتا جائے گا فضاؤں میں ہر طرف آوے ہی آوے۔۔۔۔ جیتے گا بھئی جیتے گا۔۔۔ گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکا اور دو، اور سات ترازو تول کے ویکھو، ساڈا پلہ بھاری ہے، کے نعروں کی گونج سنائی دے گی۔

انتخابی مہم کی یہ گہما گہمی ہر ملک کے الیکشن میں ہوتی ہے۔ لیکن ایسی مارا ماری بھی کسی اور ملک میں نہیں ہوتی۔ جیسی یہاں جاری ہے۔ ووٹرز کو لبھانے، انہیں اپنے جلسوں

میں لانے اور پولنگ ڈے پر اپنے حق میں ووٹ ڈلوانے کے نت نئے طریقے اور حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ جلسوں میں کرسیاں، کھانے، اور لانے لے جانے کی سہولت مفت فراہم کی جا رہی ہے۔

سیاسی جماعتیں اس مقصد کے لیے مختلف ترغیبات کا بھی سہارا لے رہی ہیں۔ انتخابی عمل میں نسلی، لسانی، قومیت، مذہب کی بنیاد پر ووٹ مانگنا ہماری اقدار کا حصہ بن چکی ہیں جس نے انتخابی ماحول کو پراگندہ کر دیا ہے، وہیں ووٹرز کے انتخابی عمل پر اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔الیکشن میں سرمائے کا بے دریغ استعمال، نسلی، گروہی، لسانی و فرقہ وارانہ نعرے، اسلحے کی کھلے عام نمائش الیکشن کمیشن کی ہدایات اور قوانین کا مذاق اڑا رہی ہے۔ ہمارا انتخابی عمل شفاف نہیں ہے، ماضی کی داستانیں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی ، بھٹو کی دھاندلی سے لے کر مشرف کے ٹھپہ الیکشن تک سب اندیشوں کا شکار ہیں۔ 65 سالہ تاریخ میں بار بار کی فوجی مداخلت اور جمہوری حکم رانوں کے غیر جمہوری رویوں کے باعث جمہوریت صحیح معنوں میں پنپ نہیں سکی اور عام آدمی اس کے ثمرات سے محروم رہا۔

انتخابی عمل کے دوران سرمائے کی ریل پیل، برادری ازم، گروہی و لسانی تفریق اب بھی الیکشن جیتنے کے لیے اہم ہتھیار سمجھے جاتے ہیں۔ نظریاتی بنیادوں پر عوام میں جانا اور ان سے اپنی انتخابی مہم کے لیے ووٹ کی اپیل ایک خواب ہے۔ سیاسی جماعتوں کی جانب

سے ٹکٹوں کی خرید وفروخت نے عام آدمی کے لیے انتخابی اکھاڑے میں اترنا ایک خواب بنا دیا ہے۔ عام آدمی ووٹ تو ڈال سکتا ہے، سیاسی جماعتوں کے نعرے اور پوسٹرز بھی لگا سکتا ہے لیکن امیدوار بننا اور ووٹ لینا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس تمام تر صورت حال کا فائدہ معاشرے کی ان کالی بھیڑوں کو بھی ہوتا ہے جن کے پاس نہ کردار ہے اور نا ہی قابلیت، لیکن وہ اپنے سرمائے کی طاقت سے الیکشن جیت کر سیاست کو اپنے کاروبار کے فروغ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب سیاسی جماعتیں بھی نظریات اور جماعتی وابستگی سے قطع نظر ایسے امیدواروں کو ٹکٹ دینا اولین ترجیح سمجھتی ہیں جو اپنی انتخابی مہم میں وافر سرمایہ لٹانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان نے رواں سالی جو انتخابی ضابطہ اخلاق جاری کیا ہے اس کے مطابق قومی اسمبلی کا امیدوار 15 لاکھ اور صوبائی اسمبلی کا امیدوار 10 لاکھ روپے تک رقم اپنی انتخابی مہم پر خرچ کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی شرط رکھی گئی ہے کہ ہر امیدوار بینک اکاؤنٹ کھلوا کر انتخابی اخراجات کی رقم اس میں جمع کرائے گا اور وہ انتخابی مہم کے اخراجات اسی اکاؤنٹ سے ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے، یہ سب کے سامنے ہے۔ الیکشن کمیشن کے یہ ضابطہ خوش آئند دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان ضوابط پر عمل درآمد تسلی بخش دکھائی نہیں دیتا۔ ابھی سے ہی سیاسی جماعتوں نے اخراجات کی شق پر سوالات اٹھانا شروع کر دیے ہیں اور بعض جماعتوں نے تو ان شقوں کو زمینی حقائق کے منافی قرار دیا ہے۔ ہمیں جاپان سے سبق سیکھنا چاہیئے جہاں

حکومت اور اپوزیشن کی جانب سے نہ ہی بڑے بڑے اسٹیج بنائے جاتے ہیں اور نہ ہی کارکنوں کو ان جلسوں میں شرکت کا پابند کیا جاتا ہے۔ امیدوار اپنے ایک دو ساتھیوں کے ساتھ کسی چوراہے پر کھڑا ہو جاتا اور میگا فون کے ذریعے راہ چلتے لوگوں سے ووٹ کی درخواست کرتا ہے۔

دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ بھلا یہ کس طرح الیکشن جیت سکتا ہے؟ لیکن وہی شخص بعد ازاں اقتدار کی کرسی پر براجمان نظر آتا ہے۔ الیکشن والے دن نہ ہی چھٹی ہوتی ہے اور نہ ہی دیگر معمولات زندگی متاثر ہوتے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں الیکشن میں بے دریغ دولت نہیں لٹا سکتیں اور نہ ہی کوئی امیدوار اپنا بینر کسی سرکاری عمارت یا سرکاری پول پر باندھ سکتا ہے، بلکہ اس قسم کے بینر آویزاں کرنے کی روایت ہی نہیں۔

جاپان میں خفیہ طور پر سیاسی فنڈ وصول کرنا غیر قانونی سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں اپنی مہم کے اخراجات کے لیے فنڈ ریزنگ کرتی ہیں مگر جبراً نہیں بلکہ صرف پارٹی کے افراد سے یہ چندہ لیا جاتا ہے۔ البتہ بڑی بڑی ایسوسی ایشنز بھی چندہ دیتی ہیں، مگر ان کا ریکارڈ کسی طرح خفیہ نہیں ہوتا۔ ان ایسوسی ایشنز کے چندہ دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی پسندیدہ جماعت برسر اقتدار آ کر ایسی معاشی پالیسیاں ترتیب دے جن سے ان کے کاروبار کو مزید وسعت حاصل ہو سکے۔

پاکستان میں گذشتہ ایک عشرے کے دوران ہونے والی ذرائع ابلاغ کی ترقی نے کسی حد تک

لوگوں میں یہ شعور بیدار کرنے کی کوشش ہے کہ وہ اپنے ووٹ کے استعمال میں سرمائے اور برادری ازم سے قطع نظر نظریے کو معیار بنائیں۔ ان لوگوں کو ووٹ دیں جو بھلے ہی غریب ہوں لیکن آپ کے مسائل کا نہ صرف ادراک رکھتے ہوں بلکہ انہیں حل کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ماضی قریب میں کچھ ایسی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں جب غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض افراد نے غربت اور تنگ دستی کے باوجود انتخابی عمل میں حصہ لیا اور بھرپور انتخابی مہم چلائی۔ انتخابی مہم کی بات ہو اور اس میں جلسے جلوس اور ریلیوں کا ذکر نہ ہو تو بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرکے مخالفین پر اپنی طاقت کے اظہار کا فارمولا آج بھی اتنا ہی کارگر ہے جتنا ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ گذشتہ ایک عشرے سے جاری بدامنی کے باعث سیاسی جماعتوں نے خود کو عوام سے دور کرکے بڑی حد تک الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا تک محدود کر دیا ہے لیکن ان تمام خطرات کے باوجود کوئی بھی جماعت اپنی انتخابی مہم میں جلسوں کی اہمیت کو نظرانداز کرنے پر تیار نہیں۔ آج بھی پنڈال سج رہے ہیں۔ جلسوں میں لوگ شرکت بھی کر رہے ہیں اور ہر سیاسی جماعت اپنے جلسے کو دوسروں کے جلسوں سے بڑا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔

ماضی میں سیاسی جلسوں میں ایک طرف سیاسی قوت کا اظہار ہوتے تو دوسری طرف ان میں عام آدمی کی تفریح کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ کوئی قیمے والے نان کھلا کر حمایت حاصل کرنا چاہتا، تو کسی نے فی بندہ وظیفہ مقرر کر رکھا ہوتا۔ کوئی پنڈال میں حقیق

شیر لا کر لوگوں کا دل بہلاتا تو کوئی ڈھول کی تھاپ اور "بجاں تیر بجاں" جیسے نغموں کی پر کیف موسیقی سے حاضرین کا لہو گرماتا رہا ہے۔ الغرض موسیقی انتخابی جلسوں کی جان ہوا کرتی ہے۔

سیاسی جماعتیں اپنی انتخابی مہم کے لیے خصوصی گیت تیار کرواتی ہیں۔ موجودہ دور میں اس رجحان میں جدت آئی ہے۔ اب جلسوں میں سیاسی گیتوں کے بجائے انقلابی گیت گائے جاتے ہیں۔ ڈھول کی تھاپ سے زیادہ میوزیکل بینڈز اور ایکو ساؤنڈ کی مدد لی جا رہی ہے۔ وقت کے تقاضوں کو بھانپتے ہوئے مذہبی جماعتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایک سیاسی جماعت نے تو جلسے میں کارکنوں کو محظوظ کرنے کے لیے خصوصی طور پر مزاحیہ شاعری کا بندوبست کیا تھا۔ انتخابی مہم میں میڈیا کا کردار ماضی کے انتخابات سے قطع نظر اس مرتبہ رائے عامہ کی تشکیل کے لیے میڈیا اور بالخصوص سوشل میڈیا اہم کردار ادا کرنے جا رہا ہے۔ ملک کے طول و عرض تک اپنا پیغام بہ آسانی پہنچانے کے لیے یہ ایک اہم ہتھیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سیاسی جماعتیں میڈیا کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایک طرف جہاں اشتہاری مہم کے ذریعے سیاسی راہ نماؤں کی امیج بلڈنگ کی جا رہی ہے وہیں دوسری طرف سوشل میڈیا کے لیے نوجوان بھی بھرتی کیے جا رہے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کی جانب سے خصوصی طور میڈیا سیل قائم کیے گئے ہیں جو میڈیا پر اپنا

پیغام زیادہ سے زیادہ پھیلانے اور مخالفین کو اپنی طرف راغب کرنے کی تگ ودو میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف ہیں۔ ماضی کے برعکس اس مرتبہ امیدواروں کو اپنی مہم میں بہت زیادہ احتیاط کرنا ہوگی، کیوں کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر جملہ نہ صرف کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو کر دنیا تک پہنچ رہا ہوگا بلکہ بالفرض اگر کبھی وہ اپنی بات سے مکر گئے تو ویڈیو ان کے خلاف بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ ہماری سیاست میں کارکنوں کی آپس کی لڑائیاں، کھانے پر جھپٹنا، اسلحے کی نمائش، سیاسی راہ نماؤں کے مخالف امیدواروں پر ذاتی حملے ہماری انتخابی سرگرمیوں کا معمول ہیں۔ ہم سے اچھے تو بھارت والے ہیں جو انتخابی مہم لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بولی وڈ اور کرکٹ سپر اسٹارز کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ گذشتہ انتخابات میں لوگوں کو محظوظ کرنے کے لیے شاہ رخ خان کے دل کش ڈانس اور عامر خان کی جلسوں میں شرکت نے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ہمارے یہاں مسلم لیگ ق نے منشور کا اعلان کرتے ہوئے مجرا کرایا تھا، جو چوہدری برادران کے گلے پڑ گیا۔ بھارت میں انتخابی نشان قرار دیے جانے والے جانوروں کو جلوسوں میں لے کر چلنے اور انھیں پنڈال میں لانے کا رواج بھی رہا ہے، مگر اب ایسا کرنے پر پابندی عاید کردی گئی ہے اس بار الیکشن میں نئی نئی اصطلاحیں استعمال ہو رہی ہیں۔ ان میں عمران خان کا سونامی اور ایک بال سے دو وکٹیں لینے کے دعوے شامل ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کپتان اب تک کرکٹ کی دنیا سے باہر نہیں نکلا۔ پیپلز پارٹی نے لفظوں کے مفہوم کو ہی تبدیل کر دیا ہے۔

پیپلزپارٹی کی جانب سے وزیراعظم راجہ پرویز اشرف نے چور کی اصطلاح کو عام کیا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اسلام آباد کی

ایک تقریب میں اپنے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ چور چور کے نعرے نے سب کو چور بنا دیا ہے۔ ان کی اس تقریر کے بعد ہر طرف چور کے محاوروں اور نغموں کی بہار آ گئی ہے۔ اور "چور مچائے شور" کا محاورہ بھی عام ہو گیا ہے۔ موجودہ حالات میں عوام خوف کا شکار ہیں، خیال ہے کہ ووٹنگ کا تناسب کم رہے گا، اللہ یہ انتخابات خیریت سے کرا دے، تاکہ ملک کے عوام خوشیاں اور پر امن انداز میں تبدیلی لا سکیں۔ سیاسی جماعتوں نے ٹکٹوں کی بندر بانٹ جس انداز سے کی ہے اس نے لوگوں کو مایوس کیا ہے اور وہ تبدیلی سے مایوس ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ملک پر چند سو سرمایہ دار جاگیردار خاندانی الیکشن باز ہی مسلط رہیں گے۔ یورپی جمہوری ممالک میں ہر سیاسی جماعت کے ٹکٹ کا فیصلہ ہر حلقہ کے پارٹی کارکن کثرت رائے سے کرتے ہیں، بے شک وہ کوئی عام آدمی ہو۔ لیکن پاکستان میں ہر بڑی سیاسی و مذہبی سیاسی جماعت پر ایک ہی سیاسی خاندان کا آمرانہ قبضہ ہے۔ ان سیاسی آمروں نے ہر حلقہ پر ایک موروثی سیاسی الیکشن باز خاندان کا قبضہ کروایا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ کسی عام کارکن کو ٹکٹ مل ہی نہیں سکتا۔ یہ کہاں کی جمہوریت ہے؟ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمیں اب بھی اسی جمہوریت سے سابقہ ہے، جس کا نعرہ ہے کہ جمہوریت عوام سے بدترین انتقام ہے۔

خونی الیکشن یا۔۔۔۔۔۔۔؟

پاکستان میں عام انتخابات کے انعقاد میں اب چند دن رہ گئے ہیں۔الیکشن کی ہمہ ہمی اور رنگارنگی کے بجائے کراچی سوگوار ہے، بم دھماکوں کی گونج سے ہر شخص سہما ہوا ہے۔ کراچی میدان جنگ بنا ہوا ہے، اس شہر میں برسوں سے جاری ٹارگٹ کلنگ کے نہ تھمنے والے سلسلے میں اب تیزی آگئی ہے۔ سرشام لوگ گھروں میں محصور دکھائی دیتے ہیں، پے در پے دھماکے اور اس کے بعد یوم سوگ نے عام آدمی کو ایک خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ حکومت میں پانچ سال گذارنے والے بھی اب نگراں حکومت سے تحفظ کا مطالبہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کراچی میں امن و امان کے بارے میں سپریم کورٹ کے خدشات اب کھل کر سامنے آگئے ہیں۔الیکشن میں حصہ لینے والے امیدوار اب صرف ملاقاتوں تک محدود ہیں۔ کراچی اور حیدرآباد میں فائرنگ کے سلسلے بھی شروع ہوگئے ہیں۔ جن میں ایم کیو ایم ،پی پی پی اور اے این پی نشانہ بن رہی ہے۔ تحریک طالبان اس کی ذمہ داری بھی قبول کر رہی ہے اور ان جماعتوں کو نشانہ بنانے کا اظہار بھی کر رہی ہے۔ کراچی اور سندھ میں سلامتی اور امنِ عامہ کی صورت حال کے بارے میں سکیورٹی اہلکاروں کے بیانات اور سیاسی حلقوں کے موقف میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔کچھ کہتے ہیں کہ کراچی میں ہر طرف امن ہے اور یہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ لوگ بے خوف اپنے گھروں سے باہر نکل رہے ہیں اور ایسا صرف

اس لیے ہے کہ پاکستان رینجرز نے دہشت گردوں کے خلاف کئی کامیاب آپریشن کیے ہیں۔ رینجرز کے ڈائریکٹر جنرل سندھ میجر جنرل رضوان اختر اس موقف کے حامی ہیں۔ گو رینجرز اہلکار روز ہی کوئی نہ کوئی آپریشن کر رہے ہیں، اور اس میں ان کو نقصان کا سامنا ہے۔ ابھی چند دن قبل حیدرآباد میں ان کی ایک چوکی پر حملہ ہوا، جس میں ایک سپاہی شہید ہوا، گزشتہ دو ہفتوں ہیں کراچی حیدرآباد میں فائرنگ، دھماکوں سے مرنے والوں کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہوچکی ہے۔ سیاسی مہم کے آغاز سے ہی کراچی گرم ہے، کراچی میں تحریک انصاف، متحدہ قومی موومنٹ پی پی پی، اے این پی اور جماعت اسلامی کے دفاتر، ریلی، کارنر میٹنگ اور جلسوں پر حملے ہو چکے ہیں اور پچھلے چند روز کے دوران کئی افراد سیاسی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ شہر میں کہیں نہیں لگتا کہ ملک میں عام انتخابات اتنے قریب آ چکے ہیں۔ نہ کوئی جلسے جلوس نظر آتے ہیں، ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی، اے این پی، تحریک انصاف، جماعت اسلامی کے جھنڈے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سے انتخابات کے بخار کا پتہ نہیں چلتا۔

کراچی میں کون جیتے گا ؟ کوئی اس سوال کا جواب نہیں دیتا، ؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب دینے سے عموماً سب کتراتے ہیں۔ اس سوال کی گونج ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ گھروں اور نجی محفلوں میں سیاسی تبصرے ہوتے ہیں۔ لیکن سیٹوں کی تعداد کوئی نہیں بتاتا، کیا کراچی میں ایم کیو ایم اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھے گی؟ اس بارے

میں سکہ بند تجزیہ نگار بھی رائے دیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ بظاہر کراچی کے مینڈیٹ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی ،الطاف بھائی کی تصاویر ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ اس تصویر کا جادو اس شہر پر برسہا برس سے چل رہا ہے۔ اور ابھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ ایسا ہے جس پر لب کشائی نہیں کی جاتی۔ سب کچھ جاننے والے بھی، اور نہ جاننے والے تو کسی شمار قطار میں ہیں ہی نہیں۔ بہت سے معتبر حلقے حقائق سے آگاہ ہیں۔ لیکن شائد صاف صاف بات کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ کراچی پولیس کا بھی کہنا ہے کہ وہ کراچی کے ہر علاقے تک رسائی نہیں رکھتی۔ یہ بات پولیس کی طرف سے الیکشن کمیشن کو ایک خط میں لکھی گئی ہے۔ رینجرز بھی محدود نوعیت کا آپریشن کر رہی ہے۔ ایسے میں فوج اگر کراچی میں آئی اور حساس علاقوں میں فوج تعینات ہوئی تو حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ اس بارے میں متضاد باتیں کہی جاتی ہیں کچھ اسے کراچی کے لئے نیک فال اور کچھ اسے کراچی میں مزید خرابی سے تعبیر کرتے ہیں۔
کراچی کے بارے میں کوئی بھی پولیس اہلکار کوئی بات ریکارڈ پر لانے کو تیار ہے، کراچی میں پولیس نے اس بارے میں بہت بھاری قیمت چکائی ہے۔ کراچی میں دہشت گردی کے واقعات عام ہیں۔ رینجرز کی شکایت ان علاقوں کے بارے میں ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ طالبان کا قبضہ ہے۔ کون کس کی پشت پناہی کر رہا ہے، یہ بھی صاف نظر آتا ہے۔
سیاسی جماعتیں کم از کم یہی کہتی ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار کا کہنا ہے کہ تقریباً ہر سیاسی جماعت کی پشت پناہی کوئی جرائم پیشہ گروہ کر رہا ہے۔ رینجرز کی طرف سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے

کہ جب وہ اغوا برائے تاوان کے مجرموں کو پکڑنے کے لیے کہیں آپریشن کرتے ہیں، تو کسی ملزم کے مرنے پر سیاسی جماعتوں کے حامی جلوس کیوں نکالتے ہیں۔ پچھلے دنوں لیاری میں شہر کے ایک تاجر کے اغوا کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا۔کچھ حلقے یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ایم کیو ایم کی نشستیں کم ہو جائیں گی۔ تحریک انصاف، مسلم لیگ نون، جماعت اسلامی، اور مسلم لیگ کیو ایسی ہی امیدوں کے سہارے الیکشن کمپین چلا رہی ہیں۔ ڈیفینس کی ایک سیٹ این اے ۲۵۰ ایسی ہی ایک نشت ہے۔ جس پر تحریک انصاف کے عارف علوی، جماعت اسلامی کے سابق میئر نعمت اللہ خان، ایم کیو ایم کی خوش بخت شجاعت، اور مسلم لیگ کیو کے کامران ٹیسوری سب ہی جیت کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں کوئی حتمی طور پر نہیں کہتا کہ الیکشن کے دن کیا ووٹر ووٹ ڈالنے کے لئے گھر سے نکلے گا؟ کراچی کے لئے یہ سوال بہت اہم ہے۔ خوف نے ہر کو اس دن سے ڈرا دیا ہے۔ کیا سیاسی جماعتیں اسے خوف کو ووٹر کے دل سے دور کرنے میں کامیاب ہوں گی۔ دہشت گردی کا الزام ہر ایک ہر سیاسی جماعت پر لگاتا ہے۔کچھ اس کے لئے مذہبی انتہا پسند قوت کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں تو کچھ ایم کیو ایم، پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کے بارے میں ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں پیپلز پارٹی نیشنل عوامی پارٹی اور ایم کیو ایم جس طور پر دہشت گردی کا شکار ہوئیں ہیں۔ اس کی ، وجہ سے ایم کیو ایم کو بھی اپنا خواتین کا جلسہ ملتوی کرنا پڑا۔ شہر میں اسلحہ بارود کی بہت زیادہ دستیابی اور جس طرح اب تک فوج نے اپنی غیر حاضری سے غیر یقینی کی حالت کو تقویت دی ہے، یہ عوامل اس

خدشے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کراچی میں آئندہ انتخاباتؑ پرامن نہیں ہوں گے۔
طویل عرصے بعد کراچی کے ان علاقوں میں جہاں متحدہ کی اکثریت تصور کی جاتی ہے، پیپلز پارٹی نے اس بار اپنی نششتوں پر سخت مقابلہ کی ٹھانی ہے۔ اس نے اپنی حکمت عملی بھی تبدیل کی ہے۔ لیاری میں دیگر سیاسی جماعتوں کا داخلہ مشکل نظر آتا ہے، یہی صورتحال ان تمام حلقوں میں ہے جہاں کسی بھی پارٹی کا ووٹ بنک زیادہ ہے۔ کراچی کے شہری اس رسہ کشی سے خائف ہیں۔ کراچی کے علاقے نارتھ کراچی میں پیپلز چورنگی کے قریب بم دھماکے میں دو افراد ہلاک اور بارہ زخمی ہوئے۔اس دھماکے نے کراچی والوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بم موٹر سائیکل میں نصب کیا گیا تھا اور دہشت گردوں کا نشانہ متحدہ قومی موومنٹ کا انتخابی دفتر تھا۔ایک ایسی جماعت جو پانچ سال تک .برسراقتدار رہی ہو، اور اب بھی نگراں حکومت اس کے اثر نفود سے دور نہ ہو، یہ حالات سب کے لئے پریشان کن ہیں۔ سابق صوبائی وزیر رضا ہارون کا کہنا تھا کہ دہشت گرد غیر قانونی ہتھیاروں اور بارود کے ساتھ گھوم رہے ہیں اور انہیں کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان سیاسی جماعتوں نے برسوں سے جاری کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا۔ایم کیو ایم کی جانب سے کراچی اور سندھ میں ان واقعات پر دو دن یوم سوگ منایا گیا۔ جبکہ ایک دن پیپلز پارٹی اور اے این پی نے سوگ منانے کی اپیل کی۔ لیکن اس کے برعکس بلوچستان ، کے پی کے جہاں تقریبا روزانہ ایسے واقعات ہورے ہیں وہاں معمولات زندگی جاری رہے۔ دہشت گردی کے خلاف وسیم اختر کا کہنا ہے کہ متحدہ نے چار سال

پہلے کراچی میں طالبانائزیشن کے خطرے کا اظہار کیا مگر حکومت نے اس پر توجہ نہیں دی اور آج صورتحال یہ ہے کہ طالبان کراچی میں اتنے مضبوط ہوگئے ہیں کہ وہ شہر کی سیکولر جماعتوں کو کھلے عام نشانہ بنا رہے ہیں۔ایم کیو ایم نے دو ہزار بارہ میں طالبان کے خلاف عوامی رائے ہموار کرنے کے لیے ایک ریفرنڈم کا اعلان بھی کیا تھا۔ یہ ریفرنڈم منعقد تو نہ ہو سکا مگر طالبان ان کے مزید مخالف ضرور ہوگئے۔رواں سال ایم کیو ایم سے تعلق رکھنے والے دو ارکان اسمبلی منظر امام اور فخر السلام کو قتل کیا گیا اور ان ہلاکتوں کی ذمہ داری پاکستانی طالبان نے قبول کی تھی۔

پاکستان میں انتخابی مہم کے آغاز سے قبل ہی پاکستانی طالبان نے ایم کیو ایم، عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کے جلسوں کو نشانہ بنانے کی باقاعدہ دھمکی جاری کی تھی اور لوگوں کو ان کے جلسوں میں شرکت سے خبردار بھی کیا تھا۔ طالبان کے ترجمان کے مطابق تینوں جماعتیں طالبان کی مخالفت کی وجہ سے ہٹ لسٹ پر ہیں۔طالبان کی جانب سے ان دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا اور کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ کے انتخابی دفتروں کے باہر بم حملوں نے جماعت کو شہر میں اپنے تمام انتخابی دفتر بند کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔ایم کیو ایم کے رہنماؤں کے مطابق وہ انتہا پسندوں کے حملوں اور دھمکیوں سے خوفزدہ تو نہیں مگر اس سلسلے میں کچھ احتیاطی تدابیر ضرور اختیار کی گئی ہیں۔ان تدابیر کی ایک مثال ایم کیو

ایم کا مرکزی دفتر نائن زیرو ہے جس کی سکیورٹی پہلے کے مقابلے میں کئی گنا بڑھا دی گئی ہے۔ نائن زیرو جانے کے لیے پتھر کے بیریئرز اور آہنی رکاوٹوں کے کم از کم تین ناکوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں متعین محافظ وائرلیس سیٹ اور اسلحہ سے لیس ہیں۔ مرکزی دفتر تک جانے والی تمام گلیوں پر آہنی بیریئرز لگے ہیں جبکہ ہر گاڑی اور ہر شخص کی تلاشی لازمی لی جاتی ہے۔ایم کیو ایم کے سینیئر رہنما فارق ستار کا کہنا ہے کہ انتہا پسند ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں انتخابی عمل سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ایم کیو ایم انتخابات میں حصہ لینے کے اپنے قانونی، آئینی اور جمہوری حق سے کبھی بھی دستبردار نہیں ہو گی۔ چند دن پہلے تک تجزیہ کاروں کی رائے یہ تھی کہ خوف و ہراس کی اس فضا میں شفاف انتخابات ممکن نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انتخابی مہم غیر متوازن ہے۔ اس وقت صوتحال یہ ہے کہ تحریک انصاف اور مسلم لیگ نواز تو کھلے عام بڑے جلسے جلوس کر رہی ہی مگر دوسری طرف اے این پی، پی پی پی اور ایم کیو ایم پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے کراچی میں ایم کیو ایم حقیقی کے رہنما آفاق احمد کی رہائش گاہ کے قریب فائرنگ میں ایک بچے سمیت دو افراد ہلاک ہو گئے تھے۔
انھیں اب تک جلسہ جلوس کی اجازت نہیں ہے۔ صوبہ سندھ کے شہر شکارپور میں نیشنل پیپلز پارٹی کے انتخابی امیدوار ڈاکٹر ابراہیم جتوئی پر بھی خودکش حملے ہوئے ہیں۔ جس میں خودکش بمبار ہلاک اور دو افراد زخمی ہو گئے ہیں۔ ابراہیم جتوئی اپنے گاوں سے شکارپور آرہے تھے کہ ٹول پلازہ کے قریب موٹر سائیکل سوار حملہ آور ان کی گاڑی سے ٹکرایا

جس میں ڈاکٹر ابراہیم محفوظ رہے ہیں انہیں معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ عام انتخابات میں چند دن باقی رہ گئے ہیں لیکن سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور انتخابی امیدواروں پر دہشت گردانہ حملوں کا سلسلہ تواتر سے جاری ہے۔ بلوچستان کے علاقے ڈیرہ مراد جمالی میں ہونے والے ایک بم دھماکے میں کم از کم تین افراد زخمی ہوگئے۔ یہ بم دھماکا صوبائی اسمبلی کے لیے ایک آزاد امیدوار اللہ دینو کے قافلے کے قریب ہوا۔انتخابات کی تیاریوں کے دوران دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے اور ان میں سے زیادہ تر سیاسی جماعتوں کے کارکنوں، رہنماؤں اور دیگر انتخابی امیدواروں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ منگل کو رات دیر گئے سابقہ مخلوط حکومت میں شامل تین جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی، متحدہ قومی موومنٹ اور عوامی نیشنل پارٹی کے رہنماؤں نے ایک مشترکہ نیوز کانفرنس میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ان کی جماعتوں کو دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنا کر انتخابات کے بائیکاٹ پر مجبور کیا جا رہا ہے۔تاہم ان رہنماوزں کا کہنا تھا کہ وہ انتخابات میں بھرپور حصہ لیں گے اور الیکشن کو 'ہائی جیک' کرنے کی اجازت نہیں دیں۔ بار بار یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ حملوں کا نشانہ تین جماعتیں رہی ہیں اور کالعدم تحریک طالبان پاکستان نے ان جماعتوں پر حملوں کی دھمکی دے رکھی تھی۔ لیکن ایسا نہٰں ہے کوئٹہ میں ارباب غلام علی روڈ پر نامعلوم افراد نے بلوچستان اسمبلی کے حلقے پی بی تھری سے مسلم لیگ ن کے امیدوار لشکری رئیسانی کے انتخابی دفتر پر دستی بم پھینکا جس سے چھ افراد زخمی ہوئے۔ یوں مسلم لیگ نون پر بھی حملے ہو رہے

ہیں۔ لشکری رئیسانی کچھ ماہ پہلے پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ نون میں شامل ہوئے ہیں۔

الیکشن کمیشن نے انتخابی امیدواروں کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کے واقعات پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ الیکشن کمیشن سے جاری ہونے والے ایک بیان کے مطابق کراچی، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں دہشت گردی کے واقعات قابل تشویش ہیں۔ الیکشن کمیشن کا کہنا ہے کہ امن امان کا قیام صوبائی حکومتوں کی بنیادی زمہ داری ہے، امیدواروں کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے کہ وہ بے خوف اپنی انتخابی مہم چلا سکیں۔ ذرائع کے مطابق الیکشن کمیشن کو اب تک صرف پنجاب سے پولنگ اسٹیشنوں کی تفصیلات ملی ہیں اور وہ بھی نامکمل ہیں۔ پنجاب سے ملنے والی فہرست میں ہر حلقے میں پولنگ اسٹیشنوں، پولنگ بوتھ اور عملے کی تعداد دی گئی ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ پولنگ اسٹیشن کہاں بنائے جائیں گے۔ الیکشن کمیشن کو باقی تین صوبوں سے پولنگ اسٹیشنوں کی تفصیلات کا انتظار ہے۔ ذرائع کے مطابق الیکشن کمیشن کو ملک بھر سے پولنگ اسٹیشن غلط مقامات پر بنائے جانے کی شکایات موصول ہو رہی ہیں۔ یہ شکایات صوبائی الیکشن کمیشنوں کو بھیج دی گئی ہیں تاکہ ان کا ازالہ کیا جاسکے۔

لیکن اس تمام تر صورتحال میں اس وقت تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے جب گزشتہ روز

آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے واشگاف الفاظ میں الیکشن گیارہ مئی کو ہونے کا اعلان کیا۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ پاکستان میں آئندہ انتخابات اور دہشت گردی کے خلاف جنگ سمیت اہم قومی امور پر جنرل کیانی نے اپنے خطاب میں فوج کا موقف بیان کرتے ہوئے یہ پیغام بھی دینے کی کوشش کی کہ ملک کو درپیش مسائل کے حل کے لیے قومی سوچ کا ادراک بھی ضروری ہے۔ تجزیہ کاروں کی رائے میں پاکستان کے موجودہ حالات میں جنرل کیانی کے بیان سے غیر یقینی کی صورت حال کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا۔ جنرل کیانی کا بروقت انتخابات کے انعقاد کے حق میں بیان انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

جنرل کیانی نے اپنی تقریر میں دو باتیں واضح کر دی ۔ایک یہ کہ انتخابات وقت پر ہو جائیں اور اس سلسلے میں جو مدد فوج کی طرف سے ہو سکتی ہے وہ اس کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ دوسرا پیغام دہشت گردوں کے لیے ہے کہ قانون اور آئین کے دائرے میں رہ کر گفت و شنید کرنا چاہتے ہیں تو بات ممکن ہے۔" جنرل کیانی نے اپنے خطاب میں واشگاف الفاظ یوں کہا کہ انتخابات وقت پر ہی ہوں گے اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیئے۔" جمہوریت کی کامیابی عوام کی خوشحالی سے منسلک ہے، انتخابات کا انعقاد بذات خود مسائل کا حتمی حل نہیں بلکہ مسائل کے حل کی جانب ایک اہم قدم ضرور ہے،

مسائل کے دیرپا حل کے لیے قومی سوچ اور امنگوں کا ادارک بھی ضروری ہے۔ ملک میں انتخابات کا انعقاد 11 مئی کو ہوگا ہمیں اس میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیئے۔" جنرل کیانی کا کہنا تھا کہ جمہوریت اور آمریت کی آنکھ مچولی کا اعصاب شکن کھیل صرف سزا اور جزا کے نظام سے نہیں بلکہ عوام کی آگاہی اور بھرپور شمولیت ہی سے ختم ہو سکتا ہے۔

متحدہ قومی موومنٹ کے قائد جناب الطاف حسین نے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی کا گزشتہ روز یوم شہداء کے موقع پر کیا جانے والا خطاب کو پوری پاکستانی قوم کے جذبات کی ترجمانیسے تعبیر کیا ہے۔ رابطہ کمیٹی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے آرمی چیف کے خطاب کا زبردست خیر مقدم کیا اور کہا کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے انتہائی اہم اور حساس قومی معاملات پر جس جرات مندی کے ساتھ اپنے موقف کا اظہار کیا ہے اس پر انہیں جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے وہ کم ہے۔ جناب الطاف حسین نے کہا کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے عملاً ثابت کردیا ہے ہ وہ ایک ایسے بہادر اور نڈر سپاہی ہیں جو دفاع وطن کیلئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔جناب الطاف حسن نے کہا کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کا خطاب پوری قوم کے دل کی آواز ہے اوران کے جراتمندانہ بیان سے قوم کو ایک نیا حوصلہ ملا ہے،اس سے شکوک وشبہات میں بڑی حدتک کمی واقع ہوئی ہے اور قوم میں اعتماد اورہمت کی ایک نئی لہر

دوڑ گئی ہے۔ جنرل کیانی نے جراتمندانہ اور دانش مندانہ موقف پیش کرکے پوری قوم کے سر فخر سے بلند کردیئے ہیں۔ پوری قوم انہیں اور ان سمیت مسلح افواج کے ایک ایک افسر اور سپاہی کو سلام پیش کرتی ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہر مقام پر کامیابی عطا کرے۔ الطاف حسین کے اس خیر مقدمی بیاں سے بھی اب خدشات کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور الیکشن سرگرمیاں جان پکڑتی نظر آرہی ہیں۔ اگرچہ میڈیا میں غضب ناک سیاسی لفاظی اور مباحث کے ساتھ ساتھ حکمران کا سیاسی شوروغوغا عروج پر ہے، لیکن عوام سیاست سے بالکل لاتعلق ہیں۔ اس ہنگامے میں عوام گہرے سکوت میں ہیں اور ایسا بے سبب نہیں۔ معاشرے کو تاراج کرنے والی سیاست اور پالیسیوں میں کروڑوں عوام کی دلخراش محرومیوں کا کوئی حل نہیں۔ درحقیقت انھوں نے اس معاشی تنزلی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ دن گئے جب معاشی ماہرین معیشت کو ترقی کی راہ پر لانے اور غربت کے خاتمے اور سماجی ترقی کی کم از کم کوشش ضرور کیا کرتے تھے۔ لیکن اس مایوسی اور پژمردگی کے عالم میں وہ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے تباہ کن نسخوں کو آنکھیں بند کیے لاگو کر رہے ہیں۔ نجکاری، ڈی ریگولیشن، ری اسٹرکچرنگ، لبرلائزیشن اور کٹوتیوں کی پالیساں سماج کو برباد کرنے والی معاشی ابتری کو حل کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کر رہی ہیں۔

دوسری جانب تمام سیاسی جماعتوں کا کردار عوام کے سامنے بے نقاب ہوچکا ہے اور کسی کے پاس بھی بڑے پیمانے پر عوامی حمایت حاصل نہیں کہ وہ اس بنیاد پر کوئی

فیصلہ کن برتری حاصل کرکے صورت حال کو اپنے حق میں کرسکے۔ کمزور فریقین کی باہمی لڑائی کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ریاست کے ایک دھڑے کی جانب سے طالبان کو کراچی پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے پروان چڑھایا جارہا ہے۔ لیکن آرمی چیف کے اعلان کے بعد سب جھاگ کی طرح بیٹھ گئے ہیں۔ جو سوات کے پی کے میں اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکے وہ پورے کراچی میں کیا کامیاب ہوں گے۔ گو کہ اس دوران خونریزی میں اضافہ ہوگا اور اس میں کمی کے امکانات نظر نہیں آرہے ہیں۔۔ انسانی جان سستی ہو چکی ہے چند ہزار کے موبائل فون کی خاطر انسان کی جان لے لی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ سب کے سامنے ہو رہا ہے۔ نگران حکومت کی پہلی ترجیح امن وامان کا قیام ہونا چاہیئے تھا۔ جس میں وہ کامیاب نظر نہیں آرہی ہے۔ رینجرز کی طرف سے
ٹارگٹڈ آپریشن بھی جاری ہے اس کے باوجود بہتری کی کوئی صورت حال نظر نہیں آرہی ہے۔ ان حالات کو اب بھی کنٹرول نہ کیا گیا تو شفاف انتخابات ایک خواب بن جائینگے۔ نگران حکومت اپنی ذمہ داریاں پوری کرے اور غیر جانبدارانہ انتخابات کیلئے ماحول ساز گار بنائے تمام امیدواروں کو سیکورٹی فراہم کی جائے اور سیاسی سرگرمیوں کو بھی مکمل سیکور کیا جائے۔ نگران حکومت نے تمام سیاسی جماعتوں سے امن وامان کے حوالے سے جو تجاویز لی ہیں۔ ان پر عمل کریں۔ جو قومی قیادت سندھ میں رہتی ہے اسکی حفاظت کیلئے فول پروف انتظامات کئے جائیں رینجرز کی طرف سے کئے جانے والے ٹارگٹڈ آپریشن میں تیزی لائی جائے اور ملزمان قوم کے سامنے لائے جائیں۔ کراچی میں نو گوایریاز کے خاتمے کے بغیر غیر جانبدارانہ الیکشن کیسے

ممکن ہے اور اس سلسلے میں بغیر کسی تفریق کے نو گو ایریاز ختم کئے جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا اور الیکشن کے دوران امن وامان خدانخواستہ قائم نہ کر سکے تو پھر اسکی تمام تر ذمہ داری نگران حکومت پر عائد ہو گی۔

کیا جدید طرز زندگی ذہنی انتشار میں اضافہ کر رہا ہے

جدید طرز زندگی اب لوگوں میں ذہنی انتشار یا انحطاط کا سبب بن رہا ہے۔برطانوی طبی تحقیق کے مطابق موبائیل، کمپیوٹر، کیمیکلز اور برقی مصنوعات قبل از وقت ذہنی انتشار اور انحطاط کا سبب ہے۔بورن ماوتھ یونیورسٹی کے پروفیسر کولن پرنچ ہارڈ مطابق اس سے شرح اموات میں اضافہ ہو رہا ہے اس کی وجہ ماحولیاتی اور معاشرے میں آنے والی تبدیلی ہے۔ تیس برس کے دوران ، موبائیل، کمپیوٹر، مائیکروویو، ٹی وی، اور مواصلاتی ذرائع میں چار فیصد اضافے سے دماغی کارکردگی بھی متاثر ہوئی ہے۔ یہ خیال بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ جدید طرز زندگی انسانی نسل میں ذہانت کو کم کر رہی ہے کیوں کہ اپنی زندگی کو حالات کے مطابق ڈھال لینے افراد اب قدرتی جینز پر زیادہ انحصار نہیں کرتے۔ اس بارے میں ایک نئی تھیوری سامنے آئی ہے۔ جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ست مگر یقینی طور پر ہماری انٹیلیکچوئل اور جذباتی صلاحیتیں زندگی آسان ہوجانے کے بعد ختم ہو رہی ہیں۔ کیلی فورنیا میں سٹیفورڈ یونیورسٹی کے ایک امریکی ڈیولپمنٹل بائیولوجسٹ پروفیسر جیرالڈ کریب ٹری کے مطابق صلاحیتوں کے حوالے سے ہمارے الٹے سفر کا آغاز ریئلٹی ٹی وی کی آمد سے بہت قبل ہوچکا تھا۔ انہیں یقین ہے کہ اس کا آغاز زراعت اور معاونتی شہری

معاشرہ کی ترقی سے ہوچکا تھا جس نے قدرتی انتخاب کی صلاحیت کو کمزور کیا۔ پروفیسر کریب ٹری کے دعوے کی بنیاد فریکوئنسی کی ایک سٹڈی پر ہے جس میں جینٹک کوڈ میں تباہ کن تبدیلی پائی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ انٹیلیکچوئل صلاحیت کے لئے 2000اور 5000 جینز کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے تخمینہ لگایا کہ گزشتہ 3000 برسوں یا20 نسلوں سے ہر شخص میں کم از کم دو جینز کم ہوجاتے ہیں جو کہ دماغ کے لئے نقصان دہ ہیں۔ جدید طرز زندگی نے انسانی سہل پسندی میں اضافہ کردیا ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کے بجائے جدید سائنس نے اپنے خود ساختہ خطرناک مفروضات کے تحت کائنات اور اس سے ملحقہ تمام عناصر کو اپنے شیطانی ذہن سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ سترہویں صدی میں حقیقت کو تلاش کرنے کا دعویٰ لے کر اٹھنے والی سائنس فطرت قدرت کی کرشمہ سازیوں تک ذہن انسانی اور آلات کے ذریعے پہنچتے پہنچتے اس پوری کائنات کو تباہ کرچکی ہے جدید صنعتی ترقیات کے ذریعے یہ ماحول، پودے، زمینی و سمندری مخلوقات، فضائی ہوا خلاء کا درجہ حرارت، فطری اور قدرتی مناظر، موسموں کی قدرتی ترتیب، حتی کہ انسان اس کے اعصاب سب شدید آلودگی کا شکار ہوچکے ہیں یہ وہ کائنات ہی نہیں یہ وہ بحر و بر ہی نہیں،اور یہ وہ ارض و سمائ ہی نہیں جو سترہویں صدی تک محفوظ و موجود تھے اور حالت فطرت میں

اپنے شاہکار حسن کے باعث توجہ کا مرکز تھے جدید سائنسی ترقی نے لاکھوں زمینی فضائی آبی مخلوقات کو ہلاک کردیا ہے سانس لینے کے لئے سائنس نے صاف فضاء باقی نہیں رکھی امریکہ میں پالروں کے ذریعے مہنگے داموں تازہ ہوا خرید کر استعمال کی جاتی ہے آسمان کی نیلاہٹ تک نظر نہیں آتی چاند اور ستارے، مٹی دھول اور صنعتی دھوئیں کی آلودگی کے باعث ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوچکے ہیں لاکھوں مخلوقات زہریلے صنعتی کیمیائی مرکبات کے ذریعے صفحہ ہستی سے مٹ چکیں دریاؤں ندی نالوں کا پانی پینے کے قابل نہیں رہا دنیا کی تاریخ میں کبھی اتنا کوڑا کرکٹ پیدا نہیں ہوا جتنا گزشتہ پچاس برسوں میں پیدا ہوا ہے ایسی ایسی بیماریاں جدید سائنس نے تخلیق کیں جسے سن کر ہوش اڑ جاتے ہیں ان بیماریوں کو پیدا کرنے کے بعد جدید مسلم مفکرین طنزاً ہمارے حکماء واطباء سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس ان بیماریوں کا کیا علاج ہے؟ تم اندھیرے میں ہو تم ترقی کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے موت تمہارے لئے تلخ مقدر ہے لیکن اعتراض کرنے والے نہیں جانتے کہ حکیم اور اس کی حکمت جس عہد کے لئے جس انسان کے لئے جس فطرت اور جس کائنات کی ضروریات کے لئے تھے نہ وہ کائنات رہی ہے نہ وہ انسان رہا ہے۔ وہ انسان مرچکا ہے اور اس کائنات کو تباہ کرنے کی تیاریاں روزافزوں ہیں، سترہویں صدی سے پہلے کی دنیا ایک حقیقی اور فطری دنیا تھی، اس عہد کا انسان فطرت سے ہم آہنگ تھا اس کی صحت فطرت سے مطابقت رکھتی تھی لہذا حکمت اس فطری کائنات اور فطری انسان کے لئے تھی جسے جدید

سائنس نے تباہ کردیا ہے۔

جدید سائنس، جدید صنعت، جدید تہذیب اور جدید معیشت تجارت، ثقافت اور علم میں انسان کہیں بھی سکون سے رہتا نظر نہیں آتا، وہ ہر وقت مصنوعی سہاروں کے سہارے زندگی بسر کر رہا ہے۔ مثلاً دنیا کی اکیس تہذیبوں کے کسی معاشرے میں قبض کا [constipation] ایک عالمگیر بیماری کے طور پر کبھی وجود نہیں رہا کیونکہ تمام تہذیبوں کے لوگ فطری زندگی گزارتے فطری غذا کھاتے فطری طریقے سے سوتے جاگتے تھی سبزی دالیں ریشے والے اناج ہر تہذیب کے دستر خوان کی مشترکہ میراث تھے للہذا نہ کبھی قبض بیماری کے طور پر متعارف ہوا نہ اسکے علاج کے لئے اربوں کھربوں روپے کی دوائیں ایجاد ہوئیں قبض کا بنیادی تعلق خوراک سے ہے اور خوراک کا تعلق طرزِ زندگی، طرز حیات اور اس مابعدالطبعیات سے ہے جس کے زیر اثر خوراک ہے جب عورت اور مرد Fast Food استعمال کی جارہی ہے۔جدید طرزِ زندگی کا تقاضہ دونوں کام پر چلے جایئں یا اگر عورت کام پر نہ جائے تب بھی اس کے طرزِ زندگی میں ٹی وی، ریڈیو، اخبار، ویڈیو، کمپیوٹر چیٹنگ، ہر وقت پیکر جمالیات نظر آنا، فون، موبائل ہوٹلوں سے روٹیاں اور کھانا منگوانا، راتوں Eating out، باہر کھانا کھانا، SMS، فون کو جاگنے کے باعث سستی کسل مندی للہذا ناشتے کا سامان بھی بازاری اشیائ پر مشتمل ہونا، مہمانداری کی روایت کے خاتمے کے باعث مہمانوں کی آمد کو بوجھ سمجھنا اور

مہمانداری بھی بازار کے کھانوں سے کرنا، گھر میں کھانا نہ پکانا اور اگر پکانے کا وقت آئے تو بازاری مصالحوں سے کام چلانا، گھر میں لیموں نمک شکر سے سکنجبین بناتے ہوئے شرمانا لیکن ملٹی نیشنل کمپنی کی جانب سے مہنگے ترین شربت "لیموں پانی" کے نام پر خریدنا، گھر میں سل بٹے پر چٹنی نہ پیسنا اور فوڈ فیکٹری بھی استعمال نہ کرنا لیکن بازار سے سے ہرے مصالحے کی چٹنیاں خریدنا، تازہ پھلوں کا شربت تیار کرنے کے بجائے بازاری شربت خریدنا جن میں کینسر پھیلانے والے رنگ اور ان شربتوں کی عمر بڑھانے والے زہر کثرت سے شامل ہوتے ہیں بھوکے بچوں کو پیٹ بھرنے کے لئے کھانا دینے کے بجائے برگر، پیزا، بلکٹ، پاپ کارن، رنگز، رنگ برنگے چپس، چیونگم، تیار شدہ [Sausages] چاکلیٹ، پیٹس، ٹاپ پاپ، نگیٹس، آئس کریم، ساسیجیز پراٹھے، پکے پکائے تیار کھانے، سوپ، تیار منجمد سبزیاں، تلی ہوئی منجمد پیاز، ملٹی نیشنل کمپنیوں کا دودھ دہی جس میں نہ خوشبو ہوتی ہے نہ بالائی زہریلے کیمیائی مادوں سے اس کی عمر طویل کردی جاتی ہے، کباب رول، نہاری، بازاری بریانی، کولڈ ڈرنکس، حلوہ پوری چھولے، سموسے، رول، پراٹھا رول، چیز بال، کنور کیوبس، ڈبوں میں بند تیار شدہ کھانے، بنے بنائے پراٹھے، تیار شدہ سربند سوپ، جیسی فضول بے کار بے ہودہ زہریلی اشیاء خوشی خوشی کھانے کے لئے مہیا کرنا جس کے نتیجے میں بہت سے بیماریاں وبا کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ جدید طرز زندگی کی حامل خواتین بیماریوں کے علاوہ وزن بھی بڑھا رہی ہیں۔ آغا خان یونیورسٹی کے

ماہانہ صحت سمپوزیم پروگرام میں ایک نشست کا موضوع تھا عورتوں مردوں کے جسم میں ہونے والے درد آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا چمکتی ہوئی گاڑیاں اور مردوں اور عورتیں کی قطاریں۔ ڈاکٹر نے حاضرین سے سوال کیا کہ آپ کے گھر میں کام کرنے والی عورتیں اور مرد کیا آپ سے بہتر غذا استعمال کرتے ہیں اور کیا آپ سے زیادہ کام کرتے ہیں بجواب تھا نہیں اس کا اگلا سوال تھا تو پھر انہیں درد کی شکایت کیوں نہیں ہوتی اس کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ آپ کے گھر کی ماسی.برتن کپڑے دھوتی ہے جھاڑو لگاتی کرتی رہتی ہے اس لیے اس کی صحت عمدہ رہتی ہے آپ Excercise ہے مسلسل مشق کے مرد ملازم بھی اسی لیے صحت مند رہتے ہیں کیوں کہ وہ آپ کی طرح نہ زیادہ کھاتے ہیں نہ زیادہ آرام کرتے ہیں وہ قدرتی مشقیں کرتے ہیں صحت مند رہتے ہیں آپ زیادہ کھاتے ہیں ایر کنڈیشنڈ میں رہتے ہیں اپنے کام خادموں سے کراتے ہیں اس لیے آپ کو درد رہتا ہے جس کو دور کرنے کے لیے آپ ہمیں بھاری معاوضے دیتے ہیں دوائیں استعمال کرتے ہیں قدرتی طرز زندگی ہی صحت کا ضامن ہے۔ یعنی اپنے کام خود کرنا کم کھانا اور کم سونا عیش و عشرت کی زندگی ترک کرکے سادہ زندگی کو مستقل اسلوب حیات بنانا۔ جدید طرز زندگی نے انسانوں کو مختلف مشروبات [Fast foods] کا کثرت سے استعمال، ٹیٹرا پیک غذاوں کی ترسیل و تقسیم، رات کو دیر سے سونا دن کو جلدی اٹھنا دیر سے کھانا، جلدی کھانا بہت کھانا، سگریٹ کا استعمال جیسے تحفے دیئے ہیں۔ ہماری درسی کتاب میں ایک عجیب و غریب سبق شامل تھا۔ جس میں ایک شخص

پیٹ میں شدید درد کی شکایت لے کر حکیم صاحب کے پاس تشریف لے گیا انھوں نے دوا دینے سے پہلے پوچھا رات کو کھانے میں کیا کھایا تھا اس نے جواب دیا جلی ہوئی روٹیاں حکیم صاحب نے سرمہ نکالا اور اسے ایک ہفتے تک لگانے کا حکم دیا " یہ ایک علامتی سبق تھا کہ اگر آپ کی آنکھ اچھی ہوں گی تو آپ دیکھ بھال کر کھانا کھائیں گے۔

جدید سائنس اور سرمایہ داری بہ ظاہر انسانوں کے خادم کے طور پر سامنے آتے ہیں مگر ان کا طریقہ واردات اتنا زبردست ہے کہ انسان کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ان سائنسی ایجادات اور اس جدید طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کے نتیجے میں ہم کن کن چیزوں سے محروم ہو جائیں گے ستر کے عشرے تک کراچی میں جگنو، مینڈک، بیر بہوٹی، کوئل اور خوبصورت پرندے نظر آتے تھے لیکن نوے کے عشرے تک یہ تمام مخلوقات کراچی کے لئے اجنبی ہو گئیں سائنس و سرمایہ داری اور جدید طرزِ زندگی اختیار کرنے کے نتیجے میں اہل کراچی نے اپنی جنت کو خوشی خوشی اپنے ہاتھوں سے تباہ کرلیا تمام درخت کاٹ دئے گئے لوہے اور سمنٹ کے جنگلات جگہ جگہ کھڑے کردئے گئے گھروں سے پودے، پھل پھول سب نکال دیے گئے جب فطری ماحول نہ رہا تو جگنو، مینڈک، کوئل، تتلی سب، رخصت ہوگئے اب ناظم کراچی نیدرلینڈ کے تعاون سے ' ماحول دوست دیواریں " تعمیر کرنے کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں جس کے تحت کراچی میں درختوں اور پودوں کی دیواریں

اٹھائی جائیں گی تاکہ شہر میں آلودگی کم ہو سکے۔ یہ درخت اور پودے سایہ دار نہیں ہیں لہٰذا سڑکوں پر بسوں کے انتظار میں کھڑے لوگوں کو اب درختوں کا سایہ اور فطرت کا سائبان میسر نہیں، تمام گھنے مقامی تن آور درخت کاٹ دیئے گئے ہیں اب اس کا متبادل شیشے اور پلاسٹک کے بنائے ہوئے سائبان اور نشست گاہیں ہیں جو سایہ مہیا کرنے سے قاصر ہیں جن کی وسعت محدود ہے جو ٹھنڈک مہیا نہیں کر سکتے ان کی مرمت دیکھ بھال پر لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں اور اشتہارات کے ذریعے ان سائبانوں کا حسن اور شہریوں کا ذوق تباہ کر دیا گیا ہے۔ ایک برگد کا درخت پچاس ساٹھ لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ لیکن اب ہم اس قدرتی ماحول سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

عصر حاضر کو بہت سے لوگوں نے انفرمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب کا زمانہ قرار دیا ہے اجتماعی ارتباط کے وسائل معاشروں پر پر امن تسلط کے لیے کارآمد ترین ہتھیار اور افکار و نظریات کی ترویج کے پیچیدہ ترین ہتھکنڈے ہیں۔ حالیہ چند عشروں کے دوران ترقی و پیشرفت کی حیرت انگیز رفتار اور انفرمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر دنیا میں ان وسائل اور آلات کی پیچیدگی اور ان کے کارآمد ہونے میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

جدید دور میں انسانی معاشرے کے پھیلاؤ نے انسانوں کے اجتماعی تعلقات کے

میدان میں ذرائع ابلاغ عامہ اور میڈیا کے وجود کو ایک ناگزیر امر بنا دیا ہے۔ ماضی میں انسانوں کو ایک دوسرے سے آمنے سامنے رابطہ ہوتا تھا اور اسی طریقے سے افکار و نظریات ایک دوسرے تک منتقل ہوتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسانی معاشرے روزانہ کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں ہے۔ لیکن یہی لوگ اپنے گھر والوں، آس پاس کے لوگوں سے دور ہیں۔ ایک کمرے میں یا کسی تقریب میں سب بیٹھے اپنے موبائیل سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے بہت کم ہی بات چیت کرتے ہیں۔ میڈیا نے جن میں ٹی وی چینل سیٹلائٹ حتی انٹرنیٹ بھی شامل ہے، معاشرے میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ جس کا اس سے پہلے کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خاندانی رشتوں میں فاصلے پیدا ہوگئے ہیں۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ جدید دور کے بہت سے دانشوروں کا کہنا ہے کہ اجتماعی رابطے کے وسائل حتی نظریہ اور سوچ کو بنانے میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ وسیع اور مختلف قسم کے اثرات کے حامل ہیں جن میں نفسیاتی سیاسی اقتصادی اور ثقافتی اثرات شامل ہیں اس کے علاوہ یہ عقائد، اقدار، سلیقوں اور کلی طور پر طرز زندگی کو بدلنے میں بھی اہم کردار کے حامل ہیں۔ آج ذرائع ابلاغ نے ثقافتی طاقت کے اثر و رسوخ کو بے حد تیزی اور تنوع بخشا ہے۔ ثقافتی طاقت، دوسروں کے جاذب نظر زندگی کے طور طریقوں کو اپنانے نے لوگوں کے مسائل میں اضافہ کر دیا ہے، خودکشی اور جرائم کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔

برطانیہ کے مشہور ماہر سماجیات انتھونی گیڈنز اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ٹیلی وژن کی ایجاد نے انسانوں کی روزمرہ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ ٹی وی پروگراموں سے متاثر ہو کر اپنا طرز زندگی اسی طرح کا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ے بہت لوگوں میں مایوسی پھیلتی ہے اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ماہرین سماجیات میڈیا کو معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ اس لیے معاشرے کا ایک فرد میڈیا کو اپنے دوست اور مشیر کے طور پر منتخب کرتا ہے اور خود اس سے بات کیے بغیر اس کی باتیں سنتا ہے۔ جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں بری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ میڈیا کی ایک اور روش ایجنڈا سیٹنگ ہے کہ جس کے تحت میڈیا تمام خبروں اور مطالب میں سے بعض مسائل کو نمایاں طور پر بیان کرتے ہیں جبکہ ممکن ہے کہ وہ حقیقت میں اتنے اہم نہ ہوں جتنا میڈیا ان کو اہم بنا رہا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ میڈیا کسی حد تک افراد کے فکری اور نظری نظام کی تشکیل میں موثر کردار کا حامل ہے۔ اور یہ فکری نظام ہی ہے کہ جو طرز زندگی کی بنیادوں کو واضح کرتا ہے۔ دوسری جانب میڈیا خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا مسلسل طرز زندگی کی تعلیم دے رہا ہے۔ یہ کہ لوگ کس طرح اپنے فارغ اوقات بسر کریں، ان کا گھر کس طرح کا ہونا چاہیے۔ انہیں کہاں دوسروں سے بات

چیت کے لیے ملاقات کرنی چاہیے اور سفر کے لیے کہاں جانا چاہیے اور کس کے ساتھ جانا چاہیے۔جدید طرز زندگی آزادی کا مطالبہ کرتا ہے؟آزادیء اظہار وہ تصور جس کی عوام دلدادہ ہے لیکن سرکاری حکام اس تصور سے نالاں و بدگمان ہیں۔تاہم ماڈرن ہونے کا مطلب اگر شراب اور شباب ہے تو قدامت پسند مذہبی طبقہ دست و گریباں ہونے کو تیار ہے۔ مسلمان معاشرے میں بھی یہ سوال اہم ہے کہ آزادی مگر کتنی، اس کی حدود کہاں تک ہوں گی۔کچھ مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی جدیدیت کی حدود از خود متعین کریں گے۔آج بھی مسلمانوں نے ترقی یافتہ ہونے یا جدیدیت کے عملی رجحانات کو مسترد کر دیا ہے۔ وہ اسی موقف پر بضد رہے کہ اسلامی معاشرہ خود میں ایک مکمل اور سب سے اعلیٰ نظام حیات ہے۔کچھ نے مغربی طرز زندگی کو اپنایا تو کچھ نے اپنے مذہب اور معاشرتی شناخت سے جڑے رہ کر مغربی معاشرے کے مثبت خواص کو خود میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کوشش میں وہ بکھر کر رہ گئے ہیں۔

جدید طرز زندگی میں مسلم خواتین کے نقاب کو اکثر ہی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تنقید کرنیوالوں کا کہنا ہے کہ نقاب یا حجاب یہ عورت کے کم تر درجے کی علامت ہے۔ ثقافت اور حجاب کے مخالفین اسے دقیانوسیت اور محکومی سے منسوب کرتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں مغربی لباس کو انفرادیت اور آزادی کی علامت قرار دیتے ہیں۔ان لوگوں کا کہنا ہے کہ عورت جس طرح کا لباس پہنتی ہے

اور جسطرح اپنے بالوں کا اسٹائل بناتی ہے، وہ اس کے اپنی ذات کو اہمیت دینے سے تعلق رکھتا ہے۔ نقاب اور حجاب کی مخالفت کرنیوالوں میں غیر مسلموں کیساتھ ساتھ کچھ مسلمان بھی شامل ہیں۔ دوسری جانب نقاب اور حجاب کی حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ لباس کا یہ حصہ عورت کو آزادی فراہم کرتا ہے۔ وہ غیر مردوں کے سامنے اپنے جسم کی نمائش سے محفوظ رہتی ہے اور پھر خواتین کے درمیان بھی ایکدوسرے سے لباس کی بنیاد پر برتری کا مقابلہ نہیں ہوتا۔ نقاب کی بدولت عورت مرد کیلئے سیکس آبجیکٹ بھی نہیں بنتی۔ نقاب عورت کو اپنی روحانی، ذہنی اور پیشہ وارانہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع فراہم کرتے ہوئے ترقی کی جانب لے جاتا ہے اور وہ آزادانہ طور پر اپنے کام پر توجہ مرکوز کرتی ہیں کیونکہ انہیں کسی قسم کا خوف یا احساس عدم تحفظ نہیں ہوتا۔

سچ تو یہ ہے کہ جدید اور ترقی پسندی نے انسان کو انسان کے منصب سے گرا دیا ہے۔

اب انسان کو میئسر نہیں انساں ہونا،

امریکی فوجی خواتین ساتھیوں کے لئے کھلونا بن گئی

امریکہ اپنی اخلاق باختگی کے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ امریکیوں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ بڑھتی ہوئی بے راہ روی، جنسی آزادی، اور ہتھیاروں کے آزادانہ استعمال نے ان کے معاشرے کو تباہی کی جانب دھکیل دیا ہے۔ اب وہ اس سوچ بچار میں ہیں کہ اس معاشرے کو کیسے سدھاریں، ہتھیاروں پر پابندی، خواتین کے عریاں پوسٹر، پر پابندی کے اقدامات امریکی معاشرے کے عکاس ہیں۔ لیکن امریکہ کے لئے ای اور سنگین مسئلہ اس کی فوجی خواتین کے ساتھ ان کے مرد ساتھیوں کی جانب سے کی جانے والی زیادتی کے واقعات ہیں۔ حال ہی میں تمام ملٹری ٹرینگ اکیڈمیوں میں صورتحال کا جائزہ لینے کے احکامات بھی دیئے ہیں۔ سال 2012 ء کے دوران تقریباً 26 ہزار خواتین فوجی اہلکاروں پر مجرمانہ حملے کیے گئے ہیں جو کہ گزشتہ سال کے 19 ہزار واقعات کے مقابلے میں کافی زیادہ ہیں ۔ ان واقعات میں سے پچھلے صرف 3 ہزار میں سے 74 جنسی حملوں کی شکایت درج کی گئیں۔ امریکی صدر باراک اوبامہ نے گزشتہ دنوں امریکی فوج میں خدمات سرانجام دینے والی خواتین پر امریکی فوجیوں کے جنسی حملوں کو ناقابل برداشت قرار دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی شخص جو اس طرح قبیح فعل کا مرتکب پایا گیا تو اس کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے ان کو عہدوں سے ہٹایا اور انہیں کورٹ

مارشل کا سامنا کرنا پڑے گا۔امریکی فوج میں جنسی تشدد کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی خواتین فوجیوں کے ساتھ جنسی تشدد اور ان کے حقوق کی خلاف ورزی کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری ہے۔

امریکی اخبار یو ایس ٹوڈے کے مطابق عراق اور افغانستان میں تعینات خواتین کی نصف تعداد جنسی طور پر ہراساں کی گئیں ہیں۔اخبار نے محکمہ ویٹریز افیئر کی ایک تحقیق کے حوالے سے بتایا کہ محققین نے عراق اور افغان جنگی زونز میں خدمات انجام دینے والی گیارہ سو فوجی خواتین سے سوالات کیے گئے۔جس سے معلوم ہوا کہ عراق اور افغانستان میں تعینات خواتین کی مجموعی تعداد میں سے تقریبا نصف خواتین جنسی طور پر ہراساں کی گئیں جبکہ ایک چوتھائی خواتین اہلکاروں پر جنسی حملے کیے گئے۔ عصمت دری کی 22.8 فی صد رپورٹیں درج ہوئیں۔ جنگی زونز میں تعیناتی کے دوران 48.6 فیصد فوجی خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کیا گیا۔ ان فوجی خواتین پر جنسی حملے اور ہراساں کرنے والے مرد فوجی تھے اور ان میں سے نصف تعداد ہائی رینک افسران کی تھی۔ جنسی حملوں اور تشدد کے واقعات گزشتہ برس بہت زیادہ تشویش کا باعث بنے تھے جس پر وزیر دفاع نے تمام ملٹری ٹریننگ کا جائزہ لینے کا حکم دیا۔ گزشتہ ہفتے پینٹاگون نے ملٹری آکیڈمیوں میں جنسی حملوں اور تشدد کے واقعات کی سالانہ رپورٹ جاری کی۔ جس کے مطابق 2012 میں امریکی فوجی آکیڈمیوں میں خواتین کو جنسی طور پر ہراساں

کرنے کی شرح میں 23 فی صد اضافہ ہوا۔امریکی کانگریس میں فوج میں جنسی حملوں کی سماعت کرنے والے ارکان نے بھی کہا ہے کہ حالیہ تحقیق میں انکشاف ہوا ہے کہ مسلح افواج میں ساتھی فوجی خواتین سے جنسی زیادتی کے واقعات.بڑے پیمانے پر ہو رہے ہیں۔کانگریس کی سماعت کرنے والی کمیٹی کی ایک رکن لوریٹا سینچاز کا کہنا ہے کہ سماعت کے دوران اس قسم کے واقعات کی بارے متعدد فون کالز موصول ہوئیں ہیں جن کا زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ فوجی میں شامل خواتین ایک سے زیادہ مرتبہ جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیاہے۔وزارتِ دفاع کی جانب سے سال دو ہزار تین میں ریٹائرڈ فوجی عورتوں سے انٹرویو پر مبنی سروے میں انکشاف ہوا تھا کہ پانچ سو میں سے کوئی تیس فیصد عورتوں کا دوران ملازمت ریپ (جنسی زیادتی) ہوا یا کرنے کی کوشش کی گئی۔اس سے بھی زیادہ تشویش ناک صورتحال وزارتِ دفاع کے سال دو ہزار نو میں ہونے والے سروے میں سامنے آئی تھی۔جس میں کہا گیا تھا کہ فوج کے اندر ہونے والے جنسی زیادتی کے کوئی نوے فیصد واقعات رپورٹ ہی نہیں ہو پاتے۔اس کی تصدیق سال دو ہزار تین میں عراق اور دو ہزار چھ میں افغانستان میں اپنے فرائض انجام دینے والی امریکی فضائیہ میں مارتی ریبا ئیرونے کی۔ مارتی کا تعلق ایک فوجی گھرانے سے ہے۔ وہ کہتی ہیں اپنے دادا اور والد کو دیکھ کر فوج میں بھرتی ہونا ان کا ایک خواب تھا مگر اس خواب کی تعبیر کے لیے انھیں بھاری قیمت چکانی پڑی۔ان کا کہنا تھا کہ فوج میں شمولیت کے بعد اپنے ساتھی فوجیوں کے کردار دیکھ کر بہت

مایوسی ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ افغانستان میں دو ہزار چھ میں وہ دوران ڈیوٹی اپنی بندوق رکھ کر چند لمحوں کو سگریٹ پینے کے لیے ایک طرف گئیں۔ اور اسی دوران ان کے اپنے ہی ساتھی نے ان پر حملہ کرکے ان کا ریپ کیا۔ مارتی کہتی ہیں کہ رپورٹ کرنے پر کمانڈر کا جواب تھا کہ محاذ جنگ میں ہتھیار ایک طرف رکھنا فرائض سے غفلت کے اس زمرے میں آتا ہے۔ جس پر ان کا کورٹ مارشل ہوسکتا ہے۔ اور یوں ریپ کرنے والا انتہائی آسانی سے سزا سے بچ گیا۔ امریکی وزارتِ دفاع کے جنسی حملوں سے روک تھام کی شعبے کی ڈائریکٹر ڈاکٹر کے وائیٹ لی کا کہنا ہے کہ ایک تو کسی بھی عورت کے لیے ریپ رپورٹ کرنا انسانی اور جذباتی سطح پر انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے، دوسرا اس میں اور بھی کئی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں مثلاً کمانڈر کی جانب سے یونٹ کی یک جہتی کے نام پر ایسی رپورٹنگ کی حوصلے شکنی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر کے وائیٹ لی کا کہنا ہے فی الوقت ریپ کا شکار ہونے والی فوجی عورتوں کو تفتیشی مراحل سے گزارے بغیر طبّی امداد اور کونسلنگ یعنی نفسیاتی علاج معالجے کی سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ تاہم اب ایسی کئی تجاویز زیر غور ہیں جس کے مطابق کمانڈروں کو جنسی تشدد کے مسلے سے بہت زیادہ سنجیدگی سے نمٹنا ہوگا۔ انھوں نے کہا حال ہی میں یہ دیکھا گیا ہے کہ کمانڈرز پہلے سے زیادہ کیسز کورٹ مارشل کے لیے بھیج رہے ہیں۔

عراق میں خدمات سرانجام دینے والی ایک سابق امریکی ملٹری انٹیلیجنس آفیسر

کیلا ولیمز کی نئی کتاب 'آئی لومائی رائفل مور دین یو' کچھ عرصہ قبل منظر عام پر آئی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں عراق جنگ میں حصہ لینے والے فوجیوں اور صحافیوں کے کرداروں پر ان کی خدمات کے تناظر میں روشنی ڈالی ہے۔ ایک ریڈیو پروگرام میں انہوں نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کا مقصد اس جنگ میں امریکی خواتین فوجیوں کے کردار پر روشنی ڈالنا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ عراق میں اس وقت گیارہ ہزار ایک سو خواتین مختلف عہدوں پر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ جو امریکی فوج کا آٹھ فیصد بنتی ہیں۔ عراق میں اس وقت امریکی فوج کے ایک لاکھ اڑتیس ہزار فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان خواتین فوجیوں میں سینتیس ہلاک جبکہ تین سو زخمی ہیں۔ اگرچہ وہ براہ راست جنگی محاذوں پر تعینات نہیں ہیں لیکن عراق کی صورت حال نے بہت سی خواتین کو انتہائی حساس پوزیشنوں پر دھکیل دیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ فوج میں مردوں کی طرح خواتین کے کرداروں پر بھی ایک ہی رخ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ولیمز کو فوج میں پانچ سال ہونے کو آئے ہیں جن میں سے ایک سال انہوں نے امریکہ کے عراق پر قبضہ کے دوران عراق میں گزارا۔ ان کی کتاب میں کویت، عراق کی سرحدوں، بغداد، موصل اور انتہائی دوردراز پہاڑی سلسلے میں شام کی سرحدوں پر واقع ان کی تعیناتی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ جنگ میں بہت سی خواتین جنگ میں ہلاک بھی ہوئی ہیں۔ خواتین اگرچہ وہ براہ راست جنگی محاذوں پر تعینات نہیں ہوتی ہیں لیکن عراق کی صورت حال نے بہت سی

خواتین کو انتہائی حساس پوزیشنوں پر دھکیل دیا ہے۔ ان خواتین نے عراق کو چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اپنی آنکھوں سے ہزاروں فوجیوں کو ہلاک اور زخمی ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ عراق کی ابو غریب جیل میں امریکی خواتین فوجیوں نے قیدیوں پر جو وحشیانہ تشدد کیا تھا اس کی رپورٹیں ساری دنیا کے سامنے آنے کے بعد دنیا کو پتہ چلا کہ فوجی جرائم میں امریکی خواتین فوجی بھی برابر کی شریک رہی ہیں۔ ایک ایسی ہی خاتون فوجی سے ابو غریب جیل سکینڈل کے منظر عام پر آنے کے بعد انہیں اس بارے میں مدد فراہم کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ شائد اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں عربی زبان سے آگاہی حاصل تھی اور ان کے بارے میں یہ بھی خیال کیا گیا کہ وہاں کی ثقافت کے پس منظر میں وہ خواتین قیدیوں کے حوالے سے مددگار ہو سکتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ابو غریب جیل میں قیدیوں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے بہت مضطرب تھیں اور جب امریکی فوجیوں نے قیدیوں کو ایذا رسانی کا نشانہ بنانا شروع کیا تو وہ جان گئیں کہ اب حدیں ختم ہو چکی ہیں۔ انہوں نے چاہا کہ وہ اس معاملے کے بارے میں شکایت کریں مگر یہ معاملہ خود ہی سب کے سامنے آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ عراق کی صورت حال نے وہاں رہنے والوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ سب کچھ کر گزریں۔ ولیمز نے بتایا کہ اس طرح کے جنگی زون میں اس قسم کی صورت حال نے خواتین کے لیے ایک مقابلے کی فضا پیدا کر دی ہے۔ ولیمز نے حال ہے میں ایک زخمی فوجی سے شادی کی ہے جو عراق جنگ میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ انہوں نے ولیمز کو اس کتاب کے لکھنے میں مدد

بھی کی۔انہوں نے بتایا کہ ہم سب انسان ہیں جو اچھے اور برے دونوں کرداروں کے مالک ہیں لیکن بہادری اس میں ہے کہ اچھائی کو سامنے لاتے ہوئے تمام حالات کا مقابلہ کیا جائے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ان تما حالات واقعات کے باوجود امریکی خواتین فوج میں جانا چاہتی ہیں اور جنگ میں بھی حصہ لینا چاہتی ہیں۔ گذشتہ دنوں چار خواتین فوجیوں نے امریکہ کی عورتوں کو زمینی جنگ سے دور رکھنے کی پالیسی پر پنٹاگون کے خلاف مقدمہ دائر کردیا تھا۔اب عدالت نے ان خواتین اور سروس ومنز ایکشن نیٹ ورک کی جانب سے دائر مقدمے میں حکومتی پالیسی کو ناانصافی پر مبنی قرار دیا ہے۔ مقدمہ کرنے والی دو خواتین کا تعلق افغانستان میں پرپل ہارٹر سے ہے۔واضح رہے کہ امریکہ میں خواتین فوجیوں کو زمینی لڑاکا یونٹوں میں شامل نہیں کیا جاتا لیکن عراق اور افغنستان میں ایک دہائی سے جاری جنگوں میں اب تک مختلف واقعات میں ایک سو چالیس سے زائد خواتین ہلاک ہو چکی ہیں سپینٹاگون نے فروری میں اعلان کیا تھا خواتین کو چودہ ہزار نئی ملازمتیں دی جائیں گی۔ یہ ملازمتیں زیادہ تر آرمی اور مرین کورز میں دی جانی تھیں، جن کے دروازے خواتین سروس ممبران کے لیے بند تھے۔تاہم اس اعلان کے باوجود زمینی جنگ میں خواتین کے حصہ لینے پر پابندی بتدریج قائم تھی۔ اور اس طرح خواتین انفنٹری، آرمر یونٹز اور اسپیشل فورسز میں نہیں جاسکتیں۔ اب امریکی

حکومت نے یہ پابندی ختم کردی اور کہا ہے کہ خواتین کے میدان جنگ میں حصہ لینے کی صورت میں فرنٹ لائن پوزیشنز اور ایلیٹ کمانڈوز میں خواتین کے لیے روزگار کے ہزاروں مواقع پیدا ہوں گے۔پینٹاگون میں منعقدہ ایک پریس کانفرس میں وزیر دفاع لیون پنیٹا نے پابندی کے خاتمے کا اعلان کیا اور کہا کہ ' اب فوجی خواتین کو جنگ کی حقیقت کا سامنا کرنا ہو گا، جنگ لڑنے کی اپنی رضامندی ثابت کرنا ہو گی اور ہاں اپنے امریکی ہم وطنوں کے دفاع کے لیے مرنا ہو گا۔' دوسری جانب امریکی صدر نے خواتین پر پابندی ختم کرنے کے فیصلے کو ایک 'تاریخی قدم' قرار دیا ہے۔پابندی پر خاتمے سے سنہ انیس سو چرانوے میں بنایا گیا ایک قانون ختم ہو جائے گا جس کے تحت خواتین جنگ میں حصہ لینے والے چھوٹے یونٹس کا حصہ نہیں بن سکتی تھیں۔امریکی وزیر دفاع نے فوجی خواتین کی ان شکایت کا ذکر کیا جس میں میدان جنگ میں حصہ لینے کا تجربہ نہ ہونے کے سبب ان کے لیے ملازمت میں آگے بڑھنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔انہوں نے کہا ' میرا بنیادی طور پر خیال ہے کہ ہماری فوج زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے جب کامیابی کا انحصار صرف اور صرف قابلیت، صلاحیت اور کارکردگی پر ہو'۔فوجی سربراہان پندرہ مئی تک وزیر دفاع کو نئی پالیسی پر عمل درآمد سے متعلق ابتدائی منصوبہ پیش کریں۔توقع ہے کہ امریکی فوج میں خواتین کے لیے کچھ نوکریاں اسی سال شروع ہو جائیں گی جبکہ سپیشل سروسز نیول سیلز اور ڈیلٹا فورس میں نئی نوکریاں شروع ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔اس

فیصلے سے فوج میں دو لاکھ تیس ہزار خواتین کو روزگار ملے گا اور ان میں سے زیادہ تر زمینی فوجی دستوں میں شامل ہوں گی۔امریکی محکم؟ دفاع نے گزشتہ سال اس وقت خواتین پر پابندیوں کو نرم کیا تھا جب فرنٹ لائن پر ان کے لیے چودہ ہزار پانچ سو ملازمتوں کے مواقع پیدا کیے گئے تھے جبکہ اس سے پہلے فرنٹ لائن پر خواتین پر اس قسم کی ذمہ داریاں ادا کرنے پر پابندی تھی۔عراق اور افغانستان جنگ کے دوران خواتین فوجی اہلکاروں نے طبی عملے، ملٹری پولیس اور انٹیلیجنس افسروں کے طور پر کام کیا تھا اور بعض اوقات انہیں فرنٹ لائن پر بھیجا جاتا تھا لیکن سرکاری طور پر انہیں فرنٹ لائن یونٹس کا حصہ نہیں بنایا جاتا تھا۔سال دو ہزار بارہ تک ان جنگوں میں آٹھ سو خواتین اہلکار زخمی ہوئیں اور ایک سو تیس کے قریب ہلاک ہوئیں۔اس وقت امریکہ کی چودہ لاکھ حاضر سروس فوج میں خواتین کا تناسب چودہ فیصد ہے۔

امریکی محکمہ دفاع کی ایک رپورٹ میں کچھ دن پہلے انکشاف کیا گیا ہے کہ امریکی فوج میں کام کرنے والی خواتین پر جنسی حملوں کے واقعات میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا ہے غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سال 2012 ء کے دوران تقریباً26 ہزار خواتین فوجی اہلکاروں پر مجرمانہ حملے کیے گئے ہیں جو کہ گزشتہ سال کے 19 ہزار واقعات کے مقابلے میں کافی زیادہ ہیں تاہم رپورٹ کے مطابق ان واقعات میں سے پچھلے صرف 3 ہزار میں

سے 74 جنسی حملوں کی شکایت درج کی گئیں۔ امریکی صدر باراک اوبامہ نے گزشتہ روز امریکی فوج میں خدمات سرانجام دینے والی خواتین پر امریکی فوجیوں کے جنسی حملوں کو ناقابل برداشت قرار دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی شخص جو اس طرح قبیح فعل کا مرتکب پایا گیا تو اس کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے ان کو عہدوں سے ہٹایا اور انہیں کورٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکی فوج میں جنسی تشدد کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی خواتین فوجیوں کے ساتھ جنسی تشدد اور ان کے حقوق کی خلاف ورزی کا سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ امریکی خواتین فوجیوں کے ساتھ جنسی تشدد اور ان کے حقوق کی خلاف ورزی اس حد تک ہے کہ امریکہ کے اعلی فوجی حکام نے بھی اس بات کا باقاعدہ طور پر اعتراف کرلیا ہے۔ امریکی آرمی چیف جنرل ڈمپسی نے جنسی جرائم کے خلاف مہم کے سلسلے میں امریکی وزیر دفاع کے منصوبے کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ جنسی تشدد جیسے جرائم نے امریکی فوج کی پیشہ وارانہ ماہیت کو بری طرح سے متاثر کردیا ہے۔ امریکی اعلی فوجی افسروں کے اخلاقی اسکینڈلوں کے بعد امریکی وزارت دفاع نے ایسے افسروں کی حمایت کی نوعیت پر نظرثانی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کل جمعے کو کیا گیا جس کی بنیاد، وہ نکات ہیں کہ جن کے بارے میں امریکی وزیر دفاع نے تین ہفتے قبل آرمی چیف سے گفتگو کی تھی جن میں سے ایک امریکی فوجیوں کی اخلاقی تربیت کا عمل ہے۔ اس وقت بھی دو اعلی امریکی فوجی افسروں یعنی سی آئی اے کے سابق سربراہ ڈیویڈ پیٹریئس اور افغانستان میں

امریکی فوج کے کمانڈر جنرل جان ایلین کے خلاف اس حوالے سے تحقیقات جاری ہیں۔
دوسری جانب امریکی فضائیہ میں بھی جنسی تشدد کے بڑھتے ہوئے جرائم کے پیش نظر اداروں سے خواتین کی ناشائستہ لباس میں تصاویر اور پوسٹرز ہٹائے جانے کا اقدام کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں تمام متعلقہ شعبوں سے اس قسم کی تصاویر ہٹانے کیلئے دس روز کی مہلت دی گئی تھی۔ یہ سب اقدامات امریکی فوجیوں میں جنسی تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کی روک تھام کیلئے عمل میں لائے جارہے ہیں۔ امریکی فوج کے اعداد و شمار کے مطابق سالانہ 19 ہزار افراد، جنسی تشدد کی بھینٹ چڑھتے ہیں جبکہ ایسے جرائم کے مرتکب فوجیوں اور افسروں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں شکایت کرنے والوں کے اعتراف کے مطابق مجرم فوجیوں اور افسروں کو عدالت میں طلب تک نہیں کیا جاتا اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی قانونی کاروائی کی جاتی ہے۔ جبکہ امریکی فوجیوں کے جنسی تشدد کے جرائم صرف امریکی فوج تک محدود نہیں ہیں اور وہ بیرون ملک بھی اس قسم کے جرائم کا بخوبی ارتکاب کرتے ہیں اور اس سلسلے میں جاپان اور جنوبی کوریا میں پیش آنے والے واقعات کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں کے عوام خاص طور سے جاپان کے جزیرہ اوکیناوا کے عوام نے اس قسم کی جارحیت و تشدد کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاجی مظاہرے بھی کئے ہیں۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکی فوج میں جنسی تشدد و جارحیت کا عمل نہ صرف بڑھتا جارہا ہے بلکہ اس سلسلے میں کنٹرول اور روک تھام کی خاطر خواہ کوئی

کوشش بھی نہیں کی جارہی ہے۔ ایسی صورتحال میں امریکی فوج میں ہمجنس پرستوں کی بھرتی کے اعلان سے امریکی فوجی کی اخلاقی حالت اور بھی ابتر ہو گی جس سے فوجی توانائی پر بھی کافی اثر پڑیگا امریکی فوج میں ایک سال کے دوران اڑھائی ہزار جنسی جرائم کے واقعات ریکارڈ کئے گئے جبکہ ان واقعات میں زیادہ تر اپنے ہی ساتھیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ محکمہ دفاع کی رپورٹ کے مطابق اکتوبر 2006 سے ستمبر 2007 کے دوران فوج میں جنسی جرائم کے 2688 کیس ریکارڈ کئے گئے تھے۔ 72 فیصد کیسز میں جنسی حملوں کا نشانہ بننے والے خود امریکی فوجی تھے۔ 574 کیسز متاثرہ شہریوں کی طرف سے درج کرائے گئے جو امریکی فوجیوں کی زیادتی کا نشانہ بنے تھے۔ عراق میں امریکی فوجیوں کی جانب سے جنسی جرائم کے 112 کیسز اور افغانستان میں 10 کیسز درج کئے گئے۔ محکمہ دفاع کے مطابق تحقیق کے بعد 181 کیسز میں فوجیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ 201 میں غیر عدالتی سزا دی گئی اور 218 کیسز میں فوجیوں کے خلاف انضباطی کاروائی یا ملازمت سے برطرفی کی سزا دی گئی۔ اعداد و شمار کے مطابق اڑھائی ہزار کیسز میں سے 60 فیصد اجتماعی زیادتی کے کیسز ہیں۔ واضح رہے کہ گزشتہ دنوں جاپان میں تعینات امریکی فوج کی جانب سے بھی ایک نوعمر جاپانی لڑکی کی عصمت دری کرنے کا واقعہ سامنے آیا تھا جس پر امریکی سفیر نے جاپانی حکام سے معذرت بھی کی تھی۔

انتخابات 2013 میں نامور خواتین کی ناکامی

سلونی بخاری ، ڈاکٹر رخسانہ جبین، فرخ خان، غنوی بھٹو، عائلہ ملک، فوزیہ قصوری،ڈاکٹر یاسمین راشد، شمسہ علی ایڈووکیٹ ، رخسانہ بنگش، فرزانہ راجہ، مہرین انور راجہ، نرگس فیض ملک، بشریٰ اعتزاز احسن، ثمینہ گھرکی، یاسمین مصباح الرحمٰن ، شہناز وزیر علی، تنزیلہ عامر چیمہ ، دشکہ حیدر سید ، فرخ خان، جاویدہ خالد خان ، بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر ہاجرہ طارق عزیز نگہت آغا نوشین سعید، کوثر فردوس ، کشمالہ طارق، آسیہ اسحٰق سمیت متعدد ممتاز خواتین قومی اسمبلی تک پہنچنے کی آرزو حسرت میں تبدیل پاکستانی سیاست میں خواتین ہمیشہ آگے آگے رہی ہیں۔ تحریک پاکستان میں بھ ان خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، قائداعظم کے شانہ بشانہ محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان کے ساتھ ، رعنا لیاقت، ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو، اور سب سے بڑھ کر محترمہ بے نظیر بھٹو نے پاکستانی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے پاکستانی سیاست میں نیا رجحان یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین سیاسی عمل میں سرگرم نظر آ رہی ہیں، پاکستان کے انتخابات میں جہاں

سیاسی جماعتوں کی جانب سے مرد امیدواروں نے حصہ لیا وہیں خواتین امیدوار بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران سیاست میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے ایک مثبت رجحان نظر آ رہا ہے، جس سے سیاسی جماعتیں بھی فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ کئی سیاسی جماعتوں کے پاس چند ایک مضبوط خواتین امیدوار تھی، جو رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں'۔پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خواتین نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں جنرل سیٹوں پر حصہ لے 516 کر ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ خواتین کے قومی کمیشن کی چیئرپرسن خاور ممتاز کے مطابق قومی اسمبلی کی نشستوں کے لئے 161 خواتین میدان میں نکلی ۔ ان میں سے 66 خواتین نے مختلف پارٹیوں کی جانب سے اور 95 خواتین آزاد امید وار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیا۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے والی خواتین امیدواروں کی تعداد 355 تھی۔ان میں پیپلز پارٹی کی خواتین امیدواروں کی تعداد مسلم لیگ ن اور متحدہ قومی موومنٹ 8 - 8 خواتین امید وار،اور تحریک ، 15 انصاف کی 6 خواتین امید وار، مسلم لیگ عوامی کی 3 اور مسلم لیگ ق کی دو خواتین امیدوار میدان میں تھیں۔ لیکن ان انتخابات میں جہاں بہت سے نامور سیاست دان شکست کھا گئے۔ وہاں خواتین کو بھی بری طرح پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔

مئی کے عام انتخابات کے غیر حتمی نتائج سامنے آنے کے بعد 14 خواتین نے 11

انتخابات 2013 میں اپنی دھاک بٹھا لی ہے۔ قومی اسمبلی کے لیے 5 خواتین، جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے لیے 9 خواتین امیدواروں نے الیکشن میں عام نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے مطابق عام انتخابات 2013 کے لیے 516 خواتین نے اپنی قسمت آزمائی جس میں 161 خواتین نے قومی اسمبلی اور 355 خواتین صوبائی اسمبلی کی رکنیت کیلئے الیکشن کا حصہ رہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے لیے کامیاب خواتین امیدواروں میں مسلم لیگ (ن) کی 3 خواتین اور پاکستان کی سابقہ حکمران جماعت پیپلزپارٹی کی 2 خواتین نے قومی اسمبلی کی سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ (ن) کی سمیرا ملک نے حلقہ این اے 69 خوشاب سے پاکستان تحریک انصاف کے امیدوار عمیر اسلم خان کو شکست دے کر قومی اسمبلی کی نشست اپنے نام کی، سمیرا ملک نواب کالا باغ کی نواسی ہیں، جو مسلسل تیسری بار کامیاب ہوئی ہیں۔ لیکن پارٹی بدل بدل کر۔ دوسری کامیاب خاتون امیدوار (ن) لیگ کی غلام بی بی بھروانہ ہیں جنھوں نے حلقہ این اے 88 چنیوٹ سے آزاد امیدوار مخدوم اسد حیات کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔ تیسری سائرہ افضل تارڑ ہیں جو سابق صدر رفیق تارڑ کی بیٹی ہیں۔ سائرہ افضل نے این سے 102 سے آزاد امیدوار شوکت علی بھٹی کو مات دی۔ پیپلزپارٹی کی کامیاب خاتون امیدواروں میں سابق اسپیکر قومی اسمبلی فہمیدہ مرزا نے این اے 225 بدین مسلم لیگ فنکشنل کی خاتون امیدوار یاسمین شاہ کو شکست دیکر کامیابی اپنے نام کی جبکہ پیپلزپارٹی کی رہنما اور صدر آصف زرداری کی بہن فریال

تالپور نے حلقہ این اے 207 لاڑکانہ سے غنویٰ بھٹو کو شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔ صوبائی اسمبلیوں میں کامیاب ہونے والے خواتین امیدوار میں

پنجاب اسمبلی کے لیے منتخب ہونے والی (ن) لیگ کی امیدوار نادیہ عزیز نے سرگودھا کے حلقہ پی پی 34 سے کامیابی حاصل کی جب کہ دوسری خاتون رکن اسمبلی عفت معراج ہیں جنھوں نے پی پی 53 سے نشست جیتی۔ مسلم لیگ (ن) کی نازیہ راحیل نے پی پی 88 سے صوبائی اسمبلی کی سیٹ جیتی اور اسی جماعت کی ثمینہ نور نے پی پی 185 اوکاڑہ اور نغمہ مشتاق نے پی پی 206 ملتان سے کامیابی حاصل کی۔ محترمہ ریاض امانت نے حلقہ پی پی 101 گوجرانوالہ سے کامیابی حاصل کی۔ دوسری جانب راشدہ یعقوب نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حلقہ پی پی 78 جھنگ سے پنجاب اسمبلی کے لیے نشست جیتی۔ سندھ اسمبلی کے لیے منتخب ہونے والی خاتون رکن اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی پروین عزیز نے حلقہ پی ایس 76 دادو سے جب کہ ثانیہ خان نے حلقہ پی ایس 109 کراچی سے صوبائی اسمبلی کی نشست اپنے نام کی۔تاہم بلوچستان اور خیبر پختونخوا اسمبلی کی رکنیت کے لیے کوئی خاتون امیدوار کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ خواتین کی موجودہ تعداد اس سے کم ہے جو گذشتہ انتخابات میں کامیاب ہوئی تھی۔ 2008 کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشستوں کے لیے 16 خواتین جب کہ صوبائی اسمبلی کی نشستوں کے لیے 10 خواتین منتخب ہوئیں تھیں۔ دوسری جانب اس الیکشن میں بہت سی خواتین کو ناکامی سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ خواتین کی سب سے زیادہ ناکامی پنجاب میں ہوئی، جہاں

مسلم لیگ ن کی زبردست کامیابی کے بعد دیگر پارٹیوں کے شعبہ ہائے خواتین کی مرکزی وصوبائی صدور سمیت بہت سی نامور خواتین امیدواران قومی اسمبلی تک پہنچنے سے محروم ہوئی۔ ان میں پیپلز پارٹی پنجاب شعبہ خواتین کی صدر بیلم حسنین ، تحریک انصاف شعبہ خواتین پنجاب کی صدر سلونی بخاری ،جماعت اسلامی شعبہ خواتین کی مرکزی صدر ڈاکٹر رخسانہ جبین، مسلم لیگ ق شعبہ خواتین کی مرکزی صدر فرخ خان، تحریک انصاف کی عائلہ ملک، شعبہ خواتین کی سابق مرکزی صدر فوزیہ قصوری، حلقہ این اے 120 سے نواز شریف کیخلاف براہ راست الیکشن لڑنے والی ڈاکٹر یاسمین راشد، اور جنرل سیکرٹری شمسہ علی ایڈووکیٹ ودیگر کا بھی قومی اسمبلی تک پہنچنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔ صدر زرداری کی پولیٹیکل سیکرٹری رخسانہ بنگش، بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کی چیئرپرسن فرزانہ راجہ، مہرین انور راجہ، نرگس فیض ملک، این اے 126 سے الیکشن براہ راست الیکشن لڑنے والی بشریٰ اعتزاز احسن، سابق وفاقی وزیر اور پیپلز لاہور کی صدر ثمینہ گھرکی، یاسمین مصباح الرحمٰن ، سابق مشیر وزیراعظم شہناز وزیر علی سمیت کوئی خاتون رکن اسمبلی نہیں بن سکے گی جبکہ مسلم لیگ ق کے پنجاب سے 2 نشستیں حاصل کرنے پر چوہدری خاندان کی تنزیلہ عامر چیمہ ، مرکزی سیکرٹری جنرل مشاہد حسین سید کی اہلیہ دشکہ حیدر سید، شعبہ خواتین کی مرکزی صدر فرخ خان، جاویدہ خالد خان ، دومرتبہ رکن قومی اسمبلی رہنے والی کالم نگار بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر ہاجرہ طارق عزیز نگہت آغا نوشین سعید اور جماعت اسلامی کی

سابق سینیٹر کوثر فردوس، مسلم لیگ جے کی کشمالہ طارق، اے پی ایم ایل میں آسیہ اسحق سمیت متعدد ممتاز خواتین امیدواران کی قومی اسمبلی تک پہنچنے کی آرزو حسرت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس بار انتخابات کئی حوالوں سے خطرات سے دوچار رہے۔ بم دھماکوں کے ساتھ ساتھ طالبان کے خوف، سماجی مشکلات اور انتظامیہ کی غیر ذمہ دارانہ روش کی وجہ سے بھی خواتین کی بڑی تعدا اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے سے محروم رہی۔

پاکستان کی 180 ملین کی آبادی میں سے 37 ملین خواتین اور 48 ملین مردوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ تاہم پاکستان کے متعدد علاقوں میں انتخابات کے دوران خواتین کے ووٹوں کا تناسب انتہائی کم رہتا ہے۔ ان میں شمالی مغربی صوبہ خیبر پختونخوا، قبائلی علاقہ جات اور جنوب مغربی صوبہ بلوچستان شامل ہیں۔ گیارہ مئی کے انتخابات میں بھی صورتحال اس سے مختلف نہیں رہی۔ فاٹا اور صوبہ سرحد میں کئی ایسے حلقہ جات تھے جہاں سیاسی جماعتوں کے درمیان باقاعدہ اس بات پر معاہدہ ہوا تھا کہ خواتین ووٹ نہیں ڈالیں گی۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی پر پچاس لاکھ روپے جرمانہ تھا۔

2008ء میں ہونے والے انتخابات کے دوران پیشے کے اعتبار سے اسکول ٹیچر بادامی بیگم کی ڈیوٹی مردان کے ایک پولنگ اسٹیشن میں لگی ہوئی تھی۔ ا±س وقت کو یاد کرتے ہوئے وہ بتاتی ہیں کہ "قبائلی سرداروں کی جانب سے پابندی

عائد کی گئی تھی، جس کی وجہ سے کسی خاتون نے پولنگ اسٹیشن کا رخ تک نہیں کیا اور ہم دن بھر انتظار کرتے رہے"۔ الیکشن انتظامیہ نے خواتین ووٹرز کے لیے ایک علیحدہ پولنگ اسٹیشن قائم کیا تھا تاہم اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بادامی بیگم کہتی ہیں کہ "ہم نے شام کے وقت پولنگ اسٹیشن بند کیا اور غیر استعمال شدہ بیلٹ پیپرز اور خالی ڈبے الیکشن کمیشن کے دفتر پہنچا دیے"۔ 2008ء میں 76 خواتین نے انتخابات میں حصہ لیا تھا اور ان میں سے 16 اپنی نشستوں پر کامیاب ہوئی تھیں۔اعداد و شمار کے مطابق 2008ء میں ملک بھر میں خواتین کے لیے قائم کیے گئے 28 ہزار 8 سو پولنگ اسٹیشنز میں سے 564 ایسے تھے، جہاں ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا تھا۔ ان میں سے 55 فیصد خیبر پختونخوا میں تھے۔ 2008ء میں 76 خواتین نے انتخابات میں حصہ لیا تھا اور ان میں سے 16 اپنی نشستوں پر کامیاب ہوئی تھیں۔ انتخابات سے قبل ووٹرز کا اندارج کرنے کے لیے حکام گھروں پر جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی لاکھوں خواتین کا اندارج نہیں ہو پاتا۔ خواتین کے حقوق کے لیے سرگرم فرزانہ باری کے بقول 11 ملین اہل خواتین شناختی کارڈ نہ ہونے کے باعث انتخابی عمل میں حصہ نہیں لے پاتیں۔ اس کے علاوہ مذہبی وجوہات کی بناءپر بھی خواتین کو ووٹنگ سے دور رکھا جاتا ہے۔ متعدد مذہبی رہنماؤں کا کہنا ہے کہ خواتین کا ووٹ ڈالنا غیر اسلامی ہے۔ ان دنوں لاہور ہائیکورٹ میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر انتخابات رکوانے کیلئے درخواست دائر کر دی ہے۔

درخواستگزار طارق

عزیز نے موقف اختیار کیا ہے کہ خواتین کی مخصوص نشستیں غیر آئینی ہیں لہٰذا عدالت ان پر الیکشن رکوانے کے احکامات جاری کرے۔ آئین کے مطابق خفیہ رائے شماری کے ذریعے نمائندوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ عدالت نے الیکشن کمشن سے 27 مئی کو جواب طلب کیا ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے پاکستانی سیاست میں نیا رجحان یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین سیاسی عمل میں سرگرم نظر آ رہی ہیں، حتیٰ کہ قدامت پسند قبائلی علاقوں میں بھی اب ایک خاتون بادام زری انتخابات میں امیدوار کے طور پر اپنا فارم پر کیا۔ بادام زری گیارہ مئی کے انتخابات میں ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتی تھی۔ اور اپنے قبائلی علاقے باجوڑ کی نمائندگی کرنا چاہتی تھی۔ افغان سرحد سے ملحقہ باجوڑ بد امنی کی لپیٹ میں رہا ہے اور طالبان اور القاعدہ جنگجوؤں کی پناہ گاہ تصور کیا جاتا ہے۔ بادام زری کا یہ سفر خطرات سے بھرپور تھا۔ الیکشن مہم شروع ہونے فوراً بعد ہی بادام زری نے انتخابات سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ صوبہ سرحد میں ایک خاتون امیدوار پر خودکش حملہ ہوا تھا۔ جس کے بعد انھوں نے انتخابات سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ انتخابات میں امیدوار کے طور پر شرکت کی خواہاں خواتین پشاور میں الیکشن کمیشن کے سامنے بھی پیش ہوئی۔ کچھ عرصہ قبل اقتصادی فورم کی ایک رپورٹ میں اس بات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ

آبادی کے تناسب سے۔ برطانیہ یا امریکا کے مقابلے میں پاکستانی پارلیمان میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ سائنس اور ثقافت کی جرمن فاؤنڈیشن سے وابستہ کرسٹیان واگنر کے مطابق ’پاکستانی سیاست میں خواتین کا مسئلہ ویسے ہی حل طلب ہے، جیسے کہ کئی دیگر ملکوں میں بھی ہے‘۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران سیاست میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے ایک مثبت رجحان بھی سامنے آیا ہے۔ پاکستانی کی قومی اسمبلی کی 342 نشستوں میں سے اصولاً 60 نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ جرمنی کی ہائنرش بوئل فاؤنڈیشن کے اسلام آباد دفتر کی انچارج خاتون بریٹا پیٹرسن کے مطابق ’پارلیمان میں تو خواتین کے لیے کوٹہ مخصوص ہے لیکن خود سیاسی جماعتوں کے اندر ایسا کوئی کوٹہ نہیں ہے‘۔ گزشتہ پانچ سال برسراقتدار رہنے والی حکومت نے بہت سے خواتین دوست قوانین متعارف کروائے۔ مزید برآں تمام سیاسی جماعتوں کی خواتین نے خواتین کا ایک پارلیمانی گروپ بھی تشکیل دیا، جہاں خواتین کی دلچسپی کے امور پر تبادلہء خیال کیا جاتا رہا ہے۔

مغربی مبصرین کہتے ہیں کہ پاکستانی سیاست پر جاگیردارانہ چھاپ نظر آتی ہے اور پارلیمان پر چند ایک طاقتور اور دولت مند خاندانوں ہی کا غلبہ ہے۔ یہی بات پاکستانی سیاست میں موجود خواتین کے حوالے سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ قومی

اسمبلی میں یا پھر بڑی سیاسی جماعتوں کے سرکردہ عہدوں پر موجود زیادہ تر خواتین کا تعلق طویل سیاسی روایات کے حامل خاندانوں سے ہے۔" تاہم وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹی جماعتوں میں بھی، جو متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں، اب زیادہ سے زیادہ خواتین نظر آنے لگی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کی کمی اور سماجی روایات خواتین کے سیاسی کیریئر کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ پاکستانی خواتین میں خواندگی کی شرح محض تقریباً چالیس فیصد بتائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود گزشتہ برسوں کے دوران پاکستانی خواتین نے زبردست حوصلے سے کام لیا ہے۔ خواتین کے حوالے سے پاکستان میں تبدیلی کا عمل سست رفتار لیکن مستقل ہے۔ خواتین سیاست میں کافی زیادہ سرگرم ہیں۔ مئی گیارہ کے انتخابات کے لیے پارٹی ٹکٹ تقسیم کیے جاچکے، جس سے واضح ہے کہ سیاسی جماعتیں جن کی حکمتِ عملی میں خواتین کے ووٹ تو اہمیت کے حامل ہیں تاہم جنرل نشستوں پر ان کی نامزدگی پر کافی غور سے احتراز برتا گیا۔ قومی اسمبلی کی دو سو تھمتر عام نشستوں، بشمول خواتین کی مخصوص چھتیس نشستوں پر، امیدواروں کی فہرست میں خواتین امیدواروں کی تعداد کم تھی۔ مذہبی جماعتوں، میں سے جے یو آئی۔ ف نے تو خواتین کو اہل امیدوار کے طور پر مکمل نظرانداز کیا۔ مرکزی دھارے میں شامل سیاسی جماعتوں سے تو بہتری کی امید تھی۔ وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے عام نشستوں پر گیارہ خواتین امیدواروں کو نامزد کیا ہے، سن دو ہزار آٹھ کے مقابلے میں اس بار چار خواتین امیدوار

کم نامزد کی گئی ہیں۔ایم کیو ایم نے عام نشستوں کے لیے سات خواتین امیدواروں کو ٹکٹ دیے ہیں، جو کہ گذشتہ دو انتخابات کے مقابلے میں ذرا سا ہی زیادہ ہے۔ اے این پی کے ٹکٹ پر دو خواتین امیدوار عام نشستوں پر امیدوار ہوں گی۔ پاکستان مسلم لیگ نے سات خواتین کو نامزد کیا ہے،ان کی ماضی کی کارکردگی کے مقابلے میں، بمشکل ہی بہتر کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ مجموعی لحاظ سے اس بار پاکستان مسلم لیگ۔ ق کے ٹکٹ پر گئے چ ± نے امیدواروں نے ہی کاغذاتِ نامزدگی جمع کرائے تھے۔ تاہم اس بار ان کی کارکردگی بہت نیچے تھی۔۔ گذشتہ انتخابات میں ق لیگ کے ٹکٹ پر آٹھ خواتین انتخابی میدان میں تھیں، اس بار صرف چار خواتین عام نشستوں پر امیدوار ہیں۔ پاکستان تحریکِ انصاف جو 'تبدیلی' کا نعرہ لے کر انتخابات کے میدان میں اتری ہے، اس نے مجموع طور پر دو سو ستائیس امیدواروں کو پارٹی ٹکٹ دیے ہیں تاہم ان میں صرف پانچ خواتین شامل ہیں۔ اب اس شرح کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ملک میں عوامی نمائندگی کے اعلیٰ ترین ایوان میں خواتین کی نمائندگی علامتی ہی رہتی۔ مشرف دور میں سن دو ہزار دو میں حکومت نے قومی اسمبلی میں خواتین کے لیے ساٹھ نشستوں کا کوٹہ مختص کیا تھا۔ گذشتہ پانچ سالہ جمہوری دور متعدد خامیوں کا بھی حامل رہا تاہم اس دوران خواتین کے حوالے سے قابلِ غور قانون سازی کی گئیں۔ یہ ایک اہم قدم تھا جس کا مقصد سماجی سطح پر خواتین کے مرتبے میں اضافہ کرنا ہے۔ گذشتہ قومی اسمبلی میں ارکان کی کارکردگی کے حوالے سے اعداد وشمار پر

مشتمل حقائق بیان کرتے ہیں کہ مرد ارکان کے مقابلے میں، خواتین ارکانِ اسمبلی نے پارلیمانی امور اور قانون سازی میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ خطرات سے ہچکچانے کی قدامت پسند سوچ کے برعکس، ہونا تو یہ چاہیے کہ خواتین ارکانِ قانون ساز نے جس عمدہ پارلیمانی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، اس کے پیشِ نظر سیاسی جماعتوں کو عام نشستوں پر زیادہ خواتین امیدواروں کو نامزد کرنا چاہیے تھا۔ م±لک کے بعض نہایت پسماندہ حصوں میں کچھ خواتین نے اس طے شدہ ذہنیت کو چیلنج کیا اور وہ آزاد امیدوار کے طور پر انتخابات میں حصہ بھی لیا۔ لیکن ان کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ یہ امر بھی افسوسناک ہے کہ ہماری سیاسی جماعتوں نے اس ہمت و جرات کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر، انتقالِ اقتدار میں خواتین منتخب نمائندوں کو شامل کرنے کے بجائے انہیں ایک طرف کھڑا کر دیا گیا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین دوگنا زیادہ کام کرتی ہیں لیکن انہیں بمشکل ہی آدھا کریڈٹ مل پایا۔ جائزوں سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ خواتین ارکانِ قانون ساز حاضری کے لحاظ سے اپنے مرد ساتھیوں پر سبقت لے گئیں، پارلیمنٹ میں کہ جہاں قانون سازی کی جاتی ہے۔ خواتین کی حاضری کی شرح بہت بہتر تھی۔ دوسری جانب مخصوص نشستوں کے ذریعے اسمبلیوں میں خواتین کی (قابلِ ذکر) نمائندگی یقینی بنانے کی کوشش کی گئی جہاں ان کی تعداد پہلے بہت ہی کم تھی۔ اس کے باوجود کہ خواتین کے لیے مخصوص نشستوں کا نظام غیر متنازع ہے تاہم بلواسطہ انتخاب، براہ راست طریقے سے عام نشست پر

منتخب ہونے کا متبادل نہیں۔ یہ تصور بھی کیا جاتا ہے کہ مخصوص نشستوں پر منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچنے والی خواتین دوسرے درجے کی قانون ساز ہیں، اور اس رویے کا سامنا انہیں اپنے مرد قانون ساز ساتھیوں کی طرف سے بھی کرنا پڑتا ہے۔ پچھلی قومی اسمبلی میں خواتین بائیس فیصد پر مشتمل تھیں، یہ جنوبی ایشیا میں نیپال کے بعد سب سے زیادہ شرح ہے۔ نیپال میں قانون ساز اسمبلی میں خواتین کے لیے مخصوص نشستوں کی تعداد ساٹھ فیصد ہے۔ گذشتہ عام انتخابات میں براہ راست حصہ لے کر منتخب ہونے والی خواتین کی تعداد صرف پندرہ تھی، جن میں سے تقریباً تمام ہی معروف سیاسی گھرانوں سے تھیں۔ سیاست میں خواتین کو حقیقی معنوں میں صرف اسی صورت بااختیار بنایا جاسکتا ہے کہ جب انہیں عوام کی عدالت کا براہ راست سامنا کرنے دیا جائے۔

بریڈلی مینِنگ ایک ہیرو یا غدار

امریکی تاریخ کا خفیہ فوجی اطلاعات ظاہر کرنے کا سب سے بڑا واقعہ
.بریڈلے مینِنگ کو آزاد کرانے کی جنگ، ایک بڑی تحریک کا حصہ ہے۔انہیں ا±مید
ہے کہ یہ جنگ چند مہینوں میں امریکی موسمِ بہار کی شکل اختیار کر لے گی۔
امریکہ میں ایک چوبیس سالہ فوجی بریڈلے مینِنگ نے وکی لیکس کو امریکی فوجی کیبل
کے راز افشا کر کے ساری دنیا کو امریکہ کی دہشت گردی اور اس کے فوجیوں کی وحشیانہ
کاروائیوں کو طشت از بام کر دیا، مینِنگ آج ساری دنیا کا ہیرو ہے، امریکی فوج انھیں
غدار بنانے اور سزا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ لیکن اب نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا کی
حکومتوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے اس عہد میں سچ اور ہیرا
پھیری کو چھپانے کے تمام آزمودہ حربے تیزی سے غیر موثر ہوتے جا رہے ہیں۔اب
بڑے پیمانے پر تقسیم اور رسائی کے وسائل باآسانی دستیاب ہیں اور شناخت چھپانے کی
بھی صلاحیت موجود ہے، ایسے میں ہمیشہ خطرے کا بِگل بجنے کا اندیشہ رہے گا۔اس لیے
اب صرف اس وجہ سے حکومتوں کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ صاف اور ریکارڈ درست
رکھیں۔ حکومتیں عوام کو

جواب دہ ہیں۔ انہیں بھی چاہیے کہ وہ اب شفافیت کے ساتھ اپنا کردار ادا کریں
وکی لیکس خفیہ راز افشاء کرنے کے لیے ایک نیٹ ہے جسے جولین اور اس کے احباب چلاتے ہیں۔ امریکی فوجی کاروائیوں کے متعلق راز افشاء کرنے پر اس وکی لیکس نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ یہ راز چھوٹے درجہ کے امریکی سرکاری اہلکاروں نے نجی طور پر وکی لیکس تک پہنچائے جس نے ان کی تدوین کرکے شائع کیا۔ جواباً امریکی حکومت نے کاروائی کرکے وکی لیکس کا دانہ پانی بند کروادیا۔ اس کے بانی جولین آسانج کو برطانیہ نے گرفتار کرلیا۔ وکی لیکس کے بانی جولین آسانج امریکا حوالگی کے خوف سے، گذشتہ موسم بہار سے لندن میں قائم ایکواڈور کے سفارت خانہ میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے ٹیلی گرام (کیبلز) پر مشتمل امریکا کی خفیہ سفارتی دستاویزات انٹرنیٹ پر جاری کیں، جس کے باعث گذشتہ فروری میں بریڈلے مینٹنگ کے خلاف فرد جرم عائد ہوئی، اس میں سب سے بڑا اور خطرناک الزام 'دشمن کی مدد' کا ہے۔ تاہم، اس کے باوجود وکی لیکس ایسی سفارتی دستاویزات اور خفیہ معلومات کو بدستور انٹرنیٹ پر جاری کرتا جارہا ہے، جن کے متعلق بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ امریکا اسے عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کا خواہاں ہے۔ بلاشبہ یہ قدم محققین کے لیے نہایت بیش بہا ثابت ہوا ہے۔ اسی ضمن میں وکی لیکس نے 'پبلک لائبریری آف یو ایس ڈپلومیسی' کی دستاویزات جاری کی ہیں۔ لائبریری کی

انٹرنیٹ پر قابلِ تلاش دستاویزات کی تعداد سترہ لاکھ سے زائد ہے۔ یہ امریکی سفارتی دستاویزات سن ا±نیّسو تھہتر تا ا±نیّسو چھہتر پر مشتمل ہیں، جنہی عرفِ عام میں 'کسنجر کیبلز' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس آرکائیوز میں ڈھائی لاکھ دستاویزات ایسی ہیں جنہیں وکی لیکس نے سن دو ہزار دس میں انٹرنیٹ پر جاری کیا تھا۔اگرچہ تازہ ترین جاری کی جانے والی دستاویزات ڈی کلاسیفائیڈ ہیں تاہم ان تک صرف یو ایس نیشنل آرکائیوز کے تحت ہی رسائی حاسل کی جا سکتی ہے۔ پی ڈی ایف فارمیٹ پر مشتمل یہ دستاویزات انٹرنیٹ پر ناقابلِ تلاش (نان سرچ ایبل) ہیں۔لیکن اب یہ تمام تر معلومات انٹرنیٹ پر صرف ایک کِلک کی دوری پر ہیں۔ یہ وہ معلومات ہیں جو ماضی کے اس عہد پر روشنی ڈالتی ہیں، جنہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کی گئ تھی۔جناب اسانڑ کے خلاف جو الزامات عائد کیے گئے، ان کا درست یا غلط ثابت ہونا ابھی باقی ہے تاہم ایک بات یقینی ہے کہ امریکا ان رازوں سے پردہ اٹھنے پر وکی لیکس سے ہرگز خوش نہیں۔

لندن میں ایکواڈور کے سفارت خانے میں جون سے ایک کمرہ میں رہنے والے وکی لیکس کے بانی جولیئن آسانج پھیپھڑوں کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔آسانج کے علاج کے لئے سفارت خانے میں انتظامات کیے گئے تھے۔ وکی لیکس کے بانی کو علاج کے غرض سے محفوظ راستہ دینے کے لیے۔برطانوی داخلہ آفس سے اپیل بھی کی گئ تھی۔۔برطانیہ کی جانب سے جنسی الزامات پر آسانج کو سویڈن کے حوالے کرنے

کے اعلان کے بعد ایکواڈور نے سیاسی پناہ دے رکھی ہے۔لندن میں وکی لیکس کے ترجمان نے آسانج کی صحت کے بارے میں تبصرے سے انکار کیا۔ وکی لیکس کے بانی جولین آسانج امریکی صدر اوبامہ کو دوبارہ منتخب ہونے پر' بھیڑ کے لباس میں بھیڑیا' قرار دیا تھا۔ انھوں نے امریکی عوام سے کہا کہ اوبامہ کے جیتنے پر جشن نہیں منانا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ اوبامہ ایک اچھے آدمی نظر آتے ہیں اور یہی اہم مسئلہ ہے۔وکی لیکس کے بانی کا کہنا تھا کہ یہ زیادہ اچھا تھا اگر 'بھیڑیا کے لباس میں بھیڑ' ہوتا۔انہوں نے ابامہ کی حکومت کی طرف سے وکی لیکس پر 'ظلم' کی شکایت بھی کی۔

امریکاکے فوجی بریڈلے مییننگ نے قومی خفیہ راز وکی لیکس کو فراہم کرنے کا اعتراف کر لیا ہے۔امریکا میں عدالت کے روبرو اپنے اوپر لگائے گئے الزامات قبول کرتے ہوئے بریڈلے نے کہا کہ انہوں نے عوام کو امریکہ کی خارجہ اور فوجی پالیسی سے آگاہ کرنے کیلیے وکی لیکس کو راز افشا کیے تھے۔بریڈلے کے مطابق، انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس اقدام سے ملک کو نقصان پہنچے گا۔بریڈلے نے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت میں پینتیس صفحات پر مشتمل اپنا بیان پڑھا اور خود پر لگائے گئے بائیس میں سے دس الزامات کو تسلیم کیا۔انہوں نے بغداد میں بطور انٹیلی جنس تجزیہ کار کام کے دوران 2009ء اور 2010ء میں ہزاروں کی تعداد میں عراق اور افغانستان کی جنگی رپورٹیں، سفارتی اور دوسرے

خفیہ دستاویزات اور خفیہ ویڈیو کلپس وکی لیکس کو فراہم کرنے کا اعتراف کیا۔ عدالت اب اس بات پر غور کررہی ہے کہ وہ۔بریڈلے پر صرف ان دس الزامات کے تحت ہی مقدمہ چلائے یا نہیں۔ الزامات ثابت ہونے کی صورت میں۔بریڈلے کو بیس سال قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے جبکہ استغاثہ دیگر بارہ الزامات کے تحت۔بریڈلے پر مقدمہ چلا سکتا ہے جس کی سزا عمر قید ہوسکتی ہے۔ امریکی فوجی اور عراق جنگ میں شرکت کرنے والے ۔بریڈلی مینگ نے مقدمے کی باقاعدہ سماعت سے قبل اپنے بیان حلفی میں اس الزام کو کہ اس نے ایک امریکی دشمن کی مدد کی ہے تسلیم کرنے سے وہ انکار کیا ہے۔ یہ ان کا پہلا بیان تھا جب سے انھیں وکی لیکس ویب سائٹ کو ہزاروں کلاسی فائیڈ دستاویزات افشا کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امریکی تاریخ کا خفیہ فوجی اطلاعات ظاہر کرنے کا سب سے ۔بڑا واقعہ ہے، یہ ان کا پہلا عام بیان تھا۔ امریکہ میں وکی لیکس کے لئے خفیہ فائلوں کی فراہمی کے الزام کے تحت امریکی فوجی ۔بریڈلی مییننگ کے خلاف باقاعدہ عدالتی کارروائی کا آغاز فروری میں ہوا تھا۔ کہا جارہا ہے کہ الزام ثابت ہونے کی صورت میں میننگ کو 154 ۔برس کی سزا کا سامنا ہوگا۔ کچھ الزامات کو میننگ ضرور تسلیم کیا لیکن سب سے سنگین الزام کے اس نے ایک امریکی دشمن کی مدد کی ہے کو تسلیم کرنے سے وہ انکاری ہے۔ وکی لیکس کو خفیہ فائلیں فراہم کرنے کے الزام میں۔بریڈلی میننگ کو 2010 میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس مقدمے کے

دوران

بریڈلی مینگ کے حامی، جو سماعت کے دوران سردی اور بارش میں فوجی اڈے کے باہر کھڑے رہے، وہ انھیں ایک ہیرو مانتے ہیں۔

امریکی فوج کے استغاثے کے نزدیک مینگ ایک غدار ہے، جس نے ہزاروں خفیہ دستاویزات لیک کیں اور اس طرح دشمن کو مدد فراہم کی۔ وکی لیکس ویب سائٹ کے بانی، جولیان اسانج نے اِس ہفتے مینگ کے مقدمے کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ خود امریکی فوج کے خلاف مقدمہ ہے۔ مینگ کے وکیلوں کا کہنا ہے کہ حراست کے دوران وہ اذیت کا شکار بنے ہیں۔ مینگ نے اپنے بیان حلفی میں انھوں نے کہا کہ گرفتاری کے بعد انھیں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ انھوں نے اسے ایک پنجرہ قرار دیا جہاں ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ تجزیہ کار کہتے ہیں کہ اس دلیل کے باعث مینگ کے لیے عوام میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے ہیں، جس سے اس نقصان کی طرف سے دھیان ہٹا ہے جو دستاویز افشا ہونے کے باعث ہوا۔ دفاعی تجزیہ کار لارنس کورب کہتے ہیں کہ اِس سے ایک اخلاقی مسئلے کی طرف بھی سوال اٹھتا ہے۔ عراق میں خدمات انجام دیتے ہوئے، مینگ نے جنگ کے خلاف آواز بلند کی اور ان کی طرف سے لیک کیے گئے کلاسیفائیڈ مواد سے امریکی فوجیوں کی وحشیانہ زیادتیوں کی طرف نشاندہی ہی نہیں ہوتی بلکہ امریکہ کا اصل چہرہ بھی بے نقاب ہوتا ہے۔ یہ واضح نہیں کہ مینگ کی طرف سے بڑے پیمانے پر دستاویزات کے افشا کیے جانے سے قومی سلامتی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ لیکن

یہ بات ضرور ہے کہ ان رازوں سے پردہ اٹھنے سے امریکہ کی فوج کا دہشت گرد چہرہ بے نقاب ہوا اور امریکی شہریوں کو پہلی بار اپنی حکومت کے کرتوتوں کا علم ہوا۔ مقدمے سے یہ سوالات بھی اٹھتے ہیں آیا میننگ نفسیاتی طور پر فوج میں خدمات دینے کے قابل تھا۔ ان کے سابق افسر انھیں جذباتی طور پر خلفشار کا شکار فرد قرار دیتے ہیں جسے اپنی جنس کے بارے میں شک تھا اور کوئی بھی بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ کورب کے خیال میں، یہ مقدمہ دراصل فوج کے 'اسکریننگ کے عمل' میں اصلاحات کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے۔ مقدمے پر اثرانداز ہونے کے خوف کے باعث پینٹاگان حکام اِس مقدمے کے بارے میں اظہارِ خیال سے اجتناب کرتے رہے ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ مقدمے کی باقاعدہ سماعت میں تقریباً دو ماہ تک لگ سکتے ہیں۔ دوسری جانب ناروے میں قائم نوبیل انسٹی ٹیوٹ نے کہا ہے کہ اسے 2012ئ کے نوبیل امن انعام کے لیے 231 نامزدگیاں موصول ہوئی ہیں۔

اس سال کی نامزدگیوں میں یو ایس آرمی پرائیویٹ کے .بریڈلی منگ بھی شامل ہیں، جن پر الزام ہے کہ انہوں نے خفیہ دستاویزات کی ایک بڑی تعداد وکی لیکس کو فراہم کی تھی۔ نوبیل انسٹی ٹیوٹ کو روس کے انسانی حقوق کے سرگرم کارکن سویتلانا گانوشکینا اور یوکرین کی سابق وزیر اعظم یولیا تیموشینکو کی نامزدگیاں بھی موصول ہوئی ہیں۔ قانون سازوں، یونیورسٹی کے اساتذہ اور کئی بین الاقوامی تنظیموں سمیت ہزاروں افراد اس عالمی انعام کے لیے نامزد ہونے

کی اہلیت رکھتے ہیں۔ نوبیل کمیٹی نامزد کی جانے والی شخصیات کے نام ظاہر نہیں کرتی، لیکن بعض اوقات نامزد کرنے والوں کی جانب سے اس کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ 15 لاکھ ڈالر مالیت کے انعام کے حقدار کا انتخاب پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی کرتی ہے.

مینگ کے خلاف اس مقدمے میں امریکی حکومت کے تعصب کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کی کاروائی ایک فوجی عدالت میں جاری ہے اور فوجی جج نے وکی لیکس ویب سائٹ کو حکومت کے راز افشا کرنے کے الزام میں گرفتار امریکی فوجی کے خلاف الزامات میں سے کسی بھی ایک الزام کو خارج کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میری لینڈ میں فورٹ میڈ ملٹری بیس پر ہونے والی ابتدائی سماعت کے دوران، کرنل ڈینس لِنڈ نے دفاعی وکلا کی جانب سے پرائیویٹ فرسٹ کلاس بریڈلے مینگ کے خلاف 22 الزامات کو خارج کرنے کی استدعا مسترد کر دی۔ جج نے مقدمے کا دفاع کرنے والوں کی طرف سے پیش کردہ دلائل کو مسترد کیا جن میں کہا گیا تھا کہ کلاسی فائیڈ انفارمیشن غیر قانونی طور پر اپنی تحویل میں رکھنے اور ظاہر کرنے کے عمل کے ارتکاب کے بارے میں آئینی شقوں میں ابہام ہے۔ انھوں نے دو مزید الزامات کو خارج کرنے سے بھی انکار کیا جن میں کہا گیا تھا کہ محکمہ دفاع کے کمپیوٹر نظام تک رسائی کے اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے مینگ نے ایسا عمل کیا۔

لِنڈ نے کہا کہ مینگ کے خلاف 21 ستمبر سے شروع ہونے والی کورٹ مارشل کی کارروائی نومبر یا جنوری تک موخر کی جا سکتی ہے۔ فوج کے انٹیلی جنس تجزیہ کار پر الزام ہے کہ اس نے عراق اور افغانستان کی جنگوں سے متعلق ہزاروں کی تعداد میں سفارتی کیبلز اور فوجی دستاویزات کو لیک کیا۔ ان کے خلاف سب سے زیادہ سنگین الزامات میں 'دشمن کی مدد کرنے' کا الزام شامل ہے۔

امریکی حکام کا کہنا ہے کہ مینگ کا عمل امریکی قومی سلامتی کو داؤ پر لگانے اور فوجیوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ دوسری جانب مینگ نے کہا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو امریکی فوجی آپریشنز کے بارے میں سچ جاننا چاہیئے۔

وکی لیکس کو خفیہ فوجی دستاویزات فراہم کرنے کے الزام میں گرفتار امریکی فوجی کا کورٹ مارشل کرنے یا نہ کرنے کا تعین کرنے کے لیے فوجی عدالت میں جاری سماعت مکمل ہو گئی ہے۔ اس سے قبل گزشتہ روز سماعت کے دوران استغاثہ کی جانب سے ماہرین نے بیانِ حلفی دیتے ہوئے پریزائڈنگ افسر کو بتایا تھا کہ اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ ملزم نے خفیہ دستاویزات کو ڈاؤن لوڈ کرکے ڈسکس پہ محفوظ کیا تھا جنھیں بعد میں 'وکی لیکس' کو فراہم کیا گیا۔

سماعت کے دوران میننگ کے وکلائ نے اپنے موکل کو مشکل میں گھرا ایک ایسا شخص قرار دیا جسے ان کے بقول نومبر 2009ئ سے مئی 2010ئ تک عراق میں اس کی تعیناتی کے دوران خفیہ سرکاری دستاویزات تک رسائی نہیں دی جانی چاہیے تھی۔

وکلائے صفائی نے خفیہ معلومات کے حامل کمپیوٹرز کے حفاظتی انتظامات کو بھی ناقص قرار دیتے ہوئے کاروائی کے دوران بیانِ حلفی دینے والے گواہوں کے حوالے سے کہا کہ فوجی ان کمپیوٹرز پر ویڈیو گیمز کھیلا کرتے تھے۔ میننگ پر الزام ہے کہ اس نے وہ خفیہ سرکاری دستاویزات 'وکی لیکس' کے حوالے کیں جن تک اسے بطورِ فوجی تجزیہ کار رسائی حاصل تھی۔ 'وکی لیکس' نے بعد ازاں جولائی 2010ئ سے ان دستاویزات کی اشاعت شروع کردی تھی۔ میننگ کی فراہم کردہ سفارتی کیبلز اور دیگر خفیہ فوجی دستاویزات کے اجرا نے عالمی برادری میں ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھا کیوں کہ ان میں کئی عالمی رہنماؤں کی نجی اور عوامی زندگیوں کے متعلق امریکی اہلکاروں کے تلخ تبصرے بھی موجود تھے۔ امریکی حکام کا کہنا ہے کہ 'وکی لیکس' کی جانب سے خفیہ دستاویزات کی اشاعت سے نہ صرف لوگوں کی زندگیاں خطرے میں پڑیں بلکہ امریکہ کی قومی سلامتی متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ اشتراکِ عمل کی امریکی کوششوں کو بھی دھچکا پہنچا۔ چوبیس سالہ بریڈلے میننگ سے سوال کرتے ہوئے -

امریکی ریاست میری لینڈ کے شہر بالٹی مور کے نزدیک واقع ایک فوجی مرکز میں ہونے والی سماعت کے دوران میں فوجی عدالت کے جج نے کہا کہ استغاثہ کو اپنے اس الزام کے حق میں دلائل دینا ہوں گے کہ مینگ نے اپنے مبینہ اقدامات کے ذریعے بالواسطہ طور پر القاعدہ کی مدد کی۔ اس بات کا بھی تعین ہونا باقی ہے کہ کیا مینگ نے خفیہ سفارتی دستاویزات کو سرکاری کمپیوٹرز سے کامپیکٹ ڈسکوں پر اتارا تھا جو بعد ازاں وکی لیکس کو بھیج دی گئی تھیں۔ مینگ پر لاکھوں کی تعداد میں خفیہ سفارتی مراسلے اور عراق اور افغانستان کی جنگ سے متعلق خفیہ امریکی فوجی دستاویزات اِفشا کرنے کا الزام ہے۔ لیکن یہ الزام صداقت سے دور اس لئے بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو کام اکیلے مینگ نے کیا ہے کیا وہ اس کی صلاحیت رکھتا تھا، یہ کام تو سینکڑوں افراد پر مشتمل ایک دفتر ہی کرسکتا ہے۔ وکلائے صفائی فوجی کمپیوٹرز کی نگرانی کو بھی خام قرار دیتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب عدالت میں کاروائی شروع ہوئی تو منگکے حامی احتجاج کے لیے جمع ہو گئے۔ یہ دن مینگ کے لئے یوں بھی یادگار تھا کہ یہ مینگ کی سالگرہ کا دن بھی تھا۔ سینکڑوں احتجاجی مظاہرین نے کہا کہ وہ سپاہی مانگ کے ساتھ ہر ممکن طریقے سے یکجہتی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اس فوجی اڈے کے کمپاؤنڈ کے گیٹ کے باہر مارچ کیا، جہاں اس کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ بعض ڈرائیوروں نے اس کی حمایت میں زور زور سے ہارن

بجائے، لیکن سابق فوجی خاتون ایلن بارفیلڈ نے کہا کہ بہت سے لوگوں کی نظر میں مانگ ہیرو ہیں۔ ان کے مطابق "ایسے لوگ جن کے پاس ایسی اطلاعات ہیں جو عام لوگوں کو معلوم ہونی چاہئیں، اور وہ انہیں ظاہر کر دیتے ہیں، میں انہیں ہیرو سمجھتی ہوں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کیا بریڈلے مانگ نے یہی کچھ کیا تھا، لیکن ان پر الزام اسی چیز کا لگایا گیا ہے، اور ہم میں سے بہت سے لوگ، خاص طور سے جو لوگ یہاں موجود ہیں، وہ سب، انہیں ہیرو سمجھتے ہیں۔" کارٹونسٹ سیتھ ٹابکمین نے، جو احتجاج کے نئے سائن بنا رہے تھے، کہا کہ جب سے سماعتیں شروع ہوئی ہیں، مانگ انہیں مسلسل متاثر کرتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "میں نے انہیں عدالت میں دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت مضبوط ارادے کے مالک ہیں۔ انہیں اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہیئے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اسی پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے۔"

مانگ انٹیلی جنس کے تجزیہ کار تھے اور بغداد میں تعینات تھے۔

مانگ کے وکیل کہتے ہیں کہ ان کی دلیل یہ ہوگی کہ جو اطلاعات افشائ کی گئیں، ان سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا۔ احتجاجی مظاہروں کے ایک منتظم، جیف پیٹرسن کا تعلق کریج ٹو رزسٹ نامی تنظیم سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بریڈلے مانگ کی رہائی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہم ان کی قانونی ٹیم کی مدد

کریں گے، ہم رائے عامہ کو تبدیل کریں گے تاکہ لوگ سمجھ جائیں کہ بریڈلے مانگ ہر لحاظ سے ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے غلط کاریوں کو بے نقاب کیا ہے۔

ان کے حامی کہتے ہیں کہ انھوں نے جو اطلاعات افشاء کیں، ان سے عرب موسمِ بہار کے لیے جوش و جذبہ پیدا ہوا جس کے نتیجے میں اس سال شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطٰی میں کئی آمرانہ حکومتوں کا تختہ الٹ گیا، اور امریکہ میں دھرنا دینے کی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ امریکہ میں برپا تحریکوں نے بڑی بڑی کمپنیوں کے لالچ اور انتظام کی ناقص صلاحیتوں کو نشانہ بنایا۔ بہت سے لوگوں کو امریکہ کے بہت سے شہروں کی اکوپائی تحریکوں سے بسوں کے ذریعے احتجاج کے لیے آئے تھے۔ میننگ کے حامی کہتے ہیں کہ بریڈلے میننگ کو آزاد کرانے کی جنگ، ایک بڑی تحریک کا حصہ ہے۔ انہیں امید ہے کہ یہ جنگ چند مہینوں میں امریکی موسمِ بہار کی شکل اختیار کر لے گی۔ پرائیویٹ فرسٹ کلاس بریڈلی میننگ کی آزادی کے لئے ہونے والا یہ مظاہرہ فورٹ میڈ میری لینڈ کے اس مقام پر ہوا، جہاں بریڈلی میننگ کو ایک فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا، وہائٹ ہاؤس اور امریکی وزیر خارجہ ہلری کلنٹن کا کہنا ہے کہ وکی لیکس کے انکشافات نے لوگوں کی زندگیوں اور امریکی سلامتی کے لئے خطرات پیدا کئے۔ ان کے مطابق ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کچھ حساس معلومات کی حفاظت کی جانی چاہیے ۔

جن کا عام ہونا لوگوں اور تعلقات کی سلامتی کے لئے خطرہ ہے۔ دفاعی تجزیہ کار بھی بریڈلی کے اقدام سے اتفاق نہیں کرتے۔ مائیکل او ہنلن کہتے ہیں کہ اتنی ہزاروں دستاویز کو جاری کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، شاید چند سو دستاویز ایسی ضرور ہوں، جن کے بارے میں آپ کو لگتا ہو کہ حکومت ٹھیک نہیں کر رہی، اور آپ یہ بات ثابت کر سکیں۔ لیکن اب یہ بات واضح ہے کہ بریڈلے میننگ کو آزاد کرانے کی جنگ، ایک بڑی تحریک کا حصہ ہے۔ جو امریکی عوام میں ایک مثبت تبدیلی کا اظہار بھی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا آگے جاکر میننگ کی رہائی کی تحریک اور اصولوں کی یہ جنگ چند مہینوں میں امریکی میں مثبت تبدیلی کا پیغام ہوگا۔

دنیا پر حکمرانی کرنے والے بڑے بڑے خاندان

بڑوں کی موت بعض اوقات چھوٹوں کو بہت بڑا بنا دیتی ہے‘

تاریخ شاہد ہے کہ جو بھی حکمران دنیا کے کسی حصہ پر قابض ہوا، اس نے اس حکمرانی کو اپنے خاندان کی میراث سمجھا، فرعون، نمرود، شداد کے قصے تو مشہور ہیں۔ طاقت کے حصول کی فکر انسانی سرشت میں ازل سے شامل ہے۔ کہتے ہیں کہ بڑوں کی موت بعض اوقات چھوٹوں کو بہت بڑا بنا دیتی ہے‘ پاکستان میں بھی کئی سیاسی خاندانوں کی حکمرانی ہے، کچھ خاندان سیاسی منظر سے غائب ہوگئے اور کچھ نئے خاندان سیاست میں داخل ہوگئے، بھٹو خاندان اب سیاست سے غائب ہوگیا ہے۔ اب اس کی ایک اور نسل سیاست میں داخل ہے۔ اسی طرح سے کھر، جتوئی، گیلانی، چیمہ، کائرہ، بھروانہ، راجا، اور وٹو کی خاندانی سیاست بھی جاری ہے۔ ان میں سے اکثر کو ناکامی ہوئی ہے۔ اور اب ان سیاست پر اجارہ دار سیاسی خاندانوں کو اب اقتدار کے ایوانوں میں دوبارہ داخل ہونے کے لیے اگلے انتخابات میں قسمت آزمائی کا انتظار کرنا ہوگا۔ اب سیاست یا کاروبار ہی میں وراثت چلتی ہے۔ علم‘ ادب‘ فن‘ ثقافت میں کوئی ایسا دروازہ‘ کھڑکی‘ سیڑھی نہیں ہے جو بیٹے یا بیٹی کو باپ یا ماں کے بعد دلیپ کمار‘ شاہ رخ اور

ایستابھ بنادے۔ سیاسی وراثتوں کے سچے واقعات سے۔برصغیر کی ساری تاریخ اٹی پڑی ہے' بنیادی ضروریات اور سہولیات حاصل کرنے کے بعد انسان جس ڈگر پر چل پڑتا ہے، وہ عارضی ٹھکانے میں اپنے خزانے کو ابدی دوام بخشنے کی راہ ہے، اس کے لیے وہ طاقت اور اثر رسوخ حاصل کرتا ہے۔جو کبھی نظریے، کبھی قبیلے ، کبھی قوم تو کبھی دولت کے بل پر ہوتا ہے۔ پاکستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں ، ایسے خاندان اور قبیلے ہیں جو اپنے اثر رسوخ میں اونچے درجے پر ہیں۔ ، جنھیں انسانی برادری کے بااثر ترین خاندان سمجھا جاتا ہے، جن کا اثرورسوخ کئی نسلوں، دہائیوں اور صدیوں تک قائم رہا۔

نہروگاندھی خاندان

ہندوستانی سیاست میں موتی لال نہرو کا خاندان پوری سیاسی سلطنت و بادشاہت کا درجہ اختیار کرگیا ہے۔یہ خاندان سو سال سے زیادہ عرصے سے Dynasty ہندوستان، برصغیر اور دنیا کی سیاست میں کردار ادا کر رہا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے کنبے کا شمار بھارت کے ایک بااثر سیاسی گھرانے میں ہوتا ہے، جو بھارتی اقتدار پر دہائیوں براجمان رہنے والی انڈین نیشنل کانگریس کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے، جب کہ اس کے تین اراکین کو بھارت کی وزارت عظمیٰ کا قلم دان سنبھالنے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے، جن میں پنڈت جواہر لعل نہرو، ان کی آنجہانی بیٹی اندرا گاندھی اور نواسہ راجیو گاندھی شامل ہیں۔ان میں

سے موخر الذکر 2 کو قتل کیا گیا، جب کہ راجیو گاندھی کی اہلیہ سونیا بھارتی حکم راں جماعت کانگریس کی سربراہ ہیں اور ان کے گاندھی خاندان جوان سپوت راجیو اور راہول بھی احاطہ سیاست میں وارد ہو چکے ہیں۔۔ یہ کنبہ ایشیا کے جمہوری ممالک میں موروثی سیاست کے حوالے عہد حاضر کی اہم مثال ہے۔

بھٹو خاندان

پاکستان کے سب سے بڑے سیاسی خاندن یا رائل فیملی بھٹو خاندان کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو سے ہوا جو اپنے علاقے کے سب سے بڑے جاگیر دار ہونے کے ساتھ متحدہ ہندوستان میں جوناگڑھ کے وزیراعظم رہے' اور سندھ کی سیاست میں ان کا بڑا رول ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں یہ مقولہ درست ثابت ہوا کہ' وہ آیا اس نے دیکھا' اس نے فتح کیا۔ بھٹو کے مرنے کے بعد محترمہ نصرت بھٹو، اور پھر بے نظیر بھٹو نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ اس خاندان کا المیہ یہ ہے کہ یکے بعد دیگر اس کے سارے افراد ناگہانی موت کا شکار ہوئے، ذولفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ شاہنواز بھٹو کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا، مرتضی بھٹو کو پولیس نے ان کی بہن کے عہد حکمرانی میں قتل کر دیا۔ جبکہ بے نظیر بھٹو کو راولپنڈی میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ شاہنواز بھٹو، مرتضی بھٹو کے بعد اس خاندان کی ایک فرد صنم بھٹو زندہ ہیں۔ جبکہ دوسری، تیسری نسل میں بلاول بھٹو زرداری موجود ہیں۔

باچا خان

بڑے باچا خان.بڑے سیاسی لیڈر تھے پھر ان کے فرزند خان عبدالولی خان سیاست کی دنیا کے ایک.بڑے لیڈر کے طور پر ابھرے' اسی دوران بی بی مور محترمہ نسیم ولی خان بھی میدان میں اتریں' اب آگے ولی خان صاحب کے فرزند اسفندیار ولی اس وقت باپ دادا کی گدی سنبھالے ہوئے ہیں۔

نواز شریف

ضیاء الحق کے عہد میں ایک نیا سیاسی خاندان لاہور میں پیدا ہوا' میاں نواز شریف کو مسلم لیگ کا لیڈر بنایا گیا پھر اس کے ساتھ شہباز شریف آ گئے' پھر کچھ عرصے کے لئے محترمہ ڈاکٹر کلثوم نواز صاحبہ نے چارج سنبھالا' اب تیسری کھیپ حمزہ شریف اور حسین شریف ، مریم ، ڈاکٹر صفدر کی صورت میں ملک پر حکمرانی کر رہی ہے۔

رتھ چائلڈ خاندان

رتھ چائلڈ خاندان، جسے رتھ چائلڈز بھی کہا جاتا ہے، جرمنی کا ایک یہودی کنبہ ہے، جس نے بین الاقوامی بینکنگ اور مالیات میں ایک نئی جہت متعارف کروائی اور پھر پورے یورپ کو اسی رنگ میں رنگ دیا۔ اس خاندان کی سرگرمیوں

کو بام عروج پر پہنچانے کا سہرا در حقیقت آسٹریا اور برطانیہ کے حکم رانوں کے سر ہے، جب کہ اس کے عروج کا سفر 1744 میں پیدا ہونے والے میئر ایمشیل کی جدوجہد سے شروع ہوا، جس نے تمام تر جدوجہد کے ساتھ اس بات کا بھی خاص خیال رکھا کہ اس کے کاروبار کو خاندانی تسلط سے فائدہ پہنچے۔

اس ضمن میں میئر نے اپنے کنبے کے تمام لوگوں کو کلی اختیارات دیے، تاکہ انھیں کاروباری اہداف حاصل کرنے اور دولت میں اضافہ کرنے کی ترغیب ملے۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کام یاب رہا۔ ساتھ ہی اس نے خاندان کے اندر شادیوں کے چلن کو رواج دیا اور ہر حد درجہ کوشش کی کہ کوئی رکن بھی خاندان سے باہر شادی کی زنجیروں میں نہ جکڑا جاسکے۔

☆ پلانٹا جنیٹس

پلانٹا جنیٹس خاندان کو انگلش تمدن اور سیاسی نظام کی ترقی کے حوالے سے ٹیوڈر کنبے پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ ان کے دور اقتدار کی وضع کردہ روایات موجودہ دور میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اس کے برعکس ٹیوڈر عہد میں انگلش سرزمین پر چرچ کا قیام عمل میں آیا اور ایک طبقے کے مطابق اسے زریں دور بھی قرار دیا گیا لیکن اس کے باوجود پلانٹا جنیٹس کا تاریخی قد ان سے کم نہیں ہوتا کیونکہ اس کنبے کی بنیاد بطور شاہی گھرانا ہینری دوم نے رکھی تھی۔ جو

جیفری پنجم کا بیٹا تھا۔ پلانٹاجنیٹس خاندان میں سے انگلینڈ کا پہلا بادشاہ 12 ویں صدی میں تخت نشیں ہوا۔

جب کہ اس گھرانے میں مجموعی طور پر 15 افراد کو کلیسا کی باگ ڈور سنبھالنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ عرصہ 1154 سے 1485 تک محیط رہا، جس میں انگلش فنون و ثقافت پروان چڑھے، کیوں کہ ان شعبہ ہائے زندگی کو بابائے انگریزی شاعری جیفری چاسر کے زیر اثر اہل کلیسا کی جانب سے حوصلہ افزائی بھی حاصل رہی۔ اس خاندان کی تاریخی یادگاروں میں گوتھک طرز تعمیر کے مختلف شاہ کار شامل ہیں، جن میں ویسٹ منسٹر ایبے اور یارک منسٹر کی نو تزئین شدہ عمارات کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ سماجی شعبے میں اس کنبے کے ان مٹ نقوش میں جمہوری اور سیاسی حقوق کی متفقہ تاریخی دستاویز ''میگنا کارٹا'' سرفہرست ہے۔

یہ تاریخ ساز معاہدہ پلانٹاجنیٹس کے اقتدار کے آخری دور میں جان ون کے عہد حکومت میں ہوا تھا، جو آگے چل کر عمومی و آئینی قوانین کی ترقی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ انگلینڈ کی پارلیمان اور اس کا موجودہ نمونہ بھی پلانٹاجنیٹ عہد کی دین ہے۔ اس خاندان کی علمی خدمات کیمبرج اور آکسفورڈ یونی ورسٹی کی صورت آج بھی روشنی دے رہی ہیں۔

☆خان گھرانا

خان سے مراد فرماں روا اور خاقان کا مطلب حکم راں ہے، لیکن ان الفاظ کی کانوں میں بازگشت ذہن کو منگول سلطنت کے بانی چنگیز خان کے دور میں پہنچادیتی ہے، جس نے تاریخ میں ایک وسیع و عریض ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ اس نے شمالی ایشیا کے خانہ بدوش قبائل مجتمع کیا۔ بعد ازاں اس نے چنگیز خان کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس نے کاراختان خانات، قفقاز، خوارزمی سلطنت اور مشرق ومغرب کی کئی سلطنتوں پر حملے کیے۔ اس کے عرصہ حیات میں منگول سلطنت نے وسطی ایشیا کا قابل قدر حصہ اپنے تسلط میں لے لیا۔

چنگیز خان نے 1227 میں مرنے سے پہلے اوغدائی خان کو اپنا جانشیں مقرر کیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور پوتوں میں تقسیم کردیا۔ چنگیز خان کو منگولیا کے کسی نامعلوم مقام پر دفنایا گیا۔ اس کے بعد اس کی اولادوں نے سلطنت کو وسعت دینے کا سلسلہ جاری رکھا اور موجودہ دور کا چین، کوریا، قفقاز، وسطی ایشیائی ممالک سمیت مشرق وسطی اور مشرقی یورپ کے خطے بھی خان سلطنت کے زیر نگیں رہ چکے ہیں۔

☆کلاڈیا اور جولیس خاندان

دو کنبوں کے ادغام سے تشکیل پانے والا یہ خاندان سلطنت روما کے ابتدائی دور

میں بام عروج پر تھا، جس کے پانچ اراکین بالترتیب کیلیگیولا، آگسٹس، کلاڈیس، تبیرس اور نیرو 27 قبل مسیح سے 68 عیسوی تک تخت روم پر براجمان رہے۔ تاہم اس خاندان کے آخری فرماں روا نیرو کی خود کشی نے خاندان کے اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ مذکورہ پانچوں حکم رانوں کو باہمی شادیوں اور رضاعت کے ذریعے جولیو اور کلاڈیا خاندانوں میں یک جا رکھا گیا تھا۔ اس سلسلے کا بانی بسا اوقات جولیس سیرز بھی باور کیا جاتا ہے۔

حالاں کہ وہ کلاڈین خاندان کا فرد نہیں تھا۔ اس کی بہ نسبت آگسٹس کو اس خاندان کے بانی کے طور زیادہ واضح انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ جولین کلاڈین حکم رانوں میں جو اقدار مشترک تھیں، ان میں سب کے بالواسطہ طور سریر آرائے تخت ہونے کے ساتھ سلطنت روما کی توسیع اور بڑے پیمانے پر تعمیرات شامل ہیں۔ وہ عمومی طور پر اپنے دل میں عام آدمی کا درد رکھتے تھے، لیکن سینیٹ کے ارکان بسا اوقات ان میں غصے کی آگ بھڑکا دیتے تھے۔ قدیم مورخین نے انھیں گھمنڈی اور جنسی طور پر بے راہ رو بھی قرار دیا ہے۔

☆ چو خاندان

چو، چین کے منگ خاندان کے حکم رانوں کو کہا جاتا تھا۔ پہلا منگ حکم راں ہونگوو تھا، جس نے شاہی خاندان کے منگ کا لقب منتخب کیا تھا۔ جس کے معنی ذہین ہیں۔ اس کنبے نے چین پر 1368 سے 1644 تک حکومت کی، جسے انسانی تاریخ

میں سماجی کاموں اور حکومتی استقلال کے تناظر میں درخشاں باب قرار دیا جاتا ہے۔
اس کا سبب یہ بھی تھا کہ یہ خاندان نسلی اعتبار سے تجار کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔
1644 میں سقوط بیجنگ سے منگ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، جس کا محرک لی ٹزیچینگ کا زیر قیادت باغیانہ حملہ بنا۔

تاہم اسے بھی دوام نہ مل سکا اور جلد ہی منگ نمک خوار مانچو کے زیر اثر چنگ حکم رانوں نے عنان سلطنت سنبھال لی اور ان کا دور 1662 تک برقرار رہا۔ منگ عہد میں بحریہ کی توسیع سمیت لاکھوں افراد پر مشتمل بری افواج تشکیل پائیں۔ تعمیراتی منصوبوں پر عمل درآمد کے حوالے سے بھی اس دور یاد رکھا جاتا ہے، جس میں بڑی نہریں بنانے کے ساتھ 15ویں صدی میں بیجنگ کو بیرونی حملہ آوروں سے تحفظ دینے کے لیے عظیم دیوار قائم کی گئی۔ منگ سلاطین کو چین میں تہذیب کے ارتقاء و عروج سمیت سرمایہ داری نظام کے دوام کے تناظر میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆ہسبرگ خاندان

براعظم یورپ میں ہسبرگ گھرانا ایسا شاہی کنبہ ہے، جس نے باقاعدہ طور پر سلطنت روما کے لیے منتخب حکم راں فراہم کیے۔ یہ عہد 1452 سے 1740 تک محیط ہے۔ اسپین اور آسٹریا بھی اس خاندان کے زیر اقتدار رہے۔ اس خاندان کا تعلق

بنیادی طور پر سوئٹزر لینڈ سے تھا، جس نے پہلی بار آسٹریا پر حکومت کی۔ اس خاندان کا اقتدار 6 صدیوں تک قائم رہا۔ شاہی خاندان کے اندر ہونے والی شادیوں سے برگنڈی، اسپین، بوہیمیا، ہنگری اور دیگر خطے اس خاندان کی وراثت بنے۔
اس کے بعد سلطنت کو آرگو میں واقع ہسبرگ محل کی مناسبت سے موسوم کیا جانے لگا۔ اس سلطنت کا نصب العین آسٹریا کو خوش حال رکھنا اور دوسروں کو لڑتے رہنے دینا تھا، جس سے اس خاندان کا حاکمانہ اور سیاسی تدبر واضح ہوتا ہے۔ اس کنبے میں شادی کرکے حکم راں اس کی طاقت بڑھا دیتے تھے۔ ہسبرگ خاندان کی معروف شخصیت ماریا تھریسا ہے، جسے یورپ کی عظیم دادی بھی کہا جاتا ہے۔

☆پٹولمی خاندان

مقدونیہ کا یہ شاہی خاندان 3 سو سال تک مصر پر حکم راں رہا، جس کی مدت حکومت 305 سے 30 بعد مسیح تک ہے۔ اس کنبے سے سکندر اعظم کا تعلق ہے۔ وہ اپنے محافظوں کے طور 7 جرنیلوں اور نائبین کو ہمراہ لے کر رخت سفر باندھتا تھا، جو اس کے انتقال کے بعد والیان مصر بن گئے۔ سکندر نے خود کو پٹولمی اول کے طور پر پیش کیا تھا۔ بعد میں اسے ”سوتر“ یعنی نجات دہندہ بھی پکارا جانے لگا۔

بلیان مصر جلد ہی اس کنبے کو فراعین کا نعم البدل تسلیم کر بیٹھے۔ پٹولمی خاندان کا مصر سے راج رومی فاتحین نے ختم کیا۔ اس حوالے سے آخری دور کی معروف ہستی ملکہ قلوپطرہ ہفتم، جس نے جولیس سیزر اور پومپی کے درمیان سیاسی جنگ میں اہم کردار ادا کیا تھا، کی خودکشی مصر میں پٹولمک راج کا اختتام ثابت ہوئی تھی۔

☆مدیسی خاندان

فلورین کی بااثر مدیسی فیملی کا عہد 13 سے 17 ویں صدی تک محیط ہے۔ جس میں تین پوپ بشمول لیو دہم، کلیمنٹ ہفتم اور لیو یازدہم گزرے ہیں، جب کہ اس کنبے سے تعلق رکھنے والے لاتعداد حکم راں فلورینس کی تاریخ کا حصہ بنے، جن میں نشاۂ ثانیہ کے عہد میں فنون لطیفہ کو فروغ دینے والے لوریزو کا نام ہمیشہ میں یاد رکھا جائے گا۔

بعد ازاں اس خاندان کے لوگوں نے فرانسیسی اور برطانوی شہنشاہیت میں بطور رکن حصہ ڈالا، سگنور خاندان کی طرح انھوں نے بلدیاتی حکومتیں قائم کی اور فلورینس پر خاندانی طاقت سے غلبہ پایا۔ ان کی بدولت یہ اس شہر میں فنون اور انسانیت کے احیا کا ماحول تخلیق پایا، جو بعد ازاں اطالوی نشاۂ ثانیہ کے

لیے مشعل راہ بنا، مدیسی بینک نے بھی یورپ میں اپنی شہرت وامارات کے جھنڈے گاڑے۔ اپنی دولت کے بل پر اس خاندان نے پہلے فلورینس کو دست نگر کیا اور پھر پورے یورپ پر گرفت حاصل کرلی۔

☆ کیپٹین خاندان

یہ یورپ کا سب سے بڑا شاہی کنبہ تھا، جو دراصل فرانس کے ہف کیپیٹ کی نسل سے تھا۔ اسپین کا شاہ جان کارلوس اور لگسمبرگ کے گرینڈ ڈیوک ہنری بھی اسی گھرانے کی باربون شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ صدیاں گزرنے کے ساتھ کیپٹین پورے یورپ میں پھیل گئے۔ اس دوران انھوں نے براعظم کے ہر خطے پر حکومت کا شرف پایا۔ شاہی وقار کے باوجود اس کنبے میں جنسی بے راہ روی اور محرمات سے عقد کا رجحان موجود تھا۔ ہسپانوی سلاطین اس معاملے میں سب سے زیادہ بدنام رہے۔ آج بھی اسپین اور لگسمبرگ میں کیپٹین خاندان کا راج ہے۔

خوراک میں ملاوٹ اب عالمی مسئلہ بن گیا ہے

خوراک میں ملاوٹ اب عالمی مسئلہ بن گیا ہے، شمپین ہو یا برگر، دودھ ہو یا چاکلیٹ ، خوراک کے بند پیکٹ ہو، یا جنک فوڈ اب ہر جگہ اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ خوراک ملاوٹ شدہ نہ ہو، پوری دنیا میں خوراک میں ملاوٹ ایک عالمی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس ملک میں بھی خوراک پیدا کی جاتی ہے یا تیار کی جاتی ہے وہاں اس میں دھوکہ دہی کی جارہی ہے۔ میچل وائین برگ اسکیچ کے صدر اور چیف ایگزیکیٹیو ہیں۔ یہ کمپنی خوراک کے تحفظ کے لئے مشاورت فراہم کرتی ہے۔ دنیا میں شراب میں ایسی ملاوٹ کی جارہی ہے، جو انسانی جان کو انتہائی خطرے سے دوچار کر دیتی ہے، سب سے زیادہ ملاوٹ وڈکا میں کی جاتی ہے، اور یہ کاروبار بین الاقوامی طور پر پھیلا ہوا ہے۔ وڈکا گینگ باس کیون ایڈی شا شراب میں ملاوٹ کے جرم میں پکڑا گیا، اس کی کمپنی صنعتی پیمانے پر یہ کام کرتی ہے، تحقیقات کے دوران پتہ چلا کہ اس نے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ایسی بوتلیں فروخت کیں جس سے برطانیہ کو تئیس 23 ملین ڈالر ٹیکس کا نقصان ہوا۔ عالمی ادارہ صحت بھی اس مسئلہ پر جاگ اٹھا ہے۔ اور اب اس نے خبردار کیا ہے کہ ملاوٹ شدہ خوراک کے استعمال سے بڑے پیمانے پر وبائی امراض پھوٹ پڑنے کا خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) کی ڈائریکٹر جنرل مارگریٹ چان نے

سنگاپور میں ایک پریس کانفرنس کے دوران بتایا کہ بین الاقوامی تجارت میں اضافے کے نتیجے میں کسی وبائی مرض کے جراثیموں سے آلودہ خوراک دنیا کے کسی بھی حصہ میں پہنچ کر اس مرض کے وبائی صورت اختیار کرنے کی وجہ بن سکتی ہے اور جن ممالک کی بین الاقوامی تجارت کا حجم اور شہریوں کا غیر ملکی سفر دوسروں سے زیادہ ہے، وہ اس خطرے سے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ مارگریٹ چان نے حال ہی میں ای کولی سے یورپ بھر میں 4 ہزار افراد کے متاثر ہونے اور 51 کے ہلاک ہونے کی مثال دی۔ انہوں نے کہا کہ کسی ایک وبائی مرض کے بیک وقت کئی ممالک میں پھیل جانے پر کنٹرول ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔چٹ پٹے کھانوں میں جو مصالحہ جات استعمال ہو رہے کہا جاتا ہے اسwhite poision ہیں جسمانی صحت کیلئے انتہائی نقصان دہ ہیں، چینی جسے جیسے مشروبات (بوتلوں)کا حد سے زیادہ استعمال بھیCold Drinks کا اور کولڈ ڈرنکس صحت کیلئے انتہائی خطرناک ہے۔ملاوٹ شدہ خوردنی اشیا اور ادویہ کے کاروبار دنیا کے ہر ملک میں ہو رہے ہیں۔ ، مرے ہوئے جانوروں کے علاوہ ہر طرح کا حرام گوشت ،فروخت کیا جا رہا ہے

یورپ کے بعض ملکوں میں بیف مصنوعات میں گھوڑے کا گوشت ملانے کا اسکینڈل عام ہے تو جنوبی افریقہ میں ایسی پروڈکٹس میں گدھے کے گوشت کے ساتھ بکری اور بھینس کے گوشت کی ملاوٹ کا پتہ چلا ہے۔ جنوبی افریقہ کی معروف اسٹیلن

بوش یونیورسٹی کے مطابق مارکیٹوں میں دستیاب بیف.برگر اور ساسیجز
میں روایتی اعتبار سے گائے کا گوشت ہونا چاہیے تھا لیکن ان میں (Sausages)
ملاوٹ کرنے والوں نے گدھے کے گوشت کے ساتھ ساتھ بھینس اور بکری کا گوشت
بھی شامل کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ امر اہم ہے کہ یورپ کے خاصے ملکوں میں
بیف برگر اور دوسری ایسی مصنوعات میں گھوڑے کے گوشت کی ملاوٹ کا اسکینڈل ان
دنوں پھیلا ہوا ہے۔اسٹیلن بوش یونیورسٹی کے لیبارٹی ٹیسٹوں کے بعد بتایا گیا کہ بیف
برگر اور ساسیجز کی دو تہائی پروڈکٹس ملاوٹ شدہ گوشت سے تیار کی گئی تھیں۔
یونیورسٹی کے اینمل سائنسز کے پروفیسر لوورینس سی ہوفمین (Louwrens C.
Hoffman) کا کہنا ہے کہ جنوبی افریقہ میں بیف پروڈکٹس پر لیبل پر غلط معلومات کا
اندارج کرکے ایسی کمپنیوں نے اقتصادی، اخلاقی، مذہبی اور صحت کے معاملات کو متاثر کیا
ہے۔پروفیسر ہوف مین کا کہنا ہے کہ گوشت پروڈکٹس کی سخت نگرانی کے نظام کے نہ
ہونے کی وجہ سے ایسی ملاوٹ کا عمل سامنے آیا ہے۔ جنوبی افریقہ میں لیبل کے بغیر
مطابق کسی بھی خوراک کی فروخت قابل سزا ہے۔سویڈن کے ایکیا کی کینٹین پر بیف کے
کوفتوں میں بھی گھوڑے کے گوشت کی ملاوٹ پائی گئی۔اسٹیلن بوش یونیورسٹی کی
لیبارٹری میں 139 بیف کے نمونوں کے ڈی این اے (DNA) ٹیسٹ کیے گئے۔ بیف
کی یہ پروڈکٹس دوکانوں اور گوشت فروشوں کے اڈوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ ان
139 نمونوں میں سے 68 فیصد یعنی چورانوے سے زائد سیمپلز ملاوٹ شدہ تھے۔
پروفیسر ہوف مین کے مطابق ان

نمونوں میں غیر روایتی جانوروں کا گوشت مختلف مقدار میں شامل تھا اور ان جانوروں میں گدھے، پالتو بھینسوں اور بکریوں کے گوشت کے نمونے دستیاب ہوئے۔ لیبارٹری ٹیسٹوں کے دوران بعض بیف کی پروڈکٹس میں سویا سبزی اور گلوٹین کے اجزاء کے ساتھ ساتھ خشک گوشت کے اجزا بھی شامل تھے۔. برطانیہ میں بھی. برمنگھم سٹی کونسل نے حمزہ چکن. برگرز میں خنزیر کے گوشت کی ملاوٹ کا ذمہ دار روشن فوڈز (حمزہ فوڈز) کو قرار دیا۔ کونسل کا کہنا تھا کہ یہ درست ہے کہ ان. برگرز کو روشن فوڈ والوں نے کسی دوسری کمپنی سے بنوایا تھا تاہم اس کی ری پیکجنگ چونکہ روشن فوڈ والوں نے حمزہ چکن. برگرز کے نام سے کی ہے اسلئے اس میں کسی بھی قسم کی ملاوٹ کی ذمہ داری حمزہ فوڈ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ کونسل کی ہیڈ آف انوائرمنٹل ہیلتھ (ساؤتھ) جینی ملوارڈ نے اپنے بیان میں کہا کہ. برمنگھم سٹی کونسل اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ حمزہ فوڈ کے ان چکن. برگرز میں سور کے گوشت کی ملاوٹ پائی گئی ہے۔

ملاوٹ شدہ خوراک کا مسئلہ ان دنوں فرانس میں بھی ہے۔ فرانس کی سات سپر مارکیٹوں نے فنڈس اور کومیجیلنامی کمپنیوں کی جانب سے بنائے گئے منجمند گوشت کو ہٹا دیا ہے۔ خیال رہے کہ یہ اقدام. برطانیہ اور آئرلینڈ کی سپر مارکیٹوں میں ایسے بیف. برگر فروخت ہوتے پائے تھے جن میں گھوڑے کا گوشت پایا گیا تھا۔ اس سکینڈل نے کھانے کی تجارت کی یورپی یونین کے دیگر ممالک تک

ترسیل کے نظام کی پیچیدگی پر سوال اٹھا دے ہیں۔اس سکینڈل نے برطانیہ، فرانس، سویڈن اور رومانیہ میں کھانے کی تجارت کے ڈسٹری بیوٹرز کے بزنس کو متاثر کیا ہے۔اس بات کا بھی اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ کھانے کی تجارت سے منسلک یورپی یونین کے مذید گیارہ ممالک کا کاروبار متاثر ہو سکتا ہے۔فرانس کے وزیر خوراک کا کہنا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ فرانس میں ملاوٹ سے متاثرہ تمام مصنوعات کو ہٹا دیا جائے۔انہوں نے خبر رساں ادارے اے ایف پی سے گفتگو کرتے ہوئے کہاکہ حکومت فوڈ چین سے وابستہ تمام افراد سے تازہ ترین معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اس کا آغاز کیسے ہوااور اس سے کیا سبق حاصل ہوا؟ادھر رومانیہ کی حکومت اس بات کی تفتیش کر رہی ہے کہ برطانیہ اور فرانس میں بیف کیگوشت میں گھوڑے کی گوشت کی ملاوٹ کہیں اس کے کسی مذبح خانے سے تو نہیں ہورہی۔اس دوران برطانوی دارالعوام میں دیہی اور غذائی امور کی کمیٹی کی چیئرمین ہنّی میکنٹوش نے یورپی یونین سے گوشت کی درآمدت پر عارضی طور پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔وزارت ماحولیات کے سیکرٹری اوین پیٹرسن کا کہنا ہے کہ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔'یہ عوام کے خلاف ایک سازش ہے۔ یہ یا تو حد درجہ کی نااہلیت ہے یا پھر عالمی سطح کی مجرمانہ سازش ہے۔' جن برگرز میں گھوڑے کے کوشت کی ملاوٹ پائی گئی تھی وہ برطانیہ آئرلینڈ میں ٹیسکو اور آئیس لینڈ پر اور ریپبلک آف آئرلینڈ میں ڈیونز، لڈل اور ایلڈی نامی سپر سٹوروں پر

فروخت ہو رہے تھے۔انہوں نے بتایا کہ اس معاملے کی تفتیش شروع کی گئی ہے کہ آخر ہوا کیا۔ 'ہمارے پاس گوشت کے لیے کاروباری دستاویزات بھی ہیں اور ایک نہیں بہت سے کاغذات ہیں'۔

ملاوٹ میں بھارت بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ بھارت کے صحت و خاندانی فلاح و بہبود کے مرکزی وزیر، غلام نبی آزاد نے غذائی اشیا میں ملاوٹ کے مسئلے کو کینسر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اِس سلسلے میں وضع کیے گئے نئے قانون میں ملاوٹ کو ایک جرم قرار دیا گیا ہے جِس پر عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے۔اِس کے علاوہ، ملاوٹ کرنے والوں کو دس لاکھ روپے جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے راجیہ سبھا میں کہا کہ 2006ء میں پارلیمنٹ کے ذریعے منظور کردہ غذائی تحفظ کے قانون کو تین چار ماہ کے اندر نافذ کر دیا جائے گا۔اِس قانون میں غذائی قوانین سے متعلق مختلف ضابطوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اِس کی 101 شقوں میں سے 43 کو نوٹی فائی کیا جا چکا ہے اور باقی شقوں پر جلد ہی اعلان جاری کیا جائے گا۔ بھارت میں غذائی اشیا میں بڑے پیمانے پر ملاوٹ کا دھندا جاری ہے۔ بدعنوان تاجروں کے ذریعے چاول، دالوں اور گیہوں میں کنکر، پتھر ملائے جاتے ہیں جب کہ دودھ، گھی، آئس کریم اور خوردنی تیلوں میں بھی خطرناک اور صحت کے لیے انتہائی مضر اشیا ملائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ تاجروں کے ذریعے ادویات میں بھی بڑے پیمانے پر ملاوٹ کرکے لوگوں کی زندگی کے ساتھ

مذاق کیا جاتا ہے، اور آئے دِن اِس قسم کی بد عنوانیاں اور جعل سازیاں بے نقاب ہوتی رہتی ہیں۔ ریاستی حکومتوں کے اعدادو شمار کے مطابق سال 2008ء میں 63000 نمونوں میں سے 4000 اور اُس سے قبل 65000 نمونوں میں سے تقریباً 5000 نمونے ملاوٹی پائے گئے تھے ہمارے ہاں غذائی اجزاء میں ملاوٹ کے رجحان نے لوگوں کی صحت تباہ کردی ہے۔ سرخ مرچوں میں لال اینٹوں کا برادہ مکس کیا جاتا ہے، مٹر پر کپڑے کا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے۔ چم چم کو پھلانے کے لئے اس میں ڈٹرجنٹ پاؤڈر مکس کیا جاتا ہے،

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا تو کارخانوں سے نکلنے والے سکریپ نے وہاں کے لوگوں کے لئے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیئے چنانچہ یورپی صنعت کاروں نے سکریپ کی زائد مقدار کو خوشحالی اور ترقی کے نام پر افریقی ممالک میں فروخت کرنا شروع کر دیا مگر جب افریقہ میں اس ضائع شدہ اور مضر صحت سکریپ (پلاسٹک) سے بیماریاں پھیلنے لگیں تو افریقی عوام اس کے خلاف ہو گئے اور وہاں کی سماجی تنظیموں نے اس کی درآمد کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا یہ احتجاج اتنے جاندار اور موثر تھے کہ جس پر 1992 میں یورپی کمپنیوں اور افریقی ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس کے تحت افریقہ میں اس سکریپ (ویسٹ) پر درآمد پر پابندی لگ گئی۔ چنانچہ یورپی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اپنے اس ویسٹ کو ڈمپ کرنے کا مسئلہ (Dump) درپیش ہوا تو

انھوں نے جنوبی ایشیاء کا رخ کر لیا اور پھر ان ممالک میں نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت ، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں ہر سال لاکھوں ٹن سکریپ پلاسٹک آنا شروع ہو گیا۔
1992 کے اعداد و شمار کے مطابق میں صرف پاکستان میں ڈیرھ لاکھ ٹن کے قریب سکریپ آیا جس میں دیگر میٹریل کے علاوہ فوڈ کمپنیوں کا سکریپ بھی شامل تھا۔ جب وہ سکریپ مارکیٹ میں فروخت کیلئے آیا تو بد عنوان تاجروں نے اسے خرید کر اس میں مقامی سطح پر تیار کردہ غیر معیاری اشیاء بھر کر بیچنا شروع کر دیا جو سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہ ریپرز نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی قوانین کے تحت پابندی کے باوجود لاکھوں ٹن رولوں کی شکل میں درآمد ہو رہا ہے بلکہ سر عام اہم مارکیٹوں میں فروخت ہو رہا ہے۔

پاکستان کے معروف ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ " بعض ایسے جرائم ہوتے ہیں جن کے لئے نرم ترین دل رکھنے والے بھی ایک مثالی سزا دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ ان میں زنا بالجبر ، بچوں کے ساتھ زیادتی، بچیوں کا اغوا، اغوا برائے تاوان، بیگناہ لوگوں کا چھوٹے سے تنازع پر قتل شامل ہیں۔ میں اس فہرست میں ایک اور گھناؤنا جرم شامل کرنا چاہتا ہوں اور وہ کھانے ،پینے کی اشیاء میں ملاوٹ اور جعلی دواؤں کی تیاری اور ان کی فروخت ہے۔ سخت سے سخت ترین سزا بھی ان بھیانک جرائم کرنے والوں کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ یہ انسانی جانوں سے

کھیلتے ہیں۔ اللہ تعالٰی کا فرمان ہے کہ جس نے ایک انسان کی جان بچائی گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی، اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس نے کسی ایک انسان کی جان لی گویا اس نے پوری انسانیت کو ہلاک کیا۔

ڈاکٹر قدیر کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ جن طریقوں اور جن چیزوں سے اشیاء میں ملاوٹ کی جاتی ہے اسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے کہ یہ انسانیت کے مجرم ہمیں کیا کیا کھلا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ادرک کو تیزاب میں ڈبو کر صاف کرنا، نالوں کا پانی دودھ اور مشروبات میں ملانا، چمڑے کو رنگنے والے زہریلے رنگوں کو کھانے کی اشیاء میں استعمال کرنا خصوصاً بچوں کی اشیاء، چنے کے چھلکوں کو زہریلے رنگ سے رنگ کر چائے کی پتی میں ملانا،گاڑیوں کے تیل کو گھی اور کھانے کے تیل میں ملانا اور ان سے پکوڑے اور سموسے تیار کرنا جیسے جرائم ہیں۔ یہ سب کچھ حکومتی عہدیداروں کی آنکھوں کے سامنے بلکہ ان کی سرپرستی میں ہوتا ہے۔ یہ جرائم جاری ہیں اور ان میں روز.بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے کیونکہ حکومت اس سلسلے میں کوئی موثر اقدام نہیں اٹھا رہی ہے۔ اس میں عدلیہ کی جانب سے مقدموں کی سماعت میں تاخیر اور سخت سزاؤں کے فقدان نے بھی بڑا رول ادا کیا ہے۔ ابھی ہماری جوانی کے دور میں ہی کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ لوگ خاص طور پر مسلمان اس پست اخلاقی اور کردار کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور

افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ ممکن ہے کہ مسجد میں ہمارے ساتھ کھڑا نماز پڑھنے والا انہی لوگوں میں سے ایک ہو"۔

گذشتہ دنوں سپریم کورٹ میں مرغیوں کی خوراک میں سور کی چربی کی ملاوٹ کا مقدمہ بھی پیش ہوا تھا۔ جس میں عدالت نے تمام ملاوٹ شدہ خوراک تلف کرنے کا حکم دیا تھا۔ کیس کی سماعت کے دوران مرغیوں کی خوراک درآمد کرنے والی چودہ کمپنیوں کے نمائندے عدالت میں پیش ہوئے۔ اٹارنی جنرل نے عدالت کو بتایا کہ ملاوٹ شدہ خوراک کے ایک سو پچاس کنٹینر کراچی میں پکڑے گئے تھے جن میں سے زیادہ تر کنٹینرز کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اٹارنی جنرل کا کہنا تھا کہ جان بوجھ کر ایسی خوراک درآمد کرنا جرم اور قابل سزا اقدام ہے، عدالت کو بتایا گیا کہ پولٹری فیڈ میں سور کے گوشت کے اجزاء کی ملاوٹ ثابت ہونے پر پولٹری فیڈ درآمد کرنے والی چودہ کمپنیوں پر جرمانہ عائد کیا گیا تھا۔ملاوٹ شدہ اشیاء کو فروخت کرنا ایک بہت بڑا اور نا قابل معافی جرم ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں اشیائے خوراک میں ملاوٹ کرنا ایک سنگین جرم ہے اور اس جرم کی پاداش میں بعض ممالک میں سزائے موت تک دی جاتی ہے مگر ہمارے ملک میں متعدد دیگر شعبوں کی طرح اشیاء میں ملاوٹ، مہنگے داموں فروخت، دو نمبر مال کی سپلائی، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری اور سٹہ بازی جیسے جرائم فروغ پا رہے ہیں اس پر مستزاد کہ ان جرائم کی روک تھام کے حوالے سے حکومت کی فعالیت کہیں دکھائی نہیں دیتی جس کی بنا پر تمام بازار دو نمبر اور ملاوٹ شدہ اشیاء

سے بھرے پڑے ہیں۔ پوری دنیا میں ملاوٹ، جعلسازی، مضر صحت اشیاء کی خرید و فروخت کے سخت قوانین موجود ہیں مگر پاکستان میں بین الاقوامی رد کی ہوئی خوراک کی اشیاء خوردونوش اور تاریخ تنسیخ کے بعد والی اشیاء سکریپ کے ذریعے پاکستان میں امپورٹ ہوتی ہیں۔ یہاں لیبل تبدیل کئے جاتے ہیں، تاریخ تنسیخ کی تاریخ بدل دی جاتی ہے اور مارکیٹ میں کھلے عام فروخت کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک نیوز چینل نے بھی ملاوٹ کے حوالے سے ایک رپورٹ نشر کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ بلیوں کو بازار میں مینگو جوس کے نام سے فروخت کیا جا رہا ''Whisks'' پلانے والا امپورٹڈ جوس ہے اور ٹی وی چینل کی رپورٹ کے فورا بعد ڈی سی او کی ہدایت پر ڈی او فوڈ نے چھاپہ مارا اور دو افراد کو حراست میں لے لیا۔ مگر اسکے بعد کوئی بڑی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی اور نہ ہی کوئی بڑا امپورٹر پکڑا گیا۔ نہ وہ لوگ منظر عام پر لائے گئے جو اس گھناونے کاروبار میں ملوث تھے۔ تعزیرات پاکستان کے باب 14 میں اس حوالے سے قانون سازی تو موجود ہے۔ اسی طرح پیور فوڈ آرڈیننس 1960ء میں بھی سزائیں تجویز کی گئی ہیں مگر ان سزاوں کے باوجود جرم ہو رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ میڈیا تمام تر ثبوتوں کے ساتھ، علاقوں کے ناموں کے ساتھ ناقص اشیائے خوردنی کی تیاری کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں مگر پھر بھی موت کے ان سوداگروں کی

پکڑ نہیں ہوتی اور ان کا سد باب نہیں کیا جاتا۔ پنجاب میں جعلی دواؤں نے سو افراد کی جان لے لی۔ ان جعلی دواؤں کے لندن میں کیے جانے والے لیبارٹری معائنوں سے پتہ چلا ہے کہ عارضہ قلب کے مریضوں کو دی جانے والی ایک دوائی آسوٹیب جس سے پنجاب میں 100 سے زائد اموات واقع ہوئیں میں ملیریا کش مواد کی بہت زیادہ مقدار پائی گئی ہے۔ دوائی میں پائریمیتھامین محلول کی ملیریا کے مریضوں کے لیے درکار مقدار سے بھی 14 گنا زیادہ مقدار شامل کی گئی تھی۔ کمپنی کے مالکان نے ایک بیان میں بتایا کہ کسی شخص نے ستمبر میں یہ مواد ان کی فیکٹری سے چوری کیا تھا۔ ملک بھر کے شہریوں کو 60 فیصد سے زائد ملا؟ٹ شدہ خوردنی اشیا کھانے پینے کو مل رہی ہیں جس کی وجہ سے شہریوں کی بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مختلف سائنس دانوں نے پی اور پاکستان سوسائٹی آف دی فوڈ سائنٹسٹ اینڈ ٹیکنالوجی (PCSIR) سی ایس آئی آر کے زیراہتمام 23 ویں آل پاکستان فوڈ سائنس کانفرنس اور چوتھی فوڈ اینڈ نیوٹریشن ایکسپو میں ڈی جی پی سی ایس آئی آر ڈاکٹر شہزاد عالم نے کہا کہ اس وقت شہریوں کو زیادہ تر کھانے پینے کی اشیا ملاوٹ شدہ مل رہی ہیں اگر یہی طریقہ رہا تو آنے والی نسل کو ہم کیا جواب دیں گے۔ صاف ستھری کھانے پینے کی اشیا کی فراہمی کیلئے قانون سازی کی ضرورت ہے اس قانون سازی پر عملدرآمد کروانے کی ضرورت صوبوں کی ذمہ داری ہے۔

بد قسمتی سے ہمارا ملک بچوں کی صحت مندانہ نگہداشت کے حوالے سے ابھی بہت پیچھے ہیں۔ پاکستانی بچوں میں پیٹ کی بیماریاں بہت عام ہیں۔ جن سے ہر سال ہزاروں بچوں کی اموات بھی ہوتی ہیں۔ پیٹ کی یہ تمام بیماریاں بچوں میں زیادہ تر بغیر ابلا ہوا پانی پینے، ناقص اور مضر صحت اشیاء کھانے سے ہوتی ہیں۔ میو ہسپتال میں بچوں کی امراض کے ماہر ڈاکٹر فرید کا کہنا ہے کہ لاہور کے سرکاری و غیر سرکاری ہسپتالوں میں بھی ساٹھ فیصد مریض بچے ہی ہوتے ہیں اگرچہ ان میں ہر طرح کے امراض میں مبتلا بچے پائے جاتے ہیں مگر پیٹ سے متعلقہ امراض کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے اور اس کی وجہ مضر صحت کھانے کی اشیاء ہیں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں مضر صحت اجزا کی ملاوٹ اور غیر معیاری پیکنگ میٹریل کا استعمال عام ہونے کی وجہ سے شاید کوئی گھر ایسا ہو کہ جہاں بچے ان اشیاء کو کھانے سے بیماری کا شکار نہ ہوئے ہوں۔ بچوں کے کھانے کی اشیاء میں جہاں دیگر طریقوں سے ملاوٹ کی جاتی ہے وہاں معروف غیر ملکی کمپنیوں کے مسترد شدہ پیکنگ میٹریل میں بعض جعلساز گھٹیا اور غیر معیاری ٹافیاں، چاکلیٹ، بسکٹ، چپس، ادویات اور دیگر اشیائے خوردونوش پیک کرکے اور انھیں امپورٹڈ ظاہر کرکے فروخت کر رہے ہیں جس سے بچے پیٹ، معدہ اور جگر کے امراض کے علاوہ کینسر جیسی موذی بیماری کا بھی شکار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر فرید کا کہنا ہے کہ

مضر صحت ریپرز میں فروخت ہونے والی غیر معیاری چاکلیٹ، بسکٹ، آئس کریم اور دیگر اشیاء کھانے سے سب سے پہلے دانتوں اور مسوڑوں کی بیماریاں ہوتی ہیں بعد ازاں ایسی اشیاء گلے کی خرابی کا باعث بن جاتی ہیں پھر معدہ کی بیماری کا سبب بنتی ہے اور معدہ اور انتڑیوں میں سوزش پیدا کرتی ہے جس سے بعد میں ورم ہو جاتا ہے اور جگر کام کرنا چھوڑ دیتا ہے انہوں نے بتایا جب اشیاء کو ویسٹ پلاسٹک جسے یہ کمپنیاں تکنیکی بنیادوں پر مضر صحت سمجھتے ہوئے ضائع کر دیتی ہیں میں پیک کیا جاتا ہے تو اس کے کیمیائی اجزا کھانے کی چیزوں میں شامل ہو جاتے ہیں جو بعد ازاں کنسیر کا باعث بنتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خالص خوراک کا نہ صرف بچے کی صحت سے تعلق ہوتا ہے بلکہ تعلیم اور ذہانت سے بھی اس کا بڑا تعلق ہے کیونکہ طب کی تحقیق کے مطابق ملاوٹ شدہ چیزیں کھانے والے بچوں کی ذہانت نارمل سے کم ہوتی ہے۔

یہ پیکنگ میٹریل لاہور میں اخبارات کی فروخت کی سب سے بڑی مارکیٹ پیسہ اخبار کے بالمقابل مارکیٹ میں باآسانی دستیاب ہے جہاں سے نہ صرف لاہور بلکہ دیگر شہروں کے بدنیت تاجر 80 سے 150 روپے کلو کے حساب سے خریدتے ہیں اور اس میں ٹافیاں چاکلیٹ، چپس، آئس کریم اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء پیک کرکے انھیں امپورٹڈ ظاہر کرکے فروخت کرتے ہیں جن کو کھانے سے مرد عورتیں اور خصوصاً بچے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس میٹریل میں نہ صرف

مقامی فوڈ کمپنیوں کا میٹریل ہوتا ہے بلکہ یورپ کی مشہور زمانہ ملٹی نیشنل فوڈ کمپنیوں کی پراڈکٹ پارکل، ڈبل کریم، ڈائجسٹو بار چاکلیٹ، ہب نب چاکلیٹ، بن گوٹی بسکٹ، سنکر آئس کریم، ایرو بریک وے چاکلیٹ، روکی کریم ون، کٹ کیٹ جیلی اور وش کاش جیلی اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء کے خالی اور مسترد شدہ پلاسٹک کے لفافے (ریپرز) بھی شامل ہوتے ہیں۔ ملاوٹ کے خلاف ہمارے پاس قوانین بھی موجود ہیں۔ لیکن ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔ مرکزی حکومت نے اسے صوبوں کے سپرد کر دیا ہے۔

حکومت پنجاب نے صارفین کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے اور غیر معیاری، ناقص اشیائے خوردونوش و دیگر غیر معیاری، ناقص مصنوعات اور غیر معیاری خدمات یا سروسز کے متعلق شکایات کے ازالہ کے لئے کنزیومر پروٹیکشن ایکٹ 2005 نافذ کیا جا چکا ہے۔

صارفین اگر چاہیں تو اس بارے میں شکایت اور قانون کاروائی کر سکتے ہیں۔

1۔ اگر آپ غیر معیاری اشیایئے خوردونوش دیگر ناقص اشیا یا مصنوعات سے پریشان ہوں مثلاً غیر معیاری مشروبات، ادویات، ٹیکسٹائل، ہوزری، الیکٹرانک مصنوعات، کاسمیٹکس وغیرہ وغیرہ

2۔ اگر کوئی مینوفیکچرر یا تاجر کوئی خطرناک مصنوعات یا اشیا مناسب حفاظتی

اقدامات واضح کئے بغیر تیار کر رہا ہو یا جس سے صارف کو نقصان ہو یا نقصان کا اندیشہ ہو۔

3۔ کہیں پیک شدہ اشیا واضح قیمت یا اندرونی جزئیات ظاہر کیئے بغیر تیار کی جا رہی ہوں یا ظاہر کردہ جزئیات سے چیز مطابقت نہ رکھتی ہو۔

4۔ اگر کوئی مینو فیکچر ر یا تاجر کوئی ایسی چیز تیار کر رہا ہو یا فروخت کر رہا ہو جس کی جزئیات کوالٹی، یا

Date of Expiry , یا ,Date of Manufacturing

سے متعلق صارف کو بوقت فروخت آگاہ کرنا ضروری ہو اور ایسا نہ کیا گیا ہو۔

5۔ اگر صارف کو خرید کردہ اشیا یا مصنوعات پر فراہم کردہ فارنٹی یا وارنٹی سے متعلق کوئی شکایت ہو۔

6۔ اگر کوئی تاجر یا دوکاندار خرید کردہ چیز یا اسکی قیمت کی واپسی یا تبدیلی کے حوالے سے صارف کو بوقت فروخت آگاہ نہ کرے۔

7۔ اگر کوئی تاجر یا دوکاندار، صارف کو خریداری کی رسید دینے سے انکاری ہو۔

8۔ کہیں رسید پر فروخت کردہ اشیا کی تفصیل مثلاً متعلقہ چیز کی ساخت، مقدار، وزن، قیمت، تاریخ اور بیچنے والے دوکاندار کے نام اور پتہ کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

9۔ اگر کوئی دوکاندار یا تاجر ہو سیلر یا ریٹیلر فروخت کردہ اشیا یا

مصنوعات کی ریٹ لسٹ اپنے بزنس پوائینٹ پر واضح آویزاں نہ کرتا ہو۔

-10۔ صارف یا خریدار کسی غیر سرکاری ادارے مثلاً ہسپتال ، ریسٹورنٹ ، ہوٹل ، پٹرول پمپ، سی این جی سٹیشن، ٹرانسپورٹ کمپنی ، موبائل فون کمپنی، تعلیمی ادارے ، بنک، ٹیلی فون کمپنی ، ٹریول ایجنسی ، ویزا کنسلٹنٹس وغیرہ کی غیر معیاری سروس سے پریشان ہو یا نقصان اٹھا چکا ہو۔

-11۔ صارف یا خریدار سرکاری اداروں مثلاً واپڈا، سوئی گیس، واسا، پی ٹی سی ایل، ہسپتال ، تعلیمی ادارے، بنک وغیرہ کی غیر معیاری سروس سے متاثر ہو یا نقصان اٹھا چکا ہو۔

-12۔ صارف یا خریدار کسی پروفیشنل شخص مثلاً ڈاکٹر ، انجنئیر ، ٹھیکیدار، وکیل، کنسلٹنٹ ، ٹریول یا ویزا ایجنٹ ، ٹرانسپورٹر وغیرہ کی غیر معیاری سروس سے دوچار ہو یا نقصان اٹھا چکا ہو۔

-13۔ سروس کی نوعیت ایسی ہو کہ سروس دہندہ کو صارف سے معاہدہ کے وقت اپنی صلاحیت ، قابلیت یا سروس فراہم کرنے سے متعلقہ آلات کی کوالٹی سے متعلق صارف کو آگاہ کرنا ضروری ہو اور سروس دہندہ نے ایسا نہ کیا ہو۔

-14۔ مینوفیکچررز تاجر یا سروس دہندہ جھوٹ ، فریب، دھوکہ دہی اور غلط بیانی سے مصنوعات یا اشیا یا سروس کو خریدنے کی ترغیب دینے کے لئے اشتہار بازی کر رہا ہو اور اشتہار دہندہ کئے گئے وعدہ کو پورا نہ کرے یا وعدہ پورا نہ کر سکتا ہو۔

15۔ملاوٹ شدہ یا غیر معیاری مصنوعات یا اشیا کے استعمال یا غیر معیاری سروس سے آپ کے جان و مال کو نقصان کا اندیشہ ہو۔

مندرجہ بالا صورتوں میں صارف کنزیومر پروٹیکشن کونسل کے نام بمعہ اپنے حلفیہ بیان بغیر کسی کورٹ فیس اور وکیل کے درخواست دے سکتا ہے۔ اگر صارف اپنے کیس کو عدالت لے جانا چاہتا ہو تو اس کے لئے صارف کو پہلے 14 دن کا نوٹس متعلقہ کمپنی کو دینا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد وہ کنزیومر کورٹ رابطہ کر سکتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے خاندانی نظام کو بحال کرنا ہوگا، گھر کی خواتین کھانا بہت محبت سے بناتی ہیں، اس لئے گھر کا کھانا کھایئے اور صحت مند رہیئے، اس لئے بہتر ہے کہ کچھ باتوں کا خیال کریں، لہسن ادرک تازہ پیسیں، کھانے کو فریز کرنے سے گریز کریں، اتنا پکائیں کہ وہ فوری ختم ہو جائے، مائیکرو ویو کا استعمال اچھا رجحان نہیں، جہاں تک ہوسکے اس سے پرہیز کریں، مائیکرو ویو میں پلاسٹک کے برتنوں میں کھانا گرم کرنے سے کینسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ مارکیٹ سے ملنے والی تلی ہوئی اشیاء کے لئے استعمال ہونے والا تیل بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے اور مختلف جانوروں کی انتڑیوں، سینگوں اور نقصان دہ چکنائی سے بنایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ گھر میں بھی

تلنے والے تیل کو بار بار استعمال کرنا کینسر کا باعث ہے۔

ڈرون ٹیکنالوجی سے اب ہر چیز ممکن ہے۔

اڑنے والے کیمرے، بغیر پائلٹ کے طیارے، سمندر کھوجنے والے اور جاسوسی کرنے والے ڈرون،

ڈرون ٹیکنالوجی سے اب ہر چیز ممکن ہے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا کسی ہوٹل ویٹرز کی موجودگی کے بغیر آپ کا آڈر کیا ہوا کھانا ہوا میں اڑتا ہوا آپ کی میز پر خود آئے جائے۔ یا یہ کہ جہاز بغیر پائلیٹ کے آپ کو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ یا بغیر ڈرائیور کی کار آپ کو گھر لینے پہنچ جائے، یہ سب جدید دنیا کے تصوراتی خاکے نہیں ہیں بلکہ اب ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے ہی والا ہے۔ گوگل گلاس کی ٹیکنالوجی میں اب یہ بھی ممکن بنا دیا ہے کہ اڑتے ہوئے کیمرے جہاں چاہے بھیج کر اپنی ضرورت کے مطابق تصاویر اور ویڈیوز بنائیں اور چند سیکنڈ میں انھیں انٹرنیٹ پر لوڈ کردیں۔ ڈرون ٹیکنالوجی نے یہ سب کچھ ممکن بنا دیا ہے۔ اب ایسے پرس بھی ایجاد ہوگئے ہیں کہ آپ اپنے چہرے کو غیر ضروری تصاویر سے بچاسکیں۔ جب بھی کوئی کیمرہ آپ کی تصویر لینے کے لیئے حرکت میں آئے گا۔ یہ کیمرہ لگی ڈیوائس اسقدر روشنی پھینکے گی کہ آپ کا چہرہ ہی نظر نہیں آئے گا۔ ڈرون ٹیکنالوجی ہی کی بدولت

لندن کے ایک جاپانی ریستوران نے ایسی انوکھی اڑن ٹرے تیار کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو صارف کا کھانا اس کی میز تک خود پہنچائے گی۔ یہ انوکھی ٹرے نما ڈیوائس 25 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑیں گی اور انہیں آئی پیڈ کے ذریعے کنٹرول کرکے کسی تصادم سے بچا جاسکے گا۔ یو سوشی نامی اس ریستوران کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ اب اس عملہ آئی پیڈ کے ذریعے اس اڑن ٹرے کو کنٹرول کرنے کی تربیت حاصل کر رہا ہے تاکہ اس فوڈ ڈرون کی سروس کا آغاز کیا جاسکے۔ اس ٹرے میں 2 کیمرے میں لگائے گئے ہیں تاکہ اسے کنٹرول کرنے والا راستوں کو دیکھ سکے، یعنی اب بس ٹرے کو کھانے سے بھریں اور اڑا کر مطلوبہ میز تک پہنچائیں اور صارف کے جانے کے بعد واپس بلالیں۔ اس ٹیکنالوجی کی بدولت شائد نئی نسل روبوٹ سے اڑنے والے طیاروں میں سفر کرے۔ نیو میکسیکو سٹیٹ یونیورسٹی کے بغیر پائلٹ ایئر کرافٹ پروگرام کے ڈائریکٹر ڈاگ ڈیوس کہتے ہیں، ’ہمارا یقین ہے کہ طیارے کی صنعت میں بنا پائلٹ کے ہوائی جہاز بڑی تبدیلی ہوگا۔‘ بغیر پائلٹ کے طیارے فوج کے لیے نئی بات نہیں ہیں۔ کئی برسوں سے لینڈنگ کے خودکار نظام کی مدد سے ایف-18 کرافٹ اتارے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پائلٹ کے بغیر ڈرون لڑاکا طیارے جو کسی بھی جگہ قیامت برپا کر سکتے ہیں۔ ان طیاروں کو دور بیٹھے پائلٹ ریموٹ سے چلاتے ہیں لیکن ان کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایئر کرافٹ ایک خاص ہوائی راستہ کی پیروی کرتے ہیں اور مسئلہ پیدا ہونے پر خود نیچے اتر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاز کو ہوا میں "

اپنی پوزیشن، منزل اور موسم کی معلومات ہو۔ اس کے ساتھ ہی طیارے میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہئے کہ وہ راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دیکھ سکے اور اس سے بچنے کے اقدامات ڈھونڈھ سکے۔" اس بارے میں کہا جارہا ہے کہ امریکی بحریہ کا ایکس۔ بی 47 کرافٹ تکنیکی طور پر اور بھی جدید ہوگا۔ اس میں پائلٹ کی مداخلت کم سے کم رہ جائے گا۔ بیسویں صدی میں مسلسل کوشش ہوتی رہی کہ ہوا بازی کی ٹیکنالوجی کو کس طرح مزید جدت دی جائے۔ اس کے لئے الیکٹرانکس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا گیا اور کوشش یہ کی گئی کہ پائلٹ کا کردار کم سے کم رہ جائے۔آج کل کے بعض جدید طیاروں میں تو پائلٹ طیارے کو صرف رن وے تک لے جاتے ہیں اور اس کے بعد اڑان بھرنے سے لے کر جہاز کو محفوظ اتارنے کی مکمل عمل تقریباً خودکار ہی ہوتا ہے۔ فلائی بائی وائر ٹیکنالوجی نے پائلٹ اور جہاز کے انجن کے درمیان رابطے کو تبدیل کرکے رکھ دیا ہے کیونکہ اس ٹیکنالوجی سے اب طیارے کے کنٹرول کا کام پوری طرح کمپیوٹر سے کنٹرول ہوگیا ہے۔برطانیہ بیں پائلٹ بغیر مسافر طیارے کے استعمال کو اور آگے لے جانے کے مقصد سے ٹیکنالوجی کے میدان کی کمپنی نے حال ہی میں.برطانیہ کے آسمان میں ایک پائلٹ کے بغیر طیارہ اڑایا۔ اس طیارے پر مسافر سوار تھے اور انتظامات کے مطابق ہنگامی صورتحال پیدا ہونے پر ایک پائلٹ طیارے کا کنٹرول سنبھال لیتا۔ تاہم اس کی ضرورت نہیں پڑی اور تجربہ کامیاب رہا۔ "لوگ جہاز میں پائلٹ کی موجودگی اس لئے چاہتے ہیں کہ اگر جہاز ڈانواڈول ہوگا تو مسافروں

کو یہ تسلی رہتی ہے کہ طیارے کی سب سے آگے کی سیٹ پر ایک شخص ایسا ہے جو ان کی زندگی بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔بغیر پائلٹ کے تجرباتی پرواز کرنا ایک بات ہے، لیکن 350 مسافروں سے بھرے ایک جہاز کو بغیر پائلٹ کے بحر اوقیانوس کے اوپر بھیج دینا فی الحال ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ایک وقت تھا جب مسافر طیاروں میں پانچ پائلٹ ہوا کرتے تھے۔اب یہ تعداد گھٹ کر دو رہ گئی ہے لیکن جس طرح سے ٹیکنالوجی آگے بڑھ رہی ہے، جلد ہی کاکپٹ میں ایک پائلٹ رہ جائے گا اور پھر وہ وقت بھی آئے گا جب فوجی اور سائنسی کرافٹ کی طرح مسافر طیارے بھی دور سے کنٹرول کیے جا سکیں گے۔ سائنسدان کہتے ہیں تکنیکی ترقی کا آخری پڑاؤ ہے انسانی کنٹرول کو پوری طرح ختم کر دینا، اس کے لئے ضروری ہے کہ طیارہ اپنے فیصلے لے سکے۔آج یہ کام پائلٹ کرتے ہیں جو ریڈار پر نظر رکھ کر اور کھڑکی سے باہر دیکھ کر فیصلے لیتے ہیں لیکن مشین یہ سب دیکھ پائے اس کے لئے ضروری ہے کہ ویڈیو کیمرے، سینسر اور طاقتور کمپیوٹر فیصلے لینے میں حقیقی وقت میں اس کی مدد کریں۔جس طرح سے ٹیکنالوجی آگے بڑھ رہی ہے وہ دن دور نہیں جب طیارے بغیر پائلٹ کے اڑ سکیں گے لیکن ایک مسئلہ پھر بھی رہے گا۔ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا۔ عام لوگ اس بات پر کس طرح آسانی سے یقین کر لیں گے کہ بغیر پائلٹ کے طیارہ محفوظ ہو سکتا ہے۔تاہم ان اعداد و شمار کے بل پر فی الحال لوگوں کو سمجھایا نہیں جا سکتا کہ وہ بغیر پائلٹ والے طیارے پر سوار ہو سکتے ہیں۔ گانگو میں تو بغیر پائلٹ کے اڑنے والے

جہاز نگرانی کے لیے استعمال کرنے کی سلامتی کونسل نے اجازت دے دی ہے۔ اڑنے والے کیمروں سے ملنے والی معلومات کانگو میں اقوام متحدہ کی امن فوج کے کمانڈر کو فراہم کی جائیں گی۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ بغیر پائلٹ طیارے میں نگراں کیمروں کا ایسا نظام نصب ہے جو نو وڈیو کیمروں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس نظام سے ایک وقت میں پورے ایک قصبے پر نظر رکھی جاسکتی ہے اور اس کے کیمرے 65 مختلف عکس فراہم کر سکتے ہیں۔ امریکی فوج افغانستان ییں ایسے جدید ڈرون استعمال کر رہی ہے۔ جو ایک وقت میں کئی کیمروں سے بنائی جانی والی وڈیو مہیا کرتے ہیں۔ نگراں کیمروں کے اس نظام کو جو نو وڈیو کیمروں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ Gorgon Stare کا نام دیا گیا ہے۔ اس نظام سے ایک وقت میں پورے ایک قصبے پر نظر رکھی جاسکتی ہے اور اس کے کیمرے 65 مختلف عکس فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے بر عکس موجودہ ڈرون ایک کیمرہ استعمال کرتے ہوئے صرف ایک یا دو عمارتوں کی نگرانی کر سکتا ہے۔ امریکی فوج کے ایک اعلیٰ افسر میجر جنرل جیمس پوس نے اخبار کو بتایا کہ اب یہ مسلہ نہیں ہوگا کہ کیمرے کا منہ کس طرف کیا جائے کیونکہ جدید نظام سے پورے شہر پر نظر رکھی جاسکے گی۔ مگر اخبار کے مطابق یہ سوال ابھی باقی ہے کہ اتنی زیادہ تصاویر کو فوج کتنی جلد چھانٹی کرکے ضروری معلومات جنگ کے میدان میں متعلقہ حکام تک پہنچاسکے گی۔ حکام یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ ڈرون اس وقت تک کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا جب تک زمین پر حساس معلومات اکٹھی کرنے

کے لئے انسانی ذرائع موجود نہ ہوں۔اب یہ ڈرون دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹیوں کے ان گوشوں کی تصاویر کھینچنے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں جو اس سے پہلے انسانی نظروں سے چھپے رہے ہیں۔کچھ عرصے پہلے سوئس کوہ پیماؤں نے قراقرم میں ان ریموٹ کنٹرول ہیلی کاپٹرز کے ذریعے انتہائی خوبصورت تصاویر کھینچی ہیں۔اس منصوبے کے تحت سطح سمندر سے 19ہزار 685 فٹ بلند ٹرنگو ٹاور کی تصاویر کوہ پیمائی کے دوران ڈیوڈ لاما اور ان کے ساتھی پیٹر اورٹنر نے کھینچی۔اس سے قبل ہیلی کاپٹرز کے ذریعے ایسی فوٹوگرافی کی جاتی تھی مگر یہ کام بہت مہنگا اور اکثر خطرناک بھی ثابت ہوتا تھا، جبکہ ہیلی کاپٹروں کے پروں میں مٹی، برف اور ہوا سے خرابی کا امکان بھی ہوتا تھا جس سے اس پر بیٹھے افراد کی جانیں خطرے میں پڑ جاتی تھیں۔مگر اب چند کلو گرام وزنی اور انتہائی سستے ڈرونز کے ذریعے یہ کام بہت آسان اور خطرے سے پاک ہوگیا ہے۔ماہرین کی پیشگوئی ہے کہ ڈرون کیمروں کا استعمال جلد ہر کھیل میں ہونے لگے گا اور توقع ہے کہ اس سے پاکستان میں کوہ پیمائی کی صنعت کو بھی عروج ملے۔

دنیا بھر میں جتنا پیسہ اور محنت ہتھیاروں کی تیاری پر خرچ کی جاتی ہے اگر اسکا کچھ حصہ بھی امن کے کاموں میں استعمال کیا جائے تو یقیناً پوری دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ لیکن جناب کیا کیا جائے کہ دنیا کہ اکثر ممالک

امن سے زیادہ جنگ کے حامی ہیں۔

نیا امریکی ڈرون ہیلی کاپٹر : 65 آنکھیں 1.8 گیگاپکزل کیمرہ لئے ہوئے ہے۔ امریکی فوج نے ایک ڈرون (بغیر انسانی پائیلیٹ) ہیلی کاپٹر تیار کیا ہے جس میں 1.8 گیگاپکزل کا کیمرہ نصب کیا گیا ہے۔اس ڈرون ہیلی کاپٹر میں نصب اس طاقت ور کیمرہ کی مدد سے زمین سے کم و بیش بیس ہزار فٹ کی بلندی سے قریباً 65 مربع میل دور تک کی ویڈیو بنائی جاسکتی ہے۔اس ہمنگ .برڈ ہیلی کاپٹر کو یونانی دیوتا آرگس سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی 100 آنکھیں تھیں اور وہ تمام چیزیں دیکھ سکتا تھا۔ گو کہ اس ہیلی کاپٹر کی 100 نہیں بلکہ 65 آنکھیں ہیں جن کی مدد سے یہ مختلف ٹارگٹس کو دیکھ سکتا ہے چاہے وہ مخالف سمتوں میں ہی کیوں نہ جارہے ہوں۔اس ہیلی کاپٹر کی آزمائیشی پروازیں امریکی ریاست ایریزونا میں کیگئی ہیں۔ جلد ہی اسے افغانستان میں استعمال کیا جائے گا۔اپنے طاقتور کیمرہ کے علاوہ یہ ہیلی کاپٹر دیگر تمام جدید آلات سے بھی مزین ہے اور کسی بھی قسم کی ناہموار سطح پر بھی اتارا جاسکتا ہے۔امریکی محکمہ دفاع اور ہیلی کاپٹر تیار کرنے والی .برطانوی کمپنی کے مطابق جلد ہی اس ہیلی کاپٹر کی استعداد کو مزید .بڑھادیا جائے گا اور 65 کی بجائے اسکی 130 آنکھیں کردی جائیں گی جو رات کے وقت بھی بخوبی دیکھ سکیں گی۔ یہ ڈرون اب کھیلوں میں بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ آئی سی سی چیمپنز ٹرافی کے لئے

اسپائیڈر کیمرہ استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرین اسپائیڈر کیمرے کو ڈرون قرار دے رہے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ھیلی کاپٹر کا بھی کام کر رہا ہے۔آئی سی سی چیمپنز ٹرافی کے لئے اسپائیڈر کیمرہ میدان کے اوپر آپریٹ کرتا ہے۔تار کے سہارے اسے ریموٹ سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ لیکن ٹورنامنٹ کی پلے انگ کنڈیشن کے مطابق اگر بیٹنگ کے دوران کسی بیٹسمین کا اسٹروک کیمرے سے ٹکراتا ہے تو گیند کو ڈیڈ قرار دے دیا جائے گا۔ حالانکہ جتنی بلندی پر یہ کیمرہ ہے اس پر بیٹسمین کو دس رنز ملنا چاہیے۔ سابق انگلش کپتان ایلک اسٹیورٹ نے اس کیمرے کو غیر ضروری قرار دیا ہے۔انہوں نے کہا کہ اگر میں کھیل رہا ہوتا تو یہ کیمرا میری توجہ بانٹتا۔ اسٹیورٹ کا کہنا ہے کہ اس سے کبھی کوئی کھلاڑی حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں یہ کیمرا گر گیا تو کھلاڑی زخمی ہو سکتا ہے۔ ویسٹ انڈیز کے مشہور کمنٹیٹر ٹونی کوزیئر نے اس کیمرے کو ڈرون قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جس دن یہ ڈرون کسی کھلاڑی پر گر گیا تو اس سے بڑا حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔ ڈرون کہا کہاں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ۔ چند سالوں سے شراب (وائن) بنانے والے بھی اس میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ پریسیژن وٹیکلچر میں کسی وائن یارڈ (انگوروں کے باغ) کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے بہترین فصل اگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان معلومات میں باغ میں سورج کی کرنوں کے لیے موضوں ترین مقامات سے لے کر مٹی کی نمی تک شامل ہیں۔پروفیسر گرین کا کہنا ہے کہ پریسیژن وٹیکلچر اور اس کے زیادہ

تر طریقہِ کار امریکہ اور آسٹریلیا میں شروع ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ کاروباری مقاصد کے لیے کھولے گئے وائن یارڈز کے مالکان کے پاس اب کافی پیسے ہوتے ہیں اور انہیں کافی رقبہ بھی دیکھنا ہوتا ہے۔انیس سو اسی کی دہائی میں اس شعبے پر کام شروع کرنے والے پروفیسر بتاتے ہیں کہ پریسیژن وٹیکلچر میں پہلا قدم ہوتا ہے باغ کی فضائی تصاویر بنانا۔ اس کے لیے ماڈل جہازوں میں کیمرے نصب کیے جاتے ہیں اور یہ پھر باغوں کے علاقے میں پرواز کرتے ہیں۔آج کل استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔پروفیسر گرین ایک آئی پیڈ کے ذریعے 'پیرٹ اے آر' ڈرون جہاز اڑاتے ہیں جس میں دو کیمرے لگے ہوتے ہیں جو کہ ویڈیو اور تصاویر دونوں بناتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ماڈل جہاز اڑانا کافی مشکل کام ہے۔ 'اس پرواز کو درست کرنے میں دس منٹ لگ گئے۔اس کی قیمت صرف تین سو پاؤنڈ ہے۔' ان فضائی تصاویر کی مدد سے پورے باغ کا نقشہ بنایا جاتا ہے جس میں پھر دوسری معلومات کو ڈالا جاتا ہے۔ مختلف مقامات سے مٹی کے نمونوں کے نتائج کی ان نقشوں پر نشاندہی کی جاتی ہے اور جی پی ایس کی مدد سے انگوروں کی افزائش کے لیے بہترین مقامات چنے جاتے ہیں۔ تھرمل تصاویر (درجہِ حرارت پر مبنی تصاویر) کی مدد سے مٹی میں فرق کو واضح کیا جاسکتا ہے۔ اگلا مرحلہ اب 'ہائیپر سپیکٹرل' تصاویر لینے کا ہے۔ ایسی تصاویر کھینچنے کے لیے پورے الیکٹرومگنیٹک' سپیکٹرم کا استعمال کیا جاتا ہے اور ایسی تصاویر میں وہ معلومات بھی ہوتی ہیں جو انسیانی آنکھ نہیں دیکھ

سکتی۔ایک بار جب یہ معلومات اکھٹی کر لی جاتی ہیں تو انھیں پھر ایک 'جیو گرافیکل انفارمیشن سسٹم' (جی آئی ایس) نامی سافٹ ویئر میں ڈالا جاتا ہے جو کہ اب نہ صرف لیپ ٹاپ کمپیوٹر بلکہ ٹیبلٹ اور سمارٹ فون پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان ایک طرف تو ڈرون ٹیکنالوجی کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہے تو دوسری جانب یہ بھی کہا جارہا ہے کہ پاکستان ڈرون ٹیکنالوجی پر دسترس رکھتا ہے۔ پاکستان نے جاسوس ڈرون میں کامیابیاں حاصل کرلی ہیں لیکن بمبار ڈرونز کی منزل ابھی بہت دور ہےبھارتی اخبار" ٹائمز آف انڈیا"نے الزام لگایاہے کہ پاکستان ڈرون ٹیکنالوجی کی مدد سے بھارت کی جاسوسی کر رہاہے، راجستھان کے ساتھ ملحقہ سرحد پر بھارتی فوج کی سرگرمیوں کی جاسوسی پر یہ طیارے مامور ہیں اور حالیہ دنوں میں ان جاسوس طیاروں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہواہے، رات میں چمک دار روشنی دکھاتے اور دوران پرواز اپنے پیچھے دھواں چھوڑتے ان پاکستانی ڈرون کو دیکھا جا سکتا ہے،یہ دن کے وقت بھی فعال ہیں، بھارتی سیکورٹی فورسز کے درمیان انتہائی دلچسپ اوراہم موضوع بنا ہوا ہے،پاکستانی جاسوس طیارے باڑمیر، جئے سالمر،بیکانراور راجستھان میں گنگانگر کی سرحد پر سرگرم ہیں،پاکستان چند سال سے امریکااور اٹلی کی مدد سے ڈرون تیار کر رہاہے،یہ طیارے بین الاقوامی سرحد سے صرف 500 سے 700 گز کے فاصلے پر 15 سو

سے 2ہزار میٹر کی اونچائی پر سرگرم ہیں،ان ڈرونز پر الٹرا ماڈرن کیمرے نصب ہیں جو کئی کلومیٹر بھارتی علاقے کی تصاویر لے سکتے ہیں،انہیں 25 سے 30 کلومیٹر کی دوری سے آپریٹ کیا جارہا ہے،ان ڈرونز سے کمپیوٹر آپریٹر نظام منسلک ہے جو ان ڈرون سے بنائی تصاویر کو وہ حاصل کرتے ہیں۔ بھارتی اخبار نے پاکستانی ڈرون کی ساخت اور صلاحیت پر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ایک پاکستانی کمپنی کی طرف سے ڈرون جاسوس تیار کیا گیا ہے، 20 کلوگرام وزنی یہ ڈرون 180 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرسکتا ہے، دس ہزار فٹ 3480 (میٹر) کی بلندی تک پرواز کرنے والے پاکستانی ڈرون کی رینج سو کلومیٹر ہے اور بیٹری بیک اپ کے ساتھ یہ مسلسل 4 سے 5 گھنٹے پرواز کرسکتا ہے۔اخبار لکھتا ہے کہ پاک فضائیہ نے 2004 میں ڈرون حاصل کرلیے تھے لیکن انہیں کئی تجرباتی مراحل کے بعد 2009 میں استعمال میں لایا گیا۔اس سے قبل 2003 میں پاکستان نے اٹلی سے ڈرون خریدے تھے۔

غیر ملکی میڈیا کے مطابق اب ڈرون ٹیکنالوجی کو امریکا کی جامعات میں پڑھایا جائے گا، ڈرون ٹیکنالوجی پڑھنے والوں کو بتایا جائے گا کہ ڈرون کس طرح بنتے ہیں اور ان کا آپریشنل سسٹم کیسے کام کرتا ہے، طلبا کو ڈرون ساز اداروں کا دورہ کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ آپریشنل روم میں بھی جاسکیں گے۔امریکی یونیورسٹیوں میں ڈرون ٹیکنالوجی کو بطور کورس شامل کرنے پر شدید تنقید کی

جارہی ہے، تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ خطرناک ٹیکنالوجی کو بغیر سوچے سمجھے نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دوسری جانب چین بھی اس ٹیکنالوجی میں پیش رفت کر رہا ہے۔ جس سے امریکہ پریشان ہے۔ عالمی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ چین اپنے تیزی سے بڑھتے ہوئے دفاعی بجٹ سے اپنی ڈرون ٹیکنالوجی کو جدید ترین اور موثر بنا رہا ہے جس سے یہ خدشات پیدا ہوگئے ہیں کہ وہ امریکا کو اس ٹیکنالوجی میں حاصل عالمی برتری کو جلد ہی چیلنج کرنے کے قابل ہوجائے گا۔ وائس آف امریکا کے مطابق جنوبی ساحلی شہر زہوہائی میں ایک حالیہ ایئر شو میں چین نے بغیر پائلٹ کے اڑنے والے جہازوں کا ایک جدید ماڈل پیش کیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ چین کے تیار کردہ مذکورہ ڈرون ماضی کے مقابلے میں بڑے تھے اور ان میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا تھا۔ ایئر ٹیکنالوجی سے متعلق کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ نمائش میں رکھے جانے والے کئی ڈرون بظاہر امریکی ڈرون ٹیکنالوجی کی نقل دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ واشنگٹن کو چین کے تیار کردہ ڈورنز پر تشویش ہے۔ جولائی میں امریکی محکمہ دفاع کی ایک مشاورتی کمیٹی کی جانب سے جاری ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ دفاعی شعبے میں بیجنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات اور جدید تحقیق امریکی ڈرون ٹیکنالوجی کیلئے ایک خطرہ بن سکتی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ چین کے نئے ڈرون خطرے کی علامت ہیں۔ تاہم چین کا کہنا ہے کہ ساحلی علاقوں اور بحیرہ چین کے پانیوں کی نگرانی اس کا مشن

پرامن ہے اور وہ نگرانی کا عمل موثر بنانے کیلئے 2015ء تک ساحلی علاقوں میں 11/ ڈرون مراکز قائم کرے گا۔امریکی صدر باراک اوباما اکثر یہ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں جنگ کی لہر کم ہوتی دکھائی دے رہی ہے جبکہ دوسری جانب امریکی فوج کی جانب سے بغیر پائلٹ کے ڈرون طیاروں کا مطالبہ مزید زور پکڑتا جارہا ہے۔

امریکی فضائیہ کی جانب سے ڈرون طیاروں کو چلانے کی تربیت دینے کے کورسز میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ نیو میکسیکو کے صحرا میں قائم امریکی فضائیہ کی ہولومین چھاونی پر لیفٹیننٹ کرنل مائک ویور کہتے ہیں" دنیا بھر میں فوجی کمانڈرز ڈرون ٹیکنالوجی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے"۔ دوسری جانب امریکا میں ڈرون طیاروں کے استعمال پر شدید تنقید بھی کی جارہی ہے۔ اس دوران یہ سوال بھی اٹھایا جارہا ہے کہ جب اگلے برس افغانستان سے امریکی افواج کا انخلاء طے ہے تو اس صورت حال میں امریکی فضائیہ نے ڈرون طیاروں کو آپریٹ کرنے کے کورسز میں کیوں اضافہ کیا ہے۔ادھر جاپان کی ایک سکیورٹی کمپنی نے ایسے ڈرونز کرائے پر فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جو کسی بھی عمارت میں سکیورٹی الارم بجنے کی صورت میں فوری طور پر وہاں پہنچ کر وہاں کی تصاویر اپنے مرکز کو نشر کرنا شروع کر دے گا۔جاپان کی ایک سکیورٹی کمپنی سیکوم Secom کی طرف سے تیار کیا

جانے والا یہ ڈرون ایک ہیلی کاپٹر کی شکل کا ہے اور اس میں نگرانی کے لیے ایک خصوصی کیمرہ لگا ہوا ہے جو کسی بھی ہوتے ہوئے جرم کی براہ راست تصاویر نشر کر سکتا ہے۔ سیکوم کی خاتون ترجمان آسوکا سیتو Asuka Saito کے مطابق: " یہ اڑنے والا روبوٹ ہمارے آن لائن سیکورٹی سسٹم کی طرف سے کسی کے غیر قانونی طور پر کسی عمارت میں داخلے کا سگنل ملتے ہی پرواز کر سکتا ہے۔" سیتو کا اس حوالے سے مزید کہنا ہے: " اس سے ہم جلد از جلد یہ جاننے کے قابل ہو جائیں گے کہ مذکورہ جگہ پر کیا ہو رہا ہے۔" آسوکا سیتو کے بقول چار پنکھوں کے ذریعے اڑنے والی یہ مشین دراصل جرمنی کی ایک کمپنی 'اسینڈنگ ٹیکنالوجیز Ascending Technologies' کے تیار کردہ ماڈل پر مشتمل ہے جس کے لیے کیمرہ، سوفٹ ویئر اور دیگر ضروری ٹیکنالوجی سیکوم کمپنی کی طرف سے تیار کی گئی ہے۔ سیکوم نامی اس جاپانی سیکورٹی کمپنی کے مطابق سیکورٹی کے لیے استعمال ہونے والے دنیا کا یہ پہلا خودکار پرائیویٹ ڈرون دو فٹ قطر کا ہے جب کہ اس کا وزن 1.6 کلوگرام ہے۔ یہ ڈرون کسی بھی فیکٹری کی سیکورٹی انتظامیہ کو ایسے مقامات کی نگرانی بھی فراہم کرتا ہے جہاں مستقل طور پر نصب سیکورٹی کیمروں سے نگرانی ممکن نہ ہو۔ یہ ڈرون طیارہ سیکوم کے آن لائن سیکورٹی سسٹم کا حصہ ہے اور جاپانی کمپنیاں یہ نظام پانچ ہزار ین ماہانہ کے عوض حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ رقم 58 امریکی ڈالرز کے قریب بنتی ہے۔ سیکوم کی ترجمان آسوکا سیتو کے مطابق یہ نظام اپریل 2014 کے بعد کرائے پر حاصل کیا جا سکے گا۔

جا سکتا ہے۔ سیتو کا مزید کہنا تھا کہ ان کی کمپنی یہ نظام دیگر ممالک کو بھی فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ امریکہ نے سمندر میں کام کرنے والے ڈرون بھی بنائے ہیں۔ امریکی بحریہ کے ایک افسر کا کہنا ہے کہ سی فوکس نامی ڈرونز کو پانچویں بیڑے میں شامل کیا گیا ہے جس کا دائرہ کار خلیج فارس اور بحیرہ عرب ہے۔ سمندر کی گہرائی میں کام کرنے والے اس ڈرون کی لمبائی چار فٹ ہے جو کیمرے اور سونار سے لیس ہے اور اسے سطح پر موجود کسی کشتی یا جہاز سے تار کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اسے بنانے والے جرمن ادارے، اٹلس الیکٹرونکس کے مطابق، یہ اپنے ساتھ دھماکہ خیز مواد تین ہزار دو سو فٹ دوری تک لے جا کر پانی میں موجود بارودی سرنگوں کو تباہ کر سکتا ہے۔ طیاروں کے بعد "ڈرون گاڑیاں" بھی میدان یں آگئیں ہیں۔ امریکی سرچ انجن گوگل نے سڑک حادثوں سے بچاؤ کیلئے بنا ڈرائیور کے خودکار گاڑیاں تیار کی ہیں۔ گوگل کی جانب سے خودکار گاڑیوں کو ایکسیڈنٹ پروف قرار دیا جا رہا ہے۔ گاڑیوں میں ویڈیو کیمرے، ریڈار سسٹم اور لیزر ٹیکنالوجی نصب ہے۔ راستوں کا میپ گاڑی میں پہلے سے تیار کیا جاتا ہے۔ گوگل ماہرین کے مطابق ان خودکار گاڑیوں میں آزمائشی مراحل کے دوران سان فرانسسکو میں ایک لاکھ 40 ہزار میل کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ صحت کے مطابق ہر سال دنیا بھر میں 12 لاکھ افراد ٹریفک حادثوں میں ہلاک ہو جاتے ہین تاہم گوگل ماہرین کا دعوی ہے کہ یہ خودکار گاڑیاں حادثوں کی روک تھام میں معاون ثابت

ہوں گی۔

خوشی پانے اور خوش رہنے کا راز

خوشی تو ایسی چڑیا ہے جو آپ کی کوشش کے بغیر آپ کے دامن پر اتر آتی ہے۔ اس کے لیے آپ نے کوشش بھی نہیں کی ہوتی۔ تیار بھی نہیں ہوئے ہوتے ۔ لیکن وہ آجاتی ہے۔ اشفاق احمد نے زاویہ میں خوشی کا راز بیان کرتے ہوئے یہ بات لکھی تھی۔ ہماری زندگی میں خوشی کی بہار اچانک اور چپکے ہی سے آتی ہے، دل کی کلی کب مسکرانے لگتی ہے اور کب خوشی کے بادلوں پر سوار ہو کر آپ کا دل مسرت سے بھر جاتا ہے، اس کا کوئی اصول قاعدہ قانون نہیں ہے۔ اس کے لئے نہ کسی سرمائے کی ضرورت ہے، نہ کسی دھن دولت کی، یہ خوشیاں تو آپ کے آس پاس پھیلی ہوئی ہیں۔ بس مسئلہ اتنا ہے کہ آپ کب ان کی جانب متوجہ وہتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ،،اگر آپ معمولی باتوں کی طرف دھیان دیں گے ، اگر آپ اپنی " کنکری " کو بہت دور تک جھیل میں پھینکیں گے، تو بہت بڑا دائرہ پیدا ہوگا۔ لیکن آپ کی آرزو یہ ہے کہ آپ کو بنا بنایا بڑا دائرہ کہیں سے مل جائے۔ اور وہ آپ کی زندگی میں داخل ہو جائے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ سیانے کہا کرتے تھے کہ خوش رہنا انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔

قدرت کا ایک قانون ہے جب تک آپ چھوٹی چیزوں پر ، معمولی باتوں پر ، جو آپ

کی توجہ میں کبھی نہیں آئیں، اپنے بچے پر، اپنے بھانجے پر، اور اپنے بھتیجے پر آپ جب تک اس کی چھوٹی سی حرکت پر خوش نہیں ہونگے تو آپ کو دنیا کی کوئی چیز یا دولت خوشی عطا نہیں کر سکے گی۔ روپے، پیسے سے آپ کوئی کیمرہ خرید لیں، خواتین کپڑا خرید لیں اور وہ یہ چیزیں خریدتی چلی جاتی ہیں کہ یہ ہمیں خوشی عطا کریں گی۔ لیکن جب وہ چیز گھر میں آ جاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت گھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔

میرے دفتر کے راستے میں بہت سی نرسریاں آتی ہیں۔ان کا مشاہدہ کرنا ہمیشہ میرے لیے قلب و نظر کی راحت کا سامان رہا ہے۔ان کے رنگ برنگے پھول، خوش نما پودے، سرسبز و شاداب درخت راستے سے گزرنے والے ہر شخص کو ایک خوش گوار ذہنی کیفیت سے روشناس کراتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ہمیں ناگوار لگتی ہیں۔ان پھولوں کے درمیان کیڑے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھول پودوں کے رنگ وخوشبو کے ساتھ کھاد کی غلاظت بھی ہوتی ہے۔ درختوں کی بلندی پر جو سرسبز شاخیں جھولتی ہیں، وہ ایک نسبتاً بد نما اور بدرنگ تنے کے سہارے پر بلند ہوتی ہیں۔یہ اور ان جیسے بہت سے ناگزیر حقائق اس دلکش دنیا کا لازمی حصہ ہیں۔

یہ حقائق ہمیں خدا کی دنیا کے ایک قانون سے روشناس کراتے ہیں۔وہ یہ کہ اس

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس اصول پر تخلیق کیا ہے، وہ آزمائش کا اصول ہے۔اس لیے یہاں حسن کے ساتھ بدصورتی، خوشبو کے ساتھ بدبو اور پھول کے ساتھ کیڑے کانٹے سب ہوتے ہیں۔اسی طرح دنیا میں خوشی کے ساتھ غم، آسانی کے ساتھ مشکل، راحت کے ساتھ زحمت اور امید کے ساتھ مایوسی ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح پھولوں کی دنیا میں منفی حقائق کو قبول کرکے ہی رنگ و خوشبو اور حسن و سبزے کی بہار کا لطف اٹھایا جاتا ہے، اسی طرح زندگی کی تلخ حقیقتوں پر کڑھنے کے بجائے انھیں حوصلے سے قبول کرنے ہی سے انسان دنیا کی نعمتوں کا فائدہ اٹھانے کے قابل ہوتا ہے۔

اس دنیا میں خوشگوار حالات کے ساتھ ہمیشہ منفی حالات پائے جائیں گے۔خوشی کا راز یہ ہے کہ اپنی نظر ہمیشہ اچھی چیزوں کی طرف رکھی جائے۔ جو بدلا جاسکے اسے بدلنے کی کوشش کرنے کے بعد ہر ناگوار چیز کو نظرانداز کردیا جائے۔ یہی اس دنیا میں حقیقی خوشی کا راز ہے۔خوشی پانے کی کنجی کیا ہے؟ دوست، حس مزاح، جنسی آسودگی یا دولت؟ روایتی سوچ کے مطابق خوش رہنے کا کوئی فارمولا نہیں ہے۔یا ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب پانے کے لیے گزشتہ کئی برسوں سے سائنسدان کوششوں میں مصروف ہیں۔

سائنسدانوں نے برسوں تک کی جانے والی اپنی تحقیق میں اس سوال کا جواب حاصل

کرنے کے لیے انسان کے سماجی، معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اگرچہ انہیں خوشی کا کوئی حتمی فارمولا تو نہیں ملا تاہم یہ ضرور ہوا کہ وہ خوشی کے حصول کے سلسلے میں چند ایسے اہم نکات کا کھوج لگانے میں کامیاب رہے ہیں، جو کسی بھی شخص کے ذاتی اور ثقافتی پس منظر سے قطع نظر اس پر لاگو ہو سکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک کتاب world Book یا 'خوشی کی عالمی کتاب' منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب The) of Happiness) میں خوشی کا راز پانے کی کوششوں میں مصروف اور اپنے اپنے شعبے میں دنیا کے بہترین محققین اور سائنسدانوں کے 100 مضامین کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا ماحاصل یہ ہے کہ خوشی کا جذبہ حاصل کرنے کے لیے صرف مادی دولت کا ہونا ضروری نہیں۔ روٹرڈیم کی ایراسمس یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر Ruut Veenhofen مثبت نفسیات کے شعبے کے ماہر ہیں۔ ان کے مطابق خوشی کا مطلب ہے 'اپنی ذاتی زندگی کی قدر کرنا'۔ انہوں نے خوشی کی اس تعریف کے ساتھ ہی دنیا کے 148 ممالک کے شہریوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ 'وہ اپنی زندگی میں موجود ہر چیز کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بتائیں کہ وہ اس وقت اپنی زندگی سے کتنے خوش ہیں؟'

Veen hofen نے خوشی کے لحاظ سے 10 تک کے پیمانے کو استعمال کرتے ہوئے 1 سے دنیا کا سب سے آسودہ ملک کوسٹاریکا کو (8.5) پایا۔ اس کے بعد ڈنمارک (8.3)، کینیڈا اور سوئٹزرلینڈ (دونوں 8.0) رہے۔ جبکہ جس ملک کے عوام میں سب سے کم

خوشی پائی گئی، ان میں افریقی ممالک ٹوگو (2.6)، تنزانیہ (2.6) اور زمبابوے (2.8) شامل ہیں۔

بیشتر محققین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ امریکی میگزین فوربز میں دنیا کے امیر ترین افراد کی جاری کردہ فہرست میں نام شامل ہونے سے یہ گارنٹی نہیں ملتی کہ وہ شخص نہایت آسودہ اور خوشیوں بھری زندگی بھی گزار رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق مادی دولت کا مطلب یہ نہیں کہ دولت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی بڑھتی جائے گی۔ مثال کے طور پر مادی دولت سے مالا مال ملک ناروے کو لے لیں، جو خوش باش لوگوں کے اسکیل پر 7.9 پوائنٹس حاصل کر سکا ہے۔ خوش رہنے میں مستحکم خاندانی تعلقات اور دوسروں کی مدد کا جذبہ بھی مدد دیتا ہے۔ ماہرین کے مطابق خوشی کا ایک اور اہم راز ہے، خود کا دوسرے سے تقابل نہ کرنا۔ یونیورسٹی آف آئیووا کے پروفیسر ڈیوڈ واٹسن کہتے ہیں کہ اگر خوش رہنا ہے تو 'خود کو حسد اور جلن سے آزاد رکھیں'۔ اسی طرح پیرس کی سوبورن یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والی پروفیسر کلاڈیا سینک کہتی ہیں کہ خود کا دوسروں سے موازنہ نہ کریں بلکہ اپنے منصوبوں اور اپنی آرزوؤں پر توجہ مرکوز رکھیں۔

وٹرڈیم کی ایراسمس یونیورسٹی میں سماجی حالات اور انسانی مسرت کے پروفیسر امیریٹس اور ڈیٹا بیس کے ڈائریکٹر پروفیسر روٹ ہاون کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعہ میں لوگوں کے اہداف اور اس کے نتیجے میں ان کی خوشی کے ذکر میں

منفی تعلق پایا۔ان کا کہنا ہے کہ 'عام طور پر بھلے ہی یہ سمجھا جاتا کہ خوشحال زندگی گزارنے کے لئے کسی ہدف کا ہونا ضروری ہے لیکن اس بارے میں متفرق آراء نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ کئی بار اداس افراد اپنے اہداف کے تئیں زیادہ بیدار ہوتے ہیں کیونکہ خوشی کے حصول کے لیے وہ اپنی زندگی کو بدلنا چاہتے ہیں۔'

اس تحقیق کا سب سے منفرد نتیجہ شاید یہ ہے کہ زندگی میں معنی تلاش کرنے اور خوش رہنے کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں دس ایسے ممالک ہیں، جہاں لوگوں میں خوشی کا عنصر زیادہ ہے۔ ان دس سب سے خوش ممالک میں کوسٹا ریکا، ڈنمارک ، آئس لینڈ، سوئٹزر لینڈ، ناروے، فن لینڈ، میکسیکو، سویڈن، کینیڈا، پناما،پروفیسر وین ہاون کا کہنا ہے: 'مجھے حیرت ہے کہ ہمیں ان دونوں میں کوئی تعلق نظر نہیں آیا۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے خوشی کا سب سے مضبوط تعلق ایک فعال زندگی سے ہے۔'

ان کا کہنا ہے: 'ایک خوشحال اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ فعال رہیں۔ خوشی کے لیے سرگرمی اور فعالیت زیادہ ضروری ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ کیسے ہے اور ہم ایسے کیوں ہیں۔' اس ڈیٹا بیس کی سب سے اچھی خبر یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو مزید خوشیوں بھری بنا سکتے ہیں اور اس کے بیرونی محرکات

میں صرف پیسہ ہونا ضروری نہیں۔ ہاون کہتے ہیں کہ 'تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہم خود کو خوش رکھ سکتے ہیں کیونکہ خوشی بھی وقت کے ساتھ بدلتی ہے۔ یہ تبدیلی صرف بہتر حالات کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ زندگی کو متوازن طریقے سے گزارنے سے بھی آتی ہے۔ بزرگ اور معمر لوگ نسبتاً زیادہ عقلمند ہونے کی وجہ سے بھی خوش رہتے ہیں۔' ان تحقیقات کے مطابق آپ اس وقت زیادہ خوش ہو سکتے ہیں جب:

آپ کسی کے ساتھ طویل عرصے تک رشتہ قائم رکھیں

جب آپ سیاست میں سرگرم ہوں

کام اور فرصت کے اوقات میں بھی سرگرم رہیں

ڈنر کے لئے باہر جاتے ہوں

کسی کے ساتھ گہری دوستی ہو (اگرچہ دوستوں کی تعداد سے خوشی میں اضافے کا تعلق نہیں ہے) تحقیق کے کچھ حیرت انگیز نتائج یہ بھی ہیں: جو لوگ میانہ روی کے ساتھ کوئی شغل کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خوش رہتے ہیں جو کوئی مشغلہ نہیں رکھتے۔ مرد اس معاشرے میں زیادہ خوش رہتے ہیں جہاں خواتین کو زیادہ مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ کسی مرد کی خوشی میں اس بات سے زیادہ اضافہ ہوتا کہ اسے خوش شکل تصور کیا جاتا ہے جبکہ خواتین کو اس بابت ان سے کم خوشی کا احساس ہوتا ہے۔جب آپ خود کو خوبصورت تصور کرتے ہیں تو آپ اس بات سے زیادہ خوش ہوتے ہیں کہ آپ واقعی خوش شکل ہیں۔ بچوں کی پیدائش سے

خوشی کی سطح کم ہو جاتی ہے لیکن آپ کی خوشی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ ہم جہاں خوشیاں تلاش کر رہے ہوں ان راہوں پر خوشیاں نہ ہوں جرمنی میں ہونے والی ایک مطالعہ میں نقل و حمل میں گزارے گئے وقت اور زندگی سے ملنے والے سکون کے درمیان گہرا تعلق پایا گیا ہے۔ کام پر جانے کے لئے ایک گھنٹے تک کا وقت سفر میں گزارانے والے لوگ ان کے مقابلے میں کم خوش تھے جو یہ سفر نہیں کرتے۔

اس مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ زیادہ تنخواہ والی ایسی نوکری بھی وقت برباد ہونے کی تلافی نہیں کر سکتی جس میں آمد و رفت کی دقتیں ہوں۔

پروفیسر ہاون اور ان کے ساتھیوں نے لوگوں کو ایسے کام کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی ہے جن سے ان کو خوشی ملتی ہے اور وہ اس کا ذکر آن لائن بھی کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ابھی تک 20 ہزار افراد اس کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اداسی بھی مفید ہے۔ یہ لال رنگ کی ایک ٹریفک لائٹ کی طرح ہے جس سے آپ کو اپنے منفی رویے پر لگام لگانے کا اشارہ ملتا ہے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی سے وابستہ ماہر نفسیات پروفیسر سونیا لیوبومرسکی کہتی ہیں کہ ’آیا ہم خوش باش رہنے والی شخصیت ہیں یا نہیں، اس کا 50 فیصد ہمیں پیدائشی طور پر ہی مل جاتا ہے۔ 10 فیصد کا تعلق ہمارے حالات زندگی سے جبکہ خوش رہنے کا باقی 40 فیصد دار و مدار ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے‘۔

بہت سے ماہرین کے خیال میں ورزش، حسِ مزاح، ملازمت، صحت اور جنسی آسودگی بھی خوش رہنے میں بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ ماہرین کے خیال میں اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بارے میں سوچنا بھی خوشی دیتا ہے۔

یونیورسٹی آف زغرب سے وابستہ ماہرینِ نفسیات ڈبروو کا میکلووِچ اور مائدہ ریاولیس نے خوش رہنے کے لیے چھ اہم عوامل بیان کیے ہیں۔ ان میں قابل اعتبار اور قریبی دوست، محبوب سے مستحکم رشتہ، اپنی صلاحیتوں کے مطابق نوکری، مستحکم معاشی زندگی، دن میں کم از کم تین مثبت تجربات اور جو کچھ زندگی میں حاصل ہے، اس کی قدر کرنا۔ اسی طرح پانچ اور چیزیں ایسی ہیں، جو خوشی دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ ہیں، خدا پر یقین، صاحب اولاد ہونا، مزید تعلیم کا حصول، اچھی صحت اور کچھ ناکامیوں سے تجربہ حاصل کرنا۔ خوشی کا احساس تعلیم و تربیت کے لئے بنیادی شرط ہے۔

سیانے کہا کرتے تھے کہ خوش رہنا انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔اِس بات کی تصدیق اب خوشی کے موضوع پر تحقیق کرنے والے ماہرین نے بھی کر دی ہے۔ان ماہرین کے مطابق خوشی کا 50 فیصد حصہ انسان کے اپنے جینز میں ہوتا ہے جو موروثی طور پر اس کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں۔ 10 فیصد خوشی کا انحصار انسان کے ارد گرد کے ماحول پر ہوتا ہے جبکہ خوشی کا 40 فیصد حصہ انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خوش رکھنے میں خود بہت ہی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

جرمن شہر ہائیڈل برگ میں ایک سکول کے ڈائریکٹر Ernst Fritz- Schubert کے لئے ایک چیز ہمیشہ سے پریشان کن تھی اور وہ یہ کہ آخر بچے سکول جانے سے بھی کیوں اتنا ہی ڈرتے ہیں، جتنا کہ دانتوں کے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے سے کیونکہ اِسی ڈر کی وجہ سے وہ نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے لئے خوشی کا احساس ایک بنیادی شرط ہوتا ہے۔ چنانچہ اب انہوں نے بچوں کے نصاب میں خوشی نام کا ایک مضمون شامل کیا ہے۔اس مضمون کی تعلیم کے دوران بچوں کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے اور ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔ اس مضمون کے پہلے ہی پیریڈ میں طلبا کو مختلف تصویروں والے کارڈز دکھائے جاتے ہیں اور ان سے کوئی ایک کارڈ پسند کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ پھر کسی دوسرے طالبعلم کو کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے طالبعلم کے بارے میں مثبت انداز میں بیان کرے کہ ا±س نے یہ کارڈ کیوں پسند کیا؟ مثال کے طور

ایک طالبعلم ایک درخت کی تصویر والا کارڈ پسند کرتا ہے، تو دوسرا طالبعلم اس کے بارے میں کہتا ہے: "تم نے یہ کارڈ اس لئے پسند کیا کیونکہ تمہاری اپنی جڑیں بھی بہت گہری ہیں اور تم ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہو۔" اس طریقے سے طلباء میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوتا ہے اور وہ آئندہ سکول شوق سے جاتے ہیں۔

خوشی کے مضمون میں بے شمار چیزیں شامل ہیں، جن میں سانس کی اور پر سکون رہنے کی مشقوں سے لے کر بولنے، اپنی خواہشوں کا اظہار کرنے، خواب دیکھنے اور اپنے مقاصد کا تعین کرنے تک بہت کچھ شامل ہوتا ہے۔اِس مضمون میں عملی تجربات کو اولین اہمیت دی جاتی ہے۔ ایسی عملی مشقیں کروائی جاتی ہیں، جن سے بچوں کا خوف جاتا رہے۔یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں نفسیات کی ماہر Sonja Lyubomirsky نے خوش رہنے کے بارہ طریقے وضع کئے ہیں۔ ان طریقوں میں کسی دوسرے کی مدد کرنا یا کوئی ایسا کام کرنا بھی شامل ہے، جس سے کسی دوسرے کو خوشی مل سکتی ہو۔

خوش رہنے کا ایک طریقہ Sonja Lyubomirsky یہ بھی بتاتی ہیں کہ انسان شکر گذار ہو۔ ماہرین کے مطابق خوش رہنے کے لئے انسان کو اپنی غذا کا خیال رکھنا چاہیے، اچھے دوست بنانے چاہییں، ورزش کرنی چاہیے، چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہونا سیکھنا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے، اپنی زندگی کا موازنہ دوسرے لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ انسان کو

چاہیے کہ زندگی میں کچھ اہداف مقرر کرے اور پھر جائزہ لیتا رہے کہ وہ ان اہداف کو کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اِس طرح ایک طویل فہرست ہے، جس پر عمل کرکے انسان خوش رہ سکتا ہے۔ اِس طویل فہرست سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ خوش رہنے کے لئے محنت بہرحال کرنا پڑتی ہے۔

بلاشبہ کسی بھی انسان کے لئے اپنے روزمرہ معمولات میں تبدیلی لانا آسان نہیں ہے۔ ایک طریقہ لیکن ایسا ہے، جس سے تبدیلی لانے کا یہ عمل قدرے آسان ہو سکتا ہے اور وہ یوں کہ انسان کچھ مخصوص عادات اپنا لے۔ کچھ ایسے کام اپنا لے، جنہیں وہ باقاعدہ وقفوں کے ساتھ کرے۔ مثلاً وہ طے کر لے کہ ہفتے میں تین بار ضرور ورزش کے لئے جائے گا یا یہ کہ ہفتے میں دو بار تو ضرور ہی اپنے سارے کنبے کے ساتھ بیٹھ کر شام کا کھانا کھائے گا۔ ایسے معمولات کو باقاعدگی سے ادا کرتے ہوئے انسان اپنی زندگی میں بھی بنیادی تبدیلیاں عمل میں لا سکتا ہے۔ لیکن کیا خوشی ماپنے کا کوئی پیمانہ ہو سکتا ہے؟ اس بارے میں بھی ماہرین تحقیق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بارے میں کرما نے کچھ کام کیا ہے۔ کرما بھوٹان میں مرکز برائے بھوٹانی علوم کے صدر ہیں۔ انہوں نے خوشی ناپنے کا ایک انڈکس یا GNH بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اب ہم جذبات کی ان مثبت حالتوں کی پیمائش کرتے ہیں، جن میں فراخدلی، رحم اور خوف کی عدم موجودگی کی جذباتی حالت شامل ہے۔ کسی معاملے میں ناامید ہو جانا اور حسد

بھی اس بات کو ماپنے کا ایک اچھا پیمانہ ہے کہ آیا کوئی شخص خوش ہے یا ناخوش۔ ہم ان حالتوں کی پیمائش بالواسطہ طور پر کرتے ہیں۔ اگر آپ اکثر بہت زیادہ غصے کا شکار رہتے ہیں تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وجہ کچھ بھی ہو لیکن آپ کی طبعیت میں خوشی کی طرف جھکاؤ زیادہ نہیں ہے۔" میری رائے میں تو خوشی کی تلاش میں بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے آس پاس، اپنے گھر، دوستوں میں چند اچھے تعریفی جملے، بھی کسی کے من کی کلی کھلا سکتے ہیں، ذرا کوشش تو کیجئے۔

ریڈ انڈین امریکی قبائیلی کہاں ہیں۔

آج دنیا میں امریکہ سماج اور معاشرہ کا ٹھیکیدار بنا ہوا ہے، اور قبائل کو ختم کرکے اپنا کلچر مسلط کرنا چاہتا ہے، دنیا کی تاریخ میں قدامت پسند قبائل کا کلچر اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، امریکہ جو افغانستان اور پاکستان کے قبائل اور ان کی روایات کے خلاف انھیں سرنگوں کرنے کی مہم میں مصروف ہے، آج تک اپنے ملک سے قبائیلی رویات کو ختم نہ کرسکا، امریکی ریڈ انڈین باشندے آج بھی اپنی روایات پر قائم ہیں، ان کی بستیوں میں جدید ساز و سامان اور ترقی بھی مفقود ہے او وہ اپنے قدیم رسوم رواج پر قائم ہیں۔ ریڈ انڈین (سرخ ہندی) امریکہ کے اصل باشندے ہیں ، جو تقریباً پندرہ تا بیں ہزار سال قبل ، آبنائے بیرنگ عبور کرکے ، شمال مشرقی ایشیاء سے.براعظم شمالی امریکہ پہنچے تھے۔ زیادہ تر لوگ منگول نسل کے ہیں۔ اگرچہ دیگر اقوام کے ساتھ اختلاط سے ان کی کئی قسمیں ہو گئی ہیں تاہم اب بھی بھوری جلد ، سیدھے ، کھردرے ، سیاہ بالوں اور بھوری آنکھوں کی وجہ سے ان میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ زراعت پیشہ تھے۔ مٹر ، تربوز ، آلو اور تمباکو کاشت کرتے ، پتھر کے اوزار بناتے اور آگ سے واقف تھے۔ کچھ عرصے بعد ان میں سے بعض قبائل وسطی اور جنوبی امریکہ کے علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے۔

جب کولمبس امریکا پہنچا تو اس مغربی نصف کرہ ارض پر بعض روایات کے مطابق 80 لاکھ اور بعض روایات کے بموجب سات کروڑ انڈین آباد تھے۔ مؤرخین کی اکثریت دو کروڑ پر متفق ہے۔ چونکہ کولمبس کے خیال کے مطابق وہ انڈیا پہنچ گیا تھا اس نے ان لوگوں کو انڈین کا نام دیا۔ بعد میں ہندوستان سے تمیز کرنے کے لیے انھیں ریڈ انڈین یعنی سرخ ہندی کہا جانے لگا۔ بعد میں وسطی امریکہ اور جنوبی امریکا کے انڈین بعد میں آنے والے لوگوں میں گھل مل گئے جس سے ایک نئی نسل وجود میں آئی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ریڈ انڈین کی تعداد میں کمی کے اسباب میں آب و ہوا کی تبدیلی اور وبائی امراض بتائے جاتے ہیں لیکن مورخین کے بقول اس کا اصل سبب سفید فام آبادکاروں کے ہاتھوں ان کی نسل کشی ہے۔ ایک محقق مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن) کا کہنا ہے کہ برِاعظم امریکہ کی دریافت مغربی دنیا ایک یہودی نائٹس (فری میسن) کولمبس سے منسوب کرتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ برِاعظم حضرت مسیح علیہ السلام سے ۵۲ ہزار سال پہلے آباد تھا اور مختلف زمانوں میں یہاں انسانی قافلے آتے جاتے رہے۔ کولمبس جس بحری جہاز کے ذریعہ امریکہ پہنچا۔ اس کا ملاح بھی ایک عرب جہاز راں تھا اور کولمبس کے پاس بحری راستوں کے عربوں کے تیار کردہ نقشے تھے لیکن مغربی انا پرستی کسی

مسئلہ میں کسی غیر یورپی کی برتری تسلیم نہیں کر سکتی۔ کولمبس سے پہلے وہاں متمدن آبادیاں تھیں جو منضبط قوانین و ضابطوں کے تحت زندگی گزارتی تھی۔ امریکہ کی آبادی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی سے زیادہ تھی۔ شمالی امریکہ دنیا کے 7 براعظموں میں سے ایک براعظم ہے۔ اس براعظم میں کینیڈا اور امریکہ اہم ممالک ہیں۔ اس براعظم کے قدیم باشندوں کو سرخ ہندی ریڈ انڈین قوم کے نام سے پکارا جاتا ہے 1492 میں کولمبس اور اس کے ساتھ آنے والے اور بعد میں آنے والے نوآبادکار یوروپین کی دہشت ناک خونی سرگرمیوں کے نتیجے میں ریڈ انڈینز کا تقریبا خاتمہ ہوتا چلا گیا جس کے نتیجے میں اب اس وقت دونوں امریکی براعظموں میں ریڈ انڈینز نہ ہونے کے برابر ہو گئے ہیں۔

آج مغربی دنیا میں کولمبس کو ایک عظیم ہیرو کی حیثیت حاصل ہے جس نے یورپ کو لوٹ مار کے لیے ایک وسیع و عظیم شکارگاہ فراہم کی۔ اس لیے نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ میں سب سے زیادہ اس دیوتا کے مجسمہ نظر آئیں گے۔ کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے صرف ۱۳سالوں میں اسی لاکھ ریڈ انڈین کا قتل عام کیا گیا اور پھر پندرہویں صدی کے اختتام تک امریکہ کی ریڈ انڈین آبادی جو ساڑھے نو کروڑ کے لگ بھگ تھی کیلی فورنیا یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے مشہور پروفیسر مائیکل مین کی معروف تحقیقی کتاب THE DARK SIDE OF DEMOCRACY کے مطابق صرف دو صدیوں کے بعد ان کی آبادی بڑھنے کے بجائے صرف پچاس لاکھ رہ گئی۔ باقی

نو(۹) کروڑ ریڈ انڈین سفید فام انسانیت کے ٹھیکیداروں کے مظالم کا شکار ہو کر نابود ہو گئے۔

ریڈ انڈین (سرخ ہندی) ہزاروں سال قبل مسیح سے امریکہ میں متمدن اور پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا اصل مرکز'' اوکلاہوما'' تھا۔ جہاں آج صرف چند ہزار ریڈ انڈین بچے ہیں اور ان کی پچاس زبانوں میں صرف اپاچی باقی ہے۔ یورپ کے مہذب مداخلت کاروں نے اعلان کیا کہ مغربی تہذیب کے لیے ریڈ انڈین قبائل کا خاتمہ ضروری ہے۔ نعرہ دیا گیا کہ ریڈ انڈین (سرخ ہندی) کو شہر بدر یا ختم کر دو۔ ۱۸۷۱ء کی سربراہی (Tosan) میں دو سفید گھوڑے چوری کرنے کے جرم میں جنرل ٹوسن میں ریڈ انڈین قبیلے کی اپاچی پر حملہ کرکے ۸ مرد اور ۱۳۱ ۶عورتیں قتل کی گئیں۔ مرد بڑی تعداد میں پہلے ہی قتل کیے جا چکے تھے۔ عورتوں کے قتل سے پہلے اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ اس کارنامے پر مقامی اخبار DENVER NEWS نے قاتلوں کو مبارک باد دی اور اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرنے والوں کی تعداد کم ہے دوگنی ہو سکتی تھی۔ قاتلوں پر مقدمہ کا ڈھونگ رچایا گیا۔ مقدمہ چلا۔ عدالت نے ان مجرموں کو بری کرنے میں صرف نو منٹ لگائے کیونکہ مہذب عدالتیں گورے کے خلاف کسی ریڈ انڈین کی گواہی قبول نہیں کرتی تھیں۔ اگر کبھی ریڈ انڈین گورے کو قتل کر دیتے تو

آج کی طرح ساری گوری نسلیں جمع ہو کر ان پر حملہ کرتیں۔ یورپین نسلیں ایک ہو کر ان پر حملہ کر دیتی اور غیر یورپین کے مقابلہ میں اپنے باہمی اختلافات بھلا دیتیں۔

ریڈ انڈین قبیلے نے کیلی فورنیا کی سرحد پر جنرل کیبی کو پکڑ کر قتل کر دیاMOCDOC گیا کہ جنرل شرمان کا حکم صادر ہوا کہ سوائی قبیلے کی عورتیں، بچوں، مردوں کے مکمل خاتمہ تک ہمیں نہایت سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے ان کے خلاف لڑنا ہوگا۔ غرض اس قبیلے کی مکمل نسل کشی اور ان کی زمینوں پر قبضہ کے بعد یہ جنگ ختم ہوئی۔ جارج واشنگٹن جیسا ہیرو اپنے جنرل کو ہدایت دیتا ہے کہ اِرکو قبیلے کی تمام باقیات کے خاتمہ تک امن کا کوئی نغمہ سننے کی ضرورت نہیں۔ تمام سرخ بھیڑیوں کو ختم کر دو۔ صدر واشنگٹن اور جیفرسن خود بہت سے غلام رکھتے تھے اور صدر انڈریو جیکسن جو ریڈ انڈین کا ہمدرد مشہور کیا گیا۔ اس کے دور میں ووٹ ڈالنے کا حق صرف گوروں کو حاصل تھا۔

اس نے صرف ایک گوری عورت یرغمال بنانے پر ریڈ انڈین کے ''کریک'' قبیلے کی بستیوں کو تباہ کرنے اور ان کی بیوی بچوں کو قبضہ کر لینے کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ ء میں جو رحم دلانہ آپریشن کیا گیا اس میں کریک قبیلے کے دس ہزار، چیرو قبیلے1803 کے چار ہزار، چاکٹ قبیلے کے چار ہزار باشندے ہلاک کیے گئے۔ امریکہ کے پانچویں عظیم ترین جمہوریت پسند صدر تھیوئرز روز ویلٹ کا ارشاد ہے کہ تمام جنگوں میں سب سے عظیم جنگ وہ ہے جو ریڈ انڈین وحشیوں کے خلاف لڑی گئی (چونکہ براعظم امریکہ پر غاصبانہ قبضے

نے یورپ کی گوری نسلوں کو دنیا بھر کی اقوام پر حملہ کرنے کے قابل بنا دیا)۔
کیلی فورنیا میں لاکھوں مردوں اور عورتوں کو جبراً علاحدہ کیا گیا۔ ان میں بھیانک بیماریاں عام کی گئیں۔ لڑکیوں کو طوائف بننے پر مجبور کیا گیا۔ چنانچہ 1860 سے ۲۱سال کی مدت میں صرف کیلی فورنیا میں ریڈ انڈین کی آبادی ۵۱ لاکھ سے کم 1884 ہو کر صرف ۱۳ہزار رہ گئی۔ قانوناً ریڈ انڈین کو قتل کرنے کی پوری آزادی تھی اس پر کوئی سزا نہیں تھی۔ ریڈ انڈین جہاں چلتے پھرتے نظر آتے گولیوں سے اڑا دیے جاتے۔ قتل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ انھیں ہیرو کا درجہ دیا جاتا۔ عورتوں بچوں تک کے قتل کی کھلی آزادی تھی۔ ریڈ انڈین جہاں چلتے پھرتے نظر آتے، ان کو پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ کر جبری مزدور بنا لیا جاتا۔ اس کام کے لیے ہر جگہ لاکھوں ڈالر مختص کیے جاتے۔۔ یورپین غاصب ان بے چاروں سے آئے دن معاہدے کرتے پھر معاہدے توڑ کر ان پر حملہ کر دیا جاتا۔ یہی یورپین فطرت اور ثقافت آج بھی ہے۔ ریڈ انڈین کو جن دشوار گزار خطرناک علاقوں میں دھکیلا گیا۔ وہ اتنے تنگ اور سنگلاخ تھے کہ وہاں اتنے لوگ سما نہیں سکتے تھے۔ اس طرح وہ خود بخود موت کے منہ میں چلے جاتے۔
کروڑوں ریڈ انڈین کے قتل عام کے علاوہ ان میں بیماریاں پھیلانے کے لیے مخصوص چیچک زدہ کمبل دیے گئے کہ چیچک کی وبا عام ہو۔ تا کہ ان کی

موت کا ذمہ دار گردشِ آسمانی کو ٹھہرایا جاسکے اور گورے قاتل ہر الزام سے بری ہو کر انسانیت و تہذیب کے معلم بنے رہیں۔ غرض اسی فیصد براہِ راست قتل نہیں کیے گئے بلکہ بالواسطہ ان کے مرنے کے لیے حالات پیدا کیے گئے۔ یورپین نوآبادکار امریکہ کے اصل باشندوں کو کرسچن بنانا بھی نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کے جملہ وسائل اور ہزار ہا سال کی دولت ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کا وجود ختم کرنا ضروری تھا۔ یورپ اور امریکہ نے اپنے ان قدیم باشندوں کو برابری کے حقوق نہیں دیئے، اس لیے جن ریڈ انڈین نے عیسائیت قبول کی اور یورپی کلچر اور تمدن کو اختیار کیا، ان کو بھی کبھی مغربی گورے معاشرہ نے دل سے قبول نہیں کیا۔ 2006 میں امریکہ میں سونامی کے سمندری طوفان میں دیکھا گیا۔ ہسپتالوں اور اولڈ ہومز (بوڑھوں کے گھروں) تک سے چن چن کر گورے مریضوں اور بوڑھوں کو نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا اور کالے عیسائی مریضوں اور بوڑھوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ یہی عیسائیت قبول کرنے والے ریڈ انڈین کے ساتھ ہوا۔ بے رحمانہ قتل کے ساتھ ان کی جلاوطنی کا عمل ایسی بے رحمی اور شقاوتِ قلبی سے کیا گیا۔ ان غریبوں کو خطرناک دشوار گزار غیر آباد علاقوں میں بندوق کے زور پر ہانک دیا جاتا کہ ہزار ہا بوڑھے عورتیں بچے بھوک کی Hoxic پیاس، خطرناک سفر کی صعوبتوں اور بیماریوں سے لقمہ اجل بن جاتے۔ مشہور کتاب KILL THE INDIAN SPARE THE MEN میں لرزہ خیز تفصیلات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں کہ یورپین جلادوں نے امریکی باشندوں پر اور غیر یورپین

نسل پر دنیا بھر میں ہر ہر دور میں کیسے بھیانک مظالم ڈھائے۔ آج بھی کسی گوری چمڑی والے کو کالے کرسچین کا اپنے چرچ میں آنا پسند نہیں۔ پوپ کی نجی فوج آج تک سوئٹزرلینڈ کی گوری نسل ہی سے رہی ہے۔ مغرب کی پوری تاریخ نسل پرستی اور انسانیت دشمنی کا شاہکار ہے۔ رومن امپائر نے عیسائیت قبول کرنے کے بعد یورپ اور اطراف کے ممالک کے 80 فی صد قبیلوں کا قتل عام کیا اور 20 فیصد کو کرسچن بنا کر غلامی میں لیا۔ یورپ کی اڑھائی سو سالہ مقدس مذہبی صلیبی جنگوں میں روم سے لے کر فلسطین تک راستے کے تمام شہروں کو ملا کر خاکستر کیا گیا اور شہریوں کا قتل عام ہوا۔ ان میں مشرقی رومن امپائر کے کئی ملکوں کے کرسچن شہری بھی تھے۔ یورپ کی یہ ذہنیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ گزشتہ سالوں میں عراق اور افغانستان میں 30 لاکھ سے زیادہ بے قصور عوام فضائی بمباری سے قتل کیے گئے۔ بش، ڈک چینی، رمزفیلڈ جیسے "مہذب" لوگوں نے کبھی اس درندگی پر ایک لفظ کی بھی معذرت نہیں کی۔ البتہ سفاک امریکی فوجیوں کو ہر جگہ ہیرو بنا کر خراج تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ یورپ کے ذہن، فکر و نفسیات میں یہ بات داخل ہے کہ ساری انسانیت (غیر یورپی) ان کی اطاعت یا ان کے ہاتھوں سزا پانے کے لیے خدا نے پیدا کی ہے۔ جدید تحقیقات کے لیے دیکھیے: انسائیکلوپیڈیا آف وائلنس یا کیلی فورنیا کے سوشیالوجی یونیورسٹی کے معروف پروفیسر مائیکل مین کی کتب۔ مائیکل مین کی تحقیقات بتاتی ہیں کہ یورپ کی اس مہذب نسل نے صرف بیسویں صدی میں ۳۳ کروڑ انسانوں کا دنیا بھر میں قتل عام کیا اور 17 کروڑ بے

قصور انسانوں کو بھیانک اذیت ناک سزائیں دیں۔ باقی پانچ ہزار سالہ معلوم تاریخ میں جو انسانیت کا قتل عام ہے ان میں بھی زیادہ تر چینی شہنشاہوں، تاتاریوں اور بھارت کے منووادیوں (برہمن) نے کروڑوں بھارت کے اصل باشندوں اوربدھوں کا قتل عام شامل ہے۔ پروفیسر مائیکل مین کی یورپین اقوام کے ہاتھوں انسانیت کی نسل کشی پر کئی تحقیقی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں 2005 میں دی ڈارک سائڈآف ڈیموکریسی اور2004 جمہوریت اور نسل کشی میں فطری تعلق خاص طور پر اہم ہیں ان کے بعض اہم مضامین لندن سے ہونے والے رسالے ''نیو لائف ایویو'' میں بھی چھپ چکے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف وائلنس بیس کنسلٹنگ ۳ حصے) اکیڈمی پریس1997 کے مطابق گذشتہ تین ہزار سالوں میں یعنی ۱۲۲ قبل مسیح سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک تقریباً تیں کروڑ چالیس لاکھ افراد قتل ہوئے اوریورپین غلبہ کے بعد صرف افریقی باشندوں کو پکڑ پکڑ کر جہاز بھر بھر کر غلام بنا کر لانے کے سلسلہ میں ایک کروڑ ستر لاکھ افراد قتل کیے گئے۔ حیوانیت ودرندگی کا یہ عمل اس سے کہیں زیادہ بہیمت وبے رحمی کے ساتھ براعظم آسٹریلیا میں دہرایا گیا۔ جدید تحقیقات کے مطابق.برّاعظم آسٹریلیاکے باشندوں کی خاصی تعداد مسلمان تھی اوران کا عرب جہاز رانوں کے ذریعہ باقی دنیا سے رابطہ تھا۔ وہ اسلام کی درخشاں مہذب عالمی تہذیب کا حصہ تھے۔ یورپ کی سفید چمڑی والی حیوانی نسل نے اس بری طرح اس پورے.برّاعظم میں نسل کشی کی کہ پورے.برّاعظم میں ایک بچہ تک زندہ نہیں چھوڑا جو دنیا کو

یورپی درندگی کی کہانی سناسکے۔ بیسویں صدی میں یہی دہشت گردی اور درندگی کا عمل باقی دنیا کی اقوام وتہذیبوں کے ساتھ دہرایا جارہا ہے۔

امریکہ کے اپنے جاری کردہ جرائم کے مطابق امریکی مسلح افواج نے 1776 عیسوی سے لیکراب تک دوسو بیس مرتبہ مختلف ممالک کے خلاف جنگیں کی ہیں۔گویا دوسو چونتیس سالوں میں دوسو بیس جنگیں۔تاکہ اقتصادی اور سیاسی دباؤ سے دوسرے ممالک میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں لئی جائے۔ہلاکو،چنگیز، تیمور اور ہٹلر کے ہاتھوں مارے جانے والوں کی کل تعداد تقریبا" تہتر ملین بنتی ہے جبکہ اکیلا امریکہ ایک سو ستر ملین سے زیادہ افراد کی ہلاکت کا باعث بن چکا ہے۔امریکہ نے ایک سو ملین ریڈ انڈین،ساٹھ ملین افریقی،دس ملین ویت نامی ایک ملین عراقی اور تقریبا" نصف ملین افغانیوں کو موت کی گھاٹ اتارا ہے۔ان سب کو ملایا جائے تو 171.5 ملین انسان بنتے ہیں جنہیں بلاواسطہ امریکی جارحیت کانشانہ بنناپڑا۔کولمبس نے 1492ء میں جب امریکہ دریافت کیا تو اس کی اس مہم میں کئی مسلمان جہاز راں بھی شامل تھے۔اور کولمبس کے بیٹے فرنانڈو کولون نے اپنی کتاب تو یہاں تک کہا تھا کہ اسے جینوا کے مسلمان جہاز رانوں نے ہی بتایا تھا کہ وہ مغرب کی جانب سفر کرکے متبادل راستے کے ذریعے ہندوستان پہنچ سکتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی ''دریافت'' کے اس تاریخی سفر میں دو ایسے جہاز راں بھی کولمبس کے ہمراہ تھے جن کے اجداد مسلمان تھے۔

اور وینسنٹ Martin Alonso Pinzon ان جہاز رانوں کے نام مارٹن الونسو پنزون
NINA اور PINTA تھے جو بالترتیب Vicente Yanex Pinzon یا نیز پنزون
جہازوں کے کپتان اور آپس میں بھائی تھے۔ یہ دونوں امیر کبیر اور ماہر کاریگر تھے اور
کی مرمت بھی کی تھی۔ SANTA MARIA سفر کے دوران انہوں نے پرچم بردار جہاز
پنزون خاندان کا تعلق مرینی خاندان کے سلطان ابوزیان محمد ثالث (1362ء تا
1366ء) سے تھا۔

کولمبس کا بیٹا فرنانڈو کولون یہ بھی لکھتا ہے کہ پوائنٹ کاویناس کے مشرقی علاقوں میں رہنے والی آبادی سیاہ فام تھی اور اسی علاقے میں ایک مسلم نسل کا قبیلہ ''المامی'' بھی آباد تھا۔ مینڈینکا اور عربی زبان میں المامی ''الامام'' یا''الامامو'' سے مشتق لگتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہبی یا قبائلی یا برادری کی سطح پر اعلیٰ حیثیت کے حامل تھے۔

حیاتیاتی یا جراثیمی ہتھیار سب سے پہلے برطانیہ اور امریکہ نے تیار کیے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے ایسے ہتھیار بھی تیار کیے تھے جو زراعت کو نقصان پہنچاتے ہوں مثلاً گندم اور چاول کی فصلوں کے مخصوص جراثیم جو کلسٹر بم کے ذریعے سے دشمن کے علاقے میں پھینکے جا سکتے ہوں یا ہوا میں چھڑکاؤ کیے جا سکتے ہوں۔ 1763-1756 میں فرانسیسیوں نے امریکہ کے قدیمی باشندوں (ریڈ

انڈین) میں ایسے کمبل تقسیم کیے جن میں خسرہ کے جراثیم تھے یعنی انھیں ایسے لوگوں نے استعمال کیا تھا جن کو خسرہ تھی۔ یاد رہے کہ امریکہ میں اس سے پہلے یورپی بیماریاں نہیں تھیں اور مقامی باشندے آسانی سے موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ ایسے ہی کمبل 1834 میں رچرڈ ھنری نے سان فرانسسکو میں تقسیم کیے اور کئی مقامات پر بیچے۔ بیسویں صدی میں امریکہ میں باقاعدہ طور پر فورٹ ڈسٹرکٹ کی تجربہ گاہ میں کئی جراثیم جنگی نقطہ نظر سے تیار کیے گئے۔

ایڈز کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ انسانی طور پر تیار کردہ جراثیموں کی مدد سے پھیلی۔ اور یہ امریکہ نے اپنی ایک فوجی تجربہ گاہ میں تیار کیے تھے۔ یہ فوجی تجربہ گاہ USAMRIID کہلاتی ہے۔ فورٹ ڈسٹرکٹ، میری لینڈ، امریکہ میں واقع ہے۔ اور امریکی کی خوبصورتی میں بھی اصل حصہ ریڈ انڈین کا ہے، جن کے علاقوں پر قبضہ کر کرکے انھیں بے دخل کردیاگیا۔ جھیل مشی گن شمالی امریکہ میں 5 عظیم جھیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ اس سلسلے کی واحد جھیل ہے جو مکمل طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں واقع ہے۔ اس کے گرد امریکہ کی ریاستیں انڈیانا، الینوائے، وسکونسن اور مشی گن واقع ہیں۔ اس کا نام قدیم ریڈ انڈین باشندوں کی زبان کے لفظ مشیگامی سے نکلا ہے جس کا مطلب "عظیم پانی" ہے۔ مشی گن ریاست کا نام اسی جھیل سے نکلا ہے۔ یہ جھیل رقبے میں کروشیا سے تھوڑی سی بڑی ہے۔

جھیل مشی گن کے کنارے آباد قدیم ترین لوگوں میں ہوپ ویل انڈین بھی تھے۔ ان کی ثقافت 800 عیسوی میں زوال پذیر ہوئی اور اگلے کئی سو سال تک اس علاقے پر لیٹ وڈ لینڈ انڈین لوگوں کا قبضہ رہا۔ سترہویں صدی کے آغاز میں یہاں مغربی یورپ سے مہم جو آئے جن کا سامنا لیٹ وڈ انڈین قبائل سے ہوا۔ سمجھا جاتا ہے کہ فرانسیسی مہم جو جین نکولٹ وہ پہلا غیر امریکی تھا جس نے 1634 یا 1638 میں جھیل مشی گن دریافت کی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں فرانسیسیوں نے اس جھیل کے کنارے چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں بنائیں۔ جھیل مشی گن کے ساحل پر پہلی بار 1779 میں آباد کاری شروع ہوئی۔ یہ آج کے شکاگو شہر کی جگہ تھی۔ جھیل مشی گن عظیم جھیلوں میں سے واحد جھیل ہے جو مکمل طور پر امریکہ کے ملک میں موجود ہے۔ باقی تمام جھیلیں امریکہ اور کینیڈا کے مابین مشترک ہیں۔ اس جھیل کا کل رقبہ 22400 مربع میل ہے۔ یہ جھیل رقبے کے اعتبار سے کسی ایک ملک میں موجود سب سے بڑی جھیل ہے۔ جھیل مشی گن کے کنارے پر ایک کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ افراد رہتے ہیں۔ لیکن شائد ہی کسی کو یہاں کے قدیم باشندوں ریڈ انڈین کا خیال آتا ہوگا۔

" فیشن کی دنیا میں نیا نام " اسلامک فیشن انڈسٹری

لباس انسانی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انسان اور لباس کا تعلق زمانہ قدیم سے ہے۔ لباس، جسے انسان نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کیلئے بنایا تھا، آپ کی تہذیب اور وقار کی علامت ہوتا ہے۔

یہ آپ کی شخصیت اور مزاج کے علاوہ آپ کی ثقافت، تہذیب کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ موزوں لباس کا انتخاب جہاں آپ کی شخصیت کو نکھارتا ہے، وہاں نا مناسب لباس کے انتخاب سے آپ کی شخصیت کا منفی تاثر قائم ہوتا ہے۔ لباس کے انتخاب میں مختلف عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب انسان کی پہچان اس کے لباس سے ہوتی تھی کیونکہ اس کا لباس اس کے علاقے کو نمایاں کرتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لباس کو ہر علاقے کی ضرورت کے مطابق بنایا گیا تھا۔ جیسے گرم اور سرد علاقے کے ملبوسات میں کافی فرق ہوتا تھا۔ مختلف تہواروں پر مخصوص لباس پہنے جاتے۔ ہمارے یہاں شلوار قمیض پہنی جاتی ہے اور شیروانی کو قومی لباس کہا جاتا ہے۔ ہماری نوجوان نسل نئے کلچر کے رنگ میں رنگی جا رہی ہے ہیں۔ درس گاہیں جو کہ کبھی درس و تدریس کا مرکز ہوا کرتی تھیں اب ایک فیشن شو کی طرح نظر آتی ہیں۔ تعلیم کو جہاں اہمیت دینی چاہیے تھی

وہاں لباس کوزیادہ ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ جامعات جہاں پر کسی دور میں تعلیمی اور ادبی مقابلے ہوا کرتے تھے، اب وہاں پر مہنگے ملبوسات کے مقابلوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ طالب علم مہنگے لباس پہنتے ہیں اور غور طلب بات تو یہ ہے کہ برینڈز کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ان میں سے بھی مہنگے برینڈز کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مغرب نے جہاں مسلمانوں کو کلچر کو تبدیل کرنے کی کوشش کی، وہاں اس کے برعکس ردعمل ہوا اب اسلامی ملکوں ہی میں نہیں دنیا بھر میں اسلامک فیشن کی اہمیت ہو گئی ہے۔ لباس کے انتخاب میں پہلے مذہبی اور ثقافتی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ فیشن کی دنیا میں ''اسلامک فیشن انڈسٹری'' کا رجحان بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ اس انڈسٹری کا سب سے اہم جز 'عبایا' ہے جو مسلمان خواتین ملبوسات کے اوپر پہنتی ہیں۔ عبایا کی مختلف کلرز، ڈیزائنز اور ورائٹی کی موجودگی کے سبب اس کی خرید وفروخت خاص کر دبئی اور دیگر خلیجی ممالک میں ایک منافع بخش کاروبار کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

حال ہی میں انڈونیشین دارالحکومت جکارتہ میں اسلامک فیشن شو ہوا مگر یہ کوئی روایتی فیشن شو نہیں تھا، یہاں جسم نمایاں کرنے والے ملبوسات، برہنہ ٹانگیں وغیرہ کے نظارے موجود نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں کی اس میں دلچسپی موجود تھی۔ ہ اسلامک فیشن فیئر شو میں شریک ہر ماڈل سر سے پاؤں تک

ڈھکی ہوئی تھی۔

دبئی میگزین ''عربین بزنس'' نے ایک سروے کرایا جس کے مطابق دبئی میں جس کمپنی کے سب سے زیادہ عبایا مشہور ہیں وہ ہے 'عبایا ایڈیکٹ'۔ خلاف توقع اسے میڈیکل کے پیشے سے وابستہ ڈاکٹر ڈی انا خلیل نے اپنے شوہر احمد ایوب کے ساتھ ملکر قائم کیا تھا۔ قسمت نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور عبایا ایڈکٹ دیکھتے ہی دیکھتے ہر جگہ مقبول ہو گئی۔

اسلامک فیشن ابھی بالکل نیا تصور ہے اور اس میں کوئی مارکیٹ لیڈر موجود نہیں۔ کچھ '' ڈیزائنرز عبایا ڈیزائن کر رہے ہیں لیکن وہ ایک عام مسلمان عورت کے روزمرہ پہننے کے لئے لمبی اور ڈھیلی ڈھالی آستیوں والے لباس کے لئے کوئی نئی چیز مارکیٹ میں نہیں لا رہے۔ ان لوگوں کے لئے ، جو بہت زیاد جدید انداز کے فیشن کے بجائے معتدل فیشن پر یقین رکھتے ہیں، کچھ عرصے پہلے تک کہا جا رہا تھا کہ جو کلچر ہماری یونیورسٹیوں میں نظر آتا ہے وہ ہمارے اسلامی معاشرے اور تہذیب کے بالکل برعکس ہے۔ ہماری ثقافت ہم سے دور ہوتی نظر آتی ہے۔انہیں اپنی ثقافتی اقدار اور ان کی اہمیت سے روشناس نہیں کرایا اور نہ ہی یہ بتایا جاتا لیکن اس کے باوجود اسلامی دنیا سے وابستہ لوگ سمجھتے ہیں کہ فیشن میں عریانیکی وجہ سے کیا نقصانات ہو رہے ہیں اور ہمیں اور ہماری

تہذیب کو کون سے مسائل درپیش ہیں۔ ہماری ثقافت میں قومی اور علاقائی ملبوسات کو بھی اہمیت ہے۔ یہ ملبوسات ہمارے کلچر کا حصہ ہیں۔اور ہماری الگ شناخت کا اظہار بھی ہیں۔ اس وقت اس بات کی ضرورت بھی ہے کہ ہم ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دے سکیں جو کہ اپنی تہذیب و ثقافت سے گہرا تعلق رکھتا ہو۔ بھارت اپنی فلموں اور ڈراموں سے اپنی ثقافت کی یلغار کئے ہوئے ہے۔ لیکن ابھی ہمارے لوگوں کو سمجھ ہی نہیں کہ اسلامی فیشن کی کتنی بڑی مارکیٹ ہے۔ رواں سال نومبر میں ’عبایا ایڈیکٹ‘ ملائیشیا میں ہونے والے مرسیڈیز بینز فیشن ویک میں بھیحصہ لے رہی ہے۔ جبکہ لاس اینجلس ، نیویارک ، میامی ، شکاگواور ٹیکساس میں ہونے والے فیشن شوز میں بھی کمپنی کی شرکت یقینی ہے۔ مڈل ایسٹ اور دبئ ایسی مارکیٹ ہے جس میں اسلامک فیشن کے حوالے سے بہت گنجائش موجود ہے۔ مغربی اور چین ایشین ملکوں میں پہلے ہی یہ فیشن اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ فیشن کی دنیا کے ایک ماہر کا کہنا ہے ’بلومبرگ ‘کے تازہ سروے نے اسلامک فیشن انڈسٹری کے بارے میں جاننے کے لئے جو سروے کیا اس میں چونکا دینے ‘والا انکشاف ہوا کہ اسلامک فیشن کی مارکیٹ کا حجم 96 بلین ڈالرز ہے۔

عبایا ایڈیکٹ کی جانب سے کرائے جانے والے آن لائن سروے کے مطابق معتدل فیشن صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔سروے میں حصہ لینے والے دس فیصد عیسائی مذہب کے ماننے والے بھی تھے جنھیں چرچ جاتے وقت کسی مناسب لباس کی ضرورت ہوتی

ہے۔ سات سو میں سے 70 فیصد لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں مارکیٹ میں کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں جو مکمل طور پر کور بھی کرے اور اسٹائلش اور فیشن ایبل بھی ہو۔

اب بڑے بڑے فیشن ڈیزائنرز بھی مناسب فیشن کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ''ویلن تینو'' نے بھی لمبی آستین والے ڈھیلے ڈھالے لباس بنانے شروع کر دیئے ہیں کیونکہ وہ جانتا ہے یہ ایک بڑی مارکیٹ ہے خاص طور پر یورپ میں اس کی بڑی مانگ ہے۔

یورپ میں 34 ملین مسلمان بستے ہیں۔ صرف 10 ملبوسات کے ساتھ ویب سائٹ سے اپنے کام کا آغاز کرنے والی 'عبایا ایڈیکٹ' کے اب ہر مہینے 500 آئٹمز فروخت ہوتے ہیں اور فیس بک پر اسے فالو کرنے والوں کی تعداد 27,000 ہے۔ پاکستان کے فیشن کے دل کراچی میں حجاب کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ حجاب سے مراد خواتین کا دوپٹے یا اسکارف سے منہ یا سر کا ڈھکنا، نقاب لگانا یا باقاعدہ برقع اوڑھنا ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ ایک دور میں پورے ملک کا فیشن کراچی کو دیکھ کر بدلتا تھا مگر اب یہی شہر ''پردہ'' کرنے میں باقی ملک اور خاص کر سندھ اور پنجاب سے آگے نکل رہا ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹیڈیز کے لیکچرار عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک اندازے کے مطابق شہر میں حجاب استعمال کرنے والی خواتین کی تعداد اگر کچھ سال پہلے تک 25 یا 30 فیصد تک تھی تو اب یہ تعداد تقریباً 50 فیصد ہو گئی

ہے۔ عبدالرحمٰن کا کہنا ہے کہ پہلے ان کے ڈپارٹمنٹ میں پردے میں آنے والی طالبات کی تعداد 100 میں سے 12 یا 13 ہوا کرتی تھی تو اب یہ تعداد 50 فیصد سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ گزشتہ دنوں ملک بھر میں ''یوم حجاب'' منایا گیا ہر جگہ اس دن کے حوالے سے پوسٹرز اور بینرز دکھائی دیئے۔ رمضان کی آمد کے ساتھ کراچی کی مارکیٹوں میں بھی عبایا مقبول ہے۔ 'یوم حجاب' فرانس میں مسلم خاتون مروہ الشربینی کے حجاب لینے پر چھڑنے والے تنازع اور بعد ازاں اس کے قتل کے سبب پاکستان میں شہرت کی وجہ بنا۔ قتل کا واقعہ کچھ سال پہلے 4 ستمبر کو پیش آیا تھا تب سے ہر سال اسی دن یوم حجاب کے طور پر منایا جاتا ہے۔پاکستان کی دینی و مذہبی جماعتیں خاص طور پر اس دن کا اہتمام کرتی ہیں۔

یوم حجاب کی مناسبت سے کراچی میں عربی طرز کے برقعے ''عبایا'' عام ہونے لگے ہیں۔ کسی زمانے میں سر تا پاؤں ایک ہی رنگ کا برقع چلا کرتا تھا جسے اس کی بناوٹ کے سبب ''شٹل کاک برقع'' بھی کہا جاتا تھا مگر اب یہ صرف خیبر پختونخواہ یا بلوچستان تک محدود ہوگیا ہے، اس کے مقابلے میں کراچی میں عبایا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

اس وقت شہر کی تقریباً ہر بڑی چھوٹی دکان میں عبایا اور حجاب فروخت ہو رہے ہیں۔ یہ مختلف اقسام اور اسٹائل کے ہوتے ہیں۔ ان میں کئی قسم کی کڑھائی اور

موتیوں کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ ایسا عبایا یا اسکارف بہت زیادہ مقبول ہے۔ خواتین اور نوجوان لڑکیاں چمک دمک والے اور نت نئے اسٹائلز والے عبائے اور اسکارف استعمال کر رہی ہیں۔

حجاب کی بڑھتی ہوئی مانگ کے سبب بازاروں میں حجاب کی دکانوں میں بھی اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ جو دکانیں پہلے صرف کپڑوں کی ہوا کرتی تھیں اب ان پر صرف عبایا فروخت ہوتے ہیں۔ حجاب کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ ایک دکاندار نے اس بارے میں بتایا کہ عبائے کی قیمت اس کے کپڑے اور اس کی کڑھائی و موتیوں کے کام پر منحصر ہوتی ہے۔ مارکیٹ میں دو ہزار سے لے کر آٹھ ہزار تک کے عبائے اور برقعے فروخت ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ حجاب اور عبائے کے استعمال میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک اور دکاندار نے بتایا کہ ہر خریدار خاتون نئے سے نئے اسٹائل والے اور کام والے عبائے مانگتی ہے جسکی وجہ سے عبایا بنانے والے کارخانوں میں اضافہ ہوگیا ہے جبکہ عبائے کے کاریگروں کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایک وقت تھا کہ بھاری کام والے کپڑے زیادہ فروخت ہوتے تھے لیکن اب کپڑوں کے ساتھ ساتھ برقعوں اور عبایوں کی خرید وفروخت بڑھ رہی ہے۔ دوسری جانب

عرب دنیا بھی بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ سوچ کے اعتبار سے، معاشرتی اعتبار سے یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے کے اعتبار سے بھی یہاں واضح فرق نظر آرہا ہے۔۔۔ اب یہاں بھی وقت سے آگے نکلنے کی باتیں ہورہی ہیں۔ تبدیلی کے اثرات مردوں تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ عورتوں نے بھی جدید دنیا کے تراش خراش کو اپنا لیا ہے۔ایک زمانہ تھا جب کسی عرب شہزادی کی عوامی مصروفیت کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر آج یہاں کی خواتین نہ صرف اپنے لباس کے انتخاب میں آزاد ہیں بلکہ وہ انتہائی فیشن ایبل دنیا کے معروف ڈریس ڈیزائنرز کے جدید تراش خراش والے کپڑے پہن کر مردوں کے شانہ بہ شانہ ' مووو' کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسی خواتین کو ''مسلم دنیا کا جدید چہرہ'' قرار دیا ہے۔آج کے دور میں مسلم شاہی خاندانوں کی خواتین نا صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ وہ انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی پیش پیش نظر آتی ہیں۔ یہ خواتین انتہائی جدید طرز زندگی رکھنے والی خواتین ہیں۔ ذیل میں ان کی معاشرتی زندگی پر ایک نظر ڈالی گئی ہے، ملاحظہ کیجئے :

قطر کی شیخا موزہ بنت نصر ال مسنید

قطر یونیورسٹی سے سماجیات کی ڈگری رکھنے والی شیخا موزہ، قطر فاونڈیشن، الجزیرہ ٹی وی کے بچوں کے چینل اور قطر لگژری گروپ کی سربراہی انتہائی کامیابی سے کر رہی ہیں۔ 60 سالہ موزہ امیر قطر حماد بن خلیفہ الثانی کی تین بیویوں میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ان کا شمار دنیا کی بہترین خوش لباس خواتین

میں کیا جاتا ہے۔ موزہ منفرد انداز کے حجاب استعمال کرنے کے لئے شہرت رکھتی ہیں۔ عام طور پر وہ پگڑی کی شکل کے حجاب استعمال کرتی ہیں جو انتہائی مہنگے اور گلیمرس ہوتے ہیں۔ مراکش کی شہزادی لالہ سلمیٰ

کفتان کے ملبوسات سے شناخت کی جانے والی شہزادی لالہ آئی ٹی انجینئر ہیں۔ وہ ''لالہ سلمیٰ کینسر فاونڈیشن'' کی بانی اور عالمی ادارہ صحت کی ایمبسیڈر ہیں۔ سلمیٰ شاہ محمد ششم کی بیوی اور دو بچوں کی والدہ ہیں۔ ان کی خاص پہچان کفتان سلک کے ملبوسات اور کمر کے گرد پہنی گئی بیلٹ ہے۔۔ ان کی باوقار نند شہزادی مریم اور ان کی بیٹی شہزادی سکینہ ان کی ہی طرح اپنے بہترین گلیمرس لباس کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔

اردون کی ملکہ رانیہ

امریکن یونیورسٹی قاہرہ سے بزنس کی ڈگری حاصل کرنے والی ملکہ رانیہ اردن کے شاہ حسین دوئم سے شادی سے قبل سٹی بینک اور ''اپیل'' کے ساتھ وابستہ تھیں۔ انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والی ملکہ رانیہ یونیسیف، ورلڈ اکنامک فورم اور انٹر نیشنل یوتھ فاونڈیشن میں بھی فعال کردار ادا کرتی ہیں۔

تینتالیس سالہ ملکہ رانیہ کا شمار دنیا بھر کے صف اول کے فیشن آئیکون میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی دن بھر کی مصروفیات کے دوران ٹخنوں تک لمبے ملبوسات

اور جیکٹس استعمال کرتی ہیں جبکہ ریڈ کارپٹ کے لئے گاون پہننا پسند کرتی ہیں۔ نقادوں نے ملکہ رانیہ کو دورہ فرانس کے دوران کارلا بروني سرکوزی سے زیادہ خوش لباس قرار دیا تھا۔

اردون کی شہزادی ثروت الحسن

پاکستانی نژاد کراون پرنسیس ثروت الحسن کا پہناوا روایتی ساڑھیاں اور ڈیزائنرز کوٹ ہیں۔ان کے پسندیدہ ڈیزائنرز رضوان بیگ ہیں۔ تین دھائیوں سے کراون پرنسیس چلی آ رہی کیمبرج سے تعلیم یافتہ تائی کوانڈو میں بلیک بیلٹ حاصل کرنے والی شہزادی ثروت کے والد محمد اکرام اللہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے فرسٹ سیکریٹری تھے جبکہ ان کی والدہ بیگم شائستہ سہروردی پاکستان کی ابتدائی خواتین پارلیمنٹیرینز میں شامل تھیں۔

سعودی شہزادی عمیرہ التاویل

سعودی شہزادے ولید بن طلال آل سعود کی چوتھی بیوی عمیرہ التاویل الولید بن طلال فاونڈیشن کی ایگزیکٹو کمیٹی کی سربراہ ہیں اور سیلاب کے وقت امدادی کارروائیوں کے سلسلے میں پاکستان کا دورہ کر چکی ہیں۔برطانوی شاہی شادی میں ان کا زیب تن کیااورزہیر مراد کا ڈیزائن کردہ لباس سب کی توجہ کا مرکز رہا۔ عمیرہ سعودی شاہ عبداللہ کی چہیتی ہیں۔ اسلامی دنیا مغرب سے فیشن میں مقابلے

کے ساتھ ساتھ کھیم میں بھی موجود ہے۔ کچھ عرصہ قبل جوڈو کراٹے کی عالمی تنظیم نے سعودی عرب کی خاتون ایتھلیٹ وجدان علی سراج کے حجاب پہن کر مقابلوں میں حصہ لینے کو جوڈو کے اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے، اولمپکس میں حجاب پہن کر کھیلنے پر پابندی لگا دی تھی جس پر سعودی حکومت نے شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اولمپکس مقابلوں سے بائیکاٹ کی دھمکی دی تھی۔

فیشن کیا ہے؟ کہا جاتا ہے جب بھی کوئی پرانا یا نیا طور طریقہ کسی بھی دور کے لوگوں کے رہن سہن کے مروجہ طریقوں میں رواج پا جائے وہی بنیادی طور پر اس دور کا فیشن کہلاتا ہے۔ فیشین کا لفظ اتنا وسیع ہے کہ اپنے اندر ہزاروں سالوں کے رواج اور خصوصیات سمیٹ سکتا ہے۔ یہ صرف کپڑوں یا میک اپ کا ہی نہیں ہوتا بلکہ گھر میں پینٹ کے رنگوں اور کھانا سرو کرنے والے برتنوں سے لے کر اپنے لان میں پھولوں اور پودوں کی کانٹ چھانٹ سمیت ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو فیشن چل پڑا باقی سب آنکھیں بند کئے ویسے ہی کپڑے بنوا لاتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا ہوتا کہ اس ٹائپ کے کپڑے ہماری شکل، عمر، قد کاٹھ، اور رنگ و روپ کو سجانے کا باعث بنیں گے یا لوگوں کو مفت میں ہنسانے کا سبب ہوں گے۔ حجاب یا اسلامک فیشن غیر مسلم خاندانوں میں بھی مقبول ہے۔

برطانیہ کی نوروچ.

یونیورسٹی کی اکیس سالہ طلباء جیسی روڈز کا کہنا ہے ' میں ہمیشہ حجاب پہننے کی کوشش کرتی ہوں تاہم میرے خیال میں ایک غیر مسلم عورت ہونے کی وجہ سے یہ ایک آپشن نہیں ہے '۔ انھوں نے بتایا جب ان کی دوست نے انہیں حجاب پہننے کا موقع فراہم کیا تو اس کے بعد انھوں نے اس کا استعمال شروع کیا۔ جیسی روڈز کے مطابق ان کی دوست نے انہیں اس بات کی یقین دہانی کروائی کہ حجاب استعمال کرنے کے لیے مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور ظاہری طور پر اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسی روڈز ان ہزاروں غیر مسلم خواتین میں سے ایک ہیں جو اب حجاب استعمال کر رہی ہیں۔ حجاب استعمال کرنے کی تحریک کی ابتدا نیویارک کی ایک خاتون ناظمہ خان نے کی جن کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے۔ انھوں نے سماجی رابطے کی ویب سائٹس کے ذریعے اس تحریک کو منظم کیا جس نے پوری دنیا کے پچاس ممالک کی مسلم اور غیر مسلم خواتین کو متاثر کیا۔ متعدد افراد کے لیے حجاب ظلم و ستم اور تقسیم کا نشان ہے اور مغربی ممالک میں حجاب اسلام کے بارے میں بحث کا ایک آسان ہدف سمجھا جاتا ہے۔ حجاب کی تحریک منظم کرنے والی ناظمہ خان نے بتایا کہ جب وہ گیارہ برس کی عمر میں بنگلہ دیش سے نیویارک آئیں تو حجاب استعمال کرنے کی وجہ سے ان کے ساتھ برا سلوک روا رکھا گیا۔ ان کے مطابق جب وہ نیویارک کے سکول میں پڑھتی تھیں تو انہیں 'حجابی لڑکی' کہا جاتا تھا، جب وہ مڈل سکول میں تھیں تو انہیں 'بیٹ مین' یا 'ننجا' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ناظمہ خان نے بتایا کہ گیارہ ستمبر دو ہزار ایک کے بعد جب

وہ کالج پہنچیں تو انہیں 'اسامہ بن لادن' یا 'دہشت گرد' کہا جاتا تھا۔ ناظمہ خان کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن ان کی اس مہم کو پوری دنیا کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔ ناظمہ خان کا کہنا ہے کہ برطانیہ، آسٹریلیا، بھارت، پاکستان، فرانس اور جرمنی میں موجود درجنوں افراد نے ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جیسی روڈز اوران کی دوست ودیان نے سماجی رابطے کی ویب سائٹ فیس بک کے ذریعے اپنے دوستوں کو اس مہم میں شریک ہونے کا کہا۔ جیسی روڈز کا کہنا ہے کہ ان کے والدین نے اس آئیڈیا کو پسند کیا جس کے بعد انہوں نے ایک ماہ کے لیے حجاب پہننے کا فیصلہ کیا۔ جیس روڈز کے مطابق ان کے والدین اس بات پر فکر مند تھے کہ حجاب استعمال کرنے سے ان پر حملہ ہو سکتا ہے۔ روڈز خود بھی حجاب استعمال کرنے کے حوالے سے فکر مند تھیں تاہم حجاب کے مسلسل آٹھ روز استعمال سے انہیں اس کے مثبت پہلوؤں کا پتہ چلا۔ چیچن ریپبلک کے سربراہ رمضان کادیروو کی اہلیہ مدنی کادیرووا بھی فیشن کی دنیا سے وابستہ ہیں۔ انکی ملکیت فیشن ڈیزائننگ ہاؤس "فردوس" نے دبئی میں "لیڈی چیچنیا" کے نام سے نئے فیشن ڈیزائن متعارف کرائے ہیں۔ نمائش کے ناظرین کو روزمرہ استعمال کے اور شام کو ہونے والی تقریبات میں زیب تن کیے جانے والے ملبوسات کے 70 سے زیادہ ڈیزائن دیکھنے کو ملے ہیں، جن میں مخمل، شیفون، ابریشم اور کروشیے سے بنے شادی کے پیراہن بھی شامل ہیں۔ مہین کپڑے، پہلو پہ ڈالی کی تنگ سلوٹوں اور جدید فیشن کے دیگر تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھے جانے

کے باوجود کٹرے سے کٹرا ناقد بھی یہ اعتراض کرنے سے قاصر رہے گا کہ کسی بھی ڈیزائن میں مسلمانوں کی روایات سے اغماض برتا گیا ہے۔ پوری آستینوں والے پیرہن اور ٹخنوں تک کھنچے سکرٹ، میچنگ روسریاں (سر پہ باندھے جانے والے رومال)، سب کے سب سختی کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق مگر دیکھنے میں دلکش ہیں۔ چیچن فیشن ہاؤس کی نمائش صرف مسلمان خواتین کی توجہ کا ہی موجب نہیں بنی بلکہ اس میں بہت سے معروف ڈیزائنروں نے بھی دلچسپی لی ہے۔ اسلامی دنیا فیشن کے معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے، روس کی اسلامی کمیٹی کے سربراہ گائیدر (حیدر) جمال کہتے ہیں، "خاص طور پر ایران میں تو ایسے معروف بوتیک موجود ہیں، جہاں عورتوں کے اسلامی شریعت سے ہم آہنگ فیشنی ملبوسات فروخت کیے جاتے ہیں۔ اسلام قدامت پرستی سے ہم آہنگ ملبوسات پہننے پر زور نہیں دیتا اور نہ ہی نئی نسل کو لباس کے سلسلے میں پیشرووں کی پیروی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ نئے ڈیزائن بھی، جو موجودہ عہد کی خواتین کو پسند ہوں، شرعی اصولوں کے مطابق ہو سکتے ہیں۔ اسلامی لباس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کو اجڈ لوگوں کی طرح بالکل ہی ڈھانپ دیا جائے۔ بس اتنا ہونا چاہیے، جیسے کہ قرآن میں درج ہے کہ لوگ مسلمان عورتوں کو غیر مسلم عورتوں سے ممیز کر سکیں۔ پرانے زمانوں میں مسلمان عورتیں عباء پہنتی تھیں تاکہ ان کی چھاتیاں، گردن اور بال نظر نہ آئیں۔

آج دنیا میں عورت کے لباس کی شرعی نوعیت ایک سی نہیں ہے۔ یورپ کے بہت سے ملکوں میں عوامی مقامات پر حجاب اوڑھنے پر پابندی ہے۔ چیچن فیشن ہاؤس کی جانب سے لگائی گئی نمائش، ثقافتوں کے مابین مصالحت کے ضمن میں ایک بہت اہم سرگرمی ہے، فن شناس خاتون اور روس کی ڈیزائنرز یونین کی رکن آنا شیپاکینا کہتی ہیں، " قومی روایات کا توجرمنی، فرانس، ، برطانیہ، آیرلینڈ اور روس کے ملبوسات میں بھی عکس ملتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے لباس میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ڈیزائنر اچھا ہے تو وہ عالمی رجحانات کو کبھی نظرانداز نہیں کرے گا۔ وہ اپنی قومی روایات کو غیر ملکوں میں کیے جانے والے تقاضوں سے ہم آہنگ کرے گا۔" رمضان کادیروو کی اہلیہ نے اپنے طور پر کہا کہ وہ عرب خواتین کے لیے فیشن ایبل ملبوسات ڈیزائن کرائیں گی اور انہیں نے امید ظاہر کی کہ اس کی دوسرے بھی پیروی کریں گے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ فیشن ہاؤس فردوس" کی آئندہ نمایش سعودی عرب میں ہوگی۔"

کراچی بنے گا نیو یارک

کراچی کے شہری جس طرح آج کل ٹوٹی پھوٹی بسوں کی چھتوں پر اور بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح سفر کرتے ہیں۔ ان کے لئے انڈر گراونڈ ٹرین چلانے کی خوشخبری ایک مذاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ کراچی کے شہریوں سے کراچی کو لندن اور پیرس اور نیو یارک بنانے کے وعدے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گذشتہ شہری حکومتوں اور صوبائی حکومت نے بھی ماضی میں ایسے وعدے کئے ہیں۔ کروڑوں روپوں کے خرچ سے فیزیبیلیٹی رپورٹ بنی ہیں۔ ایک بار پھر نئی حکومت آئی ہے، جو کراچی کے شہریوں کو نئے سبز باغ دکھا رہی ہے۔

کراچی کو لندن پیرس بنانے والوں نے کراچی کو کراچی بھی نہ رہنے دیا، کراچی کی سڑکیں کبھی دھلا کرتی تھیں ، یہاں ٹرام وے چلتی تھی، یہاں پارک اور باغات تھے، یہاں صفائی ستھرائی اس وقت تھی جب یہاں تانگے، بگھی،اور گدھا گاڑی چلتی تھی۔ کراچی میں تقسیم کے وقت بھارت سے آنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ تھی ۔ جنھوں نے پاکستان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے واضح اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

وزیر اعظم میاں نواز شریف نے کراچی میں ایک مختصر دورے کے دوران اہل کراچی کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ بہت جلد کراچی میں چین کی مدد سے میٹرو سروس شروع کی جائے گی۔ اور اس سلسلے میں حال ہی میں چین سے معاہدے ہوئے ہیں۔ کراچی کے شہری جس طرح آج کل ٹوٹی پھوٹی بسوں کی چھتوں پر اور بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح سفر کرتے ہیں۔ ان کے لئے انڈر گراونڈ ٹرین چلانے کی خوشخبری ایک مذاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ کراچی کے شہریوں سے کراچی کو لندن اور پیرس اور نیو یارک بنانے کے وعدے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گذشتہ شہری حکومتوں اور صوبائی حکومت نے بھی ماضی میں ایسے وعدے کئے ہیں۔ کروڑوں روپوں کے خرچ سے فیزیبیلیٹی رپورٹ بنی ہیں۔ ایک بار پھر نئی حکومت آئی ہے، جو کراچی کے شہریوں کو نئے سبز باغ دکھا رہی ہے۔ چند دن پہلے عالمی بنک کے نمائندوں نے وزیر اعلی سندھ کو ایک بریفینگ دی ہے۔ جس میں کراچی کو عالمی معیار کا شہر بنانے کیلئے شہری حکومت کو علیحدہ نظام سمیت متعدد تجاویز پیش کی گئیں۔ عالمی بینک نے کراچی کو ایک ورلڈ کلاس سٹی بنانے کے لیے یہاں شہری حکومت کا الگ نظام نافذ کرنے ، یہاں کی اراضی پر سرکاری کنٹرول کو کم کرنے، بدامنی اور مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے ''زیرو ٹالرینس'' اختیار کرنے، شہری ترقی کے لیے عالمی معیار کا ایک الگ محکمہ قائم کرنے، انفرااسٹرکچر، ٹرانسپورٹ اور

پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے ان شعبوں میں مستقل سرمایہ کاری کا نظام وضع کرنے اور آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نجی شعبے میں لینڈ اور ہاؤ؟ سنگ مارکیٹس کو متحرک کرنے کی تجاویز دی ہیں۔ یہ تجاویز عالمی بینک کی ایک پریذینٹیشن میں شامل ہیں، جو حالیہ دنوں گورنر سندھ کو دی گئی۔ عالمی بینک نے اپنی پریذینٹیشن میں ورلڈ کلاس سٹی کے طور پر نیویارک کی ایک مثال پیش کی، جہاں اعلیٰ ہنر مند اور جدید ورک فورس ہے، ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے، بہترین ٹرانسپورٹیشن اور انفرااسٹرکچر ہے۔ یہاں خوشحال صحت مندانہ اور محفوظ ماحول ہے۔ اقتصادی سرگرمیوں اور کاروبار کرنے کے لیے فضا انتہائی سازگار ہے۔آبادی کی درجہ بندی اور قابل رہائش ماحول ہے۔ پریزینٹیشن میں کہا گیا ہے کہ کراچی کو ورلڈ کلاس سٹی بننے کے لیے اہم چیلنجز کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اداروں کی تقسیم اور سرکاری سطح پر مربوط نظام کا فقدان، شہری ترقی اور انتظامی صلاحیتوں کا محدود ہونا، بڑھتی ہوئی آبادی اور لینڈ اینڈ ہاؤسنگ مارکیٹس کی طرف سے ضرورتیں پوری نہ کرنا، ٹرانسپورٹیشن کا خراب نظام اور ناکافی انفرااسٹرکچر، جرائم اور عدم تحفظ اور پانی کی قلت بڑے چیلنجز ہیں۔ ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے اداروں کے مابین ایک مربوط اور موثر نظام وضع کیا جائے۔ زمینوں پر سرکاری مالکانہ حقوق کا اثر کم کیا جائے۔ شہری منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کے صلاحیتوں کو بہتر بنایا جائے۔ لینڈ اینڈ ہاؤسنگ مارکیٹس کو زیادہ موثر

بنایا جائے تاکہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ شہری ترقی کا معیار بہتر بنایا جائے۔ ٹرانسپورٹیشن، انفرااسٹرکچر، پانی کی فراہمی اور امن وامان کو بہتر بنانے کے لیے سرمایہ کاری سے متعلق ایک بزنس پلان بنایا جائے۔ پریذینٹیشن میں بین الاقوامی تجربات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اداروں کے مابین رابطے کے مسائل پر قابو پانے کے لیے تجویز دی گئی ہیں کہ کراچی میں دنیا کے بڑے شہروں کے چار گورنمنٹ ماڈلز میں سے کسی ایک کو نافذ کیا جائے۔ ایک ''یونٹری میٹروپولیٹن'' گورنمنٹ کا ہے، جو شنگھائی، بیجنگ، شونگ چنگ، برلن، ((unitary ہیمبرگ، نئی دہلی اور منی پولس میں نافذ ہے۔ دوسرا ماڈل دو سطحی حکومت کا ہے، جو میڈرڈ، ٹورنٹو، اور لندن میں رائج ہے۔ تیسرا ماڈل رضاکارانہ کوآپریشن کا ہے، جو سان فرانسسکو، بولوگنا، مارسیلیز اور ساؤ پالو اے پی سی ریجن میں نافذ ہے۔

چوتھا ماڈل حکومت کی اعلیٰ سطحوں سے سروس کی فراہمی کا ہے، جو نیویارک کی پورٹ اتھارٹی، ممبئی اور میلبورن میں رائج ہے۔ یہ بھی تجویز دی گئی ہے کہ کراچی میں ایک ٹاسک فورس تشکیل دی جائے، جو سرکاری املاک کا شہری ترقی کے تناظر میں ازسرنو جائزہ لے یا سرکاری زمینی اثاثوں کی نجکاری کرے۔ شہری منصوبہ بندی، مینجمنٹ اور عمل درآمد کی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے پریزینٹیشن میں یہ تجویز دی گئی ہے کہ کراچی میں ایک نیا ورلڈ کلاس اربن ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ قائم کیا جائے۔ شہری منصوبہ سازی، سول انجینئرز اور پبلک فنانس کے ماہرین کے تربیتی

پروگرامز کو وسعت دی جائے۔ مذکورہ ڈیپارٹمنٹ کو زیادہ بااختیار بنایا جائے اور شفافیت اور احتساب کو یقینی بنایا جائے۔ ان ڈیپارٹمنٹ میں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ شہری منصوبہ سازوں کو بھرتی کیا جائے۔ آبادی کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے پریذینٹیشن میں اربن لینڈ مارکیٹس کو زیادہ فعال بنانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے اور یہ تجویز دی گئی ہے کہ سندھ ہائی ڈینسٹی ڈویلپمنٹس کو کی سفارشات کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور شہری اراضی کے استعمال سے متعلق قواعد اور قوانین میں ایسی تبدیلیوں پر غور کیا جائے، جن سے نجی شعبے کی ترقی رفتار تیز ہو، ٹرانزٹ نوڈز (NODES) اور کوریڈورز کے قریب گنجان آبادیوں کے دوبارہ زون بنائے جا سکیں اور ان گنجان آبادیوں میں اضافہ کیا ہو سکے، بندرگاہ کے علاقے اور شہر کے مرکزی علاقوں کی ترقی کے لیے سائٹس کی نشاندہی ہو سکے۔ پریذینٹیشن میں اربن ڈویلپمنٹ کا معیار بہتر بنانے کے لیے بھی تجاویز دی گئی ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ اربن ڈیزائن اور پلاننگ کے نئے قواعد متعارف کرائے جائیں۔ آرکیٹیکچر اور ڈیزائن کا معیار بہتر بنایا جائے اور اس کے لیے اردگرد کے ماحول کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ پارکس، کھلی جگہوں میدانوں اور فٹ پاتھ وغیرہ کے لیے مستقل سرمایہ کاری کا انتظام کیا جائے۔ بدامنی، اور عدم تحفظ کی فضا ختم کرنے کے لیے پریذینٹیشن میں تجویز دی گئی ہے کہ کراچی میں نیویارک سٹی اور لندن کی طرز پر سیکورٹی سسٹم نافذ کیے جائیں۔ مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے ''زیرو ٹالرینس'' ہونی

چاہیے۔ انفرااسٹرکچر، ٹرانسپورٹ اور پانی کی قلت پر قابو پانے کے لیے بھی قابل عمل منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

کراچی کو لندن پیرس بنانے والوں نے کراچی کو کراچی بھی نہ رہنے دیا، کراچی کی سڑکیں کبھی دھلا کرتی تھیں ، یہاں ٹرام وے چلتی تھی، یہاں پارک اور باغات تھے، یہاں صفائی ستھرائی اس وقت تھی جب یہاں تانگے، بگھی،اور گدھا گاڑی چلتی تھی۔ کراچی میں تقسیم کے وقت بھارت سے آنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ تھی ۔ جنھوں نے پاکستان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے واضح اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

کیماڑی سے لے کر بولٹن مارکیٹ ، صدر، سولجر بازار، چاکیواڑہ، کینٹ اسٹیشن،گاندھی گارڈن تک پورے شہر کو ٹرام وے کمپنی کی ٹرام سروس نے جوڑ رکھا تھا۔ شہر اس قدر صاف ستھرا اور خوبصورت اینگلو اورینٹل طرز تعمیر سے سجا ہوا تھا کہ کچھ لوگ کراچی کو چھوٹا لندن کہتے تھے۔ کراچی شہر میں صفائی ستھرائی اور دیدہ زیب عمارتوں کا جو حشر ہم نے ۳۶ برسوں میں کیا ہے ، اس پر کہا جاسکتا ہے کہ ہم ایک آزاد ملک کے حقدار نہیں تھے۔ بندر روڈ، پرنس روڈ، صدر اور سولجر بازار کے لاکھوں فلیٹوں اور اپارٹمنٹوں کو ہم نے اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ بالکونیاں اور گیلریاں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ درو دیوار اور

کھڑکیاں بے توجہی کا شکار ہو گئی ہیں۔

راستوں اور پارکوں کے نام تبدیل کرکے تاریخ کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے۔ پٹیل پارک اور کرکٹ گراؤنڈ کو ولبھ بھائی پٹیل کی متروکہ املاک سمجھ کر نشتر پارک کا نام دے دیا۔ بندر روڈ پر مولوی مسافر خانے کے سامنے ایک تکونا چھوٹا سا پارک ہوتا تھا جہاں نوجوان صبح شام ورزش کرتے تھے۔ اس پارک کا نام تھا،شوجی پارک۔ شوجی کو شیواجی سمجھ لیا جس نے ۵۲ برس تک مہاراشٹر میں اورنگ زیب عالمگیر سے جنگیں لڑی تھیں۔ اس چھوٹے سے شوجی پارک کا نام بدل کر اورنگزیب عالمگیر پارک رکھ دیا۔

صدر کا جہانگیر پارک نوجوان کرکٹروں کی نرسری تھا۔ جہانگیر پارک کرکٹ گراؤنڈ میں کھیلنے والے کئی کرکٹر ٹیسٹ کرکٹ کھیلے۔ ان میں حنیف محمد، مناف،اکرام الاہی، والس میتھائس، خالد وزیر، دلیپت، اینتاؤ ڈی سوزا، وسیم باری،انتخاب عالم اورڈنکن شارپ۔ یہ پارک اب گردونواح کا کچرا ڈالنے کے کام آتا ہے۔ چرسی، ہیروئنی، موالی، جرائم پیشہ اب جہانگیر پارک میں پنپتے ہیں۔

شہر کراچی میں مختلف مذاہب کے لوگ اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ رہتے تھے۔ یہاں ہندو رہتے تھے۔ مسلمان رہتے تھے۔ ایرانی رہتے تھے۔ یہودی رہتے تھے، جین اور بدھ مت کے پیروکار رہتے تھے، وہ

سندھی، اردو، ہندی، انگریزی، گجراتی، بلوچی، مراٹھی، فارسی وغیرہ بولتے تھے۔ وہ نہ آپس میں لڑتے، نہ جھگڑتے تھے۔ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کا دل سے احترام کرتے تھے۔ایک دوسرے کے تہواروں میں شامل ہوتے تھے کراچی کا ماضی بہت تابناک تھا، لیکن اس کا مستقبل اندھیروں میں گھرا ہوا ہے۔ ۔آج کا کراچی بہت دور دور تک پھیل گیا ہے ۔

یہ خوبصورت شہر جو کبھی 1947ء میں دوبئی، عمان اور کئی دیگر عرب ریاستوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور بہتر شہر تھا۔ پاکستان کا پہلا دارالحکومت بھی رہا۔ آج بھی سمندری راستے کے ذریعے کئی ممالک بلکہ پوری دنیا کے ساتھ جڑا ہوا ہے قیام پاکستان کے وقت کا اگر دبئ کا جائزہ لیں بلکہ کہیں سے پرانی تصاویر حاصل کرکے دیکھ لیں۔ تو شہر قائد کئی گنا ترقی یافتہ، تاریخی عمارات، انتہائی اعلیٰ درجے کے اسکولز، مدرسے، انتہائی خوبصورت عمارات قدیم چرچ (گرجا گھروں) سے بھرپور شہر تھا۔ عمارات تو اب بھی جیسے تیسے حال میں ہیں ۔ شہر میں کئی مقامات پر قدیم ریلوے اسٹیشن تھے جن کی اب عمارتیں رہ گئی ہیں۔ انگریزوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر میں خصوصاً کراچی، لاہور میں ترقیاتی کاموں کے عمل کو جاری رکھا۔

عوام کے ٹیکس سے حکومت کو آمدنی ہوتی ہے اور وہ اس ٹیکس سے آنے والی آمدنی

جو کہ قوم اور ملک کی امانت ہے اس کو فلاحی منصوبوں پر لگانے کی ذمہ دار ہے۔ لیکن عوامی نمائندے اس رقم کو جو نہ تو ان کے باپ دادا کی ہے نہ انہیں کسی سے عطیہ میں ملی ہوئی ہے۔ وہ کام کرانے کے بعد اپنی بڑی تصاویر اور سنگ بنیاد پر اپنے نام لکھوا لیتے ہیں۔ آج کی طرح کے اس وقت کے انگریز بھی ایسے ہوتے تو آج برصغیر کی ہر گلی، ہر بازار اور سڑک پر بڑی تصاویر، بینرز، پوسٹرز اور مجسمے لگے ہوتے۔

آج آپ کراچی ایئرپورٹ سے پورا شہر گھوم جائیں۔ جگہ جگہ ہر سیاسی پارٹی کے لوگوں کی بڑی بڑی تصاویر، پیغامات، نعرے، وعدے، عامل، بنگالی بابا، اور شباب حاصل کرنے والی دواؤں کے اشتہاروں سے بھرا نظر آئے گا۔ کراچی کی سڑکوں پر نظر ڈالیئے بس کے اوپر بیٹھے ہوئے اور دروازوں کے ساتھ لوگ اس طرح چمٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے پر مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ ٹوٹی ہوئی بسیں۔ ویگنیں، جن کے شیشے اور دروازے نہیں، لائٹیں نہیں انہیں کون فٹنیس سرٹیفکیٹ دیتا ہے؟ اور یہ سرٹیفکیٹ کیسے ملتے ہیں؟ یہ سب کو پتہ ہے۔ اور تو اور کراچی میں ایک اندھے (دونوں آنکھوں سے اندھے) کو ڈرائیونگ لائسنس دے دیا گیا۔ ایک ٹی وی چینل نے ٹیسٹ کیس کے طور پر رشوت دے کر اندھے کا کمپیوٹرائزڈ لائسنس بنوا دیا۔ جس پر کسی افسران اور لائسنس بنانے والوں کو معطل کر دیا گیا۔ یہ کراچی کا حال ہے۔ لیکن اس کے ماضی پر نظر ڈالیئے تو تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم یونانی کراچی کے موجودہ علاقہ سے مختلف ناموں سے

واقف تھے: کروکولا، جہاں سکندر اعظم وادی سندھ میں اپنی مہم کے بعد، اپنی فوج کی واپس بابل روانگی کی تیاری کے لیے خیمہ زن ہوا؛ بندر مروٹوبارا (ممکن کراچی کی بندرگاہ سے نزدیک جزیرہ منوڑہ جہاں سے سکندر کا سپہ سالار نیپرچس واپس اپنے وطن روانہ ہوا؛ اور بار بریکون، جو کہ ہندوستانی یونانیوں کی باختری مملکت کی بندرگاہ تھی۔ اس کے علاوہ، عربی اس علاقہ کو بندرگاہِ دیبل کے نام سے جانتے تھے، جہاں سے محمد بن قاسم نے 712ء میں کی اپنی فتوحات کا آغاز کیا۔ برطانوی تاریخ دان ایلیٹ کے مطابق موجودہ کراچی کے چند علاقے اور جزیرہ منوڑہ، دیبل میں شامل تھے۔ 1772 میں گاؤں کولاچی جو گوٹھ کو مسقط اور بحرین کے ساتھ تجارت کرنے کی بندرگاہ منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ سے یہ گاؤں تجارتی مرکز میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے شہر کی حفاظت کے لئے شہر کی گرد فصیل بنائی گئی اور مسقط سے توپیں درآمد کرکے شہر کی فصیل پر نصب کی گئیں۔ فصیل میں دو دروازے تھے۔ ایک دروازے کا رخ سمندر کی طرف تھا اور اسلئے اس کو کھارادر (سندھی میں کھارودر) کہا جاتا اور دوسرے دروازے کا رخ لیاری ندی کی طرف تھا اور اس لیئے اس کو میٹھادر (سندھی میں مٹھودر) کہا جاتا تھا۔

1795 تک کراچی خان قلات کی مملکت کا حصہ تھا۔ اس سال سندھ کے حکمرانوں اور خان قلات کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور کراچی پر سندھ کی حکومت کا قبضہ ہو

گیا۔ اس کے بعد شہر کی بندرگاہ کی کامیابی اور زیادہ بڑے ملک کی تجارت کا مرکز بن جانے کی وجہ سے کراچی کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ اس ترقی نے جہاں ایک طرف کئی لوگوں کو کراچی کی طرف کھینچا وہاں انگریزوں کی نگاہیں بھی اس شہر کی طرف کھینچ لیں۔ انگریزوں نے 3 فروری 1839 کو کراچی شہر پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ تین سال کے بعد شہر کو برطانوی ہندوستان کے ساتھ ملحق کر کے ایک ضلع کی حیثیت دے دی۔ انگریزوں نے کراچی کی قدرتی بندرگاہ کو دریائے سندھ کی وادی کا اہم تجارتی مرکز بنانے کے ل؟ے شہر کی ترقی پر اہم نظر رکھی۔ برطانوی راج کے دوران کراچی کی آبادی اور بندرگاہ دونوں بہت تیزی سے بڑھے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران کراچی میں 21ویں نیٹو انفنٹری نے 10 ستمبر کو مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر سے بیعت کر لی۔ انگریزوں نے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور "بغاوت" کا سر کچل دیا۔ میں کراچی میں بانی پاکستان محمد علی جناح کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت تک 1876 کراچی ایک ترقی یافتہ شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کا انحصار شہر کے ریلوے اسٹیشن اور بندرگاہ پر تھا۔ اس دور کی اکثر عمارتوں کا فن تعمیر کلاسیکی برطانوی نوآبادیاتی تھا، جو کہ برصغیر کے اکثر شہروں سے مختلف ہے۔ ان میں سے اکثر عمارتیں اب بھی موجود ہیں اور سیاحت کا مرکز بنتی ہیں۔ اس ہی دور میں کراچی ادبی، تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بھی بن رہا تھا۔ کراچی آہستہ آہستہ ایک بڑی بندرگاہ کے گرد ایک تجارتی مرکز بنتا گیا۔ 1880 کی دہائی میں ریل کی

پٹڑی کے ذریعے کراچی کو باقی ہندوستان سے جوڑا گیا۔ 1881 میں کراچی کی آبادی 73،500 سے، 1891 میں 105،199 اور 1901 میں 115،407 تک بڑھ گئی۔ 1899 میں کراچی مشرقی دنیا کا سب سے بڑا گندم کی درآمد کا مرکز تھا۔ جب 1911 میں برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت دہلی بنا تو کراچی سے گزرنے والے مسافروں کی تعداد بڑھ گئی۔ 1936 میں جب سندھ کو صوبہ کی حیثیت دی گئی تو کراچی کو اس کا دارالحکومت منتخب کیا گیا۔ 1947 میں کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت منتخب کیا گیا۔ اس وقت شہر کی آبادی صرف چار لاکھ تھی۔ اپنی نئی حیثیت کی وجہ سے شہر کی آبادی میں کافی تیزی سے اضافہ ہوا اور شہر خطے کا ایک مرکز بن گیا۔ پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا لیکن کراچی پھر بھی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور مرکز رہا۔ کراچی نے 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں تشدد، سیاسی اور سماجی ہنگامہ آرائی اور دہشت گردی کا شکار بنا۔ عالمی قوتوں کے ایجنڈے پر کراچی کیا آیا، یہ تباہی سے دوچار ہوتا چلا گیا۔ آج بھی کراچی میں ترقیاتی کام جاری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کراچی ایک عالمی مرکز کی شکل میں ابھر رہا ہے۔ اس کی ترقی میں یہاں کے بلدیاتی نظام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ماضی کی بلدیاتی قیادت ایماندار اور عوام کی خدمت کرنے والی تھی۔

کراچی شہر کی بلدیہ کا آغاز 1933 میں ہوا۔ ابتدا میں شہر کا ایک میئر، ایک

نائب میئر اور 57 کونسلر ہوتے تھے۔ 1976 میں بلدیہ کراچی کو بلدیہ عظمیٰ کراچی بنا دیا گیا۔ سن 2000 میں حکومت پاکستان نے سیاسی، انتظامی اور مالی وسائل اور ذمہ داریوں کو نچلی سطح تک منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے بعد 2001 میں اس منصوبے کے نفاذ سے پہلے کراچی انتظامی ڈھانچے میں دوسرے درجے کی انتظامی وحدت یعنی ڈویژن بنا۔ کراچی ڈویژن میں پانچ ضلع، ضلع کراچی جنوبی، ضلع کراچی شرقی، ضلع کراچی غربی، ضلع کراچی وسطی اور ضلع ملیر شامل تھے۔ سن 2001 میں اس تمام ضلعوں کو ایک ضلعے میں جوڑ لیا گیا۔ اب کراچی کو 18 ٹاؤن میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان سب کی منتخب بلدیاتی انتظامیہ موجود ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں اور اختیارات میں پانی کی فراہمی، نکاسی آب، کوڑے کی صفائی، سڑکوں کی مرمت، باغات، ٹریفک سگنل اور چند دیگر زمروں میں آتی ہیں۔ بقیہ اختیارات ضلعی انتظامیہ کے حوالے ہیں۔ 2005ء میں مقامی حکومتوں کے انتخابات میں سید مصطفیٰ کمال میئر بنے۔ ان سے قبل کراچی کے ناظم نعمت اللہ خان 2004ء اور 2005ء کے لیے ایشیاء کے بہترین ناظمین میں سے ایک قرار پائے تھے۔ جن کے دور میں کراچی میں بہت سے ترقیاتی کام ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی مختلف قوموں پر مشتمل پھولوں کا گلدستہ تھا جسے منی پاکستان بھی کہا جاتا تھا اور سب مل کر رہتے تھے، کراچی دن ہی نہیں راتوں کو بھی جاگتا تھا۔

کراچی میں نہ لسانی جھگڑے تھے نہ کوئی تعصب، سب مل جل کر رہتے تھے، سب ایک دوسرے کی ضرورت تھے اور ان سب کی مشترکہ کوششوں سے ہی کراچی ترقی کرتا رہا۔ کوئی بھتہ خوری نہ تھی۔ پرچی ناسور نا تھا۔ گینگ وار کارندے نہ تھے۔ قربانی کی کھالوں پر چھینا جھپٹی نہیں ہوتی تھی۔ کراچی کی ترقی شہر میں مستقل اور عارضی رہنے والوں ہی کی نہیں بلکہ ملک کی ترقی تھی کیونکہ ملک کی معیشت کا گڑھ اور پاکستان کو چلانے کا شہر تھا۔آج سپریم کورٹ میں حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ کراچی میں بہت سے نو گو ایریاز ہیں اور لیاری اب ایک ایسا خطرناک علاقہ بن چکا ہے جہاں سے حکومت کی رٹ ختم ہو چکی ہے اور لیاری کے اندرونی علاقوں میں جانے کی ہمت اب پولیس اور رینجرز ہی نہیں بلکہ فوج بھی نہیں کرپاتی ۔ کراچی میں اب روزانہ دسیوں افراد قتل ہوتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں یہاں لاقانونیت عروج پر ہے۔ کراچی اب بھی روشنیوں کا شہر بن سکتا ہے، اسے ایک مخلص قیادت کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے یہاں امن کرنا ہوگا۔ شہر میں ہنگاموں ، قتل و غارت گری، دہشت گردی،چوری اور لوٹ مار کی وارداتوں نے عوام کو مشکلات سے دوچار کیا ہوا ہے۔ کراچی کو سجانے بسانے اور دیدہ زیب بنانے کے لئے جوش جذبے اور قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ دنیاکے ترقی یافتہ شہروں کی طرح کراچی بھی لندن ، پیرس اور نیویارک بن سکتا ہے۔ کراچی کے مسائل کے حل کے لئے ضروری ہے کہ کراچی سے حاصل ہونے والا ٹیکس وفاق کے پاس نہیں بلکہ کراچی کے پاس رہنا چاہئے۔ تعلیم اور رفاع عامہ کے منصوبوں کو جلد از جلد مکمل کیا

جانا چاہئے۔ کراچی پولیس میں غیر سیاسی بنیادوں پر بھرتی اور موجودہ پولیس کی تطہیر ہونی چاہئے۔ آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لئے کراچی میں نقل مکانی کے سلسلے میں قانون سازی ہونی چاہیئے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال جب اٹلی گئے تو ان کی ملاقات مسولینی سے ہوئی۔ مسولینی اقبال کا معتقد تھا۔ اس نے پوچھا کہ اسے نصیحت کی جائے۔ اقبال نے فرمایا کہ جب شہر بھر جائے تو نئے شہر آباد کرو۔ اقبال کی اس نصیحت پر کراچی کو نیویارک بنانے والوں کو بھی سوچنا چاہئے یہ شہر مزید پھیلاؤ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

کراچی میں رمضان کی رونقیں

رمضان کیا آیا کراچی میں زندگی پھر سے لوٹ آئی، کراچی بہت ہی عجیب و غریب شہر ہے، یہاں قتل و غارت گری بھی ہے، اور زندگی کی رعنائیاں لئے ہوئے ہلہ گلہ بھی۔ یہاں رمضان میں شبینہ محفلیں، قرات نعت مقابلے، مساجد میں شب بیداری، درس قران کی محفلیں، عبادت و اذکار، روشنیوں میں نہائی ہوئی مساجد، طاق راتوں میں قبرستانوں میں روشنیاں اور لوگوں کی کثرت سے آمد، تو دوسری جانب کھیل تماشے، شاپنگ میلے، نائٹ کرکٹ میچ، گدھا گاڑی اور سائیکل ریس، گھوڑوں اور اونٹوں کی سواری بگھی پر سیر، سڑکوں پر ٹریفک جام، فٹ پاتھوں پر افطار کا انتظام، گداگروں کے ریلے، فقیروں کے میلے، کراچی کے گلی کوچوں کی یہ رونق چاند رات کو اپنے عروج پر پہنچ کر عید کے بعد اگلے سال تک کے لیے پھر غائب ہو جائے گی۔

عروس البلاد کراچی پاکستان کا سب سے بڑا اور ایسا شہر ہے جس میں رمضان المبارک شروع ہوتے ہی زندگی کے تمام معمولات بدل جاتے ہیں اور ہر طرف ایک ایسا رنگ نظر آنے لگتا ہے جس میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور روایات کی جھلک نمایاں ہوتی ہے، ماہِ رمضان اس شہر کا سارا ماحول ہی بدل دیتا ہے، مساجد اور عبادت گاہیں نمازیوں سے بھر جاتی ہیں، شہر میں موجود شادی ہالوں میں تین روزہ اور پانچ روزہ نماز تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے، رمضان کے آخری عشرے میں تمام بڑی بڑی مساجد بالخصوص نیو میمن مسجد بولٹن

مارکیٹ، رحمانیہ مسجد طارق روڈ اور مسجد طوبیٰ ڈیفنس وغیرہ میں محافل شبینہ منعقد کی جاتی ہیں، اسی طرح کراچی کے مشہور پارک ''جہانگیر پارک'' میں بھی تین روزہ تاریخی ''نورانی شبینہ'' جو پچیس تا ستائیس رمضان تک جاری رہتا ہے، کا انتظام کیا جاتا ہے، اس محفل شبینہ کی خاص بات یہ ہے کہ جب تک حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی رحمتہ اللہ علیہ حیات تھے، وہ اس محفل شبینہ کا پچیس رمضان کو پہلا پارہ پڑھ کر باقاعدہ آغاز فرماتے اور ستائیس رمضان کو آخری پارہ سنا کر اس پروقار محفل شبینہ کا اختتام فرماتے تھے، یہ روایت آج بھی قائم ہے، بس حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی جگہ اُن کے فرزند صاحبزادہ شاہ انس نورانی صدیقی نے لے لی ہے۔

آپ کو رات میں کراچی کے مختلف علاقوں میں گھوڑے، تانگے اور اونٹ نظر آئیں گے۔ لیکن اس کی وجہ ایندھن کی بڑھتی ہوئی قیمت نہیں، اور نہ ہی اس کی وجہ ہر دوسرے روز ہونے والی سی این جی اسٹیشنوں کی بندش ہے۔ ہر سال کراچی کے کچھ پرانے علاقوں میں رمضان کے مہینے میں بچوں کی تفریح کے لئے لگنے والے یہ چھوٹے چھوٹے میلے جن میں بچے گھوڑے، گھوڑا گاڑی، تانگے اور اونٹ کی سواری کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وہاں موجود جھولے اور مختلف کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے بچوں کو سستی تفریح کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ پہلے لیاری، پاکستان چوک، کھارادر، رامسوامی، لیاقت آباد اور جمشید روڈ میں ایسے مناظر کثرت سے نظر آتے، کراچی کے ساحل پر بھی یہ میلے لگتے تھے۔ اب ان میں کمی تو آئی ہے۔ لیکن یہ روایتی میلے اب بھی جاری ہیں۔ گھوڑا اور اونٹ پہلے کراچی کی

زندگی کا لازمی جز تھے۔ اب نہ گھوڑا گاڑی ہے نہ اونٹ ، جس پر کبھی بندرگاہ سے سامان ڈھویا جاتا تھا، امریکہ نے ایک بار ایوب خان کے زمانے میں امداد دی تو بندرگار سے ان اونٹوں کے گلے میں تھینک یو امریکہ کے بورڈ لٹکے ہوئے تھے۔ ایک امریکی صدر نے تو بشیر ساربان سے ہاتھ ملایا۔ اور پھر اسے امریکہ کو دورہ بھی کرایا۔ اب نہ اونٹ نہ گھوڑے نہ کوئی خریدار۔ کراچی میں ایک گھوڑا پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے تک کا مل جاتا ہے اور یہ دن میں دو بار دو، دو سو روپے کا کھانا کھا جاتا ہے اور یوں دس روپے فی سواری کے حساب سے پہلی چالیس سواریوں کے پیسے تو خود گھوڑا ہی کھا جاتا ہے۔ میرا اور میرے بچوں کا حصہ تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے "۔ یہ بات بادل نے بتائی۔ جو ایک گھوڑے کا مالک ہے اور یہی اس کی روزی روٹی کا وسیلہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا گھوڑا نہایت وفادار ہے۔ ویسے تو بادل ایک چھوٹے چکر کے ایک سواری سے دس روپے لیتا ہے لیکن پورا تانگا 'بک' کرنے کے 50 روپے لیتا ہے۔ سواری کے دوران گھوڑا گاڑی چلانے والے کا زیادہ تر وقت بچوں کو ڈانٹنے میں اور گھوڑا گاڑی سے اتارنے میں نکل جاتا ہے۔ جو مفت میں اس کی گھوڑا گاڑی پہ سوار ہو کر چکر کھاتے اور شاید یہ ریس بھی لگاتے رہے کہ کون زیادہ دیر تک گھوڑا گاڑی سے مفت میں لٹکا چکر کھاتا رہا۔ فیصل اپنے بچوں کو یہاں سیر کرانے آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی سہولت ہے کیوں کہ روزے ، نماز اور تراویح کے اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر ہم قریب ہی بچوں کو تفریح کے لئے لے جاتے ہیں اور پھر یہ ان کے ڈال کر چلنے والے والے جھولوں کی طرح مہنگے بھی نہیں جو بڑے بڑے شاپنگ مالز میں ہوتے ہیں۔ البتہ محلے کے کچھ بزرگوں اسے فالتو

شور شرابہ کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے علاقے میں جانوروں کے گند کے ساتھ ساتھ ٹریفک کی آمد و رفت بھی متاثر ہوتی ہے۔اب شہر میں اغوا کی واردات بڑھ گئی ہیں۔ اس لئے کراچی کے لوگوں کو اگر اپنے بچوں کو ان جانوروں کی سواری کرانی ہے تو کچھ زیادہ پیسے خرچ کرکے خود بھی ان بچوں کے ساتھ سواری کریں۔ کیوں کہ علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ بچوں کو سستی تفریح دینے والوں کے روپ میں جرائم پیشہ عناصر بھی اپنا کام دکھا جاتے ہیں ۔

کراچی کے گلی کوچوں کی یہ رونق چاند رات کو اپنے عروج پر پہنچ کر عید کے بعد اگلے سال تک کے لیے پھر غائب ہو جائے گی۔دنیا بھر کی طرح کراچی کے شہریوں نے بھی رمضان المبارک کا روایتی جوش وجذبے کے ساتھ استقبال کیا ہے۔ رمضان کا چاند نظر آتے ہی شہریوں کا دینی و مذہبی جوش و خروش بڑھ جاتا ہے۔ پہلے روزے کی نماز مغرب کے وقت سے ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے مساجد کا رخ کر لیا تھا۔ پہلے مغرب اور پھر عشاء کی نماز باجماعت ادا کی اور اس کے فوری بعد نماز تراویح کے لئے صفیں بچھ گئیں۔ تراویح میں کراچی کی مساجد میں غیر معمولی رش دیکھنے میں آیا۔ عمومی طور پر تمام مساجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔

رمضان میں شہر بھر میں کھانے پینے کی دوکانیں اور ہوٹل احترامِ رمضان میں افطار تک بند ہو جاتے ہیں، مسجدوں میں خوب رونق رہتی ہے، جو خاص طور پر رمضان کی طاق راتوں

میں روح پرور اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، کچھ لوگ جو سارا سال نمازِ جمعہ کے علاوہ مسجد میں نظر نہیں آتے اس بابرکت مہینے میں پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے نظر آتے ہیں، کم عمر بچے بھی بہت ذوق و شوق سے مساجد کا رخ کرتے ہیں، یوں تو خواتین (جنہیں گھر میں نماز ادا کرنے کا حکم ہے) پر مسجد میں باجماعت نماز تراویح کی ادائیگی ضروری نہیں، لیکن گزشتہ کچھ سالوں سے شہر کی کچھ مخصوص مساجد میں خواتین کے لیے بھی علیحدہ نماز تراویح کا انتظام کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ گھریلوں خواتین اپنے اپنے گھروں میں ماہ رمضان المبارک کے دوران تلاوت قرآن مجید، نوافل اور رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کا اہتمام بھی کرتی ہیں، دوران رمضان بعض گھروں میں نماز تراویح کے بعد ذکر واذکار کی محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں، مساجد اور امام بارگاہوں میں افطاری کا بندوبست دیگر شہروں کی طرح کراچی کی بھی وہ روایت اور ایسی شناخت ہے جو مسلمانوں کی مساجد اور عبادت گاہوں کو اوروں سے ممتاز اور جدا کرتی ہے۔

کچھ مساجد میں رش ضرورت سے زیادہ ہونے کے سبب لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے سڑکوں پر بھی نماز تراویح ادا کی۔ کورنگی اور ڈیفنس کے سنگم پر واقع مسجد طوبیٰ جسے گول مسجد بھی کہا جاتا ہے ، اس کا شمار ایشیاء کی چند بڑی مساجد میں ہوتا ہے۔ قریبی علاقوں کے مکینوں کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نمازیں اس مسجد میں ادا کی جائیں لہٰذا نماز تراویح کے وقت یہاں لوگوں کا جم غفیر ہوتا ہے۔ 1969 میں تعمیر ہونے والی اس مسجد کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا 236 فٹ گنبد بغیر کسی ستون کے صرف بیرونی دیواروں پر کھڑا ہے۔ مسجد کا واحد مینار 70 میٹر بلند ہے اور اس میں بیک وقت پانچ

ہزار سے زائد نمازی عبادت کر سکتے ہیں۔بولٹن مارکیٹ میں واقع نیو میمن مسجد کا شمار کراچی کی صف اول کی مساجد میں شامل ہوتا ہے اور یہاں ایک وقت میں دس ہزار تک نمازی سما سکتے ہیں۔اس عظیم شاہکار کا سنگ بنیاد 24 اگست 1949 کو رکھا گیا،اس کے گنبد کی اونچائی 70 فٹ جبکہ احاطہ 17 ہزار دو سو اسی مربع گز ہے۔رمضان کے دوران یہاں ہر روز کئی ہزارافراد کے لئے مفت افطاری کا انتظار کیا جاتا ہے۔یونیورسٹی روڈ پر گلشن اقبال کے علاقے میں واقع بیت المکرم مسجد کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے اور یہاں بیک وقت پانچ ہزار سے زائد افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔یہاں بھی نمازیوں کی غیر معمول تعداد دیکھنے میں آئی۔اس مسجد کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں سولر انرجی کے ذریعے روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔کراچی میں بدترین لوڈ شیڈنگ سے بچنے کے لئے شمسی توانائی کا یہ منصوبہ یہاں کامیابی کے ریکارڈ قائم کررہا ہے۔نارتھ ناظم آباد کی فائیو اسٹار چورنگی پر واقع مسجد فاروق اعظم میں بھی پانچ ہزارافراد نماز پڑھ سکتے ہیں۔سبزی منڈی کے علاقے میں واقع فیضان مدینہ نامی مسجد میں پندرہ ہزار فرزندان اسلام نماز ادا کر سکتے ہیں۔فیضان مدینہ تبلیغی سرگرمیوں کا بھی مرکز ہے۔رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھنے والے افراد کی تعداد سب سے زیادہ یہیں کارخ کرتی ہے۔گرومندر پر واقع جامع مسجد بنوریہ ٹاؤن بھی ایک بڑا دینی تعلیم وتدریس کا مرکز ہے ، یہاں آٹھ ہزار سے زائد نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ دار لعلوم کراچی جو تقریباً 50 ایکڑ سے زائد رقبے پر محیط ہے اور یہاں ہزاروں ملکی اور غیر ملکی طلباء زیر تعلیم ہیں۔غوث اعظم مسجد ایشیاء کی سب سے بڑی کچی آبادی کہلانے والے کراچی کے

مشہور علاقے اورنگی ٹاؤن میں واقع ہے اور یہاں بھی ہزاروں نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ مدنی مسجد عزیزآباد، تھانوی مسجد جیکب لائنز، جامع مسجد امجدیہ عالمگیر روڈ، جناح مسجد برنس روڈ، خضریٰ مسجد صدر، سبیل والی مسجد گرومندر، سلطان مسجد ڈیفنس فیز پانچ، صالح مسجد صدر، مبارک مسجد گزری، مدنی مسجد فیڈرل بی ایریا، کنزالایمان مسجد گرومندر سمیت دیگر چھوٹی بڑی مساجد میں بھی نماز تراویح کے بڑے بڑے اجتماع منعقد کیے جاتے ہیں۔ایکسپو سینٹر، خالقدینا ہال، خاتون جنت پارک فیڈرل بی ایریا، جامع کلاتھ کے قریب ایم اے جناح روڈ پر تین روزہ، پانچ روزہ اور دس روزہ تراویح پڑھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مساجد میں ستائیسویں شب کو نماز تراویح میں ختم قرآن کے مناظر بھی روح پرور ہوتے ہیں۔ کراچی کے بعض قدیم علاقوں میں ایسی مساجد بھی قائم ہیں جہاں صدیوں سے نماز تراویح ادا کی جا رہی ہیں۔ رنچھوڑ لائن کے علاقے گزرآباد میں واقع جامع مسجد پیچ والی 1875 میں تعمیر ہوئی تھی اور گزشتہ ایک صدی سے یہاں نماز تراویح ادا کی جا رہی ہے۔ایم اے جناح روڈ، لائٹ ہاؤس کے قریب کچھی میمن مسجد کا سنگ بنیاد 1850 میں رکھا گیا تھا۔ گزشتہ 150 سال سے یہاں تراویح ادا کی جا رہی ہیں۔ جونا مارکیٹ میں جامع مسجد کھجوری 80 سال پہلے بنائی گئی تھی اور گزشتہ ساٹھ سالہ سے باقاعدہ یہاں نماز تراویح ادا کی جاتی ہے رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی شہر کے مختلف علاقوں میں نوجوان سڑکوں، گلی، محلوں میں جابجا نائٹ ٹیپ بال کرکٹ ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے رہے ہیں، تاہم کراچی میں گزشتہ کئی سالوں سے امن وامان کی مخدوش صورتحال نے نوجوانوں سے صحت مند سرگرمیاں بھی چھین لی ہیں، شہر کی سڑکوں پر

جہاں نوجوانوں کے کھلاڑیوں کے بلے چھکے چوکوں کی صورت میں رنز اگلتے تھے اب وہاں بندوقیں گولیاں اگلتی ہیں، شہر میں جاری ٹارگٹ کلنگ اور آئے روز کے بم دھماکوں سے خوفزدہ شہریوں نے کھیل کا سلسلہ بھی کم کردیا ہے، ایسے ہی ٹورنامنٹ کے آرگنائزر اور ٹیپ بال، کرکٹ کے شیدائی کا کہنا ہے کہ پہلے رمضان میں تراویح کے بعد سے ہی جگہ جگہ نوجوان نائٹ کرکٹ میچ کی تیاری شروع کرتے رہتے تھے لڑکے سڑکوں کی صفائی کرکے پچ کے نشان لگاتے اور لائٹنگ کا بندوبست کرتے تھے رات بھر کھلاڑیوں کا شور گونجتا رہتا ہے جبکہ علاقے کے مقامی افراد بھی نوجوان کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے موجود ہوتے تھے۔ نوجوان جوش وخروش کیلئے وکٹ پر ٹین کی شیٹ لگواتے تھے جس سے جب کھلاڑی آؤٹ ہوتا تو گیند جب وکٹ پر ٹکراتی تو شور برپا ہوتا اور فیلڈنگ کرنے والی ٹیم اپنے بالر کو داد دینے کیلئے شور کرتے جبکہ آؤٹ ہونے والا بیٹسمین اس آواز پر افسردہ ہوجاتا اور بلا ازمین پر پٹختا ہوا سڑک پر بنے پویلین میں چلا جاتا جبکہ کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کیلئے موجود تماشائی بھی شور برپا کرتے کھلاڑیوں کو داد دیتے نظر آتے تھے، ناظم آباد، نارتھ کراچی، گلشن اقبال، ملیر، کورنگی، لانڈھی عزیز آباد اور لیاری سمیت دیگر علاقوں میں بڑے ٹورنامنٹ کا انعقاد ہوتا تھا۔ لیاری، میں بھی رمضان المبارک میں بڑے کرکٹ ٹورنامنٹ منعقد ہونے تھے جہاں شہر بھر کے مختلف علاقوں سے کھلاڑی لیاری کے ٹورنامنٹ میں کھیلنے کیلئے آتے اور کھیل میں اپنی صلاحیتیں منواتے تھے۔ آج لیاری پر خوف و دہشت گہرے سائے ہیں۔ چند سال قبل لیاری میں رمضان کا سب سے بڑا کرکٹ ٹورنامنٹ منعقد ہوا کرتا تھا جہاں پورے شہر سے نوجوان کھلاڑی میچز کھیلنے

آیا کرتے تھے لیاری جگہ جگہ نوجوان کھلاڑی کرکٹ کھیلتے نظر آیا کرتے تھے، رمضان میں لیاری کی سڑکیں پر رونق ہو جایا کرتی تھیں نوجوان رات بھر کرکٹ میچ کھیلنے اور میچ کی جیتی ہوئی رقم یا آپس میں چندہ جمع کرکے سحری کیلئے ہوٹلوں کا رخ کرتے تھے جس سے ہوٹلوں پر رش ہو جاتا۔ اب پورے شہر میں گزشتہ 2 سے 3 دہائیوں سے خوف کا بسیرا ہے، نوجوانوں سے صحت مند سرگرمیاں بھی چھین لی گئی ہیں۔ لیاری سے کرکٹ، فٹ بال، باکسنگ سمیت دیگر کھیلوں کے ذریعے نوجوان اپنے ٹیلنٹ کو اجاگر کرتے تھے، جوں جوں عید قریب آ رہی ہے۔ کراچی کے اہم تجارتی مراکز افطار کے بعد کھلنا شروع ہوگئے جس سے عید کی روائتی خریداری کا باقاعدہ آغاز ہوگیا ہے،مارکیٹوں میں گہما گہمی ہونے سے شہر کی رونقیں بحال ہوگئیں، رواں سال رمضان کے پہلے عشرے میں ہی کاروبار افطار کے بعد کھلنا شروع ہوگئے، پتھاروں کی تعداد میں تین گنا اضافہ اور عارضی طور پر لگائے گئے اسٹالز بھی سج گئے، افطار کے بعد کھلنے والے تجارتی مراکز میں کلفٹن، ڈیفنس، طارق روڈ، بہادر آباد، صدر، اللہ والا مارکیٹ، جامع کلاتھ، عیدگاہ کلاتھ مارکیٹ، جوبلی کلاتھ مارکیٹ، اولڈ سٹی ایریا، لیاقت آباد، حیدری مارکیٹ، ناظم آباد اور دیگر علاقوں کی مارکیٹیں شامل ہیں، رمضان کے دوسرے عشرے میں شہر کے دیگر شاپنگ سینٹرز اور دکانوں میں بھی عید نائٹ شاپنگ کی رونقیں بحال ہو گئی ہیں، آل کراچی تاجر اتحاد کے چیئرمین کہتے ہیں کہ کراچی میں دنیا کا سب سے بڑا عید تہوار منایا جاتا ہے، عید سیزن سیل کیلئے کراچی میں ہر سال 70 تا 80 ارب روپے کی سرمایہ کاری کی جاتی ہے جبکہ محتاط اندازے کے مطابق عید پر خریداری کا تخمینہ 40 تا 50 ارب روپے لگایا گیا ہے، مقامی

تجارت کے علاوہ عید اور عید کے فوری بعد شادیوں کے سیزن کیلئے 25تا30ارب روپے کا مال ملک کے مختلف شہروں سے منگوایا جاتا ہے جن میں ریڈی میڈ گارمنٹس، کپڑوں پر کڑھائی، جوتے، ہوزری، چوڑیاں، کاسمیٹکس ،فرنیچر، آرائش کا سامان، ہینڈ میڈ کارپٹ ، خواتین کے پرس، مہندی، پردے ، مختلف اقسام کا کپڑا، کھلونے، کراکری، آرٹیفیشل جیولری اور دیگر سامان شامل ہے، انھوں نے کہا کہ پتھارے دار ، دکاندار اور کارخانے دار طبقہ سال بھر عید سیزن سیل کا انتظار کرتا ہے جس کیلئے دل کھول کر سرمایہ کاری کی جاتی ہے، کراچی کے بازاروں میں بارش اور سیکورٹی سے کچھ کمی تو ہے لیکن رونقیں بھر بھی ہیں۔چاند رات تک شہر کی مارکیٹ رات دیر گئےتک کھلی رہتی ہیں، جن میں افطار کے بعد رات دیر تک خریداروں کا ہجوم نظر آتا ہے، شہر میں جگہ جگہ بچت بازار لگائے جاتے ہیں، جن پر ہر قسم کی اشیاء مارکیٹ سے قدرے کم ریٹ پر دستیاب ہوتی ہیں اور افطار کے بعد بازاروں میں رات دیر تک خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

سیکورٹی کے لئے مارکیٹوں کے اطراف تعینات کیئے گئے پولیس اہلکاروں کی کارکردگی موثر تونہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ تو ہے۔ مارکیٹ کمیٹیوں نے بھی پرائیوٹ سیکوریٹی اداروں کے ذریعے تاجروں اور خریداروں کی حفاظت کیلئے ٹھوس اور مؤثر اقدامات کرنے کی کوشش کی ہے۔ رواں سال عید کی روائتی خرید وفروخت میں بہتری سیکوریٹی اداروں کی کارکردگی پر منحصر ہے، گذشتہ سالوں کی بہ نسبت ٹارگٹ کلنگ کے واقعات کم ہونے کے باوجود بھتہ خوری، جبری چندہ اور پرچیوں کے واقعات میں تین گنا اضافہ ،تشویشناک ہے

ہمارے یہاں عید شاپنگ پر تاجر مصنوعات کی قیمتوں میں خصوصی رعایت کا اعلان نہیں کرتے ہیں۔ جس سے متوسط اور غریب طبقے کو عید کی حقیقی خوشیاں نہیں مل پاتی ۔ اگر منافع کم، سیل زیادہ ”کا اصول اپنائیں، تو صورتحال بہتر ہوسکتی ہے۔ کراچی اب دو “ کروڑ عوام کا شہر ہے، عید پر سب ہی خریداری کرتے ہیں۔ اور اپنے وسائل کے مطابق عیدالفطر منانے کا اہتمام کرتے ہیں، عید کی خوشیوں میں 80 فیصد حصہ بچوں کا حصہ ہوتا ہے۔ عید کے لئے غریب اور کمتر وسائل کے افراد کم از کم 500 روپے فی کس جبکہ پوش گھرانوں کے افراد اوسطاً 50 ہزار روپے فی کس تک خرچ کرتے ہیں، پسماندگی کا شکار 30 فیصد افراد عید پر نئے کپڑے سلوانے کی سکت نہیں رکھتے، کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر کراچی میں بجلی کی مسلسل فراہمی اور امن وامان کی صورتحال بہتر ہو تو اس سال عید شاپنگ کا حجم 50 ارب روپے سے بڑھ سکتا ہے۔

کراچی کی ایک اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہاں مخیّر اور اہل ثروت حضرات اور فلاحی تنظیموں کی جانب سے شہر میں جگہ جگہ غریب روزہ داروں کیلئے سحری و افطاری اور کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، بس اسٹاپوں پر مسافروں کی سہولت کیلئے افطاری کے اسٹال لگائے جاتے ہیں، کراچی میں افطار کے بعد کھانے پینے کے شوقین لوگ برنس روڈ، ایم اے جناح روڈ، سی ویو، بوٹ بیسن، سیون اسٹار چورنگی اور چٹخارے دار کھانوں کے ریستورانوں اور فورڈ اسٹریٹوں کا رخ کرتے ہیں، جوں جوں عیدالفطر قریب آنے لگتی ہے، ان بازاروں کی رونقیں اور بھی دوبالا ہو جاتی ہیں، یہ بازار تقریباً ساری رات ہی

کھلے رہتے ہیں، خاص طور پر ریسٹورنٹ تو صبح سحری تک کھلے رہتے ہیں تاکہ کسی کو بھی سحری میں تکلیف نہ ہو، بازاروں میں نت نئے خوانچہ فروش دیکھنے کو ملتے ہیں جو ٹھیلوں اور خوانچوں پر سموسے، پکوڑے، دہی بڑے، جلیبیاں اور انواع واقسام کی چاٹ فروخت کر رہے ہوتے ہیں، مارکیٹ میں ہر قسم کا پھل دستیاب ہوتا ہے، جو مہنگائی اور ناجائز منافع خوری کے رجحان کی وجہ سے ایک غریب اور عام آدمی کی پہنچ سے بہت دور ہوتا ہے، بدقسمتی سے انتظامیہ کی ملی بھگت کی وجہ سے پچھلے کچھ برسوں سے رمضان میں ناجائز منافع خوری کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، جس پر حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی۔ ایک زمانہ تھا لوگ عید کا چاند دیکھنے کے لئے کھلے میدانوں اور چھتوں پر جمع ہوا کرتے تھے اور جب کوئی چاند دیکھ لیتا تھا تو انگلی کے اشارے سے دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرتا تھا، لوگ چاند دیکھ کر چاند دیکھنے کی دعا پڑھتے اور ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دیا کرتے تھے، محلے کی مساجد سے چاند کا اعلان کیا جاتا تھا اور سائرن بجائے جاتے تھے، لیکن میدانوں اور چھتوں پر جمع ہو کر چاند دیکھنے اور ایک دوسرے کو گلے مل کر رمضان کی مبارکباد دینے کا رواج اب تقریباً متروک ہی ہوگیا ہے اور خود چاند دیکھنے کے بجائے اُس کی جگہ ٹی وی پر چاند کا اعلان سن کر موبائل میسجز کے ذریعے ایک دوسرے کو مبارکباد دینا اب عام سی بات بن گئی ہے۔ رمضان کی ایک روایت گھروں میں افطاری کی تیاری بھی ہے۔ یہ بھی ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ اب بھی بازار سے افطاری منگوانے کے بجائے خواتین کا خود گھروں میں افطاری تیار کرنے کا رواج موجود ہے اور ہماری گھریلو خواتین شربت، ملک شیک، فروٹ چاٹ، کھٹے میٹھے دہی بڑے، آلو پالک

کے پکوڑے، مختلف قسم کے سموسے بازار سے منگوانے کے بجائے گھر ہی پر تیار کرنا ضروری خیال کرتی ہیں، عموماً گھروں میں نمازِ عصر کے بعد افطاری بننا شروع ہوجاتی ہے، جس میں بچوں اور بڑوں سب کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے، رشتے داروں، ہمسایوں، محلے کے غریب گھروں اور مساجد میں افطاری اور خاص کھانوں کو بھیجنے کا رواج آج بھی زندہ ہے، آج کے دور میں افطاری کے وقت ایک دستر خوان پر ایک ساتھ سب کا روزہ کھولنا کسی انعام اور نعمت باری سے کم نہیں ہے، ہوش ربا مہنگائی کی وجہ سے سفید پوش طبقے کی جانب سے افطار پارٹیوں کا سلسلہ کم ضرور ہوگیا، مگر ابھی ختم نہیں ہوا ہے، بچوں کو روزہ رکھوا کر روزہ کشائی کے دعوت نامے تقسیم کرنا اور افطاری کی بڑی بڑی تقریبات منعقد کرنا اور اہل ثروت کی جانب سے شہر کے اعلیٰ ہوٹلوں میں افطار ڈنر (بوفے) دینا شہر کی نئی فروغ پاتی روایات میں سے ہیں۔

ماہ رمضان المبارک میں کراچی شہر پر بھی پیشہ ور بھکاریوں اور گداگروں کی یلغار ہوتی ہے جن سے بازاروں اور سڑکوں پر جان چھڑانا آسان کام نہیں ہے، اسی طرح دن بھر گھر کے دروازے پر کسی نا کسی حاجت مند کا موجود ہونا بھی علامت رمضان ہے،

رمضان المبارک کے دنوں میں سحری کے اوقات میں محلے کی مساجد سے خوبصورت لحن دار آوازوں میں نعتوں کا پڑھنا اور بار بار سحری کے اختتامی وقت کا بتانا ایک معمول ہے، حالانکہ پہلے سحری میں جگانے والے آتے تھے جو اعلانات اور ڈھول بجا کر لوگوں کو اٹھانے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے، لیکن اب رمضان کے ابتدائی دنوں میں یہ لوگ دور

دور تک نظر نہیں آتے، ہاں جہاں آخری عشرہ آتا ہے یہ لوگ نذرانے کے حصول کیلئے یوں نکل آتے ہیں جیسے پوری تندہی سے انہوں نے لوگوں کا سحری میں اٹھانے کا کام کو سرانجام دیا ہو۔ایک زمانہ تھا جب رمضان کے آخری عشرے میں مساجد میں اعتکاف میں بیٹھنے کیلئے ایک آدمی بھی نہیں ملتا تھا اور اس فرض کفایہ کی ادائیگی کیلئے بزرگوں کو اعتکاف میں بیٹھنا پڑتا تھا، لیکن گزشتہ دس پندرہ سالوں سے نوجوانوں میں اعتکاف میں بیٹھنے کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور اب کراچی کی مساجد میں ایک نہیں بلکہ کثیر تعداد میں نوجوان جن کی تعداد دو اور تین ہندسوں سے بھی زائد ہو سکتی ہے، اعتکاف میں بیٹھتے ہیں۔اب چاند رات کا انتظار ہے چاند رات کو خواتین اور نوجوان لڑکیوں کا چوڑیاں پہننا، مہندی لگوانا اور سجنا، سنورنا اور صبح عید کی تیاریاں کرنا بھی اس رات کے خاص خاصے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی کا جدید کراچی آج بھی پاکستان کا ایک ایسا شہر ہے جو اپنی تہذیب و ثقافت،اساس اور روایات کا امین اور ان سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے ہے۔

جادو ہے میرے ہاتھوں میں

'برج الخلیفہ' جادو سے غائب ہو جائے گا۔

دبئی کا 'برج خلیفہ' دنیا کی سب سے اونچی عمارت ہے جسے دیکھنے سیاح دور دور سے آتے ہیں اور اس عظیم الشان عمارت کی خوبصورتی کو دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ اب اِسی 'برج خلیفہ' کو لے کر ایک جادوگر نے دلچسپ اعلان کر کے کچھ لوگوں کو حیران تو کچھ کو پریشان کر دیا ہے۔ امارات کی ریاست راس الخیمہ سے تعلق رکھنے والے جادوگر ڈاکٹر منتقر المنصور نے یہ حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے کہ اگر انہیں کوئی اسپانسر مل جائے تو کچھ سیکنڈز کے لئے وہ 'برج الخلیفہ' کو غائب کر دیں گے۔ المنصور نے پُریقین انداز میں اپنے دعوے کو دہراتے ہوئے کہا ہے کہ وہ برج خلیفہ کو غائب کر سکتے ہیں۔ اُن کے الفاظ میں: 'میں تین سکینڈز کے لئے برج خلیفہ کو آنکھوں سے اوجھل کر سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے کوئی اسپانسر کر دے۔ میں یہ جادو دسمبر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی اسپانسر تیار ہوا تو پھر سب ہی میرا یہ جادو دیکھیں گے'۔ ڈاکٹر منتقر وہ پہلے عرب شہری ہیں جنھوں نے جادو کی دنیا کا آسکر ایوارڈ سمجھا جانے والا 'مرلن ایوارڈ' دو مرتبہ جیتا۔ یہ ایوارڈ ہر سال امریکا میں قائم بین

الاقوامی جادو گر سوسائٹی کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر المنصور کا کہنا ہے کہ وہ 26 سالوں کے دوران 70 ہزار میجک شوز اسٹیج پر پیش کر چکے ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہیرونائمس بوسک کا نام جادوئی کرتب کے حوالے سے آج بھی زندہ ہے۔ اس کے بعد بہت نامور میجک ماسٹر اس میدان میں آئے، جین ہو جین، روبرٹ ہودین پہلا جدید جادو گر تھا، جدید جادوئی کرتبوں کا آغاز اسی نے کیا اور 1840ء میں پیرس میں میجک تھیٹر بنا کر اس فن کو عروج بخشا جس میں اس نے مکینکل انجینئرز کی مدد سے کافی جدید آلات کا استعمال بھی کیا۔ اس کے بعد برطانوی میجک ماسٹر جے این میکلیں نے اس فن کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ 1873ء میں لندن میں اس کے لئے باقاعدہ ہال تعمیر کیا گیا۔ اس ہال میں تمام جادوئی آلات فراہم کئے گئے۔ انیسویں صدی کے جادو کے حوالے سے ہیری ہدونی کا نام قابل ذکر ہے جس کا سٹیج کا نام روبرٹ ہدونی تھا، جس نے ایک طویل فہرست نئے نئے کرتبوں کی نیویارک اور پوری دنیا میں متعارف کروائی، یہ فطری طور پر کچھ ایسی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اسے اسٹیج کرتبوں کے میدان میں خاص پذیرائی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت نئے اور جدید کرتبوں کی تیاری میں مصروف رہتا تھا۔

اس نے جادو کے بہت سے نئے اصول متعارف کروائے۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی

میں استعمال کیا جانے والا، پیپر گھوسٹ، جو بہت مشہور ہوا اور جدید پر فارمنس میں منظری دھوکہ کے ذریعے تاج محل جیسے بڑے عجوبے کو غائب کرتا تھا۔ جادو کے کمالات دکھانے میں سات قسم کے فنون کو زیادہ پذیرائی حاصل ہے اور کم وبیش پوری دنیا میں یہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ پہلا کرتب پروڈکشن کہلاتا ہے۔ اس میں ایک بے جان چیز مثلاً ہیٹ وغیرہ میں جادو کے ذریعے خرگوش یا کسی اور جانور کو زندہ کرکے دکھایا جاتاہے۔ دوسرا کرتب جو بہت مشہور ہے وہ میجک ماسٹر کاآن کی آن میں کسی کے کو اپنی انگلیوں میں غائب کرنا ہے یا پھر کسی پرندے کو پنجرے میں رکھ کر تالی بجا کر اسے غائب کرنا ہے۔ یا پھر مٹھی میں ایک رومال کو بند کرنا اور ہاتھ کو ملنے پر رومال کا غائب ہو جانا، تیسرا کرتب جو بہت مشہور ہے وہ ایک جادو گر کا حاضرین میں سے کسی ایک کو بلا کر اس کے ہاتھ میں ایک کارڈ دینا ہے۔ پھر اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اسے دو کرنا اور اس طرح تین، چار سے زائد کارڈ بنا دینا ہے۔ یہ سب کچھ چونکہ تماش بینوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہوتا ہے اسلئے ایسے کرتبوں پر ان کا یقین کرنا لازمی امر ہے لیکن یہ تمام کام ہوتے ہاتھ کی صفائی کی بدولت ہی ہیں۔ کرتب کی چوتھی قسم ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جادو کے ذریعے جوڑنا ہے۔

ایک رسی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا، اسے ایک گرہ کے ذریعے جوڑنا اور پھر جادو کے ذریعے اس گرہ کو غائب کر دینا ہے۔ پانچویں قسم میں جادو کے ذریعے

سے اشیاء کی اشکال تبدیل کرنا شامل ہے۔ چھٹی قسم میں میجک ماسٹر کا اپنے اسٹنٹ کو ہوا میں معلق کرنا ہے یہ اگرچہ ایک مشکل مرحلہ ہے لیکن جدید آلات اور ہاتھ کی صفائی سے یہ کرتب بے حد مقبول ہے۔ اس کے علاوہ بھی جادو کی بیشتر اقسام زمانہ قدیم سے موجود ہیں اور یہ کرتب دکھانے والے شاہی درباروں سے لے کر آج کے موجودہ سٹیج تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اس میں ہاتھ کی صفائی سے زیادہ کمال اپنے فن کو صیغہ راز میں رکھنا ہے اور جنہیں یہ جادوگر شاگرد بناتے ہیں۔ انہیں بھی اس فن کو راز میں رکھنے کی خاص ہدایت کی جاتی ہے۔ وگرنہ ان کی انفرادیت ختم ہوجائے۔ دور حاضر کے جدید میجیشن ''ڈیوڈ کوپر فیلڈ'' اپنے جادو کے لحاظ سے منفرد اہمیت کے حامل اس لیے ہیں کہ وہ کوئی جادوئی کرتب کرکے نہیں دکھاتے بلکہ کشش ثقل کے باوجود بغیر کسی سہارے کے خود کو ہوا میں معلق رکھ سکتے ہیں۔ اسی لئے انہیں دنیا کے ''فلائنگ مین'' کا نام دیا گیا ہے۔

ڈیوڈ کوپر فیلڈ کا تعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ہے اور ان کا دعوی ہے کہ وہ فضا میں آزادانہ سفر کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ چند لمحوں میں طویل دیوار چین کا راستہ عبور کر سکتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی سہارے کے۔ کسی بھی ذی عقل کے لئے ایسے انسان کا یقین کرنا جو ہوا میں بغیر کسی سہارے کے اڑ سکے اتنا آسان نہیں۔ ہوا میں اڑ نے والا یہ شخص ریاست ہائے متحدہ امریکہ

کا باشندہ ہے اور ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ستمبر 1956ء میں نیوجرسی میں پیدا ہوا۔ شروع ہی سے اسے جادو سے متعلق پرفارمنگ آرٹ سے دلچسپی تھی اور 12 سال کی عمر میں ہی وہ جادو کے کرتب دکھاتا۔ اس کے عجیب و غریب کرتبوں کو دیکھتے ہوئے امریکن میجیشن سوسائٹی نے میجک ماسٹر کے طور پر ڈیوڈ کو تسلیم کر لیا۔ اس تنظیم میں باقاعدہ اس کا نام رجسٹر کر لیا گیا۔ اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے ڈیوڈ روز افزوں ترقی کرتا گیااور سولہ سال کی عمر میں نیویارک میں 1980ء میں بننے والی ہارر فلم ''ٹیررٹرین '' میں بطور جادو گر کردار کیا۔

ایک ماہر کے مطابق ڈیوڈ کے پاس مافوق الفطرت طاقت ہے۔ ڈیوڈ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں خود کو غائب کر لیتا ہے لیکن ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوالیہ نشان موجود ہے کہ ڈیوڈ یہ سب کچھ کس طرح کرتا ہے۔ ڈیوڈ کی صلاحیت کی بدولت 1982ء میں معذور افراد کی بحالی کے لئے اس کی طاقت کو بروے کار لانے کی کوشش کی گئی۔ اس پروگرام کے تحت امریکن آکوپیشنل تھراپی ایسوسی ایشن نے ایک ہزار ہاسپٹلز کے نیٹ ورک میں معذور افراد کی مدد کے لئے ڈیوڈ کے بحالی معذوراں پروگرام کا آغاز کیا۔ ڈیوڈ نے ''میجک انڈر گراونڈ ''کے نام سے اس کام کا آغاز کیا۔ یہ بنیادی طور پر ہائی ٹیک وڈیو سسٹم تھا جس کے لئے اس میجک پرفارمنگ میں شریک ہزاروں افراد کے لئے خاص جگہیں مخصوص کی گئیں۔ لیکن

معذور افراد کے سلسلے میں ڈیوڈ کی خاص صلاحیت جو اسے دوسرے جادو گروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ سٹیج کے علاوہ حقیقی زندگی میں اپنی باکمال صلاحیتوں کا مظاہرہ ہے ڈیوڈ کے مطابق ایک بار اسے کچھ ڈاکوؤں نے لوٹنے کی کوشش کی۔ اس کے دو اسسٹنٹ اور ڈیوڈ سے رقم چھیننے کی کوشش کی گئی اور انہیں گن پوائنٹ پر ہینڈز اپ کیا گیا تو اس کے اسسٹنٹس کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کریں۔ اس نے دونوں اسسٹنٹس کا ہاتھ پکڑااور آن کی آن میں ہوا میں غائب ہوگیا۔ اس طرح اس کا پرس، سیل فون اور پاسپورٹ سلامت رہے۔ ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے پاس اس آرٹ کی مکمل تاریخ موجود ہے۔ اس لئے اسے حال اور مستقبل کا مایہ ناز جادو گر مانا جاتا ہے اڑنے اور غائب ہونے کی صلاحیت کی وجہ سے اس وقت ڈیوڈ پوری دنیا میں اپنی انفرادیت.برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس نے یہ فن طویل عرصے کی محنت اور ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس کے پاس بہت سے ایسے فنون ہیں جن کی مدد سے وہ نئے جادوئی کرتب دریافت کرسکتا ہے لیکن وہ اپنے ان تمام کمالات میں کسی کو شیئر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ انسان کی فطری جبلت ہے۔ اس پوری دنیا میں اس کے فن کو سراہنے والے موجود رہیں جادو گری ایک قدیمی فن بھی ہے اور علم بھی۔ موجودہ دور کے جادو گر بنیادی طور پر ہاتھ اور آنکھ کی صفائی کے ماہر ہیں۔ جادو کا علم اب تقریباً کتابی دنیا تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ جادوئی کمالات میں بھارت ہمیشہ بہت آگے رہا ہے۔ اس کے سادھو اور جوگی اپنا چمتکار دکھاتے رہتے ہیں۔ لیکن اب یہ

فن کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

پرکاش ماون کروے بظاہر کوئی جادوگر نہیں لگتا۔ وہ ممبئی کے ایک ہسپتال میں انستھیزیا کے ماہر ڈاکٹر کے طور پر کام کرتا ہے۔ پھر بھی وہ ڈیوٹی کے دوران وقفے میں اپنے شوق کی تسکین کے لیے کچھ وقت نکال ہی لیتا ہے۔جب پرکاش چند سکوں یا تاش کے پتوں کے ساتھ اپنا جادو دکھاتا ہے تو اس کے ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹر، مریض حتیٰ کہ میڈیکل کے طلبہ و طالبات اور ہسپتال میں موجود چھوٹے بچے سبھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ پرکاش کی عمر 58 برس ہے اور وہ مسکراتا ہوا کہتا ہے کہ ہسپتال میں نرسوں کی شفٹیں بدلتی رہتی ہیں، لہٰذا مجھے ہر وقت شائقین کا کوئی نہ کوئی ایسا گروپ مل ہی جاتا ہے، جسے میں حیران کر دوں، میرے شوق کی تکمیل بھی ہو جائے اور ساتھ ہی دیکھنے والوں کا ذہنی دباؤ بھی کم ہو جائے۔ لیکن بھارت میں، جو بڑی تیزی سے بدل رہا ہے، جادو اور جادوگر بھی بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں آبادی کے لحاظ سے اس دوسرے سب سے بڑے ملک میں مڈل کلاس بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور لوگوں کی تفریح کے معیارات کو بھی تغیر کا سامنا ہے۔

پرکاش ماون کروے کا کہنا ہے کہ اب لوگوں کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ اب ایک عام بھارتی جادوگر کو بھی مختلف طرح کے حالات کا سامنا ہے۔ پرکاش کا کہنا

ہے: ''آج دنیا میں جتنا بھی جادو کیا جاتا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ بھارت ہی نے دیا ہے۔ بھارت میں جادو کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ اس کا ذکر ہندومت کی قدیم دیومالائی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔'' ایک اور جادوئی کمالات دکھانے والے مندر پاٹل ہیں۔ بھارت کے تجارتی مرکز ممبئی میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مل کر 'ہاؤس آف میجک' چلانے والے مندر پاٹل کا کہنا ہے کہ بھارت میں روایتی جادوگری، جس میں ہاتھ کی صفائی سے تاش کا پتہ غائب کیا جاتا تھا۔اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی سڑکوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے ایسے بہت سے فنکار اس معاشرے میں آج بھی پائے جاتے ہیں، جو اپنا معاش اسی پیشے سے کماتے ہیں اور جو اس فن کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھے ہوئے ہیں۔بھارت میں پیشہ ور جادوگروں کی ایک ایسی قومی تنظیم بھی قائم ہے، جس کی بنیاد 1932 میں رکھی گئی تھی، اور جو آج اس شعبے کی قدیم ترین ملکی تنظیم سمجھی جاتی ہے۔ اس تنظیم کا نام Society of Indian Magicians ہے اور مندر پاٹل اس سوسائٹی کے ایک سابقہ صدر ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ بھارت میں پیشہ ور جادوگری کی تربیت دینے والے ایسے کئی مراکز بھی قائم ہو چکے ہیں، جو اس فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مندر پاٹل کے بقول، بھارت میں یہ فن زوال پذیر تو ہے مگر جب تک عام لوگ جادوگروں کی جادوگری پر حیران ہوتے رہیں گے، جو کہ ہر معاشرے میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا، تب تک ایک فن کے طور پر جادوگری بھی باقی رہے گی اور جادوگر بھی۔ کیرالہ کے جادوگر گوپی ناتھ

متھوکر کو آرٹ کو ان کی غیر معمولی خدمات کے مد نظر انٹر نیشنل مرلن ایوارڈ دیا گیا ہے۔ وہ پی سی سرکار کے بعد یہ ایوارڈ حاصل کرنے والے وہ دوسرے ہندوستانی بن گئے ہیں۔ جادوگری کی دنیا میں آسکر ایوارڈ کی حیثیت رکھنے والے اس ایوارڈ کو امریکہ کی جادوگروں کی انٹر نیشنل سوسائٹی کی جانب سے ان جادوگروں کو دیا جاتا رہا ہے جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ روم میں سپر میجک کے نام سے ہر سال جادوگری کا عظیم میلہ منعقد ہتا ہے۔ جادو کے سب سے زیادہ سراہے جانے والے اس بین الاقوامی میلے ایک منفرد تھیٹر ایونٹ ہے۔ جس میں خوبصورتی کا جشن مناتے، شاعری کے ساتھ رہنے کے جادو کا تجربہ کرنے کا موقع مہارت جادو اور تحقیق، شامل ہے۔ اس جشن کو منانے کے لئے ، دنیا میں سب سے زیادہ مشہور فنکاروں کی ایک نئی کاسٹ کا انتخاب کیا جاتا ہے، آرتھر ٹریس ایک جدید امریکی آپریٹر ہیں۔ جنھوں نے 2006 میں عالمی جادو ایوارڈ جادو آئی ایم ایف کی عالمی چیمپئن شپ جیتی تھی۔ اوٹو ایک آسٹریا جادوگر، اور سابق عالمی چیمپئن ہے، وہ ساری دنیا میں لاس Wessely ویگاس میں سب سے بڑا شو کرتے ہیں۔ انھوں نے پیرس میں بھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دنیا میں انھیں سب سے بڑا بصری کامیڈین تصور کیا جاتا ہے۔ قدیم یورپ میں ایک بار خوف وہراس کی ایک وبا، جادوگری کی وجہ سے چلی تھی اور پوری تین صدیوں تک یورپی زندگی، اس عجیب و غریب اور دردناک خوف کے غلبے کے دوران بدحواسیوں کا شکار رہی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یوں تو دنیا بھر میں کسی نہ کسی

حد تک جادو ٹونے پر یقین کیا جاتا ہے مگر وحشی اقوام کے سروں پر بھی اس طرح کا بے پناہ جنون کم ہی دیکھنے میں آیا تھا، حالاں کہ تیرھویں صدی کے آخر تک یورپ میں اس طرح کی کوئی بات پائی نہیں جاتی تھی۔ اس سلسلے میں کلیسا (جو ایک ادارے کے طور پر آسیبیات کی حد تک خاصا اہم ہے)، کا رویہ خاصا بے اعتقادی کا اور مقابلتاً رواداری کا تھا۔ مثال کے طور پر، اس وقت کے پاپائے روم نے "ہولی آفس" کو، نام نہاد چڑیلوں کو سزا دینے کے مسئلے کو اپنے دائرہ اختیار میں لینے سے روک دیا تھا۔ یہ تبدیلی تو آنے والی صدی میں آئی اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں، ایک پاپائی فرمان کے بعد تو چڑیلوں کی حرکتوں پر مبنی دہشت ناک کہانیاں معاشرے کے ہر طبقے میں سنی جانے لگیں۔ پندرھویں صدی کے آخر میں کولون میں شائع ہونے والی ایک مشہور کتاب Malleus Maleficarum میں جادوگری کے تمام تر نظریے کی تدوین اور تفصیل پیش کی گئی اور اس طرح اس المیے کے لیے اسٹیج مہیا کر دیا گیا جسے کم و بیش ایک ہی صورت میں تمام عیسائی ممالک میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس تمام تر نظریے کی تشکیل دینیاتی اور قانونی ماہرین کے دماغوں میں ہوتی اور ہدف بننے والیوں کو اس وقت تک ایذا دی جاتی جب تک وہ مصنفین کے خیالات کے مطابق "اعترافات" نہ کر لیتیں۔ حالاں کہ ایسے روشن خیال لوگ موجود تھے، جو کسی نہ کسی حد تک یہ جانتے تھے کہ یہ عجوبہ کیوں پیش آیا ہے مگر بہر حال اٹھارویں صدی اور اس کے بعد تک جادوگری کو بعض اوقات مخدوش مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں جوں ہی جادوگری کا غلبہ ختم ہوا، ایک اور غلبے یعنی عریانی کے غلبے نے اس کی جگہ لے لی جس کا منبع حیرت انگیز طور پر وہی تھا، یعنی ٹیڑھے میڑھے مذہبی خیالات۔ لگتا تھا کہ خوف کی اس ما قبل انسانی پیاس کو اپنے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے تھا اور اس لیے جب جادوگری اپنی دہشت ناکیاں کھو چکی تو عریانی کا یہ نیا سیاہ کارانہ ظلم اس کے لیے اسی طرح کام آیا۔ اس معاملے میں ، تیرھویں صدی کے چڑیلوں کے متلاشی، یقینا آج کی عریانی کے متلاشیوں کے نصف ثانی ہیں۔ چڑیل کے گرد خیرہ کن ہالہ واقعتاً نقصان دہ اثرات کا باعث ہوا کرتا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح اب ہم عریانی کے گرد کشش کا ایک ایسا ہالہ تیار کرتے ہیں جس سے وہ تاثیر ملتی ہے جو بصورت دیگر اس کے پاس نہیں ہوتی۔ رچرڈ وائزمین نے فریب کے موضوع پر نفسیات میں پی ایچ ڈی کی ہے؟ وہ ماضی میں جادوگری کیا کرتے تھے اور اپنے کمالات سے دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتےتھے۔ وہ کہتے ہیں کہ روزمرہ زندگی میں بہت ہی معمولی تبدیلیوں سے بڑے پیمانے پر سکون اور خوشی حاصل کی جا سکتی ہے۔انہوں نے اپنی کتاب میں انسانی نفسیات کے موضوع پر سائنسی جریدوں میں شائع ہونے والے کئی مطالعاتی جائزوں کے نتائج کو بنیاد بنا کر خوشگوار اور کامیاب زندگی گذارنے کے چند سادہ اور آسان اصول تجویز کیے ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب میں ، کام، تعلقات، توجہ حاصل کرنے، فیصلہ کرنے اور ذہنی دباؤ جیسے موضوعات پر تفصیل سے

گفتگو کی ہے۔ ہیری پوٹر کی مقبولیت بھی جادو ہی کی مرہون منت ہے۔ ہیری پوٹر اسٹار ڈینئل ریڈ کلف کے من میں اب یہ نئی خواہش جاگی ہے کہ وہ جیمز بانڈ سیریز کی مووی میں ہیرو نہیں ولن بنیں ۔ڈنیل ریڈ کلف نے ہیری پوٹر سیریز میں خوب ہنگامہ مچایا کبھی جادو گری دکھا کر تو کبھی کچھ اور کمال دکھا کر، بچوں کے تو وہ من پسند اداکار ہیں۔اب جبکہ وہ عمر کی تئیس بہاریں دیکھ چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے اوپر سے ہیری پوٹر کی چھاپ مٹا سکیں۔ جادو یا واقعات کے غیر فطری طور پر ظہور پذیر میں لانے کا فن۔ یہ علم ہر زمانے میں ہر قوم کے افراد کے عقیدے میں داخل رہا۔ اور مختلف اشخاص ہر جگہ اس کا دعوی کرتے چلے آئے ہیں۔ قدیم مصر کے پجاری اسی دعوے پر اپنی عبادت اور مذہب کی بنیاد رکھتے تھے۔ چنانچہ قربانیاں جادو ہی کی بنیاد پر دی جاتی تھیں۔ قدیم مصری ، بابل ، ویدک اور دیگر روایتوں میں دیوتاؤں کی طاقت کا ذریعہ بھی جادو ہی کو خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ میں باوجود عیسائیت کی اشاعت کے جادو کا رواج جاری رہا۔ افریقہ میں اب تک ایسے ڈاکٹر موجود ہیں جو جادو کے ذریعے علاج کرتے ہیں۔سیاہ علم یا کالا جادو جنوں ، دیوتاؤں اور بدروحوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور علم سفید یعنی سفید جادو نیک روحوں اور فرشتوں کے ساتھ ملاتا ہے۔ اس کے علاوہ قدرتی جادو قدرت کے واقعات میں تصرف کے قابل بناتا ہے۔ رمل ، جفر، جوتش ، اور نجوم بھی اسی کی شاخیں ہیں۔ جو توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی جادو کئی شکلوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

مثلا تعویز، گنڈے، جن اور بھوت کا چمٹنا اور اتارنا وغیرہ۔آج کے ترقی یافتہ دور میں ان سب چیزوں کو توہم پرستی کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا۔

.برطانیہ کے جادوگر ''ڈائنمو'' جو دنیا بھر میں اپنے مختلف نوعیت کے کرتب دکھانے کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انہوں نے ایک حیرت انگیز کرتب لندن کی سڑکوں پر دکھایا وہ ایک ڈبل ڈیکر کے باہر ہوا میں اڑتے ہوئے ملی بینک سے پارلیمنٹ اسکوائر کے راستے ویسٹ منسٹر برج تک گئے۔ انکے اس حیران کن کرتب کو سڑکوں پر درجنوں لوگوں نے دیکھا تھا۔ شائد یہ بھی نظر بندی ہی کا کوئی کمال تھا۔ ہارر اور تھرلر فلمیں ہمیشہ سے بولی وڈ میں بنائی جاتی رہی ہیں مگر ماضی میں اس نوع کی فلمیں ثانوی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی تھیں۔ عام طور پر ان فلموں میں کم معروف اداکار کام کرتے تھے اور ان کا بجٹ بھی محدود ہوتا تھا۔ ایسی ڈراؤنی اور مافوق الفطرت قوتوں کے موضوعات پر بنائی گئی فلموں کی تعداد بہت کم تھی جن کی کاسٹ میں صف اول کے اداکار شامل ہوں۔ بہر کیف ڈراؤنی اور جادوئی فلمیں بھارت میں پسند کی جاتی رہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندو معاشرے میں جادو ٹونے کا چلن عام ہے۔ '' ایک تھی ڈائن'' اس سلسلے کی نئی فلم ہے۔ سیف علی خان اور کنال کھیمو کی فلم '' گو، گوا، گون'' بھی ایک ایسی ہی فلم ہے۔ جس کی کہانی ان مُردوں کے گرد گھومتی ہے جو کسی ماورائی قوت کے زیر اثر زندہ ہوجاتے ہیں۔ انگریزی میں انھیں zombie کہا جاتا ہے۔ مغرب میں

اس موضوع پر ان گنت فلمیں بنائی جاچکی ہیں مگر ہندی سنیما کے لیے یہ موضوع ابھی نیا ہے۔ حقوق انسانی کی تنظیمیں اس کے خلاف ہیں ان کا کہنا ہے کہ لوگ فلموں کی کہانیوں پر یقین کر لیتے ہیں اور اس سے عورتوں کے خلاف تشدد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حالیہ عرصے میں ہندوستانی ذرائع ابلاغ میں ایسے بہت سے واقعات رپورٹ ہو چکے ہیں جن میں دیہاتیوں نے کسی عورت کو جادوگرنی قرار دے کر طرح طرح سے اذیتیں پہنچا مار ڈالا، یا اس کا گھر جلا کر اسے گاؤں بدر کر دیا۔ اس ضمن میں مختلف اداروں کی جانب سے ریسرچ بھی کی گئی ہیں، جن کے نتائج میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ جادوگرنیوں سے متعلق فلمیں اور ڈرامے خواتین کے خلاف تشدد اور دیہاتیوں کے ہاتھوں ان کی ہلاکت کے واقعات میں اضافے کا سبب بنے ہیں۔ اسلام نے جادو ٹونے کو حرام قرار دیا ہے۔ بچوں کو دل بہلانے کی حد تک ان کمالات کی پذیرائی کی جا سکتی ہے۔ لیکن عملیات کے ذریعہ جادو ٹونا اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف اور اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دنیا کے وسائل پر قبضے کی جنگ

مسلم امہ کی معیشت

دنیا کی کل مسلم آبادی 1.62 ارب کے لگ بھگ ہے۔ جو دنیا کی کل آبادی کا تقریبا 23 فیصد ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے کل رقبے میں 21.7 فیصد رقبہ مسلم دنیا کے پاس ہے۔

سب سے زیادہ آبادی والے مسلم اکثریت والے ممالک انڈونیشیا، پاکستان اور بنگلہ دیش ہیں۔ جہاں دنیا کی کل مسلم آبادی کا تقریبا 36 فیصد حصہ ہے۔

مسلم امہ علم کے میدان میں ناکامی سے دوچار ہے۔ ایک کروڑ 40 لاکھ یہودیوں کے مقابلے میں ڈیڑھ ارب مسلمان سیاسی و اقتصادی طور پر کمزور تر ہو رہے ہیں۔ اسلامی ممالک میں صرف 500 یونیورسٹیاں، امریکہ میں 5758 اور بھارت میں 8460 یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ عیسائیوں میں شرح خواندگی 90 فیصد، مسلمانوں میں صرف 40 فیصد ہے۔ مسلم دنیا میں ریسرچ پر جی ڈی پی کا صرف 0.2 فیصد خرچ ہوتا ہے۔

عطا محمد تبسم

دنیا میں وسائل پر قبضے کی جنگ تیزی سے جاری ہے۔ دنیا کے اسی فیصد وسائل پر بیس

فیصد ترقی یافتہ ممالک قابض ہیں۔ یہ ممالک غریب ملکوں پر جنگیں مسلط کرتے ہیں۔ ان پر قبضے کرتے ہیں، انسانوں کو قتل کرتے ہیں، انھیں غلام بناتے ہیں، اور ان کے وسائل پر قبضہ کرلیتے ہیں۔ امریکہ دنیا میں شتر بے مہار ہے، جو جس طرف چاہتا ہے پیش قدمی کرتا ہے۔ انسانوں پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مظالم بڑھتے جا رہے ہیں۔ جس سے ان ممالک کے عوام میں غم و غصہ بڑھ رہا ہے، تشدد کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور دنیا میں انسان کی آزادی ایک خواب ہو کر رہ گئی ہے۔ امریکی جارحیت اور امریکی حمایت کی زد بالخصوص تیسری دنیا پر پڑتی ہے اور اس کا شکار بالعموم پسماندہ اور مفلس انسان ہی ہوتے ہیں، جن میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مسلم دنیا میں زیادہ سے زیادہ عدم استحکام پیدا کرنا بظاہر مغربی پالیسیوں کا مرکزی نکتہ محسوس ہوتا ہے۔ امریکہ اور یورپ اس حقیقت سے کسی طور انکار نہیں کرسکتے کہ انہوں نے گزشتہ سو سال کے عرصے میں تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک کو کنٹرول کرنے کی کوشش کے دوران پوری مسلم دنیا کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شاید دانستہ طور پر طے کر لیا گیا تھا کہ مسلم ممالک کو پسماندگی سے دوچار رکھنا ہے۔ پس پردہ حقیقت تو یہی محسوس ہوتی ہے کہ دنیا بھر میں جنگ کا ماحول گرم کر کے قیمتی وسائل کی لوٹ مار پر پردہ ڈالنے کے لیے ہی انسانی حقوق اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نعرہ بلند کیا جائے۔ سامراجی دانشور سیموئل پیٹر ہٹینگٹن نے 1993ء میں، تہذیبوں کے تصادم کا مفروضہ ایجاد کیا تھا۔ اس مفروضے میں بتایا گیا کہ دنیا بھر میں جہاں بھی کسی قسم کی تصادم کی صورتحال موجود ہے، اس کے پس پردہ اقتصادیات یا معاشیات کی تھیوری نہیں

بلکہ اصل وجہ تہذیبوں کا باہمی ٹکراؤ ہے۔ ہنٹینگٹن کی محض اس ایک دلیل سے ہی استعماری طاقتوں کا مکروہ چہرہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق تہذیب سے تو مراد ہی مہذب انسانوں کا گروہ ہے، انسانی گروہ اسی وقت باہم دست و گریباں ہوتے ہیں یا کسی قوم یا گروہ پر حملہ آور ہوتے ہیں، جبکہ وہ تہذیب یافتہ نہیں ہوتے۔ تہذیب کا مطلب ہے کہ لوگ اپنے مسائل کا حل آپس میں پُرامن طریقے سے بات چیت کے ذریعے نکالیں، تہذیب یافتہ سماج میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ فریب اور دھوکے سے کسی گروہ یا قوم پر حملہ آور ہونا یا اپنے مفاد کے لیے کسی خطے میں تصادم کی صورتحال پیدا کرنا کیا مہذب ہونے کی علامت ہو سکتی ہے؟ شاید ہنٹینگٹن صاحب کا مقصد اپنے آقاؤں کو بدنامی سے بچانا تھا اسی لیے انہوں نے اس سفید جھوٹ کو گڑھا۔ انہوں نے بتایا کہ عیسائی اور ہندو تہذیب، مسلم تہذیب سے اور بدھ تہذیب کنفیوشس تہذیب سے ٹکرا رہی ہے۔ لیکن یہ سب ڈھکوسلا ہے، اصل بات وہی ہے۔ مسلمانوں کو تہس نہس کرنا اور انھیں ان کے وسائل سے محروم کرنا۔ دنیا میں مسلمان ایک قوت تو ہیں لیکن غیر منظم اور مختلیف گروہوں میں بٹے ہوئے۔ مسلم امہ کا تصور پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ مسلمان ایک جسد ہیں۔ انھیں منظم کرنے کی ضرورت اب شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ دنیا میں تمام مسلم ممالک کی معیشت کا مشترکہ حجم کیا ہے؟ جو دنیا میں سب سے زیادہ متحرک اور تعداد میں بھی زیادہ ہیں؟ مسلم ممالک کے اہم اقتصادی خصوصیات میں سے کچھ کیا ہیں؟ اس بارے میں جو کچھ آسانی سے دستیاب جوابات موجود ہیں۔ شائد یہ ہمارے لئے حیرت کی بات ہو، ہم میں سے بہت سے لوگ دنیا کی کل مسلم آبادی کے بارے میں نہیں جانتے۔ بلکہ ہم

میں سے اکثر مسلم دنیاکے بہت سے ممالک کے بارے میں بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔
پاکستان میں ذرائع ابلاغ اکثر او آئی سی کے رکن ممالک کی فہرست میں اٹھاون یا ستاون ممالک لکھتے ہیں۔ اور اس کے لئے او آئی سی کی تنظیم کی ویب سائٹ کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، 57 یا58 جن مسلم ممالک کی تعداد کا حوالہ دیا جاتا ہے۔اس میں مسلم اکثریت والے ممالک شامل ہیں۔ لیکن نائیجیریا اور موزمبیق جیسے ممالک جو او آئی سی کے ارکان کے طور پر درج ہے، مسلم اکثریت والے ممالک نہیں ہیں. اس میں سب سے زیادہ مستند فہرست 49 ممالک کی ہے۔ جو مسلم اکثریت والے ممالک ہیں۔ یہ فہرست پیو ریسرچ سینٹر کی طرف سے 2010 میں جاری ہوئی۔ اس بھی شامل cohort میں مسلم اقلیت والے ممالک جیسے بھارت اور نائجیریا، کیراٹ ہیں۔ جہاں ایک بڑی مسلم اقلیت موجود ہے۔ دنیا کی کل مسلم آبادی 1.62 ارب کے لگ بھگ ہے۔ جو دنیا کی کل آبادی کا تقریبا 23 فیصد ہے۔ جغرافیائی سائز کی بات کی جائے تو دنیاکے کل رقبے میں 21.7 فیصد رقبہ مسلم دنیاکے پاس ہے۔ رقبے کے لحاظ سے مسلم دنیاکا سب سے بڑا ملک قازقستان، جب اس کے بعد مسلم ممالک میں الجزائر، سوڈان، سعودی عرب اور انڈونیشیا آتے ہیں۔دنیا کی مسلم آبادی میں سے تقریبا 22 فیصد آبادی، عرب ممالک میں بستی ہے جبکہ تقریبا 1.3 ارب مسلمانوں کی آبادی باقی ماندہ مسلم اکثریت والے ممالک میں بستی ہے۔ جبکہ سب سے زیادہ آبادی والے مسلم اکثریت والے ممالک انڈونیشیا، پاکستان اور بنگلہ دیش ہیں۔ جہاں دنیا کی کل مسلم آبادی کا تقریبا 36 فیصد حصہ ہے۔ دنیا میں سب سے چھوٹا مسلم ملک مالدیپ کا جزیرہ ہے۔ جس کی کل آبادی 338.442 ہے۔ دنیاکے تمام مسلم ممالک کی

معیشت کا مجموعی حجم $ 5.7 ٹریلین ہے۔ جو دنیا کی مجموعی معیشت کا آٹھ اعشاریہ ایک
اور سعودی عرب (bnفیصد ہے۔ اسلامی دنیا میں سب سے بڑی معیشت ترکی ($ 775
کی ہے۔ اس کے بعد انڈونیشیا ہے۔ جس کی معیشت کا سائز $ 846 ($ 577bn)
ہے۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں $ bnارب ڈالر ہے۔ ایران کی معیشت کا سائز 500
پاکستان آبادی کے لحاظ سے دوسرا سب سے بڑا مسلم ملک ہے، اس کی معیشت کے حجم کے
لحاظ سے اسلامی دنیا میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ . مسلم اکثریت والے ممالک کی معیشت کو
تیل کی شراکت کو چھوڑ کر، اسلامی دنیا کی عدم تیل کی جی ڈی پی دنیا کی جی ڈی پی میں
بہت معمولی یعنی 4 فیصد ہے.اسلامی دنیا کا سب سے بڑا غیر تیل کی پیداوار معیشت والا
ملک ترکی ہے جس کے بعد ملائیشیا اور پاکستان کا نمبر آتا ہے۔ .1980 کے بعد سے
مسلم دنیا میں سب سے تیز رفتار سے بڑھتی ہوئی معیشتوں میں قطر (جن کی معیشت اس
مدت کے دوران 22 گنا اضافہ ہوا ہے)، عمان (12 گنا اضافہ)، ملائیشیا (11.5
گنا اضافہ)، ترکی (11.3 گنا اضافہ)، انڈونیشیا (10.8 گنا اضافہ) اور مصر (10.3
گنا اضافہ). پاکستان میں بھی 1980 ء کے بعد سے 8.9 گنا معیشت کے حجم میں
اضافہ ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کے جی ڈی پی میں اس مدت کے دوران 6.4
گنا اضافہ ہوا ہے۔ مجموعی طور پر مسلم ممالک کی مشترکہ فی کس آمدنی $ 4.185 یعنی
چالیس فیصد کے مترادف ہے۔ فی کس آمدنی (موجودہ امریکی ڈالر) کے لحاظ سے امیر
مسلم ممالک میں قطر، کویت اور برونائی دارالسلام ہیں. 2012 کے مطابق ان ممالک
میں فی کس آمدنی $ 90.524، $ 56.514 ڈالر اور 41.127 ڈالر تھی۔
نمبر پر آتا ہے۔ مسلم دنیا کے thپاکستان مسلم دنیا میں فی کس آمدنی کے لحاظ سے 30
اندر سب سے بڑے برآمد

bnانڈونیشیا $ 376 عرب $ bn ملائیشیا 264، bn $، 213 کنندگان میں سعودی عرب $ 376

ہیں. سب سے بڑے غیر تیل برآمد کنندگان ملک ملائیشیاbnڈالر اور ترکی ڈالر 185 اور ترکی ہیں۔ دور جدید میں سب سے زیادہ ہائی ٹیکنالوجی برآمد کرنے والے مسلم اکثریت والے ملک میں ملائیشیا ہے۔ جو ہر سال ہائی ٹکنالوجی اشیا کی تقریبا $ 60 bn مالیت کی برآمد کرتا ہے۔اس کے بعد انڈونیشیا، قازقستان اور ترکی ہیں. قازقستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان۔ - خواندگی کے لحاظ سے، سب سے زیادہ تعلیم یافتہ مسلم اکثریت والے ممالک وسطی ایشیائی ممالک ہیں۔ پاکستان اس فہرست میں سب سے نیچے ہے۔ ورلڈ ڈیولپمنٹ فہرست کے مطابق، افغانستان صحت کے اخراجات کے لحاظ سے مسلم دنیا میں سب سے اوپر ہے۔ پچیس مسلم ممالک ایسے ہیں جو صحت کی خدمات پر جی ڈی پی کا 5 pc یا اس سے زیادہ خرچ کرتے ہیں- پاکستان اس فہرست میں مسلم دنیا کے اندر سب سے نیچے سے ساتویں نمبر پر ہے۔ آخر میں، سائنس اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے صرف ایک مسلم ملک تیونس میں تحقیق اور ترقی پر جی ڈی پی کا ایک فیصد سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ مسلم دنیا کے باقی ملکوں میں آر اینڈ ڈی ریسرچ اور ڈیولپمنٹ پر خرچ کرنے والوں میں ترکی دوسرا ملک ہے- پاکستان حالیہ اعداد و شمار کے ساتھ اس فہرست میں حیرت انگیز طور پر چوتھے نمبر پر ہے۔ اللہ تعالی نے اسلامی ممالک کو بے شمار نعمتوں، بے پناہ قدرتی وسائل اور متنوع انسانی وسائل سے نوازا ہے۔ اسلامی ممالک کی نمائندہ تنظیم او آئی سی اقوام متحدہ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی اور نمائندہ تنظیم ہے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام انتشار کا شکار رہا ہے۔ اس لیے او آئی سی کا قیام عمل میں آیا۔ او آئی سی نے

ابتداء میں کچھ نمایاں کام کیے لیکن رفتہ رفتہ اس کی آواز غیر موثر ہوتی گئی لیکن عالم اسلام میں اس بات کی ضرورت کو محسوس کیا جارہا ہے کہ او آئی سی کو نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی محاذوں پر ہی متحرک کیا جائے۔ معاشی میدان میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے اور فروری 2009 کو بین الاقوامی زکواۃ آگنائزیشن کا قیام عمل میں آیا تھا اور اندازہ تھا کہ اس کے ذریعے سالانہ 65 کروڑ ڈالر کے لگ بھگ زکواۃ اکھٹی کی جائے گی۔اور اس رقم کو عالم اسلام غربت، افلاس، بے روزگاری اور جہالت کے خاتمے کے لیے استعمال کرے گا۔ لیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔اس وقت جبکہ دنیا میں مختلف تجارتی بلاکس وجود میں آچکے ہیں، مختلف ممالک کے درمیان تجارت اور اقتصادی تعاون کے بلاک کی تشکیل مختلف مسلم ممالک میں اسلامی معیشت ومالیاتی نظام کے قیام، اسلامی بینکنگ کے فروغ، سود سے نجات کے لیے مربوط، منظم اور مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ عالمی معیشت میں اس وقت مسلمانوں کا حصہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ جبکہ باہمی اقتصادی تعاون، باہمی تجارت کے فروغ، سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ اور باہمی اشتراک اور عالم اسلام کے پاس موجود قدرتی اور انسانی ذرائع سے بھر پور فائدہ اٹھانے سے صرف آئندچند برسوں میں مسلم ممالک کا عالمی مجموعی قومی پیداوار میں حصہ دگنا ہوسکتا ہے۔ مسلم ممالک میں سے ترکی، پاکستان، مصر، انڈونیشیا، ملائیشیا، نائیجریا اور بنگلہ دیش کا شمار دنیا کی ابھرتی ہوئی معاشی قوتوں میں شامل ہے پاکستان اگرچہ دہشت گردی کی جنگ، بدامنی اور توانائی کے بحران کی وجہ سے متاثر ہوا ہے تاہم اب بھی اس ملک میں ترقی کرنے اور معاشی قوت بننے کا بڑا پوٹینشل موجود ہے۔ خلیج کے ممالک میں

بھی معاشی اور اقتصادی ترقی کا بے حد پوٹینشل موجود ہے۔ خوارک کی قلت دور کرنے لیے او آئی سی فوڈ سیکورٹی پلان تشکیل دیا جائے اور زرخیز مسلم ممالک جن میں پاکستان بھی شامل ہے کسی امیر مسلم ممالک ٹیکنالوجی کے حصول اور فی ایکٹر پیداوار میں اضافے اور زرعی تحقیق میں مدد کریں تو مسلم ممالک کی زرخیز زمینوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس وقت یورپ کے متعدد ممالک شدید اقتصادی بحران سے نمٹنے کے لیے جدوجہد کررہے ہیں۔ شرح نمو گررہی ہے، یونان، اٹلی، اسپین قرض کے جال میں پھنس چکے ہیں اور اقتصادی مشکلات نے فرانس

برطانیہ اور جرمنی کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہ بہترین وقت ہے کہ اسلامی ممالک اپنے ملک میں اسلامی اقتصادی نظام کو متعارف کرکے سودی و سرمایہ دارانہ نظام معیشت و جاگیرداری سے چھٹکارا حاصل کریں اور دنیا کو اسلامی معیشت واقتصادیات کی برکات کے عملی ثمرات سے آگاہ کریں۔ اسلامی نظام بینکاری اور حلال فوڈ اب صرف مسلمانوں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی مقبولیت حاصل کرتے جارہے ہیں اس لیے مسلمانوں کو شریعت کے مطابق تجارت اور کاروبار اور سب سے بڑھ کر معیشت کو اختیار کرنا بے حد ضروری پڑگیا ہے۔ اس میں دینا اور آخرت دونوں کا نفع ہے۔ اسلامی اقتصادی نظام ہمیں دینا اور آخرت دونوں کی بے چینی سے بچاتا ہے۔ دونوں کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے۔ دنیاکے بیشتر مالک کی معیشت کا دارومدار تیل پر ہے جبکہ دنیاکے 70 فیصد تیل

کے ذخائر مسلم ممالک کے پاس ہیں۔ عالمی آبادی میں اضافے کی وجہ سے تیل کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر تیل کی موجودہ طلب برقرار رہی تو اسلامی ممالک کی شرح نمو 5 فیصد تک رہے گی۔ عالمی اقتصادی بحران اور سودی معیشت کی نحوست کی وجہ سے جو نقصانات 2007 سے 2009 میں ہوئے اس کا اندازہ 3 ہزار 400 ارب ڈالر تک لگایا گیا ہے جو دنیا کے 35 ممالک کی مجموعی قومی آمدنی سے زیادہ ہے۔ جاپان جیسے مضبوط اور مستحکم معاشی بنیادیں رکھنے والے ملک کی معیشت 6 فیصد سکڑ گئی، یورپی ممالک کی معیشت میں 4 فیصد کی کمی ہوئی۔ عالمی سطح پر بے روزگاری کی شرح 2007 میں 5.6 فیصد تھی جو 2010 تک بڑھ کر 6.2 فیصد ہو گئی۔ ااسلامی ممالک میں ملائیشیا 14.1 فیصد، سعودی عرب 13.6 فیصد، انڈونیشیا 9.4 فیصد، متحدہ عرب امارات 9.3 فیصد، ترکی 6.8 فیصد ایران 6.1 فیصد کے ساتھ نمایاں برآمداتی ممالک ہیں۔ درآمدات کے لحاظ سے ملائیشیا 12.6 فیصد، ترکی 12.4 فیصد، متحدہ عرب امارات 11 فیصد، انڈونیشیا 9 فیصد، سعودی عرب 6 فیصد کے ساتھ نمایاں ہیں جبکہ پاکستانی عالم اسلام کا 10 واں بڑا درآمدی ملک ہے اور کل اسلامی ممالک کی درآمدات ہی اس کا حصہ تقریباً 3 فیصد ہے۔ اسلامی ممالک میں باہمی برآمدات میں سعودی عرب 35.4 ارب ڈالر، متحدہ عرب امارات 34.1 ارب ڈالر، ترکی 32.2 ارب ڈالر، ملائیشیا 22 ارب ڈالر انڈونیشیا 17.4 ارب ڈالر، ایران 13.5 ارب ڈالر اور مصر 10.2 ارب ڈالر کے ساتھ نمایاں ہیں۔ اسلامی ممالک میں باہم تجارت بڑھانے کے لیے مسلم ممالک کو ٹیرف میں کسی کو منصوبہ بندی کرنی ہوگی اور آئندہ برسوں میں اس میں 5 سے 25 فیصد کمی کرکے باہمی تجارت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اسلامی ممالک کے تاجروں کو

مربوط اور منظم رابطوں کے ذریعے انہیں تجارت کو فروغ دینا چاہیے اور مسلم ممالک کے درمیان مشترکہ ایوان ہائے صنعت وتجارت کے قیام، باہمی آزاد اور ترجیحی تجارتی معاہدوں، مفاہمت کی یاداشتوں اور مشترکہ تجارتی اور صنعتی نمائشوں کے علاوہ کاروباری وفود، اطلاعات و معلومات اور تجارتی ومعاشی تحقیقات کے تبادلے سے ہی مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں نیز مسلم ممالک میں کاروباری برادری کو قریب لانے کے لیے ویزے کی پابندیوں میں نرمی، مسلم ممالک میں مشترکہ اور قابل قبول تجارتی معیار کا اجرا ئبھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مسلم امہ علم کے میدان میں ناکامی سے دوچار ہے۔ ایک کروڑ 40 لاکھ یہودیوں کے مقابلے میں ڈیڑھ ارب مسلمان سیاسی و اقتصادی طور پر کمزور تر ہو رہے ہیں۔ اسلامی ممالک میں صرف 500 یونیورسٹیاں، امریکہ میں 5758 اور بھارت میں 8460 یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ عیسائیوں میں شرح خواندگی 90 فیصد، مسلمانوں میں صرف 40 فیصد ہے۔ مسلم دنیا میں ریسرچ پر جی ڈی پی کا صرف 0.2 فیصد خرچ ہوتا ہے۔ مسلم حکمرانوں کو تو لگتا ہے بس مال و دولت جمع کرنے، بلند و بالا عمارات بنانے، عالیشان محلات کی تعمیر عیاشی یا علاج کرانے کیلئے یورپی ممالک میں جانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں سوجھتا۔ ایک طرف ہم تعلیم کو مسلمان کی میراث بتاتے ہوئے نہیں تھکتے اور دوسری طرف ہماری یہ حالت ہے کہ پڑھ کر شرم آتی ہے۔ ہم جو دنیا پر چھانے کے خواب دیکھتے ہیں جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا میں ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ ہمارے حکمران اپنے اقتدار کی خاطر صدیوں سے عوام کو جہالت کے اندھیروں سے نکالنے کیلئے تیار نہیں کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ اگر یہ مجبور و محکوم

عوام علم و ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھ گئے تو پھر ان کا اقتدار خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کے مسلم ممالک مختلف قسم کے وسائل سے مالا مال ہیں، دھن دولت انکے پاس بے شمار ہے، یورپی و امریکی بنک انکے سرمائے سے بھرے پڑے ہیں اگر وہ اس دولت سے اپنے ممالک میں علم کی دولت عام کریں ٹیکنالوجی کی راہیں کھولیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ممالک علمی میدان میں کامیابی و کامرانی کے جھنڈے نہ گاڑ سکیں۔

بھارت معاشی ترقی یا غربت کا سیلاب

عالمی معیشت اور گلوبل ویلیج نے آج دنیا کو ایک دوسرے سے اس جوڑ کر رکھ دیا ہے کہ اب ایک ملک کا بحران دوسرے ملک کو بھی بری طرح متاثر کرتا ہے۔ عالمی معیشت کے اس تصور میں اب ایک ملک پر چھائے بحرانی بادل ہر دوسرے ملک پر برستے جارہے ہیں اور حقیقی سطح پر اس نظام کا عالمی بحران پیدا ہوچکا ہے۔ پاکستان کے معاشی حالات دگرگوں ہیں تو ہمارا پڑوسی ملک بھارت بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ چند دنوں میں امریکی ڈالر نے ایشیائی کرنسیوں خاص طور پر بھارتی کرنسی کو روند ڈالا' مئی سے اب تک بھارتی روپے کی قدر میں 17 فیصد کمی ہوئی ۔ گولڈن بھارت میں 5-2004 میں ہندوستان میں کُل 40.72 کروڑ افراد غریب تھے، جب کہ 10-2009 میں یہ تعداد اسی فارمولے پر بڑھتے ہوئے 34.47 کروڑ ہو گئی ہے۔ بھارت میں اگرچہ اس وقت جاپان سے زیادہ ارب پتی موجود ہیں، لیکن وہاں عدم مساوات دنیا میں بدترین سطح پر ہے۔ ایک ارب ہندوستانی اذیت اور غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے چلے گئے۔ بھارت میں ہر بیس منٹ پر عورت سے زیادتی کا واقعہ ہوتا ہے۔ دہلی ریپ کیس نے پوری دنیا میں بھارت کی خواتین کے عدم تحفظ کی صورتحال کو بے نقاب کیا ہے۔ الجزیرہ کی ایک رپورٹ کے مطابق بھارت کی آدھی سے زیادہ آبادی کو بیت الخلا

کی سہولت بھی میسر نہیں اور اس مقصد کے لیے کھلی جگہوں اور فصلوں کا استعمال کیا جاتا ہے، جو کہ صحت کے لیے انتہائی غیر مناسب اور مضر ہے۔ چمکتے ہندوستان کے حکومتی دعوؤں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ 2011-12ء میں جی ڈی پی کی شرح نمو تیزی سے گر کر 5.3 فی صد تک آ پہنچی ہے۔

حال ہی میں بھارت کی معیشت کو ایک دھچکہ اس وقت پہنچا جب دنیا کی معیشتوں کی حالت کا تجزیہ کرنے والے عالمی ادارے سٹینڈرڈ اینڈ پوورز (ایس اینڈ پی) نے بھارت کی معیشت کو مستحکم کے زمرے سے ہٹا کر منفی درجے میں شمار کیا۔ اس رپورٹ میں متنبہ کیا ہے کہ اگر آئندہ دو برسوں میں معیشت میں بہتری نہ آئی تو بھارت کی معیشت کمتر درجے میں شمار کی جائے گی۔ اس تجزیے کے بعد بھارت کے حصص بازاروں میں زبردست گراوٹ آئی ہے۔ معاشی اصطلاح میں بھارتی معیشت کی درجہ بندی اِس وقت ٹرپل بی پلس ہے جسے ایس اینڈ پی نے منفی درجے میں ڈالتے ہوئے ٹرپل بی مائنس کر دیا ہے۔ اس سے بھارتی کمپنیوں کو غیر ممالک سے قرضے مہنگی شرحوں پر ملیں گے اور حصص بازار پر بھی برا اثر پڑے گا۔ ٹرپل بی مائنس سرمایہ کاری کے لیے سب سے کم درجہ ہے۔ معیشت کی درجہ بندی کرنے والی ایجنسی نے کہا ہے کہ 'معیشت کو منفی زمرے میں رکھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ بھارتی معیشت دو برس میں کمتر درجے کی جانب گامزن ہے'۔ بھارتی روپے کی قدر میں امریکی ڈالر کے مقابلے میں اب تک کی سب سے زیادہ گراوٹ آئی ہے جس سے

ایک ڈالر کی قیمت 62 روپے سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ جمعہ کے روز بازار کھلنے کے ساتھ ہی روپے میں ریکارڈ گراوٹ درج کی گئی اور غیر ملکی کرنسی مارکیٹ میں ڈالر کے مقابلے روپیہ ایک بار پھر تیزی سے نیچے گرا۔

صبح ساڑھے دس بجے کاروبار شروع ہوتے ہی ایک ڈالر کی قیمت 62.03 روپے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد کاروبار میں کچھ نرمی دکھائی دی اور شام تک ایک ڈالر کی قیمت روپے کے آس پاس آ گئی۔ گذشتہ ہفتے ایک ڈالر 61.80 پیسے کی قیمت تک بکا 61.80 تھا جب کہ بدھ کو کاروبار کے اختتام پر شرح تبادلہ 61.43 روپے رہی تھی۔ روپے کی قدر میں کمی کو دیکھتے ہوئے بازار حصص بھی زبردست فروخت کا دباؤ ہے۔ سنسیکس ۔ میں بھی گراوٹ درج کی گئی جس میں 450 پوائنٹس سے زیادہ کی کمی دیکھی گئی نیشنل سٹاک ایکسچینج نفٹی میں بھی 150 پوائنٹس سے زیادہ کی گرواٹ دیکھی گئی ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے ڈالر کی قیمت روپے کے مقابلے میں خاصی کمزور ہوتی رہی ہے جس سے بھارتی معیشت پر برا اثر پڑا ہے۔ کچھ دن پہلے ہی بین الاقوامی کریڈٹ ریٹنگ ادارے فچ نے بھارت کی کریڈٹ ریٹنگ آؤٹ لک میں کمی کرتے ہوئے اسے 'مستحکم' کم کرکے سے 'منفی' کر دیا تھا۔ اس سے پہلے سٹینڈرڈ اینڈ پورز نے بھی پالیسی ساز فیصلوں میں بہتری کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بھارت کے

لیے اپنی کریڈٹ ریٹنگ میں کمی کی تھی۔فچ کا اندازہ ہے کہ بھارتی معیشت اس مالی سال میں 6.5 فیصد کی شرح سے ترقی کرے گی جو پہلے سے لگائے گئے تخمینے 7.5 فیصد سے کم ہے۔بھارتی صنعتی دنیا کی کئی مشہور شخصیات ملک کی اقتصادی حالت پر تشویش ظاہر کر چکی ہیں۔

این نارائن مورتی اور عظیم پریم جی نے اقتصادی بدحالی پر کچھ دن پہلے یو پی اے حکومت پر سخت تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ اس سے ملک کی معیشت کو دھچکا لگا ہے۔

بھارت کو ایک ایسے عجیب قسم کے تضاد کا شکار بتایا جاتا ہے جو تصویر کے ایک دوسرے سے قطعی مختلف دو رُخ سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ایک بھارت تو وہ ہے جو تیزی سے پھل پھول رہا ہے اور پنپ رہا ہے اور دوسرا بھارت وہ ہے جس کی توقعات ناکامی و نامرادی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں۔ بھارتی معاشی ماہرین یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بھارت کو دنیا کی ابھرتی ہوئی عظیم مارکیٹ بنانے کے لئے بھارت کی دونوں اقسام کو یکجا کرنا ضروری ہے۔ بھارتی معاشی امور سے متعلق ایک ماہر کے نزدیک مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ’’بھارت کیا کر رہا ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ بھارت کیا کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں عدم مطابقت پائی جاتی ہے‘‘۔ یعنی بھارت جس قدر کر سکنے کی

اہلیت رکھتا ہے اس قدر نہیں کر پا رہا۔ بھارت اب ترقی پذیر ممالک کی اس کلب کا ممبر ہے جسے BRIC's (برازیل، روس، انڈیا اور چائنہ) کا نام دیا جاتا ہے، جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ آنے والے وقت میں دنیا کی معاشی افزائش کو اسی کے ذریعے سے آگے بڑھنے کی قوت ملے گی۔ بھارت کو چین پر اگرچہ ڈیموگرافک لحاظ سے ایک فوقیت حاصل ہے لیکن پچھلے برس چین میں غیر ملکی سرمایہ کاری 124 بلین ڈالر تک پہنچ گئی جبکہ بھارت اس ضمن میں صرف 32 بلین ڈالر تک ہی پہنچ سکا۔ تیز ترین ترقی کے لئے جس مناسب انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھارتی حکومت مہیا کرنے میں ناکام رہی ہے جبکہ چین میں اس حوالے سے پوزیشن بہتر ہے۔ بھارت میں ترقی کی رفتار کو بہت سست بتایا جا رہا ہے بلکہ یہ خیال بھی ہے کہ ترقی تقریباً رک ہی گئی ہے اور اب خود بھارتی دانشور ڈیموکریٹک پالیٹکس کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اکتوبر میں آئی ایم ایف نے بھارت کو 2012ء کی اس درجہ بندی سے نیچے گرا دیا جس کے مطابق 4.9 فیصد گروتھ کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ ایک ریسرچ فرم "کیپٹل اکنامکس" کو ماہ اگست کی اس رپورٹ کے حوالے سے بہت تشویش ہے جس کے مطابق بھارت ایسے (معاشی) جمود کو جھیل رہا ہے جس نے بلند افراطِ زر اور کم تر افزائش کے آمیزے سے جنم لیا ہے۔ گزشتہ جون میں Standard & Poor's نامی ریٹنگ ایجنسی نے انتباہ کیا تھا کہ بھارت BRIC's کلب کا پہلا رکن ہوگا جو اپنا انویسٹمنٹ سٹیٹس گریڈ کھو دے گا۔ 1991ء ہی سے بھارت میں معاشی اصلاحی عمل

ایسے اتار چڑھاؤ کا شکار چلا آ رہا ہے جیسا اتار چڑھاؤ بھارت کی جمہوری سیاست میں چلا آ رہا ہے۔

بھارت میں ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی وہاں کے حالات سے تنگ ہیں۔ حال ہی میں فنش ٹیلی کام کمپنی نوکیا نے نئی دہلی کے رویے سے تنگ آ کر بھارت سے منہ موڑ لیا اور اب وہ اپنی مصنوعات کی برآمدات کے فروغ کے لیے چین کو مرکز بنانا چاہتی ہے۔ایک بھارتی اخبار کی رپورٹ کے مطابق نوکیا نے بھارتی حکومت کو بتایا ہے کہ بھارت اب اس کے لیے اہم مارکیٹ نہیں رہا اور اب وہ چین کے ذریعے اپنی مصنوعات کی برآمدات کرنا چاہتی ہے۔ یاد رہے کہ نوکیا بھارتی حکام کی جانب سے 20 ارب روپے (31 کروڑ 10 لاکھ ڈالر) کی ٹیکس ڈیمانڈ سے لڑ رہی ہے۔ اخبار نے نوکیا کے خط کا حوالے دیتے ہوئے کہا کہ کمپنی نے بھارتی حکومت پر زور دیا کہ وہ بھارت کے بطور کاروباری مقام منفی تصور کو ٹھیک کرنے کے لیے فوری اقدامات کرے۔بھارت میں کام کرنے کیلیے سیاسی خطرہ اچانک نمایاں طور پر بڑھ گیا ہے جس کے مستقبل میں کسی بھی (غیر ملکی کمپنی) کے بھارت میں کام کرنے سے متعلق فیصلوں پر لازمی طور پر اثرات ہوں گے، نوکیا اور دیگر کثیر قومی کمپنیوں کے خلاف ٹیکس کلیمز کا بھارتی کاروباری ماحول پر اس قدر زیادہ اثر ہوگا کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔اخبار کے مطابق فنس کمپنی نے بھارتی حکومت کے لیے یہ خط 19 جون کو لکھا تھا جو بھارتی وزارت خزانہ کو

جولائی میں ملا۔ نوکیا کا کہنا ہے کہ بھارت کے ٹیکس مسائل نے اس کے لیے چین میں موبائل فون کی تیاری کی منتقلی اور چنائی میں تیاری کے بجائے بھارتی مارکیٹ میں درآمد کو زیادہ کاسٹ ایفیشنٹ بنا دیا ہے۔ یاد رہے کہ نوکیا کا چنائی میں پلانٹ اس کے بڑے پلانٹس میں سے ایک ہے جہاں 8ہزار افراد کام کر رہے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے دنیاکے دوسرے بڑے ملک بھارت میں 27 کروڑ لوگ انتہائی غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ بھارت میں منصوبہ بندی کمیشن کی جانب سے جاری تازہ ترین اعداد وشمار کے مطابق ملک میں اب غریبوں کی تعداد 27 کروڑ تک جا پہنچی ہے یعنی ہر پانچ میں سے ایک شہری غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ یہ تعداد کل آبادی کا 22 فیصد بنتی ہے۔ بنیادی ضروریات پر دیہی علاقوں میں 27 اور شہری علاقوں میں 33 روپے سے زیادہ خرچ کرنیوالے افراد کو انتہائی غریب کے زمرے میں شامل نہیں کیاگیا۔ ماہرین اوراپوزیشن جماعتوں کاالزام ہے کہ غریبوں کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 33 روپے میں گزارا کرنا ناممکن ہے اور حکومت نیااقتصادی ترقی کی بہتر تصویر پیش کرنے کیلئے یہ پیمانہ اختیار کیاہے۔ تازہ ترین رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ خراب حالات ریاست چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، منی پور، اروناچل پردیش اور بہار میں ہے جبکہ گوا میں صرف 5 فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ کیرالہ، ہماچل پردیش، پنجاب اور پوڈوچیری میں بھی غریبوں کی تعداد 10 فیصد سے کم ہے۔ رپورٹ کے مطابق 2004ء میں بہار کی 54 فیصد آبادی

غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی تھی لیکن اب یہ تعداد تقریباً 34 فیصد رہ گئی ہے۔"

اس تمام تر صورت حال سے بھارت میں بوسیدہ سماجی انفرااسٹرکچر کے درمیان پایا جانے والا تضاد بھی کھل کر سامنے آچکا ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی کو معاشی دائرے سے باہر دھکیل دیا گیا ہے جو کہ غیرانسانی حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ صحت سمیت تمام تر سماجی شعبے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ بھارتی شہروں کی جھونپڑ پٹیوں میں گندگی اور کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، جب کہ دیہی علاقے شدید آلودگی اور ماحولیاتی تباہی کا شکار ہیں۔ صحت کے لحاظ سے بھارت میں پچھلے دنوں اس قدر ترقی بتائی گئی کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے بھی لوگوں نے علاج کروانے کے لیے بھارت کا رخ کیا، لیکن جہاں باقی تمام تر چیزیں طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کی گئی ہیں وہیں علاج کو بھی اس قدر منہگا اور محنت کش طبقے اور ملک کی 80 فی صد سے زاید آبادی کی پہنچ سے دور کر دیا گیا ہے کہ وہ قابل علاج بیماریوں سے بھی مرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

امریکی ڈالر نے جہاں ایشیائی کرنسیوں کو متاثر کیا ہے۔ وہاں بھارتی کرنسی کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ مئی سے اب تک بھارتی روپے کی قدر میں 17 فیصد کمی ہوئی جبکہ پاکستان، ترکی، انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ، فلپائن

سمیت دیگر ایشیائی ممالک کی کرنسی بھی امریکی ڈالر کے دھچکے برداشت نہ کرسکیں' ایشیائی ممالک ممیں سرمایہ کاروں نے سٹاک مارکیٹ سے سرمایہ نکالنا شروع کردیا۔ میڈیا رپورٹس میں شور مچا ہوا ہے کہ امریکی ڈالر نے گزشتہ چند روز میں ایشیائی کرنسی خصوصی طور پر بھارتی کرنسی کو بری طرح کمزور کیا ہے۔ ایک ماہ میں بھارتی اسٹاک ایکس چینج انڈیکس میں 11 فیصد کمی ہوئی صرف گزشتہ چار روز میں بھارتی سٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی قیمت میں ڈالر نے بھارتی روپیہ کو 100 ارب ڈالر کا ٹیکہ لگا دیا جس کے باعث بھارت کے امیر ترین شخص مکیش امبانی کے اثاثوں کی مالیت 5.6 ارب ڈالر کم ہو کر 17.5 ارب ڈالر رہ گئی جبکہ مکیش کے بھائی انیل امبانی کے اثاثوں میں بھی 1.3 ارب ڈالر کا نقصان ہوا۔ رپورٹس کے مطابق امریکی مرکزی بنک ملکی معیشت کو سہارا دینے کیلئے 85 ارب ڈالر ماہانہ ادا کرتا تھا جس میں سے کچھ رقم ایشیائی ممالک کی سٹاک مارکیٹ میں منتقل کی جاتی تھی تاہم اب امریکی مرکزی بنک نے ماہانہ دی جانے والی ریزرو رقم دینے کا سلسلہ ختم کرنے کا عندیہ دے دیا جس کے باعث سرمایہ کاروں نے ایشیائی ممالک خاص طور پر بھارتی سٹاک ایکسچینج سے سرمایہ کاری نکالنا شروع کردی جس کے باعث ایشیائی کرنسی میں واضح طور پر گراوٹ ہورہی ہے۔ ایشیائی ممالک میں بھارت کے علاوہ انڈونیشیا روپیہ چار سال جبکہ ملائشین رنگٹ' تھائی بھات تین سال کی کم ترین سطح پر پہنچ گیا دوسری جانب پاکستانی روپیہ' ترک لیرا' فلپائنی پیسو' جنوبی کوریا کے وون سمیت دیگر

ایشیائی ممالک کی کرنسی میں بھی کمی دیکھنے میں آرہی ہے۔ پچھلے دنوں ہندوستان میں ہونے والی دو روزہ عام ہڑتال نے ہندوستان کی معیشت اور سماجی ترقی کا پول کھول دیا۔اس ہڑتال میں بھارت کی تقریباً کی تمام ترٹریڈ یونینوں سمیت پبلک سیکٹر، بینک، سرکاری انشورنس، پوسٹل سروس، ٹرانسپورٹ، توانائی، کول مائینز، اسٹیل مائینز، بندرگاہوں، پیٹرولیم اور پلانٹیشن اور دیگر پرائیویٹ سیکٹرز کے مزدوروں سمیت صنعتی محنت کشوں نے بڑھ کر حصہ لیتے ہوئے سرمایہ داری نظام اور اس کی غلاظتوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ محتاط اندازوں کے مطابق اس ہڑتال میں کروڑوں محنت کشوں نے شرکت کی، جب کہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی تھی جس نے اس ہڑتال میں بل واسطہ حصہ لیتے ہوئے اس کی کام یابی کو یقینی بنایا۔

بھارت کی موجودہ صورت حال میں اس ہڑتال کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہونا کوئی حیران کن بات نہیں ہوگی۔ دراصل یہ پچھلے سال ہونے والی 28 فروری کی عام ہڑتال ہی کا تسلسل ہے، جس نے ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی ہڑتال ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا اور محنت کش طبقے میں ایک بڑے حوصلے کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ یہ ہڑتال ایک ایسے دور میں وقوع پذیر ہوئی جب ہندوستان کی معیشت کو عالمی سرمایہ داری ابھرتی ہوئی معیشت قرار دے رہی تھی۔ پچھلے چند ایک سال سے جب دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک میں عالمی معاشی بحران نے اپنا

برازیل، روس، چین، انڈیا، جنوبی (BRICS غلبہ جمار کھا تھا اور ہندوستان سمیت افریقہ) کے چند ایک ممالک کی معاشی ترقی کا بول بالا کیا جا رہا تھا۔ اس صورت حال میں ہندوستان سے اٹھنے والی اس چنگاری نے اس کی مصنوعی ترقی کا جنازہ نکال دیا۔

اس وقت یورپ اور امریکا سمیت دنیا کی تمام تر بڑی معیشتیں بحرانوں کا شکار نظر آتی ہیں۔ آج عالمی طور پر منڈی سکڑتی جا رہی ہے وہیں یورپ کی منڈی شدید خرابی کی زد میں ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ 9-2008 کے معاشی بحران کے بعد یورپ اور امریکا کا وہ حصہ جو ابھی تک بحران کی زد میں نہیں آیا تھا اب تیزی سے معاشی زوال کی طرف گام زن ہے۔

عالمی سطح کے اس بحران میں ہندوستان کی معیشت کی بابت جو تمام تر خوش فہمیاں تھیں اور جس ترقی کو حوالہ بنا کر معاشی ترقی کے شادیانے بجائے جا رہے تھے، وہ درحقیقت 1991 کے دور کے بعد سے شروع ہونے والے لبرلائزیشن (Liberalization) کی ترقی تھی، جس کے دوران ہندوستان کے ایک بہت بڑے معاشی سیکٹر کی نج کاری کے ذریعے غیر ملکی سرمایہ کاری کو پروان چڑھا کر بڑے پیمانے پر ترقی کی گئی، لیکن 2008ء کے معاشی بحران کے اثرات ناگزیر طور پر بھارت پر بھی پڑے۔ مغربی ممالک کے مقابلے میں بھارت اور چین کی معیشتوں کا

زیادہ گروتھ ریٹ بتا کر انہیں بحران کی زد سے باہر رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی، لیکن آخرکار بھارتی معیشت بھی اسی عالمی معیشت کا حصہ ہے۔ مغربی معیشتوں میں یورو زون کا بحران اور امریکی معیشت کی سست روی کے بھارتی معیشت پر تیزی سے اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور جی ڈی پی کی نام نہاد زیادہ شرح نمو سے غربت کم ہونے کی بجائے اسی شرح سے بڑھ رہی ہے۔

پچھلے عشرے میں بھارتی معیشت کی شرح نمو اوسطاً 9 فی صد رہی ہے، خطِ غربت کے نیچے ایک ڈالر یومیہ پر گزارہ کرنے والے افراد کی تعداد 770 ملین سے بڑھ کر 860 ملین ہو چکی ہے۔ پلاننگ کمیشن آف انڈیا نے گذشتہ سال اپنی سالانہ رپورٹ میں غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی ایک نئی تشریح پیش کی ہے، جس کے مطابق شہروں میں یومیہ 28.65 روپے (فی فرد) خرچ کرنے والے جب کہ دیہات میں 22.42 روپے خرچ کرنے والے افراد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے کے زمرے میں نہیں آتے۔ اگر ان اعداد و شمار کو ماہانہ ضرب کیا جائے تو فی شہری 859.6 روپے (مہینہ) جب کہ 672.8 روپے کی کھپت کرنے والی دیہی آبادی غریب نہیں ہے۔ اس طرح بھارتی حکومت نے ''جمہوری'' طریقے سے 2009ء سے اب تک تقریباً 29.8 فی صد سرکاری طور پر غربت ختم کر دی ہے!

بولی وڈ اور کرکٹ کی دنیا میں بظاہر ایک بہت بڑا معاشی انقلاب برپا کروانے

کی کوشش کی جارہی ہے، جس سے عوام کے سامنے یہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ معاشی استحکام ابھی برقرار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کالے دھن نے بھارتی ریاست میں اس قدر economy) سرائیت کرلی ہے کہ اب ریاستی جائز طریقوں سے اس کالے دھن کرنے میں ریاست اپنا کردار ادا کرہی (formal economy) کو سفید (informal ہے۔ اس قسم کی سرمایہ کاری سے کالادھن بغیر کسی رکاوٹ کے سفید ہوجاتا ہے۔

2013ء کی معاشی صورتحال بھی مایوس کن ہے۔ 9 فی صد کے لگ بھگ شرح نمو بھی ہندوستانی عوام کو بربادی کے سوا کچھ نہیں دے سکی۔ معاشی ترقی کا فائدہ قلیل تعداد میں موجود درمیانے طبقے کو ہوا جب کہ ایک ارب ہندوستانی اذیت اور غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے چلے گئے۔ بھارت کی تاریکی کا اندازہ بھارتی عورتوں کی صورت حال کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ پچھلے دنوں ہوئے دہلی ریپ کیس کے بعد عوامی شعور بڑے پیمانے پر متحرک ہوا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہلے ہندوستان میں عورتوں سے زیادتی کے واقعات نہیں ہوا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں ہر بیس منٹ میں ایسا ایک واقعہ ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان دنیا میں خواتین کے لیے چوتھا بدترین ملک ہے۔ ہندوستانی خواتین اور بچیوں کے مصائب ان کی پیدا ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک کروڑ سے زیادہ بچیوں کا اسقاطِ حمل ہو چکا ہے اور

ہر سال پانچ لاکھ سے زاید بچیاں پیدا ہونے سے قبل ہی ختم کردی جاتی ہیں۔ اس تمام تر صورت حال کے باوجود ہندوستانی حکمراں ترقی کا راگ الاپتے ہیں، لیکن اس واقعے کے بعد عوام کے شدید رد عمل نے بھارت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بھارتی عوام حکمراں طبقے کی تمام تر جعلسازیوں، دھوکوں اور جھوٹ سے آگاہ ہوچکے ہیں اور ان ظالم حکمرانوں کے سفید جھوٹ کو اب بہ آسانی پہچاننے لگے ہیں۔

گلوبلائزیشن نے پچھلے 20 سال میں ہندوستانی معاشرے کو سوائے غربت اور بے حسی کے اور کچھ نہیں دیا، لیکن ماضی کی نسبت آج بڑے پیمانے پر محنت کش طبقے کا احتجاج بڑھ رہاہے۔ بڑے پیمانے پر تحریکیں اٹھتی نظر آرہی ہیں۔ اس تمام تر معاشی اور سماجی جبر میں بھارت کی واحد امید محنت کش طبقہ اور نوجوان ہیں۔ حکمراں طبقے کے پالیسی سازوں نے نیچے پکنے والے لاوے کی آنچ کم کرنے کے لیے دھوکا دہی کے کئی طریقے استعمال کیے ہیں۔ انا ہزارے سمیت سول سوسائٹی کی تمام تحریکوں نے موجودہ نظام، اور کرپشن کے خلاف آواز تو اٹھائی لیکن اس کا کوئی متبادل پیش نہیں کی گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ بھی اپنے مصلحتی کردار کی وجہ سے عوام کے سامنے بے نقاب ہوچکی ہے۔

بھارتی کی مجموعی آبادی کا ایک بڑا حصہ اب بھی خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ بھارت کی 1.2 بلین آبادی کا 5/3 واں حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور وہ بڑی حد تک زراعت پر ہی انحصار کرتا ہے۔ بھارت میں کئی برس اچھی فصل کے بھی آئے۔تاہم حکومت کے پاس اناج کی مناسب ذخیرہ اندوزی کا انتظام نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہ کھلے آسمان کے نیچے سڑتا رہتا ہے۔ بھارت کی عدالت عظمیٰ نے اس بات کی سخت سرزنش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اناج کو سڑانے کے بجائے انہیں غریبوں میں مفت تقسیم کردینا چاہئے۔ تاہم حکومت نے اس پر عمل نہیں کیا اور کہا کہ یہ عدالت کا مشورہ ہے حکم نہیں۔ بعد میں سپریم کورٹ نے واضح لفظوں میں کہا کہ یہ مشورہ نہیں بلکہ حکم ہے۔ بھارت کا ایک اہم مسئلہ ملک میں اقتصادی عدم مساوات ہے۔ بھارت میں غربت بھی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یومیہ ایک ڈالر سے بھی کم آمدنی والے کروڑوں خاندانوں کو اوپر اٹھانا ایک بڑا چیلنج ہے۔ ایک خاندان نے اپنی غربت کو بیاں کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس صرف ایک رضائی ہے، سردیوں میں ہم تمام آٹھ افراد اسی سے گزارا کرتے ہیں۔ بجلی لگوانے کی سکت نہیں اور نہ گھر میں پانی ہے۔ مگر رونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ کون ہے جو ہماری سنے؟ بھارت کی چمک دھمک دکھانے میں وہاں کے میڈیا فلم انڈسٹری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ چند برسوں کے دوران بھارت میں پرائیویٹ ٹیلی وژن چینلز کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور آج کل وہاں تقریباً بارہ سو چینلز دستیاب ہیں۔ لیکن بھارت کا اصل چہرہ وہاں کی غربت

اور افلاس ہے۔ جو بھارت کی ترقی کا ڈھول بجانے والوں کا پول کھول دیتا ہے۔

فاسٹ فوڈ جلدی کا کھانا اب ہمارے کلچر کا حصہ بنتا جارہا ہے

فاسٹ فوڈ کے نتیجے میں ہر سال ۲۸ لاکھ افراد مٹاپے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

فاسٹ فوڈ جلدی کا کھانا اب ہمارے کلچر کا حصہ بنتا جارہا ہے۔ ہم نے اپنے روایتی کھانوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور اب ہم ولایتی، چینی، امریکی، اٹلی کے کھانوں کا مزہ لے رہے ہیں۔ برگر شاپ جگہ جگہ کھل گئی ہیں، اور برگر اپنے کھانے والا برگر نہیں رہا، بلکہ معاشرے میں ایک پوری برگر کلاس نے جنم لے لیا ہے۔ کراچی میں فٹ پاتھ ہوٹل اور ریسٹورینٹ کثرت سے کھل گئے ہیں۔ سرشام کسی علاقے میں نکل جائیں، آپ کو یہ فٹ پاتھ ہوٹل ہر جگہ مل جائیں گے۔ کھنے والے اور زبان کے چٹخارے کے بہت سے عادی یہ بھی کہتے ہیں کہ آج چاہے کراچی میں کتنے ہی امریکن فوڈ چینز کھل جائیں یا فوڈ اسٹریٹ بن جائیں مگر جو مزہ سلور اسپون کے رولز، مسٹر برگر، دستگیر کی نہاری، مزیدار حلیم، برنس روڈ کے دھی بڑھے، انچولی کی چاٹ، فنگر فش، بنوری ٹاؤن کے جوس، جیل روڈ کی مچھلی، پی آئی ڈی سی کے پان اور اسٹوڈنٹ بریانی کا تھا وہ کسی اور کا نہیں۔ اب حیدرآباد کالونی حیدرآبادی کھانوں کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے، جہاں سے لقمی، اچار، دہی بڑے، ہریسا، بگارے بیگن اور وہ سب کچھ مل جاتا ہے۔ جو

حیدرآباد کھانوں کی جان ہے۔ اب یہ کھانے بڑی مقدار میں بیرون ملک بھی جاتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ ایسے کھانے کو کہتے ہیں جسے آپ چلتے پھرتے کھا سکیں۔ آجکل کی نوجوان نسل اس سے بہت متاثر نظر آتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ فاسٹ فوڈ کا استعمال صحت کے لے انتہائی مضر ہے۔ طبّی ماہرین فاسٹ فوڈ کے زیادہ استعمال سے پرہیز کا مشورہ دیتے ہیں، کیوں کہ اس میں کیلوریز کا تناسب حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ فاسٹ فوڈ کھانے سے وزن مین تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے آئی کیو لیول پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ان کھانوں میں استعمال کیے گئے تیز مصالحے اور گوشت کو جلد گلانے کے لیے مختلف کیمیائی اجزا انسانی معدے کو تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ فاسٹ فوڈ کے بجائے سبزی اور دودھ کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ اس سے جسم توانا اور دماغ چست رہتا ہے۔ مزید یہ کہ سبزیوں سے کولیسٹرول کنٹرول میں رہتا ہے اور دل کے دیگر امراض سے بچا جا سکتا ہے۔اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے انسان مختلف اقسام کی خوراک کھاتا ہے، جس میں پھل، سبزیاں، گوشت، مشروبات وغیرہ شامل ہیں۔ان تمام چیزوں کی اپنی جگہ پر خاص اہمیت ہے۔ متوازن غذا کھانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی عمر، صنف اور صحت کے مطابق ان سب چیزوں کا اعتدال میں استعمال کیا جائے۔

پاکستان میں گوشت کھانے کو رواج کچھ زیادہ ہی ہے۔ فاسٹ فوڈ کے مراکز

پہلو میں کڑاہی گوشت، بریانی، بالٹی گوشت، تکے، کباب کے کھابے بھی کثرت سے نظر آتے ہیں، برنس روڈ، بوٹ بیسن، طارق روڈ، حسن اسکوئر، جہاں چاہیں آپ کو یہ ڈشین مل جائیں گی۔ دوسرے غذائی اجزاء کے علاوہ گوشت بھی انسانی خوراک کا اہم جزو ہے، جس سے جسم کو پروٹین، لحمیات، آئرن، وٹامن B وغیرہ حاصل ہوتی ہیں، جو کہ ایک صحت مند جسم کیلئے ضروری ہیں۔ تاہم ہر قسم کی غذا کے اپنے فوائد اور نقصانات ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کو عام روٹین میں ضرورت کے مطابق کھانا چاہیے، گوشت کھانے میں غیر معمولی زیادتی سنگین قسم کے صحت کے مسائل کا سبب بن جاتی ہے۔ مچھلی اور مرغی کے گوشت کو عام طور پر White meat کہا جاتا ہے، اس سے انسانی جسم کو پروٹین وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ White meat میں کلوریز اور چکنائی کی مقدار بھی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ اس طرح چوپائیوں اور دودھ پلانے والے جانوروں (Mamals) کا گوشت Red Meat کہلاتا ہے۔ مٹن (چھوٹا گوشت) میں چکنائی کی مقدار، چکن کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ بیف (بڑے گوشت) میں چکنائی کی زیادہ مقدار ہوتی ہے، تاہم اس سے دوسری غذائی ضروریات مثلاً پروٹین، زنک، فاسفورس، آئرن اور وٹامن B وغیرہ پوری ہوتی ہیں۔ Red Meat اور White Meat دونوں کے اپنے اپنے فوائد اور نقصانات ہیں، اس لیے انہیں ایک حد سے زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

طب اور غذائیات کے میدان میں ہونے والی ریسرچ سے پتا چلتا ہے کہ عام روٹین

میں سرخ گوشت کا زیادہ استعمال مختلف سنگین نوعیت کی بیماریوں مثلاً کینسر، دل کے
امراض، ذیابیطس، معدہ، جگر کی بیماریوں کا باعث بن سکتا ہے، اس کے علاوہ بعض
(Premature سٹڈیز کے مطابق اس کے زیادہ استعمال سے وقت سے پہلے اموات
death) بھی واقع ہوسکتی ہیں۔ بالخصوص وہ لوگ جو پہلے سے ہی ان بیماریوں میں مبتلا
ہیں، انہیں سرخ گوشت کے استعمال میں غیر معمولی احتیاط برتنی چاہیے۔

گوشت کی خرید و فروخت کا (Processed) ہمارے ہاں شہروں میں ڈبوں میں پیک
سرخ گوشت سے بھی صحت کے مسائل Processed رواج بھی عام ہوتا جارہا ہے۔
لاحق ہوتے ہیں۔ ہاورڈ سکول آف پبلک ہیلتھ کی طرف سے کی جانے والی ایک تحقیق کے
سرخ گوشت کو روزانہ ایک بار بھی کھانے میں استعمال کیا Processed مطابق اگر
جائے تو دل کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے امکانات 42% تک، جبکہ ذیابیطس میں
مبتلا ہونے کے امکانات 19% تک بڑھ جاتے ہیں۔

کا استعمال کیا جاتا ہے، جو کہ (Nitrates) ایسے گوشت کو محفوظ کرنے کیلئے نائٹریٹس
بعض سائنسدانوں کے نزدیک کینسر پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ اس لیے اس تحقیق میں
سرخ Processed لوگوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ کینسر کے خطرے سے بچنے کیلئے
گوشت سے اجتناب کریں۔

جو لوگ صحت کے حوالے سے مختلف مسائل کا شکار ہوتے ہیں، اگر وہ سرخ گوشت کی مقدار اپنی معمول کی خوراک میں کم کردیں تو سٹڈیز کے مطابق ان کی صحت میں بھی بہتری کی کافی گنجائش موجود ہی ہے۔ گزشتہ سال برطانیہ کے صحت کے حوالے سے قائم کردہ سائنٹفک ایڈوائزری کمیشن نے اپنے شہریوں کیلئے تجویز کیا تھا کہ وہ اوسطاً 70 گرام یا (2.5 oz) روزانہ، جو ہفتے میں تقریباً 500 گرام (یا 17 oz) بنتا ہے، سرخ گوشت استعمال کرسکتے ہیں تاکہ بڑی آنت کے کینسر کے خطرے کو کم سے کم کیا جاسکے۔

ہمارے شہروں میں فاسٹ فوڈ کلچر بھی جڑ پکڑ چکا ہے۔ کے ایف سی، میکڈانلڈ اور سب وے کے علاوہ بھی فاسٹ فوڈ چینز تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ پیزا ہٹ کے علاوہ بھی پیزا کی بہت سے ریسٹورینٹ کھل گیے ہیں۔ نوجوان اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی فیملیز بڑی کثرت اور رغبت کے ساتھ یہ کھانے کھاتے ہیں۔ ان فاسٹ فوڈ میں بھی چکن یا گوشت کی دوسری اقسام شامل ہوتی ہیں۔ اسے معمول کا حصہ بنا لینے سے سب سے زیادہ موٹاپے کی شکایت پیدا ہوتی ہے، جو کہ خود ایک بیماری ہے اور بہت سی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ نیز ان کے استعمال سے صحت کے مختلف دوسرے مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

اس لیے نہایت ضروری ہے کہ فاسٹ فوڈز سمیت گوشت کی دوسری تمام مصنوعات کو

بڑی احتیاط کے ساتھ اعتدال میں برتا جائے۔ تاکہ اس سے آپ کے جسم کو نقصان کی بجائے فوائد حاصل ہو سکیں اور آپ ایک صحت مند زندگی گزار سکیں. برطانوی ماہرین نے کہا ہے کہ فاسٹ فوڈ کھانے سے بچوں کو دمہ، اگزیما اور آنکھوں میں پانی کی شکایت ہو سکتی ہے۔

ماہرین کے مطابق فاسٹ فوڈ کھانوں میں اعلیٰ سطح کے سیر شدہ چکنائیاں ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے بچوں میں موٹاپا اور بیماریاں عام ہو رہی ہیں۔ بہت کم عمری میں دو سے تین سال میں ایسے کھانے کھانے سے دمہ کا خطرہ انتالیس فیصد ہوتا ہے جبکہ چھ سے سات سال کی عمر میں فاسٹ فوڈ کھانوں سے دمہ ہونے کے امکانات ستائیس فیصد تک ہوتے ہیں۔ ماہرین نے والدین کو متنبہ کیا کہ اس عمر میں بچوں کو زیادہ سے زیادہ پھل کھلائیں تاکہ ان میں بیماریوں کی شرح کو کم کیا جا سکے۔ فاسٹ فوڈ کمرشلز دیکھ کر بچوں میں جنک فوڈ کی طرف رغبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ فاسٹ فوڈ کا استعمال دنیا بھر میں بڑھتا جا رہا ہے۔ پپاکستان میں ان کھانوں کا رجحان وہ چمکیلے اشتہار ہیں، جو پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر دکھائے جاتے ہیں۔

آرکائیوز آف پیڈیاٹرکس اینڈ ایڈولیسنٹ میڈیسن میں چھپنے والی ایک مطالعاتی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں گرچہ ٹیلی وژن پر شوگر اور چکنائی سے بھرپور

اشیائے خورد و نوش کے اشتہارات میں کسی حد تک کمی آئی ہے تاہم اب بھی کھانے پینے کی زیادہ تر ایسی اشیاء کے اشتہارات ٹیلی وژن پر دکھائے جاتے ہیں، جو بچوں کی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اس رپوٹ کے مطابق امریکہ میں چھ سال پہلے کے مقابلے میں اب ٹیلی وِژن پر دکھائے جانے والے فاسٹ فوڈ کمرشلز کی تعداد کہیں زیادہ رہی۔

فاسٹ فوڈ کے ذرائع ابلاغ میں نظر آنے والے اشتہارات سے متعلق اس نئی تحقیق رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اشیائے خورد و نوش تیار کرنے والی 17 کمپنیوں نے مشرکہ طور پر ایک پروگرام کے تحت ایسی اشیاء کے غذائی اجزاء کا معیار بہتر بنانے کا وعدہ کیا ہے، جن کے اشتہارات خاص طور سے 12 سال سے کم عمر بچوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں کوکا کولا، کرافٹ فوڈز، جنرل ملز اور کیلوگ جیسی مشہور کمپنیاں شامل ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان تلے ہوئے کھانوں کے ذریعے چکنائی خون کے شریانوں میں جمع ہونے لگتی ہے۔

اُدھر شکاگو کی یونیورسٹی آف اِلینوئے کی ایک ریسرچر لیزا پوُول، جنھوں نے اشیائے خورد و نوش کے اشتہارات سے متعلق اس نئی تحقیق میں شامل ٹیم کی سر براہی کی، کا کہنا ہے، مجموعی طور پر غیر صحت مند اشیاء کی تشہیر میں کچھ کمی آئی ہے، جو کہ ایک اچھی خبر ہے' تاہم دوسری جانب فاسٹ فوڈ کے

اشتہارات میں بہت زیادہ اضافہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے'۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ چھوٹی عمر میں موٹاپے کا شکار ہونے والے بچوں کی تعداد کی ذمہ داری کس حد تک غیر صحت منداشیائے خورد ونوش کے اشتہارات پر عائد ہوتی ہے، یہ کہنا تو مشکل ہے تاہم یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کے شواہد بھی پائے جاتے ہیں کہ فاسٹ فوڈ کمرشلز دیکھ کر بچوں میں جنک فوڈ کی طرف رغبت میں اضافہ ہوتا ہے۔حال ہی میں یورپی یونین کے ممالک میں بھی بچوں کے موٹاپے کے خلاف مہم شروع کی گئی ہے۔امریکی محققہ لیزا پاؤل کا کہنا ہے کہ اشیائے خورد ونوش کے اشتہارات سے متعلق اس تحقیق کے نتائج نے بچوں کے ٹیلی وژن پروگراموں کے دوران کی جانے والی فوڈ مارکیٹنگ میں سیلف ریگولیشن یا خود احتسابی کے بارے میں چند بنیادی سوالات اٹھائے ہیں۔'کونسل آف بیٹر بزنس بیورو' کے ایک ترجمان لی پیلر کے مطابق اس تحقیق کے دوران ریسرچرز نے فاسٹ فوڈ اشتہارات کی تعداد پر غور کیا، نہ کہ اُن میں شامل اشیاء کے معیار پر۔ لی کا کہنا ہے کہ برگر کنگ اور میکڈانلڈز نے بچوں کے کھانوں اور ان کے اشتہارات کا معیار بہتر بنایا ہے۔اب ان دونوں کمپنیوں نے بچوں کے مینیو میں فرنچ فرائز اور سوڈا کے بجائے ایپل سلائیسز اور کم چکنائی والا دودھ شامل کیا ہے۔اکثر ماؤں کو شکایت رہتی ہے کہ ان کا بچہ کھاتا نہیں ہے یا کم کھاتا ہے۔کچھ ماؤں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا بچہ

کھاتا تو ہے لیکن گھر کا بنا کھانا وہ پسند نہیں کرتا لیکن فاسٹ فوڈ پیٹ بھر کھالیتا ہے.....
پیزا، برگر جیسے فاسٹ فوڈ اور کولڈ ڈرنکس کے استعمال سے بچے پہلے تو موٹاپے کا شکار ہوتے ہیں اور پھر ان کو موٹاپے کی وجہ سے ہونے والی بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ ایسے بچوں کی ماں کو ہمیشہ فکر لگتی رہتی ہے کہ بچہ موٹاپا یا دیگر بیماریوں کا شکار نہ ہو جائے لیکن جب وہ گھر میں بنے پکوانوں کی طرف دیکھتا بھی نہیں تو اس کی ماں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اس کو فاسٹ فوڈ کھلائے۔ بچوں کے کھانوں میں سدھار ممکن ہے۔ ایسے بچوں کی ماں کے لئے کچھ تجاویز دی جا رہی ہیں جنہیں اپنا کر وہ اپنے بچے کے دل میں گھر کے کھانے کی دلچسپی پیدا کر سکتی ہیں۔

☆ بچوں کا کھانا مقوی ہو جس سے انہیں کاربوہائیڈریٹ، پروٹین، فیٹ، فائبر، معدنیات اور وٹامن متوازی طور پر مل سکیں۔

☆ بچے سے کبھی بھی یہ نہ کہیں کہ اگر وہ دو چپاتی یا ایک کٹوری سبزی کھائے گا تو آپ اسے بعد میں ایک چاکلیٹ دیں گی یا اسے ٹی وی دیکھنے دیں گی یا اسے باہر کھیلنے جانے کی چھوٹ مل جائے گی۔ اگر بچہ کوئی کھانا کھانے سے انکار کرے تو اس کی جگہ پر اسے کوئی اور کھانا کھانے کو دیں۔

☆ اس کے کھانے کا وقت مقرر کریں 2 کھانوں کے درمیان 2 گھنٹے کا وقفہ رکھیں۔

☆ کافی سارے بچے اس لئے بھی کھانا کم کھاتے ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان

کو وہی کھانا دیا جائے جو انہیں پسند ہو۔ اگر بچہ بار بار ایک ہی طرح کا کھانا کھانا چاہتا ہے تو اس کی اس عادت کو روکنے کیلئے اس کو دن میں ایک بار وہی کھانا دیں اور دوسرے وقت اسے سادہ کھانا دیں۔

☆ اگر اسے فاسٹ فوڈ انتہائی پسند ہے تو گھر میں ہی مزیدار مقوی کھانا بنا کر دیں جیسے برگر، پاؤ بھاجی، نوڈلز، وغیرہ گھر پر ہی بنائیں۔

☆ آج کل کھانے کے تئیں بچوں کی پسند ناپسند کافی اہم ہوتی جا رہی ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ جو اسے بنا کر دیں وہ اسے اچھا لگے۔ اسلئے کھانا بناتے وقت اس کی پسند کو ذہن میں ضرور رکھیں۔ اگر وہ کھانے میں کسی قسم کی تبدیلی چاہے تو اس میں تاخیر نہ کریں۔

☆ بہتر ہوگا اگر بچے گھر پر ہی ڈنر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شام کا کھانا اپنے پورے فیملی کے ساتھ مل کر کھانے سے بچوں کی جسمانی اور ذہنی صحت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

☆ بچوں کو اچھا نظر آنے والا کھانا پسند آتا ہے۔ آپ کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ کھانا دستر خوان یا میز پر لانے سے پہلے اس کی تھوڑی سجاوٹ ضرور کر دیں آج امریکہ کی سیر کو نکلیں، گاڑی پر یا پھر ٹور بس پر۔ امریکہ کا تو گزارا ہی فاسٹ فوڈ پر ہے۔ امریکہ میں سفر کے دوران، آپکو ایک کے بعد ایک فاسٹ فوڈ ریستوران نظر آئیں گے۔ بیشمار مختلف ناموں والے یہ ریستوران بیحد پسند کئے جاتے ہیں اور ہر کسی کو اپنی پسند کے مطابق کھانے کی چیزیں

مل بھی جاتی ہیں۔اگرچہ، فاسٹ فوڈ فراہم کرنے والے اِن ریستورانوں میں آج کل low-fat چیزیں بھی کھانے کے لئے ملتی ہیں، لیکن زیادہ بکنے والی چیزوں میں چند ہیمبر گر، آلو کے چپس، تلا ہوا چکن، گریسی پتزا شامل ہیں۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو امریکہ کے سرجن جنرل کے مطابق امریکہ میں موٹاپے کی وبا میں اضافے کا باعث ہیں۔اور جن ریستورانوں میں صحت مند کھانے پیش کئے جاتے ہیں اُن کے مقابلے میں low-fat چیزوں میں بھی کیلوریز کی بھرمار ہوتی اِن فاسٹ فوڈ ریستورانوں کی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، Dan Evins ہے۔ کریکر بیرل نامی ایک چین کے بانی اور یہ چین مزیدار لیکن موٹا کرنے والی چیزیں فروخت کرتی ہے، اور اِس کے زیادہ ریستوران بڑی بڑی شاہراہوں کے کنارے واقع ہوتے ہیں۔اِن کھانوں میں زیادہ تر گریوی کے ساتھ بسکٹ، مقنزیا پھر پرانے انداز میں تیار کی گئی سٹیک شامل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے ایسے ریستوران بھی کھولے ہیں جن میں صحت مند کھانے جیسے برائلڈ مچھلی، بھاپ میں تیار کردہ سبزیاں اور اِسی طرح کی دوسری چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن، اِن میں زیادہ تر دیوالیہ ہو گئے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ صحت مندانہ بنیادوں پر تیار کئے جانے والے کھانے کہیں زیادہ مہنگے ہوتے ہیں۔ پھر کم معاوضے پر ایسے باورچی بھی نہیں ملتے جو جلدی جلدی صحت مند لیکن مزیدار کھانے تیار کر سکیں۔ اسلئے، اس طرح کی دکانیں کامیاب نہیں رہتیں۔

کیونکہ اگرچہ امریکی کہتے تو یہی ہیں کہ وہ صحت مند کھانا چاہتے ہیں، لیکن جب انہیں مینو میں پیش کر دیا جائے تو وہ اُس کا آرڈر نہیں دیتے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جب صحت مند کھانوں کی قیمت کم ہو جائے گی، تو ممکن ہے امریکیوں کو اِس کی عادت ہو جائے۔ لیکن، ابھی ایسا نہیں۔ اور ابھی کوئی ایسی مثال بھی نہیں ملتی کہ فاسٹ لیکن صحت مند کھانوں کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ طبّی ماہرین نے اس بات کا بھی اندازہ لگایا ہے کہ زیادہ کھانے اور موٹاپے کی وجہ سے ہر سال 28 لاکھ افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ آسٹریلیا میں ایک اندازے کے مطابق اسی فیصد آبادی آئیندہ چند برسوں میں مٹاپے کا شکار ہو جائے گی۔ یہ مسئلہ یورپ کے تمام ہی ملکوں میں نمایاں ہے۔ اور اب اس کے تدارک کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔

بھاری مینڈیٹ اور بھاری آزمائش

میاں نواز شریف بھاری مینڈیٹ حاصل کرنے کے بعد دوسری بار کراچی آئے ہیں۔ کراچی اب پہلے والا کراچی نہیں رہا، پلوں کے نیچے سے ہی نہیں یہاں کے ندی نالوں سے بھی بہت سا پانی بہہ گیا ہے۔ کراچی ایک آتش فشاں بن چکا ہے۔ ایک ایسا آتش فشاں جو جب چاہے آگ اگلنے لگے۔ آگ بھی ایسی جو ہر چیز بھسم کرکے رکھ دے۔ یہ آگ کراچی کے ہر شہری اور ہر گلی کوچے میں لگی ہے۔ اس کو بجھانے والا کوئی نہیں ہے۔ الیکشن کے بعد نواز شریف پہلی بار کراچی آئے تو ہر شخص انتظار میں تھا کہ وہ کوئی جادو کا چراغ لے کر آئیں گے۔ اور کراچی میں ٹارگیٹ کلنگ رک جائیگی۔ بھتہ خور بھاگ جائیں گے۔ روشنیوں کا شہر جگمگا اٹھے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، نواز شریف تو اپنے ہی زخم سہلاتے رہے۔ مشرف دور میں اے ٹی سی کورٹ میں بکتر بند گاڑی میں پہلی بار معزولی کے بعد آنا۔ انھیں اب بھی وہی یا تھا۔ وہ اسی یاد کا ذکر کرکے چلے گئے۔ سب کو مایوسی ہوئی۔ کراچی پھر سے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ نواز شریف ایک بار پہلے بھی کراچی آئے تھے۔ تیرانوے میں غیر معمولی مینڈیٹ کے بعد جب ان کی حکومت ختم کردی گئی تھی۔ کراچی کے عوام ان کے ساتھ تھے۔ آواری ٹاورز ہوٹل میں عوام کا جم غفیر تھا۔ وہ اپنے شیر سے کچھ سننا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی نواز شریف نے کراچی والو کو مایوس ہی کیا تھا۔ وہ ایک

ایسی بے جان تقریر کرکے چلے گئے۔ جس نے مایوسی کو مزید گہرا کر دیا تھا۔ کراچی اب دو کروڑ کا شہر ہے۔ نواز شریف کو کراچی کیا پورے صوبے میں بس پاؤں رکھنے ہی کی جگہ ملی ہے۔ بھائی نے انھیں جاگ پنجابی جاگ کا طعنہ دے کر مبارکباد دی تھی۔ نواز شریف بھی دو کروڑ کراچی والوں کے مقابلے میں دس کروڑ پنجاب والوں کو فوقیت دیتے ہیں۔ وہ ان کا بیس کیمپ ہے۔ اس کی مضبوطی اور طاقت ضروری ہے۔ کراچی تو ٹیکس حاصل کرنے کے لئے، کمائی کرنے کے لئے، اپنے پسندیدہ افسران کی پوسٹنگ کے لئے، اور کبھی کبھی سیر و تفریح کے لئے اچھا ہے۔ میاں صاحب کو ان دو دن میں جن اجلاسوں میں جانا پڑا۔ انھیں خوب سننے کو ملیں۔ بے بھاؤ کی، یہاں تک کہ کچھ یار لوگ تو گورنر اور وزیر اعلی سندھ دونوں کو ہٹانے کا مطالبہ کر بیٹھے۔ اب آگے کیا ہو۔ یہاں بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ نے سارے شہر کو ویران کر دیا ہے۔ اس پر ایڈیشنل آئی جی کی دیدہ دلیری دیکھیئے کہ وزیر اعظم کی شہر مین موجودگی میں پریس کانفرنس میں، اعلانیہ کہا کہ کراچی میں چند لوگوں کا مرنا بڑی بات نہیں ہے۔ دو کروڑ کے شہر میں ٹارگٹ کلنگ تو ہوتی رہتی ہے۔ جب سیاں بنے کوتوال تو پھر ڈر کس کا، وزیر اعظم کو بھی دکھا دیا کہ ہم کسی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ ان کی موجودگی میں چودہ ہلاکتیں ہوئیں، رینجرز اور نیوی اہلکار، انٹیلیجنس آفیسر سب مرنے والوں میں شامل ہیں۔ افسر شاہی بھاری مینڈیٹ والوں سے کھیل رہی ہے۔ افسر شاہی محض اس وقت ہی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جب اس پر حکم چلانے والے

کانے،، نہ ہوں۔ اس حکومت میں تو،، کانے،، کیا اندھے لولے لنگڑے سب ہی موجود،، ہیں۔ جس ملک کے بائیس اہم اداروں،کارپوریشن،کے سربراہ نہ لگائے جاسکے ہوں، وہاں اندھیر نگری چوپٹ راج نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ میاں نواز شریف کی کچن کیبنٹ، تخت لاہور، تاجر اور صنعتکار برادری اگر اپنی منافع خوری، دولت کی ہوس کو حد میں رکھے، ملک میں امن وامان قائم کرنے، پیداوار بڑھانے، بے روزگاری کے خاتمے، اپنے ذمہ عائد ٹیکسوں کو ادا کرنے پر آمادہ ہوجائے تو یہ حکومت پانچ سال تو کیا آئندہ پانچ سال بھی قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو حکومت کو اپنی بقاکے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ زرداری حکومت کا زوال، کرپشن، مہنگائی، بیروزگاری، لوٹ مار، حکمران ٹولے کی اقربا پروری اور ناقابل برداشت، غرور تھا۔ جسے عوام نے اپنے ووٹوں سے خاک میں ملا دیا۔ میاں صاحب کراچی والے، مشکل میں ہیں، عام آدمی کی زندگی اجیرن ہے۔ ہارون رشید کی طرح بھیس بدل کر نکلیں کراچی میں کیا ہورہا ہے۔ سب پتہ چل جائے گا۔ ورنہ سرشام ویران سڑکوں اوربدحال لوگ کو دیکھ کر اندازہ کرلیجئے گا۔ جو بسوں کی چھتوں پر بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔ روز لٹ پٹ کر گھر جاتے ہیں۔ بھاری مینڈیٹ والوں نے بھاری آزمائش میں کراچی کا ساتھ نہ دیا تو پھر یہاں بھاری بوٹ کی چاپ نہیں گونج سنائی دے گی۔

نواز حکومت میں تبدیلی کا خواب چکنا چور

نواز حکومت میں تبدیلی کا خواب چکنا چور

تاجر کنگال ، غریب بدحال

سیاست دانوں نے عوام کا کچومر نکال دیا

عوام نے پانچ سال پیپلز پارٹی کی حکومت کو بڑے صبر کے ساتھ برداشت ، اس امید پر کیا تھا کہ سیاست دان انھیں تبدیلی کا خواب دکھاتے رہے، عوام نے اس تبدیلی کے لئے اپنے ووٹ کا بھرپور استعمال کیا۔ اور ووٹوں کے ذریعے حکومت مسلم لیگ نواز کی جھولی میں ڈال دی۔ لیکن اس حکومت کے آتے ہی عوام کو جن اذیت ناک دور کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس نے تبدیلی کے خواب کو چکنا چور کردیا ہے۔ اب مہنگائی، بھتے، اغوابرائے تاوان، پیٹرول کی قیمت میں ہوش ربا اضافے، بجلی کے نرخوں میں اضافے، لوڈ شیڈنگ، قتل و غارت گری، بم دھماکے، لوٹ مار نے اس تبدیلی کے خواب کو ایک ڈراونے خواب سے بدل دیا ہے۔ اب تاجر کنگال اور غریب نڈھال ہے۔ حکومت کی ترقی کے دعویٰ جھوٹے ثابت ہوئے ہیں۔ جمہوریت کا نعرہ لگانے والے سیاست دانوں نے عوام کا کچومر نکال کر رکھ دیا ہے۔ مہنگائی کا یہ سیلاب اب یہاں رکے کا نہیں،

پاکستانی روپیہ روز اپنی قدر کھو

رہا ہے، ڈالر کے دام بڑھ رہے ہیں۔ قرضوں کے بوجھ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے نے ہر چیز کے نرخ بڑھا دیئے ہیں۔ اب مرغی کا گوشت بھی مہنگا اور دال اور آٹا بھی عوام سے دور ہو گئے ہیں۔

یوں تو مہنگائی کا مسئلہ ہر دور حکومت میں رہا ہے لیکن اتنی شدت کے ساتھ نہیں تھا، کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ مگر اب ملک جیسے جیسے ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے (یعنی مصنوعی ترقی، قرضوں کے بل بوتے پر) ویسے ویسے مہنگائی کا جن بھی آسانی سے اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ کیوں! اس لیے کہ پچھلی یعنی ماضی کی حکومتوں کے دور میں ایک سال، چھ مہینوں میں اشیائے خور و نوش اور دیگر اشیائے ضروریات کی قیمتوں کا تعین (رد و بدل) ہوا کرتا تھا۔ لیکن پچھلے 5،6 سال سے جمہوری حکومتوں نے یہ رویہ اپنایا ہوا ہے کہ ہر مہینے پندرہ دن میں اشیا خور و نوش اور دیگر اشیا کی قیمتیں بدلنے لگی ہیں۔

بالخصوص پٹرولیم مصنوعات، بجلی و گیس، پانی کے نرخ بڑھائے جاتے ہیں اور اس پر طرہ امتیاز یہ ہے کہ قیمتیں بڑھائی تو جاتی ہیں 5 سے 7 روپے تک لیکن جب کمی کا احسان کرتے ہیں تو ایک روپے، دو روپے یا 80 نوے پیسے کم کرتے ہیں۔ خصوصاً بجلی کی قیمتوں میں سب سے زیادہ اضافہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس اضافے کا بوجھ عام صارفین پر نہیں پڑے گا، بلکہ یہ قیمتیں صنعتی

صارفین پر لاگو ہوں گی۔ صارفین کی بجلی، گیس، تیل، پانی وغیرہ کی قیمتیں بڑھیں گی تو کیا ان کی پیداواری لاگت میں اضافہ نہیں ہوگا اور پھر وہ اپنی مصنوعات مارکیٹ میں لائیں گے تو اسی اضافے کی نسبت سے عوام کو سپلائی کرنے کے لیے قیمتوں میں اضافہ نہیں کریں گے؟

وہ جو کہتے ہیں نا کہ چھاج تو چھاج چھلنی بھی بولی، تو پیپلز پارٹی کو بھی یہ موقع مل گیا کہ اس نے بھی نواز شریف کی حکومت پر تبرا کرتے ہوئے اشیا خوردونوش میں ہونیوالی ہوشربا مہنگائی کی تقابلی رپورٹ جاری کی ہے۔ اس جاری کردہ رپورٹ میں واضح کیا کہ گذشتہ تین ماہ کے دوران پاکستان میں اشیاء خوردونوش کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اسکی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رپورٹ کے مطابق مختلف اشیاء کی قیمتوں میں 22 سے 567 فیصد تک اضافہ کیا گیا۔ سب سے زیادہ اضافہ ٹماٹر کی قیمت میں کیا گیا جس کی قیمت 567 فیصد اضافے سے 15 روپے سے بڑھ کر 100 روپے ہو گئی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ حکومت میں فی کلو گرام بڑی الائچی 1500 روپے تھی جو اب بڑھ کر 2050 روپے ہو گئی ہے۔ اسطرح بڑی الائچی کی قیمت 37 فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ فی کلو گرام لونگ کی قیمت 35 فیصد اضافے سے 1350 روپے، سفید زیرے کی قیمت 43 فیصد اضافے سے 400 روپے فی کلو، چاول ایک نمبر 38 فیصد اضافے سے 110 روپے، آلو 67 فیصد اضافے سے 25 روپے فی کلو گرام ہو گئی ہے ۔سیاسی ومذہبی

جماعتیں بھی اس مہنگائی پر اور پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کو مسترد اور اس کےخلاف شدید احتجاج کرتے ہوئے۔ حکومت پر شدید تنقید کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جمہوریت اور عوام کا نعرہ لگانے والی مسلم لیگ (ن) مہنگائی کی ''چیمپئن'' بن چکی ہے۔ عمران خان اس مہنگائی کا ایک اور ہی سبب بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک حکومت اشرافیہ سے ٹیکس نہیں لیتی تب تک عوام پر مہنگائی کا بوجھ ڈالتی رہے گی، ملک دیوالیہ ہو چکا ہے، ملک کی آمدنی 2 ہزار ارب اور خرچ ساڑھے 3 ہزار ارب روپے ہے، ان 2 ہزار ارب میں سے 1300 ارب روپے تو قرضوں کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے اور باقی فوج کو چلا جاتا ہے جس کے بعد ملک کو چلانے کے لئے مزید قرضے لئے جاتے ہیں۔ عمران خان کہتے ہیں کہ ڈالر 105 روپے ہو چکا ہے تو مہنگائی تو لازمی بڑھے گی، انہوں نے کہا کہ گزشتہ 2 سے 3 سال میں عام آدمی کے گھر کے خرچ میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے اور یہ مزید بڑھے گا۔ انہوں نے کہا کہ بجلی مہنگی ہونے سے مہنگائی میں مزید اضافہ ہو گا۔ جمہوریت میں اپوزیشن کا اہم کردار ہوتا ہے اور کرپشن سے پاک حکومت ہی ملک میں مہنگائی ختم کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ایک مخلص اور ذمہ دار اپوزیشن ضروری ہے۔ مسلم لیگ نواز نے ہمیشہ پیپلز پارٹی سے سمجھوتہ کئے رکھا۔ جس کی وجہ سے زرداری حکومت پانچ سال لوٹ مار اور کرپشن کرتی رہی۔ اس صورتحال کا خمیازہ اب عوام کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ سید منور حسن پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے پر عوام کی دکھتی رگ پر

ہاتھ رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ حکومت سے کسی بھی قسم کی امید رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، مسلم لیگ (ن) کو ووٹ دینے والے مزید مہنگائی کے لئے تیار رہیں۔ سینیٹر شاہی سید حکومت کی طرف سے پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں ہوش اڑانے والے اضافے کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت نے پیٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں اضافہ کرکے عوام پر کیمیائی بم گرایا ہے اس ملک کی عوام جو کہ پہلے ہی مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، دہشتگردی، بدامنی کا شکار ہے پیٹرولیم مصنوعات میں اضافہ کرکے عوام سے دو وقت کی روٹی بھی چھینی جارہی ہے پیٹرولیم مصنوعات میں روز بروز ہونے والے اضافے نے عوام کی زندگی اجیرن کردی ہے غریب طبقہ جو کہ پہلے ہی مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہے پیٹرولیم مصنوعات میں اضافہ کا اثر براہ راست غریب اور متوسط طبقے پر پڑیگا غریب آدمی کا جینا مشکل ہوتا جارہا ہے۔

موجودہ حکومت کو اقتدار میں آئے ابھی سو دن بھی نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن اس نے تیسری بار پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرکے عوام کو مہنگائی کی چکی میں پینا شروع کردیا ہے۔ پٹرول اور گیس کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے سے اشیاء خورد ونوش کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں مسلم لیگ (ن) نے اپنے انتخابی منشور میں وعدہ کیا تھا کہ وہ خوشحالی لیکر آئیگی لیکن سو دن میں عوام کو پتہ چل گیا ہے کہ ان کے ساتھ کیا ہاتھ ہوگیا ہے۔ بے رحم

مہنگائی نے عوام کی زندگی اجیرن بنا دی ہے جبکہ حکمران اس مہنگائی کو گذشتہ حکومت کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مئی کے الیکشن میں صرف چہرے تبدیل ہوئے ہیں۔ پیپلز پارٹی کا نام مسلم لیگ سے بدل گیا ہے۔ پالیسیاں پہلے والی ہی جاری ہیں۔ عوام نے 11 مئی کے عام انتخابات میں مسلم لیگ (ن) کو پیپلزپارٹی کی عوام دشمن پالیسیوں سے تنگ ہو کر ووٹ دیئے تھے۔ تاکہ مسلم لیگ اقتدار میں آ کر عوام دوست پالیسیاں بنائے لیکن حکومت کے ابتدائی سو دن بتا رہے ہیں کہ حکومت عوام دوست پالیسیاں بنانے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ نئی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی ہوم ورک نہیں کیا تھا۔ غریب، کم تنخواہ اور مزدوری کرنے والے چھوٹے ملازمین کیلئے اب گھر کا چولہا جلانا ممکن نہیں۔ وفاقی وزیر اطلاعات پرویز رشید کہتے ہیں کہ پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں ردوبدل عالمی منڈی کے نرخوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت عالمی منڈی میں پٹرولیم کی قیمتیں پہلے والی سطح پر ہی برقرار ہیں۔ لیکن حکومت اپنا منافع کسی طور پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ ماہ جولائی میں مہنگائی کی شرح 8.3 فیصد ریکارڈ کی گئی تھی، جس کی اہم وجہ نئے بجٹ میں سیلز ٹیکس میں ایک فیصد اضافے سے اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں بڑھنا دیکھا گیا تھا جبکہ ماہ اگست میں بھی مختلف اشیاء کی قیمتوں میں آگ لگی رہی۔ اگست کے مہینے میں اوسطاً مہنگائی کی شرح 8.27 فیصد بتائی گئی۔ جس کا مطلب ہے کہ گزشتہ ماہ کے برعکس اگست میں بھی مہنگائی کی رفتار میں کوئی

تبدیلی نہیں ہوئی۔ کچھ ماہرین کے مطابق مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے اور یہ شرح 9 فیصد ریکارڈ کی جائے گی۔ جمہوری حکومتیں آنکھیں بند کیے ہوئے قرضوں اور ٹیکسوں کی آمدنی پر اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتی ہیں۔ وہ مڑ کر عوام کی طرف دیکھتی ہی نہیں کہ اس مہنگائی نے عوام کا کیا حال کر ڈالا۔ عوام کی طرف سے مہنگائی کے خلاف ہونے والے احتجاج، ہڑتالیں، ریلیاں، دھرنے، مشتعل ہو کر گھیراؤ جلاؤ کرنے اور دیگر ایسے ہی نفرت وغصے والے عوامی رد عمل کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پاکستان کے عوام نے 66 سال میں کبھی سکون، امن، چین اور خوشحالی نہیں دیکھی، بس اندھیرے ہی اندھیرے دیکھے۔ آیئے! ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم مہنگائی کے جن کو قابو کریں گے اور ہمارے حکمران ایسا آئین و قانون بنائیں گے جس سے مہنگائی کا تدارک ہو سکے۔ نیک نیتی، خلوص، ایمانداری سے کام کیا جائے تو مطلوبہ حقائق کا حصول بھی ممکن ہو سکے گا اور مہنگائی کا خاتمہ بھی۔ تحریک انصاف کے چیرمین عمران خان نے کہا کہ جب تک حکومت ملک سے کرپشن کا خاتمہ نہیں کرتی تب تک ملک کو تباہی کی طرف بڑھنے سے نہیں روکا جا سکتا۔

وزیر پٹرولیم شاہد خاقان عباسی کہتے ہیں کہ پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں حالیہ اضافہ او گرانے کیا اور یہ ایک مجبوری تھی۔ وزیر پٹرولیم کا کہنا تھا کہ اگر یہ قیمتیں نہ بڑھاتے تو اس کے دوررس منفی اثرات مرتب ہوتے۔ انہوں نے

کہا کہ حکومت نے اوگرا کی تجویز کے باوجود ڈیزل کی قیمتوں میں آدھا اضافہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا فارمولا ہم نے نہیں بنایا، کئی برسوں سے رائج ہے، حکومت کے مالی معاملات ایسے نہیں کہ تمام سبسڈی خود برداشت کرلیں۔ پنجاب اسمبلی میں پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کیخلاف اپوزیشن نے بھی شدید احتجاج کیا ہے۔ اپوزیشن نے نشستوں پر کھڑے ہو کر وفاقی حکومت کیخلاف شدید نعرے بازی کی۔ اپوزیشن ارکان نے احتجاجاً ایوان سے واک آوٹ کے بعد پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر حکومت کیخلاف احتجاجی مظاہرہ کیا اور وفاقی حکومت سے پٹرولیم مصنوعات میں اضافہ فوری طور پر واپس لینے کا مطالبہ کیا جبکہ اپوزیشن جماعتوں نے پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کیخلاف سینٹ اور قومی اسمبلی میں تحاریک التواجمع کرا دی ہیں جبکہ گزشتہ روز پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن کی جانب سے مشترکہ طور پر پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کیخلاف مذمتی قرارداد جمع کروائی گئی۔ عوام اب یہ کہنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ اتنا اضافہ تو پیپلز پارٹی کے 5 سالہ دور میں نہیں ہوا جتنا مسلم لیگ (ن) نے 90 دنوں میں کیا ہے۔ پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کیخلاف اپوزیشن جماعتوں عوامی نیشنل پارٹی، پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان تحریک انصاف، جماعت اسلامی کے ارکان کی جانب سے تحاریک التواء جمع کروادی گئیں ہیں۔ اپوزیشن ذرائع کے مطابق حکومت کی جانب سے تیل کی قیمتوں کے حوالے سے عوام کو ریلیف نہ دینے کے حکومتی اعلان تک اپوزیشن

جماعتیں دونوں ایوانوں میں شدید احتجاج کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔ اپوزیشن کی جانب سے اس سلسلے میں پارلیمانی کارروائی نہ چلنے دینے کا اور اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کا بھی خدشہ ہے۔ ادھر پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں حالیہ اضافے کےخلاف سندھ

ہائیکورٹ میں درخواست دائر کردی گئی۔ اس وقت پاکستان کی عوام معاشی چکی میں بری طرح پس رہی ہے، غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غریب خط غربت سے کہیں نیچے کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، بجلی گیس، پیٹرول کی قیمتوں اور ٹیکسوں کے بوجھ نے عوام کا کچومر نکال دیا ہے۔ سو دن میں جنرل سیلز ٹیکس کی اضافی شرح سے حکومت نے ڈیڑھ ارب ڈالر کی ٹیکس آمدنی حاصل کی ہے، اور سال کے آخر تک یہ آمدنی چھ ارب ڈالر تک بڑھنے کا اندازہ کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں ٹیکس نیٹ میں امیر نہیں غریب ہے۔ ایک غریب شخص بھی جتنی مرتبہ ماچس، گھی، آٹا، مرچیں، نمک اور اس طرح کی گھریلو اشیاء خریدتا ہے اتنی مرتبہ ٹیکس ادا کرتا ہے کیونکہ ان تمام اشیا پر ٹیکس عائد ہوتا ہے جو حکومت کے کھاتے میں جاتا ہے جس کا بوجھ عوام کے کندھوں پر پڑتا ہے۔ جنرل سیلز ٹیکس میں ایک فیصد اضافے نے ان پر مزید بوجھ ڈال دیا ہے۔ ایک متوازن معاشی نظام میں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ حکومت پہلے اپنی کارکردگی بہتر بنائے۔ عوام کے روزگار، ضروریات زندگی کی ارزاں فراہمی اور بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کا اولین مقصد ہونا چاہئے لیکن حکومتی اقدامات سے نہ صرف غریب طبقہ پر

مہنگائی کا بوجھ تناسب سے کہیں زیادہ بڑھتا نظر آتا ہے بلکہ بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔

پاکستان کے دوسرے شہروں اور صوبوں میں اس غربت مہنگائی کا جو حال ہو سو ہو، لیکن سندھ میں کراچی ان دنوں بدترین خونی دور سے گذر رہا ہے، تاجر بھتے سے پریشان ہیں اور عوام روز روز کی قتل غارت گری سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ کراچی جسے ملک کی معیشت میں شہ رگ کا درجہ حاصل ہے۔ اب تباہ حال ہے۔ یہاں کے تاجر سب سزیادہ پریشان ہیں۔ گذشتہ دنوں آل کراچی تاجر اتحاد کا اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ تاجر برادری حکومت سندھ کی گمشدگی کا اشتہار اخبارات میں چھپوائے گی کیونکہ گزشتہ 5 سال سے تاجر بھتہ خوری، قتل و غارت غاری، اغوا برائے تاوان، دہشت گردی، بم دھماکوں اور تخریب کاری کے واقعات کا شکار ہیں جس سے نہ صرف ان کا بلکہ شہر اور ملک کا نقصان ہو رہا ہے لیکن پولیس اور حکومت سندھ کی جانب سے کئے گئے دعوے کارآمد ثابت نہیں ہوسکے اور حکومت سندھ کی رٹ کہیں نظر نہیں آتی۔

تاجروں کا کہنا تھا کہ بازاروں میں کاروبار بند ہو گیا ہے اور ہر طرف خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، پولیس اور رینجرز بے بس اور بے اختیار نظر آتی ہے اور حکومت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ کراچی جو کہ پورے ملک کی شہ رگ

ہے میں معاشی و تجارتی سرگرمیاں جمود کا شکار ہیں، گزشتہ 10 روز میں سے صرف 6 روز کاروبار ہوا اور ہمیں 4 ارب روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ شائد اسی لئے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کراچی آئے۔ اور اس دعوی کے ساتھ آئے کہ ،، میں امن قائم کرنے کے لئے آیا ہوں۔ بدامنی اور دہشت گردی کے خاتمے کے لئے حکومت کو طاقت استعمال کرنا پڑے گی۔ ،، انھوں نے سیاسی جماعتوں سے مشاورت بھی کی۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صوبے میں دوسری پارٹی کی حکومت ہے۔ قیام امن کے لئے وفاق ہر طرح کا تعاون فراہم کرنے کے لئے تیار ہے اور تیار رہے گا۔ وزیراعظم محمد نواز شریف نے دہرایا کہ کراچی پاکستان کا اہم شہر اور تجارتی مرکز ہے۔ میرا کراچی آنے کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جائے اور اس امر پر اتفاق رائے پیدا کیا جائے کہ کراچی میں دہشت گردی کے خاتمے کے لئے کیسے آگے بڑھا جائے تاکہ یہاں لوگوں کو امن وسکون حاصل ہوسکے۔ انہوں نے کہا کہ دہشت گردی اور امن وامان سمیت پاکستان کو کئی مسائل درپیش ہیں۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے حکومت کو اپنی طاقت استعمال کرنی پڑے گی۔ اقتصادی مسائل کے حل کے لیے بھی حکومت کو اپنی بھرپور صلاحیت استعمال کرنی ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ بدامنی میں کوئی بھی سرمایہ کار سرمایہ کاری نہیں کرتا۔ امن نہیں ہوگا تو ہم کس طرح ترقی کرسکیں گے، کس طرح بیروزگاری کو ختم کرسکیں گے اور کہاں سے پیسہ لے آئیں گے جو سب معاملات کو ٹھیک کردے۔ امن اور ترقی دونوں

لازم و ملزوم ہیں۔ وزیراعظم نے کہا کہ ہمارے پاس کئی آپشن موجود ہیں۔ قوانین میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ کون آپریشن کریگا، رینجرز اگر آپریشن کرے گی تو اس کو کیا اختیارات دیئے جائیں اور پولیس کا کیا کردار ہوگا لیکن ہم چاہتے ہیں کہ سب ملکر ایک ساتھ چلیں اور کوئی الگ الگ راستے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ میرا صرف ایک ہی مقصد پہلے کہ کراچی کو کس طرح پرامن شہر بنایا جائے اور اسکی روشنیاں واپس لائی جائیں کیونکہ روشنیاں واپس لانا ازحد ضروری ہے۔ نواز شریف کی یہ خواہشات اپنی جگہ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ماضی کے تجربے سے کچھ نہیں سیکھا، وہ اب بھی ماضی میں جی رہے ہیں۔ ان کے پاس حالات کی تبدیلی کا کوئی بلیو پرنٹ اور آگے بڑھنے کا کوئی نقشہ نہیں ہے۔ صرف جمہوریت سے عوام کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ایک اچھی خود مختار فعال اور شفاف حکومت عوام کے اعتماد کو بحال کر سکتی ہے اور اعتماد سازی کے لئے اقتصادی نظام کی درستگی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ معاشی ترقی کے مواقع غریب اور امیر کے لئے یکساں ہوں اور غریب آدمی پر سے مہنگائی اور ٹیکس کا بوجھ کم کرکے قومی آمدنی میں اضافے کے نئے ذرائع پیدا کئے جائیں۔ ہمیں صنعت اور زراعت پر زیادہ انحصار کی ضرورت ہے۔ عوام کو دو وقت کی روٹی چاہیئے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ غربت کے خاتمہ کے مسئلہ کو ہنگامی بنیادوں پر نمٹنے اور تیز رفتار معاشی ترقی کے منصوبے بنائے جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے وطن عزیز کو ہر نعمت سے نوازا ہے، بس ان سے استفادہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مہنگائی پر قابو پانا آسان نہیں، اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مختلف قسم کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنا ناممکن ہے۔ سب سے پہلے تو حکومتی اخراجات کم کیے جائیں اور سادگی اپنائی جائے اور جتنے بھی اقدام اس مسئلے کے حل کے لیے اٹھائے جائیں ان پر عمل درآمد" یقینی بنایا جائے، محض کاغذی کارروائی کرکے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔" مہنگائی سے چھٹکارا اسی وقت ہوسکے گا جب ایک مضبوط اور جامع معاشی پالیسی تشکیل دی جائے۔

پاکستان میں ڈرون کا گھناؤنا روپ

دنیا میں اس ٹیکنالوجی سے مفید کام لئے جار ہے ہیں۔
امریکہ نے پاکستان کی سرزمین پر ڈرون حملوں سے نفرت کی جو فصل بوئی ہے، اس سے ساری دنیا اور پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ڈرون ہمارے لئے ایک تباہی ہے تو امریکہ اور اسے کے حواری ملکوں میں ڈرون ٹیکنالوجی انسانیت کی فلاح و بہبود اور نت نئے سامان راحت پیدا کر رہی ہے۔ پاکستان میں 2004ء سے ڈرون ہوائی جہازوں کے استعمال سے ہزاروں انسانوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ڈرون حملوں کی یہ داستان انتہائی بے رحم ، سفاک، دہشتناک اور الم انگیز ہے۔ اکیس ویں صدی میں مہذب امریکہ کا یہ گھناونا روپ سب کے لئے قابل نفرت ہے۔ لیکن یہی ڈرون ٹیکنالوجی .برطانوی فضاء میں سماج دشمن عناصر، احتجاج کرنے والے مظاہرین اور اجناس چوروں سمیت کئی دیگر افراد کی نگرانی اور دوسرے مفید کاموں میں استعمال کی جارہی ہے۔ .برطانیہ کی مشہور ہتھیار ساز کمپنی British Aeronautical Engineering ،جو جنگی مقاصد کے لئے بغیر پائلٹ کے جاسوسی طیارے بناتی ہے اب .برطانیہ کے مختلف حکومتی اداروں کے لئے یہ طیارے بنائے ہیں۔ پولیس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ڈرون کو سمندری حدود کی فضائی

نگرانی کے لئے استعمال کیا جائے گا لیکن اظہار رائے کی آزادی کے قانون کے تحت گارڈین نے جو دستاویزات حاصل کئے ہیں ان میں اس ٹیکنالوجی کے کئی اور مقاصد بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق مستقبل میں ان طیاروں کو بنکوں کی کیش مشینوں سے چوری کی روک تھام، سڑکوں اور ریلوے لائنوں کی نگرانی اور امدادی کاموں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ناقدین کے مطابق اس ٹیکنالوجی کا قابلِ تشویش پہلو یہ ہے کہ اسے شہریوں کی جاسوسی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔۔ لیکن پاکستان میں اس ٹیکنالوجی نے صرف تباہی پھیلائی ہے۔ پاکستان میں یہ حملے جارج بش کی حکومت نے خود ساختہ دہشت جنگ کے سلسلہ میں شروع کیے۔ بارک اوبامہ کے صدر بننے کے بعد، اور پاکستان میں زرداری حکومت کے قائم ہونے کے بعد ان حملوں کے تعداد اور شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ ڈرون حملے، پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری کے خلاف کئے جانے والے امریکی اقدامات میں سر فہرست ہیں۔ پاکستان میں نامعلوم تعداد میں افراد ان حملوں میں ہلاک یا زخمی ہو چکے ہیں۔ مبصرین کے مطابق سال 2010ء میں سب سے زیادہ حملے کیے گئے، اور حملوں کی ذمہ دار امریکی CIA ہے۔ پاکستان میں انسانی حقوق کیلئےکام کرنیوالے ایک ادارے انسانی حقوق کمیشن کے مطابق 2010ء میں امریکی ڈرون حملوں سے 900افراد ہلاک ہوئےمیں۔اپریل 2011ء میں پاکستانی فوجی اور سیاسی حکام نے امریکہ سے ڈرون حملے بند کرنے کے لیے کہا۔ زخمیوں کا علاج کرنے والے طبیبوں نے بتایا ہے کہ امریکی ڈروں کے زریعہ کیمیائی ہتھیار

استعمال کر رہے ہیں حملہ کے بعد امدادی کاروائی کرنے والوں پر امریکی ڈرون دوبارہ حملہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرنے والوں کے جنازہ پر بھی ڈرون پھر حملہ کرتے ہیں۔ ان ڈرون کو امریکی فوجی اور کارندے چلاتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق امریکی صدر بارک اوبامہ ہر ہفتہ قتل کے لیے افراد کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ گزشتہ سالوں میں پاکستان میں ہونے والے کچھ امریکی ڈرون حملوں کی تفصیل کے مطابق 18 جون 9ڈرون طیارے کے جنوبی وزیرستان کے علاقے MQ- کو افغانستان سے اڑنے والے وانا پر میزائل حملے میں نیک محمد وزیر سمیت 5 افراد ہلاک ہو گئے۔ 2005 چودہ مئی کو شمالی وزیرستان کے علاقے میں افغان بارڈر کے قریب ڈرون حملے میں حاتم ال یمینی ہلاک ہو گیا۔ 30 نومبر کو شمالی وزیرستان کے شہر میران شاہ کے قریب آسورے (Asoray) میں امریکی ڈرون حملے میں القاعدہ کا لیڈر ابو حمزہ ربیعہ مارا گیا۔ 2006 تیرہ جنوری کو باجوڑ کے علاقے ڈاماڈولا میں میزائل حملے سے 8 افراد ہلاک ہو گئے لیکن ایمن الزواہری اس حملے میں بچ گئے۔ 26 اپریل کو شمالی وزیرستان کے علاقے سید گئی میں ڈرون حملے سے 4 افراد ہلاک ہو گئے۔ 19 جون کو شمالی وزیرستان کے علاقے مامی روگا میں ڈرون حملے میں 20 افراد ہلاک ہو گئے۔ 2 نومبر کو شمالی وزیرستان میں ایک مدرسے پر میزائل حملے میں 5 افراد ہلاک ہو گئے۔ جنوری: 2008 میں میزائل حملے کا پہلا واقعہ 29 جنوری کو پیش آیا جب شمالی وزیرستان کی تحصیل میر علی کے گاؤں خوشحالی میں ستار نامی شخص کے مکان پر ایک میزائل لگا جس کے نتیجہ میں مقامی حکام کے

مطابق بارہ افراد ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ مبینہ طور پر اس حملے میں ہلاک ہونے والوں میں القاعدہ کے رہنما ابو اللیث اللبی بھی شامل تھے۔فروری: دوسرا حملہ 28 فروری کو جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا سے قریباً 10 کلومیٹر مغرب کی جانب افغان سرحد کے قریب اعظم ورسک کے علاقے کالوشہ میں ہوا اور اس میں 8 طالبان ہلاک ہو گئے۔ مقامی ذرائع کے مطابق ہلاک ہونے والوں میں ترکمان، عرب اور پنجابی طالبان شامل تھے۔مارچ: قریباً دو ہفتے بعد 18 مارچ کو جنوبی وزیرستان کا گاؤں شاہ نواز کوٹ میزائل حملے کا نشانہ بنا۔ حملے میں 18 افراد ہلاک جبکہ 7 زخمی ہوئے۔ مئی: 14 مئی کو باجوڑ کے علاقہ ڈمہ ڈولہ کے گاؤں پوی کلی میں جاسوس طیاروں کے حملے کا تیسرا واقعہ پیش آیا۔ اس حملے میں طیاروں سے عبیداللہ نامی شخص کے گھر پر دو گائیڈڈ میزائل داغے گئے جن سے 3 بچوں سمیت 7 افراد ہلاک اور 6 زخمی ہو گئے۔ جون: 11 جون کو امریکہ کی جانب سے پاکستانی حدود میں کارروائی کا ایک اور واقعہ پیش آیا جب امریکی طیاروں نے پاکستان کے قبائلی علاقے مہمند ایجنسی میں پاکستانی سیکورٹی فورسز کے اہلکاروں کے ایک ٹھکانے پر بمباری کر دی جس کے نتیجہ میں 11 اہلکاروں سمیت 19 افراد ہلاک
ہو گئے۔ جولائی: جولائی کے آخر میں 28 تاریخ کو جنوبی وزیرستان کے علاقے اعظم ورسک میں ایک میزائل حملے میں 7 افراد ہلاک ہوئے جن میں اطلاعات کے مطابق القاعدہ کے اہم رہنما اور بم بنانے کے ماہر مدحت مصری المعروف ابوخباب

المصری بھی شامل تھے۔ اگست: 28 جولائی کا حملہ مبینہ طور پر امریکہ کی جانب سے سرحد پار پاکستانی علاقے میں کارروائیوں میں آنے والی حالیہ تیزی کا نقطہ آغاز ثابت ہوا اور 13 اگست کو وانا سے تیس کلومیٹر دور افغان سرحد کے قریب علاقہ باغڑ میں ایک مکان پر 4 میزائل گرے جس سے ایک درجن سے زیادہ لوگ ہلاک ہوگئے۔ 7 دن کے بعد 20 اگست کو جنوبی وزیرستان میں ہی افغانستان سے داغے گئے دو میزائل زیڑی نور میں یعقوب مغل خیل وزیر نامی قبائلی کے مکان پر گرے جس سے کم از کم 6 لوگ ہلاک ہوگئے۔ ماہِ اگست کے آخری دن شمالی وزیرستان کے صدر مقام میرانشاہ سے قریباً پندرہ کلومیٹر مشرق کی جانب علاقہ تپئی میں داوڑ قبیلے کے ایک رکن سوار خان داوڑ کے مکان پر میزائل حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں 4 افراد ہلاک جبکہ دو زخمی ہوگئے۔ ستمبر: 3 ستمبر کو امریکی فوج نے جنوبی وزیرستان میں موسیٰ نیکہ کے علاقے میں زمینی کارروائی کی جس میں قریباً بیس مقامی افراد مارے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ اگلے ہی دن 4 ستمبر کو شمالی وزیرستان کے صدر مقام میران شاہ کے علاقہ چار خیل میں رحمٰن والی خان اور فرمان نامی افراد کے مکان پر 3 میزائل گرے، جس کے نتیجہ میں 5 افراد ہلاک اور 4 زخمی ہوگئے۔ 8 ستمبر کو جاسوس طیاروں نے شمالی وزیرستان میں ڈانڈے درپہ خیل میں واقع طالبان کمانڈر جلال الدین حقانی کے گھر اور مدرسے کو 7 میزائلوں سے نشانہ بنایا۔ اس حملے میں کم از کم 20 افراد ہلاک ہوئے۔ اسی دوران امریکہ کے چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف

کمیٹی مائیک مولن نے امریکی کانگریس کی ایک کمیٹی کے سامنے بیان دیا کہ امریکہ طالبان سے متعلق اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر رہا ہے جس کے تحت اب سرحد پار کرکے پاکستان کے اندر طالبان پر بھی حملے ہو سکتے ہیں اور پھر امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کی یہ رپورٹ بھی منظرِ عام پر آئی جس میں کہا گیا کہ امریکی صدر بش نے جولائی میں پاکستانی حکومت کو مطلع کیے بغیر پاکستان کی حدود میں کارروائی کی خفیہ اجازت دی تھی۔ تاہم ان رپورٹوں کی اشاعت اور پاکستانی حکام کی جانب سے ان پر سخت ردعمل کے باوجود میزائل حملوں کا سلسلہ تھما نہیں اور جمعہ 12 ستمبر کو پاکستان کے قبائلی علاقے شمالی وزیرستان میں افغان سرحد کے قریب امریکی جاسوس طیاروں نے ایک مکان اور پرائمری سکول کو میزائلوں سے نشانہ بنایا ہے جس کے نتیجے میں 12 افراد ہلاک ہوگئے۔ پندرہ ستمبر کو انگور اڈہ کے قریب افغانستان کے علاقے میں امریکی گن شپ ہیلی کاپٹروں اور جہازوں کی آمد پر پاکستانی فوجیوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ انگور اڈہ باغاڑ چینا سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق امریکی جہازوں کے اترنے کے بعد قریبی پہاڑی سلسلوں میں موجود پاکستانی فوج کے ٹھکانوں سے بگل بجائے گئے اور فائرنگ بھی کی گئی۔ 17 ستمبر کی شام امریکی جاسوس طیارے نے 4 میزائل داغے جس سے 5 افراد ہلاک اور 3 زخمی ہوئے۔ حکام نے بی بی سی بات کرتے ہوئے کہا کہ جنوبی وزیرستان کے باغاڑ چینا علاقے میں 4 میزائل داغے گئے جن میں سے دو ایک گھر پر گرے اور دو پہاڑیوں پر

لگے۔ اگلے روز حکومتِ پاکستان نے کہا کہ امریکہ نے اسے میزائل حملے کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی اور اس طرح کے یک طرفہ حملوں سے حالات میں بہتری آنے میں مدد نہیں ملے گی۔ اکتوبر: 31 اکتوبر کو وزیرستان میں 4 میزائل حملوں میں 20 افراد ہلاک ہوگئے جن میں القاعدہ رہنما ابو آکاش اور محمد حسن خلیل ال حکیم بھی شامل تھے۔ 14 نومبر کو میران شاہ کے قریب میزائل حملے میں 12 افراد ہلاک ہوگئے۔

نومبر کو بنوں میں میزائل حملے میں عبداللہ اعظم السعودی مارے گئے۔ 22 نومبر 19 کو شمالی وزیرستان میں میزائل حملے میں العدہ کے اہم رہنما راشد رؤف اور ابو زبیر المصری سمیت 5 افراد ہلاک ہوگئے۔ 22 دسمبر کو جنوبی وزیرستان میں میزائل حملے میں افراد ہلاک ہوگئے۔ 2009ء اس سال امریکہ نے ان فضائی حملوں میں 700 سے 8 زیادہ پاکستانی شہری قتل کیے۔ 14 فروری کو جنوبی وزیرستان کے لدھا سب ڈویژن کے علاقے نصر خیل میں مبینہ امریکی جاسوس طیارے نے روشان محسود نامی ایک شخص کے مکان پر دو میزائل داغے جس سے مکان مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور اس میں موجود اٹھائیس افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے۔ یکم اپریل کو پہلی مرتبہ ڈرون طیاروں نے اورکزئی ایجنسی کو نشانہ بنایا اور اس حملے میں کم از کم 8 طالبان ہلاک ہوئے۔ یہ حملہ اپر اورکزئی کے خادیزئی علاقے میں کیا گیا۔ ہلاک ہونے والے زیادہ تر افراد کا تعلق اوکزئی ایجنسی سے ہی تھا۔ 4 اپریل کو شمالی وزیرستان میں امریکی جاسوس طیاروں نے طالبان کے ایک مشتبہ

ٹھکانے کو نشانہ بنایا۔ اس حملے میں 13 افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے۔ یہ حملہ رات تقریباً 3 بجے ہوا جس میں جاسوس طیاروں نے شمالی وزیرستان کی تحصیل دتہ خیل کے ڈانڈہ علاقے میں ایک مقامی شخص طارق کے مکان کو نشانہ بنایا۔ مقامی ذرائع کے مطابق اس حملے میں ہلاک ہونے والوں میں سے بعض غیر ملکی تھے تاہم سرکاری طور پر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ڈرون حملوں کے خلاف ملک میں مظاہروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔29اپریل کو جنوبی وزیرستان کے سب ڈویژن لدھا سے 10 کلومیٹر دور جنوب کی جانب کانیگرم کے علاقے اسمان منزہ میں امریکی جاسوس طیارے نے ایک گاڑی کو نشانہ بنایا جس سے اس گاڑی میں سوار 6 افراد مارے گئے۔ مقامی انتظامیہ نے دعوی کیا کہ ہلاک ہونے والوں کا تعلق بیت اللہ گروپ سے تھا اور وہ مقامی طالبان تھے۔16 مئی کو شمالی وزیرستان کی تحصیل میر علی سے پچیس کلومیٹر دور جنوب کی جانب خیسور کے علاقے میں امریکی جاسوس طیارے سے دو میزائل داغے گئے جس کے نتیجہ میں 25 افراد ہلاک جبکہ 6زخمی ہوگئے۔ حکام کے مطابق ایک میزائل حملے میں ایک گاڑی اور دوسرے میں ایک مدرسے کو نشانہ بنایا ہے۔ مقامی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ گاڑی بھی مدرسے کے قریب موجود تھی۔مقامی ذرائع کے مطابق اکیس افراداس حملے میں ہلاک ہوئے۔23 جون کو جنوبی وزیرستان میں امریکی جاسوس طیاروں نے ایک دن میں دو میزائل حملے کیے۔ پہلا حملہ لدھاکے علاقے میں کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے سربراہ بیت اللہ محسود کے ساتھیوں کے ایک ٹھکانے پر ہوا جس میں

متعدد افراد مارے گئے۔ ان افراد کی نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہونے والے افراد پر ایک اور میزائل حملہ کیا گیا۔ مقامی انتظامیہ کے مطابق ان دونوں حملوں میں کم از کم 50 افراد ہلاک ہوئے۔ 8 جولائی کو دو مرتبہ جنوبی وزیرستان کا علاقہ ڈرون حملوں کا نشانہ بنا۔ پہلے حملے میں ڈرون طیارے سے داغے جانے والے میزائلوں کا نشانہ جنوبی وزیرستان کے سب ڈویژن لدھا کے پہاڑی علاقے کاروان منزہ میں واقع طالبان کا تربیتی مرکز بنا۔ بیت اللہ گروپ کے اس ٹھکانے پر ہونے والے حملے میں 8 مقامی جنگجو مارے گئے۔ یہ جنوبی وزیرستان میں دن دو میں ہونے والا دوسرا ڈرون حملہ تھا۔ بعد ازاں اسی شام لدھا سے سراروغہ جانے والے شدت پسندوں کی 5 گاڑیوں پر 3 ڈرون طیاروں نے 5 میزائل داغے۔ مقامی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ ان حملوں میں 50 کے قریب شدت پسند ہلاک ہوئے ہیں جبکہ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ حملے میں 40 جنگجو مارے گئے۔ 5 اگست کو جنوبی وزیرستان کے سب ڈویژن لدھا سے پندرہ کلومیٹر دور شمال مشرق کی جانب شوبی خیل کے علاقے زنگڑہ میں ڈرون طیاروں نے بیت اللہ محسود کے سسر ملک اکرام الدین کے گھر کو نشانہ بنایا۔ ابتدائی طور پر اس حملے میں صرف بیت اللہ محسود کی اہلیہ کی ہلاکت کی تصدیق کی گئی تاہم دو دن بعد پاکستانی حکام نے انٹیلی جنس ذرائع کے حوالے سے اسی حملے میں خود بیت اللہ محسود کے مارے جانے کی بھی تصدیق کر دی۔ 2011ء نئے سال کے آغاز پر امریکیوں کے پاکستان کے علاقہ وزیرستان پر حملہ میں 18 افراد ہلاک۔ 16 مارچ 2011ء کو امریکی حملے میں

چالیس افراد لقمہ اجل بن گئے۔ حملے کی مذمت چیف آف آرمی اسٹاف اشفاق پرویز کیانی نے بھی کی۔8 جون 2011ء ،امریکیوں نے ڈرون حملہ سے 20 افراد قتل کر دیے۔ اگست 2011ء ،امریکیوں نے ڈرون حملہ سے 21 افراد قتل کر دیے۔5 مئی 9 نکو امریکیوں نے ایک ہی ہفتہ میں دوسرے حملے میں آٹھ راکٹ چلا کر دس 2012 افراد کو قتل کر دیا۔ پاکستانی دفتر خارجہ نے احتجاج کیا۔28 مئی 2012ء امریکہ نے حملہ کرکے آٹھ افراد کو قتل کر دیا۔لگاتار تین روز سے فضائی حملوں میں امریکہ نے افراد ہلاک کر دیے۔6 جنوری، نئے سال کے وزیرستان پر دوسرے حملے میں 27 اوبامہ نے 17 افراد ہلاک کر دیے۔28 مئی، میرانشاہ میں امریکی ڈرون حملے میں چار پاکستانی قتل، چار شدید زخمی۔ انتخابات کی تیاری کے دوران خاموشی کے بعد حملے دوبارہ شروع۔7 جون، انتخابات کے بعد نئی حکومت کے دور کا پہلا امریکی ڈرون حملا۔ سات پاکستانی قتل۔2 جولائی، وزیرستان پر بارک اوبامہ کی فوج کاڈرون حملہ، 16 افراد قتل-13 جولائی، شمالی وزیرستان پر امریکی ڈرون حملے میں دو پاکستانی قتل28 جولائی، بارک اوبامہ کا شمالی وزیرستان پر ڈرون حملہ، سات پاکستانی قتل کیئے۔ ڈرون حملوں کی یہ داستان انتہائی بے رحم ، سفاک، دہشتناک اور الم انگیز ہے۔ اکیس ویں صدی میں مہذب امریکہ کا یہ گھناونا روپ سب کے لئے قابل نفرت ہے۔ لیکن یہی ڈرون ٹیکنالوجی.برطانوی فضاء میں سماج دشمن عناصر، احتجاج کرنے والے مظاہرین اور اجناس چوروں سمیت کئی دیگر افراد کی نگرانی اور دوسرے مفید کاموں میں استعمال کی

جارہی ہے۔برطانیہ کی مشہور ہتھیار ساز کمپنی British Aeronautical Engineering جو جنگی مقاصد کے لئے بغیر پائلٹ کے جاسوسی طیارے بناتی ہے اب، برطانیہ کے مختلف حکومتی اداروں کے لئے یہ طیارے بنائے ہیں۔برطانوی روزنامے گارڈین کے مطابق ڈرون طیاروں کے اس منصوبے کو.برطانوی وزارتِ داخلہ کی حمایت کی پولیس اور دوسرے سرکاری اداروں کی Kent حاصل ہے۔برطانیہ کے ایک کاؤنٹی کے ساتھ مل کر اس پروجیکٹ پر کام کررہی ہے۔پولیس کا یہ بھی BAA ایک کنسورشیم دعویٰ ہے کہ ڈرون کو سمندری حدود کی فضائی نگرانی کے لئے استعمال کیا جائے گا لیکن اظہار رائے کی آزادی کے قانون کے تحت گارڈین نے جو دستاویزات حاصل کئے ہیں ان میں اس ٹیکنالوجی کے کئی اور مقاصد بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان کاغذات کے مطابق مستقبل میں ان طیاروں کو بنکوں کی کیش مشینوں سے چوری کی روک تھام، سڑکوں اور ریلوے لائنوں کی نگرانی اورامدادی کاموں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ناقدین کے مطابق اس ٹیکنالوجی کا قابلِ تشویش پہلو یہ ہے کہ اسے شہریوں کی جاسوسی کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔طاقتور کیمروں اور حساس آلات سے لیس اس نوعیت کا پہلا طیارہ سال گزشتہ کے آخر میں تجربے کے لئے.برطانوی فضاء میں چھوڑاگیا تھا۔ اب ڈرون کے ذریعے ویٹرز کی موجودگی کے بغیر آپ کا آڈر کیا ہوا کھانا ہوا میں اڑتا ہوا آپ کی میز پر خود آئے جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہاز بغیرپائیلٹ کے آپ کو منزل مقصودتک پہنچادے۔یا بغیر ڈرائیور کی کار آپ کو گھر لینے پہنچ

جائے، یہ سب جدید دنیا کے تصوراتی خاکے نہیں ہیں بلکہ اب ڈرون ٹیکنالوجی نے یہ ممکن بنا دیا ہے۔ گوگل گلاس کی ٹیکنالوجی میں اب یہ بھی ممکن بنا دیا ہے کہ اڑتے ہوئے کیمرے جہاں چاہے بھیج کر اپنی ضرورت کے مطابق تصاویر اور ویڈیوز بنائیں اور چند سیکنڈ میں انھیں انٹرنیٹ پر لوڈ کر دیں۔ ڈرون ٹیکنالوجی ہی کی بدولت لندن کے ایک جاپانی ریستوران نے ایسی انوکھی اڑن ٹرے تیار کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو صارف کا کھانا اس کی میز تک خود پہنچائے گی۔ یہ انوکھی ٹرے نما ڈیوائس 25 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑیں گی اور انہیں آئی پیڈ کے ذریعے کنٹرول کر کے کسی تصادم سے بچا جا سکے گا۔اس ٹرے میں 2 کیمرے میں لگائے گئے ہیں تاکہ اسے کنٹرول کرنے والا راستوں کو دیکھ سکے، یعنی اب بس ٹرے کو کھانے سے بھریں اور اڑا کر مطلوبہ میز تک پہنچائیں اور صارف کے جانے کے بعد واپس بلا لیں۔ اس ٹیکنالوجی کی بدولت شاید نئی نسل روبوٹ سے اڑنے والے طیاروں میں سفر کرے۔ نیو میکسیکو سٹیٹ یونیورسٹی کے بغیر پائلٹ ایئر کرافٹ پروگرام کے ڈائریکٹر ڈاگ ڈیوس کہتے ہیں، 'ہمارا یقین ہے کہ طیارے کی صنعت میں بنا پائلٹ کے ہوائی جہاز بڑی تبدیلی ہو گا۔' بغیر پائلٹ کے طیارے فوج کے لیے نئی بات نہیں ہیں۔ کئی برسوں سے لینڈنگ کے خودکار نظام کی مدد سے ایف-کرافٹ اتارے جاتے ہیں۔برطانیہ میں پائلٹ بغیر مسافر طیارے کے استعمال کو 18 اور آگے لے جانے کے مقصد سے ٹیکنالوجی کے میدان کی کمپنی نے حال ہی میں برطانیہ کے آسمان میں ایک پائلٹ کے بغیر طیارہ

اڑایا۔ اس طیارے پر مسافر سوار تھے اور انتظامات کے مطابق ہنگامی صورتحال پیدا ہونے پر ایک پائلٹ طیارے کا کنٹرول سنبھال لیتا۔ تاہم اس کی ضرورت نہیں پڑی اور تجربہ کامیاب رہا۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ بغیر پائلٹ طیارے میں نگراں کیمروں کا ایسا نظام نصب ہے جو نو وڈیو کیمروں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس نظام سے ایک وقت میں پورے ایک قصبے پر نظر رکھی جاسکتی ہے اور اس کے کیمرے 65 مختلف عکس فراہم کر سکتے ہیں۔ امریکی فوج افغانستان میں ایسے جدید ڈرون استعمال کر رہی ہے۔ جو ایک وقت میں کئی کیمروں سے بنائی جانے والی وڈیو مہیا کرتے ہیں۔ نگراں کیمروں کے اس نظام کو جو نو وڈیو کیمروں کے ساتھ کام کرتا ہے۔ Gorgon Stare کا نام دیا گیا ہے۔ اس نظام سے ایک وقت میں پورے اس نظام کو ایک قصبے پر نظر رکھی جاسکتی ہے اور اس کے کیمرے 65 مختلف عکس فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس موجودہ ڈرون ایک کیمرہ استعمال کرتے ہوئے صرف ایک یا دو عمارتوں کی نگرانی کر سکتا ہے۔ ڈرون اس وقت تک کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا جب تک زمین پر حساس معلومات اکٹھی کرنے کے لئے انسانی ذرائع موجود نہ ہوں۔ اب یہ ڈرون دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹیوں کے ان گوشوں کی تصاویر کھینچنے کے لئے استعمال ہورہے ہیں جو اس سے پہلے انسانی نظروں سے چھپے رہے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے سوئس کوہ پیماؤں نے قراقرم میں ان ریموٹ کنٹرول ہیلی کاپٹرز کے ذریعے انتہائی خوبصورت تصاویر کھینچی ہیں۔ اس منصوبے کے تحت سطح سمندر سے 19 ہزار 685 فٹ

بلند ٹرنگو ٹاور کی تصاویر کوہ پیمائی کے دوران ڈیوڈ لاما اور ان کے ساتھی پیٹر اورٹنر نے کھینچی۔اس سے قبل ہیلی کاپٹرز کے ذریعے ایسی فوٹوگرافی کی جاتی تھی مگر یہ کام بہت مہنگا اور اکثر خطرناک بھی ثابت ہوتا تھا، جبکہ ہیلی کاپٹروں کے پروں میں مٹی، برف اور ہوا سے خرابی کا امکان بھی ہوتا تھا جس سے اس پر بیٹھے افراد کی جانیں خطرے میں پڑ جاتی تھیں۔مگر اب چند کلو گرام وزنی اور انتہائی سستے ڈرونز کے ذریعے یہ کام بہت آسان اور خطرے سے پاک ہوگیا ہے۔ماہرین کی پیشگوئی ہے کہ ڈرون کیمروں کا استعمال جلد ہر کھیل میں ہونے لگے گا اور توقع ہے کہ اس سے پاکستان میں کوہ پیمائی کی صنعت کو بھی عروج ملے۔دنیا بھر میں جتنا پیسہ اور محنت ہتھیاروں کی تیاری پر خرچ کی جاتی ہے اگر اسکا کچھ حصہ بھی امن کے کاموں میں استعمال کیا جائے تو یقیناً پوری دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ لیکن جناب کیا کیا جائے کہ دنیا کہ اکثر ممالک امن سے زیادہ جنگ کے حامی ہیں۔

نیا امریکی ڈرون ہیلی کاپٹر : 65 آنکھیں 1.8 گیگاپکزل کیمرہ لئے ہوئے ہے۔امریکی فوج نے ایک ڈرون (بغیر انسانی پائیلیٹ) ہیلی کاپٹر تیار کیا ہے جس میں 1.8 گیگاپکزل کا کیمرہ نصب کیا گیا ہے۔اس ڈرون ہیلی کاپٹر میں نصب اس طاقت ور کیمرہ کی مدد سے زمین سے کم و بیش بیس ہزار فٹ کی بلندی سے قریباً 65 مربع میل دور تک کی ویڈیو بنائی جاسکتی ہے اس ہیلی کاپٹر کی استعداد کو

مزید بڑھادیا جائے گااور 65 کی بجائے اس کی 130 آنکھیں کر دی جائیں گی جو رات کے وقت بھی بخوبی دیکھ سکیں گی۔ یہ ڈرون اب کھیلوں میں بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ آئی سی سی چیمپئنز ٹرافی کے لئے اسپائیڈر کیمرہ استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرین اسپائیڈر کیمرے کو ڈرون قرار دے رہے ہیں۔ چند سالوں سے شراب (وائن) بنانے والے بھی اس میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ پریسیژن ویٹیکلچر میں کسی وائن یارڈ (انگوروں کے باغ) کے بارے میں معلومات اکھٹی کرکے بہترین فصل اگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان معلومات میں باغ میں سورج کی کرنوں کے لیے موضوں ترین مقامات سے لے کر مٹی کی نمی تک شامل ہیں۔پروفیسر گرین کا کہنا ہے کہ پریسیژن ویٹیکلچر اور اس کے زیادہ تر طریقۂ کار امریکہ اور آسٹریلیا میں شروع ہوئے۔ پاکستان ایک طرف تو ڈرون ٹیکنالوجی کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہے تو دوسری جانب یہ بھی کہا جارہا ہے کہ پاکستان ڈرون ٹیکنالوجی پر دسترس رکھتا ہے۔ غیر ملکی میڈیا کے مطابق اب ڈرون ٹیکنالوجی کو امریکا کی جامعات میں پڑھایا جائے گا، ڈرون ٹیکنالوجی پڑھنے والوں کو بتایا جائے گا کہ ڈرون کس طرح بنتے ہیں اور ان کا آپریشنل سسٹم کیسے کام کرتا ہے، طلبا کو ڈرون ساز اداروں کا دورہ کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ آپریشنل روم میں بھی جا سکیں گے۔امریکی یونیورسٹیوں میں ڈرون ٹیکنالوجی کو بطور کورس شامل کرنے پر شدید تنقید کی جارہی ہے، تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ خطرناک ٹیکنالوجی کو بغیر سوچے سمجھے نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دوسری

جانب چین بھی اس ٹیکنالوجی میں پیش رفت کر رہا ہے۔ جس سے امریکہ پریشان ہے۔ عالمی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ چین اپنے تیزی سے بڑھتے ہوئے دفاعی بجٹ سے اپنی ڈرون ٹیکنالوجی کو جدید ترین اور موثر بنا رہا ہے جس سے یہ خدشات پیدا ہوگئے ہیں کہ وہ امریکا کو اس ٹیکنالوجی میں حاصل عالمی برتری کو جلد ہی چیلنج کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ادھر جاپان کی ایک سکیورٹی کمپنی نے ایسے ڈرونز کرائے پر فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جو کسی بھی عمارت میں سکیورٹی الارم بجنے کی صورت میں فوری طور پر وہاں پہنچ کر وہاں کی تصاویر اپنے مرکز کو نشر کرنا شروع کر دے گا۔جاپان کی ایک سکیورٹی کمپنی کی طرف سے تیار کیا جانے والا یہ ڈرون ایک ہیلی کاپٹر کی شکل کا ہے Secom سیکوم اور اس میں نگرانی کے لیے ایک خصوصی کیمرہ لگا ہوا ہے جو کسی بھی ہوتے ہوئے جرم کی براہ راست تصاویر نشر کر سکتا ہے۔امریکہ نے سمندر میں کام کرنے والے ڈرون بھی بنائے ہیں۔ امریکی بحریہ کے ایک افسر کا کہنا ہے کہ سی فوکس نامی ڈرونز کو پانچویں بیڑے میں شامل کیا گیا ہے جس کا دائرہ کار خلیج فارس اور بحیرہ عرب ہے۔ سمندر کی گہرائی میں کام کرنے والے اس ڈرون کی لمبائی چار فٹ ہے جو کیمرے اور سونار سے لیس ہے اور اسے سطح پر موجود کسی کشتی یا جہاز سے تار کے زریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اسے بنانے والے جرمن ادارے ، اٹلس الیکٹرونکس کے مطابق، یہ اپنے ساتھ دھماکہ خیز مواد تین ہزار دو سو فٹ دوری تک لے جا کر پانی میں موجود بارودی سرنگوں کو تباہ کر سکتا ہے۔ طیاروں کے بعد

ڈرون گاڑیاں " بھی میدان میں آگئیں ہیں۔امریکی سرچ انجن گوگل نے سڑک " حادثوں سے بچاؤ کیلئے بنا ڈرائیور کے خودکار گاڑیاں تیار کی ہیں۔ گوگل کی جانب سے خود کار گاڑیوں کو ایکسیڈنٹ پروف قرار دیا جارہا ہے۔گاڑیوں میں ویڈیو کیمرے ، ریڈار سسٹم اور لیزر ٹیکنالوجی نصب ہے۔ راستوں کا میپ گاڑی میں پہلے سے تیار کیا جاتا ہے۔ گوگل ماہرین کے مطابق ان خودکار گاڑیوں میں آزمائشی مراحل کے دوران سان فرانسسکو میں ایک لاکھ 40 ہزار میل کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ صحت کے مطابق ہر سال دنیا بھر میں 12 لاکھ افراد ٹریفک حادثوں میں ہلاک ہو جاتے ہین تاہم گوگل ماہرین کا دعوی ہے کہ یہ خودکار گاڑیاں حادثوں کی روک تھام میں معاون ثابت ہوں گی۔ غرض یہ سب کچھ انسان ہی پر منحصر ہے کہ وہ خنجر کا استعمال کسی قتل میں کرے یا اس سے جراحی کا کام لے کر کسی انسان کی جان بچالے۔

منی بجٹ' ٹیکسوں کی بھرمار '

حکومت نے سال کے وسط میں منی بجٹ کے ذریعے ٹیکسوں کی بھرمار شروع کردی ہے۔ اور اب Rs105 ارب روپے کے نئے ' گیس لیوی ' لگائے جا رہے ہیں۔ بجلی کی شرح میں 30-50 فیصد بتدریج اضافہ ہوا ہے، 30 اداروں کی نجکاری کی جارہی ہے، جس کا آغاز پی آئی اے کے چھبیس فیصد حصص کی نج کاری سے ہوا ہے، جس پر پی آئی اے کی تمام یونینیں سراپا احتجاج ہیں۔ سب سے زیادہ مشکلات کا سبب بین الاقوامی مالیاتی فنڈ آئی ایم ایف کے ساتھ 6.64bn $ کا بیل آوٹ معاہدہ ہے۔ اس قرض کے نتیجے میں عوام پر ٹیکسوں کا دباو بڑھایا جا رہا ہے، سبسیڈی ختم کی جارہی ہے۔ دسمبر 2013 تک، سالانہ بنیاد پر FDP 0.4 فی صد ٹیکس آمدنی کا اضافہ ہو جائے گا۔ سابق صدر زرداری سے پوچھا گیا کہ وہ اس صورتحال میں کیا کرتے تو ان کا دانشمندانہ جواب تھا کہ میں دیگر ذرائع سے سرمایہ حاصل کرتا اور آئی ایم ایف کے ساتھ اس معاہدہ پر دستخط نہ کرتا، اگر ضروری ہوتا تو قرض کی رقم کم کرتا اور اپنی شرائط پر قرض لیتا، گو زرداری ماہر معاشیات نہیں ہیں لیکن پھر بھی انھیں معاملات کا ادراک ہے اور وہ عوام پر کم بوجھ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن نواز شریف کے اقتصادی منیجر اقتصادی اپنی مالی پالیسیاں بہتر کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں اور وہ اسی

عطار کے لونڈے یعنی آئی ایم ایف پر انحصار کر رہے ہیں، جس نے پاکستان کی معیشت نیشنل فنانس کمیشن ایوارڈ کی حرکیات کو تبدیل کرنے کا thکا تباہ کیا ہے۔ حکومت نے 7 بھی اشارہ دیا" جس کے لئے رواں مالی سال کے اختتام سے قبل مذاکرات شروع ہوں گے۔ یہ ایک پنڈورا بکس کھولنے کے مترادف ہوگا۔ جس سے صوبوں کے درمیان ہم آہنگی کو نقصان پہنچے گا۔ آئی ایم ایف ہمارے ہر معاملے میں دخیل ہے، وہ ہمیں بری بری خبریں سناتا ہے، مثلا حال ہی میں آئی ایم ایف نے خبردار کیا ہے کہ اگلے سال پاکستان کی معاشی ترقی 6.7 ارب ڈالر کے قرضہ پیکیج کے باوجود سخت سادگی کے اقدامات کے باعث توقع سے زیادہ بدتر ہو سکتی ہے۔ آئی ایم ایف نے پاکستان کی معیشت کے حوالے سے واشنگٹن سے جاری ہونے والی رپورٹ میں کہا ہے پاکستان معاشی بحران سے دوچار ہے اور معیشت ہائی رسک پر ہے جبکہ ادائیگیوں میں توازن نہیں، اس کے باوجود یہ بات خوش آئند ہے کہ حکومت نے معیشت کی بہتری کیلیے اقدامات کیے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان نے مالی خسارہ 4.7 فیصد تک محدود کرنا تھا لیکن یہ 8 فیصد رہا، حکومت ٹیکسوں کی وصولیوں میں ناکام رہی، بجلی بحران اور ناقص سیکیورٹی کی صورتحال نے معیشت کو متاثر کیا۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں نئی توانائی پالیسی عمل میں لانا خوش آئند ہے، ٹیکس چھوٹ کم کرکے وصولی بہتر بنائی جا سکتی ہے اور جو شعبے ٹیکس کے دائرے سے باہر ہیں ان پر ٹیکس لگایا جائے، معاشی استحکام کیلیے صوبوں کو وفاق کے ہم قدم ہونا پڑے گا، مہنگائی پر کنٹرول کیلیے

خود مختار مانیٹری پالیسی ضروری ہے، پاکستان میں انکم سپورٹ کے ذریعے غریبوں تک پہنچنا بھی ایک اچھا قدم ہے۔ برطانوی خبرایجنسی رائٹرز کے مطابق آئی ایم ایف کا کہنا ہے کہ حالیہ برسوں میں پاکستان کی معاشی کارکردگی ناقص رہی ہے، ادارے کے ایگزیکٹو ڈائریکٹرز نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ پاکستانی معیشت خطرات سے دوچار اور ہائی رسک پر ہے۔ چند دن پہلے اسٹیٹ بنک نے بھی شرح سود کم کردی۔ بینک قرضوں کی لاگت کم کرنے کے طریقہ کار کو اُلٹنے کے لیے، اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا فیصلہ بہت سوں کے لیے حیران کُن ہے۔ شرح سُود کم کرکے نو فیصد پر کرنے کے فیصلے کو صرف تین ماہ بعد واپس لے کر، اس میں نصف فیصد یا پچاس بیسک پوائنٹس کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ دلخراش حقیقت یہ ہے کہ حکومت آئی ایم ایف سے اس بات پر متفق ہے کہ رواں مالی سال کے دوران 'مالیاتی ایڈجسٹمنٹ کے اثرات کم' کرنے کی خاطر، مانیٹری پالیسی کو اپنے اندر سمونے کے لیے بینک بدستور گنجائش فراہم کرتا رہے گا، یہ ان سے قرض حاصل کرنے کے لیے کیا جانے والا ایک وعدہ بھی تھا، جسے خود حکومت نے کیا۔ شرح سُود میں اضافہ کرتے ہوئے بینک نے افراطِ زر کے خطرے کی طرف اشارہ کیا لیکن صرف یہ واحد جواز نہیں۔ ملکی سطح پر توانائی کی قیمت میں اضافہ، عالمی تیل مارکیٹ کا عدم استحکام، بجٹ خسارہ کم کرنے کے لیے حکومت کا مسلسل بینک سے قرض حاصل کرنا اور کرنسی کی شرح تبادلہ پر دباؤ بھی اس کے اسباب ہیں۔ خدشہ ہے کہ گزشتہ مالی سال کے دوران سات اعشاریہ چار فیصد رہنے والا افراطِ زر رواں

مالی سال کے اختتام پر بارہ فیصد تک بڑھ سکتا ہے۔ گزشتہ جون میں دیے گئے بجٹ کے اندر توانائی پر دی جانے والی زرِتلافی (سبسڈی) کے خاتمے اور بلواسطہ (ان ڈائریکٹ) ٹیکسوں میں اضافے کے واسطے نئی حکومت کی منصوبہ بندی کے باعث، افراطِ زر میں اضافہ غیر متوقع نہیں اور حکومتی پالیسیوں کے تناظر میں بینک اس خطرے سے اچھی طرح باخبر ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے افراطِ زر کی بڑھتی شرح کے خطرات اور ملکی ادائیگیوں کے کمزور توازن کے بارے میں خدشات کو نظرانداز کرنے کا انتخاب کیا۔ اسٹیٹ بینک جو کہتا ہے اس کے برعکس، شرح سُود میں اضافے سے حکومت کے گھریلو قرضوں کی ادائیگی پر دباؤ پڑے گا، اقتصادی شرح نمو کم اور نجی بینکوں سے قرض لے کر سرکاری خزانے کی دستاویزات پُر کرنے کے خطرناک رجحان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ نجی طور پر قرض کے حصول میں عدم دلچسپی پر، بڑھتی شرح سُود کے بجائے، توانائی کی مسلسل بڑھتی قلت اور سلامتی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی دلیل پیش کی جاتی ہے جو دل کو نہیں لگتی۔ یا پھر ایسا ہی ہے تو گزشتہ دو برسوں کے دوران اسٹیٹ بینک نے شرح سُود میں مجموعی طور پر پانچ سو بیسک پوائنٹس کی کمی کیوں کی تھی؟ شرح سُود میں اضافے سے صاف ظاہر ہے کہ بینک اپنی مالیاتی پالیسی کو مزید سخت تر کر رہا ہے اور آگے چل کر اس میں مزید اضافے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ افراطِ زر کو دھکیلنے کی خاطر سخت مالیاتی پالیسی اپنانے کے مثبت اور موثر اثرات نہ ماضی میں کبھی برآمد ہوئے ،اور نہ ہی مستقبل میں اس سے کوئی توقع کی جاسکتی ہے

نہ ہی اس سے حکومتی بجٹ خسارہ پورا کرنے کے لیے قرض حاصل کرنے کے رجحان کو کبھی روکا جاسکا ہے۔اس سے، ملکی مشکلات کے لیے سابقہ حکومت کی مالیاتی پالیسیوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے بینک کی بعد از وقت تنقید ہی سامنے آتی ہے۔ لیکن چند دن میں ڈالر کی شرح روپے کے مقابلے میں اوپر گئی ہے، اس سے مہنگائی کے خطرات میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹیکسوں کی بھر مار سے عوام اور تاجر سب ہی پریشان ہیں۔ ویلیو ایڈیڈ ٹیکس پر ٹیکسٹائل ایسوسی ایشن کا شدید رد عمل ہے۔ انھوں نے ایف بی آر کی جانب سے ویلیو ایڈیڈ ٹیکسائل صنعت پر ٹیکسوں کے نفاذ کو مسترد کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس اقدام سے صنعتیں خود بخود بند ہوجائیں گی۔ ایف بی آر کی جانب سے ویلیو ایڈڈ سیکٹر مثلاً گارمنٹس بیڈ لینن اور ٹاول سمیت دیگر ٹیکسٹائل کی صنعتوں کے لیے 2 فیصد سیلز ٹیکس عائد کرنے کے علاوہ ود ہولڈ ہولڈنگ ٹیکس کی شرح 1 فیصد سے بڑھا کر 5 فیصد کر دی گئی ہے۔ اس تناظر میں اسٹیٹ بنک کی تازہ رپورٹ انتہائی مایوس کن ہے۔ موجودہ حکومت نے اڑھائی ماہ میں ریکارڈ 547 ارب روپے قرضہ لیا جوکہ موجودہ حکومت کے عوام سے کیے گئے تمام وعدوں کی نفی کرتا ہے۔ روپے کی قدر دن بدن کم ہورہی ہے جبکہ ڈالر 106 روپے کا ہوچکا ہے۔ جنوبی ایشیائی ممالک میں سب سے زیادہ مہنگائی کی شرح پاکستان میں ہے۔ اس میں کمی کے حوالے سے حکمرانوں کی جانب سے کوئی خاطر خواہ اقدامات نظر نہیں آرہے۔ پاکستان میں فی کس آمدنی دوسرے ممالک سے کم ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران نجی سرمایہ کاری نصف رہ گئی ہے۔ کفایت شعاری

کے باعث 6.7 ملین ڈالر ریسکیو فنڈز حاصل کرکے بھی عوام کے معیار زندگی پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آرہا۔ کہا جارہا ہے کہ ناقص پالیسیوں اور روپے کی قدر میں کمی کی وجہ سے اسٹیٹ بنک کے ذخائر 14.78 بلین ڈالر سے کم ہوکر صرف 6 بلین ڈالر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے سودی نظام کا خاتمہ ناگزیر ہوچکا ہے۔ قرضے اتارنے کے لئے مزید قرضے لینے کی پالیسی نے براہ راست عام آدمی کی زندگی کو متاثر کیا ہے۔ توانائی کا سنگین بحران، امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور حکمرانوں کے ناعاقبت اندیش فیصلوں نے ملکی معیشت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ادارے جو کبھی منافع بخش اور پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے ایک ایک کرکے خسارے میں جاچکے ہیں۔ صرف پی آئی اے کو ماہانہ تین ارب روپے کا خسارہ ہورہا ہے۔ اس وقت اٹھارہ کروڑ کی آبادی میں صرف 12 لاکھ افراد ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ سابق وزیر خزانہ حفیظ شیخ کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے کہ ''ملک کے منتخب ایوانوں میں موجود گیارہ سو نمائندگان میں سے ساڑھے آٹھ سو نمائندے ٹیکس کی مد میں قومی خزانے میں ایک روپیہ بھی جمع نہیں کراتے''۔ تنخواہ دار طبقات پر ٹیکسوں کے بوجھ میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے مگر جاگیر دار، وڈیروں اور سرمایہ داروں پر تاحال کوئی گرفت مضبوط نہیں کی جاسکی۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھ رہا ہے۔ ان حالات میں اسٹیٹ بنک نے نئی مانیٹری پالیسی کا جو اعلان ہے جس میں شرح سود کو کم کرکے نو فیصد کرنے کا فیصلہ کیا ہے قبل ازیں یہ

شرح 9.5 فیصد تھی بنک کی طرف سے ان خدشات کا اظہار کیا گیا ہے نئے مالی سال کے بجٹ میں حکومت کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات کے نتیجے میں محصولات کا ہدف حاصل نہ ہوسکے گا سٹیٹ بنک کی رپورٹ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ حکومت نے مالی سال کے دوران افراط زر کا آٹھ فیصد کا جو ہدف مقرر کیا ہے بجلی کے نرخوں میں مرحلہ وار اضافے سے اس کا حصول بھی ممکن نہیں ہے یہ امر قابل ذکر ہے کہ سٹیٹ بنک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے توازن ادائیگی کی صورتحال کو درپیش خطرات کے مقابلے میں گرتے ہوئے افراط زر اور نجی شعبے کے کم قرضوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اسٹیٹ بنک کے سروے کے مطابق صارفین کے اعتماد متوقع معاشی حالات اور افراط زر کی توقعات میں نمایاں بہتری آئی ہے تاہم بیرون ملک سے رقوم کی آمد میں کمی اور بینکاری نظام سے بلند مالیاتی قرضے سخت معاشی چیلنج بنے ہوئے ہیں اسی طرح بجلی کی قلت اور امن وامان کے حالات ترقی کی شرح نمو کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں ادھر ایوان ہائے صنعت وتجارت کی طرف سے شرح سود میں کمی کو بہترین فیصلے سے تعبیر کیا ہے اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس کے ملکی معیشت پر بے حد مثبت اثرات مرتب ہوں گے کاروباری حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر شرح سود میں کمی کے ساتھ حکومت پاور اور گیس ٹیرف میں کمی کے اقدامات کرے تو تاجر اور صنعتکار اپنی صنعتی وکاروباری سرگرمیوں کو توسیع دے سکیں گے جس سے نہ صرف قومی پیداوار کا حجم بڑھے گا بلکہ ملک مختلف شعبوں کے برآمدی اہداف کا حصول بھی ممکن ہوسکے گا بہرحال مجموعی طور پر

صنعتی اور کاروباری حلقوں نے شرح سود میں کمی کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ اس کے نتیجے میں نئی صنعتیں لگانے پر کم لاگت آئے گی اور لوگ بنکوں میں پڑے اپنے بڑے اکاؤنٹس کو کاروباری سرگرمیوں کے لئے استعمال کریں گے جس سے سرمایہ سرکل میں آئے گا اور نجی شعبہ ترقی کرے بیرون ملک پاکستانیوں کی طرف سے بھیجی جانے والی رقوم میں کمی تشویشناک ہے اب تک زرعی شعبہ اور بیرون ملک سے ترسیلات زر پر ہی ہماری معیشت کھڑی تھی اگر فوری طور پر بیرون ملک سے ترسیلات زر کے معاملے پر توجہ نہ دی گئی تو معیشت کو ایک اور شدید جھٹکا لگ سکتا ہے ۔اسٹیٹ بنک نے اس ضمن میں اہم فیصلہ کیا ہے اب صنعتی وکاروباری حلقوں کو سرمایہ کاری کے معاملے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ حکومت کو اس امر کا ادراک ہے کہ جب تک بجلی کی کمی ہے اس وقت تک چھوٹی یا بڑی صنعتوں کو ترقی نہیں دی جاسکے گی اور بلاشبہ حکومت اس سلسلے میں قلیل المدت اور طویل المدت پالیسیوں کے تحت تیزی سے کام بھی کر رہی ہے لیکن اسے اس حقیقت کو بھی پلے سے باندھ لینا چاہیے کہ بجلی کے نرخوں میں اضافہ سے معاشی ترقی کے اہداف حاصل نہیں کئے جاسکتے بجلی کے نرخوں میں اضافے کا مطلب کسی بھی چیز کی پیداواری لاگت میں اضافہ ہے اور مہنگی اشیاء عالمی مارکیٹ میں جگہ بنا سکتی ہیں نہ مقامی مارکیٹ میں ان کی کھپت ممکن ہو سکتی ہے اس کے برعکس پیداواری لاگت میں کمی سے برآمدات کو فروغ دیا جاسکتا ہے اور یہ کمی بجلی کے نرخوں میں کمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسری جانب سیلز ٹیکس کی شرح میں اضافے کے باوجود ایف بی آر، جولائی میں ٹیکس آمدنی کا مجموعی ہدف حاصل کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔ایف بی آر نے جولائی میں 139 ارب روپے ٹیکس آمدنی حاصل کرنے کا ہدف رکھا تھا۔لیکن اس عرصے میں صرف 127 ارب روپے کا ٹیکس اکٹھا ہوسکا جو ہدف سے 12 ارب روپے کم ہے۔ذرائع کے مطابق سیلز ٹیکس کی شرح میں 1 فیصد اضافے کے باوجود ہدف کا پورا نہ ہونا ایف بی آر کی ناقص کارکردگی کا ثبوت ہے۔ادارہ نئے افراد کو ٹیکس دائرہ کار میں لانے اور نظام میں موجود بدعنوانیوں کے خاتمے میں ناکام نظر آرہا ہے۔یکم جولائی سے نہ صرف سیلز ٹیکس کی شرح کو 16 سے بڑھا کر 17 فیصد کردیا گیا تھا بلکہ غیر رجسٹر شدہ افراد پر یہ شرح 18 فی صد کردی گئ تھی مگر اس کے باوجود ٹیکس آمدنی کا مجموعی ہدف حاصل نہ ہوسکا۔حکومت کو جنرل سیلز ٹیکس کی شرح میں اضافے پر نظرثانی کرنا ہوگی کیونکہ ملک میں پہلے ہی مہنگائی ہے اور پیداواری لاگت میں اضافہ سے ہونے سے مزید مہنگائی ہورہی ہے۔اکثر افراد کی رائے ہے کہ حکومت کو عوام سے بالواسطہ ٹیکس نہیں لینا چاہیے۔بالواسطہ ٹیکس اب تک ختم نہیں کئے گئے۔حالانکہ جب حکومت براہ راست ٹیکس لے رہی تو پھر ان ڈائریکٹ ٹیکسز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔گورنر اسٹیٹ بنک مہنگائی میں اضافے کی بنیادی وجوہات میں حکومت کی جانب سے جنرل سیلز ٹیکس اور توانائی کی قیمتوں میں اضافہ کو قرار دیتے ہیں ۔ان کا کہنا ہے کہ مشرقِ وسطی میں جاری بحران کی وجہ سے عالمی منڈی میں تیل کی قیمتیں بھی

مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ عالمی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف نے پاکستان کو معاشی بحران سے بچنے اور معاشی اصلاحات میں مدد دینے کے لیے 6.7 ارب ڈالر کے قرضے دینے کی منظوری دی تھی۔اس قرضے کی 54 کروڑ ڈالر کی پہلی قسط جلد جاری کی جائے گی جبکہ بقایہ رقم اگلے تین برسوں میں اقساط کی صورت میں دی جائے گی۔کہا جارہا ہے کہ یہ قرضہ پاکستان کو اپنے زرمبادلہ کے ذخائر بہتر بنانے میں مدد دے گا۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حکومت نے ملک میں بڑے پیانے پر ہونے والی ٹیکس چوری اور توانائی کے شعبے میں اصلاحات پر آئی ایم ایف سے رضامندی ظاہر کی ہے۔مہنگائی پر سیاست دان کوئی بھرپور ردعمل نہیں دیتے۔لیکن کبھی کبھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل لیاقت بلوچ کا کہنا ہے کہ بجلی اور پیٹرولیم مصنوعات میں اضافہ عملی طور پر منی بجٹ ہے حکومت اپنی مقبولیت کھوچکی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بجلی اور گیس کی بدترین لوڈشیڈنگ اور پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرکے حکومت نے عوام کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔کائرہ بھی 152ارب روپے مالیت کا مِنی بجٹ متعارف کرانے پر نگران حکومت پر تنقید کرتے ہوئے اُسے غیر آئینی قرار دیتے ہیں۔ وفاقی وزیر خزانہ اسحٰق ڈار اب بھی پر امید ہیں وہ کہتے ہیں کہ 503 ارب روپے کا گردشی قرضہ کرکے لوڈشیڈنگ پر قابو پانے کی کوشش کریں گے۔ حکومت کوئی منی بجٹ نہیں لائے گی جبکہ وزیراعظم ہاؤس کے اخراجات میں 45 فیصداوردوسری تمام وزارتوں کے اخراجات میں 30 فیصد کٹوتی

لازمی کی جائے گی۔ ان کا دعوی ہے کہ 5 لاکھ نئے ٹیکس دہندگان کو اس سال ٹیکس کے دائرے میں لایا جائے گا۔ لیکن ان کے وعدے کا کیا اعتبار۔۔۔۔

القاعدہ ہو یا الشباب بین الاقوامی ڈراموں کی تخلیق عموماسی آئی اے کی زیر نگرانی ہوتی ہے

دنیا میں ابھی القاعدہ کی بازگشت ختم نہیں ہوئی ہے کہ اب الشباب کے چرچے ہونے لگے ہیں۔ الشباب ہے کیا؟ ہے بھی یا نہیں، یا یہ بھی کیسی تخلیق کار کا تیار کیا ہوا ڈرامہ ہے۔ ایسے بین الاقوامی ڈراموں کی تخلیق عموما سی آئی اے کی زیر نگرانی ہوتی

ہے۔کینیا کے ویسٹ گیٹ شاپنگ سینٹر اور پشاور میں چرچ میں ہونیوالی دہشت گردی ایک ہی ڈرامے کی کڑی ہو بھی سکتی ہیں۔کینیا کی وزیر خارجہ کا کہنا ہے کہ شاپنگ سینٹر پر حملہ کرنے والوں میں 'ایک برطانوی اور دو سے تین امریکی' بھی تھے۔ویسٹ گیٹ شاپنگ سینٹر میں دہشت گردی سے باسٹھ افراد ہلاک اور 170 زخمی ہوئے ہیں۔ پشاور میں اکیاسی جنازے اٹھے، زخمیوں کا شمار ابھی نہیں کیا جا سکتا، جانے کتنے زخموں کی تاب نہ لاکر اس جہاں سے گذر جائیں۔ کینیا ریڈ کراس کا کہنا ہے کہ اس محاصرے کے نتیجے میں تریسٹھ افراد اب بھی لاپتہ ہیں۔پی بی ایس نیوز آور کو انٹرویو میں وزیر خارجہ نے کہا کہ امریکی حملہ آوروں کی عمریں 18 یا 19 سال تھی اور وہ مینیسوٹا اور ایک اور جگہ کے رہائشی تھے۔۔برطانوی حملہ آور کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک خاتون تھی اور وہ پہلے بھی اس قسم کی کارروائیوں میں حصہ لے چکی تھی۔ صومالیہ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کم و بیش ایک ناکام ریاست ہے۔ یہاں بیس برس

سے کوئی حکومت مستحکم نہیں اور اس دوران ملک مسلسل لڑائی کی زد پر رہا ہے۔ ایسے حالات الشباب، طالبان، یا ایسی ہی مسلح دہشت گرد تنظیموں کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ جب پہلی بار یہ تنظیم سامنے آئی تو اس نے عوام کو تحفظ دینے کی بات کی تو ان کہ خوب واہ واہ ہوئی۔ لیکن جب 2011 میں قحط کے دوران اس نے مغربی امداد قبول کرنے سے انکار کیا تو اس کی عوامی مقبولیت دھری رہ گئی۔ عربی زبان میں 'الشباب' کا مطلب جوان افراد ہے۔ یہ گروپ 2006 میں اب غیر فعال تنظیم یونین آف اسلامک کورٹس کے سخت گیر یوتھ ونگ کے طور پر سامنے آیا تھا اور اس نے صومالیہ کی کمزور عبوری حکومت کی مدد کے لیے ملک میں آنے والی ایتھوپیائی افواج کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ ایسی اطلاعات بھی ہیں کہ غیر ملکی جنگجو الشباب کا ساتھ دینے کے لیے صومالیہ گئے ہیں۔ الشباب اب بھی اکثر موغادیشو اور دیگر علاقوں میں خودکش حملے کرتی رہتی ہے۔ الشباب نے اپنے زیرِ اثر علاقے میں سخت گیر شرعی قوانین نافذ کیے ہیں جن میں خواتین کو بدکاری پر سنگسار کرنا اور چوروں کے ہاتھ کاٹنے جیسی سزائیں شامل ہیں۔ الشباب کے رہنما احمد عبدی غودان اس گروپ کے قائد ہیں۔ انھیں مختار ابوزبیر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور ان کا تعلق شمالی علاقے صومالی لینڈ سے ہے۔ الشباب میں جنوبی صومالیہ سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں کی اکثریت ہے اور ان کی تعداد اندازاً سات سے نو ہزار کے درمیان ہے۔ مختار ابوزبیر 2008 میں اپنے پیشرو معلم عدن حاشی کی امریکی ڈرون حملے میں ہلاکت کے بعد

اب شاذ ونادر ہی منظرِ عام پر آتے ہیں۔الشباب میں جنوبی صومالیہ سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں کی اکثریت ہے۔ مغربی ذرائع کہتے ہیں کہ الشباب نے فروری 2012 میں القاعدہ کا حصہ بننے کا اعلان کیا تھا۔ایک مشترکہ ویڈیو میں مختار ابوزبیر نے القاعدہ کے سربراہ ایمن الظواہری کی 'فرمانبرداری' کرنے کا عہد کیا تھا۔اس کے بعد سے یہ دونوں تنظیمیں مل کر کام کر رہی ہیں اور القاعدہ کے غیر ملکی جنگجو صومالی شدت پسندوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں۔ گزشتہ برس الشباب نے ارکان نے القاعدہ سے تعلق رکھنے کے دعویدار امریکی شہر ابو عبداللہ المہاجر کے ہمراہ اپنے زیرِ اثر قحط سے متاثرہ علاقوں میں امداد بھی تقسیم کی تھی۔ الشباب والے بھی انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا ٹوئیٹر اکاونٹ بند ہوتا ہے تو وہ پھر کسی اور نام سے آجاتے ہیں۔ جیسے ہمارے طالبان کسی بھی واقعے کی ذمہ داری کے لئے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہفتے کو اکاؤنٹ کی منسوخی کے بعد، شدت پسند گروپ 'الشباب' پھر سے سماجی رابطے کی سائٹ 'ٹوئٹر' پر نمودار ہوا۔ٹوئٹر نے ان کا اکاؤنٹ اُس وقت بند کیا جب الشباب نے نیروبی کیشاپنگ مال پر ہونے والے مہلک حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔لیکن یہ شدت پسند گروپ کچھ ہی دیر میں سائٹ پر واپس آگیا۔اِس بار، اُس نے کچھ مختلف نام درج کیا۔الشباب کو تیسری بار ٹوئٹر سے خارج کیا گیا ہے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد افغانستان اور پاکستان سے بھاگنے والے القاعدہ کے جنگجو صومالیہ میں پناہ لے رہے ہیں۔الشباب نے

یوگنڈا کے دارالحکومت کمپالا میں 2010 کے فٹبال ورلڈ کپ کا میچ دیکھنے والے شائقین کو خود کش حملوں کا نشانہ بنایا تھا اور ان حملوں میں 76 افراد مارے گئے تھے۔اس حملے کی وجہ یوگنڈا کی جانب سے افریقی یونین کی فوج میں شمولیت کے لیے اپنی افواج بھیجنا بتائی گئی تھی۔کہا جاتا ہے کہ الشباب وہابی اسلام کا پرچار کرتی ہے۔ صومالیہ میں صوفی عقائد والے زیادہ ہیں۔ عراق میں سنی شیعہ کو لڑایا جارہا ہے۔پاکستان میں بھی مختیلف عقیدے اور فرقوں کو صف آرا کیا جاتا ہے۔ جیسے پاکستان میں مسجد،

مدرسہ،مزار، گرجا، محفوظ نہیں ایسے ہی الشباب کے بارے میں کہا جاتا ہے۔اس نے بہت سے صوفیاء کے مزارات تباہ کیے ہیں ۔کچھ عرصے سے حالات تبدیل ہوئے تھے۔ ملک میں امید کی نئی کرن چمکی تھی، بہت سے صومالی جلاوطنی ختم کر کے ملک واپس آئے ہیں اور امکان پیدا ہوا ہے کہ دو دہائیوں کے بعد صومالیہ ایک بار پھر ابھرے گا۔ لیکن پاکستان کی طرح یہ خواب ٹوٹ گیا، طالبان یا لڑائی کرنے والوں سے مزاکرات کا عمل شروع ہونے سے پہلے ہی پاکستان میں دہشت گردی کہ نئی لہر آئی ہے۔ جس پر ہر ایک کو ایسا ہی غم و غصہ ہے، جیسے سوات کی ایک لڑکی کو کوڑے مارنے کی ویڈیو دیکھ ہوا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا، وہ ایک جعلی ویڈیو فلم نکلی۔ کس کس واقعے کا ذکر کیا جائے، کس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ کون جانے

گجرات فساد کا اصل چہرہ، نفرت کی سیاست کا علمبردار

نریندر مودی بھارت میں وزیر اعظم کا امیدوار

متنازعہ سیاست دان نریندر مودی بھارتیہ جنتہ پارٹی کے اگلے برس کی انتخابی مہم کے سربراہ ہیں۔ ان کے وزیر اعظم بننے کے امکانات بھی ہیں۔ کیونکہ بھارت میں انتخابی مہم کی سربراہی پانے کا مطلب ہے کہ وہ 2014 کے پارلیمانی انتخابات میں وزارت عظمٰی کے لیے بی جے پی کے امیدوار ہوں گے۔ نریندر مودی اپنی الیکشن مہم میں کامیابی کے لئے ایک بار پھر نفرت کی سیاست شروع کر دی ہے۔ وہ گزشتہ ایک دہائی سے بھی زائد عرصے سے اقتصادی لحاظ سے خوشحال ریاست گجرات کے وزیر اعلیٰ چلے آ رہے ہیں۔ بی جے پی 2014 کے انتخابات میں کامیاب رہے گی یا نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ اس انتخاب میں پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر ضرور پھیلائے گی۔ وزارت عظمٰی کے منصب کی جانب سفر میں مودی کا ایک بڑھتا ہوا قدم ہے اس کے باوجود کہ بہت سے بھارتی باشندے انہیں 2002 کے مسلمان مخالف فسادات کے حوالے سے براہ راست ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ نریندر مودی بھارت بھر میں اپنی جماعت اور اپنی ذات کی حمایت کی مہم چلا تو رہے ہیں لیکن گجرات فسادات میں مسلمانوں کے اجتمائی قتل کے سائے ان کے ساتھ رہیں گے۔ مودی کے ایک ریاستی وزیر کو عدالت نے فسادات بھڑکانے کے الزام میں

عمر قید کی سزا سنا رکھی ہے تاہم مودی پر کوئی الزام ثابت نہیں کیا جاسکا۔ گجرات میں مسلمانوں کی بڑی تعداد بستی ہے۔ جو آج تک مودودی کے جرائم کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔ 62 سالہ نریندر مودی کے ہدف پر بائیں بازوں کی جانب جھکاؤ رکھنے والی حکمراں کانگریس پارٹی ہے، جس کے نوجوان رہنما راہول گاندھی کی مقبولیت میں گزشتہ کچھ عرصے سے کمی دیکھی جارہی ہے۔ مودی خود کو ایک تاجر دوست اصلاح پسند کے طور پر پیش کرتے ہیں جو کانگریس کو شکست دینے کے بعد دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت کے باسیوں کی معاشی تقدیر بدلنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ نئی دہلی میں کانگریس حکومت کو بدعنوانی کے متعدد اسکینڈلز نے بھی خاصا متاثر کیا، جنہیں بی جے پی نے سیاسی حربے کے طور پر خوب اچھالا۔

اگرچہ جنتا پارٹی میں ان کے سیاسی گرو 82 سالہ لال کرشنا اڈوانی اور اوما بھارتی جیسے سینیئر سیاست دان وزارت عظمٰی کے لیے مودی کی نامزدگی کے مخالف ہیں تاہم مقامی ذرائع ابلاغ کے مطابق پارٹی کا مجموعی مزاج مودی کے حق میں ہے۔ وزیر اعظم

نواز شریف کی طرف سے بھارتی ہم منصب من موہن سنگھ کو مبینہ طور پر دیہاتی عورت کہے جانے پر مودودی نے نواز شریف کے خوب لتے لیئے ہیں۔ بھارتی سیاست میں اس حوالے سے گرما گرمی جاری ہے۔ مودی نے اس واقعہ پر ایک جلسہ میں خوب گرم تقریر کی۔ لیکن اب بی جے پی کے رہنما اور نامزد وزیر اعظم

نریندر مودی کی رائی کا پہاڑ بنا کر پوائنٹ اسکورنگ کی کوشش ان کے گلے پڑ گئی ہے، بھارتی وزیر خارجہ سلمان خورشید نے نریندر مودی کی باتوں پر رد عمل دیتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستانی وزیراعظم نواز شریف نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور اگر ایسا کچھ کہا بھی ہے تو دیہاتی عورت ہونا کوئی گالی نہیں ہے۔ بھارتی وزیر خارجہ نے تو اپوزیشن رہنما نریندر مودی کو مکمل احمق قرار دیتے ہوئے کہا کہ یوں لگتا ہے کہ مودی صاحب کو دیہاتی خواتین پسند نہیں، ان کے لیے ہر دیہاتی عورت ایک گالی کے مترادف ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مودی نہ تو اخبار پڑھتے ہیں اور نہ ہی ٹی وی دیکھتے ہیں، انہوں نے اپنے گرد چند احمق اکٹھے کر رکھے ہیں جن کی لکھی تقریریں مودی طوطے کی طرح پڑھ دیتے ہیں۔ بھارتی وزیر خارجہ نے ہندو انتہا پسند رہنما پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مودی کے قول اور فعل میں ہمیشہ تضاد رہا ہے، ان کے اندر حقائق کو جاننے کی صلاحیت کی کمی ہے، وہ نہ تو سیاست کو سمجھتے ہیں اور نہ کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم نواز شریف کی جانب سے من موہن سنگھ کو دیہاتی عورت کہے جانے کی خبر منظر عام پر آنے کے بعد نریندر مودی نے اسے بھارتی وزیراعظم کی بے عزتی کے مترادف قرار دے کر کافی واویلہ مچایا تھا، دوسری جانب وزیراعظم نواز شریف کے اس بیان کی بعد میں تردید بھی کی جاچکی ہے۔ دوسری جانب نریندر مودی درندہ ہے۔ نریندر مودی قاتل ہے۔ نریندر مودی کو پھانسی دی جانی چاہئے۔ نریندر مودی مسلمانوں کی نسل کشی کا ذمہ دار ہے۔ نریندر مودی گجرات فساد کا اصل

چہرہ ہے۔ جیسی شہ سرخیاں اور سرخیاں بھارتی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، جو گزشتہ سالوں عوام پڑھتے اور دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ سرخ سرخ رنگ کی یہ لائنیں اپنے 10 رنگ سے ہی انسانی خون کی المناک داستان سناتی نظر آتی ہیں۔ بھارتی جریدے ''نئی دنیا'' نے مودی سے 25 سوالات کیے تھے۔ اس مضمون کی سرخی کچھ اس طرح سے تھی۔ نریندر مودی ''نئی دنیا'' کے 25 سوال، جن کا جواب فیصلہ کرے گا کہ مودی انسان ہے یا شیطان؟ اور آگے ایک بڑا سوالیہ نشان۔ مودی کا رویہ اخبارات اور صحافیوں سے بھی بڑا جارحانہ ہے۔ مودی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انٹرویو نہیں دیتے ہیں اور اگر کوئی ان سے کسی میٹنگ میں براہ راست سوال بھی کرے تو وہ بری طرح سے ناراض ہوجاتے ہیں، سوالنامہ تک اٹھا کر پھینک دیتے ہیں اور فوراً وہاں سے چل دیتے ہیں۔ مودی کسی بھی جرنلسٹ کو انٹرویو نہیں دیتے ہیں۔ گجرات فسادات کے حوالے سے یہ بات بھی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ مودی پولیس کے بڑے بڑے افسروں کو یہ ہدایات دے رہے تھے کہ ہندوؤں کو غصہ کے اظہار کا موقع دیا جائے اور یہ ایک دو نے نہیں کئی اہم عہدیداران نے میڈیا کو بتائی ہے۔ گجرات کے اہم آئی پی ایس آفیسر سنجیو بھٹ نے تو کھلم کھلا مودی کو فساد کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ بھارت میں مودی کی مسلم دشمنی روز روشن کی طرح عیاں ہے جس کو انھوں نے کبھی نہیں چھپایا۔ انھوں نے تو یہاں تک کیا کہ گجرات فساد کے متاثرین کو اور ان کی مدد کرنے والوں کو ڈرایا دھمکایا تھا۔ گجرات کے فساد کی کہانی، کسی شواہد کی محتاج نہیں ہے

اور جس طرح اس میں مسلم نسل کشی کی گئی اور خود نریندر مودی نے جس طرح اس میں حصہ داری نبھائی اسے سب جانتے ہیں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا مودی اب خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دس سال بعد اب مودی کہتے ہیں کہ اگر میں قصوروار ہوں تو مجھے پھانسی پر لٹکا دو، لیکن جس شخص کے خلاف گزشتہ دس برسوں میں ایف آئی آر تک درج نہیں ہو سکی ،اسے کون پھانسی دے گا؟ مودی کو جب بھی جیسے بھی موقع ملا ہے ،اس نے مسلمانوں کو زک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مودی کے دل میں مسلمانوں کے لئے بے پناہ نفرت ہے۔ انھیں گجرات کے فساد کے لئے نہ کوئی پچھتاوا ہے اور نہ وہ معافی مانگیں گے۔ مودی کو بھارت میں اسٹیٹ اسپانسرڈ ٹیرارزم' کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں مسلمانوں' کوٹارگٹ کرکے مارا گیا۔ گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بہتر منتظم، اور ایک فیصلہ کن ذہنیت کے سیاسی رہنما ہیں۔ بہت دنوں سے یہ چرچا عام ہے کہ مودی ہی بھارت کا بیڑہ پار کریں گے۔ میڈیا اور قوم پرست تجزیہ کاروں نے ایک ایسا تاثر قائم کر دیا ہے کہ خود نریندر مودی اپنے بارے میں بھرم میں مبتلا نظر آنے لگے ہیں۔ مودی گجرات میں دوہزار دو کے قتل عام اور اس کے بعد ریاست کے مسلمانوں اور عیسائی اقلیتوں کو ریاست کے اصل دھارے سے الگ کرنے سے قبل ایک اوسط درجے کے غیر محسوس سیاست داں تصور کیے جاتے تھے۔ لیکن ایک بار اقتدار ملنے کے بعد مودی نے پورے نظام پر اپنی آہنی گرفت مضبوط کی اور بہت

شعوری طور پر انہوں نے دو پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی ہے۔ گجرات پہلے سے ہی بھارت کی سب سے بڑی صنعتی ریاست رہی ہے۔ مودی نے اسے صنعتکاروں کے لیے اور بھی بہتر بنا دیا۔ مودی نے اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ بھارتی معاشرے اور بھارت کی سیاست میں ہندو قوم پرستی کو بہت برجستہ اور کھل کر فروغ دیا۔ ان کی اقتصادی ترقی کی بنیاد نفرتوں پر قائم رہی ہے۔ مودی کی سیاست کا محور نفرت ہے۔ یہ نفرت کبھی سیکولر سیاسی نظام کے خلاف نظر آئے گی تو کبھی بھارت کی مذہبی اقلیتوں کے خلاف۔ مودی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ کوئی بھی تقریر، کوئی بھی بیان کسی کو نشانہ بنائے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ مودی کی مذہبی نفرت کی سیاست سے کانگریس اس قدر خوفزدہ رہی ہے کہ گزشتہ دس برس سے پارٹی نے انتخابات میں اپنے مسلم رہنماؤں کو انتخابی مہم تک کے لیے نہیں اتارا ہے۔ نریندر مودی کا ہندو نظریاتی غرور اس حقیقت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کی موجودہ کابینہ میں کوئی مسلم وزیر نہیں ہے اور اسمبلی کے انتخابات میں ایک بھی مسلم کو ٹکٹ نہیں دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی تجزیہ کار اور انتخابی پنڈت گجرات میں نریندر مودی کی زبردست فتح کی پیش گوئیاں کر رہے ہیں۔ بھارت میں آج کل یہ بحث زوروں پر ہے کہ کیا مودی ملک کے اگلے وزیر اعظم بنیں گیں۔ کیا وہ وزیر اعظم بننے کے بعد پورے ملک میں ہندوئیت کے اپنے نظریے کو نافذ کریں گے؟ بھارت کی حکمراں جماعت کانگریس بھی مودی کی اس لابی کی اعصابی سیاسی جنگ کے آگے مغلوب نظر آ رہی ہے۔ سیاسی جماعتیں بڑھتی ہوئی ہندو قوم پرستی اور

منفی سیاست کے رحجان سے گھبراہٹ میں مبتلا ہیں۔ کانگریس گجرات میں مودی کی منفی اور نفرت پر مبنی سیاست کا منہ توڑ جواب دینے کے بجائے اسی کے پیرائے میں خود کو پیش کرنے کوشش کرتی رہی ہے۔

منفی سیاست اور مذہب پر مبنی قوم پرستی بھارت کی سیکولر جمہوریت کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ مودی اسی جمہوریت کی پیداوار ہیں لیکن وہ بلا شبہ جمہوری اصولوں پر یقین نہیں رکھتے۔ گجرات میں مودی کی ممکنہ جیت اور قومی سطح پر ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت تمام جمہوریت پسندوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

بھارت کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے حالیہ دنوں میں جنگی جنون کو ہوا دے کر پاکستان میں ان بھارتی شردھالوؤں کے پروپیگنڈے کی قلعی کھول دی ہے، جو اٹھتے بیٹھے پاکستان کو مذہبی تنگ نظری اور اردو پریس کو جنگجوئی کا نعرہ دیتے اور بھارتی سیاستدانوں کے علاوہ میڈیا کو امن پسند، روشن خیال اور ذمہ دار قرار دیتے نہیں تھکتے۔ انہیں اندرون و بیرون ملک ہر پیش آنے والے ہر واقعہ میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ، فوج اور خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ نظر آتا ہے یا نان سٹیٹ ایکٹرز کی کارستانی اور حالیہ واقعات نے ثابت کیا ہے کہ پاکستان دشمنی آج بھی بھارت میں مقبول موضوع ہے اور قومی سوچ کا مرکز و محور اس لئے میڈیا ان جذبات کو ہوا دے رہا ہے۔ مودی اور ان کے حواریوں کو

یہی فضا اچھی لگتی ہے۔ ہندو جوتشی، نجومی اور پنڈت بھی کئی سال سے شور مچا رہے ہیں کہ چین کے تعاون سے پاکستان 2013 میں بھارت پر حملہ کر سکتا ہے۔ 2011 میں بھارتی اکنامک گروتھ رکنے کی پیش گوئی سچ ثابت ہونے پر ان جوتشیوں اور پنڈتوں پر ضعیف الاعتقاد، توہم پرست، بھارتی فوجی و سیاسی قیادت کا اعتماد بڑھ گیا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اگر اس ٹولے نے جنگ کی مہورت نکالی ہے تو درست ہی ہو گی۔ پنڈتوں نے 2013 میں ہمالیہ کے پہاڑوں سے ایک مہارشی کے اترنے کی پیش گوئی کی ہے جو بھارتی فوج کی قیادت کرے گی۔ اگر بھارت نے ان جوتشیوں کے بقول 2013ء میں پاکستان کی اندرونی صورتحال سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر پاکستان ناقابل تسخیر ہو سکتا ہے اور بھارت کے لئے بہت بڑا خطرہ۔ شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش کے معاملے میں جوتش پر یقین رکھنے والے بھارتی آخر ان باتوں کو سچ کیوں نہ مانیں؟ 2013 کے بھارت کی انتخابی مہم میں بھی پاکستان دشمنی اہم انتخابی موضوع ہے اور کانگریسی حکومت نریندر مودی جیسے فرقہ پرست، مسلمان و پاکستان دشمن مدمقابل کا توڑ سرحدی کشیدگی، پاکستانی سفارت کار پر حملے اور دوستی بس کے سامنے رکاوٹوں کی صورت کر رہی ہے، لیکن اگر مسلمانوں کو کتے کے پلے سے تشبیہ دینے والے نریندر مودی نے پاکستان دشمن عوامی جذبات کے فائدہ اٹھا کر کامیابی حاصل کر لی۔ تو بھارتی جوتشیوں کی پیش گوئیوں کے مطابق پاک بھارت تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی؟ من موہن سنگھ نواز شریف ملاقات سے پاکستان کو کیا حاصل ہو گا؟ اگرچہ مودی پر گجرات میں

سنہ 2002 کے فسادات کے سلسلے میں الزامات لگے ہوں لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی میں انہیں وزیر اعظم کے عہدے کا سب سے مضبوط دعویدار مانتے ہوئے انہیں پہلے بی جے پی کی انتخابی مہم کمیٹی کا چیئرمین نامزد کر دیا گیا۔اسے نریندر مودی کی چمتکار ہی کہا جائے گا کہ چاہے گجرات اسمبلی انتخابات ہو یا پھر دوسرے انتخابات وہاں ان کی پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی سے زیادہ مودی کی شخصیت حاوی رہتی ہے۔

نریندر مودی سنہ 1950 میں گجرات میں مہسانا کے واڈنگر علاقے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علم سیاست میں ایم اے کیا۔ بچپن سے ہی ان کا جھکاؤ ہندو شدت پسند تنظیم آر ایس ایس کی جانب تھا۔ گجرات میں آر ایس ایس کی بنیاد کافی مظبوط مانی جاتی ہے۔ وہ1967 میں 17 سال کی عمر میں احمد آباد پہنچے اور اسی سال وہ آر ایس ایس کے رکن بن گئے۔اس کے بعد 1974 میں وہ نرمان آندولن یعنی تعمیر نو تحریک میں شامل ہو گئے۔

اس طرح فعال سیاست میں آنے سے پہلے مودی کئی سالوں تک آر ایس ایس کے پرچارک یا مبلغ رہے۔سنہ 1980 کی دہائی میں جب مودی گجرات کی بی جے پی اکائی میں

شامل ہوئے تو کہا جانے لگا کہ کہ پارٹی کو مذہبی ہندو تنظیموں کی انجمن سے براہ راست فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ سال 1988-89 میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی گجرات اکائی کے جنرل سیکریٹری بنائے گئے۔ نریندر مودی نے بی جے پی کے سینئر رہنما لال کرشن اڈوانی کی کی سومناتھ سے ایودھیا جانے والی رتھ یاترا کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا 1990 تھا۔اس کے بعد وہ بی جے پی کی جانب سے کئی ریاستوں کے انچارج بنائے گئے۔
مودی کو 1995 میں بی جے پی کا قومی سکریٹری اور پانچ ریاستوں کی انتخابی پارٹی انچارج بنایا گیا۔ اس کے بعد 1998 میں انہیں جنرل سکریٹری (تنظیمی امور) بنایا گیا۔

اس عہدے پر وہ اکتوبر 2001 تک رہے۔ لیکن 2001 میں کیشو بھاء پٹیل کو وزیر اعلیٰ کے عہدے سے ہٹانے کے بعد مودی کو گجرات کی قیادت سونپی گئی۔ اس وقت گجرات میں زلزلہ آیا تھا اور زلزلے میں 20 ہزار سے زیادہ لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ مودی کے اقتدار سنبھالنے کے تقریبا پانچ ماہ بعد ہی گودھرا ریل حادثہ ہوا جس میں کئی ہندو کارسیوک ہلاک ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد فروری 2002 میں گجرات میں مسلمانوں کے خلاف فسادات بھڑک اٹھے۔ ان فسادات میں حکومت کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ اور برطانوی ہائی کمیشن کی ایک آزاد کمیٹی کے مطابق

تقریباً 2000 افراد ہلاک ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان تھے۔جب اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے گجرات کا دورہ کیا تو انھوں نے انہیں 'راجدھرم ادا کرنے' انھیں وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے فرض ادا کرنے کا مشورہ دیا جسے واجپئی کی ناراضگی کے علامت کے طور پر دیکھا گیا۔ مودی پر یہ الزام لگے کہ وہ فسادات کو روکنے میں ناکام رہے اور انھوں نے اپنے فرض کی ادائیگی نہیں کی۔ جب بھارتیہ جنتا پارٹی میں انہیں عہدے سے ہٹانے کی بات اٹھی تو انہیں اس وقت کے نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی اور ان کے حامیوں کی طرف سے حمایت ملی اور وہ عہدے پر برقرار رہے۔ گجرات میں ہونے والے فسادات کی بات کئی ممالک میں اٹھی اور مودی کو امریکہ جانے کا ویزا نہیں ملا۔ برطانیہ نے بھی دس سال تک ان سے اپنے تعلقات منقطع رکھے۔ مودی پر الزام لگتے رہے لیکن ریاست کی سیاست پر ان کی گرفت مسلسل مضبوط ہوتی گئی۔ گجرات بی جے پی میں اب کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو ان کو چیلنج کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ اب تو بی جے پی کے قومی سطح کے لیڈر بھی کھلے عام مودی کی تنقید کا خطرہ نہیں مول لیتے ہیں۔ مودی ایک اچھے مقرر مانے جاتے ہیں اور انہیں آر ایس ایس کی بھی حمایت حاصل ہے۔ انہیں گجرات میں خوشحالی اور ترقی کا کریڈٹ بھی دیا جاتا ہے، حالانکہ بہت سے لوگ اس سے متفق نہیں ہیں۔ بھارت کے کچھ بڑے صنعت کار بھی ان کی پالیسیوں کی کھل کر تعریف کرتے ہیں۔ مسلسل تین بار اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی ان کی مقبولیت پر مہر لگاتی ہے۔ بی جے پی

کی کئی سابق اتحادی سیاسی پارٹیاں فسادات کا حوالہ دیتے ہوئے مودی کو بی جے پی کی جانب سے وزیر اعظم کے عہدے کے امیدوار کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔جہاں مودی پر 2002 کے فسادات کو نہ روکنے کے الزام لگے ہیں، وہیں ان کی حکومت میں وزیر کے عہدے پر رہنے والی مایا وڈنان انہی وجوہات سے 28 سال کی سزا بھگت رہی ہیں۔ مودی کے ناقدین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ فسادات میں کردار کی وجہ سے ہی مودی نے وڈنان کو وزیر کے عہدے سے نوازا تھا۔ مودی کے خلاف فسادات سے متعلق کوئی الزام کسی عدالت میں ثابت نہیں ہوئے ہیں۔تاہم، خود مودی نے بھی کبھی فسادات کے بارے میں نہ تو کوئی افسوس ظاہر کیا ہے اور نہ ہی کسی طرح کی معافی مانگی ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ فسادات کے چند مہینوں کے بعد ہی جب دسمبر 2002 میں ریاست میں اسمبلی انتخابات میں مودی نے کامیابی حاصل کی تھی تو ان کو سب سے زیادہ فائدہ ان علاقوں میں ہوا تھا جو فسادات سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔اس کے بعد 2007 کے اسمبلی انتخابات میں انہوں نے گجرات کی ترقی کو ایشو بنایا اور پھر کامیابی حاصل کی۔پھر 2012 میں بھی نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی گجرات اسمبلی انتخابات میں فاتح رہے اور اب مرکز میں اپنا سیاسی سکہ چلانے کی راہ پر گامزن ہیں مودی پالیسی سے زیادہ انفرادی رہنما پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ابتدائی دنوں میں وہ اپنی ہر تقریر میں گاندھی فیملی کو نشانہ بنایا کرتے تھے۔ وہ سونیا گاندھی کے اطالوی نژاد ہونے پر اکثر نسلی اور شخصی طنز کیا

کرتے تھے۔

کانگریس پارٹی آزادی کے بعد کے بیشتر سال اقتدار میں رہی ہے۔اختلاف جمہوریت کا بنیادی پہلو ہے لیکن کانگریس سے مودی کی نفرت جمہوریت کی حدوں کو پار کر گئی ہے۔ وہ انتخابات میں کانگریس اور اس کے سیاسی نظریات کو شکست دینے کی بات نہیں کرتے وہ کانگریس کو ہی ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ مودی اپنے حامیوں سے ایک ایسے بھارت کی تعمیر کی بات کر رہے ہیں جس میں کانگریس کا وجود نہیں ہوگا۔ کانگریس کے وجود کو ہی ختم کرنا ان کا سب سے بڑا نعرہ ہے۔یہ ایک خطرناک سیاسی روش ہے۔ سیاسی جماعتیں اپنے اپنے پروگراموں اور پالیسیوں کی بنیاد پر اقتدار میں آنے کے لیے انتخاب لڑتی ہیں کسی سیاسی جماعت کو تباہ کرنے کے لیے نہیں۔

آنے والے دنوں میں مودی یقیناً اپنے پروگرام اور پالیسیاں عوام کے سامنے پیش کریں گے لیکن ابھی تک ان کی روش منفی رہی ہے۔ منفی سیاست سے بہت زیادہ دنوں تک عوام کی حمایت نہیں حاصل کی جا سکتی۔نریندر مودی کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ سیاسی جماعتیں کسی کے ختم کرنے سے نہیں ختم ہوتی، وہ اپنے فرسودہ اور منفی نظریات سے فنا ہوتی ہیں۔ مودی اپنے انتظامی معاملات میں بھلے ہی ایک باصلاحیت منتظم رہے ہوں لیکن سیاست میں خواہ وہ ان کی اپنی

پارٹی رہی ہو یا حریف جماعتیں ان کی روش ہمیشہ منفی رہی ہے۔ یہ دور نفرتوں کی سیاست کا نہیں مثبت سیاست کا ہے۔ جماعتیں اپنی کارکردگی، رہنماؤں کی شخصیت اور پروگراموں کی بنیاد پر جانچی پرکھی جائیں گی۔ مودی کو کامیاب ہونے کے لیے جمہوریت کا یہ گر بہت جلد سیکھنا ہوگا ورنہ وہ خود اپنی منفی سیاست کی نذر ہو جائیں گے۔

امریکہ میں شٹ ڈاون کا موسم

بین الاقوامی ساکھ کا جنازہ نکل گیا، افغانستان میں فوجیوں کے پیمپر اور خواتین فوجیوں کی وردی کھٹائی میں پڑ گئی۔

آج کل امریکہ میں 'شٹ ڈاؤن' کا موسم ہے۔ جو سیاحوں کے لیے خاصی ناامیدی کا باعث بن سکتا ہے کیوں کہ بیشتر عجائب گھروں، نیشنل پارکس اور دیگر قومی یادگاروں کے ملازمین کو "غیر ضروری" قرار دیے جانے کے سبب ان مقامات کو عوام کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ شٹ ڈاون سے دنیا میں ''امریکا کی بین الاقوامی سطح پر ساکھ متاثر ہوئی ہے۔ امریکی اتحادی اس سے مزید مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکا کی خواتین فوجیوں اور عام فوجیوں کے یونیفارم کی تیاری میں بھی دشواری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ پینٹاگان یونیفارم اپنے سول کے شعبے سے سلواتا ہے جو اس شٹ ڈاون کی زد میں آ چکے ہیں۔ اب افغانستان میں امریکی فوجیوں کے لیے بھجوائے جانے والے پمپرز کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔ گو ابھی نہیں بتایا ہے کہ انہیں بھی پینٹاگان سے وابستہ سول کا شعبہ تیار کرتا ہے یا بھاری اخرجات کرکے اوپن مارکیٹ سے خریدے جاتے ہیں۔ حکومتی کاروبار بند ہو گیا جبکہ کارکنوں کو یہ بھی علم نہیں کہ انہیں اگلی تنخواہوں کے چیک

کب ملیں گے۔ واشنگٹن کی گلیاں خالی ہیں اور فضا میں بے یقینی کا احساس ہے۔ موجودہ حالات میں امریکا کو اپنے فوجی اخراجات اور روزمرہ کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے ہر روز چار ارب ڈالر کا قرض لینا پڑتا ہے۔

یکم اکتوبر منگل کو جب رات کے بارہ بجے تو واشنگٹن کی گلیاں خالی تھیں اور فضا میں بیےیقینی کا احساس پایا جاتا تھا۔ صدر باراک اوباما سمیت بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ کانگریس میں عین آخری وقت پر ایسا کوئی نہ کوئی تصفیہ ہو جائے گا جس کی مدد سے حکومتی اداروں کو بند ہونے سے روکا جاسکے گا لیکن یہ امید نہیں.بر آئی۔ دو عشروں بعد امریکا میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ واشنگٹن میں معمول کی حکومتی اور دفتری گہما گہمی نظر نہیں آتی۔ حکومتی کاروبار بند ہو چکا ہے۔ کارکنوں کو یہ بھی علم نہیں کہ انہیں اگلی تنخواہوں کے چیک کب ملیں گے۔ بازاروں کی رونق ختم ہو رہی ہے، اور میوزیم، اور سیاحتی ادارے بند ہیں۔ امریکی حکومت اگر اس شٹ ڈاون سے نکل بھی گئی تو قرضوں کا بحران سامنے کھڑا ہے، جس میں حکومت کو اپنے اخراجات کے لئے نئے قرضے لینے ہیں۔ جس کی اب کوئی حد نہیں رہی ہے۔ یہی نہیں اب تو اگلا ممکنہ حکومتی شٹ ڈاؤن بھی محض چند ہفتے دور رہ گیا ہے۔ واشنگٹن ڈی سی کو عام طور پر شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح پر ہجوم قرار دیا جاتا ہے، سات لاکھ سے زائد وفاقی ملازمین اور ان گنت ملین سیاحوں سے بھرا ہوا، جو پورا سال اس شہر میں ایک

قومی یادگار سے دوسری تک جاتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ امریکا میں وفاقی حکومت اس ملک کا سب سے بڑا آجر ادارہ ہے، جس کے دو ملین سے زائد ملازمین کے اہل خانہ کا انحصار ان کارکنوں کو ملنے والی تنخواہوں پر ہوتا ہے۔ موجودہ شٹ ڈاؤن کی وجہ سے وفاقی حکومت کے قریب آٹھ لاکھ ملازمین کو بغیر تنخواہوں کے رخصت پر بھیجا جا چکا ہے۔ کئی وفاقی ایجنسیاں اور محکمے بند ہو چکے ہیں اور کم از کم تعداد میں صرف وہی ملازمین اس وقت کام پر ہیں جن کی موجودگی وفاقی حکومت کے کاروبار کو چلتا رکھنے کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔ امریکا میں مالی بحران سے پیدا ہونے سے آٹھ لاکھ سرکاری ملازمیں کے فوری متاثر ہونے کے بعد اس خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا رہا ہے کہ اگر مالی بحران کے اسباب دور نہ کیے گئے تو امریکا کی دنیا بھر میں موجود فوجی سرگرمیاں اور آپریشنز بھی اس کی زد میں ہوں گے۔ امریکی خواتین اور مرد فوجیوں کے یونیفارم سلوانے میں بھی دشواریاں آسکتی ہیں۔ امریکہ میں دونوں سیاسی جماعتوں کے درمیان اصل جھگڑا وہ انشورنس کا بل ہے جس کے تحت ان لاکھوں امریکیوں کو صحت کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں جو اپنی جیب سے 'ہیلتھ انشورنس' خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ 'اوباما کیئر' نامی یہ قانون یکم اکتوبر سے شروع ہونے والے مالی سال سے مؤثر ہو گیا ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ ری پبلکن جماعت کے ارکان اس قانون کے سخت مخالف ہیں اور انھوں نے ان بجٹ تجاویز کو منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے جس میں اس قانون کے لیے بھی رقم مختص ہو گی۔ دوسری

جانب صدر اوباما اور ان کی جماعت 'ڈیموکریٹ' کے ارکانِ کانگریس کسی ایسے بل کو منظور کرنے سے انکاری ہیں جس میں 'اوباما کیئر' کے لیے بجٹ نہیں رکھا جائے گا۔ دونوں جماعتوں کے اپنے اپنے موقف پر اصرار کے باعث نئے مالی سال 14-2013 کا بجٹ منظور نہیں کیا جاسکا ہے جس کے باعث امریکی حکومت کو اپنی "غیر ہنگامی نوعیت" کی سرگرمیاں معطل کرنا پڑی ہیں۔ 'شٹ ڈاؤن' کے دوران میں امریکی معیشت کی پیداواری صلاحیت میں روزانہ 30 کروڑ ڈالر کی کمی ہوگی۔ لیکن اس بحران سے متعلق اصل پریشانی اس کا دورانیہ ہے۔ یہ 'شٹ ڈاؤن' جتنا طویل ہوگا، امریکی معیشت اتنا ہی زیادہ نقصان اٹھائے گی۔ امریکی پارلیمان – جسے کانگریس کہا جاتا ہے – کے دونوں ایوانوں کے درمیان بجٹ پر موجود اختلافات دور نہ ہونے کے سبب یکم اکتوبر سے امریکی حکومت 'شٹ ڈاؤن' ہو گئی ہے۔ کسی بھی ملک کی حکومت گاڑی کی طرح ہوتی ہے جو 'روپے پیسے' کے ایندھن سے چلتی ہے۔ اب اگر گاڑی میں ایندھن نہ ڈالا جائے تو لامحالہ وہ رک جائے گی۔ امریکی حکومت کی گاڑی میں ایندھن بھرنے کی ذمہ داری کانگریس کی ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ حکومت کو کب، کتنی رقم، کس سرگرمی کے لیے دی جانی ہے۔ امریکہ میں نئے مالی سال کا آغاز یکم اکتوبر سے ہوگیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ امریکی حکومت نے گزشتہ مالی سال میں کانگریس سے اپنی سرگرمیوں کے لیے جو پیسہ لیا تھا، وہ 30 ستمبر کو ختم ہوگیا اور اب اسے اپنے کام جاری رکھنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت ہے۔ لیکن کانگریس کے دونوں ایوان – یعنی سینیٹ اور

ایوانِ نمائندگان - تاحال نئے سال کے بجٹ پر متفق نہیں ہوسکے ہیں۔ان دونوں ایوانوں کے اختلافات کے باعث نیا مالی سال شروع ہونے کے باوجود اس کا بجٹ منظور نہیں ہوسکا اور پیسے نہ ہونے کے باعث امریکی حکومت کو اپنی سرگرمیاں اور ادارے بند کرنے پڑ گئے ہیں۔ اس بندش کو ہی 'شٹ ڈاؤن' کہا جاتا ہے۔ امریکہ میں مالی وسائل نہ ہونے کے باعث حکومت کا اپنی سرگرمیاں روکنا کوئی ایسی نئی بات بھی نہیں۔ سنہ 1977 سے اب تک امریکی حکومت 17 بار 'شٹ ڈاؤن' کا شکار ہوئی ہے۔ آخری بار حکومت کو 1996 میں اس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ شٹ ڈاؤن 21 دن جاری رہا تھا۔امریکہ میں دوجماعتی سیاسی نظام رائج ہے اور اس وقت وہاں کی پارلیمان واضح تقسیم کا شکار ہے۔ ایوانِ بالا، یعنی سینٹ میں صدر براک اوباما کی جماعت 'ڈیموکریٹ' کی اکثریت ہے جب کہ ایوانِ نمائندگان میں 'ری پبلکن' کو اکثریت حاصل ہے۔ دو جماعتی ایوان ہونے کے باعث امریکہ میں اس وقت تک نہ تو کوئی قانون بن سکتا ہے اور نہ ہی بجٹ منظور ہوسکتا ہے جب تک دونوں ایوان اس کی منظوری نہ دے دیں۔ اس شٹ ڈاون کے باوجود امریکی حکومت کی وہ تمام سرگرمیاں بدستور جاری رہیں گی جن کا تعلق قومی سلامتی، دفاع اور ہنگامی نوعیت کی صورتِ حال سے ہے۔ امریکہ کی وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے تمام ادارے اپنے ملازمین میں سے ان افراد کی نشاندہی کریں گے جن کا اپنی ملازمت پر موجود رہنا "قومی سلامتی یا انسانی جانوں اور املاک کے تحفظ" کے لیے "ضروری" ہے۔ان تمام "ضروری" ملازمین کو بدستور اپنی

ذمہ داریاں انجام دینا ہوں گی اور انہیں کانگریس کی جانب سے فنڈز جاری کیے جانے کے بعد اس عرصے کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ البتہ دیگر "غیر ضروری" ملازمین کو اس وقت تک بغیر تنخواہ کے گھر بیٹھنا پڑے گا جب تک نیا بجٹ منظور نہیں ہو جاتا۔ اس 'شٹ ڈاؤن' سے پولیس اور امریکی فوج کے مسلح اہلکار متاثر نہیں ہوں گے البتہ محکمہ دفاع کے چار لاکھ سول ملازمین میں سے نصف کو بغیر تنخواہ کے گھر بیٹھنا ہوگا۔ اسی طرح محکمہ خارجہ کی بیرونِ ملک جاری بیشتر سفارتی سرگرمیاں بھی جاری رہیں گی اور ویزا درخواستوں کی وصولی اور اجرا بھی جاری رہے گا۔ امریکہ کی داخلی سکیورٹی کے ذمہ دار ادارے 'ڈپارٹمنٹ آف ہوم لینڈ سکیورٹی' نے اپنے کل دو لاکھ ملازمین میں سے 86 فی صد کو "ضروری" قرار دیا ہے۔ باقی کے 14 فی صد ملازمین 'شٹ ڈاؤن' کے عرصے کے دوران بغیر تنخواہ کے رخصت پر بھیج دیے گئے ہیں۔ امریکہ میں 'شٹ ڈاؤن' کا موسم سیاحوں کے لیے خاصی ناامیدی کا باعث بن سکتا ہے کیوں کہ بیشتر عجائب گھروں، نیشنل پارکس اور دیگر قومی یادگاروں کے ملازمین کو "غیر ضروری" قرار دیے جانے کے سبب ان مقامات کو عوام کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ امریکہ کی وفاقی حکومت کے ملازمین کی تعداد لگ بھگ 22 لاکھ ہے۔ ان میں امریکی فوج کے مسلح اہلکار اور محکمہ ڈاک کے وہ ملازمین شامل نہیں جو 'شٹ ڈاؤن' سے مستثنیٰ ہیں۔ ان 22 لاکھ ملازمین میں سے لگ بھگ آٹھ لاکھ کو 'شٹ ڈاؤن' جیسے حالات میں "غیر ضروری" سمجھا جاتا ہے اور انہیں 'شٹ ڈاؤن' کے عرصے کے دوران

میں بغیر تنخواہ کے چھٹیوں پر بھیجا جا سکتا ہے۔ "غیر ضروری" قرار دیے جانے والے ملازمین 'شٹ ڈاؤن' کے دوران بھی سرکاری امور انجام دے سکتے ہیں لیکن ایسا کرنا ان کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ 'شٹ ڈاؤن' کے عرصے کے دوران میں "غیر ضروری" سرکاری ملازمین کی جانب سے اپنے سرکاری امور کی انجام دہی تیکنیکی طور پر غیر قانونی عمل ہے۔ حتیٰ کہ یہ ملازمین اس عرصے کے دوران میں اپنا سرکاری ای میل اکاؤنٹ بھی چیک نہیں کر سکتے۔ سادہ سی بات یہ ہے کہ جب لوگوں کو تنخواہ نہیں ملے گی، تو وہ خریداری کے لیے بازاروں کا رخ کریں گیا ور نہ ہی کریڈٹ کارڈ اور قرض پر لی جانے والی اشیاء کی قسطیں ادا کر پائیں گے۔ اس عدم ادائیگی کے باعث کاروباری اور معاشی اداروں کی آمدن متاثر ہوگی جس کا اثر امریکی معیشت پر پڑے گا۔ بعض امریکی تجزیہ کاروں کو خدشہ ہے کہ 'شٹ ڈاؤن' کے دوران میں امریکی معیشت کی پیداواری صلاحیت میں روزانہ 30 کروڑ ڈالر کی کمی ہوگی۔ لیکن اس بحران سے متعلق اصل پریشانی اس کا دورانیہ ہے۔ یہ 'شٹ ڈاؤن' جتنا طویل ہوگا، امریکی معیشت اتنا ہی زیادہ نقصان اٹھائے گیایک عالمی خبر رساں ادارے کے مطابق مالی مسائل کی وجہ سے شٹ ڈاون جاری رہا تو اس سے بحری جنگی جہازوں کی مرمت اور جنگی آپریشن کے علاوہ فوج کے مختلف شعبوں کے لیے تربیت کا اہتمام بھی مشکلات سے دوچار ہو سکتا ہے۔امریکا کے دفاعی حکام کے مطابق اس شروع ہو جانے والے شٹ ڈاون سے افواج کو سول کے شعبے سے ملنے والی معاونت کے بعد بالواسطہ طور پر امریکی افواج کی

افرادی قوت بھی متاثر ہو گی۔ اس لیے یہ بھی خدشہ ہے کہ مسلح افواج کو بعض شعبوں کے لیے آلات کی رسد میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ اس بارے میں ایک سینئیر فوجی ذمہ دار کا کہنا تھا'' شٹ ڈاون سے جو اثرات فوج کو برداشت کرنا پڑیں گے ان کا احساس فوری طور پر زیادہ نہیں ہو گا، البتہ بعد ازاں اس شٹ ڈاون کے مضرات کا احساس ہو جائے گا۔''

ان ذرائع کے مطابق بحری جنگی جہازوں سے شپ یارڈز پر ہونے والے کام متاثر ہوں گے، فوج کے بعض انتظامی شعبوں کے معمولات بھی گڑبڑ ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے امریکی فورسز کی اس شٹ ڈاون پر فکر مندی کا کھلے عام ذکر نہیں کیا جا رہا لیکن مستقبل میں اس معاملے کے سنگین نوعیت کے اثرات کا احساس ہر سطح پر ہے کہ پیر سے شروع ہونے والا شٹ ڈاون کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے امریکا کو ایک اسی نوعیت کے شٹ ڈاون کا سامنا 1995 میں کرنا پڑا تھا۔ اٹھارہ سال قبل ہونے والے شٹ ڈاون کے حوالے سے ایک سابق میجر جنرل کا کہنا تھا'' امریکا کو اس وجہ سے بوسینیا میں ایک آرمرڈ یونٹ تشکیل دینے میں انتہائی زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔'' امریکا کے وزیر دفاع چک ہیگل کا اس شٹ ڈاون کے بارے میں کہنا ہے'' امریکا کی بین الاقوامی سطح پر ساکھ متاثر ہو گی اور امریکی اتحادی اس سے مزید مایوسی کا شکار ہوں گے۔'' امریکی پینٹاگان کے حکام میں بھی اس شٹ ڈاون پر سخت تشویش کی ایک لہر ہے، حتی کہ امریکا کی خواتین فوجیوں اور عام فوجیوں کے یونیفارم کی تیاری میں بھی

دشواری ہو سکتی ہے۔ کیونکہ پینٹاگان یونیفارم اپنے سول کے شعبے سے سلواتا ہے جو اس شٹ ڈاون کی زد میں آ چکے ہیں۔ان ذرائع نے افغانستان میں امریکی فوجیوں کے لیے بھجوائے جانے والے پمپرز کے بارے میں نہیں بتایا ہے کہ انہیں بھی پینٹاگان سے وابستہ سول کا شعبہ تیار کرتا ہے یا بھاری اخرجات کرکے اوپن مارکیٹ سے خریدے جاتے ہیں۔

کوئینی پیک یونیورسٹی کے جائزے کے مطابق تقریباً 72 فیصد افراد ہیلتھ کیئر بل کی وجہ سے ہونے والے اس 'شٹ ڈاون کے حق میں نہیں۔ شٹ ڈاون کے بعد واشنگٹن میں معمول کی حکومتی اور دفتری گہما گہمی نظر نہیں آئی، حکومتی کاروبار بند ہو گیا جبکہ کارکنوں کو یہ بھی علم نہیں کہ انہیں اگلی تنخواہوں کے چیک کب ملیں گے۔ واشنگٹن کی گلیاں خالی ہیں اور فضا میں بے یقینی کا احساس ہے، صدر بارک اوباما سمیت بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ کانگریس میں عین آخری وقت پر ایسا کوئی نہ کوئی تصفیہ ہو جائے گا جس کی مدد سے حکومتی اداروں کو بند ہونے سے روکا جاسکے گا لیکن یہ امید اپنے بر آنے کی منتظر ہی رہی۔ دریں اثناء یورپین سنٹرل بنک کے چیف ماریو ڈرگئی کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ہونے والا شٹ ڈاون دنیا بھر کی معیشت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ منگل یکم اکتوبر کی صبح واشنگٹن میں جو ملازمین حسب معمول اپنے کام پر آئے، انہیں یہ سننا پڑا کہ حکومتی دفاتر کی بہت بڑی تعداد بند ہو چکی ہے

اور وہ واپس اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔ امریکی حکومت کی موجودہ مالیاتی صورت حال پر ناامیدی اور پژمردگی کا شکار ایسے بہت سے ملازمین کا کہنا تھا کہ اصل میں تو ایوان نمائندگان کے ارکان کی تنخواہیں روکی جانا چاہییں تھیں۔ ایسے ایک سرکاری ملازم نے بڑی بے صبری سے کہا، ''اگر ہمیں تنخواہیں نہیں ملیں گی تو انہیں (کانگریس کے ارکان کو) بھی تنخواہیں نہیں ملنی چاہییں۔'' امریکا میں اس حکومتی شٹ ڈاؤن سے انتہائی اہم حکومتی ادارے، مثال کے طور پر پبلک اسکول، ٹرانسپورٹ اور قومی سلامتی کے ادارے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن اب امریکی دارالحکومت میں وہ عوامی گہما گہمی بھی نظر نہیں آتی جو اس شہر کا خاصا بن چکی ہے۔ درجنوں پبلک عجائب گھر، قومی یادگاریں، حتیٰ کہ قومی چڑیا گھر تک بند ہو چکے ہیں۔ اس پس منظر میں حکام خبردار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ صرف واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں اس شٹ ڈاؤن سے ہونے والا نقصان روزانہ بنیادوں پر 200 ملین ڈالر اور ہفتہ وار بنیادوں پر قریب ایک بلین ڈالر تک ہو سکتا ہے۔

امریکی کانگریس کے اقدامات کی عوامی تائید و حمایت کی موجودہ شرح پہلے ہی بہت کم تھی جو مزید کمی کے بعد اس وقت محض 10 فیصد کی تاریخی حد تک کم ترین شرح تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت پورے امریکا میں عام لوگوں کے پاس اگر کچھ ہے تو وہ سیاستدانوں کے خلاف ظاہر کیا جانے والا وہ غصہ ہے، جس کی وجہ منتخب

عوامی نمائندوں کی اس حوالے سے کسی مصالحتی حل تک پہنچنے میں ناکامی ہے۔ امریکی نشریاتی ادارے CNN کے ORC کے ساتھ مل کر کرائے جانے والے ایک تازہ عوامی سروے کے نتائج کے مطابق ہر دس میں سے سات امریکی شہریوں کی رائے میں وفاقی حکومتی ادارے چاہے محض چند ہی روز کے لیے بند ہوں، یہ بنیادی طور پر ایک بڑی منفی پیش رفت ہے۔ واشنگٹن میں ایک مقامی شہری نے کہا، ''امریکی شہری کے طور پر مجھے اس صورت حال پر بہت غصہ بھی ہے اور شرمندگی بھی ہو رہی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی یہ بات امریکا کے لیے بے عزتی کا باعث ہے۔''

امریکی فضائیہ کے ایک سینئر افسر کلیٹن کے مطابق کانگریس کے ارکان کے رویوں میں، جو پارٹی بنیادوں پر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، فوری طور پر کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ بہت سے امریکی شہری حکومتی اداروں کی موجودہ بندش کے لیے ایوان نمائندگان میں ریپبلکن ارکان کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کانگریس نے صدر اوباما کو صحت عامہ کے شعبے میں ان کے سنگ میل قرار دیے جانے والے پروگرام سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرنے کے لیے دفتری کام کرنے والے سرکاری ملازمین کے خاندانوں کو مالیاتی حوالے سے جیسے یرغمال بنا رکھا ہے۔ واشنگٹن میں بین الاقوامی معیشت کے پیٹرسن انسٹیٹیوٹ کے ایک سینئر محقق جیکب کرکیگارڈ کو خدشہ ہے کہ موجودہ صورت حال کچھ بہتر ہونے سے پہلے مزید خراب ہو گی۔ ان کے مطابق، ''اس

میں کوئی شک نہیں کہ حکومتی شٹ ڈاؤن ملکی معیشت کو بہت مہنگا پڑے گا، ایک ایسی معیشت جس کی کارکردگی پہلے ہی سے بہت اچھی نہیں ہے۔'' ان حالات میں امریکی کانگریس کے ڈیموکریٹ اور ریپبلکن ارکان عنقریب ہی مل کر ایک بار پھر کوئی نہ کوئی مصالحتی حل نکالنے کی کوششیں کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ امریکی حکومت اپنی معمول کی کارکردگی کو یقینی بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنے قرضے لے سکتی ہے، ان کی موجودہ حد ممکنہ طور پر 17 اکتوبر کو پوری ہو جائے گی امریکا میں اس سے قبل بھی شٹ ڈاؤن ہوتے رہے ہیں۔ کچھ کا دورانیہ محض چند گھنٹوں کا رہا ہے جبکہ عمومی طور پر یہ دو سے تین دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم طویل ترین شٹ ڈاؤن 21 دنوں پر محیط رہا ہے۔ یہ گزشتہ شٹ ڈاؤن تھا جو 16 دسمبر 1995 کو شروع ہوا تھا اور 5 جنوری 1996 تک جاری رہا تھا۔ شٹ ڈاؤن میں حکومت کے پاس اخراجات کرنے کی قانونی اجازت نہیں ہوتی جبکہ قرض کے بحران میں حکومت کے پاس اخراجات کی منظوری تو ہوتی ہے مگر اخراجات کے لیے نہ تو اس کے پاس رقم ہوتی ہے اور نہ ہی اسے مزید قرض حاصل کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ان میں آپس میں یہ تعلق ہے کہ نتیجہ دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے یعنی حکومت کے پاس اپنے ضروری اخراجات کے لیے یا تو رقم موجود نہیں ہوتی یا پھر اس کی منظوری نہیں ہوتی۔ اس طرح حکومت کے تمام پروجیکٹس پر کام رک جاتا ہے اور وفاقی ملازمین کو تنخواہوں کی ادائیگی بھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ اس قانون کی وجہ سے ریپبلیکن اور ڈیموکریٹ قانون سازوں کے درمیان

پائے جانے والا اختلاف واضح طور پر منظر عام پر آیا ہے۔ڈیموکریٹس کا کہنا ہے کہ اوباما کیئر قانون تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے منظور کیا گیا اور اب یہ امریکی قانون کا حصہ ہے۔ امریکا کو اپنے فوجی اخراجات اور روزمرہ کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے ہر روز چار ارب ڈالر کا قرض لینا پڑتا ہے۔امریکی کانگریس کی جانب سے امریکی حکومت پر قرض لینے کی ایک حد مقرر کی جاتی ہے۔ جب قرض کی رقم اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو مزید اخراجات کے لیے قانونی طور پر حکومت بینکوں سے مزید قرض نہیں لے سکتی۔ اس طرح حکومت کے پاس اخراجات کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ اسے قرض کا بحران کہا جاتا ہے۔ اس وقت امریکا پر قرض کی حد 16.4 ٹریلین ڈالر ہے جو توسیع کرکے 2011ء میں مقرر کی گئی تھی۔ تکنیکی طور پر امریکا اس حد کو 31 دسمبر 2012ء میں پار کرچکا ہے۔ تاہم اس برس جنوری میں خصوصی اقدام کے ذریعے امریکی حکومت کو اس میں مہلت دے دی گئی تھی اور عبوری طور پر اسے مزید قرض لینے کی اجازت بھی۔ اب اندازہ ہے کہ شٹ ڈاون کے مسئلے سے نمٹتے ہی سترہ اکتوبر کو اوباما حکومت کو قرض کے بحران کا سامنا کرنا پڑے گا ہیلتھ انشورنس سے محروم افراد کو رعایتی نرخوں پر پالیسی حاصل کرنے کا موقع فراہم کرے گا تاکہ بیماری کی صورت میں لوگ گھمبیر معاشی مسائل سے دوچار نا ہوں۔ یکم اکتوبر کی نصف شب سے کچھ دیر قبل وائٹ ہاؤس کی بجٹ ڈائریکٹر سیلویا بُرویل نے وفاقی اداروں کو ''مرحلہ وار شٹ ڈاؤن کے منصوبے پر عملدرآمد'' کا ایک ہدایت نامہ جاری کیا۔ اس اقدام سے

تقریباً آٹھ لاکھ سرکاری ملازمین متاثر ہوں گے۔ متاثر ہونے والے وفاقی سرکاری اداروں میں نیشنل پارک سروس، ٹریفک سیفٹی ایجنسیز اور محکمہ دفاع شامل ہیں۔ اس ہدایت نامے سے متاثر ہونے والوں میں اکثریت سول ملازمین کی ہو گی۔ ہوم لینڈ سکیورٹی ایجنٹ، بارڈر سکیورٹی کے دفاتر اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کام کرتے رہیں گے۔ اس شٹ ڈاون کے باوجود صدر براک اوباما کہتے ہیں کہ امریکی افواج کے اہلکار اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور تمام جاری کارروائیاں بشمول جو افغانستان میں تعنیات ہیں، اپنا کام جاری رکھیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک بل پر دستخط کریں گے جس سے اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ افواج کے ارکان کو تنخواہوں کی ادائیگی ہوتی

رہے۔انھوں نے کانگریس سے شٹ ڈاؤن کے خاتمے کے لیے کام کرتے رہنے کے عزم کا اظہار بھی کیا۔اس شٹ ڈاؤن سے صحت عامہ کا قانون متاثر نہیں ہوگا جو کہ کانگریس میں ہونے والی کھینچاتانی کی ایک بڑی وجہ رہا۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ دو ہفتوں سے زائد رہنے والے شٹ ڈاؤن سے ملک کی پہلے سے خراب اقتصادی صورتحال مزید سست روی کا شکار ہوگی، ھس کی بڑی وجوہات میں سیاحت کی مد میں آمدن میں کمی اور شٹ ڈاؤن سے متاثرہ وفاقی ملازمین کی جانب سے اخراجات میں کمی شامل ہوں گی۔امریکہ میں حکومت کا جزوی شٹ ڈاؤن جمعرات کو تیسرے روز میں داخل ہوگیا، جب کہ اس کے فوری خاتمے کے بظاہر کوئی آثار نہیں۔کانگریس کے رہنماؤں نے صدر براک اوباما سے بدھ کو دیر گئے تقریباً ایک گھنٹہ طویل بند کمرہ ملاقات کی

تھی جس کے بعد بھی بجٹ کی منظوری سے متعلق کوئی پیش رفت نا ہو سکی۔ایوانِ نمائندگان کے اسپیکر جان بوئینر کے مطابق مسٹر اوباما نے اُنھیں بتایا کہ وہ شٹ ڈاؤن کے خاتمے سے متعلق کسی سمجھوتے پر بات نہیں کریں گے۔ سینیٹ میں ڈیموکریٹک رہنما ہیری ریڈ کا کہنا ہے کہ ڈیموکریٹ ریپبلکنز کے ساتھ خوشی سے ان معاملات پر بات چیت کرنے کو تیار ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں بشرطیکہ بجٹ منظور کرکے شٹ ڈاؤں کا خاتمہ کیا جائے۔تاہم ملاقات سے قبل مسٹر اوباما نے نشریاتی ادارے سی این بی سی کو بتایا کہ وہ مشکل صورت حال میں ریپبلکنز کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے شٹ ڈاؤن کو قطعاً غیر ضروری قرار دیا۔امریکی حکومت کے شٹ ڈاؤن کی وجہ سے صدر براک اوباما کو اپنا متوقع دورہِ ایشیا مختصر کرنا پڑا ہے۔ وائٹ ہاؤس کا کہنا ہے کہ مسٹر اوباما ملائشیا اور فلپائن نہیں جائیں گے، تاہم توقع ہے کہ وہ ایشیا پیسیفک اقتصادی تعاون تنظیم اور مشرقی ایشیا کے ممالک کی تنظیم کے سربراہ اجلاسوں میں شرکت کے لیے انڈونیشیا اور برونائی کا دورہ کریں گے۔امریکی نیشنل سکیورٹی کونسل کی ترجمان کیٹلن ہیڈن نے کہا کہ یہ اقدام ایوانِ نمائندگان کی وجہ سے ''حکومت کے شٹ ڈاؤن کا ایک اور نتیجہ ہے''۔شٹ ڈاؤن کی وجہ وائس آف امریکہ کی نشریات متاثر نہیں ہوئی ہیں، تاہم سمتھ سونیئن عجائب گھر اور کئی ایسے دفاتر بند ہیں جن کا تعلق وفاقی ٹیکس اور غریب لوگوں کو خوراک کی فراہمی جیسی سہولتوں سے ہے۔پینٹاگون کے بیشتر سیولین ملازمین بھی کام پر

نہیں جا رہے، اگرچہ امریکی فوج بدستور اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہی ہے۔ خلائی تحقیق کے امریکی ادارے ناسا کی تقریباً تمام سرگرمیاں بند ہو گئی ہیں۔ دیگر وفاقی ملازمین نوکری پر جا رہے ہیں تاہم اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ اُنھیں کام کا معاوضہ ملے گا۔

صدر براک اوباما نے کانگریس میں ری پبلیکن ارکان سے مطالبہ کیا ہیکہ وہ
کاروبارِ حکومت کو دوبارہ جاری کرنے میں مدد دیں، کیونکہ، اُن کے بقول، حکومتی 'شٹ ڈاؤن' جتنا طول پکڑے گا، معیشت کو اتنا ہی شدید نقصان پہنچے گا۔ اوباما نے قوم سے خطاب میں، صدر اوباما نے ری پبلیکنز کے لیے ایک پیغام میں کہا: 'بجٹ منظور کیا جائے۔ بِل ادا کیے جائیں۔ مزید انتظار مناسب نہیں۔ تاخیر سے کام نہ لیا جائے'۔ صدر اوباما نے کہا کہ صحت عامہ کا پروگرام جاری ہے؛ اور ہیلتھ کیئر انشورنس حاصل نہ کر سکنے والے 15 فی صد امریکی اس نئے پروگرام سے استفادہ کر سکیں گے۔ انھوں نے انشورنس کے بغیر افراد کو 'ہیلتھ کیئر ڈاٹ گو' وزٹ کرکے، اپنا نام درج کرنے کا مشورہ دیا، جہاں، اُن کے بقول، کم آمدنی والے افراد کو کم لاگت پر بہتر خدمت فراہم ہونے کا موقع ملے گا۔ حکومت کے فخریہ ہیلتھ کیئر پروگرام کے معاملے پر وفاقی حکومت کے شٹ ڈاؤن پر، صدر نے ری پبلیکنز پر 'نظریاتی مہم جوئی' پر عمل پیرا ہونے کا الزام لگایا۔ ری پبلیکن پارٹی کی اکثریت والے ایوان نمائندگان نے نئے مالی سال کے لیے حکومتی رقوم مختص کرنے کے معاملے کو ہیلتھ کیئر پروگرام سے منسلک کیا ہوا ہے، جسے وہ 'اوباما

کیئر' کا نام دیتے ہیں۔ اور انھوں نے بارہا اِس کے لیے رقوم نہ مانگے جانے، اِسے مؤخر کرنے یا ختم کردینے کا مطالبہ کیا ہے۔ ہر بار، ڈیموکریٹک پارٹی کے اکثریت والی سینیٹ نے ایسی قانون سازی کو مسترد کر دیا ہے۔ بجٹ کے بارے میں کسی قانون سازی پر سینیٹ کا متفق ہونا لازمی ہے۔ شٹ ڈاؤن کے دوران، تقریباً آٹھ لاکھ وفاقی کارکن فرلو' (انضباطی چھٹی) پر ہیں، جب کہ باقی وفاقی کارکن کام پر ہیں، حالانکہ اس بات کی' کوئی ضمانت نہیں کہ اُنھیں ڈیوٹی کی انجام دہی پر ادائگی ہوگی۔ کہا جا رہا ہے کہ شٹ ڈاؤن کا 'وائس آف امریکہ' کی نشریات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم، قومی پارکس، ٹریفک کے حفاظتی ادارے بند رہیں گے، جب کہ محکمہ دفاع کے زیادہ تر شہری ملازمین بے روزگار رہیں گے۔ امریکی فوج اپنے فرائض ادا کرتی رہے گی، اور افغانستان جیسی فوجی کارروائیاں جاری رہیں گی۔

اسمارٹ پولیس کے لئے اسمارٹ فون

پولیس بندوق کے بجائے اسمارٹ فون سے مجرموں کا مقابلہ کرے گی
پولیس سمارٹ فون کے ذریعے تمام وارداتوں کی معلومات اکٹھی کرے گی اور پھر ان معلومات کو سامنے رکھ کر جرائم روک تھام کے لیے منصوبہ بندی کی جائے گی۔ پنجاب میں پولیس والوں کو تیس ہزار اسمارٹ فون دیئے جائیں گے۔
دنیا میں نئی سے نئی ٹیکنالوجی جنم لے رہی ہے۔ لیکن یہ ٹیکنالوجی جہاں عوام کے لئے راحت اور آسانیاں فراہم کرتی ہے۔ وہاں مجرموں کو بھی یہ ٹیکنالوجی جرائم میں آسانیاں اور جدت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ پاکستان میں موبائیل فون آیا تو سینکڑوں جانیں تو موبائیل چھیننے کی وراداتوں میں چلی گئی۔ پھر مجرموں نے موبائیل فون کی سموں کو ہتھیار بنالیا۔ ان سموں سے خودکش دھماکے ہونے لگے۔ حکومت کو یہ سمجھ ہی نہیں آتی کہ موبائیل فون سے کیسے نمٹے، کبھی موبائیل فون کی سروس بند کی جاتی ہے۔ کبھی جعلی سموں کی روک تھام کے لئے، سروس فراہم کرنے والی کمپنیوں کے چیف ایگزیکیٹیو کو گرفتار کرنے کی بھی دھمکی دی جارہی ہے۔ ٹیکنالوجی کا یہ سفر جاری ہے۔ اب سمارٹ فون جرائم کی

روک تھام کے لئے مقبول ہو رہا ہے۔ حال ہی میں آئی فون بنانے والی امریکی کمپنی ایپل نے کہا ہے کہ تین دن کے اندر 90 لاکھ سمارٹ فون فروخت ہو گئے ہیں جو ایک ریکارڈ ہے۔ کمپنی کی جانب سے آئی فون، سمارٹ فون کے دو نئے ماڈل لانچ کئے ہیں اور لانچنگ کے تین دن کے اندر 90 لاکھ فون فروخت ہو گئے ہیں۔اس فون نے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہی سمارٹ فون سے اب جرائم کی روک تھام کے لئے استعمال کے ساتھ ساتھ اور بہت سے کام کر رہا ہے، لیکن ہمارے یہاں اب پولیس کو بندوق اور ہتھیار کے بجائے، اسمارٹ فون سے لیس کیا جا رہا ہے۔ اب تک تو یہ تھا کہ موبائل فون کے ذریعے وارداتوں کی خبریں پہنچائی جاتی تھی۔ یا کسی خود کش دھماکے یا اغوا کی واردات کی ذمہ داری قبول کی جاتی تھی۔ لیکن اب یہی فون جرائم کی روک تھام کے لئے استعمال ہوں گے۔ جرم کو روکنے کے لیے فون کے استعمال کی بات بالکل نئ ہے۔پاکستانی پولیس کے لیے جدید اسلحے سے لیس مجرموں سے لڑنا آسان نہیں، لیکن اب لاہور میں پولیس کو جرائم کے خاتمے کے لیے ایک اور طرح کا ہتھیار دیا جا رہا ہے۔ وہ ہے سمارٹ فون۔اب لاہور میں پولیس سمارٹ فون کے ذریعے تمام وارداتوں کی معلومات اکٹھی کرے گی اور پھر ان معلومات کو سامنے رکھ کر جرائم روک تھام کے لیے منصوبہ بندی کی جائے گی۔ڈاکٹر علی چیمہ کا تعلق ایک تحقیقاتی ادارے انسٹی ٹیوٹ آف ڈیویلپمنٹ اینڈ اکنامکس آلٹرنیٹوز سے ہے۔ گذشتہ برس ان کی گاڑی چوری ہوئی جو ابھی تک بازیاب نہیں ہو سکی۔تاہم اس واردات نے انھیں شہر میں ہونے والے

جرائم کی معلومات سے متعلق ایک نئے نظام کی تحقیق کی راہ دکھائی۔ڈاکٹر علی چیمہ کہتے ہیں: 'جب میری گاڑی چوری ہوئی تو اس وقت اس علاقے میں ایسے بہت سے واقعات ہو رہے تھے لیکن بحثیت شہری مجھے یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ اس قسم کی واردات ہونے کے امکانات کتنے زیادہ ہیں۔ اسی سے میں نے سوچا کہ ہم کسی طرح جرم ہونے کے امکانات کو جانچنا شروع کریں اور اس کے لیے کوئی نظام بنائیں کہ کب کہاں کیا ہوا اور جہاں زیادہ خطرات ہوں، وہاں کے معروضی حالات کے مطابق حکمتِ عملی بنائی جا سکے۔' "پہلے ہم نے لاہور کے تھانوں کی حدود بلکہ بیٹس کے حساب سے نقشہ بنوایا اور اس کے لیے ایک بنیادی ٹول تیار کیا جس پر لاہور میں جن جرائم کی ایف آئی آر درج ہو رہی ہیں ان کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ پھر ہم نے اینڈرائڈ فون کی ایک ایسی ایپلکیشن ڈیزائن کی جس میں جرائم کی معلومات درج کی جا سکتی ہیں۔ ابتدائی طور پر لاہور کے چار تھانوں میں یہ فون دیے گئے اور انھوں نے یہ رپورٹ کرنا شروع کیا کہ کب کہاں کیا ہو" پاکستان میں روایتی طور پر جرائم کی روک تھام کے لیے جو نظام رائج ہے اس میں جرم کرنے والے کی نفسیات اور حالات پر بہت توجہ دی جاتی ہے تاہم ڈاکٹر علی چیمہ اور ان کے ادارے نے مجرموں کے بجائے ان علاقوں پر توجہ دینے کی بات کی جہاں جرائم زیادہ تعداد میں ہو رہے ہوں۔ اور اس مقصد کے لیے سمارٹ فونز کا سہارا لیا گیا۔ علی چیمہ نے پنجاب پولیس کے کچھ افسران کے سامنے یہ آئیڈیا رکھا اور پھر باہمی مشاورت کے بعد ایک ایسی سمارٹ فون

اپلیکیشن بنانے پر اتفاق ہوا جس میں جرائم سے متعلق تمام معلومات درج کی جاسکیں۔ پاکستان میں فون کے لیے اور فون کے ذریعے وارداتوں کی خبریں تو معمول ہیں لیکن جرم کو روکنے کے لیے فون کے استعمال کی بات بالکل نئی تھی۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لاہور یونیورسٹی آف مینیجمنٹ سائنسز میں موجود شعبے کی خدمات لی گئیں۔ یہ شعبہ ٹیکنالوجی کے ذریعے عام آدمی کے مسائل حل کرنے کے کئی منصوبوں پر کام کررہا ہے۔ لاہور پولیس کے لیے ایسی سمارٹ فون ایپلیکیشن ڈیزائن کی گئی جس میں وہ ہر وقوعے کی تاریخ، وقت، تصویر، دفعات، ایف آئی ار کا نمبر اور دوسری تمام معلومات درج کر سکتے ہیں۔ اس پہلے پنجاب میں سمارٹ فون کے زریعے ڈینگی کی روک تھام کا منصوبہ شروع کیا گیا تھا۔ اس پراجیکٹ کی کنسلٹنٹ مریم افضل کہتی ہیں: 'پہلے ہم نے لاہور کے تھانوں کی حدود بلکہ حلقے کے حساب سے نقشہ بنوایا اور اس کے لیے ایک بنیادی ٹول تیار کیا جس پر لاہور میں جن جرائم کی ایف آئی آر درج ہو رہی ہیں، ان کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ پھر ہم نے اینڈرویڈ فون کی ایک ایسی ایپلیکیشن ڈیزائن کی جس میں جرائم کی معلومات درج کی جا سکتی ہیں۔ ابتدائی طور پر لاہور کے چار تھانوں میں یہ فون دیے گئے اور انھوں نے یہ رپورٹ کرنا شروع کیا کہ کب کہاں کیا ہوا۔' اب لاہور کے 83 تھانوں میں بندوق کے ذریعے جرائم کا خاتمہ کرنے والی پولیس کو جرائم کا خاتمہ کرنے کے لیے سمارٹ فون مل چکے ہیں۔ ڈی آئی جی انوسٹی گیشن ذوالفقار حمید کا کہنا ہے کہ اس نظام سے

انھیں شہر میں جرائم کے مراکز کا اندازہ ہو رہا ہے اور اب وہ ایسے علاقوں میں پولیسنگ کے نظام کو بہتر بنانے پر توجہ دے سکتے ہیں جہاں جرائم زیادہ ہوں۔ "پورے لاہور میں ہونے والے جرائم اب ہمیں ایک نقشے پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ کن مقامات پر جرم زیادہ ہو رہا ہے اور کس نوعیت کا جرم زیادہ ہے۔ ہم نے یہ ایپلیکشن استعمال کرنے کے لیے پولیس اہلکاروں کو ایک کورس کروایا ہے اور ایک باقاعدہ طریق؟ کار طے کیا ہے کہ ہر تھانے میں رپورٹ ہونے والے ہر جرم کو فون "کے ذریعے محفوظ کیا جائے

پورے لاہور میں ہونے والے جرائم اب ہمیں ایک نقشے پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس ' سے ہمیں یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ کن مقامات پر جرم زیادہ ہو رہا ہے اور کس نوعیت کا جرم زیادہ ہے۔ ہم نے یہ ایپلیکشن استعمال کرنے کے لیے پولیس اہلکاروں کو ایک کورس کروایا ہے اور ایک باقاعدہ طریقہ کار طے کیا ہے کہ ہر تھانے میں رپورٹ ہونے والے ہر جرم کو فون کے ذریعے محفوظ کیا جائے۔' سمارٹ فون کے ذریعے سمارٹ گورننس کا تصور دنیا میں تو بہت نیا نہیں تاہم پاکستان میں لاہور نے اس سلسلے میں بازی لے لی ہے۔ پنجاب انفارمیشن ٹیکنالوجی بورڈ نے پولیس اہلکاروں کی سہولت کے لیے اس ایپلیکشن کا سافٹ ویئر اردو میں تیار کیا ہے۔ چیئرمین پنجاب آئی ٹی بورڈ عمر سیف کہتے ہیں کہ لاہور کے بعد پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی یہ منصوبہ شروع کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا: 'ہمارے

جو بھی لوگ عوام کو خدمت فراہم کرنے کے لیے فیلڈ میں کام کر رہے ہیں سمارٹ فون کے ذریعے ہم ان کو بھی موثر انداز میں مانیٹر کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے اب سمارٹ فون سستے ہوگئے ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی ایپلیکیشن بنانا اور اسے استعمال کرنا انتہائی آسان ہے۔' اس پہلے پنجاب میں سمارٹ فون کے زریعے ڈینگی کی روک تھام کا منصوبہ شروع کیا گیا جو انتہائی کامیاب رہا۔ اس وقت بھی پنجاب حکومت مختلف منصوبوں کے لیے 30 ہزار سمارٹ فون خرید رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جدید ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے، جہاں آئے دن نت نئی ایجادات انسانی زندگی کو مزید آسان بنا رہی ہیں۔ اسمارٹ فون سے کیا کیا کام لئے جا رہے ہیں اور کیا لیئے جا سکتے ہیں، اس بارے میں دنیا حیرت زدہ ہے۔ حال ہی میں ایک ایسی کیتلی متعارف کروائی گئی ہے جس میں کافی یا چائے کے لیے پانی گرم کرنے کے لیے کچن میں داخل ہونا تو دور کی بات کے ذریعے اسمارٹ فون سے WiFi?! بستر سے اٹھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کیتلی نامی اس کیتلی کو بستر پر لیٹے لیٹے موبائل iKettle ن ہو کر اپنا کام شروع کرتی ہے۔ فون سے ایک میسج کرکے ا؟ن کیا جاتا ہے جو پانی کے گرم ہوتے ہی جواب میں ایک میسج کرکے آگاہ بھی کرتی ہے۔ آجکل ساری دنیا میں اسمارٹ فون کا ہر طرف دور دورہ ہے، پاکستان میں اسکا استعمال عام ہے یا کہ ابھی عوام الناس کی پہنچ سے دور ہے؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ طے ہے کہ اسمارٹ فون کا فائدہ تو ایک اچھے انٹرنیٹ ڈیٹا کنکشن سے ہی ہو سکتا ہے، پاکستان میں

موبائل کمپنیاں ابھی اچھے پیکیج آفر نہیں کر رہی ہیں۔ پاکستان میں ابھی ٹو جی نیٹ ورک ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بائیس ملین یا دو کروڑ بیس لاکھ سمارٹ فون یوزر ہیں۔ مختلف کمپنیوں کے پیکجز مختلف ہیں۔مثلاً زونگ 2 جی بی 200 روپے میں اور 4 جی بی 400 میں دیتی ہے۔ موبی لنک 100 روپے میں 200 ایم بی منتھلی اور 10 روپے میں ڈیلی "ان لمیٹیڈ" جس پر 200ایم بی ڈیلی کی لمٹ ہوتی ہے۔ دوسری جانب امریکی انٹیلیجنس ان ہی اسمارٹ فون کو اپنے عوام اور دنیا بھر میں معلومات کی چوری، اور جاسوسی کے لیئے استعمال کر رہی ہے۔ یہ اطلاعات ہیں کہ امریکی نیشنل سیکورٹی ایجنسی زیادہ تر سمارٹ فونز کے ڈیٹا تک رسائی حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ جرمن میگزین ڈیر شپیگل نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ امریکی نیشنل سیکورٹی ایجنسی (این ایس اے) آئی فون، اینڈرونڈ اور بلیک بیری کے فونز کے ڈیٹا تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اسمارٹ فونز کے ذریعے بھیجے جانے والے ایس ایم ایس اور ای میل پیغامات کی نگرانی کی جاتی رہی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا کہ این ایس اے اسمارٹ فونز کے کانٹیکٹس، نوٹس اور صارف کی لوکیشن کی معلومات حاصل کر سکتی ہے۔ میگزین نے اس سلسلے میں این ایس اے اور برطانیہ میں قائم اسی طرز کے برطانوی ادارے جی سی ایچ کیو کی دستاویزات کا حوالہ دیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان ایجنسیوں نے ہر طرح کے اسمارٹ فون کیلیئے مخصوص ٹیمیں مقرر کر رکھی ہیں جن کا کام دہشت گردی کی ممکنہ کارروائیوں جیسے خطرات کے بارے میں

معلومات اکٹھی کرنا ہے۔ ان دستاویزات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کیا این ایس اے بڑے پیمانے پر اسمارٹ فونز کے صارفین کی نگرانی کر رہی ہے تاہم یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس طریقے سے مخصوص لوگوں کی نگرانی کی جا رہی ہے تاہم ڈیر شپیگل نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دستاویزات اس کے ہاتھ کیسے لگیں۔ ان کے مصنفین میں سے ایک لارا پوئٹراس ہیں۔ وہ امریکی فلمساز ہیں اور ان کے این ایس اے کے سابق ملازم ایڈورڈ سنوڈن سے قریبی رابطے رہے ہیں۔ ڈیئر شپیگل حالیہ ہفتوں کے دوران سنوڈن کے حوالے سے متعدد مضامین شائع کر چکا ہے۔ قبل ازیں اس میگزین نے ایک رپورٹ میں یہ بھی بتایا تھا کہ این ایس اے اقوام متحدہ کی ویڈیو کانفرنسوں کی جاسوسی کرتی رہی ہے۔ ڈیر شپیگل میگزین کی گزشتہ ماہ سامنے آنے والی اس رپورٹ کے مطابق این ایس اے نے امریکی انٹیلیجنس اہلکاروں کو اقوام متحدہ کی ویڈیو کانفرنسوں تک غیر قانونی طریقے سے رسائی دی۔ اس رپورٹ میں این ایس اے کی دستاویزات کے حوالے سے بتایا گیا کہ اقوام متحدہ کے جوہری ادارے آئی اے ای اے کی کانفرنسوں تک بھی رسائی حاصل کی گئی۔

پنجاب پولیس کے بر عکس کراچی جہاں جرائم میں ٹیکنالوجی کا استعمال مجرموں کی جانب سے بہت زیادہ ہے، وہاں ان جرائم سے نمٹنے کے لئے حکومت کا عزم ماند پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ کراچی میں امریکی قونصل خانہ بھی پولیس کی تربیت میں تعاون کر رہا ہے۔ حال ہی میں انسپکٹر جنرل سندھ سندھ پولیس مشتاق احمد شاہ اور کراچی میں تعینات امریکی قونصل جنرل ولیم مارٹن

نے سینٹرل پولیس آفس کراچی میں 25 پولیس افسران جن میں سندھ پولیس کے 16 اور بلوچستان پولیس کے 9 افسران شامل ہیں کو پوسٹ بلاسٹ کرائم سین انویسٹی گیشن کورس کرایا ہے۔ اور اس کورس کی کامیاب تربیت مکمل کرنے پر اسناد بھی تقسیم کیں۔ اس کورس میں افسران کو تخریب کاری کے واقعات اور دھماکے کے بعد شواہد اکٹھا کرنے اور انہیں محفوظ کرنے کی تربیت دی گئی۔ آئی جی سندھ پولیس سید مشتاق احمد شاہ تو کہتے ہیں کہ پولیس کو جدید تربیت اور ٹیکنالوجی کی فراہمی کے لئے مزید اقدامات کئے جارہے ہیں اور یہ کورس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انہوں نے کورس کے انعقاد میں تعاون پر امریکی قونصل جنرل کا شکریہ ادا کیا۔

کراچی میں ٹیکنالوجی کو جرائم کے لئے استعمال کرنے میں حکومت کی عدم دلچسپی کا اظہار اس بات سے ہوجاتا ہے کہ یہاں اب تک سی سی ٹی وی کیمرے بھی پوری طرح نہیں لگ سکے، جہاں لگے وہاں بھی ان کی مینٹیننس نہ ہو سکی، جس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ : کمشنر کراچی شعیب احمد صدیقی کہتے ہیں کہ ترقیاتی ممالک کی طرح امن وامان کے قیام، کرائم کو کنٹرول کرنے اور جرائم کے خاتمے کے سلسلے میں سرویلنس کیمرہ سسٹم سمیت دیگر جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھایا جائے، جن اداروں نے یہ سسٹم رائج کیا ہوا ہے انھیں اس کا بھرپور فائدہ بھی پہنچ رہا ہے۔ وہ اس کی افادیت کے قائل ہیں۔ گذشتہ دنوں انھوں نے

اپنے دفتر میں سیکیورٹی اینڈ سرویلنس کیمرہ سسٹم کے حوالے سے گورنر اسٹیٹ بینک کے نمائندے، بینکوں کے صدور کے نمائندوں، پیٹرولیم ڈیلرز ایسوسی ایشن کے سربراہ، ڈی آئی جی ساؤتھ ،کے ایم سی اور پولیس انفارمیشن ٹیکنالوجی کے افسران و دیگر کے ساتھ ایک اجلاس بھی کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ کرائم کنٹرول کے سلسلے میں سرویلنس کیمروں کا استعمال انتہائی مفید ہے مگر تمام اداروں بشمول بینک، پٹرول پمپس، صنعتی و تجارتی علاقے، تفریحی مقامات سمیت دیگر اہم مقامات پر کے ایم سی کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم اور پولیس کے تحت لگائے جانے والے سرویلنس کیمرہ سسٹم کا ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہونا نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے اس موقع پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین پر مشتمل ایک فوکل گروپ قائم کرنے کا اعلان کیا جو کہ تمام اداروں کے مابین سرویلنس کیمرہ سسٹم منسلک کرنے کے سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کریگا، انھوں نے آئی جی سندھ سے بھی پولیس کے کیمروں کے مانیٹرنگ سسٹم کو مزید بہتر اور فعال بنانے کے لئے کہا ہے۔ کراچی میں سیکورٹی کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات کو مزید بہتر بنانے کے لئے پنجاب پولیس کی تحقیقات کو سامنے رکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جائے، لیکن اس میں سب سے اہم بات ان اقدامات کو پوشیدہ رکھنا ہے، کیونکہ ان کیمروں اور دیگر حساس تنصیبات کے بارے میں میڈیا پر خبریں اور تصاویر نشر ہونے کے بات اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

امن کا نوبل انعام ملالہ کا ملال بن گیا

دشمن میرے جسم کو ختم کر سکتے ہیں لیکن میرے خوابوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ ملالہ پاکستان کی تاریخ میں ملالہ یوسف زئی کا نام بہادری، روشن خیالی، اور بچوں کی تعلیم کے لئے دنیا بھر میں ایک علامت بن گیا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پاکستان کی وزیراعظم بن کر قوم کی خدمت کرنے کی خواہاں ملالہ یوسف زئی دنیا میں امن نوبل پرائز کے لئے نامزد ہونے والی کم عمر خاتون ہیں۔ اس کم عمری میں دنیا میں انھوں نے جو شہرت پائی ہے وہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس کم عمری میں دنیا کے سولہ بڑے ایوارڈ حاصل کئے ہیں، اقوام متحدہ کے اجلاس سے خطاب کیا ہے۔ ملالہ یوسف زئی امن کا نوبیل انعام نہیں جیت سکیں، ایوارڈ کیمیائی ہتھیاروں کی روک تھام کرنے والی تنظیم کو دے دیا گیا۔ اس حوالے سے تجزیہ کاروں اور عوام کی رائے ہے کہ ملالہ نے انعام نہیں جیتا لیکن وہ پوری دنیا جیت چکی ہے، گل مکئ ایوارڈز سے بہت بلند ہے، جس نے دنیا میں پاکستان کا مثبت تاثر مضبوط کیا۔ نوبل امن انعام انھیں نہ مل سکا، لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ ساری دنیا کا اس بات کا ملال ہوا کہ ملالہ کو یہ انعام کیوں نہیں دیا

گیا۔ نوبل انعام کے اعلان سے چند گھنٹے پہلے انھوں نے امریکی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ پاکستان کی وزیراعظم بننا چاہتی ہیں۔ پہلے ان کا خیال تھا کہ وہ ڈاکٹر بنیں ۔ لیکن اب وہ سیاست میں آنا چاہتی ہیں۔ گیارہ اکتوبر کا دن ملالہ یوسف زئی کے لئے اہم ترین ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے لئے بھی تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ ملالہ نوبل انعام نہیں جیت سکیں۔ لیکن، کروڑوں جیت لئے ہیں۔ اتنے دل شاید انہوں نے بھی نہ جیتے ہوں جنہیں امن کا نوبل ملا ہے۔ صدر براک اوباما اور امریکی خاتون اول، مشیل اوباما نے اس دن اوول آفس میں ملالہ یوسفزئی سے ملاقات کی اور پاکستان میں بچیوں کی تعلیم کے سلسلے میں ملالہ کی سچی لگن اور قابل تقلید جذبے کے ساتھ کی جانے والی کوششوں پر اُن کا شکریہ ادا کیا۔ جہاں ساری دنیا میں ملالہ کے نوبل انعام نہ ملنے پر رنج اور افسوس تھا۔ وہاں تحریک طالبان کو اس بات کی خوشی تھی۔ کالعدم تحریک طالبان پاکستان کا موقف ہے کہ ملالہ یوسف زئی اسلام کے خلاف اور ایک سیکیولر لڑکی ہے اور ملالہ یوسف زئی کو امن کا نوبل انعام نہ ملنے پر انہیں بہت خوشی ہے۔ کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد کا کہنا تھا کہ ملالہ یوسف زئی نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ اسے امن کا نوبل انعام دیا جاتا، امن کا نوبل انعام ایسے مسلمان کو ملنا چاہیئے تھا کہ جس نے اسلام کی سربلندی کے لئے خدمات انجام دی ہوں ۔ لیکن شائد طالبان یہ بات نہیں جانتے کہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں

کو نوبل انعام دینے میں مغرب کیوں دلچسپی لے گا۔ پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان کو بھی ملالہ یوسف زئی کو نوبیل امن انعام نہ ملنے پر مایوسی ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ نوبیل انعام کیلیے ملالہ کی نامزدگی پوری پاکستانی قوم کیلیے باعث فخر ہے۔ ملالہ پاکستان کی بیٹی ہے۔ امریکا میں پاکستان کی سابق سفیر ملیحہ لودھی نے کہا ہے کہ امن کا نوبیل انعام سیاسی بنیادوں پر دیا گیا ہے۔ بختاور بھٹو زرداری نے ملالہ کے نام اپنے ٹوئٹر پیغام میں کہا کہ نوبیل کو چھوڑیں، وہ ملالہ کو وزیراعظم دیکھنا چاہتی ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی کے سربراہ اسفندیار ولی نے کہا ہے کہ ملالہ نے دشمن کو اتنا خوفزدہ کردیا کہ وہ اب بھی اس کو مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے، ملالہ پر پختونوں اور پوری قوم کو فخر ہے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے کہا ہے کہ قوم کی بیٹی ملالہ یوسف زئی کو امن کے نوبیل انعام کیلیے نامزد کرنا ہی پاکستان کیلیے فخر کی بات ہے، ملالہ نے گھٹن زدہ ماحول میں علم کی شمع روشن کی۔ ملالہ یوسف زئی کا کہنا تھا کہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہر شخص حالات کی بہتری کے لئے خود آگے بڑھنے کے بجائے دوسرے کا انتظار کرتا ہے لیکن وہ ملک کی تقدیر بدلنے کے لئے سیاستدان بننا چاہتی ہیں۔ جہاں ان کی کوشش ہوگی کہ ملک میں تعلیم مفت ہو اور اسے لازمی قرار دیا جائے اور انہیں یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب پاکستانی عوام کو ان کے حقوق ملیں گے، ملک میں امن ہوگا اور ہر بچہ اسکول جائیگا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں فخر ہے کہ وہ

پختون ہیں اور انہوں نے اب بھی پختون روایات کو برقرار رکھا ہے۔ملالہ کو دنیا بھر کی اہم شخصیات کے پیغامات مل رہے ہیں۔ ملکہ برطانیہ الزبتھ نے بھی گل مکئی ملالہ یوسف زئی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اور ملالہ یوسف زئی کو ملاقات کیلئے شاہی محل آنے کی دعوت دی ہے۔ شاہی خاندان کے ترجمان کے مطابق ملکہ برطانیہ الزبیتھ ملالہ یوسف زئی کی بہادری اور لڑکیوں کی تعلیم کیلئے اس کی جدوجہد سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ جس پر انہوں نے ملالہ یوسف زئی کو برطانوی شاہی محل میں دعوت پر مدعو کیا ہے۔ ملالہ یوسف زئی اس سال کے امن کے نوبل انعام کے لیے پسندیدہ ترین شخصیت تصور کی جارہی تھی۔ اور امید کی جارہی تھی کہ رواں سال ملالہ امن کا نوبل حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ نوبل پیس پرائز کمیٹی کے سربراہ تھور بجورن جگلینڈ کا کہنا تھا کہ انہیں امن کے نوبل انعام کے 259 امیدواروں میں ملالہ یوسف زئی اس انعام کی سب سے زیادہ حق دار نظر آتی ہیں۔ ملالہ کو بچوں کے عالمی امن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے، جبکہ تعلیم کے فروغ کے لئے ملالہ فنڈ بھی قائم ہوچکا ہے 2013 جس میں سب سے پہلے رقم اقوام متحدہ کی خیر سگالی کی سفیر انجلینا جولی نے جمع کرائی تھی، ملالہ یوسف زئی کے نام پر فنڈ کے قیام کا مقصد دنیا بھر میں لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی کے لئے اقدامات کرنا ہے۔ ملالہ یوسف زئی کا اقوام متحدہ کی یوتھ اسمبلی سے خطاب بھی اس ملک کا نام سربلند کرنے کا سبب بنا ہے۔ ملالہ یوسفزئی کو ان کی سولہویں سالگرہ پر اقوام متحدہ میں نوجوانوں سے

خصوصی خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔اس موقع پر ملالہ کا کہنا تھا۔ تعلیم دنیا کے ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ قلم اور کتاب کے ذریعے دنیا میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔انہوں نے کہا اسلام امن کا مذہب ہے۔ملالہ کا کہنا تھا طالبان کا حملہ فروغ تعلیم کے لیے ان کے عزم کو متزلزل نہیں کرسکا۔انہوں نے کہا انتہا پسند قلم اور تعلیم کی طاقت سے خوفزدہ ہیں۔ملالہ نے کہا وہ خود پر حملہ کرنے والے طالبان سے بھی نفرت نہیں کرتیں۔ ملالہ کا کہنا تھا وہ قائد اعظم، مارٹن لوتھر کنگ اور مدر ٹریسا کی پیروکار ہیں۔ ملالہ نے کہا کہ بے نظیر بھٹو شہید کی شال اوڑھ کر خطاب کرنا ان کے لیے فخر کا باعث ہے۔اس سے پہلے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے اپنے خطاب میں کہا ملالہ فروغ تعلیم کے مشن کی چیمپئن ہے۔ سابق برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے ملالہ کو سالگرہ کی مبارکباد میں کہا تھا کہ پوری دنیا ملالہ کے ساتھ ہے۔ ملالہ کی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب اس نے گل مکئی کے نام سے بی بی سی میں ڈائری کے اوراق لکھے تھے۔ یہ اوراق کیا لکھے، گویا پوری ایک تاریخ رقم کردی۔ ایسی تاریخ جو پاکستانی معاشرے کے بہت سے پوشیدہ پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ملالہ یوسف زئی پاکستان کی کروڑوں لڑکیوں میں سب سے خوش قسمت ثابت ہوئی ہیں۔ صرف ایک سال میں انہوں نے وہ عالمی اعزازات اور شہرت حاصل کی جس کی لوگ عمر بھر تمنا کرتے ہیں۔ 9 اکتوبر 2012ء سے 11 اکتوبر 2013ء تک کی ایک سالہ مدت میں ان کا نام ساری دنیا میں گونجتا رہا۔

وہ دنیا میں جہاں جہاں گئیں، جس اسٹیج پر کھڑی ہوئیں وہاں ملالہ یوسف سے پہلے پاکستان کا نام پکارا گیا۔ لہٰذا، جو لوگ ملالہ پر تنقید کرتے ہیں وہ اتنا ضرور سمجھیں کہ پاکستان میں کئی سالوں سے موجود 'سخت ترین قحط' اور 'حبس کے موسم' میں ملالہ پاکستان کا 'سافٹ امیج' بن کر سامنے آئی ہیں۔ حال ہی میں ملالہ کی یادداشت پر مشتمل کتاب 'میں ملالہ ہوں' شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے 9 اکتوبر کے حادثے کا دکھ جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ انسان کا کلیجہ منہ کو لے آتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں، 'نو اکتوبر 2012ء۔۔۔ یہ وہ دن تھا جب ان کے ساتھ زندگی کا نہایت بھیانک واقعہ پیش آیا۔ وہ اپنے آبائی گھر سے وین کے ذریعے اسکول جانے کے لئے نکلی تھیں۔ اسکول وین کا یہ سفر ابھی جاری ہی تھا کہ راستے میں ایک شخص نے وین کے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا اور کچھ پوچھنے لگا کہ اسی دوران ایک اور شخص وہاں آ گیا جس نے کپڑے سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ اس نے لڑکیوں کے قریب آتے ہی سوال کیا کہ ملالہ کون ہے؟'

اس سوال پر وین میں موجود لڑکیوں نے ملالہ کی طرف دیکھا جو دراصل اس کے سوال کا خاموش جواب تھا۔ اس نے بندوق نکالی اور گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ فائرنگ کرنے والا شخص 20 سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ اس کی فائرنگ سے

ملالہ، اس کی دو سہیلیاں بھی زخمی ہوگئیں۔ ایک گولی ملالہ کی آنکھ کے قریب سے ہوتی ہوئی سر میں پیوست ہو گئی۔ اس گولی کی تکلیف ملالہ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ انہیں علاج کے لئے پہلے سی ایم ایچ پشاور لے جایا گیا جہاں آپریشن کے لئے ان کے سر میں لگی گولی نکالی گئی۔ اس کے بعد مزید علاج کے لئے راولپنڈی لے جایا گیا۔ لیکن، آخر کار سرجری کے لئے انہیں برمنگھم کے کوئن الزبتھ اسپتال لے جانا پڑا۔ ملالہ کو اس واقعے کے چھ دن بعد ہوش آیا۔ ہوش آنے پر انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کے بارے میں وہ اپنی کتاب میں لکھتی ہیں، 'بے ہوشی کے بعد آنکھ کھولی تو ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے بس یہ پتا تھا کہ میں اپنے ملک میں نہیں ہوں، کیوں کہ آس پاس موجود لوگ انگلش بول رہے تھے۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن گردن میں لگی ٹیوب کی وجہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی، بائیں آنکھ کی نظر بہت دھندلی تھی اور مجھے ہر کسی کی چار چار آنکھیں اور دو دو ناک نظر آ رہے تھے۔' میرے ذہن میں ہر قسم کے سوالات گھوم رہے تھے۔ میں کون ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ میرے والدین کہاں ہیں؟ کیا میرے والد زندہ ہیں؟ میں بہت خوفزدہ تھی۔ مجھے صرف ایک بات کا احساس تھا کہ اللہ نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے حروفِ تہجی کا بورڈ دیا جس کی مدد سے میں نے 'کنٹری' اور 'فادر' کے ہجے کیے۔ نرس نے مجھے کہا کہ میں برمنگھم میں ہوں لیکن مجھے کوئی اندازہ نہیں

تھا کہ یہ کہاں ہے۔ نرسیں مجھے کچھ نہیں بتا رہی تھیں، حتیٰ کہ میرا نام بھی نہیں۔ میرے سر میں اس قدر شدید درد تھا کہ انجکشن بھی اسے روکنے سے قاصر تھے، دائیں کان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ چہرے کا دایاں حصہ مناسب طریقے سے حرکت نہیں کر رہا۔ میں مسکرا بھی نہیں سکتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اسپتال کا خرچ کون برداشت کرے گا، مجھے ڈر تھا کہ ڈاکٹرز مجھے اسپتال سے باہر نکال دیں گے کیوں کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ایک دن میں نے نرس سے پوچھا کہ میرے پیٹ پر یہ ابھری ہوئی چیز کیا ہے، اس کی وجہ سے مجھے اپنا پیٹ بھاری لگتا تھا۔ نرس نے جواب دیا کہ یہ تمہاری کھوپڑی کا اوپری حصہ ہے۔ یہ جواب سن کر میں ششدہ رہ گئی۔ میرے والدین حملے کے 16 دن بعد برطانیہ پہنچے۔ اس دوران میں ایک دن بھی نہیں روئی، درد کی شدت سے تڑپتی رہی لیکن روئی نہیں۔ سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا مگر والدین کو دیکھ کر میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی اور ان سے لپٹ کر اتنا روئی کہ دل کا سب غبار نکل گیا۔ یہ وہی دل خراش واقعہ ہے جس نے ملالہ کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ اس واقعے کے سبب ہی آج پوری دنیا ملالہ کو سلام کرتی ہے، دل میں بیٹھاتی ہے لیکن دوسری جانب ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ملالہ کیس تھانہ سیدو شریف میں درج کیا گیا تھا۔ لیکن، پراسیکیوشن نے نامکمل تفتیش کی بنا پر کیس واپس کردیا تھا۔ اس کے بعد اس کیس کی حتمی رپورٹ کبھی سامنے نہیں آئی۔ اس کیس کا فیصلہ کب ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں کون جانے۔۔ لیکن، ملالہ نے

اپنے مجرم کو معاف کر دیا ہے۔ ایک انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اس لڑکے سے بدلہ لیں گی جس پر اس نے حملہ کیا تھا تو ملالہ کا جواب تھا۔۔ ''نہیں!!! وہ اس لڑکے کو سوئی کے برابر بھی نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتیں کیونکہ وہ امن اور معاف کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ بارہ اکتوبر کا دن ملالہ کی زندگی کا بدترین دن تھا تو گیارہ اکتوبر 2013ء کا دن ان کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کے لئے یادگار ثابت ہوگا۔ انہیں نوبل انعام نہیں ملا اس کے باوجود دنیا بھر میں انہوں نے اپنے چاہنے والے جس بڑی تعداد میں پیدا کئے ہیں۔۔ جتنے زیادہ دل جیتے ہیں۔۔ ان کی تعداد صرف ایک نوبل کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ ملالہ کا کہنا ہے، 'نوبل انعام کے لئے نامزد ہونا ہی ان کے لئے بڑا اعزاز تھا۔ اصل اہمیت اس چیز کی ہے کہ دنیا بھر سے لوگ انہیں سپورٹ کر رہے ہیں۔ امریکا، برطانیہ، پاکستان اور بھارت نے ان کو سپورٹ کیا۔۔۔ 'لگتا یوں ہے کہ مجھے پوری دنیا کے لوگوں نے نامزد کیا تھا۔

ملالہ کو ملنے والے عالمی اعزازات اور ایوارڈز کی فہرست میں

یورپی یونین کی جانب سے ملنے والا انسانی حقوق کا سخاروف ایوارڈ

ستارہ شجاعت

بچوں کا بین الاقوامی امن کا انعام

'ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جانب سے 'ضمیر کی سفیر

اردن کی ملکہ رانیا کی جانب سے ملنے والا گلوبل سٹیزن ایوارڈ

ہارورڈ یونیورسٹی کی جانب سے ہومینیٹیرین ایوارڈ

اقوام متحدہ کی جانب سے 'ملالہ ڈے' کا انعقاد

ملالہ کو اپنی 16ویں سالگرہ پر اقوام متحدہ میں خطاب کا موقع

ٹائم میگزین نے ملالہ کو 2012 کی موثر ترین شخصیات میں شامل کیا

ملالہ کی یادداشتوں پر مبنی کتاب 'آئی ایم ملالہ' کی اشاعت، سب ملالہ کی کامیابی کی داستان ہیں۔ گیارہ اکتوبر کو لندن میں صبح ہوتے ہی پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما بلاول بھٹو زرداری نے ملالہ کو اپنی دعائیں بھیجیں۔ اور جیسے ہی یہ واضح ہوا کے امن انعام کسی اور کا ہوا تو بلاول نے ٹوئٹر پر 'وزیراعظم ملالہ یوسفزئی' کا نعرہ لگایا۔ تھوڑی دیر میں ان کی بہنیں آصفہ اور بختاور بھی اس نعرے میں شامل ہوئیں جس کا ملالہ کی جانب سے جواب آیا کہ 'انشااللہ اپنی رول ماڈل بینظیر بھٹو شہید کے نقش قدم پر'۔ اس دوران ہزارہا لوگوں نے کہا کہ انعام ملے نا ملے، ملالہ کروڑوں دلوں کی ملکہ ہیں۔ اس سال نوبیل امن انعام کے لیے ریکارڈ 259 افراد کو نامزد کیا گیا تھا جن کے ناموں کو صیغہ راز میں رکھا گیا ہے لیکن سٹے بازوں کے نزدیک بھی ملالہ کو انعام ملنے کا امکان سب سے زیادہ تھا۔ اس سال نوبیل انعام کی رقم 1.25 ملین امریکی ڈالر ہے۔ کراچی میں سول ہسپتال کے قریب واقع ملالہ یوسف زئی سیکنڈری سکول کا نام گذشتہ سال ملالہ یوسف زئی سے منسوب کیا گیا تھا۔ یہاں وہ خود آئی

تھیں اور یہاں اس سلسلے میں ایک تقریب بھی منعقد کی گئی تھی۔دو شفٹوں میں چلنے والے اس سکول کی ہیڈ مسٹریس کے دفتر کے ایک کونے میں ملالہ کی اس وقت کے صوبائی وزیر تعلیم پیر مظہر الحق کے ساتھ تصویر، بی بی سی میں گل مکئی کے نام سے لکھی گئی ڈائری اور بچوں کے حقوق کے حوالے سے انہیں ملنے والے اعزازات کی تفصیلات چھوٹے چھوٹے کارڈز پر تحریر تھیں۔اس سکول کی طالبات کے لیے ملالہ ایسی شہزادی نہیں جو مشکل سے نکلنے کے لیے بہادر شہزادے کی منتظر ہوتی ہے، لیکن وہ ماڈرن اینیمیٹڈ سیریز کی ایسی کردار ہے جو تمام شیطانی قوتوں کے ساتھ خود لڑتی ہے۔نوبیل انعام کا معاملہ تو سال بھر کے لیے ٹل گیا لیکن پاکستان میں یہ بحث ابھی جاری رہے گی کیونکہ ایسے لوگ بھی ہیں جو ملالہ کو پیش آنے والے واقعات کو محض سازش سمجھتے ہیں۔ملالہ یوسف زئی کو قومی و بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں قوم کی بہادر بیٹی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔اسکولوں، کالجوں اور گھروں میں اس کی نوبل انعام میں کامیابی کے لئے دعائیں مانگی جارہی ہیں۔سوشل میڈیا بھی اس سلسلے میں کسی سے پیچھے نہیں۔بہت سوں نے ملالہ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے فیس بک پر اپنی پروفائل پکچر کی جگہ ملالہ کی تصویر ڈسپلے کر رکھی ہے۔شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔ادیبوں نے مذمتی قرار دادیں اپنے اسٹیٹس پر آویزاں کر رکھی ہیں۔بہت سوں کا خیال ہے کہ ملالہ کو باقاعدہ ''قوم کی بیٹی'' کے خطاب سے نوازا جائے۔اسے امن کا نوبل انعام دیے جانے کے حامی بھی بہت ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی

ہیں جو ملالہ پر حملے کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ملالہ کی ''گل مکئی ڈائری'' کا معمہ حل ہو گیا۔یہ ڈائری ایک غیر ملکی ادارے کا مقامی نامہ نگار لکھتا رہا ہے۔چوتھی جماعت میں پڑھنے والی ایک بچی اوباما کے بارے میں کتنا جان سکتی ہے کہ اسے اپنا آئیڈیل قرار دے۔ایک کالم نویس نے ''گل لالہ بمقابلہ ملالہ'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ ''ملالہ یوسف زئی پر حملے پر تلملانے اور آنسو بہانے والے ڈرامے بازو، کیا تمہیں وزیرستان میں ڈرون اور جیٹ حملوں میں شہید ہونے والی معصوم بچیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ایک صاحب نے ملالہ کی ڈائری سے یہ جملہ بھی نقل کیا ہے ''برقعہ پتھر کے دور کی نشانی ہے'' یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ اگر ملالہ پر یہی حملہ کراچی میں ہوا ہوتا تو کیا اسے اتنی زیادہ کوریج ملتی ؟عافیہ صدیقی بھی تو قوم کی بیٹی ہے۔اس پر ہونے والے امریکی مظالم پر خاموشی کیوں ؟ڈرون حملوں اور لال مسجد میں شہید ہونے والی معصوم بچیوں کا ماتم کون کرے گا؟ بہت سے لوگ اسے بھی مغرب کی سازش کہتے ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ملالہ یوسف زئی پر حملے کی آڑ میں کوئی اور کھیل کھیلا جا رہا ہو۔لیکن اس سب کے باوجود ملالہ نے پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔اور وہ ہمارے بہتر مستقبل کی نشانی ہے۔

کراچی کی تاریخی عمارات

کراچی کی شان و شوکت میں پتھروں سے بنی خوبصورت عمارتوں کا بڑا حصہ ہے ماضی کی شان و شوکت ہمیشہ دل کو لبھاتی ہے۔ شہروں کی عمارتیں اور کھنڈرات اس تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو اس دور کا طرہ امتیاز تھی۔ تہزیب جب زوال پذیر ہو تو تاریخ کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اسی لیے تاریخ میں ایسے شہروں کا ذکر ہے کہ جن کے کھنڈرات ان کے ماضی کی شان و شوکت بیان کرتے نظر آتے ہیں، اور ان کے ویرانوں میں ماضی کے سایہ حرکت کرنے اور ماحول کو پراسرار بناتے ہوئے، تخیلات کو کہیں سے کہیں پہنچاتے ہیں، لیکن تمام شہر اپنی تہذیبوں کیساتھ گمنامی میں نہیں چلے جاتے، کراچی کا شمار بھی ان تاریخی شہروں میں ہوتا ہے۔ جو اپنے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں اس کی عظمت رفتہ کی داستانیں ان تاریخی عمارتوں میں نظر آتی ہیں۔ جنہیں امتداد زمانے نے کھنڈروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ کراچی کا شمار دنیا کے چند سب سے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ اور ہوائی اڈہ بھی کراچی میں قائم ہے۔ کراچی 1947ء سے 1960ء تک پاکستان کا دارالحکومت بھی رہا۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ کراچی کی جگہ پر واقع قدیم ماہی گیروں کی بستیوں میں سے ایک

کا نام کولاچی جو گوٹھ تھا۔ انگریزوں نے انیسویں صدی میں اس شہر کی تعمیر و ترقی کی بنیادیں ڈالیں۔ 1959ء میں پاکستان کے دار الحکومت کی اسلام آباد منتقلی کے باوجود کراچی کی آبادی اور معیشت میں ترقی کی رفتار کم نہیں ہوئی۔ اکیسویں صدی میں تیز قومی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ کراچی کے حالات میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ قدیم یونانی کراچی کے موجودہ علاقہ سے مختلف ناموں سے واقف تھے: کروکولا، جہاں سکندر اعظم وادی سندھ میں اپنی مہم کے بعد، اپنی فوج کی واپس بابل روانگی کی تیاری کے لیے خیمہ زن ہوا؛ بندر مرونٹوبارا (ممکنً کراچی کی بندرگاہ سے نزدیک جزیرہ منوڑہ جہاں سے سکندر کا سپہ سالار نییرچس واپس اپنے وطن روانہ ہوا؛ اور بار،بریکون، جو کہ ہندوستانی یونانیوں کی باختری مملکت کی بندرگاہ تھی۔ اس کے علاوہ، عرب اس علاقہ کو بندرگاہِ دیبل کے نام سے جانتے تھے، جہاں سے محمد بن قاسم نے 712ء میں اپنی فتوحات کا آغاز کیا۔ برطانوی تاریخ دان ایلیٹ کے مطابق موجودہ کراچی کے چند علاقے اور جزیرہ منوڑہ، دیبل میں شامل تھے۔

1772ء میں گاؤں کولاچی جو گوٹھ کو مسقط اور بحرین کے ساتھ تجارت کرنے کی بندرگاہ منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ سے یہ گاؤں تجارتی مرکز میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے شہر کی حفاظت کے لیے شہر کی گرد فصیل بنائی گئی اور مسقط سے توپیں درآمد کرکے شہر کی فصیل پر نصب کی گئیں۔ فصیل میں دو

دروازے تھے۔ ایک دروازے کا رخ سمندر کی طرف تھا اور اس لیے اس کو کھارادر سندھی میں کھارودر) کہا جاتا اور دوسرے دروازے کا رخ لیاری ندی کی طرف تھا) اور اس لیے اس کو میٹھادر (سندھی میں مٹھودر) کہا جاتا تھا۔ 1795ء تک کراچی خان قلات کی مملکت کا حصہ تھا۔ اس سال سندھ کے حکمرانوں اور خان قلات کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور کراچی پر سندھ کی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔ کراچی کی ترقی نے جہاں ایک طرف کئی لوگوں کو اس شہر کی طرف کھینچا وہاں انگریزوں کی نگاہیں بھی اس شہر کی طرف کھینچ لیں۔

1876ء میں کراچی میں بانی پاکستان محمد علی جناح کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت تک کراچی ایک ترقی یافتہ شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کا انحصار شہر کے ریلوے اسٹیشن اور بندرگاہ پر تھا۔ اس دور کی اکثر عمارتوں کا فن تعمیر کلاسیکی برطانوی نوآبادیاتی تھا، جو کہ برصغیر کے اکثر شہروں سے مختلف ہے۔ ان میں سے اکثر عمارتیں اب بھی موجود ہیں اور سیاحت کا مرکز بنتی ہیں۔

کراچی آہستہ آہستہ ایک بڑی بندرگاہ کے گرد ایک تجارتی مرکز بنتا گیا۔ 1880 کی دہائی میں ریل کی پٹڑی کے ذریعے کراچی کو باقی ہندوستان سے جوڑا گیا۔ 1881 میں کراچی کی آبادی 73،500 تک، 1891 میں 105،199 اور 1901 میں 115،407 تک بڑھ گئی۔ 1899 میں کراچی مشرقی دنیا کا سب سے بڑا گندم کی درآمد کا مرکز

تھا۔ جب 1911 میں برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت دہلی بنا تو کراچی سے گزرنے والے مسافروں کی تعداد بڑھ گئی۔ 1936 میں جب سندھ کو صوبہ کی حیثیت دی گئی تو کراچی کو اس کا دارالحکومت منتخب کیا گیا۔

1947 میں کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت منتخب کیا گیا۔ اس وقت شہر کی آبادی صرف چار لاکھ تھی۔ اپنی نئی حیثیت کی وجہ سے شہر کی آبادی میں کافی تیزی سے اضافہ ہوا اور شہر خطے کا ایک مرکز بن گیا۔ پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے راولپنڈی اور پھر اسلام آباد منتقل تو ہوا لیکن کراچی اب بھی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور صنعتی و تجارتی مرکز ہے۔ ابھی کراچی میں ترقیاتی کام بہت تیزی سے جاری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کراچی ایک عالمی مرکز کی شکل میں ابھر رہا ہے۔

کراچی کی شان وشوکت میں صدر، کنٹونمنٹ، کلفٹن ، بندر روڈ پر پتھروں سے بنی خوبصورت عمارتوں کا بڑا حصہ ہے۔ اس شہر کی تاریخی شان و شوکت کی گواہی دیتی یہ عمارتیں آج زبوں حالی اور یاس کی تصویر دکھائی دیتی ہیں۔ ، ستائیس دسمبر 2009 کو ہونے والے بم دھماکے کے بعد بندر روڈ کی اکثر تاریخی عمارتوں کو جلا دیا گیا۔ شہر میں بہت سی عمارتیں منہدم ہو کر نئے پلازے اور شاپنگ سنٹر میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

تاریخی آثار مٹ رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کی تاریخی

عمارت سے لے کر ٹاور تک کی سڑک جو کبھی بندر روڈ کہلاتی تھی (جسے بعد میں پاکستان کے بانی محمد علی جناح کے نام سے منسوب کیا گیا) پر ایسی کئ عمارتیں تھیں جنہیں وقت کی دیمک تو کھوکھلا نہیں کر سکی لیکن یہ تخریب کاری، پیشے کی ہوس، اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے تباہ برباد ہو رہی ہیں۔ مشہور گانا بندر روڈ سے کیماڑی میری چلی رہے گھوڑا گاڑی میں ان عمارتوں کا خوبصورت انداز میں تعارف کرایا گیا تھا۔ کبھی اس مصروف ترین سڑک پر یہاں ٹرامیں چلتیں تھیں اور زندگی انتہائی پر سکون گزرتی تھی۔ لیکن بدلتے حالات نے کراچی کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ دھواں، دھول، کچرے کے ڈھیر اور ٹریفک کے اژدھام میں شہر کا پرانا حصہ گھٹن کا شکار ہے۔

یاسمین لاری ماہرِ تعمیرات ہیں اور کراچی کی قدیم عمارتوں اور ان کے فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ قدیم عمارتوں اور ان کے فنِ تعمیر سے گہری دلچسپی رکھنے والی ماہرِ تعمیرات یاسمین لاری نے کراچی کے ثقافتی ورثہ کو بچانے کے لئے طویل جہد و جہد کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈیسنو ہال کے پورے بلاک میں بارہ عمارتیں ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل ہیں ان میں سے پانچ کو قومی ورثہ بھی قرار دیا جا چکا ہے۔ان کے مطابق انگریز اس علاقے کو نیٹیو ٹاؤن یا بلیک ٹاؤن کہتے تھے، اٹھارہ سو تینتالس میں بندر روڈ بنایا گیا تو اس کے بعد قدیم شہر بڑھنا شروع ہوا اور اس علاقے کا نام مارکیٹ کوارٹر رکھا گیا۔ یاسمین لاری کا کہنا ہے کہ ’اس علاقے میں جو عمارتیں ہیں وہ شہر کی

سب

سے قدیم عمارتیں ہیں ان کی اپنی ایک شناخت ہے، اگر یہ انگریز دور حکومت کی بھی ہیں تو کیا ہوا تعمیر تو یہاں کے لوگوں نے کی ہیں'۔ حکومت سندھ نے 129/ تاریخی مقامات حکومت سندھ کے حوالے کیے ہیں جن کی دیکھ بھال کے لیے حکومت سندھ ایک بورڈ آف مینجمنٹ تشکیل دیا ہے۔

شائد یہی سوچ تھی کہ حکومت سندھ کے محکمہ ثقافت نے کراچی کی مزید 1061/ نجی اور سرکاری عمارتوں کو قومی ورثہ قرار دے دیا ہے۔ محکمہ ثقافت نے جو فہرست جاری کی ہے اس میں کراچی جیم خانہ، عائشہ باوانی اسکول، میٹروپول ہوٹل، پرل کانٹی نینٹل ہوٹل، بمبئ ہوٹل (کینٹ اسٹیشن)، پی آئی ڈی سی ہاؤس، کیپری سنیما، پرنس سنیما، نشاط سنیما، سیفی ہوٹل، نگار سنیما، الفا ریسٹورنٹ، لوٹیا بلڈنگ، جاگیردار ہوٹل، مینی والا اسکول، سیونتھ ڈے اسپتال، ہولی فیملی اسپتال، ایف ٹی سی ہال شارع فیصل، سندھ میڈیکل کالج، جناح اسپتال، ہاکی کلب، بلوچ آفیسرز میس، فوارہ چوک (گورنر ہاؤس)، تین تلوار (کلفٹن) اور دیگر اہم اور قیمتی عمارتیں شامل ہیں۔ سندھ حکومت کا کلچر ڈیپارٹمنٹ رولز آف بزنس مجریہ 1986 کے مطابق کلچر ڈیپارٹمنٹ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ ثقافتی ورثے کی عمارتوں کا تحفظ اور نگہداشت کرے جہاں تک ثقافتی ورثے کی عمارتوں کو فہرست میں رکھنے اور فہرست سے نکالنے کی بات ہے یہ سندھ ثقافتی ورثہ تحفظ) ایکٹ مجریہ 1994ء کی دفعہ 3 کے تحت ہے اور اس سلسلے میں حکومت)

سندھ میں ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جاچکی ہے۔ مشاورتی کمیٹی حمید ہارون، ڈاکٹر کلیم اللہ لاشاری (تاریخ دان) عارف حسین آرکیٹیکٹ اور مس انیلہ نعیم آرکیٹیکٹ پر مشتمل ہے۔ حکومت سندھ کے اعلامیے میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ نوٹیفکیشن کی اشاعت کے بعد ایک ماہ تک 1061 بلڈنگوں کے مالکان اور کسٹوڈین اور عام پبلک اپنے اعتراضات حتمی فیصلے سے پہلے کلچر ڈیپارٹمنٹ میں داخل کرا سکتے ہیں۔

کراچی میں بہت سی پرانی اور تاریخی عمارات خطرناک بھی ہو گئی ہیں۔ مدت سے ان کی کوئی دیکھ بھال نہیں ہے۔ تجاوزات نے بھی انھیں تباہی سے دوچار کیا ہے۔ کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کی ٹیکنکل کمیٹی برائے خطرناک عمارات نے سال 2008 ء میں ایک سروے رپورٹ جاری کی تھی۔ جس میں شہر کی مختلف قدیم اور مخدوش عمارتوں کو خطرناک قرار دیا تھا۔ کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی (کے بی سی اے) کی ٹیکنکل کمیٹی نے جن 157 عمارتوں کو خطرناک قرار دیا تھا۔ ان میں ''محفوظ ورثہ'' کی 22 عمارتیں بھی شامل ہیں۔

اس رپورٹ کے مطابق فہرست میں سب سے زیادہ خطرناک عمارتیں صدر ٹاؤن میں واقع ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق کراچی میں 182 پرائمری 69 سیکنڈری اور 30 ایلیمنٹری اسکولوں کی عمارتیں اپنی خستگی کے باعث حادثات کے خطرے سے دوچار

ہو سکتی ہیں۔ دنیا بھر میں ثقافتی ورثے کو محفوظ بنانے پر کافی توجہ دی جاتی ہے۔ بد قسمتی سے برصغیر پاک و ہند میں تباہی کا سب سے زیادہ نشانہ ثقافتی ورثے کو بنایا گیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی تاریخی ورثہ تباہی سے دوچار ہے، موہنجو ڈارو اب برباد ہو چکا ہے۔ اس کی دیکھ بھال پر کوئی توجہ نہیں ہے۔ کراچی میں بھی یہی صورتحال ہے، کراچی کے دلچسپ مقامات میں ، نئے اور پرانے سب لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ ان میں مزار قائد۔ بابائے قوم محمد علی جناح کی آخری آرام گاہ ، مسجد طوبٰی۔ واحد گنبد کی دنیا کی سب سے بڑی مسجد، آئی آئی چندریگر روڈ۔ پاکستان کی وال اسٹریٹ، آغا خان یونیورسٹی ہسپتال، ساحل کراچی ، ڈی ایچ اے مرینا کلب ، منوڑہ کا ساحل، کلفٹن اور جہانگیر کوٹھاری پیریڈ، سی ویو، کلفٹن، ڈی ایچ اے مرینا کلب، ہاکس بے، پیراڈائز پوائنٹ، سینڈز پٹ پوائنٹ، فرنچ بیچ، رشین بیچ، پورٹ فاؤنٹین۔ 600 فٹ بلند فوارہ، زمزمہ تجارتی مرکز۔ اپنے بوتیک اور کیفے کے لئے مشہور ہے۔

عبداللہ شاہ غازی کا مزار، عجائب گھر پاکستان ایئر فورس میوزیم، قومی عجائب گھر، میری ٹائم میوزیم، موہٹہ پیلس، کراچی و خطے کی تاریخ کا عجائب گھر، کراچی ایکسپو

سینٹر، برطانوی راج کے دور کی عمارات ایمپریس مارکیٹمیری ویدر ٹاور، فریئر ہال، خالقدینا ہال، جہانگیر کوٹھاری پیریڈ، گورنر ہاؤس، سینٹ پیٹرکس کیتھیڈرل، سابق وکٹوریا میوزیم (بعد ازاں عدالت عظمی کے زیر استعمال)، ہندو

جیم خانہ (اب نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس کے زیر استعمال ہے)،ایمپریس مارکیٹ، سندھ کلب، جزائر کلفٹن آئسٹر روکس، منوڑہ، بنڈل، بھٹ شاہ، باغات بن قاسم پارک (سابق کلفٹن پارک)، سفاری پارک (یونیورسٹی روڈ)،الہ دین پارک (راشد منہاس روڈ)، سند باد، کراچی چڑیا گھر (گاندھی گارڈن)، سی ویو پارک، عزیز بھٹی پارک، عسکری پارک پرانی سبزی منڈی پارک (یونیورسٹی روڈ)،ہل پارک، کشتزار فارم ہاؤسز) °ولیج گارڈن، میمن فارم ہاؤس،ڈریم ورلڈ ریزورٹ، ریس کورس،ایوان عکس، (سینیما) کیپری سینما،نشاط سینما،پرنس سینما،یونیورس سنیپلیکس (کلفٹن)، ہندو جمخانہ جیسے مقامات شامل ہیں۔ کراچی کے چند اہم تاریخی اور قومی ورثہ کے حامل مقامات میں چند یہ ہیں۔ ہائی کورٹ کی عمارت، سندھ اسمبلی بلڈنگ، ان میں سپریم کورٹ کراچی رجسٹری کی عمارت کو ثقافتی ورثے کا درجہ دیا جاچکا ہے۔ کراچی کا قدیم ہوٹل میٹروپول بھی ان ہی تاریخی عمارتوں میں شامل ہے۔ جسے اب قومی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ہوٹل اب ملبے کا ڈھیر ہے۔ ہوٹل کے ترجمان امتیاز مغل کا شکوہ بھی یہی ہے کہ جب ہوٹل ٹھیک تھا تو قومی ورثے میں نہیں لیا گیا اب توڑ پھوڑ کے بعد میدان بن گیا ہے تو اسے قومی ورثہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی ہوٹل کے سامنے لوٹیا بلڈنگ ہے۔ جو پرائیوٹ پراپرٹی ہے۔ اس سے چند قدم آگے سندھ کلب کی عمارت ہے۔ جہاں انگریز دور میں لکھا ہوتا تھا کہ یہاں کتوں اور کالے آدمیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ یہاں کراچی میں سب سے پہلے بجلی لائی گئی تھی۔ اس سے آگے فریئر ہال ہے۔

فریئر ہال

.برطانوی راج کے دوران کی طرز تعمیر کی ایک مثال ہے۔ یہ سر ہنری بارٹل ایڈورڈ فریئر کے اعزاز میں بنایا گیا تھا 1815-1884 میں سر بارٹل نے کراچی کی اقتصادی ترقی میں اہ کردار ادا کیا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر پر ایک لاکھ اسی ہزار روپے خرچ ہوئے۔ حکومت نے اس میں صرف دس ہزار روپے دئے۔ جبکہ باقی رقم کراچی میونسپلٹی نے خرچ کی۔.برطانوی دور میں یہ ٹاون ہال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔۔ اس عمارت کی بے حد شاندار بات یہ ہے کہ اسکی چھت کو مشہور مصور صادقین نے اپنی مصوری کے شاہکاروں سے سجایا ہے اور اسکی خوبصورتی کو صرف دیکھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ اتنی خوبصورت ہے کہ بہت دیر تک سر اٹھائے رکھنے پہ بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہاں ہر اتوار کو پرانی کتابوں کا میلہ بھی سجایا جاتا ہے۔

ہندو جمخانہ

ہندو جمخانہ مغل انداز تعمیر کی یہ خوبصورت عمارت آرٹس کونسل کے مقابل ہے۔ یہ کراچی کی پہلی پبلک عمارت تھی۔ ہندو جمخانہ کی عمارت انیس سو پچیس میں تعمیر ہوئی، جو مغل طرز تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل شہر کا ہندو امراء کا طبقہ اس میں سماجی سرگرمیاں منعقد کیا کرتا تھا، اس عمارت کی

تعمیر کے لئے سیٹھ رام گوپال نے رقم فراہم کی تھی۔ اس عمارت کا نقشہ ایک مسلمان آرکیٹیکچر آغا احمد حسن نے بنایا تھا۔ عمارت مخدوش ہونے کی وجہ سے 1984 میں اسے منہدم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آج کل یہاں نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس قائم ہے۔ یہ ادارہ گائیکی، اداکاری اور ڈانس کی تربیت فراہم کرتا ہے۔ سابق صدر پرویز مشرف کی ہدایت پر سن دو ہزار پانچ میں سندھ کے محکمہ سیاحت اور ثقافت آرٹس اکیڈمی شروع کرنے کے لیے کراچی کی تاریخی عمارت ہندو جمخانہ معروف اداکار اور صداکار ضیاء محی الدین کے حوالے کر دی تھی۔

اس دور میں اس عمارت میں تاریخی نوعیت کے سامان کو بے دردی سے حیدرآباد کے میوزیم میں منتقل کیا گیا۔ اس عمارت میں ضیا محی الدین نے 'ناپا' کی بنیاد رکھی۔ اکیڈمی کا افتتاح بھی سابق صدر مشرف نے کیا تھا۔

این ای ڈی یونیورسٹی

این ای ڈی یونیورسٹی کی پرانی عمارت ڈی جے کالج کے سامنے ہے۔ اس ادارے کا قیام انیس سو بائیس میں عمل میں آیا جب پرنس آف ویلز کے کراچی کے دورے کے موقع پر کراچی کے شہریوں نے عطیات جمع کرکے اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس وقت اس کا نام پرنس آف ویلز انجینئرنگ کالج تھا۔ یہ اس وقت صوبہ سندھ کا واحد

انجینئرنگ کالج تھا۔انیس سو چوبیس میں اس کا نام اس وقت کی معروف سماجی شخصیت نادر شاہ ادولجی ڈنشا کی پہلی برسی کے موقع پر ان کے خاندان کی جانب سے بہت خطیر رقم بطور امداد ملنے کے بعد اس کا نام نادر شاہ ادولجی ڈنشا انجینئرنگ کالج رکھ دیا گیا۔اس وقت اس کالج کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے تھا۔انیسو سینتالیس میں قیامِ پاکستان کے بعد اس کا انتظام سندھ حکومت نے سنبھال لیا اور اس کا الحاق سندھ یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔انیس سو اکاون میں جامعہ کراچی کے قیام کے بعد اس کا الحاق جامعہ کراچی سے کر دیا گیا جو انیس سو ستتر تک جاری رہا۔انیسو ستتر میں اسے باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔

عبداللہ شاہ غازی کا مزار

کراچی کے ساحل پر نیلے رنگ سے بنی ہوئی ایک خوبصورت ہے۔ یہ دراصل مشہور بزرگ حضرت عبداللہ شاہ غازی کا مزار ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ سن 720 ہجری میں مدینے سے براستہ کوفہ سندھ میں تشریف لائے اور یہاں کے رہنے والوں کو اسلام کی تبلیغ کی۔ کراچی میں یہ ایک قدیم مزار شمار ہوتا ہے۔

مزار قائدِ اعظم "۔

کراچی کے عین وسط میں سفید رنگ کے سنگ مرمر سے بنی ہوئی یہ عمارت پاکستان کے بانی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی آخری آرام گاہ ہے۔ یہ عمارت کو 1960 سے 1970 کے درمیان میں تعمیر کی گئی۔ اسکا ڈیزائن مشہور پاکستانی آرکیٹیکچر "یحییٰ مرچنٹ" نے بنایا تھا۔ یہ مقبرہ 75 فٹ چوڑے ایک چوکور چبوترے پر قائم ہے۔ اس مقبرے کی اُنچائی تقریباً 43 ہے۔ اس کے اردگرد ایک وسیع و عریض باغ ہے۔

سوامی نارائن مندر

کراچی میں مندروں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سندھ اور خاص طور سے کراچی میں صدیوں پرانی ہندوانہ طرز تعمیر رکھنے والی عمارات آج بھی موجود ہیں۔ سوامی نارائن مندر طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنے اندر سالوں پرانی روایات کا امین ہے۔ بندر روڈ اور فریئر روڈ کراچی کے درمیان واقع سوامی نارائن مندر شہر کا قدیم ثقافتی ورثہ ہے۔ سوامی نارائن مندر یا سری نرائن مندر کا سن تعمیر 1882ء بتایا جاتا ہے۔ اس کا طرز تعمیر آریہ اسٹائل کا ہے۔ اگرچہ رقبے کے لحاظ سے یہ کوئی بہت بڑا مندر نہیں تاہم اس کی تعمیر کے لئے پیلے رنگ کا جنگ شاہی اور چونے کا پتھر خصوصی طور پر کراچی لایا گیا تھا۔ مندر اس دور کے مخصوص طرز تعمیر کے مطابق گنبد اور شکارا پر مشتمل ہے۔
شکارا سے مراد مصری پیرامڈ نما چھت ہے جو نیچے سے اوپر جاتے ہوئے پتلی سے پتلی ہوتی چلی

جاتی ہے۔ پچھلے بیس سالوں کے دوران اس میں سو سے دو سو ناجائز تجاوزات قائم ہو گئی ہیں جن میں رہائشی مکانات سرفہرست ہیں۔

نشاط سینما

حکومت سندھ کے محکمہ ثقافت نے کراچی کی مزید جن 1061/ نجی اور سرکاری عمارتوں کو قومی ورثہ قرار دے دیا ہے۔ اس فہرست میں کیپری سینما، نشاط سینما اور پرنس سینما بھی شامل ہیں۔ سنیما انڈسٹری کے بُرے حالات تو ایک عرصے سے ہیں ۔ لیکن اس کا اثر کراچی پر یہ پڑا کہ آہستہ آہستہ یہاں کے تمام سینما جو تاریخی ورثہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ختم ہو گئے۔

بندر روڈ (اب ایم اے جناح روڈ) پر واقع نشاط سنیما کا کراچی کے سنیما گھروں میں ایک منفرد مقام ہے۔ ایک تو یہ 1948 سے قائم ہے اور اس لحاظ سے یہ کراچی اور پاکستان کا سب سے پرانا سنیما گھر تھا۔ دوسرے اس کا افتتاح قائدِاعظم کی بہن مادرِملّت محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔ نشاط میں پہلی فلم ' ڈولی' دکھائی گئی۔ اُس وقت یہ سنیما کراچی کے مشہور پارسی بزنس مین گوڈریج کانڈاوالا کی ملکیت تھا۔ 1988ء میں نشاط پاکستان کا پہلا سنیما گھر تھا جس نے سٹیریو ساؤنڈ کی ٹیکنالوجی اپنائی۔

مہتا پلیس

کلفٹن جاتے ہوئے ایک خوبصورت عمارت نظر آتی ہے۔ یہ مہتاپیلیس ہے۔ جو 1927 میں سیورتن چندرامہتہ نے اپنی گرمیاں گزارنے کے لئے بنوایا تھا۔ اس عمارت کو بھی اس زمانے کے مشہور معمار آغا احمد حسن نے ڈیزائین کیا تھا۔ اس کی تعمیر میں راجھستانی پتھر، اور جودھپور کا گلابی پتھر استعمال کیا گیا۔ مغل طرز تعمیر کی یہ عمارت اٹھارہ ہزار پانچ سو مربع گز پر تعمیر کی گئی۔ اس میں ایک میل لمبی ایک سرنگ بھی ہے جو مندر تک جاتی ہے۔ اس عمارت پر بھوتوں کے راج کے قصے بھی مشہور ہیں۔ تقسیم کے بعد حکومت پاکستان نے اس عمارت کو منسٹری آف فارن افیئرز کے لئے خرید لیا۔ میں محترمہ فاطمہ جناح یہاں منتقل ہو گئی اور انھوں نے یہاں سے ایوب خان 1964 کے مقابلے میں تاریخی صدارتی الیکشن لڑا۔ 1960 میں اس کا نام قصر فاطمہ جناح رکھ دیا گیا۔ محترمہ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد ان کی بہن شیریں جناح یہاں رہنے لگیں۔ ان کے انتقال کے بعد اس عمارت کو سیل کر دیا گیا۔ 1995 میں حکومت سندھ نے اس عمارت کو خرید لیا اور میوزیم بنا دیا۔ 1999 یہ عمارت میوزیم کا درجہ رکھتی ہے۔ مہتا پیلس میوزیم'' کی تزئین و آرائش اور نئی گیلریز کی تعمیر کیلیے وفاقی حکومت فنڈز'' فراہم کر رہی ہے۔ مالی سال 2009-10 کے دوران وفاقی حکومت نے ڈھائی کروڑ روپے جبکہ سندھ حکومت نے ڈیڑھ کروڑ روپے فراہم کئے۔

خالق دینا ہال

کراچی کی تاریخی عمارتوں میں اس کا شمار ہے۔ اس کا پورا نام غلام حسین خالق دینا ہال ہے۔ ای عمارت لائیبریری کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ 1921 انگریزوں نے خلافت مومنٹ میں حصہ لینے پر مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا شوکت علی پر غداری کا مقدمہ اسی عمارت میں چلایا تھا۔ اور اسے ایک عدالت کی حیثیت دے دی تھی۔ یہ عمارت بندر روڈ پر واقع ہے۔

وزیر مینشن

قائد اعظم کی جائے پیدائش کی حیثیت سے تاریخی اہمیت رکھنے والی یہ عمارت کھارادر میں واقع ہے۔ یہاں قائد اعظم کے والد جناح پونجا 1874 سے 1900 تک کرائے پر رہے تھے۔ دومنزلہ اس عمارت کو میوزیم کا درجہ دیا گیا ہے۔ قومی ورثہ کی یہ عمارت خستہ حالی کا شکار ہے۔ 2008 میں اس کی آرائش اور تزئین کی گئی تھی۔

ہولی ٹرینٹی چرچ

اس چرچ کا ایک نام گیرژن چرچ بھی ہے۔ یہ 1852-1855 میں تعمیر کیا گیا۔ کیپٹن جان ہل نے اس کا ڈیزائن بنایا

ویلس برج

کراچی کا سب سے قدیم برج ہے۔ جو کینٹ اسٹیشن کے ساتھ ہے۔ اس برج کو اس وقت تعمیر کیا گیا تھا۔ جب کراچی میں ریل کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اس برج کے ساتھ سٹی اسٹیشن کا بھی پرانا نام میکلوڈ اسٹیشن تھا۔ جو جان میکلوڈ ڈپٹی کلکٹر کسٹم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس سڑک کا نام بھی میکلوڈ روڈ ہے۔ جسے اب آئی آئی چندریگر روڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ویلس برج 1850 میں قائم ہوا تھا۔ یہاں پنجاب سے گندم لایا جاتا تھا۔ اور پھر ہندوستان لیجایا جاتا تھا۔

ڈینسو ہال

شہر کے قدیم علاقے میں بندر روڈ پر قائم ڈینسو ہال اب ایک بس اسٹاپ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ تالپور دور میں کراچی ایک چھوٹا سا ساحلی شہر تھا۔ جسے انگریزوں نے وسعت دی اور ایک بڑی بندگاہ بنائی۔ انگریز نے میونسپلٹی کی بناد رکھی تو شہر میں لائیبریریاں قائم کی جہاں صرف انگریز اور ان کے خاندان کے افراد کو داخلے کے حقوق تھے۔ ڈینسو ہال 1886 میں تعمیر کیا گیا، اور یہاں کراچی کے شہریوں کے لئے پہلی لائیبری قائم کی گئی 2010 میں اس عمارت کو ثقافتی ورثہ قرار دیا گیا۔

فری میسن لاج

کراچی پریس کلب سے آتے ہوئے پی آئی اے کے دفتر کے سامنے اور وائی ایم سی اے سے متصل یہ عمارت.برطانوی راج میں 1914 میں تعمیر کی گئی۔ یہ عمارت فری میسن ٹرسٹ نے بنائی تھی اور یہاں فری میسن سوسائٹی کے اجلاس ہوتے تھے۔ عام لوگ جو اس زمانے میں انگریزی سے ناواقف تھے۔ وہ اس عمارت کو جادو گھر کہتے تھے۔1972 میں بھٹو دور میں فری میسن تحریک پر پابندی لگا دی گئی۔ 1990 میں اس عمارت کو سندھ وائلڈ لائف کو دے دی گئی۔ 2001 میں اسے ثقافتی ورثہ قرار دیا گیا۔ اس عمارت کو بھی میوزیم بنانے کا منصوبہ ہے۔.برصغیر کی ممتاز ادیب و ناول نگار قرۃ العین حیدر بھی اس عمارت بہت دنوں تک اپنا دفتر بنائے رہی ہیں۔

چین نے امریکہ کے راستے بند کر دیئے

بھارت ،ترکی، اور دیگر مملکت سے دفاعی ہتھیاروں کی خریداری کے معاہدوں نے امریکی حکام کی نیندیں اڑا دی ہیں

چینی نے امریکہ کے راستے بند کر دیئے۔ بھارت ،ترکی، اور دیگر مملکت سے دفاعی ہتھیاروں کی خریداری کے معاہدوں نے امریکی حکام کی نیندیں اڑا دی ہیں۔ اب یہ سوال امریکہ کے سامنے ہے کہ چین کے اقتصادی انقلاب کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ یہ امر عالمی پالیسی سازوں کے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں ہے۔ چین میں اس انقلاب کے پہلے مرحلے یعنی صنعتی ترقی نے عالمی معیشتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چین میں اقتصادی ترقی کے پہلے مرحلے میں اس ملک نے اپنی صنعتی ترقی کی بدولت دنیا بھر میں اپنی برآمدات کو یقینی بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ چین نے متعدد ممالک میں ہر قسم کے صارف کے لیے مختلف قیمتوں کی مصنوعات کو متعارف کرایا۔ جس نے چین کی اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ عالمی سطح پر اقتصادی ترقی کے اس مقابلے میں اس دوران چین نے کئی اہم ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا۔ چینی اقتصادی ترقی کا دوسرا مرحلہ اور بھی تابناک خیال کیا جا رہا ہے۔ ناقدین کے بقول چین میں مستقبل

میں خدمات مہیا کرنے پر زیادہ زور دیا جائے گا جب کہ صنعت میں سکڑاؤ پیدا ہو گا۔ اس حوالے سے وہاں سستی لیبر ایک نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے۔ ایک اور میدان ہتھیاروں کی فروخت کے حوالے سے ہے۔ جس میں چین امریکہ کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ امریکہ کے نا چاہنے کے باوجود اس وقت چین پاکستان کو ہتھیار فراہم کرنے والا اولین ملک ہے اور لگتا یوں ہے کہ وہ اپنی اس پوزیشن سے ہٹنے والا نہیں ہے۔ چین اور پاکستان کے مابین کئی نئے سمجھوتے کئے گئے ہیں۔ امریکی وال سٹریٹ جرنل نے پاکستانی فضائیہ کے ذرائع کے حوالے سے لکھا ہے کہ دونوں ممالک نے پاکستان کو سٹینتھ ٹکنالوجی کی بنیاد پر تیار کردہ پچاس چینی جنگی طیاروں جے ایف 17 کی فراہمی کا سمجھوتہ کیا ہے۔ ایک پائلٹ کے لیے نشست والے ایسے طیاروں کی ایک کھیپ پاکستان کو اس سے پہلے مہیا کی جا چکی تھی۔ ایسے ایک طیارے کی قیمت ڈیڑھ کروڑ ڈالر ہے، پاکستانی فضائیہ کا ارادہ ہے کہ آئندہ چند سال کے دوران ڈھائی سو جے ایف 17 طیارے خریدے جائیں۔ پاکستان اور چین نے 1999 میں ایسے طیاروں کی پیداوار میں تعاون کا سمجھوتہ کیا تھا جس کے باعث مغربی ممالک سے پرزوں کی فراہمی پر پاکستان کا انحصار کم ہو چکا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ چینی فوجی مشینوں کو بہتر بنایا جا رہا ہے، چینی ساخت کے کئی قسم کے ہتھیار مغربی ھتیاروں سے بہتر ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چین ہتھیاروں کی فراہمی کو سیاسی یا کسی طرح کی دوسری شرائط سے منسلک نہیں کرتا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھ ہے کہ چین مشرق وسطٰی میں امریکہ کے

اثر و رسوخ کو کم کرنا چاہتا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے چین نے بیان دیا ہے کہ ایشیا میں امریکہ کی فوجی موجودگی میں اضافہ قطعی نامناسب ہے۔ چین بلاشبہ خلیج فارس اور اس پورے خطے میں امریکہ کے اثر و رسوخ کو روکنے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ چین نے رسمی طور پر اس خطے کو اپنے لیے خاص اہمیت رکھنے والا خطہ قرار نہیں دیا لیکن چینی حکام کے ہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ بیجنگ امریکہ کو ایشیا میں اپنا اثر بڑھانے سے روکنے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ توقع ہے کہ اس سال اور اگلے سال چین امریکہ تعلقات میں تناؤ بڑھتا رہے گا۔ چین امریکہ کو ایشیا سے ہٹانے، افریقہ میں امریکہ کے اثر و رسوخ کو کم کرنے اور خلیج فارس میں امریکہ کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی کوششیں جاری رکھے گا۔ دنیا بھر میں ہتھیاروں کی منتقلی کے حوالے سے اعداد و شمار اکھٹا کرنے والے سویڈن کے ادارے اسٹاک ہوم انٹر نیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے کچھ عرصہ قبل دنیا میں ہتھیاروں کی درآمد و برآمد کے حوالے سے ایک رپورٹ مرتب کی تھی۔ جس کے مطابق سال دوہزار نو کے دوران امریکا نے سب سے زیادہ ہتھیار فروخت کئے۔ مالی بحران نے امریکا کے بڑے بڑے بینکوں کو دیوالیہ کردیا تھا مگر اس کے باوجود امریکا ہتھیاروں کی برآمد میں سر فہرست رہا۔ امریکا دنیا کے ستر ممالک کو ہتھیار برآمد کرتا ہے۔ان ممالک میں جنوبی کوریا، متحدہ عرب امارات اور اسرائیل شامل ہیں۔ روس دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے جو امریکا کے بعد سب سے زیادہ اسلحہ فروخت کرتا ہے۔ان دونوں ممالک کی مجموعی برآمدات

ترپن فیصد بنتی ہیں۔اس میں تیس فیصد امریکا اور 23 فیصد حصہ روس کا بنتا ہے۔جرمن کا نمبر تیسرا اور فرانس کا نمبر چوتھا ہے۔ گزشتہ پانچ سالوں کے دوران جرمنی نے ہتھیاروں کی برآمدات دوگنا کرلی ہیں۔ یہی حال فرانس کا ہے۔فرانسیسی ہتھیاروں کی بیرون ملک برآمدات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔لیکن اب چین نے امریکہ کو مات کردیا ہے۔ حال ہی میں چینی وزیراعظم نے دورہ بھارت کے دوران تنازعات کے باوجود 8 معاہدوں پر دستخط کئے۔ چینی وزیراعظم نے کہا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان کھلے دل سے تمام معاملات پر بات چیت کی گئ ہے۔دنیا کا سب سے بڑا اسلحہ درآمد کنندہ ہونے کی وجہ سے بھارت ہتھیاروں کو جدید بنانے میں سالانہ 30ارب ڈالر خرچ کررہا ہے۔بھارت 70فی صد انحصار درآمد شدہ دفاعی سازوسامان پر کرتا ہے۔
امریکا،برطانیہ،فرانس اور اسرائیل سے بھی دفاعی سازوسامان لے رہا ہے۔ لیکن اب اس کی توجہ چین پر ہے۔ توقع ہے کہ 2020تک بھارت سالانہ 65.4ارب ڈالرکے دفاعی اخراجات کرے گا۔ ادھر چین ترکی کو بھی دفاعی ساز وسامان دے رہا ہے۔ترکی کے ایک سینئیر عہدیدار نے کہا کہ ان کا ملک آئندہ چھ ماہ میں ایک چینی کمپنی کے ساتھ میزائل کے دفاعی نظام کی مشترکہ تیاری سے متعلق معاہدے کو حتمی شکل دے سکتا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ مستقبل میں کئی عشروں تک چین عالمی اقتصادیات کا ایک اہم ملک رہے گا۔ اس تناظر میں چائنیز اکیڈمی آف انٹرنیشنل ٹریڈ اینڈ اکنامک کارپوریشن سے وابستہ ماہر اقتصادیات لی جیان کہتے ہیں کہ یہ امر اہم ہے کہ یہ کیمونسٹ

ملک مستقبل میں صرف اہم خام مال کی پراسیسنگ اور ان کو دوبارہ برآمد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرے گا۔ چین میں کامرس کی وزارت کیاس تھنک ٹینک سے منسلک جیان نے مزید کہا کہ چین نے یہ احساس کر لیا ہے کہ وہ اندھا دھند صرف سرمایا کاری یا برآمدات کی بدولت اپنی اقتصادی حیثیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا ہے، اس لیے چین کی اقتصادی ترقی میں اب طلب و رسد میں مزید توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چینی صدر شی جن پنگ نے کہا ہے کہ بیجنگ حکومت نے یہ باور کرانے کے لیے کہ وہ پائیدار ترقی کے لیے سنجیدہ ہے، رواں برس کی پہلی ششماہی میں اپنی اقتصادی نمو کو دانستہ طور پر کم رکھا ہے تاکہ طویل المدتی اسٹریکچرل ترجیحات کی وجہ سے کسی قسم کے منفی پیغام سے بچا جا سکے۔ واشنگٹن میں قائم ورلڈ بینک سے منسلک ماہر اقتصادیات فلیپ شیلکنز کے بقول بیجنگ حکومت کی طرف سے نئ اقتصادی اصلاحات عالمی سطح پر اہمیت کی حامل ہوں گی۔ وہ کہتے ہیں کہ جیسے جیسے چین میں تبدیلیاں پیدا ہوں گی، ویسے ویسے دنیا پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔ بیجنگ میں واقع 'ہونگیان سکیوریٹیز' سے وابستہ تجزیہ کار 'ہی ٹریفنگ' کہتے ہیں کہ چین میں ایسی اقتصادی تبدیلی دو دھاری تلوار سے کم نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چینی اقتصادیات میں بہتری کی اس کوشش سے بالخصوص امریکا اور یورپی ممالک کو عالمی سطح پر سخت مقابلے کا سامنا ہو سکتا ہے۔ چین اس وقت امریکا کے بعد دوسری سب سے بڑی اقتصادی طاقت ہے جب کہ تیسرے اور چوتھے نمبر پر بالترتیب جاپان اور جرمنی ہیں۔ دنیا

کے بیشتر ممالک امریکا کو دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ چین بننے جارہا ہے دنیا کی معاشی سپرپاور، یہ بات سامنے آئی ہے 39 ،ممالک میں ہوئے ایک تازہ سروے کے نتائج میں

یہ سروے 'پیو ریسرچ سینٹر' نے منعقد کروایا۔ اس سروے کے دوران 'پیو ریسرچ سینٹر' نے39 ممالک میں 37653 افراد کو انٹرویو کیا۔ اس دوران یہ بات سامنےآئی کہ عالمی کساد بازاری نے امریکی معیشت کو بری طرح متاثر کیا ہے جبکہ چین نے اس دوران انتہائی تیز رفتار ترقی کی ہے۔ جائزے کے نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ چین ایک بڑی معیشت کے طور پر اب دنیا کی قیادت کرے گا۔اس سروے میں شامل 39 میں 22 اقوام آج بھی یہ سمجھتی ہیں کہ امریکا اس دنیا کی سب سے طاقتور معیشت ہے۔ آٹھ ممالک کے نزدیک چین دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہے اور ان آٹھ میں امریکا کے بڑے اتحادی کینیڈا، برطانیہ، جرمنی اور فرانس بھی شامل ہیں۔ امریکا کے خلاف سب سے زیادہ نفرت مصر میں دیکھنے میں آئی۔ غالبا پاکستان کے بعد کسی دوست ملک میں اسقدر امریکہ کے خلاف نفرت پیدا ہوئی ہے تو وہ مصر ہے۔ امریکی کے لیے سب زیادہ نفرت مشرق وسطی کی اکثر ریاستوں میں دیکھے گئے۔ وہاں سات میں سے پانچ ممالک میں امریکا مخالف جذبات دیکھنے میں آئے۔ ان میں مصر 81 فیصد کے ساتھ پہلے اور ترکی 70 فیصد کے ساتھ دوسرے نمبر پر تھا۔امریکی امداد وصول کرنے والے بڑے ممالک مصر اور پاکستان میں لوگوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ اس امداد کے ان کے ملک پر منفی اثرات ہو رہے ہیں۔ سروے

کا سب سے دلچسپ اور حیران کن پہلو یہ ہے کہ امریکی خود بھی اس حوالے سے تقسیم کا شکار نظر آتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں کہ چین دنیا کی سب سے بڑی عالمی طاقت ہے یا امریکا عالمی معاشی لیڈر ہے۔ 44 فیصد امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ چین نمبر ایک عالمی طاقت ہے جبکہ 39 فیصد امریکا کو آگے دیکھتے ہیں۔

خبر رساں ادارے اے پی کے مطابق حالیہ سروے کے مطابق سن 2008ء میں جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ چین دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اب ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوچکا ہے۔ اسپین، جرمنی اور برطانیہ میں یہ تعداد دگنی، روس میں تین گنا اور فرانس میں اس تعداد کو 22 پوائنٹس دیے گئے ہیں۔ Pew Research Center's Global Attitudes Project کی جانب سے یہ سروے پہلی بار سن 2008ء میں اور اب دوسری بار سن 2013ء میں منعقد کروایا گیا ہے۔ اس بار کے نتائج میں جو واضح تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اکثریت اب یہ مانتی ہے چین دنیا کی سب سے بڑی عالمی طاقت ہے۔ یہ سروے امریکی نیشنل سکیورٹی ایجنسی کی جانب سے پرزم جاسوسی پروگرام کے انکشاف سے قبل منعقد کروایا گیا تھا۔ اس سروے میں اکثریت کا ماننا تھا کہ امریکا شخصی آزادیوں کے حوالے سے دنیا بھر میں سب سے آگے ہے۔ 39 ممالک میں سے صرف تین میں لوگوں نے دہشت گردوں کے خلاف امریکی ڈرون حملوں کی حمایت کی، ان اسرائیل 64 فیصد، امریکا 61 فیصد اور کینیا میں 56 فیصد۔ چین کی تیز رفتار ترقی سے حکومت بھی پریشان ہے، اور کئی

سخت اقدام اٹھا رہی ہے۔
دنیا میں اسلحے کی تجارت میں آئینی بنیاد کی تشکیل کے لئے اقوام متحدہ اور سول سوسائٹی تنظیموں کے درمیان جاری اسلحے کی تجارت کے سمجھوتوں سے متعلق مذاکرات نیو یارک میں جاری ہیں۔مذاکرات کا ہدف اقوام متحدہ اور سول سوسائٹی تنظیموں کے درمیان اسلحے کی تجارت میں حد بندی کے لئے معاہدوں کا طے پانا ہے اقوام متحدہ اسلحے کی تجارت کو متعینہ اصولوں کا تابع کرنے کے لئے ایک ایسی اہم دستاویز تشکیل دینے کی توقع کر رہی ہے۔ جو آج تک حاصل نہیں کی جا سکی۔واشنگٹن کا مطالبہ ہے کہ دھماکہ خیز مادوں کو اس تجارتی معاہدے سے باہر رکھا جائے جبکہ چین ہلکے اسلحے کو معاہدے سے باہر رکھنے کا خواہش مند ہے تاہم ترکی سمیت یورپی ممالک اسلحے کی تجارت کو زیادہ شفاف شکل میں لانے کے لئے کوششیں کر رہے ہیں۔اقوام متحدہ کے ذرائع کے مطابق عالمی اسلحے کی تجارت کا بڑا حصہ امریکہ کے ہاتھ میں ہے اس کے علاوہ برطانیہ، چین، فرانس، جرمنی اور روس بھی اسلحے کے اہم تاجروں میں شمار ہوتیہیں۔واضح رہے کہ دنیا میں ہر سال اسلحے کی خرید کے لئے ستر بلین ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں ایک سوئیڈش تھنک ٹینک کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ چین دنیا میں اسلحہ برآمد کرنے والا پانچواں بڑا ملک بن گیا ہے۔سٹاک ہوم انٹر نیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق 1950ء کے بعد سے پہلی بار برطانیہ پانچویں مقام سے چھٹے نمبر پر آگیا

ہے اور چین نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ایس آئی پی آر آئی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ پانچ برس (2008-2012) میں اس سے پہلے کے پانچ برس کے مقابلے میں چین کے اسلحہ کی برآمدات میں 162 فیصد اضافہ ہوا ہے۔خبر رساں ادارے اے پی اور اے ایف پی کے مطابق ایس آئی پی آر آئی نے کہا ہے کہ اسلحے کی عالمی برآمدات میں چین کا حصہ دو فیصد سے بڑھ کر پانچ فیصد تک پہنچ گیا ہے۔واضح رہے کہ چینی ہتھیاروں کا سب سے بڑا خریدار پاکستان ہے جو اپنے پچپن فیصد ہتھیار چین سے حاصل کرتا ہے۔اس کے بعد میانمار اور بنگلہ دیش بالترتیب آٹھ اور سات فیصد ہتھیار چین سے برآمد کرتے ہیں۔اسلحہ برآمد کرنے والے ممالک میں امریکہ تیس فی صد، روس چھبیس فی صد، جرمنی سات فی صد، فرانس چھ فی صد، اور چین پانچ فی صد ہے۔ایس آئی پی آر آئی کے ڈائریکٹر پال ہالٹوم نے کہا ہے کہ 'چین کی برآمدات میں اضافے کی وجہ پاکستان کا بھاری تعداد میں اس سے اسلحہ حاصل کرنا ہے۔'انھوں نے مزید کہا حالیہ چند معاہدوں سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ چین نے اپنے آپ کو اہم اسلحہ فراہم کرنے' والے ملک کے طور پر منوانا شروع کر دیا ہے کیونکہ اس سے اسلحہ حاصل کرنے والے ممالک کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔'ایس آئی پی آر آئی کے مطابق چین نے حال ہی میں الجیریا کو تین فریگیٹ، وینزویلا کو آٹھ مال بردار ہوائی جہاز اور مراکش کو 54 ٹینک فروخت کیے ہیں۔جہاں دنیا میں اسلحہ برآمد کرنے والے ممالک میں امریکہ، روس، جرمنی، فرانس اور چین شامل ہیں وہیں سب سے زیادہ اسلحہ درآمد

کرنے والے ممالک میں بھارت 12 فیصد کے ساتھ اول نمبر پر ہے۔۔ چین ایک عالمی طاقت بننے کے راستے پر گامزن ہے لیکن یہ راستہ اکثریت کی توقع کے مطابق نہیں ہے۔ گذشتہ دنوں چینی حکومت نے 19 صنعتوں سے متعلق قریب 14 سو کمپنیاں بند کرنے کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ بیجنگ حکومت نے اضافی پیداوار کے منفی اثرات سے بچنے اور اقتصادی ڈھانچے میں تبدیلی کی خاطر یہ سخت قدم اٹھایا ہے۔ چینی ماہر اقتصادیات ٹروائی ٹرھانگ کے بقول حکومت معیشت کی ری اسٹرکچرنگ بابت سنجیدہ ہے اور اس کے لیے 'ناگزیر درد' سہنے کو بھی تیار ہے۔ چین میں کئی صنعتی شعبوں میں جیسا کہ شمسی بجلی پیدا کرنے والے پینلز کی پیداوار کے لیے حکومت کی سبسڈیز اور بے دریغ سرمایہ کاری سے اس قدر پراڈکشن ہو گئی کہ اسے فروخت کرنے کے لیے قیمت گراتے گراتے بعض اوقات لاگت سے بھی کم دام پر اشیاء فروخت کرنا پڑیں۔ رواں برس Suntech نامی کمپنی کا دیوالیہ ہونا اس کی ایک مثال ہے۔ماہرین اقتصادیات پہلے ہی طویل مدت کے لیے چین کی اقتصادی ترقی کے حوالے سے خدشات ظاہر کر چکے ہیں۔ بالخصوص ریٹیل سیکٹر اور فیکٹری آؤٹ پٹ میں کمزور نمو اور دیگر اشاریے اس کا سبب ہیں۔ رواں ماہ ہی بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے چین میں 2013ء کے لیے اقتصادی نمو کی پیش گوئی کو آٹھ اعشاریہ ایک سے کم کرکے ساتھ اعشاریہ آٹھ کیا ہے۔ نجی شعبے کی پیش گوئی کے

مطابق اگلی مالیاتی ششماہی میں اقتصادی نمو کی شرح سات فیصد تک بھی گر سکتی ہے۔ چین کا شمار دنیا کی دوسری بڑی معیشت میں ہوتا ہے جو عالمی سطح پر برامدت میں کم ہونے کے بعد اپنی معیشیت میں توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسری جانب عام تاثر یہ ہے کہ چین کے برامدی کمپنیاں ملک میں رقم لانے پر عائد ہونے والی پابندیوں کو نظر انداز کرنے کے لیے اصل فروخت سے زیادہ برآمدات ظاہر کر رہے ہیں۔ ان خدشات کی بنا پر چینی حکام نے ملک میں سرمائے کی آمد اور منتقلی پر کڑی نگاہ رکھی ہے اور زرِ مبادلہ کے نگران ادارے (ایس اے ایف ای) نے برآمدات سے حاصل ہونے والی آمدن اور دارمدی ادائیگیوں کی غلط معلومات فراہم کرنے پر جرمانہ عائد کیا ہے۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ غلط معلومات فراہم کرنے پر حکومتی کارروائی سے تجارتی سرگرمیوں کمی ریکارڈ کی گئی ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ چین کے تجارتی اعداد و شمار اب کسی حد تک معیشت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ چین کی مجموعی قومی پیداوار گذشتہ تیس برسوں میں سو ارب ڈالر سے بڑھ کر پانچ ٹریلین ڈالر ہو گئی ہے لیکن یہ اب بھی امریکہ کی مجموعی قومی پیداوار کے صرف ایک تہائی کے برابر ہے۔ چین کو دنیا کے اسٹیج پر زیادہ بھرپور کردار ادا کرنا چاہیئے۔ دنیا کی نظریں چین پر لگی ہوئی ہیں اور اس بارے میں کافی جوش و خروش پایا جاتا ہے کیوں کہ ہمارا خیال ہے کہ چین اکیسویں صدی میں ایک منفرد لیڈر بن سکتا ہے۔ ” اکیسویں صدی کی طاقت بننے کے ساتھ ساتھ جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں قبول کرنے سے

چین کے لوگوں کو ترقی کے ایسے عظیم مواقع ملیں گے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔ امریکہ اور چین کے تعلقات بڑے نازک موڑ پر ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب امریکہ اور چین کے درمیان باقاعدہ تعلقات بحال ہوئے تقریباً تین عشرے گذر چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بحرالکاہل کے دونوں طرف چین کے عروج اور امریکہ اور چین کے تعلقات کے بارے میں تشویش پائی جاتی ہے۔ علاقے میں اور یہاں امریکہ میں کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ چین کی ترقی خطرناک ہے اور اس سے سرد جنگ کے طرز کی کشمکش یا امریکہ کا زوال شروع ہو جائے گا اور دوسری طرف چین میں کچھ لوگ پریشان ہیں کہ امریکہ چین کے عروج اور اقتصادی ترقی کو محدود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نظریے نے چین میں شدید نوعیت کی قوم پرستی کو جنم دیا ہے۔ پنٹاگون نے حال میں چین کے حوالے سے خطرات کے بارے میں ایک رپورٹ جاری کی ہے۔ ان کا فوجی بجٹ بڑھ رہا ہے۔ یہ اس وقت اس بجٹ کا پانچواں حصہ ہے جو امریکہ عراق اور افغانستان میں خرچ کرتا ہے اور یقیناً یہ امریکی فوجی بجٹ کا ایک معمولی حصہ ہے۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں ہے جب امریکہ چین کے قریب سمندر میں بحری مشقیں کر رہا تھا۔ چین نے اس موقع پر احتجاج کیا تھا اور خاص طور پر ایٹمی طاقت سے چلنے والے طیارہ بردار بحری بیڑے ''یو ایس ایس جارج واشنگٹن'' کو مشقوں میں لانے پر اس نے شدید احتجاج کیا تھا کیونکہ چین کا کہنا تھا کہ اس بیڑے کے ذریعے امریکہ بیجنگ پر ایٹمی حملہ کر سکتا ہے۔ اس پر امریکہ کا موقف تھا کہ چین جارحانہ طرز عمل اختیار کر رہا ہے کیونکہ وہ

سمندروں کے حوالے سے آزادی میں مداخلت کر رہا ہے۔اب اگر اس حوالے سے دفاعی اور فوجی تجزیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں اس کو سلامتی کا ایک کلاسیک المیہ کہا جاتا ہے جس میں دونوں فریق ٹکراؤ کا شکار ہیں۔۔چین سپر طاقت کے طور پر کیسا ہو گا؟ شاید آپ کے خیال میں یہ پہلے سے ہی ایک سپر طاقت ہے تو ایسا نہیں ہے۔ بعض افراد کا خیال ہے کہ چینی فوج کا امریکی فوج سے موزانہ کرنا درست نہیں ہے۔ اس وقت امریکہ کے پاس گیارہ طیارہ بردار بحری جہاز ہیں جبکہ چین نے اس قسم کے پہلے بحری جہاز کو گزشتہ ماہ ہی بحریہ میں شامل کیا ہے۔ جبکہ عالمی سیاست میں اس کا اثر ورسوخ بہت کم ہے۔صرف معاشی میدان میں چین کی قوت ایک عالمی طاقت کے طور پر سمجھ آتی ہے۔ اس وقت چین کی معیشت کا حجم امریکی معیشت کے مقابلے میں آدھا ہے اور ایک اندازے کے مطابق چینی معیشت سال دو ہزار اٹھارہ تک امریکی معیشت پر برتری حاصل کر لے گی لیکن ٹیکنالوجی اور زندگی کا معیار امریکہ سے بہت پیچھے ہے۔ لیکن چینی اپنے گھر میں رہنا چاہتے ہیں، وہ 'مڈل کنگڈم' چین کے پرانے نام پر یقین رکھتے ہیں، اس کا ادبی ترجمہ ہو گا کہ ہم زمین کے مرکز میں ہیں اور انسانی تہذیب کی اعلیٰ ترین قسم ہیں۔یورپ کے برعکس چینیوں کی وقت کے بارے میں سوچ بہت مختلف ہے۔ جہاں امریکی سمجھتے ہیں کہ وقت بہت کم ہے وہیں چینی سوچتے ہیں کہ بہت زیادہ ہے۔ ان کے خیال میں ایک صدی کچھ بھی نہیں۔

ساری دنیا کی جاسوسی امریکہ کے گلے پڑ گئی

امریکہ کی نیشنل سیکورٹی ایجنسی سے وابستہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہر ایڈورڈ سنوڈن نے یہ انکشاف کرکے امریکہ سمیت پوری دنیا کو ہلا دیا ہے کہ امریکہ کی حکومت اتنے بڑے پیمانے پر امریکیوں کی جاسوسی کر رہی ہے کہ امریکہ میں فرد کی نجی زندگی کا وجود ہی نہیں رہا۔ اس لیے کہ امریکہ کی حکومت اپنے شہریوں کی ڈاک پڑھ رہی ہے، ٹیلی فون کالز سن رہی ہے، ان کی ای میلز ملاحظہ کر رہی ہے۔گارڈین اخبار کے مطابق اس پروگرام کی معلومات ظاہر کرنے والا شخص انتیس سالہ ایڈورڈ سنوڈن ہے جو امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے سابق ٹیکنکل اسسٹنٹ ہیں۔اس وقت وہ ڈیفنس کنٹریکٹر بوز ایلن ہیملٹن کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ایڈورڈ نے برطانوی اخبار کو بتایا کہ وہ بیس مئی کو ہانگ کانگ گئے تھے جہاں انہوں نے اپنے آپ کو ایک ہوٹل میں بند کرلیا۔ اس کا کہنا تھا کہ 'میں ایسے معاشرے میں نہیں رہنا چاہتا جہاں اس قسم کا کام کیا جائے۔۔۔ میں ایسی دنیا میں نہیں رہنا چاہتا جہاں ہر وہ چیز جو میں کروں یا کہوں اس کو ریکارڈ کیا جائے۔' برطانوی اخبار گارڈین نے اپنی خبر میں بتایا کہ امریکی نیشنل سیکورٹی ایجنسی بڑے پیمانے پر فون اور انٹرنیٹ کی نگرانی کر رہی ہے۔اخبار کے مطابق امریکی خفیہ ایجنسی کے اس پروگرام کے ذریعے لوگوں کی ذاتی ویڈیوز، تصاویر اور ای میلز تک نکال

لی جاتی ہیں تاکہ مخصوص لوگوں پر نظر رکھی جاسکے۔ بعدازاں امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی کے ڈائریکٹر جیمز کلیپر نے تسلیم کیا تھا کہ حکومت انٹرنیٹ کمپنیوں سے صارفین کی بات چیت کا ریکارڈ حاصل کرتی ہے تاہم انہوں نے کہا تھا کہ معلومات حاصل کرنے کی پالیسی کا ہدف صرف 'غیر امریکی افراد' ہیں۔ صرف غیر ملکیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ دوسری بڑی خبر یہ تھی کہ امریکہ پینتیس ممالک کی جاسوسی کر رہا ہے۔ اور ان مملکت کے صدر اور وزیر اعظم کی فون کال کو ٹیپ کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ ہنگامہ جرمنی کی چانسلر کے فون ٹیپ کی اطلاعات پر ہوا۔ امریکہ میں این ایس اے کے تحت شہریوں کی فون کالز، پیغامات، ای میلز اور انٹرنیٹ چیٹ تک کی تفصیلات جمع کی جاتی ہیں۔ یہ جاسوسی نظام اس قدر وسیع ہے کہ ایک عام دن میں جرمنی کے دو کروڑ فون کنکشن اور ایک کروڑ انٹرنیٹ ڈیٹا سیٹ کی این ایس اے کے ذریعے نگرانی کی جاتی ہے اور مشغول ترین دنوں میں فون کالز کنکشن کی تعداد چھ کروڑ تک چلی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ اور فون نگرانی کے خفیہ امریکی پروگرام 'پرزم' اور اس کے برطانوی متبادل 'ٹیمپورا' کی خبروں پر جرمنی میں غصہ ہے۔ واضح رہے کہ جرمن باشندے اپنی حکومت کے ذریعہ کی جانے والی نگرانی کے خلاف بھی کافی حساس واقع ہوئے ہیں جن کے دلوں میں سابقہ کمیونسٹ ملک مشرقی جرمنی میں حکومت کی خفیہ پولیس شٹاسی اور نازی ہٹلر کے دور کے گیستاپو کی یاد باقی ہے۔ در شپیگل کا کہنا ہے کہ امریکی خفیہ ادارہ فرانس میں بھی روزانہ بیس لاکھ کنکشن کی روزانہ نگرانی کرتا ہے۔

برسلز میں ایک سربراہ اجلاس کے دوران یورپی رہنماؤں نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ امریکہ کے بارے میں بڑھتی ہوئی بداعتمادی دہشت گردی کے خلاف جنگ کو متاثر کر سکتی ہے۔جرمن چانسلر انگیلا مرکل کہتی ہیں کہ " ایک مرتبہ بداعتمادی کا بیج بو دیا جائے تو انٹیلیجنس تعاون بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ قطعی غلط ہے کہ دوست ایک دوسرے کی جاسوسی کریں" یہ بھی کہا جارہا ہے کہ صدر اوباما کو اس بارے میں معلوم تھا اور صدر براک اوباما نے جاسوسی کی اس کارروائی کو روکنے کے بجائے اسے جاری رہنے دیا امریکی خفیہ ایجنسی کے سابق اہلکار ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے منظرِ عام پر لائے گئے دستاویزات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ امریکہ دنیا بھر میں وسیع پیمانے پر مواصلاتی جاسوسی کر رہا ہے۔جاسوسی کے پروگرام میں فرانس، یونان اور اٹلی کو 'ہدف' بنایا گیا ۔جرمنی کے سپیگل میگزین میں شائع ہونے والی خبر میں انکشاف کیا گیا تھا کہ امریکہ نے یورپی یونین کے دفاتر کی جاسوسی کی ہے، یہ دستاویزات امریکہ خفیہ ایجنسی کے سابق اہلکار ایڈورڈ سنورڈن منظر عام پر لائے ہیں۔ جو امریکی حکومت کو مطلوب ہیں اور ان دنوں روس کے دارالحکومت ماسکو کے ہوائی اڈے پر ہیں۔ اور انھوں نے ایکواڈور میں پناہ کی درخواست بھی دی ہوئی ہے۔گارڈین اخبار میں شائع ہونے والی سنہ 2010 کی دستاویز کے مطابق اڑتیس سفارت خانے اور مشنز کو نیشنل سکیورٹی ایجنسی نے 'ہدف' قرار دیا، اس دستاویز میں غیر معمولی جاسوسی کے

طریقوں کی تفصیلات موجود ہیں جن میں بگ لگانا، کیمونیکیشن کو سننا وغیرہ شامل ہیں۔ دستاویز میں اقوام متحدہ میں فرانس اور جرمنی کے مشن اور واشنگٹن میں اٹلی کے سفارت خانے میں غیر قانونی آپریشنز کے خفیہ نام بھی درج ہیں۔ جاسوسی کا ہدف بنائے جانے والی فہرست میں جاپان، میکسکو، جنوبی کوریا، ترکی اور بھارت بھی شامل ہیں۔ جرمنی کے رسالے کے مطابق خفیہ امریکی دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی نے واشنگٹن میں یورپی یونین کے دفتر کے کمپیوٹر نیٹ ورکس کی جاسوسی کی اور نیویارک میں اقوام متحدہ کی عمارت میں واقع یورپی یونین کے دفاتر سے بھی خفیہ طور پر معلومات حاصل کرتی رہی۔ ان خبروں نے ساری دنیا میں اضطراب بڑھادیا۔ فرانس کے وزیر خارجہ لورونگ فیبیوس نے کہا ہے کہ اگر یہ دعویٰ درست ہوا تو خفیہ نگرانی کا یہ عمل قطعی طور پر 'نا قابل قبول' ہوگا۔ جرمنی کی وزیر انصاف نے اسے سرد جنگ کی یاد دلانے والا رویہ قرار دیا۔ یورپی پارلیمینٹ کے صدر مارٹین شلٹس نے کہا کہ اگر حقیقت میں یہ الزام سچ ہوا تو امریکہ کو بہت ساری چیزوں کا جواب دینا ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'مجھے دھچکہ لگا ہے، فرض کریں کہ اگر یہ سچ ہوا تو پھر تو مجھے ایسا محسوس ہوگا کہ یورپی باشندے اور یورپی ادارے کے نمائندے کی حیثیت سے میرے ساتھ وہی برتاؤ ہوا ہے جو دشمن کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیا باہمی اعتماد پر مبنی تعمیری تعلقات کی یہ بنیاد ہوتی ہے۔ میرے خیال میں نہیں۔ اس لیے یہاں برسلز میں امریکہ کے سفارتخانے سے میرا پہلا سوال

یہی ہوگا کہ کیا یہ سچ ہے؟ اور اگر یہ سچ ہے تو کیوں؟ انہیں اس کی وجہ بتانا ہوگی۔ یورپی یونین کی امریکی جاسوسی کے بارے میں زیادہ تفصیل تو معلوم نہیں ہوئی لیکن یورپی یونین میں شامل یورپی ممالک کی تجارت اور دفاعی معلومات تک رسائی سے امریکہ کے لیے یورپی ممالک سے مذاکرات میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ امریکہ اقوام متحدہ کی بھی جاسوسی کرتا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے ایک بیان میں کیا کہا کہ امریکہ کے نیشنل سیکیوٹی کے ادارے نے اقوامِ متحدہ کی رازدارانہ رابطہ کاری کے دوران حاصل کیے گئے بعض خفیہ کوڈز توڑے تھے۔ تاہم اقوامِ متحدہ کے ترجمان نے اس بارے میں بھی خیالات کا اظہار کرنے سے منع کر دیا کہ آیا اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون کی بھی جاسوسی کی گئی یا نہیں۔ امریکہ کی نیشنل سیکیورٹی ایجنسی نے اس الزام سے انکار کیا کہ اس نے یاہو اور گوگل کے ڈیٹا سینٹرز کے رابطوں کی خفیہ طور پر نگرانی کی ہے۔ واشنگٹن پوسٹ میں شائع کی جانے والے دستاویزات کے مطابق انٹرنیٹ کے ان بڑے نیٹ ورکس پر سے روزانہ لاکھوں ریکارڈز اکٹھے کیے جاتے رہے۔ تازہ انکشافات ایسے وقت سامنے آئے ہیں جب جرمنی کے انٹیلیجنس حکام کا ایک گروہ امریکہ پہنچا ہے جہاں وہ وائٹ ہاؤس میں امریکی حکام سے وائس چانسلر انگیلا میرکل کے ٹیلی فون کی نگرانی کیے جانے کے الزامات کی بابت بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ امریکی نیشنل انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جیمز کلیپر نے امریکی ایوانِ نمائندگان کے پینل کے سامنے بیان

دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس قسم کے اقدامات امریکی انٹیلی جنس کے اہم ترین قواعد میں شامل ہیں۔ تاہم انہوں نے یہ بھی کہنا تھا کہ امریکہ دیگر اقوام کی 'بلا امتیاز' جاسوسی نہیں کرتا۔ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے کہا کہ 'غیر ملکی رہنماؤں کے ارادوں سے واقفیت بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ یہ معلومات ہم جمع کرتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے غیر ملکی اتحادی بھی امریکی حکام اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جاسوسی کرتے ہیں اور ایسا کرنا معمول کی بات ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ کسی اور ملک کے پاس اتنے بڑے پیمانے پر نگرانی کا نظام نہیں جتنا امریکہ کے پاس ہے اور 'اگر کوئی غلطی ہوئی بھی ہے تو وہ انسانی یا مشینی تھی۔' دوسری جانب معاملے کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے کہا گیا کہ صدر اوباما کو اس بارے میں معلوم نہیں تھا۔ وائٹ ہاؤس پر عالمی رہنماؤں کی جاسوسی کی اطلاعات اور صدر اوباما کی ان آپریشنز سے بظاہر لاعلمی کے معاملے پر وضاحت کے لیے دباؤ بڑھا ہے۔ کسی بھی آدمی کو یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ امریکی صدر اس بارے میں نہیں جانتے۔ سی آئی اے کے سابق اہلکار ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے افشا کی جانے والی نئی دستاویزات میں کہا گیا کہ امریکہ کی نیشنل سیکیورٹی ایجنسی جرمن چانسلر سمیت 34 عالمی رہنماؤں کی نگرانی کرتی رہی ہے۔ سینیٹر ڈائین فائن سٹائن نے اس پر امریکی حکام سے کئی سوال پوچھے ان کا کہنا تھا کہ امریکہ کی جانب سے اپنے دوست ممالک کے رہنماؤں کی جاسوسی کیا جانا صحیح نہیں اور صدر

کی اتحادی ممالک کے رہنماؤں کی جاسوسی کے آپریشنز سے لاعلمی بڑا مسئلہ ہے۔ امریکی ادارے نیشنل سکیورٹی ایجنسی نے سپین کے چھ کروڑ باشندوں کے نگرانی کی تھی اس انکشاف نے بھی ایک ہل چل مچا دی اور اس انکشاف کے بعد سپین نے امریکی سفیر کو وزارت خارجہ میں طلب کرکے اپنے شہریوں کی نگرانی کی مکمل معلومات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اسپین کے وزیر نے کہا کہ اگر سپین کے چھ کروڑ شہریوں کی جاسوسی کی اطلاعات درست ہیں تو یہ انتہائی 'نامناسب اور 'ناقابل قبول' ہے۔ اس بارے میں ا جاپان کے خبر رساں ادارے نے کہا کہ این ایس اے نے سنہ 2011 میں جاپان کی حکومت سے جاپان سے گزرنے والی فائبر آپٹک تاروں کی نگرانی میں مدد دینے کے لیے کہا تھا۔ یہ تاریں جاپان کے راستے ایشیاپیسیفیک خطے تک جاتی ہیں۔ کیوڈو خبر رساں ادارے کی خبر میں کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد امریکہ کو چین کی جاسوسی کرنے کی اجازت دینا تھا لیکن جاپان نے قانونی مسائل اور عملے کی کمی کی وجہ سے اس سے انکار کیا۔ امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی نے اس خبر کی تردید کی ہے کہ ادارے کے سربراہ نے جرمنی کی چانسلر کے موبائل فون کی جاسوسی کے بارے میں صدر اوباما کو کوئی بریفنگ دی تھی۔ جبکہ جرمن میڈیا نے دعویٰ کیا ہے کہ امریکہ گذشتہ دس برس سے زائد عرصے سے جرمنی کی چانسلر انگیلا میرکل کے موبائل فون کی نگرانی کر رہا ہے اور صدر براک اوباما کو سنہ 2010 میں اس کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ جرمنی کے جریدے ڈاشپیگل کے دعوے کے مطابق امریکہ گذشتہ دس برس سے زائد

عرصے سے جرمنی کی چانسلر آنگیلا میرکل کے موبائل فون کی نگرانی کر رہا ہے۔ایک اور اطلاع یہ بھی تھی کہ سنہ 2010 میں امریکی صدر براک اوباما اس جاسوسی کے بارے میں بتایا گیا لیکن وہ اسے روکنے میں ناکام رہے۔ڈا شپیگل نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ اس نے امریکی نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کی وہ دستاویزات دیکھی ہیں جس میں سنہ 2002 میں آنگیلا میرکل کا موبائل فون نمبر موجود تھا جبکہ وہ تین برس بعد جرمنی کی چانسلر بنی تھیں۔جریدے کے مطابق آنگیلا میرکل کے موبائل فون کی جاسوسی سنہ 2013 میں بھی جاری ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دستاویزات میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ چانسلر انگیلا میرکل کے موبائل کی جاسوسی کی نوعیت کیا تھی۔جریدے کے مطابق مثال کے طور پر یہ ممکن ہے کہ چانسلر انگیلا میرکل کی بات چیت ریکارڈ کی جا رہی ہو یا پھر ان کے تعلقات کے بارے میں جانا جا رہا ہو۔

ایک امریکی اخبار نے اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ امریکہ نے پاکستان میں جاسوسی کے نیٹ ورک کو توسیع دی ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق ''ٹاپ سیکرٹ بجٹ ڈاکومنٹس'' میں کہا گیا ہے کہ امریکی خفیہ ادارے سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی نے پاکستان میں کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے ٹھکانوں کے حوالے سے امریکہ کے تحفظات دور کرنے کیلئے معلومات اکٹھی کرنے کے سلسلے میں جاسوسی نیٹ ورک کو توسیع دی ہے۔ اخبار نے سی آئی اے کے بلیک بجٹ کے نام سے

ترتیب دی گئی 178 صفحات پر مشتمل دستاویزات کے حوالے سے بتایا کہ امریکی انٹیلی جنس اداروں کے پاس معلومات ناکافی ہونے کے حوالے سے بنائے گئے چارٹ میں پاکستان سرفہرست ہے اور پاکستان کو نئے بنائے گئے تجزیاتی سیلز کیلئے ہدف بنایا گیا ہے۔ اخبار کے مطابق امریکہ میں پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کی سیکورٹی کے حوالے سے تشویش اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ناجائز اسلحہ کے پھیلاؤ کی روک تھام کے حوالے سے بجٹ سیکشن میں پوری دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوتی نظر آئی جس میں ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف باقی دنیا ہے۔

نیشنل سکیورٹی ایجنسی جاسوسی کرنے کے لیے کیا طریقے استعمال کرتی ہے؟

جاسوسی کا سب سے بڑا ادارہ انٹرنیٹ ہے۔ اور امریکہ نے انٹرنیٹ کمپنی کے ڈیٹا تک رسائی حاصل کر رکھی ہے۔ جون میں دستاویزات سے معلوم ہوا کہ این ایس اے کیسے خفیہ طریقے سے انٹرنیٹ کمپنیوں کے ڈیٹا تک رسائی حاصل کی۔ این ایس اے کو نو انٹرنیٹ کمپنیوں کے سرورز تک رسائی حاصل ہے جس کے ذریعے جاسوسی کے پرزم نامی پروگرام کے تحت آن لائن کمیونیکیشن کی نگرانی کی جاتی ہے۔ ان کمپنیوں میں فیس بک، گوگل، مائیکروسافٹ اور یاہو شامل ہیں۔ دوسرا ذریعہ فائیبر آپٹیک ہے۔ اس بارے میں برطانوی اخبار گارڈین نے انکشاف کیا تھا کہ برطانیہ نے فائیبر آپٹک کیبلز کے ذریعے عالمی کمیونیکیشن کی جاسوسی کی اور اس سے حاصل ہونے والی معلومات کو این ایس اے کے ساتھ شیئر کیا گیا۔ گارڈین

کے مطابق دستاویزات میں کہا گیا ہے کہ.برطانیہ نے دو سو فائیبر آپٹک کیبلز تک رسائی یا صل کی جس کے باعث.برطانیہ یومیہ چھ سو ملین کمیونیکیشن کی نگرانی کر سکتا تھا۔اس کے علاوہ فون ٹیپنگ کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔اکتوبر میں جرمنی کی میڈیا نے رپورٹ کیا کہ امریکہ نے جرمنی کی چانسلر آنجیلا میرکل کے فون کی دس سال سے زیادہ جاسوسی کی۔ یہ جاسوسی چند ماہ قبل ہی ختم کی گئی ہے۔ٹارگٹڈ جاسوسی کے لئے دیگر ذرائع استعمال کیئے گئے۔جرمنی کے جریدے ڈاشپیگل کے مطابق امریکہ نے امریکہ اور یورپ میں یورپی یونین کے دفاتر کی بھی جاسوسی کی۔جریدے کی رپورٹ کے مطابق این ایس اے نے واشنگٹن میں یورپی یونین کے اندرونی کمپیوٹر نیٹ ورک کی جاسوسی کی اور یورپی یونین کے اقوام متحدہ کے دفتر کی بھی جاسوسی کی۔ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے لیک کیے گئے دستاویزات کے مطابق این ایس اے نے.برسلز میں ایک عمارت میں بھی جاسوسی کی جہاں یورپی یونین کے وزراء کی کونسل یورپی کونسل واقع ہے۔اس سے قبل امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے خبر دی تھی کہ امریکی خفیہ ایجنسیاں سراغ رسانی کی غرض سے انٹرنیٹ کی نو.بڑی کمپنیوں کے سرورز سے صارفین کے بارے میں.براہ راست معلومات حاصل کر رہی ہیں۔ان کمپنیوں میں فیس بک، یوٹیوب، سکائپ، ایپل، پال ٹاک، گوگل، مائکروسافٹ اور یاہو بھی شامل ہیں۔ان خبروں کے بعد ورلڈ وائیڈ ویب کے خالق سر ٹم.برنرز لی نے پرزم پروگرام پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکی حکومت کی جانب سے یہ اقدام بنیادی

انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ انہوں نے انٹرنیٹ کے صارفین سے کہا کہ وہ انفرادی طور پر بھی اس معاملے پر آواز اٹھائیں اور احتجاج کریں۔ دوسری جانب فیس بک کے خالق مارک زکر برگ اور گوگل کے مالک لیری پیج نے امریکہ خفیہ ایجنسی کو صارفین کی معلومات کی فراہمی کی تردید کی تھی۔ اس سے قبل ایپل اور یاہو بھی کسی بھی حکومتی ایجنسی کو اپنے سرورز تک براہ راست رسائی دینے کے الزام سے انکار کر چکی ہیں۔ امریکہ بڑی کمپینیوں اور تجارتی اداروں کی بھی جاسوسی کرتا ہے۔ اس کا انکشاف برازیل کے گلوبو ٹی وی نے اپنی رپورٹ میں کیا کہ ایڈورڈ اسنوڈن کی دستاویزات کے مطابق امریکی نیشنل انٹیلجنس ایجنسی نے پٹرو براس کی جاسوسی کی تھی۔ برازیل کی اس کمپنی کا سرمایہ ترانوے ارب یورو ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ امریکہ جاسوسی سے کیا ھدف رکھتا تھا۔ واضح رہے امریکہ نے برازیل کی صدر کی بھی جاسوسی کی تھی۔ امریکہ میں پر بہت غم وغصہ ہے۔ عوام احتجاج کر رہے ہیں ۔اور خفیہ اداروں کی جاسوسی کے خلاف امریکی سینیٹرز بھی بول اٹھے۔ دنیا بھر سے کھری کھری سننے کے بعد بالاآخر امریکہ نے خفیہ اداروں کی جاسوسی کی کارروائیوں کا تفصیل سے جائزہ لینے کا اعلان کر دیا۔ امریکی اداروں کی جاسوسی پر دنیا بھر کی تنقید کے بعد امریکی سینیٹرز بھی بول اٹھے ہیں۔ امریکی سینیٹر ڈائن فائن کا کہنا ہے دوست ممالک کے رہنماؤں کی جاسوسی غلط اور اس سارے عمل سے صدر اوباما کی لاعلمی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ امریکی سینیٹر کا کہنا تھا کہ وہ فرانس، جرمنی، سپین اور دیگر

اتحادی ممالک کے رہنماؤں کی جاسوسی کے خلاف ہیں۔ خاتون سینٹر کا کہنا تھا وائٹ ہاؤس نے انہیں ہر قسم کی جاسوسی روک دینے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ دوسری جانب دنیا بھر کے شہریوں اور عالمی رہنماؤں کی جاسوسی سے بظاہر لاعلمی پر صدر اوباما کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ یورپ سمیت کئی ممالک نے وائٹ ہاؤس سے اس معاملے پر وضاحت طلب کی ہے۔ صدر اوباما نے ایک امریکی ٹی وی کو انٹرویو میں کہا ہے کہ وہ خفیہ اداروں کی کارروائیوں کا دوبارہ جائزہ لے رہے ہیں۔

ایڈورڈ سنوڈن کے اس انکشاف نے کہیں اور کیا خود امریکہ کے منتخب ایوانوں میں بھی ایک زلزلہ برپا کردیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے تمام خفیہ ادارے اب تک کانگریس اور سینیٹ کے اراکین کو یہ بتاتے رہے ہیں کہ نگرانی کا نظام محدود ہے اور اس کا ہدف غیر امریکی ہیں۔پہلے امریکہ کے حکمرانوں نے ڈھکے چھپے انداز میں اہل امریکہ کو یقین دلایا کہ پابندیوں کا ہدف دہشت گرد یعنی مسلمان ہیں، غیر مسلموں کو ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر اب یہ چھری غیر مسلم امریکیوں کے گلے پر بھی چل رہی ہے۔

لیکن ایڈورڈ سنوڈن کے انکشاف سے معلوم ہوا ہے کہ یہ نظام لامحدود ہے اور خود امریکہ کے عام شہری ہی نہیں اس کے خواص بالخصوص خواص الخواص کو بھی

مشتبہ سمجھتے ہوئے ان کی بھی نگرانی کی جارہی ہے۔ ایک وقت تھا کہ امریکہ کمیونسٹ روس سے فرار ہو کر مغربی دنیا میں پناہ حاصل کرنے والوں کو ''ضمیر کے قیدی'' کہا کرتا تھا۔ مگر اب امریکہ جولین اسانج اور ایڈورڈ سنوڈن کو ضمیر کا قیدی تسلیم کرنے کے بجائے انہیں ''غدار'' کہہ رہا ہے۔ لیکن ایڈورڈ سنوڈن کے انکشافات نے امریکہ کے عوام کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔

صومالی قزاق ساری دنیا کے لئے دہشت کی علامت

قزاقوں کی صدیوں سے پانی پر حکمرانی ہے۔ سمندر میں جہازوں کی آمد رفت اب بھی خطرے سے خالی نہیں ۔اب بھی بحری جہازوں کا عملہ قرن افریقہ کے پانیوں میں داخل ہوتے ہی خوف وہراس میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ حالیہ دنوں میں صومالی قزاقوں ساری دنیامیں مشہور ہوچکے ہیں۔ ٹام ہاکسن کی فلم کیپٹن فلپ اس موضوع پر بنے والی ایسی فلم ہے، جس نے ساری دنیامیں عوامی مقبولیت حاصل کی ہے۔ دوہزار گیارہ کے بعد قزاقی کی ان وارداتوں میں کسی حدتک کمی آئی ہے۔ حال ہی میں اوام متحدہ ورلڈ بنک اور انٹرپول نے ایک رپورٹ جاری کی ہے، جس میں قزاقی کرنے والے، ان کے مددگار اور دیگر لوگوں سے انٹرویو کئے گئے ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ قزاق آج بھی صدیوں پرانے اصول اور ضوابد کے پاسدار ہیں۔آج بھی کوئی قزاق اگر کسی یرغمالی عورت کواس کی مرضی کے بغیر زیادتی کانشانہ بنائے تواسے اسی وقت موت کی گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ قزاق کسی بھی سمندری راستے میں گزرنے والے بحری جہازوں کو روک کر مسافروں اور عملے کو یرغمال بنالیتے ہیں اور بھاری تاوان طلب کرتے ہیں۔ 2011 میں بحری قزاقوں نے جہازوں پر 176 حملے کیے تھے۔ کئی ایسے بحری جہاز بھی ان کانشانہ بن چکے ہیں جن کے عملے میں پاکستانی شہری شامل تھے۔ بعدازاں بھاری تاوان کی ادائیگی کے بعد بہ دقت

تمام ان کی رہائی عمل میں آ سکی تھی۔ بحری قزاقوں سے نمٹنے کے لیے.برطانیہ کی رائل نیوی کے 1500 سپاہی اور 14 جنگی جہاز ہمہ وقت سمندر میں گشت پر رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی کارروائیاں جاری ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صومالیہ کے کچھ لوگ قزاقی پر اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ دنیا بھر سے.بڑے بڑے جہاز ان کے سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر لے جاتے ہیں، اور مقامی ماہی گیروں کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ گذشتہ کئی.برسوں سے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں صومالی قزاقوں کا تذکرہ اتنے تسلسل سے ہو رہا ہے کہ ہر خطے کے رہنے والے ان کی کارروائیوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ صومالی قزاق قرن افریقاکے ساتھ لگنے والے سمندر میں مستقل اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ قزاق کو صومالیہ میں ایک پیشے کی حیثیت حاصل ہے۔ امریکہ نے نوے کی دہائی میں صومالیہ میں جو فوج کشی کی اس کے سبب ہی قزاقی کو عروج حاصل ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک گلوکار ہم کے گیتوں سے یہ قزاق خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ شہرہ آفاق پاپ گلوکارہ.برٹنی اسپیئرز کے گیت اس کے کروڑوں چاہنے والوں میں بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔اس کی جادو بھری آواز کے دیوانے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ .برٹنی کے مداحوں کی چاہت نے اسے پندرہ.برسوں سے امریکا کی مقبول ترین گلوکاراوں میں شامل کر رکھا ہے۔ کیریئر کی ابتدا میں برٹنی کے دو گیت Oops! I Did It Again اور Baby One More Time بے انتہا

مقبول ہوئے تھے۔ کئی ہفتوں تک یہ گیت میوزک چارٹس پر سرفہرست رہے تھے۔ اور جن البمز میں یہ گیت شامل تھے، ان البمز نے ریکارڈ بزنس کیا تھا۔ مغربی پاپ موسیقی کے دل دادگان میں یہ گیت آج بھی ذوق و شوق سے سنے جاتے ہیں۔ پاپ میوزک ورلڈ کی یہ گلوکارہ کروڑوں شائقین کی فیورٹ سنگر ہے، مگر حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ برٹنی کی سریلی آواز سے نفرت کرنے والے بھی موجود ہیں۔ حیرانگی کی بات ہے کہ بحر ہند کے پانیوں میں دہشت کی فضا قائم کرنے والے صومالی قزاقوں کو امریکی گلوکارہ کی آواز سخت ناپسند ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ برٹنی کی آواز ہی کو ان کے خلاف خفیہ ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ صومالی قزاقوں کے خلاف بحریہ اب روایتی ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ برٹنی اسپیئرز کی آواز سے بھی کام لے رہی ہے۔ اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے مرچنٹ نیوی کی افسر راکیل اوویز کا کہنا تھا کہ صومالی بحری قزاق مغربی ثقافت اور مغربی موسیقی سے سخت نفرت کرتے ہیں اور اسے کسی صورت برداشت نہیں کرسکتے۔ اسی لیے سمندر میں سفر کرنے والے بحری جہازوں کے کپتانوں کو ہدایت جاری کی گئی تھی کہ قزاقوں کو دیکھتے ہی وہ برٹنی اسپیئرز کے مذکورہ بالا دو گیت انتہائی بلند آواز سے بجانا شروع کردیں، اور اب تک اس کے بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ برٹنی کے گیت سنتے ہی بحری ڈاکو راستہ بدل لیتے ہیں۔ سیکنڈ آفیسر اوویز کے مطابق برٹنی کے ان گیتوں کا انتخاب ایک سیکیورٹی ٹیم نے کیا تھا جس کا خیال تھا کہ قزاق ان

دو گیتوں کو سخت ناپسند کریں گے، اور بعد ازاں یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ سیکیورٹی ایسوسی ایشن فار دی میری ٹائم انڈسٹری کے سینیئر اہل کار اسٹیون جونز کا کہنا ہے کہ یہ 'ہتھیار' اتنا موثر ثابت ہو رہا ہے کہ قزاقوں کے حملے کی صورت میں بیشتر اوقات روایتی ہتھیار چلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور وہ بریٹنی کی آواز سنتے ہی رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ صومالی قزاقی کی ابتدا بھی امریکہ کی توسیع پسند عزائم کی وجہ سے ہوئی۔ امریکی مداخلت کے نتیجے میں صومالیہ میں 1990 سے خانہ جنگی کی صورتحال پیدا ہوئی، جس کے بعد سے سمندر میں صومالی قزاقوں تجارتی جہازوں کے لیے خطرہ بن گئے۔ حکومت ختم ہونے کے بعد یورپی بحری جہاز صومالیہ کی ساحل پر تابکار فضلا اور خطرناک مواد ٹھکانے لگانے لگے جس سے علاقہ میں خطرناک بیماریاں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ اس کے علاوہ صومالی پانیوں سے بڑے تجارتی یورپی جہاز کثیر تعداد میں غیر قانونی طور پر مچھلیاں پکڑنے لگے۔ مقامی ماہی گیروں نے تیز رفتار کشتیوں میں ان یورپی جہازوں کا تعاقب شروع کر دیا اور اس طرح قذاقی کی ابتدا ہوئی۔ اپریل 2009 میں کچھ سولہ سے انیس سالہ قزاق لڑکوں نے امریکی مال بردار جہاز کے کپتان رچرڈ فلپس کو جان بچاؤ کشتی میں گرفتار کر لیا۔ امریکی بحریہ کے نشانہ بازوں نے قزاقوں کو قتل کر کے رچرڈ کو چھڑا لیا۔ امریکی اخبارات کے مطابق صدر بارک اوبامہ نے اس جھڑپ کی خود نگرانی کی اور اپنے پہلے فوجی امتحان میں سرخرو ہوئے۔ مارچ 2011 میں بھارتی بحریہ نے کچھ قیدیوں کو قزاقوں

سے چھڑایا۔ مگر 5 پاکستانیوں کو تین ماہ تک بھارت نے ممبئی جیل میں رکھنے کے بعد رہا کیا۔ جون 2011ء میں انصار برنی وَقف نے چندا اکٹھا کرکے 2.1 ملین امریکی ڈالر کا تاوان ادا کرکے 22 ملاحوں کو صومالی قزاقوں سے ایک سال کی قید کے بعد چھڑایا۔ ملاحوں میں 11 مصری، 6 بھارتی، 4 پاکستانی، اور 1 سری لنکن شامل تھے مگر تاوان کی رقم صرف پاکستانیوں نے ادا کی ۔قزاقوں کے خلاف کاروائیاں بھی کی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں کبھی کبھی غلط فہمی بھی ہوجاتی ہے۔ ایک ایسی ہی کاروائی میں صومالیائی ساحل کے قریب ہندوستانی بحریہ نے صومالی قزاقوں کے بجائے تھائی کمپنی کے ایک جہاز کو ڈبو دیا گزشتہ ہفتے خلیج عدن میں گشت کر رہے بھارتیہ بحریہ کے جہاز آئی این ایس طبار نے ایک بڑی کشتی پر گولہ باری کرکے اسے ڈبو دیا تھا۔ جو افراد اب تک قزاقوں کی کارروائیوں سے محفوظ رہے ہیں انہیں بھی ہر وقت کا دھڑکہ لگا رہتا ہے کہ قزاقوں کی اگلی کارروائی کا نشانہ انہی کا جہاز بنے گا۔ بھارتی مالبردار جہاز ’صفینہ ابراہیمی‘ کے عملے کے اراکین اس سلسلے میں بہت چوکنا رہتے ہیں۔ اس جہاز کے کپتان عثمان داؤد کی آنکھوں کے گرد حلقے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ واضح ہے۔ اُن کے بقول ’ہم چوبیس گھنٹے قزاقوں پر نظر رکھتے ہیں‘۔ خود اعلان کردہ جمہوریہ ’صومالی لینڈ‘ کے بندرگاہ ’بربیرہ‘ پر لنگر انداز ہونے والے صفینہ ابراہیمی کا عملہ 20 تاجر پیشہ جہاز رانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے کپتان عثمان داؤد کا کہنا ہے، ’ مجھے تو اب یاد بھی نہیں کہ کتنی بار قزاق

ہمارے جہاز پر سوار ہوئے۔ ایسا کم از کم بیس بار ہوا ہے'۔ عثمان داؤد نے یہ بھی بتایا کہ اُن کے عملے کے اراکین کو اچھی طرح یہ یاد ہے کہ کون سی تاریخوں کو قزاقوں نے حملہ کیا اور موبائل فونز اور دیگر قیمتی اشیاء اپنے قبضے میں لے لیں اور چند روز بعد انھوں نے پھر کسی اور جگہ سے لوٹ یا ڈاکے کا مال حاصل کیا۔ صومالی قزاقوں کے لیے جہازوں پر موجود الیکٹرونک مصنوعات، استعمال شدہ گاڑیاں، ٹرکوں کے پہیے، چاولوں کی بوریاں اور دیگر اشیاء کوئی خاص دلچسپی کا باعث نہیں ہوتیں۔ ان کا اصل ہدف یورپی اور امریکی آئل ٹینکر ہوتے ہیں کیونکہ اگر ان کے عملے کو یرغمال بنا لیا جائے تو عموماً تاوان کی بہت بھاری رقوم حاصل ہوتی ہیں۔ 'صومالی لینڈ' کی بندرگاہ 'بربیرہ' کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر 'ابوکو جاما' کو قزاقوں کی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ کہتے ہیں' ہر ماہ اس بندرگاہ پر 30 جہاز اور 50 کے قریب چھوٹی کشتیاں آ کر لنگر انداز ہوتی ہیں، جبکہ چند سالوں پہلے تک ان جہازوں کی تعداد 40 سے 60 کے درمیان اور کشتیوں کی 60 تا 80 ہوا کرتی تھیں'۔ صومالی لینڈ جیسے چھوٹے افریقی ملک کی بندرگاہ سے ہونے والی آمدنی میں واضح کمی اس ملک کے لیے کافی تکلیف دہ ہے۔ صومالی لینڈ ہنوز عالمی برادری کی طرف سے اپنے وجود کے تسلیم کیے جانیکا منتظر ہے۔ 'صومالی لینڈ' کے بندرگاہ 'بربیرہ' کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر 'ابوکو جاما' کا کہنا ہے کہ صومالی لینڈ کی آمدنی کا 80' فیصد حصہ اسی بندرگاہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں سے اونٹ، بھیڑیں، اور بکریاں خلیجی

ریاستوں میں بذریعہ بحری جہاز بھیجی جاتی ہیں۔قزاقی کوئی نیا کام نہیں ، معلوم تاریخ میں اس کی ابتداء صدیوں قبل ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جب سے انسان نے سمندر کے راستے سفر کرنا شروع کیا ہے اسی وقت سے اس کام کی بھی ابتداء ہوئی۔ بری راستوں پر جانے والے قافلوں کو اگر لوٹا جاتا تھا تو بحری ڈاکو (قزاق) سمندر میں سفر کرنے والے مسافروں سے بھی مال ومتاع چھین لیتے تھے۔ بحری قزاق صدیوں سے سمندروں میں موجود ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں لیکن اکیسویں صدی میں صومالیہ کے قزاقوں نے کروڑوں ڈالر تاوان وصول کرکے اس کام کو ایک انتہائی منافع بخش صنعت کا درجہ دیدیا ہے۔

آج ایک سوال جو جدید دور میں زندگی گزارنے والوں کو پریشان کر رہا ہے کہ جب دنیا اتنی ترقی کرچکی ہے ، امریکی سیارے زمین پر چلتی چیونٹی کو بھی دیکھ لیتے ہیں ، اس کے ڈرون طیارے غاروں میں پناہ گزین افراد کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں اور دنیا کے ہر ملک کے پاس جیٹ فائٹرز ہیں تو پھر ان صومالی قزاقوں کو مارنے کی بجائے تاوان کیوں دیا جاتا ہے۔ ان بحری قزاقوں کی تمام شرائط من وعن کیوں تسلیم کی جاتی ہیں اور برطانیہ و امریکہ جیسے ممالک اپنے بحری جہازوں کو ان سے کیوں نہیں بچا سکتے۔ اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ دنیا صرف ہمارے لئے ہی جدید نہیں ہوئی ، صومالی قزاقوں نے بھی ترقی سے خوب فائدہ اٹھایا ہے اور ڈالروں سے اپنی تجوریاں ہی نہیں بھریں ، انتہائی حساس کمیونیکیشن نظام بھی خریدا ہے۔ قزاقوں کے پاس اس وقت جدید ترین سیٹلائیٹ

فون، انٹرنیٹ، موبائل، جی پی ایس سسٹم اور بحری جہازوں کیلئے راستوں کی نشاندہی کرنے والا ریڈار نظام بھی ہے۔ قزاقی پر تحقیق کرنے والے ایک برطانوی محقق کے مطابق کچھ قزاقوں نے اپنی کشتیوں پر ایسے ریڈار نظام اور انٹینا نصب کئے ہیں جو سیٹلائٹ نظام اور جنگی جہازوں تک ان کے سگنل کو پہنچنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ

لوگ اپنے شکار کو بہت مہارت اور کامیابی کے ساتھ مطلوبہ علاقے میں لے جانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔اس وقت بحری قزاقوں کا سب سے بڑا مرکز صومالیہ کی ساحلی پٹی ہے اور اس کی بڑی وجہ ملک میں مؤثر حکومت کا نہ ہونا ہے۔ 1991ء سے لے کر آج تک صومالیہ میں کوئی مضبوط اور مؤثر حکومت کا قیام عمل میں نہیں لایا جا سکا جس کی وجہ سے ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت ہے اور مختلف مسلح دھڑوں نے اپنے اپنے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں۔ عام طور پر کہا جارہا ہے کہ خلیج عدن کا پورا علاقہ ہی قزاقی کی لپیٹ میں ہے اور امریکہ سے آسٹریلیا جانے والا کوئی جہاز بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں لیکن زیادہ تر قزاقوں کا بسیرا صومالیہ کا تین ہزار تین سو تیس کلومیٹر طویل ساحل ہی ہے۔

خلیج عدن اور افریقہ کے ساحلوں پر تو قزاقی عام ہے لیکن اب یہ وبا بحر ہند تک پہنچ چکی ہے اور عالمی سمندر میں بھی قزاق جہازوں پر حملے کر رہے ہیں۔

دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی بحری افواج اپنے مال بردار جہازوں کو تحفظ فراہم کرنے اور قزاقوں کے خلاف کارروائی کیلئے عالمی پانیوں میں متحرک رہتی ہیں لیکن صومالی قزاق پھر بھی باز نہیں آتے۔ صومالی قزاقوں کی یہ سرگرمیاں پچھلے کئی برسوں سے جاری ہیں۔ یہ قزاق، بنیادی طور پہ صومالیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ براعظم افریقہ کا حصہ ہے۔ قزاقوں کی اس سرگرمی کا باعث کئی باتوں کو بتایا جاتا ہے۔ مثلاً ملک میں سیاسی عدم استحکام اور برسوں سے جاری خانہ جنگی جسکی وجہ سے عملاً کوئی حکومت نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صومالی مچھیروں کی انتقامی کارروائی ان غیر ملکی ٹرالرز کے خلاف ہے جو کہ انکے سمندری حصے میں آکر اتنی زیادہ مچھلیاں پکڑتے تھے کہ انہوں نے سمندر کو مچھلیوں سے خالی کر دیا اور اس سے مقامی مچھیروں کا ذریعہ روزگار ختم ہو گیا۔ ان قزاقوں میں تین طرح کے لوگ شامل ہیں۔ مقامی مچھیرے، جنہیں سمندر سے پوری واقفیت ہے اور یہ قزاقوں کا ماسٹر مائینڈ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ باہر کی بوٹس کو انکے ساحل کے قریب سے گذرنے کا کوء حق نہیں۔ سابق فوج کے افراد جو پہلے اپنے جنگی سرداروں کے لئے لڑا کرتے تھے اب اس کام میں شامل ہو گئے۔ تیکنیکی مددگار جو تیکنیکی آلات کو دیکھتے ہیں مثلاً جی پی ایس۔ یہ صومالی قزاق اپنی سمندری حدوود کے قریب سے گذرنے والے پانی کے جہازوں پہ قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر لاکھوں ڈالر تاوان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صومالیہ ایک مسلمان اکثریتی ملک ہے لیکن غربت یہاں کا بنیادی مسئلہ ہے۔ قزاقوں کو

ایک لمبے عرصے سے اتنی کامیابی سے حملہ کرتے دیکھ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ ان قزاقوں کو اسلحہ کہاں سے ملتا ہے۔ اندازہ ہے کہ اسلحہ انکے پاس یمن اور موغادیشو کے رستے سے آتا ہے۔ دوسرا خیال یہ آتا ہے کہ تاوان کی رقم ادا کیسے کی جاتی ہے۔ تاوان کی رقم ڈالرز کی شکل میں ادا کی جاتی ہے اور ہیلی کاپٹر کے ذریعے جہاز تک پہنچائی جاتی ہے۔ قزاقوں کے ذریعے آمدنی نے علاقے کے معاشی حالات کو بہت بہتر کر دیا ہے۔ بہترین گھر بنے، تفریحی مقامات وجود میں آئے، مختلف اشیائے زندگی کی ڈیمانڈ بنی انکی مارکیٹ وجود میں آ رہی ہے اور یوں خوشحالی نے جگہ بنالی ہے۔ خوش شکل لڑکیوں کو بھی مالدار بحری قزاقوں کی رفاقت ملی۔ مقامی آبادی کے لوگ اس چیز سے خوش ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انکے سمندر کے ماحول کو جو نقصان پہنچایا گیا اس طرح وہ اسکی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں بھی چند شکایات ہیں اور ان میں سر فہرست قزاقوں کا نشہ آور اشیاء اور اسلحے کا بے دریغ استعمال۔ قزاقوں کی اس مصیبت سے وہاں سے گذرنے والے جہاز خطرے سے دوچار رہتے ہیں۔ اس علاقے کی پوزیشن ایسی ہے کہ یہاں سے ہر سال ہزاروں پانی کے مال بردار اور مسافر جہاز گذرتے ہیں۔ یوں یہ منظر بیک وقت قزاقوں کے لئے خوشحال زندگی کی نوید بنتے ہیں اور پانی کے جہاز سے وابستہ لوگوں کے لئے ایک مسلسل خطرہ۔ اسکے علاوہ کاروباری حلقوں کی سرگرمیاں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں اور اعتماد دگرگوں ہوتا ہے۔ اس ساری بظاہر دہشت ناک صورت حال کے

باوجود ان قزاقوں کی پیدائیش کا ایک مثبت اثر محسوس ہو رہا ہے اور وہ صومالیہ اور اسکے ارد گرد کے سمندر کی ماحولیاتی زندگی کی بحالی ہے۔ صومالیہ سے منسلک کینیا میں رواں سال مچھلی کی بہترین پیداوار رہی۔ اسکی وجہ، بحری قزاقوں کے خوف کی وجہ سے باہر کے ٹرالرز کا شکار سے دور رہنا ہے۔ خوف، شکار ہو جانے والوں کو کمزور بنا سکتا ہے مگر استعمال کرنے والوں کو مضبوط۔ دیکھنا یہ ہے کہ دنیا اس دہشت گردی پہ قابو پانے کے لئے کیا راستہ نکالتی ہے۔ اقوام متحدہ سے بحری قزاقی کی روک تھام کے لیے فورس قائم کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ بحری جہازوں کے مالکان کی ایک بھارتی تنظیم نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ صومالی قزاقوں سے مقابلے کے لیے ایک خصوصی فورس قائم کرے۔ ایسوسی ایشن نے کہا کہ قزاقی سے بین الاقوامی پیمانے پر جہاز رانی کی صنعت کو انشورنس، تاوان، جہازوں پر محافظوں کی تعیناتی اور قزاقوں سے بچنے کے لیے طویل راستے اختیار کرنے پر ہر سال تقریباً 9 ارب ڈالر کے اخراجات برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ تنظیم کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اقوام متحدہ کی خصوصی فورس کے محافظوں کو تجارتی جہازوں پر تعینات کیا جائے اور انہیں ایسے جہازوں پر چڑھنے کا اختیار حاصل ہو، جس پر یہ شبہ ہو کہ ان میں قزاق موجود ہو سکتے ہیں۔ کئی برسوں سے بحری جہازوں کو یرغمال بنانے کی کارروائیوں مصروف صومالی قزاقوں نے اب اپنی کارروائیوں کا دائرہ بحیرہ عرب اور بحر ہند تک بڑھا دیا ہے جو صومالیہ

کی ساحل پر واقع ان کے مراکز سے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ بین الاقوامی سمندروں کی نگرانی سے متعلق ادارے کا کہنا ہے کہ اس وقت صومالی قراقوں کے قبضے میں 15 بحری جہاز اور عملے کے 277 افراد موجود ہیں۔ دنیا کے مصروف ترین آبی تجارتی راستے میں حالیہ مہینوں کے دوران قزاقی کی وارداتوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے انشورنس کی لاگت اور مال برداری کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں جبکہ صومالی قزاق اب تک کروڑوں ڈالرزتاوان کی صورت میں وصول چکے ہیں۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر قزاقوں کے خلاف کارروائی کے لئے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کئے گئے اور نہ پہلے ایسا کیا جاسکتا تھا کیونکہ قزاقوں کا پیچھا کرنے والی فورسز کو صومالیہ کی زمینی حدود میں ان کے خلاف کارروائی کی اجازت نہیں تھی حالانکہ قزاقوں نے زمینی علاقوں میں ہی اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں. امریکا نے سلامتی کونسل میں ایک قرارداد منظور کرائی تھی۔ اس کے تحت ان ممالک کو قزاقوں کے خلاف کارروائی کا اختیار حاصل ہوگیا ہے جو صومالیہ کی عبوری حکومت کے مطابق اس کے ساتھ تعاون کررہے ہیں . صومالی حکومت نے ایسے ممالک کی فہرست اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بین کی مون کو پیش کی تھی .۔ پچھلے عرصے میں بحری قزاقوں کی سرگرمیوں میں کمی نظر آئی ہے، خلیج عدن سے گزرنے والے تجارتی اور سیاحتی جہازوں پر حملوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ انٹر نیشنل میری ٹائم بیورو کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ بحری قزاقوں کی سرگرمیوں میں کمی کی وجہ اس علاقے

میں متعین بین الاقوامی بحری دستوں کے اقدامات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صومالیہ کے پانیوں میں سرگرم بحری قزاق اب اس علاقے کو چھوڑ رہے ہیں۔ رواں سال وہاں تجارتی جہازوں پر صرف آٹھ حملے رجسٹرڈ کئے گئے ہیں، بحری قزاق صرف دو جہازوں پر قبضہ کرسکے۔ سن دو ہزار چھ سے بحری قزاقوں کی سرگرمیوں میں اس قدر کمی نہیں ہوئی تھی، بحری قوانین سے متعلق روسی مرکز کے اہلکار کے مطابق قوی امکان ہے کہ بحری قزاق خلیج عدن میں بین الاقوامی بحری دستوں کی تعنیاتی کے پیش نظر اپنی سرگرمیاں روکنے لگے ہیں۔ بین الاقوامی دستے اور مختلف ممالک کے جنگی بحری جہاز خلیج عدن میں مسلسل گشت جاری رکھے ہوئے ہیں اس لیے بحری قزاق تجارتی جہازوں کو نشانہ بنانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ بین الاقوامی بحری دستے تمام مشکوک جہازوں کا معائنہ بھی کرتے ہیں۔ بحری دستوں کی تعنیاتی کے علاوہ قانون سازی کے میدان میں کئے جانے والے اقدامات بھی اہم ہیں۔ اقوام متحدہ کئی قراردادیں منظور کر چکی ہے جن کے ذریعے بحری قزاقی کے مقابلے سے متعلق بین الاقوامی قوانین کو بہتر کیا گیا ہے۔ اب صومالیہ کے پانیوں میں حتی کہ صومالیہ کی سرزمین پر بحری قزاقوں کو گرفتار کئے جانے کی اجازت ہے جس سے بحری قزاقوں کو گہرا جھٹکا لگ چکا ہے۔ خطرناک سمندری علاقوں میں جنگی بحری جہازوں کی تعنیاتی ایک موثر تدبیر ثابت ہوئی ہے لیکن بڑی جہازراں کمپنیاں اس پر مطمئن نہیں ہوئیں اور اپنے تجارتی جہازوں کے عملوں میں محافظین کو شامل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان محافظین کے

پاس واٹر کینننز اور نوکدار تار ہے جو بحری قزاقوں کے حملوں کو ناکام بنائے جانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر بحری قزاقوں کو گرفتار کیا جائے تو انہیں عدالت کے سامنے لایا جانا ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کونسے بین الاقوامی قوانین کے مطابق بحری قزاقوں کے خلاف مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

عالمی برادری ایسا قانون ابھی تک منظور نہیں کر سکی ہے اس لیے خدشہ ہے کہ بحری قزاق ایک علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں اپنی سرگرمیاں تیز تر کریں گے۔ یہ بھی اطلاع ہے کہ مغربی یورپ کی بڑی بیمہ کمپنیاں (بحر ہند میں) صومالیہ کے پانیوں میں جہاز رانی کی سلامتی کو یقینی بنانے کی خاطر بحری بیڑا تشکیل دے رہی ہیں۔ منصوبے کے مطابق خلیج عدن میں تیز رفتار بحری کشتیاں متعین ہوں گی۔ ہر کشتی کا عملہ چار اراکین اور نو مسلح فوجیوں پر مشتمل ہوگا جنہیں بحری قزاقوں کے خلاف طاقت کے استعمال کا حق ہے۔ ایک کشتی کی خدمات اٹھارہ ہزار ڈالر کے عوض حاصل کی جا سکیں گی۔ لیکن ان تمام تر اقدامات کے باوجود جب تک خوراک، تعلیم، ذریعہ معاش، اور مستحکم حکومت نہیں ہوگی، پوری دنیا میں سماجی انصاف اور وسائل کی منصفانہ تقسیم نہ ہوگی۔ قزاقی یا لوٹ مار کا کاروبار یونہی چلتا رہے گا۔

ارب پتی کلب میں ایشیائی باشندے بازی لے گئے

دنیا بھر میں ارب پتیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور اس کام میں سب سے زیادہ رفتار ہے ایشیائی امیروں کی ہے۔ ایک طرف دنیا کے مختلف ممالک میں بھوک سے بلکتے بچیوں کو سر پر کھلا آسمان تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا دستیاب نہیں۔ دوسری جانب چم چماتی گاڑیاں بے شمار دولت، ارب پتیوں کی تعداد میں دھڑا دھڑ اضافہ ہونے لگا۔ ویلتھ ایکس اور یو بی ایس بلین ایئر سینسس 2013 کے مطابق ایشیا میں 2012 سے 2013 تک صرف ایک سال کے دوران ارب پتی افراد کی تعداد میں تین اعشاریہ سات فیصد سے تیرہ فیصد تک کا اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ اضافہ اس بات کی عکاس ہے کہ خطہ تیزی سے ترقی پا رہا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایشیا بین الاقوامی اقتصادی صورتحال کو تبدیل کر رہا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ اگلے پانچ برس میں یہ خطہ شمالی امریکا کے مد مقابل ہوگا۔ سروے میں امیر افراد کے پبلک اور نجی اداروں میں حصہ داری، رہائشی اور سرمایہ کاری، آرٹ کلیکشن، ذاتی طیارے اور نقد زر کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ خیال ہے کہ رواں سال دنیا بھر میں ارب پتی افراد کی تعداد 2 ہزار 170 تک پہنچ گئی ہے۔ ویلتھ ایکس اور ویلتھ منیجر یو ایس بی کی جانب سے پہلی بار دنیا بھر کے ارب پتی افراد کے اعداد و شمار سے متعلق جاری رپورٹ کے مطابق 2013 میں دنیا بھر میں

ارب پتی افراد کی تعداد 2 ہزار 170 تک پہنچ چکی ہے جب کہ دنیا بھر کے امیر ترین افراد میں 3 اعشاریہ 7 فیصد کا تعلق ایشیا سے ہے۔ رپورٹ کے مطابق ایشیا بین الاقوامی اقتصادی صورتحال کو تبدیل کر رہا ہے، اگر ایشیا میں اسی طرح ارب پتی افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا تو آئندہ 5 برس میں یہ خطہ شمالی امریکا کے مدمقابل آ جائے گا جہاں ارب پتی افراد کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ دولت میں اضافہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ایشیا تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ دنیا بھر میں 2009 عالمی مالیاتی بحران کے بعد 810 ارب پتی افراد کا اضافہ ہوا جب کہ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ 2020 تک دنیا بھر میں ارب پتی افراد کی تعداد 3 ہزار 900 تک پہنچ سکتی ہے۔ چین بھی اس فہرست میں آگے آگے ہے۔ اب چین میں ارب پتی افراد کی تعداد 300 سے زائد ہو گئی ہے۔ یہ اعداد و شمار بیجنگ میں قائم ایک میگزین نے شائع کیے ہیں۔ چین میں مالدار افراد کی فہرست کے مطابق 2013ء میں ملک میں ارب پتی افراد کی تعداد 315 ہو گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ملک میں پہلی مرتبہ ارب پتی افراد کی تعداد 300 سے زائد ہوئی۔ روپرٹ ہوگیفر، جنہوں نے 'ہورن' رپورٹ تیار کی ہے کا کہنا ہے کہ چین میں اقتصادی شرح نمو میں کمی کے باوجود یہ اعداد و شمار مثبت رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر اقتصادی ترقی کی رفتار بڑھی، جس کی توقع کی جا رہی ہے، تو ارب پتی افراد کی تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق آمدن کا بڑا ذریعہ جائیداد کی خرید و

فروخت 'رئیل اسٹیٹ' کی صنعت تھی، جس کی قیمت میں حال ہی میں تیزی آئی ہے۔اعداد و شمار میں 'رئیل اسٹیٹ ڈویلپر' وینگ جینلین کا نام شامل ہے جو چین کی سب سے مالدار شخصیت ہیں اور ان کی دولت لگ بھگ 22 ارب ڈالر ہے۔ سٹر وینگ کا گروپ ہوٹل، فلم، تھیٹر کی صنعت سے وابستہ ہے جب کہ یہ گروپ بڑے 'ڈیپارٹمنٹل اسٹور' بھی چلاتا ہے۔رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ چین میں 1,000 مالدار ترین افراد میں سے نصف کے مالی اثاثوں میں گزشتہ ایک سال میں اضافہ ہوا ہے۔ ایشیا ریجن میں ارب پتیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے کے بعد اٹھارہ مال دار ارب پتی کلب کے ممبر بن جائیں گے۔ امریکی ادارے کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ایشیائی ریجن میں ارب پتی کلب میں حیران کن اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ رپورٹ میں دعوی کیا گیا ہے کہ دنیا بھر کی کل دولت کا 13 فی صد ایشیائی ارب پتیوں کے پاس ہے۔ ایشیا میں ارب پتیوں کی تعداد میں اضافے کی رفتار یہی رہی تو آئندہ پانچ سالوں میں ایشیا امیر ترین افراد کی فہرست میں شمالی امریکہ کے برابر آ جائے گا۔ اعداد و شمار میں کہا گیا ہے کہ 2009 کی عالمی کساد بازاری کے باوجود بھی ارب پتی کلب میں 810 ارب پتیوں کا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔۔۔دنیا بھر میں ارب پتیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور اس کام میں سب سے زیادہ اسپیڈ ہے ایشیائی امیروں کی۔۔۔ویلتھ ایکس اور یو بی ایس بلین ایئر سینسس 2013 کے مطابق ایشیا میں 2012 سے 2013 تک صرف ایک سال کے دوران ارب پتی افراد کی تعداد میں تین

اعشاریہ سات فیصد سے تیرہ فیصد تک کا اضافہ رکارڈ کیا گیا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ اضافہ اس بات کی عکاس ہے کہ خطہ تیزی سے ترقی پا رہا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایشیا بین الاقوامی اقتصادی صورتحال کو تبدیل کر رہا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ اگلے پانچ برس میں یہ خطہ شمالی امریکا کے مد مقابل ہوگا۔ سروے میں امیر افراد کے پبلک اور نجی اداروں میں حصہ داری، رہائشی اور سرمایہ کاری، آرٹ کلیکشن، ذاتی طیارے اور نقدزر کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ کارلوس لگاتار تیسرے سال سرفہرست رہے ہیں اور ان کے اثاثوں کی مالیت کا اندازہ اننتر ارب ڈالر کے لگ بھگ لگایا گیا ہے۔ دوسرے نمبر پر مائیکرو سافٹ کے بانی، بِل گیٹس اکسٹھ ارب ڈالر کے ساتھ دوسرے اور امریکی سرمایہ کار وارن بفٹ چوالیس ارب ڈالر کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہیں۔ اس مرتبہ کوئی بھی بھارتی ارب پتی، پہلی دس شخصیات میں جگہ نہیں بنا سکا۔ گزشتہ سال دس امیر ترین افراد میں شامل لکشمی متل اس مرتبہ اکیسویں نمبر پر ہیں اور ان کے اثاثے تقریباً ساڑھے دس ارب ڈالر کی کمی کے ساتھ بیس ارب ستّر کروڑ ڈالر رہ گئے ہیں۔ ارب پتیوں میں سب سے زیادہ تعداد امریکی شہریوں کی ہے جن میں کاروں کے پاکستانی نژاد تاجر شاہد خان بھی شامل ہیں۔ فہرست میں چار سو اکانوویں نمبر پر موجود شاہد خان کی دولت کا تخمینہ ڈھائی ارب ڈالر لگایا گیا ہے۔ فوربز میڈیا کے سربراہ، سٹیو فوربز نے اس نئی فہرست کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ ’یہ فہرست بتاتی ہے کہ گزشتہ سال معیشت کے بارے میں خدشات

ظاہر کیے جاتے رہے اور اس کی کوئی خاص بحالی نہیں ہوئی۔ اگرچہ دنیا میں سولہ ارب پتیوں کا اضافہ ہوا لیکن کچھ ایسے خطے تھے جہاں سے ارب پتیوں کی تعداد کم ہوئی' ۔ان کے مطابق 'چین کے امراء کم ہوئے اور روس کے بھی، جہاں اجناس کی قیمتوں میں کمی ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سال دنیا کی معیشت صحیح معنوں میں آگے نہیں بڑھی اور یہ چیز ارب پتیوں کی نئی فہرست میں نظر آتی ہے'ین الاقوامی تجارتی میگزین فوربز نے کہا ہے کہ معاشی بحرانوں کے باوجود دنیا میں ارب پتیوں کی تعداد بلند ترین سطح پر پہنچ گئی ہے۔ فوربز نے دو ہزار بارہ کی ارب پتی شخصیات کے ناموں کی جو فہرست جاری کی ہے جس میں ایک ہزار دو سو چھبیس افراد شامل ہیں اور فوربز کی پچیس سالہ تاریخ میں یہ ارب پتیوں کی سب سے زیادہ تعداد ہے۔

دولت دولت۔۔۔۔ دنیا میں ہر شخص مایا کا اسیر ہے۔ سب سے بڑا روپیہ دنیا کی حقیقت ہے۔ اور اس کے لئے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے، جو دولت کماتے ہیں، ان کا بڑا نام ہوتا ہے۔ اس دنیا کی دولت کا بڑا حصہ تھوڑے سے لوگوں کے پاس ہے۔ جبکہ دنیا کی اکثریت بیماری، بھوک ، افلاس، سے پریشان ہے۔دولت مند پہلے دولت کماتے ہیں پھر دولت لٹاتے ہیں۔ یا پھر ڈیرہ اسماعیل خان کے اس فقیر کی طرح بوریوں میں بھری چھوڑ جاتے ہیں۔ جس کا کوئی والی تھا نہ وارث، اور وہ خود بھوک بیماری سے مر گیا۔ کس کام آئی یہ دولت۔

فوربز میگزین ہر سال دنیا کے امیر ترین لوگوں کی فہرست شایع کرتا ہے' فوربز میگزین کے بارے میں کہا جاتا ہے دنیا کا کوئی ارب پتی شخص اس وقت تک ارب پتی نہیں بنتا جب تک فوربز میگزین اسے ارب پتی تسلیم نہیں کرلیتا۔ فوربز میگزین کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے اِن امیر ترین لوگوں کے پاس اندازا پانچ اعشاریہ چار ٹرلین ڈالر کی مجموعی ملکیت ہے، جو پاونڈ کے حساب سے 3.6 ٹرلین کی رقم بنتی ہے، یعنی دنیا کی سب سے بڑی معیشت، امریکہ کی سالانہ پیداوار کی مجموعی قومی ملکیت کا ایک تہائی سے زیادہ حصے کے برابر کی دولت۔ گذشتہ سال تین عدد نسبتا کم عمر ارب پتی جنھوں نے ارب پتی کلب میں شمولیت اختیار کی ان میں 28 سالہ فیس بک کے بانی، مارک زکربرگ اور ان کے 30 برس عمر کے سابق ساتھی اڈوارڈو ساورن، اور 28 سالہ دوستن مسکووٹز شامل ہیں۔ فوربز میگزین کا کہنا ہے کہ باوجود یہ کہ دوستن مسکووٹز کی دولت کا اندازہ ارب ڈالر لگایا گیا ہے، وہ روزانہ کام کے لیے اپنی سائیکل پر سفر کرتے ہیں، اور 3.8 بزنس کلاس میں فضائی سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ نیواڈ کے صحرا میں برننگ مین نامی ثقافتی میلے میں اپنا خیمہ خود ہی لگاتے ہیں۔ ٹوئٹر کے شریک بانی اور پنک میوزک کے شوقین، جیک ڈورسی کا شمار بھی ارب پتیوں میں ہوتا ہے، جس کی ملکیت 1.1 ارب ڈالر ہے۔ ارب پتیوں میں خواتین کی دنیا بھر میں کل تعداد صرف 138 ہے، جب کہ گذشتہ برس ان کی مجموعی تعداد 104

تھی۔ خواتین میں دنیا کی امیر ترین خاتون نوے برس کی فرانسیسی کو سمیٹکس صنعت کی مالک، للیین بتن کورٹ ہیں، جب کہ بین الاقوامی طور پر دنیا کے ارب پتیوں میں ان کا شمار نویں نمبر پر ہوتا ہے۔ فوربز کی اس فہرست کے اجراء کے ساتھ ہی گذشتہ برس ایک تنازعہ بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ جس نے فوربس کی اس فہرست پر شکوک و شبہات کو جنم دیا تھا۔ سعودی عرب کے شہزادے ولید بن طلال نے امریکی جریدہ 'فوربز' پر الزام لگایا تھا کہ اس نے ان کی دولت کا غلط اندازہ لگایا ہے اور انہیں امیر ترین شخصیات کی فہرست میں صحیح مقام نہیں دیا گیا ہے۔ جریدے نے سنہ 2013 میں دنیا کی امیر ترین شخصیات کی فہرست میں شہزادہ ولید کی دولت کا اندازہ بیس ارب ڈالر لگایا تھا اور انہیں اس فہرست میں چھبیسویں نمبر پر رکھا تھا۔ سعودی شہزادے کے دفتر سے جاری ہونے والے بیان میں الزام لگایا گیا ہے کہ فوربز نے جو طریقہ کار استعمال کیا ہے وہ ناقص ہے کیونکہ وہ مشرق وسطیٰ کے سرمایہ کاروں کو کم تر دکھاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ فوربز جریدے نے سعودی عرب کے حصص بازار کی قیمتوں کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا حالانکہ وہ میکسیکو جیسی معیشتوں کی قیمتیں قبول کر رہے تھے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ اس سے ظاہر ہے کہ فوربز مختلف ممالک کے لیے مختلف معیار استعمال کرتا ہے۔ شہزادہ ولید کے دفتر کے مطابق انھوں نے فوربز سے درخواست کی ہے کہ وہ شہزادے کا نام اس فہرست سے نکال دیں۔ شہزادے کی 'کنگڈم ہولڈنگ کمپنی' کے چیف فنانشل افسر کے مطابق 'ہم کئی سالوں سے فوربز کے ساتھ کام

کرتے رہے ہیں اور کئی مرتبہ فوربز کو ان کے طریقہ کار سے متعلق مسائل سے آگاہ کر چکے ہیں۔ ہم کئی سالوں سے ان سے کہہ رہے ہیں کہ ان چیزوں کو درست کرنے کی ضرورت ہے'۔انہوں نے کہا کہ تاہم اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ فوربز کا اس بارے میں کچھ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کیونکہ فوربز ہماری سرمایہ کاری کی صحیح قیمت نہیں لگا رہا ہم اب آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔' فوربس نے اس کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ کمانے والی حسینہ کا بھی انکشاف کیا ہے۔ یہ اداکارہ کرسٹن اسٹیورٹ ہیں۔ جنہوں نے ہالی ووڈ کی تمام خوبرو حسیناؤں کو پیچھے چھوڑ دیا۔
فلم اسنو وائٹ اینڈ دی ہنٹس مین " کی ہیروئن ایک سال میں سب سے زیادہ آمدنی" کرنے والی اداکارہ بن گئی ہیں۔ میگزین فوربز کے مطابق کرسٹن اسٹیورٹ نیتمام حسیناؤں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ بائیس سالہ کرسٹن اسٹورٹ نے مئی دو ہزار گیارہ سے مئی دو ہزار بارہ تک تین کروڑ چالیس لاکھ ڈالر سے زائد معاوضہ حاصل کیا۔دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ آمدنی والی فلم " بیڈ ٹیچر " کی اداکارہ کیمرون ڈیاز رہیں۔آسکر ایوارڈ یافتہ اداکارہ ساندرا بلوک دو کروڑ پچاس لاکھ ڈالر آمدنی کے ساتھ تیسرے اور گزشتہ سال آمدنی کے لحاظ سے سرفہرست انجلینا جولی چوتھے نمبر پر آگئیں ہیں۔ انہوں نے دو کروڑ ڈالر کمائے۔
فوربز نے ستمبر 2012 میں دنیا کے چار سو ارب پتی لوگوں کی جو فہرست شایع کی

تھی‘ اس فہرست میں پہلی بار ایک پاکستانی امریکن شہری کا نام آیا ہے‘ اس شخص کا نام شاہد خان ہے‘ یہ 1950 میں لاہور میں پیدا ہوئے‘ ان کا خاندان تعمیرات کے شعبے سے وابستہ تھا‘ شاہد خان سولہ سال کی عمر میں امریکا چلے گئے‘ یہ امریکا میں ابتدائی راتیں دو ڈالر کے کمرے میں گزارتے رہے‘شاہد خان نے انجینئرنگ اسکول میں تھوڑی مدت گزارنے کے بعد فلیکس اینڈ گیٹ نام کی کمپنی میں پارٹ ٹائم کام شروع کر دیا‘ یہ کمپنی گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس بناتی تھی‘ شاہد خان کام کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔انھوں نے 1971 میں انجینئرنگ اسکول سے گریجویشن کی۔

گریجوایشن کے بعد وہ فلیکس اینڈ گیٹ میں ڈائریکٹر ہو گئے‘ نوکری کے دوران انھیں محسوس ہوا امریکا کی کوئی کمپنی پک اپ ٹرکس کے لیے ’’ون پیس‘‘ بمپر نہیں بنا رہی‘ کمپنیاں دو دو‘ تین تین پیس میں بمپر بناتی ہیں‘ یہ بمپر ٹکڑوں میں ٹرک کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں‘ سفر اور وزن کی وجہ سے بہت جلد ان بمپرز کے جوڑ کھل جاتے ہیں۔ شاہد خان نے نوکری سے استعفیٰ دیا‘ اسمال بزنس لون کارپوریشن سے پچاس ہزار ڈالر قرض لیا‘ ان کے پاس 16ہزار ڈالر اپنے جمع تھے‘ انھوں نے 1978 میں 66 ہزار ڈالر سے ون پیس بمپر بنانا شروع کر دیے‘ آئیڈیا اچھا تھا چنانچہ ان کا کام چل نکلا‘ خوشحالی آئی اور شاہد خان نے دو سال میں وہ فلیکس اینڈ گیٹ کمپنی خرید لی جس میں وہ طالب علمی کے دوران کام کرتے رہے تھے۔1989 میں شاہد خان کو ٹویوٹا کمپنی کی تمام گاڑیوں کے بمپر مل گئے‘ یہ واحد کمپنی تھی جو

ٹویوٹا کو بمپر فراہم کرتی تھی اور یوں شاہد خان امریکا کے بڑے بزنس مین بنتے چلے گئے۔ 2011 میں ان کی کمپنی میں 12 ہزار 4 سو 50 ملازم تھے اور ان کے پاس 48 مینو فیکچرنگ پلانٹس تھے‘ شاہد خان نے دسمبر 2011 میں 76 کروڑ ڈالر میں امریکا کا بڑا فٹ بال کلب جیکسن ولے جیگوار بھی خرید لیا‘ یہ امریکا کی قومی فٹ بال لیگ ہے۔ فوربز نے ستمبر 2012 میں شاہد خان کو دنیا کے ارب پتیوں کی فہرست میں شامل کر لیا‘ یہ امریکا کے 179 ویں اور دنیا کے 491 ویں امیر ترین شخص ہیں‘ ان کے پاس اڑھائی ارب ڈالر ہیں۔ امریکا کی ساڑھے 31 کروڑ کی آبادی میں 179 ویں نمبر پر آنا اور دنیا کے ساڑھے چھ ارب لوگوں میں 491 ویں نمبر کا امیر شخص کہلانا واقعی اعزاز کی بات ہے اور یہ اعزاز ایک پاکستانی صرف اپنی محنت کی بنیاد پر 34 برسوں میں حاصل کیا ہے۔ دولت کمانے والے اس دولت کو خرچ بھی کرتے ہیں۔ اپنی دولت کے اظہار کے نئے نئے طریقے ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند ایسے بھی ہیں جو اپنی دولت کے ذریعے دنیا سے غربت، جہالت اور بیماریاں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ فوربز نے ایک کانفرنس میں ۱۶۱ امراء کو بلایا۔ ان میں سے ۶ امریکی دولت مند... وارن بفٹ، بل گیٹس، میلنڈہ گیٹس، سٹیو کیس، ڈیوڈ ربنسٹین اور لیون بلیک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اب تک نوع انسانی کے مسائل حل کرنے کی خاطر ۱۰۰ ارب ڈالر (۹۶۰۰ ارب روپے) کی خطیر رقم خرچ کر چکے۔ دوران کانفرنس ایک دن یہ ۶ مخیر ہستیاں جمع ہوئیں۔ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا کامیاب لوگوں کی یہ اخلاقی ذمے داری ہے کہ وہ فیاضی کا

مظاہرہ کریں؟ میلنڈہ گیٹس نے اس بارے میں کہا کہ انسان جب بھی کچھ دے تو اسے دل سے یہ عمل کرنا چاہیے۔ کم از کم میرے نزدیک خدمت خلق کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ اس کی بدولت دنیا گھومنے اور اجنبیوں سے بات چیت کا موقع ملتا ہے۔ لوگوں سے ملنے ملانے کے ذریعے ہی مجھے علم ہوا کہ تمام انسانوں کی ضروریات ملتی جلتی ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں مقیم ہوں۔ لیکن عقل سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ دماغ ہی آپ کی رہنمائی کرتا ہے کہ آپ اپنی دولت کے ذریعے ایک فرد سے لے کر لاکھوں افراد تک کی زندگیاں کیونکر بدل سکتے ہیں۔ عقل ہی بتاتی ہے کہ دولت کیونکر استعمال کی جائے۔ ڈیوڈ ربنسٹین کا کہنا تھا کہ میں میلنڈہ کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ اول خدمت خلق کے واسطے دولت دے کر انسان دلی مسرت اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ یوں اس کی ذہنی و جسمانی صحت بہتر ہوتی اور عمر بڑھتی ہے۔ دوسرے اس طرح کسی دکھیارے کی مدد بھی ہو جاتی ہے۔ گو آپ کو عموماً اس امر کا پتا نہیں چلتا مگر آپ کی دی گئی رقم لوگوں کی زندگیوں میں ضرور تبدیلی لاتی ہے۔ ایک امیر شخص اپنی دولت تین طرح سے استعمال کر سکتا ہے۔ اول یہ کہ اپنی اولاد کو دے ڈالے، موت کے بعد اسے خرچنے کی وصیت کر دے یا اپنی زندگی ہی میں اسے صَرف کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اسے خدمت خلق پر لگایا جائے۔ انسان اپنی اولاد پر بے تحاشا دولت لگائے تو عموماً وہ ضائع جاتی ہے۔ پھر اس کی چھوڑی ہوئی دولت بہت کم ہی

دنیا میں تبدیلی لا پاتی ہے۔ عام طور پر دنیا میں انقلاب وہی لاتے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں خدمت خلق پر دولت خرچ کریں۔ یوں نہ صرف انھیں دلی خوشی ملتی ہے بلکہ بچے بھی ان پر ناز کرتے ہیں۔ سٹیو کیس کا کہنا تھا کہ پہلے ہم میاں بیوی خاموشی سے خدمت خلق کرنا مناسب سمجھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ لوگوں کو ساتھ ملا کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا زیادہ سہل اور کارآمد طریقہ ہے۔ اسی لیے اب ہم "گیونگ پلیج (Giving Pledge)" کو دولت دے کر خدمت خلق کر رہے ہیں۔ بل گیٹس کی اس بارے میں رائے تھی کہ دولت مندوں کو چاہیے وہ اپنے دفاتر سے نکل کر غریبوں کی بستیوں کا دورہ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے غرباء کی حالت زار کا مطالعہ کریں۔ انھیں چاہیے کہ وہ دنیا کی خوبصورتی دیکھنے کے ساتھ ساتھ بدصورتیاں بھی دیکھیں۔ اس طرح دنیا بدلنے کا عزم رکھنے والے امراء کو حقیقی تجربے حاصل ہوں گے۔ وہ پھر دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والے عملی اقدامات کر سکتے ہیں۔

وارن بفٹ اس پر خدا کا شکر کرتے ہیں کہ مجھے ہزاروں سال قبل پیدا نہیں کیا۔ تب جلد یا بدیر میں کسی حیوان کا شکار ہو جاتا لیکن آج میں اس قابل ہوں کہ ہزارہا انسانوں کی مدد کر سکوں۔ یہ بہت بڑا انعام ہے جو مجھے ملا۔ وارن بفٹ کہتے ہیں کہ مجھے زیادہ پرانی باتیں یاد نہیں۔ میری یاداشت کمزور ہو چکی ہے۔ میلنڈہ گیٹس کا کہنا تھا کہ جب بل اور میری شادی ہوئی تو ہم نے اسی وقت

طے کر لیا کہ مائیکروسوفٹ سے ہمیں جو دولت ملی وہ معاشرے کو لوٹانی ہے۔ دراصل ہم دونوں کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جنھوں نے ہمیشہ خدمت خلق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شادی سے قبل ہم افریقہ میں سیر و تفریح کرنے گئے۔ وہاں پھیلی غربت نے ہمارے چودہ طبق روشن کر دیے۔ بس پھر ہم اپنی پوری توانائی سے خدمت خلق پر جُت گئے۔ اس منفرد سفر کے دوران ہم جوڑے نے بہت کچھ پایا اور سیکھا۔

لیون بلیک کا کہنا تھا کہ ۵ سال قبل مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری بیوی خون کے کینسر کی مریضہ ہے۔ اس جان لیوا مرض کا علاج کراتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ دنیا بھر میں ہزارہا مرد و زن بھی اس بیماری کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن فی الوقت اس کا توڑ دریافت نہیں ہو سکا۔ چنانچہ پچھلے سال میں نے خون کے سرطان پر تحقیق کرنے کی خاطر ایک تحقیقی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ اس میں ۳۰ محقق دن رات محنت کرتے ہوئے کوشش کر رہے ہیں کہ بذریعہ تحقیق خون کے سرطان کا شافی علاج دریافت کر لیں۔ سٹیو کیس کہتے ہیں کہ ہم دولت اس لیے صرف کر رہے ہیں تاکہ وہ دنیا میں مثبت تبدیلی لائے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ رقم سوچ سمجھ کر خرچ کی جائے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ فضول منصوبوں پر پیسہ لگانا گناہ ہے۔ ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ کم سے کم رقم میں زیادہ بڑی تبدیلیاں جنم لیں۔ ڈیوڈ ربنسٹین نے بتایا کہ میرے نزدیک ہر وہ انسان خدمت خلق کر رہا ہے

جو مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہوئے دولت، وقت، توانائی اور ذہن خرچ کرتا ہے۔ وارن بفٹ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں چین، بھارت اور روس کے ارب پتیوں سے مل چکا۔ گو یہ تمام لوگ مختلف تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی عادات و رویے بھی متفرق ہیں لیکن مجھے یہ جان کر حیرت و خوشی ہوئی کہ خدمت خلق کے سلسلے میں بیجنگ، نئی دہلی اور نیویارک کے سبھی مخیر لوگ کئی مشترک خصوصیات رکھتے ہیں۔

برطانیہ اسلامی بنکاری میں دنیا سے بازی لے گیا

برطانیہ میں اسلامی مالیات اور بنکاری ساری دنیا سے زیادہ ہے۔ اور اس شعبے میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے۔ اسلامی مالیات برطانوی اقتصادیات کا ایک اہم حصہ ہے۔ برطانیہ اس شعبے میں مغرب کے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ برطانیہ میں اس شعبے میں ترقی کی عظیم مثالیں پہلے ہی موجود ہیں۔ لندن میں ایک درجن سے زائد بنک اسلامی مالیاتی لین دین فراہم کر رہے ہیں، جن میں سے پانچ مکمل طور پر شریعت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ لندن کا منظر شریعہ لین دین کی وجہ سے تبدیل ہو چکا ہے، دا شارڈ (لندن میں شیشے کی بنی 72 منزلہ عمارت) چیلسی بیرکس، ہیرڈز، اولمپک ویلج، ان سب کو مکمل یا جزوی طور پر اسلامی مالیاتی وسائل سے تعمیر کیا گیا ہے۔ برطانیہ کی عالمی لیڈرشپ کو مزید مستحکم کرنے کے لئے لندن کا انتخاب 9 ویں عالمی اسلامی اقتصادی فورم کے میزبان کی حیثیت سے کیا گیا تھا، پہلی بار یہ فورم اسلامی دنیا سے باہر ہوا ہے۔ لندن میں ورلڈ اسلامک اکنامک فورم کا نواں اجلاس گذشتہ ماہ منعقد ہوا۔ جس میں لندن اسٹاک ایکسچینج میں اسلامک انڈکس بھی متعارف کرایا گیا۔ عالمی اسلامی اقتصادی فورم کے اس اجلاس کے دوران اسلامی دنیا کی اقتصادی ترقی اور مسلم ممالک کے درمیان تجارتی تعاون کے فروغ کے لیے بہت سی تجاویز پیش کی گئی۔ اس دوران مسلم ممالک کی معاشی بہتری

کے لیے متعدد سفارشات پر غور بھی کیا گیا۔برطانوی وزیرِاعظم ڈیوڈ کیمرون نے اسلامک انڈکس کا افتتاح کیا۔ ماہرین کے نزدیک برطانیہ تیزی سے پھیلتی ہوئی اسلامی فنانس مارکیٹ کے ثمرات میں سے اپنے حصے میں اضافے کا خواہش مند ہے۔کیمرون یہ سمجھتے ہیں کہ لندن مسلم دنیا سے باہر مسلم اقتصادیات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ خبر رساں ادارے اے پی کے مطابق حالیہ سالوں میں اسلامی سرمایہ کاری میں ریکارڈ اضافہ دیکھا گیا ہے۔ سن 2006ء سے اسلامی بینکاری نظام تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ ماہرین یہ توقع کر رہے ہیں کہ اگلے سال کے آخر تک اس کا حجم دو ٹریلین ڈالر تک پہنچ جائے گا۔برطانیہ کی جانب سے اسلامک بانڈ 'سکوک' کا اجراء بھی کیا گیا۔ سکوک وہ اسلامی بانڈ ہیں جن کو سود کے متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جاری کیے جانے والے اسلامک بانڈز کی مالیت 323 ملین امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ ان بانڈز کا اس سے پہلے ملائشیا اور عرب دنیا میں کامیاب اجرا ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ بین الاقوامی اسلامک انڈکس کا افتتاح بھی کیا گیا۔ ورلڈ اسلامک اکنامک فورم میں دنیا بھر سے آئے ہوئے 1800 سے زائد مندوبین شریک ہوئے۔ اہم مقررین میں پاکستانی وزیر اعظم محمد نواز شریف بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے خطاب کے دوران پاکستانی وزیر اعظم نے مسلمان رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ پائیدار انسانی ترقی کے لیے کوششیں کریں۔ انھوں نے کہا کہ امت مسلمہ کو پائیدار سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے توانائی، پانی، بنیادی ڈھانچے، تجارت اور سرمایہ کاری کی ضرورت

ہے۔ نواز شریف کا مزید کہنا تھا کہ انسانیت کا مستقبل ایک دوسرے پر انحصار میں مضمر ہے اور کوئی خطہ اپنے طور پر الگ تھلگ رہتے ہوئے ترقی نہیں کر سکتا۔ نواز شریف نے کہا کہ اسلامی ممالک اقتصادی سماجی اور سیاسی شعبوں میں دنیا کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

اس وقت دنیا میں ایک بدلتے ہوئے اقتصادی منظر میں عالمی دوڑ جاری ہے، معاشی طاقت مشرق کا رخ کر رہی ہے، چین اور بھارت اور مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کے بورژوا درمیانی طبقے کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔شائد اسی لئے برطانیہ کو دنیا کو یہ دکھانے کی ضرورت ہے کہ برطانیہ غیر ملکی سرمایہ کاری اور تجارت کیلئے اول درجے کا مرکز ہے۔ یہ دکھانے کی کہ برطانیہ کے دروازے کاروبار کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ لندن یہ پیغام واضح اور بلند آواز سے بھیج رہا ہے۔ یہ اب بھی دنیا کا نمبر ون مالیاتی مرکز ہے اور یہ ایک ایسا مقام ہے جسے برطانیہ کھونا نہیں چاہتا ہے۔ برطانیہ اس وقت دبئی، نیو یارک اور ہانگ کانگ کے علاوہ مستقبل کے علاقائی مراکز، جیسے نائیجیریا، سے بڑھتی ہوئی مسابقتی دوڑ میں شریک ہے۔ نائیجیریا افریقی مالیاتی مرکز بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ شائد اسی لئے ابرطانیہ نے اسلامی مالیات کا شعبہ منتخب کیا ہے۔ اسلامی مالیات ایک ایسا شعبہ ہے جہاں پیشرفت ممکن ہے۔ یہ کوئی چاندی کی گولی نہیں لیکن ایک سنہرا موقع ضرور ہے۔اس لئے بھی کہ دنیا کی تیزی سے ترقی کرتی ہوئی 25

مارکیٹوں میں سے 10 مسلم اکثریتی ملکوں میں ہیں۔دوسری وجہ یہ کہ، اسلامی مالیات آج کی اخلاقی مالیات کی تلاش کا جواب ہے۔اسلامی بنکاری کی پیش رفت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ 2009 تک ۵۷ سے زائد مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں تین سو سے زائد اسلامک بنک اور شریعت کی بنیادوں پر قائم مالیاتی ادارے وجود میں آئے جو اس وقت انڈونیشیا، ملیشیا،ایران، سوڈان، اردن ، سعودی عرب ، متحدہ عرب امارات اور کویت وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال اس میں دس فیصد کی شرح سے اضافہ ہورہا ہے اور ان اسلامی بنکوں میں آج بھی تقریباً پانچ کھرب ڈالر کا محفوظ سرمایہ موجود ہے اسلامی بنکنگ کی عالمی سطح پر مقبولیت کا اندازہ وہ صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ.برطانیہ کی یونیورسٹی آف ریڈنگ نے اسلامک فائنانس کورس کے لئے ایک مستقل شعبہ شروع کیا ہے ،فرانس کی یونیورسٹی کی طرف سے بھی اس طرح کی اطلاعات آرہی ہیں ، ملیشیا میں اسلامک بنکنگ سے استفادہ کرنے والوں میں پہلے سال ہی 50 سے زائد غیر مسلم تھے ، سنگاپور نے جب اسلامک بانڈ جاری کئے تواس سلسلہ میں سرمایہ کاری کرنے والوں کا اندازہ تھا کہ اسلامک بانڈ کی مقبولیت کا یہی حال رہا تو صرف اگلے دو تین سالوں میں اس کی مالیت ایک کھرب ڈالرتک بآسانی پہونچ جائیگی ،امریکہ میں اسلامک بنک کا آغاز ہوچکا ہے ، خود فرانس کی حکومت بھی اپنے یہاں اس غیر سودی اسلامی بنکنگ نظام کو جاری کرنے پر سنجیدگی سے غور کررہی ہے انڈیا میں بھی وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے اسلامک بنکنگ کے امکانات کا جائزہ

لینے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے۔

مغربی دنیا میں مالیاتی دھچکے کے بعد سے جب یہ واضح ہوا کہ نقصان اور منافع کے درمیان ربط ٹوٹ چکا ہے، سود کا نہ ہونا بہت لوگوں کے لئے پر کشش ہوگیا ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ اس غیر انسانی سودی نظام نے صرف گذشتہ سو سال میں انسانیت کو معاشی واقتصادی اعتبار سے بھی ہلاکت کے کس غار تک پہونچا دیا ہے، اس کے لئے صرف امریکی ویوروپی بنکوں کی مثالیں کافی ہیں، دنیا کو یہ بتانا ضروری ہے کہ عالمی سطح کی موجودہ کساد بازاری اور کروڑوں انسانوں کی یک لخت بے روزگاری کے پس پردہ اسی سودی نظام کی خباثتیں ہیں جس نے قرضوں تلے دبے ہزاروں انسانوں کو خود کشی پر مجبور کیا،پلک جھپکنے میں کروڑ پتی سے بھیک مانگنے والا بنادیا۔سودی قرض لینے والوں کو اسراف وعیش پسندی کا خوگر بنادیا،اخلاقی حدود وقیود کو پامال کردیا،کریڈٹ کارڈ کی شکل میں انسانوں کا راتوں رات دیوالیہ کردیا،اسی مالی نظام نے انسانوں کو اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنے کا عادی بنادیا،غریب کو غریب تر کردیا اور عالمی سطح پر غربت کے گراف میں ناقابل یقین اضافہ کیا،اسی غیر سودی نظام نے پہلے خود سود لینے والوں کو ڈبو دیا اور کنگال کیا بالآخر چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ جس نے دوسروں کو کنگال کیا ایک دن وہ خود بھی کنگال ہوگیا،یورپ کے اسٹاکس ایکسچینج اچانک بیٹھ گئے امریکی انشورنس کمپنیاں دیکھتے دیکھتے بیٹھ گئیں،برطانیہ

سے بھی محروم ہو گئے Assets اور فرانس کے شہیر بازار خود اپنے اصل سرمایہ اور ۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے کہ اللہ تعالی سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔ در حقیقت، لوگوں کا ایسی سرمایہ کاری تلاش کرنا جو ان کے فلسفے اور عقائد کے مطابق ہو کوئی نئی بات نہیں اور نہ ہی صرف اسلام کا خاصہ ہے۔ ترکی میں اسلامی تقاضوں کے مطابق کام کرنے والے بنکوں کے اثاثوں کی مالیت گزشتہ دس سال میں ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ قرض حسنہ کے ذریعے اسلامی مالیات ایک خیر خواہ معاشرے، دولت کی گردش، بھلائی کے کام اور ضرور تمندوں کی مدد کا عزم رکھتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب اعتماد کمزور ہے اور حکومت جی ایٹ کے ساتھ مل کر مالیاتی اداروں میں شفافیت کے لئے کام کر رہی ہے، اسلامی مالیات ایک معقول اور نیا تلا بنکاری متبادل بن سکتا ہے۔ اور یہ تیسری وجہ ہے کہ اسلامی مالیات کیوں ایک اہم متبادل ہے کیونکہ ہم پہلے کی طرح اسی راہ پر چلنا جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہمیں توازن نو پیدا کرنا اور معیشت کو متنوع بنانا ہے۔ ہمیں اپنے موجودہ مقام کو مستحکم اور محفوظ کرنا ہے۔ ہمیں نئی مارکیٹوں، مصنوعات اور خطوں سے سے رابطہ کرنا ہوگا۔ مالیاتی مشورے کا پہلا اصول " اپنے پورٹ فولیو کو متنوع بنانا" ہے، اسلامی مالیات کا منفرد انداز بنکاری شعبے کیلئے ایسا کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ اسلامی مالیاتی لین دین میں صرف منافع ہی

نہیں نقصان کی بھی شراکت ہوتی ہے۔ سرمایہ کاری سے پہلے کاروباری پیش کش کی نتیجہ خیزی کو سختی سے جانچا جاتا ہے۔ اور منصوبے کا جائزآمدنی پیدا کرنا لازمی ہے۔ فلسفہ یہ ہے کہ آپ 'وہ شے فروخت نہیں کر سکتے جو آپ کے پاس ہو ہی نہیں'۔ اسلامی مالیاتی شعبے میں قیاس یا غرار سے کسی حدتک تحفظ مل جاتا ہے۔برطانوی وزیر سعیدہ وارثی کہتی ہیں کہ برطانیہ میں پہلی بار کسی وزیر کے تحت اسلامی مالیاتی ٹاسک فورس کا قیام ہوا ہے جسے کئی شعبوں کی وزارتی چھتری میسر ہے، اس ٹاسک فورس کی پانچ نکات پر توجہ ہوگی۔اول، مارکیٹ سے تعاون۔ ہم نے رکاوٹوں کو دور کرنے اور مارکیٹ کی طلب کے مطابق ترقی اوراختراع کے طریقوں پر غور شروع کردیا ہے۔اسلامی مالیات کے لئے موزوں ٹیکس اور ضابطوں کے فریم ورک کو برقرار رکھنے کے خصوصی ہدف کے ساتھ لندن کو ایک مسابقتی قوت دینا،برطانیہ نے اسلامی مارگیج کیلئے جو ٹیکس نظام پہلے ہی فراہم کیا ہے تاکہ سکوک کو نقصان نہ پہنچے۔ ہم متبادل مالیاتی اسکیموں جیسے مرابحہ اور وکالہ کے ذریعے طلبہ کے اسٹوڈینٹس لون کو شریعہ کے مطابق فراہم کرنے کا متبادل فراہم کررہے ہیں۔دوئم، مالیاتی انفرااسٹرکچر جیسے جیسے اسلامی مالیات کی طلب بڑھ رہی ہے اسی کے ساتھ برطانیہ کے لئے بیرونی سرمایہ کاری کے بڑے مواقع بھی موجود ہیں اور ہم غور کررہے ہیں کہ ٹاسک فورس کس طرح سرمایے کو مثال کے طور پر 40 بڑے ترجیحی انفرااسٹرکچر منصوبوں کے لئے متحرک کرسکتی ہے جن کی قومی انفرااسٹرکچر منصوبے میں نشاندہی کی گئی ہے۔ سوئم ضابطے۔ ٹاسک

فورس اسلامی مالیات کے لئے ضابطوں پر بھی غور کررہی ہیکیونکہ سرکاری نظم و ضبط اورانفرااسٹرکچر جواس شعبے کو قوت دے گا وہی مستقبل کے استحکام اور افادیت کی ضمانت ہوگی۔

چہارم یہ کہ برطانیہ کے اسلامی مالیاتی تعلیمی، تربیتی اور تحقیقی مہارت کو فروغ اور برآمد کیسے کیا جائے۔ پنجم مواصلات۔ مارکیٹ کی نمو میں تعاون کے ہمارے منصوبے میں لازمی اہمیت لندن کو ایک ترجیحی مرکز بنانا ہے۔ لندن اول درجے کی مالیاتی اور اس سے منسلک خدمات کی پیشکش کرتا ہے جن میں اکاؤنٹنسی، قانون اور ثالثی شامل ہے اور وہ اسلامی مالیات کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں جس سے کسی معاملت کے ہر مرحلے کی تکمیل ایک ہی مالیاتی مرکز میں ہونا ممکن ہے۔

اسلامی مالیات دو بلین سے زائد افراد کے لئے مارکیٹ بین بننے کی قوت رکھتی ہے۔

مالیاتی بحران کے دور میں وہ اصول جن پر اسلامی مالیات کا دارومدار ہے پہلے سے زیادہ اہم اور پرکشش ہوگئے ہیں۔ توازن، نقصان میں شراکت، شفافیت، تحفظ اور فروگزاشت کے اصول۔ وہ اصول جو آپ کو ایسی شے فروخت کرنے سے باز رکھتے ہیں جو آپ کے پاس ہے ہی نہیں یا ان اثاثوں کی قیمت لگانا جن کا وجود نہ ہو۔

اسلامی بنکاری کے فروغ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل تشویش ہے کہ جس تیزی سے پوری دنیا میں غیر سودی بنیادوں پر اسلامک بنکوں کا قیام عمل میں آرہا ہے اس تناسب سے ان بنکوں اور شرعی مالیاتی اداروں کو رہنمائی کے لئے شریعت کے ماہرین دستیاب نہیں ہورہے ہیں۔ اور نہ ایسے ماہرین دستیاب ہیں جو عالمی مالیاتی نظام سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اسلامی مالیاتی نظام کی روح سے ان کو مناسبت نہیں ہوتی ،اس کے برخلاف ہمارے علماء بنیادی اسلامی اقتصادی نظام سے دس سال سے زائد فقہ کی کتابوں کو پڑھنے کی وجہ سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ وہ اس کے ماہر بھی ہوتے ہیں لیکن عالمی مالیاتی وبنکنگ نظام سے عدم واقفیت اور اپنی پڑھی ہوئی فقہی بحثوں اور ابواب کو اس سے تطابق نہ دینے کی وجہ سے ان سے اس میدان میں فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے۔ گو ہمارے علما نے اس باب میں بہت کام کیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاردی نے اسلام کا اقتصادی نظام کے نام سے جدید اسلامک بنکنگ کے خد وخال پہلے ہی واضح کردیئے تھے، اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسلامی معاشیات کے جدید اصول وضوابط پر ایک مکمل کتاب تالیف کی تھی ،خود مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے بھی آج سے ۵۷ سال قبل جدید سودی نظام کے مضرات وقباحتوں پر قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک لاجواب کتاب سود کے نام سے لکھ کر سود سے پاک اسلامک مارکیٹنگ کا تصور سب سے پہلے پیش کیا تھا، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ

ہمارے دینی مدارس میں اسلامک بنکنگ میں تعلیم پر توجہ دی جائے تاکہ ملت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوسکے۔

اس وقت پاکستان میں اسلامی بینکنگ میں 15 فیصد اضافہ کی شرح برقرار ہے، دنیا بھر کے 51 اسلامی ممالک میں 500 سے زائد اسلامی بینک اور مالیاتی ادارے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جس سے کروڑوں لوگ مستفید ہورہے ہیں، ان اداروں سے استفادہ کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی شامل ہیں جو آج غیر سودی بینکاری کو زیادہ محفوظ تصور کرتے ہیں، اگرچہ اس وقت اسلامی مالیاتی اداروں کے اثاثے عالمی بینکنگ اور مالیاتی اداروں کی کل مارکیٹ کا صرف ایک فیصد ہیں، لیکن آئندہ ایک عشرے میں توقع کی جارہی ہے کہ یہ بڑھ کر 8 سے 10 فیصد ہوجائیں گے، پاکستان میں اس وقت 6 اسلامی بینک کام کررہے ہیں جن کی ملک بھر میں 560 شاخیں ہیں، جبکہ 12 روایتی بینکوں کی اسلامی بینکنگ شاخیں بھی موجود ہیں، اسلامی بینکنگ کا ملک کے مجموعی بینکنگ اثاثوں میں حصہ 5 فیصد کے لگ بھگ ہے اور اسلامی بینکوں کا 35 ارب روپے کا تمسکاتی پروگرام ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا غیر سودی قرض منصوبہ ہے، جس سے حکومتِ پاکستان استفادہ کرسکتی ہے۔اسلامی بینکنگ دیگر اقسام کی بینکنگ سے کس طرح مختلف ہے اس کا اندازہ اس مثال سے ہوتا ہے کہ اسلامی بینک کمپنیوں کو فلوٹنگ انٹرسٹ ریٹ پر قرضے دیتے ہیں، فلوٹنگ ریٹ کا انحصار کمپنی کی شرح

نمو پر ہوتا ہے، چنانچہ بینک کا نفع کمپنی کے منافع کی ایک خاص شرح کی صورت میں ملتا ہے، جب قرض کی اصل رقم واپس کر دی جائے تو نفع میں شراکت کا یہ معاہدہ ختم ہو جاتا ہے،اس نظام کی ایک اور مثال کاروبار میں سرمایہ کاری ہے، کاروبار کرنے والا افرادی قوت فراہم کرتا ہے جبکہ بنک اس میں سرمایہ لگاتا ہے، اس طرح نفع اور نقصان دونوں میں شرکت ہو جاتی ہے، سرمایے اور مزدور کے درمیان اس طرح کا شراکتی انتظام اسلام کے اس اصول کی نشاندہی کرتا ہے کہ کاروبار میں کسی ناکامی کا سارا بوجھ صرف قرض دار کو ہی نہ اٹھانا پڑے، دوسری طرف اس سے آمدن بھی متوازن طور پر تقسیم ہو جاتی ہے اور معیشت پر قرض دینے والے کے تسلط کا بھی سدِّباب ہو جاتا ہے،رہن کے معاملے میں بھی بینک اسلامی اصول پر عمل کرتے ہیں، اس نظام میں بینک کوئی چیز خریدنے کے لئے رقم فراہم نہیں کرتا بلکہ مطلوبہ شئے خود خرید لیتا ہے اور پھر اپنا منافع رکھ کر وہ چیز صارف کو دوبارہ فروخت کر دیتا ہے، بینک صارف کو اس شئے کی قیمت قسطوں میں ادا کرنے کی سہولت بھی دیتا ہے اور تاخیر سے ادائیگی کی صورت میں کوئی اضافی رقم یا جرمانہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا، اس تیسری مثال میں نادہندگی سے بچنے کے لئے فریقین کے درمیان سخت شرائط رکھی جاتی ہیں۔آج اسلامی بینکنگ اوراسلامی سرمایہ کاری کا ہر طرف بہت شور ہے،اسلامی دنیا میں بینکاری کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے مغرب میں بھی حکومتی سطح پر اس نظام کو فروغ دیا جا رہا ہے ،اسلامک بینکنگ کا نظام اس وقت پاکستان سمیت کئی اسلامی

ممالک میں رائج ہے گو کہ مغربی ممالک میں یہ تصور ابھی اتنا عام نہیں ہے، لیکن اب امریکہ میں بھی اسلامی بینکنگ اور مسلم فائنسنگ نظام متعارف کروانے کی کوشش کی جا رہی ہے، یوں اس کے فوائد اب صرف اسلامی ممالک تک محدود نہیں رہے ہیں بلکہ دنیا بھر میں تسلیم کئے جا رہے ہیں، اس سال برطانیہ سود سے پاک، سکوک، اسلامی بانڈ جاری کرے گا، ان بانڈز کی قدر سٹرلنگ پاؤنڈ میں مقرر کی گئی ہے تاکہ برطانیہ میں رہنے والے مسلمان اور دیگر ایسے لوگ جو سٹرلنگ پاؤنڈ میں کاروبار کرنے کے خواہشمند ہیں، اس موقع سے فائدہ اٹھا سکیں، مزید برآں یورپ میں یورپی اسلامی سرمایہ کار بینک اور برطانوی اسلامی بینک جیسے کئی بڑے اسلامی مالیاتی ادارے ابھر کر سامنے آ رہے ہیں، تھائی لینڈ اور سنگاپور بھی انہی خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں اور ایشیاء میں ہانگ کانگ اور سنگاپور سب سے پر کشش اسلامی فنانس مارکیٹ کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔اس وقت برطانیہ کی کئی یونیورسٹیوں میں اسلامی بینکنگ سے متعلق ماسٹر ڈگری پروگرام اس وجہ سے شروع کئے گئے ہیں کہ اُن کی بینکوں سے ایک بڑی رقم نکل کر مسلمان ممالک کی اسلامی بینکوں میں نہ چلی جائے، چنانچہ وہ اس سرمائے کو اپنی بینکوں میں محفوظ رکھنے کیلئے اپنے یہاں اسلامی بینکاری نظام کو فروغ دے رہے ہیں۔

ذرا ہوشیار اب سڑک پر خواتین ڈرائیور آرہی ہیں

پشاور کے نواح میں لوگوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک نوعمر اور دبلی پتلی لڑکی تین پہیوں والا چنگ چی رکشہ چلا رہی ہے۔ یہ شائد پاکستان کی پہلی خاتون رکشہ ڈرائیور ہے۔ ابتدائی حیرانگی کے اظہار کے بعد، لوگوں کو جلد احساس ہوا کہ وجیہہ کافی مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔ رکشہ چلا کر روزی کمانے کے لئے وجیہہ اپنے خاندان کی کفالت میں غیر معمولی حوصلے کا مظاہرہ کررہی ہے۔اپنے نیلے چپلوں کے ساتھ رکشہ کو سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے پر اعتماد انداز میں کہا کہ مجھے کسی نے بھی رکشہ چلانے یا کوئی دوسرا کام کرنے کا نہیں کہا۔ لیکن میرے والد کی صحت کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ مجھے انکی مدد کرنی چاہیے، اس وجہ سے میں نے رکشہ چلانا سیکھا۔ نیلے رنگ کے پرانے لباس اور سنہری رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے وجیہہ ایک مقامی سکول میں پرائمری کی طالبہ ہے۔ سکول کے بعد، وہ اور اس کا والد قریبی سٹینڈ سے سواریاں اٹھاتے ہیں۔انعام الرحمان پنشن یافتہ شخص ہے۔ پینشن اس کے خاندان کی کفالت کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس نے سواریاں اٹھانے کے لیے رکشہ خریدا۔ معذور ہونے کے باوجود، انعام نے کبھی اپنی بیٹی سے مدد کرنے کا نہیں کہا، لیکن وجیہہ نے اپنی مرضی سے یہ کام اپنے ذمے لیا ہے۔ حیرانگی اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک لڑکی چھ سواریوں کے ہمراہ کافی مہارت

کے ساتھ رکشہ چلاتی ہے۔ لیکن اب لوگ اس پر حیرت نہیں کرتے۔ مقامی لوگ اس سے متاثر ہیں کہ وہ اپنے والد کی مدد کر رہی ہے۔ صوبہ سرحد میں زاہدہ کاظمی بھی ہیں جو ٹیکسی چلاتی ہیں۔ انھوں نے 1992 میں 33 سال کی عمر میں اپنے خاوند کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد ٹیکسی ڈرائیور کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ اسکے خاندان نے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی مگر اپنے 6 بچوں کو پالنے کی خاطر اسکے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ شروع شروع میں وہ ٹیکسی میں اپنی حفاظت کیلیے پیسٹل رکھتی تھی اور برقعہ بھی پہنتی تھی مگر یہ ابتدائی فکر جلد ختم ہو گئی۔ زاہدہ کو پاکستان کے شمالی علاقوں کے کٹھن روٹوں پر بھی ٹیکسی چلانا پڑی جن میں بالاکوٹ، چترال، دھیر اور وادی سوات جیسے علاقے شامل ہیں۔ قبائلی علاقوں کے پٹھان جو مردانہ فخر اور غیر لچکدار رویے کیلیے مشہور ہیں وہ بھی اسکے ساتھ بہت اچھے سلوک سے پیش آئے۔ زاہدہ کہتی ہیں کہ اب میں بوڑھی ہو رہی ہوں اور تھک بھی جاتی ہوں اسلیے ہر وقت ٹیکسی نہیں چلا سکتی لیکن میں کیا کروں، میرے بیٹے میری مدد نہیں کرتے، اگر مجھے چانس ملتا تو میں ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کرتی۔ دنیا بھر میں ٹیکسی چلانا یا ڈرائیونگ کرنا مردوں ہی کا کام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اب دنیا بدل رہی ہے۔ عورتین ہر پیشے میں داخلہ ہو رہی ہیں۔ پاکستان مین گو اس کی مثالیں کم ہیں۔ لیکن ایرانی ٹیکسی کی ایک کمپنی مردوں کے بجائے صرف عورتوں کو ڈرائیور کی ملازمت پر رکھتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ٹیکسی ڈرائیونگ کے دوران خواتین کو مشکل حالات اور

غلط افراد سے سابقہ نہیں پڑتا ایران کی ٹیکسی ڈرائیور خواتین بڑی مرد مار ہیں۔ ایک بار ایک مرد ٹیکسی ڈرائیور نے سنسان علاقے میں پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور مرضیہ خاتون شریعتی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت کا انجام کیا ہوگا۔ اس نے غالباً یہی سوچا ہوگا کہ ایک تنہا عورت اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے... لیکن مرضیہ خاتون جوڈو کراٹے کی انسٹرکٹر تھی۔ اس نے بے ہودہ حرکت کے جواب میں اس کی کئی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ پھر اسے ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال کر پولیس اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ ایسی ہی ایک خاتون 23 سالہ ٹیکسی ڈرائیور ثمرین مظہری ہیں۔ انھوں نے ہائی اسکول سے کمپیوٹر سائنس میں تعلیم حاصل کی ہے اور چند دن قبل ٹیکسی کمپنی کے اشتہار شائع ہونے پر اس نے ٹیکسی کے لیے ڈرائیونگ کا انٹرویو دیا۔ کمپنی کو پچاس خواتین ڈرائیوروں کی ضرورت تھی وہ منتخب ہونے والوں میں سے ایک تھی۔ اس انتخاب میں کمپنی والوں نے اُن عورتوں کو ترجیح دی تھی جو بیوہ ہیں اور دوسرے'' نمبر پر اُن عورتوں کو ملازمت دی گئی تھی جو غریب ہیں۔ ''ثمرین مظہری نے بتایا تھا۔ کسی سنسان جگہ جا کر ہمیں خوف نہیں ہوتا؟ کیوں کہ گاڑی میں الارم سسٹم نصب ہے'' اور وائرلیس سیٹ بھی موجود ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے ہم اپنی پوزیشن مرکزی آفس کو بتاتے رہتے ہیں۔'' ایران میں ٹیکسی چلانے کے لیے ان خواتین کو بھی ترجیح دی جاتی ہے جو غیر ملکی زبان پر عبور رکھتی ہیں مثلاً، عربی، ترکی، افغانی، آذربائیجانی، انگریزی اور فرنچ

زبانوں میں سے کوئی زبان بول اور سمجھ سکتی ہوں۔ تاکہ غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔ ثمرین نے بتایا کہ اس کی شادی کو چار سال ہو چکے ہیں اور اس کے دو بچے ہیں۔ دن کے وقت اس کا شوہر بچوں کو سنبھالتا ہے اور وہ خود شام کو گھر پہنچتی ہے۔ پھر اس کا شوہر ڈیوٹی پر چلا جاتا ہے جو کسی ہوٹل میں ملازم ہے۔ ''ہم مشہد سے تقریباً تیس کلو میٹر دور جنوب کے ایک قصبے 'دوشیب' میں رہتے ہیں۔'' ثمرین نے بتایا تھا۔ ''ہم کوئی امیر لوگ نہیں ہیں لیکن میری ملازمت سے خاصی بچت ہو جاتی ہے۔ لیکن لبنان میں "بنات ٹیکسی" نامی کمپنی نے ایک ایسی منفرد مواصلاتی سروس متعارف کرائی ہے کہ جو صرف اور صرف خواتین کے لئے ہے۔ اسکیم میں شامل گلابی رنگ کی ان ٹیکسیوں کو خواتین ڈرائیور چلاتی ہیں۔ ابتدائی طور پر یہ سروس بیروت کے شمال مشرقی علاقے المطیلب میں شروع کی گئی ہے، جسے بعد میں دوسرے شہروں تک پھیلایا جائے گا۔ اس منفرد سروس کی نگران اور کمپنی کی مالک نوال یاغی فخری ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیونگ کا شعبہ لبنان میں خواتین کے لئے شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا، ہم نے اس سوچ کو تبدیل کرنے کی ٹھانی۔ اس منصوبے کو شروع کرنے کی خاطر میں نے اخبارات میں خواتین ٹیکسی ڈرائیوروں کی بھرتی کا اشتہار دیا تو ہمیں بڑی تعداد میں خواتین نے اس جاب کے لئے درخواستیں ارسال کیں۔ ہم نے تیس برس سے زائد عمر کی مہذب، سمارٹ اور فریش خواتین کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ نوال فخری بیروت میں ایک بیوٹی پارلر بھی چلاتی ہیں اور اسی

بلڈنگ میں انہوں نے "گلابی ٹیکسی" کمپنی کا دفتر کھول رکھا ہے۔ انہوں نے کہ چستی اور پھرتی ڈرائیونگ کے لئے ضروری امر ہے، اس لئے ہم نے دونوں سہولیات کو یکجا کر دیا ہے۔ لبنانی وزیر سیاحت کے دفتر میں میڈیا کوارڈینٹر لینا غانم کا کہنا ہے کہ "گلابی ٹیکسی" کا آئیڈیا انتہائی منفرد سوچ کا مظہر ہے۔ ہماری وزارت کے لئے یہ سروس ایک نیک شگون ہے کیونکہ لبنان سیاحت کے اعتبار سے اہم ملک ہے۔ یہاں پر زیادہ سیاح خلیجی ممالک سے آتے ہیں اور وہاں سے آنے والی خواتین سیاح خواتین کی معیت میں سفر کرنا زیادہ سہل محسوس کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لبنانی عوام اپنی ندرت فکر کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں اور سیاحوں کی خدمت کے ضمن میں "گلابی ٹیکسی سکیم" اسی بات کی نشانی ہے۔

ایک جانب ایران اور دیگر عرب ملکوں میں خواتین ٹیکسی چلا رہی ہیں تو دوسری جانب سعودی عرب میں خواتین کو ڈرائیونگ کی اجازت دیے جانے پر مخالفانہ مہم زور و شور سے جاری ہے، ایک مذہبی عالم نے تو ایک نئ تحقیق پیش کی ہے۔ جس کے مطابق ڈرائیونگ کرنے والی خواتین کو بچوں کی پیدائش کے وقت طبّی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سعودی ویب سائٹ 'سبق' کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں شیخ صالح اللوہائے نے کہا ہے کہ، اگر کوئی خاتون باقاعدگی سے گاڑی چلاتی ہے تو اس کی صحت پر برے اثرات پڑتے ہیں۔۔ خاص طور پر بچوں کی پیدائش کے وقت انھیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شیخ صالح کی جانب سے یہ تبصرہ ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب سعودی عرب میں خواتین کی ڈرائیونگ کے حق کے لیے مہم

چلانے والی تنظیم 'وومن ٹو ڈرائیو' کے کارکنوں کی جانب سے مہم میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت تیزی آ رہی ہے۔ادھر، یہ تنظیم خواتین پر زور دے رہی ہے کہ وہ خواتین کے ڈرائیونگ چلانے کی پابندی کی خلاف ورزی کرین۔ اور گاڑی چلائیں۔ 'ڈیلی میل' کے مطابق، سعودی عرب میں خواتین کے کار چلانے پر گذشتہ 20 برس سے پابندی عائد ہے۔ تاہم، حالیہ مہینوں کے دوران اس پابندی کے خلاف سخت احتجاجی مظاہرے ہوئے ہیں۔اس اخبار نے اپنی خبر میں سنہ 2011 میں مذہبی شوریٰ کی جاری کردہ ایک رپورٹ کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر خواتین کی ڈرائیونگ پر عائد پابندی ہٹالی گئی، تو ریاست میں بے ہودگی اور ہم جنس پرستی کی وبا پھیل جائے گی، طلاق کی شرح میں اضافہ ہو جائے گا اور جسم فروشی عام ہو جائے گی۔ سعودی عرب کی وزارت داخلہ نے اس مہم کے منتظمین سے رابطہ کیا ہے، جو خواتین کی ڈرائیونگ پر پابندی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے انھیں گاڑیاں چلانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ حکام نے کہا کہ ایسی خواتین کو سزائیں دی جائیں گی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مہم میں شریک خواتین انٹرنیٹ پر مسلسل فوٹیجز پوسٹ کر رہی ہیں، جن میں خواتین کو سعودی سڑکوں پر گاڑیاں چلاتے دکھایا گیا ہے۔ اس مہم کی خواتین منتظمین نے عورتوں سے کہا تھا کہ اگر ان کے پاس کسی دوسرے ملک کا ڈرائیونگ لائسنس ہے، تو وہ اس پابندی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے گاڑیاں چلائیں۔یہ خواتین ٹریفک کے حوالے سے سعودی عرب میں نافذ اسلامی شریعہ قوانین کے مبہم ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

خواتین کے لیے اس حق کے حصول کی کوشش میں ہیں۔ سعودی عرب میں خواتین کو ڈرائیونگ کا حق نہ دینے پر اسے پوری دنیا میں تنقید کا سامنا رہتا ہے، حال ہی میں سعودی وزارت داخلہ کی جانب سے جاری کردہ ایک بیان میں کہا گیا تھا کہ خواتین کا گاڑی چلانا ایک غیر قانوی طرز عمل ہے، تاہم اب حکام اس بات اپنا موقف مزید سخت کر رہے ہیں۔ لیکن بنگلہ دیش اس میں ایک قدم آگے ہے، وہاں اب خواتین ٹیکسی نہیں ٹرین چلا رہی ہیں۔ بنگلہ دیش میں ایک طویل عرصے تک خواتین کے ٹرین چلانے پر پابندی رہی اور پھر اس پابندی کو 1995ء میں ختم کیا گیا۔اس پابندی کے ختم ہونے کے بعد سے اب تک سلمیٰ خاتون بنگلہ دیش ریلوے میں واحد خاتون ڈرائیور ہیں جو مسافر ریل گاڑی چلاتی ہیں لیکن مردوں کی اجارہ داری والے اس معاشرے میں یہ کام سلمیٰ کے لیے انتہائی مشکل ہے۔ سلمی کو اس پیشے مین بہت مشکلات کو سامنا کرنا پڑا ہے۔ سلمیٰ اس توہین آمیز رویے کو جس کا انہیں ٹرین ڈرائیور کے طور پر سامنا کرنا پڑتا ہے یاد کرکے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتیں اور رو پڑتی ہیں۔ وہ جب بھی ایک شہر سے دوسرے شہر تک ٹرین چلاتی ہیں تو لوگ انہیں چھیڑتے ہیں، ان پر پتھر پھینکتے ہیں اور ہر طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ سلمیٰ کا کہنا تھا، ”میں یہ سب توہین اس لیے برداشت کرتی ہوں تاکہ بنگلہ دیش میں موجود دیگر خواتین کے لیے ایک راہ ہموار کر سکوں تاکہ وہ کل کو ٹرین ڈرائیور بن سکیں اور ٹرین چلا سکیں بالکل ویسے ہی جیسے مرد چلاتے ہیں“۔ عالمی اقتصادی فورم کے مطابق

ممالک میں بنگلہ دیش کا نمبر 86 واں ہے جہاں بڑی حد تک جنسی فرق نمایاں 135 ہے جبکہ چار مرتبہ وہاں خاتون کی قیادت میں حکومت تشکیل ہو چکی ہے لیکن زیادہ تر لوگ اب بھی قدامت پسند سوچ کے مالک ہیں۔ سلمیٰ کا کہنا ہے کہ اس کے خاندان اور ساتھیوں نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے لیکن مسئلہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جن سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ عورت کے ہاتھ میں کنٹرول ہو۔ سلمیٰ اپنی ٹریننگ مکمل ہونے سے اب تک 5000 کلومیٹر تک ٹرین چلا چکی ہیں۔ انہوں نے دیگر خواتین کے لیے اس شعبے میں آنے کی راہ ہموار کی ہے اور اس وقت مزید 10 خواتین کو ٹرین ڈرائیور بننے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ سلمیٰ کا تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے لیکن ان کے ارادے بڑے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، ''میرا فلسفہ بہت سادہ ہے، اگر عورت ملک کی سربراہ ہو سکتی ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں نے ٹرین ڈرائیور بننے کا چیلنج لیا اور پھر اسے پورا کرکے دکھایا''۔ بنگلہ دیش میں خواتین ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں اور اس کام کو منظم کیا جا رہا ہے۔ بنگلہ دیش کی BRAC نامی ایک غیر سرکاری تنظیم نے حکومت کے ساتھ مل کر دارالحکومت ڈھاکہ میں آٹھ ہفتے کا ایک ڈرائیونگ کورس شروع کر رکھا ہے، جس میں آج کل تقریباً 600 غریب خواتین کو پیشہ ورانہ ڈرائیونگ سکھائی جا رہی ہے۔ ان خواتین میں ملک کے جنوب مغربی علاقے کے ایک غریب گاؤں کی بائیس سالہ جہاں آرا بھی شامل ہے، جو اس کورس کی تکمیل کے بعد ڈرائیونگ کو پیشے کے طور پر اپنانا چاہتی ہے۔ اُس کے خیال میں اس پیشے سے اُسے آزادی

بھی حاصل ہو گی اور یہ اُس کے لیے ایک معقول ذریعہ آمدنی بھی ہو گا۔ جہاں آرا اکیس خواتین کے اُس گروپ کا حصہ ہے، جس نے اس سال یہ تربیتی کورس مکمل کر لیا ہے۔ اس کورس کا مقصد ڈرائیونگ کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے سلسلے میں خواتین کی حوصلہ افزائی کرنا اور یوں معاشرے میں نظر آنے والے صنفی امتیاز کو ختم کرنا ہے۔ خواتین کہتی ہیں کہ پیشہ ورانہ زندگی انہیں آزادی بھی دے گی اور آمدنی بھی خواتین کہتی ہیں کہ پیشہ ورانہ زندگی انہیں آزادی بھی دے گی اور آمدنی بھی۔ لیکن بنگلہ دیش جیسے قدامت پسندانہ اقدار کے حامل مسلم اکثریتی ملک میں جہاں آرا کو اپنے فیصلے کی بھاری قیمت چکانا پڑی ہے۔ وہ بتاتی ہے: ''گاؤں کے بزرگوں نے میرے گھر والوں کے ساتھ تعلقات ختم کر دیے۔ انہوں نے کہا کہ میرے جیسی نوجوان لڑکی کو گھر والوں سے دور اکیلے نہیں رہنا چاہیے اور یہ کہ ڈرائیونگ سے خواتین کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں نے اپنے والدین سے کہا کہ جب میری مالی پوزیشن مستحکم ہو جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب ہم بھوک کا شکار ہوں تو گاؤں کے بزرگ ہمیں کھانا بھی نہیں دیتے۔ جہاں آرا نے اپنے شوہر سے خلع لے لیا تھا کیونکہ وہ جہیز میں سونا اور ایک موٹر سائیکل مانگ رہا تھا۔ بہت سے دیگر مسلم اکثریتی ممالک کے برعکس بنگلہ دیش میں خواتین ملازمت تو کرتی ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر خواتین ٹیکسٹائل کے برآمدی شعبے سے وابستہ ہیں، جہاں انہیں انتہائی کم تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ڈرائیونگ کا کورس مکمل کرنے والی ہر خاتون ڈرائیور کے

طور پر ملنے والی کسی سرکاری یا پرائیویٹ ملازمت کے دوران کم از کم دَس ہزار ٹکے (ڈالر) کما سکے گی۔ یہ آمدنی ملبوسات کی صنعت سے وابستہ کسی خاتون کی تنخواہ 122 سے تین گنا زیادہ ہو گی۔اس پروگرام کے سربراہ احمد نجم الحسین کو امید ہے کہ اس طرح کے کورسز کے نتیجے میں بنگلہ دیش کی سڑکوں پر زیادہ تعداد میں خواتین ڈرائیور نظر آ سکیں گی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ کوئی انھونی بات نہیں رہے گی۔آج کل بنگلہ دیش میں رجسٹرڈ ڈرائیوروں میں سے صرف 265 خواتین ایسی ہیں، جو پیشہ ورانہ طور پر ڈرائیونگ کرتی ہیں۔ اس کے برعکس مرد ڈرائیوروں کی تعداد کا اندازہ 2.4 ملین لگایا گیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یورپ اور امریکا کے مقابلے میں بنگلہ دیش میں ٹریفک حادثات کی شرح کم از کم پچاس گنا زیادہ ہے۔ بنگلہ دیش روڈ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے سربراہ ایوب الرحمان خان کہتے ہیں: ”ہم نے سوچا کہ حادثات کی تعداد کم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں خواتین ڈرائیونگ کریں۔ خواتین ڈرائیورز کا رویہ کم جارحانہ ہوتا ہے۔ مرد ڈرائیوروں کے مقابلے میں مہلک حادثات میں اُن کے ملوث ہونے کا تناسب پچاس فیصد کم ہوتا ہے اور سڑک پر جارحانہ ماحول کی شدت بھی کافی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن مغرب میں ایسا نہیں ہے وہاں خواتین ڈرائیور پولیس کی بھی دوڑ لگوادیتی ہیں۔ حال ہی میں امریکی ریاست کیلی فورنیا میں ایک خاتون ڈرائیور نے ہائی وے پولیس کی دوڑیں لگوادیں، خاتون ڈرائیور کیلی فورنیا کی ہائی وے پر سو میل فی گھنٹے

کی رفتار سے گاڑی دوڑا رہی تھی اس دوران اس نے کئی بار پولیس کی ہدایات نظرانداز کیں، ہائی وے پر کار چیسنگ اورنج کاؤنٹی کے نزدیک شروع ہوئی اور اس کا اختتام رانچو مارگریٹا انٹرسیکشن کے پاس ہوا۔اس دوران ڈرائیور نے ہائی وے پر کئی یوٹرن لئے اور اپنی گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکرائی، ہائی وے پولیس نے کئی گاڑیوں کی مدد سے گھیرا ڈال کر ڈرائیور کو گاڑی روکنے پر مجبور کردیا اور خاتون ڈرائیور کو گرفتار کرلیا۔'' ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں بھی خواتین ڈرائیونگ کے پیشے مین داخل ہو گئی ہیں۔۔ دہلی کی سڑکوں پر صنف نازک کے خلاف بڑھتے ہوئے جرائم پر شکنجہ کسنے کی فکر میں متعدد تجربے ہوتے رہے ہیں۔ مجرمانہ سرگرمیوں کے پیش نظر خواتین اب ان روزگاروں اور کاروبار میں بھی داخل ہوچکی ہیں جن میں کبھی صرف مردوں کی اجارہ داری ہی تصور کی جاتی رہی تھی؛ مثلاً، دہلی کی سڑکوں پر دوڑنے والی ٹیکسیوں میں اب خواتین ٹیکسی ڈرائیور بھی شامل ہو چکی ہیں۔یہ خواتین شہر کے مختلف حصوں میں بطور ڈرائیور ٹیکسی میں خواتین سواریوں کے سفر کا ذریعہ بن رہی ہیں۔لہٰذا اگر آپ کو دہلی کی سڑکوں پر خاتون ٹیکسی ڈرائیور اپنا کام پوری ذمہ داری سے کرتی نظر آئے تو تعجب کی بات نہیں۔ضرورت مند خواتین کو ٹیکسی ڈرائیونگ کے ذریعے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد کر رہی ہیں۔ مینو وڈھیرا نے ایسی خواتین کو منظم کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ بیرون ملک سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ وہاں خواتین بھی ٹیکسی ڈرائیور کا کام بڑی آسانی سے کرتی ہیں۔ 2003 میں ملک آنے

پر انہیں خواتین کو روزگار دلانے کا اس سے اچھا ذریعہ نظر نہیں آیا تو انھوں نے آزاد فاونڈیشن کی شروعات کی۔ فی الحال آزاد فاونڈیشن جنوبی دہلی کی کچی بستیوں اور غریب خاندانوں کی خواتین کی مدد کر رہی ہے۔ کمزور مالی حالات کی ماری خواتین خاندانی پریشانیوں کی وجہ سے کام کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں جبکہ انہیں پورا محنتانہ بھی نہیں ملتا۔ انہی خواتین کو پر وقار زندگی کیساتھ ساتھ اقتصادی طور پر قابل بنانا 'سکھا' کا مقصد ہے۔ سکھا نے خواتین کی ٹیکسی کیب سروس شروع کی جس میں جی پی ایس، موبائل فون ایمر جنسی بٹن اور پیپر اسپرے جیسے سیکورٹی ذرائع بھی دستیاب ہیں۔ ممبئی میں پہلے سے ، ہی کچھ خواتین ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر کام کر رہی ہے۔ جنوبی ہند کی کچھ ریاستوں میں وہ آٹو ڈرائیور بھی ہیں۔ گذشتہ دنوں مشہور انڈسٹری تنظیم 'ایسوچیم' کی طرف سے ایک مطالعہ کروایا گیا تھا۔ اس مطالعہ کے تحت 1998 سے 2004 کے درمیان پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کے روزگار میں عورتوں کی تعداد کے تناظر میں تحقیق کی گئی تھی۔ اس مطالعہ کے مطابق پبلک سیکٹر میں خواتین کی تعداد تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ ان دونوں علاقوں میں خواتین کی تعداد 49.05 لاکھ تھی جو 2004 میں بڑھ کر 50.02 لاکھ ہو گئی ہے۔ 'سکھا' نامی کمپنی بھی اسی لئے شروع کی گئی ہے جس سے خواتین اقتصادی طور پر بھی قابل بن سکیں۔ یہ تنظیم انہی خواتین کو تربیت دیتی ہیں جن کی عمر کم از کم 20 سال ہو اور وہ آٹھویں پاس ہوں۔ چھ ماہ کی ٹریننگ کے دوران یہ خواتین ڈرائیونگ کے ساتھ سیلف ڈیفنس

کی ٹیکنالوجی، بات چیت کرنے کا فن اور انگریزی کا علم بھی حاصل کرتی ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ان میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد انہیں روزگار بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ریڈیو ٹیکسی سروس اسی لئے شروع کی گئی ہے تاکہ اس میں صرف خواتین اور خاندان ہی سفر کر سکیں۔ مینو نے لندن اسکول آف اکونومکس سے فراغت حاصل کی۔ ان کے والد انڈین نیشنل آرمی میں تھے۔ انہی کے نام پر مینو نے تنظیم کا نام آزاد فاونڈیشن رکھا۔ وہ اس کی ڈائریکٹر ہیں۔ آزاد فاونڈیشن کے اس کام میں کئی بڑی کمپنیاں ماروتی اور شیل مدد کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی پولیس بھی خواتین کو سیلف ڈیفنس کی ٹریننگ دینے میں مدد کر رہی ہے۔ دہلی شہر کی سڑکوں پر اب ایسی کیب فراٹے بھرنے لگی ہیں جن کی چلانے والی خواتین ہیں۔ اس جدت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خواتین کیلئے روزگار کا ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ لہٰذا جب کبھی فروزی اور بیگنی رنگ کی وردی زیب تن کئے کسی خاتون کا گاڑی چلاتے ہوئے لوگ دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کوئی عام ڈرائیور خاتون نہیں ہے۔ اگرچہ روزمرہ کی زندگی میں صنف نازک کو چمچماتی گاڑیوں کا اسٹیرنگ تھامے بارہا دیکھا گیا ہے لیکن پیشہ ورانہ طور پر اسے اختیار کرتے ہوئے دیکھنا دہلی والوں کیلئے کسی عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ غریب اور جھگی بستیوں کی ان کی لڑکیوں نے چولہا چوکہ چھوڑ کر ڈرائیونگ کو بطور معاش اختیار کرلیا ہے۔ گزشتہ 2برسوں سے خواتین کو ڈرائیونگ کی تربیت دینے والے شری نواس کے مطابق پسماندہ بستیوں کی خواتین کو ان کے گھر سے

نکال کر روزگار کے میدان میں لانا اور کام کے تئیں ان کی خود اعتمادی اور یقین کو پروان چڑھانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔اس کے باوجود وہ 72 سے زیادہ عورتوں کو گاڑی چلانے کی تربیت دے چکے ہیں جو دارالسلطنت کی پرائیویٹ اور کمرشیل گاڑیوں کو چلارہی ہیں۔ متعدد خواتین کو اس پیشہ میں داخل ہونے سے بھارت میں ایک نئی بحث چل نکلی ہے۔ جن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ کیا خواتین کے ڈرائیور بن جانے سے صنف نازک کے خلاف جاری مجرمانہ سرگرمیوں میں کمی آئے گی یا اس چلن سے فتنوں کا نیا باب کھلے گا۔

ارب پتی افرد کی دولت میں دگنا اضافہ

دولت میں اضافہ ایک ہوس ہے، جس میں دنیاکے ارب پتی سب سے آگے ہیں۔ دنیا کے وسائل پر دنیاکے تھوڑے سے لاگوں کا قبضہ ہے۔ سال 2009 سے ان ارب پتی افراد کی دولت میں اضافے پر اضافہ ہو رہا ہے۔بزنس نیوز ایجنسی 'بلو مبرگ' کے مطابق گذشتہ سال دنیاکے امیر ترین افراد کی دولت 241 ارب ڈالر بڑھکر کل ملاکر 19 کھرب ہو گئی ھے۔ سب سے بڑا اضافہ یعنی 20 فیصد اضافہ ان ارب پتیوں کی دولت میں ھوا جن کا بزنس ٹیلی کمیو نکیشن اور دیگر شعبہ جات سے وابستہ ھے۔ اس فہرست میں اسپین کے 76 سالہ شہری، تیار شدہ لباس کے ٹریڈ سینٹر زنیٹ ورک کے مالک آمانسیو اورتیگا نے امریکی ارب پتی اورین بافٹ سے تیسری پوزیشن چھین لی۔ دوسری پوزیشن پر امریکی بزرس مین بل گیٹس ھیں جنکی دولت کا اندازہ 63 ارب ڈالرتک ھے جبکہ ٹیلی کمیو نکیشن بزنس میں مصروف میکیسکو کے شہری کارلوس سلیم کو پھر سے دنیا کا امیر ترین آدمی قرار دیا گیا ھے۔

اقوام متحدہ نے دنیاکے ارب پتی افراد پر ٹیکس عائد کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے تاکہ سالانہ چار سو بلین ڈالر اکٹھے کرتے ہوئے غریب ممالک کی مدد کی جاسکے۔ سالانہ عالمی اقتصادی اور سماجی سروے کے مطابق دنیا میں غریبوں کی

مدد کرنے کے لیے نئے طریقے تلاش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے جبکہ وعدوں کے مطابق امداد بھی نہیں دی جا رہی۔ رپورٹ کے اندازوں کے مطابق صرف امریکا ہی میں ارب پتی افراد کی تعداد 425 کے قریب ہے۔ ایشیا پیسفک میں 315، یورپ میں 310، شمالی اور جنوبی امریکی ممالک میں 90 جبکہ افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں موجود ارب پتیوں کی تعداد 86 ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ ارب پتی افراد مجموعی طور پر 4.6 ٹریلین ڈالر کے مالک ہیں۔ اگر ان پر ایک فیصد بھی ٹیکس عائد کیا جائے تو 46 بلین ڈالر سے زائد رقم جمع کی جا سکتی ہے۔ کیا اس اقدام سے ارب پتی افراد کو نقصان پہنچے گا؟ رپورٹ میں اس سوال کے جواب میں کہا گیا ہے، ”ٹیکس ادائیگی کے بعد بھی ہر ارب پتی اوسطاً 3.7 ارب ڈالر کا مالک ہے۔ اگر یہ ارب پتی روزانہ ایک ہزار ڈالر بھی خرچ کرے تو اسے اپنی تمام رقم خرچ کرنے کے لیے 10 ہزار سال درکار ہوں گے۔ اس رپورٹ کے مطابق سن 2008 میں آنے والے عالمی معاشی بحران سے پہلے، گزشتہ دو عشروں میں ان ارب پتی افراد کی دولت میں سالانہ چار فیصد اضافہ ہوا تھا۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اگر دولت میں اضافے کی یہی شرح رہتی ہے تو آئندہ سترہ برس سے بھی کم عرصے میں یہ دولت دوگنا ہو جائے گی۔ لیکن اب صرف پانچ سال کے عرصے میں ان ارب پتی افراد کی دولت دگنی ہو گئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کا یہ نیا منصوبہ امریکی ٹائکون وارن بفیٹ جیسے ارب پتی افراد کو اچھا لگ سکتا ہے۔ اس امریکی ارب پتی نے شکایت کی تھی کہ وہ اپنی سکریٹری سے کم ٹیکس ادا کرتے

ہیں۔ساتھ ہی اقوام متحدہ نے یہ بھی تسلیم کہ ہے کہ اس منصوبے کو بڑے پیمانے پر حمایت حاصل نہیں ہوسکے گی۔ اس رپورٹ میں بین الاقوامی ٹیکس کے لیے کئی دوسری تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے کہ ہر ملک فی ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج پر ٹیکس ادا کرے۔ اسی طرح ایک تجویز یہ بھی ہے کی عالمی سطح پر کرنسی کے لین دین پر مخصوص ٹیکس عائد کیا جائے۔اس مہینے کے شروع میں مشہور امریکی رسالے، فوربس (Forbes) نے کھرب پتیوں کی تازہ فہرست جاری کی تھی۔ اس کے حساب سےاس وقت دنیا میں" 1426 "کھرب پتی موجود ہیں جو 5.4 ٹریلین ڈالر کی دولت رکھتے ہیں۔ (ایک ٹریلین ڈالر برابر ایک ہزار ارب ڈالر)۔ پچھلے سال کھرب پتیوں کی مجموعی دولت 4.6 ٹریلین ڈالر تھی۔ گویا صرف ایک برس میں ان کی دولت میں 800 ملین ڈالر کا اضافہ ہوگیا۔ یاد رہے،اس فہرست میں کم از کم 1ارب ڈالر(99 ارب روپے) دولت رکھنے والی شخصیات ہی شامل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایسے افراد پاکستانی کرنسی کے لحاظ سے کھرب پتی ہی ہوئے۔ اگر جی ڈی پی (GDP) کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ 1426 کھرب پتی یورپی یونین، امریکہ اور چین کے بعد دنیا کا چوتھا بڑا جی ڈی پی رکھتے ہیں۔ چھ ارب لوگوں میں موجود یہ تھوڑے سے لوگ ساری دنیا میں بہت اثر رسوخ کے مالک ہیں۔ ان کھرب پتیوں میں کئی سیلف میڈ ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت و محنت سے پیسا کمایا۔ بعض کو وراثت میں جائیدادیں اور کمپنیاں ملیں، چنانچہ وہ بیٹھے بیٹھائے کھرب پتی بن گئے۔ لیکن اس فہرست میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو کسی

طرح نیک نام نہیں کہے جا سکتے ہیں۔ ان کھرب پتیوں نے غیر قانونی اور ناجائز طریقے استعمال کر کے دولت کمائی۔ دنیا کے امیر ترین انسان، کارلوس سلیم نے میکسیکو اور دیگر ممالک میں کئی شعبوں میں اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ وہ ناجائز ہتھکنڈے اختیار کر نے میں شہرت رکھتے ہیں۔ بے شک وہ کئی اچھے منصوبوں پر کروڑوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن انھیں ایماندار اور شریف نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح امریکی کاروباری کھرب پتی، ایس کرٹس جانسن (S. Curtis Johnson) اپنی سوتیلی بیٹی کی بے حرمتی کرنے کے گھناؤنے جرم میں ملوث پایا گیا۔ اٹلی کے دو کھرب پتی ہم جنس عاشق ہیں جنھوں نے مل کر ڈولس اینڈ گابانا کمپنی قائم کی۔ اُدھر روسی اور بھارتی کھرب پتی اپنی دعوتوں اور تقریبات پر تو کروڑوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن غریبوں کو ایک پائی نہیں دیتے۔ ں ایسے کھرب پتی جو عوام الناس کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد امریکہ میں ہے۔ ان میں سے چند سر فہرست افرد یہ ہیں۔ والٹن خاندان دولت :115.79 ارب ڈالر امریکہ کا یہ امیر ترین خاندان آمدنی میں عدم مساوات کی بہترین مثال بھی ہے۔ اس خاندان کے چھ افراد دنیا میں سب سے بڑی ریٹیلر کمپنی کے مالک ہیں۔ اس کمپنی کا بانی سام والٹن تھا جس نے (Walmart) ''وال مارٹ'' ء میں پہلا وال مارٹ سٹور کھولا۔ اس وقت پوری دنیا میں اس خاندان کے 1962 تقریباً نو ہزار سٹور واقع ہیں جن میں ''بائیس لاکھ افراد'' کام کرتے ہیں۔ یہ خاندان کرسٹی والٹن (28.2 ارب ڈالر)، جم والٹن (26.7)، ایلس

والٹن (26.3)، روب والٹن (26.1)،ایلی والٹن (4.5)،اور نینسی والٹن (3.9 ارب ڈالر) پہ مشتمل ہے۔ امریکی عوام کے نزدیک یہ ان دولت مند ''1 فیصد'' امریکیوں کا نمائندہ خاندان ہے جو اپنی شاطرانہ پالیسیوں سے خود تو ہر سال امیر سے امیر تر ہو رہے ہیں، جبکہ ملازمین اور کارکنوں کو انھوں نے استحصالی طریقوں کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ 2007ء میں فوربس فہرست کی رو سے وال مارٹ کے چھ مالکان 69.7 ارب ڈالر کی مجموعی دولت رکھتے تھے۔ تب ان کی دولت نچلے طبقوں کے 30 فیصد امریکیوں کی مجموعی دولت کے برابر تھی۔ چھ برس بعد وہ 115.79 ارب ڈالر کی مجموعی دولت رکھتے ہیں۔ گویا اب یہ دولت نچلے 41 فیصد امریکیوں کی مجموعی دولت کے برابر ہو چکی۔ دوسری طرف لاکھوں امریکی اب تک 2008ء کے عالمی معاشی بحران سے نہیں نکل پائے۔ ان کی تنخواہیں بس اتنی ہی ہیں کہ روز مرہ کے اخراجات پورے ہو سکیں۔بڑی امریکی کارپوریشنیں اپنے نچلے و درمیانے درجے کے ملازمین کی تنخواہیں بہت کم بڑھاتی ہیں۔ اور ان کارپوریشنوں کی سرخیل وال مارٹ کمپنی ہے۔ مٹھی بھر افسروں کو چھوڑ کر عام کارکن کی تنخواہ 8.81 ڈالر فی گھنٹہ ہے جو امریکی معیار سے بہت کم ہے۔ وال مارٹ کی دیکھا دیکھی دیگر کمپنیوں نے بھی تنخواہیں کم رکھی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف مالکان کی دولت دن دگنی رات چوگنی کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت امریکہ میں بدترین قسم کا ارتکاز دولت جنم لے چکا اور وہاں دولت چند ہاتھوں تک محدود ہو چکی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ والٹن خاندان اپنے لاکھوں کارکنوں کی تنخواہوں میں معقول

اضافہ کرکے انہیں مایوسی، ڈپریشن اور مالی مسائل سے نجات دلا سکتا ہے۔ لیکن یہ خاندان اپنی دولت تقسیم کرنے کو تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں باقاعدہ ایسی تنظیمیں بن چکی جو وال مارٹ اور والٹن خاندان کی کارکن دشمن پالیسیوں کے خلاف جلسے منعقد کرتی اور جلوس نکالتی ہیں۔ کوک برادران دولت: 70 ارب ڈالر یہ تین برادران امریکہ میں دوسرے بڑے کاروباری گروپ، کوک انڈسٹریز (Koch industries) کے مالک ہیں۔ یہ گروپ اپنے دامن میں مختلف اقسام کی کمپنیاں سموئے ہوئے ہے جن میں 70 ہزار ملازمین کام کرتے ہیں۔ گروپ کی سالانہ آمدنی 110 ارب ڈالر ہے۔ گروپ کے مالک دونوں بھائی، چارلس کوک (34 ارب ڈالر) اور ڈیوڈ کوک (34 ارب ڈالر) امریکہ کی چوتھی امیر ترین ہستیاں ہیں۔ تیسرا بھائی، ولیم کوک گروپ میں 4 ارب ڈالر کے حصص رکھتا ہے۔ ان امیر بھائیوں کے دو چہرے ہیں جو پچھلے چند برس میں امریکی عوام پہ عیاں ہو چکے۔ ایک طرف یہ عجائب گھروں، آرٹ کی تنظیموں، تھنک ٹینکس اور سماجی تنظیموں کو کثیر مالی امداد دیتے ہیں۔ دوسری طرف چاہتے ہیں کہ حکومت عوام کی بھلائی کے لیے شروع کی گئی سرکاری اسکیمیں مثلاً سوشل سکیورٹی، میڈی کیئر وغیرہ ختم کردے۔ کوک انڈسٹریز کی بیشتر کمپنیاں ماحول دشمن سبز مکانی گیسیں (Greenhouse Gases) خارج کرتی ہیں۔ یہ گیسیں کنٹرول نہ کرنے پر ماضی میں کمپنیوں پر بھاری جرمانے بھی ہو چکے۔ کوک بھائیوں نے بھاری جرمانوں سے بچنے کا یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا کہ وہ ان سائنس دانوں اور سائنسی اداروں کی

سرپرستی کرنے لگے جو عالمی آب و ہوا میں جنم لیتی تبدیلیوں کے انکاری ہیں۔ یہ امریکی بھائی ہر امریکی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ صنعت و تجارت اور کاروبار پر عائد ٹیکس کم کیے جائیں۔ ان برادران نے قدامت پرست امریکی سیاسی جماعت، ٹی پارٹی (Tea party) کو لاکھوں ڈالر بطور چندہ دیئے۔ یہ سیاسی جماعت بھی ٹیکس کم کرنے کے حق میں ہے۔ کوک برادران کی خواہش ہے کہ حکومت کاروبار اور صنعت و تجارت میں کم سے کم دخل دے اور سب کچھ مالکان پر چھوڑ دے، تاکہ وہ من مانیاں اور ملازمین کا استحصال کر سکیں۔ کوک برادران اسلام سے خوف (اسلام فوبیا) کا بھی شکار ہیں۔ 2005 میں ایک امریکی این جی او، دی کلیرن فنڈ (Clarion Fund) نامی نے Obsession: Radical Islam's War Against the West، اسلامی مخالف فلم بنائی تھی۔ امریکہ میں اس فلم کی بہت تشہیر ہوئی۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ کوک برادران لاکھوں ڈالر بطور امداد دی کلیرن فنڈ کو دے چکے۔ گویا انہی کی ایما اور سرمائے سے یہ اسلام دشمن فلم تیار ہوئی اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا منصوبہ بنا۔ واضح رہے، ان بھائیوں کے آبا و اجداد یہودی تھے، لیکن اپنی نسل بچانے کے لیے وہ ہالینڈ میں کیتھولک عیسائی ہو گئے۔ کوک بھائی مشہور امریکی میڈیا گروپ، ''ٹریبون'' کمپنی خریدنے کے خواہش مند ہیں تاکہ اپنا پروپیگنڈا خود کر سکیں۔ یہ کمپنی 23 ٹی وی چینلوں اور لاس اینجلس ٹائمز اور شکاگو ٹریبون جیسے بڑے اخباروں کی مالک ہے۔ جینا رائن ہارٹ دولت: 17 ارب ڈالر اس موٹی تازی آسٹریلوی عورت پر پتھر دل ہونے

کا محاورہ فٹ بیٹھتا ہے۔ یہ 59 سالہ عورت سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی۔ باپ کانوں کا مالک تھا۔ دنیا سے رخصت ہوا، تو اس کی ساری جائیداد اکلوتی بیٹی کو مل گئی۔ چھپّر پھاڑ کر دولت ملی، تو اس نے جینا کا دماغ خراب کر دیا۔ اس امر کا ثبوت وہ اپنے ''خیالات عالیہ'' ظاہر کرکے اکثر دیتی ہے۔ 2011ء میں جینا رائن ہارٹ (Gina Rinehart) نے غریبوں کو ''سنہرا'' پیغام دیا: ''ہم امیروں سے حسد نہیں کرو۔ بلکہ شراب وسگریٹ کم پیو، ملنے جلنے میں وقت ضائع نہ کرو اور زیادہ سے زیادہ کام کرو تاکہ خود بھی امیر ہو سکو۔'' پھر 2012ء میں جینا نے آسٹریلوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ملازمین کے لیے کم از کم تنخواہ کی شرط ہٹا ڈالے۔ اور کمپنیوں کے مالکان کو اجازت دے کہ وہ اپنی مرضی سے ملازموں کی تنخواہیں مقرر کر سکیں۔ جینا نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ افریقی محض دو ڈالر روزانہ پر کام کرنے کو تیار ہیں۔ لٰہذا آسٹریلوی ملازمین کو 20 تا 30 ڈالر روزانہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ دراصل ایسے مطالبے کرکے جینا ملازمین کی تنخواہوں اور مراعات کے ''زائد خرچ'' سے بچنا چاہتی تھی۔ جینا کان کنی کی کمپنی، ہینوک پروسپیکٹنگ (Hancock Prospecting) کی مالک ہے۔ نیز میڈیا گروپوں میں بھی اس نے کثیر سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ جینا حقیقت میں لالچی اور خود غرض عورت ہے۔ اپنی دولت و جائیداد پر سانپ بن کر بیٹھی ہے۔ حتیٰ کہ اسی دولت کی خاطر اپنے بچوں سے لڑ بیٹھی اور ان سے مقدمے بازی میں مصروف ہے۔ جو ماں اپنے بچوں کو ان کے حق سے محروم کردے، اس کے پتھر دل ہونے

میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ سرمایہ کاروں کی ایک مخصوص خامی بھی جینا میں موجود ہے۔ وہ سالانہ اربوں روپے کماتی ہے۔ لیکن اٹھتے بیٹھتے اس بات کا پرچار کرتی ہے ''حکومت نے بھاری ٹیکس لگا رکھے ہیں، گزارہ نہیں ہوتا۔'' واہ کیا معصومیت ہے! رپرٹ مردوخ دولت: 11.2 ارب ڈالر عام طور پہ بے ایمانی، دھوکے، رشوت، دھونس سے جب کسی انسان کا کام نکل آئے، تو وہ اسے اپنی کامیابی سمجھتا ہے۔ یہی معاملہ رپرٹ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ 82 سالہ آسٹریلوی نژاد (Rupert Murdoch) مردوخ امریکی کاروباری، رپرٹ مردوخ دنیا میں دوسرے بڑے میڈیا گروپ، نیوز کارپوریشن کا مالک ہے۔ یہ کمپنی امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں مشہور ٹی وی چینلوں، اخبارات اور رسائل کی مالک ہے۔ لیکن اب سبھی لوگوں کو معلوم ہوچکا کہ مردوخ نے مجرمانہ سرگرمیوں کے ذریعے ہی اپنی میڈیا سلطنت قائم کی۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کی اپنی طاقت اور اپنے اثر ورسوخ کا اس نے غلط استعمال کیا۔ مردوخ چاہتا، تو اس طاقت کے ذریعے عوام کی بھلائی کے کئی کام کر سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے چینلوں، اخبارات اور رسالوں کے ذریعے جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، جھوٹی خبریں پھیلانا، عوام کو عدم برداشت سکھانا اور لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا اپنا وتیرہ بنالیا۔ حتی کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے بظاہر مضبوط جمہوری ممالک میں بھی سیاست دان اس سے ڈرنے لگے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر انہوں نے مردوخ کا شیطانی جال توڑنے کی کوششیں کیں، تو وہ پروپیگنڈے کے بل پر ان کا سیاسی کیریئر تباہ کرڈالے گا۔

اسکینڈلوں نے مردوخ (Hacking) آخر دوسال قبل برطانیہ اور امریکہ میں ہیکنگ کی عزت تار تار کردی۔ انکشاف ہوا کہ نیوز کارپوریشن کے چینلوں، اخبارات اور رسائل میں کام کرنے والے ملازم چوری چھپے مشہور شخصیات سے لے کر عام افراد تک کے ٹیلی فون سنتے اور ان کی جاسوسی کرتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ کوئی چٹ پٹی اور سنسنی خیز خبر مل سکے۔ چنانچہ ان اسکینڈلوں میں مردوخ کو پولیس، ایف بی آئی اور دیگر تحقیقی اداروں کی تفشیش کا سامنا کرنا پڑا۔ آج زرد صحافت اور رپرٹ مردوخ ہم معنی اصطلاحیں بن چکیں۔ بے شک وہ 11ارب ڈالر کی کثیر دولت رکھتا ہے، لیکن اس کی عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی۔ ایسے لوگ آزادی صحافت کے نام پر دھبہ ہیں" سلویو برلوسکونی دولت: 6.5 ارب ڈالر مقولہ ہے کہ اقتدار مل جائے تو وہ بے ایمان انسان کو مزید کرپٹ بنادیتا ہے۔ یہ مقولہ سابق اطالوی وزیراعظم ، سیلویو برلوسکونی پر فٹ بیٹھتا ہے۔ یہ کاروباری شخص تقریباً دس برس اٹلی کا وزیراعظم رہا۔ لیکن اس نے تعمیری کام کم کیے، بس کرپشن اور جنسی سکینڈلوں میں لتھڑا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹلی کا اندرونی قرضہ 126.10 ارب ڈالر پہنچ چکا جو دنیا میں آٹھواں بڑا ہے۔ جبکہ بیرونی قرضہ بھی 2.46 ٹریلین ڈالر ہو چکا جو دنیا میں نواں بڑا عدد ہے۔ موصوف پارٹیاں کراتا رہا جنھوں نے قدیم (bunga-bunga) "اپنے دور میں "بنگا بنگا رومیوں کی رنگ رلیوں کو بھی ماند کرڈالا۔ طوائفوں سے تعلقات رکھنے اور انہیں منہ مانگی رقم دے کر بلاتا رہا۔ اس اطالوی سیاستدان کا مجرمانہ

ریکارڈ طویل اور حیرت انگیز ہے۔ یہ ٹیکس فراڈ، رشوت خوری اور غبن میں ملوث رہا۔ اب بھی برلوسکونی پر بیس مقدمے چل رہے ہیں۔ نچلی عدالتیں دو مقدمات میں اسے پانچ برس کی سزائیں سنا چکی۔ اب معاملہ اعلیٰ عدالتوں میں ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ مجرمانہ اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے باوجود پچھلے ماہ اطالوی پارلیمانی انتخابات میں برسکولونی کی پارٹی دوسرے نمبر پر آئی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ شخص اٹلی میں سب سے بڑا میڈیا مغل بھی ہے۔ لہٰذا اس کے ٹی وی چینل اور اخبارات مسلسل اطالویوں کو باور کراتے رہتے ہیں کہ برلوسکونی سیاسی انتقام کا نشانہ بنا ہوا ہے، شیلڈن ایڈلسن دولت: 36.5 ارب ڈالر 79 سالہ شیلڈن کٹر یہودی ہے، اس لیے امریکی شہری ہونے کے باوجود اس کی تمام تر ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کا یہ بیٹا خودپروردہ ہے، لیکن کیسینوؤں کا مالک بنا، تو غربت کی زندگی بھول گیا۔ اپنی کمپنیوں کے ملازمین کا استحصال کرتا اور نفس پرست ہے۔ اسے یہ امر بہت ناپسند ہے کہ حکومت Sheldon) امیروں پر زیادہ ٹیکس لگا کر ان سے رقم چھین لیتی ہے۔ شیلڈن ایڈلسن شروع میں ڈیموکریٹک پارٹی کا رکن تھا۔ لیکن جب ایک لیبر یونین سے Adelson(لڑائی کے دوران ڈیموکریٹک لیڈروں نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا تو وہ ریپبلکن پارٹی کا رکن بن گیا۔ شیلڈن اب صدارتی انتخابات میں اس امریکی رہنما کو دل کھول کر چندے دیتا ہے جو اسلامی ممالک کی مخالفت اور اسرائیل کی حمایت کریں۔ مثلاً حالیہ صدارتی انتخاب میں شیلڈن

نے ریپبلکن امیدوار، مٹ رومنی کو پانچ کروڑ تیس لاکھ ڈالر بطور چندہ دیا۔ یہ کسی واحد شخص سے رومنی کو ملنے والی سب سے بڑی رقم تھی، تاہم وہ بھی اسے وائٹ ہاؤس نہ پہنچا سکی۔ شیلڈن اسلامو فوبیا کا بھی مریض ہے۔ وہ فلسطینی ریاست کا مخالف ہے۔ کہتا ہے کہ ریاست بننے سے اسرائیل اور یہودی خطرات میں گھر جائیں گے۔ چنانچہ اسرائیلی حکومت فلسطینیوں پر ظلم و ستم کرے تو اس کے ضمیر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امریکہ میں شیلڈن ہی اسرائیل نواز تنظیموں اور قدامت پسند گروپوں کو سب سے زیادہ چندے دیتا ہے۔ اب تک وہ تقریباً دس کروڑ ڈالر ان تنظیموں میں بانٹ چکا۔ دلچسپ بات یہ کہ شیلڈن نے اپنی ساری دولت جوئے بازی کے کاروبار سے کمائی ہے۔ اب امریکی حکومت شکایات موصول ہونے پر اس کے کاروبار کی چھان بین کر رہی ہے۔ سرکاری جاسوسوں کا کہنا ہے کہ شیلڈن چوری چھپے غیر قانونی طریقے اختیار کرتا اور اپنا کاروبار بڑھاتا ہے۔ شاید مستقبل میں قانون کے لمبے ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیں۔ پیٹر پیٹرسن دولت: 1.3 ارب ڈالر سٹیفن شوارزمان کے ساتھ بلیک سٹون گروپ کی بنیاد رکھنے والا یہ 87 سالہ سرمایہ کار امریکہ میں اب بھی اثرورسوخ رکھتا ہے۔ صدر نکسن کے دور میں امریکی وزیر خزانہ رہا۔ اب امیر ترین ایک فیصد امریکیوں میں شامل ہو کر ان کی ذہنیت افشا کرتا ہے۔ پیٹر بارہا کہہ چکا کہ امریکی حکومت سوشل سکیورٹی، میڈی کیئر اور میڈی کیڈ جیسے عوام دوست پروگرام ختم کر دے تاکہ بجٹ خسارہ کم کیا جا سکے۔ اور یوں اندرونی و بیرونی قرضے ختم کرنے میں بھی مدد

ملے گی۔ لیکن امریکی عوام کے نزدیک معاشی مسائل سے چھٹکارا پانے کا یہ انتہائی گھٹیا طریقہ ہے۔ امریکی حکومت ہر سال اربوں ڈالر اسلحہ بنانے، فوجیں رکھنے اور جنگیں کرنے پر خرچ کرتی ہے۔ پیٹر پیٹرسن کی توجہ خوفناک نوعیت کے اس سرکاری خرچ پر نہیں جاتی، مگر وہ عوام کی مددگار سرکاری سکیمیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہی امیر اسے امریکہ میں قابل نفرت کھرب پتی بنا ڈالتا ہے۔ سٹیون شوارزمان دولت: 6.5 ارب ڈالر یہ سالہ کھرب پتی امریکی سرمایہ داروں کی مخصوص ذہنیت آشکارا کرتا ہے۔ پردے 66 بیچنے والے ایک یہودی دکاندار کا بیٹا ہے۔ تعلیم پا کر مختلف کمپنیوں سے وابستہ رہا۔ ء میں پیٹ پیٹرسن کے ساتھ سرمایہ کار کمپنی، بلیک سٹون گروپ 1985 کی بنیاد رکھی۔ پیسہ ملا تو کارکنوں اور غریبوں کے حقوق (Blackstone Group) بھول بھال اپنی دولت زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور اسے تحفظ دینے میں لگ گیا۔ اپنی سالگرائیں شاندار طریقے سے منانے کا شوقین ہے۔ ہر سالگرہ پر پاکستانی حساب سے کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں لیکن اپنے ملازمین کی تنخواہیں نہیں بڑھاتا۔ دوسری طرف حکومت ٹیکسوں کی رقم تھوڑا سا بھی بڑھائے تو چیخ اٹھتا ہے۔ اسی لیے ریپبلکن پارٹی کا طرفدار ہے جو امرا پہ ٹیکس بڑھانے کی حامی نہیں۔ سٹیون شوارزمان نے حال ہی میں تین امریکی ریاستوں، نیویارک، (Stephen Schwarzman) ایریزونا اور فلوریڈا میں 3.5 ارب ڈالر کی لاگت سے 20 ہزار گھر خریدے ہیں۔ وہ ان گھروں کو کرائے پر چڑھا کر مالی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یہ سبھی گھر مارکیٹ

ویلیو سے 30 تا40 فیصد کم رقم پر خریدے گئے۔ یوں سٹیون نے پریشان حال امریکیوں کی بے بسی سے خوب فائدہ اٹھایا اور سستے داموں ان کی خون پسینے کی کمائی سے بنی رہائش گاہیں خرید لیں۔ ڈونالڈ ٹرمپ دولت: 3.2 ارب ڈالر امریکہ کے اس 66 سالہ کھرب پتی کی بنیادی خامی یہ ہے کہ شہرت کا بھوکا ہے۔ یہ بھوک اس سے کبھی کبھی مضحکہ خیز حرکتیں بھی کراتی ہے۔ دراصل ٹرمپ چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت خبروں میں رہے۔ للذا وہ کوئی نہ کوئی متنازع ایشو کھڑا کیے رکھتا ہے۔ مثلاً صدر اوباما اپنا برتھ سرٹیفکیٹ جاری کر چکے، مگر ٹرمپ یہی راگ الاپتا رہتا ہے کہ وہ غیر ملکی ہیں اور ممکن ہے کہ مسلمان بھی ہوں۔ ڈونالڈ ٹرمپ (Donald Trump) رئیل اسٹیٹ ٹائکون ہے۔ امریکی شہروں میں کئی قیمتی عمارتوں اور پلاٹوں کا مالک ہے۔ 2011 میں اعلان کیا کہ وہ2012 میں صدارتی انتخابات لڑے گا۔ مگر پھر دستبردار ہوا اور مٹ رومنی کا حمایتی بن گیا۔ اسرائیل کا حامی ہے مگر کھل کر فلسطینیوں کی مخالفت نہیں کرتا۔ منہ پھٹ سمجھا جاتا ہے مگر اسلاموفوبیا کا شکار نہیں۔ کہتا ہے کہ بہت سے مسلمان ذہین، باصلاحیت اور اہل ہیں۔ تاہم یہ بھی سمجھتا ہے کہ اسلامی دنیا کسی مسئلے کا شکار ہے ،اسی لیے مغرب کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ ڈونالڈ شہرت کی خاطر جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس واسطے امریکہ میں ''جھوٹے'' کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ایک اور طریق واردات یہ ہے کہ جب بھی کوئی ڈونالڈ پر تنقید کرے، وہ اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ ٹھونک دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ڈونالڈ سیکڑوں مقدموں میں ٹانگیں پھنسائے بیٹھا ہے۔ موصوف پاکستان کا مخالف ہے۔ 2011 میں بیان دیا کہ پاکستان کو اسی وقت امریکی امداد دینی چاہیے جب وہ اپنے ایٹمی ہتھیار تلف کردے۔ کارل ایکان دولت: 20 ارب ڈالر امریکہ کا یہودی سرمایہ دار جسے امریکی عوام کئی منفرد خطابات سے نواز چکی...مثال کے طور پر کارپوریٹ لٹیرا''، ''عیار سرمایہ کار'' اور ''لالچی ایکان''۔ 2007 میں سی این این'' نے اسے کرہ ارض پر سب سے چالاک سرمایہ کار کا خطاب دیا۔ 77 سالہ کارل ایکان ناکام گلوکار اور ایک اسکول استانی کا بیٹا ہے۔ 1961 میں وال (Carl Icahn) سٹریٹ میں سٹاک بروکر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ جتنا کماتا اس سے کمپنیوں کے حصص خرید لیتا۔ یوں اس کی دولت بڑھتی چلی گئی، مگر ساتھ ساتھ لالچ و حرص میں بھی اضافہ ہوا۔ ذہین تھا، مگر اس کی ذہانت نے منفی رخ اختیار کرلیا۔ کارل ایکان کا طریق واردات یہ ہے کہ وہ مالی مشکلات کا شکار کمپنی سستے داموں خریدتا ہے۔ پھر کمپنی کے ملازمین کو اکثریت کو گھر بھجوا دیتا ہے۔ پھر کمپنی کی جائیدادیں مہنگے داموں بیچ کر اپنا منافع کھرا کرتا ہے۔ یوں دوسرے لوگ تو اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، جبکہ ایکان زیادہ امیر کبیر بن جاتا ہے۔ 1985ء میں درج بالا معاملہ مشہور امریکی فضائی کمپنی، ٹرانس ورلڈ ایئر لائنز کے ساتھ بھی پیش آیا۔ تب کمپنی کے سابق چیئرمین، سی ای نے ایکان کو ''دنیا کا سب سے زیادہ لالچی انسان'' قرار دیا۔ (C.E. Meyer) میئر امریکی کمپنیوں کے ملازمین

کے عرف سے مشہور (Icahn the Barbarian) ”میں وہ ”ایکان دی باربیرین
ہے۔ کچھ دن قبل وال اسٹریٹ جرنل کی ایک رپورٹ سے انکشاف ہوا کہ پچھلے دس
برس میں کارل ایکان ”68 کمپنیوں“ کے ساتھ مقدمے بازی میں مصروف رہا۔ آج
بھی ڈیل کمپیوٹرز، یاہو، نوویٹار، نیٹ فلیکس، ہربل لائف اور کئی بڑی کمپنیوں سے وہ
لڑائی میں مصروف ہے۔ ارب پتی کی یہ فہرست اس بات کی غماز ہے کہ دولت کے جمع
کرنے والے ہر دور میں قارون کی طرح ہی رہے ہیں۔

ڈالر کی اونچی اڑان حکومت پریشان

مشرف دور میں محترمہ بے نظیر بھٹو ایک بار کراچی پریس کلب آئی تو انھوں نے اپنی تقریر میں بہت سے سیاسی باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ ڈالر کی قیمت سو روپے سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس وقت ڈالر کی قیمت روپے کے مقابلے میں 62 روپے تھی۔ میاں نواز شریف کے دور کے بعد اس میں دس ہی روپے کا اضافہ ہوا تھا، محترمہ کی اس بات کو کسی نے سنجیدگی سے نہ لیا۔ لیکن میاں نواز شریف کی حکومت کے آنے کے بعد تو ڈالر کو پر لگ گئے ہیں۔ اس کی اڑان بلند سے بلند تر ہو رہی ہے۔ موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ڈالر کی قدر میں جاری تیزی کا سفر 110 روپے کی حد بھی عبور کرگیا ہے۔ موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ڈالر نے پہلی مرتبہ سنچری مکمل کی تھی ۔فاریکس ڈیلرز سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق یکم جون 2013 کو ڈالر کی قیمت فروخت 99.70 روپے جبکہ قیمت فروخت 100.25 روپے تھی جو کہ یکم جولائی کو 100.5 اور 100.95 روپے ہو گئی تاہم اس کے بعد ڈالر کی قیمت میں اضافے کا سلسلہ رکنے میں نہیں آ رہا وفاقی وزیر اسحٰق ڈار کئی مرتبہ دعویٰ کرچکے ہیں کہ ڈالر واپس آئے گا ایک مرتبہ تو وہ ڈالر کی قدر واپس 100 روپے پر آنے کا بھی دعویٰ کرچکے ہیں لیکن ان تمام دعوؤں کے باوجود روپے کی قدر میں کمی کا سلسلہ رکنے میں نہیں آ رہا اس

اثنا میں فاریکس ڈیلرز کا یہ دعویٰ بھی سامنے آیا ہے کہ بینکوں نے انہیں ڈالر کی ادائیگی روک دی ہے وزیر خزانہ اور دیگر حکام مسلسل یہ کہہ رہے ہیں کہ ڈالر کی قدر میں اضافے کے ذمے دار سٹے باز اور اسمگلرز ہیں مگر عملی طور پر ان سٹے بازوں اور اسمگلرز کے خلاف کوئی کارروائی سامنے نہیں آئی مارکیٹ ذرائع کے مطابق سیکنڈ ہینڈ گاڑیوں کی خریداری اور ایکسپورٹ کی اوور انوائسنگ کے ذریعے بھی بھاری زرمبادلہ باہر جارہا ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پاکستانی کرنسی کی قدر میں سالانہ اوسطاً سات اعشاریہ پانچ فیصد کی شرح سے کمی ہو رہی ہے۔ قیام پاکستان کے ابتدائی چند برسوں میں 3 روپے 30 پیسے میں ڈالر ملتا رہا۔ 1955ء میں ڈالر نے پہلی مرتبہ سر اٹھایا اور اس کی قدر 4 روپے 76 پیسے تک جا پہنچی۔ 1971 تک روپیہ اسی پر ڈالر کے سامنے ڈٹا رہا۔ پاکستان دولخت ہوا تو روپیہ بھی قدر کھونے لگا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ڈالر کی قیمت دوگنی ہو کر 9 روپے 91 پیسے ہو گئی۔ سابق صدر ضیاء الحق کے دور اقتدار میں روپیہ مزید کمزور پڑنے لگا اور 1988ء تک انٹر بینک میں ڈالر 17 روپے اٹھارہ پیسے میں ملنے لگا۔ 90ء کی دہائی میں بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی حکومتیں بھی ڈالر کی پرواز نہ روک سکیں اور 1999ء تک اس کی قدر 51 روپے تک جا پہنچی۔ 2008ء میں مشرف حکومت گئی تو 62 روپے 55 پیسے میں ایک ڈالر دستیاب تھا۔ لیکن پھر ڈالر کے سامنے روپیہ بے قدر ہوتا گیا اور میاں نواز شریف کی موجودہ حکومت کے دور

میں ڈالر اوپن مارکیٹ میں 109 روپے جبکہ انٹر بینک مارکیٹ میں 110 کی سطح عبور کر چکا ہے۔ کسی زمانے میں ڈالر کی قیمت اور روپے کی قیمت میں کوئی خاص فرق نہ تھا مگر نوئے کی دہائی کے بعد تو ڈالر کو جیسے پر ہی لگ گے ہوں موجودہ دور میں ڈالر کی قدر میں اضافہ اس تیزی سے ہوا ہے کہ حکومت اور حکومتی ادارے خود حیران اور پریشان ہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ ایسے ہی سابق دور حکومت میں ہوا تھا جب ڈالر نے ایک اونچی اڑان بھری تھی اور اس پر حکومت کو ایکشن لینا پڑا تھا اور ملک کے کئی کرنسی کا کوروبار کرنے والے افراد کو گرفتار کیا گیا تھا اور قوم کو ایک امید دلائی گئی تھی کہ اب کی بار ڈالر میں اضافہ کرکے منافع کمانے والے قانون کی گرفت میں آچکے ہیں مگر پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا وہ بااثر لوگ اپنی دولت کے بل بوتے پر آرام سے.بری ہو کر پہلے سے زیادہ معزز بن گے لیکن اب موجودہ حکومت کو ایک بار پھر انھی حالات کا سامنا ہے کیونکہ ڈالر اپنی اڑان کو اونچا سے اونچا کرتا جا رہا ہے لیکن حکومت بے بس ہے دوسرے لفظوں میں حکومت کو یہ سمجھ ہی نہیں آرہا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے کیونکہ ڈالر کی قدر میں غیر متوقع اضافہ کی وجہ سے پاکستان کے ذمہ واجب الادا قرضے میں خود بخود اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے حکومتی مالیاتی اداروں کی طرف سے طے شدہ ملکی بجٹ.بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک ایکشن کمیٹی بنائی گئی جو اس بات کا جائزہ لینے کے لئے ہے کہ وہ پتا چلایا جائے کہ آخر ایسا کیونکر ہو رہا ہے

جس کام کو بہت دن پہلے ہو جانا تھا حکومت نے بہت دیر کر دی ہے کمیٹی کے جائزے کے بعد یہ عجیب انکشاف ہوا ہے کہ پاکستان سے تقریباً 25 ملین ڈالر یومیہ ملک کے مختلف ہوائی اڈوں کے راستے بیرون ملک سمگل ہو رہے ہیں یہ غیر ملکی زر مبادلہ بیشتر بریف کیسوں میں منتقل کیا جاتا ہے جو کہ حکومتی ناک کے عین نیچے ہو رہا ہے اور حکومت بے بسی کی تصویر بنی ہوئی ہے گورنر سٹیٹ بینک بھی روپے کی قدر میں حالیہ تخفیف کی سب سے بڑی وجہ یہی بتاتے ہیں اسٹیٹ بینک ایف آئی اے کے ساتھ مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کر رہا ہے تاکہ ان سوٹ کیسوں اور بریف کیسوں کی تلاشی لے سکے جو ڈالر کی سمگلنگ کا باعث بنتے ہیں شاید اسطرح زر مبادلہ کی سمگلنگ کے راستے بند کیے جا سکیں سٹیٹ بینک نے یہ چونکا دینے والا انکشاف اس وقت کیا جب امور خزانہ کی قائمہ کمیٹی نے ان سے دریافت کیا کہ حکومت روپے میں لوگوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے کیا کر رہی ہے؟ سرمایہ کا غیر قانونی فرار غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخائر میں کمی کا باعث بنتا ہے لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے اس کے حجم میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ایک تخمینے کے مطابق اس سے قبل ڈالر کی سمگلنگ 5 سے 10 ملین ڈالر یومیہ تھی جو اب ماہانہ 750 ملین ڈالر یا 9 ارب ڈالر سالانہ تک پہنچ چکی ہے گویا سمگل ہونے والے زر مبادلہ کی مالیت آئی ایم ایف سے لیے جانے والے قرضے کی رقم سے بھی کہیں زیادہ ہے یاد رہے کہ ایک تین سالہ بیل آوٹ پیکیج کے تحت پاکستان آئی ایم ایف سے 6.7 بلین ڈالر بطور قرض حاصل کرے گا جس

کی وجہ سے پاکستان کو آئی ایم ایف کی شرائط کی پاسداری بھی کرنی پڑے گی کالے۔
پاکستان میں کالا دھن بہت ہے، اس دھن کو سفید کرنے کے لئے حکومت کچھ نہ کچھ کوشش کر رہی ہے، ابھی حکومت نے اس دھن کو سفید کرنے کی ایک اسکیم کا اعلان کیا ہے۔ ابھی مزید اعلانات ہونے ہیں۔ کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس میں منشیات کی تجارت سب سے اہم ہے اس کے لئے سرمایے کی کمی منشیات کے دھندے سے حاصل شدہ روپے سے پوری کی جاتی ہیں منشیات فروش یورپ کو منشیات کی سمگلنگ کے لیے دالبدین، ایران، ترکی روٹ استعمال کرتے ہیں اور ملک میں نقدی، اشیائے تعیش اور اسلحہ سمگل کرتے ہیں ان سے حاصل ہونے والی رقم کو بلیک مارکیٹ میں بیچ دیا جاتا ہے اور وہ لوگ جو کالے دھن کو سفید کرنا چاہتے ہیں روپے سے ڈالر خرید کر دبئی کے راستے محفوظ مقامات پر بھجوا دیتے ہیں اس سارے کاروبار میں ہوائی اڈوں پر تعینات اہلکار بھی ملوث ہوتے ہیں جو اس کام کی منہ مانگی رقم وصول کرتے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق یہ رقم اتنی بڑی ہوتی ہے جو اپنی سروس پوری کرنے پر حکومت کی طرف سے ان کو دی جاتی ہے ایسی رقم وہ کسی ایک کام سے ہی کما لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان اہلکاروں کی کروڑوں کی جائیداد بن چکی ہوتی ہے جب وہ ان محکموں کو خیر اباد کہہ رہے ہوتے ہیں اس کی کئی مثالیں آئے دن میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں مگر ان پر کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہے کہ جو ان اہلکاروں کو چیک کر سکے کہ ان کے یہ اثاثے کہاں سے بنے ہیں۔ وہ تمام لوگ

جو اپنے کاروبار کا حساب نہیں رکھتے اور ٹیکس ادا نہیں کرتے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ بیرون ملک رکھنا محفوظ تصور کرتے ہیں زرمبادلہ کی کمی اور روپے کی قیمت میں تشویشناک تخفیف پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف رقم بھیجنے والے سے اس کے حصول کا ذریعہ آمدن دریافت کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس نے اس پر ٹیکس بھی ادا کیا ہے یا نہیں اگر حکومت ڈالر کی اس غیر متوقع اڑان کو روکنا چاہتی ہے تو تو اس کے لئے ملکی ہوائی اڈوں کی کڑی نگرانی کا نظام بنائے اور ڈالروں سے بھرے بریف کیسوں کو ہوائی جہازوں کے ذریعے باہر لے جانے کا مؤثر سدباب کیا جائے. کیونکہ زرمبادلہ کے ذخائر میں مسلسل کمی تشویشناک صورت اختیار کر چکی ہے اس وقت برآمدات سے 25 بلین ڈالر اور زرمبادلہ کی ترسیلات کی صورت میں 14 ملین ڈالر سالانہ موصول ہو رہے ہیں جبکہ درآمدات کا بل 44 بلین ڈالر تک پہنچ چکا ہے جو کہ ملکی معیشت کے لئے خطرناک ہے اس فرق کو سٹیٹ بینک کے محفوظ ذخائر سے پورا کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے زرمبادلہ کے ذخائر بہت تیزی سے کم ہوتے ہیں زرمبادلہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے لیے اوپن مارکیٹ سے ڈالر کی خریداری سے روپے کی قیمت میں مسلسل کمی اور افراط زر کا سبب بنتی ہے جس کی وجہ سے مہنگائی کی ایسی لہر آتی ہے جس کو وکنا خود حکومت کے بس میں نہیں رہا۔ ڈالر کی تیزی سے ملکی معیشت اور پاکستانی روپیہ دباؤ میں کیوں ہے؟ اس کی بہت سی وجوہات ہیں، لیکن سب سے بڑی وجہ ملک کے زرِمبادلہ کے ذخائر میں تیزی سے واقع ہونے والی کمی ہے۔ فروری دو

ہزار بارہ میں زرِ مبادلہ کے ذخائر تقریباً ساڑھے سولہ ارب ڈالر تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کو آئی ایم ایف کے قرض کی ادائیگی شروع کرنا تھی۔ پاکستان سال دو ہزار بارہ میں اب تک دو ارب باون کروڑ بیس لاکھ ڈالر آئی ایم ایف کو ادا کر چکا ہے جبکہ رواں سال کی آخری قسط اکیس نومبر کو ادا کی گئی جس کے نتیجے میں زرِ مبادلہ کے ذخائر تیزی سے گرے اور اب یہ ذخائر تیرہ ارب اکیاسی کروڑ ڈالر رہ گئے ہیں۔ سال رواں میں پاکستان آئی ایم ایف اور دیگر اداروں کو مزید چار ارب ڈالر ادا ہو رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں زرِ مبادلہ کے ذخائر میں مزید کمی آ رہی ہے۔ درآمدات کے لیے زرِ مبادلہ کی فراہمی اس کے علاوہ ہے۔ اس عرصے میں حکومت یہ توقع کرتی رہی کے امریکہ سے کولیشن سپورٹ فنڈ کی مد میں ساٹھ کروڑ ڈالر، پی ٹی سی ایل کی نجکاری کے اسّی کروڑ ڈالر اور تھری جی لائسنس کی نیلامی سے تقریباً اتنی ہی رقم حاصل ہو جائیگی جس سے زرِ مبادلہ کے ذخائر پر دباؤ کم کرنے میں مدد ملیگی مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ممتاز ماہر اقتصادیات ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کہتے ہیں کہ سٹیٹ بینک کے پاس حکومت کے ذخائر صرف آٹھ ارب چھیاسی کروڑ ڈالر ہیں، جب کہ باقی چار ارب اکتّر کروڑ ڈالر پاکستانی شہریوں کے ہیں۔ اس وقت ملک کے معاشی حالات ایسے ہیں کہ زرِ مبادلہ کے حصول کے ذرائع اور امکانات محدود ہیں جبکہ حکومت کا بڑا انحصار برآمدات اور ترسیلات پر ہے۔ حکومت نے ڈالر کی کمی پورا کرنے کے لئے ایک لمبی فہرست ایسے اداروں کی بنائی ہے۔ جن کو فروخت

کرکے ڈالر حاصل کیۓ جاسکیں، ان میں پی آئی اے، پاکستان اسٹیل، انشورنس کی تینوں سرکاری کارپوریشن، اور دیگر ادارے ہیں۔ لیکن ان اداروں کی نجکاری آسان نہیں ہے، اس لئے زرِ مبادلہ کے دیگر سوتے بھی خشک نظر آتے ہیں یعنی سرکاری صنعتوں کی نجکاری، براہ راست بیرونی سرمایہ کاری، اسٹاک مارکیٹ میں بیرونی سرمایہ کاری اور عالمی مالیاتی منڈیوں میں بانڈز کا اِجرا وغیرہ بھی موجودہ حالات ممکن نظر نہیں آتا۔ "زرِ مبادلہ کے ذخائر میں تیزی سے ہوتی کمی کے نتیجے میں روپے کی قدر میں کمی ناگزیر ہے۔ آنے والے مہینوں میں ڈالرایک سو بیس روپے سے تجاوز کر جانے کے دعوی کییئے جارہے ہیں۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ آنے والے مہینوں میں صورتحال مزید خراب ہوسکتی ہے۔

یہ صورتحال ملک کے معاشی منتظمین کے لیے توپریشان کن ہے ہی مگر عوام کے لیے بھی شدید مشکلات کا پیش خیمہ ہے۔

ملک پہلے ہی مہنگائی اور بیروزگاری کی زد میں ہے اور عوام کے لیے روپے کی قدر میں مزید کمی کا مطلب صرف اور صرف مہنگائی، مہنگائی اور مہنگائی ہے ،اکتوبر دو ہزار تیرہ میں اقوام متحدہ کے ایشیاء سے متعلق معاشی اور معاشرتی سروے نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں افراط زر کی شرح کئی برسوں سے کافی زیادہ ہے اور گزشتہ برس سیلاب کی تباہ کاریوں اور خوراک کی درآمد کی وجہ سے افراط زر چودہ فیصد رہی تاہم اس سال اس کے کم ہو کر بارہ فیصد ہونے کا امکان ہے۔مالی سال سنہ دو ہزار دس میں پاکستان میں شرح نمو

تین اعشاریہ آٹھ فیصد تھی جو کم ہو کر گزشتہ برس دو اعشاریہ آٹھ فیصد تک رہ گئی۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں امن وامان کی خراب صورت حال، عالمی مارکیٹ میں پیٹرول کی قیمتوں میں اضافہ، ملک کے بڑے حصے میں آنے والے سیلاب، بجلی اور قدرتی گیس کی شدید قلت شرح نمو میں کمی کی بڑی وجوہات ہیں۔حکومت پاکستان نے گزشتہ برس بھی شرح نمو چار فیصد ہونے کا دعوی کیا تھا تاہم اصل میں یہ بہت کم رہی۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کو بجٹ کے خسارے کا سامنا ہے اور اس ضمن میں پاکستانی حکومت کو اسے کم کرنے کے لیے شدید مشکلات درپیش ہیں۔رپورٹ کے مطابق بجٹ کے خسارے کی بڑی وجوہات میں سکیورٹی اخراجات میں اضافہ، مختلف اشیاء پر سبسڈی اور سیلاب کے معیشت پر برے اثرات شامل ہیں۔"امن وامان کی خراب صورت حال، عالمی مارکیٹ میں پیٹرول کی قیمتوں میں اضافہ، ملک کے بڑے حصے میں آنے والے سیلاب، بجلی اور قدرتی گیس کی شدید قلت پاکستان میں شرح نمو میں کمی کی بڑی وجوہات ہیں۔"اقوامِ متحدہ کی رپورٹ میں ان ممالک کا بھی ذکر ہے جنہیں بجلی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ان میں پاکستان کے علاوہ نیپال اور بنگلہ دیش بھی شامل ہیں۔پاکستان کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہاں پر بجلی اور قدرتی گیس کی شدید قلت نے صنعتی پیداوار بالخصوص ٹیکسٹائل اور کھاد کی صنعت کو بری طرح متاثر کیا۔رپورٹ میں بجلی اور قدرتی گیس کی قلت پر قابو پانے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کے لیے تجاویز بھی دی گئی ہیں جس میں بجلی

کی چوری کو روکنے کے علاوہ بجلی ضائع ہونے سے بچانے کے اقدامات بھی شامل ہیں۔اقوام متحدہ نے غربت کے خاتمے کے لیے پاکستان پر معاشی اصلاحات پر عملدرآمد، سرکاری محکموں کو مضبوط کرنے، گورننس میں بہتری اور ایسا نظام تشکیل دینے کی ضرورت پر زور دیا جس کے تحت غریب طبقوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔رپورٹ میں بیرون ممالک مقیم پاکستانیوں کی جانب سے گیارہ ارب بیس کروڑ ڈالر بھجوانے سے زیر مبادلہ کے ذخائر میں بھی قابل ذکر حد تک اضافہ نوٹ کیا گیا ہے۔ ڈالر کی قیمت میں اضافہ کو رجحان ایشیا بھر میں ہے۔ایشیائی کرنسی مارکیٹ میں ڈالر کی قیمت میں تیزی کے رجحان سے سرمایہ کاروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ٹوکیو مارکیٹ میں ڈالر کی شرح تبادلہ ین کے مقابلے میں معمولی اضافے کے بعد97.29 ین فی ڈالر ہو گئی۔یورو کی شرح تبادلہ بھی ڈالرکے مقابلے میں نسبتاً گر گئی جو پچھلی شرح ڈالر فی یورو سے کم ہوکر1.3563 ڈالر فی یورو پر آ گئی تاہم یورو کی قدر 1.3572 ین کے مقابلے میں نسبتاً بہتر ہو گئی ہے۔ ماہرین اقتصادیات کے مطابق ڈالر کی شرح تبادلہ میں حالیہ بہتری امریکی صدر کی جانب سے فیڈرل ریزرو کیلئے جینٹ ییلسن کی بطور چیئرمین نامزدگی ہے جس کے بارے میں سرمایہ کاروں کا موقف ہے کہ وہ ادارے کی صورتحال بہتر کرنے میں کامیاب رہیں گے ۔ دوسری جانب یہ بھی کہا جارہا ہے کہ امریکی کرنسی کو پچھاڑنے کی چینی جنگ بھی شروع ہو چکی ہے۔اب چین کی اگلی منزل (دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت بننا اور اپنی کرنسی'' یوان'' (یا رینمبی

کو عالمی کرنسی بنانا ہے۔ چند ماہ سے اس امر کے اشارے ملے ہیں کہ ڈالر کو پچھاڑنے کی چینی جنگ شروع ہو چکی۔ پچھلے چند ماہ میں چین نے آسٹریلیا، پاکستان، تھائی لینڈ، جنوبی کوریا اور دیگر ممالک سے تبادلہِ کرنسی کے معاہدے کیے ہیں۔ گویا اب پاکستانی روپے سے براہ راست یوان خریدا جاسکے گا۔ ورنہ پہلے امریکی ڈالر خرید کر یوان خریدنے پڑتے تھے۔ سرکاری بینکوں کی عالمی تنظیم، دی بینک فار انٹر نیشنل سیٹلمینٹس نے اعلان کیا کہ یوان تجارتی لین دین کے لیے استعمال ہونے والی دنیا کی دس بڑی کرنسیوں میں شامل ہو چکا۔ یہ خبر بھی آشکارا کرتی ہے کہ چینی حکومت اب اپنی کرنسی کو عالمی معاشی و تجارتی سطح میں زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا چاہتی ہے۔ سرکاری بینکوں کی عالمی تنظیم کی تازہ رپورٹ کے مطابق دنیا میں روزانہ 5.3 ٹرلین ڈالر کا تجارتی لین دین ہوتا ہے۔ اس میں سے 4.7 ٹرلین کا لین دین امریکی ڈالر میں ہوتا ہے۔ جبکہ فی الوقت یوان میں ہونے والا لین دین صرف 120 ارب ڈالر روزانہ تک محدود ہے۔ گویا چینی کرنسی کو ابھی ڈالر سے آگے نکلنے میں خاصا طویل سفر طے کرنا ہے۔ لیکن اس کی بڑھوتری خاصی تیزی سے ہو رہی ہے۔ 2010ء میں یوان میں 34 ارب ڈالر کا لین دین ہوتا تھا۔ یوں صرف تین برس میں یوان کا لین دین تقریباً ”تین سوگنا“ بڑھ گیا۔ دنیا کی دس طاقتور کرنسیوں کی فہرست اب کچھ یوں تشکیل پاتی ہے:1... امریکی ڈالر۔ 2 ...یورو۔ 3 جاپانی ین۔ 4... برطانوی پونڈ۔ 5 ...آسٹریلوی ڈالر۔ 6 ... سوئس فرانک۔ 7 ...کینیڈین... ڈالر۔ 8 ... میکسیکن پیسو۔ 9 ... چینی

یوان اور 10... نیوزی لینڈ ڈالر۔ چینی حکومت اس وقت 3.44 ٹریلین امریکی ڈالر کا زرمبادلہ رکھتی ہے۔ یہ دنیا میں زرمبادلہ کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ مگر چین کو خطرہ ہے کہ امریکی حکومت کے قرضے (15 ٹریلین ڈالر) اور تجارتی عدم توازن (555 ارب ڈالر) کی وجہ سے امریکی ڈالر کمزور ہو سکتا ہے۔ اسی باعث چینی حکومت پچھلے دو تین برس سے اپنے ڈالروں کے ذریعے سونا خرید رہی ہے۔ ظاہر ہے، ڈالر کی نسبت سونا زیادہ محفوظ سرمایہ کاری ہے۔ گو چین اور (روس نے بھی) وسیع پیمانے پر سونا خریدا تو پوری دنیا میں سونے کی قیمتیں مانگ بڑھنے سے کئی گنا بڑھ گئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چینی حکومت یوآن کو عالمی کرنسی بنانے کی خاطر کسی قسم کے معاشی و سیاسی اقدامات کرتی ہے۔ کیونکہ امریکی حکومت اور اس کے چیلے (برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا وغیرہ) کبھی نہیں چاہیں گے کہ ان کی کرنسیوں کی قدر و قیمت گھٹ جائے۔ لہٰذا وہ پوری شدت اور جائز اور ناجائز طریقوں سے چین کا مقابلہ کریں گے۔ بعید نہیں کہ اس معاملے پر کرہ ارض میں تیسری جنگ عظیم چھڑ جائے۔ دراصل امریکہ کو اکلوتی سپرپاور بنانے میں ڈالر کا بڑا ہاتھ ہے۔ پھر مشینوں، انجنوں و گاڑیوں، تیل اور اسلحے کی فروخت ہی سے زیادہ آمدن ہوتی ہے۔ یہ تینوں ایسی چیزیں ہیں کہ جب کہیں جنگ یا خانہ جنگی ہو تو نہ صرف ان کی کھپت بڑھتی بلکہ قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بہرحال پوری دنیا خصوصاً عالم اسلام میں کروڑوں لوگ یہ انتظار کر رہے ہیں کہ عالمی سطح پر ڈالر کی اجارہ داری انجام کو پہنچے اور امریکی حکومت اپنے حواس میں

آئے جسے حد سے زیادہ طاقت نے مغرور، خودسر اور ضدی بنادیا ہے اور شاید اسی سے
پاکستان بھی ڈالر کی غلامی سے آزاد ہو۔

نوجوان فیس بک سے ناراض ہوگئے

مارک ذیرسرگ امریکی کمپیوٹر، انٹرنیٹ ماہر ہیں۔انکی شہرت فیس بک کے بانیوں کے طور پر ہے۔اپریل 2013 میں وہ فیس بک کے سربراہ اور چیف ایگزیکیوٹو بن گئے اور اب انکی ذاتی دولت کا اندازہ 16.8 بلین امریکی ڈالر لگایا گیا ہے۔ شوشل میڈیاکے حوالے سے مشہور فیس بک کا آغاز فروری سنہ 2004 میں امریکی طالبعلم مارک زکرسرگ اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا اور آج دنیا بھر میں اس کے ایک ارب کے لگ بھگ صارفین ہیں۔ مارک زکرسرگ اس وقت ہارورڈ یونیورسٹی کے طالبعلم تھا اور اس نے یہ سہولت اپنے ہاسٹل کے کمرے سے اپنے چند دوستوں کی مدد سے شروع کی تھی اور اس کا مقصد ایک دوسرے کو بہتر طریقے سے جاننے کے سلسلے میں طلبا کی مدد کرنا تھا۔اس کے آغاز کے چوبیس گھنٹے کے اندر ہارورڈ کے بارہ سو طلبا اس پر اندراج ہوگئے تھے اور جلد ہی یہ جال دیگر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک پھیل گیا۔ سنہ 2005 کے آخر میں فیس بک کو برطانیہ میں متعارف کروایا گیا اور آج فیس بک کی سہولت دنیا کی ستر سے زیادہ زبانوں میں موجود ہے۔ سماجی ویب سائٹس کی بات کی جائے تو بے شک فیس بک معروف ترین سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہے۔ تاہم اب نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد فیس بک کو استعمال نہیں کر رہی۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فیس بک کے صارفین

کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ جس سے اس کے مالکان پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ فیس بک پر نوجوان صارفین کے رجحانات پر تحقیق کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ فیس بک اب بدل چکا ہے۔ ان کا مطلب ہے کہ نوجوان اب فیس بک کو زیادہ استعمال نہیں کر رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 2013ء میں فیس بک کو ایک مسئلے کا سامنا رہا ہے، وہ یہ کہ 35 سال سے کم عمر کے بہت سے افراد نے فیس بک چھوڑ کر دوسرے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کا انتخاب کر لیا ہے۔ برلن کے انسٹیٹیوٹ برائے کمیونیکیشن اینڈ سوشل میڈیا سے منسلک کارسٹن وینسلاف Karsten Wenzlaff کہتے ہیں کہ ابھی تک دیگر سماجی نیٹ ورکس کے مقابلے میں فیس بک انتہائی مضبوط تھا۔ وہ کہتے ہیں ''سماجی ویب سائٹس کا اصل مقصد دوستوں اور جاننے والوں سے رابطے میں رہنا ہے۔ لیکن اب موبائل ٹیلیفون میں بھی وَٹس ایپ یا اسی طرح کی کئی دیگر ایپلیکیشنز آ گئی ہیں، جو یہ کام کرتی ہیں۔ صرف یہ ایپس ڈاؤن لوڈ کر لیں اور ٹیلیفون میں موجود تمام نمبر خود بخود اس ایپ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔''

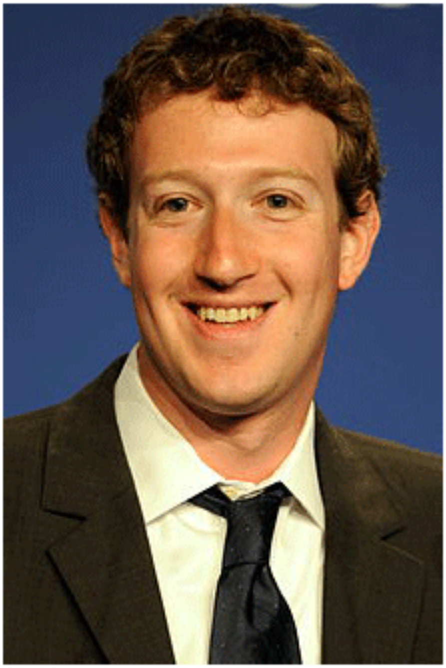

کارسٹن وینسلاف ان ایپس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان ویب سائٹس کو مزید ترقی دینے یا جدید بنانے کے مواقع محدود ہیں اور یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ان کے بقول فیس بک کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ پلیٹ فارم بہت پرانا ہو چکا ہے۔ فیس بک کے مالیاتی شعبے کے سربراہ ڈیوڈ ایبرزمین David Ebersman نے تبدیل ہوتے ہوئے اس رجحان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ اسی وجہ سے فیس بک کے حصص کی قیمتوں میں عارضی طور پر کمی آئی ہے۔ وینسلاف کہتے ہیں کہ بے شک نوجوان فیس بک چھوڑ رہے ہیں لیکن کمپنی کی کوشش ہے کہ نئی ایپلیکیشنز اور نئے فیچرز متعارف کرانے کا سلسلہ جاری رکھا جائے تاکہ صارفین کی تعداد بھی برقرار رکھی جا سکے۔ فیس بک معاشرے کے ہر طبقے اور ہر مزاج کے لوگوں کے لیے کوئی نہ کوئی نیٹ ورک بنانا چاہتا ہے۔ نوجوان اب تصاویر اور ویڈیو شیئرنگ کے لیے Instagram اور چیٹنگ کرنے کے لیے وٹس ایپ استعمال کرتے ہیں۔ اسنیپ چیٹ وقت کے ساتھ ساتھ معروف ہوتے جا رہے ہیں۔ کارسٹن وینسلاف کے بقول آج کل رجحان یہ ہے کہ سب کچھ ایک ہی سماجی ویب سائٹ

پر موجود ہو۔ آج سے چند سال قبل جب فیس بک کو شہرت ملی، تو اُس وقت فیس بک کے ایپس صرف اِسی سماجی ویب سائٹ تک محدود تھے۔ تاہم اب لوگوں کی خواہش ہے کہ انہیں مختلف کاموں کے لیے مختلف ایپس دستیاب ہوں۔ لیکن اس صورتحال کے باوجود نوجوانوں میں آخر فیس بک کے غیر مقبول ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس حوالے سے ماہرین کہتے ہیں کہ کم سن افراد اور نوجوانوں کے مابین فرق سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ پسند نہیں کہ ان کے والدین یا اساتذہ بھی انہی کے نیٹ ورک پر موجود ہوں۔ کارسٹن ویندسلاف کے بقول بچے اکثر ان جگہوں پر جانے سے کتراتے ہیں، جہاں ان کے والدین بھی موجود ہوں۔ اس کے علاوہ فیس بک پر نجی معاملات کی سکیورٹی بھی ایک مسئلہ رہی ہے۔ کارسٹن ویندسلاف کہتے ہیں بنیادی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سماجی نیٹ ورکس کو اس سلسلے میں مزید کام کرنا ہو گا اور خود کو بہتر اور جدید بنانا ہو گا۔

سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کا تجزیہ کرنے والے ایک ادارے کے مطابق رواں سال کے دوران صرف امریکا میں فیس بک کے صارفین میں 1.2 ملین کی کمی آئی ہے۔ میونخ میں قائم ذرائع ابلاغ کے ایک ادارے کے نیلز بروگن کہتے ہیں کہ فیس بک کو فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان کے بقول سوشل میڈیا کا کاروبار بہت بڑھ چکا ہے اور یہ پلیٹ فارم معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

جرمن سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ سٹوڈی فاؤنیٹ Studi -

فیس بک کی وجہ سے مشکلات میں گھری ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی مثال یہ VZ ہے کہ اس ویب سائٹ کو خود کو 2009 میں اسپین، فرانس، اٹلی اور پولینڈ تک بڑھانا پڑ گیا تھا اگر مالی منڈیوں میں فیس بک کے حصص کی قیمتوں کا گراف بلندی کی طرف جا رہا ہے تو دوسری جانب اس کو استعمال کرنے والے ٹین ایجر گروپ میں خاصی کمی کا رجحان سامنے آیا ہے۔ رواں برس کے دسویں مہینے اکتوبر کے اختتام پر فیس بک کے حصص کی قیمتیں گزشتہ برس کے مقابلے میں پندرہ فیصد زیادہ ریکارڈ کی گئی ہیں۔ امریکا میں تیس ستمبر کو ختم ہونے والے مالی سال کے دوران فیس بک کو حاصل ہونے والے منافع کا حجم 425 ملین امریکی ڈالر لگایا گیا ہے۔ سن 2012 میں اکتوبر ہی کے مہینے میں فیس بک کے حصص کی قیمتیں گرنے کے عمل سے دوچار تھی۔ بعض تجزیوں سے معلوم ہوا ہے کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ کے حصص کی قیمتوں میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن اس کے نوجوان اور خاص طور پر ٹین ایجر یوزرز میں کمی کا رجحان سامنے آیا ہے۔ ٹین ایجرز میں کمی کے رجحان سے فیس بک کے حصص کی قیمتوں میں کمی بھی واقع ہوئی۔ انڈیپینڈنٹ سیلیکون ویلی کے تجزیہ کار راب اینڈرلی (Rob Enderle) کا کہنا ہے کہ حصص میں کمی یقینی ہے کیونکہ حصص کی قیمتوں کو کسی حد تک فیس بک کے ساتھ ٹین ایجرز کی محبت اور لگاؤ سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ اینڈرلی کے مطابق مالی منڈیاں متلون المزاج ہوتی ہیں اور ایسے میں فیس بک یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ ٹین ایجرز اس سے دور جائیں۔ مبصرین کے خیال میں اگر ابھرتی

نسل کے منہ موڑنے کا تعین ہو جاتا ہے تو فیس بک ادارے کے مستقبل پر سوال اٹھ سکتے ہیں۔ مختلف دوسرے تجزیہ کاروں کی طرح راب اینڈرلی بھی اس خیال سے متفق ہیں کہ نوعمر اور ٹین ایجرز فیس بک کے مستقبل کا سرمایہ ہیں اور فیس بک ایسے سرمائے سے کسی صورت ہاتھ دھونے کو تیار نہیں ہے۔ فیس بک کے چیف فنانشل افسر ڈیوڈ ایبرزمین نے اپنے ادارے کے تجزیاتی ٹیسٹوں کے حوالے سے بتایا ہے کہ سر دست امریکا میں کم عمر اور ٹین ایجرز اُن کے ادارے سے دور نہیں ہو رہے۔ ڈیوڈ ایبرزمین کے مطابق فیس بک کے یوزرز میں گزشتہ سال کی اکتوبر پر ختم ہونے والی سہ ماہی کے مقابلے رواں برس کی اِسی سہ ماہی میں 25 فیصد اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اسی طرح فیس بک پر اشتہارات کی مد میں بھی 49 فیصد اضافے کا بتایا گیا ہے۔ دوسری جانب فیس بک ادارے کے چیف ایگزیکٹو مارک زوکر بیرگ کے مطابق دنیا بھر میں پچھلے دس برسوں سے فیس بک دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگوں کو ایک رابطے میں منسلک کرنے میں مصروف ہے۔ اپنے مالی وسائل میں اضافے کے تناظر میں زوکر بیرگ کا کہنا ہے کہ ان کا پلان ہے کہ اگلے کچھ عرصے میں کم از کم مزید پانچ ارب افراد کو فیس بک کے ذریعے منسلک کرکے نالج اکانومی کو مزید تقویت دی جائے۔ فیس بک اس کو بھی پلان کر رہی ہے کہ کسی بھی یُوزر کو جب وہ آن لائن ہو تو کسی مشکل صورت حال پر اٹھائے گئے سوال کا فوری طور پر جواب دیا جائے اور زوکر بیرگ کے مطابق اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یہ ادارے کی مجموعی ساکھ کے لیے انتہائی قوت بخش عمل ہو گا۔ فیس

بک پر اب فحش تصاویر اور کال گرل کے رابطوں کا سلسلہ بھی بڑھ گیا ہے۔ فیس بک پر خواتین کی تصویروں کو ڈال کر انھیں ذہنی اذیت سے دوچار کرنے کے واقعات کو بھی دنیا بھر میں اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ دنوں سماجی رابطوں کی مقبول ویب سائٹ فیس بک نے ڈیٹنگ سے متعلق اشتہار شائع کرنے پر معافی مانگی ہے جس میں خودکشی کرنے والی سترہ سالہ لڑکی کو دکھایا گیا تھا۔ کینیڈا کے صوبے نووا سکوشیا کی رہائشی 17 سالہ ریہتایہ پارسنز نے رواں سال اپریل میں اس وقت خودکشی کی جب اس کی فحش تصاویر فیس بک پر لگا دی گئی تھیں۔ اس لڑکی کی ماں کے مطابق اس وقت تصویر شائع ہونے کے بعد پارسنز کو بہت زیادہ تنگ کیا گیا جس پر اس کی بیٹی نے خودکشی کر لی۔ پارسنز کے والد نے بتایا کہ تصویر شائع ہونے کے بعد ان کی بیٹی زندگی سے بیزار ہو گئی تھی۔ فیس بک کے مطابق اس واقعے میں ملوث ویب سائٹ پر پابندی لگا دی ہے۔ لیکن اس جیسے واقعات کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ فیس بک کے ایک ترجمان کے مطابق 'یہ ایک انتہائی بدقسمت مثال ہے جس میں ایک اشتہاری کمپنی نے انٹرنیٹ کے لیے ایک تصویر حاصل کی تاکہ اس کو اشتہار میں استعمال کیا جا سکے'۔ 'یہ ہماری پالیسی کی کھلی خلاف ورزی ہے اور ہم نے اس اشتہار کو ہمیشہ کے لیے ویب سائٹ سے ہٹا دیا ہے اور اشتہاری کمپنی کا اکاؤنٹ بند کر دیا ہے'۔ ترجمان کے مطابق 'جس کو اس واقعے سے تکلیف پہنچی ہے ہم اس سے معافی مانگتے ہیں'۔ پارسنز کی والدہ کے مطابق اشتہار میں استعمال کی جانے والی تصویر ایک تقریب میں شرکت کی تھی

اور اس دوران بہت زیادہ شراب نوشی کرنے کے بعد ہوش میں نہیں رہیں تھی۔ کمپنی کی اشتہاری مہم کا عنوان تھا 'کینیڈا میں اپنا پیار تلاش کریں' یہ ویب سائٹ اب آن لائن نہیں ہے۔ متاثرہ لڑکی کی والدہ نے ٹی وی چینل سی بی سی نیوز کو بتایا کہ 'لوگوں نے اسے ہراساں کیا، جن لڑکوں کو وہ جانتی نہیں تھی انھوں نے اسے پیغامات بھیجنے شروع کر دیے۔ اس کے بعد عدالت میں دو نوجوان پر پورنو گرافی کا الزام عائد کیا گیا۔ جن پر اب مقدمہ چل رہا ہے۔ متاثرہ لڑکی کے والد نے اشتہاری ادارے کو خبردار کیا تھا اور اپنے ایک بلاگ میں اس واقعے پر اپنی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اب نووا سکوشیا کی حکومت نے اس واقعے کے بعد ایک خصوصی پولیس یونٹ قائم کیا ہے تاکہ انٹرنیٹ پر ہراساں کیے جانے کے واقعات کو روکا جا سکے۔ دوسری جانب فیس بک پر کیا شائع ہو کیا نہ ہو اس پر بھی بحث جاری ہے۔ اس سماجی ویب سائٹ کو امریکہ اور دیگر ممالک کی جاسوس ایجنسیاں بھی استعمال کر رہی ہیں۔ اس بارے میں فیس بک نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سال کے پہلے چھ ماہ کے دوران 70 سے زائد ملکوں میں حکومتی ایجنٹس نے فیس بک استعمال کرنے والے ہزاروں افراد کے بارے میں معلومات طلب کی۔ فیس بک کی طرف سے جاری کی گئی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں نے تقریباً 38000 صارفین کے بارے میں معلومات مانگی، جن کی نصف تعداد ایسے افراد کی ہے جن کے بارے میں امریکی حکام نے ڈیٹا طلب کیا۔ فیس بک کا کہنا ہے کہ ادارے کی تیار کردہ رپورٹ میں پہلی جنوری سے

جون تک کی مدت کا احاطہ کیا گیا ہے جس دوران جن حکومتوں نے ایسی درخواست 30 کی اُنھیں شامل کیا گیا ہے۔ سماجی رابطے کی ویب سائٹس، مثلاً فیس بک اور ٹوئٹر سرگرم کارکنوں کے لیے منظم ہونے کا پلیٹ فارم بن سکتی ہیں، جس کے باعث حکومتیں اُنھیں ہدف بناتی رہتی ہیں۔اِس سال کے اوائل میں حکومت مخالف بڑے اجتماعات کے تناظر میں، ترک وزیر اعظم رجب طیب اردگان نے سماجی میڈیا کو 'معاشرے کی بدترین لعنت' قرار دیا۔مائکروسافٹ اور گوگل نے بھی اعداد و شمار جاری کیے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حکومتوں کی طرف سے کب کب اُن کے صارفین کے بارے میں معلومات کا تقاضا کیا۔جائے یا نہیں؟اِس بارے میں، اِن دِنوں ناظرین کی طرف سے مختلف آرا پیش کی جارہی ہیں۔ حال ہی میں فیس بک پر یہ تنازعہ بھی درپیش ہے کہ سر قلم کیے جانے کی وڈیوز کو انٹرنیٹ کے اِس معروف سماجی میڈیا پر پوسٹ کیے جانے کی اجازت دے۔آزادیِ اظہار کے ضمن میں اِن دِنوں فیس بک پر ایک تنازع جاری ہے، جس میں سر قلم کیے جانے کی وڈیوز کو انٹرنیٹ کے معروف سماجی میڈیا پر پوسٹ کرنے کی اجازت دینے یا نہ دینے کے بارے میں مختلف آرا پیش کی جارہی ہیں۔ مئی میں سر قلم کیے جانے سے متعلق وڈیوز کو شائع کیے جانے پر پابندی لگائی گئی تھی، کیونکہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ یہ عمل متعدد ناظرین، خصوصاً جواں سال افراد کے نفسیاتی احساسات پر گراں گزر سکتا ہے۔تاہم، امریکہ میں قائم اِس ادارے نے حالیہ دِنوں میں یہ پابندی اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ یہ پالیسی اِس لیے بدلی جارہی ہے کہ ناظرین عالمی

واقعات کے بارے میں اطلاعات کا تبادلہ کر سکیں، جن میں دہشت گرد حملے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے معاملات شامل ہیں۔

لیکن، ادارے نے جوں ہی یہ پالیسی بدلی، فیس بک کو ایک نئی تنقید کا سامنا رہا جس میں میکسیکو میں منشیات سے متعلق تشدد کے واقعے میں ایک خاتون کا سر قلم کیا گیا، اور وہ خون میں لت پت پڑی تھی۔برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون نے فیس بک کے خلاف حملوں میں شریک ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ کمپنی نے خون آلود واقعے کی وڈیو شائع کرنے کی اجازت دے کر 'غیر ذمہ داری' کا ثبوت دیا، خصوصی طور پر یہ انتباہ نہ دے کر کہ کچھ ناظرین کو یہ ناگوار گزرے گا۔

احتجاج پر رات گئے، فیس بک نے خاتون کی یہ وڈیو ہٹالی اور تشدد پر مبنی تصاویر کو شائع کرنے سے متعلق اپنے مؤقف کی وضاحت پیش کی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایسی وڈیوز شائع کرنا قابلِ قبول نہ ہوگا، اگر یہ عام لوگوں کے مفاد اور تشویش کا باعث ہوں، ایسے میں جب فیس بک استعمال کرنے والوں نے اکثر تشدد کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔ سماجی ابلاغ کے ایک امریکی ماہر، پال لیونسن نے، جو 'فوردھام یونیورسٹی' کے پروفیسر ہیں، وائس آف امریکہ کو بتایا کہ قانونی طور پر فیس بک یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کہ سائٹ پر کون سی وڈیو شائع ہو اور کون سی نہیں، جن میں سر قلم کرنے کی وڈیوز بھی شامل ہیں۔ تاہم، انھوں نے سوال کیا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ کسی خاص واقعے کو سمجھنے کے لیے بھیانک قسم کی تصاویری جھلک دکھائی جائے۔ فیس بک پر آنا یوں بھی خطرناک ہوگیا ہے کہ اب کسی بھی وقت امریکہ آپ کو جاسوسی کے الزام میں یا دہشت گردی کا الزام لگ کر گرفتاری کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ حال ہی میں امریکا میں ایک پاکستانی شہری کو شام میں صدر بشارالاسد کے خلاف جہادی گروپ کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہونے کا منصوبہ رکھنے کے الزامات کا سامنا ہے۔ اگر عبدالباسط شیخ پر جرم ثابت ہو جائے تو انھیں 15 سال تک جیل اور 2 لاکھ 50 ہزار امریکی ڈالر جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔ عبدالباسط جاوید شیخ پر جن کی عمر 29 سال ہے الزام ہے کہ انھوں نے القاعدہ سے منسلک شامی حکومت کے خلاف برسرپیکار جہادی گروپ میں شامل ہونے کا منصوبہ بنایا۔ ان پر فرد جرام عائد کیا

گیا ہے کہ انھوں نے بیرونی دہشت گرد ادارے کو امداد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ایک خبر رساں ادارے کے مطابق عبدالباسط شیخ کے والد جاوید شیخ نیاس کی تردید کی اور کہا کہ وفاقی حکومت نے ان کے بیٹے پر شام میں شدت پسندوں کے ساتھ لڑائی میں شامل ہونے کا غلط الزام عائد کیا ہے۔ انھوں نے امریکی سکیورٹی ادارے ایف بی آئی کے طرف سے اس بیان کو رد کیا کہ ان کا بیٹا جبھہ النصر نامی تنظیم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

عبدالباسط شیخ کو دو نومبر کو شمالی کیرولینا میں جہاز پر سوار ہونے سے پہلے گرفتار کیا گیا۔ عبدالباسط شیخ نے امریکی سکیورٹی ادارے ایف پی آئی کے ایک خفیہ اہلکار کو جبت النصر نامی گروپ کا رکن سمجھ کر ان سے رابطہ کیا۔امریکی محکمہ خارجہ اس گروپ کو القاعدہ کا شام میں ذیلی تنظیم سمجھتا ہے۔ حلفیہ بیان میں کہا گیا ہے کہ باسط شیخ نے ایف بی آئی کے اہلکار کو ستمبر کے اوائل میں بتایا تھا کہ انھوں نے ترکی جانے کے لیے جہاز کا یک طرفہ ٹکٹ خریدا ہے اور امید ظاہر کی کہ وہاں ان کا ایسے لوگوں سے رابطہ ہو جائے گا جو انھیں شام لے جائیں گے۔ باسط شیخ پر گذشتہ ہفتے شمالی کیرولینا میں فرد جرم عائد کیا گیا تھا، وہاں پر امریکی اٹارنی جنرل کے دفتر کے مطابق باسط شیخ نے شام جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تاکہ وہ وہاں ’کسی بھی طریقے سے مجاہدین کی مدد کرے۔‘گذشتہ ہفتے عدالت میں سماعت کے دوران شیخ

باسط کو اپنی دفاع کے لیے دو سرکاری وکلا کی خدمات حاصل تھیں۔ ایف بی آئی کے اہلکار جیسن ماسلو نے اپنی حلفیہ بیان میں کہا کہ اس سال پانچ مہینے تک عبدالباسط شیخ نے اپنے فیس بک کے صفحے پر بشارالاسد کے خلاف لڑنے والے شدت پسندوں کے حق میں پیغامات اور ویڈیوز شائع کیے۔

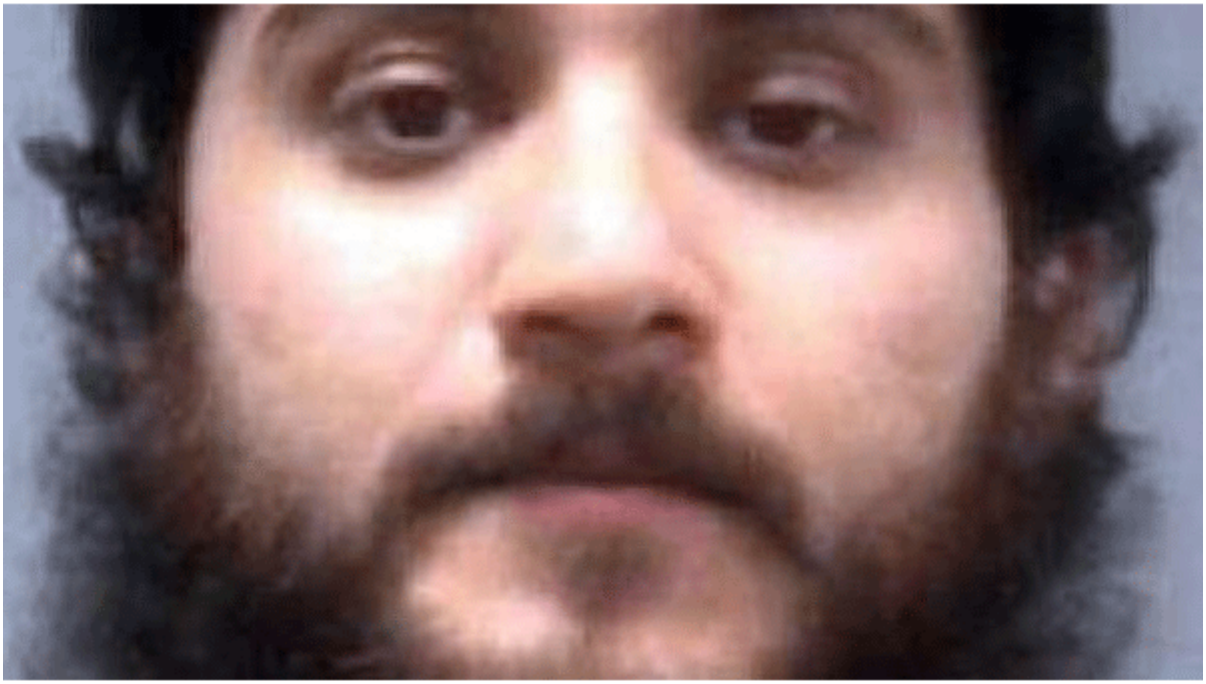

حلفیہ بیان کے مطابق اگست میں باسط شیخ نے اسلامی شدت پسندی کو فروغ دینے والے 'فیس بک' کے صفحے پر ایف بی آئی کے خفیہ اہلکار کے ساتھ تعلقات بنائے۔ حلفیہ بیان میں کہا گیا ہے کہ باسط شیخ نے ایف بی آئی کے اہلکار کو ستمبر کے اوائل میں بتایا تھا کہ انھوں نے ترکی جانے کے لیے ہوائی جہاز کا یک

طرفہ ٹکٹ خریدا ہے اور امید ظاہر کی کہ وہاں ان کا ایسے لوگوں سے رابطہ ہو جائے گا جو انھیں شام لے جائیں گے۔ امریکہ ہی نہیں بلکہ اب فیس بک کے سلسلے میں پاکستان میں بھی مقدمات درج ہونے لگے ہیں۔ پاکستان میں اپنی نوعیت کے پہلے مقدمے میں سماجی ویب سائٹ پر نفرت انگیز مواد اپ لوڈ کرنے کے الزام میں کمالیہ سے ایک نوجوان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پاکستان میں پہلی بار ایک نوجوان کو سماجی ویب سائٹ 'فیس بک' پر نفرت انگیز مواد اپ لوڈ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ کمالیہ کی مقامی مسجد کے امام نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی تھی کہ جکھڑ سے تعلق رکھنے والے حسنین رضا اور اللہ دتہ نے فیس بک پر شر انگیز مواد اپ لوڈ کیا ہے۔ اے آر وائے نیوز کے مطابق پولیس نے ملزمان کے خلاف 295 اے اور 298 اے کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کر لیا ہے جبکہ ملزم حسنین رضا کو جوڈیشل ریمانڈ پر ڈسٹرکٹ جیل ٹوبہ ٹیک سنگھ بھجوا دیا گیا ہے۔ دوسرے ملزم کی تلاش جاری ہے۔ فیس بک کے منتظمین کو اب یہ پریشانی لاحق ہے کہ اگر نوجوان ان واقعات کی وجہ سے اسی طرح فیس بک کی والز پر غیر فعال ہوتے گئے تو اس سوشل ویب سائٹ کا مستقبل کیا ہوگا۔ نوجوانوں کے دوبارہ اپنی طرف بلانے کے لیے فیس بک کی انتظامیہ کیا کرتی ہے، اس سوال کا جواب آنے والا وقت دے گا۔

اب چلے گی ڈیجیٹل کرنسی

دنیا بدل رہی ہے۔ انسان نے اس دنیا کے رنگوں میں کتنی تبدیلی کی ہے۔ شائد اسے جب اپنی ضروتوں کے لئے دیگر اشیاء کی طلب ہوئی تو سب سے پہلے اسے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اشیاء کا تبادلہ کیا جائے، لین دین کا یہ اصول ہی بعد میں سکے، روپیہ، پیشہ ، کرنسی کی بنیاد بنا۔ لیکن اب کرنسی کے بارے میں بھی رائے تبدیل ہو رہی ہے۔ لوگ پھر سے ایک ایسا دور چاہتے ہیں۔ جس میں سرے سے کوئی کرنسی ہی نہ ہو، کیا ایسا ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوگا تو دنیا میں ایک سکون آ جائے گا، چوری، لوٹ مار، دھوکہ دہی اور قتل و غارت گری کا شائد خاتمہ ہی ہو جائے۔ حال ہی میں دنیا کے ممالک میں کرنسیوں پر ایک جنگ جاری ہے۔ مختلف ممالک کے مرکزی بینکوں کے حالیہ بیانات سے ماہرین اقتصادیات نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کرنسی کی جنگوں کے نئے دور کی دلہیز پر آن پہنچی ہے جس سے عالمی معیشت کو نیا خطرہ درپیش ہے۔ کئی ممالک اپنی قومی کرنسیوں کے مبادلے کی شرح میں زبردستی کمی کرنے لگے ہیں تاکہ اپنی معیشتوں کو تقویت پہنچا سکیں۔ یہ طریقہ اپنائے جانے کی ایک وجہ انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کی طرف سے جاری کردہ نئے اعداد و شمار اور پیشن گوئیوں سے متعلق نئی رپورٹ ہے۔ آئی ایم ایف کے مطابق دنیا کی مجموعی

اندرونی پیداوار میں اضافے کی رفتار کم ہوتی جارہی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں افراط زر کی شرح بڑھ چکی ہے۔ اس پس منظر میں سرمایہ کاروں کی سرگرمیاں سست روی کا شکار ہیں جبکہ سرمایہ کاری معاشی ترقی کی اصولی شرط ہوتی ہے۔ حالات میں بہتری لانے کے لیے یورپی یونین کے مرکزی بینک نے اپنی مانیٹری پالیسی کو نرم کرنے کے بارے میں اعلان کیا ہے۔اب عالمی مارکیٹ میں ں ڈالر کے تناسب سے یورو کرنسی کی قدر انتہائی حد تک بڑھ گئی ہے۔ یورپی یونین کے مرکزی بینک کے علاوہ نیوزی لینڈ کے مرکزی بینک اپنی پالیسی تبدیل کر رہے ہیں۔ شرح سود میں کمی کی جارہی ہے۔تاکہ قومی کرنسی کی شرح پر قابو پایا جاسکے۔ کرنسی کی جنگیں دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلسل جاری ہیں، ان کی اولین وجہ معاشی عدم توازن ہوتا ہے۔ عدم توازن کو دور کرنے کے لیے دنیا کے ممالک اپنی اپنی قومی کرنسیوں کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی لاتے ہیں اور آئندہ بھی لاتے رہیں گے۔ تاہم اس طریقے کی کچھ خامیاں ہیں۔ اگر کسی کرنسی کی قدر میں اچانک بہت کمی آئے تو افراط زر میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے جس سے معیشت پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ایک کرنسی کی قدر میں کمی سے دوسری کرنسی کی قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ خدشہ ہے کہ یہ ایک نا ختم ہونے والا عمل ثابت ہوگا کیونکہ اپنی کرنسی کی قدر میں کمی کرنے کے لیے کچھ ممالک کے اقدامات کو دیکھتے ہوئے دیگر ممالک جوابی اقدامات کر سکتے ہیں۔ یوں بین الاقوامی تجارت کے حجم میں کمی آسکتی ہے حتی کہ عالمی کرنسی نظام ختم ہو سکتا ہے۔ یاد رہے

کہ سن 1944 میں قائم کردہ کرنسی نظام 70 کے عشرے کے اوائل میں ختم ہو گیا تھا جب امریکہ نے اپنی قومی کرنسی کی قدر میں انتہائی کمی کر دی تھی اور ڈالر کی قدر کو سونے کی قیمت سے منسلک کرنا بند کر دیا تھا۔ لیکن اب دنیا میں ایک نئی کرنسی وجود میں آ رہی ہے۔ جو بہت جلد عالمی کرنسی کو روپ دھار لے گی۔ یہ بٹ کوئین ہے۔ انٹر نیٹ کی دنیا کی کرنسی جس کا نہ کوئی بنک ہے نہ چیک بک، پاس ورڈ کا یہ کھیل دنیا بھر میں چھا رہا ہے۔ بٹ کوئنز دنیا کی پہلی ڈیجیٹل مگر انتہائی غیر مستحکم کرنسی ہے جس کا (bitcoin) استعمال انٹرنیٹ پر خریداری کے لیے ہوتا ہے۔ چار برس قبل بٹ کوئن ورچوئل کرنسی میں 22 امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے والے ناروے کے ایک شہری کو اس وقت خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب اس سرمایہ کاری پر اسے ساڑھے آٹھ لاکھ امریکی ڈالر کا فائدہ ہوا۔ بٹ کوائنز کی قدر میں اس حیرت انگیز اضافے سے 29 سالہ کرسٹوفر کوچ اوسلو کے ایک مہنگے علاقے میں فلیٹ خریدنے کے قابل ہوئے۔ انھوں نے یہ فلیٹ اپنے پانچ ہزار بٹ کوائنز کا پانچواں حصہ بیچ کر حاصل کیا۔ کرسٹوفر کوچ نے کہا کہ انھیں ورچوئل کرنسی کی قدر میں اضافے کے بارے میں اخبار میں خبر پڑھ کر اپنی سرمایہ کاری یاد آئی۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اچانک معلوم ہوا کہ ان کے پانچ ہزار بٹ کوئنز یا سکوں کی مالیت ساڑھے آٹھ لاکھ امریکی ڈالر ہو گئی ہے۔ بٹ کوئین کو ورچوئیل کرنسی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کرنسی کو صارف اپنے فون یا کمپیوٹر پر موجود 'انکرپٹڈ والِٹ' میں رکھتا ہے۔

کوچ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انھیں اپنے سیف کا تالہ کھولنے کے لیے پاس ورڈ یاد کرانے میں خاصا وقت لگا۔ ناروے کے میڈیا نے کوچ کے حوالے سے بتایا کہ 'میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ میری سرمائے کی قدر میں اس قدر اضافہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ 'یہ بات عجیب ہے کہ نفسیاتی ردِ عمل ہمیں کسی چیز کو اتنی اہمیت دینے پر مجبور کرتا ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔' کرسٹوفر کوچ نے کہا کہ سنہ 2009 میں انکرپشن پر تحقیق کرنے کے بعد انھوں نے ورچوئل کرنسی میں سرمایہ کاری کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن یہ کرنسی دنیا میں منی لانڈرنگ کا بھی سبب بن رہی ہے۔ منی لانڈرنگ اپنی ابتدا سے انتہا تک مغربی فساد ہے۔ صرف امریکا میں ہر برس 10 کھرب ڈالر جائز زر میں تبدیل کرکے ساری دنیا میں پھیلا دیے جاتے ہیں۔۔بڑے بڑے منظم سینڈیکیٹ، مافیا اسلحہ اور منشیات دنیا بھر میں پھیلائے جارہے ہیں۔ ان کے بجٹ، ان کے منافع کئی چھوٹے ملکوں کے سالانہ بجٹ سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ اتنے طاقتور ہیں کہ دنیا کی اور انسانی تاریخ کی طاقت ور ترین حکومتیں اور ادارے بھی ان کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ناجائز دولت کے کھربوں ڈالرز کو جائز بنانے کے لیے انھوں نے نت نئے طریقے اپنا رکھے ہیں۔ ابھی دنیا میں کرنسی کے مصائب کم نہیں ہوئے ہیں۔ کب کس کرنسی کی ویلیو گھٹ جائے اور کب کونسی کرنسی قیمتی ہوجائے، یہ حکومتوں کے کھیل ہیں۔ ''ورچوئل کرنسی'' کے ذریعے لاکھوں ڈالرز کے کالے دھن کو سفید بھی کیا جاچکا ہے۔ 28 مئی کو

ہفنگٹن پوسٹ، اے بی سی نیوز اور دیگر کئی عالمی خبر رساں اداروں نے رپورٹ دی کہ امریکی حکام نے "کوسٹاریکا" کی رقم منتقل کرنے والی ایک کمپنی کو بند کر دیا ہے۔ کمپنی کی ویب سائٹ بھی بند ہے۔ اس پر لکھا آ رہا ہے کہ اس "ڈومین" کو امریکا کی "گلوبل ایلیٹ فنانشل ٹیم" نے بند کر دیا ہے۔ کمپنی کا نام "لبرٹی ریزرو" ہے۔ بی بی سی کا کہنا ہے کہ امریکی حکام کے مطابق "لبرٹی ریزرو ڈیجیٹل منی سروس" 6 ارب ڈالر کی منی لانڈرنگ میں ملوث تھی۔ اب تک 5 گرفتاریاں عمل میں آ چکی ہیں۔

گرفتاریوں میں کمپنی کے بانی آرتھر بڈاسکی بھی شامل ہیں جنھیں اسپین میں

حراست میں لیا گیا۔ اب تک ڈھائی کروڑ ملین ڈالر کی رقم کے 45 بینک اکاؤنٹ منجمد کر دیے گئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر چلنے والے 5 ڈومین بھی بند کیے گئے ہیں۔ دنیا بھر میں 45 کے قریب افراد کی یا تو تلاش جاری ہے یا انھیں حراست میں لیا جا چکا ہے۔ 15 ممالک میں مدد کی 36 درخواستیں روانہ کی جا چکی ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ منی لانڈرنگ کی تاریخ کا اب تک کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اور یہ بٹ کوئین کی بدولت ہی ہوا ہے۔اب کینیڈا میں دنیا کا پہلا بٹکوئن اے ٹی ایم کھول دیا گیا۔ بٹکوئن اے ٹی ایم کی سہولت سے اب کسٹمرز اپنے سمارٹ فونز کے ذریعے کافی اور کیک کاغذ کی روایتی کرنسی کے بغیر خرید سکیں گے۔

مذکورہ اے ٹی ایم وینکوور کی ایک ویونز نامی معروف کافی شاپ پر قائم کیا گیا ہے۔ بٹکوئن اے ٹی ایم مشین کو روبو کوب نے ڈیلیور کیا ہے۔ بٹکوئن دراصل روایتی کرنسی کے متبادل انٹرنیٹ ڈیجیٹل اور ورچوئل کرنسی ہے جو 2008ء میں کمپیوٹر سائنسدان ستوشی ناکاموتو نے متعارف کرائی۔ اس ڈیجیٹل کرنسی کی سیکورٹی کے لئے کریپٹو گرافی استعمال کی جاتی ہے جس کی نقل یا جعل سازی فی الحال ناممکن ہے۔ بٹکوئن استعمال کرنے والے ڈیجٹل والٹ رکھتے ہیں اور رقوم کی منتقلی کے لئے ڈیجیٹل دستخط جس کو ''پبلک اینکرپشن کی'' بھی کہا جاتا ہے سے تصدیق یا توثیق کی جاتی ہے۔ بٹکوئن مائننگ پراسس کے ذریعے تشکیل دی جاتی ہے۔ اس عمل سے فی الحال ہر دس منٹ میں 25 بٹکوئن تشکیل دئے جا سکتے ہیں

قانون نافذ کرنے والے ایک اہل کار نے نیویارک ٹائمز کو بتایا کہ لبرٹی ریزرو بڑی بڑی رقمیں منتقل کرتا تھا اور بغیر کسی شناخت کے، کوئی بھی فرد اپنی شناخت بتائے بغیر کتنی ہی بڑی رقم کیوں نہ ہو دنیا میں کہیں بھی منتقل کرسکتا تھا۔ یہ مجرموں کے لیے ایک پے پال (رقم کی منتقلی کا برقی ذریعہ) تھا۔ یہ تمام تر سلسلہ کچھ یوں تھا کہ ''ایل آر'' کے نام کی ایک ڈیجیٹل کرنسی متعارف کروائی گئی تھی جس فرد کو ملک یا بیرون ملک کہیں بھی رقم منتقل کرنی ہوتی وہ ''ایل آر'' کے دفتر جاکر مقامی کرنسی کے عوض ''ایل آر'' کے یونٹ خریدتا تھا۔ یہ یونٹ کسی بھی مقدار میں خریدے جاسکتے تھے۔ امریکا آن لائن پیمنٹ کے حوالے سے اختیار کیے جانے والے طریقہ کار سے وابستہ خطرات کا جائزہ لے رہا ہے۔ ان میں پے پال اور بٹ کوائن جیسی کمپنیوں کے ذریعے ادائیگیوں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ بعض بینکرز کی طرف سے اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا گیا ہے کہ آن لائن مارکیٹ میں بعض نئی کمپنیوں کے مالیاتی نظام پر مضر اثرات ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے فیڈرل ریزرو آفس کی نائب سربراہ جینیٹ یلین Janet Yellen کا کہنا تھا، ''ہم اس حوالے سے بینکنگ کمپنیوں سے گزشتہ دو برسوں سے بات چیت کرتے رہے ہیں۔ ہم نہایت احتیاط کے ساتھ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ادائیگی کے لیے نئے طریقہ ہائے کار کے حوالے سے کیا تحفظات ہو سکتے ہیں۔''

پے پال دراصل امریکا کی معروف انٹرنیٹ ریٹیل سروس eBay کا حصہ ہے جو آن لائن ادائیگی کی سہولت فراہم کرتا ہے۔تاہم انہوں نے اس بات کی تردید کی کہ ایسی کمپنیاں بنا کسی قانونی دائرہ کار کے بغیر کام کر رہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکا میں بہت سے لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ سخت ریگولیٹری ماحول موجود ہے، خاص طور پر صارف کے تحفظ کے حوالے سے۔ چین کے تجارتی مرکز شنگھائی میں ہونے والی انٹرنیشنل مانیٹری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جینیٹ یلین کا کہنا تھا، ’’اصل بات یہ ہے کہ امریکا میں ایسے قوانین موجود ہیں جو پے پال اور دیگر آن لان ادائیگی کی سروسز فراہم کرنے والوں پر اطلاق ہوتا ہے۔‘‘ پے پال دراصل امریکا کی معروف انٹرنیٹ ریٹیل سروس eBay کا حصہ ہے جو آن لائن ادائیگی کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ جینیٹ یلین کا مزید کہنا تھا کہ آن لائن ادائیگیوں کا سلسلہ امریکی حکومت کی نظروں میں ہے اور اس سے وابستہ خطرات کا محتاط جائزہ لیا جا رہا ہے۔

بٹ کوائن 2009 میں عالمی اقتصادی بحران کے دوران ایک نامعلوم پروگرامر کی طرف سے قائم کی گئی تھی گو کہ بہت سے صارفین اس سروس کو جائز کاموں جیسے دوستوں کو پیسے بھیجنے یا فری لانسرز کے کام کی قیمت چکانے کے لیے استعمال کرتے تھے وہیں سائبر جرائم میں ملوث افراد کی ایک بڑی تعداد بھی اس سروس کو رقوم کی منتقلی کے لیے استعمال کرتی تھی۔ڈیجیٹل کرنسی کی سروسز فراہم کرنے والی کوسٹا ریکا کی کمپنی Liberty Reserve کو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے بند کر دیا اور اسکے مالک کو منی لانڈرنگ کے الزام میں سپین سے گرفتار کر لیا گیا۔ابتدائی معلومات کے مطابق کوسٹا ریکا کا شہری آرتھر بڈوسکی Liberty Reserve کے کاروبار کو منی لانڈرنگ کے لیے استعمال کرتا تھا۔ جس پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے کاروائی کرتے ہوئے کمپیوٹر سرورز کو قبضہ میں لے لیا اور اسکے دفاتر کی تالہ بندی کر دی۔دیگر ڈیجیٹل کرنسی سروسز جیسے PayPal کے مقابلے میں Liberty Reserve کا اکاؤنٹ بنانے کے لیے آپ کو نہ تو رجسٹرڈ پتہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کریڈٹ کارڈ کی۔ کوئی بھی شخص اپنا نام ، تاریخ پیدائش اور ای میل پتہ درج کرکے اکاؤنٹ کھول سکتا ہے

اور اس اکاؤنٹ کو کریڈٹ کارڈ، منی آرڈر یا بینک ٹرانسفر کے ذریعے چارج بھی کیا جا سکتا ہے۔ dollars روس بند ہوجانے سے ہزاروں افراد متاثر ہوئے ہیں جن میں پاکستانی فری لانسرز کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے، جنھوں نے اپنے اکاؤنٹ سے پیسے نہیں نکلوائے تھے۔ صارفین کمپنی بند ہوجانے سے بہت پریشان ہیں اور متعلقہ حکام سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں رقوم کی واپسی کا طریقہ کار بتایا جائے۔ بعض ماہرین کو خطرہ ہے کہ ورچوئل کرنسی جرائم پیشہ افراد یا دہشت گردوں کے کام آ سکتی ہے یا یہ ہیکرز کے ہتھے بھی چڑھ سکتی ہے۔ گزشتہ ماہ امریکی حکومت نے کوسٹاریکا میں قائم لبرٹی ریزرو نامی کمپنی کے خلاف غیر قانونی طور پر رقوم کی منتقلی کے الزامات کے تحت تحقیقات بھی شروع کی ہیں۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے حکومتی کنٹرول سے باہر کہیں بڑی رقوم منتقل کی ہیں۔ عموماً بڑی خریداریاں دیکھنے میں آتی رہیں۔ ''ایل آر'' کی خریداری کے لیے قطعی طور پر یہ ضروری نہ تھا کہ خریدار اپنی درست اور حتمی شناخت و ذرائع آمدنی بیان کرے۔ خریدار دنیا کے قریباً 17 ممالک میں موجود ''ایل آر '' کی شاخوں سے یہ رقم وہاں کی مقامی کرنسی میں وصول یا کسی کو بھی ادا کرسکتا تھا۔ چونکہ یہ تمام ترلین دین ''تھرڈ پارٹی'' نظام کے تحت ہوتا تھا لہٰذا رقم بھیجنے یا وصول کرنے والے کو اپنی شناخت چھپانے کی مکمل آزادی تھی۔ استغاثہ کے مطابق کریڈٹ کارڈ کے فراڈ، شناخت کی چوری، سرمایہ کاری کے فراڈ، کمپیوٹر ہیکنگ، پورنو گرافی خاص کر چائلڈ پورنو گرافی اور منشیات کی

ترسیل وغیرہ کی رقوم کی وصولی اور ادائیگی کا یہ ایک بڑا ذریعہ تھا۔ جب کرنسی کا چلن شروع ہوا تھا تو اس وقت سے آج تک ماہرین کبھی بھی لین دین کے اس طریقے پر مکمل اعتماد کا اظہار نہیں کرپائے۔ ہر دور میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ فطین افراد کی کارستانی ہے۔ ان فطین افراد نے دہرا وار کیا ہے۔ ایک جانب لوگوں سے ان کا اصل زر سونے اور چاندی کی شکل میں حاصل کیا تو دوسری جانب عالمی سطح پر حکومتوں کے زر کے مالک بھی بن بیٹھے۔ خاص کر امریکی ریزرو کے بارے میں بھی شدید تحفظات پائے جاتے ہیں۔ خیال کیا جارہا ہے کہ عالمی اصل زر یعنی سونے کے ذخائر آج غیر حکومتی قوتوں کے قبضے میں ہیں۔ بینکوں کا نظام ان کا ہراول دستہ ہے۔ یہ دستہ مصنوعی زر یعنی کرنسی نوٹ تخلیق کیے جارہا ہے لوگوں کو کاغذ کے چند چیتھڑے دے کر خوش کردیا جاتا ہے۔ اب دور مزید آگے بڑھ رہا ہے۔ اب ورچوئل کرنسی کا دور آگیا ہے۔ اب ادارے آپ کو کاغذ بھی نہیں دیتے۔ صرف آپ کو چند ہندسے بتا دیے جاتے ہیں۔ آپ کی زندگی اب ان ہندسوں کو بڑھانے سے مشروط کردی گئی ہے۔ ہندسوں کے گھٹنے بڑھنے کا ایسا جال بن دیا گیا ہے کہ افراد اس میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ذہنی طور پر ہمیں یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ ہندسوں کا نہ ہونا یا کم ہونا اچھی بات نہیں۔ آپ کی اور آپ کی آیندہ آنے والی نسل کی بقاء اسی سے مشروط ہے کہ آپ کے پاس بہت سارے ہندسے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آپ سسک سسک کر مرجائیں گے۔ انسان خوف اور لالچ کے خمیر سے بنا ہے۔ وہ ڈر جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ

روایتی تہذیبوں میں بھی امید اور ڈر ہوا کرتی تھی، لیکن اس دور کے لوگ زیادہ پرسکون اور خوش باش تھے۔ ان پر مصروفیت مشغولیت اور شدید ذہنی دباؤ اور تناؤ کا عذاب بھی مسلط نہیں تھا۔ایک ان دیکھی قوت پر تکیہ کرکے زندگی گزرا کرتی تھی۔ آج کا ایمان اور یقین چند ہندسوں پر آن ٹکا ہے۔ اگر بینک میں یا کسی بھی جگہ آپ کے پاس چند ہندسے ہیں تو آپ جی سکتے ہیں۔ آپ کسی بھی ریسٹورنٹ میں جاکر کچھ بھی کھا سکتے ہیں۔ کھانا کھانے سے توانائی ملی لیکن ہندسے کم ہوگئے۔ اب پھر جت جایئے ان ہندسوں کو بڑھایئے جو توانائی حاصل ہوئی ہے اسے صرف کیجیے۔ اسی طرح اگر آپ بیمار ہوجاتے ہیں تو آپ کو علاج کی اشد ضرورت ہے۔ اگر آپ نے علاج نہ کروایا تو مرجائیں گے۔ اور مرجانا تو بہت ہی بری بات ہے۔آپ کے اکاؤنٹ سے چند ہندسے پھر کسی بڑے اکاؤنٹ میں منتقل ہوچکے ہوں گے۔ اب پھر فوراً جت جایئے اپنے کم ہونے والے ہندسوں کو بڑھانے کے لیے۔ آپ کو بتایا جارہا ہے کہ آپ کی زندگی کے لیے ایک عمدہ گھر یا فلیٹ بھی بہت ضروری ہے۔ آپ کے لیے گاڑی اور ایک بڑی اسکرین کا ٹی وی بھی ضروری ہے۔ کمپیوٹر کا دور ہے اب لیپ ٹاپ اور آئی پیڈ کے بغیر گزارا نہیں۔ آپ کو کتابیں پڑھنے کا چسکا ہے۔ کینڈل لے لیجے۔ اب اس کے بغیر کیا کتاب پڑھنا۔ غرض شدید قسم کی محنت مزدوری کرکے آپ نے جو چند ہندسے جمع کیے وہ بھی اکثر آنے سے پہلے ہی غائب ہوگئے۔

آپ کے پاس نہ اپنے لیے وقت ہے نہ اپنی بیوی کے لیے نہ اولاد کے لیے نہ والدین کے لیے۔ بچے اول تو پیدا ہی کم کیے جائیں جو اس دنیا میں آ بھی جائیں تو وہ ماں باپ کے سینے پر کھیلنے اور پلنے کے بجائے ڈے کیئر سینٹر میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ والدین کے جسم کا لمس اور والدین کے جسم کی خوشبو انھیں زندگی بھر نہیں ملتی۔ نتیجے کے طور پر ان میں کبھی والدین کی خدمت کا جذبہ بھی نہیں ابھرتا۔ ان کے والدین کی اخیر عمر اولڈ ایج ہاؤسز میں ہی سسکتے بلکتے ختم ہوتی ہے۔ یہ مادیت کی وہ ورچوئل دنیا ہے کہ جہاں جذبات اور احساسات ایک قدر زائد سے زیادہ نہیں۔ ورچوئل دنیا کی ورچوئل کرنسی نہ جس کے مالکوں کا پتا ہوتا ہے اور نہ جس کے اصل فائدہ اٹھانے والوں کا علم۔ اس سنجیدہ معاملے کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ اسلحہ، منشیات اور پورنوگرافی پر قدغن عائد کرنے میں کوئی سنجیدہ نہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ جمہوریت اور سرمایہ داریت کے فروغ کے لیے کرپشن بہرحال ضروری ہے

پاکستان میں فیشن شو کی دوڑ

آج کل پاکستان میں فیشن شو کی دوڑ ہے،ان فیشن شوز میں پاکستانی فیشن ڈیزائنرز سب سے آگے ہیں۔ پاکستانی فیشن انڈسٹری نے جس تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ان کی بازگشت اب ملک ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں سنائی دیتی ہے۔ پاکستان فیشن انڈسٹری ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ کئی ممالک کے فیشن ڈیزائنرز اور ماڈلز بھی اِن کے ساتھ کام کرنے کے خواہشمند ہیں۔ کئی ایک پاکستان کے ماڈلز اور ڈیزائنرز بھارت، عرب ممالک، امریکا اور یورپین ممالک میں فیشن شوز کرچکے ہیں۔ جس سے گارمنٹس اور فیشن انڈسٹری کو بے پناہ ترقی ملی ہے۔ پاکستان میں فیشن کی مقبولیت گزشتہ دس برسوں میں دوچند ہوئی ہے۔ یہ فیشن لوئرمڈل کلاس سے اپر کلاس تک سب کے لیے ڈیزائن تیار کئے جاتے ہیں۔ کئی کالجز اور یونیورسٹیسز میں فیشن کی ڈگری جاری کی جارہی ہے اس وجہ سے ہر سال ڈیزائنرز ماڈلز اور بیوٹیشن کی ایک بڑی تعداد فیشن انڈسٹری میں داخل ہوتی ہے۔اس کے علاوہ بے شمار ملٹی نیشنل اداروں کی آمدنے بھی فیشن انڈسٹری کی ترقی کو چار چاند لگادیے ہیں کپڑوں کی ڈیزائننگ سے لے کر جوتوں جیولری اور عینکوں تک سب کچھ ڈیزائن کیا جارہا ہے۔ ان تمام اشیاء کو بہتر کوالٹی کی بدولت نہ صرف

پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی برآمد کیا جارہا ہے۔ جس سے کثیر زرمبادلہ حاصل ہورہا ہے۔ پاکستان کی فیشن انڈسٹری میں کراچی کے بعد لاہور اور اسلام آباد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان شہروں میں لاتعداد آؤٹ لیٹس اور مسلسل ہونے والے فیشن شوز، انڈسٹری کی ترقی کو ظاہر کرتے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے نامور اور صفِ اول کے ڈیزائنرز، ماڈلز اور میک اپ آرٹسٹ گل زیب آصف کے ملٹی ڈیزائنرز سٹور کی افتتاحی تقریب دبئی میں منعقد ہوئی جس میں پاکستان، بھارت اور عرب ممالک کے ڈیزائنرز کے ملبوسات ایک ساتھ رکھے گئے ہیں تاکہ صارفین کو ایک ہی جگہ تمام سہولیات میسر ہوں۔ پاکستان کی سب سے بڑی پی آر کمپنی Savvy Prand Events نے اس فنکشن کو آرگنائز کیا، جس میں ماڈلز نے ان تمام ڈیزائنرز کے موسم گرما کے ملبوسات کی نمائش بھی کی۔ جن ڈیزائنرز کے ملبوسات اس سٹور میں رکھے گئے ہیں ان میں آصفہ اینڈ نبیل، فراز منان، عاصم جفا، گل زیب، خلود بن عرب، نجوہ عمران Paisley and Tunics by، وردا، سعدیہ مرزا، sonar، Ennz Jewellery، کے علاوہ یمنی منصور، حاجرہ حیات، شعیب شفیع شامل تھے۔ تقریب کے مہمان Jazz خصوصی بالی وڈ فلم 'وکی ڈونر' کے یشمان کھرانہ تھے اس کے علاوہ پاکستان سپر ماڈل ''ایان'' ٹی وی آرٹسٹ اعجاز اسلم، عدنان صدیقی اور مہوش حیات کی شرکت نے بھی تقریب کو رونق بخشی۔ پاکستانی مصنوعات خصوصاً فیشن ویئر پوری دنیا میں مقبول ہو رہی ہیں۔ برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون اور سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے مابین یہ طے

پایا تھا کہ برطانیہ پاکستان کیساتھ 2.5 بلین پونڈ کی تجارت کرے گا جبکہ اس وقت بھی ایک اعشاریہ چھ 1.6 بلین پونڈ کی تجارت شروع ہے۔اگلے سال جنوری سے پاکستان کو جی ایس پی پلس ڈیوٹی فری ایکسسز مل جائے گا۔ جس سے برطانیہ یورپ میں پاکستانی مصنوعات کی مقبولیت بھی بڑھے گی اور ہمارے وطن پاکستان کا نام بھی روشن ہوگا۔پاکستان فیشن اینڈ) فیشن ڈیزائنرز اور ماڈل محمد معاذ کا کہنا ہے کہ ماڈلنگ میرا شوق ہے جبکہ فیشن ڈیزائننگ مستقبل میں میرا پروفیشن ہوگا۔ موجود دور میں پاکستان فیشن ڈیزائننگ میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ اور اس فیلڈ میں بڑا اچھاکام ہو رہا ہے۔ اب پاکستانی فیشن ڈیزائنرز کی دنیا بھر میں مانگ بڑھ رہی ہے اور ان کا کام پسند کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہاکہ یہ خوش آئند امر ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود فیشن انڈسٹری نے ترقی کی ہے اور اس فیلڈ میں لوگ سرمایہ لگا رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں خود کو پرفیکٹ ماڈل نہیں سمجھتا یہ اور بات ہے کہ لوگ فیشن شوز میں میری کیٹ واک کو پسند کرتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب اس فیلڈ میں آتے ہوئے لڑکے لڑکیاں گھبراتے تھے اور ماڈل بننے کو برا سمجھا جاتا تھا مگراب ٹرینڈ بدل گیا ہے پڑھے لکھے لوگ اس شعبے میں آرہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل پیرس میں پاکستانی سفارت خانے کی طرف فیشن شوکا انعقاد ہوا تھا، فیشن شو میں لاہوراور کراچی کے اعلی ڈیزائنرز کے تیار کردہ ملبوسات شرکا کیلیے پیش کئے گئے، جس میں شرکا نے منفرد اور دلکش ملبوسات میں خوب دلچسپی کا اظہار کیا،فرانس کے دارالحکومت پیرس میں

پاکستانی سفارت خانے میں لاہور اور کراچی کے اعلیٰ ملبوسات ڈیزائنرز نے اپنے تیار کردہ ملبوسات فیشن شو میں رکھے، فیشن ڈیزائنگ سے تعلق رکھنے والوں نے فیشن شو میں منفرد اور دلکش ملبوسات میں بھرپور دلچسپی سے حصہ لیا، شرکاء پاکستانی ڈیزائنروں کی تعریف کیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب پاکستانی ڈیزائنرز کے ملبوسات کی مصنوعات کا دیگر ممالک کی مصنوعات سے موازانہ کرکے خریداری کی جاتی ہے کہ کس کی کوالٹی اور معیار بہتر ہے۔ پاکستانی فیشن گارمنٹس بین الاقوامی مارکیٹ میں مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ماڈل واداکارہ عمائمہ ملک کا کہنا ہے کہ پاکستان فیشن انڈسٹری نے دنیا بھر میں اپنا مقام اپنے کام سے بنایا ہے مجھے فخر ہے کہ میں مختلف نجی کمپنیز کی برانڈ ایمبسیڈر ہونے کی وجہ سے پاکستان کی متعدد ملکوں میں نمائندگی کرچکی ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ ماضی میں ہمارے ہاں جن چیزوں کا فقدان تھا خوشی ہے کہ ہم اب ان کا خلا پر کرچکے ہیں ایک سوال کے جواب میں عمائمہ ملک کا کہنا تھا کہ پاکستان نے اپنے ڈرامے کو ماضی کے مقابلے میں بہت بہتر کیا ہے ہمارے فنکار معیاری کام کر رہے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ نئے فنکاروں کو بھی اگر مواقع فراہم کیے جائیں تو ہم مزید بہتری کی طرف جائینگے۔ انسان کو کسی بھی مقام پر خود کو مکمل نہیں سمجھنا چاہیے ہر لمحہ کچھ نیا سیکھنے کے لیے ہوتا ہے انھوں نے مزید کہا کہ ڈرامہ رائٹر اگر روایتی کہانیوں سے نکل کر اپنے انداز میں تبدیلی لائیں اور کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کریں ہم اب ساس بہو پر ڈرامے کا آغاز کرکے اس کا اختتام

نہیں کر سکتے۔ ہمارے یہاں اب فیشن کے اسکول اور انسٹی ٹیوٹ کھل رہے ہیں اور ان میں کام ہو رہا ہے۔ ایسا ہی ایک ادارہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف فیشن اینڈ ڈیزائن (Pakistan Institute of Fashion and Design) ایک ڈیزائن ادارہ ہے جو ڈیزائن کی تعلیم کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ کئی اسکولز بھی کھل گئے ہیں جہاں فیشن ڈیزائن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں پاکستان اسکول آف فیشن ڈیزائن، پاکستان اسکول آف فیشن مارکیٹنگ اینڈ پروموشنز، پاکستان اسکول آف ٹیکسٹائل ڈیزائن، پاکستان اسکول آف ایکسیسریز اینڈ پروڈکٹ کے نام قابل ذکر ہیں۔ معروف فیشن ڈیزائنر ریحانہ نثار نے کلفٹن میں واقع ایمرالڈ ٹاور میں ایر این فیشن کے نئے اسٹور کی افتتاحی تقریب اور فیشن شو میں حصہ لیا۔ اس فیشن شو میں پاکستانی کی اسٹار ماڈلز نے شرکت کی جن میں متیرا سمیت فوزیہ امان، ثنا خان، صائمہ ہارون، ابیر عدیل، فلک شیخ اور دیگر شامل تھیں۔ اس تقریب میں سی اے ایس 360 کے چیف ایگزیکٹو آفیسر فرحان احمد نے کہا کہ آر این فیشن جدید ملبوسات کی دنیا میں ایک بہترین نام ہے جس میں ہر موسم کے ملبوسات تیار کئے جاتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے معروف ڈیزائنرز کے موسم سرما کی مناسبت سے تیار کردہ ملبوسات پر مبنی ''فیشن پریڈ'' لندن میں ہوئی۔ جس میں ماہین خان، نومی انصاری، ثانیہ ماسکاٹیا، لیلیٰ چتور، مشعال معظم، سارہ روحیل اصغر، نازنین طارق، مریم نجمی جب کہ بھارت سے ترن تیلانی اور منیشن اروڑا سمیت دیگر شامل ہوئے۔ ''فیشن پریڈ'' میں پاکستان اور بھارت کے معرورف

ڈیزائنرز کے علاوہ لندن میں کام کرنیوالے معروف فیشن ہاؤسز نے بھی اپنے ملبوسات کو ریمپ پر متعارف کروایا۔ شو کے منتظمین انسائیکلومیڈیا کی روح رواں عمارہ حکمت اور مستنگ پروڈکشنز کی مینجنگ ڈائریکٹر سعدیہ صدیق نے کا کہنا تھا کہ اس شو کے ذریعے ہماری کوشش ہے کہ پاکستان اور بھارت کے معروف ڈیزائنرز کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے، اور دونوں ممالک کے تعلقات کو بہتر کرنے میں بھی خاصی مدد ملے گی۔ ایک نیا فیشن یہ بھی ہوا ہے کہ پاکستانی فیشن ڈیزائنرز اپنے ڈیزائن بھارتی فنکاروں کے ذریعے متعارف کرا رہے ہیں۔ حال ہی میں فیشن فراز منان کے ڈیزائن کردہ ڈیجیٹل پرنٹس کو کرشمہ کپور نے زیب تن کرکے ان ملبوسات کی ماڈلنگ کی ہے۔ فیشن ڈیزائنر فراز کا کہنا ہے کہ پاکستانی فیبرکس کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کیلئے ہم نے بین الاقوامی شہرت یافتہ فنکارہ کرشمہ کپور کو اپنا برانڈ ایمبیسڈر بنایا ہے، اس سے دونوں ممالک کے درمیان ثقافتی و تجارتی تعلقات خوشگوار ہونگے۔ ان ملبوسات کی ڈیمانڈ بنگلہ دیش ، بھارت ، ،برطانیہ ، دبئی اور پاکستان بھر کے شہروں میں ہو چکی ہے۔ بھارتی اداکارہ کرشمہ کپور نے پاکستانیوں کے نام اپنے پیغام میں کہا ہے کہ فلم انڈسٹری سے دور ہونے کے بعد بھی پاکستانیوں کے دلوں میں میری محبت جان کر بہت مسرت ہو رہی ہے، حالانکہ اس وقت تو میری بہن کرینہ کپور کی مقبولیت کی دھوم ہے، پاکستان کی مٹی میں جو چاہت و انسیت ہمارے خاندان کیلئے پنہاں ہے ،اس کی وجہ میرے دادا راج کپور ہیں ، جن کا

جنم بھی پاکستان کے شہر پشاور میں ہوا تھا۔ وہ اپنی جنم بھومی کے حوالے سے بہت جذباتی ہو جاتے تھے۔ میرے والد رندھیر کپور، چاچا رشی کپور پاکستان کے دورے کی حسین یادوں کا اکثر ذکر کرتے رہتے ہیں، میری بھی خواہش ہے کہ دادا کی جنم بھومی کو دیکھوں ،کاش دونوں ممالک کے درمیان نفرتوں کے بجائے محبتیں پروان پاجائیں۔ ذرائع نے بتایا ہے کہ اس تشہیری مہم کیلئے کرشمہ کپور کو پرکشش معاوضہ دیا گیا ہے۔ پاکستان کے دیگر فیشن ڈیزائنرز بھی بھارتی اداکاراؤں اور اداکاروں سے بھی رابطے میں ہیں، خواتین کیساتھ ساتھ مردوں کیلئے بھی خصوصی ڈیزائن کردہ ملبوسات کی ماڈلنگ کیلئے برانڈ ایمبیسڈرز بنانے کیلئے سرگرم ہیں۔ ان میں سے اکثر فیشن ڈیزائنر ممبئی اور دبئی میں ان کے شوٹ کراتے ہیں۔ دوسری جانب پاکستانی برانڈ میں بھارتی فنکاروں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی سے پاکستانی ماڈلز میں پریشانی کی لہر ڈور گئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی پروڈکٹس کی تشہیری مہم کیلئے بھارتی فنکاروں کا انتخاب کسی المیہ سے کم نہیں۔ پاکستانی فیشن انڈسٹری کو معاشی بحران سے دوچار کرنےکی سازش کی جارہی ہے۔ چند لوگ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ممبئی جاکر ان فنکاروں کی نازبرداریاں کرتے ہیں، اس سے پاکستان کا امیج بھی خراب ہو رہا ہے۔ فیشن انڈسٹری کی بقا وفروغ کیلئے ایک پالیسی بنانی ہوگی تاکہ پاکستانی ماڈلز اور فیشن ڈیزائنرز کا بھی تحفظ ہوسکے۔ ان دنوں پاکستانی فیشن ڈیزائن کونسل کے زیر اہتمام لاہور میں برائیڈل فیشن ویک جاری ہے، جس

میں ڈیزائنر نے اپنی عروسی کولیکشنز کی نمائش کی۔برائیڈل فیشن ویک میں ماڈلز نے عروسی ملبوسات زیب تن کرکے ریمپ پر کیٹ واک کے جلوے بکھیرے۔ڈیزائنر فہد حسین کی کولیکشن میں برصغیر کی تہذیب کی جھلک نمایاں تھی جسے شائقین نے بہت پسند کیا۔ڈیزائنر مشالاکھانی کی کولیکشن بھی شرکا کی دلچسپی کا مرکزبنی رہی۔برائیڈل ویک میں زیورات اور ماڈلز کے میک اپ پر بھی خصوصی توجہ دی گئی تھی۔فیشن شو کی وبا اب ملک کے دیگر شہروں میں بھی پھیل گئی ہے۔کچھ دن پہلے ملتان کے نجی ہوٹل میں ہونے والے فیشن شومیں مقامی ڈریس ڈیزائنرز نے اپنی خوبصورت کلیکشن پیش کی۔ مشرقی اور عروسی ملبوسات زیب تن کیے ماڈلز نے ریمپ پر دھنک رنگ بکھیر دیے۔ خوبصورت میک اپ ، دیدہ زیب ملبوسات اور ماڈلز کی اداؤں نے شام کومزید حسین بنادیا۔اس موقع پر مردانہ کلیکشن کو بھی حاضرین نے بہت پسند کیا۔فیشن شو میں اداکارہ میرا کی شرکت نے چارچاند لگادیے۔سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس میرا نے مخصوص ادا سے سلام کیا تو حاضرین داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔پورے شو میں میرا شائقین کی توجہ کا مرکزبنی رہیں۔ایک طرف یہ رجحان بڑھ رہاہے تو دوسری طرف ماہرین یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ فیشن انڈسٹری کو حکومتی سپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی ٹیکسٹائل کی برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہاہے۔فیشن کے رنگوں نے تمام عمرکے لوگوں کواپنا متوالا بنارکھاہے۔آئے دن معروف ڈیزائنزاپنی خداداد صلاحیتوں کے بل پرایسے ملبوسات تیارکررہے ہیں جولوگوں کی شخصیت کو

پرکشش بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پاکستان فیشن انڈسٹری سے وابستہ معروف ڈیزائنر بھی پاک وطن کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کیلئے کوشاں ہیں۔ موجودہ دور میں فیشن انڈسٹری بہت سے سنگ میل پار کرتی ہوئی اب مغربی دنیا تک پہنچ رہی ہے۔ ہمارے کلچر کی عکاسی کرتے ملبوسات مغربی ممالک میں بسنے والوں کی توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔ ایک طرف تو خوبصورت رنگوں میں تیار کردہ ملبوسات ہیں اور پھر ان کو جس مہارت کے ساتھ سجایا، سنوارا جاتا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی ڈیزائنرز کے تیار کردہ ملبوسات اب لندن میں بسنے والی خواتین بھی استعمال کرنے لگی ہیں۔ بلکہ دیار غیر میں بسنے والی پاکستانی کمیونٹی تو شادی بیاہ اور اسی طرح کی دیگر رسومات پر پاکستانی ڈیزائنرز کے تیار کردہ ملبوسات کو ہی ترجیح دیتی ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ برطانیہ کے شہر لندن میں ہونیوالی ''فیشن پریڈ'' میں پاکستان سے معروف ڈریس ڈیزائنر ماہین خان، نومی انصاری، ثانیہ مسکاٹیا، مشعال معظم، لیلیٰ چتر، سارہ روحیل اصغر اور نازنین طارق کے ملبوسات تھے جبکہ بھارت سے ستیاپال اور ترن تیلانی نے بھی شو میں اپنے ڈریسز متعارف کروائے۔ شو میں برطانیہ کی ٹاپ ماڈلز ریمپ پر جلوہ گر ہوئیں جنھوں نے ملبوسات کے ساتھ جیولری، ہیئر سٹائلنگ اور دیگر اشیاء کو متعارف کروایا۔ ریمپ پر چلتی معروف ماڈلز فیشن

کی جدت اور پاکستانی ثقافت کی عکاسی کر رہی تھیں جبکہ بھارتی ڈیزائنرز کے ملبوسات میں مغرب کی جھلک نمایاں تھیں۔ اس طرح سے ''فیشن پریڈ'' مشرق اور مغرب کا خوبصورت ' فیوژن' محسوس ہو رہی تھی۔ عمارہ حکمت جو ایسے شوز کو ڈیزائن کرتی ہیں کہتی ہیں کہ دیارِ غیر میں پاکستانی کلچر کی عکاسی کرنے کا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ ہمارے ملک کے معروف ڈیزائنرز کے تیار کردہ ملبوسات کو بہت پسند کیا گیا۔ خاص طور پر نوجوان لڑکیاں جن کی پرورش برطانیہ میں ہوئی ہے اور وہ زیادہ تر اپنے پہناوے میں ترجیح جینز، ٹی شرٹس کو دیتی ہیں، وہ بھی ہمارے ملبوسات کو پسند کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ مغرب اور مشرق کے کلچر کی عکاسی کرتے ملبوسات بھی تیار کریں جس کا اچھا رسپانس ملتا ہے۔ '' فیشن پریڈ'' میں لندن میں بسنے والی اہم شخصیات کے ساتھ معروف فیشن ہاؤسز کے لوگوں کی کثیر تعداد بھی موجود تھی، جنھوں نے شو میں ہمارے ملبوسات دیکھ کر مستقبل میں مل کر کام کرنے کی پیشکش کی۔ مستنگ پروڈکشنز' کی چیف ایگزیکٹو سعدیہ صدیقی کہتی ہیں کہ پاکستانی ڈیزائنرز بہت ' تیزی کے ساتھ فیشن ورلڈ میں اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ پاکستان میں فیشن کے بدلتے رجحانات کی پسندیدگی اور پڑھے لکھے نوجوانوں کا فیشن انڈسٹری میں آنا ہے۔ فرانس، اٹلی اور دیگر یورپی ممالک میں پاکستانی ڈیزائنرز کے ملبوسات کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب یورپ کے معروف فیشن ہاؤسز میں پاکستانی ڈیزائنرز کے تیار کردہ

ملبوسات بھی موجود ہونگے۔ پاکستان میں ٹیلینٹ کی کوئی کمی نہیں ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی سرپرستی کی جائے۔

کام کیجئے کام

ہمارے جیسے ملک میں زیادہ تر کمپنیوں نے بظاہر آٹھ کام گھنٹے یا بلکل تھک جانے کی حد تک کام کی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ کام کی زندگی کے درمیان توازن کو برقرار رکھنے کا کہا جاتا ہے۔ کچھ نوجوان افراد کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ جب وہ پیشہ ورانہ دائرے میں داخل ہوں تو اپنی عادات کو کسی نظم و ضبط کے دائرے میں لائیں۔ اصل میں جاب مارکیٹ میں داخل ہونا ایک چیلنج ہے۔ اور اگر آپ نے زمانہ طالب علمی میں اس چیلینج کی تیاری نہیں کی ہے تو آپ عدم توازن کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لئے عملی زندگی میں آنے سے قبل تعلیمی مصروفیات اور خاندان اور سماجی زندگی کے درمیان نازک توازن کو برقرار رکھنے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ کام پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ دس ، سے بارہ گھنٹے کام کرکے جب وہ گھر واپس لوٹتے ہیں تو تھکن سے بے حال ہوتے ہیں۔ اور پھر گھر واپس آنے کے بعد وہ خاندان کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ اصل میں ، اسی کو اکثر معیار سمجھا جاتا ہے. اس کے برعکس ، اگر نوجوان خواتین کو اپنے پیشے کی پیروی کرنا چاہتی ہوں تو ہمیشہ گھر آنے پر ان سے مدد کی توقع کی جاتی ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ یہ خواتین گھر آنے پر امور خانہ داری بھی اسی طرح انجام دیں جیسے گھر گرہستی عورتیں کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں خواتین

کے بارے میں عمومی رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سپر ماں ،ایک کامیاب بنکار، استاد وکیل ، ایک ٹی وی اسٹار جیسی کامل شخصیت ، اچھی طرح بچوں کا خیال رکھنے والی آیا،، ایک اچھی گھروالی اور سماجی زندگی میں کامیاب خاتون ہو۔ ہم نے معاشرے میں سپر ماں کا تصور بنایا ہوا ہے، یہ تصویر اکثر میڈیا سے باہر آتا ہے۔ لیکن ایک ماں کی ذمہ داریوں کے بارے میں بہت کم بتایا جاتا ہے۔ گھریلو خواتین اپنا وقت کس طرح سے گذاریں اس پر بہت کم ہی دھیان دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کی مثال لے لیں اس کے ڈیوٹی کے اوقات اور اس کے بعد کوئی کلینک کیا اسقدر مصروفیات میں وہ اپنے خاندان اور مریضوں سے انصاف کرسکے گا۔ یہ حال نوجوانوں کا ہے، بے تحاشا مصروفیات انہیں کسی کام کا نہیں رہنے دیتی۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اور اس زندگی میں سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کام اور زندگی کے درمیان توازن کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی زندگی کے حاصل لمحات کو خوشگوار بنانا چاہیئے۔ میریٹ انٹر نیشنل ہوٹل اپنے ملازمین کے لیے ایسے مواقع پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اگلی پوزیشنوں پر جاسکیں۔ اس میں ۳ ہزار مینیجرز نے معمولی پوزیشنوں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ارنسٹ اینڈ ینگ نامی کمپنی کے ملازمین نے ایک دن میں ۸۳ ہزار گھنٹے رضاکارانہ کام کے لیے صرف کیے۔ سافٹ ویئر کی معروف کمپنی سیلز فورس اپنی رفاہی خدمات کے حوالے سے مشہور ہے۔ یہ اپنے ملازمین کو سماجی خدمت کے مواقع فراہم کرتی رہتی ہے۔ ہر ملازم کو سال

میں تنخواہ کے ساتھ ۶ دن ملتے ہیں کہ وہ کسی رفاہی سرگرمی میں حصہ لے سکے۔
انٹیوٹ کمپنی جدت پسندی کو فروغ دینے کے لیے اپنے ملازمین کو اپنی مرضی کے منصوبے پر کام کرنے کے لیے ہفتے میں ۴ گھنٹے دیتی ہے۔ جنرل ملز فوڈ کی کمپنی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ ہم لوگوں کو جاب کے بجائے کیریئر فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ۵۸ فیصد آفیسرز نے اسی کمپنی میں چھوٹی پوزیشنوں سے کام شروع کیا تھا۔ امیکوا بینک کا ادارہ اپنے ملازمین سے کہتا ہے کہ وہ سال میں ۴۰ گھنٹے رضاکارانہ طور پر سماجی خدمت کے لیے وقف کر سکتے ہیں اور اس کا انھیں معاوضہ بھی ملتا ہے۔ ای او جی ریسورسز آئل کمپنی ہے جو ہر سال اپنے ملازمین کو گھر والوں کے ساتھ ایک تقریب میں مدعو کرتی ہے جہاں ان کے تعاون کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ٹمبرلینڈ اور پرائس واٹر ہاؤس کوپرز بھی ۲ ایسی کمپنیاں ہیں جو ملازمین کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں کہ وہ سماجی خدمت کے کام بھی کریں۔ اداروں کے لیے اپنی اقدار اور وژن کا تعین کرنا بہت اہم ہے۔ اس سے انھیں سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ کیا ادارے کا مقصد محض نفع کمانا ہے اور وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ بہتر معاشرہ کیسا ہوگا اور اس میں ان کا کیا کردار ہوگا۔ اداروں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو ان اقدار اور وژن کی تعلیم بھی دیتے رہیں۔ اقدار اور وژن کے حوالے سے ایک دلچسپ مثال ہولسٹی کے بارے میں مشہور ہے۔ یہ کمپنی کپڑا فروخت کرتی ہے۔ یہ اپنی مشن

سٹیٹمنٹ کو ایک پوسٹر کی شکل میں سامنے لے کر آئی جس میں اُس نے اپنی اقدار کے بارے میں لکھا۔ اس میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ کمپنی نفع کمانے کے علاوہ زندگی اور کامیابی کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ یہ مشن سٹیٹمنٹ اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ ان کی اصل پراڈکٹ کے بجائے کمپنی کو اسی حوالے سے زیادہ جانتے ہیں۔ اسے انٹرنیٹ پر ۵۰ ملین سے زائد بار دیکھا گیا اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

ترقی پذیر ممالک کے اداروں کے پاس اگرچہ وسائل محدود ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود کام کے بارے میں اچھا وژن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کام ایک ایسی سرگرمی بن جاتا ہے جس سے نفع بھی حاصل ہو اور سماجی بھلائی کی سوچ کو بھی فروغ ملے۔ اگر ملازمین کو اچھا معاوضہ اور سہولتیں مل بھی جائیں تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کام ان کے لیے پُرلطف سرگرمی ہوگا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ وہ کام کے بارے میں ایک اچھا ذہنی رویہ بھی اپنائیں۔ انھیں کام کے لیے ایک بڑا وژن سامنے رکھنا ہوگا تاکہ اس میں ایک مقصدیت پیدا ہو۔ انھیں دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے لیے اپنے کام کے ذریعے کتنا مفید بن رہے ہیں یا ان کی وجہ سے معاشرے کی اجتماعی تصویر میں کیا بہتری آ رہی ہے۔

بہت سے لوگ کام کو اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے اختیار میں ہو تو وہ ایک دن کے لیے بھی کام پر نہ جائیں۔ درحقیقت زندگی میں مقاصد جتنے اعلیٰ ہوں اس میں پریشانی اور تناؤ اسی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ اس حوالہ سے روچسٹر یونیورسٹی میں ایک دلچسپ تحقیق کی گئی۔ محققین نے طالب علموں سے ان کی زندگی کے مقاصد کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔ تقریباً ۲ سال کے بعد ان طالب علموں سے جب وہ عملی زندگی میں کام کر رہے تھے ان کے مقاصد کی کامیابی کے حوالے سے بات چیت کی گئی۔ تحقیق سے یہ سامنے آیا کہ جن طالب علموں کے مقاصد میں اپنی زندگی اور سوچ کو بہتر بنانا اور دوسروں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلی لانا جیسے عزائم شامل تھے، وہ یونیورسٹی کے دنوں کی نسبت زیادہ مطمئن تھے اور ان کی زندگی میں تناؤ کم تھا۔ اس کے برعکس جن طالب علموں کے مقاصد دولت اکٹھی کرنا، شہرت پانا تھے، وہ دولت تو حاصل کر رہے تھے لیکن وہ یونیورسٹی کے دنوں میں جتنے خوش تھے آج اتنے خوش نہیں تھے۔ ان کی زندگی میں بے چینی اور تناؤ تھا۔ گویا وہ اپنے مقاصد تو حاصل کر رہے تھے لیکن ان کی خوشی میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔

جب کام میں بوریت اور تناؤ ہو تو بہت کچھ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام اور ملازمت کا واحد مفہوم اگر تنخواہ حاصل کرنا ہو تو یہ ایک ناپسندیدہ چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ سیتھ گوڈن مارکیٹنگ کی دنیا کا بڑا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اگر ہم خود کو ایک ایسا آرٹسٹ سمجھیں جو اپنے اندر موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کو گفٹ کی طرح سمجھتا ہے تو ہمارے نزدیک کام کا واحد مفہوم تنخواہ حاصل کرنا نہیں ہوگا۔ اس حوالے کے لیے وہ دنیا کے ایک بڑے فوٹوگرافر کی مثال دیتا ہے جس کا کام سب کے لیے مفت دستیاب ہے۔ وہ اپنے کام کو گفٹ سمجھتا ہے جسے وہ دنیا کے ساتھ شیئر کرتا ہے۔ اس کام کے علاوہ اس کے پاس ایسے کام کی بھی کمی نہیں جس کا اسے معقول معاوضہ ملتا ہے۔ جس کام سے آمدن بھی ہو رہی ہو اور آپ اس حوالے سے اچھا محسوس کر رہے ہوں کہ اس سے معاشرے میں کوئی بہتری آ رہی ہے تو ایسا کام خوشگوار ہوتا ہے۔ ہمیں اسی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے کام کا جائزہ لینا چاہیے۔جب کام ہمیں پسند ہو تو اس میں ہماری کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔ اچھے ملازم ڈھونڈتے ہوئے بھی اسی سوچ کو سامنے رکھنا چاہیے۔ معروف فلاسفر ہنری ڈیوڈ تھوریو کا کہنا ہے کہ اُس شخص کو ملازم نہ رکھو جو دولت کے لیے کام کرے بلکہ اسے ملازم رکھو جو کام کی محبت میں کام کرنا چاہے۔ زپوز جوتے فروخت کرنے والی امریکی کمپنی ہے۔ یہ کمپنی موٹیویٹیڈ لوگوں کو ڈھونڈنے پر یقین رکھتی اور اِس کے لیے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کرتی ہے۔ کمپنی منتخب ہونے والے ملازمین کو ایک ہفتے کی ٹریننگ دیتی ہے۔ اس ٹریننگ کے بعد انھیں آپشن دی جاتی ہے کہ اگر وہ کمپنی کے ساتھ نہیں چل سکتے تو وہ کمپنی چھوڑ سکتے ہیں اور کمپنی انھیں ۲ ہزار ڈالر کی رقم بھی دیتی ہے۔

کام میں دلچسپی ہو تو انسان اسے بہتر سے بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ مقبول مصنف گبریل گارشیا مارکیز کے بارے میں جیرالڈ نے زبردست کتاب لکھی۔ جیرالڈ کی اپنے کام سے لگن ایسی تھی کہ ایک رات اس نے اُس قصبے میں ایک بنچ پر بھیگتے ہوئے گزار دی جہاں مارکیز پیدا ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اس علاقے کے احساس کو اپنے اندر سمو سکے۔ امریکا کے نامور مصنف نیل گیمن کہتے ہیں کہ جب میں کسی چیز کو ایڈونچر سمجھتا تھا تو اُسے پوری لگن سے کرتا تھا۔ جس دن مجھے لگتا تھا کہ میں کام کر رہا ہوں اسی دن میں اس سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ ہم اپنے وقت کا بڑا حصہ روزی کمانے کے لیے کام یا ملازمت کرتے ہوئے گزارتے ہیں۔ آج ہمیں ماضی کے لوگوں کے مقابلے میں کام کو کم وقت دینا پڑتا ہے۔ کام کے بارے میں ہمارا تصور بھی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کہا جاتا تھا کہ انسان روزی کمانے کے لیے کام بھی کر رہا ہو اور وہ آزاد، مطمئن اور خوش بھی ہو، یہ ۲ باتیں ناممکن ہیں۔ آج اِس تصور کو بھی فروغ مل رہا ہے کہ کام کو ایک بامعنی سرگرمی بنانا ممکن ہے۔ یہ ہماری زندگی میں خوشی، اطمینان اور مقصدیت لا سکتا ہے لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جو صبح کام پر جاتے ہوئے بے دِلی، بوریت اور تناؤ سے دُور ہوں اور دُنیا کو اپنے اور دوسرے لوگوں کے لیے بہتر جگہ بنانے کے عزم سے سرشار ہوں؟ کام اگر ہمارے لیے ایک خوشگوار سرگرمی ہو تو ہماری پوری

زندگی پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے جسے اپنی پسند کا کام مل گیا ہو۔ اداروں اور کمپنیوں کا کام کے بارے میں کیا تصور ہوتا ہے؟ کام کا اچھا ماحول بنانے میں اس تصور کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح ملازمین کام کو بامقصد بنانے کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں، یہ چیز بھی کام کو پُر لطف بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کام کرنے کی اچھی جگہ پر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ملازمین کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ انھیں اپنے خیالات سامنے لانے اور تخلیقی سوچ کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔ وہاں ملازمین کو نئی چیزیں سیکھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ انھیں کچھ حاصل ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ جب ملازمین کو یہ چیزیں ملتی ہیں وہ اداروں کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میڈیا کے کئی بڑے ادارے ایسی فہرستیں شائع کرتے ہیں جن میں ان کمپنیوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے جو ملازمین کا خیال رکھنے میں سب سے آگے ہوں۔ بہت سی کمپنیاں اور ادارے پیداواریت بڑھانے پر تو زور دیتے ہیں لیکن کام کو ایک پُر لطف سرگرمی بنانا ان کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا۔ کارپوریٹ دنیا پر ایک نظر دوڑائی جائے تو ہمیں ایسی کئی کمپنیاں ملیں گی جو اپنے ملازمین کے کام کو پُر لطف بنانے اور اس میں لوگوں کی خدمت جیسی مقصدیت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے آگے بڑھنے کے امکانات پیدا کرتی ہیں۔ گوگل کمپنی انٹرنیٹ کی دنیا کا بڑا نام ہے۔ یہ اپنی جدت پسندی اور ملازمین کے لیے کام کا خوشگوار

ماحول پیدا کرنے کے حوالے سے سب سے آگے تسلیم کی جاتی ہے۔ ۳۱ سال قبل اس نے ایک چھوٹی کمپنی کی حیثیت سے اپنا سفر شروع کیا۔ آج اس کے ملازمین کی تعداد ۰۳ ہزار سے زائد ہے اور دنیا میں اس کے ۰٦ دفاتر ہیں۔

گوگل کا ہیڈکوارٹر وسیع و عریض رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں رنگ برنگی سائیکلیں کھڑی ہوتی ہیں تاکہ ملازمین انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے استعمال کرسکیں۔ کمپنی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے کچن بنائے گئے ہیں تاکہ جب بھی کسی ملازم کو بھوک لگے وہ کچن میں جاکر کچھ کھا پی سکے۔ کمپنی میں ۱۰۰ سے زائد ایسے کچن موجود ہیں۔ ان کے علاوہ وہاں کئی بڑے کیفے اور ریسٹورنٹ بھی موجود ہیں۔ کمپنی میں ملازمین کے لیے ٦ جم بھی بنائے گئے ہیں۔ وہاں ملازمین کے لیے واشنگ مشین اور ڈرائیر بھی موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ کام کے ساتھ ساتھ اپنے کپڑے دھونا چاہیں تو انھیں استعمال کرسکیں۔ گوگل کمپنی میں کام کا ماحول بڑا لچک دار ہے۔ انجینئر ٹیبل ٹینس کھیلتے ہوئے بھی کسی نئے منصوبے پر بات چیت کرسکتے ہیں۔

گوگل کمپنی کے ۰۲ فیصد کے قانون کے مطابق ملازمین اپنے وقت کا ۰۲ فیصد اپنی مرضی سے کسی ایسے پروجیکٹ کو دے سکتے ہیں جو کمپنی کے لیے فائدے مند ہو سکتا ہے۔ گوگل کی ای میل کی سہولت جی میل اور گوگل نیوز جیسی کئی چیزیں اسی

فیصد وقت میں سامنے آئی ہیں۔ کام کے اسی اچھے ماحول کی وجہ سے گوگل کمپنی کو ہر ۲۰
سال لاکھوں افراد ملازمت کے لیے اپنے کوائف بھیجتے ہیں۔ آئی ٹی کمپنی ان ٹیل اپنے
لوگوں کو ۱۸ یا ۲۴ مہینوں کے بعد نئی پوزیشن پر لے جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے
کہ وہ مختلف شعبوں کے بارے میں نئی نئی چیزیں جان سکیں۔ نئے آنے والوں کو کہا جاتا
ہے آپ کی اگلی ۵ ملازمتیں ہمارے ساتھ ہوں گی۔ زندگی ہے تو جہاں ہے۔ اس مقولے
پر عمل کیجئے اور زندگی کو خوشگوار بنائیے۔ کام وہ منتخب کیجئے جس میں آپ کی دلچسپی ہو،
فیض نے کہا تھا کہ وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے۔ جو کام سے عاشقی کرتے تھے۔ آپ
بھی کام سے عشق کر لیجئے، پھر زندگی سنور جائے گی۔

تعلیمی نظام کی تباہی کا ذمہ دار کون؟

پاکستان کی تباہی کا ذمہ دار اگر کسی ایک نکتہ کو لیا جائے تو وہ اس کے تعلیمی نظام کی تباہی ہے۔ اس پر تمام اہل دانش یکساں رائے رکھتے ہیں۔ لیکن ہماری حکومت کے لئے یہ ترجیح نہیں ہے۔ ان کی ترجیحات میں بلٹ پروف گاڑیاں، سرکاری مراعات، غیر ملکی دورے، اور سب کچھ ہے، تعلیم کے علاوہ۔ سندھ کے ایک سابق سیکریٹری تعلیم نے ایک واقعہ سنایا، ایک بار سندھ کی سابق وزیر تعلیم حمیدہ کھوڑو اپنے محکمہ تعلیم کے افسروں سے پوچھ رہی تھی کہ سندھ کے سرکاری اسکولوں کا کیا حال ہے۔ سب اچھا، سب اچھا کی رپورٹ آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک افسر نے اٹھ کر کہا کہ گستاخی معاف سرکاری اسکولوں کا یہ حال ہے کہ یہاں موجود سب افسران میں سے کسی کا بچہ ان پیلے اسکولوں میں نہیں پڑھتا۔ یہ سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔

عالمی ادارے کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں تقریباً دو کروڑ پچاس لاکھ بچے اسکول نہیں جاتے جبکہ پرائمری سکول چھوڑ دینے والے بچوں کی شرح 30 فیصد ہے۔ پاکستان کی نئی نسل میں تعلیم کا رجحان روز بہ روز کم ہو رہا ہے۔ صرف ایک سال پہلے، یعنی 2012 کی بات کریں، تو اس سال تک ملک بھر میں صرف 21

فیصد افراد پڑھے لکھے اور 79 فیصد ان پڑھ تھے۔ ان دونوں ہندسوں کا درمیانی فرق 21 ویں صدی کے جدید ترین دور میں حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ افسوسناک بھی ہے۔اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کا کہنا ہے کہ دنیا کے 221 ممالک میں مذکورہ بالا شرح خواندگی کے ساتھ پاکستان 180 ویں نمبر پر ہے۔عمر کے لحاظ سے دیکھیں تو جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہیں ان کی عمریں 55 سے 64 سال کے درمیان ہیں اور ان کی شرح خواندگی 57 فیصد بنتی ہے جبکہ 15 سے 24 سال کی عمر کے نوجوانوں کی شرح 72 فیصد ہے یعنی تعلیم کا گراف گر رہا ہے. جنھوں نے پہلے پڑھا، سو پڑھا، نئی نسل میں تعلیم کا رجحان ہی کم ہے۔حد تو یہ ہے کہ شرح خواندگی میں پاکستان جنوبی ایشیا میں صرف افغانستان اور بنگلہ دیش سے اوپر ہے جبکہ چین، ایران، سری لنکا، نیپال اور برما بھی پاکستان سے آگے ہیں۔۔ پاکستان کی نئی نسل میں تعلیم کا رجحان روز بہ روز کم ہو رہا ہے۔ سنہ 2012 میں 70 لاکھ طلبا اسکول اور کالج جا رہے تھے جن میں سے 26 لاکھ پرائمری اسکول، 29 لاکھ سیکنڈری اسکول اور 15 لاکھ کالج یا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبا میں وقت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا رجحان بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔اسکولوں سے فارغ التحصیل ہو کر کالج جانے والے طلبا کی شرح صرف 3 فیصد رہ جاتی ہے، جبکہ جب یونیورسٹی کا مرحلہ آتا ہے تو یہ شرح گھٹ کر صرف ایک فیصد رہ جاتی ہے۔پاکستان کے سرکاری خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان نے یونیسکو کی جاری کردہ اِسی رپورٹ کے

حوالے سے کچھ مزید اعداد و شمار بھی جاری کئے ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:۔ ملک بھر میں 75 فیصد لڑکے اور لڑکیاں میٹرک یعنی 10 ویں کلاس سے بھی پہلے اسکول کو سدا کے لئے خیرباد کہہ دیتے ہیں۔۔ اکیاسی فیصد طالب علم انگریزی کے الفاظ نہیں پڑھ سکتے۔۔ تین سے پانچ سال کی عمر کے سندھ سے تعلق رکھنے والے 72 اور بلوچستان کے 78 فیصد طلبا اسکول نہیں جاتے۔۔ سروے کے دوران پانچویں اور چھٹی کلاس کے طلبا کو انگریزی کا ایک مضمون پڑھنے کے لئے دیا گیا۔ ان میں سے چھٹی کلاس کے 94 اور 5 ویں کلاس کے 68 فیصد بچے یہ مضمون نہیں پڑھ سکے۔ہمارا مذہب اسلام تمام عورتوں اور مردوں کو تعلیم حاصل کرنے کا پابند بناتا ہے، لیکن یہاں 51لاکھ بچے بنیادی تعلیم سے بھی محروم ہیں۔دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی ہر سال خواندگی کا عالمی دن منایا مناتا جاتا ہے۔ بلند بانگ دعوی کیئے جاتے ہیں۔ اس دن کی مناسبت سے وزیراعظم نواز شریف نے اپنے پیغام میں کہا ہے کہ حکومت ملک سے جہالت اور ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کرے گی۔ایک سرکاری بیان میں ان کا کہنا کہ پاکستان میں خواندگی کی شرح کو 56 فیصد سے بڑھانے کے لیے بھی اقدامات کیے جارہے ہیں۔ لیکن یہ بیان ہی جاری ہوتے ہیں صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔پاکستان میں تعلیمی شعبے کی صورتحال غیر تسلی بخش ہے اور اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں تقریباً دو کروڑ پچاس لاکھ بچے اسکول نہیں جاتے جب کہ پرائمری کی سطح پر ہی اسکول چھوڑ جانے والے

بچوں کی شرح 30 فیصد ہے۔حکومت نے صوبوں کے تعاون سے ایک مہم کے ذریعے ملک بھر میں تقریباً پانچ لاکھ بچوں کو اسکول داخل کرانے کا اعلان کیا ہے۔ ہمارے یہاں اس وقت تعلیم پر سالانہ ملک کی مجموعی پیداوار کا دو فیصد سے بھی کم خرچ کیا جا رہا ہے جب کہ اقوام متحدہ کے مطابق اسے کم از کم چار فیصد تک ہونا چاہیے۔پاکستان میں بچوں کے اسکول میں داخلے اور پھر اسکول چھوڑ جانے کی تشویشناک شرح کی وجہ مبصرین کی نظر میں تعلیمی نظام میں سقم کے علاوہ ایک قابل ذکر تعداد میں اسکولوں میں بنیادی سہولتوں اور تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی ہے۔ امریکہ کے ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی 'یو ایس ایڈ' نے پاکستان میں تعلیمی شعبے میں بہتری کے لیے 16 کروڑ ڈالر کے ایک منصوبے میں معاونت فراہم کی ہے۔ جس میں بین الاقوامی ریسکیو کمیٹی اور اس کی دس شراکت دار تنظیموں کے ذریعے 'پاکستان ریڈنگ پراجیکٹ' نامی اس منصوبے کے لیے تحت ملک بھر کے 38 ہزار اسکولوں میں تعلیمی سرگرمیوں کو بہتر اور 94 ہزار اساتذہ کی استعداد کار کو بہتر بنایا جائے گا۔ اس منصوبے سے تقریباً 32 لاکھ بچے مستفید ہو سکیں گے۔ملک کے تعلیمی نظام میں تباہی کا ایک سبب گھوسٹ اسکول ہیں۔ جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن کاغذوں پر یہ اسکول قائم ہیں۔ چھٹی کلاس کے مختلف شہروں میں گھوسٹ' اسکولوں کی موجودگی کا انکشاف ہوا ہے جن کی تعداد 1200 سے زائد ہے۔' اس بات کا انکشاف پاکستان میں بیسک ایجوکیشن کمیونٹی اسکولز کی تحقیقی رپورٹ میں کیا گیا ہے۔رپورٹ کے مطابق، ملک بھر کے

مختلف شہروں میں گھوسٹ اسکولوں کی اتنی بڑی تعداد صرف کاغذی کاروائی تک محدود ہے اور ان اسکولوں کے اساتذہ کو باقاعدگی سے تنخواہیں بھی دی جا رہی ہیں۔ لیکن، حقیقی طور پر ان اسکولوں میں تعلیمی سرگرمیاں موجود نہیں۔ یہ تحقیقی رپورٹ بتاتی ہے کہ گھوسٹ اسکولوں کی سب سے زیادہ تعداد خیبر پختونخوا میں ہے، جن کی تعداد اور فاٹا کے قبائلی علاقوں میں 305 گھوسٹ اسکول موجود ہیں۔ 345

جبکہ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں ان گھوسٹ اسکولوں کی تعداد 276 ، سندھ میں 64، بلوچستان میں 69، کشمیر اور گلگت بلتستان میں 89 اسکول اور اسلام آباد میں 57 گھوسٹ اسکول ہیں، جہاں کسی بھی قسم کی تعلیمی سرگرمیاں

نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ملک بھر سے اتنی بڑی تعداد میں گھوسٹ اسکولوں کا سامنے آنا تعلیم کی صورتحال کا ایک تشویشناک پہلو ہے۔ سپارک نامی تنظیم کی بچوں کی صورتحال کی رپورٹ برائے سال 2012 کے مطابق پانچ سے نو سال تک کی عمر کے تقریباً دو کروڑ بچوں میں سے ایک چوتھائی اسکول جانے سے محروم ہیں اور یوں ملک میں ایسے بچوں کی کل تعداد تقریباً اڑھائی کروڑ بنتی ہے۔ ان میں سے تین سے پانچ سال تک کی عمر کے ستر لاکھ بچے بنیادی تعلیم سے بھی محروم ہیں۔ رپورٹ کے مطابق گزشتہ ایک دہائی میں پاکستان میں تعلیم کا بجٹ 2.6 فیصد سے کم ہو کر 2.3 فیصد پر آیا اور ''یوں دنیا کی تعلیمی انڈیکس میں 120 ممالک میں سے پاکستان 113 نمبر پر ہے''۔ رپورٹ کے مطابق آبادی کے اعتبار سے ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں اسکول داخل نہ کروائے جانے والے بچوں کی شرح سب سے زیادہ 61 فیصد ہے۔ سندھ میں یہ شرح فیصد، خیبر پختونخواہ میں 51 فیصد اور بلوچستان میں 47 فیصد رہی۔ نوجوانوں میں 53 خواندگی کی شرح کے اعتبار سے بھی پاکستان سب سے کم سطح پر ہے جو کہ 70.7 فیصد ہے۔ 15 سے 24 سال کے عمر کے صرف 79 فیصد لڑکے جب کہ 61 فیصد لڑکیاں خواندہ ہیں۔ حالیہ انتخابات کے بعد مرکز اور صوبوں میں قائم ہونے والی حکومتوں نے اپنے بجٹ میں تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نا صرف اسکولوں سے باہر بچوں کو تعلیمی نظام میں شامل کیا جائے گا بلکہ نصاب کو بھی جدید تقاضوں کے مطابق تبدیل کر کے معیار تعلیم کو بہتر بنایا جائے

گا۔ پاکستان میں تقریباً 75 فیصد بچے اور بچیاں دسویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں جبکہ جماعت سوئم میں پڑھنے والے 81 فیصد طالب علم دوسری جماعت کے انگریزی کے جملے نہیں پڑھ سکتے۔ حال ہی میں حکومتی ادارے منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے جاری ہونے والی سالانہ تعلیمی صورتحال 2012ء نامی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صوبہ سندھ اور بلوچستان میں بالترتیب 62 اور 78 فیصد 3 سے 5 سال کی عمر کے بچے اور بچیاں اسکول نہیں جاتے۔ رپورٹ کے مطابق سروے کے دوران، بلوچستان میں جماعت سوئم اور پنجم کے طالب علموں کو جماعت دوئم کا ایک مضمون پڑھنے کو دیا گیا مگر ان میں سے بالترتیب 94 اور 68 فیصد ایسا نہ کر سکے۔ ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ ملک میں تعلیمی معیار کی تنزلی کی وجہ اس شعبے میں بہتری لانے کے لیے حکومتوں کی عدم دلچسپی ہے۔ یہ اعداد و شمار تعلیمی محکموں اور وزرا کی کارکردگی کا منہ چڑاتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ یہ اعداد وشمار ان کے دفاتر میں نمایاں طور پر چسپاں کرنے چاہیئں اور انہیں کہا جائے یہ ہیں تمھارے دعوے اور یہ ہے حقیقت۔ تعلیمی اداروں میں نا اہل اساتذہ کی بھرتیاں ایک مستقل روگ ہے۔ جبکہ ان کی تربیت کے لیے بھی کوئی طریقہ کار موجود نہیں۔ یہ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ ملک میں تعلیمی نصاب میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ حکومت کیطرفدار کہتے ہیں کہ ملک کا تعلیمی نظام گزشتہ کئی سالوں کے دوران حکومتوں کی عدم توجہ کے باعث تباہ ہوا ہے اس لیے اس میں بہتری کے لیے وقت درکار

ہوگا۔ حکومت کی جانب سے حال ہی میں تعلیم کے فروغ کے لیے بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دیا گیا ہے جبکہ 30 لاکھ نادار بچوں کو تعلیم فراہم کرنے کے لیے وسیلہ تعلیم نامی چار سالہ منصوبے کا اعلان کیا گیا ہے۔ لیکن ان منصوبوں پر سست روی سے پیش رفت کی جارہی ہے۔ اقوام متحدہ کے ملینیئم گولز کے مطابق پاکستان کو شرح خواندگی 2015 تک 56 سے 88 فیصد تک لے جانی ہے۔ لیکن حکومتی عہدیدار پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اس ہدف کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کی صوبائی حکومت نے تعلیم کے شعبے میں تبدیلی لانے کیلئے صوبے میں اسمارٹ اسکول سسٹم متعارف کرایا ہے۔ جو نچلے طبقے کو رسائی نہیں دیتا۔ اسمارٹ اسکول سسٹم میں' آٹھویں جماعت سے دسویں جماعت تک کے تمام سرکاری اسکولوں کا تعلیمی کورس کتابوں کے بجائے الیکٹرانک 'آئی پیڈز' پر منتقل کیا گیا ہے۔ حکومت پنجاب کی جانب سے صوبے کے سرکاری اسکولوں میں اسمارٹ اسکول سسٹم کے تحت 12 لاکھ طالبعلموں کو کمپیوٹر ٹیبلٹ فراہم کرنے کا پروگرام ہے تاکہ وہ کورس کو ان ٹیبلٹ پر ڈاؤن لوڈ کرسکیں اور طالبعلموں کو بھاری بھرکم بستوں سے نجات مل سکے'۔ منصوبے میں صوبے کے ہر اسمارٹ اسکول کے کمپیوٹروں کر ڈیجیٹل لائبریری سے منسلک کیا جانا بھی شامل ہے۔ یہ سب ایک ایسے ملک میں کیا جارہا ہے جہاں بچوں کی بڑی تعداد کھلے میدانوں اور بوری یا چٹائی پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اسکولوں میں اساتذہ کی کمی اور وہاں بچوں کی بے تحاشہ تعداد، جس کی وجہ سے بچوں پر توجہ نہیں دی جاسکتی۔

ملک میں سیاسی عدم استحکام، سلامتی کے حالات اور قدرتی آفات کی وجہ سے تعلیم کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششیں بھی شدید متاثر ہوئی ہیں۔ تعلی کے لحاظ سے سب سے برا حال صوبہ سندھ کا ہے۔ جس کے بارے میں سرکاری اسکولوں کے بارے میں جائزہ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ صوبہ سندھ کے 27 اضلاع میں قائم 6721 سرکاری اسکولوں میں سے 4540 اسکول غیر فعال ہیں، جبکہ 2181 اسکول محض کاغذوں پر موجود اسکول موجود ہیں۔ سندھ ہائی کورٹ کے سیشن ججز کی جانب سے مرتب کردہ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سندھ کے تعلیمی نظام کو دہشتگردوں اور خودکش حملوں سے نہیں تعلیمی نظام میں رائج بدعنوانی، جاگیرداروں اور وڈیروں سے خطرہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق، سندھ بھر میں 48227 سرکاری اسکول قائم ہیں، جس میں کراچی کے پانچ اضلاع کے 4540 سرکاری اسکول غیر فعال ہیں۔ سندھ کے 524 سرکاری اسکولوں میں غیر قانونی تجاوزات ہیں، جبکہ 17 اسکولوں کی تعمیر التوا کا شکار ہے۔ رپورٹ میں 2181 گھوسٹ اسکولوں کا انکشاف کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ مختلف اسکولوں کو مقامی زمینداروں اور جاگیرداروں کی جانب سے مویشی پالنے اور 'گیسٹ ہاوس' کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کا سندھ میں تسلسل ہے۔ سابق صدر آصف علی زرداری کے اپنے ہی ضلع بینظیر آباد میں 112 اسکولوں میں بچے تعلیم سے محروم ہیں جبکہ ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اپنے عہد صدارت میں انھوں نے ملالہ یوسف زئی کی اپیل پر دنیا بھر کی لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کے پروگرام کے لیے

سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک کروڑ ڈالر دینے کا اعلان کیا تھا۔ جبکہ ان کے اپنے ہی صوبے میں تعلیم کا نظام ابتر، اور تباہی سے دوچار رہا۔ سپریم کورٹ نے ایک سوموٹو ملک میں تعلیم کے سلسلے میں بھی لیا تھا۔

سپریم کورٹ آف پاکستان کے ازخود نوٹس پر ملک بھر میں تعلیمی نظام کی جانچ پڑتال کیلئے 11 فروری 2012 کو بنائی گئی ججز پر مشتمل کمیٹیوں کو ملک بھر میں تعلیم کے حوالے سے رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا گیا تھا.اس حکم میں کہا گیا تھا کہ ڈسٹرکٹ و سیشن ججز بذات خود جا کر اسکولوں کا جائزہ لیں اور عدالت میں رپورٹ جمع کرائیں۔ جس کے بعد ہائی کورٹ کی تجزیاتی رپورٹ سامنے آئی ہے، جس میں سندھ میں تعلیم کے نظام کی خستہ حالی سامنے آئی۔گذشتہ دور

حکومت کی سندھ کی مضبوط سیاسی جماعت نے اسمبلیوں میں مفت اور لازمی تعلیم کے کئی آرڈیننس اور قراردادیں بھی منظور کرائیں، مگر عملی طور پر سندھ میں تعلیم کے لیے اب بھی کوئی قابلِ قدر اقدامات ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دیے۔ سندھ میں گذشتہ دور میں تعلیم کے شعبے میں لاکھوں روپے رشوت لے کر ملازمتیں فروخت کرنے کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اب تک اس بارے میں کوئی تحقیقات ہیں نہ ہی اہل امیدواروں کی ملازمت کا کوئی فیصلہ ہوا ہے۔ اساتذہ اپنی تنخواہوں سے بھی محروم ہیں۔ ان کے احتجاج بھی بے اثر ہیں۔

اب ہنسی علاج غم بھی نہیں رہی

لیجیئے صاحب ، اب ہنسی علاج غم بھی نہیں رہی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ہنسنا اور دل کھول کر ہنسنا کبھی کبھی زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ طب کی دنیا میں کی جانے والی ایک نئ تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ہنسی کے نام نہاد فوائد سب پر یکساں نہیں ہو سکتے ہیں۔آکسفورڈ یونیورسٹی سے وابستہ محققین نے مریضوں میں ہنسی کے فوائد کا جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ ہنسنے کو ایک بہترین دوا سمجھنے والوں کو اس بات سے حیرانی ہو سکتی ہے کہ ہنسنا سو فیصد فائدہ مند نہیں ہے بلکہ اچانک ہنسی کا دورہ صحت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے جس سے دل پھٹ سکتا ہے یا دمے کا دورہ اور بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔

.برٹش میڈیکل جرنل کے کرسمس کی اشاعت کے خاص ایڈیشن میں ہنسنے کے فوائد اور نقصانات کا جائزہ لینے کے حوالے سے ایک سائنسی رپورٹ پیش کی گئ

ہے۔سائنسدانوں کو 1946 سے رواں برس تک مریضوں پر کیے جانے والے ایک تجربے سے پتا چلا ہے کہ اچانک قہقہوں کی وجہ سے نرخرا یا دل پھٹ سکتا ہے جبکہ دوران قہقہ تیزی سے سانس لینے سے دمے کا دورہ پڑ سکتا ہے اس کے علاوہ دیگر

نقصانات میں ہرنیا، درد شقیقہ کا بڑھنا یا جبڑے کی ہڈی بھی اتر سکتی ہے۔ تاہم برمنگھم اور آکسفورڈ سے تعلق رکھنے والے سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ درجنوں تحقیقی مطالعوں میں ماہرین کی جانب سے ہنسی کو ایک اچھی دوا کے طور پر تجویز کیا گیا ہے جس سے قلبی اور نفسیاتی تناؤ کی کیفیت میں آرام آتا ہے۔ ہنستے رہنے سے بلڈ پریشر کم رہتا ہے اور دل کے دورے کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ مسخروں کے ہمراہ کیے جانے والے اس تجربے سے ثابت ہوا کہ مسخروں کی وجہ سے مریضوں کے پھیپھڑوں کے افعال میں بہتری آئی اسی طرح دن بھر کی حقیقی ہنسی 200 کیلوریز جلانے کے کام آئی اسی طرح ذیابیطس کے مریضوں میں بلڈ شوگر بھی کم ہوئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اچانک سے ہنستے رہنا اور بے قابو قہقہوں کے باعث پیٹ پر دباؤ پیدا ہوتا ہے جس سے آنتوں کی نقل و حرکت بڑھ سکتی ہے۔ محققین نے کہا کہ ان کا جائزہ اس نظریہ کو چیلنج کرتا ہے کہ ہنسنا ایک مکمل طور پر فائدہ مند نسخہ ہے تاہم کسی بھی شکل کے مزاح کا فائدہ نقصان سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنسنا دل کی ضرورت ہے لیکن پھر بھی ہنسی مذاق نہیں ہے۔ سائنسدانوں نے نتیجے میں کہا کہ ''ہنسنا خالصتاً فائدہ مند نہیں ہے لیکن ہنسی کے فوائد عام طور پر فرض کر لیے جاتے ہیں جن کا حقیقی طور پر مظاہرہ نہیں ہوتا ہے لیکن اس کے نقصانات فوری نوعیت کے ہوتے ہیں اگرچہ تحقیق کے نتیجے میں ہنسنے کے فوائد اور نقصانات کی درجہ بندی پیش کی گئی ہے پھر بھی کچھ لوگ اس کے فوائد کو نظر انداز کرنے کی غلطی

کر سکتے ہیں جبکہ دوسری جانب ہنسی کے نقصانات کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ تو کہتے ہیں کہ ذہنی پریشانی یا دباؤ ہو تو شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بھرپور طریقے سے مسکرائیں یہ فوری ریلیف کا بہترین نسخہ ہے۔ اس کے علاوہ ذہنی تناؤ کے شکار افراد کو باقاعدہ ورزش، چہل قدمی، تیراکی، سائیکلنگ اور دیگر جسمانی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ کہاوت تو آپ نے اکثر سنی ہو گی کہ ہنسی علاج غم ہے۔ اب جدید سائنسی تحقیق سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ خوش رہنے اور زیادہ ہنسنے سے عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہنستا ہوا چہرہ نہ صرف دیکھنے والوں کو اچھا لگتا ہے بلکہ ہنسی آپ کو کئی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ امریکی ریاست ورجینیا کے شہر رچمنڈ میں ایک ایسا کلب موجود ہے جس میں داخل ہونے والا اپنی ہنسی قابو میں نہیں رکھ سکتا اور قہقہے لگا کر ہنسنے لگتا ہے کیونکہ اس کلب میں ممبر شپ کی شرط ہنسنا اور قہقہے لگانا ہے۔ اس کلب میں ہنسی کو سٹریس تھراپی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بہت سے افراد اس کلب کے ممبر ہیں جو وہاں پر دل کھول کر ہنستے ہیں اور ہنسی کے ذریعے اپنے ذہنی اور دماغی تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہنسی جہاں غم کا علاج سمجھی جاتی ہے وہیں یہ بہت سی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔ سائنسدانوں کی نئی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں کورٹی سول اور ایپین فرائن ہارمون ذہنی کھچاؤ کا باعث بنتے ہیں۔ ان کا لیول صرف ایک قہقے سے گر جاتا ہے اور انسان اپنے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس کرتا ہے جو اسے

پریشانیوں سے نکلنے اور اچھی اور بھرپور زندگی گزارنے میں مدد دیتی ہے۔ ہمارے گاؤں دیہاتوں میں بھانڈوں کی جگتیں ہوتی ہیں۔ جو دلہا دلہن اور ان کے بھائی بندوں سے لے کر کسی کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بھانڈ ایک ایک کو چن چن کر جگت لگاتے رہے اور سب ہنستے رہتے ہیں۔اب بھی پنجاب کے کئی دیہات میں بھانڈوں اور میراثی ایک ادارہ کی طرح کام کرتے ہیں، ان کے ذمہ ایک کام ہے اور وہ وہی کرتے ہے۔ وہی ان کی روزی روٹی ہے۔ صوبہ سرحد میں اگر شادی بیاہ میں کوئی ہنسنے ہنسانے والا آ بھی جاتا ہے تو وہ ادھر ادھر کا مذاق تو کرتا ہے محفل میں بیٹھے خانوں پر کوئی جگت نہیں لگاتا۔ کیا ہنسنا اتنی بری چیز ہے۔ کیا وہ خود پر ہنس بھی نہیں سکتے۔ اگر خود پر ہنسیں گے نہیں یا ہنسی برداشت نہیں کریں گے تو اپنی گھٹن کیسے کم ہو گی۔ کہتے ہیں کہ قہقہہ دو انسانوں کے درمیان سب سے کم فاصلہ ہوتا ہے۔ اگر ایک دوسرے پر اور ان کے ساتھ، ہنسیں گے نہیں تو فاصلہ کیسے کم ہو گا۔ اور اگر فاصلہ نہیں کم ہو گا تو قربتیں کیسے بڑھیں گی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر ہنسنے کے لیئے کچھ بھی نہیں ہے تو کریڈٹ پر ہنس لیں۔ اس کی بات مان لیں، یقین کیجیئے کچھ نقصان نہیں بلکہ الٹا افاقہ ہو گا۔ تنے رہنے سے دماغی مسائل ہی بڑھتے ہیں۔ میری بات پر یقین نہیں تو ان کی طرف دیکھیئے جو تنے رہتے ہیں۔ کہا خوب کہا کسی نے کہ 'وہ میرے خواب پر ہنستی رہتی ہے اور میں اس کی ہنسی کے خواب دیکھتا رہتا ہوں' سال انیس سو پچانوے میں انڈیا کے ایک ڈاکٹر مدن کتاریا نے ہنسی کا عالمی کلب

قائم کیا تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ہنسنے سے انسانی صحت کا دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے۔ آج انڈیا بھر میں اس کے سینکڑوں ارکان ہیں۔ ویتنام کے لوگوں نے لافٹر یوگا کو معمول کا حصہ بنا لیا ہے۔ ہنوئی میں شہری صبح سویرے پارک کا رخ کرتے ہیں جہاں وہ قہقے لگا کر یوگا کی مشق کرتے ہیں۔ یوگا میں نوجوانوں کے ساتھ معمر افراد بھی .بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

کیطرح سے کام کرتا ہے اور ہر وہ(Magnet) آج کی جدید سائنس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ انسانی ذہن ایک مقناطیس شئے اپنی طرف کھینچتا ہے جس کے بارے میں انسان سوچ رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ خوشی کے مواقع پر انسان کو ہر طرف خوشی نظر آتی ہے حتیٰ کہ شور بھی موسیقی کی طرح معلوم ہوتا ہے ،محبت کے عالم میں

زندگی کے معاملات انتہائی خوبصورت اور رنگین نظر آتے ہیں جبکہ غم و پریشانی کے عالم میں دنیا بھر میں کرب اور تکلیف دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ دراصل اسی قانون کے مطابق ہے کہ انسانی ذہن جس سوچ و فکر میں مگن ہے وہ اپنے اردگرد اسی طرح کے حالات و واقعات اکٹھا کرتا جا رہا ہے۔ انگریزی ادب کے مشہور ادیب سیموئل جانسن نے اپنی مشہور انگریزی ڈکشنری (1755) کا انتساب لارڈ چیسٹر فیلڈ کے نام کیا مگر Chesterfield نے کوئی ایک لفظ بھی Samuel Johnson سے شکریہ کا نہیں کہا۔ اس پر شکایتاً جانسن نے کہا کہ ''وہ مسکرایا تک نہیں۔ جواباً چیسٹر فیلڈ کا کہنا تھا کہ ہنسنا جذبات کی گراوٹ ظاہر کرتا ہے۔ وہ مسکراہٹ اور قہقہہ لگانے یا زور سے ہنسنے میں فرق کرتا ہے اور زور سے ہنسنا اس کے نزدیک تہذیب کے خلاف ہے، لیکن عصر حاضر میں نفسیات دانوں نے قہقہہ لگانے یا زور زور سے ہنسنے کو جذبات کے اظہار اور اندر کی گھٹن کے اخراج کے لئے ضروری قرار دیا ہے، اسی لئے موجود زمانے میں ایسے بہت سے کلب یا جماعتیں ہیں جہاں لوگ ایک جگہ جمع ہو کر زور زور سے ہنستے ہیں، جس سے ان کی طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔ ہنسنے اور مسکرانے کے حوالے سے جو روایات ہیں، وہ بڑی اہم ہیں کہ کسی شخص کی کمزوری پر نہیں ہنسنا چاہیے۔ بے ہودہ مذاق پر ہنسنا بھی اچھی روایت نہیں رہی۔ کسی کے انتقال پر یا عبادت گاہ میں بے جا ہنسنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تمام تر پابندیوں کے باوجود ہنسنا مسکرانا انسان کی بنیادی ضرورت رہا ہے۔ اسلام میں تو مسکرانا اور مسکراہٹیں

بانٹنا کارِ خیر ہے۔ مسکراہٹ کے بہترین نمونے ہمیں یونان کے مجسموں میں ملتے ہیں جن میں عورتیں اور مرد مسکراتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ کبھی غمگین ہے، کبھی، شرارتی۔ مسکراہٹ کی وجہ سے ہی مونالیزا کی تصویر مشہور ہو گئی۔

مسکراہٹ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ سترہویں صدی کے انگلستان میں عورتیں ایسا مالک یا خاوند چنتی تھیں، جس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ مسکراتا ہو چہرا بلاشبہ دلکش ہوتا ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ مسکراہٹ سے شخصیت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ مسکراہٹ کی اہمیت کے پیش نظر ہی انگس ٹرومبل نے اس موضوع پر...... اے بریف ہسٹری آف سمائل کے عنوان سے لائق مطالعہ کتاب لکھ دی تھی۔ مصنف کا خیال ہے کہ جب بھی کوئی شخص مسکراتا ہے تو اس کے ذریعے نہ صرف اس کے جذبات کی عکاسی چہرے سے ہوتی ہے، بلکہ اسے اپنے جسم کو بھی کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ اس عادت اور طور طریق کو شائستگی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انگس ٹرومبل کا خیال ہے کہ مسکراہٹ چاہے اچانک ہو یا بناوٹی، شستہ ہو یا شہوت سے بھری ہوئی؟ یہ دماغ میں کسی کیمیائی رد عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ مسکراہٹ کے ذریعے ہم خاموشی سے کوئی نہ کوئی پیغام دوسروں کو دیتے ہیں...... مسکراہٹ ایسی زبان ہے، جسے بچے بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں، مسکراہٹ کا نہ کوئی جغرافیہ ہے، نہ مسلک، بلکہ یہ آفاقی لباس ہے، جسے زیبِ تن کرکے

کوئی بھی اچھا کہلا سکتا ہے، لیکن اسے بد نصیبی کے سوا کیا کہیے کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا، سرمایہ دارانہ و صنعتی معاشرے کے قیام کے ساتھ ہی انسان بھی مشین اور روبوٹ بننے لگا۔ محنت محبت پر غالب آ گئی، پیار کی جگہ بیوپار اور جذبات کی جگہ مہارت نے لے لی، چنانچہ انیسویں صدی میں ادب آداب پر یورپ میں جو کچھ لکھا گیا، اس میں ملازمین کے لئے خاص ہدایات تھیں کہ مالک اور ملازم اور باس اور نوکر کے درمیان فاصلہ ضروری ہے۔ تب یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ کیا ملازموں کے ساتھ مسکرا کر بات کرنی چاہیے؟ اس بارے میں بیوروکریٹک ''نہیں'' بھی تھی، مگر کچھ کا خیال تھا کہ مسکرا کر بات نہ بھی کریں تو آپ کا شکریہ، مہربانی ضرور کہنا چاہیے۔

مزدوری اور ملازمت کی دلدل نے انسانوں سے مسکراہٹ چھین لی ہے۔ اسی پس منظر نے ایک (Harvey Ball) میں 1963ء میں مشہور کمرشل آرٹسٹ ہاروے بال مسکراتا ہوا چہرہ بنایا جو مقبول عام ہوا، اس نے بناوٹی زندگی گزارنے والوں کو یاد کروایا کہ انسان مسکرا بھی سکتا ہے، یہ مسکراتی تصویر دنیا بھر میں گڈ چیئر اور گڈ ول کی علامت بن گئی۔ مسکراہٹ کی مقبولیت نے اس کی افادیت کا راز بھی افشا کرنا شروع کر دیا اور ہاروے بال نے ہی سوچا کہ ہمیں ہر سال کم از کم ایک دن مسکراہٹ اور مہربانی کے لئے وقف کرنا چاہیے۔ آہستہ آہستہ کچھ لوگ اس کے حامی ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہر سال اکتوبر کا پہلا

جمعہ مسکراہٹوں کا دن ہوگا۔ اسی تصور کے ساتھ پہلا "ورلڈ سمائل ڈے" 1999ء میں منایا گیا۔ 2001 میں ہاروے بال انتقال کرگیا تو اس کے چاہنے والوں نے اس کے نام سے ایک فاونڈیشن بنائی ، اب اس فاونڈیشن کے زیرِ اہتمام ہر سال اکتوبر کے پہلے جمعہ کو مسکراہٹ کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔آج کل ہم اتنے مشینی ہو گئے ہیں کہ مسکرانا بھول چکے ہیں۔

جی ہاں ! مسکراہٹ کا سبق دوسروں کو یاد کروانا اور مسکراہٹیں بانٹنا ایسا کار خیر ہے، جس کا اجر دونوں جہانوں میں ملتا ہے۔اٹلی کے رہائشی اپنی انوکھی مزاح کی حس کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس دفعہ کے میلے میں سیاست دانوں کا طرز زندگی اور سماجی مسائل کو پیٹس کے ذریعے اجاگر کیا گیا۔

سبز آنکھوں اور دُم کے بغیر کالی بلی کا پپٹ اس میلے کی خصوصی علامت تھی۔ شہر کے سابق میئر نے پریڈ کے دوران ایک ماڈل بلی کی دم کو کاٹا جس کا مقصد یہ باور کرانا تھا کہ معاشی مسائل کو اس طرح کاٹ کر ختم کیا جاسکتا ہے۔ میلے کے شرکا کا کہنا تھا کہ اگر آپ میں مزاح کی حس ہے تو زندگی بہت آسان ہوجاتی ہے، مسکرانا اور قہقہے لگانا ہمیں مشکلات اور مسائل سے دور رکھتا ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ اس میلے کے انعقاد سے ملک میں ٹورازم کو فروغ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ اس میلے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اداکارہ بشریٰ انصاری ہنسنے ہنسانے کی قائل ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی عوام مشکلات کا شکار ہے انکو تفریح اور ہنسی مذاق کے مواقع فراہم کرنا بھی صدقہ جاریہ ہے ۔ بشریٰ انصاری کا کہنا ہے کہ میں نے زیادہ تر کامیڈی رول ادا کئے ہیں جو کہ بہت مشکل ہوتے ہیں، کیونکہ کامیڈی میں لوگوں کو ہنسانا اور ان کو ذہنی تفریح فراہم کرنا مقصد ہوتا ہے اور اسی وجہ سے مجھے کامیڈی اداکاری کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر میں نے کامیڈی کے علاوہ بھی ایسے سنجیدہ کردار ادا کئے ہیں جنہوں نے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھی لائے مگر مجھے رونے کی بجائے ہنستے ہوئے چہرے اچھے لگتے ہیں۔دوسری جانب ڈاکٹروں نے ہنسی کو درد کا خاتمہ کرنے والی گولی (پین کلر) سے تشبیہہ دی ہے، ہنسنے کا عمل آپریشن کے زخم کو جلد مندمل کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

مذاق یا مزاح میڈیکل کٹ کا لازمی حصہ ہے، ہنسنے ہنسانے سے مریضوں میں اُمید، مسرت اور شادمانی کے مثبت جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ تجربات سے یہ بات ثابت کی ہے کہ ہنسنے کا عمل انسان کی صحت پر بہت خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ ہنسنے سے انسان میں بھی زندگی کی نئی روح دوڑ جاتی ہے۔ بیشتر ممالک کے اسپتالوں میں ڈاکٹروں کو باقاعدہ مریضوں سے ہنسی مذاق کرنے کی تربیت دی جاتی ہے، یہاں تک کہ آپریشن تھیٹر میں لے جاتے ہوئے مریضوں کو بھی خوش رکھنے اور ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔امریکہ کے بعض اسپتالوں میں 24 گھنٹے کی نشریات پر مشتمل ایسے ٹی وی چینل کھولے گئے ہیں جو صرف اسپتال کی حد تک محدود ہیں اور ان میں مزاحیہ ڈرامے، فلمیں لطائف اور مزاحیہ خاکے گانے اور اس طرح کی دوسری چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔ بعض اسپتالوں میں جوکرز کرداروں کو مدعو کیا جاتا ہے جو اپنی حرکات وسکنات سے مریضوں کو ہنساتے ہیں۔ ایسے ٹی وی چینلز کو ہیومر ہیپلس ہیلنگ کا نام دیا گیا ہے۔ بعض اسپتالوں میں اس چینل کے علاوہ ہیومر تھراپسٹس کو باقاعدہ ایک شعبہ کی شکل دی گئی ہے جو ہیومر ایسوسی ایشن کے نام سے اسپتال میں مختلف وارڈ میں گھوم پھر کر مریضوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس پلاسٹک کی مرغیاں پانی والا پستول اور اسی قسم کی دیگر اشیا ہوتی ہیں جن کو وہ ہنسنے ہنسانے کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ اسپتالوں کے علاوہ گھروں میں بھی ہنسنے کے رجحان کو ترقی دی جارہی ہے۔

بعض دوست اپنا مخصوص گروپ بنالیتے ہیں اور پھر کسی پارک میں جاکر دس یا بیس منٹ تک مسلسل ہنستے ہیں ایک عام آدمی کی نظر میں یہ حرکت قدرے عجیب سی بھی ہوسکتی ہے لیکن اس عمل سے گزرنے والے بہرحال ایک فائدہ مند عمل کر رہے ہوتے ہیں۔امریکن ایسوسی ایشن فار تھراپیوٹک ہیومر بھی اس ضمن میں کافی کام کررہی ہے۔ ہنسنے ہنسانے اور خوشگوار مذاق کی خصوصیات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بچوں کی انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں بھی جوکرز کرداروں کی ٹیموں کو داخلے کی اجازت ہے جو وہاں پر داخل بچوں کو اپنی دلچسپ حرکات اور تماشوں سے محظوظ کرتے ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بچے ایک دن میں 400 مرتبہ جبکہ جوان افراد 15 مرتبہ ہنستے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بچوں میں بڑوں کی نسبت چھوٹی موٹی بیماریاں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔امریکی ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق ہنسنے سے بلڈ پریشر کے مریضوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچتا ہے اور اگر ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے تو اس میں کمی ہوجائے گی ، دباؤ میں بھی کمی آئے گی اور اعصاب کو سکون ملے گا، پٹھوں پر بھی اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے، سب سے اہم بات یہ کہ انسانی جسم کی قوتِ مدافعت میں اضافہ ہوگا۔ہنسی سے انسانی صحت پر اثرانداز ہونے والے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں مختلف دوستوں کے دو الگ الگ گروپ بنائے گئے ایک گروپ کو مزاحیہ ویڈیو فلمیں کتابیں اور اسی طرح مزاحیہ گیت سنائے

گئے جبکہ دوسرے گروپ کو ان چیزوں سے محروم رکھا گیا نتائج کے مطابق جن طلبہ کو مزاحیہ سامان مہیا کیا گیا تھا ان میں دباؤ کے آثار دیگر طلبہ کی نسبت بہت کم تھے ان کے کولیسٹرول کی سطح بھی دوسرے گروپ کے مقابلے میں بہتر اور متوازن تھی ان تمام دوستوں کا بلڈ پریشر تقریباً یکساں تھا جبکہ دوسرے گروپ میں بعض لڑکوں کا بلڈ پریشر ایک دوسرے سے خاصا مختلف تھا۔ ماہرین نے ان طلبہ کی قوت مدافعت کو بھی دوسرے گروپ سے بہتر قرار دیا ان کے چہرے بھی دیگر طلبہ کی نسبت روشن اور تفکرات سے عاری تھے۔ڈاکٹروں کے مطابق سخت قسم کی بیماریوں کے دوران بھی ہنسنے کا عمل مریضوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسے مریضوں کے لیے جو آپریشن کے بعد زخم کے مندمل ہونے کا انتظار کر رہے ہوں ان پر ہنسی بہت مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ ان کے زخم جلد مندمل ہو جاتے ہیں۔ مریضوں کو ہنسنے ہنسانے کی غرض سے فلم تیار کرنے والے ایک شخص کو امریکن ایسوسی ایشن فار تھراپیوٹک ہیومر نے باقاعدہ ایوارڈ سے نوازا ہے۔

مریضوں کو خوش رکھنے اور انہیں ہنسی مذاق سے محفوظ رکھنے کا رواج ساڑھے چار سو قبل یونانیوں میں بھی موجود تھا قدیم یونانی تاریخ کے مطابق ایسے مریض جنہیں جراحت آپریشن) کے عمل سے گزرنا پڑتا تھا ان کے لیے خاص طور پر ہیلنگ ہاؤسز قائم کیے) گئے تھے انہیں آپریشن کے بعد لازمی ان ہاؤسز میں داخل

ہونا پڑتا جہاں مسخرے اپنی حرکات و سکنات سے انہیں ہنساتے تھے۔آج ایسے کئی مراکز موجود ہیں جو انہی ہیلنگ ہاؤسز کی جدید شکل ہیں جہاں بیمار افراد کا ہنسی مذاق سے علاج کیا جاتا ہے ، یہاں ڈاکٹرز اور نرسیں باقاعدہ راؤنڈ کرتی ہیں ادویات کھلانے کے علاوہ مریضوں کو ہنسانا ڈاکٹرز اور دیگر اسٹاف کی باقاعدہ ڈیوٹی میں شامل ہے اس سے مریضوں پر ادویات استعمال کرنے کے باعث جو دباؤ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اس سے نجات ملتی ہے۔ ڈاکٹرز اور نرسیں مریضوں سے مختلف انداز میں مذاق کرتے ہیں اسی طرح کھلاڑیوں کو بھی تازہ دم رکھنے کے لیے بعض کوچز نے جوکرز وغیرہ کی مدد لینا شروع کردی ہے تاکہ میدان میں اترنے سے قبل وہ ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہوکر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ مختلف بادشاہوں نے اپنے دربار میں ایسے لوگوں کا انتظام کر رکھا تھا جو انہیں مختلف طریقوں سے ہنساتے تھے اور ان مسخروں کو بھاری انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امورِ سلطنت کی انجام دہی بادشاہوں کو ذہنی طور پر تھکادیتی تھی چنانچہ جب وہ مسخروں سے لطائف وغیرہ سنتے تو خود کو پرسکون اور تازہ . دم محسوس کرتے۔ہم آج بھی ملا دوپیازہ اور بیربل کے لطائف پر ہنستے ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہنسنے کا عمل ان کا جسمانی قوت مدافعت میں اضافہ کرتا اور اس سے ان کا اعتماد بڑھتا تھا۔امریکن ایسوسی ایشن فار تھراپیوٹک ہیومر کی ایک نرس کے مطابق ہمارا بیمار مریضوں کو ہنسانا یا ان سے ہنسی

مذاق کرنے کا عمل ادویات کا نعم البدل نہیں ہے اور نہ یہ کوئی باقاعدہ علاج ہے ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ دس منٹ کی روزانہ ہنسی آپ کو کسی مرض سے چھٹکارا دلا دے گی تاہم اتنا ضرور ہے کہ مذاق یا مزاح میڈیکل کٹ کا ایک حصہ ہے۔ہنسی سے مریضوں میں اُمید مسرت شادمانی اور مثبت جذبات پروان چڑھتے ہیں ان میں اپنی بیماریوں کے خلاف لڑنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے ان میں مایوسیوں کا خاتمہ ہوتا ہے وہ زندگی سے پیار کرنے لگے ہیں۔ مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آ گئی ہے کہ چھوٹے موٹے امراض کو دور کرنے میں ہمارے دفاعی نظام کا بہت عمل دخل ہے میڈیکل کے طلبہ اور عمر رسیدہ افراد کا دباؤ کے باعث دفاعی نظام کمزور پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے انہیں جلدی ٹھنڈ لگ سکتی ہے اس کے علاوہ ان میں غصہ چڑچڑاپن عدم تحفظ کا احساس اور دباؤ بڑھ سکتا ہے اور یہ تمام چیزیں دل کے امراض کا سبب بن سکتی ہیں اگر یہ لوگ مزاحیہ فلمیں اور اس قسم کی دیگر ہنسنے ہنسانے والی دیگر سرگرمیوں سے محفوظ ہوں تو ان میں قوت مدافعت بڑھ سکتی ہے اور انہیں کولیسٹرول (زندگی کے لیے ضروری ایک اہم ایڈرنیل کارٹیکل سیٹرائڈم) کی سطح بھی متوازن رکھنے میں مدد ملے گی اور ایسے ہارمونز جو دباؤ کا باعث بنتے ہیں ان میں بھی کمی آئے گی۔

ایک تحقیق کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمارا ذہن ہمارے دفاعی نظام سے باقاعدہ گفتگو کرتا ہے اسی طرح ہمارے اعصاب دفاعی نظام اور دیگر جسمانی

اعضاء ایک کیمیکل کی مدد سے برقی اشاروں کی طرح ذہن تک اپنی بات پہنچاتے ہیں جب ہم ہنستے ہیں تو ہمارے اعصاب دماغ کو خوشگوار اور مسرت بھرے پیغام بھیجتے ہیں جس پر یقیناً دماغ کا جواب بھی خوشی اور مسرت کی صورت میں نکلتا ہے جس سے دفاعی نظام مضبوط ہوتا ہے۔ یوں دباؤ اور دیگر چھوٹے موٹے امراض قوت مدافعت کے سامنے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ بھارت میں اس وقت 150 سے زائد لافٹر کلب (ہنسنے کے مراکز) قائم ہیں جبکہ اس کے علاوہ فرانس اور جرمنی وغیرہ میں بھی اس طرز کے مراکز کا رواج بہت بڑھ رہا ہے، ان مراکز میں باقاعدہ ہنسنے کے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ جس میں شیر کی ہنسی، منہ بند ہنسی، کبوتر کی ہنسی وغیرہ ہنسنے کے عام طریقے ہیں۔ ہنسنے کا عمل جسم کے مختلف اعضا کی بہترین ورزش بھی تصور کی جاتی ہے۔ یہ پھیپھڑے دل و دماغ اور دیگر اعصاب کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی ہے، اس سے آپ کی روح کو تازگی ملتی ہے بالخصوص سانس کے امراض کے لیے دس منٹ کی روزانہ ہنسی بہت مفید رہتی ہے اگر کسی پارک یا کھلی فضا میں یہ عمل کیا جائے تو زیادہ موثر ثابت ہوگا، آپ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔ ماہرین کی رائے میں ہنسی کے دوران آپ کے دماغ کا دیگر پریشانیوں سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے، غیر ضروری سوچیں اور بے معنی تفکرات جو اکثر اوقات آدمی کو گھیر لیتے ہیں ان سے چھٹکارا ملتا ہے۔ بھارت میں لافٹر کلب کی بانی مس کیتریا کے بقول روزانہ صبح بیس منٹ کی ہنسی ایک ایسی چابی ہے جو آپ کے جسم میں خوشگوار اثرات بھر دیتی ہے اور آپ پورا دن

چاق و چوبند اور خوش رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں آپ کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا لیکن اس کے عوض جسمانی اور روحانی طور پر آپ کو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے ۔ہر وقت خود پر سنجیدگی طاری رکھنا آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا ہنسنے کی بات پر دل کھولکر ہنسیے۔ کیلی فورنیا میں سائنسدان باقاعدہ اس بات پر تحقیق کر رہے ہیں کہ ہنسی کے ذریعے سر میں موجود رسولی کا کس طرح خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ روزانہ مسکرانا اور مسکراہٹیں بانٹنا بھی ایک فن ہے۔ ولیم آرتھر وارڈ نے کہا تھا کہ..... مسکراہٹ مہربانی، محبت اور انسانیت کی آفاقی زبان ہے۔ آج انسانوں کو اس کی اشد ضرورت ہے ہمیں یہ زبان بھول جانے والوں کو اسے دوبارہ یاد کروانا ہے۔

سال دو ہزار تیرہ چند یادیں چند باتیں

سال دو ہزار تیرہ کے اہم واقعات پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ان میں کینیا کے ایک شاپنگ مال میں ہونے والا حملہ، بوسٹن میراتھون کے دوران بم دھماکے، شام کا کیمیکل حملہ، مصر میں مرسی جمہوری حکومت کا خاتمہ، مصر میں اخون المسلمون پر حکومتی جبر اور ہزاروں افراد کا قتل اور مظاہروں کا سلسلہ۔ یوکرین میں مظاہروں کے علاوہ ٹائیفون ہیان اور جنوبی افریقہ کے سابق صدر نیلسن منڈیلا کی موت سمیت متعدد واقعات شامل ہیں جو رواں سال پیش آئے۔ایشیا میں سال 2013ء کے اہم واقعات میں بنگلہ دیش میں ملا عبدالاقادر کی پھانسی، حسینہ واجد کو داخلی سیاسی بحران سامنا شامل ہے۔ بنگلہ دیش میں اس سال کے آغاز سے ہی سکیورٹی فورسز اور مظاہرین کے درمیان پُر تشدد جھڑپوں کے واقعات تواتر سے پیش آتے رہے، جن میں دسمبر تک دو سو سے کہیں زیادہ افراد مارے گئے۔ بنگلہ دیش میں مجوزہ نئے پارلیمانی انتخابات اور جماعت اسلامی کے کئی سابقہ ارکان کو سنائی جانے والی موت کی سزاؤں کو ان احتجاجی مظاہروں میں مرکزی اہمیت حاصل رہی۔اس سال پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک حکومت نے اپنی پانچ سالہ مدت پوری کی اور نئے انتخابات کے نتیجے میں پاکستان مسلم لیگ.برسرِ اقتدار آئی، شمالی کوریا نے تیسرا ایٹمی تجربہ کیا۔

بین الاقوامی اہمیت کے حامل واقعات و حالات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں میرے نزدیک سب سے اہم واقعہ 84 سال کی ان تھک جدوجہد کے نتیجے میں مصر میں اخوان کا برسراقتدار اور اس حکومت کا یک سال کے عرصے میں خاتمہ ایسا واقعہ ہے۔ جس نے نے مشرق وسطٰی کی سیاست میں ایک بھونچال پیدا کر دیا ہے۔ اُدھر کویت اور بحرین میں ملوکیت کے خلاف عوامی جدوجہد روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔ کویت میں عوام نے امیر کے نئے انتخابی ضابطے کے خلاف پرامن احتجاج جاری رکھا۔
لاطینی امریکہ کی تیل سے مالا مال ریاست وینزویلا کے صدارتی انتخاب میں بطل حریت نے ایک بار پھر امریکہ کی حمایت Hugo Chavez استعمار شکن قائد ہیوگو شاویز یافتہ متحدہ حزب اختلاف کے صدارتی امیدوار کو شکست فاش دے کر امریکی استعمار پر ایک اور ضرب کاری لگائی۔ دوسری جانب امریکہ کی جانب سے دہشت گردی کے خلاف نام نہاد مہم کے نام پر افغانستان، عراق، پاکستان، مالی، یمن صومالیہ وغیرہ پر انتہا پسندی کا الزام عائد کرکے ان کی بستیوں پر ڈرون حملے جاری رہے۔ جس میں معصوم شہری ہلاک ہو رہے۔ اس سال کی خاص بات امریکہ اور ایران کی صلح ہے۔ جس کے خطے پر دیرپا اثرات مرتب ہوں گے۔ پاکستان بھارت سے دوستی کے لیے جتنا مشتاق ہے، بھارت اس سے اتنا ہی بیزار

ہے۔ بھارت کو خوش کرنے کے لیے حکمرانوں اور منافع خور تاجروں نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ اسے پسندیدہ ترین ریاست قرار دینے کی پیشکش کے ساتھ تجارت اور سرمایہ کاری کی دعوت عام دے ڈالی جبکہ ایک میڈیا نے پریم سبھا اور امن آشا کے ذریعے بھارت کی جنتا کو رام کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کے جواب میں بھارت کی حکومت سر کریک اور سیاچن جیسے فروعی تنازعات پر بھی کوئی لچک نہیں دکھاتی اور الٹا پاکستان پر دہشت گردی کا الزام لگاتی ہے۔ پاکستان میں نئے سال کا آغاز دہشت گردی کی ایک لہر سے ہوا، جس میں کوئیٹہ میں بم دھماکے ہوئے۔ اس دہشت گردی کے واقعات میں دو سو سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ پاکستانی سیاست کو ایک دھچکہ اس وقت لگا جب ملکی سیاست کے ایک اہم اور فعال رہنما اور سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد چھ جنوری کو انتقال کر گئے۔ قاضی حسین احمد (پیدائش: 12 جنوری 1938ء، وفات: 6 جنوری 2013ء) ممتاز عالم اور سیاستدان تھے جنہوں نے جماعت اسلامی کے امیر کے طور پر شہرت پائی۔ آپ کے دور میں جماعت سیاسی طور پر زیادہ عوامی مقبولیت کی طرف مائل ہوئی۔ آپ کی زیر صدارت انیس اٹھاسی کے انتخابات میں جماعت کا یہ نعرہ ظالمو ڈرو، قاضی آ رہا ہے مقبول ہوا۔ وہ جماعت اسلامی کے سابق امیر۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کے آخری سربراہ تھے۔ قاضی حسین احمد 1938ء میں ضلع نوشہرہ (صوبہ سرحد) کے گاؤں زیارت کاکا صاحب میں پیدا ہوئے۔ والد مولانا قاضی محمد عبدالرب صاحب ایک ممتاز عالم دین تھے اور اپنے علمی

رسوخ اور سیاسی بصیرت کے باعث جمعیت علمائے ہند صوبہ سرحد کے صدر چنے گئے تھے۔ قاضی صاحب نے اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کے بعد پشاور یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم ایس سی کی۔ بعد از تعلیم جہانزیب کالج سیدو شریف میں بحیثیت لیکچرار تعیناتی ہوئی اور وہاں تین برس تک پڑھاتے رہے۔ جماعتی سرگرمیوں اور اپنے فطری رحجان کے باعث ملازمت جاری نہ رکھ سکے اور پشاور میں اپنا کاروبار شروع کردیا۔ جہاں سرحد چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ دوران تعلیم اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان میں شامل رہنے کے بعد آپ 1970ء میں جماعت اسلامی کیرکن بنے، پھر جماعت اسلامی پشاور شہر اور ضلع پشاور کے علاوہ صوبہ سرحد کی امارت کی ذمہ داری بھی ادا کی گئی۔ 1978ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری جنرل بنے اور 1987ء میں جماعت اسلامی پاکستان امیر منتخب کر لیے گئے۔ تب سے اب تک چار مرتبہ (1994، 1999، 1992، 2004) امیر منتخب ہوئے۔ قاضی حسین احمد 1985ء میں چھ سال کے لیے سینیٹ آف پاکستان کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1992ء میں وہ دوبارہ سینیٹر منتخب ہوئے، تاہم انہوں نے حکومتی پالیسیوں پر احتجاج کرتے ہوئے بعد ازاں سینٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ 2002ء کے عام انتخابات میں قاضی صاحب دو حلقوں سے قومی اسمبلی کیرکن منتخب ہوئے۔ نورانی صاحب کی وفات کے بعد تمام مذہبی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے یعنی متحدہ مجلس عمل کے صدر منتخب ہوئے۔ جولائی 2007ء میں لال مسجد واقعے کے بعد اسمبلی سے استعفیٰ دینے کا اعلان کر دیا 3 نومبر کے تاخت کے

بعد آپ کو اپنے گھر میں نظربند کر دیا گیا۔ 14 نومبر کو عمران خان کو پولیس کے حوالے کرنے کا واقعہ ہوا۔[2] دو ہی روز بعد حکومت نے قاضی صاحب اور جماعت اسلامی کے بڑوں کی نظربندی ختم کر دی۔ قاضی حسین احمد 6 جنوری 2013ء کو دل کے عارضہ سے اسلام آباد میں انتقال کر گئے اور یوں پاکستانی سیاست کا ایک اہم باب بند ہوگیا۔اس سال کے آغاز میں لاہور میں توہین رسالت کے تنازع پر ناخوشگوار واقعات پیش آئے جن میں مظاہرین نے توہین رسالت کے تنازع پر نذر آتش پاکستانی عیسائیوں کے 100 سے زیادہ گھر جلا دیئے۔ مارچ میں پاکستان میں انتخابات کا سلسلہ شروع ہوا۔

میر ہزار خان کھوسو کو 25 مارچ سے پاکستان کے نگران وزیر اعظم کے طور پر مقرر کیا گیا ہے .جناب میر ہزار کھوسو نے مئی میں شیڈول کے مطابق عام انتخابات کی نگرانی کی ۔ ملک کے عام انتخابات 11 مئی 2013 کو منعقد ہوئے۔گیارہ مئی کے عام انتخابات اور خاص کر اس کے نتائج نے تقریباً تمام بڑی سیاسی جماعتوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کئی جماعتیں تو ایسی ہیں جن کا بالکل ہی صفایا ہوگیا ہے۔ مثلاً، اے این پی۔ جبکہ، کچھ جماعتیں ایسی ہیں جنھیں اپنے ہی سیاسی قلعوں میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، مثلاً ایم کیو ایم کو کراچی میں اور پیپلز پارٹی کو اندرون سندھ۔ ان انتخابات اور گزشتہ ادوار کے انتخابات میں جو سب سے بڑا فرق نظر آیا وہ پاکستان تحریک انصاف کی دھواں

دار انٹری تھا۔ جبکہ پنجاب اور خیبر پختونخوا میں گزشتہ کئی دہائیوں کے روایتی نتائج پاش پاش ہو گئے۔ تحریک انصاف نے پنجاب کی دوسری اور خیبر پختونخوا کی سب سے بڑی جماعت بن کر ایک جانب پیپلز پارٹی کو سندھ تک محدود کر دیا، تو وہیں مسلم لیگ ق اور عوامی نیشنل پارٹی بھی سیاسی نقشے سے دور ہو گئی۔ گیارہ مئی کے انتخابات نے سب سے بڑے شہر کراچی کی منجمد سیاست کو بھی جنھجھوڑ کر رکھ دیا۔ اگرچہ، شہر کے سیاسی پس منظر میں کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آئی، لیکن تین دہائیوں کے بعد بھرپور مقابلے کی فضا نظر آئی۔ جماعت اسلامی عین وقت پر انتخابات سے بائیکاٹ کر گئی۔ جس سے عوام کو مایوسی ہوئی، جبکہ پی ٹی آئی کراچی میں یک نئی سیاسی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ۔ قومی اسمبلی کے حلقے این اے 245 نارتھ ناظم آباد سے پی ٹی آئی کے امیدوار ریاض حیدر کو شکست کے باوجود 54 ہزار ووٹ ملے۔ این اے 246 کی صورتحال بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں پی ٹی آئی کے امیدوار امیر شرجیل کو 32 ہزار اور این اے 243 نارتھ کراچی اور نیو کراچی سے زاہد حسین کو تیس ہزار ووٹ ملے۔ اسی طرح، پی ٹی آئی کے راشد صدیقی نے لیاقت آباد میں قومی اسمبلی کے حلقہ این اے- 247 سے 35 ہزار سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ جبکہ، محمود آباد کے حلقہ این اے- 251 سے پی ٹی آئی کے امیدوار راجہ اظہر کو تقریباً انتالیس ہزار ووٹ پڑے۔ کراچی کا حلقہ این اے 250 زیادہ تر پوش علاقوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کے ووٹر کو چونکہ عام آدمی جیسے مسائل کا سامنا نہیں۔ لہٰذا، وہ ووٹ

ڈالنے کم ہی نکلتے ہیں۔ لیکن، اس بار کمال ہوگیا۔ اُن علاقوں میں بڑی تعداد میں ووٹرز نہ صرف گھروں سے نکلے بلکہ انہوں نے کئی کئی گھنٹے لائنوں میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کیا۔ اس کے باوجود، جو لوگ تاخیر سے پہنچنے اور بے ضابطگی یا مبینہ طور پر دھاندلی کے سبب ووٹ کاسٹ نہ کر سکے، انہوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اسی احتجاج کے سبب، الیکشن کمیشن نے 19 مئی کو یہاں دوبارہ پولنگ کے احکامات جاری کئے۔ جس کے نتیجے میں عارف علوی تحریک انصاف کو کراچی سے ایک سیٹ دلانے میں کامیاب ہوگئے۔ تجزیہ نگاروں اور سیاسی مبصرین کی رائے ہے کہ مسلم لیگ ن کے لئے انتخابات میں کامیابی کسی بھی طرح پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوگی۔ حکومت کو لوڈ شیڈنگ، معاشی بدحالی، مہنگائی اور بے روزگاری جیسے بہت سارے سنگین اور دیرینہ مسائل کا سامنا ہے۔ پچیس مئی کو گجرات کے قصبہ کوٹ فتح کے قریب سکول وین میں آگ لگنے سے خاتون ٹیچر اور 16 بچے زندہ جل گئے، تین زخمی بچوں کو سی ایم ایچ کھاریاں کے برن یونٹ میں منتقل کر دیا گیا ہے، جاں بحق ہونے والے بچوں میں زندہ جل جانے والی سکول ٹیچر کی تین بھتیجیاں اور ایک بھتیجا بھی شامل تھے۔ اِس دردناک حادثے سے گجرات کے دیہات منگووال، راجیکی، کنگ سیائی، کنگ چنن اور کنجاہ میں کہرام مچ گیا۔ وین بچوں کو لے کر منگووال کے ایک پرائیویٹ سکول جا رہی تھی کہ گاڑی میں رکھا ہوا پٹرول لیک ہونے سے اِس میں اچانک آگ بھڑک اٹھی، بچے باہر نہ نکل سکے اور وین کے اندر ہی جل کر جاں بحق ہو گئے۔ صدر

وزیراعظم اور سیاسی رہنماوں کی طرف سے اِس واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے،
نگران وزیراعلیٰ پنجاب نجم سیٹھی نے مرحوم بچوں کے لواحقین کے لئے پانچ پانچ لاکھ روپے کی امداد کا اعلان کیا ہے۔ وین کا ڈرائیور موقع سے فرار ہوگیا جسے بعد میں گرفتار کر لیا گیا۔ ڈرائیور کے بیان کے مطابق وین نے آگ اُس وقت پکڑی جب اُس نے انجن کو گیس سے پٹرول پر منتقل کرنے کے لئے سوئچ لگایا۔ ایک اطلاع کے مطابق سکول سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر بچوں نے ڈرائیور سے کہا کہ انکل جلنے کی بو آ رہی ہے، لیکن ڈرائیور نے انہیں یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ چپ رہو ورنہ وین سے نیچے اتار دوں گا۔ اِس افسوسناک واقعہ کے بعد ضلع گجرات کے تمام سکولوں میں سوگ میں تعطیل کر دی گئی۔ پنجاب کے ڈائریکٹر ایجوکیشن نے تمام پرائیویٹ سکولوں کو ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ اپنے سکول سے بچوں کو لے جانے والی گاڑیوں کی فٹنس کو یقینی بنانے کے لئے اقدامات کریں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے واقعات اب بھی جاری ہیں۔ نواز شریف 2013 کے عام انتخابات میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی فتح کے بعد، پاکستان کے وزیراعظم کے طور پر منتخب کیا جاتا ہے. شریف 5 جون کو وزیراعظم کے طور پر حلف لیا۔ ممنون حسین 2013 کے صدارتی انتخابات میں صدر کے طور پر منتخب کیا گیا صدر کے طور پر حلف اٹھا لیا۔ پاکستان th تھا، انہوں نے 9 ستمبر کو پاکستان کے 12 یوم آزادی منایا. مسلم رہنماؤں کی thکے عوام نے 14 اگست کو اپنے ملک کی 67
ایک بین الاقوامی کانفرنس 25-26 ستمبر کو

بین الاقوامی کانفرنس، منصورہ لاہور میں ہوئی جس کی صدارات جماعت اسلامی پاکستان کے امیر سید منور حسن نے کی۔اکتوبر کے آخر میں وزیراعظم امریکی صدر براک اوباما کے ساتھ ایک ملاقات کے لئے واشنگٹن ڈی سی کے لئے گئے۔ اس دورے سے بہت سی توقعات تھی لیکن وہ پوری نہیں ہوسکیں۔ پاکستان میں طالبان سے مزاکرات کی بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی کیونکہ نومبر میں تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے حکیم اللہ مسعود رہنماایک ڈرون حملے میں موت سے ہمکنار کردیئے گئے۔ 2013 میں پاکستان کی سیاست میں دواہم تبدیلیاں دو چیف کی رٹائیرمنٹ تھی۔ جس میں چیف جسٹس پاکستان افتخار چوہدری اور چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز اشفاق کیانی شامل ہیں۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں جنرل راحیل شریف نے پاک فوج کے 15ویں سربراہ کی حیثیت سے تقرری کے بعد گزشتہ روز جی ایچ کیوراولپنڈی میں کمانڈ کی تبدیلی کی ایک پروقار تقریب میں پاک فوج کی قیادت سنبھالی۔ ماضی میں فوجی سربراہوں کی ملکی معاملات میں عمل دخل کو مد نظر رکھتے ہوئے جنرل اشفاق پرویز کیانی کی ریٹائرمنٹ کی میعاد جوں جوں قریب آتی جارہی تھی توں توں اس حوالے سے میڈیاکے ساتھ ساتھ عوامی حلقوں میں بھی مختلف قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ نئے آرمی چیف کے تقرر نے میاں نواز شریف کے برسراقتدار آنے کے تناظر میں بھی نمایاں اہمیت اختیار کرلی تھی۔ لیکن یہ تبدیلی خوشگوار انداز میں ہوئی۔ 12-12-13 وہ تاریخ تھی۔ جس کا بہت سے لوگوں کو شدت سے انتظار تھا کیونکہ انہیں اندازہ ہے کہ اس تاریخ کو ملک کے

سب سے بڑے جج کی تبدیلی کے بعد معاملات میں تبدیلی آئے گی۔ یہ مرحلہ بھی بحسن خوبی انجام پایا اور چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس تصدق حسین جیلانی نے ان کے جانشین بن گئے۔ یہ سال کئی فنکاروں کی رخصتی کا سال بھی ہے۔ اُن فنکاروں میں کی رخصت سے شوبزنس کی دنیا ہمیشہ ان کا خلا محسوس کرتی رہے گی۔ ان فنکاروں میں مہناز بھی شامل ہیں۔ مہناز پاکستان کی مایہ ناز پلے بیک سنگر تھیں۔ رواں سال کے پہلے مہینے کے 19ویں دن، جب مہناز علاج کی غرض سے امریکہ جارہی تھیں، دورانِ سفر بحرین میں انتقال کر گئیں۔ اُن کی عمر 58 سال تھی۔ انہوں نے 200 سے زائد فلمی اور تقریباً 1000 غیر فلمی گیتوں کو اپنی آواز سے سجایا اور لوگوں کے دلوں میں اتارا مثلاً۔ ''مجھے دل سے نہ بھلانا''، ''میرا پیار تیرے جیون کے سنگ رہے گا''۔ فلمی گلوکارہ زبیدہ خانم کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انہوں نے 78 برس کی عمر میں 19 اکتوبر کو وفات پائی۔ ان کا فنی کیریئر 1951ء میں فلم ''بلو'' سے شروع ہوا تھا۔ ان کے گیتوں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے لاہور فلم انڈسٹری کو عروج بخشا تو قطعی غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں گانے گائے۔ فلم ''شہری بابو''، ''باغی''، ''سولہ آنے''، ''جٹی'' اور ''شیخ چلی'' کے گانے انہی کی بدولت بام عروج تک پہنچے۔ کلاسیکل سنگر ریشماں کو نئی نسل میں پذیرائی بھارتی فلم ''ہیرو'' کے ایک گانے ''لمبی جدائی'' سے ملی۔ تاہم، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ شروع ہی سے ایک منفرد گائیکا کی حیثیت سے اپنی ایک الگ

پہچان رکھتی تھیں۔ انہیں ''بلبل صحرا'' کا لقب دیا گیا تھا۔ ریشماں کے گائے ہوئے گانوں میں سے کچھ گانوں کو تو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا مثلاً 'ہائے او ربا نئیں لگدا دل میرا'، 'لمبی جدائی'، 'اکھیاں نوں رہن دے اکھیاں دے کول کول' اور 'وے میں چوری چوری تیرے نال لائیاں اکھاں وے'۔ حکومت پاکستان نے انہیں 'ستارہ امتیاز' سے نوازا تھا۔ وہ کافی عرصے تک کینسر کے مرض میں مبتلا رہیں اور 3 نومبر 2013ء کو 66 سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئیں۔ ریاض الرحمٰن ساغر شاعر اور نغمہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق صحافی بھی تھے۔ انہوں نے یکم جون کو 72 سال کی عمر میں لاہور انتقال کیا۔ فلمی دنیا اور گیت نگاری کے لیے ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ بھارتی پنجاب کے شہر بھٹنڈا میں 1941ء میں پیدا ہوئے۔ تاہم، پاکستان بننے کے ساتھ ہی یہاں آ بسے۔ انہوں نے پاکستانی فلموں 'کبھی تو نظر ملاو'، 'چیف صاحب'، سرگم'، 'گھونگھٹ'، 'انتہا'، 'محبتاں سچیاں'، 'سمجھوتہ ایکسپریس' اور 'عشق خدا' ' کے لئے نغمے تراشے۔۔ جبکہ '' دوپٹہ تیرا ململ کا' اور ''، یاد سجن دی آئی'' جیسے نغمے بھی انہی کے ہیں۔ ان کے کئی گانوں کو حدیقہ کیانی، عدنان سمیع، راحت فتح علی خان اور بھارتی پلے بیک سنگر آشا بھوسلے نے اپنی آوازوں میں گایا ہے۔ سنہ 80 کی دہائی کا کون سا ایسا فرد ہوگا جو قریش پور کے نام اور کام سے واقف نہ ہو۔ وہ پی ٹی وی کے شہرت آفاق شو کسوٹی' کے میزبان تھے۔ اس شو کی بدولت انہیں گھر گھر شہرت ملی۔ انہیں '

اگست کو موت کے فرشتے نے دیکھا اور اپنے ساتھ ہی اس جہاں سے لے جا کر چھوڑا۔ 5
مرحوم 1932ء میں پیدا ہوئے تھے۔وہ ذرائع ابلاغ کے ماہر تصور کئے جاتے تھے۔ ٹیلی
وژن کے ساتھ ساتھ انہوں نے ناول نگاری اور کالم نگاری میں بھی اپنا لوہا
منوایا۔انہوں نے 1972 ء میں پی ٹی وی سے باقاعدہ وابستگی اختیار کی اور 1992ء
میں کنٹرولر پریزنٹیشن کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ پنجابی فلموں کا ایک جانا پہچانا نام۔۔
آسیہ۔۔ جنہوں نے اردو فلموں میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ وہ 9مارچ 2013
ء کو کینیڈا میں انتقال کر گئیں۔ وہ عمر کی 65 بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ خوب صورتی کے
سبب انہیں فلم انڈسٹری میں 'پری چہرہ' کہا جاتا تھا۔آسیہ کی کامیاب فلموں میں ہدایت
کار شباب کیرانوی کی انسان اور آدمی، دل اور دنیا، مولا جٹ، جیرا بلیڈ، یادیں، وعدہ،
ایماندار، غلام، میں بھی تو انسان ہوں، پازیب، پیار ہی پیار، سہرے کے پھول، جوگی،
دل اور دنیا، وحشی جٹ، خان اعظم، آخری میدان، جٹ دی کھڑاک، غنڈہ ایکٹ، جٹ
دا ویر، بھریا میلہ، چڑھدا سورج، نوکر ووہٹی دا، حشر نشر، دو رنگیلے، شیر میدان دا،
شریف بدمعاش، لاہوری بدمعاش، تم سلامت رہو شامل ہیں۔اظہار ریڈیو، ٹی وی اور
اسٹیج کے معروف اداکار اور براڈ کاسٹر تھے۔وہ 30مارچ 2013 کو اس جہان فانی سے
رخصت ہوئے۔ منظور نیازی کا انتقال 9اپریل کو ہوا۔ وہ نعت، قوالی اور صوفیانہ کلام
گانے میں ملکہ رکھتے تھے۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں قائداعظم محمد علی جناح نے
انہوں 'بلبل دکن' کا خطاب دیا تھا۔ 'خواجہ کی

دیوانی‘ ان کی مشہور ترین قوالی ہے۔ انہوں نے اپنی خدمات کے عوض تمغہ امتیاز بھی حاصل کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 93 سال تھی۔ صفیہ ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج پر اداکاری کا ایک معروف نام تھا۔ وہ رواں سال 25 اپریل کو اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ انہوں نے 1976ء میں پاکستان ٹیلی وژن پشاور سینٹر سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ انہیں بھی کینسر کے مرض نے آ گھیرا تھا اور آخر کار وہ اس بیماری سے کبھی اپنا پیچھا نہ چھڑا سکی۔ ریڈیو، ٹی وی، فلم اور اسٹیج کے ہی ایک اور مزاحیہ اداکار نشیلا نے اسی سال جون کو دنیا سے رخصت طلب کی۔ ان کا اصل نام شوکت علی تھا۔ انہیں پی ٹی وی کی 23 معروف سیریل ’عینک والا جن‘ کے ایک کردار سے بے پناہ شہرت ملی۔ اس کے علاوہ سال 2013ء میں ہی 3 اگست کو معروف صداکار حسن شہید مرزا، یکم ستمبر کو اداکار منظور مگسی، 13 ستمبر کو فلمی ہیرو انور حسین، 23 ستمبر کو اداکار جہانگیر خان اور 28 نومبر کو اداکار عابد بٹ کا انتقال ہوا۔

الیکٹرانک آلات کے کُوڑے میں ہولناک اضافہ

دنیا میں سائنس کی نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں اور پرانی الیکٹرونک اشیا متروک ہو رہے ہیں۔ ہر سال ای ڈمپنگ یا الیکٹرونک آلات کا کچرا بڑھ رہا ہے۔ بعض مملک میں ری سائیکلنگ کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک مصنوعات میں استعمال ہونے والے ان مادوں کو محفوظ طریقے سے تلف کرنے کا رجحان بھی نہیں ہے۔ جن میں سے زیادہ تر زہریلے ہوتے ہیں۔ دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشتوں کی اقتصادی ترقی عالمی معیشت کو آلودگی میں بدل رہی ہے۔ ہر سال دنیا بھر میں کوڑے میں پھینک دی جانے والی الیکٹرانک مصنوعات کا وزن، جو 2012 میں 48.9 ملین ٹن تھا، 2017 میں بڑھ کر 65.4 ملین ٹن تک جا پہنچے گا اور اس میں سے زیادہ تر کوڑے کی ذمہ دار وہ ترقی پذیر ریاستیں ہوں گی، جو آج کل اقتصادی میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ لیکن انہی ممالک کی وجہ سے دنیا تیزی کے ساتھ اس ماحولیاتی آلودگی کا شکار ہو رہی ہے جو آئندہ نسلوں کی صحت کے لیے ایک بڑا سوالیہ نشان بن جائے گی۔
مغربی ممالک نے مدد کے نام پر تیسری دنیا کے غریب ممالک کو اپنی ضائع شدہ اشیا کا ڈسٹ بن بنا دیا۔ پاکستان میں ہر سال لاکھوں من الیکٹرونک کوڑا جس میں کمپیوٹر، مانیٹر، کی بورڈ، موبائل فون، ٹی وی، ریفریجریٹرز اور دیگر

اشیا شامل ہیں آتا ہے جو ری سائیکلنگ کے عمل سے گزرتے ہوئے نہ صرف خارج ہونے والی انتہائی مہلک گیسوں کی وجہ سے کینسر جیسے موذی امراض کا سبب بن رہا ہے بلکہ فضائی اور زمینی آلودگی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس کوڑے سے نکلنے والی سونا اور چاندی جیسی قیمتی دھاتوں کے لالچ میں مقامی تاجر اس کوڑے کے نقصانات سے بے خبر اسکی درآمد میں ہر سال اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں جبکہ آئندہ 15/10 سال بعد اس کے نتیجے میں ہونے والے گھمبیر اثرات سے بے خبر سرکاری ادارے اس کے تدارک کیلئے کوئی مناسب اقدامات نہیں کر رہے۔ صرف برطانیہ کی ساوتھ ویلز کمپنی نے گذشتہ برس لاکھ کمپیوٹر، 5 لاکھ ٹیلی ویژن، 30 لاکھ ریفریجریٹر، 40 لاکھ دیگر الیکٹرک اشیا اور 402 کروڑ موبائل فون پر مشتمل کوڑا کرکٹ تیسری دنیا کے ممالک میں برآمد کیا جبکہ امریکہ میں 2001 میں تقریباً 4 کروڑ کمپیوٹر متروک ہوئے جو دس گنا کم قیمت پر پاکستان، بھارت اور چین کو فروخت کیے گئے اور ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں اب ہر سال کروڑ سے 8 کروڑ کے قریب کمپیوٹر متروک ہو جاتے ہیں جن میں سے دو تہائی ایشیا 6 میں برآمد کر دئے جاتے ہیں۔ دراصل دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا تو کارخانوں سے نکلنے والے سکریپ نے وہاں کے لوگوں کے لئے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیئے جبکہ کمپیوٹر کی صنعتی پیدوار کے بعد دوران تیاری ٹوٹ پھوٹ پر مشتمل اور پرانے ہو جانے والے مال نے مغرب کے ان مسائل میں کئی گنا اضافہ کر دیا جبکہ وہاں پر اس مال کی ری سائیکلنگ

یعنی اسے دوبارہ قابل استعمال کرنے کیلئے کئی گنا زیادہ اخراجات آتے تھے جبکہ وہاں کے قوانین اور ان پر عملدرآمد کی وجہ سے ان کے سرمایہ داروں کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا چنانچہ یورپی صنعت کاروں نے اس سکریپ کی زائد مقدار کو خوشحالی اور ترقی کے نام پر افریقی ممالک میں فروخت کرنا شروع کردیا مگر جب افریقہ میں اس ضائع شدہ اور مضر صحت الیکٹرونک سکریپ سے بیماریاں پھیلنے لگیں تو افریقی عوام اس کے خلاف ہو گئے اور سماجی تنظیموں نے اس کی درآمد کے خلاف احتجاج کرنا شروع کردیا یہ احتجاج اتنے جاندار اور موثر تھے کہ جس پر 1992 میں یورپی کمپنیوں اور افریقی ممالک کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا جس کے تحت افریقہ میں اس سکریپ (ویسٹ) پر درآمد پر (Dump) پابندی لگ گئی۔چنانچہ یورپ کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اپنے اس ویسٹ کو ڈمپ کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو انھوں نے جنوبی ایشیا کا رخ کر لیا اور پھر ان ممالک سے نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت ، سری لنکا، بنگلہ دیش اور چین میں ہر سال لاکھوں ٹن الیکٹرونک کوڑا اور دیگر سکریپ آنا شروع ہو گیا۔اگرچہ پاکستان میں بھی ایسے قوانین موجود ہیں کے جس کے تحت کوئی ایسا سکریپ ملک میں داخل نہیں ہو سکتا جو انتہائی خطرناک ہو اور عوام کی صحت کیلئے مضر ہو مگر بعض اداروں کے کچھ اہلکاروں کی وجہ سے اس کی درآمد باآسانی ہو رہی ہے۔ لاہور کے علاوہ دیگر تمام شہروں میں یہ کوڑا جگہ جگہ نظر آتا ہے جس کو بعض پلاسٹک کا کام کرنے والے افراد خرید کر اسے پگھلاتے ہیں تاکہ اس سے تیار ہونے والے

پلاسٹک دانہ سے دیگر چیزیں بنائی جائیں جبکہ کمپیوٹر کے کوڑے سے سونا اور چاندی جیسی دیگر قیمتی دھاتیں بھی اس کاروبار کے بڑھانے میں ایک اہم وجہ ہے۔ی۔ یہ لوگ اس کوڑے کو نہ صرف کھلی جگہوں پر جلاتے ہیں بلکہ مختلف کیمیکلز میں ڈال کر اس سے دھاتیں علیحدہ کرتے ہیں اس سارے عمل میں ٹیٹینیم ، بیریلیم ، ویناڈینیم ،یوٹیریم اور سیلینیم جیسی دھاتوں کے جلنے سے پیدا ہونے والی گیس کینسر جیسی موذی کا مرض بن رہی ہے اور ایک اندازے کے مطابق صرف لاہور کے گردونواح میں ہر ماہ 25 سے 30 ٹن پلاسٹک نکالا جاتا ہے اور بتدریج اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے یہی حال دیگر شہروں کا بھی ہے ،اس سکریپ سے کالا شاپر جیسی دیگر مصنوعات بنائی جاتی ہیں جبکہ اس کا بچنے والا گند نالوں اور ندیوں میں بہا دیا جاتا ہے جس سے نہ صرف فضائی بلکہ زمینی آلودگی بڑھ رہی ہے اور فضا گندی ہونے کی وجہ سے سانس اور گلے کی دیگر بیماریاں بھی پھیل رہی ہیں۔اور اگر یہ صورت حال ایسی ہی رہی تو آئندہ دس سالوں کے بعد تمام خطہ آلودہ ہو جائے گا۔ایک رپورٹ کے مطابق 27 کلو کمپیوٹر کے کوڑے میں سے پلاسٹک کلو،لیڈ 1.72 کلو،سیلیکا 6.8 کلو، ایلمونیم 3.86 کلو،لوہا 5.58 کلو، تانبہ 6.26 کلو،نکل 0.23 کلو، زنک 0.6 کلو، ٹن 0.27 کلو گرام نکلتی ہے جبکہ سونا ،1.91 چاندی ،آرسینک ، مرکری ، انڈیم ، یٹریم ، ٹیٹانیم ، کوبالٹ ، کرومیم ، کیڈمیم ، سیلینیم ، بیریلیم ،ٹیٹالم ، ویناڈیم اور ایروپیم کی بھی خاصی مقدار نکلتی ہے۔اس حوالے سے 1992 میں وفاقی

محتسب کو ایک درخواست بھیجی گئی تھی۔ جس پر جسٹس (ر) پیر عثمان علی شاہ نیا یسے
کچرے کی درآمد پر پابندی لگانے کے علاوہ دیگر محکموں کو اس کے مستقل تدارک کیلئے
ہدایت کی تھی مگر اس پر آجتک عمل نہیں ہو سکا۔حال ہی میں ایک رپورٹ کے
کے StEP مطابقاقوام متحدہ کی تائید وحمایت سے چلنے والے بین الاقوامی پروگرام
مطابق کُوڑے میں پھینک دی جانے والی الیکٹرانک مصنوعات کی مقدار کے حوالے سے
StEPچین اور دیگر ابھرتی ہوئی معیشتوں نے اب مغربی دنیا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔
مخفف ہے، ’سالونگ دی ای ویسٹ پرابلم‘ کا اور اس پروگرام میں اقوام متحدہ کے
اداروں اور مختلف حکومتوں کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری تنظیمیں اور
سائنسدان بھی شامل ہیں۔اس پروگرام کی جانب سے الیکٹرانک کُوڑے کے سلسلے میں
جاری کی گئی اپنی نوعیت کی پہلی رپورٹ میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ 2012ء اور
2017ء کے درمیانی عرصے میں ٹیلی وژن سیٹوں سے لے کر موبائل فونز تک پر
مشتمل الیکٹرانک کُوڑے کی مقدار میں ماضی کے مقابلے میں 33 فیصد تک کا اضافہ ہو
سکتا ہے۔ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ موبائل فونز کو توڑ اور پگھلا کر 24 کلو گرام
سونا اور 250 کلو گرام چاندی حاصل کی جا سکتی ہے۔اس رپورٹ کے اجراء کا مقصد ری
سائیکلنگ کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک مصنوعات میں استعمال ہونے والے اُن مادوں کو
محفوظ طریقے سے تلف کرنے کے رجحان کو بھی فروغ دینا ہے، جن میں سے زیادہ تر
زہریلے ہوتے ہیں۔اس رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھرتی ہوئی معیشتوں کی
اقتصادی ترقی

عالمی معیشت کو آلودگی کے اعتبار سے بھی کیسے تبدیل کر رہی ہے۔ یو این یونیورسٹی سے وابستہ اور StEP پروگرام کے ایگزیکٹیو سیکرٹری زوڈیگر کوہر کا کہنا ہے کہ کہ 'ای ویسٹ کے مسئلے پر عالمگیر پیمانے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس پروگرام کا کہنا ہے کہ ہر سال دنیا بھر میں کوڑے میں پھینک دی جانے والی الیکٹرانک مصنوعات کا وزن، جو 2012ء میں 48.9 ملین ٹن تھا، 2017ء تک بڑھ کر 65.4 ملین ٹن تک جا پہنچے گا اور اس میں سے زیادہ تر کوڑے کی ذمے دار وہ ترقی پذیر ریاستیں ہوں گی، جو آج کل اقتصادی میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔رپورٹ میں مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ 2017 تک کوڑے میں پھینک دی جانے والی پرانی واشنگ مشینوں، کمپیوٹرز، ریفریجریٹرز، الیکٹرانک کھلونوں اور دیگر برقی آلات کا وزن بڑھ کر دو سو ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگز کے برابر ہو چکا ہو گا۔بھارت جیسے ممالک میں الیکٹرانک آلات کو بغیر زیادہ احتیاطی اقدامات اختیار کیے پگھلانے کی کوشش کی جاتی ہے، جس سے انسانی صحت کو سنگین خطرات لاحق ہوتے ہیں۔جہاں 2017 تک مغربی دنیا کا الیکٹرانک کوڑا بڑھ کر 28.6 ملین ٹن تک جا پہنچے گا، وہاں ترقی پذیر اور بھارت، برازیل اور جنوبی افریقہ جیسی ابھرتی ہوئی معیشتوں کا برقی فضلہ کہیں زیادہ یعنی 36.7 ملین ٹن تک پہنچ جائے گا۔کچھ مغربی ممالک کا الیکٹرانک فضلہ غریب ترقی پذیر ممالک میں پہنچتا ہے، جہاں بہت سے لوگ انتہائی ابتر حالات میں اور بہت ہی کم اجرت پر اس کوڑے کے حصے بخرے کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس کوڑے سے

ماحول کو بھی بے اندازہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ کُوڑا سود مند بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک تحقیقی جائزے کے مطابق ایک ملین موبائل فونز سے 24 کلو گرام سونا، 250 کلوگرام چاندی، 9 کلو گرام پلیڈیم اور 9 ٹن سے زیادہ تانبا حاصل ہو سکتا ہے۔ اتوار پندرہ دسمبر کو جاری کی جانے والی اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کا ہر باشندہ سال میں 7 کلو گرام وزن کے برابر الیکٹرانک آلات کُوڑے میں پھینکتا ہے۔ کلوگرام کے ساتھ سب سے زیادہ فی کس الیکٹرانک کُوڑا امریکی شہری پھینکتے 29.8 ہیں۔

ری سائیکلنگ کے نام پر الیکٹرانک کوڑا بھارت میں جرمنی اور یورپ سے کمپیوٹرز، پرنٹرز اور ایسے ہی دیگر پرانے آلات پر مشتمل سالانہ ہزارہا ٹن کوڑا غیر قانونی طور پر بھارت پہنچتا ہے، جسے وہاں ری سائیکل کیا یعنی دوبارہ استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پرانے برقی آلات میں استعمال ہونے والی دھاتوں کو ری سائیکلنگ کے ذریعے دوبارہ ایسے بنیادی مادوں کی شکل دی جا سکتی ہے، جن سے دوبارہ نئی اَشیا بنائی جا سکتی ہیں۔ اِس عمل سے خام مادوں اور ماحول پر پڑنے والے دباؤ میں کمی آتی ہے۔ تاہم دُنیا بھر سے سالانہ جو ہزارہا ٹن پرانے اور مزید ناقابلِ استعمال الیکٹرانک آلات غیر قانونی طور پر بھارت

پہنچتے ہیں، اُن کی ری سائیکلنگ اُلٹا ماحولیاتی آلودگی میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ بھارتی دارالحکومت نئی دہلی کے قریب غیر قانونی طور پر قائم کئے گئے ایک صنعتی علاقے میں ایک ایسا ہی ری سائیکلنگ مرکز ہے۔ یہاں ہریش نامی ایک مزدور پلاسٹک کی ایک بڑی سی ٹینکی میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہے اور اُس کا کہنا ہے کہ اُسے سبز رنگ کے اِس تیزابی محلول میں، جس سے مسلسل بُلبلے اٹھ رہے ہیں، ہاتھ ڈالنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اِس تیزاب سے اُٹھنے والی بھاپ سانس کی نالیوں کے لئے خطرناک ہے اور وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا ہے۔ ممبئی میں مزدور الیکٹرانک آلات کو ری سائیکل کرنے کے ایک مرکز میں کام کر رہے ہیں.

ہرِیش کے مطابق اِس خطرے کے باوجود وہ یہاں کام کرنے پر مجبور ہے کیونکہ اُس نے اور کسی قسم کی تعلیم و تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ ہریش ری سائیکلنگ کے جس مرکز میں کام کرتا ہے، وہاں دُنیا بھر سے پرانے کمپیوٹر، پرنٹر، سی ڈی پلیئر اور دیگر آلات لائے جاتے ہیں۔ اِن آلات کو تیزابی محلول میں ڈال دیا جاتا ہے۔اِس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ بتاتے ہیں، ایک غیر سرکاری تنظیم "Toxic Link" کے سربراہ روی اگروال: ”یہ تیزاب بہت زود اثر ہے۔ جب کمپیوٹرز اور پرنٹرز کی پرانی پلیٹیں اِس میں رکھی جاتی ہیں تو باقی سب کچھ اِس میں تحلیل ہو جاتا ہے، صرف خالص تانبا باقی بچتا ہے، جو دوبارہ استعمال

میں لایا جا سکتا ہے۔اِس تیزاب سے جسم شدید طور پر جل سکتا ہے اور جب اِسے بہایا جاتا ہے تواِس سے خارج ہونے والی گیسیں پورے ماحول کو متاثر کرتی ہیں۔''

روی اگروال بتاتے ہیں کہ بھارت آنے والا کوڑا کرکٹ اِس نام سے نہیں بلکہ 'مِکسڈ میٹل' یعنی ملی جلی دھاتوں کے نام سے آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، انُھوں نے الیکٹرانک کوڑا کرکٹ سے بھرے ایسے کنٹینر بھی دیکھے ہیں، جن پر باقاعدہ کسٹم حکام کی مہر لگی ہوئی تھی۔اِن کارکنوں کے اندازوں کے مطابق ایسا سالانہ پچاس تا ساٹھ ہزار ٹن کوڑا بھارت لایا جاتا ہے افریقہ کا 'ای ویسٹ'، یورپ سے بھی زیادہ ہے۔اقر خیال کیا جاتا ہے کہ الیکٹرانک اشیاکے حوالے سے ترقی یافتہ ملکوں کا 'ڈمپنگ گراوٴنڈ' سمجھا جانے والے براعظم افریقہ اگلے پانچ برسوں کے دوران الیکٹرانک کُوڑا کرکٹ پیدا کرنے میں یورپ کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔ناقابل استعمال الیکٹرونک آلات کو الیکٹرانک کوڑا یا ای ویسٹ' کانام دیا جاتا ہے۔ترقی یافتہ ملکوں کی طرف سے ای ویسٹ ترقی پزیر ملکوں' اور خاص طور پر افریقہ کے کم ترقی یافتہ ملکوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اسی لیے افریقہ کو ای ویسٹ کا ڈمپنگ گراوٴنڈ بھی کہا جاتا ہے۔تاہم تازہ اعداد وشمار کے مطابق 2017ء تک براعظم افریقہ میں پیدا ہونے والے ای ویسٹ کی سالانہ مقدار اس حد تک بڑھ جائے گی کہ یہ براعظم یورپ کو بھی پیچھے چھوڑ

جائے گا۔افریقہ کو ای ویسٹ کا ڈمپنگ گراؤنڈ بھی کہا جاتا ہے۔نائجیریا کے تحفظ ماحول کے ادارے نیشنل انوائر نمنٹل اسٹینڈرڈز اینڈ ریگولیشن انفورسمنٹ ایجنسی سے تعلق رکھنے والی میرانڈا امارچی نے خبر رساں ادارے اے ایف پی کو بتایا: 'جس سالانہ شرح سے افریقہ میں ای ویسٹ پیدا ہو رہا ہے 2017 تک اس کی سالانہ مقدار یورپ میں پیدا ہونے والے ای ویسٹ سے بھی بڑھ جائے گی۔اقوام متحدہ کے تحفظ ماحول کے حوالے سے ادارے کی طرف سے نیروبی میں منعقد ہونے والے چین افریقن فورم کے دوران ماہرین نے بتایا کہ افریقہ میں ای ویسٹ کی پیداوار بڑھنے کی دو اہم وجوہات ہیں۔ پہلی آبادی میں ہونے والا اضافہ، جبکہ دوسری وجہ اس براعظم میں موبائل فونز، کمپیوٹرز اور دیگر الیکٹرانک آلات کا تیزی سے بڑھتا ہوا استعمال ہے۔ماہرین کے مطابق افریقہ میں الیکٹرانک ویسٹ سے قابل استعمال دھاتیں حاصل کرنے کے لیے پراسیسنگ کا عمل زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ماہرین کے مطابق افریقہ میں الیکٹرانک ویسٹ سے قابل استعمال دھاتیں حاصل کرنے کے لیے پراسیسنگ کا عمل زیادہ محفوظ نہیں ہے۔فورم کے دوران پیش کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق افریقہ میں گزشتہ ایک دہائی کے دوران کمپیوٹرز کے استعمال میں دس گنا اضافہ ہوا ہے جبکہ موبائل فون کے استعمال میں ہونے والا اضافہ سو گنا تک ہے۔ماہرین کے مطابق افریقہ میں الیکٹرانک ویسٹ سے قابل استعمال دھاتیں حاصل کرنے کے لیے پراسیسنگ کا عمل زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے اسے جدید بنانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کی صحت کے

علاوہ

اسے ماحول کے لیے بھی محفوظ بنایا جا سکے۔

کالے کوٹ والے دہشت گرد اور لفافہ جرنلسٹ

سابق صدر مشرف جیسے کمانڈو ہیں ویسے ہی کمانڈو ان کے وکیل احمد رضا قصوری ہیں۔ وہ ایک وکیل کے ساتھ ساتھ ایک اچھے اداکار ہیں، جو حالات کے مطابق اپنے کردار کو ڈھال کر مکالمات بولنے کی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خبروں میں رکھنے کا فن جانتے ہیں۔ گزشتہ روز مشرف کی عدالت میں عدم پیشی اور میڈیکل رپورٹ کے حوالے سے پوچھے گئے سوال پر وہ پھر آپے سے باہر ہوگئے۔ وہ سوال پوچھنے والے صحافی پر برس پڑے اور اسے لفافہ جرنلسٹ اور بھارتی ایجنٹ قرار دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ تم وہ لوگ ہو جو لفافہ جرنلزم کر رہے ہوں، ہمیں تمہارے ساتھ بھی مقابلہ کرنا پڑے گا۔ احمد رضا قصوری نے اتنی بار شیم آن یو کے الفاظ کہے، کہ ان الفاظ کو بھی اس معزز وکیل پر شرم آنے لگی۔ مشرف کیس میں اب ان کے حمایتی بے نقاب ہونے لگے ہیں۔۔برسوں ایک آمر کے سائے میں پلنے والے جمہوری گدھ، ایک آئین شکن، لال مسجد کے خاک نشینوں پر کلسٹر بم گرانے والے ، کراچی میں بارہ مئی کو خون میں نہلانے اور اسے اپنے جلسے میں طاقت کا مظاہرہ قرار دینے والے اس کمانڈو کی حمایت میں صف بندی کرتے نظر آتے ہیں، نمک کھانے والے اپنا حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ مشرف کے دور میں ایک جمہوری وزیر اعظم پر غداری کے مقدمے میں مہر بلب سیاستدان، اب غداری کے لفظ سے خوف کھاتے ہیں۔ کیا آئین صرف ایک

دستاویز ہے، کیا اس میں لکھے حرفوں کی کوئی حرمت نہیں ہے، کوئی جب چاہئے اسے اٹھا کر پھینک دے۔ پر اسے اپنے حلف کا بھی پاس نہ ہو، ایسے آمر کو غدار نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ غدار کی حمایت کرنے والے بہت ہیں ۔لیکن احمد رضا قصوری کا جواب نہیں ۔ ایک بار ٹی وی پروگرام میں یوں گویا ہوئے،، نواز شریف اور سابق چیف جسٹس افتخار چوہدری مل کر مشرف کو سزا دلانا چاہتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوگا،، اور دوسرے ہی لمحے کہنے لگے،، میں پاکستان کی تاریخ میں طاقتور افراد میں سے ہوں۔ میں نے بھٹو کو تختہ دار پر چڑھا دیا تھا۔ بھٹو کے کیس میں سزا کا مطالبہ کر رہا تھا اور مشرف کے کیس میں ان کا دفاع کر رہا ہوں۔ وہاں بھی جیتا تھا اور اس مرتبہ بھی جیتوں گا،، احمد رضا قصوی کے والد قصور کے نواب محمد احمد خان قصوری نے انگریز کے زمانے میں بطور مجسٹریٹ ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ ان دنوں جنگِ آزادی کے ایک ہیرو بھگت سنگھ کو جیل میں پھانسی دینے کے لئے کوئی مجسٹریٹ وہاں جانے کے لئے راضی نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ جیل کے تمام قیدی مشتعل تھے، نواب محمد احمد خان نے انگریز کیا کاسہ لیسی میں یہ خدمت سرکار انگلشیہ انجام دی۔ داحمد رضا قصوری گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی لاء کالج کے طالب علم لیڈر رتھے ذوالفقار علی بھٹو نے 1967ء میں پیپلز پارٹی بنائی تو وہ ذوالفقار علی بھٹو کے پرستاروں میں سے تھے۔ انہیں 1970ء کے الیکشن میں پی پی پی کی ٹکٹ بھی حاصل کی اور ممبر قومی اسمبلی منتخب بھی ہو گئے۔ لیکن جلد ہی بھٹو سے دل

بھر گیا۔ ابتدائی دور میں وہ ذوالفقار علی بھٹو کو جمہوریت کا چیمپیئن کہا کرتے تھے اور خوب زور دار آواز میں پارٹی اجلاس میں انہیں ،، میرے چیمپیئن ،،کہتے نہ تھکتے تھے۔ سابق صدر پرویز سے احمد رضا قصوری کو اتنی محبت ہے کہ ایک ٹی وی پروگرام میں وہ یہ کہ کر آبدیدہ ہوگئے کہ سابق صدر دو کمروں میں قید ہیں۔ احمد رضا قصوری کے ساتھ ہاتھ اس وقت ہوا تھا۔ جب سپریم کورٹ میں صدر کے دو عہدوں سے متعلق درخواستوں کی سماعت سے پہلے پشاور سے آئے ایک وکیل نے ان کے (احمد رضا قصوری) کے چہرے پر سیاہ رنگ کا اسپرے کر دیا۔ پشاور کے وکیل محمد خورشید نے اچانک ان کے چہرے پر سیاہ رنگ کا اسپرے کرکے داغ بھی ایسے دیئے کہ چھڑائے نہ بنے ، اور یوں احمد رضا قصوری اپنے رو سیاہ کے ساتھ مقدمے کی سماعت کرنے والے نو رکنی لارجر بینچ کے روبرو پیش ہوئے اور اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر غم و غصہ کا اظہار کیا۔ بینچ کے سربراہ جسٹس رانا بھگوان داس نے انہیں ہدایت کی کہ وہ تحریری شکایت پیش کریں۔ اسوقت انھوں نے اپنے وکیل برادری کے لئے کہا تھا کہ ،، میرے ساتھ ایسا کرنے والے کالے کوٹ میں دہشت گرد ہیں ، یہ لوگ ہمارے پیشے پر بد نما دھبہ ہیں ،، مجھے مشرف غداری کیس سے بھٹو کا مقدمہ اور یحیٰی بختیار یاد آ گئے ، جو اخباروں میں تو شہ شرخیوں میں شوشے چھوڑتے رہے۔ لیکن مقدمے پر دھیان نہ دیا ، مشرف کے وکیلوں کو چاہیے کہ دھیان سے مقدمے پر توجہ دیں۔ ٹرائل کو سنجیدگی سے لیں ، یہ نہ ہو کہ جس طرح منتخب وزیراعظم پھانسی پر چڑھ گیا اسی طرح سابق

ڈکٹیٹر کے ساتھ بھی کچھ ہو جائے۔

نوجوانوں کے لئے قرضہ اسکیمیں

معاشی استحکام اور خوشحالی کا خواب جو موجودہ حکومت نے برسر اقتدار آنے سے قبل انتخابی مہم کے دوران دکھایا تھا وہ ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔ موجودہ حکومت کو عنان اقتدار سنبھالے چھ ماہ سے زائد ہو چکے ہیں مگر عام آدمی کے معاشی مسائل حل کرنے کے وعدے ابھی تک ایفا ہونے کے منتظر ہیں۔ عام آدمی روز مرہ زندگی میں بنیادی سہولیات کے فقدان کا اسی طرح سامنا کر رہا ہے جس طرح وہ ماضی میں کرتا رہا ہے اس کی زندگی میں کوئی بہتر تبدیلی نہیں آئی۔ توانائی کا بحران بدستور جاری ہے اور مستقبل قریب میں بھی اس کے خاتمے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ سب سے زیادہ بے چینی نوجوانوں میں ہے۔ جو ملک میں تبدیلی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ یوتھ اس ملک کی سب سے بڑی قوت ہیں، شائد اسی لئے میاں نواز شریف نے سب سے پہلے نوجوانوں کے لئے اسکیمیں شروع کی ہیں۔ وزیر اعظم نواز شریف نے نوجوانوں کی بہبود کے لیے چھ نئی اسکیموں کا اعلان کیا ہے۔ ان منصوبوں کے لیے ابتدائی طور پر 18 بلین روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ان میں پہلی اسکیم چھوٹے بلا سود قرضوں کی اسکیم ہے جو کمزور مالی طبقات کے افراد کے لیے مخصوص ہو گی۔ اس اسکیم کے لیے موجودہ مالی سال میں ساڑھے تین ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ اس سے اڑھائی لاکھ افراد مستفید ہو سکیں گے۔ ان قرضوں پر کوئی سود

نہیں لیا جائے گا۔ دوسری اسکیم چھوٹے کاروباری قرضوں کی سکیم ہے۔ یہ سکیم بے روزگار بالخصوص پڑھے لکھے نوجوانوں کے لیے مخصوص ہو گی جو اپنا کاروبار شروع کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ 50 فیصد قرضے خواتین کے لیے مختص ہوں گے۔ 5 لاکھ سے 20 لاکھ روپے تک کے قرضے ہنر مند افراد کو ملیں گے جو اپنے ذاتی کاروبار مثلاً ورکشاپ یا زراعت سے وابستہ کاروبار شروع کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس قرضے پر مارک اپ کی رعایتی شرح صرف 8 فیصد ہو گی، باقی شرح خود حکومت ادا کرے گی۔ ابتدائی طور پر یہ قرضے نیشنل بینک اور فرسٹ ویمن بینک کے ذریعے جاری کیے جائیں گے۔ اس سکیم کے لیے پانچ ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے تربیتی سکیم وہ تیسرا پروگرام ہے جو حکومت شروع کر رہی ہے۔ اس پروگرام کے تحت منظور شدہ تعلیمی اداروں سے مجموعی طور پر 16 سالہ تعلیم کی ڈگری کے حامل نوجوانوں کو عملی تربیت کے مواقع فراہم کیے جائیں گے تاکہ انہیں اندرون یا بیرون ملک روزگار کی تلاش میں آسانی ہو۔ دوران ملازمت تربیت کے عرصے میں نوجوانوں کو ایک سال تک دس ہزار روپے ماہانہ وظیفہ بھی ملے گا۔ اس سکیم کے لیے چار ارب روپے مختص کیے گئے ہیں اور اس سے 50 ہزار گریجویٹس استفادہ کر سکیں گے۔ اس سکیم کا مقصد بے روزگار نوجوانوں کو ایسے ہنر اور فنون کی تربیت دینا ہے جن کے ذریعے وہ باعزت طریقے سے روزی کما سکیں۔ پچیس سال تک کی عمر کے ایسے تمام نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکیں گے، جنھوں نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کر رکھی ہو۔ ان

نوجوانوں کو چھ ماہ کے لیے فیس اور وظیفے کی مد میں پانچ ہزار روپے ماہانہ دیے جائیں گے۔ تربیتی اداروں کی فیس حکومت خود ادا کرے گی۔ اس مد میں 80 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ پانچویں اسکیم پسماندہ علاقوں کے طلبہ وطالبات کے لیے حکومت کی طرف سے فیس کی ادائیگی سے متعلق ہے۔ ایم اے، ایم ایس سی یا اس سے بالاتر سطح کی تعلیم حاصل کرنے والے ایسے نوجوانوں کی فیس حکومت خود ادا کرے گی۔ اس سکیم کے لیے ایک ارب بیس کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جن سے 30 ہزار طلبہ وطالبات کی اوسطاً 40 ہزار روپے سالانہ کی فیس ادا کی جائے گی۔

وفاقی حکومت نے ملک بھر کے لیے اس سکیم کے اجرا کا فیصلہ کیا ہے جس سے اس سال ایک لاکھ طلبہ وطالبات کو لیپ ٹاپ کمپیوٹر فراہم کیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے چار ارب روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ نواز شریف نے نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے جس اسکیم کا اعلان کیا ہے وہ قابل ستائش ہے سوا اس کے کہ اس کی بنیاد بینکوں سے لئے جانے والے سودی قرضوں پر رکھی گئی ہے جس کا بوجھ بالآخر غریب عوام پر ہی پڑے گا جو پہلے ہی سودی قرضوں، ٹیکسوں اور اوپر سے مسلط کی جانے والی مہنگائی کے مارے ہوئے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ یہ سرمایہ نوجوانوں کو حکومت خود نوٹ چھاپ کر بلاسود مہیا کرتی اور ماہرین کا ایک پینل بلاسود قرض دینے سے پہلے درخواست گزاروں کا انٹرویو کرکے یہ فیصلہ کرتا کہ واقعی درخواست گزار میں قرض سے روزی کمانے کی اہلیت ہے کہ نہیں

دوسرے یہ کہ یہ اسکیم وقتی نہیں ہمیشہ کے لئے ہوتی اور نوجوانوں کو مسلسل سرمایہ فراہم کرتی رہتی۔ اگر آپ بھی وزیراعظم کی قرض اسکیم کے لیے درخواست دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پہلے اس کے اہم نکات اور شرائط جان لیں، وہ کیا ہیں۔ پرائم منسٹر یوتھ بزنس لون اسکیم شروع ہوچکی ہے۔ مقررہ بینکوں میں درخواست فارم، ناقابل واپسی 100 روپے کے ساتھ جمع کروائے جاسکتے ہیں۔ درخواست فارم میں تحریر اہم نکات و شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بینک مقررہ اوقات میں یا جب مناسب سمجھے، درخواست گزار کے مقررہ اکاونٹ یا اس کے کسی دوسرے اکاونٹ سے درخواست گزار کو نوٹس دیئے بغیر واجب الادا رقم نکال سکتا ہے۔ ویسے تو وزیراعظم نے اعلان کیا ہے کہ یہ قرض نوجوانوں کو 8 فیصد شرح سود پر دیا جائے گا، لیکن درخواست فارم میں درج شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر حکومت پاکستان مارک اپ میں دی گئ رعایت کو قرض کی مدت کے دوران کسی بھی وجہ سے واپس لیتی ہے تو قرض لینے والا نئی شرح کے مطابق قرض کی ادائیگی کا پابند ہوگا۔ قرض کے لیے درخواست دینے والے کو دو ریفرنس کے علاوہ ایک ضمانتی بھی مہیا کرنا ہوگا، اور آپ کی ضمانت وہی شخص دے سکے گا جو گریڈ پندرہ یا اس سے اوپر کا سرکاری ملازم ہو یا پھر آپ کے مانگے گئے قرض کا ڈیڑھ گنا اس کے پاس ہونا چاہئے، جس کے لیے بینک اسٹیٹمنٹ درخواست کے ساتھ فراہم کرنا ہوگی۔ مسلم لیگ (ن) نے اپنے انتخابی منشور میں نوجوانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے آسان شرائط پر قرضے دینے کا اعلان کیا

تھا اور نواز شریف انتخابی مہم کے دوران بار بار یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد ان باصلاحیت اور ہنر مند نوجوانوں کو جو ڈگریاں ہاتھوں میں لیے مارے مارے پھر رہے ہیں، باعزت روزگار کے لیے معقول اور آسان شرائط پر قرضے فراہم کریں گے تاکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے باعزت روزگار کما سکیں اور اس کام میں مزید چند لوگوں کو نوکری بھی فراہم کر سکیں۔ یہ ایک اچھی اور پُر کشش ترغیب تھی، جس کی یقینی طور پر نوجوانوں میں ستائش ہوئی اور نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے نے مسلم لیگ (ن) کو ووٹ بھی دیئے اور اپنے مستقبل کی امیدیں بھی اس پارٹی سے وابستہ کرلیں، کیونکہ ذہین طلبا طالبات میں حکومتِ پنجاب کی طرف سے لیپ ٹاپ کی تقسیم بہت سی تنقید اور اعتراضات کے باوجود نوجوانوں میں مقبول ہوئی تھی۔

اس اسکیم کا انچارج وزیر اعظم نواز شریف کی بیٹی مسز مریم نواز کو بنایا گیا ہے جن کا نام ابتدا میں وزارت خارجہ کے لیے آرہا تھا۔ مریم نواز ایک خوش گفتار، خوش لباس اور مہذب خاتون ہیں۔ وہ گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے سیاست میں سرگرم ہیں۔ حکومت اس اسکیم کی تعریف و توصیف میں پورے پورے صفحات کے اشتہارات شائع کر رہی ہے، جب کہ ٹیلی ویژن چینلز پر بھی لمبی چوڑی مہم جاری ہے۔ کاش کوئی وزیر اعظم کو یہ مشورہ دے کہ جو زرِ کثیر اشتہاری مہم پر خرچ کیا جارہا ہے اس رقم کو اس اسکیم کو مزید بہتر اور آسان بنانے پر صرف کیا

جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کا نوجوانوں اور خود مسلم لیگ (ن) کو فائدہ ہوگا، کیونکہ نعروں اور اشتہارات کے ذریعے کبھی کوئی مہم کامیاب نہیں ہوئی۔ ایوب خان دور کی ''دس سالہ ترقی'' کی ساری اشتہاری مہم ایوب خان کے اقتدار کو بچا تو نہ سکی البتہ ان کے زوال اور چارج شیٹ کا حصہ ضرور بن گئی۔ پنجاب میں چودھری پرویز الٰہی نے ''پڑھا لکھا پنجاب'' کی اشتہاری مہم پر سرکاری خزانے سے جو کثیر رقم خرچ کی وہ اگر اصل منصوبے پر لگا دی جاتی تو نتائج بھی بہتر ہوتے اور لوگ بھی اس منصوبے کے خالقوں کو یاد رکھتے۔ کچھ اخباری دانشور یہ کہتے ہیں کہ یہ ساری اسکیم 6 سے 8 ماہ میں دھڑام سے زمین پر آ گرے گی۔ اس اسکیم کی ناکامی اگر ہوئی تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوگی کہ ملک کی نئی نسل کو سودی نظام کے شکنجے میں کس دیا گیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ اسکیم بنیادی طور پر بینکوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔ اس میں وہ بینک جن کی حالت روز بروز پتلی ہو رہی تھی اب 100 ارب کے قرضے جاری کریں گے اور سروس چارجز کی مد میں کثیر رقم کے علاوہ اصل زر بمع سود وصول کرلیں گے۔ اس اسکیم کے بارے میں بہت سے لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ مہنگائی کے اس دور میں 5 سے 20 لاکھ روپے کا قرضہ ناکافی ہے۔ 5 لاکھ روپے کا قرضہ تو یقینا ناکافی ہے کہ اس سے کوئی دکان بھی نہیں کھولی جا سکتی۔ البتہ 20 لاکھ روپے کا قرضہ مناسب ہے۔ تاہم انجینئرنگ اور بعض دوسرے شعبوں میں کام کرنے کے خواہشمند نوجوانوں کے لیے 20 لاکھ روپے کا قرضہ ناکافی ہے اور اس پر

حکومت کو سوچنا چاہیے کہ اگر سیاستدان اربوں روپے کے قرضے حاصل کرتے ہیں تو نوجوانوں کے لیے یہ رقم اس قدر کم کیوں رکھی گئی ہے۔ بعض حلقے اس اسکیم پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ ہے کہ یہ رقم سود سمیت 8 سال میں واپس کرنا ہے۔ یہ مدت بہت کم ہے۔ اس عرصے میں نوجوانوں کے کاروبار پوری طرح جم نہیں پائیں گے کہ قرضہ واپس کرنے کا وقت آجائے گا۔ اعتراض کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ سیاستدان اور صنعت کار۔بڑے بینکوں سے جو قرضے حاصل کرتے ہیں ان کی واپسی کی مدت کم از کم 20 سال ہوتی ہے، حالانکہ یہ قرض لینے والوں کے کاروبار جمے جمائے ہوتے ہیں۔ اس لیے۔بزنس لون اسکیم کے قرضوں کی واپسی کی مدت بھی 20 سال کی جانی چاہیے۔

اس اسکیم پر سب سے بڑا اعتراض بہت زیادہ شرح سود ہے، اور یہی اس منصوبے کے ناکام ہونے کی وجہ بنے گی۔ اگرچہ حکومت اس سود کو سروس چارجز کا نام دے رہی ہے لیکن یہ ہر طرح سے سود ہے جس کی شرح ناقابل۔برداشت ہے۔ اسکیم کے تحت یہ قرضہ فیصد شرح سود پر دیا جارہا ہے۔ اس طرح 20 لاکھ روپے کا قرض حاصل کرنے والا 8 نوجوان پہلے ہی سال بعد 4 لاکھ 45 ہزار روپے بینک کو لوٹائے گا، یعنی تقریباً 40 ہزار روپے ماہانہ... جس نوخیز نوجوان کو 40 ہزار روپے ماہانہ صرف بینک کو دینا ہے اسے جگہ کا کرایہ، بجلی، پانی، گیس اور ٹیلی فون کے بل، ملازموں کی تنخواہیں بھی نکالنا ہیں اور خود اپنے خاندان کی کفالت بھی

کرنا ہے، اس طرح وہ کم از کم ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ منافع کمائے تو اس کا کاروبار جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اور 20 لاکھ روپے کے سرمائے سے کوئی کاروبار ڈیڑھ لاکھ روپے کا منافع نہیں دے سکتا، جب کہ اس قرضے کی نصف سے زیادہ رقم تو انفرااسٹرکچر وغیرہ ہی پر لگ چکی ہوتی ہے۔ اس طرح بمشکل چار پانچ لاکھ کے رننگ کیپٹل کے ساتھ کسی نوجوان کے لیے اپنا کاروبار جاری رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس معاملے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ صنعت کار اربوں روپے کے قرضے 3 سے 5 فیصد شرح سود پر حاصل کرتے ہیں جب کہ نوجوانوں کو یہ 8 فیصد سود پر دیا جا رہا ہے۔ اس لیے شرح سود کو اگر کم نہ کیا گیا تو نہ صرف نوجوانوں کے کاروبار نہیں چل سکیں گے بلکہ یہ ساری رقم ہی ڈوب جائے گی۔ یہ بھی خدشہ ہے کہ قرضوں کی واپسی کے مشکل اور بے لچک نظام کی وجہ سے بہت سے نوجوان مشکلات کا شکار ہوں گے، وہ نفسیاتی اور قانونی دباؤ کی وجہ سے اپنے کاروبار بھی متاثر کرلیں گے اور معاشرے میں بھی نئے انتشار کا سبب بنیں گے۔ پاکستان میں 9 کروڑ سے زائد نوجوان ہیں۔ جن کی ضرورت ہر سیاسی جماعت کو پڑتی ہے۔ نوجوانوں کو اہمیت دینے کے کام کا آغاز پہلے تحریک انصاف اور عمران خان نے کیا اور سوشل میڈیا کا تصور اجاگر کیا، پھر پیپلز پارٹی کی حکومت نے یوتھ کو اپنی طرف مائل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اب مسلم لیگ (ن) یوتھ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں مصروف ہے۔ اس اسکیم میں بے روزگار نوجوانوں کی دلچسپی ہے۔ سمیڈا اور بنکوں کی مختلف برانچوں سے لاتعداد بے روزگار، نوجوان بچے بچیاں

قرضہ فارم حاصل کرچکی ہیں۔ لیکن اب مسئلہ قرضہ فارم کا نہیں مسئلہ قرضہ حاصل کرنے کی شرائط پوری کرنے اور پھر اس قرضہ سے کوئی کاروبار کرنا ہے، خاص کر ایسے حالات میں جب ملک میں پہلے ہی بجلی اور گیس کے بحران کی وجہ سے ایسے ہزاروں نہیں لاکھوں افراد اپنا چھوٹا موٹا کاروبار بند کرنے کے قریب آچکے ہیں۔ میاں نواز شریف کے سابقہ دور میں یلیو کیب اسکیم آئی جس میں قومی بینکوں کے 32,30 ارب روپے کھائے گئے۔ اس اسکیم کے تحت نکلنے والی گاڑیاں افغانستان تک گئیں اور ان قرضوں کو کھانے والے آج بھی انجوائے کر رہے ہیں جبکہ ان کے ضمانت کنندگان پریشان اور بے حال ہیں۔

اس اسکیم کے حوالے سے یہ خدشہ بھی ہے کہ اگر 7-6 سال میں اس کی ریکوری 100 فیصد نہ ہوئی تو اس سے حکومت کے لئے انتظامی، مالی اور سیاسی طور پر کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ بہت سے نوجوان قرض حاصل کرتے ہوئے ضرور یہ سوچیں گے بعد میں اِسے آسانی سے معاف کروالیا جائے گا۔ لیکن ان قرضوں کی معافی اتنی آسان نہ ہوگی۔ ایک کالم نگار نے اسکیم میں سودی قرضوں پر سوال اٹھایا تھا۔ جس پر مریم نواز صاحبہ نے ان کالم نگار کو کہا کہ،، میرا ایمان ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر عمل پر جواب دینا ہے تو ایسے میں میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہوں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کریں گی جس سے ان کے والد (وزیر اعظم نواز شریف) یا

ان کی اپنی آخرت خراب ہو جائے۔ پھر مریم صاحبہ نے کہا کہ وہ پہلے ہی اس مسئلہ کے اوپر کام کر رہی ہیں کیوں کہ وہ سود کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتیں جب کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ ہے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ وزیراعظم نواز شریف نے وزیر خزانہ اور ان کے ساتھ ہونے والی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان قرضوں میں سود نہیں لیا جائے گا بلکہ اس ساری اسکیم کو اسلامی بنکنگ کے اصولوں کے مطابق چلایا جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کا اعلان بہت جلد کر دیا جائے گا۔ مریم صاحبہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ نہیں چاہتیں کہ اچھے کام کو بے برکت کر دیا جائے۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ انشاءاللہ یہ تو پاکستان میں سودی نظام کے خاتمہ کی شروعات ہے،،۔ نواز شریف کی خواہشات اپنی جگہ لیکن عملاً صورتحال یہ ہے کہ سود کے خاتمے کے مقدمے میں نواز شریف حکومت کے کہنے پر ہی اسٹے آڈر ملا تھا، اور یہ مقدمہ اب بھی عدالت میں ہے۔ وزیراعظم نے اس اسکیم کو آسان بنانے کی ہدایت بھی کی ہیں اور کہا ہے کہ جو نوجوان قرض کا مستحق ہے، اس کی درخواست کو رد نہیں کیا جائے، جو مستحق نہیں ہے، اس کی درخواست منظور نہیں کی جائے۔ قرضوں کا اجرا شفاف اور منصفانہ ہونا چاہیے۔ کسی کی سفارش اور دباو قبول نہ کیا جائے۔ ایک اندازے کے مطابق اب تک 35 لاکھ درخواست فارمز جاری کیے گئے،20ہزار درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ درخواست دہندگان میں 89 فیصد نوجوان مرد اور 11 فیصد خواتین ہیں۔ 60 فیصد درخواستیں زرعی شعبے سے متعلق ہیں۔

وزیراعظم نے ہدایت کی کہ درخواست فارمز کی وصولیابی کا عمل تیز کیا جائے۔ وزیراعظم کی خواہشات اپنی جگہ لیکن ملک میں بدامنی اور تشدد کے واقعات نے پوری قوم کو نہیں نوجوانوں کو بھی متاثر کیا ہے، پاکستان میں نوجوانوں کی اکثریت ملک سے باہر جا رہی ہے، ذہین اور مہارت رکھنے والوں کی ملک میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ والدین بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ملک سے باہر چلے جائیں تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ جس ملک کے نوجوان ، باہر جا رہے ہوں ، پہلے تو انھیں روکنے اور ان کے لئے اچھی سہولتیں روزگار ، تعلیم ، امن وامان کی فراہم ہونی چاہیئے، اگر ہم یہ نہ کرسکے تو ملک میں ٹیلینٹ کیسے رک سکے گا۔ اور قرض کی اسکیمیوں کا کیا فائدہ ہوگا۔

اسرائیل امریکہ کی جاسوسی کر رہا ہے۔

دنیا بھر کی جاسوسی کرنے والا امریکہ کی جاسوسی بھی کی جاتی ہے، اور یہ جاسوسی کوئی اور نہیں اس کا پالتو بلا اسرائیل کرتا ہے، اسرائیل جسے امریکہ اپنا دودھ پلا کر پال رہا ہے، دنیا بھر میں دہشت گردی اور جاسوسی میں اسرائیلی انٹیلیجنس موساد کو کمال مہارت حاصل ہے، کچھ عرصے پہلے دبئ میں اسرائیلی ایجنٹوں نے ایک فلسطینی رہنما کو ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں دن دھاڑے قتل کیا اور باآسانی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے، اسرئیلی ایجنٹوں نے جن غیر ملکیوں کے نام کے پاسپورٹ اور دستاویزات استعمال کیئے وہ سب جعلی نکلے۔ وٹیرز ٹوڈے کی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیل امریکہ میں اپنا جاسوسی کا سب سے بڑا نیٹ ورک قائم کرچکا ہے۔ اور اس میں اسے یہودی اور غیر یہودی امریکیوں کی مدد حاصل ہے۔ امریکہ میں اسرئیل کی جاسوسی کی طاقت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ کوئی امریکی صدر بھی اسرائیلی مفادات کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک چند نمائیشی اقدامات کے علاوہ کسی اسرئیلی جاسوس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جاسکی۔ امریکی اسرائیلی ایجنٹوں کے لئے ایک قانون منظور کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق کسی اہلکار کو حلف اٹھا کر گواہی دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا فائدہ

اٹھاتے ہوئے یہ اہلکار جی بھر کو جھوٹ بولتے ہیں ، نائین الیون کے کیمیشن کو بھی اسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کی،، امریکی ،،اہلکاروں نے کمیشن کے سامنے حقائق چھپائے اور جھوٹ بولا۔

قصور وار ثابت ہونے پر عمر قید ہو سکتی ہے۔ نائین الیون کو اسرائیلی ایجنٹوں کی ایک پوری ٹیم پکڑی گئی تھی۔ لیکن بعد میں ایک اسرائیلی ایف بی آئی کا جعلی ایجنٹ بن کر آیا اور پوری ٹیم کو گرفتار کرکے غائب ہوگیا، اس جاسوسی نیٹ ورک کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگایا جاسکا۔ دو ہزار نو میں اسرائیل کے لئے جاسوسی کے الزام میں امریکی سائنسدان کو گرفتار کیا گیا۔ یہ سائنسدان امریکی خلائی ادارے "ناسا" اور وائٹ ہاوس میں

خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ امریکا میں حکام کے مطابق ایک سائنس دان پر جنھوں نے امریکی محکمہ دفاع اور ناسا کی خلائی ایجنسی جیسے اداروں میں کام کیا ہے، جاسوسی کی کوشش کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ امریکا کے محکمہ انصاف کا کہنا تھا کہ سائنس دان سٹیورٹ ڈیوڈ نوزیت نے مبینہ طور پر خفیہ معلومات ایک ایسے شخص کو دینے کی کوشش کی جسے وہ اسرائیلی انٹیلی جنس ادارے کا افسر سمجھتے رہے۔ باون سالہ نوزیت کو جنھیں کبھی اعلیٰ سطح کی سکیورٹی کلیرنس حاصل تھی، اس ایجنٹ کو ایف بی آئی کے ایجنٹوں نے گرفتار کیا۔ جاسوسی کے اس "سودے" میں نوزیت نے

گیارہ ہزار ڈالر کیش کی رقم قبول کی تھی۔ لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ اس ایجنٹ پر ایسا کوئی الزام نہیں لگایا گیا کہ اسرائیل یا اسرائیل کی طرف سے کسی نے امریکی قانون کی خلاف ورزی کی ہو۔ان کے خلاف شکایت میں کہا گیا ہے کہ ان کا طور طریقہ سنگین نوعیت کا تھا اور امریکہ کے معاون اٹارنی جنرل ڈیوڈ کرس نے کہا ہے "جو کوئی بھی پیسے کی خاطر ہمارے ملک کے رازوں پر سودا بازی کرنے کا سوچے گا اس کے لیے یہ وارننگ کافی ہونی چاہیے۔" ایک حلف نامے کے مطابق نوزیت سنہ نواسی سے نوے کے درمیان وائٹ ہاؤس میں نیشنل سپیس کونسل میں کام کرتے رہے اور اسی دوران انھوں نے ریڈار بنا کر تجربے کے ذریعے دکھایا کہ چاند پر پانی کے آثار پائے جاتے ہیں۔اس کے بعد وہ دس برس تک لیبارٹری میں کام کرتے رہے اور سنہ دو ہزار میں انھوں نے امریکی حکومت، پینٹاگون اور ناسا کے لیے انتہائی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی تیار کی۔ایک بیان میں محکمہ انصاف نے کہا ہے کہ سنہ انیس سو نواسی سے دو ہزار چھ تک نوزیت کو باقاعدگی سے خفیہ معلومات تک رسائی حاصل تھی کیونکہ انھیں حد درجہ بلند سطح کی سکیورٹی کلیرنس مل چکی تھی۔ ان کی رسائی ایسی خفیہ دستاویزات تک بھی تھی جن کا امریکی دفاع سے تعلق تھا۔ گرفتاری سے قبل ایف بی آئی کے ایک ایجنٹ نے بھیس بدل کر نوزیت سے رابطہ کیا اور خود کو اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا افسر ظاہر کیا۔ نوزیت نے مبینہ طور پر اس ایجنٹ سے کہا کہ وہ اسے (ایجنٹ کو) اسرائیلی پاسپورٹ اور مال کے عوض باقاعدگی کے ساتھ خفیہ معلومات سے متعلق

سوالوں کے جواب دیں گے۔ دوران سائنس دان نے ایجنٹ کو جوابی خطوط دیئے جن میں "انتہائی خفیہ" معلومات تھیں جن کا تعلق امریکہ سیٹلائٹس سے تھا۔ اس کے علاوہ یہ معلومات پیشگی خبردار کرنے کے نظام، دفاعی نظام، بڑے حملے کو پسپا کرنا، اطلاعاتی انٹیلی جنس اور دفاعی حکمتِ عملی کے بعض عناصر سےمتعلق تھیں چاند پر پانی کی موجودگی کا انکشاف کرنے والی ٹیم کے ایک رکن اور امریکاکے سرکردہ خلائی سائنسدان نے کہا ہے کہ وہ اپنے اوپر اسرائیل کے لئے جاسوسی کے لگنے والے الزام میں بے قصور ہیں. ان پر ایک امریکی عدالت میں اسرائیل کو بیس لاکھ ڈالرز کے عوض امریکاکے دفاع راز فروخت کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے. عدالت کے جج ڈیبوراہ رابنسن نے خلائی سائنسدان اسٹیوارٹ ڈیوڈ نوزیٹے کی ضمانت کی درخواست مسترد کر دی ہے اور کہا ہے کہ وہ ہوائی سفر کے ذریعے ملک سے راہ فرار اختیار کر سکتے ہیں، اس لئے انہیں ان کے خلاف مقدمے کی سماعت تک جیل ہی میں رکھا جائے. سٹیوارٹ کو ایف بی آئی نے ایک خفیہ کارروائی کے بعد 19 اکتوبر کو گرفتار کیا تھا. باون سالہ سٹیوارٹ نوزیٹےکے خلاف اسرائیلی انٹیلی جنس آفیسر کا روپ دھارنے والے ایف بی آئی کے ایک خفیہ ایجنٹ کو دفاعی راز فروخت کرنے اور جاسوسی کے دو الزامات پر فردجرم عاید کی گئی ہے. اگر ان پر یہ جرم ثابت ہوگیا تو انہیں سزائے موت ہو سکتی ہے یا پھر انہیں عمر قید کی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا. مقدمے کے شواہد کے مطابق فیڈرل پراسیکیوٹر ہیتھر شمڈٹ نے عدالت کو بتایا کہ ''مدعا علیہ کے خلاف

ٹھوس ثبوت موجود ہیں''. استغاثہ کی جانب سے عدالت میں پیش کی گئی دستاویز میں اسٹوارٹ نوزیٹے پر صرف بیس لاکھ ڈالرز کے عوض جاسوسی کرنے کا الزام عاید کیا گیا ہے''. استغاثہ کے مطابق انہوں نے نقد رقوم اور غیر ملکی پاسپورٹ کے عوض ایک ایسے فرد کو خفیہ معلومات مہیا کی تھیں، جسے وہ اسرائیلی انٹیلی جنس کا افسر خیال کر رہے تھے. امریکی حکومت کی جانب سے عدالت میں نوزیٹے اور ایف بی آئی اے کے ایجنٹ کے درمیان 19 اکتوبر کو ہونے والی گفتگو کے اقتباسات ریکارڈ کی شکل میں پیش کئے ہیں جس میں نوزیٹے مسکراتے ہوئے اسرائیل کے لئے جاسوسی پر مشتبہ قرار پانے کے بعد امریکا سے راہ فرار اختیار کرنے کے مختلف منصوبوں کا تذکرہ کر رہے ہیں. اس روز اپنی آخری گفتگو کے دوران ایف بی آئی کے خفیہ ایجنٹ نے مبینہ طور پر نوزیٹے کو سوبلوں کی شکل میں دس ہزار ڈالرز کی رقم دی تھی جو وہ ایک ہوٹل کے باتھ روم ٹائیلٹ کے ٹینک میں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس دوران انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا. ایک اور مقدمے میں اسرائیلی حکومت کی جانب سے امریکہ میں جاسوسی کے الزام میں عمر قید کاٹنے والے ایک اسرائیلی شہری کی رہائی کیلئے امریکی انتظامیہ سے باقاعدہ اپیل کی تھی۔ اسرائیلی شہری جوناتھن پولارڈ کی رہائی کیلئے وزیرِاعظم بینجمن نیتن یاہو کی جانب سے باضابطہ اپیل پر مشتمل خط امریکی صدر براک اوباما کو روانہ کیا گیا تھا۔ امریکہ میں قید جوناتھن پولارڈ کی اہلیہ نے اسرائیلی وزیرِاعظم سے ملاقات کرکے اپنے شوہر کی جانب

سے ان کے نام لکھا گیا ایک خط پہنچایا تھا۔ ملاقات کے بعد نیتن یاہو کا کہنا تھا کہ وہ پولارڈ کی رہائی کیلئے امریکہ سے باضابطہ اپیل کریں گے۔ جوناتھن پولارڈ بنیادی طور پر امریکی شہری ہیں اور وہ امریکہ کی بحری انٹیلی جنس میں تجزیہ کار کے طور پر تعینات تھے۔ 1985 میں امریکی سیکورٹی اہلکاروں کے ہاتھوں اپنی گرفتاری کے بعد پولارڈ نے دورانِ تفتیش اسرائیل کیلئے جاسوسی کرنے کا اعتراف کیا تھا۔ حکام کی جانب سے یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ پولارڈ نے امریکہ کے کون سے راز اسرائیل کے حوالے کیے تھے تاہم یہ گمان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسرائیلی حکام کو ہزاروں خفیہ امریکی دستاویزات تک رسائی فراہم کی تھی۔ اسرائیل کیلئے جاسوسی کا جرم ثابت ہونے پر ایک امریکی عدالت کی جانب سے پولارڈ کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی جس کے بعد اسرائیلی حکومت کی جانب سے 1995 میں پولارڈ کو اسرائیل کی شہریت عطا کی گئی تھی۔ حال ہی میں سامنے آنے والی اطلاعات کے مطابق 56 سالہ پولارڈ آج کل شدید علیل ہیں۔ اسرائیلی وزیرِ اعظم کا کہنا تھا کہ وہ امریکہ سے پولارڈ کی رہائی کی اپیل کرنے کو اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔۔ اسرائیل کے لئے کام کرنے والا امریکی شہری جوناتھن پولاڈ اسرائیلی جاسوس نکلا، جوناتھن اسرائیل کا ایسا جاسوس تھا جو عرب دنیا اور پاکستان کے راز بھی سرائیل کو دیتا رہا ہے۔ اسرائیلی جاسوس پاکستان اور سعودی عرب کے لئے مواد اکھٹا کرتا تھا۔ امریکا کی سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے کی جاری کردہ دستاویزات

کے مطابق اسرائیل کے لیے جاسوسی کرنے کی پاداش میں عمر قید کے امریکی ملزم شہری جونا تھن پولاڈ پاکستان اور عرب ملکوں کے ایٹمی پروگرام سے متعلق معلومات جمع کرتا رہا۔ سی آئی اے کے مطابق امریکی بحریہ میں کام کرنے والا جوناتھن پولاڈ 1985 میں امریکا میں اسرائیلی سفارتخانے میں پناہ لینے کی کوششوں کے وقت گرفتار ہوا اور اسے اسرائیل کو دفاع سے متعلق خفیہ راز دینے پر عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ جاری دستاویزات کے مطابق جوناتھن پولاڈ پاکستان اور عرب ملکوں کے ایٹمی پروگرام میں بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا۔ 1995ء میں اسرائیل نے اعتراف کیا تھا کہ جوناتھن پولاڈ اسرائیلی جاسوس ہے اور تل ابیب نے پولاڈ کی رہائی کے لیے امریکا سے مختلف فورم پر بات کی ہے۔ جوناتھن پولارڈ نامی ایک اسرائیلی جاسوس کو یہ ذمے داری دی گئی تھی کہ وہ پاکستان کی ایٹمی پروگرام کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ اس بات کا انکشاف ریلیز ہونے والی دستاویز میں کیا گیا تھا۔ 1984 سے 1985 تک پولارڈ نے اسلاآباد کے قریب واقع ایک نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کی معلومات کے کئی سیٹس اسرائیلی حکام کے حوالے کئے اور یہ آفیشل امریکی ڈاکیومنٹ تھے۔ پولارڈ، اگرچہ امریکی شہری ہیں لیکن امریکی بحریہ سے وابستہ رہتے ہوئے انہوں نے اسرائیل کے لئے جاسوسی کی۔
انہیں اسی بنیاد پر عمر قید کی سزا دی گئی تھی۔ 14 دسمبر، 2012 کو سیآئی اے 1987 نے ایک خفیہ دستاویز جاری کی جس کا نام ' جوناتھن جے پولارڈ جاسوسی کیس، نقصان کا اندازہ' ہے اور یہ رپورٹ 30 اکتوبر

کو تیار کی گئی تھی۔ یہ دستاویز، جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے نیشنل سیکیورٹی 1987 آرکائیو پروجیکٹ کی اپیل پر جاری کی گئی ہے جس میں پولارڈ کے جاسوسی مشن پر معلومات موجود ہیں۔ یہ ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے جس کا مقصد امریکہ میں خفیہ اور درپردہ معلومات کو کم سے کم کرکے لوگوں اس کی لوگوں تک رسائی فراہم کرنا ہے۔ پولارڈ کیخلاف عدالتی کارروائی میں سابق امریکی وزیر دفاع کیسپر وائنبر گرنے بتایا تھا کہ پولارڈ کو جو خفیہ دستاویز دی گئیں ان سے چھ فٹ چوڑا، اتنے ہی فٹ لمبا اور دس فٹ اونچا کمرہ بھرا جاسکتا ہے۔ سیآئی اے کی تفصیلات سے معلوم ہوا ہے کہ پولارڈ کو عرب (اور پاکستانی) نیوکلیئر پروگرام، عرب ممالک کی جانب سے باہر سے خریدے گئے ہتھیاروں اور کیمیائی اسلحے، سوویت جنگی ہوائی جہاز، سوویت ایئر ڈیفینس سسٹم، فضا سے فضا تک مار کرنیوالے میزائلوں اور عرب افواج کی تیاریوں میں خصوصی دلچسپی تھی۔ دستاویز میں بڑا حصہ وہاں سے سینسر کیا گیا ہے جس میں پولارڈ کی جاسوسی کا اسرائیلی فائدے پر بحث کی گئی ہے۔ صفحہ 58 پر لکھا ہے کہ پولارڈ نے اسرائیل کیلئے مٹیریل بھی چرایا اور کافی فوائد۔۔۔ (سینسر)۔ پھر صفحہ 59 پر لکھا ہے (سینسر) پولارڈ نے تیونس میں پی ایل او ہیڈ کوارٹر سے متعلق معلومات بھی دیں۔ ساتھ ہی تیونس اور لیبیا کے ایئر ڈیفینس کے بارے میں معلومات فراہم کی اور اسلام آباد کے قریب پاکستان کے نیوکلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ پر بھی دستاویز فراہم کی تھیں۔ اکتوبر 1985 میں اسرائیل

نے ان معلومات کی بنا پر تیونس میں واقع پی ایل او رکے صدر دفاتر پر حمہ کیا تھا۔
آرکائیو کی ویب سائٹ پر پوسٹ کی گئی دستاویز میں تقریباً دس جگہ پاکستان اور اس کی
ایٹمی تنصیبات کا ذکر ہے جسے مٹایا گیا ہے۔ بعض ڈاکیومینٹس میں افغان جنگ اور اس
میں پاکستان کے کردار پر بھی بات کی گئی ہے۔ اگرچہ سی آئی اے کی دستاویزات سے یہ
ظاہر نہیں ہوتا کہ امریکی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں کتنا کچھ جانتے تھے
لیکن اسی ویب سائٹ پر پوسٹ کردہ دوسری دستاویز میں ایسا نہیں ہے۔ ریکارڈ سے ظاہر
ہے کہ 1980 کے عشرے میں امریکی یہ جانتے تھے کہ پاکستان ایٹمی میدان میں خاصی
پیش رفت کر رہا ہے لیکن افغانستان میں جاری سوویت جنگ میں اسلام آباد کی
حمایت کے بدلے پاکستان کیخلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ پھر جولائی 1982 میں
ریگن حکومت نے سیآئی اے کے سابق نائب سربراہ جنرل ورنن والٹرز کو جنرل ضیا
الحق کے پاس روانہ کیا تاکہ انہیں ایٹمی پروگرام میں پاکستانی کی خفیہ اور تیز رفتار پیش
رفت پر واشنگٹن کی تشویش سے آگاہ کیا جاسکے۔ پھر 1986 میں آرمز کنٹرول اور
ڈسآرمامنٹ ایجنسی کے ڈائریکٹر، کینتھ ایڈلمان نے بھی وائٹ ہاوس کو خبردار کیا کہ
پاکستان ایٹمی پروگرام آگے بڑھا رہا ہے۔ تاہم وائٹ ہاؤس نے اسرائیلی جاسوس کی رہائی
کیلئے صدر شمعون پیریز کی اپیل مسترد کر دی۔ غیر

ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق امریکی قومی سلامتی کونسل کے ترجمان ٹومی ویٹر نے اپنے ویب سائٹ بیان میں کہاکہ اسرائیلی جاسوس جوناتھن پولارڈ کو عمر قید کی سزا دینے کے بارے میں ہماری پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انہوں نے کہاکہ اگرچہ اسرائیلی صدر شمعون پیریز نے صدر اوبامہ کو پولارڈ کی رہائی کیلئے تحریری درخواست دی ہے تاہم ہمارا موقف ہے کہ اس حوالے سے پہلے جیسا ہے۔ دریں اثناء اسرائیلی اخبار کی رپورٹ کے مطابق شمعون پیریز نے اپنی اپیل پولارڈ کی صحت کو بنیاد بنا کر کی ہے۔ اپنی اپیل میں انہوں نے کہاکہ پولارڈ کی اہلیہ نے اس کی بگڑتی ہوئی صحت بارے صدر کو آگاہ کیا ہے جبکہ شہریوں کی اکثریت بھی پولارڈ کی رہائی کیلئے صدر سے استدعا کی ہیسرائیلی کابینہ کے کئی ممبران نے امریکہ کی جانب سے اسرائیلی رہنماؤں کی جاسوسی کی خبروں کے بعد مطالبہ کیا ہے کہ امریکی جیل میں قید اسرائیلی جاسوس جوناتھن پولارڈ کو رہا کرے۔ سی آئی اے کے سابق اہلکار ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے لیک کی جانے والی تازہ دستاویزات کے مطابق امریکہ کی نیشنل سکیورٹی ایجنسی نے اسرائیلی رہنماؤں کی بھی جاسوسی کی تھی۔ اسرائیلی وزیر اعظم بنیامن نیتن یاہو اسرائیلی رہنماؤں کی امریکہ کی جانب سے جاسوسی کی خبروں کے بعد امریکہ کے ساتھ تعلقات کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ جوناتھن پولارڈ امریکی بحری انٹیلی جنس میں تجزیہ کار تھے۔ ان کو 1987 میں اسرائیل کے لیے جوسوسی کے الزام میں عمر قید کی سزا دی گئی

تھی۔ اسرائیل نے کئی بار امریکی صدور سے پولارڈ کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے لیکن ان صدور نے ان کو معافی دینے سے انکار کیا ہے۔ ایک اور ایسا ہی کیس جس سے گمان ہوتا ہے کہ امریکہ نے اپنے شہریوں کو اسرائیل کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ وہ رچرڈ سنسٹون کا ہے۔ رچرڈ سنوڈن کا نیا تہلکہ خیز انکشاف 12 ستمبر کو امریکی حکومت کے "غدار" رچرڈ سنوڈن نے ایک اور انکشافاتی دھماکہ کرڈالا۔ اس نے برطانوی اخبار، گارڈین کو ایک خفیہ معاہدے کی نقل فراہم کی جو 2009ء میں امریکی اور اسرائیلی حکومتوں کے مابین طے پایا تھا۔ اِس خفیہ معاہدے کے ذریعے امریکیوں نے اسرائیلیوں کو اُس اربوں میگا بائٹ ڈیٹا تک رسائی دے ڈالی جو امریکہ کی سب سے بڑی امریکی خفیہ ایجنسی، این ایس اے (National Security Agency) اپنی عوام اور غیر ملکیوں کی جاسوسی کرکے حاصل کرتی ہے۔ اس ڈیٹا میں عوام وخواص کی موبائل فون کالوں، ای میلز اور انٹرنیٹ پہ سرچنگ کا ریکارڈ شامل ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اسرائیلی بھی امریکہ میں اپنے شکار دریافت کرسکیں۔ ایک اور خفیہ دستاویز سے اسرائیل اور امریکہ کے عجیب وغریب رشتے کا اتا پتا ملتا ہے جو بیک وقت دوستی و مخاصمت پہ استوار ہے۔۔ دستاویز میں این ایس اے کے ایک اعلیٰ افسر کا یہ جملہ درج ہے: "اسرائیلی دنیائے انٹرنیٹ وموبائل میں جاسوسی کرتے ہوئے ہمارا بہت ہاتھ بٹاتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ ہمیں بھی ٹارگٹ کرتے ہیں تاکہ مسئلہ مشرق وسطیٰ کے سلسلے میں ہمارے خیالات و نظریات جان سکیں۔" اسی دستاویز میں این ایس اے کے ایک ڈپٹی

ڈائریکٹر نے اسرائیلی خفیہ ایجنسی، موساد کو ''امریکہ کے خلاف شدومد سے کام کرنے والی تیسری بڑی انٹیلی جنس سروس قرار دیا۔'' درج بالا معاہدہ اور دستاویز منظر عام آنے پہ امریکہ میں خاصا ہنگامہ برپا ہے۔ معاشی زوال کا شکار امریکہ میں پہلے ہی کئی امریکی شہری اسرائیل کو اپنی تباہی کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''اسرائیلی حکومت ہی نے امریکہ کو جنگوں میں الجھایا اور خود اس کا کام فلسطینیوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا ہے۔ وہ ہماری ساتھی نہیں دشمن ہے جسے امریکی حکومت ہر سال اربوں ڈالر کی امداد دے ڈالتی ہے۔'' امریکی عوام اپنی حکومت کی منافقت بھی عیاں کرنے پہ جتے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی بریڈلے مینینگ، رچرڈ سنوڈن، مائیکل ہیسٹنگز (صحافی) اپنی حکومت کی غیر قانونی وغیر انسانی سرگرمیاں افشا کرے، تو وہ غدار اور وطن دشمن قرار پاتا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ اپنے عوام کے نجی راز خود امریکی حکومت نے اسرائیلیوں کے حوالے کر دیئے۔ دنیا میں ایسی بے ضمیر حکومتیں کم ہی ہیں جو اپنے شہریوں کو یوں بیچ ڈالیں۔ امریکہ کا مشہور صحافی، ایلین برگ اپنے کالم میں لکھتا ہے: ''پہلے تو امریکی شہری اپنی وسیع و عریض خفیہ ایجنسی، این ایس اے چلانے کے لیے اربوں ڈالر ادا کرتے اور اس دوران خود کو صحت و تعلیم کی سہولیات سے دور کر ڈالتے ہیں۔ پھر یہی ایجنسی غیر قانونی طور پر امریکی شہریوں سے متعلق بے پناہ معلومات جمع کرتی ہے۔ پھر امریکی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ساری معلومات ایک غیر ملک کو مفت دے ڈالتی ہے۔ یہ سارا

معاملہ صرف ایک لفظ سے بھی بیان کرنا ممکن ہے ... غداری۔" امریکہ میں باشعور لکھاری اپنے عوام پر زور دے رہے ہیں کہ وہ نیند سے جاگ کر اپنی حکومت کی ناجائز سرگرمیوں پہ آواز اٹھائیں۔ تاہم ایک کالم نگار امریکی عوام کی بے حسی پہ کچھ یوں طنز کر گیا: "امریکی عوام اسی وقت جاگتے ہیں جب اگلا آئی فون آجائے۔ تب سٹورز کے سامنے صبح سویرے لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ آئی فون خرید کر وہ برگر و بوتل پکڑتے اور مزے سے پیٹ بھرتے یہ دیکھنے لگتے ہیں کہ اب اگلی کون سے گرما گرم (HOT) مصنوعات آنے والی ہے۔ پھر وہ واپس وادیِ نیند میں جا پہنچتے ہیں۔" گویا بقول حبیب جالب رقصِ آتش و آہن، دیکھتے ہی جاؤگے دیکھتے ہی جاؤگے، ہوش میں نہ آؤگے۔

اسرائیل ایک طرف تو امریکہ کا پالتو ہے لیکن دوسری جانب اسرئیل امریکہ کو آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔ اسرائیل کے وزیر برائے ٹرانسپورٹ نے امریکہ سے اسرائیلی رہنماؤں کی جاسوسی فوری روکنے اور پولارڈ کو فوری طور پر رہا کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا: 'امریکہ منظم طریقے سے اسرائیل کے سیاسی اور سکیورٹی کے رہنماؤں کی جاسوسی کر رہا ہے۔' اسرائیل کے وزیر برائے سیاحت نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا 'پولارڈ کو اسرائیل لانے کا اس سے بہتر موقع کوئی نہیں ہو سکتا۔' تاہم اسرائیلی وزیر اعظم نے کابینہ کے اجلاس کے بعد پریس کانفرنس میں کہا کہ اسرائیل کو امریکہ کے ساتھ پولارڈ پر بات چیت کے لیے کسی خاص موقعے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے وائٹ ہاؤس میں تواتر سے پولارڈ کا ایشو اٹھایا ہے اور 'امید ہے کہ

صورتحال ایسی پیدا ہو جائے گی کہ پولارڈ کو رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن اس بات کا تعلق تازہ صورتحال کے ساتھ نہیں ہے۔' دوسری جانب ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے لیک کی گئی دستاویزات میں حال ہی میں یہ بات منظر عام پر آئی ہے کہ این ایس اے اور برطانوی تنظیم جی سی ایچ کیو نے 2009 میں اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم ایہود اولمرٹ اور وزارت دفاع کے سینیئر حکام کی ای میل ہیک کی تھیں۔ اسرائیل کے وزیر برائے سٹریٹیجک امور نے امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے کی جانے والی جاسوسی کو ناقابل قبول قرار دیا۔ تاہم انھوں نے مزید کہا کہ اگرچہ یہ ممالک اسرائیل کے اتحادی ہیں لیکن اسرائیل نے یہ سمجھ کر چلتا ہے کہ وہ جاسوسی کریں گے۔ سابق وزیر اعظم اولمرٹ کی جانب سے جاری ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ اگر جاسوسی کی خبریں درست ہیں تو یہ ای میل ایڈریس حساس نوعیت کا نہیں تھا اور اس لیے اس جاسوسی سے اسرائیل کو بہت کم نقصان پہنچا ہو گا۔

سندھی ثقافت کے نام پر

سندھ بھر میں سندھی کلچرل فیسٹیول کی تقریبات جاری ہیں۔ جس کے پروگرام 15 فروری تک 18 مختلف ثقافتی مقامات پر ہوں گے۔ سندھی ثقافت کو اجاگر کرنے کے لئے حکومت سندھ کے اخراجات اربوں روپے کے ہوں گے سندھ کی ثقافت کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کے لیے افتتاحی تقریب تاریخی شہر موئنجودڑو میں ہوئی جس میں بلاول بھٹو زرداری، بختاور بھٹو زرداری، آصفہ بھٹو زرداری، وزیر اعلیٰ سندھ، سید قائم علی شاہ، سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی، حنا ربانی کھر، سندھ کے علاوہ صوبائی وزرااور پیپلز پارٹی کے رہنما سمیت 500 مہمان شریک ہوئے۔ موہینجوڈارو کے کھنڈرات ایک طویل عرصے سے ویرانی اور عدم توجہی کا شکار ہیں۔ لاڑکانہ شہر میں بہت عرصے بعد سڑکیں بنی ہیں، باقی سب پہلے کی طرح ہی دھول مٹی اڑتی ہے۔ موہنجوڈارو کا میوزیم کب کا اجڑ چکا ہے، تاریخی نوادرات میں سے اکثر غائب ہیں، جہاں ان کی نقل رکھی ہوئی ہے۔ گو ہائی کورٹ کے ایک مقدمے میں اس بات کی تنبیہ کی گئی تھی کہ تاریخی آثار قدیمہ میں کوئی توڑ پھوڑ نہ کی جائے، لیکن اس کے باوجود تاریخی سٹوپا کے سامنے لکڑی کا 80 فٹ چوڑا اور پچاس فٹ طویل سٹیج تیار کیا گیا اور مختلف تاریخی آثار میں ہی خوبصورت لائٹنگ بھی کی گئی۔ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کی یاد میں سندھ فیسٹیول سے ایران کے بادشاہ رضا

شاہ پہلوی کی یاد تازہ ہو گئی، انھیں بھی اپنی ہزار سالہ تہذیب پر فخر تھا، انھوں نے بھی ان آثار پر ایک جشن منایا تھا، پھر نہ بادشاہت رہی نہ وہ ہزار سالہ تہذیب۔ سندھ فیسٹیول میں سندھ کے نامور فنکار کی جگہ پوپ گلوگار اور ڈانسرز بلائے گئے تھے۔ جو صوفیانہ اور لوک موسیقی اور لوک گیتوں کے ساتھ جو کچھ پیش کر رہے تھے وہ سندھی ثقافت کے نام پر ایک سیاہ دھبہ تھی۔ سندھ کی قدیم اور جدید ثقافت پر مبنی عروسی لباس پہنے ماڈلز نے جلوے بکھیرے، گلوکارہ عینی نے گیت کے دوران جو بوسے دیئے، وہ کس ثقافت کی عکاسی کر رہے تھے۔ کس کو نہیں معلوم، آتش بازی کے شاندار مظاہرے سے بھی کچھ سندھی ثقافت اجاگر ہوئی۔ سابق وزیر اعلیٰ سندھ ممتاز علی بھٹو کو اپنے نواسے بلاول کے یہ انداز شائد پسند نہیں آئے۔ اس لئے انھوں نے سوال کیا کہ سندھ میں کروڑوں لوگ غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، سندھ حکومت بتائے وہ کس مقصد کیلئے اربوں روپے کے اخراجات سے جشن منا رہی ہے، اگر جشن کا اتنا ہی شوق ہے تو رقم غریبوں میں آٹا اور چاول تقسیم کرکے پورا کر لی جائے۔ انھوں نے سندھ کے حکمرانوں سے یہ بھی پوچھا کہ وہ قوم کو بتائیں کہ کیا وہ جشن پر پیسہ اپنے غیر ملکی اکاؤنٹس سے نکال کر خرچ کریں گے یا پھر عوامی خزانے پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ یہ رقم ترقیاتی منصوبوں کیلئے مختص فنڈز کو روک کر جشن پر خرچ کی جائیگی۔ خبریں یہ ہیں کہ اس جشن کے لئے مہمانوں کو لیجانے کے لئے ایک کروڑ روپے تو جہاز کے ٹکٹ پر خرچ کئے گئے۔ مجموعی طور پر

افتتاحی تقریب پر تقریباً پچھتّر کروڑ روپے کا خرچہ آیا ہے۔ موہن جوڈارو کئی ہزار برس قبل دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک بہت بڑی تہذیب تھی، جو مٹ گئی، مگر اپنے پیچھے تاریخی نقوش چھوڑ گئی۔ موہن جوڈارو کے آثار میں سے صرف ایک تہائی سن 1922 میں دریافت کیے گئے تھے۔ سرزمینِ سندھ ہمیشہ سے صوفیا اور اولیا اللہ کیسرزمیں ہے۔ سندھ کی مہمان نوازی بھی مشہور ہے۔ سندھ کے لوگ سچے سیدھے سادے ہیں۔ ان کی حقیقی ثقافت دیکھنی ہو تو سندھ کے کسی گاؤں دیہات میں چلے جائیں۔ جہاں ایک غریب اپنی غربت اور مفلوک الحالی کے باوجود مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن آج سندھی چینل اور ارباب اختیار ایک دوسرا سندھی معاشرہ دکھا رہے ہیں جو اپنی اصل اقدار سے دور ہوتا نظر آ رہا ہے۔ سندھ کے نوجوانوں کو ایک خاص مہم کے، ذریعے اپنی ثقافت اور روایات سے دور کیا جا رہا ہے۔ اس مہم کا سہرا سندھی میڈیا کے سر جاتا ہے، جو دعویٰ تو سندھ اور سندھیوں کی ترقی کا کرتا ہے، لیکن حقیقت اس سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ سندھی میڈیا نے سندھ میں اسلحہ کلچر کو عام کیا۔ ٹی وی ڈراموں میں پیش کردہ کرداروں سے متاثر ہو کر نوجوانوں نے اسلحہ اٹھالیا ہے جس سے ان کا اور معاشرے کا مستقبل تباہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ سندھی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے بعد ہر روز اخبارات میں اور ٹی وی پر کئی پریمی جوڑوں کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ سندھی روایات ایسی نہیں کہ ان کی بچیاں گھروں سے بھاگ کر شادی کریں اور نہ ہی سندھ کی روایات میں یہ شامل ہے کہ چھوٹی بچیوں کی

زبردستی شادیاں کی جائیں۔ سندھی میڈیا نے شراب نوشی کے کلچر کو عام کر دیا ہے۔ سندھی کلچر ڈے کے نام پر سندھی خواتین کو ٹوپی اجرک پہنا کر سڑکوں پر نچانے کا سہرا بھی سندھی میڈیا کے سر جاتا ہے۔ اگر سندھی ثقافت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں سندھی ٹوپی اور اجرک مرد کی شان ہے، نہ کہ عورت کی۔ آج کا سندھی میڈیا سندھی کم اور مغربی زیادہ لگتا ہے۔ اب امتحان سندھ کے دانشوروں اور سندھی زبان، ثقافت اور روایات کی حفاظت کے دعویداروں کا ہے۔ وہ بتائیں کہ اصل سندھی کلچر کیا ہے؟ سندھ، سندھی ثقافت اور سندھ کے معاشرے سے پیار رکھنے والے کیا اپنی قوم اور ثقافت کو تباہی کی طرف جاتا دیکھ کر اب بھی خاموش رہیں گے۔

بھارت میں انقلاب، پاکستان میں انتظار

بھارت میں سیاست دانوں کی بڑی تعداد پریشان ہے، اس انقلاب سے جو ان کے سرپر کھڑا ہے۔ یہ انقلاب اب خواب نہیں رہا، بلکہ اس نے سچ مچ ایک حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ عام آدمی کی معاشرے میں وقعت ہی کیا ہے، اسے پوچھتا کون ہے، لیکن جب اس عام آدمی نے ایک پارٹی کا روپ دھارا تو یہ بھارت کی سب سے طاقتور پارٹی کی حیثیت میں سامنے آئی ہے۔ عام آدمی پارٹی ایک بھارتی سیاسی پارٹی ھے۔ اس کی تخلیق اروند کیجری وال نے دوہزار بارہ میں کی تھی۔ حالیہ دلی کے انتخابات میں یہ دوسری سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری۔ اس نے اٹھائیس نشستیں حاصل کیں 'عام آدمی' نامی جماعت کی قیادت اروند کیجریوال کر رہے ہیں جو سابق سرکاری ملازم ہیں۔ دہلی کے مقامی انتخابات میں حصہ لینے والی یہ جماعت انسداد بدعنوانی کی اس مہم کے بعد وجود میں آئی جو دو برس پہلے بھارت میں شروع ہوئی۔ برصغیر کے سیاسی حلقوں میں یہ خبر حیرت سے سنی گئی کہ بھارت کے حالیہ ریاستی انتخابات میں (جو راجستھان، چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش، دہلی اور میزورام کی ریاستوں میں ہوئے) گزشتہ تین انتخابات میں تسلسل سے جیتنے والی خاتون شیلا ڈکشٹ کو جو پندرہ سال سے وزیراعلیٰ چلی آرہی تھیں، ایک نئی پارٹی ''عام آدمی پارٹی'' کے سربراہ اروند کجری وال نے

ہزار ووٹوں سے شکست دے دی اور شریمتی شیلا ڈکشٹ نے اپنی ہزیمت تسلیم 25 کرتے ہوئے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اروند گجری وال بھارتی ریاست کی کبھی معروف شخصیت نہیں تھے۔ وہ بھارت کی بیورو کریسی کے ہجوم میں ایک ایسے عہدے دار تھے جو ملک کے زوال پذیر تہذیبی کلچر سے نالاں تھے اور معاشرے کو کرپشن کے کینسر سے نجات دلا کر دیانت اور امانت کے کلچر کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اپنی اس آرزو کی تکمیل کیلئے انہوں نے شری انا ہزارے کا ساتھ اس وقت دیا جب انہوں نے کرپشن کے خلاف تحریک چلائی اور عوام میں بیداری کی ایک موثر لہر دوڑا دی۔ اس تحریک میں گجری وال.....انا ہزارے کے ترجمان تھے۔ اس تحریک میں ہی انہیں بھارت کے کرپشن سے ڈسے ہوئے اور گرانی اور بے روزگاری کی زد میں آئے ہوئے عوام سے براہ راست رابطے کا موقعہ ملا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ سیاسی عمل میں شامل ہو کر سماجی برائیوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کے حامی ایک شخص کا کہنا تھا 'ہم نے بہت سے سیاستدانوں کو دیکھ لیا جنھوں نے ہم سے وعدے تو بہت کیے لیکن عمل بہت کم کیا۔ اب میں انہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔' ''عام آدمی پارٹی'' (اے،اے،پی) کا قیام 26 نومبر 2012ء کو عمل میں آیا تھا۔

الیکشن سے پہلے ان کا ایک پیغام اکثر سننے میں آتا۔ 'میں اروند کیجریوال ہوں۔۔۔ جھاڑو کو ووٹ دیں۔' یہ سادہ سا پیغام ہر روز دہلی کے ریڈیو سٹیشن سے

نشر کیا جاتا ہے۔ الیکشن میں ان کی پارٹی کامیاب رہی اور 'عام آدمی پارٹی' دہلی کے انتخابات میں ایک اہم جماعت کے طور پر سامنے آگئی۔ یہ ہر ماہ اپنی کارکردگی رپورٹ بھی عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ابھی دوسرا ماہ ہوا ہے۔ انھوں نے نئی دہلی میں مسلسل دوسرے روز ماہانہ کارکردگی پر رپورٹ پیش دی ہے۔ اور اس میں بھی اروند کیجری وال نے حسب روایت ایک نیا محاذ کھول دیا۔ کیجری وال نے راہول گاندھی کو کھلے عام کرپٹ قرار دیتے ہوئے کرپٹ سیاست دانوں کی فہرست بھی جاری کردی، مایاوتی، چدم برم، شردپور، ملائم سنگھ یادو کے نام اس لسٹ میں شامل ہیں۔ اروند کیجری والی نے کانگریس، بی جے پی، سماج وادی پارٹی سمیت سب کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اروند کیجری وال اک کہنا ہے کہ وہ کرپٹ سیاستدانوں کے خلاف مضبوط ترین امیدوار کھڑے کریں گے اور انہیں پارلیمنٹ میں نہیں جانے دیں گے۔ اس پہلے کیجری وال نے لوک سبھا کی 300 سے زائد نشستوں پر امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان کیا تھا۔ عام آدمی پارٹی کی ایک اور خوبی جیسے عوام میں سراہا جارہا ہے وہ اس کے وعدے ہیں جن پر عمل بھی کیا جارہا ہے۔ دہلی کے نو منتخب وزیراعلیٰ اروند کیجروال منصب سنبھالتے ہی عوام سے کیے گئے وعدے پورے کرنے میں لگ گئے۔ انھوں نے سب سے پہلے تو یہ اعلان کیا کہ ہر خاندان کو ہر ماہ 700 لیٹر مفت پانی فراہم کیا جائے گا، پھر 400 یونٹ استعمال کرنے والوں کے لیے بجلی کی قیمت بھی آدھی کر دی۔ اروند کیجروال نے انتخابی منشور میں عوام کو مفت پانی، بجلی فراہم

کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ایسی بھی مثال قائم کرنے لگے ہیں جو اس سے پہلے ناپید تھی۔ بخار ہونے کے باوجود اروند کیجریوال نے اجلاس اپنے گھر بلالیا اور گھر پر اجلاس 103 کے دوران یہ فیصلے کیے ۔ انھوں نے پولیس کی ایسی امداد کرنا شروع کی ہے جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے ایک پولیس اہلکار کی ہلاکت پر ایک کروڑ امداد کا اعلان کرکے سب کو حیران کردیا۔ بھارت کی سیاست میں ابھرنے والی نئی سیاسی قوت عام آدمی پارٹی کے سربراہ کی حلف برداری کی تقریب بھی ایک تاریخی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اروند کیجریوال کے کہنے پر ان کی حلف برداری دہلی کے مرکزی میدان میں ایک بڑی عوامی تقریب میں ہوئی اور وہ وی آئی پی کلچر کو رد کرتے ہوئے بغیر پروٹوکول اس تقریب کے لیے میٹرو کے ذریعے وہاں پہنچے تھے۔۔ عام آدمی پارٹی کے اروند کیجریوال سے بھارتی عوم کو بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ بھارت کے سیاسی کلچر میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ عام آدمی پارٹی کا صدر دفتر دارالحکومت کے وسط میں ایک پرانی سے عمارت میں واقع ہے۔ یہاں رضاکار چندہ جمع کرنے، جماعت کی مہم کا لائحہ عمل تیار کرنے اور محدود وسائل کے استعمال کا طریق کار طے کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ لوگ باقاعدہ اور پیشہ ور سیاستدان نہیں ہیں۔ یہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھنیوالے وکلا، طلبا، صحافی اور گھریلوں خواتین ہیں جو ملک کے سیاستدانوں سے مایوس ہیں۔ انہیں سیاست میں آنے کے لیے دو سال قبل ملک میں انسدادِ بدعنوانی کے لیے چلنے والے مہم سے تحریک ملی۔ بدعنوانی

کے خلاف مظاہروں کی قیادت کیجریوال اور ان کے رہنما 'انا ہزارے' نے کی تھی۔ نہ صرف ملک بھر سے بلکہ بیرونِ ملک سے بھی ان کے حامی مظاہروں میں شرکت کے لیے آئے تھے۔اس مہم میں شرکت کے لیے چھٹی لے کر آنے والے ہانگ کانگ کے ایک بینکار امت اگروال کا کہنا ہے 'یہ لوگ جو کر رہے ہیں وہ سچ میں متاثر کن ہے۔' امت اگروال نے ہانگ کانگ میں مقیم دوسرے بھارتی باشندوں کے ساتھ مل کر اس مہم کے لیے دو لاکھ ڈالر چندہ کیے۔اس جماعت نے شفافیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تمام افراد کے نام ظاہر کیے ہیں جنھوں نے انہیں چندہ دیا۔ اگروال کہتے ہیں 'وہاں بہت سے بھارتی ہیں جو رقم عطیہ کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ حکومت کی جانب سے ہراساں کیے جانے سے خوفزدہ ہیں۔دیگر کا خیال ہے کہ یہ بھارت میں ایک بڑے پیمانے پر ہونے والی تبدیلی کی ابتدا ہے۔ سنگاپور میں مینیجمنٹ کنسلٹنٹ راجن مکھنجا کہتے ہیں کہ یہ بھارتی جمہوریت کی ابتدائی فیس بک یا گوگل ہے۔ 'میں اسے کسی چیز کے عوض چھوڑ نہیں سکتا۔'۔لیکن جماعت کے اندر تنازعات کی بھی کمی نہیں۔ انا ہزارے نے بھی خود کو سیاست سے دور ہی رکھا تھا کیونکہ وہ بظاہر جماعتی سیاست میں حصہ لینے کے فیصلے سے ناخوش تھے۔

اس کے علاوہ جماعت کی اہلیت پر بھی سوال اٹھتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے تصورات کو ٹھوس پالیسیوں کی شکل دے پائے گی۔

ایک سیاسی تجزیہ نگار نیرجہ چوہدری کا کہنا ہے ان کے لیے کار کردگی کا مظاہرہ کرنا ایک بڑا امتحان ہوگا۔ 'وہ سیاسی طور پر نا تجربہ کار ہیں۔' انتخابات کے اگلے مرحلے میں سب کی نگاہیں نئے سیاسی حریف کی طرف ہیں۔ اگر 'عام آدمی' اچھی کار کردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی تعداد میں نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ ایک قابلِ تقلید مثال بن جائے گی۔ کانگریس پارٹی اور حزب مخالف کی بڑی جماعت بی جے پی کے اندازوں کو غلط ثابت کر سکتی ہے۔ ان جماعتوں کے لیے آئندہ برس کے عام انتخابات میں جیت کے لیے دہلی کے انتخابات جیتنا بہت اہم تھا۔ اپنی کامیابی پر اروند کیجریوال کہتے ہیں 'ہم کانگریس یا بی جے پی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر رہے۔ یہ عام آدمی ہے جو ان کے مقابل آیا ہے۔ ان کا دل ان دونوں جماعتوں سے بھر چکا ہے اور اب آخر کار انہیں ایک دیانت دار جماعت کو منتخب کرنے کا موقع ملا ہے۔' اس جماعت کی انتخابی مہم انتہائی کم بجٹ پر چلائی گئی تھی۔ دہلی کے قرب و جوار کے پسماندہ علاقوں میں ایک کھلی جیپ پر سوار کیجریوال کے ساتھ ٹک ٹک اور سکوٹروں کا قافلہ چلتا تھا۔ جس میں پارٹی کے کارکنوں نے اپنے رہنما کی تقلید کرتے ہوئے سفید ٹوپیاں پہن رکھی ہیں جس پر تحریر تھا میں ایک عام آدمی ہوں'۔ کئی افراد پارٹی کا انتخابی نشان جھاڑو اٹھائے چلتے تھے۔'
لوگوں کا مشاہدہ تھا کہ کانگرس اپنے متعدد حکومتی ادوار میں اور بی جے

پی اپنے چھ سال پر محیط دور حکومت میں عوام الناس کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنے اور انہیں آسودگی فراہم کرنے سے قاصر رہی ہے۔ کیجروال کا انا ہزارے سے ان کا اختلاف اس بات پر ہوا کہ ''معاشرتی اصلاح کے خصوصی مقاصد کیلئے کیا سیاست میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں؟'' کجری وال کے نزدیک کسی بڑے مقصد کے حصول کیلئے عوامی بیداری ضروری ہے، لیکن کامیابی کیلئے اختیار اور اقدار تک رسائی بھی ضروری ہے۔ آزادی کے ساٹھ سے زیادہ سال گزر جانے کے بعد سماجی حالات میں تغیر و تبدل پیدا ہو رہا ہے۔۔ الیکٹرانک میڈیا کے فروغ نے عوام کے سیاسی اور سماجی شعور کو باندازدگر بیدار کر دیا تھا۔ کرپشن کے خلاف انا ہزارے کی ملک گیر تحریک انکے سامنے ایک مثال کے طور پر موجود تھی۔ چنانچہ اروند کجری وال نے ''عام آدمی پارٹی'' بنائی تو سب سے پہلے بااختیار حلقوں تک اپنی آواز پہنچانے کیلئے عوامی احتجاج کا طریق ہی اختیار کیا۔ انہوں نے دہلی میں بجلی اور پانی کی قیمتوں میں اضافے کی خلاف مہم چلائی تو عوام نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ انہی دنوں عورتوں پر تشدد کے متعدد واقعات کے علاوہ جبری زیادتیوں کی وارداتیں بھی میڈیا میں ''ہائی الرٹ'' کی گئیں، کجری وال پرامن معاشرے کیلئے انسانیت سوز جرائم کے خلاف سخت قوانین بنائے جانے کا تقاضا بھی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ''عام آدمی پارٹی'' کو سیاسی رنگ دے دیا اور مارچ 2013 میں اسے الیکشن کمیشن آف انڈیا میں ایک

سیاسی پارٹی کی حیثیت میں رجسٹر کروالیا اور اسکے ساتھ ہی اس برس کے ریاستی انتخابات میں حصہ لینے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ اس پارٹی کو الیکشن کمیشن آف انڈیا نے ''جھاڑو'' کا انتخابی نشان دیا۔ ''جھاڑو'' صفائی کا بنیادی ''ہتھیار'' ہے اور یہ نچلے پست طبقے کا علامتی نمائندہ بھی ہے۔ کانگرس اور بی جے پی کے انتخابی نشانات کے برعکس ''عام آدمی پارٹی'' کے نشان (جھاڑو) نے انتخابی عمل میں زیادہ دلچسپی پیدا کی۔ چنانچہ اس نشان کا تذکرہ زبان زد خاص عام ہونے لگا تو اسے تضحیک کی نظر سے بھی دیکھا گیا۔ عوامی مسائل کی احتجاجی تحریکوں سے کجری وال نے جو تجربہ حاصل کیا تھا، اسے اپنی پارٹی کا منشور بنانے اور انتخابی عمل کیلئے امیدوار چننے میں ہوش مندی سے استعمال کیا اور ایسے امیدوار منتخب کئے جن کی دیانت پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا تھا اور جن کی قناعت پسندی سے حلقے کے لوگ شناسا تھے۔ انکے مخالفین نے منفی حربے استعمال کر کے کجری وال کے کارکنوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی اور ایسے ویڈیو جاری کئے گئے جن میں انتخاب میں حصہ لینے والے امیدوار سرمایہ داروں سے عطیات وصول کرتے نظر آتے تھے۔ اس قسم کا الزام جب اے، اے، پی کی ایک امیدوار شازیہ علی پر لگا تو انہوں نے انتخاب سے دستبردار ہو جانے کی پیشکش کر دی لیکن انہیں ٹکٹ دے دیا گیا۔ کیونکہ ان کے خلاف جو ویڈیو جاری کیا گئی تھی وہ جعلی تھی۔ ''عام آدمی پارٹی'' نے دہلی اسمبلی کی 28 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ بی جے پی نے سب سے زیادہ نشستیں

جیتیں اور کانگرس اسی طرح زمیں بوس ہو گئی جس طرح پاکستان کے عام انتخابات میں پی پی پی پنجاب میں عبرتناک شکست سے دوچار ہوئی تھی۔ ''عام آدمی پارٹی'' کی کامیابی میں مستقبل روشن اشارے موجود ہیں اور یہ بھی کہا جارہا ہے کہ کجری وال اس پارٹی کو آل انڈیا سطح پر پھیلائیں گے اور 2014 کے انتخابات میں مختلف مقامات سے اپنے امیدوار کھڑے کرکے انہیں خاص تعداد میں کامیاب بھی کرائیں گے اور اس طرح لوک سبھا میں ایک نئی جماعت اپنی فعال حیثیت میں شامل ہو جائیگی۔ انھوں نے دہلی حکومت سنبھالی تو وعدے کے مطابق فوری طور پر پانی فری اور بجلی کا بل نصف کر دیا۔ عام آدمی پارٹی'' کی یہ ابتدائی کامیابی ظاہر کرتی ہے کہ جب بڑی سیاسی پارٹیاں عوام'' کے بہبود کو پس پشت ڈال کر اپنی ذات اور خاندان کو مضبوط کرنے لگیں اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا جائے تو پھر عوام اپنے حقوق کیلئے متحرک ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے اس قسم کا تغیر 1970 کے عام انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے پیدا کیا تھا۔ دوسری مثال عمران خان کی ہے جس کے پرہجوم جلسوں نے پاکستانی سیاست کی کایا پلٹ دی لیکن دونوں صورتوں میں ان کے لیڈروں کو کامیابی ملی ہیں۔ ''عام آدمی پارٹی'' کی جیت پاکستانی سیاست دانوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے انتخابی وعدوں کو عملی جامہ پہنانے میں مزید تاخیر نہ کریں اور بہبودی عوام کے کاموں کو فوری طور پر زیر عمل لائیں۔ ان دونوں پارٹیوں یعنی پاکستان میں 'تحریک انصاف' اور ہندوستان میں عام آدمی'

پارٹی' کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ حکومت اور سیاست میں بڑے پیمانے پر بدعنوانی کا وجود ہے۔ بدعنوان سیاست دان الیکشن جیت کر حکومتیں بناتے ہیں جو ان کو تحفظ فراہم کرتی ہیں اور بدعنوانی کو بڑھانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ ان دونوں پارٹیوں نے آگے کی جانب سفر کیلئے اس "گندگی کی صفائی" کی ہی نشاندہی کی۔۔۔یہی راستہ درمیانی طبقہ کی زندگیوں کو آسان بنا سکتا ہے اور نچلے، پچھڑے طبقے کو فائدہ، یہ ایک نکتہ ہے۔ لیکن پاکستان میں ان عناصر کو جزوی کامیابی ہوئی ہے۔ عوام پارٹی کو انتخاب میں جتاتے ہیں لیکن ان کے حکمرانی کے طریقے، معاشی پالیسیوں اور دیگر چیزوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا اس لئے انتخابات سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ شائد اسی وجہ سے ہمارے عوام "سیاست" سے بیزار ہوگئے ہیں۔ سیاسی وعدے کے ساتھ عوام نیا سیاسی کلچر چاہتے ہیں۔ پاکستان میں سیاست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور عوام ان سیاسی جماعتوں سے مایوس نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف بھارت میں عام آدمی پارٹی نے اپنے پہلے ہی انتخابی عمل میں بڑی کامیابی حاصل کرکے ہر ایک کو حیرت میں ڈال دیا اور انتخابات سے پہلے، جو اپریل اور مئی میں ہونے والے ہیں، دوسری مستحکم سیاسی جماعتوں کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام کردی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اے اے پی کو کامیابی وقت سے بہت پہلے مل گئی ہے جس کی وجہ سے اس پارٹی کی نشونما پر اثر پڑ سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں ووٹرز پاکستان کے مقابلے میں 'تبدیلی' سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں؟ اور

وہاں کے عوام دو ٹوک فیصلہ دیتے ہیں۔ شائد اس کی وجہ ہمارے اور ان کے انتخابی عمل کی شفافیت ہے۔ پاکستان کے سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کے لئے یہ ایک نوشتہ دیوار ہے۔ جو صحیح معنوں میں سیاسی تبدیلیاں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ کیا ہمارے سیاست دان حقیقت پسند ہیں۔ کیا وہ وہی کرتنے ہیں جس کا وہ عوام سے وعدہ کرتے ہیں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ہامرے عوام اور سیاست دان بہت جلد اپنے وعدوں کو بھول جاتے ہیں۔ عام آدمی پارٹی کا ہوم ورک بہت اچھا ہے۔ انھوں نے چیزوں کی باقاعدہ دستاویز بندی کی ہے۔ ان کا دہلی الیکشن منشور دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی این جی او کا تیار کیا ہوا باقاعدہ منصوبہ۔ قابل تصدیق حوالے اور تصدیق کرنے کے ذرائع کے ساتھ مکمل، مختصر، واضح اور بالکل قابل عمل۔مثال کے طور پانی، ایک ایجنڈا آئیٹم، انہوں نے ایک دن میں 700 لٹر تک استعمال کرنے والے گھرانوں کو مفت پانی دینے کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی دہلی واٹر بورڈ کے کام کرنے میں شفافیت، اور مستقبل میں بارش کے پانی کو پورے شہر میں قابل استعمال بنانے کا منصوبہ بھی پیش کیا۔ پھر بدعنوانی پر قابو پانے کیلئے ایک نیا قانون جو تمام سرکاری افسروں پر لاگو ہوگا؛ محدود مدت میں تحقیقات اور بدعنوانی کے مقدموں کا فوری فیصلہ؛ وزیروں، ایم ایل اے اور سیکریٹریوں کے خلاف فیصلے چھ مہینے سے ایک سال کے اندر ایسا انقلابی اقدام ہے۔ جو واقعی لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ بھارت میں اس تبدیلی پر میڈیا نے بھی تبصرے کئے ہیں اروِند کیجری وال کے

وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے پر 'وال سٹریٹ جرنل' کہتا ہے کہ اُن کی حیرت انگیز انتخابی کار کردگی نے ملک کے روائتی سیاسی طبقے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اروند کیجری وال کی عام آدمی پارٹی، جو صرف ایک سال قبل وجود میں آئی تھی، بدعنوانی کے خلاف اُس ملک گیر تحریک کا نتیجہ ہے، جس میں متوسط طبقے کے دسیوں ہزاروں لوگ سرکاری اداروں میں رشوت کی علّت کے خلاف احتجاج کرنے کیلئے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ رام لیلیٰ گراؤنڈ میں ایک عظیم مجمعے سے خطاب کرتے ہوئے کیجری وال نے کہا، 'دو سال قبل کسی کے وہم و گُمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ملک میں اس قسم کا انقلاب آئے گا۔'

اخبار کہتا ہے کہ ہندستان کے دارالحکومت میں مسٹر کیجری وال کا برسر اقتدار آنا اُس وسیع تر تحریک کی طرف ایک اشارہ ہے جو دُنیا کے اس سب سے بڑے جمہوری ملک کے اندر اگلے سال کے عام انتخابات میں لوگوں، پارٹیوں اور پالیسیوں کو ہلا کر رکھ دے گی۔ مسٹر کیجری وال نے کانگریس پارٹی کی حمایت سے اقتدار سنبھالا ہے، اُنہوں نے وزیر اعلیٰ کے لئے مخصوص شاندار کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے اور اپنے لئے سیکیورٹی گارڈز رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور اُن سرکاری گاڑیوں میں سفر کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے، جو صاحب اقتدار طبقے کا طرّہ امتیاز بن چکا ہے۔ اُنہوں نے عام آدمیوں کے ساتھ میٹرو ٹرین سے سفر کرنے کو ترجیح دی۔ ان کے ساتھ جن چھ وزیروں نے حلف اُٹھایا ہے وہ سابق انجنئیر، وکیل اور صحافی ہیں، جو پہلے کبھی وزیر نہیں تھے۔ سویٹر اور گاندھی ٹوپی میں ملبوس کیجری

وال نے اپنی پہلی تقریر میں زور دے کر کہا کہ رشوت ستانی کسی صورت.برداشت نہیں کی جائے گی۔ اگر حکومت کا کوئی فرد آپ سے رشوت مانگے۔ تو انکار مت کریں اور ہم آپ کو جو نمبر دیں گے اُس پر آپ ہمیں فون کریں، تاکہ ہم رشوت خور کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکیں۔اخبار کہتا ہے کہ اگلے سال مئی کے اواخر میں جو عام انتخابات ہونگے، اُن میں عام آدمی پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی کے خاصے ووٹ کاٹ سکے گی۔ اس وقت رائے عامہ کے جائزوں کے مطابق، جنتا پارٹی، حکمراں کانگریس پارٹی سے آگے نکل چکی ہے اور اُس نے شہروں میں رہنے والے متوسط طبقے پر بہت زیادہ تکیہ کر رکھا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کی سیاست میں عام آدمی کب داخل ہوگا؟

سندھ فیسٹیول سندھی ثقافت، اور تہذیب کا اظہار

سندھی ثقافت، سندھی بولی اور سندھی تہذیب کے لئے سندھی دانشور، ادیب، اور پڑھے لکھے افراد پریشان ہیں، مجھے اس پریشانی اور درد کا احساس ممتاز صحافی اور لکھک اعجاز نصیر کی کتاب سفر کہانیوں کی تقریب میں جاکر ہوا۔ سندھی ادیب دانشور بھی اسی طرح پریشان ہیں جیسے اردو والے سب کو اپنی تہذیب، زبان اور ثقافت کے ختم ہونے کا غم ہے۔ نصیر اعجاز کا شکوہ تھا کہ ہمارے بچے سندھی زبان جو ہزاروں سال قدیم ہے سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں۔اسکولوں میں سندھی زبان کے لئے رکھے گئے اساتذہ خود سندھی سے ناآشنا ہیں۔ رہی سہی کسر موبائیل پر میسیج نے پوری کردی، سندھی ہو یا اردو والے سب اپنی زبان رومن خط میں تحریر کر رہے ہیں۔ شائد یہی احساس ہو جس میں حکومت سندھ نے اپنی ثقافت اور تہذیب کو اجاگر کرنے کے لیے سندھ کے قدیم شہر موئن جو دڑو میں 'سندھ فیسٹیول' کرنے کی ٹھانی۔ 'سندھ فیسٹیول' کی افتتاحی تقریب پر شکوہ انداز میں ہوئی جس کا آغاز آتش بازی سے ہوا جس کے بعد محفلِ موسیقی منعقد ہوئی۔اس تقریب کا افتتاح پاکستان پیپلز پارٹی کے سرپرست بلاول بھٹو زرداری نے کیا۔ افتتاحی تقریب کے دوران گفتگو میں بلاول کا کہنا تھا کہ فیسٹیول کا مقصد سندھ کی ثقافت کو اجاگر کرنا ہے۔فیسٹیول کے آغاز پر سندھ

کے روایتی ملبوسات پہنے ماڈلز نے کیٹ واک کی۔ پاکستان کی مشہور پاپ گلوکارہ عینی کے علاوہ کئی لوک فنکاروں نے سندھی ثقافتی نغمے پیش کیے۔ جس کے بعد بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکار راحت فتح علی خان نے اپنی آواز کا جادو جگایا جبکہ نوجوانوں میں مشہور گلوکار علی گل پیر نے اپنا گانا 'سائیں تو سائیں' پیش کیا۔ تقریب میں سابق وزیراعظم راجہ پرویز اشرف اور وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ سمیت 500 مہمانوں مدعو تھے جن میں پیپلز پارٹی کے مرکزی و صوبائی رہنما، لیڈر، سفارت کار علاوہ شوبز اور مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔ 'سندھ فیسٹیول' کی افتتاحی تقریب کے موقع پر صوبائی وزیر اطلاعات شرجیل میمن نے اس فیسٹیول کی غرض و غائیت بتاتے ہوئے کہا کہ فیسٹول کے ذریعے نوجوان نسل صوبے کے تاریخی مقامات اور قدیم ثقافت سے آگاہ کرنا ہے۔ اس پندرہ روزہ 'سندھ فیسٹیول' کا آغاز سندھ کے تاریخی ورثے کی حیثیت رکھنے والے شہر موئن جو دڑو سے ہوا ہے۔ فیسٹیول یکم فروری سے 15 فروری تک سندھ کے مختلف شہروں میں جاری رہے گا۔ سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی میں بھی سندھ فیسٹیول کی تقریبات شروع ہو گئی ہیں۔ موہن جودڑو میں ہزار سال پرانی تہذیب اب پتھروں، ٹیلوں، گلیوں، اور نشانات کی صورت میں محفوظ ہے۔ سندھ پر ہمیشہ سے صوفیانہ اور لوک موسیقی، کا اثر رہا ہے۔ سندھی لوک گیتوں اور فنکاروں نے سندھ کے محبت اور امن کے پیغام کو عام کیا ہے۔ اس پندرہ روزہ فیسٹول کا مقصد بھی نئی نسل کو سندھ کی روایات اور ثقافت سے روشناس

کراتا ہے۔ اس لئے فیسٹول کی افتتاحی تقریب میں سندھ کی قدیم طرز زندگی کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا۔ سندھ کی قدیم اور جدید ثقافت پر مبنی عروسی لباس پہنے ماڈلز نے جلوے بکھیرے، اس دوران لوک فنکار سائیں ظہور کے گیت نے سماں باندھ دیا۔ گلوکارہ عینی نے بھی اپنے انداز میں لوک گیت گائے۔ ملک بھر میں مشہور 'سائیں نے بھی ،اپنی سائیں گیری کا جادو دکھایا۔ سندھی دھنوں پر جدید انداز میں ڈانس پیش' کیا گیا تو بھی حاضرین داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ راحت فتح علی خان نے بھی اپنی مدھر آواز سے کانوں میں رس گھولے۔ سندھی ثقافت کو اجاگر کرتی لیزر شو نے بھی تقریب کی شان بڑھائی جسے سب نے پسند کیا۔ کراچی میں ساحلی علاقے کلفٹن میں قائم 'باغِ ابن قاسم' میں 'سندھ ولیج فیسٹیول' لگایا گیا ہے جہاں سندھ کی ثقافتی اشیا فروخت کیلئے رکھی گئی۔ یہاں بھی 'سندھ ولیج فیسٹیول' کا افتتاح بلاول بھٹو زرداری نے اپنی بہنوں بختاور اور آصفہ کے ساتھ مل کر کیا۔ افتتاحی تقریب میں وزیراعلی سندھ کی مشیر شرمیلا فاروقی اور پیپلزپارٹی رہنما اویس مظفر بھی موجود تھے۔ 'سندھ ولیج فیسٹیول' میں اندرون سندھ سے آنے والے افراد نے سندھی ملبوسات، گھریلو استعمال کی اشیا، سندھی دستکاری، سندھی اجرک ٹوپی اور دیگر اشیا کے متعدد اسٹالز لگائے ہیں۔ جب کہ لوک فنکار بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرکے سندھی موسیقی سے فیسٹیول میں رونقیں بڑھا تے رہے۔ 'سندھ فیسٹیول' میں بچوں کے لیے بھی مختلف کھیل اور دیگر سرگرمیوں کا انعقاد کیا گیا تھا جبکہ کھانے پینے

کی اشیا بھی ثقافتی فیسٹیول کا حصہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سندھ کی تاریخ و تہذیب پانچ ہزار سال نہیں 50 ہزار سال پرانی ہے سندھ کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم تہذیبوں میں ہوتا ہے اس لیے ثقافتی میلے سندھی تہذیب کا حصہ ہیں۔ سندھ کے شہروں قصبے اور دیہات میں تقریبا سارے سال ہی عرس، میلے ہوتے ہیں۔ سندھ کی قدیم تہذیب کے شاہکار کوٹ ڈیجی قلعہ، رنی کوٹ، کارونجھر، عمرکوٹ، مکلی، بھنبھور، موئن جو دڑو اوڑ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کراچی کے فریئر ہال میں بھی سندھ آرٹ فیسٹیول منعقد کیا جارہا ہے جس میں پاکستان کے نامی گرامی مشہور فن کاروں کے فن پارے نمائش کیلئے رکھے گئے ہیں۔فریئر ہال میں سجی آرٹ نمائش میں بینظیر بھٹو شہید کے پسندیدہ فنکاروں کی آرٹ کلیکشن بھی رکھی گئی ہے جن میں احمد پرویز، بشیر مرزا، گل جی، صادقین اور دیگر آرٹسٹوں کے فن پارے شامل ہیں۔ کیلیے مختص فنڈز کو روک کر جشن پر خرچ کی جائیگی۔ اپنا کوئی بھی مقصد حاصل نہیں کرسکیں گے کیونکہ اس جشن سے پہلے تھرکول کے افتتاحی منصوبے کے بہانے بھی جشن منایا جائیگا۔ جہاں پر تمام مجرم اور مدعی ایک ساتھ ہوں گے۔ سندھ کی ثقافت کے تحفظ کے حوالے سے سابق وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کے صاحبزادے بلاول بھٹو زرداری کی جانب سے شروع کی جانے والی مہم پر پاکستان کے متعدد ماہرین آثار قدیمہ نے شدید تنقید کی ہے۔ بلاول بھٹو زرداری چاہتے ہیں کہ کئی ہزار سال پرانے موہن جوڈارو میں ثقافتی میلے کا انعقاد کریں، تاہم ماہرین کے مطابق اس سے اس

قدیمی ثقافی ورثے کو شدید نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے۔ موہن جو ڈارو کئی ہزار برس قبل دریائے سندھ کے کنارے آباد ایک بہت بڑی تہذیب تھی، جو مٹ گئی، مگر اپنے پیچھے تاریخی نقوش چھوڑ گئی۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی جانب سے عالمی تاریخی ورثہ کہلائے جانے والے موئن جو ڈارو کو سندھ کی شاندار تاریخی پہچان کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ادھر اس فیسٹیول کے انعقاد میں مصروف صوبائی حکومت کے عہدیداروں نے اس بات کی تردید کی ہے کہ اس فیسٹیول سے موہن جو ڈارو کے آثار کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ صوبائی محکمہ برائے آثار قدیمہ کے ایک عہدیدار قاسم علی قاسم کے مطابق وہ اس سلسلے میں انتظامات کی نگرانی کر رہے ہیں اور ہر طرح سے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ میلے سے موہن جو ڈارو کو کسی طرح کا کوئی نقصان لاحق نہ ہو۔سرزمینِ سندھ ہمیشہ سے صوفیاء اور اولیا اللہ کی آماجگاہ رہی ہے۔ اس خطے میں ہمیشہ امن کی باتیں ہوئی ہیں۔ سندھ کی مہمان نوازی بھی مشہور ہے۔ سندھ کے لوگ جتنے سیدھے سادے ہیں۔ سندھ کی سادہ زندگی آج بھی مشہور ہے، جہاں ایک غریب اپنی غربت اور مفلوک الحالی کے باوجود مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔ ایک دو بکریوں یا گائے، بھینس اور زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے پورے ایک خاندان کا گزر بسر ہوتا ہے۔ اگر کسی کو پُرسکون زندگی دیکھنی ہو تو وہ سندھ کے کسی دیہات میں کچھ دن گزار کر دیکھ لے۔ فجر کی اذانوں سے قبل ایک نئی صبح کے آغاز اور سورج ڈھلتے ہی رات کی آمد کے مناظر بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ پھر رات کو گاوں کی اوطاق میں بزرگوں

کی کچہریاں بھی بے مثل ہیں جن میں بظاہر اَن پڑھ لوگ عقل و دانش کی وہ باتیں کرتے ہیں۔فرد شناسی کا فن بھی ان بزرگوں کو خوب آتا ہے۔ ایک ہی ملاقات میں کسی فرد کا پورا معائنہ کرکے اس کی شخصیت کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور اسی بنیاد پر اس سے مستقبل میں تعلقات استوار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ سندھ کے لوگ سادہ لوح ہوتے ہیں اور ان کی روایات اب بھی اسی طرح قائم ہیں جیسا کہ زمانہ قدیم میں تھیں۔ لیکن بہت سے سندھی اس بات کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ میڈیا کے ذریعے سندھی قوم کو اپنی ثقافت اور روایات سے دور کیا جارہا ہے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس مہم کا سہرا سندھی میڈیا کے سر جاتا ہے، جو دعویٰ تو سندھ اور سندھیوں کی ترقی کا کرتا ہے، لیکن حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔

سندھی میڈیا نے سندھ میں اسلحہ کلچر کو عام کیا۔ اگرچہ سندھ کی ثقافت میں کلہاڑی کو اہمیت حاصل ہے لیکن واضح رہے کہ سندھی معاشرے میں ہر کسی کے کلہاڑی اٹھانے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کلہاڑی صرف اُس فرد کے پاس ہوتی تھی جو یا تو جنگل میں جانور چراتا، چوکیداری کرتا یا کبھی کسی دشمن سے بچاؤ کے لیے اسے اٹھاتا۔ لیکن میڈیا سے نشر ہونے والے ڈراموں میں اب تو پندرہ سولہ سال کے نوجوانوں کے ہاتھ میں بھی اسلحہ دکھائی دیتا ہے جس کی ہر وقت نمائش کی جاتی ہے۔ سندھ میں اسلحہ کی نمائش اس طرح کی جارہی ہے جیسے ہمارے ہاں

موبائل فون کی ہوا کرتی ہے۔ بغیر کسی سبب کے صرف ٹی وی ڈراموں میں پیش کردہ کرداروں سے متاثر ہو کر نوجوانوں نے اسلحہ اٹھالیا ہے جس سے ان کا اور معاشرے کا مستقبل تباہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

سندھی میڈیا سے قبل سندھ میں گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن سندھی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے بعد ہر روز اخبارات میں اور ٹی وی پر کئی پریمی جوڑوں کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ہر معاشرے میں اس طرح کے ایک دو واقعات ضرور ہوتے ہوں گے، لیکن ایسے معاملات کو اچھال کر یہ تصور دینا کہ سندھ کی ہر لڑکی گھر سے باہر نکل کر شادی کرنا چاہتی ہے۔ درست نہیں ہے۔ سندھی میڈیا اپنے ڈراموں میں خاص سندھی دیہاتی پس منظر میں یہ بھی دکھا رہا ہے کہ گھر سے نکلنے والی ہر لڑکی اپنے کسی محبوب سے ملنے کے لیے ہی نکلتی ہے۔ لیکن سندھ کی حقیقی زندگی میں اس کا نام نشان بھی نہیں ہے۔ سندھی کلچر ڈے کے نام پر سندھی خواتین کو ٹوپی اجرک پہنا کر سڑکوں پر نچانے کا سہرا بھی سندھی میڈیا کے سر جاتا ہے۔ اگر سندھی ثقافت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں سندھی ٹوپی اور اجرک مرد کی شان ہے، نہ کہ عورت کی۔ عورت کو اجرک صرف اسی وقت پہنائی جاتی ہے جب اسے کسی موقع پر عزت دینا مقصود ہو۔ خواتین کا سندھی اجرک سے بنے جوڑے پہننا بھی سندھی روایات کے خلاف ہے۔ سندھ کے دانشوروں اور سندھی زبان، ثقافت اور روایات کی حفاظت

کرنے والوں کو اس کا نوٹس لینا چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اربابِ اختیار
سندھی تہذیب و ثقافت اور معاشرے کے تحفظ کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

مواشیطانی ڈبہ سرچڑھ کر بول رہا ہے

پاکستانی صحافت مشکلات کے گرداب میں ہے اور مواشیطانی ڈبہ سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ ملک میں صحافی حالیہ مذاکرات میں ایک ایسا کردار ادا کر رہے ہیں، جس کے نتیجے میں اگر تبدیلی واقع ہوئی اور مذاکرات کامیاب ہوگئے تو ہمشہ صحافت کا نام نامی بلند رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صحافت ایک پرخطر پیشہ بھی بنتا جارہا ہے۔ صحافیوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیم رپورٹرز ود آؤٹ بارڈرز نے اپنی تازہ رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان صحافیوں کے لیے بدستور ایک خطرناک ملک ہے۔ صحافیوں کے لئے کام کرنے والی بین القوامی تنظیم نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کہا کہ پاکستان میں گزشتہ سال صحافت سے وابستہ کم از کم سات افراد کو قتل کیا گیا جن میں سے چار کا تعلق ملک کے جنوب مغربی صوبہ بلوچستان سے ہے۔ رپورٹ میں بلوچستان کو صحافیوں کے لیے مہلک ترین صوبہ بھی قرار دیا گیا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستان میں شدت پسند یا مسلح گروہ صحافیوں کے لیے بڑا خطرہ ہیں۔ پاکستان میں صحافیوں کے لئے شدت پسند بلا شبہ ایک بڑا خطرہ ہیں۔ لیکن یہ شدت پسند ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مین دائیں بائیں کی قید بھی نہیں ہے۔ جس کا جس جگہ زور اور بس چلتا ہے۔ وہاں صحافی، اخبارات اورچینل سب یر غمال ہیں۔

وفاقی وزیر اطلاعات پرویز رشید اپنے حالیہ بیانات میں یہ کہہ چکے ہیں کہ صحافیوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے حکومت اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی اور اس بارے میں ضروری قانون سازی بھی کی جائے گی۔ حکام کے مطابق دہشت گردی نے جہاں معاشرے کے دیگر طبقوں کو متاثر کیا، اس کے اثرات سے صحافی بھی نا بچ سکے۔ پاکستان میں صحافیوں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں یہ کہتی آئی ہیں کہ ملک کے شورش زدہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کو ضروری تربیت فراہم کرنے کے منصوبوں پر زور دیتی آئی ہیں اور اُن کا ماننا ہے کہ ایسی تربیت کا مقصد یہ ہے خطرات سے بچتے ہوئے صحافی اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ گذشتہ بہت عرصے سے پاکستان میں اس بحث نے طول پکڑنا شروع کیا ہے کہ بظاہر سب کا احتساب کرنے والے میڈیا کا اپنا احتساب بھی ضروری ہے کہ نہیں؟ چند ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستانی میڈیا کی حالت شترِ بے مہار جیسی ہوتی جا رہی ہے جو بغیر کسی حدود و قیود کے کام کر رہا ہے۔ مگر کیا یہ دلائل درست ہیں؟ کیا واقعی پاکستان میں میڈیا بے لگام ہوتا جا رہا ہے؟ کیا پاکستانی میڈیا کو اپنی سمت درست کرنے کی ضرورت ہے؟ گذشتہ دنوں واشنگٹن ڈی سی کے تھنک ٹینک یو ایس آئی پی میں اسی موضوع پر ایک نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں پاکستان میں میڈیا کے حالات اور پاکستانی میڈیا کو درپیش چیلنجز جیسے موضوعات زیرِ بحث آئے۔ اس نشست میں یو ایس آئی پی میں ساؤتھ ایشیا پروگرام کے ڈائریکٹر معید یوسف نے بتایا کہ جنوبی ایشیائی ممالک سے متعلق

تحقیق میں پاکستان پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ یہ ادارہ پاکستان سے متعلق مختلف موضوعات پر تحقیق کرتا ہے جن پر مقالے لکھے جاتے ہیں۔ معروف صحافی پامیلا کانسٹیبل نے پاکستان میں گزرے اپنے وقت کا ذکر کیا اور کہا کہ 1998 میں جب وہ پہلی مرتبہ پاکستان گئی تھیں، تب اور اب کے پاکستان میں بہت فرق ہے۔ پامیلا کہتی ہیں کہ، 'پاکستانی میڈیا ابھی بھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے اور میڈیا کے مسائل اور نقص بہت واضح ہیں۔ دوسری طرف پاکستانی میڈیا سماج کے لیے بہت سے مثبت اقدامات بھی کر رہا ہے اور عوام کی آواز بلند کرنے میں ان کا ساتھ دے رہا ہے'۔ ہُما یوسف کہتی ہیں کہ وہ دور چلا گیا جب محض سرکاری ٹیلی وژن ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے پاس خبریں سننے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔ میڈیا کو آزادی 2002 میں ملی تھی اور تب سے اب تک پاکستان میں 90 میڈیا چینلز کام کر رہے ہیں۔ ریڈیو سٹیشنز کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت پاکستان میں 115 ایف ایم چینلز کام کر رہے ہیں۔ 70÷ عوام کو موبائل فون کی سہولت موجود ہے جبکہ 20 سے 30 ملین افراد انٹرنیٹ تک دسترس رکھتے ہیں'۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں میڈیا میں بہت سی تبدیلیاں آئیں اور اب نہ صرف پرنٹ اور الیکٹرانک جرنلزم بلکہ سوشل میڈیا بھی اپنی جڑیں خوب پکڑ رہا ہے۔ 'سوشل میڈیا سے وہ لوگ بھی اپنی آواز دنیا تک پہنچا رہے ہیں جنھیں میڈیا تک رسائی نہیں ہے۔ مگر سماجی رابطے کی ویب سائٹس کے ذریعے وہ اپنی آواز بلند کر رہے ہیں اور اپنے مسائل

کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کر رہے ہیں'۔ بہت سے لوگ پاکستان میں صحافت پر تنقید کرتے ہیں، پامیلا کانسٹیبل بھی ان مین سے ایک ہیں وہ کہتی ہیں کہ پاکستانی میڈیا کا ایک بڑا مسئلہ پروفیشنلزم کا فقدان ہے۔ پامیلا کے بقول، 'پاکستانی میڈیا میں پرنٹ اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں حقائق سے زیادہ چیخنے چلانے پر زور دیا جاتا ہے جو جتنا چیختا ہے اسے اتنی ہی ریٹنگ مل جاتی ہے۔ لوگ کچھ بھی بول دیتے ہیں اور کسی بھی انداز میں کسی پر بھی تنقید کر لیتے ہیں۔ اب ٹی وی پروگرام shouting matches بنتے جا رہے ہیں'۔ کچھ کا خیال ہے کہ پاکستانی میڈیا کی سمت درست کرنے کے لیے چند مثبت اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں میڈیا کو اپنی راہ متعین کرنی ہوگی اور اپنے آپ کو چند حدود و قیود کا پابند کرنے کے ساتھ ساتھ ورک ایتھکس کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تبھی میڈیا معاشرے میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ برصغیر میں صحافت ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ جو مغربی journalism سے مشابہت نہیں رکھتی۔ ہمارے یہاں لفظ صحافت رائج ہے جو صحیفہ سے نکلا ہے اور دین میں صحیفوں کیحیثیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے یعنی ''آفاقی پیغام''۔

قیام پاکستان کے بعد سے اکیسویں صدی تک پاکستان میں ذرائع ابلاغ کا کردار مخصوص دائرے تک ہی محدود رہا لیکن قومی کردار کی تعمیر، تہذیبی و اخلاقی اقدار کی پاسداری اور اصلاح احوال سے کبھی غفلت نہیں برتی گئی لیکن اکیسویں صدی کے آغاز پر پاکستان میں جیسے ہی نجی ٹی وی چینلوں کے آغاز کے ساتھ ہی جو '' انقلاب'' برپا ہوا اس نے ملک کو سماجی، معاشرتی، سیاسی، معاشی اور نظریاتی جڑوں کو کھوکھلا کر ڈالا ہے۔ جدید دور میں عوام کی سوچ و فکر پر گہرا اثر مرتب کرنے والا میڈیا اب پاکستان میں ایک ایسی دو دھاری تلوار ثابت ہو رہا ہے جو اپنے ہی ملک کی نظریاتی، اخلاقی و حقیقی سرحدوں کے درپے ہو گیا ہے۔

حقیقتا تو عوامی رحجانات ہی میڈیا کو اپنا رخ متعین کرنے میں مدد دیتے ہیں، لیکن وطن عزیز میں میڈیا عوامی رحجانات کو نئے نئے رخ'' عطا کر رہا ہے۔''

صرف یہ امر زیر غور لائیے کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں کی صرف 30 فیصد آبادی خواندہ ہو وہاں میڈیا کیا کیا قیامتیں ڈھا سکتا ہے۔ میڈیا ٹرن سیٹر ہے جو عام آدمی کے ملبوسات سے لے کر اس کی سوچ تک پر گہرے اثرات ڈالتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کے مثبت کردار کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے۔ میڈیا ایک جانب جہاں عوام میں مایوسی بڑھانے کا کام کیا جا رہا ہے تو دوسری جانب غیروں کی تہذیب کو اپنی تہذیب سے برتر ثابت کر کے احساس کمتری میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ پاکستانی تہذیب سے ناطہ توڑ کے ہندو تہذیب کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ بچوں ہی نہیں بڑوں کی زبان پر بھی ذرائع ابلاغ نے بہت برا اثر ڈالا ہے حتی کہ ''خ'' کو ''کھ'' اور ''پھ'' کو ''ف'' بولنا کئی بچوں کی عادت بن چکی ہے۔ اسکولوں میں پرائمری سطح پر بھی بچے ''پریم پتر'' کے ہمراہ پکڑے جا چکے ہیں۔
میرے ایک صحافی دوست نے سالگرہ کے لئے جنم دن کا استعمال کیا۔ خبروں پر گانے کے ٹکڑے لگا کر ان کی اہمیت اور شدت کو ختم کیا جا رہا ہے۔ جرائم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ گھروں سے بھاگ کر شادی کرنے کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے وہیں خواتین کی عصمت دری کے واقعات بھی بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ حتی کہ کئی واقعات میں 5، 6 سالوں کی معصوم جانیں بھی اپنی عصمت اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ معاشرے میں پھیلتا ہوا یہ جنسی انتشار کس نے پیدا کیا ہے۔ بعض حلقے اس کے لئے ذرائع ابلاغ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ کیونکہ اکثر ڈرامہ، فلم، کارٹون، پروگرام ایک لڑکے اور لڑکی کی محبت اور ان

کے تعلق کے گرد گھومتا ہے۔ علاوہ ازیں ساس اور بہو کے تعلق اتنا بھیانک کرکے پیش کیا جا رہا ہے کہ اب دونوں رشتوں کے درمیان ایک دوسرے سے حسن ظن رکھنے کا رجحان ہی کم ہوتا جا رہا ہے اور بہو گھر آنے سے قبل ہی یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا کر آتی ہے کہ اس کی ساس ظالم ہوگی۔ اس سے ہمارے معاشرے میں رائج خاندانی نظام پر براہ راست زک پڑی ہے۔ دوسری جانب ذرائع ابلاغ نے مغربی و ہندو تہذیب کو بھی فروغ دیا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے برعکس چند موضوعات پردہ، موسیقی، جہاد، برقع جیسے موضوعات نام نہاد ''مذاکروں'' اور ''ٹاک شوز'' میں پیش کیے جاتے ہیں جن کا واحد مقصد عوام کے ذہنوں کو مزید منتشر کرنا ہوتا ہے۔ ان پروگرامات کا بنیادی ہدف یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اسلام کو ''جدید روشن خیالی'' کے فلسفے سے مکمل ہم آہنگ (Compatible) ثابت کر دیا جائے۔ اخلاقی میدان میں بگاڑ پیدا کرنے اور ملک کی نظریاتی سرحدوں کے خلاف بھرپور ''دراندازی'' کے علاوہ عوام میں مایوسی پھیلانے میں بھی نجی چینلوں سے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ صحافت کے بنیادی اصولوں کے تحت خبر کو جوں کا توں پیش کرنا ہمارے ذرائع ابلاغ کی بنیادی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ لیکن جب 2 منٹ کی خبر کو طول دے کر 4 گھنٹے پر محیط کیا جائے گا اور اس پر مذاکرے و مباحثے پیش ہوں گے تو خبر تو خود بخود مبالغہ آمیز ہوگی ہی۔ خبروں میں رنگ آمیزی کا یہ رجحان ہی خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ جس سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ویلنٹائین ڈے، بسنت ہولی جیسے تہواروں کی ثقافت کو

مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس سے آج ہمارے معاشرے کا ہر فرد خصوصاً نوجوان طبقہ اپنے مذہب، قوم و ملک سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اس کی آنکھوں پر مادہ پرستی و عیش پسندی کی ایسی پٹی بندھی ہے کہ وہ تعیشات کے حصول کے لیے بگٹٹ چلا جارہا ہے۔ایک زمانہ تھا جب ٹیلی ویژن کو 'مُوا شیطانی ڈبہ' کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں ٹیلی ویژن چینلز کے نام پر صرف پی ٹی وی ہوا کرتا تھا اور ٹی وی ڈرامے انتہائی شریفانہ ہوتے تھے جنہیں خاندان بھر کے لوگ اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے تھے۔

کبھی ٹیلی ویژن کا شمار 'تعیشات' میں کیا جاتا تھا لیکن اب یہ دنیا بھر کی ضرورت ہے۔ آج جب دنیا ایک وسیع تر گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے،،اور ترقی و تمدن کی انتہاؤوں کو چھو رہی ہے،،،ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کا ہر شخص اور ادارہ بغیر کسی معین ہدف کے اندھوں کی مانند ٹامک ٹوئیاں مارنے میں مصروف ہے،،، ہم بحثیت مجموعی ہر شعبہ میں زوال اور تنزلی کا شکار ہی نہیں،،، عمومی طور پر اپنے مستقبل سے ناامید بھی ہوتے جارہے ہیں اس صورتحال میں جہاں ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورتحال سے عہدہ.برا ہونے کے لیے اپنے حصے کی کوشش کرے بلکہ بطور مجموعی بھی ہر شعبے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورتحال کے تدارک کے لیے.بحثیت مجموعی اقدامات کرے۔ سب سے اہم کردار صحافت کا ہے۔ یہی وہ واحد شعبہ ہے جو پوری سرعت سے تبدیلی کی نہ صرف

راہ ہموار کر سکتا ہے بلکہ اسے مہمیز بھی دے سکتا ہے۔ لازم ہے کہ اس شعبہ کو نہ صرف کالی بھیڑوں اور بد کردار لوگوں سے پاک کیا جائے،،، بلکہ جو سچی اور دیانتدار لوگ اس میں ہیں،،،ان کو بھی ایک مضبوط اور مربوط لڑی میں پرویا جائے اور انہیں اس ضمن میں انکی اہمیت ،افادیت اور اہلیت سے آگاہ کیا جائے اور اس مقصد کے لیے ایک جامع پلیٹ فارم بھی مہیا کیا جائے۔ صحافی اور پریس کلب سمیت ملک بھر میں کسی بھی تنظیم کے آئین اور دستور میں صحافی کی کوئی جامع تعریف ہی نہیں متعین کی گئی ہے۔ نہ ہی صحافت کی کوئی مخصوص تعریف ہے۔ بہت سے لوگ صحافت مفادات کی آبیاری کرپشن ،بدعنوانی کو چھپانے کا ہتھیار اور مال اکھٹا کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ صحافت جو، قوموں کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہے ہمارے ملک اور معاشرے کے لیے ایک مصیبت کا رخ اختیار کر چکی ہے اسکا کردار تعمیری نہیں رہا۔ٹرھتا ہوا کمرشل ازم' صحافت کے لیے ایک خطرہ بنتا جا رہا ہے۔آزادی اظہارِ رائے کی طرح نجی زندگی میں عدم مداخلت بھی عوام کا بنیادی حق ہے جس کا صحافیوں کو احترام کرنا چاہیئے۔پریس کی آزادی، فرد کی آزادی سے منسلک ہے۔ اس لئے صحافیوں کو خود بھی ضابطہ اخلاق کی پابندی کرنی چاہئے۔ پاکستانی صحافت پر پولیس، حساس اداروں، لسانی اور سیاسی تنظیموں اور مافیاز کے ساتھ ساتھ ابلاغی اداروں کا مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ بھی اثر انداز ہورہا ہے۔اسلام آباد کے صحافی سلیم شہزاد کے قتل کی تحقیقات کرنے والے عدالتی کمیشن اپنی رپورٹ میں حکومت سے ملک میں

خفیہ اداروں کے احتساب کا نظام وضع کرنے، ان کے دائرہ کار کے بارے میں قانون سازی اور ان کی نگرانی کا پارلیمانی نظام وضع کرنے کی سفارش کی تھی۔ لیکن اب تک ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ پاکستان میں آزادی صحافت کی موجودہ صورتِ حال اطمینان بخش نہیں ہے اور خطرات بدستور موجود ہیں جنہوں نے اپنی شکل تبدیل کر لی

ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آزادی صحافت کے لیے سب سے بڑا خطرہ خود صحافی بن چکا ہے جو خبر اور تبصرے کا فرق ملحوظ نہیں رکھتا۔ ان کے بقول موجودہ صحافت میں شفافیت کا فقدان ہے اور پیشہ ورانہ اہلیت اور معروضیت سے روگردانی کی جارہی ہے۔ پاکستان پریس کونسل' کی تشکیلِ نو کے بارے میں یہ تجویز ہے کہ کونسل میں حکومت' کے نامزد اراکین کے بجائے آزاد اور غیر جانب دار افراد کی شمولیت یقینی بنائی جائے۔ صحافیوں کو اپنا محتسب خود ہی بننا ہوگا اور عالمی طور پر تسلیم شدہ صحافتی معیارات از خود نافذ کرنے ہوں گے۔ آئین کی دفعہ 19 اے کے تحت ہر فرد کو معلومات تک رسائی کا حق حاصل ہے جس پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ معاشرے میں اپنے حقوق کے لیے عوامی سطح پر بھرپور آواز اُٹھائی جانے لگی ہے اور عوام کا میڈیا پر بھرپور اعتماد ہے۔ عوام میڈیا کو اپنے مسائل کے حل کے لیے اہم ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ اینکر پرسن، کالم نگار، تجزیہ نگار، رپورٹر اور اسی طرح ایڈیٹر حضرات معاشرے میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں، ناانصافیوں اور بدعنوانیوں کی درست انداز میں نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ

مسائل کا حل اور تجاویز بھی پیش کرتے ہیں اس ضمن میں عوامی رائے کو بھی برابر اہمیت دی جانے لگی ہے اس بنا پر آج ٹی وی ڈراموں سے عوام کی توجہ ہٹ چکی ہے اور لوگ زیادہ تر ٹی وی ٹاک شوز اور کالم نگاروں کے علاوہ تجزیہ نگاروں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور مسلسل ان میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹی وی ٹاک شوز نے معاشرے میں ایک نئی تبدیلی کو جنم دیا ہے جس سے ہر شہری میں سیاسی طور پر بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اب ہر شہری بلا خوف اپنی رائے اور معاشرے کی ناانصافیوں اور بے ضابطگیوں کو منظر عام پر لانے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ حکومتی عہدوں پر فائز اعلیٰ شخصیات اور سیاستدانوں سمیت عوامی نمائندوں کی خوبیاں اور برائیاں بڑے تواتر سے عوام کے سامنے لائی جاتی ہیں جو کہ معاشرے میں بڑا مثبت اقدام ہے۔ ہمارے ہاں ہر دور حکومت میں فوجی ہوں یا سیاسی دونوں ہی میں بلکہ نگران ''سیٹ اپ'' میں بھی ایسے صحافیوں کی کھیپ موجود ہوتی ہے جو کہ اپنے صحافتی پیشے کو نظر انداز کرکے حکومتی عہدے قبول کر لیتی ہے یعنی وزیر، مشیر، سفیر حتیٰ کہ اب تو وزیر اعلیٰ تک کے عہدے بھی صحافیوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ آج بھی صحافی ملک کو بحران سے نکالنے کے لئے مذاکرات کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارا میڈیا بجائے انڈسٹری کی شکل اختیار کرنے کے اگر مملکت پاکستان کے اس ستون کا کردار ادا کرے جو کہ قوم کی اصلاح اور ملک و ملت کی ترقی میں اپنا قومی فریضہ ادا کرتا ہوا دکھائی دے۔۔۔ میڈیا گروپس قومی

اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے اور ان کو مضبوط بنانے میں فعال کردار ادا کریں۔
پاکستان اس وقت جن نازک حالات سے دو چار ہے، ان حالات میں میڈیا کو ذمہ داranہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا میڈیا اپنا قبلہ درست کرلے اور سچ کو سچ اور غلط کو غلط اور ظالم کو ظالم، آمر کو آمر اور کرپٹ کو کرپٹ ہی کہے اور کسی کی پردہ پوشی نہ کرے تو یقین کریں کہ پاکستان میں ہر میدان میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی صحافت اور صحافیوں کا ایک تابناک ماضی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ ہمیں اس راہ پر چلنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔

بگ تھری کرکٹ کے نئے بادشاہ گر

دنیا کرکٹ میں سیاست کا چلن تیز تر ہوگیا ہے، تین بڑے، بگ تھری کے روپ میں کرکٹ کے بادشاہ گر ٹھہرے ہیں۔ اب نجم سیٹھی کے آنے کے بعد پی سی بی پھر نئے پر تول رہی ہے۔ ذکا اشرف کی بطور چیئرمین برطرفی کے بعد پی سی بی نے بگ تھری معاملے پر یوٹرن لے لیا ہے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ آئی سی سی کے اگلے اجلاس میں اس منصوبے کی حمایت کردی جائیگی۔ شائد نجم سیٹھی کو پنتیس پنکچر کے صلے میں ملنے والی پی سی بی کی چیئرمنی کا یہی سب سے بڑا ٹاسک ہو۔ کرکٹ پر اس کے کیا اثرات ہوں گے، اس کا اندازہ دنیا کے مختلف ممالک میں کرپشن کی سطح کو جانچنے والے بین الاقوامی ادارے ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ سے ہوجاتا ہے، جس میں اس نے کہا ہے کہ انٹرنیشنل کرکٹ کونسل میں تین ممالک کی اجارہ داری کرکٹ میں کرپشن کے فروغ کا باعث بنیگی۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے سنگاپور میں آئی سی سی کے 'بگ تھری' کو عالمی کرکٹ کا عملی طور پر منتظم بنانے سے متعلق ہونے والی اصلاحات پر اپنے ردعمل میں کہا ہے کہ انٹرنیشنل کرکٹ کو اچھی انتظامیہ کی ضرورت ہے نہ کہ طاقت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کی۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کرکٹ کونسل سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ آئی سی سی میں اصلاحات سے متعلق وولف کمیشن پر اپنا باضابطہ ردعمل ظاہر کرے۔

آئی سی سی نے 2011 میں انگلینڈ اور

ویلز کے سابق چیف جسٹس لارڈ وولف سے آئی سی سی میں اصلاحات سے متعلق ایک رپورٹ بنوائی تھی۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کا کہنا ہے کہ آئی سی سی کی مجوزہ اصلاحات ان اصولوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتیں جو وولف کمیشن میں تجویز کیے گئے تھے۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کہا ہے کہ سنگاپور میں منظور ہونے والی تجاویز اچھی حکمرانی اور جمہوریت کے اصولوں کو نظرانداز کیا گیا ہے اور اصلاحات کی مجوزہ دستاویز میں کرکٹ کے کھیل سے بدعنوانی کے خطرے سے نمٹنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا ہے۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کہا کہ نئے منصوبے کے تحت کرکٹ کھیلنے والے کئی ممالک کو حق رائے دہی سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ کونسل انتظامی سطح پر کرکٹ میں بدعنوانی کے خطرات سے کیسے نمٹے گی۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کہا کہ آئی سی سی کی تمام طاقت کا تین بورڈوں میں ارتکاز کا بظاہر مقصد اختیارات کا ناجائز استعمال اور ذاتی فائدے معلوم ہوتی ہے۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کہا کہ ان اصلاحات سے طاقت ان چند ہاتھوں میں چلی جائے گی جو کسی کو جوابدہ نہیں ہوں گے۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے کہا کہ کرکٹ میں میچ فکسنگ اور سپاٹ فکسنگ جیسی کرپشن ابھر رہی ہے لیکن ان اصلاحات میں کرپشن سے نمٹنے کے کوئی اقدامات تجویز نہیں کیے گئے ہیں۔ دوسری جانب نو منتخب چیئرمین نجم سیٹھی آتے ہی اپنے اہداف کو پانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا پہلا ہدف جمہوری اور آئینی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے

تمام اسٹیک ہولڈرز کی مشاورت سے ایسا نیا آئین بنانا ہے جس میں پروفیشنل ازم اور کرکٹ کی بہتری ہو۔ دوسرا اہم کام آئی سی سی میں پاکستان کو تنہائی سے نکالنا ہے، بد قسمتی سے عالمی فورم پر بعض لوگوں نے پاکستان کا کیس مس ہینڈل کیا۔ ذرائع کے مطابق عوامی دباؤ کی وجہ سے جو کام سابق چیئرمین نہ کرکے اب نئی انتظامی کمیٹی کرے گی، حکومت کی جانب سے گرین سگنل ملتے ہی بگ تھری سے بغلگیر ہونے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے، توقع کی جارہی ہے کہ نجم سیٹھی اگلے آئی سی سی اجلاس میں اس کا اعلان کردیں گے۔ انتظامی کمیٹی بھارت کے ساتھ سیریز اور دیگر ایشوز پر بات چیت بھی کریگی، سنگاپور کی میٹنگ میں پاکستان کا ساتھ دینے والے واحد ملک سری لنکا کی جانب سے ہتھیار ڈالے جانے کے بعد پی سی بی کو عوامی طور پر غیر مقبول فیصلہ کرنے کا معقول جواز بھی ہاتھ آگیا ہے ۔ ادھر سری لنکا نے بھی مفادات کی خاطر بگ تھری کے معاملے پر پٹری بدلنے کی تیاری کرلی، بورڈ سیکریٹری نشانتھا رانا ٹنگا کا کہنا ہے کہ نئی تجاویز سے ہمارے تحفظات دور ہوگئے۔

آئی سی سی میں بگ تھری کیخلاف پاکستان، سری لنکا اور جنوبی افریقہ میں اتحاد بنا تھا۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ کیونکہ عین وقت پر جنوبی افریقی بورڈ پلٹی کھا گیا جبکہ اب سری لنکا نے بھی اس معاملے پر بگ تھری کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے، ایس ایل سی کے سیکریٹری نشانتھا رانا ٹنگا اب

کہتے ہیں کہ آئی سی سی کی نئی تجاویز ہماری پوزیشن کے لیے خطرہ نہیں ہیں، ان پر اعتراض کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ بطور ٹیسٹ ملک سری لنکا کو جو کچھ مل رہا ہے اس میں کمی ہو، اب جن نئی تجاویز کی منظوری دی گئی اس میں کئی چیزیں زیادہ واضح ہو گئی ہیں، پہلے پیپر میں یہ تھا کہ کرکٹ کونسل پر صرف تین بڑے ممالک کی حکمرانی ہوگی، مگر اب کہا جا رہا ہے کہ پہلی مرتبہ اہم عہدوں پر بھارت، آسٹریلیا اور انگلینڈ کے آفیشلز موجود ہوں گے اس کی وجہ نئی نشریاتی ڈیل ہے، اس کے بعد بورڈ میں شامل دیگر ممبران اپنی مرضی کا چیئرمین منتخب کر پائیں گے۔ دوسری جانب بھارتی بورڈ کے صدر این سری نواسن نے بھی سری لنکا کو اپنے موقف پر نظر ثانی کا مشورہ دیا ہے، انھوں نے کہا کہ سری لنکا کرکٹ ایک خود مختار باڈی اور اپنے فیصلے خود کرنا جانتی ہے، اسے سمجھنا چاہیے کہ کھیل کے مفاد میں کیا ہے۔ ادھر جنوبی افریقی بورڈ کے صدر کرس نینزانی نے کہا کہ بگ تھری کی حمایت کسی ڈیل کے نتیجے میں نہیں کی، انھوں نے کہا کہ ہم نے آخری وقت پر فیصلہ تبدیل نہیں کیا بلکہ یکم فروری کو ہی مجھے اپنے بورڈ نے اس فیصلے کا اختیار دے دیا تھا، ہم نے میٹنگ سے پہلے پاکستان اور سری لنکا کو بھی اپنے موقف سے آگاہ کر دیا تھا بین الاقوامی کرکٹ کونسل کی اصلاح کے لیے تین بڑوں' آسٹریلیا، انگلستان اور بھارت کی جانب سے پیش کردہ سفارشات اب' قانون کا درجہ پانے والی ہیں اور تین چوتھائی اکثریت سے منظور ہونے کے بعد صرف پاکستان اور سری لنکا ہی وہ ملک

ہیں جنھوں نے اب تک اس کی مخالفت میں نہ سہی لیکن حق میں بھی ووٹ نہیں دیا۔
دونوں ممالک نے آئی سی سی کے گزشتہ اجلاس میں ترمیم شدہ سفارشات پر غور کے لیے مزید وقت طلب کیا تھا اور پاکستان تو ایک مرتبہ پھر انتظامی بحران کا شکار ہو چکا ہے اور کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ کرکٹ کی عالمی تنظیم انٹرنیشنل کرکٹ کونسل نے ادارے کے مالی اور انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں کرتے ہوئے بھارت، انگلینڈ اور آسٹریلیا کے کھیل اور ادارے پر پہلے سے زیادہ کنٹرول کی منظوری دے دی ہے۔ بی سی سی آئی کے صدر سری نواسن نے انگلینڈ اور آسٹریلوی کرکٹ بورڈ کے ساتھ مل کر ایک ایسا مسودہ آئی سی سی میں پیش کیا تھا جس کے تحت ان تینوں ممالک کو آئی سی سی کے انتظامی اور مالی معاملات میں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ آئی سی سی کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ سنیچر کو ہونے والے اجلاس میں آئی سی سی کے دس میں سے آٹھ ارکان نے ان تجاویز کی حمایت کی۔ آئی سی سی کی جانب سے جاری کیے گئے بیان میں کہا گیا ہے کہ قرارداد کو سنگاپور میں ہونے والے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ اس قرارداد کو دس ' ممبران میں سے آٹھ کے ووٹ ملے جبکہ پاکستان اور سری لنکا نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انھیں اس ترمیم شدہ قرارداد کی جانچ پڑتال کے لیے مزید وقت درکار ہے۔' آئی سی سی کی جانب سے منظور کردہ مسودے کے مطابق آئی سی سی کے ایگزیکٹیو اختیارات اور مالی کنٹرول ای سی بی، کرکٹ آسٹریلیا اور بی سی سی آئی کے ہاتھ میں رہے گا، جو بالترتیب انگلستان ،

آسٹریلیا اور بھارت کے کرکٹ بورڈ ہیں۔اس کے علاوہ یہ تینوں کرکٹ بورڈز آئی سی سی کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے مستقل رکن ہوں گے جبکہ چوتھا رکن دیگر سات ممالک میں سے کوئی ایک نامزد ہوگا۔ عالمی کرکٹ کی آمدنی کا بڑا حصہ انھی تین کرکٹ بورڈز کو ملے گا جبکہ ٹیسٹ میچوں میں ترقی اور تنزلی کے طریق کار میں بھی یہ تینوں کرکٹ بورڈز تنزلی سے مبترا ہوں گے۔ "بی سی سی آئی کے سری نواسن جولائی سنہ 2014 سے آئی سی سی کے بورڈ کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالیں گے۔آئی سی سی کا بورڈ فیصلہ سازی کے مرکز کے طور پر کام کرنا جاری رکھے گا۔ایک نئی ایگزیکیٹو کمیٹی بنائے جائے گی جو بورڈ کو رپورٹ کرے گی۔ ابتدائی طور اس کمیٹی کے چیئرمین کرکٹ آسٹریلیا کے وولی ایڈورڈ ہوں گے جبکہ ای سی بی کے گائلز کلارک فنانس اور کمرشل افیئرز کے کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے۔ یہ دونوں افراد جولائی سنہ 2016 تک ان عہدوں پر کام کریں گے۔ "بگ تھری پلان' یعنی کرکٹ کے تین بڑے ممالک انگلینڈ، آسٹریلیا اور بھارت کی انٹرنیشنل کرکٹ کونسل پر اجارہ داری کے مسودے کی پاکستان، سری لنکا اور جنوبی افریقہ کھل کر مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن جب ووٹنگ ہوئی تو جنوبی افریقہ نے اس کے حق میں ووٹ ڈالا۔ بگ تھری' کے منصوبے کی کامیابی کے لیے انہیں پاکستان، جنوبی افریقہ اور سری لنکا میں سے کسی ایک ممبر کا ووٹ درکار تھا۔ ویسٹ انڈیز، نیوزی لینڈ، زمبابوے، اور بنگلہ دیش بگ تھری کے منصوبے کے پہلے ہی حامی ہیں۔آئی سی سی کی جانب سے منظور کردہ قرارداد کے تحت ٹیسٹ کھیلنے

والی ٹیموں کے لیے سنہ 2023 اپنے ملک میں ٹیسٹ پروگرام کو یقینی بنانے کے لیے ایک ٹیسٹ فنڈ متعارف کیا جائے گا۔ یہ فنڈ کرکٹ آسٹریلیا، بی سی سی آئی اور ای سی بی کے علاوہ تمام ٹیسٹ کھیلنے والے ممالک کے لیے ہوگا۔اس کی بھی تصدیق کی گئی ہے کہ فل ممبران آپس میں دو طرفہ معاہدے کریں تاکہ مستقبل کے دوروں کے نظام الاوقات کی تصدیق ہو سکے جس کی سنہ 2023 تو سیع کی جائے گی۔ عالمی ٹیسٹ چیمپیئن شپ کی جگہ 2017 اور 2021 میں آئی سی سی چیمپیئن ٹرافی متعارف کی جائے گی۔ یہ ایک ایسا ٹورنامنٹ ہے جس کے لیے ٹاپ ایسوسی ایٹ ممبران کے بشمول کوئی بھی آئی سی سی کا ممبر ایک روزہ کرکٹ میں اپنی کارکردگی بہتر کرکے کوالیفائی کر سکتے ہیں۔ فل ممبران کو کھیل کے فروغ کے لیے کام کرنے، خاص کر مالی معاونت، آئی سی سی کی تاریخ اور میدان میں کارکردگی کی بنیاد پر زیادہ مالیاتی فوائد ہوں گے۔ " عالمی ٹیسٹ چیمپیئن شپ کی جگہ 2017 اور 2021 میں آئی سی سی چیمپیئن ٹرافی متعارف کی جائے گی۔ یہ ایک ایسا ٹورنامنٹ ہے جس کے لیے ٹاپ ایسوسی ایٹ ممبران کے بشمول کوئی بھی آئی سی سی کا ممبر ایک روزہ کرکٹ میں اپنی کارکردگی بہتر کرکے کولیفائی کر سکتے ہیں۔" نئے ماڈل کی ساخت اس بات کو یقینی بنائے گی کہ فل ممبران مالی طور اپنے موجودہ حالت سے بہتر ہوں۔ایک نئی ایگزیکیٹو کمیٹی بنائے جائے گی جو بورڈ کو رپورٹ کرے گی۔ ابتدائی طور اس کمیٹی کے چیئرمین کرکٹ آسٹریلیا کے وولی ایڈورڈ ہوں گے جبکہ ای سی بی کے گائلز کلارک فنانس اور کمرشل افیئر

کے کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے۔ یہ دونوں افراد جولائی سنہ 2016 تک ان عہدوں پر کام کریں گے۔جب یہ عبوری مدت پوری ہو جائے گی تو آئی سی سی بورڈ کے چیئرمین کو آئی سی سی بورڈ کے ممبران میں سے چنا جائے گا جس میں فل ممبر ڈائریکٹر انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔مندرجہ بالا میں سے کئی فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اب بھی آئی سی سی کے فل کونسل کی توثیق درکار ہے۔آئی سی سی کے صدر ایلن آئزک کا کہنا ہے کہ بورڈ نے بعض اہم فیصلے کیے ہیں جس سے ہمیں مستقبل میں گورننس اور مالی معاملات کو مستحکم کرنے میں مدد ملی ہے۔معروف کرکٹ ویب سائٹ کرک انفو کے مطابق سری لنکا کرکٹ کے سیکرٹری نشانتھا رانا تنگا نے کہا ہے کہ ترمیم شدہ سفارشات بین الاقوامی کرکٹ میں سری لنکا کے لیے اب سنگین خطرہ نہیں لگتیں۔ ہمارا اعتراض یہی تھا کہ ہم ٹیسٹ کھیلنے والے ملک کی حیثیت سے جو کچھ حاصل کر چکے ہیں وہ نہ گنوا بیٹھیں۔ لیکن اب ترمیم شدہ دستاویزات پر غور کرنے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بیشتر معاملات واضح ہو چکے ہیں۔اجلاس سے ایک ہفتہ قبل سری لنکا کرکٹ کے اراکین، سابق کھلاڑیوں، منتظمین اور کپتانوں کے ایک مشترکہ اجلاس میں بالاتفاق رائے سفارشات کی مخالفت کی گئی تھی اور بورڈ کے صدر جیانتھا دھرماسینا نے آئی سی سی کے وکلاء کو ایک خط بھی لکھ بھیجا تھا جس میں سفارشات کی قانونی حیثیت پر سوال اٹھائے گئے تھے ۔ جنوبی افریقہ نے ان سفارشات کے خلاف سب سے پہلے آواز بلند کی تھی اور کہا تھا کہ یہ تجاویز بین

الاقوامی کرکٹ کی روح کو نقصان پہنچائیں گی۔ جنوبی افریقہ آئی سی سی کے گزشتہ اجلاس میں بھی پاکستان اور سری لنکا کے شانہ بشانہ کھڑا تھا لیکن چند روز قبل بھارت اور جنوبی افریقہ کے درمیان رابطوں اور آئی سی سی کے نئے انتظامی ڈھانچے میں کرکٹ ساؤتھ افریقہ کے چیف ایگزیکٹو ہارون لورگاٹ کو اہم عہدہ دینے کا ''دانہ'' ڈالا، جسے پروٹیز بورڈ نے آنکھیں بند کرکے ''چگ'' لیا۔ یوں جنوبی افریقہ کی حمایت کے بعد ''بگ تھری'' کی تجاویز کی منظوری کے لیے مطلوبہ ووٹ بھی مکمل ہوگئے اور پاکستان اور سری لنکا کے کرکٹ بورڈز منہ تکتے ہی رہ گئےاور ''انکار'' کا ووٹ تک نہ ڈال سکے۔ آئی سی سی اجلاس میں جنوبی افریقہ کا مضبوط برج بھی ''تین بڑوں'' کے سامنے گر گیا لیکن اس صورتحال میں پاکستان اور سری لنکا کے بورڈز اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ پاکستان میں بہت سے لوگ ''بگ تھری'' کی مخالفت کو ذکا اشرف کا جذباتی پن قرار دے رہے ہیں، اور ان کا کہنا ہے کہ ذکا پی سی بی کے مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ضد پر اڑے رہے اور پاکستان کرکٹ کے لیے گڑھا کھود ڈالا۔ لیکن پاکستان کے لیے اب کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے اور بھارت، انگلینڈ اور آسٹریلیا جیسے ممالک کی مخالفت کرنے کے بعد پاکستان کرکٹ بورڈ اپنی کشتیاں جلا چکا ہے، اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا جسے ہر حال میں اپنے موقف پر قائم رہنا ہے کیونکہ اپنا موقف تبدیل کرنے اور ''بگ تھری'' کی حمایت کرنے کے باوجود

پاکستان کو کچھ حاصل نہ ہوتا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی صورت میں پاکستان کے پاس کھونے کو کچھ نہیں تھا۔ذکا اشرف کو اب تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے اس لیے بالفرض اگر پی سی بی بھی ''بگ تھری'' کے مطالبات مان لیتا تو سوشل میڈیا پر ذکا اشرف کو تنقید کا نشانہ بنانے والے ''موسمی تجزیہ کار'' پی سی بی کے سربراہ پر پھر بھی تعریف کو ڈونگرے نہ برساتے بلکہ ایسا کرنے کی صورت میں بھی ذکا اشرف کو کڑی تنقید کا نشانہ ہی بنایا جاتا اور کہا جاتا کہ انہوں نے ''بگ تھری'' سے خوفزدہ ہو کر اپنا ووٹ دیا ہے یا بھارت کے ساتھ پی سی بی کی کوئی خفیہ ڈیل ہوچکی ہے۔احسان مانی کا کہنا ہے کہ بگ تھری کا اقدام آئی سی سی کے آئین کی خلاف ورزی ہے اور اسے عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا انحصار سری لنکا اور پاکستان پر ہے۔احسان مانی نے بی بی سی کو دیے گئے خصوصی انٹرویو میں کہا کہ آئی سی سی میں تین ملکوں نے اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے جو بھی فیصلے کیے ہیں وہ صریحاً آئی سی سی کے آئین کے خلاف ہیں۔

انھوں نے کہا کہ ان فیصلوں کو عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی اس معاملے کو آگے بڑھائے۔احسان مانی نے کہا کہ انھیں نہیں معلوم کہ پاکستان اور سری لنکا میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ اس معاملے کو عدالت میں لے جائیں۔احسان مانی نے اس بات سے اتفاق کیا کہ

انٹر نیشنل اولمپک کمیٹی اور فیفا میں اراکین کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پر کشش پیشکشوں کے معاملات پر گرفت ہوئی ہے لیکن آئی سی سی میں ایسا نہیں ہے۔ "آئی سی سی کے اجلاس سے قبل سری لنکا اور جنوبی افریقی کرکٹ بورڈز نے ان سے رابطہ کیا تھا جنھیں انہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تینوں ممالک اس اجلاس کو ایک ہفتہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں تاکہ دباؤ دوسرے ممالک کی جانب منتقل ہوسکے اور اس دوران تینوں ممالک قانونی طور پر پابند ہو کر مفاہمت کی یادداشت پر متفق ہوں اور اپنا ایک ترجمان بنائیں جو بگ تھری سے بات کرسکے" احسان مانی نے ان اطلاعات پر بھی سخت حیرانی ظاہر کی کہ سری نواسن آئی سی سی کی صدارت سنبھالنے کے بعد بھی بی سی سی آئی کے صدر کا عہدہ نہیں چھوڑیں گے۔ احسان مانی نے سوال کیا کہ کیا یہ مفادات کا ٹکراؤ نہیں؟ کیا سری نواسن ہی مستقبل میں میچز اور پیسے کی تقسیم کو کنٹرول کرینگے اور جس نے ان کا ساتھ دیا ان پر ہی نظر کرم رہے گی۔ انہوں نے کہا کہ 'اگر یہ تینوں ممالک اکٹھے رہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن جنوبی افریقہ نے کرکٹ کا نہیں اپنے فائدے کا سوچا۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے "بگ تھری" تجاویز کا ساتھ نہ دینا پی سی بی کی بے وقوفی ہے کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں پی سی بی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا جبکہ جنوبی افریقہ نے آخری وقت میں پینترا بدلتے ہوئے کچھ فوائد حاصل

کر لیے ہیں۔آئی سی سی کے پچھلے اجلاس میں ذکا اشرف کو آئی سی سی کی صدارت کی پیشکش کی گئی تھی جبکہ بھارت اور انگلینڈ نے پاکستان سے سیریز کھیلنے کی زبانی کلامی بات کی تھی۔اس بات کا کیا ضمانت تھی کہ متنازع تجاویز قبول کرنے کی صورت میں کیا واقعی بھارت اور انگلینڈ کی ٹیمیں پاکستان کے ساتھ سیریز کھیلتیں۔پانچ سال سے پاکستان میں انٹر نیشنل کرکٹ نہیں ہو رہی لیکن دبئی میں ہونے والے آئی سی سی کے اجلاس میں پاکستان کا قیمتی ووٹ خریدنے کے لیے بھی ملک میں انٹر نیشنل کرکٹ کی بحالی کا جھانسہ تک نہ دیا گیا۔ایشین کرکٹ کونسل میں پاکستان اپنی حمایت کھو چکا ہے جہاں بنگلہ دیش جیسا ملک بھی پاکستان کو آنکھیں دکھاتا ہے اور ''بگ تھری'' کا بھارت خاموشی سے تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ایسی صورتحال میں اگر پاکستان ''بگ تھری'' کی متنازع تجاویز کی حمایت کرتا تو اس کی حالت ''شامل باجا'' کی سی ہوتی جس کا ساز ''بڑے سازندوں کی آواز میں دب کر رہ جاتا۔''بگ تھری'' تجاویز کی مخالفت'' کرکے یا کم از کم ان کے حق میں ووٹ نہ دے کر پی سی بی نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے کیونکہ ''بگ تھری'' کی یہ متنازع تجاویز دیرپا ثابت نہ ہوں گی جن میں صرف تین بڑے ممالک کا مفاد وابستہ ہے اور چند سکوں پر بہل جانے والے چھوٹے ممالک کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوگا جب عملی نفاذ کے بعد یہ تجاویز عالمی کرکٹ کے لیے زہر قاتل ثابت ہوں گی۔پاکستان کرکٹ بورڈ کم از کم جنوبی افریقہ کی طرح ''تھالی کا بینگن'' نہیں بنا بلکہ عالمی کرکٹ میں اپنی کمزور

پوزیشن کے باوجود غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ دکھایا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں ''بگ تھری'' کی مخالفت کرنے سے پاکستان عالمی سطح پر مزید تنہائی کا شکار ہو جائے گا تو ان کے لیے یہ عرض ہے کہ پاکستان پہلے ہی تنہائی کی انتہائی سطح پر ہے جہاں پانچ سال سے انٹرنیشنل کرکٹ نہیں ہوئی اور چار سال سے پاکستان ''بگ تھری'' میں شامل ممالک میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی ٹیسٹ سیریز نہیں کھیل سکا۔ اس سے زیادہ پاکستان مزید کتنی تنہائی کا شکار ہوگا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بھارت کے مقابلے میں سیاست ہو یا کھیل پاکستان ہمیشہ کمزور ہی رہا ہے۔

موجودہ صدی مذاکرات کی ناکامی کی صدی ہے

جنگ رہے اور امن بھی ہو۔ کیا ممکن ہے تم ہی کہو

جنگ رہے اور امن بھی ہو، کیا ممکن ہے تم ہی کہو۔ امن کی خواہش ازل سے انسان کی فطرت رہی ہے۔ لیکن ام ہی کے نام پر انسان جنگ کے شعلے بھڑکاتا رہا ہے۔ انسانی تاریخ، جنگ اور امن کے معاہدوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن یہ بھی شہادت تاریخ ہی دیتی ہے کہ دنیا میں امن مذاکرات اور بات چیت ہی سے ممکن ہوا ہے۔ جنگ کے بعد بھی امن کے لئے مذاکرات ہی کی میز بچھانا پڑتی ہے۔ ۵۶، اور ۷۱ کی جنگوں کے بعد بھی ہمیں بھارت کے سامنے شملہ اور اندرا گاندھی سے مزاکرات ہی کرنے پڑے تھے۔ پھر آج ہم بلوچستان اور سرحد کے متحارب گروہوں سے مذاکرات کیوں نہیں کر پاتے۔ امن، سماج کی اس کیفیت کا نام ہے جہاں تمام معاملات معمول کے ساتھ بغیر کسی پر تشدد اختلافات کے چل رہے ہوں۔ امن کا تصور کسی بھی معاشرے میں تشدد کی غیر موجودگی یا پھر صحت مند، مثبت بین الاقوامی یا بین انسانی تعلقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کیفیت میں معاشرے کے تمام افراد کو سماجی، معاشی، مساوت، اور سیاسی حقوق و تحفظ حاصل ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں، امن کا دور اختلافات یا جنگ کی صورتحال کی

غیر موجودگی سے تعبیر ہے۔ امن بارے تحقیق اس کی غیر موجودگی یا تشدد کی وجوہات کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ عمومی طور پر امن تباہ کرنے میں عدم تحفظ، سماجی بگاڑ، معاشی عدم مساوات، غیر متوازن سیاسی حالت، قوم پرستی، نسل پرستی اور مذہبی بنیاد پرستی جیسے عوامل شامل ہوتے ہیں۔ امن کی عمومی تعریف میں کئی معنی شامل ہوتے ہیں۔ ان میں مجموعی طور پر امن کو تحفظ، بہتری، آزادی، دفاع، قسمت اور فلاح کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ انفرادی طور پر امن سے مراد تشدد سے خالی ایک ایسی طرز زندگی کا تصور لیا جاتا ہے جس کی خصوصیات میں افراد کا ادب، انصاف اور عمدہ نیت مراد لی جاتی ہے۔ معاشرے میں انفرادی طور پر امن کی حالت ہر فرد پر یکساں لاگو ہوتی ہے، جبکہ مجموعی طور پر کسی بھی خطے کا پورا معاشرہ مراد لیا جاتا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں لفظ امن یا سلامتی کو خوش آمدید یا الوداعی کلمات کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔
یا پھر عربی زبان کا لفظ سلام، امن یا Aloha مثال کے طور پر ہوائی زبان کا لفظ سلامتی کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ الوداعی یا خوش آمدیدی کلمات کے کا لفظ الوداعی کلمات میں PEACE طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں ،استعمال ہوتا ہے، خاص طور پر مردہ افراد کے لیے ایک فقرہ استعمال ہوتا ہے جیسے ۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران دنیا بھر میں 85 سے زائد ممالک یاRest in Peace علاقوں میں جاری 750 اندرونی اور بین الریاستی تنازعات کی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان علاقوں میں ہونے والے

فائر بندی کے معاہدے مطلوبہ ہم آہنگی اور امن وسکون لانے میں ناکام رہے۔ ہو سکتا ہے ان ناکام معاہدوں کی تاریخ ان لوگوں کے لئے زیادہ خوش کن نہ ہو جو نوزا شریف حکومت اور طالبان نمائندوں کے درمیان جاری حالیہ مذاکرات یا بات چیت کے بعد پاکستان میں پائیدار امن دیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ایک ریسرچ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا 750 معاہدوں میں سے زیادہ تر حکومت یا اس کی افواج اور عسکریت پسند گوریلا گروپوں کے درمیان ہوئے تھے تاہم ان معاہدوں کا احترام شاذونادر ہی ہوا۔ چند ایک کیسز میں عارضی سکون یا وقفہ ملا لیکن یہ اس لحاتی وقفہ میں بھی انسانی خون کا بہنا نہ رک سکا۔ اقوام متحدہ' سویڈن کی یونیورسٹی' نیویارک کی تنظیم آئی سی آئی جے 'آئرش یونیورسٹی' ,برطانوی یونیورسٹی اور امریکا کے امن انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے گزشتہ چند دہائیوں میں تیار کردہ ان 750 معاہدوں کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراعاتیں دینے اور وعدوں کے باوجود امن کے قیام کا مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے قیام کے وقت سے اقوام متحدہ عالمی تنازعات کے حل کیلئے کوشاں ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے تحت متحارب فریقین میں بہت سے معاہدے ہوئے تاہم ان میں اکثر ناکام ہوئے اور شدید تنازع کی صورت اختیار کر گئے جبکہ کچھ معاہدوں کے بعد تعطل کی صورتحال پیدا ہوئی ، معاشی کشمکش اور جرائم کی ,ڑھے تاہم چند ایک معاہدوں کے بعد ہی پائیدار امن قائم ہوا۔ مثال کے طور پر 29 جولائی 2013 کی ,برطانوی ریڈیو کی رپورٹ میں 46

سالہ اسرائیل عرب جنگ کے بارے میں بتایا گیا۔ جون 1967 میں ہونے والی مشرق وسطی جنگ کے بعد سے بہت سے امن منصوبے اور بے شمار مذاکرات ہوئے۔ ان معاہدوں میں کچھ کامیاب ہوئے جن میں مصر اور اسرائیل اور اردن اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے معاہدے شامل ہیں لیکن اہم فریقین یعنی اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان معاہدہ ہونا ابھی باقی ہے۔ ان معاہدوں میں سے چند ایک قصر ابیض کے سرسبز صحنوں میں طے پائے تھے اور ان کے ثالث امریکی صدر تھے۔ اس حوالے سے کچھ خفیہ بات چیت ناروے، روس، سعودی عرب اور یورپی یونین کی حکومتوں کی سرپرستی میں ہوئی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ 1978 ، میڈرڈ کانفرنس کیمپ ڈیوڈ معاہدہ 2000، طابا معاہدہ 2001 عرب امن اقدام 2002 ، 1991 بیروت کی عرب سربراہ کانفرنس 2002 ، 2003 کا جنیوا معاہدہ، 2007 کا اناپولس معاہدہ اور 2010ء کی واشنگٹن کانفرنس کا مقصد امن عمل کا دوبارہ ا? غاز اور اسرائیل اور فلسطین کے درمیان تمام حل طلب تنازعات کو طے کرنا تھا لیکن ہر مرتبہ
سفارتکاری ناکام ہوئی اور ڈیڈ لاک قائم رہا۔ ان امن معاہدوں کے تفصیلی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں طویل عرصے سے جاری جنگ سے متاثرہ افغانستان کی بہتری کیلئے ثالثی کا کردار کرتا رہا ہے۔ جس کی مثال 1992 کا پشاور امن معاہدہ ہے جس کی ایران اور سعودی عرب نے بھی حمایت کی تھی۔ اس پر مختلف افغان سیاسی گروپوں نے دستخط کئے تھے۔ 1992 میں 51 رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی جس نے اس وقت کے کابل کے حکمرانوں سے دو ماہ

میں اقتدار حاصل کرنا تھا۔ ایک کونسل کا عرصہ چار ماہ مقرر کیا گیا تھا اور متعلقہ فریقین کو 2 سال کیلئے وزارتیں دی گئی تھیں۔ مذاکرات میں شامل تمام جماعتوں نے اختلافات ختم کرنے کا عہد کیا تھا۔ 1993 میں بھی اس مقصد کیلئے اسلام آباد میں ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس پر حکومت افغانستان اور دوسری سیاسی جماعتیں جن میں جماعت اسلامی ' حزب اسلامی ' حرکت انقلاب اسلامی ' نجات ملی ' محاذ ملی ' احمد زئی اتحاد ملی حرکت اسلامی اور حزب وحدت اسلامی نے دستخط کئے تھے۔ افغانستان سے متعلق اسی ' قسم کے معاہدے جلال آباد (1993) ' ماہی پار (1996) تاشقند (1999) اور بون (2001) میں بھی ہوئے لیکن یہ بھی سارے کاغذی ثابت ہوئے۔ ریسرچ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جو اپنی تاریخ میں کسی براہ راست یا بالواسطہ فائر بندی میں شامل یا شریک نہ رہا ہو۔ اندرونی خلفشار، خانہ جنگی یا دوسری قوتوں کے ساتھ تنازعات کے باعث جن ملکوں نے امن معاہدے کئے، ان میں الجیریا، تنزانیہ، البانیہ، نیشنل لبریشن آرمی / مقدونیہ، انگولا، آرمینیا، سلطنت عثمانیہ، ارجنٹینا/برطانیہ، آذربائیجان، بنگلہ دیش، بوسنیا، ہرزیگووینیا، برونڈی، کمبوڈیا، کیمرون/نائیجیریا، سنٹرل افریقن ری پبلک، چاڈ، چاڈ/لیبیا، چین/بھارت، کولمبیا، آئیوری کوسٹ، کروشیا، کانگو، مشرقی تیمور، ڈجیوٹی، کانگو/یوگنڈا، ایکواڈور/پیرو، قبرص، آسٹریا، جیکو سلواکیہ، کانگو/روانڈا، کروشیا/سربیا، ایل سلواڈور، ایتھوپیا/ارٹیریا، فجی، جارجیا/الجیزیا، گیبون، گوئٹے مالا

ہیٹی، بھارت/پاکستان، انڈونیشیا/اچے، عراق/اقوام متحدہ، اسرائیل/اردن، اسرائیل/اردن/فلسطین، ایکواڈور، پیرو، ڈجبوٹی، اریٹیریا، اسرائیل/اردن/شام/لبنان/پی ایل او، اسرائیل/لبنان، مالے/لبنراواد، ابیریا، مقدونیہ، کوسوو، میکسیکو، مراکش/مغربی صحارا، موزمبیق، جنوبی افریقہ، جنوبی افریقہ/نمیبیا، روس/چیچنیا، جاپان/چین، فلپائن، نکاراگوا، کانگو،برازیل، نیپال، نائیجیریا، رومانیہ، یوکرین، سربیا، مونٹیگرو، سری لیون، پاپوا نیو گنی، روانڈا، روس/جارجیا، روس/اسٹونیا، روس/لٹویا، روس/پولینڈ، ترکی/آرمینیا۔یونان' سالومن آئی لینڈز' کولمبیا/ پانامہ' سوڈان/ چاڈا' سوڈان' سلوونیا' صومالیہ' جرمنی/ روس' تاجکستان' روس اور اتحادی قوتوں کے درمیان 1918 کا معاہدہ جس کے بعد روس پہلی جنگ عظیم سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ 1918 میں فرانس' برطانیہ اور جرمنی کے درمیان معاہدہ جس سے پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ 1919 کے معاہدے جرمنی اور تجارتی فورسز کے درمیان جنگ ختم ہو گئی۔ 1920 میں اٹلی' سلطنت' سرب' کروشیا اور سلوویٹز کے درمیان معاہدہ ہوا۔ برطانیہ/ شمالی آئرلینڈ' یوگنڈا' یوگوسلاویہ' برطانیہ/ افغانستان' اٹلی / ایتھوپیا' اٹلی اور ویٹی کن سٹی' یوگنڈا/ روانڈا' یوگنڈا/ سوڈان' امریکا/ شمالی کوریا' امریکا جاپان' امریکا میکسیکو' ترکی' یونان' رومانیہ اور یوگوسلاویہ' جرمنی / اٹلی' رومانیہ / بلغاریہ' امریکا/ جرمنی' یمن عرب ری پبلک / عوامی جمہوریہ چین' سعودی عرب / برطانیہ اور یمن اور سعودی عرب کے معاہدے شامل ہیں۔ آج کی صورتحال میں مختلف معاہدوں پر

دستخطوں اور 3 کروڑ کولمبیائی شہریوں کے ایک غیر معمولی مظاہرے کے بعد بھی FARC نامی عسکریت پسند تنظیم ابھی تک اغوا برائے تاوان اور ڈرگ کے غیر قانونی دھندے میں ملوث ہیں۔ کولمبیا کی حکومت کیخلاف 1964 سے برسرپیکار تنظیم FARC کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ 6 لاکھ لوگوں کی موت کا ذمہ دار ہے اور 45 لوگوں کی نقل مکانی اس کے علاوہ ہے۔ کولمبیا' امریکا' کینیڈا' چلی' نیوزی لینڈ کی وینزویلا FARC اور یورپی یونین کی طرف سے دہشت گرد قرار دی جانے والی تنظیم کے سابق صدر ہوگوشاویز نے کئی فورسز پر حمایت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی سیاسی حمایت اس تنظیم کو اغوا اور دہشت گردی کے اقدامات سے دور رہنے پر مجبور کردے گی۔ 2012 میں اس تنظیم نے اعلان کیا تھا کہ وہ اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں ملوث نہیں ہوگی اور اغوا کئے گئے 10 فوجیوں اور سپاہیوں کو رہا کردے گی لیکن اس نے یرغمال بنائے گئے سیکڑوں شہریوں کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ 2012 میں اس تنظیم نے کولمبیا کے انرجی سیکٹر پر 239 حملے کئے اور یوں اس جنگ زدہ ملک میں امن کے امکانات کو ختم کردیا۔ پاکستان آج اپنی تاریخ کے اہم دور سے گذر رہا ہے، مذاکرات ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں اب مہمند ایجنسی میں ایف سی کے 23 مغوی اہلکاروں کو قتل کرنے کی خبر اور اس حوالے سے کالعدم تحریک طالبان مہمند ایجنسی کی جانب سے ویڈیو جاری ہونے کے بعد اب آپریشن بھی شروع ہوچکا ہے، بمباری ہورہی ہے، زمینی فوجیں بھی اس آپرشن میں شامل ہورہی ہیں۔ طالبان کے

ایک رہنما نے ان اہلکاروں کو قتل کرنے کی ذمہ داری قبول کی گئی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے اپنے ساتھیوں کے قتل کا انتقام لینے کیلئے ایف سی اہلکاروں کو قتل کیا ہے۔ دوسری جانب ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ مہمند ایجنسی میں طالبان کی نعشیں مختلف مقامات سے ملی ہیں۔ حکومت کو متنبہ کر رہے تھے کہ وہ ہمارے ساتھیوں کی نعشیں گرانے سے باز رہے۔ حکومت ہمارے اخلاص کو کمزوری نہ سمجھے۔ ہم اپنے ساتھیوں کا انتقام لینا جانتے ہیں۔ ہم مسلسل حکومت کو میڈیا کے توسط سے متنبہ کر رہے تھے کہ وہ اس طرح کی کارروائیوں سے باز رہے، ہمارے ساتھیوں کے قتل کا یہ سلسلہ روک دے کیونکہ قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ ہمارا بنیادی ممکنہ مطالبہ ہے۔ حکومت گویا مذاکرات سے قبل موقع کو غنیمت سمجھ کر ہمارے ساتھیوں کو مسلسل مار رہی تھی۔ حکومت پر یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ساتھیوں کا انتقام لینا جانتے ہیں۔ پہلے بھی جب مذاکرات کامیابی سے آگے بڑھ رہے تھے تو سوات میں ایک سترہ سالہ لڑکی کو سرعام "کوڑے" مارے کی ویڈیو سامنے آئی تھی۔ تمام دنیا کا میڈیا اس واقعے کو بار بار نشر کرتا رہا۔ اور دنیا بھر میں اسلام دشمن جذبات کو اس واقعے کی بنیاد پر ہوا دی جاتی رہی، ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے "کچھ" لوگ اس پر شرمناک قسم کے تبصروں میں مصروف رہے۔ اس واقعے پر جہاں "باشعور" کہلانے والوں نے اپنے "شعور' کا دل کھول کر مظاہرہ کیا ہے وہیں مذاکرات ختم ہوئے اور سوات میں آپریشن شروع ہوا۔ لاکھوں افراد بے گھر ہوئے، ہزاروں قتل ہوئے، لیکن اس واقعے کا سب

سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ وہ ویڈیو جعلی نکلی۔اس واقعے کو ایک "مذہبی جذباتی" رنگ دے کر اچھالا گیا ہے اس لئے عوام کی جانب سے اس پر "حسب توقع" ردِ عمل دیکھنے کو ملا اور جہاں جہاں بھی کسی لحاظ سے کمی نظر آئی تو اسے ہمارے سیاسی موقع پرستوں نے پورا کر دیا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ ایک طویل خوں ریزی کے بعد بالاخر سوات سمیت تمام مالاکنڈ میں فریقین ایک امن معاہدے پر راضی ہو چکے تھے جس پر امریکہ اور اسکی حواریوں نے کھلے عام تنقید کی اور اس پر برہمی کا اظہار کیا،اس امن معاہدے کے نتیجے میں تمام دنیا نے دیکھا کہ سوات سمیت تمام مالاکنڈ میں تیزی سے امن و امان کی صورتحال بہتر ہوتی چلی جارہی تھی اور وہ علاقے جو چند ہفتوں پیشتر تباہ حالی کا شکار تھے اب وہاں زندگی کی چل پہل پھر سے بیدار ہو چلی تھی، دوسری جانب امن معاہدے کا ایک اہم حصہ اسلامی قانون کا نفاذ تھا جس پر فریقین راضی تھے اور اس کا عملی سلسلہ بھی شروع ہوچکا تھا مگر صدر پاکستان کی منظوری اور دستخط کے بغیر اس کی کوئی آئینی اور قانونی حیثیت نہ تھی اور یہ معاملہ کئی روز سے ایوان صدر میں التواء کا شکار تھا اور اس التواء کی وجہ سے اس معاہدے کے ذمہ دار افراد نے ڈیڈ لائن بھی دے رکھی تھی کہ اگر مقررہ وقت تک اس معاہدے کو آئینی اور قانونی حیثیت نہ ملی تو وہ اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہو جائیں گے اور اس کے بعد امن و امان کی خرابی کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی، دوسری جانب اس التواء کی سب سے بڑی وجہ اس امن معاہدے پر امریکہ کی

رہی تھی، اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ معاہدہ پاکستان اور پاکستانی عوام کے لئے ایک طویل عرصے سے جاری خوں ریزی کا ایک بہت مناسب انجام تھا، لیکن اس کو ایک جعلی ویڈیو نے سبوتاژ کرکے رکھ دیا۔امریکہ اور اس کے ایجنٹوں نے اس معاہدے کو سبوتاژ کرنے کا منصوبہ تیار تھااور اس گھناؤنے مقصد کے حصول کے لئے جو گھٹیا اقدامات طے ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ مالاکنڈ اور سوات کے علاقوں میں شریعت کے نفاذ کے حوالے سے جو معاہدہ طے پایا ہے کسی طرح اسے ختم کیا جاسکے تاکہ امن وامان کی بحالی کا یہ سلسلہ نہ صرف رک جائے بلکہ حالات دوبارہ اسی بدترین صورت پر لوٹ جائیں جس میں امریکہ کو اپنے مفادات کے حصول میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔آج بھی حکومتی اور طالبان کی مذاکراتی کمیٹی بڑے اخلاص اور ہمت سے مذاکرات کو ڈول ڈالا تھا۔ لیکن اس بار بھی مذاکرات کے حامی ناکام اور آپریشن کے حامی کامیاب ہوگئے، نہ جانے یہ جنگ کیا رخ اختیار کرے گی۔

پاکستانی مردوں میں فیشن کا بڑھتا ہوا رجحان

پاکستان میں اب مردوں میں بھی فیشن کا رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ میں جس ہیر کٹنگ والے کے پاس جاتا ہوں، وہاں نوجوانوں کی بڑی تعداد صرف بال راشوانے کے لئے نہیں بلکہ جدید فیشن سے ہم آہنگ ہونے کے لئے آتی ہے۔ چند سال قبل سیلون میں مرد صرف حجامت کروانے یا شیو بنوانے آتے تھے لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ ان کے پاس ایک بڑی تعداد بھنویں بنوانے سے لیکر ویکسنگ اور فیشل کروانے والوں کی بھی آتی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں طالبانائزیشن کا خوف بڑھ رہا وہاں خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں میں بھی فیشن سے رغبت بڑھتی جا رہی ہے۔ اسلامی عسکریت کے بڑھتے رجحان کے ساتھ اسلامی نظریہ کے ساتھ جڑے اس ملک میں فیشن پسند مردوں کی تعداد میں ہونے والا خاموش اضافہ حیران کن ہے۔ اشتہارات کے شعبے سے متعلق سینرجی ایڈورٹائزنگ ایجینسی سے وابسطہ 30 سالہ ایسوسیئٹ کریئیٹو ڈائریکٹر حسن کیلدی باجوہ کے مطابق مردوں میں فیشن کے بڑھتے رجحان کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ بینکوں کی فراخ دلی اور ملک میں میڈیا کا بڑھتا ہوا اثر ہے۔ وہ کہتے ہیں، " اب لوگوں کی قوت خرید زیادہ ہو گئی ہے اور اس کی وجہ ہے گزشتہ 10 سے 15 برسوں کے درمیان بینکوں میں لائی جانے والی وہ اصلاحات ہیں، جن کے ذریعے اب ہر کسی کے لیے قرضہ لینا ممکن ہو گیا ہے۔ یہ پاکستان میں پہلے ممکن نہیں

تھا۔ اس کے علاوہ ملک تیزی سے ترقی کرتے ہوئی ابلاغ عامہ کی صنعت بھی اس رجحان کے پیچھے ایک بڑی حقیقت ہے۔" باجوہ مزید کہتے ہیں کہ پاکستان میں پھیلتی غربت اور تباہ کن معاشی صورتحال کے باوجود ملک کے امیر سے امیر تر ہوتے طبقے کے پاس خرچ کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ دولت موجود ہے۔ اس دولت کو اب وہ اپنے امیج کو بہتر کرنے پر خرچ کر رہے ہیں۔ پاکستانی مردوں میں فیشن کے بڑھتے رجحان کی ایک بڑی وجہ مغربی کلچر کا اثر بھی ہے۔ باجوہ کے مطابق مختلف اشتہاری مہم بھی لوگوں میں اپنا امیج بہتر بنانے میں بڑا کردار ادا کر رہی ہیں، جس کے باعث مرد خوبصورت نظر آنے کے مغربی رجحان کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ ایسا ہی کچھ کہنا ہے محمد عباس کا بھی جو پاکستان کے شہر کراچی سے تعلق رکھتے ہیں اور شہر کے پُر رونق علاقے طارق روڈ پر مردوں کے ایک سیلون کے مالک ہیں۔ وہ اس فیلڈ سے گزشتہ دس برسوں سے وابستہ ہیں اور بتاتے ہیں کہ پاکستانی مردوں میں اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھنے کا رجحان پچھلے پانچ برسوں میں زیادہ دیکھنے میں آیا۔ ان کے مطابق اس کی ایک بڑی وجہ مغربی کمپنیوں کے علاوہ مقامی میڈیا کی جانب سے بھی مردوں میں آرائش حسن کا شعور بیدار کرنے کی مہم ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب سے چند سال قبل ان کے سیلون میں مرد صرف حجامت کروانے یا شیو بنوانے آتے تھے لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ ان کے پاس ایک بڑی تعداد بھنویں بنوانے سے لیکر ویکسنگ اور فیشل کروانے والوں کی بھی آتی ہے۔

ان میں سے کئی حضرات شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت سے پہلے

اپنے آرائش حسن پر توجہ دینے میں دلچسپی دکھاتے ہیں۔ پاکستان میں ہر گزرتے دن کے ساتھ فیشن کی جانب مائل ہونے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس کا اندازہ اسلام آباد میں ہونے والے فیشن ویک میں بڑی تعداد میں لوگوں کی شرکت سے لگایا جا سکتا ہے۔ مردوں کے فیشن کا ایک عالمی رجحان بھی ہے۔ اس کا اندازہ لندن میں ہونے والے فیشن شو میں مردانہ کلیکشن سے ہوتا ہے۔ فیشن شو میں نت نئے منفرد انداز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس شو کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اب فیشن کی دنیا میں مرد حضرات بھی کود پڑے ہیں، لندن کی سخت سردی میں بارش کے باوجود نوجوانوں کی بڑی تعداد فیشن شو دیکھنے پہنچی تھی اور تین دن تک جاری رہنے والے فیشن ویک میں اول جلول فیشن بھی دیکھنے کو ملے۔ کلر فل پرنٹس پر دلچسپ ڈیزائننگ نے نوجوانوں کو متوجہ کیا تو کہیں ہلکے رنگوں پر منفرد انداز نے داد پائی، فیشن شو میں بارشوں کے موسم اور سردی سے نمٹنے کے لئے بھی خوبصورت ملبوسات دکھائے گئے۔ لندن میں فیشن ویک کے اختتام پر ڈریکولا بھی ریمپ پر آئے، ماڈلز کے انوکھے انداز بھی سب کو بھائے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ خواتین کی جگہ مردوں نے لے لی ہے۔ کچھ عرصے پہلے کراچی فیشن ویک میں مردانہ ملبوسات نے دھوم مچادی تھی۔ کراچی فیشن ویک میں کراچی فیشن ویک میک میں خواتین موڈلز کی بجائے مرد موڈلز کو ریمپ پر جلوے دکھانے کا موقع دیا گیا۔ گہما گہمی والے اس رنگارنگ فیشن ایونٹ میں لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور سب نے اس انعقاد کو خوب سراہا۔ کراچی فیشن ویک دو دن

تک اپنی رونقیں بکھیرتا رہا۔

سجنا سنورنا' ہر عورت اپنا حق سمجھتی ہے اور سنورنے کا کوئی طے شدہ فارمولا بھی نہیں کہ کیسا لباس پہن کر' تیار ہو کر خاتون کو تسلی ہو گی۔ خاص مواقعوں اور تہواروں پر سجنے اور سنوارنے کے لیے خواتین ہلکان رہتی ہیں۔ عیدالاضحیٰ کے بعد یوں بھی ہمارے یہاں شادیوں کا موسم ہوتا ہے، ایسے میں تیاری اور خرچا دونوں ہی دل کھول کر کیے جاتے ہیں۔ لیکن مرد بھی کیوں کسی سے پیچھے رہیں۔ فیشن چینلز کی بھرمار اور فیشن شوز نے ہر کسی کو فیشن کے نت نئے اور منفرد تقاضوں سے متعارف بھی کروایا ہے۔ اکثر سوال اٹھتا ہے کہ کیسے فیشن میں خود کو اسٹائلش بنایا جاسکتا ہے؟ ایک بات تو واضح ہے کہ فیشن اور اسٹائل دو الگ چیزیں ہیں اسٹائل کا تعلق آپ کی شخصیت سے ہے جسے آپ فیشن سے سدھار یا بگاڑ سکتی ہیں۔ لباس کے حوالے سے ڈیزائنرز کے تیار کردہ ملبوسات ہمارے یہاں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ پسندیدگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ڈیزائنر شخصیت کو مد نظر رکھ کر لباس بناتے ہیں جس سے آپ کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے فیشن کے معاملے میں خواتین کی یاد داشت بڑی تیز ہوتی ہے اس لئے وہ نئے سے نئے ڈیزائن کی تلاش مین رہتی ہیں۔ فیشن میں اچھا پہننے کا مطلب مہنگا پہننا ہرگز نہیں ہے۔ اچھے سے مراد ایسا لباس، ایسا فیشن ہے جو آپ کو سنوار دے اور خوب صورتی میں اضافہ کردے۔ حال ہی میں لاہور

میں منعقدہ فیشن شو میں پاکستان کے معروف ڈیزائنرز نے اپنے نئے ڈیزائنز پیش کیے، لندن میں اب جو فیشن شو ہو رہے ہیں ان میں مرد فیشن کے مظاہر بھی دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ فیشن شو میں مرد ماڈلز بناؤ سنگھار اور نت نئے ملبوسات کے ساتھ ریمپ پر واک کرکے اپنی دھاک بٹھا رہے ہیں۔ اس فیشن شو میں مشہور برطانوی ڈیزائنر رچرڈ جیمزکے دیدہ زیب ملبوسات کو نمائش کیلئے پیش کیا گیا، رچرڈ جیمز مردانہ ملبوسات کی منفرد اور خوبصورت ڈیزائننگ کیلئے دنیا بھر مقبول ہیں۔ ماڈلز حضرات نے موسم سرما کے ڈیزائن کردہ ملبوسات کو پہن کر ریمپ پر واک کی۔ مردوں کے فیشن شوکے زیادہ تر شائقین بھی مرد حضرات تھے جنھوں نے ملبوسات کو بے حد پسند کیا۔آج کے فیشن کو آپ محض 50 سال پیچھے لے جائیں تو وہ لوگ اسے غیر انسانی کہیں گے۔۔ اور ممکن ہے کہ آنے والے 50 سالوں کے بعد یہی فیشن ہوں اور نئے فیشنوں کو غیر انسانی کہا جائے ۔ کسی بھی چیز کو جگہ بنانے میں وقت لگتا ہے۔۔ اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید کم ہونے لگتی ہے بالاآخر وہ معاشرے کا حصہ بن جاتا ہے۔ مردوں کے بالوں کے انداز بھی خوب ہیں۔ اب یہی "ٹریکٹر والے اسٹائل (Crown Style) اور اسی سے ملتے جلتے اسٹائل پہلے عجیب لگتے تھے مگر اب انھوں نے خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔اسی کی دھائی میں آپ پینٹ کوٹ پہن کر کسی گاوں یا محلے کا رخ کر لیتے تو کتے جان ہی نہ چھوڑتے تھے اب معاملہ یکسر مختلف ہے۔ کتے بھی نئے لباسوں سے آشنا ہو گئے ہیں۔

عالمی سطح پر فیشن اور ملبوسات اب ایک بہت بڑی صنعت ہیں۔ اب تک اس میدان میں، خاص کر مردانہ فیشن میں، مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ملکوں کا بہت زیادہ حصہ نہیں تھا لیکن اب آہستہ آہستہ یہ صورتحال تبدیل ہو رہی ہے۔ متحدہ عرب امارات میں دبئ فیشن انڈسٹری کے ایک بڑے مرکز کے طور پر سامنے آ رہا ہے۔ نوجوان اپنی مردانہ شخصیت کو مد نظر رکھیں زمانے کے ساتھ ساتھ ہر معاشرے میں رہن سہن کے ڈھنگ اور لباس کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ لباس کے انداز عموماً علاقے کی ثقافت کے زیرِاثر ہوتے ہیں لیکن انٹرنیٹ اور میڈیا کے دور میں جب دنیا گلوبل ولیج بن گئ ہے، دور دراز کے ثقافتی اثرات بھی ہمارے پہناوں پر اثر ڈال رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ روایتی انداز میں تیزی سے تبدیلی جاری ہے۔ ہمارے نوجوان ثقافتی روایات سے انحراف کرتے ہوئے لڑکیاں، مردانہ لباس اور لڑکے زنانہ فیشن کے انداز اپنا رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ذرائع ابلاغ ہیں کیوں کہ ذرائع ابلاغ سے ہی ہمارا نوجوان تیزی سے دوسروں کی تہذیب وثقافت سے واقف ہو رہا ہے لیکن افسوس ناک بات صرف یہ ہے کہ نوجوان ہر شے کو اپنا تو رہے ہیں مگر اس بات سے ناواقف نظر آتے ہیں کہ ان اشیا کا استعمال ان کی شخصیت پر کیسا اثر ڈالے گا۔ اس وقت نوجوان لڑکے جدید فیشن کے تحت ہینڈ بینڈ، مختلف قسم کے بریسلٹ، رِنگز، گلے میں چین وغیرہ استعمال کر رہے ہیں، جن سے اُن کی شخصیت نامناسب محسوس ہوتی ہے لیکن نوجوان اسے فیشن قرار دیتے

ہیں۔ پہلے نوجوان لڑکوں کی پسند کا مرکز گھڑی ہوا کرتی تھی لیکن موبائل کی موجودگی میں اس کی اہمیت میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ پوش علاقوں کے لڑکے.برانڈڈ اشیااور متوسط علاقے کے نوجوانوں کے ہاتھوں میں چین وغیرہ بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ زمانے کے ساتھ چلنا.برائی نہیں ہے لیکن نوجوانوں کو اپنی مردانہ شخصیت کو مد نظر رکھ کر فیشن کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے تاکہ فیشن اِن کی شخصیت میں نکھار کا سبب بنے۔ سائنس کی ایجادات اور وقت کی رفتار کے ساتھ جدّت نے ہماری زندگی کے بہت سے اصول و قوانین تبدیل کرڈالے ہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ چیزیں آج بھی ماضی کی طرح قایم اور مسلّم ہیں۔ تمام ترقی کے باوجود آج بھی انسان سکون کا اسی طرح متلاشی ہے،جس طرح ماضی میں نظر آتا تھا۔اور تمام تر ترقی کے باوجود عورت آج بھی اپنی خوبصورتی میں چار چاند لگانے کے لئے چیزوں کی متلاشی نظر آ تی ہے۔

ایک معقولہ سُنا اور پڑھا بھی ہوگا۔آپ ساری دُنیا کا چکر لگا کر آ جائیں ،خوبصورتی اگر آپ میں نہیں ،تو آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔۔یعنی خوبصورتی کا تعلق انسان کے اندر موجود تمنّا، خواہش سے منسلک ہوتا ہے۔یہ رنگ ، روپ ، بال انداز، لباس یہ سب تو وہ سہارے ہیں جن سے انسان اپنی خواہش کی تکمیل کے اسباب تراشتا ہے ایسے میں جب ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری اور بم دھماکے عام ہیں، نئی طرز اور نہج کو رواج دینے کی فکر اور سعی کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔

کراچی میں بھی ایسے ایونٹ ہوتے رہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں کراچی کے ایک ہوٹل میں عالمی معیار کا 'فیشن پاکستان ویک' ہوا، جس میں کئی مختلف فیشن ڈیزائنرز نے اپنے اپنے ڈیزائن کیئے ہوئے کپڑوں کی نمائش کی۔ 'فیشن پاکستان ویک' کی روح رواں، صنم چوہدری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس فیشن ویک میں کراچی اور لاہور کے تقریباً 30 ڈیزائنرز نے حصہ لیا۔ اس موقع پر دوسرے ممالک سے آیا ہوا میڈیا اور خریدار بھی موجود تھے۔

اس شو کے ڈائریکٹر اور مشہور ڈیزائنر حسن شہریار نے بتایا کہ یہ ان کا فیشن کی دنیا میں شرکت کا بیسواں سال ہے، اور ان کے خیال میں، پاکستانی فیشن انڈسٹری بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ شیری رحمان نے اس شو کے بارے میں کہا کہ آج فیشن پاکستان ویک ایک بڑا ایونٹ بن چکا ہے اور اس کو حکومتی اور نجی شعبوں کی حمایت حاصل ہے، جسے مزید فروغ دیا جانا چاہیئے۔ انھوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ اس سے پاکستان کی ثقافت، فیشن اور ملبوسات کی صنعت کو بڑھاوا ملے گا۔ مشہور فوٹوگرافر، ٹپو جویری نے کہا کہ پاکستان کی فیشن انڈسٹری، عالمی معیار کی ہے اور وہ امید کرتے ہیں کہ مغربی خریدار اس طرف متوجہ ہونگے۔ پروگرام کے منتظمین میں سے ایک، نعمان عارفین ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس طرح کے پروگراموں سے دنیا کو یہ پتا چلتا ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں، اور اگر مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ملک کا ایک برا امیج بن رہا

ہے، تو باقی لوگوں کو چاہئے کہ اس طرح کے ایونٹس کرکے دنیا کو بتائیں کہ یہاں صرف دہشت گرد نہیں بستے۔ ان فیشن شو میں گلیمر' سے بھرپور فیشن شوز میں ریمپ پر سب کی نظروں کا مرکز بننے والی موڈلز فیشن شو والے دن صبح سے ہی ریہرسل میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اسٹیج کے پیچھے اور اسٹیج پر بہت زیادہ دباؤکے عالم میں کام کرتے ہیں۔ لیکن، پاکستان کی صفہ اول کی ماڈلز میں سے ایک، نادیہ حسین کا کا کہنا تھا کہ، 'ٹیم ورک کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہوجاتی ہے'۔ نادیہ حسین کے بقول، اس طرح کے فیشن ایونٹس ملک کی عزت کا سوال ہوتے ہیں اور جب دنیا کا میڈیا موجود ہو تو کراچی کے حالات کی وجہ سے کام رک نہیں سکتا، کیوں کہ فیشن کی دنیا میں پاکستان کا ایک اچھا امیج ہے، اور فیشن انڈسٹری اس طرح کے حالات کے سامنے جھکے گی نہیں۔ ہمارے مذہب اسلام عورت کے لباس اور فیشن کے معاملے میں بھی واضح ہدایات دیتا ہے تاکہ عورت اور مرد اپنے اپنے ستر پوشی کے اسلامی نکات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خدا کی نعمتوں کو بھرپور استعمال کریں۔ فیشن اور لباس کے انتخاب میں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کس انداز وتراش خراش کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں مغربی نقالی میں یہ وبا بڑی شدّت اختار کر چکی ہے کہ زنانہ و مردانہ لباس تقریباً یکساں ہوتا جا رہا ہے۔ یہیں پر بس نہیں آج کل تنگ لباس، بغیر آستین والی قمیض، تنگ پاجامے اور بغیر دوپٹے والے لباس کا فیشن عام ہوتا جا رہا ہے جبکہ یہ تمام انداز اسلامی تہذیب سے تعلق نہیں رکھتے۔

آج کل فیشن اور عریانی میں بھی فرق نہیں رکھا جا رہا۔ بازاروں اور سڑکوں پر ننگی پنڈلیوں، کھلے بازوں کے ساتھ اپنے چہرہ اور بالوں کی نمائش عام ہے۔ اجکل ٹی وی ڈراموں اور میڈیا نے نوجوانوں اور خواتین کے دماغ میں بس خوبصورت بننے کی ڈھن سوار کر دی ہے۔ماضی میں مسلم خواتین نے باپردہ رہتے ہوئے بھی بہت اعلی امور انجام دیئے ہیں۔اور آج بھی باپردہ خواتین ڈاکٹر بھی ہیں اور پائلٹ بھی۔ اب یہ ہمارا انتخاب ہے کہ ہم اسلام کی راہ اپنا کر معاشرے میں اپنا احترام پیدا کریں۔یا پھر مغرب کی تقلید کرکے اپنے رب کی ناراضگی مول لیں۔ فیشن شو میں پہلے عورتیں ہی نمائش کا ذریعہ ہوتی تھیں لیکن اب مرد بھی حصہ لیتے ہیں۔ نامور گلوکار شہزاد رائے بھی اس راہ پر چل پڑے ہیں۔ انھوں نے کراچی فیشن ویک میں کیٹ واک کی اور حاضرین کی جانب سے زبردست داد سمیٹی ۔ نئی نسل کے مقبول گلوکار شہزاد رائے فیشن کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ انہوں نے ایکسپو سینٹر میں منعقدہ کراچی فیشن ویک کے آخری روز ریمپ پر کیٹ واک کرکے سب کو حیران کردیا، جیسے ہی وہ ریمپ پر آئے تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال کیاگیا۔ شہزاد رائے کا کہنا تھا کہ میں نے اس سے قبل بھی ایک دو فیشن شو میں کیٹ واک کی ہے۔ میری اصل شناخت گلوکاری ہے لیکن دوستوں کی محبت میں کبھی کبھی ماڈلنگ بھی کرلیتا ہوں۔ مغربی فیشن انڈسٹری پر کئی برسوں تک راج کرنے والے پاکستانی نژاد فرانسیسی فیشن ڈیزائنر محمود بھٹی کا فیشن کی دنیا میں بڑا نام ہے۔ لیکن اب انہوں نے فیشن کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے

خیر باد کہہ دیا ہے۔ انھوں نے اپنی بقیہ زندگی فلاحی کاموں کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان میں میڈیکل کالج، اسپتال سمیت دیگر فلاحی کام کرنے کے لیے جلد ہی وطن واپس لوٹیں گے۔ 70 کی دہائی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے فرانس جانے والے محمود بھٹی کو اپنے ابتدائی دور میں ایک اسٹور پر بطور ہیلپر کام کرنے کا موقع ملا جہاں بعد میں انھیں پیکنگ کی ملازمت مل گئی، اس دوران تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور پھر اسی جگہ انھیں بطور سیلزمین کام مل گیا۔ ایک طرف انھوں نے پیرس کی مقامی یونیورسٹی سے ''ایم بی اے'' کی ڈگری حاصل کی اور دوسری جانب وہ اپنی محنت، لگن اور ویژن کی بدولت ترقی کی راہ پر گامزن رہے، انھوں نے ڈیزائن کردہ ملبوسات کا برانڈ متعارف کروایا جس نے فرانس سمیت یورپی ممالک میں شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ محمود بھٹی واحد پاکستانی ہیں جنھوں نے دنیا کی سب سے بڑی فیشن انڈسٹری میں اپنے منفرد کام کی بدولت نام اور مقام حاصل کیا، انھیں فیشن کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور فرانس سمیت دیگر یورپی ممالک کے معروف ٹی وی چینلز نے ان پر خصوصی ڈاکومنٹریاں بنائیں۔ دوسری جانب محمود بھٹی نے فلاحی کاموں کا سلسلہ بھی جاری رکھا، انھوں نے لاہور میں ایک جدید اسپتال قائم کیا جہاں پر غریب لوگوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے جب کہ معروف ہدایتکارہ شمیم آرا سمیت بہت سے فنکار اس اسپتال سے علاج کروا چکے ہیں۔ اس وقت فیشن کی دنیا میں یہ رجحان بہت عام ہے کہ مغربی ملکوں کے صارفین کے لیے

بہت مہنگی اور مشہور مصنوعات تیار کرنے والے بڑے بڑے ادارے اپنے اشتہارات اور بزنس شوز میں ایشیائی چہرے استعمال کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور ان میں عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد بھی شامل ہیں۔

دھوئیں، آلودگی سے ڈھکے شہر انسانوں کے قاتل بن گئے

سانس لینے سے پہلے سوچ لیجئے کہ آپ اپنے پھیپھڑوں میں زہر تو نہیں بھر رہے۔ دنیا میں انسان کے لئے ایک ہوا خالص رہ گئی تھی، جیسے بھی انسان نے آلودہ کر دیا ہے۔ اور انسانوں کو ان بڑے بڑے شہروں میں سانس لینا بھی محال ہے۔ ذرا ان شہروں کا حال تو لیجئے، کیسے کیسے مسائل ہیں جو یہاں پیدا ہو رہے ہیں۔ چین کے شہر بیجنگ کی ہوا اس قدر آلودہ ہے کہ وہاں ماسک کے بغیر سانس لینا بھی محال سمجھا جاتا ہے۔ اولان باتور منگولیا کے دارالحکومت کا شمار دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ سردیوں میں لوگ گھروں کو گرم رکھنے کے لیے کوئلے اور لکڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ اس شہر میں موجود دھوئیں کے 60 سے 70 فیصد تک کی وجہ یہی روایتی طریقے ہیں۔ ایرانی شہر اہواز دنیا کا آلودہ ترین شہر ہے۔ اس کی وجہ شہر کے ارد گرد قائم مختلف صنعتیں ہیں لاہور کا شمار بھی ایسے ہی شہروں میں ہوتا ہے۔ ہوا میں آلودگی پاکستان کا ایک اہم ماحولیاتی مسئلہ ہے۔ یہ صورتِ حال اس ملک کے دوسرے بڑے شہر لاہور میں خاصی گمبھیر ہے۔ اس شہر میں دھوئیں کی اہم وجوہات میں کوڑا کرکٹ جلانا، ٹریفک

اور قریب ترین صحرائی علاقوں سے یہاں پہنچنے والی باریک مٹی بھی شامل ہیں۔ پڑوسی ملک بھارت کے دار لحکومت نئی دہلی میں 30 برس کے اندر اندر موٹر گاڑیوں کی تعداد ایک لاکھ اسّی ہزار سے بڑھ کر 35 لاکھ ہو چکی ہے۔ تاہم شہر کی آلودہ ہوا کی زیادہ تر ذمہ داری کوئلے سے چلنے والے بجلی گھروں پر ڈالی جاتی ہے۔ اس شہر کی فضا میں پائی جانے والی خطرناک گیسوں کا اسّی فیصد انہی بجلی گھروں کی چمنیوں سے اٹھتا ہے۔ ریاض سعودی عرب کے اس شہر میں ریت کا طوفان ہوائی آلودگی کو اور بھی خطرناک بنا دیتا ہے۔ شہر کی فضا میں اڑتی ہوئی ریت میں گاڑیوں اور صنعتوں کا دھواں بھی شامل ہو جاتا ہے۔ قاہرہ جو مصر کا دارالحکومت ہے۔ یہاں کی کی ناقص ہوا بیماریوں کی باعث ہے۔ یہاں ہر سال سانس کی بیماریاں اور پھیپھڑے کا سرطان دس ہزار سے لے کر پچیس ہزار تک افراد کی موت کا سبب بنتے یں۔ وہاں ٹریفک اور بڑھتی ہوئی صنعتیں آلودگی کی وجہ ہیں۔ جرمن شہر مائنز کے ماکس پلانک انسٹیٹیوٹ کے ایک مطالعے کے مطابق ٹوکیو اور نیویارک میں ہر سال آلودہ ہوا کے باعث پانچ سو افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکا میں یہ تعداد تقریبا پندرہ ہزار ہے۔ روس کے دارالحکومتماسکو میں بھی فضائی آلودگی کا وہی عالم ہے جو کسی بھی میگا سٹی میں ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کی آلودہ فضا میں شہر کی مغربی سمت سے آنے والی تازہ ہوائیں سکون کا سانس لینے کا موقع دیتی ہیں میکسیکو سٹی جو لاطینی امریکا میں ہے، اس شہر میں آلودگی کی وجہ اس کی جغرافیائی پوزیشن

ہے۔ اسے تقریباً پانچ ہزار میٹر بلند آتش فشاں پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ سلفر ڈائی آکسائیڈ اور ہائیڈرو کاربنز کی وجہ سے میکسیکو کا شہر میکسیکو سٹی دنیا کے آلودہ ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ امریکہ کے شہر نیویارک کا بھی یہی حال ہے۔ جہاں فضائی آلودگی نے گرمی کی شدت میں اضافہ کر دیا ہے یہاں پانی اور آلودہ ہوا کے ساتھ شور بھی انسان کے لئے خطرہ کی علامت ہے۔ آلودگی کوئی بھی ہو کرہ ارض پر رہنے والوں کی زندگیوں کے لئے خطرے کا ہی باعث ہیں۔ فضائی آلودگی سے بچنے کے لئے عالمی سطح پر ہر ممکن اقدامات کئے جا رہے ہیں اور دنیا بھر میں رہنے والوں کو اس خطرے سے بچنے کی تدابیر بھی بتائی جا رہی ہیں تاکہ اس کا تدارک ہو سکے۔ دنیا کے گرد قدرتی طور پر اوزن کی جو تہہ ہے اس کو دھویں اور دیگر کثافتوں کی وجہ سے شدید خطرہ لاحق ہے دھویں کی آلودگی کے باعث ماحول بدل رہا ہے، بیماریاں پھیل رہی ہیں اور موسموں میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی ہے یہ فضائی آلودگی ہی ہے جس کی وجہ سے گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ دھویں کی تہہ کی وجہ سے سورج کی شعاعیں درست طور پر انسانی جسم تک نہیں پہنچ پاتیں۔ گرمی کی شدت کے باعث پہاڑوں پر برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے جس سے آئے دن سیلاب کی بھرمار ہوتی ہے اور سمندر کی سطح بھی بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے جس سے تباہ کن طوفانوں کا خطرہ بڑھتا ہے۔ ماہرین کے مطابق سمندر کی سطح بلند ہونے کے باعث دنیا کے بیشتر ممالک سطح زمین کے اندر دھنس جائیں گے۔ فضائی آلودگی کے اثرات انسانی زندگی

پر تیزی سے رونما ہو رہے ہیں آئے روز نت نئی بیماریاں دریافت ہو رہی ہیں جگہ جگہ گندگی کے انبار سے بھی ماحول کی آلودگی متاثر ہو رہی ہے۔ جہاں گندگی اور کیچڑ کی بدبو سے فضا آلودہ ہو رہی ہے وہاں گاڑیاں کا دھواں کینسر جیسے موذی مرض کو پھیلا رہا ہے۔ اگر اس پر قابو نہ پایا گیا اور کوئی لائحہ عمل مرتب نہ کیا گیا تو یہ مرض انسانی زندگی کیلئے روگ بن کر رہ جائے گا جبکہ ناک، کان اور گلے کی بیماریاں بھی انسانی زندگی کے لئے خطرے کا باعث بن رہی ہیں اور سگریٹ کا دھواں بھی انسان کو نت نئی بیماریوں میں مبتلا کر رہا ہے۔ فضائی آلودگی میں جہاں کارخانوں اور فیکٹریوں کا بڑا ہاتھ ہے وہاں سڑکوں پر چلنے والی گاڑیاں بھی فضا کو خراب کر رہی ہیں۔ سگریٹ کا دھواں خطرناک قرار دیا گیا ہے مگر ہر قسم کی گاڑیوں سے خارج ہونے والا دھواں سگریٹ کے دھویں سے زیادہ خطرناک ہے جو فضا کو آلودہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی صحت کو بھی متاثر کر رہا ہے اس سے ایسے مرض پھیل رہے ہیں جن کا علاج بھی ابھی تک دریافت نہیں کیا گیا جبکہ ہمارے پاس اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ ہم آنے والے خطرے کو بھانپ کر اس کے ازالہ کے لئے کوئی اقدامات کر سکیں۔ اس کے علاوہ دنیائے ممالک میں ہونے والے ایٹمی دھماکے بھی فضائی آلودگی میں اضافہ کا باعث بن رہی ہیں ایٹم بذات خود انسان کی تباہی کا موجب ہے اور اسی کا دھماکہ ایک سے دوسرے بلکہ تیسرے ملک تک اپنے اثرات مرتب کرتا ہے اور فضا آلودہ ہو کر انسانوں کو نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ پہلے صرف زمین

پر ایٹمی دھماکے کے کئے جاتے تھے آج کل خلا میں ایٹمی دھماکے کرنے کا رواج بڑھ رہا ہے جس سے فضائی ایٹمی ذرات پوری دنیا کو متاثر کرنے کیلئے آلودگی میں اضافہ کر رہے ہیں جو پوری دنیا کے لئے تباہی و بربادی کا باعث ہے۔ فضائی آلودگی کے جہاں منفی اثرات انسان پر اثر انداز ہو رہے ہیں وہاں ہماری زراعت بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا پائی فضا میں آکسیجن کی کمی سے فصلیں بے جان ہوتی جا رہی ہیں۔ ان میں غذائیت کی شدید کمی واقع ہو رہی ہے اور رہی سہی کسر وہ تیزابی بارشیں پوری کر رہی ہیں جو فضائی آلودگی کے باعث برس رہی ہیں ۔ جنگ اور اسلحہ بارود کی وجہ سے بھی فضائی آلودگی میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ خلیجی جنگ میں کویت میں جلتے ہوئے تیل کے کنوئیں سے جو دھواں اٹھا تھا۔ اس سے انسانی صحت کے ساتھ ساتھ موسموں پر بھی برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں کالی بارشوں کا آغاز ہو چکا ہے یہ سب کچھ فضائی آلودگی کی وجہ سے ہی ہو رہا ہے کیونکہ فضائی آلودگی نے موسموں کی نظام کو بھی تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ بارشیں بے موسم اور شدید قسم کی ہو رہی ہیں جس سے سیلاب انسانی بستیوں میں تباہی مچا رہے ہیں یہ تباہی صرف انسانوں ہی کا مقدر نہیں بنی بلکہ جانور بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب شور سے پیدا ہونے والی آلودگی زیادہ تر جمبو جیٹ قسم کے ہوائی جہازوں' کارخانوں کی چمنیوں سے خارج ہونے والے دھوئیں اور لاوڈا

سپیکروں سے پیدا ہونے والے شور تک محدود تھیں اب یعنی گزشتہ 20-15 برسوں میں جہاں اس طرح کے شور کی شدت میں اضافہ ہوا ہے شور مچانے والے دیگر وسائل بھی شہروں کے علاوہ دیہات کو بھی اپنی زد میں لے چکے ہیں۔ گاؤں میں ٹریکٹر ڈیزل پمپ اور ٹیلی ویژن سیٹ عام ہو چکے ہیں۔ اونچی آواز میں ریکارڈنگ سے بھی ماحول متاثر ہو رہا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں بسوں، ٹرکوں میں ''پریشر ہارن'' لگانے پر پابندی ہے اور ہمارے ہاں تو ایسے ہارن شہروں میں شوقیہ ڈرائیور بجا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں اور اب تو شہروں خصوصاً راولپنڈی، اسلام آباد، پشاور، لاہور، کراچی جیسے شہروں میں شور سے پیدا ہونے والی آلودگی خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے اور اس سے بہرے پن کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ شور سے صرف ہماری قوت سماعت ہی متاثر نہیں ہوتی بلکہ کام کرنے کی صلاحیت میں بھی کمی آ جاتی ہے۔ ذہنی تناؤ بڑھ جاتا ہے۔ نیند متاثر ہوتی ہے، بے خوابی کی وجہ سے امراض کا بھی خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ بچپن میں آپ کو جا بجا ''یہاں ہارن مت بجائیں'' کے بورڈ آویزاں نظر آتے تھے۔ لیکن اب یہ بورڈ غائب ہو چکے ہیں۔ ان پر کوئی عمل کرنے والا بھی نہیں رہا۔ اسکولوں، ہسپتالوں کے قرب و جوار کے علاقوں میں بھی اس قانون کا نفاذ نہیں ہوتا۔ ٹریفک پولیس بھی اکثر خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔ دنیا پوری طرح فضائی آلودگی کے گھیرے میں آ چکی ہوئی ہے اور یہ بات بھی حیرت کا باعث ہے کہ ایک طرف انسان اپنے لئے امن، آرام اور سکون تلاش کر رہا ہے جبکہ دوسری طرف وہ

خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہی کی جانب گھسیٹ رہا ہے حالانکہ یہ فضائی آلودگی پاکستان سمیت پوری دنیا کے لئے خطرے کا باعث ہے۔ آج کل کئی ایسے ادارے وجود میں آ چکے ہیں جو دنیا کو فضائی آلودگی سے بچانے کے لئے کام کر رہے ہیں گو انہیں اس ضمن میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہو پا رہی مگر یہ بھی سو فیصد امید ہے کہ ان کی کوششیں رنگ لا کر رہیں گی۔ ویسے بھی اب دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس مسئلہ کی طرف سنجیدگی سے سوچ بچار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ دنیا بھر میں فضائی آلودگی کو کم کیا جائے اور دنیا کو تباہی سے بچایا جائے۔ فوربس میگزین کے مطابق نیویارک کا شمار امریکا کے بیس سب سے آلودہ شہروں میں ہوتا ہے۔ تاہم شہر کی انتظامیہ نے گاڑیوں کے حوالے سے جدت اور فلٹریشن سسٹم کے ذریعے آلودگی کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دہلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سانس لے کر سوچنے کی بجائے سوچ کر سانس لیں، بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں فضائی آلودگی کا عالم اب یہ ہے کہ وہاں ایک گہری سانس لینے سے قبل دس مرتبہ سوچ لینا چاہیے۔ اسی تناظر میں اب دہلی کا موازنہ دنیا کے سب سے زیادہ آلودہ شہر کہلانے والے بیجنگ سے کیا جانے لگا ہے۔ خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس کے مطابق نئی دہلی میں کچھ روز تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ فضائی آلودگی کے باعث ہوا اتنی مٹیالی ہو جاتی ہے کہ ٹریفک تک کو رینگ رینگ کر چلنا پڑتا ہے۔ اب وہاں افراد کی باہم گفتگو کے بیچ کھانسی ایک معمول سا بن گئی ہے، جیسے یہ بھی گفتگو ہی کا کوئی حصہ ہو

اور سورج کی روشنی اس آلودہ فضا سے یوں ٹپک ٹپک کر زمین کو چھوتی ہے کہ آسمان اپنا نیلا رنگ اتار کر نارنجی قبا اوڑھ لیتا ہے۔ یہ تو شاید کہنا فی الحال ممکن نہ ہو کہ ان دونوں شہروں میں سے کس کی فضا میں اس آلودگی کے باعث دھند زیادہ ہے، کیوں کہ فضا میں موجود ان مہلک ذرات کی قسمیں بھی کئی طرح کی ہیں اور ان کے پیمائشی معیارات بھی متنوع، مگر ایک چیز واضح ہے اور وہ یہ کہ کم از کم چین میں اس سلسلے میں بہتری کے لیے حکومت اقدامات کرتی نظر آ رہی ہے مگر گزشتہ کچھ برسوں میں اس بابت نئی دہلی حکومت کے اقدامات ناکافی نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نئی دہلی کے شہری اس سلسلے میں کم کم ہی شکایت کرتے ملتے ہیں۔ نئی دہلی میں طبی ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ اب پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ افراد اس فضائی آلودگی سے متاثر ہو کر ہسپتالوں میں پہنچ رہے ہیں، تاہم اس بابت نئی دہلی میں اعداد و شمار جمع کرنے کا شاید کوئی نظام ہی نہیں۔ فضائی آلودگی انسانی پھیپھڑوں کو بری طرح متاثر کرتی ہے، تاہم محققین کی ایک بڑی تعداد یہ بھی بتاتی نظر آتی ہے کہ اس آلودگی کی وجہ سے انسان ذہنی تناؤ اور جسم سوزش یا جلن اور دیگر کئی طرح کے مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ PAK-EA کی رپورٹ کے مطابق کراچی اور لاہور میں آلودگی انتہائی خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ کراچی میں نائیٹروجن گیس (NO2) گیس کی انتہائی مقدار 399 مائکروگرام پر کیوبک میٹر تک جبکہ لاہور میں TSP یا ہوا میں معلق ذرات کی مقدار 126 مائکروگرام پر کیوبک میٹر

تک پہنچ گئی ہے جو کہ عالمی سٹینڈرڈ (35 مائکرو گرام پر کیوبک میٹر) سے تین گنا زیادہ ہے۔یہ سروے پاکستان انوائر نمنٹل ایجنسی PAK-EA نے جاپان کی مدد سے پاکستان کے پانچ بڑے شہروں کراچی، لاہور، اسلام آباد/راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ میںدس جدید ترین آلات کو انسٹال کر کے مکمل کیا۔ اس کے علاوہ ایجنسی نے چند دیگر شہروں جیسے گوجرانوالہ، گجرات، فیصل آباد وغیرہ میں بے ماحولیات سے متعلق سروے کیا۔نائٹروجن لیول کے لحاظ سے اختیار کردہ سروے کے مطابق یاد رہے کہ نائٹروجن کی زیادتی سے سانس کے مسائل جیسے دل کے امراض، پھیپھڑوں کا ٹھیک کام نہ کرنا، دمہ، مدافعتی نظام کا کمزور ہونا اور اوزون پر بد اثرات وغیرہ جبکہ معلق ذرات کی وجہ سے آنکھوں اور گلے کی انفیکشن، کھانسی، وغیرہ جیسے امراض کا سبب بنتے ہیں۔آلودگی میں ہونے والا یہ خوفناک اضافہ کی ایک وجہ پچھلے چند سالوں میں ہونے والی آزادانی کار فائینانسنگ اور تیز انڈسٹیرلائزیشن بیان کی جاتی ہے۔ جس میں موٹر وہیکلز کی ایک بہت بڑی تعداد پاکستان کی سڑکوں پر آ گئی جبکہ پاکستان کا روڈ سٹرکچر اسکی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ روڈز کی توسیع کے نتیجے میں کٹنے والے درختوں نے اس کی خطرناکی میں مزید اضافہ کر دیا۔گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں، گرمی Toxic acids، روڈز پر اڑنے والی گرد و غبار، فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں اور انکے مضر صحت مادے وغیرہ نے پاکستانی کی ماحولیاتی آلودگی میں بے انتہا اضافہ کیا ہے۔

جب انسان آلودہ ہوا میں سانس لیتے ہیں تو در حقیقت خود کو انتہائی خطرے میں ڈالے ہوئے ہوتے ہیں اور خود کو دل، سانس و پھیپھڑوں کی بیماریوں، آنکھوں کے امراض کے سامنے پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی انسان کا معمولی آلودگی میں لمبے عرصہ تک سانس لینا بھی انتائی خطرناک ہوتا ہے کجا یہ کہ انسان ایسی فضا میں سانس لے کہ جو عالمی معیار سے کئی گنا زیادہ آلودہ ہو۔ کراچی کی آبادی ایک کروڑ اسی لاکھ کے لگ بھگ ہے، آبادی کے تیزی سے بڑھتے تناسب کی وجہ سے اسے دنیا کے گنجان ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس گنجان ترین شہر میں آلودگی جس تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے اس سے یہ خدشہ پیدا ہو رہا ہے کہ آئندہ دس برسوں میں اس شہر کا ہر دوسرا فرد سر درد، نزلہ، زکام، دل کے امراض اور الرجی وغیرہ میں مبتلا ہو سکتا ہے اور اس کی بڑی وجہ ہے اس شہر کی فضا میں پیدا ہونے والے وہ آلودہ عناصر جو انسانی صحت کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہیں۔

آغا خان یونیورسٹی میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق مجموعی طور پر 68.6 فیصد افراد نے ایمرجنسی وارڈ میں علاج کروایااور 31.4 فی صد نے اسپتالوں میں باقاعدہ علاج کے لیے داخلہ لیا۔ اسپتال کا ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ ان مریضوں میں اکثریت کی تعداد دل کے امراض کی تھی، ریسرچ سے ظاہر ہوا ہے کہ

فضائی آلودگی کے مستقل بڑھنے کی وجہ سے دل کے امراض میں اضافہ ہوا ہے۔ شہر کے دو معروف ترین علاقے کورنگی جہاں صنعتی علاقے میں فیکٹریوں اور ملوں سے نکلنے والا دھواں جو خاصا آلودہ اور مضر صحت اجزاء سے بھرپور ہوتا ہے پوری آبادی پر اثر انداز ہوتا ہے جب کہ شہر کے وسط میں تبت سینٹر کا علاقہ بھی جہاں روزانہ تقریباً تین لاکھ گاڑیاں گزرتی ہیں اپنی مضر صحت گاڑیوں سے خارج ہونے والے دھوئیں کی بدولت شہریوں کی زندگی کو ابتر کر رہی ہیں۔ کورنگی جہاں ریفائنریاں، ٹیکسٹائل ملیں اور دوسری کیمیائی فیکٹریاں شامل ہیں نہ صرف اپنے دھوئیں بلکہ خارج ہونے والے آلودہ پانی کی بدولت بھی سنگین صورت حال پیدا کر رہی ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کے ایک جائزے کے مطابق ایشیائی ممالک میں آلودگی کی بڑھتی ہوئی صورت حال تشویشناک حد تک خطرناک ہے جہاں اس وجہ سے خطرناک بیماریاں پھیل رہی ہیں اور سالانہ آٹھ لاکھ افراد موت کا شکار بن رہے ہیں۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں عام عوام کے لیے ٹرانسپورٹ کی صورت حال خاصی ابتر ہے لیکن گاڑیوں کی شکستہ حالی کی بدولت فضا میں خارج ہونے والا دھواں جو ان گاڑیوں کی بدولت لوگوں کی صحت کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ فضائی آلودگی کا شکار نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے دوسرے بڑے شہر جن میں لاہور، فیصل آباد اور اسلام آباد شامل ہیں۔ فیصل آباد کا درجہ اس اعتبار سے خاصا بلند ہے جب کہ لاہور دوسرے نمبر پر آتا ہےسنگاپور میں پڑوسی ملک انڈونیشیا کے جزیرے ساٹرا کے جنگلوں میں بھڑکنے

والی آگ کے نتیجے میں دھویں کے بادل چھانے کے بعد وہاں تیسرے روز فضائی آلودگی ریکارڈ سطح پر پہنچ گئی ہے۔دنیائے ممالک کو چاہیے کہ وہ دھواں چھوڑنے والی فیکٹریوں اور کارخانوں کو آبادی سے دور منتقل کریں اور ان کارخانوں و فیکٹریوں سے نکلنے والے دھویں میں کثافتوں کو صاف کرنے کے لئے خصوصی پلانٹ لگائیں جو فضا میں جاکر آلودگی نہ پھیلائیں اس کے علاوہ ایسی تکنیک ایجاد کی جائے کہ سڑکوں پر چلنے والی ہر قسم کی گاڑیوں کے دھویں کو کنٹرول کیا جاسکے اس معاملے میں شمسی توانائی اہم کردار ادا کرسکتی ہے انسان کو اس کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے تاکہ فضائی آلودگی کو کم کیا جاسکے اور جس قدر ممکن ہو دنیا کو تباہی سے بچایا جائے اور ایک صحت مند معاشرہ عمل میں آئے یہی وقت کا اہم تقاضا ہے۔

دنیا کے دِل پھینک حکمران اور عوام

فرانسیسی سب سے آگے پاکستانی بھی پیچھے نہیں ہیں

دل پھینک کی ''ٹرم'' ہمارے ہاں عام فہم ہے اور فراوانی سے استعمال ہوتی ہے۔ ہماری قوم بھی دل پھینک واقع ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دل پھینک ہونا صاحب دل ہونے کی نشانی ہے۔ کچھ تجربہ کار حضرات کا مشاہدہ ہے کہ دل پھینکنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے جبکہ اکثر سمجھ دار لوگ کہتے ہیں کہ اس واردات کی کوئی عمر یا حد نہیں۔ یہ حادثہ زندگی میں کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ فلموں میں عاشق دل پھینک ہی ہوتا ہے۔ جیمز بانڈ فلموں میں بانڈ کی اداکاری اور ان کی پر اسرار شخصیت جتنی دلکش ہے لڑکیوں کے معاملے میں اتنا ہی دلپزیر ہے ان کا دل پھینک انداز ہمیشہ ان کے ہر ستاروں کا بھاتا ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں سے جیمز بانڈ یہی کر رہے ہیں۔ بانڈ فلموں کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر پہلی بانڈ گرل یونس گیسن تو شان کونری کو ہی اپنا پسندیدہ بانڈ مانتی ہیں۔ جب چوراسی سالہ یونس گیسن سے ان پسندہ بانڈ کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، تو وہ کہتی ہیں 'اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرا فیورٹ بانڈ کون ہے۔ ظاہر ہے کہ میری وفاداری تو شان کے ساتھ ہے۔ بانڈ فلموں کی ایک خاصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس

میں ایک ہی اداکار کو کئی مواقع ملے ہیں لیکن ان کے ساتھ کام کرنے والی خواتین اداکارہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ یہ تو فلموں کی باتیں تھی۔ لیکن حقیقی زندگی میں بھی مرد دل پھینک ہی واقع ہوئے ہیں۔ ان میں فرانسیسی تو سب سے آگے ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ بے وفائی کے رویوں پر کیے گئے ایک سروے کے نتائج میں فرانسیسی مرد سرفہرست رہے ہیں۔جب فرانس کے صدر کو ہی اپنی پارٹنر کے پیٹھ پیچھے رنگ رلیاں منانے کے الزام کا سامنا کرنا پڑا تو وہاں کے شہری بھلا کیوں پیچھے رہنے لگے۔ پاکستان کے عوام کو چھوڑ یئے، ہمارے حکمراں بھی اس باب میں بہت مشہور ہیں،۔ پاکستانی قوم کی زندہ دلی اور دل پھینکنے کے مظاہرے بیرون ملک قدم قدم پر ملتے ہیں جہاں خاص طور پر گوروں کے ممالک میں زندہ دلان پاکستانی دل ہاتھ پہ سجائے پھرتے ہیں اور جہاں موقعہ ملتا ہے دل پھینک دیتے ہیں۔ ایک ماہر امراض قلب کی تحقیق ہے کہ پاکستان میں دوسرے ممالک کے مقابلے میں دل کا مرض کم ہے کیونکہ پاکستانی دل کا استعمال بہت کرتے ہیں جس سے دل کی ورزش ہوتی رہتی ہے اور وہ کم بیمار پڑتا ہے۔ بھارت والے بھی اس میں پیچھے نہیں ہیں، جواہر لال نہرو کے خاندان کے معاشقے اب بھی نہیں بھولتے، حال ہی میں بھارت کے معروف مرکزی وزیر ششی تھرور کے معاشقے کی بھی بہت شہرت ہوئی، جو ایک پاکستانی صحافی خاتون سے عشق کی پینگیں بڑھاتے رہے، اس معاشقے کا المناک انجام یہ ہوا کہ ششی تھرو کی اہلیہ دارالحکومت نئ دہلی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں پُراسرار طور

پر مردہ پائی گئی ہیں۔ ششی کی اہلیہ سنندہ پشکر نے اپنی موت سے دو روز قبل اپنے خاوند ششی تھرور کا ایک پاکستانی صحافیہ مہر تارڑ سے معاشقہ بے نقاب کیا تھا اور انھیں اپنے میاں کے پاکستانی صحافیہ سے تعلقات کا ٹویٹر پر پیغامات کے ذریعے پتا چلا تھا۔ فرانسیسی مردوں کے دل پھنک ہونے کا انکشاف ایک سروے میں کیا گیا ہے۔ اس سروے کا اہتمام آئی ایف اوپی' نامی ادارے نے کرایا۔ اس حوالے سے مغربی یورپ کے چھ ملکوں' میں اٹھارہ برس یا اس سے زیادہ عمر کے چار ہزار آٹھ سو لوگوں سے سوال کیے گئے۔ اس کے نتائج بدھ 26 فروری کو جاری کیے گئے، جن کے مطابق فرانس اور اٹلی کے مرد زیادہ بے وفا ہوتے ہیں۔ دونوں ملکوں میں 55 فیصد مردوں نے تسلیم کیا کہ انہوں نے کبھی نہ کبھی اپنی پارٹنر سے بے وفائی کی۔ فرانس اور اٹلی میں ہر تین میں سے ایک خاتون نے بے وفائی کی مرتکب ہونے کا اعتراف کیا۔ اس سروے کے منتظمین کا کہنا ہے کہ بے وفائی سے عبارت رویوں کا مذہب سے بھی تعلق دکھائی دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یورپ کے پروٹسٹنٹ اکثریتی ملکوں میں یہ شرح کم ہے۔ مثلاً برطانیہ میں صرف 42 فیصد اور جرمنی میں 46 فیصد مردوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی افیئر میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ آئی ایف اوپی کے ڈائریکٹر فرانسوا کراؤس نے ایک خبر رساں ادارے کو بتایا کہ اولاند اور اٹلی کے سابق وزیر اعظم سلویو برلسکونی اپنے اپنے ملکوں میں پائے جانے والے رویوں کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔۔ برلسکونی کو گزشتہ برس ایک کم عمر جسم فروش کے ساتھ جنسی تعلق

قائم کرنے پر سزا سنائی گئی تھی۔

سروے کے مطابق جرمنی میں 43 فیصد، اٹلی میں 32 فیصد، فرانس اور برطانیہ میں 29 فیصد خواتین نے اپنے اپنے پارٹنرز کو دھوکا دینے کا اعتراف کیا۔ شمالی یورپ کے بظاہر زیادہ سلجھے ہوئے جوڑے بھی مکمل طور پر فرشتے ثابت نہ ہوئے۔ تقریبا? 53 فیصد جرمن اور 50 فیصد برطانوی شہریوں نے تسلیم کیا کہ انہوں نے اپنے پارٹنر کے پیٹھ پیچھے کسی دوسرے فرد کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ سروے میں فرانس، اٹلی اور بیلجیم میں ایسے شہریوں کی شرح 46 فیصد رہی۔تاہم اس سروے میں سرِ فہرست فرانس ہی ہے جہاں 35 فیصد شہریوں کا کہنا ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اپنے پارٹنر کو دھوکہ دے سکتے ہیں۔ جرمنی اور اسپین میں یہ شرح 31 فیصد، اٹلی میں 28 فیصد اور برطانیہ میں 25 فیصد رہی۔اس سروے کے نتائج فرانس کے صدر فرانسوا اولاند کے ایک معاشقے کی کہانی منظر عام پر آنے کے بعد سامنے آئے ہیں۔ فرانس کے ایک میگزین نے ان کی تصاویر شائع کر دی تھیں، جن میں انہیں موٹر سائیکل پر بیٹھے اداکارہ جولی گاییۓ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ تصاویر سیلیبرٹی میگزین کلوزر نے شائع کی تھیں۔ ساتھ ہی ایک رپورٹ بھی دی گئی تھی کہ فرانسوا اولاند کا فلمی اداکارہ اور سوشلسٹ پارٹی کی سپورٹر جولی گاییۓ کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے۔

اس اسکینڈل کے نتیجے میں اولاند کی پارٹنر ویلیری ٹریئر وائلر پہلے تو ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر ہسپتال جا پہنچیں۔ وہ تقریبا دس روز تک ہسپتال میں رہیں۔ بعدازاں انہوں نے صدر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔اڑتالیس سالہ ٹریئر وائلر ہفت روزہ پیرس میچ کی کالم نگار ہیں۔ انہوں نے اولاند سے شادی نہیں کی تھی تاہم دونوں 2006 سے ساتھ تھے۔ مئی 2012 میں اولاند صدر بنے تو ٹریئر وائلر نے سرکاری تقریبات کے موقع پر خاتون اوّل کا کردار ادا کیا۔ہمارے عوام کو تو عشق اور دل پھینکنے کے کم مواقع ملتے ہیں۔ لیکن ہمارے حکمران بہت رنگیلے ہیں۔ وہ اپنا اپنا واحد دل کسی نہ کسی حسینہ کی زلفوں میں اٹکا ہی دیتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح بھی ایک بار دل ہار بیٹھے تھے۔ لیکن انھوں نے اس عشق پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں کہ،، وہ جناح) انگلستان میں تھے جب ان کی ''بچپن'' کی شادی کی خاندانی دلہن انتقال کر گئی۔) تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ہندوستان لوٹے، قانون کی پریکٹس شروع کی، نام و دام کمایا اور ان کا دامن اس قدر صاف رہا کہ ان کے بدترین دشمن بھی ان پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے صاحب دل ہونے کا ثبوت اس وقت دیا جب انہوں نے محترمہ رتی ڈنشا سے شادی کی ورنہ بمبئی میں عام خیال یہی تھا کہ جناح ''یخ ٹھنڈے'' دل کا مالک ہے۔ اس عشق میں بھی نوجوان رتی کا ہاتھ زیادہ تھا۔ قائداعظم نے رتی کو سوچنے اور غور کرنے کے لئے پورا ایک سال دیا کیونکہ عمروں میں تفاوت بہت

تھا۔ جب شادی کا فیصلہ ہو گیا تو محمد علی جناح رتی کو بمبئی کی جامع مسجد کے امام مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لے گئے جہاں رتی نے مولانا کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنا نام مریم رکھا۔ مولانا نذیر احمد صدیقی نے محمد علی جناح کا نکاح مریم سے پڑھایا۔ بھلا ! مولانا نذیر احمد صدیقی کون تھے ؟ مولانا صدیقی پاکستان کی معروف مذہبی شخصیت مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کے سگے تایا تھے۔ نہایت عبادت گزار نیک انسان تھے۔ ان کے بقول محمد علی جناح اکثر ان سے مذہبی راہنمائی لیا کرتے تھے۔ اپنی دعا اور آرزو کے مطابق مولانا نذیر احمد صدیقی جنت البقیع مدینہ منورہ میں مدفون ہیں۔ محمد علی جناح کی محبت کی شادی چند برس سے زیادہ نہ چل سکی اور پھر محمد علی جناح قائد اعظم نے اپنا دل ہندوستان کے مسلمانوں کو دے دیا اور تصور پاکستان سے شادی کر لی۔ یہ رسم وفا اس قدر مضبوط، ایثار کیش اور روح پرور ثابت ہوئی کہ تاریخ کا حصہ بن گئی۔ قائد اعظم کے دست راست نوابزادہ لیاقت علی خان نے بھی خاندانی شادی کے باوجود دل رعنا لیاقت علی خان کو دے دیا جو شادی سے قبل شاید لیکچرر تھیں، پڑھی لکھی اور پبلک لائف کے تقاضے سمجھتی تھیں۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد وہ پاکستان کی سفیر بنیں اور بہت کامیاب رہیں۔ علامہ اقبال نے بھی پہلی شادی کی ناکامی کے بعد دوسری شادی والدہ جاوید سے کی لیکن یہ انتخاب ان کا اپنا نہیں تھا، گھر والوں کا تھا۔ تفصیلات سے درگزر کرتے ہوئے پاکستان کے پہلے صدر سکندر مرزا نے بھی اپنا دل ایرانی

نژاد ناہید پر پھینکا، عشق کیا اور دوسری بیوی بنا لیا۔ سکندر مرزا کے صاحبزادے نے اس وقت کے امریکی سفیر کی صاحبزادی پر محبت کا تیر پھینکا اور شادی کر لی۔ یوں پاکستان اور امریکہ میں اس ساس سسر کا رشتہ طے ہوا جس کا ہنستے ہنستے ذکر ہلیری کلنٹن نے بھی کیا تھا۔ سر فیروز خان نون پاکستان کے وزیر اعظم رہے اور تقسیم سے قبل انگلستان میں سفیر تھے۔ وہ اپنی سیکرٹری ''وکی'' کو دل دے بیٹھے اور اس سے شادی کر لی۔ یہ محترمہ جنرل ضیا الحق کی کابینہ میں وزیر تھیں اور بڑھاپے میں شرما شرما کر بتایا کرتی تھیں کس طرح ''گریٹ مین'' نے مجھے پرپوز کیا۔ جنرل ایوب خان صدر تھے۔ اس دور میں ان کا برطانوی ماڈل کرسٹائن کیلر سے آنکھ مٹکا مشہور ہوا تھا۔ ان کی کابینہ کے رکن جناب ذوالفقار علی بھٹو مزاجاً عاشق تھے۔ دن کی روشنی میں عوام کو دل دیتے اور ذاتی زندگی میں جہاں چاہتے دل رہن رکھ دیتے۔ خاندانی شادی محترمہ امیر بیگم سے ہوئی۔ ایرانی نژاد نصرت کو دل دے بیٹھے۔ دوسری شادی ان سے کر لی۔ پھر ایک بنگالی حسینہ ''بلیک کوئین'' سے عشق کر بیٹھے جس سے نکاح مولانا کوثر نیازی نے پڑھایا۔ چھوٹی موٹی عاشقیاں قابل ذکر نہیں۔ جنرل یحییٰ خان کی حسن پرستی عبرت کا سامان تھی۔ آئی ایس پی آر کے ایک سابق میجر ابن الحسن نے ان کی ایک واردات کا حال قلمبند کیا ہے اور یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب یحییٰ خاں جرنیل تھے اور یہ میجر صاحب عینی شاہد تھے۔ اس داستان کے ہر لفظ سے بو آتی ہے اور عبرت حاصل ہوتی ہے۔ جس محترمہ کے پاس وہ جاتے تھے

وہ ان کے ماتحت کی ''گوری بیوی'' تھی۔ جب یحییٰ خان صدر بنے تو جنرل رانی کے ساتھ ساتھ کئی خواتین مشہور ہوئیں حتیٰ کہ پاکستان ان کے جام میں ڈوب کر ٹوٹ گیا۔اس میدان میں جن دو حکمرانوں یا لیڈران نے ریکارڈ قائم کئے وہ تھے مصطفیٰ کھر اور جنرل پرویز مشرف۔ مصطفیٰ کھر نے اَن گنت شادیاں کیں، اَن گنت عشق کئے۔ ان کی اصل شخصیت اور پیشہ ور عاشق کی جھلک ان کی سابق بیوی تہمینہ درانی کی کتاب ''مائی فیوڈل لارڈ'' میں ملتی ہے۔ محترمہ تہمینہ درانی اب ہمارے محبوب قائد جناب شہباز شریف کی تیسری بیوی ہیں۔ جنرل پرویز مشرف مزاجاً پیشہ ور عاشق تھا جس کی جھلک اس کی سوانح حیات میں بھی ملتی ہے۔ پیشہ ور ان معنوں میں کہ وہ جلد جلد دل پھینکتا اور جلد از جلد نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ جاوید چوہدری نے ایک بار لکھا تھا کہ پرویز مشرف شاپنگ بیگ میں کروڑوں روپے ڈال کر ''حسین'' خاتون کو دے دیتا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ چند سو روپوں کے اثاثوں سے بحثیت کیڈٹ زندگی شروع کرنے والا آج ارب پتی ہے۔ ''ہور چوپو''۔ شوکت عزیز اس کے
وزیراعظم تھے جس کے بارے سابق امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ کونڈا لیزا رائس نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ''فاتح خواتین'' سمجھتا تھا۔'' ایک بار اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے چاہے۔ میں نے جواباً گھورا تو معذرتوں پر اتر آئے''۔سابق صدر زرداری بھی دل پھینک واقع ہوئے ہیں، امریکی نائب صدارت کی ایک خاتون امیدوار کا تو انھوں نے ایسے ہاتھ تھاما کہ سفارت کاروں کو

مشکل پڑ گئی۔ ان کے صاحبزادے بلاول بھٹو اور سابق وزیر خارجہ حنا ربانی کھر کا قصہ تو تازی تازہ ہے۔ شہباز شریف بھی کچھ کم نہیں ہیں، ان کے رنگ رنگیلے قصے بھی مزیدار ہیں۔ ان کے صاحبزادے حمزہ شہباز شریف بھی ان میدان میں تازہ تازہ کودے ہیں۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ کئی ''گوریوں'' نے اپنی یادداشتوں میں پاکستانی حکمرانوں اور سیاستدانوں کے بھانڈے پھوڑے ہیں لیکن کچھ پردہ رکھنا ضروری ہے۔ایک غیر ملکی صحافی نے تاثیر سلمان کے قصے بھی اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ تو یوں فرانسیسی قوم کے ساتھ ہم پاکستانی قوم اور حکمران بھی دل پھینک ہیں!!

دہشت گردی کے بعد اب ڈالر گردی

ڈالر بیچ دوں یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ڈالر بیچ دوں یا ابھی رکھوں؟ یہ سوال پچھلے کئی دنوں سے ہر 'ڈالر' رکھنے والا کر رہا ہے۔ گھروں میں، دفاتر میں، نجی محفلوں میں شاپنگ سینٹرز میں حتیٰ کہ فون پر بھی۔۔۔ہر شخص ایک دوسرے سے مشورہ مانگ رہا ہے جن کے پاس پہلے سے ڈالر موجود ہیں وہ پوچھ رہے ہیں۔۔'ڈالر بیچ دوں کیا؟۔۔ کہیں مزید نہ 'گر' جائے۔۔۔ریٹ نہیں بڑھے تو۔۔۔؟ جن کے پاس ڈالر نہیں وہ انہیں خریدنے کے لئے 'ماہرین' سے مشورے کر رہے ہیں۔۔'ریٹ دوبارہ کب تک بڑھے گا۔۔۔؟؟ کہاں تک جائے گا۔۔۔؟؟ سوا سو روپے سے تو اوپر ہی جائے گا نہ۔۔آپ تو عرصے سے لین دین کر رہے ہیں، مشورہ دیں مارکیٹ سے مزید ڈالر 'اٹھا' لوں کیا۔ڈالر رکھنے والے پہلے روز امیر ہو رہے تھے، اب ان کی دولت میں کمی آ رہی ہے۔ درآمد کرنے والے خوشی سے بغلیں بجا رہے ہیں تو برآمد کرنے والوں کے چھکے چھوٹ رہے ہیں۔ پہلے کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اسحاق ڈار نے کیا جادو کیا ہے، اب آہستہ آہستہ سمجھ آ رہا ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ڈار فیمیلی نے اس میں بھی مال کمایا ہے، ان کو پہلے سے پتہ تھا کہ ڈالر گرے گا۔ سو انھوں نے

اپنے سارے ڈالر اونچے ریٹ پر بیچ دیئے اور اب دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں۔ بلی تھیلے سے اس وقت بر آئی جب یہ خبر عام ہوئی کہ سعودی عرب نے حکومتِ پاکستان کو ڈیڑھ ارب ڈالر کا قرض فراہم کیا ہے تاکہ حکومتِ پاکستان اپنے زرِ مبادلہ کے ذخائر کو بہتر کر سکے اور اپنے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے اور بڑے توانائی اور بنیادی ڈھانچے کے منصوبے مکمل کر سکے۔ اس قرض کی اطلاع پاکستانی حکام نے خبر رساں ادارے رائٹرز اس وقت دی جب ورلڈ بنک اور دیگر اداروں نے اس پر سوال اٹھائے۔ یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ ڈیڑھ ارب ڈالر کے بدلے ملک کی خارجہ پالیسی کا سودا تو نہیں کیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سینیٹر فرحت اللہ بابر نے تو اس بارے میں تحریک التوا سینیٹ میں جمع کرا دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ایوان میں بحث کی جائے کہ ایک اسلامی ملک نے ڈیڑھ ارب ڈالر پاکستان کو دیئے ہیں کیا اس کا تعلق شام کے بارے میں پاکستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی میں تبدیلی سے تو نہیں؟ فرحت اللہ بابر نے دعویٰ کیا ہے کہ ملک کا قرضہ 800 ارب روپے کم ہو گیا ہے کیونکہ ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت بڑھ گئی ہے اور روپے کی قیمت میں یہ اضافہ ڈیڑھ ارب ڈالر کے بیل آوٹ کے بعد ہوا ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ کیا اس کے بدلے ملک کی خارجہ پالیسی کا سودا تو نہیں کیا گیا۔ وزیر خزانہ اسحاق ڈار کا کہنا ہے کہ ایک اسلامی ملک جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا نے پاکستان کو ڈیڑھ ارب ڈالر دیئے ہیں۔ یہ رازداری بہت سارے سوالات کو جنم

دیتی ہے۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ پاکستان ڈیولپمنٹ فنڈ کا قیام کب اور کس مقصد کے لئے عمل میں لایا گیا اور کچھ عرصہ پہلے قائم کئے گئے فرینڈز آف ڈیموکریٹک پاکستان کا کیا بنا۔ ہمیں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ یہ رقم گرانٹ ہے، مدد ہے یا قرضہ ہے؟ اور اگر یہ قرضہ تو یہ کن شرائط پر حاصل کیا گیا ہے؟ کیونکہ دنیا میں ممالک کے درمیان تعلقات میں کوئی بھی چیز مفت نہیں ہوتی۔ اور یہ ایسے امور ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وزیراعظم میاں نواز شریف کے سعودی شاہی خاندان کے ساتھ دیرینہ تعلقات ہیں خاص طور پر جب سعودی شاہی خاندان نے ان کی دوسرے دورِ حکومت کے دوران فوجی بغاوت کے بعد انھیں جلاوطنی کے بعد پناہ فراہم کی۔
پرنس الولید بن طلال نے جو سعودی سرمایہ کار ہیں اور بیت السعود کے رکن ہیں نواز شریف کو 'پاکستان میں سعودی عرب کا اپنا آدمی' قرار دیا ہوا ہے۔
یاد رہے کہ ایک ڈالر پاکستانی روپے کے مقابلے میں 105.40 کی قدر سے 4 سے مارچ کے درمیان گر کر 97.40 تک پہنچ گیا جو کہ اس کی قدر میں 30 دن میں 12 سب سے تیزی سے اضافہ ہے۔ایک پاکستانی اہلکار جو اس لین دین سے باخبر ہیں نے نام نہ بتانے کی شرط پر رائٹرز کو بتایا کہ 'وزیراعظم کی ذاتی ضمانت پر سعودی عرب نے ارب ڈالر دیے ہیں جس نے پاکستانی روپے کی قدر کو سنبھالا 1.5

دیا ہے۔' دوسری جانب سعودی مرکزی بینک کے گورنر نے اس پر تبصرہ کرنے سے معذوری ظاہر کی ہے اور حکام نے اس قرض کی کوئی شرائط نہیں بتائی ہیں۔ایک اور اعلیٰ اہلکار نے جو لاہور میں رہتے ہیں کہا کہ یہ رقم ایک اکاؤنٹ میں منتقل ہوئی ہے جسے پاکستان ترقیاتی فنڈ کہا جاتا ہے جو 'دوست ممالک' جیسا کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات سے رقوم کی ترسیل کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ہمارے پاس 3 ارب ڈالر کے وعدے ہیں جن میں سے اب تک 1.5 ارب ڈالر موصول ہو چکے ہیں جبکہ ایک اور اہلکار نے کہا کہ 'حال ہی میں ہمیں 750 ملین ڈالر سعودی عرب سے موصول ہوئے ہیں۔پاکستانی وزیرِ خزانہ اسحاق ڈار نے بدھ کو اس بات کی تصدیق کی کہ 1.5 ارب ڈالر موصول ہوئے ہیں مگر اس کے بھجوانے والے کا نام نہیں بتایا۔ابتدا میں اسحاق ڈار نے ایک پریس کانفرنس میں ایک رپورٹر سے کہا تھا کہ 'آپ کیوں ہمارے دوستوں کو منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں۔ جو ممالک ہماری مدد کرتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ان کو ظاہر کیا جائے۔وزیر خزانہ نے 18 فروری کو ایک نئے فنڈ کی تشکیل کا اعلان کیا جس دن سعودی ولی عہد اور نائب وزیرِاعظم سلیمان بن عبدالعزیز نے پاکستان کے تین روزہ دورے کا اختتام پذیر ہوا تھا۔یہ بھی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ پاکستان کے نئے فوجی سربراہ جنرل راحیل شریف نے بھی اس فنڈ کی تشکیل سے دو ہفتے قبل سعودی فرمانروا شاہ عبداللہ اور اعلیٰ سعودی فوجی اہل کاروں سے ملاقات کی تھی۔دوسری اعلیٰ سطحی سعودی اہل کار جنھوں نے پاکستان کا حالیہ دنوں میں

دورہ کیا ان میں سعودی وزیرِ خارجہ سعود الفیصل اور پرنس سلمان بن سلطان شامل ہیں جو سعودی عرب کے نائب وزیرِ دفاع شامل ہیں۔ دوسری جانب عالمی مالیاتی فنڈ کے قرض کی تیسری قسط 550 ملین کی صورت میں مارچ کے آخر تک پاکستان کو موصول ہو گی جس کے بعد توقع کی جا رہی ہے کہ زرِ مبادلہ کے ذخائر 10 ارب ڈالر سے تجاوز کر جائیں گے۔ پاکستان کو 150 ملین اسلامی ترقیاتی بینک سے مارچ کے مہینے میں ملیں گے جبکہ 150 سے 200 ملین ڈالر کے قریب کولیشن سپورٹ فنڈ سے بھی موصول ہونے ہیں۔ پاکستان کو اس کے علاوہ مئی کے مہینے میں 500 ملین ڈالر مالیت کے یورو بانڈز جاری کرے گا اور اس کا منصوبہ ہے کہ نجکاری سے بھی اربوں ڈالر وصول کیے جائیں گے۔ بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے رقوم کی ترسیل میں 11 فیصد اضافہ ہوا جس کے بعد یہ اس سال مالیاتی سال کے پہلے آٹھ مہینے کے دوران 10.2 ارب ڈالر تک پہنچ گئے۔ رواں ہفتے امریکی ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قدر میں غیر متوقع طور پر خاصی بہتری دیکھی جا رہی ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق ایک امریکی ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر ایک سو کی نفسیاتی حد سے بھی نیچے آ چکی تھی۔ جس کے بعد پھر اسے سو روپے پر استحکام دیا گیا ہے۔

کرنسی مارکیٹ کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ایک امریکی ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر بہتر ہوتے ہوئے ایک سو کی نفسیاتی حد سے بھی نیچے

جانے کے بعد سو روپے پر آچکی ہے۔ عام آدمی اور ملکی معیشت پر روپے کی قدر میں بہتری کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔اس بارے میں قیاس آرائیاں جاری ہیں۔ مارچ کے اوائل تک چھوٹے.بڑے سرمایہ کار حتی کہ عام صارفین بھی ڈالرز خرید رہے تھے اور یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ اب کبھی بھی ڈالر کی قدر کم نہیں ہوگی اور یوں کمائی کی ایک آسان مگر ملکی معیشت کے حوالے سے ایک منفی روش مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ اب رواں ہفتے سے یہ رجحان خاصا بدل چکا ہے۔ مارکیٹ ذرائع کے مطابق گرچہ اب بھی کچھ بڑے مالیاتی ادارے اور سرمایہ دار شخصیات مبینہ طور پر کروڑوں ڈالر کی ذخیرہ اندوزی کیے بیٹھے ہیں مگر ڈالر کی قدر میں حالیہ کمی کے باعث صورتحال تبدیلی کی جانب گامزن ہے۔ڈالر کی قدر میں کمی یا دوسرے الفاظ میں پاکستانی کرنسی کی قدر میں حالیہ بہتری کے پیچھے حکومت کی مانیٹری پالیسیوں کو اہم قرار دیا جارہا ہے۔ یاد رہے کہ وزیر خزانہ اسحاق ڈالر چند ماہ قبل پارلیمان میں خطاب کے دوران کہہ چکے تھے کہ حکومت اس بات کو یقینی بنائے گی کہ ڈالر کو واپس اس کی حقیقی قدر یعنی ایک سو روپے سے کم کی سطح پر لایا جائے۔ غیر ملکی کرنسی کی لین دین کا کاروبار کرنے والی فاریکس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے چیئرمین ملک بوستان کے بقول وزیر خزانہ نے نجی بینکوں کے منتظمین پر اسلام آباد منعقدہ ایک ملاقات میں غیر رسمی طور پر یہ زور دیا تھا کہ وہ ڈالر کی ذخیرہ اندوزی کی حوصلہ افزائی نہ کریں بلکہ روپے میں سرمایہ کاری اور اس کی قدر میں بہتری کے

اقدامات کریں۔ ”اس وقت پوری دنیا میں پاکستان کے بینک سب سے زیادہ منافع کما رہے ہیں۔ آپ ان کا سالانہ منافع دیکھیں تو دنگ رہ جائیں گے۔ یہ اربوں روپے کما رہے ہیں۔ بینکوں کو ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور پاکستان کی فراخدلانہ پالیسیوں کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، تمام نہیں لیکن کچھ بینک اس میں ملوث ضرور ہیں“۔انتخابات کے بعد مسلم لیگ ن کی حکومت کے قیام کے وقت امریکی ڈالر 98 روپے میں خریدا جارہا تھا تاہم معاشی، سیاسی اور امن امان کی مخدوش صورتحال کے باعث ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کار بدگمان تھے اور یوں ملک کے اندر ڈالر کی آمد کم جبکہ بیرون ملک سے سامان اور خدمات کی درآمد باعث ڈالر کا اخراج زیادہ تھا۔ مبصرین کے مطابق روپے کی قدر میں بہتری کی ایک اور بڑی وجہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، ایشیائی ترقیاتی بینک اور اسلامی بینک کی جانب سے قرض کی دستیابی بھی ہے۔ وزیر خزانہ اسحاق ڈار اپنے ایک تازہ بیان میں کہہ چکے ہیں کہ مارچ کے آخر تک زر مبادلہ کے ذخائر دس ارب ڈالر تک پہنچ جائیں گے۔ وزارت مالیات سے جاری کردہ اعلامیے کے مطابق پالیسیوں میں تبدیلی کے باعث براہ راست بیرونی سرمایہ کاری کو فروغ ملا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق بڑی حدتک غیر متوقع طوپر سعودی عرب سے کسی دفاعی تعاون کے سلسلے میں سات سو ملین ڈالر کی دستیابی اور سعودی عرب سمیت عرب امارات اور کویت کو تیل کی مد میں ادائیگیوں کے وقت میں چھوٹ نے بھی پاکستانی روپے کو سہارا فراہم کیا ہے۔ واضح رہے کہ اندازے لگائے گئے

ہیں کہ محض سعودی عرب کی جانب سے خام تیل کی مد میں ادائیگیوں میں نرمی سے پاکستان کو ماہانہ پانچ سو ملین ڈالر تک کی بچت ہو رہی ہے۔امید کی جا رہی ہے کہ ڈالر کی قدر میں کمی کے اثرات عام صارفین تک دیر سے ہی صحیح مگر پہنچیں گے ضرور۔ اس کی ایک سادہ مثال پٹرولیم کی قیمتوں میں فی لٹر پانچ سے دس روپے تک کی کمی کی صورت میں سامنے آ سکتی ہے جو مجموعی طور پر تمام اقتصادی ڈھانچے کے لیے ایک خوشگوار جھونکے کی مانند ہو گی۔ بظاہر ڈالر کی قدر میں کمی کے باعث پاکستانی مصنوعات بیرون ملک برآمد کرنے والے نقصان میں ہیں۔ ذرائع کے مطابق ایکسپورٹرز حکومت پر دباؤ ڈالیں گے کہ ڈالر کی قدر کو مستحکم کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔ ان تمام تر عوامل کے باوجود روپے کی قدر میں موجودہ بہتری چونکہ صنعتی یا اقتصادی ڈھانچے میں ٹھوس بہتری کی بنیادوں پر قائم نہیں اسی لیے مستقبل میں روپے کی قدر اور پاکستانی معیشت کے حوالے سے یک دم بہت زیادہ خوش گمانی لا معنی ہے۔ روپے کی قدر میں اضافہ کیسے ہوا، ایک تو اسحاق ڈار کا عزم داد کا مستحق ہے، دوسرے زر مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ، تیسرے جی ایس پی پلس کا فیصلہ، چوتھے میاں شہباز شریف کے غیر ملکی پھیرے جن کی وجہ سے بیرونی سرمایہ کار پاکستان کا رخ کرنے پر آمادہ ہو گئے، پانچویں سعودی عرب اور کویت سے چند ماہ کی تاخیر سے ادائیگی کی شرط پر پٹرول کی فراہمی کی بات چیت کا آغاز، سونے کی برآمد پر پابندیاں، تھری جی اور فور جی ٹیکنالوجی کی نیلامی کا فیصلہ، ماہ رواں میں حکومت کو کسی قرضے کی

ادائیگی بھی نہیں کرنی، آئی ایم ایف کی طرف سے معاشی شرح نمو میں 2.8 کی جگہ 3.1 کے اضافے کی پیش گوئی، بجلی اور گیس کی سپلائی کو متوازن رکھنے کی حکومتی کوشش، سعودی عرب کی طرف سے ڈیڑھ ارب ڈالر کے قرضے یا گرانٹ کی فراہمی کا وعدہ۔اور یہ بھی پہلی دفعہ ہے کہ ڈالر کو کنٹرول کرنے کے لئے اسٹیٹ بنک نے دخل اندازی نہیں کی۔یہ سارے عوامل بھی کارگر ہوئے ہیں۔ لیکن امن ومان کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ مذاکرت کی سمت پیش رفت اہم قدم ہے۔ اگر ملک میں دہشت گردی کا بازار گرم رہتا ہے تو کسی بھی معاشی تبدیلی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ تاجر کہتے ہیں کہ ان کی نظر حالات پر ہے جو عالمی سطح پر رونما ہو رہے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان پر ڈالروں کی بارش ہو رہی ہے اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کی امریکی، جاپانی، فرانسیسی ،برطانوی، آسٹریلوی وزیر اعظم یا صدر یا جرنیل اسلام آباد یا پشاور کے دورے پر نہ اترتا ہو۔پاکستان کی جیو اسٹریٹجیک اور سفارتی اہمیت ہمارے حوصلوں کو مہمیز بخشتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ڈالر اور ڈار کے بھونچال نے بڑے۔بڑوں کی پھرکیاں گھما دی ہیں۔کچھ کہتے ہیں کہ ڈالر کی قیمت میں اضافہ مصنوعی تھا۔اب 'مصنوعی بحران تو ختم ہو رہا ہے۔۔۔یہ جو بار بار ریٹ بڑھ رہے تھے اور ڈالر کے مقابلے میں روپیہ نیچے آرہا تھا۔۔وہ 'اچھال' مصنوعی تھا، ڈالر اصل ریٹ پر تو اب آیا ہے۔ تجزیہ نگار مزمل اسلم کہتے ہیں کہ 'پاکستان کے پاس دو ارب ڈالر آجانے کے بعد یہ صورتحال پیدا ہوئی ہے۔ عوام کے پاس اربوں روپے مالیت

کے ڈالر ہیں جو سارے کے سارے رولنگ میں آ گئے تو صورتحال مزید خراب بھی ہو سکتی ہے۔'کراچی اسٹاک ایکسچینج، کاٹن ایکسچینج، اسٹیٹ بینک آف پاکستان، کرنسی ڈیلرز کے دفاتر، ٹاور، بولٹن مارکیٹ اور چندریگر روڈ پر واقع ملکی اور غیر ملکی بینکوں کے آس پاس آنے جانے والوں لوگوں آج کل سب سے زیادہ جس موضوع پر بات ہوتی ہے وہ ڈالر' ہی ہے۔ایک خاتون پریشان ہیں کہ ڈالر اور کم نہ ہو جائے۔ان کا کہنا تھا کہ ' انہوں نے 93 روپے فی ڈالر کے حساب سے ڈالرز خریدے تھے۔ماہر کرنسی ڈیلرز کا کہنا ہے کہ ڈالر صرف پاکستانی کرنسی میں ہی کم نہیں ہوا بلکہ کرنسی کے کاروبار سے جڑے ماہرین کے بقول پورے ایشیائی خطے کی مارکیٹوں میں بھی ڈالر کو دھچکا لگا ہے، جبکہ یورپ انگلینڈ اور مشرق وسطی میں صورتحال کم و بیش ایسی ہی ہے۔ بھارت میں ڈالر کی قدر میں دو اعشاریہ آٹھ فیصد کمی ہوئی اور بھارتی روپیہ گذشتہ سات ماہ کی بلند ترین سطح پر آ گیا۔بنگلا دیش کے ٹکہ میں بھی ڈالر کے مقابلے میں ایک فیصد اضافہ ہوا ہے۔ حیرت انگیز طور پر عوامی رد عمل یہ ہے کہ ڈالر کم ہوا تو ان کا ذاتی نقصان ہوگا، یہ سوچ کم ہے کہ اس سے کم آمدنی والوں کو کتنا فائدہ ہوگا۔ یا یہ چیز کس حد تک اپنے لئے نہیں پوری عوام کے لئے فائدہ مند ہے، معیشت کے لئے یہ صورتحال کتنی سود مند ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈالر گرنے سے پیٹرول، ڈیزل اور فرنس آئل سمیت تمام پیٹرولیم مصنوعات کے نرخ کم ہونے چاہیئے۔ ایک اور غور طلب پہلو یہ ہے کہ عوام کو یہ امید ہی نہیں کہ بین

الاقوامی مارکیٹ میں ڈالر کے ریٹ کم ہوئے تو ہمارے ملک میں مہنگائی ختم اور سستائی' بڑھ جائے گی۔ سیاسی مبصرین کو یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہونے وال، عوام کو' کبھی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ عوام اب بھی پیٹرول خوردنی تیل، اور دیگر چیزوں کے نرخ میں کمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ دہشت گردی سے پسے عوام اب ڈالر گردی کی لپیٹ میں ہیں۔ اس لئے لوگ ڈالر کے بڑھنے یا 'گرنے' کو میں عوام کیا کیا ہوگا۔ اس بارے میں کون بتائے۔

دنیا بدل رہی ہے

سائنس کی دنیا میں حیرت اب کم ہی ہوتی ہے۔ دنیا برق رفتاری سے اپنا سفر کر رہی ہے اور سائنس کی حیران کن ایجادات اب انسان کو ایک نئی دنیا کی سیر کرا رہی ہیں۔ کیا پہلے آپ سوچ سکتے تھے کہ ایک پلک کی جنبش سے تصویر کھینچ لی جائے۔ لیکن اب یہ ممکن ہے۔ اب چھلکتی روشنی والا لیمپ بھی آگیا ہے۔ جس سے آپ روشنی کو مختلف زاویے دے کر اپنے کمرے کو چار چاند لگائیں.

ہنگری سے تعلق رکھنے والے تخلیق کار Peter Torony نے ایک ایسا لیمپ تخلیق کیا ہے، جس میں سے چھلکنے والی روشنی سورج گرہن کی منظر کشی بھی کر سکتی ہے۔ چارج ایبل بیٹری کی مدد سے روشن رہنے والے اس لیمپ کی بنیادی شکل فٹ بال جیسی ہے۔ تاہم یہ گولائی تین مختلف ٹکڑوں یا حصوں کا مجموعہ ہے، جس میں ایک درمیانی یا مرکزی حصہ ہے، جس کی دائیں اور بائیں جانب دو ڈھلوانی حصے ہیں۔ یہ دونوں حصے یا ٹکڑے درمیانی حصے میں موجود لوہے کی پلیٹ سے مقناطیس کی مدد سے جوڑے گئے ہیں۔ ان دونوں حصوں اور مرکزی حصے کے درمیان خلا یا ''درز'' رکھی گئی ہے۔ اس خلا یا Gap کے باعث ان دونوں حصوں کو انگلیوں کی مدد سے

مختلف سمتوں میں بہ آسانی حرکت دی جا سکتی ہے۔ اس حرکت دینے کے عمل کے دوران لیمپ کے درمیانی حصے اور دونوں جانب موجود حصوں سے روشنی دکھائی نہیں دیتی۔
تاہم دونوں حصوں اور مرکزی حصے کے درمیان میں موجود خلا سے روشنی کا اخراج ہوتا ہے اور یہی روشنی کا اخراج اس لیمپ کا طرہ امتیاز ہے۔ مختلف زاویوں سے نظر آنے والی یہ روشنی دیکھنے والے کو حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔
بلب لگائے گئے ہیں، جس کے ساتھ LED واضح رہے کہ لیمپ کے درمیان 5 واٹ کے دو بیٹری بھی موجود ہے۔ لیمپ عمدہ پولی میر مادے سے بنایا گیا ہے۔ کمرے میں روشنی پھیلانے کے بجائے روشنی کو مقید کرنے کے بعد خوب صورت زاویوں سے چھلکانے والے اس لیمپ کو بہ آسانی لٹکایا بھی جا سکتا ہے اور کسی ہموار سطح پر رکھ کر کمرے کی خوب صورتی میں چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔

اسپرنگ بیٹری

برقی آلات میں اب دو کی جگہ چار بیٹریاں بہ آسانی سما سکتی ہیں.

روزمرہ کی زندگی میں برقی آلات کے لیے بیٹریوں کا استعمال لازم و ملزوم ہے۔ اس حوالے سے مختصر جگہ گھیرنے والی بیٹریوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ اسی سوچ کو مد نظر رکھتے ہوئے چین کے نوجوان طالب علموں نے ایک ایسی بیٹری تشکیل دی

ہے، جس کی شکل دیکھنے میں میکینکل اسپرنگ جیسی ہے۔ اس بیٹری کو بہ آسانی برقی آلات میں بیٹری لگانے کے مختلف سائز کے خانوں میں لگایا جاسکتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اگر ایک اسپرنگ بیٹری کی قوت مدھم ہونے لگے تو بیٹری کی پھیلنے اور سکڑنے کی سہولت کے باعث اس کے ساتھ دوسری اسپرنگ بیٹری لگا کر آلے کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یعنی دو بیٹریوں کی جگہ کی گنجائش میں بہ آسانی چار بیٹریوں سے دیر تک کام لیا جاسکتا ہے۔ تین طالبات ہینگ کن، مینگ ٹرن، ہی تنگ اور ایک طالب علم لیویان کی اس کاوش کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

لپیٹا جانے والا چولہا

جسے کھانے کے برتن پر لپیٹیں اور پھر گرما گرم کھانا کھائیں

سیر سپاٹے کے دوران کھانا گرم کرنا ایک دقت طلب مسئلہ ہے۔WrapStove بالخصوص ساحلی مقامات پر تو تیز ہوا آگ جلنے ہی نہیں دیتی۔ تو پھر جناب ! کیا کیا جائے ؟

پریشان مت ہوئیے۔ اس مشکل صورت حال کا حل ایک ایسے پٹی نما چولہے کی شکل میں سامنے آچکا ہے جس کو آپ بہ آسانی پتیلی یا کسی بھی برتن پر باہر کی

جانب لپیٹ کر حسب مرضی کھانا گرم کر سکتے ہیں۔ اس تخلیق کے موجد ''وان چول ہانگ'' کا کہنا ہے کہ ان کے اس چولہے یا گرم پٹی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پٹی کو پتیلی کی بیرونی سطح Wrapstove مقناطیس کے چھوٹے ٹکڑے لگائے گئے ہیں، جو سے چپکائے رکھتے ہیں۔ جب کہ درج؟ حرارت کو کنٹرول کرنے کے لیے پٹی میں ٹچ اسکرین رکھی گئی ہے، جس میں موجود کنٹرول پینل سے پٹی کو اپنی سہولت کے مطابق استعمال کیا جاسکتا ہے۔

بعد ازاں اسے تہہ کرکے سفری بیگ میں رکھا جاسکتا ہے۔ لچک دار چارج ایبل بیٹری کی سہولت سے آراستہ اس چولہے میں پولی مر مادے سے بنی لچک دار حرارتی تہہ لگائی گئی ہے، جو چولہے میں ہیٹر کا کام دیتی ہے۔ یہ پٹی نما چولہا (Heating Film) سیاحوں میں تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔

الٹی چھتری

چھتری بند ہونے پر پانی ٹپکنے کے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا گیا

عموماً بارش کے دوران چھتری استعمال کرنے والے جب کسی خشک جگہ پر پہنچتے ہیں اور چھتری بند کرتے ہیں، تو اس میں سے ٹپکنے والی بوندیں اس جگہ کو گیلا کر دیتی ہیں، اور اگر ایسے میں فرش پر قالین وغیرہ بچھا ہو تو صورت حال

مزید خراب ہو جاتی ہے۔

اس نامناسب صورت حال سے نکالنے کے لیے جنوبی کوریا کے ڈیزائنروں نے ایک ایسی چھتری ڈیزائن کی ہے جس کا بیرونی گیلا حصہ چھتری کو بند کرتے وقت اندر کی جانب چلا جاتا ہے اور اس طرح بوندوں کی شکل میں گرنے والا پانی فرش پر یا استعمال کنندہ کے کپڑوں پر نہیں گرتا۔ اس مقصد کے لیے تینوں ڈیزائنرز آہان مو، کم تی ہان اور سیو ڈانگ ہان نے چھتری کھولنے اور بند کرنے والی تیلیوں کو عام استعمال کی تیلیوں کے برعکس زیادہ لچک دار بنایا ہے۔

ڈیزائن کے مطابق اس چھتری کو بند کرتے ہوئے عام استعمال کی چھتریوں کے برعکس جب چھتری بند کرنے کے لیور کو اوپر سے نیچے کی جانب لایا جاتا ہے، تو چھتری کے اوپری حصے پر لگائی گئی تیلیاں اندر کی جانب سمٹتے ہوئے بیرونی گیلے حصے کو اندر کی جانب بند کر دیتی ہیں۔ اسی انوکھی خصوصیت کے باعث چھتری کو "الٹی چھتری" کا نام دیا گیا ہے

سائنس نے انسانی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اور یقیناً اگر ترقی کی یہی رفتار برقرار رہی تو اگلے پانچ سے دس سال میں بہت کچھ مزید بدل جائے گا۔ ایک وقت تھا جب ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر نے ہر جگہ دھوم مچا رکھی تھی تاہم

امریکہ سمیت بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر اب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ ڈیجیٹل الیکٹرانکس کے اسٹوروں میں اب ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر کا شاہد ہی کوئی پیس نظر آجائے کیونکہ ان کی جگہ لے لی ہے لیپ ٹاپ کمپوٹرز نے۔ لیپ ٹاپس کے اکثر نئے ماڈلز میں استعمال کیا جانے والا مائیکروپراسسر ڈیسک ٹاپ کے مقابلے میں طاقت، ریم میموری اور ہارڈ ڈسک بھی نمایاں طور پر زیادہ ہے۔ گرافک کارڈ بہتر ہیں اور انٹرنیٹ کے لیے زیادہ قوت کے وائی فائی استعمال کیے گئے ہیں۔

لیب ٹاپ کے اکثر نئے ماڈلز کو ڈیسک ٹاپ کے متبادل کا نام دیا جا رہا ہے۔ قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پانچ سو سے سات سو ڈالر میں آپ ایک ایسا لیپ ٹاپ لے سکتے ہیں جو آپ کو ڈیسک ٹاپ کی ضرورت سے بے نیاز کر سکتا ہے اور آپ جس جگہ چاہیں، آرام سے بیٹھ کر اپنا کام کر سکتے ہیں۔ بجلی کے کنکشن کا جھنجھٹ اور نہ انٹرنیٹ کی تار لگانے کی ضرورت۔ نئے طاقت ور لیپ ٹاپ وزن میں ہلکے ہیں، ان کی بیٹری دیر تک چلتی ہے یعنی آپ چھ سے آٹھ گھنٹے تک بیٹری چارج کیے بغیر کام کر سکتے ہیں۔ اب ایسے لیپ ٹاپ بھی دستیاب ہیں جن کی بیٹری پندرہ گھنٹوں تک چلتی ہے۔ ایک طرف جہاں ڈیسک ٹاپ کی جگہ لے رہا ہے لیپ ٹاپ تو دوسری طرف لیپ ٹاپ کی بقا بھی خطرے میں پڑی ہوئی ہے۔

چار پانچ سال پہلے لیپ ٹاپ کے مقابلے میں نیٹ بک متعارف ہوئی تھی۔ یہ ہلکا پھلکا لیپ ٹاپ ایسے لوگوں کے لیے تھا جو زیادہ تر انٹرنیٹ پر رہتے ہیں۔ نیٹ بک کے بعد کے ماڈلز کو لیپ ٹاپ کا متبادل بنانے کیلئے ان میں طاقت ور مائیکرو پراسیسر، زیادہ ریم میموری اور بڑی ہارڈ ڈیسک لگائی گئی۔ نیٹ بک ابھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی رہی تھی کہ اس پر شب خون مارا ایپل نے آئی پیڈ کی شکل میں۔ آئی پیڈ ایک طرح سے نیٹ بک ہی ہے، مگر اس کا وزن کم تھا، کارکردگی بہتر تھی، بیٹری زیادہ چلتی تھی اور دیکھنے میں کہیں زیادہ جاذب نظر تھی۔ آئی پیڈ کی نقل میں بہت سی ڈیجیٹل کمپنیاں بھی اسی طرح کے اپنے کمپیوٹر مارکیٹ میں لے آئیں۔ امریکی مارکیٹوں میں اب نیٹ بک ڈھونڈے سے ہی کہیں دکھائی دیتی ہے اور ہر جگہ اپنے جلوے دکھا رہے ہیں آئی پیڈ طرز کے منی کمپیوٹر۔ منی کمپیوٹرز کی اس نئی نسل نے صرف نیٹ بک اور روایتی لیپ ٹاپ کو ہی اپنا نشانہ نہیں بنایا بلکہ الیکٹرانک بک ریڈرز بھی اس کی زد میں آ گئے کیونکہ وہ اپنی شکل وشبہات اور حجم میں بک ریڈرز سے بہت قریب ہیں، جس پر آپ ڈیجیٹل کتابیں پڑھنے کے ساتھ کمپیوٹر کی سہولت کا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ان منی کمپیوٹرز یا لیپ ٹاپس کی بہتات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ بک ریڈر جو چند سال پہلے تک چار پانچ سو ڈالر میں ملتا تھا، اب ایک سو ڈالر سے کم میں بھی دستیاب ہیں مگر کوئی خریدار نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی جگہ لینے کا یہ سلسلہ ابھی تھما نہیں ہے۔

آئی پیڈ طرز کے کمپیوٹرز کو اب نگل رہا ہے سمارٹ موبائل فون۔ گذشتہ دو برسوں کے دوران سمارٹ فونز کے سائز نمایاں طور پر بڑے ہو چکے ہیں۔ اور مارکیٹ میں پانچ سے سوا پانچ انچ سائز کے فونز عام فروخت ہو رہے ہیں۔ ان میں طاقت ور مائیکرو پراسیسر نصب ہیں۔ نئی نسل کے کئی سمارٹ فونز اب ڈبل کور پراسیسرز کے ساتھ آ رہے ہیں اور ان ریم میموری دو جی بی ہے جب کہ قابل استعمال میموری سولہ سے بتیس جی بی ہے جب کہ ان میں چونسٹھ جی بی فلیش میموری کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ گویا ایک طرح سے آپ کے پاس چھیانوے جی بی ہارڈ ڈسک موجود ہے جو نیٹ بک اور آئی پیڈ ٹائپ منی کمپیوٹرز سے کہیں زیادہ ہے۔ ان میں این ٹائپ طاقت ور وائی فائی انٹرنیٹ اور جی فور کی سہولت فراہم کی گئی ہے جس سے اس کی انٹرنیٹ کارکردگی ایک اچھے اور معیاری لیپ ٹاپ جیسی بن گئی ہے۔ ان سمارٹ فونز میں دو کیمرے فراہم کیے گئے ہیں۔ سامنے کے رخ ویڈیو چیٹنگ کے لیے تقریبا دو میگاپیکسلز کا کیمرہ لگایا گیا ہے جب کہ پیچھے کی جانب آٹھ میگاپیکسلز کا زوم کیمرہ ہے، جو نہ صرف معیاری تصویر اتارتا ہے بلکہ 1080 ایچ ڈی ویڈیو فلم بھی بنا سکتا ہے۔ بعض ماڈلز میں سولہ میگاپیکسلز کے کیمرے نصب ہیں۔

نئے سمارٹ فونز کے کیمروں میں کئی ایسے فنکشنز بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو

اس سے پہلے صرف اعلی معیار کے پروفیشنلز کیمروں میں ہی ملتے تھے۔ نئے سمارٹ موبائل فونز اب لیپ ٹاپ کی ہائی ریزلوشن سکرین کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس طرح سمارٹ فونز کی نئی نسل، صرف فون ہی نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت ایک طاقت ور منی کمپیوٹر بھی ہے، ایک معیاری سٹل اور ویڈیو کیمرہ بھی ہے، ایک ڈیجیٹل بک ریڈر بھی ہے، ایک جدید جی پی ایس بھی ہے جس سے آپ راستے معلوم کر سکتے ہیں اور اس کے سیٹلائٹ لنک کے ذریعے سڑکوں پر ٹریفک کی تازہ ترین صورت حال سے بھی باخبر رہ سکتے ہیں۔ نئے سمارٹ فونز میں ٹی وی کی سہولت بھی موجود ہے اوران پر آپ اپنی پسند کے ٹی وی چینلز لائیو دیکھ سکتے ہیں۔ گویا ایک فون میں کئی ڈیجیٹل آلات کی خصوصیات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اکثر تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ آج ہمارے زیر استعمال بہت سے سائنسی آلات آئندہ پانچ سے دس برسوں میں روزمرہ زندگی سے نکل جائیں گے اور ان سب کی جگہ لے لے گا ایک سمارٹ فون، جو کمپیوٹر سے لے کر گھر کے الیکٹرانک آلات کو کنٹرول کرنے والے ریموٹ تک کی بجائے استعمال کیا جانے لگے گا

جدید عینک جو پل بھر میں تصویر کھینچ لے۔

گوگل کمپنی کی جدید ترین عینک کے ذریعے صرف پلک کی ایک جنبش سے تصویر کھینچی اور ویڈیو اپ لوڈ کی جا سکتی ہے۔ اس ہائی ٹیک چشمے سے پیغام بھیجنے، رابطہ کرنے اور زبانی ہدایات کے ذریعے بہت سے دوسرے کام بھی ممکن ہو سکیں

گے۔ کمپنی کے مطابق گوگل گلاس نامی اس ہائی ٹیک چشمے میں ایسی نئی خصوصیات متعارف کروائی گئی ہیں، جن سے ذاتی معلومات اور پرائیویسی بھی برقرار رہے گی۔ گوگل نے ان عینکوں میں ایک انتہائی جدید آلہ لگایا ہے، جو ہمہ وقت انٹرنیٹ سے منسلک رہتا ہے۔ کمپنی کے سوشل نیٹ ورکنگ کے پیج گوگل پلس پر لکھا ہے، ’’ہم نے ایسا سافٹ ویئر تیار کیا ہے، جس کی مدد سے آپ صرف پلک جھپک کر اپنے یادگار لمحوں کو بہت آسانی سے قید کر پائیں گے، اس بیان میں مزید لکھا ہے، ’’ہم تصویر لینے سے شروع کر رہے ہیں لیکن ذرا سوچئے کہ ہم اس سے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔‘‘ بیان کے مطابق گوگل اُس جگہ تک پہنچنا چاہتا ہے، جہاں یہ چشمہ پہننے والا صرف ٹیکسی کے میٹر کی ریڈنگ کو دیکھ کر اپنی آنکھ کو حرکت دے تو کرایہ کی ادائیگی ہو جائے۔ اگر کسی دکان میں کوئی چیز پسند آ جائے تو صرف پلک جھپک کر اُسے خریدا جا سکے۔ یہ ٹیکنالوجی جتنی آسان لگتی ہے، استعمال کرنے والے کی ذاتی معلومات سے متعلق اتنے ہی بڑے خطرے بھی لے کر آئی ہے۔ ذاتی ڈیٹا سے متعلق خطرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس چشمے کے سافٹ ویئر میں بہتری لائی گئی ہے۔ اب اس چشمے کا مالک ایک مخصوص کوڈ کے ذریعے اسے مقفل کر پائے گا۔ لاک کرنے کی سہولت کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر کسی کو صحیح کوڈ نہیں پتہ تو وہ عینک کا غلط استعمال بھی نہیں کر پائے گا۔ گوگل گلاس کے نئے سافٹ ویئر میں ایسی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں کہ چشمہ پہننے والا کسی بھی ویڈیو کو براہ راست یوٹیوب پر اپ لوڈ کر سکے گا۔ فیس بک اور

ٹوئٹر سمیت کئی کمپنیوں نے بھی گوگل گلاس کے لیے خصوصی ایپلیکشن بنائی ہیں لیکن ان ایپس تک صرف اُن سافٹ ویئر ڈویلپرز اور مخصوص یوزرز کو رسائی حاصل ہے، جو گوگل گلاس کے لیے پندرہ سو ڈالر (تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے) ادا کر چکے ہیں۔اس ہائی ٹیک عینک سے تصویر کھینچنے، ویڈیو بنانے، پیغام بھیجنے، رابطہ کرنے اور بول کر دی گئی ہدایات کے ذریعے بہت سے دوسرے کام بھی ممکن ہو سکیں گے۔ یہ آلہ وائی فائی کے ذریعے انٹرنیٹ یا موبائل کے نیٹ ورک سے بھی منسلک کیا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ خریداری کرنے یا کسی بھی جگہ کے موسم کی تازہ معلومات سے لے کر ویڈیو گیمز کھیلنے میں بھی اس چشمے کا استعمال ہو سکتا ہے۔ کمپنی کی طرف سے گوگل گلاس کو مارکیٹ میں لانچ کرنیکے لئے ابھی کوئی دن تو مقرر نہیں کیا گیا ہے لیکن قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں کہ اس سال یہ ہائی ٹیک چشمہ عام شہریوں کے لیے مارکیٹ میں دستیاب ہوگا۔

ستارہ شماری، جدید ترین یورپی دوربین کے ذریعے یورپی اسپیس ایجنسی کی جانب سے جمعرات کے روز ایک بلین ڈالر سے زائد مالیت کے ایک پروجیکٹ کے تحت ایک انتہائی جدید دوربین خلا میں روانہ کی جا رہی ہے، جس کا مقصد ملکی وے کہکشاں کا سہ جہتی نقشہ تیار کرنا ہے۔اس دوربین کے ذریعے حاصل شدہ تھری ڈی ماڈل سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ملکی وے کہکشاں میں زمین اور نظام شمسی کس جگہ پر قائم ہیں۔ اس دوربین کو سویوز ایس ٹی بی فریگٹ راکٹ کے ذریعے

نامی اِس دوربین کو عرف عام میں (Gaia) فرانسیسی گنی سے روانہ کیا جائے گا۔ گائیا ڈسکوری مشین' یا 'دریافتی آلہ' کہا جا رہا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اس دوربین' سے حاصل شدہ ماڈل ملکی وے میں زمین کی پوزیشن کے حوالے سے سابقہ اندازوں کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اس دوربین کی تیاری پر ایک اعشاریہ دو بلین ڈالر لاگت آئی کے مطابق گائیا کی ممکنہ دریافتیں انوکھی اور سائنسی اعتبار ESA ہے۔ یورپی خلائی ایجنسی سے انتہائی اہمیت کی حامل ہوں گی۔ اس دوربین کا ایک اہم ہدف ملکی وے کہکشاں میں موجود ستاروں میں سے ایک فیصد یا تقریباً ایک بلین ستاروں کی پوزیشن کا پتا چلانا ہے۔ دوربین کے اس کام کو 'اسٹرونومیکل سینسس' یا 'ستارہ شماری' قرار دیا گیا ہے۔ فرانسیسی سائنسدان فرانکوئس مگرانڈ کے مطابق دو برسوں کے عرصے میں آسمان کی ایک بہتر تصویر انسان کے سامنے ہو گی۔ اس پروجیکٹ پر ایک ارب ڈالر سے زائد لاگت آئی ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل سن 1989 میں یورپ کی جانب سے ہیپر کوس نامی ایسا ہی ایک مشن روانہ کیا گیا تھا، جس پر اس وقت کے جدید ترین آلات نصب تھے۔ اس دوربین نے چار برس تک کام کیا اور مجموعی طور پر ایک لاکھ اٹھارہ ہزار ستاروں کی پوزیشن اور تصاویر انسان کو مہیا کیں۔ آج بھی اس مشن سے حاصل شدید تصاویر کو سائنسدان اور خلانورد استعمال کرتے ہیں۔ گائیا دوربین چھ جہتوں کی حامل ہے، جب کہ اس میں نصب آلات ہیپر کوس کے مقابلے میں دو سوگنا زیادہ حساس کی ویب سائٹ کے مطابق اگر ہیپر کوس کے ذریعے چاند پر ESA ہیں۔

موجود کسی خلانورد کا قد ناپا جا سکتا تھا، تو گائیا کے ذریعے اس کی انگلی کے کسی ناخن تک کی بھی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ دوربین سورج سے 150 نوری سال کے فاصلے پر موجود تقریباً پچاس ہزار اجرام فلکی کو دریافت کر پائے گی۔ سائنسدانوں کے مطابق اس دوربین کو مریخ اور مشتری کے درمیان پہنچایا جائے گا اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہو گا کہ یہ اُن خلائی چٹانوں کا پتا چلائے جو کسی وقت زمین کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس دوربین کی مدد سے تباہ ہوتے ستاروں کا ریئل ٹائم نظارہ بھی کیا جائے گا اور 'بُجھ جانے والے ستاروں' پر بھی نگاہ رکھی جا سکے گی۔ سائنسدانوں کے مطابق اس دوربین کے ذریعے آئن اسٹائن کے عمومی نظریہ اضافیت کی جانچ بھی ممکن ہو گی۔ عمومی نظریہ اضافیت کے مطابق کسی بڑے آبجیکٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے روشنی کے انعکاس کی وجہ سے کسی ستارے کی پوزیشن میں دیکھنے والے کے لیے معمولی فرق پیدا ہوتا ہے۔

چین نے اپنا ایک روبوٹ مشن کامیابی کے ساتھ چاند کی سطح پر اتار دیا ہے۔ اس طرح چین، امریکا اور سابقہ سوویت یونین کے بعد چاند پر ایسا کوئی کامیاب مشن اتارنے والا تیسرا ملک بن گیا ہے۔ ایک تجربہ گاہ میں ایک تاریک آڈیٹوریم میں تقریباً ڈھائی سو چینی نوجوان ایک پروجیکٹر سے برآمد ہو کر سکرین پر پڑنے والی نیلی روشنی اور نمودار ہوتی تصاویر اور الفاظ کو بغور

دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ چین کے لونر پروجیکٹ کے بانی اویانگ زی ژوان کی ملک کے خلائی پروگرام کے مستقبل سے متعلق گفتگو کو انہاک سے سن رہے تھے۔ایک ایسے وقت پر کہ جب امریکا اور دوسرے ممالک خلائی پروگرامز کے اخراجات کی مد میں نمایاں کمی کر رہے ہیں، چین اس شعبے میں زیادہ سرمایہ کاری کر کے خود کو ایک ابھرتی ہوئی سپر طاقت کے طور پر منوانا چاہتا ہے۔ یہ کچھ ایسا ہی ہے، جیسا امریکا اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے زمانے میں تھا۔ تب خلائی تحقیق کے شعبے میں سنگ میل عبور کرکے دونوں ممالک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ چین میں خلائی شعبے میں بہت زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ بیجنگ حکومت نوجوانوں کی دلچسپی خلائی شعبے کی جانب مبذول کرانے کے لیے اپنے گزشتہ روور مشنز چانگ ای ون اور چانگ ای ٹو سے حاصل کردہ تصاویر، ماڈلز اور خلائی راستوں کو مختلف سیمنارز اور ورکشاپس میں دکھا رہی ہے۔ ہفتے کے روز چاند کی سطح پر اترنے والے نئے روبوٹ مشن چانگ ای تھری جیڈ ربیٹ سے حاصل کردہ تازہ تصاویر بھی سامنے لائی جا رہی ہیں اور کچھ ایسی خیالی تصاویر بھی دکھائی جا رہی ہیں، جن میں چاند کی سطح پر ایک خلانورد نظر آ رہا ہے، جو وہاں سرخ چینی پرچم گاڑ رہا ہے۔رواں ہفتے بیجنگ میں معروف چینی سائنسی ویب سائٹ گوکر کی جانب سے نوجوانوں کے ساتھ 78 سالہ اویانگ زی ژوان کی اس ملاقات کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اویانگ زی ژوان چینی خلائی پروگرام کے سابق سربراہ ہیں۔ان کا کہنا تھا، ’کمیونسٹ پارٹی کی

سینٹرل کمیٹی ہماری بھرپور حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ ہم چاند سے بھی آگے بڑھیں۔ چین پہلے ہی ڈیپ اسپیس ایکسپلوریشن کی اہلیت کا حامل ہے۔' ان کا کہنا تھا کہ چین پورے نظام شمسی کو مسخر کرے گا۔ چین میں زیادہ تر افراد چاند کی جانب اس جست کو پوری قوم کے لیے قابل فخر سمجھتے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ اس معاملے میں چین امریکا کے شانہ بشانہ کھڑا ہے۔ بیجنگ میں قائم انٹرنیشنل اسپیس انسٹیٹیوٹ کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر ماؤریسیو فلانگا کے مطابق، 'مغربی خلائی سائنسدان یہ بات جانتے ہیں کہ چین خلا کو مسخر کرنے کی اہلیت کا حامل ہے اور اسی لیے وہ چینی سائنسدانوں اور خلائی پروگرام کا تعاون چاہتے ہیں۔' ان کا کہنا ہے کہ چینی سمجھتے ہیں کہ وہ امریکا اور روس کے مدمقابل کھڑے ہیں اور ایک عالمی طاقت بننے کو ہیں۔ واضح رہے کہ سن 2010 میں چین نے پہلی مرتبہ ایک انسان کو خلا میں بھیجا تھا جب کہ وہ سن 2020 تک زمینی مدار میں گردش کرنے والا اپنا ایک مستقل خلائی اسٹیشن قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہی وقت ہے کہ جب امریکا، روس، جاپان، کینیڈا اور یورپ کے خلائی اسٹیشنز اپنی مدت پوری کرکے ریٹائر ہو جائیں گے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امریکا نے خلائی تحقیق کے شعبے میں ناسا کو مہیا کیے جانے والے سرمایے میں نمایاں کمی کر دی ہے۔

کہ سید کھری بات کہتا ہے اس زمانے میں۔

سید منور حسن میں ایک ہی خرابی ہے۔ وہ صاف اور کھری بات کہتے ہیں، لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ وہ زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتے تھے، سید صاحب چینلز پر ہوں یا جلسہ یا پریس کانفرنس وہ اخبار میں سرخیاں اور چینلز کی بریکنگ نیوز بن جاتے، انھوں نے دینی جماعتوں کے اتحاد کے نام پر ذاتی سیاست اور مال بٹورنے والے مولانا کو سیاست میں ناک آوٹ ہی نہیں کیا بلکہ ان کی سیاسی ساکھ بھی تمام کردی۔ اب وہ زیرو ہیں۔ فوج سے جماعت اسلامی کے تعلق کو فاصلہ ہی نہیں دیا بلکہ ان سے ڈٹ کر اختلاف بھی کیا۔ ان کی سادگی، سچائی، دینداری اور کھرا پن ان کے مخالفین کو ہضم نہیں ہوتا۔ لیکن سارا پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا گواہ ہے کہ سید کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے، انھوں نے آج اس ذمہ داری اور امانت کا بار بھی سراج الحق کو سونپ دیا۔ جو خود بھی ایک درویش ہے، وہ وزیر رہتے ہوئے بھی عام آدمی کی طرح رہتا ہے، اس کے پاس نہ گارڈ ہیں نہ پولیس کی ہٹو بچو والی گاڑیاں، آج سراج الحق کو آئندہ 5 سال کے لئے نیا امیر منتخب کرلیا گیا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے دامن میں کیسے کیسے ہیرے، جواہر موجود ہیں۔ نو منتخب امیر جماعت اسلامی سراج الحق 7 اپریل کو اپنے عہدے کا حلف اٹھائیں گے۔ سید مودودی اور میاں طفیل کے بعد

اسلامی جمیعت طلبہ سے تعلق رکھنے والے یہ تیسرے امیر جماعت ہیں۔جماعت اسلامی کے ناظم انتخابات کے مطابق نئے امیر کے انتخاب کیلئے منور حسن، لیاقت بلوچ اور سراج الحق کے ناموں پر 25 ہزار 533 ارکان جماعت اسلامی نے خفیہ رائے شماری میں حصہ لیا اور اکثریت نے سراج الحق کے حق میں رائے دی جس کے بعد سراج الحق 5 برس تک امیر جماعت اسلامی کی ذمہ داریاں سرانجام دیں گے۔سابق امیر سید منور حسن 29 مارچ 2009 کو پانچ سال کیلئے امیر منتخب ہوئے تھے۔سراج الحق کی درویش صفت طبیعت اور مجاہدانہ اوصاف کی بدولت تحریکی اور عوامی حلقوں میں انکو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ میٹرک تک بنیادی تعلیم مختلف سکولوں میں حاصل کی جس کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج تیمر گرہ سے بی اے کی ڈگری لی، پشاور یونیورسٹی سے بی ایڈ اور پھر ایم اے کیا۔ تعلیمی دور میں اٹھویں جماعت سے ہی کالجز یونیورسٹیز کی سطح پر ملک گیر تنظیم (اسلامی جمیعت طلبہ) سے وابستہ ہوگئے۔ تین سال صوبہ سرحد جمیعت کے ناظم رہے۔بعد ازاں 1998 میں اسلامی جمیعت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ بنے۔ تعلیمی مراحل سے فراغت کے بعد جب عملی میدان میں گئے تو تقریبا ایک سال جماعت اسلامی کے کارکن کے طور پر کام کیا بعد میں رکن بن گئے۔ایک سال ضلع دیر میں جندول کے علاقہ بیں رکن کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ پھر جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے سیکرٹری جنرل کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے۔اکتوبر 2002 کے انتخابات میں دینی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی بطور سینئر

وزیر حکومت میں چار سال فرائض سرانجام دیے۔بعد ازاں 2003 ہیں جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے امیر بنے۔ جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی گراں بار ذمہ داری آپ نے احسن انداز میں نبھائی۔اپریل 2009 میں جماعت اسلامی کے مرکزی انتخاب کے بعد انہیں امیر جماعت اسلامی پاکستان سید منور حسن نے نائب امیر کی ذمہ داری سونپی، جسے وہ بخوبی انجام دیتے رہے ہیں۔ متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت میں آپ نے جو موثر کردار ادا کیا اس کے اپنے اور بیگانے سب ہی معترف ہیں۔ کئی غیر ملکی اداروں نے صوبہ سرحد میں اپنے سروے رپورٹوں میں ان کے دور حکومت میں بہترین کارکردگی پر تعریف کی۔ سراج الحق صاحب اردو، انگریزی، فارسی، عربی، پشتو اور دیگر زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ پشتو کے علاوہ اردو میں بھی آپ کی تقریر عوامی حلقوں ہیں پسند کی جاتی ہے۔آپ جماعت اسلامی اور صوبائی حکومت کی طرف سے مشرق وسطی اور کئی یورپی ممالک کا دورہ کرچکے ہیں۔آپ کی صلاحیتوں اوراہم دینی و سیاسی حیثیت کی بدولت دنیا بھر سے آپ کو عالمی کانفرنسوں میں دعوت دی جاتی ہے۔جماعت اسلامی اور پاکستان کے عوام کو درویش صفت امیر سراج الحق مبارک ہو۔ اللہ انھیں کامیاب وکامران کرے

کیا کلاسیکی موسیقی رخصت ہو گئی؟

پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کو جس طرح سے نظر انداز کیا جاتا ہے، اُس کے پیش نظر امکان غالب ہے کہ نوجوان نسل آگے چل کر کلاسیکی موسیقی کو بھول ہی جائے۔
بھارت میں آج بھی کلاسیکی موسیقی کو بے پناہ اہمیت اور مقام حاصل ہے، مشرقی موسیقی کی مختلف اصناف میں پاکستان نے اپنا منفرد مقام بنایا تاہم اب سروں کے دلدادہ گائیکی کے معیار سے مطمئن دکھائی نہیں دیتے ۔۔ فلمی گائیکی کا ذکر کیا جائے تو پاکستان نے ملکہ ترنم نور جہاں اور مہدی حسن جیسے عظیم گائیک پیدا کئے۔ یہ وہ گلوکار ہیں جنہیں کلاسیکی موسیقی پر بھی عبور حاصل تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے خوبصورت رنگوں میں ٹھمری، دادرہ، کافی اور خیال گائیکی کا ذکر کبھی بھی شام چراسی، پٹیالہ ، تلونڈی، گوالیار اور قصور گھرانوں کے بنا مکمل نہیں ہو سکتا۔ استاد نصرت فتح علی خان کو فن قوالی کی تاریخ کے سب سے درخشاں ستارے کی حیثیت حاصل ہے۔ غلام فرید صابری اور عزیز میاں سمیت کئی دوسرے قوالوں نے بھی موسیقی کی اس صنف کو بام عروج تک پہنچایا۔ غزل گائیکی کا ذکر مہدی حسن، فریدہ خانم، اقبال بانو، خورشید بیگم، غلام علی اور پرویز مہدی کے بغیر ادھورا ہے۔ فوک موسیقی میں عالم لوہار، شوکت علی، نذیر بیگم، ثریا ملتانیکر، ریشماں، پٹھانے خان، عابدہ

پروین، سائیں اختر، عارف لوہار اور دیگر نے نام کمایا۔ گائیکی کا ایسا شاندار ماضی رکھنے کے باوجود ناقدین کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں دیگر فنون کی طرح فن گائیکی اور کلاسیکی موسیقی زوال پذیر ہے۔ موسیقی سے محبت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جب تک نئے گلوکار اس فن کے اسرار رموز سے واقفیت حاصل نہیں کرتے موسیقی کے اس میدان میں کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر میں جب فلمیں بننا شروع ہوئیں اسوقت سے لیکر آج تک فلمی موسیقی میں بھی مسلمان چھائے رہے ہیں اور اپنے فن سے ایک دنیا کو سحر زدہ کئے ہوئے ہیں۔ ماسٹر غلام حیدر، خواجہ خورشید انور، سجاد، نوشاد، ماسٹر عنایت حسین، رشید عطرے، فیروز نظامی، نثار بزمی، سہیل رعنا، ملکہ ترنم نور جہاں، ثریا، شمشاد بیگم، طلعت محمود، مہدی حسن، غلام علی، احمد رشدی، منیر حسین وغیرہ کی فنی عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ وہ فنکار ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے فن کا لوہا منوایا بلکہ لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان فنکاروں میں عظیم گلوکار محمد رفیع مرحوم کا نام بھی شامل ہے جنہیں گلوکاری کے شعبہ میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کے نمبر ون ''گلوکار کی حیثیت حاصل ہے۔ محمد رفیع کو نہ صرف اپنے دور کے تمام گلو'' کاروں پر برتری حاصل رہی ہے بلکہ ناقدین فن نے بھی ان کی عظمت کے اعتراف کیساتھ ساتھ انہیں بے مثل قرار دیا ہے۔

محمد رفیع [4 دسمبر 1924ء۔ 31 جولائی 1980] امرتسر کے گاؤں کوٹ سلطان سنگھ میں پیدا ہوئے انہوں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کے ایام لاہور شہر میں بھاٹی کے علاقے میں گزارے۔ان کا تعلق اگرچہ موسیقی کے کسی گھرانے سے نہ تھا لیکن موسیقی ان کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی۔وہ حقیقتاً ایک پیدائشی فنکار تھے ۔ محمد رفیع کی سُریلی و مدھر آواز نے کئی سی کلاس موسیقاروں کو اے کلاس موسیقاروں کی صف میں لاکھڑا کیا اگر ہندوستانی فلم انڈسٹری کو محمد رفیع جیسا گلوکار نصیب نہ ہوتا تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہاں کے فلمی گانوں کے خزانے میں نہ صرف بہت بڑی کمی واقع ہوتی بلکہ فلمی موسیقی کو وہ عروج حاصل نہ ہوتا جو اسے حاصل ہوا۔کہتے ہیں کہ شنکر جے کشن جو نوشاد صاحب کے ہم پلہ موسیقار تھے غیر مسلم ہونے کی بنا پر ہمیشہ مکیش اور مناڈے کو اپنی دھنوں میں گوانے کی کوشش کرتے رہے لیکن بالآخر وہ بھی محمد رفیع کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرنے لگے یہاں تک کہ ''بیجو باورا'' کے مقابلے پر جب فلم ''بسنت بہار''میں انہوں نے کمپوزیشنز بنائیں تو منڈے کیساتھ ساتھ اس فلم میں محمد رفیع کو گوانے پر مجبور ہو گئے مناڈے کے مقابلے میں اس فلم کے محمد رفیع کی آواز میں گائے ہوئے کلاسیکل گیت ''دنیا نہ بھائے موہے''اور ''بڑی دیر بھئی'' کمپوزیشن کے اعتبار سے نسبتاً مشکل ہیں اور مقبولیت کے لحاظ سے بھی انہیں مناڈے کے نغموں پر فوقیت حاصل ہے بعد میں تو شنکر جے کشن نے محمد رفیع سے بیشمار ایسے مدھر اور سدا بہار گیت گوائے جنہیں شاہکار کہا

جا سکتا ہے یہی حال دیگر ہندو موسیقاروں کا تھا جن میں ایس ڈی برمن، روشن، مدن موہن، او پی نیر، لکشمی کانت پیارے لال، کلیان جی آنند جی، این دتا اور آر ڈی برمن قابل ذکر ہیں۔ ان موسیقاروں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی بنائی ہوئی دھنوں کو محمد رفیع کی آواز سے نہ سجایا تو وہ دھنیں نہ تو مقبولیت کے مقام تک پہنچ پائیں گی اور نہ ہی آئندہ انہیں فلموں میں کوئی چانس دیگا۔ محمد رفیع بڑی مضبوط آواز کے مالک تھے ہر سُر مکمل رچاو سے ادا کرتے الفاظ کی ادائیگی کے دوران سُروں کے زیر و بم کے ذریعے ان کا صحیح مفہوم و مقصد عیاں کرنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ قدرت نے ان کے گلے کو تمام ''سچے سُر'' عطا کر دیئے تھے جن سے وہ جب بھی اور جس طرح سے چاہتے کام لیتے اور گانے کو منفرد بنا ڈالتے۔ ان کے گائے ہوئے نغمات میں. ا۔ ''من کی بین متوالی باجے''۔
۲۔ ''اج ہن آئے بالما''۔ ۳۔ ''من تڑپت ہری درشن کو آج''۔ ۴۔ ''کو ہو کو ہو بولے کوئلیا''۔ ۵۔ ''زندہ باد اے محب زندہ باد''۔ ۶۔ ''میری آواز سنو''۔ محمد رفیع گو اب دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی آواز آج بھی زندہ ہے اور کئی مردہ دلوں اور بیمار ذہنوں کو نئی توانائی بخشنے میں مسیحا کا کردار ادا کرتی ہے۔ رفیع صاحب نے مصنوعی انداز کی بجائے قدرتی انداز میں گایا اور غیر ضروری و خوبصورتی سے خالی ''جگہوں'' کو اپنے گانے میں شامل کرنے سے ہمیشہ گریز

کیا اب کبھی ایک لفظ کو ایک ہی گانے میں مختلف انداز سے ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی خاص طور پر لتا منگیشکر اور آشا بھوسلے کیساتھ دوگانوں میں ایسا کرنا ناگزیر ہوا تو محمد رفیع نے اپنے فن کی عظمت کو اور بھی زیادہ عیاں کیا۔ صحت مند جسم، مضبوط چھاتی توانا گردن، پر رونق اور روشن آنکھوں والے محمد رفیع کے لبوں پر ہر وقت تبسم، رقصاں رہتا۔ ان کی اکثر تصویریں بھی ایک خوش مزاج ''کھلے ڈلے'' ہنستے ہنساتے شخص کا پتہ دیتی ہیں آواز کی پختگی اور سُریلے پن کو برقرار رکھنے کیلئے وہ نہ صرف روزانہ باقاعدگی سے ریاض کرتے بلکہ ورزش کرنا بھی اپنے معمولات میں شامل رکھتے۔ موسیقی کے علاوہ ان کا بس ایک ہی شوق تھا، پتنگ اُڑانا۔ جب کبھی موقع ملتا اپنے گھر یا سٹوڈیو کی چھت پر چڑھ کر پتنگ اُڑاتے شاید یہ ان کے ''لاہوری مزاج'' کا حصہ تھا۔

روشن آراء بیگم

روشن آرا بیگم کا تعلق بنیادی طور پر کلکتہ سے تھا، جہاں اُن کی پیدائش 1917 میں استاد عبدالحق خان کے ہاں ہوئی۔ انہوں نے موسیقی اپنے قریبی عزیز استاد عبدالکریم خان سے سیکھی، جن کی وساطت سے اُن کا تعلق موسیقی کے کیرانا گھرانا سے بنتا ہے۔

روشن آرا بیگم تقسیم ہند سے پہلے ہی کیرانا گھرانا کی خیال گائیکی میں ایک بلند مقام حاصل کر چکی تھیں۔ تب وہ بمبے والی روشن آرا بیگم کہلاتی تھیں کیونکہ 1930 کے عشرے کے اواخر میں وہ کلکتہ سے بمبئ منتقل ہو گئی تھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ خاص طور پر آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے لاہور کا سفر کیا کرتی تھیں، جہاں وہ موسیقی کی دیگر محافل میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرکے خوب داد سمیٹتی تھیں۔ لاہور میں موچی گیٹ کے قریب محلہ پیر گیلانیاں میں چن پیر کے ڈیرے پر اُن کے ساتھ یادگار محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ وہ کوئی بھی راگ پیش کرنے سے پہلے جب اُس کا الاپ کرتی تھیں تو اسی میں راگ کے مرکزی سروں کو کھول کر بیان کر دیتی تھیں اور الاپ ہی سے راگ کی پوری شناخت سامنے آ جاتی تھی۔ یہ امر اہم ہے کہ کیرانا گھرانا الاپ گائیکی میں منفرد پہچان کا حامل ہے۔ راگ داری میں تان لگانا آسان نہیں سمجھا جاتا اور تان وہی گلوکار لگا سکتا ہے، جو موسیقی کے فن کے ساتھ ساتھ اپنی سانس کو بھی پوری طرح سے کنٹرول کر سکتا ہو۔ روشن آرا بیگم کی تان میں اُن کے کیرانا گھرانے کا رنگ ملتا ہے۔ اُن کا تان لگانے کا انداز بہت ہی سہل اور میٹھا تھا، یوں لگتا تھا، جیسے کوئی ندی دھیرے دھیرے بہہ رہی ہو۔ 1948 میں پاکستان منتقل ہونے کے بعد اُن کی شادی کلاسیکی موسیقی کے دلدادہ ایک پولیس افسر احمد خان کے ساتھ ہوئی، جن کا تعلق لالہ موسیٰ سے تھا۔ روشن آرا بیگم اسی چھوٹے سے شہر سے ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں

شرکت کے لیے لاہور کا سفر کرتی تھیں۔ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم نے فلموں کے لیے بھی کچھ گیت گائے، جن میں سے زیادہ تر کی دھنیں انیل بسواس، فیروز نظامی اور تصدق حسین جیسے اپنے دور کے نامور موسیقاروں نے ترتیب دی تھیں۔ انہوں نے جن فلموں کے لیے گیت گائے، اُن میں 1945 کی فلم 'پہلی نظر'، 1947 کی 'جگنو'، 1956 کی قسمت'، 1960 کی 'روپ متی باز بہادر' اور 1969 کی "نیلا پربت' بھی شامل' تھیں۔ کلاسیکل وسیقی کا ذکر ہو اور نوشاد کا نام نہ آئے یہ ممکن نہیں ہے۔ انڈین فلم انڈسٹری کے معروف موسیقار نوشاد علی کی پیدائش پچیس دسمبر 1919 کو ہوئی تھی۔ سن 1937 میں وہ ممبئ کام کی تلاش میں آئے تھے۔ان کی موسیقی کو انڈین فلم انڈسٹری میں ایک بیش بہا خزانے کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ سڑسٹھ فلموں میں اپنی موسیقی کا جادو جگانے والے موسیقار اعظم کی آخری فلم اکبر خان کی تاج محل تھی اور ان کی موسیقی کی تعریف میں وزیراعظم ہند منموہن سنگھ نے ایک توصیفی سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔ انہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ اور سنگیت اکیڈمی ایوارڈ مل چکا تھا۔ حکومت نے انہیں پدم بھوشن کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ شاہ جہاں، دل لگی، دلاری، انمول گھڑی، مغل اعظم، بیجو باؤرا، انداز، آن، امر، داستان، جیسی فلموں کے دل کو چھو لینے والی موسیقی اور ان کے نغموں کو برصغیر کے عوام شاید کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ حال ہی میں بی بی سی کے ساتھ ایک انٹرویو میں نوشاد نے کہا تھا کہ انہیں یقین ہے کہ ابھی انہیں اپنی زندگی کی بہترین موسیقی کی تخلیق کرنی

باقی ہے۔ نوشاد نے ایک خصوصی انٹرویو میں بی بی سی کو بتایا: 'میں 1937 میں بمبئی (ممبئی) آیا۔ جیب خالی تھی، کام نہیں تھا، رہنے کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا لیکن دل میں جذبہ، لگن اور حوصلہ تھا۔ خدا سے دعا کرتا تھا کہ کچھ بننا چاہتا ہوں تو مدد کر۔' دادر علاقہ میں خداداد سرکل تھا۔ پہلے وہاں براڈوے سنیما تھا جو اب نہیں ہے۔ اسی کے فٹ پاتھ پر آ کر سو جاتا تھا۔ وہاں اس لیئے سوتا تھا کیونکہ براڈوے تھیٹر کی روشنی فٹ پاتھ تک آتی تھی۔ اس روشنی میں اپنا مستقبل تلاش کرتے کرتے نیند آجاتی۔ پھر وہی صبح اور وہی کام کی تلاش۔ مشتاق حسین کے آرکسٹرا میں پیانو بجانے کا کام ملا اور پھر راہ کھلتی گئی۔ میوزک ڈائریکٹر کھیم چند پرکاش کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ 'سولہ برس بعد میری فلم بیجو باوٴرا بے حد کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کے نغموں کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اسی براڈوے تھیٹر میں فلم کا پریمئیر تھا۔ فلمساز وجے بھٹ ساتھ میں تھے۔ میں نے تھیٹر سے سامنے کی فٹ پاتھ کو دیکھا جہاں میں سویا کرتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وجے بھٹ نے حیرت ظاہر کی کہا 'یہ خوشی کا موقع ہے اور تم رو رہے ہو؟ میں نے کہا اس فٹ پاتھ کو پار کرکے یہاں تک پہنچنے میں مجھے سولہ سال لگ گئے۔ شاہجہاں، دل لگی، دلاری، انمول گھڑی، مغل اعظم، بیجو باوٴرا، انداز، آن، امر، داستان، جیسی فلموں کے دل کو چھو لینے والی موسیقی اور ان کے نغموں کو کون بھول سکا ہے؟ چھ دہائیوں تک بھارتی فلم انڈسٹری پر اپنی موسیقی کے ذریعہ

حکومت کرنے والے عظیم موسیقار نوشاد علی اب نہیں رہے۔ نوشاد نے ایک طرف اپنی موسیقی سے جاوداں نغمے پیش کیے وہیں انہوں نے کئی گلوکاروں کو فلمی دنیا سے روشناس کرایا اور پھر ان گلوکاروں نے ایسے نغمے پیش کیے جو ان کی اپنی زندگی کے لافانی گیت ثابت ہوئے۔ نوشاد کے بنائے گیت آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ وہ تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی اور لوک گیتوں کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کرنے کا فن وہ اچھی طرح جانتے تھے انیس سو سینتیس میں ممبئی میں انہوں نے قدم رکھا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد انہوں نے فلمی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا۔ انہوں نے اس دور میں ایسے کئی تجربات کیے جس کے بارے میں اس دور کے موسیقار سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مغل اعظم، دل لگی، انمول گھڑی، بیجو باورا، آن امر اور داستان جیسی کئی فلموں میں لافانی موسیقی کے خالق کو فلم انڈسٹری کے فنکاروں نے اپنے انداز میں خراج عقیدت پیش کیا۔ نوشاد صاحب اس دور سے تعلق رکھتے تھے جب ہندوستانی موسیقی میں کلاسیکی موسیقی کا زیادہ اثر تھا۔ ہمیشہ اپنے فن میں تجربات کرنے کے لیے مشہور نوشاد نے اس دور میں کلاسیکی موسیقی اور لوک سنگیت کو آسان انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا۔ نوشاد صاحب نے اپنی علالت کے باوجود فلم تاج محل کی موسیقی دی۔ کوئل جیسی دلکش آواز کی ملکہ لتا منگیشکر نے نوشاد صاحب کے ساتھ اپنی زندگی کی زیادہ تر نایاب نغمے دیے۔ لتا منگیشتر کہتی ہیں کہ 'نوشاد صاحب کی وجہ سے میں نے نغمگی کو سمجھا، ان سے زبان اور تلفظ کی باریکیوں کو

جانا۔ ان کی موسیقی میں انفرادیت تھی، انہوں نے کئی فنکاروں کو یادگار نغمے دیے جس کے بعد وہ گلوکار بلندیوں پر پہنچ گئے۔ ’نوشاد صاحب نے غزل، ٹھمری، کجری سے فلمی گیت بنائے جو آج کے موسیقار نہیں کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا میوزک لافانی نہیں ہوتا۔‘ موسیقار خیام کہتے ہیں کہ اکہ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود نوشاد نے ہارمونیم سیکھا اور فلم پریم نگر سے انہوں نے اپنا فلمی کریئر شروع کیا۔ اس کے بعد اپنی لگن اور محنت کی وجہ سے انہوں نے ایک اعلی مقام بنا لیا۔ خیام کے مطابق نوشاد ’دن رات مشقت کرتے تب ایک گیت بناتے، یہی وجہ تھی کہ ان کی موسیقی سیدھے سننے والے کے دل تک پہنچتی تھی۔ 1949 میں انہوں نے بابل اور 1955 میں اڑن کھٹولا کی موسیقی دی۔ مغل اعظم، گنگا جمنا جیسی بے شمار فلموں کی موسیقی کی وجہ سے ان فلموں کے نغمے یادگار گیت بن چکے ہیں۔ فلموں کا وہ دور تھا جب یادگار اور سدا بہار فلمیں بنتی تھیں اور عظیم فنکار ہوا کرتے تھے۔ نوشاد صاحب کے مطابق فلم ’انمول گھڑی‘ کا گیت ’آواز دے کہاں ہے‘ نورجہاں کی خوبصورت آواز کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ’نورجہاں کو بھی اپنا وہی گیت بہت پسند تھا اور وہ اپنے ہر پروگرام کا آغاز اسی سے کیا کرتی تھیں۔ وہ خود جتنی خوبصورت تھیں ان کی آواز اس سے زیادہ سریلی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلی گئیں لیکن ہمیشہ وہاں سے فون کرتیں اور پھر رو پڑتی تھیں۔‘

تقسیم سے پہلے کے دور میں خاندان، انمول گھڑی اور جگنو نورجہان کی بے مثال فلمیں کہلائیں۔ 'یہ فلم انڈسٹری کا گولڈن جوبلی سال تھا اور اس سلسلے میں شان مکھانند ہال میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا تھا جس میں تمام پرانے فنکاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ دلیپ کمار، پران، دیو آنند، راجکپور، شمشاد بیگم، سلیم درانی اور پھر پاکستان سے نورجہاں کو مدعو کیا گیا۔ ہم انہیں ایئر پورٹ لینے گئے تھے۔ پروگرام میں ہر فنکار سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنا اپنا گیت پیش کرے گا۔ سب فنکار آرہے تھے اور تالیوں کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہو رہا تھا۔ نورجہاں کا نمبر آیا اور انہوں نے جیسے ہی 'آواز دے کہاں ہے' گنگنایا پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور ان کے احترام میں لوگ کھڑے ہو گئے۔ اتنا پیار اور اتنی عزت افزائی دیکھ کر نورجہاں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کلاسیکل موسیقیکو اب بھی روح کی غذا سمجھا جاتا ہے، لیکن اب ایسا دور ہے، جس میں نہ ایسے انسان ہیں اور نہ ہی ایسے فنکار جن کی موسیقی روح کی غذا سمجھی جاتی ہے،۔

بھارت میں کالے دھن کی بھرمار

بھارت میں 543 رکنی لوک سبھا کے انتخاب میں دھن دولت بری طرح لٹائی جارہی ہے۔ سیاسی سرگرمیاں شروع ہوتے ہی مختلف حلقوں کے لیے امیدواروں کے ناموں کا اعلان ہونے پر انتخابی دنگل کا بگل بج چکا ہے۔ ان حلقوں میں ہزاروں سیاسی کارکن رائے دہندگان کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے پوری طرح حرکت میں آ چکے ہیں۔ ظاہر ہے الیکشن پیشے کے بغیر تو نہیں لڑا جاسکتا ہے۔ اس انتخاب کے لئے بھارتی حکومت ایک کھرب روپے کے اخراجات کرتی ہے۔ بھارتی انتخابی کمیشن نے امیدواروں کے لیے ذاتی طور پر اپنے حلقے میں ستر لاکھ روپے کے اخراجات کی حد مقرر کر رکھی ہے۔ بھارت کے ایک صنعتی ادارے ایسوچیم کے مطابق ہر حلقے میں کم از کم چار سنجیدہ امیدوار ہوتے ہیں اور ادارے کے اندازے کے مطابق ہر امیدوار اوسطاً پانچ کروڑ روپے انتخاب پر خرچ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے تقریباً ایک سو دس ارب روپے آئندہ دو مہینوں میں انتخابات کے دوران خرچ کیے جائیں گے۔ اخراجات کی حد مقرر ہونے کے سبب ان میں سے بیشتر رقم کالے دھن سے آئے گی۔ رواں انتخابات میں بے ایمانی اور بدعنوانی سب سے اہم موضوع ہے۔ بھارت میں کھلی معیشت کا راستہ اختیار کیے جانے کے بعد ملک کی سیاست اور صنعتی نظام میں بدعنوانی نے ایک نئی اور حیرت

انگیز جست لگائی ہے۔۔ معروف جریدے 'دی ایکنامسٹ' کے مطابق پچھلے دس برس میں بدعنوان سیاست دانوں اور صنعت کاروں نے بے ایمانی رشوت اور کمیشن سے سیکڑوں ارب ڈالر بنائے ہیں۔ بدعنوانی پر نظر رکھنے والی عالمی تنظیم 'ٹرانس پیرینسی انٹرنیشنل' کے مطابق بھارت میں 54 فی صد لوگوں کا کہنا ہے کہ انھیں گذشتہ برس کسی نہ کسی مرحلے پر رشوت دینی پڑی ہے۔ "بدعنوانی کے خلاف تحریک چلانے والے انا ہزارے اور اروند کیجریوال جیسے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ انتخابی اخراجات بھارت میں بدعنوانی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ امیدواروں کو جیتنے کے لیے کروڑوں روپے صرف کرنے پڑتے ہیں اور جیتنے کے بعد ان کی ساری توجہ جائز اور ناجائز ہر طریقے سے صرف پیسے کمانے پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس بار کے انتخابات میں کالا دھن کے گیارہ ہزار کروڑ سے بیس ہزار کروڑ روپے تک صرف کیے جانے کا اندازہ ہے۔ آئندہ حکومت کتنی ایماندار ہوگی اس کا اندازہ ابھی سے لگایا جا سکتا ہے۔"ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ملک کی غالب اکثریت بدعنوانی سے بے چین ہو رہی ہے۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق 96 فی صد لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بدعنوانی کی وجہ سے ملک آگے نہیں بڑھ پا رہا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ گذشتہ پانچ برس میں ملک میں بدعنوانی کی صورتحال پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوئی ہے۔ رشوت چور بازاری اور بے ایمانی کا یہ عالم ہے کہ کچھ عرصے پہلے تک کرناٹک کی کانوں سے دو ہزار ٹرک روزانہ بے روک ٹوک غیر قانونی طور پر خام لوہا نکال کر چین برآمد کیا جا رہا تھا۔ جب تک کوئی آواز اٹھتی تب

تک ریاست کے کئی سیاست داں اور بڑے بڑے سرکاری اہلکار دو ارب ڈالر سے زیادہ کما چکے تھے۔ تحقیقی ادارے 'گلوبل فینانشیل انٹیگریٹی' کے اندازے کے مطابق بھارتی سیاست دانوں، صنعت کاروں اور اہلکاروں نے 2007 سے ہر برس کالے دھن کے اوسطاً ارب ڈالر غیر ممالک میں جمع کیے۔ یعنی سات برس میں بے ایمانی کے ساڑھے تین 52 سو ارب ڈالر سے زیادہ کی رقم باہر بھیجی گئی۔ پچھلے برس امریکہ برطانیہ اور دیگر بعض ملکوں کی طرف سے سوئٹزر لینڈ، لگزم برگ اور جرمنی کے بینکوں پر دباؤ پڑنے کے بعد جرمنی اور سوئٹزر لینڈ نے وہاں پیسہ جمع کرنے والوں کی فہرست بھارتی حکومت کو سونپی تھی۔ لیکن کالا دھن جمع کرنے والوں کی یہ فہرست ابھی تک ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان بظاہر مفاہمت نظر آتی ہے۔ اپوزیشن بی جے پی نے موجودہ منموہن سنگھ کی حکومت کو تاریخ کی سب سے بدعنوان حکومت قرار دیا ہے لیکن خود اس کا دامن بھی صاف نہیں لگتا۔ احتسابی ادارے لوک پال کو بااثر نہ ہونے دینے اور اس کی تقرری میں ہر ممکن رکاوٹیں ڈالنے میں سبھی بڑی سیاسی جماعتوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادارہ ابھی تک تشکیل نہیں پا سکا ہے۔ اب ایک بار پھر انتخابات کی سرگرمیاں ہیں۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق نریندر مودی اور سونیا گاندھی جیسے رہنماؤں کے انتخابی جلسوں کے انعقاد پر 15 کروڑ روپے سے لے کر 50 کروڑ تک روپے صرف ہوتے ہیں اور اس طرح کی ریلیاں ہر روز ہو رہی ہیں۔ بدعنوانی کے خلاف تحریک چلانے والے انا ہزارے اور اروند کیجریوال جیسے رہنماؤں کا کہنا

ہے کہ انتخابی اخراجات بھارت میں بدعنوانی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ امیدواروں کو جیتنے کے لیے کروڑوں روپے صرف کرنے پڑتے ہیں اور جیتنے کے بعد ان کی ساری توجہ جائز اور ناجائز ہر طریقے سے صرف پیسے کمانے پر مرکوز ہوتی ہے۔ دوسری جانب بھارتی حکومت نے سوئس بینکوں میں کالے دھن کے الزامات کی تحقیقات شروع کردی ہیں، بھارت کی وزارت خزانہ کی جانب سے جاری بیان میں کہا گیا ہے کہ بدعنوانی کے خلاف مہم چلانے والے سماجی رہنما اروند کیجری وال کی جانب سے لگائے گئے ان الزامات کی تحقیقات شروع کردی گئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بھارت کے مالدار شہریوں نے غیر قانونی طور پر اربوں روپے بیرون ملک بینکوں میں جمع کر رکھے ہیں، بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ اس سلسلے میں تحقیقات جاری ہیں اور غیر ملکی ٹیکس حکام سے ان بھارتی کھاتہ داروں کی معلومات حاصل کی جارہی ہیں جنھوں نے اپنا پیسہ بیرون ملک جمع کر رکھا ہے۔ واضح رہے کہ سماجی رہنما اروند کیجری وال نے دعویٰ کیا تھا کہ صرف ایک غیر ملکی بینک میں 700 بھارتی شہریوں نے غیر قانونی طور پر اربوں روپے جمع کر رکھے ہیں۔

تین سال پہلے وکی لیکس کے بانی جولین اسانج نے بھارتی جریدے کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ کالا دھن زیادہ بھارت سے آتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ بھارتی عوام کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے، وقت گزرنے کیساتھ ساتھ سوئس اکاؤنٹس میں بلیک منی کے حوالے سے بھارتی شخصیات کے نام بھی شائع کرکے

منظر عام پر لائے جائینگے۔انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ سوئس اکاؤنٹس میں بلیک منی کے حوالے سے متعدد نام بھارتی شخصیات کے بھی ہیں جن میں کچھ نام اس قبل شائع کئے جا چکے ہیں تاہم ، جلد منظر عام پر آنے والی اشاعت میں اگرچہ کہ میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کتنی بھارتی شخصیات کے نام اس فہرست میں شامل ہیں لیکن میں نے بھارتی شخصیات کے نام جلد شائع ہونے والی فہرست میں دیکھے ہیں۔وکیلیکس کے ان انکشافات نے بھارتی سیاست میں ایک بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ سوئس بینکوں میں جتنا کالا دھن بھارتیوں کا ہے اتنا کسی دوسرے ملک کا نہیں، بھارتی اپوزیشن اس الزام کو لے اڑی تھی۔ اورحکومت سے جواب طلب کرلیا تھا۔ جولین اسانج نے ایک اور سنسنی خیز خبر سنادی کہ وکیلیکس جلد ان کرپٹ بھارتیوں کے نام بھی جاری کرسکتا ہے جنہوں نے کرپشن کا پیسہ بینکوں میں چھپا رکھا ہے۔ اسانج نے بھارتی عوام سے کہا ہے کہ وہ امید رکھیں بہت جلد کرپٹ حکام کے چہروں پر سے پردہ اٹھ جائے گا۔ وکیلیکس کے اس انکشاف پر بھارتی اپوزیشن نے حکومت کو آڑے ہاتھوں لے لیا تھا۔ بھارت کے سینئرترین وکیل رام جیٹھ ملانی نے کہا ہے کہ حکومت کرپٹ افراد کے نام چھپانے کی کوشش کر رہی ہے، کیونکہ سب سے زیادہ کرپٹ افراد موجودہ حکومت کا حصہ ہیں۔ ان ایہ الزام کسی حدتک صحیح بھی تھا کیونکہ اب تک یہ نام راز ہی رہے ہیں۔ وکی لیکس نے یہ بھی الزام لگایا تھا کہ انڈرورلڈ اور گینگسٹرز بالی ووڈ فلموں میں کادھن کی سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ پچھلے

ایک عشرے سے بالی ووڈ کی مار دھاڑ والی فلموں کا پسندیدہ موضوع" انڈرورلڈ" اور" گینگسٹرز" رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ" انڈرورلڈ" کی اصطلاح سے بھی عام آدمی انہی فلموں کے ذریعے متعارف ہوا ہے۔ ان فلموں میں گینگسٹرز کا کردار نہایت نفرت آمیز ہوتا ہے جو بات بات پر دوسروں کو قتل کردینے اور پیسے کی خاطر ملک دشمنی سے بھی نہیں چوکتا۔ پھر گینگسٹرز اور سیاستدانوں کا چولی دامن کا ساتھ دکھایا جانا بھی عام بات ہو گئی ہے۔ اکثر فلموں میں دکھایا جاتا ہے کہ سیاستدان ہی گینگسٹر کو پروان چڑھاتے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے جبکہ دوسرا رخ یہ ہے کہ "بالی ووڈ کے بیشتر فلمساز انہی گینگسٹرز اور انڈرورلڈ ڈانز" سے فلموں میں بڑھ چڑھ کر پیسہ لگانے پر رضامند کرتے ہیں۔ یعنی انہی کا جوتا اور انہی کا سر!! سرمایہ بھی انہی کا اور بدنامی بھی انہی کی۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے سفارتی انکشافات کرنے والی ویب سائٹ "وکی لیکس" نے بالی ووڈ فلموں اور اس کے چمکتے دھمکتے ستاروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ویب سائٹ نے اب تک جہاں دنیا بھر کی حکومتوں کے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے وہیں وکی لیکس نے اپنی کیبل میں یہ راز بھی افشاں کیا ہے کہ بالی ووڈ فلمساز بڑے.بڑے گینگسٹرز اور سیاستدانوں سے اپنی فلموں میں سرمایہ لگواتے اور انہیں منافع کی شکل میں بڑی.بڑی رقمیں دیتے ہیں۔ یہ وہی دھن ہے جسے بھارتی اصطلاح میں "کالا دھن" کہا جاتا ہے۔ وکی لیکس کا دعویٰ ہے کہ حالیہ.برسوں کے دوران بالی ووڈ

فلم انڈسٹری نے نا صرف ممبئی کے انڈر ورلڈ سے قربت حاصل کی بلکہ انہیں کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کرنے کا راستہ بھی سجھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بڑے ڈان سے لیکر ہر چھوٹے سے چھوٹا 'ڈان' فلموں میں پیسہ لگاتا ہے۔ اگرچہ ویب سائٹ نے ان فلموں کا نام نہیں دیا جن کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ ان میں ڈان نے سرمایہ کاری کی لیکن ویب سائٹ نے دعویٰ کے ساتھ یہ کہا ہے کہ فلموں میں انڈر ورلڈ کی جانب سے پیسہ لگانے کا آغاز حکومت کی جانب سے بالی ووڈ کو صنعت کا درجہ دینے کے بعد شروع ہوا اور اس وسیع سرمایہ کاری کی بدولت بالی ووڈ کو اتنی بڑی فلمیں بنانے کی قوت مل گئی کہ اس نے مغربی انداز کی فلمیں بنانی بھی شروع کر دیں۔ یک مراسلے میں وکی لیکس کا کہنا تھا کہ اگرچہ بالی ووڈ مغربی انداز کی فلمیں بنا رہا ہے، تاہم اس بات کے امکانات موجود نہیں کہ بالی ووڈ کی فلمیں مغربی شائقین کی توجہ حاصل کر سکیں۔ وکی لیکس کا کہنا ہے کہ اس صورتحال سے بالی ووڈ بہت اچھی طرح واقف ہے اور وہ مغربی مارکیٹ میں داخل ہونے اور جنوبی ایشیا میں اپنا منافع کمانے کی نئی راہیں تلاش کر رہی ہے۔ آڈٹ اور ٹیکس کے حوالے سے پیشہ ورانہ خدمات فراہم کرنے والی کمپنی کے ایم پی جی کے سربراہ جے بل ٹھاکر نے وکی لیکس کو بتایا" فلموں میں پیسے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے گینگسٹرز کے ساتھ تعلقات کوئی نئی بات نہیں۔ اس کا آغاز 2000 میں ہوا تھا جب سرکاری سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے بالی ووڈ، بینکوں سے یا پرائیویٹ طور پر بھی قرضے لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی، ایسے

میں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان گینگسٹرز کی جانب سے کی جانے والی پیشکش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس سے قبل ایسے افراد کا پیسہ قبول کر لیا جاتا تھا جو بڑے کاروبار کے مالک ہوا کرتے تھے، مثال کے طور پر کمرشل فنانسنگ کرنے والے افراد اور ایسے سرمایہ کار جن کا تعلق تعمیرات یا تجارتی صنعت سے تھااور جو اپنے سرمائے پر ساٹھ سے سو فیصد تک سود وصول کرتے تھے۔ تاہم اس کے بعد سیاست دانوں اور گینگسٹرز کا دیا ہوا پیسہ بھی قبول کیا جانے لگا۔ یہ لوگ اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کی غرض سے پیسہ فلموں میں لگاتے تھے۔ ٹائمز میگزین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انڈر ورلڈ ڈان ابو سلیم نے بھارتی رپورٹرز کو بلایا اور بتایا کہ اس نے شاہ رخ خان کی فلم "دیوداس" کے لیے پیسہ فراہم کیا تھا۔ اس فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھارت کی مہنگی ترین فلم تھی۔ بعض فنکاروں کو انڈر ورلڈ ڈان کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی بڑی قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے۔ اداکار ریتک روشن، گوونداِ امریش پوری اور ہدایتکار کرن جوہر کو انڈر ورلڈ کی جانب سے قتل کی دھمکیاں ملنے کے بعد پولیس گارڈ رکھنے پڑ گئے تھے۔ سپر اسٹار عامر خان اور ڈائریکٹر اشوتوش گورریکر کو بھی دھمکی آمیز کالز موصول ہوئیں کیونکہ انھوں نے اپنی آسکر ایوارڈ میں نامزد ہونے والی فلم کی بھرپور کامیابی کے بعد گینگسٹرز کی جانب سے کی گئی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ شاہ رخ خان نے بھی سٹی پولیس اور انسداد دہشت گردی اسکواڈ کو رپورٹ کی تھی کہ اسے گینگسٹر بنٹی پانڈے کی

جانب سے دھمکی آمیز فون موصول ہو رہے ہیں اور ان سے دو ارب روپے طلب کیے جا رہے ہیں۔ یہ تو رہا فلموں کا معاملہ لیکن بھارت میں کالے دھن والوں نے کھیل پر بھی قبضہ جمالیا ہے۔ انڈین پریمیئر لیگ (آئی پی ایل) میں مبینہ سپاٹ فکسنگ کی خبروں کے بعد کروڑوں ڈالر کی یہ لیگ سوالوں کے گھیرے میں آ گئی تھی۔ وزیر کھیل اجے ماکن نے اس بات کو تسلیم کیا کہ آئی پی ایل میں کالے دھن کا کاروبار ہو رہا ہے۔ ماکن کا ماننا ہے کہ بی سی سی آئی اور آئی پی ایل کو معلومات کے حق کے دائرے میں لانا چاہیے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ اس سے کرکٹ میں کالے دھن پر روک لگے گی۔ ایک چینل سے بات چیت میں ماکن نے کہا کہ بی سی سی آئی اور آئی پی ایل کو فیما (فارن ایکسچینج منیجمینٹ ایکٹ) اور انکم ٹیکس کے تحت نوٹس بھیجے گئے ہیں۔ ماکن نے خدشہ ظاہر کیا کہ آئی پی ایل میں سینکڑوں کروڑ روپے کی ٹیکس چوری اور بلیک منی کا کاروبار ہو سکتا ہے۔ اجے ماکن نے کہا کہ انہوں نے نفاذ ڈائریکٹوریٹ (انفورسمینٹ ڈائریکٹوریٹ) اور محکمہ انکم ٹیکس سے تفتیش کا مطالبہ کیا ہے کہ کیا کھلاڑیوں کو آئی پی ایل میں کالا دھن دیا گیا تھا۔ ایک ٹی وی چینل کے اسٹنگ آپریشن میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح کھلاڑی کہہ رہے تھے کہ انہیں کالے دھن کے طور پر بی سی سی آئی کی معاہدہ رقم سے زیادہ رقم مل رہی ہے۔ اس اسٹنگ آپریشن میں آئی پی ایل میں بدعنوانی کے انکشاف کا دعوی کیا تھا جس کے بعد بی سی سی آئی نے فوری طور پر اثرات سے پانچ بھارتی کھلاڑیوں کو معطل کر دیا تھا۔ بھارت

میں فلم، سیاست کھیل سب میں پیشہ چلتا ہے۔ اب کہیں بہار میں ممبران اسمبلی کی خرید وفروخت ہو رہی ہے، کہیں مودی کے گجرات میں کانگریس کے ممبران اسمبلی بی جے پی میں داخل ہو رہے ہیں اور کہیں کل تک ریاستی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ براہ راست سیاست میں چھلانگ لگا رہے ہیں۔ جمہوریت پر ایمان برقرار رکھنے کے لیے الیکشن نام کا جو ''ووٹ تہوار'' ہوتا ہے وہ بے ایمانی کے ایک جلسے میں تبدیل کر دیا گیا ہے، رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب ملک کی درجن بھر انتخابی سروے ایجنسیوں میں سے ایک چھوڑ کر باقی تمام اسٹنگ آپریشن میں رنگے ہاتھوں پکڑی گئیں۔ یہ سروے ایجنسیاں کالا دھن لے کر سروے کر رہی تھیں اور ''اوپری'' پیسہ لے کر جھوٹے نتائج ملک کے سامنے رکھے جا رہے تھے۔ ملک کے سب سے بڑے نیوز چینلز اور اشاعت گروپوں کے انتخابی سروے کرنے والی ایجنسیاں جب کھل کر اپنے تن اور من کو فروخت کی بات کرتے ہوئے خفیہ کیمروں پر پکڑی جائیں تو یہ لگتا ہے کہ اس کے بعد جمہوریت میں ایمان کیوں اور کیسے بچا رہے؟ انتخابات تو بھرشٹ ہو چکے ہیں، پارٹیاں اور لیڈر کالے دھن پر سوار ہو کر، فرقہ پرستی اور ذات پات کی نفرت بھڑکاتے ہوئے پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ وہ ان مقامات کو بدعنوان کروڑپتیوں اور ارب پتیوں سے بھرتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں سوا سو کروڑ سے زیادہ آبادی میں اسی کروڑ سے زیادہ ووٹروں کا ایمان جمہوریت پر کس طرح قائم رہے؟ شائد اسی لئے دوسری طرف ممبئی کے ہائی کورٹ کو وہیں کی نچلی عدالت اور حکومت سے

پوچھنا پڑ رہا ہے کہ سنجے دت جیسے طاقتور ارب پتی فلمی ستارے کو مسلسل پیرول کیسے مل رہی ہے اور باقی لوگوں کو یہ کیوں نہیں نصیب ہو رہا؟ ادھر ملک کی سب سے بڑی عدالت، سپریم کورٹ، ملک کے سب سے مشہور اور متنازعہ ارب پتی تاجروں میں سے ایک سبرت رائے سہارا کے معاملے میں عدالت میں کھل کر بار بار کہہ رہی ہے کہ ڈیڑھ برس سے سبرت رائے عدالت کا حکم اور ہدایات ان سنی کر رہے ہیں اور کسی بھی بات پر عمل نہیں کر رہے۔ ہندوستانی جمہوریت میں ایسے کتنے لوگ ہیں جن کو سبرت رائے کی طرح کا خاص درجہ ملا ہوا ہو؟ اور جو برس ہا برس تک سپریم کورٹ کا وقت ضائع کرتے ہوئے، ملک کی سب سے بڑی عدالت کے حکم کو ان سنا کرتے ہوئے اپنی من مانی کرتے رہیں؟ مجموعی طور پر پارلیمنٹ، ریاستی اسمبلیاں، وفاق اور ریاست کی حکومتیں، کاروباری حضرات اور ملک کے لیڈر، پارٹیاں اور میڈیا، ان سب کا جو حال نظر آ رہا ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ چور تو سبھی ہیں، کچھ پکڑے جا چکے ہیں، اور باقی کا پکڑا جانا ابھی باقی ہے۔ ایسے ملک میں سچن ٹینڈولکر جیسے لوگ بھارت رتن بن رہے ہیں، جو کروڑوں کی ٹیکس رعایت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو اشتہاروں کی ماڈلنگ میں کھلاڑی نہیں اداکار ثابت کرتے ہیں، کروڑوں کی مہنگی کاروں سے لے کر پانی صاف کرنے والے واٹر فلٹروں کی تشہیر کرنے والے یہ لوگ پارلیمنٹ میں بیٹھ کر غریبوں کی موت کے ذمہ دار گندے پانی کے بارے میں کبھی سوچتے بھی نہیں۔ کالے دھن میں بھارت ہی نہیں پاکستان بھی بدنام ہے۔ یہ خبریں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں

کہ سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں 40 پاکستانی سیاست دانوں اور تاجروں کا 200 ارب ڈالر جبکہ مختلف ملکوں کی باا ثر شخصیات اور کمپنیوں کا 20 کھرب ڈالر کا کالا دھن پڑا ہوا ہے جسے نکلوانے کیلئے امریکہ، بھارت اور کئی یورپی ممالک سوئس حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ تحقیقاتی صحافت کے عالمی کنسورشیم (ICIJ) کی ایک رپورٹ کے مطابق سوئٹزر لینڈ ایسے لوگوں اور کمپنیوں کے لئے جنت ہے جو ٹیکسوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ 1991 تک پاکستان کو فارن کرنسی اکاؤنٹ رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن نواز شریف حکومت نے 1992 میں اکنامک لبرالائزیشن سکیم کے تحت پہلی مرتبہ فارن کرنسی اکاؤنٹ کھلوانے کی اجازت دی تھی جس کے بعد اہم افراد نے پاکستان سے کالا دھن سوئس بینکوں میں رکھوانا شروع کر دیا۔ بی ای ای آئی (BEEI) کے سابق صدر اے بی شاہد نے کہا ہے کہ نواز حکومت کا یہ غلط فیصلہ تھا حالانکہ یہ سہولت صرف غیر ملکی تجارت کرنے والوں کو بھی ملنی چاہیے تھی۔ سابق چیئرمین سیکیورٹیز ایکسچینج کمیشن آف پاکستان رضی الرحمٰن نے تصدیق کی ہے کہ پاکستانیوں کی سوئس بینکوں میں پڑی رقم اربوں ڈالر میں ہے۔ سوئٹزر لینڈ میں سیکریسی قوانین بہت سخت ہیں جس سے اکاؤنٹ کی معلومات کا پتہ چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت عرصے سے کہا جا رہا ہے کہ حکومت پاکستان یہ لوٹی ہوئی رقم واپس لانے کیلئے قانونی حکمت عملی وضع کر رہی ہے اور سوئس حکام سے رابطے میں ہے۔ حکومت نے سوئٹزر لینڈ سے دوہرے ٹیکسوں کا دوطرفہ معاہدہ کرنے کے لئے مذاکرت پھر سے شروع کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ لیکن نتیجہ

وہی ڈھاک کے تین پات۔ نواز شریف کی نئی حکومت نے بھی آتے ہی دسمبر تیرہ میں کالا دھن سفید کرنے کی نئی اسکیم نکالی۔ کالا دھن سفید کرنے کی وزیراعظم سرمایہ کاری اسکیم کا نوٹیفکیشن بھی جاری ہوا۔ اسکیم کے تحت سرمایہ کاری کرنے والوں سے آمدن کا ذریعہ نہیں پوچھا جائے گا۔ گرین فیلڈ، انڈسٹری اور تعمیرات کے شعبے میں سرمایہ کاری کی جاسکے گی۔ ایف بی آر کے نوٹیفکیشن کے مطابق وزیراعظم کی سرمایہ کاری اسکیم کا آغاز یکم جنوری سے ہوجائے گا۔ جس کے تحت سرمایہ کار تعمیرات، بلوچستان، کے پی کیمیں کان کنی، تھرکول، گرین فیلڈاورانڈسٹری کیشعبوں میں سرمایہ کاری کرسکیں گے۔ اسکیم کے تحت سرمایہ کاری کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اسکیم کے تحت کھاد، چینی، سگریٹ، ٹیکسٹائل کی صنعتیں لگانے کی اجازت دی جائے گی جبکہ گھی، تیل، اسلحہ اور مشروبات کی صنعتیں لگانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جانے کیوں سیاست دانوں کو ہمیشہ کالے دھن والوں ہی کی کیوں فکر لگی رہتی ہے۔

بھارتی فلمی ستارے، شہرت کے آسمان سے سیاست کے میدان تک

بھارتی عوام میں مقبول فلمی ستاروں کے سیاست کے میدان میں اترنے کی داستان کوئی نئی نہیں۔ دلیپ کمار ہوں یا امیتابھ بچن بے شمار ستارے انتخابات میں اپنی قسمت آزمائی کر چکے ہیں۔ کئی ستارے لوک سبھا میں اپنی جگہ بنانے میں بھی کامیاب رہے اور کچھ کو اس میدان میں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تاہم یہ سلسلہ ہے کہ کہیں رکتا دکھائی نہیں دیتا۔ بھارتی عام انتخابات میں سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ بولی ووڈ کے کئی ستارے بھی حصہ لے رہے ہیں، جن کی وجہ سے یہ انتخابات پہلے سے بڑھ کر رنگین ہو گئے ہیں۔ سیاستدانوں کی تقاریر، سیاستدانوں کے حیلے بہانے اور سیاستدانوں کے منصوبے یہ سب بھارت کی سیاست کو کافی ڈرامائی بنا دیتے ہیں، تاہم بھارت کی فلم انڈسٹری ان سیاسی ڈراموں کو پردہ سکیں پر پیش کرنے میں پس و پیش کرتی ہے۔ فلموں میں سیاسی مسائل تو ہوتے ہیں لیکن خالص سیاسی فلم مشکل سے ہی نظر آتی ہے۔ سیاست میں دلچسپی کے باوجود دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے دعوے کے بعد بھی بھارت سیاسی فلمیں بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس بارے میں مختلف سماجی مسائل کو فلموں کا موضوع بنانے والے فلم ساز اور ہدایت کار شیام بینیگل نے کہا: ’ہمارے ملک میں سینسر کافی حساس ہے۔ اگر ہم نے ایک سیاسی فلم بنا بھی لی تو

سینسر اپنی قینچی لیے کھڑا ہوگا۔ وہ نہیں چاہتے کہ کسی بھی پارٹی یا کسی بھی برادری کے مقاصد اور ان کے نقطۂ نظر کو پردے پر دکھا کر لوگوں کے خیالات تبدیل کیے جائیں۔' بھارت میں فلم کا مطلب ہے جو آپ کو تفریح فراہم کرے۔ کوئی اپنی فلموں کے " ذریعے کبھی ایک پارٹی یا ایک معاشرے کی سرگرمیوں پر تبصرہ یا رائے نہیں دے سکتا۔ کئی سالوں سے فلموں کا مطلب ہی تفریح ہو گیا ہے۔ پھر پولیٹکل سنیما کو کیسے جگہ ملے؟ پھر کیا طریقہ ہے پولیٹکل فلمیں بنانے کا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے بینیگل نے کہا: دیکھو اگر ایسی فلمیں بنانی ہی ہیں تو طنز اور ڈرامے کو ساتھ لینا پڑے گا کیونکہ یہاں براہِ' راست سیاسی فلم بنانا اور بیچنا مشکل ہے۔ کوئی بھی پروڈیوسر ایسے موضوع پر پیسے لگانے سے پہلے تین بار سوچے گا اور اس لیے کوئی یہ خطرہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایسا صرف بھارت میں ہی نہیں دنیا بھر میں ہے۔' شیام بینیگل نے مزید کہا: 'اگر کسی کو سیاسی فلم بنانا ہے تو دستاویزی فلم کی طرح سے بنایا جائے کیونکہ فیچر فلم بنانے میں زیادہ خطرہ ہے اور دستاویزی فلم وہی دیکھیں گے جنھیں سیاسی سنیما میں دلچسپی ہے۔' فلم 'شپ آف تھیسیس' بنانے والے آنند گاندھی آج کل ایک سیاسی ڈاکیومنٹری پر کام کر رہے ہیں۔ اس دستاویزی فلم میں عام آدمی پارٹی کی دہلی اسمبلی انتخابات میں کامیابی اور بھارت میں گذشتہ ایک سال کی سیاسی ہلچل کو کیمرے میں قید کیا گیا ہے۔ 'کئی ہندوستانی فلموں میں سیاسی گفتگو دکھائی جاتی ہے۔ جیسے کئی فلموں میں بے روزگاری، مہنگائی،

بدعنوانی وغیرہ کو مرتکز کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں آنے والی فلم 'دیکھ تماشا دیکھ' کے ڈائریکٹر فیروز عباس خان اپنی فلم کو سیاسی طنزیہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: 'سنیما دیکھنے والوں کا مقصد اپنی حقیقی دنیا کو بھول کر ایک خواب کی دنیا میں چلے جانا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی مشکلات کو سنیما پر نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے سیاسی سنیما کا چلن کم ہے۔' فیروز عباس سے جب 'اپہرن' اور 'راج نیتی' جیسی فلمیں بنانے والے ہدایتکار پرکاش جھا کی بات کی گئی تو انھوں نے کہا: 'پرکاش جھا کی تازہ فلموں میں گہرائی نہیں ہے۔ ان میں سب پرانا سا لگتا ہے۔ ان کی فلموں کی آنچ تو پولیٹکل ہے لیکن اندر کی کہانی عام ہوتی ہے، شاید وہ سمجھ گئے ہیں کہ مارکیٹ یہی چاہتی ہے۔' سیاسی فلم بنانے کا موقع بھارت میں بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ عباس خان کہتے ہیں کہ 'ایک فلم کے ساتھ بہت سے لوگ جڑتے ہیں اور شاید ان میں سے کچھ کو اس پر یقین نہیں ہے۔ سیاسی موضوع پر مضمون لکھنا آسان ہے، ڈرامہ کرنا آسان ہے، پر فلم بنانا مشکل ہے۔' بھارت میں تقریباً 80 کروڑ ووٹرز ہیں اور پولیٹکل فلمیں برائے نام ہی بنتی ہیں۔ دیوان کا کہنا ہے جب تک ہندوستانی سنیما پر سے یہ ناچ گانے والی فلموں کی مہر نہیں اٹھتی اور جب تک فلم سازوں کی سیاست جیسے اہم ایشوز پر فلم بنانے کی خواہش نہیں ہوگی تب تک یہ سوال اٹھتا رہے گا کہ سیاسی فلموں سے کیوں بھاگتا ہے بالی وڈ؟ بھارت میں سیاسی فلمیں تو نہیں بن سکی۔ لیکن فنکار سیاست دان بن گئے،اس بار الیکشن میں بھی بہت سے فنکار

حصہ

لے رہے ہیں۔ فتح تو جانے ان کے نصیب میں ہے یا نہیں، لیکن ہیما مالنی بی جے پی کے ٹکٹ پر متھرا سے لوک سبھا کا انتخاب لڑیں گی، میرٹھ سے کانگریس کے ٹکٹ پر فلمسٹار نغمہ امیدوار ہیں۔ راج ببر اس مرتبہ غازی آباد سے الیکشن لڑیں گے،انھوں نے سیاست کو اپنی زندگی میں اس طرح شامل کیا ہے کہ اب تک چار مرتبہ انتخابات جیت چکے ہیں۔ گورداس پور سے الیکشن لڑنے والے ونود کھنہ نے بھارتیہ جنتا پارٹی کو دل میں بسا رکھا ہے۔ مون مون سین ترینامل کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں گی اور تاش کے تیسرے بادشاہ کو تو ہم بھول ہی گئے۔شتروگن سھنا کو بی جے پی کا ٹکٹ پٹنہ سے ملا ہے۔ پریش راول بھی بی جے پی کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ جانا چاہتے ہیں، راکھی ساونت کو بی جے پی نے بنگال سے لڑانا چاہا مگر وہ ممبئی سے الیکشن لڑنے پر بضد ہیں۔ تاہم سچ یہ ہے کہ وہ بھی بی جے پی سے الیکشن لڑین گی۔ دھرمندر بی جے پی کی طرف سے انتخابی مہم میں حصہ لیں گے۔کانگریس چھوڑ بی جے پی کا ہاتھ اور بی جے پی چھوڑ کر کانگریس کا ہاتھ تھامنے والے فلمی ستاروں کی سیاسی تگ و دو اب شروع ہونے کو ہے۔ پچھلے دنوں مشہور بھارتی فلمی اداکارہ پونم ڈھلون نے کانگریس سے ناطہ توڑ کے بی جے پی میں شمولیت اختیار کی۔ پونم کے والد ایروناٹیکل انجینیئر تھے، بھائی بہن ڈاکٹر اور خود پونم نے پولیٹکل سائنس پڑھی تھی۔ لیکن اپنی دلکش شکل و صورت کے باعث پونم نے بھارتی فلمی صنعت ممبئی کی بالی ووڈ سے اپنے کرئیر کا آغاز کیا۔ اور نو سال کے عرصے میں نوے فلموں میں کام کیا۔

پونم کا شمار ان دو درجن بھارتی فلمی ستاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے عام انتخابات کے لئے سیاست میں اترنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر فلمی صنعت کو خیر باد کہا اور اپنی نجی زندگی میں مشغولیت کے دوران ہی انھوں نے سیاست کا میدان چُنا۔ ابتدا میں انھوں نے کانگریس کے ساتھ دو سال کام کرنے سے اور اب حالیہ انتخابات کے لئے انھوں نے بی جے پی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کانگریس کے ساتھ اپنی سیاسی کاوشوں کو پونم نے خاصا کارگر' قرار دیا ہے۔ اب ان کا کہنا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت سیاست کو' دینے کو تیار ہیں اور اپنی پولیٹکل سائنس کی تعلیم کو صحیح معنوں میں استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ 'یہ ڈگری ان کے کام آئے گی' بھارت میں لوک سبھا کے الیکشن میں بی جے پی نے امیٹھی کے حلقے سے کانگریس کے نائب صدر راہل گاندھی کے مقابلے کیلئے ٹی وی کی سابق فنکارہ سمرتی ایرانی کو نامزد کردیا ہے، یاد رہے کہ وہ ''ساس بھی کبھی بہو تھی'' نامی ڈرامہ سیریل کے ذریعے بہت بڑے پیمانے پر مشہور ہوچکی ہیں، اسی حلقے سے عام آدمی پارٹی نے ممتاز شاعر کمار وشواس کو ٹکٹ دیا ہے جنھوں نے ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے یہ دلچسپ فقرہ کہا کہ میرے مقابلے پر ''ایرانی ہو یا پاکستانی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ حلقے کے عوام فیصلہ کرچکے ہیں''، بھارتی ذرائع ابلاغ کے مطابق انتخابی مہم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، اس مرتبہ بہت بڑی تعداد میں نوجوان پہلی مرتبہ اپنا حق رائے دہی استعمال کریں گے، ماضی کی نسبت سوشل

میڈیا کو تشہیری مہم میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوچکی ہے، ان تمام عوامل کی وجہ سے لوک سبھا کے آئندہ الیکشن میں امیدواروں کے درمیان سخت مقابلے کا امکان ہے، سیاسی مہم کے دوران بعض اوقات امیدواروں اور رہنماؤں میں دلچسپ فقروں کا تبادلہ بھی ہو رہا ہے۔بھارت میں پارلیمانی انتخابات کے پیش نظر ہر جگہ سیاسی ہلچل نظر آ رہی ہے یہاں تک کہ اس دوران ریلیز ہونے والی فلموں کے پروموشن میں بھی انتخابات کے تعلق سے باتیں ہو رہی ہیں۔کچھ ایسے بھی فنکار ہیں کہ جو اپنے خاندان کی سیاست سے کنارہ کش نظر آتے ہیں۔ ممبئ میں ایک فلم کے پروموشن کے دوران معروف اداکار سنی دیول نے ایک سوال کے جواب میں کہاکہ وہ سیاست کے لیے نہیں بنے ہیں۔یاد رہے کہ ان کے والد اور اپنے زمانے کے معروف اداکار دھرمیندر بھی سیاست کے میدان میں اتر چکے ہیں جبکہ ان کی سوتیلی ماں ہیما مالنی تو بی جے پی کا معروف چہرہ تصور کی جاتی ہیں۔سنہ 1983 میں فلم 'بیتاب' سے اپنے فلمی کریئر کا آغاز کرنے والے سنی دیول گذشتہ دنوں ممبئ میں فلم 'ڈھشکیاؤں' کے پروموشن کے لیے آئے تھے جس میں وہ 'للکوا' کا کردار نبھا رہے ہیں۔ وہاں انھوں نے انتخابات کے موضوع پر اخباری نمائندوں سے بات کی۔انتخابات کے بعد ملک میں وہ کس قسم کی تبدیلی دیکھنا چاہیں گے ؟اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا: 'تبدیلی پہلے ہم سب کو اپنے اندر لانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر چیز صحیح طریقے سے کرنے کی ضرورت ہے۔اگر ہم کوئی کام کرنے جا رہے ہیں اور وہ کام نہیں ہو پا رہا ہے، تو ہمیں اس کے

لیے رشوت نہیں دینی چاہیے۔' سنی دیول نے فلم بیتاب سے اپنے کریئر کی شروعات کی تھی۔انھوں نے کہا: 'اگر آپ کسی قطار میں لگے ہوں تو اس قطار کو نہ توڑیں اور کوڑا کرکٹ ادھر ادھر نہ پھینکیں۔ اگر ہم یہ سب کریں اور کسی کی برائی نہ کریں تو ملک میں اپنے آپ ہی تبدیلی آ جائے گی۔ سنی دیول نے کئی معروف فلمیں کی ہیں جن میں 'سوہنی مہیوال'، 'یتیم، 'گھایل'، 'غدر ایک پریم کتھا'، 'بورڈر' وغیرہ شامل ہیں۔کیا سنی دیول کا فلموں سے سیاست میں آنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں سنی نے کہا: میں ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کل کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا البتہ میں' اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں اس ڈھنگ کا آدمی نہیں ہوں اور میں سیاست کے لیے نہیں بنا ہوں۔' ٹی وی میں آنے کے سوال پر انھوں نے کہا: 'اگر ٹی وی میں مجھے کچھ ایسا شو ملے، جس میں ایک اچھی کہانی ہو اور اس کے کردار اچھے ہوں تو میں اس پروگرام کو ضرور کرنا چاہوں گا۔ واضح رہے کہ امیتابھ، سلمان، شاہ رخ، اور عامر خان جیسے بڑے اداکار ٹی وی پر بھی موجود ہیں۔ سنی دیول بہت سی فلموں میں سکھ کے کردار میں نظر آئے ہیں۔جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا وہ ٹی پروگرام 'ستیہ مے وجیتے جیسے کسی پروگرام کا حصہ بننا چاہتے ہیں جس میں سماجی مسائل پر بحث کی جاتی ہے تو انھوں نے کہا: دیکھئے میں نے یہ شو نہیں دیکھا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ اگر کسی شو میں اچھی' کہانی ہوگی تو میں اسے ضرور کرنا چاہوں گا۔' سنی دیول کا زور کہانی پر تھا لیکن کہا جاتا ہے کہ آج

کل کہانی سے زیادہ اس کی پروموشن فلم کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ اس بات پر سنی دیول نے کہا: 'دیکھیے پبلسٹی پر ہی فلمیں نہیں چلتیں۔ پبلسٹی کو صرف بیداری پھیلانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد ہی لوگوں کو آپ کی فلم کے ٹریلر اچھے لگیں گے، آپ کی فلم کی جھلک اچھی لگے گی تو وہ فلم دیکھنے آئیں گے۔ عوام کو اس وقت کیا کھانے کی خواہش ہے۔ بی جے پی کی سب سے بڑی حریف کانگریس پارٹی نے چودہ فلمی ستاروں کو اپنی جماعت میں شامل کیا تھا۔ اس کے رکن پارلیمان سبیرامی ریڈی کا کہنا ہے کہ فلمی ستاروں میں ماضی کے مقابلے میں آج سیاسی شعور زیادہ ہے۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ' ہیں اور سیاست کو سمجھتے ہیں۔ بیشتر فلمی ستارے سیاسی جماعتوں کے لئے انتخابی مہموں میں شامل ہوئے ہیں لیکن فلم سٹار گوندا ممبئی کے ایک انتخابی حلقے سے ایک بڑے وفاقی وزیر کے خلاف الیکشن لڑ چکے ہیں۔ فلمی ستاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بھارتی تاریخ سے آشنا نہیں ہیں۔ جب ایک اخبار نویس نے بی جے پی کا ہاتھ تھامنے والے سریش اوبرائے سے پوچھا کہ چھ دسمبر 1992 کیوں اہم تاریخ سمجھی جاتی ہے تو انہوں نے بڑے اچنبھے سے پلٹ کر اخبار نویس سے ہی پوچھا آخر کیوں'؟ یاد رہے کہ یہ وہ تاریخ ہے جب ایودھیہ میں بابری مسجد منہدم کی گئی تھی۔ انیس سو اسی کے وسط میں مشہور اداکار امیتابھ بچن نے کانگریس کے ٹکٹ پر اپنے آبائی شہر الہ آباد سے انتخاب جیتا تو تھا مگر پھر انہوں نے سیاست چھوڑ دی تھی۔ امیتابھ کا خیال تھا کہ سیاست جذبات کی دنیا سے بڑا میدان ہے

اور اس میں کھیلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں'۔ بھارت میں حالیہ عام انتخابات میں اس بار بھی کئی فلمی ستارے انتخابی سرگرمیوں میں مصروف نظر آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی بھارتی فلمی ستارے کروڑوں ووٹروں کو انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے لئے اکسانے کی مہم پر بھی نکلے ہوئے ہیں۔ فنکار سیاست کے میدان میں کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ سپر سٹار عامر خان اور 2006 میں سپر ہٹ ہونیوالی فلم ''رنگ دے بسنتی'' کے ہدایت کار راکش مہرا نے مل کر ٹی وی کے لئے ایک ایک منٹ کی تین اشتہاری فلمیں بنائی۔ جن کا مرکزی پیغام ہے '' استحکام کے لئے ووٹ دیں، اچھے لوگوں کو ووٹ دیں''۔ عامر خان کا کہنا ہے کہ تشدد اور ممبئی حملوں نے بھارت کو بدل دیا ہے۔ اب عوام زیادہ حساس ہوگئے ہیں اور ان کی سیاستدانوں سے زیادہ توقعات وابستہ ہیں۔ میرے خیال میں یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ صحیح امیدواروں کو ووٹ دیں۔''انھوں نے مزید کہا: '' میں کسی پارٹی یا کسی خاص نظریہ کو مشتہر نہیں کر رہا میرا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام صحیح امیدواروں کو کامیاب بنائیں۔''کئی بار سیاست میں بولی وڈ کے فلمی ستاروں نے نہ صرف بھارت میں مثبت تبدیلیوں کے لئے اپنا کردار ادا کیا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ عوام میں سیاسی شعور آگاہی کے لئے بھی سالوں سے جدوجہد میں مصروف ہیں۔'' انتخابات میں حصہ لینے پر سنجے دت کی پابندی اور گووندہ کی انتخابات سے دستبرداری جیسے معاملات کے ساتھ ساتھ کئی بار یہ فلمی ستارے سیاسیت کی بام اوج تک بھی پہنچے۔ سنجے دت کے والد سنیل دت

کانگریس کی طرف سے انیس سو چوراسی میں پارلیمان کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ من موہن سنگھ کی کانگریس جماعت کی حکومت میں انہوں نے بوقت مرگ 2005 تک بطور وزیر بھی خدمات سرانجام دیں۔دلیپ کمار بھارتی ایوان بالاکے رکن رہے اور ہند وپاک دوستی کے رابطوں کے لئے اہم کردار ادا کیا۔امیتابھ بچن بھی انیس سو چوراسی میں ریکارڈ ووٹوں سے بھارتی لوک سبھاکے رکن منتخب ہوئے تھے۔تاہم دو برسوں بعد وہ ایوان کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ان کے علاوہ بولی وڈکے سیاست کے میدان میں بھی کامیاب رہنے والے ستاروں میں گووندہ، شترگن سنہا، دھرمندر، ہما مالنی اور ونود کھنہ قابل ذکر نام ہیں۔نوپم کھیر کی اہلیہ کرن کھیراپارلیمانی انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں اور وہ انکی پرزور حمایت کر رہے ہیں۔میڈیا سے گفتگو میں انوپم کھیر نے خواتین کو انتہائی مضبوط قرار دیتے ہوئے اس بات کی بھی پرزور مخالفت کی کہ سیاست فلمی ستاروں کے بس کی بات نہیں۔انہوں نے کہاکہ فلمی ستاروں میں سیاست کی سمجھ بوجھ سیاسی لیڈروں سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔

بھارت میں عام انتخاب کے لئے جہاں سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے وہیں بالی وڈکے فلمی ستاروں کی انتخابی بھاگ دوڑ بھی بڑھ گئی ہے۔ بالی وڈکے اداکار سلمان خان کانگریس کے ایک امیدوار ملند دیوڑا کی انتخابی مہم میں شرکت کرچکے ہیں۔ وہ ایک روڈ شو میں اپنی جھلک دکھلا کر چل

دیئے۔ سلو بھیا کی آمد کا سن کر علاقے کے ہزاروں ووٹروں نے انتخابی جلسے میں شرکت کی اور ان کیلئے نیک جذبات کا اظہار کیا۔ دوسری طرف بالی وڈ کے منا بھائی سنجے دت کا غذات نامزدگی مسترد ہونے کے بعد اپنی جماعت سماج وادی پارٹی کے جلسوں کیلئے دن رات کام کیا۔ سنجے دت سماج وادی پارٹی کی اتحادی جماعت کے ایک امیدوار راما سنگھ کی انتخابی مہم کیلئے دن رات لگے رہے۔ سیاست ہو یا اداکاری دونوں میں عوام کی دلچسپی اور جوش خروش قائم رہتا ہے، دنیا بھر میں فلمی ستارے اپنی سیاسی وابستگی کا کہیں نہ کہیں اعلان کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں طارق عزیز نے پیپلز پارٹی میں بڑے جوش خروش سے کام کیا۔ لیکن پاکستانی فلمی اداکاروں کو سیاست راس نہیں آئی۔

سی آئی اے تفتیش کے وحشیانہ طریقے

امریکہ میں سی آئی اے کیا کاروائی قیدیوں پر انسانیت سوز مظالم پر چھ ہزار صفحات نے ایک رپورٹ نے تلکہ مچایا ہوا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق جارج بش کے دور میں ''بلیک سائٹس'' نامی خفیہ مقامات پر اسیروں کو انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنایا گیا، ان طریقوں کی ناکامی کے باوجود نتیجہ خیز قرار دیا گیا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ان انسانیت سوز مظالم کے باوجود دہشت گردی روکنے میں مدد نہیں ملی، بہت سے اہلکاروں نے اس طریقے سے اختلاف بھی کیا لیکن اسے نظرانداز کیا گیا، اب برسہابرس گذرنے کے بعد امریکی سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی نے انکشاف کیا ہے کہ خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ملزمان سے تفتیش کیلئے وحشیانہ طریقے استعمال کئے اور ان کے بارے میں حکومت اور عوام کو گمراہ کیا، 6300 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں کمیٹی نے بتایا کہ کہ سی آئی اے نے تفتیش کے یہ ظالمانہ طریقے سابق صدر بش کے دور میں اختیار کئے، ''بلیک سائٹس'' نامی خفیہ مقامات پر متعدد اسیروں پر انسانیت سوز مظالم کئے گئے جو مکمل طور پر ناکام رہے، اس کے باوجود سی آئی اے کے ذمے داروں نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ طریقے بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئے کیونکہ ان کی بدولت اسیر ملزمان سے اہم

معلومات حاصل کی گئیں، سینیٹ کمیٹی نے اس دعوے کو یکسر غلط اور بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ اب یہ حقیقت ثابت ہو گئی ہے کہ ان ناپسندیدہ طریقوں کے نتیجے میں اسیروں سے کوئی اہم اطلاع نہیں مل سکی، جو خفیہ اطلاعات مل سکیں وہ بھی ان اذیت ناک طریقوں سے نہیں بلکہ دنیا بھر میں رائج تکنیکی طریقوں کے نتیجے میں حاصل ہوئیں، یہ طریقے اس قدر بہیمانہ تھے کہ سی آئی اے کے کئی اہلکار انہیں دیکھ نہیں سکے اور انہوں نے ان ہتھکنڈوں سے اختلاف کیا جسے سینئر عہدیداروں نے مسترد کر دیا، اس کے بعد اختلاف کرنے والے کئی اہلکار ملازمت چھوڑ کر بھاگ گئے، یہ رپورٹ جمعرات کو سینیٹ میں پیش کی گئی۔ لیکن اب بھی سی آئی اے کی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں۔ سی آئی اے کے ذرائع نے سینیٹ کمیٹی کی رپورٹ پر تبصرے سے انکار بھی کیا ہے اور بہانہ یہ بنایا ہے کہ ہمیں تاحال اس کی نقل نہیں ملی، رپورٹ پڑھنے سے قبل ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے، امریکی اخبار کے مطابق اس رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ تفتیش کے نام پر قیدیوں کو سرد موسم کے دوران ٹھنڈے پانی میں ڈبکی لگوانا، ان کے سروں کو دیوار سے ٹکرانا اور طویل دورانیے تک انہیں سونے نہ دینا بھی شامل تھے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ امریکی صدر جارج بش کے زمانے میں سی آئی اے کی طرف سے قیدیوں پر تشدد کے طریقوں کے بارے میں امریکی سینیٹ کو غلط معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کا سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کے حوالے سے

کہا ہے کہ سی آئی اے نے تفتیش کے اپنے طریقوں کی افادیت ثابت کرنے کے لئے غلط بیانی کی تھی۔ سی آئی اے کے امریکہ میں ں ایسے خفیہ مقامات ہیں جہاں قیدیوں پر تشدد کیا جاتا ہے۔ سی آئی اے کے ان خفیہ مقامات کو 'بلیک سائٹس' کہا جاتا ہے۔

ان بلیک سائٹس پر قیدیوں پر تشدد کے ایسے طریقے استعمال کیے جاتے تھے جن کے بارے پہلے کبھی نہیں سنا گیا۔ بہت عرصے سے اس بات کی بازگشت سنائی دے رہی تھی کہ سی آئی اے تشدد کے بہیمانہ طور طریقے اپنائے ہوئے ہے، ہیومین رائٹس کے کئی ادارے ان پر تنقید کرتے تھے۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی نے مطالبہ کیا تھا کہ امریکی سینیٹ اپنی وہ رپورٹ جاری کرے، جس میں سی آئی اے کے ہاتھوں تشدد اور ایذا رسانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ رپورٹ سابق صدر جارج ڈبلیو بش کے دور میں امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کی طرف سے استعمال کیے گئے تفتیشی ہتھکنڈوں کے بارے میں تھی۔ اسی رپورٹ کے بارے میں سی آئی اے اور امریکی سینیٹ کی ایک کمیٹی کے مابین شدید تنازعہ بھی پایا جاتا ہے۔ ناقدین کے مطابق گیارہ ستمبر 2001 کے حملوں کے بعد سی آئی اے نے ایک تفتیشی پروگرام کے تحت ایسے طریقے اپنا لیے تھے، جو اس بہیمانہ تشدد کے زمرے میں آتے ہیں جس کی بین الاقوامی قانون کے تحت ممانعت ہے۔ اس موضوع پر اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹس کمیٹی میں امریکی کارکردگی کا

دو روزہ جائزہ جنیوا میں کئی روز جاری رہا تھا۔ سی آئی اے کے تشدد کے پروگرام سے منسلک ایک اہلکار نے اخبار کو بتایا کہ تشدد کے اس پروگرام کے نتائج زیادہ مفید نہیں تھے لیکن اس پروگرام کو جاری رکھنے کے لیے سی آئی اے نے ان طریقوں کی افادیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا کرتی تھی۔ ابھی اس بات کا فیصلہ کیا جائیگا کہ 6300 صفحوں پر مشتمل اس رپورٹ کی سمری صدر براک اوباما کو پیش کی جائے یا نہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے اہلکاروں نے یہ جانتے ہوئے کہ اس تشدد سے زیادہ مفید نتائج حاصل نہیں ہو رہے لیکن اس کے باوجود انھیں جاری رکھنے کی اجازت دی گئی۔ ایک اہلکار کا کہنا تھا کہ القاعدہ کے رکن ابو زبیدہ سے تمام اچھی معلومات انھیں 83 بار واٹر بورڈنگ کیے جانے سے پہلے ملی تھیں۔ اس رپورٹ میں قیدیوں کی حالت زار کے بارے میں سی آئی اے میں پائے جانے والے اختلافات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ایک ماہ پہلے سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی نے سی آئی اے کی طرف سے سینیٹ کے کمپیوٹروں تک رسائی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ الزام البتہ سنگین ہے کہ سی آئی اے' مشتبہ دہشت گردوں سے پوچھ گچھ کے منصوبوں کے متعلق عوام اور' قانون سازوں کو کئی برسوں تک غلط معلومات فراہم کرتی رہی تھی۔ واشنگٹن پوسٹ' کے مطابق امریکی سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں تصدیق کی کہ 'سی آئی اے' نے پوچھ گچھ کے متنازع طریقے استعمال کر کے شدت پسندوں سے اہم معلومات حاصل کرنے اور اس کی بنیاد پر دہشت گرد

حملے ناکام بنانے کے جو دعوے کیے، وہ سراسر جھوٹ تھے۔ اکثر اوقات 'سی آئی اے' کے اہلکار قیدیوں پر بدترین تشدد کرنے سے قبل ہی ان سے یہ معلومات حاصل کرچکے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود انہیں پوچھ گچھ کے متنازع اور تکلیف دہ طریقوں سے گزارا جاتا تھا۔

مذکورہ رپورٹ امریکی سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کی جانب سے 'سی آئی اے' کے متنازع اور پرتشدد 'انٹیرو گیشن پروگرام' کی گزشتہ چار برسوں سے جاری تحقیقات کا نتیجہ ہے۔اس 'انٹیرو گیشن پروگرام' کا آغاز امریکہ پر 11 ستمبر 2001 کے دہشت گرد حملوں کے بعد اس وقت کے صدر جارج ڈبلیو بش کے دورِ حکومت میں ہوا تھا۔ مشتبہ شدت پسندوں اور قیدیوں کیساتھ ظالمانہ اور ناروا سلوک اور تفتیش کے دوران تشدد کرنے کے الزامات اور شواہد سامنے آنے کے بعد امریکی حکومت نے اس پروگرام پر پابندی عائد کردی تھی اور اس میں ملوث اہلکاروں کیخلاف تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ 'سی آئی اے' کے قیدیوں کے ساتھ اس سلوک پر خود ایجنسی کے اندر بھی سخت اختلافات موجود تھے۔ 'واشنگٹن پوسٹ' اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ایک موقع پر تھائی لینڈ میں قائم 'سی آئی اے' کے خفیہ قید خانے میں قیدیوں سے پوچھ گچھ کے دوران ان کے ساتھ کیے جانے والے "ظالمانہ برتاو سے گھبرا کر تفتیش کی نگرانی کرنے والے ایجنسی کے بعض افسران بھی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی یہ رپورٹ عوام کے لئے جاری

نہیں کی گئی ہے۔

سینیٹ کمیٹی نے معاملے کی تحقیقات مکمل کرکے اپنی ضخیم رپورٹ جائزے اور اپنا موقف واضح کرنے کے لیے 'سی آئی اے' کے حکام کو بھجوادی ہے جن کا جواب آنے کے بعد اس کے کچھ حصوں کو عوام کے لیے جاری کیا جاسکتا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ پوری رپورٹ عوام کے لئے جاری نہیں ہوگی۔ البتہ تحقیقاتی رپورٹ کی تلخیص عوام کو جاری کرنے کی سفارش کی جائے گی۔ اس کی حتمی اجازت صدر براک اوباما ہی دیں گے۔ گزشتہ ماہ سینیٹ کمیٹی کے چیئرمین سینیٹر ڈیانے فیسنٹن نے 'سی آئی اے' پر تحقیقات کے دوران کمیٹی کے زیرِ استعمال رہنے والے کمپیوٹر نیٹ ورک کی جاسوسی کرنے کے الزامات بھی عائد کیے تھے جس کے بعد یہ معاملہ خاصا گھمبیر ہوگیا تھا۔

سی آئی اے' کے حکام نے جوابی الزام عائد کرتے ہوئے کہا تھا کہ سینیٹ کمیٹی کے بعض' معاونین نے تحقیقات کے دوران ایجنسی کی بعض خفیہ دستاویزات غیر قانونی طور پر ہتھیا لی تھیں۔ سینیٹر ڈائن فائن سٹائن نے الزام عائد کیا تھا کہ سی آئی اے کی طرف سے سینیٹ کے کمپیوٹروں کی ہیکنگ 'آئینی فریم ورک' کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔ سی آئی اے کے تشدد کے حوالے سے گوانتا ناموجیل بہت بدنام ہوئی۔ میڈیکل رپورٹس سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ گوانتا ناموجیل

میں قید ایک قیدی پر سی آئی اے اہلکاروں نے دوران حراست ایسا تشدد کیا کہ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی اور وہ عمر بھر کیلئے طبّی مسائل سے دوچار ہوگیا۔ عمار ال بلوچ نامی شخص 11/9 حملوں میں مدد کے الزام میں قید ہے۔ عمار کے بلوچ کی پیروی کرنے والے اٹارنی جیمز کونیل نے قیدیوں کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کے حوالے سے کیس کی سماعت کے دوران بتایا کہ عمار کو سی آئی اے کی حراست میں سر پر چوٹ لگی جس کی وجہ سے ان کی یاداشت متاثر ہوئی ہے اور وہ بے خیالی و دیگر ذہنی امراض میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ انہیں یہ چوٹ 2003 سے 2006 کے دوران سی آئی اے کی حراست میں لگی۔ امریکہ نے نائین الیون کے بعد دنیا بھر خصوصا مسلمان ملکوں سے ہزاروں بے گناہ افرد کو گرفتار کرکے عقوبت خانوں میں رکھا اور ان پر بدترین تشدد کیا۔ محمد جواد بھی ان ہزاروں افراد کی طرح پانچ سال بعد گوانتا ناموبے جیل سے رہا گیا تھا۔ جن پر امریکیوں نے جھوٹے الزام لگائے تھے۔ جواد پر دو امریکی فوجیوں پر حملہ کرکے زخمی کرنے کا الزام عائد تھا۔ اس وقت جواد کی عمر ۱۲ سال تھی۔ انسانی حقوق کی تنظیموں اور اداروں کے لئے یہ ایک ٹیسٹ کیس تھا۔ محمد جواد کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ اسے گوانتاناموبے کی خوفناک جیل میں خوفناک اذیتیں دی گئی۔ اس کا بچپن اس سے چھین لیا گیا۔ لیکن عالمی عدالت انصاف سوتی رہی۔ اور برسہابرس تک امریکیوں کے بھیانک جرائم پر پردہ پڑا رہا۔ سی آئی اے کی جانب سے دورانِ تفتیش مشتبہ دہشتگردوں پر جو تشدد کیا جاتا رہا

اس کی تفصیلات اب امریکی دستاویزات کا حصہ ہیں۔ جو آہستہ آہستہ منظر عام پر آ رہی ہیں۔ بدنام زمانہ گوانتاناموبے میں قیدیوں کو خوفزدہ کرنے کیلئے ان کے سیل سے ملحقہ کمروں میں دیگر قیدیوں کے قتل کا ڈرامہ رچا کر تفتیش کیے جانے اور شدید نفسیاتی دباو ڈالے جانے کا بھی انکشاف ہوا ہے۔ امریکی میڈیا کے مطابق عنقریب جاری کی جانے والی سی آئی اے کی رپورٹ میں گوانتاناموبے جیل کے قیدیوں سے وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک کیے جانے کا واضح تذکرہ موجود ہے۔ رپورٹ کے مطابق قیدیوں میں جان سے مارے جانے کا خوف پیدا کرنے کیلئے ان کے سیل سے ملحقہ کمروں میں باقاعدہ فائرنگ اور ہنگامہ آرائی کرکے قیدی کو عدم تعاون پر قتل کرنے کا بھرپور ڈرامہ رچایا جاتا تھا۔ قیدیوں کو نشانے پر لے کر فائر کرنے کا ڈرامہ کیا جاتا اور ڈرل مشین کو جسم کے حساس اعضا کے قریب چلا کر انہیں دہشت زدہ کیا جاتا رہا۔ سی آئی اے کی ان دستاویزات سے پتہ چلا ہے کہ دوران تفتیش نائن الیون کے مبینہ ماسٹر مائنڈ خالد شیخ محمد کو بچوں کے قتل تک کی دھمکی دی گئی تھی۔ تاکہ اس سے اعتراف کرایا جاسکے۔ چند برس قبل جاری کی جانی والی ایک رپورٹ کے سنسر شدہ حصوں میان بتایا گیا تھا کہ درجنوں مواقع پر سی آئی اے اہلکاروں نے مشتبہ شدت پسندوں کو ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا۔ امریکہ کی ں ایک عدالت نے حکم دیا تھا کہ سی آئی اے کے تشدد پر رپورٹ کے ان خفیہ حصوں کو منظر عام پر لایا جائے جنہیں بش انتظامیہ نے کلاسیفائیڈ کر دیا تھا۔ ان جرائم کی شدت کو دیکھتے ہوئے صدر

باراک اوباما نے دہشت گردی کے اہم ملزمان سے تفتیش کرنے کے لیے ایک نیا یونٹ تشکیل دینے کی منظوری دی تھی۔امریکی صدر باراک اوباما انتظامیہ نے سی آئی اے کے حراستی مراکز میں قیدیوں پر دوران تفتیش غیر قانونی تشدد کے انکشافات کے بعد اس معاملہ کی تحقیقات کرنے پر غور شروع کیا تھا۔ لیکن اس میں دس سال لگ گئے۔ سی آئی اے اہلکاران جرائم پر نہ تو شرمندہ ہوئے اور نہ انھوں نے مقدمات کا سامنا کیا۔ ایک مقدمے میں چھ اہلکاروں پر الزام تھا۔ جن میں سے صرف ایک کو سزا ہوئی باقی کے بارے میں سی آئی اے کے تحقیقاتی بورڈ کے ذریعہ پوچھ گچھ کی ہدایت کی گئی۔تاہم ان میں سے دو نے سی آئی اے بورڈ کے سامنے پیش ہونے کی بجائے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ان ہولناک مظالم کے بارے میں خود سی آئی اے حکام پریشان ہیں کہ وہ اپنے ان غیر قانونی اقدامات کا دفاع کس طرح کریں۔ نئی پابندیوں کے پیش نظر سی آئی اے نے بھی اپنی حکمت عملی میں تبدیل کرلی ہے۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پینیٹا نے اپنے ساتھیوں کو ایک ای میل بھیجی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کا تحفظ کریں گے جنہوں نے اپنے ملک کے لئے خدمات انجام دی ہیں۔ اور انہیں قانونی امداد دی جائے گی۔ سی آئی اے کے اہلکاروں کو ممکنہ جرائم کے مقدمات کا سامنا کرنے کی صورتحال پیش آسکتی ہے۔ جرمنی کے ایک ہفت روزہ نے یہ بھی انکشاف کیا تھا کہ امریکی سی آئی اے نے گوانتانامو بے کے قیدی منتقل کرنے کے لئے بلیک واٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ہفت روزے نے بلیک واٹر

کے دو سابق اہلکاروں کے حوالے سے بتایا ہے کہ بلیک واٹر قیدیوں کو مختلف ممالک منتقل کیا گیا۔ جہاں قیدیوں پر تشدد میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی۔ ان ممالک میں پاکستان، افغانستان، ازبکستان کا نام لیا گیا تھا۔ ابھی ان چار ہزار گمشدہ افراد کی تلاش کا کام بھی جاری ہے۔ جو دہشت گردی کے شبے میں غائب کر دیے گئے ہیں۔ عالمی انسانی حقوق کے اداروں کو ان مظالم پر آواز اٹھانی چاہیئے۔ کئی قانونی ماہرین کا خیال ہے کہ بش انتظامیہ کی جانب سے ان طریقوں کی اجازت دینا تشدد کے خلاف اس بین الاقوامی چارٹر کی صریحاً خلاف ورزی ہے جس پر امریکہ نے بھی دستخط کیے ہوئے ہیں۔

ایک واقعے میں سی آئی اے کے ایجنٹوں نے ایک قیدی کا گلا گھونٹا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس قیدی کو جھنجھوڑ کر ہوش میں لایا جاتا اور پھر اس کا گلا گھونٹا جاتا یہ سلسلہ تین مرتبہ جاری رہا۔ سی آئی اے سرد جنگ کے زمانے سے دنیا بھر میں اپنی حرکتوں کی وجہ سے خاصی بدنام رہی ہے۔ ماضی میں سی آئی اے کے غیر قانونی کاموں کو وقت کی حکومت کھلم کھلا سرپرستی نہیں دیتی تھی۔ لیکن سابق صدر بش اور سابق نائب صدر ڈک چینی نےاس بات کا دفاع کیا اور کہا کہ انہوں نے جو طریقے اپنائے وہ ملک کی سلامتی کے لیے انتہائی ضروری تھے۔ یہ بات دنیا کے لئے خاصی حیرانی کا باعث ہے کہ کس طرح، بظاہر ایک مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں تشدد کو سرکاری پالیسی کے طور پر اپنایا گیا اور اس کو

ایڈوانس انٹیرو گیشن ٹیکنیکس' یا اے آئی ٹیز کا نام بھی دیا گیا۔ سابق صدر بش اور ' اس کی انتظامیہ نے بڑی محنت کے بعد دس ایسی اے آئی ٹیز دریافت کیں جو امریکہ کے محکمہ انصاف کے بقول بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں کرتیں۔ بش انتظامیہ نے تشدد کے جن طریقوں کی منظوری دی تھی ان میں حواس باختہ کرنا: اس طریقے میں قیدی کے دونوں کاندھوں پر گردن کے پاس پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے سخت دباؤ ڈالتے ہوئے تفتیش کار کی جانب دھکیل کر لایا جائے گا۔ دیوار سے ٹکرانا: اس میں قیدی کو تفتیش کے دوران اچانک زور سے آگے کھینچا جائے گا اور پھر زور سے اس کو پیچھے دھکیل کر ایک مضبوط گدے کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا جائے گا جس سے اس کے کاندھے شولڈر بلیڈ) ٹکرائیں گے۔ خیال رکھا جائے گا کہ قیدی کے سر کو سہارا دیکر محفوظ رکھا) جائے۔ چہرا ساکت رکھنا: قیدی کا چہرا تفتش کار اپنے ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیوں سے مظبوطی سے پکڑ کر رکھے گا تاکہ ملزم اپنا چہرا نہ ہلا سکے۔ بے عزتی کے لیے چہرے پر تھپڑ: قیدی کو بےعزت کرنے کے لیے یہ 'تکنیک' استعمال کی جائے گی جس میں قیدی کے گال پر کھلے ہاتھ سے تھپڑ مارا جائے گا لیکن خیال رہے کہ انگلیاں کھلی ہوں۔ تنگ جگہ میں میں قید تنہائی: اس طریقے میں قیدی کو چھوٹے یا بڑے، اندھیرے بکسوں میں بند کیا جاتا ہے تاکہ اس کی ہمت ٹوٹ جائے۔ چھوٹے بکسے میں قید تنہائی دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے اور بڑے بکسے میں قیدی کو زیادہ سے زیادہ اٹھارہ گھنٹے تک بند رکھا جا سکتا ہے۔ تنگ جگہ میں قیدی

کے ساتھ کیڑے: قیدی کے اندھیرے بکسے میں غیر نقصان دہ کیڑے ڈالے جاسکتے ہیں۔جوڑوں پر دباؤ: قیدی کو ایک دیوار سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑا کرکے اسے دیوار کی جانب اس طرح جھکایا جائے گا کہ اس کے بازو سامنے کی جانب سیدھے ہوں اور اس کا پورا وزن اس کے ہاتھوں کی انگلیوں پر توازن قائم کرلے۔ قیدی کو اس پوزیشن میں ہاتھ یا پاؤں کی حرکت کی اجازت نہیں ہوگی۔مسلسل دباؤ: قیدی کو فرش پر بٹھا کر اس کی ٹانگوں کو سامنے کی جانب سیدھا پھیلا کر رکھا جائے گا، اس کے ہاتھ سر سے اوپر اٹھے ہوں گے یا پھر زمین پر رکھے رہیں گے جبکہ قیدی کو پیچھے کی جانب پینتالیس ڈگری پر جھکا کر بٹھایا جائے گا۔نیند نہ کرنے دینا: کسی بھی ایک وقت میں قیدی کو گیارہ دن تک جگایا جاسکتا ہے۔ڈبونے کا احساس دلانا: اس طریقے کو واٹر بورڈنگ کا نام دیا گیا اور اس میں قیدی کو ایک بنچ سے باندھ کر بنچ کو ایک طرف سے اس طرح بلند کیا جاتا ہے کہ قیدی کا سر نیچے جبکے ٹانگیں اٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ قیدی کا سر ایک جگہ ساکت کیے جانے کے بعد ایک تفتیش کار اس کے منھ اور ناک پر کپڑا ڈالتا ہے جبکہ دوسرا اس کپڑے پر آہستہ آہستہ پانی انڈیلتا ہے۔ قیدی کی سانس کی نالی بند ہوجاتی ہے اس کے جسم میں آکسیجن کی کمی واقع ہوتی ہے اور قیدی کو ڈوبنے کا احساس ہوتا ہے۔قیدی کو بھاری ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں مسلسل دن بھر ایک سیل سے دوسرے منتقل کیا جاتا۔اس کے علاوہ کئی اے آئی ٹیز کو مزید سخت بنانے کے لیے ایجنٹوں نے اپنے طور پر تبدیلیاں کیں۔ بعض ایسے ہتک آمیز اور پر تشدد

طریقے بھی اپنائے گئے جن کی بش انتظامیہ تک نے بھی منظوری نہیں دی تھی۔ ان کے چہرے پر سگار کا دھواں چھوڑا گیا، مخصوص جوڑوں پر دباؤ ڈالا گیا، قیدیوں کے جسم پر سخت برش استعمال کیا گیا، قیدیوں کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں پر کھڑے ہو کر ان کو جسمانی اذیت پہنچائی گئی وغیرہ شامل ہیں۔ایک رپورٹ میں خصوصی طور پر النشیری اور ابو زبیدہ پر کی جانے والی تفتیش کا ذکر کیا گیا ہے۔ الزام کے مطابق ایک اہلکار النشیری کی تفتیش کے دوران ایک خالی بندوق حوالات کے کمرے میں لایا اور اسے النشیری کے سر پر رکھ کر اس کو ڈرانے کی کوشش کی۔ اسی دن ایک ڈرل مشین کے ساتھ بھی النشیری کو ڈرایا دھمکایا گیا۔النشیری کو یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر اس نے زبان نہیں کھولی تو اس کی ماں کو اور باقی خاندان کو بھی یہاں لا کر جنسی طور پر بے عزت کیا جائے گا۔خالد شیخ محمد کی تفتیش میں ایک اہلکار نے ان سے کہا کہ اگر امریکہ میں مزید حملے ہوئے تو ان بچوں کو قتل کر دیا جائے گے۔ایک واقعہ افغانستان کے اسد آباد فوجی اڈے پر ہوا جہاں سی آئی اے کے منظور شدہ ایک ٹھیکیدار نے چار دن کے تفتیش کے دوران ایک افغان مشتبہ شخص پر اتنا تشدد کیا کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ خالد شیخ محمد کو ایک سو تراسی مرتبہ واٹر بورڈنگ سے گزارا گیا۔جب کہ ابو زبیدہ پر تراسی مرتبہ واٹر بورڈ تشدد کا طریقہ استعمال کیا گیا۔جو قیدی اپنا منہ نہیں کھولتے تھے ان کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا جاتا تھا۔ ایک قیدی کو تفتیش کے دوران ننگا کر کے کئی دن تک سرد کمرے میں رکھا گیا۔ تشدد

کے ایک دوسرے واقعے میں سی آئی اے کا ایک افسر ایک مدرسے کے مولوی سے کچھ معلومات حاصل کر رہا تھا جس پر مولوی ہنس پڑے تو افسر نے ان کے دو سو طالب علموں کے سامنے ان کو رائفل کے بٹ اور لاتوں سے پیٹا۔ گیارہ ستمبر سن دو ہزار ایک کے امریکہ پر ہونے والے حملوں کے بعد سے اصل میں قیدیوں پر کتنے مظالم ڈھائے جا چکے ہیں ان کا اندازہ کبھی نہیں لگایا جا سکے گا۔ رپورٹ میں بیان کیے گئے یہ کچھ واقعات ہیں لیکن گیارہ ستمبر سن دو ہزار ایک کے امریکہ پر ہونے والے حملوں کے بعد سے اصل میں قیدیوں پر کتنے مظالم ڈھائے جا چکے ہیں ان کا اندازہ کبھی نہیں لگایا جا سکے گا۔

بھارت کی بادشاہ گر خواتین سیاست دان

بھارت کے انتخات پر سب کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن بھارت کے سیاست دانوں کی نظریں ان بادشاہ گر خواتین سیاست دانوں پر ہیں جو کسی بھی لیڈر کو وزیر اعظم بنا سکتی ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے مسئل بھی عجیب و غریب ہیں۔ بھارت کی غربت کا کوئی انت نہیں ہے، اور خواتین مسائل سیلاب کی طرح ہیں۔ انتخابات میں فلمی صنعت، کرکٹ، سیاست اور سٹاک مارکیٹ ،بھائی لوگ سب کے سب مصروف ہیں۔ سات اپریل 2014 سے لوک سبھا کی 543 نشستوں کے انتخابات شروع ہو گئے ہیں جو بارہ مئی تک جاری رہیں گے جن کے بعد اس ملک کی نئی سیاسی قیادت 67 سال پرانے عوامی مسائل حل کرنے کے وعدے پورے کرنے کا وعدہ کے ساتھ اقتدار میں آئیگی اور حسب سابق پہلے سے زیادہ مسائل چھوڑ جائے گا۔ ہندوستان کی سیاست میں کہا جارہا ہے کہ تین خواتین کو بادشاہ گر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ خواتین اماں، دیدی اور بہن جی بھی کہلاتی ہیں۔ سیکولر جمہوریت کی یہ بادشاہ گر یا حکمران ساز خواتین ہیں ریاست تامل ناڈو کی وزیر اعلیٰ جے للیتا۔ جو سابق اداکارہ بھی ہیں۔ یہ اپنے عقیدت مندوں (ضرورت مندوں) کی ماں جی بھی کہلاتی ہیں چھیاسٹھ سالہ اس ماں جی نے اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کا ایک نیا عالمی ریکارڈ بھی قائم کیا تھا۔ جے للیتا کے

علاوہ جایا رام، ممتابینرجی اور مایاوتی بھی بادشاہ گروں کی تکون میں شامل بتائی جاتی ہیں۔ وہ اپنی سیاست کی وجہ سے اور اپنی کارکردگی کی بنا پر بھی نہیں اپنی شہرت کے بل بوتے پر ہندوستان کے 81 کروڑ 45 لاکھ بالغ ووٹروں کی رائے عامہ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور عام انتخابات کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کو بھی متاثر کر سکتی ہیں۔ بادشاہوں کی شخصی حکومتوں سے جمہوریت تک کے طویل سفر کے باوصف ہندوستانی سماج ابھی تک شخصی فیصلوں کی حکمرانی اور حکمرانوں کے شخصی فیصلوں کی زد سے باہر نہیں نکلا۔ بھارتی سیاست کا سب سے تیز رفتار گھوڑا بی جے پی کے وزیراعظم کے عہدے کا امیدوار نریندر مودی ہے۔ جو زبردست تیاریوں اور بے پناہ اخراجات کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں مگر ان کی کامیابی کچھ زیادہ یقینی نہیں کہی جاسکتی۔ تین دہائیوں سے زیادہ عرصہ ہوچکا ہے کہ ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے عام انتخابات میں پچاسی فیصد ووٹ حاصل نہیں کئے۔ اب تک اتحادی پارٹیوں نے حکومتیں بنائیں ہیں۔ اس بار بھی کسی سیاسی جماعت کے واضح اکثریت کے آثار نہیں ہیں۔ دراصل مضبوط حکومت سیاست بازوں کی سودہ بازیوں کے حق میں نہیں ہوتی حکومت جتنی کمزور ہوگی سیاسی بلیک میلنگ اسی قدر آسان ہوگی۔ ہندوستان کا جو بھی سیاست دان مستقبل کا وزیراعظم بننے کا خواہش مند ہوگا اسے امریکہ بہادر کی مرضی اور ماں جی جے للیتا، دیدی مایاوتی اور بھین جی ممتابینرجی کے سیاسی تعاون کی بھی ضرورت ہوگی۔ اخبارات میں اس نوعیت کی خبریں آئی ہیں کہ جے للیتا نے

اپنی پارٹی کو ہدایت کی ہے کہ وہ نریندر مودی کے خلاف بیان بازی سے گریز کرے مگر اس سے مودی صاحب کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کو ماں جی کا سیاسی تعاون حاصل ہو گیا ہے۔ماں جی نے یہ بھی کہا ہے کہ کانگریس کی لوٹ مار ختم ہونی چاہئے لیکن اس سے ان کی یہ مراد بھی نہیں ہوگی کہ بی جے پی کی لوٹ مار شروع ہو جائے۔تامل ناڈو کی اماں کے بارے میں یہ خبر بھی چھپی تھی کہ پانڈی چرمی کے ایک چھاپے میں ان کی وارڈ روب سے دس ہزار قیمتی ساڑھیاں اور 750 جوتوں کے جوڑے برآمد ہوئے تھے۔اس نوعیت کی خبروں سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی شہرت میں کمی آنے کی بجائے اضافہ ہوتا ہے۔ماں جی اگر اپنی بے پناہ دولت کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں تو اپنے ووٹروں کی بھرپور مالی معاونت اور مدد بھی کرتی ہیں۔للیتا نے بھی اپنے علاقے میں بہت سارے لیپ ٹاپ تقسیم کئے ہیں ممتا بیز جی کی شہرت ان کی سادہ زندگی اور سادگی پسندی سے تعلق رکھتی ہے۔مایاوتی چھوٹی جاتیوں کے لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور ہیں اور ہندوستان کے مستقبل کی حکومتوں کی سربراہی میں ان کا عمل دخل واضع حدتک ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان تین بادشاہ اگر خواتین میں سے کوئی ایک خود بھی ہندوستان کی ملکہ بننے کی خواہش کرے مگر بادشاہ گر ہونا بادشاہ ہونے سے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔

جے للیتا: جنوبی ہند کی ملکہ۔

جے للیتا آنجہانی فلمی ہیرو ایم ڈی راماچندرن کے ساتھ بہت سی فلموں کا حصہ رہی ہیں اور اسکرین پر ان دونوں کی کیمسٹری نے آج تک لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ چندرن نے 1972ء میں ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل دی تھی اور جے للیتا یہاں بھی ان سے قدم سے قدم ملا کر چلا کرتی تھیں مگر درمیان میں چندرن کو بے رحم موت کا فرشتہ اپنے ساتھ لے اڑا۔

چندرن کی موت پر ہمدردی کا عوامی جذبہ اور جے للیتا کی فلمی شہرت، ان کے سیاسی کیرئیر کی مضبوطی کا زینہ بن گئی۔ مضبوطی بھی اس قدر کہ 1991ء سے مسلسل تین مرتبہ۔۔یعنی 15 سالوں تک وہ ریاست کی وزیراعلیٰ منتخب ہوتی رہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی شخصیت کا جادو ابھی تک چھایا ہوا ہے حالانکہ ان پر بدعنوانی کے زبردست الزامات بھی لگتے رہے ہیں۔

اپنی شہرت کو مزید دوام بخشنے کے لئے انہوں نے 'اماں کینٹین' کے نام سے ایک عوامی خدمت کی مہم شروع کی ہوئی ہے جس کے تحت ہر ضرورت مند آدمی کو صرف تین روپے میں دوپہر کا کھانا ملتا ہے۔ وہ مختلف عوامی ریلیوں میں لوگوں کو لیپ ٹاپ اور سائیکلیں بھی مفت بانٹتی رہی ہیں، جبکہ انہوں نے عوام کو ایسی اور بہت سی اسکیمیں شروع کرنے کا یقین دلایا ہے۔۔اس شرط پر کہ عوام انہیں ووٹ دے اور ان کی جماعت کم از کم 30 نشستیں جیتنے میں کامیاب ہو جائے۔

سنہ 1997ء میں پولیس نے غیر قانونی طور پر دولت جمع کرنے کے الزام میں ان کے گھر پر چھاپا مارا تھا جس میں پولیس کو نہایت قیمتی 10 ہزار ساڑھیاں اور 750 جوڑی مہنگے ترین جوتے ملے تھے۔ لیکن، پھر بھی بھارت کی خوش حال ترین اور صنعتی مرکز کا درجہ رکھنے والی ریاست، تامل ناڈو کے بڑے بڑے وزیر ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ پچھلے 30 سالوں سے جے للیتا ریاست کی بے تاج بادشاہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ بادشاہ گر بنی ہوئی ہیں۔

ممتا بینرجی

اگرچہ للیتا جنوبی ہند کی ملکہ ہیں تو ممتا بینرجی اور ان کی جماعت 'ترنومل کانگریس' مغربی بنگال اور اس کے دارالحکومت کولکتہ پر حکمرانی کرتی ہے۔ سنہ 2012ء میں اختلاف کے باعث اپنے 18 ارکان کو حکومت سے علیحدہ کرنے کے فیصلے نے کانگریس کی سربراہی میں قائم مخلوط حکومت کو 'پارہ پارہ' کر دیا تھا۔ اس وقت بھی ترنومل کانگریس مغربی بنگال کی 42 نشستوں میں سے تقریباً 30 نشستیں کی توقع کر رہی ہے۔ ممتا بینرجی کو لوگ 'دی دی' یعنی بہن کہتے ہیں۔ تجزیہ نگاروں کے خیال میں 16 مئی کو آنے والے انتخابی نتائج سنیں کے بعد وہ کدھر کا رخ کریں گی اس کا

ابھی سے اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

کولکتہ سے تعلق رکھنے والے ایک تجزیہ نگار سبیا ساچی باسو رے چوہدری کا کہنا ہے ’ممتا بینرجی، جے للیتا کے مقابلے میں اپنے سادہ لائف اسٹائل اور عام آدمی تک باآسانی رسائی کی صلاحیت کے عوض خوب شہرت رکھتی ہیں۔

مایاوتی: دلتوں کی رانی

بھارت میں اچھوتوں کو ’دلت‘ کہا جاتا ہے اور مایا وتی کو ’دلتوں کی رانی‘۔ اس کے علاوہ انہیں عام لوگ ’بہن جی‘ بھی کہہ کر پکارتے ہیں۔ انہوں نے شیڈولڈ یا پسماندہ دلتوں کو ان کا حق دلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے عوض آج بھی لاکھوں لوگ ان پر جان چھڑکتے ہیں۔

مایا وتی کی جماعت کا نام ’بہوجن سماج پارٹی‘ ہے جو موجودہ لوک سبھا (ایوان زیریں) میں 21 نشستیں رکھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر بھارت نے اگلے وزیراعظم کے طور پر نریندر مودی کو منتخب کیا تو یہ بھارت کی تباہی کے مترادف ہوگا۔ ماضی میں انہوں نے بی جے پی کے ساتھ تعاون ختم کرکے اسے بھارت کی سب سے بڑی ریاست اترپردیش کی وزارت اعلیٰ سے محروم کردیا تھا۔

چنائی اور دہلی جیسے کاسموپولیٹن شہروں سے تعلق رکھنے والے کچھ ماہرین اور اعلیٰ عہدیداروں کا کہنا ہے کہ تینوں خواتین کی جڑیں عوام میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورتحال میں ان کی امیج، ان کا جذبہ، ان کا شخصی کرشمہ اور انتظامی مہارت۔۔سب کچھ لوگوں پر اثرانداز ہوتا ہے اور ایسے میں جب وہ ووٹ کی غرض سے کہیں جائیں تو عوام کیلئے ان کا کہا ماننا تو 'بنتا' ہی ہیبھارت میں سیاسی جماعتیں خواتین ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن خواتین کا کہنا ہے کہ لوک سبھاکے آئندہ انتخابات میں خواتین امیدواروں کی نمائندگی بہت کم ہے۔برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان کی سیاست پر کچھ نامور سیاسی شخصیات رونما ہوئیں جو آج بھی اس علاقے کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ ان میں ایک جانا پہچانا نام اندرا گاندھی کا ہے جو ہندوستان کی ایک نامور خاتون سیاست دان بن کر ابھریں۔ وہ سن 1917 میں پیدا ہوئیں ۔ سیاسی خاندان سے ان کا تعلق تھا اور ان کے والد بھی ہندوؤں کے معروف لیڈر تھے۔ ان کی وجہ شہرت ان کا سیاسی کیریئر ہی تھا۔پنڈت جواہر لعل نہرو کی بیٹی بھی ایک بادشاہ گر تھی۔ وہ الہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ سوئٹزرلینڈ سمرویل کالج آکسفورڈ اور بعد میں وشوا بھارتی شانتی نکتین میں تعلیم حاصل کی۔ گیارہ ، برس کی عمر میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔انگلستان میں قیام کے دوران میں اور بعد ازاں ہندوستان واپس آکر بھی طلبا کی تحریکوں میں سرگرم حصہ لیتی رہیں۔ تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں

تیرہ ماہ کے لیے جیل بھیج دی گئیں۔ 1942 میں ایک پارسی نوجوان فیروز گاندھی سے شادی کی۔ اسی زمانے میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلی۔ جس میں حصہ لینے پر وہ اوران کا خاوند قید ہوگئے۔ 1947 میں آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کی ممبر منتخب ہوئیں۔ بعد میں کانگرس کے شعبہ خواتین کی صدر، مرکزی انتخابی کمیٹی اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کی ممبر بنیں۔ فروری 1959 میں انڈین نشنل کانگرس کی صدر چنی گئیں۔ 1964۔66 میں وزیر اطلاعات و نشریات ہوئیں۔ 1966 میں لال بہادر شاستری کے انتقال کے بعد وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ 1967 کے انتخابات میں کانگرس کی فتح کے بعد وزیراعظم بنیں۔ 1971 کے انتخابات کے بعد تیسری مرتبہ وزیراعظم چنی گئیں۔ مارچ 1977 کے پارلیمانی انتخابات میں ان کی پارٹی کانگرس آئی نے جنتا پارٹی سے شکست کھائی۔ وہ خود بھی جنتا امیدوار راج نارائن سے ہار گئیں۔ 1978 میں مہاراشٹر کے ایک حلقے کے ضمنی انتخاب میں لوک سبھا کی رکن چن لی گئیں۔ لیکن دسمبر 1978 میں لوک سبھا نے، دوران حکومت اختیارات کے ناجائز استعمال کے جرم میں ان کی رکنیت منسوخ کر دی گئی۔ اور قید کی سزا دی۔

تقریبا ایک ہفتے بعد رہا کر دی گئیں۔ جنوری 1980 میں لوک سبھا کے عبوری انتخابات میں کانگرس آئی کی جیت ہوئی اور اندرا گاندھی نے مرکز میں وزارت بنائی۔ سکھوں کے خلاف انھوں نے فوجی آپریشن کا آغاز کیا۔ اور گولڈن ٹمپل پر

فوجی حملے کے بعد سکھوں میں ان کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ 1984 میں دو سکھ محافظوں نے گولی مار ان کو قتل کر دیا۔ ان کے بیٹے راجیو گاندھی بعد میں ہندوستان کے وزیراعظم رہے۔ جبکہ ان کی بہو سونیا گاندھی ان دنوں انڈین نیشنل کانگرس کی صدر ہیں۔ سونیا گاندھی نے انتخابی عمل شروع ہوتے ہی مشکلات میں مبتلا رہی۔ ان کی پارٹی میں بغاوت سر اٹھا رہی تھی۔ موقع پرست وفاداریاں تبدیل کر کے پل کے دوسرے کنارے کی طرف جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں سونیا کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ناکامی کے تاثر کو کیسے روکا جائے؟ انہوں نے ہمت کی اور اپنے قدم بڑھائے دہلی کی شاہی مسجد کی طرف۔ امام بخاری کے بند دروازے پر دستک دی، گلے شکوے ہوئے۔ ماضی کی غلطیوں کو درست کرنے پر اتفاق ہوا۔ اس سے بڑھ کر دونوں نے سیکولرازم کے لئے ایسی طاقت کے بڑھتے ہوئے قدم تخت دہلی کی طرف روکنے کی حکمت عملی کا اعلان کیا۔ جو فرقہ پرستی کے الزام کی زد میں ہے دونوں نے تھوڑے وقت میں بڑے بڑے فیصلے کر لئے۔ سونیا گاندھی کو امام بخاری کی حمایت اور مدد ایسے وقت میں میسر آئی ہے جب کانگریس کو ہی نہیں مسلمانوں کو بھی مودی کے قدم روکنے کی ضرورت تھی۔ سونیا نے شاہی مسجد جا کر اپنی انا کی قربانی دی اور امام بخاری جو کانگریس سے سخت ناراض تھے اور 2009 کے الیکشن میں سماج وادی پارٹی کو حمایت دے چکے تھے۔ اترپردیش کے فسادات نے امام بخاری کو ملائم سنگھ سے دور کر دیا اور مایاوتی کی طرف لے جا رہے تھے۔ بی جے پی اور مودی کی مقبولیت کی لہر جس کو سیکولر

قوتیں مصنوعی مقبولیت قرار دے رہی تھیں۔ بے شک اسے مصنوعی قرار دیا گیا ہو مگر اس نے امریکہ اور یورپ تک کے میڈیا کو اپنے سحر میں لے رکھا ہے۔ سونیا گاندھی نے امام بخاری سے ملاقات کرکے کانگریس کو متوقع شکست سے سنبھالا دیا ہے ورنہ کانگریس کا یہ حال تھا کہ اس کی کشتی ڈوبتی نظر آنے لگی تھی اور وہ تاریخی شکست سے دوچار ہوتی۔ سونیا گاندھی نے اس یقینی شکست کو کافی حد تک روک لیا ہے اس کا فائدہ تو انتخابی نتائج کے بعد ہی سامنے آئے گا۔ البتہ ملاقات سے مسلم ووٹرز نرم ہوتے ہیں سونیا اور امام بخاری کی کوششوں سے سیکولر قوتیں زور پکڑتی اور اتحاد دکھاتی ہیں تو بی جے پی اور ان کے اتحادیوں کے لئے سب اچھا نہیں۔ مودی کی اس سے پہلے اڑان کافی اونچی تھی۔ خاص طور پر امام بخاری نے بھارت کے نمائندہ مسلمانوں کو جامع مسجد میں ان کے ساتھ انتخابی حکمت عملی تیار کرنے کے لئے اکٹھا کیا۔ جب سونیا اور امام بخاری ملاقات ہوئی تو میڈیا ہی نہیں بلکہ بی جے پی اور اس سے وابستہ جماعتوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ نریندر مودی کی پریشانی بھی چھپائے نہ چھپ رہی تھی اور یہ پریشانی بلا سبب بھی نہیں تھی۔ کیونکہ نریندر مودی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر مسلمانوں کی طاقت کانگریس کی طرف لڑھک گئی تو پھر اس کے اقتدار میں آنے کے خواب ریت کے گھروندے ثابت ہوں گے۔ بی جے پی کی اتحادی اور بال ٹھاکرے کے لگائے ہوئے پودے شیو سینا کی مایوسی اس حد تک بڑھی ہے کہ اس نے کانگریس پر فرقہ وارانہ جماعت سے اتحاد کا طعنہ ہی نہ دیا بلکہ انہوں

نے سونیا گاندھی اور امام بخاری کی ملاقات کو گیدڑ اور بھیڑیا کی ملاقات قرار دیدیا۔ سونیا گاندھی کی اس کامیابی، انتخابی حکمت عملی اور سیاست کو مخالف جو بھی نام دیں اصل بات یہ ہے وہ ایک کامیاب سیاست دان کی طرح مخالفین پر حملہ آور ہوئی ہیں اور ایسی حکمت عملی اتنی کامیاب کہ مخالفین کے چھکے چھوٹ گئے ہیں۔ لالو پرشاد یادو نے تو امام بخاری کا شکریہ ادا ہی نہیں کیا بلکہ بھارت کے اتحاد کے لئے ان کی کوششوں کو زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ لالو پرشاد یادو نے بہار میں چھ مسلمان بھی اپنی پارٹی کی طرف سے امیدوار اتارے ہیں۔ بہار میں لوک سبھا کی 12 نشستیں ایسی ہیں جہاں مسلمانوں کے ووٹ فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے 17 فی صد ووٹ ہیں۔ امام بخاری نے سونیا کی حمایت مسلمانوں کے مستقبل اور مفاد میں کی ہے بھارت دنیا کے ایسے ملکوں میں سے ایک ہے جہاں اقلیتوں کے خلاف سب سے زیادہ فرقہ وارانہ فسادات کے واقعات ہوتے ہیں۔ جن میں مسلم اکثریت کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان کی املاک تباہ کی جاتی ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ فسادات میں حکومتیں اور انتظامیہ شریک ہوتی رہی ہیں۔ جس کی مثال چند روز پہلے بابری مسجد کی تازہ رپورٹ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وزیراعظم نرسیما راؤ، یوپی کے وزیراعلی کلیان سنگھ، منوہر جوشی، ایڈوانی، اوما بھارتی سب مسجد کی شہادت کی منصوبہ بندی میں شامل تھے۔

انہیں مسجد شہید کرنے کی ٹریننگ دی گئی اس کے ساتھ یہ بھی حقیت ہے کہ سیکولر ازم کی بالادستی اور مسلمانوں کے حقوق کی جنگ آج تک جامعہ مسجد دہلی اور اس کے امام بخاری لڑتے رہے ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد تین سو سال سے رہنمائی کی پہچان ہے۔ مغلیہ عہد میں لال قلعہ جس طرح ہندوستان پر حکومت اور اقتدار اعلی کی علامت تھا۔ وہاں دینی اور سیاسی رہنمائی دہلی کی جامعہ مسجد سے ملتی تھی اور یہ ضرورت ہر عہد کا تقاضا رہی ہے۔ اس مسجد کے اولین امام سید عبدالغفور بخاری کو مغل حکمران شاہ جہان بخارا سے ہندوستان لائے جن کا استقبال خود شاہ جہان نے پیدل چل کر کیا۔ دہلی کی جامع مسجد کی سیاسی طاقت کو متاثر اور کمزور کرنے کی کوشش کو ہر حکمران نے اپنی ضرورت سمجھا مگر وہ کامیاب نہ ہوتے۔ رہنمائی کے اس مرکز کو سید عبداللہ بخاری نے بڑے زوروں سے منوایا۔ مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار پارلیمنٹ اور وزارتوں میں تو جاتے رہے مگر سیاسی وفاداریوں کی مجبوری تھی کہ ان کی آواز کو بہت بلند اور اونچا کبھی نہ سنا گیا جب حالات اور ظلم حد سے بڑھتا گیا تو امام بخاری مسلمانوں کے مسائل اپنے خطبہ میں سمیٹتے رہے۔ امام بخاری کے اس انداز کو حکمرانوں نے پسند نہیں کیا۔ اتحاد کی سوچ آگے بڑھی مگر حکمران ناراض ہوتے چلے گئے ان کا کردار اس سے بھی آگے بڑھا، سیاسی قائد کے طور پر بھی مانے جانے لگے۔ ان کا طرز فکر عموماً کانگریس کی طرف داری رہا۔ اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں ان کی آواز نمایاں تھی۔ اندرا

گاندھی کو اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کا احساس ہوا تو سیدھا سید عبداللہ بخاری کی پاس پہنچی غلطیوں پر معافی مانگی۔ ان کی زندگی میں ہی (2000) احمد بخاری صرف امامت کے منصب پر ہی نہیں بلکہ سیاسی وراثت کا تاج بھی ان کے سر پر رکھا گیا۔ موجودہ امام بخاری کی کوئی سیاسی جماعت نہیں امام صرف الیکشن سے قبل اپیل کرتا ہے۔ نشان منزل دکھاتا ہے۔ یہ بھی راہنمائی فرماتا ہے کہ کس طرح اور کہاں کہاں اتحاد کرکے مسلمانوں کی بڑی تعداد پارلیمنٹ میں بھیجی جا سکتی ہے۔ امام بخاری حمایت کے رخ اور زاویئے ضرورتوں اور سہولتوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ سونیا گاندھی سے جو کچھ امام بخاری نے مانگا ہے وہ بھارت کے آئین میں درج ہے۔ مسلمانوں کے مسائل کا حل فرقہ وارنہ فسادات کا خاتمہ سچر رپورٹ پر عمل اور رنگا ناتھ مشرا کمیشن کی سفارشات کا نفاذ میں اگر کانگریس اقتدار میں آتی ہے تو تمام وعدوں کو پورا کرنا۔ اب سے کچھ 2014 ہفتوں بعد بننے والی نئی بھارتی حکومت سے متعلق سیاسی پنڈتوں نے فال نکالنا شروع کردی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی حکومت کی تشکیل تین خواتین 'کنگ میکرز' کے ہاتھوں میں جا سکتی ہے۔ یہ ایسی 'بادشاہ گر' خواتین ہیں جو علاقائی سطح پر عوام کے دلوں میں بستی ہیں۔ ان میں سے ایک تو اپنے دور کی مشہور فلم اسٹار بھی رہی ہیں۔ آج بھی عوام انہیں بہت عزت واحترام سے 'اماں' کہہ کر پکارتی ہے۔ یہ کنگ میکرز ہیں۔۔۔ جے للیتا، ممتا بینرجی اور مایاوتی۔۔ ان کا کرشمہ سیاست کی آمیزش کے ساتھ ڈنکے پیٹ رہا ہے۔ مضبوط

سیاسی نظریہ رکھنے والے کہتے ہیں یہ تینوں خواتین نئی سرکار بنانے میں اہم ترین رول ادا کریں گی۔نریندر مودی انتخابی دوڑ میں ابھی تک سب سے آگے ہیں۔ لیکن یہ امید کسی کو بھی نہیں کہ ان کی پارٹی، علاقائی جماعتوں کی حمایت کے بغیر مطلوبہ اکثریت حاصل کر سکے گی۔ پچھلے 30 سالوں سے کوئی بھی ایک جماعت 50 فیصد پارلیمانی نشستیں نہیں جیت سکی ہے۔فرانسیسی خبر رساں ادارے کے مطابق ایک مخصوص سیاسی تجزیہ نگار کا کہنا ہے 'نئی دہلی میں تبدیلی کا وقت آن پہنچا ہے۔ ریاست تامل ناڈو کی وزیراعلیٰ جے للیتا اپنے حمایتیوں کو ایک اشارہ کر دیں تو اقتدار کی چڑیا مودی کے سر پر بیٹھ جائے۔' اس بار یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ انتخابی نتائج پر خواتین کا معنی خیز اثر ہو سکتا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کی گریجویٹ سچیکا پاٹھک کا کہنا ہے کہ "میں بہت پرجوش ہوں اور انتخابات کے دن کا انتظار کر رہی ہوں کیونکہ میرا بھی ایک ووٹ ہے اور میں پہلی بار اس کو ڈالنا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے ووٹ میں زبردست طاقت ہے اور میرے مستقبل کی تعمیر میں یہ بہت بڑی تبدیلی لا سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے خاتون پارلیمانی امیدوار صرف چند ہی ہیں۔" بھارت کے الیکشن کمیشن کے مطابق، 2010 سے لے کر اب تک 20 میں سے 16 ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں خواتین ووٹروں کی تعداد مردوں سے زیادہ رہی ہے۔ اترپردیش اور بہار دونوں میں-- جو بالترتیب 80 اور 40 لوک سبھا نشستوں کی نمائندگی کرتے ہیں -لیکن سیاست میں مردوں کے غلبے اور عمومی مردانہ عصبیت، عورتوں کے لیے ہنوز

ایک چیلنج ہے۔ کمیشن کے اعداد و شمار کے مطابق، 2009 کے لوک سبھا انتخابات میں ووٹ ڈالنے والی خواتین کی تعداد کافی زیادہ تھی– 342.2 ملین خواتین ووٹر اور 374.7 ملین مرد ووٹر– تاہم مرد امیدواروں کی نمائندگی کل نامزد امیدواروں کا 93.1 فیصد تھی۔ بہت سی خواتین کہتی ہیں کہ "ہم سے ہر سطح پر امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، خواہ یہ روزگار ہو یا دوسری سماجی ذمہ داریاں۔ حتی کہ جب ووٹنگ کی بات ہوتی ہے تو ہم سے اپنے بزرگوں کے حکم پر عمل کرنے کو کہا جاتا ہے اور ووٹ ہمارے لئے بے معنی ہو جاتا ہے۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ووٹ ہماری زندگی تبدیل کر سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ خواتین ووٹر اور خواتین بادشاہ گر بھارت میں کیا تبدیلی لاتی ہیں۔

حکمران دولت کیسے بناتے ہیں

حکمرانوں کی مرضی کے مطابق قوانین کی تشکیل اور عوام کو نقصان پہنچا کر منافع ہی منافع کمایا جاتا ہے۔ حکمران اسی طرح دولت سمیٹتے ہیں۔ عالمی بنک نے اس بارے میں ایک رپورٹ حال ہی میں شائع کی ہے، جس میں تیونس کا جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ حکمراں کس طرح دولت بناتے ہیں۔ جمہوری ملکوں کے حکمران بھی قومی دولت لوٹنے میں بادشاہوں کی طرح ہیں۔، بادشاہت اور دولت وثروت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں شاہ ہوگا وہاں شاہی خزانہ بھی ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مختلف شاہی خزانوں کا موازنہ کیا جائے تو کوئی نسبتاً چھوٹا ہوگا، کوئی بڑا اور کوئی بہت بڑا۔ لیکن چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، خزانہ بہرحال خزانہ ہی ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر سکتا ہے۔ موقر امریکی جریدے "فوربز "نےشاہی مقام و مرتبہ رکھنے والے دنیاکے امیر ترین افرادکے بارے میں ایک رپورٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار کی مدد سے دنیاکے بعض شاہی خزانوں کی وسعت کااندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں دنیا بھر کے 15 مالدار ترین حکمرانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ سال گزشتہ اس فہرست میں شامل بعض فرمانرواؤں کے لیے مشکلات لے کر آیا اور وہ ٹیکس بچانے سے لے کر پارلیمنٹ توڑے جانے تک مختلف تنازعات کا شکار

ہوئے لیکن اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر ان 15 شاہی شخصیات کی دولت میں صرف ایک سال کے دوران 36 ارب ڈالر کا نا قابل یقین اضافہ ہوا۔ گزشتہ سال ان کی مجموعی دولت کا تخمینہ 131ارب ڈالر لگایا گیا تھا۔مالدار ترین شاہی شخصیات میں تھائی لینڈ کے بادشاہ بھوی بول ایدلیا ویج سرفہرست ہیں، جن کی دولت کا موجودہ تخمینہ 35 ارب ڈالر ہے. چھ سو سال قدیم بادشاہت کے وارث سلطان حسن البلقیہ مراکش کے شاہ محمد ششم ,مشرق وسطی کی امیر ترین شخصیت متحدہ عرب امارات کے صدر اور ابو ظہبی کے حکمراں شیخ خلیفہ بن زاید آل نیہان ,دبئی کے حکمران شیخ محمد بن راشد المکتوم الجسنٹن اسٹین نامی چھوٹی سی یورپی خود مختار ریاست کے فرمانروا شہزادہ ہینز ایڈم دوئم شامل ہیں۔ شہزادہ ہینز ایڈم کی دولت کا سب سے بڑا ذریعہ "ایل جی ٹی بینک" ہے، جسے گزشتہ 70برس سے ان کا خاندان چلا رہا ہے لیکن آج کل اس بینک کو ٹیکس چوری میں مدد دینے کیا سکینڈل کا سامنا ہے۔ الزام عائد کیا گیا ہے کہ یہ بینک امیر کھاتے داروں کو اپنا کالا دھن چھپانے میں مدد دیتا ہے۔ خود مختار ریاست مونا کو کا رقبہ نیویارک کے سینٹرل پارک کے برابر ہے۔ لیکن اس کے حکمران شہزادہ البرٹ دوم کا شمار دنیا کے امیر ترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔ ان کے اثاثوں کی مالیت 1.4ارب ڈالر بتائی جاتی ہے۔ ان کی دولت کا بڑا حصہ بیش قیمت جائیداد پر مشتمل ہے بن علی کے خاندان نے اسی طریقے سے دولت کمائی۔ تیونس میں یہ سب کچھ کیسے ہوا، یہ بات عالمی بینک نے اپنے ایک

مطالعاتی جائزے میں بتائی ہے۔ آمر حکمران زین العابدین بن علی 1987 سے لے کر تک تیونس میں سیاہ و سفید کے مالک رہے اور پھر 14 جنوری 2011 کو 2011 بھاگ کر سعودی عرب چلے گئے۔ حال ہی میں جاری ہونے والے اس جائزے کو 'آل اِن دی فیملی' یعنی 'سب کچھ خاندان میں ہی' کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس جائزے کے مرتبین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تیونس کے نجی کاروباری شعبے کی آمدنی کا بیس فیصد سے زیادہ حصہ سابق حکمران زین العابدین بن علی کے خاندان کو جاتا تھا۔ ایک آمر حکمران کیسے اتنی دولت جمع کر پاتا ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے اس جائزے میں شمالی افریقی ملک تیونس کو مثال بنایا گیا ہے لیکن جائزے کے مرتبین میں سے ایک انتونیو نوکیفورا کے مطابق اسی طرح کے ڈھانچے پوری دُنیا میں موجود ہیں۔ اس جائزے کے لیے تیونس کی ایسی 220 کمپنیوں کو جانچا گیا، جنھیں جنوری 2011 میں بن علی کا تختہ الٹے جانے کے بعد ریاستی نگرانی میں لے لیا گیا تھا۔ آمر بن علی کے خاندان نے اپنی توجہ صرف ایسے شعبوں پر مرکوز کی، جو زیادہ سے زیادہ منافع دیتے تھے۔ ان شعبوں میں کام کرنے والے افراد کی تعداد ملک بھر میں برسرِ روزگار افراد کی کُل تعداد کا صرف ایک فیصد بنتی تھی لیکن ان سے نجی شعبے کی کُل آمدنی کا اکیس فیصد حاصل کیا جاتا تھا۔ عالمی بینک کے جائزے کے مطابق حکمران خاندان نے ٹیلی مواصلات، ٹرانسپورٹ اور پراپرٹی کے شعبوں کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ ان شعبوں میں قیمتوں کا تعین اپنی من مرضی کے مطابق

کیا کرتا تھا۔ ماہر اقتصادیات انتونیو نوکیفورا عالمی بینک سے وابستہ ہیں۔ انتیونیو نوکیفورا بتاتے ہیں کہ 'اس طرح سے مختلف شعبوں پر اجارہ داری قائم ہوتی چلی گئی اور یہ کمپنیاں ایسی تھیں، جو بے انتہا منافع بخش تھیں'۔ جب بن علی کے خاندان کا اقتدار ختم ہوا تو تیونس حکومت کے اندازوں کے مطابق یہ خاندان تیرہ ارب ڈالر کا مالک تھا۔ دوسری طرف عوام سراسر گھاٹے میں رہے کیونکہ اکثر حالات میں یہ ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ حکمران خاندان کی کمپنیوں سے کوئی چیز خریدے بغیر وہ اپنے روز مرہ معمولات کو آگے بڑھا سکیں۔ نوکیفورا کے مطابق 'دیکھا جائے تو بظاہر اس خاندان نے کوئی غیر قانونی کام بھی نہیں کیا تھا'۔ وہ بتاتے ہیں: ''بن علی اور اُن کے خاندان کے افراد نے بس یہ کیا کہ پہلے سے موجود قواعد و ضوابط کو ہوشیاری کے ساتھ اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔'' البتہ 1993 میں سرمایہ کاری کے حوالے سے جو قانون منظور ہوا، وہ عین اس خاندان کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے وضع کیا گیا تھا۔ پچیس ایسے نئے فرمان جاری کیے گئے، جن کے نتیجے میں نئی کمپنیوں کے لیے منڈیوں میں قدم رکھنا مشکل بنا دیا گیا۔ عوام کو لیکن یہ بتایا گیا کہ ان ضوابط کا مقصد صارفین کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ ماہر اقتصادیات نوکیفورا کے خیال میں تیونس میں سیاسی تبدیلی کے سلسلے میں بنیادی کردار اُس خلیج نے ادا کیا، جو معیشت تک رسائی رکھنے والی شخصیات اور عوام کی بہت بڑی تعداد کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ نوکیفورا کہتے ہیں کہ جن ڈھانچوں کی بدولت بن

علی نے دولت جمع کی، وہ تیونس میں آج بھی موجود ہیں اور ایسے میں پھر سے پرانے حالات کا لَوٹ کر آ جانا خارج از امکان نہیں ہے۔ چودہ جنوری 2011 کو تیونس میں ہونے والے ایک احتجاجی مظاہرے میں ایک شخص نے ایک بینر اٹھا رکھا ہے، جس پر لکھا ہے، 'بن علی نکل جاؤ'، اسی روز بن علی نے ملک چھوڑ دیا۔ تاہم تیونس کے آجرین کی تنظیم کی خاتون سربراہ وداد بوشاوی خبردار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ایسے میں تمام کامیاب آجرین کو ہی شک و شبے کی نگاہ سے دیکھنا درست نہیں ہوگا۔ وہ کہتی ہیں: ''بن علی ہماری تاریخ کا حصہ ہیں، جسے ہمیں قبول کرنا ہوگا۔'' وہ کہتی ہیں، اب اہم یہ ہے کہ تعمیری سوچ اپنائی جائے اور ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھا جائے۔ دیکھا جائے تو تیونس واحد ایسا ملک نہیں ہے بلکہ خطے کے دیگر ممالک میں بھی، جہاں عوام حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ایسے ہی ڈھانچے موجود ہیں۔ انتونیو نوکیفورا زور دے کر کہتے ہیں: ''عرب دنیا میں یہ ایک عمومی مسئلہ ہیں۔'' ماہر اقتصادیات نوکیفورا کے مطابق اقربا پروری اور اس سے فائدہ اٹھانے والے مقتدر طبقے دنیا بھر کے مختلف ممالک میں 'موجود ہیں، مثلاً روس یا پھر یوکرائن میں بھی'۔ نوکیفورا نے اعلان کیا کہ عرب دنیا کے دیگر ملکوں کے اقتصادی ڈھانچوں کے بارے میں بھی ایک ایسا ہی مطالعاتی جائزہ آئندہ شائع کیا جائے گا۔ یہ بات تیونس ہی کی نہیں ہے، مصر کے آمر مطلق حسنی مبارک جیسے مرسی کی جمہوری حکومت ختم کر کے فوج نے تحفظ دے رکھا ہے، ایک ایسا آمر ہے جس

نے مصری عوام کی دولت کو بیدریغ لوٹا ہے۔ اس کی دولت کا آج بھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ حسنی مبارک دنیا کے امیر ترین شخصیت ہیں؟ اس بارے میں فوربز میگزین میں دنیا کے جن ارب پتی افراد کی فہرست شائع کی تھی، اس میں حسنی مبارک کا نام شامل نہیں تھا۔ فوربز کے مطابق دنیا کی امیر ترین شخصت میکسیکو کے کارلوس ہیں جن کی دولت کا تخمینہ ساڑھے 53 ارب ڈالر ہے، جب کہ مائیکروسافٹ کے بل گیٹس 53 ارب ڈالر کے ساتھ دوسرے نمبر پر تھے۔اس فہرست میں چوتھے اور پانچویں نمبر پر بھارتی شخصیات تھیں، ایک ایسے ملک کے ارب پتی، جہاں غریبوں کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ حسنی مبارک کی دولت کا اندازہ 70 ارب ڈالر تک لگایا جارہاہے، جو دنیا کے امیر ترین شخص کارلوس سے تقریباً ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ افریقہ ڈاٹ کام نے دعویٰ کیا ہے کہ حسنی مبارک دنیا کے امیر ترین انسان ہیں۔برطانوی اخبار گارجین نے لکھاہے کہ 82 سالہ حسنی مبارک کے 70 ارب ڈالر سوئٹزرلینڈ اور کئی دوسرے ممالک کی تجوریوں میں محفوظ پڑے ہیں۔ نیویارک، لندن اور کیلی فورنیا کے شہر بیورلی ہلز میں ان کی بیش قیمت جائیدادیں بھی ہیں،اخبار کا کہناہے کہ انہوں نے یہ دولت اپنے 30 سالہ دوراقتدار میں مصری خزانے سے لوٹی ہے۔الجزیرہ ٹیلی ویژن نے اپنی ایک رپورٹ میں کہاہے کہ زیادہ تر مصری باشندوں کا خیال ہے کہ ملک کی قومی دولت سے صرف حسنی مبارک اوران کے خاندان کو فائدہ پہنچاہے اورکچھ ثمرات ان کاروباری افراد نے سمیٹے ہیں جو حسنی مبارک کے قریب تھے۔ مصر میں

لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی آمدنی دو ڈالر روزانہ سے کم ہے اور وہ غربت وافلاس کی زندگی گذار رہے ہیں۔ حسنی مبارک کے دور حکومت میں مصر میں بے روزگاری کی سطح بہت بلند تھی۔ لوگ غربت کی وجہ ملکی دولت کی لوٹ گھسوٹ ،اور رشوت خوری کو قرار دیتے تھے۔ قاہرہ کی سڑکوں پر صدر حسنی مبارک کی اقتدار سے برطرفی کے لیے بڑے بڑے مظاہروں میں حکومت پر لگائے جانے والے الزامات میں کرپشن بھی شامل تھی۔ الجزیرہ ٹیلی ویژن کے مطابق مصری صدر اور ان کے خاندان کے پاس نقد دولت کا تخمینہ 40 سے 70 ارب ڈالر تک ہے۔ جس سے ایک ایسی ریاست کی تصویر ابھرتی ہے جہاں قومی دولت کو سیاسی قوت کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ پریس ٹی وی کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ حسنی مبارک کی زیادہ تر دولت سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کے بینکوں میں خفیہ اکاؤنٹس میں چھپائی گئی ہے۔ جو آج بھی اس خاندان کے کام آ رہی ہے۔ ایک عربی اخبار الخبر کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ صدر مبارک کے بیٹے کمال اور علا ارب پتی ہیں اور وسطی لندن کے انتہائی مہنگے علاقے میں قیمتی جائیدادوں کے مالک ہیں۔ اخبار نے اپنے مضمون میں کئی ایسی مغربی کمپنیوں کے نام شامل کیے جن میں حسنی مبارک کے خاندان کی شراکت داری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کمپنیاں انہیں سالانہ 15 کروڑ ڈالر ادا کرتی ہیں۔ اخبار گارجین نے مشرق وسطی امور کے پروفیسر کرسٹوفر ڈیوڈسن کے حوالے سے لکھا تھا کہ عرب کی خلیجی ریاستوں میں کسی غیر ملکی کو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے مقامی باشندوں کا 51 فی صد حصہ

رکھنا پڑتا ہے، جب کہ مصر میں غیر ملکی 20 فی صد مقامی شیئرز کے ساتھ کاروبار کا آغاز کر سکتے ہیں۔ 20 ممتاز مصری شخصیات کے ایک گروپ نے پبلک پراسیکیوٹر کو ایک درخواست بھی دی تھی کہ حکمران خاندان کی دولت کے بارے میں زبان زد عام کہانیوں کی تحقیقات کرے اور یہ جائزہ لے کہ اپنے 30 سالہ دور اقتدار میں مبارک کا خاندان کس طرح اربوں ڈالر اکھٹے کرنے میں کامیاب ہوا۔ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ دولت جو اپنی جائز ضرورتوں سے زیادہ ہو، اس کے اصل حق دار محروم طبقات ہیں۔اور اس دولت کو خوشیاں باٹنے کے لیے اسی طرح استعمال کرنا چاہیے ۔پاکستان کا شمار بھی ان بدقسمت ملکوں میں کیا جاتا ہے، جہاں حکمران خاندانوں کی دولت کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب ، جس ملک میں 38 سالوں میں 6 لاکھ 69 ہزار 819 بااثر افراد کے 256 ارب روپے سے زاید مالیت کے قرضے معاف کردیے جاتے ہوں۔ تو ظاہر ہے پھر ایک عام شہری کے ذہن میں سوال تو ابھرے گا نا کہ آخر ایسا کیوں؟ آخر ان امیر خاندانوں اور حکمرانوں سے تعلق رکھنے والوں کے قرض ہی کیوں معاف کیئے جاتے ہیں۔ یہ فرق کیوں ہے؟ یہ سوال بھی جواب طلب ہے کہ آخر وہ کونسے عوامل ہیں جن کی بنا پر ارکان اسمبلی کے اثاثے اتنی جلدی بڑھ جاتے ہیں۔ایک بیوکریٹ نے یہ واقعہ لکھا کہ مارشل لاگانے کے بعد اختیارات ہتھیانے کے کچھ عرصے بعد آغا حسن عابدی ایوب خان کو ملے اور مشورہ دیا کہ وہ ابو ظہبی کے حکمران شیخ زید بن سلطان کو شکار کی دعوت دیں۔ ’’ ابو ظہبی کہاں ہے؟‘‘ایوب خان نے قدرے حیران

ہو کر پوچھا... ”یہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے لیکن بہت جلد اہمیت اختیار کرلے گی کیونکہ وہاں تیل نکل رہا ہے۔ایوب خان آغا حسن صاحب کی فہم و فراست کا مداح تھا۔ چنانچہ شیخ زید کو شکار کی دعوت دی گئی جو اتفاق سے کراچی آیا ہوا تھا چونکہ اس وقت شیخ کے پاس اپنا جہاز نہیں تھا اس لئے پی آئی اے کا فوکر چارٹر کیا گیا جب جہاز سکھر کیلئے اڑا تو PAF کے دو سپر جیٹ اس کو ESCORT کررہے تھے۔ عینی شاہدین کے مطابق شیخ اس قدر مسحور ہوا کہ کھڑکیوں سے کبھی ایک جہاز کو دیکھتا تھا اور کبھی دوسرے کو شکار کے بعد وہ ٹرین ٹربیٹھ کر رحیم یار خان آیا اور کریم داد گجر کے ہاں ٹھہرا۔ تلور کا شکار کرتے ہوئے اس نے ریت کا ایک بہت بڑا ٹیلا دیکھا۔ بولا ” کریم داد! دیکھ لینا ایک دن میں یہاں عالیشان محل بنواؤنگا۔ میرے پاس ایک ایسا ” فلیٹ“ ہوگا جس میں دنیا کا ہر بڑا جہاز ہوگا چنانچہ وہی ہوا رحیم یار خان میں شیخ محل کا شمار دنیا کے چند بڑے محلات میں ہوتا ہے۔اس کے خاندان کے پاس چھبیس جہازوں کا بیڑا ہے جس میں جمبو سے لیکر C130، ائربس اور ہیلی کاپٹروں کی کثیر تعداد موجود ہے۔اب یہ لوگ کسی حکمران کو ملنے نہیں جاتے بلکہ حاکم ان سے درِ دولت پہ دستک دیتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نے ملک کو جس طرح لوٹا ہے، اس سے بعض ”جیالے“ اب بھی انکار کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات سب کو پتہ ہے کہ سابق صدر آصف علی زرداری نے سوئس حکام سے باضابطہ طور پر مطالبہ کیا تھا کہ 1997 میں تحقیقات کے بعد محترمہ بینظیر بھٹو کا انتہائی قیمتی ہیروں کا ہار

جس کی مالیت 23 لاکھ 23 ہزار ڈالر کے لگ بھگ ہے اور اسکے علاوہ دیگر زیورات جو کہ ضبط کر لئے گئے تھے۔ یہ اب واپس کر دیئے جائیں! اصل حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے ان زیورات کی واپسی کے لئے سوئس حکام سے رابطہ ہوا تھا۔ جس کی تصدیق سوئس حکام نے بھی کی تھی۔ ماضی میں زرداری صاحب کے جن لاکھوں ڈالرز کا تذکرہ ہوتا رہا ہے کہ یہ دولت سوئس بینکوں میں پڑی ہے یہ قومی خزانے سے خیانت اور دیگر بدعنوانیوں کے حربوں سے حاصل کرکے بیرونِ ملک منتقل کر دی گئی تھی۔۔۔ اب اس دولت کا وجود سوئٹزرلینڈ کے کسی بھی بینک میں ہے یا نہیں یہ ایک سربستہ راز ہے۔ کیونکہ برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر خود سوئٹزرلینڈ جا کر زرداری صاحب کے تمام مالی امور کے حوالے سے پڑی دستاویزات اپنا سفارتی استحقاق استعمال کرکے واپس برطانیہ لے آئے تھے اور برطانیہ کے مختلف بینکوں اور دیگر آف شور کمپنیز میں یہ تمام کا تمام سرمایہ محفوظ کروا دیا گیا تھا۔ موجودہ حکومت جو حزب اختلاف کے زمانے میں لوٹی ہوئی قومی دولت واپس لانے کا مطالبہ کرتی تھی اب اس مطالبے سے آنکھیں چراتی ہے۔ قومی خزانے میں خیانت ہوئی اور پھر اس مشہور مقدمے پر قوم کا بے پناہ سرمایہ بھی خرچ ہوا۔۔ لیکن اس سارے کھیل کا جو نتیجہ نکلا وہ ساری قوم کے سامنے ہے یعنی صدارتی استحقاق "کرپشن" پر حاوی رہا اور "کرپشن" آخر کار جیت گئی۔ سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی ہوں یا رینٹل راجہ پرویز اشرف، یا امین فہیم سب ہی اس حمام میں ننگے ہیں۔ نہ تو زرداری صاحب کا کسی نے احتساب کیا ہے

اور نہ ہی بیرونِ ملک سے ان کی دولت پاکستان واپس لائی جا سکی۔ ماضی میں آصف علی زرداری کے حوالے سے لندن میں ''سرے محل'' جس کی مالیت چار ملین ڈالر تھی اس کا بھی بہت چرچا رہا۔ لیکن اب اس کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔ 2003 میں سوئٹزرلینڈ کی ایک عدالت نے فیصلہ دیا کہ محترمہ بینظیر بھٹو اور آصف علی زرداری منی لانڈرنگ میں ملوث ہیں اور وہ پاکستان کو 11.5 ملین ڈالر واپس کریں۔ زرداری صاحب کو ماضی میں ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' بھی کہا جاتا رہا۔ بین الاقوامی بزنس مین اور امریکی معیشت کے ماہر Raymond W. Bakerکی کتاب Capitalism\'s Achilles Heel جو کہ دنیا کے مختلف ممالک کے حکمرانوں کی دولت کے حوالے سے بے پناہ معلومات پر مبنی ہے اس کتاب میں صفحہ 76 سے لے کر 87 تک پورے کا پورا حصہ پاکستان کے حکمرانوں کی بیرونِ ملک جائیدادوں اور اثاثوں کے بارے میں ہے جس میں خاص طور پر سابق صدر آصف علی زرداری، میاں نواز شریف اور پاکستان کے جرنیلوں کی دولت کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ آج تک پاکستان سے کسی نے Raymond W. Baker کی اس کتاب میں پاکستان کے حکمرانوں کے حوالے سے بھی ان کی جائیدادوں اور اثاثوں کی فراہم کردہ تفصیلات کو غلط ثابت نہیں کیا۔ اسی کتاب کی تفصیلات کے مطابق آصف علی زرداری کے سوئٹزرلینڈ کے 7 سے زائد مختلف بینکوں میں ذاتی اکاؤنٹس تھے اور اس کے علاوہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں انتہائی قیمتی جائیدادیں بھی موجود ہیں۔ 14 سے زائد برطانوی ورجن آئس لینڈ کی مختلف کمپنیز میں ان کی

جائیدادیں اور دیگر اثاثے موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حکمرانوں نے آخر برطانیہ، امریکہ، فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں بے پناہ دولت اور اثاثے کس طرح بنائے ؟ یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ آخر انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے کتنی دولت درکار ہوتی ہے؟آج دولت پر قبضہ صرف اور صرف محض چند خاندانوں کا ہے اور ساتھ ہی ہوسِ اقتدار بھی ہے۔ کل ہم اقتدار میں تھے اور اب ہمارے بچے اقتدار میں آئیں گے۔ یہ اس معاشرے کی بدقسمتی ہے۔ کسی نے کبھی نہیں پوچھا کہ اتنی دولت کہاں لے کر جاؤ گے ؟امیر حکمرانوں کی فہرست میں دوملکائیں بھی شامل ہیں۔ ہالینڈ کی ملکہ بیٹرکس دولت وثروت کے معاملے میں 14 مشہور ہیں۔.برطانیہ کی ملکہ الزبتھ دوم بھی دولت مند حکمرانوں میں شامل ہیں۔ یہ اس کے علاوہ ہے کہ شاہی اشیا، مثلاً تاج برطانیہ میں جڑے ہیرے جواہرات، بکنگھم پیلیس جیسے محلات کو برطانوی قوم کا ورثہ قرار دیا جاتا ہے۔ امیر ترین فرمانرواؤں کی فہرست میں ایک ایسی شخصیت بھی شمار کی جاتی ہے، جو کسی ریاست کی حکمران نہیں مگر پھر بھی شاہی مقام و مرتبے کی حامل ہے۔ یہ اسماعیلیوں کے روحانی پیشوا شہزادہ کریم آغاخان ہیں۔ ان کے اثاثوں کی مالیت ایک ارب ڈالر بتائی جاتی ہے- 15امیر ترین حکمرانوں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو کئی دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں مثلاً یہ کہ ایک طرف تو اقوام عالم کی صفوں میں ایک ارب سے زائد مسلمان نہایت پسماندہ اور غربت زدہ دکھائی دیتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کے حکمران دولت وثروت کے معاملے میں مغربی

ملکوں میں اربوں ڈالرز کی سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔ بیشتر مسلم فرمانروا اسراف بے جا کا چلتا پھرتا اشتہار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی شاندار محلات پر دولت لٹا رہا ہے تو کسی نے تعیشات اور تفریح کو ہی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ نہ تو انھوں نے مستقبل کا سوچا ہے اور نہ ہی جدید دور میں میڈیا کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس اہم شعبے میں سرمایہ کاری کی ہے،نہ کسی نے کوئی عظیم الشان لائبریری قائم کی ہے نہ کوئی ایسا سائنسی ادارہ بنایا کہ جو عالمی برادری سے اپنا لوہا منوا سکے۔ دولت کی اصل قدر اور قیمت اور اس کے صحیح استعمال کی اہمیت سے بھی وہی واقف ہوتے ہیں جو محنت کے بل بوتے پر دولت کماتے ہیں۔ جبکہ بیشتر حکمرانوں کو مالی وسائل محض ورثے میں ملے ہیں اور شاید اسی لیے وہ "Easy Come Easy Go" کا جیتا جاگتا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔

بھارت میں دنیا کے دوسرے سب مہنگے الیکشن ہونے جا رہے ہیں

بھارت میں دنیا کے دوسرے سب مہنگے الیکشن ہونے جا رہے ہیں، جن پر پانچ ارب ڈالر کے اخراجات متوقع ہیں، دنیا کی سب سے مہنگی امریکی صدارتی مہم ہے، جس پر صرف رقم سات ارب ڈالرز شمار کی جاتی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اس انتخابی مہم سے بھارت کی گرتی ہوئی معیشت کو ایک عارضی سہارا مل سکتا ہے۔ بھارتی سیاستدانوں انتخابات کے پیشہ پانی کی طرح بہارہے ہیں، اخبار 'ہندوستان ٹائمز' کا کہنا ہے کہ ملک کا کوئی اخبار، ٹی وی چینل، ریڈیو اسٹیشن، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، سڑک، گلی کوچے، محلہ، شہر، دیہات اور قصبہ ایسا نہیں جہاں بی جے پی اور نریندر سنگھ مودی کا 'گانا' نہ گایا جارہا ہو۔اخبار نے رپورٹ میں مودی کے قریبی ذرائع کے حوالے سے بتایا ہے کہ بی جے پی نے تین ماہ کے لئے ملک بھر میں 15 ہزار ہورڈنگز کرائے پر بک کرائے ہوئے ہیں جبکہ ایک ہورڈنگز کا ایک ماہ کا کرایہ دو سے تین لاکھ ہے جبکہ نریمن پوائنٹ ممبئی جیسی اہم ترین لوکیشنز پر ان ہورڈنگز کا کرایہ بیس لاکھ روپے ماہانہ ہے۔ مجموعی طور پر ہورڈنگز کی اشتہاری مہم پر ڈھائی کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔رپورٹ کے مطابق ملک کے 50 اہم ترین اخبارات میں چالیس دنوں تک اشتہارات پہلے سے بک ہیں۔ الیکشن تک ہر روز کم از کم پانچ اشتہارات شائع

ہوتے رہیں گے۔ اخباری بجٹ پانچ سو کروڑ روپے کا ہے جبکہ میگزینز میں اشتہاری مہم پر خرچ ہونے والے 150 کروڑ روپے اس کے علاوہ ہیں۔ٹی وی کمپین پر 80 ہزار فی سیکنڈ کی شرح سے اشتہارات بک کئے گئے ہیں۔ ٹی وی کا مجموعی بجٹ آٹھ سو سے 30 ایک ہزار کروڑ روپے تک ہے۔ ریڈیو اور انٹرنیٹ کی اشتہاری مہم کے لئے 35 کروڑ روپے کا بجٹ مختص ہے۔ بھارت کا شمار دنیاکے غریب ممالک میں کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود امیدواروں نے اپنی اپنی انتخابی مہم پر لاکھوں اور کروڑوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے ہیں۔ کچھ سیاستدان تو دنیا کی مہنگی ترین گاڑیوں میں سوار ہو کر اپنے ووٹرز کی حمایت کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر جارہے ہیں۔ جبکہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بالکل منفرد طریقے سے انتخابی مہم چلا رہا ہے۔بھارتی الیکشن کمیشن اس بات پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے کہ اخبارات اور میڈیا میں جو خبریں پیسے دے کر چھپوائی جاتی ہیں۔ان پر کتنی رقم خرچ کی جارہی ہے۔ بھارتی انتخابات میں اخبارات میں رقم کی ادائیگی کے ساتھ خبریں شائع کرانے کا رجحان بڑھا ہے۔ اس بارے میں علاقائی رپورٹرز کو بھی رقم ادا کی جارہی ہیں۔ اور امیدوار اپنے مطلب کی خبریں لگوارہے ہیں۔ بھارتی الیکشن کمیشن کے سربراہ ایس وائی قریشی نے ایڈیٹرز گلڈ کو کہا ہے کہ الیکشن کمیشن اخبارات پر نظر رکھے ہوئے ہے، اور پیڈ خبروں کے اخراجات کو بھی مونیٹر کیا جارہا ہے۔ ایک امیدوار کے لئے انتخابی اخراجات کی حد ستر لاکھ روپے رکھی گئی ہے، اس کے لئے اسے ایک

رجسٹر رکھنا ہوگا، جس ان تمام اخراجات کا اندراج کرنا ہوگا، کاغذات نامزدگی وصولی کے موقع پر اس رجسٹر کی جانچ پڑتال ہوگی، اور اس کا موزانہ مانیٹرنگ کمیٹی کے رجسٹر سے کیا جائے گا، جو اس کا علیحدہ ریکارڈ رکھ رہی ہے، کوئی امیدوار بیس ہزار روپے سے زائد کی ادائیگی، چیک یا بنک ڈرافٹ کے بغیر نہیں کر سکتا۔

بھارتی انتخابی مہم میں نوٹوں سے بھرے لفافے کے ساتھ ساتھ ملٹی ملین ڈالر اشتھاراتی مہمات بھی شامل ہیں۔ سنیٹر فار میڈیا اسٹیڈیز کے مطابق بھارت میں انتخابی مہم خرچ کا اندازہ 300 ارب روپے ($ 4.9 ارب) میں اندازہ لگایا گیا ہے . گزشتہ سال ملک بھر میں ریلیوں اور ایڈورٹائزنگ شروع کرنے والے متوقع وزیر اعظم ، نریندر مودی نے ایک سال پہلے ہی سے ایڈورٹائزنگ اور ریلیوں میں روپے پیشے کی ریل پیل سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تھا، کہا جارہا ہے کہ اس بار ہونے والے اخراجات 2009 میں ہونے والے انتخابی خرچ سے تین گنا زیادہ ہوں گے۔ اس کے بعد سے طویل معاشی بحران کے خاتمے کا سبب 1980s انتخابی مہم کے اخراجات بھی بن سکتے ہیں۔ دوسری جانب الیکشن کمیشن اور دوسرے آزاد ذرائع اس کھوج میں ہیں کہ یہ رقم کہاں سے آ رہی ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ امیدوار کی مہم اور بھارت میں پارٹی فنڈنگ کے ذرائع مبہم ہیں اور اخراجات کی زیادہ سے زیادہ حد کے ذریعہ کا پتہ لگانے کے لئے مشکل کا سامنا ہے

گزشتہ بھارتی انتخابات پر خرچ نے ملک میں ایڈورٹائزنگ بزنس، میڈیا گروپ،، کے کاروبار کو وسعت دی تھی۔ صارفین پر Brewers موٹر سائیکل مینوفیکچررز اور منی فرموں، اور اشتہاری آمدنی سے بہت سے میڈیا گروپوں اور مشتہرین کے کاروبار نے فائدہ اٹھایا تھا۔ بھارت کی اشتہار بازی کی صنعت کی سب سے بڑی ایجنسی، میڈیسن میڈیا کے ایک اندازے کے مطابق، انتخابات کے موسم کے دوران ایڈورٹائزنگ میں 800 ملین ڈالر کی رقم آنے کی امید ہے. بھارت میں امیدوار ووٹ خریدنے کے لئے نت نئے انداز اپنا رہے ہیں۔ اس میں ایک طریقہ اخبارات میں چھپی ہوئی نقد رقم کے لفافے ہیں۔ بہت سے حلقے یہ بھی الزام لگا رہے ہیں کہ اس مہم میں خرچ کی جانے والی زیادہ تر رقم فروغ پذیر سیاہ معیشت کا حصہ ہیں۔ قواعد امیدواروں کو اپنی مہم پر ستر لاکھ روپے خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں. لیکن پارلیمنٹ کی نشست کی اصل لاگت 70 لاکھ سے کہیں زیادہ تصور کی جاتی ہے۔ جس میں، ریلیوں، ایندھن اور میڈیا کی مہم پر خرچ کے اخراجات شامل ہیں۔ بھارتی سیاست دانوں کی جانب سے ووٹروں کو باقاعدگی سے ان کی حمایت کو محفوظ کرنے کے لئے نقد ادائیگی یا شراب کی رشوت دی جا رہی ہے۔ حالیہ ریاستی انتخابات میں امیدوار موبائل فون کے کریڈٹ اور صبح کے اخبارات میں نقد رقم کے لفافے کے ذریعے ووٹروں کو پیسے بھیج رہے ہیں۔ گزشتہ انتخابی مہم میں ہیلی کاپٹر، دودھ ٹرک اور یہاں تک کہ جنازہ وین کے ذریعے بھی رقوم بانٹی گئی تھی۔ ووٹ خریدنے کے ثبوت کے باوجود، بھارت کے انتخابات کو بڑی

حد تک آزاد اور شفاف قرار دیا جاتا ہے۔ بھاری اخراجات اور نتائج کو متاثر کرنے کے لئے غیر قانونی فنڈز کے استعمال اور " پیسے کی طاقت " کے بارے میں بھارتی چیف الیکشن کمشنر فکر مند نظر آتے ہیں۔ لیکن اب تک وہ اس بارے میں کوئی لائحہ عمل نہیں بنا سکے جس سے اس کا سدباب ہو سکے۔ بی جے پی ان اخراجات کو اپنے حامیوں کی دریا دلی قرار دیتی ہے۔ مودی نے فنڈ ریزنگ کے ذریعے ایک نئی جہت دی ہے۔ نریندر مودی کی بھارتیہ جنتا پارٹی ، یا بی جے پی ، بی جے پی کمزور ہے اور ماضی میں پیسہ خرچ سے گریز کیا ہے۔ مودی کی بی جے پی کی زیر قیادت اتحادی رائے کے انتخابات میں حکمران کانگریس پارٹی ایک مضبوط قیادت ہے ، لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک مکمل اکثریت حاصل کرنے کا امکان نہیں ہے . مودی کی فنڈ ریزنگ کے لئے لندن میں سٹی بینک کے ایک سابق سرمایہ کاری بینکر سمیت سات رکنی ٹیم نے مہم کا آغاز کا تھا۔ اس ٹیم نے بھارت میں ایک آن لائن فنڈ جمع کرنے کی مہم کا اعلان کیا تھا۔ اب ہانگ کانگ اور سنگاپور میں رہنے والے امیر بھارتیوں کی طرف سے عطیات کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

بھارت کا شمار دنیا کے غریب ممالک میں کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود امیدواروں نے اپنی اپنی انتخابی مہم پر لاکھوں اور کروڑوں روپے پانی کی طرح بہا دیئے ہیں۔ کچھ سیاستدان تو دنیا کی مہنگی ترین گاڑیوں میں سوار ہو کر اپنے ووٹرز کی حمایت کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر جا رہے ہیں۔ جبکہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بالکل منفرد طریقے سے

انتخابی مہم چلا رہا ہے۔انڈین اسپائیڈر مین اس شخص کا نام ہے گورو شرما۔اسے ممبئی باسی 'انڈین اسپائیڈر مین' بھی کہتے ہیں۔ 'آئی بی این لائیو' کے مطابق گورو آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے ہیں اور انہوں نے اپنی مہم کو منفرد بنانے کے لئے گھر گھر جانے کے بجائے عمارت در عمارت چڑھ چڑھ کر لوگوں کو پمفلٹس پہنچانے کا طریقہ اپنایا ہے۔۔باقی سارے امیدوار ووٹرز کو رجھانے کے لئے ان کے دروازے تک پہنچ رہے ہیں تو گورو شرما دیواریں پھاندتے، چھتیں پھلانگتے اور دوڑتے بھاگتے ووٹرز تک پہنچ رہے ہیں۔بی ایم ڈبلیو، آڈی، جیگوار، مرسیڈیز، ہمر، شیورلیٹ وغیرہ دنیا کی انتہائی مہنگی کاریں ہیں۔ایک' عام امیر' بھی ان میں سفر کرنے کو مہنگا خیال کرتا ہے لیکن بھارت میں غریبی کی مقررہ لکیر سے بھی نیچے رہنے والے عام آدمی کے نمائندے ہونے کا دعویٰ کرنے والے انگنت افراد ایسے ہیں جو نا صرف ایسی کئی کئی گاڑیوں کے مالک ہیں بلکہ وہ انہی مہنگی ترین گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنی انتخابی مہم چلا رہے ہیں۔'این ڈی ٹی وی' کی ایک رپورٹ کے مطابق امرتسر سے بی جے پی کے امیدوار ارون جیٹلی پیشے سے وکیل ہیں جبکہ مرسیڈیز، بی ایم ڈبلیو، ہنڈا ایکورڈ اور پورشے جیسی کاریں ان کی ملکیت میں ہیں لیکن حلف نامے میں انہوں نے خود کو صرف ایک 'ہنڈا' کار کا مالک دکھایا ہے۔بی جے پی کا ہی ایک اور امیدوار منوج تیواری جو دہلی کے ایک علاقے سے انتخابات لڑ رہا ہے اس کے پاس آڈی کیو سیون، مرسیڈیز بینز، فورچیونز اور ہنڈا سٹی جی ایکس آئی کے

بیڑے کا مالک ہے۔اداکاری سے سیاست کے میدان میں قدم رکھنے والی ہیما مالنی مرسیڈیز، ٹویوٹا، رینج رووراور ماروتی کی مالک ہیں۔اسی طرح ناگپور کی رکن پارلیمنٹ کانگریس کی جیوتی میردھا ریاست راجستھان کی سب سے امیر خاتون ہیں، ان کے پاس بھی مرسیڈیز گاڑیوں کا ایک بیڑہ موجود ہے۔ہریانہ جن ہت پارٹی کے سربراہ کلدیپ بشنوئی پانچ مہنگی ترین گاڑیوں کے مالک ہیں۔سابق کرکٹر محمد اظہرالدین کے پاس بھی ایک دو نہیں کئی مہنگی ترین گاڑیاں موجود ہیں۔ان کے علاوہ بھی سینکڑوں امیدوار ایسے ہیں جو انتہائی مہنگی گاڑیوں کے مالک ہیں۔ان کی قیمتیں عام آدمی کے کئی کئی سال کے بجٹ سے بھی بڑھ کر ہیں۔ایسی گاڑیوں میں بیٹھنے کا خواب بھی عام آدمی کے بس کی بات نہیں، استعمال کرنا تو دور کی بات ہے۔انتخابات میں پانچ ہزار کروڑ کی اشتہاری مہم کا بھی چرچا ہے۔چار انتخابی مراحل طے ہو جانے کے ساتھ ساتھ بھارت میں انتخابی مہم زور و شور سے جاری ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی مہم باقی سب پر برتری لے جانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔اس مہم پر بی جے پی نے مجموعی طور پر پانچ ہزار کروڑ روپے خرچ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔فضائی صنعت کے ماہرین کے مطابق، اس رپورٹ کی تیاری تک سب سے زیادہ سفر بی جے پی کے امیدوار نریندر مودی نے کئے۔ان کے بعد نمبر آتا ہے کانگریسی رہنما اور وائس پریذیڈنٹ راہول گاندھی کا۔طیارے اور ہیلی کاپٹر کرائے پر دینے والی کمپنیاں عام دنوں میں چار نشستوں اور ایک انجن والے ہیلی کاپٹر کا فی گھنٹہ کرایہ 70 ہزار سے 75 ہزار تک وصول

کرتی ہیں، جبکہ بزنس جیٹ طیاروں کے نرخ ڈھائی لاکھ سے تین لاکھ روپے فی گھنٹہ ہیں۔ لیکن، الیکشن کے دوران ڈیمانڈ میں اضافے کے ساتھ ہی نرخوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔بزنس ایئر کرافٹ آپریٹرز ایسو سی ایشن کے سیکریٹری آر کے بالی کا کہنا ہے کہ گزشتہ دو سالوں کے دوران، ہوائی صنعت کا خسارہ 2 فی صدتک پہنچ گیا تھا۔ لیکن، انتخابی مہم میں طیاروں اور ہیلی کاپٹرز کے بڑھتے ہوئے استعمال نے نہ صرف خسارہ پورا کردیا ہے بلکہ صنعت ایک مرتبہ پھر مثبت زون میں داخل ہو گئی ہے۔ڈائریکٹوریٹ جنرل آف سول ایوی ایشن آف انڈیا کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ملک میں اس وقت تقریباً 130 نان شیڈولڈ ایئر کرافٹ آپریٹر ہیں، جن میں سے 40 آپریٹرز کا بزنس بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس چار سے پانچ پرائیویٹ جیٹ ہیں جو اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی سفر پر رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کی تعداد 520 بنتی ہے۔ نسبتاً کم کرائے پر سفر کی روایت ڈالنے والی ایک نجی ایئر لائن کے کیپٹن جی آر گوپی ناتھ کا کہنا ہے کہ اتنی زیادہ سہولیات کے باوجود مودی اور راہول گاندھی دونوں دو سو سے زائد حلقوں کا ہی دورہ کرسکیں گے۔ بھارتی لوک سبھا کے انتخابات 9 مرحلوں میں مکمل ہوں گے۔ پولنگ کا آخری مرحلہ 12 مئی کو ہوگا جبکہ نتائج کا اعلان 16 مئی کو ہوگا۔ حالیہ انتخاب میں 81 کروڑ40 لاکھ بھارتی شہری انتخابات میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے کے اہل ہیں اور یہ تعداد 2009 کے الیکشن سے دس کروڑ زیادہ

ہے۔ ووٹنگ کے عمل کے لیے الیکٹرانک مشینوں کی مدد لی جا رہی ہے اور پہلی مرتبہ رائے دہندگان کو کسی بھی امیدوار کو نہ چننے کی 'آپشن' بھی دی گئی ہے۔ ایسے ووٹر ان امیداروں میں سے کوئی نہیں' والا بٹن دبا کر اپنی رائے دے سکیں گے۔ گذشتہ ' برسوں کے مقابلے میں اس بار آسام میں علیحدگی پسند تنظیم الفا کے کسی بھی گروہ نے نہ تو لوگوں سے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی ہے اور نہ ہی کسی پارٹی کے خلاف کوئی بیان دیا ہے۔ آسام میں کانگریس کو خاصا مضبوط سمجھا جاتا ہے لیکن بہت سے لوگوں کو کانگریس نے اپنے منشور میں وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ دوبارہ اقتدار میں آتی ہے تو ملک میں عوامی فلاح کی سکیمیں شروع کرے گی جن میں ہر کسی کے لیے صحتِ عامہ کی سہولیات اور بزرگ اور معذور افراد کے لیے پینشن بھی شامل ہے۔ بی جے پی نے اب تک انتخابات کے لیے اپنا منشور تک جاری نہیں کیا ہے لیکن وزیراعظم کے عہدے کے لیے جماعت کے امیدوار نریندر مودی کے بہتر بنیادی ڈھانچے، مضبوط قیادت، روزگار کے مواقع اور بہتر گورننس سے متعلق وعدے کیے گئے ہیں۔ اس مرتبہ بھارتی الیکشن میں ایک نئی جماعت عام آدمی پارٹی بھی شریک ہے جس نے دہلی کی ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں نتائج سے سب کو حیران کر دیا تھا۔ بھارت کی پارلیمان کا ایوانِ زیریں یا لوک سبھا 543 نشستوں پر مشتمل ہے اور کسی بھی جماعت یا اتحاد کو حکومت بنانے کے لیے کم از کم 272 نشستیں درکار ہوں گی ۔ اخراجات میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ یہ بھارتی تاریخ کے طویل

ترین یعنی 9 مراحل پر مشتمل الیکشن ہونگے۔ بھارتی الیکشن کمیشن کے اندازوں کے مطابق انتخابی اخراجات کی مد میں 35 ارب روپے خرچ ہوں گے جبکہ توقع ہے کہ سیاسی پارٹیاں اور انتخابی امیدوار 3 کھرب 5 ارب روپے الیکشن مہم پر خرچ کرینگے۔ اس حساب سے یہ بھارتی انتخابات دنیا کے مہنگے ترین انتخابات ہونگے جن میں گزشتہ انتخابات میں خرچ ہونیوالی رقم سے 3 گنا زائد رقم خرچ ہو گی۔ ان انتخابات میں بھی اصلی حریف انڈین نیشنل کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی ہیں۔ موجودہ بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ آئندہ وزارت عظمیٰ کا الیکشن نہ لڑنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اسی طرح کانگریس کے انتخابی مہم کی قیادت راجیو گاندھی کے بیٹے اور اندرا گاندھی کے پوتے راہول گاندھی کر رہے ہیں، ادھر بی جے پی نے گجرات میں ہونیوالے مسلم کش فسادات میں مسلمانوں کے قتل عام سے شہرت پانیوالے نریندر مودی کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار نامزد کر رکھا ہے، بھارت کی ریاستی حکومتوں پر نظر دوڑائی جائے تو اس وقت 28 ریاستوں اور 2 وفاق کے زیر انتظام علاقوں پانڈے چری اور دہلی میں سے 11 ریاستوں میں انڈین نیشنل کانگریس کی حکومت ہے اور یہاں کانگریس سے تعلق رکھنے والے وزرا اعلیٰ برسر اقتدار ہیں۔ ان ریاستوں میں آسام، ہریانہ، ہماچل پردیش، کرناٹکہ، کیرالا، مہاراشٹر، منی پور، میگھالے، میزورام اور اترا کھنڈ شامل ہیں جبکہ بھارت کی 5 ریاستوں چھتیس گڑھ، گووا، گجرات، مدھیا پردیش اور راجستھان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی صوبائی حکومتیں ہیں۔ بھارت کے سب سے بڑے صوبے اتر

پردیش جس میں لوک سبھا کی سب سے زیادہ سیٹیں ہیں وہاں سماج وادی پارٹی کی حکومت ہے، بھارت کی موجودہ یعنی 15 ویں لوک سبھا پر نظر ڈالی جائے تو اس میں انڈین نیشنل کانگریس کی 200، بھارتی جنتا پارٹی کی 112، بھوجن سماج پارٹی کی 21، سماج وادی پارٹی کی 21، جنتا دل کی 19، آل انڈیا ترنمول کانگریس کی 18، ڈی ایم کے کی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی 16، بجو جنتا دل کی 14، شیو سینا کی 10، آل انڈیا انا، 18 ڈی ایم کے کی 9، نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کی 8، آزاد امیدواروں کی تعداد 10، تلکو دیشم پارٹی کی 6، راشٹریہ لوک دل کی 5، سی پی آئی کی 4، شرمنی اکالی دل کی 4، جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کی 3، راشٹریہ جنتا دل کی 3، آل انڈیا فارورڈ بلاک کی 2، انڈین یونین مسلم لیگ کی 2، جھار کھنڈ مکتی مورچہ کی 2، جھار کھنڈ بکھاس مورچہ 2، ریوولوشنری سوشلسٹ پارٹی (آر ایس پی) کی 2 نشستیں ہیں۔بھارتی انتخابات میں جو ریاستیں اہم کردار ادا کرتی ہیں ان میں آندھرا پردیش، بہار، گجرات، کرناٹکہ، مدھیاپردیش، مہارا شٹر، تامل ناڈو، اترپردیش اور مغربی بنگال شامل ہیں۔چونکہ لوک سبھا کی سب سے زیادہ نشستیں اترپردیش میں ہیں جن کی تعداد 86 ہے جبکہ اندھرا پردیش میں 25، بہار میں 55 مدھیہ پردیش میں 29، مہاراشٹر میں 45، مغربی بنگال میں 34 لوک سبھا کی سیٹیں ہیں۔ بی جے پی کے انتخابات میں وزارت عظمیٰ کے امیدوار نریندرا مودی کا تعلق گجرات سے ہے اور اس وقت وہ گجرات کے وزیر اعلیٰ ہیں۔ گجرات میں لوک سبھا کی 22 سیٹیں ہیں۔

انڈین نیشنل کانگریس کے وزارت عظمیٰ کے امیدوار اور کانگریس کی انتخابی مہم کے سربراہ راہول گاندھی امیٹھی سے الیکشن لڑ رہے ہیں جو ان کی آبائی سیٹ ہے جس پر اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی الیکشن لڑتے رہے ہیں۔اتر پردیش میں واقع یہ حلقہ اس بار بھی خصوصی توجہ کا مرکز ہوگا کیونکہ بی جے پی راہول گاندھی کے مقابلے میں سمرتی ایرانی کو ان کے مقابلے میں اتارا ہے۔وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی نائب صدر بھی ہیں۔ سمرتی سابقہ ماڈل، معروف ٹیلی ویژن اداکارہ اور پروڈیوسر ہیں جو ایک این جی او چلا رہی ہیں جو غریب لوگوں کو پینے کا صاف پانی مہیا کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مہنگے الیکشن کا نجام کیا ہوتا ہے۔

دودھ مافیا ڈیری مافیا

ڈیری مافیا یومیہ 4 کروڑ روپے کا ناجائز منافع کما رہی ہے،

میں ہمیشہ کھلا دودھ استعمال کرتا ہوں، شام کو گھر جاتے ہوئے، ایک اہم ڈیوٹی یہی ہے کہ دودھ لے کر جایا جائے، اگر کسی وجہ سے میں اپنی مخصوص دکان سے دودھ نہ خرید سکوں تو پھر دودھ کا ناغہ کرنا پڑتا ہے کہ مجھے ڈبے کا دودھ اس کی گرانی سے زیادہ شک وشبے میں مبتلا کرتا ہے، گذشتہ چند برسوں میں دودھ کی قیمتیں واقعی آسمان کو پہنچ گئی ہیں، اس کا اندازہ دودھ والے کی دکان پر ان چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کو دیکھ کر ہوتا ہے، جو غریب آدمی دس یا بیس روپے کا دودھ لے کر بنواتا ہے۔ دس یا بیس روپے کا دودھ کتنا ہو سکتا ہے، آپ خود اندازہ کرلیں، اب کیا یہ دودھ بچہ پی سکتا ہے، یا ایک گھرانے کی چائے کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے، کراچی اب مافیاوں کا شہر بنتا جا رہا ہے، پانی، ٹریفک، دودھ، بھتہ، بھکاری، اغوا، بجلی چوری، آپ کس کس مافیا کو روئیں گے۔ دودھ ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ پانی کی طرح ہر روز دودھ کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ صبح سویرے دودھ کی دکانوں پر گاہکوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ کھانے

کی 50 فی صد اشیا میں کسی نہ کسی صورت دودھ استعمال ہوتا ہے۔اس لیے قیمتوں کے عدم استحکام سے کروڑوں صارفین متاثر ہوتے ہیں۔ حکم رانوں کی عوامی مسائل سے عدم دل چسپی، کرپشن اور قانون پر عمل درآمد نہ ہونے سے دودھ جیسی ضروری غذائی اشیا بھی غریبوں کی پہنچ سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ دودھ کے نرخ کون طے کرتا ہے، اس کی قیمت میں اضافے کا ذمے دار کون ہے، معیاری دودھ میں کون سے اجزا ہوتے ہیں، دودھ کا کاروبار کس طرح چلتا ہے اور کون لوگ یہ نظام چلا رہے ہیں۔ یہ بات اب راز نہیں رہی ہے، آئے دن اس بارے میں خبریں شائع ہوتی ہیں۔اب ڈیری مافیا نے ایک بار پھر کراچی کے شہریوں کو ڈس لیا ہے۔ شہری انتظامیہ اور سرکاری نرخ کو خاطر میں لائے بغیر دودھ کی قیمت میں 4 روپے فی لیٹر اضافے کا اعلان کردیا۔ شہر کے دکانداروں کے مطابق ڈیری فارمرز ایسوسی ایشن کی جانب سے 31 مارچ سے دی جانے والی سپلائی میں فی لیٹر 4 روپے کا اضافہ کردیا گیا ہے جس کے بعد شہر بھر میں تازہ دودھ کی خوردہ قیمت 84 روپے فی لیٹر ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے دودھ کی سرکاری قیمت 70 روپے فی لیٹر تھی۔ جس پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا۔ شہر بھر میں تازہ دودھ 76 سے 80 روپے لیٹر کی مختلف قیمتوں پر فروخت کیا جارہا تھا۔ کراچی میں ڈیری مافیا پہلے ہی من مانی قیمت پر دودھ فروخت کرتی رہی ہے اور اس بار بھی سرکاری نرخ 70 روپے فی لیٹر کے باوجود قیمت بڑھادی گئی ہے، یہ نہ سزا سے ڈرتی ہے اور نہ جرمانوں سے شہریوں کا کہنا ہے کہ انتظامیہ اس قدر نااہل ہے کہ دودھ فروشوں سے بھی سرکاری

احکام پر عمل نہیں کرا سکتی، در اصل یہ نااہل سرکاری افسران ہی ہیں جو رشوت کے کروڑوں روپے لے کر ان مافیا کے ساتھی اور مددگار بنے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں حکومت نام کی کوئی شے موجود ہی نہیں ہے۔ جو دودھ کی قیمتوں میں من مانے اضافے کا نوٹس لے۔ جو حکام قانونی کارروائی کرنے نکلتے ہیں، وہ بھی اپنی قیمت لے کر واپس آجاتے ہیں۔ کھلے دودھ کی فی لیٹر قیمت بڑھانے کا فیصلہ حکومت یا سرکاری دفتر میں نہیں بلکہ بھینس کالونی میں ڈیری فارمرز اور ہول سیلرز کے اجلاس میں کیا جاتا ہے۔ صوبائی حکومت اور سٹی گورنمنٹ گزشتہ 3 سال سے کراچی میں دودھ کی قیمت کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہیں۔ اس عرصے میں فی لٹر کھلے دودھ کی قیمت 37 روپے سے بڑھ کر 70 روپے اور اب 84 روپے ہو چکی ہے۔ اس صورت حال پر سخت نوٹس لیتے ہوئے وزیر اعلیٰ اور گورنر سندھ نے ڈی سی او کراچی کو ہدایت کی ہے کہ وہ حکومت کی جانب سے مقرر کردہ نرخ پر عوام کو دودھ کی فراہمی یقینی بنائیں اور ناجائز منافع خوروں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ لیکن اس پر عمل درآمد کون کرائے۔ ڈیری فارمرز اور ہول سیلرز نے راتوں رات دوودھ کی قیمت میں اضافہ کرکے لاکھوں روپے کما لئے ہیں۔ کراچی میں دودھ کی قیمت چار سال میں چوبیس روپے فی کلو بڑھائی گئی ہے۔ دودھ مافیا نے عوام سے دودھ جیسی بنیادی شے کو چھین لیا ہے۔ دو ہزار دس کے دوران دودھ کی قیمت ساٹھ روپے، دسمبر دو ہزار گیارہ میں اڑسٹھ روپے، مارچ دو ہزار بارہ میں چوہتر روپے، اپریل دو ہزار تیرہ میں اٹھتر روپے اور اب چھ روپے

اضافے سے دودھ کی فی کلو قیمت چوراسی روپے کردی گئی ہے۔ ریٹیلرز کہتے ہیں ڈیری فارمرز سے پوچھا جائے قیمت کیوں بڑھی ہے۔ لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کراچی میں روزانہ پینتیس لاکھ لیٹر دودھ استعمال ہوتا ہے۔ ریٹیلرز قیمت میں اضافے کا ذمہ دار ڈیری فامرز، بیوروکریسی، غیر قانونی چھاپوں اور ٹرانسپورٹیشن کی قیمتوں میں اضافے کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن پس تو عوام ہی رہے۔ اضافے کے لئے ایک من گھڑت لاگت کا تخمینہ کمشنر آفس کو ارسال کردیا جاتا ہے، جس کے جواب میں بھاری رشوت لے کر کمشنر کراچی اور ان کا عملہ نوٹیفکیشن جاری کر دیتا ہے۔ پھر اس نوٹیفیکشن کی مدت کے خاتمے سے قبل ہی یہ ڈرامہ دوبار رچایا جاتا ہے۔ ڈیری مافیا نے دودھ کی پیداوار، تھوک اور ریٹیل فروخت کے لیے لاگت کا من گھڑت تخمینہ دوبارہ کمشنر آفس میں جمع کرادیتی ہے جس میں دودھ کی سرکاری قیمت مزید فی لیٹر بڑھانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ موسم سرما کے دوران دودھ کی کھپت میں کمی اور پیداوار میں اضافے کے سبب طلب کے مقابلے میں رسد زیادہ ہونے کی نشاندہی کرتے ہوئے موسم سرما میں قیمت کم کرنے پر اتفاق کیا گیا تھا تاہم صوبائی حکومت اور اعلیٰ انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے موسم سرما میں قیمت کم کرنے کی بجائے اضافے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ اور یہ حکمت عملی کامیاب ٹھہری۔ ڈیری انڈسٹری کے ذرائع کے مطابق موسم سرما میں دودھ کی پیداوار میں 20 سے 30 فیصد اضافہ ہوجاتا ہے ساتھ ہی دودھ کے کمرشل استعمال

میں 50 فیصد تک کمی ہوجاتی ہے سرد موسم کے سبب لسی، دودھ کی بوتلوں، قلفی، فالودے، دودھ سے تیار مشروبات، قلفی کھیر فرنی اور دودھ سے تیار کیے جانے والے دیگر ٹھنڈے آئٹمز کی طلب غیر معمولی طور پر کم ہوجاتی ہے پیداوار بڑھنے اور طلب کم ہونے سے مجموعی طور پر طلب کے مقابلے میں رسد 80 فیصد تک بڑھ جاتی ہے جس سے دودھ کی تھوک قیمت میں بھی کمی واقع ہوتی ہے موسم سرما میں شہر بھر میں دودھ کے عارضی اسٹالز اور دکانیں قائم کردی جاتی ہیں۔جہاں دودھ عام دکانوں سے 20 فیصد تک ڈسکاؤنٹ پر فروخت کیا جاتا ہے تاہم بندی پر دودھ لینے والے دکاندار بدستور مہنگے داموں دودھ فروخت کرتے ہیں، اس سارے کھیل میں نام نہاد کنزیومر رائٹس پروٹیکشن کونسل آف پاکستان بھی شامل ہے، جو صارفین کی نام نہاد نمائندگی کرتی ہے، بلکہ اس کھیل کا حصہ ہے۔ دوسری جانب ڈبے بند دودھ کی قیمتوں میں بھی من مانا اضافہ کیا جاتا ہے۔ ایک کمپنی نے غیراعلانیہ طور پر فی لیٹر دودھ کے پیکٹ کی قیمت میں 4 روپے کا اضافہ کیا، پھر دوسروں نے بھی اس کی پیروی کی۔ جس کے نتیجے میں فی لیٹر ٹیٹراپیک دودھ کے پیکٹ کی قیمت 95 روپے سے بڑھ کر 99 روپے ہو گئی، اس طرح سے رواں سال کے ابتدائی ڈھائی ماہ کے دوران ٹیٹراپیک ملک کے تیارکنندگان کی جانب سے بلاجواز فی لیٹر دودھ کے پیکٹ کی قیمت میں مجموعی طور پر 9 روپے کا اضافہ کردیاگیا ہے۔ واضح رہے کہ جنوری 2014 میں فی لیٹر ٹیٹراپیک دودھ کی قیمت 90 روپے تھی جو فروری کے وسط میں 5 روپے کے اضافے سے 95 روپے کردی گئی اوراب

ہفتہ کو مزید 4 روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔مارکیٹ ذرائع کا کہنا ہے کہ ٹیٹرا پیک دودھ کے تیار کنندگان کی جانب سے یہ روایت بن گئی ہے کہ وہ پیشگی اطلاع دیے بغیر اچانک من مانے انداز میں قیمتوں میں اضافہ کرنے لگے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کمپنیوں کو لگام دینے کیلیے متعلقہ ادارے غیر متحرک ہو گئے ہیں اور پرائس کنٹرول کمیٹی کی رٹ بھی ختم ہو گئی ہے۔کچھ عرصے قبل کراچی میں شہری حکومت نے سرکاری طور پر مقرر کردہ نرخ سے زیادہ قیمت پر دودھ فرخت کرنے کے الزام میں دودھ فروشوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے چالیس دکانداروں پر جرمانے عائد کیے ہیں جبکہ پانچ کو جیل بھیجا۔لیکن اب نہ جرمانے کی پروا کی جاتی ہے اور نہ جیل جانے کی دودھ اسی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔اس کی وجہ بھی ڈیری مافیا ہے، جو اپنے ارکان کو بچانے کے لئے ساز باز کرتی رہتی ہے۔بہت سے دودھ فروشوں چاہتے ہیں کہ قیمت میں کمی کی جائے، لیکن ایسو سی ایشن انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔باڑے سے گھر تک دودھ پہنچانے میں کئی لوگ حصہ لیتے ہیں، جن میں تین کردار بڑے اہم ہیں، باڑے کا مالک ڈیری فارمر)، مڈل مین اور دُکان دار۔جب دودھ کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو اس) کی ذمے داری یہ تینوں ایک دوسرے پر ڈالنے لگتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ تینوں ہی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے ہیں اور بھگتنا عوام کو پڑتا ہے۔پانچ برسوں میں دودھ کی قیمت دُگنی ہو چکی ہے۔دُکانوں پر کبھی اصل قیمت پر دودھ فروخت نہیں ہوتا۔دُکان دار سرکاری ریٹ سے ہمیشہ پانچ ،دس روپے

زیادہ ہی وصول کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے دودھ 80 روپے میں فروخت ہو رہا تھا، جس میں یکم اپریل سے منافع خوروں نے اچانک 4 روپے اضافہ کرکے فی لیٹر دودھ 84 روپے تک پہنچا دیا۔ دودھ کے نرخ ایک کمیٹی مقرر کرتی ہے، جس میں تمام اسٹیک ہولڈرز کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ان میں ڈیری فارمرز، ہول سیلرز، ریٹیلرز اور صارف تنظیموں کے نمائندوں کے علاوہ شہری وصوبائی حکومتوں اور لائیو اسٹاک کے عہدے دار شامل ہوتے ہیں۔ ان سب کے اتفاق رائے سے دودھ کی قیمت طے ہوتی ہے۔ نرخ طے کرنے کی بنیاد ایک تحقیق پر ہوتی ہے، جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک بھینس روزانہ اوسطاً 8 لیٹر دودھ دیتی ہے اور بھینس کا چارا، اُس کی دوائی، ملازمین کی تن خواہیں وغیرہ شامل کرکے ایک بھینس پر آنے والے اخراجات کا حساب نکالا جاتا ہے۔ اس طرح باڑے کے مالک، ہول سیلرز اور ریٹیلرز کا منافع شامل کرکے فی لیٹر دودھ کا سرکاری ریٹ مقرر کیا جاتا ہے۔ دودھ کے کاروبار سے جڑے بعض افراد کا کہنا ہے کہ سرکاری کمیٹی محض خانہ پُری کے لیے ہوتی ہے، اصل ریٹ باڑے کے مالکان طے کرتے ہیں اور کمیٹی کو اُن کے مقرر کردہ ریٹ کے مطابق فیصلہ دینا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو کچھ دنوں بعد باڑے والے اپنی قیمت پر دودھ بیچنا شروع کر دیتے ہیں اور دکان دار بھی سرکاری نرخ سے زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں۔ عوامی شکایات پر حکومت رسمی طور پر کچھ دکان داروں پر گراں فروشی کا جرمانہ کر دیتی ہے اور پھر پورا سال خاموشی سے عوام کے لٹنے کا تماشا دیکھتی رہتی ہے۔

باڑے والے ، دُکان داروں کو براہ راست دودھ نہیں بیچتے۔ اُن کے درمیان ایک مڈل مین ہوتا ہے، جو باڑے کے مالک سے ایک سال کا معاہدہ کرتا ہے، جسے 'بندی' کہتے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت باڑے والا، مڈل مین کو پورے سال ایک ہی ریٹ پر دودھ فروخت کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ مڈل مین اپنا کمیشن رکھ کر دودھ دُکان دار کو بیچتا ہے۔ مڈل مین اور دُکان دار کے درمیان بھی بندی کا معاہدہ ہوتا ہے۔اس معاہدے کی معیادہر سال 31 دسمبر کو ختم ہوتی ہے۔

ان دودھ فروشوں کا مطالبہ ہے کہ شہری حکومت تازہ دودھ کے کاروبار کو تحفظ فراہم کرے اور ڈیری فارموں اور ڈسٹری بیوٹروں کو بھی پابند کرے کہ وہ دوکانداروں کو دودھ سرکاری نرخ پر فراہم کریں تاکہ عوام کو بھی سرکاری قیمت پر دودھ مہیا ہوسکے۔ ڈیری مافیا کا موقف یہ ہے کہ حکومت ڈبے والوں کو کچھ نہیں کہتی، جبکہ تازہ دودھ فروخت کرنے والے ہی مارکیٹ میں مقابلہ کی فضاء قائم رکھے ہوئے ہیں اور جب یہ نہیں رہیں گے تو ڈبہ کا دودھ فروخت کرنے والی ان کثیرالاقوامی کمپنیوں کی اجارہ داری ہوجائے گی اور دودھ بہت مہنگا ہوجائے گا۔دودھ فروشوں کی انجمن بھی ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ حکومت ڈیری فارم والوں اور ڈسٹری بیوٹروں کو پابند کریں کہ وہ دوکانداروں کو دودھ مقررہ قیمت پر فروخت کریں تاکہ دوکانداروں کو نقصان برداشت نہ کرنا پڑے۔ان کا کہنا ہے کہ دوکاندار دودھ زائد قیمت میں خرید کر کم قیمت میں کیسے فروخت

کر سکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ کئی برسوں سے طے نہیں ہوا ہے اور مستقل نقصان برداشت کرنے کی وجہ سے بہت سے دوکانداروں نے دودھ کے کاروبار کو خیرآباد کہہ دیا ہے۔ ان کا یہ دعوی بھی ہے کہ تازہ دودھ کی فراہمی کو جان بوجھ کر مشکل ترین بنایا جارہا ہے اور اس سے کثیرالاقوامی کمپنیوں کو فائدہ ہورہا ہے۔ بھینس مالکان کہتے ہیں کہ اگر حکومت چارے کی قیمتوں میں اگر دو تین سال تک اضافہ نہ ہونے کی یقین دہانی کرادے تو باڑے والے بھی دودھ کی قیمت میں اضافہ نہیں کریں گے۔ بھینس کے راشن میں شامل کتّر (سبز گھاس)، بھوسا، دلیہ، کھلی اور چوکر وغیرہ شامل ہے۔ دودھ گاڑھا کرنے کے لیے سردیوں میں بھینسوں کی خوراک کے ساتھ گھی ملایا جاتا ہے اور گرمیوں میں سرسوں کا تیل شامل کیا جاتا ہے۔ بھینسوں کو بورنگ کا پانی پلانے سے دودھ کی کوالٹی متاثر ہوتی ہے اور دودھ پتلا ہوتا ہے، اسی لیے بھینسوں کو میٹھا پانی دینا پڑتا ہے۔ ایک بھینس روزانہ 9 سے 10 کلو راشن کھاتی ہے۔ ایک کلو راشن 40 روپے کا پڑتا ہے۔ راشن کے ساتھ بھینسوں کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ جو بھینس ایک لاکھ 10 ہزار کی تھی، آج وہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی ملتی ہے۔" حکومتی عہدے داروں اور صارف تنظیموں کے نمایندوں کا موقف ہے کہ باڑے والے دودھ کی قیمت میں اضافہ کرنے کے لیے اخراجات بڑھاچڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اس میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر باڑے والوں کو اس کاروبار میں نقصان ہورہا ہے تو بہتر ہے وہ کوئی دوسرا کاروبار کرلیں اور یہ

کام کسی اور کو کرنے دیں۔اُن کا کہنا ہے کہ کچھ باڑے والوں کے اپنے فارم اور دکانیں ہیں، جو ہر طرف سے منافع کما رہے ہیں، لیکن پھر بھی اخراجات کا رونا روتے رہتے ضروری ہے لیکن بازار میں فروخت (Fats) ہیں۔ معیاری دودھ میں 6 فی صد چکنائی ہونے والے دودھ میں صرف 2 سے 3 فی صد چکنائی ہوتی ہے۔اگر ایک فی صد چکنائی کم ہو جائے تو دودھ کی قیمت میں فی لیٹر 10 روپے کی ہو جاتی ہے۔ انڈیا میں اسی اُصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ ممبئ میں چکنائی کی پیائش کی مشینیں نصب ہیں، جہاں چکنائی کے حساب سے دودھ فروخت ہوتا ہے۔ دو سال قبل کوالٹی کنٹرول کے اہل کاروں نے شہر بھر سے دودھ کے 117 نمونے اکٹھے کیے تھے، جن میں سے 35 فی صد مضر صحت نکلے۔ دنیا بھر میں گوشت اور دودھ دینے والے جانور الگ ہوتے ہیں لیکن ہمارے یہاں اس میں کوئی فرق نہیں رکھا جاتا۔ جن گائے بھینسوں سے دودھ حاصل کرتے ہیں، بعد میں اسی کو ذبح کرکے کھا جاتے ہیں۔ باڑا مالکان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بھینسوں سے زیادہ سے زیادہ دودھ حاصل کرے۔ اس کوشش میں وہ بعض اوقات اخلاقی حدود بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ ایک نارمل بھینس ایک سال تک دس سے بارہ کلو روزانہ دودھ دیتی ہے اس کے بعد اُس میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ جب بھینس کم دودھ دینے لگتی ہے تو اسے چوائی (دودھ دھونے) کے وقت ایک خاص قسم کا انجکشن لگایا جاتا ہے، جس سے وہ دودھ کی مقدار بڑھا دیتی ہے۔ یہ غیر فطری طریقہ ہے، جس سے بھینس کو دودھ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دوسری ظلم اُن کا ساتھ یہ کیا جاتا ہے کہ

اُن کے کٹوں کو پیدا ہونے کے کچھ دن بعد قصائیوں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اپنی ماں کا دودھ پی کر اُن کے منافع کو کم نہ کر دیں۔ قصائی ان کٹوں کو ذبح کرکے اُن کا گوشت ہوٹلوں میں بیچ دیتے ہیں، جہاں اسے بکرے کے گوشت سے تیار کھانے ظاہر کر کے گاہکوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا دودھ کی پیداوار میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ وہاں دودھ دینے والی گائیں الگ ہوتی ہے، جن کی خاص طریقے سے پرورش کی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں بھینسوں کا علاج معالجہ مفت ہوتا ہے اور چارے کی قیمتیں سال بھر مستحکم رہتی ہیں۔ حکومت سندھ اگر ہمیں سہولتیں دیں تو ہم 10 لاکھ لیٹر دودھ کی قلت دُور کر سکتے ہیں۔ اس وقت کراچی میں روزانہ 70 لاکھ لیٹر دودھ کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن کراچی کے باڑوں میں موجود قریباً 19 لاکھ بھینسوں سے 60 لاکھ لیٹر دودھ حاصل ہوتا ہے اور 10 لاکھ لیٹر دودھ کی کمی خشک دودھ سے پوری کی جاتی ہے۔ دودھ میں پانی ملا کر مقدار بڑھانے اور اسے گاڑھا کرنے کے لیے اس میں روورڈ اور یوریا کیمیکل ملانے کی شکایات اکثر سامنے آتی ہیں۔ ملاوٹ کے لیے دودھ مافیا نے باقاعدہ پیٹرول پمپوں پر اپنے اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ جہاں پانی کی ملاوٹ کی جاتی ہے۔ دودھ میں یوریا کیمیکل اور پانی بھی ملایا جاتا ہے۔ کراچی میں بھی مضرِ صحت دودھ سے متعلق سیکڑوں شکایات موصول ہوتی ہیں، جن پر بہت کم ایکشن لیا جاتا ہے۔
باڑوں سے نکلنے کے بعد دودھ کو برف یا فریزر میں نہ رکھا جائے تو وہ 4 گھنٹے بعد خراب ہو جاتا ہے، چناں چہ دُکان

دار دودھ کے ڈرم کے وسط میں اسٹیل کی ٹنکی میں برف رکھتے ہیں، تاکہ فروخت ہونے تک دودھ خراب نہ ہو۔ برف پگھل کر دودھ میں شامل ہوتی رہتی ہے، لیکن اسے ملاوٹ کے بجائے دکان دار کی مجبوری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دودھ کے کاروبار سے منسلک لوگ دودھ میں پانی کی ملاوٹ تسلیم کرتے ہیں لیکن کوئی دوسری مایع شے کی ملاوٹ کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ دودھ بڑی حساس شے ہوتی ہے، اس میں تیل، گھی یا کسی مایع شے کا چھینٹا بھی پڑ جائے تو وہ خراب ہوجاتا ہے۔ اس لیے اراروٹ اوریوریا کیمیکل کی ملاوٹ والی بات عقل تسلیم نہیں کرتی۔ ڈبے کا دودھ ڈالر کی کمی کے باوجود مہنگا ہو رہا ہے۔ اس کے نرخ مسلسل بڑھ رہے ہیں' بچوں کیلئے دودھ کے ڈبے کی قیمت دو ماہ میں 15 فیصد بڑھ چکی ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران 200 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ پاکستان دنیا میں دودھ پیدا کرنے والا چوتھا بڑا ملک ہونے کے باوجود ملک پروسیسنگ پر سرمایہ داروں کی اجارہ داری کے باعث بچوں کیلئے خشک دودھ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پانے میں ناکام ہے حالانکہ ملک پروسینگ انڈسٹری میں گزشتہ 5 سالوں کے دوران 700 ملین ڈالر کی اضافی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اس کے باوجود ڈبے میں محفوظ دودھ مارکیٹ کا صرف سات فیصد حصہ ہے۔ ڈبہ والے دودھ کے مالکان کے مطابق پروڈکشن کاسٹ میں مسلسل اضافے کی وجہ سے دودھ کے ڈبے کی قیمتوں میں اضافہ روکنا ناممکن ہوگیا ہے۔ ایک لیٹر کا دودھ کا ڈبہ جو پانچ سال قبل 36 روپے کا تھا اب 99 روپے کا ہوگیا ہے۔ ڈبے کا دودھ

بنانے والی کمپنیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ عالمی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے کم سے کم منافع پر اپنی مصنوعات فروخت کر رہے ہیں۔ قیمتوں میں اضافے میں سب سے بڑا رول کراچی کی ضلعی انتظامیہ کا ہے۔ جو اجلاس میں شریک ڈیری فارمرز، ہول سیلرز اور ریٹیلرز سے سرکاری نرخ پر دودھ فروخت کرنے کی یقین دہانی حاصل کرنے میں ناکام رہی اور ڈیری فارمرز کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس موقع پر صارف انجمنوں کے نمائندے بھی خاموش رہے، جو ایک مجرمانہ خاموشی ہے۔ دودھ صحت بخش غذا ہے، اس لیے ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا بچہ ناشتے میں یا رات کے وقت دودھ کا ایک گلاس پی کر سوئے۔ تاہم غیر معیاری دودھ بچے کو صحت مند بنانے کے بہ جائے اُس کی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ دودھ ہمیشہ اچھے اور ایمان دار دُکان دار سے خریدنا چاہیے۔ جگہ جگہ اسٹالوں میں فروخت ہونے والا دودھ غیر معیاری ہوتا ہے، جس میں دیہات سے جمع کیا گیا گائے، بکری کا دودھ بھی شامل کر لیا جاتا ہے اور اسے انتہائی غیر محفوظ طریقے سے جمع کرکے شہر تک پہنچایا جاتا ہے۔ دودھ کی قلت دور کرنے کے لیے نئے باڑوں کا قیام ناگزیر ہوچکا ہے۔ اس سلسلے میں سندھ حکومت کا ٹھٹھہ میں 8.2 ارب روپے لاگت کا ''بھنبھور ڈیری فارم (ولیج) اینڈ پروسیسنگ زون'' منصوبے زیر تعمیر ہے۔ پورے ملک میں دودھ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایسے منصوبے جلد از جلد مکمل کیے جانے چاہیے تاکہ دودھ کی قیمتیں کم کی جا سکیایک اندازے کے مطابق کراچی میں تازہ دودھ کی یومیہ کھپت 50 لاکھ لیٹر ہے جس پر فی لیٹر 8

روپے منافع وصول کیا جانے سے ڈیری مافیا یومیہ 4 کروڑ روپے کا ناجائز منافع کمارہی ہے، یہ رقم رشوت کے لئے استعمال کی جارہی ہے۔ ذرائع کے مطابق شہریوں سے غیر سرکاری قیمت کے نام پر وصول کی جانے والی رقم، پرائس اور کوالٹی کنٹرول کے تمام محکموں میں تقسیم کیے جانے کی اطلاعات ہیں۔

سونے کا نوالہ کھانے والے

کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی آنکھ سے، یا منہ میں سونے کا چمچہ لے پیدا ہوا ہے، اردو کے محاورے ہیں۔ لیکن حقیقت میں سونا کھانا اور اسے پیٹ میں رکھنا ایک حیرت انگیز کام ہے، پرانے حکیموں کے بارے میں یہ سنا گیا تھا کہ وہ بادشاہوں کے لئے جو کشتے بناتے تھے، اس میں سونے کی آمیزش بھی کرتے تھے، لیکن اب تو یہ حیرت انگیز قصہ ہے کہ ایک تاجر نے اپنے پیٹ میں سونے کی بارہ اینٹیں جمع کر لی تھی۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق 63 سالہ بھارتی تاجر کو قے اور پاخانے میں تکلیف کی شکایت کے بعد ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ تاجر نے ڈاکٹر کو بتایا کہ انھوں نے بیوی سے لڑائی کے بعد غصے میں آ کر بوتل کا ڈھکن نگل لیا تھا لیکن جب ڈاکٹروں نے ان کا آپریشن کیا تو انھیں ان کے معدے سے بوتل کی ڈھکن کے بجائے تقریباً چار سو گرام کا سونا ملا۔ آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں نے بتایا کہ پولیس اور کسٹم حکام نے تاجر سے پوچھ گچھ کی ہے اور سونے کو اپنے قبضے میں لیا ہے۔ دنیا میں بھارت سب سے زیادہ سونا استعمال کرنے والا ملک ہے جہاں دھات کی درآمد پر ٹیکس میں اضافہ کی وجہ سے اس کی اسمگلنگ میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے۔ سر گنگا رام ہسپتال میں سینیئر سرجن ڈاکٹر سی ایس رام چندراں نے کہا یہ پہلی دفعہ ہے کہ

میں نے کسی مریض کے پیٹ سے سونا نکالا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے ایک مریض سے ایک کلو وزنی مثانے کا پتھر نکلا تھا لیکن ایک مریض کے پیٹ میں سونا ایک ناقابلِ یقین بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تھکا دینے والا تین گھنٹے کا آپریشن تھا۔ وہ ایک بزرگ مریض تھا اور ہمیں احتیاط سے کام لینا تھا۔ ہمیں ان کی پیٹ سے سونے کی اینٹوں کا ڈھیر ملا۔ انسانی جسم اللہ کی عجیب و غریب نعمت ہے، اس کے کمالات 12 انسانی زندگی میں جا بجا نظر آتے ہیں، پاکستان میں ایک ڈرامہ ایک انڈونیشی خاتون نے رچایا تھا، بہت زمانے کی بات ہے، خاتون کے پیٹ سے آوازیں آتی تھیں ، لوگ اسے معجزہ سمجھتے تھے، اس زمانے میں میڈیا اس قدر ترقی یافتہ نہ تھا، اخبارات میں اس قصے کی بڑی بڑی خبریں لگتی رہیں، پھر اچانک انکشاف ہوا کہ اس نے پیٹ پر ٹیپ ریکارڈ باندھا ہوا تھا، سادہ لوگ تھے، اس قصے سے بہت دن تک لوگ لطف اٹھاتے رہے، اب جدید دور میں اسمگلنگ کے لئے انسانی جسم کو استعمال کیا جاتا ہے، جسم کے حصوں میں ہیروین، اور دیگر منشیات کی تھیلیاں اور کیپسول چھپائے جاتے ہیں ، کچھ پکڑے جاتے ہیں، کچھ اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور کچھ کے جسم میں یہ کیپسول یا تھیلیاں پھٹ جاتی ہیں، اور وہ موت سے ہمکنار ہوجاتے ہیں۔ لیکن اب ایسے آلات ، درون بین، نگرانی کرنے والے کیمرے، ایکس رے کی مشین الٹرساونڈ جیسی چیزوں سے جسم کے اندر چھپی ہوئی اشیاء کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ یہ سامان نگرانی کی چوکیوں پر انسانی جسم میں موجود منشیات کے اجزا کی نشان دہی کے

لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس سامان سے تلاشی کا عمل کافی زیادہ تیز ہوگیا ہے۔ اور منشیات کی ساخت کا زیادہ درست طور پر تجزیہ ہو جاتا ہے۔ منشیات سمگل کرنے کی کوششوں میں زیادہ ر افراد غیر ملکی ہوتے ہیں، جن میں عورتیں اور مرد شامل ہوتے ہیں۔ منشیات سمگل کرنے والوں میں یورپین، مشرق وسطی اور افریقی ممالک کے باشندے زیادہ شامل ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ برطانوی، افغانی اور نائیجرین شہری پکڑے جاتے ہیں، یہ افراد ہیروئن کیپسول میں بھر کر پیٹ اور جسم کے مختلف حصوں کے اندر چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کا کھوج جدید آلات سے اور الٹرا ساونڈ سے کیا جاتا ہے۔ صوبہ سندھ میں اللہ وسایو ایک ایسا زندہ کردار ہے، جو شیشہ، اینٹیں، پتھر، لوہا، کیل، لکڑی، اور گھاس سب کچھ کھا جاتا تھا۔ لکڑ ہضم اور پتھر ہضم کا محاورہ تو ہر ایک نے سنا ہے اور شاید کچھ لوگوں نے مشاہدہ بھی کیا ہو لیکن ایسا کم ہی لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ کوئی انسان شیشہ، اینٹیں، پتھر، لوہا، کیل، لکڑی، گھاس اور نیز ہر چیز کھالے اور اسے کچھ بھی نہ ہو۔ اللہ وسایو شیدی عجیب و غریب کمالات دکھاتا تھا۔ وہ کہتا سائیں یہ تو کچھ بھی نہیں، مجھے حکومت سے اجازت لے کر دیں تو چھ ماہ کے اندر دس ڈبوں والی حال ہی میں شروع کردہ تھر ایکسپریس کھا جاؤں گا۔ اکیاون سالہ اللہ وسایو شیدی نے حیدرآباد سندھ کے ریلوے سٹیشن کے سامنے باچا خان چوک پر جمع ہونے والے ایک مجمعے کے سامنے یہ دعویٰ کیا۔ بی بی سی کے نمائندے نے اس بارے میں لکھا کہ صوبہ سندھ کے ضلع بدین میں میں ہر کوئی

اللہ وسایو شیدی کے قصے بیان کرتا نظر آتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اللہ وسایو پچاس آدمیوں کا کھانا اکیلے کھا جاتا ہے اور کسی کا کہنا کہ وہ ایک من گھاس کھالیتا ہے لیکن کوئی حرام چیز نہیں کھاتا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ میری ملاقات اللہ وسایو سے حیدرآباد کے ریلوے سٹیشن کے پاس باچا خان چوک کے سامنے ایک تنگ اور گندی گلی میں واقع ایک مسافر خانے میں ہوئی۔ وہ اس مسافر خانے میں کئی ماہ سے مقیم ہیں اور صبح ہوتے ہی مختلف علاقوں میں اپنا کرتب دکھانے نکل جاتے ہیں اور شام گئے واپس پہنچتے ہیں۔ ہلکے ہرے رنگ کے میلے کپڑے اور پھٹی ہوئی چپل پہنے ہوئے اللہ وسایو شیدی کے ہمراہ جب چوک پر آئے تو انھوں نے مٹی کے پکے ہوئے برتنوں کے ایک ریڑھے سے ایک پیالہ اٹھایا۔اللہ وسایو نے پیالہ توڑ کرجب ٹکڑے کھانے شروع کیے تو وہاں بیسیوں افراد کا مجمع لگ گیااور میرے سمیت ہر شخص انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

اللہ وسایو کو جاننے والے نے ایک شخص نے آواز لگائی کہ اس شخص نے دو روز قبل ایک خالی بوتل توڑ کر کھاگیا۔جب وہاں سے تھوڑا آگے ایک لوہے کی دوکان پر آئے اور نٹ بولٹ اور کیل خریدے۔لوگ اس کے بارے میں بہت سی باتیں کرتے، لیکن وہ کہتا

میں ان پڑھ آدمی ہوں میرے پاس جن ہوتے یا کالا علم تو کیا در در کے دھکے ’

کھاتا۔ اللہ وسایو نے جب چھ عدد بولٹ نگل لیے۔ تو مجمع اتنا بڑھ گیا کہ ٹریفک بلاک ہو گئی اور ایک سپاہی پہنچ گیا اور کہا کہ مہربانی کرکے یہ بند کریں سڑک بند ہو گئی ہے۔ اتنی دیر میں انہوں نے ایک درجن کے قریب پونے انچ والے کیل کھالیے۔ جس پر مجمعے سے لوگوں نے مختلف باتیں کرنا شروع کر دیں۔ ایک نے کہا کہ یہ نظر بندی کر رہا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کے پاس جن ہیں جو ان کے منہ سے چیزیں نکال لیتے ہیں اور ان کے پیٹ میں چیزیں نہیں جاتیں۔ کسی نے کہا کہ اس کے پاس کالا جادو ہے۔ ایک مولوی صاحب نے کہا کہ ان سے پہلے بسم اللہ یا کلمہ پڑھوائیں پھر یہ نہیں کھا سکے گا۔ ایک نوجوان نے کہا کہ انہیں پیر فقیر کی دعا ہے بس اللہ والا آدمی ہے۔ خیر اللہ وسایو سب کی باتیں سنتے رہے اور کہا کہ میں مسلمان ہوں کلمہ پڑھ کر کھانے کو تیار ہوں اور الٹرا ساؤنڈ کرانے کے لیے بھی تیار ہوں تاکہ لوگ دیکھیں کہ ساری چیزیں پیٹ میں ہیں یا نہیں۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے ایک شرط رکھی کہ جو بھی چیلنج کرے گا اسے ہارنے پر ایک ہزار روپے جرمانہ دینا ہوگا۔ میں نے سب سے پہلے مولوی صاحب کی طرف مائیک کیا تو وہ مسکراتے ہوئے چل دیے اور پورے مجمع میں سے کسی ایک شخص نے بھی اللہ وسایو کو چیلینج قبول نہیں کیا۔ اللہ وسایو نے بتایا کہ انہیں ایک جاننے والا شخص کراچی کے اس ہوٹل میں لے گیا جہاں چار سو روپے کے عوض پیٹ بھر کر کھانے کا اختیار تھا۔ اللہ وسایو نے بتایا کہ جب انہوں نے پچاس آدمیوں کا کھانا کھالیا تو ہوٹل مالک نے ہاتھ جوڑے اور چار سو روپے پلے سے دیے اور

کہا کہ بوفے آپ کے لیے نہیں ہے۔میں نے اکیلے میں جب اللہ وسایو سے پوچھا کہ آپ کے پاس جن ہیں، کالا علم ہے آخر قصہ کیا ہے تو اللہ وسایو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے ' صاحب آپ بھی۔۔۔ !'میں ان پڑھ آدمی ہوں میرے پاس جن ہوتے یا کالا علم تو کیا در در کے دھکے کھاتا۔ بس خدا نے انسان کے روپ میں کیا بنا دیا ہے۔ انگریز کے ملک میں پیدا ہوتا تو وہ تحقیق کرتے کہ قدرت کی کیا کرشمہ سازی ہے۔اللہ وسایو کا قصہ کئی سال پرانا ہے، نہ اب کہاں ہوگا، شائد مر کھپ گیا ہو، لیکن امریکی سائنس دانوں نے انسانی جسم میں حل ہوجانے کی صلاحیت رکھنے والے انتہائی باریک برقی آلات ایجاد کر لیے ہیں۔ان دنوں مغربی ذرائع ابلاغ عامہ نے ایسی اطلاعات دی ہیں۔ جن میں انٹیلی جینس کے حوالے سے نئے خوفناک منصوبے تیار کیئے جا رہے ہیں ۔ جس میں انسانی جسم میں آلات اور بم بھی رکھے ۔ان دنوں مغربی ذرائع ابلاغ عامہ نے انٹیلی جینس کے حوالے سے ایک نئے خوفناک منصوبے کے بارے میں اطلاع دی ہے۔ میڈیا کے مطابق ایک گروہ انسانی بم بنانا چاہتا ہے۔ اس گروہ کے لیے کام کرنے والے جراحوں نے برطانیہ کے بہترین اسپتالوں میں تربیت حاصل کرکے انسانی جسم میں بم نصب کرنے کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ واضح رہے کہ ایسے بم کا پتہ لگایا جانا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔کیا، یہ کوئی من گھڑت افسانہ ہے یا پھر عالمی برادر کو زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے؟ تجزیہ نگار یوگینی یرمولائیو اور ماہر شرقیات ویکتور نادیئین رائیوسکی کا کہنا تھا کہ یہ گروہ کچھ بھی کرنے کے قابل ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سن دو ہزار نو میں بم بنانے والے ماہر ابراہم حسن العسیری نے اپنے بھائی عبداللہ کے جسم میں بم نصب کیا تھا تاکہ وہ سعودی انٹیلی جینس چیف کو ہلاک کرے۔ یہ معلوم ہے کہ ابراہم العسیری نے اپنے بھائی کے جسم میں انتہائی طاقت ور بم نصب کیا تھا لیکن اس مرتبہ جراحی نہیں کی گئی تھی۔ دھماکہ خیز مادہ انسانی جسم میں قدرتی طور موجود سراغ میں رکھا گیا تھا۔ لیکن قاتلانہ حملہ ناکام رہا تھا، اس میں صرف خود کش بمبار ہلاک ہو گیا تھا۔ لیکن یہ ایک پروپیگنڈہ ہی تھا، کیونکہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ خود کش حملہ آوروں کے جسم میں بم نصب کرنے کا مقصد کیا تھا، کیونکہ یہ ایک امشکل طریقہ تھا۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ جراحی کے بعد ٹانکے ایک طویل عرصے تک دور نہیں ہوتے ۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ کپڑوں کے نیچے سے ٹانکے نہیں دکھائی دیں گے۔ مختصر یہ کہ انسانی بم بنائے جانے کے بارے میں اطلاعات من گھڑت افسانہ ہی تھی۔ مغربی ممالک میں عام لوگوں کو ڈرانے کی کوشش میں یہ بات بھی پروپیگنڈہ کا حصہ تھی۔ لیکن مغربی سائنس دانوں نے انسانی جسم میں تحلیل ہو جانے والے آلات ضرور بنا لیئے ہیں۔ ایک جریدے ”سائنس“ میں شایع ہونے والی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ یہ آلات اپنا کام مکمل کرنے کے بعد جسم میں حل ہو جائیں گے۔

تحلیل ہونے والے آلات کا بنیادی مقصد زخموں کو انفیکشن سے بچانا ہے۔ یہ آلات سیلیکون اور میگنیشیم آکسائیڈ کے بنے ہیں اور تحفظ کے لیے انھیں ریشم کے باریک ترین پردوں میں لپیٹا گیا ہے۔ یہ تحقیق

کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے "Transient Electronics" ٹرانزیئنٹ الیکٹرانکس اور اسے ان محققوں نے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے جو قبل ازیں جلد کے ساتھ پھیلنے اور سکڑنے والے آلات بنا چکے ہیں۔ محققین نے ان حل ہو جانے والے آلات کو روایتی برقیات کے مقابلے میں "پولراپوزٹ" یعنی قطبی مخالف کا نام دیا ہے۔ روایتی برقی آلات پائیدار اور ٹھوس ہوتے ہیں جب کہ یہ آلات جسم کے ساتھ پھیلتے سکڑتے ہیں اور جسم میں ہی حل ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ٹفٹ اسکول آف انجنیئرنگ کے پروفیسر فائرنزو اومینیسٹو کے مطابق اس طریقہ کار میں دو عوامل کارفرما ہیں: ایک یہ کہ اس میں اشیا حل ہو جاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ انھیں کب حل ہونا ہے۔ سلیکون پانی میں تحلیل ہو ہی جاتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روایتی برقیات میں سلیکون سے بننے والے آلات اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ وہ تحلیل ہونے میں بہت زیادہ وقت لگاتے ہیں۔ سائنس دانوں نے سلیکون کی ایک ایسی باریک جھلی تخلیق کی جو ہفتوں اور دنوں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اس جھلّی کا نام انھوں نے "نینو میمبرین" رکھا ہے۔ ان آلات کے تحلیل ہونے کی رفتار کو ریشم کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے، اور یہ مادہ ریشم کے کیڑے سے حاصل کیا جاتا ہے۔پروفیسر اومینیسٹو کا کہنا ہے، "موجودہ آلات کے مقابلے میں ٹرانزیئنٹ الیکٹرانکس کی کارکردگی بہتر ہے کیونکہ وہ ماحول میں ایک معینہ مدت کے اندر پوری طرح سے گھل جاتے ہیں، خواہ منٹوں میں یا برسوں میں۔" تجربہ گاہ میں ان آلات کی متعدد اقسام کے استعمال پر تحقیق کی گئی ہے

جن میں چونسٹھ میگا پکسل ڈیجیٹل کیمرے سے لے کر حرارت جانچنے والے آلات اور شمسی خلیے شامل ہیں۔زخموں کو انفیکشن سے محفوظ رکھنے کے علاوہ اس ٹیکنالوجی کو دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر جسم کے اندر ایسی دواوں کا داخلہ جو آہستہ آہستہ خارج ہوتی رہیں۔مزید یہ کہ اس ٹیکنالوجی سے بنے سینسر دل اور دماغ میں داخل کیے جاسکتے ہیں۔

اس ٹیکنالوجی کو ایسے کمپیوٹر اور موبائل فون بنانے کے لیے بھی کام میں لایا جاسکتا ہے جو ماحول دوست ہوں۔۔برقیاتی کچرا ماحول کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر ایسے کمپیوٹر، موبائل فون اور دیگر برقیاتی آلات بنالیے جائیں جو اپنی مدت پوری ہونے کے بعد کچرے کے ڈھیر کی صورت میں پڑے رہنے کے بجائے گھل کر ختم ہوجائیں تو اس سے ماحول کو کتنا فائدہ ہوگا۔

نیویارک بدمعاشوں کی جنت

نیویارک میں کم سن نوجوانوں کے جرائم پیشہ گروہ نے پولیس اور عوام کا جینا محال کر دیا ہے۔ پولیس، ایف بی آئی اور دوسرے ادارے آئے دن ان نوجوانوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ لیکن وہ بھی کوئی کچی گولیاں کھیلنے والے نہیں اسی امریکہ اور اس کی سڑکوں اور گلیوں میں پیدا ہوئے ہیں، وہ پولیس سے ہاتھ کرنا جانتے ہیں۔ پولیس کے مطابق نیویارک میں بدمعاشوں کے تین سو سے زیادہ ایسے ٹولے ہیں، جن میں شامل افراد کی عمریں 12 سے 20 سال کے درمیان ہیں۔ انہوں نے اپنے گینگز کے نام بھی ' ویری کرپسی گینگسٹر، ٹرو منی گینگ ، کیش باما بلیز رکھے ہوئے ہیں۔ نیویارک پولیس کے مطابق یہ گروہ مخصوص علاقوں میں گشت کرتے ہیں اور شہر میں ہونے والے فائرنگ کے چالیس فیصد واقعات کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہوتی ہے۔ پولیس انسپکٹر کیون کاٹالینا ' کہتے ہیں ان میں زیادہ تر واقعات انتہائی معمولی سی وجوہات کی بناپر رونما ہوتے ہیں، جیسے لڑکی کو چھیڑنا یا ایک دوسرے کو غلط انداز سے گھورنا۔ ماہرین کہتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گینگز بنانے کا رجحان شکاگو اور شمالی مشرقی شہروں میں اُس وقت بڑھا جب پولیس نے بڑے اور منظم جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف کارروائی کرنا شروع کی تھی۔ تفتیش کار اب مخصوص گروپوں کے

حوالے سے تفصیلات جمع کر رہے ہیں۔ تاکہ ان گروہوں اور ان کی سرگرمیوں کو سمجھا جائے۔ اس دوران پولیس نے مختلف گروپوں کے انتہائی فعال ارکان کو گرفتار کرنے کا سلسلہ بھی تیز کر دیا ہے۔ نیو یارک کے پولیس کے محکمے کے اعداد و شمار کے مطابق فائرنگ کے واقعات میں گزشتہ برس کے مقابلے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے جبکہ جرائم پیشہ افراد کی گرفتاری کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس کے باوجود مختلف گروہوں کی جانب سے تشدد کے واقعات پہلے کی طرح ہی جاری ہیں۔ تفتیش کاروں کے بقول اس سلسلے میں رواں برس مارچ میں پیش آنے والے واقعہ کو ذرائع ابلاغ نے بہت زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس واقعے میں ' اسٹک منی گونز' نامی گروپ کے ایک 14 سالہ رکن نے 357 ریوالور سے بروکلین کے بھرے بازار میں مخالف گروہ ' ٹوان فیمیلی' کے ایک کارندے پر فائرنگ کر دی تھی۔ تاہم گولی سے تارکین وطن گھرانے کا ایک مرد ہلاک ہوگیا، جو اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے دو مختلف نوکریاں کرتا تھا۔کچھ عرصے قبل امریکی تحقیقاتی ادارے ایف بی آئی کی طرف سے ان گروہوں کے خلاف وسیع پیمانے پر شروع کئے گئے کریک ڈاؤن کے نتیجے میں گرفتار کیے گئے مشتبہ افراد کا تعلق منظم جرائم پیشہ گروہوں سے بتایا گیا ہے۔ امریکہ میں سرگرم عمل مافیاکے خلاف اس کارروائی کو امریکی تاریخ میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا آپریشن قرار دیا گیا تھا ۔امریکی اٹارنی جنرل ایرک ہولڈر کے بقول یہ گرفتاریاں نیو یارک ، نیو جرسی اور روڈز آئی لینڈ میں عمل میں آئیں تھیں ۔ ہولڈر نے بتایا ہے کہ یہ

کریک ڈاؤن منظم جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف جنگ کا ایک حصہ ہے۔ صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے ہولڈر نے کہا کہ امریکی حکومت پر عزم ہے کہ منظم طور پر کیے جانے والے جرائم کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس حوالے سے مزید گرفتاریاں بھی کی جائیں گی اور مشتبہ افراد کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تاکہ وہاں وہ اپنا مؤقف بیان کریں۔ انہوں نے بتایا کہ ان چھاپوں کو کامیاب بنانے کے لئے کل آٹھ سو سے زائد ماہر افراد نے حصہ لیا۔ انہوں نے اس نئی پیش رفت کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس آپریشن میں ایف بی آئی، پولیس اور دیگر متعلقہ اداروں نے کامیاب رابطہ کاری کی۔ انہوں نے کہا کہ منظم جرائم پیشہ گروہوں کے خلاف ایک دن کے دوران کیا جانے والا یہ آپریشن، امریکی تاریخ کی سب سے بڑی کارروائی تھی۔ ایرک ہولڈر کے مطابق مافیا کی کارروائیوں کے نتیجے میں امریکی معیشت پر بھی منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ایف بی آئی گرفتار شدگان سے مختلف حوالوں سے تفتیش جاری رکھے ہوئے ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ان مشتبہ افراد میں کئی اہم مافیا سربراہ بھی شامل ہیں اور ان پر قتل، لوٹ مار، ڈاکے، منشیات کی ناجائز فروخت اور دنگا فساد کرنے کے الزامات کے تحت مقدمات درج کئے گئے ہیں۔ ادھر اب عالمی بنک کو بھی خیال آگیا ہے کہ بے روزگاری نوجوانوں کو حکومت مخالف تحریکوں، جرائم پیشہ گروہوں کی جانب مائل کرتی ہے۔ عالمی سرمایہ داری کو تحفظ دینے والا ورلڈ بینک خود پوری دنیا میں معاشی ناہمواری پیدا کر رہا ہے، دنیا بھر میں

نوجوان اس بات سے شاکی ہیں کہ ان کے لئے روزگار کے مواقع کم ہوتے جارہے ہیں، ورلڈ بینک نے اپنی ایک رپورٹ میں اب اس بات اکا اعتراف کیا ہے کہ بے روزگاری کے باعث نوجوان ،جرائم پیشہ گروہوں اور حکومت مخالف تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں،ورلڈ بینک کی جاری ایک رپورٹ کے مطابق دنیاکے مختلف ممالک میں رہنے والے تقریباًڈیڑھ ارب لوگ سیاسی عدم استحکام اور جرائم کے باعث جنم لینے والے تشدد سے متاثر ہیں، جرائم میں اضافے کی وجوہات میں بے روزگاری ،مذہبی اور لسانی بنیادوں پر کشیدگی اور پریشانیاں سرفہرست ہیں ،رپورٹ میں میں بتایاگیا ہے کہ جن ممالک میں سیاسی عدم استحکام اور جرائم کی شرح زیادہ ہے وہاں نہ صرف معیشت میں ٹھہراو ہے بلکہ انسانی ترقی کی رفتار بھی جمود کا شکار نظر آتی ہے۔ گذشتہ سال کرغیر کے علاقے بشکیک میں تین ثانوی اسکولوں کے طلباکے مابین بڑے پیانے پر لڑائی ہوئی جس کے بعد نوجوانوں کے منظم جرائم کے عام مسئلے سے متعلق بڑے پیانے پر عوامی خدشات اور تبادلہ خیال کا آغاز ہوا۔ کرغیز وزارت برائے داخلی امور کے مطابق، دو ہزار سے زائد اسکول کے بچے منظم جرائم پیشہ گروہوں میں شامل ہو گئے ہیں اور ایک ہزار کے قریب سماجی طور پر خطرناک حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے مطابق، جمہوریہ کی اولمپک ریزرو اسپورٹس اکیڈمی کے چوتھی اور پانچویں جماعت کے پچاس سے زائد طلبا نے ثانوی اسکول 2 اور 38 پر حملہ کرتے ہوئے ایک اسکول کا داخلی دروازہ گرادیا اور سنگ باری کے ذریعے دوسرے

کی دو درجن کے قریب کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے۔ حملہ آوروں نے موقع پر پہنچنے والے پولیس اہلکاروں سے بھی مزاحمت کی۔ انہیں اسکول کے لڑکوں کو قابو کرنے کے لئے ہوا میں انتباہی گولیاں چلانا پڑیں۔ اس واقعے میں دس بچے زخمی ہوئے اور ایک اسکول کے سیکورٹی گارڈ کو مار پیٹ کا نشانہ بنایا گیا۔ ریاستی ادارہ برائے کھیل، امورِ نوجواناں اور تحفظِ بچگاں کے مطابق، پچاس نوجوانوں پر مشتمل نشے میں مدہوش ایک گروہ نے اسپورٹس اکیڈمی کی املاک پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس صورتحال کے سبب ماہرین بالغوں کے جرائم پیشہ گروہوں سے وابستہ نوعمر افراد کی تعداد میں اضافے کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ نوجوان کہیں کے ہوں اگر انھیں منظم جرائم پیشہ عناصر کے اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ جرائم کی کھلی چھٹی مل جائے تو معاشرہ تہہ بالا ہو جائے گا۔

پاکستان بھی بدقسمتی سے ان ممالک میں شامل ہے، جہاں نوجوان تیزی سے جرائم کی طرف بڑھ رہے ہیں، تعلیمی اداروں میں گروہی، لسانی اور مذہبی سیاست عروج پر ہے، جس نے جھتہ بندی کی شکل اختیار کر لی ہے، طلبہ یونین پر پابندی اور ضیا الحق کی جانب سے طلبہ اور نوجوانوں کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی نے بے شمار مسائل کو جنم دیا۔

ایک طرف حکمران طبقات کے نسل در نسل سیاست پر قبضے کے عمل کو سہل بنا دیا گیا اور دوسری جانب نوجوان نسل کو حکمرانوں کی عیاشیوں اور لوٹ مار کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اسی عمل نے معاشی اور سماجی حالات سے تنگ نوجوانوں کی بڑی تعداد کو حکمرانوں کیلئے خام مال

کے طور استعمال ہونے پر مجبور کیا اور ہمیں مختلف حکمران سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کے ساتھ منسلک ایسے گروپ وجود میں آتے ہوئے دکھائی دیئے جن کا کام جرائم پیشہ سرگرمیوں کے ذریعے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملانا اور سیاسی شخصیات اور پارٹیوں کی سرپرستی میں منشیات کے دھندے سمیت اغوا، بھتہ خوری، جائیدادوں پر قبضے، لوٹ مار اور مختلف نوعیت کے فسادات برپا کرنا، قتل و غارت گری کرنا ہوتا ہے۔ ایسے گروپ پاکستان کے تمام ہی شہروں میں موجود ہیں اور اپنی سرگرمیاں کھلے عام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ قانون نافذ کرنیوالے ادارے انکے خلاف کارروائی کرنے سے کتراتے اور اس لوٹ مار میں اپنا حصہ وصول کرکے خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر روز کئی نوجوان اپنی جان سے ہاتھ دو بیٹھتے ہیں، ہر روز عزتیں لٹتی ہیں، امیدیں ٹوٹتی ہیں، لوگ جائیدادوں سے محروم ہوتے ہیں اور در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا ہی جا رہا ہے۔ جب تک یہ خونی معاشی ڈھانچہ اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، حکمران تبدیل ہونگے، حکمرانوں کی نسلیں تبدیل ہونگی، محرومیاں جب تک موجود ہیں پاکستان کے ہر شہر، ہر گلی، ہر کوچے سے محرومیوں سے تنگ نوجوان اس دلدل میں دھنستے رہیں گے اور حکمران طبقات ان گروپوں میں شریک نوجوانوں کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرکے پولیس کی گولیوں کا شکار بننے پر مجبور کرتے رہیں گے۔ پورے ملک میں جرائم کے جو واقعات پیش آ رہے ہیں ان میں نوجوانوں کی اور وہ بھی

کم عمر کے نوجوانوں کی اکثریت ہے، پولیس اور جیلیں ان نوجوانوں کو سدھارنے اور اچھا شہری بنانے کے بجائے جرائم سے قریب کر رہی ہیں۔ کراچی کے پوش علاقوں میں ایسے گینگز کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، گن کلچر کے سبب مختلف گروپ آپس میں دست و گریباں رہتے ہیں جس کے نتیجے میں یا تو یہ آپسی تصادم کے دوران ایک دوسرے کی گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں یا سرپرستوں کی ضروریات پوری کر لینے کے بعد پولیس کارکردگی کے نام پر سرکاری گولیاں انکے سینے چیر جاتی ہیں۔

راولپنڈی اسلام آباد میں بھی سیاسی جماعتوں اور انکی ذیلی تنظیموں کے زیر سایہ چلنے والے اس طرح کے جرائم پیشہ گروہ خاصی تعداد میں موجود ہیں اور منشیات فروشی سمیت دیگر جرائم کھلے عام کر رہے ہیں، گزشتہ عرصہ میں ہونیوالے مختلف واقعات میں کئی نوجوان ان جرائم پیشہ عناصر کے کھلے عام شکار بنے، کئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو کئی موبائل، نقدی اور دیگر قیمتی اشیا سے محروم ہو گئے، ان جرائم پیشہ عناصر کے ہاتھوں سر انجام پانے والا ہر ایک واقعہ مختلف نوعیت کے سیاسی، معاشی اور انتظامی عزائم کی تکمیل کا باعث بنتا ہے۔ کراچی میں اب زیادہ تر نوجوانوں کے ایسے آزاد جرائم پیشہ گروپ بن گئے ہیں، جو نہ تو کسی سیاسی جماعت یا سیاسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کے پسِ پردہ کوئی عوامل ہیں۔ یہ گروپ اپنی کاروائیوں میں

آزاد ہیں، کئی تو ایسے گروپ ہیں جن میں بڑے گھرانوں کے نوجوان شامل ہیں ، جو صرف تفریح کے لئے جرائم کی وارادات کرتے ہیں اور کبھی کبھی اافسوس ناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ جرائم پیشہ گروہ نے اپنے سربراہ خود چنتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کسی سیاسی شخصیت کے مقاصد کی تکمیل کیلئے غریب عوام کے سروں پر دہشت اور خوف بھی مسلط کرتے ہیں۔ راولپنڈی میں ایک افسوسناک واقعے میں جرائم پیشہ عناصر نشے کی حالت میں ہاسٹل کے پانی کے ٹینک میں پیشاب کر رہے تھے ، اس حرکت سے روکنے پر انہوں نے طالب علم کو قتل کر دیا۔ پاکستان جو پینسٹھ سالوں میں ایک قوم کی شکل میں ابھرنے کی اہلیت وصلاحیت سے عاری رہا اور پوری ریاست قومیتوں کے ایک جیل خانہ کی صورت میں دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ اس ملک میں بسنے والے غریب عوام حکمرانوں کے جبر واستبداد، سامراجی اداروں کی لوٹ مار کا شکار ہوتے ہوئے کسمپرسی کی حالت میں زندگیاں گزار رہے ہیں اور قومی محرومی سمیت معاشی اور سیاسی محرومیوں کا شکار ایک عبرتناک صورتحال سے دوچار ہیں۔ ان پر مسلط حکمران بلا رنگ ، نسل، قوم، علاقہ ، قبیلہ یکجا ہو کر کشمیر کے پہاڑوں سے لیکر سندھ کے صحراؤں تک بسنے والے تمام عوام کو قوموں، علاقوں، قبیلوں، نسلوں، فرقوں اور مذاہب میں تقسیم در تقسیم کرتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں سرگرم دونوں ہاتھوں سے لوٹ مار کر رہے ہیں۔ اس تقسیم در تقسیم کو مزید تقویت پہنچانے کیلئے حکمران طبقات نے اپنے ہی گماشتے پال رکھے ہیں جو مظلومیت کا رونا رو کر اپنے مقاصد کے حصول میں مگن

ہیں۔ یہ قبضہ گروپ اور جرائم پیشہ گروہ بھی انہی حکمرانوں اور ان کے نظام کے پیدا کردہ ہیں جو براہ راست معاشی اور سماجی مسائل سے تنگ نوجوانوں کو لوٹ مار کے اس ننگے کھیل میں جھونک رہے ہیں۔ دونوں اطراف غریب نوجوانوں کا قتل عام ہو رہا ہے اور حکمران نسل در نسل اپنی حکمرانی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سندھ کے صحراؤں سے کشمیر کے پہاڑوں تک بسنے والے تمام نوجوانوں اور محنت بیچنے والے غریب عوام کے دکھ ایک ہیں، تکالیف و مسائل ایک ہیں، بھوک وہاں بھی ہے اور یہاں بھی، بیروزگاری کی اذیت بھی ایک، قومی محرومی بھی اور لوٹ مار، استحصال کرنیوالے ہمارے دشمن بھی ایک ہیں، ان دہشت پھیلانے والے عناصر کو پیدا کرنیوالے بھی وہی ہیں اور ان کی گولیوں کا شکار ہونیوالے نوجوان، بڑے، بوڑھے، عورتیں اور بچے کسی بھی شہر، محلے، گلی، کوچے، علاقے یا قبیلے کے ہو سکتے ہیں۔ یہ معاشی اور سیاسی ڈھانچہ اسقدر بوسیدہ ہو چکا ہے کہ ان سب مصائب و اذیتوں کے علاوہ انسانیت کو اور کچھ نہیں دے سکتا اور اس قتل و غارتگری سے نجات بھی مشترک لڑائی کے بنا ممکن نہیں، اس سلسلے کو توڑنے کیلئے نوجوانوں اور محنت کشوں کو یکجا ہونا ہوگا، علاقے، قوم، قبیلے، رنگ، نسل، مذہب کی تفریقوں کو پھیلانے والے عناصر کا قلع قمع کرتے ہوئے اس نظام کیخلاف ایک مشترک جدوجہد ہی محرومیوں کے خاتمے کا باعث ہو سکتی ہے۔ کراچی میں لیاری کبھی کھیلوں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا اب سفاکیت کی نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اگرچہ، لیاری کے، بدنصیب باشندوں کے واسطے گولیاں

چلنے کی آوازیں اور دستی بموں کے دھماکے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ لیکن اب آئے دن کے واقعات نے عوام کو نڈھال کر دیا ہے۔ ماضی میں بھی، جرائم پیشہ گروہوں کے درمیان یا پھر قانون نافذ کرنے والے اداروں سے ان کی جھڑپوں میں چلنے والی گولیوں کی زد میں آ کر، بے گناہ شہری اپنی جان سے جاتے رہے ہیں۔ ان دنوں لیاری میں ہونے والے واقعات میں جان بوجھ کر خوف و دہشت پھیلانے کے لیے جرائم پیشہ افراد براہ راست شہریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ ان جارئم پیشہ افراد نے اپنے ایک ساتھی کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لئے خریداری میں مصروف معصوم شہریوں کا قتلِ عام کیا۔ جرائم پیشہ کے اس حملے میں کم از کم چودہ افراد اپنی جانوں سے گئے، مرنے والوں میں زیادہ تر خواتین اور بچے شامل تھے۔ماضی میں، گروہوں کے مسلح تصادم سے قبل شہریوں کی خبرداری کے لیے اعلان کیا جاتا تھا لیکن اس مرتبہ قتلِ عام سے پہلے اس طرح کا کوئی اعلان سامنے نہیں آیا۔ متحرک سیاسی سرگرمیوں کے مرکز لیاری کے اطراف کی محنت کش بستیاں، ریاست اور سیاسی جماعتوں کی طرح جرائم پیشہ گروہوں کے سامنے ہتھیار پھینک چکی ہیں۔ شہر کے اندر دیگر علاقوں پر چھائی مافیا کی طرح، لیاری بھی باہر سے آنے والوں کے واسطے ایسا 'نو گو ایریا' بن چکا، جہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار بھی داخل نہیں ہوپاتے۔ یہاں کی سڑکوں پر، بے تحاشہ ہتھیاروں سے لیس، جرائم پیشہ گروہوں کے بدمعاش نوجوانوں کا راج ہے۔ یہ صورتِ حال برسوں میں اس مقام تک پہنچی ہے، جس کا ذمہ دار سیاسی قیادت اور

حکومت کو ٹھرایا جاتا ہے۔ یہ جرائم پیشہ مسلح گروہ اب اس قدر مضبوط ہو چکے کہ انتخابات میں ان کی مرضی سے لیاری سے امیدوار 'نامزد' کیے جاتے ہیں۔ مسئلے کی جڑ یہ ہے کہ لیاری کو جرائم پیشہ گروہوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے سیاسی آمادگی دکھائی نہیں دیتی۔ گذشتہ کئی ماہ سے کراچی اور لیاری کے بعض مخصوص حصوں میں جاری ایک بڑے آپریشن کے باوجود قانون نافذ کرنے والے ادارے اب تک لیاری کو جرائم پیشہ گروہوں سے مکمل طور پر پاک کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ لیاری میں بھی سب سے زیادہ نوجوان متاثر ہو رہے ہیں، ان کے پاس تعلیم روزگار اور تفریح کے مواقع موجود نہیں ہیں۔ دنیا بھر میں جب تک غربت کا خاتمہ نہ ہو، نوجوانوں کے لئے تعلیم روزگار، تفریح کے موقع موجود نہ ہوں، جرائم کرنے والوں کو گرفتار کرکے انصاف کے کٹھرے میں نہیں لایا جائے گا۔ چاہے نیویارک ہو یا لیاری امن ایک خواب ہی رہے گا۔

نفرت کی سیاست کا موسم بہار

بھارت میں نفرت کی سیاست عروج پر ہے۔ الیکشن کے موسم نے جذبات کی تپش کو بڑھا دیا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں پر حملے نئی بات نہیں لیکن انتہا پسند ہندوؤں کے اندر پلتے مسلم کش جذبات کس قدر بھیانک ہو چکے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ روز ریاست اترپردیش میں ایک ٹی وی شو کے دوران انتہا پسند ہندو نے خود کو آگ لگا کر وہاں موجود مسلمان سیاستدان کو بھی جلا ڈالا۔ ٹی وی شو جاری تھا کہ اچانک ایک انتہا پسند ہندو اسٹیج پر آیا اور پہلے اس نے مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگائی اور اس کے بعد بہوجن سماج وادی پارٹی سے تعلق رکھنے والے مسلمان سیاستدان قمرالزماں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ جکڑ لیا۔ قمرالزماں کو تشویشناک حالت میں سلطان پور کے اسپتال لے جایا گیا۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کی رپورٹ کے مطابق بھارتی ریاست اترپردیش کے شہر سلطان پور میں سرکاری ٹی وی چینل نے ایک پبلک پارک میں سیاستدانوں کے درمیان مباحثے کا اہتمام کیا تھا جسے براہ راست نشر کیا جا رہا تھا۔ مباحثے میں جہاں کئی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سیاستدان موجود تھے وہیں بہوجن سماج وادی پارٹی سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان سیاستدان قمرالزماں بھی شریک تھے۔ ٹی وی شو جاری تھا کہ

اچانک ایک انتہا پسند ہندو اسٹیج پر آیا اور پہلے اس نے مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگائی اس کے بعد قمر الزماں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ جکڑ لیا۔ وہاں موجود لوگوں نے قمر الزماں کو خود سوزی کرنے والے شخص کے شکنجے سے نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ قمر الزماں کو بچانے کی کوشش میں شو میں شریک 2اور سیاستدان رام کمار سنگھ اور چوہدری ہری دیو رام ورما بھی زخمی ہوئے۔ دونوں کو شدید تشویشناک حالت میں سلطان پور کے اسپتال لے جایا گیا تاہم بعد میں دونوں کو لکھنؤ کے سرکاری اسپتاال میں منتقل کردیا گیا، جہاں انہیں طبّی امداد دی جا رہی ہے۔پولیس نے اپنے آپ کو آگ لگانے والے شخص کی شناخت درگیش کمار کے نام سے کی ہے، پولیس کا کہنا ہے کہ درگیش کا جسم 95 فیصد جبکہ قمر الزمان 75 فیصد جلے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان دونوں کے بچنے کے امکانات انتہائی کم ہیں، دونوں کی حالت ایسی نہیں کہ ان کے بیان ریکارڈ کئے جاسکیں تاہم واقعے کے محرکات جاننے کے لئے تفتیش شروع کردی گئی ہے۔ بھارت میں ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کو نشانہ بنانا نئی بات نہیں لیکن کسی مخالف سیاسی جماعت یا.برادری کے نمائندے کے ساتھ بھارت میں ہونے والا یہ اندوہناک واقعہ پوری دنیا کی انتخابی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ کسی سیاسی رہنما کو اس طرح سرعام جلانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ ایک المناک اور تاریخی سچائی ہے کہ ہندو ہمیشہ سے متعصب رہا ہے، اس کے متعصبانہ رویہ ہی نے ہندو، مسلمان کے بیچ تفریق پیدا کی۔ 1947 میں تقسیم

پاکستان کو بھی ہندو متعصب لیڈروں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ تب ہی سے نفرت و عداوت کے یہ سوداگر کبھی سیاست اور مذہب کے نام پر تو کبھی ذات پات اور مسلک کے کے نام پر لوگوں کو لڑا کر اپنی اپنی دوکان چمکانے کی مذموم کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔اور اب 2014 کے عام انتخابات میں سیاست دانوں نے اپنی نفرت انگیز بیان بازیوں کے ذریعہ ماحول کو اسقدر مکدر کردیا ہے کہ عوام الناس دو مخالف خیموں سے نفرت کے آتش فشاں کو پھٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ حقیقتاً یہ نہ تو صحت مند سیاست کی علامت ہے اور نا ہی سلیم العقل سیاست کی عکاسی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جمہوریت صرف الیکشن کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرزِ حکومت ہے جہاں ہتکِ عزت اور آپسی بغض و عناد کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے تاکہ جمہوریت کے جھنڈے تلے بلا تفریقِ مذہب وملت اور ذات پات ہر شہری کو امن و سکون کے ساتھ زندگی میں آگے بڑھنے کا موقع میسر ہوسکے۔ بھارت میں انتخابات کو نفرت کی سیاست کا موسمِ بہار قرار دیا جا سکتا ہے۔ایسے لوگوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے نفرت انگیز سیاست کی آگ میں تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے۔ شروعات وشو ہندو پریشد کے کارگذار صدر پروین توگڑیا نے کی؛انھوں نے صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شرانگیز بیان دیا کہ اگر میں ہندوستان کا وزیرِ اعظم بن گیا تو میں مسلمانوں سے رائے دہی کا حق چھین لونگا اور مزید یہ کہا کہ مسلمانوں کو کسی اہم عہدے پر نہیں رہنے دونگا، تمام عہدے چھین لونگا۔ پتریکا ڈاٹ کام)۔گنگا جمنی تہذیب میں زہر)

گھولنے کے بعد بھی پروین توگڑیا کے خلاف قانونی کارروائی کا نہ ہونا ہندوستانی جمہوریت کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے مترادف ہے۔یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ اس ملک میں جہاں سیکڑوں معصوم ناکردہ گناہوں کی سزا سلاخوں کے پیچھے کاٹ رہے ہیں ، وہیں بیانگِ دہل جمہوریت کو چیلینج کرنے والے آزادی کے ساتھ دستورِ ہند کا منہ چڑھاتے پھر رہے ہیں۔خوش آئند بات یہ ہے کہ اب مسلمان ٹھوکر کھا کھا کر کافی حد تک سنبھل گئے ہیں ، اسی وجہ سے اسطرح کے بیانات کے بعد کسی رد عمل سے گریز ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے ایک لمبے عرصے تک خاموشی کے ساتھ الفاظوں کے تیر سہتے رہنا انسانی فطرت میں نہیں ہے۔پروین توگڑیا تو کیا، مسلمان مخالف کوئی حکومت بھی مسلمانوں سے اسکا دستوری حق نہیں چھین سکتی۔ دراصل یہ دریدہ دہن لوگ مسلمانوں کے مخالف نہیں بلکہ پھولتی پھلتی جمہوریت کے لئے زہر ہلاہل ہیں۔ان بے لگاموں کو لگام دینا جنکا کام ہے اگر وہ اپنی ذمہ داری سے یوں ہی پہلو تہی کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب انہیں اپنی نااہلی کا تاوان بڑے پیمانے پر بھرنا پڑے گا۔حالیہ سیاست میں نفرت کی سیاست کا نیا نام گری راج سنگھ ہے۔ بہار کے اس بی جے پی لیڈر نے ایک انتخابی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی کے وزیر اعظم کے امیدوار نریندر مودی کی جو لوگ بھی مخالفت کر رہے ہیں ان کے لئے لوک سبھا کے عام چناؤ کے نتیجہ کے بعد بھارت میں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ گری راج سنگھ ے گڈا ضلع میں ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ

لوگ جو نریندر مودی کو وزیر اعظم بننے سے روکنا چاہتے ہیں وہ پاکستان کی جانب نظریں گاڑے ہوئے ہیں اور آنے والے دنوں میں بھارت میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں رہے گی ان کے لئے صرف پاکستان میں ہی جگہ ہوگی۔ یہ سراسر مسلمانوں کو دھمکی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ بیان گیدڑ بھبکی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ، لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ جمہوریت کے ان ٹھیکداروں کو جمہوریت کا مطلب ہی نہیں معلوم ہے۔کیا جمہوریت میں ہر شخص کو اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دینے کا حق نہیں ہے؟ کیا جمہوریت میں ڈرا دھمکا کر ووٹ لیا جا سکتا ہے؟کیا جمہوریت کے اندر انتخابات میں شکست خوردہ لوگوں کو ملک میں رہنے کا حق نہیں ہے؟کیا جمہوریت میں بدلے کی سیاست کی گنجائش ہے؟یہ اور اسطرح کے بہت سارے سوالات ہیں جوایک جمہوری ملک میں نفرت آمیز سیاست کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔دراصل نفرت کی سیاست کرنے والے ان لوگوں کا اپنا کوئی کردار نہیں ہے کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بے کردار لوگ ہی کیچڑ اچھالنے کا کام کرتے ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ نفرتوں کے یہ پتھر نفرتوں کے شیش محل میں رہنے والے لوگوں نے پھینکے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب رد عمل کی شروعات ہوگی تو یہ لوگ خود نفرتوں کے شیش محل میں مدفون ہوجائینگے۔ لیکن یہ سوال اب بھی ہے کہ کیا دنیا کی عظیم ترین جمہوریت بھارت کے پاس نفرت کی سیاست کا پائیدار حل نہیں ہے؟۔بھارت کے نوجوان سیاستدان گاندھی خاندان کے سپوت راہول گاندھی میں شاید انکی والدہ کی طرف سے شامل اطالوی خون ہے جس کی وجہ سے وہ

بھارت کی نفرت بھری سیاسی فضا میں نفرتوں سے بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں اگر وہ روایتی سیاسی بیان بازی سے ہٹ کر واقعی بی جے پی کی نفرت پھیلانے والی سیاست کا گند دور کرنے پر تیار ہیں تو یہ خوش آئند بات ہے۔ بی جے پی نے ہندو اور مسلم کی تقسیم، مسلم کش اقدامات اور پاکستان سے نفرت کی سیاست سے جو شہرت پائی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی تو بہت تلخ ہے کہ خود راہول گاندھی کی اپنی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کا دامن بھی مسلم کش اقدامات اور پاکستان سے دشمنی کے حوالے سے کچھ زیادہ صاف نہیں ہے۔ حیدرآباد دکن اور کشمیر میں مسلم دشمن اقدامات آج بھی پاکستان اور بھارت میں تلخی پیدا کر رہے ہیں۔ اب اگر راہول گاندھی نفرت کی سیاست ختم کرنا چاہتے ہیں تو آگے بڑھیں پاکستان اور بھارت کے درمیان نفرت کی دیوار گرائیں، کشمیر کا مسئلہ کشمیریوں کی خواہشات کے مطابق حل کریں تو اس سے نہ صرف پاکستان سے تعلقات بہتر ہوں گے بلکہ خود بھارت کے مسلمان بھی محفوظ ہو جائیں گے اور کسی انتہا پسند جماعت کو ان کے خلاف نفرت پھیلانے کا موقع نہیں ملے گا وہ سب دل و جان سے کانگرس اور راہول گاندھی کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے اور بھارتی سیاست سے انتہا پسندی ختم ہو جائے گی۔ بھارتی مسلمانوں کے لئے 2002 میں ہونے والے گجرات فسادات کا احوال بیان کرنا اب بھی اتنا ہی اذیت ناک ہے جتنا گیارہ برس قبل۔ ہندو کی نفرت اور تشدد کا منہ بولتا ثبوت وہ تصویر ہے، جس میں 28 سالہ قطب الدین انصاری، ایک تنگ برآمدے میں کھڑا

ہندو دہشت گردوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اس کی چیک والی شرٹ پر جا بجا خون کے دھبے لگے ہوئے ہیں، شرٹ تشدد کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ قطب الدین انصاری کی آنکھوں میں خوف انتہا کا ہے۔ یہی تصویر نہیں دیکھی جاتی تو بلقیس بانو کی کہانی کیسے سنی جائے گی جس کے گھر میں مسلح ہندوؤں کا ایک گروہ گھس آیا تھا۔ اس ہجوم میں اس کے ہندو پڑوسی بھی شامل تھے اور چھ پولیس اہلکار بھی اور دو ڈاکٹرز بھی۔ بلقیس اس وقت پانچ ماہ کی حاملہ تھیں، ہجوم نے سارے گھر والوں کے سامنے بلقیس کی اجتماعی عصمت دری کی، اس کے بعد ان کے گھر کے آٹھ افراد کو مسلسل بدترین تشدد کر کے شہید کر ڈالا، باقی کے چھ افراد کو ساتھ لے گئے، ان کے بارے میں آج تک کسی کو خبر نہیں۔ اس ہجوم نے بلقیس کی ساڑھے تین سالہ بیٹی صالحہ کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ نریندر مودی کا کیا دھرا تھا، جو اب بھارت کے وزیر اعظم بننے کے لیئے پر تول رہے ہیں۔ گجرات فسادات کو مغربی ذرائع ابلاغ نے بھی 1947 کے بعد سب سے خوفناک فسادات قرار دیا تھا۔ اس میں قریباً دو ہزار افراد کو شہید کیا گیا تھا۔ بیسیوں بلقیسوں کی عصمت دری ہوئی، سینکڑوں ننھی منی صالحائیں شہید کر دی گئیں، سفید بالوں اور کمزور جسموں والے بیمار بوڑھوں کی تعداد بھی سینکڑوں میں تھی، انھیں بھی مار مار کے مار دیا گیا اور یہی معاملہ جوانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ریاست کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے بارے میں واضح شواہد سامنے آئے کہ یہ آگ وخون کا کھیل انہی کے اشارے پر اور

انہی کی منصوبہ بندی کے عین مطابق کھیلا گیا۔ دہشت گرد ہندو تنظیم راشٹریہ سوایمسیوک سنگھ (آر ایس ایس) میں اپنا لڑکپن، جوانی اور اب بڑھاپا گزارنے والے نریندر مودی نے مسلم مخالف فسادات کے دوران پولیس کو مداخلت نہ کرنے کی ہدایت دی تھی۔ بعدازاں جب مودی انتظامیہ کے خلاف گواہان عدالتوں میں پہنچے تو مودی انتظامیہ ایک بار پھر حرکت میں آئی اور چن چن کر ہرایسے فرد کو قتل کر دیا گیا جس کی وجہ سے مودی سرکار پھنس سکتی تھی۔ زیادہ تر پولیس مقابلوں میں شہید کر دیئے گئے۔ اب اسی نریندر مودی کو بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) نے امیدوار برائے وزیراعظم نامزد کر دیا ہے۔ غالباً یہ بھارتی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب کوئی سیاسی جماعت انتخابات سے پہلے ہی کسی فرد کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے میدان میں لے آئی ہے۔ مغربی دنیا بھی نریندر مودی کو ایک انتہا پسند شخصیت مانتی ہے۔ یاد رہے کہ گجرات فسادات کے بعد 2005ء میں امریکہ نے مودی کو سفارتی ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ امریکہ نے مودی کے سیاحتی اور کاروباری ویزے کو بھی رد کر دیا تھا۔ یہ پابندی اب بھی برقرار ہے۔ برطانیہ نے بھی مودی کو ویزا دینے میں انکار کیا تھا تاہم اب برطانیہ نے مودی کو ویزا دینے کے لیے ہامی بھر لی ہے۔ تجزیہ نگاروں اور ماہرین کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ 2014 کے پارلیمانی انتخابات صدارتی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں قوم کو اس سوال کا جواب دینا ہے کہ وہ مودی کو وزیراعظم بنانا چاہتی ہے یا نہیں؟ یہ سوال بی جے پی کے لئے بہت بڑا رسک ہے۔ پارلیمانی انتخابات میں

ایک طرف مودی ہیں اور دوسری طرف وہ تمام حقیقی اور خود ساختہ سیکولر طاقتیں جو ان کے نظریے کو مذہبی آہنگی اور قومی سالمیت کے لیے خطرہ مانتی ہیں۔ حالیہ تاریخ میں مودی پہلے ایسے رہنما ہیں جن کے لوگ یا تو سخت خلاف ہیں اور یا پھر زبردست حامی اور یہ صورتحال خود ان کی اپنی جماعت کے اندر بھی موجود ہے۔ان کے حامی بھی شدید جذبات رکھتے ہیں جبکہ مخالفین بھی انھیں ایک لمحہ کے لئے بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بی جے پی کی کامیابی اسے اگلے پانچ برس کے لئے ایسا سنہری موقع فراہم کرے گی جس کے نتیجے میں نئے سنہری مواقع پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اگر قوم نے مودی کی وجہ سے بی جے پی کو مسترد کر دیا تو بی جے پی سیاسی طور پر موت کے گھاٹ اتر جائے گی۔ یہ سخت گیر ہندوتوا کے ساتھ ہی ساتھ مودی کی ساکھ کی بھی شکست ہوگی، اس کے بعد بی جے پی کو پھر ایک نئی نظریاتی سمت اور نیا رہنما تلاش کرنا پڑے گا۔ بی جے پی کے رہنماؤں میں سب سے کم پڑھے لکھے مودی نے ''گجرات میں ترقی'' کا پراپیگنڈا کرکے بھارت کے بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔اس طرح بھارتی وزارتِ عظمیٰ کے ایک مضبوط امیدوار'' کی ساکھ بنالی۔انھوں نے ریاست کے '' اندر اپنی تمام مدمقابل شخصیات اور طبقات کو کچل دی جبکہ بیوروکریسی اور پولیس کو بھی خوفزدہ رکھا۔ تاہم اس سب کچھ کے نتیجے میں ایک مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ اب آر ایس ایس میں بھی ایسے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو ان کے بے رحمانہ شخصی انداز سیاست پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ مودی میں برداشت نام کو بھی نہیں ہے۔

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ وہ اپنے مخالفین بالخصوص مسلمانوں کو چن چن کر پولیس مقابلوں میں ہلاک کراتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آر ایس ایس کی قیادت مودی سے مکمل طور پر خوش نہیں۔ سنگھ پریوار کے بعض حلقوں میں یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ گجرات اور بی جے پی ایک شخص کے ارد گرد سمٹ کر رہ گئی ہے اور سنگھ کی اہمیت کو بھی نہیں پہچانا جارہا۔ دوسری طرف بی جے پی کے بہت سے لوگ بھی اسی سبب مودی کے خلاف ہیں کہ مودی نے اپنی ذات کو نمایاں جبکہ پارٹی کو پس منظر میں بھیج دیا ہے۔ مودی اپنے آپ کو ایک ایسے ہندو ہیرو کے طور پر پیش کر رہے ہیں جو ملک کے اندر اور باہر دشمنوں سے نبرد آزما ہیں۔ 15 ستمبر 2013ء کو (وزارت عظمٰی کیلئے اپنی نامزدگی کے محض دو دن بعد) انھوں نے ریٹائرد بھارتی فوجیوں کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ سٹیج پر سابق آرمی چیف ریٹائرڈ جنرل وی کے سنگھ بھی موجود تھے۔ اس موقع پر نریندر مودی نے کہا" دہلی حکومت کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ تمام مسائل کا حل مرکز کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ہمیں ایک مضبوط اور محب وطن حکومت چاہیے تاکہ ملکی سالمیت اور ہماری فوجیوں کی زندگیاں محفوظ بنائی جا سکیں"۔ نریندر مودی واضح طور پر پاکستان کو ذہن میں رکھ کر یہ باتیں کر رہے تھے۔

مودی ایک تنگ نظر، متعصب ہندو قوم پرست رہنما کے طور پر ساری دنیا میں بدنام ہیں۔ وزیراعظم بننے کے لئے وہ اپنی شخصیت کو متوازن ثابت کرنے کی کوششوں

میں لگے ہوئے ہیں۔ تاہم ان کی اصل ساکھ ، نظریات اور اب وزارت عظمیٰ کے لئے دوڑ نے انھیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اب اگر وہ ہندوؤں کے مسائل پر کافی توجہ نہیں دیتے تو انہیں اپنی سیاسی زمین سے محروم ہونے کا نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ دوسری طرف مشکل یہ بھی ہے کہ اگر وہ تنگ نظری کی روش پر قائم رہتے ہیں تو انہیں قومی لیڈر نہیں سمجھا جائے گا۔ مودی کی وجہ سے بی جے پی کو ملک بھر کے مسلمان ووٹوں سے کلی طور پر محروم ہونا پڑے گا۔ یاد رہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد 180 ملین ہے جو کل آبادی کا 15 فیصد ہیں۔ چھ ریاستوں میں مسلمان ووٹرز کل ووٹرز کا 11 فیصد ہیں۔ ان میں سیاسی طور پر اہم ترین ریاست اترپردیش بھی ہے۔ یہ ملک کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست ہے اور ملک کی پارلیمان یا ایوان زیریں میں سب سے زیادہ تعداد میں 80 رکن منتخب ہو کر یہاں سے جاتے ہیں۔ اترپردیش کے علاوہ کوئی دوسری ریاست بی جے پی کی مجموعی کامیابی میں اہم کردار نہیں ادا کر سکتی۔ تاحال یہاں کی فضا بھی بی جے پی کے بالکل خلاف ہے۔ گزشتہ عام انتخابات میں بی جے پی کو محض 10 نشستیں ہی مل پائی تھیں اور پارٹی کے مجموعی ووٹوں کی شرح میں بھی 4.7 فیصد کی کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہونے والے اسمبلی انتخابات کے نتائج بھی اس پارٹی کے لیے بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ بات پھر وہی ہے کہ مودی کو یہاں کی فضا اپنے لئے سازگار کرنی ہے تو ووٹروں کو قائل کرنا ہوگا کہ وہ عام انتخابات میں مقامی مسائل پر قومی مسائل کو ترجیح دیں۔ علم سیاسیات میں ماسٹر ڈگری

رکھنے والے نریندر مودی 1950 میں مہسانا (گجرات) کے واڈنگر علاقے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی جھکاؤ دہشت گرد ہندو تنظیم آر ایس ایس کی جانب تھا۔ گجرات میں آر ایس ایس کی جڑیں کافی گہری تھیں۔ 17 سال کی عمر میں احمد آباد پہنچے اور آر ایس ایس کے رکن بنے۔ سیاست میں فعال ہونے سے پہلے مودی برسوں تک آر ایس ایس کے پرچارک یا مبلغ رہے۔ گجرات میں مودی کے اقتدار سنبھالنے کے تقریباً پانچ ماہ بعد ہی گودھرا ریل حادثہ ہوا جس میں کئی ہندو کارسیوک ہلاک ہوگئے۔ اس کے فوراً بعد فروری 2002 میں گجرات میں مسلمانوں کے خلاف فسادات بھڑک اٹھے۔ ان فسادات میں حکومت کے مطابق 1000 سے زیادہ اور برطانوی ہائی کمیشن کی ایک آزاد کمیٹی کے مطابق تقریبا 2000 افراد ہلاک ہوئے جن میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ مودی نے ان فسادات کو روکنا ضروری نہ سمجھا۔ اس پر انھیں اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی ناراضی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تاہم اس وقت کے نائب وزیر اعظم ایڈوانی نے مودی کی حمایت کرکے انھیں بچالیا۔ 2002 کے فسادات کے سبب ہی مودی حکومت میں وزیر کے عہدے پر رہنے والی مایا کوڈنانی 28 سال کی سزا بھگت رہی ہیں۔ یہ بات بھی زبان زد عام ہے کہ فسادات میں کردار کی وجہ سے ہی مودی نے کوڈنانی کو وزیر کے عہدے سے نوازا تھا۔ مودی نے کبھی فسادات کے بارے میں کوئی افسوس ظاہر کیا نہ ہی کسی طرح کی معافی مانگی۔ مودی ہندوتوا کے کٹر نظریے کے علم بردار ہیں، قوم کا وقار سربلند رکھنے کے لیے وہ پاکستان اور چین کو سبق سکھانا چاہتے ہیں اور

کانگریس اور راہل گاندھی کو گھر بٹھانا ان کی اولین ترجیح ہے۔ وہ مسلمانوں کو کتنا پسند کرتے ہیں، یہ تو معلوم نہیں لیکن ایک عوامی جلسے میں انہوں نے ٹوپی پہننے سے ضرور صاف انکار کر دیا تھا۔ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ مودی کی سیاست نفرتوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ نفرت کبھی سیکولر سیاسی نظام کے خلاف نظر آئے گی تو کبھی بھارت کی مذہبی اقلیتوں مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف۔ گویا مودی کی سیاست کا محور نفرت ہے جو ان کی ہر تقریر، ہر بیان میں نظر آتی ہے۔ مسلمانوں سے ان کی نفرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی موجودہ کابینہ میں کوئی مسلم وزیر نہیں ہے اور ریاستی انتخابات میں کسی ایک مسلمان کو بھی ٹکٹ نہیں دیا گیا۔اس تناظر میں بھارت میں یہ سوال بھی زیر بحث ہے کہ کیا مودی وزیراعظم بننے کے بعد پورے ملک میں ہندوتوا کا نظریہ نافذ کریں گے؟کیا نفرت کے یہ شعلے بھارت کو بھسم کر کے نہ رکھ دیں گے۔

کراچی کے چٹخارے

شہر میں غیر ملکی فوڈ چینز کا کاروبار بڑھ گیا

کراچی بدل رہا یا کراچی بدل چکا۔ اس بارے میں مختلف رائے ہو سکتی ہیں ، لیکن میری نسل کے لئے کراچی تبدیل ہو چکا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا وہی ہے، لیکن اب رہنے سہنے کھانے پینے اور سیر و تفریح کے سب انداز بدل چکے ہیں۔ کراچی کی نہاری جو دو تین روپے میں پیٹ بھر دیتی تھی، اب غریب کی پہنچ سے دور ہو کر امیروں کا چونچلا بن گئی ہے۔ نہاری کی پلیٹ ساٹھ، ستر روپے کی ہو گئی ہے، کراچی یونیوسٹی کی کیفے ڈی پھونس سے لے کر اسٹوڈینس بریانی سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے، نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ماحول ، بے فکری اور آزادی سے کراچی کے ہر گلی محلے میں جانا بھی اب تو خواب ہوگیا ہے۔ کراچی جو 70 کی دہائی تک ایک بڑا غریب پرور شہر ہوا کرتا تھا اور یہاں ملنے والے کھانے اور پکوان لذت اور معیار کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے، یہ خوش ذائقہ اشیائے خورونوش نہ صرف تازہ اور معیاری ہوا کرتی تھیں بلکہ کم قیمت بھی، نہ جیب پر گراں گزرتی تھیں نہ معدہ پر، ہوٹلوں میں آدھا نان بھی مل جاتا تھا جبکہ گریبی مفت ہوتی تھی، یہ شہر برنس روڈ کی مغز نہاری ، نلی نہاری ، سری پائے ،

سیخ کباب، گولہ کباب ، کٹاکٹ ، میٹھے دہی بڑے، ربڑی ، نمکین و میٹھی لسی ، پیر کالونی کی حلوہ پوری ،ڈرگ کالونی کے چپلی کباب ، بولٹن مارکیٹ کی تلی مچھلی، لیاری کے ماما ڈوسا کی دال چاول ڈش، ناظم آباد کے مرغ چھولے ، لنڈی کوتل چورنگی کا بالٹی گوشت سپر ہائی ویکا دنبہ روسٹ ، حسن اسکوائر کی بجی، لیاقت آباد کی مٹکا قلفی ،جامعہ کلاتھ ، مارکیٹ کی چاٹ ، پانی پوری ، گنے کے رس اور فریسکو کے سموسوں کیلئے مشہور تھا۔ شہر میں جابجا ٹھیلوں اور ریڑھیوں پر حلیم اور بریانی ملا کرتی تھی لیکن اب یہ شہر بڑے تیزی سے مغربی ملکوں کے جنک فوڈ کلچر کو اپناتا جارہا ہے۔ کراچی والوں کے نخرے بدل گئے،ان کی زبان کے چٹخارے بھی ماحول کے ساتھ بدل گئے۔ اب یہاں بڑے بڑے غیر ملکی اور مہنگے مہنگے آوٹ لیٹس کھل گئے ہیں۔پاکستان اب دال روٹی کھانے والا معاشرہ نہیں رہا۔بڑے شہروں اور خاص طور پر کراچی میں تو امریکی اور مغربی فوڈ چین اور فرنچائز کا انبار لگتا جارہا ہے، 70 کی دہائی میں نرسری پر خیام سنیما کی عقبی گلی میں ایک برگر شاپ ہوتی تھی جہاں سلاد کے بڑے بڑے پتوں کے ساتھ کولڈ ڈرنک کے ساتھ برگر 2 روپے میں ملا کرتا تھا لیکن اس زمانے میں اس برگر کو ہیم برگر کہا جاتا تھا، اب یہاں کھانے والوں کی کاروں کی قطار لگی رہتی ہے۔برنس روڈ کا برگر گو مہنگا ہوگیا ہے۔ لیکن اب بھی غریب کا گزارا ہے۔برگر کا چلن تو کوئی 25 سال پہلے عام ہوا، آج کراچی میں ایک وقت میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ برگر کھالیے جاتے ہیں، صرف برگرز کی اقسام اور ناموں پر

نظر ڈالیں تو بھی یہ تعداد حیرت میں ڈال دیتی ہے۔شہر کراچی کے پرانے رہائشی آج بھی اس بات کو یاد کرتے ہیں ۔ لیکن اب ، لوگوں کے کھانے پینے کے انداز بدلے ہوئے ہیں۔۔ جس شہر میں پہلے ٹھیلوں اور ریڑھیوں پر صرف مرغ چھولے، حلیم،.بریانی یا بن کباب کھائے جاتے تھے، آج وہاں بڑے بڑے غیر ملکی آوٹ لیٹس کھلے ہوئے ہیں اور ان کی ہر روز بڑھتی ہوئی رونق، گاہکوں کا رش، جدید انداز و تراش خراش اور صاف صفائی دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گویا آپ کسی اور ملک میں بیٹھے ہیں۔ نئی نسل کیلئے حلیم اور بریانی کا ذائقہ اولڈ ہوگیا، آج برگر، سینڈوچ اور پیزا ان کا ہاٹ فیورٹ ہے۔ کراچی میں 90 کی دہائی میں برگر کو متعارف کرانے کا سہرا مسٹر برگر کے سر ہے، اس امریکی غذا کو پاکستان کے دال روٹی والے معاشرے میں وہ پذیرائی ملی کہ آج 25 سال بعد بھی اسے ہاتھوں ہاتھوں خریدا جاتا ہے۔ نئی نسل آسانی سے اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ 90 کی دہائی میں لوگ برگر کے نام سے بھی ناواقف تھے اور جب تک انہوں نے پہلی مرتبہ اسے کھا کر دیکھ نہیں لیا، وہ یہ سمجھ ہی نہ سکے کہ برگر ہوتا کیا ہے۔

میں پہلی مرتبہ امریکی فاسٹ فوڈ کمپنی نے پاکستانی معاشرے میں قدم رکھا جس 1998 کے بعد اس کی مانگ میں اضافہ ہوتا چلا گیا، آج ہر روز اس کی طلب میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔فاسٹ فوڈ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کا آغاز 18 ویں صدی میں امریکا سے ہوا۔ ابتدا میں سستے اور غیر معیاری قسم کے برگر صرف میلوں ٹھیلوں اور سرکس وغیرہ میں اسٹالز پر دستیاب ہوتے تھے۔

بعد ازاں انیسویں صدی میں ''وائٹ کاسل'' نامی پہلی فوڈ چین معرض وجود میں آئی جو اعلیٰ معیار کے برگر اپنے گاہکوں کو ریستورانوں میں فراہم کرتے تھے۔ اس کے بعد میکڈونلڈ برادرز نے 1948 اپنی فوڈ چین میکڈونلڈ کا آغاز کیا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے بدلتی دنیا میں فاسٹ فوڈ کا رجحان بھی تیزی سے فروغ پانے لگا۔ رفتہ رفتہ فاسٹ فوڈ کی مقبولیت یورپ اور امریکا کے ساتھ دنیا میں پھیلنے لگی۔ اس دوران غیر ملکی مشہور فوڈ چینز نے اپنا نیٹ ورک بڑھایا اور دنیا بھر کے ممالک میں فاسٹ فوڈ کلچر تیزی سے فروغ پانے لگا۔ مغرب سے فاسٹ فوڈ کلچر مشرق اور دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی پہنچ گیا۔ طبّی ماہرین اور صحت سے متعلق اداروں نے فاسٹ فوڈ کو نقصان دہ قرار دیا ہے، مگر زمانے کی تیز رفتار ترقی اور وقت کی کمی کے باعث یہ کلچر تیزی سے ساری دنیا میں پھیلنے لگا۔ امریکا اور دوسرے ممالک میں بے شک اسے جنک فوڈ بھی کہا جاتا ہو لیکن ہمارے یہاں رات کے کھانے کے طور پر، برنچ میں، شام کی چائے کے ساتھ برگر ہضم کر لیا جاتا ہے۔ گویا برگر ایک فیشن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، آج بڑے شہروں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جہاں امریکی و مغربی فرنچائز کے ساتھ عربی، افریقی، چائنیز، تھائی، جاپانی، انڈین، بنگالی، حیدرآبادی اور اطالوی فرنچائز مثلاً سب وے، پیزا ہٹ، ہارڈیز' او پی ٹی پی، نینڈوز، ڈنکن ڈونٹس اور ڈومینوز نہ ہوں، دنیا بھر میں شہرت رکھنے والی امریکی فوڈ چین کے ایف سی کو پاکستان میں آئے کئی برس گزر گئے ہیں، یہ

پاکستان کی پہلی غیر ملکی فرنچائزز میں سے ایک ہے۔ کین ٹکی فرائیڈ چکن کے آپریشن منیجر سندھ محمد عظیم کا کہنا ہے کہ ہماری کمپنی انتظامیہ حال ہی میں تبدیل ہوئی ہے، نئی انتظامیہ عنقریب برانچیں بڑھانے والی ہے۔اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کمپنی کا کاروبار بڑھ رہا ہے۔برگر کنگ بھی ایک غیر ملکی فرم ہے جو گزشتہ سال ہی پاکستان میں آئی ہے ابھی اس کا ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔ کراچی شہر میں اس وقت برگر کنگ کی صرف 4 یا 5 آوٹ لیٹس ہی ہیں، برگر کنگ ہولڈنگز انکارپوریٹ کے ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ اینڈ ایشیاپیسیفک کے صدر، ایلیاز ڈی یاز سیس کا کہنا ہے کہ ان کاادارہ بہت جلد پاکستان میں اپنا بزنس بڑھائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کیلئے مثالی ماحول موجود ہے۔اب ہر چھوٹے بڑے شاپنگ مال میں فوڈ کورٹس کھل گئے ہیں۔

غیر ملکی سرمایہ کار پاکستان کا رخ کرنے لگے، معاشی سرگرمیوں میں تیزی کے امکان، بین الاقوامی فوڈ چین نے بحریہ ٹاؤن کے ساتھ کاروباری معاہدہ کر لیا، ملک ریاض کہتے ہیں بحریہ ٹاؤن کراچی سے ڈیڑھ لاکھ لوگوں کو روزگار ملے گا،مستحکم معیشت سے ہی دہشتگردی ختم ہوگی، آج کل کے جدید دور میں کھانے پینے کی پرانی روایات بھی بدلتی جارہی ہیں۔ اب لوگ گھر کے بنے ہوئے سادہ کھانوں کے بجائے بازار کے بنے ہوئے کھانے زیادہ شوق سے کھاتے ہیں۔ کراچی

شہر کے جس علاقے اور حصے میں جائیں وہاں ہر گلی، محلے میں مختلف ٹھیلوں، اسٹالز اور ڈھابوں پر کھانے کی اشیا فروخت ہوتی نظر آئیں گی۔ محمد علی نامی کراچی کے شہری ایک کالج کے کینٹین میں برگر اور فاسٹ فوڈ کی دکان پر پارٹ ٹائم نوکری کرتے ہیں جنھوں نے حال ہی میں کالج ٹائمنگ کے بعد شہر کی مشہور مارکیٹ میں اپنا خود کا ایک 'برگر' کا ٹھیلا لگایا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ، "آجکل شہر میں چلنے والا سب سے اچھا کاروبار کھانے پینے کی اشیا کا ہے شہر کی جس دکان اور ٹھیلے پر دیکھیں گاہکوں کا رش ہی نظر آئے گا کئی دکانوں والوں نے دوسرا کام کرتے تھے انھوں نے کھانے پینے کی اشیا فروخت کرنی شروع کردی ہیں جسمیں سب سے زیادہ فاسٹ فوڈ بکتا ہے'۔شہریوں میں فاسٹ فوڈ کی پسندیدگی کے حوالے سے وہ بتاتے ہیں کہ، 'میں گزشتہ کئی سالوں سے اجس کالج کینٹین میں کام کر رہا ہوں وہاں برگر بنانے میں ہمارا ہاتھ نہیں رکتا آپ خود اندازہ کرلیں یہ چیزیں کتنی بکتی ہیں'۔ شہر میں فاسٹ فوڈ کے نام پر بکنے والے چکن اور بیف برگرز، بن کباب، فرنچ فرائز، حلیم چنا چاٹ رولز اور دیگر اشیا شامل ہیں اکثر اوقات دفتروں اور دیگر اداروں میں کام کرنیوالے افراد لنچ ٹائم میں بھی اسی طرح کے کھانے کھانا پسند کرتے ہیں۔ چھٹی کا دن ہو یا ویک اینڈ شہریوں کی ایک بڑی تعداد ان کھانوں کیلئے شہر کے مختلف ریستورانوں اور ہوٹلس کا رخ کرتی ہے مگر شہری حفظانِ صحت کے اصولوں کے خلاف تیار کئیگئے ان کھانوں کے مضر اثرات سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان کھانوں کی لذت

اور مقبولیت ایک طرف لیکن اب میڈیا پر آنے والی رپورٹوں نے کراچی کے شہریوں کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ ان رپوٹوں میں بازار کے کھانوں میں مضر صحت مصالحے، غیر معیاری تیل و گھی، گوشت کو جلد گلانے کے لیے مختلف کیمیائی اجزا، اور گلی سڑی سبزیاں اور مضر صحت گوشت کے استعمال کو دکھایا گیا ہے، جس سے لوگوں کی تشویش بڑھ گئی ہے۔ ان غیر معیاری کھانوں سے انسانی صحت تباہ ہو رہی ہے۔ کیوں کہ یہ چیزیں معیاری چیزوں سے کہیں سستے داموں مل جاتی ہیں۔ فاسٹ فوڈ کا کاروبار کرنیوالے ان اشیا کی تیاری حفظان صحت کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر اپنا کاروبار چمکانے میں مگن ہیں۔ان اشیا کو خریدنے کر کھانے والے شہری یہ نہیں جانتے کہ زبان کے چٹخارے انھیں کئی بیماریوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔ کراچی کے سول اسپتال کے جنرل فزیشن ڈاکٹر سلیم مصطفٰی بتاتے ہیں کہ، ’اسٹریٹ فوڈ کے انسانی صحت پر منفی اثرات پڑتے ہیں جس میں تیل کی زیادتی کے باعث جسم میں کولیسٹرول بڑھ جاتا ہے اگر ان اشیا کا استعمال روزانہ کی بنیاد پر کیا جائے تو انسان بیماریوں میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنک فوڈ سے جسم میں توانائی کے بجائے کیلوریز میں اضافہ اور پروٹین کی مقدار کم ہوجاتی ہے جس سے جسم فربہ ہونا شروع ہوجاتا ہے اور دیگر بیماریاں جنم لیتی ہیں‘۔فاسٹ فوڈ کے بڑھتے ہوئے استعمال نے پاکستانیوں کی سماجی و معاشرتی زندگی کو مکمل تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا تاخیر سے کھانے کے باعث لوگوں کی سماجی زندگی اب گھر اور خاندان کے بجائے ہوٹلوں

تک محدود ہو گئی ہے۔ جو لوگ اچھا کھانا کھانے اور کھلانے کے شوقین تھے، اب گھروں پر روایتی کھانوں کی دعوتیں کرنے کے بجائے ہوٹلوں میں کھانا کھانے اور کھلانے کو ترجیح دیتے ہیں جس سے روایتی خاندانی نظام اور رابطے کم زور ہو رہے ہیں۔ فاسٹ فوڈ ریستورانوں نے بھی نصف شب کے بعد اپنی پروڈکٹس کی قیمتوں میں نمایاں کمی کرکے لوگوں کو خصوصاً نوجوان کو نصف شب کے بعد گھروں سے باہر رہنے پر مجبور کردیا ہے۔30 سال پہلے لاہور میں کھانے پینے کی مختلف اشیاکے لیے مشہور 'ڈھابے' ہوا کرتے تھے۔ اب لاہور میں 20 ہزار کے قریب ہوٹل اور ریستوران ہیں۔ کراچی میں برگر، بریانی، حلیم، روسٹ، گولا کباب، چپلی کباب، نہاری، پائے، سینڈوچ اور دوسرے کھانے پینے کی اشیا کی دکانوں کی تعداد تین لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ کراچی میں اس وقت سب سے زیادہ چلنے والا کاروبار ہی کھانے پینے کا ہے۔ڈاؤ میڈیکل ہیلتھ سائنس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر زمان شیخ کہتے ہیں کہ 'فاسٹ فوڈ میں کیلیوریز کی بھرمار ہے ایک چھوٹے سے بن کباب میں نمک اور چکنائی کی بھرپور مقدار موجود ہوتی ہے جس سے انسانی جسم میں کولیسٹرول میں اضافہ، موٹاپا اور دیگر بیماریاں جنم لیتی ہیں جو صحت کیلئے خطرناک ہیں'۔ جبکہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ، 'ان کھانوں کو جانچنے کا کوئی پیمانہ کوئی نہیں ہے اگر شہری ان اشیا کی بناوٹ دیکھ لیں تو ان کا دل لرز جائے کہ کس گندگی دے اسکو تیار کیا جاتا ہے شہریوں کو فاسٹ فوڈ جیسے کھانوں کا چسکا منہ کو لگ گیا ہے' ایسے کھانوں کو متاثر کن بنانے

کیلئے ان میں فوڈ کلر کے بجائے کپڑا رنگنے کا رنگ استعمال ہو رہا ہے جو بہت سستا ہوتا ہے'۔ان کا مزید کہنا تھا کہ 'فوڈ ڈیپارٹمنٹ اور دیگر انتظامیہ کو فعال ہونے کی ضرورت ہے حکومت کو چاہئے کہ ان اداروں میں کام کرنیوالے افسران کو غیر متوازن اشیا کا پیانہ کرنے اور ان چیزوں کی فروخت کرنیوالوں سے سختی سے نمٹیں تو ان بیماریوں پر کافی حدتک قابو پایا جا سکتا ہے۔' اس وقت ٹھیلوں، ڈھابوں اور دکانوں اور روسٹورنٹ میں حفظانِ صحت کے اصولوں کیخلاف بننے والے ان کھانوں کی جانچ پڑتال کے لیے کوئی سرکاری ادارہ بھی سرگرم نہیں ہے۔ کئی پاکستانی نجی چینلز کے کئی پروگرامز کی کئی چھاپہ مار ٹیموں نے فاسٹ فوڈ کا گندا کاروبار کرنیوالے ایسے کئی چہرے بے نقاب کرکے افسران بالا کی توجہ اس جانب دلانے کی کوشش بھی کی مگر سب عارضی رہا، کھانے والے کھا رہے ہیں بیچنے والے کاروبار کررہے ہیں اور اپنی جیبیں بھر رہے ہیں۔ اور مرنے والے مر رہے ہیں۔ کراچی کے علاقوں مثلاً طارق روڈ، حیدری، کلفٹن، ڈیفنس، گلشن اقبال، گلستان جوہر، نارتھ ناظم آباد اور دیگر تمام علاقوں کے شاپنگ سینٹرز کے پورے پورے فلورز ان فرنچائزز سے بھرے ہیں لیکن چند سال پہلے کی بات ہے شہر میں ایک ہی فوڈ اسٹریٹ ہوا کرتی تھی ،برنس روڈ جہاں ایک ساتھ درجنوں ہوٹلز اور ریسٹورنٹس ہوا کرتے تھے، مگر دیسی اسٹائل کے جبکہ اب ہر علاقے کی اپنی ایک فوڈ اسٹریٹ ہے۔ گلشن اقبال، نارتھ ناظم آباد یہاں تک کہ نیو کراچی میں سندھی ہوٹل پر بھی کھانوں کی انگنت ورائٹیز

اور ریسٹورنٹس موجود ہیں کچھ عالمی اداروں کی رپورٹس بتاتی ہیں کہ کراچی اب بھی سستے ترین شہروں میں شامل ہے، کم از کم یہاں ایک وقت کا کھانا جتنے کم پیسوں میں مل جاتا ہے ایسا باقی شہروں میں کم ہی ہوتا ہے لیکن کراچی کے بدلتے ہوئے لائف اسٹائل کو دیکھ کر لگتا ہے کہ پیسہ اب شاید مسئلہ نہیں رہا، ہر طبقے کے لوگ اپنی پہنچ کے مطابق ہوٹلنگ کرتے ہیں۔ ان قیمتوں میں کمی بیشی کی بنیاد وقت، سائز، اسپیشل ایونٹس اور ڈیلز پر انحصار کرتی ہے،ان قیمتوں کے باوجود غیر ملکی فوڈ چینز کا بزنس خوب بڑھ رہا ہے۔۔ کراچی کے ایک رہائشی اور ہوٹلنگ کے شوقین، بتاتے ہیں کہ اب شہر کے کسی بھی علاقے میں چلے جائیں ہوٹل پر جگہ نہیں ملتی، آپ کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ سندھی مسلم سوسائٹی میں واقع نینڈوز کی میں ایک ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ گھنٹوں تک ٹریفک میں پھنسے رہنے کی کوفت کے باجود لوگ ان آوٹ لیٹ میں جگہ ملنے کا انتظار کرتے ہیں۔ غور طلب پہلو یہ ہے کہ کراچی بری طرح سے بدامنی اور دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے، اگر یہاں امن ہو تو فوڈ انڈسٹری اربوں روپے کا منافع دے سکتی ہے، بعض علاقے تو ایسے ہیں جہاں ریسٹورنٹس اور ہوٹلنگ کا بزنس بہت عروج پر ہے، جیسے پورٹ گرینڈ اور دو دریا وغیرہ ، ان علاقوں میں چلتا فوڈ بزنس رونق بخش ہونے کے ساتھ دولت بخش بھی ہے،فاسٹ فوڈ کے بڑھتے ہوئے چلن پر تبصرہ کرتے ہوئے روایتی کھانوں کے ہوٹل مالکان کہتے ہیں مغربی طرز کے یہ جنک فوڈ اور ان کے ساتھ انرجی سافٹ ڈرنک کا استعمال معاشرے میں شکم پرے

رجحان کو فروغ دے رہا ہے، سافٹ ڈرنکس اور کاربونیٹیڈ واٹر سے معدے میں تیزابیت بڑھ رہی ہے جس سے نظام ہضم کی بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔اس کے باوجود اب بھی شام ہی سے کراچی میں انواع واقسام کے کھانوں کا مرکز سمجھے جانے والے 'برنس روڈ' پر کھانوں کے شائقین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ شہر کے مرکزی علاقے صدر کے نزدیک واقع اس فوڈ اسٹریٹ کو دیسی و ثقافتی کھانوں کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے جہاں لذیذ ومزیدار کھانوں کے کئی چھوٹے بڑے ریستوران قائم ہیں۔ شام ہوتے ہی یہاں کھانا کھانے آنے والوں اور خریدنے والوں کا رش لگ جاتا ہے جو رات گئے تک رہتا ہے۔ مچھلی کھانے کے شوقین افراد میں کراچی کے علاقے کیماڑی کی قدیم مچھلی مارکیٹ آج بھی مقبول ہے۔ موسم کچھ خوشگوار ہو اور اہلیان کراچی ساحل سمندر تفریح گاہوں اور فوڈ اسٹریٹ کا رخ نہ کریں ایسا ممکن نہیں، آخر خوش خوراکی میں کراچی والے بھی کسی سے کم نہیں۔

لندن سپر دولت مندوں کا شہر

دنیا بھر کی سیاسی، تعلیمی، تفریحی، صحافتی، فیشن اور فنون لطیفہ پر گہرے اثرات مرتب کرنے والا بین الاقوامی شہر لندن ایک بار پھر دنیا کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس بار لندن کی شہرت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ لندن اب دنیا کے امیر ترین لوگوں کا شہر بن گیا ہے۔ لندن.برطانیہ کا دارالخلافہ بھی ہے اور اس کا سب سے بڑا شہر بھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد تقریباً دو ہزار سال پہلے قدیم رومیوں نے رکھی تھی۔اس کے قیام سے آج تک لندن بہت سے تحریکوں اور عالمگیر واقعات کا مظہر رہا ہے، جس میں انگریزی کا ارتقاء، صنعتی انقلاب اور قدیم رومیوں کا احیاء بھی شامل ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرکزِ شہر اب بھی وہی قدیم شہر لندن ہے، جس میں اب بھی قرون وسطیٰ کی حدود نظر آتی ہیں، تاہم کم از کم انیسویں صدی سے نام ''لندن''، اُن تمام علاقوں تک پھیل گیا، جو اس کے اطراف و اکناف میں آباد ہوئے تھے۔ آج آبادیوں کا یہ ہجوم لندن،.برطانیہ کے علاقوں اور عظیم لندن کے انتظامی علاقے اور مقامی طور پر منتخب ناظم اور لندن دستور ساز مجلس کا حامل ہے۔ لندن دنیا کے ممتاز تجارتی، معاشی اور ثقافتی مراکز میں سے ایک ہے۔ لندن چار یونیسکو عالمی ثقافتی ورثہ کا حامل شہر بھی ہے ویسٹمنسٹر محل اور

کلیسائے ویسٹمنسٹر، کلیسائے سینٹ مارگریٹ، لندن برج، گرینچ کی تاریخی آبادی اور شاہی نباتیاتی باغیچہ، کیو۔ لندن دنیا بھر سے آنے والے سیاحوں کی دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ، مختلیف مذاہب اور ثقافتوں کا گھوارہ ہونے کی وجہ سے اس شہر میں تین سو سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں کی آبادی 75,12,400 ہے جو کہ عظیم لندن کی حدود میں ہے۔
آبادی کے لحاظ سے یورپی اتحاد کا سب سے بڑا شہر ہے۔ لندن کی نئی وجہ شہرت یہ بنی ہے کہ یہاں دنیا کے کسی بھی شہر کے مقابلے میں سب سے زیادہ ارب پتی افراد رہتے ہیں۔ برطانیہ مجموعی طور پر 104 امیر ترین افراد کا گھر ہے جن میں سے 72 لندن میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ تعداد نیویارک کے ارب پتی افراد کے مقابلے میں تقریبا دوگنی ہے۔ 'سنڈے ٹائمز رچ لسٹ' کے مطابق 'سپر رچ' لوگوں کے لیے لندن ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جہاں دنیا کے تقریباً 10 فیصد ارب پتی آباد ہیں اور لندن نے پہلی بار بلینئرز کے شہر ماسکو اور نیویارک پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ ماسکو امیر ترین لوگوں کا دوسرا بڑا شہر ہے جس کے باشندوں میں 48 ارب پتی شامل ہیں۔ ماسکو کے بعد نیویارک 43 امیر ترین شخصیات کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہے۔ اس کے علاوہ سان فرانسسکو میں 'سپر رچ' افراد کی کل تعداد 42 ہے جس کے بعد پانچویں پوزیشن پر لاس اینجلس ہے جہاں مجموعی طور پر 38 ارب پتی آباد ہیں۔ دیگر ملکوں اور شہروں میں ہانگ کانگ، بھارت، بیجنگ اور سنگاپور میں بڑی تعداد

میں بلینئنرز آباد ہیں۔برطانیہ کے امیر ترین لوگوں میں سے صرف ایک تہائی افراد ایسے ہیں جو برطانیہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ لندن کے 72 ارب پتی افراد میں سے 39 دولت مندوں کا تعلق دوسرے ملکوں سے ہے جو برطانیہ میں آکر آباد ہوئے جبکہ برطانیہ سے باہر پیدا ہونے والوں کی تعداد 44 ہے۔برطانوی سپر دولت مندوں کی فہرست میں ایک پاکستانی بھی شامل ہے۔ ان کا نام سر انور پرویز ہے جو 1960 کی دہائی میں برطانیہ منتقل ہوئے تھے۔ وہ 'بیسٹ وے کیش اینڈ کیری' کے مالک ہیں اور دولت مندوں کی گنتی میں 72 ویں نمبر پر ہیں۔برطانیہ میں رہنے والے دولت مندوں کے مجموعی اثاثوں کی کل مالیت 301 ارب پونڈ بنتی ہے۔ اس فہرست میں بھارتی نژاد ارب پتی شری چند اور گوپی چند ہندوجا گروپ کے مجموعی اثاثوں کی مالیت 11.9 ارب پونڈ ہے جس کے ساتھ وہ برطانیہ کے امیر ترین افراد میں اول نمبر پر ہیں۔ روسی نژاد علی شیر عثمانوف 10.65 ارب پونڈ کے ساتھ دوسرے امیر ترین شخص ہیں۔ متل اسٹیل کے مالک بھارتی شہری لکشمی متل 10.25 ارب پونڈ کے اثاثوں کے ساتھ برطانیہ کے تیسرے ارب پتی بن گئے ہیں۔برطانوی ارب پتی ڈیوک آف ویسٹ منسٹر 8.5 ارب پونڈ کی مالیت کے ساتھ دولت مند افراد کی فہرست میں دسویں نمبر پر ہیں۔ ان کے علاوہ مشہور فٹ بال کلب چیلسی کے مالک رومان ابراموویچ کا شمار ارب پتی افراد کی فہرست میں نویں نمبر پر کیا گیا ہے۔ مجموعی آبادی اور ارب پتی افراد کے تناسب کے لحاظ سے بھی برطانیہ دنیا میں پہلے نمبر پر ہے جہاں ہر چھ لاکھ سات ہزار شہریوں

میں سے ایک فرد ارب پتی ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں تقریباً دس لاکھ شہریوں میں سے ایک فرد ارب پتی ہے۔ دولت دولت کو کھینچتی ہے اس لئے برطانیہ کی مالیاتی ساکھ غیر ملکیوں کو لندن کی جائیداد میں سرمایہ کاری کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ جبکہ امریکہ کے برعکس برطانیہ میں نان ڈومیسائل لوگ اپنی گلوبل ویلتھ پر کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے ہیں۔ انھیں صرف برطانوی آمدنی پر ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں ارب پتی افراد کی تعداد میں ایک دہائی میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ برس برطانوی ارب پتی شہریوں کی کل تعداد 88 تھی اور ان کی مجموعی دولت کا تخمینہ 246 بلین پونڈ تھا۔ لندن کا نام لندن کیوں ہے یہ بات ہنوز صیغہ راز میں ہے۔ کوئی اسے جیوفرے آف منمماؤتھ برطانیہ کی قبل از تاریخ سے جوڑتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ یہ نام اسے اس وقت کے برطانوی بادشاہ لد کی بدولت ملا، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے لندن پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کا نام کیرلد رکھا تھا۔ کیرلد وقت کے ساتھ ساتھ کیرلدن اور پھر آخر کار لندن ہوگیا۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی قیاس آرائیاں ہیں، جو کہ گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہیں، جن میں سے زیادہ تر کے مطابق یہ نام ویلزی یا برطانوی لفظ سے اخذ کردہ ہے جبکہ بعض کے مطابق یہ متروک شدہ پرانی انگریزی حتیٰ کے بعض کے مطابق یہ لفظ عبرانی سے لیا گیا ہے۔ارب پتیوں کے اعتبار سے لندن کو کئی معاصر شہروں نیویارک اور ماسکو پر سبقت حاصل ہے۔ اس وقت لندن میں مجموعی طور پر 72 ارب پتیوں کی

دولت ایک کھرب آسٹریلوی پاؤنڈ یعنی ایک کھرب 60 ارب امریکی ڈالر بنتی ہے۔ ان ایک سو چار امرا کی کل دولت پانچ کھرب سات ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ مجموعی آبادی میں ارب پتیوں کے تناسب کے اعتبار سے بھی۔برطانیہ کو سبقت حاصل ہے۔ .برطانیہ میں ہر چھ لاکھ 70 ہزار افراد میں ایک ارب پتی موجود ہے جبکہ امریکا میں ایک ملین لوگوں میں صرف ایک ارب پتی ملتا ہے۔تاہم ایک دوسرے پہلو سے لندن نیویارک اور ماسکو سے پیچھے بھی ہے۔ لندن میں موجود نصف ارب پتی مقامی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کے تارکین وطن پر مشتمل ہیں۔ لندن میں ایسے 39 ارب پتی موجود ہیں جن کی پیدائش مقامی نہیں، جبکہ مجموعی طورپر بھی 104 ارب پتیوں میں 44 غیر ملکی ہیں یعنی تارکین وطن میں سمجھے جاتے ہیں۔.برطانوی ارب پتیوں کاتذکرہ کرتے ہوئے اس بھارتی خاندان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جس نے سنہ 1914 میں لندن میں "ھندوجا" نامی ایک کمپنی قائم کی تھی۔آج اس فرم میں 72 ہزار افرادکام کرتے ہیں۔ یہ کمپنی تیل، گیس، ذرائع ابلاغ اور مواصلات سمیت کئی دوسرے اداروں میں سروسز فراہم کر رہی ہے۔اس کے علاوہ 78 سالہ سریچانڈ اوراس کے 74 سالہ بھائی گوبشنڈ.برطانیہ کے سب سے دولت مند افراد سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی مجموعی دولت وثروت گیارہ ارب نوے کروڑ ڈالر سے زیادہ ہے۔ بہر صورت لندن اس وقت ارب پتیوں کی دنیا کا مرکز ہے جہاں دنیا بھر سے امرا کھچے چلے آتے ہیں۔تین سال قبل عرب ممالک میں شروع ہونے والی بغاوت کی تحریکوں کے نتیجے میں بڑی تعداد میں عرب امراء نے بھی

برطانیہ جیسے ملکوں کا رُخ کیا۔ ان کے ساتھ ان کا سرمایہ بھی لندن منتقل ہوا۔ برطانوی حکومت نے بھی موقع غنیمت جانا اور عرب سرمایہ داروں کے لیے ویزوں کی شرائط میں نرمی کر دی۔ لندن حکومت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سنہ 2013ء کے دوران عرب سرمایہ داروں کے لیے سنہ 2012ء کی نسبت 423 ویزوں کا اضافہ ہوا۔ سنہ 2012ء میں عرب ممالک کے مخصوص افراد کے لیے 530 ویزے جاری کیے گئے جبکہ 2013ء میں یہ تعداد 1038 تک جا پہنچی ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس امر سے بھی لگا سکتے ہیں کہ اسی عرصے میں چین کے سرمایہ کاروں کے لیے 95 کے بجائے 171، اور 125 کے بجائے امریکیوں کے لیے 19 کے بجائے 66، روسیوں کے 99 کے بجائے 125 اور مصریوں کے لیے ویزوں کی تعداد دوگنا کر دی گئی تھی۔ ایک غیر سرکاری عالمی تنظیم اوکسفام' کی جانب سے شائع ہونے والی تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ،برطانیہ کے ' پانچ ارب پتی خاندانوں کے مشترکہ اثاثوں کی کل مالیت 20 فیصد غریب برطانوی آبادی کی دولت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ برطانیہ کے پانچ ارب پتی خاندانوں کی مال و دولت کا تخمینہ 28.2 ارب پونڈ لگایا گیا ہے جو کہ غریب آبادی پر مشتمل 20 فیصد گھرانوں کی مشترکہ دولت 28.1 ارب پونڈ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ امدادی تنظیم نے تحقیقی رپورٹ کے لیے فوربیس میگزین کی تازہ ترین دولت مند افراد کی فہرست سے حاصل کردہ اعداد و شمار کو استعمال کیا ہے۔ اوکسفام کی جانب سے متنبہ کیا گیا ہے کہ برطانیہ کے امیر ترین 0.1 فیصد آبادی کی آمدنی میں تقریبا چار گنا تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس سے

معاشرے میں شدید عدم مساوات پیدا ہو رہی ہے۔ تنظیم کی جانب سے کہا گیا ہے کہ موجودہ رپورٹ اقتصادی ناکامی کی ایک علامت ہے۔برطانوی اخبار انڈیپینڈنٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مٹھی بھر ارب پتی جن میں پراپرٹی سرمایہ دار چارلس کیڈیگن اور اسپورٹس ڈائریکٹر باس مائیکل ایشلے کی املاک کی مشترکہ مالیت تقریبا 12.6 فیصد غریب برطانوی لوگوں کی دولت کے مساوی ہے۔ارب پتیوں کی فہرست میں سب سے اوپر جیرالڈ کیونڈش کا نام شامل ہے جو کہ چھٹے ڈیوک آف ویسٹ منسٹر ہیں اور لندن اور مے فیئر میں سو ایکڑ سے زائد زمین کے مالک ہیں۔ان کے بعد اس فہرست میں پراپرٹی ٹائیکون ڈیوڈ اور سمن ریوبن کا نام آتا ہے جن کے کل اثاثے 11.3 ارب پونڈ ہیں اس فہرست میں تیسرا نام لندن سے تعلق رکھنے والے دو بھائیوں شری چند اور گوپی چند کا ہے جن کے کل اثاثوں کی مالیت تقریبا 10 ارب کے لگ بھگ ہیں۔ان کے علاوہ اس فہرست میں چارلس کیڈیگن جن کے خاندان کی کل مال و دولت کا تخمینہ 6.9 ارب پونڈ ہے جب کہ مائیکل ایشلے کے خاندان کی کل دولت کا تخمینہ تقریبا 5.5 ارب پونڈ لگایا گیا ہے۔ اوکسفام نے اس رپورٹ کے حوالے سے شدید فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ،بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا عدم مساوات ایک شیطانی دائرہ ہے جس میں دولت اور طاقت محض چند ہاتھوں تک مرکوز ہو کر رہ گئی ہے اور باقیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کی خاطر مسلسل قوانین بنائے جا رہے ہیں مثلا زیادہ آمدنی کمانے والوں پر کم

ٹیکس عائد کرنے کی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں۔اوکسفام کے نتائج جنوری میں شائع ہونے والی اس رپورٹ کے تناظر میں پیش کی گئی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ دنیا کے 85 ارب پتیوں کے مشترکہ اثاثوں کی کل مالیت تقریباً نصف دنیا کی آبادی کی دولت کے مساوی ہے۔اوکسفام کے ڈائریکٹر بین فلپ نے کہا کہ برطانوی قوم ایک گہری تقسیم کا شکار ہے ایک طرف اشرافیہ یا امیر طبقہ کی آمدنی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب غریب طبقے کے لیے بنیادی ضروریات کو پورا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے سرگرم ایک بین الاقوامی تنظیم نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے 85 امیر ترین افراد کی دولت دنیا کی نصف غریب آبادی کی دولت کے برابر ہے۔برطانوی تنظیم 'آکسفام' نے دنیا میں عدم مساوات کے موضوع پر جاری کی جانے والی اپنی تازہ' رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے امیر ترین افراد اپنی دولت میں اضافے کے لیے سیاسی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہیں جس کا بالواسطہ نقصان کم آمدنی والے افراد کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ امیر طبقہ ٹیکس بچاتا ہے اور اپنی دولت کو حکام کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے اور اس میں مزید اضافے کے لیے ہر ممکن جتن کرتا ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مالی معاملات میں عدم شفافیت، ٹیکسوں کی چوری اور فلاح عامہ کے منصوبوں میں سرمایہ کاری نہ کرکے مال دار طبقہ نہ صرف اپنی مالی اور سیاسی حیثیت مستحکم کرتا ہے بلکہ اس دولت کی اگلی نسلوں تک منتقلی بھی یقینی بناتا ہے۔'آکسفام' نے اپنی

رپورٹ میں بتایا ہے کہ گزشتہ ایک دہائی کے دوران میں بھارت میں ارب پتی افراد کی تعداد میں 10 گنا اضافہ ہوا ہے۔رپورٹ کے مطابق یورپ میں حکومتوں کے بچت اقدامات سے مالدار طبقے کو کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہااور ان اقدامات سے زیادہ تر متوسط اور غریب طبقے متاثر ہورہے ہیں۔اس بات کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ افریقی ممالک میں سرگرم بین الاقوامی کمپنیاں اور کارپوریشنز ٹیکسوں سے بچنے کے لیے اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتی ہیں جس کے باعث ان ملکوں میں غربت کا مقابلہ کرنے کے لیے دستیاب وسائل مہیا نہیں ہوپارہے۔برطانوی تنظیم نے اپنی یہ رپورٹ سوئٹزرلینڈ کے شہر ڈیووس میں 'ورلڈ اکنامک فورم' کے ایک اہم اجلاس سے قبل جاری کی ہے جس میں دنیا میں دولت کی عدم مساوی تقسیم پر بات ہوئی۔دنیا کی کاروباری شخصیات اور سیاسی رہنماوں سے اپیل بھی کی جارہی ہے کہ وہ مختلف حکومتوں کی جانب سے متوسط اور غریب طبقوں کی فلاح کے لیے بنائے جانے والے منصوبوں کی حمایت کریں۔مالدار تاجروں اور کاروباری افراد سے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے، ٹیکسوں کی بروقت اور منصفانہ ادائیگی اور دولت چھپانے کے اقدامات ختم کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔چندماہ قبل امریکہ کے مالیاتی مرکز نیویارک سے شروع ہونے والی تحریک آکوپائی وال سٹریٹ، یعنی وال سٹریٹ پر قبضہ کرلو نامی تحریک کا دائرہ امریکہ کے بہت سے چھوٹے بڑے شہروں سمیت دنیا کے کئی ملکوں تک پھیل گیا تھا۔اس تحریک سے وابستہ افراد امیر اور غریب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کے خلاف

آواز بلند کر رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اس کی ذمہ داری بڑے مالیاتی اداروں اور حکومتی پالیسوں پر عائد ہوتی ہے۔ ماہرین یہ سوچ رہے ہیں امیر اور غریب کے درمیان فرق کیسے دور کیا جاسکتا ہے؟ مگر اس بارے میں پائے جانے والے نظریات کے درمیان موجود فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ مظاہرین کا کہنا ہے کہ مشکلات میں گھرے بینکوں کو ٹیکس دہندگان کے پیسے سے بچالیا جاتا ہے مگر ان غریب لوگوں کے گھروں پر جو مالی مشکلات کے باعث اپنی ماہانہ قسطیں ادا نہیں کر سکتے، بینک قبضہ کر لیتے ہیں۔ تحریک کے سرگرم اراکین معاشی بحران کے لئے بینکوں اور وال سٹریٹ کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ملک کے ایک فی صد امیر 99 فی صد آبادی کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاکر سب سے زیادہ دولت کماتے ہیں اور اپنے سیاسی اثر ورسوخ کے ذریعے امیروں پر ٹیکس نہیں لگنے دیتے۔ قبضہ کرو تحریک ایک منصفانہ معاشرے کی خواہشمند تحریک تھی۔ جس کے دنیا بھر میں اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ کے پیٹر ویلی سن کہتے ہیں کہ کم ٹیکس اور قواعد وضوابط معیشت کے لئے نقصان دہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حکومت کو نئے کاروبار شروع کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹیں نہیں کھڑی کرنی چاہیں، کیونکہ ایپل کمپنی کے اسٹیو جانز سمیت ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ غریب ہی سخت محنت کرکے امیر بننے میں کامیاب ہوئے۔ لوگوں کے راستے میں نہیں آنا چاہیے۔ مگر واشنگٹن کے ایک تحقیقی ادارے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ایک اسکالر جان کیوانا گ کا خیال ہے کہ جب

ملک میں بیروزگاری کی سطح اتنی بلند ہو تو غریب سے امیر بننے کے قصے خواب لگتے ہیں۔ امریکی کانگرس کے بجٹ آفس کے اعداد و شمار کے مطابق پچھلی تین دہائیوں میں آبادی کے ایک فی صد کی آمدن میں 275 فی صد اضافہ ہوا ہے مگر انتہائی غربت میں زندگی گذارنے والی 20 صد آبادی کی آمدنی صرف 18 فی صد بڑھی ہے۔ آرگنائزیشن فار اکنامک کوآپریشن اینڈ ڈیولپمنٹ کے مطابق معاشرے کے دس فی صد امیروں کی آمدنی غریب آبادی کی کل آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہے۔ دوسری جان دنیا بھر میں پھیلے ہوئے بے روزگار ہیں۔ جو دولت مندوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جینے کا حق مانگ رہے ہیں۔

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا

گالیوں سے پرہیز کریں آپکو جرمانہ یا سزا ہو سکتی ہے۔
اتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب۔گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا، بعض کہنے والے کہتے ہیں گالیاں تہذیب کی علامت ہیں،اگر آپ کو کسی کے اہل زبان ہونے کا پتا لگانا ہو تو ان کی گالیوں کا موازنہ کریں ، وہیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔
سیانے کہتے ہیں کہ کسی زبان کو یکھنا ہو تو اسکے لئے سب سے پہلے اس کی گالیاں یکھنی چاھئیں۔شائد اسی لئے اس سیانے نے یہ بات ایک گالی دیتے ہوئے کہی تھی۔گالی کا خیال اس لئے آیا کہ روسی صدر نے ایک حکم نامہ جاری کر دیا ہے، جس کی رو سے گالیاں دینے والوں پر جرمانہ کیا جائے گا۔ دوران گفتگو شائستہ زبان کا استعمال اچھی شخصیت کاآئینہ دار ہوتا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ گالم گلوچ اور انسانی رویوں کے مابین ایک فطری تعلق پایا جاتا ہے۔ اشتعال کے عالم میں بڑے بڑے دانش ور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی بازاری زبان استعمال کرتے ہیں،تاہم روسی شہریوں کو اب غصے کی حالت میں بھی اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہوگا، بہ صورت دیگر ان کی جیب پر بوجھ پڑے گا۔دراصل روس میں حال ہی میں ایک قانون منظور کیا گیا ہے جس کے

تحت فحش گوئی اور نازیبا زبان استعمال کرنے پر جرمانہ عائد ہوگا۔ اس قانون کی منظوری گذشتہ پیر کو روسی صدر ولادیمیر پیوتن نے دی جس کا اطلاق یکم جولائی سے ہوگا۔ قانون کے مطابق فحش گوئی کا الزام ثابت ہونے پر ایک فرد پر ڈھائی ہزار روبل تک جرمانہ عائد ہوگا، جب کہ اداروں کے لیے جرمانے کی حد 50000 روبل تک ہے۔یکم جولائی سے تمام ثقافتی، تفریحی اور فن سے متعلق تقاریب میں نازیبا زبان استعمال کرنا ممنوع ہوگا۔ اگر کسی فلم میں فحش مکالمات شامل ہوئے تو اسے نمائش کا اجازت نامہ جاری نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح جن کتابوں، سی ڈیز میں بیہودہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں، ان کی پیکنگ پر ''نازیبا الفاظ شامل ہیں'' درج ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جہاں کہیں نازیبا الفاظ پر تنازع جنم لے گا وہاں ماہرین کا ایک پینل الفاظ کے بیہودہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ روس میں مخالفین کی جانب سے اس قانون پر تنقید کی جارہی ہے جو اسے آزادی اظہار پر قدغن لگانے سے تعبیر کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح قدامت پسند اور قوم پرست نقطہ نظر کو فروغ دیا جارہا ہے۔ یہ ابھی تک واضح نہیں ہے کہ اس قانون کا اطلاق سوشل میڈیا، جیسے فیس بک اور ٹویٹر کے استعمال کنندگان پر ہوگا یا نہیں۔ بھارت کے پارلیمانی انتخابات کی مہم بھی گالی گلوچ سے گزر کر اب شائستگی کے دائرہ میں آئی ہے۔ الیکشن میں سیاست دانوں کی زبان شدت اختیار گئی تھی۔ الیکشن کے جلسوں یں حریف رہنماؤں نے ایک دوسرے کے خلاف جس طرح کی زبان استعمال کی ہے اس کی

ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے ایک تقریر میں میں مودی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ زہر کی کھیتی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ انہیں ایک بار 'موت کا سوداگر کہہ چکی ہیں۔ بی جے پی کے وزارت عظمٰی کے امیدوار نریندر مودی سونیا گاندھی کے غیر ملکی ہونے پر اکثر طنز کرتے رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے نائب صدر راہل گاندھی کو ہمیشہ 'شہزادے' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں انھوں نے کہا کہ اگر سونیا گجرات کی ترقی کے بارے میں سوال کر سکتی ہیں تو پھر شہزادے کی ماں کے بارے بھی سوال اٹھ سکتے ہیں۔ 'لیکن سونیا گاندھی کے بارے میں '

سب سے زیادہ غیر پارلیمانی بیان ایک آر ایس ایس نواز سادھو بابا رام دیو کی طرف سے آیا۔ انھوں نے سونیا گاندھی کو 'غیر ملکی لٹیری بہو' کہا اور ان کا موازنہ ایک تمثیلی دیونی سے کیا جو سب کو نگل جاتی ہے۔ " عوامی بیداری، تبدیلی کی خواہش، بڑی تعداد میں نئے ووٹروں کی موجودگی اور سوشل میڈیا کے سبب اس بار کے پارلیمانی انتخابات ماضی کے مقابلے زیادہ سخت اور چیلنجنگ رہے ہیں۔ انتخابی مہم میں سیاست دان کروڑوں روپے داؤ پر لگا کر ہر قیمت پر انتخاب جیتنا چاہتے ہیں۔ " مودی نے کچھ دنوں پہلے کہا تھا کہ بھارت کو تین 'اے کے سے خطرہ ہے، اے کے 47 یعنی دہشت گردی، وزیر دفاع اے کے اینٹونی جنھوں نے بقول مودی فوج کے جذبوں کو پست کیا اور تیسرے اے کے یعنی اروند کیجریوال جو ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ مودی کے خلاف سب سے سخت بیان سہارن پور سے کانگریس کے امیدوار عمران

مسعود کی طرف سے آیا۔ انھوں نے کہا: 'اگر مودی نے یوپی کو گجرات بنانے فسادات کرانے) کی کوشش کی تو وہ مودی کی بوٹی بوٹی کر دیں گے۔' انھیں گرفتار کر) کے جیل بھیج دیا گیا ہے۔ سماجوادی پارٹی کی ایک امیدوار ناہید حسن نے مایاوتی کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک تقریر میں کہا: 'مایاوتی تین بار مودی کی گود میں بیٹھ چکی ہیں۔ اور دونوں ہی غیر شادی شدہ ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گالیاں دینے کے بھی آداب ہوتے ہیں مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب کے مخالف انہیں خطوط میں گالیاں لکھتے رہتے تھے۔ ایک بار کسی مخالف نے انہیں ماں کی گالی لکھ دی۔ مرزا اسے پڑھ کر ہنسے اور بولے، اس بیوقوف کو گالی دینے کا بھی شعور نہیں ہے۔ بوڑھے اور ادھیڑ عمر شخص کو بیٹی کی گالی دینی چاہئیے تاکہ اسے غیرت آئے۔ جوان آدمی کو ہمیشہ جورو کی گالی دو کہ اسے جورو سے بہت لگاؤ ہوتا ہے اور بچے کو ہمیشہ ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ سب سے زیادہ ماں سے مانوس ہوتا ہے۔ ہمارا ذوق بھی خوب ہے کہ اردو زبان کی گالی دل پر جا لگتی ہے اور انگریزی میں دی گئی گالی کو ہنسی خوشی مذاق ہی مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔ ہماری تہذیب میں گالیاں دینا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ گالی کا تہذیب یا بدتہذیبی سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ذخیرہ الفاظ کیطرح یہ بھی ایک زبان کے زندہ ہونے کی نشانی ہوتی ہیں مثلا اربن ڈکشنری کو ہی لیجیے۔ پہلے تو یہ بھی گالی میں شمار ہوتا تھا کہ 'اجی کیا پاجامہ آدمی ہیں آپ، یہ بلی کا گولے کر آے کیا'' پنجابی زبان کو گالیوں کے حوالے سے بڑا بدنام قرار.

دیا جاتا ہے۔بقولِ یوسفی ''گنتی، گالی اور گندہ لطیفہ اپنی مادری زبان میں ہی لطف دیتے ہیں۔ پنجابی زبان کے بارے میں میاں محمد طفیل سابق امیرِ جماعت ''اسلامی'' کیا خوب فرما گئے ہیں کہ ''پنجابی فقط گالیوں کی زبان ہے۔ ایک صاحب جو عرصے کے بعد پاکستان آئے تھے، فرماتے ہیں کہ ملتان میں جمعہ کا خطبہ سنا اور پہلی بار اتنی ساری پنجابی زبان بغیر گالی کے سنی تو کانوں پر یقین نہ آیا۔ چٹکی لے کر یقین دلایا گیا کہ خواب نہیں تھا۔ وہ لطیفہ بھی آپ کو یاد ہوگا کہ ایک پنجاب سے تعلق رکھنے والے کی ایک انگریز سے لڑائی ہو گئی، انھوں نے انگریزی میں خوب گالیاں دیں، لیکن جب دل نہ بھرا اور طبعیت سیر نہ ہوئی تو فرمانے لگے، مورا اوور ان پنجابی اور پھر اپنی زبان میں دل کھول کر گالیاں دیں۔ لغت کے لحاظ سے گالی، نا شائستہ، نازیبا، سخت، کڑوے کسیلے الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جو کسی کو ذلیل کرنے کے لیے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بولا جائے۔ یہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعے یہ پیمائش کی جا سکتی ہے کہ ایک فرد، سماج یا معاشرہ کتنا تہذیب یافتہ ہے ؟" گالی " عموماً غصے کی حالت میں وجود میں آتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی زبان کی علاقائی فرق کی وجہ سے بھی عجیب و غریب انداز میں لاشعوری طور پر" گالی " عالم وجود میں آتی ہے۔ہماری پارلیمان بھی اس معاملے میں بہت آگے ہے۔ پہلی پارلیمانی زبان شرافت اور وقار کی علامت تھی۔ اب پارلیمانی زبان کا مفروضہ بھی اب پرانا ہوچلا کہ اب جو زبان پارلیمان میں بولی جاتی ہے اس سے ادارہ

گالیوں کی لغت 'فیروز المغلظات' بنانے کا کام لیتا ہے۔ ہمارے وزیر قانون کے قانون کے لمبے ہاتھ تو سبھی کو یاد ہیں مگر اس کے علاوہ اب ہمارے معزز ایوانوں میں اس طرح باتیں ہوتی ہیں کہ ''سابق وزیر قانون عبد الرشید عباسی نے کہا کہ دنیا میں بڑے بڑے واقعات ہو جاتے ہیں ماں بہن کی گالی برداشت نہیں ہے دونوں صاحبان معذرت کر لیں' یا پھر آزاد کشمیر کی اسمبلی کے رکن نے کہا کہ ''''میرے سامنے ایک رکن نے ماں کی گالی دی پھر اس پر یہ بھی انصاف ہونا چاہیے اس موقع پر انہوں نے مصطفیٰ گیلانی کو ایوان سے باہر بھیج دیا۔'' وغیرہ اردو زبان کی گالیوں کی تین مختلف اصناف ہیں۔ وہ گالیاں جو مہذب محفل میں کچھ جھجک کے ساتھ دی جا سکتی ہیں مثلا اکبر الہ آبادی کی گالیاں وغیرہ۔ دوسری جو یاروں دوستوں کے ہمراہ دی جاتی ہیں مثلا بھینس کا منہ اور تیسری قسم مزید شدید جیسے کسی کو پرویز مشرف یا میر جعفر کہ دینا، یہ دل آزاری کی بدترین قسم ہے۔

گالیوں کے آداب کے سلسلے میں آبِ گم میں مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں کہ بزرگوار موجودہ الہ دین یعنی رحیم بخش کو عام طور پر الہ دین ہی کہتے تھے۔ البتہ کوئی خاص کام مثلًا پیر دبوانے ہوں یا بے وقت چلم بھروانی ہو یا محض پیار اور شفقت جتانی ہو تو الہ دین میاں کہ کر پکارتے۔ لیکن گالی دینی ہو تو اصل نام لیکر گالی دیتے تھے۔مزید آداب مغلظات کے سلسلے میں مثال سے فرماتے ہیں کہ'' خلیفہ نے غصے سے بے قابو ہو کر دو مرتبہ اسے '' تیرا دھنی

مرے! کی گالی دی تو بشارت سنانے میں آ گئے۔ لیکن سرِ دست وہ گھوڑے کو قابو میں لانا چاہ رہے تھے۔اور بسا اوقات گالیوں کا استعمال بوقت ضرورت مدعا کے بیان کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً ''کوئی جوان عورت مچھلی لینے آتی تو مچھلی والا ڈھال ڈھال کر بلی کو آرزو بھری گالیاں دینے لگتا۔''قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامہ" میں ملک امیر محمد کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقع رقم کیا ہے. لکھتے ہیں کہ چوہدری ظہور الاہی سیاست کے افق پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فوجی آمر ایوب کے نزدیک ہو گئے... پہلے تو نواب نے چوھدری ظہور الہی کو موٹی موٹی اور غلیظ گالیاں دیں اور ساتھ ہی کاغذوں کا ایک پلندہ ایوب کے سامنے رکھ دیا، جو کہ ایک ایس پی نے ابھی ابھی پیش کیا تھا، اور فرمایا کہ حضور ان کاغذات میں اس (گالی) آدمی کا کچا چٹھا ہے . ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ جناب ابھی تو میں نے اپنا شکاری کتا اس پہ نہیں چھوڑا'وزرا کا یہ وطیرہ تو تبدیل نہیں ہوا، اب تک ہے کہ '' کسٹم حکام کو خدشہ تھا کہ وزیر موصوف کے بنکاک سے انے والے مہمانوں کے پاس غیر قانونی سامان ہے-اِسی لئے انھوں نے تلاشی کرنا چاہی تو چوہدری صاحب طیش میں اکر کسٹم حکام پر برس پڑے-انہیں گالیاں دیں اور نوکری سے گو شالی کا قصیدہ گایا-ایرپورٹ کے کیمروں نے چوہدری صاحب کی تو تکار و دھکم پیل ثبوت کے لئے محفوظ کر لی-اِسی وزیر کے خلاف لاہور کے تھانوں میں عملے کو گالیاں و دھمکیاں دینے پر رپٹ درج ہے- تھانہ نو لکھا کے انسپکٹر نوید گجر نے صحافیوں

کو بتایا کہ وزیر نے ایک ملزم انتظار شاہ کو فوری رہا نہ کرنے کی پاداش میں تھانے کے عملے کو ننگی گالیاں اور نوکری سے برخواست کروانے کی دھمکیاں دیں۔سب سابق چوہدری عبدالغفور نے بائیس مئی کو پریس کانفرنس میں تمام الزامات کی تردید کی۔''
بعض حضرات گالی کے فوائد بھی بتاتے ہیں ، ان کے مطابق گالی ٹانک کا کام کرتی ہے آدمی کو ری چارج کرتی ہے۔مالک نے نوکر کو گالی دے کر ڈانٹا، حرام زادے ! ذرا تیزی دکھا ابھی بہت کام باقی ہے ، نوکر کو غصہ آیا۔ دل ہی دل میں مالک کو گالیاں دیتا ہوا تیزی سے ہاتھ چلانے لگا۔ مالک کے حسب منشا وقت پر کام نمٹ گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہوٹلوں ، ڈھابوں ، گیراجوں اور دکانوں پر کام کرنے والے نوکروں کو خصوصاً کم سن بچوں کو مالکان ، گالیوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ جس دن مالک نوکر کو گالیوں سے نہیں نوازتا وہ جان لیتا ہے کہ ، آج مالک سالا بیمار ہے۔، پھر وہ یہ سوچ کر کہ آج مالک زیادہ تنگ نہیں کرے گا خود کو پرسکون محسوس کرتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو نوکر مالک کی گالیاں خاموشی سے سن لے ، بھلے ہی ٹھیک سے کام نہ کرے، اچھا نوکر۔ اور جو نوکر مالک کی گالیوں کے جواب میں اس کے منہ کو آئے بھلے ہی دل و جان سے کام کرے.برا نوکر کہلاتا ہے۔گالی کمزور کا ہتھیار ہے۔ اپنے سے طاقتور مدمقابل پر جب اس کا زور نہیں چلتا تو دل ہی دل میں اسے گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ ایسا کرنے سے اس کا ذہنی تناؤ دور ہوتا ہے۔ ذرا سوچیے ! اگر گالیاں نہ ہوتیں تو اسکا ذہنی تناؤ اتنی

آسانی سے کیسے دور ہوتا؟ "گالی" ڈھال کا کام کرتی ہے۔ آپ کا پڑوسی آپ سے جھگڑنے آیا کہ آپ کے لائق فرزند ارجمند نے اس کے فرزند کو پیٹ دیا۔ اس کی شکایت سنتے ہی آپ نے اپنے فرزند کو ڈانٹا اور چار پانچ اعلی وارفع گالیاں اسے دے ڈالیں۔ پڑوسی کا کلیجہ اور غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ پاکستانی سیاست میں گالی کا چلن گو غلام محمد، امیر محمد خان نواب کالا باغ سے شروع ہوا تھا، لیکن عوامی سطح پر پہلی بار میڈیا یعنی ریڈیو پر گالی جو پوری قوم اور دنیا نے سنی وہ ذوالفقار علی بھٹو کی تھی، جو کراچی میں ایک جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ جوش خطابت میں انھوں نے ایک فحش گالی دے ڈالی، پھر بار بار کہتے رہے کاٹ دو، اسے کاٹ دو، ریڈیو پر نشر ہونے والی گالی تو پوری قوم نے سن لی، اب اس کو کاٹ دو یا مٹا دو سے کیا ہو سکتا ہے، بھٹو اس بارے میں مشہور تھے، وہ نجی محفلوں میں دھڑلے سے گالیوں کو استعمال کرتے تھے۔ بعد میں آنے والے دور میں سابق صدر مشرف اور عوامی لیڈر شیخ رشید نے بھی اس میدان میں خوب شہرت پائی، شیخ رشید بھرے جلسوں میں ایسی باتیں اور اشارے کرتے جو گالی سے بڑھ کر تھے۔ پاکستان میں سیاسی عمل جنرل ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے بعد اگست 1988ء میں شروع ہوا تھا۔ صدر غلام اسحاق خان کے تین خطابات میں خوب ہنگامہ آرائی ہوئی، اور قومی اسمبلی کا ایوان ''گو بابا گو'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ میں نعروں کی ابتدا پیپلز پارٹی کی (Rhythem) اس قسم کے منفی احتجاج اور ردھم چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو

نے کی تھی اور انہوں نے ہی اسے پروان چڑھایا۔ اعلیٰ عدالتوں کو ''کنگرو کورٹس'' اور فیصلوں کے خلاف منفی احتجاج کا رجحان بھی انہوں نے ہی پیدا کیا تھا۔ اپنے دور میں سردار فاروق لغاری کو صدارت کا عہدہ بے نظیر بھٹو نے اپنی پیپلز پارٹی کا مخلص ترین رکن سمجھ کر ہی پیش کیا تھا لیکن ان کے باطن سے ایک حقیقی صدر برآمد ہوا تو انہوں نے پیپلز پارٹی کی رکنیت ترک کردی اور 8ویں ترمیم کے تحت بے نظیر بھٹو کو برطرف کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ دوسری طرف صدر لغاری کے صدارتی خطابات ہنگاموں سے خالی نہیں تھے۔ ایک خطاب میں ڈیسک کھڑکانے اور نعرہ بازی پر ہی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اپوزیشن کی رکن تہمینہ دولتانہ نے برافراختہ ہو کر اپنا دوپٹہ بھی اتار پھینکا اور لغاری صاحب نے اپنی تقریر شور شرابے اور نعرہ بازی میں مکمل کی۔ تاریخی سانحہ یہ بھی ہے کہ صدر فاروق لغاری کے تیسرے خطاب میں مہمانوں کی گیلری سے اپوزیشن پر جوتے پھینکے گئے اور ایوان میں ہاتھا پائی اور گالی گلوچ بھی ہوا اور اب یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ صدر کے خطاب کے دوران اپوزیشن کے پُر غضب احتجاج، ہنگامہ آرائی اور شور و غوغا کی روایت بھی سیاسی عمل کے ساتھ پروان چڑھتی رہی ہے۔ جسے سابق صدر پرویز مشرف برداشت نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنے ناپسندیدہ سیاستدانوں کو انتخابی عمل سے باہر رکھنے کیلئے ''گریجوایٹ اسمبلی'' منتخب کرائی لیکن پہلے اجلاس کے خطاب میں ہی ان کی وردی کا رعب جم نہ سکا، اور انہیں پرزور اور پر شور احتجاج کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اس پہلے خطاب کے بعد

ایوان اسمبلی میں مکا دکھا کر گئے اور پھر اسمبلی کو "بدتہذیب" بھی کہتے رہے لیکن پانچ سال کے اس دور میں دوبارہ "خطاب" پر آمادہ نہ ہوئے۔ گالی کے ذریعہ شہرت پانے والوں میں مشرف کے ایک سابق وزیر وصی ظفر اور پرویز مشرف کے وکیل احمد رضا قصوری کو بھی حاصل ہے۔ ایک معروف ٹی وی شو میں اپنے مؤکل کے دفاع میں انھوں نے وزیراعظم نواز شریف کو ایسی رذیل گالیاں دیں کہ سننے والوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ شو کے اینکر نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، اور خاموش رہنے کے لیے منت سماجت شروع کر دی لیکن بات نہ بنی۔ یہ شو اس وقت خواجہ سراؤں کی منڈلی بن گیا جب طلال چوہدری نے مشرف کو سائیکل چور اور بھینس چور کہہ دیا۔ احمد رضا قصوری جو پہلے ہی سے غصے میں بھرے بیٹھے تھے یکدم لال بھبھولہ ہو کر آپے سے باہر ہو گئے۔ طلال چوہدری کو بے اعتنائی سے نظر انداز کرتے ہوئے وزیراعظم نواز شریف پر اندھا دھند چڑھ دوڑے، طلال چوہدری کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گرجے اور اخلاق و حدود کی تمام حدیں پار کر گئے۔ اس شو کا سب سے اہم حصہ تجزیہ نگار بابر کے وہ جملے تھے جو انھوں نے کاشف عباسی کو طنزیہ انداز میں کہے انھوں نے کہا کاشف صاحب یہ آپ ہی کا کمال ہے کہ آپ یہ سب کروا لیتے ہیں اپنے پروگرام میں۔ پنجاب اسمبلی گالیوں میں سرفہرست ہے، 2012 میں ہونے والے اکثر اجلاس میں پیپلز پارٹی اور نون لیگ نے گالیوں کا خوب استعمال کیا۔ پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں بدترین ہنگامہ آرائی ہوئی، ارکان میں ہاتھا پائی، گالی گلوچ ہوئی اور تھپڑ بھی

چل گئے۔ ایک دوسرے کیخلاف شدید نعرہ بازی اور الزمات کی بوچھاڑ کے باعث ایوان مچھلی منڈی بنا رہا۔ وزیر اعلی شہباز شریف کیخلاف ریمارکس لکھ کر ایوان میں لہرانے۔ خاتون پر صوبائی وزیر جیل خانہ جات چودھری عبدالغفور کے حملہ اور سینئر صوبائی وزیر راجہ ریاض احمد کی جانب سے مسلم لیگ (ق) کے رکن محسن لغاری کو غدار قرار دینے پر پنجاب اسمبلی کا اجلاس ہنگامہ آرائی کی نظر ہو گیا، جبکہ مسلم لیگ (ق) اور یونیفکیشن گروپ کے رہنما عطا محمد مانیکا نے صوبائی وزیر جیل خانہ جات کے رویہ پر ایوان کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا۔ پنجاب اسمبلی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومتی مرد اراکین کی جانب سے اپوزیشن کی خواتین اراکین کو بدترین تضحیک کا نشانہ بناتے ہوئے ننگی گالی دی گئی اور ''موت کے کنویں میں ناچنے والی خواتین ''قرار دے دیا گیا ہے جس پر اپوزیشن خواتین اراکین نے شدید رد عمل کا اظہار کیا، عمران خان نے عدلیہ کے بارے میں لفظ شرمناک کہا تو اسے ایک گالی سمجھا گیا اور اسو پر خان صاحب کو عالت میں پیش ہو کر معافی مانگنا پڑی، دوسری جان عمران خان کے خلاف ہر طرح کے الزامات اور گالیاں اب اشوشل میڈیا پر بھی دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ سابق وفاقی وزیر فردوس اعواں اور کشمالہ طارق کے درمیاں ٹی وی پر ہونے والے گالی گلوچ اور الزامات سے مزین شو کو بھی لوگ یاد کرتے ہیں، سندھ اسمبلی میں ارباب غلام رحیم پر جوتے پھینکے کا واقعہ گالی سے بڑھ کر ہے۔ پاکستان مین نیوز چینلز پر ہونے والی بحث و تکرار بھی اب گالیوں تک

پہنچ گئی ہیں۔ ان شو میں ایک گالی۔ ایک فتنہ۔ ایک دشنام ان کی ریٹنگ کو بڑھاتا ہے، جس کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ نیوز چینلز جرائم ، خصوصاً جنسی بے راہ روی کے معاملات کو اچھالتے اور "چسکے" لے لے کر بیان کرتے ہیں، مقصد اصلاح معاشرہ نہیں ، ریٹنگ محض ریٹنگ کہ جتنی ریٹنگ زیادہ ہو گی اُتنا ہی زیادہ "دھن" اکٹھا ہو گا۔ دَھن کی "دُھن" میں مست نیوز چینلز مالکان کے حکم پر ترتیب دیئے گئے جرائم پر مبنی یہ پروگرام معاشرے کی اصلاح نہیں ، بگاڑ کا باعث بن رہے ہیں اور کوئی غیرت مند خاندان ایسے پروگراموں کو اکٹھے بیٹھ کر دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ٹاک شوز میں وہ اُدھم مچا ہوتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ یہ عین حقیقت ہے کہ اپنے منہ سے جہالت کا کوئی بھی اقرار نہیں کرتا ماسوائے اُس شخص کے کہ دوسرے نے ابھی بات ختم نہ کی ہو اور وہ اپنی بات شروع کر دے۔ ہمارے اینکرز جو ماشااللہ خود سیاست دانوں سے بھی بڑے سیاست دان ہیں، کسی مہمان کو کَم کَم ہی بولنے کا موقع دیتے ہیں اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات ابھی ادھوری ہوتی ہے اور وہ درمیان میں کود پڑتے ہیں۔ اُدھر ٹاک شوز کے شُرکا کا یہ عالم کہ باہم تُو تکار، محض تو تکار اور کج بحثی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ سبھی بیک وقت بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اینکر خوش کہ ریٹنگ بڑھ رہی ہے اگر نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جائے تو اینکر کی ریٹنگ آسمان کی رفعتوں کو چھونے لگتی ہے۔ مزاحیہ پروگرام "تھیٹروں" میں ڈھل چکے ہیں جہاں پگڑیاں اچھالی جاتی اور ذو معنی جملوں اور پھکڑپَن

کی بھرمار نظر آتی ہے۔ وہی سٹیج اداکار اور اداکارائیں جو کبھی مخصوص جگہوں پر اپنے فن '' کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور جن سے ''مخصوص ذہنیت '' کے لوگ ہی'' مستفید'''' ہوا کرتے تھے ، وہ سب اب الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے گھر گھر پھیل چکے ہیں۔ گالیوں کا یہ چلن پورے معاشرے کے لئے ایک خطرے کی گھنٹی ہے، مادر پدر معاشرے بھی اب حدود و قیود میں آ رہے ہیں تو پاکستان جو ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے، یہاں ان اصولوں اور قوانین اور ضابطہ اخلاق کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا۔

ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور انہیں تسخیر کرنے کا خواب

مریخ پر پلاٹوں کی خرید وفرخت

ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور انہیں تسخیر کرنے کا خواب اب حقیقت کی جانب بڑھ رہاہے اس کا اندازہ مریخ پر پلاٹوں کی بکنگ اور ٹکٹ کے لئے بکنگ سے ہوتا ہے۔ اب یہ امکان پیدا ہوگیا ہے کہ اس صدی کے آخر تک انسانی قدم اس سیارے پر ہوں گے۔ پراسرار اور دور دراز سرزمینیں، نامعلوم سمندر اور نادریافت شدہ جزیرے ہمیشہ ہی سے مہم جوؤں کو اپنی طرف کھینچتے رہے ہیں۔ تاریخ کی کتابیں ایسے سرپھرے مہم جوؤں کے واقعات سے بھری پڑی ہیں جو شدید خطرات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انجانی منزلوں کے سفر پر نکل جاتے تھے۔ کولمبس اور مجیلن ایسے ہی دو نام ہیں مجیلن نے دنیاکے گرد پہلا چکر لگایا تھا۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کرلیا تھا۔ زمین سے انسان اب دوسرے سیاروں کی سرزمین پر جانا چاہتا ہے۔ مریخ کی سرخ پہاڑیاں انسانوں کو اپنی زمیں جیسی ہی لگتی ہیں۔ انسانوں نے ابھی مریخ کی زمین پر قدم نہیں رکھا کہ مریخ پر زمیں کی خرید وفروخت شروع ہو گئی۔ امریکی جریدے نیوز ویک نے اس بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے کہ ایک امریکی کمپنی نے مریخ پر پلاٹوں کی خرید فروخت شروع کر دی ہے۔ اب جب آپ نے یہ طے کرلیا ہے کہ اب چاند پر یا مریخ پر جا کر رہنا ہے تو وہاں گھر بھی

بنیں گے اور پلاٹ بھی فروخت ہوں گے۔ خیال ہے کہ 2018 میں مریخ کے لئے
باقاعدہ فلائٹ شروع ہو جائیں گی۔ لیکن یہ یہ طرفہ ہوں گی، یعنی واپسی کا ٹکٹ ہی نہیں
ہوگا۔ پلاٹ ہیں بھی بہت سستے، صرف 22.99 ڈالر یا 19.99 ڈالر فی ایکڑ، ان
پلاٹوں کی بکنگ لونر ایمبیسی نامی امریکی کمپنی نے شروع کی ہے، جس کے بانی ڈینس
ہولس نے اس کاروبار سے اب تک ایک کروڑ ڈالر کمالیئے ہیں۔ پلاٹ بک کرانے
والے بھی عام لوگ کے ساتھ بڑے لوگ بھی ہیں۔ جن میں امریکی سابق صدر
رونالڈ ریگن اور جارج ڈبلیو بش بھی شامل ہیں۔ مریخ کی چمکدار چٹان سے سائنسدان
حیران ہیں۔ مریخ پر جانے کے خبط میں امریکہ، یورپ کے لوگ ہی نہیں بھارت والے
بھی ہیں۔ بھارتیوں نے مریخ کی جانب قدم بھی بڑھائے لیکن مریخ کی جانب روانہ
ہونے والے بھارتی خلائی جہاز کے انجن فیل ہونے سے ان کا مشن ناکام ہوگیا ہے۔ مریخ
پر جانے والوں کی ابھی بکنگ شروع ہوئی ہے۔ اس لیے شاید یہ بات زیادہ حیران کن
نہیں ہے کہ مارز ون کو ٹکٹ کھلنے سے پہلے ہی ہزاروں امیدوار درخواستیں بھیج چکے
ہیں، حالانکہ یہ وہ سفر ہے جس میں واپسی کی گنجائش نہیں ہے۔ایسے مہم جوؤں کی کچھ
خصوصیات بھی ہوں گی۔ وہ مستقل مزاج ہوں، خود کو حالات میں ڈھالنے کی صلاحیت
رکھتے ہوں، باتدبیر ہوں اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے اہل ہوں۔
آغاز سے ابتدا تک اس تمام سفر کی فلم بندی ریئلٹی ٹی وی کے انداز میں کی جائے
گی۔لندن میں بی بی سی کے دفتر کے دورے میں مارز ون کے شریک بانی بیس لینڈورپ
نے تفصیل بتائی کہ یہ سفر یک

طرفہ کیوں ہو گا۔ وہ کہتے ہیں کہ مریخ کے سات سے آٹھ ماہ تک کے سفر میں خلابازوں کی ہڈیوں اور پٹھوں کی کیت کم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ مریخ کی کم کشش ثقل میں رہنے کے بعد ان کے لیے زمین کی زیادہ طاقت ور کشش ثقل میں اپنے آپ کو دوبارہ ڈھالنا تقریباً ناممکن ہو گا۔ دنیا اسلام میں جہاں ہر معاملے میں حلال و حرام کی بحث ہوتی ہے، مریخ پر جانے کے بارے میں بھی یو اے ای کے علماء نے فتوی جاری کر دیا ہے۔ متحدہ عرب امارات کی اسلامی امور اور وقف کی جنرل اتھارٹی نے ایک فتویٰ جاری کیا ہے جس میں کہا ہے کہ سرخ سیارے مریخ پر جانا اسلام کی روح سے حرام ہے۔ یو اے ای کے اخبار خلیج ٹائمز میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق اس فتویٰ میں کہا گیا ہے کہ ''اس طرح کے یک طرفہ سفر سے انسانی جان کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اور اس کا اسلام میں کوئی بھی جواز پیش نہیں کیا جاسکے گا۔ نیز یہ ممکن ہے کہ جو شخص مریخ سیارے پر جاتا ہے، وہ زندہ نہ رہ سکے اور اس کے موت کے منہ میں جانے کے زیادہ امکانات ہیں''۔ اس اتھارٹی نے خبردار کیا ہے کہ جو لوگ مریخ پر جانے کے خطرناک سفر میں حصہ لیں گے، وہ کسی جائز جواز کے بغیر اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے اور انھیں خودکشی کی حرام موت مرنے والوں کی طرح سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

خلیج ٹائمز نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ یہ فتویٰ نیدرلینڈز کی ''مارس ون کمپنی'' کی جانب سے اپریل 2013ء میں رضاکاروں سے مریخ پر جانے اور وہاں

رہنے کے لیے طلب کردہ درخواستوں کا ردعمل ہو سکتا ہے۔اس تمام مہم کے لیے کمپنی نے صرف اڑتیں ڈالرز فیس طلب کی تھی۔اس مہم کا مقصد مریخ پر انسانوں کو مستقل طور پر بسانا ہے۔اس مہم پر روانہ ہونے کے لیے دنیا بھر کے ایک سو چالیس ممالک سے تعلق رکھنے والے دو لاکھ سے زیادہ رضاکاروں نے اپنے ناموں کا اندراج کرایا ہے۔ان میں سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے پانچ سو افراد بھی شامل ہیں۔اس مہم پر بھیجے جانے والے افراد کے انتخاب کا دوسرا مرحلہ اس سال شروع ہوگا اور مریخ اول کی سلیکشن کمیٹی امیدواروں کے ذاتی انٹرویوز کرے گی۔یو اے ای کی اسلامی اتھارٹی نے اپنے فتوے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ بعض رضاکار محض اس لیے مریخ پر جانا چاہتے ہیں تاکہ وہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے روبرو کھڑے ہونے سے بچ سکیں۔مریخ کا یک طرفہ سفر آٹھ سال بعد 2022ء میں شروع ہوگا اور ڈچ کمپنی کو اس کی قریباً چھے ارب ڈالرز لاگت آئے گی۔اس سفر پر جانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی عمریں اٹھارہ سے چالیس سال کے درمیان ہوں اور ان کی جسمانی صحت اچھی ہو لیکن اس کمپنی کی جانب سے یہ وضاحت سامنے نہیں آئی ہے کہ اگر اس کی مہم روانہ ہی نہ ہو سکی تو پھر لوگوں سے وصول کردہ رقم کیسے لوٹائی جائے گی۔

کامیاب امیدواروں کو جسمانی اور ذہنی تربیت دی جائے گی۔ ٹیم اس منصوبے کے تمام پہلوؤں کے لیے موجودہ ٹیکنالوجی ہی استعمال کرے گی۔ توانائی شمسی

پینلوں سے حاصل کی جائے گی، پانی زمین سے نکالا جائے گا اور آباد کار اپنی خوراک خود پیدا کریں گے۔تاہم کیا یہ سوچنا حقیقت مندانہ ہے کہ انسان مریخ پر بس سکتا ہے؟ مریخ سورج سے خارج ہونے والے طاقت ور ذرات کی مسلسل بمباری کی زد میں ہے، جسے شمسی ہوا کہا جاتا ہے۔ مریخ کی فضا بہت پتلی ہے کیوں کہ خیال ہے کہ شمسی ہوا نے اس فضا کے بڑے حصے کو ختم کر دیا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ مریخ پر آباد کار دو یونٹوں میں رہیں گے جب کہ بقایا یونٹوں میں امدادی ساز و سامان رکھا جائے گا۔ منصوبے کے مطابق اس مریخی بستی میں ہر دو سال کے بعد چار مزید افراد شامل ہوتے رہیں گے۔یونیورسٹی آف ایریزونا کی ڈاکٹر ویرونیکا برے کہتی ہیں کہ مریخ کی سطح زندگی کے لیے انتہائی ناسازگار ہے۔ انھیں اس منصوبے کے بارے میں شکوک و شبہات ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ وہاں مائع پانی نہیں پایا جاتا، ہوا کا دباؤ تقریباً خلا کے برابر ہے، تابکاری بہت زیادہ ہے اور درجہ حرارت میں انتہائی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ 'تابکاری بہت بڑا خدشہ ہے، خاص طور پر سفر کے دوران۔ اس سے سرطان کا خطرہ بڑھ جائے گا، قوتِ مدافعت کمزور ہو جائے گی اور ممکنہ طور پر بانجھ پن پیدا ہو جائے گا۔'تابکاری کے خطرے کو کم کرنے کے لیے مریخی آبادکاروں کو اپنے ٹھکانوں کو کئی میٹر موٹی مٹی کی تہہ سے ڈھانپنا پڑے گا۔ تاہم اس میں مشکلات بھی ہیں۔ ڈاکٹر برے کہتی ہیں، 'مجھے اس بات میں شک نہیں ہے کہ ہم مریخ پر انسان کو بھیج سکتے ہیں۔ لیکن کیا وہ وہاں لمبے عرصے تک رہ پائیں گے؟ ناسا کے خلاباز

سٹین لو ان مشکلات کو اچھی طرح جانتے ہیں کیوں کہ ان کے ساتھی زمین کے نچلے مدار میں بین الاقوامی خلائی سٹیشن پر ان کا تجربہ کر چکے ہیں۔ وہ آلات جو انسانی آلائشوں کو ری سائیکل کرتے ہیں اور 'گذشتہ کل کی کافی کو آئندہ کل کی کافی میں ڈھالتے ہیں، انھیں مستقل دیکھ بھال کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرین قیاس یہ کہ یہ ٹیکنالوجی مریخ پر لمبے عرصے تک کام نہیں کر پائے گی۔' مریخ کو بے رحم سیارہ بھی کہا جاتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین اور مریخ کی فضا ابتدا میں ایک جیسی تھی، لیکن بعد میں مختلف ہو گئی۔ مریخ کی فضا بہت پتلی اور ہلکی ہے، وہاں انتہائی سردی ہوتی ہے، اور پانی جما ہوا اور زیرِ زمین ہے۔ اس بات کے شواہد ہیں کہ ایک زمانے میں مریخ پر پانی کے سمندر پائے جاتے تھے۔ مریخ کی پتلی فضا سطح کی گرمی کو برقرار نہیں رکھ سکتی اور یہ خلا میں ضائع ہو جاتی ہے۔ لو حال ہی میں انٹارکٹیکا کے برفستان سے لوٹے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انٹارکٹیکا 'مریخ کے مقابلے پر پکنک کی طرح ہے۔'' انٹارکٹیکا پانی سے مالامال ہے۔ آپ کھلی فضا میں جا کر سانس لے سکتے ہیں۔ یہ مریخ کے مقابلے پر جنت ہے، لیکن اس کے باوجود آج تک وہاں پر کوئی مستقل طور پر جا کر آباد نہیں ہوا۔' لیکن اس کے باوجود لو مارز ون پراجیکٹ کو سراہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نجی کمپنیاں اس بارے میں لوگوں کی معلومات میں اضافہ کر سکتی ہیں اور ممکنہ طور پر کوئی ایسی ٹیکنالوجی ایجاد کر سکتی ہیں جو مستقبل میں مریخ پر انسانوں کو بسانے میں معاون ثابت ہو سکے۔' ہم

پچھلے 50 برسوں سے یہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ چاند کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مریخ جانے کے لیے درمیانی منزل ثابت ہو گا۔ لیکن جب آپ اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہ بیحد مشکل کام ہے۔' یہ ایک مہنگا منصوبہ ہے۔اس منصوبے کے تحت لوگوں کی پہلی کھیپ بھیجنے پر چھ ارب ڈالر خرچ آئے گا۔آکسفرڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر کرس لینوٹ کہتے ہیں کہ اگرچہ تکنیکی طور پر یہ منصوبہ ممکن ہے، لیکن اس کے لیے رقم اکٹھی نہیں ہو سکے گی'اس مقصد کی تکمیل کے لیے سیاسی عزم اور مالی وسائل درکار ہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جسے آج تک کوئی حل نہیں کر سکا۔'لیکن لینڈورپ کو رقم کی فراہمی میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی۔ وہ اولمپکس کی عالمی براڈکاسٹ کے حقوق سے پیدا ہونے والے سرمایے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ 'یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ ہو گا۔ اسے لوگ 15 سال بعد بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ زمین اور زمین سے باہر کی دنیاؤں کا کھوج لگانا انسان کے ڈی این اے میں ہے۔ ان مہم جوؤں کے مریخ جانے کا خواب ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔' آیا یہ مشن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا یا نہیں، ٹیلی وژن پر درخواست دینے والوں کے براہِ راست دکھائے جانے سے اتنی تشہیر ضرور ہو گی کہ دنیا کی آنکھیں اس مشن پر لگی رہیں گی۔21 سالہ راستوگی ان 1058 درخواست گزاروں میں سے ایک ہیں جنھیں مریخ کے یک طرفہ سفر کے لیے ابتدائی مرحلے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ولندیزی تنظیم 'مارز ون' نے میں مریخ کا یک طرفہ ٹکٹ جاری کرنے کا اعلان کیا 2024

تھا جس کے بعد دنیا بھر سے 20 لاکھ افراد نے مریخ کے یکطرفہ سفر پر جانے کی درخواستیں بھیجی تھیں اور ان میں سے اب تک 1058 کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے، تیسرے اور آخری مرحلے میں صرف 24 افراد کو مریخ کے سفر پر روانہ کیا جائے گا۔ درخواست گزاروں میں امریکہ کے بعد سب سے زیادہ 62 بھارتی شہری شامل ہیں۔

حتمی امیدواروں کو مریخ کے سفر پر روانہ کیے جانے سے پہلے 2015 سے سات سالہ تربیت شروع کی جائے گی۔ منتخب افراد کو خود کو حالات میں ڈھالنے کی صلاحیت حاصل کرنے کی تربیت اور ایک چھوٹے گروہ میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے اور رہنے کا اہل بنایا جائے گا۔ بھارتی درخواست گزاروں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ ان میں طالب علم، چھوٹا موٹا کاروبار کرنے والے، بازارِ حصص کے سٹاک بروکر اور اعلیٰ نوکریوں پر فائز افراد شامل ہیں۔

مثال کے طور پر ان میں مشرقی شہر کلکتہ کے رہائشی 24 سالہ آرندم ساہا بھی شامل ہیں۔ وہ توانائی کے متبادل ذرائع کے شعبے میں کام کرتے ہیں اور انھوں نے مریخ کے سفر کے لیے شادی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ آرندم کے مطابق: 'مجھے شک تھا کہ ایک ایسے شخص سے کوئی خاتون شادی نہیں کرے گی جو مریخ پر

رہائش پذیر ہونا چاہتا ہو۔ اسی لیے میں نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا ہے، میری کوئی محبوبہ نہیں اور نہ ہی شادی کرنے کی کوئی خواہش ہے۔' درخواست دینے کی فہرست میں ممبئی سے تعلق رکھنے والے 45 سالہ سٹاک بروکر اشیش مہتا بھی شامل ہیں۔ اشیش کے مطابق ان کے مستقبل کی منصوبہ بندی میں مریخ کا سفر شامل ہے۔ 'میں 20 سال سے شادی کے بندھن میں ہوں، میرا ایک 19 سالہ بیٹا اور ایک 17 سالہ بیٹی ہے، میں نے اپنے مکان کی قسطیں ادا کر دی ہیں اور پانچ سے چھ کروڑ روپے کا سرمایہ میرے پاس ہے، میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے خاندان کے لیے بہت کچھ کر دیا ہے۔' اشیش کے مطابق: 'جب میں مریخ کے سفر پر روانہ ہوں گا تو اس وقت میرے بیٹے کی عمر 29 سال اور بیٹی کی عمر 27 سال ہو گی۔ اس وقت تک انھوں نے یقینی طور پر اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد شادی کر لی ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ جب میں سفر پر روانہ ہوں تو اپنے پوتوں، نواسوں کو دیکھ کر جاؤں۔' اگرچہ کامیاب درخواست گزاروں کو مریخ کے سفر کے لیے تربیت دی جائے گی لیکن یہ واضح نہیں کہ وہ ایک ایسے سیارے پر گزارا کیسے کریں گے جہاں زندگی کے لیے حالات سخت غیر موافق ہیں۔ مریخ کی فضا بہت ہلکی ہے، وہاں موسم شدید سرد ہے اور پانی ممکنہ طور پر ہے تو سہی، لیکن زیرِ زمین منجمد حالت میں۔ خطرناک تابکار ذرات سے لیس شمسی جھکڑ ایک اور پریشانی ہیں۔ اس کے علاوہ سرمائے اور ٹیکنالوجی کے حصول کے بارے میں بہت سے سوالات حل طلب ہیں۔ ونود کے مطابق زندگی میں ایسا موقع ایک بار ہی آتا ہے اور وہ اسے ہاتھ

سے جانا نہیں چاہتے۔ جیراڈ ہوفٹ جیسے نمایاں سائنس دان حیران ہیں کہ مریخ کے سفر کے لیے سرمایہ کہاں سے حاصل کیا جائے گا کیونکہ منتخب کردہ امیدواروں سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ لیکن مارز ون کے شریک بانی بیس لینڈورپ کو یقین ہے کہ وہ دس سالوں میں انسان کو کامیابی سے مریخ پر اتار سکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کو اس مشن کے لیے چھ ارب ڈالر کی ضرورت ہے اور اس رقم کو ہائی پروفائل عطیات اور نشریاتی حقوق فروخت کرکے حاصل کرنے کا منصوبہ ہے۔ بیس لینڈورپ کے مطابق: اگر لندن اولمپکس تین ہفتے کے ایونٹ میں نشریاتی حقوق اور تشہیری ذرائع سے چار ارب ڈالر حاصل کر سکتا ہے تو مارز ون ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ یہ ایسا ہی ہوگا کہ لوگ اولمپک مقابلے، غیر معمولی لوگوں اور چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔' دریں اثنا بھارتی درخواست گزار مریخ پر انسانوں کو بسانے کے سلسلے میں پرامید ہیں۔ توانائی کے ایک سرکاری ادارے میں مینیجر ونود کوٹیا کے مطابق وہ مریخ پر جا کر مثال قائم کرنا چاہتے ہیں۔ 'میں اس خوف سے نہیں جا رہا کہ زمین پر کسی دن کچھ ہو جائے گا، میں مثال قائم کرنا چاہتا ہوں اور زندگی میں ایسا موقع ایک بار ہی ملتا ہے اور میں اسے کسی صورت میں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ دو سال پہلے مریخ پر بھیجی جانے والی خودکار روبوٹ گاڑی 'کیوروسٹی' کے پہیوں کے نیچے کچلی جانے والی ایک چٹان نے سائنسدانوں کو حیران کر دیا تھا۔ سرخ سیارے کے نام سے معروف مریخ پر پائی گئی یہ چٹان چمکدار سفید رنگ کی ہے اور اسے 'ٹنٹینا' کا

نام دیا گیا ہے۔ چٹان کا یہ غیر معمولی رنگ ایسے ہائیڈریٹ یا آبی خاصیت والے معدنیات کی موجودگی کا اشارہ ہے جو قدیم زمانے میں اس وقت وجود میں آئے تھے جب مریخ کی سطح پر پانی بہتا ہوگا۔ ٹنٹینا میں آبی خاصیت والی معدنیات کی نشاندہی سے اس سیارے پر ماضی میں پانی کی موجودگی کے خیال کو تقویت پہنچی ہے۔ سفید چٹان کی موجودگی کا اعلان امریکی ریاست ٹیکساس میں چاند اور سیاروں کے بارے میں چوالیسیوں سالانہ کانفرنس میں کیا گیا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے اس دریافت کے نتیجے میں اس خیال میں ایک قدم مزید پیش رفت ہوئی ہے جس کے مطابق سرخ سیارہ کبھی زندگی کے لیے سازگار تھا۔ مریخ کے بارے میں کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے چیف سائنسدان جان گراٹزنگر کا کہنا تھا کہ کیوروسٹی مریخ پر جس جگہ اتری ہے وہ اس سیارے پر دریافت ہونے والا پہلا ماحول ہے جہاں زندگی پنپ سکتی تھی۔ امریکی خلائی ادارے ناسا کی روبوٹ گاڑی اگست 2012 میں مریخ پر اتاری گئی تھی۔ اس گاڑی نے جو تصاویر بھیجی ان کے مطابق 'کیمرے نے جو دیکھا ہے وہ چٹانوں کے معدنی ڈھانچے میں موجود پانی ہے۔ یہ پانی ماضی کے آبی دور کا ہے اور اب آبی خاصیت والی معدنیات میں محفوظ ہے۔' امریکی خلائی ادارے ناسا نے کہا ہے کہ مریخ گاڑی کیوروسٹی نے ایک اور اہم دریافت کی ہے۔ مریخ گاڑی نے ایک چٹان میں کھدائی کرکے مٹی کے مرکبات کا سراغ لگایا تھا۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ یا تو پانی کی اندر وجود میں آئے تھے یا پھر پانی ان پر خاصا اثرانداز ہوا ہے۔ مریخ کے لیے کیوریاسٹی کا مشن مہنگے ترین خلائی

پروگرام میں سے ایک ہے۔ امریکی خلائی ادارے ناسا نے سرخ سیارے کی سطح پر اس چلتی پھرتی لیبارٹری کے پروگرام پر ڈھائی ارب ڈالر خرچ کیے تھے۔ مریخ کئی صدیوں سے انسانی تجسس کا مرکز ہے۔ طاقت ور دوربینوں کی ایجاد کے بعد اس سیارے کی سطح کے بارے میں کئی مفید معلومات حاصل ہوئیں اور خلائی سائنس کی ترقی نے تحقیق کے نئے راستے کھول دیے۔ 1965ء میں مریخ کے مدار میں پہلا امریکی راکٹ میرینز فور پہنچا جس سے سیارے پر پانی کی موجودگی کے شواہد فراہم کیے۔ مریخ کی لطیف فضا کے باعث وہاں کیوریاسٹی کا اتارا جانا سائنس دانوں کے لیے ایک کڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔ راکٹ سے الگ ہونے کے بعد کیوریاسٹی کو مریخ کی سطح پر اترنے میں سات منٹ لگے۔ سات منٹ میں کیوریاسٹی کی رفتار 13200 میل فی گھنٹہ کی رفتار سیصفر تک لانا ایک دشوار مرحلہ تھا، جسے سائنس دانوں نے خوف کے سات منٹ کا نام دیا تھا۔ اسے مریخ کی ریتلی سطح پر اتارنے کے لیے پیراشوٹ اور رفتار کم کرنے والے راکٹ انجن استعمال کیے گئے اور یہ منظر ناسا کے مرکزی کنٹرول روم میں سائنس دانوں نے اپنی سانسیں روک کر دیکھا اور اس کے بحفاظت مریخ کی سطح چھونے کے بعد سائنس دانوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ناسا کی جیٹ پروپلشن لیبارٹری کے سائنس دان مینوئل ہوارلیس کہتے ہیں، 'یہ بگولا ویسا ہی ہوتا ہے جو آپ نے فلموں میں دیکھا ہوگا کہ یہ دھول کے ایک ننھے سے ٹورنیڈو کی مانند ہوتا ہے۔ اس مظہر کو سمجھنا بہت ضروری ہے کیوں کہ مریخ کے موسم کا تعین بڑی حد تک انھی بگولوں سے ہوتا ہے۔' یہ گردباد

بعض اوقات پورے سرخ سیارے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ گرد فضا کو بھی گرم کر دیتی ہے۔ کیوروسٹی پر نصب آلات سے پتا چلا ہے کہ گاڑی جس گڑھے کے اندر اتری تھی وہاں عام طور پر ہوائیں مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہیں۔ یہ بات سائنس دانوں کے لیے حیران کن تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ وہاں موجود پہاڑ کی وجہ سے یہ ہوائیں شمال سے مغرب کی جانب چلیں ۔ناسا کی جانب سے مریخ پر بھیجے گئے روبوٹ کیوروسٹی نے مریخ کی زمین کے نمونے بھجوائے ہیں جن کی جانچ پڑتال کے بعد پتا چلا ہے کہ یہ نمونے امریکی جزیرے ہوائی پر ملنے والی مٹی سے ملتے جلتے 'سیم' مٹی کے نمونوں میں سے نامیاتی مرکبات کا اندازہ لگائے گا، یا ایسے مرکبات جن میں کاربن کی موجودگی ہو جن سے مریخ پر حال یا ماضی میں زندگی کے شواہد مل سکیں امریکی خلائی ایجنسی ناسا کا کہنا ہے کہ مریخ پر بھیجی گئی 'کیوروسٹی' نے اپنا پہلا آزمائشی سفر مکمل کر لیا ہے۔ مریخ پر زندگی کی تحقیق میں کیوروسٹی نے اہم کردار ادا کیا ہے، اس تحقیقاتی مشن میں ویسے تو اور بھی آلات تھے۔ لیکن کم کیم سب سے زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کیوں کہ یہ گاڑی کے اوپر لگا ہوا ہے اور اس کے شعاعیں تئیس فٹ کے فاصلے پر پڑے پتھروں تک پہنچتی تھی۔ آلے سے نکلنے والی انفرارڈ شعاعیں ہدف پر ایک ملین واٹ توانائی کے ساتھ پڑتی ہیں اور وہ بھی ایک سیکنڈ کے اربویں حصے سے کم وقت کے لیے۔اس سے چنگاری پیدا ہوتی ہے اور یہ آلہ دوربین کے ذریعے معائنہ کرتا ہے۔ اور پھر سائنسدان رنگوں سے معلوم کرتے ہیں

کہ کس قسم کے کیمیائی عناصر پتھر میں موجود ہیں۔ مریخ پر کیوروسٹی کے دو سالہ قیام کے دوران کم کیم تجربات کے لیے نمونے اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب حضرت انسان جب مریخ پر پہنچیں گے تو پتہ چلے گا کہ زمین کی گود اچھی تھی یا آسمان پر چمکتے سیارے۔

فن پاروں کی چوری

دنیا بھر میں فن پارے، مصوری کے شاہکار، نوادرات، قدیم مخطوطے، تصاویر کی چوری، فروخت، اسمگلنگ ایک کاروبار بن گیا ہے۔ اب یہ فن پارے چوری ہوتے ہیں، اسمگلنگ ہوتے ہیں اور خفیہ طور پر بیچ دیئے جاتے ہیں، اور کبھی کبھی پکڑے بھی جاتے ہیں۔ یہ چوری انفرادی طور پر بھی ہوتی ہے اور حکومتیں بھی اس میں شامل ہوتی ہیں، جو مفتوح قوم کے ثقافتی ورثہ کو بھی لوٹ کر لے جاتی ہیں، یورپ، امریکہ ،برطانیہ فرانس کے عجائب گھر برصغیر سے لوٹے جانے والے ہیرے جوہرات،اور تاریخی نوردارات سے بھرے پڑے ہیں۔ امریکہ نے افغانستان، عراق، شام کے قدیم عجائب گھروں کو خوب لوٹا ہے۔

حال ہی میں نازیوں کے چوری کردہ مصوری کے فن پاروں کو فرانسیسی حکومت نے ان کے حقیقی مالکان کو واپس کردیا ہے۔وزیر ثقافت اوریلی فلیپیٹی کا کہنا تھا کہ فن پاروں کی واپسی ان کی ''اخلاقی ذمہ داری'' تھی۔ ان کا یہ بیان نازیوں کی عالمی جنگ دوئم میں زیادتیوں کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔نازیوں نے یہودی اور غیر یہودی خاندانوں سے مصوری کے فن پارے قبضے میں لے لیے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں چوری شدہ تصاویر فرانس کے عجائب گھر میں نمائش کے لیے آویزاں

تھیں اور امید کی جارہی تھی کہ ان کے مالکان کو یہ واپس کر دی جائیں گی۔ رانس کے دارالحکومت پیرس کے عجائب گھر سے ایک چور نے پچاس کروڑ یورو مالیت کی پینٹنگز چُرا لی ہیں جن میں ہنری متسے اور پابلو پکاسو کے شاہکار فن پارے بھی شامل تھے۔ پیرس میں ایفل ٹاور کے قریب واقع عجائب گھر ''میوسے ڈی آرٹ موڈرن'' سے فن پاروں کی چوری کا انکشاف اس وقت ہوا جب اسے کھولا جا رہا تھا جس کے بعد اسے سیل کر دیا گیا اور پولیس نے اس دیدہ دلیر ڈکیت کی تلاش شروع کر دی ہے جس نے بیش قیمت فن پارے چرائے ہیں۔ تحقیقات کاروں کو عجائب گھر کی ایک کھڑکی ٹوٹی ہوئی ملی ہے اور نگرانی والے کیمروں کی فوٹیج میں صرف ایک چور کو کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ عجائب گھر سے میتسے اور پکاسو کے علاوہ جارجیس براق، فرڈیننڈ لیگر اور آمیڈاو موڈیگلیانی کے فن پارے بھی چُرا لیے گئے ہیں۔ چُرائے گئے تمام فن پاروں کی مالیت کا تخمینہ پچاس کروڑ یورو لگایا گیا ہے۔ پیرس کے اس میوزیم میں لوگوں کا بہت آنا جانا رہتا ہے اور چوری کی اس واردات کے بعد اس کی سکیورٹی اور تحفظ کے بارے میں سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ جو فن پارے چُرائے گئے تھے۔ ان میں ہسپانوی مصور پابلو پکاسو کی 1912ء کی بنی ''ڈوو ود گرین پیاس'' کے عنوان سے پینٹنگ اور ان کے فرانسیسی ہم عصر میتسے کی ''پاسٹورل'' کے عنوان سے پینٹنگ شامل تھی۔ پیرس کے میئر برٹرینڈ ڈیلانیو نے فن پاروں کی چوری پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے اور اسے پیرس میں

عالمی ثقافتی ورثے پر ایک ناقابل قبول حملہ قرار دیا ہے۔ فرانس میں عجائب گھروں سے فن پاروں کی چوری کی وارداتوں میں اضافہ ہونے سے ان فن پاوں کے قدر دانوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ایک اور چوری کے واقعے میں کوٹ ڈی آزور میں واقع ایک نجی ولا سے پکاسو اور ہنری ڈاونیر روسو کی پینٹنگز سمیت کوئی تیس فن پارے چرالیے گئے تھے۔ان کی مالیت دس لاکھ یورو بتائی گئی تھی۔ اس طرح پیرس میں واقع پکاسو میوزیم سے دن دہاڑے بیسویں صدی کے نامور مصور کی ڈرائینگز کی ایک کتاب چُرالی گئی تھی۔اس کی مالیت تیں لاکھ یوروبتائی گئی تھی۔اس کے علاوہ بھی فرانس کے عجائب گھروں سے مصوری کے نمونے چرانے کی متعدد وارداتیں ہو چکی

ہیں۔ سوئیٹزرلینڈ میں ایک میوزیم سے نامعلوم چوروں نے معروف آرٹسٹ پابلو پکاسوکے دونایاب فن پارے چوری کرلئے تھے۔ پولیس ذرائع ابلاغ کے مطابق دونوں فن پاروں کی مالیت 4.5 ملین ڈالر تھی۔ پولیس کے مطابق چند روز قبل نامعلوم چوروں نے ملک کے مشرقی شہر پیسی کون کے ایک میوزیم سے پکاسوکے دو نایاب فن پارے چوری کرلئے۔ یہ فن پارے 1944 اور 1962 میں تخلیق کئے گئے تھے۔

.برطانیہ میں پولیس کو ایک شخص نے ٹاور آف لندن میں داخل ہو کر اس کی چابیاں چرا کر حیران کردیا۔برطانیہ میں تاریخی شاہی مقامات کے منتظم ادارے کے ترجمان کے مطابق چور کے عمارت میں داخل ہونے کا یہ واقعہ حیرت ناک تھا۔ جو چابیاں چرائی گئی تھی۔ وہ عمارت میں موجود ریستوران، کانفرنس روم، اور بوقت ضرورت اٹھائے جانے والے پل کے اندورنی قفل کی تھیں۔ تاہم چابیوں

کی چوری کے بعد تمام تالے بدل دیے گئے ہیں۔ترجمان کے مطابق کراؤن جیولز کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور کسی بھی لمحے ٹاور کی سیکیورٹی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔یونان میں پولیس نے مختلف چھاپوں کے دوران ایسے پینتیس افراد کو گرفتار کیا تھا۔جو زمانہ قدیم کے سکّوں اور فن پاروں کی چوری میں ملوث رہے ہیں۔پولیس نے ان افراد کے قبضے سے ہزاروں سکے اور فن پارے بھی برآمد کیے۔ایک شخص کے پاس سے چار ہزار سے زائد سکے ملے ہیں۔پولیس نے میٹل ڈیٹیکٹرز یعنی دھاتی اشیا کی موجودگی کی نشاندہی کرنے والے آلے بھی برآمد کیے۔یونان میں نوادرات کی غیر قانونی تجارت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ایک اور واقعے میں چوروں نے اولمپک کھیلوں کے ایک عجائب گھر پر حملہ کرکے ایک خاتون محافظ پر قابو پانے کے بعد وہاں سے شہر کے قریب نوادرات چوری کر لیے تھے۔یہ عجائب گھر قدیم المپکس کھیلوں کی تاریخ سے متعلق تھی۔شہر کے میئر کا کہنا ہے کہ ان چیزوں کی قیمت، جن میں سے اکثر کانسی اور مٹی کے مجسمے ہیں، نا قابلِ شمار ہے۔جمہوریہ آئرلینڈ کے دارالحکومت ڈبلن میں تو چوروں نے ایک گرجا گھر سے ڈبلن کے پیٹرن سینٹ کا محفوظ کیا ہوا دل چرا لیا تھا۔یہ دل بارہویں صدی کے سینٹ لارنس او ٹول کا تھا جسے سنبھال کر رکھا گیا تھا اور اسے دیکھنے قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے لوگ یہاں آتے تھے۔اسے ایک دل کی شکل کے ڈبے میں رکھا گیا تھا جس کے گرد مضبوط سلاخوں کا جال تھا۔چوروں نے گرجے میں کوئی دروازہ نہیں توڑا گیا اس لیے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ ممکن

ہے کہ چور رات کو عمارت کے اندر ہی رہے ہوں اور جب صبح اسے کھولا گیا تو چپکے سے نکل گئے ہوں۔ گرجے کے ایک ترجمان کا کہنا تھا کہ یہ چوری ایک عجیب چوری ہے جس میں چور دوسری قیمتی اشیا چھوڑ کر سینٹ کا دل اٹھا کر چلے گئے۔ نوادرات کی چوری اور بازیابی کا ایک اور محیر العقول واقعہ عراقی وزیرِ اعظم نوری المالکی کے دفتر کے کچن میں گتے کے ڈبوں سے ملنے والے زمانہ قدیم کے چھ سو سے زیادہ آثار، کی عراق کے قومی عجائب گھر کو واپسی تھا۔انسانی ہنر اور صناعی کے یہ گمشدہ نمونے جن میں سے کچھ ہزاروں سال پرانے ہیں، مختلف اوقات میں عراق سے باہر سمگل کر دیے گئے تھے اور بالاآخر امریکہ سے ملے۔انھیں سنہ دو ہزار نو میں عراق کو واپس کر دیا گیا تھا لیکن یہ نوادارات ایک مرتبہ پھر کھو گئے تھے۔آثارِ قدیمہ کے محکمے کے وزیر قحطان الجباری نے الزام عائد کیا کہ ان اشیا کی گمشدگی کی وجہ غیر مناسب طریقے سے ان کا عراق کو لوٹایا جانا تھا۔یہ پتہ نہیں چلا سکا کہ یہ اشیا کھوئیں کیسے مگر بعد میں وزیرِ اعظم کے دفتر کے کچن کا سامان رکھنے والے خانوں سے چھ سو اڑتیں نمونے گتے کے ڈبوں میں بند مل گئے۔ان میں سونے کے زیورات اور مٹی کی تختیاں بھی ہیں اور کانسی کی بنی ہوئی مورتیاں بھی۔عراق کے قومی عجائب گھر کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ یہ بہت اہم نوادارات ہیں۔'ان میں سے کچھ اسلام کے ابتدائی دنوں سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ کچھ اتنے قدیم ہیں جتنی بابل کی ابتدائی تہذیب کا غیر سامی دور۔عراق میں سنہ دو ہزار تین میں امریکی سالاری

میں ہونے والے حملے کے بعد افرا تفری کے دوران لاکھوں کی تعداد میں آثارِ قدیمہ کی اشیا لوٹ لی گئی تھیں جن میں سے کچھ کا تعلق لگ بھگ سات ہزار سال قبل کی تہذیبوں سے ہے۔ عالمی کوششوں کے باوجود ابھی تک لوٹے جانے والے آثارِ قدیمہ میں سے صرف نصف کا ہی پتہ چل سکا۔ ایف بی آئی نے نوادرات کی چوری کرنے والے ایک گروہ کو پکڑا بھی، ان کہنا تھا کہ 1990 میں بوسٹن کے ''ازابیلا اسٹیورٹ گارڈنز میوزیم'' سے ایک ارب ڈالر مالیت کے مصوری کے فن پاروں کی چوری میں یہ گروہ ملوث تھا۔ فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن (ایف بی آئی) کے اسپیشل ایجنٹ رچرڈ دلاریئر نے بتایا ہے کہ مشتبہ افراد کا تعلق برطانیہ اور وسطی اٹلانٹک ممالک کی ایک جرائم پیشہ تنظیم سے ہے۔ انہوں نے مشتبہ افراد کی شناخت کے بارے میں تفصیلات نہیں بتائیں۔ فن مصوری کے ان 13 نادر نمونوں کو تلاش کرنیوالے کیلئے 50 لاکھ ڈالر انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ اِن فن پاروں میں ریمبرانت، ورمیر، دیگار اور منات کے مصوری کے معرکۃ الآرا شہ پارے شامل تھے۔ امریکی فن پاروں کی تاریخ کی یہ مہنگی ترین چوری شمار ہوتی ہے۔ ایجنسی کے فیڈرل ایجنٹوں کا کہنا ہے کہ 23 برس قبل چوری ہونے والے اِن فن پاروں کو چوری کے کچھ ہی دنوں بعد فلاڈیلفیا اور کنیٹی کٹ کی طرف لے جایا گیا تھا، اور ایک عشرہ قبل انھیں فروخت کرنے کی کوشش بھی ہوئی تھی۔ اس کیس کی تہہ تک پہنچنے میں مدد دینے کی غرض سے ایف بی آئی نے ایک ویب سائٹ قائم کر رکھی ہے۔ عالمی مصوری کی تاریخ پانچ بڑے ادوار میں تقسیم ہے،

جس میں پہلا دور قبل از مسیح کا ہے۔ اس کے بعد کے ادوار میں قدیم مصوری، مغربی مصوری، مشرقی مصوری اور اسلامی مصوری کے دور شامل ہیں۔ قدیم مصوری کے حوالے سے قبل از مسیح مصوری کے تین دور دکھائی دیتے ہیں، انھیں برسوں کی ترتیب، مصوری اور مجسمہ سازی میں خام مال کے استعمال کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا۔ ان تینوں ادوار میں غاروں اور پہاڑی سلسلوں پر مصوروں نے اپنے فن کا اظہار کیا، ان کے علاوہ دیگر دھاتوں پر بھی آرٹ کے نمونے تخلیق کیے گئے، وہ نمونے آج بھی موجود ہیں۔ یہ زمانہ ہاتھ سے چیزیں بنانے کا تھا۔ اہرام مصر ہوں یا کوئی پینٹنگ، اس میں انسانی طاقت اور ہاتھ ہی استعمال ہوتے تھے۔ قدیم مصوری کے دور میں کئی طرز کا آرٹ تخلیق ہوا، جس کے ذریعے ثقافت اور تہذیبوں کا بول بالا ہوا۔ فن مصوری اور مجسمہ سازی کے حوالے سے قدیم زمانے میں تقریباً پندرہ تہذیبوں نے اپنے فنون میں مقبولیت حاصل کی، لیکن جن کو بام عروج ملا، ان میں چین، ہندوستان، عراق، ایران، مصر، یونان اور روم کی تہذیبیں شامل تھیں۔

مغربی مصوری، جس میں یورپی ممالک کے آرٹسٹوں کا کام سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس خطے میں بھی آرٹ کی تخلیق کا زمانہ بہت پیچھے سے شروع ہوتا ہے۔ عہد حاضر تک اس خطے سے ایک سے بڑھ کر ایک آرٹسٹ سامنے آیا، جن کی صلاحیتیں دیکھ کر انگلیاں دانتوں تلے دبے رہ جاتی ہیں۔ یورپ کے آرٹ کی تاریخ، نو ادوار پر

مشتمل ہے۔ انھیں ہم تحریکوں کے زمانے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان نو ادوار کے ذریعے، اس فن کے چاہنے والوں پر آرٹ کے کئی حیرت انگیز پہلو منکشف ہوئے۔ یہ ادوار مندرجہ ذیل ترتیب سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ پہلا دور قرون وسطیٰ کا فنی دور کہلاتا ہے۔ دوسرا دور فنی نشاط ثانیہ تھا۔ تیسرے دور کو آداب پرستی کے عنوان سے یاد رکھا جاتا ہے۔ چوتھا دور یورپ کے خاص عہد کا طرزِ تعمیر، جسے سترہویں صدی کے فرانسیسی حکمرانوں سے منسوب کیا گیا۔ پانچویں دور میں نوکلاسیکیت اپنے عروج پر تھی۔ چھٹا دور رومان پرستی کا دور تھا۔ ساتویں دور کو حقیقت پسندی کا نام دیا تھا۔ آٹھواں دور جدید آرٹ کا زمانہ کہلایا اور نویں دور کو عہدِ حاضر کہا جاتا ہے، جس میں ہم جی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹی موٹی تحریکوں نے جنم لیا، مگر بنیادی طور پر یہ نو ادوار ایسے ہیں، جن کے ستونوں پر مغربی آرٹ کی تاریخ کھڑی ہے۔

مشرقی مصوری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس خطے میں فن مصوری نے مختلف ثقافتوں اور مذاہب سے اثرات لیے اور فن کی دنیا میں ایسے قدم جمائے کہ مشرقی آرٹ پورے قد و قامت سے مغربی آرٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مشرقی خطے میں جن تہذیبوں نے مصوری پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اپنے جداگانہ فنی اسلوب میں کامیابیاں سمیٹیں۔ مختلف پس منظر رکھنے والی ان تہذیبوں نے ایک دوسرے کے کئی رجحانات کو بھی اپنایا، ان میں چینی، جاپانی، کورین، ہندوستانی، ایرانی

اور دیگر تہذیبوں کے پس منظر والے ملک شامل تھے۔ ان کے علاوہ بحر الکاہل اور نزدیک کے سمندری جزیروں والے ممالک نے بھی اپنے حصے کا فن تخلیق کیا، جس کو مشرقی آرٹ کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔اسلامی آرٹ کے کئی پہلو ہیں، یہاں فن صرف کسی ایک مخصوص میڈیم تک محدود نہیں ہے۔

ان پہلوؤں میں کیلی گرافی، پینٹنگ، ظروف، قالین، عمارتوں اور دیگر اشیاپر بنائے ہوئے مصوری کے فن پارے ہیں۔ ان میں سے کچھ کام تو ایسا ہے، جس کو دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہے اور اس کا اپنا ایک جداگانہ مقام ہے۔ برصغیر کا مغل دور میں تخلیق کیا گیا کام عالمی سطح پر کسی بڑے فن سے پیچھے نہیں ہے۔ تہذیب کا جمالیاتی رنگ لیے ہوئے اس تہذیب کے آرٹ کی دلدادہ پوری دنیا ہے اور اس مصوری کے ماہر مصوروں کو عالمی شہرت حاصل ہے۔آرٹ کے تاریخی سفر میں آرٹ میوزیم کی اہمیت بھی کلیدی ہے۔ مصوروں نے اپنے فن کا اظہار کینوس پر کیا، جب کہ فن سے محبت کرنیوالوں نے ان آرٹ گھروں میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ آرٹ میوزیم جیسی جگہ مصوری کے نادر فن پاروں سے سجائی جاتی ہے، تاکہ آرٹ کے مداح وہاں آکر ان فن پاروں سے روشناس ہو سکیں۔ ان کی رسائی فنی تخلیق تک ممکن ہو، وہ اپنے خیالات کا عکس کینوس پر بکھرے ہوئے رنگوں میں دیکھ سکیں۔

پینٹنگز کی نمائشیں اس فن کے فروغ میں ہمیشہ مددگار رہی ہیں۔ آرٹ کے کئی فن پارے مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ متنازعہ بھی بنے۔ کسی فن پارے کو بہت پسند کیا گیا، کسی کے بارے میں شدید ناراضگی کا اظہار ہوا۔ کئی قیمتی فن پارے چوری بھی ہوئے۔ اصلی فن پاروں کی نقول بنا کر مداحین کو دھوکہ بھی دیا گیا اور چاہنے والوں نے ماسٹرز کی اصلی پینٹنگز منہ مانگے دام دے کر خریدیں۔ پینٹ بنانیوالے اور انھیں پسند کرنے والے دونوں کی دلی ترجمانی کا عکس ان تصاویر میں جھلکتا ہے۔ آرٹسٹوں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جائے، تو دنیا کے کئی ایک نامور آرٹسٹ ہیں، جنھوں نے تکلیف دہ زندگی گزاری، مگر شہرت کی دیوی ان پر مہربان رہی۔ اسی طرح کئی پینٹنگز بھی ایسی ہیں، جن کو بے پناہ پسند کیا گیا، ناقدین کی طرف سے تنقید بھی بے شمار ہوئی، مگر شہرت کے دروازے ان پر کھلے رہے۔

مصر نے کہا ہے کہ ایسے ممالک جن کا دعوی ہے کہ اُن کے نوادرات چوری ہونے کے بعد دوسرے ممالک میں نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ان کی بازیابی کے لیے متحد ہو جائیں۔ مصر کے آثارِ قدیمہ کی سپریم کونسل کے سربراہ ضاہی حواس نے دنیا بھر کے ثقافتی حکام سے اپیل کی ہے کہ وہ اِن نوادرات کی فہرست مرتب کریں۔ مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں نوادرات کی بازیابی سے متعلق منعقد ہونے والی دو روزہ کانفرنس میں بیس ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ ضاہی

حواس نے لیبیا، یونان، اٹلی، چین اور پیرو کے مندوبین کو بتایا کہ 'نوادرات چوری ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ عجائب گھر ہیں۔' حواس کے مطابق اگر اُن کے ممالک چوری شدہ نوادرات کو خریدنے سے انکار کر دیں تو اس صورت میں نوادرات کی چوری کم ہو سکتی ہے۔ حواس نے مندوبین کو بتایا کہ اُن کے ممالک کو نوادرات کی بازیابی کے لیے مل کر کام کرنا ہو گا۔ اُن کا کہنا تھا 'ہر ملک نوادرات کی چوری کے خلاف اکیلا لڑ رہا ہے، اور اکیلا متاثر ہو رہا ہے اس لیے ہمیں متحد ہو کر لڑنا ہو گا۔' کانفرنس کے مندوبین نے اس بات پر غور کیا کہ وہ اقوامِ متحدہ کے ثقافتی ادارے یونیسکو سے اپیل کریں کہ وہ سنہ انیس سو ستر کے بعد چوری ہونے والے نوادرات کی بازیابی کے لیے اقدامات کریں۔ مصری حکام نے چوری شدہ نوادرات کی بازیابی کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ سب سے زیادہ نوادر مصر اور عراق سے چوری کیئے گئے۔ مصر کے آثار قدیمہ کے وزیر نے ایک فرعون کے مجسمے کی چوری کا بھی انکشاف کیا تھا۔ یہ چوری تحریر سکوائر کے قریب واقع مشہور عجائب گھر سے ہوئی تھی۔ آثار قدیمہ کے وزیر زاہی ہواس کا کہنا تھا کہ چوری ہونے والے نوادارت میں فرعون ٹوٹن کامون کا لکڑی کا بنا ہوا ایک مجسمہ بھی شامل تھا۔ وزیر کے مطابق ان اہم اور قیمتی نوادرات کو تحریر سکوائر پر حسنی مبارک کے خلاف ہونے والے عوامی احتجاج کے دوران لوٹا گیا۔ مسٹر ہواس کا کہنا ہے کہ عجائب گھر میں موجود اشیاء کی فہرست کے

مطابق اٹھارہ نوادرات غائب تھیں۔ مصر میں عوامی احتجاج شروع ہونے کے بعد لوگ چھت کے ذریعے عجائب گھر میں داخل ہو گئے تھے اور اس دوران ستر کے قریب نوادرات کو نقصان پہنچا تھا۔ قائرہ کے تحریر سکوائر کے سامنے واقع مصر کا عجائب گھر دنیا بھر میں مشہور ہے جہاں دسیوں ہزار انتہائی قیمتی قدیم نوادرات رکھے ہوئے ہیں جن میں مشہور فرعون ٹوٹن کامون کے مقبرے سے ملنے والے اشیاء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

جسے گیزہ کا عظیم ہرم بھی کہا جاتا ہے گیزہ میں (Pyramid of Khufu) ہرم خوفو تین اہراموں میں سب سے قدیم اور سب سے بڑا ہے۔ذرائع ابلاغ کی رپورٹیں اٹھاکر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ مصر میں آنے والے انقلاب نے جہاں ملک کو سیاسی اتھل پتھل کا شکار کر دیا ہے وہیں کفن چوروں پر مشتمل ایسے گروہوں کو بھی پیدا کردیا ہے ہے جو غیر قانونی طور پر مدفون خزانے تلاش کر کے چاندی کاٹ رہے ہیں۔غزہ کے علاقے میں واقع اہرام کے نزدیک مقیم افراد کا کہنا ہے کہ وہاں زمین میں نمودار ہونے والے گڑھوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور یہ دعوے غلط نہیں۔ایک صحرائی راستے کے قریب اور اہرام سے ذرا دور ہمیں ایک ڈیڑھ میٹر قطر کا گڑھا ملا جس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کیلئے اس میں پتھر پھینک کر تہہ سے ٹکرانے کی آواز سنی گئی۔اس گڑھے سے کچھ فاصلے پر ایک اور سرنگ تھی اور گڑھے کے برعکس اس میں داخلہ نسبتاً آسان تھا۔معائنہ کار جیسے

جیسے اندر جاتے گئے، ہمیں پتھروں پر اوزاروں کے نشانات اور کھدائی کے آثار دکھائی دینے لگے۔اس علاقے میں آثارِ قدیمہ کے انچارج ڈاکٹر اسامہ الکشمی کا کہنا ہے کہ یہ واضح ہے کہ لوگ مدفون خزانوں کی تلاش میں کھدائی کر رہے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب وہ کھدائی کریں گے تو انہیں سونا ملے گا جس سے وہ راتوں رات امیر ہو جائیں گے۔'ڈاکٹر اسامہ کے مطابق اس قسم کے افراد کو روکنا یا انھیں اس عمل سے باز رکھنا خطرناک ہے کیونکہ ان میں سے اکثر مسلح ہوتے ہیں۔غیر قانونی کھدائیوں کا یہ عمل صرف غزہ ہی میں ہو رہا۔ قاہرہ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر دہشور کے مقام پر زمین کھدائی کی وجہ سے چاند کی سطح کا سا منظر پیش کرنے لگی ہے۔یہی نہیں بلکہ سقارہ اور ابوصر میں مسلح افراد نے ایسے گوداموں پر حملے کر کے لوٹ مار کی ہے جہاں حکومت کی سرپرستی میں ہونے والی کھدائی میں دریافت ہونے والے آثارِ قدیمہ رکھے گئے تھے۔اس مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں ہم جنوبی مصر میں الاقصر جا پہنچے جہاں ایک زمانے میں قدیم شہر تھیبز آباد تھا۔ یہاں بادشاہوں کی وادی کے قریب زمین آثارِ قدیمہ کے خزانوں سے مالامال ہے تاہم گذشتہ دو برس میں پولیس کو ان آثارِ قدیمہ کی تلاش میں غیر قانونی کھدائی کی درجنوں شکایات موصول ہوئی ہیں۔

سکیورٹی فورسز نے معائنہ کاروں کو ایک ناقابلِ یقین ویڈیو فوٹیج دکھائی جو

سرنگوں کے ایک پرپیچ اور طویل سلسلہ کے بارے میں تھی جسے حال ہی میں دریافت کیا گیا ہے۔الاقصر میں اکثر غیر قانونی کھدائی کا سلسلہ ان آثارِ قدیمہ کے قریب واقع کسی گھر کے دالان میں شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی نشاندہی اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں مصریات کے استاد پروفیسر کینٹ ویکس کے بقول صورتحال سنگین ہوتی جارہی ہے۔الاقصر میں سیاحت اور آثارِ قدیمہ کی پولیس کے سربراہ بریگیڈیئر حسنی حسین کے مطابق 'غیر قانونی کھدائی ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے لیکن انقلاب کے بعد اس میں اضافہ ہوا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہاں کوئی سیکورٹی ہی نہیں ہے۔' وہ اس امکان کو رد کرتے ہیں کہ مصر میں اب بھی زمین میں نمودار ہونے والے ایسے گڑھے موجود ہیں جن کے بارے میں پولیس کو معلوم نہیں ہے جبکہ اب تک جو بھی خزانہ چوری ہوا ہے اسے برآمد کرلیا گیا ہے۔

بریگیڈیئر حسین کے بقول 'ہمیں اس بات کا علم ہے کہ یہاں کیا ہورہا ہے، لیکن مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ ہماری محنت کی وجہ سے اس ملک میں کہیں سے بھی کچھ چوری نہیں ہوا ہے۔' بدقسمتی سے یہ حقیقت نہیں ہے اور اس کو ثابت کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مصر میں غیر مدفون خزانوں کی تلاش کے کھدائی اور قدیم فن پاروں کی تجارت غیر قانونی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے قاہرہ میں قدیم ساز و سامان فروخت کرنے کی بڑی بلیک مارکیٹ وجود میں آ گئی

ہے۔معائنہ کاروں کا ایک مقامی ساتھی ایسے ہی ایک تاجر سے یہ کہہ کر ملنے گیا کہ وہ ایک برطانوی تاجر کی جانب سے آیا ہے جو مصریات کے ماہر ہیں۔اس تاجر نے معائنہ کار کے دوست پر یقین کیا اور اسے قدیم فن پارے دکھائے جو ان کے بقول 3 ہزار سال پرانے تھے۔اس تاجر نے اپنا چہرہ نہ دکھانے کی شرط پر ان مجسموں کی منظر کشی کی اجازت دی اور ان فن پاروں کی ابتدائی قیمت 5 ہزار ڈالر بتائی۔پرفیسر کینٹ ویکس کا کہنا ہے کہ فن پاروں کی چوری قدیم زمانے سے ہو رہی ہے لیکن گذشتہ دو برسوں اس میں بے حد اضافہ ہوا ہے جبکہ اس طرح کے واقعات کی اہم وجہ معاشی حالات ہیں۔پروفیسر کینٹ ویکس کا خیال ہے کہ گذشتہ کچھ عرصوں مصر کے لوگوں کو ان قدیم ساز و سامان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ 'شاید کئی ہزار قدیم اثاثے چوری ہو چکے ہیں۔ ہمیں تو اس بارے میں علم ہی نہیں ہے۔' غزہ میں رہنے والے مقامی افراد نے بتایا کہ گڑھوں کا نمودار ہونا عام بات ہے جبکہ بعض مرتبہ انھوں نے صحرا میں ان گڑھوں کے قریب ٹرک کھڑے دیکھے ہیں۔۔

کراچی سے سوتیلاپن کب ختم ہوگا؟

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر سراج الحق نے کراچی کو مسائل سے نکالنے کے لیے حکومت سے کراچی کے لیے 100ارب روپے کے ترقیاتی پیکج کا مطالبہ کرکے ایک بار پھر کراچی کے عوام کے دل جیت لیئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے امیر منتخب ہونے کے بعد کراچی میں ان کا والہانہ استقبال اور کراچی کی نبض پر ہاتھ رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت ایک بار پھر اس شہر کے عوام کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتی ہے۔ بابائے کراچی میئر عبدالستار افغانی نے کراچی میں جو ترقیاتی کام کیئے انھیں آج بھی کراچی کی عوام یاد کرتی ہے، کراچی کی ترقی میں نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ نے کراچی کے پہلے ناظم ہونیکی حیثیت سے پہلی بار وفاق سے کراچی کی تعمیر وترقی کیلئے 29ارب روپے کا پیکیج لیا تھا۔ اس پیکیج نے کراچی کو بدل کر رکھ دیا، پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے ساتھ ہی انھوں نے کراچی کو گرین بسوں کے ذریعہ ایسا شاندار ٹرانسپورٹ کا نظام دیا تھا، جس نے کراچی کی شان بڑھادی تھی۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے کراچی کی سڑکوں سے ان بسوں کا نام ونشان ہی نہیں مٹایا بلکہ ٹرانسپورٹ کے سارے نظام کو مافیاکے سپرد کردیا۔ کراچی کے شہری جس طرح آج کل ٹوٹی پھوٹی بسوں کی چھتوں پر اور بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح

سفر کرتے ہیں۔ وہ ایک عبرت ناک منظر ہے۔ دوسری جانب صوبائی حکومت اور وفاقی حکومت نے بھی ان مسائل پر آنکھ بند کر رکھی ہیں۔ اب کراچی والوں کو کبھی انڈر گراونڈ ریلوے کا لالی پاپ دیا جاتا ہے تو کبھی شہر کو لندن اور پیرس اور نیو یارک بنانے کے وعدے کیئے جاتے ہیں۔ کراچی پر تسلسل سے حکومت کرنے والی گذشتہ شہری حکومتوں اور صوبائی حکومت نے بھی ماضی میں ایسے وعدے کئے ہیں۔ کروڑوں روپوں کے خرچ سے فیزیبلیٹی رپورٹ بنی ہیں۔ لیکن کراچی اندھیروں ہی میں ڈوبتا چلا گیا۔ کراچی کو لندن پیرس بنانے والوں نے کراچی کو کراچی بھی نہ رہنے دیا، کراچی کی سڑکیں کبھی دھلا کرتی تھیں، یہاں ٹرام وے چلتی تھی، یہاں پارک اور باغات تھے، یہاں صفائی ستھرائی اس وقت تھی جب یہاں تانگے، بگھی،اور گدھا گاڑی چلتی تھی۔ کراچی میں تقسیم کے وقت بھارت سے آنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ تھی۔ جنھوں نے پاکستان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے واضح اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ سندھ حکومت جو تیسری اقتدار کی ٹرم گزار رہی ہے، وہ نہ تو پنجاب اور نہ ہی خیبر پختوں خواہ کی طرح عوام کو کوئی فلاحی منصوبہ نہ دے پائی۔ کچھ عرصے پہلے عالمی بنک کے نمائندوں نے وزیر اعلی سندھ کو ایک پریذینٹیشن میں ورلڈ کلاس سٹی کے طور پر نیو یارک کی ایک مثال پیش کی، جہاں اعلیٰ ہنر مند اور جدید ورک فورس ہے، ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا ہے، بہترین ٹرانسپورٹیشن اور انفرااسٹرکچر ہے۔ خوشحال صحت مندانہ اور محفوظ ماحول ہے۔۔

پریزینٹیشن میں بتایا گیا کہ کراچی کو ورلڈ کلاس سٹی بننے کے لیے اہم چیلنجز کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اداروں کی تقسیم اور سرکاری سطح پر مربوط نظام کا فقدان، شہری ترقی اور انتظامی صلاحیتوں کا محدود ہونا، بڑھتی ہوئی آبادی اور لینڈ اینڈ ہاؤسنگ مارکیٹس کی طرف سے ضرورتیں پوری نہ کرنا، ٹرانسپورٹیشن کا خراب نظام اور ناکافی انفرااسٹرکچر، جرائم اور عدم تحفظ اور پانی کی قلت بڑے چیلنجز ہیں۔ ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے اداروں کے مابین ایک مربوط اور موثر نظام وضع کیا جائے۔ زمینوں پر سرکاری مالکانہ حقوق کا اثر کم کیا جائے۔ شہری منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کے صلاحیتوں کو بہتر بنایا جائے۔ لینڈ اینڈ ہاؤسنگ مارکیٹس کو زیادہ موثر بنایا جائے تاکہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ پریزینٹیشن میں اربن ڈویلپمنٹ کا معیار بہتر بنانے کے لیے بھی تجاویز دی گئی تھیں جن میں کہا گیا تھا کہ اربن ڈیزائن اور پلاننگ کے نئے قواعد متعارف کرائے جائیں۔ آرکیٹیکچر اور ڈیزائن کا معیار بہتر بنایا جائے اور اس کے لیے اردگرد کے ماحول کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ پارکس، کھلی جگہوں، میدانوں اور فٹ پاتھ وغیرہ کے لیے مستقل سرمایہ کاری کا انتظام کیا جائے۔ بدامنی اور عدم تحفظ کی فضا ختم کرنے کے لیے پریزینٹیشن میں تجویز دی گئی ہے کہ کراچی میں نیویارک سٹی اور لندن کی طرز پر سیکورٹی سسٹم نافذ کیے جائیں۔ مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے ''زیرو ٹالرینس'' ہونی چاہیے۔ انفرااسٹرکچر، ٹرانسپورٹ

اور پانی کی قلت پر قابو پانے کے لیے بھی قابل عمل منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ سب تجاویز فائیلوں میں بند ہو گئی۔ کراچی اب پھر لہو لہو ہے۔ بجلی، پانی، ٹرانسپورٹ کے مسائل نے شہریوں کو بے دم کردیا ہے۔ میاں نواز شریف کراچی میں اب تک نہ امن وامان بحال کرپائے ہیں اور نہ ہی انھوں نے کراچی کے مسائل کے حل کے لئے کوئی پیکیج دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کراچی سے سوتیلے پن کا یہ سلوک ختم کیا جائے۔ اور یہاں کے مسائل کے حل کے لئے ترقیاتی کاموں پر مشتمل پیکیج کا اعلان کیا جائے۔۔

پاکستان کا مٹاپے میں عالمی ریکارڈ دنیا میں نواں نمبر

عالمی ادارہ صحت کے مطابق پاکستان میں تقریباً 19 فیصد مرد اور 25 فیصد خواتین موٹاپے کا شکار ہیں۔ یہ تعداد 2015 تک مردوں میں 27 اور خواتین میں 34 فیصد ہو جائے گی۔

کہاں کی غربت اور کہاں کی بھوک ، پاکستان نے تو اب ایک اور ریکارڈ قائم کر دیا ہے ، یعنی مٹاپے میں بھی ہم نویں نمبر پر کھڑے ہیں۔ دنیا کے ہر تیسرے بالغ اور ہر چوتھے بچے کا وزن مقررہ حد سے زیادہ ہونے سے صحت عامہ کا مسئلہ سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ صحت عامہ کے لیے کام کرنے والی عالمی تنظیموں کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں موٹاپا لوگوں کی صحت کے لیے سگریٹ سے بھی بڑا خطرہ بن کر ابھر رہا ہے۔ان تنظیموں کا کہنا ہے کہ عالمی 'فوڈ انڈسٹری' کو بھی تمباکو کی صنعت کی طرح کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔اس بارے میں تحقیق کرنے والی تنظیموں کا کہنا ہے کہ سہ 2005 میں موٹاپے اور وزن کی زیادتی کی وجہ سے 26 لاکھ افراد ہلاک ہوئے جبکہ پانچ سالوں میں یعنی سنہ 2010 تک یہ تعداد بڑھ کر 34 لاکھ ہو گئی۔شاہدًا اسی وجہ سے اب ڈاکٹر اور محققین یہ سراغ لگا رہے ہیں کہ مٹاپے کی وجوہات کیا ہیں۔ 'لانسیٹ' نامی طبّی جریدے میں واشنگٹن یونیورسٹی کے ہیلتھ میٹرکس اینڈ ایوالویشن ادارے کے محققوں کی ٹیم نے یہ

انکشاف کیا ہے کہ دنیا میں دو ارب سے زیادہ افراد مجموعی طور پر یا موٹے ہیں یا پھر معمول کے وزن سے زیادہ ہیں۔اس تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سنہ 1980 کے بعد سے کوئی بھی ملک اس پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ٹیم کا کہنا ہے کہ انھوں نے عصر حاضر میں عوامی صحت کو درپیش مسائل کا اب تک کا جامع مطالعہ کیا ہے جو سنہ 1980 اور 2013 کیدرمیان 188 ممالک سے حاصل کیے جانے والے اعداد و شمار پر محیط ہے۔ مٹاپے کے بارے میں عام طور پر اب تک اس کا تعلق کھاتے پیتے خوش حال گھرانوں سے سمجھا جاتا تھا لیکن رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے موٹے لوگوں میں سے 62 فیصد لوگ ترقی پذیر ممالک میں ہیں۔چین دوسرے نمبر پر ہے تو بھارت تیسرے نمبر پر۔جب کہ موٹاپے سے متاثر ملکوں میں پاکستان نویں نمبر پر جبکہ امریکہ نمبر ایک پر ہے۔ روس چوتھے، برازیل پانچویں، میکسیکو چھٹے، مصر ساتویں، جرمنی آٹھویں، اور انڈونیشیا دسویں نمبر پر ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کویت، لیبیا، قطر اور سماؤ میں 50 فی صد سے زیادہ خواتین موٹاپے کا شکار ہیں۔سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ موٹاپا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو سستے، چربی دار، میٹھے، نمکین اور زیادہ کیلری والے جنک فوڈ اور آرام طلب طرز زندگی سے بڑھتا ہے۔یونیورسٹی آف واشنگٹن میں انسٹیٹیوٹ آف ہلتھ میٹرکس اینڈ ایویلوئیشن کے ڈائرکٹر کرسٹوفر مرے کا کہنا ہے کہ موٹاپا ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہر عمر اور آمدنی کے لوگوں کو دنیا بھر میں متاثر کر رہا ہے۔' گذشتہ تین دہائیوں میں ایک بھی ملک ایسا

نہیں ہے جس نے موٹاپے کی شرح کم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہو۔' انھوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ 'اگر عوامی صحت کے اس بحران کے تدارک کے لیے فوری طور پر اقدام نہیں کیے گئے تو کم اور متوسط آمدنی والے ممالک میں آمدنی میں اضافے کے ساتھ اس میں متواتر اضافہ ہوگا۔' سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ زیادہ وزن والے لوگوں کو ہمیشہ دل کی بیماریوں، کینسر، ذیابیطس، گٹھیا اور گردے کی بیماریوں کا خطرہ زیادہ رہتا ہے۔ تازہ تحقیق میں کہا گیا ہے موٹاپے میں اضافے سے ان عارضوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جس سے ہیلتھ کیئر نظام بڑے دباؤ میں ہے۔ اس تحقیق کے مصنفوں کا کہنا ترقی یافتہ ممالک میں ایک چوتھائی اور ترقی پذیر ملکوں میں 13 فی صد بچے زیادہ وزن یا موٹے کی قطار میں کھڑے ہیں۔ سنہ 1980 میں یہ شرح 16 اور آٹھ ہوا کرتی تھی۔

تحقیق میں کہا گیا ہے کہ بچوں میں یہ رجحان مشرق وسطی کے ممالک اور شمالی افریقی ممالک میں نظر آتا ہے اور بطور خاص لڑکیوں میں زیادہ ہے۔ امریکہ میں 13 فی صد بچے موٹے ہیں اور اگر معمول سے زیادہ وزنی بچوں کا شمار کیا جائے تو یہ شرح 30 فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔ موٹاپے کی جانب مائل خواتین کی شرح سب سے زیادہ مصر، سعودی عرب، عمان، ہونڈوراز اور بحرین میں ہے تو مردوں میں یہ رجحان سب سے زیادہ نیوزی لینڈ، بحرین، کویت، سعودی عرب اور امریکہ میں ہے۔ صحت کی عالمی تنظیم ڈبلیو ایچ او نے سنہ 2025 تک موٹاپے کی جانب مائل اس

رجحان پر روک لگانے کا ہدف رکھا ہے جس کے بارے میں اس نئی رپورٹ کا کہنا ہے کہ یہ ہدف انتہائی حوصلہ مندانہ ہے اور بغیر مجموعی کوششوں اور مزید تحقیق کے اس کا' حصول ناممکن ہے۔' رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک مقابلے مشرق وسطی، شمالی افریقہ، وسطی امریکہ، بحرالکاہل کے ممالک اور کریبیائی جزائر میں موٹاپے کی جانب تیز میلان جاری ہے۔ عالمی سطح پر موٹاپے کے مسئلے کو اجاگر کرنے کے حوالے سے برطانوی محققین نے ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ لگ بھگ تیس برس کے عرصے میں ترقی پذیر دنیا میں فربہ افراد کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا ہے جس کے بعد ترقی پذیر ممالک میں وزنی یا فربہ افراد کی کل تعداد تقریباً ایک ارب تک جا پہنچی ہے۔ 'اوورسیز ڈیویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ ' کی جائزہ رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں ہر تین میں سے ایک شخص وزن کی زیادتی یا موٹاپے کا شکار ہے لیکن گذشتہ تین دہائیوں میں امیر ملکوں کے مقابلے میں غریب ممالک میں وزنی اور موٹے افراد کی تعداد میں تقریباً دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ دنوں برطانوی روزنامہ دی گارڈین نے فیوچر ڈائٹ نامی رپورٹ میں 1980 کی دہائی سے 2008 کے دوران دنیا بھر کے لوگوں کے کھانے پینے کے اعداد و شمار پر مبنی ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ پچھلے برسوں میں ترقی پذیر ممالک میں موٹاپا کسی وبائی مرض کی طرح پھیلا ہے اور کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ نسبتاً خوشحال ممالک میں 25 ماس انڈیکس 2008 سے زیادہ رکھنے والوں کی تعداد 904 ملین تک جا

پہنچی ہے جبکہ 1980 میں کم ترقی یافتہ ملکوں میں فربہ افراد کی تعداد 250 ملین بتائی گئی تھی اس کے برعکس بلند آمدنی رکھنے والے ممالک میں وزنی یا فربہ افراد کی کل تعداد 557 ملین ہے۔ ریسرچ کے مصنف اسٹیو ویگنز نے کہا کہ ترقی پذیر ممالک میں زیادہ وزن اور موٹاپے کی بڑھتی ہوئی شرح خطرناک ہے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کے کھانے پینے کے موجودہ رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ، عالمی سطح پر کئی موذی امراض مثلاً کینسر کی بعض اقسام، ذیابیطس، ہارٹ اٹیک اور اسٹروک میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ موٹاپے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن خوراک کا انسان کی صحت پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر جن ممالک کے متوسط طبقے کی شہری آبادی کی قوت خرید میں اضافہ ہوا ہے وہ اپنی من پسند خوراک کھانا پسند کرتے ہیں جو زیادہ تر فاسٹ فوڈ پر مشتمل ہوتی ہیں اسی طرح اشتہارات کی بھرمار نے لوگوں کو وقت بچانے اور جلد تیار ہوجانے والی ایسی ریڈی میڈ چیزیں کھانے کی طرف مائل کر دیا ہے جن میں نشاستہ اور چربی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نشاستہ اور چکنائی کا استعمال آہستہ آہستہ لوگوں کو موٹاپے کی جانب دھکیل رہا ہے۔ اس تجزیاتی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عالمی سطح پر اگرچہ 1980 سے 2008 کے دوران موٹاپے کی شرح میں 23 فیصد سے 34 فیصد کا اضافہ نظر آیا ہے لیکن دنیا بھر میں فربہ افراد کی تعداد میں سب سے بڑا

اضافہ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک میں ہوا جہاں موٹاپے کی شرح کا گراف 7 فیصد سے 22 فیصد تک جا پہنچا۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ انفرادی طور پر فربہ ممالک میں موٹے افراد کی اکثریت خاص طور پر ایسے ممالک میں نظر آئی جہاں آمدنیوں میں اضافہ ہوا ہے ان میں چین اور میکسیکو سر فہرست ہیں جہاں اس عرصے میں موٹے افراد کی تعداد میں دوگنا اضافہ ہوا، اسی طرح مشرق وسطی کی زیادہ تر ریاستوں میں تیں برس کے دوران موٹاپے کی شرح میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے. مثلا شمالی امریکہ میں اب بھی بالغ فربہ افراد کی شرح سب سے زیادہ ہے یعنی 70 فیصد ہے اس کے علاوہ 64 فیصد برطانوی شہریوں کو وزن کی زیادتی یا موٹاپے کا شکار بتایا گیا ہے۔ کنسیومرز انٹرنیشنل اور ورلڈ اوبیسٹ فیڈریشن تو موٹاپا بڑھانے والی غذاؤں پر پابندی لگانے کے لیے سخت اقدامات کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ان تنظیموں کا کہنا ہے کہ کھانے کے پیکٹوں پر موٹاپے سے جسم کو ہونے والے نقصان کے بارے میں ویسے ہی اشتہار شائع ہونے چاہییں جیسے سگریٹ کے پیکٹ پر ہوتے ہیں۔ یہ بھی مطالبہ کیا جارہا ہے کہ دنیا بھر میں حکومتوں کو اشیائے خورد و نوش پر لازمی اصول لاگو کرنے چاہییں۔ ایسے نئے قوانین کا مطالبہ کیا جارہا ہے جس میں کھانے کی چیزوں میں نمک، چربی اور چینی کی سطح میں کمی لانے، ہسپتالوں اور سکولوں میں فراہم کیے جانے والے کھانے کے معیار کو بہتر بنانے، اشتہارات پر سخت کنٹرول اور لوگوں کو اس بارے میں آگہی دینے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ مصنوعی

ٹرانس فیٹ' کو آئندہ پانچ سال کے اندر اندر تمام کھانوں اور مشروبات سے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ان تنظیموں کا کہنا ہے کہ ٹی وی پر بچوں کے لیے بنائے گئے پروگراموں کے دوران 'جنک فوڈ' کے اشتہارات پر پابندی ہونی چاہیے۔ورلڈ اوبیسٹی فیڈریشن کی ڈاکٹر ٹم لبسٹین کا کہنا یہ ہے کہ 'اگر یہ کوئی متعدی بیماری ہوتی تو اسے روکنے کے لیے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری ہو چکی ہوتی۔'لیکن چونکہ موٹاپا چربی اور چینی والے کھانوں کے استعمال سے ہوتا ہے اس لیے پالیسی ساز کارپوریٹ اداروں کے مفادات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سلسلے میں اقدامات کرنے کے خواہش مند نہیں نظر آتے۔'مسٹر ویگنز نے حکومتوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ فاسٹ فوڈ اور موٹاپا پیدا کرنے والی خوراک میں چربی کی مقدار کم کرنے کے لیے حکومتی سطح پر بالکل ویسے ہی اقدامات کرنے چاہیئں جیسے سگریٹ نوشی کے خلاف کئے گئے ہیں موٹاپا جہاں کئی بیماریوں کا باعث بنتا ہے وہیں ایک حالیہ تحقیق کے مطابق موٹے افراد میں ذہانت کی سطح بھی دبلے افراد کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔فرانسیسی طبّی ماہرین کی تحقیق کے مطابق جیسے جیسے جسمانی وزن بڑھتا ہے آئی کیو کی سطح کم ہوتی جاتی ہے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ موٹاپے کے باعث جسم میں چربی جمع ہوجاتی ہے جس سے ایسے کیمیکل خارج ہوتے ہیں جو سوچنے سمجھنے والے ہارمونز کی کارکردگی کو سست کردیتے ہیں جبکہ موٹاپے کے باعث دماغ کو خون پہنچانے والی رگوں میں بھی چکنائی جم جاتی ہے جو دماغ کی صلاحیت پر اثرانداز ہوتی ہے۔کچھ لوگ موٹا

پا کم کرنے کے ورزش کو بہترین حل تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ کیا کہ اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ زیادہ ورزش سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ برطانوی غذائی ماہر زوئے ہرکومب نے اپنی کتاب میں خوراک اور ورزش سے متعلق موجود عام تصور کو یکسر طور پر رد کرتے ہوئے نئے انکشافات کیے ہیں۔ زوئیکے مطابق بہت زیادہ ورزش کرنا بھی موٹاپے کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ زیادہ ورزش کرنے سے بھوک زیادہ لگتی ہے اور خوراک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ زوئے نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ گوشت کا استعمال پھلوں سے زیادہ فائدہ مند ہے کیونکہ پھلوں میں موجود چینی جسم میں جا کر چکنائی کے طور پر جمع ہو جاتی ہے جبکہ گوشت میں موجود وٹامن اور منرلز جسم کے لیے نہایت فا ئدہ مند ہیں۔ کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عام تصور کے بر عکس نشاستے کا زیادہ استعمال بھی موٹاپے کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمارے ماہرین بھی اس بارے میں لوگوں اکو متنبہ کرتے ہیں ، بین الاقوامی مرکز برائے کیمیائی وحیاتیاتی علوم (آئی سی بی ایس) جامعہ کراچی کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال چوھدری کا اس بارے میں کہنا ہے کہ صحت مند انسان کے لئے مٹاپے کا مرض ایک چیلنج ہے، دوسرے ممالک کی طرح پاکستان میں بھی مٹاپے کا مرض خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے، دس مہلک امراض میں سے پانچ کا تعلق موٹاپے سے ہے۔ جس میں امراض قلب، شوگر، ہائی بلڈ پریشر، فالج، مثانے سے متعلق امراض، سانس کے امراض، کینسر و دیگر امراض بھی شامل ہیں،

پاکستان میں مٹاپے کی وجہ شہری

علاقوں میں کولیسٹرول والے کھانوں کا کثرت سے استعمال اور ورزش نہ کرنا ہے۔
عالمی ادارہ صحت کے مطابق پاکستان میں تقریباً 19 فیصد مرد اور 25 فیصد خواتین موٹاپے کا شکار ہیں۔ یہ تعداد 2015 تک مردوں میں 27 اور خواتین میں 34 فیصد ہو جائے گی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا بھر میں 40 کروڑ افراد زائد وزنی ہیں۔
ماہرین مٹاپے سے نجات کے لیئے کہتے ہیں کہ طرز زندگی میں تبدیلی وزن میں کمی کا سبب بن سکتی ہے۔ کولڈ ڈرنک کا بہترین متبادل لیموں پانی اور لسی ہو سکتی ہے۔ فائبر فوڈ یعنی دالوں، کچی سبزیوں اور پھلوں کا غذا میں استعمال شامل کرنے سے بھی وزن کی زیادتی رک سکتی ہے۔ جبکہ اسپغول کی بھوسی کا دن میں ایک مرتبہ استعمال بھی وزن کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق روزانہ کم از کم 20 منٹ کی واک اور ایکسرسائز ضروری ہے۔ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اشتہاری دواؤں سے وزن کم کرنے کی کوشش خطرناک ثابت ہو سکتی ہے جو مختلف بیماریوں کا سبب بھی بن سکتی ہے اور دوائیں روک دینے کے بعد وزن ڈبل بھی ہو سکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق وزن کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کھانا کم کھائیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے کھائیں، یعنی ناشتے، دوپہر یا رات کے کھانے کے دوران اگر بھوک لگے تو سلاد یا پھل کھالیا جائے لیکن شرط یہی ہے کہ ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا سادہ اور کم کھائیں۔ سبز چائے کا استعمال کریں جو اگر وزن کم نہیں کرتا تو اسے بڑھنے بھی نہیں دیتا۔ برطانیہ کے دنیا مین فربہی کے لحاظ سے سب

سے زیادہ شرح کے حامل ہونے کے باوجود ہیلتھ سروس کا ردعمل ناکافی ہے۔ رائل کالج آف فزیشنز والے کہتے ہیں کہ برطانیہ میں بہت سارے ڈاکٹر اور نرسیں اس قدر موٹی ہیں کہ ان مریضوں کے لئے جن کی فربہی کا وہ علاج کر رہے ہیں۔ مثال قائم کرنا ناممکن ہے۔ برطانیہ میں تقریباً 25 فی صد آبادی موٹی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی سب سے بڑی میڈیا کمپنی والٹ ڈزنی نے کہا ہے کہ وہ اپنے ٹیلی وژن، ریڈیو اور آن لائن پروگراموں میں 'جنک فوڈ' یعنی بازاری کھانوں کے اشتہارات پر پابندی لگائے گی۔ کمپنی کا کہنا ہے کہ وہ امریکہ کے بچوں میں موٹاپے کے روز افزوں مسائل سے نمٹنے کے لیے یہ نیا معیار قائم کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ نئے ضابطے سن دو ہزار پندرہ سے قبل نافذ نہیں ہوں گے۔ امریکہ میں جنک فوڈ' اور میٹھے مشروب بنانے والی کمپنیاں سالانہ ایک ارب ڈالر بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے اشتہارات پر خرچ کرتی ہیں ۔ڈزنی کے مطابق ایسے کھانے جس میں دس گرام سے زیادہ شکر ہو گی یا ایسا کھانا جس میں چھ سو سے زیادہ کیلوریز ہوں گی وہ اس کی تشہیر نہیں کرے گی۔ پاکستان کو بھی اب خطرے کی گھنٹی کا احساس ہونا چاہیئے۔ اور اپنے شہریوں کو صحت مند کھانوں کی جانب راغب کرنا چاہیئے۔

فن کاروں کی ڈھکی چھپی باتیں

اداکاروں کے انگنت پرستار اپنے پسندیدہ فنکاروں کی زندگی کے بارے میں ہر بات جاننا چاہتے ہیں اور ہر وقت منظر عام پر رہنے کی وجہ سے ان اسٹارز کی زندگی بھی کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن، بہت سے اداکاروں اور فنکاروں کی زندگی کے کچھ راز ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔

فن کی دنیا دیوانی ہوتی ہے، فنکاروں کے چاہنے والے بھی اپنے محبوب فن کاروں سے والہانہ محبت رکھتے ہیں، اداکاروں کے انگنت پرستار اپنے پسندیدہ فنکاروں کی زندگی کے بارے میں ہر بات جاننا چاہتے ہیں اور ہر وقت منظر عام پر رہنے کی وجہ سے ان اسٹارز کی زندگی بھی کھلی کتاب کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن، بہت سے اداکاروں اور فنکاروں کی زندگی کے کچھ راز ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ایشوریا رائے بچن کروڑوں دلوں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ اپنی خوبصورتی کے بل پر کروڑوں لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والی ملکہ حسن ایشوریہ رائے بچن کے بارے میں ان پر مرنے والے پرستار بھی شاید یہ نہیں جانتے کہ ایشوریہ رائے کو ایک دو نہیں بلکہ چھ زبانیں آتی ہیں۔ تولو، تیلگو

اور مراٹھی کے علاوہ فلم ’رین کوٹ‘ کے لئے ایش نے بنگالی بھی خصوصی طور پر سیکھی۔ لیکن جناب دنیا بھر میں شہرت حاصل کرنے سے پہلے ایشوریہ ایک ٹی وی سیریل کی ڈبنگ جاب کے لئے بھی رجیکٹ کر دی گئی تھیں۔ کرینہ کپور کا نام کس طرح رکھا گیا یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ کرینہ کے دنیا میں آنے سے پہلے ان کی والدہ جو کتاب پڑھ رہی تھیں اس کا نام تھا ’اینا کرنینا‘۔ تو بس جب کرینہ اس دنیا میں آئیں تو ان کی والدہ نے ان کا نام کرینہ ہی رکھ دیا۔ بالی وڈ کے 500 کروڑ کلب میں داخل ہونے والی واحد میگا ہیروئن دپیکا پڈکون ’’ریس 2‘‘، کوک ٹیل‘‘ اور’’ چنائی ایکسپریس‘‘ سے لے کر’’ گولیوں کی راس لیلا۔ رام لیلا‘‘تک بیک ٹو بیک ایک سے بڑھ کر ایک ہٹ دے چکی ہیں۔ وہ اس وقت بالی وڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ ہیں اور ان کو جس چیز کا سب سے زیادہ شوق ہے وہ ہے ’کھانا‘۔ جی ہاں۔۔ دیپکا کو کھانے پینے کا بے حد شوق ہے۔ ویسے ان کا پرفیکٹ فیگر دیکھ کر اس بات پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ورسٹائل ایکٹریس کے طور پر اپنی شناخت بنانے والی ودیا بالن کو شہرت اور نام حاصل کرنے کے لئے بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ انہوں نے بالی وڈ میں کامیابی سے پہلے بہت سے کمرشلز میں کام کیا۔ لیکن، فلموں میں قسمت آزمائی کی تو ساؤتھ میں بھی کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ فلم ’پری نیتا‘ کے لئے ودیا کو 40 اسکرین ٹیسٹ دینے پڑے اور 17 مرتبہ میک شوٹس کروانے پڑے۔ شلپا شیٹھی کو بھلا کس چیز سے خوف آتا ہے۔۔۔ جی ہاں

شلپا کو ڈر لگتا ہے ڈرائیونگ سے۔ شلپا ڈرائیو نہیں کر سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جاتی ہیں ڈرائیور کے ساتھ ہی جاتی ہیں۔ بالی وڈ کی باربی ڈول کترینہ کیف بہت مذہبی ہیں۔ وہ اپنی ہر فلم کی ریلیز سے پہلے سیدھی وینائیک مندر، ماؤنٹ میری چرچ اور درگاہ اجمیر شریف کا دورہ کرتی ہیں۔ کترینہ کے بارے میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ بھارت کی ایسی خاتون ہیں جن کی سب سے زیادہ تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا اور یہ ثابت کر دکھایا سابقہ مس یونیورس سشمیتا سین نے۔ سشمیتا سین کا پالتو جانور کوئی کتا، بلی نہیں بلکہ ایک اژدھا ہے۔ فلموں میں ایکٹنگ کے علاوہ ڈمپل بیوٹی پریتی زنٹا غیر ملکی نشریاتی ادارے بی بی سی آن لائن کے ساوٴتھ ایشیا سیکشن کے لئے کالم بھی لکھتی ہیں۔ ایکٹنگ اور سنگنگ میں اپنی صلاحیتیں منوانے والی پریانکا چوپڑہ کو جے پی دتہ نے فلم 'امراوجان' کا ٹائٹل رول آفر کیا تھا جو انہوں نے 'بلف ماسٹر' کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ یہی کردار بعد میں ایشوریہ رائے بچن نے ادا کیا۔ پریانکا پہلی بھارتی ایکٹریس ہیں جن کو بین الاقوامی ڈیزائنر برانڈ 'گیس' کا فیس منتخب کیا گیا۔ پرینتی چوپڑہ پڑھائی میں بہت تیز تھیں اور انہوں نے 12 اسٹینڈرڈ ایگزامز میں پورے بھارت میں ٹاپ کیا تھا اور انہیں اس کارنامے پر بھارتی صدر کی جانب سے اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔ فلم نگری جوائن کرنے سے قبل پرینیتی مانچسٹر میں رہتی تھیں اور مشہور فٹ بال کلب مانچسٹر یونائیٹڈ کے لئے کام کرتی تھیں نرگس

فخری کے بارے میں اطلاعات ہیں کہ وہ ڈیوڈ دھون کی فلم 'میں تیرا ہیرو' کی پروموشن مہم بیچ میں ہی چھوڑ کر اپنی پہلی ہالی وُوڈ فلم کی شوٹنگ کے لئے نیویارک پہنچ گئی ہیں۔ نرگس فخری ہالی وُوڈ پروڈیوسر پال فِگ کی فلم میں سیکریٹ ایجنٹ کا کردار ادا کر رہی ہیں جبکہ 'میں تیرا ہیرو' میں ورون دھون ان کے ہیرو ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ نرگس کی پہلی بالی ووڈ فلم رنبیر کپور کے ساتھ 'راک اسٹار' تھی جبکہ مدراس کیفے' میں بھی انہوں نے اپنی اداکاری کے ہنر دکھائے تھا۔ ماڈل سے ایکٹر بننے' والی نرگس فخری شاہد کپور کے ساتھ فلم 'پھٹا پوسٹر نکلا ہیرو' کا ایک گانا بھی پکچرائز کراچکی ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کونسا اداکار ہے جو ٹام کروز اور ٹام ہینکس سے زیادہ امیر ہے؟' امریکہ کے 'اے بی سی نیوز' ٹیلی ویژن کے مارننگ شو میں شرکا نے بتایا کہ، 'یہ اداکار ٹام سلیک بھی نہیں، بلکہ شاہ رُخ خان ہیں'۔ اگر آپ نے اُن کے بارے میں نہیں سنا، تو یہ کوئی حیران کُن بات نہیں ہوگی۔ ہاں، اگر آپ امریکہ سے باہر ہیں، تو معاملہ دیگر ہو سکتا ہے'۔ گڈ مارننگ امریکہ' میں بتایا گیا کہ 48 برس کے شاہ رُخ خان بھارتی فلمی صنعت کے بڑے ستاروں میں سے ایک ہیں، جو بالی ووڈ کے نام سے مشہور ہے۔ شاہ رُخ خان کو 'ٹام کروز آف انڈیا' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، جِن کا معاوضہ 'مشن امپوسبل' کے اداکار کے مساوی ہے۔ درحقیقت، کبھی کبھار اِس بھی زیادہ۔ شاہ رخ خان فلم میں کام کرنے کا معاوضہ 12 کروڑ ڈالر لیتے ہیں، جو 'ویلتھ ایکس'

نام کے تحقیقی ادارے کے مطابق، ٹام کروز کے معاوضے سے کہیں زیادہ ہے۔شاہ رُخ خان نے بھارتی ٹیلی ویژن میں کردار سے اپنی ایکٹنگ کا آغاز کیا، اور 1992 میں دیوانہ' اُن کی پہلی ہٹ فلم تھی۔ 'ویلتھ ایکس' ادارے کے مطابق، ہالی وڈ اور بالی وڈ' کے امیر ترین اداکاروں میں

۔ جیری سائن فیلڈ، 82 کروڑ ڈالر، 2۔ شاہ رُخ خان، 60 کروڑ ڈالر، 3۔ ٹام کروز، 1 کروڑ ڈالر، 4۔ ٹیلر پیری، 45 کروڑ ڈالر 5۔ جانی ڈیپ، 45 کروڑ ڈالر، 6۔ جیک 48 نکل سن، 40 کروڑ ڈالر، 7۔ ٹام ہینکس، 39 کروڑ ڈالر، 8۔ بِل کوسبی، 38 کروڑ ڈالر، ۔ کلنٹ ایسٹ وڈ، 37 کروڑ ڈالر، شامل ہیں۔فنکاروں میں بہت سے ایسے بھی ہیں۔ 9 جو اصل زندگی میں 'حاتم طائی' سے کسی طور کم نہیں۔ ان کی فراخدلی کا یہ عالم ہے کہ کسی کے کام سے خوش ہوئے تو سادہ سا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر مہنگے مہنگے تحفوں کی بارش کر دیتے ہیں۔اب شاہ رخ خان کی مثال ہی لے لیجیئے۔ وہ جب بھی کسی سے خوش ہوتے ہیں یا تو مہنگی ترین گاڑی تحفہ دے دیتے ہیں یا کوئی اور ایسا ہی مہنگا سا کوئی گفٹ۔ 'انٹرٹیمنٹ ون انڈیا' ویب سائٹ کے مطابق 'اوم شانتی اوم' کے ایک چھوٹے سے گانے میں کام کرنے کا زیادہ تر فنکاروں نے ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ مگر، شاہ رخ خان نے ان 31 فنکاروں کو شکریہ کے طور پر انتہائی مہنگے اور قیمتی تحفے دیئے۔اتنا ہی نہیں، بلکہ فلم کی ریلیز کے بعد فلم کی کاسٹ میں شامل ارجن رامپال اور انوبھو سنگھ سمت دیگر کو بطور تشکر پانچ بی ایم ڈبلیو سیون کاریں تحفے میں

دے دیں، جبکہ ایک کار کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے۔

امیتابھ بچن نے فلم میکر ودھو ونود چوپڑا سے فلم 'ایک لو ویا' میں کام کرنے کا صرف ایک روپیہ معاوضہ لیا تھا۔ لیکن، ونود نے بدلے میں انہیں انتہائی قیمتی اور دنیا کی مہنگی ترین گاڑیوں میں سے ایک 'رولز رائس فینٹم' کار تحفے میں دی۔ سلمان خان بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جو نا صرف سب کے بہی خواہ ہیں، بلکہ جن سے پیار کرتے ہیں انہیں اکثر و بیشتر قیمتی تحائف سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کے حوالے سے پچھلے دنوں یہ افواہ بھی گردش کر رہی تھی کہ انہوں نے کترینہ کیف کو دو قیمتی گاڑیاں تحفے میں دی تھیں۔ ایک 'بلیک ایس یو وی' اور دوسری 'آڈی'۔ اِن گاڑیوں کی قیمت کروڑوں روپے بنتی ہے۔ وہ فلم 'باڈی گارڈ' کی تیاری کے دنوں میں اپنی ساتھی فنکارہ کرینہ کپور کو ان کی سالگرہ کے موقع پر بی ایم ڈبلیو اور راج ببر کو مرسیڈیز بھی گفٹ دے چکے ہیں۔ کرن جوہر کی فلم 'اگنی پتھ' کے آئٹم سانگ 'چکنی چنبیلی۔۔' میں کام کرنے کا معاوضہ کترینہ کیف نے ایک پائی بھی نہیں لیا۔ لیکن، کرن نے کترینہ کو گفٹ میں دنیا کی مہنگی کاروں میں سے ایک 'فراری' کا تحفہ دے کر خود انہیں حیران کر دیا۔ اسی طرح، ادیتیہ چوپڑا رانی مکھرجی کو تحفے میں سوا کروڑ مالیت کی گاڑی 'آڈی اے ایٹ ڈبلیو 12' بطور تحفہ دے چکے ہیں۔ ابھیشیک اور ایشوریہ رائے بچن کی بیٹی ارادھیہ اور بھی زیادہ لکی ہیں۔ جس وقت ان کی عمر صرف چار ماہ

تھی انہیں ابھیشیک نے پہلے 'آڈی ایٹ' کار، پھر ایک مکان اور اس کے بعد 'بی ایم ڈبلیو منی کوپر' کار تحفے میں دی۔ اس کی مالیت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ عامر خان کی بات کریں تو جب ان کے بھتیجے عمران خان کی پہلی فلم 'جانے تو۔۔یا جانے نا' کامیاب ہوئی تو عامر نے انہیں 'بی ایم ڈبلیو' کار تحفے میں دی۔ اور جب ان کی فلم 'مترو کی بجلی کا من ڈولہ' بن کر تیار ہوئی تو فلم کے ڈائریکٹر وشال بھردواج نے انہیں ایک قیمتی موٹر سائیکل 'رائل ان فیلڈ 500 سی سی' تحفے میں دی۔ 10۔ ایڈم سینڈلر، 34 کروڑ ڈالر کسی بھی چیز کو خوش بختی کی علامت سمجھ کر اپنا لینا ایسا ٹرینڈ ہے جو بالی وڈ کے لئے بھی نیا نہیں۔ شاہ رخ خان سے لے کر کترینہ کیف تک سب ہی اپنی قسمت کے ستارے کو عروج پر رکھنے کے لئے کسی نہ کسی چیز کا سہارا لیتے ہیں اور اسے اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنائے رکھتے ہیں۔ کچھ اسٹارز تو توہم پرست ہونے کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ لیکن، چند ایسے بھی ہیں جو انکاری ہیں۔ بالی وڈ کے چمکتے ستاروں کی جگمگاہٹ میں کون کون سی چیزوں کا کردار بنیادی ہے۔ بالی وڈ کے بادشاہ شاہ رخ خان نے انڈین پریمئر لیگ میں اپنی ٹیم 'کولکتہ نائٹ رائیڈرز' کی شرٹ کے کلر کو بلیک سے پرپل کرنے کی تردید کرتے ہوئے پرزور انداز میں کہا کہ وہ بالکل بھی توہم پرست نہیں۔ لیکن سب ہی شاہ رخ کی گاڑیوں کے نمبر 555 کے حوالے سے ان کے جنون سے واقف ہیں۔ عامر خان سمجھتے ہیں کہ سال کا آخری مہینہ دسمبر ان کے لئے بہت 'لکی' ہے اور ان کی جو فلم بھی

دسمبر میں ریلیز ہوئی میگاہٹ سے کم نہیں رہی۔ یہی نہیں بہت سے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ عامر خان اور ان کی فلم میکر بیگم کرن راؤ نے سروگیسی کے ذریعے پیدا ہونے والے اپنے بیٹے آزاد کی پیدائش کا مہینہ بھی دسمبر رکھوایا تھا۔ڈرٹی پکچرز کی ریکارڈ توڑ کامیابی نے ودیا بالن کو بھی توہم پرست بنا دیا اور اب سرخ کے علاوہ ان کو اور کوئی رنگ بھاتا ہی نہیں۔ ودیا کا سرخ رنگ کے بارے میں جذباتی ہونا اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے فلم 'فراری کی سواری' کے لئے آئٹم سونگ میں بھی ہری کے بجائے سرخ ساڑھی پہننے کی ضد کی۔ ودیا کا ایک اور جنون۔۔ ایک خاص پاکستانی برانڈ کا کاجل بھی ہے جو وہ اپنی آنکھوں کو مزید خوبصورت بنانے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ باربی ڈول کترینہ کیف بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں۔ اپنی ہر فلم کی ریلیز سے پہلے کترینہ کا اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دینا لازمی ہے۔ کترینہ کو ایک مرتبہ شارٹ اسکرٹ پہن کر درگاہ پر جانے پر شدید تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن کترینہ نے فلم کی ریلیز سے پہلے درگاہ پر کامیابی کی دعا کرنے کا روٹین نہیں بدلا۔ بھارتی اخبار 'مڈ ڈے' کا کہنا ہے کہ نئی نسل بھی توہم پرستی میں پیچھے نہیں۔ رنبیر کپور اپنی والدہ نیتو سنگھ کو اپنے لئے بہت لکی سمجھتے ہیں اور اپنی گاڑی کی نمبر پلیٹ نیتو کی تاریخ پیدائش کی مناسبت سے 8 رکھا ہے۔ رنبیر نیتو کو اپنی اکثر فلم پروموشنز پر بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ لیکن فلم 'بے شرم' میں نیتو کی موجودگی بھی رنبیر کے لئے کوئی

جادو نہ دکھا سکی اور فلم ناکام ہو گئی۔ بالی وڈ کے ہیوی ویٹ سلمان خان کے لئے خوش قسمتی کی علامت داہنے ہاتھ میں پہنے جانے والا نیلم کا بریسلیٹ ہے جو وہ کبھی خود سے جدا نہیں کرتے۔ سلمان کو لگتا ہے کہ یہ بریسلیٹ انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ سلمان اپنی فلمیں ہمیشہ عید پر ریلیز کرتے ہیں کیونکہ 'وانٹیڈ'، 'دبنگ'، 'باڈی گارڈ'، 'ایک تھا ٹائیگر'۔۔یہ سب فلمیں عید پر ریلیز ہوئیں اور میگاہٹ رہیں۔ سنجے دت بالی وڈ کے ماچو مین سنجے دت 'نمبرلوجی' پر اعتقاد رکھتے ہیں اور نمبر 9 کو اپنے لئے خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ سنجے 4545 عدد کو اپنی گاڑیوں کی نمبر پلیٹ کا حصہ بناتے ہیں جسے جمع کریں تو 9 کا ہندسہ بنتا ہے۔ کرینہ نمبر 3 جبکہ سیف علی خان 7 کو لکی مانتے ہیں۔ان کی ہر کار کا نمبر بھی لکی نمبر کے حساب سے ہی ہوتا ہے۔

دیپکا پڈکون بہت لکی ایکٹریس ہیں۔ وہ ایسی واحد اداکارہ ہیں جن کی سب سے زیادہ فلموں نے 100، 100 کروڑ روپے کا بزنس کیا، جبکہ ایک فلم تو 400 کروڑ کا ہندسہ بھی عبور کر چکی ہے۔ فن کی دنیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی ادکارہ کا نام بھی سامنے آگیا ہے، اب دپیکا کو ایک اور اعزاز حاصل ہونے والا ہے۔۔ بھارتی میگزین انڈیاٹوڈے' نے رپورٹ دی ہے کہ فلم پروڈیوسر سنجے لیلا بنسالی اپنے ڈریم پروجیکٹ ' باجی راوی مستانی' کے لئے انہیں 8 کروڑ روپے میں سائن کر چکے ہیں۔یہ وہی فلم ہے ' جس کے لئے دیپکا نے کرن جوہر کی

فلم 'شدھی' میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کچھ فلمی حلقوں کا کہنا ہے کہ 'انکار کی اصل وجہ کیا تھی یہ اب سمجھ میں آیا ہے'۔

لیکن ان ستاروں اور اس چکاچوند نگری کا ایک اور بھی رخ ہے جو روشن نہیں بلکہ تاریک ہے اور جس کا اقرار کچھ اسٹارز تو کھلے عام کرتے ہیں۔ لیکن، کچھ اپنیا میج کی خاطر انکار کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک تاریک پہلو ہے کچھ بالی وڈ اسٹارز کی جانب سے ڈرگز یا منشیات استعمال کرنا۔ بھارت کے ایک مقبول ترین رسالے 'انڈیا ٹوڈے' نے بالی وڈ کے ان ٹاپ اسٹارز سے متعلق ایک رپورٹ میں بتایا تھا کہ یہ ادکار ماضی میں منشیات استعمال کرتے رہے ہیں۔ پے در پے 100 کروڑ کا بزنس کرنے والی میگا ہٹس کے ہیرو رنبیر کپور بالی وڈ کے نئے سپر اسٹار ہیں جن کا ایک زمانہ دیوانہ ہے۔ 'انڈیا ٹوڈے' سے بات چیت میں رنبیر کپور نے بتایا کہ وہ نا صرف اسکول کے زمانے میں چرس سے بھری سگریٹ پیتے تھے بلکہ فلم 'راک اسٹار' کی شوٹنگ کے دوان بھی انہوں نے چرس استعمال کی، تاکہ اپنے اپنی پرفارمنس بہتر کرسکیں۔ رنبیر کے مطابق، '300 سے زائد بے زار جونیئر آرٹسٹس کے ساتھ زندگی سے بھرپور راک سانگ کی پکچرائزیشن میں 'چرس' کے بغیر حقیقی رنگ آنا مشکل تھا۔' سلور اسکرین پر برائی کے مقابلے میں اچھائی کو پروموٹ کرنے والے 'منا بھائی' ابتدائی دور میں باقاعدگی سے ڈرگز استعمال کرتے تھے اور اسی سبب شروع میں ان کا کیریئر مشکلات کا شکار رہا۔ سنجے کو

1982ء میں ڈرگز کیس میں پانچ مہینے کی سزا بھی کاٹنا پڑی۔ تاہم، سنجے کے والد سنیل دت نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے بیٹے کی بری عادتیں ختم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔، یہاں تک کہ وہ ایک امریکی ڈرگ ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں زیرعلاج بھی رہے۔ بالی وڈ ہیرو فردین خان 5 مئی 2001ء کو اُس وقت خبروں کی ہیڈ لائنز بن گئے جب انہیں ممبئی کے پوش علاقے جوہو سے گرفتار کرکے ان کے قبضے سے کوکین برآمد کی گئی جبکہ ڈرگز سے چھٹکارے کے لئے ان کا سرکاری اسپتال میں علاج بھی کروایا گیا۔ فردین نے ڈرگز کیس میں معافی کی درخواست بھی دائر کی جسے مارچ سنہ 2012 میں جاکر منظوری ملی۔ فلم 'مون سون ویڈنگ' اور 'دہلی بیلی' جیسی فلموں میں کام کرنے والے وجے راز کو ڈرگز رکھنے کے الزام میں 2005 میں دبئی ایئرپورٹ سے گرفتار کیا گیا۔ بالی ووڈ ایکٹر سنجے خان کے داماد اور کامیاب ڈسکو جوکی عقیل کو بھی نشہ آور شے رکھنے کے الزام میں 3 جون 2007 کو دبئی ایئرپورٹ سے گرفتار کیا گیا۔ بعد میں پولیس کی جانب سے کرائے جانے والے ڈرگز ٹیسٹ سے تصدیق ہوئی کہ عقیل نے ڈرگز استعمال نہیں کی تھیں۔ سنہ 90 کی دھائی میں فیشن شوز کی جان سمجھی جانے والی ماڈل گیتا نجلی بھی ڈرگز کا شکار ہو کر نام، شہرت اور پیسہ سبھی سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور آخرکار نشے کی عادت کے ہاتھوں ایک فٹ پاتھ پر جان کی بازی ہار گئیں۔ گیتا نجلی نے سشمیتا سین کے ساتھ بھی کئی فیشن شوز میں حصہ لیا تھا۔ ٹی وی جج، ہوسٹ اور بی جے پی کے لیڈر پرمود مہاجن کے بیٹے راہول مہاجن کو جون 2006 میں

ڈرگز کی زیادہ مقدار لینے کے باعث حالت غیر ہو جانے کے بعد اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد راہول کو ڈرگز رکھنے اور استعمال کرنے پر گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ ایک اور راز یہ بھی ہے کہ بالی ووڈ کی مار دھاڑ والی فلموں کا پسندیدہ موضوع " انڈرورلڈ" اور " گینگسٹرز" اس لیئے رہا ہے کہ فلمی دنیا کو اس کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ " انڈرورلڈ" کی اصطلاح سے بھی عام آدمی انہی فلموں کے ذریعے متعارف ہوا ہے۔ ان فلموں میں گینگسٹرز کا کردار نہایت نفرت آمیز ہوتا ہے جو بات بات پر دوسروں کو قتل کردینے اور پیسے کی خاطر ملک دشمنی سے بھی نہیں چوکتا۔ پھر گینگسٹرز اور سیاستدانوں کا چولی دامن کا ساتھ دکھایا جانا بھی عام بات ہو گئی ہے۔ اکثر فلموں میں دکھایا جاتا ہے کہ سیاستدان ہی گینگسٹر کو پروان چڑھاتے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ "بالی ووڈ کے بیشتر فلمساز انہی گینگسٹرز اور انڈرورلڈ ڈانز " سے فلموں میں بڑھ چڑھ کر پیسہ لگانے پر رضامند کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے سفارتی انکشافات کرنے والی ویب سائٹ "وکی لیکس "نے بالی ووڈ فلموں اور اس کے چمکتے دھمکتے ستاروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ویب سائٹ نے دنیا بھر کی حکومتوں کے رازوں سے پردہ اٹھایا وہیں وکی لیکس نے یہ راز بھی افشاں کیا ہے کہ بالی ووڈ فلمساز بڑے بڑے گینگسٹرز اور سیاستدانوں سے اپنی فلموں میں سرمایہ لگواتے اور انہیں منافع کی شکل میں بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔ یہ وہی

دھن ہے جسے بھارتی اصطلاح میں "کالا دھن "کہا جاتا ہے۔ وکی لیکس کا کہنا تھا کہ گذشتہ برسوں کے دوران بالی ووڈ فلم انڈسٹری نے نا صرف ممبئی کے انڈر ورلڈ سے قربت حاصل کی بلکہ انہیں کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کرنے کا راستہ بھی سجھایا۔ ویب سائٹ نے دعویٰ کے ساتھ یہ بتایا کہ فلموں میں انڈر ورلڈ کی جانب سے پیسہ لگانے کا آغاز حکومت کی جانب سے بالی ووڈ کو صنعت کا درجہ دینے کے بعد شروع ہوا اور اس وسیع سرمایہ کاری کی بدولت بالی ووڈ کو اتنی بڑی فلمیں بنانے کی قوت مل گئی کہ اس نے مغربی انداز کی فلمیں بنانی بھی شروع کر دیں۔ آڈٹ اور ٹیکس کے حوالے سے پیشہ ورانہ خدمات فراہم کرنے والی کمپنی کے ایم پی جی کے سربراہ جے ہل ٹھاکر نے وکی لیکس کو بتایا" فلموں میں پیسے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے گینگسٹرز کے ساتھ تعلقات کوئی نئی بات نہیں۔ اس کا آغاز 2000 میں ہوا تھا جب سرکاری سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے بالی ووڈ، بینکوں سے یا پرائیویٹ طور پر بھی قرضے لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی، ایسے میں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ان گینگسٹرز کی جانب سے کی جانے والی پیشکش قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس سے قبل ایسے افراد کا پیسہ قبول کر لیا جاتا تھا جو بڑے کاروبار کے مالک ہوا کرتے تھے، مثال کے طور پر کمرشل فنانسنگ کرنے والے افراد اور ایسے سرمایہ کار جن کا تعلق تعمیرات یا تجارتی صنعت سے تھا اور جو اپنے سرمائے پر ساٹھ سے سو فیصد تک سود وصول کرتے تھے۔ تاہم اس کے بعد سیاست دانوں اور گینگسٹرز کا دیا ہوا

پیسہ بھی قبول کیا جانے لگا۔ یہ لوگ اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کی غرض سے پیسہ فلموں میں لگاتے تھے۔ٹائمز میگزین نے اپنے ایک مضمون میں انکشاف کیا تھا کہ انڈر ورلڈ ڈان ابو سلیم نے بھارتی رپورٹرز کو بتایا کہ اس نے شاہ رخ خان کی فلم "دیوداس" کے لیے پیسہ فراہم کیا تھا۔ اس فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھارت کی مہنگی ترین فلم تھی۔ بعض فنکاروں کو انڈرورلڈ ڈان کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کی بڑی قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے۔ اداکار ریتک روشن، گووندا، امریش پوری اور ہدایتکار کرن جوہر کو انڈر ورلڈ کی جانب سے قتل کی دھمکیاں ملنے کے بعد پولیس گارڈ رکھنے پڑ گئے تھے۔ سپر اسٹار عامر خان اور ڈائریکٹر اشوتوش گوریکر کو بھی دھمکی آمیز کالز موصول ہوئیں کیونکہ انھوں نے اپنی آسکر ایوارڈ میں نامزد ہونے والی فلم کی بھرپور کامیابی کے بعد گینگسٹرز کی جانب سے کی گئی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا تھا۔

انسان سستے قبریں مہنگی

ہندوستان کے آخری تاجدار نے شکوہ کیا تھا کہ دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں، لیکن اب دو گز زمیں کا حصول سب ہی کے لئے مشکل ہوگیا ہے۔ دنیا بھر میں ہانگ کانگ ایسا علاقہ ہے جہاں کم از کم 40 ارب پتی ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں جگہ کی قلت کی وجہ سے رہائشی اپارٹمنٹس تو سستے ہیں مگر قبر کا حصول انتہائی دشوار اور مہنگا ہو گیا ہے۔ ہانگ کانگ میں زمین کی قلت کے سبب 1970 کی دہائی کے دوران کے کسی مقام یا علاقے میں مستقل قبروں کی تعمیر پر مکمل پابندی عائد کر دی گئ تھی۔ پہلے سے قائم سرکاری قبرستانوں میں موجود قبروں کی باقیات کو 6 سال بعد تلف کرنے یا جلانے کے احکامات بھی جاری کئے گئے تھے تاکہ نئے مردوں کی تدفین کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ لیکن چھ برس بعد پرانی قبر ختم کرکے نئی بنانے کی پالیسی بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی اور اب حالات خاصے مشکل ہو گئے ہیں۔ ہانگ کانگ ایک ایسا گنجان آباد شہری علاقہ ہے جہاں ایک سال کے دوران تقریبا 40 ہزار افراد کی طبعی اور ناگہانی اموات واقع ہوتی ہیں۔ کچھ فوت ہو جانے والے اس لحاظ سے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ انکے لئے بعض رشتہ دار اپنے دفن شدہ رشتہ داروں کی باقیات کو جلانے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ اب قبر کی جگہ کے لئے قرعہ اندازی

کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ لیکن بہت کم مر جانے والوں کو اب بھی قبر نصیب ہوتی ہے۔ اب حکومت نے چھ سالہ پرانی قبروں میں سے مردے کی باقیات کو سرکاری طور پر جلانے کا سلسل شروع کر دیا ہے۔ قبر کے حصول کا ایک اور ذریعہ کسی گرجا گھر سے منسلک ہونا خیال کیا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ کے بعض گرجا گھروں کے نجی قبرستان بھی موجود ہیں۔ ان قبرستانوں میں اگر جگہ دستیاب ہو تو قبر بنانے کی اجازت مل جاتی ہے مگر ایک خطیر رقم ادا کرنے پر۔ ایسے قبرستانوں میں قبر کی قیمت تین لاکھ 86 ہزار ڈالر یا تین ملین ہانگ کانگ ڈالر کے مساوی ہوتی ہے۔ قبریں بنانے والی ایک کمپنی 900 کے ڈائریکٹر ہوئی پونگ کووک کا کہنا کہ اب اتنی بڑی رقم کے ساتھ قبر کی جگہ کا حصول بھی ناممکنات میں سے ایک ہے۔

ہانگ کانگ شہری انتظامیہ کو زمینی رقبے کی بھوک نے مار ڈالا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کو میونسپل حکام جس طرح شہریوں کے رہائشی معاملات کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں بالکل اسی طرح مر جانے والوں کی تدفین کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہانگ کانگ میں تقریباً سات ملین لوگ آباد ہیں۔ شہری انتظامیہ کی جانب سے مردوں کی باقیات کو جلانے کے سلسلے کو بھی عام لوگوں نے قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ سن 2013 میں 90 فیصد مر جانے والوں کو ورثا کی خواہش پر جلا دیا گیا تھا۔ نعشیں نذر آتش کرنے کے رجحان میں اب خاصا اضافہ دیکھا گیا ہے کیونکہ سن 1975 میں یہ صرف 38 فیصد تھا۔

قبرستانوں کی طرح وہ مقامات جہاں نذر آتش کی گئی لاشوں کی خاک رکھی جاتی

ہے، وہ بھی تنگ ہوتے جارہے ہیں۔ نذر آتش کی گئی نعشوں کی خاک رکھنے والے مقام کو کولمبیریم (columbarium) کہا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ کے ایسی جگہوں میں خاک دان رکھنے کے لیے چالیس پچاس مربع انچ جگہ کے لیے بھی پانچ سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لیے تین ہزار ہانگ کانگ ڈالر فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ امرا جو نعشوں کی خاک رکھنے کا انتظار نہیں کر سکتے وہ ایک ملین ہانگ کانگ ڈالر تک ادا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ہانگ کانگ کے فینلنگ ضلع کے مشہور لنگ شان ٹیمپل میں خاک دان رکھنے کی جگہ 63 اسکوئر انچ ہے اور اتنی جگہ کی مالیت 1.8 ملین ہانگ کانگ ڈالر کے مساوی ہے۔ لیکن پاکستان میں ابھی حالات ایسے خراب نہیں ہوئے ہیں، یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو وقت سے پہلے قبر کی جگہ محفوظ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

کوئٹہ کے ایک دیہی علاقے بھوسہ منڈی کے نزدیک واقع ایک قبرستان کے سیلز ایجنٹ 45 سالہ حبیب اللہ ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ میں ماہانہ 4,000 روپے (48 امریکی ڈالر) کمالیتا ہوں، اور اگر میں (اضافی کام) کروں تو قبرستان کا مالک مجھے مزید ادائیگی کرے گا"۔ کوئیٹہ کے حبیب اللہ بازار جاتے ہیں تو ان کا مقصد کچھ خریدنے کی بجائے کچھ فروخت کرنا ہوتا ہے۔ اور ان کی فروخت کردہ مصنوعات کھدائی سے قبل قبریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "(ضرورت کے وقت) قبر کی جگہ خریدنے کی نسبت پہلے سے قبر کی جگہ محفوظ کرالینا کہیں زیادہ سستا

پڑتا ہے"، "ہر روز میں اپنا بیشتر وقت۔۔۔ قبریں فروخت کرنے پر صرف کرتا ہوں اور ان لوگوں کو قائل (کرنے کی کوشش) کرتا ہوں جن کے ہاں میت رکھی ہوتی ہے۔۔۔ کہ وہ ہم سے قبر خرید لیں"۔ اکثر ملکوں میں قبر کی جگہ خریدنے کا تصور کوئی نئی چیز نہیں لیکن پاکستان میں یہ ایک نیا کاروبار ہے۔ ماضی میں قبروں کے لئے جگہ بلامعاوضہ ہوا کرتی تھی اور انہیں مرحوم کے لواحقین کھودتے تھے۔ اس نئے کاروبار کے ابھرنے کی ایک وجہ پسماندہ علاقے میں ملازمتوں کے محدود مواقع کے دوران روزی کمانے کی خواہش ہے۔ ایک اور وجہ قبروں کے لئے بلامعاوضہ جگہ کی قلت ہے۔ حبیب اللہ بتاتے ہیں کہ گورکن بننے سے قبل وہ کافی عرصہ تک کوئی اور کام ڈھونڈنے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ "اگرچہ میری آمدنی انتہائی قلیل ہے اور میں اس کام سے بمشکل ہی اپنے گھریلو اخراجات پورے کر رہا ہوں، تاہم میرا خیال ہے کہ بے روزگار رہنے سے یہ کام بہتر ہے"، انھوں نے کہا۔ ہمارے قبرستانوں میں تو مقبرے تعمیر کیئے جاتے تھے، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق، کچھ ہی حال اب ہمارے قبرستانوں کا ہے، ایک طرف تو قبرستان میں موجود کچھ قبروں پر کئی کئی سیلنگ فین بھی لگے ہیں۔ زیادہ پاور والے انرجی سیور روشن ہیں، دروازے بہت ہی خوب صورت ڈیزائن والے اور مہنگی لکڑی سے تیار کردہ ہیں۔ فرش پر بیرون ملک سے منگائے گئے قیمتی ٹائلز لگے ہیں۔ لیکن دوسری جانب ایسی قبریں بھی ہیں، جن کو مٹی کا دیا بھی

میسر نہیں ہے۔ایک مورخ کا قول ہے 'دور مغلیہ نے ہندوستان کو تین چیزوں سے نوازا۔' اردو زبان'، ' مرزا غالب' اور' تاج محل'۔ لیکن، آج کا مورخ جب بھی کراچی کے قبرستانوں کا ذکر کرے گا، یہ ضرور لکھے گا کہ 'یہاں ایک، ایک قبرستان میں کئی کئی 'تاج محل' ہیں۔شاہجہاں کے بنائے ہوئے 'تاج محل' کی حقیقت ایک 'مقبرے' سے بڑھ کر نہیں۔۔۔آگرہ کے' تاج' اور کراچی میں بنے تاج 'محلوں' میں بھی یہی یکسانیت ہے۔ یہاں بھی انگنت لوگوں نے اپنے پیاروں سے محبت کی یاد میں ایسے ایسے مقبرے بنا رکھے ہیں جنہیں دیکھ کر کہیں عقل حیران ہوجاتی ہے تو کہیں تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ سخی حسن کے قدیم قبرستان میں ایک ایسا وسیع وعریض مقبرہ بنا ہوا ہے جس کی لمبائی چوڑائی کئی ہزار گز ہوگی۔تاج محل کی طرح ہی اس مقبرے کا بہت بڑا حصہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔تاج محل کی طرح ہی اس کا بھی ایک گول اور بلند و بالا گنبد ہے۔ بہت بڑا صحن ہے جہاں سبزہ اگا ہے، نہایت صاف ستھری روش بنی ہوئی ہیں، 25، 30 قبریں بھی ہیں جو سب سنگ مرمر کی ہیں۔مقبرے کی دیکھ بھال کے لئے باقاعدہ کئی ملازم ہیں۔ان ہی ملازمین میں سے ایک ملازم نے بتایا کہ وہ کئی برس سے یہاں بہت سے کام کر رہا ہے مثلاً پودوں اور گھانس کو پانی دینا، پانی کی موٹر چلانا، بجلی کے انتظامات، مقبرے کے احاطے میں ہی بنی ہوئی دو منزلہ مسجد کی دیکھ ریکھ، صاف صفائی اور دیگر کئی چیزوں کے انتظامات اسی کا ذمہ ہیں۔اسی نے یہ انکشاف کیا کہ 'شہر کے ہر کونے کی لائٹ چلی جائے تب بھی یہاں

'لوڈ شیڈنگ نہیں ہوتی۔۔اس کے لئے 'خصوصی انتظامات' موجود ہیں۔
مقبرے میں روشنی اور ہوا کے لئے نہایت نفیس انداز میں کھڑکیاں بھی رکھی گئی ہیں۔
اس کی چوکھٹیں، وارنش، مہنگی لکڑی، اس کا ڈیزائن، شیشہ، نیٹنگ، رنگ و روغن۔۔
سب کچھ اسی انداز کا ہے جیسے کسی علیشان بنگلے کا ہوتا ہے۔اسی قبرستان میں ایک مقبرہ
ایسا بھی ہے جہاں باقاعدہ بجلی کا میٹر لگا ہے۔ قبرستان کی دیکھ بھال پر مامور ایک شخص
نے بتایا کہ 'مزار کو روشن رکھنے کے لئے جو بجلی استعمال ہوتی ہے، لواحقین باقاعدگی سے
ہر ماہ اس کا بل ادا کرتے ہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہے کہ یہ صرف ایک قبرستان میں بنے
کسی ایک مقبرے کی بات ہو بلکہ شہر میں موجود تقریباً 34 قبرستانوں میں ایسے ہی
بڑے بڑے مقبرے موجود ہیں۔ پاپوش نگر، طارق روڈ، کلفٹن، یاسین آباد، ڈیفنس
ہاؤسنگ سوسائٹی، میوہ شاہ، لیاقت آباد، گلشن اقبال، جامعہ کراچی، علی باغ، ڈرگ
روڈ، ماڈل کالونی، ملیر، دارالعلوم کورنگی، عظیم پورہ، عیسیٰ نگری، لیموں گوٹھ، میٹروول
تھرڈ، میاں گوٹھ، نیو کراچی، سائٹ ایریا، پیر بخاری، فوجی قبرستان، جنت البقیع،
پہلوان گوٹھ، سعود آباد، شاہ فیصل، شانتی نگر ڈالمیا روڈ، اسماعیل گوٹھ، لانڈھی اور محمد
شاہ قبرستان نارتھ کراچی سمیت شاید ہی کوئی قبرستان ایسا ہے جہاں لوگوں نے اپنے
پیاروں کے مقبروں کو اپنی اپنی حیثیت یا گنجائش کے مطابق اسے 'اچھے سے اچھا' بنانے
کی کوشش نہ کی ہو۔کچھ

مقبروں پر تو ہر جمعرات کو دینی تہواروں پر اور سالانہ عروس وغیرہ کے موقع پر بڑے پیمانے پر لنگر بھی لگتا ہے۔ اس لنگر میں ملنے والے کھانوں پر بھی بہت بڑی بڑی رقمیں خرچ ہوتی ہیں۔ بکرے اور مرغی کا سالن تو عام بات ہے۔ شہر کے بہترین پکوان ہاوسز اور نامی گرامی باورچیوں سے یہ کھانے تیار ہوتے اور مزار پر لاکر غریبوں میں مفت تقسیم کر دیئے جاتے ہیں، تاکہ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچ سکے۔ لنگر کے معاملے میں تو آگرہ کا تاج محل بھی پیچھے رہ گیا ہے۔ کہ وہاں اس قسم کی کوئی نیاز نذر نہیں ہوتی ہے نا ہی لنگر لگتا ہے۔ کراچی میں کئی 'وی آئی پی' قبرستان بھی ہیں۔ مثلاً ڈیفنس فیز فور گزری کا قبرستان۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ملازم کا کہنا ہے کہ یہاں بہت سے وی آئی پی محو خواب ہیں جیسے سلیم ناصر، ملکہ ترنم نورجہاں، شفیع محمد، رضوان واسطی، طاہرہ واسطی، ابراہیم نفیس، سید کمال، چوہدری اسلم، فوزیہ وہاب وغیرہ۔ یہ قبرستان خیابان راحت سے شروع ہو کر خیابان مومن اور سعودی قونصل خانے تک آباد ہے۔ اس قبرستان میں چند قبریں ایسی بھی ہیں جن پر انتہائی جدید انداز کی تراش خراش والے جاپانی اسٹائل سے ملتے جلتے لکڑی کے پائیوں اور چھت والے شیڈز موجود ہیں جبکہ کتبوں کے ڈیزائن بھی 'نہایت دلکش ڈیزائن' اور جدید اسٹائل کے ہیں جنہیں دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرحوم معاشرے میں اعلیٰ حیثیت یا اونچا اسٹیٹس رکھنے والا تھا اور اس کے لواحقین بھی کچھ کم حیثیت والے نہیں۔

یہیں ایک قبر کے سرہانے قیمتی پتھر سے بنی اور جدید تراش خراش اور بیل بوٹوں سے کندہ ایک بنچ بھی موجود ہے جس پر بیٹھ کر آپ مرحومین کے لئے دعا اور تلاوت کر سکتے ہیں۔ ایک قبر تو بلیک سنگ مرمر کی ہے، شاید بلیک سنگ مرمر، سفید رنگ کے سنگ مرمر سے بھی کچھ مہنگا ہوتا ہے۔ تبھی اس کا استعمال بھی نسبتاً کم ہوتا ہے۔

اس قبرستان کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ پہاڑ پر بنا ہے۔ کچھ قبریں انتہائی اوپر، پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہیں اور جیسے جیسے پہاڑی راستے نیچے اترتے جاتے ہیں قبروں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تاہم عام قبرستانوں کی بہ نسبت یہاں صفائی ستھرائی کا بہت اچھا انتظام ہے، شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ یہ نہایت وسیع و عریض اور جاذب نظر بنگلوں کے درمیان واقع ہے۔ کیوں کہ یہاں وی آئی پی لوگ دفن ہیں۔ کراچی شہر میں 34 سے زائد قبرستان ہیں اور جس طرح زندہ آبادی کو متوسط، غریب، رولنگ کلاس یا 'پیسے والوں' کے طبقات میں شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی انہیں مختلف 'کلاسز' میں تقسیم کرتے ہوئے قبرستانوں میں اتار دیا جاتا ہے۔ قبرستانوں کی تقسیم ایسے ہی ہے جیسے نیو کراچی، اورنگی ٹاون، نارتھ کراچی، موسیٰ کالونی، عیسیٰ نگری کی غریبوں کی بستیاں ہیں، سو یہاں کے قبرستانوں کا پرسان حال بھی کوئی

نہیں۔۔اینٹ اور گارے سے بنی۔۔ٹوٹی ہوئی اور زمین میں دھنسی قبریں۔۔ان پر اگتے جھاڑ جھنکار۔۔۔کچھ قبرستانوں میں منشیات استعمال کرنے والوں کے ڈیرے۔۔جرائم پیشہ افراد کی پناہ گاہیں جو سبزے کو ترستے ہوئے لق دق صحرا میں بدل گئے ہیں۔اور ان کے مقابلے میں ہیں کلفٹن اور ڈیفنس جیسے پوش علاقوں کے وی آئی پی قبرستان ہیں۔ اس تضاد کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسان کا 'اونچا اسٹیٹس' مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا' کرتا رہتا ہے۔زندگی میں حیثیت اعلیٰ ہو اور رتبہ بڑا ہو تو مرنے کے بعد بھی' اسے 'وی آئی پی قبرستان' سے کم حیثیت کی جگہ نہیں ملتی۔بصورت دیگر بعض دفعہ کفن دفن کے لئے بھی چندہ کرنا پڑتا ہے۔اور اس کے بعد بھی جو قبر ملتی ہے وہ کسی غریب بستی میں قائم قبرستان سے گزرتے گندے نالے سے زیادہ دور نہیں ہوتی۔ دنیا میں قبرستانوں کی بھی تقسیم ہو گئی ہے۔ جرمنی میں ہم جنس پرست خواتین کے لئے ایک علیحدہ قبرستان ہے۔ یہ نیا قبرستان برلن میں انسانوں کی جس ابدی آرام گاہ کے اندر قائم کیا گیا ہے، وہ خود دو سو برس پرانی ہے اور برلن کے مشرقی حصے میں Prenzlauer Berg نامی علاقے میں قائم ہے۔اس 'قبرستان کے اندر قبرستان' کا رقبہ 400 مربع میٹر یا چار ہزار تین سو مربع فٹ بنتا ہے۔ اس آخری آرام گاہ میں بہت سے درخت بھی لگے ہوئے ہیں اور وہاں ریت سے ایسا پُر خم راستہ بھی بنایا گیا ہے جسے باقاعدہ لینڈ اسکیپ کے طور پر تیار کیا گیا ہے۔اس قبرستان میں مجموعی طور پر 80 قبروں کی گنجائش ہے، جہاں انتقال کر جانے

والی ہم جنس پرست خواتین یا میت سوزی کی صورت میں ان کی راکھ کو دفنایا جاسکے گا۔ ایسا ہی ایک قبرستان دہلی کا نکلسن قبرستان ہے۔ جوپُرآشوب ماضی کی کہانی ہے۔ نئی دہلی کا نکلسن مسیحی قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں زیادہ تر نوآبادیاتی دور میں ہلاک ہونے والوں یا انتقال کر جانے والے برطانوی شہریوں کی قبریں ہیں۔ کئی ایک ایسے بھی ہیں جنھوں نے جیتے جی قبرستان کو گھر بنا لیا ہے۔ سندھ میں ''کاریوں کا قبرستان'' بھی ہے۔ جہاں کاری کی جانے والی مظلوم عورتوں کو دفن کیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی انھیں عام قبرستان میں دفن نہیں کیا جانے دیا جاتا۔ سربیا میں ایک بے گھر شخص نے گزشتہ پندرہ برس سے زائد عرصے سے ایک قبرستان میں ایک کھلی قبر کو رہائش گاہ بنا رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے مُردوں سے نہیں، زندہ انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔ تاریخ کے ثبوت ہمیں مقبروں، مزاروں اور دوسرے بے شمار پھیلے ہوئے کھنڈرات کی صورت میں ملتے ہیں۔ جسے دیکھتے ہی ماضی کا شاندار عکس ذہن میں ابھر آتا ہے ایسے عام آثار دیکھنے والوں کے لیے عبرت کا مقام بھی ہیں۔ ایسے ہی تاریخی آثاروں میں سندھ کی قدیم تاریخ کا لازوال شہرہ آفاق قبرستان مکلی بھی ہے جو دنیا کا سب سے بڑا قبرستان ہے دنیا میں مسلمانوں کے اس سب سے بڑے قبرستان میں لاکھوں قبریں اور مقبرے عہد پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا خاموش شہر مکلی کے چھ مربع میل سے زائد رقبہ پر محیط ہے اس سے ماضی کی چار سو سال پرانی ایک عظیم تہذیب وابستہ ہے۔ مکلی محض ایک قبرستان نہیں بلکہ اپنے عہد

کا جیتا جاگتا تاریخی ہنرمندی کا ثبوت ہے قبروں اور مقبروں کی عمدہ نقش نگاری، بے مثال خطاطی اور اعلیٰ کندہ کاری اپنی مثال آپ ہے مکلی قبرستان کی ہر قبر اور ہر مقبرہ جاذب نظر اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس قبرستان میں اندازاً چار لاکھ سے زائد قبریں موجود ہیں۔ ان میں ایک لاکھ سے زائد اولیا کرام 33 بادشاہ اور 17 گورنر مدفون ہیں۔ اس قبرستان کا نام مکلی اس لیے پڑا کہ یہاں پر جو پہلی قبر تعمیر ہوئی وہ ایک عورت کی تھی اور وہ علاقے میں مکلی کے نام سے معروف تھی۔

کراچی میں ایک جدید قبرستان کی بھی شہرت ہے۔ یہ سپر ہائی وے پر وادی حسین کا قبرستان ہے۔ انسان انفورمیشن ٹیکنولوجی کی دنیا میں بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ پہلے انسان صرف انفورمیشن ٹیکنولوجی کا استعمال زندہ لوگوں کو دیکھنے اور ان سے بات کرنے کے لئے کرتا تھا مگر اب مردہ لوگوں کی قبر کو دیکھنے اور فاتحہ خوانی کرنے کے لئے بھی انفورمیشن ٹیکنولوجی کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ آپ اگر کسی وجہ سے اپنی کسی عزیز کی قبر پر نہ آسکے ہوں تو اس قبر کو آن لائن دیکھا اور فاتحہ خوانی کی جا سکتی ہے، آن لائن قبر کو دیکھنے کے لئے صرف قبر کا نمبر یا نام درکار ہوتا ہے۔ پاکستان میں سب سے پہلا آن لائن قبرستان میں سپر ہائی وے کراچی پر واقع ہے اور اس کا نام وادیِ حسین قبرستان ہے۔ اس آن لائن طرز کے قبرستان کی بنیاد دو بھائی شیخ

سخاوت علی اور شیخ یاور علی نے 1999 میں رکھی۔ قبرستان کو بنانے کا خیال مرحوم حاجی محمد یوسف نقوی کا تھا۔ سب سے پہلے ان ہی کے بڑے بھائی کو اس قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس قبرستان کا کل رقبہ کم سے کم بارہ ایکڑ سے زیادہ ہے۔ آپ وادیِ حسین قبرستان کی انتظامیہ کو صرف ایک فون کال کرکے سارے انتظامات کروا سکتے ہیں۔ قبرستان کی طرف سے فراہم کردہ سروسز میں ایمبولینس سروسز جو کہ میت کو لے کر جانے کے لئے ضروری ہے فراہم کی جائے گی۔ اس کے علاوہ قبر کشائی کے انتظامات، میت کے عزیزوں کے لئے ٹرانسپورٹ، قبر کی بکنگ اور قبر کو بنانا سب کچھ انتظامیہ خود کرتی ہے۔ قبروں کا ڈیزائن اور سائز بھی ایک جتنا ہی رکھا جاتا ہے۔ آن لائن انتظامات ہمیشہ ہی بہترین ہوتے ہیں اسی لئے وادیِ حسین قبرستان کے انتظامات کو بھی آن لائن رکھا گیا ہے۔

اب حال ہی میں اسلام آباد کے مرکزی قبرستان جو اس شہر کا سب سے بڑا قبرستان بھی ہے کی ویب سائٹ بھی منظر عام پر آ گئی ہے۔ آپ اس قبرستان میں آسودہ خاک ہونے والوں کی تدفین کو بذریعہ انٹرنیٹ باآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ اسلام آباد اگر دنیا کا نہیں تو ایشیا کا واحد شہر ضرور ہے جہاں دفن ہونے والے تمام افراد کی قبریں انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ خضر عزیز اسلام آباد قبرستان کے انتظامات سنبھالتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس ویب سائٹ میں سن دو ہزار سے سن

دو ہزار تین تک کے دوران قبرستان میں دفن ہونے والے ساڑھے تین ہزار افراد کے کوائف اکھٹے کئے ہیں اور اس قبرستان میں پینتیس ہزار قبریں ہیں جن کے کوائف وہ آہستہ آہستہ انٹرنیٹ پر منتقل کر رہے ہیں۔ شاعر نے سچ ہی کہا تھا کہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی اگر چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ بات شاعری کی حد تک رہتی تو ٹھیک تھی مگر کسے معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب لوگوں کو قبروں میں بھی چین نصیب نہیں ہوگا۔بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ اس جہان فانی میں اگر عبرت حاصل کرنی ہے تو پھر قبرستان کا رخ کرو کہ کیسے کیسے لوگ منوں مٹی تلے دبے جاتے ہیں۔ لیکن اب تو زمانہ ہی الٹا چل رہا ہے۔ قبرستان برائی کے اڈے بنتے جارہے ہیں۔ اور عام انسان اتنا وحشی ہوگیا ہے کہ وہ قبروں میں ابدی نیند سوئے ہوؤں کو بھی بخشنے کو تیار نہیں۔

پاک بھارت تجارتی تعلقات۔ آزمائش کا پل صراط

پاک بھارت تعلقات میں بہتری کی جانب جب بھی کوئی پیش رفت ہوتی ہے تو نہ جانے کیوں ملک کے اندر سیاسی عدم استحکام شروع ہو جاتا ہے، اب بھی اس جانب پیشرفت شروع ہوئی ہے اور یہ دوستانہ تعلقات ایک نئے دور میں داخل ہوا چاہتے ہیں کہ ملک کی سیاست میں ابال آنا شروع ہوگیا ہے۔ نان ایشو پر اخباری اور میڈیا کا دنگل جاری ہے، چائے کی پیالی میں طوفان شائد اسی صورتحال کے لئے کہا گیا ہو۔ یہ صرف دو ملکوں کے تجارتی تعلقات کا مسئلہ نہیں ہے، یہ اس خطے کے تقریباً سوا ارب انسانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے کا معاملہ ہے، جو گذشتہ کئی دہائیوں سے ایک دوسرے کے لئے جنگی میدان بنے ہوئے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس خطے میں مفادات رکھنے والی عالمی قوتیں کیا دونوں ملکوں کو باہمی منڈیوں تک بلا امتیاز رسائی دینے پر متفق ہو جائیں گی؟ کیااب دونوں ممالک کے درمیان واہگہ کے راستے پورا ہفتہ چوبیں گھنٹے تجارت ہو گی؟ نئی دہلی میں سارک ممالک کے کاروباری نمایندوں کی تین روزہ کانفرنس کے بعد دونوں ملکوں کے وزرا تجارت نے مشترکہ اعلامیہ میں تو ایسی ہی نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ دونوں ممالک کے وزراء تجارت نے پاک بھارت دوطرفہ تجارتی تعلقات کو معمول پر لانے کے عمل کو تیز کرنے ' انھیں وسعت دینے اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو

دور کرنے ایک دوسرے کو اپنی منڈیوں تک بلا امتیاز رسائی فراہم کرنے' دونوں ممالک کے بینکوں کی برانچز کھولنے سمیت باہمی تجارت کے فروغ کے لیے کیے گئے دیگر فیصلوں پر عملدرآمد پر اتفاق کیا تھا۔ وزیر اعظم نواز شریف کی طرح، صوبہ پنجاب کے وزیراعلیٰ محمد شہباز شریف بھی یہی کہتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کو معاشی تجارتی، صنعتی، زرعی اور اقتصادی میدان میں آگے بڑھنا ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین، دو طرفہ تجارتی تعلقات کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ وزیراعظم نواز شریف بھی بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات کے خواہشمند ہیں۔ شہباز شریف نے اس موقع پر بھارتی وفد سے کھل کر کہا کہ پاکستان اور بھارت کو خطے کی ترقی و خوشحالی اور پائیدار امن کے لیے اپنے تمام تنازعات مل بیٹھ کر مخلصانہ بات چیت کے ذریعے طے کرنے چاہئیں۔ جنگوں نے دونوں ممالک کو تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جنگوں سے دونوں ممالک کے لوگوں کی مشکلات اور مصائب میں اضافہ ہوا۔ غربت اور بے روزگاری کے مسائل پیدا ہوئے۔ تاریخ سے سبق حاصل کرکے پاکستان اور بھارت کو مستقبل کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کچھ ایسی ہی باتیں کینیڈین ہائی کمشنر گریگ جیوکاس نے بھی کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پاک بھارت تجارتی تعلقات خطے میں اہمیت کے حامل ہیں اور علاقائی تجارت کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج کے دورے کے موقع پر کینیڈین ہائی کمشنر نے وزیر اعظم نواز شریف کی جانب سے بھارت کے دورہ خوش آئند قرار دیا ہے اور اس امید کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان و بھارت کی قیادت اپنے تمام مسائل مذاکرات

کی میز پر حل کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔پاک بھارت میں تعلقات ہمسائے جیسے ہو جائے گے ایک ایسا ہمسایہ جو دوسرے کو اپنے جیسا ہی سمجھتا ہو۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ بھارت ان مسائل پر بات کرنے سے گریزاں ہے۔ جو دونوں ملکوں میں کشیدگی کا سبب رہے ہیں۔ پاکستان کا موقف یہ ہے کہ کشمیر سمیت تمام مسائل پر ایک ساتھ بات ہونی چاہیے۔پاکستان کے نزدیک دیگر تمام مسائل کی بنیاد کشمیر کا تنازعہ ہے اس لئے اس معاملے پر پہلے بات ہونی چاہئے کیونکہ اگر مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرلیا جائے تو دیگر مسائل کا حل تلاش کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ جبکہ بھارت کا کہنا ہے کہ کشمیر کے علاوہ دیگر مسائل پر بھی گفتگو ساتھ ساتھ ہونی چاہے اور دیگر امور پر پیش رفت کو کشمیر میں کشیدگی کی وجہ سے نہیں روکا جاسکتا۔سب سے اہم تنازعہ جو پاکستان اور بھارت کے درمیان ہے وہ کشمیر کا تنازعہ ہے۔ تقسیم ہند کے معاہدے کے مطابق ہندوستان کے مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان اور ہندو اکثریت والے علاقے بھارت میں شامل ہو نگے جبکہ ملحقہ ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت کسی کے ساتھ مل جائیں چنانچہ کئی ایک ریاستیں پاکستان میں شامل ہو گئیں اور متعدد بھارت کا حصہ بن گئیں۔ مگر بعض ایسی ریاستوں کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ بھارت میں شامل ہوں یا پاکستان میں کہ جہاں پر عوام کی اکثریت مسلم اور حکمرانی غیر مسلموں کے پاس تھی یا وہ کہ جہاں پر اکثریت یا اثر و رسوخ غیر مسلموں کے پاس تھا ایسی ہی ریاستوں میں ایک کشمیر بھی

شامل ہے کہ جہاں پر مسلم اکثریت پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔بھارت میں شمولیت کے ساتھ ہی کشمیری عوام اس فیصلے کے خلاف ہو گئے اور جلسے جلوس اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا جو آج تک جاری ہے بھارت کا اصرار ہے کہ ریاست کشمیر ہمارا حصہ ہے اور پاکستان کا اصرار ہے کہ کشمیر ہمارا حصہ ہے اس پر اب تک تین جنگیں ہو چکی ہیں۔جبکہ وہاں کی عوام کی جدوجہد علیحدہ سے جاری ہے۔1948کے آغاز میں ہی یہ مسئلہ عالمی برادری کی نظر میں آچکا تھا چنانچہ اس وقت کے بھارت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کشمیری عوام کی رائے جاننے کے لیے اقوام متحدہ میں کشمیر میں ریفرینڈم کرانے کا وعدہ کر لیا یعنی کہ اگر عوام کی اکثریت پاکستان میں شامل ہونا چاہے گی تو کشمیر پاکستان کا حصہ اور اگر عوام کی اکثریت نے بھارت میں شامل ہونے کیلئے ووٹ ڈالا تو کشمیر بھارت کا حصہ ہو گا۔بھارت کے اس جمہوری طریقہ کار سے اب دور بھاگ رہا ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین ہندوستانی ریاست گجرات اور پاکستانی صوبے سندھ کے علاقے میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین بین الاقوامی سرحد کے تعین پر بھی اتفاق ہونا باقی ہے۔یہ علاقہ سر کریک کا علاقہ کہلاتا ہے۔ ساٹھ سے سو کلومیٹر کے اس علاقے میں بہت سی کریک یعنی خلیج اور دریاؤں کے دہانے ہیں۔ اس علاقے کا تنازعہ 1960 کی دہائی میں سامنے آیا تھا جس پر 1968 میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک ویسٹرن باؤنڈری ٹرائیبیونل ایوارڈ قائم کیا گیا لیکن یہ طے نہیں ہو سکا کہ سر کریک کے علاقے میں بین الاقوامی سرحد کا تعین

کس قانونی بنیاد پر کیا جائے۔ اس علاقے کا کچھ حصہ آبی ہے اور کچھ حصہ خشک۔ پاکستان اور بھارت کے مابین کئی دفعہ اس مسئلہ پر مذاکرات ہو چکے ہیں لیکن اس پر بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ دونوں ممالک کی اس علاقے میں دلچسپی یہاں پر ماہی گیری کی وسیع صنعت اور تیل کے وافر ذخائر ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان اختلاف اس بات پر ہے کہ آخر سرحد کس جگہ ہے۔ پاکستان کا کہنا ہے کہ سر کریک کا پورا علاقہ اسکا اپنا ہے۔ لیکن ہندوستان اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ایک اور اہم مسئلہ وولر پروجیکٹ کا ہے جو بھارت دریائے جہلم پر کشمیر میں وولر پروجیکٹ کے نام سے ایک ڈیم بنا رہا ہے جس کی پاکستان شروع سے ہی مخالفت کرتا رہا ہے۔ بھارت کا یہ کہنا ہے کہ یہ پروجیکٹ پانی سے بجلی پیدا کرنے کے لئے تعمیر کر رہا ہے اور اس کا پانی دیگر ذرائع کیلئے بھی استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ پاکستان کو خدشہ ہے کہ گرمی کے موسم میں دریائے جہلم میں پانی کی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے ہاں پانی کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ پاکستان کو پہلے ہی پانی کی کمی کا سامنا ہے۔ دریائے جہلم بھارت کے زیر انتظام کشمیر سے شروع ہو کر پاکستان میں ختم ہوتا ہے۔ یہاں بھی بھارت وولر پراجیکٹ کی طرح ایک دوسرا پروجیکٹ دریائے چناب پر تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اسے سلال ڈیم کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ان دونوں منصوبوں پر دونوں ملکوں کا اتفاق ہونا باقی ہے۔ پاکستان میں پانی کے مسائل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ ہمارے لئے زندگی موت کا مسئلہ ہے کیونکہ پاکستان

کو جن دریاوں سے پانی ملتا ہے ان میں سے اکثریت بھارت کی زیر انتظام کشمیر سے نکلتی ہے اور اگر بھارت ان پر ڈیم بنالے جیسا کہ ستلج اور راوی پر بنائے ہوئے ہیں۔ تو یہ ہماری معیشت کی تباہی ہوگی۔ایک اور مسئلہ تجارتی تعلقات کا ہے۔ پاکستان اور بھارت ڈبلیو ٹی او کے ممبر ہیں جو ایک آزاد تجارتی معاہدہ ہے۔ عالمی تجارتی تنظیم یعنی ڈبلیو ٹی او کے قوانین کے تحت وقت کے ساتھ ساتھ اس تنظیم میں شامل تمام رکن ممالک کے لیے لازمی ہے کہ دنیا میں آزاد تجارت قائم کرنے کے لئے ایک دوسرے کو ایم ایف این یعنی خصوصی مراعات یافتہ قوم کا درجہ دیں۔ ایم ایف این کا درجہ جس ملک کو دیا جاتا ہے وہاں سے اشیاء کی درآمد اور برآمد میں تاجروں کے لئے آسان ہوجاتی ہے۔اس مسئلہ پر بھی گفت شنید ہوئی ہے۔ پاک ایران گیس پائپ لائن منصوبہ بھی دونوں کی تجارت میں حائل ایک رکاوٹ ہے۔ پاک بھارت کی تجارت میں سب سے زیادہ دوں ملکوں کی نیک نیتی ضروری ہے۔ اگر دونوں ممالک اچھے ہمسائے کی طرح رہنے کا دل سے فیصلہ کریں۔ تو ایک ارب عوام کو خوشحالی میسّر آ سکتی ہے۔ لیکن دونوں ملکوں کی عسکری قوت ان مذکرات اور تعلقات کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ پاکستان کی جمہوری حکومت کو درپیش موجودہ حالات بھی اس صورتحال کی عکاس ہے۔

قانون سو رہا ہے، لوگ مر رہے ہیں

پنجاب کی جس پولیس نے دو عورتوں سمیت دس افراد کو دن دھاڑے ہلاک کر کے علامہ طاہر القادری پاکستانی سیاست میں ایک بار پھر ان کر دیا، یہ پولیس والے اگر ایک گولی ہوا میں بھی چلا دیتے تو فرزانہ کی جان بچ جاتی۔فرزانہ جسے غیرت کے نام پر اپنوں نے اس مملکت خداداد پاکستان میں دن دھاڑے عدالت کے احاطے میں سنگسار کر کے مار دیا۔ میری رات کی نیند درخت پر رسی سے جھولتی اس تیرہ سالہ لڑکی کی تصویر کے سبب اڑ جاتی ہے، جو اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ یہ بچی پنجاب کے کسی دیہات میں سر شام حوائج ضرورت کے تحت نکلی تھی۔ اگلے دن اس کی لاش ملی، انسانوں نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو درندوں بھی نہیں کرتے۔ میری نظروں میں اس پچھتر سالہ بوڑھی عورت کی درخواست بھی گھوم رہی ہے، جس میں اس نے پولیس اور عدالت سے انصاف کی دھائی دیتے ہوئے، کہا ہے کہ ایک شخص اس بیوہ عورت کے گھر میں رات کو گھس آیا اور اس کی آبرو ریزی کی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پورا معاشرہ عفریت کا روپ دھار گیا ہے، نہ بچیاں محفوظ ہیں نہ بوڑھی خواتین، نہ گھروں میں نہ محلوں میں ۔ عورت جو ماں بہن بیٹی بیوی بن کر ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے، لیکن جب انتقام کے شعلے بلند ہوں تو اسی پھول کو کوئی روندتا ہے، کوئی اسے قتل کرتا ہے، کوئی اسے مسل کر پھینک دیتا ہے۔اب پاکستان خواتین کے خلاف

تشدد بشمول جنسی زیادتی کے واقعات میں بھی بدنام ہے۔ پنجاب میں رواں سال یکم جنوری سے 31 مارچ تک خواتین پر تشدد کے 1400 واقعات رپورٹ ہوئے جن میں قتل، اغوا، خودکشی اور جنسی زیادتی کے واقعات شامل ہیں۔ چھوٹے دیہات نہیں، ضلع فیصل آباد، لاہور جیسے شہران تشدد کے واقعات میں سرفہرست ہیں۔ تیزاب گردی کے واقعات، اغواکے واقعات کو تو شمار ہی نہیں کیا جاتا۔ میں نے ابھی آمنہ کی تو بات ہی نہیں کی۔اس بیچاری کو تو اپنے پر ہونے والی زیادتی کے بارے میں شکایت درج کرانے کے لئے اور اپنا کیس آگے لانے کے لیے خودسوزی کرنا پڑی۔ کس کو سزا ملی، کس کے ہاتھ قلم ہوئے، مظفرگڑھ کی آمنہ جنسی زیادتی کا شکار ہوئی۔ پولیس نے اس کی سنوائی نہ کی اور وہ اس جانبدارانہ سلوک کی وجہ دنیا ہی سے کوچ کر گئی۔کیا سپریم کورٹ کے از خود نوٹس اور وزیراعلیٰ پنجاب کی جانب سے غفلت برتنے پر پولیس اہلکاروں کی معطلی اور سرزنش جیسے اقدامات سے آمنہ واپس آجائے گی۔ پنجاب کے ہی دو شہروں میں بچیوں کو زندہ جلانے اور گولیاں مار کر نہر میں پھینکنے پر بھی کسی کو کوئی ملال نہیں ہے۔ یہ خون خاک نشیاں ہے۔ جو رزق خاک ہو رہا ہے۔ ملک میں قانون موم کی ناک ہے، طاقت والے اس سے کھیل رہے ہیں۔ قانون کے موثر نفاذ کے بغیر اس کی حیثیت صرف ایک دستاویز سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن کون عملدرآمد کرائے گا، اور کس سے کرائے گا۔ اس پولیس سے جو کمزوروں پر گولیاں چلاتی ہے، اور طاقت والوں کو سلام کرتی ہے۔ جنسی زیادتی کے مقدمات میں واقعاتی شہادت

کی بجائے صرف گواہی پر توجہ مرکوز رکھی جاتی ہے جس سے اکثر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں اب بھی خواتین کو کسی نہ کسی حوالے سے تشدد کا سامنا ہے اور اکثر وہ اس کے خلاف کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔۔۔اقوام متحدہ کے اعداد وشمار کے مطابق دنیا بھر میں ہر تین میں سے ایک عورت یا لڑکی کبھی نہ کبھی تشدد کا شکار ضرور بنی ہے۔ عورت فاونڈیشن کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوہزار دس کے دوران خواتین پر تشدد کے لگ بھگ آٹھ ہزار واقعات رپورٹ ہوئے۔ جبکہ دوہزار گیارہ میں ان واقعات کی تعداد آٹھ ہزار پانچ سو اتنالیس رہی۔یعنی ان واقعات کی تعداد میں چھ اعشاریہ سات چار فیصد اضافہ ہوا ہے۔ غیرت کے نام پر عورتوں پر تشدد، خاص طور پر غیرت کے نام پر قتل، تیزاب سے حملوں اور خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک کے خاتمے کے لیے کتنے اعلان، کتنے دعوی ہوچکے، حالیہ برسوں میں قانون سازی بھی ہوئی ہے۔لیکن نتیجہ کیا ہے، یہ واقعات مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ قانون کے نفاذ کا عمل کمزور، انتظامیہ، عدلیہ اور پولیس بے حس۔ کس سے فریاد کی جائے۔ اسلام نے عورت کو بلندی کا مقام دیا۔نہ ہمیں اس مقام کا احساس ہے اور نہ اس وقار و تقدس کا۔ خواتین معاشرے کا اہم جز ہیں جن کے بغیر بالخصوص معاشرتی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خواتین ہر روپ میں قابل احترام و عزت ہیں،اسلام نے اسکا ایک مقام متعین کیا ہے جسے تسلیم کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ہمارا میڈیا، جو ڈرامے دکھا رہا ہے، اس سے کونسے نتائج کی توقع کی

جاسکتی ہے۔ ایمیزون نے تو جنسی تشدد کے موضوع پر لکھی کتابیں ہٹا لی ہیں۔ تو کیا ان ڈراموں اور فلموں ، اشتہارات کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے کتنے جنسی درندوں کو سزائیں دی۔ ہمیں اپنی نسلوں کی حفاظت کرنا ہے تو کڑوی گھونٹ پی کر معاشرہ میں پولیس کی تطہیر، عدالتوں سے انصاف، اور دلوں میں خوف خدا پیدا کرنا ہوگا۔

سندھ کا بجٹ کہاں خرچ ہو رہا ہے؟

سندھ میں شدت کی گرمی اور حکومت کی نااہلیت کا بھانڈہ ایک بار پھر پھوٹ گیا ہے کہ سہون میں شہباز قلندر کے عرس میں گرمی، پانی کی عدم دستیابی، محکمہ اوقاف کی بے حسی سے تین چار دن میں پچاس سے زائد ہلاکتیں ہو چکی ہیں اور حکومت سندھ کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگ رہی، سندھ حکومت نے مالی سال 2014-15 کا بجٹ اسمبلی میں پیش کیا ہے۔ جس کا حجم 686 ارب روپے ہے۔ بجٹ اجلاس میں ہٹ دھرمی کا وہی راج ہے، جس میں سب اچھا سب اچھا کا راگ الاپا جارہا ہے۔ حکومتی اراکین بجٹ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے جبکہ چھوٹی سے اپوزیشن حکومتی وزرا پر کرپشن کا الزام لگا رہی ہے۔ مسلم لیگ (ن) ، مسلم لیگ فنکشنل اور تحریک انصاف کے چند اراکین آواز اٹھا رہے ہیں۔ لیکن یہ طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں ہے۔ یوں بھی حکمران جماعت پیپلز پارٹی دوسری جماعتوں کی تنقید کی پرواہ نہیں کرتی۔ سندھ میں بجٹ میں رکھی گئی رقوم کہاں خرچ ہوتی ہیں ،.برسوں سے یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

حکومت کے بجٹ اور اس کے استعمال کے طریقہ کار پر ہر ایک انگلی اٹھا رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ نے اس بار جو بجٹ پیش کیا ہے وہ موجودہ مالی سال کے بجٹ حجم سے 11 فیصد زیادہ ہے ۔حکومت نے بجٹ میں ترقیاتی منصوبوں کے لیے 1 کھرب 68 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ نئے مالی سال کے بجٹ

میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور پنشن میں 10 فیصد اضافہ کیا گیا ہے جبکہ اس دوران 40 ہزار ملازمتوں اور 65 ہزار افراد کو ہنرمندی کی تربیت کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔ لیکن اس بجٹ کا تاریک پہلو یہ ہے کہ سندھ میں گورنس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ صوبائی حکومت کرپشن کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام ہے۔یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ رواں سال کا 70 فیصد ترقیاتی بجٹ خرچ نہیں کیا گیااور اپوزیشن ارکان کو فنڈز نہیں دیئے گئے۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہیں سوچا گیا۔ مسلم لیگ (ن) کے سید اعجاز علی شاہ شیرازی نے تو اسمبلی فلور پر کہا ہے کہ محکمہ خزانہ میں پہلے 10 فیصد کمیشن لیا جاتا تھا اب 12 فیصد کمیشن لیا جاتا ہے۔ پنجاب میں سڑکیں اور ترقیاتی کام دیکھے جائیں تو سندھ کی حالت دیکھ کر شرم آتی ہے۔ محکمہ تعلیم میں بھی رشوت کی ہوشربا داستانیں ہیں، جن کے سرے وزیر تعلیم تک جاتے ہیں۔ صوبے میں تعلیم پر 120 ارب روپے سے زائد بجٹ رکھا گیا تھا لیکن اس کے باوجود سرکاری سکولوں کا معیار بدترین ہے۔ صوبے میں صحت کے شعبے پر 50 ارب روپے رکھے گئے ہیں، لیکن لوگوں کو علاج معالجے کی سہولت دستیاب نہیں ہے۔ ہسپتالوں میں کتے اور سانپ کاٹنے کے ویکسئین تک دستیاب نہیں ، اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ متعدد مریض ویکسئین کی عدم دستیابی کے باعث لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ امن وامان پر 50 سے 60 ارب روپے سالانہ خرچ کئے جارہے ہیں جبکہ شہروں میں رہنے والے دہشتگردوں اور ٹارگٹ کلرز کے ہاتھوں روزانہ بے دردی سے مارے جارہے۔ بجٹ سے

قبل ایک اجلاس میں سابق صدر آصف علی زرداری نے تمام وزرا اور وزیراعلی کو بلاول ہاؤس میں بلا کر کہا تھا کہ اس سال بجٹ میں تعلیم، صحت، پینے کے صاف پانی، آبپاشی، زراعت، انفرااسٹرکچر سمیت شہری اور دیہی علاقوں کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ ترقیاتی منصوبے شامل کئے جائیں۔ انہوں نے ہدایت کی تھی کہ سندھ کے مالی سال کا بجٹ 2014-15 عوام کی امنگوں کے مطابق ہونا چاہیۓ۔ آصف علی زرداری نے تمام وزرا کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنائیں۔ پارٹی رہنماؤں، کارکنان اور عوام سے رابطے میں رہیں۔ اور متنبہ کیا تھا کہ جن صوبائی وزرا کے خلاف آئندہ شکایتیں آئیں گی انہیں عہدوں سے ہٹادیا جائے گا۔ نئے مالی سال میں توانائی کے شعبے کیلیۓ 20 ارب، صحت کی مد میں 43 ارب 51 کروڑ، پیپلز ہیلتھ کیئر کیلیۓ 2 ارب 37 کروڑ جبکہ ادویات کی خریداری کے بجٹ میں 35 فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ لیکن کراچی میں ٹرانسپورٹ، لوکل ریل، پانی جیسے منصوبوں سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ سید قائم علی شاہ کا کہنا ہے کہ ٹیکس وصولیوں میں کمی کی وجہ سے ترقیاتی اخراجات کم کیے گئے ہیں جبکہ سندھ کو وفاق سے رواں سال 61 ارب روپے کم ملے ہیں۔ سندھ میں 70 فیصد گیس کی پیداوار ہوتی ہے، سندھ کو گیس انفرااسٹرکچر کی مد میں وفاق سے جو رائلٹی ملنی چاہیۓ تھی وہ نہیں ملی تاہم اس میں اضافے کیلیۓ وفاقی حکومت کو خط لکھ دیا گیا ہے جبکہ گیس پر ٹیکس عائد کرنے سے پہلے صوبوں سے بھی مشاورت کی جانی چاہیۓ۔ سوال یہ ہے کہ سندھ کے پاس جو کچھ ہے وہ کہاں خرچ ہو رہا ہے،

اس کی بھی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے۔

رمضان میں مہنگائی کا جن قابو سے باہر ہوگیا

رمضان المبارک کے دوران مشرقِ وسطیٰ سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں ''سیلز پروموشنز'' کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں عوام کو سستی اشیاء فراہم کی جاتی ہیں، یہ یہاں معمول کی بات ہے، سپر اسٹوروں پر عوام کو سیل کے نام پر لوٹا نہیں جاتا ہے، اس بار رمضان سے پہلے سعودی عرب کے مختلف شہروں میں قائم چین سٹور کی ایک شاخ نے رمضان کی سیلز پروموشن کا اہتمام کیا تھا، اس اسٹور میں عوام نے دل کھول کر لوٹ سیل میں حصہ لیا، گاہوں کے ہجوم نے دل موہ دینے والی رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے فوڈ چین کی ایک.برانچ پر ایسا ہلہ بولا کہ سارے انتظام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ گاہکوں کا انبوہ مقبول عام فوڈ اینڈ گراسری 'تمیمی مارکیٹ' پر خریداری کے لئے اتنی.بڑی تعداد میں جمع ہوا کہ فوڈ چین کی ساری سجاوٹ دھری کی دھری رہ گئی۔ لیکن ہمارے یہاں رمضان آتے ہی جو لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا، اس برس فروری میں اشیاء خورونوش کی قیمتوں میں یکایک بلاجواز اضافہ نے شہریوں کی چیخیں نکلوادی تھیں جس پر حکومت پنجاب نے مارکیٹ کمیٹیوں کو سرکاری نرخناموں کے اجراء اور اس پر عمل درآمد کے لیے منتخب نمائندوں کو ٹاؤن انتظامیہ کو متحرک کیا تھا جس نے بازاروں اور دکانوں پر تیزی سے چھاپے مارنے شروع کیے جس کے نتیجہ میں قیمتوں میں

کافی حد تک کمی آئی۔ لیکن سندھ میں منگائی کا جن قابو سے باہر ہے اور حکومت کی رٹ ایک سوال ہے، بازاروں میں اشیا کی وافر فراہمی، معیار اور نرخوں پر عمل درآمد کو یقینی دہانی کے دعوے سب بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ گراں فروشوں کے خلاف سخت کارروائی حکومتی پریس ریلز تک محدود ہے، در حقیقت حکومت سندھ کو مہنگائی اور عوام کی بھلائی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ نہ ہی رمضان کے حوالے سے کوئی تیاری کی گئی تھی۔ تاکہ ماہ رمضان میں عوام کو لوٹنے کا سلسلہ ختم ہو سکے۔ مرکزی سطح پر بھی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی بہتر منصوبہ بندی نہیں کی۔ اقتصادی رابطہ کمیٹی نے 2 ارب روپے کے رمضان پیکیج کی منظوری دی تھی، جس کے ذریعے یوٹیلٹی اسٹورز پر اشیائے ضروریہ کی قیمتیں 10 سے 15 فیصد کم ہونے کی خوشخبری سنائی گئی تھی، لیکن ایک تو یوٹیلٹی اسٹور غریب کی پہنچ سے دور وی آئی پی علاقوں میں ہیں۔ جہاں عوام مشکل سے پہنچ سکتے ہیں، جتنے کی بچت نہیں ہوتی جتنا کرائے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ کمشنر کراچی شعیب احمد صدیقی نے رمضان سے قبل اس بات کی نوید سنائی تھی کہ پرائس کنٹرول کمیٹی اور مینو فیکچررز اور ہول سیلرز کے تعاون سے رمضان میں شہریوں کو اشیائے ضروریہ میں ریلیف دینے کے لیے رعایتی قیمتوں پر مشتمل رمضان پیکیج تیار کیا گیا ہے۔ پیکیج میں آٹا، روٹی، تیل، گھی، مٹھائی، نمکو، بیکری کی اشیا، چائے کی قیمتوں میں ریلیف دینے کا کہا گیا تھا۔، تیل، گھی، مٹھائی، نمکو، بیکری کی اشیا، چائے کی قیمتوں میں کمی کے لئے مختلیف کمپنیوں سے

ڈالڈا فوڈز، کسان گھی، میسرز یونی لیورز پاکستان اور صوفی گھی اینڈ آئل نے مختلف رعایتوں کا اعلان کرایا گیا تھا۔ لیکن اس پر عمل کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ سب سے زیادہ آٹے پر مذاق کیا گیا، عوام کو کہا گیا کہ آٹا 360 روپے کا دیا جائے گا، سندھ فلور ملز ایسو سی ایشن نے انتظامیہ کو تحریری طور پر آٹے کی قیمت میں کمی کی یقین دہانی کرائی ہے انھوں نے 10 کلو کے عوامی آٹے کا تھیلا 360 روپے میں دینے کا اعلان کیا تھا۔ ۔تمام ملز نے اپنی فیئر پرائس شاپس بھی قائم کرنے کا کہا تھا، لیکن اس پر دکھاوے کا ہی عمل ہوا، عوام کو آٹا 480 روپے تھیلا ہی ملا۔ روٹی کی قیمتوں میں کمی کا بھی فیصلہ کیا گیا تھا، تندور مالکان نے شہریوں کو ریلیف دینے کے لیے روٹی کی قیمت کم کرنے کا تحریری طور پر اعلان کیا تھا، فیصلے کے مطابق روٹی کی کم سے کم قیمت پانچ روپے اور زیادہ سے زیادہ نو روپے کی ہوگی۔ لیکن عوام کو رمضان میں روٹی چھ روپے اور دس روپے ہی میں دستیاب ہوئی۔ مرکزی حکومت کے دو ارب کے پیکج کے مقابلے میں حکومت پنجاب نے صوبے کے عوام کیلئے پانچ ارب روپے کے رمضان پیکج کی حتمی منظوری دی تھی۔ صوبے بھر میں رمضان بازار بھی لگائے گئے۔ اور وہاں آٹے کا دس کلو کا تھیلا تین سو دس روپے میں دیا گیا۔ یوٹیلیٹی سٹورز کارپوریشن کے ایم ڈی نے میڈیا نمائندوں کے سامنے دعوی کیا تھا کہ رواں برس رمضان میں یوٹیلیٹی سٹوروں پر فروخت کے لیے معیاری اشیاء فراہم کی جائیں گی۔ ایم ڈی کے مطابق ان کا ٹارگٹ تنخواہ دار طبقہ ہے۔

اس

سال رمضان کے لیے اشیا کی کوالٹی اور نرخوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس پر بھی عمل نہیں ہوا۔ اکثر چیزوں کے غیر معیاری ہونے کی شکایت عام تھی۔ کارپوریشن میں بد عنوانی کا یہ حال ہے کہ کارپوریشن میں چوری اور غیر معیاری اشیاء کی فروخت میں ملوث 1500 ملازمین کو نوکری سے فارغ کیا گیا ہے۔ دو فرنچائز سٹوں کے لائسنس منسوخ کیے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کوئی سدھار نہیں ہوا۔ عوام کو یہ شکایت رہی کہ یوٹیلیٹی سٹوروں پر اعلان کردہ اشیاء سرے سے دستیاب ہی نہیں تھی۔ یہ اشیاء اسٹور کا مالک دکانداروں کو فروخت کر دیتا ہے یا ایک فرد کو اس کی ضرورت سے زائد دے دیتا ہے جس سے کئی صارفین یہ اشیاء خریدنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اب تک عوام کو یہ سمجھ نہیں آئی کہ حکومت یوٹیلیٹی اسٹوروں پر جو اربوں روپے سبسڈی کی مد میں خرچ کر رہی ہے عام شہری کو اس کا کیا فائدہ پہنچ پایا۔ سبزیوں کے دام بھی عوام پر بھاری ہیں ۔لاہور میں آلو 70 روپے کلو، تو کراچی میں 60 روپے اور پشاور میں 90 روپے میں فروخت کیا جا رہا ہے، جب کہ لاہور میں پیاز 40 روپے کلو تو کراچی میں 35 روپے اور پشاور میں 50 روپے کلو میں فروخت کی جا رہی ہے۔ کیلے کی فی درجن قیمت لاہور اور کراچی میں 120 جب کہ پشاور میں 130 روپے ہے۔ منافع خوروں کے خلاف حکومت کچھ بھی نہیں کرپاتی۔ دنیا بھر میں تہذیب یافتہ ممالک میں مذہبی تہوار اور خوشی کے مواقع پر دکاندار سستی اشیاء فروخت کرتی ہیں۔ ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ غریب اور پسماندہ طبقات کو بھی ان تہواروں کی خوشیوں میں شریک کیا جائے۔

اسی وجہ سے ان ممالک میں ایسے مواقع پر زبردست سیل لگی رہتی ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ خصوصاً پسماندہ طبقات کے لوگ ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں جبکہ پاکستان بھر میں روایات تہذیب یافتہ دنیا سے بالکل برعکس ہیں۔ یہاں ضرورت کی اشیاء پہلے غائب کر لی جاتی ہیں یا ان کی ذخیرہ اندوزی بڑے بڑے لوگ اور تاجر حضرات حکومت وقت کی سرپرستی میں کرتے ہیں۔اس کا مقصد ان اشیاء کی قلت کو یقینی بنانا ہوتا ہے اور بعد میں زیادہ قیمت پر بڑے دکاندار اور دوسرے لوگوں ان اشیاء کو فروخت کرتے ہیں۔ بات یہیں نہیں رکتی ، چھوٹے دکاندار اور ریڑھی والے اس میں دو گنا اضافہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ضرورت اور روزمرہ میں استعمال ہونے والی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ عام اور غریب لوگوں کے دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں۔

دنیا بھر میں افطار کے رنگ

رمضان المبارک رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے، مختلف ممالک میں مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق افطار کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن دنیا بھر میں افطاری کا سب سے بڑا اہتمام خانہ کعبہ میں کیا جاتا ہے، مسجد نبوی ﷺ کا افطار دستر خون بھی ساری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔اس ماہ مقدس میں افطار پارٹیوں کے نام پر خاندان بھر کو ایک دستر خوان پر مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ماہ صیام کا ایک خاص حسن افطار پارٹی ہے۔روزہ کھلوانا ثواب تو ہے ہی مگر افطاری کے موقع پر ایک دستر خوان پر بیٹھنے سے عزیزو اقارب اور دوست احباب کے درمیان محبت اور بھائی چارے کی فضا بھی پروان چڑھتی ہے۔اس ماہ مبارک کی رونقوں کی بھی کیا بات ہے افطار پارٹی کے موقع پر طرح طرح کے لوازمات تیار کیے جاتے ہیں ایک طرف خواتین کچن میں افطاری کی تیاری میں مصروف ہوتی ہیں تو دوسری جانب بزرگ عبادت میں مشغول۔لڑکیاں دستر خوان سجاتی نظر آتی ہیں۔افطاری کے اوقات میں جہاں دستر خوان رنگا رنگ پکوانوں سے سجا ہوتا ہے وہیں دوستوں اور احباب کی انکھیں محبت سے دمکتی اور چہرے خوشی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ مسلم گھرانوں کی یہ خوبصورت روایت جہاں سب کو آپس میں مل جل کر بیٹھنے کا موقع فراہم کرتی ہے وہیں مہمان نوازی کی خوبصورت مثال بھی

ہے۔ دبئی میں رمضان کا سب سے بڑا دستر خوان کی تیاری، بادشاہ کے ذمہ ہے۔ رمضان کے دوران بادشاہ خوشی خوشی ڈبل شفٹ میں کام کرتے ہیں۔ 150 کلو باسمتی چاول اور 60 کلو بکرے کے گوشت سے 'کانجی' بنانا ان کی ذمے داری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیسہ کمانا ہی ان کا مقصد نہیں ہے بلکہ ہر روز ہزاروں افراد کو یہاں روزہ کھولتے دیکھ کر بہت سکون ملتا ہے۔ مسجد نبوی دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے انتہائی مقدس جگہ ہے۔ یہاں ہر سال پچاس لاکھ سے زائد افراد زیارت اور عبادات کی غرض سے پہنچتے ہیں۔

سب سے زیادہ افراد دوران حج یہاں کا سفر کرتے ہیں جبکہ دوسری بار رمضان کے

مہینے میں یہاں سب سے زیادہ افراد آتے ہیں۔ اسی سبب رمضان میں یہاں صفائی ستھرائی سے لیکر لاکھوں افراد کے سحری اور افطار کے وسیع پیمانے پر انتظامات کئے جاتے ہیں۔

مکہ اور مدینہ کے علاوہ غالباً دنیا کے کسی اور ملک میں روزہ افطار کرنے کے اتنے بڑے اجتماعات نہیں ہوتے جتنے یہاں ہوتے ہیں۔ مسجد نبوی میں روزہ افطار کرنے والوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ افطار اجتماع کے انتظامات سنبھالنے والے خدام کی تعدداد پانچ ہزار سے زائد ہوتی ہے۔ملازمین کی تعیناتی کے لئے باقاعدہ ایک ایجنسی کام کرتی ہے جس کی خدمات میں مسجدِ نبوی کے امور کی دیکھ بھال شامل ہے۔ یہ ادارہ سعودی حکمراں شاہ عبداللہ کو جوابدہ ہے۔ شاہ عبداللہ خادم الحرمین شریفین کہلاتے ہیں یعنی مسجد نبوی اور مسجد الحرام مکہ کا 'خادم' یا خدمت گزار۔ مسجد نبوی میں 10 ہزار سے زائد قالین بچھے ہوئے ہیں جن پر دوران رمضان ہر شام نہایت وسیع وعریض دستر خوان بچھائے جاتے ہیں جن پر بیٹھ کر لاکھوں عمرہ زائرئن اور دیگر افراد بیک وقت زوہ افطار کرتے ہیں۔ یہ انتہائی پر لطف اور دلکش منظر ہوتا ہے۔ پوری مسجد اس کا صحن اور ارد گرد کا تمام علاقہ زورافطار کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔پانچ ہزار ملازمین کے علاوہ صاحب حیثیت سعودی شہری روزے کے انتظامات اپنی جیب سے بھی کرتے ہیں۔ایسے افراد کی تعداد میں سینکڑوں میں

ہے۔ ان افراد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ روزہ دار ان کے دستر خوان پر روزہ افطار کریں چنانچہ روزہ داروں کو مسجد کے گیٹ سے ہی باقاعدہ ہاتھ پکڑ پکڑ کر اپنے اپنے دستر خوان پر بیٹھایا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے انہوں نے ملازمین بھی رکھے ہوئے ہیں جن کا کام صرف روزہ داروں کو دستر خوان تک لانا ہوتا ہے۔

سعودی عرب کے سرکاری خبر رساں ادارے ایس پی اے کے مطابق مسجد نبوی میں یومیہ ایک لاکھ سے زائد افراد بیک وقت افطار کرتے ہیں۔ یہاں قدیم سعودی روایات کے مطابق افطار میں روٹی ، دہی، کھجوریں، پانی ، قہوہ اور قماش قماش

کے جوسز اور پھل موجود ہوتے ہیں۔ کچھ افراد سموسوں، سینڈوچ اور دیگر اسی قسم کے دیگر لوازمات بھی رکھتے ہیں جبکہ بسکٹ، بریڈ اور چاکلیٹ تو عام بات ہے۔ سب سے زیادہ ڈسپلن یہ ہے کہ روزہ کھلنے کے دس منٹ بعد ہی دستر خوان جس تیزی سے ہٹائے اور قالین صاف کیے جاتے ہیں وہ منظر بھی قابل دید ہوتا ہے۔ کئی کئی میٹر طویل پلاسٹک کے دستر خوان اس تیزی اور نفاست سے سمیٹے جاتے ہیں کہ قالین یا فرش پر ایک چیز نہیں گرتی۔ ساری صاف ستھرائی منٹوں میں ہوتی ہے چونکہ چند لمحوں بعد ہی نماز مغرب ادا کی جاتی ہے۔

پوری مسجد میں آب زم زم سپلائی کیا جاتا ہے۔ مسجد کے امور کی دیکھ بھال کرنے والے ادارے کے نائب چیئرمین عبدالعزیز الفالح کے مطابق مسجد میں ہر روز 300 سے زائد آب زم زم سپلائی ہوتا ہے۔ زم زم براہ راست مکہ سے مدینہ لایا جاتا ہے۔

مسجد کے صحن میں نمازیوں کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے نہایت بڑی بڑی اور خودکار الیکٹرک چھتریاں لگائی گئی ہیں۔ ان چھتریوں کی تعداد 250 سے زیادہ ہے۔ سن 2010ء میں پہلی مرتبہ ان کی تنصیب شروع ہوئی تھی۔ صحن میں چھتریوں کے ساتھ ساتھ پنکھے بھی نصب ہیں جن کی تعداد تقریباً450 ہے۔ نمازیوں کے جوتے رکھنے کے لئے مسجد میں جگہ جگہ لکڑی کے باکس اور الماریاں موجود

ہیں تاہم اس سال جوتے رکھنے کے لئے المونیم کے بنے تین ہزار سے زائد نئے باکسز رکھے گئے ہیں۔اسلام ایک عالمگیر مذہب ہیاور اس کا اظہار وقتاً فوقتاً مختلف تہواروں ، مہینوں اور عبادات کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ حج کا موقع ہو تو دنیا بھر کے مسلمان حج کی ادائیگی کے لئیحجاز مقدس کا رخ کرتے ہیں اور باقی مسلمان اپنے اپنے ملکوں میں قربانی ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح رمضان کے مہینے کا آغاز ہو تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تمام مسلمان اللہ پاک کی اس نعمت سے لطف اندوز نہ ہوں۔ پاکستان , بھارت، بنگلہ دیش، جاپان، چین، مشرق وسطیٰ، امریکہ، یورپ، جنوبی امریکہ، افریقہ،آسٹریلیا اور دنیا بھر کے دیگر ممالک میں مسلمانوں نے افطاری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کئی ملکوں میں رمضان کی آمد کی خوشی میں جشن بھی ہوااور مسلم روزہ داروں نے نماز ادا کر اللہ پاک سے رمضان جیسا بابرکت مہینہ عطا کرنے پر شکر ادا کیا۔آیئے ہم آپ کو افطار اور دیگر عبادات کے روح پرور مناظر کی سیر کراتے ہیں۔ یہ رمضان کی ایک عام سی صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ جگہ ہے دبئی کا مشہور علاقہ سوناپور جہاں واقع ایک کچن میں تقریباً 11 شیف اور ان کے درجنوں ہیلپرز میں ایک ریس سی لگی ہے۔ یہ ریس ہے وقت سے آگے نکلنے کی۔انہیں روزہ کھلنے سے بھی کئی گھنٹے پہلے 10 جہازی سائز کے برتن بھر کر کھانا بنانا ہے۔ مقامی زبان میں اس ڈش کو 'کانجی' کہتے ہیں۔ سونا پور، ڈیرہ دبئی کا علاقہ ہے اور یہیں 'نائف گولڈ سوق' نامی سونے کی مارکیٹ میں 'الراشد لوٹا مسجد' کے قریب یہ کچن واقع ہے جہاں

ہر روز 3 ہزار آدمیوں کے لئے کھانا پکتا ہے۔ پورے متحدہ عرب امارات میں افطار کا اتنا بڑا انتظام کہیں اور نہیں ہوتا۔ گلف نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق انڈین مسلم ایسو سی ایشن یو اے ای، جو ایمان کلچرل سینٹر کے نام سے رجسٹرڈ ہے، اس کے جنرل سیکریٹری لیاقت علی کا کہنا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر افطار کا اہتمام ایک دو برس سے نہیں پچھلے برسوں سے جاری ہے۔ کچن میں صبح پانچ بجے سے کام کا آغاز ہو جاتا ہے جو دن بھر 35 چلتا رہتا ہے، اس کام کو شیفس اور دیگر 50 افراد ملکر انجام دیتے ہیں۔ اس کام میں کھانا پکانا، اسے پیک کرنا، لوڈنگ، ان لوڈنگ۔۔ سب کچھ شامل ہے۔ انتالیس سالہ انور بادشاہ جو اسی کچن کے لیبر کیمپ میں باورچی ہیں وہ بتاتے ہیں: 'پچھلے 10 سالوں سے رمضان کے دوران میں مشکل سے ہی کبھی سویا ہوں گا، اب تو یہ میرے شیڈول کا حصہ بن گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ انسانی خدمت ہے۔ رمضان کے دوران بادشاہ خوشی خوشی ڈبل شفٹ میں کام کرتے ہیں۔ 150 کلو باسمتی چاول اور 60 کلو بکرے کے گوشت سے 'کانجی' بنانا ان کی ذمے داری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیسہ کمانا ہی ان کا مقصد نہیں ہے بلکہ ہر روز ہزاروں افراد کو یہاں روزہ کھولتے دیکھ کر بہت سکون ملتا ہے۔ یہاں روزہ داروں کو ملنے والے فوڈ پیکٹ میں دلیے کے علاوہ سموسے، کھجوریں، پانی، فروٹ اور جوسز ہوتے ہیں۔ لیکن، دلیہ یہاں مہینے بھر کے دوران روزہ کھولنے والے تقریباً ایک لاکھ روزہ داروں کے لئے سب سے زیادہ لطف کا باعث ہے۔ مہینے بھر کے لئے کھجوروں کے تقریباً 500 کارٹنز منگائے جاتے ہیں، جبکہ ہر

ایک کارٹن کا وزن 10 کلو ہوتا ہے۔ یہ سب سامان مسجد میں ہی رکھا جاتا ہے جو ’کویتی مسجد‘ کے نام بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔کانجی کیا ہے؟

کانجی بھارتی ریاست تامل ناڈو کی مقامی اور روایتی ڈش ہے۔ اصل میں یہ ایک طرح کا دلیہ ہے۔ لیاقت علی کے بقول، کانجی ایسی ڈش ہے جو رمضان میں ہر روز کھائی جاتی ہے۔ دبئی میں یہ کانجی پچھلے 35سالوں سے افطار میں روزہ داروں کی پسندیدہ خوراک بنی ہوئی ہے۔'یہ سروس سنہ 1979میں شروع کی گئی تھی۔ اس وقت روزہ داروں کی تعداد تین سال تک صرف 500ہی رہی۔ لیکن، آج یہ تعداد یومیہ تین سے چار ہزارتک جا پہنچی ہے۔افطار ٹیم کے لیڈر اور جوائنٹ

سیکریٹری محمد طٰحہ کا کہنا ہے کہ کچن کا سارا کام 65 افراد مل کر انجام دیتے ہیں جبکہ جس وقت افطار کے لئے دستر خوان لگ رہا ہوتا ہے ہزاروں لوگ رضاکارانہ طور پر اس کام میں لگ جاتے ہیں اور تقریباً دو گھنٹے تک کام میں مصروف رہتے ہیں۔ طٰحہ مزید بتاتے ہیں کہ یہاں روزہ کھولنے والے افراد کا تعلق مختلف ممالک سے ہوتا ہے۔ یہ تمام افراد اپنے اپنے ممالک چھوڑ کر دبئی میں روزگار کی خاطر مقیم ہیں۔ یہاں بڑی گنجائش موجود ہوتی ہے اور جو لوگ آخری لمحوں میں بھی یہاں پہنچتے ہیں انہیں بھی ہر چیز مل جاتی ہے۔)
دنیا بھر کی طرح فرانس میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کی طرف سے مساجد میں افطار اور سحری کے پر تکلف انتظامات کے ساتھ ساتھ عبادات کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستانی کمیونٹی کی سارسل اور پیری فیت کی مساجد میں یہاں مقیم مخیّر افراد نے افطاری اور سحری کیلئے انتظامات کیلئے دن مخصوص کر رکھے ہیں اس روز وہ مساجد کے روزمرہ کے نمازیوں کے علاوہ اپنے دوست احباب کو بھی خصوصی طور پر مدعو کرتے ہیں۔ افطار کے بعد نماز کی ادائیگی اور بعد ازاں پر تکلف کھانے کا اہتمام کرکے میزبان خوشی اور راحت محسوس کرتے ہیں۔ پیری فیت مسجد کے پیش امام مولانا محمد صدیق ہیں۔ یہاں کی پاکستانی کمیونیٹی کہتی ہے کہ ہمیں یہاں غریب لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ وطن عزیز میں موجود مجبور لوگوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ اجتماعی افطاری اور سحری کے موقع پر ملکی ترقی اور خوشحالی کیلئے خصوصی دعا بھی کرائی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ فرانس کی مختلف مساجد میں

چاند رات تک جاری رہتا ہے۔ امریکہ میں بھی مختلیف خاندان رمضان کی تیاریاں بہت پہلے سے کرتے ہیں۔ ایک خاتون بتاتی ہیں کہ ،، رمضان سے ایک ہفتہ پیشتر مَیں نے ۵۶ ڈالر میں میدجول کھجوروں کے بڑے باکس کا آرڈر دیا۔ کھجور کے اشتہار میں اس کی خوبیوں کی تفصیل کچھ یوں رقم تھی ’’اللہ کے فضل سے سو فی صد قدرتی، بہترین اور معیاری‘‘۔ مَیں سوچنے لگی ’’ کیا اس قیمت پر یہ بہتر ہوگا۔‘‘ امش کے نام سے معروف قدامت پسند عیسائی کاشت کار طبقہ کے ذریعہ پالے گئے مرغ اور مسلمانوں کے ہاتھوں ذبح شدہ حلال فری رینج چکن کے علاوہ جو چیزیں میری فہرست میں شامل تھیں وہ خشک خوبانی، مٹھائی بنانے کے لئے ورق لوئی اور نصف ملین دوسری چیزیں تھیں کیوں کہ رمضان کے مقدس مہینے کے لئے کھانے کی متعدد چیزوں کا جمع کرنا بھی کسی مسلم گھرانے میں کام کرنے والے باورچی کے کام کا حصہ ہے۔ جب آپ دن میں صرف ایک بار کھانا کھائیں تو اسے خاطر خواہ ہونا چاہئے، ایسا جس کا شمار کیا جاسکے۔ دن کے اوقات میں رمضان المبارک خواہ خود پر ضبط اور تحمل کا مہینہ ہو، لیکن بہ وقتِ شب یہ ضیافت کی ساعت بن جاتا ہے۔ خاندان کے افراد اور دوستوں کے ساتھ موسمی چیزوں سے لطف اندوزی امریکہ ہی میں نہیں ہر اس خطہ زمیں پر جشن کی سی کیفیت پیدا کردیتی ہے جہاں رمضان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سیئٹل میں ہماری مقامی برادری بہت متنوع ہے، اس لئے لوگوں کا جمع ہونا بہت سی مختلف ثقافتی روایات کا ایک مجموعہ بن جاتا ہے۔ تیونس کے دوست پودینہ کی خوشبو والی سبز چائے کی صراحی کے ساتھ آتے ہیں تو

مصری باشندے پرت دار پیسٹری کی رکابی لاتے ہیں جسے شکم کو سَیر کرنے والے گھر میں بنے امریکی پکوان جیسے تلے ہوئے مرغ اور بسکٹ کے شانہ بہ شانہ دستر خوان پر چنا جاتا ہے۔ ایسے میں جب کسی قریب ترین آئی فون سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے (اس کے لئے بھی ایک اپلی کیشن ہے) تو وہ لمحہ بڑا خاص ہوتا ہے جب آپ محبت سے تیار کئے گئے روایتی کھانوں کی میز کی جانب لپکتے ہیں۔ جی ہاں، رمضان روحانی طور پر غور و فکر کا مہینہ ہے۔ یہ ایک ایسا مہینہ ہے جب پوری دنیا کے مسلمان روزہ، قرانِ پاک کی تلاوت اور صدقہ کے ذریعہ پروردگارِ عالم سے لَو لگاتے ہیں اور اس کی قربت کے متمنی ہوتے ہیں۔ اس عالم میں جب کوئی شخص ایک لحظہ کو بھی اگر کھانے کے بارے میں رطب اللسان ہوتا ہے تو لازماً وہاں کوئی نہ کوئی اسے ٹوک دیتا ہے ''کھانے کی بات نہیں ہے۔ آپ کو کھانے کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہیۓ۔'' ٹھیک ہے بھائی، آپ کی بات درست ہے۔ لیکن افطار کے وقت جو بریانی آپ کھاتے ہیں، کیا لگتا ہے آپ کو۔ اسے کون بناتا ہے؟ یہ خود ہی تو تیار نہیں ہوتی۔ اس کے لئے گھر کی خواتین تیاری کرتی ہیں۔ نیویارک کا اسلامی مرکز بھی رمضان میں رونق اور خوشیوں سے بھر جاتا ہے۔ یہ مرکز جملہ اسلامی مراکز میں سے ایک ہے جو نیویارک کے مسلمانوں کے لیے افطاری کا انتظام کرتا ہے حال حاضر میں ہر رات دو ہزار سے زیادہ روزہ دار نماز جماعت ادا کرنے کے بعد افطاری کے پروگرام میں شرکت کرتے ہیں۔ دنیا کے دیگر مسلمان چاہے وہ کسی بھی خطہ ارض میں زندگی بسر کر رہے ہوں

اپنے رسم و رسومات کو پورا کرنے اور مذہبی مراسم کو انجام دینے میں آزاد ہیں۔ در حالانکہ امریکہ کے لوگ امریکی طرز و طور سے زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ مساجد میں افطار کا یہاں بھی اہتمام ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو مجبور ہیں غروب کے وقت اپنی ڈیوٹیوں پر رہیں ان کے لیے مساجد میں افطار ایک بڑی نعمت ہے۔ وہ لوگ افطار کے وقت فورا اپنے آپ کو اپنے کام سے نزدیک مسجد میں پہنچاتے ہیں اور افطار کرکے اپنے کاموں پر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ رمضان کی امریکہ پر ایک تاثیر یہ بھی ہے کہ اس ماہ میں امریکہ والوں پر یہ اثر پڑتا ہے وہ مسلمانوں کے ذریعے اسلام سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں یعنی امریکہ میں مسلمانوں کو بے شمار مشکلات لاحق ہونے کے باجود وہ اس مہینہ میں امریکیوں پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں جس کی بنا پر وہ مسلمانوں سے اپنے روابط برقرار کرتے ہیں۔ اور اسلام سے آشنا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ان مسلمانوں کو دیکھ کر جو اپنے خدا کی خاطر ایک پورا ماہ اپنے نفس کے ساتھ معرکہ آرائی کرتے ہیں اور اسے تمام خواہشات سے دور رکھتے ہیں امریکہ والے اسلام سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔اور مسلمانوں کا احترام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کے مسلم اکثریتی علاقوں میں سائرن کی آواز ہوتی ہے جسے سن کر لوگ افطار کرتے ہیں۔ کہیں کہیں گولے بھی داغے جاتے ہیں اور بعض مقامات پر اذان کی آواز ہی وقت ہونے کا اعلان ہوتی ہے۔پرانی دہلی اور جامع مسجد کے علاقے میں یہ سماں کچھ زیادہ ہی رہتا ہے جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتا ہے۔ 80 سالہ بزرگ

اور ریٹائرڈ ٹیچر ماسٹر محمد انیس صدیقی اپنی یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ دہلی میں وہ 1955 سے مسلسل سائرن کی آواز سنتے آرہے ہیں۔اس سے پہلے وہ اترپردیش کے ایک ضلع میں رہتے تھے۔یہ سائرن افطار اوار سحری دونوں وقت بجایا جاتاہے۔لیکن پھر بھی سحری میں کبھی کبھی لوگ نیند کی شدت سے نہیں اٹھ پاتے اس کیلئے دہلی ہی نہیں پورے ملک میں عرصہ دراز سے مختلف طریقے رائج ہیں۔بعض جگہوں میں مساجد سے مسلسل اعلان ہوتا ہے کہ سحری کا وقت ہوگیا ہے یا وقت ختم ہونے میں صرف اتنی دیر باقی ہے۔بعض مقامات پر مسجد کے ہی لاوڈا سپیکر سے نعت اور حمد کا سلسلہ سحری کے اوقات میں مسلسل جاری رہتاہے لہذا جولوگ اعلان سے نہیں جاگ پاتے اس کو غنیمت سمجھتے ہیں۔لیکن ایک طریقہ جواب صرف دیہاتوں اور قصبوں تک محدود رہ گیاہے اور لاوڈا سپیکر کی ایجاد سے پہلے ہی سے معروف ہے وہ یہ کہ گاؤں یا محلے کے چند افراد کی ایک ٹیم سحری کے مقررہ وقت سے پہلے گھروں پر جاکر لوگوں کو جگاتی ہے اور راستے بھر نعت حمد اور ترانے گاتی جاتی ہے۔

بعض علاقوں میں یہ خدمت گاؤں یا آس پاس کے علاقے کے غربا انجام دیتے ہیں۔سحری کے روحانی وقت میں عموما ان کی حمدو نعت دلوں میں اترتی محسوس ہوتی ہے اور ''اٹھو روزے دارو! سحری کھالو ''کا نعرہ بڑا ہی زوردار معلوم ہوتا ہے جس سے نیند یکلخت غائب ہوجاتی ہے۔دن کو مائیں جب بچوں کو بتاتی ہیں کہ آج جگانے والے نے کتنی اچھی نعت پڑھی تو بچے ماؤں سے ضد کرکے اس وقت اٹھانے کے لئے کہتے ہیں تاکہ وہ بھی اس کو سن سکیں۔رمضان کے آخری ایام میں اس ٹیم کا ''الوداع ماہ رمضان۔'' کا پرسوز ترانہ عموما ہر خاص وعام کے لئے ایک کسک چھوڑ جاتاہے۔ہندوستان کا پھیلاو شمالا جنوبا زیادہ ہے لیکن مشرق تا مغرب بھی اس کا فاصلہ کم نہیں ہے لہذا سحر و افطار کے اوقات میں یہاں کافی فرق ہے۔مغربی بنگال اور آسام کے مشرقی حصے کے سحر وافطار کے اوقات سے راجستھان ،گجرات اورمہاراشٹر کے مغربی اضلاع کے اوقات میں تقریبا ایک گھنٹے سے زائد کا فرق پایا جاتاہے۔ماضی میں دہلی سمیت پورے ہندوستان میں گھر کی بنائی ہوئی موٹی موٹی سوئیاں گڑ میں ڈال کر کھانے کا عام رواج تھا لیکن اب یہ

روایت ختم ہو گئی اب نہ تو گھریلو سوئیاں ہی ہیں اور نہ گڑ آسانی سے دستیاب ہے۔اس کی جگہ اب کھجلا، فینی وغیرہ نے لے لی ہے۔دودھ کے علاوہ سبزی بھی سحری کے وقت ہندوستان میں کھانے کا عام رواج ہے۔شمالی ہند کے دیگر علاقوں مثلاً اعظم گڑھ الہ آباد وغیرہ میں ناریل کی گری ،کاجو، بادام اور دگر میوہ جات سے تیار شدہ مسالا پینے کا عام رواج ہے۔ بعض مقامات پر چپاتی اور پاو سے اس کو کھاتے بھی ہیں۔لیکن مہاراشٹر کے کچھ علاقوں میں دودھ اور کیلا بھی سحری میں کھایا جاتاہے۔جب کہ جنوبی ہند کی ریاست کیرلہ اور تمل ناڈو میں چاول اور کھجور زیادہ کھائی جاتی ہیں۔اکثر جگہوں میں رمضان میں پاو کی مانگ بڑھ جاتی ہے لیکن اترپردیش کے کچھ علاقوں میں دودھ پاو ہی سحری کی مرغوب غذا ہے۔لہٰذا بیکریاں نت نئی ڈیزائن اور سائز کے پاو بنانے میں ایک دوسے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔رمضان جانے کے بعد سال بھر افطار کے ان کھانوں کی یاد آتی رہتی ہے۔

کیا پاکستان میں ہیلتھ انشورنس اسکیم کامیاب ہوگی

پاکستان اور بھارت جیسے ملکوں میں ہر سال بہت سے مریض صرف غربت کی وجہ سے ہسپتال کا خرچ نہیں اٹھا پاتے اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ہیلتھ انشورنس اس کا ایک اچھا علاج ہے تاہم ترقی پذیر ملکوں میں اب تک عام شہری کی پہنچ اس تک نہیں۔ ہیلتھ انشورنس کا بنیادی مقصد کم پیسے ادا کرتے ہوئے محدود طبّی سہولیات تک رسائی ہے۔ جرمن انشورنس کمپنی آلیانز کے میتھائیل انتھونی کا کہنا ہے کہ ''ایک شخص جس کی آمدنی دو ڈالر یومیہ تک محدود ہو، عمومی طور پر میڈیکل انشورنس سروس کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہیلتھ انشورنس کی دنیا میں کم آمدنی والے صارف کی جگہ بن نہیں پاتی۔''

دوسرے انشورنس نظاموں کی طرح مائیکرو ہیلتھ انشورنس کو بھی زیادہ تعداد میں صارفین کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اخراجاتی رسک کو کم سے کم ہو۔ دنیا بھر میں اب انشورنس کے ذریعے طبّی سہولتیں حاصل کرنے کا رجحان ہے۔ پاکستان میں میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اور بڑے ادارے جو اپنے ملازمین کو طبّی سہولتیں دینا چاہتے ہیں ان کا رجحان بھی ہیلتھ انشورنس کی جانب ہو رہا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی معیشت امریکہ میں گزشتہ برس ایسے افراد کی تعداد 50 ملین کے قریب تھی جن کے پاس بیماری کی صورت میں علاج کے لیے کوئی ہیلتھ انشورنس نہیں تھی۔ یہ

تعداد سن 2009 کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ایک مطالعے کے دوران ماہرین کو پتہ یہ چلا کہ وہ مریض جن کے پاس بیماری کی صورت میں علاج کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے بیمے کی سہولت نہیں ہوتی ان میں سے ہر ایک اوسطاً صرف 2.8 روز تک کسی نہ کسی ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ ان میں سے زیادہ تر مریض دمے اور ذیابیطس جیسی بیماریوں کا شکار تھے ۔امریکی صدر براک اوباما نے ہیلتھ انشورنس کے لیئے بہت بڑی جنگ لڑی ہے۔ امریکہ میں پاس ہونے والے 'ایفرڈایبل کیئر ایکٹ' کے تحت 80 لاکھ شہریوں نے ہیلتھ انشورنس کی سہولت حاصل کی ہے۔انتخابی سال کے دوران، ریپبلیکن پارٹی سے تعلق رکھنے والے افراد اس قانون کو ہدف تنقید بناتے رہے ہیں۔ صدر اوباما پر امید ہیں کہ اس قانون کی بدولت عام شہریوں کی زندگیوں میں ایک مثبت تبدیلی آئے گی۔ پاکستان میں بھی زیراعظم محمد نواز شریف نے غریب ترین افراد کیلئے نیشنل ہیلتھ انشورنس سکیم کی منظوری دی ہے۔جس میں 10 کروڑ افراد کیلئے مرحلہ وار ہیلتھ انشورنس پروگرام اجرا کیا جائے گا۔ بدقسمتی سے نواز شریف نے کسی انشورنس کے ماہر ایکچویری کو اس اسکیم کا سربراہ بنانے کے بجائے مریم نواز کو اسکیم چلانے کا فریضہ سونپا ہے۔ تخت لاہور کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ کسی بھی اہم منصب کے لیئے اپنے خاندان کے سوا کہیں نہیں دیکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی اہمیت کی تین بڑی انشورنس کارپوریشن ، اسٹیٹ لائف انشورنس، نیشنل انشورنس، اور پاکستان انشورنس ایک سال سے زائد مدت گذرنے کے باوجود چیئرمین اور بورڈ آف

ڈائریکٹرز سے محروم ہیں۔ جس کے سبب اربوں روپے کی کارپوریشن کے معاملات تعطل کا شکار ہیں۔ ایسے میں اگر کسی مالیاتی ادارے میں کوئی بڑا مالیاتی اسکنڈل ہوگیا تو عوام کو جن کی پالیسیاں ہیں، اور جن کی رقوم کے لائف فنڈز پر یہ ادارے کھڑے ہیں۔ بے حد نقصان ہوگا۔ ہیلتھ انشورنس پروگرام معاشرے کے معاشی طور پر پسماندہ لوگوں کو صحت کے تحفظ کی فراہمی کا واحد راستہ ہے۔ کہا جارہا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی سکیم ہے جس نے شکایات کے حل پر مبنی نظام کے ساتھ ساتھ پاکستان کے غریب ترین لوگوں کے لئے سماجی تحفظ کا نظام متعارف کرایا ہے۔ اس پروگرام کے نتیجہ میں ملک کے محروم طبقات کو نہ صرف بلامعاوضہ صحت کی سہولیات تک رسائی حاصل ہو گی بلکہ پاکستان بھر میں جدید ہیلتھ انفراسٹرکچر کو ترقی دینے میں بھی مدد ملے گی۔ وزیراعظم چاہتے ہیں کہ اس سکیم سے پاکستان میں پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کو فروغ ملے اور اس سے سرمایہ کاری کی نئی راہیں کھلیں گی۔ پاکستان کی مجموعی آبادی کا اندازہ اٹھارہ سے بیس کروڑ نفوس کے لگ بھگ لگایا جاتا ہے جن میں سے تقریباً آدھی آبادی بے وسیلہ افراد کی ہے جو دو وقت کی روٹی تو کسی نہ کسی حیلے سے محنت مشقت کے ذریعے بے شک حاصل کرلیتی ہے مگر بیماری اور حادثے وغیرہ کی صورت میں دوا دارو کا حصول ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی ان بے چاروں کا کوئی پرسان حال ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ملک کے دس کروڑ غریب ترین افراد کے لیے ہیلتھ انشورنس اسکیم کی منظوری کے اعلان کو ایک انتہائی اہم پیشرفت

قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کریڈٹ بھی ضیا دور میں میاں یاسین وٹو کو جاتا ہے کہ انھوں نے پہلی بار پاکستان میں حادثاتی انشورنس اسکیم کا اجرا کیا تھا، جس کے ذریعہ کسی حادثاتی موت پر دس ہزار روپے کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اس اسکیم کا انتظام و انصرام اسٹیٹ لائف انشورنس نے بڑی کامیابی سے چلایا تاہم بعد میں آنے والی حکومتوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ گذشتہ دور میں بے نذیر انکم سپورٹ کے تحت بھی محدود پیمانے پر ایک اسکیم کا اجراء کیا گیا۔ لیکن عوام تک اس کے ثمرات پوری طرح نہیں پہنچ سکے۔ محترمہ مریم نواز کے ساتھ اب ، وزیر مملکت برائے صحت سائرہ افضل تارڑ کو بھی اس اسکیم کی سربراہی کے لئے چنا گیا ہے۔ جن کا تعلق بھی وزیر اعظم کے قریبی خاندان سے ہے۔اس اسکیم کے تحت ملک کے غریب لوگوں کو امراض قلب، ذیابیطس (شوگر)، ہیپاٹائٹس، اعضاکے ناکارہ ہونے اور کینسر (سرطان) جیسے بڑے امراض کے مفت علاج معالجے کی سہولیات فراہم کرنے کا سوچا جارہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اس سکیم کے لئے اچھی انشورنس کمپنیوں کی مشاورت اور ماہرین کے تعاون سے کوئی ایسی راہ نکالے جس سے عوام کی مشکلات میں کمی ہوں اور انشورنس کے مفید منصوبوں سے عوام کو فائدہ ہو۔

میلبورن دنیا کا پہلا 'سگریٹ فری' شہر

دنیا بھر میں منشیات کے استعمال کی وجہ سے سالانہ پانچ لاکھ اموات ہوتی ہیں، سگریٹ کے ذریعے کئے جانے والے نشے اور شیشہ نوشی کے سبب 60 لاکھ افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ پاکستان کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں شیشہ نوشی بڑھ رہی ہے۔ آسٹریلیا کے شہر میلبورن کو دو سال بعد دنیا کے پہلے سگریٹ فری شہر ہونے کا اعزاز مل جائے گا۔ میلبورن شہر کے کونسلر رچرڈ فوسٹر نے کہا ہے کہ 'اس طرح ہم دنیا بھر کے لوگوں اور سیاحوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جن کی خواہش ہوگی کہ وہ کسی سگریٹ فری شہر میں جائیں'۔ انہوں نے بتایا کہ اس منصوبہ کے تحت کسی سڑک، گلی، ریسٹورنٹ اور دیگر عمارتوں میں کام کرنے والوں کو سگریٹ سلگانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ فوسٹر کے مطابق سگریٹ نوشی کیلئے انتظامیہ خصوصی شیلٹر بنائے گی جہاں شہریوں کو سگریٹ پینے کی اجازت ہوگی۔ ڈبلیو ایچ او کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں سالانہ 25 لاکھ افراد کی ہلاکتیں صرف شراب نوشی کی وجہ سے ہوتی ہیں جبکہ دیگر نشہ آور اشیاء کے استعمال سے ہونے والا جانی

نقصان اس علاوہ ہے۔ ہمارے ملک میں بھی منشیات کی پیداوار اور اس کے عادی افراد کی تعداد میں تیزی سے اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ لیکن ہماری حکومتوں کی توجہ اس جانب نہیں ہے۔ صرف لاہور شہر میں تقریبا 75 ہزار لوگ نشے کے عادی ہیں جن میں 20 ہزار سے زائد ہیروئن کا نشہ کرتے ہیں۔ نشہ آور اشیاکے استعمال میں شراب، شیشہ نوشی، نشہ آور انجیکشن، خواب آور گولیاں، نشہ آور شربت، کیفین، ہیروئن اور چرس وغیرہ شامل ہیں۔ منشیات میں صرف شراب نوشی ہی ہلاکتوں کا باعث نہیں بلکہ شیشہ نوشی اور سگریٹ کے ذریعے کئے جانے والے نشے بھی انتہائی خطرناک ہیں بعض تو کیمکل سونگھنے کا انتہائی زہریلہ نشہ بھی کرتے ہیں۔ حکومت پنجاب صوبہ بھر میں منشیات کی روک تھام اور منشیات فروشوں کے خلاف کارروائی کے لئے دور رس اقدامات کئے اور تمام وسائل بروئے کار رہی ہے۔ پنجاب حکومت وفاقی اداروں اور مختلف بین الاقوامی اور مقامی این جی اوز کے تعاون سے منشیات کے پھیلاؤ کو روکنے، عوامی شعور اجاگر کرنے اور اس سے متاثرہ لوگوں کی بحالی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ دنیا بھر میں منشیات کے استعمال کی وجہ سے سالانہ پانچ لاکھ اموات ہوتی ہیں، سگریٹ کے ذریعے کئے جانے والے نشے اور شیشہ نوشی کے سبب 60 لاکھ افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ منشیات کے حوالے سے لاہور کی صورت حال بھی ملک کی مجموعی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک محتاط تخمینے کے مطابق لاہور میں نشہ کے عادی افراد کی تعداد

ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے جن میں 25 سے 30 ہزار ہیروئن استعمال کرتے ہیں جبکہ 15 سے 20 ہزار افراد ہیروئن یا کوئی اور نشہ بذریعہ انجیکشن لے رہے ہیں اور یوں وہ انجکشن کے غیر محتاط استعمال سے ہیپاٹائٹس اور ایڈز کا بھی شکار ہو رہے ہیں۔ نوجوان عمر کے لڑکے لڑکیاں شیشہ نوشی کو فیشن کے طور پر اپنا رہے ہیں جو نشہ کی انتہائی مہلک شکل ہے۔ لاہور کی کل آبادی میں 2 سے 3 فیصد کام کاج کے قابل لوگ نشے کی علت میں گرفتار ہو کر یا تو کام کاج کے قابل نہیں رہے یا کام کاج کرنے سے گریز کرتے ہیں یوں معاشی سرگرمیوں سے کٹ کر اپنے خاندان اور معاشرے کے لئے معاشی، جسمانی اور روحانی بوجھ بنے جاتے ہیں۔ حکومت کی کوشش ہے کہ 2020 تک پاکستان کو منشیات سے پاک ملک بنایا جائے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے صوبائی دارالحکومتوں اور پھر بتدریج تمام شہروں کو منشیات سے پاک کرتے چلے جانا ہے۔ ''لاہور ڈرگ فری سٹی'' منصوبہ اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس کے تحت حکومت پاکستان اور حکومت پنجاب مختلف اداروں اور این جی اوز کے تعاون سے مشترکہ طور پر لاہور کو منشیات سے پاک کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اپنی قدیم ثقافت، روایات اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے لئے دنیا بھر میں مشہور لاہور کو منشیات سے پاک کرنے کے لئے حکومت پنجاب اور وفاقی حکومت مربوط کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ متاثرہ زندگیوں کو اس لعنت سے بچانے کے لئے 100 ملین روپے کی خطیر رقم سے '' لاہور ڈرگ فری سٹی

کا منصوبہ بھرپور انداز میں جاری ہے۔اینٹی نارکوٹکس فورس، پولیس، غیر سرکاری" تنظیموں اور تمام اداروں کے تعاون سے منشیات کے نقصانات سے آگہی، نشے میں مبتلا افراد کے علاج معالجے اور منشیات فروشوں کی بیخ کنی کے حوالے سے ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں۔3 سال پر مشتمل اس پراجیکٹ کو شروع ہوئے 2سال ہو چکے ہیں جبکہ اس پراجیکٹ پر 60 ملین روپے وفاق اور 40 ملین روپے پنجاب حکومت کی جانب سے فنڈز کی صورت میں فراہم کئے جارہے ہیں۔اس پراجیکٹ پر 18 مختلف محکمے کام کررہے ہیں۔منشیات کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے لاہور میں 1375 مختلف ورکشاپس، کیمپس لیکچرز، تصاویری نمائش، سیمینارز، تقریری وکھیلوں کے مقابلے اور واک سمیت دیگر ایونٹس منعقد کروائے جاچکے ہیں۔سی سی پی او لاہور کو اس کا سربراہ بنایا گیا ہے جو پولیس کی کمان کررہے ہیں اور انہوں نے تمام پولیس افسران کو ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ منشیات فروشی کے عادی افراد کے خلاف مقدمات درج کرنے کی بجائے منشیات فروخت کرنے والے بڑے مگرمچھوں کو پکڑیں جو اس لعنت کو شہر میں پھیلا رہے ہیں۔لاہور ڈرگ فری سٹی کے پراجیکٹ ڈائریکٹر الطاف قمر نے وزیراعلی پنجاب محمد شہباز شریف سے بھی اس حوالے سے خصوصی ملاقات کی جس کے بعد حکومت پنجاب کی جانب سے منشیات میں مبتلا افراد کے لئے مینٹل ہسپتال میں 100بستروں پر مشتمل ایک علیحدہ ہسپتال کی منظوری بھی دی گئی ہے۔سال 2011کے دوران منشیات فروشی کی روک

تھام کے لئے موثر اقدامات کرتے ہوئے 11130 ملزمان کو گرفتار کیا گیا، 74 کلو سے زائد افیون، 482 کلو سے زائد ہیروئن، 1895 کلو گرام چرس اور 74066 شراب کی بوتلیں قبضے میں لی گئیں جبکہ سال 2012 کے دوران مقدمات کی تعداد میں کمی واقع ہوئی، 6121 مقدمات درج کئے گئے، 6374 ملزمان کو گرفتار کیا گیا جبکہ 75 کلو گرام سے زائد افیون، 313 کلو گرام سے زائد ہیروئن، 1669 کلو سے زائد چرس اور شراب کی 64627 بوتلیں قبضے میں لی گئیں۔ منشیات کے خلاف جہاد میں ساری قوم متحد ہے، لیکن سندھ میں بڑی ہوٹلوں میں شیشہ پینے پر پابندی نہیں ہے، جس کی وجہ سے خواتین میں بھی اس کا رضحان بڑھ رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ منشیات فروشوں کے خلاف کارروائیوں کے ساتھ ساتھ عوام میں منشیات کے مضر اثرات اور تباہ کاریوں کے حوالے سے شروع کی گئی آگاہی مہم کو بھرپور طریقے سے کامیاب بنایا جائے اور متعلقہ اداروں کی کوششوں کو موثر اور نتیجہ خیز بنانے میں بھرپور تعاون کیا جائے۔ تمام شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد کو اس منصوبے کی کامیابی کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔ والدین اور خاندان کے دیگر افراد کا کردار اس حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اپنے بچوں پر نظر رکھیں کہ وہ کیسی صحبت میں اپنا وقت گزار رہے ہیں تاکہ وہ بے راہ روی کا شکار ہو کر نشہ کی لعنت میں مبتلا نہ ہو سکیں یہی وہ اقدامات ہیں جن کے ذریعے لاہور کے شہریوں کو منشیات سے بچانے

میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسلام آباد کے نوجوانوں میں منشیات کے بڑھتے ہوئے استعمال کے بارے میں بھی تشویش ناک رپورٹ منظر عام پر آچکی ہیں۔ سگریٹ کے کش لگانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سگریٹ کا دھواں سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت کو اس قدر دھندلا دیتا ہے کہ ان بے شمار زہریلے مرکبات کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی جو سگریٹ میں موجود ہوتے ہیں۔ لوگوں کو سگریٹ سے بچنے کی ترغیب دینے والی ویب سائٹ ''سموک فری فور سیتھ'' نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سگریٹ میں قریباً 4 ہزار زہریلے مرکبات پائے جاتے ہیں، یہ وہی کیمکل ہیں جو کہ صفائی کیلئے استعمال ہونے والے تیزاب، نیل پالش اتارنے والے کیمیکل، آرسینک جیسے زہر، ایندھن، امورنیا اور چوہوں کو مارنے والے زہر میں شامل ہوتے ہیں اور تو اور سگریٹ میں خطرناک گیس کاربن مانو آکسائیڈ اور خطرناک زہر سایانائیڈ جیسے مرکبات بھی پائے جاتے ہیں۔ ماؤنٹ سینائی سکول آف میڈیسن کے ڈاکٹر لزکلاڈیو نے بتایا کہ تشویش کی بات یہ ہے کہ سگریٹ میں قدرتی تمباکو کے علاوہ سینکڑوں ایسے کیمکل اور مرکبات اضافی طور پر شامل ہوتے ہیں کہ جو انسانی صحت کیلئے زہر قاتل ہیں۔ واضح رہے کہ سگریٹ دنیا بھر میں ایسی اموات کی سب سے بڑی وجہ ہے کہ جن سے بچا جاسکتا ہے اور سگریٹ کے دھوئیں سے صرف امریکہ میں 50 ہزار کے قریب ہر سال وہ لوگ ہلاک ہوتے ہیں جو کہ خود سگریٹ نوش ہوتے ہیں۔ اسکول اور کالجوں میں بھی منشیات کے

حوالے سے شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں میں مقبول شیشہ عربی طرز کا حقہ ہے جس میں گرم پانی اور پائپ کے ذریعے تمباکو کو کوئلہ کے ذریعہ جلاتا ہے اور جس کا دھواں بھرپور کش کے ذریعہ اندر کی جانب کھینچا جاتا ہے۔ شیشہ پینے والا جب کش لیتا ہے تو دھوئیں کے اندر تمام زہریلے مادے پانی سے ہوتے ہوئے دھوئیں کی شکل میں انسانی جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ برطانوی ادارے ٹوبیکو کنٹرول ریسرچ کا کہنا ہے کہ شیشے کا کش لگانا اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا کہ سگریٹ پینا خطرناک ہے۔ تازہ ترین ریسرچ کے مطابق ایسے لوگوں میں کاربن مونو آکسائیڈ کا لیول سگریٹ نوشوں کی نسبت چار سے پانچ گنا تک زیادہ ہو سکتا ہے اور کاربن مونو آکسائیڈ کی غیر معمولی مقدار دماغ کے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ سگریٹ کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں آج کے دور میں خود کو سگریٹ نوشی سے بچائے رکھنا کیا کسی چیلنج سے کم ہے؟

امریکی فاسٹ فوڈ کمپنیوں میکڈونلڈ کی سیلز بری طرح متاثر

چین میں حفظان صحت سے متعلق میکڈونلڈ کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد دنیا کی سب سے بڑی فاسٹ فوڈ چین میکڈونلڈ کے شیئرز بدستور دباو کا شکار ہیں

امریکی فاسٹ فوڈ کمپنیوں میکڈونلڈ کی سیلز بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ چین میں حفظان صحت سے متعلق میکڈونلڈ کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد دنیا کی سب سے بڑی فاسٹ فوڈ چین میکڈونلڈ کے شیئرز بدستور دباو کا شکار ہیں۔ جس کے سب اس کی سیلز میں بہت زیادہ کمی ہوئی ہے۔ مکڈونلڈ اور اس کی حریف کمپنی یم برانڈز کو ایک خفیہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد نقصان کا سامنا ہے۔ جس میں شنگھائی ہیوی پلانٹ کے اندر حفظان صحت کا خیال نہ رکھنے کی نشاندہی کی گئ تھی۔ اس پلانٹ کے ذریعے دونوں کمپنیوں کو گوشت کی فراہمکی جاتی تھی۔ گذشتہ ہفتے ایشیاپیسیفک، فشرقی وسطی اور افریقہ کی مارکیٹیوں میں 7.2 فیصد سیلز کی کمی واقع ہوئی۔ جو اشاریہ دو فیصد کی اس کمی کے مقابلے میں بدترین ہے جس کی وال اسٹریٹ جنرل نے پیش گوئی کی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ فاسٹ فوڈ چین کو مشکلات کا سمان ہے۔ مکڈونالڈ اور

کے ایف سی' کو محفوظ خوراک کی فراہمی سے متعلق چین میں نئی تحقیقات کے سبب '
تشویشناک صورت حال کا سامنا ہے۔جب کہ حکام ایک ایسی رپورٹ کی تفتیش کر رہے
ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ گوشت فراہم کرنے والے ایک مقامی کمپنی کی طرف سے زائد
المعیاد یا پرانا بیف اور چکن فراہم کیا گیا۔ میکڈونلڈ کارپوریشن اور یم برانڈ کی کمپنی جو
کے ایف سی اور پیزا ہٹ کی بھی مالک ہے، کا کہنا ہے کہ انھوں نے ایک مقامی کمپنی کی
طرف سے فراہم کیے جانے والے گوشت کا استعمال بند کر دیا ہے۔ شنگھائی میں محفوظ
خوراک کی فراہمی کے ایک ادارے نے گوشت فراہم کرنے والی ایک مقامی کمپنی پر
پابندی عائد کر دی ہے۔ شنگھائی ڈیلی نیوز کے مطابق برگر کنگ، پاپا جانز پیزا، سٹار بکس
اور سینڈوچ بنانے والی سب وے کمپنیاں بھی ان کمپنیوں میں شامل (جنھیں مبینہ طور
پر پرانا گوشت فراہم کیا گیا) ہے۔ یہ تازہ کارروائی ممکنہ طور پر دو برانڈ کے لیے تشویش
کا باعث ہے جنھوں نے اس معاملے میں خود بھی تفتیش شروع کر دی ہے۔ یہ دونوں
کمپنیاں 2012 میں فوڈ سیفٹی کے ایک اسکینڈل کی وجہ سے شدید متاثر ہوئی تھی۔یم
کمپنی نے حالیہ معاملے پر صارفین کو پہنچنے والی تکلیف پر معذرت کی ہے۔ اس کمپنی کے
میں منافع میں کمی دیکھنے میں آئی، جس کی وجہ خوراک سے متعلق تحفظات 2013
رہے۔ چین کے خبر رساں ادارے ژنہوا کے مطابق شنگھائی فوڈ اور ڈرگ ایڈمینسٹریشن
ایس ایف ڈی اے) نے شنگھائی ہیوسی فوڈ کمپنی کو کام کرنے)

سے روک دیا ہے۔اس کمپنی نے یم۔کے ایف سی اور پیزا ہٹ کو زائد المدت گوشت فراہم کیا تھا۔شنگھائی کے ایک ٹی وی چینل پر نشر ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ شنگھائی ہیوسی کی طرف سے مبینہ طور پر پرانے گوشت کی فروخت کے علاوہ اس کی کمپنی کی ایک مقامی فیکٹری میں صفائی کا مناسب انتظام بھی نہیں تھا۔اس رپورٹ کے نشر ہونے کے بعد متعلقہ حکام نے مذکورہ کمپنی کا دورہ بھی کیا، جس کے بعد جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا کہ پولیس اس معاملے کی تفتیش کر رہی ہے۔چین میں محفوظ خوراک کے حوالے سے مسائل رہے ہیں، اس کی وجہ قواعد و ضوابط کے نفاذ میں نرمی اور کھانے پینے کی اشیاء بنانے والی کمپنی کی طرف سے سستی چیزیں بنانا بھی ہے۔کچھ عرصہ قبل دنیا بھر میں معروف امریکی فاسٹ فوڈ چین "میکڈونلڈز" نے جزیرہ نما کرائمیا میں اپنے تین ریسٹورنٹس عارضی طور پر بند کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہاں سے ملازمین کو یوکرین منتقل ہونے کی پیشکش کی گئی ہے۔ایک بیان میں میکڈونلڈز کا کہنا تھا کہ اس عارضی بندش کی وجہ اشیا کی تیاری میں درپیش چند غیر واضح مشکلات ہیں اور امید ہے یہ مسائل ہونے کے بعد ریستورانوں کو دوبارہ کھول دیا جائے گا۔اس ادارے نے کرائمیا میں اپنے ملازمین کو موجودہ حیثیت اور تنخواہ کے ساتھ یوکرین میں واقع ریستورانوں میں منتقل ہونے کی پیشکش کی ہے۔ملازمین کو جگہ کی منتقلی اور تین ماہ تک گھر کا کرایہ دینے کی بھی پیشکش کی

گئی۔ کرائمیا نے گزشتہ ماہ ایک ریفرنڈم میں روس کے ساتھ الحاق کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ اس ریفرنڈم کو امریکہ اور اس کے اتحادی غیر قانونی قرار دیتے ہیں۔ امریکہ نے اس الحاق کے خلاف ماسکو پر اقتصادی پابندیاں بھی عائد کی ہیں۔اس تنازع کے باعث بحیرہ اسود کے اس خطے میں مغربی ادارے اپنا کاروبار جاری رکھنے کے بارے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں فاسٹ فوڈ کی مقبول فرنچائز 'سب وے' نے اعلان کیا ہے کہ.برطانیہ اور آئر لینڈ کی تمام شاخوں پر اب صرف حلال گوشت سے تیار کردہ سینڈوچز فراہم کیے جائیں گے جبکہ خنزیر کے گوشت سے تیار کردہ تمام سینڈوچز کو مینو سے نکال دیا گیا ہے۔ 'میل آن لائن' کی خبر کے مطابق امریکی فاسٹ فوڈ چین کی جانب سے مسلمانوں کے پر زور اصرار کو مد نظر رکھتے ہوئے.برطانیہ اور آئر لینڈ کی ریسٹورنٹس پر حلال گوشت سے بنے ہوئے سینڈوچز متعارف کرائے گئے ہیں جو کہ 185 اسلامی قوانین کے تحت ذبیحہ گوشت سے تیار کئے جاتے ہیں۔.برطانیہ میں جانور کو بے ہوش کئے بغیر ذبح کرنا غیر قانونی ہے لیکن قانون میں مذہب کی بنیاد پر مسلمان اور یہودی قصابوں کو ذبیحہ کا چھوٹ دی گئی ہے۔ فاسٹ فوڈ کے ترجمان نے بتایا ہے کہ آئر لینڈ اور.برطانیہ کے سب وے اسٹورز پر اب صرف حلال گوشت سے تیار کردہ سینڈوچز فروخت کئے جارہے ہیں جبکہ ہیم اور بیکن کی جگہ ٹرکی یعنی فیل مرغ کا گوشت استعمال کیا جائے گا۔ ترجمان نے کہا کہ .برطانیہ کی کثیر

اثقافتی آبادی میں فاسٹ فوڈ سینڈوچز کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم مختلف کمیونٹیز کی مذہبی اقدار کا احترام کریں۔ترجمان کے مطابق چین ریسٹورنٹ کے کے منصوبے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ نئے اسٹور کھولنے سے پہلے آبادی کی 2007 خصوصیات کو مدنظر رکھا جائے گا اور صارفین کی طلب کو پورا کیا جائے گا۔ گزشتہ دنوں برطانوی خبر رساں ادارے 'رائٹرز' نے خبر دی تھی کہ 'سب وے' کا سال 2020 تک برطانیہ اور آئرلینڈ میں مزید 1,200 فاسٹ فوڈ اسٹورز کھولنے کا ارادہ ہے جن سے برطانیہ بھر میں روزگار کے تقریباً 13,000 مواقع پیدا ہوں گے۔فاسٹ فوڈ چین کے مطابق، سب وے پر فراہم کیے جانے والے تمام سینڈوچز حکام کی طرف سے سند یافتہ حلال گوشت سے تیار کیے جاتے ہیں۔برطانیہ میں سب وے کے تمام ریستورانوں کے استقبالیہ کے علاوہ داخلی دروازے پر بھی حلال گوشت کی علامتی تختی آویزاں کردی گئی ہے۔ باسی اور ایکسپائر گوشت استعمال کرنے کا اسکینڈل منظر عام پر آنے کے بعد میکڈونلڈز کی سیلز دنیا بھر میں متاثر ہوئی ہے۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ میکڈونلڈز پاکستان نے بھی باسی گوشت بیچنے والی چینی کمپنی سے گوشت خریدا۔ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ فوڈ چین 2014 میں فروخت کا سالانہ ہدف پورا نہیں کرسکے گی۔ غیرملکی نیوز ایجنسی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جولائی میں یورپ کے سوا پوری دنیا میں مکڈونلڈز کی فروخت میں واضح کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔ فوڈ ماہرین کا کہنا

ہے کہ مکڈونلڈز کو اگر پھر سے اپنے صارفین کا اعتماد جیتنا ہے تو محض نمائشی اقدامات سے کام نہیں چلے گا بلکہ انہیں بنیادی امور کی طرف پھر سے توجہ دینا ہوگی۔ مکڈونلڈز کو خصوصاً ایشیا میں زیادہ خراب صورت حال کا سامنا ہے جہاں فوڈ سیفٹی اسکینڈل سامنے آیا جس نے پوری دنیا میں مکڈونلڈز کی سیل کو متاثر کیا ہے۔ یہ اسکینڈل چین میں اس وقت سامنے آیا جب مکڈونلڈز کو گوشت سپلائی کرنے والی حوسی کمپنی کے اہل کار زائد المعیاد گوشت پر نئی تاریخوں کے لیبل لگاتے ہوئے پکڑے گئے۔ فوڈ کنسلٹنگ کمپنی ٹیکنومِک کے نائب صدر ڈیوڈ ہینکیز کا کہنا ہے کہ ایشیا میں انہیں سپلائی کے مسائل کا سامنا ہے اور اس لیے گوشت کے محفوظ ہونے سے متعلق صارفین کا اطمینان یقینی طور پر پہلا قدم ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پاکستان کسٹمز کے ریکارڈ سے اس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ میکڈونلڈز پاکستان نے بھی حوسی کمپنی سے گوشت خریدا تھا جسے چین میں بین کر دیا گیا ہے۔ میکڈونلڈز نے پابندی کی شکار چینی کمپنی سے مئی میں 41 ٹن اور جون میں 71 ٹن چکن مصنوعات درآمد کیں۔ اس کے علاوہ مختلف حلقوں کی جانب سے یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ چینی کمپنی میں کون سا مفتی یا عالم دین بیٹھ کر یہ دیکھتا ہے کہ مرغی حلال طریقے سے کاٹی گئی تھی یا نہیں۔ ان کمپنیوں کو ایک اور دھچکہ اس وقت لگا جب امریکہ میں فاسٹ فوڈ کمپنیوں کے ہزاروں ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کیلئے ہڑتال کر دی

میڈیا رپورٹس کے مطابق واشنگٹن اور نیویارک سمیت درجنوں شہروں میں فاسٹ فوڈ کمپنیوں کے ملازمین نے ہڑتال میں حصہ لیا۔ملازمین کا مطالبہ ہے کہ ان کی فی گھنٹہ مزدوری دگنی کی جائے اور انہیں مزدور یونین قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ہڑتال پر موجود ملازمین کا کہنا ہے کہ یہ کمپنیاں ہماری محنت کی وجہ سے لاکھوں ڈالر کماتی ہیں اس لئے انہیں چاہئے کہ ملازمین کو بھی اچھا معاوضہ ادا کریں۔ واضح رہے کہ امریکہ کی تاریخ میں فاسٹ فوڈ کمپنیوں کے ملازمین کی یہ سب سے بڑی ہڑتال قرار دی جارہی ہے۔ ماہرین فاسٹ فوڈ کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس سے صحت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ولوگوں کو آج کل ہوٹلوں کے کھانے یا پھر Frozen Food منجمد غذا پر گزارا کرنا پڑتا ہے جسے processed food ((ایک کیمیائی عمل کے تحت محفوظ کی گئی غذا) کہا جاتا ہے جس میں شامل بعض کیمیائی اجزا مختلف بیماریوں کا سبب بنتے ہیں جن میں کینسر بھی شامل ہے۔جنک یا فاسٹ فوڈ بھی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے، فاسٹ فوڈ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ وامریکا میں مقبول ترین کھانوں کا سلسلہ بنا، جس نے ایشیاکے ملکوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا ہے، ان کھانوں میں بھی فریزڈ گوشت وسبزیاں استعمال ہوتی ہیں یہ کھانے مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔جدید ریسرچ کے مطابق بچوں کے مزاج میں چڑچڑا پن اور بے چینی کی سب سے بڑی وجہ جوسز، ٹافیوں ودیگر اشیا میں Synltetic Food Colors کا استعمال ہے،

یہ تمام کیمیائی اجزا چاکلیٹ وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں، کھانے یا گھر پر استعمال ہونیوالے کیمیکلز الرجی کا سبب بنتے ہیں۔ غذا سے ہونے والی الرجی آج کل عام ہونے لگی ہے، جدید کھانوں میں 3500 کیمیائی اجزا شامل کیے جاتے ہیں جو مصالحوں سے لے کر پروسیسڈ فوڈ بچوں کے کھانے کی تمام اشیاء، جوسز، سافٹ ڈرنکس کھانے کے تیل، خشک وپیکٹس کے دودھ میں پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر کی صفائی کے لیے استعمال ہونے والی کیمیائی مصنوعات جن میں مچھر وکیڑے مارنے والی دوائیں بھی اکثر الرجی وغیرہ کا سبب بنتی ہیں، غذا میں ملاوٹ موجودہ دور کا سنگین مسئلہ بن چکے ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے اکثر وبائی بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں، محکمہ صحت جنھیں قابو پانے میں اکثر ناکام رہتاہے گھروں کے سامنے، گلیوں، محلوں وراستوں اور سڑکوں پر کوڑے کرکٹ وگند کے انبار لگے دکھائی دیتے ہیں اور میونسپل کارپوریشنز ایسا لگتاہے گہری نیند سو رہی ہوں، اس کوتاہی وغفلت کے نتیجے میں ہر سال بے شمار قیمتی جانیں ضایع ہوجاتی ہیں مگر کوئی لائحہ عمل سامنے نہیں آتا، حقیقتاً یہ سادہ کھانے اور ورزش گرتی ہوئی صحت میں بہتری لانے کا سبب بنتے ہیں، جدید تحقیق کے مطابق اگر روزانہ پانچ سبزیوں پر مشتمل سلاد کی پلیٹ کھائی جائے تو طبعی عمر میں دس سال کا اضافہ ہوسکتاہے۔۔

میٹھا بھی ایک نشہ ہے

طبی ماہرین کے مطابق چوہے بھی میٹھے کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا کہ انسان میٹھا بھی ایک نشہ ہے۔ جس کے بارے میں اب تحقیق ہو رہی ہے کہ ایسا کیا ہے کہ میٹھا کھانے کی خواہش پوری نہیں ہوتی، اور مزید اور چاہیئے، کا دل چاہتا ہے۔ صبح ناشتے میں میٹھی موسلی، دوپہر سے پہلے آئس کریم اور بعد میں کافی کے ساتھ میٹھے بسکٹ۔ میٹھے سنیکس بہت سے لوگوں کے لیے معمول کی خوراک کا حصہ ہیں لیکن اب اس بارے میں نئے سوالات سامنے آئے ہیں۔ اکثر لوگ اپنے میٹھا کھانے کی خواہش پر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست کے گھر والے ان سے میٹھا چھپا کر رکھنے لگے، خیال تھا کہ اس سے ان کی بیماری پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔ لیکن میرے دوست کے گھر والے حیران رہ گئے کہ وہ رات کو چھپ کر فریج سے میٹھے کی ڈش نکال کر کھانے لگے۔ جس سے ان کی بیماری میں اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس کو میٹھا کھانے کی ممانیت ہوتی ہے، وہ اس کی اتنی ہی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ کئی لوگوں میں بہت زیادہ کیلوریز والی ان اشیائے خوراک کی طلب اور چاہت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی پوری نہیں ہوتی۔ لیکن ماہرین اب یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آیا ایسے حالات کو نشے کی عادت

قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک میٹھی نوکری کا ذکر جس پر برطانیہ کی مشہور زمانہ کیمبرج یونیورسٹی کو اس وقت پی ایچ ڈی کے لیے ایک ایسے طالب علم یا طالبہ کی تلاش ہے، جسے ریسرچ اسکالر کے طور پر دی جانے والی آئندہ تحقیقی ملازمت کو 'دنیا کی سب سے میٹھی نوکری' کا نام دیا جا رہا ہے۔ برطانوی دارالحکومت لندن سے موصولہ رپورٹوں کے مطابق اس منصوبے کی کامیاب تکمیل پر متعلقہ تحقیقی ماہر کو 'ڈاکٹر آف فزکس' اور 'ڈاکٹر آف کیمسٹری' کی طرز پر غیر رسمی طور پر 'ڈاکٹر آف چاکلیٹ' بھی کہا جا سکے گا۔ مناسب تعلیمی قابلیت کے حامل اور ڈاکٹریٹ کے کسی بھی طالب علم یا طالبہ کو اس ملازمت کی پیشکش اس مقصد کے تحت کی جا رہی ہے کہ متعلقہ ریسرچر کو 'چاکلیٹ اسٹڈیز' یا چاکلیٹس سے متعلق بنیادی علوم پر تحقیق کرنا ہو گی۔ کیمبرج یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر اس بارے میں شائع کردہ 'جاب نوٹس' کے مطابق اس تحقیق کا مقصد یہ پتہ چلانا ہے کہ ایسی اشیائے خوراک جن کی تیاری میں چاکلیٹس استعمال کی گئی ہوں، انہیں گرم موسم یا زیادہ درجہ حرارت پر پگھلنے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ اس موضوع پر کیمبرج یونیورسٹی نے ایک پی ایچ ڈی پروگرام شروع کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ دنیا کی کوئی بھی چاکلیٹ، چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ معیار کی کیوں نہ ہو، 34 ڈگری سینٹی گریڈ یا 93 ڈگری فارن ہائیٹ درجہ حرارت کے قریب نرم پڑنا یا پگھلنا شروع ہو جاتی ہے حالانکہ یہ ٹمپریچر انسانی جسم کے اوسط درجہ حرارت سے بھی کم ہوتا

ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کی ویب سائٹ کے مطابق اس آسامی پر انتخاب کے لیے صرف یورپی یونین کے شہری ہی درخواستیں دے سکتے ہیں۔ اس ریسرچ پروجیکٹ کے لیے فزکس یا نرم soft matter رہنمائی کا کام کیمیکل انجینئرنگ، جیو ٹیکنکل انجینئرنگ اور مادوں سے متعلق طبیعیاتی علوم کے ماہرین کریں گے۔

اس تحقیق کے نتیجے میں اگر گرم موسم یا زیادہ درجہ حرارت کے باوجود چاکلیٹ مصنوعات کو نرم پڑ جانے سے بچانے کا کوئی طریقہ دریافت کر لیا گیا، تو عام صارفین کے ساتھ ساتھ اس کا سب سے زیادہ براہ راست کاروباری فائدہ چاکلیٹ تیار کرنے والی دنیا کی دس سب سے بڑی کمپنیوں کو ہو گا۔ گزشتہ برس ان 10 کمپنیوں کو ان کی چاکلیٹ مصنوعات کی فروخت سے ہونے والی مجموعی آمدنی 85 ارب ڈالر سے زائد رہی تھی۔

یہ بھی کہا جارہا ہے کہ چاکلیٹ سے دل کی بیماریوں سے بھی محفوظ رہا جاسکتا ہے۔

آسٹریلوی محققین کی ایک تازہ ترین ریسرچ سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ دس سال تک روزانہ بلیک یا ڈارک چاکلیٹ کی ایک خاص مقدار کھانے والے افراد کے اندر دل کی بیماریوں کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ ریسرچرز کا کہنا ہے کہ بلیک یا ڈارک چاکلیٹ کا ایک طویل عرصے تک مسلسل استعمال، ہارٹ اٹیک یا دل کے دورے اور فالج کے خطرات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ملبرن کی مناش یونیورسٹی کی طرف سے دو ہزار سے زائد آسٹریلوی باشندوں پر کروائی جانے والی اس تحقیق سے پتہ چلا

کہ روزانہ 100 گرام یا 3.5 اونس چاکلیٹ جس میں 70 فیصد یا اس سے بھی زیادہ کوکوا شامل ہوتا ہے، کھانے والے افراد میں دل کے امراض جنم لینے کے امکانات بہت کم پائے گئے۔ اس نئی تحقیق میں شامل محققین کی ٹیم کی سربراہ 'ایلازومر' کے مطابق ان کی ٹیم نے دوران تحقیق یہ اندازہ لگایا ہے کہ دل کے ہر 10 ہزار مریضوں کو 70 مہلک اور 15 غیر مہلک واقعات رونما ہونے سے بچایا جا سکتا تھا اگر انہوں نے دس سال تک کوکوا سے بنی ڈارک چاکلیٹ کا پابندی سے استعمال کیا ہوتا۔ برطانوی طبّی جریدے 'برٹش میڈیکل جرنل' میں شائع ہونے والی اس رپورٹ میں محققین نے دعویٰ کیا ہے کہ انہیں دل کے امراض میں مبتلا انسانوں کے علاج کے ساتھ ساتھ ڈارک چاکلیٹ تھراپی کے بہت کامیاب تجربوں کا پتہ چلا ہے۔ اس طرح ممکنہ اموات اور قلبی امراض کے مہلک ہونے اور نہ ہونے دونوں کیسز میں ڈارک چاکلیٹ پابندی سے کھانے والوں اور ایسا نہ کرنے والوں میں واضح فرق پایا گیا ہے۔

ہائی کوکوا چاکلیٹس اس لیے فائدہ مند ہے کہ اس میں 'اینٹی آکسیڈنٹ کیمیکل' یا مانع تکسید پایا جاتا ہے جسے طبّی اصطلاح میں 'پولی فینول' کہا جاتا ہے۔ اس کا کام خون کی شریانوں کو سکڑنے سے روکنا اور انہیں کشادہ رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ہائی بلڈ پریشر یا بلند فشار خون کے خلاف موثر ثابت ہوتا ہے اور اس کا مسلسل استعمال جسم میں خون کی گردش کو درست رکھتا ہے۔ کوکوا کی

کاشت زیادہ تر افریقی ممالک میں ہوتی ہے۔اس کے علاوہ گرین ٹی یا سبز قہوہ اور گہرے رنگ کے پھلوں میں بھی 'پولی فینول' بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً سرخ سیب اور بلو بیریز میں 'پولی فینول' بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ گزشتہ برس Huffington Post میں فرینک لپ مین کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ انہیں میٹھا کھانے کی عادت تھی اور پھر انہوں نے اس عادت سے چھٹکارا پانے کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کیے۔فرینک لپ مین خود کو ایک integrative ڈاکٹر قرار دیتے ہیں۔ ان کے اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد میٹھی اشیاء کھانے سے متعلق بڑی گرما گرم بحث شروع ہو گئی تھی۔ فرینک لپ مین کا کہنا ہے کہ میٹھا کھانے کی خواہش شروع میں تو ماں کے دودھ میں پائی جانے والی قدرتی مٹھاس کی وجہ سے تیز ہو جاتی ہے اور بعد میں والدین کے اُس رویے کی وجہ سے جس کے تحت وہ اپنے بچوں کو خوش کرنے کے لیے یا پھر انعام کے طور پر اکثر انہیں میٹھی اشیاء دیتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ میٹھا کھانے سے ان کا موڈ بہتر ہو جائے گا اور انہیں توانائی ملے گی فرینک لپ مین کے بقول جب تک انسان بالغ ہوتا ہے، تب تک اکثر لوگ یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ میٹھا کھانے سے ان کا موڈ بہتر ہو جائے گا اور انہیں توانائی ملے گی۔ طبّی ماہرین کے مطابق چوہے بھی میٹھے کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا کہ انسان۔ سن 2007 میں فرانس میں مکمل کی گئی ایک تحقیق نے ثابت

کر دیا تھا کہ کم از کم چوہوں میں چینی بھی اتنی ہی نشہ آور ثابت ہوتی ہے جتنی کہ کوکین، نکوٹین یا پھر الکوحل۔ میٹھی اشیا آسانی سے ہضم ہو جاتی ہیں اور صحت کے لیے صرف نقصان دہ ہی نہیں ہوتیں۔ اس تحقیق کے دوران سائنس دانوں نے چوہوں کو پینے کے لیے دو طرح کا پانی دیا تھا۔ ایک طرح کے پانی میں میٹھا گھول دیا گیا تھا اور دوسرے میں کچھ کوکین ملا دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 94 فیصد چوہوں نے پینے کے لیے میٹھے پانی کو ترجیح دی۔ پھر ایک دوسرے جائزے سے بھی ثابت ہو گیا کہ وہ چوہے جو کوکین ملا پانی پیتے تھے، جب انہیں چینی ملے پانی کی پیشکش کی گئی، تو انہوں نے بھی کوکین والا پانی چھوڑ کر میٹھا پانی پینا شروع کر دیا تھا۔ پروفیسر فالک کیفر جرمنی کے شہر من ہائم کے رہنے والے ہیں اور وہ نشہ آور اشیاء کے استعمال سے متعلق ریسرچ کے ماہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میٹھے کے نشے کے نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ طبّی ماہرین کے مطابق چوہے بھی میٹھے کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا کہ انسان۔ پروفیسر کیفر کہتے ہیں کہ میٹھا اور ہیروئن جیسی نشہ آور اشیاء دماغ کے ایک ہی حصے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہ اس حصے کو انسانی دماغ کے 'ریوارڈ سسٹم' کا نام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خوراک کی خواہش کو ہیروئن کے نشے کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خوراک سے متعلقہ امور کے ایک جرمن ماہر سوین ڈیوڈ میولر کی رائے بھی یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح کا نشہ ہیروئن اور کوکین استعمال کرنے والے لوگوں کی عادت ہوتا ہے، اس کا موازنہ

چاکلیٹ کھانے والے کسی شخص کی عادت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ میولر کہتے ہیں کہ شوق سے میٹھا کھانا ایک ایسی شدید خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے جو کچھ لوگوں میں نشے کی عادت کی حد تک شدید ہوتی ہے۔

Sven-David Müller کہتے ہیں کہ مٹھاس دراصل ایک ایسا ذائقہ ہے جسے ہم مثبت تجربہ سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق بچوں پر کیے گئے تجربات سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔ ان کے بقول میٹھی اشیاء آسانی سے ہضم ہو جاتی ہیں اور صحت کے لیے صرف نقصان دہ ہی نہیں ہوتیں۔ پروفیسر فالک کیفر کہتے ہیں، 'اگر میرا وزن معمول سے بہت زیادہ نہ ہو، میں باقاعدگی سے ورزش کروں اور اپنے دانت بھی باقاعدگی سے صاف کروں، تو نہ تو میرے دانت خراب ہوں گے اور نہ ہی میٹھا کھانے سے مجھے ذیابیطس کی بیماری کا سامنا کرنا پڑے گا' دنیا بھر میں بیلجیم کی چاکلیٹ اپنے ذائقہ کے سبب مشہور ہیں۔ لیکن اب انھیں بھی نقل کرنے والوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ بیلجیم نے اپنی چاکلیٹ مصنوعات کے.برانڈ کی حفاظت کے لیے یورپی یونین میں درخواست دی ہے۔ بیلجیم کے چاکلیٹ سازوں کا ماننا ہے کہ انہیں اپنی مصنوعات کی انفرادیت قائم رکھنے کا حق حاصل ہے۔ بیلجیم کی چاکلیٹس پوری دنیا میں مشہور ہیں اور اپنی ہی ایک منفرد حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ بیلجیم میں چاکلیٹ سازی کی صنعت اس وجہ سے تشویش کا شکار ہے کہ یورپ کی دیگر چاکلیٹ کمپنیاں اکثر اپنی مصنوعات پر بیلجیم کی معروف چاکلیٹس کے

حوالے سے ایسا کچھ نہ کچھ لکھ دیتی ہیں جس سے تاثر ملتا ہے کہ ان کی چاکلیٹس بھی اتنی ہی معیاری ہیں جتنی کہ بیلجیم کی۔ بیلجیم میں چاکلیٹ سازی کی صنعت کی نمائندہ فیڈریشن علاقائی حکومتوں کے ساتھ اس بارے میں مذاکرات کرنا چاہتی ہے کہ یورپی یونین کی سطح پر بیلجیم کو اپنی چاکلیٹ مصنوعات کے برانڈ کی حفاظت کے لیے کس قسم کی درخواست دینی چاہیے۔ یورپی ملک بیلجیم میں چاکلیٹ سازی کی تاریخ ایک صدی پرانی ہے۔ 1912 میں سوئٹزر لینڈ سے تعلق رکھنے والے Jean Neuhaus نے ایک سخت خول کے اندر کریم بھر کر خاص قسم کی چاکلیٹ ایجاد کی تھی جسے 'پرالین' کہا جاتا ہے۔ تب سے یورپ سمیت پوری دنیا میں بیلجیم کی اس نہایت لذیذ مٹھائی نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ اس سے متاثر ہو کر دیگر یورپی ممالک نے بھی اسی طرز کی چاکلیٹس تیار کرنا شروع کر دی تھیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی چاکلیٹ مصنوعات کی تشہیر اور ان کی فروخت میں اضافے کے لیے اکثر چاکلیٹس کی پیکنگ پر بیلجیم اسٹائل' یا 'بیلجیم کی ترکیب' جیسے الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ' چاکلیٹ خریدنے والے افراد چاکلیٹ کی پیکنگ پر درج 'بیلجیم' کا نام دیکھتے ہی اس کے معیاری ہونے کا یقین کرتے ہوئے یہ چاکلیٹس خرید لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ بیلجیم کا نام ایک طرح سے چاکلیٹ کے خوش ذائقہ ہونے کی ضمانت کی حیثیت رکھتا ہے اور جس بھی چاکلیٹ پر بیلجیم درج ہو، اس پر جیسے معیاری ہونے کی مہر لگ جاتی ہے۔ اس قسم کی کاروباری چال چلنے والوں کو تجارتی

اصطلاح میں ' کاپی کیٹ ' کہا جاتا ہے۔ بیلجیم کے چاکلیٹ سازوں کا ماننا ہے کہ انہیں اپنی مصنوعات کی انفرادیت قائم رکھنے اور انہیں مارکیٹ میں اپنی مخصوص شناخت کیساتھ پیش کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے، جتنا فرانسیسی وائن تیار اور فروخت کرنے میں تیار کیے جانے والے خنزیر کے Parma والے تاجروں کو یا پھر اٹلی کے علاقے کے نام سے اپنی Parma Ham گوشت کے پارچوں کو تیار کر کے بیچنے والوں کا جو مصنوعات بیچتے ہیں۔ کولون میں ہر سال مٹھائی سازی کی صنعت کی نمائش کا انعقاد ہوتا ہے۔ بیلجیم کی چاکلیٹس کی نقل کر کے اپنی مصنوعات فروخت کرنے والوں کی مذمت Jos چاکلیٹ کمپنی کے چیف ایگزیکٹو Neuhaus کرتے ہوئے اس یورپی ملک کی نے خبر رساں ادارے روئٹرز کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا، 'ہمیں اس امر Linkens پر افسوس ہے کہ ہماری چاکلیٹس کی نقل کرنے والوں کی مصنوعات کا معیار ہماری اصلی بیلجیم کی بلکٹ بنانے والی Jos Linkens چاکلیٹس کے مقابلے میں بہت کم ہے'۔ ایک معروف کمپنی کے سربراہ بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دنیا کی دیگر بڑی اور معیاری چاکلیٹ ساز کمپنیاں بیلجیم کی چاکلیٹس کی نقل کریں تو انہیں تکلیف نہیں ہو گی کیونکہ وہ اپنی مصنوعات کے معیار پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ بیلجیم کے چاکلیٹ ساز اداروں کا کہنا ہے کہ ان کی مصنوعات اس لیے دنیا بھر کی چاکلیٹس کے مقابلے میں معیاری اور منفرد ہیں کہ ان کے ہاں اس شعبے کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے اور بہت سے باصلاحیت کارکن اس صنعت سے وابستہ ہیں۔ اس کے

علاوہ ان اداروں کی طرف سے چاکلیٹ سازی صرف مشینوں کے ذریعے نہیں کی جاتی۔ بیلجیم کی 'پرالینز' میں نت نئی کریمیں بھرنے اور انہیں زیادہ سے زیادہ ذائقہ دار بنانے میں ان منجھے ہوئے باورچیوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو اکثر کام مشینوں کی بجائے خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں۔۔

آزادی مارچ اور انقلاب مارچ کے بدلتے رنگ عالمی میڈیا کے سنگ

میاں محمد نواز شریف پانچ سال کے لیے ملک کے وزیراعظم منتخب ہوئے ہیں اور امریکہ ان سے مستعفی ہونے کے مطالبے کی حمایت نہیں کرتا۔

بین الاقوامی میڈیا کا یہ بھی کہنا ہے کہ وفاقی دارالحکومت میں آزادی اور انقلاب مارچ کی وجہ سے شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن، آئی ڈی پیز، پرویز مشرف، این آر او خارجہ اور داخلی معاملات، مہنگائی، بے روزگاری، لوڈ شیڈنگ، کرپشن اور کئی دیگر اہم ایشوز پس منظر چلے گئے۔

2013 کے عام انتخابات کو جج کرنیوالے بین الاقوامی مبصرین نے ان انتخابات کو تمام گزشتہ عام انتخابات کے مقابلے میں شفاف اور بہتر قرار دیا۔

عالمی میڈیا کے نزدیک عمران خان سیاست کے میدان کو کھیل کے میدان کی طرح لے کر چل رہے ہیں۔

پاکستان میں انقلاب، تبدیلی، یا نیا پاکستان کے بڑے پلیئرز اب کھل کر سامنے

آ گئے ہیں۔ امریکہ جسے پاکستان کی سیاست میں تبدیلیوں کا منبع قرار دیا جاتا ہے، نے واضح کردیا کہ میاں محمد نواز شریف پانچ سال کے لیے ملک کے وزیرِاعظم منتخب ہوئے ہیں اور امریکہ ان سے مستعفی ہونے کے مطالبے کی حمایت نہیں کرتا ہے۔ واشنگٹن میں محکمہ خارجہ کی ترجمان نے معمول کی بریفنگ کے دوران پاکستان سے متعلق سوال پر صحافیوں کو بتایا کہ امریکہ پاکستان کی صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور وہاں کے موجودہ سیاسی حالات کو "تشویش ناک" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ترجمان نے کہا کہ امریکہ پاکستان میں آئینی اور انتخابی عمل کی حمایت کرتا ہے جس کے تحت ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں نواز شریف کی حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے۔ ترجمان نے واضح کیا کہ پاکستان کے جمہوری نظام میں بالائے آئین تبدیلیاں لانے اور ان کی کوشش کرنے والے افراد کو امریکہ کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ محکمہ خارجہ کی ترجمان میری ہارف نے پاکستان میں جاری سیاسی بحران کے تمام فریقین سے تحمل کا مظاہرہ کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ امریکہ سمجھتا ہے کہ حالیہ بحران سے پرامن طور پر نکلنے کا راستہ موجود ہے۔ ترجمان نے کہا کہ موجودہ بحران کے باوجود پاکستان میں سیاسی مکالمے کی بہت گنجائش ہے جسے پرامن انداز سے انجام پانا چاہیے۔ امریکہ کا یہ بیان اس تسلسل کا حصہ ہے، جس میں دو دن پہلے انھوں نے کہا تھا کہ امریکہ پاکستان کی صورتحال کا جائزہ لے رہا ہے ہیں، پاکستان میں جاری معاملات مذاکرات کے ذریعے حل کئے جائیں۔ امریکی ترجمان کے حوالے سے مارچ

اور دھرنا دینے والوں کے لئے یہ ایک مثبت اور امید افزا پیغام تھا، لیکن بدھ کی شب جاری ہونے والے اس بیان عمران خان اور طاہر القادری کے حامیوں کو شدید مایوسی میں دھکیل دیا۔ بین الاقوامی میڈیا اسلام آباد کے مارچ پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اور یہ مارچ گرما گرم سرخیوں کی زینت بن چکا ہے۔ سوشل میڈیا پر آزادی اور انقلاب مارچ کے حوالے سے گرما گرم بحث بھی جاری ہے۔ بدھ کو امریکی اخبار نیویارک ٹائمز واشنگٹن پوسٹ، ہفنگٹن پوسٹ، دی گارڈینز، دی ٹیلی گراف، الجزیرہ اور ہندوستان، ٹائم نے بھی ان واقعات کو انتہائی اہمیت دی۔ مجموعی طور پر امریکہ اور بھارت سمیت تمام عالمی میڈیا کے عمران خان کے آزادی مارچ اور طاہر القادری کے انقلاب مارچ کے حوالے سے ملے جلے تاثرات تھے۔ عالمی میڈیا کے نزدیک عمران خان سیاست کے میدان کو کھیل کے میدان کی طرح لے کر چل رہے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق طاہر القادری اور عمران کے مارچ نے دارالحکومت میں نظام زندگی مفلوج کر دیا۔ شہری پوچھ رہے ہیں انہیں کس بات کی سزا دی جارہی ہے۔ برطانوی اخبار دی گارجین نے لکھا ہے کہ دونوں رہنما اسلام آباد میں 10 لاکھ تو نہ لاسکے تاہم دارالحکومت میں نظام زندگی مفلوج ہوگیا۔ بھارتی اخبار انڈیا ٹائمز نے کہا ہے کہ پاکستان میں پہلے ہی دہشت گرد حملے ہورہے ہیں اور لانگ مارچ کے بعد پاکستان مزید انتشار کا شکار ہوگا۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق دنیا کی اکلوتی مسلم ایٹمی قوت پر دنیا بھر کی نظریں تو ویسے بھی ہر وقت رہتی ہیں

اور اب ان نئی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ خبریں منظر سے غائب ہو گئی جو ان مارچوں سے پہلے زبان زد عام اور سب سے اہم سمجھی جاتی تھیں۔ بین الاقوامی میڈیا کا یہ بھی کہنا ہے کہ وفاقی دارالحکومت میں آزادی اور انقلاب مارچ کی وجہ سے شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن، آئی ڈی پیز، پرویز مشرف، این آر او خارجہ اور داخلی معاملات، مہنگائی، بے روزگاری، لوڈ شیڈنگ، کرپشن اور کئی دیگر اہم ایشوز پس منظر چلے گئے ہیں۔۔برطانوی اخبارڈیلی میل نے مارچ کے حوالے سے لکھا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی رہنمانے اپنے کارکنوں کو یوٹیلٹی اوردیگر بل ادا کرنے سے منع کیاہے۔ عمران خان نے اپنے دھرنے کی ناکامی کو میڈیا اور سیاسی تجزیہ کاروں سے چھپانے کیلیے سول نافرمانی کی تحریک کااعلان کیاہے۔ بی بی سی نے کہاہے کہ عمران خان کے سول نافرمانی تحریک کے اعلان کے بعد اور ان کی تقریر شروع ہونے سے پہلے کے مناظر یکسر بدل گئے۔ تقریر سے پہلے لوگوں کا گروہ اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا جو اعلان کے بعد واپسی کیلیے مڑگیا، وہ سول نافرمانی کے اعلان سے متفق نہ تھے۔امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کے مطابق طاہر القادری اور عمران خان کے مارچ نے پاکستان کے دارالحکومت میں نظام زندگی مفلوج کردیا ہے۔ شہری پوچھ رہے ہیں کہ انھیں کس بات کی سزادی جارہی ہے، ایک اوراخبار نے لکھاہے کہ پہلے سے معاشی مسائل کا شکار ملک پاکستان میں سول نافرمانی تحریک کے اعلان کے بعد مزید انتشار کاخطرہ پیدا ہوگیاہے۔ عالمی میڈیانے عمران خان کے لانگ مارچ کو پاکستان کے لیے

مشکل قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ لانگ مارچ ملک کو انتشار کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس کشیدگی کی صورتحال میں بھی امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان پر امید ہیں کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کے باوجود امریکہ پاکستان کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل جاری رکھے گا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے جاری سیاسی بحران کے حل کے لیے حکومت اور اپوزیشن رہنماؤں نے مذاکرات کے آغاز پر اتفاق کرکے ایک دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ گو اس سلسلے میں پہلے روز کے مذاکرات بغیر کسی نتیجے کے اختتام پذیر ہو گئے ہیں۔ اور مذاکرات کا دوسرا دور اب شروع ہوگا۔ تجزیہ کاروں کے مطابق آج سے دو دن پہلے تک حکومت مخالف دونوں جماعتیں ہی مذاکرات کی مخالفت کر رہی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ 'آزادی مارچ' اور 'انقلاب' حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اب دونوں جماعتوں نے مذاکرات پر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے ان کا آغاز کر دیا ہے۔ مبصرین کے مطابق دونوں حکومت مخالف جماعتوں کے موقف میں تبدیلی آرمی کی طرف سے جاری ہونے والے اس بیان کے بعد سامنے آئی ہے، جس میں فریقین سے مسائل کا حل مذاکرات کے ذریعے تلاش کرنے کا کہا گیا تھا۔ پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان اور پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ طاہر القادری کے ہزاروں کارکن اس وقت پاکستانی پارلیمان کے سامنے دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔ ان دونوں حکومت مخالف رہنماؤں نے وزیراعظم نواز شریف سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ دونوں جماعتوں نے احتجاجی مظاہروں کا آغاز چودہ اگست کو

لاہور سے کیا تھا۔ گزشتہ روز تحریک انصاف کے رہنماؤں نے حکومتی وزرا سے مذاکرات کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں پی ٹی آئی کے وائس چیئرمین شاہ محمود قریشی کا کہنا تھا، ” ہم نے حکومتی ٹیم کے سامنے اپنے مطالبات رکھ دیے ہیں اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ان کا جائزہ لینے کے بعد جمعرات کو ہم سے رابطہ کیا جائے گا۔“اس سے پہلے عمران خان کی طرف سے ایک مرتبہ پھر سخت بیان سامنے آیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس وقت تک مذاکرات میں شامل نہیں ہوں گے، جب تک وزیراعظم نواز شریف مستعفی نہیں ہو جاتے۔ دوسری جانب حکومتی اہلکار متعدد مرتبہ دہرا چکے ہیں کہ وزیراعظم کے استعفے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ ایک نقطہ ہے، جس پر اگر فریقین نے لچک نہ دکھائی تو مذاکرات جمود کا شکار ہو سکتے ہیں۔ عمران خان کا یہی ایک مطالبہ غیر آئینی ہے، آئین پاکستان میں وزیر اعظم کو ہٹا کا اختیار اسمبلی کو دیا گیا ہے، اور اس کا طریقہ کار بھی متعین ہے۔ نیوز ایجنسی اے ایف پی کے مطابق دونوں حکومت مخالف جماعتیں مل کر احتجاج کر رہی ہیں اور اسی وجہ سے حکومت پر دباؤ بھی زیادہ ہے۔ حکومت عوامی تحریک کے سربراہ طاہر القادری سے بھی مذاکرات جاری رکھے ہوئے ہے۔ بظاہر عوامی تحریک اور تحریک انصاف کے مقاصد بھی مختلف ہیں اور اگر طاہر القادری کی حکومت سے کوئی ڈیل ہو جاتی ہے تو سخت موقف کے باوجود عمران خان کی پوزیشن بھی کمزور ہو جائے گی۔ تجزیہ کاروں کے مطابق فوج کی طرف سے سامنے آنے والے بیان اور اس کے بعد مذاکرات کے آغاز سے یہ بھی

پتہ چلتا ہے کہ ملک کی سیاست میں اب بھی فوج کی مانی جاتی ہے۔ دوسری جانب خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے سابق سربراہ حمید گل کا کہنا تھا کہ نواز شریف کے ساتھ اختلافات کے باوجود فوج سیاسی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان کے مطابق یہ عمران خان اور قادری تھے، جو فوج کو درمیان میں لانا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق اس سیاسی بحران نے نواز شریف کو کمزور کر دیا ہے، ''اب اگر نواز شریف اقتدار میں رہنا چاہتے ہیں، تو ان کے پاس فوج کی بات سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔ مشرقِ وسطیٰ کی ویب سائٹ العربیہ نے لکھا ہے کہ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب عوامی تحریک کے سربراہ طاہر القادری نے نواز شریف کو اپنے دس مطالبات پورا کرنے کے لیے 48 گھنٹے کی مہلت دینے کا اعلان کیا۔ طاہر القادری نے نواز شریف اور شہباز شریف سے مستعفی ہونے، اسمبلیاں توڑنے اور خود کو قانون کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو 'فیصلہ عوام کا ہوگا' اور وہ ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ طاہر القادری کی تقریر کے بعد خیابانِ سہروردی پر موجود ہزاروں افراد 'گو نواز گو' کے نعرے لگاتے رہے۔ طاہر القادری نے اپنے مارچ کے شرکا کو کہا کہ وہ خبردار رہیں کیونکہ ان کے اعلان کے بعد اب ان پر 'دہشت گردی کا حملہ' ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل پاکستان تحریکِ انصاف کے قائد عمران خان نے آزادی مارچ کے شرکا سے ایک مرتبہ پھر خطاب کرتے ہوئے حکومت کو متنبہ کیا کہ وزیرِ اعظم صاحب فاسٹ بولر میں صبر نہیں ہوتا۔ نواز شریف صاحب

غلط فہمی میں نہ رہیں، یہ سونامی وزیر اعظم ہاؤس بھی جا سکتا ہے۔ عوامی تحریک کے سربراہ ڈاکٹر طاہر القادری نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ وزیر اعظم نواز شریف اور وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی حکومت کے خاتمے اور ان کی گرفتاری تک دھرنے کے شرکا یہاں سے نہیں اٹھیں گے۔ طاہر القادری نے کہا کہ لاہور کی سیشن کورٹ نے سانحہ ماڈل ٹاؤن میں وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ پنجاب سمیت اکیس افراد کے خلاف مقدمہ درج کرنیکا جو حکم دیا ہے، اس پر فوراً عمل کیا جائے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر فوری طور پر شریف برادران کے خلاف مقدمہ درج نہ کیا گیا تو اس کے نتائج پولیس کو بھگتنا ہوں گے۔ انہوں نے دس نکاتی چارٹر آف ڈیمانڈ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شریف برادران کی حکومت کے خاتمے اور ان کی گرفتاری کے بعد اُن کا دوسرا مطالبہ قومی اور تمام صوبائی اسمبلیوں کی تحلیل اور تیسرا مطالبہ قومی حکومت کا قیام ہے۔ ان کا چوتھا مطالبہ یہ ہے کہ ایک قومی حکومت کے ذریعے کرپٹ افراد کا کڑا احتساب کیا جائے۔ انہوں نے قومی حکومت کے ذریعے دس نکاتی معاشی اور دس نکاتی انقلابی ایجنڈے کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے ملک سے فرقہ واریت کے خاتمے اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی ترامیم کا بھی مطالبہ کیا۔ طاہر القادری کا جلسہ اس وقت ڈرامائی شکل اختیار کر گیا جب ہجوم سے ایک پستول بردار شخص کو پکڑ کر اسٹیج پر لایا گیا۔ طاہر القادری نے اس شخص کو شریف برادران کی جانب سے بھجوایا گیا دہشت گرد بتاتے ہوئے معاف کرنے کا

اعلان کیا۔تاہم ہجوم کی جانب سے ممکنہ تشدد کے سبب سہمے ہوئے اس شخص کا کہنا تھا کہ وہ پولیس اہلکار ہے اور ڈیوٹی ختم کرکے گھر جاتے ہوئے طاہر القادری کے اہلکار زبردستی پکڑ کر پنڈال میں لے آئے تھے۔ بعد میں ایک نجی ٹی وی نے اس پولیس اہلکار کا زخمی حالت میں ہسپتال کے بستر پر ایک انٹرویو دکھایا جس میں عوامی تحریک کے کارکنوں کے تشدد کا نشانہ بننے والے اہلکار نے اپنا نام عدیل ہاشمی بتایا اور کہا کہ جلسے میں شریک افراد نے اس شبہے کی بنیاد پر تشدد کا نشانہ بنایا۔دوسری جانب تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان بنی گالہ میں اپنی پر تعیش رہائش گاہ پر آرام کرنے کے بعد کئی گھنٹوں کی تاخیر سے جلسہ گاہ پہنچے۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ وہ نواز شریف کا استعفیٰ لیے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔ خیال رہے کہ عمران خان کو گزشتہ شب کارکنوں کو کھلے آسمان تلے چھوڑ کر اپنے گھر چلے جانے کی وجہ سے سوشل میڈیا اور مقامی ذرائع ابلاغ پر بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔اسلام آباد میں ہفتے کی صبح ہونے والی بارش کے بعد دن بھر بھی موسم ابر آلود رہا۔ صوبے خیبر پختونخواہ سے دو روز قبل آزادی مارچ میں شرکت کے لیے آنے والے تحریک انصاف کے کارکنوں کو دو راتیں کھلے آسمان تلے گزارنا پڑیں۔ کھانے پینے کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر کارکن ٹھیلوں پر موجود اشیا مہنگے داموں کھانے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ بیت الخلا کے لیے بھی انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے بھی لوگوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تاہم عوامی

تحریک مارچ کے منتظمین نے اپنے شرکا کے لیے کھانے پینے کے نسبتاً بہتر انتظامات کر رکھے ہیں۔ وفاقی حکومت نے آزادی اور انقلاب مارچ کے شرکا کے اسلام آباد پہنچنے کے بعد بظاہر اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی ہے۔ مقامی ذرائع ابلاغ کے مطابق وزیر اعظم نواز شریف نے اپنی جماعت مسلم لیگ (ن) کی مقامی قیادت کو مارچ کے شرکا کے لیے کھانے پینے کے انتظامات کرنے کی ہدایت کی تاہم جب مسلم لیگ (ن) کی مقامی قیادت مظاہرین کے لیے کھانے پینے کی اشیا لے کر آبپارہ پہنچے تو عوامی تحریک کے کارکنوں نے حکومتی کھانا لینے سے انکار کر دیا۔ اسی دوران وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے دھرنے کے مقامات سمیت شہر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور سکیورٹی انتظامات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ڈیوٹی پر موجود پولیس، ایف سی اور رینجرز کے اہلکاروں سے بھی ملاقات کی۔ وزیر داخلہ نے وہاں موجود تحریک انصاف اور پاکستان عوامی تحریک کے نمائندوں کو یقین دہانی کرائی کہ سکیورٹی انتظامات کو فول پروف بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ دھرنوں اور احتجاج سے دور حکومت اور تحریک انصاف کے درمیان مصالحت کے لیے دو ہفتے قبل شروع کی گئی کوششیں اب بھی جاری ہیں۔ اس ضمن میں گورنر پنجاب چوہدری سرور نے ہفتے کے روز پیپلزپارٹی کے سینیٹر رحمان ملک سے ٹیلی فون پر بات چیت کی جبکہ لاہور میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر سراج الحق سے تنظیم کے مرکزی دفتر منصورہ میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد ذرائع ابلاغ سے بات کرتے ہوئے سراج الحق نے

فریقین کو صبر و تحمل سے کام لینے کی ہدایت کی۔ اسی ملاقات کے بعد وزیر داخلہ چوہدری نثار نے ٹیلی فون پر سراج الحق سے سیاسی صورتحال پر تبادلہ خیال کیا اور ان سے اسلام آباد پہنچنے کی درخواست کی تاکہ وہ اسلام آباد میں موجود تحریک انصاف کی قیادت اور حکومت کے درمیان مصالحت کرائیں تاکہ دارلحکومت میں روز مرہ زندگی کو معمول پر لایا جاسکے۔ اس صورتحال پر برطانوی اخبار ''گارجین'' لکھتا ہے کہ انتخابی دھاندلی سے تحریک انصاف کے کامیاب نہ ہونے کے عمران خان کے موقف سے تجزیہ کار اور

سفارت کار قائل نہیں ہوسکے۔ بین الاقوامی مبصرین نے پاکستان کے ان انتخابات کو تمام گزشتہ عام انتخابات کے مقابلے میں شفاف اور بہتر قرار دیا۔ عمران خان کے پاس ایسا کوئی قانونی راستہ نہیں جس سے وہ اپنے مقاصد حاصل کرسکیں۔ عمران خان کے نام نہاد آزادی مارچ حکومت کے لئے سنجیدہ الارم ہے۔ اقتدار کے 14 ماہ کے دوران رفوج، طاہر القادری اور عمران خان نے نواز شریف کی اتھارٹی کو متاثر کیا۔ حکومت کو خدشہ کہ اسلام آباد میں مظاہرین سے تصادم جنم لے سکتا ہے جو فوج کے لئے راستہ کھول سکتا ہے۔ اخبار نے طاہر القادری کو متنازع عالم، عمران خان کی مضحکہ خیزیاں اور آزادی مارچ کو نام نہاد قرار دیا۔ اخبار نے پاکستان کی احتجاجی سیاست پر اپنی تفصیلی رپورٹ میں لکھا کہ عمران خان کے رویے نے بہت سے تجزیہ کاروں اور سفارتکاروں کو حیرت میں ڈال دیا جو اس پر قائل نہیں ہوسکے کہ انتخابی خرابیوں اور دھاندلیوں سے تحریک انصاف کو کامیابی سے محروم

کیا گیا۔ 2013 کے عام انتخابات کو جج کرنیوالے بین الاقوامی مبصرین نے ان انتخابات کو تمام گزشتہ عام انتخابات کے مقابلے میں شفاف اور بہتر قرار دیا ہے۔ مبصرین اشارہ دیتے ہیں کہ عمران خان کے پاس ایسا کوئی قانونی راستہ نہیں جس سے وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔ کیونکہ حکومت کے پاس پارلیمنٹ میں بھاری اکثریت ہے اور حکومت کو باہر نکالنے کے لئے اس کے خلاف پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کا کوئی امکان نہیں۔ بہر حال لاہور سے اسلام آباد کے لئے عمران خان کے نام نہاد آزادی مارچ حکومت کے لئے سنجیدہ الارم ہیں۔ مارچ کو روکنے کیلئے سخت اقدام اٹھائے گئے ہیں۔ ناقدین کا کہنا ہے حکومت نے صورت حال کو مس ہینڈل کیا۔ سخت مون سون کے دوران مظاہروں کی اجازت دے دینی چاہیے تھی۔ حکومت کو خدشہ ہے کہ اسلام آباد میں ہزاروں کی تعداد میں مظاہرین سے تصادم جنم لے سکتا ہے۔ جو فوج کے لئے راستہ کھول سکتا ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ عام انتخابات میں بھاری اکثریت کے ساتھ تیسری بار اقتدار میں آنے والے نواز شریف کو ابھی ایک سال سے تھوڑا عرصہ زیادہ ہوا تھا کہ افرا تفری اور سیاسی بے یقینی آ گئی۔ نواز شریف کی بھاری پارلیمانی اکثریت سے پاکستان پر نظر رکھنے والوں میں ایک مثبت امید پیدا ہوئی، جو مشکل سے ہی ایک نئے وزیر اعظم سے امید لگاتے ہیں کہ ان کے پاس کمزور معیشت کی بحالی، بھارت کے ساتھ امن قائم کرنے اور اسلامی عسکریت پسندی سے نمٹنے کے مقاصد کو حاصل کرنے کا مینڈیٹ ہے۔ لیکن اقتدار کے 14 ماہ کے دوران پاکستان کی طاقتور فوج، کینیڈا میں عالم طاہر

القادری اور عمران خان نے ان کی اتھارٹی کو متاثر کیا۔ اخبار لکھتا ہے کہ رواں ہفتے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ایک سیاسی بحران کی موجودگی میں بڑے پیمانے پر احتجاج ہونے جارہا ہے جب شہروں میں پٹرول کی فراہمی بند ہو چکی ہے، لاہور میں ایک متنازع عالم کے حامیوں اور پولیس کے درمیان جھڑپیں جاری ہیں۔ اس صورت حال میں عمران خان نے نواز شریف سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا ہے۔ عمران خان نے اسلام آباد کو جام کرنے کا اعلان کیا ہے، حکومت کے مستعفی اور نئے انتخابات کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ اخبار نے سینئر تحریک انصاف کے رہنما شفقت محمود کے حوالے سے لکھا کہ ہم نے فوری طور پر انتخابی نتائج کو مسترد نہیں کیا ہم نے سوچا کہ عدالتوں سے ہمیں ریلیف مل سکتا ہے لیکن اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہر چیز جس کے لئے ہم نے پارلیمینٹ میں کوشش کی اور عدالتوں نے کام نہیں کیا اور ہمارے پاس ایک بڑا احتجاج کرنے کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ طاہر القادری نے بھی نواز شریف کے اختیارات کو چیلنج کر رکھا ہے۔ قادری نے اگست کے اختتام سے پہلے حکومت کے گرنے کی پیش گوئی کی ہے۔ اخبار نے اپنی ابتدائی رپورٹ میں طاہر القادری کو متنازع عالم، عمران خان کی مضحکہ خیزیاں اور آزادی مارچ کو نام نہاد قرار دیا۔ تاہم کچھ گھنٹوں بعد مضحکہ خیزی کو تبدیل کرکے رویے کا ذکر کیا گیا۔ نیو یارک ٹائمز نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا کہ اب مارچ کی شدت میں کمی آ گئی ہے۔ ہفتے کے اختتام تک اصل صورت حال واضح ہو جائے گی۔ عالمی اخبارات میں اسلام آباد میں

دھرنوں کو نمایاں اہمیت دی گئی ۔ امریکی اخبار نیو یارک ٹائمز نے سرخی جمائی ہے کہ آزادی کا سونامی اور انقلاب بھیگ گیا ہے۔ اخبار کے مطابق مارچ حکومت کیلئے خطرہ ہے تاہم شدت میں کمی آ گئی ہے۔ پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ ایک بڑے ہجوم کے ساتھ اسلام آباد آنے کا دعویٰ کر رہے تھے، لیکن کپتان کے پیچھے آنے والوں کی تعداد توقع سے کم ہے۔ خراب موسم کی وجہ سے کئی شرکا ساتھ چھوڑ گئے، اخبار کے مطابق دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کے دوران مارچ کو عوامی سطح پر بھی کڑی تنقید کا سامنا ہے۔ نیو یارک ٹائمز لکھتا ہے کہ پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ طاہر القادری کا جھکاو فوج کی طرف ہے، طاہر القادری پہلے بھی حکومت گرانے کی کوششیں کر چکے ہیں۔ اسلام آباد میں طاہر القادری اور عمران خان کی آمد سے نواز کے حامیوں پر مارشل لا کا خطرہ منڈلانے لگا ہے، تاہم مارچ کی اجازت دیئے جانے کے حکومتی اقدامات نے غیر یقینی صورت حال بہتر بنائی۔ وزیر اعظم نواز شریف اور جنرل راحیل شریف کی ایک ساتھ شرکت نے فوج اور حکومتی میں دوری کا تاثر بھی ختم کیا۔ اخبار کے مطابق انقلاب اور آزادی مارچ کی اصل صورت حال بعد میں میں واضح ہو گی۔ عالمی میڈیا نے احتجاجی مارچ کو مشکل قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں ہونے والے مارچ اسے انتشار کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ایسو سی ایٹڈ پریس نے لکھا ہے کہ عمران خان کی سول نافرمانی کی تحریک کے اعلان کے بعد پہلے سے سیاسی اور معاشی عدم استحکام کے شکار پاکستان میں مزید انتشار کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

دو رہنما 10 لاکھ افراد کو اسلام آباد لانے میں کامیاب نہ ہو سکے ہیں۔ سخت سکیورٹی اقدامات کی وجہ سے دارالحکومت عملی طور پر مفلوج ضرور ہوا ہے۔۔برطانوی اخبار گارڈین نے لکھا ہے کہ حکومت سے پر تشدد تصادم سے ہی اس احتجاج کا منطقی نتیجہ نظر آرہا ہے جبکہ بھارتی اخبار ہندوستان ٹائمز نے لکھا ہے کہ پاکستان میں پہلے ہی دہشت گرد حملے بڑھ رہے ہیں۔ ایسے میں ہونے والے مارچ پاکستان کو انتشار کی طرف لے جارہے ہیں۔۔برطانوی میڈیا نے کہا ہے کہ تحریک انصاف کو لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔۔برطانوی ویب سائٹ ''نیوز ٹرائب'' کے مطابق پاکستان تحریک انصاف نے لانگ مارچ اور دھرنا اس لئے دیا تھا کہ وہ نواز حکومت کا خاتمہ اور وزیراعظم نواز شریف اور وزیراعلی پنجاب شہباز شریف پر مستعفی ہونے کیلئے دباؤ ڈالے۔ پی ٹی آئی نے دھرنا بھی دیا لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی جس پر بالآخر تحریک انصاف قومی اسمبلی اور تین صوبائی اسمبلیوں سے مستعفی ہوتی ہے تو وہ پارلیمنٹ کی نمائندگی کا حق بھی کھو بیٹھے گی۔۔برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ اسلام آباد کے علاقے آبپارہ میں دو دن کی بارش کے بعد جس طرح موسم بدلا اسی طرح سے آزادی مارچ اور انقلاب مارچ کا رنگ بھی بدلا ہوا نظر آیا۔ انقلاب مارچ کا اجتماع میں شریک افراد کی تعداد میں بظاہر پہلے روز کی طرح کوئی کمی اور اضافہ نہیں ہوا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ انقلاب مارچ کے اطراف میں قناتیں لگ چکی ہیں۔ آزادی مارچ کی جانب جانے

والا راستہ پہلے سے تھوڑا وسیع ہو گیا دوسری جانب آزادی مارچ میں داخل ہونے پر کرسیوں کی قطاریں نظر آئیں اور ان پر تھکے ہارے کارکن آرام کرتے نظر آئے اور انکی آزادی مارچ کے کنٹینر سٹیج کی جانب سے جانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم گذشتہ دو دن کے برعکس اتوار کی رات کو لوگوں کی ایک بڑی تعداد سٹیج کی جانب رواں دواں تھی۔ اس جلوس میں لوگ اپنے اہلخانہ کے ساتھ موجود تھے۔ سٹیج اپنے پرانی جگہ سے مزید تین سو گز آگے جاچکا تھا اور دن کے وقت میں لگائی گئیں کرسیاں پرانے کے سٹیج کے سامنے تک نظر آئیں۔ عمران خان کی حکومت کو دی جانے والی ڈیڈ لائن آج ختم ہو گی،

سوشل میڈیا اور بین الاقوامی میڈیا پر بھی آزادی مارچ کے خوب چرچے ہیں۔اسلام آباد مارچ کو امریکی اخبارات اور دیگر غیر ملکی میڈیا نے صفحہ اول سرخیوں کی زینت بنایا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پر آزادی مارچ کے حوالے سے گرما گرم بحث تو جاری ہے ،

ساتھ ہی ساتھ پی ٹی آئی سربراہ عمران خان بھی ٹوئٹر پر وقتاً فوقتاً ٹوئٹ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عمران خان نے اپنی ٹوئٹ میں کہا کہ پاکستان کیلئے فیصلہ کن گھڑی آ گئی۔ ٹوئیٹر پر مریم نواز شریف بھی سرگرم ہیں، جنھوں نے ٹوئٹ کیا تھا کہ وزیر اعظم استعفی نہیں دیں گے۔ انقلاب اور آزادی مارچ کا اختتام طربیہ ہوگا یا المیہ اس کا علم اس ڈرامے کے کرداروں سے زیادہ اس کا اسکرپٹ لکھنے والوں یا ڈائریکٹر کو ہوگا۔ جس کی رونمائی میں کچھ وقت لگے گا۔

انسانیت اور جانور محبت کے رشتے

انسان اور جانور جب محبت کے رستے میں جکڑے جاتے ہیں تو ایسی ہی دل گداز کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

ٹارزن کی کہانی سب نے پڑھی ہوگی۔ ٹارزن (انگریزی:Tarzan) ایک افسانوی کردار ہے جو پہلی بار 1912 میں امریکی مصنف ایڈگر رائس بورس (1875 – 1950) نے کہانی "بندروں کا ٹارزن" (Tarzan of the Apes) میں متعارف کرایا۔ جس نے اس وقت بہت مقبولیت حاصل کی، بعض لوگ اسے افسانوی کرداروں میں سے سب سے مقبول کردار قرار دیتے ہیں، کہانی کی اشاعت کے بعد ٹارزن فلموں، بچوں کی کہانیوں، ٹی وی اور ریڈیو پروگراموں، تیل کے اشتہاروں، بچوں کے کھلونوں، کپڑوں اور کھیلوں کے جوتوں میں نظر آیا، ٹارزن پر 1918 سے لے کر 2014 تک 200 فلمیں بنائی جاچکی ہیں، یہ شخصیت اتنی مقبول ہوئی کہ بعض لوگ اسے ایک حقیقی کردار سمجھنے لگے، ٹارزن پر امریکی مصنف فلپ فارمر جو سائنسی کہانیاں لکھنے کے لیے مشہور ہیں نے ایک نظریہ وضع کیا جس کے مطابق.برطانیہ میں 13 دسمبر 1795 کو ورلڈ نیوٹن نامی شہر پر ایک شہاب ثاقب گرتا ہے جس کے اثر سے حادثہ کے قریب رہنے والے لوگوں میں وراثتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، یہ تبدیلی ان لوگوں کی آگے کی نسل میں غیر طبعی طاقتیں پیدا کردیتی ہے، فارمر

کے مطابق اس شہر کے لوگوں کی نسل سے غیر طبعی طاقتوں کی حامل سب سے مشہور شخصیات ٹارزن، شرلاک ہولمز اور جیمز بانڈ ہیں، یہ درست ہے کہ مذکورہ تاریخ کو اس چھوٹے سے شہر میں واقعی ایک شہابِ ثاقب گرا تھا تاہم فارمر کا نظریہ صرف ایک فرضی مفروضہ ہے جسے انہوں نے اپنی کہانیوں میں استعمال کیا۔ لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ بندروں میں معصوم بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ وہ انسانوں سے بڑھ کر بچوں کا خیال رکھتے ہیں۔ برسوں پہلے یوگنڈا کا ایک چار سالہ بچہ، جو ایک جنگل میں بچھڑ گیا تھا اور اُسے تقریباً 6 ماہ بندروں کے ساتھ گزارنا پڑے تھے، لیکن جب ریسکیو حکام نے اُسے تلاش کیا تو وہ بالکل خیریت سے تھا۔ بندروں نے اس کی دیکھ بھال کی اور اس کی خوراک کا بھی خیال رکھا۔ انسانوں اور جانوروں کا ازل کا ساتھ ہے، بعض انسان جانوروں کے ساتھ رہ کر وحشی بن جاتے ہیں تو بعض جانور انسانوں کے ساتھ رہ کر انسانی خصلت اختیار کر لیتے ہیں۔ جانوروں کے ساتھ کسی بچے کے رہنے اور اُس ماحول میں پرورش پانے کا ایک اور واقعہ گذشتہ برس روس کے علاقے 'روسٹو' میں پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ایک دو سالہ بچے کو جبراً گھر والوں نے بکریوں کے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ اس واقعے کو برطانوی اخبار ڈیلی میل سمیت متعدد اخبارات نے کوریج دی۔ یہ بچہ جس کا نام 'ساشائی' بتایا گیا ہے، کو نہ تو بولنا سکھایا گیا تھا اور نہ ہی کھانا پینا۔ ریسکیو حکام کا کہنا تھا کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو بچے کی ماں وہاں موجود نہیں تھی اور بچہ بغیر لباس

کے سرد کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں ٹھنڈ اتنی شدید تھی کہ کوئی بھی لمحہ بچے کی زندگی کو موت میں بدل سکتا تھا۔

اس کے علاوہ کمرا انتہائی گدلا اور بدبو دار بھی تھا۔ ریسکیو حکام نے بچے کو کپڑے میں لپیٹا اور اسپتال پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ بچے کے دماغ نے ٹھیک طرح سے نشوونما نہیں پائی ہے۔ اس کا وزن ایک نارمل بچے کے مقابلے میں کئی گنا کم تھا۔ ایک ڈاکٹر کے مطابق ساشائی نے بستر پر سونے سے انکار کر دیا۔ اسے بستر پر لٹایا جاتا مگر وہ اتر کر بستر کے نیچے گھس جاتا۔ بچہ بہت خوف زدہ تھا اور وحشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ ہر چیز توڑنے کی کوشش کرتا۔ بعد ازاں حکام نے بچے کے والدین سے حق وراثت چھیننے کے لیے اقدامات شروع کر دیے، جنھوں نے اسی یتیمی کی بلکہ جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ 27 مئی 2009 کو برطانوی اخبار ٹیلی گراف میں ایک پانچ سالہ بچی کے حوالے سے خبر شائع ہوئی، جس کے بارے میں خیال تھا کہ اس کی پرورش کتوں اور بلیوں میں رہ کر ہوئی ہے۔ سائبیریا کے علاقے ٹرانس بیکل میں پیش آنے والے اس افسوس ناک واقعے کے حوالے سے پولیس کا کہنا تھا انہیں ایک نامعلوم ٹیلی فون کال کے ذریعے بتایا گیا کہ سوویت دور کی ایک پرانی عمارت میں ایک معصوم بچی جانوروں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ پولیس کے مطابق اس عمارت میں بچی کے والد اور دیگر رشتے دار بھی رہتے تھے۔

پولیس کا کہنا تھا کہ بچی روسی زبان سمجھتی ہے، لیکن اُسے بولنا نہیں آتا۔ بچی کو جس ادارے میں رکھا گیا وہاں کی سربراہ نے سرکاری ٹی وی کو بتایا کہ بچی کے اندر جانوروں والی خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے کہا، ''میں جب دروازے سے نکلنے لگی تو بچی نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور بھونکنا شروع کر دیا۔ اُسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ٹیبل پر کیسے بیٹھنا ہے اور کھانا کیسے کھانا ہے۔''

اسی حلقے میں بچوں کے امور کی ایک ماہر، لاریسا پوپووا نے سرکاری ٹی وی کو بتایا کہ بچی نے بہت ہی غلیظ ماحول میں زندگی گزاری ہے۔ جس جگہ وہ رہ رہی تھی وہاں ناقابل برداشت بدبو تھی۔ انھوں نے کہا کہ وہاں بہت سے جانور تھے، جن میں کتے اور بلیاں بھی شامل تھیں، لیکن بچی نے تمام تر صورت حال کے باوجود وہاں پرورش پائی۔

پولیس کا کہنا تھا کہ عمارت میں پانی، بجلی اور گیس کافی عرصے سے ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے بند تھی۔ ایک خبر رساں ایجینسی نے بچی کی والدہ کے حوالے سے بتایا کہ بچی جب ڈھائی برس کی تھی تو اس کا باپ اُسے بتائے بغیر بچی کو لے کر چلا گیا تھا، جب کہ بچی کے والد کا کہنا ہے کہ اس کی ساس نے اُس سے کہا تھا کہ وہ بچی کو یہاں سے لے جائے، کیوں کہ اس کی والدہ بچی کی مناسب دیکھ بھال نہیں کرتی۔ حکام کا کہنا ہے کہ بچی کے والد کو پرورش میں غفلت برتنے کے جرم میں 3 برس قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

جانوروں کی طرف سے انسان دوستی کا ایک اور غیر معمولی واقعہ 20 دسمبر2008 کو ارجنٹائن کے علاقے مسی یونز میں پیش آیا اور اس خبر کو بھی برطانوی اخبار ٹیلی گراف نے شائع کیا۔ ایک خاتون پولیس آفیسر کو راہ چلتے بِلّیوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ یہ بلیاں ایک دوسرے سے جُڑ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ خاتون نے جب غور سے دیکھا تو اُسے ان بلیوں کے درمیان، ایک شیر خوار بچہ دکھائی دیا، جو نہایت اطمینان سے سو رہا تھا۔ خاتون پولیس آفیسر کا کہنا تھا کہ جب میں ان کے قریب گئی تو بلیاں محتاط ہو گئیں اور میری طرف دیکھ کر غرّانے لگیں۔ پولیس آفیسر کی نظر بلیوں کے قریب بچی کچی خوراک پر پڑی، جس کے بارے میں خیال تھا کہ یہی خوراک بچے کو دی جاتی رہی ہوگی۔ انہوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ ''بلیوں کو پتا تھا کہ یہ بچہ لاوارث ہے اور اسے تحفظ کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ بلیاں بچے کو سرد رات میں گرمی پہنچا رہی تھیں اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو بچے کی جان جا سکتی تھی۔ پولیس نے بچے کے والد کا سراغ لگایا تو پتا چلا کہ وہ بے گھر ہے اور کئی دنوں سے اُس کا بچہ لاپتا ہے۔ اُس کا ''کہنا تھا کہ بلیاں ہمیشہ ہی سے اُس کے بچے کی محافظ رہی ہیں۔

یہ کسی کو نہیں معلوم کہ یہ بچہ کتنے دنوں سے خوراک کے اُن ٹکڑوں پر پل رہا تھا جو بلیاں اُس کے لیے لائی تھیں اور وہ بچہ کب سے جما دینے والی سردی

میں ان بلیوں کے درمیان سو رہا تھا، لیکن جس طرح سے اُس کے والد نے اعتراف کیا کہ اُس کا بچہ کئی دنوں سے اُس سے لاپتا ہے اور بلیاں اُس کے بچے کی ہمیشہ حفاظت کرتی رہی ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے والد نے عادتاً اپنی مرضی سے کئی مرتبہ بچے کو اسی طرح بے آسرا چھوڑا ہوگا۔ جون سیبونیا کا تعلق یوگنڈا سے ہے۔ اس کی پیدائش 1980 کے وسط میں ہوئی۔ جب وہ تین برس کا تھا تو اپنے باپ کے ہاتھوں ماں کا قتل دیکھ کر خوف کے باعث گھر سے نکل گیا تھا اور قریب ہی واقع جنگل جا پہنچا تھا۔ سیبونیا کے بارے میں خیال ہے کہ جنگل میں اس کی پرورش افریقی خون خوار بندروں نے کی تھی۔ سیبونیا1991 میں میلی نامی ایک قبائلی خاتون کو اُس وقت ملا جب وہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میلی اسے 'مین فوک' لے آئی، لیکن پھر جیسا کے کنگ کانگ والی فلموں میں دیکھتے ہیں کہ، نہ صرف جون نے مزاحمت کی بلکہ اس کو پالنے والے خاندان، یعنی بندر بھی اس کے دفاع کے لیے آ گئے اور انھوں نے گاؤں والوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میلی نے اسے ایک یتیم خانے کے سپرد کر دیا۔ ابتداً تو وہ بات نہیں کرسکتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ اس نے بولنا سیکھ لیا۔ جون اب صرف باتیں ہی نہیں کرتا بلکہ گانا بھی گاتا ہے۔ بی بی سی نے جون کی زندگی پر ''لیونگ پروف'' کے نام سے ایک دستاویزی فلم بھی بنائی ہے، جو 13 اکتوبر 1999 کو ریلیز ہوئی تھی۔

ٹرین کالڈارار نامی اس بچے کا تعلق رومانیہ سے ہے، جو 1999 میں چار سال کی عمر میں، اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا۔ خیال ہے کہ اس کے گھر والوں نے بعض گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ ٹرین کالڈارا کا جب سراغ ملا تو اُس کی عمر سات برس تھی، لیکن وہ بمشکل تین سال کا لگ رہا تھا۔ وہ نہ بولنا جانتا تھا اور نہ ہی اُس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ایک گتے کے ڈبے کو گھر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کی جسمانی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق، ممکن ہے کہ اس نے خود سے زندہ رہنے کی کوشش کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیہات کے آوارہ کتوں نے زندہ رہنے میں اس کی مدد کی ہو۔ یہ بچہ شیفرڈ نامی ایک شخص کو اُس وقت ملا جب وہ اپنی زمینوں کی طرف جا رہا تھا اور اُس کی کار خراب ہو گئی تھی۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی جس نے بچے کو پکڑ لیا۔ ٹرین کتوں کی طرح چلتا تھا اور بستر کے بجائے اس کے نیچے سونا پسند کرتا تھا۔ جب اسے خوراک نہیں ملتی تو وہ بہت غصے میں آجاتا۔ اُسے ہر وقت کھانے کے لیے کسی شے کی تلاش رہتی تھی۔

مندرجہ بالا واقعات ایسے ہیں جو گذشتہ چند برسوں میں پیش آئے، لیکن بھارت میں برسوں قبل اس طرح کی ایک کہانی بڑی مشہور ہوئی۔ اس کہانی کی مرکزی کردار ڈیڑھ سالہ کمالا اور آٹھ سالہ امالا بھارتی ریاست مغربی بنگال کے علاقے ''مدناپور'' کے ایک جنگل میں بھیڑیے کے بھٹ سے ملی تھیں۔ یہ کہانی

ابتدا ہی سے تنازعات میں جکڑی رہی، کیوں کہ دونوں بچیوں کے درمیان عمروں کا فرق بہت زیادہ تھا۔ ماہرین نہیں سمجھتے تھے کہ دونوں بچیاں آپس میں بہنیں ہوں گی۔ اُن کا خیال تھا کہ ان بچیوں کو بھیڑیے مختلف اوقات میں وہاں لائے ہوں گے۔ جس شخص کے پاس ان بچیوں کو لایا گیا تھا، اُس کا نام ''جے اے ایل سنگھ'' بتایا جاتا ہے، جو ایک مقامی یتیم خانے کا نگراں تھا۔ اُس نے ان بچیوں کو یتیم خانے پہنچایا۔ اگرچہ چند برسوں تک ان بچیوں کی پرورش ہوتی رہی لیکن حیرت انگیز طور پر انہیں کچھ بیماریوں نے جکڑ لیا۔ جے اے ایل سنگھ کا کہنا تھا کہ ''اگر ہم ان بچوں کے ساتھ مخلص ہیں تو بہتر یہی ہوگا کہ انہیں دوبارہ جنگلوں میں چھوڑ دیا جائے۔'' جس کے بعد ان بچیوں کو جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ گو اس دنیا میں ٹارزن جیسے کردار حقیقی زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ لیکن انسان اور جانور جب محبت کے رستے میں جکڑے جاتے ہیں تو ایسی ہی دل گداز کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

وقت کا پہیہ

وقت کا پہیہ چلتا ہے۔ کل میں آج بدلتا ہے۔ تاریخ کا پہیہ جب الٹا چلنے لگتا ہے تو اُسے نہ ماضی میں کوئی روک پایا ہے نہ آئندہ کوئی روک پائے گا۔ پاکستان کی سیاست میں جمہوریت کی گاڑی جن پہیوں پر چل رہی ہے۔ اس ڈی ریل کیا گیا تو پھر ملک میں کچھ نہیں بچے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اب جیسی بھی جمہوریت ہے اس کا پہیہ چلنے دیا جائے اور ہر پانچ سال بعد عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے البتہ پارلیمنٹ میں موجود سیاسی جماعتیں الیکشن چار سال بعد کروانے کا فیصلہ کرلیں تو ہمارے جیسے ملک کے لئے بہتر ہوگا۔ انسانی تاریخ میں پہیہ ہی وہ چیز ہے، جس نے انسان کے لیل ونہار کی گردش کو تیز کیا ہے۔ انسان نے زمین پر قدم جماتے ہی قدرت کی طرف سے دی ہوئی ذہنی صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے اپنی اولین ترجیحات کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے اُن چیزوں کی تلاش شروع کردی جو اولین ضروریات میں شامل تھیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں سرد گرم موسم کے بچاؤ، کھیتی باڑی و شکار وغیرہ کیلئے لباس وآلات مختلف اشکال میں متعارف ہونا شروع ہو گئے۔ آج 21 ویں صدی جدید دُنیا کا وہ دور ہے جس میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوچکا ہے کہ دُنیا کی سب سے اہم ایجاد و دریافت کیا ہے۔ کیونکہ سائنسی ترقی میں میکانی، الیکٹریکل والیکٹرونکس کا ایسا امتزاج ہے جس نے طب

کی دُنیا میں بھی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ گو اس ترقی کے بہت سے منفی پہلو بھی ہیں جن میں سب سے اہم مہلک ہتھیار ہیں۔ بہرحال زمین سے آسمان تک رسائی حاصل کرنے کیلئے، سر کے بالوں سے پاؤں کے انگوٹھے تک کی تکلیف دور کرنے کیلئے، ایک کا دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کیلئے اور سرکاری و نجی سطح پر بہترین سے بہترین تعمیرات کیلئے وہ اشیا استعمال ہو رہی ہیں جن کی تعریف ہر زبان پر ہے۔ لیکن ان سب کی ابتدائی کامیابی کا سہرا آج بھی ایک بڑے طبقے کی رائے کے مطابق اُس ایجاد سے منسلک سمجھا جاتا ہے جس کو ''پہیہ یا وہیل'' کہا جاتا ہے۔ پہیہ اُس ہی دور کی ایک ایسی میکانی ایجاد ہے جس کے متعلق قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پہلی دفعہ کب استعمال ہوا۔ اس کی پہلی کہانی تو یہ ہے کہ جس زمانے میں انسان درختوں کے تنے کاٹ کر جب اپنے کام میں لاتا تھا اُس ہی دوران کسی حصے کو گول دیکھ کر ایک کمہار نے اُسکی طرز کی ایک ایسی گول چکی سی بنائی یا ایجاد کی جس پر مٹی کے برتنوں کی بنوائی و بناوٹ کو نئی نئی شکل دے کر اُس نے برتنوں کی دُنیا میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دوسری کہانی یہ ہے کہ ایک لکڑ ہارا کسی پہاڑی پر درخت کاٹ کر اُس کے حصے کر رہا تھا کہ درخت کے تنے کا ایک گول حصہ پہاڑی پر سے گول گھومتا ہوا نیچے کی طرف کچھ اسطرح آیا کہ وہاں قریب ہی کھڑے ایک شخص کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لکڑی کے پھٹے سے ٹکرا کر اُسکے نیچے سے گزر گیا اور پھٹا اُس تنے کے اوپر ہونے کی وجہ سے کچھ آگے جا کر گرا۔ جسکی وجہ سے اُس لکڑی کے پھٹے

والے شخص کو خیال آیا کہ اگر کسی طرح لکڑی کو گول کاٹ کر کچھ ایسے طریقے سے کسی بھی چیز کے نیچے سے اُسکو منسلک کر دیا جائے تو وہ چیز ضرور آگے کی طرف آسانی سے بڑھے گی۔ بس یہی فکر اُس وقت سہولت کا باعث بن گئی جب پہیہ ایک کارآمد ایجاد بن کر انسان کی ضروریاتِ زندگی کا اہم حصہ بن گیا۔ پہیہ کی تاریخ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ اس ایجاد و دریافت کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں ملتی۔ لیکن وہ انسان کے استعمال میں صدیوں سے ہیں۔ پہیہ بھی اُن ہی میں سے ایک ہے۔ لیکن پھر بھی دُنیا کے ارتقائی دور کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اسکے بارے میں بھی کچھ اندازے لگائے گئے ہیں۔ اب اُن میں حقیقت کتنی ہے وہ ایک الگ بحث ہے، لیکن پھر بھی ذیل کی معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے دائرے میں پہیہ قابلِ ذکر و سب سے اہم ایجاد ہے۔

میسوپوٹیمیا میں 3500 قبل مسیح میں کمہار کے برتن بنانے والے باٹ (چکی) میسوپوٹیمیا (آجکل کے عراق) کے تمدن کی ایک کڑی کے طور پر اہم ایجاد سمجھا جا سکتا ہے جسکے ذریعے کمہار اپنی اُنگلیوں سے برتنوں کو آسانی سے مختلف اشکال دے کر آگ کی بھٹی میں پکا کر اُنھیں تیار کرتا تھا۔ یہ فن آج بھی اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے۔

3200 قبل مسیح میں میسوپوٹیمیا میں ہی لکڑی کا پہیہ واضح طور پر آمد و رفت میں استعمال ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ بلکہ اُسکے درمیان میں سوراخ کر کے ایکسل نامی ڈانڈا دونوں پہیوں میں اسطرح لگا دیا گیا کہ پہیہ آسانی سے تیز گھومنا شروع ہو گیا اور اس کامیابی کی شکل اُس دور کے وہاں کے وہ

گھوڑوں والے رتھ (ٹانگیں) تھے جن میں ان کو لگا کر سفر بھی کیا جاتا تھا اور مقابلے کی دوڑیں بھی لگائی جاتی تھیں۔ لہٰذا اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ پہیہ اپنی ابتدائی شکل و استعمال کے ساتھ مینو فیکچرنگ وائس دور کی صنعتی ترقی کی وہ کڑی ہو سکتا ہے جو مستقبل میں بہتر سے بہتر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ 2000 قبل مسیح میں مصر میں باقاعدہ طور پر پہیہ استعمال ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اور 1400 قبل مسیح میں یورپ میں اس کی موجودگی کو محسوس کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں اس قسم کی ایجاد کا تعلق کسی بھی طرح مشرقِ وسطیٰ سے نہیں تھا۔ حالانکہ تحقیق کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یورپ اُس دور میں چاہے کیسی بھی حالت میں تھا لیکن وہاں کے لوگ مصر کی تہذیب و تمدن کے بارے شاید کچھ نہ کچھ ایسی معلومات رکھتے تھے کہ وہاں کے لوگ مصر کا سفر کرتے تھے اور جو بھی بات یا شے ہٹ کر نظر آتی تھی اُسکے اثرات یقینی طور پر یورپ میں بھی نظر آتے ہونگے۔ اسکی ہی ایک مثال یونانی فلسفی تھیلز کی ہے جو 600 قبل مسیح کے قریب علمی معلومات کیلئے سفر کرتا ہوا مصر گیا تھا اور وہاں سے واپس آنے کے بعد ہی دُنیا کے سامنے اُس نے پہلا سوال رکھ دیا تھا کہ انسان کیا ہے؟ جہاں سے دُنیاوی علم پر سائنسی بنیادوں پر بحث کا آغاز ہوا۔ تو پہیہ وقت کے بہتے دھاروں کے ساتھ ''وہیل'' بن گیا: قبل مسیح سے عیسوی دور میں داخل ہونے تک انسان اپنی ضرورت کے مطابق اشیا کو ترتیب دیتا رہا اور اگر کسی شے کے حاصل کرنے کے نتیجے پر نہ

پہنچا تو اُسکی دیوار یا پتھروں پر تصویر بناڈالی جو آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے ایک مثال ثابت ہوتی رہی۔ پھر جب میکانی (مشینی) دور کا آغاز ہوا تو تقریباً ہر شے یا مشینی حکمتِ عملی کو آگے بڑھانے کیلئے پہیہ لازمی قرار پایا۔ بلکہ صدیوں سے مختلف زبانوں میں اسکو جس نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہوگا اس نئے دور کی ایجادات میں انگریزی زبان میں ''وہیل'' کے نام سے دُنیا بھر کی ضرورت بن گیا۔ پہیہ اب جدید دور کی مختلف ایجادات کی اہم ضرورت ہے۔ یورپ میں ترقی کی نئی راہیں کھلیں تو پہیہ مزید بہتر استعمال کرنے کیلئے اسکے ارد گرد 'ربڑ' کا استعمال کرکے اسکی گولائی کو مزید بہتر کیا گیا اور ساتھ کچھ رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا۔ پھر چاہے سائیکل کی ایجاد ہو یا خوبصورت بگھی بنائی گئی ہو یا چار پہیوں کی کار وغیرہ، انکی بنیاد پہیہ ہی بنی۔ اسٹیم انجن کی ایجاد اور اُسکے ساتھ ٹرین کے ڈبوں کا ترتیب وار جوڑ لوہے کے انتہائی پائیدار ''وہیل'' ہی کے مرہونِ منت شہرت کا باعث بنا۔ ہوائی جہاز کی بیسویں صدی کے آغاز میں ایجاد اور پھر وقت کے ساتھ استعمال کے مطابق روز بروز جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوتے چلے جانے میں بھی اُسکے سب سے اہم حصے ''وہیل'' کا ہی کمال ہے۔ انجن اپنی باکمال صفت میں اگر آسمان اور زمین کا ملاپ کروا رہا ہے تو اُسکے پہیوں کے نظام نے ہی آج انسان کے سفر کے وقت کو صرف چند گھنٹوں پر محیط کر دیا ہے۔ آج پہیہ جہاں تک عوام کو نظر آتا ہے وہ ایک مضبوط ربڑ کی ایسی گول شکل میں ہوتا ہے جس کے اندر ایک نرم ربڑ

کی گول ٹیوب ہوتی ہے جس میں پریشر کے ذریعے ہوا بھری جاتی ہے۔ جیسے ہی مطلوبہ مقدار کے مطابق اُس ٹیوب میں ہوا بھر جاتی ہے اُوپر کا مضبوط حصہ سفر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اُس حصے کو ہم ''ٹائر'' کہتے ہیں۔ کچھ میں ٹیوب نہیں ہوتی ہے لیکن ہوا بھرنے کا طریقہ وہی ہوتا ہے اور اسکو ''ٹیوب لیس ٹائر'' کہتے ہیں۔ ٹیوب والا یا ٹیوب لیس ٹائر دونوں صورتوں میں وہ ایک لوہے کے رم پر چڑھا ہوتا ہے اور اسکو چلتے ہوئے نرم رکھنے کیلئے چھوٹا سا بیئرنگ استعمال کیا جاتا ہے۔ دلچسپ یہ ہے کہ اس نظام میں ایکسل کی اہمیت ماضی کی طرح ہی ہے لیکن نئی جدت کے مطابق اسکو ڈھال لیا گیا ہے۔ پانی میں بحری جہاز چلانے کیلئے جو ہینڈل استعمال کیا جاتا ہے اسکو شپ وہیل کہتے ہیں۔ اسطرح توانائی کیلئے فلائی وہیل استعمال ہوتا ہے۔ کار وغیرہ کو قابو کرنے والے ہینڈل کو سٹیرنگ وہیل کہتے ہیں۔ اسطرح بے شمار جگہوں پر اس میں لوہے یا لکڑی کی سلاخیں لگا کر بھی اسکو قابلِ استعمال بنایا جاتا ہے۔ برصغیر کی حالت بدلے میں بھی اس پہیہ نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن یہ ریل کا پہیہ ہے۔ 1857 سے پہلے عملی طور پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی والے اس حقیقت کو جانتے تھے کہ کراچی شہر ایک بہت اہم بندرگاہ بن سکتا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بھی نکتہ تھا کہ پنجاب اور دیگر علاقوں سے خام مال کراچی اور پھر بین الاقوامی منڈیوں میں لے جانے کے لیے اُس وقت کے لحاظ سے ایک قابل اعتماد نظام کی ضرورت ہے۔ 1851 میں ہنری ایڈورڈ

فریری سندھ کا کمشنر مقرر کیا گیا۔ اُس نے وائسرائے ہند لارڈ ڈلہوزی سے اجازت طلب کی کہ کراچی میں ایک سمندری بندرگاہ کے لیے سروے کیا جانا چاہیے۔1858 میں اُس نے ریلوے لائن اور ریلوے کے نظام کے لیے ایک تفصیلی جائزہ لینا شروع کر دیا۔
ابتدائی طور پر ریلوے کا نظام کراچی اور کوٹری کے درمیان مختص تھا۔ سکنڈ (سندھ) ریلوے1855 میں معرض وجود میں آ چکی تھی۔ صرف تین سے چار سال کے عرصے میں کراچی کو کوٹری سے بذریعہ ریل ملا دیا گیا۔ ریلوے کی چار کمپنیاں، (سندھ)، سکنڈ، انڈس فلوٹیلا، پنجاب اور دہلی ریلویز کو ایک ریلوے کمپنی میں تبدیل کر دیا گیا۔
اس نئی کمپنی کا نام سکنڈ، پنجاب اور دہلی ریلوے کمپنی رکھا گیا۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ نے تاج برطانیہ کی اجازت سے1886 میں اس کمپنی کو خرید لیا۔ اس کا نام تبدیل کر کے نارتھ ویسٹرن اسٹیٹ ریلوے رکھا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اسٹیٹ کا لفظ نکال کر یہ نام صرف نارتھ ویسٹرن ریلوے رہ گیا۔ ایک طرز سے، یہ نجی ملکیت سے حکومتی ملکیت کی طرف ایک قدم تھا۔ 1889 میں کراچی شہر اور کیماڑی کے درمیان لائن بچھا دی گئی۔
میں کیماڑی سے کوٹری تک لائن کو دو رویہ کر دیا گیا۔ اگر آپ پشاور سے 1897 کراچی تک کی ریلوے لائن کا جائزہ لیں تو اس کی ترتیب تقریباً وہی ہے جو سکندر اعظم نے صدیوں پہلے ہندوستان پر حملے کے دوران رکھی تھی۔ یہ ہندو کش کے پہاڑی سلسلے سے بحیرہ عرب تک تقریباً سفر کی وہی لکیر ہے جو سکندر اعظم اور اس کے لشکر نے اختیار کی تھی۔ 1889 میں

دریائے سندھ پر لینسز ڈاؤن پُل تعمیر کیا گیا۔ یہ پُل انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اس پُل کی بدولت کراچی اور پشاور کو بذریعہ ریل آپس میں ملا دیا گیا۔ کوئٹہ کی فوجی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اُس وقت بھی برطانیہ کو یہ خوف تھا کہ روس کہیں افغانستان سے کوئٹہ پر حملہ نہ کر دے اور اس طرح اپنے اثر اور حکومت کو اس خطہ میں لانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ 1857 میں ولیم اینڈریو سکنڈ پنجاب اور دہلی ریلوے کا چیئرمین تھا۔ اس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ کوئٹہ تک ریل کا ایک نظام ہونا چاہیے تاکہ اسے جنگ کی صورت میں ترسیل کو تیز تر کرنے میں استعمال کیا جا سکے۔ صرف چار ماہ کے قلیل عرصے میں رکھ سے سبی تک 1880 میں 215 کلومیٹر کی لائن بچھا دی گئی۔ اس سےآگے پہاڑوں کا انتہائی مشکل پھیلاؤ تھا۔ پُل اور دشوار گزار سرنگیں بنانے میں تقریباً سات سال کا عرصہ لگا۔ 1887 میں سبی کو کوئٹہ سے ملایا جا چکا تھا۔ 1947 میں نارتھ ویسٹرن ریلویز کو تقسیم کر دیا گیا۔ ہندوستان کو31330 کلومیٹر جب کہ پاکستان کو8124 کلومیٹر ریلوے ٹریک منتقل ہوا۔ شروع میں اس شعبہ میں پاکستان نے کافی محنت کی۔ مردان سے چارسدہ، جیکب آباد سے کشمور اور کوٹ ادو سے کشمور تک ٹریک کو بڑھایا گیا۔ 1961 میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کا نام تبدیل کر کے اسے پاکستان ریلوے کا نام دے دیا گیا۔ ہماری ٹرین کی حد رفتار 120 کلومیٹر فی گھنٹہ تک تھی اور ہے۔ پاکستان ریلوے تقریباً 6 سے سات کروڑ مسافروں کو سالانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے

پاس 200 مال بر داری کے تجارتی مرکز تھے۔ ہماری ریلوے میں تقریباً 82000 ملازمین ہیں۔ ہمارا سالانہ اوسط ریونیو تقریباً انیس ہزار ملین روپے ہے۔ لیکن ہم نے اس ریل کے پہیہ کو جام ہی نہیں کیا۔ بلکہ ترقی کی رفتار کو بھی الٹا کر کے الٹا پہیہ چلا دیا۔ جس نے ریل کے سارے نظام کو تباہ کر دیا۔ ہمارے پڑوس میں یہ ریل کا پہیہ پورے زور و شور سے چل رہا ہے۔ انڈیا ریلوے کے کے سترہ جغرافیہ زون ہیں۔ اس میں تیرہ لاکھ لوگ کام کرتے ہیں۔ اس کا سالانہ اوسط ریونیو 20 بلین ڈالر ہے۔ اس کا سالانہ منافع تقریباً 2 بلین ڈالر ہے۔ ریلوے ٹریک کی لمبائی 65000 کلومیٹر ہے۔ 23000 کلو میٹر پر بجلی کی ٹرین چلتی ہے۔ ریلوے کی وزارت کے پاس 14 پبلک سیکٹر ادارے ہیں۔ ان میں ویگن بنانے سے لے کر سیاحت اور کھانا بنانے تک کی کمپنیاں موجود ہیں۔ انڈیا کی ریلوے اپنے انجن بھی خود بناتی ہے۔ اب ریلوے کا سرکاری محکمہ بھوٹان، نیپال، ویت نام، اور برما تک توسیع کر رہا ہے۔ راجستھان کی سیاحت کے لیے خصوصی آرام دہ ٹرینیں چلائی گئی ہیں۔ ان میں مہاراجہ ایکسپریس، رائل راجستھان اور کئی اور ٹرینیں شامل ہیں۔ ان تمام ٹرینوں میں ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے انتہائی آرام دہ نظام بنایا گیا ہے۔ یہ دراصل پہیے پر چلتے ہوئے محل ہیں۔ ان میں لاکھوں سیاح کئی کئی دن اور رات سفر کرتے ہیں۔ ہندوستان کی ریلوے اب بایو ٹوائلٹ نصب کر رہی ہے۔ تمام نئی ویگنوں میں یہ ٹوائلٹ نصب کیے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے بھی ایک الگ محکمہ بنایا گیا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ابتدائی 55 برس میں کسی ٹرین میں کوئی ٹوائلٹ نہیں تھا۔ بلکہ یہ تصور بھی نہیں تھا کہ کسی ٹرین میں یہ سہولت میسر ہو گی۔1909 میں بابو ادھکل چندرا سین نے اس سہولت کے نہ ہونے کی صاحب گنج کے ریلوے افسر کو شکایت کی۔ چنانچہ 50 میل سے زیادہ سفر کرنے والی تمام ٹرینوں کی لوئر کلاس میں یہ سہولت مہیا کی گئی۔ انڈین ریلوے نے صفائی کے لیے ایک خصوصی مہم شروع کی ہے۔ جیسے ہی ٹرین کسی مختص ریلوے اسٹیشن پر رکتی ہے، خصوصی طور پر تربیت یافتہ 20-25 افراد ٹرین کی مکمل صفائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ شیشوں سے لے کر کچرہ کے ڈبوں تک ہر چیز کو چمکا دیتے ہیں۔ ریلوے کے مختلف ترقیاتی منصوبوں کے لیے200 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ تمام بڑے ریلوے اسٹیشنز پر کھانے پینے کے فوڈ کورٹ بنائے گئے ہیں اور اس میں نجی شعبے کو ترجیح دی گئی ہے۔ پہیہ کی یہ گردش ہر جگہ ہے۔ آپ کسی ترقی یافتہ ملک میں چلے جائیں۔ آپ کو ریلوے اسٹیشن اور ائیر پورٹ میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو گا۔ یورپ کو چھوڑ دیجیے۔ چین کو لے لیجیے۔ بیجنگ کے مین ریلوے اسٹیشن پر چلے جائیں۔ آپ کو انتہائی قابل بھروسہ اور صاف ماحول ملے گا۔ ہمیں آزادی کے وقت ہمیں دنیا کا بہترین ریلوے کا نظام ملا تھا۔ ہمارے ریلوے کے ملازمین کی وردیاں تک قابل رشک تھیں۔ لیکن ہمارا ریلوے کا پہیہ مدتوں سے منجمد ہے۔ یہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ چاند، سورج نکلتا ہے۔ رات آتی دن ڈھلتا ہے۔ آسمان بھی دیکھو تو۔ کیسے رنگ بدلتا ہے۔ وقت کا پہیہ چلتا ہے۔

کل میں آج بدلتا ہے۔پاکستان میں اب وقت بدل گیا ہے۔ اب پہیہ الٹا چلنے لگا بلکہ اُلٹی گنتی شروع ہوچکی ہے۔ تبدیلی کا موسم آچکا ہے۔ ہ آج نہیں تو کل تبدیلی اور انقلاب آئے گا۔وقت کا پہیہ چلتا ہے۔کل میں آج بدلتا ہے۔پاکستان میں پہیہ کی یہ گردش ہی زندگی ہے، پہیہ ریل کو ہو یا سیاست و جمہوریت کا اسے چلتا رہنا چاہئے۔

دھرنوں کی سیاست معیشت کو اربوں کا مالی نقصان

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد دھرنوں اور مارچ کی سیاست کی زد میں ہے حکومت اوراپوزیشن ایک آواز ہیں اوردیگر سیاسی جماعتوں بھی اب دھرنا کرنے والوں سے ہم آواز نہیں ہیں۔ ایک ماہ سے اسلام آباد میں یہ دھرنے جاری ہیں۔ جماعت اسلامی کے امیر سراج الحق حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات میں مصروف ہیں۔ ان کی کوشش اور خواہش یہی ہے کہ دھرنے کا اختتام پرامن اور نتیجہ خیز رہے۔ دارالحکومت اسلام آباد کے مرکز میں دھرنا دینے والے احتجاجی لیڈر عمران خان روز نت نئے اعلانات کرتے ہیں۔ وہ اپنی دھواں دار تقاریر میں ارباب اقتدار وسیاست کی بدعنوانیوں اور گذشتہ سال منعقدہ عام انتخابات میں مبینہ دھاندلیوں کے انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ ایک ماہر جادوگر اور شبعدہ باز کی طرح وہ اپنے سامعین ،ناظرین، اور دھرنا کے شرکا کو ہر روز ایک نئے اعلان ، انکشاف اور خوشخبری کی امید دلاتے ہوئے، اگلے دن کسی نئے انکشاف کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے اس دھرنے کو جز وقتی (پارٹ ٹائم) دھرنا بھی کہا جاتا ہے، جہاں شام کو لوگ راگ رنگ اور موج میلے کے لئے اکھٹے ہوجاتے ہیں۔ اس آزادی تحریک اور مارچ کو ایک ماہ کی مدت گزر چکی ہے۔ عمران خان اسے اقتدار کی جنگ نہیں ہے بلکہ حاکم اور محکوم کی جنگ کہتے ہیں۔

اور جبر و استبداد کے خلاف سخت جنگ لڑنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عوام کو لوٹنے والے لوگ اب ان کے پُرامن دھرنے کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے اس مطالبے پر بھی ڈٹے ہوئے ہیں کہ وزیراعظم نواز شریف انتخابات میں دھاندلیوں پر مستعفی ہو جائیں۔ وہ وفاقی وزرا کے اس دعوے کو بھی تنقید کو نشانہ بناتے ہیں۔ جس میں انھوں نے کہا تھا کہ عمران خان اور ان کے احتجاجی اتحادی ڈاکٹر طاہر القادری کے دھرنے کے نتیجے میں قومی معیشت کو ایک کھرب روپے کا نقصان پہنچ چکا ہے۔ عمران خان سول نافرمانی کے لئے اور بجلی کے بل ادا نہ کرنے کا بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے خود اسلام آباد کے علاقے بنی گالا میں واقع اپنے گھر کا بجلی کا بل ادا کر دیا ہے۔ البتہ لاہور کے گھر کا بل ادا نہیں کیا ہے۔ عمران خان اور ان کے انقلابی لیڈر ڈاکٹر طاہر القادری ایک جانب تو ڈی چوک اور شاہراہ دستور پر دھرنا دینے والے اپنے حامیوں سے تندو تیز تقاریر کر رہے ہیں اور دوسری جانب ان کے مذاکرات کاروں کی وفاقی وزرا کے ساتھ بات چیت بھی جاری ہے۔ فریقین کے درمیان اب تک مذاکرات کے چودہ ادوار ہو چکے ہیں لیکن ان میں کوئی نمایاں پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

وزیر خزانہ اسحاق ڈار کا کہنا ہے کہ حکومت اور پی ٹی آئی کے درمیان پانچ نکات پر اتفاق رائے ہو چکا ہے۔ صرف وزیراعظم نواز شریف کے استعفے پر اختلاف ہے اور حکومت اس پر کوئی بات نہیں کرے گی جبکہ پی ٹی آئی وزیراعظم کے استعفے پر ہی اصرار کر رہی ہے۔ اس دھرنے کا سب سے بڑا نقصان ملکی معیشت کو پہنچا ہے۔

جس سے مہنگائی، بے روزگاری، اور بے یقینی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دھرنے کے باعث اسٹیل مل جیسے ادارے کے معاملات ٹھپ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور کہا جارہا ہے کہ اس ادارے کو اب تک مجموعی طور پر دو سو باون ارب روپے کا نقصان ہوچکا ہے، جس میں نواز دور کے پینتیس ارب روپے کا نقصان بھی شامل ہے۔ دوسری جانب سیاسی افق پر چھائے کالے بادل اسٹاک مارکیٹ اور قومی معیشت پر اثر انداز ہورہے ہیں۔ تاجر، کاروباری برادری تذبذب کا شکار ہے، جس سے کاروبار پر بھی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ اسٹاک مارکیٹ جھٹکے کھا رہی ہے۔ اس ہفتے مندی غالب رہی ہے۔ مارکیٹ کو فائنل راونڈ تک ایک اور جھٹکے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ملک میں جاری سیاسی افراتفری کے سبب معیشت کو خدشات لاحق ہیں جس کا اظہار تاجر اور صنعت کار برادری کرچکی ہے، اسٹاک مارکیٹ کے سرمایہ کار بھی دھرنے اور احتجاج کی سیاست کے موڑ کو دیکھ کر فکر مند دکھائی دے رہے ہیں، سرمایہ کاروں کے اعتماد میں کمی کے سبب مارکیٹ ایک بار پھر زبردست مندی کا شکار ہوئی اور مندی کے سبب مارکیٹ میں سرمایہ کاروں کے اربوں روپے ڈوب گئے جبکہ کاروباری حجم بھی کم ترین سطح پر دیکھا گیا۔ اسلام آباد کا ڈی چوک جسے دھرنے کا مرکزی مقام قرار دیا جارہا ہے، میٹرو بس کے سلسلے میں اس کی کھدائی مزید گہری ہوتی جارہی ہے، ان یہ پروجیکٹ بھی ایک ماہ تاخیر کا شکار ہوگیا ہے۔ اسلام آباد میں آرٹیکل 245 نافذ کرکے پاک فوج کو خصوصی اختیارات سونپ دیئے گئے ہیں۔ لیکن فوج اور دیگر ادارے کوئی

کاروائی کرتے نظر نہیں آتے۔ اسٹاک مارکیٹ معیشت کا بیرومیٹر کہی جاتی ہیں، ان کی اونچ نیچ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرمایہ دار کیا سوچ رہا ہے۔ مارکیٹ کی سرگرمیاں مندی کا شکار ہیں۔ تاجروں کا کہنا ہے کہ ملک میں بڑھتی بدامنی' افراتفری' محاذ آرائی اور بے یقینی کی فضا نے کاروبار بری طرح متاثر کیا ہے۔ کاروباری سرگرمیاں ساٹھ فیصد کے قریب متاثر ہوئی ہیں اور توانائی بحران اور دیگر عوامی سے مشکلات کے شکار تیس چالیس فیصد تاجر اپنی تجارتی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکے ہیں اور معیشت بڑی تیزی سے سکڑ اور بیروزگاری بڑھ رہی ہے۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ دھرنوں کی سیاست معیشت کیلئے نہایت نقصان دہ ہے۔ سیاسی انتشار اور محاذ آرائی کی بجائے حکومت اور اپوزیشن افہام و تفہیم سے مسائل حل کریں۔ عوام اور تاجروں کا تحفظ اور معاشی سرگرمیوں کا فروغ مضبوط حکومتی عزم اور اپوزیشن کے مثبت رویے سے ہی ممکن ہے۔ پاکستان آج کل ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف عالمی اقتصادی بحران نے ہماری معاشی بنیادوں کو ہلانا شروع کر دیا ہے اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے آپ کو کسی اور بحران سے بچانے کے لئے پاکستان سمیت تمام ترقی پذیر ممالک کو دیئے جانے والے قرضوں، مراعات اور ان سے درآمد کئے جانے والے مال کی ڈیمانڈ میں کمی بڑھادی ہے، جبکہ دوسری طرف سیاسی عدم استحکام، سوات، فاٹا کے حالات اور سب سے بڑھ کر ''دھرنا'' کی سیاست نے معاشی سرگرمیوں میں رہی سہی جان بھی نکال کر رکھ دی ہے۔ کہا جارہا

ہے کہ سال رواں کے آئندہ مہینوں میں صورتحال مزید پریشان کن ہو سکتی ہے۔
پاکستان کے ساڑھے سولہ سے سترہ کروڑ عوام کی اکثریت جس میں اٹھارہ سال سے چالیس سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد 45 فیصد سے 50 فیصد کے درمیان ہے۔ ان نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تاجر اور عوام ملکی معیشت کا پہیہ چلتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن بجلی، گیس کا ٹیرف اور لوڈ شیڈنگ کی رکاوٹ اور اس پر بڑھتا ہوا سیاسی عدم استحکامعوام کو پریشان کیئے ہوئے ہے۔ معیشت کے عدم استحکام کی وجہ سے غربت کی شرح 28 فیصد سے بڑھ کر 40 فیصد کے قریب پہنچ چکی ہے یعنی ساڑھے چھ کروڑ سے زائد افراد غریبوں کی صف میں شمار ہو چکے ہیں۔ پولیس نے سیکڑوں کنٹینر پکڑ کر اسلام آباد میں کھڑے کر دیئے۔ کنٹینرز دنیا بھر میں تجارت کے لئے استعمال کیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان کا عجب استعمال کیا ہے۔ تاجروں کو ان کنٹینرز پر بھاری رقوم ادا کرنی پڑتی ہے۔ سینکڑوں کنٹینرز راستے میں رکے ہوئے ہیں۔ ٹرانسپورٹرز کے مطابق 600 کے قریب کنٹینرز پورٹ پر پڑے ہوئے ہیں جن میں نیٹو افواج کے لیے کھانے پینے کی اشیا اور دیگر ضروری سامان ہے۔ اس کے علاوہ براستہ پاکستان افغانستان کو جانے والی اشیا کی ترسیل بھی غیر یقینی صورتحال کے باعث شدید متاثر ہوئی ہے۔ اسلام آباد کی بہت سی تاجر تنظیموں اور تاجر برادری نے تحریک انصاف کے آزادی مارچ اور عوامی تحریک کے انقلاب مارچ کا کسی قیمت پر بھی حصہ نہ بننے اور مکمل طور پر الگ رہنے سمیت کاروباری مراکز کھلے رکھنے کا فیصلہ

کیاہے اور حکومت سے آزادی اور انقلاب مارچ کے دوران تجارتی مراکز کی سکیورٹی سمیت تاجر برادری کو تحفظ فراہم کرنے کی حکمت عملی اپنانے کا مطالبہ کیاہے تاکہ تاجر برادری معمول کے مطابق اپنی تجارتی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔ عمران خان کو تاجروں کی حمایت میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ اسلام آباد کے مکین طاہر القادری کے احتجاجی دھرنے کے دوران بھی شدید متاثر ہوئے تھے۔ بیشتر دکانیں، دفاتر، بازار، اسکول اور تعلیمی ادارے ایک ماہ سے بند پڑے ہیں۔ وفاقی دارالحکومت کے باسیوں اور باالخصوص ڈی چوک سے متصل رہائشی علاقوں اور ہوسٹلوں کے مکین تذبذب کا شکار ہیں۔ ملک کی معیشت کو کروڑوں روپے کا یومیہ نقصان پہنچ رہاہے۔ ایک دوسرے کی حکومتوں کو گرانے کی سیاست کا ملک کسی طرح بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ مارچ اور دھرنوں کے بارے میں پاکستان کے عوام کی اکثریت کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی۔ پاکستان کے بڑے بڑے بزنس مین اور ٹائیکون حضرات بھی پہلے سیاسی قیادت کے کردار اور پالیسیوں پر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر جھگڑے کرتے تھے۔ اب وہ کھل کر ان معاملات کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ ہماری سیاسی قیادت کو چاہئے کہ الزامات کی سیاست سے نکل کر ملکی سیاسی امور مثبت انداز میں چلانے کی فکر کریں، کیونکہ اس وقت پاکستان کی سلامتی کو لاحق خطرات میں کمی نہیں اضافہ ہو رہاہے۔ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے بداعتمادی کے ماحول سے نکل کر صرف ملک و قوم کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

بھارتی پارلیمنٹ یا مجرموں کی آماجگاہ

بھارتی لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے 30 فیصد سے زائد ارکان جرائم پیشہ ہیں، جن پر قتل، اقدام قتل، زیادتی، اغوا برائے تاوان اور انسانی سمگلنگ سمیت مختلف سنگین جرائم کے مقدمات زیر سماعت ہیں

جمہوریت کا کھیل اب دولت کا کھیل نہیں رہا۔ اب جرائم قتل و غارت گری بھی اس کھیل کا حصہ ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت میں پارلیمنٹ جرائم پیشہ ارکان اسمبلی سے بھر گئی ہے۔ جن پر ریپ، ڈکیتی، قتل، سمگلنگ، اغوا برائے تاوان سمیت مختلف کیسز ہیں اور ان کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی حالت بھی بہت پتلی ہے۔ بالیووڈ کے مسٹر پرفیکٹ عامر خان کہتے ہیں کہ بھارتی پارلیمنٹ مجرموں کی آماجگاہ بن چکی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ایک بھارتی ٹی وی چینلز پر اپنے پروگرام میں عامر خان کے یہ الزامات حیران کن تھے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے منتخب ادارے ہوں یا بھارتی پارلیمنٹ تمام جگھوں پر جرائم پیشہ افراد بیٹھے ہوئے ہیں۔ قانون ساز ادارے ان جرائم پیشہ افراد کے لئے گنگا کی طرح ہے جہاں اشنان کرکے نا صرف وہ پاک ہوجاتے ہیں بلکہ انہیں آئندہ 5 سال کے

لئے بھی کھلی چھوٹ مل جاتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ اس وقت بھارتی لوک سبھا اور راجیہ سبھاکے 30 فیصد سے زائد ارکان جرائم پیشہ ہیں، جن پر قتل، اقدام قتل، زیادتی، اغوا برائے تاوان اور انسانی سمگلنگ سمیت مختلف سنگین جرائم کے مقدمات زیر سماعت ہیں اور بدقسمتی سے ہر انتخابات میں جرائم پیشہ افراد کی شمولیت بڑھتی جارہی ہے۔ عامر خان نے عوام کو یاد بھی دلایا کہ اپنے چھوٹے سے مفاد کے لئے ووٹ جیسی طاقت کو بیچنا عوام کے اپنے لئے خطرناک ہے کیونکہ ان ہی کے ووٹ سے وہ ان پر جبر کا نظام مسلط کرتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق بھارت کے 186 ارکان پارلیمنٹ کے خلاف عدالتوں میں مقدمات زیرالتوا ہیں۔ ان میں سے 112کے خلاف سنگین نوعیت کے مقدمات درج ہیں۔ ان مقدمات میں قتل' اقدام قتل' اغوا' زنا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو سبوتاژ کرنے کے مقدمات شامل ہیں۔ انڈین ایکسپریس کی ایک اور رپورٹ میں بھارت کے انتخابات میں پیشے کے چلن کا بھی ذکر ہے، اس رپورٹ کے مطابق بھارت کی قومی اسمبلی لوک سبھا میں کروڑ پتیوں کی فراوانی ہو گئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق لوک سبھاکے اراکین کی مجموعی تعداد 541 ہے اور ان میں سے 322 کروڑ پتی ہیں۔ اس سلسلے میں پارٹی پوزیشن یہ ہے :

بی جے پی... 237 کروڑ پتی

کانگریس... 35 کروڑ پتی

آل انڈیا انا دراوڑ منیترا کازگام... 27 کروڑ پتی

تری مول کانگریس... 21 کروڑ پتی

رپورٹ کے مطابق لوک سبھا میں اوسطاً ہر رکن کے پاس 14 کروڑ 61 لاکھ روپے ہیں۔ اس طرح لوک سبھا کے تمام اراکین کے پاس موجود مجموعی رقم 6 ہزار 500 کروڑ روپے ہے۔ بھارت کی قومی زندگی کے یہ حقائق ہولناک ہیں، لیکن ان کی ہولناکی اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھارت میں 86 کروڑ افراد خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں۔ یعنی ان افراد کی یومیہ آمدنی 2 ڈالر سے کم ہے۔ بھارت کی ایک ارب 20 کروڑ آبادی کے 60 فیصد حصے کے پاس بیت الخلا نہیں ہیں۔ 21 ویں صدی میں بھارت کے 30 کروڑ افراد کے پاس بجلی کی سہولت نہیں ہے۔ بھارت کی سیاست میں بدعنوانی اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ انا ہزارے نے اس بنیاد پر ایک بڑی قومی مہم چلائی، اس مہم کی کوکھ سے عام آدمی پارٹی کے عنوان سے ایک نئی سیاسی جماعت نے جنم بھی لیا جس نے دہلی کی صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی پھر کیا ہوا انا ہزارے کو استعفی ہی دینا پڑا۔ بھارت کی سیاست پر جرائم پیشہ ذہنیت اور جرائم پیشہ افراد کا غلبہ اُس وقت اور بھی ہولناک نظر آتا ہے بھارت کی نومنتخب لوک سبھا کئی اعتبار سے مختلف اور منفرد ہے۔ پارلیمنٹ کے نومنتخب 543 ارکان میں سے 186 ارکان کے خلاف کرمنل مقدمات قائم ہیں۔ ایسوسی ایشن فار ڈیموکریٹک ریفارمز کے ایک تجزیے کے مطابق بی جے پی کے لیڈر نریندر مودی کی جانب سے انتخابات میں کئے گئے

شفافیت اور کرپشن سے نجات کے وعدوں کے باوجود انڈیا کی پارلیمان میں ایسے اراکین کی ریکارڈ تعداد ہے۔ جن پر قتل، اغوا، رہزنی اور فرقہ وارانہ یا نسلی فسادات پھیلانے جیسے سنگین جرائم کے الزامات ہیں۔ اے ڈی آر کے مطابق ایسے ارکان کی تعداد 186 ہیں جن پر کوئی نہ کوئی مقدمہ قائم ہے۔ اس کے علاوہ پی آر ایس لیجس لیٹیو ریسرچ نے تمام سیٹوں کی پروفائل اسٹڈی کے بعد فہرست جاری کی ہے جس سے نئی لوک سبھا کی پوری صورت حال سامنے آتی ہے۔ ریسرچ کے مطابق اس بار انتخابات میں کل 61 نشستیں ایسی ہیں جہاں سے خواتین امیدوار کامیاب ہوئی ہیں جو مجموعی شرح کا تقریبا 11 اعشاریہ تین فیصد ہے۔ ملک میں نوجوان ووٹروں کی بڑی تعداد کے باوجود اس بار ایسے ایم پی کی تعداد زیادہ ہے جن کی عمر 55 سال سے زیادہ ہے، ان کی مجموعی تعداد 253 ہے جو کہ پارلیمنٹ کا 47 فی صد ہیں۔ ایسے منتخب ارکان کا تناسب جو دسویں جماعت بھی پاس نہیں، تین فی صد سے بڑھ کر 13 فیصد تک پہنچ گیا ہے۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والے ممبران کی تعداد میں پہلے سے تین فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ مودی نے غریب عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اپنے بچپن کی محرومی اور سیاست کے عاجزانہ آغاز کا بھی خوب چرچا کیا۔ مودی کی شخصیت کے ہر پہلو کی طرح بچپن کی غربت کی ''گلیمرآئزیشن'' بھی عوام کو دھوکہ دینے کا بیہودہ ہتھکنڈا کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مودی کی اصل طاقت عوام کے ووٹ کی بجائے سرمایہ دار طبقے اور طاقتور جرائم پیشہ مافیا کی حمایت ہے۔ پچھلے سال نومبر میں ہی

ہندوستان کے سو بڑے سرمایہ داروں میں سے 72 نے وزیراعظم کے امیدوار کے طور پر مودی کو پسندیدہ قرار دیا تھا۔ حالیہ الیکشن ہندوستان کی تاریخ کا سب سے مہنگا الیکشن تھا جس میں BJP نے ووٹ خریدنے، جلسے کروانے اور مخالف امیدواروں کو پیسے دے کر دستبردار کروانے کے لئے اپنے سرمایہ دار ''ڈونرز'' کا پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ BJP کے انتخابی اخراجات تمام پارٹیوں سے زیادہ تھے اور الیکٹرانک میڈیا پر ریکارڈ ائیر ٹائم کے ساتھ ساتھ اخبارات میں پارٹی کے اشتہاروں کی بھرمار تھی۔ خود سرمایہ دار ہونے کے ناطے میڈیا مالکان نے ایک کرشماتی رہنما کے طور پر مودی کا تشخص ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سب سے زیادہ تشویش کا پہلو یہ ہے کہ منتخب ہونے والی لوک سبھا میں کروڑ پتی اور جرائم پیشہ افراد کی تعداد بذات خود ایک ریکارڈ ہے۔ روزنامہ ''دی ہندو'' میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق انتخابات میں کامیاب ہونے والے ''ایک تہائی سیاستدانوں پر جرائم کے الزامات یا مقدمے ہیں۔۔۔ سولہویں لوک سبھا میں جرائم کے مقدمات کا سامنا کرنے والے سیاستدانوں کی تعداد تاریخ میں سب سے زیادہ ہے۔ 2004 میں 24 اور 2009 میں 30 فیصد کے برعکس اب کی بار 34 فیصد ممبران پر مقدمات قائم ہیں۔ مجموعی طور پر جرائم پیشہ افراد کے انتخابات میں جیت نے لوگوں کو حیران کر دیا ہے۔ اسی طرح لوک سبھا کے 82 فیصد ممبران کے اثاثے ایک کروڑ سے زیادہ ہیں۔ 2004 میں یہ شرح 30 فیصد، جبکہ 2009 میں 58 فیصد تھی۔'' رپورٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار

ایسو سی ایشن فار ڈیمو کریٹک ریفارمز" نامی ادارے کی جانب سے شائع کئے گئے"
ہیں۔ہندو شاونسٹ اور بنیاد پرست سیاسی جماعت کی انتخابی فتح میں سب سے اہم کردار
مجموعی طور پر نیم رجعتی معروض اور معاشی جبر و استحصال سے نجات کا راستہ دکھانی والی
۔موضوعی سیاسی قوت کی عدم موجودگی نے ادا کیا ہے
بھارت میں ہونے والے لوک سبھا انتخابات کو تاریخ کے مہنگے ترین انتخابات قرار دیا
گیا ہے حکومت کو انتخابی عمل پر 1114 کروڑ بھارتی روپے خرچ کرنا پڑے۔
امیدواروں، سیاسی جماعتوں اور حکومت کے مجموعی اخراجات 30 ہزار کروڑ روپے بنتے
ہیں۔ بھارت میں ایک امیدوار کو 76 لاکھ روپے تک خرچ کرنے کی اجازت ہے ایک
اندازے کے مطابق 9 مرحلوں پر محیط بھارتی انتخابات پر حکومت، سیاسی جماعتوں اور
امیدواروں کی طرف سے مجموعی طور پر 30 ہزار کروڑ بھارتی روپے خرچ کئے گئے۔
افراد پر مشتمل پچھلی کابینہ کے مقابلے میں ایوانِ زیریں کے 34 فیصد اراکین پر 158
جرم کے الزامات ہیں۔ یہ تنظیم گڈ گورننس اور صاف حکومت کی وکالت کرتی ہے اور
اسی کے لئے تحقیق کرتی ہے۔ 543 اراکین پر مشتمل کابینہ کے کئی اراکین پر سنگین جرائم
کے الزامات ہیں۔ بی جے پی کے نو میں سے چار اراکین پر قتل کے مقدمات ہیں، جبکہ
سترہ میں سے دس پارلیمانی اراکین پر اقدامِ قتل کے الزامات ہیں۔نریندر مودی کے
دور میں 2002 میں گجرات میں مسلم کش فسادات کے دوران 26 ہزار کے لگ
بھگ مسلمانوں بشمول

خواتین بچوں کی شہادت کے بعد ان کے وزیراعظم بننے سے لاکھوں مسلمانوں کی نسل کشی، ہجرت اور بے سروساماں ہونے کا خطرہ ہے یہ سانحہ گجرات سے بھی بڑا المیہ ہو سکتا ہے۔ بی جے پی مسلم دشمنی اور مسلم نسل کشی کے باعث پوری دنیا میں بدنام ہے۔اس بار بھارت کی 16 ویں منتخب پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد تاریخ میں سب سے کم ہے اور حالیہ انتخابات میں 543 نشستوں میں سے صرف 20 مسلمان کامیابی حاصل کر پائے۔ ریاست اترپردیش کی 80 نشستوں میں سے کوئی بھی مسلمان امیدوار کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ مغربی بنگال سے کانگریس کے ٹکٹ پر 2، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکے 2 اور ترینامول کانگریس کے 3 ، جبکہ ریاست بہار سے راشٹریہ جنتا دل، نیشنلسٹ کانگریس پارٹی، لوک جنشکتی پارٹی اور کانگریس کے ایک، ایک مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے۔ اسی طرح مقبوضہ جموں کشمیر سے پیپلز ڈیمو کریٹک پارٹی کے ٹکٹ پر 3، آسام سے آل انڈیا یونائٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ کے 2، لکشدویپ سے نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کے ایک ، ریاست تامل ناڈو کے شہر رماناتھاپورم سے "اے آئی اے ڈی ایم کے" کے ایک اور حیدرآباد دکن سے مجلس اتحاد المسلمین کے رہنما لوک سبھا میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے، تاہم 30 سال بعد ایوان میں تنہا حکومت بنانے والی بھارتیہ جنتا پارٹی کے 282 کامیاب امیدواروں میں سے کوئی ایک بھی مسلمان نہیں جس سے انتہا پسند جماعت کی مسلمانوں سے نفرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ساری دنیا میں بھارت کی بڑی دھوم ہے کہ یہ سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ بھارت کی تعریف کرنے

والے یہ راگ بھی الاپتے سنائی دیتے ہیں کہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے سب سے بڑے ملک، بھارت، میں کبھی فوجی حکومت نہیں آئی۔ لیکن ''دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت'' کا باطن کس قدر تاریک ہے اور اس کی پارلیمنٹ کے درجنوں ارکان کتنے بدعنوان ہیں، اس کا بھانڈا بھارت ہی کے اخبارات نے پھوڑدیا ہے۔ نریندر مودی وزیراعظم بن چکے ہیں لیکن ان کی تشدد پسند اور مسلمان دشمن پارٹی، بی جے پی، کے منتخب درجنوں ارکانِ اسمبلی جرائم پیشہ بھی ہیں، اس کا انکشاف بھی بھارتی میڈیا اور بھارت کی طاقتور این جی اوز کررہی ہیں۔ بھارت کی دو غیر سرکاری تنظیموں نے موجودہ بھارتی لوک سبھا یعنی بھارت کی قومی اسمبلی کے 53 منتخب سیاستدانوں کی فہرست شایع کی ہے جو نہایت سنگین جرائم میں ملوث رہے ہیں اور ان کے خلاف کئی اعلیٰ بھارتی عدالتوں میں اب بھی مقدمات زیرِ سماعت ہیں۔ بھارت کے نامور قانون دان اور دانشور جناب اے جی نورانی نے بھی اپنے ایک حالیہ انگریزی آرٹیکل میں انکشاف کیا ہے کہ ان 53 سیاستدانوں میں 24 ایسے ارکانِ اسمبلی ہیں جو ''بھارتیہ جنتا پارٹی'' کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے ہیں اور کریمنل کورٹس میں ان کے خلاف سنگین جرائم کے تحت مقدمات چل رہے ہیں۔ اگر فیصلہ ان کے خلاف آتا بھی ہے تو انھی ملزم ارکانِ اسمبلی کو اطمینان ہے کہ انھیں پانچ سال تک تو کوئی بھی عدالت ڈِس کوالیفائی نہیں کرسکے گی کیونکہ بھارتی قوانین کے تحت عدالتوں میں کسی بھی مقدمے کو دس سال تک آسانی کے ساتھ کھینچا جاسکتا ہے۔

گویا بھارتی جمہوریت کو داغدار کرنے میں کرپٹ بھارتی سیاستدان اور عدالتیں یکساں کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس سے قبل 19 مئی 2014 کو ممتاز بھارتی اخبار ''انڈین ایکسپریس'' نے بھی انکشاف کیا تھا کہ جو بھارتی سیاستدان منتخب ہو کر لوک سبھا میں بیٹھنے جا رہے ہیں، ان میں ایک سو بارہ افراد ایسے ہیں جن کے خلاف مختلف بھارتی عدالتوں میں نہایت سخت الزامات کے تحت مقدمات زیر سماعت ہیں۔ ان مقدمات میں قتل، اقدامِ قتل، اغواکاری، عورتوں کی عصمت دری اور فرقہ وارانہ فسادات کروانے ایسے سنگین الزامات شامل ہیں۔

بھارتی اخبارات ہی کی شایع شدہ رپورٹوں کی بنیاد پر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اگر بھارت دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے تو پھر حقائق کی بنیاد پر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ بھارتی پارلیمنٹ دنیا کی سب سے بڑی بدعنوان اور داغدار پارلیمان ہے۔ بھارت ہی کے ایک نامور جریدے ''انڈیا ٹوڈے'' نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ دولتمند اور سرمایہ دار بھارتی سیاستدان اپنے ملک کے موثر اخبار نویسوں اور اینکر پرسنوں کو رشوت دے کر اپنے سیاسی مخالفین کو بدنام اور ذلیل کرنے کی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ بھارت کی مبینہ کرپٹ پارلیمان اور منتخب بدعنوان ارکانِ پارلیمنٹ کے خلاف بھارت ہی کے ایک سابق چیف جسٹس، محمد ہدایت اللہ، کئی برس قبل کہہ چکے ہیں کہ اب تیزی سے بدلتے حالات میں کرپٹ سیاستدانوں کو لوک سبھا میں آنے سے روکنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔

وزیراعظم نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی کے کئی بدنامِ زمانہ ارکان جس طرح بھاری اکثریت سے جیت کر لوک سبھا کے رکن بنے ہیں، تقریباً چار عشرے قبل جسٹس ہدایت اللہ کے کہے گئے یہ الفاظ آج پوری صحت کے ساتھ بھارتی پارلیمنٹ پر منطبق ہورہے ہیں۔ بھارت ہی کے ایک نامور بیوروکریٹ بی کے نہرو نے 1981 میں کہا تھا کہ آیندہ ایام میں بھارت کے دولتمند اور کرپٹ افراد ہی منتخب ہوکر رکنِ پارلیمنٹ بنا کریں گے۔ انھوں نے ایک بھارتی صوبے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں تو تیس فیصد سے زائد ارکان اسمبلی قاتلوں اور اغواکاروں میں شامل ہیں۔ بھارت کے سابق چیف جسٹس جناب ہدایت اللہ نے برسوں قبل بھارتی سیاستدانوں کے بارے میں جو پیشگوئی کی تھی، وہ اپریل/مئی 2014 کے عام بھارتی انتخابات کے نتائج کی روشنی میں بالکل سچ ثابت ہوئی ہے۔ گزشتہ دنوں بھارتی اخبار ''انڈین ایکسپریس'' نے دل دہلا دینے والی ایک اور رپورٹ شایع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موجودہ بھارتی پارلیمنٹ، جہاں بی جے پی کو اکثریت حاصل ہے، کے ارکان میں جس سیاستدان کے پاس کم سے کم سرمایہ ہے، اس کی مالیت بھی پندرہ کروڑ ہے۔ ان کروڑ پتی بھارتی سیاستدانوں میں بی جے پی کے 237، کانگریس کے 35، تامل ناڈو کی آئی اے ڈی ایم پارٹی کے 29اور مغربی بنگال کے ترنمول کانگریس پارٹی کے اکیس ارکان شامل ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بھارت کا نہ صرف نہایت دولتمند طبقہ پہلی بار خود رکنِ پارلیمنٹ بنا ہے بلکہ بھارت کے ارب پتی تاجروں نے دانستہ اپنے

چندے کی طاقت سے نریندر مودی اور بی جے پی کو جتوایا ہے تاکہ بھارت میں سرمایہ دار طبقات کے مفادات کو نہ صرف تحفظ دیا جائے بلکہ انھی کی پسندیدہ پالیسیاں بنائی جائیں۔یہی وہ طبقہ ہے جو صوبہ گجرات میں مسلسل پندرہ برس نریندر مودی کی طاقت کا نہ صرف محور تھا بلکہ اسی طبقے نے نریندر مودی کو ایک کامیاب وزیراعلیٰ بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اسی دولتمند اور کرپٹ طبقے کی پشت پناہی سے دنیا بھر میں نریندر مودی کی نام نہاد کامیاب معاشی پالیسیوں کی گونج سنائی دیتے رہی۔ یہاں تک کہ اسے ایک ''دیوتا'' بنا کر پیش کیا گیا کہ اب وہی پورے بھارت کو بنا اور سنوار سکتا ہے؛ چنانچہ اسی طاقتور لہر پر سوار ہو کر چائے فروش کا بیٹا، نریندر مودی، بھارت کا وزیراعظم بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ بھارت کے اس بدعنوان اور کرپٹ منتخب طبقے کی موجودگی میں بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاسکتا ہے؟ بھارتی جمہوریت کے فریم آف ورک میں رہتے ہوئے ایک طرف ایک غریب اور تہی دامن چائے فروش کا بیٹا ملک کا چیف ایگزیکٹو بن گیا لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ بھارت کے اکثریتی طبقے میں احساسِ محرومی مزید پھیل رہا ہے اور دلی سے ناراضیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ یہ احساس بڑھ اور پھیل کر بھارت کی یک جہتی میں دراڑیں ڈالنے کا موجب بھی بنے گا۔ نریندر مودی اور ان کے ارب پتی مگر بدعنوان اور جرائم پیشہ ساتھی کب تک لوک سبھا میں رہ کر بھارت کو اکٹھا رکھنے میں کامیاب رہ سکیں گے۔ بھارتی پارلیمنٹ کے یہ داغدار ممبر ہی بھارت اکائی کو بکھیرنے میں عمل

انگیز کا کام کریں گے۔ بھارت کی شمالی ریاستوں میں یہ عمل تو شروع بھی ہو چکا ہے، پارلیمنٹ میں اس اکثریت کی یہی جرائم پیشہ ذہنیت ہے جس نے بھارت کے فلم سازوں سے درجنوں پاکستان مخالف فلمیں بنوائی ہیں، اور یہی ذہنیت ہے جس نے نریندر مودی جیسے شخص کو ملک کا وزیراعظم بنوایا ہے۔ بھارت کی سیاست پر جرائم پیشہ افراد کے غلبے کا ایک زاویہ یہ ہے کہ بھارت کے عوام کیا خواص کو بھی بھارتی سیاست کے جرائم پیشہ افراد کے نرغے میں چلے جانے پر کوئی خاص تشویش نہیں ہے۔ بلکہ بھارت کے عوام ہی جرائم پیشہ افراد کو منتخب کرکے منتخب ایوانوں میں بھیج رہے ہیں۔ بلاشبہ اناہزارے کی تحریک اس رجحان کے خلاف ایک احتجاج تھا، مگر اس احتجاج کا رخ صرف مالی بدعنوانی کی طرف تھا۔ اس صورت حال کا مفہوم واضح ہے۔ پاکستان ہو یا امریکہ' فرانس ہو یا بھارت... سیاست کو اخلاقیات اور علم کے تابع کیے بغیر سیاست میں خرابیوں کا راستہ نہیں روکا جاسکتا۔

فصلوں کی انشورنس کے نام پر کب تک جھوٹ بولا جائے گا۔؟

پاکستان میں ایک بار پھر عوام سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھ رہے ہیں۔ سیلابی بند ٹوٹ رہے ہیں۔ کہیں شہروں اور دیہات کو بچانے کے لئے حفاظتی بندوں میں شگاف ڈالے جا رہے ہیں۔ سیلاب سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی ہے۔ پنجاب میں چار لاکھ ایکڑ رقبے پر موجود فصلیں تباہ ہوئی ہیں۔ سیلابی ریلا پنجاب سے نکل کر سندھ میں آنے والا ہے۔ سیلاب سے اب تک پنجاب کے دس اضلاع متاثر ہوئے جن میں سے جھنگ، چنیوٹ اور حافظ آباد میں سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ نہ قدرتی آفات سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس فعال ادارے ہیں ۔ اور نہ ہی نقصانات کا اندازہ کرنے کے لئے کوئی مکینیزم ہے۔ چاہے بے نظیر بھٹو قتل کیس کی تفتیش ہو یا سیلاب کی تباہ کاری کا اندازہ کرنے کے لئے اعداد و شمار، ہم ہر کام کے لئے اقوام متحدہ سے رجوع کرتے ہیں۔ اس بار بھی وفاقی حکومت نے ملک بھر میں بارشوں اور سیلاب کے سبب ہونے والے جانی و مالی نقصانات کا تخمینہ لگانے کیلئے اقوام متحدہ سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پنجاب اور آزاد جموں و کشمیر کے ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹیز سے کہا گیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے وسیع تر تجربے سے استفادہ کرنے کیلئے اس کے متعلقہ حکام کے ساتھ مل کر تخمینہ

لگائیں تاکہ حکومت متاثرین کی بحالی کا کام شروع کر سکے۔ حالیہ بارشوں اور سیلاب کے سبب ہونے والی حقیقی تباہ کاریوں کا تخمینہ تو پانی اترنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ لیکن ہمارے یہاں جانی و مالی نقصانات کے بارے میں حقیقت پسندانہ اعداد و شمار پیش کرنے کی نہ تو روایت ہے نہ اس کی کوئی مساعی۔ ہر سال مون سون کا موسم شروع ہوتے ہی ملک کے کئی دیہاتی اور زیریں علاقوں میں خوف کی ایک فضا قائم ہو جاتی ہے۔ بارشیں چاہے پاکستان میں ہوں یا بھارت میں۔ سیلاب کا خدشہ ہر وقت ہمارے پورے زراعتی نظام اور انفرااسٹرکچر پر تباہی بن کر نازل ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے کمزور ریاستی ڈھانچے اور ادارے اس کے خلاف کوئی موثر ڈھال بننے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان کے قیام سے اب تک ہمیں 20 بڑے سیلابوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جن میں سے پچھلے چار سال میں سے تین سیلاب ہماری کمزور معیشت کو تباہ کر چکے ہیں۔ ان میں 2010، 2011 اور 2012 کے سیلاب شامل ہیں اور اس وقت 2014 کا سیلاب سے ہمیں ایک بدترین صورتحال کا سامنا ہے۔ ایک اندازے کیمطابق 2010 سے اب تک سیلاب کی تباہ کاریوں میں 3 ہزار سے زائد جانوں کا نقصان ہوا جب کہ مالی نقصانات کا تخمینہ 16 ارب ڈالرز تک لگایا گیاہےجب کہ پچھلے دو سے تین دہائیوں کا ریکارڈ دیکھا جائے تو جانی نقصان کا اندازہ تقریباً 11 ہزار جانوں سے زائد ہے جب کہ ملک کی معیشت پر اربوں روپے کا بوجھ پڑ چکا ہے۔

کو ان (GDP) اقوام متحدہ کے اداروں کے اعداد و شمار کیمطابق ہماری قومی پیداوار بارشوں اور سیلابوں کی تباہ کاریوں سے جو نقصان ہو رہا ہے وہ ہماری فی کس آمدنی کی سے بھی زیادہ ہے۔ جو کہ تمام ایشیائی ممالک میں ہونے والا سب (Growth) نشوونما سے بڑا نقصان ہے ایک اندازے کے مطابق ان نقصانات کا تخمینہ ہماری قومی پیداوار کے 2 فیصد کے قریب ہے۔ 2005 کے زلزلے کے بعد نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کا قیام وجود میں آیا تھا۔ لیکن یہ ادارہ بھی ایک ناکامی کی داستان بن کر رہ (NDMA) گیا ہے۔ تحریک انصاف کے دھرنوں میں حکومتی اعداد و شمار کو چیلنج کیا گیا تھا۔ وزیر خزانہ اسحاق ڈار مالیاتی بجٹ 15-2014 کے بارے میں پاکستان تحریک انصاف کے وائٹ پیپر کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہیں ۔ ان کا دعوی ہے کہ اس سال کے بجٹ میں صنعتی اور کاروباری سرگرمیوں کے علاوہ زرعی شعبے کے فروغ کے لئے اقدامات بھی شامل ہیں جب کہ کاشت کاروں میں قرضوں کی تقسیم اور انہیں زرعی مصنوعات میں اعانت دینے کے لئے بجٹ میں 5 سو ارب روپے مختص کئے گئے۔ اسحاق ڈار نے کا کہنا ہے کہ لائیو اسٹاک اور فصلوں کی انشورنس اسکیمیں زرعی شعبے کی ترقی کے لئے بڑے اقدامات کئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق فصلوں کی انشورنس اور لائیو اسٹاک کی انشورنس کی اسکیم بھی شروع کی جارہی ہے۔ فصلوں اور زرعی انشورنس کا ہم گذشتہ بیں برس سے ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ دس سال پہلے پرویز الیہ نے بھی ملک میں پہلی بار فصلوں کی انشورنس کا اعلان کیا تھا۔ بینک آف پنجاب کی ایک

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سابق وزیرِ اعلی پرویز الہی نے اس انشورنس اسکیم کے خدوخال کی وضاحت تو نہیں کی تھی۔ تاہم انھوں نے کہا تھا کہ اس انشورنس نظام کی وجہ سے خشک سالی، بارش، سیلاب، طوفان اور ٹڈی دل کے حملوں جیسی آفات کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کے نتیجہ میں کسان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرویز الہی نے پنجاب بنک کو ہی تباہ کرڈالا۔ ان کا خاندان اربوں روپے کے مالی اسکینڈل میں ملوث ہوا۔ گذشتہ سال ایک بار پھر اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے لائیو اسٹاک انشورنس اسکیم متعارف کرانے کا اعلان کیا۔ اسٹیٹ بینک، ایس ای سی پی، کمرشل بینکس، انشورنس کمپنیوں اور تمام صوبائی لائیو اسٹاک اور ڈیری محکموں کے تعاون سے متعارف کرائی جانے والی اس انشورنس اسکیم کا مقصد لائیو اسٹاک اور ڈیری کے شعبوں کو قرض کی فراہمی میں اضافے اور قدرتی آفات، حادثات و بیماریوں کے نتیجے میں مویشیوں کی ہلاکت کے باعث لائیو اسٹاک شعبے میں قرض لینے والے افراد کے رسک میں حتی الامکان کمی کرنا بتایا گیا تھا۔ ملک میں لائیو اسٹاک کا شعبہ ملکی زراعت کی مجموعی قومی پیداوار میں 55 فیصد جبکہ مجموعی قومی پیداوار میں 11.4 فیصد شراکت داری کا حامل ہے۔ تاہم ان سب عوامل کے باوجود ملک میں بینکوں کی جانب سے 13-2012 کے دوران لائیو اسٹاک اور ڈیری کے شعبوں کو فراہم کیے جانے والے قرضے کا حجم محض 56 ارب روپے ہے جو فراہم کیے جانے والے مجموعی زرعی قرضوں 336 ارب روپے کا محض 17 فیصد بنتا ہے۔ اسٹیٹ بینک کے مطابق لائیو اسٹاک

اور ڈیری کے شعبے میں قرضوں کے حصول میں عدم دلچسپی کی بڑی وجہ ان شعبوں میں رسک کی زیادتی بتائی جاتی ہے۔لائیو اسٹاک اور ڈیری کے شعبے میں قرض حاصل کرنے کیخواہش مند قدرتی آفات، حادثات اور مختلف موسمی بیماریوں کے باعث مویشیوں کی ہلاکت کے تحفظات کا شکار رہتے ہیں اور یہی خوف انہیں لائیو اسٹاک اور ڈیری سیکٹر میں قرضوں کے حصول سے روکتا ہے۔ اسٹیٹ بینک کی اسکیم کے مطابق لائیو اسٹاک انشورنس اسکیم کے تحت مویشیوں کی خریداری کیلئے 50 لاکھ تک کے لون پر بینک قرض حاصل کرنے والے فرد کے مویشیوں کو انشورنس فراہم کرینگے اور مویشیوں کی بیماری، سیلاب، طوفان، حادثات اور دیگر قدرتی آفات کے نتیجے میں ہلاکت پر قرض دار کے مفادات کا خیال رکھتے ہوئے مکمل رسک انشورنس فراہم کی جائیگی۔ اسٹیٹ بینک نے تمام کمرشل بینکوں کو فوری طور پر لائیو اسٹاک انشورنس اسکیم پر عملدرآمد شروع کرنے کے احکامات جاری کرتے ہوئے حکومت پاکستان سے اس اسکیم کے تحت چھوٹے فارمرز کے پریمئیم کی ادائیگی بجٹ سپورٹ فنڈ سے کرنے کی درخواست بھی کی تھی۔ لیکن اب تک اس پر عمل نہ ہوسکا۔ہمارے ملک میں زرعی شعبے کی معاشی شرح نمو زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہی۔ زرعی شعبے کے ترقی نہ کرنے کی وجہ سے ملکی سطح پر اشیائے خوردنی کی قلّت پیدا ہونے سے مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔ ملک کی تقریباً 65 فیصد آبادی دیہی علاقوں میں آباد ہے جس کی اکثریت زرعی شعبے سے وابستہ ہے۔ زرعی شعبے کا ملکی جی ڈی پی میں حصہ تقریباً 23 فیصد ہے اور زراعت کے ترقی نہ کرنے کی

وجہ سے جہاں ایک طرف ملکی معیشت متاثر ہوتی ہے تو دوسری طرف اس شعبے سے وابستہ غریب دیہی آبادی کے معیار زندگی میں کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ پاکستان کی آبادی میں سالانہ دو اعشاریہ پانچ فیصد کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے اور ماہرین کے مطابق آئندہ 40 سالوں میں پاکستان کی آبادی دگنی ہو جائے گی جبکہ کھانے پینے کی اشیا کی مہنگائی نے ہماری موجودہ آبادی کے بڑے حصے کی قوت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی خوراک کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ہمیں اپنی زرعی فی ایکڑ پیداواریت بڑھانا ضروری ہے تاکہ عوام کو سستے داموں اشیائے خوردنی مہیا کی جا سکیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ابھی تک فصلوں کی انشورنس کے حوالے سے کوئی موثر اسکیم نہیں ہے۔ موسمی تغیرات سے فصلیں متاثر ہوتی ہیں۔ ہمارے زیادہ تر کسان موسمی تغیرات کا پیشگی علم نہ رکھنے کی وجہ سے اکثر اپنی فصلوں اور لائیو اسٹاک کو شدید موسمی تغیرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ مارکیٹ کا فرسودہ میکنزم بھی کسانوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ کسان اپنی زرعی پیداوار کو طویل عرصے کے لئے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے غلے کے ضائع ہونے کے اندیشے اور فصل کی دوبارہ بوائی کے اخراجات کیلئے انہیں مجبوراً اپنا غلہ جلد از جلد فروخت کرنا پڑتا ہے۔ سڑکوں کے ناقص نیٹ ورک اور ٹرانسپورٹ کے زیادہ کرایوں کی وجہ سے کسانوں کو اپنی فصلوں اور غلے کو مارکیٹ تک پہنچانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے جس کی وجہ سے کسان اپنی فصلوں کو مارکیٹ اور صنعتوں تک پہنچانے کے بجائے

آڑھتیوں کو کھیتوں میں ہی سستے داموں فروخت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ فصل کے آنے کے بعد مارکیٹ کے کھلاڑی طلب اور رسد کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے کسانوں سے نہایت کم قیمتوں پر غلہ خرید کر اسے ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ دو سے تین ماہ غلے کی ذخیرہ اندوزی کے بعد یہی ذخیرہ اندوز ان اجناس کو مہنگے داموں مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں جس سے ملک میں مہنگائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ 2010 میں سیلاب کی وجہ سے ہماری فصلوں کی پیداوار خراب رہی اور صرف کاٹن کی فصل میں 20 لاکھ گانٹھوں کا نقصان ہوا۔ اس بار پھر کہا جا رہا ہے کہ فصلوں کی انشورنس اسکیم شروع کی جا رہی ہے۔ جس سے کاشتکاروں کے نقصان کا ازالہ کیا جاسکے گا۔ نیشنل انشورنس کمپنی آف پاکستان کے ذرائع کا کہنا ہے کہ فصلوں کی انشورنس اسکیم سے کاشتکار و کسان بلاامتیاز استفادہ کر سکیں گے۔ لیکن اس اسکیم پر اب تک کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی خبر اخبارات کی زینت بنی ہے کہ حکومت پنجاب نے رواں مالی سال کے بجٹ میں زراعت کے مختلف ترقیاتی منصوبوں کیلئے 7 ارب 96 کروڑ روپے سے زائد مختص کئے ہیں تاکہ کاشتکاروں کو زرعی آلات، زرعی قرضوں اور فصلوں کی انشورنس پر سبسڈی فراہم کی جاسکے۔ وفاقی حکومت نے بھی پارلیمنٹ میں بجٹ پیش کرتے وقت اعلان کیا تھا کہ فصلوں کو قدرتی آفات، موسمی تبدیلیوں، بیماریوں اور تباہی سے بچانے کیلئے انشورنس اسکیم کا دائرہ وسیع کیا جائے گا اور اسکیم کے تحت 25 ایکڑ رکھنے والے کسانوں کو قرضے دیئے جائیں گے۔ اسکیم کے تحت 7 لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہنچے

گا اور منصوبے کیلئے 2 ارب 50 کروڑ روپے مختص کیئے گئے ہیں۔ لیکن افسوناک بات یہ ہے کہ بجٹ دستاویزنر میں نئے مالی سال اس اسکیم کیلئے کوئی فنڈز نہیں رکھے گئے۔ وزیر خزانہ اس بات کا کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ نئے مالی سال میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کا بجٹ بڑھا کر 118 ارب روپے کر دیا گیا ہے۔ لیکن بجٹ دستاویزنر میں بی آئی ایس پی کیلئے نئے بجٹ میں 97 ارب 15 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جبکہ باقی 21 ارب روپے وزیراعظم کی خصوصی اسکیموں پر خرچ کیئے جائیں گے۔ جو رواں مالی سال کے 25 ارب روپے کے مقابلے میں 4 ارب روپے کم ہے۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ وفاقی حکومت نے پاکستان بیت المال کو بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام میں ضم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ 2014-15 کے بجٹ میں پاکستان بیت المال کیلئے کسی قسم کے ترقیاتی فنڈز مختص نہیں کئے گئے بلکہ غیر ترقیاتی فنڈز کے نام پر ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں و دیگر اخراجات کیلئے دو ارب روپے مختص کئے گئے ہیں۔ وزیر خزانہ نے اس حوالے سے ٹاسک فورس تشکیل دیدی ہے۔ بجٹ میں اعلان کردہ اقدامات اور بجٹ دستاویزات میں تضادات سامنے آ گئے۔ فصلوں کی انشورنس اور چھوٹے قرضوں کیلئے بجٹ میں کوئی رقم مختص نہیں کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کب تک عوامکو دھوکہ دیتی رہے گی۔ امریکہ جیسے ملک میں حکومت کسانوں اور زراعت پیشہ افراد کو انشورنس کے سلسلے میں سبسیڈی سے مدد دیتی ہے۔ لیکن ہم نے اس اہم شعبے کو ایک طرح نظرانداز کر دیا ہے۔ ایک بار پھر پورا ملک سیلاب کی لپیٹ میں ہے، اور ہم

انشورنس کے منصوبوں سے کوئی فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔

پاکستان میں تقریباً 4 کروڑ افراد کو غذائی قلّت کا سامنا ہے

صوبہ سندھ میں 21 سے 23 فی صد آبادی خوراک کی قلّت کا شکار ہے۔ تھر میں غذائی قلّت سے ایک بڑا انسانی المیہ جنم لے چکا ہے۔ سینکڑوں بچوں کی ہلاکت کے باوجود حکومت نے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا
سیلاب کی تباہ کاریوں کے بارے میں وفاقی کابینہ کے اجلاس کے دوران.بریفنگ دیتے ہوئے این ڈی ایم اے کے چیئرمین نے بتایا کہ شدید بارشوں کے باعث سیلاب کے نتیجے میں 274 افراد جاں بحق اور 11 لاکھ متاثر ہوئے۔ وزیراعظم نواز شریف کی زیر صدارت ایک طویل عرصے کے بعد وفاقی کابینہ کا اجلاس ہوا۔ جس میں جانی مالی نقصانات کے جائزے سے زیادہ سیاسی معاملات پر بحث ہوئی۔ ابتدائی تخمینے کے مطابق سیلاب کے باعث پنجاب کے 10 اضلاع.بری طرح متاثر ہوئے،جب کہ جھنگ، چنیوٹ اور حافظ آباد میں سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ سیلابی ریلوں کے باعث 3 ہزار دیہات متاثر ہوئے اور 45 ہزار گھروں کو نقصان پہنچا۔ لیکن یہ سب ابتدائی تخمینے ہیں اصل صورتحال تو بہت بعد میں سامنے آئے گی۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے ساتھ ہی ملک میں غذائی خوراک میں کمی کے مسائل بھی جنم لے رہے ہیں۔ جس کے اثرات غربت کے مارے عوام پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی خوراک

اور زراعت کی عالمی تنظیم نے دنیا بھر میں غذائی عدم تحفظ کے حوالے سے اپنی سالانہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ ” 1990 سے پاکستان میں غذائی قلت میں مسلسل اضافہ ہی ہو رہا ہے، یوں تو دنیا میں ہر 9 میں سے ایک شخص کو خوراک کی کمی کا سامنا ہے، لیکن پاکستان میں تقریباً 4 کروڑ افراد کو غذائی قلت کا سامنا ہے۔ سنگین صورت حال کے باعث پاکستان اقوام متحدہ کے وضع کردہ ترقی کے اہداف میں سے ایک، بھوک میں کمی کو پورا نہیں کر پا رہا ہے۔ پاکستان میں 2012 سے 2014 تک کے اعداد و شمار کے مطابق 3 کروڑ 96 لاکھ افراد کو غذائی قلت کا سامنا رہا، پاکستان میں غذائی ضروریات کو بہتر بنانے کے لئے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی نہ ہی اس کے لئے کوئی منصوبہ بندی کی گئی۔ بلکہ اس میں مزید بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، اس سنگین صورت حال کے باعث پاکستان ملینیم ڈویلپمنٹ گولز، یعنی اقوام متحدہ کے وضع کردہ ترقی کے اہداف میں سے ایک بھوک میں کمی کو پورا نہیں کر سکے گا۔ اس وقت توانائی کے بحران اور اجناس کی قیمتوں میں اضافے کے باعث پاکستانی عوام تین سال پہلے کے مقابلے میں گندم کی دو گنی قیمتیں ادا کر رہے ہیں اور غربا کے لئے غذائی سلامتی کی صورت حال دشوار ہے۔ جنیوا میں انسانی امداد سے متعلق اجلاسوں کے موقع پر عالمی ادارہ خوراک کے ملکی ڈائریکٹر برائے پاکستان وولف گینگ ہربنگر نے بھی اس کی تصدیق کی کہ پاکستان میں غریب عوام کے لئے خوراک کی قیمتیں حد سے زیادہ ہیں جس سے خوراک کی قلت کی سطح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی ادارہ خوراک کے مطابق، صوبہ سندھ میں 21

سے 23 فی صد آبادی خوراک کی قلت کا شکار ہے۔ ہر بنگر نے کہا کہ 15 فی صد آبادی کے متاثر ہونے کو ہنگامی صورت حال قرار دیا جاتا ہے۔ اس تباہ کن صورتحال کے باوجود سندھ میں حکومت کے کان پر کوئی جوں رینگتی نظر نہیں آتی۔ لوگ گندم کے بڑھتے نرخ اور آٹے کی قیمت میں اضافے سے پریشان ہیں۔ روٹی کی قیمت میں اضافہ اور اس کے سائز اور وزن میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں غریب طبقہ کے لوگ دودھ، گوشت اور پھل خریدنے کے متحمل نہیں، غذا کا بڑا حصہ گندم کے آٹے ہی سے پورا کرتے ہیں۔ گویا غریب طبقہ کو اپنی غذا کی واحد شے بھی پوری مقدار میں میسر نہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وطن عزیز میں اشیائے ضروریہ اور اشیائے خورونوش کی قیمتیں اس حدتک بڑھ چکی ہیں کہ عام صارف انہیں صرف دیکھ سکتا ہے، خرید نہیں سکتا۔ اشیائے ضروریہ اور اشیائے خورونوش کی قیمتوں میں بے قابو اضافے کی بنیادی وجہ بلدیاتی سطح پر حکومتوں کا نہ ہونا۔ اور ذمہ داران کا تساہل ہے۔ جس سے گرانفروشوں، ذخیرہ اندوزوں اور ناجائز منافع خوروں کی چاندی ہے۔ قیمتوں پرچیک نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز منافع خور جب چاہتے ہیں اُن کے نرخ بڑھا دیتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔جب اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں بلا روک ٹوک اضافہ ہوتا ہے تو عام شہریوں کی قوت خرید دم توڑ دیتی ہے۔ نتیجتاً غریب اور محروم طبقات سے تعلق رکھنے والے شہری غذائی قلت کا شکار ہو کر بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان میں لاکھوں ایکڑ قابل کاشت زرعی

اراضی بیکار پڑی ہے اور اسے کسی مصرف میں نہیں لایا جا رہا۔ سندھ میں زمین کا سب سے زیادہ حصہ استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے صحرائی علاقے تھر اور دیگر علاقوں میں میں چرند اور پرند کے بعد اب انسانوں پر بھی غذائی قلت کے اثرات سامنے آ رہے ہیں۔ تھر میں غذائی قلت سے ایک بڑا انسانی المیہ جنم لے چکا ہے۔ غذائی قلت کا سب سے پہلا شکار بچے بنتے ہیں ۔ صحرائے تھر میں بھوک اور غذائی قلت سے سینکڑوں بچے ہلاک ہو چکے ہیں۔ عالمی اداروں کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے 65 فیصد بھوک میں مبتلا افراد کا تعلق بھارت، چین، کانگو، بنگلہ دیش، ایتھوپیا، انڈونیشیا اور پاکستان سے ہے۔ مناسب خوراک کی عدم فراہمی اور ناقص غذا کھانے کی وجہ سے ان ممالک کے بچے عالمی معیار سے کم وزن رکھتے ہیں۔ پاکستان جہاں بظاہر غذائی قلت کے کوئی اسباب نہیں ہیں۔ یہ سوال کیا جاتا ہے کہ دنیا کا وہ ملک غذائی بحران کا کیوں شکار ہے، جو گندم کی پیداوار میں ایشیا کا تیسرا بڑا، گنا پیدا کرنے والا چوتھا بڑا، کپاس پیدا کرنے والا پانچواں بڑا ملک ہے اور دودھ پیدا کرنے والے ممالک میں بھی اس کا شمار چوتھے بڑے ملک میں ہوتا ہے۔ پھل، سبزیاں، بڑا گوشت، چھوٹا گوشت اور انڈوں کی پیداوار میں بھی پاکستان کا نمایاں مقام ہے۔ اجناس خوردنی کی پیداوار میں خود کفالت کے باوجود شہریوں کو یہ اجناس مہنگے داموں کیوں خریدنا پڑتی ہیں۔ قومی غذائی سروے میں بھی یہ بتایا گیا کہ پاکستان کا شمار دنیا کے ان تین ممالک میں ہوتا ہے جہاں 2011 عورتوں اور بچوں پر مشتمل

آبادی کا نصف حصہ غذائی کمی کا شکار ہے۔
اس سروے کے مطابق پاکستان میں صرف تین فیصد بچوں کو وہ خوراک میسر ہے جو صحتمند غذا کے کم سے کم معیار پر پورا اترتی ہے۔ 51 فیصد حاملہ جبکہ 50 فیصد غیر حاملہ خواتین خون کی کمی کا شکار ہیں جبکہ بالغ آبادی کا تقریبا 54 فیصد کا وزن نارمل نہیں ہے51 فیصد حاملہ جبکہ 50 فیصد غیر حاملہ خواتین خون کی کمی کا شکار ہیں جبکہ بالغ آبادی کا تقریبا؟ 54 فیصد کا وزن نارمل نہیں ہے۔اس رپورٹ کے مطابق 51 فیصد حاملہ جبکہ 50 فیصد غیر حاملہ خواتین خون کی کمی کا شکار ہیں جبکہ بالغ آبادی کا تقریبا؟ فیصد کا وزن نارمل نہیں ہے۔ قومی غذائی سروے کے مطابق ملک میں غذائی کمی کی 54 بڑی وجوہات میں غربت ،ماؤں میں ناخواندگی کی شرح اور غذائی عدم تحفظ شامل ہے۔دودھ جو بچوں کی غذا کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اس کی قیمتیں عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو گئی ہے۔ماہرین اس بارے میں کہتے ہیں کہ پاکستان میں صرف غربت، مہنگائی اور خوراک کی عدم دستیابی غذائی کمی کا سبب نہیں بلکہ مختلف حکومتوں کی عدم توجہی کے سبب اس مسئلے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ہمارا ملک ،ایک زرعی ملک ہے۔ لیکن ہم کبھی گندم، کبھی چاول، کبھی آلو، کبھی ٹماٹر درآمد کرتے ہیں۔ دودھ پیدا کرنے والے دنیا کے دس بڑے ممالک میں پاکستان کا شمار ہوتا ہے، لیکن پھر بھی عام آدمی کو سستا دودھ میئسر نہیں۔ یہ گورننس کا مسئلہ ہے اور اس میں

جو بھی حکومت ہے وہ خوراک کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے براہ راست ذمہ دار ہے۔اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر ایک ہزار میں سے 86 بچے ہر سال ایسی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں جو قابل علاج ہوتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال (یونیسیف) کے مطابق ان اموات میں سے 35 فیصد کی وجہ غذائی قلت ہے۔ یونیسف کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 44 فیصد بچے غذائی کمی جب کہ 15 فیصد شدید غذائی قلت کا شکار ہیں۔ اس سروے کے مطابق پاکستان مین صرف تین فیصد بچوں کو وہ خوراک میسر ہے جو صحتمند غذا کے کم سے کم معیار پر پورا اترتی ہے۔دیگر حکومتوں کی طرح مسلم لیگ (ن) کی موجودہ حکومت بھی غذائی کمی کی صورتحال میں بہتری لانے کی دعویدار ہے۔ وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی و ترقی احسن اقبال اس علاج ملک میں غذائی ایمرجنسی نافذ کرنے میں ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ حکومت کو صورتحال کی بہتری کے لیے عملی اقدامات اٹھانا چاہیئے۔تاکہ اس کی سنجیدگی کا اندازہ ہو سکے۔بجٹ میں غذائی تحفظ کے پروگرام کو خصوصی جگہ دینا چاہیئے۔ ہم سب کچھ بیرونی قرضوں کی ادائیگی، دفاعی اخراجات،اور اللے تللے میں خرچ کر رہے ہیں۔ ترقیاتی بجٹ پینے کے صاف پانی، صحت کی سہولیات اور گورننس کی بہتری پر خرچ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے عدم استحکام میں جہاں عسکریت پسندوں کی دہشت گردانہ کاروائیوں، امریکی ڈرونز، بھارت کے ساتھ مسلسل کشیدگی، خوراک اور توانائی کی قلت، دھرنے شامل ہیں۔

وہاں موسمیاتی تبدیلیاں بھی ایک بہت بڑا خطرہ ہیں۔ پاکستان کی تقریباً 190 ملین کی آبادی میں زراعت سے جڑے لوگوں میں سے زیادہ تر کا انحصار دریائی پانی پر ہوتا ہے۔ یہ دریا پاکستان میں اُگنے والی فصلوں کے 90 فیصد کے لیے پانی مہیا کرتا ہے۔ ملک میں بجلی کی پیداوار کا 50 فیصد بھی اسی دریا پر لگائے گئے ہائیڈرو پاور منصوبوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ 2010 سے 2014 تک مون سون بارشوں میں شدت کا سامنا رہا، جس کی وجہ سے پاکستان میں شدید سیلاب آئے'یو این ڈی پی پاکستان کے ڈائریکٹر مارک اینڈرے فرانکے کے مطابق موسمیاتی تبدیلیوں کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے سب سے متاثرہ ملکوں میں سے ایک ہے۔ ''یہاں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے، جو سرسبز ہو اور ماحول سے مطابقت رکھتا ہو تاکہ پائیدار ترقی اور نمو تک پہنچا جا سکے۔ پاکستانی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ موسمیاتی تبدیلیوں سے بچنے اور قومی پالیسی کی کامیابی کے لیے فوری اور مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے، جن مس زیادہ درجہ حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت کی حامل فصلیں، سیلاب سے پیشگی خبردار کرنے کا نظام اور شمال کی جانب دریائے سندھ پر پانی ذخیرہ کرنے کے بڑے اور زیادہ منصوبے شامل ہیں۔ تاہم ان منصوبوں کے لیے سرمایے کی فراہمی ایک بڑا چیلنج ہے۔ پاکستان کو شدید سمندری طوفانوں اور ساحلی علاقوں میں سمندری پانی چڑھ آنے کی وجہ سے سیم اور تھور جیسے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ انڈس ڈیلٹا کے قریب گندم اور کیلے کی فصلوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ درجہ

حرارت میں اضافے کی وجہ سے مقامی علاقے کے رہائشیوں کو صحت کے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں مقامی کسان اپنے کھیتوں اور کھلیانوں کو چھوڑ چھوڑ کر شہروں کی جانب نقل مکانی پر مجبور ہو رہے ہیں۔ جس سے شہری علاقوں میں آبادی کا دباوہ بڑھ رہا ہے۔ جب تک حکومت سنجیدگی سے ان مسائل اور اس کے سد باب کے لئے کوشش نہیں کرے گی۔ ملک میں عدم استحکام رہے گا اور عوام کے بے چینی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

گدھے بھی انٹرنیٹ کے چکر میں

انٹرنیٹ تقریباً دنیا کے تمام کونوں تک پہنچ چکا ہے

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا حد سے متجاوز استعمال اور الیکٹرونک میڈیا کے ساتھ حد سے زیادہ وقت گزارنے کے نتیجے میں ہمارے معاشرتی رویئے اور اقدار تباہ ہو رہی ہیں۔ طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے۔

گدھے اور انٹرنیٹ بات تو انوکھی ہے، لیکن ہے دلچسپ، ٹیکنالوجی کی دنیا کے مختلف کارنامے تو اکثر آپ کی نظر سے گزرتے رہتے ہوں گے, لیکن ایک حیرت انگیز کمال ترکی نے بھی اب کر دکھایا ہے۔ترکی میں گدھے ہر وقت ٹیکنالوجی کی دنیا سے رابطے میں رہنے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔درحقیقت یہ سولر پاور ڈنکیز (گدھے) ہیں جن کی مدد سے ترکی کے عام کاشتکار اپنے موبائل فونز اور لیپ ٹاپس کو چارج کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔کاشتکاروں کی اس تخلیقی سوچ نے دنیا کو حیران کر کے رکھ دیا ہے۔کاشتکاروں نے اپنے گدھوں پر شمسی پینلز نصب کر رکھے ہیں اور وہ انہیں طویل فاصلے کے کسی سفر کے دوران اپنے موبائل فون یا لیپ ٹاپ وغیرہ کو چارج کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ہر گدھا 5 سے 7 کلو

واٹ بجلی کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی سبب ہے کہ کاشتکار اپنے کام کاج کے دوران بھی انٹرنیٹ پر آن لائن رہتے ہیں۔کاشتکاروں کا کہنا ہے کہ کھیتوں میں کام کے دوران ماضی میں انہیں پوری پوری رات تنہا ستاروں کو گھورتے ہوئے گزارنا پڑتی تھی لیکن اب وہ ان گدھوں کے ذریعے ہر وقت آن لائن رہ کر تفریح کر سکتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ گدھوں کو سن بلاکر کی مدد سے سورج کی روشنی سے بچایا جائے اور صرف سولر پینلز کو روشنی کی زد میں رکھا جائے تو اس سے بجلی کی پیداوار دوگنا تک بڑھ سکتی ہے۔ دنیا میں انٹرنیٹ کو ساری آبادی تک پہنچانا ایک خواب ہے۔ لیکن اس کی تکمیل میں کوشش جاری ہیں۔ مشہور انٹرنیٹ سرچ انجن گوگل نے ڈرون بنانے والی کمپنی ٹائیٹن ایرواسپیس خرید لی ہے۔ اس فیصلے کا مقصد ان علاقوں میں انٹرنیٹ کی خدمات فراہم کرنا ہے جو اب تک اس سہولت سے محروم ہیں۔دنیا بھر کی معلومات کے حصول اور لوگوں سے رابطے میں رہنے کا سب سے تیز رفتار اور موثر طریقہ انٹرنیٹ ہے۔ لیکن اعداوشمار کے مطابق اس وقت دنیا کی دو تہائی آبادی انٹرنیٹ تک رسائی سے محروم ہے ، کئی ممالک کے دورافتادہ علاقوں میں انٹرنیٹ کی سہولت ہی موجود نہیں اور کہیں سگنلز اچھے نہیں آتے ،ایسے علاقوں کے لیے گوگل نے ڈرون بنانے والی معروف کمپنی خرید لی ہے۔ گوگل کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ ان علاقوں میں انٹرنیٹ کی سہولت فراہم کرنے کے لیے ڈورن استعمال کیے جائیں گے۔ٹائیٹن ایرواسپیس کا کہنا ہے کہ اس کے تیار کردہ بعض ڈرون پانچ سال تک ری فیولنگ اور زمین پر

آئے بغیر فضا میں رہ سکتے ہیں جس تیزی سے دنیا بھر میں انٹرنیٹ صارفین کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، اسی تیزی سے کئی ممالک اپنے شہریوں پر انٹرنیٹ کا دائرہ تنگ کرتے جارہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی دنیا میں انٹرنیٹ کو روکنے اور اس کی سنسر شپ کی بھی کوشش جاری ہے۔ گو اس پر قابو پانا مشکل ہے۔ اب انٹرنیٹ سینسر شپ ایک عام سی بات ہے اور کئی ممالک نے اپنے شہریوں کی انٹرنیٹ تک رسائی انتہائی محدود کررکھی ہے۔ پاکستان میں یوٹیوب پر دو سال سے پابندی ہے جبکہ چین گریٹ فائر وال آف چائنا کی مدد سے اپنے کروڑوں انٹرنیٹ استعمال کرنے والے شہریوں کی نگرانی اور ان کی رسائی کنٹرول کرتا ہے۔ ایران، نارتھ کوریا، فن لینڈ، ڈنمارک، اٹلی، برطانیہ، آئرلینڈ سمیت کئی ممالک میں بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔ اسی سینسر شپ کا مقابلے کرنے کے لئے ٹورینٹس کے حوالے سے مشہور پائریٹ بے (Pirate Bay) نے اپنا ایک براؤزر Pirate Browser کے پیش کیا ہے جس کے ذریعے انٹرنیٹ کے ان حصوں تک بھی رسائی حاصل کی جاسکتی ہے جن تک رسائی پر حکومتوں نے قدغن لگا رکھی ہے۔ پائریٹ براؤزر کا بنیادی مقصد انٹرنیٹ سینسر شپ سے آزادی ہے اور اس میں صارف کی شناخت چھپانے کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں کیا جاتا۔ آج دنیا کی صرف ایک تہائی آبادی کو انٹرنیٹ تک رسائی حاصل ہے لیکن سن دو ہزار بیس تک عملاً" تمام آبادی کو انٹرنیٹ تک رسائی حاصل ہو چکی ہوگی جس میں موبائل آلات کا وسیع تر پھیلاؤ مددگار ثابت ہوگا۔ موبائل آلات کے استعمال میں توسیع کے

ساتھ ساتھ انٹرنیٹ میں مقبول ترین مواد کی ہیئت، اشیاء اور خدمات کی قیمتوں میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ انٹرنیٹ کی رسائی میں موبائیل فون نے بھی ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔ اور اب نئی نئی اپلیکشن آ رہی ہیں۔ اب ایسے آلات کی اوسط قیمت کم ہو کر ساٹھ ڈالر ہو گئی ہے جبکہ بعد میں یہ قیمت پندرہ ڈالر تک کم ہو سکتی ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں سب سے زیادہ استعمال کئے جانے والے سرچ انجن گوگل ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی دنیا بھر میں انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد انٹرنیٹ تک رسائی کی سکت نہیں رکھتی۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں پانچ ارب کے قریب لوگ اس جدید ایجاد سے محروم ہیں، ان میں اکثریت دیہاتیوں کی ہے لیکن اب بھارت میں Question Box نامی ایک ایجاد نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ ناخواندہ افراد بھی انٹرنیٹ پر موجود علم کے خزانے سے مستفیض ہو سکیں۔ 'Question Box' ایک عام سے تکونی مشین ہے، جس کے اندر موبائل لگا ہوا ہے۔ کوئی بھی شخص اسکا بٹن دبا کر اُس آپریٹر سے بات کر سکتا ہے، جو کال سینٹر میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ یہ شخص آپریٹر سے اپنی مقامی زبان میں کچھ بھی پوچھ سکتا ہے۔ زیادہ تر دیہاتی یونیکی کل آبادی کے بارے میں پوچھتے ہیں اور جب آپریٹر جواب دیتا ہے تو وہ تالیاں بجا کر اسے داد دیتے ہیں۔ ابتدا میں انٹرنیٹ صرف امیر لوگوں کا ہی شوق سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب غریب اور غیر تعلیم یافتہ افراد کو بھی اس کے دائرے میں لایا جارہا ہے۔ سسٹر لوسی کیرین پونے کے ایک آشرم کی بانی ہیں ان

کا خیال ہے کہ یہ ایجاد اسکول کے بچوں کے لئے بہت معاون ثابت ہوگی کیونکہ اس سے انہیں نہ صرف پڑھائی میں مدد ملے گی بلکہ وہ اپنے امتحانات کے نتائج بھی معلوم کرسکیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کی معلومات انٹرنیٹ پر دستیاب ہوتی ہے لیکن اس جدید ٹیکنالوجی سے محرومی نے لوگوں کو معلومات سے دور رکھا ہوا تھا۔ لیکن اب Question Box کی بدولت گاؤں کے لوگوں کو بھی یہ معلومات میسر آجائے گی۔ کیرین کا کہنا ہے کہ اس ایجاد کو نوجوان اور طالب علم صحت کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ بھارت میں کوسچن بوکس کو2007 سے استعمال کیا جارہا ہے اور اب ملک میں دس ایسے مقامات ہیں، جہاں ان مشینوں کو نصب کیا گیا ہے۔ ان مقامات میں دیہات اور کچی آبادیاں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر Nikhil Agarwal اوپن مائنڈ ٹرسٹ انڈیا کے چیئرمین ہیں اور وہ Question Box کے استعمال کو فروغ دینے کے عمل کی نگرانی بھی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اگروال کا کہنا ہے کہ اس مشین کا مقصد ناخواندہ افراد کو بھی اس قابل بنانا ہے کہ وہ جدید معلومات سے مستفیض ہوسکیں۔ ان کا کہنا انٹرنیٹ تقریباً دنیا کے تمام کونوں تک پہنچ چکا ہے۔ بھارت کی 1.1 بلین کی آبادی میں صرف 81 ملین افراد یعنی آٹھ فیصد بھارتی آن لائن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بھارت دنیا میں موبائل استعمال کرنے والے دوسرا بڑا ملک ہے، جس میں موبائل صارفین کی تعداد 490 ملین ہے لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ بھارتی باشندوں کو ہر طرح کی معلومات تک رسائی حاصل ہے۔ بہت سے بھارتیوں کو

اس بنیادی معلومات تک بھی رسائی حاصل نہیں ہے جو شہری طبقے کو آسانی سے میسر آجاتی ہے۔ ہم اس دیہی اور شہری کی تفریق کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ Question Boxکو یوگنڈا میں بھی نصب کیا گیا ہے۔ یوگنڈا کمیونٹ ورکرز دیہاتوں میں جا کر کسانوں اور گاؤں کے لوگوں کے سوالات جمع کرتے ہیں اور پھر وہ ان سوالات کے جوابات کے لئے ایک لیب سے رابطہ کیا جاتا ہے، جہاں آپریٹرز ان کو اِن سوالات کے جوابات دیتے ہیں۔ بھارت اور یوگنڈا میں Question Box ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے، جہاں وہ زیادہ تر کسانوں اور دیہاتیوں کو معلومات مہیا کرکے ان کی مدد کر رہے ہیں لیکن مستقبل میں اس مشین کو ذہنی امراض سے متعلق آگاہی فراہم کئے جانے سمیت کئی اور مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جائے گا۔ پاکستانیوں کے انٹرنیٹ مواد پر رسائی کے دنیا میں سر فہرست ہونے کے چرچے اس وقت نہ صرف مغربی میڈیا بلکہ پاکستانی ذرائع ابلاغ پر بھی کئے جارہے ہیں۔ مغربی خبر رساں ادارے فاکس نیوز کی طرف سے گوگل کے اس ڈیٹا کی بنیاد پر پاکستان کے غیر اخلاقی مواد تک رسائی میں سر فہرست ہونے کی خبر سامنے آئی تھی۔ بعد میں اسی ماہ خود گوگل کے ہی ترجمان نے یہ کہہ کر اس خبر کی تردید بھی کردی تھی کہ اس طرح کی کوئی بھی رپورٹ اغلاط سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ دیگر کئی ممالک ایسی اصطلاحات کی تلاش میں پاکستان سے بہت آگے ہیں۔ ان ممالک میں ویتنام، فلپائن، جنوبی افریقہ، ،برطانیہ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا شامل ہیں۔ یہ وہی ممالک ہیں ،جنھوں نے انفرادیت، شخصی آزادی

تفریح اور طرز زندگی کے خوبصورت عنوانوں سے یہ انسانیت سوز "تحائف" دنیا کو دیے ہیں۔ یہ اعداد و شمار شہروں کے حوالے سے بھی دیکھے جا سکتے ہیں جن میں نئی دہلی، بنگلور، چنائی، ممبئی، سڈنی، میلبورن، ہنوئی، لاس اینجلس اور ڈیلاس سرفہرست ہیں۔ دنیا کی چھٹی سب سے بڑی آبادی ہونے کے ناطے سبھی دائروں اور شعبوں میں پاکستان کے انٹرنیٹ صارفین و استعمال کنندگان کا زیادہ ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ گوگل ہی کی رپورٹ کی مطابق دیگر بہت سے ایسے مثبت الفاظ بھی ہیں جن میں پاکستان سرفہرست، دوسرے یا تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ مثلاً لفظ محمد، اسلام، قرآن، ایجوکیشن، ریسرچ اور جابز کے الفاظ کو ٹرینڈز پر دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اس بات کو مغربی میڈیا اور اس کی پیروی میں پاکستانی ذرائع ابلاغ دونوں ہی گول کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں گذشتہ عشرے کے دوران نہ صرف انٹرنیٹ کے ذریعے غیر اخلاقی مواد تک رسائی کے رجحان میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے، بلکہ ہر قسم کے غیر اخلاقی مواد تک ہر عمر کے افراد کی رسائی میں بھی خطرناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ڈیڑھ سے دو کروڑ افراد کو انٹرنیٹ تک رسائی حاصل ہے۔ دوسری جانب بازاروں میں بھی ہر طرح کی سی ڈی اور ڈی وی ڈی بلا تخصیص عمر فروخت کی جا رہی ہیں، موبائل فون کے ذریعے بھی نوجوان اس مصیبت میں دھڑا دھڑ گرفتار ہو رہے ہیں اور کیبل پر دکھائے جانے والے نیوز اور تفریحی چینلز بلا تفریق ہر ناظر کو اشتعال انگیز مناظر دکھا رہے ہیں۔ ہمارے یہاں ڈراموں، فلموں، یہاں تک کہ

اشتہارات میں بھی غیر اخلاقی پہلو معمول بنتا جارہا ہے، سڑکوں پر لگے بل بورڈز ایک خاص ثقافتی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں اور رہی سہی کسر سوشل میڈیا کے غلط استعمال نے پوری کردی ہے جو ویب سائٹس کے ساتھ ساتھ ہر اچھے موبائل پر بھی دستیاب ہے اور جس کے ذریعے سے ہر رطب و یابس کو پلک جھپکتے شیئر کیا جاسکتا ہے۔ اس سیلاب بلا کو روکنا جن کی ذمہ داری تھی وہ خود اس میں پھنسے نظر آتے ہیں اور عوام ہیں کہ انہیں یہ احساس تک نہیں ہورہا کہ ہماری آیندہ نسلوں کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پی ٹی اے کی جانب سے ۱۳ہزار ایسی ویب سائٹس کو بلاک کیا جاچکا ہے جو بظاہر خوش آئند ہے کہ ایک ذمہ دار ادارے کو احساس تو ہے، لیکن جب اس کا موازنہ انٹرنیٹ پر موجود ایسی غیر اخلاقی ویب سائٹس سے کیا جاتا ہے جو اس وقت بھی موجود ہیں یا ان میں روزانہ کی بنیاد پر ہزاروں کا اضافہ ہورہا ہے، تو اس رکاوٹ کی وقعت بہت کم رہ جاتی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا پر کسی بھی قسم کی غیر اخلاقی سرگرمیوں یا مواد کی نشرواشاعت کو پیمرا روکنے کی مجاز ہے جس کے قانون پروگراموں کے عمومی معیار، دفعہ ٦'' میں موجود ہے کہ کسی بھی قسم کی فحش نگاری'' میں مبتلاء پائے جانے والے نشریاتی ادارے کا لائسنس منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کیبل پر نشر ہونے والے مواد کیلئے بھی قوانین موجود ہیں۔ سوال محض ان قوانین پر عمل درآمد کا ہے، لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ایسا نہیں ہورہا۔ ہمارا مذہب، ثقافت اور ہمارا ورثہ کوئی بھی ان سب چیزوں کی

اجازت نہیں دیتا، لیکن اس کے باوجود ہم سب خاموش ہیں۔ معاملہ محض مذہب کا بھی نہیں، کیونکہ ایسے بہت سے ممالک جو خود کو سیکولر کہتے ہیں، اس قسم کے مواد اور ویب سائٹ کو روکنے اور بنیادی انسانی اخلاقیات کی حفاظت کے لئے ضروری اقدامات کررہے ہیں۔۔ چین کی کمپنیوں نے اپنے ملک اور سعودی عربمیں ایسی مجرب اخلاق سائیٹس کو بلاک کرنے کو پروگرام بنارکھا ہے۔ پی ٹی اے نے ان چینی کمپنیوں سے رابطہ کیا تھا۔ جو چین اور سعودی عرب کو پورن بلاکنگ سروسز فراہم کررہی ہیں، لیکن پھر کچھ ہی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ حکومت کی جانب سے پی ٹی اے کو اس مقصد کیلئے فنڈز فراہم نہیں کئے گئے اسلئے معاملہ بات چیت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ چین کوئی مذہبی ملک نہیں ہے۔ لیکن اس نے غیر اخلاقی ویب سائٹ کی ایک بہت بڑی تعداد کو بھی بلاک کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے چین میں سخت قوانین بھی موجود ہیں اور بالخصوص چائلڈ آن لائن پروٹیکشن ایکٹ 1989 کے تحت تمام کمرشل ویب سائٹس تک سے ’’ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کم عمر نوجوانوں اور بچوں سے ایسی تمام اشیا اور معلومات کو دور رکھیں جو ان کے لئے کسی بھی لحاظ سے نقصان دہ ہیں۔ اسی طرح چین میں فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا پر بھی پابندی عائد ہے۔ ملائشیا میں غیر اخلاقی مواد سے متعلق سخت قانون موجود ہے اور اس قسم کے مواد کو دیکھنے، رکھنے یا اسے نشر کرنے پر ۴ سال تک کی قید دی جاسکتی ہے۔ ملائشیا میں 2005 کے دوران یہ قانون بننے سے لیکر ابتک سینکڑوں افراد کو سزائیں اور بھاری جرمانے بھگتنا بھی پڑے ہیں۔

اس کے علاوہ سعودی عرب میں فحش نگاری کے خلاف انتہائی سخت قوانین موجود ہیں اور ان پر عمل درآمد بھی کیا جاتا ہے۔اس حوالے سے ہمارے سیکولر ہمسایہ ملک بھارت نے خاصے اقدامات کئے ہیں۔ واضح رہے کہ پوری دنیا میں چین اور امریکا کے بعد ہندوستان انٹرنیٹ صارفین کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ حال ہی میں بھارت کے چیف جسٹس نے ملک میں تمام غیر اخلاقی ویب سائٹس کو بند کرنے کے احکامات جاری کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انڈین پینل کوڈ کی شق ۲۹۲ ملک میں غیر اخلاقی کتب کی خرید وفروخت، فحش نگاری اور غیر اخلاقی معلومات کے تبادلے پر بھی پابندی عائد کرتی ہے اور ان جرائم میں ملوث ہونے والے افراد کو ۲ سال تک کی قید اور بھاری جرمانے کا سزاوار سمجھتی ہے۔ عریانیت یا غیر اخلاقی مواد پھیلانے والی ویب سائٹس کے علاوہ سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کا بے محابا اور بے لگام استعمال بھی ہمارے یہاں ایک سنگین مسئلے کی صورت اختیار کرچکا ہے۔ انٹرنیٹ صارفین بخوبی جانتے ہوں گے کہ غیر اخلاقی مواد کو پھیلانے کے عمل میں غیر اخلاقی ویب سائٹس کے علاوہ سوشل میڈیا کا بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹوں پر ایک اور الزام یہ بھی ہے کہ ان سے انسانوں کا ’’رائٹ ٹو پرائیویسی‘‘ یعنی حقِ تخلیہ بری طرح متاثر ہوا ہے، کیونکہ ان ویب سائٹس کے ذریعے انسان کی ذاتی زندگی کی بہت سی معلومات لاکھوں افراد تک پہنچتی ہیں جن کی مدد سے کسی بھی انسان کو جذباتی طور پر پریشان کیا جاسکتا ہے۔ امریکی جریدے نیوز ویک میں شائع ہونیوالی ایک تحریر

کے مطابق سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس لوگوں میں دنیا سے ایک غلط طرح کے رابطے یا رشتے کا احساس پیدا کرتی ہیں اور اس سے تنہائی پسندی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ ان ویب سائٹس کے ذریعے ایک اور انتہائی غیر اخلاقی عمل آن لائن گفتگو ہے جس کے باعث برائی کا سیلاب مزید تیزتر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اب ان ویب سائٹس کی وجہ سے جو آفات آرہی ہیں ان میں سے ایک بڑی آفت دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی طلاق کے رجحان میں خطرناک اضافے کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔ مصر میں اسی رجحان کو بنیاد بنا کر چند علماء نے متعدد ویب سائٹس کو حرام بھی قرار دیا ہے۔

بات محض انٹرنیٹ پر موجود غیر اخلاقی مواد، اس تک بلاروک ٹوک رسائی اور اس میں سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس کے منفی استعمال و کردار تک محدود نہیں، بلکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا حد سے متجاوز استعمال اور الیکٹرونک میڈیا کے ساتھ حد سے زیادہ وقت گزارنے کے نتیجے میں ہمارے معاشرتی رویئے اور اقدار تباہ ہورہی ہیں۔ اس تباہی کی ایک قیمت ہم ادا کررہے ہیں اور باقی ہماری آئندہ نسلیں ادا کریں گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انٹرنیٹ کا استعمال ہو یا الیکٹرہنک میڈیا کا، اس حد تک رکھا جائے جہاں تک یہ مفید رہے، اور غیر مفید سرگرمیوں کی حکومت نگرانی بھی کرے اور انہیں محدود بھی۔ دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ محض حکومت کی کوششوں سے یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا، بلکہ اسکے

لئے ان تمام لوگوں کو بھی باہم مل کر اپنی اقدار اور روایات کی پاس داری کا فرض ادا کرنا ہوگا جو اس ملک و قوم کا درد رکھتے ہیں۔ عوامی سطح پر منظم جدوجہد اور سماجی دباؤ کے تحت جہاں حکومت کو موثر اقدامات اٹھانے کے لئے مجبور کیا جائے وہیں معاشرتی سطح پر عوام میں دین کا شعور بیدار کرنے، اخلاقی اقدار کے تحفظ اور فحاشی و عریانی کے خاتمے کے لئے انفرادی اور اجتماعی دائرے میں اصلاح معاشرہ پر مبنی منظم اجتماعی جدوجہد بھی ناگزیر ہے۔ معاشرے کی اسلام پسند اور محب وطن قوتوں اور درد دل رکھنے والے عناصر کو اس کے لئے ہراول دستے کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اگر ہم اخلاقی انحطاط و زوال سے بچنا چاہتے تو اخلاقی بگاڑ کو ہر سطح پر روکنا ہوگا۔

جیک ما

معروف امریکی اخبار وال سٹریٹ جرنل نے سال کے شروع میں ایشیا کی ان شخصیات کی لسٹ جاری کی ہے جنھیں نیوز میکر کہا جاتا ہے۔ 27 افراد پر مشتمل اس لسٹ میں 2 پاکستانی بھی شامل ہیں، تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان اور کالعدم تحریک طالبان کے سربراہ ملا فضل اللہ کو اخبار نے پاکستانی نیوز میکرز قرار دیا ہے، فہرست میں بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی اور عام آدمی پارٹی کے سربراہ، دہلی کے وزیراعلیٰ اروند کیجری وال بھی اس فہرست میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں،، لسٹ میں چین کی کمیونسٹ پارٹی کے وان ھننگ ،، چینی وزیر خزانہ لو جی اور ارب پتی چینی بزنس مین وان جیانگ اور چینی انٹرنیٹ کمپنی علی بابا گروپ کے چیئرمین جیک ما بھی شامل ہیں۔جیک ما کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ وہ پہلے چینی بزنس مین ہیں جو فوربس مگزین کی کور اسٹوری بنے۔ ہونگزو صوبے میں پیدا ہونے اس نوجوان کو انگریزی سیکھنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ روزانہ پینتالیس منٹ بائیک چلا کر ایک ایسے موٹل جایا کرتے تھے جہاں وہ غیر ملکیوں سے انگریزی میں بات چیت کر سکیں . وہ انہیں بطور ایک گائڈ شہر کی سیر کرتے تھے تاکہ انگریزی میں خوب باتیں کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنی زبان بہتر بنا سکیں ... نو عمری میں دو دفعہ یونیورسٹی کے داخلہ ٹیسٹ میں فیل ہوئے اور مجبوراانہیں ٹیچرز

انسٹیٹوٹ میں پڑھانا پر جو کہ ایک عام سی یونیورسٹی ہے .جیک مانے لکھا ہے کہ سب سے پہلے میں نے چینی کمپنیوں کے لیے ویب سائٹس بنانے کا سوچا اور اسکے لیے اپنے امریکی دوستوں سے مدد لی ......جس دن میری ویب سائٹ انٹرنیٹ پر آئی میں نے اپنے تمام دوستوں اور ٹی وی لے لوگوں کو گھر پر جمع کیا......انٹرنیٹ بہت سلو تھا، ڈائل اپ کے کنکشن پر ہم نے ساڑھے تین گھنٹے میں آدھا صفحہ ڈونلوڈ کیا.. ہم کارڈ کھیلتے رہے، کھاتے پیتے رہے...تاکہ ویب سایٹ ڈونلوڈ ہوجائے...بہت وقت لگا مگر میں حد سے زیادہ خوش تھا کہ میں نے سب کو دیکھا دیا کہ انٹرنیٹ کا وجود ہے۔ جیک ما کی کمپنی چین کی آن لائن شاپنگ کمپنی علی بابا ہے۔ جس نے اپنے آئی پی او یعنی شروعاتی عوامی پیشکش سے سرمایہ کاروں کو ایک ہی دن میں مالا مال کر دیا تھا۔نیویارک سٹاک ایکسچینج میں اس کا شیئر 40 فیصد کے زبردست پریمیم پر درج کیا گیا۔ علی بابا امریکہ کی سلیکون ویلی سے کاروبار کرتی ہے اور دوسری آن لائن ریٹیل (خوردہ) کمپنیوں کی ہی طرح اس کا زور خوردہ خریداروں پر نہ ہو کر بڑے کاروباریوں پر رہتا ہے۔ مبصرین کا کہنا تھا کہ نیویارک سٹاک ایکسچینج میں شامل ہونے کے بعد علی بابا کا نام بھی فیس بک، ایمیزون اور ای بے جیسی کمپنیوں کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔یہاں ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ آخر علی بابا پر کیا کیا دستیاب ہے تو جواب کچھ اس طرح دیا جاتا ہے وہاں کیا دستیاب نہیں؟یہ کمپنی آن لائن مارکٹنگ، آن لائن خدمات اور لاجسٹکس تو مہیا کراتی ہی ہے اس کے

علاوہ یہ بہت سی دوسری چیزیں بھی فراہم کراتی ہے جس کا مختصراً ذکر یہاں کیا جارہا ہے۔
یہاں فوجی سازو سامان آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔اگر کوئی ٹینک، توپ، گولہ،
راکٹ لانچر خریدنے کی حسرت رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی
علی بابا حاضر ہے۔اس قسم کے ٹینک کی فراہمی بھی علی بابا کے یہاں سے ہو سکتی
ہے۔اس کے آن لائن پلیٹ فارم پر ایک اصلی فوجی ٹینک ایک لاکھ 90 ہزار ڈالر میں
دستیاب ہے۔صرف ٹینک ہی نہیں دیگر فوجی سازو سامان بھی علی بابا آپ کو فراہم کرا
سکتا ہے۔توپ و تفنگ کے شوقین حضرات کے لیے یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ کم
خرچ میں اصلی ٹینک اور راکٹ لانچروں کی نقل بھی ملتی ہے۔اگر آپ ہوائی جہاز
خریدنے کی حسرت رکھتے ہیں تو علی بابا آپ کو وہ بھی فراہم کرا سکتا ہے۔

اگر گلائڈر میں دلچسپی ہے تو آرڈر دے سکتے ہیں۔سنہ 1983 میں بننے والا سوویت کارگو طیارہ اس کی ویب سائٹ پر دستیاب تھا۔

اگر آپ بوٹ گلائڈ یا گلائڈنگ بوٹ یا ایئرشپ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی قیمت دیکھ کر آپ اسے علی بابا سے منگوا سکتے ہیں۔علی بابا پر تلا ہوا انڈا بھی دستیاب ہے اور وہ بھی مخصوص شکلوں میں۔ آپ چاہیں تو مخصوص مذکورہ شکل میں ہاف فرائڈ بیضہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔اگر آپ کو اپنے پالتو جانور کے لیے تابوت چاہیے تو پریشان ہونے یا بہت سر کھپانے کی ضرورت نہیں، علی بابا ہے نا مانو اس کے پاس دنیا بھر کے خزانے کی چابی کھل جا سم سم ہے ۔علی بابا جب 1999 میں وجود میں آئی تو اس وقت اس میں 18 لوگ کام کرتے تھے لیکن اب دنیا بھر میں اس کے لئے 22 ہزار افراد کام کرتے ہیں۔سنہ 1999 میں جیک ما نے alibaba.com کے نام سے اپنا بزنس شروع کیا تھا۔ یہ ویب سائٹ چین (اور دیگر ممالک) کے ایکسپورٹرز کو دنیا بھر میں پہلی 190 کمپنیوں سے جوڑتی

ہے۔ بہر حال علی بابا کی ویب سائٹ کا صرف یہی کام نہیں ہے۔ علی بابا taobao.com بھی چلاتی ہے جو چین کی سب سے بڑی شاپنگ ویب سائٹ ہے اور چین میں ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے لیے tmall.com اس کی ایک اور ویب سائٹ برانڈڈ چیزیں مہیا کرتی ہے۔ علی بابا کی پہنچ بس یہیں ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک آن لائن alipay.com پیمنٹ نظام بھی چلاتی ہے جو PayPal کی طرح کام کرتا ہے۔ علی بابا کمپنی آن لائن مارکٹنگ، آن لائن خدمات اور لاجسٹکس کے علاوہ یہ بہت سی دوسری چیزیں بھی فراہم کراتی ہے۔ چین میں ٹوئٹر جیسی سوشل میڈیا کی ویب سائٹ سنا وائبو میں بھی اس کی بڑی شراکت داری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یوٹیوب جیسی ویڈیو شیئرنگ Youku Tudou ویب سائٹ میں بھی اس کی حصہ داری ہے۔ انٹرنیٹ سے ہونے والے کاروبار کے ایک بڑے حصے پر اس کا کنٹرول ہے۔

چین ایک ایسا ملک ہے جو ساٹھ ستر سال تک افیم، افیمیوں اور اپنی کثرت آبادی کی وجہ سے دنیا میں جانا جاتا تھا۔ اب یہی ملک اپنی ترقی اور دنیا کی سب سے بڑی معیشت بننے کی طرف گامزن ہونے کے حوالے سے دنیا میں مشہور ہے۔ چینی کمپنیاں یورپی اور جاپانی کمپنیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں اور کسی حد تک یورپی کمپنیوں کو پیچھے چھوڑتی جا رہی ہیں۔ چینی مصنوعات کا اعلیٰ معیار اور کم قیمت دنیا بھر کے صارفین کے لیے کشش رکھتا ہے۔ چین نہ صرف اس وقت دنیا کی سب سے بڑی معیشت بننے کی طرف گامزن ہے بلکہ اب اس نے ایک اور سنگ

میل عبور کرنے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس کی ای کامرس کی صنعت امریکہ کی ای کامرس کی صنعت سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس میں اس کی ایک عظیم الشان فرم مارکیٹ پر چھا رہی ہے اور یہ ہے "علی بابا ڈاٹ کام۔۔۔۔۔ Alibaba.com"، جو اس وقت کسی حد تک دنیا کی سب سے بڑی ای کامرس کمپنی بن چکی ہے۔ گذشتہ دو سال کے دوران علی بابا کی دو ذیلی کمپنیاں 170 ارب ڈالر کمانے میں کامیاب ہو چکی ہیں جو eBay اور ایمازون Amazon کی مجموعی سیلز سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ علی بابا اس وقت دنیا کی سب سے پہلی کمپنی بننے جا رہی ہے جو ایک سال میں ایک ٹریلین ڈالر کی ٹرانزیکشن کر چکی ہے۔ تاہم اس قدر غیر معمولی کامیابی کے باوجود چین سے باہر لوگوں کی بڑی تعداد اس پرائیویٹ کمپنی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتی۔ جیک ما، نے جو انگلش کے سابق ٹیچر ہیں، نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ اگلے سال مئی تک کمپنی کی چیف ایگزیکٹو کی کرسی اپنے بااعتماد ساتھی جوناتھن لو کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد جلد ہی اس بات کا امکان ہے کہ کمپنی اپنی ابتدائی پبلک (IPO) آفرنگ کی تفصیلات کا اعلان کرے گی جو کہ گذشتہ سال فیس بک کی IPO کے بعد مشہور ترین اور ممکنہ طور پر زیادہ بڑی پبلک آفرنگ ہو گی۔ یاد رہے کہ فیس بک کی پبلک آفرنگ کی مالیت 104 بلین ڈالر تھی (اس کی مارکیٹ کیپیٹیلائزیشن اس وقت سے دوبارہ کم ہو کر 63 ارب ڈالر پر واپس آ گئی ہے)۔ علی بابا کی مالیت ممکنہ طور پر 55 بلین ڈالر سے لے کر 120 بلین ڈالر تک ہو سکتی ہے۔ ابتدائی پبلک آفرنگ یا IPO

کے نتیجے میں علی بابا کا شاندار عروج دنیا بھر کی توجہ حاصل کرے گا۔اس کے علاوہ کمپنی کا بغور جائزہ لینے کے اور بھی اسباب ہیں۔ان میں سے ایک مستقبل میں اس کی ترقی کے امکانات ہیں۔اگر یہ فیس بک کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بچ جاتی ہے تو امکان ہے کہ آئندہ چند سال تک یہ دنیا کی سب سے زیادہ مالیت والی کمپنی بن جائے گی (اس وقت اس حوالے سے دنیا کی سب سے بڑی کمپنی Apple ہے جس کی نقد مالیت اس وقت لگ بھگ 420 بلین ڈالر ہے جبکہ 2009 میں اس کی مالیت صرف 90 بلین ڈالر تھی۔) علی بابا کی ایک اور کامیابی یہ ہے کہ یہ دیگر نئی مارکیٹوں میں بھی اپنے پاؤں پھیلا رہی ہے اور یہ چین کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔علی بابا کی کامیابی کی داستان دانش مندانہ اختراع کی ایک شاندار مثال ہے کہ چین میں مسابقانہ فوائد کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔جیک ما نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''eBay سمندر کی شارک ہو سکتی ہے، لیکن میں یانگ زی کا مگرمچھ ہوں۔اگر ہم سمندر میں لڑتے ہیں تو شاید ہم ہار جائیں لیکن اگر ہم دریا میں لڑتے ہیں تو ہم جیت جائیں گے۔''اس وقت سے جیک ما کو ''یانگ زی کا مگرمچھ'' کہا جاتا ہے۔جیک ما نے 1999 میں ''علی بابا ڈاٹ کام'' کے نام سے اس کمپنی کا آغاز کیا تھا جو کہ ایک بزنس ٹو بزنس پورٹل تھی جو کہ چین کے چھوٹے مینو فیکچررز کو بیرون ملک خریداروں سے جوڑتی تھی۔اس کی دوسری ایجاد تاؤباؤ Taobao تھی جو کوئی ایک کنزیومر ٹو کنزیومر پورٹل تھی جو کہ اب مصنوعات کو بیس کامیاب ترین ویب سائٹس کے ذریعے دنیا بھر میں پیش کرتی تھی۔

اس کی ایک نئی کمپنی ہے جو کہ بزنس ٹو کنزیومر پورٹل ہے اور کسی حد تک Tmall ایمازون کی طرح عالمی سطح کے برانڈز جیسے ڈزنی اور لیویز کو چین کی مڈل کلاس تک رسائی میں مدد فراہم کرتی ہے۔ علی بابا اس سے بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہے۔ چین کی ای کامرس کی صنعت کے بارے میں پیش گوئی کی جاتی ہے کہ 2020ء تک امریکا، برطانیہ، جاپان، جرمنی اور فرانس کی ای کمپنیوں کی جو مجموعی تعداد بنتی ہے، ان سے بھی بڑی کمپنی بن جائے گی۔ اگرچہ ابھی علی بابا امریکہ میں ''ایمازون'' کو چیلنج کرتی دکھائی نہیں دیتی لیکن عالمی سطح پر چین کے لوگ بیرون ملک جو اخراجات کرتے ہیں، یہ ان کو اپنے کنٹرول میں لارہی ہے اور تیزی سے ترقی کرتی ہوئی معیشتوں میں شامل ہورہی ہے۔ اس سلسلے میں اس کی مدد کرنیوالی اس کی ذیلی کمپنی Alipay ہے، یہ آن لائن پے منٹ سسٹم کے حوالے سے ایک دلچسپ کمپنی ہے۔ یہ صرف اس وقت فروخت کنندگان کو پے منٹ کرتی ہے جب اس کی مصنوعات کے خریدار وصول شدہ مصنوعات کے معیار سے مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اس طرح جن معاشروں میں قانون کی حکمرانی کمزور ہے، وہاں پر یہ کمپنی لوگوں کا اعتماد حاصل کررہی ہے۔ شاید علی بابا کا سب سے عظیم الشان خزانہ اس کا غیر استعمال شدہ کسٹمر ڈیٹا ہے۔ چین میں ڈیلیور کیے جانے والے کوئی ساٹھ فیصد پارسل اسی کی سائٹس کی وساطت سے ترسیل پاتے ہیں۔ یہ چینی مڈل کلاس بشمول لاکھوں چینی تاجروں کی اخراجات کی عادات اور ''کریڈٹ ورتھی نیس'' کے حوالے سے سب سے زیادہ جانتی ہے۔ ''علی فنانس'' بھی اس کی ایک

ذیلی کمپنی ہے جو چھوٹی فرموں کو چھوٹے قرضے دینے والا ایک بڑا ادارہ ہے۔ اب یہ عام صارفین کو بھی قرضے دینے کے کاروبار تک رسائی حاصل کر رہا ہے۔ حقیقت میں یہ چینی فنانس کو لبرلائز کرنے میں مدد دے رہا ہے۔ چین کے بڑے بڑے سرکاری بینک جو کہ سرکاری اداروں کو سستا سرمایہ فراہم کرنے کا چینل ہیں طویل عرصے تک سب کو نظرانداز کرتے آئے ہیں۔ فرم اپنے آن لائن پلیٹ فارمز کو استعمال کرتے ہوئے انشورنس پراڈکٹس بھی فراہم کر رہی ہے اور اس قسم کی مزید اختراعات تیاری کے مراحل میں ہیں۔

یعنی "بانس بھری سرمایہ داری" bamboo capitalism چنانچہ اس وقت علی بابا کے قلب میں بیٹھی ہے۔ یہ اصل میں چین میں آپس میں گتھی ہوئی اور تیزی سے پھیلتی ہوئی پرائیویٹ سیکٹر کی فرمز جو کہ سرکاری اداروں سے زیادہ قابل ہیں، کے لیے ایک اصطلاح ہے۔ کوئی ساٹھ لاکھ کے قریب وینڈرز اس کی سائٹس پر موجود ہیں۔ فرم کی کوششوں سے چین کے نااہل ترین ریٹیل اور لاجسٹک سیکٹر کی پیداواری صلاحیت بڑھانے میں مدد مل رہی ہے۔ علاوہ ازیں دیگر تمام کمپنیوں سے بڑھ کر یہ کمپنی ایک ایسا کام کر رہی ہے جس کی سخت ضرورت ہے۔ کمپنی چین کے انوسٹمنٹ ہیوی گروتھ کے ماڈل کو صارفی ماڈل میں تبدیل کر رہی ہے۔ اس طرح یہ کمپنی ایسے اور بھی کئی اختراعی کاروباروں میں مصروف ہے جو چین کی ترقی کی رفتار میں قابل ذکر حد تک اضافہ کر سکتے ہیں۔ ہر کامیابی اور کامرانی کو خطرات

کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ جس طرح دریائے یانگ زی کے مگرمچھوں کے وجود کو خطرات لاحق ہیں، اس طرح علی بابا کا مستقبل بھی خطرات سے خالی نہیں۔ تین خطرات ایسے ہیں جو فرم کو اس کی راہ سے بھٹکا سکتے ہیں۔

اس کو پہلا خطرہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی ترقی سے ہی ہے۔قابل ترین بانی کے معاملات سے علیحدگی سے پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنا کم ہی آسان ثابت ہوتا ہے۔چین کے کمتر معیارات کے حساب سے علی بابا عام طور پر اچھے نمبر حاصل کرتی ہے۔ ایک کیوییٹ(مشتری ہوشیار باش کی علامت) کے ساتھ مبصرین چند سال قبل جیک ما کی کی لانچ کو Alipay جانب سے مرکزی کمپنی میں سے مبہم طریقے سے

شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سرکاری کمپنیاں جس طرح منظر سے غائب ہوجاتی ہیں، یہ اس طرح غائب نہیں ہو سکتی۔اس کی مصنوعات میں بھی اسی قسم کی شفافیت کی ضرورت ہے۔ چینی معیار کے حساب سے علی بابا نے جعلی اشیا سے لڑنے کے لیے بہت کام کیا ہے کو سرکاری اعزاز سے نواز دیا Taobao یہاں تک کہ امریکی حکومت نے حال ہی میں تھا۔ تاہم اس کے باوجود سائٹ پر بہت سی غلط اشیا بھی مل جاتی ہیں۔

صرف ان چیزوں سے نمٹ لینا کوئی اچھی مینیجمنٹ نہیں۔ یہاں پر ایک اور خطرہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ خطرہ ہے علی بابا کی غیر ملکی سرمایہ کاری سے محرومی۔ چین کی کمپنیوں کو بیرون ملک شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے وسائل کے لیے بھوکے سرکاری اداروں کو افریقہ میں احتجاج کا سامنا ہوچکا ہے۔ اکاؤنٹنگ سکینڈل کی وجہ سے شمالی امریکہ کے سٹاک ایکسچینجز میں موجود اس کی فرمز کو جرمانے ہو چکے ہیں۔ ایک کو امریکہHuawei امریکی رکن کانگرس کی جانب سے چین کی عظیم الشان ٹیلی کام کمپنی کی دشمن قرار دیا جاچکا ہے۔ یہ بات افسوس ناک ہوگی کہ علی بابا کو جس کا چینی حکومت کے ساتھ تعلق بہت کم ہے، اس کو اسی قسم کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ لیکن علی بابا کو جو سب سے بڑا خطرہ ہے، وہ چین میں ہی ہے۔ ایمازون اور ای بے کی طرح علی بابا کو بھی ضرورت ہے کہ اسے انٹی ٹرسٹ ریگولیٹرز کی جانب سے مانیٹر کیا جائے۔ لیکن چین کی سیاست اس کے

لیے خاصی خطرناک ہے۔بڑے بڑے بینک اس کے معاشی بازوؤں کے خلاف پہلے ہی متحد ہو رہے ہیں۔کمیونسٹ پارٹی بھی اس سے حسد رکھتی ہے کہ محض ایک ادارہ اس کے شہریوں کے بارے میں اس قدر اعدادوشمار رکھتا ہے۔اگر چینی حکومت بغیر کسی ٹھوس جواز کے علی بابا کے پر کترنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ غلط ہوگا۔علی بابا دنیا کی سب سے زیادہ مالیت والی کمپنی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس طرح چین کی ترقی میں بھی مددگار ہو سکتی ہے۔گذشتہ دنوں علی بابا نے امریکی مارکیٹ میں اپنے حصص فروخت کرنے کا اعلان کیا تھا اور کمپنی کا کہنا ہے کہ اس اقدام سے وہ زیادہ عالمی کمپنی بن جائے گی۔ماہرین نے 2012 میں فیس بک کے حصص جاری ہونے کے بعد سے کسی ٹیکنالوجی کمپنی کی جانب سے حصص جاری کرنے کا یہ سب سے بڑا موقعہ قرار دیا تھا۔بعض ماہرین نے پیش گوئی کی ہے کہ علی بابا مارکیٹ سے پندرہ ارب ڈالر جمع کر سکے گی۔اس سے امریکی کمپنی یاہو کو بھی کافی فائدہ پہنچے گا کیونکہ یاہو بھی علی بابا کے بڑے حصے کا مالک ہے اور اس حصے کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔کمپنی کی جانب سے جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا ہے کہ 'اس اقدام سے ہم ایک زیادہ عالمی کمپنی بن جائیں گے اور کمپنی کی شفافیت میں اضافہ ہوگا جو ہمارے مستقبل کے لیے اہم ہے۔علی بابا کی جانب سے یہ اقدام ایک ایسے وقت کیے گئے تھے۔ جبکہ دو روز قبل ہی ایک دوسری چینی کمپنی ویبو (جو کہ ٹوئٹر جیسی سروس فراہم کرتی ہے) نے اعلان کیا ہے کہ وہ پانچ سو ملین تک حصص امریکی منڈی میں جاری کرنے والی تھی۔گذشتہ ستمبر

میں علی بابا کے ہانگ کانگ سٹاک ایکسچینج پر حصص جاری کرنے کی کوشش ناکام ہونے کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ کمپنی اپنے حصص نیویارک میں جاری کرے گی۔ علی بابا کے مینجمنٹ ڈھانچے میں سینیئر اہلکار بورڈ آف ڈائریکٹرز کا کنٹرول رکھتے ہیں جو کہ ہانگ کانگ ایکسچینج کے قوانین کی خلاف ورزی شمار ہوتی تھی۔ اس وقت علی بابا کا شمار دنیا کی سب سے بڑی انٹرنیٹ پر خرید و فروخت کی ویب سائٹ ہے اور اس کے 500 ملین صارفین کے لیے 800 ملین اشیا برائے فروخت شامل تھی۔ ابتدا میں کمپنی کو چین سے باہر زیادہ شہرت حاصل نہیں تھی لیکن اب ساری دنیا میں اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے ہیں۔

پورے ملک میں بجلی کے زائد بلنگ کے ذریعے تین ارب روپے ماہانہ کی لوٹ مار

وزیراعظم کی صدارت میں گذشتہ دنوں وفاقی کابینہ کے اجلاس میں صارفین بجلی سے اضافی بل وصول کرنے کے معاملہ پر وفاقی وزارت پانی و بجلی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ڈاکٹر مصدق ملک کی سربراہی میں قائم کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات کی تصدیق کی کہ صارفین سے بجلی کے زائد بل وصول کرنے کی شکایات حقیقت پر مبنی ہیں۔ وزیر اعظم کو پیش کی جانے والی رپورٹ کے مطابق ملک کی دس ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کے تقریبا 150000 صارفین کے ڈیٹا کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ بجلی کی فراہمی والی کمپنیاں تیس سے پینتیس فیصد صارفین پر ہر ماہ زائد بلنگ کر رہی ہیں۔ جس پر وزیر اعظم نے 200 یونٹ بجلی استعمال کرنے والے صارفین کے بل آئندہ ماہ کے بل میں ایڈجسٹ کرنے کو کہا ہے۔ وزیر اعظم کے مشیر برائے توانائی مصدق ملک نے اجلاس میں بجلی کے زائد بلوں پر کابینہ کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے وزارت پانی و بجلی کی طرف سے زائد بلوں کی واپسی اور عوامی شکایات کے ازالے کیلئے سفارشات بھی دی گئیں۔ مشیر پانی و بجلی نے اپنی رپورٹ میں کہاکہ میٹر ریڈرز نے ریڈنگ کئے بغیر اندازے کے مطابق ریڈنگ ڈالی۔ اندازے کے مطابق 35 فیصد صارفین کو بجلی کے زائد بل بھجوائے گئے، تقسیم کار کمپنیوں پر سرکلر ڈیٹ

پر قابو پانے کا شدید دباو تھا جسکی وجہ سے مطلوبہ اہداف حاصل کرنے کیلئے اضافی بل بھجوائے گئے۔ جس پر وفاقی وزیر پانی و بجلی خواجہ آصف نے ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی تاہم وزیر اعظم محمد نواز شریف نے ان کے مستعفی ہونے کی پیشکش مسترد کر دی اور کام جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ وفاقی کابینہ کا اجلاس ساڑھے چار گھنٹے تک جاری رہا جس میں نصف سے زائد وقت بجلی کے زائد بلوں پر بحث کی نذر ہوا۔ مسلم لیگی وزرا نے بھی کم و بیش 2 گھنٹے تک بجلی کے بلوں میں اضافے پر تنقید ہی نہیں کی بلکہ وہ زائد بلوں پر پھٹ پڑے۔ اجلاس میں وفاقی کابینہ نے بجلی کے زائد بلوں کے ذمہ داروں کے خلاف سخت کارروائی کا فیصلہ کرتے ہوئے بجلی کے صارفین سے لئے گئے زائد بلوں کو اگلے ماہ میں ایڈجسٹ کرنے کی ہدایات جاری کی ہیں۔ جبکہ وزیر اعظم نواز شریف نے بجلی کے اضافی بلوں کے معاملے کو آڈٹ کرانے کا بھی حکم دے دیا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق وزیراعظم نے اوور بلنگ پر متعلقہ حکام کے خلاف کارروائی کے علاوہ عوام سے ناجائز طور پر حاصل کی گئی رقوم واپس کرنے کا بھی کہا ہے۔ اس حوالے سے بجلی کی ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کو فوری طور پر کارروائی کرکے عوام سے ناجائز طور پر حاصل کی گئی رقوم واپس کرنے کا طریق کار وضع کرکے اس کا اعلان کرنا چاہیے تاکہ شہریوں کو ریلیف مل سکے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر ماہ عوام سے تقریبا تین ارب روپے زائد بلنگ کے صورت میں وصول کیئے جارہے ہیں۔ یہ ڈاکہ اور لوٹ مار ان قانون پسند

شہریوں سے کی جارہی ہے۔ جو بجلی کا بل باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ اوور بلنگ پورے پاکستان میں ہورہی ہے۔ اور کراچی میں کے الیکٹرک نے اس کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ جو اعلانیہ لوگوں سے زائد بلنگ کے نام پر لاکھوں روپے وصول کرہی ہے۔ زائد بلنگ پر ملک بھر میں عوام نے احتجاجی مظاہرے بھی کیے ہیں۔ جماعت اسلامی، پیپلز پارٹی سمیت بہت سے سیاسی گروپ بھی عوام سے ہمدردی کر اظہار کر رہے ہیں۔ عوام ابھی لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے نہیں نکلے ہیں کہ انھیں زائد بلنگ کی لوٹ مار سے واسطہ پڑگیا ہے۔ اگر بجلی کی تقسیم کار کمپنیاں اپنا کام کرنے کا انداز درست کریں تو یہ معاملات بہتر ہو سکتے ہیں۔ بجلی کمپنیوں کے کرپٹ افسر و اہلکار عوام کو خود بجلی چوری پر آمادہ کرتے ہیں اور اس چوری ہونے والی بجلی کے بل ان شہریوں کو ڈال دیے جاتے ہیں جو چوری میں شامل نہیں ہوتے۔ زائد بلنگ کا ایک سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ اوور بلنگ میں زائد یونٹ ڈال کر سلیب تبدیل کرکے صارفین سے زیادہ بل وصول کرلیا جائے۔ نواز شریف کے سابقہ دور میں 1998 میں جب واپڈا فوج کے حوالے کیا گیا تو فوج نے بجلی کی ریڈنگ کے لیے ہر صارف کو میٹر ریڈنگ کارڈ جاری کیا تھا۔ ہر میٹر ریڈر کے لیے لازم تھا کہ وہ صارف سے کارڈ لے کر اس کے میٹر کی ریڈنگ اس کارڈ پر درج کرکے صارف کے حوالے کرے اس سے بجلی کی ریڈنگ میں گڑبڑ کرنے کا عمل ختم ہوگیا تھا۔ لیکن اب کمپنیوں نے میٹر ریڈر کم کر دیئے ہیں اور اندازے کی بنیاد پر بلنگ کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ حکومت تمام تقسیم کار

کمپنیوں کو ہدایت دے کہ ہر گھریلو اور کمرشل صارف کو میٹر ریڈنگ کارڈ جاری کرے اور میٹر ریڈر اس کارڈ پر ریڈنگ کا اندراج کرکے صارف کو واپس کرے تاکہ دفتروں میں بیٹھ کر میٹر ریڈنگ درج کرنے اور اوور بلنگ کا سلسلہ ختم ہوسکے۔ اسی طرح زائد بلنگ کے طوفان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ حکومت کو اس سلسلے میں فوری فیصلہ کرکے اس پر عمل درآمد کرانا چاہیے ۔ کراچی میں بعض علاقوں میں گھریلو نرخوں پر 8 روپے فی یونٹ کے بجائے کمرشل ریٹس پر 22 روپے فی یونٹ بجلی فراہم کی جارہی ہے جس کے باعث عوام ماہانہ تنخواہوں کا 30 فیصد سے زائد بجلی کے بلوں کی ادائیگی میں صرف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ دو تین سال قبل کے ای ایس سی نے بجلی کے مارے عوام کو اسلامی شریعت کی مار مارنے کا فیصلہ بھی کیا تھا اور اس کے پہلے مرحلے پر کے ای ایس سی نے 21 علما اکرام سے فتویٰ حاصل کیا ہے کہ بجلی کی چوری حرام ہے۔ اس بارے میں خبر بھی شائع کرائی گئی۔ لیکن عوام سے زبردستی زائد بلنگ کرنا حرام نہیں ہے۔ اس پر کے الیکٹرک کے ذمہ داروں کو سوچنا چاہیئے۔ کے الیکٹرک کے معاملات اس قدر خراب ہوچکے ہیں کہ ایوان بالا میں اپوزیشن نے کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی (کے الیکٹرک) کی جانب سے بجلی کے صارفین کو زائد بلنگ کے معاملے پر توجہ مبذول نوٹس بھی جمع کرایا ہے۔ سینیٹ سیکرٹریٹ میں پیپلز پارٹی کے پارلیمانی لیڈر میاں رضا ربانی، سینیٹر عبدالقیوم سومرو، سینیٹر سعید غنی، سینیٹر مختار احمد دھامرا اور سینیٹر شاہی سید کی جانب سے جمع کرائے گئے

توجہ مبذول نوٹس میں 20 جون کے قومی اخبارات کی خبر کا حوالہ دیتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ کے الیکٹرک کی جانب سے کراچی میں بجلی کے صارفین کو زائد بلنگ ناانصافی اور ناجائز طریقہ سے ریونیو اکٹھا کرنے کی کوشش ہے جس کا نوٹس لیا جائے۔کے الیکٹرک بلنگ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے شہر کے رہائشی اور کمرشل علاقوں میں بھاری تعداد میں ایورج بل بھیجنے کا سلسلہ زور پکڑ گیا، ایورج بلوں میں یونٹس کی تعداد کو 10 سے 200 گناہ زائد بتا کر سینکڑوں روپے کے بل ہزاروں میں وصول کئے جاتے ہیں، زائد بلنگ کی شکایت پر صارفین کو میٹر ٹمپرنگ اور کنڈا استعمال کرنے کے جرمانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں، حیرت انگیز امر یہ ہے کہ زیادہ تر بل میٹر ریڈنگ کے بغیر جاری کئے جاتے ہیں۔ شکایت پر کنزیومر کو بجلی چوری کا الزام لگا کر واپس کر دیا جاتا ہے۔ کراچی کے تاجروں اور شہریوں نے کے الیکٹرک کی اوور بلنگ پر شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے جبکہ نمائندہ مارکیٹس ایسوسی ایشنز نے کے الیکٹرک کی زائد بلنگ کے خلاف عدالت جانے کا فیصلہ کیا ہے۔زائد بلنگ کے بارے میں جب کوئی شہری کے الیکٹرک کے دفتر شکایات کرنے جاتا ہے تو اس کو جواب دیا جاتا ہے کہ بل تو آپ کو ہر صورت میں ادا کرنا پڑے گا۔کے الیکٹرک نے ایک حربہ یہ اختیار کیا ہے کہ صارف کو پچاس ہزار کا زائد بل بھیج دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کو میٹر سست رفتار ہے۔ یہ بجلی کے نئے میٹر لگانے کا بہانہ ہوتا ہے۔ نئے میٹر کے بارے میں عوام کی شکایات ہیں کہ یہ تیس فیصد تیز ہیں۔ عوام کو سمجھ

میں نہیں آ رہا کہ وہ اس سلسلے میں کس سے داد وفریاد کریں۔ حالہ ہی میں کے الیکٹرک کی انتظامیہ نے وفاقی محتسب اور الیکٹرک انسپکٹرز کی جانب سے شہریوں کے حق میں آنے والے فیصلوں پر عمل درآمد کے بجائے فیصلوں کے خلاف عدالت سے رجوع کرنا شروع کردیا جس کی وجہ سے شہریوں کے مسائل حل ہونے کے بجائے مزید بڑھ رہے ہیں۔کے الیکٹرک کی انتظامیہ نے 50 سے زائد کیسز میں عدالتوں سے رجوع کیا ہوا ہے جب کہ وفاقی محتسب اور الیکٹرک انسپکٹرز کے پاس مجموعی طور پر 10 ہزار سے زائد شکایت التوا کا شکار ہیں۔ نیپرا نے زائد بلنگ کے ایک کیس میں کے الیکٹرک پر دس کروڑ روپے کا جرمنہ بھی کیا ہے۔ وفاقی محتسب کے کراچی آفس میں جہاں مختلف اداروں کی جانب سے شکایتوں کے دور نہ ہونے پر شہریوں کی جانب سے رجوع کیا جاتا ہے ان میں گزشتہ تین ماہ کے دوران کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی کے متعلق سب سے زیادہ شکایتیں جمع کرائی گئی ہیں۔ وفاقی محتسب کے کراچی آفس میں اس وقت 2000 شہریوں کی شکاتیں جمع ہیں۔ ان شکایتوں میں سب سے زیادہ شکایتیں زائد بلنگ کی ہیں۔ وفاقی محتسب آفس کا کہنا ہے کہ کے ای ایس سی کے افسران کو ان شکایتوں کے حوالے سے نوٹس جاری کیے جاتے ہیں مگر ان کی جانب سے اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے یہ کیسز التوا کا شکار ہیں۔ وفاقی محتسب آفس کی جانب سے شہریوں کی درخواستوں پر جب وہ دونوں جانب کا موقف سننے اور کوئی فیصلہ کرنے کے لیے عدالت لگاتے ہیں تو اس میں کے ای ایس سی کا نمائندہ شریک نہیں ہوتا جس کی

وجہ سے وہ ان پر یک طرفہ فیصلہ دینے سے گریز کرتے ہیں۔ دوسری جانب سے سندھ حکومت کے محکمہ انرجی ڈپارٹمنٹ کے تحت کام کرنے والے الیکٹرک انسپکٹر کے پاس بھی کے الیکٹرک کے خلاف ہزاروں درخواستیں موجود ہیں، سب سے زیادہ درخواستیں اورنگی ٹاؤن زون اور لیاقت آباد، گلشن اقبال زون کی ہیں، کئی معروف صنعت کاروں نے بھی کے الیکٹرک کے خلاف کیس دائر کیا ہوا ہے۔ ان درخواستوں میں 90 فیصد درخواستیں زائد بلنگ کی ہیں اور شہریوں کی جانب سے دی جانے والی درخواستوں میں لکھا گیا ہے کہ کے الیکٹرک کی انتظامیہ نے ان پر بغیر کسی تحقیق اور جرم ثابت ہوئے چوری کا الزام عائد کیا اور کے الیکٹرک کے تمام علاقائی دفاتر کا عملہ صرف ایک ہی جواب دیتا ہے کہ بل جمع کرادو پھر دیکھیں گے۔ کراچی میں دو الیکٹرک انسپکٹر نے کئی کیسز میں شہریوں کے حق میں فیصلہ بھی دیا تاہم کمپنی کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ تسلیم نہیں کیا اور ان فیصلوں کے خلاف عدالت سے رجوع کرلیا جس کی وجہ سے شہری کو کئی ماہ بعد اپنے حق میں فیصلہ آنے کے باوجود انصاف نہیں مل رہا۔ حال ہی میں گلشن اقبال میں بھی کے الیکٹرک کی جانب سے سینکڑوں شہریوں کو زائد بل موصول ہوئے ہیں۔ یہ بھی شنید ہے کہ کے الیکٹرک نے اپنے عملے کو ہدایت کی ہے کہ زائد بل کرو۔ ورنہ ملازمت سے نکال دیئے جاؤگے۔ کراچی چیمبر آف کامرس نے بھی بجلی طویل بندش پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کے الیکٹرک کا ناقص کارکردگی پر کڑی تنقید کی۔ کے الیکٹرک کے قریبی ذرائع بتاتے ہیں کہ کے الیکٹرک فرنس آئل سے

چلنے والے تھرمل پاور پلانٹس سے 1200 میگا واٹ بجلی کی پیداوار کی صلاحیت رکھتا ہے، ایسے ہنگامی حالات میں کے الیکٹرک کو طلب کے مطابق بجلی کی پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن وہ فرنس آئل کے اخراجات سے بچنے کے لیے ایسا نہیں کیا جاتا اور تھرمل پاور پلانٹس کو بند رکھا جاتا ہے۔ عوام کو خدمات فراہم کرنے والے ادارے کو کم از کم ہنگامی حالات میں ان پلانٹس کو ضرور چلانا چاہیے تاکہ عوام کی مشکلات کو کم کیا جاسکے۔ شہر بھر کے تمام صنعتی زونز اور کمرشل مراکز میں بجلی کی سپلائی معطل ہونے کی وجہ سے تاجر و صنعتکار برادری کو مالی نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک دن بجلی کی بندش سے تاجر و صنعت کار برادری کو 4 سے 5 ارب روپے کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ کاروباری و صنعتی سرگرمیاں بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں اور پیداواری نقصانات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ عمران خان کے دھرنے میں سول نافرمانی کی تحریک میں بجلی کے بل ادا نہ کرنے کی اپیل کے جواب میں کراچی کے شہری بھی اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں اگر ایسا ہوا تو کے الیکٹرک کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بجلی کی عدم فراہمی اور زائد بلوں کی شکایات پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ کراچی کے شہریوں کا پیمانہ صبر لبریز بھی ہو سکتا ہے۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین، جماعت اسلامی کی قیادت، وزیراعظم میاں محمد نواز شریف، گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد، وزیراعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ اور متعلقہ وفاقی وصوبائی وزرا کو ملک میں زائد بلنگ کی ان جائز شکایات

پر توجہ دینی اور بجلی بحران کے حوالے سے موجودہ صورتحال کا نوٹس لینا چاہیئے۔ کراچی اور ملک کے دیگر حصوں میں ان کمپنیوں کو انفرااسٹیکچر کو بہتر بنانے کے لیے سرمایہ کاری بھی کرنا چاہیئے، صرف بجلی کے صارفین کو دودھ دینی والی گائے سمجھ کر اس کا دودھ ہی نہیں دھونا چاہیئے۔

سائبر کرائم ساری دنیا کا درد سر

انٹرنیٹ کی دنیا میں سائبر کرائم ایک ایسا جرم ہے جس میں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ویب سائٹ کو ہیک کرنا، غیر قانونی ہیکنگ سائٹس بنانا، کسی شخص کا پاس ورڈ چرا کر اس کا غلط استعمال کرنا، کسی بھی شخص کی فحش تصاویر بنا کر انہیں انٹرنیٹ پر شائع کرنا، بیہودہ اور سپیم ای میل بھیجنا،بڑے اداروں کی معلومات چرا کر انہیں دیگر ممالک یا کمپنیوں میں لنک کرنا، معلومات چرا کر لوگوں کو لوٹنا اور فحش فلمیں بنا کر بیرون ملک فروخت کرنا شامل ہیں۔

عطا محمد تبسم

دنیا بھر میں انٹرنیٹ کے ذریعے ہونے والے جرائم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ سائیبر کرائم کا جال ملکوں ملکوں پھیلتا جا رہا ہے۔ ساری دنیا میں یہ جرائم ہو رہے ہیں لیکن ان کے سدباب کے لئے کوئی مشترکہ کوشش نظر نئی آتی۔ سائبر کرائم ایک ایسا جرم ہے جس میں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ویب سائٹ کو ہیک کرنا، غیر قانونی ہیکنگ سائٹس بنانا، کسی شخص کا پاس ورڈ چرا کر اس کا غلط استعمال کرنا، کسی بھی شخص کی فحش تصاویر بنا کر انہیں انٹرنیٹ پر شائع کرنا، بیہودہ اور سپیم ای میل بھیجنا،بڑے اداروں کی معلومات چرا کر انہیں

دیگر ممالک یا کمپنیوں میں لنک کرنا، اور فحش فلمیں بنا کر بیرون ملک فروخت کرنا شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عالمی پیمانے پر 'تقریبا 100' لوگ ہی ہیں جو پوری دنیا کے سائبر جرائم کے لیے ذمہ دار ہیں۔یورپی یونین کے پولس سائبر کرائم سینٹر کے سربراہ ٹرولز اورٹنگ کہتے ہیں کہ تفتیش کرنے والے افسران اگر 'بہترین پروگرامرز کے ایک مختصر گروہ پر توجہ دیں تو بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔' انھوں نے کہا: 'ہم انھیں بمشکل ہی جانتے ہیں۔ اگر ہم ان لوگوں کو ناکارہ کر دیتے ہیں تو باقی اپنے آپ گر جائیں گے۔' ان کا خیال ہے کہ سائبر کرائم سے نمٹنا مشکل کام ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بڑھنے ہی والی ہے۔اورٹنگ کہتے ہیں: 'ہم ابھی ان کا سامنا کر سکتے ہیں لیکن مجرموں کے پاس زیادہ وسائل ہیں۔ ان کے سامنے مشکلات بھی نہیں ہیں۔ وہ لالچ اور منافع کے لیے کام کر رہے ہیں۔'

انھوں نے کہا: 'ہم جتنی رفتار سے انھیں پکڑ رہے ہیں وہ اس سے زیادہ تیزی سے مال ویئر (کمپیوٹر وائرس) بنا رہے ہیں۔'

ان کے مطابق سائبر جرائم کا سامنا کرنے میں سب سے بڑی مشکل ایسے مجرموں کا

کسی ملک اور سرحد کے باہر ہوتا ہے۔انھوں نے کہا: 'مجرم اب ہمارے ملک میں نہیں آتے۔ وہ بہت دور بیٹھ کر جرم کرتے ہیں۔ عام حکمت عملی سے ہم انھیں نہیں پکڑ سکتے۔'ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سائبر کرائم سے جڑے بیشتر اہم مجرم روسی زبان بولنے والے علاقوں سے آتے ہیں۔اورنگ حال ہی میں روسی دارالحکومت ماسکو میں سائبر جرائم پر بات چیت کے لیے گئے تھے۔انھیں امید ہے کہ مجرموں کو گرفتار کیا جائے گا اور انھیں سزا ملے گی۔انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی روز افزوں تعداد نے سائبر کے مجرمین کے کام کو قدرے مشکل بنا دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ سائبر کے جرائم پیشہ افراد مال ویئر کو آن لائن پر فروخت کر رہے ہیں۔عام لوگوں کو ان مجرموں سے کس طرح کا خطرہ ہو سکتا ہے، اس پر اورنگ نے کہا: 'آپ کو اپنی ذاتی اور حساس معلومات کی حفاظت کے بارے میں سوچنا چاہیے۔آپ کے بارے میں تھوڑی سی معلومات حاصل کر کے وہ آپ کے گوگل، فیس بک یا آئی فون اکاؤنٹ میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔'تاہم اورنگ کا خیال ہے کہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی روز افزوں تعداد نے ان کے کام کو قدرے مشکل بنا دیا ہے۔ پاکستان میں راولپنڈی کے ایک اے ٹی ایم سے کروڑوں روپے اڑا لیئے گئے۔ سائیبر کرائم کرنے والوں نے ایسی چپس اے ٹی ایم میں لگا دی تھی۔ جس سے اے ٹی ایم استعمالکرنے والوں کی تمام معلومات منتقل ہو جاتی تھی۔
اب محققین نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ سائبر چوروں نے اے ٹی ایم یعنی کیش مشین سے رقم اڑانے کے لیے وائرس کا استعمال کیا ہے۔

حالیہ تحقیق میں کہا گیا ہے کہ مجرموں نے مشین میں سوراخ کرکے اس کے ساتھ یو ایس بی منسلک کی تاکہ اے ٹی ایم کا استعمال کرنے کے لیے وہ اس میں خراب سافٹ ویئر ڈال سکیں۔جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں ہیکروں پر مبنی 'کیاس کمپیوٹنگ کانگریس' نامی تھیم کے تحت اس حملے کی تفصیلات بتائی گئیں جس میں ایک بینک کی کیش مشین کا ذکر کیا گیا تاہم بینک کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔اس میں یہ بات بھی کہی گئی کہ سائبر چور ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے۔اس سارے معاملے کی جن دو محققین نے تحقیق کی ہے انھوں نے بھی یہ استدعا کی ہے کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔چوری کا علم جولائی سنہ 2013 میں اس وقت سامنے آیا جب اس بینک نے یہ محسوس کیا کہ ان کی اے ٹی ایم سارے حفاظتی اقدام کے باوجود خالی ہو رہی ہے۔جب نگرانی بڑھائی گئی تو بینک کو یہ معلوم ہوا کہ چور مشین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرکے اس کے ساتھ کمپیوٹر وائرس والی یو ایس بی سٹک منسلک کر دیتے ہیں۔ایک بار جب اے ٹی ایم میں خراب وائرس چلے جاتے ہیں پھر وہ اس سوراخ کو بند کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ ایک ہی مشین کو بغیر کسی مزید خطرے کے بار بار نشانہ بنا سکتے ہیں۔شروع میں چور اپنا کوڈ ایکٹیویٹ کرنے کے لیے 12 ہندسوں پر مشتمل ایک کوڈ ڈالتے ہیں جو مخصوص انٹرفیس لانچ کر دیتے ہیں۔چار متاثرہ مشینوں میں انسٹال کیے جانے والے خراب سافٹ ویئر کے تجزیہ سے یہ معلوم ہوا کہ ایک مخصوص انٹرفیس اس مشین میں موجود رقم کے

بارے میں معلومات دیتا ہے کہ اس مخصوص مشین میں کس قیمت کے کتنے نوٹ ہیں۔ یعنی کتنے پانچ سو کے نوٹ ہیں، کتنے ہزار کے نوٹ ہیں اور کتنے سو کے نوٹ ہیں وغیرہ۔ اور اس میں پھر ایک مینو یا فہرست موجود ہوتی ہے جس میں یہ سہولت ہے کہ آپ اس میں سے کس قسم کا نوٹ کتنی مقدار میں نکالنا چاہتے ہیں۔

تحقیق کاروں کا کہنا ہے کہ اس طرح کے حملہ آور سب سے زیادہ قیمت والے نوٹ کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انھیں زیادہ خطرہ اٹھائے بغیر کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رقم حاصل ہوسکے۔ تحقیق کاروں کا کہنا ہے کہ اس طرح کے حملہ آور سب سے زیادہ قیمت والے نوٹ کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انھیں زیادہ خطرہ اٹھائے بغیر کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رقم حاصل ہوسکے۔ لیکن اس جرم کے ماسٹر مائنڈ کو اس بات کی بھی فکر ہے کہ کہیں ان کے گروہ کا کوئی آدمی یہ کام اکیلے ہی نہ کرلے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مخصوص پروگرام میں بھی خفیہ کوڈ رکھا ہوا ہے اور اسی کے بعد اے ٹی ایم سے رقم نکل سکتی ہے۔اور کوڈ جاننے کے لیے ہر بار گینگ کے دوسرے رکن کو فون کرنا پڑتا ہے مزید.برآں اگر وہ تین منٹ تک اس مشین پر کچھ نہیں کرتے تو وہ مشین پھر سے معمول پر آ جاتی ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ اس سافٹ ویئر کا نام تو وہ نہیں جان سکے۔ لیکن اس کے سدباب کی کوشش کی جارہی ہے۔ حال ہی میں .برطانیہ کے وزیر دفاع نے قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے ایک سائبر یونٹ تشکیل دینے کے

منصوبے کا اعلان کیا ہے۔ نئے جوئنٹ سائبر ریزرو یونٹ کے لیے وزارت دفاع کمپیوٹر کے سینکڑوں ماہرین کو بطور ریزرو بھرتی کرے گی جو مستقل اراکین کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔ وزیر دفاع فلپ ہیمنڈ کا کہنا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو یہ نئی فورس سائبر حملے بھی کرے گی۔ اس سلسلے میں بھرتیاں کا سلسہ اگلے ماہ شروع کیا جائے گا۔ اس فورس کا کام کمپیوٹر نیٹ ورک اور اہم ڈیٹا کا تحفظ ہوگا۔ وزارت دفاع نے ایک بیان میں کہا ہے کہ 'جوائنٹ سائبر یونٹ کی تشکیل سے ان لوگوں کی انفرادی قابلیت، ہنر اور مہارت سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا جو انہوں نے سویلین تجربے سے حاصل کی ہے اور خطروں سے نمٹا جائے گا۔' فلپ ہیمنڈ نے اخبار دی میل آن سنڈے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ سائبر حملوں' سے دشمن کے کمیونیکیشن، جوہری اور کیمیائی ہتھیاروں، ہوائی و بحری' جہازوں کو ناکارہ بنایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا 'لوگ ملٹری کی بارے میں جب بات کرتے ہیں تو بری، بحری اور ہوائی کا سوچتے ہیں۔ بہت عرصہ قبل ایک چوتھی قسم خلا آئی تھی اور اب پانچویں سائبر ہے۔

اب دفاع کے لیے ایک اور محاذ ہے۔ کئی سالوں سے ہم ایک دفاعی نظام بنا رہے ہیں' تاکہ خود کو سائبر حملوں سے محفوظ رکھ سکیں لیکن اب وہ کافی نہیں ہے۔' آپ جارحانہ صلاحیت سے لوگوں کو روک سکتے ہیں۔ ہم دشمن کے سائبر حملوں کا جواب دینے کے لیے برطانیہ میں سائبر حملے کی صلاحیت پیدا کریں گے۔ سائبر

کو اب بری، بحری، ہوائی اور خلائی کارروائیوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔ ''ہمارے کمانڈر مستقبل کی لڑائیوں میں روایتی ہتھیاروں کے ساتھ سائبر ہتھیار بھی استعمال کر سکیں گے۔' حالیہ برسوں میں سائبر حملے اور جرائم بہت عام ہوتے جا رہے ہیں۔

جولائی میں برطانوی خفیہ ادارے جی سی ایچ کیو نے بی بی سی کو بتایا تھا کہ برطانیہ کی حکومت اور انڈسٹری کے نیٹ ورک کو ہر ماہ جاسوسی کی غرض سے ستر سائبر حملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گزشتہ دسمبر میں کابینہ کے وزیر فرانسس موڈے نے ایک تحریری بیان میں کہا تھا کہ دو ہزار بارہ میں 93 فیصد بڑے اداروں اور 76 فیصد چھوٹے کاروباروں نے سائبر حملے کی رپورٹ کی تھی۔ برطانیہ میں بچوں کے استحصال کے واقعات پر نظر رکھنے والے ادارے نے کہا ہے کہ ملک میں سینکڑوں بچوں کو آن لائن بلیک میلنگ کے ذریعے جنسی حرکات کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

چائلڈ ایکسپلائٹیشن اینڈ آن لائن پروٹیکشن سنٹر کے مطابق مجرم خود کو بچہ ظاہر کر کے بچوں سے آن لائن ملتے ہیں اور انھیں مائل کرتے ہیں کہ وہ جنسی نوعیت کی تصاویر انھیں دے دیں۔ اس کے بعد وہ بچوں کو دھمکی دیتے ہیں کہ یہ تصاویر ان کے خاندان کے افراد یا دوستوں تک پہنچا دی جائیں گی۔ سی ای او پی

کے مطابق گذشتہ دو برسوں میں پیش آنے والے 12 ایسے واقعات میں 424 بچوں کو اس طریقے سے بلیک میل کیا گیا، جن میں سے 184 بچوں کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ادارے کے ڈپٹی چیف ایگزیکٹو اینڈی بیکر کا کہنا ہے کہ جنسی استحصال کے واقعات میں تیزی آئی ہے۔سائبر بلیک میلنگ کا شکار بننے والے کئی بچے خودکشی کر چکے ہیں، جن میں ایک 17 سالہ برطانوی لڑکا بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ سات نے اپنے آپ کو سنگین نقصان پہنچایا ہے، جن میں سے چھ کا تعلق برطانیہ سے ہے۔

بیکر نے کہا: 'ہم انٹرنیٹ کے ایک بہت چھوٹے سے تاریک گوشے کا ذکر کر رہے ہیں، اور یہ وہ جگہ ہے جس کی نگرانی کی ضرورت ہے۔'برطانوی بچوں کو نشانہ بنانے کی سب سے پہلی وجہ تو انگریزی زبان ہے، کیوں کہ یہ بہت مقبول زبان ہے۔اس کے علاوہ مجرم سمجھتے ہیں کہ برطانوی معاشرہ بہت آزاد خیال ہے، اس لیے وہ برطانوی بچوں کو زیادہ آسانی سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔اس سال جولائی میں 17 سالہ ڈینیئل پیری نے خودکشی کر لی تھی۔ بلیک میلروں نے پہلے انھیں جھانسا دیا کہ وہ ایک امریکی لڑکی سے چیٹنگ کر رہے ہیں، اور پھر ان سے مطالبہ کیا کہ وہ ہزاروں پاؤنڈ رقم ادا کریں۔انھیں دھمکی دی گئی تھی کہ ان کی ویڈیو چیٹنگ ان کے دوستوں اور خاندان کے افراد کو دکھائی جائے گی۔ سی ای او پی کے مطابق بلیک میلروں کا تعلق چار براعظموں سے ہے اور پانچ ایسے

واقعات ہوئے ہیں جن میں مجرم برطانیہ سے کارروائی کر رہے تھے۔ بیکر نے کہا کہ آٹھ برس تک کی عمر کے بچوں کو 'غلامانہ حرکتوں' کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ جنسی حرکات کے علاوہ ان بچوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آپ کو نقصان پہنچائیں۔ اس کے علاوہ ان سے رقم بٹورنے کی بعض کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ پاکستان میں جرائم کی وارداتوں میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور صورتحال اب یہ ہے کہ جرائم کی وارداتوں کا عام ہونا معمول کی بات بن چکی ہے۔ قتل و غارتگری، لوٹ مار اور چوری و ڈکیتی کی وارداتوں کے ساتھ ساتھ آج کل سائبر کرائم میں بھی دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جدید ٹیکنولوجی کے اس دور میں جہاں ماڈرن ٹیکنولوجی کے استعمال نے ملک و سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا، وہیں نوجوان نسل اس جدید ٹیکنولوجی کا غلط استعمال کر کے سماج کو برائیوں کی طرف بھی لے جا رہی ہے۔ سائبر کرائم ایک ایسا خطرناک جرم ہے جو موجودہ نوجوان نسل کو تباہی کے دہانے پر لے جا رہا ہے۔

وفاقی حکومت کی جانب سے سال 2007 میں سائبر کرائم آرڈیننس جاری کیا تھا، جس کے بعد موجودہ حکومت نے بھی اس آرڈیننس کی تجدید کر دی۔ اس قانون کا مقصد دیگر ممالک کی طرح پاکستان کو انٹرنیٹ کے ذریعے ہونے والے جرائم کی روک تھام کے لئے قوانین سے لیس کرنا اور نوجوان نسل کو انٹرنیٹ کے خطرات سے بچانا ہے، جبکہ انٹرنیٹ کے ذریعے کئے جانیوالے جرائم کی روک تھام کے لئے

دنیا کے تقریباً تمام ممالک نے اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ پاکستان نے بھی اس سلسلے میں قابل اعتماد اقدام اٹھائے ہیں، جن میں سائبر کرائم سے متعلق قانون سازی بھی شامل ہے۔

اس قانون سازی کے اجرا سے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پاکستان میں سائبر کرائم میں خاطر خواہ کمی آتی، لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوچکا ہے۔ اس آرڈیننس کے غیر مؤثر ہونے سے اس وقت بھی سائبر کرائم کے تحت رجسٹرڈ ہونے والے ہزاروں کیس التواء کا شکار ہیں، جبکہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے علاوہ موبائل فون کے ذریعے جرائم کرنے والے افراد کے خلاف ایف آئی اے کا سائبر کرائم ونگ بھی اب بے بس نظر آتا ہے۔ تقریباً ڈھائی سال قبل ایف آئی اے نے پاک بگز اور پاک ہیکرز کے نام سے ۲ ایسے گروپس کے خلاف کارروائی کی تھی جو پاکستان میں مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ویب سائٹس ہیک کرکے ان کا سارا ڈیٹا حاصل کرتے رہے ہیں۔ یوں تو ان دونوں گروپس سے وابستہ درجنوں نوجوانوں کو ایف آئی اے سائبر کرائم نے گرفتار بھی کیا، لیکن قانون غیر مؤثر ہونے سے ان کے خلاف کارروائی نہ کی جاسکی۔

ہیکرز کے اس گروہ نے سرکاری ویب سائٹس میں نہ صرف فیڈرل پبلک سروس کمیشن، وفاقی تعلیمی بورڈ، نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی اور کئی دیگر سرکاری اداروں کی ویب سائٹس کو ہیک کیا، بلکہ ایف آئی اے کی ویب سائٹ کو بھی نہ بخشا گیا

جبکہ غیر سرکاری ویب سائٹس کی تعداد کئی گناہ زیادہ ہے۔ ایف آئی اے کی جانب سے پاک بگز کے خلاف مناسب کارروائی تو نہ ہو سکی، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس گروپ کی منفی سرگرمیاں کافی حد تک محدود ہو گئیں، لیکن پاک ہیکرز نامی گروپ سرکاری و غیر سرکاری ویب سائٹس ہیک کرنے کے علاوہ مختلف ڈسکشن فورمز اور ویب سائٹس کی انتظامیہ کو سائٹس ہیک کرنے کی دھمکیاں دینے سے باز نہیں آیا۔

آئی ٹی درسگاہ ڈوٹ کوم نامی ویب سائٹ حکومتی سرپرستی کے بغیر قومی زبان میں آئی ٹی کی مفت تعلیم دیتی ہے۔ اس فورم پر کام کرنے والی ٹیم تعلیم یافتہ اور پیشہ ور افراد پر مشتمل ہے جو اپنی مدد آپ کے تحت مختلف فورمز پر آئی ٹی کی مفت تعلیم فراہم کرتے ہیں۔ آئی ٹی تعلیم کی درجہ بندی میں اس وقت پاکستان کا نمبر 140 ہے، جو ایک خوش آئند بات ہے۔ اس کے علاوہ براڈ بینڈ انٹرنیٹ سروس استعمال کرنے والوں میں پاکستان کا نمبر پوری دنیا میں چوتھا ہے۔ آئی ٹی کے فروغ میں جہاں حکومت اہم کردار ادا کر رہی ہے وہیں آئی ٹی درسگاہ جیسی بیشتر ویب سائٹس بھی حکومتی سرپرستی کے بغیر آئی ٹی کے شعبے میں پاکستان کا نام روشن کر رہی ہیں۔

آئی ٹی درسگاہ ڈوٹ کوم کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ پاک ہیکرز نامی گروپ نے ان کی ویب سائٹ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ ہیکرز گروپ کا طریقہ واردات

یہ ہے کہ اس نے ایک غیر قانونی ویب سائٹ بنا رکھی ہے جہاں پیسے بٹورنے کی غرض سے انٹرنیٹ ہیکنگ سکھائی جا رہی ہے جن میں ویب سائٹ ہیکنگ، ای میل ہیکنگ، کمپیوٹر نیٹ ورک ہیکنگ، پاس ورڈ ہیکنگ، کریڈٹ کارڈ چوری، بینک اکاؤنٹ ہیکنگ اور سم کلوننگ وغیرہ جیسے مکروہ دھندے شامل ہیں۔ یہ گروپ اپنی سائٹ پر رجسٹر ہونے والے ممبرز کا ڈیٹا حاصل کرکے ان کی اجازت کے بغیر ان کے ای میل سرور تک رسائی حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ان کی ذاتی معلومات چرا لیتا ہے۔ایف آئی اے نے ہیکنگ اور کریکنگ حملوں کی روک تھام اور اس میں ملوث افراد کی گرفتاری کے لئے سائبر کرائم کی ایک ویب سائٹ بھی لانچ کی ہے۔ جس پر ہیکنگ اور کریکنگ سے بچاؤ کے علاوہ کاپی رائٹ اور سائبر کرائم سے متعلق قانونی معلومات بھی موجود ہیں، لیکن حکومت کی طرف سے مناسب تشہیر نہ ہونے کے باعث انٹرنیٹ سے وابستہ صارفین کی اکثریت اس سے لاعلم ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے پاکستان میں سائبر کرائم کے خاتمے کے لئے ایسے گروپس کے خلاف ایف آئی اے کو براہ راست کارروائی کرنا ہوگی۔

امن کا نوبل انعام بچوں کے نام

امن کا نوبل انعام پاکستان اور بھارت کو پہلی بار مشترکہ طور پر ملا ہے۔ یہ انعام بچوں کے نام ہے، پاکستان کی ملالہ ، گل مکئی سے نوبل انعام تک پہنچ گئی۔ اور بھارت میں بچوں کے لئے کام کرنے والے اکسٹھ سالہ کیلاش ستیار تھی نے تو اپنی عمر ہی بچوں کے بچپن کو بچانے کے لئے لگا دی۔ ہندوستان کے کیلاش ستیار تھی اور پاکستان کی ملالہ یوسف زئی کی عمروں میں فرق کے باوجود دونوں بچوں کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ملالہ بچوں کی تعلیم کی حمایت میں ملکوں ملکوں گھوم رہی ہیں تو ستیار تھی ہندوستان میں بچوں کے مستقبل کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ 80ہزار سیز ائد بچوں کی زندگی بدلنے والے کیلاش ستیار تھی کو اور بچوں کی تعلیم کے لئے سرگرم رول ادا کرے والی پاکستان کی ملالہ یوسف زئی کو مشترکہ طور پر اس سال کے نوبل امن انعام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ نوبل کی انعامی رقم 12 لاکھ ڈالر کے قریب ہے۔ ملالہ اور کیلاش کو اس کا نصف نصف ملے گا۔ نوبل پرائز کی ویب سائٹ کے مطابق ملالہ اور کیلاش ستیار تھی کو یہ ایوارڈ ان کی بچوں اور نوجوانوں کے استحصال کے خلاف جدوجہد اور تمام بچوں کے لئے تعلیم کے حق کے لئے کوششوں پر دیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ 11 جنوری 1954 کو پیدا ہوئے کیلاش ستیار تھی بچپن بچاؤ آندولن کے روح رواں ہیں۔ وہ تقریباً دو دہائی سے بچہ

مزدوری کے خلاف آواز بلند کررہے ہیں اور اس تحریک کو عالمی سطح پر لے جانے کے لئے مشہور ہیں۔ کیلاش ستیارتھی کی کوششوں سے اب تک تقریباً80ہزار بچوں کی زندگی میں نئی روشنی آئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے بعد ملالہ دوسری پاکستانی ہیں جنہیں نوبل انعام سے نوازاگیا ہے۔بی بی سی اردو سروس میں گل مکئی کے نام سے سوات سے ڈائریاں لکھ کر عالمی شہرت حاصل کرنے والی ملالہ یوسف زئی کو اکتوبر2012ء میں طالبان نے حملے کا نشانہ بنایا تھا۔ حملے کے وقت وہ مینگورہ میں ایک اسکول وین میں گھر جارہی تھی۔ اس حملے میں ملالہ سمیت دو اور طالبات بھی زخمی ہوئی تھیں۔ ابتدائی علاج کے بعد انہیں برطانیہ منتقل کیا گیا جہاں وہ صحت یاب ہونے کے بعد اب زیر تعلیم ہیں۔

بعد ازاں حکومت پاکستان نے انہیں سوات میں طالبان کے عروج کے دور میں بچوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھانے پر نقد انعام اور امن ایوارڈ بھی دیا تھا۔ انہیں2011ء میں انٹر نیشنل چلڈرن پیس پرائز کے لئے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ ملالہ یوسف زئی کا تعلق سوات کے صدر مقام مینگورہ سے ہی ہے۔ سوات میں 2009 میں فوجی آپریشن سے پہلے حالات انتہائی کشیدہ تھے اور شدت پسند مذہبی رہنما مولانا فضل اللہ کے حامی جنگجو وادی کے بیشتر علاقوں پر قابض تھے جب کہ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی پابندی لگادی گئی تھی۔

ناورے کی نوبل کمیٹی کے سربراہ تھوربجورین جگلینڈ نے کہاکہ نوبل کمیٹی اس بات پر مسرت کا اظہار کرتی ہے کہ امن کا نوبل انعام ایک ہندو اور ایک مسلمان کو دیا جارہا ہے یعنی ایک ہندوستانی

اور ایک پاکستانی کو تاکہ دونوں ممالک انتہا پسندی اور تعلیم کے خلاف مشترکہ جدو جہد میں شریک ہوں۔ ملالہ کو عالمی سطح پر پذیرائی ملنے سے صوبہ خیبر پختونخوا اور باالخصوص ملاکنڈ ڈویژن میں تعلیمی اداروں میں بچیوں کے داخلے کی شرح میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ملالہ بچوں کی تعلیم خصوصا لڑکیوں کی تعلیم کے لئے آزادی کا ای استعارہ ہیں۔ صوبہ خیبر پختونخوا کے وزیر تعلیم عاطف خان کہتے ہیں کہ "صوبے میں ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں دو لاکھ سے زیادہ بچوں کی مختلف سکولوں میں انرولمنٹ ہوئی ہے۔ ان میں 75 ہزار بچیاں ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ اب لوگوں کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ تعلیم کے بغیر ترقی کرنا ممکن نہیں۔ ملالہ کا واقعہ ایک افسوس ناک تھا دعا ہے کہ پھر ایسا نہ ہو"۔ محکمہ تعلیم سوات کے حکام کا کہنا ہے کہ طالبان کے جانے کے بعد اور ملالہ کی مہم کے نتیجے میں ملاکنڈ ڈویژن میں تعلیمی اداروں میں طلبا و طالبات کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن حکومت تعلیمی اداروں میں ایک ہزار سے زائد خواتین اساتذہ کی کمی اور دو سو کمرے تعمیر کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہے، جس کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ملاکنڈ ڈویژن میں 2011 کے بعد سکولوں میں داخلے کی شرح 34 فیصد سے بڑھ کر 50 فیصد ہو گئی ہے۔ سوات کے لوگ پُر امید ہیں کہ جلد یہاں اعلیٰ تعلیمی ادارے پہلے کی طرح تعلیم کی روشنی پھیلائیں گے۔ دہشت گردوں نے صوبہ خیبر پختونخوا اور ملحقہ قبائلی علاقوں میں آٹھ سو زیادہ سرکاری سکولوں کو

تباہ کیا تھا۔ صرف ملاکنڈ ڈویژن میں دہشت گردوں نے 182 سکول تباہ کیے تھے اور صوبائی حکومت ابھی تک صرف 43 سکولوں کو دوبارہ تعمیر کر پائی ہے۔

دوسری جانب عالمی برادری کے تعاون سے درجنوں سکول فعال ہو چکے ہیں۔ سکولوں کو تباہ کرنے کے علاوہ ملاکنڈ ڈویژن میں طالبان اپنے غیر قانونی ایف ایم ریڈیو سے لڑکیوں کو سکول نہ بھیجنےکی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ اس مہم کے نتیجے میں سوات کی تحصیل چار باغ میں چار سو زیادہ طالبات نے سکول چھوڑا تھا لیکن طالبان کے جانے کے بعد انہوں نے فوراً ہی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ ملاکنڈ ڈویژن سے تعلق رکھنے والی رُکن صوبائی اسمبلی نگینہ خان کا کہنا ہے کہ ''سوات پہلے بھی تعلیمی میدان میں آگے تھا کچھ عرصے کے لیے یہ سلسلہ رک گیا لیکن آج پھر سے شروع ہو گیا ہے۔ سوات میں اور بھی ملالہ ہیں اور ہر لڑکی یہی چاہتی ہے کہ وہ بھی تعلیم حاصل کرکے ملالہ جیسی بن جائے''۔ سوات کے بعض علاقوں میں آج بھی خوف کی فضاء قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ سوات کے لوگ کھل کر ملالہ پر بات نہیں کرتے لیکن ملالہ کو نوبل ایوارڈ ملنے کی دُعا ضرور کرتے رہے ہیں۔ ملاکنڈ ڈویژن میں 2011 کے بعد سکولوں میں داخلے کی شرح 34 فیصد سے بڑھ کر 50 فیصد ہو گئی ہے۔ ملاکنڈ ڈویژن سے تعلق رکھنے والے سابق وزیر تعلیم سردار حسین بابکا کہنا ہے کہ ملالہ پر حملے نے عوام میں تعلیم کی اہمیت مزید اجاگر کی ہے ''ملالہ پر حملہ ہوا تو اس سے پوری قوم کو یہ احساس ہوا کہ انہوں نے اپنے بچوں اور خصوصاً لڑکیوں کو

پڑھانا ہے۔ خواتین کی تعلیم کی شرح میں اضافہ ہوا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہمارے صوبے میں خواتین کی شرح خواندگی سو فیصد ہو جائے گی''۔ ان کا مزید کہنا تھا خیبر پختونخوا ایک عرصے سے دہشت گردی کی زد میں رہا اور آج بھی ہے دہشت گرد'' جہاں بے گناہ انسانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں تعلیمی اداروں کو بھی تباہ کیا ہے لیکن ہمیں اُمید کہ یہ دن جلد ہی گزر جائیں گے''۔ سوات کے لوگ پُر امید ہیں کہ جلد ان کی وادی کا امن مکمل طور بحال ہو گا اور یہاں اعلیٰ تعلیمی ادارے پہلے کی طرح تعلیم کی روشنی پھیلائیں گے۔ پاکستان اور خاص طور پر خیبر پختونخوا کے طلبا و طالبات ملالہ کو اپنا آئیڈل کہتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ ملالہ ملک سے جہالت ختم کرنے اور تعلیمی میدان میں آگے جانے کی اپنے مشن میں کامیاب ہو جائے۔ دوسری جانب بھارت میں بچوں کے حقوق کا اگر ذکر ہو تو 'بچپن بچاؤ تحریک' کا ذکر بھی آ ہی جاتا ہے۔ یہ غیر سرکاری ادارہ کیلاش ستیار تھی نے قائم کیا تھا اور اسے بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے اداروں میں سرِ فہرست مانا جاتا ہے۔ ستیار تھی نوبیل امن انعام حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی ہیں۔ مہاتما گاندھی تک اس اعزاز سے محروم رہے تھے۔ اپنے انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ 'تمام ہندوستانیوں کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے، یہ ان بچوں کے لیے بھی بڑا اعزاز ہے جو آج بھی غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں، میں اس اعزاز کو دنیا میں محرومی کا شکار بچوں کی نذر کرتا ہوں۔

ستیارتھی سنہ 1954 میں مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے تھے اور پیشے کے لحاظ سے وہ الیکٹریکل انجینیئر تھے لیکن 26 سال کی عمر میں ہی انھوں نے اپنی نوکری چھوڑ کر بچوں کے حقوق کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کا ادارہ اب تک ہزاروں بچوں کو کہیں غلامی تو کہیں استحصال سے بچا چکا ہے۔ ان کے کام کا بنیادی محور وہ بچے ہیں جن سے زبردستی کام کروا کر ان کا بچپن چھین لیا جاتا ہے۔ فی الحال وہ 'گلوبل مارچ اگینسٹ چائلڈ لیبر' کے سربراہ بھی ہیں۔

اگرچہ ستیارتھی کا نام نوبیل انعام کے لیے نامزد کیا گیا تھا لیکن بھارت میں نہ اس کا کوئی خاص ذکر تھا اور شاید نہ ہی کسی کو یہ امید تھی کہ نوبیل کمیٹی ستیارتھی کو اس اعزاز سے نواز سکتی ہے۔ ستیارتھی کی تحریک نے 80 کے عشرے میں انڈیا میں بچوں سے مزدوری کروائے جانے کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے پہل کی تھی۔ یہ ادارہ بین الاقوامی سطح پر ان چیزوں کے بائیکاٹ کے لیے بھی مہم چلاتا ہے جو بچوں کا استحصال کر کے بنوائی جاتی ہیں۔ بچپن بچاؤ تحریک کی ویب سائٹ کے مطابق یہ ادارہ بچوں کو آزاد کر کے ان کی تعلیم جاری رکھنے اور انھیں دوبارہ بسانے کا انتظام کرتا ہے۔ ستیارتھی کی تحریک نے 80 کے عشرے میں انڈیا میں بچوں سے مزدوری کروائے جانے کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے پہل کی تھی۔ یہ ادارہ بین الاقوامی سطح پر ان چیزوں کے بائیکاٹ کے لیے بھی مہم چلاتا ہے جو بچوں کا استحصال کر کے بنوائی جاتی

ہیں۔ ستیارتھی کے مطابق جن بچوں سے مزدوری کروائی جاتی ہے ان میں سے تقریباً 70 فیصد کا تعلق دیہی علاقوں سے ہوتا ہے، لہٰذا 2001 میں ادارے نے ایک نئی سکیم شروع کی جس کے تحت دیہات میں ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں بچوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنایا جاسکے اور ان کی تعلیم اور گزر بسر کا مناسب انتظام ہو۔ نوبیل امن انعام 1979 میں مدر ٹریسا کو دیا گیا تھا جنھوں نے اپنی زندگی بھارت میں کوڑھ کے مرض میں مبتلا لوگوں اور بے گھر افراد کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔۔ ستیارتھی نے اپنی زندگی اس مشن کے لئے وقف کر رکھی ہے، پیشے کے اعتبار سے الیکٹرک انجینئر کیلاش ستیارتھی نے 26 برس کی عمر میں ہی کیریئر چھوڑ کر بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی اس تنظیم نے اب تک 80 ہزار بچوں کی زندگی کو نئی روشنی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نوبیل امن انعام حاصل کرنے والے کیلاش کا کہنا ہے "یہ ان تمام بچوں کے لیے وقار کی بات ہے، جو ٹیکنالوجی اور معیشت کی اتنی ترقی کے باوجود غلامی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ میں اس جدید دور میں اذیت سے گذرنے والے لاکھوں بچوں کی بدحالی کو دور کرنے کے کام کو تسلیم کرنے کے لیے نوبیل کمیٹی کا مشکور ہوں۔" انھوں نے مزید کہا کہ وہ ملالہ کے ساتھ مل کر چائلڈ لیبر سے لڑنا چاہتے ہیں۔ بے امنی کے اس دور میں جب کہ پاک بھارت فوجیں سرحدوں پر لڑائی لڑ رہی ہیں، ایسے وقت میں ان دونوں ممالک کے دو ایسے افراد کو امن کا ایوارڈ ملنا، جن کو اپنی سوسائٹیز

میں بھی تنقید کا سامنا ہے، بہت بڑی بات گردانی جارہی ہے۔ملالہ نے جب سوات میں لڑکیوں کی تعلیم کی بات کی تو اسے گولی کا نشانہ بنایا گیا اور اس ایوارڈ کے جواب میں بھی اس کے دشمن اسے ایک بار پھر تیز دھار اوزاروں سے قتل کرنے کا علان کر چکے ہیں، ایسی ہی صورتحال کا سامنا ستیارتھی کو کئی بار کرنا پڑا، لیکن ان دونوں نے ہار ماننے سے انکار کرتے ہوائے اپنا سفر جاری رکھا۔ الیکٹرک انجینئر کیلاش ستیارتھی گیارہ جنوری 1954ء کو بھارت کے وسطی ریاست مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے۔انہوں نے اپنا شاندار کیریئر قربان کرکے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا شروع کیا تاکہ معاشرے کو زیادہ پر امن اور خوبصورت بنایا جاسکے۔ بچہ مزدوری کے خلاف مہم چلا کر ہزاروں بچوں کی زندگیاں بچانے کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔کیلاش ستیارتھی کو نوبیل امن انعام تمام بچوں کے لیے تعلیم اور بچوں اور نوجوانوں کے استحصال کے خلاف ان کی جدوجہد کے لیے دیا جارہا ہے۔ بچوں کو بچانے کے دوران ان پر کئی جان لیوا حملے ہوئے۔ گیارہ مارچ 2011ء کو دہلی کی ایک گارمنٹ فیکٹری پر چھاپے کے دوران ان پر حملہ کیا گیا۔ اس سے قبل 2004ء میں گریٹ رومن سرکس کے بچہ فن کاروں کو آزاد کرانے کے دوران بھی ان پر حملہ ہوا تھا۔کیلاش ستیارتھی کو ان کی خدمات کے لیے اب تک بھارت میں متعدد قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ ان میں ایوارڈز میں 1994ء میں جرمنی کا دی ایکینئر انٹرنیشنل پیس ایوارڈ اور 1999ء میں جرمنی کا ہی فریڈرش ایبرٹ فاؤنڈیشن

ایوارڈ بھی شامل ہیں۔ نوبیل کمیٹی کے مطابق کیلاش ستیار تھی کو یہ ایوارڈ تمام بچوں کے لیے تعلیم اور بچوں اور نوجوانوں کے استحصال کے خلاف ان کی جدوجہد کے لیے دیا گیا ہے۔ بھارت کے مقابلے میں پاکستان بچہ مزدوری سے بڑی حد تک بچا ہوا ہے۔ لیکن پرائمری تعلیم میں خاصی کمی ہوئی ہے۔ سندھ میں تعلیم کا مستقبل بچوں کے حوالے سے مخدوش ہے۔ ملالہ کے امن نوبل انعام پانے سے شائد ان بچوں کا مقدر بھی سنور جائے۔

اسٹیٹ لائف میں چیئرپرسن نرگس گھلو کی تقرری سے ادارے کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا

نیشنل سیونگ اسکیم نے اپنے سرٹیفکیٹس کے منافع میں کمی کا اعلان کرکے ایک بار ملک کے ان لاکھوں عوام کو مشکل میں ڈال دیا ہے، جو رٹائرمنٹ ، یا کسی معذوری کے سبب اپنی بچوں کو کسی کاروبار میں لگانے سے قاصر ہیں۔ نیشنل سیونگ نے بہبود سیونگ سرٹیفکیٹ میں شرح منافع 0.48 فی صد کمی کے بعد 12.24 فی صد ہوگیاہے۔ سیونگ اکاونٹس میں شرح منافع 6.65 سے کم ہو کر 6 فی صد ہوگیا۔ ڈیفنس سرٹیفکیٹ پر شرح منافع 10.80 سے گھٹ کر 10.36 فی صد آگیا ہے۔، نیشنل سیونگ والوں کو یہ کہنا ہے کہ اسٹیٹ بینک کی جانب سے شرح سود میں کمی کے بعد نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ کے شرح منافع کو کم کیا گیاہے۔ زندگی کے اہم معا ملات جہاں بڑی رقوم کی ضرورت ہو۔ وہاں اس طرح کے منصوبوں میں حصہ لے کر بچتوں کو فروغ دیا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں اول تو ایسی منافع بخش اسکیم ناپید ہیں۔ اسلامی اور شریعہ کے مطابق بھی ایسے منصوبے حکومت کے تحت نہں ہیں۔ ماضی میں این آئی ٹی، اور حال ہی مضاربہ اسکینڈل نے عوام کے اعتماد کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ لے دے کر انشورنس کا ایک قومی ادارہ اسٹیٹ لائف رہ گیا تھا جس کی پالیساں عوام کے تحفظ میں مدد دے رہی ہیں۔ لیکن یہاں بھی حکومت اب تک اسلامی انشورنس کی پالیسیاں جاری کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اسٹیٹ لائف ملک کا قومی

اور مستحکم ادارہ ہے۔ جس لا لائف فنڈ اب ساڑھے تین سو ارب تک پہنچ چکا ہے۔ اسٹیٹ لائف ریٹائرمنٹ پر بڑی رقم کا حصول، بچوں کی تعلیم اور انکی شادی کے اخراجات، مکان کی خریداری جیسے منصوبوں کی تکمیل کے علاوہ خاندان کو تحفظ فراہم کرتی ہے، یہ ادارہ پاکستانی معیشت میں اہم کردار ادا کررہا ہے ہیں۔ اسٹیٹ لائف انشورنس آف پاکستان پالیسی ہولڈروں کو تحفظ فراہم کرتی ہے آج تک ہزاروں لوگ اس ادارے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ادارہ پاکستان کی معیشت کے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ سال بہ سال اس ادارے کا کاروبار بڑھ رہا ہے۔ سرکاری نظم ونسبق میں چلنے والا یہ واحدادارہ ہے۔ جو منافع بخش ہے۔ اور کارکردگی کے لحاظ سے بہتر۔ اسٹیٹ لائف انشورنس نے سال 2013 میں سال اول پریمیم کی مد میں گزشتہ سال کے مقابلے میں 10.45 فیصد اضافہ کیا تھا۔ 2013 میں اس کا پریمئیم 14 ارب 83 کروڑ90 لاکھ روپے تک جا پہنچا ہے۔ اسٹیٹ لائف کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مارکیٹنگ محمد اذکار خان نے اس سلسلے میں بہت محنت کی ہے۔ اسٹیٹ لائف کے بزنس میں اضافہ پالسی ہولڈرز کی جانب سے ادارے پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہے۔ انفرادی بیمہ زندگی کے تحت بیمہ داروں کی تعداد 38 لاکھ سے بڑھ کر 44 لاکھ ہو گئی ہے جبکہ گروپ اینڈ پنشن کے تحت بیمہ داروں کی تعداد 59 لاکھ سے بڑھ کر 79 لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ اسٹیٹ لائف مستحکم ترین قومی ادارہ ہے جو ملک کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کررہا

ہے جس کا ثبوت کارپوریشن کے لئے پاکستان کریڈٹ ریٹنگ ایجنسی (پاکرا) کی جانب سے ٹرپل "اے" ریٹنگ ہے۔ گذشتہ دو سال سے یہ ادارہ کسی چیئرمین اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کے بغیر چل رہا تھا۔ اس ادارے کے ملازمین، فیلڈ ورکرز فیڈریشن، اور مارکیٹنگ کے افراد کے مسلسل دباؤ احتجاج اور شور شرابے کے بعد گذشتہ روز اس ادارے کی قسمت جاگ گئی کہ حکومت نے یہاں چیئرپرشن کے طور پر محترمہ نرگس گھلو کو تعینات کر دیا۔ محترمہ نرگس گھلو کی شہرت ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر کی ہے۔ وہ اسٹیٹ لائف میں طویل عرصہ کام کر چکی ہیں۔ انھوں نے ایڈمنسٹریشن کے علاوہ مارکیٹنگ کے ایگزیکیٹیو ڈائریکٹر کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے حکومت کا یہ ایک اچھا فیصلہ ہے کہ انھوں ے ایک قابل اعتماد فرد کو اس ادارے کی ذمہ داری سونپ دی ہے۔ دو سال کسی ادارے میں چیئرمین نہ ہونے سے بہت سی خرابیاں در آئی ہیں۔ اس لئے محترمہ نرگس گھلو کو بہت باریک بینی سے معاملات کو دیکھنے ہوں گے۔ اور سخت فیصلے کرنے ہوں گے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کو درست سمت میں لے کر چلنا ہوگا۔

ادارے کی انوسمنٹ اور ریئل اسٹیٹ کے منصوبوں کو دیکھنا ہوگا تاکہ بیمہ داروں کو اچھے بونس مل سکیں۔ مارکیٹنگ کے لوگوں کی ترقیاں، رٹائرڈ ملازمیں کے مسائل، میڈکل، گریجویٹی کے مسائل بھی ان کی توجہ کے محتاج ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں ان مسائل پر توجہ دیں گی، پالسی ہولڈرز کے بونس کا اعلان کریں گی۔

نیا ایشیائی ترقیاتی بنک کیا پاکستان کے مسائل حل کر پائے گا

دنیا میں ایک دوسرے پر اقتصادی بالا دستی کے لئے کوشش جارہی ہیں۔ چین نے گلوبل ویلیج کے تصور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاشی میدان میں جو ترقی کا نقشہ بنایا تھا۔ اب آہستہ آہستہ وہ رنگ و روپ اختیار کر رہا ہے۔ گذشتہ دنوں چین نے عالمی مالیاتی اداروں کی اجارہ داری ختم کرنے کیلئےایک اور کارروائی کی۔ چینی دارالحکومت بیجنگ کے گریٹ ہال آف دا پیپل میں پچاس ارب ڈالر سے نیا ایشین بینک قائم کر دیا۔ یوں تو اس بنک کا نام،، ایشین انفراسٹرکچر انوسٹمنٹ بینک،، (AIIB) ہوگا۔ لیکن اسے ایشیائی ترقیاتی بنک کے مماثل ہی قرار دیا جارہا ہے۔ اس بنک کیقیام کی مفاہمتی یاداشت پر، پاکستان اور بھارت سمیت 21 ممالک نے دستخط کیئے ہیں۔ اس بینک میں سنگاپور جیسے ترقی یافتہ ملک سے لے کر بھارت اور چین جیسے مضبوط معاشی ممالک اور ویت نام، فلپائن، منگولیا، کمبوڈیا، ازبکستان، عمان، تھائی لینڈ، سری لنکا، قطر، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش،،برونائی، قازقستان، کویت، ملائیشیا اور میانمار شامل ہیں تاہم جاپان، جنوبی کوریا، انڈونیشیا اور آسٹریلیا اس بینک کا حصہ نہیں۔ حالانکہ چین ان ممالک کو بھی اس بینک کے قیام میں شریک کرنے کا خواہاں ہے۔ چینی صدر شی جن پنگ کی طرف سے اس بینک کا خیال گزشتہ

برس ایشیاپیسیفک کی اقوام کی ایک میٹنگ کے دوران پیش کیا گیا تھا۔ چین کی جانب سے پچاس ارب ڈالر کے علاوہ اے آئی آئی بی کیلئے 50 ارب ڈالر نجی کمپنیوں سے حاصل کئے جائیں گے ۔ یہ بینک ایشیا میں سڑکوں، ریلوے اور پاور پلانٹس، ٹیلی کیمونیکیشن جیسے منصوبوں کیلئے سرمایہ فراہم کرے گا۔ عالمی مالیاتی ماہرین کے مطابق یہ چیز علاقے کی معیشتوں کے لیے ضروری ہے۔ بینک کے قیام سے ورلڈ بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک کو چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ اب ایشیائی بنک اور ورلڈ بنک کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے۔ ماضی میں ورلڈ بینک، آئی ایم ایف یا عالمی مالیاتی فنڈ اور ایشین ڈویلپمنٹ بینک جیسے اداروں پر امریکا، جاپان اور یورپی ممالک کی اجارہ داری رہی ہے۔ جو قرض حاصل کرنے والے ممالک کو من مانی شرائط پر قرض دیتے تھے۔ امریکا نے اس بنک کے قیام کی مخالفت کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ،، اس بینک کے قیام سے عالمی مالیاتی ادارے غیر مستحکم ہوں گے۔،، یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ نیا بینک چین کی علاقائی سطح پر سرمایہ کاری کو فروغ دینے کی خواہش کے علاوہ امریکاکے ساتھ اس کے مسابقت پر مبنی تعلقات کا بھی عکاس ہے۔اس نئے بینک کے قیام کی یادداشت پر جن ملکوں کے نمائندوں نے چینی صدر شی لنگ کی سربراہی میں منعقدہ تقریب کے دوران دستخط کیے، ان میں آبادی کے لحاظ سے چھوٹے مگر مضبوط معیشتوں کے مالک ممالک مثلاً سنگاپور، ویت نام، فلپائن اور منگولیا وغیرہ شامل ہیں۔ جن ملکوں نے اس مفاہمتی یادداشت پر دستخط نہیں کیے، ان میں امریکا

کے اتحادی ملک جاپان، جنوبی کوریا اور آسٹریلیا شامل ہیں۔ واضح رہے کہ چین ان ممالک کو بھی اس بینک کے قیام میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ پاکستان بھی چین کے ساتھ اس مفاہمتی یاداشت پر دستخط کرنے والوں میں شامل ہے۔ وفاقی وزیر خزانہ اسحاق ڈار اس تقریب میں شریک تھے۔ اور چینی صدر کی موجودگی میں انھوں نے ایشیائی بینک کے قیام کی یادداشت پر دستخط کیے۔ بینک پاکستان کے انفراسٹرکچر کے منصوبوں میں پُرکشش شرائط پر فنڈز فراہم کرے گا۔ بنک کے بورڈ میں ویٹو پاور کے لئے ایک ارب ڈالر جمع کرانے کی شرط تھی۔ لیکن پاکستان یہ شرط پوری نہ کر سکا۔ پاکستان نے بینک کے ممبر کے لیئے کم سے کم معینہ رقم جو ایک ارب ڈالر سے بھی زیادہ تھی جمع نہیں کرائی تھی، اس لیے پاکستان کو بینک کے بورڈ کے اجلاس میں ویٹو پاور حاصل نہیں ہوگی، جبکہ ہندوستان نے ایک ارب ڈالر سے زیادہ فنڈز بینک کو فراہم کرکے ویٹو پاور حاصل کرلی ہے۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ، ایشیائی ملکوں نے مغرب کی معیشت کے خلاف چین کی قیادت میں ایک محاذ کھول دیا ہے۔ امریکا چین کے اس اقدام کو ورلڈ بینک جیسے عالمی اداروں کا غیر ضروری حریف تیار کرنے کی ایک کوشش قرار دیتا ہے۔
بینک کے قیام کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چینی صدر شی لنگ نے کہا کہ بینک کے تمام طریقہ کار میں عالمی مالیاتی اصولوں کو مدّ نظر رکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک کے تجربات سے بھی فائدہ اُٹھایا جائے گا۔ چینی وزیر مالیات لُو جیوائی نے مستقبل کے اس بینک کو ایک ایسا

کثیر القومی مالیاتی ادارہ قرار دیا، جو منصفانہ بنیادوں پر سب کی مدد کے لیے دستیاب ہو گا اور جس کو چلانے کے لیے بہترین طریقہ کار وضع کیا جائے گا۔ واشنگٹن چین کی بڑھتی ہوئی معاشی بالادستی سے کسی حد تک خوفزدہ ہے۔ اس لیئے اس کا کہنا ہے کہ اس نئے بینک کے قیام کے بعد مضبوط عالمی ادارے، ورلڈ بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور ایشیئن ڈیولپمنٹ بینک متاثر ہوں گے۔ دنیا کی پہلی اور دوسری مضبوط معیشتیں امریکا اور چین، ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں، کچھ عرصے قبل ایشیائی ترقیاتی بینک نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ پاکستان کی گزشتہ مالی سال میں اقتصادی ترقی کی شرح حیران کن طور پر بڑھ کر چار اعشاریہ ایک فیصد رہی ، موجودہ اور آئندہ سال مہنگائی کی شرح کم رہے گی۔ پاکستان میں دو ہزار چودہ اور پندرہ کے دوران مہنگائی کی شرح کم رہے گی۔ تاہم ملکی معشیت میں بہتری کے لیے ایشیائی بینک نے تجویز دی تھی کہ درآمدت اور ترقیاتی منصوبوں کے اخراجات میں کمی اور سبسڈیز پر غیر ترقیاتی اخراجات سے سرمایہ کاری میں واضح کمی کے خطرات نمایاں ہیں، اس بات پر بھی پاکستان کو ہمیشہ دباؤ کا سامنا رہا ہے کہ قرضوں کی ادائیگی کے لئے بجلی، گیس، اور دیگر یوٹیلیٹی کے ٹیرف میں اضافہ کیا جائے۔ شائد یہی وجوہات ہیں کہ پاکستان اب دیگر ذرائع کی جانب رجوع کر رہا ہے۔

ایشیائی ترقیاتی بنک کا قیام: 1966 میں عمل میں آیا تھا۔ اس وقت اس کے

ارکان کی تعداد: 47 تھی۔ اس بینک کا قیام اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن برائے ایشیا اور بحرالکاہل کی سفارشات پر جاپان کے تعاون سے عمل میں آیا۔ اس بینک کے قیام کے دو مقاصد بتائے گئے تھے۔ جن میں ایشیائی اور بحرالکاہل کے علاقے کے ممالک کے مابین تعاون بڑھانا، اور علاقے میں واقع ممالک کی اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا۔ لیکن عملا ان مقاصد کی بجاآوری نہ ہو سکی۔ 1986 میں چین بھی ایشیائی ترقیاتی بنک کا رکن بنا تھا۔تاہم جب سے چین نے دنیا کی معیشت کو فتح کرنے سلسلہ شروع کیا ہے۔ امریکہ جیسے ممالک پریشان ہیں کہ وہ کس طرح چین کی بڑھتی ہوئی معیشت اور اقتصادی قوت کا مقابلہ کریں۔ چار سال قبل چین پر امریکہ سمیت کئی ممالک یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ وہ اپنی کرنسی یوآن کے ایکسچینج ریٹس کم کرکے دوسرے ریاستوں کے تجارتی مفادات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔اس مسئلے پر امریکہ اور چین کے درمیان اقتصادی سرد جنگ بھی رہی۔ امریکی قانون سازوں نے ایک بل بھی متعاراف کرایا ہے جس کے مطابق اگر بیجنگ نے اپنی کرنسی کے ایکسچینج ریٹس نہ بڑھائے، تو اس کی مصنوعات پر ڈیوٹی لگائی جائے گی۔ عالمی معاشی بحران کے پیش نظر چین نے اپنی کرنسی کے ایکسچینج ریٹس کو امریکی ڈالر سے منسلک کردیا تھا، جس سے لچکدار ایکسچینج ریٹس کے دور کا خاتمہ ہوا اور جب سے چینی کرنسی قدرے مستحکم ہے۔ 2005 سے 2008 کے درمیان چینی کرنسی ڈالر کے مقابلے میں 20 فیصد بڑھی۔ اب چین کی معشیت تیزی سے ترقی کر رہی ہے جب کہ امریکی معیشت میں تنزلی

کے آثار نمایاں ہیں۔ چین امریکہ برآمدات کے لئے پہلے نمبر پر رہا۔ لہٰذا اگر امریکہ اور اس کی کمپنیاں برآمدات کے لئے کوئی مارکیٹ دیکھتی ہیں، تو یہ چینی مارکیٹ ہوتی ہے۔ کئی کمپنیوں کی مصنوعات اسمبل کرنے یا جوڑنے کا عمل چین میں ہوتا ہے، پھر یہ امریکہ درآمد کردی جاتی ہیں۔ چین سے اسی طرح مصنوعات برآمد ہوتی ہیں۔ لوگ چین کو دنیا کی ورک شاپ کہتے ہیں لیکن کئی اعتبار سے یہ مصنوعات کے پرزوں کا جوڑنے کا عالمی مرکز ہے۔" اس ساری بحث سے قطع نظر بیجنگ اور واشنگٹن کی معیشتوں کا ایک دوسرے پر بہت زیادہ انحصار ہے۔ اور نئے ایشیائی ترقیاتی بنک کے قیام سے خطے میں ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دیوالیہ ہونے سے بچئے

آئے دن اخبارات میں کسی نی کسی کے دیوالیہ ہونے یا دیوالیہ نکل جانے کی خبریں آتی ہیں۔ دیوالیہ ہونے کے اعداد و شمار ساری دنیا میں بڑھتے جارہے ہیں گزشتہ چند دہائیوں میں ایسے لوگوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے جو اپنے قرضہ جات ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ جبکہ قانون سازی کرنے والے افراد ایسے قوانین بنانے پر توجہ دے رہے ہیں جو لوگوں کے لئے خود کو دیوالیہ ثابت کرنا مشکل کردے۔ دیوالیہ ہونے والوں میں کمزور معیشت کے کاروباری حضرات ہی نہیں دینا کی بڑی بڑی مستحکم سلطنیتیں بھی شامل ہیں۔ مالیاتی اداروں کی تو بات ہی چھوڑ دیں ۔ یہ دیوالیہ پن اسکینڈل بھی ہوتا ہے اور دیوالیہ ہونے کا ڈھونگ بھی رچایا جاتا ہے۔ گزشتہ سال امریکہ میں مالی بجٹ کی عدم منظوری کی وجہ سے امریکی حکومت اور کانگریس میں جو تنازعہ شروع ہوا تو امریکی معیشت پر تباہ کن اثرات اور اس کے دیوالیہ ہونے کی پیشن گوئیاں کی جانے لگیں۔ ضروری قانون سازیاں نہ ہونے کے باعث نہ صرف معیشت کو 30 کروڑ ڈالر یومیہ کا نقصان ہورہا تھا۔ بلکہ امریکی حکومت کے ڈیفالٹ کرجانے کا بھی خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ پڑ رہا ہے۔ یونان کی بیمار معیشت کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ یونان کے قرضوں کے ڈھانچے میں تبدیلی بارے

سمجھوتہ کئے جانے کے باوجود اس ملک کے دیوالیہ ہونے کا خطرہ دور نہیں ہوا۔ مالیاتی ریٹنگ ایجنسی موڈیز کے مطابق اگرچہ یونان کے 107 ارب یورو کا قرض معاف کیا جا چکا ہے پھر بھی خدشہ ہے کہ یونان کا قرضوں کا بحران طویل عرصہ جاری رہے گا۔ ہمارے بڑے بڑے ادارے بھی دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ پاکستان سٹیل ملز تو کئی بار دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچکر بچ جاتی ہے۔ پنجاب بنک نے دیوالیہ ہو کر کتنوں کو ارب پتی بنادیا۔ 2008 میں امریکہ پر سرمایہ کاری بنکوں پر کیا گزری ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سال امریکہ کے پانچ بڑے انویسٹمنٹ بنک کا دیوالیہ نکل گیا تھا۔ دیوالیہ ہونے والا انسان کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاتا ہے اور خود کو قانونی طور پر دیوالیہ قرار دلوا کر واجب الادا قرضوں سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا ہے۔ نوکری کا چھوٹ جانا استعفیٰ، برخاستگی یا برطرفی کسی بھی وجہ سے نوکری چھوٹ جانے کے اثرات براہ راست ماہانہ انکم پر پڑتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں رہنے والوں کی ماہانہ آمدن ملازمت چھوٹ جانے کی صورت میں صفر ہو جاتی ہے۔ مغربی ممالک میں نجی شعبہ میں بھی ملازمتوں کے حوالے سے قوانین پر عمل کیا جاتا ہے اور کسی کو برطرف کرنے سے قبل اسے نوٹس دیا جاتا ہے، کہ وہ اپنے لئے کسی اور ملازمت کا بندوبست کر لے۔ مزید یہ کہ حکومت کی جانب سے بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری الاونس بھی دیا جاتا ہے جبکہ پاکستان جیسے ملک میں نجی شعبہ کے غیر مستحکم اور چھوٹے اداروں میں کسی بھی فرد کو بغیر کسی نوٹس کے فارغ کر دیا جاتا ہے

ایسے ادارے اپنے آپ کو قانونی طور پر دیوالیہ قرار دلا لیتے ہیں۔ بے روزگاری، الاونس کا تو ترقی پذیر ممالک میں تصور تک نہیں ہے۔ حد سے زیادہ قرضوں سے استفادہ بہت سے لوگوں کا اپنے اخراجات پر قابو نہیں رہتا ہے۔ ان کی خواہشات ہوتی ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ہیں جبکہ آمدن کے ذرائع محدود ہوتے ہیں، فری مارکیٹ اکنامی کے رائج ہونے کے بعد سے مالیاتی شعبہ میں مسابقت بہت بڑھ گئی ہے۔ بہت سے مالیاتی ادارے انتہائی آسان شرائط پر قرضے فراہم کرتے ہیں جو زیادہ اخراجات کے شوقین لوگوں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔ حصول میں آسان ہونے کے باعث شاہ خرچ لوگ آسان شرائط پر اتنے قرض حاصل کر لیتے ہیں کہ کچھ عرصے بعد انہیں پتہ چلتا ہے۔ آدھی سے زیادہ آمدن تو سود کی ادائیگی میں چلی جاتی ہے جبکہ بعض قرضوں کا سود ادا نہ کرنے پر سود بھی قرض کی اصل رقم میں شامل ہوتا رہتا ہے اور قرض بڑھتا جاتا ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایسے افراد کی آمدن کا ایک بڑا حصہ قرضوں کے سود ادا کرنے میں خرچ ہوتا ہے جبکہ ان کے حقیقی اخراجات پورے کرنے کے لئے ان کے پاس آمدن کی قلت ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے چار و ناچار وہ بہت سے قرضوں کا سود ادا کرنے سے کترانے لگتے ہیں اور روز مرہ کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً قرضوں کی ادائیگی کے لئے ان کی جائیدادیں تک نیلام کر دی جاتی ہیں اور بقیہ قرض ادا کرنے سے بچنے کے لئے انہیں خود کو دیوالیہ قرار دلوانا پڑتا ہے۔ خاندانی تنازعات مغربی ممالک

میں ازدواجی رشتہ ختم کرنے کی بھی اچھی خاصی لاگت آتی ہے جس میں معاہدے کے مطابق اپنے سابقہ ہمسفر کو ایک خطیر رقم بطور ہرجانہ ادا کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس فریق کا دیوالیہ نکل جاتا ہے، اسی ایما پر علیحدگی ہوتی ہے۔تاہم ایشیائی ممالک میں ازدواجی رشتوں کے ختم ہونے پر تو اتنی لاگت نہیں آتی تاہم خاندانی تنازعات خاص طور پر جائیداد کے تنازعوں اور مشترکہ جائیداد کے حصے بخرے ہونے کی وجہ سے دیوالیہ ہونے کا امکان موجود رہتا ہے۔ خاص طور پر خاندان کا ایسا فریق جس کے حصے میں کسی قانونی وجہ سے کم ورثہ آیا ہو وہ خود کو دیوالیہ قرار دلوا کر اپنی مالیاتی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ناگہانی اخراجات کسی ناگہانی آفت مثلاً زلزلے، سیلاب یا طوفان کی وجہ سے جائیداد یا کاروبار کو ناقابل-تلافی نقصان کی وجہ سے کوئی بھی فرد دیوالیہ ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر جب کسی کا کاروبار یا جائیداد ناگہانی آفات کے حوالے سے بیمہ شدہ نہ ہو، تو پورے کا پورا نقصان صاحب جائیداد یا کاروبار کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں دیوالیہ ہو جانا فطری امر ہے اور عدالت بھی ضروری کاغذی کارروائی اور شواہد کی پڑتال کے بعد ایسے افراد کو دیوالیہ قرار دے دیتی ہے۔ لب لباب ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے یا چھوٹ حاصل کرنے کے لئے خود کو دیوالیہ قرار دلوانے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ تاہم دانشمندی، مالیاتی منصوبہ بندی اور مستقبل کے حوالے سے تیاری کے ذریعے دیوالیہ پن سے بچا جا سکتا ہے۔ ایسے افراد جو بہت

زیادہ نقصانات اٹھانے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دیوالیہ پن کی دہلیز پر آ چکے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ خود کو دیوالیہ قرار دلوانے کے لئے کسی بہتر مالیاتی و قانونی مشیر کی خدمات حاصل کرکے اس جانب کوئی قدم اٹھائیں۔ اپنے طرز زندگی میں تبدیلی لائیں، بے جا قرض اور فضول خرچی سے بچیں۔ حکومتیں اور بڑے ادارے بھی اگر کفایت شعاری سے کام لیں تو انھیں بھی دیوالیہ پن سے نجات مل سکتی ہے۔

ہم کیوں مر رہے ہیں

ہم کیوں مر رہے ہیں ؟ کچھ عجیب سی بات ہیکہ اس موضوع پر بات کی جائے، لیکن اب دینا میں تحقیق نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے، سائینسدان اور ڈاکٹر یہ جاننا چاہتے ہیں۔ کہ انسانوں کی موت کے اسباب کیا ہیں۔ بھارت اشوک کمار ایک ایک گاون میں جاکر عجیب و غریب سوالات کرتے ہیں۔وہ گھروں میں جا کر پوچھتے ہیں۔آپ کے گھر میں گذشتہ چھ مہینوں میں کسی کی موت تو نہیں ہوئی؟ اگر ہوئی تو کن حالات میں ؟ مرنے والے کو کیا بیماری تھی؟ علاج کہاں چل رہا تھا؟ بلڈ پریشر، ذیابطیس، یا ایچ آئی وی ایڈز جیسی کوئی بیماری تو نہیں تھی؟ شراب یا سگریٹ کا شوق تھا، اور اگر ہاں تو کس حد تک ؟اشوک کمار محکمہ مردم شماری کے ملازم ہیں، سوالات کی فہرست لمبی ہے، لیکن ،، دس لاکھ لوگوں کی موت کے اسباب جاننے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ زبانی پوسٹ مارٹم جی ہا سوالات پر سوالات یہی ’ملین ڈیتھس سٹڈی‘ کا مقصد ہے جس کے تحت ’زبانی پوسٹ مارٹم‘ کے ذریعے بھارتی حکومت اور ایک غیر سرکاری ادارہ ’سینٹر فار گلوبل ہیلتھ ریسرچ‘ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملک میں لوگ کن بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کے مرنے کا سبب کیا ہے؟ اس غیر معمولی پراجیکٹ کے تحت ملک کے کچھ مخصوص علاقوں میں دس لاکھ لوگوں کی موت

کی ممکنہ وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھارت میں تو یہ تحقیق اب اپنے آخری مراحل میں ہے۔ لیکن پاکستان میں اب تک کوئی ایسی تحقیق نہیں ہو رہی ہے کہ جس سے پتی چلایا جاسکے کہ ہمارے لوگ گاؤں دیہاتوں اور شہروں میں کن بیماریوں سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ اور یہ بیماریاں کیوں بڑھ رہی ہیں۔ دنیا بھر میں ہر سال تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ لوگوں کی موت ہوتی ہے لیکن ترقی پذیر ممالک میں اکثر موت کی وجہ معلوم نہیں ہو پاتی۔ پاکستان میں ہر سال بانوے ہزار بچے اس مرض کے باعث موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں بیماریوں سے ہلاک ہونے والے اٹھارہ فیصد بچوں کی ہلاکت کی وجہ یہی بیماری ہےپاکستان کے صوبہ سندھ میں خسرہ کی بیماری سے ایک ہفتے کے اندر سو سے زیادہ بچے ہلاک ہوگئے ہیں۔

صوبہ سندھ کے وزیر صحت ڈاکٹر صغیر احمد نے ان ہلاکتوں کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ خسرہ کی بیماری سے صوبے کے آٹھ اضلاع متاثر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صغیر احمد کے مطابق جہاں معمول کی ویکسینیشن نہ ہو اور بچے غذائی قلت کا شکار ہوں تو وہاں خسرہ کی بیماری پھیل سکتی ہے۔ پاکستان میں کینسر، امراض قلب، گردے کی بیماریاں تو ہیں ہی لیکن معمولی بیماریوں سے بھی ہلاکتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ امراض قلب میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر سال دو لاکھ پاکستانی دل کی بیماریوں سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس مرض سے 2030 تک دنیا بھر

میں تئیس ملین افراد کی ہلاکت کا خدشہ ہے۔پاکستان ان 20 ممالک میں شامل ہے۔جہاں یہ خطرات ہیں۔ ملیریا جیسی معمولی بیماری بھی ہمارے یہاں جان لیوا ہے۔ صوبہ سندھ کے محکمہ صحت کی 2001 سے 2012 تک کے اعداد و شمار پر مشتمل رپورٹ کے مطابق گزشتہ گیارہ سالوں میں ملیریا کی بیماری کے 6 لاکھ سے زائد جبکہ گزشتہ سال 2012 میں ملیریا کے 1 لاکھ 74 ہزار افراد مریض رپورٹ ہوئے۔ملیریا بیماری کے بارے میں کراچی میں قائم انڈس اسپتال کی ڈاکٹر فنزویہ فاروقکھتی ہیں کہ ملیریا کے وائرس سے سب سے زیادہ 5 سال تک کے بچے اور حاملہ خواتین متاثر ہوتی" ہیں جبکہ پاکستان میں ہر سیکنڈ میں ایک بچہ ملیریا کی بیماری کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔"انھوں نے کہا کہ گزشتہ سال صرف انڈس اسپتال میں 960 ملیریا کے مریض آئے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مرض ڈینگی بخار سے زیادہ پھیل رہا ہے۔ملیریا عام بیماری ہونیکے باوجود لوگوں میں اب تک مکمل آگاہی موجود نہیں جسکے باعث بیشتر افراد زیادہ دیر رہنے والے بخار، یرقان اور ٹائیفائید کو بھی ملیریا سمجھنے لگتے ہیں اور گھریلو ادویات سے علاج کرتے رہتے ہیں جس سے ملیریا شدت اختیار کر جاتا ہے۔ دس لاکھ لوگوں کی موت کے اسباب جمع کرنے کا خیال کیسے آیا اس بارے میں سینٹر فار گلوبل ہیلتھ ریسرچ کے سربراہ ڈاکٹر پربھات جھا کہتے ہیں کہ انڈیا جیسے ملکوں میں زیادہ تر اموات گھر پر ہی ہوتی ہیں اور موت کا سبب کبھی معلوم نہیں ہو پاتا۔’میرے دادا کا انتقال چوّن سال کی عمر

میں اچانک گھر پر ہی ہوا تھا۔ بیس سال کے بعد جب میں نے اپنی دادی سے ان کی موت کے بارے میں پوچھا تو انھیں سب کچھ یاد تھا۔ انھوں نے بتایا کہ دادا غسل خانے میں تھے، اچانک چیخے اور وہیں گر گئے۔ ان کے جسم کا دایاں حصہ کام نہیں کر رہا تھا۔ کہانی سن کر میں نے فوراً کہا کہ انھیں شاید سٹروک ہوا تھا۔'تب میرے ذہن میں زبانی پوسٹ مارٹم کا خیال آیا اور میں نے حکومت سے رابطہ کیا۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ لوگ کن بیماریوں کی وجہ سے مر رہے ہیں تو حکومت کی پالیسیوں اور حفظان صحت کے نظام میں ان بیماریوں پر زیادہ توجہ دی جا سکتی ہے۔'ڈاکٹر جھا کا خیال ہے کہ تحقیق اس سال مکمل ہو جائے گی اور اس کے نتائج یکجا کرنے میں ایک دو سال کا وقت اور لگے گا۔ لیکن تحقیق کے دوران ہی بہت سے حیرت انگیز نتائج سامنے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ملک میں ملیریا سے مرنے والے لوگوں کی تعداد ڈبلو ایچ او کے تخمینوں سے تیرہ گنا زیادہ ہیں!

لیکن عالمی ادارہ صحت ان اعداد و شمار سے متفق نہیں ہے۔ انڈیا میں ادارے کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ یہ تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ اور جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان کی 'مزید تفتیش کی جانی چاہیے۔' کیونکہ بخار صرف ملیریا کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا۔
تحقیق سے وابستہ ڈاکٹر سریش راٹھی کہتے ہیں کہ سانپ کے کاٹنے سے مرنے والوں

کی تعداد نے بھی انھیں حیرت میں ڈال دیا۔ 'ڈبلیو ایچ او کے مطابق پوری دنیا میں ہر سال پچاس ہزار لوگ سانپ کے کاٹنے سے مرتے ہیں، ہماری ریسرچ کے مطابق صرف ہندوستان میں ہی مرنے والوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔' اشوک کمار اور ان کے تقریباً ایک ہزار دیگر تربیت یافتہ ساتھی جو معلومات اکٹھی کرتے ہیں وہ دو مختلف ڈاکٹروں کو بھیجی جاتی ہیں اور ان معلومات کی بنیاد پر وہ موت کی ممکنہ وجہ کا تعین کرتے ہیں۔ اگر وہ اتفاق نہیں کر پاتے تو ایک سینیئر ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ موت کا سبب معلوم ہونے سے وسائل کے بہتر استعمال کی راہ ہموار ہوتی ہے، اور الگ الگ علاقوں میں جن بیماریوں کا زیادہ زور ہے وہاں انھیں کنٹرول کرنے کے لیے اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر جھا کہتے ہیں کہ 'مرنے والے کی زندگی کا جائزہ لینے سے آپ کو موت کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے اور لوگوں کی زندگی بہتر بنانے کا موقع بھی ملتا ہے۔ وہ سگریٹ نوشی کی مثال دیتے ہیں جسے کنٹرول کرنے کے لیے اب حکومت نے سخت اقدامات کیے ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں سگریٹ نوشی کے مناظر پر پہلے سے ہی پابندی ہے اور حالیہ بجٹ میں حکومت نے سگریٹ پر ڈیوٹی میں بھاری اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر جھا کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں سگریٹ نوشی کرنے والوں کی عمر اوسطاً دس سال کم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بہت سے ماہرین مانتے ہیں کہ 'زبانی پوسٹ مارٹم' میں غلطی کی گنجائش رہتی ہے لیکن لندن سکول آف ہائیجین سے وابستہ ڈاکٹر سنجے کنرا، جن کا اس تحقیق سے کوئی تعلق نہیں ہے، کہتے ہیں کہ

ملین ڈیتھس سٹڈی سے ہندوستان کو فائدہ ہوگا۔'یہ ایک اچھی کوشش ہے۔۔۔ لیکن حکومت کو ایک ایسا نظام وضع کرنا چاہیے جس میں ہر موت کا رجسٹریشن لازمی ہو۔۔۔ صرف کچھ مخصوص علاقوں میں نہیں۔پروفیسر جھا کا کہنا ہے کہ دیہی علاقوں میں لوگ کھل کر بات کرتے ہیں، چاہے موت خودکشی سے ہوئی ہو یا ایڈز جیسی کسی بیماری سے۔اور موت چونکہ ذہن پر گہرا نقش چھوڑتی ہے اس لیے لوگوں کو تفصیلات.برسوں تک یاد رہتی ہیں۔تو کیا ہر وقت موت کے ذکر سے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی؟ وہ کہتے ہیں کہ 'میرا اصول یہ ہے کہ جو گزر گئے ہیں ان کی زندگی کا مطالعہ کرو تاکہ جو زندہ ہیں ان کی مدد کی جاسکے۔پاکستان میں حکومت کا سارا زور پولیو کے قطروں کی ویکسین پلانے پر ہے، لیکن بچے جن دوسری بیماریوں سے ہلاک ہورہے ہیں، ان پر کوئی توجہ نہیں ساری دنیا میں ایبولا سے ہونے والی ہلاکتوں کا شور ہے۔ عالمی اداروں نے پاکستان میں بھی وارننگ جاری کی ہے۔ ایبولا کے نتیجے میں ہلاکتیں 4000 سے تجاوز کر چکی ہیں۔اس سے شدید متاثر ہونے والے ممالک میں لائبیریا، گنی اور سیئیرالیون شامل ہیں۔اس کے علاوہ اخراج خون کی بیماری کے نتیجے میں سینیگال میں آٹھ جبکہ امریکہ میں ایک ہلاکت واقع ہوچکی ہے۔ دنیا کے.بڑے.بڑے ہوئی اڈوں پر ایبولا کے مریضوں کی سکریننگ شروع کی جارہی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جس ملک میں سگریٹ ، پان گٹکے پر پابندی نہ لگائی جائے، جہاں زہریلی شراب نوشی سے لوگوں کی ہلاکت ہوتی ہوں۔ وہاں بیماریوں کی روک تھام کی کسے پرواہ ہوگی۔ یہ ایک المیہ ہے کہ

ہر جگہ سرعام شراب کی غیر قانونی فروخت جاری ہے اور انتظامیہ خاموش تماشائی کا کردار ادا کررہی ہے ہمیں چھوٹے بڑے شہروں میں منشیات خاص طور پر گٹکا، مین پڑی سرعام دکانوں پر سجے ہوئے اور بکتے ہوئے نظر آتے ہیں، جبکہ قانونی طور پر ان اشیا پر بندش ہے ایسے میں جب لوگوں کی ہلاکتیں ہورہی ہیں انتظامیہ کو مثبت اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے صحت کے مسائل روز بروز بگڑتے جارہے ہیں مگر انتظامیہ کہیں نظر نہیں آتی ۔ سندھ میں صحت کی سہولیات سب سے زیادہ خراب ہیں ایسے میں منشیات کا سرعام فروخت مزید پیچیدگیوں کا سبب بن رہا ہے اور ان میں سب سے زیادہ نوجوان نسل تباہ ہورہی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کیوں مر رہے ہیں۔

مونچھ میلے

روشن صبح کے سفر کا آغاز

خالق کائینات نے انسان کو ایک ضابطہ قدرت عطا کیا ہے کہ جس کی بنیاد پر انسانی معاشرے میں امن چین سکون قائم ہو۔ مسلمان چونکہ انبیا کے اس پیغام کے وارث ہیں۔ اس لئے اس ضابطہ کو نافذ کر کے انسانیت کا فلاح کا راستہ دکھانے کی ان پر بنیادی ذمہ داری ہے، یہی احساس تھا کہ بر صغیر کے مسلمانوں نے ایک علیحدہ وطن کی جدوجہد کی، اور اس وطن کی سرزمین پر اسلام کے آفاقی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھا۔ تحریک پاکستان جن نعروں کی بنیاد پر کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس میں ایک اہم نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لاالہ اللہ قانون ریاست کیا ہوگا محمد الرسول اللہ ۔لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان ۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔اس طرح پاکستان کا قیام دراصل ایک نظریاتی مملکت کا قیام تھا کہ اللہ کے نام پر جو سرزمین حاصل کی جارہی ہے اس میں اللہ کا قانون نافذ ہوگا۔ نظریاتی طور پر یہ ایک مکمل پاکستان کی تصویر تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد کلمہ کی بنیاد پر اس ریاست کا قیام ایک خواب ہی رہا اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو جس نظریے کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ وہ نظریہ نافذ نہ ہوسکا اس لیے اس اعتبار سے بھی یہ ایک نامکمل ملک ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنوں کی سازشوں اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کی

وجہ سے چوبیس سال بعد یہ ملک ٹوٹ گیا اور ہمارا ایک بازو ہم سے کٹ گیا۔ اس طرح کشمیر کے نہ ملنے کی وجہ سے ایک نامکمل پاکستان اور آدھا ہو گیا۔ اس وقت پورے ملک میں تبدیلی کا نعرہ لگایا جارہا ہے، لیکن اس نعرے کو لگانے والوں کو یہ نہیں معلوم کہ تبدیلی کیا ہو گی۔ اور انقلاب کیسا ہوگا۔ اس اہم موقع پر امیر جماعت اسلامی سراج الحق نے تحریک تکمیل پاکستان کا ایک خواب دیکھا ہے۔ سراج الحق 21 نومبر کو مینار پاکستان لاہور میں عوامی ایجنڈے کا اعلان کریں گے۔ سراج الحق کا کہنا ہے کہ تحریک پاکستان میں کروڑوں مسلمانوں نے حصہ لیا۔ لاکھوں نے ہجرت کی اور ہزاروں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ان لوگوں نے صرف ہندوؤں یا انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے اور صحراؤں اور پہاڑوں پر مشتمل ایک ٹکڑا زمین حاصل کرنے کے لیے یہ قربانیاں نہیں دی تھیں بلکہ ان کی عظیم اور مقدس جدوجہد کا مقصد مدینہ منورہ کے بعد ایک ایسی اسلامی ریاست کا قیام تھا جہاں انسان انسان کا غلام نہ ہو، عدل انصاف کی حکمرانی ہو اور سب امیر غریب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ آج ہماری تحریک کا مقصد بھی پاکستان کو اسی منزل سے ہمکنار کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جن لوگوں نے 68 سال سے پاکستان کو یرغمال اور عوام کو غلام بنا رکھا ہے، انہوں نے نظریہ پاکستان کو سبوتاژ کیا ہے۔ یہ کرپٹ اشرافیہ نظریہ پاکستان کے ساتھ جغرافیہ کو بھی تحفظ نہیں دے سکا۔ 71ء میں پاکستان کو دولخت کر دیا گیا اور آج اسی کرپٹ ٹولے کی وجہ سے بنگلہ دیش میں ان محسنوں کو پھانسیاں دی جارہی ہیں

جنھوں نے اس نظریہ کے تحفظ کے لیے قربانیاں دیں۔انھوں نے کہاکہ بنگلہ دیش میں پہلے عبدالقادر ملا کو پھانسی پر لٹکادیا گیا، پھر پروفیسر غلام اعظم جیل کی سلاخوں کے پیچھے دم توڑ گئے اور اب جماعت اسلامی کے امیر مطیع الرحمٰن نظامی اور میر قاسم کو پھانسی کی سزا سنادی گئی ہے مگر حکومت پاکستان اس بارے میں مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ 71ء میں جس ملک کو نیا پاکستان کہا گیا وہاں چار صوبے تو موجود ہیں مگر پاکستانیت کہیں نظر نہیں آتی۔ استعماری قوتیں ایٹمی پاکستان پر جنگ مسلط کرکے اس کے وجود کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ یہ استعماری قوتیں عراق، افغانستان اور شام کی طرح پاکستان کو بھی رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم کرنا چاہتی ہیں۔ سراج الحق اب عوام کے لئے امید کا روشن چراغ ہیں۔ اس لئے انھوں نے گاؤں، گاؤں اور قریہ قریہ گھوم کر لوگوں کو 21,22,23 نومبر کو مینار پاکستان لاہور میں جماعت اسلامی کے تین روزہ اجتماع عام میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ جس میں پورے ملک سے لاکھوں افراد شریک ہوں گے ،اس کا عنوان ہی تکمیل پاکستان رکھا گیا ہے۔ سراج الحق اس اجتماع سے ایک تحریک برپا کرنا چاہتے ہیں۔ جو تحریک تکمیل پاکستان کی تحریک ہو گی۔آج پاکستان اپنی نظریاتی اور جغرافیائی حدود دونوں کے اعتبار سے نامکمل ہے۔ جغرافیائی طور پر مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہے کشمیر جو پاکستان کا دست و بازو تھا اس سے ہم محروم ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے پاکستان کو اب سیکولر اور آزاد خیال بنانے کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ اسلام کے

نام پر اس ملک کو حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں اسلام کا آفاقی نظام اب تک نافذ نہ ہو سکا امیر جماعت اسلامی پاکستان جناب سراج الحق نے اس اجتماع کا مرکزی خیال اسی نظریہ پاکستان کو بنایا ہے۔ اس وقت انقلاب اور تبدیلی کا اصل پیغام بھی یہی ہے۔ اس وقت ہمیں نئے پاکستان کی ضرورت ہے نہ، صوبوں کی تقسیم کی، اس وقت ایک مضبوط، خوشحال اور اسلامی پاکستان کی ضرورت ہے۔ اس اجتماع عام کے بعد تحریک تکمیل پاکستان کی مہم چلائی جائے گی۔ قافلہ سالار سراج الحق ہوں گے، جو شب تاریک میں اپنے کارواں کو روشن صبح کی جانب لے کر نکلیں گے۔

"چین پاکستان" اسٹریٹجک پارٹنرشپ

کچھ عرصے قبل پاکستان میں چین کے سفیر لیو جیان نے پروفیسر خورشید احمد کے ادارے پاکستان انسٹیوٹ آف پالسی اسٹیڈیز اسلام آباد میں ایک سیمینار میں اس بات کا مستقبل میں چین پاکستان اسٹریٹیجک پارٹنر سپ مضبوط ہو گی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایٹمی توانائی کا پر امن استعمال ہر قوم کا حق ہے اس معاملے میں دوہرے معیارات ناپسندیدہ ہیں ان سے اجتناب کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ چین مسئلہ کشمیر کے پر امن حل کا خواہاں ہے جو پاکستان اور بھارت کے باہم مذاکرات سے ہی ہو گا۔ یہ دوہرے معیارات امریکہ کے ہیں۔ جو پاکستان پر ایٹمی توانائی کے منصوبوں پر تو پابندی لگاتا ہے۔ لیکن بھارت کو سستی توانائی کے ان منصوبوں کی اجازت دیتا ہے۔ پاکستان کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہی توانائی کا بحران ہے۔ چین نے پاکستان کے اس سنگین مسئلہ پر توجہ دی ہے۔ اور اب وہ اس کے حل کے لئے سنجیدگی سے عملی اقدام کرنا چاہتا ہے۔ وزیر اعظم نواز شریف بھی اس وقت یہی چاہتے ہیں کہ چین اور پاکستان دونوں مل کر اس مسلئے کا حل نکالیں۔ پاکستان میں دھرنے نہ ہوتے تو اگست میں چینی وزیر اعظم پاکستان آ چکے ہوتے اور اب تک یہ معاہدے ہو بھی چکے ہوتے۔ بعض حلقے یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ چین کی اس پیش رفت کو روکنے میں امریکہ کا ہاتھ ہے، جس نے دھرنے والوں کو مالی امداد

فراہم کرکے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ ایک اندازے کے مطابق چین پاکستان میں 2017 تک پاکستانی معیشت کے مختلف شعبوں اور خاص طور پر توانائی کے شعبے میں 50 بلین ڈالر تک کی سرمایہ کاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس سرمایہ کاری کا مقصد پاکستان کو توانائی کے بحران سے نکال کر معاشی ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف بھی چین کا دورہ کرکے آئے تھے تو انھوں نے بھی یہ خوشخبری سنائی تھی کہ چین نے آئندہ پانچ سال تک پاکستان میں ہر سال ساڑھے چار ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ یہ سرمایہ کاری زیادہ تر ملک بھر میں توانائی اور انفراسٹرکچر کے شعبوں میں کی جائے گی۔ اس حوالے سے یہ طے بھی ہوا کہ لاہور میں ایک ارب سات کروڑ ڈالر سے لائیٹ ریل کا منصوبہ مکمل کیا جائیگا۔ ہ بھی کہا گیا کہ لاہور میں لائٹ ریل منصوبہ چین کے وزیر اعظم کی خصوصی دلچسپی کے باعث منظور ہوا، گو یہ منصوبہ کراچی کی ضرورت تھا۔ لیکن چین کو کراچی میں پیپلز پارٹی اور متحدہ سے وہ تعاون حاصل نہ ہوا۔ جو ان منصوبوں کے لئے ضروری تھا۔ اس لیئے اب یہ اہم منصوبہ بھی کراچی سے اٹھا کر لاہور چلا گیا ہے۔ پاک چین دوستی ایک لازوال رشتہ ہے، دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اور اتحاد و یکجہتی کی بے مثال لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ خطہ کی اہمیت اور امریکی کیمپ کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے بھی چین کی توجہ پاکستان پر ہے۔ دھرنے کی وجہ سے جب چینی وزیر اعظم کا دورہ ملتوی ہوا تو عمران خان نے یہ

بھی کہا تھا کہ نواز حکومت چین سے چونتیس ارب ڈالر قرضے کا معاہدہ کر رہی ہے۔ لیکن اب یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ چین پاکستان کے منصوبوں میں سرمایہ کاری میں سنجیدہ ہے۔ چین کی جانب سے پاکستان میں آئندہ 8 برس کے دوران توانائی، پانی، کوئلے، سڑکوں و دیگر بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں میں 40ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا امکان ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان نے وسیع چینی سرمایہ کاری کیلئے راہ ہموار کرنے پر کام شروع کر رکھا ہے۔ موجودہ دور حکومت میں چین کی پاکستان میں غیر معمولی سرمایہ کاری دیکھنے میں آ رہی ہے جو دراصل چین کی نئی عالمی حکمت عملی ہے۔ چین جس کی موجودہ جی ڈی پی 4 ٹریلین ڈالر ہے، کے پاس اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ زر مبادلہ کے ذخائر ہیں لیکن تیزی سے بڑھتی ہوئی اجرتوں کی وجہ سے چین کی پیداواری لاگت میں نہایت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کے باعث چین کو خدشہ ہے کہ اس طرح وہ آنے والے وقت میں عالمی مارکیٹ میں اپنی مقابلے کی سکت کھودے گا جس سے نمٹنے کیلئے چین نے نئی حکمت عملی اختیار کی ہے۔ چین میں فی کس سالانہ آمدنی 6600 ڈالر سے تجاوز کر گئی ہے جبکہ پاکستان میں یہ صرف 1300 ڈالر ہے۔ پاکستان میں اس وقت ورکر کی فی گھنٹہ اجرت 51 سینٹ، پاکستان میں بجلی 17 سینٹ ہے۔ گزشتہ سال مئی میں چینی وزیراعظم لی چیانگ نے اسلام آباد میں حکومت کے ساتھ متعدد ترقیاتی، اقتصادی و تجارتی دوطرفہ معاہدوں پر دستخط کئے جبکہ جون میں وزیراعظم میاں نواز شریف نے چین کی سرکاری صنعتی کارپوریشن Norinco سے

پاکستان میں ایک شمسی پاور پلانٹ کی تنصیب، کان کنی کے شعبے کے فروغ اور آئرن کے ذخائر کی تسخیر جیسے اہم شعبوں میں تعاون کی درخواست کی تھی۔ حالیہ دورہ چین کے موقع پر وزیراعظم پاکستان نے شنگھائی میں منعقدہ پاک چین توانائی فورم میں چین کی 50 سے زائد توانائی کمپنیوں اور سرمایہ کاروں سے ملاقات کی۔

چینی سرمایہ کاروں نے کاشغر سے گوادر تک 2000 کلومیٹر موٹر وے جسے اکنامک کوریڈور کا نام دیا گیا ہے، تعمیر کرنے کا عندیہ دیا ہے جو پاکستان کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گی۔ چینی سرمایہ کاروں کا موقف ہے کہ وہ پاکستان میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں لیکن پاکستان کی بیوروکریسی اور سیکورٹی خدشات ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ پاکستان میں اس وقت چین کی ایک کمپنی 969 میگاواٹ کے نیلم جہلم ہائیڈرو پروجیکٹ پر کام کررہی ہے جو 2015ء تک پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ اس کے علاوہ چینی کمپنی تھری گارجز کیرٹ، کوہالہ اور تونسہ میں بجلی کے 3 منصوبوں پر کام کررہی ہے جس سے 2000 میگاواٹ بجلی پیدا کی جائے گی جبکہ دیامیر بھاشا اور بونجھی پن بجلی کے منصوبوں پر بھی کام جاری ہے۔ چین نے اپنے قدرتی وسائل خصوصاً دریاؤں کے پانی کو آبپاشی اور توانائی کے حصول کے لئے انتہائی مہارت سے استعمال کیا ہے۔ چین کے سب سے بڑے دریا یانگ سی پر Dam Gorges Three بنا

کر دریا کا رخ موڑ دیا گیا ہے جس سے مون سون میں پانی ذخیرہ کر کے نہ صرف لاکھوں ایکڑ رقبے پر فصلوں کو سیلاب سے بچالیا جاتا ہے بلکہ ڈیم کی وجہ سے چین دنیا میں سب سے بڑا نہری نظام رکھنے والا ملک بن گیا ہے۔پاکستان نے چین کو گوادر کی اہم بندگاہ بھی دی ہے۔ جس پر بھارت نے پاکستان کی جانب سے اسٹریٹیجک لحاظ سے انتہائی اہم گوادر بندرگاہ چین کو دینے کے فیصلے پر تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ توقع ہے کہ جب گوادر بندرگاہ کا کام مکمل ہوجائے گا تو یہ پاکستان سے مغربی چین تک توانائی اور تجارت کی اہم ترین راہداری بن جائے گی۔پاکستان چین کی ٹیکنیکی مہارت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ چین کے ایک بہت بڑے گروپ ''روئی' د: چین پاکستان ریلویز کے انفرااسٹرکچر کی ڈیولپمنٹ اور کراچی سے پشاور تک نیا ٹریک بچھانے پلوں، لیول کراسنگ کی مرمت سمیت متعدد منصوبوں پر ساڑھے 3 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا ارادہ رکھتا ہے۔ ریلوے ٹریک کو تبدیل کرکے نیا ٹریک بچھانے کے حوالے سے ایک فزیبلٹی رپورٹ آئندہ سال فروری میں چین اور پاکستان کی حکومت کو فراہم کی جائے گی۔ توقع ہے کہ نیا 2015 ٹریک بچھائے جانے کے بعد ریلوے ٹرین کی رفتار85 سے105 کلومیٹر فی گھنٹہ سے بڑھ کر120 کلو میٹر فی گھنٹہ تک پہنچ جائیگی۔وزیر اعظم کا دورہ چین شروع.....

دھرنوں کی وجہ سے چینی صدر تو پاکستان نہ آسکے لیکن چینی حکومت نے کام کو جاری رکھنے کیلئے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کو دورہ چین کی دعوت دے دی تھی جس پر میاں نواز شریف چین کا دورہ

کر رہے ہیں۔ جو ہر لحاظ سے تاریخی ہونے جا رہا ہے۔ توقع کی جا رہی ہے کہ اس دورہ کے دوران ہونے والے معاہدے پاکستان کی تقدیر بدل کر رکھ دیں گے۔ اسی لئے چین کے دورہ سے پہلے کابینہ کے اجلاس میں وزیر اعظم میاں نواز شریف نے اس بارے میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ چین کی پاکستان میں سرمایہ کاری ان بین الاقوامی قوتوں کو قابل قبول نہیں جو پاکستان کے دوست حلیف ہونے کی دعویدار تو ہیں لیکن پاکستان کو اندھیروں میں رکھنے کی بھی خواہاں ہیں۔ سابق صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کے دور میں جب امریکی صدر نے پہلے بھارت اور پھر پاکستان کا دورہ کیا تب بھارت کی توانائی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے امریکہ نے بھارت کے ساتھ سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی دینے کا معاہدہ کیا لیکن پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کی تلاش میں میاں نواز شریف کا فوکس چین اور ترکی رہے ہیں۔
ترکی نے میاں نواز شریف کے ساتھ کئی شعبوں میں تعاون شروع کیا لیکن چینی قیادت نے تو پاکستان پر اپنے دروازے کھول دیئے۔ چین پاکستان کے شعبہ انرجی میں سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ اس میں تھر کے کوئلہ سے بجلی، سولر سے بجلی جیسے منصوبہ شامل ہیں۔ چینی کمپنی نے ہی امپورٹڈ کوئلہ سے بجلی بنانے کے منصوبوں کی بجائے مقامی کوئلہ سے بجلی بنانے کی شرط رکھی تاکہ پاکستان کا امپورٹ بل کم رہے۔ گوادر سے چینی سرحد تک انفراسٹرکچر بنایا جائے گا۔ چین کی گرم سمندروں تک رسائی بھی عالمی برادری کو قبول نہیں لیکن اب دنیا چین کو روک

نہیں سکتی۔ پاکستان میں بڑھتا ہوا چینی اثرورسوخ پاکستان کو امریکہ سے دور کر رہا ہے۔ جس میں پاکستان کی ترقی اور بھلائی ہے۔ شاید اسی طرح ہم ملک میں صنعتی انقلاب لا سکیں۔

دنیا کے چھوٹے بڑے لوگ

یہ دنیا بھی عجب تماشا ہے۔جہاں ہر طرح کے تماشے کیئے جاتے ہیں پھر ان تماشوں کی تشہیر ہوتی ہے۔ ملٹی میڈیا کمپنی اور میڈیا اس میں رنگ بھرتا ہے اور پوی دنیا اس تماشے کو دیکھنے کو دوڑ پڑتی ہے۔ ایسا ہی ایک تماشا گذشتہ دنوں لندن میں ہوا۔ جس میں دنیا کے سب سے لمبے اور سب سے چھوٹے قد کے انسانوں کی ملاقات کرائی گئ۔ ترکی کے آٹھ فٹ نوانچ قد کے حامل 31 سالہ کوزن نے نیچے جھک کر ساڑھے 21 انچ کے 74 سالہ چندرا بہادر ڈنگی سے ہاتھ ملایا۔ پھر اس تقریب کو شہرہ ہوا۔

دنیا کے سب سے لمبے اور سب سے چھوٹے قد کے حامل اشخاص کی اس ملاقات کا اہتمام گینز ورلڈ ریکارڈز کی دسویں سالانہ تقریب کے موقع پر کیا گیا تھا۔ تقریب کے دوران ترکی کے آٹھ فٹ نو انچ قد کے حامل سلطان کوزن ساری دنیا کو اپنی بلندی سے دیکھ رہے تھے۔ وہاں نیپال کے چندرا بہادر ڈنگی ایک بونے کی طرح دیو ہیکل انسانوں کو تک رہے تھے۔ چندرا کا قد صرف ساڑھے 21 انچ ہے۔ لندن میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے 31 سالہ سابق کسان کوزن نے نیچے جھک کر 74 سالہ ڈنگی سے ہاتھ ملایا تو سب نے تالیاں بجائی۔ کوزن کا کہنا تھا انھیں بھی اس ملاقات کو اشتیاق تھا کیونکہ انہیں ڈنگی کے قد میں دلچسپی تھی کہ وہ ان کے پیروں کے کس حصے تک پہنچ سکتے ہیں جیسے ہی میں نے انہیں دیکھا مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان کا قد بہت کم تھا۔ انہوں نے کہا کہ کافی جھک کر ہاتھ ملانے کے باوجود چندرا کے ساتھ ان کی ملاقات شاندار تھی۔ کوزن نے کہا کہ جب وہ زیادہ دیر تک کھڑے رہتے ہیں تو ان کے گھٹنوں میں تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ کوزن نے کہا کہ حالانکہ وہ لمبے ہیں اور چندرا چھوٹے اس کے باوجود دونوں نے زندگی میں ایک ہی طرح کے مسائل کا سامنا کیا ہے۔ میں نے جب چندرا کی آنکھوں میں دیکھا مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں دنیا کے سب سے لمبے انسان کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا اور ان سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔ اس عجیب و غریب تقریب میں دنیا بھر سے.ڑی تعداد میں لوگوں

نے ہر طرح کے ریکارڈ بشمول سر مارنا، نیزوں کو پکڑنا اور دیگر کے نئے ریکارڈ بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ دنیا کے سب سے لمبے اور سب سے چھوٹے قد کے حامل اشخاص گینس ورلڈ ریکارڈز کی دسویں سالانہ تقریب میں مدعو کیئے گئے تھے۔ جہاں ان کے قد کی پیائش کی گئی اور ان کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرنے کا علان کیا گیا۔ دنیا کے سب سے لمبے قد کے ساتھ ساتھ کوزن کے ہاتھ بھی دنیا میں سب سے بڑے ہیں جن کا سائز 11 انچ سے بھی زائد ہے۔ڈنگی بونے پن کی بیماری کا شکار ہیں اور اپنے گاؤں میں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ میں دنیا کے سب سے لمبے انسان کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا اور ان سے ملکر مجھے خوشی ہوئی۔گنیز ورلڈ ریکارڈ کے مطابق دو فٹ کی 18 سالہ ہندوستانی طالبہ جیوتی اگے کو دنیا میں موجود پستہ ترین قد کی لڑکی کی حیثیت سے تصدیق ہو گئی ہے۔ جیوتی اگے کو یہ اعزاز اس وقت حاصل ہوا جب وہ ممبئ سے 520 کلومیٹر دور مشرق میں واقع ناگپور شہر میں اپنے گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ 18 ویں سالگرہ منا رہی تھیں۔

گنیز ورلڈ ریکارڈ کے ایڈجوڈیکیٹر روب مولی نے کہا کہ وہ صرف 62.8 سینٹی میٹر قامت کی ہیں۔اگے کو 24 گھنٹے میں تین بار ناپا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹروں نے ان کی موجودگی میں دو بار اس لڑکی کو کھڑے حالت میں اور ایک بار لیٹنے کی حالت میں ناپا اور ہر بار یہی پیائش رہی۔جب اس کو اس کے والدین

سالہ کش اور 50 سالہ رنجنا کی موجودگی میں سند عطا کی گئی تو وہ خوشی سے رو55 پڑی۔ یہ لڑکی روایتی ساڑی زیب تن کیے تھی۔ اس نے کہا کہ اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہو رہی ہے اس نے ایک ورلڈ ریکارڈ بنایا ہے۔اس کے والد نے کہا کہ ان کی بیٹی کو امید ہے کہ وہ بالی ووڈ اداکارہ بنے گی۔ بھارت کے شہر ناگپور سے تعلق رکھنے والی 19 سالہ جیوتی کا قد صرف دو فٹ اور وزن پانچ کلو کے قریب ہے۔ دنیا کی سب سے چھوٹے قد کی لڑکی ہونے پر جیوتی کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کر لیا گیا، جیوتی کا کہنا ہے کہ گنیز ورلڈ ریکارڈ میں نام درج ہونے سے وہ بہت خوش ہے ، وہ لندن اور اٹلی کی سیر کرنا چاہتی ہے جبکہ اس کی خواہش ہے کہ وہ بالی ووڈ میں بھی کام کرے۔ چندرا اور جیوتی میں اگرچہ عمروں کا طویل فرق موجود ہے لیکن فوٹو کھنچواتے وقت جیوتی اپنی ہنسی قابو نہ کر سکی۔ دونوں ہمسایہ ممالک کے ان ننھے انسانوں نے روایتی لباس زیب تن کر رکھا تھا،ایک فٹ لمبی جیوتی کو گزشتہ سال دسمبر میں اسکی اٹھارویں سالگرہ پر دنیا کی سب سے چھوٹی خاتون قرار دیا گیا تھا جبکہ نیپال سے تعلق رکھنے والے اکیس اعشاریہ پانچ انچ کے چندرا بہادر کا نام رواں سال فروری میں گینزبک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا گیا ہے۔دنیا کا سب سے پست قامت شخص نیپال کا کھاجیند را تھاپا ماگر (khagendra Thapa Magar) بھی گینزبک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنا نام درج کرانے کا منتظر ھے.برطانوی اخبار ٹیلی گراف کے مطابق کھاجیند رائے نے اپنی اٹھارویں سالگیرہ پر اس خواھش کا اظھار کیا کہ

اسے بیوی کی تلاش ھے جینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے حکام نے اسے دنیا کا سب سے چھوٹا شخص تسلیم کر لیا ھے تاھم اسے عالمی اعزاز سے نوازنے کی کوئی کیٹیگری موجود نھیں ھے۔عالمی اعزاز کا منتظر یہ شخص اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ کوہ ھمالیہ کے دامن میں واقع اپنے گاؤں اپنی سالگیرہ کی تقریبات سے لطف اندوز ھو رھا ھے دو فٹ قامت کا نیپالی باشندہ چین کے He Pingping ھی پنگپنگ سے چھوٹا ھے ۔ دو فٹ اور پانچ انچ کا مالک سب سے چھوٹا شخص ھونے کا اعالمی اعزاز رکھتا ھے کھا جیندرا اپنے قد و قامت کی لڑکی سے شادی کا خواھاں ھے اس کا کھنا ھے جب مجھے دنیا کا سب سے پست قامت کے طور پر مان لیا جائے گا تو مجھے بھت فوائد ملیں گے۔اس کی زندگی کا خواب ھے کہ اس کے چار بچے ھوں تاھم چھوٹے یا کم عمر بچوں کے لئے عالمی سطح پر عالمی ریکارڈ کا کوئی تصور نھیں ھے اور نہ ھی یہ اعزاز ابھی تک کسی کو دیا گیا ھے اس نے تین سال قبل دنیا کا سب سے چھوٹا شخص ھونیکے عالمی اعزاز کیلئے گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ سے رابطہ کیا تھا کھا۔جیندرا کھٹمنڈ سے 125 میل دور میں پیدا ھوا پیدائش کے وقت اس کا وزن صرف پانچ اونس تھا اس وقت مقامی نیپالی سیاست دان اس کا نام گینز بک میں اندراج کرانے کی مھم چلا رھے تھے

۔دنیا کی سب سے چھوٹے قد کی خاتون ہونے کا اعزاز امریکی خاتون کے پاس ہے جس کا قد 27 انچ ہے۔گنیز ورلڈ ریکارڈ کے مطابق دنیا کی سب سے چھوٹی خاتون کا

قد 27 انچ ہے اور وہ امریکی ریاست الی نوائے کی رہنے والی 20 سال کی طالبہ ہے۔ .برجٹ کے بھائی کا قد 38 انچ ہے وہ جمناسٹک، کراٹے، باسکٹ بال کھیلتا ہے۔اس نے بھی گنیز ورلڈ ریکارڈ کے لئے اپنا نام دیا تھا۔اس سے پہلے چھوٹے قد کی خاتون ہونے کا اعزاز 27.5 انچ کی ترکی کی ایلف کوکامان کے پاس تھا۔ساڑھے تئیس انچ کے فلپائنی شہری کو دنیا کا سب سے چھوٹے قد کا آدمی قرار دیا گیا ہے۔ تئیس انچ چھوٹا۔۔جنرے بالاونگ دیکھنے میں کوئی چھوٹا بچہ نظر آتا ہے مگر اس کی عمر اٹھارہ.برس ہے۔جنرے کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں سب سے چھوٹے قد کے آدمی کے طور پر درج کیا گیا ہے۔گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہونے کے لئے امیدوار کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہونا ضروری ہے۔جوں ہی جنرے اٹھارہ.برس کا ہوا اسکا نام ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرلیاگیا۔اس سے قبل دنیا کے پستہ قد آدمی کا ٹائیٹل نیپال کے تھاما میگر کے نام تھا جس کا قد چھبیس انچ تھا۔نیا کا سب سے لمباترین آدمی 2 میٹر اور 47 سینٹی میٹر کا ہے۔اُسکا نام کوزن ہے اور اُن کا تعلق ترکی سے ہے۔لمبے ہونے کا فائدہ 100 میٹر دور تک دیکھ سکتا ہے۔لندن میں ورلڈ ریکارڈ بک کے لئے منتخب ہو چکے ہیں۔انکی عمر سال ہے انکا کینسر کا مسئلہ تھا اور وہ اسکی وجہ سے.بڑھنے کی صلاحیت میں خاطر خواہ 27 اضافہ کے باعث اتنے لمبے ہوگئے۔وہ ڈیکس میں نہیں بیٹھ سکتے انکا کہنا ہے کہ میرے لئے اسپیشل گاڑی تیار کی جائے گی اور مزاق کرتے ہوئے کہ رہے تھے گھر کے لیمپ وغیرہ آسانی سے تبدیل کر سکتے

ہیں۔ سلطان کوزن اپنے لئے بیوی کی تلاش میں بھی ہیں انکا کہنا ہے کہ پہلے بہت ہی اپ سیٹ تے لیکن اب شادی کیلئے تیار ہیں۔ کوئی شادی کیلئے تیار ہے تو سامنے آئے۔ سب سے لمبا انسان ہونے کا نیا دعویدار ژہاؤ لیانگ آٹھ فٹ ایک انچ کے قریب ہیں۔ چین میں دنیا کے سب سے طویل القامت شخص ہونے کا ایک نیا دعویدار سامنے آیا ہے۔ چینی صوبہ حنان کے علاقے تیانجن سے تعلق رکھنے والے سابق باسکٹ بال کھلاڑی ژہاؤ لیانگ کے طویل القامت ہونے کا پتہ اس وقت چلا جب وہ اپنے پاؤں کا علاج کروانے کے لیے ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں نے جب ان کا قد ناپا تو وہ دو اعشاریہ چار چھ میٹر یا آٹھ فٹ ایک انچ سے کچھ کم نکلا۔ اگر اس پیمائش کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اس وقت دنیا کے سب سے لمبے شخص سے دس سنٹی میٹر یا تین اعشاریہ نو انچ لمبے ہیں۔ اس وقت دنیا کے سب سے طویل القامت شخص کا اعزاز چین ہی کے ستاون باؤزیشن کے پاس ہے۔

باؤ زیشن سات فٹ آٹھ اعشاریہ نو پاچن انچ طویل ہیں اور ان کا نام سنہ 2005 میں گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں درج کیا گیا تھا۔تاہم اب ستائیس سالہ ژہاؤ اپنے سب سے زیادہ طویل القامت ہونے کا دعوٰی پیش کر رہے ہیں۔ جب تک گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے ماہرین ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کر دیتے انہیں باقاعدہ طور پر دنیا کا سب سے لمبا آدمی نہیں مانا جائے گا۔ چین کے سرکاری خبر رساں ادارے ژن ہوا کے مطابق ژہاؤ سنہ 2006 تک بیروزگار تھے اور اس کے بعد ہی انہوں نیگلیوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا شروع کیا تھا۔ ادھرترکی کے ایک شخص نے دنیا کا سب سے لمبا آدمی ہونے کا اعزازحاصل کرلیا تھا۔ 27 سالہ ترک کسان سلطان کوسن Kosen کا قد آٹھ فٹ ایک انچ ہے۔اور اس کا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں دنیا کے سب سے لمبے آدمی کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔لندن میں میڈیا سے بات کرتے ہوئے سلطان کوسن کا کہنا تھا کہاپنے لمبے قد کے باعث انہیں بلب بدلنے اور پردے لٹکانے میں آسانی ہوتی ہے۔تاہم لمبے قدکی وجہ سے ان کے خاص کپڑے سلتے ہیں اور ٹیکسی کے سفر میں مشکل ہوتی ہے۔سلطان کی خواہش ہے کہ وہ پوری نیا کی سیر کریں اور اپنے لیے جیون ساتھی تلاش کریں۔گنیز بک کے ذرائع کے مطابق دنیا میں صرف دس افراد کا قد8 فٹ سے زیادہ بڑھا ہے۔سلطان کوسن سے پہلے دنیا کا سب سے لمبا انسان یوکرین کا رہنے

والا تھا جس کا قد مبینہ طور پر 8 فٹ اور 5.5 انچ تھا۔ تاہم اس سے یہ اعزاز اس وقت واپس لے لیا گیا جب اس نے اپنا قد ناپنے کی اجازت نہیں دی۔ چھوٹے قد والے یوں تو احساس متری کا شکار رہتے ہیں۔ لیکن جب سے ایک حالیہ سائنسی تحقیق میں چھوٹے قد والے مردوں کی ایک ایسی خوبی کا انکشاف ہوا ہے کہ جسے جاننے کے بعد یہ مرد خوشی سے پھولے نہیں سما رہے اور اپنے چھوٹے یا قدرے چھوٹے قد کو عظیم نعمت قرار دے رہے ہیں۔ سائنسی جریدے "ڈیسکور میگزین" میں شائع ہونے والی تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ 5 فٹ 9 انچ یا اس سے چھوٹے قد کے مردوں میں مردانہ قوت اور جوش وخروش کی صلاحیت دراز قد مردوں کی نسبت واضح طور پر زیادہ پائی جاتی ہے اور زندگی کے دوران انھیں ان معاملات کا دراز قد مردوں کی نسبت زیادہ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اس تحقیق میں 20 سے 54 سال کے 531 مردوں کے بارے میں معلومات جمع کی گئیں۔ جہاں چھوٹے قد کو سرگرم جنسی زندگی کی علامت پایا گیا ہے وہیں موٹاپے کا منفی اثر بھی دیکھنے میں آیا اگرچہ نوعمر اور نوجوان لوگوں میں موٹاپے کا جنسی صحت پر زیادہ اثر نہیں دیکھا گیا لیکن 45 سال سے زائد عمر کے لوگوں میں موٹاپا عمومی صحت کے ساتھ ساتھ جنسی صحت کو بھی بری طرح متاثر کرتا ہے۔ چھوٹے قد کے مقصود فلموں کی وجہ سے مشہور ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ،، مجھے کبھی کسی قسم کا احساس کمتری نہیں رہا کہ میں کسی سے کم ہوں یا خدانخواستہ مجھ میں کوئی نقص ہے'' بھئی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں کہ اس نے ہمیں چار ہاتھ پیروں

سے نوازا ہے... ہم اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں کسی کو تکلیف نہیں دیتے،، مقصود عام قد و قامت کے مقابلے میں خاصی چھوٹی قامت کے تھے۔ مقصود ایک طویل عرصے تک اپنے فن سے لوگوں کو محظوظ کرتے رہے اور نارمل عمر گزارنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ پاکستان میں مقصود بھائی اور منی باجی اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ان کے دوستوں کا ایک بڑا حلقہ تھا، وہ ریڈیو پاکستان کے باقاعدہ ملازم تھے، ان کے بارے میں بہت سی باتیں شرارتوں کی طرح ریڈیو میں مشہور تھیں۔ پاکستان بننے سے قبل ہی آواز کی دنیا میں بچوں کے لیے منی باجی کا نام ایک سحر کی طرح تھا جس نے پاکستان بننے کے بعد بھی کئی عشروں تک جکڑے رکھا، اپنے تمام نارمل بہن بھائیوں میں منی باجی کا قد و قامت عام لوگوں جیسا نہ تھا ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مقصود حسن بھی ان ہی کی طرح تھے لیکن منی باجی کی روش پر چلتے ہوئے مقصود حسن جو ریڈیو پاکستان میں ہر بڑے چھوٹے کے مقصود بھائی تھے کامیاب سفر طے کرتے رہے، انھیں جو شہرت نصیب ہوئی وہ بہت سے عام انسانوں کی سوچ سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسٹیج، ٹی وی، فلم اور ریڈیو سے ان کا رشتہ پرانا تھا۔ مزاح ان کی فطرت میں رچا بسا تھا۔ مقصود بھائی ایک شرارتی، معصوم اور بڑے فنکار تھے، اب اس دنیا سے جا چکے ہیں، منی باجی اور مقصود بھائی واقعی عام انسانوں کی طرح نہیں تھے کیوں کہ انھوں نے ہم سب کے دلوں پر اپنی خوبصورت

یادوں کے نقش ثبت کر دیے۔ خدا انھیں بلند درجات عطا کرے۔ چھوٹے قد والے فنکاروں کو دیکھ کر ہنستے تو سب ہیں لیکن ان کی مشکلات کا لوگوں کو کم ہی احساس ہوتا ہے۔ نامور کامیڈین اداکار جاوید کوڈو کا کہنا ہے کہ چھوٹے قد کی وجہ سے فلموں میں معاوضہ نہیں ملتا اور ڈراموں میں بلاتے نہیں، اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے سٹیج ڈرامے سے ہونے والی آمدن سے ہی گزارا کر رہا ہوں۔ جاوید کوڈو نے کہا کہ فلم انڈسٹری میں کام کرنا اس لئے چھوڑا ہے کیونکہ وہاں پر معاوضہ نہیں ملتا اگر مل بھی جائے تو پیسے دیتے ہوئے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی جان جاتی ہے جس کی وجہ سے میں نے فلم انڈسٹری کو چھوڑ دیا ہے اور جہاں تک ٹی وی ڈراموں کا تعلق ہے تو مجھے کام کے لئے نہیں بلایا جاتا۔ چھوٹے قد والوں کی شادی بھی ایک مسئلہ ہے۔ فیصل آباد میں جب ایک ایسی ہی شادی ہوئی تو لوگوں نے خوب جشن منایا۔ فیصل آباد میں سوا دو فٹ قد کا دلہا اور ڈھائی فٹ قد کی دلہن شادی کے بندھن میں بندھے تو خوشی کے اس موقع پر دولہا میاں بے قابو ہو کر باراتیوں کے ہمراہ بھنگڑے ڈالنے لگے۔ کہتے ہیں کہ دینے والا جب بھی دیتا ہے، دیتا چھپّر پھاڑ کے اور اوپر والے کا کرم ہو گیا فیصل آباد کے 48 سالہ ریحان نجم پر۔ ریحان نجم کا قد صرف سوا دو فٹ ہے۔ وہ برسوں سے کنوارا تھا۔ گھر والوں کو ریحان کے جوڑ کی دلہن دستیاب نہ تھی لیکن پھر وہ مل گئی۔ ریحان نجم جھٹ منگی اور پٹ بیاہ پر راضی ہوا۔ شادی پر سارے خاندان کی خوشی دیدنی تھی۔ دلہے راجا تو اتنے خوش تھے کہ قدم قدم

پر بھنگڑے ڈالتے رہے۔ باراتیوں نے بھی موقع کا خوب فائدہ اٹھایا۔ دلہے کے دادا نے پوتے کو کامیاب زندگی گزرنے کی دعائیں دیں۔ رخصتی کے موقع پر دلہن رونے کے بجائے اپنے چلبلے سرتاج کی حرکتوں پر ہنس پڑی۔ چھوٹے قد والے جوڑے کی شادی میں اہل علاقہ نے بھی بھرپور شرکت کی۔ یہ تقریب لوگوں کو مدتوں یاد رہے گی۔ پاکستان میں بڑے قد والوں میں عالم چنا اور محمد ریاض کو نام بھی شامل ہے۔ گو وہ گینز بک میں اپنا نام درج نہ کر سکے لیکن پاکستان میں لوگ ان کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا ضرور ہوتے نظر آئے۔

دماغ کو قابو میں رکھیئے۔ کھیل بھی انسانی دماغ کے لیے خطرناک

مردوں کا دماغ خواتین کی نسبت 10 فیصد زیادہ بھاری ہوتا ہے، لیکن بڑے دماغ کے باعث مرد زیادہ ذہین نہیں ہوتے۔

نیلی بیریاں (بلو بیری) اور اخروٹ یادداشت بہتر بنانے کے علاوہ انسان کو الزائمر سے بھی محفوظ رکھتی ہیں۔

ہنسی یا قہقہہ سے دماغ پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

موبائل فون کا حد سے زیادہ استعمال دماغ کیلئے نہ صرف انتہائی مضر ہے، بلکہ دماغی کینسر کا بھی باعث بن سکتا ہے۔

کھیل دراصل صحت کے لیے ایک فائدہ مند مصروفیت ہے۔ لیکن کئی برسوں تک مسلسل اور ضرورت سے زیادہ دباؤ والے کھیل نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں، خاص طور پر دماغ کے لیے۔ یہ بات مضحکہ خیز لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ کئی فٹبال کھلاڑی بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ مسلسل ہیڈ اسٹروک ہیں۔ فٹبال میں سر کو لگنے والے جھٹکے اتنے زیادہ خطرناک نہیں ہیں، جتنے کہ امریکی فٹبال یا پھر آئس ہاکی میں لگنے والے جھٹکے۔ لیکن بظاہر بےضرر نظر آنے والے جھٹکے بھی نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ اپنے دماغ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو

پھر آپ آئس ہاکی کھیلنے سے بھی پرہیز کریں۔ آئس ہاکی کے متعدد کھلاڑیوں میں بھی باکسر سنڈروم کی بیماری پائی گئی ہے۔ تصادم جان بوجھ کر ہو یا حادثے کے طور پر، حقیقت یہ ہے کہ مسلسل جھٹکوں سے دماغ میں خطرناک قسم کی پروٹینز کی تعداد اور مقدار میں اضافہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہیلمٹ مکمل حفاظت نہیں کرتے۔ نیشنل فٹ بال لیگ پہلے تو کئی برسوں تک اس بات کی تردید کرتی رہی کہ کھلاڑی باکسر سنڈروم سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ اب آ کر چند قوانین تبدیل کیے گئے ہیں تاکہ دماغ کو کم سے کم جھٹکے لگیں۔ اس وقت سائنسدان ایسے مقناطیسی ہیلمٹ تیار کرنے میں مصروف ہیں، جو جھٹکے کی طاقت کو کمزور کرنے میں مدد دیں گے۔ 'باکسر سنڈروم' بیماری صرف باکسرز ہی کو نہیں ہوتی، خاص طور پر 'امریکی فٹ بال' کے کھلاڑیوں میں بھی یہ بیماری اکثر پائی جاتی ہے۔ تحقیقی جریدے 'سائنس' کے مطابق نیشنل فٹبال لیگ کے کھلاڑیوں کے دماغ کو ایک سیزن کے دوران 600 سے زائد جھٹکے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھلاڑیوں کے ہیلمٹ بھی دماغ کو متاثر ہونے سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ زیادہ دباؤ والے کھیل کھیلنے سے دماغ کو نقصان پہنچانے والی بیماری کو ڈاکٹر 'باکسر سنڈروم' کہتے ہیں۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ سر کو مستقل جھٹکے دینے سے دماغ متاثر ہوتا ہے۔ نتیجہ انسان کی یادداشت کمزور، بولنے میں مشکل، خودکشی کے خیالات اور آخرکار ڈیمنشیا جیسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بیماری ایک باکسر میں پائی گئی تھی، اسی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ ریسلنگ صرف ایک شو ہی نہیں

بلکہ اس کھیل میں مسلسل چوٹوں کی وجہ سے متعدد پہلوانوں کے دماغوں کو واقعی نقصان پہنچا ہے۔ کینیڈین پہلوان کرس بینواٹ نے چالیس برس کی عمر میں خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔ یوں تو گزشتہ چند برسوں کے دوران سائنسدان انسانی جسم کے کئی عجائبات جان چکے لیکن دماغ کے اسرار سے بہرحال واقف نہیں ہو سکے۔ موجودہ وقت میں جدید ٹیکنولوجی کے تحت کی جانیوالی سائنسی تحقیق کے باعث ماہرین پر رفتہ رفتہ نئے راز افشاء ہو رہے ہیں۔ کھیلوں کے بارے میں تو آپ جان ہی چکے لیجیئے کچھ اور حیرت انگیز انکشافات ملاحظہ کیجئے۔ انسان جب کوئی بات یاد کرنے کی کوشش کرے تو کچھ دیر لگتی ہے۔ ایسی حالت میں بعض لوگ اپنی یادداشت کو برا بھلا کہتے ہیں، حالانکہ اس میں بیچارے دماغ کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ ہمارا دماغ دراصل ایک سو ارب عصبی خلیوں کا مجموعہ ہے اور جب ہم کوئی بات یاد کرنے کی سعی کرتے ہیں تو ہمارے احکامات دماغ میں 5 سے 120 میٹر فی سیکنڈ کی شرح سے دوڑتے ہیں، چنانچہ احکامات بجالانے میں دماغ کو کچھ دیر لگ جاتی ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انسانی دماغ کا وزن صرف 3 پاؤنڈ ہے، لیکن ہمارا یہ عضو اپنی سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے جسمانی توانائی کا 20 فیصد استعمال کرتا ہے۔

سال 2011 میں کولمبیا یونیورسٹی امریکہ میں کی جانیوالی تحقیق کے بعد ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ انسان انٹرنیٹ استعمال کرتے وقت سوچ بچار پر کم

اور یادداشت پر زیادہ توجہ دیتا ہے، لیکن یہ امر دماغ کو کمزور کرتا ہے اور انسان کئی باتیں بھولنے لگتا ہے۔ اس صورتحال سے بچنے کیلئے ہمیں چاہئے کہ غوروفکر پر زیادہ دھیان دیں۔ چند ماہ قبل ولندیزی ماہرین نے ایک انوکھا تجربہ کیا، جس کے تحت انہوں نے 5 افراد کے سامنے برگر، چرغہ اور چپس وغیرہ کے نام پکارے۔ اس دوران سننے والوں کے دماغ میں وہی حصے متحرک ہوگئے جو منشیات استعمال کرنیوالوں کے دماغوں میں بھی تحرک پیدا کرتے ہیں۔ ماہرین کی رو سے یہ تحرک انسان میں جوش و جذبہ اور لذت پیدا کرنے والے ہارمونز ''ڈوپامائن'' سے جنم لیتی ہے۔ دوسری جانب ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کی یادداشت میں بچپن کے سنے گئے گانے ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ سال 2010 میں کئے گئے ایک تجربہ کے دوران انکشاف ہوا کہ انسان جب بچپن میں سنا کوئی گانا دوبارہ سنے تو اس کے ذہن میں بہت سی خوشگوار یادیں تازہ ہوجاتی ہیں اور اس کا موڈ بھی بہتر ہوجاتا ہے۔

جدید تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انسانی دماغ کا سب سے اگلا حصہ، جسے ''فرنٹ پولر کورٹیکس'' کہا جاتا ہے، ماضی کے تجربات سے نتائج اخذ کرکے مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان ذہنی طور پر فوق البشر طاقت (سپر پاور) نہیں رکھتا، لیکن تجربات کے بل پر نتائج اخذ کرتے ہوئے مختصر المدتی پیشین گوئیاں کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

کمپیوٹر گیمز کے حوالے سے کے گئے ایک تجربہ کے دوران ماہرین نے 20 بچوں کو 3 ماہ تک کمپیوٹر پر کھیلے جانے والے ذہنی آزمائش کے کھیلوں میں مصروف رکھا۔ اس دوران بچے بعض سرگرمیاں بہتر انجام دینے لگے، لیکن ماہرین نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ دماغی کھیل یادداشت یا کام اور سیکھنے کی صلاحیتوں پر مثبت اثرات نہیں ڈالتے، جبکہ موسیقی سننا یادداشت کہیں زیادہ تیز کرتا ہے۔ امریکی یونیورسٹی اسٹانفورڈ میں ہونیوالی تحقیق کے مطابق موسیقی سننے والے لوگ اپنے کام منظم طریقے سے کرتے ہیں، ان پر توجہ دیتے ہیں، پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور اپنی یادداشت کو اپ ڈیٹ بھی کرتے رہتے ہیں۔

وزن کے لحاظ سے مردوں کا دماغ خواتین کی نسبت 10 فیصد زیادہ بھاری ہوتا ہے، لیکن اس بات پر مردوں کو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ماہرین کے مطابق بڑے دماغ کے باعث مرد زیادہ ذہین نہیں ہوتے، بلکہ صرف اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جسمانی کام زیادہ بہتر طور پر سرانجام دے سکیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ 20 سے 28 سال کے درمیان انسان کی دماغی صلاحیتیں عروج پر ہوتی ہیں، یعنی اس وقت دماغ اپنے شباب پر ہوتا ہے، جبکہ 28 سال کی عمر کے بعد یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے، لیکن دماغی صلاحیتیں خاصی حد تک برقرار رہتی ہیں۔ تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ انسانی دماغ 45 سال کے بعد زوال پذیر

ہونے لگتا ہے، اسلئے ماہرین کا مشورہ ہے کہ دماغ اور ذہنی صلاحیتوں کو توانا رکھنے کے لئے مخصوص غذائیں، مثلاً نیلی بیریاں (بلو بیری) اور اخروٹ وغیرہ مفید رہتے ہیں، جو یادداشت بہتر بنانے کے علاوہ انسان کو الزائمر سے بھی محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ غذائیں دراصل دماغ میں مخصوص ہارمون ''ایسیٹائل کولین'' کی شرح بڑھاتی ہیں جو یادداشت بہتر بناتا ہے۔

حالیہ تحقیق سے ثابت ہوچکا ہے کہ موبائل فون کا حد سے زیادہ استعمال دماغ کیلئے نہ صرف انتہائی مضر ہے، بلکہ دماغی کینسر کا بھی باعث بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ موبائل فون کا زیادہ استعمال نیند اور گھبراہٹ کے مسائل پیدا کرتا ہے، اسلئے ماہرین کا مشورہ ہے کہ موبائل فون براہ راست استعمال کرنے کے بجائے ہیڈ سیٹ یا ائیر پیس سے مدد لیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم رات کو اچھی نیند لیں، کیونکہ اس طرح یادداشت مستحکم ہوجاتی ہے۔ نیند کے دوران ہمارے دماغ کے بعض حصے بدستور بیدار رہتے ہیں۔ اس دوران یہ حصے ہماری یادوں کو پروسیس کرتے اور غیر اہم یادوں کو مٹاتے رہتے ہیں۔

تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوچکا کہ امید پرست افراد مایوس لوگوں سے زیادہ جیتے ہیں، لیکن باعث مسرت بات یہ ہے کہ ہمارے جینز زندگی کا نقطہ نظر بنانے میں صرف 30 سے 40 فیصد کردار ہی ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مایوسی کے

بجائے امید بھرا نقطہ نظر اپنانے پر زور دینا چاہیے جس سے ہم بتدریج اپنے خیالات بدل کر مثبت زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہرین کا کہنا ہے کہ ۸ ہفتوں تک روزانہ 30 منٹ مراقبہ کرنے سے ایسے دماغی حصوں کو تقویت پہنچتی ہے جو یادداشت، احساسِ خودی، ہمدردی اور ذہنی دباؤ سے متعلق ہیں۔ مراقبے کا بہترین طریقہ کار یہ ہے کہ دل ہی دل میں کوئی سکون بخش لفظ دہراتے رہیے، تاکہ انتشار پھیلانے والے خیالات دماغ پر حملہ آور نہ ہوں، یا پھر دن میں کسی وقت اپنی مکمل توجہ نظامِ تنفس پر مرتکز کرلیجیے تاکہ خیالات بھی مرکوز رہیں۔

کئی لوگ دفتر یا گھر میں مصروف رہ کر یہی سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی سرگرمیوں کی بدولت تندرست اور فٹ رہیں گے، لیکن دفتری یا گھریلو مصروفیت بہرحال ورزش کا نعم البدل نہیں ہو سکتی، جو دماغ کیلئے بہت مفید ہے۔ ورزش کے ذریعے دماغ خود کو تازہ دم کرلیتا ہے اور کئی بیماریوں مثلاً الزائمر وغیرہ سے بچاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ روزانہ کم از کم 30 منٹ کی ورزش کیجئے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ پیدل چلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں، سیڑھیاں چڑھیں اور دیگر ایسے کام کریں جن میں بدن حرکت کرے۔

ماہرین کے مطابق دماغ کے لئے مفید غذائی عناصر میں اومیگا۔ تھری تیزاب، کولائن، پیچیدہ نشاستہ اور مانع تکسیدی مادے (آکسیڈنٹس) شامل ہیں۔

اومیگا۔ تھری تیزاب دماغ کی دانشورانہ صلاحیتیں بڑھاتے ہیں، جبکہ کولائن وٹامن بی کی ایک قسم ہے جو انڈوں اور دیگر غذاؤں میں ملتی ہے۔ یہ وٹامن جسمانی تھکن کم کرکے دماغی چستی میں اضافہ کرتا ہے، یادداشت بڑھاتا اور ذہنی دباؤ دور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پیچیدہ نشاستہ اور مانع تکسید مادے (آکسیڈنٹس) بھی دماغی کارکردگی بہتر کرتے ہیں۔

حالیہ تجربات سے ثابت ہوچکا کہ انسان جب ہنسی یا قہقہہ سنے تو دماغ کے 2 اہم حصوں ایمی گڈالا'' اور ہیپوکیمپس'' پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ دونوں حصے'' انسان میں تناؤ''ڈیپریشن'' پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہنسی یا قہقہہ سنے سے دماغ کا حصہ ''اکومبنز'' بھی متحرک ہوتا ہے، جو دراصل انسان میں مسرت بخش جذبات جنم دیتا ہے۔ ہنسنے سے انسان میں تناؤ پیدا کرنیوالے ہارمونز کی افزائش رکتی ہے خون کا درجہ حرارت کم ہوتا ہے۔ اس عمل کے نتیجہ میں انسان حملہ قلب (ہارٹ اٹیک) اور فالج کے حملے سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ چند ماہ قبل واشنگٹن یونیورسٹی میں کئے گئے ایک تجربہ سے انکشاف ہوا کہ بچوں کی ہنسی اور کلکاریاں سننے سے ''آکسی ٹوسین'' نامی ہارمون کی مقدار بڑھتی ہے۔ یہ ہارمون ہمارے اندر خوشی کا احساس بڑھاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انٹرنیٹ میں ہنسنے والے بچوں کی ویڈیوز اکثر بہت مقبول رہتی ہیں۔

دماغی صحت بہتر رکھنے کیلئے بلند فشار خون (ہائی بلڈ پریشر) پر توجہ دینا ضروری ہے۔ بلند فشار خون یا ہائپر ٹینشن دور جدید کا ایسا خطرناک مرض ہے جسے کئی لوگ سنجیدگی سے نہیں لیتے، حالانکہ یہ مرض دل اور دماغ دونوں پر بے پناہ دباؤ ڈالتا ہے اور انہیں کمزور کر دیتا ہے۔ اس لئے بلند فشار خون کا علاج کروانا اور اسے قابو میں رکھنا ضروری ہے۔
اس کے علاوہ گذشتہ ۹ برسوں سے نیویارک یونیورسٹی کے ماہرین یہ تحقیق کر رہے تھے کہ ذیابیطس کے جو مریض اپنے خون کی شکر قابو میں نہیں رکھتے، ان پر کیسے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ جون 2012 میں کی گئی اس تحقیق کے نتائج میں انکشاف کیا گیا کہ ذیابیطس رفتہ رفتہ دماغ کو کمزور کر دیتا ہے، للہذا ذیابیطس کے مریضوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس بیماری پر قابو پائیں اور خون میں شکر کی سطح اعتدال پر رکھیں. برس کی عمر میں ہی ان کا دماغ الزائمر کے پچاسی سالہ مریض کی طرح کا ہو چکا تھا۔ اگر زیادہ عرصہ خوش وخرم زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو اپنے دماغ کو قابو میں رکھیئے۔

سارک کانفرنس - امید کی کرن

سارک کانفرنس علاقائی و اقتصادی تعاون بڑھانے، خطے میں غربت کے خاتمے کے لئے امید کی کرن

نیپال میں دو روز جاری رہنے والی اٹھارویں سارک کانفرنس چھتیس نکاتی مشترکا اعلامیہ پر ختم ہو گئی۔ جس میں علاقائی و اقتصادی تعاون بڑھانے، خطے میں غربت کیخاتمے کیلیے اقدامات کرنے کے علاوہ سارک ڈویلپمنٹ فنڈکے قیام کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ سارک ممالک کازمینی راستوں کے ذریعے روابط بڑھانے پر بھی اتفاق کیا گیا ہے۔ آئیندہ انیس ویں سارک کانفرنس دو ہزار سولہ میں اسلام آباد میں ہونے پر بھی اتفاق کیا گیا ہے۔اختتامی سیشن سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم نواز شریف نے اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ اگر حقیقت پسندانہ اور مرحلہ وار اقدامات کیے جائیں تو خطے کے مسائل کے خاتمے میں بڑی مدد ملے گی۔کانفرنس میں رکن ممالک نے توانائی کی شراکت کے معاہدے پر بھی دستخط کیے ہیں سارک سربراہ کانفرنس میں یورپی یونین کی طرز پر جنوبی ایشیائی ممالک پر مشتمل اقتصادی یونین اور مشترکہ ترقیاتی فنڈکے قیام پر اتفاق کیا گیا ہے جبکہ کانفرنس کے آٹھ ملکوں کے درمیان توانائی کی شراکت کا ایک معاہدے پر بھی دستخط ہوئے ہیں۔ تاہم خطے میں معاشی تعاون کے دو دیگر معاہدوں پر اتفاق

رائے نہیں ہو سکا۔ اقتصادی یونین نے ہوا، پانی، شمسی، بائیوفیول کے منصوبوں، زراعت، غذائی تحفظ، تحقیق اور فنی تعاون بڑھانے پر بھی اتفاق کیا۔ جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کی تنظیم یا سارک جنوبی ایشیا کے 8 ممالک کی ایک اقتصادی اور سیاسی تنظیم ہے۔ یہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی علاقائی تنظیم ہے جو تقریباً 1 اعشاریہ 47 ارب لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ تنظیم 8 دسمبر 1985 کو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، مالدیپ اور بھوٹان نے قائم کی تھی۔ 3 اپریل 2007 کو نئی دہلی میں ہونے والے تنظیم کے 14 ویں اجلاس میں افغانستان کو بھی آٹھویں رکن کی حیثیت تنظیم میں شامل کیا گیا۔ جنوبی ایشیائی ممالک پر مشتمل ایک تجارتی بلاک کا خیال بنگلہ دیش کے صدر ضیاالرحمٰن نے پیش کیا۔ 1981 میں کولمبو میں ہونے والے ایک اجلاس میں بھارت، پاکستان اور سری لنکا نے بنگلہ دیشی تجویز کو تسلیم کیا۔ اگست 1983 میں ان رہنماؤں نے نئی دہلی میں منعقدہ ایک اجلاس میں جنوبی ایشیائی علاقائی تعاون کے معاہدے کا اعلان کیا۔ 7 ایشیائی ممالک جن میں نیپال، مالدیپ اور بھوٹان بھی شامل ہیں، نے زراعت و دیہی ترقی مواصلات، سائنس، ٹیکنالوجی اور موسمیات، صحت و بہبود آبادی، ذرائع نقل و حمل، انسانی ذرائع کی ترقی کے شعبوں میں تعاون پر اتفاق کیا، افغانستان کو 13 نومبر 2005 کی بھارت کی تجویز پر 3 اپریل 2007 کو مکمل رکن کی حیثیت سے تنظیم میں شامل کیا گیا۔ افغانستان کی شمولیت سے تنظیم کے رکن ممالک کی تعداد بڑھ کر 8

ہو گئی ہے۔ اس تجارتی بلاک کی اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب اپریل 2006 میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی کوریا نے مبصر کی حیثیت سے تنظیم میں شمولیت کی باقاعدہ درخواست دی۔ بعد میں یورپی یونین نے بھی مبصر کی حیثیت سے شمولیت میں دلچسپی ظاہر کی اور جولائی 2006 میں سارک وزرا کونسل میں اس حیثیت کے لیے باقاعدہ درخواست دی۔ 2007 میں ایران نے بھی مبصر کی حیثیت کے لیے درخواست دی۔ یوں نہ صرف خطے میں بلکہ دنیا میں اس تجارتی بلاک کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ سارک رہنماؤں نے خطے سے غربت کے خاتمے کے لیے بھرپور عزم کا اظہار کیا۔ اختتامی اجلاس میں جہاں متفقہ طور پر کٹھمنڈو اعلامیہ جاری کیا گیا وہیں اجلاس کے آخری دن کٹھمنڈو کے قریب ایک تفریحی مقام پر آٹھ ملکوں کے درمیان مشترکہ گریڈ کے ذریعے بجلی کی شراکت کے ایک معاہدے پر دستخط بھی ہوئے ۔ اس موقع پر بھارت صرف ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے حق میں نہیں تھا بلکہ دو مزید معاہدے جن کا تعلق ٹرانسپورٹ اور ریلوے سے تھا ان پر بھی دستخط کرنا چاہتا تھا تاہم پاکستان نے اس پر یہ کہہ کر دستخط سے انکار کر دیا کہ ان معاہدوں پر وزرا کی سطح پر بات چیت نہیں ہوئی اور ان پر بات چیت کرنا ابھی مناسب نہیں۔ کانفرنس کے شرکاء نے پاکستان کے موقف کو تسلیم کیا جس پر بھارت بھی رضا مند ہو گیا۔ نیپال کے وزیر اعظم سشیل کوئرالہ نے بھی اس کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ مشترکہ چیلنجز سے نمٹنے کے لئے سربراہان کے درمیان تعمیری بات

چیت ہوئی ہے اور یہ سارک کے ایجنڈے کے فروغ میں بھرپور کردار ادا کریں گے۔
اس کانفرنس کی خاص بات یہ بھی تھی کہ اس میں پاکستان اور بھارت کے وزراء اعظم کے درمیان مختصر مصافحہ بھی ہوا۔ جس سے دونوں ملکوں کے درمیان جاری تناؤ میں کمی آئی ہے۔ نواز شریف نے تو یہاں تک کہا کہ پاکستان بھارت سے مذاکرات کیلئے تیار ہے۔ سارک کے قیام کو تین دہائی گزر چکی ہیں۔ لیکن یہ پلیٹ فارم اب بھی یورپی یونین کی طرح موثر نہیں بن سکا ہے۔ سارک کے استحکام میں علاقائی تنازعات بڑی رکاوٹ ہیں ۔ بھارت پاکستان کے تنازعات بھی اس میں اہم رکاوٹ ہیں۔ سارک مملکت کو دہشت گردی کے چیلنج کو بھی سامنا ہے۔ جنوبی ایشاء مملکت کے لئے سارک ایک اہم ترین پلیٹ فارم ہے جس کے ذرریعے خطے کے عوام کی خوشحالی اور رکن ممالک اپنی اجتماعی بہتری کیلئے شاندار انداز سے کام کر سکتے ہیں، سارک کو اس ضمن میں یورپی یونین کی تقلید کرنی چاہیئے۔ جس نے بہت تھوڑے عرصے میں ویزہ، کرنسی، پاسپورٹ میں یکسانیت کے علاوہ یورپی یونین میں شامل ممالک اقتصادی تعاون میں بھی زبردست انداز سے پیشرفت کی ہے۔ یورپی یونین بڑے ممالک کی تنظیم ہے اور اس کے مقابلے میں سارک میں شامل ممالک چھوٹے ہیں لیکن اس تنظیم میں خطے کے ممالک کیلئے کام کرنے کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ سارک کو موثر بنانے میں پاک بھارت کو کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا، اور تعاون کے فروغ بڑھانے کے لئے مل جل کر قدم بڑھانا ہوگا۔

نیوز میکر جنھوں نے دنیا بدلنے کا عزم کیا

آج کل میڈیا کا دور ہے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل شائد اسی لیئے کہا گیا تھا کہ اگر آپ خبروں میں نہیں ہیں تو پھر کہیں بھی نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو ہمیشہ خبروں میں ان رہتے ہیں۔ میڈیا انھیں نیوز میکر یا خبر بنانے والے کہتا ہے۔ معروف امریکی اخبار وال سٹریٹ جرنل نے چند ماہ پہلے ایشیا کی ان شخصیات کی لسٹ جاری کی تھی۔ جنھیں نیوز میکر کہا جاتا ہے. 27افراد کی اس لسٹ میں 2 پاکستانی بھی شامل ہیں، تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان اور کالعدم تحریک طالبان کے سربراہ ملا فضل اللہ کو غیر ملکی میڈیا نے پاکستانی نیوز میکرز قرار دیا ہے، مولوی فضل اللہ تو اب کبھی کبھی اخبات کی ہیڈنگ میں آتے ہیں لیکن عمران خان کے بغیر تو اب میڈیا کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ کپتان کے ایک کزن تو سیاسی دھرنا چھوڑ کر بھاگ گئے ورنہ وہ بھی نیوز میکرز میں آگے آگے ہی تھے۔ اس فہرست میں بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی اور عام آدمی پارٹی کے سربراہ، دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کیجری وال بھی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں،، لسٹ میں چین کی کیمونسٹ پارٹی کے وان ھننگ ،، چینی وزیر خزانہ لو جی اور ارب پتی چینی بزنس مین وان جیانگ اور چینی انٹرنیٹ علی بابا گروپ کے چیئر مین جیک ما بھی شامل ہیں۔،، جاپانی وزیر اعظم شنزو ایبے ،، شمالی کوریا کے کم

جونگ،، جنوبی کوریائی سکیٹنگ گرل کم یونا،انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ کے گورنر جوکو وڈوڈو،،جاپانی سوفٹ بینک کے مالک ماسا یوشی بھی اس فہرست کا حصہ ہیں۔ جاپانی بیس بالر ماسا ہیرو،،جاپانی فٹ بالر سنیچی ٹنکانا،،سام سنگ کے مالک جے وائے لی،، تھائی لینڈ کی وزیر اعظم ینگ لک شینا وترا،برما کی اپوزیشن لیڈر آنگ سان سوچی،،تائیوانی پاپ گلوکار جیسن شن ارب پتی تائیوانی تاجر ٹیری گو بھی لسٹ میں شامل ہیں۔ارب پتی کلائیو پامر،،افغان وزیر خارجہ رنگین دادفر،،ہانگ کانگ کے ارب پتی تاجر لی کاشنگ،،بینک آف چائنہ کے چیئرمین جیاؤ ژنگ،، ہانگ کانگ کے ماہر تعلیم چارلس لی،، کیتھے پیسیفک ایئر لائنز کے چیف ایگزیکٹو ٹونی چو بھی اس لسٹ میں شامل ہیں۔

عمران خان

عمران خان کو دنیا کرکٹ کی وجہ سے جانتی ہے۔ دنیا کے اس عظیم کرکٹر کا پورا نام عمران خان نیازی ہے۔ جو تحریک انصاف کے سربراہ، پاکستان کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان، شوکت خانم میموریل ہسپتال کے بانی اور اب دھرنا اور شہر ہی نہیں پورا م بند کرنے کی تحریک بپا کیئے ہوئے ہیں۔ عمران خان لاہوری ہیں۔ وہ لاہور میں 25 نومبر 1952 میں اکرام اللہ خان کے گھر پیدا ہوئے۔ وہ پاکستان کرکٹ ٹیم کیلیے 1971 سے 1992 تک کھیلتے رہے۔ پشتونوں کے مشہور قبیلے نیازی سے تعلق ہے۔ ان کی والدہ شوکت خانم صاحبہ زیادہ تر میانوالی میں رہی . کپتان

جناب اکرام اللہ خان صاحب کے اکلوتے بیٹے ہیں. ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کیا. تاہم بعد میں. برطانیہ گئے. وہاں رائل گرائمر سکول میں پڑھا اور پھر آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔ آپ 1974 میں آکسفورڈ یونیورسٹی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ عمران خان صاحب نے کرکٹ کی دنیا اپنا مقام بنایا ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس وقت وہ سیاست کے بجائے کرکٹ سے زیادہ تعارف کرایا جاتا ہے. عمران خان کی قیادت میں پاکستان نے 1992 میں عالمی کرکٹ کپ جیتا تھا. انہوں نے 88 ٹیسٹ میچ کھیل کر 362 وکٹیں 22.81 کی اوسط سےحاصل کیں۔ 1981 - 1982 میں لاہور میں سری لنکا کے 8 کھلاڑی صرف 58 رنز دے کر آؤٹ کیے۔ اور 23 مرتبہ ایک اننگز میں 5 وکٹیں حاصل کیں۔ انہوں نے 36.69 کی اوسط سے 3807 رنز بنائے جن میں سے 5 سنچریاں بھی شامل ہیں۔ ان کا زیادہ سے زیادہ سکور اڈیلیڈ میں 1991 میں آسٹریلیا کے خلاف کھیلتے ہوئے 132 رنز رہا۔ ان کا شمار پاکستان کرکٹ کے کامیاب ترین کپتانوں میں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ پاکستان کے پہلے کپتان تھے جن کی قیادت میں پاکستانی ٹیم نے بھارت کو بھارت اور انگلستان کو انگریزی سرزمیں میں ہرایا۔ بطور کپتان انھوں نے 48 ٹیسٹ میچ کھیلے جن میں سے 14 جیتے اور 8 ہارے اور 26 برابر یا بغیر کسی نتیجے سے ختم ہوئے۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم نے 1992 میں ان کی قیادت میں کھیلتے ہوئے پانچواں کرکٹ عالمی کپ جیتا۔ یہ اعزاز ابھی تک پاکستان صرف ایک دفعہ ہی حاصل کر سکا ہے۔ انھوں نے 175 ایک روزہ میچوں میں حصہ لیا۔ اور 182 وکٹیں حاصل کیں۔

رنز 33.41 کی اوسط سے بنائے۔ ان کا زیادہ سے زیادہ سکور 102 ناٹ 3709 آؤٹ تھا جو انھوں نے سری لنکا کے خلاف 1983 میں کھیلتے ہوئے بنائے۔ ان کی قیادت میں 139 ایک روزہ میچ کھیلے گیے جن میں سے 77 جیتے 57 ہارے، چار بے نتیجہ رہے جبکہ 1 میچ برابر رہا۔انھوں نے مجموعی طور پر 5 عالمی کرکٹ کپ میں حصہ لیا جو کہ 1975 ، 1979 ، 1983، 1987اور 1992 میں منعقد ہوئے۔ سیاست میں مشرف نے انھیں آگے بڑھانے کا سوچا اور پیچھے ہٹ گئے۔ پھر خان صاحب خود ہی چل پڑے۔ پاکستان تحریک انصاف بنائی۔ اب اس کے چیئرمین ہیں. ان کی پارٹی.
کے عام انتخابات میں ووٹ لینے کے لحاظ سے دوسری اور نشستیں جیتنے کے لحاظ 2013 سے تیسری بڑی پارٹی بنی۔ اگست 2014 مین آپ نے آزادی مارچ شروع کیا جس کا مقصد پاکستان کو ایک مستحکم اور شفاف محکوم ریاست بنانا تھا۔ لیکن اب وہ شہر اور ملک بند کرانے کی مہم پر ہیں۔انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے صدراتی ایوارڈ بھی ملا۔ علاوہ ازیں 1992 میں انسانی حقوق کا ایشیا ایوارڈ اور ہلال امتیاز (1992) میں عطا ہوئے۔ 1995 میں عمران خان نے مرحوم برطانوی ارب پتی، سر جیمز گولڈ سمتھ کی بیٹی، جیمیما گولڈ سمتھ سے شادی کی۔ جیمیا گولڈ سمتھ نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا اور ان کا اسلامی نام جمائما خان ہے۔ اس شادی کا شہرہ پوری دنیا میں ہوا اور عالمی میڈیا نے اس کو خصوصی اہمیت دی۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اور عمران خان نے جمائما کو طلاق دے دی۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ پاکستان کی دوسری نیوز میکر شخصیت مولوی فضل اللہ کی ہے۔ جنہیں

تحریک طالبان کا سربراہ بھی بنایا گیا۔ عالمی میڈیا کے لئے تحریک طالبان پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنا حکیم اللہ محسود کے مارے جانے سے کہیں زیادہ اہم خبر تھی۔

مولوی فضل اللہ۔ تحریک طالبان

مولوی فضل اللہ ان عسکریت پسندوں میں سے ایک ہے جو پاکستان کی ریاست سے ہر طرح کی ٹکر لینے کے لیے اُس وقت سے کمربستہ ہے جب سے وہ پراسرار طور پر سوات کے گرد پاکستان آرمی کے تنگ گھیرے میں سے مکھن کے بال کی طرح نکل کر سرحد کے اُس پار کنڑ صوبے میں جا پہنچے۔ لحیم شحیم، مولوی فضل اللہ مشکل راستوں پر چلنے کا عادی نہیں تھا۔ اُس کا کام ریڈیو کے ذریعے واعظ کرنا اور اپنے کمانڈرز کو احکامات جاری کرنا تھا۔ فضل اللہ نے صحت یاب ہونے کے بعد کنڑ کے گورنر کی سربراہی میں ایک بڑا لشکر تشکیل دیا۔ اب یہی فضل اللہ افغانستان میں سے اس تنظیم کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے جسے حکیم اللہ محسود اور اس سے پہلے بیت اللہ محسود نے وزیرستان میں رہتے ہوئے ملک اور قوم پر حملوں کے لیے استعمال کیا۔ دوسرے الفاظ میں مولوی فضل اللہ کی صورت میں تحریک طالبان پاکستان اب تحریک طالبان پاکستان افغانستان بن گئی ہے۔ مولوی فضل اللہ ایک ''غیر اہم مفرور'' کے مقام سے اٹھ کر تحریک طالبان کے قائد کی مسند پر جا بیٹھا ہے۔ وہ اس وقت وہ تمام بدلے چکا سکتا ہے جو اس سرزمین سے نکلتے وقت

اس نے اپنے ذہن پر نقش کیے تھے۔

نریندر مودی بھارتی وزیر اعظم

نریندر دامودر داس مودی کی مادری زبان گجراتی ہے۔ وہ بھارت کے وزیر اعظم ہیں۔ اس سے پہلے، انہوں نے گجرات (بھارت) کے وزیر اعلی کا منصب سنبھالا ہوا تھا۔ مودی کا سیاسی سفر 1984 میں شروع ہوا۔ جب آر ایس ایس نے اپنے چند ارکان کو بھارتیہ جنتا پارٹی میں بھیجا، ان میں مودی بھی شامل تھے۔ انہوں نے اڈوانی کی سومناتھ - ایودھیا یاترا اور مرلی منوہر جوشی کی کنّیا کماری- کشمیر یاترا میں حصہ لیا۔ بعد میں انہوں نے گجرات میں انتخابات کے پرچار کی ذمہ داری نبھائی۔ وزیر اعلی کیشو بھائی پٹیل کے استعفی دینے کے بعد مودی کو وزیر اعلی بنایا گیا۔ مودی کا جنم 17 ستمبر 1950 کو گجرات کے مہسانہ ضلع میں ایک غریب خاندان میں ہوا تھا۔ ان کے والد دامودر داس ریلوے سٹیشن پر چائے بیچتے تھے اور والدہ ہیرا بین گزر بسر میں مدد کے لیے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھیں۔ بچپن میں خود نریندر مودی اپنے والد کے ساتھ ٹرینوں میں چائے بیچا کرتے تھے۔ ان کے سوانح نگار کے مطابق بچپن میں ان کے ذہن میں سنیاسی بننے کا بھی خیال آیا تھا اور وہ کچھ دن راما کرشن مشن میں بھی جا کر رہے۔ 17 سال کی عمر میں جشودا بین سے ان کی شادی ہوئی لیکن دونوں کبھی ساتھ نہیں رہے۔ تعمیر تحریک ("تعمیر نو"). تنظیم کے لیے ایک مکمل وقت آرگنائزر کے طور

پر کام کرنے کے بعد، انہوں نے بعد میں بھارتیہ جنتا پارٹی میں اس کے نمائندے کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ نریندر مودی کو دہلی میں پارٹی کے جنرل سیکریٹری کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ 1995 میں، مودی پارٹی کے قومی سیکریٹری مقرر کیا گیا تھا اور بھارت میں پانچ اہم ریاستوں کے انچارج بنا دیا گیا. 1998 میں انہوں نے جنرل سیکرٹری تنظیم)، ایک پیغام ہے کہ وہ اکتوبر 2001 تک منعقد کے طور پر ترقی دی گئی. نریندر) دامودر داس مودی متنازع شخصیت کے مالک ہیں۔ مودی کے مخالفین انھیں تفرقہ پیدا کرنے والی شخصیت گردانتے ہیں۔ سنہ 2002 کے گجرات فسادات کے دوران مودی گجرات کا وزیراعلی تھا جس کی وجہ سے ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پس پردہ اس میں ملوث تھے۔

عام آدمی کی پارٹی کے سربراہ اروند کجروال

دہلی کے ریاستی انتخابات میں اک نئی پارٹی وجود میں آئی اور انتخابی پنڈتوں کو حیران کر دیا کیوں کے اس نوزائیدہ جماعت کو بنے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر انتخابی نتائج نے نہ صرف بھارت بلکے برصغیر کے تمام ممالک پاکستان، بنگلہ دیش، میں گہرا اثر کیا اس پارٹی کی بنیاد اک انکم ٹیکس افسر اروند کجروال نے ڈالی وہ ہی اب اس پارٹی کے سربراہ بنے۔ ریاستی انتخابات میں عام آدمی پارٹی نے بھاری کامیابی حاصل کی اور دہلی میں اروند

کجروال وزیر اعلی (مکھی منتری) منتخب ہوے اور اپنی وزارت اعلی قائم کی اور واقعاتا عام آدمی کی طرح میٹرو بس میں بیٹھ حلف لینے آیے اور دہلی کے شہریوں کے لیے پانی صحت امن کے لیے اصلاحات کیں کئی بار وہ خود بھی شہر کی ٹریفک میں پھنسے دیکھے گے۔ کجروال نے پروٹوکول کلچر کا خاتمہ کیا۔ کجرول نے جب کرپشن کے خلاف بل کی منظوری چاہی تو کانگریس اور بی جے پی اس کے اڑے آ گئیں کجروال کا کہنا تھا اگر وہ لوک پال بل اسمبلی سے منظور نہ کروا کے تو مستعفی ہو جائیں مگر بل منظور نہ سکا یوں اروند کجروال کی وزرات اعلی اپنے اختمام کو پہنچی۔ کجروال کچھ کرکے یا نہ کرکے لیکن تاریخ میں اپنا نام تو لکھوا لیا۔

جیک ما علی بابا کے مالک

چینی انٹرنیٹ کمپنی علی بابا گروپ کے چیئرمین جیک ما بھی نیوز میکرز میں شامل ہیں۔ جیک ما کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ وہ پہلے چینی بزنس میں ہیں جو فوربس مگزین کی کور اسٹوری بنے۔ ہونگزو صوبے میں پیدا ہونے اس نوجوان کو انگریزی سیکھنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ روزانہ پینتالیس منٹ بائیک چلا کر ایک ایسے موٹل جایا کرتے تھے جہاں وہ غیر ملکیوں سے انگریزی میں بات چیت کر سکیں. وہ انہیں بطور ایک گائڈ شہر کی سیر کرتے تھے تاکہ انگریزی میں خوب باتیں کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنی زبان بہتر بنا سکیں... نو عمری میں دو

دفعہ یونیورسٹی کے داخلہ ٹیسٹ میں فیل ہوئے اور مجبوراانہیں ٹیچرز انسٹیٹوٹ میں پڑھانا پر جو کہ ایک عام سی یونیورسٹی ہے .جیک مانے لکھا ہے کہ سب سے پہلے میں نے چینی کمپنیوں کے لیے ویب سائٹس بنانے کا سوچا اور اسکے لیے اپنے امریکی دوستوں سے مدد لی ......جس دن میری ویب سائٹ انٹرنیٹ پر آئی میں نے اپنے تمام دوستوں اور ٹی وی لے لوگوں کو گھر پر جمع کیا ......انٹرنیٹ بہت سلو تھا، ڈائل اپ کے کنکشن پر ہم نے ساڑھے تین گھنٹے میں آدھا صفحہ ڈونلوڈ کیا.. ہم کارڈ کھیلتے رہے، کھاتے پیتے رہے...تاکہ ویب سایٹ ڈونلوڈ ہوجائے...بہت وقت لگا مگر میں حد سے زیادہ خوش تھا کہ میں نے سب کو دیکھا دیا کہ انٹرنیٹ کا وجود ہے۔ جیک ماکی کمپنی چین کی آن لائن شاپنگ کمپنی علی بابا ہے۔ علی بابا امریکہ کی سلیکون ویلی سے کاروبار کرتی ہے اور دوسری آن لائن ریٹیل (خوردہ) کمپنیوں کی ہی طرح اس کا زور خوردہ خریداروں پر نہ ہو کر بڑے کاروباریوں پر رہتا ہے۔ مبصرین کا کہنا تھا کہ نیویارک سٹاک ایکسچینج میں شامل ہونے کے بعد علی بابا کا نام بھی فیس بک، ایمیزون اور ای بے جیسی کمپنیوں کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ یہاں ذہن میں یہ سوال ابھر سکتا ہے کہ آخر علی بابا پر کیا کیا دستیاب ہے تو جواب کچھ اس طرح دیا جاتا ہے وہاں کیا دستیاب نہیں؟ یہ کمپنی آن لائن مارکٹنگ، آن لائن خدمات اور لاجسٹکس تو مہیا کراتی ہی ہے اس کے علاوہ یہ بہت سی دوسری چیزیں بھی فراہم کراتی ہے۔ یہاں فوجی ساز و سامان آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اگر کوئی ٹینک، توپ، گولہ، راکٹ لانچر خریدنے کی حسرت رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی یہاں بہت کچھ ہے۔

انڈونیشیا کے صدر جو کووڈوڈو

جو کوو ڈوڈو نے انڈونیشیا کے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھا کر سب کو حیران کر دیا تھا۔ جو کوو ڈوڈو انڈونیشیا کے پہلے صدر ہیں جن کا انڈونیشیا کے سابق صدر اور آمر حکمران سوہارتو سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا ہے۔ ان کی حلف برداری کی تقریب پارلیمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوئی۔ حلف برداری کی تقریب میں امریکی وزیر خارجہ جان کیری سمیت فوجی، سیاسی اور کاروباری افراد نے شرکت کی۔ جو کوو ڈوڈو موجودہ صدر سوسیلو بمبانگ کی جگہ اگلے پانچ سال کے لیے انڈونیشیا کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اس سے قبل وہ دارالحکومت جکارتہ کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ انڈونیشیا کے پہلے صدر ہیں جن کا سابق صدر سوہارتو کے بتیس سالہ دورِ حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ایک غریب گھرانے میں پیدا ہونے والے جو کوو ڈوڈو نے فرنیچر کے کاروبار کے ذریعے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کیا۔ جکارتہ کے گورنر بنے اور آج انڈونیشیا کے صدر مقرر ہوئے۔ ترپن سالہ وڈوڈو انڈونیشیا کی تاریخ کے ساتویں اور عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے تیسرے صدر ہیں53 سالہ جو کو ویدودو21 جون 1961 کوانڈونیشی شہر' سوراکارتا (Surakarta)میں پیدا ہوئے۔ والد' نوتو میہردیجو معمولی ترکھان تھے۔ انہیں

فرنیچر بنا کر بہ مشکل اتنی آمدنی ہوتی کہ روز مرہ اخراجات پورے ہو سکیں۔ خاندان کرائے کے گھر میں مقیم تھا۔ جوکو کی پیدائش کے چند سال بعد نوتو مقروض ہو گیا۔ حتیٰ کہ کرایہ ادا کرنے کو رقم نہ رہی۔ جوکو کی والدہ، سدجیامتی نے شوہر کو وہ قیمتی برتن دیئے جو انہیں اپنے باپ سے پہلے بیٹے کی پیدائش پر تحفتاً ملے تھے۔ مدعا یہ تھا کہ شوہر انہیں بیچ کر کچھ رقم حاصل کر لیں۔ یہ ایک خاتون خانہ کی طرف سے بڑی قربانی تھی۔ نوتو مہر دیجو برتن لیے سائیکل میں انہیں بیچنے نکلے۔ افسوس کہ راستے میں برتن گرے اور چکنا چور ہو گئے۔ اس نقصان پر قدرتاً اہل خانہ کو بڑا افسوس ہوا۔ نوتو کے والد کی ایک گھڑی بیٹے کے پاس محفوظ تھی۔ وہ باپ بیٹے کی محبت کی انمول نشانی تھی۔ اب نوتو نے دل پر پتھر رکھ کر وہ جان سے زیادہ پیاری گھڑی گروی رکھ دی۔ لیکن گھڑی کے بدلے جو رقم ملی، وہ ناکافی تھی۔ چنانچہ کرایہ ادا نہ ہونے پر انہیں گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ پھر وسط شہر میں بہتے دریائے سولو کے کنارے بنی کچی آبادی میں رہنے لگے۔ انہوں نے درخت کاٹ کر وہاں ایک جھونپڑی بنائی اور یوں سر چھپانے کا ٹھکانا میسر آ گیا۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی نوتو کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم دلوائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترقی کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ ان کے ایک رشتے دار فرنیچر بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ چلاتے تھے۔ نوتو کو وہاں ملازمت مل گئی۔ وہ محنتی انسان تھے۔ انہوں نے دان رات محنت کرکے اتنی رقم جمع کر لی کہ اپنی دکان کھول سکیں۔ وہیں

بارہ سالہ جو کو بھی باپ سے ترکھان کا کام سیکھنے لگا۔ وہ صبح سکول جاتا' سہ پہر کو باپ کا ہاتھ بٹاتا۔ اللہ تعالیٰ نے کام میں برکت دی اور وہ چل پڑا۔ جلد ہی جمع پونجی کے ذریعے نوتو نے ذاتی گھر تعمیر کر لیا۔

1980ء میں جو کو نے میٹرک پاس کیا۔ اب کالج میں پڑھائی کا مرحلہ آیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے زیادہ سرمایہ بھی درکار تھا۔ ادھر دکان سے اتنی ہی آمدن ہوتی کہ گھر کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ تب تک جو کو کی دو بہنیں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔ سو خرچ بڑھ گیا۔ اس کڑے وقت میں خاندان والے پھر باپ بیٹے کی مدد کو پہنچے۔ مشترکہ خاندانی نظام کا یہ بہت بڑا وصف ہے کہ اس میں سب لوگ مشکل وقت میں ایک دوسرے کی بھرپور مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ نوتو کے بھائیوں نے بھتیجے کی فیس کا بندوبست کیا۔ یوں جو کو جکارتہ چلے آئے اور وہاں گاجامادا یونیورسٹی کے شعبہ جنگلات میں تعلیم پانے لگے۔ 1985 میں جو کو نے بی ایس سی فارسٹری کر لیا۔ کبھی انہیں ماں باپ کے ساتھ دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ کبھی دن بھر پیٹ بھرنے کو ایک ہی کھانا ملتا۔ کبھی ایک ہی لباس زیب تن کیے کئی ہفتے گزر جاتے۔ جب ان کی مالی حیثیت مستحکم ہوئی تو جو کو سوچنے لگے' کس طرح غریب ہم وطنوں کی حالت بدلی جائے؟ تب انہیں احساس ہوا کہ وہ حکومت میں پہنچ کر ایسے اقدامات کر سکتے ہیں جو غربا کو کم از کم تین فوائد پہنچائے: سر چھپانے کو جگہ دے۔ پیٹ بھر کھانا کھلائے اور تن ڈھانپنے کو کپڑا

دے۔ دوستوں نے بھی انھیں سیاست میں جانے کا مشورہ دیا۔ان کی خواہش تھی کہ ایماندار،اہل اور مخلص نوجوان انڈونیشی سیاست میں حصہ لیں۔ 2004 سے سوراکارتا کی بلدیاتی سیاست میں حصہ لینے لگے۔ جو کو شہر کے چپے چپے پر گئے اور ہر قسم کے لوگوں سے ملے۔ یوں انہیں مزید واقفیت ملی کہ عام آدمی کس قسم کی مشکلات میں مبتلا ہے۔جو کو نے شہریوں کو یقین دلایا کہ اگر وہ میئر شہر بن گئے، تو ان کے مصائب دور یا کم کرنے کی ہر ممکن سعی کریں گے۔ اس نوجوان رہنما کا خلوص و سچائی باتوں اور آنکھوں سے ظاہر تھی' اس لیے جو کو دیکھتے ہی دیکھتے سوراکارتا میں جانے پہچانے عوامی رہنما بن گئے۔آخر 2005 میں وہ شہر کے میئر منتخب ہوئے۔ انھوں نے حکمران جماعت کے نمائندے کو شکست دے کر سبھی کو حیران کر دیا۔ مگر ابھی جو کو کے کارناموں نے پورے ملک کو چونکا دینا تھا۔ وہ سات برس شہر کے میئر رہے اور اس دوران سوراکارتا کی کایا پلٹ ڈالی۔2005 میں سوراکارتا مجرم پیشہ گروہوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ قانون کا نام ونشان نہیں تھا کیونکہ انتظامیہ کرپشن کی دلدل میں پھنسی تھی۔ جو کو نے برسراقتدار آتے ہی بلدیہ کے کرپٹ ملازمین کو گھر بھجوایا اور ایمان دار ملازم بھرتی کیے۔ پھر شہر میں اعلان کرا دیا کہ بلدیہ کا جو ملازم رشوت مانگے' اس کی خبر انہیں دی جائے۔ چنانچہ چند ماہ میں بلدیہ کے ملازم... افسروں سے لے کر خاکروبوں اور مالیوں تک اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دینے لگے۔اب جو کو دیگر عوامی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے شہر میں

نئی بسیں چلائیں اور ٹرانسپورٹ نظام بہتر بنایا۔ غریبوں کے لیے کم قیمت مکانات بنوائے۔ مخصوص مقامات میں مارکیٹیں بنائیں جہاں غریب چھابڑی والوں کو مفت دکانیں دی گئیں۔ جن پارکوں میں مجرموں کا بسیرا تھا' وہاں نئے درخت و پودے لگوائے اور انہیں بہترین تفریحی مقام بنا دیا۔ شہر میں جتنے بھی ترقیاتی منصوبے شروع کیے گئے' ان کا ٹھیکہ جوکو کے کسی رشتے دار حتیٰ کہ دوست کو بھی نہیں ملا۔ جوکو نے یوں شہر میں وی آئی پی کلچر' کرپشن اور اقربا پروری کے بخیے ادھیڑ ڈالے اور میرٹ و قانون کی حکمرانی کو پروان چڑھایا۔ وہ روزانہ کسی محلے یا کچی آبادی جاتے اور لوگوں سے گفت و شنید کرتے' ان کے مسائل سنتے۔ یوں انھوں نے براہ راست عوام سے تعلق رکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو آج بھی جاری ہے۔

حکومت نے موٹر وے کو رہن رکھ کر ایک ارب ڈالر کے سکوک بانڈ جاری کر دیئے

قرض کی معیشت کب تک حکومت کو سہارا دے گی۔

پاکستانی معیشت میں استحکام کے چرچے ہیں ۔زر مبادلہ کے ذخائر کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس سال کے اختتام کے ساتھ ہی زر مبادلہ کے ذخائر 15 ارب ڈالر ہو جائیں گے۔ زر مبادلہ کے ذخائر میں تازہ اضافہ سکوک بانڈ کی نیلامی سے حاصل ہونیوالے 1 ارب ڈالر ہیں۔ جو اسٹیٹ بنک کو موصول ہو چکے ہیں۔ سکوک بانڈ کی کامیابی کے بعد آئی ایم ایف نے بھی پاکستان کیلیۓ 6.6 ارب ڈالر کے قرضہ میں سے 1.05 ارب ڈالر کے قرضہ کی دو اقساط جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ آئی ایم ایف کا کہنا ہے کہ یہ اقساط پاکستان کی اقتصادی حالت کے جائزہ کے بعد جاری کرنے کی منظوری دی ہے۔ آئی ایم ایف کی طرف سے 1405 بلین ڈالر قرضہ کی اقساط جاری کرنے کی اس منظوری کے بعد آئندہ چند روز میں ملک کے زر مبادلہ کے ذخائر 15 بلین ڈالر ہو جائیں گے۔ سکوک بانڈ کی رقم بین الاقوامی سرمایاکاروں کو فروخت ہونے والے سکوک بانڈز سے حاصل ہوئی ہے۔ حکام کے مطابق اس رقم سے 103 ارب مالیت کا مہنگا مقامی قرض کی واپسی ہوگی۔ 5 سالہ سکوک بانڈز عالمی سرمایاکاروں کو سالانہ 6اعشاریہ 75 فیصد شرح منافع پر فروخت کیے

گئے ہیں۔ سکوک بانڈز کی نیلامی سے قبل حکومت کو اس میں کامیابی کی بہت زیادہ امید نہ تھی۔ اور اندازہ تھا کہ اس سے پچاس کروڑ ڈالر کی رقم ہی حاصل ہوسکے گی۔ تاہم بین الاقوامی سرمایہ کاروں نے اس میں زبردست دلچسپی لی اور حکومت کو 2 ارب 30 کروڑ ڈالر کی پیشکشیں وصول ہوئیں لیکن حکومت نے صرف 1 ارب ڈالر مالیت کے سکوک بانڈز جاری کیے۔ اسٹیٹ بینک کا کہنا ہے کہ سکوک کی کامیاب نیلامی بین الاقوامی سرمایاکاروں کا ملک پر اعتماد کا اظہار ہے۔ وفاقی وزیر خزانہ سینیٹر اسحاق ڈار بھی اس کامیابی پر پھولے نہ سمائے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کو سکوک بانڈ کے اجرا کیلئے ہدف سے 5 گنا زیادہ پیشکشیں موصول ہوئی تھیں۔ لیکن 2 ارب 30 کروڑ ڈالر کی پیشکشوں میں سے ایک ارب ڈالر کی پیشکش قبول کی گئی۔ انھوں نے سکوک بانڈ کے اجرا سے قرضے بڑھنے کے تاثر کو بھی رد کیا۔ سکوک بانڈ کے اجراء سے قبل وزیر خزانہ لندن اور دبئی، ابو ظہبی۔ سنگاپور میں دنیا کے سرمایہ کاروں کو سکوک بانڈ میں سرمایہ کاری کے پُر کشش مواقع سے آگاہ کرنے کے لئے بھی گئے تھے۔ ان کانفرنسوں میں مالیاتی اداروں، پنشن فنڈز، بینکوں کے نمائندوں اور سرمایہ کاروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ 5 سالہ سکوک بانڈ 6 اعشاریہ 75 فیصد منافع پر فروخت کیے گئے ہیں۔ اپریل میں جاری کیے گئے یورو بانڈ کے مقابلے میں ان بانڈز پر پاکستان کو 0 اعشاریہ 5 فیصد کم منافع دینا پڑ رہا ہے۔ اب حکومت 10 سالہ بانڈز جاری کرنے پر غور کر رہی ہے جس پر 7 اعشاریہ 65 فیصد تک منافع دیا جاسکتا ہے۔ بانڈز کی فروخت

سے جہاں ملکی زر مبادلہ ذخائر میں اضافہ ہوا ہے وہاں روپے کی قدر پر مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ عالمی ریٹنگ ایجنسی موڈیز نے بھی پاکستان کی معاشی صورتحال کو مستحکم قرار دیا ہے۔ موڈیز نے پاکستانی سکوک بانڈ کی درجہ بندی سی اے اے ون مقرر کر دی جو موڈیز کی جانب سے پاکستانی معیشت کے لئے جاری ریٹنگ کے برابر ہی ہے۔ دوسری عالمی ریٹنگ ایجنسی اسٹینڈرڈ اینڈ پورز نے پاکستانی سکوک بانڈ کی ریٹنگ منفی بی مقرر کی ہے۔ پاکستان کی جانب سے دوسری مرتبہ سکوک بانڈ جاری کئے گئے ہیں۔ اس قبل پاکستان نے پہلی مرتبہ دسمبر 2004 میں ساٹھ کروڑ ڈالر مالیت کے عالمی سکوک بانڈ جاری کئے تھے۔ سکوک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اسلامی بانڈ کے ہیں جن کو سود کے متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسلامی بنکاری کے مختلف طریقوں مثلاً مضاربہ باہمی شراکت) رہن (مارٹ گیج) اور سکوک بانڈ کے لیے مختلف ممالک میں مختلف) طریق کار رائج ہیں۔ بین الاقوامی سکوک مارکیٹ سال 2001 میں شروع ہوا اور اس کے (Structural Innovation) نے جلد ہی نہ صرف اجراء بلکہ ساختی جدت معاملے میں بھی مقبولیت حاصل کر لی۔ سکوک مارکیٹ میں سال 2004 سے 2007 کے درمیان اضافے کی ریکارڈ شرح رہی اور کارپوریٹ، نیم سرکاری اور خود مختار جاری کنندگان کے ذریعہ بین الاقوامی و ملکی دونوں اجراء میں کئی سنگ میل عبور کئے۔ 2008 کے مالیاتی بحران نے سکوک مارکیٹ کو بھی متاثر کیا تھا۔ 2009 اور 2010 کے اواخر عرصے میں زیادہ تر بین الاقوامی سکوک بحرین، انڈونیشیا، متحدہ عرب

امارات اور قطر کے خود مختار اور نیم سرکاری اداروں میں جاری ہوئے۔ اسلامی مالیات میں سکوک، فکسڈ پروفائل اور بہتر کریڈٹ جیسی خصوصیات کی وجہ سے اسلامی کیپٹل اور منی مارکیٹ میں مقبول مالیاتی ذریعے سمجھا جاتا ہے۔ سکوک سب سے تیزی سے ابھرنے والے متبادل وسائل اور کیپٹل مارکیٹ ذرائع ہیں جن کا استعمال زیادہ تر جی سی سی و مشرق وسطی اور پھر جنوب مشرقی ایشیا میں وہاں کی حکومتوں، حکومت کے ماتحت اداروں اور کارپوریشنز کی طرف سے کیا جاتا رہا ہے۔ سکوک مارکیٹ بڑی تیزی سے عالمی سرمائے مارکیٹ میں اپنا مقام بنا رہی ہے۔ سکوک خاص منصوبوں یا خصوصی سرمایہ کارانہ سرگرمیوں سے متعلق ٹھوس اثاثوں کی ملکیت میں غیر منقسم حصص کی نمائندگی کرتا ہے۔ چونکہ سکوک سرمایہ کار، سرمایہ کاری سے منسلک اثاثوں کی ملکیت میں ایک عام حصہ رکھتا ہے لہٰذا وہ بنیادی اثاثوں میں ایک غیر منقسم منفعت بخش ملکیت کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ سکوک ہولڈرز سکوک اثاثوں سے پیدا کردہ آمدنی میں حصے کے حقدار ہوتے ہیں۔ صکوک ایک ایسا قانونی طریقہ ہے جو شریعہ قانون کے موافق ہے، یہ شریعہ کے علماء اور متعلقہ ریگولیٹری حکام کی طرف سے منظور شدہ و نظرثانی کردہ قانونی معاہدوں کے ذریعہ چلایا جاتا ہے۔ (یہ سرمایہ کاروں کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے)۔ اس میں جاری کنندہ (Issuers) کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ قسط اور اصل رقم کی ادائیگی معینہ دنوں میں کردیں۔ عام طور پر سکوک کی قسمیں، قرض میں جزوی ملکیت سکوک مرابحہ)، اثاثہ (سکوک اجارہ)، منصوبہ (سکوک)

استثنا)، کاروبار (سکوک مشارکہ)، یا سرمایہ کاری (سکوک استثمار) ہیں۔ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں 2000 سے زائد اسلامی مالیاتی ادارے اسلامی بنکاری،اسلامی انشورنس (تکافل)،اسلامی فنڈ، مضاربہ ،اجارہ،اسلامی بانڈ سکوک)اور اسلامی مائیکروفینانس سمیت چند دیگر صورتوں میں شریعہ سے ہم آہنگ) اسلامی مالیاتی خدمات میں سرگرم ہیں۔کہا جارہا ہے کہ سکوک بانڈز کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سٹیٹ بینک کے خزانے میں جانے کے بعد اس رقم کی برابر مالیت کے پاکستانی روپے کو داخلی قرضوں کی ادائیگی میں استعمال کیا جائے گا۔سکوک بانڈ کے اجرا سے پاکستان نو سال کے وقفے کے بعد کامیابی سے اسلامی بانڈ کی بین الاقوامی منڈی میں واپس آگیا ہے۔ سکوک بانڈ کے اجراء کے ساتھ پاکستان جس بات کی توقع کررہا تھا کہ آئی ایم ایف ٹیم ملک کی معاشی حالت میں بہتری کی کلین چٹ دے دے گی۔ وہ بھی پوری ہو گئی ۔سکوک بانڈ کے اجرا کیلئے مختلف اثاثے رہن کرنے کے لئے سوچا گیا تھا۔ تاہم موٹر وے ایم ٹو کو اس مقصد کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ایم ٹو کو ماضی میں بانڈ کے اجرا کیلئے استعمال کیا گیا ہے، 2005 میں پانچ سال کیلئے500 ملین ڈالر کے سکوک بانڈ جاری کئے تھے اور اس مقصد کیلئے ایم ٹو کے اثاثے بطور رہن رکھے تھے تاہم یہ رقم 2010 میں ادا کردی گئی تھی۔ اس طرح اس سال367 کلومیٹر ایم ٹو ایک بار پھر بطور رہن استعمال کی گئی۔ وزارت خزانہ کے سابق مشیر ڈاکٹر اشفاق ایچ خان کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کو500 ملین ڈالر سے

زیادہ سکوک بانڈ جاری نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ اگر ایک ارب ڈالر کے بانڈز کے اجرا سے مارکیٹ میں یہ تاثر جائے گا کہ ملک کے قرضے لینے کی صورتحال بہت خطرناک ہے۔ سکوک بانڈ کے کامیاب اجراء سے پاکستان کے اندرونی قرضوں میں تو کمی آئے گی۔ لیکن بیرونی قرضوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔حکومت ملکی معیشت کو مستحکم کرنے کے عزم کے ساتھ ہی یہ بھی کہتی رہی ہے کہ اگر دھرنے نہ ہوتے تو ملکی معیشت کے حالات مزید بہتر ہوتے، اب دھرنے بھی ختم ہوگئے ہیں۔حکومت کو ٹیکس کے دائرے کو بڑھانے، حکومتی اخراجات میں کمی، پیٹرول کی کم قیمتوں کا عوام کو فائدہ پہنچانے کے اقدامات بھی کرنے چاہیئے اور اس کا اظہار بجٹ خسارے میں کمی سے ہونا چاہیئے۔

کریڈٹ کارڈ فراڈ

ہر سال ایک سو ملین امریکی کریڈٹ کارڈ فراڈ کا شکار ہوتے ہیں۔
امریکی صدر اوباما بھی اس فرڈ سے نہ بچ سکے۔
دنیا میں جہاں کمپیوٹر نے انسان کو سہولت دی ہے، وہاں ان کے لئے خطرات اور فراڈ کو بھی جنم دیا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ فراڈ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ہوتے ہیں۔ جن سے امیرکی صدر اوباما بھی نہیں بچ سکے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے تجارتی شہر لندن میں ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈ کے فراڈ اس قدر زیادہ ہیں کہ یہ اب دنیا میں سرفہرست آگیا ہے، جبکہ مانچسٹر ،برسٹل اور کارڈف فراڈ کے معاملے میں سرفہرست 5 شہروں میں شامل ہیں۔فراڈ کے معاملے میں سرفہرست 5 شہروں میں گزشتہ سال پلے متھ، کیمبرج اور بیلفاسٹ شامل تھے۔ لندن میں ہر پانچویں شخص کو ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈ کے فراڈ کی شکایت ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ 40 فیصد افراد کو اس وقت تک فراڈ کا پتہ نہیں چلتا جب تک کہ بینک کا گوشوارہ ان کو موصول نہیں ہوتا۔ اگرچہ فراڈ کے واقعات بلاامتیاز ہوتے ہیں لیکن ریسرچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کریڈٹ کارڈ کی چوری کے سلسلے میں خواتین اور ضعیفوں کو زیادہ نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سی پی پی میں کارڈ پروٹیکشن کے

سربراہ زومینٹون کا کہنا ہے کہ کارڈ کا فراڈ انتہائی تشویشناک بات ہے جو کہ احتیاطی تدابیر کے باوجود اب بھی جاری ہے۔اس اعلان کے باوجود کہ اپنے کھوجانے یا چوری ہوجانے والے کریڈٹ کارڈ کی اطلاع فوری دی جائے۔کارڈ کی چوری کی اطلاع اپنے بینکوں یا کارڈ کمپنیوں کو دینے میں اوسطاً 10 گھنٹے کا عرصہ لگتا ہے۔ 2011 میں امریکا کی تاریخ کے سب سے بڑے کریڈٹ کارڈ فراڈ میں تیرہ بھارتی باشندوں ملوث تھے۔ نیویارک کی عدالت میں تیرہ ملین ڈالر کے اس فراڈ کو عالمی سطح پر سب سے منظم گروہ کا فراڈ قرار دیا گیا تھا۔اس فراڈ کرنے والے گروہ میں ایک سو گیارہ افراد شامل تھے۔ گروہ میں روسی، چینی باشندوں کے علاوہ تیرہ بھارتی بھی شامل تھے۔اسگروہ کے بارے میں عدالت کے جج نے کہا کہ تھا کہ یہ منظم گروہ امریکی تاریخ کا سب سے بڑا اور پیچیدہ گروہ ہے۔انتظامیہ نے ان افراد کو چھیاسی چھاپوں کی دوران گرفتار کیا۔عدالت کو بتایا گیا کہ یہ افراد کسی اور کے کریڈٹ کارڈ پر ہنڈ بیگز خریدنے سے لے کر جیٹ طیارے تک چارٹر کرتے تھے۔امریکا میں کریڈٹ کارڈز استعمال کرنے والے صارفین کے ساتھ دھوکہ بازی میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔خود امریکی صدر بھی ایسی واردات کا نشانہ بنا دیے گئے۔ کریڈٹ کے کھاتے میں ایک سال کے دوران ایک سو ملین امریکیوں کے ساتھ فراڈ ہوگیا۔امریکی صدر براک اوباما کا کریڈٹ کارڈ اس وقت کام نہ آسکا جب وہ پچھلے ماہ امریکی خاتون اول کے ساتھ نیویارک کے ایک ہوٹل میں کھانے گئے تھے۔امریکی صدر نے کریڈٹ کارڈ کے

استعمال میں نہ آ سکنے پر کہا'' لگتا ہے میں نے اسے زیادہ استعمال نہیں کیا ہے، اس لیے یہ واپس باہر آ گیا۔''امریکی صدر کی ذمہ داریوں میں ایسے لمحات کم ہوتے ہیں کہ تعطیلات کے علاوہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ خوشگوار انداز میں نجی طور پر کہیں گھوم پھر سکیں۔ لیکن نیویارک میں اس طرح کی ایک کوشش میں کریڈٹ کارڈ حائل ہوتا نظر آیا۔امریکی صدر اس مقصد کے لیے اپنی اہلیہ مشعل اوباما کے ساتھ '' بگ اپیل'' پر عشائیے کے لیے آئے تھے۔ صدر نے کہا اچانک کریڈٹ کارڈ کے جواب دے جانے پر صارفین کے لیے قائم مالی تحفظ کے کے بیورو میں کہا'' لگتا ہے کچھ فراڈ ہو رہا ہے۔''امریکی صدر نے اس حوالے سے ڈیبٹ کارڈز کے استعمال کو محفوظ بنانے کے لیے کچھ مزید اقدامات کرنے کا بھی اعلان کیا۔ سال 2013 میں ایک سو ملین امریکی شہری ایسے کارڈز کی وجہ سے کسی نہ کسی واردات کا نشانہ بن چکے ہیں۔ صدر اوباما نے کہا'' میں کھانا پیش کرنے والی خاتون کے سامنے وضاحت کر رہا تھا کہ آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ میں اپنے بل خود ادا کرتا رہا ہوں، لیکن اس کے باوجود اس واقعے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔''امریکی صدر کو سالانہ چار لاکھ ڈالر تنخواہ ملتی ہے جبکہ پچاس ہزار ڈالر کی خریداری ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر کر سکتا ہے۔پاکستانمیں کریڈٹ کارڈ فراڈ کیس میں رکن پنجاب اسمبلی شمائلہ رانا کا.ٹراچرچا ہوا تھا۔ ان کے خلاف مقدمہ بھی درج کیا گیا تھا۔ شمائلہ رانا پر لاہور کی رہائشی زائرہ ملک نے الزام لگایا تھا کہ مسلم لیگ نواز کے رکن پنجاب اسمبلی نے

کریڈٹ کارڈ چوری کرکے اس سے خریداری کی ہے۔ آج کل کے دور میں کریڈٹ کارڈ ایک عالمی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا کے ہر کونے میں قابلِ قبول ہیں۔ امریکا کے کسی بینک کا جاری کردہ کریڈٹ کارڈ کراچی میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور پاکستان کے کسی بھی شہر میں موجود کسی بینک سے بنوایا گیا کریڈٹ کارڈ یورپ ہو یا امریکا، کہیں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے کے لیے کسی بینک کا اکاؤنٹ ہولڈر ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ اپنی مالی حیثیت کے اعتبار سے اسے باآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کریڈٹ کارڈ دراصل ایک فوری نوعیت کا ''قرضہ'' ہوتا ہے جو کہ بینک آپ کو دیتا ہے۔ بینک آپ کی طرف سے رقم کی ادائیگی کرتا ہے اور آپ پھر یہ رقم بینک کو واپس ادا کرتے ہیں۔ اگر آپ بینک کے مقرر کردہ وقت (جو 20 سے 55 دنوں تک ہوسکتا ہے) کے دوران رقم کی ادائیگی کردیتے ہیں تو بینک آپ سے کوئی سود طلب نہیں کرتا۔ لیکن اگر رقم کی ادائیگی مقررہ وقت کے دوران نہیں ہوتی تو بینک اپنی دی ہوئی رقم پر سود (مارک اَپ) بھی طلب کرتا ہے۔ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ یہ سود عام قرضے کے مقابلے میں خاصا زیادہ ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں صارفین کو اندازہ نہیں ہوتا۔ کریڈٹ کارڈ کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ اس کی بے شمار سہولیات ہیں۔ کریڈٹ کارڈ سے آپ آن لائن شاپنگ کے علاوہ دیگر کئی کام لے سکتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ریستوران، شاپنگ سنٹر، اسپتال، پیٹرول پمپ، اسٹورز وغیرہ سے خریداری کے بعد کریڈٹ کارڈ سے ادائیگی کرسکتے ہیں۔

بڑی رقم کو اپنے ساتھ لے کر گھومنا ایک خطرناک کام ہے اس لئے کریڈٹ کارڈز بڑی رقوم کی ادائیگی کے لئے بھی باکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ کی دو قسمیں زیادہ مقبول ہیں، ایک ماسٹر کارڈ اور دوسرا ویزا کارڈ۔ یہ بنیادی طور پر نیٹ ورکس ہیں جو کہ رقوم کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا کام کرتے ہیں۔ ایسے دیگر نیٹ ورکس میں امریکن ایکسپریس، ڈسکوری اور یونین پے بھی خاصے معروف ہیں۔ یہ کریڈٹ کارڈز چونکہ آسان اور فوری قرضہ فراہم کرتے ہیں جسے مقررہ دِنوں میں واپس کرنے پر کوئی مارک اَپ بھی نہیں دینا ہوتا یا اسے آسان اقساط میں ادا کیا جاسکتا ہے، اس لئے لوگوں نے بے دریغ کریڈٹ کارڈ بنوانے شروع کر دیے۔ بٹوے میں کریڈٹ کارڈ کی موجودگی اطمینان کا باعث ہوتی ہے کہ آپ کے پاس پیسے ہوں نہ ہوں کریڈٹ کارڈ موجود ہے جس سے آپ ہزاروں روپے کی خریداری یا ادائیگی کر سکتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ پاکستان میں بھی انتہائی مقبول ہے اس کے علاوہ آن لائن خریداری کا عمل بھی ہمارے ہاں جاری ہے۔ اپنے کریڈٹ کارڈ سے آپ باآسانی بیرون ممالک سے بھی اشیا پاکستان منگوا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے شہروں میں کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی قبول کرنے والے ہزاروں مرچنٹس بھی موجود ہیں۔ پیسوں کا لین دن سب ایک الیکٹرانک کارڈ کے ذریعے ہو رہا ہو تو بھلا ہیکرز کی رال کیوں نہیں ٹپکے گی...؟؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہیکرز کیسے کریڈٹ

کارڈ سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ کریڈٹ کارڈ چوری کیسے کرتے ہیں؟ کسی کریڈٹ کارڈ کا گم یا چوری ہونا یا مرچنٹ کے پاس بھول آنا ایک غیر معمولی بات ہے اور یہ واقعہ بہت کم پیش آتا ہے۔ ویسے بھی کارڈ کی گمشدگی کے فوراً بعد صاحبِ کارڈ اسے بلاک کروا دیتے ہیں اس لیے اس سے نقصان کا اندیشہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہی ہے تو پھر کیسے ہیکرز نے آج تک کریڈٹ کارڈز کے ذریعے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ڈالر کے فراڈز کیے ہیں؟ جبکہ مزیدار بات یہ ہے کہ ہیکر کسی کا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہوئے ہزاروں روپے کی خریداری کر جاتے ہیں لیکن کریڈٹ کارڈ مالک کو یہ نقصان برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ تو پھر نقصان کس کا ہوتا ہے؟

کریڈٹ کارڈ دھوکے بازیوں کی بات کی جائے تو اس کا سب سے زیادہ نشانہ بننے والا ملک امریکا ہے۔ امریکن شہری ہر چھوٹی بڑی خریداری کے لیے تقریباً کریڈٹ کارڈ ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہیکرز کا نشانہ بھی زیادہ بنتے ہیں۔ جیب میں پیسے رکھنے کی بجائے اگر آپ ایک مقناطیسی پٹی پر انحصار کرنا شروع کر دیں گے، جو کہ باآسانی کاپی بھی کی جا سکتی ہو تو چالاک ہیکرز کا نشانہ بننا کوئی بڑی بات نہیں۔ سب سے پہلے کریڈٹ کارڈ صارف سوچتا ہے کہ آخر اس کا کریڈٹ کارڈ کوئی دوسرا کیسے استعمال کر سکتا ہے کیونکہ کارڈ تو ہر وقت ان کے بٹوے میں موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی آج تک یہی

سوچتے رہے ہیں تو یقین جانیں آپ بہت ہی بھولے ہیں۔ ایک کریڈٹ کارڈ سے آن لائن خریداری کے لیے آپ کو تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے کریڈٹ کارڈ کا نمبر، اس کی تاریخ تنسیخ یا ایکسپائری ڈیٹ اور سی وی وی (Card Verification Value) نمبر۔ اس کے علاوہ بعض اوقات نام اور پتا بھی درکار ہوتا ہے۔ تین اعداد پر مشتمل سی وی وی کوڈ انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو کہ کریڈٹ کارڈ کی پچھلی جانب کارڈ کے اعداد کے آخر میں لکھا ہوتا ہے۔ بینک کی جانب سے ہدایت ہوتی ہے کہ یہ اعداد نوٹ کرنے کے بعد اسے کارڈ پر سے اسکریچ کر دیں تاکہ پڑھنے کے قابل نہ رہیں۔ اگر آپ کا کارڈ خدانخواستہ چوری یا گم ہو جائے تو ان تینوں تفصیلات کو استعمال کرتے ہوئے کوئی بھی باآسانی آن لائن خریداری کر سکتا ہے۔ اگر کارڈ گم یا چوری نہیں ہوا تو پھر ہیکر کریڈٹ کارڈ کی معلومات تک کیسے پہنچتے ہیں؟ تو اس سوال کا جواب بہت ہی آسان ہے۔ دراصل خود کریڈٹ کارڈ صارفین اپنی یہ معلومات بانٹتے پھرتے ہیں۔ جب کسی جگہ شاپنگ کرنے کے بعد یا گاڑی میں ایندھن بھروانے کے بعد ادائیگی کے لیے آپ بے فکر ہو کر اپنا کارڈ دکاندار کو تھما دیں گے تو سوچیں پہلا خطرہ تو یہیں سے شروع ہو گیا۔ اگر کارڈ کی معلومات نوٹ کر لی جائیں جو کہ صرف ایک منٹ کی کارروائی ہے۔ اسکمنگ (Skimming) کہلانے والی یہ تکنیک دنیا بھر میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس طریقے میں کریڈٹ کارڈ کی معلومات کاغذ پر نوٹ کر کے، کریڈٹ کارڈ کی فوٹو کاپی کر کے یا Skimmer مشین کے ذریعے چرائی جاتی ہیں۔

مشین ایک الیکٹرانک آلہ جو کہ پوائنٹ آف سیل (جس پر کریڈٹ کارڈ کو رگڑایا سوائپ کیا جاتا ہے) جیسی ایک مشین ہوتی ہے۔ اس پر جب کسی کریڈٹ کارڈ کو سوائپ کیا جاتا ہے تو یہ اس کی معلومات کو ریکارڈ کرلیتا ہے۔ مثلاً اسٹور پر آپ نے گھر کا راشن لینے کے بعد ادائیگی کے لیے اپنا کارڈ پیش کیا، دکاندار نے بخوشی کارڈ لیا اور ایک مشین پر آزمایا۔ مشین نے کارڈ قبول نہیں کیا، اس نے پاس پڑی دوسری مشین پر آزمایا اور کارڈ چل گیا، آپ نے رسید پر دستخط کرکے دکاندار کے حوالے کی اور اپنا سامان لے کر گھر چلے گئے۔ اسکمنگ کے لیے اسی طرح کے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ایک مشین نہ چلی لیکن دوسری چل گئی۔ حالانکہ اس اضافی مشین کو کریڈٹ کارڈ کی تفصیلات نوٹ کرنے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

قانونی طور پر تمام ویب سائٹس جہاں کریڈٹ کارڈ قبول کیا جاتا ہے، اس بات کی پابند ہوتی ہیں کہ وہ صارفین کے کریڈٹ کارڈز کی معلومات اپنے پاس محفوظ نہ رکھیں اور اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو صارف کے علم میں لا کر یہ عمل کیا جائے۔ چوری شدہ کریڈٹ کارڈز کی تفصیلات بیچنے کا کاروبارہ کافی پھیل چکا ہے۔ ایسے کریڈٹ کارڈ جن کی زیادہ سے زیادہ درست معلومات دستیاب ہو، 100 ڈالر تک میں فروخت ہوتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ سے آن لائن خریداری کے لیے صرف تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کریڈٹ کارڈ کے حوالے سے جتنی زیادہ درست معلومات

موجود ہوگی، جیسے کہ صارف کا ایڈریس و فون نمبر، کریڈٹ کارڈ اتنا ہی مہنگے داموں بِکتا ہے۔ یہ اضافی معلومات آن لائن خریداری کے دوران چوری کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اکثر ویب سائٹس پر خریداری کے لیے آپ کو یہ دیگر معلومات بھی تصدیق کے لیے فراہم کرنی ہوتی ہیں تاکہ پتا چل سکے آپ اپنا ہی کارڈ استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح کریڈٹ کارڈ تفصیلات چوری کرنے والے زیادہ تر انھیں خود استعمال نہیں کرتے تاکہ ان کی ساکھ برقرار رہے لیکن انھیں بیچ کر ضرور کچھ پیسے بنا لیتے ہیں۔ اس بے ایمانی کے دھندے میں ایمانداری عروج کی ہوتی ہے۔ چوری شدہ کارڈ بیچنے والے مکمل یقین دہانی کراتے ہیں کہ کارڈ درست اور کارآمد ہے لیکن اگر کارڈ بلاک ہو چکا ہو تو اس کے بدلے نیا کارڈ نمبر فراہم کیا جاتا ہے۔

سیاہ ویب (ڈارک ویب) کا ایک بڑا حصہ اسی مقصد کے لئے مخصوص ہے۔ سیاہ ویب انٹرنیٹ کا وہ خفیہ حصہ ہے جو کسی سرچ انجن کی دسترس میں نہیں۔ ان کے بارے میں نہ بِنگ۔ گوگل پتا لگا پاتا ہے نہ SilkRoad نامی ویب سائٹ جو کہ اب بند کی جاچکی ہے، اس کام کے لئے خاصی مقبول تھی۔ لیکن سلک روڈ اس کی صرف ایک مثال ہے، ایسی ہزاروں ویب سائٹس موجود ہیں جو کہ اس کام میں ملوث ہیں۔ کریڈٹ کارڈ چوری کرنے کے بعد اس بات کی تصدیق کے لئے کہ آیا کریڈٹ کارڈ چل رہا ہے کہ نہیں، ایک دلچسپ ترکیب استعمال کی جاتی ہے۔ ہیکرز مختلف رفاعی اداروں کی

ویب سائٹس جو کریڈٹ کارڈ کے ذریعے امداد قبول کرتی ہیں، چوری شدہ کریڈٹ کارڈ سے ان پر 1 سے 2 ڈالر کی "امداد" دیتے ہیں۔ اس سے دو فائدے ہوتے ہیں، پہلا کریڈٹ کارڈ کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ آیا وہ چل رہا ہے کہ نہیں۔ دوسرا چونکہ چارج کی گئی رقم بہت معمولی ہوتی ہے کہ تو کریڈٹ کارڈ مالک بھی اسے بیشتر مواقع پر نظر انداز کرتے ہوئے رپورٹ نہیں کرتا۔ اس طرح کریڈٹ کارڈ بلاک ہونے سے بھی بچ جاتا ہے۔ تیسرا فائدہ، معمولی ہی سہی، لیکن رفاعی ادارے کو ہوتا ہے کہ انہیں امداد مل جاتی ہے۔چوری شدہ کریڈٹ کارڈ نمبرز کا استعمال کرتے ہوئے ہیکرز زیادہ تر ایسی چیزیں خریدتے ہیں جنھیں وصول کرنا آسان اور بے نشان ہو۔ مثلاً ایسے واؤچرز یا گفٹ کارڈز (مثلاً ایمزون گفٹ کارڈز) جن سے آگے مزید شاپنگ کی جا سکے، سافٹ ویئر کے لائسنس وغیرہ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے حصول کے لئے انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اِدھر ہیکر نے درست کریڈٹ کارڈ نمبر فراہم کیا، اُدھر لائسنس یا گفٹ واؤچر ان کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اب ہیکرز کرتے یہ ہیں کہ سافٹ ویئر کا لائسنس کسی اور کو سستے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ گفٹ کارڈز یا واؤچرز بھی کیش کی دوسری شکل ہیں۔ زیادہ تر کریڈٹ کارڈ چور گفٹ کارڈ خریدنے کے بعد ان سے الیکٹرانکس اشیاء جیسے کہ موبائل فون، کمپیوٹر، گیم کنسول، ٹیبلٹس وغیرہ خریدتے ہیں۔ یہ ایسی اشیاء ہیں جو فوراً فروخت ہو جاتی ہیں اور ان کی قیمت بھی اچھی مل جاتی ہے۔ کچھ ہیکرز اس سے مختلف طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ انڈر گراؤنڈ ویب

سائٹ جو کہ ڈارک ویب کا حصہ ہیں، پر قیمتاً ایسے افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو کہ اپنے پتے پر ارسال کیا گیا پیکٹ واپس ہیکر کے پتے پر ارسال کردیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے فری لائسنسنگ ویب سائٹس بھی استعمال کی جاتی ہیں جہاں معصوم اور بھولے بھالے لوگ ان ہیکرز کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتے ہیں اور کچھ پیسوں کے عوض ہیکرز کو اپنا ایڈریس استعمال کرنے دیتے ہیں۔ہیکرز یہ سب اپنی شناخت چھپانے کے لئے کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کا ان چوروں تک پہنچنا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ایک تکنیک ہیکرز یہ بھی اختیار کرتے ہیں کہ چوری شدہ کریڈٹ کارڈز کے ذریعے وہ اپنے پری پیڈ ڈیبٹ کارڈز میں پیسے ڈلواتے ہیں اور پھر اس ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے آن لائن خریداری کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے کہ اس کی وجہ سے ہر سال اربوں ڈالر کا نقصان ہوتا ہے۔آن لائن فروخت کی ویب سائٹس ان تمام باتوں سے باخبر ہیں اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کرتی ہیں کہ خریدار کی چھان بین کریں۔ کچھ ویب سائٹس کریڈٹ کارڈ چارج کرنے سے پہلے صارف کو فون کرکے تصدیق کرتی ہیں۔ ایک دفعہ چوری شدہ رپورٹ ہونے والے کارڈز کو یہ ہمیشہ کے لیے بلاک کر دیتے ہیں۔ یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ کریڈٹ کارڈ مالک کو کارڈ چوری اور اس کے نتیجے میں ہونے والا نقصان نہیں برداشت کرنا پڑتا۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ نقصان بینک کا بھی نہیں ہوتا جس نے کریڈٹ کارڈ کے عوض مرچنٹ کو رقم ادا کی ہے۔ نقصان سارا مرچنٹ کا ہوتا ہے، اسے اُس (Merchant)

چیز کی قیمت بھی نہیں ملتی جو اس سے خریدی گئی ہے اور مرچنٹ جس بینک کا پوائنٹ آف سیل یا پیمنٹ گیٹ وے استعمال کر رہا ہوتا ہے، وہ بینک بھی مرچنٹ سے ''چارج بیک'' کے نام پر رقم وصول کرتا ہے۔ تاہم ہر بار ایسا نہیں ہوتا۔ اگر کریڈٹ کارڈ مالک یہ بات ثابت کرنے میں ناکام ہوجائے کہ اس نے خریداری نہیں کی تو پھر نقصان اسے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذہنی کوفت، وقت کا ضیاع اور جھنجھلاہٹ رقم کے نقصان کے علاوہ ہیں جو صارف کو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اگر آپ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب بیرون ممالک کی کہانیاں ہیں تو آپ غلط ہیں۔ یہ سب کچھ پاکستان میں بھی جاری ہے۔ جیسا کہ ہم نے بتایا کہ کریڈٹ کارڈ کہیں کا بھی ہو کہیں بھی استعمال ہو سکتا ہے تو پاکستان میں بھی یہ فراڈز جاری ہیں۔ چوری شدہ پاکستانی کریڈٹ کارڈز بھی بین الاقوامی بلیک مارکیٹ میں بکتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد خاصی کم ہے لیکن ہے ضرور۔ نیز، پاکستان میں موجود ہیکرز بھی اس بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوتے ہیں۔ چونکہ پاکستان میں قانون کی عمل داری اور خاص طور پر ڈاک کا نظام کسی تعارف کا محتاج نہیں، اس لئے پاکستانی Scammers بلیک مارکیٹ سے خریدے گئے کریڈٹ کارڈز کو دھڑلے سے استعمال کرتے ہیں اور ایسی مصنوعات پاکستان میں منگواتے ہیں جو کہ یہاں باآسانی فروخت ہوجاتی ہیں۔ چونکہ ایسی مصنوعات پاکستان میں بذریعہ غیر رجسٹرڈ ڈاک منگوائی جاتی ہیں اس لئے ان کی ڈیلیوری کا ریکارڈ بھی مرتب نہیں ہوتا۔ یہاں محکمہ ڈاک کے ملازمین اور کسٹم حکام سے گٹھ جوڑ

کرکے اشیاء حاصل کرلی جاتی ہیں۔ ماضی میں پاکستان سے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے فراڈ کرنے والے بڑے بڑے گروہ پکڑے گئے ہیں لیکن یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔

سائبر کرائمز سے نمٹنے کے لیے کوششیں عرصے سے جاری ہیں، لیکن فراڈ کے نت نئے ذرائع بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ فراڈ سے بچنے کے لیے آپ کوشش کریں کہ اپنی ذاتی معلومات کسی کو مت دیں۔ جب تک بینک کے کاروباری نمبروں سے کال نہ آئے، فون پر کسی کو بھی اپنے بارے میں کوئی معلومات مت فراہم کریں۔ بینک کی جانب سے ہر ماہ ارسال کی جانے والی کریڈٹ کارڈ اسٹیٹمنٹ کا بغور مطالعہ کریں اور کسی بھی ایسی ٹرانزیکشن جو کہ آپ نے نہیں کی، کے بارے میں فوراً بینک کو مطلع کریں۔ جب بھی اپنا کریڈٹ کارڈ آپ کسی مرچنٹ پر چارج کروائیں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ مرچنٹ آپ کے سامنے ہی کارڈ کو چارج کرے۔ عام طور پر کریڈٹ کارڈ سے کی گئی ہر خریداری کی فوری اطلاع بذریعہ ایس ایم ایس بھی صارف کو موصول ہو جاتی ہے۔ اس سہولت کو ضرور زیرِ استعمال رکھیں اور وہی نمبر استعمال کریں جو ہر وقت آن ہو۔ کریڈٹ کارڈ فراڈ سے اپنے صارفین کو بچانے کے لئے پاکستانی بینک کریڈٹ کارڈ کو اس وقت تک انٹرنیٹ پر استعمال کے قابل نہیں بناتے جب تک صارف انہیں فون کرکے خود ایسا کرنے کو نہ کہیں۔ عموماً اس کے لئے Session کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ صارف جب چاہے سیشن کو بند بھی کرواسکتا ہے تاکہ کوئی بھی اس کے کارڈ کو انٹرنیٹ پر استعمال نہ

کرے۔ اگر آپ کو کسی خریداری کی اطلاع ملے جو کہ آپ نے نہیں کی تو پریشان ہوئے بنا اپنے بینک سے رابطہ کرکے اس کی شکایت درج کروائیں۔ ایسے مرچنٹس پر اپنے کریڈٹ کارڈ کو چارج کرنے سے گریز کریں جن کی شہرت اچھی نہ ہو۔

امریکہ میں نسلی امتیاز بڑھ رہا ہے

امریکی پولیس ہر سال چار سو افراد کی جان لے لیتی ہے
پولیس حملوں میں ہفتے میں دو سیاہ فام مارے جاتے ہیں

امریکی شہر سینٹ لوئس میں پولیس نے گولی مار کر ایک سیاہ فام نوجوان کو ہلاک کر دیا ہے۔اگست میں اسی شہر میں پولیس کے ہاتھوں ایک اور سیاہ فام نوجوان مائیکل براؤن کی ہلاکت کے بعد شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔مقامی پولیس کا موقف ہے کہ یہ نوجوان مسلح تھا اور اس نے ایک افسر پر پستول تانی تھی۔۔برکلے میں مارے جانے والے اس نوجوان کی شناخت 18 سالہ انتونیو مارٹن کے طور پر ہوئی ہے۔انتونیو مارٹن کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت کی خبر پھیلتے ہی مظاہرین کی بڑی تعداد موقع پر جمع ہو گئی اور امریکی پولیس کے خلاف احتجاج کیا۔ہلاک ہونے والے اور احتجاج کرنے والے سیاہ فام نسل سے ہیں۔ جس کے بعد شہر میں پولیس اور مظاہرین کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئی ہیں۔پولیس کے ترجمان سارجنٹ برائن شیل کے مطابق منگل کی شام معمول کے گشت کے دوران دو مشکوک افراد کی تلاشی لینے کی کوشش کی گی۔ تو ان میں سے ایک نے پولیس افسر پر پستول تان لی۔ اپنی زندگی کو خطرے میں پاتے ہوئے اس افسر نے جوابی

کارروائی کی جس میں یہ نوجوان مارا گیا اور دوسرا موقعے سے فرار ہوگیا۔ یہ دوسرا موقع ہے، جس میں پولیس نے ایک سیاہ فام کو مار دیا ہے۔ اس سی پہلے مائیکل براؤن کو ہلاک کیا یا تھا جو غیر مسلح تھا مارنے والے پولیس افسر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی جس کے خلاف سیا فام امریکی شہریوں نے ملک بھر میں احتجاج کیا تھا۔ امریکا میں جہاں تمام انسانوں کو بلا تفریق بنیادی شہری حقوق حاصل ہیں وہیں پولیس کو کسی بھی شہری کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے بھی خصوصی اختیارات حاصل ہیں۔ انہی خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے امریکا کے سیکیورٹی ادارے سالانہ چار سو افراد کی جان لے لیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ فسادات پاکستان یا ترقی پذیر ملکوں ہی میں ہوتے ہیں۔ دنیا کے سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ ملک امریکہ میں خوفناک فسادات کی آگ بڑھ رہی ہے۔ نسلی امتیاز بڑھ رہا ہے۔ جس پر امریکہ کے 90 شہروں میں آتشزنی اور تشدد بھڑک اٹھا۔ کئی شاپنگ مال جلا دیئے گئے ہیں درجنوں گاڑیاں پھونک دی گئی ہے۔ لوٹ مار کے واقعات بھی ہوئے۔ گذشتہ قتل کے واقعے میں جیوری نے پولیس اہلکار پر چارج شیٹ نہ لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد سینٹ لوئی کونٹی کے وکیل رابرٹ میکلوک نے اعلان کیا تھا کہ پولیس افسر ڈیرر ویلسن کے خلاف کوئی امکانی وجہ نہیں ملی ہے جس کی بنیاد پر اس پر مقدمہ چلایا جائے اس فیصلے کے بعد امریکہ کی اس ریاست میں فسادات شروع ہوگئے۔ امریکہ کی گوری آبادی کا الزام ہے کہ گرینڈ جیوری میں سیاہ فاموں کا بول بالا ہے۔ اس لئے

ملزم کو رہا کر دیا گیا ہے۔ اس میں نو سیاہ فام اور تین گورے جج تھے۔ فسادات کو روکنے کے لئے 10 ہزار سے زیادہ سیکورٹی فورس کے جوان فسادات زدہ علاقوں میں تعینات کئے گئے 150 راؤنڈ گولیاں سیکورٹی فورس کے ملازمین پر مظاہرین نے داغی ۔مائیکل براون کے قتل کی جو ویڈیو سامنے آئی ہے اس میں مائیکل براؤن کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں دکھائی دے رہا ہے۔اگست میں پولیس نے فرگوسن میں پر تشدد مظاہروں کے بعد 31 افراد کو گرفتار کرلیا تھا۔ سینٹ لوئیس کے مضافاتی علاقے فرگوسن میں یہ واقعہ اگست کو پیش آیا تھا۔ جس میں پولیس نے ایک 18 سالہ سیاہ فام نوجوان مائیکل 9 براؤن کو ہلاک کیا تھا جس کے بعد علاقے میں ہنگامے شروع ہوگئے تھے۔ مقامی سیاہ فام آبادی میں اس نہتے لڑکے کی ہلاکت پر علاقے کی سفید فام اکثریت والی پولیس کے خلاف شدید اشتعال پایا جاتا تھا۔ فرگوسن میں مائیکل براؤن پر گولی چلانے والے اہلکار کی گرفتاری کے لیے مظاہرے اب بھی جاری ہیں ۔ پولیس کا کہنا ہے کہ 'مشتبہ شخص پولیس اہلکاروں کی جانب مڑا، اس نے چاقو نکالا اور پھر اہلکاروں کو للکارا کہ 'مجھ پر گولی چلا کر دکھاؤ۔ مجھے مار کر دکھاؤ۔ مائیکل براؤن کی ہلاکت کے عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ اہلکار نے براؤن پر اس وقت گولی چلائی جب وہ اپنے ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھا جبکہ پولیس کا کہنا ہے کہ گولی براؤن اور ولسن کے درمیان جدوجہد کے دوران چلی۔

براؤن کے خاندان کی طرف سے ایک ڈاکٹر نے مائیکل براؤن کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق براؤن کو چھ گولیاں ماری گئی جن میں سے دو ان کے سر میں لگیں جبکہ ان کے جسم پر کسی قسم کی لڑائی کے آثار نہیں ملے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ براؤن کو دو فٹ سے زیادہ فاصلے سے گولیاں ماری گئیں کیونکہ لاش پر گن پاؤڈر کے کوئی اثرات نہیں تھے۔ بعد میں عدالت نے سفید فام پولیس افسر کو اس قتل میں بری کر دیا۔ جس عوام میں اشتعال پھیلا، فرگوسن میں حالات خراب ہونے کے بعد نیشنل گارڈز کو تعینات کیا گیا۔ حالات ایسے بگڑے کہ پولیس اہلکاروں کو آنسو گیس استعمال کرنا پڑی کیونکہ ان پر 'فائرنگ کی گئی اور پیٹرول بموں سے حملہ کیا گیا۔' ان ہنگاموں کے بعد . امریکی صدر براک اوباما نے بھی عوام کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے فرگوسن کے مقامی لوگوں پر زور دیا ہے کہ وہ آپس میں 'ہم آہنگی' پیدا کریں۔ انھوں نے کہا کہ وہ نوجوان لڑکے کی ہلاکت پر غم و غصے کے اظہار کو سمجھتے ہیں لیکن لوٹ مار کرنے، اسلحہ لے کر گھومنے اور پولیس پر حملے کرنے سے کشیدگی بڑھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'اس سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔' سیاہ فام نوجوان کی ہلاکت پر پولیس کی بریت نے جلتی پے تیل کا کام کیا اور پورے فرگوسن شہر میں پر تشدد مظاہروں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پولیس کی تحقیقات میں قاتل کو بری قرار دیتے ہوئے واضح کیا گیا کہ اس نے سیاہ فام شہری پر خود کو حاصل اختیارات کے تحت ہی

گولی چلائی تھی۔امریکا وفاقی تحقیقاتی ادارے ایف بی آئی کی رپورٹ کے مطابق امریکا میں پولیس کے ہاتھوں سالانہ اوسطاً 400 افراد مارے جاتے ہیں۔ان تمام افراد کے قاتل پولیس اہلکاروں کو یہ کہہ کر بری کر دیا تھا ہے کہ انہوں نے قانون کے اندر رہتے ہوئے گولی چلائی تھی۔رپورٹ کے مطابق گذشتہ برس امریکی پولیس کے ہاتھوں مجموعی طور پر 463 افراد ہلاک ہوئے۔ان میں سے ایک چوتھائی سیاہ فام امریکیوں پر مشتمل تھی جو کل آبادی کا صرف 14 فیصد ہیں۔رپورٹ کے مطابق امریکا کی سفید فام پولیس کے ہاتھوں ہفتے میں دو سیاہ فاموں کی موت واقع ہوتی ہے اور انہیں پھر بری کر دیا جاتا ہے۔امریکا میں سیاہ فاموں کی جانب سے اپنے کسی شخص کی پولیس کی فائرنگ میں ہلاکت کے رد عمل میں پہلی مرتبہ اتنا سخت احتجاج نہیں کیا بلکہ اس سے قبل سنہ 1992 میں پولیس نے رونی کنگ نامی ایک سیاہ فام نسل کے باشندے کو تشدد کرکے قتل کردیا تھا جس کے خلاف پورے امریکا میں پرتشدد مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا جو ایک ہفتے تک جاری رہا۔پرتشدد مظاہروں کے دوران کم سے کم 53 افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ایک ارب ڈالر سے زاید مالیت کا قومی املاک کو نقصان پہنچا تھا۔امریکہ میں اس نسلی تشدد پر روس کی وزارت خارجہ کے ایلچی برائے انسانی حقوق کونستاتین دولگوو کا کہنا ہے کہ امریکا کے شہر فرگوسن میں پیش آنے والے واقعات امریکا کو درپیش سنگین مسائل کی علامت ہیں۔دولگوو کے مطابق امریکی معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان اختلافات بڑھ رہے ہیں کیونکہ ملک

کے حکام اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے کچھ نہیں کر رہے۔ایسے عالم میں جب حالیہ مظاہروں نے امریکہ میں نسلی امتیاز کے مسئلے کو مرکز توجہ بنا دیا ہے باراک اوبامہ نے کہا ہے کہ یہ مسئلہ امریکی تاریخ اور معاشرے میں اپنی جڑیں پیوست کر چکا ہے۔اگرچہ امریکہ میں غیر سفید فاموں کے ساتھ نسلی امتیاز سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن فرگوسن اور پھر اس کے بعد نیویارک میں سیاہ فام کے قتل میں ملوث پولیس افسر کو بری کر دیئے جانے کے بعد اس دیرینہ مسئلے کے نیچے دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن چکی ہے۔امریکی سیاہ فام سمجھتے ہیں کی اس سے قبل بھی بارہا ایسا ہوا ہے کہ اس طرح کے کیس کے ملزمین قانون کے ہاتھ سے بچ نکلنے میں کامیاب رہے اور سیاہ فام امریکی نوجوان کے قتل کیس میں بھی ایسا ہی ہوا۔مارتین ایک سیاہ فام امریکی نوجوان تھا جو چھبیس فروری دوہزار بارہ میں ریاست فلوریڈا کے سنفور شہر کے ایک محلے کے گارڈ جارج زیمر من کی گولیوں کا نشانہ بن کر ہلاک ہوگیا۔اس فائرنگ پر بھی بڑے پیانے پر احتجاجی مظاہرے ہوئے تھے لیکن آخرکار زیمر من بھی الزامات سے بری ہوگیا۔امریکہ میں نسلی امتیاز ایک دیرینہ مسئلہ ہے اور اس ملک کی تاریخ و ثقافت کی جڑوں میں پیوست ہے۔امریکہ کی تشکیل کے بعد، اس ملک کی اقتصادی و معاشی پیشرفت و ترقی کا بھاری بوجھ ان غلاموں کے کاندھوں پر لاد دیا گیا جو افریقہ سے اسمگل کئے جاتے تھے۔یہ معاشی منفعت سماجی اور قانونی شکل اختیار کرگیا تھا یہاں تک کہ غلامی، کے دور کے خاتمے کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔مارٹین لوتھر کنگ

کی رہبری میں غلامی کے خلاف شروع ہونے والی تحریک کے نتیجے میں غلامی ختم کئے جانے کے برسوں بعد سیاہ فاموں کی صورت حال بہتر ہوئی تاہم یہ دیرینہ مسئلہ ختم نہ ہوسکا۔امریکہ کی قانونی اور سماجی تحقیقات کے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ظاہر کے برخلاف، امریکی سماج کے درمیانی اور نچلے طبقے کی تہوں میں نسلی امتیاز بڑھتا جارہا ہے۔اس وقت بہت سے وسائل اور مراعات جو سفید فاموں کو حاصل ہیں، وہ غیر سفید فاموں کو میسر نہیں ہیں۔مثال کے طور پر تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر کاموں، بالخصوص محنت کے کاموں میں سفید فام مزدوروں کے مقابلے میں سیاہ فام اور ہیسپانوی مزدوروں کو نہایت کم اجرت ملتی ہے۔جرائم کے ارتکاب کے سلسلے میں سیاہ فاموں کو سفید فاموں کے مقابلے میں تقریبا بیس فیصد زیادہ سزا دی جاتی ہے۔امریکہ میں سزائے موت یا عمر قید کی سزا پانے والوں میں زیادہ تر سیاہ فام یا غیر سفید فام ہوتے ہیں۔امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار وہائٹ ہاؤس میں سیاہ فام صدر پہنچنے کے بعد یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ اب اس ملک کی مختلف نسلوں کے درمیان آشتی قائم ہوجائیگی۔لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ غیر سفید فام صدر ہونا امریکہ کی اس دیرینہ مشکل کے حل میں نہ صرف یہ کہ معاون ثابت نہ ہوا بلکہ سروے رپورٹوں کے مطابق اس ملک میں نسلی کشیدگی میں اضافے کا باعث بنا ہے۔امریکہ کی اس صورتحال پر اس کا دیرینہ حریف ایران بھی تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ امریکہ کی صورت حال، اس ملک میں حقیقی پالیسی اور حکومت کے ساتھ سماجی شراکت اور

ڈیموکریسی کے دعوؤں کے درمیان واضح فاصلے کی غماز ہیں۔ وزارت خارجہ کے پریس نوٹ میں دفتر خارجہ کی ترجمان محترمہ مرضیہ افخم نے امریکہ میں نسلی امتیاز کی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، تاکید کی کہ نسلی امتیاز کے خلاف امریکہ کے عوام کے وسیع احتجاج اور غیر سفید فاموں کے خلاف تشدد پسندانہ برتاؤ سے امریکہ کے معاشرے میں پائے جانے والے طبقاتی فرق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مرضیہ افخم نے امریکہ کی پولیس کے رویّے اور غیر سفید فاموں اور اقلیتوں کے خلاف تشدد اور نسلی امتیاز کے حوالے سے اس ملک کی عدلیہ کے جانبدارانہ اقدامات پر بھی تنقید کی اور کہا کہ امریکہ کے سیاستدانوں اور حکمرانوں کو اپنے ملک کی اندرونی صورت حال پر گہری توجہ دیئے جانے کی ضرورت ہے۔ امریکی حکومت کہ جو گذشتہ چند دہائیوں سے انسانی حقوق کو ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرکے اور اپنے دوغلے رویّوں کے ذریعے، مسلسل دیگر ملکوں کو نشانہ بنارہی ہے، خود اپنے ملک کی اندرونی صورت حال سے غافل ہے۔ ادھر اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے انسداد تشدد نے بھی امریکہ میں سیکورٹی اداروں کی جانب سے سیاہ فام شہریوں پر تشدد اور ان کے خلاف طاقت کے بے دریغ اور بلاجواز استعمال کی مذمت کی ہے۔ اقوام متحدہ کی دس رکنی کمیٹی کی رپورٹ میں امریکی حکام پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اقلیتوں پر بلاجواز تشدد اور ان کے ساتھ نسلی امتیاز روا رکھنے والے پولیس اہکاروں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ دنیا بھر میں انسانی حقوق کے موضوع کے لے کر چودھراہٹ کا مظاہرہ

کرنے والے ملک کے تعلق سے اقوام متحدہ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ امریکہ میں پولیس کی طرف سے شوٹنگ یا سیاہ فام افراد کا پیچھا کیے جانے کے واقعات اکثر و بیشتر اور بار بار نظروں سے گزرتے ہیں۔اقوام متحدہ انسانی حقوق کے ماہرین کے پینل نے امریکی حکومت پر یہ بھی الزام عائد کیا ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق امریکی عہدے داروں نے اعداد و شمار فراہم نہیں کیے۔2006 کے بعد سے امریکہ کے ریکارڈ کے بارے میں اقوام متحدہ کے ماہرین کے پینل کی طرف سے سامنے آنے والی یہ پہلی جائزہ رپورٹ ہے۔اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے انسداد تشدد کی جاری کردہ رپورٹ میں رواں برس امریکی ریاست میزوری کے شہر فرگوسن میں سفید فام پولیس اہکار کے ہاتھوں ایک نوجوان سیاہ فام شہری کے قتل کے واقعے اور اس کے بعد پر تشدد مظاہروں کے واقعات کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی ساہ فام نوجوان کی تازہ ہلاکت پر کوئی تبصرہ کیا گیا ہے۔

قرضوں پر چلنے والی حکومت

میاں نواز شریف کو تاریخ میں ریکارڈ قائم کرنے کا شوق ہے، انھوں نے اپنی جمہوری حکومت میں دو بار انسداد دہشت گردی کے لئے فوجی عدالتیں قائم کی ہیں، اچھے دہشت گرد اور برے دہشت گرد کا امتیاز بھی ان کے دور حکومت کا خاصا ہے، قرض لینے میں بھی انھوں نے اپنے سابقین کو مات دی ہے، انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی حکومت نے 90دن میں 547 ارب روپیہ کا قرضہ لے کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔ پاکستان کی 65 سالہ تاریخ میں کسی حکومت نے اپنے پہلے 90 دنوں میں اتنا قرضہ نہیں لیا۔ میاں نواز شریف کی حکومت نے بینکوں سے قرضہ لینے کے بھی تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ موجودہ مالی سال 2014 کو حکومت نے بینکوں سے 10 ہزار 907 ارب روپے کے قرضے حاصل کئے ہیں۔ اسٹیٹ بینک کی حالیہ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ حکومت موجودہ مالی سال میں جی ڈی پی کے 42.09 فیصد کے تناسب سے قرضے حاصل کئے ہیں۔ گذشتہ سال حکومت نے 9521 ارب روپے بینکوں سے قرضے حاصل کئے تھے۔ سابقہ وفاقی حکومت نے 2012 میں 7683 ارب روپے کا قرضہ بینکوں سے حاصل کیا تھا۔ 2011 میں گیلانی حکومت نے 6012 ارب روپے کے قرضے حاصل کئے تھے جبکہ 2010 میں حکومت نے 4651 ارب روپے کے قرضے حاصل کئے گئے۔ حکومت کی قرض کی ہوس ہے کہ ختم نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ملک میں معاشی بہتری کے نام پر

بار بار ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ ، یوٹیلیٹیز کے نرخوں میں اضافہ کیا جاتا ہے، جس نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ گذشتہ قرضے کی درخواست پر پاکستان میں یورپی یونین کے سفیر لارس گونار وگامارک نے کہا تھا کہ اسلام آباد کی بین الاقوامی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف سے قرضے کے حصول کی کوششوں کی حمایت نواز شریف حکومت کے معاشی ڈھانچے میں بنیادی کمزوریوں کو دور کرنے اور ٹیکس دہندگان کی تعداد میں نمایاں اضافہ سے مشروط ہے۔انہوں نے واضح کہا تھا کہ یورپی یونین دہشت گردی اور انتہا پسندی کی وجہ سے موجودہ حکومت کی ہر طرح کی مدد کو تیار ہے مگر اس کے لیے اسلام آباد کو بھی ''کچھ اہم'' اقدامات کرنا ہوں گے۔''ہم ان (پاکستان) کی ایسے ہی حمایت نہیں کریں گے۔ جیسا کہ آئی ایم ایف نے بھی بڑے واضح انداز میں کہہ دیا ہے ہم چاہیں گے کہ پاکستان اقتصادی ڈھانچے میں کمزوریوں کو دور کرے خصوصاً ٹیکس وصولی کو بڑھائے، ٹیکس نیٹ کو وسیع کرے۔۔۔۔ ہم ان شرائط میں کوئی تبدیلی نہیں لا رہے۔'''' ڈونرز کا پیسہ پاکستان کی ترقی کے لیے خرچ کرتے ہوئے ہم دیکھنا چاہیں گے کہ یہاں پر جن لوگوں کے پاس پیسہ ہے وہ منصفانہ انداز میں ملک کے بجٹ میں اپنا حصہ ''ڈالیں اور پاکستان میں ایسے کئی لوگ ہیں جن کے پاس اچھی خاصی دولت ہے۔ حکومت اب تک اس بات می ناکام ہی رہی کہ دولت مندوں سے ٹیکس حاصل کر سکے، اور نئے ٹیکس دہندگاں شامل کر سکے، ٹیکس کی یہ تلوار عوام کی کمزور گرن ہی پر

چلتی ہے۔پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں ٹیکس دہندگان کی تعداد بہت کم ہے جو کہ اقتصادی ماہرین کے مطابق ملک کی کمزور معیشت کی ایک بڑی وجہ ہے۔آئی ایم ایف پاکستان مشن کے سربراہ جیفری فرینکس نے یہ شکوہ بھی کیا تھا کہ پاکستانی حکام پر مشکل پڑے تو قرضہ لیتے ہیں مگر مشکل کٹتے ہی رقم لیتے وقت کئے گئے وعدے بھول جاتے ہیں، اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے۔آئی ایم ایف کا قرضہ پاکستان کی عوام کو ہر بار بھاری پڑتا ہے، خاص طور پر توانائی اور ٹیکس نظام میں اصلاحات کے نام پر عوام پر کڑی مشکلات پڑتی ہیں۔ تبدیلی کا نعرہ لگانے والے عمران خان اپنی ذاتی زندگی میں شادی کرکے تبدیلی لے آئے ہیں، عمران خان کچھ عرصے قبل موجودہ حکومت کو جعلی مینڈیٹ سے قائم ہونے والی حکومت کہتے تھے اور الزام لگاتے تھے کہ حکومت نے نے عوام کے دکھوں کا مداوا کرنے کی بجائے انہیں نئے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، ایک سال میں ملکی تاریخ کا سب سے زیادہ قرض لیا گیا اور بجلی حکومت گزشتہ حکومت نے پانچ برسوں میں جتنی کی تھی موجودہ حکومت نے ایک سال میں اس سے دگنی کردی ہے۔عمران خان نے ایشین ترقیاتی بینک کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ میٹرو بس منصوبے پر اسلام آباد میں صرف چار ارب روپے خرچ آئیں گے مگر ہمارے حکمران چوبیس ارب روپے اس پر خرچ کررہے ہیں۔الزامات سے قطع نظر یہ بات واضح ہے کہ حکومت گڈ گورنس سے محروم ہے،ایک طرف کرپشن کو روکنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا تو دوسری جانب نج کاری کے ذریعے ملکی ادارے بیچے

جارہے ہیں۔ نواز شریف حکومت نے او جی ڈی سی کے 10 فی صد حصص بیچنے اور واپڈا، اسٹیل مل کی نجکاری کا اعلان کر رکھا ہے۔ جس کے سبب پورے ملک میں مزدور اور ملازمین نواز شریف حکومت کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں۔ ان میں جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی جیسی جماعتیں بھی ہیں جو نجکاری کے خلاف ہیں۔ نواز شریف دو تہائی اکثریت سے وزیر اعظم منتخب ہوئے ہیں، لیکن ان کے گرد سرمایہ دار اور کارخانہ داروں کا گھیرا ہے۔ جن کی خواہش ہے کہ سرکاری اداروں، کارپوریشنوں اور بڑے بڑے سرکاری فرموں کو نج کاری کے ذریعے سرمایہ دارون کو کوڑی کے بھاو بیچ دیا جائے۔ نج کاری کی فہرست میں شامل 65 سرکاری اداروں میں ریلوے، پی آئی اے، سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن، آئل اینڈ گیس، سوئی گیس کا ادارہ اور اس کے علاوہ ایسے بہت سارے ادارے ایسے ہیں، جن پر ملک کے کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کی نظریں لگی ہوئی ہیں، 1985 سے 2008 تک مختلف حکومتوں نے 184 اداروں کی نج کاری سے 496 ارب روپے حاصل کیئے۔ نج کاری سے حاصل شدہ رقم کو دفاع، غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی اور فلاحی کاموں کے لئے برابر برابر تقسیم کرنا اور ان شعبوں پر خرچ ہونا تھا۔ لیکن نج کاری سے حاصل شدہ رقم نہ تو غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کی گئی اور نہ ہی اس سے لوگوں کے فلاح و بہبود کے کام کئے گئے۔

پاکستان کا غیر ملکی قرضہ جو 1991 میں 23 ارب ڈالر تھا 2008 میں 45 ارب ڈالر اور 2012 میں 85 ارب ڈالر تک پہنچ گیا اور ہر پاکستانی ایک لاکھ روپے کا

قرض دار ہے۔ غُربت کی شرح بڑھتے بڑھتے 45 فی صد سے تجاوز کر گئی۔ حالیہ تحقیقات کی رو سے نجکاری معاشی زوال کا سبب بنتی ہے۔ اب دنیا میں آئی ایم ایف سے قرض میں بھی کمی آئی ہے اور نجکاری کا رُجحان بھی ختم ہو رہا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ ایک طرف قرضہ لے رہے ہیں اور دوسری جانب نفع بخش اداروں کو اونے پونے بیچ کر ملک میں غُربت، افلاس، مہنگائی اور بے روزگاری پیدا کر رہے ہیں۔

سندھ میں گنّے کے کاشتکاروں کا گنّے کی کم قیمت پر احتجاج

سابق صدر آصف علی زرداری کی سندھ میں 16 شوگر ملیں ہیں جن کے سبب حکومت کوئی قدم نہیں اٹھا رہی ہے۔کاشتکاروں کا موقف

منگل کی صبح حیدرآباد سے کراچی آتے ہوئے، سپرہائی وے قاسم آباد، سے ٹول پلازہ تک گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، خوش قسمتی سے اس وقت تک حیدرآباد سے آنے والی ٹریفک کا راستہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ مہران یونیورسٹی کے قریب.بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے، گاڑیاں رینگ رہی تھیں۔آگے چل کر پورے ہائی وے پر جگہ جگہ ٹرک، ٹرالر اور بسیں گھڑی تھیں۔سندھ میں یوں تو احتجاج، ریلیاں، جلسے جلوس ہوتے ہیں لیکن قومی شاہراہ پر اپنے مطالبات کے لئے دھرنا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔اس کے نتیجے میں عوام کو جو پریشانی اور مشکلات ہوتی ہیں۔ وہ ناقابل فراموش ہوتی ہیں۔اس بار یہ احتجاج سندھ کے گنّے کے کاشتکاروں کی جانب سے تھا جو گنّے کے مقررہ نرخ نہ دیئے جانے کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ان کے اس احتجاج میں سیاسی، قوم پرست جماعتوں اور کاشتکاروں نے جامشورو میں سپرہائی وے پر دھرنا دے رکھا تھا۔دھرنے کے باعث کراچی، حیدرآباد، جامشورو، کوٹری اور دادو جانے والی ٹرانسپورٹ معطل ہو گئی تھی۔اس

دھرنے کی قیادت سابق وزیراعلیٰ سندھ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم، متحدہ قومی موومنٹ کی رابطہ کمیٹی کے معاون غازی صلاح الدین، سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے سربراہ جلال محمود شاہ، جسقم کے رہنما نیاز کالانی اور دیگر کر رہے تھے۔ دھرنے کے شرکا کا کہنا تھا کہ جب تک گنے کے سرکاری نرخ پر عملدرآمد نہیں کرایا جاتا احتجاج کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس مسئلہ پر سندھ اسمبلی میں بھی خوب گرما گرمی رہی ہے۔ جمعہ کو اپوزیشن ارکان نے گنے کے کاشت کاروں کے مسائل پر بات کرنے کی اجازت نہ ملنے پر زبردست احتجاج کیا، جس پر ڈپٹی اسپیکر سیدہ شہلا رضا نے اجلاس پیر کی صبح تک ملتوی کر دیا۔ اجلاس میں وقفہ سوالات میں پاکستان مسلم لیگ (فنکشنل) کی خاتون رکن نصرت سحر عباسی نے سوال کیا تھا کہ حکومت گندم کے نرخ تو مقرر کرکے انہیں نافذ کراتی ہے لیکن گنے کے نرخوں پر عمل درآمد کیوں نہیں کراتی۔ وزیر صحت جام مہتاب حسین ڈاہر اور سینئر وزیر نثار احمد کھوڑو نے اعتراض کا جواب تو نہیں دیا بلکہ یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہاں گندم کی بات ہو رہی ہے اور یہاں گنے سے متعلق سوالات کیے جا رہے ہیں۔ جام مہتاب حسین ڈاہر نے کہا کہ ہم نے بالائی سندھ میں شوگر ملز کے مالکان سے بات کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ وہ سرکاری نرخ پر گنا اٹھائیں، بات چیت کامیاب ہوئی تھی لیکن سارے معاملے کو سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے۔ سندھ میں گنے کی قیمت کا تنازع شدت اختیار کر گیا ہے۔ 5 جنوری سے دوبارہ ملیں بند کرنے کے اعلان کے بعد صوبہ کی شوگر ملیں بند کر دی گئی 32

ہیں۔ صرف ضلع گھوٹکی کی 4 شوگر ملوں سردار غلام محمد مہر شوگر ملز، ڈھرکی شوگر ملز، جی ڈی بلیو شوگر ملز اور الائنس شوگر ملز نے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے کرشنگ جاری رکھی ہے۔ کرشنگ بند کرنے والی شوگر ملوں میں اکثریت اومنی گروپ کی شوگر ملوں کی ہے جن کی ملکیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سابق صدر آصف زرداری کی ہیں۔ کاشتکاروں کا کہنا ہے کہ اسی وجہ سے سندھ حکومت ان کے خلاف کارروائی سے گریز کر رہی ہے۔ کاشتکاروں کی تنظیمیں سندھ آباد گار بورڈ، شوگر کین گرووز، ایوان زراعت اور دیگر میں شامل مختلف سیاسی جماعتوں نے اس مسئلہ پر احتجاجی تحریک شروع کر دی ہے۔ سندھ حکومت نے کاشتکاروں کے مطالبے پر اس برس گنے کی قیمت خرید 182 روپے فی 40 کلو مقرر کی تھی۔ شوگر ملوں نے اس قیمت پر خریداری شروع کر دی مگر چند دنوں کے بعد شوگر ملوں کے ایک گروپ نے 150 روپے فی 40 کلو قیمت پر گنا اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اب 32 شوگر ملوں کی طرف سے کرشنگ روکنے کے باعث شدید بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں 19 لاکھ ٹن پیداواری نقصان کا خدشہ ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ گنے کی قیمت کے تنازع کا اثر آئندہ سیزن کے لئے کاشت میں تاخیر اور کاشت پر پڑے گا۔ کاشتکار گنے کی بجائے چاول، دالیں اور سورج مکھی سمیت خریف کی دوسری فصلوں کی جانب راغب ہوں گے۔ سندھ کو اس سارے معاملے کو احسن طریقہ سے نمٹنا چاہئے تھا لیکن یہ مسئلہ اب گھمبیر ہو گیا ہے۔ کاشتکاروں کا کہنا ہے کہ حکومت نے گنے کا جو ریٹ طے کیا ہے اس پر عمل کرایا جائے اور گنے

کی فروخت کے لئے ملوں پر پورا دباؤ ڈالا جائے۔گنا تاخیر سے خریدنے کی صورت میں وزن کھو دیتا ہے۔ اس حوالے سے اگر اس میں کسی سیاسی گروپ کی ملیں شامل ہیں تو ان کی وجہ سے کاشتکاروں سے زیادتی نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے کاشتکاروں کے احتجاج میں سیاسی جماعتوں کی شمولیت کی صورت میں سندھ حکومت کے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس حوالے سے سردار ممتاز علی بھٹو نے انتباہ کیا ہے کہ اگر اس برس گنا سرکاری نرخ پر نہ خریدا گیا تو کاشتکار اگلے برس گنا کاشت ہی نہیں کریں گے تو شوگر ملیں کیسے چلیں گی۔ وفاقی حکومت کو اس معاملے میں مداخلت کرکے صوبائی حکومت، کاشتکاروں اور مل مالکان کے درمیان فوری تصفیہ کرانے کے لئے عملی پیشرفت کرنی چاہئے تاکہ کاشتکاروں کو نقصان نہ پہنچے اور ملک میں اس حوالے سے کوئی بحران پیدا نہ ہو۔ مل مالکان کو بھی اس امر کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اگر انہوں نے ملیں بند کرکے کاشتکاروں کو دبانے کی کوشش کی تو اس کا اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا اور اگلے برس ان کے لئے جو مشکلات پیدا ہوں گی وہ پھر اس کا کوئی حل نہیں نکال سکیں گے۔ سندھ حکومت اپنے فیصلہ پر بغیر کسی سیاسی دباؤ کے فوری عملدرآمد کرائے تاکہ صوبے میں سندھ میں کاشتکاروں نے گنے کی صحیح قیمت مل سکے۔۔نائب صدر آباد گار بورڈ ذوالفقار یوسفانی کے مطابق شوگر ملز کی جانب سے کرشنگ میں تاخیر اور گنے کی قیمت 182 کے بجائے محض 155 روپے دیئے جانے سے کاشتکاروں کو نقصان ہوا ہے اس لیئے احتجاج جاری رہے گا۔ گزشتہ روز شوگر ملز نے ہڑتال

توختم کر دی تاہم سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے تک گنے کے نرخ 155 روپے ہی دیئے
جانے کا اعلان کیا تھا۔آباد گاروں کا کہنا ہے کہ شوگر ملرز کا مقابلہ عدالت میں اور
سڑکوں پر احتجاج سے ہوگا۔سندھ میں گنے کا مسئلہ اس لیئے اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ
سابق صدر آصف علی زرداری کی سندھ میں 16 شوگر ملیں ہیں۔ان کے ساتھ اور
بھی سیاسی لوگ ہیں۔جو کاشتکاروں کو ان کا حق دینے سے گریز کر رہے ہیں۔گنا سندھ
کی اہم پیداوار ہے۔اگر اس پر حکومت نے توجہ نہ دی تو سندھ میں دیگر پیداوار بھی متاثر
ہوں گی۔اور اگر آئندہ گنا کاشت نہ ہوا تو سندھ حکومت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے
گا۔

سوئی سدرن گیس کے سیاہ گڑھے، جو ادارے کے نام پر کالک مل رہے ہیں

پاکستان میں اچھے اچھے منافع بخش ادارے کیسے تباہ ہوتے ہیں، اس کی ایک زندہ مثال سوئی سدرن گیس کمپنی ہے۔ کبھی یہ کمپنی اپنی دیانت، سروس، سہولیات کی فراہمی، قیمت، اور بلنگ کے لئے مثالی کہی جاتی تھی۔ اس کے ملازمین کی اکثریت ایماندار، بے لوث، ادارے سے کمنٹمنٹ کے لئے مشہور تھی۔ اس کے لئے ادارے کے سابقہ افسران اور انظامیہ نے بہت محنت بھی کی تھی۔ لیکن اب یہ ادارہ بھی دیگر اداروں کی طرح روبہ زوال ہے۔ اب اس کا کام یا تو گیس کی لوڈ شیڈنگ یا گیس کی چوری روکنا، یا اپنے صارفین کو گیس کے پریسر میں کمی کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنا ہے۔ کراچی حیدرآباد میں ہزاروں گھروں کے چولھے گیس کے انتظار میں رہتے ہیں۔ بہت سے بچے اور کمانے والے افراد صبح سویرے گھر کے ناشتے سے محروم رہتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے سوئی سدرن نے ایسا ہی ڈراوا دیتے ہوئے صارفین کو نوید سنائی تھی کہ سندھ میں سی این جی کی مسلسل فراہمی کیلیے صنعتوں کے گیس استعمال میں کمی ضروری ہے، کمپنی کا کہنا تھا کہ گیس استعمال میں کمی سے پٹرول بحران پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔ سوئی سدرن نے صنعتوں سے اپیل کی تھی کہ وہ رضاکارانہ طور پر گیس کے استعمال میں 30 فیصد تک کمی کریں ۔۔ اب پیٹرول کا بحران تو اس کے سستے ہونے سے کم ہوگیا ہے۔ جانے گیس کے بحران کا کیا ہوگا۔ سوئی سدرن

گیس کمپنی کی جانب سے شہر کے مختلف علاقوں میں گیس کی فراہمی میں شدید حد تک کمی اور بندش نے شہریوں کی اذیت میں کئی گناہ اضافہ کر رکھا ہے۔ دنیا بھر میں بجلی، پانی، گیس کی فراہمی کے ادارے عوامی خدمت کیلئے اولین سمجھے جاتے ہیں جو عوام کو ہر ممکن سہولت فراہم کرتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک میں عوامی خدمت کے ادارے عوام کے لئے زحمت بن چکے ہیں۔ عوام کو بنیادی سہولتوں سے محروم رکھنے کا عمل کسی ملک کی تعمیر و ترقی میں فائدہ مند نہیں ہوتا بلکہ اس قسم کے عمل سے عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ حکومت اپنے چکر میں ہے، وہ عوام کی بنیادی ضروریات پر انھیں بلیک میلنگ کر رہی ہے، پیٹرول سستا ہونے پر پنجاب اور سرحد میں پیٹرول کی مصنوعی قلّت کرکے جس طرح عوام کو لوٹ گیا ہے، اس نے ایک بار پھر ڈالر اکاونٹ منجمد کرنے، اور ڈالر کی قیمتوں کو اوپر نیچے کرکے عوام کو لٹنے کی ساری کہانیاں یاد دلا دی ہیں۔ بار بار کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں گیس کے ذخائر بس اب ختم ہوا چاہتے ہیں اور ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے فوری طور پر اس کی درامد یا کوئی اور متبادل راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ کچھ عرصے پہلے تک قطر سے گیس کی درامد کرنے کا شور تھا۔ یہ منصوبہ کس کے ذہن کی پیداوار تھا، اور کون کون اس سے مال کمانا چاہتے ہیں، اس بارے میں بھی حقائق منظر عام پر آہی جائیں گے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ یہ ملک کو مستقل طور پر گروی رکھنے کا سامان ہے۔اس کی ڈیل مشکوک ہے، کہا جارہا ہے کہ یہ ڈیل قطر کی حکومت کے ساتھ نہیں

کی جارہی بلکہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کونو کو فلپس کے ساتھ کی جارہی ہے۔ اس ڈیل کو پاکستان میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی اینگرو ہینڈل کرے گی۔ اس طرح یہ دو ملٹی نیشنل کمپنیاں آپس میں کاروبار کریں گی جس کی قیمت پاکستانی عوام ادا کرے گی۔ مڈوے ٹائمز ڈاٹ کام کی رپورٹ کے مطابق حکومت پاکستان نے یومیہ پانچ سو ملین کیوبک فیٹ گیس خریدنے کا بیس برس تک کا معاہدہ کیا ہے۔ اب پاکستانی حکومت یہ گیس لے یا نہ لے ، اس کو اس کی ادائیگی جو تقریبا پچاس لاکھ ڈالر روزانہ ہے وہ کرنی پڑے گی۔ اس معاہدہ کی رو سے حکومت پاکستان یہ گیس کسی دوسرے ملک کو فروخت نہیں کرسکے گی اور اس کی قیمت پندرہ ڈالر فی ملین بی ٹی یو بتائی جارہی ہے جو پاکستان میں سوئی سدرن گیس کے نظام میں داخل ہونے کے بعد چوبیس ڈالر فی ملین بی ٹی یو تک پڑے گی۔ جس سے پاکستان میں گیس کے نرخ کئی گنا بڑھنے کا امکان ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس قیمت میں بیس سال تک کوئی ردوبدل نہیں کیا جاسکے گا۔ اندازہ لگایا جارہا ہے کہ اس پورے کھیل میں پاکستانی سیاستدانوں اور دیگر کھلاڑیوں کو تقریبا چار سوارب روپے کا کمیشن ملے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ گیس ختم ہو گئی تو کیا کیا جائے گا۔ تو کیا واقعی پاکستان میں گیس کے ذخائر ختم ہورہے ہیں۔ یہ ایک مفروضہ ہے۔ ہم نے ابھی تک گیس کے موجودہ ذخائر کو استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ سندھ میں سانگھڑ کے مقام پر قدرتی گیس کے جووافر ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ اس پر ابھی کام ہی نہیں ہوا۔ سندھ میں کھیر تھر کے پہاڑی سلسلے میں شیل یا ٹائٹ گیس کے ذخائر

وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ شیل یا ٹائٹ گیس کا کیمیائی فارمولا قدرتی گیس سے ذرا ہی مختلف ہوتا ہے مگر اس کا کام اور استعمال قدرتی گیس جیسا ہی ہوتا ہے۔ امریکا، کینیڈا اور چین یہ ذخائر نہ صرف نکال رہے ہیں بلکہ ملکی ترقی کے لئے بھرپور استعمال بھی کر رہے ہیں۔ مڈوے ٹائمز کی رپورٹ میں ایک امریکی رپورٹ کا حوالہ دیا گیا ہے جس کے مطابق یہ ذخائر پاکستان میں کینیڈا سے بھی زیادہ ہیں۔امریکہ نے حال ہی میں ان ذخائر کو استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر پاکستان میں گیس کی موجودہ کھپت کو آئندہ بیس سال میں تین گنا بھی بڑھا لیا جائے تو بھی یہ ذخائر آئندہ بیس برس تک ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مستقبل میں ٹیکنالوجی کہاں پہنچے گی، اور مزید کیا امکانات ہوں گے اس بارے ہمیں اچھی امید رکھنے چاہیئے۔ حکمرانوں کی نیت ٹھیک ہوگی تو وسائل بھی قدرت مہیا کرے گی۔ سجاول میں ایسے ہی ایک کنوئیں سے سوئی سدرن گیس یہی ٹائٹ یا شیل گیس حاصل کر رہی ہے اور چھ ڈالر فی ملین ایم بی ٹی یو کی ادائیگی کر رہی ہے۔ اس اندازہ کر لیں ۔ کہاں چھ ڈالر اور کہاں چوبیس ڈالر۔ دوسری جانب سوئی گیس اوگرا کے ذریعہ گیس کی قیمت میں بھی اضافہ کر رہی ہے۔ گذشتہ سال اوگرا سے جاری نوٹیفیکیشن کے مطابق سوئی سدرن گیس کمپنی کے ٹیرف میں 73 روپے ایم ایم بی ٹی یو جبکہ سوئی ناردرن کے ٹیرف میں 50.62 پیسے ایم ایم بی ٹی یو کا اضافہ کیا گیا تھا۔ ٹیرف میں اضافے کی منظوری مالی سال 2014-2015 کے بجٹ میں دی گئی

تھی۔اوگراکے ترجمان نے اس اضافے پر یہ کہ کر تسلی دی تھی کہ دونوں کمپنیوں کے ٹیرف میں اضافے کا عوام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا بلکہ 32ارب روپے سرچارج کی مد میں صوبوں کی مد میں سے کٹوتی کی جائے گی اوراس سے سوئی ناردرن اور سوئی سدرن گیس کمپنیوں کے پیداوری اثاثوں میں اضافے کی توقع ہے۔ دوسری جانب سوئی سدرن گیس اپنے واجبات کی وصولی میں بھی کمزور یاتساہل کا شکار ہے، اور اب اس سلسلے میں مقدمات کا بوجھ برداشت کر رہی ہے۔ سندھ ہائی کورٹ میں سوئی سدرن گیس کمپنی کی جانب سے واجبات کی وصولی کے لیے کے ای ایس سی کے خلاف 55 ارب 70 کروڑ سے زائد کا دعویٰ دائر ہے، سوئی سدرن گیس کمپنی کے ای ایس سی کو پاور جنریشن یونٹس کی مد میں بلاتعطل گیس فراہم کرتی رہی ہے لیکن اس نے وصولیوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب کے ای ایس سی کے اوپر 55 ارب 70 کروڑ سے زائد روپے واجب الادا ہیں لیکن ان کی ادائیگی نہیں ہورہی ہے، اب کے ای ایس سی نے بغیر کسی منظوری اپنا نام تبدیل کرکے کے الیکٹرک کردیا ہے، جس سے اور مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ گیس کی فراہمی کا معاہدہ سوئی سدرن گیس کمپنی اور کے ای ایس سی کے درمیان ہوا تھا۔ اب کے الیکٹرک سے یہ واجبات کیسے ملیں گے۔ سوئی سدرن والے عام صارف کے تو چند ہزار ہوجائیں تو گیس کاٹنے آجاتے ہیں۔۔بڑے اور بااثر اداروں سے وصولی میں ناکام رہتے ہیں۔ جانے ایسے کتنے واجبات ہیں۔ سوئی سدرن کی تباہی کا ایک اور سوئی سدرن گیس کمپنی کے منافع میں کمی کا ہے۔ اس ساکھ کی رپورٹ تو ابھی منظر عام پر نہیں

آئی تاہم گذشتہ سال کمپنی کو منافع میں 45 فیصد سے زائد کمی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ گیس چوری اور بلوں کی عدم ریکوری قرار دی گئی تھی۔ سوئی سدرن گیس کمپنی نے سال 2010-11 میں 4.724 ارب روپے کا خالص منافع کمایا تھا جو 2011-12 میں کم ہو کر 2.581 ارب روپے رہ گیا تھا۔ یہ ایک عضیب بات ہے کہ ایک جانب تو صارفین کی تعداد 2.37 ملین سے بڑھ کر 2.49 ملین تک پہنچی ۔ اور آمدنی 126 ارب روپے سے بڑھ کر 153 ارب روپے ہوئی۔ لیکن گیس فروخت اور صارفین کی تعداد میں اضافے کے باوجود کمپنی کے خالص منافع کو گیس چوری اور گیس کے ضیاع نے چاٹ لیا۔ اب دونوں گیس کمپنیوں سوئی ناردرن اور سدرن میں بھاری گیس نقصانات اور چوری سے معاملات وگر گوں ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں سالانہ 35 ارب روپے سے زیادہ کی گیس چوری اور نقصانات کی نذر ہو جاتی ہے۔ یہ بات اوگرا نے اپنی سالانہ رپورٹ برائے مالی سال 2012-13 میں تسلیم کی ہے۔ اس رپورٹ میں بھاری گیس نقصانات اور گیس چوری کو کمپنیوں کی ناقص کارکردگی بتایا گیا ہے۔ اور یہ نقصانات صارفین پر گیس قیمت میں اضافے کی صورت میں بوجھ ہوں گے۔ اور کمپنیوں کے منافع میں بھی کمی ہوگی۔ گیس کی چوری کتنی بڑھ چکی ہے اس کا اندازہ اس خبر سے کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ سال سوئی سدرن گیس نے کراچی میں کارروائی کرکے چار ہزار سے زائد گیس چوروں کے کنکشن منقطع کیئے تھے۔ اندازے کے مطابق صرف کراچی میں سالانہ پچاس سے پینتالیس کروڑ روپے کی گیس چوری کی جارہی ہے۔ سوئی سدرن گیس کی ٹاسک فورس کے بھی بہت سے

علاقوں میں جاتے ہوئے پر جلتے ہیں۔ سوئی سدرن کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ سوئی سدرن گیس کو سالانہ دو سو ستر ایم ایم سی ایف ڈی گیس چوری کا سامنا ہے۔ یہ گیس کی چوری ہزاروں میٹر لمبے پائپوں سے ہوتی ہے۔ سوئی سدرن گیس کے نئے ایم ڈی خالد رحمان اور کمپنی کے چیف آپریٹنگ آفیسر شعیب وارثی کے لئے یہ صورتحال ایک چیلنج ہے۔ گو انھیں اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں ان سیاہ گڑھوں پر توجہ کرنی ہوگی، جس اس اچھے بھلے ادارے کے نام پر کالک مل رہے ہیں۔

یمن میں خانہ جنگی کے خدشات، صدر، وزیراعظم کا استعفی

یمن میں خانہ جنگی کے خدشات، صدر، وزیراعظم کا استعفی پارلیمنٹ ختم، باغی ایک دوسرے کے مقابل

یمن میں خانہ جنگی سر پر آ پہنچی ہے، اور کسی بھی وقت یہاں بڑے پیمانے پر خانہ جنگی شروع ہونے کے خدشات ہیں۔ اقوام متحدہ، امریکہ، یورپی یونین، سعودی عرب اور ایران اس خطے میں بھرپور دلچسپی رکھتے ہیں۔ عرب دنیا میں نوجوان اپنے حکمرانوں سے ناراض ہیں، عوام کا غصہ اور ناراضگی، شدت پسندی کو فروغ دے رہا ہے۔ امریکی مداخلت نے عرب خطہ کو ایک جنگی علاقہ میں تبدیل کردیا ہے۔ یمن میں ایک طرف القاعدہ کے جنگجو ہیں تو دوسری جانب اقلیتی مسلک حوثی باغیوں کا گروپ ہے، جس نے پارلیمنٹ اور سرکاری عمارتوں کا گھیراو کیا ہوا ہے۔ بغاوت کو فرد کرنے کے لئے یمنی صدر عبد ربو منصور ہادی نے حوثی باغیوں کے ساتھ ایک سمجھوتا طے کرلیا تھا۔ اس سمجھوتے کے مطابق صدر کی رہائش گاہ کا محاصرہ ختم ہونا تھا۔ اور حوثی باغیوں کو آئین کی جس مجوزہ شق پر اعتراض تھا اُسے ہٹا دیا جانا تھا۔ لیکن باغیوں نے محاصرہ ختم کرنے اور اغواء کیے گئے ایک اعلیٰ اہلکار کی رہائی کا وعدہ پورا نہیں کیا اور ارکان پارلیمنٹ کو بھی اجلاس میں نہ آنے دیا۔ صدر منصور اور ان کی حکومت کے تمام

وزرا نے باغیوں کی جانب سے صدارتی محل پر قبضے اور اہم سرکاری اہلکاروں کو یرغمال بنانے کے بعد جمعرات کو احتجاجاً استعفے دے دیے تھے۔ کئی عرب سیٹلائٹ چینلز نے یہ خبر دی تھی کہ حوثی باغیوں نے پارلیمان کی جانب جانے والے راستوں پر پہرہ لگا دیا تھا جس کے باعث ارکان وہاں نہ پہنچ سکے جس کے بعد یمن کے دارالحکومت صنعا میں شیعہ مسلک حوثی باغیوں کا قبضہ ہے۔ صدر اور وزیراعظم نے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا ہے۔یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یمن کی فوج اس صورتِ حال کے بعد ختم ہو گئی ہے تاہم القاعدہ سے تعلق رکھنے والے سنی قبائل حوثی باغیوں کے خلاف جھڑپوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس تمام فریم ورک میں امریکہ کے لیے سب سے اہم بات اس خطے میں اس کے اتحادیوں کی سکیورٹی ہے جسے اس وقت خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ یمن ایک غریب ملک ہے، جس کی تیل کی برآمدات سنہ 2020 سے پہلے ختم ہو جائیں گی۔ لیکن سب سے زیادہ اہم اس کا محل وقوع ہے۔ یمن خلیج فارس پر خام تیل کی سپلائی کے راستے پر واقع ہے۔ اس کے شمال اور مشرق میں سعودی عرب اور اومان، جنوب میں بحیرہ عرب ہے، اور مغرب میں بحیرہ احمر ہے۔ یمن کا دارالحکومت صنعاء ہے۔ یمن کی آبادی 20 ملین ہے۔ مشرق وسطی میں یمن عربوں کی اصل سرزمین ہے. قدیم دور سے یمن مصالحوں کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ یمنکے دائیں جانب باب المندب ہے جو مشرقِ وسطیٰ کو افریقہ سے جدا کرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سالانہ 20,000 بحری جہاز بحرِ ہند اور بحیرہ احمر سے گزرتے ہیں۔ سنہ 2000 میں شدت پسند تنظیم القاعدہ کی

جانب سے امریکی بحری جہاز یو ایس کول پر کیے جانے والے خود کش حملے کے بعد امریکی نیوی اس راستے سے اجتناب کرتی ہے۔ امریکہ اور مغرب یمن کو شدت پسند تنظیم القاعدہ اے کیو اے پی کی سرزمین سمجھتے ہیں۔ القاعدہ ہی کی وجہ سے امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے اور پینٹاگان کے خصوصی آپریشنز کمانڈ اس جانب متوجہ ہوئے۔ اس ماہ کے شروع میں پیرس کے معروف رسالے چارلی ایبڈو پر ہونے والے حملے کی ذمہ داری بھی اس گروپ نے قبول کی تھی تاہم وہ اس حوالے سے کوئی ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اے کیو اے پی اب تک تین بار بین الاقوامی پروازوں کے ذریعے بم سمگل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ امریکہ نے ایک دہائی سے زائد عرصے کے دوران یمنی حکومت کی انسدادِ دہشت کی استعداد کو بڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ امریکہ کی خصوصی افواج خفیہ طور پر یمن کی فوج کو دارالحکومت صنعا میں تربیت فراہم کرتی رہی ہیں جبکہ امریکہ، سعودی عرب اور یمن نے مشترکہ طور پر یمن میں شدت پسندوں کے خلاف ڈرون حملے بھی کیے ہیں۔ ان متنازع ڈرون حملوں میں اب تک درجنوں عام شہری مارے جا چکے ہیں۔ اس حالیہ بحران پر قابو پانے کے لئے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے خصوصی مشیر جمال بن عمر نے صنعا میں یمن کے صدر اور عوامی کمیٹیوں کے نمائندوں سے ملاقات کی تھیں۔ لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گلف کواپریشن کونسل کے وزرا نے بھی باغی گروپ سے فوری طور سے صدارتی محل کا محاصرہ ختم کرنے، اُن کی نجی رہائش گاہ خالی کرنے اور یمنی صدر

عبدالرب منصور ھادی کے ایک قریبی ساتھی کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت، عمان، قطر اور بحرین کے نمائندوں پر مشتمل جی سی سی نے خطے میں سیاسی عدم استحکام کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے یمن کے عسکریت پسند باغیوں کے گروپ حوثی پر زور دیا ہے کہ وہ صدارتی محل خالی کر دیں۔ مستعفی صدر عبد الرب منصور ھادی 2012 میں اپنے پیش رو علی عبداللہ صالح کی تین دہائیوں تک جاری رہنے والی حکومت کے خاتمے کے بعد یمن کے صدر بنے تھے۔ بعض حلقے صدر صالح پر حوثی باغیوں کے ساتھ اتحاد بنانے کا شبہ بھی ظاہر کر رہے ہیں۔

جمعرات کی شب مستعفی ہونے سے قبل وزیراعظم خالد بحاح نے بھی اپنا استعفیٰ صدر کے ساتھ ملاقات کے دوران جمع کروایا تھا۔ یمنی پارلیمنٹ کا اتوار کے روز موجودہ صورت حال پر بحث کے لیے خصوصی اجلاس طلب کیا تھا۔ جو ناکامی سے دوچار ہوا۔ حوثی ملیشیا نے پارلیمنٹ کی بلڈنگ کا راتوں رات محاصرہ کر لیا تھا۔ اس ملیشیا کے ارکان صدارتی محل کے گرد پہلے ہی گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح مسلح افراد نے اعلیٰ حکومتی اہلکاروں کے گھروں کے گرد بھی گھیرا ڈال لیا ہے۔ ملیشیا کے افراد وزیر دفاع محمود الصبیحی اور انٹیلیجنس ایجنسی کے سربراہ علی الاحمدی کے مکانوں کو خاص طور پر گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ یمنی باشندوں نے کئی علاقوں میں حوثی گروپ کے خلاف کئی جلوس نکالے ہیں۔ تجزیہ کاروں کے مطابق اِس صورت حال میں حوثی دارالحکومت پر مکمل کنٹرول کرتے ہوئے عبوری حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ حوثی باغیوں کی جانب سے

دارالحکومت اور سرکاری عمارتوں پر قبضے کے خلاف صنعا اور یمن کے کئی دیگر شہروں میں بھی احتجاجی مظاہرے ہو رہے ہیں۔ یمن کے دیگر پانچ صوبوں کی حکومتوں نے بھی عندیہ دیا ہے کہ وہ صنعا پر قابض باغیوں سے ہدایات وصول نہیں کریں گی۔ یمن کے جنوبی اور شمالی علاقے 1990 تک الگ الگ ملک تھے جنہوں نے بعد ازاں ایک دوسرے سے الحاق کرلیا تھا۔ حوثی باغیوں نے گزشتہ سال ستمبر میں دارالحکومت صنعا پر قبضہ کرلیا تھا جس کے بعد یمنی صدر عبدالرب منصور ہادی نے باغیوں کے نئی حکومت کے قیام کے مطالبے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ حوثی باغی یمن کے اقلیتی "زیدی" قبائل کو زیادہ اختیارات دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اپنی مرضی کی آئینی ترمیم منظور کرانے میں ناکامی کے بعد باغی صدارتی محل پر قابض ہوگئے تھے کے بعد یمنی حکومت عملاً مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ادھر نیویارک میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا بند کمرے کا اجلاس ہو رہا ہے جس میں یمن میں جاری بحران پر غور کیا جائے گا۔ عرب دنیا میں تیونس اور مصر، یمن میں 1992 تحریکیں شروع ہوئیں۔ جسے عرب بہاری کا نام دیا گیا۔ لیکن اس تحریک کی ناکامی نے عرب عوام میں ایک غم وغصہ پیدا کردیا ہے۔ جو خانہ جنگی کی جانب جا رہا ہے۔

اسلام اور دہشت گردی کے خلاف جنگ

حالیہ دہشت گردی کا سب سے زیادہ شکار خود مسلمان اور مسلمان مملکت ہیں مصر کی معروف درسگاہ جامعہ الازہر کے سربراہ ڈاکٹر احمد الطیب نے شدت پسندی روکنے کے لیے، مذہبی تعلیمات کی تشریح کا طریقہ بدلنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ان خیالات کا اظہار انہوں نے سعودی عرب کے شہر مکہ میں 'اسلام اور دہشتگردی کے خلاف جنگ' کے نام سے ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ 'شدت پسندی کی بنیادی وجوہات قرآن و سنت کی غلط تشریحات ہیں۔'اُن کا کہنا تھا کہ مسلم اُمہ کے لیے اتحاد بحال کرنے کا واحد راستہ، سکولوں اور جامعات کے اندر ایسی تشریح کی حوصلہ شکنی کرنا ہے جو دیگر مسلمانوں کو بے عقیدہ قرار دیتی ہیں۔کانفرنس میں دولتِ اسلامیہ کا نام لئے بغیر اُنھوں نے دہشت گرد گروہوں کے متعلق بات کی جنھوں نے اُن کے بقول ظلم و بربریت کا راستہ اپنایا ہے۔انھوں نے خطے میں عدم استحکام کی ذمہ دار ایک سازش کو قرار دیا جو بقول اُن کے صہیونیت کا ساتھ دینے والا نیا عالمی نوآبادیاتی نظام ہے۔ اس کانفرنس میں سعودی فرمانروا سلمان بن عبدالعزیز کا ایک پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔جس میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ انتہا

پسند مسلمان نہ صرف، مسلمانوں کے لیے خطرہ ہیں بلکہ دنیا بھر میں مذہب کا امیج خراب کر رہے ہیں۔ دہشت گردی اور انتہا پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ یہ دقیانوس اسلام پسند نہ صرف مسلمانوں کو ڈرا دھمکا رہے ہیں بلکہ اسلام کے تشخص کو بھی داغدار کر رہے ہیں۔ اس کانفرنس کا اہتمام اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) نے کیا تھا۔ ''اسلام اور دہشت گردی مخالف جنگ'' کے موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس اس عالمی ایجنڈے کا حصہ کہی جا سکتی ہے۔ جس میں امریکہ اور سعودی عرب ایک ہی پیج پر دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ سلمان نے کہا کہ ''مسلم اقوام کو اس وقت اسلام کے نام پر دہشت گردی کی دراندازی کے خطرے کا سامنا ہے۔ اس دہشت گردی نے اسلامی دنیا کی سرحدوں کو پامال کر دیا ہے۔ انتہا پسند اسلام کے مسخ شدہ بینر تلے دین کے ایک ایسیوشن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں جس سے مسلمانوں کے خلاف منافرت پھیل رہی ہیں اور مسلم مخالف رائے کو ہوا مل رہی ہے''۔ شاہ سلمان نے اپنے پیغام میں مزید کہا کہ ''مسلمانوں کو آج جرم، خوف اور تشویش کا ذریعہ خیال کیا جا رہا ہے۔ انتہا پسند اور دہشت گرد مسلم اقوام، ان کی تنظیموں اور عوام کے لیے دوسری قوموں کے سامنے سُبکی کا سبب بنے ہوئے ہیں حالانکہ ہم ان اقوام سے تعاون کے رشتے میں جڑے ہوئے ہیں''۔ ان کا کہنا تھا کہ ''ان دہشت گردوں کی وجہ سے مسلم ممالک کے غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں سرد مہری آئی ہے۔ یہ لوگوں کو ہلاک کرنے اور انفرااسٹرکچر کو تباہ کن نقصان سے دوچار کرنے کے علاوہ قوموں

کو تار تار کر رہے ہیں۔ ہماری قوموں کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ ان گمراہ اور گم کردہ دہشت گردوں سے لاحق ہے۔ انھوں نے دین اسلام اور اس کے پیروکار ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے دشمنوں کو انھیں نقصان پہنچانے کا موقع دیا ہے اور وہ اسلام کے نام پر ایسے جرائم کے مرتکب ہورہے ہیں جن کا اس کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ انھوں نے کہا کہ ''سعودی عرب نے دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے سخت اقدامات کیے ہیں اور اس پر قابو پانے کے لیے اپنے سکیورٹی اداروں کو متحرک کیا ہے۔ سکیورٹی فورسز کے اہلکاروں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جانیں قربان کی ہیں۔ اس وقت ہماری فضائیہ ان دہشت گردوں کے خلاف جنگ کے لیے عالمی اتحاد کا حصہ ہے''۔ شاہ سلمان نے اپنے پیغام میں اسلام کی رواداری، اعتدال پسندی اور عفو ودرگذر کی تعلیمات کو اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ جو ان صفات کو چھوڑ دیتا ہے، وہ مسلمانوں کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا اور وہ ان کے درمیان نفرت اور تقسیم کے بیج بونے کا سبب ہی بنے گا۔ شاہ سلمان نے عوام الناس پر بھی زور دیا کہ وہ دہشت گردوں کے ساتھ نہ تو کسی طرح کا کوئی تعاون کریں اور نہ ان کے ساتھ کوئی ہمدردی جتلائیں۔ دوسری جانب امریکی صدر براک اوباما نے دنیا بھر کے شہری اور مذہبی راہنماؤں پر زور دیا کہ وہ 'شدت پسندوں کے جھوٹے وعدوں' کے خلاف جنگ میں متحد ہو جائیں اور اس خیال کو مسترد کر دیں کہ 'دہشت گرد' گروہ اسلام کی غمازی کرتے ہیں۔ انھوں نے انسداد دہشت گردی کے موضوع پر واشنگٹن میں منعقدہ بین

الاقوامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی، انھوں نے کہا ہے کہ دہشت گرد، ایک ارب مسلمانوں کی ترجمانی نہیں کرتے۔امریکی صدر براک اوباما نے کہا ہے کہ دہشت گردی اور پرتشدد انتہا پسندی کے خلاف اقدام میں تمام ملکوں کو یکجا ہونا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ 'وہ اپنے آپ کو مذہبی راہنما اور مقدس جنگجو ظاہر کرتے ہیں'۔ بقول اُن کے، 'وہ مذہبی لیڈر نہیں ہیں، وہ دہشت گرد ہیں۔ ہم اسلام کے خلاف صف آرا نہیں ہیں۔ ہم اُن افراد کے خلاف نبرد آزما ہیں جنھوں نے اسلام کا نام بدنام کیا ہے'۔ اوباما نے یہ بھی اعتراف کیا کہ، ' ہمیں پتا ہے کہ صرف فوجی طاقت کے ذریعے اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا'۔ دہشت گردی کے خلاف یورپ اور امریکہ کا پروپیگنڈہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں یورپ میں امریکہ، فرانس مین مسلمانوں اور ان کی مساجد پر حملوں میں شدت آتی جارہی ہے۔ایک جانب تو دہشت گردی کے خلاف یہ کانفرنیس ہورہی ہیں تو دوسری جانب امریکا اور اُس کے اتحادی عراق اور شام میں تیزی سے سے اپنے قدم جما رہا ہے، جنھوں نے حال ہی میں آسٹریلیا، کینیڈا، فرانس اور ڈینمارک میں دہشت گرد حملے کیے ہیں۔براک اوباما نے کہا کہ 'داعش اور القاعدہ جیسے مہلک گروہ اُس غصے اور مایوسی کو ابھار کر ہمدردیاں سمیٹتے ہیں جو بے انصافی اور بد عنوانی کے نتیجے میں پروان چڑھ رہی ہیں؛ اور وہ (نوجوان) یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں بہتری آ ہی نہیں سکتی۔ دنیا کو چاہیئے کہ نوجوانوں کو بہتر مستقبل کا یقین

دلائیں'۔اس اجلاس میں 60 ملکوں کے اہل کار شریک تھے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس یک طرفہ رد عمل پر پیرس ریلی کے بعد ترک وزیر اعظم نے توقع ظاہر کی تھی،، کہ ایسی ہی حساسیت کا مظاہرہ مغربی ممالک میں اسلاموفوبیا کے اظہار اور مساجد کو نشانہ بنانے کے حوالے س بھی کیا جانا ضروری ہے تاکہ دوہرے معیار کا تاثر گہرا نہ ہو۔،،امریکہ اور اس کے حمایتی فلسطین میں اسرائیل کی جانب سے جاری دہشت گردی پر خاموش ہیں۔امریکہ ،حالیہ دہشت گردی جس کا سب سے زیادہ شکار خود مسلمان اور مسلمان مملکت ہیں،کا تعلق صلیبی جنگوں سے بھی جوڑتا رہا ہے۔افغانستان میں نیٹو کے سابق امریکی کمانڈر جنرل پیٹریئس نے اپنے ایک حکم نامے میں دہشتگردی کو اسلام سے جوڑتیہوئے "باغیوں سے مقابلہ،، نامی کتابچے میں باغیوں کو اسلامی انتہا پسند اور اسلامی تخریب کار کہا تھا۔ 9/11 کے فورا بعد اس وقت کے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے صلیبی جنگوں بات کہہ کر عالم اسلام کے خلاف مغربی دنیا کی جس حکمت عملی کا اعلان کیا تھا، وہ اب بھی جاری ہے۔ عراق اور افغانستان، شام لیبیا کے بارے میں ان کی پالیسیوں کے سامنے آتے ہی واضح ہوگیا کہ بش کا صلیبی جنگ نعرہ ہی امریکہ کی اصل پالیسی ہے جس کے تحت وہ عالم اسلام کو اپنے نشانے پر لئے ہوئے ہے۔ اس بارے میں مغرب اور امریکہ کو صرف زبانی نہیں بلکہ عمل سے اپنا کردار واضح کرنا ہوگا۔

جلتی پر تیل کا کام اسرائیلی وزیر اعظم کا وائٹ ہاؤس کی مرضی کے بغیر دورہ

ایران کے نیوکلیئر پروگرام پر امریکی صدر اوباما اور اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو ایک دوسرے کے مقابل

جلتی پر تیل کا کام اسرائیلی وزیر اعظم کا وائٹ ہاؤس کی مرضی کے بغیر دورہ امریکہ ہے

ایرانی نیوکلیئر پروگرام پر معاہدہ دو قدیم ترین حلیف امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات میں زبردست کشیدگی کا سبب بن گیا ہے۔ ایران کے نیوکلیئر پروگرام پر امریکی صدر بارک اوباما اور اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان لفظی جنگ ایک بڑے سیاسی تنازع کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جلتی پر تیل کا کام اسرائیلی وزیر اعظم کا وائٹ ہاؤس کی مرضی کے بغیر دورہ امریکہ ہے۔ کیونکہ مروجہ روایات کے مطابق، دعوت نامہ وائٹ ہاؤس سے مشورے کے بعد جاری ہونا تھا،اسرائیلی وزیر کے امریکی کانگریس سے خطاب کی خبر صدر براک اوباما کے اسٹیٹ آف یونین خطاب سے ایک روز بعد آئی تھی۔ جس میں امریکی صدر نے کانگریس کو خبردار کیا تھا کہ اگر اس نے ایران پر مزید اقتصادی پابندیاں عائد کیں تو وہ اسے ویٹو کر دیں گے۔ امریکی

صدر براک اوباما نے اسرائیلی وزیر اعظم سے ان کے دورہ امریکہ کے ملاقات بھی نہیں کی۔ وائٹ ہاوس نے اس کا جواز یہ دیا ہے کہ کیونکہ یہ ملاقات اسرائیل میں انتخابات کے بہت قریب ہو گی۔ امریکی صدر براک اوباما اور بن یامین نتن یاہو کے درمیان ایران کے جوہری پروگرام کے معاملے پر تناو بڑھتا جا رہا ہے۔ اسرائیلی وزیر اعظم ایران کے جوہری پروگرام کے حوالے سے بات چیت پر نالاں ہیں۔ منگل کو امریکی کانگریس سے متنازعہ کلیدی خطاب کے موقع پر نیتن یاہو نے اعلان کیا کہ ایران کے نیوکلیئر پروگرام میں تخفیف سے متعلق ایران۔ امریکہ معاہدہ اسرائیل کے وجود و بقا کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے۔ اسرائیلی وزیر اعظم نیاوباما پر الزام عائد کیا کہ انھوں نے جوہری ھتیاروں کے حصول کے لیے ایران کو روکنے کی کوششیں ترک کر دی ہیں۔ اوباما اور ان کی خارجہ پالیسی کے سرکردہ عہدیدار اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کے موقف کو درست نہیں سمجھتے ، ان کا اصرار ہے کہ کیا کہ سمجھوتہ ہی ایسے تمام مبینہ خطرات پر قابو پانے کا بہترین طریقہ ہے۔ امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے بھی ایران کے جوہری معاملے پر اسرائیل کے وزیراعظم کی رائے کو غلط قرار دیا ہے۔ جان کیری نے کہا کہ امریکی صدر اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ وہ ایران کو جوہری ہتھیار تیار نہیں کرنے دیں گے۔ ان دنوں نیتن یاہو ایرانی نیوکلیئر پروگرام پر سمجھوتہ کے خلاف واشنگٹن کے دورہ پر ہیں جبکہ امریکی وزیر خارجہ جان کیری اس سمجھوتہ کو یقینی بنانے کیلئے جنیوا میں ایرانی ذمہ داروں سے بات

چیت میں مصروف ہیں۔اسرائیلی وزیراعظم ایک ایسے وقت میں واشنگٹن کا دورہ کر رہے ہیں جب چھ عالمی طاقتیں ایران کے جوہری پروگرام پر اس سے مذاکرات کر رہی ہیں۔ایران اور گروپ فائیو پلس کے درمیان ایٹمی مذاکرات سوئٹزرلینڈ کے شہر مونٹیرو میں جاری ہیں۔ ان مذاکرات میں ایرانی وفد کی قیادت وزیرخارجہ محمد جواد ظریف جبکہ امریکی وفد کی قیادت جان کیری کر رہے ہیں۔مذاکرات میں ایران کے ایٹمی توانائی کے ادارے کے سربراہ علی اکبر صالحہ، امریکی وزیر توانائی ارنسٹ مونیز، ایران اور امریکہ کے نائب وزرائے خارجہ سید عباس عراقچی، مجید تخت روانچی اور وینڈی شرمین، یورپی یونین کی خارجہ پالیسی کی نائب سربراہ ہلگا اشمیت اور ایرانی صدر کے خصوصی نمائندے حسین فریدون شریک ہیں۔ منگل کو ان مذاکرات کو دوسرا دور ختم ہوا۔مذاکرات میں فریقین نے مختلف تیکنکی مسائل پر بات چیت کی۔مذاکرات کی پہلی نشست پیر کی رات بھی ڈھائی گھنٹے تک مذاکرات جاری رہی تھی۔ دونوں فریقوں کو اس معاہدے کے فریم ورک کو 30 مارچ تک حتمی شکل دینی ہے، تاکہ 30 جون تک حتمی معاہدہ کیا جاسکے۔نیتن یاہو کو کانگریس سے خطاب کی دعوت بھی متازعہ ہے۔ نتن یاہو کو ایوانِ نمائندگان کے ریپلکن سپیکر جان بوہینر نے کیپیٹل ہل میں خطاب کے لیے مدعو کیا تھا۔اس دعوت پراوباما انتظامیہ کو اعتماد میں نہیں لیاگیا۔ ریپبلکن پارٹی کی جانب سے اسرائیلی وزیراعظم کو کانگرس سے خطاب کی دعوت پر ڈیموکریٹک پارٹی ناراض ہے۔

ڈیموکریٹک رہنما نائب صدر جو بائڈن سمیت متعدد

رہنماوں نے اسرائیلی وزیراعظم کے کانگرس سے خطاب میں شرکت بھی نہیں کی۔ پارٹی کے چند رہنما دباؤ محسوس کر رہے ہیں کہ ایسے میں وہ کس کا انتخاب کریں صدر اوباما کا یا اپنی اس خواہش کا کہ اسرائیل کو ناراض نہ کیا جائے۔دوسری جانب اسرائیلی وزیر اعظم بن یامین نتن یاہو نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کا امریکی کانگریس سے خطاب کرنے کا مقصد امریکی صدر کی بے عزتی کرنا نہیں ہے۔اس سے پہلے انھوں نے امریکی اسرائیلی لابی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ امریکہ میں اسرائیل کے بارے میں رائے کو ہرگز منقسم نہیں کرنا چاہیں گے۔دوسری جانب اسرائیل میں دو ہفتے بعد انتخابات ہو رہے ہیں جن میں نیتن یاہو کی جماعت کو داخلی دباؤ کا سامنا ہے۔اسرائیلی وزیراعظم کے اس دورے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے اسرائیل میں اپنا مقبولیت بڑھانا چاہتے ہیں۔ شائد اسی لئے انھوں نے واشنگٹن روانگی سے قبل کہا تھا کہ ان کا یہ دورہ 'نتیجہ خیز اور تاریخی مشن' ہوگا۔ نتین یاہو ایران کو اسلامک اسٹیٹ (آئی ایس) سے تشبیہہ دیتے ہیں۔انھوں نے امریکی کانگریس سے اپیل کی کہ تہران کے خلاف سخت تر موقف اختیار کیا جائے تاکہ اسے نیوکلیائی اسلحہ کے حصول سے روکا جاسکے اور سرکشی کے رجحان کی سرکوبی کی جاسکے۔ نیتن یاہو نے کہا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل اس بات پر متفق ہیں کہ ایران کو جوہری ہتھیار بنانے نہیں دیے جائیں گے، لیکن یہ ہدف کیسے حاصل ہو، اس پر اُن کی سوچ مختلف ہے۔ اوباما انتظامیہ کا اصرار ہے کہ وہ ایران کو جوہری بم نہیں بنانے دے گی اور

وہ اسرائیل کی سلامتی پر یقین رکھتی ہے۔ تاہم وہ اس بات پر برہم ہے کہ بوہنیر نے وائٹ ہاؤس کو بغیر بتائے وزیراعظم نیتن یاہو کو کانگرس سے خطاب کرنے کی دعوت کیسے دی۔ امریکی صدر نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ایران کے ساتھ تمام امور پر مذاکرات ہو رہے ہیں اور تعلقات میں گزشتہ سات ماہ کی نسبت بہتری آئی ہے،، اوباما کا کہنا تھا کہ ایران کے ایٹمی معاملے پر امریکا کا رویہ جارحانہ نہیں ہے،، ہم مسئلہ سفارتی طریقے سے حل کرنا چاہتے ہیں، اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے بارے صدر اوباما نے کہا کہ امریکاکے اسرائیل سے تعلقات اٹوٹ ہیں تاہم وہ اسرائیل پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مذاکرات مکمل کیے بغیر ایران کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے۔ ادھر ایران نے اپنے جوہری پروگرام کو دس سال تک منجمند کرنے کے امریکی صدر کے مطالبے کو مسترد کر دیا ہے۔ ایران کے وزیر خارجہ نے صدر اوباماکے مطالبے کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ صدر امریکی صدر نے غیر مناسب اور دھمکی دینے والے انداز میں گفتگو کی ہے۔ تاہم انہوں نے مذاکرات کی میز چھوڑنے سے انکار کیا۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ 'ایران کے جوہری پروگرام پر امریکا اور اسرائیل کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہ تنازعہ واشنگٹن اور مشرق وسطی میں اس کے سب سے قریبی حلیف کے رشتوں کو ہمیشہ کے لیے متاثر نہیں کرے گا۔' امریکہ کی امریکہ کی قومی سلامتی کی مشیر سوزان رائس نے امریکہ میں صیہونیوں کی سب سے بڑی لابی آپیک کے اجلاس میں

خطاب کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ،،ایسا کوئی راستہ نہیں ہے جس کے ذریعے ایران کو مجبور کیا جاسکے کہ وہ ایٹمی شعبے میں حاصل شدہ اپنی کامیابیوں سے دستبردار ہوجائے۔ انہوں نے ایران سے مذاکرات کرنے پر مبنی امریکی صدر اوباما کی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہوئے دعوی کیا کہ ایران کو ایٹمی ہتھیار سے دور رکھنے کے لئے اس کے ساتھ جامع ایٹمی معاہدے سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ایران جینوا عبوری ایٹمی معاہدے پر عمل پیرا ہے اور ایٹمی انرجی کی عالمی ایجنسی ایران کی اہم ایٹمی تنصیبات کی سرگرمیوں کی نگرانی کررہی ہے۔

ایٹمی ہتھیاروں سے دنیا کو محفوظ کیا جائے۔ویانا کانفرنس میں مطالبہ

ایٹمی ہتھیاروں سے دنیا کو لاحق خطرات کا جائزہ لینے اور اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل تشکیل کے لئے دنیا کے 150 ملکوں کی کوشش بظاہر رائیگاں ہوتی نظر آتی ہے۔ ویانا میں ایٹمی ہتھیاروں سے دنیا کو لاحق خطرات پر ہونے والی اس کانفرنس میں پہلی بار امریکا اور برطانیہ نے شرکت کی ہے۔ دونوں ملک اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ممبر ہیں۔ اور دنیا کے ان نو ملکوں میں شامل ہیں۔ جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ اس کانفرنس میں 150 ممالک کی جانب سے 800 وفود نے شرکت کی۔ ان ملکوں میں پاکستان اور بھارت بھی شامل ہیں۔ تاہم روس، فرانس، چین نے اس کانفرنس میں اپنے سرکاری وفود نہیں بھیجے ہیں۔ البتہ چین کا ایک تھینک ٹینک گروپ اس کانفرنس میں شریک رہا۔ کانفرنس میں دنیا میں موجود سولہ ہزار تین ایٹمی ہتھیاروں پر بھی بحث تو ہوئی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کانفرنس میں ایک چوراسی سالہ جاپانی مندوب سیٹکو تھرلو بھی ویل چیئر پر شریک ہے۔ وہ 1946 میں جاپان کے شہر ہیروشما پر امریکی ایٹم بم حملے سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ حملے دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کے دو شہر ناگاساکی اور ہیروشما پر کیئے تھے۔ جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکی جوہری بم حملوں کی آئندہ سال سترویں برسی

منائی جائے گی۔ جاپان کے سرکاری عہدے دار اور ماہرین یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ جوہری ہتھیاروں کا خاتمہ کیا جائے۔ جوہری ہتھیاروں کے انسانیت پر اثرات پر یہ تیسری بین الاقوامی کانفرنس ہے۔ جو 8 اور 9 دسمبر کو ویانا میں ہوئی۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 1946 سے 1990 تک دنیا میں تقریبا دو ہزار ایٹمی تجرباتی دھماکے کیئے گئے۔ 1954 میں امریکہ نے جو ایٹمی تجربہ کیا تھا وہ ہیروشما میں گرائے گئے ایٹم بم سے ایک ہزار گنا زیادہ طاقتور تھا۔ جبکہ روس کا ٹی سار بمبا کا دھماکہ سب سے بڑا خیال کیا جاتا ہے۔ شمالی کوریا جو تین بار ایٹمی دھماکے کرچکا ہے اور اسرائیل ایسے ملک ہیں جنھوں نے یہ کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ان کے ایٹمی ہتھیار ہیں۔ کانفرنس میں جوہری ہتھیار کے استعمال کی صورت میں انسانی صحت اور ماحول پر پڑنے والے اثرات کی تصدیق کے علاوہ حادثاتی طور پر ایٹمی دھماکے یا ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے والے اثرات کو بھی جائزہ لیا گیا۔ جاپانی عہدے داروں کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں جوہری بم حملوں کا نشانہ بننے والے واحد ملک کے حیثیت سے جاپان، دیگر ملکوں سے جوہری ہتھیاروں کے خاتمے کے لیے پرزور کوششوں کا مطالبہ کرتا رہے گا۔ جاپان کے مندوبین کا یہ بھی کہنا ہے کہ بین الاقوامی برادری کو ایسے غیر انسانی ہتھیاروں کے بغیر دنیا کے قیام کے لیے متحد ہونا ہوگا۔ اسرائیل مشرق وسطی کا واحد ملک ہے جسکے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ مشرق وسطی میں ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمہ کا مسئلہ چند سالوں سے زیر بحث ہے۔ ایران

بھی مشرق وسطی میں ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کا قائل ہے اور اسکی تجویز پر ہی 2010 میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1994 سے لیکر 2010 تک اپنی ہر سال کی قرارداد میں اسرائیل سے کہا ہے کہ وہ این پی ٹی معاہدے پر دستخط کرے اور آئی اے ای اے کے قواعد و ضوابط پر عمل کرے۔ ایٹمی توانائی کے عالمی ادارے آئی اے ای اے نے 1987 سے لیکر 1991 تک مسلسل پانچ سال اور اسکے بعد 2009 میں بھی اسرائیل سے اسی طرح کا مطالبہ کیا ہے۔ آئی اے ای اے نے 1981 میں بھی اسرائیل سے کہا تھا کہ وہ اپنی ایٹمی تنصیبات کے دروازے آئی اے ای اے کے معائنے کے لئے کھول دے لیکن اسرائیل نے اس عالمی ادارے کے فیصلے کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی امریکہ کی خفیہ دستاویزات اور اسٹریٹیجک ماہرین کے اندازے کے مطابق اسرائیل کے پاس اس وقت تین سو کے قریب ایٹمی وار ہیڈز موجود ہیں۔ ترکی کے ایک تحقیقاتی ادارے نے بھی اپنی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ اسرائیل کے ایٹمی پلانٹ ڈیمونا میں ہر ہفتہ تقریبا" ڈیڑھ کلو گرام یورینیم تیار ہو رہی ہے جس کی سالانہ پیداوار چار سے بارہ ایٹم بم بنانے کیلئے کافی ہے۔ اسرائیل کو سب سے زیادہ امریکہ کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ گذشتہ دنوں امریکی نائب صدر جو بائیڈن نے تو برملا اسرائیلی سلامتی کے حوالے سے واشنگٹن کے عزم سے متعلق تمام شکوک و شبہاتکو 'بیہودہ' باتیں قرار دیا تھا۔ واشنگٹن میں اسرائیل نواز 'سابان فورم' سے خطاب کرتے ہوئے جو بائیڈن کا کہنا تھا کہ ہمارے اور اسرائیلیوں کے

درمیان اسرائیل کی سیکیورٹی سے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔انھوں نے دو ٹوک الفاظ میں واضح کیاکہ "ہم ایران کو نیوکلیئر ہتھیار حاصل نہیں کرنے دیں گے۔امریکا، اسرائیل اور مشرق وسطی کو نیوکلیئر اسلحے سے لیس ایران کے ڈراوے سے ہمیشہ کے لئے بچانے کا واحد طریقہ تہران کے ایٹمی پروگرام پر قابل تصدیق پابندیاں سمجھتا ہے۔ ویانا میں جہاں جوہری ہھتیاروں کو تلف کرنے پر کانفرنس ہوئی، اس کے مقابل ایک اور کانفرنس بھی ہوئی جس میں سول سوسائیٹی کے ستر ملکوں کی سو آرگنائزیشن کے چھ سو نمائیدے شریک ہیں۔ ان کا بھی یہی مطالبہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں پر مکمل پابندی لگائی جائے۔

یورپ میں مسلمانوں کے خلاف ایک بار پھر نائین الیون جیسی صورتحال ہے

فرانس کے دارالحکومت پیرس میں ہفت روزہ اخبار چارلی ہیبڈو کے دفتر میں ہونے والے حملے کے بعد یورپ میں مسلمانوں کے خلاف ایک بار پھر نائین الیون جیسی صورتحال ہے۔ اس بارے میں بھی اطلاعات ہیں کہ اس جریدے نے حال ہی میں داعش کے سربراہ ابوبکر البغدادی کے طنزیہ کارٹون چھاپے تھے۔ جس کے رد عمل میں یہ حملہ ہوا ہے۔ ہفت روزہ اخبار چارلی ہیبڈو نے 9فروری 2006 کو حضور اکرم ﷺ کے توہین آمیز خاکہ شائع کئے تھے۔ جس پر ساری دنیا میں مسلمانوں نے احتجاج کیا تھا۔ یہ میگزین حالیہ دنوں میں داعش کے سربراہ ابوبکر البغدادی کا طنزیہ کارٹون چھاپنے کے سبب عالمی افق پر زیر بحث رہا ہے اور میگزین کے ٹویٹر اکاونٹ سے آخری ٹویٹ بھی اسی کارٹون سے متعلق ہے۔ لیکن اس حملے کی ابتدائی خبروں ہی سے اس واقعے کو پیغمبر اسلام کے خاکوں کا رد عمل ،اور مسلمانوں کی کاروائی بیان کرکے ساری دنیا میں مسلمانوں کو مذمت کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ادھر فرانس کے رسالے چارلی ایبڈو نے اپنےتازہ شمارے کے سرورق پر ایک بار پھر پیغمبر اسلام کا خاکہ شائع کیا ہے۔ اس بار اس رسالے کی 30 لاکھ کاپیاں شائع کی گئی ہیں۔ جبکہ عام طور پر اس رسالے کے ایک شمارے کی زیادہ سے زیادہ 60 ہزار کاپیاں شائع ہوتی ہیں مگر رسالے کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ اس بار پوری دنیا میں

اس کی مانگ میں اضافہ ہوا ہے۔ مسلمانوں کی اپنے پیغمبر آنحضرت ﷺ سے محبت جو کہ مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے، کو اچھی طرح جانتے ہوئے، اب جو پوری دنیا میں یہ کارٹون پھیلائے جارہے ہیں تو اس بات کے خدشات ہیں کہ یہ امر مسلمانوں کے جذبات کو انگیز کرنے کی ایک سازش ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق پیغمبرِ اسلام کی کسی بھی قسم کی شبیہہ بنانا ممنوع ہے۔ فرانس میں ہونے والے واقعے کے بعد یورپ بھر میں دائیں بازو کے انتہا پسند سرگرم ہوگئے ہیں اور انھوں نے مختلف ممالک میں مسلمانوں کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ جرمنی میں پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں۔ فرانس سے پچاس لاکھ مسلمانوں کے انخلا کے بارے میں بھی رائے عامہ ہموار کی جارہی ہے۔ جبکہ مسلمان علما کو بھی ڈی پورٹ کیا جارہا ہے۔ یورپی حکومتی لیڈروں اور اعتدال پسند رہنماؤں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف محاذ نہ بنانے کی اپیلوں کے باوجود یورپ کے انتہا پسندوں نے احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ ابتدائی طور انتہا پسندوں نے مسلمانوں کے خلاف جرمنی،
اوسلو، آسٹریا، ڈنمارک، ناروے، سپین، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں جلسے اور جلوسوں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور اس میں شدت آتی جارہی ہے۔ فرانس سے اظہار یکجہتی کے لئے پیرس ریلی ملین مارچ کیا گیا جس میں دنیا بھر سے 40 ممالک کے رہنماؤں نے شرکت کی، جن میں مسلمان ممالک بھی شامل تھے، ریلی میں بھی اہانت آمیز کارٹون اور مسلمانوں کے خلاف پوسٹر اور پلے کارڈ بھی تھے، آزادی صحافت کے

حق میں پیش پیش رہنے والوں میں سے متعدد ملکوں کے ایسے رہنما بھی اس ریلی میں شریک تھے، جو اپنے ملکوں میں آزادی اظہار رائے کے مخالف ہیں۔ ان ممالک میں مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے آزادی اظہار رائے اور صحافت پر قدغنیں لگائی جاتی ہیں۔ واحد مسلم رہنما مراکش کے وزیر خارجہ صلاح الدین میزور تھے جنھوں نے پیرس کے یکجہتی مارچ میں توہین آمیز خاکوں کی موجودگی کے باعث ریلی میں احتجاجاً شرکت نہیں کی۔ مراکش کی وزارت خارجہ نے اعلان کیا کہ ریلی میں گستاخانہ خاکوں کے پوسٹرز کی موجودگی کے باعث مراکش کے وزیر خارجہ یا کوئی حکومتی عہدیدار پیرس کے مارچ میں شریک نہیں ہوا۔ جبکہ ایک روز قبل مراکش نے فرانس سے اظہار یکجہتی کے لئے پیرس ریلی میں شرکت کا اعلان کیا تھا۔پاپائے روم پوپ فرانسس نے بھی ایسی مذہبی انتہا پسندی کی سخت مذمت کی ہے، جس سے متاثر ہونے کی وجہ سے پیرس کا سانحہ
رونماہوا۔فرانس کی دفترِ خارجہ کی ویب سائٹ پر فرانس کے وزیرِ اعظم ژان مارک ایرو کی طرف سے شائع کیے جانے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ 'اظہارِ آزادی فرانس کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔' فرانس میں اظہار آزادی کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ دوسروں کی دل آزاری کا سبب بن جائے۔ ایسے دل آزار کارٹون بنانے والے اور ان کو چھاپنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمان جب اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کا نام لیتا ہے تو کہتا ہے ''فداہ ابی وامی'' میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں۔ یہ مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے کہ اپنی جان اور اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ

پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول صادق ﷺ سے محبت کرے۔ حضور اکرم ﷺ نے ہمیشہ معاف کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور خود معاف کرکے جو مثال اپنی اُمت کے سامنے پیش کی ہے۔ مکہ والوں نے آپ کو بے حد ستایا لیکن جب مکہ فتح کیا تو معافی کا دروازہ کھول دیا اور انتہا یہ ہے کہ جس عورت نے ان کے محبوب چچا حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا اسے بھی معاف کردیا۔ اس لئے چند متشدد افراد کے اس اقدام کو پوری مسلمان برادری پر تھوپنا، دنیا مین انار کی پھیلانے کا سبب بنے گا۔ فرانس کے صدر نے صاف طور پر کہا ہے کہ وہ تشدد کو اسلام سے وابستہ نہیں سمجھتے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کا تشدد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے فرانس کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اس واردات کو اسلام سے وابستہ کرکے نہ دیکھیں۔ اہل مغرب کو سوچنا چاہیئے کہ ان متنازع کارٹونوں کی وجہ سے پوری مسلمان دنیا سراپا احتجاج کیوں ہے۔ کارٹونوں پر اٹھنے والے اس تنازعے نے جمہوری معاشرے میں توازن، رواداری، ایک دوسرے کے مذہبی عقائد کے احترام اور آزادیِ اظہار جیسے نظریات کے فروغ میں کچھ نہیں کیا۔ آزادی اظہار پر فرانس اور بعض دوسرے یورپی ملکوں نے، دوہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ پہلی بار جب یہ کارٹون شائع ہوئے تھے تو فرانس کی حکومت نے کہا ہے کہ ان کارٹونوں سے جن لوگوں کے جذبات مجروح ہوئےہیں، وہ اس معاملے کو عدالت میں لے جا سکتے ہیں۔ ایک مسلمان گروپ نے پیرس میں پراسیکیوٹرز کے پاس فوجداری شکایت درج بھی کرائی تھی۔ لیکن جب مذہبی گروپوں کی دل آزاری کرنے کے الزام میں ہفتے

کے خلاف مقدمے دائر کیے گئے، تو ان کا فیصلہ Charlie Hebdo وار رسالے رسالے کے حق میں ہوا ہے۔ 2008 میں جب اس رسالے نے پوپ کا کارٹون شائع کیا، تو اس کے خلاف شکایت درج کرائی گئی تھی لیکن وہ بھی ناکام رہی تھی۔فرانس کی کہتے ہیں کہ اگر ان کارٹونوں کے Pierre Guerlain پیرس ویسٹ یونیورسٹی کے بارے میں شکایت کو کامیاب کرنا ہے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ کارٹون نسل پرستی پر مبنی ہیں۔ فرانس میں مذہبی وجوہ، کافی نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ بات بھی جانتے ہیں کہ یورپ کے بعض ملکوں میں سر پر حجاب لینا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اور یہ صرف اور صرف مذہبی امتیاز ہی کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

داعش کیا عالمی امن کے لئے خطرہ ہے؟

عراق میں دولتِ اسلامیہ (داعش)امریکی تخلیق ہے؟

روسی صدر ویلا میر پیوٹن نے دنیا میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور انتہا پسندی کی بنیاد امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو قرار دیا ہے، انھوں نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ عراق اور شام میں داعش کا مسئلہ بھی امریکہ اور مغرب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ بعض حلقے یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ شام پر امریکا کے فضائی حملوں نے بشارالاسد حکومت کے مخالف جنگجوؤں کو داعش سے جڑنے یا الگ اتحاد بنانے کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی بمباری کے خلاف لوگوں میں نفرت بڑھی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ داعش کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ گو امریکہ کی بمباری اور کاروائی کے نتیجے میں دولت اسلامیہ کو زک پہنچی ہے اور انھیں پیچھے ہٹنا اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن مشرقی وسطی کا امن اب بھی خطرے سے دوچار ہے۔ کچھ عرصے پہلے برطانوی روزنامہ ''گارجین'' نے شام کی باغی فوج اور دیگر مسلح گروپس کے ارکان کے انٹرویو کیے تھے، جس میں یہ بات کھل کر سامنے آئی تھی کہا جنگجو گروپ اور داعش میں لوگوں کی شمولیت امریکہ کی پالیسی کے خلاف اظہار نفرت

تھی۔ انٹرویو کے دوران شام میں برسرِپیکار جنگجوؤں نے ’’گارجین‘‘ کو بتایا کہ امریکا کی مہم جوئی کے باعث بشارالاسد کے مخالف گروپس اور جنگجوؤں کا رویہ تبدیل ہوا اور اب وہ داعش کے حامی ہیں، بہت سے جنگجو کہتے ہیں کہ داعش کی حمایت میں اضافہ ہونا ہی تھا۔ لوگوں کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جب آپ کسی بلی کو تنگ کرتے ہیں تو وہ پنجے مارتی ہے۔ بہت سے شدت پسند اس خیال کے حامی ہیں کہ،، امریکا اور اس کے اتحادی مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں اور قتل عام کر رہے ہیں۔ ہم کیوں اس پر خاموش رہیں،،۔ باغیوں کے لیئے داعش باغیوں کے لئے ایک مقناطیس کی طرح تھا، جو بڑی تعداد میں ان لوگوں اپنی جانب کھینچ رہا تھا، جو امریکہ اور مغرب کی پالیسی پر تنقید سے بڑھ کر نفرت کرتے تھے۔ مشرقی وسطی میں برسرپیکار ان جنگجو افراد کو خیال ہے کہ امریکا کی قیادت میں بننے والا فوجی اتحاد داعش کے خلاف نہیں، اسلام کے خلاف ہے۔ جس کے سبب دیگر اسلامی ملیشیا کے ارکان بھی داعش کا حصہ بن گئے ہیں، جیش المجاہدین، الشام بریگیڈ، احرار الشام بریگیڈ اور النصرہ فرنٹ ،ایک سال پہلے داعش کے مدمقابل تھے، اب وہ سب اتحاد کی باتیں کر رہے ہیں۔ داعش نے جہاں ایک جانب کئی غیر ملکیوں کے گلے کاٹے، وہاں اس نے مقامی طور پر سماجی بہبود کے اقدامات اور لوگوں کو تحفظ کا احساس بھی دلایا۔ داعش نے رقہ شہر میں عوام کو مفت کھانا فراہم کرنے کے لیے ۷۵ ہوٹل کھول رکھے تھے۔ جہاں روزانہ ، تین وقت کا کھانا مفت دیا جاتا

تاکہ کوئی چور، لٹیرا یہ بہانہ نہ کرسکے کہ اس نے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے چوری کی۔ شہریوں کو مفت ایندھن بھی فراہم کیا گیا۔ شرعی قوانین پر عمل درآمد کے باعث رقہ اور داعش کے زیر انتظام دیگر علاقوں میں جرائم کی شرح بھی تیزی سے گری۔ طویل عرصے عراق میں خانہ جنگی اور امریکی کاروائی کے سبب مشرق وسطی میں امریکہ کی قیام امن کی پالیسی مکمل طور پر ناکام رہی ہے، اس پالیسی نے مشرقِ وسطی میں عدم استحکام، اور جنگی جوئی کو فروغ دیا ہے۔ امریکا نے دولتِ اسلامیہ کی تشکیل کا سبب بننے والے حالات، یعنی عراق اور شام میں جاری خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں دونوں ریاستوں کی کمزوری، کو درست کرنے کے لیے کسی عزم یا جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا ہے۔

جس نے عرب مملکت میں تھوڑی سی ناراضگی بھی پیدا کی۔ لیکن اردن کے یرغمال پائیلٹ معاذالکساسبہ کے داعش کے ہاتھوں زندہ جلا دینے کے بعد اردن سعودی عرب بحرین اور قطر۔ اور متحد امارات پھر اس جنگ میں شامل ہوگئے ہیں۔ بین الاقوامی، طور پر بھی داعش کے خلاف عالمی رائے عامہ ہموار ہوئی ہیں۔ جس میں داعش کے زیر حراست امریکی امدادی کارکن کیالاڑاں میولر کی ہلاکت، جاپانی صحافی کینجی گوٹو کے سفاکانہ قتل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ داعش کے خلاف عالمی اتحاد کا دائرہ وسیع کیا جارہا ہے، اور اتحاد میں شامل ممالک کی تعداد 62 تک پہنچ گئی ہے۔ مشرق وسطی میں امریکی پالیسی اور داعش کے خلاف کاروائیوں پر خود امریکی بھی تنقید کر رہے ہیں۔

سابق امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے اسلامی

ریاست کے خلاف اوباما انتظامیہ کی حکمت عملی پر شدید تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ پالیسز سے داعش پر فتح ناممکن ہے۔ وہ زمینی کاروائی کی حمایت کرتے ہیں ۔انکا کہنا تھا کہ اسلامک اسٹیٹ کو شکست دینے کے لئے ضروری ہے کہ چند سو فوجی خطے میں تعینات کئے جائیں جو زمینی کارروائی میں حصہ لیں ورنہ موجودہ حالات میں امریکی صدر کا آئی ایس آئی ایس کو ختم کرنے کا خواب ناقابل حصول ہوگا۔ داعش کے بارے میں لوگوں میں بہت سے شکوک وشبہات ہیں۔ بہت سے لوگوں کیا خیال ہے کہ عراق میں دولتِ اسلامیہ (داعش)امریکی تخلیق ہے؟ اس کے ذریعے مسلمانوں کو بدنام کرنا تھا۔ اس کہانی پر بہت سے لوگ یقین رکھتے ہیں، عراق میں داعش یا دولتِ اسلامیہ نامی شدت پسند گروہ کے پیچھے امریکی ہاتھ کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سابق امریکی وزیرِ خارجہ ہلری کلنٹن نے اپنی کتاب 'ہارڈ چوئسز' میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ لبنانی فوجوں کے خلاف دولتِ اسلامیہ کے جنگجوؤں کی وحشیانہ کارروائیوں، اور یرغمالیوں کے سر قلم کرنے کی ویڈیوز جس انداز میں انٹرنیٹ پر دکھائی جانے لگیں۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی عام ہونے لگا کہ امریکہ اس گروہ کی تشکیل کا ذمہ دار ہے۔ ماضی میں طالبان ، القاعدہ کے ہیولے میں اسی انداز میں رنگ بھرا گیا تھا، یہ بھی کہا جارہا ہے کہ امریکہ نے دولتِ اسلامیہ کو خطے میں بدامنی کے لیے تیار کیا ہے تاکہ امریکی مفادات پورے ہو سکیں۔ اور ایک بار پھر امریکہ کو یہاں فوج اتارنے کا بہانہ مل جائے۔ان افواہوں کی کثرت کی وجہ یہ بھی کہی

جاسکتی ہے کہ امریکہ نے کئی بار اقتدار میں تبدیلی کے لیے باغی گروہوں کی حمایت کی ہے۔افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کی پشت پناہی اور مشرقِ وسطیٰ کے سیاق و سباق میں یہ کوئی ناقابلِ یقین بات نہیں ہے۔ اس افواہ کی شدت کی وجہ سے لبنانی وزارتِ خارجہ نے امریکی سفیر ڈیوڈ ہیل کو بھی طلب کرکے وضاحت مانگی تھی۔ معاملہ کی سنگینی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ بیروت میں امریکی سفارت خانے کو اس سلسلے میں ایک خصوصی بیان جاری کرنا پڑا تھا جس میں اس کی بات کی تردید کی گئی۔ ہلیری کلنٹن نے اپنی کتاب میں کہا تھا کہ امریکہ کی جانب سے شامی باغیوں کی مدد نہ کرنے کی وجہ سے دولتِ اسلامیہ وجود میں آئی۔ ان باتوں سے لبنان میں امریکی ساکھ کو انتہائی نقصان پہنچا ہے، اور لبنان میں امریکی حامیوں کی تعداد کم ہوئی۔حال ہی میں امریکہ نے خطے میں اپنی پالیسی ایک بار پھر تبدیل کرلی ہے، "داعش" کے خلاف جاری اتحادی فوج کے فضائی آپریشن کے انچارج جنرل جون ایلن نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ دولت اسلامی کے خلاف جلد ہی زمینی آپریشن کا آغاز ہونے والا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ داعش کے خلاف فضائی حملوں کے ساتھ ساتھ زمینی کارروائی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جنرل ایلن کا کہنا ہے کہ دولت اسلامی کے شدت پسندوں کے خلاف زمین آپریشن کا آغاز عراق کے اندر سے ہوگا۔ اس سلسلے میں عراقی فوج کے 12 بریگیڈز کو جنگی تربیت اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا جارہا ہے۔ اس سے یہ بات پائے ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ امریکہ ایک بار پھر اپنی فوجیں

عراق میں اتارنے جارہا ہے، پہلے یہ القاعدہ کے خلاف تھا تو اس بار یہ داعش کو کچلنے کے نام پر ہوگا۔

بھارت بنگلہ دیش تعلقات کا نیا دور

پانی اور سرحدی تنازعات کا حل ایک اچھی پیش رفت

بنگلہ دیش اور بھارت کے درمیان اکیسویں صدی میں تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ جس میں خطے کے دونوں ملکوں کے درمیان تعاون اور تجارتی و سفارتی تعلقات کو مضبوط بنایا جا رہا ہے۔ بنگلہ دیش اور بھارت کے مابین تعلقات مسلسل اتار چڑھاؤ کے شکار رہے ہیں۔ لیکن دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اب تقریبا چالیس برس کے بعد پہلی مرتبہ بنگلہ دیشی صدر عبدالحامد نے بھارت کا دورہ کیا ہے۔ جس میں سرحدی تنازعات پر بات ہوئی ہے۔ دونوں جانب سے اس ملاقات کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس چھ روزہ سرکاری دورہ سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید وسیع اور مستحکم ہوں گے۔ 1971 میں پاکستان کی تقسیم اور ایک آزاد ملک کے طور پر بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد سے دونوں ملکوں کے درمیان اچھے تعلقات بھی رہے اور کبھی کبھی ان میں تناو بھی آیا۔ بھارت کی طویل ترین سرحد بنگلہ دیش سے ملتی ہے جبکہ بنگلہ دیش سے ملحق بھارت کی شمال مشرقی ریاستوں میں جاری شورش پسندی، علیحدگی کی تحریکیں اور دہشت گردی کے واقعات بھارتی حکومت کے لیے مستقل پریشانی

کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ بھارت کی جانب سے الزام عائد کیا جاتا ہے کہ عسکریت پسند بھارتی علاقے میں اپنی مسلح کارروائیوں کے بعد بنگلہ دیشی علاقوں میں پناہ چلے جاتے ہیں جب کہ متعدد انتہاپسند لیڈروں نے بھی وہاں پناہ لے رکھی ہے۔ بھارتی حکام کا خیال ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین سرحدی تنازعہ حل ہو جانے سے انتہاپسندی اور سرحد پار سے ہونے والی دہشت گردی پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔ سرحدی تنازعہ کو حل کرنے کے لیے 2011 میں اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ اور ان کی بنگلہ دیشی ہم منصب شیخ حسینہ واجد کے درمیان ایک معاہدہ بھی طے پایا تھا۔ بنگلہ دیشی پارلیمان نے اس معاہدے کی توثیق بھی کردی تھی لیکن بھارتی پارلیمنٹ میں اس معاہدے پر بڑی لے دے ہوئی۔ کئی سیاسی جماعتوں اور بی جے پی نے بھی اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن وزیر اعظم نریندر مودی اس بارے میں پر امید تھے۔ انھوں نے اپنے حالیہ دورہ آسام میں عوام کو یقین دلایا کہ اس سرحدی تنازع کو حل کرنے اور بنگلہ دیش کے ساتھ زمین کی تبادلے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے دراندازی اور بنگلہ دیشیوں کی غیر قانونی آمد کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ اس کے بعد اس معاملے کو پارلیمنٹ کی خارجہ امور سے متعلق اسٹینڈنگ کمیٹی کو سونپ دیا گیا، جس نے یکم دسمبر کو اپنی رپورٹ میں کہا کہ حکومت زمین کے تبادلے کے معاملے کو آگے بڑھائے۔ اس معاہدے کے تحت بھارت بنگلہ دیش کو 17169 ایکڑ پر مشتمل 111 انکلیو بنگلہ دیش کے حوالے کرے گا جب کہ بنگلہ

دیش اس کے بدلے 7110 ایکڑ پر مشتمل 51 انکلیو بھارت کو دے گا۔ ان علاقوں میں تقریبا اکیاون ہزار کی آبادی ہے۔ ان میں آسام، مغربی بنگال، تری پوری اور میگھالیہ کے علاقے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ ہوجانے کے بعد ان افراد کو وہ سرکاری سہولیات حاصل ہوسکیں گی، جن سے وہ اب تک محروم ہیں۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیشیوں کی غیر قانونی آمد کے مسئلے کو بھی حل کرنے میں مدد ملے گی۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان تیستاندی کی پانی کے تقسیم کا مسئلہ بھی حل طلب ہے۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے درمیان تین دہائیوں سے جاری متنازع سمندری حدود کا بھی اب تصفیہ ہوچکا ہے۔ یہ معاملہ اقوام متحدہ کے ایک ٹرائبیونل کے ذریعہ حل ہوا۔ جس نے متنازع علاقے کا تقریباً 80 فیصد حصہ بنگلہ دیش کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کے تحت دونوں ممالک کے درمیان خلیج بنگال کے متنازع 25 ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے میں سے 19،500 کلومیٹر کا علاقے بنگلہ دیش کو دیا گیا ہے جبکہ بھارت کے حصے میں تقریبا چھ ہزار کلومیٹر علاقہ آیا ہے۔ اب دونوں ملک اس فیصلے پر رضامند ہیں۔ بھارت کے ساتھ جاری سمندری حدود کے تنازعے کو بنگلہ دیش نے سنہ 2009 میں سمندری امور کے متعلق اقوام متحدہ کے بین الاقوامی ٹرائبیونل میں اٹھایا تھا۔ اس تنازعے کے حل کا ایک خوشگوار پہلو یہ بھی ہے کہ بنگلہ دیش کو خلیج بنگال میں پٹرول اور گیس کی تلاش کا موقع ملے گا۔ ماہرین کے مطابق خلیج بنگال میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر ہیں۔

دونوں ملکوں کے درمیان برسوں کی خلیج کو

پاٹنے کی کوشش کے باوجود بنگلہ دیش کی عوام میں بھارت مخالف جذبات موجود ہیں۔جس سے بھارتی دانشور پریشان ہیں۔ایک بھارتی تھنک ٹینک مولانا ابوالکلام آزاد انسٹیٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز (MAKAIAS) کے چیئرمین سیتارام شرما کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش میں ہر پریشان کن واقعہ کے پیچھے بھارتی ہاتھ تلاش کرنے کا قدرتی رجحان موجود ہے۔ سیتارام شرما کا کہنا تھا کہ بھارت بنگلہ دیش میں جمہوری حکومت کو ترجیح دیتا ہے، کیوں کہ وہ اسے کم بھارت مخالف سمجھتا ہے۔جبکہ بنگلہ دیش کے سابق سفارت کار محسن علی خان کا خیال ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام بھارت مخالف جذبات نہیں رکھتے بلکہ وہ بھارت سے مایوس اور ناراض ہیں۔بھارت بنگلہ دیش کے درمیان ایک تنازعہ غیر قانونی تارکین وطن کا ہے۔ بھارتی حکومت اور ماہرین کا دعویٰ تھا کہ بھارت میں ۲ کروڑ غیر قانونی تارکینِ وطن ہیں۔بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے اپنی انتخابی مہم کے دوران غیر قانونی تارکینِ وطن کے مسئلہ کو اٹھایا تھا اور اقتدار میں آنے کے بعد غیر قانونی تارکینِ وطن کو بنگلہ دیش واپس بھیج دینے کی دھمکی بھی دی تھی۔ بنگلہ دیش بھارت پر پانی کی چوری کا بھی الزام لگاتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت بھارت کسی مشترکہ دریا سے پانی نہیں نکال سکتا۔لیکن بھارت ایک عرصہ سے مشترکہ دریاوں کا پانی نکال کر زراعت اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور بنگلہ دیش کو اُس کے حق سے محروم کر رہا ہے۔ بنگلہ دیش 54 دریا کے پانی میں شراکت دار ہے، جن میں سے 52 پر بنگلہ دیش اور

بھارت کا مشترکہ حق ہے۔بھارت اور بنگلہ دیش کی سرکاری پاور کمپنیوں نے کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کے ڈیڑھ ارب ڈالر کے ایک پاور اسٹیشن کی تعمیر کے معاہدے پر دستخط کر رکھے ہیں۔ جس سے روزانہ 1320 میگاواٹ بجلی پیدا ہوگی۔اس منصوبے سے 2016 تک پیدوار شروع ہوگی۔ بھارت نیبنگلہ دیش کے تاجروں کو بھی کئی سہولتیں دے رکھی ہیں، بھارت نے ایسے بنگلہ دیشی کاروباری حضرات کو دو سال کا ملٹی پل ویزا جاری کرنا بھی شروع کر دیا ہے جو بھارت کے ساتھ تجارت کرنا چاہتے ہیں۔دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی منڈیوں کے قیام بھی ہوا ہے۔ جس سے بھارت سے 225 اشیاء محصول کے بغیر بنگلہ دیشی منڈیوں میں داخل ہو پائیں گی۔بھارت اور بنگلہ دیش کی تجارت کا بھی کوئی موازنہ نہیں ہے۔ مالی سال 2011-2012 میں بھارت کی طرف سے بنگلہ دیش کو 4.74 بلین ڈالر کی مصنوعات بھیجیں گئیں۔ جبکہ بنگلہ دیش نے بھارت کو 500 ملین ڈالر مالیت کی مصنوعات.برآمد کیں۔ یوں لگتا ہے کہ بھارتی ایجنڈا میں معاشی اہداف سرفہرست ہیں۔اور وہ انھیں کے ذریعے چھوٹے ملکوں پر اپنا اثر رسوخ.بڑھانا چاہتا ہے۔ بھارت کی بنگلہ دیش میں بڑھتی ہوئی دلچسپی میں یہ امر بھی پوشیدہ ہے کہ وہ سفارت کاری کے عمل میں تیزی کے ذریعے جنوبی ایشیا میں چین کے اثر کو حد میں رکھنا چاہتا ہے۔ بھارت خطے میں سرحدوں کے قریب تجارتی چوکیوں پر نئی سڑکوں، ریل لنکس اور زیریں ڈھانچے کے جال کی تعمیر کو بھی یقینی بنانا چاہتا ہے۔

اسرائیل کی ایک اور ہٹ دھرمی

انٹر نیشنل کریمنل کورٹ کو اپنے فوجیوں پر مقدمہ چلانے نہیں دیں گے

اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو بینجمنن نے عالمی برادری کو ایک بار پھر یہ کہہ کر چیلینج کردیا ہے کہ اسرائیل اپنے فوجیوں کے خلاف ہیگ میں قائم بین الاقوامی فوجداری عدالت (آئی سی سی) میں ممکنہ جنگی جرائم کے الزامات پر مقدمات نہیں چلانے دے گی۔ اسرائیل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کو تو پہلے ہی رد کرتا چلا آ رہا ہے اور وہ انھیں کسی خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ اب اس کے انتہا پسند وزیر اعظم Benjamin Netanyahu نے یہ بیان دیا ہے کہ ہم اسرائیل کی دفاعی افواج کے فوجیوں اور افسروں کو ہیگ میں عالمی فوجداری عدالت میں گھسیٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسرائیل نے انٹر نیشنل کرائم کورٹ میں اپنے خلاف درخواست کے رد عمل میں فلسطینی اتھارٹی پر اقتصادی پابندیاں لگانا شروع کر دی ہیں اور محصولات کی رقم کی ساڑھے 12 کروڑ ڈالرز کی قسط کو ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے فلسطینیوں کے خلاف امریکا سمیت مختلف مقامات پر مقدمات چلانے کی بھی دھمکی

دی ہے۔ اسرائیل ہر ماہ فلسطینی اتھارٹی کو تقریباً ساڑھے 12 کروڑ ڈالرز ادا کرتا ہے۔ یہ رقم فلسطینی اتھارٹی کے ملازمین کی تنخواہوں کی ادیگی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اتھارٹی کے ملازمین کی ماہانہ تنخواہوں کی کل مالیت 20 کروڑ ڈالرز بنتی ہے۔ دوسری جانب امریکا نے اسرائیل کی طرف سے فلسطینی اتھارٹی کو محصولات کی رقم کی منتقلی معطل کرنے کی مخالفت کی ہے۔ امریکی دفتر خارجہ کی ترجمان جین ساکی کا کہنا ہے کہ '' اسرائیل کا یہ اقدام کشیدگی میں اضافے کا سبب بنے گا۔ '' دوسری جانب اسرائیل نے فلسطین کو مزید انتقامی اقدامات کی دھمکی دی ہے۔حالیہ ''ویک اینڈ'' کے موقع پر امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے بھی اسرائیلی وزر اعظم بنجمن نیتن یاہو سے بات چیت کی تھی ، اسی طرح امریکی ٹیم فلسطینی حکام کے ساتھ بھی رابطے میں ہے۔امریکہ کی کوشش ہے کہ معاملات کو بڑھنے نہ دیا جائے اور ایک دوسرے کے خلاف ادلے بدلے میں کیے جانے والے اقدامات کو روکا جائے۔' اسرائیل اور فلسطین کے درمیان حالیہ تنازع نومبر دو ہزار بارہ سے فلسطینی اتھارٹی کو اقوام متحدہ میں مبصر کی حیثیت حاصل ہونے پر ہوا ہے۔ اسرائیل نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ مغربی کنارے کے انتہائی حساس علاقوں میں مزید یہودی بستیاں تعمیر کرے گا۔ امریکہ بھی فلسطین کی جانب سے اسرائیلی فوجیوں کو عالمی عدالت میں گھسیٹنے ، اور فلسطینی اتھارٹی کیطرف سے فوجداری عدالت کا حصہ بننے کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے۔ امریکا کا کہنا ہے کہ ایسے فیصلوں سے

فلسطینی عوام کی الگ ریاست کی منزل قریب نہیں آئے گی۔ محصولات کی رقم روکنے پر فلسطین نے اسرائیل کے اس اقدام کی مذمت کی ہے اور اسے ایک اور 'جنگی جرم' قرار دیا ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ اسرائیل نے فلسطین کو ٹیکس کی رقوم کی منتقلی کو روک دیا ہو۔ اس سے قبل سنہ 2014 میں بھی جب فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے مختلف بین الاقوامی معاہدات اور کنونشنز میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اسرائیل نے ٹیکسوں کی رقوم فلسطینی اتھارٹی کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہیگ میں قائم جرائم کی عالمی عدالت یکم جولائی سنہ 2002 میں روم کے قانون کے نفاذ کے بعد قتل عام، انسانیت کے خلاف جرائم اور جنگی جرائم کے واقعات پر مقدمات چلا سکتی ہے۔ فلسطینی اتھارٹی کے سربراہ محمود عباس نے عالمی فوجداری عدالت میں شمولیت کا فیصلہ اس وقت کیا جب انھیں اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا۔ فلسطینی صدر محمود عباس نے عالمی فوج داری عدالت کے معاہدہ روم کے علاوہ بھی تقریباً 20 دوسرے عالمی اداروں میں شمولیت کے معاہدوں پر بھی دستخط کیے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے فلسطین کی انٹرنیشنل کریمنل کورٹ (جرائم کی عالمی عدالت) کی رکنیت حاصل کرنے کی درخواست منظور کرکے فلسطین کے لئے امید کا ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ اب فلسطین کو اس بات کے مواقع حاصل ہوں گے کہ وہ اسرائیل کے خلاف عالمی عدالت میں جنگی جرائم کے مقدمات دائر کر سکے۔ انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے ارکان کی 122 ملکی کانفرنس میں فلسطینی اتھارٹی کو بطور مبصر کے

شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس تحریک کے نتیجے میں فلسطینی اتھارٹی کے بین الاقوامی کرائم ٹربیونل کا حصہ بننے کا راستہ ہموار ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کی جانب سے بان کی مون کے اس فیصلے سے اسرائیل اور امریکہ کی طرف سے بھرپور مخالفت کے باوجود ہیگ میں قائم عالمی عدالت یکم اپریل کے بعد سے فلسطینی علاقوں میں جنگی جرائم پر مقدمات چلا سکتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ترجمان سٹیفین یوجرک نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ بان کی مون نے آئی سی سی کے رکن ممالک کو اس بات سے آگاہ کردیا ہے۔ سیکرٹری جنرل نے اس بات کی تصدیق بھی کر لی ہے کہ فلسطین کی طرف سے یہ درخواست قواعد کے مطابق دی گئی تھی۔ فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس نے آئی سی سی اور دیگر 16 عالمی معاہدوں اور دستاویزات پر دستخط 31 دسمبر کو سلامتی کونسل کی طرف سے ان کی ایک قرارداد رد کیے جانے کے ایک دن بعد کیے تھے۔ دوسری جانب امریکی کانگریس نے بھی 44 کروڑ ڈالر کی امداد روک لینے کی دھمکی دی ہے۔ گذشتہ برس پچاس دن تک غزہ پر اسرائیل کی فوج کشی کی وجہ سے 2200 فلسطینی شہید ہوگئے تھے جن میں چار سو سے زیادہ بچے بھی شامل تھے۔ اسرائیل جنگ کا آغاز کرتے ہوئے، طاقت کے زعم میں تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ غزہ کو نیست و نابود کردے گا۔ اسرئیل کے پاس ایسا سوچنے کا جواز بھی تھا۔ کیونکہ وہ فلسطین (حماس) کے ہر حملے کو ناکام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے پاس ایسے ائیرن ڈوم راکٹ شکن موجود ہیں جو فلسطین کے ہر راکٹ کے ہدف اور نشانے کو سمجھ کر اسے فضا میں ہی

ناکام بنادے، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو فلسطین کے کئی راکٹ اپنے ہدف پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسرائیل کے لوگ مارے گئے۔ حماس نے بے جگری سے یہ جنگ لڑی اوراسرائیل کو یہ ماننے پر مجبور کردیا ہے کہ وہ اس کا ایک مضبوط دشمن ہے۔ حماس نے اس لڑائی میں نہ صرف اسرائیل کے 69 نوجوان ہلاک کیئے۔ بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ وہ طویل جنگ لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسرائیل نے فلسطین کو نیست و نابود کرنے کا جو خواب دیکھا تھا، اس میں ناکامی نے اس کو نفسیاتی شکست میں مبتلا کردیا ہے۔ ہیگ میں قائم یہ ادارہ (جرائم کی عالمی عدالت) آزادانہ حیثیت میں کام کرتا ہے اور یہ اقوام متحدہ کے نظام کا حصہ نہیں ہے۔ فلسطین آئی سی سی کی رکنیت کے حصول میں عرصہ سے سرگرم تھا، تاکہ اسرائیل کے انسانیت کے خلاف جنگی جرائم کو اس عدالت میں پیش کیا جا سکے۔ اسی لیئے فلسطینیوں نے آئی سی سی کی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں اپنے لیے مبصر کی حیثیت سرکاری طور پر قبول کرلی تھی۔ دوسری طرف ہیومن رائٹس واچ میں آئی سی سی کی وکیل بلقیس جراح کا کہنا تھا کہ ہماری کوشش یہ تھی کہ فلسطین کسی طرح کورٹ میں شامل ہوجائیں تاکہ کسی طرف سے بھی انسانیت کے خلاف سنگین جرائم کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہ بات بھی اطمینان بخش ہے کہ روس، چین، بھارت جیسے ملکوں کو اتفاق رائے سے دعوت دی گئی تھی۔ فلسطینیوں کو مبصر کے طور پر دعوت دینے پر بھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس جنگ کے بعد اسرائیل میں نفسیاتی شکست کا احساس جنم لے رہاہے اور پڑھا لکھا طبقہ

یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس میں غزہ کی اس جنگ کو اسلحہ کے بل پر جیتنے کی صلاحیت نہیں ہے۔اس جنگ میں اسرائیل کی طرف سے کھلے عام عالمی قوانین کی خلاف ورزی کی جاتی رہی ۔ پناہ گزینوں کی رہائش گاہوں پرتابڑ توڑ حملے کیئے گئے۔ اقوام متحدہ کے اسکولوں میں پناہ لئے ہوئے بچوں اور عورتوں کو ہلاک کیا گیااور عالمی اپیلوں کو نظر انداز کیا گیا۔ اس جنگ میں اسرائیل کوسفارتی ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔اس جنگ میں اسرائیل کے رویے نے پوری دنیا میں یہ پیغام دیا تھا کہ وہ ایک جابر قوم ہے اور جنگ کے دوران اصولِ جنگ کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہے۔پوری دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں کے بڑے شہروں میں اسرائیلی بربریت کے خلاف احتجاج نہ ہوا ہو، اس سے پوری دنیا میں اسرائیل کی شبیہ ایک درندہ صفت قوم کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے ،اسرائیل نے اس جنگ کا االزام حماس پر تھوپنے کی بہت کوشش کی لیکن دنیا نے اسرائیل کی ہر دلیل کو مسترد کردیا۔یہ اسرائیل کی بڑی سفارتی ناکامی ہے۔سفارتی سطح پر اسرائیل کو ناکامی کا پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں اس کے حق میں صرف امریکہ کا ایک ووٹ پڑا ،باقی 29 ملکوں نے اس کے خلاف ووٹ کیا۔ اس ووٹنگ میں اس کے کئی دوست ملک جن میں ہندوستان بھی شامل ہے اسرائیل کی بربریت کو دیکھتے ہوئے مخالف ہوگئے۔اسرائیلی حملوں میں دوہزار دوسوسے زیادہ فلسطینی ہلاک ہوئے۔جن میں چار سو سے زیادہ بچے، تقریباڈھائی سو عورتیں، 74 بوڑھے شامل تھے۔ ان حملوں میں دس

ہزار سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے ہیں جن میں 2805 بچے، 1823 عورتیں اور 343 بوڑھے شامل ہیں۔اسرائیل نے شروع کے چار ہفتوں میں غزہ پر کل 55800 حملے کیے،ان میں 6663 فضائی، 33871 بری اور 16209 سمندری حملے کیے۔ان حملوں میں 138 مساجد پورے طور پر اور 110 مساجد جزوی طور پر منہدم ہوئی ہیں۔52 اسپتالوں کو نقصان پہنچا تھا۔توقع ہے کہ عالمی عدالت میں جانے سے اسرائیل کے جرائم بے نقاب ہوں گے۔اور فلسطینوں کو اپنے موقف میں اقوام عالم کی حمایت حاصل ہوگی۔

مصر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی معزول صدر محمد مرسی پر نئے مقدمے

اخوان المسلمون کے 183 حامیوں کو سزائے موت ، نظام انصاف فرسودہ ہے۔ایمینسٹی انٹرنیشل

مصر میں ایک بار پھر اخوان المسلمون کو تعزیر اور پھانسی کی سزاوں کا سامنا ہے۔
معزول صدر محمد مرسی کے خلاف الجزیرہ ٹیلی وژن کو 'اہم دستاویزات' فراہم کرنے کے الزام میں ایک نیا مقدمہ شروع کیا جارہا ہے، جس میں انھیں سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔ مصر کی ایک عدالت نے 13 پولیس اہلکاروں کے قتل کے الزام میں اخوان المسلمون کے 183 حامیوں کو بھی سزائے موت کا حکم دیا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیسنل نے ان سزاؤں کی مذمت کی ہے ۔اور کہا ہے کہ یہ متنازعہ فیصلہ مصر میں انصاف کے فرسودہ نظام کی عکاسی کرتا ہے۔ ایمینسٹی کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ سزائیں معطل کی جائیں اور ملزمان کا مقدمہ عالمی معیار کے مطابق چلایا جائے۔ مصر میں فوجی حکومت کی جانب سے اب تک ہزاروں افراد کو سزائے موت دی جاچکی ہے۔ جن میں اسلام پسند ،اور لبرل شامل ہیں۔ ایمینسٹی کا کہنا ہے کہ جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے والے جنرل سیسی کی حکومت ، عدالت کو مخالفین کو کچلنے کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ سابق صدر محمد مرسی کے خلاف اس نئےمقدمیکا آغاز اس ماہ کی 15 تاریخ سے قاہرہ میں

ہو گا۔ مصر کے پہلے منتخب صدر محمد مرسی کی حکومت کو فوج سے ختم کر دیا تھا۔ مسلح افواج کے سربراہ جنرل عبدالفتاح السیسی نے 3 جولائی کو حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔اس فوجی اقدام کے خلاف احتجاج کرنے والے اخوان المسلمون کے کارکنان اور دیگر جمہوریت پسندوں کے خلاف سکیورٹی فورسز نے سخت کریک ڈاؤن کیا تھا جس کے دوران ایک ہزار چار سو سے زیادہ افراد ہلاک اور دو ہزار سے زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔ مصر کے معزول کئے جانے والے صدر اور اخوان المسلمین کے رہنما محمد مرسی کو گرفتاری کے بعد کئی مقدمات کا سامنا ہے ان پر الزام ہے کہ انھوں نے اپنے دور اقتدار میں مظاہرین کو قتل کرایا، مبینہ طور پر عالمی طاقتوں خاص طور پر ایران کے ساتھ مل کر مصر میں امن وامان کی صورت حال کو خراب کی، اور سابق صدر حسنی مبارک کو 2011 میں معزول کرنے کیلئے جیل توڑی اور پولیس ہر حملے کروائے۔ مرسی ان الزامات کی تردید کرتے ہیں۔ اور خود کو اب بھی مصر کا جمہوری صدر قرار دیتے ہیں۔ سابق صدر مرسی پر پرانے مقدمے تو چل ہی رہے ہیں۔ لیکن تازہ مقدمہ حال ہی میں مصری عدالت میں جمع کروائی گئی ایک درخواست کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ جس میں مرسی پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے دیگر 9 ساتھیوں کے ہمراہ جن میں ایک الجزیرہ کا رپورٹر بھی شامل ہے، کے ساتھ مل کر الجزیرہ ٹی وی کو دس لاکھ ڈالرز کے بدلے میں انتہائی خفیہ دستاویزات فراہم کیں تھیں۔ دراخواست میں جن افرد کا ذکر ہے، ان میں سے سات افراد پہلے سے ہی حکومت کی تحویل میں ہیں۔ دوسری جانب

آسڑیلیا سے تعلق رکھنے والے الجزیرہ کے رپورٹر پیٹر گریسٹا کو مصر کی فوجی حکومت نے عالمی دباو کی بنیاد پر رہا کردیا ہے۔ پیٹر گریسٹا ایک سال تین ماہ سے قید میں تھے۔ ان پر الجزیرہ کی رپورٹوں میں اخوان المسلمون کی حمایت کا الزام تھا۔ الجزیرہ انگریزی سے تعلق رکھنے والے رپورٹر کو ان کے دو دیگر ساتھیوں کینیڈین نژاد مصری شہری محمد فہمی اور مصری پروڈیوسر باہر محمد کے ساتھ دسمبر 2013 میں گرفتار کیا گیا تھا۔ الجزیرہ نے فوجی بغاوت کے بارے میں خبریں نشر کی تھی، جن کی بنیاد پر اس کی نشریات بھی معطل کردی گئی تھیں۔ الجزیرہ نیوز چینل نے اپنے رپورٹر کی رہائی کو خوش آئیند قرار دیتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ ان کے دیگر دو صحافیوں کو بھی جلد رہا کردیا جائے گا۔ الجزیرہ کے ایکٹنگ ڈائریکٹر جنرل مصطفیٰ سوآنگا کہنا ہے کہ ہم باہر محمد اور محمد فہمی کی رہائی تک وہ چین سے نہیں بیٹھے گے۔ اس امید کا اظہار کیا جارہا ہے کہ پیٹر گریسٹا کی طرح ان دونوں رپوٹرز کو بھی مصری صدر عبدالفاتح السیسی کی جانب سے ایک خصوصی حکم نامے کے ذریعے بیرون ملک جانے کی اجازت دیدی جائے گی۔ مظاہرین کی ہلاکتوں کے الزام میں ڈاکٹر مرسی کے علاوہ اخوان المسلمون کے مرکزی قائدین محمد البلتاجی اور اعصام العریان کو بھی اس مقدمے میں ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس مقدمے کے پندرہ مدعا علیہان میں سے آٹھ اس وقت زیر حراست ہیں اور باقی مفرور ہیں۔ ڈاکٹر مرسی پر جاسوسی کے الزام میں الگ سے جو مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ اس میں مصر کے پراسیکیوٹرز نے

ان پر پاسداران انقلاب ایران کو ریاست کے خفیہ راز افشاء کرنے کا الزام عاید کیا تھا جن کا مقصد مصر کو عدم استحکام سے دوچار کرنا تھا۔پراسیکیوٹرز نے معزول صدر پر یہ سنگین الزام عاید کیا تھا کہ انھوں نے اخوان کے پینتیس دوسرے لیڈروں، فلسطینی جماعت حماس اور ایران کے ساتھ مل کر مصر کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی سازش کی تھی۔ معزول صدر ڈاکٹر محمد مرسی،اخوان کے لیڈروں اور لبرل کارکنان سمیت چوبیس افراد کے خلاف عدلیہ کی توہین سمیت مختلف الزامات کے تحت تین اور مقدمات بھی چلائے جارہے ہیں۔ان میں اپنے مخالفین کو قتل کرنے کی شہ دینے، غیر ملکی گروپوں کے ساتھ مل کر سازش کرنے اور جیل توڑنے کے الزامات پر مبنی مقدمات شامل ہیں۔ان کیسوں میں انھیں موت کی سزا سنائی جاسکتی ہے۔ملک بھر میں مصر کی آرمی کی جانب سے ہونے والے کریک ڈاؤن میں ہزاروں لوگوں کو جیل اور سیکڑوں کو پھانسی کی سزائیں ہوچکی ہیں جبکہ سیکڑوں کی تعداد میں ہلاکتیں بھی سامنے آئیں ہیں۔اخوان المسلمون کے ان رہنماؤں کے خلاف نئے مقدمے کا آغاز ایک ایسے وقت میں کیا جارہا ہے، جب ملک میں آئین سے متعلقبنیادی تبدیلیاں کی جارہی ہیں۔ فوجی حکومت ریفرنڈم کے ذریعے آئینی تبدیلیوں کے لیے عوامی سطح پر "ہاں" کی تیاریوں میں مصروف ہے۔اخوان المسلموں کے وکیل صفائی محمد الدماطی نے اس نئے مقدمے کی مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سراسر 'سیاسی مقدمہ' ہے اور حکومت اپنے پر تشدد کریک ڈاؤن کو قانونی حیثیت دینے کی کوشش کررہی ہے۔ مصر کے حالیہ واقعات

مشرقی وسطی کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ مصر کی موجودہ فوجی حکومت کو بڑے پیمانے پر امریکہ اور سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے، جبکہ برطانیہ اور یورپی یونین مصر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے باوجود فوجی حکومت کی سیاسی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ آٹھ کروڑ آبادی کے اس ملک کے بیس فیصد عوام خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مصری فوج جس کی تعداد چار لاکھ پینسٹھ ہزار ہے۔ ایک ایسا ادارہ بن گیا ہے جس کے اپنے کمرشل مفادات ہیں۔ مصری فوج کے علیحدہ سوشل کلب اور شاپنگ سینٹر ہیں اور پچھلے کئی عشروں سے انہوں نے اپنے تجارتی مفادات کو مزید پھیلایا ہے۔ مصری فوج پر امریکی اثر رسوخ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ ہر سال مصری فوج کو ایک بلین ڈالر سے زیادہ کی امداد دیتا ہے اور مصری فوج، امریکی ٹیکنالوجی پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں آگ اور پانی کا ملاپ

بے جے پی اور پی ڈی پی حکومت کی تیاریوں میں مصروف

انسانی حقوق کی خلاف ورزی، اور بھارتی فوج اور پولیس کی جانب سے جبر استبداد،

تشدد کے واقعات پر ایمینسٹی انٹرنیشنل اور بھارتی تنظیموں کا احتجاج

مقبوضہ کشمیر میں حکومت کے قیام پر تعطل ختم کا امکان ہوگیا ہے، اور اب آگ اور پانی کا ملاپ یعنی بے جے پی اور پی ڈی پی کے درمیان حکومت میں شراکت کے فارمولے کو حتمی شکل دی جارہی ہے۔ جس کا اعلان کسی وقت بھی متوقع ہے۔ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے درمیان مذاکرات میں پیش رفت سے وزیراعظم نریندر مودی کو بھی آگاہ کردیا گیا ہے۔ دونوں جماعتوں کے معاہدہ کے مطابق پی ڈی پی کے سربراہ مفتی محمد سعید وزیراعلیٰ ہوں گے۔ جبکہ بی جے پی کو ڈپٹی وزیراعلی کا عہدہ ملے گا۔ تاہم دونوں فریقوں کے درمیان متنازعہ مسلح افواج خصوصی اختیارات ایکٹ (افسپا) اور دفعہ 370 گلے کی ہڈی بن گئی ہے۔ اس پر دونوں جماعتیں اپنے موقف پر قائم ہیں۔ اور کوئی بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں ہے۔ پی ڈی پی دفعہ 370 کو بحال رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن بی جے پی اس

پر تیار نہیں ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ گرما گرمی آرٹیکل 370 ہے۔ جس کے لئے BJP نے اپنے منشور میں تحریری وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ آرٹیکل 370 کو ختم کر دے گی۔ بی جے پی شروع سے ہی ریاست میں دفعہ 370 ہٹانے کا مطالبہ کرتی رہی ہے.
دوسری طرف پی ڈی پی دفعہ 370 کو لے کر کسی بھی معاہدے کے لئے تیار نہیں ہے۔ دفعہ 370 سے کشمیر ریاست کو خصوصی درجہ ملا ہوا ہے۔ بی جے پی کی دقت یہ بھی ہے کہ اگر وہ ان مسائل سے پیچھے ہٹتی ہے تو ریاست میں ان کے حامی لیڈر مخالفت کر سکتے ہیں۔ مزاکرات کو آگے بڑھانے والے کہتے ہیں کہ حکومت بنانے کے لئے دونوں ہی پارٹیاں کچھ مسائل کو لے کر معاہدے کو نتیجہ خیر بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن دونوں جماعتوں کی اپنی پالیسیاں ان کے ہم آہنگی کے راستے پر رکاوٹ بنی ہوئی
ہیں. مقبوضہ جموں کشمیر میں ان انتخابات کو ڈھونگ قرار دیا جارہا ہے۔ جس میں انتخابی نتائج کے محض 17 دن بعد یعنی 9 جنوری کو قابض بھارتی حکومت نے گورنر راج نافذ کر دیا ہے۔ مقبوضہ ریاست کے گورنر ''نریندر ناتھ ووہرا'' نے یہ انتہائی قدم بھارتی صدر پرناب مکھرجی کے حکم پر اٹھایا۔ 23 دسمبر کے انتخابی نتائج کے مطابق 87 رکنی ریاستی اسمبلی میں سے 28 سیٹیں PDP 25 کو، BJP کو اور 15، نیشنل کانفرنس کو 12 کانگرس کو جبکہ 7 سیٹیں دیگر چھوٹی پارٹیوں اور آزاد امیدواروں کو حاصل ہوئیں۔ بھارتی انتخابات کو ڈھونگ قرار دینے والے اپنے موقف کی تائید میں انڈین آرمی کے سابق چیف جنرل وی کے سنگھ کو دہراتے ہیں، جنھوں نے 23 ستمبر 2013 کو کھلے

عام اعتراف کیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں آج تک کوئی حکومت بھارتی فوج کی مدد کے بغیر وجود میں نہیں آئی۔ مقبوضہ کشمیر اسمبلی نے وی کے سنگھ کے اس بیان کے خلاف 30 ستمبر 2013 کو ایک قرارداد بھی منظور کی تھی ۔ BJP کی پوری کوشش تھی کہ وہ مقبوضہ ریاست میں اپنی حکومت بنائے یا حکومتی اتحاد میں اس کو اہم حیثیت حاصل ہو۔ یہ دھمکی بھی دی گئی کہ BJP کی شرکت کے بغیر کسی کو حکومت بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ کہا جارہا ہے کہ گورنر راج نافذ کرکے گویا اس دھمکی کو عملی شکل دی گئی ہے۔ بھارتی حکومت نے ریاستی آئین کی دفعہ 92 کے تحت مقبوضہ جموں وکشمیر کو براہ راست اپنے انتظامی کنٹرول میں لے لیا ہے۔ معاہدے کو نتیجہ خیز بنانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر مزاکرات کامیاب نہ ہوئے اور سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی اتحاد حکومت بنانے کے لئے سامنے نہ آیا تو چھ ماہ بعد از سر نو انتخابات کا اعلان ہوگا۔ گذشتہ 37 سال میں یہ چھٹا موقع ہے جب کشمیر میں سیاسی عدم استحکام کے باعث ریاست کا انتظامی کنٹرول نئی دہلی نے اپنے ہاتھ لے لیا۔ بھارتی جنتا پارٹی (بی جے پی) اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے درمیان جموں وکشمیر میں حکومت بنانے کے لئے مذاکرات کے کئی دور ہوئے۔ جن میں پی ڈی پی کے سرپرست اعلیٰ مفتی سعید اور چیئرمین پی ڈی پی محبوبہ مفتی، بی جے پی کے ارون جیٹلی اور بھگت رام شریک ہوئے ۔ مقبوضہ ریاست میں سیاست کی فضا کشیدہ ہے۔ بی جے پی اور اور پی ڈی پی ایک دوسرے کے سخت ترین مخالف جماعتیں ہیں۔

وادی کے مسلمانوں، جو حریت کے جذبے سے سرشار ہیں، کی نمائندگی پی ڈی پی کرتی ہے۔ جبکہ بی جے پی جموں کے ہندوؤں اور اس موقف کی نمائندہ ہے کہ کشمیر بھارت کا حصہ بنا رہے۔ دونوں جماعتوں کے دو مختلف حلقے اور ووٹرز ہیں۔ پی ڈی پی کا کوئی بھی رکن اسمبلی ہندو نہیں ہے اسی طرح بی جے پی کا بھی کوئی ممبر مسلمان نہیں ہے۔ بے جے پی کا مطالبہ یہ رہا ہے کہ وزیراعلی ہندو ہونا چاہیے۔ اس پر دونوں جماعتوں کے ڈائیلاگ بھی ہوئے ہیں۔ پی ڈی پی کے رہنما مفتی سعید نے بی جے پی کے رہنماؤں کو بتایا ہے کہ اگر میں آپ کے اس مطالبے کو تسلیم کرلوں کہ آپ کا آدمی سری نگر کی حکومت کی' قیادت کرے گا تو وادیء کشمیر میں، میں عوام کو منہ دکھانے لائق نہیں رہوں گا۔' اس پر بی جے پی کے رہنما نے جواب دیا کہ 'اگر میں آپ کے مطالبے کو تسلیم کرلوں تو پورے ملک میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔' بے جے پی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان کے پاس دکھانے کو بھی کوئی مسلمان چہرہ نہیں ہے۔ دوسری جانب مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی، اور بھارتی فوج اور پولیس کی جانب سے جبر استبداد، تشدد کے واقعات بھی ہیں۔ حال ہی میں حقوق انسانی کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مقبوضہ کشمیر میں مظاہرین کیخلاف طاقت کے بے تحاشہ استعمال کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے پلہالن کے نوجوان طالب علم کی ہلاکت کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔ 20 سالہ نوجوان طالب علم فاروق احمد بھگت کو ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے گولی مار دی تھی۔ ایمنسٹی

انٹر نیشنل کے پروگرام ڈائریکٹر شمیر بابو نے پولیس فورسز کی کارروائی کے نتیجے میں فاروق احمد بھگت کے گولی لگنے سے ہلاکت کی مکمل اور غیر جانب دارانہ تحقیقات کرانے پر زور دیتے ہوئے انکوائری مکمل کر کے ملوث اہلکاروں کو قانون کی عدالت میں کھڑا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔۔۔بزرگ حریت رہنما سید علی گیلانی نے بھارتی فوج اور پولیس کی طرف سے مقبوضہ علاقے میں جبر واستبداد کے بڑھتے ہوئے سلسلے پر شدید تشویش ظاہر کی ہے۔ علی گیلانی نے قابض انتظامیہ غیر قانونی طور پر نظر بند حریت رہنماؤں، کارکنوں اور عام کشمیری نوجوانوں کو فوری طور پر رہا اور غیر اعلانیہ کرفیو اور پابندیوں کا سلسلہ ختم کرنے کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں بڑھتے ہوئے مظالم ،پولیس کی جانب سے رات کے وقت لوگوں کے گھروں میں گھس کر مکینوں کو ہراساں کرنے ۔ اور مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں پر اب بھارت میں بھی آواز اٹھنے لگی۔انسانی حقوق کی بھارتی تنظیم پیپلز یونین فار ڈیموکریٹک رائٹس نے بھارت سے مقبوضہ جموں وکشمیر میں نافذ کالے قوانین کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

بھارت اور روس کے معاہدے

بھارت اور روس کے معاہدے، صدر ولادیمیر پیوٹن کے دورے نے خطے میں نئی صف بندی کا علان کردیا

اس ہفتے روسی صدر ولادی میر پیوٹن کے دورہ بھارت اور روس و بھارت کے مابین اربوں ڈالر کے 20 معاہدے، روس کی جانب سے آئندہ 20 سال کے دوران مزید ایٹمی ری ایکٹر کی تعمیر، جدید ہیلی کاپٹر اور جنگی ساز و سامان بنانے کی فیکٹری 12 لگانے کے معاہدے خطے میں بدلتے ہوئے حالات اور نئی صف بندی کی جانب اشارہ ہیں۔ روسی صدر ولادی میر پیوٹن کے دورہ بھارت سے یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ دونوں مملکت ماضی کے تعلقات جاری رکھیں گے۔ دنیا میں امریکہ اپنی قدر کھو رہا اور روس اقوام عالم میں اپنی اس قدر بحال کر رہا ہے کہ وہ اپنے دوست ممالک کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ امریکہ کے بارے میں یہ تاثر گہرا ہوتا جارہا ہے کہ جن جن ممالک کے حکومتوں نے امریکہ سے دوستی وفاداری نبھائی امریکہ انہی کو وقت پر چھوڑ گیا۔ اس بات کا بھی اظہار کیا جارہا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں امریکی تسلط کے خاتمے کے بعد بین الاقوامی سطح پر طاقت کسی ایک ہاتھ تک محدود نہیں رہے گی بلکہ چین، روس اور کسی حد تک بھارت بھی آئندہ دور میں عالمی طاقت کے حصے دار ہوں گے۔ پاکستان نہ صرف ان تینوں

ممالک کے درمیان میں واقع ہے بلکہ اپنی مستحکم جوہری حیثیت کی وجہ سے بھی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یوں آئندہ برسوں میں پاکستان ایک تیزی سے ترقی کرتی ہوئی معیشت اور انتہائی اہم ریاست کے طور پر نظر آرہا ہے۔اس سال جولائی میں چین، روس، بھارت، جنوبی افریقہ اور برازیل کے گروپ برکس نے ایک سو بلین ڈالر کے ترقیاتی بینک کے قیام کا اعلان تنظیم کی چھٹی سربراہی کانفرنس کے موقع پر برازیل کے شہر فورٹالیزا کے مقام پر کیا تھا۔ جس میں بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی اور روس کے صدر پیوٹن کی ملاقات ہوئی تھی۔ موودی نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ جوہری، دفاع اور توانائی کے شعبے میں روس کے ساتھ اسٹریٹجک تعاون کو مزید آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے روسی صدر پیوٹن کو دسمبر میں بھارت کے دورے اور جوہری توانائی پلانٹ دیکھنے کے لئے مدعو کیا تھا. مودی اس سے پہلے 2001 میں بھی پیوٹن سے مل چکے ہیں. انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے تعلقات بہت پرانے ہیں اور روس ہر کسوٹی پر کھرا اترا ہے. مودی کا کہنا تھا کہ آپ بھارت میں کسی بچے سے بھی پوچھ کر دیکھئے کہ بھارت کا سب سے سچا اور اچھا دوست کون ہے تو جواب ملے گا روس. امریکہ بھارت کے روس سے بڑھتے ہوئے تعلقات کو تحسین کی نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ بھارت کے روس کے ساتھ دفاعی معاہدوں پر اظہار ناراضگی کر رہا ہے۔ اسکے باوجود امریکہ بھارت کو کھونے کو تیار نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ بھارت امریکہ کا اہم شراکت دار ہے اور صدر اوباما روس بھارت معاہدوں کے باوجود

بھارت کا دورہ منسوخ نہیں کرینگے۔ روس کی جانب سے بھارت میں 12 ایٹمی ری ایکٹر تعمیر کرنے سمیت 20 معاہدوں کے حوالے سے امریکی ترجمان جین ساکی نے کہا ہم ان معاہدوں کو مانیٹر کر رہے ہیں۔ ہم تمام ممالک سے یہ کہتے رہیں گے کہ روس کے ساتھ ماضی کی طرح کے معاملات سے گریز کریں۔امریکہ اور یورپ نے یوکرائن پر روس کے حامیوں کے قبضے کے بعد روس پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔روس اور بھارت کی باہمی دفاعی اور اقتصادی تعاون کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بھارت نے صرف روس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی جنگی دفاعی صلاحیت و قوت بڑھانے کیلئے اس نے امریکہ، فرانس، جرمنی اور برطانیہ سے بھی اسلحہ کی خریداری کے متعدد معاہدے کر رکھے ہیں۔ دو ماہ قبل بھارت نے امریکہ کیساتھ بھارت میں اسلحہ ساز فیکٹریاں لگانے کے بھی معاہدے کئے جبکہ امریکہ کے ساتھ اس کا ایٹمی ٹیکنالوجی بڑھانے کا معاہدہ پہلے ہی موجود ہے، اس طرح بھارت اس وقت جدید اور روایتی اسلحہ خریدنے والا دنیا کا سب سے بڑا ملک بن چکا ہے اور اب وہ امریکہ اور روس کے تعاون سے اسلحہ سازی کی فیکٹریاں لگا کر اسلحہ برآمد کرنیوالے ممالک کی صف میں بھی شامل ہو جائیگا۔ بھارت کا خود کو اسلحہ سے لیس کرنے کا جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ جس سے خطے میں طاقت کا توازن بگڑ رہا ہے۔روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کے دورہ ہندوستان کو خاصی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اگلے ماہ امریکی صدر اوباما بھی بھارت کا دورہ کرنے والے ہیں۔ حال ہی میں روس اور پاکستان کے درمیان روابط بڑھے ہیں۔ بھارت نے پیوٹن کے اس دورے کو

باہمی تعلقات میں ایک سنگ میل قرار دیا ہے۔ وزارت خارجہ کے جوائنٹ سکریٹری اجے بساریا کے مطابق وزیر اعظم روس کے ساتھ تعلقات کو اپنی خارجہ پالیسی کا اہم ترین حصہ سمجھتے ہیں۔ صدر پیوٹن نے اس دورے کے دوران ہندوستان میں نئے ایٹمی بجلی گھروں کی تعمیر، سخوئی سپر جیٹ، جنگی طیاروں، ایم ایس۔ 21 طرز کے مسافر بردار طیاروں اور روسی ٹکنالوجی پر مبنی اسمارٹ سٹی قائم کرنے میں تعاون کی بات بھی کی ہے۔ ہندوستان اپنی دفاعی ضروریات کے لئے اب صرف روس پر انحصار کرنے کے بجائے دیگر ملکوں سے بھی دفاعی ساز و سامان درآمد کرتا ہے تاہم سفارتی لحاظ سے وہ اب بھی روس کو کافی اہمیت دیتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نئی دہلی کا ماسکو کے ساتھ کسی معاملے میں کوئی بڑا اختلاف کبھی نہیں رہا جب کہ سرد جنگ کے زمانے میں ماسکو کشمیر پر ہندستان کے موقف کی مسلسل تائید کرتا رہا ہے اور افغانستان، ایران، تیز دہشت گردی جیسے بین الاقوامی امور پر بھی دونوں ملکوں کے موقف یکساں ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک عالمی اداروں پر مغرب کے بڑھتے ہوئے غلبے کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ روس اور بھارت کے درمیان ہونے والے معاہدوں میں تیل کی سپلائی و تلاش، فوجی تربیت، مشترکہ لڑاکا اور ٹرانسپورٹ طیارے بنانے کے معاہدے کے علاوہ 12 نئے جوہری ری ایکٹرز کی تعمیر، روس کی جدید ترین ہیلی کاپٹر KA-226T بھارت میں تیار کرنے کے معاہدے بھی شامل ہیں۔ روس اگلے سال گجرات میں ایک بڑا انڈسٹریل پلانٹ بھی تعمیر کرے گا۔ اس سے قبل 2008 اور 2010 کے معاہدوں کی

روشنی میں روس جنوبی علاقے کودن کولام میں دو ایٹمی ری ایکٹرز قائم کرچکا ہے اور نئے ری ایکٹرز کی تعمیر کے بعد روس اور بھارت کے درمیان دفاع کے شعبے میں مزید تعلقات مضبوط ہوں گے۔ بھارت اپنے ہتھیاروں کا ستر فیصد روس سے خریدتا ہے۔ روس بھارت کو ہتھیار بیچنے کے علاوہ اہم ٹیکنالوجی بھی فراہم کرتا ہے۔ بھارت نے من موہن سنگھ کے دور میں فرانس، امریکہ، اسرائیل سے بھی کئی اہم دفاعی معاہدے کیئے تھے۔ دوسری جانب روس کے لئے بھارت اہم مارکیٹ ہے، جسے وہ کھونا نہیں چاہتا۔ روس اسلحہ فوخت کرنے والا بڑا ملک ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی حجم دس ارب ڈالر کا ہے۔ جس میں گذشتہ عرصے میں کچھ کمی دیکھنے میں آئی تھی۔ وزیراعظم نریندر مودی کے اقتدار میں آنے کے بعد روسی صدر کا یہ پہلا دورہ بھارت ہے جب کہ ان دنوں روس کو یوکرین کے معاملے پر امریکا اور یورپی یونین کی جانب سے پابندیوں کا سامنا ہے۔ موجودہ صورتحال میں پاکستان کی سیاسی قیادت کے لیئے ایک امتحان ہے کہ وہ ان عالمی طاقتوں کے ساتھ اپنے روبط میں کس طرح توزن قائم رکھتا ہے۔ قیادت کی ذرا سے غلطی پاکستان کو مشکلات سے دوچار کرسکتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد اور یمن میں سعودی فوجی کارروائی

اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد نے یمن میں سعودی فوجی کارروائی کو قانونی جواز فراہم کر دیا۔

شام، عراق اور لیبیا کی طرح یمن میں طویل خانہ جنگی کے سائے بڑھ رہے ہیں

امریکہ اور سعودی عرب سمیت دس ممالک اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کی جانب سے حوثی باغیوں کو اسلحہ کی فراہمی پر پابندی کی قرارداد منظور کرانے میں تو کامیاب ہو گئے، لیکن اس سے نہ تو حوثی باغیوں پر کوئی فرق پڑا ہے، اور نہ ہی ایران نے اس مسئلے پر پیچھے ہٹنے کا اظہار کیا ہے۔ حوثی باغیوں نے تو سیکورٹی کونسل کی اس قرارداد کو 'جارحیت کی مدد' قرار دیتے ہوئے قرارداد کی مذمت کی ہے اور یمن کے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ جمعرات کو اقوام متحدہ کی اس قرار داد کے خلاف مظاہرے کریں۔ایران نے سلامتی کونسل کی قرارداد منظور ہونے کے بعد ایک چار نکاتی امن معاہدہ تیار کیا ہے جو اقوام متحدہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ایران کی جانب سے پیش کردہ چار نکاتی امن منصوبے میں سعودی عرب کی طرف سے یمن پر بمباری کو بند کرنے کا نکتہ بھی شامل ہے جو ممکنہ طور پر سعودی عرب کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ ایرانی منصوبے میں تجویز دی گئی

ہے کہ یمن میں سب سے پہلے جنگ بند کروائی جائے۔ لڑائی بند ہونے کے بعد فریقین مذاکرات کریں اور متفقہ طور پر ایک حکومت قائم کی جائے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے یمن مسئلہ پر دوسری بار قرارداد منظور کی ہے، جس میں حوثی باغیوں کو اسلحہ کی فراہمی پر پابندی کے ساتھ ساتھ حوثی باغیوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فوری طور پر لڑائی بند کر دیں اور صنعا سمیت دیگر زیر قبضہ علاقوں سے نکل جائیں۔ سلامتی کونسل نے یمن ریپبلکن گارڈ کے سابق سربراہ احمد صالح اور حوثی قبائل کے رہنما بدالمالک حوثی پر بیرون ملک سفر کی پابندی لگاتے ہوئے ان کے بین الاقوامی اثاثوں کو بھی منجمد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے پہلے صالح کے والد اور سابق صدر علی عبداللہ صالح اور حوثی قبائل کے دو دیگر رہنماؤں عبدالخاق الحوثی اور یحیٰی الحکیم کو بھی سلامتی کونسل نے گذشتہ برس نومبر میں 'بلیک لسٹ' کر دیا تھا۔ ایران، حوثی باغی، اور یمن کی عوامی انقلابی تحریک انصاراللہ نے خلیج فارس تعاون کونسل کی مجوزہ قرارداد کی حمایت پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو علیحدہ علیحدہ ہدف تنقید بنایا ہے۔ انصار اللہ نے اس قرارداد کو ظالمانہ قرار دیا ہے۔ اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں ایک پریس کانفرنس میں ایرانی وزیر خارجہ جواد ظریف نے میڈیا کو بتایا کہ انھوں نے یمن میں امن کے لیے منصوبہ اقوام متحدہ میں جمع کروا دیا ہے اور امید ہے کہ تمام فریق اس پر آمادہ ہو جائیں گے۔ جواد ظریف کا کہنا تھا کہ یمن میں امن مذاکرات کسی تیسرے ملک کی ثالثی میں کروائے جائیں۔ سلامتی

کونسل کی حالیہ قرارداد جو چودہ ارکان کی حمایت سے منظور ہوئی ہے، اس میں روس نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ روس کے نمائندے ویتیلے چورکن کا کہنا ہے کہ قرار داد کو پیش کرنے والوں نے روس کی اس تجویز کو قرار داد میں شامل کرنے سے انکار کر دیا جس میں تنازعے میں ملوث تمام فریقوں پر جنگ بندی کرنے اور مذاکرات کے ذریعے تنازعے کا حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ روس نے اس سے قبل بھی اپنیقرارداد میں مطالبہ کیا تھا کہ سعودی عرب انسانی ہمدردی کی بنیاد پر یمن میں اپنی کارروائیاں عارضی طور پر بند کر دے اور کسی ایک نہیں بلکہ جنگ میں شامل دونوں فریقوں پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ یمن کے سابق صدر عبداللہ صالح اور حوثی باغیوں کے متعدد رہنماؤں پر گذشتہ سال نومبر میں بھی اسی قسم کی پابندیاں لگائی گئیں تھیں، جو بے نتیجہ رہی۔ حالیہ قرارداد یمن میں سعودی عرب اور اس کے حامی خلیجی ممالک کی بمباری کے بعد پہلی قرارداد ہے۔ گذشتہ دنوں روس کی درخواست پر یمن مسلئے پر اقوامِ متحدہ کا اجلاس بھی بلوایا گیا تھا تاہم وہ بے نتیجہ ختم ہوگیا تھا۔ سلامتی کونسل کی حالیہ قرارداد سے سعودی عرب، اور اس کے دس اتحادی ممالک جو اس جنگ میں شامل ہیں۔ انھیں اس مداخلت کا قانونی جواز مل گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ حوثی باغیوں نے ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ عدن میں باغیوں اور حکومت کے حامیوں کے درمیان دست بدست لڑائی جاری ہے۔ اقوامِ متحدہ کے اندازوں کے مطابق اب تک اس جنگ میں 600 سے زائد افراد ہلاک ہو چکے

ہیں، جن کی اکثریت عام شہری ہیں۔ بمباری سے عام شہریوں کی ہلاکتیں زیادہ ہیں، ادویات اور خوراک کی کمی کی بھی اطلاعات ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال یونیسف' کا کہنا ہے کہ یمن کے بحران کی وجہ سے تقریباً 100,000 افراد بے گھر ہو گئے ہیں جبکہ بچوں کو ہلاکتوں، معذوری اور بیماریوں سے خطرے کا بھی سامنا ہے۔ بچوں کی صحت، تعلیم کے مسائل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یونیسف نے بین الاقوامی انسانی ہمدردی کے قوانین کے تحت بچوں اور ان کے خاندانوں کے تحفظ کی طرف خصوصی توجہ کا مطالبہ کیا ہے۔ ریڈ کراس کی ضروری امداد کی ترسیل کو بھی تاخیر کا سامنا ہے۔ شام، عراق اور لیبیا کی طرح یمن طویل خانہ جنگی کے سائے بڑھ رہے ہیں۔ آئیندہ دنوں میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ پاکستان کی پارلیمان کی قرارداد کے برخلاف سعودی حکومت، فوجی مدد کے لئے پاکستان پر اپنا مزید دباؤ بڑھائے۔ ایران کے ساتھ بات چیت میں پاکستان اور ترکی کی حکومتیں سفارتی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتی ہے لیکن سعودی عرب کے بغیر مذکرات کی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی۔

یمن پر سعودی فضائی حملے بند، اب آپریشن کا دوسرا مرحلہ امید کی تجدید شروع ہوگا

امن کے لئے جنگجو یمنی کو ایک میز پر لانا ہوگا۔ اور انھیں اپنے معاملات خود طے کرنے کا موقع دینا ہوگا۔

یمن کے شہریوں نے بدھ کی رات اس وقت سکھ کا سانس لیا جب ان اطلاعات کی باقاعدہ تصدیق ہو گئی کہ سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں نے یمن میں ہونے والا ،، فیصلہ کن طوفان،، نامی آپریشن ختم دیا ہے، چار ہفتے سے جاری اس فضائی آپریشن نے یمن کے باشندوں کی نیند اڑا دی تھی، سارے ایر پورٹ بند تھے، خوراک کی قلت کے آثار پیدا ہو چکے تھے، اور عملا پورا ملک بند تھا۔ لوگ گھروں میں محصور تھے۔ دو کروڑ بیس لاکھ آبادی کے اس ملک میں خوف کے سائے گہرے تھے۔ ان فضائی حملوں میں سو سے زائد افراد ہلاک ہوئے ہیں، جبکہ زخمیوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ سعودی عرب کی جانب سے یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف فوجی آپریشن ختم کرنے کے اعلان کے فورا بعد ہی ایران نے لڑائی سے متاثرہ افراد کو فوری امداد فراہم کرنے، اور نئی حکومت کے قیام کے لیئے مذاکرات پر زور دینا شروع کردیا ہے۔ ایرانی وزیر خارجہ جواد ظریف نے سعودی عرب اور اتحادی ممالک کے فضائی حملے بند کرنے کے فیصلے کو ’مثبت‘ قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری جانب سعودی عرب کی جانب سے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ فضائی حملوں کی بندش کے

بعد اب باغیوں کے خلاف آپریشن کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا، جسے ،، امید کی تجدید ،، کا نام دیا گیا ہے۔ اس دوسرے مرحلے میں حوثی باغیوں کو کاروائی سے روکا جائے گا، اور ان سے ہتھیار ڈالنے کو کہا جائے گا۔ سعودی عرب کی جانب سے بمباری بند کرنے کے اعلان سے پہلے خلیج کی صورتحال خاصی کشیدہ تھی، ایک طرف ایران کی اسلحے سے لیس کشتیاں یمن کی جانب جارہی تھیں تو دوسری جانب امریکی بحری بیڑہ بھی حرکت میں آگیا تھا۔ اس سے قبل ایران کی بری افوج کے سربارہ بریگیڈیر احمد رضا بوردستان نے ایک ٹی وی ٹاک میں دھمکی دی تھی کہ اگر سعودی عرب نے یمن میں بمباری نہ روکی تو ایران سعودی عرب کے خلاف فوجی کاروائی سے گریز نہیں کرے گا۔ سعودی عرب ایران پر حوثی باغیوں کی مدد کرنے کا الزام لگاتا رہا ہے، جبکہ تہران ان الزامات کی تردید کرتا ہے۔ یمن میں اس وقت خانہ جنگی کی سی کیفیت ہے، اس وقت جاری لڑائی میں شیعہ حوثی باغیوں، سنی قبائل، سعودی عرب، ایران، خلیجی ممالک، القاعدہ، دولتِ اسلامیہ سب شامل ہیں۔ مفادات کی اس جنگ نے ملک کی صورتحال کو انتہائی سنگین کردیا ہے ۔حالات اتنے خراب ہوگئے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ نے ملک میں اپنے سفارت خانے بند کردیے ہیں جبکہ خلیجی ممالک نے اپنے سفارت خانے جنوبی شہر عدن منتقل کردیے ہیں۔ یمن کی اہمیت یہ ہے کہ بحیرہ احمر کی آبنائے باب المندب جہاں سے سالانہ 20 ہزار بحری جہاز گزرتے ہیں کے داخلے کا راستہ عدن سے کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ حالیہ فوجی آپریشن کا بنیادی مقصد اقوام متحدہ کی ثالثی میں طے

پائے سمجھوتے پر عمل درآمد کرانا ہے۔ جس سے باغیوں نے خود اتفاق کیا تھا اور دستخط کیے تھے لیکن بعد میں انھوں نے بغاوت برپا کردی تھی۔ سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک یہ نہیں چاہتے ہیں کہ یمن میں زمینی لڑائی ہو۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یمن میں جنگ لڑنا مہنگا اور پیچیدہ عمل ہے۔ سعودی عرب یمن میں ایران کو ایک فریق کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتا ہے، اس لئے وہ ایران کی جانب سے مذاکراتی عمل کا بھی مخالف ہے۔ سعودی عرب کا خیال ہے کہ ایران کی جانب سے حوثیوں کی امداد کا بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ یمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک موثر اور فعال شراکت دار بننا چاہتا ہے۔ سعودی عرب یمن کے ساتھ اپنی سرحد کو محفوظ بنانے کے لیے باڑ لگا رہا ہے اور اس کے ساتھ بحیرہ احمر کی بندرگاہ جزان میں واقع اپنے بحری اڈے کو بھی مضبوط بنا رہا ہے۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ سعودی عرب کی فوجی تیاریوں اور سفارتی بھاگ دوڑ سے لگتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں آبنائے باب المندب پر حوثیوں کا قبضہ ہونے سے روکنا چاہتا ہے۔' یمن میں بیرونی مداخلت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ساٹھ کی دہائی کی خانہ جنگی میں مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے جمہوریت پسندوں کی حمایت میں اپنی فضائیہ بھیجی تھی جس نے بادشاہت کے حامیوں پر کیمائی بم گرائے تھے۔ سنہ 1967 تک عدن اور اس سے ملحقہ صوبوں کا انتظام برطانیہ کے پاس تھا۔ جنوبی یمن پر روس کے حمایت یافتہ کمیونسٹوں کی حکومت تھی اور روس کا وہاں فوجی اڈا بھی تھا۔ سنہ 1994 کی شمالی اور جنوبی یمن کی

خانہ جنگی میں سعودی عرب نے شمالی یمن کا ساتھ دیا تھا۔ گزشتہ 20 برسوں سے امریکی فوجی انسداد دہشت گردی میں مدد دینے کے بہانے یہاں موجود رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حقیقی معنوں میں اس جنگ کا حل تلاش کرنا ہے تو تمام جنگجو یمنی کو ایک میز پر لانا ہوگا۔ اور انھیں اپنے معاملات خود طے کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

مولانا ہزاروی کے جنات، اور ایوب خان کے فرشتہ ہونے کا ذکر

انور سعید صدیقی کی کتاب پورا ماجرا میں مولانا ہزاروی کے جنات، اور ایوب خان کے فرشتہ ہونے کا ذکر

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے احمد سعید اور انور سعید دونوں ہمارے سنئیر رہے ہیں۔احمد سعید قریشی نے اخباری صحافت اور انور سعید صدیقی نے ریڈیائی صحافت میں نام پیدا کیا۔ دونوں صحافت کی دنیا کے درخشندہ ستارے، دونوں اپنے اپنے شعبے میں نامور، دونوں اسلام، پاکستان، تحریک اسلامی سے وابستہ۔ ہمارا دونوں سے تعارف طالب علمی کے دور میں ہوا۔ دونوں نے ہمیں ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح محبت دی۔ میں نے دونوں کے سایہ شفقت میں کام کیا، احمد سعید قریشی جسارت سے وابستہ ہوئے، اور جسارت ہی پر نثار ہوگئے۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔
انور سعید صدیقی نے اخبارات سے صحافت کی ابتدا کی، مشرق، روزنامہ جنگ، روزنامہ جسارت، روزنامہ آغاز، روزنامہ انجام اور روزنامہ حریت سے ریڈیو پہنچے اور پھر کنٹرولر نیوز سے رٹائر ہوئے۔انھوں نے درس وتدریس بھی کی جناح یونیورسٹی میں صحافت پڑھائی۔ مستقبل کے صحافیوں کو ریڈیو اور ٹیلی وژن سکھانے کے لئے ایک انگریزی کی کتاب نیوز آن ریڈیو اینڈ ٹیلی وژن بھی لکھی۔ حکیم محمد سعید شہید نے ان سے بچوں کی

کہانیاں بھی لکھوائی، جو قراقرم کی وادی اور گلاب ڈھیری کا نیلم کے نام سے شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں ہم نے کراچی کے کتب میلے میں ہمدرد کے اسٹال سے خریدی، کیونکہ کوئی اور تو ان پرانے ایڈیشن کا خریدار نہ تھا۔ انور سعید صدیقی ہی اپنے خاندان کے بچوں کو تحفے میں دینے کے لئے اپنی کتابیں خرید لیتے ہیں۔ انور سعید صدیقی بنیادی طور پر رپورٹر ہیں، وہ کہیں بھی ہوں، خبر کے بنیادی جز کب کہاں کیوں کیسے کے کھوج میں رہتے ہیں۔ ان کی یہ عادت اب اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ روز مرہ کی باتوں میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کے ساتھ گفتگو شروع ہو تو ایک کے ایک بعد قصہ ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہے، یوں بھی ریڈیو کے لئے خبر نگاری کرتے ہوئے، انھیں نہ صرف ارباب اقتدار کے ساتھ مختلیف ملکوں کے دورے کا موقع ملا، بلکہ حکمرانوں اور صحافیوں کو بھی بہت قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔ آج کل کی صحافت، زبان، تحریر، سرخیاں، ٹیکر اور سب کچھ یہ دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں کڑھتے بھی ہیں۔ جہاں تک یہ اداروں میں رہے اصلاح کی کوشش بھی کی، لیکن جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہو۔ وہاں کہاں تک اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالی کی جانب سے ان پر خصوصی انعام واکرام کی بارش بھی ہے، اس سال وہ حج کی سعادت کے لئے جارہے ہیں۔ لیکن سابق صدر مشرف کے دورے سعودی عرب کے دوران خانہ کعبہ میں ان کی حاضری انعام الہی ہے۔ حرم میں بڑے بڑے وزراء حکام اور اہلکار کھڑے

تھے، خانہ کعبہ کا دروازہ کھلا، اور سعودی اہلکار نے انھیں دور سے بلا کر انھیں اس باب سے خانہ کعبہ کے اندر داخل کردیا، جہاں سربراہاں کے علاوہ صرف چند نفوس تھے۔ ان میں انور سعید صدیقی بھی شامل تھے۔ سربراہاں کے ساتھ دوروں کی ایسی بہت سے کہانیاں ان کی زنبیل میں موجود ہیں ان کا صحافتی سفر روزنامہ مشرق سے شروع ہوا، جو اپنے زمانہ کا کثیر اشاعت اور چمک دھمک والا اخبار تھا۔ مختلف اخبارات، ٹیلی ویژن چینل اور ریڈیو میں انہوں نے صحافتی ذمہ داریاں نبھائیں ہیں ان میں احساس ذمہ داری بہت زیادہ رہا ہے۔ ان کے دور میں ریڈیو کی خبر میں کوئی غلطی چلی جائے اور انور سعید صدیقی صاحب کا فون نہ آئے یہ ممکن نہیں تھا۔

بہ طور کنٹرولر نیوز ریڈیو پاکستان سے ریٹائرمنٹ کے بعد انور سعید صدیقی نے اخبارات میں کالم نویسی شروع کی اور یہ کتاب انہی کالموں اور چند مطبوعہ مضامین پر مشتمل ہے۔ حالاتِ حاضرہ اور مختلف مسائل کی نشان دہی کرتے یہ کالمز مصنف کی زندگی کے مختلف ادوار کے تجربات اور گہرے مشاہدے کا نچوڑ ہے۔ پاکستان میں برائی اور لاقانونیت کس قدر منظم ہو گئی ہے، اس کا اشارہ انھوں نے 2010 کے کالم میں خطرناک رجحان میں کیا ہے، جس میں کسٹم حکام کی جانب سے کسٹم کے بین الاقوامی دن کے موقع پر منشیات اور شراب کو ضائع کرنے کی تقریب پر تین سو افراد کا منظم حملہ اور منشیات کو لے ،جانے کا واقعہ شامل ہے

منشیات سے بڑھ کر اب ڈاکوں اور قاتلوں کے منظم گروہ بن گئے ہیں، جو گروہ کی شکل میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کالموں سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولانا ہزاروی کے پاس جنات آتے تھے، ان میں بارہ سو سال پرانے جنات بھی شامل تھے۔ ان کا وہ کالم بھی مزیدار ہے، جو ایوب خان فرشتہ ہوگئے کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ان کے مضامین تاریخ کو سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ کتاب میں شام مضامین پرانے ہیں لیکن ان کو پڑھ کو اندازہ ہوتا ہے کچھ بھی نہیں بدلا، سب کچھ اسی طرح جاری ہے۔ اپنے اس تجربے اور مشاہدے کے ساتھ انور سعید اب پھر میدانِ صحافت میں اپنے وجود کا احساس دلانے اترے تو ہیں۔ لیکن وہ ابھی ساحل پر ہیں۔ اب انھیں ساحل سے نظارہ کرنے کے بجائے اس دریا میں اترنا چاہیئے۔ بقول مقصود یوسفی ''ایک مخصوص مدت پر ریٹائرمنٹ کی رسمی کارروائی تک صحافی کے مشاہدات اور تجربات اس قدر پختہ ہو جاتے ہیں کہ ان سے استفادہ نہ کرنا زیادتی کے زمرے میں آجاتا ہے۔ انور سعید لکھنے کے ساتھ ساتھ کالم بول بھی سکتے ہیں۔ ریڈیو تو پھر ان ہی کا میدان ہے۔ اب تو ان کے پاس لکھنے کا وقت بھی ہے اور عملی زندگی کے بھرپور تجربات اور مشاہدات بھی، ان کے کالم سرسری اور عام معلومات پر نہیں بلکہ ریسرچ اور تصدیق اور تحقیق کے مراحل سے گذر کر تحریری صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے مضامین اور کالموں میں نہ صرف معلومات ہیں بلکہ بہت سے سوالوں کے جوابات بھی ملتے ہیں۔''

انور سعید صدیقی کی کتاب پورا ماجرا کی جمعیت الفلاح میں تقریب رونمائی کے موقع پر)
(پڑھا گیا مضمون

چاچا پنچو

چاچا پنچو ، جگت چاچا تھے ، کبیر شاہ بابا کے کچے مزار اور محلے کے واحد میونسپلٹی کے نلکے کے پاس ان کی کھاٹ بچھی رہتی ، شام کو سارے بچے اور کتے کے تین چار پلے ، چاچا پنچو کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھتے ، محلے میں سبیل لگانی ہو ، تعزیئے کی تیاری ہو ، قوالی کی محفل ہو یا شاہ صاحب کے عرس کی تیاری سب کچھ چاچا پنچو کی زیر صدارت اجلاس میں طے ہوتا ، چاچا پنچو کون تھے ، کہاں سے آئے تھے ، ان کا خاندان کون تھا ، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا ، ہم نے تو انھیں سدا محلے میں اس کھٹیا پر ہی پڑے دیکھا ، اچھے زمانے تھے ، لوگ گھروں سے کھانا بھیج دیتے ، چائے وہ ایک کیتیلی پر اینٹوں کے چولہے پر پکا لیتے ، بچوں سے چاچا کی یاری تھی ، یوں بھی مغرب کے بعد کوئی اور مصروفیت تو ہوتی نہیں تھی ، اس لئے محلے کے بچے ادھر ہی ڈیرہ ڈالے رہتے۔ ایک دن صبح اٹھے ، تو دیکھا کہ چاچا پنچو کھلی آنکھوں خاموشی سے سو رہے ہیں ، اور ان کی کھٹیا کے پاس بیٹھے کتے کے پلے منہ اٹھا اٹھا کر رو رہے ہیں۔ چاچا پنچو چلے گئے ، ان کے ساتھ ہی محلے سے ان کی کھٹیا اور کتے کے پلے بھی غائب ہو گئے۔

پولا جی

فربا جسم پائجاما، آدھی آستین کا بنیان اور سر پر سفید ٹوپی، تھوڑی پر چند سفید بال پھولے گال اور اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، یہ تھے پولا جی، دکان میں چند شیشے کی برنیوں، میں کھٹی میٹھی گولیاں، تل کے لڈو، کیھیل کے لڈو، میٹھے چنے، پاپڑ، اور اس جیسی چند اور چیزیں لئے پولا جی صبح سویرے ہی دکان کھول لیتے، اسکول آتے اور جاتے پولا جی سے میٹھی گولیاں، اور ایک دو پیسے کی چیز خریدنے کا معمول تھا، پولا جی بچوں سے محبت سے پیش آتے، نائی کے پیڑ سے آگے اب بھی ان کی دکان یاد آتی ہے۔

مائی آچھیں

آنکھیں تو جانے کب سے چھن گئی تھیں، مائی آچھیں مسجد کے زیر سایہ کھڑی بیٹھی صدا لگاتی رہتی، ایک کٹورا، ایک ڈنڈا لیئے سر پر دوپٹہ، میلے کپڑے، اسکول سے آتے اور جاتے ہم مائی کو چھیڑتے، اس سے گالیاں سنتے، ایک دن چند لڑکوں نے گتے کے ڈبے میں گائے کا تازہ گرم گرم گوبر بھر کر مائی کے سامنے رکھ دیا اور کہا حلوہ لائے ہیں، مائی نے گوبر میں انگلیاں ڈالیں، ناک میں گوبر کی بو محسوس ہوئی تو گوبر کا گتہ پھینک خوب گالیاں دیں۔ پھر پھوٹ پھوٹ رونے لگی، مائی کی یہ تصویر اب تک آنکھوں میں گھومتی ہے، لیکن اس دن کے بعد سے مائی تو تنگ کرنا چھوڑ دیا۔

ہیڈ ماسٹر سید فیاض علی

اونچا قد، سفید پائجاما، شیر وانی، اور سر پر رنگین صافہ سرمہ بھری آنکھیں، سفید نورانی داڑھی، یہ تھے ہمارے پرائمری اسکول رئیس غلام محمد بھرگڑی اسکول سرے گھاٹ کے ہیڈ ماسٹر سید فیاض علی صبح اسمبلی میں تلاوت کلام پاک ہوتی، قومی ترانہ پاک سرزمیں شاد باد چیخ چیخ کرپڑھتے، کلاس میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کو دھکے دیتے، لیکن ماسٹر فیاض علی چھڑی سے نہ مارتے، دینیات کا پریڈ ہوتا، اور ماسٹر فیاض علی کی کلاس تو وہ پڑھاتے پڑھاتے، قیامت اور حساب کتاب کا ذکر چھیڑ دیتے، پھر فرشتوں کی پوچھ گچھ اور حساب کتاب اور عذاب کا وہ نقشہ کھینچتے کہ خود بھی روتے، کلاس کے سارے بچے بھی روتے، ان کی داڑھی خشیت الٰہی سے آنسو سے تر ہو جاتی۔

چند ایام کابل میں

”تشکر کابل“

(2008ء کا دورہ کابل)

تحریر: رئیس اختر

جب آپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فضا سے کابل شہر پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو خشک پہاڑوں کے درمیان یہ شہر ایک عجیب اور بے رونق شہر کا منظر پیش کرتا ہے۔ اور ذہن ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ نجانے وہاں کیا حالات ہوں۔ لیکن جب آپ کابل کے شہریوں سے ملتے ہیں، وہاں گھومتے پھرتے ہیں تو آپ کا اندازہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ کابل جو کہ 30 سال سے جنگ اور خانہ جنگی کا شکار ہے۔ ایک ایسے نئے شہر کے خدوخال پیش کرتا ہے جو آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں اس دورۂ کابل کا موقع جرمنی کے ایک غیر سرکاری ادارے Friedrich Ebert Stiflung نے فراہم کیا۔ 13 پاکستانی نوجوانوں پر مبنی وفد 20 اکتوبر 2008 کو FES افغانستان کی دعوت پر کابل روانہ ہوا۔ دورے کا مقصد افغانی اور پاکستانی نوجوانوں کو ایک دوسرے سے ملانا اور دونوں ممالک کو درپیش مسائل اور معاملات پر غور و فکر کرنے کے علاوہ باہمی تعلقات کو مضبوط کرنا تھا۔ پاکستانی وفد کی میزبان FES افغانستان کی کنٹری ڈائریکٹر آرزو کولاخ اور ان

کے معاون سلیمان قیامت نے میزبانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور پاکستانی وفد کا بہت خیال رکھا۔ کابل میں ہمارا قیام شہر نو کے علاقہ میں واقع سینٹرل ہوٹل میں تھا۔ شہر نو کا علاقہ ظاہر شاہ کے دور میں آباد ہوا۔ جو ایک جدید اور گنجان علاقہ تھا مگر اب صورتِ حال مختلف ہے۔ کابل شہر کی آبادی تقریباً پچاس لاکھ ہے، وہاں کے شہریوں کی اکثریت فارسی بولتی اور سمجھتی ہے۔ کابل کے شہری نسلاً تو پختون ہیں لیکن وہ خود کو کابلی کہلانا زیادہ پسند کرتےہیں۔ کابل شہر میں چند سنیما گھر بھی ہیں جن میں زیادہ تر بھارتی اور ایرانی فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔ یہاں لسانی کشیدگی بدستور موجود ہے اور فارسی بولنے والے قندھار اور جلال آباد جانے سے کتراتے ہیں اور پختون مزار شریف جانے سے۔ اس صورتِ حال کے باوجود تمام افغانی افغانستان کو متحد اور طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور باہمی اختلافات کے نقصانات کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔

کابل شہر میں قہوہ خانے، شراب خانے اور نائٹ کلب بھی موجود ہیں۔ کابل میں ایک جبکہ کابل سے باہر دو متوازی حکومتیں ہیں ایک حامد کرزئی اور دوسری جنگجو سرداروں اور طالبان کی۔ عوام دونوں کے ہی احکامات کو مانتے ہیں۔ آج کی افغان سرکار میں پاکستانی تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل اعلیٰ تعلیم یافتہ افغان نوجوان اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جو افغان حکومت میں اپنا اثرو رسوخ رکھتے ہیں اور پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت اور عقیدت بھی۔ مگر کیا کیا

جائے کہ ہم نے تو خود اپنے آپ سے محبت کرنا چھوڑ دی ہے تو پھر دوسرے ہمارے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ افغانستان آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ افغانستان میں سول سوسائٹی زیادہ اثر نہیں رکھتی۔ مگر کابل آکر میرا اندازہ غلط نکلا۔ یہاں کی سوسائٹی کافی مضبوط ہو رہی ہے اور اپنا کردار موثر انداز میں ادا کر رہی ہے۔ یہ بات میرے لئے حیرت کا باعث تھی کہ صرف کابل شہر میں 100 سے زائد این جی اوز، خواتین کے حقوق کے لئے کام کر رہی ہیں۔ افغانستان کے لوگ پاکستان کے لوگوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے جنگ کے دوران افغانیوں کو پناہ دی مگر افغان پاکستانی حکومت اور اداروں سے خفا ہیں اور ان کو اپنی بعض مشکلات کا باعث سمجھتے ہیں۔ اپنے اس وزٹ میں مجھے مختلف شعبوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ جن میں جرنلسٹ، ممبر آف پارلیمنٹ، سول سوسائٹی کے افراد اور عام افغانی بالخصوص نوجوان، سب کو پاکستان سے مخلص اور محبت کرنے والا پایا۔ کابل آکر اس خیال کی بھی تردید ہوئی کہ کابل میں لوگ پاکستانیوں کو دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کیبرعکس کابل کے لوگ پاکستانیوں کو اپنا بھائی کہتے ہیں اور پاکستان کے خراب حالات میں افغانستان پر اُس کے اثرات کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں اور موجودہ صورت حال پر کابلی لوگوں میں کافی تشویش میں محسوس کی۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان وفود کا تبادلہ جاری رہنا چاہئے۔ اس سے رابطے کا جو فقدان ہے اُس میں کمی واقع ہوگی۔ مختصراً یہ کہ مستحکم اور پُرامن حالات

پاکستان و افغانستان دونوں ممالک کے مفاد میں ہیں۔

کابل شہر میں فارسی و پشتو کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اُردو ہے۔ کابل شہر جدید عمارات اور شاپنگ سینٹرز کے ذریعے اپنے تیس سالہ جنگی دور کے اثرات کو زائل کر رہا ہے۔ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ بھارتی چینلوں کے ڈرامے وہاں مقبول ہیں جنہیں فارسی زبان میں ڈبنگ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور اسٹار پلس بھی فارسی زبان میں ہی نشر کیا جاتا ہے۔ کابل شہر میں بھارت کا تعمیر کے تعمیر کردہ اندرا گاندھی اسپتال کا شمار شہر کے بڑے اور اچھے اسپتالوں میں ہوتا ہے۔ کابل کی سڑکوں پر ٹاٹا کمپنی کی بھارتی اور پاکستان کی جانب سے دی گئیں بسیں بھی سڑکوں پر باآسانی دکھائی دیتی ہیں۔ جب ہم کابل اور دہلی کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں تو افغان نوجوان اُس سے خائف ہوتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ افغانستان ایک آزاد اور خودمختار ملک ہے۔ جس طرح پاکستان سے ہمارے تعلقات اہم ہیں اسی طرح بھارت سے بھی ہیں۔ پاکستان ہمیں Dictation نہ دے اور افغانیوں کی ایک کثیر تعداد انڈیا سے دوستانہ تعلقات کی خواہش مند ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انڈیا افغانستان میں اپنے اثر و رسوخ کے ساتھ موجود ہے اور ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم افغانستان اور انڈیا کے بڑھتے ہوئے تعلقات کو نشانہ بنانے کے بجائے افغانستان سے اپنے تعلقات بہتر بنانے پر توجہ دیں۔

افغانستان میں قیام کے دوران پاکستانی وفد کو کابل کے نوجوان ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی تنظیم اور پاکستانی نوجوانوں کا کردار پاکستان اور افغانستان کی موجودہ صورت حال پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر پاکستانی وفد کے میزبان سلیمان قیامت بھی موجود تھے۔ کاشانہ نویس گان کے علاوہ دیگر گروپس، آرگنائزیشن، سرکاری اداروں، اخبارات جن میں کوآپریشن فار پیس اینڈ یونٹی، یوتھ ایمپاورمنٹ پروگرام، انجمن نوجوانانِ ولایت کابل، افغانستان سینٹر فار ریسرچ اینڈ پالیسی اسٹڈیز، انٹرنیوز نیٹ ورک افغانستان، ریجنل اسٹڈیز سینٹر آف افغانستان۔ افغان سول سوسائٹی فور ACSF، نے پاکستانی وفد کے اعزاز میں پروگرام ترتیب دیئے۔ ان تقاریب میں پاکستانی نوجوانوں کو افغانی نوجوانوں اور اداروں سے کھل کر بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ منسٹری آف فارن چیف اسٹاف فارن اور کلچر افیئرز، ڈپٹی منسٹر یوتھ افیئرز محمد ظاہر غوث اور کابل سے رکن پارلیمنٹ جمیل کرزئی جو نیشنل یوتھ سولیڈریٹی پارٹی آف افغانستان کے سربراہ ہیں نے پاکستانی وفد کے اعزاز میں مختلف تقاریب منعقد کی۔ جمیل کرزئی آٹھ سال کا طویل عرصہ کوئٹہ پاکستان میں گزار چکے ہیں اور حامد کرزئی کے کرزئی کے کزن ہیں۔ دوران گفتگو جمیل کرزئی نے پاکستان حالات پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ افغانستان کبھی بھی بلوچستان کو پاکستان سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ پاکستان سے علیحدگی کے بعد بلوچستان لسانی خانہ جنگی کا شکار ہو سکتا ہے جس سے افغانستان مزید

متاثر ہوگا۔ اس طرح کے ملتے جلتے خیالات کا اظہار مختلف محفلوں میں افغان صحافیوں، ادیبوں، سول سوسائٹی کے لوگوں اور دیگر شعبہ جات کے لوگوں نے کیا۔ شمالی اتحاد کے شہید سربراہ احمد شاہ مسعود کے دستِ راست اور ہفت روزہ کابل کے چیف ایڈیٹر فہیم دشتی مجھ سے ملاقات کے لئے ہوٹل تشریف لائے۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ میری خواہش ملاقات پر وہ خود تشریف لائے۔ فہیم دشتی کی مادری زبان فارسی ہے اور سیاسی وابستگی احمد شاہ مسعود سے رہی ہے۔ دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے والے فہیم دشتی سے کھل کر گفتگو ہوئی۔ فہیم دشتی نے شکوہ کیا کہ پاکستان نے ہمیشہ فارسی بولنے والوں کو نظر انداز کیا۔ اس حقیقت باوجود کہ افغنستان کی 50 فیصد سے زیادہ آبادی کی مادری زبان پشتو نہیں ہے اور کابل شہر کی آدھی سے زیادہ آبادی غیر پختونوں پر مشتمل ہے۔ فہیم دشتی نے کہا کہ پاکستانی اداروں نے صرف لسانی بنیاد پر پختون سیاسی اور مذہبی گروپوں کی حمایت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ شمالی اتحاد پاکستان سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کا خواہاں ہے مگر اس کے لئے پاکستان بھی ہاتھ بڑھائے۔ انہوں نے پاکستانی عوام سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا مگر اس کے ساتھ ہی پاکستانی حکومت اور اداروں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ فہیم دشتی نے پاکستان اور بالخصوص کراچی کا دورہ کرنے اور پاکستانی سول سوسائٹی، صحافیوں، ادیبوں سے ملنے اور شمالی اتحاد اور فارسی بولنے والے لوگوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف شعبۂ زندگی سے

تعلق رکھنے والے افراد کو چاہیے کہ وہ باہمی روابط کو بڑھائیں تاکہ آپس میں پید

اہونے والی غلط فہمیاں اور دوریاں ختم ہوں۔

صحن چمن کی باتیں - لفظوں کی حرمت

کراچی کی شدید گرمی اور حبس نے برا حال کیا ہوا تھا، روزہ میں دل تو یہی چاہتا تھا کہ قریب کی مسجد میں جمعہ کی ادائیگی کر لوں، وہاں اے سی بھی لگے تھے۔ پر دل چاہتا تھا کہ کسی بڑی مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کی جائے، سو اس جامع مسجد میں پہنچا وضو سے قبل طہارت خانے گیا تو سفید خوبصورت ٹائیل پر سیاہ مارکر سے لکھے الفاظ نے دل بوجھل کر دیا، اتنی بڑی جامع مسجد، عالم میں اس کا نام لیکن تدریس میں ،، لفظوں کی حرمت ،، کا درس شائد ہی دیا جاتا ہو۔ تو کیا یہاں کے علماء اور اساتذہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان کے طہارت خانوں میں دیواروں پر کیا لکھا جا رہا ہے۔ کیا انسان سازی کرنے والے ذہن سازی کے ہنر سے عاری ہیں۔ لفظ ہی تو سب کچھ ہیں، یہ آنکھوں کو بھاتے ہیں تو سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ لفظ خوشیوں بھرے ہوں تو اس کا احساس روح میں محسوس ہوتا ہے۔ کسی کا ایک پیار بھرا لفظ کسی کے پورے دن کو خوش گوار بنا دیتی ہے اور کبھی آپ کا ایک لفظ کسی کو گھنٹوں رلا دیتا ہے' لفظوں میں جادو ہے۔ ان کا سحر قلب اور ذہن دونوں پر اثر کرتا ہے اور جب لفظ تحریر کی صورت میں ہو تو ان کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ جب تک لفظ لکھا رہے گا ہر پڑھنے والا اس کے اثرات لیتا رہے گا اچھے یا برے الفاظ ہمارے رویئے اور سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ بقول سجاد

باقر رضوی،، تخلیقی معاشرہ بے جان لفظوں کی آماجگاہ نہیں ہوتا۔ ایسے معاشرے میں اقدار کے متعلق تقریریں نہیں ہوتیں، نعرے بلند نہیں کئے جاتے۔ صداقت، نیکی اور حسن کی اقدار نعروں کی صورت میں بلند بانگ لفظوں میں ادا ہونے کے بجائے انسانی عمل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہی وہ صورت ہے جس میں معنی خود لفظ بن جاتے ہیں اور ایسے ہی لفظوں کو ہم 'زندہ لفظ' کہتے ہیں۔،، قول و عمل کا تضاد لفظوں کو بے روح اور عمل کو بے جہت بنادیتا ہے۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شے کی حرمت باقی نہیں رہتی۔،، لفظوں کی حرمت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے بعد بھی ہمارے لکھے لفظ زندہ رہتے ہیں۔ چین والے لفظوں کا عجب طور احترام کرتے ہیں۔ چین کے قدیم شہروں میں عجیب طرز کی لائیبریری قائم تھیں۔۔برطانوی ادیب رچرڈ میک لکھتا ہے،، بعض گلیوں کے نکڑ پر۔بری بری ٹوکریاں دکھائی دیتی، جن میں پرانے چینی رسالے اور اخبارات پڑے ہوتے، بظاہر یہ ردی کی ٹوکریاں معلوم ہوتی، لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ لکھے اور چھپے ہوئے الفاظ کوڑے میں شامل ہوکر ضائع نہ ہوں، ان ٹوکریوں پر تحریر ہوتا،، چھپے ہوئے کاغذ پر رحم کریں، جیسے ہمارے یہاں،، مقدس آیات یا اوراق کا احترام کریں،، چین میں وہ لوگ بھی باعزت سمجھے جاتے جو ان چھپے اوراق کو ان ٹوکریں میں ڈالتے۔ یا ان میں سے جو تحریر اچھی لگتی اسے پڑھنے کے لئے گھر لے جاتے۔ میں نے اپنے بچپن میں لکھے ہوئے لفظ اور سڑک پر پڑے روٹی کے ٹکڑے کو لوگوں کو احترام سے اٹھا کر چومتے ہوئے اونچی جگہ پر رکھتے دیکھا ہے، وہ

نسل تعلیم یافتہ نہ تھی، لیکن لفظوں کا احترام اسے خوب آتا تھا۔ اب ہم تعلیم یافتہ ہو کر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں تو پھر معاشرے کے ناخواندہ افراد سے کیا امید رکھی جائے۔ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ درسگاہوں میں لکھے ایک نازیبا جملے نے کتنے خودکش پیدا کر دیئے۔ ان مدارس کے اساتذہ اپنے بچوں سے کیا کبھی اس بات کی توقع کریں گے کہ ان کے گھر کے باتھ روم میں بھی ایسے فقرے لکھے ہوں۔ کیا ان علماء کو اس بات کو کبھی موقع ملے گا کہ وہ ہفتے میں ایک بار کبھی ان بچوں کی کاپیوں یا باتھ روم کا جائزہ لیں جہاں لفظوں کی حرمت کو پائمال کیا جاتا ہے۔ مسجد میں دعا کے موقع پر عجیب سماں تھا، منبر سے دعاء کے لئے نکلنے والے الفاظ دلوں پر رقت طاری کیئے ہوئے تھے، اللہ کے حضور بلند ہونے والے ہر صدا سسکیوں، اور چیخوں میں ڈھل رہی تھی۔ یہی تو لفظ ہیں جیتے جاگتے جو روح و بدن میں اتر جاتے ہیں، تو پھر اپنے بچوں کو لفظوں کی حرمت کا درس کیوں نہیں دیتے۔ شائد لفظوں کی حرمت کا احساس ہماری زندگیوں کو بدل دے۔

ہماری ویب رائٹرز کلب کی جانب سے پروفیسر سحر انصاری کو ستارہ امتیاز دیئے جانے پر پروقار تقریب کا اہتمام

ہماری ویب کا شمار پاکستان کی ان بڑی ویب سائٹ میں ہوتا ہے، جو آج پوری دنیا میں نہ صرف اردو بلکہ اسلامی معلومات، تعلیمات ، خبروں ، فیچرز انٹرویوز، مضامین شاعری،اور دیگر موضوعات پر اطلاعات اور معلومات کی فراہمی میں اولیت رکھتی ہے۔ ہماری ویب کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اس نے اردو مضامین لکھنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے، بلکہ پندرہ ہزار سے زائد لکھنے والوں کا ایک پلیٹ فارم بھی مہیا کیا ہے، جس پر وہ آزادی اور آسانی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس ویب سائٹ پر اردو مضامین جو مختلیف موضوعات پر ہیں، ان کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار ہے، جس میں ہر روز اضافہ ہوتا جارہا ہے، اب اردو میں سرچ کرنے پر ہماری ویب کے مضامین کی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ ہماری ویب پر سالانہ دو کروڑ 48 لاکھ وزیٹرز وزٹ کرتے ہیں ۔یعنی روزانہ یہاں ستر ہزار کے لگ بھگ وزیٹرز ہیں۔ ہماری ویب نے پاکستان بھر کے نئے لکھنے والوں کے لیئے ہماری ویب رائیٹرز کلب کی داغ بیل بھی ڈالی ہے۔ جو تیزی سے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی، تربیت کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔ ہماری ویب نے لکھنے والوں کی ای بکس شائع کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے، اب تک اس طرح کی تیس ای بکس شائع ہوچکی ہیں۔ جو اردو کی دنیا میں ایک منفرد اور قابل قدر کارنامہ ہے۔

گزشتہ دنوں ہماری ویب نے ای بکس کے دوسرے مرحلے پر پندرہ مصنفین کی ای بکس کی رونمائی اور ملک کے معروف شاعر و ادیب جناب پروفیسر سحر انصاری کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں " ستارہ امتیاز " دیئے جانے پر ایک پروقار تقریب منعقد کی۔ جس میں لکھنے والوں کو شیلڈ اور ہماری ویب کے کارڈ بھی دیئے گئے۔ہماری ویب کے سی ای او اور ہماری ویب رائٹرز کلب کے چیئرمین ابرار احمد نے اس کا اہتمام کیا۔ہماری ویب رائٹرز کلب کے تاسیسی جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے میرے لئے یہ ایک اعزاز ہے۔ تقریب کا آغاز کلام پاک کی تلاوت سے ہوا۔ ہماری ویب کے کالم نگار ڈاکٹر شیخ ولی خان المظفر نے تلاوت کی اس موقع پر چیئرمین رائٹرز کلب ابرار احمد نے خطبہ استقبالیہ دیتے ہوئے اپنے خطاب میں کہا کہ ہماری ویب اپنے قیام کی ابتدا سے ہی اپنے معزز کالم نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف اقدامات کرتی آئی ہے۔ اور اسی سلسلے میں ہماری ویب کی جانب سے رواں سال کے آغاز میں آن لائن لکھنے والوں کا ایک فورم بھی تشکیل دیا گیا تھا جس کا نام " ہماری ویب رائٹرز کلب " رکھا گیا تھا۔ آج اس کی یہ دوسری تقریب ہے۔ابرار احمد نے تقریب میں شرکت کرنے والے کالم نگاروں اور مہمانِ خصوصی پروفیسر سحر انصاری صاحب کا شکریہ ادا کیا انھوں نے تقریب میں پروفیسر سحر انصاری جیسی علم و ادب سے تعلق رکھنے والی اعلیٰ شخصیت کی موجودگی کو ہماری ویب، ہماری ویب رائٹرز کلب اور ہماری ویب پر لکھنے والوں کے لیے قابلِ فخر اور انتہائی

اعزاز کی بات قرار دیا۔ ابرار احمد نے اس موقع پر جنوری 2016 میں ہماری ویب رائٹرز کلب کے الیکشن کے انعقاد کا بھی اعلان کیا۔ تقریب میں رائٹرز کلب کے صدر جناب ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی نے مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ انہوں نے شرکاء اور پروفیسر سحر انصاری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر سحر انصاری کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے علم وادب سے تعلق رکھنے والے بخوبی واقف ہیں۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے پروفیسر سحر انصاری کو ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے " ستارہ امتیاز " سے نوازا جانا نہ صرف پاکستان بلکہ ادبی حلقوں کے لیے بھی انتہائی اعزاز کی بات ہے۔ تقریب کے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری نے ہماری ویب کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے کی جانے والی کاوشوں کو خوب سراہا۔ پروفیسر سحر انصاری کا کہنا تھا کہ " ہماری ویب رائٹرز کلب حقیقی معنوں میں اردو کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے اور مجھے ابرار احمد جیسے نوجوانوں کو اردو کی خدمت کرنے والے اداروں سے وابستہ دیکھ کر بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے"۔

تقریب میں ہماری ویب رائٹرز کلب کی جانب سے پروفیسر سحر انصاری کو اعزازِ توصیفی کے طور پر شیلڈ پیش کی گئی۔ اس تقریب کا ایک اور شاندار مرحلہ ہماری ویب کی تخلیق کردہ " ای بک " کی رونمائی کا بھی تھا۔ اس موقع پر ہماری ویب کی جانب سے مزید 15 کالم نگاروں کی تیار کردہ " ای بک " کی رونمائی کی گئی۔ تقریب میں جن کالم نگاروں کی ای بک متعارف کروائی گئیں انہیں شیلڈ سے بھی نوازا

گیا جو کہ مہمانِ خصوصی پروفیسر سحر انصاری نے کالم نگاروں کو پیش کیں۔ جن کالم نگاروں کی ای بک شائع کی گئی ان میں، ڈاکٹر ظہور احمد دانش، سید انور محمود، ڈاکٹر شیخ ولی خان المظفر، محمد احمد ترازی، محمد انور، راشد اشرف، قادر خان، ثنا غوری، جاوید صدیقی، نغمہ حبیب پشاور، مسرت اللہ جان۔ پشاور، روشن خٹک پشاور، محمد شفیق احمد خان کوٹ ادو، ذوالفقار علی بخاری راولپنڈی، پروفیسر رفعت مظہر۔ لاہور شامل تھے۔ تقریب میں ایک اور انتہائی اہم مرحلہ رائٹرز کلب کے ممبران کو ان کے ممبر شپ کارڈ کا اجرا کا بھی تھا۔ تقریب میں ہماری ویب کی جانب سے چند ممبران کو ان کے کارڈ بھی پیش کیے گئے۔ تاہم یہ کارڈ کے اجرا کا پہلا مرحلہ تھا لیکن ہماری ویب جلد از جلد کارڈز کی تقسیم کے عمل کو مکمل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ تقریب میں شریک کالم نگاروں نے ہماری ویب کی اس تقریب کو بے انتہا سراہا اور اسے ہماری ویب رائٹرز کلب کا ایک حوصلہ افزا اقدام قرار دیا اور ساتھ ہی اپنے ہر قسم کے تعاون کا بھی بھرپور یقین دلوایا۔ تقریب میں نوجوان شاعر عثمان جامعی نے بھی شرکت کی۔ تقریب میں نظامت کے فرائض رائیٹرز کلب کے جنرل سیکریٹری عطا محمد تبسم نے انجام دیئے۔

نجکاری سے لاکھوں مزدور اور محنت کش بے روزگار ہوں گے

میاں نواز شریف جب بھی برسر اقتدار آتے ہیں، وہ ملک میں نجکاری کے عمل کو تیز کرتے ہیں اور جاتے جاتے ملک کے کچھ نہ کچھ ادارے اونے پونے بیچ کر اپنے ہمنوا ساتھیو کو بہت کچھ دے جاتے ہیں۔ اب بھی حکومت اس پروگرام پر تیزی سے عمل درآمد کرنے میں مصروف ہے۔ چیئرمین نجکاری کمیشن اور وزیر مملکت محمد زبیر عمر اور وزیر خزانہ اسحق ڈار رات دن نجکاری کی فائیلیں آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ 2018 تک پی آئی اے، پاکستان اسٹیل، ایس ایم ای بینک، اسٹیٹ لائف انشورنس، نیشنل انشورنس سمیت 30 اداروں کی نجکاری کی جائے گی۔ اس وقت پاکستان اسٹیل کی نجکاری پر تیزی سے کام ہورہا ہے۔ اس بیں کام ہونے والی پیش رفت میں حکومت سندھ نے رخنہ ڈال دیا کہ وہ اسے خریدنا چاہتے ہیں۔ حکومت سندھ کی دلچسپی پاکستان اسٹیل کو چلانے سے زیادہ اس کی زمینوں میں ہے، اب مرکزی حکومت نے وزیراعلیٰ سندھ کو خط لکھ دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر سندھ حکومت نے ماہ نومبر کے اختتام تک جواب نہ دیا تو پھر نجکاری کمیشن پاکستان اسٹیل کیلیے دوسرا خریدار تلاش کرے گی۔ حکومت نے پاکستان اسٹیل کی نجکاری کے معاملات اندرون خانہ مکمل کر لیے ہیں اور ٹرانزیکشن تک معاملات پہنچ چکے ہیں، حال ہی بیں چائنا میں روڈ شو بھی اسی لیے کیا گیا جس میں بہت سی چینی کمپنیوں نے بھی پاکستان اسٹیل خریدنے

یں دلچسپی ظاہر کی ہے۔ نواز حکومت دسمبر تک پاکستان اسٹیل کی نجکاری کا فیصلہ کرنا چاہتی ہے۔ حکومت اس بار نقصان والے ادارے ہی نہیں بلکہ منافع بخش اداروں کی بھی نجکاری کر رہی ہے۔ بہت سے اداروں میں مصنوعی بحران پیدا کرکے انھیں تباہ کیا جارہا ہے تاکہ انھیں اونے پونے بیچا جاسکے۔ نجکاری کمیشن نے پی آئی اے پر ہاتھ صاف کردیا ہے۔ اسکی نجکاری کا معاملہ بھی آخری مراحل میں ہے اس کے علاوہ، 9 پاور ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کی نجکاری بھی کی جارہی ہے اور فیصلآباد الیکٹرک کمپنی کی نجکاری کا کام بھی شروع ہے۔ امیر جماعت اسلامی سینیٹر سراج الحقکا کہنا ہے کہ ملک میں نجکاری کے نام پر مکاری ہورہی ہے، منافع بخش اداروں کو اونے پونے داموں بیچ کر سات لاکھ سے زیادہ مزدوروں کو بے روزگار کیا گیا۔ نجکاری کے نام پر تین ہزار ارب روپے کی کرپشن کی گئی۔ حکومت اسٹیل مل، پیآئی اے جیسے اداروں کو بیچنا چاہتی ہے مگر ہم حکومت کو مزدور کشی نہیں کرنے دیں گے۔ حکومت نے نجکاری کے نام پر محنت کشوں اور مزدوروں پر مسلسل ایک تلوار لٹکا رکھی ہے۔ دیگر سیاسی جماعتوں میں جماعت اسلامی ہی واحد سیاسی جماعت ہے جو نج کاری کے خلاف مہم چلائے ہوئے ہیں۔ کل لاہور میں بھی جماعت اسلامی کی جانب سے نجکاری کے خلاف ایک بڑی کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ نجکاری کے اس عمل میں ہزاروں مزدوروں کا معاشی قتل کیا گیا۔ 13 اکتوبر 1997 کو یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کے 5416 ملازمین کے معاشی قتل کرنے کے بعد جبری برخاست شدہ ملازمین کو 100 فیصد

مراعات دینے کی بجائے 50 فیصد مراعات دی گیں اور 50 فیصد مراعات کو بطور بھتہ خوری ضبط کرلیا گیا تھا۔ اج تک یہ جبری برخاست شدہ ملازمین انصاف اور حق تلفی کے ازالہ سے محرم ھیں۔ پی ٹی سی ایل کی نجکاری کے سلسلے میں 800 ملین ڈالرز ابھی تک پھنسے ہوئے ہیں ۔اتصلات نے یہ رقم اس وقت دینی تھی۔ اب ان کا مطالبہ ہے کہ 31 پراپرٹیز کی منتقلی کا وعدہ پورا کیا جائے۔ اچھی ساکھ اور انتہائی منافع بخش ادارہ اسٹیٹ لائف انشورنس جس پر میاں نواز شریف کی نظر 1996 سے ہے، اب اگلے 2 ماہ میں اس کا بھی آئی پی او کیا جائے گا۔ ایس ای سی پی کی رپورٹ پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کی شفافیت پر تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ جس پر اسٹیٹ لائف کارپوریشن نے ایس ای سی پی سے احتجاج کیا ہے اور آگاہ کیا گیا ۔اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن ایسا منافع بخش ادارہ ہے جو ہر سال حکومت کو کروڑوں روپے منافع دیتا ہے۔ یہ چار سو ارب روپے مالیت کا ادارہ ہے، اسٹیٹ لائف ہیلتھ، گروپ انشورنس اور مائیکرو انشورنس کی نئی اسکیمیں شروع کر رہی ہے۔ باہر جانے والے پاکستانیوں کی گروپ انشورنس کی اسکیم پر بھی عمل جاری ہے۔ ملک میں جاری نج کاری کا یہ عمل کسی طور پر بھی قومی یا ملکی مفاد میں نہیں بلکہ آئی ایم ایف کی ان شرائط کا حصہ ہے۔ جو حکومت قرضوں کے سلسلے میں پوری کر رہی ہے۔ اس وقت 68 قومی ادارے اونے پونے بیچنے کا منصوبہ ہے۔ زیادہ تر اداروں کی خریداری میں حکومت میں شامل لوگ دلچسپی لے رہے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ

نجکاری شفاف نہیں بلکہ سفارشی بنیادوں پر ہوگی۔ قومی اداروں کے پاس اربوں روپے کی زمین اور اثاثے ہیں جن پر ملکی و غیر ملکی کمپنیوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ نجکاری سے لاکھوں مزدور اور محنت کش بے روزگار ہوں گے۔ اور ملک میں معاشی ابتری میں اضافہ ہوگا۔

پڑھو پڑھاؤ تحریک غریب والدین کی مدد کا ایک آغاز

اپریل کے آغاز کے ساتھ ہی کراچی اور سندھ کے تعلیمی اداروں میں بچے نئی کاپیاں اور کتابیں خرید کر اپنی نئی سال کی پڑھائی کا آغاز کر رہے ہیں۔ سندھ میں تعلیمی نظام ایک ابتری کا شکار ہے۔ انسٹیٹیوٹ آف سوشل اینڈ پالیسی سائنس کی رپورٹ کے مطابق سندھ میں 5 سے 16 سال کی عمر کے اسکول نا جانے والے بچوں کی تعداد 73 لاکھ بچے ہیں۔ سندھ میں تعلیم کے سلسلے میں اعداد شمار پریشان کن ہیں۔ ایک اور رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت سندھ کی جانب سے جاری کیے گئے اعداو شمار کے مطابق سندھ میں سرکاری اسکولوں کی تعداد 48 ہزار 914 ہے۔ جن کی تعلیم کے لئے تقریباً 1 لاکھ 46 ہزار اساتذہ موجود ہیں، اعداو شمار کے مطابق تقریبا 27 ہزار اسکول بجلی، 24 8، ہزار پینے کے صاف پانی، 20 ہزار اسکول بیت الخلا کی سہولت سے محروم ہیں، ہزار 280 سکول ایسے ہیں جن کے پاس اپنی کوئی جگہ نہیں ہے، سندھ کی بیشتر جامعات کو سیاسی بھرتیوں اور فنڈز کی کمی کے باعث بدترین مالی بحران کا سامنا ہے۔ سندھ میں گورنمنٹ اسکولوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ یہاں پڑھنے والے بچے غریب ہوتے ہیں۔ غریب بچوں کے والدین کے لئے نیا کورس اور کتابوں کی خریداری بھی ایک بڑا امتحان ہوتا ہے۔ ایک تو درسی کتابیں وقت پر موجود نہیں ہوتی ، دوسری جانب ان پر آنے والے اخراجات بھی غریب والدین کے لئے ایک

بوجھ ہوتے ہیں۔ بچوں کو وقت پر کتابیں مل جانا انھیں کس قدر خوشیاں مہیا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم اپنے بچپن کو یاد کرکے کر سکتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سارے پرائیویٹ اسکولوں کے مالکان محض اس وجہ سے اپنے اسکولوں میں سندھ کی نصابی کتابیں نہیں پڑھاتے کہ یہ سال کے ابتدا میں مارکیٹوں سے مفقود ہو جاتی ہیں۔ اسکولوں میں زیر تعلیم ہزاروں بچے ہر تعلیمی سال کے آغاز پر درسی کتب سے محروم ہوتے ہیں۔ایک جانب گزشتہ چند سالوں سے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ درسی کتب چھپوا کر سرکاری سکولوں میں زیرِ تعلیم بچوں میں مفت تقسیم کر رہا ہے جس سے غریب اور مستحق بچے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ تقسیم اور کتابوں کی دستیابی بھی بڑی حد تک شفاف نہیں ہے۔

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ ہر سال درسی کتب کے لیے کاغذ خریدنے اور کتب چھپوانے کی مد میں ساٹھ کروڑ ستر کروڑ روپے تک خرچ کرتا ہے۔ درسی کتب کی تلاش میں اکثر والدین بازاروں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اکثر والدین اپنا کام چھوڑ کر روزانہ اردو بازار کے چکر لگاتے ہیں لیکن ان کو مطلوبہ کتابیں نہیں ملتی۔گذشتہ دنوں ایک غیر سرکاری تنظیم کی جانب سے یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ سندھ کے تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں سیاسی جماعتوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے۔ سندھ اسمبلی کے اجلاس میں متعدد بار تعلیم کے مسئلے کو اٹھانے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ سندھ کے تعلیمی بجٹ

کو بہتر طریقے سے مسائل کے حل پر صرف نہیں کیا جاتا۔ جماعت اسلامی نے اس بارے میں ادا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال ہی میں اپنی مدد آپ کے تحت جماعت اسلامی کے کارکنوں کی جانب سے ''پڑھو اور پڑھاؤ تحریک'' کا آغاز ایک قابل تحسین عمل اور مثبت سرگرمی ہے۔ جس میں طالب علموں کے لیے درسی کتب اور دیگر تعلیمی اشیاء کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ آئندہ سال سے یہ تحریک، جماعت اسلامی کراچی کے تحت پورے شہر بھر میں چلائی جائے گی۔ اردو بازار ناظم آباد میں جماعت اسلامی ناظم آباد کے تحت ''پڑھو اور پڑھاؤ'' تحریک کا کیمپ قائم ہے۔ یہ کیمپ نئے تعلیمی سیشن کے آغاز کے موقع پر لگایا گیا ہے۔ جہاں سے طالب علموں کو کتابیں اور اسکول بیگ وغیرہ مفت فراہم کیے جارہے ہیں۔ کیمپ سے والدین اور طلبہ وطالبات کی بڑی تعداد اپنی ضرورت کی درسی کتب دیگر تعلیمی اشیاء حاصل کررہی ہے۔ طلبہ وطالبات اور والدین کی جانب سے جماعت اسلامی کی ان کوششوں کی زبردست پذیرائی کی گئی۔ کیمپ پر جماعت اسلامی کے کارکنوں کی بڑی تعداد بھی موجود رہتی ہے۔ عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنی استعمال شدہ درسی کتب کو اور دیگر تعلیمی اشیاء کیمپ پر جمع کرائیں۔ اس پر بھی عوام نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قابل تقلید سرگرمی اور پڑھو اور پڑھاؤ تحریک کو علاقوں کی سطح پر منظم کیا جائے۔ ایک جانب تعلیم مہنگی ہے ۔ دوسری جانب ریاست اور حکومت تعلیم کی سہولت فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ ان حالات میں ''پڑھو اور پڑھاؤ'' تحریک ایک

تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ حکومت کو بھی تعلیم کے شعبے پر 2 فیصد بجٹ بڑھانا چاہیئے۔
اس وقت ملک میں نظریاتی اخلاقی اور سیاسی کرپشن کا ایک سیلاب ہے۔ حکمران بھی
اس میں ملوث ہیں۔ جماعت اسلامی ملک بھر میں کرپشن کے خلاف بھی مہم چلا رہی
ہے۔ اس کی پڑھو پڑھاو تحریک دیگر سیاسی جماعتوں اور این جی او کے لئے بھی ایک مثال
ہے۔ جس پر پورے ملک میں کام ہونا چاہیئے۔

بنگلہ دیش میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی

بنگلہ دیش میں جوں جوں انتہا پسندی بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی عوام میں اس کیخلاف غم و غصہ بھی بڑھتا جارہا ہے۔ امریکہ جو دنیا بھر میں اسلامک اسٹیٹ (داعش) کی بپا کی ہوئی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد انسداد کی کوششوں میں مصروف ہے، اس بارے میں فکر مند ہے کہ بنگلہ دیش جیسے ملک، جس میں سیکولرازم، آزادی رائے اور کرسچنوں اور ہندوؤں جیسی مذہبی اقلیتوں کا احترام پایا جاتا ہے، میں مسلم انتہا پسندی کی جڑیں کیوں مضبوط ہو رہی ہیں۔ وہ اس انتہا پسندی کو تمام خطے کے لیے نہایت خطرناک سمجھتا ہے۔ امریکا کی غیر معمولی تشویش اور غُصے کا سبب بنگلہ دیش میں ہونے والے خونریز حملوں کے ساتھ ساتھ خاص طور سے بنگلہ دیشی نژاد امریکی مصنف اویجت رائے پر ڈھاکا کی ایک گنجان سڑک پر گزشتہ برس فروری میں ہونے والا حملہ تصور کیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں نوجوان انتہا پسندوں کی طرف سے اقلیتوں اور اعتدال پسندوں کے خلاف دہشت گردانہ حملے، انہیں نفرت آمیز الفاظ سے نوازنے اور چاقو وغیرہ سے ان پر وار کرنے کا سلسلہ 2013ء میں شروع ہوا تھا۔ جس کی شدت میں اضافہ حال ہی میں ایک کیفے میں ہونے والا حملہ ہے۔ جس میں بہت سے غیر ملکی بھی مارے گئے ہیں۔ بنگلہ دیش کے وزیر صنعت امیر حسین امو کا کہنا ہے کہ کیفے پر حملہ کرنے والے ڈاکٹر ذاکر نائیک سے متاثر

تھے۔بنگلہ دیشی حکومت نے بھارتی مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے ٹی وی چینل " پیس ٹی وی کی اندرون ملک نشریات پر پابندی عائد کردی ہے۔ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بنگلہ دیش " کے الزامات کی تردید کی ہے۔اس حملے میں غیر ملکیوں سمیت 20 سے زائد افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔پہلے یہ کہا گیا کہ یہ حملہ داعش کی جانب سے کیا گیا۔لیکن پھر اس کا رخ مقامی تنظیموں کے جانب موڑ دیا گیا ہے۔اب بنگلہ دیش میں نماز جمعہ کے دوران دیئے جانے والے خطبات کی بھی نگرانی اور اشتعال انگیز تقریروں اور خطبات کو روکنے کے لئے بھی اقدامات کیئے جارہے ہیں۔حکومت اس بارے میں بھی کوشاں ہیں کہ ملکی ائمہ اور دانشوروں اپنے خطبات میں اسلام کی حقیقی تصویر پیش کریں اور دہشت گردی و انتہاپسندی کی مذمت کریں۔ حسینہ واجد کی حکومت بنگلہ دیش میں ایک جانب تو اسلام پسند کو کچلنے اور اپنے سیاسی مخالفین جماعت اسلامی کے رہنماوں کو نام نہاد جنگی جرائم میں پھانسی کی سزائیں دے رہی ہے۔اور دوسری جانب سیکولر اور لبرل ایجنڈے پر عمل پیرا ہے۔لیکن اس کا جو ہولناک نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں امیر اور لبرل خاندانوں کے نوجوان دہشت گردی کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور عالمی دہشت گرد تنظیموں سے نظریاتی وابستگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ان دہشت گرد حملوں کے بعد وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد نے سکولوں اور یونیورسٹیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایسے طلبا کی فہرست جاری کریں جو غیر حاضر ہیں۔ڈھاکہ میں 'ہولی آرٹیزن بیکری' نامی ریسٹورنٹ پر حملہ کرنے والے افراد

ملک کے معروف سکولوں اور کالجوں سے تعلیم یافتہ تھے۔ جن میں شیخ حسینہ واجد کی پارٹی کے ایک وزیر کا بھتیجا بھی شامل ہے۔ حملے میں ہلاک شدگان میں نو اطالوی، سات جاپانی، دو بنگلہ دیشی اور ایک ایک امریکی اور بھارتی شہری شامل تھے۔ اس انتہا پسندی کے لئے ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جارہا ہے۔ اور سماجی رابطے کی ایسی ویب سائیٹوں کے خلاف کارروائی بھی کی جارہی ہے۔ تعلیم یافتہ اور کالجوں یونیورسٹیوں کے امیر خاندانوں کے ان نوجوانوں کے اس رجحان سے اس تاثر کی نفی ہوئی ہے کہ دہشت گردی تنظیمیں تمام بھرتیاں مدرسوں سے کرتی ہیں۔ بنگلہ دیش کی حکومت نے دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے خطرے کا الزام ملک میں موجود شدت پسند گروہوں پر عائد کیا ہے۔ حالیہ حملوں میں ملوث افراد کا تعلق مقامی شدت پسند تنظیم جماعت المجاہدین سے بتایا جاتا ہے۔ حملے میں ملوث تمام افراد کی عمریں 22 سال سے کم تھیں اور انھوں نے 20 یرغمالیوں کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ بنگلہ دیش کے تین نوجوانوں کی ملک میں ایسے مزید حملے کرنے کی دھمکی کی ایک ویڈیو بھی داعش نے جاری کی ہے۔

ویڈیو فوٹیج میں ایک نوجوان شخص خانہ جنگی کے شکار عرب ملک شام کے علاقے الرقہ کی ایک مصروف سڑک پر کھڑے ہو کر بات چیت کر رہا ہے۔ واضح رہے کہ الرقہ کو شدت پسند تنظیم 'اسلامک اسٹیٹ' کے کارکن اپنی نام نہاد خلافت کا

دارالخلافہ قرار دیتے ہیں۔ معلوم ہوا ہیکہ ان نوجوانوں کا پس منظر بھی ایسا ہی تھا۔ حکام نے بتایا کہ ان میں سے ایک ڈھاکہ میں دانتوں کا معالج تھا، دوسرا اگائیک بننا چاہتا تھا جبکہ تیسرا جس نے اپنا چہرہ جزوی طور پر ڈھانپا ہوا تھا، غالبا مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یہ تینوں نوجوان کئی ماہ سے لاپتا تھے۔ گزشتہ دو سال کے دوران بنگلہ دیش میں سیکولر مصنفوں، غیر ملکیوں اور مذہبی اقلتیوں سے تعلق رکھنے افراد کو تواتر سے نشانہ بنایا جاتا رہاہے۔ اس بار عید کی نماز کے موقع پر بھی بم سے حملہ کیا گیا جس میں امام مولانا فرید الدین مسعود بال بال بچ گئے۔ اس حملے میں کم از کم چار افراد ہلاک ہوئے۔ سولہ کروڑ آبادی کے ملک بنگلہ دیش میں مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن اب یہ ملک سرکاری طور پر سیکولر ہے۔ اب تک اعلیٰ بنگلہ دیشی قیادت ملک میں داعش اور القاعدہ کی جانب سے گذشتہ برس کے دوران ہونے والی پُر تشدد کارروائیوں کی ذمہ داری قبول کرنے دعوؤں کو مسترد کرتی آئی ہے۔ حکومتی اہلکار اس میں مقامی شدت پسند یا سیاسی مخالفین کے گروہ کے ملوث ہونے کا اعتراف کرتے ۔ بنگلہ دیش میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی مغربی ممالک بالخصوص امریکا کے لیے گہری تشویش کا باعث ہے۔ کچھ عرصے قبل امریکی ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ کے ایک کارکن اور ہم جنس پرستوں کے بارے میں نکلنے والے ایک رسالے کے ایڈیٹر ذولحاج منان کو بھی چاقوؤں کے وار کے کارکن اور ہم جنس پرستوں کے حقوق کے سرگرم USAID کرکے قتل کردیا گیا تھا۔

ذولحاج منان

کے بہیمانہ قتل کی ذمہ داری دہشت گرد گروہ القاعدہ کی جنوبی ایشیا کی ایک شاخ نے قبول کی تھی۔ القاعدہ کے اس دعوے کی گرچہ تصدیق نہیں ہو سکی ہے تاہم اس سے بنگلہ دیش کے سیاسی بحران میں اضافہ ہوگیا ہے۔ امریکا کے ڈپٹی سیکرٹری آف اسٹیٹ انٹونی بلینکن نے کا کہنا ہے کہ ،، ڈھاکا حکومت چاہے سیکولر بلاگرز اور دیگر افراد پر ہونے والے دہشت گردانہ حملوں کا ذمہ دار چاہے جس حدتک بھی اپوزیشن کو ٹھہرائے، ایسے ثبوت موجود ہیں کہ انتہا پسند گروپ چاہے وہ مقامی ہوں یا یہ آئی ایس یا القاعدہ سے منسلک ہوں، یہی عناصر ملک میں سیکولر اور دیگر موقف رکھنے والوں کے قتل کے پیچھے ہیں۔ انٹونی بلینکن نے امریکی ہاؤس آف فارن آفیئیرز کمیٹی سے اپنے خطاب میں کہا، ''ان واقعات نے ہمارے ذہنوں میں آئی ایس یا داعش کی بنگلہ دیش میں پائی جانے والی جڑوں کے بارے میں خدشات بڑھا دیے ہیں۔ یہ وہ آخری چیز ہو گی جو ہم چاہیں گے۔ امریکہ کے ان عزائم سے اس بات کے خدشات میں اضافہ ہوگیا ہے کہ امریکہ کا اگلا ہدف بنگلہ دیش بھی ہو سکتا ہے۔

قاتل پہاڑ

عائشہ طارق

یہ انیس سو ترپن کا ذکر ہے جب جرمنی اور آسٹریا کے کوہ پیماؤں پر مشتمل ایک ٹیم پاکستان پہنچی۔ اس ٹیم کا مقصد پاکستان کے شمالی علاقوں میں واقع دنیا کے نویں اونچے ترین پہاڑ جو قاتل پہاڑ کے نام سے مشہور ہے، کو سر کرنا تھا۔ اس وقت تک اس مقصد کو پورا کرنے کی ناکام کوششوں میں 32 کوہ پیما اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ ٹیم میں شامل ایک کوہ پیما نانگاپربت کی چوٹی کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یوں آسٹریا کا کوہ پیما ہرمن بوہل پاکستان کی تاریخ میں نانگاپربت کی چوٹی تک پہنچنے والا پہلا انسان بن گیا۔ اس سے پہلے نانگاپربت کو سر کرنے کی ہر کوشش کا اختتام ناکامی یا موت پر ہوا تھا۔ ان کوششوں کا آغاز 1895 میں ہوا جب برطانوی کوہ پیما البرٹ ممری اس پہاڑ پر دو پورٹروں کے ساتھ ایولانچ کا شکار ہوا۔ البرٹ ممری ایک مشہور کوہ پیما اور سیاح تھا۔ بیسویں صدی میں یہ پہاڑ جرمن کوہ پیماؤں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ 1930 کی دھائی میں چھ جرمن کوہ پیما ٹیمیں اس مقصد سے آئیں اور ناکام ہو گئیں۔ اسی دھائی میں کوہ پیماء کی تاریخ کے دو بدترین حادثے ہوئے، جن میں جرمنی کے چند بہترین کوہ پیما اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان حادثات

نے اس پہاڑ کی دہشت ساری دنیا پر بٹھا دی تھی۔

پہلا حادثہ 1934 میں ہوا۔ جرمنی میں الیکشن کے بعد نازی حکومت اقتدار میں آ گئی تھی۔ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے اپنی دھاک بٹھانے کے لئے فیصلہ کیا کہ نانگا پربت کی چوٹی سر کی جائے گی اور نازی جھنڈا پہاڑ کی چوٹی پر لہرایا جائے۔ جرمنی کے بہترین کوہ پیماؤں پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دی گئی۔ اسے حکومت کی مکمل حمایت اور مالی مدد حاصل تھی۔ ٹیم کا لیڈر ولی مرکل تھا۔ وہ ایک تجربہ کار کوہ پیما تھا اور پہلے بھی نانگا پربت پر ایک ٹیم کی قیادت کر چکا تھا۔ ٹیم بغیر کسی مشکل کے آگے بڑھ رہی تھی اور ولی مرکل اپنے دو ساتھیوں اور پورٹروں کیساتھ باقی ٹیم سے بہت آگے چوٹی کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ لیکن موسم سخت خراب ہوگیا، وہ دھند اور شدید برف باری میں پھنس گئے۔ انھوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ نو دن بعد طوفان ختم ہوا لیکن تب تک ولی مرکل اور اسکے تمام ساتھی بھوک اور سردی سے مر چکے تھے۔ چند سال بعد کوہ پیماؤں نے انھیں اس غار میں دریافت کیا، انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی موت بہت اذیت ناک تھی۔ اس حادثے میں 10 افراد موت کا شکار ہوئے۔ یہ اس زمانے میں کوہ پیماء کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔

تین سال بعد جرمن حکومت نے ایک بار پھر نانگا پربت کی تسخیر کے لئے بہترین

کوہ پیما ٹیم بھیجی۔ یہ ٹیم 16 افراد پر مشتمل تھی۔ یہ تمام لوگ ایک ساتھ ایوالانچ کے ہاتھوں موت کے منہ میں چلے گئے۔ یہ دونوں اس زمانے کے حساب سے کوہ پیماء کی بہترین ٹیمیں تھیں۔ بیسویں صدی میں جرمن کوہ پیماؤں نے نانگا پربت کو اپنی منزل قرار دیا۔ لیکن وہ اس منزل پر کبھی نہ پہنچ سکے۔

نانگا پربت سطح سمندر سے 8126 میٹر بلند دنیا کا نواں اونچا ترین پہاڑ ہے۔ یہ سلسلہ ہمالیہ کے مغربی کنارے پاکستان کے شمال میں گلگت بلتستان میں واقع ہے۔ قراقرم کا پہاڑی سلسلہ بھی اسی خطے میں ہے۔

دوسرے پہاڑوں کے برعکس نانگا پربت پر کوہ پیمائی کا آغاز سطح سمندر کے قریب سے کرنا پڑتا ہے۔ آغاز میں ٹمپریچر 25 ڈگری ہوتا ہے تو چوٹی پر منفی 45 تک ہوگا۔ تجربہ کار کوہ پیماؤں کے مطابق آٹھ ہزار میٹر سے بلند چوٹیوں میں کے۔ٹو کے بعد سب سے دشوار اور کھٹن چڑھائی نانگا پربت کی ہے۔ شرح اموات کے لحاظ سے بھی نانگا پربت تیسرے نمبر پر ہے۔

برف کی تین دیواریں یا ابھار نانگا پربت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، یوں چوٹی تک پہنچنے کے تین مرکزی راستے ہیں۔ جنوبی رخ کو روپل کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں سے چند میل دور روپل نام کی بستی ہے۔ روپل چوٹی تک پہنچنے کا سب سے چھوٹا راستہ ہے اور زیادہ تر چڑھائی عمودی ہے۔ یہاں سے نانگا پربت کی

چوٹی واضح دکھائی دیتی ہے۔ مشرق اور مغرب میں برفانی دیواریں اسے شمال میں واقع رائیکوٹ اور دیامر سے الگ کرتی ہیں۔

شمال مشرقی حصے کو رائیکوٹ کہتے ہیں اور شمال مغربی حصے کو دیامر۔ ان دونوں کے درمیان موجود پہاڑی دیوار یا ابھار دیامر ریج Diamir ridge کہلاتی ہے۔ عام طور پر کوہ پیما دیامر ریج سے کوہ پیماء کا آغاز کرتے ہیں۔ فیری میڈو کی خوبصورت وادی اسی طرف واقع ہے۔ اس وادی کی خوبصورتی کو دیکھ کر ولی مرکل نے اسے فیری میڈو کا نام دیا تھا۔ یہاں سارا سال سیاحوں کا رش ہوتا ہے۔

رائیکوٹ کے راستے سے کوہ پیمائی کا طویل ترین اور کوہ پیماؤں کے مطابق مشکل ترین راستہ ہے۔ یہاں سے پہاڑ پر موجود کئی دوسری چھوٹی بڑی چوٹیاں بھی نظر آتی ہیں۔ 1953 میں بوہل نے نانگا پربت اسی جانب سے سر کیا تھا۔ ہرمن بوہل کے بعد سے لے کر آج تک صرف ایک ہی ٹیم نے چوٹی تک یہ راستہ اختیار کیا ہے۔

1953 میں پاکستان آنے والی یہ ٹیم دس افراد پر مشتمل تھی۔ اس ٹیم کا لیڈر کارل ہرلیکوفر تھا۔ ہرلیکوفر ولی مرکل کا بھائی تھا اور اس نے یہ مہم 1934 میں مرنے والوں کی یاد میں ترتیب دی تھی۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا اور

باقاعدہ کوہ پیمائی کا تجربہ نہ رکھتا تھا۔ ٹیم میں پیٹر اشنبریز بھی تھا جو تجربہ کار کوہ پیما تھااور 1934 کی مہم میں بچ جانے والے کوہ پیماؤں میں سے ایک تھا۔ ان دو کے علاوہ جرمنی کے پانچ اور آسٹریا کے تین کوہ پیما ٹیم میں شامل تھے۔ مہم کے دوران انھوں نے ایک چٹان پر ویڈیو ریکارڈ کرائی جو "نانگاپربت کا وعدہ" کہلاتی ہے۔ اس ویڈیو میں وہ سب موجود ہیں اور یہ الفاظ دھرا رہے ہیں۔

ہم عہد کرتے ہیں کہ اس سرزمین کی بلندترین چوٹی پر پہنچنے کے معرکے میں ہم دیانت سے کوشش کریں گے، دوستی کے اصولوں کا احترام کریں گے، اور تکمیل مقصد کے لئے پورازور لگائیں گے۔

پوری دنیا میں کوہ پیماء کے فروغ کے لئے مادرِوطن کی عزت افزاء کے لیئے اور ہمیں اس مہم کا موقع فراہم کرنے کے لیئے، ہم اس پہاڑ کو سلام پیش کرتے ہیں۔

ٹیم کا فوٹوگرافر ہانس ارٹل تھا جو بولیویا سے خاص طور پر مہم میں شرکت کرنے آیا تھا۔

مہم کا آغاز کچھ اچھا نہ ہوا موسم خراب تھا اور ان کے شیرپا پورٹروں کو حکومت پاکستان نے پاکستان میں داخلے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً انہیں مقامی پورٹر حاصل کرنے پڑے جو ہندوستانی شیرپا پورٹروں کی طرح بلندی کا تجربہ

نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے شمال میں رائیکوٹ کے رخ سے کوہ پیاء کا آغاز کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چوٹی تک پہنچنے کا آسان ترین راستہ ہے۔ خراب موسم اور نا تجربہ پورٹروں نے مہم کی رفتار ست کر دی تھی۔

رائیکوٹ گلیشیر کے پاس انھوں نے اپنا کیمپ قائم کیا۔ اگلا کیمپ انھوں نے رائیکوٹ گلیشیئر کے اوپر قائم کیا۔ نانگا پربت کی چوٹی کے ساتھ نسبتاً چھوٹی رائیکوٹ چوٹی ہے، اگلا کیمپ انھوں نے اس کے نیچے قائم کیا۔ یہاں سے آگے ایک عمودی چڑھائی تھی جو ان کے پورٹر پار نہیں کر سکتے تھے۔

جون کو بوہل اور اوٹو کیمپٹر نے رسوں کی مدد سے یہ عمودی چڑھائی عبور کی اور 20 دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ رات تک وہ کیمپ میں واپس آ گئے۔ خراب موسم، بیمار پورٹر اور دھند نے ان کی مہم اور مشکل کر دی تھی۔ مون سون کا موسم بھی قریب آ رہا تھا۔ اگلے کچھ دن انھوں نے کیمپ میں ہی گزارے۔ انہیں امید تھی کہ نیچے سے تازہ دم پورٹر آئیں گے لیکن پورٹر نہیں آئے۔ انھوں نے پھر صرف دو افراد کی ضرورت کے مطابق سامان لیا اور اگلا کیمپ قائم کرنے آگے بڑھے۔ اگلا کیمپ، کیمپ 5 آخری کیمپ تھا جہاں انھوں نے بوہل اور کیمپٹر کو چھوڑ کر واپس آنا تھا مگر خراب موسم اور دھند نے انہیں پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس ناکامی نے ان کی ہمت پست کر دی تھی۔ گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا

اور شدید سردی میں کیمپ واپس پہنچنے تک وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ مہم موخر کر کے واپس جانا چاہیے۔ کیمپ میں حرارت بحال ہونے کے بعد ان کی جان میں جان آئی۔ اگلے دن بھی موسم خراب تھا وہ واپس کیمپ 3 میں آ گئے۔ وہاں ہانس ارٹل چار پورٹروں کے ساتھ موجود تھا۔

جون کو موسم صاف تھا، انھوں نے ایک کوشش اور کرنے کا فیصلہ کیا مگر وہ سب 30 جانتے تھے کہ پہاڑوں پر موسم کسی بھی وقت خراب ہو سکتا ہے۔ بیس کیمپ میں موجود ساتھیوں سے ریڈیو پر رابطہ ہوا تو انہوں نے ان کو مہم موخر کر کے واپس آنے کو کہا۔ ان کا ایک ساتھی واپس جا چکا تھا۔ بوہل اور اس کے ساتھیوں نے ایک کوشش اور کرنے کا فیصلہ کیا۔

جولائی کو بوہل، ارٹل، فرانبر گر اور کیمپٹر تین پورٹروں کے ہمراہ آگے بڑھے۔ 2 انھوں نے آگے جا کر کیمپ 5 قائم کیا۔ وہاں بوہل اور کیمپٹر کو چھوڑنے کے بعد ارٹل اور فرانبر گر واپس کیمپ 4 پہنچے۔ کیمپ 5 انھوں نے 6900 میٹر کی بلندی پر قائم کیا تھا۔ 1934 میں آنے والی ٹیم نے بھی اسی جگہ کیمپ قائم کیا تھا لیکن انھوں نے پھر اپنا آخری کیمپ آگے چوٹی کے قریب قائم کیا تھا۔ اگلے دن انھوں نے مہم کے مشکل ترین راستے پر سفر کرنا تھا۔

جولائی کو بوہل صبح 2 بجے جاگا اور مہم کی تیاری شروع کر دی۔ کیمپٹر تھکا ہوا تھا اور 3 بوہل کے جگانے کی کوشش کرنے پر بھی سویا رہا۔ بوہل اکیلا ہی ڈھائی بجے تک روانہ ہوا۔ کیمپٹر نے بوہل کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد سفر شروع کیا۔

صبح پانچ بجے سورج طلوع ہوا اور روشنی پھیل گئی۔ بوہل نے تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر چل پڑا۔ دوسری طرف کیمپٹر جو بوہل کے پیچھے آ رہا تھا، سخت تھکا ہوا تھا۔ وہ سلور پلیٹیو پہنچ کر تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے رکا اور سو گیا۔ سلور پلیٹیو برف کا ایک ہموار میدان ہے، بوہل یہاں سے کافی دیر پہلے گزر چکا تھا۔ نیند سے کیمپٹر کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بوہل بھی اب اس سے بہت دور جا چکا تھا اور پہاڑ پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیمپٹر نے باقی دن اسی جگہ گزارا، اسکا خیال تھا کہ بوہل واپس آئے گا۔ شام کو وہ کیمپ 5 واپس چلا گیا۔

بوہل آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے چڑھائی میں آسانی کے لیئے ضرورت کی چند اشیا جیبوں میں ڈالیں اور اپنا رک سیک (کوہ پیماء میں استعمال ہونے والا مضبوط بیگ) وہیں ایک کھوہ میں چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اب اس کے پاس صرف کیمرہ، چائے کا فلاسک، ادویات، برف میں استعمال ہونے والی کلہاڑی، اور سکی سٹکس تھیں۔ اس

نے پھر بزین گیپ پار کیا۔ اتنی اونچائی پر بوہل کو قدم اٹھانے میں دقت ہو رہی تھی۔ بوہل آسٹریا کے مغربی حصے ٹائرول کا رہنے والا تھا۔ یہ علاقہ جرمنی اور اٹلی کے درمیان واقع ہے اور پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ سلسلہ یورپ کا سب سے بڑا پہاڑی سلسلہ ہے۔ ہرمن بوہل نے دس سال کی عمر میں کوہ پیماء شروع کر دی تھی۔ ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں کی نسبت سلسلہ الپ کے پہاڑ چھوٹے ہیں۔ زیادہ تر پہاڑوں کی اونچائی تین یا چار ہزار میٹر ہے۔ اس وقت تک اتنی اونچائی پر اتنا عرصہ گزارنے سے صحت پر ہونے والے اثرات کے متعلق کوئی تحقیق نہ ہوئی تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے انسان کی صحت پر تاحیات منفی اثرات پڑتے ہیں۔ وہ چوٹی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہرمن بوہل کے مطابق وہ اس وقت تھکن سے چور تھا۔ اس نے اپنی سکی سٹکس پھینک دی تھیں، ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ آگے جگہ ختم ہو چکی ہے۔ وہ ناگاپربت تسخیر کر چکا تھا۔

یہ 3 جولائی 1953 کا دن اور شام سات بجے کا وقت تھا، بوہل نے اپنی کلھاڑی برف میں گاڑ دی۔ اس نے دستے سے پاکستانی اور ٹائرول جھنڈے لہراتے تصویریں بنائیں۔

چڑھتے وقت اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا اس راستے سے اب بغیر رسی واپس اترنا ممکن نہ تھا، وہ دوسری طرف سے اترنے لگا۔ جلد ہی اندھیرا چھا گیا اور بوہل کے لیئے مزید سفر ممکن نہ رہا۔ اس وقت وہ ایک چٹان سے اتر رہا تھا اور وہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ اس کے دونوں پیر ٹک سکیں۔ اتنی اونچائی پر بوہل کھلی جگہ کھڑا تھا۔ اسکا اضافی جیکٹ اس کے رک سیک میں تھا جو وہ چھوڑ آیا تھا۔ یہ ایک کوہ پیا کو پیش آنے والی مشکل ترین حالت ہے۔ رات کو ہوا بند تھی اسکے باوجود بوہل سردی کو لہر در لہر اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور منجمد ہونے کا خطرہ تھا۔ بوہل نے خون کی گردش بحال رکھنے کے لیئے ہر لیکوفر کی دی ہوئی گولیاں نگل لیں۔ بوہل کے مطابق صبح تک وہ کافی تازہ دم ہوگیا تھا۔ روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ بوہل نے سفر دوبارہ شروع کیا۔ وہ اب گھوم کر اپنے پرانے راستے پر واپس آ چکا تھا۔ اسے اپنا رک سیک بھی اسی جگہ مل گیا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔ سلور پلیٹیو سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر اسکی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے دوبارہ گولیاں نگل لیں۔

دوسری طرف اوٹو کیمپٹر جب کیمپ پانچ پہنچا تو فرانبر گر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب بوہل چوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ اس دن ارٹل اور فرانبر گر نے بھی طبّی امدادی سامان لے کر آنا تھا مگر پورٹروں کے ناساز ہونے

کی وجہ سے نہ آ سکے۔ اگلے دن وہ امدادی سامان اور آکسیجن لے کر کیمپ پانچ پہنچے۔ ان کے سامان میں دوسری اشیا کے علاوہ آکسیجن بھی تھی۔ اس دن انھوں نے بوہل کو تلاش کرنے نکلنا تھا مگر اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں بوہل کو تلاش کرنا بیسود تھا، چنانچہ انھوں نے یہ مہم اگلے دن پر موخر کر دی۔

انھوں نے پھر 1934 میں مرنے والوں کی یاد میں ایک چھوٹی سی یادگار قائم کی۔ اس تقریب کے بعد کیمپٹر پورٹروں کے ہمراہ واپس چلا گیا۔

فرانبر گر یادگار کے پاس کھڑا تھا جب اس نے دور سلبر ساڈل پر ایک دھبہ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ بوہل تھا جو 40 گھنٹے بعد واپس آ رہا تھا۔ وہ بوہل کو فوراً کیمپ میں لے گئے اور اسے آکسیجن اور گرم چائے دی۔ یہ ان کے لیئے جزباتی لمحات تھے، وہ ہنس رہے تھے اور رو رہے تھے۔ انھوں نے ریڈیو کے ذریعہ کامیابی کی خبر دوسرے ساتھیوں کو بھی پہنچائی۔ مہم کے دوران بوہل کے پیروں پر سردی کا اثر ہو گیا تھا، ان کا خیال تھا کہ یہ معمولی ہے۔ فرانبر گر رات گئے بوہل کے پیروں کی مالش کرتا رہا۔

جولائی کو وہ بیس کیمپ پہنچے۔ بوہل ابھی تک کمزوری اور تھکن محسوس کر رہا 7

تھا۔ ہرلیکوفر نے جب بوہل کے پیر کا معاینہ کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ فراسٹ بائٹ خطرناک ہے۔ کچھ دن بعد انھوں نے واپسی کا سفر شروع کیا اور اسی دن بارشیں بھی شروع ہو گئیں۔ بوہل کو بیس کیمپ سے روڈ تک لے جایا گیا۔ ان کی ٹیم راستے میں جہاں کہیں آبادی سے گزرتی لوگ لوگ جرمنی زندہ باد کے نعروں سے ان کا استقبال کرتے۔ ہرمن بوہل کا گلگت ہسپتال میں علاج ہوا پھر لاہور ہسپتال میں اس کے پاؤں کی دو انگلیاں بیکار ہو گئی تھیں جو کاٹنی پڑیں۔

کراچی میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں صدر پاکستان نے ساری ٹیم کو میڈلوں سے نوازا۔ تین سال بعد بوہل دوبارہ پاکستان آیا۔ اس بار وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تھا۔ ان کی ٹیم کا لیڈر مارکس شمکٹ تھا۔ ان کے علاوہ دو کوہ پیما فرٹز ونٹرسٹیلر اور کرٹ ڈیمبرگر شامل تھے۔ بوہل ان میں کوہ پیماء سے متعلق سب سے زیادہ تجربہ رکھتا تھا۔ وہ یہاں قراقرم کے برف زار میں واقع دنیا کی بارہویں بلند ترین چوٹی براڈ پیک سر کرنے آئے تھے۔ براڈ پیک کے اردگرد دنیا کی کئی بلند چوٹیاں ہیں۔ یہاں سارا سال برف جمی رہتی ہے اور ٹمپریچر منفی درجہ حرارت میں رہتا ہے۔ اس مہم کے لیئے انھوں نے پورٹروں کی خدمات حاصل نہیں کی اور نہ ہی وہ آکسیجن لائے تھے۔ موسم سے مطابقت کے بعد انھوں نے کوہ پیماء کا آغاز کیا۔

بوہل ڈیمبر گر کے ساتھ تھا، شمک اور ونٹر سٹیلر ساتھ تھے۔

چوٹی سے کچھ دور بوہل نے محسوس کیا کہ وہ مزید آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ نانگا پربت پر فراسٹ بائٹ سے متاثر ہونے والا پیر رکاوٹ بن گیا تھا۔ ڈیمبر گر اکیلا ہی چوٹی تک پہنچا۔ یہ 9 جون 1957 کا دن تھا۔ شمک اور ونٹر سٹلر بھی چوٹی تک پہنچے اور واپس پلٹ گئے۔ ڈیمبر گر نے بھی واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اسے راستے میں بوہل ملا جو مشکل کے باوجود چوٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ڈیمبر گر بھی دوبارہ اپنے ساتھی کے ساتھ چوٹی پر پہنچا۔ دونوں نے براڈ پیک کی چوٹی سے غروب ہوتے سورج کا سحر انگیز منظر دیکھا۔

بیس کیمپ میں چند دن آرام کے بعد شمک اور ونٹر سٹیلر نے سکل بروم نامی چوٹی سر کرنے کا پروگرام بنایا۔ براڈ پیک کی کامیابی کے گیارویں دن وہ سکل بروم کی چوٹی پر تھے۔ دوسری طرف بوہل اور ڈیمبر گر نے چوغولیزا پر کوہ پیماء کا منصوبہ بنایا۔

چوغولیزا سطح سمندر سے 7668 میٹر بلند ایک شاندار پہاڑی ہے۔ تین دنوں میں بوہل اور ڈیمبر گر نے طوفانی انداز میں نوے فیصد فاصلہ مکمل کر لیا تھا۔

28 جون کو انھوں نے صبح پانچ بجے اپنا کیمپ چھوڑا اور کوہ پیمائی کا آغاز کیا۔ انہوں نے آج چوٹی پر پہنچنا تھا۔ بوہل بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے

ڈیمبر گر کو بتایا کہ اس کی ہمیشہ خواہش تھی کہ وہ اس طرح کے کسی شاندار پہاڑ کو راستے کی رکاوٹوں کے بغیر ایک ہی ہلے میں سر کرے۔

چند گھنٹوں بعد ہی اچانک موسم بدلنے لگا اور طوفان کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ چوٹی سے صرف تین سو میٹر دور تھے جب انھیں محفوظ مقام کے لیئے واپس اترنا پڑا۔ ڈیمبر گر رہنمائی کر رہا تھا۔ دھند اور کہر میں کچھ صاف نظر نہ آ رہا تھا۔

اچانک ڈیمبر گر کو اپنے پیروں کے نیچے لرزش سی محسوس ہوئی۔ وہ اس وقت برف کے ایک چھجے کے کنارے پر تھا جو کھوکھلا اور پتلی برف کا تھا۔ اس نے فوراً پہاڑ کی طرف چھلانگ لگا دی اور لڑھکتا ہوا محفوظ جگہ تک پہنچ گیا۔ بوہل کہیں نظر نہیں آ رہا تھا وہ تھوڑی دیر انتظار کرتا رہا پھر اسے تلاش کرنے دوبارہ خطرے والی جگہ کی طرف بڑھا۔ برف میں اس کے قدموں کے نشان کے ساتھ بوہل کے قدموں کے نشان بھی تھے جو برف کے اس چھجے کی طرف بڑھ رہے تھے جو پہاڑ سے ٹوٹ کر نیچے کہیں غائب ہو چکا تھا۔ نیچے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ ڈیمبر گر تیزی سے بیس کیمپ کی طرف اترا۔ وہاں شمک اور ونٹر سٹیلر بھی اس کے ساتھ بوہل کو تلاش کرنے نکلے مگر بوہل کا کہیں سراغ نہ ملا۔

آج ہرمن بوہل کی موت اور نانگا پربت کی تسخیر کو ساٹھ سال سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب تک کئی کوہ پیما نانگا پربت کی چوٹی سر کر چکے ہیں، لیکن کوہ پیماء کی تاریخ میں جو مقام ہرمن بوہل کو حاصل ہے، وہ آج تک کسی اور کوہ پیما کو نہ مل سکا۔

ترکی میں نظریہ کی فتح عوام نے اپنے خون سے نئی تاریخ رقم کردی

ترکی میں 'بغاوت' ایک بم تھا جو رات کے اندھیرے میں گرا، لیکن اس بم کو ترکی عوام نے پھٹنے سے پہلے ہی اپنے خون، جوش، جذبے اور قربانیوں ناکام بنا دیا۔ فوجی بغاوت کی خبریں رات تک ساری دنیا میں پھیل گئی تھیں۔ لیکن صبح ہوتے ہوتے ترک عوام نے اپنے بے مثل جذبے اور قربانیوں سے ایک اور تاریخ رقم کردی ہے۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے ترک وزیر اعظم بن علی یلدرم نے ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے دنیا کو بتایا کہ اس بغاوت کو ناکام بنا دیا گیا ہے۔ سولہ جولائی کی صبح استنبول ایک روشن اور تابناک صبح تھی۔ جس نے تاریکی کو شکست دے دی۔ عوام نے باغیوں اور ان کے حمایتیوں کو بھرپور جواب دیا۔ وزیر اعظم بن علی یلدرم نے انقرہ میں ملکی پارلیمان کا ایک ہنگامی اجلاس کیا اور اب پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔ میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق اس ناکام بغاوت کے دوران انقرہ میں پارلیمان کی عمارت کو بھی شدید نقصان پہنچا، جس کی وجہ باغی فوجی اہلکاروں کے زیر استعمال جنگی ہیلی کاپٹروں سے کیے جانے والے فضائی حملے تھے۔ ان حملوں اور پھر مسلح بغاوت کے کچل دیے جانے کے بعد سرکاری ٹیلی وژن سے نشر کی گئی ویڈیو فوٹیج میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح ان حملوں سے پارلیمان کی عمارت کی متعدد دیواریں گر گئیں اور بہت سی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ترک فوج اور عوام کے

تعلقات بہت اچھے تھے۔ لیکن رات کی تاریکی میں جب فوج نے عوام پر گولیاں اور بم برسائے تو وہ غم وغصہ سے بھر گئے۔ اور پھر گلی کوچوں اور سڑکوں پر ایک جنگ کا آغاز ہوا۔ ناکام بغاوت کے آغاز پر ترک فوج کے ایک حصے نے متعدد ایف سولہ جنگی طیارے اور جنگی ہیلی کاپٹر اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ صدر رجب طیب ایردوآن کے دفتر کے مطابق یہ بغاوت 'ترک فوج کے اندر ایک گروپ' نے کی تھی اور اس کا یہ عمل عسکری کمان کے معمول کے طریقہ کار سے باہر' تھا۔ صدر ایردوآن کی طرف سے یہ' بھی کہا گیا ہے کہ ملکی فوج کو ایسے تمام باغی یا باغیانہ سوچ رکھنے والے عناصر سے پاک کر دیا جائے گا۔ رات میں فوج کے ایک گروپ نے ایک ٹی وی چینل کی عمارت میں داخل ہو کر ایک اینکر سے فوجی بغاوت اور مارشل لاء اور کرفیو کے نفاذ کا اعلان کرایا، دوسری جانب صدر طیب اردگان کے ویڈیو پیغام نے عوام کو ایک جوش اور جذبہ سے گھروں سے نکلنے کی راہ ہموار کر دی۔ بغاوت ناکام رہنے کے بعد مشتعل شہریوں نے آبنائے باسفورس پر بنے ایک پل پر تعینات باغی فوجیوں کی پٹائی بھی کی۔ اس بناکام بنا دی گئی فوجی بغاوت میں قریب دو سو افراد مارے گئے۔

فوجی بغاوت کی اس خونریز کوشش کے دوران کم از کم 194 افراد مارے گئے جبکہ فوج کے ڈیڑھ ہزار سے زائد اہلکاروں (1563 فوجیوں اور افسران) کو گرفتار بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ محتاط اندازہ ہے، اس کی تفصیلات میں اصل نقصان

کا اندازہ ہوگا۔ فی الحال ان ہلاکتوں کی تصدیق آرمڈ فورسز کے قائم مقام سربراہ جنرل امید دوندار نے کی ہے۔ایک اعلیٰ حکومتی اہلکار کے بقول گرفتار کیے گئے فوجی اہلکاروں میں پانچ جنرل اور کم از کم 29 کرنل بھی شامل ہیں، جنھیں فوج سے برطرف کرکے حراست میں لیا جا چکا ہے۔ وزیر اعظم بن علی یلدرم کے مطابق گزشتہ رات اس ناکام بغاوت کے دوران ایک ایسا فوجی جنرل مارا بھی گیا، جو اس بغاوت کا حصہ تھا۔
ابھی تک یہ واضح نہیں کہ اس بغاوت کے پیچھے مرکزی محرک شخصیات کون سی تھیں۔ لیکن فتح اللہ گولن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ اس کے پیچھے ہیں۔ اور وہ امریکہ میں بیٹھے ہیں۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اوکے پیچھے کونسی طاقتیں ہیں۔اس ناکام بغاوت کی بہت سے اعلیٰ فوجی کمانڈروں اور ملک کی چاروں بڑی سیاسی جماعتوں کی طرف سے بھرپور مذمت کی گئی ہے۔ ان سیاسی جماعتوں میں صدر ایردوآن اور وزیر اعظم یلدرم کی حکمران پارٹی اور اپوزیشن کی تینوں بڑی سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ بغاوت کی کوشش کے دوران صدارتی محل میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے فوجی گرفتار کر لیے گئے۔ترکی کے صدر رجب طیب ایردوآن نے حکم دیا ہے کہ 13 باغیوں کے زیر استعمال لڑاکا طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو مار گرایا جائے۔ ایک ترک عہدیدار نے بتایا کہ صدر ایردوآن کہ حامی ترک فضائیہ کے لڑاکا طیارے مغربی ترکی کی اکی شہر ائر بیس سے اڑان بھرنے کے

بعد باغیوں کے زیر استعمال جہاز اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کر رہے ہیں۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کا آغاز جمعے کی شام ساڑھے سات بجے ہوا جب استنبول کے مرکزی پلوں پر ٹینک کھڑے کر دیے گئے۔ کچھ دیر بعد انقرہ کی سڑکوں پر فوجی نظر آنے لگے اور جنگی طیاروں نے بھی شہر پر پروازیں شروع کر دیں۔ فوج سے تعلق رکھنے والے ایک گروپ نے سرکاری ٹی وی پر یہ اعلان کیا کہ ملک میں مارشل لا اور کرفیو لگا دیا گیا ہے، اقتدار ان کے پاس ہے اور ایک 'امن کونسل' اب ملک کا نظام چلائے گی۔ استنبول کے مشہور تقسیم چوک کے قریب اور انقرہ میں پارلیمان کی عمارت میں دھماکوں کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ دوسری جانب صدر اردوغان نے آئی فون کی فیس ٹائم سروس کی مدد سے ترک ٹی وی پر بیان دیا جس میں انھوں نے عوام سے بغاوت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی۔

اس اعلان کے بعد عوام کی بڑی تعداد سڑکوں پر نکل آئی اور باغی فوجیوں کے خلاف مزاحمت شروع کر دی۔ صدر رجب طیب اردوغان بیرونِ ملک سے واپس استنبول پہنچ کر اس بات کا اعلان کیا کہ وہ موجود ہیں ان کی حکومت نے ایک بار پھر ملک کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ صدر اردوغان نے اس فوجی اقدام کو 'ملک سے بغاوت' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ فوج میں صفائی ہونی چاہیے۔ ترک صدر نے علی الصبح اپنے نشریاتی خطاب میں کہا کہ فوج کے ایک چھوٹے سے گروہ کی طرف سے بغاوت کی سازش کو عوام نے ناکام بنا دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فوج میں شامل

غداروں کو سخت سزا دی جائے گی۔ترکی کی صورتحال پر عالمی رہنماؤں نے بھی تشویش کا اظہار کیا۔ترک فوج کے مختلف شعبوں کے چوٹی کے کمانڈرز نے ٹیلی وژن پر آ کر جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کو رد کرنے کا بھرپور اظہار کیا ہے۔اسی غیر یقینی صورتحال میں ہفتے کی صبح ترک صدر رجب طیب ایردوآن استنبول کے ہوائی اڈے پہنچے تو ان کے سینکڑوں حامیوں نے وہاں ان کا پرتپاک استقبال کیا۔اس موقع پر انہوں نے کہا کہ عوام نے اپنے عزم سے اس سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ایردوآن کا کہنا تھا کہ وہ اپنے عوام کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے بلکہ اپنے ملک میں ہی رہیں گے۔ انہوں نے واضح کیا کہ بغاوت کرنے والوں کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا ہو گا۔

ترک صدر کا مزید کہنا تھا کہ بغاوت کی اس کوشش کے بعد ملکی فوج میں 'آپریشن کلین اپ' ناگزیر ہو گیا ہے۔ایردوآن کا کہنا تھا کہ ملکی عوام کی وجہ سے یہ بغاوت ناکام ہوئی ہے۔ایردوآن کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس بغاوت کے پیچھے امریکا میں مقیم ترک مذہبی رہنما فتح اللہ گولن کا کردار تھا۔ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق انقرہ اور استنبول سے کم از کم پچاس باغی فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔تاہم ساتھ ہی ان دو اہم شہروں میں تشدد کی اطلاعات بھی موصول ہو رہی ہیں۔جمعے اور ہفتے کی رات کے دوران وہاں متعدد دھماکوں کی اطلاع بھی ملی جبکہ ذرائع ابلاغ نے بتایا کہ مسلسل فائرنگ بھی ہوتی

رہی۔ترکی کے حکام ملک کو جلد از جلد معمول پر لانے کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ ہوائی اڈوں،پلوں اور سڑکوں کو دوبارہ کھولنے میں مصروف ہیں۔ ٹینک کے گولوں سے پارلیمنٹ کی عمارت کو شدید نقصان ہونے کے باوجود ممبران غیر معمولی بہادری سے ڈٹے رہے۔ترکی کی یہ بغاوت دراصل سیکولر عناصر کی جانب سے تھی۔ جو مسلسل طیب اردگان کے نظریاتی کردار اور اس کی جانب سے اٹھائے اقدامات اور ان کی عوامی مقبولیت سے خوفزدہ ہیں۔ترکی کے ریسرچر مائیکل روبن کا کہنا ہے کیا بغاوت ناگزیر تھی؟ نہیں۔ لیکن جنھوں نے بغاوت کی ان کا سوچنا یہ تھا کہ وہ ترکی کو عوام سے دور اور نظریاتی لیڈرشپ سے بچا رہے ہیں۔ یہ عناصر اردگان کی حکومت میں بدعنوانی کے الزامات لگاتے ہیں۔ جن کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔وہ ان کی جارحانہ پالیسیوں سے بھی خوفزدہ ہیں۔ ان عناصر کا خیال تھا کہ ان کے لئے یہ آخری موقع ہے کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اس بغاوت کو فرد کرنے میں شوشل میڈیا کا کردار بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اردگان اس دوران ملک سے باہر تھے۔ انھوں نے اسکائپ پر اپنے عوام کو پیغام بھیجا۔ جبکہ ترکی میں موجود صحافی ایلو سکوٹ نے ایک پیغام ٹویٹ کیا ہے جو ان کے بقول صدر طیب اردوغان نے لوگوں کو بھیجا تھا۔ اس پیغام میں صدر نے عوام سے حکومت کی حمایت کرنے کی اپیل کی تھی۔انقرہ کے فوٹو گرافر پیرو کسٹیلانو نے کا کہنا ہے کہ عوام اس وقت سڑکوں پر آئی جب صدر اردوغان نے ٹی وی پر لوگوں سے حمایت کی اپیل کی۔

لوگ مرکزی سکوائر کی جانب روانہ ہو گئے اور ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے سامنے ' آئے اور پھر خونریز جنگ شروع ہوئی۔''اس کی توقع نہیں کی جا رہی تھی۔ عوام اور فوج کے درمیان گہرے روابط ہیں یا کم از کم کل رات تک تھے۔ اسی لیے لوگ اس وقت حیران رہ گئے جب فوج نے لوگوں پر فائرنگ کی۔ اور اسی نے انھیں غم وغصے سے بھر دیا۔ہلاک ہونے والوں میں زیادہ تر عام شہری ہیں۔

اے کے جماعت کی تشکیل کے ایک سال بعد ہی ترکی کے صدر طیب اردوغان 2002 میں برسرِ اقتدار آئے۔ 61 سالہ اردوغان 11 سال ترکی کے وزیرِ اعظم رہے اور اگست 2014 میں پہلے براہ راست منتخب ہونے والے صدر بنے۔ باغیوں نے ترکی کی فوج کے سربراہ اور ملٹری چیف آف سٹاف ہلوزی اکار کو انقرہ کے شمال مغربی علاقے میں واقع ایئر بیس میں ایک جگہ محصور کر دیا تھا۔ جنھیں بعد میں سکیورٹی فورسز نے ریسکیو کر لیا ہے۔اس سے قبل کہا جا رہا تھا کہ باغی فوجیوں نے ان کو یرغمال بنالیا اس 'فوجی بغاوت' کی بظاہر ناکامی کی تین وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ استنبول کی یونیورسٹی کے سینٹر فار سکیورٹی سٹڈیز میں پولیٹیکل سائنس اور انٹرنیشنل ریلیشنز کے شعبے کے سربراہ گلنور ایبت نے ایک عالمی نشریاتی ادارے سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں فوجی بغاوت کی بظاہر ناکامی کی تین وجوہات دکھائی دیتی ہیں۔ تختہ الٹنے کی کوشش میں بہت کم تعداد

میں فوجی شریک ہوئے۔ سینیئر کمانڈر اس کوشش کی مذمت میں کھل کر سامنے آئے۔ عوام اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے باہر نکلے۔ امریکہ میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے والے ترکی کے رہنما فتح اللہ گولین نے گو اس بات کی تردید کی ہے کہ ترکی میں حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کے پیچھے ان کا ہاتھ ہے۔ لیکن کوئی ان کی بات پر یقین نہیں کر رہا ہے۔ بغاوت کی ناکامی کے باوجود برطانوی خبر رساں ایجنسی روئٹرز یہی خبر دیتی رہی کہ اس کو باغی فوجیوں کے گروہ کی جانب سے ایک بیان ای میل کیا گیا ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ وہ 'اب بھی پر عزم طریقے سے لڑ رہے ہیں'۔ ترکی کی فوجی بغاوت کی ناکامی پر مغرب ششدر ہے۔ امریکہ جس نے مصر کی جمہوری حکومت کو ختم کرنے کے بعد ایک آمر فوجی جنرل کی حمایت کی ہے، وہ اس بار اپنی سازش میں ناکام رہا ہے اور اب وہ شکست پر اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ اور اب جمہوری حکومت کی حمایت کے بیانات دے کر اپنی شرمندگی اور خفت کو چھپا رہا ہے۔

دہشت گردی کے نام پر ساری دنیا کے امن کو تاراج کرنے والی قوتیں بے بسی کا شکار ہیں

فرانس میں دہشت گردی کی حالیہ لہر کے بعد ایک جانب تو فرانسیسی حکومت کی جانب سے مسلمانوں اور مساجد پر پابندی لاگائی جارہی ہے تو دوسری جانب پوپ فرانسس نے اسلام اور تشدد کے درمیان ربط کو مسترد کردیا،، حالیہ تناظر میں پوپ کے اس بیان،، کو فرانس میں مسلمانوں کے خلاف پابندی کی مہم میں ایک مثبت پیش رفت کہا جاسکتا ہے۔ پولینڈ سے واپسی کے دوران طیارے میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے پوپ کا کہنا تھا کہ "میرے نزدیک اسلام کو تشدد کے ساتھ جوڑنا درست نہیں"۔ دوسری جانب فرانسی حکومت نے انسداد شدت پسند کے پرگرام کے تحت اب تک 20 مساجد کو تالے لگانے اور کم سے کم 80 آئمہ مساجد اور مذہبی رہ نماؤں کو ملک سے بے دخل کردیا ہے۔ 77 سالہ کیتھولک فرقے کے روحانی پیشوا نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ "میں روزانہ اخبار میں اٹلی میں تشدد کے واقعات پڑھتا ہوں۔ کوئی اپنی دوست خاتون کو قتل کردیتا ہے تو کوئی اپنی ساس کو۔۔ یہ لوگ کٹر کیتھولک ہوتے ہیں"۔ انہوں نے مزید کہا کہ " اگر میں اسلام کے تناظر میں تشدد کی بات کروں تو پھر مجھ پر لازم ہے کہ نصرانیت کے تناظر میں تشدد کے بارے میں بھی گفتگو کروں۔ تقریبا ہر مذہب میں بنیاد پرستوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ضرور رہتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے یہاں بھی موجود ہیں"۔پوپ نے اس بات پر

زور دیا کہ تشدد کے پیچھے حقیقی سبب مذہب نہیں ہے۔انہوں نے غیر ملکیوں کے خلاف نسل پرستی اور عداوت پھیلانے والی عوامیت پسند جماعتوں میں اضافے سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ "جس طرح چھرے سے قتل کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح زبان سے بھی یہ عمل پورا ہو سکتا ہے"۔پوپ فرانسس کے مطابق " ہم نے اپنے کتنے ہی نوجوانوں کو بے روزگار چھوڑ دیا جس کے نتیجے میں ان لوگوں نے منشیات ، شراب نوشی اور بنیاد پرست جماعتوں کا رخ کر لیا ہے۔ گذشتہ برس نومبر کے بعد سیفرانس میں نفرت پھیلانے والے مراکز اور اداروں کے خلاف آپریشن جاری ہے۔فرانسیسی حکومت نے انتہا پسندی کے الزام میں تین اسلامی تنظیموں پر پابندی عاید کرتے ہوئے ان کے زیرانتظام چلنے والے اداروں اور مساجد کو بھی بند کر دیا ہے۔ حکومت نے انتہا پسندی میں ملوث جن تین اسلامی این جی اوز پر پابندی عاید کی ہے۔ان میں سے ایک تنظیم کے زیراہتمام پیرس میں ایک مسجد بھی قائم کی گئی تھی جسے پچھلے سال نومبر میں ہونے والے دہشت گردانہ حملوں کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔فرانسیسی پولیس نے پچھلے سال دسمبر کے اوائل میں پیرس کے نواحی علاقے لانیی سورمارن کے مقام پر ایک مسجد کی تالابندی کر دی تھی۔ یہ اقدام 13 نومبر کو پیرس میں ہونے والی دہشت گردی کے رد عمل میں کیا گیا تھا۔ تیرہ نومبر 2015ء کو فرانس میں دہشت گردی کے واقعات میں 130 افراد ہلاک ہو گئے تھے اور ان حملوں کی ذمہ داری ''داعش'' نے قبول کی تھی۔جس کے بعد عالمی برادری نے فرانس کے ساتھ بھرپور یکجہتی کا

اظہار کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے ترکی اور دیگر اسلامی مملکت میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات پر فرانس اور مغرب نے چپ سادھ لی ہے۔ فرانسیسی وزیر داخلہ مسٹر کازنوف فرانس میں جید علماء کرام کی نگرانی میں مساجد کے آئمہ کرام کی تربیت کا ایک پروگرام بھی متعارف کرا رہے ہیں۔ جس میں آئمہ کو اسلام کی اعتدال پسندانہ تعلیمات سے روشناس کرایا جائے گا۔ فرانس کی حکومت نے ملک میں دہشت گردی کے بڑھتے واقعات کے پیش نظر پولیس کی معاونت اور امن وامان برقرار رکھنے کے لیے 10 ہزار فوجی اہلکار تعینات کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جو امن کے قیام میں پولیس کی مدد کریں گے۔ فرانس جہاں سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے، حالیہ واقعات کے بعد مضطرب دکھائی دیتا ہے۔ شہری آبادی کے تحفظ اور سیاحتی مقامات میں سیکیورٹی کے لیے پیرس میں 4000 اور ملک کے دوسرے شہروں میں 6 ہزار مزید فوجی تعینات کیے جا رہے ہیں۔ فرانسیسی حکومت داعش کے خلاف جنگ کرنے والے اتحادی ممالک میں شامل ہے۔ فرانسیسی وزیر دفاع نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ،،پولیس کی معاونت کے لیے فوج کو سڑکوں پر سیکیورٹی کی ذمہ داری سونپا شدت پسند گروپ دولت اسلامی 'داعش' کے خلاف ہماری جنگ کا حصہ ہے،،۔ان کا کہنا ہے کہ داعش کے جنگ کے لیے فرانس بیرون ملک آپریشن جاری رکھے گا۔ پارلیمنٹ نے رواں سال ستمبر میں فرانسیسی بحری بیڑا چارل ڈیگال عراقی فورسز کی معاونت کے لیے روانہ کرنے کی منظوری دے رکھی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ ستمبر کے اوائل ہی میں متحدہ عرب امارات اور اردن

سے فرانسیسی طیارے داعش کے ٹھکانوں پر بمباری میں مزید شدت لائیں گے۔ فرانسیسی حکومت کے ترجمان اسٹیفن لوفول نے کہا ہے کہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف ان کی جنگ پوری قوت سے جاری رہے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ نفرت کے مبلغین کے خلاف جنگ کو مزید وسعت دی جائے گی۔ 2001 کے بعد ساری دنیا میں دہشت گردی کو روکنے کے نام پر طاقت کا جو استعمال کیا گیا ہے، اس نے پوری دنیا کو آگ اور خون کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب ان مملک میں بھی دہشت گردی کے واقعات جنم لے رہے ہیں۔ جو اس سے پہلے امن اور شانتی میں تھے۔ برطانوی خبر رساں ادارے رائٹرز کے مطابق سال 2014 میں دنیاکے 95 ممالک شدت پسندی کے 13 ہزار463 واقعات پیش آئے اور اس میں 32 ہزار سات سو زائد افراد ہلاک ہوئے ۔ پاکستان بھی میں 706 دہشت گردی کا نشانہ بنا رہا۔ ان دہشت گرد حملوں میں 1325 2015 انسانی جانیں ضائع ہوئی جن میں 619 شہری اور348 سیکیورٹی اہلکار تھے۔ جبکہ 325 دہشت گرد بھی مارے گئے۔ دہشت گردی میں اضافے کی بڑی وجہ عراق اور شام میں شدت پسند تنظیم دولتِ اسلامیہ، نائجیریا میں بوکو حرام اور افغانستان میں طالبان کی کارروائیاں بتائی جاتی ہیں۔ اس وقت دولتِ اسلامیہ کو سب سے بڑی دہشت گرد تنظیم کہا جارہا ہے۔ اس میں بڑی تعداد میں غیر ملکی جنگجو شامل ہو رہے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق 'دسمبر کے آخر تک 16 ہزار غیر ملکی دہشت گرد شام گئے ہیں۔ 'دولتِ اسلامیہ نے 2014 میں عراق اور شام میں غیر معمولی پر علاقوں پر قبضہ کیا ہے اور اس کی غیر ملکی شدت پسندوں کو

بھرتی کرنے کی صلاحیت برقرار ہے اور اس نے لیبیا، نائجیریا اور مصر میں اتحاد قائم کر لیا ہے۔ اس باب میں نئی پیش رفت یہ ہے کہ مغرب میں کسی شدت پسند گروپ سے تعلق نہ رکھنے والے شدت پسندوں کے حملوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس پر مغربی دانشور خاموش ہیں۔ دہشت گردی کے نام پر ساری دنیا کے امن کو تاراج کرنی والی قوتیں کس بے بسی کا شکار ہیں۔ اس کا اندازہ ایک امریکی اہلکار کہ اس اعترافی بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ ،، دہشت گردی کے جس چیلینج کا ہمیں سامنا ہے وہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور ہمیں درست اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ یہ آئندہ دہائی بلکہ یہاں تک کہ ایک سال کے اندر کیا شکل اختیار کرے گا،،۔

فاران کلب میں الطاف حسن قریشی کی کتاب ،، ملاقاتیں کیا کیا،، کی تقریب پذیرائی

فاران کلب کی اکثر تقریبات کراچی شہر میں علم عرفان ، سماجی رابطے، علمی مباحث اور شعر و شاعری سے سجی ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک یادگار تقریب گذشتہ دنوں ہوئی تو یوں لگا جیسے کراچی علم و ادب ، شعر و سخن کا مرکز و محور بن گیا ہو۔ اس تقریب میں شہر ہی نہیں بلکہ بیرون شہر سے بھی علم و ادب کے شناور شریک تھے۔ ہفتہ کی شب ہونے والی اس تقریب میں بڑی تعداد میں ادیب ، صحافی ، شعراء، ادب نواز شریک ہوئے، یہ تقریب تھی سینئر صحافی الطاف حسن قریشی کی کتاب ''ملاقاتیں کیا کیا'' کی تقریب پذیرائی کی۔ جس میں سینئر صحافی مجیب الرحمٰن شامی ،جماعت اسلامی کے معراج الہدیٰ صدیقی، سینئر صحافی سجاد میر، معروف شاعرہ فاطمہ حسن،اینکر انیق احمد،کالم نویس صحافی روف طاہراور وفاقی سیکریٹری ارشاد کلیمی، الطاف حسن قریشی کے پوتے عارف حسن نے اظہار خیال کیا۔ یہ تقریب سیاست، صحافت اور ادب کا حسین امتزاج تھا۔ وزیر اعظم کے مشیر عرفان صدیقی نے تقریب میں کتاب اور صاحب کتاب سے زیادہ حکومت کی صفائی اور حکمران مخالف پر لب کشائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ آپریشن ضرب عضب سے دہشت گردی میں کمی ہوئی ہے اور دہشت گردی جلد ختم ہو جائے گی۔ملک میں آئین پر عملدرآمد کھلونا بن گیا ہے۔ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے پارلیمنٹ میں نہیں آتے بلکہ مسائل کا حل ڈی

چوک کو سمجھتے ہیں۔ مسائل کا حل پارلیمنٹ ہے ڈی چوک نہیں ہے۔ آئین اور قانون راہ پر چلتے رہتے تو آج بہت آگے کھڑے ہوتے۔ وزیر اعظم کے مشیر کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ اس لئے پارلیمنٹ میں نہیں آتے کے وزیر اعظم متنازعہ ہیں۔ اختلاف کرنا حزب اختلاف کا حق ہے لیکن مسائل کا حل ڈی چوک نہیں پارلیمنٹ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ماضی میں دیکھیں تو محرومیوں کی ایک طویل داستان ملتی ہے، ملک کی 70 سالہ تاریخ کا طویل حصہ مارشل لاء کی نظر ہوگیا۔ افسوس کہ ہماری تاریخ سیاہ ضرور ہے لیکن کوشش کرکے اس کے اثرات کو روکا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں توانائی بحران سے زیادہ ذہنی، علمی اور فکری بحران بڑا ہے جو سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ معاشرے میں برداشت اور رواداری ختم ہو گئی ہے اور گفتگو کے سلیقے کو فراموش کر دیا ہے۔ انہوں نے الطاف حسن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ الطاف حسن قریشی نے انٹرویوز کو تخلیقی ادب کا حصہ بنا دیا ہے ان کے کئے گئے انٹرویوز میں ادب لطیف کی تمام اصناف کا مکمل عکس ملتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میڈیا کو اپنی سمت درست کرنے کی ضرورت ہے صحافت میں آنے والے نوجوانوں کی تربیت کے لئے اکیڈمی قائم ہونی چاہیے۔ مجیب الرحمٰن شامی نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کی یوم اقبال کی تعطیل ختم کرنے کے فیصلے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ یوم اقبال کی تعطیل کو اگر پیپلز پارٹی ختم کرتی تو ن لیگ کی حکومت اس کا حشر نشر کردیتی۔ اور آج اس چھٹی کو بحال کر دیتی۔ چھٹی بحال کرنے کے معاملے پر مریم نواز سے بات ہوئی تو انہوں نے

کہا تھا کہ ہم نے چھٹی بحال کر دی ہے لیکن نہیں ہوئی، وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے بتایا کہ چھٹی میں نے ختم کرائی ہے تاکہ تعلیمی اداروں میں طلبہ علامہ اقبال کے فلسفے کو جان سکیں۔انہوں نے کہا کہ امید ہے کہ آئندہ سال یوم اقبال کی چھٹی بحال ہوگی۔ورنہ چھٹی تو سب کی ہو سکتی ہے۔انہوں نے کہا کہ آئین اور منتخب حکومت کو کسی بھی صورت فوجی طاقت کے ذریعے ختم نہیں ہونا چاہیے۔بار بار مارشل لاء نہ لگتا تو آج ملک میں دہشت گردی اور فرقہ واریت نہ ہوتی۔ملک کا نظام دستور کے تحت چلنا چاہیے۔خبر لیکس سے اتنا نقصان نہیں ہوا ہے جتنا اس کے بعد کئے گئے پروپیگنڈے سے ہوا ہے۔امیر جماعت اسلامی صوبہ سندھ معراج الہدیٰ صدیقی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ قومی اخبارات وجرائد میں شائع ہونے والے کالم کمال دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی رائے سے کالم نگاروں کو بھی مطلع کرتے ہیں، اس کی رسید دیتے ہوئے مجیب الرحمٰن شامی نے کہا کہ ان کے کمنٹس سب سے پہلے آتے ہیں اب یہ بات معلوم نہیں کہ وہ کالم پڑھتے بھی ہیں یا نہیں۔اس موقع پر معراج الہدیٰ صدیقی نے کہا کہ الطاف حسن قریشی کی کتاب تاریخ پاکستان ہے، جس کو پڑھ کر اندازا ہوتا ہے کہ الطاف حسن قریشی کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔یہ انٹرویوز کی نہیں بلکہ تاریخ کی کتاب ہے۔آج ہمارے میڈیا کو تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کی ضرورت ہے۔میر مجلس الطاف حسن قریشی نے اپنی تقریر میں حکومت کو بھی آئینہ دکھایا، اور کہا کہ اگر حزب اختلاف کے لوگ پارلیمنٹ میں نہیں آتے

تو وزیر اعظم کا بھی پارلمنٹ سے کیا سلوک ہے، مہینوں بلکہ سال سال بھر اجلاس میں نہیں آتے، کشمیر ایشور پر پارلمنٹ میں شریک ارکان کی تعداد صرف 26 تھی۔اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہوگی ۔انہوں نے کہاکہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم سمیت کئی وزراء بھی نہیں جاتے حکومت بھی اپنی کارکردگی پر توجہ دے۔صرف ایک جانب کی بات نہیں ہونی چاہیے۔انھوں نے کہاکہ 1956 میں دائیں اور بائیں جماعتوں کے اتفاق سے بننے والے آئین کو ختم کردیاگیا یہ آئین سب کو متحد رکھنے کی عمارت قائم ہو سکتی تھی۔انہوں نے کہاکہ ایوب خان کے مارشل لاء دور میں محترمہ فاطمہ جناح سے انٹرویو کیا تھا جو مارشل لاء کی وجہ سے کسی اخبار میں شائع نہ ہوسکا تاہم کتاب کے آئندہ شمارے میں شامل ہوگا۔انہوں نے کہاکہ محترمہ شہید بے نظیر بھٹو صحافتی آزادی کے معاملے میں اپنے والد سے زیادہ سمجھدار ثابت ہوئی۔انہوں نے کہاکہ آج کل ٹی وی شو پر نشر ہونے والے ٹاک شوکے ذریعے بے یقینی کا کلچر تقویت پا رہا ہے۔صحافی سجاد میر نے کہاکہ الطاف حسن ہماری صحافت کے داتا گنج ہجویری ہیں،اگر الطاف ھسن قریشی نہ ہوتے تو ہم سے کوئی بھی نہ ہوتا۔ یہ جو انجمن آج یہاں نظر آرہی ہے، ان میں سے بیشتر کا تعلق کسی نہ کسی صورت الطاف حسن قریشی سے رہا ہے۔صحافی روف طاہر نے کہاکہ ایک آمر ایوب خان تھا تو ملک میں ذوالفقار علی بھٹو کی بھی آمریت اس ملک میں رہی ہے۔جب حق بات کرنا اور حق لکھنا ایک جرم تھا، الطاف حسن قریشی نے اس دور میں جرات تحریر سے کام لیا۔وفاقی

سیکریٹری ارشاد کلیمی نے اپنے مخصوص انداز میں خیالات کا اظہار کیا اور تاریخ کے کئی دریچے وا کر دیئے۔ اینکر انیق احمد نے الطاف حسن کی کتاب سے مجیب الرحمٰن کے انٹرویو کے اقتباسات ڈرامائی انداز میں پڑھ کر سنائے۔ فاطمہ حسن ایک طویل مضمون میں کتاب کے انٹرویوز کا جائزہ لیا۔ آخر میں ندیم اقبال نے کہا کہ فاران کلب معاشرے میں کتاب کی اقدار کو فروغ دے رہا ہے۔ اور فاران کلب لائبریری اس وقت بہترین لائبریوں میں شمار ہوتی ہے۔

وی آئی پی مومنٹ کا عذاب اور بدترین ٹریفک جام

صبح سویرے گھر سے نکلتے ہوئے ہر ممکن احتیاط کے باوجود نیشنل اسٹیڈیم کے پاس ایک چھوٹی سی تنگ سڑک پر ہزاروں گاڑیاں گھنٹوں سے بدترین ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس ہجوم میں میں بھی شامل تھا، کونے پر ٹریفک پولیس والے مزے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے، دوپہر میں گاڑی کے بجائے رکشاء والے سے ڈیڑھ سو روپے طے کرکے، گرومندر سے سی ایم ہاؤس تک جانے کے لئے نکلا تو آواری ٹاورز کے پاس ٹریفک وی آئی پیم مومنٹ کے لئے بند تھا، اسکول وین یں بچے گرمی سے پریشان تھے، اور بغیر اے سی کی گاڑیاں والے دھوئیں اور گرمی سے بے حال تھے۔ یہاں بھی لوگ گھنٹوں ٹریفک میں پھنسے رہے، گذشتہ روز جہلم نے شہریوں کو اسی طرح گھنٹوں ٹریفک جام کے عذاب میں مبتلا کیئے رکھا۔ اس وقت کراچی کے علاقے شارع فیصل پر بدترین ٹریفک جام ہے۔ گاڑیوں کی لمبی قطاروں سے شہریوں کو گھر پہنچنے میں شدید مشکلات کا سامنا ہے، جبکہ شہری کئی گھنٹے سے ٹریفک جام میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایئر پورٹ جانے والے ہوں یا ایمبولینس میں موت اور زیست کی جنگ میں مبتلا مریض سب ٹریفک کا عذاب جھیل رہے یں۔ آج تو یوں بھی بادشاہ سلامت وزیراعظم) کی سواری شہر میں ہے۔ دوسری جانب دفاعی نمائش 4 روز تک جاری) رہے گی جس میں 43 ممالک اور 90 وفود شرکت کررہے ہیں اور ان میں سے 30 مندوبین اعلیٰ سطح کے ہیں جنمیں سربراہ، وزیر دفاع، ڈیفنس سیکرٹریٹر، چیف ڈیفنس اسٹاف یا

حاضر چیفس ہیں۔ ان وی آئی پیپیز نے پورے شہر کو عذاب میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ دوسری جانب دعوی کیا گیا تھا کہ دفاعی نمائش کا سیکیورٹی پلان ترتیب دے دیا گیا ہے جس کے مطابق 2 ایس پیز، 4 ڈی ایس پیز سمیت 2 ہزار پولیس اہلکار سیکیورٹی پر تعینات کیا گیا، سوک سینٹر کے اطراف سڑکیں ٹریفک کے لئے بند کردی گئی۔ کراچی کے لئے یہ نئی بات نہیں نیو اسلامیہ روڈ پر شام کو کار ڈیلروں کا قبضہ ہوتا ہے، حسن اسکوئر سے آگے فوڈ اسٹریٹ والے پورے روڈ پر قابض ہیں جگہ جگہ پتھارے لگے ہیں، جیل روڈ میکنک اور ورکشاپ بنا ہوا ہے۔ شہر کے جس حصے میں آپ شام اور رات کے اوقات میں ٹریفک میں بلاوجہ پھنسی گاڑیاں دیکھیں، سمجھ جائیں آس پاس کوئی نہ کوئی موبائل مارکیٹ، کار ڈیلرز، فوڈ اسٹریٹ کی دکانیں، ٹھیلے بازار لگے ہوں گے۔ کراچی میں اسٹریٹ کرائم اور دہشت گردی کے بعداب ’ٹریفک جام‘ کی دہشت گردی سے بھی عوام کا پارہ اوپر چڑھا ہوا ہے۔ پورا شہر تقریباً 18 ٹاؤنز اور 5 اضلاع پر مشتمل ہے اور ہر ڈسٹرکٹ میں ایک یا دو ایسے شاپنگ مالز اور مارکیٹس موجود ہیں جو دن بھر اور خاص کر شام کے اوقات میں ٹریفک کی روانی میں بری طرح خلل کا سبب بن رہے ہیں۔ لیکن شہری حکومت اور صوبائی حکومت لاتعلقی اور نااہلی کے ساتھ شہریوں کی بے بسی کا مزاق اڑاتی نظر آتی ہے۔ شہر میں جدھر بھی چلے جایئے راستے تنگ نظر آتے ہیں اور گلیاں ایک دوسرے سے ’دست و گریبان‘ ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ بیشتر مقامات پر لگتا ہے گاڑیاں دکانوں کو چھو کر گزر رہی ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ جیسا گاڑی کسی دکان کے اندر ہی نہ آجائے۔

کراچی تقریباً دو کروڑ کی آبادی رکھنے والا پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اسے بڑھتی ہوئی آبادی ہی نہیں، بلکہ سال بھر بڑھتے ٹریفک کے بھی کئی سنگین مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ یہاں کی پولیس نے ایک عرصے سے ٹریفک کنٹرول کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تاہم وہ رشوت وصول کرتے، موٹر سائیکل سواروں سے بھتہ لینے میں مستعد نظر آئیں گے۔ اولڈ سٹی ایریاز، ایم اے جناح روڈ، صدر نیو ایم اے جناح روڈ، طارق روڈ، حیدری مارکیٹ نارتھ ناظمآباد اور راشد منہاس، یونیورسٹی روڈ، شاہراہ فیصل، ہر جگہ ایک سا حال ہے۔ اس وقت ''شہر میں 38 لاکھ گاڑیاں چل رہی ہیں اور اس میں ہر روز گاڑیوں کا اضافہ ہو رہا ہے جبکہ شہر میں ٹریفک مینجمنٹ کو بہتر بنانے کے لئے کوئی 900 ٹھوس نظام کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا۔ صبح اور شام گاڑیوں کا سیلاب سڑکوں پر امڈ آتا ہے اور ساتھ ہی ٹریفک جام ہونے لگتا ہے۔ فضاء زہریلے دھویں سے بھرنے لگتی ہے جو انسانی صحت کے ساتھ ساتھ حیوانات اور شہر کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے والے سبزہ زاروں کے لئے بھی 'خاموش موت' کا سبب بن رہا ہے۔ اوور لوڈ گاڑیاں جان کیلیئے وبال جان بن گئی ہیں۔ پاکستان میں ٹریفک کے قوانین ہوتے ہوئے بھی ٹریفک والے جس طرح سے ان قوانین کی دھجیاں اڑھا رہے ہیں ۔ یہ ایک المیہ ہے۔ انگنت گاڑیوں کے انجنوں کا شور انسانی سماعت کو مسلسل 'زخمی' کر رہا ہے۔ اس پر ٹریفک'' جام میں اپنا راستہ بنانے کے لیے 'چیختی چلاتی' ایمبولینسز کا شور دل دہلا دیتا ہے۔ ''آج کی طرح شہر میں اگر کوئی وی آئی پی سڑکوں سے گزرنے لگے تو شاہراہیں محض پروٹوکول' کے سبب کئی کئی گھنٹوں تک بند کر دی جاتی ہیں اور ٹریفک جام ہو جاتی' ہیں۔ اس ویآئی پی کلچر کے سندھ ہائی کورٹ میں

باقاعدہ درخواستیں زیر سماعت ہیں۔ لیکن عدالتیں سو رہی ہیں۔ وی آئی پی موومنٹ کی آمد کے موقع پر ٹریفک کی بندش کے سبب کئی قیمتی انسانی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ اس شہر میں بہتر ٹریفک مینجمنٹ ایک خواب بنا ہوا ہے۔ یہ خواب کب پورا ہوگا یہ بھی کوئی نہیں بتاسکتا۔